بسم اللہ الرحمن الرحیم

ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر

بیان القرآن

یعنی

اردو ترجمۃ القرآن معہ حل لغات و حواشی تفسیریہ

تالیف

حضرت مولینا محمد علی
مفسر انگریزی ترجمہ و تفسیر القرآن

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام

لاہور

۱۴۰۱ ہجری

www.aaiil.org

بیان القرآن

از

حضرت مولانا محمد علیؒ

احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام لاہور

www.aaiil.org

- بار اوّل ——— لیتھو ایڈیشن ——— تین جلدوں میں

جلد اوّل سنہ ۱۳۴۰ھ بمطابق سنہ ۱۹۲۲ء
جلد دوم سنہ ۱۳۴۱ھ بمطابق سنہ ۱۹۲۳ء
جلد سوم سنہ ۱۳۴۲ھ بمطابق سنہ ۱۹۲۴ء

- بار دوم ——— عکسی ایڈیشن ——— سنہ ۱۹۶۹ء
- بار سوم ——— عکسی ایڈیشن ——— سنہ ۱۹۷۲ء
- بار چہارم ——— بڑا سائز ——— عکسی ایڈیشن ——— محرم الحرام سنہ ۱۴۰۱ھ بمطابق دسمبر سنہ ۱۹۸۰ء

- مطبع : الجدّہ پریس اردو بازار لاہور
- ناشر : احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

اللہ تعالیٰ نے قوموں کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں میں اپنے رسول بھیجے اور ان کی تعلیم نے مُردہ دلوں پر وہی کام کیا جو آسمانی بارش مُردہ زمین پر کر کے دکھاتی ہے وہ روشن چراغ تھے جنہوں نے ایک تاریک رات میں انسانوں کی مختلف بستیوں کو منور کیا اور ان سب کے آخر اللہ تعالیٰ کے ظاہری قانون قدرت کے مطابق وہ آفتاب عالمتاب نمودار ہوا جس نے کُل عالم کو منور کیا اور جس کے سامنے سب روشنیاں ماند پڑ گئیں، وہ سراج منیر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہ نور ہدایت جو آپ لائے قرآن کریم ہے۔ آپ کے بعد کسی پیغامبر کی ضرورت نہ رہی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا آخری اور کامل پیغام لوگوں تک پہنچ گیا اور نہ کسی نبی کی ضرورت رہی اس لیے کہ تمام صفات الٰہی کا کامل مظہر آچکا۔ دنیا میں اب ایک ہی پیغام ہوگا اور ایک ہی پیغامبر یہ دونوں تاقیامت زندہ رہیں گے، ہاں اس پیغام کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے واقف ہونا اور اس پیغامبر کے حالات سے آگاہی حاصل کرنا ہر ایک مسلم کہلانے والے کا پہلا فرض ہے۔ وہ مقدس پیغام ان لوگوں کی زبان میں نازل ہوا جنہوں نے دنیا میں اس کے حامل بننا تھا۔ مگر آج اس عالم کے مختلف اطراف واکناف میں رہنے والے مسلمان اس زبان سے ناآشنا ہیں اور بہت ہیں کہ اس پیغام کو پڑھتے ہیں مگر انہیں علم نہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس پیغام کی غرض یہ تھی کہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں اور غلط راہوں کو چھوڑ کر اپنی دینی اور دنیوی فلاح کا صحیح راستہ اختیار کریں تو اس کا مطلب سمجھے بغیر وہ غرض حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں نے جب تبلیغ اسلام کی ضرورت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے انگریزی میں اس پاک کلام کے ترجمہ اور مطالب کو بیان کیا تو بہت سے احباب نے یہ اصرار کیا کہ اُردو زبان میں بھی اپنے اہل ملک کے فائدہ کے لیے اسے شائع کیا جائے مگر یہاں کی ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے از سرِ نو یہ کام کرنا پڑا۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ ہر ایک مسلمان قرآن کریم کو پڑھے اور اس کے مطالب پر آگاہ ہو کر اپنی روزمرہ زندگی میں درپیش مشکلات پیش آمدہ میں اسے اپنا ہادی اور رہنما بنائے اس راہ کو اختیار کیے بغیر مسلمان کبھی موجودہ مشکلات سے باہر نہیں نکل سکتے۔

انگریزی ترجمہ کی طرح اُردو ترجمہ قرآن شریف مکمل ایک جلد میں شائع نہیں ہو سکا جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس ترجمہ و تفسیر میں انگریزی کی نسبت بہت زیادہ تشریح ہے۔ الفاظ کی لغت کی تشریح کے علاوہ حواشی تفسیریہ بھی زیادہ ہیں اور ان میں بسط بھی زیادہ ہے اور اس لیے اس کا حجم بھی قریب قریب انگریزی ترجمہ کے حجم سے (دیباچہ کو الگ کر کے) دوچند ہو جائیگا اور علاوہ بریں یہ دقت ہے کہ انگریزی کے لیے جو باریک کاغذ استعمال ہوا ہے ہندوستان میں وہ مشینیں نہیں کہ جو اسے چھاپ سکیں اس لیے موٹا کاغذ لگانا پڑا اور قرآن کریم کو تین جلدوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ اسوقت پہلی جلد شائع ہوتی ہے جو قریباً ساڑھے سات سو صفحوں کی ہے اور گو اس میں قریباً ساڑھے سات پارے ہیں مگر آئندہ جلدوں کا حجم جو قریباً گیارہ گیارہ پاروں کو لئے ہوئے ہونگی اسی کے قریب قریب ہوگا کیونکہ بیشتر مضامین پہلے پاروں میں تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں اس لیے آئندہ حواشی میں ان مضامین کے دہرانے کی ضرورت نہ رہے گی اس جلد کے ساتھ صرف ان مضامین کی فہرست لگائی گئی ہے جو تفسیری حواشی میں آ گئے ہیں اور ان الفاظ کی فہرست جن کی لغت بیان ہوئی ہے نہیں لگائی گئی اس لیے کہ ایسی فہرست اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جب وہ ترتیب وار لغت کی طرز پر تیار ہوتی اور یہ کام سوائے تکمیل کے ہو نہیں سکتا۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ مکمل فہرست آخری جلد کے ساتھ لگائی جائیگی اس وقت تک لغت کی تشریح کی تلاش میں بلاشبہ قارئین کرام کو دقت پیش آئے گی مگر یہ مجبوری ہے علاوہ ازیں آخری جلد کے ساتھ مضامین کی انڈکس بھی ہوگی جس سے یہ تلاش کرنا آسان ہو جائے گا کہ کس مضمون پر کس مقام پر بحث ہے۔

ترجمہ کے متعلق میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میری یہ کوشش رہی ہے کہ اصل الفاظ کو محاورۂ زبان پر کسی طرح قربان نہ کیا جائے بایں محاورہ کو مدنظر رکھا ہے اور لفظی ترجمہ کرتے ہوئے اسے اُردو کے محاورہ کے مطابق ادا کیا ہے۔ ترجمہ کو عموماً الفاظ کی حد سے نہیں نکلنے دیا گو محاورہ اُردو نے اسبات کے لیے مجبور کر دیا ہے کہ ہر لفظ کا ترجمہ اس لفظ کے نیچے نہیں آسکا۔ ترجمہ میں اپنی طرف سے لفظ بڑھانے کے اصول کو قریباً بکلی ترک کیا گیا ہے۔ ہاں جہاں اُردو زبان میں آکر مطلب خبط ہوتا تھا زاید الفاظ کو خطوط وحدانی میں لکھ دیا گیا ہے جو کہ بہت ہی کم دیکھنے میں آئے گا۔

حل لغت میں امام راغب کی نادر کتاب مفردات فی غریب القرآن کو مقدم کیا ہے جو لغت قرآن میں بہترین کتاب ہے اور اس کا بیشتر حصہ نوٹوں میں آجائیگا۔ مگر اس کے ساتھ ہی تاج العروس اور لسان العرب جیسی ضخیم کتابوں کی طرف بھی بکثرت رجوع کیا ہے اور جہاں مفردات میں کسی لفظ کی تشریح میں کمی تھی اسے دوسری معتبر لغاتوں سے پورا کر دیا ہے۔ عام قارئین کو لغت کے حصہ سے زیادہ دلچسپی نہ ہوگی اور مفردات کی فلسفیانہ بحث لغت الفاظ شاید تفصیل بھی معلوم ہوں مگر اس کے بغیر تفسیری حواشی نامکمل ہوتے اور چونکہ میرا منشاء یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں قرآن کریم کے درس تدریس کا سلسلہ عام طور پر جاری ہو اور یہ غرض بغیر حل لغت حاصل نہ ہو سکتی تھی اس لیے میں نے اس اضافہ کو ضروری سمجھا۔ ہاں عام قارئین حصہ لغت کو ترک کر سکتے ہیں ہر لفظ جس کی تشریح کی ہے اس تشریح کے سامنے حاشیہ پر وہ لفظ حروف عربی میں دیدیا ہے اور مضامین جن پر بحث ہے ان کی سُرخیاں اُردو حروف میں ہیں۔ پس جن قارئین کو لغت کے حصہ کی ضرورت نہیں وہ اسے آسانی سے چھوڑ سکتے ہیں۔ حل لغت میں بہترین صورت یہ ہوتی کہ ایک لفظ کی مکمل تشریح اور قرآن شریف کے مختلف موقعوں پر اس کا استعمال ایک جگہ آجاتا مگر اس طرح پر حجم بھی بہت بڑھ جاتا اور حل لغت کے حصہ میں ثقالت بھی بڑھ جاتی۔ اس لیے عموماً ملتے جلتے استعمال کا ایک جگہ ذکر کر دیا ہے اور جہاں کسی دوسرے معنی میں لفظ کا استعمال ہوا ہے اسے اپنے موقعہ پر بحث کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اس جگہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں الفاظ کے استعمال میں وسعت لغوی موجود ہے اور ایک جگہ ایک لفظ ایک معنی میں استعمال ہوا ہے تو دوسری جگہ کسی اور معنی میں استعمال ہو گیا ہے اور یہ صرف سیاق سے ہی فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کونسے معنی کس جگہ مراد ہیں۔ مثلاً کفار کا لفظ عموماً حق کا انکار کرنے والوں پر بولا گیا ہے مگر ایک جگہ اپنے لغوی معنی میں کسانوں پر بھی بولا گیا ہے اصحاب الجنۃ سے عموماً بہشتی ہی مراد ہیں مگر ایک جگہ اس دنیا کے ایک باغ کے مالک بھی مراد لیے گئے ہیں اصحاب النار دوزخی ہیں مگر ایک جگہ دوزخ کے داروغے بھی ہیں۔

اصول تفسیر پر مفصل بحث کی جگہ نہیں، میں نے جن اصول کو مدنظر رکھا ہے وہ یہ ہیں۔ اول یہ کہ قرآن کریم کے ایک موقعہ کا حل دوسرے موقعہ سے کیا جائے اور یہ اصول خود اس پاک کتاب نے بتایا ہے جہاں تک متشابہات کے ذکر میں کل من عند ربنا فرما کر بتا دیا کہ ایک مقام کی تفسیر قرآن کریم کے دوسرے مقام کے خلاف نہیں ہونی چاہیئے جہانتک میں نے اس پاک کتاب پر غور کیا ہے یہی معلوم ہوا ہے کہ کوئی مضمون اس میں ایک جگہ بطور اشارہ یا برنگ اجمال ہے تو دوسری جگہ اس کی وضاحت اور اس کی تفصیل موجود ہے اور اس بات نے مجھے بہت سے مشکل مقامات کے حل کرنے میں مدد دی ہے اور جہاں معنی میں اشتباہ واقع ہو وہاں سب سے بڑھکر خود قرآن پاک اس اشتباہ کو دور کرتا ہے دوسری بات یہ مدنظر رکھی ہے کہ احادیث صحیحہ کو تفسیر میں اور باتوں پر مقدم کیا جائے اس غرض کے لیئے میں نے امام بخاری کی کتاب التفسیر تفسیر ابن جریر اور تفسیر ابن کثیر کو سامنے رکھا ہے لیکن یہاں چند باتوں میں احتیاط ضروری ہے یعنی اول کوئی حدیث خواہ وہ صحاح کی ہو قابل قبول نہیں اگر قرآن کریم کی صراحت کے خلاف ہو یا اصول دینی کے خلاف ہو۔ دوم تفاسیر میں بہت سی اسرائیلی روایات راہ پا گئی ہیں اور ان پر اس قدر اصرار ہو گیا ہے، کہ ان کے خلاف اگر کہا جائے تو بعض لوگ ناواقفی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ حدیث کو رد کر دیا گیا۔ سوم قصص کی احادیث پر خود محدثین نے وہ تنقید نہیں کی جو اوامر و نواہی کی احادیث پر کی ہے اس لیے حدیث قصص بہت احتیاط سے قبول کرنے کے قابل ہیں چہارم جو باتیں احادیث میں واقعات یا مشاہدہ یا مسلمہ تاریخ کے خلاف ہوں وہ قابل قبول نہیں اور ان سب امور کے علاوہ یہ بات مدنظر رکھنے کے قابل ہے کہ احادیث اور بالخصوص احادیث قصص میں روایت بالمعنی ہے تیسری بات جس کا میں بالخصوص ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ میں نے استعمال الفاظ کے متعلق لغت کو سب سے مقدم کیا ہے جن معنوں کی اجازت لغات عربی نہیں دیتی ان معنوں کو قبول نہیں کیا صحابہ کے اقوال کی میں بہت عزت کرتا ہوں لیکن کسی صحابی سے اختلاف کرنا جرم نہیں۔ صحابہ میں خود آپس میں بھی اختلاف تھے مفسرین نے بھی ان سے اختلاف کیا ہے اور سب سے آخر اقوال مفسرین کے متعلق اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ان بزرگوں کی محنت کی ان کے علم و فضل کی ان کے عشق قرآن کی میرے دل میں بیحد عظمت ہے اور ان کی خدمت قرآن کے سامنے میں اپنی اس ناچیز خدمت کو ہیچ سمجھتا ہوں لیکن حالات زمانہ کے اثر سے کوئی شخص خالی نہیں ہو سکتا۔ آج اس زمانہ میں نئے علوم نے قرآن کریم کی عظمت کو اور بھی بڑھا دیا ہے میرے خیالات حالات زمانہ سے متاثر ہو کر غلط ہو سکتے ہیں مگر خدا کے کلام کے ایک حرف کو بھی کوئی علم باطل نہیں کر سکتا۔ ہاں اپنے زمانہ کے مطابق جو علوم ہوں ان کی روشنی میں ہی ہم جو کچھ خدمت کر سکتے ہیں کرتے ہیں۔

اس ترجمہ اور ان حواشی میں ایک بات کی طرف بالخصوص توجہ دلانا چاہتا ہوں قرآن کریم سے اجنبیت نے جن دلوں میں یہ خیال پیدا کیا ہے کہ اس پاک کتاب کے مضامین میں کوئی ترتیب نہیں انہوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے موجودہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہے اور یہ ایک ابلغ اور محکم ترتیب ہے۔ مخالفین میں غور و خوض کی کمی نے بے ترتیبی کا خیال پیدا کیا یہانتک کہ اس زمانہ میں ایک مسلمان نے بھی ان خیالات سے متاثر ہو کر ایک ترتیب نزول اپنے پاس سے بنا کر قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے ترتیب اور نظم دکھانے میں پچھلے مفسرین نے قابل قدر خدمات کی ہیں مگر میں نے اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے اس حصہ کو خاص قوت دی ہے اور تین قسم کی ترتیب کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ہے یعنی اول آیات میں باہمی تعلق جو جگہ جگہ جہاں ضرورت تھی حواشی میں ظاہر کیا ہے دوم ہر سورت کے رکوعوں میں باہمی تعلق، سوم سورتوں میں باہمی تعلق۔ ان دونوں اغراض کے لیے ہر رکوع کا خلاصہ اس رکوع کے نیچے دیدیا ہے اور ہر سورت کے شروع میں ان تمام خلاصوں کی ترتیب اور نظم کو ظاہر کیا ہے جس کا عنوان خلاصہ مضمون ہے اور سورتوں کے باہمی تعلق کو عنوان تعلق کے ماتحت ظاہر کیا ہے اس کے علاوہ سورتوں کے اسماء میں بھی حکمت ہے اور نبی کریم صلعم نے یہ اسماء رکھے ہیں کسی نام کے رکھنے میں جو حکمت میری سمجھ میں آئی ہے اسے ابتدائے سورت میں ظاہر کیا ہے۔

بعض خاص باتوں سے قارئین کرام کو آگاہ کر دینا ضروری ہے ہر سورت کی آیات کا شمار مسلسل چلتا ہے مگر آیت اور رکوع کا شمار اس آیت یا رکوع کے آخر پر نہیں دیا جیسا کہ عموماً مروج ہے؎ بلکہ اس کے شروع میں دیا ہے مثلاً ۱۰/۱۴ سے مراد ہے کہ یہاں سے دسواں رکوع سورت کا اور چودھواں رکوع پارے کا شروع ہوتا ہے اور اس رکوع میں گیارہ آیتیں ہیں آیات کے شمار کے لیے حاشیہ میں علیحدہ جگہ خالی چھوڑی ہے جہاں کسی سطر کے سامنے کوئی نمبر ہے اس سے مراد ہے کہ اس سطر کے کسی موقعہ پر اس نمبر کی آیت شروع ہوتی ہے اور جہاں اس سطر میں دو یا زیادہ آیتیں شروع ہوتی ہیں تو وہ نمبر اسی ترتیب سے اوپر نیچے کر دیئے ہیں اس سے حوالہ کی تلاش میں سہولت رہیگی۔ نوٹوں کا شمار سارے قرآن شریف میں مسلسل ایک ہی چلتا ہے تاکہ کسی نوٹ میں جب دوسرے نوٹ کا حوالہ آ جائے تو اسکی تلاش میں سہولت ہے۔ نوٹوں کے اندر جہاں قرآن کریم کی کسی آیت کا حوالہ دیا ہے سورت کے نام کے اوپر سورت کا نمبر۔ اور آگے آیت کا نمبر دیا ہے۔ جہاں اسی سورت کی دوسری آیت کا حوالہ ہو تو صرف خطوط وحدانی میں آیت کا نمبر دیدیا ہے جہاں ــــ حوالہ ہے اس سے مراد اس نمبر کا نوٹ ہے حوالجات لغت و تفاسیر وغیرہ میں بجائے پورے نام کے اختصاراً حروف دیدیئے ہیں۔ تت تاج العروس۔ ث ابن کثیر۔ ج تفسیر ابن جریر۔ ح تفسیر بحر المحیط۔ ر روح المعانی۔ ز تفسیر کبیر امام رازی۔ ض تفسیر بیضاوی۔ غ مفردات راغب۔ غق تفسیر غرائب القرآن۔ ف تفسیر فتح البیان۔ ک تفسیر کشاف۔ ل لسان العرب۔ ن نہایہ ابن اثیر کی جگہ ہے۔

بالآخر اس بات کا ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ گو قرآن شریف کی اس ناچیز خدمت میں میں نے سلف صالحین کی محنت سے بہت فائدہ اٹھایا ہے مگر میری زندگی میں جس شخص نے قرآن کریم کی محبت اور خدمت قرآن کا شوق پیدا کیا وہ اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی اور ان کے بعد فہم قرآن میں جس شخص نے مجھے اس راہ پر ڈالا وہ اُستاذی المکرم حضرت مولوی نور الدین صاحب مرحوم ہیں اگر کسی شخص کو میری اس ناچیز خدمت سے کچھ فائدہ پہنچے تو وہ جہاں میرے لیے دُعا کرے ان بزرگوں کے لیے بھی دعا کرے میں محض مٹی ہوں اگر اس میں کچھ خوشبو کسی کو معلوم ہو تو وہ کسی اور کی پھونکی ہوئی روح ہے ؎

جمال ہم نشیں در من اثر کرد　　وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

پھر میں اکیلا کچھ نہ کر سکتا تھا اگر میرے وہ احباب جو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کے ممبر ہیں میرے معاون نہ ہوتے مجھ سے بڑھ کر ان احباب کی کوششوں کا نتیجہ یہ ترجمہ ہے جزاہم اللہ خیرا۔ معمولی لغزشوں اور غلطیوں پر اگر کوئی صاحب چشم پوشی سے کام لیں تو اللہ تعالیٰ کی صفت ستاری ہے۔ قابل اصلاح غلطی نظر آئے تو مجھے اطلاع دیں اپنی سمجھ کے مطابق اصلاح کی کوشش کروں گا۔ اختلاف رائے پر صبر کریں تو آج اتحاد اسلامی کے لیے سب سے بڑھ کر اسی کی ضرورت ہے وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الامین۔

اگر اللہ تعالےٰ نے زندگی صحت اور توفیق عطا فرمائی تو دوسری جلد ترجمہ کی انشاء اللہ تعالیٰ نومبر ۱۹۲۲ء میں اور تیسری جلد اپریل ۱۹۲۳ء میں شائع ہو جائے گی۔ مقدمہ علیحدہ کتاب کی صورت میں ہوگا جو کسی وقت بعد میں شائع ہوگا؛

خاکسار
محمد علی

احمدیہ بلڈنگس، لاہور
۸۔ مارچ ۱۹۲۲ء

؎ بعد کے ایڈیشنوں میں مروّج طریقہ ہی اختیار کر لیا گیا۔ ناشر

فہرست مضامین بیان القرآن جلد اول

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
۱- سورۃ الفاتحۃ - ۱تا۶	
سورتوں کے نام توقیفی ہیں	۱
فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی	〃
فاتحہ کے اور نام	〃
اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی چار صفات	〃
فاتحہ کے دو حصے اور ان کا باہم تعلق	〃
فاتحہ کی عظمت	〃
خلاصہ تعلیم قرآنی	〃
فاتحہ میں عقاید باطلہ کی تردید	۲
فاتحہ میں میانہ روی کی تعلیم	〃
بہترین دعا	〃
عیسائی دعا سے مقابلہ	〃
بہترین وظیفہ	〃
ابتدائی وحی	〃
نماز باجماعت کی ابتدا	〃
نزول میں سب سے پہلی مکمل سورت	〃
بسم اللہ کا نزول ہر سورت کی ابتدا میں	〃
ہر سورت میں مستقل آیت ہے	〃
بسم اللہ ہر سورت کا خلاصہ ہے	〃
سورۃ فاتحہ کا خلاصہ	〃
نظام عالم رحمانیت و رحیمیت پر ہے	〃
نظام روحانی بھی رحمانیت و رحیمیت پر ہے	۳
اسم اعظم	〃
بسم اللہ میں عملی توحید	〃
بسم اللہ کی ابتدا	〃
بسم اللہ سے کام میں برکت ہوتی ہے	〃
فعلان اور فعیل کے مبالغہ میں فرق	〃
رحمان دنیا - رحیم آخرت	〃
رحمان غیر اللہ پر نہیں بولا جاتا	〃
حمد - مدح - شکر میں فرق	〃
الحمد میں رضا بالقضا کا سبق	۴
قلب نبوی کی وسعت	〃
احمد - محمد	〃
وحدت نسل انسانی	〃
ضرورت وحی	〃

خلاصہ مضامین	صفحہ
مخلوق کی خدمت کا سبق	۴
رب اور اب	〃
دعاؤں میں ربنا کا استعمال	〃
جزا و سزا اس عالم میں بھی ہے	〃
مالکیت میں گناہوں کی معافی کا اشارہ	〃
عبادت مقصد زندگی ہے	۵
عبادت استعانت پر مقدم ہے	〃
ہدایت چار طرح پر ہے	〃
دعائے فاتحہ کا مقصد	〃
مقام عصمت سے اوپر کمال انسانی کا حصول ہے	〃
منعم علیہم کون ہیں	〃
اسلام کس مقام پر پہنچاتا ہے	〃
انعمت علیہم میں مقام نبوت کی دعا نہیں	〃
نبوت موہبت ہے	〃
النبی - الرسول	〃
کن کمالات کی دعا ہے	۶
دعائے حصول نبوت اور اُمت کی محرومی	〃
غضب الٰہی	〃
مغضوب علیہم اور ضالین کون ہیں	〃
حقوق میں تفریط و افراط	〃
عملی اور علمی غلطیوں سے بچنے کی دعا	〃
آمین	〃
۲- سورۃ البقرۃ - ۷تا۱۷۸	
نام خلاصہ مضمون	۷
ابتدا میں رکھے جانے کی وجوہات	〃
زمانۂ نزول	۸
مدنی سورتوں میں مکی آیات	〃
مقطعات	〃
نفی ریب کا دعویٰ اور اس کی دلیل	〃
متقی بروئے حدیث	〃
تقوی اللہ نگہداشت حقوق ہے	۹
قرآن ہدی للمتقین کس معنی سے ہے	〃
ہدی للناس کس معنی سے	〃
متقی کے لیے غیر متناہی ترقی	〃
تقوی کمال کے حصول کی پہلی سیڑھی ہے	〃

خلاصہ مضامین	صفحہ
ایمان کا دوہرا مفہوم	۹
ایمان کے معنی پر حدیث سے روشنی	〃
ایمان کا مفہوم خاص اسلام میں	〃
ایمان بالغیب کی حقیقت	۱۰
صلوٰت کی اقامت کا مفہوم	〃
اقامت کے حقوق	〃
نماز کی تفصیلات	〃
ارکان و اوقات میں اتحاد اسلامی	〃
آنحضرتؐ کی نماز	〃
ایمان بالغیب اور صلوٰۃ کا تعلق	〃
انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم	۱۱
صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے اکٹھے ذکر میں حکمت	〃
حسن و احسان	〃
وحی اور رسول کا نزول	〃
وحی الٰہی پر ایمان	〃
پہلی وحی پر ایمان میں حکمت	〃
پہلی وحی پر عمل کی ضرورت نہیں	〃
ایمان بالآخرۃ کا مفہوم	۱۲
مذہب کی اصلی غرض	〃
جزا و سزا پر یقین گناہ سے بچاتا ہے	〃
مفلح کون ہیں	〃
ہر فعل مذموم کفر میں داخل ہے	〃
اصل اور فرع کا کفر	〃
اضداد کا ذکر	۱۳
انذار کی پروا نہ کرنے والے	〃
دلوں پر مہر سے مراد	〃
خدا کی مہر نتیجۂ اعمال ہے	〃
بدی کا اثر ساتھ ساتھ پیدا ہوتا ہے	〃
عقل سے کام نہ لینا دل پر مہر ہے	〃
برے کام کو اچھا سمجھنا دل پر مہر ہے	۱۴
مہر لگانے کی نسبت اللہ کی طرف	〃
زردشتی عقیدہ کی تردید	〃
عذاب کا استعمال قرآن میں	〃
عذاب عظیم اور عذاب الیم	〃
اللہ اور آخرت پر ایمان سے مراد	〃

خلاصہ مضامین	صفحہ	خلاصہ مضامین	صفحہ	خلاصہ مضامین	صفحہ
عبداللہ بن اُبی	۱۴	قرآن کی مثل کا مطالبہ	۲۱	قوائے عالم پر انسان کے تصرف کی غرض	۲۸
اسلام کے اندرونی دشمن	〃	شرط یہ نہیں چاہیے فصاحت و بلاغت چاہیے حقیقت مضامین ہدایت دینا	〃	سجدۂ اختیار و تسخیر	〃
منافقین زمانہ حال	〃	پتھر کس معنی میں دوزخ کا ایندھن ہیں	〃	لغوی معنی میں سجدہ	〃
عملی نفاق	〃	دوزخ پر فنا	〃	ملائکہ کے سجدہ سے مراد	〃
منافقوں کی دھوکہ بازی	۱۵	بہشت کے باغ اور نہریں	۲۲	ابلیس اور شیطان	۲۹
امراض روحانی	〃	جنت کے پھل	〃	ابلیس اور قوت وہمیہ	〃
منافقوں کی بیماری	〃	بہشت میں ازواج	〃	شیاطین محرک بدی ہیں	〃
خدا کس طرح بیماری بڑھاتا ہے	〃	مچھر کی مثال	۲۳	شیطان کو کیوں پیدا کیا	〃
جھوٹ منافق کا نشان ہے	〃	میثاق عہد	۲۴	نوری ناری مخلوق	〃
صحابی کی روایت پر جھوٹ کا احتمال نہیں	〃	قطع ما یوصل	〃	شیطان کو حکم فرمانبرداری	〃
زمین کا پکڑ کھانا	〃	فساد فی الارض	〃	ابلیس کا انکار سجدہ	۳۰
منافقوں کا فساد اور انکا دعویٰ اصلاح	〃	نیستی سے ہستی دلیل الوہیت ہے	〃	شیطان کی فرمانبرداری	〃
منافقوں کا مسلمانوں کو بیوقوف کہنا	۱۶	اللہ کی طرف رجوع	〃	خلق آدم میں تیسرا امر تنبیہ	〃
انسانوں میں سے شیطان	〃	زمینی مخلوق انسان کے فائدہ کیلئے ہے	〃	بہشت میں بیبیاں	〃
بُرے اخلاق پر شیطان کا اطلاق	〃	آسمان کیا ہے	۲۵	آدم کی پہلی جنت	〃
شیطان کا انسان میں خون کی طرح پھرنا	〃	سات آسمان	〃	سکون روحانی کی جنت	〃
بدی کا محرک شیطان ہے	〃	صفاتِ علم و قدرت	〃	هٰذِهِ الشجرة	۳۱
شیطان صفت انسان	〃	اللہ تعالیٰ کا قول	〃	لا تقربا کا حکم فطری ہے	〃
ایک ہی الفاظ کے اللہ تعالیٰ اور انسانوں پر بولے جانے کے مفہوم میں فرق	〃	فرشتوں کا وجود	〃	بائبل کی غلطی کی اصلاح	〃
اللہ کا استہزا	۱۷	وحی الٰہی خارجی شے ہے	〃	شیطان کی وسوسہ اندازی	〃
کسی فعل پر سزا کا ذکر انہی الفاظ میں	〃	فرشتے قویٰ کا نام نہیں	〃	آدم کی لغزش	۳۲
سزا کا فلسفہ	〃	ذریت آدم خلیفہ ہے	۲۶	ہبوط آدم سے مراد	〃
عمہ اور عمی میں فرق	〃	ضرورتِ نبوت	〃	نفس انسانی اور شیطان	〃
منافقوں کا انجام	〃	انسان کے خلیفہ ہونے سے مراد	〃	فطری کمزوری کا علاج	〃
آگ جلانے کی مثال	〃	فرشتوں کا ذکر فساد	〃	وحی الٰہی خارجی شے ہے	〃
بارش کی مثال	۱۸	ملائکہ کو انسان کی خونریزی کا علم کس طرح ہوا	〃	اولاد آدم کا ہبوط اور اس کا علاج	۳۳
کمزور دل منافق	〃	تسبیح و تقدیس میں فرق	〃	نسل انسانی میں نزول وحی کا قانون	〃
صفات الٰہی اور صفات مخلوق میں کامل و ناقص کا امتیاز	۱۹	آدم	۲۷	فطری بیگناہی اور کامل عصمت	〃
خدا کی مشیت انسان کی مشیت پر غالب ہے	〃	الاسماء سے مراد	〃	وحی کی ضرورت	〃
قادر مطلق پر اعتراض اور اس کا جواب	〃	بنی آدم اور علم اسماء	〃	اس دنیا کا دوزخ	〃
خدا نیستی سے ہستی کرتا ہے	〃	خدا کا انسان کو علم دینا	〃	بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل	۳۴
عبادت اور اطاعت میں فرق	〃	خواص اشیاء کا علم	〃	عرب میں یہودی	〃
خلق سے توحید الٰہی پر دلیل	〃	ملائکہ پر اشیاء کا پیش کرنا	〃	بنی اسرائیل کے ذکر سے اصل مقصود	〃
عبادت سے حصول کمال	〃	انبئونی میں اشارہ	〃	بنی اسرائیل کا خدا سے عہد	〃
نظارہ قدرت اور فطرت انسانی کا مقابلہ	۲۰	صادق ہونے سے مراد	〃	مسلمانوں کا عہد	〃
شرک فی العبادۃ شرک فی الذات ہے	〃	ملائکہ اور علم خواص اشیاء	۲۸	قرآن کے مصدق کتب ہونے سے مراد	۳۵
شہید کون کون ہیں	〃	آدم کا ملائکہ کو اسماء بتانا	〃	مثیل موسیٰ کی پیشگوئی	〃
رازِ توحید وحی نے کھولا ہے	〃	ملائکہ کے کتمان سے مراد	〃	حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک تین نبیوں کا انتظار	〃

خلاصہ مضمون	نمبر صفحہ
یہودیوں اور عیسائیوں پر اتمام حجت	۳۵
ثمن قلیل	〃
حق و باطل کی ملاوٹ	〃
نماز اور زکوۃ	۳۶
واعظ کیلئے ضرورت عمل	〃
مذہب میں عقل کے استعمال کی ضرورت	〃
عقل اور وحی	〃
طریق استعانت	۳۷
مصائب میں توجہ الی اللہ کی ضرورت	〃
لقاء اللہ	〃
رجوع الی اللہ	〃
بنی اسرائیل کی فضیلت	〃
مسئلہ شفاعت	۳۸
آل محمد اور اُمت محمد	〃
فرعون رعمیس	۳۹
بنی اسرائیل سے ذلیل کام کروانا	〃
بنی اسرائیلی لڑکوں کا مارنا	〃
بنی اسرائیل کا عبور دریا	〃
رعمیس ثانی کا زمانہ	۴۰
نزول شریعت موسوی	〃
بنی اسرائیل اور گائے کی پرستش	〃
خلق۔ برأ میں فرق	۴۱
قتل نفس سے مراد کیا ہے	〃
بنی اسرائیل کا اللہ کو دیکھنے کا سوال	〃
حضرت موسیٰ کا سوال رب ارنی کرنا	〃
صاعقہ اور رجفہ ایک ہی ہیں	۴۲
موت کے مختلف معنی	〃
بنی اسرائیل کی موت کے بعد زندگی	〃
بادل کا سایہ	〃
من و سلوی کا اُترنا	۴۳
بنی اسرائیل کا جنگ سے انکار	〃
رجز کا عذاب	۴۴
ابتدائی مذاہب کی دعائیں	〃
بارہ چشموں کا معجزہ	〃
بلا محنت مانگنے کی عادت بنی اسرائیل اور مسلمان	۴۵
زراعت اور فتوحات ملکی کا مقابلہ	〃
قتل بمعنی اشراف علی القتل	۴۶
نبی کے لغوی معنی اور اصطلاح شریعت	〃

خلاصہ مضمون	نمبر صفحہ
نبی کیلئے کتاب ضروری ہے	۴۶
آنحضرتؐ کے بعد نبی نہیں	〃
بنی اسرائیل کی ذلت و مسکنت	〃
قتل انبیا سے مراد	〃
ایمان باللہ والیوم الآخر	۴۷
وسعت دائرہ اسلام	〃
کامل نجات صرف اسلام میں ہے	〃
اخذ میثاق	〃
پہاڑ اٹھانے سے مراد	〃
بنی اسرائیل کا بندر بننا	۴۸
گائے ذبح کرنے کا حکم	۴۹
گائے کے ذبح کے مقابل پر ایک اور واقعہ	۵۰
مسیح کے قتل کی کوشش	〃
قرآن کریم آپ اپنی تفسیر کرتا ہے	۵۱
حضرت مسیح اور واقعات صلیب	〃
بنی اسرائیل کی قساوت قلبی	〃
مسلمانوں کی حالت	〃
کلام اللہ کا مفہوم بلا لفظ نہیں	۵۲
تحریف لفظی	〃
بائبل میں تحریف لفظی	〃
تحریف شدہ کتاب کا نام توریت و انجیل ہونا	〃
قرآن کریم کن معنوں میں مصدق ہے	〃
ایک مفسر بائبل کا اقرار تحریف لفظی	〃
کتب خمسہ میں تحریف لفظی کی مثالیں	〃
اناجیل اور مسیح کی زبان کا اختلاف	〃
اناجیل کے متعلق پہلے کاتبوں کا خیال	〃
اناجیل میں تحریف لفظی کا اقرار	〃
اناجیل میں تحریف کی مثالیں	۵۳
منافق یہودی	〃
آنحضرتؐ کے ظہور کی پیشگوئیوں کی عام شہرت	〃
یہود کے ذکر میں اشارہ کہ سب مسلمان علم حاصل کریں	〃
یہودیوں اور عیسائیوں کا دعویٰ متعلق عذاب	۵۴
بدی کا مقابلہ	〃
نیکی کی قوت بدی سے زبردست ہے۔	〃
توریت کے احکام	۵۵
اپنی قوم کے خلاف جنگ نہ کرنے کا حکم	〃
تین قیامتیں۔ کبریٰ۔ وسطیٰ۔ صغریٰ	۵۶
اوس و خزرج کی جنگوں میں یہود کی شرکت	〃

خلاصہ مضمون	نمبر صفحہ
مسلمان ایک دوسرے کے خلاف جنگ کریں	۵۶
مسلم کی تعریف	〃
فتاویٰ کفر سے قوم کی تباہی	〃
لفظ رسول کا اطلاق مجاز کے طور پر	۵۷
سلسلہ رسل بنی اسرائیل	〃
رسول کے لیے ہدایت لانا ضروری ہے	〃
روح القدس	〃
ابن مریم نام کی وجہ	〃
روح القدس کا تعلق حضرت عیسیٰ سے	〃
یہودیوں کا شیوہ تکذیب و قتل انبیاء	〃
دلوں کے پردے	۵۸
بنی اسرائیل اور نبی موعود	〃
موعود نبی کی شناخت	〃
یہودیوں کا حسد آنحضرتؐ سے	۵۹
غیر بنی اسرائیل سے نبی آنا کیوں ضروری تھا	〃
منہ سے دعویٰ ایمان اور عملی نافرمانی	〃
توریت کی غلطی کی اصلاح	۶۰
یہودیوں سے مباہلہ	〃
آرزوئے موت	〃
ہزار سال کی زندگی	〃
عیسائیت کی مخالفت اسلام	۶۱
جبرائیل۔ میکائیل۔ اسرافیل	〃
جبرائیل اور یہودی۔ جبرائیل کا وحی لانا	〃
قلب پر نزول قرآن سے مراد	〃
جبرائیل کا آنحضرتؐ پر وحی لانا	〃
میکائیل	۶۲
اللہ کی عداوت کا مفہوم	〃
سلیمان پر یہودیوں کا افترا	〃
سلیمان کی طرف کفر و شرک کی نسبت اور	۶۳
بائبل میں تحریف کی اصلاح	〃
ہاروت و ماروت کا قصہ یہودیوں نے ایرانیوں سے لیا	〃
اس پر محققین اہل اسلام کے خیالات	〃
تعلیم سحر	〃
فری میسنری	۶۴
اسلام کے خلاف خفیہ منصوبے	〃
فری میسنری کی اصلیت	〃
مومنوں کو تکالیف پہنچنے کی وجہ	〃
منصوبہ کرنے والوں کا انجام	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
یہودیوں کی شرارتیں	۶۵
یہودیوں کی مخالفت نیک نیتی سے نہ تھی	″
یہود کا اعتراض کہ شریعت موسوی کیوں منسوخ ہوئی	۶۶
یہ شریعت کس معنی میں موسوی شریعت کی مثل ہے	″
وجوہات کہ یہاں نسخ شرائع سابقہ کا ذکر ہے نہ نسخ	″
آیات قرآنی کا	″
آنحضرتؐ قرآن کو بھولتے نہ تھے	″
نسخ کی کوئی روایت آنحضرتؐ تک نہیں پہنچی	″
صحابی کا قول نسخ پر حجت نہیں	″
روایات نسخ میں ایک دوسرے کی تردید	″
روایات نسخ ضعیف ہیں۔	″
تعداد آیات منسوخ میں بھاری اختلاف	۶۷
اختلاف قبول کر کے منسوخ کہنا	″
یہودیوں کے گستاخانہ سوالات	″
یہود کا بت پرستی کو توحید سے اچھا قرار دینا	″
جنگوں میں مسلمانوں کا عفو پر عمل	″
نماز بطور علاج	۶۸
قرآن دعوی کی دلیل دیتا ہے	″
اسلام شریعت میں دو طرح پر ہے	″
نجات عمل سے ہے نہ الفاظ سے	″
طریق عمل جو جنت میں پہنچاتا ہے	″
خوف و حزن سے نجات	۶۹
ہر مذہب میں سچائی ہونے کی تعلیم	″
غلط عقاید پر اس دنیا میں گرفت نہیں	″
خدا کی عبادت سے روکنے کی سزا	″
مساجد سے مراد مسجد حرام	″
مسلمانوں کا مسلمانوں کو مسجد سے روکنا	۷۰
دنیا کی سزا آخرت کی سزا پر بطور دلیل	″
خانہ کعبہ سے روکا جانے پر مسلمانوں کو تسلی	″
بشارت فتوحات	″
لفظ ولد کا استعمال مجازی	″
عیسائی عقیدہ کی بنیاد	″
ابنیت مسیح کا عقیدہ	″
خدا کا بیٹا بطور مجاز	″
انجیل کی شہادت کہ مسیح مجازاً خدا کا بیٹا کہلایا	″
ابنیت کے عقیدہ سے خدا میں نقص ماننا پڑتا ہے	۷۱
ابنیت کے تعلق سے بڑھ کر مخلوق ہونے کا تعلق ہے	″
بغیر مادہ کے پیدا کرنے والا بیٹے کا محتاج نہیں	″

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
قضا و قدر میں فرق	۷۱
حکم کن	″
خدا کے عام لوگوں سے کلام نہ کرنے کا اعتراض	۷۲
مطالبہ نشان ہلاکت	″
خدا کس سے کلام کرتا ہے	″
نشان ہلاکت کا آنا	″
ملۃ اور دین میں فرق	″
مذہب علم ہے	۷۳
اسلام ایک علم اور کامل ہدایت نامہ ہے	″
کامل علم کے بعد عمل کی ضرورت	″
صحابہ کا بے نظیر عمل قرآن پر	″
مسلمانوں کی موجودہ حالت	″
بنی اسرائیل کو تین مرتبہ خطاب	″
عرب سے تعلق	۷۴
کلمات سے حضرت ابراہیم کی تکمیل نفس	″
وعدہ ابراہیمی	″
قرآن بائبل سے نہیں لیا گیا	″
وعدہ ابراہیمی میں اسمٰعیل کی شمولیت پر تاریخی شہادت	۷۵
بیت المقدس کا دو دو مرتبہ اصل خداوندوں کے ہاتھ سے نکلنا	″
دنیا کی پہلی عبادت گاہ	″
تفرقہ کے بعد اجتماع مذاہب	″
خانہ کعبہ کی قدامت پر مورخ کی شہادت	″
بائبل میں بیت ایل اور اس سے مراد	۷۶
کعبہ کے متعلق دو پیشگوئیاں	″
خانہ کعبہ پر کبھی اس کے دشمن قابض نہ ہوں گے	″
مقام ابراہیم	″
خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم	″
اسمٰعیل اور ہاجرہ	″
فاران	۷۷
عرب کا اسماعیل کی اولاد سے ہونا	″
تطہیر کعبہ	″
مکہ کیلئے دعائے ابراہیم	″
عرب کے عزت پانے کی پیشگوئی	″
ابراہیم کا خانہ کعبہ کو تعمیر کرنا	۷۸
خانہ کعبہ پانچ مرتبہ بنایا گیا	″
خانہ کعبہ بنانے والے مزدور	″
اعمال حج ابراہیم کے قائم کردہ ہیں	″
اعلام اور تعلیم میں فرق	۷۹

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
تعلیم کتاب تلاوت سے الگ رسول کا کام ہے	۷۹
دعائے ابراہیم	″
دعا کا اثر	″
امت مسلمہ اور تزکیہ کا ذکر بطور پیشگوئی	″
رسول کے چار کام	″
علمائے ربانی	″
فیصلہ کیلئے ملت ابراہیمی کا اصل	۸۰
عملی اصول	″
مسلم کا مقام بلند	″
یعقوب	″
وصیت انبیاء بھی دین کیلئے ہوتی ہے	″
جوارح کی عبادت	۸۱
انبیاء سب ایک امت ہیں	″
ملت ابراہیمی کا اعتقادی اصل	″
جامعیت مذہب اسلام	″
دنیا کے کل نبی ایک ہی مذہب پر تھے	″
ما انزل من قبلک کی تفسیر	″
اسلام کسی بزرگ کو جھوٹا نہیں کہتا	۸۲
دین اسلام کا مقابلہ عیسائی بپتسمہ سے	″
خالص اور صافی میں فرق	″
خدا کی ربوبیت کی وسعت	″
مسلمانوں کو تعلیم کہ اپنے دشمن سے بھلائی کریں	۸۳
کفارہ مسیح اور انبیائے سابق	″
تحویل قبلہ	۸۴
تحویل قبلہ پر احادیث	″
تحویل قبلہ دو دفعہ نہیں ہوئی	″
وحی الٰہی قلب نبوی سے نہ پھوٹتی تھی	″
قبلہ کے مضمون میں ختم نبوت کی طرف اشارہ	۸۵
کمالات امت محمدیہ	″
تحویل قبلہ کے ذریعہ سے تمحیص	″
علم بمعنی تمیز۔ علم الٰہی دو طرح پر ہے	″
ضرورت تمحیص	″
قبلہ پرستش کی چیز نہیں	″
قبلہ اصل مقصود نہیں	۸۶
منہ کا آسمان کی طرف پھیرنا	″
خانہ کعبہ کی تولیت	″
اہل کتاب اور آنحضرت صلعم	۸۷
قبلہ سے مراد دین	″

خلاصہ مضمون	نمبر صفحہ	خلاصہ مضمون	نمبر صفحہ	خلاصہ مضمون	نمبر صفحہ
یہودیوں۔ سامریوں۔ عیسائیوں کے قبلے	۸۷	سوء اور فحشاء میں فرق	۹۷	صدقۂ فطر	۱۰۶
اہل کتاب کا آنحضرتؐ کو شناخت کرنا	″	بدی اور بے حیائی کا تعلق غذاؤں سے	″	روزہ سے نیکی کی قوت ترقی پکڑتی ہے	″
وجوہات تقرر قبلہ	۸۸	عقل سے کام لینے کی ہدایت	۹۸	قرآن نام کی وجہ	۱۰۷
مسلمان کعبہ کی پرستش نہیں کرتے	″	مردار وغیرہ کی حرمت شریعت یہود میں	″	ابتدائے نزول قرآن رمضان میں	″
حجر اسود کا بوسہ	″	مسیح کا سؤر سے اظہار نفرت	″	قرآن کے تین کمالات	″
انگورستان کی تمثیل	″	حرمت کی وجہ	″	قرب اللہ کا بندہ سے اور بندہ کا اللہ سے	″
کعبہ کی طرف منہ اتحاد پیدا کرتا ہے	″	حرمت غذا اور تقویٰ کا تعلق	۹۹	رمضان میں قرب الٰہی کی راہیں	″
قبلہ کے حکم کو تین دفعہ دہرانے میں حکمت	۸۹	خدا کا دوزخیوں سے کلام نہ کرنا	″	قرب الٰہی کے حصول کی دعا	۱۰۸
اہل کتاب کا اعتراض	″	تفصیلات شریعت اور اصل الاصول	۱۰۱	معمولی دعائیں اور ان کی قبولیت	″
عبادت الٰہی کا پہلا اور آخری گھر	″	کعبہ کی طرف منہ کرنے کی اہمیت	″	رمضان میں عورت سے رغبت	″
دعائے ابراہیمی کا رسول اور قبلہ ابراہیمی	۹۰	تکالیف میں صبر قوم کی کامیابی کا اصل گر ہے	″	میاں بی بی کا تعلق	″
اعلائے کلمۃ اللہ سے ہی مسلمان بڑے بن سکتے ہیں	″	ایمان کا مفہوم	″	نزول حکم قرآنی سے پہلے روزہ میں تشدد	″
مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اور اس کی مشکلات	″	ایثار	″	روزہ کی حدود	۱۰۹
صبر اور صلوٰۃ	″	دشمنوں سے پیار کا عملی رنگ	″	جہاں دن لمبے ہوں وہاں روزے کا حکم	″
استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا دو دفعہ ذکر	″	نماز اور زکوٰۃ	″	روزہ اور حرام خوری سے اجتناب	۱۱۰
اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے مردہ نہیں	۹۱	ایفائے عہد	″	سوالات کی غرض	″
ان کی زندگی کا مفہوم	″	صبر سب سے بڑا اصل کامیابی کا ہے	″	حج کے مہینے	″
کافر کی بعد موت زندگی حیات نہیں	″	حکم قصاص کی مناسبت	۱۰۲	حرمت کے مہینے	″
شہداء کی زندگی	″	زخموں میں قصاص	″	ابواب جنت و ابواب جہنم	″
شہداء کی موت اور اس سے استدلال کا ناجائز ہونا	″	قصاص میں امتیاز حیثیت نہیں	″	فرشتوں کا کتے والے گھر میں داخل نہ ہونا	″
مصائب میں حکمت	″	خون بہا	″	عرب کی توہم پرستی	″
صحابہ کا کمال صبر	۹۲	قصاص قوم کی زندگی کی بنیاد ہے	۱۰۳	ذی الحج کی دس راتیں	″
انا للہ کا مفہوم	″	حکم وصیت منسوخ نہیں	″	حج اور جنگ کے اکٹھے ذکر میں حکمت	۱۱۱
اللہ کی صلوٰۃ بندوں پر	″	قرآن و حدیث کی شہادت	″	فی سبیل اللہ جنگ سے مراد	″
صفاء اور مروہ کے ذکر میں اشارہ	″	ایک تہائی مال کی وصیت	″	اس کی غرض مذہبی آزادی کا قیام تھی	″
حج اور عمرہ میں فرق	″	خیراتی کاموں کیلئے وصیت	″	اسلامی جنگ کی شرائط	″
سعی بین الصفا والمروۃ	۹۳	ورثا کے لیے وصیت نہیں	″	ہر کافر کے قتل کا حکم نہیں	″
کتمان ہدایت اور اس کے نتائج	″	وصیت کے وقت اصلاح	۱۰۴	جنگ کی حد	″
توحید ہدایت کا اصل الاصول ہے	۹۴	روزہ سب قوموں میں پایا جاتا ہے	″	فتنہ سے مراد کفار کی ایذا رسانی ہے	″
توحید کیا ہے	″	حضرت عیسیٰ کا روزہ رکھنا اور روزہ کی تعلیم	″	مسجد حرام میں جنگ کی ممانعت	۱۱۲
مناظر قدرت سے توحید باری کی شہادت	۹۵	روزہ کی غرض	″	کفار کے جنگ سے رک جانے کی صورت میں حکم	″
فطرت انسانی کی شہادت توحید باری پر	″	خواہشات پر حکومت کی تعلیم	″	یکون الدین للہ سے مراد	″
عقل اور محبت کا مقام	″	عاشورہ کا روزہ	۱۰۵	مذہبی آزادی کا قیام	″
جھوٹے پیشواؤں اور پیروؤں کی ایک دوسرے سے بیزاری	۹۶	روزہ چھوڑنے کیلئے بیماری کی حد	″	حرمت کے مہینوں میں جنگ سے رکنے کا حکم	۱۱۳
بدی پر حسرت عذاب بن جاتی ہے	″	سفر کی حد	″	فی سبیل اللہ اموال کا خرچ نہ کرنا ہلاکت ہے	″
نیکی پر ندامت نہیں ہوتی	″	رخصت یا وجوب	″	حج میں روکا جانے کی صورت	″
غذاؤں کا اثر اخلاق پر	۹۷	آیت فدیہ صیام کی منسوخی میں اختلاف	۱۰۶	سر منڈوانا	۱۱۴
ظاہری اور باطنی طہارت کا تعلق	″	روزے کا فدیہ کون لوگ دے سکتے ہیں	″	حج تین طرح پر	″

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
حج کی غرض	۱۱۵
حج میں زادِ راہ کی ضرورت ہے	″
آخرت کا زادِ راہ	″
حج میں تجارت	″
دینی اور دنیوی ترقی پہلو بہ پہلو	″
میدان عرفات	۱۱۶
اسلام نے کیا انقلاب پیدا کیا	″
غفو عفو پر ترقی ہے	۱۱۷
استغفار کا بلند مرتبہ	″
جنت میں استغفار کی ضرورت	″
امتیاز قومی کو دور کیا	″
رمی جمار یعنی کنکریوں کا پھینکنا	″
حج میں دوڑنا اور تیز چلنا	″
طواف	″
باپ دادوں کی بڑائی کرنے سے روکا ہے	″
دعائے جامع دین و دنیا	″
دنیا کی حسنات کی طلب	″
خدا کا محاسبہ دنیا اور قیامت میں	۱۱۸
ایام تشریق	″
مہذب مفسد	″
حکومت کی اصل غرض	۱۱۹
مہذب اقوام کا نقشہ	″
مسلمانوں کا حکومت کی اصل غرض کو بھلا دینا	″
جھوٹی شیخی حصول کمال میں مانع ہے	″
صحابہ کا بلند مقام	″
اسلام میں کامل طور پر داخل ہونے کی ضرورت	۱۲۰
بادلوں کے سائے	″
اللہ کا آنا	۱۲۱
ملائکہ کا آنا	″
جنگوں میں نزول ملائکہ	″
فتح مکہ	″
غلبۂ اسلام کی پیشگوئی	″
آنحضرتؐ کی صداقت کے کھلے نشان	″
تبدیل نعمت اللہ	″
تباہی چاہنے والوں کو جواب	″
بری چیزوں کا اچھا دکھانا شیطان کا کام ہے	۱۲۲
کافروں کا مومنوں پر ہنسنا	″

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
فوقیت اخلاق سے ہے	۱۲۲
قرآن شریف کس دنیا کی زندگی کی مذمت کرتا ہے	″
انبیاء کی بعثت کا عام قانون	″
سب اختلافوں کے فیصلہ کیلئے محمد صلعم کی بعثت	۱۲۳
ہر نبی کے ساتھ کتاب اتری	″
حق کے قیام میں مشکلات	″
نصرت الٰہی کیا ہے۔	″
انفاق مال کی ترغیب	۱۲۴
مسلمان جنگ کو ناپسند کرتے تھے	″
موجودہ حالت اور جنگ	″
حرمت کے مہینوں میں جنگ	۱۲۵
کفار کی مسلمانوں پر زیادتی	″
ابن حضرمی کا قتل	″
کفار کی مسلمانوں سے جنگ میں غرض	″
ہر مرتد کا حکم قتل نہیں	″
ہر مرتد کا نکاح فسخ نہیں ہوتا	۱۲۶
حصول طلاق کے لیے عیسائیت	″
حبط عمل تین طرح پر ہے	″
حبط عمل کی دو اور صورتیں	″
ہجرت	۱۲۷
جہاد کی تین قسمیں	″
جہاد اصغر جہاد اکبر	″
منافقوں سے جہاد	″
مقدم کونسی ہجرت اور جہاد ہیں	″
خمر و میسر کا تعلق	″
خمر و میسر کا جنگ سے تعلق	۱۲۸
عیسائی اقوام کی خاص بیماریاں اور انکا علاج	″
یہودیوں میں حرمت شراب قطعی نہ تھی	″
ہندوؤں میں شراب	″
عیسائیت اور شراب	″
شراب اور آنحضرتؐ کی قوت قدسی	″
حرمت شراب کی تدریج میں حکمت	″
شراب تھوڑی اور بہت یکساں حرام ہے	″
شراب کا استعمال بطور دوا	″
نفس اور اولاد پر خرچ	۱۲۹
یتیموں سے میل جول	″
انجمنیں اور یتامیٰ	″
مشرکین سے تعلقات نکاح کی ممانعت	۱۳۰
شرک سے بیزاری عملی رنگ میں	″

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
مشرکین اہل کتاب سے نکاح	۱۳۰
مسلمان اور مشرکانہ رسوم	″
مسائل طلاق کا تعلق جنگ سے	۱۳۱
ایام حیض میں مقاربت	″
قرآن کریم میں مرد و عورت کے تعلقات	″
بائبل میں فحش قصے	″
ستیارتھ پرکاش میں مرد و عورت کے تعلقات کا ذکر	″
عورت کے بمنزلہ کھیتی ہونے سے مراد	″
انی شئتم سے مراد	۱۳۲
نیکی سے روکنے کی قسم یا عہد	″
لغو قسمیں	″
عورت کے پاس جانے کی قسم	۱۳۳
عربوں میں طلاق	″
یہودیوں اور ہندوؤں میں طلاق	″
عیسائیت اور طلاق	″
اسلام نے طلاق میں اعتدال قائم کیا	″
وجوہ طلاق کو کیوں معین نہیں کیا	″
طلاق حالت طہر میں ہو سکتی ہے	″
طلاق پر پہلی حد بندی	″
طلاق پر دوسری حد بندی عدت ہے	۱۳۴
عدت کی دوسری غرض	″
طلاق پر تیسری حد بندی	″
مساوات حقوق زوجین اور مردوں کی فوقیت	″
معاشرت اور تمدن	″
طلاق پر چوتھی حد بندی	۱۳۵
طلاق پر پانچویں حد بندی	″
طلاق صرف دو دفعہ دی جا سکتی ہے	″
تین دفعہ طلاق کہنے کا کوئی حکم نہیں	″
طلاق رجعی اور طلاق بائن	″
طلاق بدعی	″
تین طلاق کتاب اللہ سے ہنسی ہے	″
تین طلاق ایام جاہلیت کا بقیہ ہے	″
تین طلاق اور حضرت عمرؓ کا فیصلہ	″
طلاق کے تین اقسام	″
حالت حیض کی طلاق طلاق نہیں	۱۳۶
طلاق میں حسن سلوک کا حکم + مہر کی ادائیگی ضروری ہے،	″
طلاق پر چھٹی حد بندی ادائیگی مہر ہے	″
عورت بذریعہ قاضی طلاق حاصل کر سکتی ہے۔	۱۳۷

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
جمیلہ کی طلاق کا واقعہ	۱۳۷
عورت کن وجوہات پر طلاق لے سکتی ہے	〃
بلا وجہ طلاق پر زجر	〃
ناموافقت طبع کو کیوں وجہ طلاق قرار دیا گیا ہے	〃
ہندوستان میں عورت کی حق طلاق سے محرومی	〃
طلاق پر ساتویں حد بندی طلاق بائن ہے	〃
حلالہ رسم جاہلیت ہے۔	۱۳۸
حدیث اور عمل صحابہ میں اس سے اظہار نفرت	〃
نکاح عارضی نہیں ہو سکتا	〃
عورت کو خاوند کی طرف سے دکھ ہو تو قاضی طلاق دلا سکتا ہے	〃
عدت گزرنے پر پہلے خاوند اور بی بی کا نکاح	۱۳۹
تین طلاقوں کا عدم جواز	〃
دودھ پلانے کی مدت	〃
بیوہ کی عدت	۱۴۰
بیوہ کا نکاح	〃
عدت میں بیوہ کو پیغام	۱۴۱
طلاق قبل از تقرر مہر	〃
نکاح بغیر تقرر مہر	〃
آنحضرتؐ کا طلاق سے بکثرت روکنا	۱۴۲
طلاق قبل از خلوت جب مہر مقرر ہو چکا ہو	〃
مسائل طلاق کا ربط ذکر نماز سے	〃
صلوٰۃ وسطیٰ نماز عصر ہے	〃
نمازوں کی تعداد پانچ ہے	〃
حالت خوف میں نماز	〃
خوف میں نماز با جماعت	〃
نماز ذکر اللہ کی بہترین صورت ہے	۱۴۳
اہل قرآن کی غلطی	〃
وحی خفی سے نماز کا سکھایا جانا	〃
نماز کی تفصیلات قرآن میں برنگ اشارہ	〃
بیوہ کے ایک سال متاع کا حکم	〃
نسخ اور عدم نسخ کے اقوال	۱۴۴
حدیث لا وصیۃ لوارث	〃
بنی اسرائیل کا مصر سے خروج	۱۴۵
بنی اسرائیل کی موت اور زندگی	〃
تاریخ اسرائیل سے مسلمانوں کیلئے سبق	〃
انفاق فی سبیل اللہ	۱۴۶
سموئیل کا ذکر اور مسلمانوں کو نصیحت	۱۴۷
طالوت یا ساؤل	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
بادشاہ کے انتخاب کے اصول	۱۴۷
بادشاہت وراثت سے نہیں	〃
بادشاہت کی غرض	〃
بادشاہت کی ضرورت	〃
موسیٰ و ہارون دونوں صاحب اُمت و صاحب کتاب نہیں	۱۴۸
بائبل کا تابوت	〃
توریت و انجیل کا باہم اختلاف	〃
قرآن میں کس تابوت کا ذکر ہے	〃
عیسائیوں کا اعتراض	〃
سموئیل کی کتابیں	〃
تابوت کی تاریخ	〃
قرآن کریم میں تابوت بمعنی قلب ہے	〃
سکینت کا تعلق قلب سے ہے	۱۴۹
نہر سے آزمائش	〃
جدعون کے ذریعہ سے پہلی آزمائش	〃
تھوڑوں کا بہتوں پر غالب آنا	۱۵۰
بائبل میں طالوت کے متعلق متضاد بیان	۱۵۱
داؤد میں بادشاہت اور نبوت کا اجتماع	〃
عیسائیوں کے اعتراض اور قرآن کی حقانیت	〃
آنحضرتؐ میں اجتماع نبوت و بادشاہت	۱۵۲
فضیلت سے دوسرے میں نقص لازم نہیں	〃
آنحضرتؐ کا جامع کمالات انبیائے بنی اسرائیل ہونا	〃
حضرت داؤد اور مسیح کی پیشگوئیوں میں آنحضرتؐ	〃
کی آمد کو خدا کی آمد قرار دیا ہے	〃
احادیث کہ مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو	〃
اللہ کا کلام بندہ کے ساتھ صرف تین طرح ہے	〃
خدا کا کلام کل رسولوں سے ہوا	〃
حضرت عیسیٰ کے ذکر کی وجہ	۱۵۳
سب قوموں کی طرف ایک رسول کے آنے کی ضرورت	〃
قیامت میں بیع۔ خلت شفاعت کا نہ ہونا	〃
قیامت کی خلت و شفاعت	〃
کفار سے مشابہت نہ ہو	۱۵۴
سنۃ کو نوم پر مقدم کرنے کی وجہ	〃
شفاعت کیلئے ضرورت اذن	〃
شفاعت اور دعا	〃
علم میں احاطہ	۱۵۵
آیۃ الکرسی	〃
اسم اعظم	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
آیۃ الکرسی میں مذاہب باطلہ کا رد	۱۵۵
مسئلہ شفاعت کو افراط و تفریط سے پاک کیا	〃
انصار میں بطور نذر یہودی بنانے کا دستور	۱۵۶
آیت لا اکراہ منسوخ نہیں	〃
حکم لا اکراہ اہل کتاب سے مقید نہیں	〃
قرآن کریم مسلمانوں سے بھی بجبر کچھ نہیں منواتا	〃
کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ سے مراد	〃
اللہ کی ولایت مومنوں سے کیا ہے	۱۵۷
نور واحد اور ظلمات جمع لانے کی وجہ	〃
ظالموں کو ہدایت نہ دینے سے مراد	〃
حضرت ابراہیم کا بادشاہ سے جھگڑا	۱۵۸
احیائے موتیٰ کی دوسری مثال حزقیل کی رؤیا	۱۵۹
حزقیل کے مکاشفہ کا ذکر قرآن کریم میں	〃
یروشلم کیلئے پیشگوئی	〃
رؤیا میں سو سال کی موت کیوں دکھائی گئی	〃
کیفیت احیائے موتیٰ کا سوال	۱۶۰
مردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں	〃
حدیث کی شہادت کہ سوال کیفیت سے تھا	۱۶۱
انفاق فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے	〃
قوم کی زندگی کے اسباب کیا ہے	〃
بیج کی مثال اور انجیل سے مقابلہ	〃
اسلام کی ترقی انفاق فی سبیل اللہ سے ہوگی	۱۶۲
انفاق کی پہلی غرض ترقی دین ہے	〃
بھلی بات بتانا بھی صدقہ ہے	〃
صدقہ کے ابطال سے مراد	۱۶۳
ریا کے خرچ کی مثال	〃
ریا کا خرچ مسلمانوں کا کام نہیں	〃
رسم و رواج کے اخراجات ریا میں داخل ہیں	〃
مال خرچ کرنے سے محبت الٰہی کا بڑھنا	۱۶۴
من واذیٰ کا اثر صدقہ پر	〃
کیسا مال خدا کی راہ میں خرچ کیا جائے	۱۶۵
صدقہ سے انسان مفلس نہیں ہوتا	〃
لمّہ شیطانی و لمّہ ملکی	〃
حکمت خیر کثیر ہے	〃
صحابہ کا نمونہ	〃
نذر میں شرط	۱۶۶
علانیہ صدقات	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
انجیل کی ناقص تعلیم	۱۶۶
قومی چندے	〃
مخفی صدقات	〃
غیرمسلموں پر مال خرچ کرنا	۱۶۷
صدقہ سے فائدہ	〃
غیرحقدار کے ہاتھ صدقہ کا چلا جانا	〃
کون محتاج خصوصیت سے مستحق امداد ہیں	〃
سوال کرنا مذموم ہے	۱۶۸
بھیک مانگنے سے روکنے کا انتظام	〃
قرآن نے صدقات کی تعلیم کو کامل کیا	〃
صدقات اور سود کا تقابل	〃
ربائے جاہلیت	۱۶۹
حرمت ربا کا حکم آخری حکم نہیں	〃
اس قول کے معنی کہ آنحضرتؐ نے ربا کی تفسیر نہیں کی	〃
سود کی ممانعت عام ہے	〃
بنکوں کا سود	〃
زمینداز بنک	〃
بغیر تقرر کے زیادہ رقم لینا	〃
احادیث میں حرمت ربا	〃
ممانعت سود کی دو وجوہ	۱۷۰
مال کی بیجا محبت	〃
شراب اور سود کے بدنتائج بہت باریک ہیں	〃
آنحضرتؐ کی کامل تعلیم اور کامل قوت قدسی	〃
کسی کی پچھلی کمزوریوں کا ذکر	〃
سود اور تجارت میں فرق	〃
سود سے محنت کی بیوقری	〃
شراکت کی افضیلت	〃
سودخواری کا دوسرا بدنتیجہ	۱۷۱
سوشلزم اور بولشوزم	〃
اصول محنت و مساوات دولت میں توازن	〃
شراب کی تجارت	〃
سود سے بے برکتی اور صدقات سے برکت کا پیدا ہونا	〃
قوم کا مال کس طرح بڑھتا ہے	〃
بقایا سود کا ترک کرنا	۱۷۲
حجۃ الوداع کا خطبہ	〃
سود لینے والے کا قتل کرنا جائز نہیں	〃
سود کا روپیہ اشاعت اسلام پر خرچ کرنا	〃
ملازمین کا بونس	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
ناجائز کمائی کا روپیہ	۱۷۲
قرضہ کا معاف کرنا	〃
آخری آیت جو آنحضرتؐ پر نازل ہوئی	۱۷۳
آیات کی ترتیب آنحضرتؐ کے حکم سے	〃
حفاظت مال کی تعلیم	〃
لین دین کے معاملات چار طرح پر	〃
تحریر معاملات کے حکم میں آیندہ کی خبر	〃
وثیقہ نویس	۱۷۴
مدیون کا حق	〃
باہم معاملات میں اصول قوانین	〃
دو گواہ	〃
عورت کی گواہی	۱۷۵
رہن باقبضہ کا جواز عام ہے	〃
آنحضرتؐ کا زرہ کو یہودی کے پاس رہن رکھنا	〃
نبی کریمؐ کا گزارہ	〃
رہن بلاقبضہ جائز نہیں	〃
مکان اور زمین کا رہن	〃
معاملہ دنیوی میں راستی کی اہمیت	〃
کتمان شہادت اور جھوٹی شہادت	〃
آیت ان تبدوا کی منسوخی پر بحث	۱۷۶
نسخ کا استعمال صحابہ میں	〃
چھپی اور کھلی باتوں پر خدا کا محاسبہ	〃
سب انبیاء پر ایمان	۱۷۷
من قبلک کی تحدید	〃
مشقت سے راحت پیدا ہوتی ہے	〃
ظل اللہ	〃
عفو اور غضب کا اکٹھا ذکر	۱۷۸
خواتیم سورت بقرہ کی فضیلت	〃
نسیان اور خطا	〃
عہد شکنی	〃
قضا و قدر کے مصائب	〃
دعائے عفو و غفر و رحم	〃
سورت کی غرض و غایت	〃
۳ - سورۃ آل عمران - ۱۷۹ تا ۳۰۳	〃
نام - خلاصہ مضمون	۱۷۹
بقرہ اور آل عمران کا تعلق الزہراوان	〃
زمانہ نزول	۱۸۰
صفات الٰہی جن سے عیسائیت کا ابطال ہوتا ہے	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
آنحضرت کی وفد نجران سے گفتگو	۱۸۰
حضرت عیسیٰ پر فنا کا ذکر	〃
پہلی وحی کے ہوتے ہوئے نزول قرآن کی ضرورت	〃
توریت میں کونسی کتابیں ہیں	۱۸۱
صحابہ کے سینے اناجیل ہیں	〃
انجیل کونسی کتاب ہے	〃
چار انجیلیں	〃
بائبل	〃
پرانا اور نیا عہد نامہ	〃
اناجیل کے مصنف	〃
زمانہ تصنیف اناجیل	〃
محرف کتابوں کا نام بھی توریت و انجیل ہی ہے	۱۰۲
توریت و انجیل میں ہدایت	〃
فرقان قرآن کا نام ہے	〃
حضرت مسیح کا اعتراف لاعلمی	〃
آدم کو اللہ کی صورت پر پیدا کرنے سے مراد	〃
روحی میں ضمیر	۱۸۳
مسیح کا معمولی بچوں کی طرح حمل میں آنا اور پیدا ہونا	〃
محکم اور متشابہ پر راغب کی بحث	〃
اپنی خواہش کے مطابق تاویل	۱۸۴
راسخ فی العلم اور متشابہات کی تاویل	〃
عیسائی مذہب کی بنیاد متشابہات پر ہے	۱۸۵
پیشگوئی متشابہات سے ہے	〃
بائبل کی پیشگوئیاں جن میں خدا کے آنے کا ذکر ہے	〃
آنحضرت صلعم کیلئے ہیں	〃
لفظ خدا کا استعمال نیکوں کے حق میں	〃
اقرار مسیح کہ وہ بطور مجاز خدا کا بیٹا کہلائے	〃
مرزا صاحب کی طرف دعویٰ نبوت کی نسبت	〃
محکمات اصول دین ہیں	۱۸۶
فروع کو اصول کے ماتحت کیا جائے	〃
متشابہات میں پڑنے والا گروہ	〃
زیغ سے بچنے کی دعا	〃
کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی	۱۸۷
النساء لا یحتسبن سے مراد	〃
عیسائیوں سے خطاب	۱۸۸
جنگ بدر کی پیشگوئیاں	〃
آنحضرت کی دعا بدر کے دن	〃
بائبل میں جنگ بدر اور ہجرت کی پیشگوئیاں	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
بدر میں مسلمانوں کا کفار کو دوچند دکھنا	۱۸۹
دنیا کے مرغوبات مقصدِ زندگی نہیں	۱۹۰
جنّت اور رضائے الٰہی کا حصول دنیا میں	"
انہماک مرغوبات دنیا کا انجام	"
استغفار ترقی کا آخری مرتبہ ہے	۱۹۱
صبح کے وقت استغفار اور دعا	"
اللہ تعالےٰ کا نزول سماءِ دنیا پر	"
توحید پر تین قسم کی شہادت	"
عیسائیت پر اتمام حجت	"
کیوں اسلام ہی قابلِ قبول دین ہے	۱۹۲
آنحضرتؐ کی بعثت اسود و احمر کی طرف	"
نبیوں کا قتل	۱۹۳
حبطِ عمل	"
تحریفِ بائبل	"
قرآن تمام اختلافات مذہبی کا فیصلہ کرتا ہے	"
دوزخ سے بریّت کا دعویٰ	"
فعل اور اس کی جزا میں اتصال	۱۹۴
خدا کی بادشاہت	"
لفظ عزت میں حکومت کی خوشخبری	"
مردہ اور زندہ سے مراد	۱۹۵
ذِلات کفار	"
مسئلہ تقیہ اور اہلِ تشیع	۱۹۶
کفار سے موالات کی ایک صورت	"
دشمنانِ اسلام کی مخفی تدابیر	۱۹۷
کفار کے ذکر میں مسلمانوں کو ہدایات	"
دوسرا شفیع	"
محبوبِ الٰہی کس طرح بنتا ہے	۱۹۸
کفارہ گناہ سے نہیں چھڑا سکتا	"
حضرت عیسٰی کے ذکر کی ابتدا	"
آدم اوّل اور آدم آخر ۔	"
برگزیدگی بالخصوص اپنے زمانہ میں ہے	"
مریم کو اُخت ہارون اور بنت عمران کہنے سے منشاء	۱۹۹
اولاد کو خدمت دین کے لیے وقف کرنا	"
عورتیں بھی خدمت دین کر سکتی ہیں	۲۰۰
مریم کا بیاہا جانا اور صاحب اولاد ہونا	"
حدیث مس شیطان	"
مس شیطان کے دو مفہوم	"
بچہ اور وساوس شیطانی	۲۰۱

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
ہر بچہ معصوم پیدا ہوتا ہے	۲۰۱
احادیث میں یحیٰی کا گنہگار ہونے سے استثنا	"
یحیٰی۔ مریم۔ ابن مریم کا ذکر بطور مثال	"
حدیث میں مس شیطان کا اصل مفہوم	"
حدیث میں پیدائش روحانی مراد ہے	"
زکریا اور زکریاہ	۲۰۲
مریم کے متعلق بعض مفسرین کے خیالات	"
بے موسم پھل	۲۰۳
رزق سے مراد	"
مریم کے پاس رزق کا پہنچنا	"
معمولی امور کے ذکر میں سبق	"
نیک اولاد کی خواہش	۲۰۴
ملائکہ کا کلام	"
یوحنا بپتسمہ دینے والا	"
سلسلہ موسویہ کے اوّل و آخر دو دو نبیوں کا ظہور	"
یحیٰی کے ظہور کی پیشگوئی	"
الیاس کا آسمان پر جانا	"
الیاس کی دوبارہ آمد کی پیشگوئی	"
کلمہ کی تصدیق سے مراد	۲۰۵
یحیٰی اور عیسٰی	"
زکریا کی خاموشی اضطراری تھی یا اختیاری	۲۰۶
لوقا کا قصہ	"
مریم نبیہ تھیں یا نہیں	۲۰۷
محض مکالمہ نبوت نہیں	"
غیر انبیاء سے مکالمہ اور ان کو وحی	"
نبی بلحاظ معنی لغوی	"
نبی اصطلاح شریعت میں	"
طہارت جسمانی و طہارت نفس	"
عالمین پر فضیلت سے مراد	"
عورتوں میں فضیلت	"
مریم کی فضیلت سے عیسٰی کی فضیلت پر استدلال	"
مریم کا ذکر اناجیل میں	۲۰۸
حضرت مسیح کا اپنی والدہ سے خطاب	"
آنحضرتؐ کا اپنی بیٹی کی عزت کرنا	"
حکم دینے سے خلاف درزی حکم پر استدلال	"
واقعات گذشتہ اور غیب	"
مسیح اور مریم کے صحیح حالات انباء الغیب ہیں	"
مریم کی عصمت پر شہادت انباء الغیب سے ہے	"

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
مریم کی دوسری کفالت مریم کی بلوغت پر	۲۰۹
مریم صدیقہ کا نکاح	"
قرعہ اندازی	"
مریم کی بریت کی شہادت	"
اصطفائے روحانی میں ذکر خصوصیت	"
کلمۃ اللہ سے مراد	۲۱۰
اصول اور خصوصیت کی بحث	"
بروئے قرآن کلمات اللہ بہت ہیں	"
کلمہ یا قول کے آنے سے مراد	"
آنحضرتؐ کا اپنے آپکو دعائے ابراہیم قرار دینا	"
کلمہ کی دوسری توجیہہ	"
نام کی وجہ تسمیہ	"
مسیح کا کشمیر وغیرہ میں آنا	"
مسیح کی بائیں اور دجال کی دائیں آنکھ نہ ہونے سے مراد	۲۱۱
مسیح کو وجیہہ کہنے کی وجہ	"
حضرت عیسٰی کا دوسری اقوام اسرائیل میں جانا	"
مسیح کا مقرب ہونا	"
مسیح کو مقرب کہنے کی ضرورت	"
مسیح کا جھولے میں اور بڑھاپے میں باتیں کرنا	"
جھولے کے کلام پر بحث	۲۱۲
لکڑی کی آواز معجزات نبوی میں سے ہے	"
صالح ہونے سے مراد	"
مہد اور کہولت کی باتوں سے مراد	"
بشارت کے ذکر میں نفی الوہیت مسیح	"
کھانا کھانے کے ذکر میں نفی الوہیت	۲۱۳
حضرت مسیح کی بن باپ پیدائش اسلامی عقاید میں	"
داخل نہیں عیسائیت کا اصول ہے	"
بن باپ پیدا ہونے میں فضیلت نہیں	"
مسلمان مریم کا روح القدس سے حاملہ ہونا نہیں مانتے	"
نسل انسانی کی پیدائش کے متعلق قانون الٰہی	"
مس بشر	"
توریت و انجیل کی تاریخی بشارت	"
یوسف کا مریم سے تعلق زوجیت	"
اور اولاد کا ہونا	"
حدیث کی شہادت کہ حضرت مسیح معمولی حالات	۲۱۴
میں حمل میں آئے اور پیدا ہوئے	"
حضرت عیسٰی کی تعلیم کس طرح پر ہوئی	"
حضرت عیسٰی کا صرف بنی اسرائیل کیطرف مبعوث ہونا	۲۱۵
دوسری اقوام کو کتوں کی حیثیت دینا	"

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
یہود سے مایوسی پر دوسری اقوام کیطرف توجہ	۲۱۵
حضرت مسیح امت محمدیہ میں نہیں آسکتے	〃
خلق کے معنی جب انسان کیلئے بولا جاتا ہے	〃
خلق پیدا کرنے کے معنی میں غیر اللہ تعالیٰ کیلئے	۲۱۶
پانی میں پھونکنے کی ممانعت	〃
بدی اور نیکی کا نفخ	〃
حضرت عیسیٰ کا پرند یا چمگادڑ بنانا	〃
خلق اشیاء خاصہ صفات باری ہے	۲۱۷
طیر کی توجیہ کہ وہ جلد مٹی ہوجاتے تھے	〃
مسیح کے کلام میں کثرت مجاز	۲۱۸
روحانیت کا ذکر جسمانیات میں	〃
طیر کے مجازی معنی	〃
طیر کا استعمال بطور مجاز قرآن وحدیث میں	〃
انجیل میں بیماریوں سے مراد روحانی بیماریاں ہیں	۲۱۹
قرآن کریم میں بیماریوں اور شفا سے مراد	〃
عیسائیوں کی لفظ پرستی	〃
دنیا کا سب سے بڑا طبیب	〃
مردوں کا اس دنیا میں واپس آنا	〃
قرآن کریم میں روحانی مردوں کے احیاء کا ذکر	۲۲۰
مسیح کے احیائے موتٰی سے مراد	۲۲۱
نبی کی قوت قدسی کا اظہار دو رنگوں میں	〃
مسیح کے متعلق غلط قصے	〃
حضرت مسیح کے احکام کھانے اور ذخیرہ کے متعلق	〃
مسیح کا توریت کا مصدق ہونے سے منشا	〃
توریت اور انبیائے بنی اسرائیل	۲۲۲
حضرت عیسیٰ کا بعض احکام توریت کو منسوخ کرنا	〃
توریت کی تکمیل ترمیم نسخ کی مثالیں	〃
حضرت عیسیٰ کا اپنی اطاعت کیطرف بلانا	〃
نبی کی اطاعت جزو دین ہے	〃
اناجیل میں توحید کی تعلیم	〃
حواری نام کی وجہ	۲۲۳
بارہ حواریوں کے نام	〃
وعظ کے لیے ہدایات	〃
حواریوں کا کام	〃
حواریوں کی ایمانی حالت بروئے اناجیل	〃
حواریوں کے ساتھ وعدے	〃
قرآن شریف کا عیسائیوں پر احسان	〃
صلیب پر کھچوانے کی تدبیر	۲۲۴

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
مسیح کو آسمان پر اٹھانا مخفی تدبیر نہیں	۲۲۴
متوفیک پر مفسرین کے خیالات	۲۲۵
وفات مسیح	〃
امام مالک کا مذہب کہ مسیح فوت ہوگئے	〃
حیات مسیح کا عقیدہ اور عیسائی مذہب	〃
وفات مسیح پر حدیث کی شہادت	۲۲۶
رفع کے معنی حدیث میں	〃
حضرت عیسیٰ کی تطہیر	۲۲۷
حضرت عیسیٰ کی تطہیر اور آنحضرتؐ کا عفو	〃
حضرت عیسیٰ کے متبع عیسائی ہیں مسلمان نہیں	〃
کافران مسیح	〃
حضرت مسیح کے چار وعدے	〃
یہود کی تدبیر صلیب کا جواب	〃
چاروں وعدوں میں ترتیب	〃
مسیح کے منکر قیامت تک رہیں گے	〃
اختلاف عقیدہ تا قیامت رہے گا	۲۲۸
مسیح کے منکروں کیلئے عذاب دنیا	〃
عیسائیوں کے دو گروہ	〃
قرآن کو کیوں ذکر کہا جاتا ہے	〃
مسیح کے حالات سے الوہیت کے خلاف دلیل	〃
آدم اور عیسیٰ کی مشابہت	۲۲۹
ہر بشر مٹی سے پیدا ہوتا ہے	〃
دعوت مباہلہ عیسائیوں پر اتمام حجت کیلئے	۲۳۰
واقعہ مباہلہ وفد نجران سے	〃
مسجد میں عیسائیوں کو نماز پڑھنے کی اجازت	〃
عیسیٰ پرستی کی تردید	〃
مباہلہ میں حضرت علی کا نکلنا اور اہل تشیع	〃
مباہلہ کب جائز ہے	〃
شرک فی الصفات	۲۳۱
پیر پرستی	〃
تین قسم کا شرک عبادت صفات اطاعت میں	〃
اصول مقابلہ مذاہب اور صداقت اسلام	〃
مقوقس کے نام آنحضرت صلعم کا خط	۲۳۲
مذہب ابراہیمی بطور امر مشترک	〃
یہودیوں اور عیسائیوں پر اتمام حجت	〃
ابراہیم سے نفی یہودیت و نصرانیت	〃
آنحضرتؐ ابراہیم کے متبع ہیں	۲۳۳
عیسائیوں کی مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوششیں	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
یہودیوں کی منافقانہ چال	۲۳۴
احکام اسلام میں تفریق کی چالبازی	〃
موجودہ زمانہ میں عیسائیوں کی چالبازیاں	〃
مثیل موسیٰ کی پیشگوئی اور یہودیوں کے اس	〃
سے گریز کے حیلے	۲۳۵
پیشگوئی ناقابل تردید ثبوت صداقت اسلام کا ہے	〃
نبوت ایک قوم سے مخصوص نہیں	۲۳۶
اہل کتاب کے معاملہ میں اسلام کا منصفانہ رویہ	〃
معاملات دنیا میں دیانت معیار امتیاز ہے	〃
امّی سے مراد	〃
عیسائیوں کا دوسروں کے حقوق اپنے برابر نہ سمجھنا	〃
عہد کے معاملہ میں تعلیم اسلامی	۲۳۷
اہل ذمہ کے حقوق	〃
عہد اور امانت	〃
دنیا پرستی	〃
عیسائی اور معاہدات	〃
اہل کتاب کی کتاب کے پڑھنے میں تحریف	۲۳۸
عیسائیت کی تحریف	〃
علمائے ربانی مثیل اور وارث انبیاء ہیں	۲۳۹
ہر نبی کو کتاب و حکم دیا جاتا ہے	〃
وفد نجران کا آنحضرتؐ کے متعلق غلط خیال	〃
میثاق النبیین	〃
آنحضرت صلعم جملہ انبیائے عالم کے موعود ہیں	۲۴۰
اول النبیین اور آخری نبی	〃
کل دنیا کیطرف صرف ایک رسول کا آنا اور اس میں حکمت	〃
آخری رسول کی سب سے بڑی علامت تصدیق رسل عالم ہے	۲۴۱
حواریان مسیح کی شہادت آنحضرتؐ کیلئے	〃
ابراہیم اور عیسیٰ کی پیشگوئیوں کا ذکر	〃
اسلام عالمگیر ہے	〃
طوعاً و کرہاً فرمانبرداری سے مراد	۲۴۲
اسلام کو چھوڑنا فطرت بگاڑنا ہے	〃
نجات اور دوسرے مذہب	〃
اہل کتاب کا باوجود مشاہدہ صداقت نبوی سے انکار	۲۴۳
توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے	〃
ازدیاد کفر	〃
مال دنیا آخرت میں کام نہ دے گا	۲۴۴
خیر و برکت حاصل کرنے کی راہ	〃
مما تحبون کیا ہے۔	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
اونٹ کے گوشت کے متعلق اعتراض	۲۴۴
بنی اسرائیل پر بعض چیزیں حرام ہوئیں	۲۴۵
یہود و نصاریٰ کو ملت ابراہیم کے اتباع کی دعوت	〃
بکہ کو مبارک کہنے سے مراد	〃
خانہ کعبہ سب سے پہلا دنیا کا معبد ہے	۲۴۶
آدم کا کعبہ کو بنانا	〃
بیت اللہ اور بیت المقدس میں چالیس سال کا فرق	〃
مکہ کے نام۔ خانہ کعبہ کے نام۔ آخری عبادتگاہ	〃
استطاعت راہ سے مراد	〃
مقام ابراہیم سے شہادت	۲۴۷
کعبہ مقام امن ہے	〃
خانہ کعبہ کا حج کبھی نہ رُکے گا	〃
خانہ کعبہ دشمن کے قبضہ میں نہ جائے گا۔	〃
کفار کی اطاعت	۲۴۸
کامیابی کا پہلا گر فرداً فرداً ذمہ داری کا احساس ہے	۲۴۹
کامیابی کا دوسرا گر اتحاد قومی ہے	〃
قرآن پر مسلمانوں کا اتحاد	〃
قرآن کی بنیاد اتحاد ہونے سے منشاء	〃
قرآن میں اتحاد پیدا کرنے کی طاقت	۲۵۰
کامیابی کا تیسرا گر دعوت الی الاسلام ہے	〃
موجودہ گدیاں	〃
دعوت الی الاسلام کی اہمیت	〃
مجدد صدی چہاردہم اور دعوت الی الاسلام	۲۵۱
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر	〃
پہلے مذاہب کا اصولی اختلاف	〃
مونہوں کی سفیدی اور سیاہی سے مراد	۲۵۲
اُمت محمدیہ کا کام دوسروں کی تکمیل ہے	۲۵۳
اُمت کی فضیلت اور اس کی وجوہات	〃
فضیلت کا ثبوت	〃
یہود کی شکست کی پیشگوئی	۲۵۴
یہود کا انجام	〃
اہل کتاب کے مومن	۲۵۵
عصمت انبیاء	۲۵۶
دشمن کو دوست بنانے کی ممانعت	۲۵۷
یہود کی منافقت اور بدزبانی	〃
حضرت عائشہؓ کا جنگ اُحد میں شریک ہونا	۲۵۸
جنگ میں عورتوں کی شمولیت	〃
جنگ اُحد کے متعلق	〃
آنحضرتؐ کی تین رویا	۲۵۸
مشورہ کی عزت	〃
واقعات جنگ اُحد	۲۵۹
آنحضرت صلعم کے مختلف کام	〃
بنو حارثہ اور بنو سلمہ	〃
قرآن سے توکل کے معنی پر روشنی	۲۶۰
احادیث سے توکل کے معنی پر روشنی	〃
تین ہزار ملائکہ کی نصرت کا وعدہ	۲۶۱
احزاب میں پانچ ہزار ملائکہ کا وعدہ	〃
بدر۔ اُحد۔ احزاب میں نزول ملائکہ کی حکمت	〃
امر رب کا آنا	〃
نزول ملائکہ فرضی بات نہ تھی	〃
ملائکہ نے قتال نہیں کیا	۲۶۲
اُحد میں کفار کی ناکامی	۲۶۳
آنحضرتؐ کا بد دعا کرنا	〃
واقعہ بئر معونہ	〃
آنحضرتؐ کو بد دعا سے روکنے میں سبق	۲۶۴
رحمت کا غضب پر سبقت لے جانا	〃
حرمت سود جنگوں کے روکنے میں معاون ہے	〃
کامیابی اللہ اور رسول کی اطاعت میں ہے	۲۶۵
رسول کی اطاعت شرک نہیں	〃
و تفسیر کے لئے نہیں آتی	〃
رسول۔ اللہ کی تفسیر نہیں	〃
مغفرت الٰہی	۲۶۶
وسعت جنت	〃
مکان جنت کی کیفیت اس عالم کی طرح نہیں	〃
خوشحالی اور تنگی میں انفاق	۲۶۷
غضب کا دبانا	〃
محسن	〃
بیان اور نطق میں فرق	۲۶۸
اُحد میں آنحضرتؐ کی دعا	۲۶۹
علم و قوع فصل	〃
تکالیف کی غرض	۲۷۰
تکلیف سے فائدہ اٹھانا مومن کا کام ہے	〃
خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو	〃
موت اور قتل	۲۷۱
اُحد میں آنحضرتؐ کے قتل کی خبر مشہور ہو جانا	〃
آنحضرتؐ سے پہلے تمام رسول فوت ہو چکے	۲۷۲
فلسفۂ عمل	۲۷۳
دنیوی اور اُخروی بھلائی کے متعلق قانون الٰہی	〃
اپنی کمزوری کا علاج دشمن پر فتح سے مقدم ہے	۲۷۴
محسن کون ہے	۲۷۵
اطاعت کفار	〃
آنحضرتؐ کی غیرت توحید باری	〃
مسلمانوں کا کافروں پر رعب	۲۷۶
آنحضرتؐ کا رعب آپ کی خصوصیات میں سے ہے	〃
ابتدائے جنگ میں کفار کا شکست کھانا	〃
قوم کے بعض افراد کا اثر کل قوم پر	۲۷۷
تیراندازوں کی غلطی	〃
حصول مال غنیمت جنگوں کی غرض نہ تھی	〃
صحابہ کی جانفشانی اور شجاعت کا اظہار	۲۷۸
آنحضرت صلعم کی شجاعت	۲۷۹
صحابہ کی محبت آنحضرت صلعم سے	〃
نبی کریم صلعم کا جنگ میں تنہا رہ جانا	۲۸۰
منافقوں کی چہ میگوئیاں	۲۸۱
صحابہ کی جاں نثاری پر قرآن کی شہادت	〃
جنگ اُحد میں بھاگنے والے	〃
بھاگنے والوں کی تعداد اور وہ کون تھے	۲۸۲
حضرت عثمان پر طعن	〃
مسلمانوں کو موت سے خائف نہ ہونا چاہیئے	۲۸۳
آنحضرتؐ کی لینت	۲۸۴
آپ کے اخلاق اور خلق لینت کا کمال	〃
آنحضرتؐ کی رحمت	〃
استغفار کے معنی	۲۸۵
شوریٰ کا حکم	〃
آنحضرتؐ کا شوریٰ پر عمل	〃
کثرت رائے پر عمل	〃
عزم شوریٰ کا نتیجہ ہے	〃
مجدد کا کثرت رائے کے اصول کو زندہ کرنا	〃
خیانت کی سزا کا ذکر بطور مثال	۲۸۶
عصمت انبیاء پر شہادت	〃
تفاوت درجات	۲۸۷
نبی کا کام دوسروں کو پاک کرنا ہے	〃
آنحضرتؐ کی تعلیم اور تزکیہ کی چار دفعہ میں حکمت	〃
مصیبت کی وجہ اور غرض	۲۸۸
قوم کو ہلاکت یا ذلت سے بچانے کا فرض	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
ادائگی فرض میں موت کی پروا نہ ہو	۲۸۹
شہداء کی زندگی	〃
خوف وحزن سے مراد	۲۹۰
دینی اور دنیوی منافع کی بشارت	〃
غزوۂ حمراء الاسد	〃
حکم رسول کی فرمانبرداری	۲۹۱
بدر صغریٰ	〃
جیش السویق	〃
مصائب کی غرض	۲۹۲
کیوں ہر شخص کو وحی نہیں ہوتی	۲۹۳
یہودیوں کا اسلامی چندہ پر استہزا	۲۹۴
مبالغہ کی نفی	〃
سوختنی قربانی	۲۹۵
شریعت موسوی کا ایک امتیازی نشان	〃
آگ کا آسمان سے اترنا	〃
زبور اور کتاب	〃
دنیا کی زندگی دھوکہ ہونے سے مراد	۲۹۶
موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے مالی	〃
اور جانی نقصانوں اور ایذا کی پیشگوئی	〃
ان مصائب کا علاج	۲۹۷
اہل کتاب کا اپنی کتاب کو چھپانا	〃
مسلمانوں کی بیماری قرآن کو بیان نہ	〃
کرنا ہے	〃
قرآن کریم کے پیش کرنے سے اصلاح	〃
اور اشاعت کے دو کام ہوتے ہیں	〃
مخلوق اور اختلافات زمانہ میں نشان	۲۹۸
ذکر و فکر	〃
عبادت اور حصول علم کا اکٹھا بیان	۲۹۹
اشیاء میں فکر سے خدا کی طرف توجہ دلائی	〃
دنیا اور آخرت کی آگ	〃
منادی سے مراد	〃
دین و دنیا میں کامیابی کی دعا	۳۰۰
وعدہ کے ساتھ دعا کی ضرورت	〃
دعا کے ساتھ عمل کی ضرورت	〃
وہ عمل جن پر کامیابی ملتی ہے	〃
مومنوں سے وعدہ	۳۰۱
گناہوں سے پاک کرنے والی چیزیں	〃
عیسائیوں کے زمین میں تصرف کی پیشگوئی	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
عیسائیوں کے اسلام لانے کی پیشگوئی	۳۰۲
بدی اور دشمن دونوں کے مقابلہ کی	〃
ضرورت	〃
تقوی اللہ	۳۰۳
۴ - سورۃ النساء ۳۰۴ تا ۴۰۱	〃
نام۔ خلاصہ مضمون	۳۰۴
تعلق	۳۰۵
تاریخ نزول	〃
نفس واحدۃ سے مراد	〃
نسل انسانی کا متحد الاصل ہونا	۳۰۶
آدم سے پہلی نسل انسانی کا وجود	〃
حوا کا آدم سے پیدا ہونا	〃
عورت کا پسلی سے پیدا ہونا	〃
انسان اول کی پیدائش	۳۰۷
عورت میں اعوجاج کا مطلب	〃
حقوق العباد صلہ رحمی میں داخل ہیں	〃
صلہ رحمی کی تاکید	〃
یتامیٰ کی خبر گیری کی تاکید	۳۰۸
وجہ حب جائداد یتیم	〃
یتامیٰ کی بحث میں تعدد ازدواج کا ذکر	〃
نکاح میں پسندیدگی اور ایک دوسرے	۳۰۹
کو دیکھ لینا	〃
چھوٹی عمر میں نکاح	〃
چار سے زیادہ نکاح منع ہیں	〃
تعدد ازدواج کے متعلق چار سوال	〃
یہ اجازت ہے نہ حکم	〃
اجازت صرف ضرورت کیلئے ہے	〃
تعدد ازدواج کی ضرورتوں کی تصریح	〃
کیوں نہیں کی	۳۱۰
تعدد ازدواج کی ضرورت	〃
سبب استنباط تعدد ازدواج کے مجوز ہیں	〃
چار کی حد بندی	۳۱۱
نبی کریم کی ازواج کی تعداد	〃
نکاح میں اصول ایک شوہر کے لیے ایک	〃
بی بی ہے	〃
عدل کی شرط	〃
حجر اسود یمین اللہ ہے	〃
ملک یمین سے مراد	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
لونڈیاں	۳۱۲
مہر عطیہ بلا بدل ہے	〃
مہر دینے کی تاکید	〃
مہر پر لڑکی کے والد کا کوئی حق نہیں	۳۱۳
مال کو ترقی نہ دینے والے سفہاء ہیں	〃
یتامیٰ وغیرہ کی تربیت	〃
حفاظت مال کی تاکید	〃
صغر سنی کی شادی	۳۱۴
سن بلوغ	〃
تربیت اولاد	〃
مال یتیم سے حق الخدمت	〃
جاہلیت میں یتامیٰ کی ورثہ سے محرومیت	۳۱۵
آنحضرتؐ کی قوت قدسی کا کمال	〃
آپ کی یتیموں اور بیواؤں کی بےنظیر حمایت	〃
تقسیم ترکہ کے وقت غرباء کو کچھ دینا	۳۱۶
اسلام کا قانون وراثت	〃
تقسیم وراثت میں اصول جمہوریت	۳۱۷
تقسیم دولت کا صحیح اصول	〃
بولشوزم	〃
تقسیم دولت میں مساوات قائم رکھنے	〃
کے لیے چار علاج	〃
حقوق وراثت کن باتوں سے پیدا ہوتے	〃
ہیں	〃
اولاد کا حق وراثت	۳۱۸
پوتے کا حق	〃
ماں باپ کے حصے	〃
ماں باپ کے ساتھ بھائیوں کی موجودگی	〃
وصیت اور قرضہ	۳۱۹
وصیت کا حق کہاں تک ہے	〃
غرض وصیت	۳۲۰
خاوند اور بیوی کے حصے	〃
عول کا مسئلہ	۳۲۱
کلالہ کی وراثت	〃
دو قسم کے کلالہ	〃
وراثت کی پانچ صورتیں	۳۲۲
ضرر والا قرضہ	〃
رواج اور قرآن	〃
عورت کی عصمت کو محفوظ کرنے کے اسباب	۳۲۳

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
مبادیٔ زنا کا علاج	۳۲۳
تعلیم اسلام میں زنا سے بچانے کے	״
سامان	״
مبادیٔ زنا میں مرد کیلئے سزا	״
توبہ اور اس کی قبولیت	۳۲۴
عدم قبولیت توبہ	۳۲۵
عورتوں کا ورثہ میں لیا جانا	״
طلاق کے وقت عورت سے مال لینا	״
عورت سے سلوک	۳۲۶
حدیث میں حسن معاشرت کی تاکید	״
طلاق کب دینی جائز ہے	״
مہر کی مقدار	۳۲۷
حضرت عمرؓ کا خطبہ تعین مہر پر	״
میثاق غلیظ	״
عورت سے مہر کس صورت میں لیا جا سکتا ہے	۳۲۸
چودہ وجوہ حرمت نکاح	۳۲۹
رضاعت کے رشتے	״
ملک یمین کا حکم	۳۳۰
استمتاع اور متعہ میں فرق	۳۳۱
نکاح اور مسافحت	״
متعہ مسافحت ہے نہ نکاح	״
احادیث میں متعہ کی حرمت	״
متعہ کب حرام ہوا	۳۳۲
متعہ کے بارہ میں ابن عباس کا مذہب	״
مہر کی کمی بیشی تقرر مہر کے بعد	״
لونڈیوں سے نکاح	۳۳۳
لونڈیوں سے نکاح سے روکنے کی وجہ	״
ماریہ قبطیہ	״
لڑکیوں کی تعلیم	۳۳۴
لونڈیوں سے نکاح کی شرائط	״
مالک اور مملوک لونڈی	״
شرائع کا نزول	״
نزول شریعت کی غرض	״
نزول شریعت کی ضرورت	۳۳۵
شرائع پر چلنے کی قابلیت اور عیسائی	״
عقیدہ	״
کفارہ	״
تجارت	۳۳۶
خودکشی	״

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
کبیرہ گناہ کون کون سے ہیں	۳۳۶
بدی سے پاک ہونے کا طریق	۳۳۷
بدی کا کفارہ اسلام اور دیگر مذاہب میں	۳۳۸
تمنی سے روکنے کا مطلب	״
مال کے حصول کا ذریعہ اکتساب ہے	״
رضا بالقضا	۳۳۹
مال کے حصول کے دو دیگر جائز ذرائع	
معاہدہ کے ذریعہ سے ورثہ کی منسوخی	״
مردوں کے عورتوں پر قوام ہونے سے	״
مراد	۳۴۰
ہر گھر ایک بادشاہت ہے	״
حدیث ولوا امرھم امرأۃ سے مراد	״
نیک عورتوں کی دو بڑی صفات	״
خوف میں مفہوم علم	״
نشوز کرنے والی عورتیں	۳۴۱
عورت کے نشوز کا علاج	״
عورت کو مارنا کب اور کس حد تک	״
جائز ہے	״
نبی کریم صلعم کا نمونہ	۳۴۲
میاں بیوی میں فساد میں دو حکم مقرر	״
کرنا	״
کل مخلوق سے حسن سلوک	۳۴۳
پڑوسی کے حقوق	״
غلاموں سے حسن سلوک	״
مختال اور فخور میں فرق	״
تکبر کیا ہے	۳۴۴
رسول اللہ صلعم کی گواہی اُمت محمدیہ پر	۳۴۵
نماز کے ساتھ حالت سکر و جنابت کیوں	״
جمع نہیں ہو سکتی	۳۴۶
شراب کی قطعی حرمت سے پہلے حالت	״
سکر سے روکا	״
نماز کیلئے حضور قلب کی ضرورت	۳۴۷
تیمم کا طریق	״
دو قسم کی تحریف	۳۴۸
یہودیوں کا نبی کریم صلعم سے طرز عمل	״
طمس وجوہ سے مراد	۳۴۹
یہود کی سزا	״
بندر بننے سے مراد	״

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
شرک کی اقسام	۳۴۹
شرک کے نہ بخشنے کی وجہ	۳۵۰
شرک کی سزا اور اس سے توبہ	״
مسلمانوں میں پیر پرستی کی بیماری	۳۵۱
ایک دوسرے کی مدح کرنے کی ممانعت	״
یہودیت پر عرب کی بت پرستی کا اثر	״
مسلمانوں پر ہندوؤں کی بت پرستی کا اثر	״
بادشاہت اور نبوت کے لیے وسعت	״
قلب کی ضرورت	״
مسلمانوں کے لیے بادشاہت اور نبوت	״
کا وعدہ	״
چمڑوں کے پکنے اور بدلنے سے مراد	۳۵۳
ادائے امانت سے مراد	۳۵۴
حاکم و محکوم کے تعلقات	״
عثمان بن ابی طلحہ اور خانہ کعبہ کی چابی	״
اولی الامر سے مراد	״
اولی الامر کا حکم کس حد تک مانا جا سکتا ہے	״
مخلوق کی اطاعت باقی نہیں رہتی جب خالق	״
کی معصیت لازم آئے	۳۵۵
اولی الامر کی اطاعت	״
اہل قرآن اور رسول اللہ کی اطاعت	״
اہل تشیع اور قادیانی احمدی	۳۵۶
منافقوں کا ذکر	״
ہر رسول مطاع ہوتا ہے مطیع نہیں ہوتا	۳۵۷
ختم نبوت پر فیصلہ کن دلیل	״
حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد	״
انبیاء بنی اسرائیل	۳۵۸
آنحضرت صلعم کا استغفار	״
رب کی قسم سے منشا	״
شریعت کی ظاہری پابندی	۳۵۹
اجتہاد نبوی میں وحی خفی	״
اپنے آپ کو قتل کر دینے کے حکم سے مراد	״
اطاعت رسول سے منعم علیہم کی رفاقت	۳۶۰
دنیا میں منعم علیہم کی رفاقت	״
اکتساب کا کمال صدیقیت ہے	۳۶۱
صرف مبشرات باقی ہیں	״
ولایت یا محدثیت	۳۶۲
صحابہ کی کمال اطاعت	״

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
دشمن کے مقابلہ کے لیے تیاری کی ضرورت	۳۶۲
مسلمان جنگ کرنیوالے کیسے ہوں	۳۶۳
مال غنیمت کا حاصل کرنا غرض جنگ نہ ہو	〃
جنگ کی ضرورت	۳۶۴
دلی اور نصیر	〃
مسلمانوں اور کفار کی اغراض جنگ کا	〃
مقابلہ	〃
کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی	〃
اصلاح نفس جہاد پر مقدم ہے	〃
فرائض کی ادائیگی میں موت سے خائف	۳۶۶
نہ ہو	〃
بھلائی اور دکھ اللہ کی طرف سے ہونے	〃
سے مراد	〃
من اللہ اور من عند اللہ	〃
رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے	۳۶۷
رسول اللہ صلعم کے حالات میں اختلاف	〃
کثیر کے باوجود قرآن میں اختلاف نہ ہونا	〃
اس کے منجانب اللہ ہونے پر دلیل ہے	〃
آنحضرتؐ کا امی ہونا اور قرآن کریم میں اختلاف	۳۶۸
نہ ہونا اس کے اعجاز پر شاہد ہے	〃
قرآن میں اختلاف کا نہ ہونا ناسخ منسوخ	〃
کو غلط ٹھہراتا ہے	〃
استنباط مسائل	۳۶۹
جنگ کیلئے آنحضرتؐ اکیلے مکلف تھے	〃
السلام علیکم کی سنت	۳۷۰
منافقوں کے مختلف مدارج	〃
منافقوں کے اور گروہ	۳۷۱
مرتد کب قتل ہو سکتا ہے	〃
مسلمان کا مسلمان کو غلطی سے مار دینا	۳۷۲
مومن کا قتل عمد	۳۷۳
مومن کو کافر کہنا	〃
قتل بربنائے کفر نہیں بربنائے جنگ ہے	〃
دشمن قوم میں سے السلام علیکم کہنے والے	〃
کا حکم	۳۷۴
مال غنیمت کا خیال	〃
السلام علیکم اسلام کا نشان ہے	〃
جہاد کی فضیلت	〃
جہاد نہ کرنے والوں کا حکم	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
اولوا الضرر سے مراد اور ان کا حکم	۳۷۴
ہجرت کی استطاعت رکھنے والے	۳۷۵
اور نہ رکھنے والے	〃
حالات موجودہ میں ہجرت	۳۷۶
قصر صلوٰۃ سے مراد	〃
سفر میں قصر ضروری ہے	〃
کیا قصر صرف حالت خوف میں ہے	〃
قصر دو طرح پر ہے قصر سفر اور قصر خوف	۳۷۷
حالت جنگ اور میدان جنگ کی نماز	〃
غزوۂ ذات الرقاع	〃
طعمہ بن ابیرق کا واقعہ	۳۷۸
آنحضرتؐ کی فوق العادت امانت اور	〃
دیانت	〃
خطیئۃ اور اثم میں فرق	۳۸۰
نیک بات کا مشورہ	〃
اصلاح بین الناس	۳۸۱
اللہ تعالیٰ کا انسان سے معاملہ	〃
اجماع اُمت	〃
شیطان کی عبادت سے مراد	۳۸۲
کان چیرنے کی رسم	〃
خلق اللہ سے مراد دین اللہ	〃
واشمات	〃
شیطان کے وعدے	۳۸۳
ایمان بلا عمل محض امانی کی پیروی ہے	〃
مرد اور عورت میں نتائج اعمال کے لحاظ	〃
سے مساوات	〃
اللہ کی بندہ سے محبت	〃
اتباع ملت ابراہیم	۳۸۴
مسئلہ تعدد ازدواج پر مزید روشنی	〃
خاوند کا نشوز عورت پر	۳۸۵
عورتوں میں عدل سے مراد	۳۸۶
عدل و انصاف پر قیام کی نصیحت	۳۸۷
ہنسی اور ٹھٹھے کی مجالس	۳۸۸
منافقوں کی دورخی چال	۳۸۹
خدع کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف	〃
الحرب خدعۃ سے مراد	〃
نماز میں کسل اور راحت	۳۹۰

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
عذاب کی غرض اصلاح ہے	۳۹۱
ازالہ حیثیت عرفی کا قانون	〃
لکھی لکھائی کتاب کے اتارنے کا سوال	۳۹۲
حضرت مریم پر بہتان	〃
یہودیوں میں طرز صلیب	۳۹۳
مسیح کی نفی قتل و صلیب	〃
انجیل کی شہادت کہ مسیح صلیب پر چڑھائے	〃
گئے مگر زندہ رہے	〃
واقعات تاریخی اور اتمام حجت	〃
مسیح کے ہمشکل کا قصہ	۳۹۴
مسیح کے آسمان پر جانے کا ذکر قرآن میں	〃
نہیں	〃
حضرت مسیح کے مقتول ہونے میں شک	〃
شک آسمان پر جانے کو غلط ٹھہراتا ہے	〃
رفع اور عدم مصلوبیت کا تعلق	۳۹۵
قول ابوہریرہ متعلق نزول مسیح	〃
حضرت عیسیٰ اگر دوبارہ آئیں تو لوگ ان پر ایمان	〃
نہیں لائیں گے بلکہ آنحضرت صلعم پر لائیں گے	〃
ان من اھل الکتاب میں مراد	〃
عیسائی ہیں	۳۹۶
طیبات جو یہود پر حرام کی گئیں	〃
وحی کی اقسام	۳۹۷
آنحضرت صلعم کی وحی دیگر انبیاء کی طرح	〃
تھی	〃
آنحضرتؐ سب انبیاء کے کمالات کے	〃
جامع ہیں	〃
دوسری قوموں میں نبی	〃
حضرت موسےٰ پر نزول جبرائیل	〃
صداقت قرآن پر اللہ تعالیٰ کی گواہی	۳۹۸
عیسائی عقیدہ کہ مسیح ملعون ہوا	〃
حضرت عیسےٰؑ کے روح منہ ہونے سے	〃
مراد	۳۹۹
تثلیث	〃
مسیح کا اقرار عبودیت	۴۰۰
کلالہ کی وراثت	۴۰۱
ایک لطیف اشارہ	〃
۵ ـ سورۃ المائدۃ ۴۰۲ تا ۴۵۳	
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق	۴۰۲

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
زمانہ نزول	۴۰۳
وفاداری کی تعلیم	"
عہد اور عیسائیت	"
دشمن کے حقوق	۴۰۵
قومیت کی بنیاد ایک دوسرے کی اعانت ہے	"
ذبح کی غرض	"
جاہلیت میں فال نکالنے کا دستور	۴۰۶
غیر اللہ کے نام پر جانور کا ذبح کرنا	"
قبروں کے چڑھاوے	"
فال نکالنے کا حکم	"
استخارہ	"
قرعہ اندازی	"
اسلام کے کمال غلبہ کی پیشگوئیاں	۴۰۷
خشیت اللہ	"
اسلام میں تکمیل دین	"
تکمیل دین میں کیا امور داخل ہیں	۴۰۸
اتمام نعمت و کمال اطاعت	"
شکار کا جواز	۴۰۹
اہل کتاب کا کھانا کھانا اور دعوت کرنا	"
اہل کتاب کا ذبیحہ	"
اہل کتاب سے مناکحت	"
یہودیوں میں غیروں سے نکاح	"
عیسائیوں میں غیروں سے نکاح	۴۱۰
ایمان کا انکار	"
صفات بہیمی اور صفات ملکوتی	"
تفصیل وضو کے ذکر میں حکمت	"
موزوں پر مسح	"
فطری عہد	۴۱۱
حقوق العباد کی تاکید	۴۱۲
آنحضرتؐ کا دشمنوں سے بچانا	"
یہود کا عہد	۴۱۳
زمین کنعان اور بارہ اسرائیلی سردار	"
عیسائیوں کو شریعت پر چلنے کا حکم	"
عیسائیوں میں باہم بغض	"
مسیح کی موت ماننے کے سوائے الوہیت	۴۱۴
مسیح کا ابطال نہیں ہو سکتا	"
گزشتہ کے متعلق مضارع کا استعمال	۴۱۵
یہود و نصاریٰ کا دعویٰ ابنیت	"

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
زمانہ فترت	۴۱۶
حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرت صلعم کے درمیان	"
نبی	"
خالد بن سنان	"
یہود کی عہد شکنی کی ایک مثال	"
نبی اور بادشاہ بنانے سے مراد	"
اصحاب موسیٰ اور اصحاب محمد صلعم	۴۱۷
ہابیل اور قابیل کے قصے کی غرض	۴۱۸
آدم کے دو بیٹے	"
دو مسلمانوں کا جنگ کرنا	۴۱۹
اثمی سے مراد میرے خلاف گناہ ہے	"
ذنبك سے مراد	"
کسی کے ارادہ قتل پر اس کا قتل جائز	"
نہیں	"
جانوروں سے سبق	۴۲۰
فساد یا ڈاکہ کی سزا	۴۲۱
عرنیہ کی سخت سزا کی وجوہات	"
ڈاکہ کی چار قسم کی سزا	"
توبہ پر معافیٔ سزا	۴۲۲
حصول قرب الٰہی	"
دوسروں کو وسیلہ بنانا	"
دوزخ سے نکلنا	۴۲۳
قطع ید سے مراد	"
ہاتھ کاٹنا چور کی انتہائی سزا۔ عادی چور کی سزا۔	"
سزا بلحاظ حالات	۴۲۴
منافق یہودی	"
یہودیوں کے فیصلے توریت کے مطابق	"
یایھا الرسول سے خطاب	۴۲۵
یہودیوں کا توریت کے فیصلوں کو	"
قبول نہ کرنا	"
توریت میں ہدایت و نور	"
حفاظت توریت	
انبیائے بنی اسرائیل کا مطابق توریت	۴۲۶
فیصلہ کرنا نہیں الگ کتب ملنے کے	"
منافی نہیں	"
ما انزل اللہ پر ایمان	۴۲۷
زخموں میں قصاص	"
مسیح کا پہلے انبیاء کے نقش قدم پر آنا	"

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
انجیل میں ہدایت و نور سے اشارہ	۴۲۷
کفر دون کفر	۴۲۸
قرآن کتب سابقہ کا محافظ ہے	"
اختلافات مذہبی کا فیصلہ	"
ہر نبی صاحب شریعت ہے	۴۲۹
شرائع مختلفہ۔ حکمت اختلافات مذہبی	"
اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی	۴۳۰
اہل کتاب سے موالات	"
غلبہ کفر سے مرعوب نہ ہونا چاہیے	۴۳۱
ابتدائی تاریخ اسلام میں واقعات ارتداد	۴۳۲
ابوبکر کے صدق پر شہادت قرآنی	"
موجودہ فتنہ ارتداد اور مجدد صدی	"
چہاردہم	"
مومنوں کی موالات کس سے ہے	"
حضرت علی اور انگوٹھی دینے کا واقعہ	"
کن اہل کتاب سے موالات جائز ہے	۴۳۳
اذان	"
اہل کتاب کا مسلمانوں سے سلوک	"
مسیح موعود اور قتل خنزیر	۴۳۴
یہود و نصاریٰ میں عداوت	۴۳۵
عصمت انبیاء سے مراد	۴۳۶
تبلیغ حق اور عصمت کا تعلق	"
اہل تشیع کا خیال	"
علم دین سب کا سب اُمت کو پہنچا دیا گیا	"
وعدہ حفاظت کی ضرورت کیوں ہوئی	۴۳۷
عیسائیوں کو ان کی اپنی کتب مقدسہ کی	"
شہادت پر الزام	"
مسیح کی خدائی اور تثلیث	۴۳۸
مسیح کے کھانا کھانے کا ذکر	۴۳۹
الوہیت مسیح میں پہلے بت پرستوں	"
کی نقل	"
بنی اسرائیل پر داؤد اور عیسیٰ کے بعد	"
عذاب آنا	۴۴۰
بُرے کاموں سے روکنا	"
النبی سے مراد	"
عیسائیوں کے اسلام کے زیادہ قریب	۴۴۱
ہونے کی وجہ	"
موجودہ عیسائی اور اسلام	"

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
نجاشی اور مسلمان مہاجر	۴۴۱
اسلام اور رہبانیت	۴۴۲
مسکین کے کھانے کا اندازہ	〃
قسم کا کفارہ	۴۴۳
شراب اور بت پرستی	〃
عیسائیوں کا حرام کو حلال بنا لینا	〃
تقویٰ کے تین مراتب	۴۴۴
عیسائیت کے ذکر میں حرمت کعبہ	〃
کا ذکر	〃
حالت احرام میں شکار	۴۴۵
خانہ کعبہ کا دنیا کیلئے قیام ہونا	〃
حج بیت اللہ کا ہمیشہ قایم رہنا	۴۴۶
کعبہ کے متعلق پیشگوئی	〃
چھوٹے چھوٹے سوالات کی ممانعت	〃
مشرکانہ رسوم سے بچنے کی ضرورت	۴۴۷
ضال قوم کی کثرت کے وقت علاج	〃
غیر مسلم کی گواہی	۴۴۸
رسولوں سے ان کی قبولیت کا سوال اور	〃
اس سے مراد	۴۴۹
حضرت مسیح سے دشمنوں کو روکنے کے	〃
معنی	۴۵۰
انبیاء کو ساحر کہنے کی وجہ	〃
غیر نبی کی طرف وحی	〃
حواریوں کی حالت ظاہری	〃
حواریوں کی درخواست مائدہ	۴۵۱
حواریوں کی حالت روحانی	〃
حضرت عیسیٰ کی دعائے مائدہ	〃
آنحضرتؐ کو اُمت کی روحانیت کا فکر	〃
وقتی تعلیم اور معجزات مسیح	〃
حضرت عیسیٰ سے عالم برزخ میں سوال	۴۵۲
مریم کی الوہیت	〃
حضرت عیسیٰ کا اقرار توحید اور تعلیم	〃
وفات مسیح پر دلیل	۴۵۳
حضرت عیسےٰ کی دعائے مغفرت	〃
یوم سے مراد	〃
صادقوں سے صدق کے سوال کا مطلب	〃
۶ ـ سورۃ الانعام ۴۵۴ تا ۵۰۰	〃
نام	۴۵۴

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
مشرکانہ رسوم کی بیخکنی اسلام کا اصل	۴۵۴
کام تھا	〃
گائے کی مشرکانہ عظمت	〃
خلاصہ مضمون۔ تعلق	〃
تاریخ نزول۔ ثنویہ کا شرک	۴۵۵
بدی کیا ہے	〃
خالق شر الگ نہیں ہو سکتا	〃
لکھی ہوئی کتاب کیوں نہیں اتری	۴۵۷
فرشتہ کیوں رسول بن کر نہیں آیا	〃
اللہ کی رحمت کی وسعت	۴۵۸
فعلی شہادت	۴۵۹
فطری روشنی اور اس پر مواخذہ	〃
شرک افترا علی اللہ ہے	〃
شرک نہ کرنے کا عذر	۴۶۰
دلوں پر پردوں کا ڈالنا	۴۶۱
افعال بد کے بد نتائج اور ان کا اخفاء	〃
ظہور آخرت پر یقین کا فائدہ	〃
لقاء اللہ کا مرتبہ	۴۶۲
لہو و لعب میں فرق	〃
حیٰوۃ الدنیا سے مراد	〃
آنحضرتؐ کی صداقت کا اعتراف	〃
لامبدل لکلمات اللہ کا مفہوم	۴۶۳
بعث سے مراد بعث روحانی ہے	〃
آیۃ سے مراد عذاب استیصال ہے	۴۶۴
دابہ اور طیر کے انسانوں جیسی اُمت ہونے	〃
سے مراد	〃
حیوانات کا حشر	〃
عذاب اور ساعۃ کا مقابلہ	۴۶۵
دعائے اضطرار	〃
عذاب دینے کی غرض	〃
بدعملی کو اچھا کر کے دکھانا شیطان کا	〃
کام ہے	〃
دابر قوم کے کاٹ دینے سے مراد	〃
قوم کب ہلاک ہوتی ہے	〃
نیکی کی خاطر نیکی	۴۶۶
آنحضرتؐ کی عصمت	〃
کمال عمل	۴۶۷
مسلمان غربا کے متعلق کفار قریش کا مطالبہ	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
چھوٹے کس طرح بڑے بن جاتے ہیں	۴۶۷
آنحضرتؐ کا بت پرستی سے بچا رہنا	۴۶۸
وسعت رحمت الٰہی	〃
حکم خدا کے ماتحت حکم	〃
دلیل قرآنی کا دوہرا کام	۴۶۹
قوموں کا عروج و زوال	〃
توفی بمعنی نیند	〃
کونسی چیز قبض ہوتی ہے	〃
حفاظت اعمال کا قانون	۴۷۰
توفی میں جسم نہیں لیا جا سکتا	〃
فوق اور تحت کے عذاب سے مراد	۴۷۱
اعدائے اسلام میں باہم جنگ کا	〃
عذاب	〃
اُمت محمدیہ کی ہلاکت باہمی فساد سے	〃
آنحضرتؐ کے لیے سرخ و سفید خزانوں	〃
کا وعدہ	〃
مجلس استہزا میں شمولیت سے روکنے کی وجہ	〃
غیرت دینی ہے	〃
صحبت کا بد اثر	۴۷۲
ہمصحبتوں کو نصیحت کی ضرورت	〃
غیر اللہ کے اتباع کا نتیجہ	۴۷۳
کن فیکون سے مراد	〃
نفخ فی الصور	〃
آزر کون تھا	۴۷۴
انبیاء کیلئے نور عقل کی ہدایت	〃
ستاروں وغیرہ کا قانون میں جکڑے ہوئے	〃
ہونا اور معبود نہ ہونا	〃
قوم ابراہیم کا بڑا دیوتا سورج تھا	〃
بعض انبیاء کے ناموں کو اکٹھا کرنے کی	〃
وجہ اور غیر تاریخی ترتیب کی حکمت	۴۷۶
کسی نبی کی فضیلت کا ذکر الزام دور کرنے	〃
کے لیے	〃
منصب نبوت کی ضروری شرائط	〃
آنحضرت صلعم کو تمام انبیاء کے کمالات	〃
کا وارث بنایا گیا	۴۷۷
یہود کا انکار نبوت	۴۷۸
مکی سورتوں میں اہل کتاب سے خطاب	〃
قرآن کی فضیلت دیگر کتب پر	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
مخالفین کے مختلف اقسام	۴۷۸
عبداللہ بن سعد بن ابی سرح	؍؍
حق کی ابتدائی حالت اور تدریجی کامیابی	۴۷۹
دو قسم کا شرک	۴۸۱
اہرمن	؍؍
خدا کا بیٹا ہونے کے عقیدہ کی تردید	؍؍
اللہ تعالیٰ کی ربوبیت	۴۸۲
مشیتِ الٰہی متعلق شرک	۴۸۳
دوسرے معبودوں کو گالیاں نہ دینے کی تعلیم	؍؍
تزیین اعمال	؍؍
قرآن شریف معجزات کا انکار نہیں کرتا	؍؍
اللہ کا دلوں کو پھیرنا	۴۸۴
دلائل اور معجزات	؍؍
معجزات کے باوجود ایمان نہ لانے والے	؍؍
کلام موتیٰ سے مراد	؍؍
مذہبی اختلافات میں کوئی شخص حکم نہیں	؍؍
بنایا جا سکتا	۴۸۵
کتاب مفصل سے مراد	؍؍
دعاوی اور دلائل کا قرآن میں ہونا	۴۸۶
دنیا کی آخری مذہبی کتاب	؍؍
مشرکانہ رسوم	؍؍
ظاہری اور باطنی گناہ	؍؍
آنحضرتؐ کا مردوں کو زندہ کرنا	۴۸۷
رسالت موہبت ہے	؍؍
ضیق صدر	۴۸۸
کفر سے سینہ تنگ ہوتا ہے	؍؍
جن کا استعمال انسان پر	۴۸۹
جن سے مراد خاص انسان ہونے پر دلائل	؍؍
خلود جہنم	؍؍
کیا جنوں میں رسول آئے ؟	؍؍
ہلاکت سے پہلے تنبیہ ہوتی ہے	۴۹۰
آنحضرتؐ نے مشرکانہ رسوم کا استیصال کیا	۴۹۱
قتل اولاد کی رسم	؍؍
اولاد کو جاہل رکھنا بھی قتل کرنا ہے	؍؍
قتل اولاد سے مراد	۴۹۲
لو شاء اللہ ما اشرکنا کی تفسیر	۴۹۴
توحید کا عملی رنگ	۴۹۵
حفاظت جان و مال کی ضرورت	۴۹۶
توریت کن معنوں میں اتمام نعمت ہے	؍؍
محمد رسول اللہ توحید کی عملی تعلیم ہیں	۴۹۷

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
نیکی اور بدی کے بدلہ کا قانون	۴۹۸
آنحضرتؐ کے اول المسلمین ہونے کی دلیل	۴۹۹
ہر مسلم کا نصب العین	؍؍
ہر انسان کی اپنی ذمہ داری اور کفارہ	؍؍
مسلمانوں کی حکومت کمالِ رُوحانی کا نتیجہ تھی	۵۰۰
۷۔ سورۃ الاعراف۔ ۵۰۱ تا ۵۵۱	
نام۔ خلاصہ مضمون تعلق	۵۰۱
زمانہ نزول	؍؍
قرآن کا نام ذِکر رکھنے کی وجہ	۵۰۲
نزول کتاب سے مصلح کو شرح صدر کا ملنا	؍؍
نزول کتاب کی غرض	؍؍
وزن اعمال سے مراد	۵۰۳
آدم اور ابن آدم کا معاملہ ایک ہے	؍؍
شیطان کو سجدہ کا حکم	۵۰۴
جنوں کا آگ سے اور انسان کا مٹی	؍؍
سے پیدا ہونا	؍؍
شیطان کے ہبوط سے مراد	؍؍
یوم یبعثون سے مراد	؍؍
شیطان کے مہلت مانگنے سے مراد	؍؍
ذکر آدم میں بنی آدم کا ذکر	؍؍
شیطان کو مہلت کا ملنا	۵۰۵
شیطان کے ہر طرف سے آنے سے مراد	؍؍
شیطان کا مردود ہونا	؍؍
شیطان کا آدم اور حوا کو اُن کی سوآت	۵۰۶
دکھانے سے مراد	؍؍
شیطان کا بدی کو سجانا	؍؍
پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنے سے مراد	۵۰۷
جسمانی افعال میں روحانی امور کی طرف اشارہ	؍؍
زمینی زندگی کا اختتام صرف موت سے ہے	؍؍
لباس اور اسکے اتار دینے سے مراد	۵۰۸
آدم اور ابن آدم	؍؍
جنوں یا شیاطین کا دیکھنا	؍؍
لفظ شیطان کا استعمال بطور اسم جنس	؍؍
گمراہی کا فتویٰ	۵۰۹
عرب کا عبادت کے وقت کپڑے اُتار دینا	؍؍
نماز کے وقت زینت سے مُراد	؍؍
کھانے پینے میں اعتدال کی تعلیم	؍؍
اچھی چیزوں کا استعمال خلاف شریعت نہیں	۵۱۰

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
فاحشہ ۔ اثم ۔ بغی	۵۱۰
رسولوں کے بھیجنے کا عام قانون اور ختم نبوت	؍؍
رسول کیساتھ پیغام کا آنا ضروری ہے	۵۱۱
دو چند عذاب سے مراد	۵۱۲
آسمان کے دروازے نہ کھولنے سے مراد	؍؍
دوسری زندگی کے حواس اور کیفیات	۵۱۳
اصحاب اعراف سے مراد	۵۱۴
اہل نار کی رزق سے محرومی کی وجہ	۵۱۵
آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کرنے سے مراد	؍؍
استویٰ علی العرش سے مراد	۵۱۶
کرسی اور عرش کے متعلق غلط فہمی	؍؍
مصائب میں دعا	۵۱۷
تضرع کی دعا	؍؍
روحانی بارش کا اثر	؍؍
قبولیت حق میں اختلاف استعداد	۵۱۸
انبیاء کے ذکر کی غرض	؍؍
حضرت نوح	؍؍
عصمت انبیاء	؍؍
طوفان نوح	۵۱۹
قوم عاد	؍؍
رسولوں کا امین ہونا اور عصمت انبیاء	؍؍
قوم ثمود	۵۲۰
ناقۃ اللہ	؍؍
صالح کی اونٹنی	؍؍
حضرت لوط	۵۲۲
حضرت لوط اور بائبل میں تحریف	؍؍
حضرت شعیب	۵۲۳
تلوار سے مسلمان کرنے کے خلاف دلیل	۵۲۴
مسلمانوں میں ارتداد نہ تھا	؍؍
انبیاء میں غمخواری	۵۲۵
عذاب بطور سزا نہیں علاج کے طور پر ہے	؍؍
مہر لگانے سے مراد	۵۲۶
عہد فطرت	؍؍
حضرت موسیٰ اور اُن کی بعثت کی اصل غرض	۵۲۷
حضرت موسیٰ کے دو معجزے	؍؍
حضرت موسیٰ کے معجزات کا پہلا ظہور کن سالوں میں ہوا	؍؍
ان معجزات میں کیا سمجھایا	۵۲۸
انبیاء کو ساحر کہنے کی وجہ	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
حضرت موسیٰ کا ساحروں سے مقابلہ اور ان	۵۲۸
کی رسیاں اور سونٹیاں	״
ساحروں کی سونٹیاں اور عصائے موسےٰ	۵۲۹
ساحروں کا ایمان لانا اور بائبل	״
بنی اسرائیل کے ذکر میں مسلمانوں کی مشکلات کا علاج	۵۳۰
بادشاہت کے حصول کا طریق	۵۳۱
مسلمانوں کے مصائب اور مجدد صد چہاردہم	״
حضرت موسیٰ کے نو نشان	۵۳۲
الارض سے مراد	۵۳۳
اس امت کی کامیابی تلوار سے نہیں	״
بنی اسرائیل پر مصریوں کا اثر	״
مسلمانوں پر ہندوؤں کا اثر	״
بت پرستی کے نابود ہونے کی پیشگوئی	״
شرک کے خلاف دلیل	״
عبادت کی چالیس خاص راتیں	۵۳۴
ہارون کی خلافت سے مراد	״
موسیٰ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا سوال	״
الٰہی تجلیات	״
اللہ تعالیٰ کی کامل تجلی	۵۳۵
اللہ تعالیٰ کو دیکھنا	״
کلام الٰہی اور رسالت	״
اللہ تعالیٰ کے توریت کے لکھنے سے مراد	״
توریت میں ہر چیز کی تفصیل سے مراد	״
اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا منقطع نہیں ہوسکتا	۵۳۶
قرآن کا ہارون کے بچھڑا بنانے سے انکار	״
اور بائبل کی اصلاح	۵۳۷
حضرت موسیٰ کے تختیاں توڑنے کے معاملہ	״
میں بائبل کی اصلاح	״
حضرت موسیٰ کی میقات طور پر ایک ہی تھی	״
حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کو طور پر غشی کا آنا	۵۳۸
وسعت رحمت الٰہی	״
توریت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی	۵۳۹
انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی	״
رسول موعود کی صفات	״
ساری نسل انسان کا نبی	״
سبت کے دن مچھلی کا شکار	۵۴۰
یہودیوں کا نقشہ مکی اور مدنی سورتوں میں ایک سا ہے	۵۴۱
یہود کے بندر بننے سے مراد	״

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
یہودیوں کے متعلق پیشگوئی	۵۴۱
گناہ کی مغفرت کا اصول	۵۴۲
میثاق فطرت	״
میثاق فطرت کب اور کس طرح لیا گیا	۵۴۳
میثاق فطرت سے مراد	״
اس اعتراض کا جواب کہ تقلیداً بدیاں کرنیوالے	״
قابل الزام نہیں	״
بلعم	۵۴۴
کتے کی مثال	״
اطمینان قلب کس طرح ملتا ہے	״
جہنم کیلئے انسانوں کا پیدا کرنا	۵۴۵
اسماء الٰہی سے حصول کمال	״
ہلاکت میں تدریج	״
رسول کو جنون نہیں ہوتا	۵۴۶
قریش کی ساعت وسطیٰ	۵۴۷
اصول اسلام کی سادگی	״
آدم کی طرف شرک کی نسبت غلط ہے	״
بتوں کا عبد ہونا	۵۴۸
بے نظیر تحدی	״
اسلام کی کامیابی پر ایمان کی ضرورت	״
بت پرستی کا انجام اور آخر مغلوب ہونا	۵۴۹
دشمنوں کو معافی	״
انسان شیطان	״
غضب کا علاج	۵۵۰
شیاطین کے بھائی	״
فاتحہ خلف امام کا مسئلہ	״
دل میں ذکر	۵۵۱
دون الجہر سے مراد	״
سجدۂ تلاوت	״
دعائے سجدۂ تلاوت	״
۸ ـ سورۃ الانفال ـ ۵۵۲ تا ۵۷۴	
نام ـ خلاصہ مضمون	۵۵۲
تعلق ـ زمانہ نزول	״
مال غنیمت اور انفال میں فرق	״
فیٔ اور نفل میں فرق	۵۵۳
ایمان کا بڑھنا اور گھٹنا	״
ایمان کی شاخیں	״
مسلمانوں کو عاجزی سکھا کر جنگ کیلئے تیار کرنا	״

خلاصہ مضامین	
جنگ بدر کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم	۵۵۳
کن حالات میں نکلے	״
ارباب سیر کی غلطی	״
اسباب کی شہادتیں کہ آنحضرتؐ قافلہ پر حملہ کیلئے	۵۵۴
نہیں بلکہ لشکر کے مقابلہ کیلئے نکلے تھے۔	״
مزید دلائل کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دفاع	״
کیلئے نکلے	״
دو گروہوں کا ذکر اور خدائی ارادہ	״
فرشتوں کا لشکر اسلامی لشکر کے آگے چلنا	۵۵۵
ایک ہزار ملائکہ	״
ملائکہ سے نصرت کیوں کر ہوئی	״
ملائکہ نے بدر میں جنگ نہیں کی	۵۵۶
میدان جنگ میں نیند کا آنا	״
جنگ بدر میں بارش کا اترنا	۵۵۷
عذاب دنیا عذاب آخرت کیلئے بطور پیش خیمہ ہے	״
جنگ میں پیٹھ دکھانے کی ممانعت	۵۵۸
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رمی اور لشکر	״
کفار کی ہزیمت	״
جنگوں کے متعلق پیشگوئی	״
کفار کی دعائے مباہلہ بدر سے پہلے	״
کفار کی جنگوں میں ناکامی کی پیشگوئی	״
مسلمانوں کی حقیقی فلاح کی راہ	۵۵۹
عقل اور مذہب	״
حالت عناد	״
مسلمانوں کی زندگی	״
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مُردے زندہ کرنا	״
اللہ کے انسان اور اسکے قلب میں حائل ہونے مراد	۵۶۰
مسلمانوں پر عظیم الشان فتنے	״
ایک خوشخبری	״
اللہ اور رسول کی خیانت سے مراد	״
قومی ترقی کا راز	۵۶۱
اغراض قومی اور دینی کی اہمیت کو نہ سمجھنے	״
کی سزا	״
اندرونی فرقان	״
دارالندوہ میں آنحضرتؐ کے خلاف مشورہ	״
خیر الماکرین	״
کفار کا عذاب مانگنا	۵۶۲
کفار پر تاخیر عذاب کی وجہ	״

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
مسلمانوں کے خانہ کعبہ کے متولی ہونے کی پیشگوئی	۵۶۲
مشرکین عرب کی عبادت کا رنگ	〃
ابن حضرمی کا قتل	۵۶۳
جنگ بدر کے بعد اور لڑائیاں اور ان میں کفار	〃
کی مغلوبیت کی پیشگوئی	〃
یکون الدین کلہ للہ سے مراد	۵۶۴
تقسیم مال غنیمت	〃
آنحضرتؐ کا گذارہ	〃
ذوالقربیٰ سے مراد	〃
جنگ بدر کیوں فرقان کہلائی	۵۶۵
رئیس بنی کنانہ شیطان کی صورت میں	۵۶۶
کفار کی عہد شکنی	〃
قوم سے نعمت کب چھنتی ہے	۵۶۷
کفر اسلام پر غالب نہیں آسکتا	۵۶۸
اسلام کے حق دشمن	۵۶۹
دشمن کے ملکی اور مذہبی مقابلہ کے لیے تیاری	〃
کا حکم	〃
قلمی جہاد میں مسلمانوں کی غفلت	〃
یورپ میں تبلیغ کا خاص فائدہ	〃
اسلام صلح کو مقدم کرتا ہے	〃
مسلمانوں کی باہمی محبت	〃
اسلام کی دشمنوں میں محبت پیدا کرنے کی طاقت	۵۷۰
سامانوں کے ساتھ توکل	〃
مسلمانوں کو جنگ پر تحریض	〃
مسلمانوں کا دو چند پر غالب آنا اور اس کی وجہ	〃
فقاہت کا قرار دینا	〃
مسلمانوں کا دہ چند تعداد پر غالب آنا اور دونوں	〃
حالتوں میں فرق	۵۷۱
قیدیان بدر … بارہ میں مشورہ	〃
بدر کے قیدیوں کا فدیہ مطابق حکم قرآنی تھا	〃
قیدیوں کے فدیہ کی مقدار	۵۷۲
ایسے مسلمانوں سے تعلقات ولایت جو کافر	〃
قوموں میں ملے جلے ہیں	۵۷۳
مسلمانوں پر مسلمانوں کی دینی مدد فرض ہے	〃
تعلقات رشتہ داری	۵۷۴
ابتدائی مسلمانوں کے تعلقات اخوت	〃
۹ ـ سورۃ التوبۃ ۵۷۵ تا ۶۱۶	
البراءۃ یا التوبۃ نام کی وجہ	〃
خلاصہ مضمون	۵۷۵

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
تعلق ـ زمانہ نزول	۵۷۵
مشرکوں سے علیحدگی کے اعلان کی وجہ	۵۷۶
وہ امور جن کا اعلان کیا گیا	〃
عہدوں کے واپس کرنے کی وجہ	〃
یوم الحج الاکبر سے مراد	〃
عہد جو مستثنیٰ کیے گئے	۵۷۷
تمام مشرکین عالم سے علیحدگی کا اعلان نہیں ہوا	〃
سزا جو بار بار کی عہد شکنی پر تجویز کی گئی	〃
اس سزا کی معافی کی صورتیں	۵۷۸
پناہ مانگنے والوں کو امن دینا اور بصورت انکار	〃
اسلام اپنی قوم میں واپس کر دینا	〃
اسلام میں عہد کی عزت	۵۷۹
کفار کا مسلمانوں سے سلوک	〃
مثلاً سود وغیرہ اور انکار زکوٰۃ والوں سے	〃
جنگ کی وجہ	۵۸۰
اسلام کس قسم کی قربانیاں مسلمانوں سے چاہتا ہے	〃
مسلمانوں کی زندگی کا اصل الاصول	۵۸۲
دین کو دنیا پر مقدم کرنا	〃
جنگ حنین	〃
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت	〃
ملائکہ ان آنکھوں سے نہیں دیکھے جا سکتے	۵۸۳
مسجد حرام میں غیر مسلم کو داخل ہونے کی ممانعت	〃
مکہ کیلئے فقر کی بجوئی کی بشارت	〃
جزیہ کیا ہے	〃
اہل کتاب کے ساتھ جنگ کے احکام	۵۸۴
نبی کریمؐ کا عمل اہل کتاب سے جنگ کے بارہ میں	〃
حضرت عزیرؑ	〃
عقیدہ ابنیت مسیح پہلی کافر قوموں کی نقل ہے	۵۸۵
ارباباً من دون اللہ اور آجکل کی گدیاں	〃
نور اللہ سے مراد	〃
دین اسلام کی کل ادیان پر غلبہ کی پیشگوئی	〃
عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ	۵۸۶
اظہار دین اسلام اور مسیح موعود	〃
علماء اور مشائخ کی حالت	〃
مال جمع کرنا اور ابوذرؓ	〃
پیشانی وغیرہ کا داغا جانا	۵۸۷
سال کے بارہ ماہ اور چار حرمت کے مہینے	〃
مسلمانوں کو دشمن کے مقابلہ میں ایک ہونے کی نصیحت	〃

خلاصہ مضامین	
نسئی کی غرض	۵۸۷
جنگ تبوک	۵۸۸
ہجرت کے واقعات اور حضرت ابوبکرؓ کی	۵۸۹
رفاقت	〃
فضیلت ابوبکرؓ	〃
عفا اللہ عنک	۵۹۰
مسلمانوں کے لیے دو بھلائیاں	۵۹۲
نماز میں سستی	〃
منافقوں پر مال و اولاد کا عذاب	〃
خرچ زکوٰۃ کی مدات	۵۹۳
فقیر اور مسکین میں فرق	۵۹۴
عاملین ـ مولفۃ القلوب	〃
غلاموں کا آزاد کرنا ـ قرضدار	〃
جہاد قلمی یا سیفی کرنے والے ـ مسافر	〃
فریضہ زکوٰۃ سے مسلمانوں کی غفلت	〃
تقسیم دولت کا مسئلہ	〃
بیت المال کی ضرورت	〃
اشاعت اسلام اور تعلیم پر زکوٰۃ کا خرچ	〃
یتامیٰ اور زکوٰۃ	۵۹۵
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن ظن اور حیا	〃
منافقوں کی آخری علیحدگی	۵۹۶
بہشت کی سب سے بڑی نعمت	۵۹۷
جہاد تین طرح پر ہے	۵۹۸
جہاد لسانی یا سیفی	〃
منافقوں سے جہاد	〃
نبی کریمؐ کی منافقوں سے سختی سے مراد	〃
منافقت کا نتیجہ ناکامی اور شیعوں پر اتمام حجت	〃
ثعلبہ بن حاطب اور منافقوں سے زکوٰۃ کا نہ لیا جانا	۵۹۹
مہر بطور سزا ہے	〃
منافقوں کیلئے استغفار اور عبداللہ بن ابی کا جنازہ	۶۰۰
منافقوں سے انقطاع تعلق جسمانی	۶۰۱
انقطاع تعلقات روحانی	〃
قبر پر دعا	〃
وحی کا رائے کے خلاف ہونا	〃
بادیہ نشین عرب	۶۰۲
الدین النصیحۃ کا مفہوم	〃
معذور لوگوں کا گروہ	〃
سواری کا نہ ہونا بھی عذر ہے	۶۰۳

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
صحابہ کا جذبہ محبت اور مسلمانوں کے لیے سبق	۶۰۳
منافقوں سے اعراض	//
قرآن نے کن لوگوں کی اصلاح کی۔	۶۰۴
انفاق کو چٹی سمجھنے والے	//
اعدائے اسلام آخر تک اسلام کی تباہی کے منتظر تھے	//
قرب الٰہی کیا ہے	//
قرآن کریم کا پیدا کردہ انقلاب	//
حصول قرب الٰہی کیلئے انفاق مال	//
آنحضرت ﷺ کی دعا اور قوت قدسی	۶۰۵
پیراوران کی نذریں	//
رضائے الٰہی	//
کامل مومنین کا گروہ	//
سابقون اولون سے مراد	//
حصول رضائے الٰہی کا مقام	۶۰۶
اھل الجنۃ مُرد کی تشریح	//
منافقین کی سزا	//
دو دفعہ عذاب سے مراد	//
اقرار گناہ	//
منافقوں کی توبہ	//
تطہیر اور تزکیہ میں فرق	۶۰۷
توبہ کرنیوالے منافقوں سے زکوٰۃ کا لینا اور	//
مسلمانوں کیلئے سبق	//
ثبوت اخلاص	//
منافقین سے تشابہ	//
مسجد ضرار	۶۰۸
ابو عامر	//
مسجد ضرار بنانے کی غرض	//
مسجد قبا	//
تطہیر سے مراد	//
قطع قلوب	۶۰۹
مسلمانوں کا عہد	//
صحابہؓ نے اس عہد کو کس طرح پورا کیا	//
یہی عہد سب انبیاء لیتے تھے	۶۱۰
حضرت مسیحؑ کی تعلیم مال و جان دینے کی	//
مومنوں کی صفات	//
مشرکوں کے لیے ممانعت استغفار	//
ابو طالب	//

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ	۶۱۰
ممانعت استغفار میں شرائط	۶۱۱
غیر مسلم کا جنازہ	//
ابراہیم اور آزر	//
ساعۃ العسرۃ	۶۱۲
مسلمانوں کی جان نثاری کا کمال	//
کعب بن مالک۔ مرارۃ۔ ہلال	//
ملک غسان	۶۱۳
صحابہ کی سچائی سے محبت	//
صحابہ کی جان نثاری اور اطاعت کا کمال	//
معیت صادقین کا حکم	//
صادقین سے مراد ہر زمانہ کے مامورین ہیں جیسے مجدد	//
اعدائے دین کا مقابلہ عبادت میں داخل ہے	۶۱۴
سب سے بڑا مجاہدہ دینی	//
مجاہدہ علمی	//
قطع الطریق سے مراد	//
ہر ایک نفقہ اور کام پر اجر	//
جنگوں کا خاتمہ	۶۱۵
صداقت اسلام کا ایک نشان	//
سب اقوام میں علم پھیلانے کی تجویز	//
نشر و توسیع علم کی تجویز	//
قریب کے کفار سے جنگ کا منشاء	//
منافقوں کو نصیحت کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں	//
قلب رسول کی کیفیت	۶۱۶
گناہ اور ہلاکت سے دنیا کو بچانے کی تڑپ	//
رب العرش	//
رسول اللہ کو تسلی کہ ایک خدا پر بھروسہ کرو	//
۱۰۔ سورۃ یونس۔ ۶۱۷ تا ۶۴۲	
نام۔ خلاصہ مضمون	۶۱۷
تعلق ترتیب اور زمانۂ نزول	//
الٓر سورتوں کا مجموعہ	//
قرآن میں حکمت	//
انبیاء کو ساحر کہنے کی وجہ	۶۱۸
دوسری پیدائش	//
ضوء اور نور میں فرق	۶۱۹
حدیث نار اھل الشرک	//
کھانا پینا مقصد زندگی نہیں	//
نجات کیلئے ایمان صحیح کی ضرورت	//

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
بہشت کا نقشہ	۶۲۰
برائی مانگنے کی ممانعت	//
مصیبت کیوں آتی ہے	//
کفار کا مطالبہ تعلیم قرآن انکے منشا کے مطابق ہو	۶۲۱
آنحضرت ﷺ کا اتباع وحی الٰہی کرنا	//
آنحضرت ﷺ کی صداقت و امانت کا اعتراف	//
پیشگوئی کہ مفتری اور مکذب فلاح نہیں پاتے	۶۲۲
بتوں کی شفاعت کا عقیدہ اور بت پرستی	//
مخالفت کا قانون مستمرہ	//
عذاب کب آئے گا	۶۲۳
دکھوں میں سبق	//
آرام میں انسان خدا کو بھول جاتا ہے	۶۲۴
سیاہی چھانے کا مفہوم	۶۲۵
تین قسم کے معبود	//
سمع و بصر کا مالک	۶۲۶
مشرکین کا اقرار توحید	//
عہد فطرت اور عہد شریعت	//
بدء خلق اور عود	۶۲۷
معبودان غیر اللہ کا عجز	//
قرآن میں ظنی باتیں نہیں	//
دو دلیلیں کہ قرآن افترا نہیں ہو سکتا	//
علوم قرآنی اور تکذیب کرنے والوں کا غور نہ کرنا	۶۲۸
اعمال کی ذمہ داری	//
بصیرت سے کام نہ لینے والے	۶۲۹
آرام اور مصیبت کا مقابلہ	//
آنحضرت ﷺ کے مخالفین پر قیامت تک سزا کا آتا رہنا	//
ہر قوم کے لیے رسول	//
حق کی قبولیت دنیوی نفع نقصان کے خیال سے پاک ہو	۶۳۰
قوموں کی زندگی و موت	//
تعیش اور غفلت سے عذاب آتا ہے	//
عذاب پر ندامت	//
صدر اور قلب میں فرق	۶۳۱
قرآن سے کیا ملتا ہے	//
اخلاق اور مال	//
کوئی اچھا عمل ضائع نہیں ہوتا	۶۳۲
قرآن کس مقام بلند پر پہنچاتا ہے	//
اولیاء اللہ کو مبشرات دی جاتی ہیں	۶۳۳

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
لم یبق من النبوۃ الا المبشرات	٦٣٣
مبشرات چالیسواں جزو نبوت ہیں	"
انقطاع نبوت سے انقطاع مقامات عالیہ نہیں ہوا	"
شرک اتخاذ ولد	٦٣٤
اعدائے رسول کو چیلنج	٦٣٥
موسیٰ ؑ کا غلبہ بذریعہ کلمات	٦٣٦
موسیٰ ؑ پر پہلے ایمان لانے والے	٦٣٧
بنی اسرائیل کے بڑے لوگ اور قوم کی بیکسی	"
بنی اسرائیل کی نجات کا سامان	"
حکومت اصل نصب العین نہیں	"
ہارون کو وحی	"
حضرت موسیٰ کی دعا فرعون کی تباہی کیلئے	٦٣٨
فرعون کا رجوع موت کے وقت	"
فرعون کی لاش اور قرآن کریم کا معجزہ	"
بنی اسرائیل پر نعمت اور ان کی مخالفت رسول	٦٣٩
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم کے متعلق کبھی	"
شک نہ تھا نہ ہو سکتا تھا	"
عبد اللہ بن سلام	٦٤٠
یونس	"
اہل نینوی اور عذاب	"
انذاری پیشگوئیوں کا ٹل جانا	٦٤١
اعدائے دین کے ظلم سے نجات	"
١١- سورۃ ھود - ٦٤٣ تا ٦٧١	
نام - خلاصہ مضمون تعلق - زمانہ نزول	٦٤٣
قرآن میں اصول و فروع کا ضروری عمل	"
اللہ تعالیٰ کا رزق پہنچانا کس طرح پر ہے	٦٤٤
کان عرشہ علی الماء سے مراد	٦٤٥
جسمانی دکھ اور سکھ	"
ضیق صدر	٦٤٦
دنیا داروں کے مطالبات	"
قرآن افترائے انسان نہیں	"
اس کے مضامین علمی	"
دنیا طلبی کے اعمال	٦٤٧
حبط اعمال	"
بینۃ قرآن کریم ہے شاھد نبی ہے	"
رسول کا اسوۃ	"
موسیٰ کی کتاب	"
ہر نبی کی وحی بینۃ ہے	"

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
دنیا طلب اور حق طلب کا مقابلہ	٦٤٨
نبی کے بشر ہونے پر اعتراض	٦٤٩
انبیاء کے پیرووں کی غربت	"
محنت شرف انسانیت ہے	
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور محنت	"
فضیلت کا معیار	"
اللہ تعالیٰ کا عماء میں ہونا	"
دنیا پرست اور دلائل حقہ	٦٥٠
انبیا کی بے نفسی	"
دعوت انبیاء کا دنیوی مال وجاہ کے لالچ	"
سے برتر ہونا	"
مومنوں کی کفار پر ہنسی سے مراد	٦٥٢
طوفان نوح	"
فار التنور سے مراد	"
حضرت نوح نے کشتی میں کیا لیا	"
طوفان نوح کل روئے زمین پر نہ تھا	٦٥٣
عمل غیر صالح سے مراد	٦٥٤
نوح کے بیٹے کا اہل میں سے نہ ہونا	"
کیسی دعا نہ کرنی چاہیے	"
نوح کا ذکر انباء الغیب کس معنی میں ہے	٦٥٥
مخلوق خدا کی خدمت فطرت انبیاء ہے	٦٥٧
ابراہیم کو بشارت اور قوم لوط کے عذاب کا تعلق	"
یہ رسول فرشتے تھے یا انسان	"
خلق مہمان نوازی	"
صلحاء کا سلام	٦٥٩
حضرت لوط کی بیٹیاں	٦٦١
بائبل کا گندہ قصہ لوط کی بیٹیوں کے متعلق	"
لوط کی بستیاں کس طرح تباہ ہوئیں	٦٦٢
رزق حسن	٦٦٣
طوفان نوح کل دنیا پر نہ تھا	٦٦٤
شعیب کی نابینائی کی روایت	"
جنت اور دوزخ کے خلود میں استثناء	٦٦٦
اس کی چار توجیہیں	"
عصاۃ مومنین اور کفار کے خلود عذاب میں	"
قرآن کریم نے کوئی فرق نہیں رکھا	٦٦٧
جہنم پر فنا آنے کی شہادت	"
فنائے جہنم کے متعلق اقوال صحابہ	"
حدیث شفاعت سے استدلال کہ کفار بھی	"

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
جہنم سے نکالے جائیں گے	٦٦٨
صحابہ کی استقامت	٦٦٩
صحابہ کی معیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے	"
ماسوی اللہ کا سہارا	"
اوقات نماز	٦٧٠
نماز مصائب سے نجات کا ذریعہ ہے	"
بدی کا کفارہ نیکی ہے	"
عذاب فساد پر آتا ہے	"
پیدا کرنے کی غرض رحم کرنا ہے	٦٧١
محدود عذاب بھی رحم ہے	"
ذکر انبیاء میں آنحضرت ؐ کا ذکر عمل اور زندگی	"
١٢- سورۃ یوسف - ٦٧٢ تا ٧٠٢	
نام - خلاصہ مضمون تعلق - زمانہ نزول	٦٧٢
عربی ام الالسنہ ہے	"
قرآن عربی سے مراد	٦٧٣
احسن القصص سے مراد	"
سچے خواب	"
سورج چاند کا سجدہ	٦٧٤
بائبل اور قرآن میں فرق	"
ستاروں سورج چاند کے سجدہ سے مراد	"
حضرت یعقوب علیہ السلام کی تعبیر	"
سائلین سے مراد	٦٧٥
بن یامین	"
بائبل اور قرآن کے بیان میں فرق	٦٧٦
وحی قبل از نبوت	"
بائبل اور قرآن کے بیان میں فرق	٦٧٧
مصائب میں صبر کا سبق	"
قمیص کا ذکر تین مرتبہ	"
قمیص کی تعبیر علم ہے	"
بلوغ سے مراد	٦٧٨
ارادہ الٰہی	٦٧٩
عصمت یوسف علیہ السلام	"
عصمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم	"
یوسف ؑ کے دل میں بدی کا خیال بھی نہیں گزرا	"
برھان ربہ سے مراد	٦٨٠
شاہد کون تھا	"
قرائن کی شہادت	"
قرآن کریم اور بائبل میں فرق	"

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
بائبل اخلاق فاضلہ نہیں سکھا سکتی	۶۸۰
عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کا واقعہ	۶۸۱
عورتوں کی چالبازی	۶۸۲
عورتوں کا یوسف پر دباؤ ڈالنا	
مصیبت پر قید کو ترجیح	۶۸۳
بائبل اور قرآن	″
مشرک کی حالت	۶۸۴
اسماء سے مراد	″
حلم اور رویا میں فرق	۶۸۵
مکہ میں سات سال کا قحط	۶۸۶
آنحضرتؐ کی دعا سے قحط کا دور ہونا	″
بائبل حضرت یوسفؑ کو الزام سے پاک نہیں کرتی	″
آنحضرت صلعم کا ارشاد لاجبت الداعی	۶۸۷
تہمت کے موقعہ سے بچے	″
ہاتھوں کا کٹنا یوسفؑ کے خلاف سازش تھی	″
راستبازوں کا طریق	۶۸۸
نفس امارہ	″
نفس لوامہ	″
نفس مطمئنہ	
حضرت یوسف علیہ السلام کا مصر پر مالی تصرف	″
الگ الگ دروازوں سے داخل ہونے کی نصیحت کی غرض	۶۹۰
حضرت یعقوبؑ کو آنیوالی مصیبت کا علم تھا	″
اسباب اور توکل	۶۹۱
نظر کا لگنا	″
بن یامین کی بوری میں پیالہ رکھنے والے حضرت	″
یوسف علیہ السلام نہ تھے	″
بائبل میں تحریف	۶۹۲
بن یامین کا حضرت یوسفؑ کے پاس رہ جانا	۶۹۳
دوسرے دین کے بادشاہ کے قانون پر عمل	″
بن یامین پر چوری کا الزام بھائیوں کا	۶۹۴
منصوبہ تھا	″
حضرت یعقوبؑ کا غم میں رو رو کر اندھا ہو	۶۹۵
جانا خلاف قرآن ہے	″
مصیبت کے چھپانے کا حکم	۶۹۶
قرآن کا بائبل سے اختلاف اور اسباب مایوسی	″
کو انتہا تک پہنچا کر پھر رحمت سے مایوس نہ کرنا	″
مسلمانوں کے مایوس دلوں کیلئے مرہم	″
بن یامین سے بھائیوں کی شرارت	۶۹۷

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
دکھ سے سکھ آتا ہے	۶۹۷
عفو یوسفؑ اور عفو خاتم النبیینؐ	″
قمیص سے حکومت کی طرف اشارہ	۶۹۸
لفظ خرّ میں تسبیح پر دلیل	۶۹۹
سجدہ یوسفؑ کو نہ تھا۔ سجدہ شکر تھا	۷۰۰
راستبازوں کی خواہش	″
مسلمانوں کو عرب اور اس سے باہر بادشاہت	″
ملنے کی خبر	″
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور اسکا انجام	″
آنکھوں سے کام لینے کی ضرورت	۷۰۱
توحید کے ساتھ شرک	″
توحید پر فطرت کی شہادت	″
مسلمانوں میں شرک	″
دعوت اسلام توحید خالص ہے	″
آنحضرتؐ کی پیروی سے بصیرت حاصل ہوتی ہے	″
رسولوں کی مشکلات	۷۰۲
نصرت الٰہی	″
قرآن تفصیل کل شئی سے مراد	″
۱۳۔ سورۃ الرعد۔ ۷۰۳ تا ۷۱۷	
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول	۷۰۳
حقانیت قرآن	″
آسمانوں کے غیر مرئی ستون	۷۰۴
نظام سماوی میں تعلقات اور اثرات	″
انسان کا تعلق خالق سے	″
ہر چیز کے ازواج	۷۰۵
اختلاف مراتب انسانی	″
تردید تناسخ	″
اغلال سے مراد	″
بعث بعد الموت اور اس کا انکار	۷۰۶
قوائے روحانی کا نشوونما	″
مطالبۂ نشان ہلاکت اور اس کا جواب	″
تمام اقوام کیلئے انذار اور ہدایت اور ختم نبوت	″
نتائج اعمال کی تشبیہ حمل سے	۷۰۷
معقبات سے مراد کراماً کاتبین ہیں	۷۰۸
اعمال کی ذمہ داری کا احساس کامل اسلام نے پیدا کیا	″
قوم کی حالت کیونکر بدل سکتی ہے	″
وحی کی مثال بارش سے	″
تعلق باللہ سے ہی فائدہ حاصل ہوتا ہے	۷۰۹

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
من دون اللہ سے نہیں	۷۰۹
کافر کی دعا	″
طوعاً وکرہاً سجدہ	″
ظلال کا سجدہ	″
ظل کے معنی میں وسعت	″
ظل اللہ سے مراد	″
ظلال کے سجدہ میں لطیف اشارہ	″
ظلی نبوت	۷۱۰
غیر اللہ سے تعلق بے سود ہے	″
خلق دلیل عبادت اور الوہیت ہے	″
بدی کو نیکی سے دور کرنے کی تعلیم	۷۱۲
عزیزوں کا جنت میں انسان کے ساتھ ہونا	″
ہدایت اور گمراہی کا قانون	۷۱۳
ذکر اللہ سے اطمینان قلب	″
وحی رحمانیت سے ہے	″
قرآن کے کمالات	۷۱۴
قارعہ سے مراد	″
کفار کے استہزاء کی وجہ	″
شرک کا ابطال	۷۱۵
معبودان باطل	″
جنت کی نعماء کا ذکر بطور مثال ہے	″
ایک قوم کا جانا اور دوسری کا آنا	۷۱۶
قضا و قدر ٹل سکتی ہے	″
حق کے آخری غلبہ کا کھلا نشان اسکی قبولیت ہے	۷۱۷
مخالفانہ منصوبے	″
اہل عرب نے کیوں بالآخر اسلام قبول کیا	″
۱۴۔ سورۃ ابراہیم۔ ۷۱۸ تا ۷۳۰	
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول	۷۱۸
ظلمت اور نور	″
نزول قرآن کی غرض	″
مسلمانوں میں ایثار کی کمی	۷۱۹
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عامہ پر ایک	″
اعتراض اور اس کا جواب	″
شکر نعمت سے مراد	۷۲۰
اخراج رسل اور ان کی آخری کامیابی	۷۲۱
شیطان کا انکار شرک	۷۲۳
چھوٹوں کی غلطی سے بڑے گمراہ ہو جاتے ہیں	۷۲۴
وعدہ شیطانی	″

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
نیکی اور بدی پر وعدے	۷۲۴
شیطانوں کا تسلط نہ نیکوں پر ہے نہ بدوں پر	〃
کلمۂ حق کی مضبوطی	〃
حق کے اصول وفروع	〃
اشجار بہشت اعمال انسانی سے پیدا ہوتے ہیں	〃
باطل کی بے بنیادی	۷۲۵
سورج چاند وغیرہ کی تسخیر	۷۲۶
سلسلہ نبوت کا نظم	〃
عصمت انبیاء کا راز اور ہمارے لیے اسمیں فوائد	〃
انبیاء میں رحمت کا جوش	۷۲۷
اسمٰعیل علیہ السلام کا کعبہ کے پاس چھوڑا جانا	〃
کس غرض سے تھا۔ خانہ کعبہ میں کشش۔	〃
ابراہیم علیہ السلام کے آب آپکے والد نہ تھے کوئی	۷۲۸
اور بزرگ تھے	〃
عذاب کے وقت کا نقشہ	〃
قریش کی تدابیر	۷۲۹
وعدۂ عذاب دنیا کیلئے بھی ہیں۔	〃
نتیجہ تبلیغ	۷۳۰
۱۵ ۔ سورۃ الحجر ۔ ۷۳۱ تا ۷۴۶	
نام ۔ خلاصہ مضمون ۔ تعلق ۔ زمانہ نزول	۷۳۱
قرآن پہلی کتابوں کے اجمال کو کھولتا ہے	〃
کافروں کے مسلمان ہونے کی آرزو	〃
فرشتوں کے آنے سے مراد	۷۳۲
قرآن کی حفاظت ابدی	〃
شیطان کاہن یا منجم کو کہا ہے	۷۳۴
شیاطین کا ملائکہ کی باتوں کو سننا	〃
آسمان کے شیاطین سے محفوظ ہونے سے کیا مراد ہے۔	〃
استراق سمع سے کیا مراد ہے	۷۳۵
کہانت اور نجوم کو قرآن کریم نے دور کیا	۷۳۶
الٰہی خزانے ۔	〃
ابتدائے پیدائش	۷۳۷
زمین کی سب سے پہلی حالت، ناری مخلوق	۷۳۸
اللہ کی رُوح کا انسان میں نفخ	〃
شیطان کا آخر دنیا تک رہنا	۷۳۹
دنیوی زندگی کو مقصد ٹھہرانا اصل حصول	〃
مقصد میں ناکامی ہے	〃
شیطان کو کسی انسان پر تسلط نہیں	〃
علی رضہ باب علم ہیں	〃
دوزخ کے سات طبقے	۷۴۰

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
جنت کی کمال راحت کا نقشہ	۷۴۰
ایمان خوف ورجاء کے درمیان ہے	〃
ابراہیمؑ کے مہمان انسان تھے	۷۴۱
حضرت لوطؑ نے بھی ان مرسلوں کو انسان ہی سمجھا	〃
اللہ تعالیٰ کی قسم سے مراد	۷۴۲
اصحاب الایکۃ کون تھے	۷۴۳
قوم لوطؑ ۔ قوم شعیبؑ اور ثمود کا یکجائی ذکر	〃
ان اللہ جمیل سے مراد	۷۴۴
قرآن کریم کو مثانی کس معنی سے کہا گیا ہے	〃
سبع من المثانی سے مُراد	〃
آئندہ زمانہ کی پیشگوئی	۷۴۵
بار بار انذار کی ضرورت	۷۴۶
عبادت کب تک ہے	〃
۱۶ ۔ سورۃ النحل ۔ ۷۴۷ تا ۷۷۵	
نام ۔ خلاصہ مضمون	۷۴۷
تعلق ۔ زمانہ نزول	〃
امر اللہ سے مراد	۷۴۸
جسمانی سامانوں کے مقابلہ پر روحانی سامان	۷۴۹
حد بندیاں محدد پر دلالت کرتی ہیں	۷۵۰
پہاڑوں سے اضطراب ارضی کا رک جانا	〃
ناشکر گذاری	۷۵۱
حضرت عیسیٰؑ کی وفات پر ایک قطعی دلیل	〃
آخرت سے انکار توحید سے بھی انکار ہے	۷۵۲
خلاف حق تدابیر کا انجام	〃
اللہ کی مشیت	۷۵۴
دکھوں کے وقت کامیابی کی بشارت	۷۵۵
اھل الذکر سے مراد	〃
عورت کی نبوت	〃
آنحضرتؐ کے مخالفین کا عذاب	۷۵۶
تین قسم کا عذاب	〃
فرشتے کیسی مخلوق ہیں	۷۵۷
من فوقھم سے مراد	〃
دو خداؤں کا عقیدہ	〃
لڑکیوں کے مارنے کے رواج کا استیصال	۷۵۸
آنحضرتؐ کی بدی کو دور کرنیکی طاقت	〃
دابۃ سے مراد ظالم انسان ہیں	۷۵۹
زمانہ جاہلیت کا نقشہ	〃
اعتقادات جاہلیت	〃

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
قرآن کی ضرورت مذاہب کے اختلافات	۷۶۰
کے فیصلہ کے لیے بھی تھی	〃
چارپایوں میں انسان کیلئے عبرت	〃
دوسری مخلوق میں عبرت	〃
شہد کی مکھی سے سبق	۷۶۱
انسانوں کے مراتب میں اختلاف اور نزول	〃
وحی	〃
کافر اور مومن کی مثال	۷۶۲
عذاب دنیا اور الساعۃ	۷۶۳
پرندوں کا تعلق ذکر عذاب سے	۷۶۴
نعمائے ظاہری سے ضرورت وحی پر دلیل	۷۶۵
نبی کس معنی میں گواہ ہے	〃
خیر وشر کی جامع تعلیم	۷۶۶
تفرقہ پر ایک مثال	۷۶۷
اہل جاہلیت اور معاہدات اور یورپ کی حالت	〃
مرد وعورت کیلئے اعمال حسنہ کی جزا یکساں ہے	۷۶۸
حیات طیبہ سے مراد	〃
تلاوت قرآن اور استعاذہ	〃
شیطان کا تسلط کس پر ہے	۷۶۹
قرآن میں نسخ نہیں	〃
مخالفین کا اعتراض کہ آپکو کوئی انسان سکھاتا ہے	۷۷۰
حالت مجبوری میں کلمہ کفر	۷۷۱
مسلمانوں کا ایمان اور اخلاص	〃
دِل پر مہر	〃
ہجرت حبش اور ہجرت مدنیہ	〃
جہاد اعلائے کلمۃ اللہ	〃
اہل مکہ کی سزا	۷۷۲
حضرت ابراہیمؑ اپنی نیکی کی وجہ سے دنیا	۷۷۳
کے پیشرو بنے	
ملت ابراہیمی پر چلنے کا ارشاد	〃
یہودیوں اور عیسائیوں کا سبت	۷۷۴
سبت میں اختلاف سے مراد	〃
دعوت الی الحق کی طرز	〃
دعوت الی الحق میں صبر کی ضرورت اور	۷۷۵
غلبہ کی پیشگوئی	〃

فہرست بیان القرآن جلد دوئم

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
سورۃ بنی اسرائیل۔ از ۷۷۶ تا ۸۱۱	
نام، خلاصۂ مضمون۔	۷۷۶
تعلق۔ زمانۂ نزول۔	"
المسجد الاقصا	۷۷۷
آیت اسریٰ اور احادیث معراج۔	"
معراج کے متعلق امت کے دو گروہ	"
معراج کے جسد عنصری کے ساتھ ہونیکے دلائل	"
معراج کے جسد عنصری کے ساتھ نہ ہونیکے دلائل۔	۷۷۸
معراج کی غرض۔	۷۷۹
اسرا میں اشارہ۔	"
معراج کب ہوا۔	"
تعلیم توحید کی غرض۔	"
بنی اسرائیل کا دوبارہ فساد کرنا اور دوبارہ اُن	"
پر تباہی آنا۔	"
بابلیوں کی بعثت سے مراد۔	۷۸۰
خورس۔	"
مسلمانوں میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا دہرایا جانا۔	۷۸۱
توریت کے مقابل قرآن کریم کے امتیازات	"
طلب شر میں انسان کی عجلت سے مراد	۷۸۲
آنحضرت ؐ کی رحمت۔	"
رات کی نشانی کے محو کرنے سے مراد۔	"
اعمال اور ان کے نتائج کا فلسفہ	۷۸۳
کتاب منشور سے مراد۔	"
انسان کا قیامت میں اپنا محاسبہ آپ کرنا۔	"
جزاو سزائے اعمال انسان کے لیے اپنے نفس	۷۸۴
میں ظاہر ہوتی ہے۔	"
جزاو سزا کے مکمل قانون یا زندگی بعد الموت	"
کی اطلاع بذریعہ انبیا دی گئی۔	"
بچہ جزا و سزائے اعمال کے قانون سے باہر ہے۔	"
کفار کے بچوں پر مواخذہ نہیں۔	"
عقل کی رسالت۔	"
دنیوی عذاب اور بعثت رسل۔	"
ماکنا معذبین کا غلط مفہوم	۷۸۵
عذاب ہلاکت کا وقت اور غرض۔	"
عذاب ہلاکت سے مراد۔	"
دنیا کو غرض زندگی بنانے والے۔	۷۸۶

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
اخلاق فاضلہ کی جڑ کیا ہے۔	۷۸۷
توحید اخلاق فاضلہ کی جڑ ہے۔	"
والدین سے سلوک۔	"
ماں باپ سے حسن سلوک اور محبت۔	"
والدین کی خدمت پر احادیث۔	"
مال کا بیجا خرچ۔	۷۸۸
کفران نعمت۔	"
خرچ میں میانہ روی۔	"
نیکی کرنے اور حق تلفی سے بچنے کی تعلیم	۷۸۹
قتل اولاد سے مراد	"
زنا کے مبادی سے بچنے کی تعلیم اور زنا کے	"
بدنتائج	"
سزائے قتل میں اسراف۔	"
دوسری سزاؤں میں اسراف	"
پورا تولنے سے مراد	۷۹۰
بدگوئی۔	"
متکبرانہ روش	"
مضامین کا بار بار مختلف پیرایوں میں بیان کرنا	۷۹۱
مشرک مقرب بارگاہ الٰہی نہیں ہو سکتا۔	"
کل مخلوق کی تسبیح سے مراد۔	"
اللہ تعالیٰ دلوں پر کیوں پردہ ڈالتا ہے۔	۷۹۲
آنحضرت ؐ کے متعلق مختلف رائیں۔	"
بعث بعد الموت پر تعجب۔	۷۹۳
اعدائے اسلام سے نرمی کی	"
زبور کی خصو ۔ ۔	۷۹۴
حصول قرب الٰہ	"
دنیا کی سب بستیوں کت ب کا آنا اور	۷۹۵
اس کی وجہ۔	"
قرآن معجزات کا انکار نہیں کر	"
ناقۂ ثمود اور اس کے خصوصیت سے ذکر۔	۷۹۶
الشجرۃ الملعونۃ سے مراد	"
رویائے معراج۔	"
شیطان کی تعلی	۷۹۷
شیطان کے سوار اور پیادے۔	"
شیطان کی مال اور اولاد میں شرکت۔	"
شیطان کو انسان پر کوئی تصرف نہیں دیا گیا۔	"

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
خسف اور ہوا کا عذاب۔	۷۹۸
بنی آدم کی فضیلت۔	۷۹۹
لوگوں کا اپنے اماموں کے ساتھ بلایا جانا۔	"
کتاب کا یمین یا دائیں ہاتھ میں دیا جانا۔	"
نامہ اعمال کا پڑھنا۔	۸۰۰
آخرت میں اندھا ہونا	"
عذاب کا ایک رنگ	"
آنحضرت ؐ کو لالچ دیکر دعوت سے روکنے کی	"
کوشش۔	"
آپؐ کا ثبات قدم۔	"
آپؐ کا حفاظت الٰہی پر بھروسہ	۸۰۱
شعب ابی طالب میں محصور ہونا۔	"
ہجرت کے بعد قریش کے لیے پیشگوئی۔	"
نماز فجر کے مشہود ہونے سے مراد۔	"
نماز اور مصائب۔	"
پانچ نمازیں۔	۸۰۲
جمع بین الصلوٰتین۔	"
نماز تہجد	"
مقام محمود۔	"
ہجرت میں کامیابی کی پیشگوئی	"
خانہ کعبہ سے بتوں کے دور کیا جانے اور پھر	۸۰۳
بت پرستی کے کبھی نہ آنے کی دوہری پیشگوئی۔	"
قرآن کن معنوں میں شفا ہے۔	"
امراض جسمانی اور قرآن کریم۔	"
تکلیف میں مایوسی۔	"
روح تین طرح پر ہے۔	۸۰۴
اقوال مفسرین دربارۂ روح	"
سوال دربارہ روح۔	"
علم انسانی بمقابلہ علم الٰہی۔	"
روح جسم کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔	"
قرآنی وحی ہمیشہ کے لیے دنیا میں رہے گی۔	۸۰۵
آخری نبوت۔	"
قرآن کی عظمت۔	"
جنّ سے مراد۔	"
تعلیم قرآنی کا کمال۔	"
روحانی انعامات کو جسمانی رنگ میں دیکھنے کی درخواست	"

خلاصہ مضامین	صفحہ
عذاب کا رنگ استعارہ کے رنگ میں۔	۸۰۶
کفار کے مطالبات میں لفظ پرستی۔	"
معراج کے روحانی ہونے پر دلیل۔	"
آسمان پر جسم سے چڑھنا منافی بشریت ہے۔	"
انسانوں کے لیے فرشتہ پیغمبر بنکر نہیں آسکتا۔	"
فرشتے حواس جسمانی سے نہیں بلکہ حواس روحانی	۸۰۷
سے دیکھے جاتے ہیں۔	"
انسان جنوں کی طرف رسول نہیں ہوسکتا۔	"
اللہ کی شہادت سے مراد۔	"
علی وجوھھم سے مراد۔	"
محشر میں تین گروہ۔	"
سزا کا مطابق اعمال ہونا۔	"
آگ کے بار بار بھڑکایا جانے سے مراد۔	۸۰۸
حیات بعد الموت میں یہ جسم نہ ہوگا بلکہ اسکی مثل ہوگا	"
نعمائے جسمانی و روحانی دونوں غیر متناہی ہیں۔	"
تسع آیات سے مراد	"
وعد الاخرۃ سے مراد۔	۸۰۹
قرآن کریم کا تدریج نزول۔	"
حضرت موسیٰ کی پیشگوئی۔	۸۱۰
صفت رحمانیت اور مذاہب باطلہ۔	"
اسمائے حسنہ سے پکارنا۔	"
دعا میں اعتدال۔	"
قرأت بالجہر اور آہستہ۔	"
توحید الٰہی۔	۸۱۱
سورۃ الکہف۔ از ۸۱۱ تا ۸۴۸	
نام۔ خلاصہ مضمون	۸۱۱
تعلق۔ زمانہ نزول۔	۸۱۲
ولم یجعل له عوجا	"
نزول کتاب سے روحانی ربوبیت۔	"
فتنۂ دجال سے مراد فتنۂ عیسائیت ہے۔	"
احادیث میں لفظ دجال اختیار کرنے کی وجہ۔ اور	۸۱۳
لفظ کی لغوی تشریح۔	"
کتاب قیمہ	"
دین قیم	"
کتاب کے کامل ہونے کے دو نتائج۔	"
عیسائی اقوام کی مخالفت اسلام۔	۸۱۴
کبرت کلمۃ	"
عیسائیت کے اصل الاصول پر کوئی علمی یا عقلی دلائل نہیں	"

خلاصہ مضامین	صفحہ
علیٰ آثارھم کے معنے۔	۸۱۴
آنحضرتؐ کا عیسائی اقوام کے لیے غم۔	"
ایک خوشخبری۔	"
عیسائی اقوام کی زمینی ترقی اور ایک پیشگوئی۔	"
اصحاب کہف کا مشہور قصہ۔	۸۱۵
اصحاب کہف کے ذکر سے قرآن کریم کی اصل غرض۔	"
عیسائیت کی تاریخ۔	"
کہف اور رقیم کا مقابلہ۔	"
اصحاب کہف کے غار میں پناہ لینے کی اصل غرض۔	۸۱۶
ضربنا علیٰ آذانہم سے مراد۔	"
دو فریق۔	"
اللہ تعالیٰ کا علم غیب کا وقوع کی طرف منتقل ہونا۔	۸۱۷
اصحاب کہف کے بعث سے مراد۔	"
قصۂ اصحاب کہف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے	"
کے واقعات زندگی کی طرف اشارہ۔	"
اصحاب کہف کے ہدایت کے مقام بلند پر پہنچنا۔	"
ربطء لعلب سے مراد۔	"
کہف سے ج کے پھر جانے سے مراد۔	۸۱۸
کہف او کا محل وقوع۔	"
یوسف آمسا رطانیہ میں جانا۔	"
اصحاب لعف	۸۱۹
اقوام یورپ ن دیوی ہوشیاری اور دینی غفلت۔	"
اصحاب کہف کا کام کے لیے اٹھنا۔	۸۲۰
اصحاب کہف کے ذکر میں ابتدائی عیسائیت کا نقشہ	"
اصحاب کہف کے ذکر میں یورپ کا موجودہ نقشہ	"
اصحاب کہف کے ۱۲ مشاپر اطلاع پ جانا۔	۸۲۱
اقوام یورپ کے اصل پر لوگوں کا اطلاع پالینا	"
نیک لوگوں کے	"
قبروں پر مسجدیں	"
اصحاب کہف کی د۔	۸۲۲
یورپ کی اقوامؑ سے مراد	"
تبلیغ اسلام میں آ کا وعدہ	۸۲۳
اسلام اور عیسائیت نرقی کا مقابلہ	"
عیسائیت کا تہ ل غربت کی حالت میں پہنچنا۔	"
تین سو نو سال اور قرآن کریم کا اظہار علم غیب	۸۲۴
ابصر بہ واسمع کے معنے۔	"
اللہ کے حکم میں کسی کا شریک نہ ہونا۔	"
ایمان یا کفر پر مجبور کوئی نہیں۔	۸۲۵
سونے کے کڑوں۔ ریشمی لباس۔ تختوں سے مراد	۸۲۶

خلاصہ مضمون	صفحہ
سبز لباس۔	۸۲۶
سونے کے کڑوں کے ذکر میں فتوحات کی طرف لطیف	"
اشارہ اور سراقہ کا واقعہ۔	"
مومن اور کافر کی مثال۔	"
باغ سے مراد۔	۸۲۷
کفار کی زینت کے سامانوں کی نسبت اللہ کی طرف	"
عیسائیت کا مال اور جتھے پر فخر۔	"
عیسائی اقوام کی روحانیت سے محرومی۔	"
عیسائیوں کا انکار خدا عملی رنگ میں۔	"
ہر انسان کا مٹی سے پیدا ہونا۔	"
دوسری زندگی کے مدارج اس زندگی کی طرح ہیں۔	۸۲۸
ماشاء اللہ کے معنے۔	"
تقلیب کفین	"
اللہ تعالیٰ کی موالات۔	۸۲۹
دنیوی زیب و زینت چلی جانیوالی چیز ہے۔	"
اعمال حسنہ کا لقا۔	"
رب کے سامنے پیش کیا جانے سے مراد۔	۸۳۰
وضع کتاب	"
ابلیس ملائکہ میں سے نہیں۔	۸۳۱
ذریت شیطان اور ہر انسان کے لیے الگ شیطان	"
کا ہونا۔	"
خلق میں عدم شرکت۔	"
دلوں پر پردوں کا ڈالنا۔	۸۳۲
وعدۂ ہلاکت۔	۸۳۳
مجمع البحرین کے معنے۔	"
موسیٰ اور خضر کے قصے پر اختلاف روایات۔	"
احادیث قصص۔	"
حضرت موسیٰ کے تلاش خضر میں نکلنے کی وجہ	"
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سفر خرطوم۔	۸۳۴
یوشع	"
مچھلی کا بھولنا اور دریا میں چلے جانا۔	"
مچھلی کا بطور نشان دیا جانا۔	"
مچھلی کا بھنا ہوا ہونا قابل قبول نہیں۔	۸۳۵
اسی قسم کے دوسرے قصے۔	"
حصول علم کے لیے سفر اور صعوبت کا اٹھانا۔	"
مچھلی بھول جانے کا سبب۔	"
حضرت موسیٰ کے لیے نشان بڑے روایات	۸۳۶
صخرۃ بھی تھا اور مچھلی بھول جانا بھی۔	"
خضر کون تھے۔	"
وفات خضر۔	"

خلاصہ مضامین	صفحہ
حدیث لوکان موسیٰ وعیسیٰ حیین الخ	۸۳۶
اور وفات عیسیٰ۔	"
خضر کی ملاقات	"
خضر کی نبوت۔	"
ولی کا الہام حجت شرعی نہیں۔	"
محمد و صد چہار دہم کا ایک واقعہ۔	"
مقامی نبوتیں اور مقامی ضروریات۔	"
ضروریات نسل انسانی کا کامل علم آنحضرتؐ	"
کے لیے مخصوص ہوا۔	"
خضر کے فرشتہ ہونے کا قول۔	۸۳۷
اتباع سے مراد	"
موسیٰ اور خضر کا علم۔	"
موسیٰ کے صبر نہ کرسکنے کی وجہ	"
خضر کا کشتی کو توڑنا۔	۸۳۸
خضر خاندان بادشاہت سے تھے۔	"
خضر کا ایک شخص کو قتل کر دینا۔	"
حضرت موسیٰؑ کا اعتراف	۸۳۹
دیوار کا واقعہ	"
کشتی توڑنے کی وجہ۔	"
اس سے قومی نبوت پر استدلال۔	"
خضر کے حاکم ہونے پر استدلال۔	۸۴۰
خضر کے جوان کو قتل کرنے کی وجہ اس کا فساد	"
اور ڈاکہ زنی تھی۔	"
بلا اجرت دیوار بنانے کی وجہ نااہل لوگوں کے	۸۴۱
کسی بزرگ کی نیکی ہے۔	"
ذکر کنز میں آنحضرتؐ کی پیشگوئی۔	"
موسیٰ اور خضر کے واقعات میں آنحضرت صلی اللہ	"
علیہ وسلم کی صداقت کا اظہار۔	"
واقعہ کشتی اور ملک عرب کی حالت۔	"
واقعہ قتل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بیگناہوں	"
کے قتل کا جھوٹا الزام۔	"
واقعہ کنز اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے	"
متعلق پیشگوئیاں۔	"
نبوت خضر۔	"
ذوالقرنین کون تھے۔	"
ذوالقرنین کے یہاں ذکر کرنے کی وجہ۔	۸۴۲
کل شیٔ سے مراد۔	"
مغرب الشمس کے معنے	"
ذوالقرنین کا سفر مغرب۔	۸۴۳

خلاصہ مضامین	صفحہ
نبوت ذوالقرنین۔	۸۴۳
مکذبین اور مومنین ذوالقرنین کا انجام۔	"
شرقی سرحد کا سفر۔	۸۴۴
اس کے لشکر اور سامان۔	"
سدّین سے مراد۔	"
یاجوج وماجوج کا وجہ تسمیہ۔	"
حدیث وآثار کی شہادت کہ یاجوج ماجوج	"
ہماری طرح آدمی ہیں۔	"
یاجوج ماجوج کی اصلیت اور انسکلوپیڈیا	"
بائیبل کی شہادت کہ یاجوج ماجوج اقوام یورپ ہیں	"
یاجوج ماجوج کا دوبار فساد اور ترکوں	۸۴۵
پر حملہ۔	"
ذوالقرنین کی دیوار۔	"
پتھر کی دیوار میں لوہے کے دروازے	۸۴۶
دیوار کی تباہی۔	"
یاجوج ماجوج کا آخری خروج اور ان کا انجام۔	"
عیسائی اقوام کی صنعت۔	۸۴۷
اللہ تعالیٰ کے لاانتہا کلمات میں سے مسیح	۸۴۸
ایک کلمہ ہے۔	"
انا بشر مثلکم میں عیسائیت کی تردید۔ اور	"
نسل انسانی کے لیے خوش خبری۔	"

سورۃ مریم[۱۹]۔ از ۸۴۹ تا ۸۷۰

خلاصہ مضامین	صفحہ
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول۔	۸۴۹
سورت کو زکریا کے ذکر سے شروع کرنے کی وجہ	۸۵۰
دعا میں اخفا اور تضرع۔	"
قبولیت زکریا اور اس کی وجہ۔	"
زکریا کے ورثہ سے مراد۔	"
یحییٰ کی بےنظیری سے مراد	۷۵۱
یحییٰ کی بےگناہی۔	"
یحییٰ کی کتاب۔	۸۵۲
اصول عصمت انبیاء۔	"
نبی کی تین سلامتیاں۔	"
حضرت عیسیٰ اور یحییٰ کے اکٹھے ذکر میں	"
حکمت۔	"
مریم کا شرقی مکان میں جانا۔	۸۵۳
شرقی مکان کون سا تھا۔	"
حضرت مریم کا حجاب کرنا اور اس کی غرض۔	"
حضرت مریم کا کشف۔	"

خلاصہ مضمون	صفحہ
کشف یا رویا میں برے کام کا ارتکاب۔	۸۵۴
حضرت مریم کی منگنی۔	۸۵۴
حضرت عیسیٰ کے آیۃ ہونے سے مراد۔	"
حضرت مریم کا حاملہ ہونا الوہیت مسیح کے	"
خلاف دلیل ہے۔	"
مکاناً قصیا سے مراد اور حضرت مریم کا سفر	۸۵۵
بیت لحم۔	"
حضرت مریم کا دردزہ دلیل ابطال الوہیت	"
مسیح ہے۔	"
حضرت مریم کے کسی سے کلام نہ کرنے کی	۸۵۶
غرض۔	"
خاموشی کا روزہ شریعت اسلام نے منسوخ	"
کر دیا۔	"
حضرت عیسیٰ کے زمانہ نبوت کے حالات۔	۸۵۷
حضرت عیسیٰ کا گدھی پر سوار ہونا۔	"
حضرت مریم کا ساتھ ہونا۔	"
شیئاً فریا سے مراد۔	"
حضرت مسیح کے کلمات بزرگان یہود کے حق میں	"
یہودیوں کا اعتراض حضرت عیسیٰ پر تھا یا	۸۵۸
مریم پر۔	"
کان فی المھد صبیا کا مفہوم۔	"
حضرت عیسیٰ پر اعتراضات اور ان کا جواب	"
اور عیسائیوں پر اتمام حجت۔	"
حضرت مسیح کی ماں سے نیکی کا ذکر بالخصوص	۸۵۹
کیوں کیا۔	"
اُمّہ صدیقۃ کہنے کی ضرورت کیوں	"
پیش آئی۔	"
انی عبد اللہ والا کلام زمانہ طفولیت	"
کا نہیں ہو سکتا۔	"
صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم مسیح کے آسمان پر	"
ہونے کو غلط ٹھیراتا ہے۔	"
عیسائیت کے فرقوں کا باہم اختلاف۔	۸۶۰
کتب خانہ اسکندریہ۔	"
حدیث لم یکذب ابراھیم الا ثلثا	۸۶۱
غلط ہے۔	"
حضرت ابراہیم کی عصمت	"
شیطان کو معبود بنانے سے مراد	"
شیطان کا ولی بننے سے مراد	"
اللہ تعالیٰ سے دوری	"
دشمن سے پیار	۸۶۲

خلاصہ مضامین	صفحہ
سورۃ الاخلاص	۸۶۲
حضرت موسیٰ کی عصمت - رسول نبی۔	″
حضرت اسماعیل کی رسالت	۸۶۳
حضرت اسمٰعیل کی عصمت۔	″
حضرت ادریس کا رفع۔	″
انبیاء کی غیر تاریخی ترتیب میں حکمت۔	″
جنت غیب ہے۔	۸۶۴
بہشت کی صبح و شام۔	″
انبیا کا نزول ضرورت پر ہوتا ہے۔	۸۶۵
بدکاروں کے لیے جہنم ضروری ہے۔	۸۶۶
مومن دوزخ میں داخل نہیں ہونگے۔	″
تکالیف میں دوزخ کا رنگ۔	″
اعلیٰ فرنیچر اور حسن منظر والی قوم	۸۶۷
اس سورت میں لفظ رحمٰن کے بار بار لانے کی وجہ	″
شیاطین سے مراد۔	۸۶۸
شیطان کی تحریک۔	″
مومنوں کا شفاعت کرنا۔	۸۶۹
شفاعت کے لیے تعلق کی ضرورت	″
عقیدۂ ابنیت کو دنیا میں پھیلانے والی قوم	″
عقیدۂ ابنیت نظام عالم کو باطل کرتا ہے۔	″
مخلوق کا کمال عبدیت میں ہے۔	۸۷۰
پاک لوگوں کی محبت دنیا میں بڑھتی چلی جاتی ہے	″
قوموں کی ہلاکت کا اٹل قانون۔	″
سورۃ طٰہٰ۔ از ۸۷۱ تا ۸۹۴	
نام خلاصۂ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول۔	۸۷۱
نور محمدی کا کمال۔	″
چودھواں سال اور چودھویں صدی۔	″
کامیابی کی بشارت	″
حضرت موسیٰ پر وحی کی ابتدا۔	۸۷۲
چار قسم کی آگ۔	″
حضرت موسیٰ کا کشف	″
حضرت موسیٰ کی وحی انبیا کی طرح تھی۔	۸۷۳
جوتیاں اتارنے سے مراد	″
قیامت کا مخفی رکھنا۔	۸۷۴
حضرت موسیٰ کے عصا کا ابتدائی نزول وحی	″
میں باریک سانپ بننا اور فرعون کے سامنے	″
اژدہا بننا اور اس کا مفہوم۔	″
شرح صدر اور عقدۂ لسان سے مراد۔	۸۷۵

خلاصہ مضامین	صفحہ
حضرت موسیٰ کی درخواست ہارون کو نبی بنانے	۸۷۵
کے لیے نہیں معاون بنانے کی ہے۔	″
غیر نبی کی وحی نبی کی وحی کی طرح یقینی ہو سکتی ہے	۸۷۶
انبیاء پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبت کا	۸۷۷
ڈالا جانا۔	″
انبیا کا اللہ تعالیٰ کے سامنے پرورش پانا	″
دلیل عصمت ہے۔	″
انبیا پر مصائب کا آنا۔	″
انبیا کا اغراض نفسانی سے پاک ہونا۔	″
دعوت الی الحق کا صحیح طریق۔	۸۷۸
ہر چیز کا اپنے دائرہ میں کمال۔	″
انسان کی پہلی اور دوسری پیدائش کا اسی	″
زمین سے ہونا۔	۸۷۹
حضرت موسیٰ کی دلائل۔	″
فرعون کا تحقیق مذہبی میں برابری اختیار کرنا	۸۸۰
فرعون کی تدابیر مختلفہ	″
حضرت موسیٰ کی تقریر کا اثر۔	″
ساحروں کی رسیاں سانپ نہیں بنیں۔ بلکہ یہ	۸۸۱
ایک شعبدہ بازی تھی۔	″
حضرت موسیٰ کا خوف۔	″
جہنم میں نہ موت ہے نہ زندگی۔	۸۸۲
حضرت موسیٰ کا سمندر میں ایک خشک رستہ	۸۸۳
پر چلنا۔	″
رضائے الٰہی ہی انسان کا بلند ترین مقام ہے	″
علی اثری سے مراد	۸۸۴
زینۃ القوم سے مراد	۸۸۵
زیورات اور بچھڑے کا تعلق۔	″
مسلمان اور عجل یورپ	″
حضرت ہارون کی عصمت اور بائبل کے بیان	″
کی تردید۔	″
سامری کا بچھڑا بنانا اور حضرت جبرائیل کی گھوڑی	۸۸۶
کا بے بنیاد قصہ۔	″
سامری کا لوگوں سے میل جول روکا جانا۔	″
بچھڑے کی خاک۔	۸۸۷
بائبل سے اختلاف	″
نیلی آنکھوں والی قومیں۔	″
دس دن اور ایک دن رہنے سے مراد	″
پہاڑوں کے اڑانے سے مراد	۸۸۸
داعی کے اتباع سے مراد	۸۸۹
شفاعت میں شافع اور مشفوع دونوں کے	″

خلاصہ مضامین	صفحہ
لیے اذن کی ضرورت اور اس سے مراد۔	۸۸۹
مومنوں کے حق میں ظلم و ہضم کی نفی۔	۸۹۰
قرآن کریم کے متعلق جلدی نہ کرنے کے حکم کا منشا	″
آدم کی عصمت۔	″
وحی سے فطری کمزوری کا علاج	″
اس عالم کی جنت میں اسباب آسائش کے مہیا	۸۹۱
ہونے سے مراد	″
شجرۃ الخلد سے مراد	″
دنیادار کی تنگی سے مراد۔	۸۹۲
حشر میں اندھا ہونے سے مراد۔	″
عذاب استیصال کب آئے گا۔	۸۹۳
اوقات نماز۔	″
نماز سے حصول کامیابی۔	″
نبی کریمؐ کا رنگ۔	″
آرائش ظاہری کے سامان۔	″
نماز نمازی کے لیے رزق روحانی ہے۔	۸۹۴
مطالبۂ عذاب ہلاکت کا لطیف جواب۔	″
بیّنۃ سے مراد رسول کریمؐ ہیں۔	″
عذاب اور رسول کا تعلق۔	″
مکذبین نبی کریمؐ کے عذاب ہلاکت کی نوعیت	″
سُورۃ الانبیاء۔ از ۸۹۵ تا ۹۱۶	
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانۂ نزول۔	۸۹۵
حساب کے قریب ہونے سے مراد۔	″
محدث کے لغوی معنی۔	۸۹۶
اصطلاح شریعت میں محدث۔	″
مخالفین کا قرآن کریم کو سحر قرار دینا۔	″
قرآن کریم کے متعلق مختلف رائیں۔	″
وفات مسیح پر فیصلہ کن دلیل۔	۸۹۷
مخالفین کے خیالات کا جواب۔	″
قرآن کریم کے ذریعہ سے قومیں عظمت حاصل	″
کریں گی۔	″
انبیا کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کا نشان۔	″
قوموں کی تباہی سے مراد۔	۸۹۸
جزا و سزا کا انکار خدا کے کاموں کو بے حقیقت	″
قرار دیتا ہے۔	″
انبیا کا تعلق اللہ تعالیٰ سے اس کی عبادت میں	″
نشاط سے ظاہر ہے۔	۸۹۹
توحید باری پر دلیل اول، ایک سے زیادہ خدا	″

خلاصہ مضامین	صفحہ
ہوں تو نظام عالم قائم نہیں رہ سکتا۔	۸۹۹
دوسری دلیل، توحید میں سب قومیں ایک دوسرے	״
کی موید ہیں شرک میں نہیں۔	״
تیسری دلیل، ہر نبی کی وحی میں توحید ہی ہے۔	״
عصمت انبیاء پر قطعی دلیل۔	۹۰۰
دوسرے کے لیے استغفار شفاعت ہے۔	״
قرآن کریم کی علمی صداقتیں جن کا اس کے نزول	۹۰۱
کے وقت دنیا کو علم نہ تھا۔	״
پانی سے زندگی کا ہونا	״
نظام عالم کی تشبیہ ایک گھر سے	״
اجرام سماوی کا اپنے افلاک میں تیز چلنا۔	۹۰۲
خلد سے حضرت عیسیٰ کے زندہ نہ ہونے پر دلیل	״
انسان کے عجلت سے پیدا ہونے سے مراد	״
متی ھٰذا الوعد میں سوال نشان ہلاکت سے ہے	۹۰۳
نار سے مراد۔	״
غلبہ اسلام کا نشان	۹۰۴
عصمت انبیاء۔	۹۰۵
ابراہیم کے بڑے بُت کو نہ توڑنے کی وجہ۔	״
حضرت ابراہیم نے بتوں کا توڑنا بڑے بت کی	۹۰۶
طرف منسوب نہیں کیا۔ نہ جھوٹ بولا۔	״
حضرت ابراہیم کا آگ سے بچایا جانا۔	۹۰۷
بکریوں کے کھیتی چر جانے کے واقعہ کی اہمیت	۹۰۸
کی وجہ۔	״
اسلام کس قسم کی بادشاہت چاہتا ہے۔	״
فہم معاملات میں غیر نبی کی فضیلت۔	۹۰۹
پہاڑوں کی تسبیح۔	״
حضرت داؤد کے لیے پہاڑوں اور پرندوں کا مسخر	״
کیا جانا۔	״
پرندوں کا جنگوں سے تعلق۔	״
پہاڑوں کی تسخیر اور تسبیح سے مراد۔	״
جبال سے مراد اہل جبال۔	״
حضرت داؤد کا زرہ بنانا۔	۹۱۰
حضرت سلیمان کے لیے ہوا کی تسخیر۔	״
شیاطین سے مراد۔	״
شیاطین غوطہ زن اور معمار انسان تھے۔	״
حضرت ایوب کی تکلیف	۹۱۱
حضرت ایوب کو ان کے اہل اور اس کی مثل دیا	״
جانے سے مراد	״
ذو الکفل حزقیل ہیں۔	״

خلاصہ مضامین	صفحہ
دوسرے صابر انبیاء۔	۹۱۱
حضرت یونس کی قوم پر ناراضگی اور بلا اذن ہجرت	۹۱۲
دعائے یونس	״
مریم میں نفخ روح سے مراد	״
سب انبیا اور راست باز ایک جماعت ہیں۔	״
مومنوں کو خوشخبری۔	۹۱۳
مُردے اس دنیا میں واپس نہیں آسکتے۔	״
خروج یاجوج ماجوج اور مسلمان۔	״
یاجوج ماجوج کا ساری روئے زمین پر تصرف	۹۱۴
اور ان کی ہلاکت۔	״
کون سے معبود جہنم میں جائیں گے۔	״
آسمان کو لپیٹ لینے سے مراد۔	۹۱۵
راست باز زمین کے وارث ہونگے۔	۹۱۶
آنحضرتؐ کی اپنی امت کے لیے پیشگوئی۔	״
آنحضرتؐ کے سرخ اور سفید خزانوں سے مراد	״
رحمۃ للعالمین	״
دشمنوں کے لیے رحمت	״
غیر مسلموں کے لیے رحمت۔	״

سُورَۃُ الحجّ [۲۲] ۔ از ۹۱۷ تا ۹۳۷

خلاصہ مضامین	صفحہ
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول۔	۹۱۷
زلزلۃ السّاعۃ	۹۱۸
پیدائش جسمانی کے مختلف مراتب۔	۹۱۹
علی وجھہ	۹۲۱
حق کو حق کی خاطر قبول کرنا چاہیئے۔	״
حق کی نصرت کو کوئی نہیں روک سکتا۔	״
اختلاف عقاید مٹ نہیں سکتا۔	۹۲۲
سجدۂ تسخیری اور سجدۂ اختیاری	״
عذاب کی غرض	۹۲۳
عذاب کی نوعیت	״
قول طیب اور صراط حمید۔	״
اعدلئے حق۔	۹۲۴
مکانات مکہ کی بیع اور کرایہ	״
تطہیر خانہ کعبہ۔	״
ارکان حج کی ابتدا۔	״
فرضیت حج۔	۹۲۵
حج کے منافع	״
اعمال حج کی اصلی غرض	״
قربانی کا گوشت	״

خلاصہ مضامین	صفحہ
خانہ کعبہ کو بیت عتیق کہنے کی وجہ۔	۹۲۵
ظاہری صفائی کی تاکید۔	״
طواف افاضہ۔ طواف صدر۔	״
وثن اور صنم میں فرق۔	۹۲۶
شرک میں ذلت۔	״
افعال حج کا مقصد۔	״
حج کل عبادتوں کا منتہا ہے۔	״
قربانی کا اصل مقصود۔	۹۲۷
قانع اور معتر میں فرق۔	۹۲۸
غرض قربانی تقویٰ کا پیدا کرنا ہے۔	״
قربانی اور جنگ	״
اسلامی جنگوں کی غرض	۹۲۹
قصہ غرانیق اور اس کی بے بنیادی۔	۹۳۱
نبی کی وحی میں شیطان القا نہیں کرتا۔	۹۳۲
شیطان کا القا شیاطین کی طرف ہی ہوتا ہے	״
سماء کا زمین پر گرنا۔	۹۳۴
حقانیت توحید پر دلیل۔	۹۳۵
شرک پر کوئی دلیل نہیں۔	״
معبودان باطل کی انتہا درجہ کی کمزوری۔	۹۳۶
مسلمانوں کو اعلائے کلمۃ اللہ پر پورا زور لگانے	۹۳۷
کی نصیحت۔	״

سُورَۃُ المؤمنون [۲۳] ۔ از ۹۳۷ تا ۹۵۳

خلاصہ مضامین	صفحہ
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول۔	۹۳۷
ترقی کی بنیاد اخلاق پر ہے۔	۹۳۸
صحابیوں کی زندگیوں کا نقشہ قرآن کریم میں۔	״
نماز میں خشوع کیا ہے	״
صلوۃ اخلاق فاضلہ کی جڑ ہے۔	״
ان اقوال و افعال سے اجتناب جن میں نسل انسانی کی	״
بہتری مدنظر نہیں ترقی کا دوسرا بنیادی پتھر ہے۔	״
زکوٰۃ بمعنی تزکیہ۔	״
انسانی ترقی کا تیسرا مرتبہ نفس انسانی کا خیرات و برکات سے ترقی دینا ہے	۹۳۹
حفظ فروج سے مراد	״
انسانی ترقی کا چوتھا مرتبہ قوائے شہوانی پر حکومت ہے	״
ترقی کا پانچواں مرتبہ پابندی عہد ہے۔	״
حفاظت نماز ترقی کا آخری مرتبہ ہے۔	״
انسان مٹی سے کس طرح بنتا ہے	۹۴۰
سات رستے اور نظام شمسی۔	״
زیتون کا درخت۔	۹۴۱

خلاصہ مضامین	صفحہ
دوسروں کی مصیبت پر خوش نہ ہونا چاہیئے۔	۹۴۲
تناسخ	۹۴۳
حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ کا نشان ہونا۔	۹۴۴
حضرت عیسیٰ کو پناہ کہاں ملی۔	۹۴۵
حضرت عیسیٰ کا کشمیر آنا۔	″
یوز آسف نبی کی قبر حضرت عیسیٰ کی قبر ہے۔	″
افغانوں اور کشمیریوں کا بنی اسرائیل سے ہونا۔	″
حضرت عیسیٰ کا ایک سو بیس برس عمر پانا۔	″
مذاہب مختلفہ کا باہمی عناد اور کل دنیا کی طرف	″
ایک رسول کا آنا۔	″
دنیا کا مال اور جتھہ کامیابی نہیں۔	۹۴۶
اہل مکہ پر عذاب قحط۔	۹۴۷
عذاب کی غرض۔	۹۴۹
دلیل توحید	۹۵۰
شرک کے خلاف ایک دلیل۔	″
مخالفین کا استیصال آپ کی زندگی میں۔	″
بدی کے مقابل پر نیکی کی تعلیم احسن پیرایہ میں۔	″
آنحضرتؐ کا وساوس شیطانی سے محفوظ ہونا۔	۹۵۱
حضرت عیسیٰ اور وسوسہ شیطانی۔	″
جمع کے خطاب سے تکرار فعل بھی ہوتا ہے۔	″
عالم برزخ۔	″
روحوں کا اس عالم میں آنا۔	۹۵۲
نسب آخرت میں فائدہ نہ دے گی۔	″
سورۃ النور ۲۴ - از ۹۵۴ تا ۹۸۱	
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ تاریخ نزول۔	۹۵۴
سورۂ نور کے احکام پر خاص زور دینے کی وجہ۔	″
سزا میں کس قسم کا کوڑا استعمال ہو۔	۹۵۵
جلد میں سونٹی یا جوتی سے مارنا بھی جائز ہے حد	″
قائم کرنے میں ننگا کرنا نہیں چاہیئے۔	″
حد قائم کرنے میں سختی سے نہ مارا جائے۔	″
اسلامی سزائے جلد اور آج کل کا کوڑا۔	″
کیا رجم اسلام میں سزائے زنا ہے۔	″
آیت رجم کے متعلق حضرت عمرؓ کا قول۔	″
آیت رجم کی تلاوت کی منسوخی اور بقائے حکم	۹۵۶
کا خیال۔	″
حضرت علی آیت رجم کے قائل نہ تھے۔	″
کیا رجم سنت رسول اللہ ہے۔	″
سنت قرآن کی تفصیل کر سکتی ہے اسے منسوخ	″

خلاصہ مضامین	صفحہ
نہیں کر سکتی۔	۹۵۶
احادیث اور سزائے رجم۔	″
اجماع سے قرآن منسوخ نہیں ہو سکتا۔	″
رجم پر اجماع امت نہیں۔	″
لونڈیوں کو سزائے زنا نصف دینے سے استدلال	″
کہ رجم سزائے زنا نہیں ہو سکتا۔	″
زانی یا زانیہ کے پاکدامنوں سے نکاح کی ممانعت۔	۹۵۷
ایک فریق کے زنا پر طلاق ہو جانی چاہیئے۔	″
زانی اور زانیہ کا نکاح	″
کسبیوں سے نکاح جائز نہیں۔	″
آیت کا صحیح مفہوم۔	″
علانیہ زنا کرنیوالوں کا برادری سے اخراج۔	″
زنا کی تہمت۔	۹۵۸
لعان	″
واقعہ افک حضرت عائشہؓ	۹۵۹
تشہیر بہتان میں کون لوگ شامل تھے۔	″
مسطح۔	۹۶۱
آنحضرتؐ اور ابوبکرؓ کی بےنظیر وسعت قلبی۔	″
تہمت سے بچنے کا علاج۔	۹۶۲
دوسرے کے گھر جانے کے آداب	۹۶۳
زنا سے بچنے کا طریق۔	″
غض بصر	۹۶۴
عورتوں کے باہر نکلنے کی ضرورت	″
مردوں کے لیے غض بصر کا حکم بتاتا ہے کہ وہ	″
عورتوں کو دیکھ سکتے ہیں۔	″
ماظہر منہا سے مراد۔	″
ضروریات انسانی کا اقتضا۔	″
اقوال مفسرین کہ عورتوں کے باہر نکلنے میں منہ اور ہاتھ کھلے رہ سکتے ہیں	″
حدیث نبوی کہ منہ اور ہاتھ کھلے رہ سکتے ہیں۔	۹۶۵
عورت کا غیر مرد کو دیکھنا۔	″
عورت کا منہ کھلا رکھنا جائز ہے مگر مرد کا اسے	″
دیکھنا جائز نہیں۔	″
عرب کی عورتوں کا اظہار محاسن کرنا اور اسلام	۹۶۶
کا اس سے روکنا۔	″
واقعات زمانۂ نبوی اور زمانہ صحابہ۔	″
من وراء حجاب کا حکم مردوں کو گھروں میں	″
آنے سے روکتا ہے نہ عورتوں کو باہر نکلنے سے۔	″
کن مردوں کے سامنے عورت اظہار محاسن	۹۶۷
کر سکتی ہے۔	″

خلاصہ مضامین	صفحہ
پردہ میں افراط تفریط	۹۶۷
مجردوں کے نکاح کا حکم۔	″
غلاموں کی آزادی میں اسلام سے آگے کسی قوم	۹۶۸
نے قدم نہیں رکھا۔	″
لونڈیوں کو زنا پر مجبور کرنا۔	″
نور اسماء الٰہی سے ہے۔	۹۶۹
اللہ تعالیٰ کے نور ہونے سے مراد۔	″
دودھ دینے والے جانوروں کے ذبح کی ممانعت	۹۷۰
رسول اللہ صلعم کے قلب صافی اور نور فطری کا	″
نقشہ	″
آپ جامع شرق و غرب ہیں۔	″
عرب کا محل وقوع۔	″
نور فطری پر نور وحی کا اضافہ	″
نور نبی مصطفیٰ دائمی اور کل عالم پر محیط ہے۔	″
صحابہ کی شہرت کی پیشگوئی۔	″
نور اسلام کے مقابل پر ظلمت کفر۔	۹۷۲
رسول بشر کی اطاعت اور اہل قرآن پر اتمام	۹۷۴
حجت۔	″
وعدۂ استخلاف اور حکومت اسلامی۔	۹۷۵
وعدۂ استخلاف سے مراد خلافت آنحضرت	″
صلعم ہے۔	″
دوام خلافت	″
نبوت کی خلافت برنگ ولایت۔	″
خلافت راشدہ۔	۹۷۶
خلافت تیس سال ہے۔	″
خلافت برنگ بادشاہت اور اعدائے اسلام	″
کی کوشش۔	″
خلافت کی کمزوری مسلمانوں کی ایمانی کمزوری کا	″
نتیجہ ہے۔	″
خلافت صرف قریش کے لیے نہیں۔	″
خلافت روحانی اور بعثت مجددین۔	″
مسلمانوں کی بیماریوں کی جڑ۔	″
تمکین دین۔	″
خلافت شیخین اور اہل تشیع پر اتمام حجت۔	″
عرب سے شرک کے مٹ جانے کی پیشگوئی۔	″
نعمائے الٰہی کی ناشکری کا نتیجہ۔	″
مصائب کا علاج۔	۹۷۷
ضرورت خلوت	″
لغویات۔ فسق و فجور کا علاج۔	″

خلاصہ مضامین	صفحہ
عمر رسیدہ عورتوں کے لیے پردہ ضروری نہیں۔	۹۷۸
لیلۃ المعراج کی وجہ تسمیہ۔	۹۷۹
معذور لوگوں کے ساتھ مل کر کھانا کھانا۔	〃
قریبی عزیزوں سے بے تکلفی اور ان کے ہاں کھانا	〃
کھانا۔	〃
تہذیب کی بیماریوں کا علاج قرآن کریم میں۔	〃
مل کر کھانا کھانا۔	〃
قومی معاملات کو ذاتی معاملات پر ترجیح ہے۔	۹۸۰
رسول اللہ صلعم کی دعوت اور اس کی طرف سے	〃
مسلمانوں کی غفلت۔	۹۸۱

سورۃ الفرقان[25]۔ از ۹۸۱ تا ۹۹۵

خلاصہ مضامین	صفحہ
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول۔	۹۸۱
فرقان نام میں اشارہ۔	۹۸۲
تمام قوموں اور نسلوں کے لیے نذیر۔	〃
تقدیر اشیاء سے مراد۔	〃
انقلاب روحانی چند کہانیوں سے پیدا	۹۸۳
نہیں ہوسکتا۔	〃
رسول اللہ صلعم خود لکھ پڑھ نہ سکتے تھے۔	〃
بائیبل کے مضامین قرآن میں۔	〃
دنیا میں باغوں اور محلات کے وعدے اور ان	۹۸۴
کا پورا کرنا۔	〃
وعدۂ مسئول سے مراد۔	۹۸۵
فرشتوں کے آنے کا مطالبہ	۹۸۶
یوم فرقان کی پیشگوئی۔	〃
قرآن کریم کا تدریجاً نزول اور اس کی ترتیب	۹۸۷
قرآن میں اعتراضوں کا جواب۔	۹۸۸
اصحاب الرس۔	〃
عرب کی بت پرستی۔	۹۸۹
اتباع حرص وہوا کا شرک	〃
عرب کی اسلام سے پہلے حالت اور آنحضرتؐ کا	〃
اس میں انقلاب پیدا کرنا۔	〃
آفتاب نبوت کا طلوع اور تاریکی کا دور ہونا۔	۹۹۰
جہاد کبیر کیا ہے۔	۹۹۱
میٹھے اور کھاری دریا۔	〃
آنحضرتؐ شمس وقمر ہیں۔	۹۹۳
آنحضرتؐ کا پیدا کردہ انقلاب۔	〃
متکبرانہ روش کی جگہ انکسار۔ جہالت کی جگہ سلامت روی	〃
شراب خوری اور عیاشی کی جگہ محبت الہٰی۔	〃
معاصی میں خرچ کرنے سے بچایا۔ طاعت میں خرچ	۹۹۴
کرنا سکھایا۔	〃
شرک۔ قتل۔ زنا کی جگہ توحید۔ حرص وہوا سے خلاصی	〃
غض بصر کا پیدا کرنا۔	〃
بدلیوں کا نیکیوں میں بدلنا۔	〃
سیئات اور حسنات سے مراد بدی اور نیکی	〃
کا ملکہ ہے۔	〃
جھوٹ کی جگہ سچ اور لغو کی جگہ مفید کام میں لگانا	۹۹۵
اتقاء کا کامل مرتبہ۔	〃
مکذبوں کے لیے فرقان۔	〃

سورۃ الشعراء[26]۔ از ۹۹۶ تا ۱۰۱۳

خلاصہ مضامین	صفحہ
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول	۹۹۶
مخالفین کی ہلاکت کی خبر سے آنحضرت صلعم	۹۹۷
کا غم۔	〃
ہر چیز کے ازواج پیدا کرنے میں نشان۔	〃
مخالفین کے مغلوب کیا جانے کے بعد رحم	〃
کی خوشخبری۔	〃
فرعون کا بنی اسرائیل کو تباہ کر دینے کا آخری فیصلہ	۱۰۰۱
اضرب بعصاک البحر کے معنی۔	〃
بارہ رستوں کا خیال بے بنیاد ہے۔	〃
نبوئین کا واقعہ عبور قلزم	۱۰۰۲
خطا منافی عصمت نہیں۔	۱۰۰۳
ابلیس کے لشکر۔	〃
ثمود کے لیے یادگاریں بنانا۔	۱۰۰۵
خلق کا اطلاق قرآن پر منع ہے۔	۱۰۰۶
کلام الہٰی الفاظ میں نازل ہوا۔	۱۰۰۹
پہلے صحیفوں میں آنحضرتؐ کے متعلق پیشگوئیاں	۱۰۱۰
عربی میں قرآن کا نزول۔	〃
مجرم عذاب دیکھ کر ایمان لاتے ہیں۔	〃
آنحضرت صلعم پر دو بڑے اعتراض	۱۰۱۱
نبوت اور کہانت میں مابہ الامتیاز	〃
شیاطین فرشتوں کا کلام نہیں سن سکتے۔	〃
آنحضرتؐ کا اپنے اقربا کو ڈرانا۔	〃
اس سے آپ کی صداقت پر دلیل۔	〃
کامیابی کی بشارت۔	۱۰۱۲
تقلب فی الساجدین سے مراد	-
آنحضرتؐ کے والدین۔	〃
شیاطین کا تعلق۔	〃
القائے سمع سے مراد	۱۰۱۲
شاعر اور نبی میں مابہ الامتیاز	〃
مومن شاعر۔	۱۰۱۳

سورۃ النمل[27]۔ از ۱۰۱۴ تا ۱۰۳۲

خلاصہ مضمون	صفحہ
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول۔	۱۰۱۴
من فی النار سے مراد۔	۱۰۱۵
سلیمان کے داؤد کا وارث ہونے سے مراد۔	۱۰۱۶
حضرت سلیمان کا علم منطق الطیر۔	〃
حضرت سلیمان کا افواج کو زیادتی سے روکنا۔	۱۰۱۸
حضرت سلیمان کے لشکر میں پرندوں کا کام۔	〃
جنوں کے لشکر کا کام۔	〃
واد النمل سے مراد۔	〃
حضرت سلیمان اور چیونٹی	〃
نمل کے گھروں میں داخل ہونے سے مراد	۱۰۱۹
حضرت سلیمان کا سفر یمن۔	〃
رعب سلیمانی اور رعب محمدی۔	〃
نمل کی اطاعت پر شکرگذاری۔	〃
حضرت سلیمان اور ہدہد۔	〃
ہدہد انسان کا نام ہے۔	۱۰۲۰
ہدہد کا وعظ ـــــ خطوط میں القاب	۱۰۲۱
ہدیہ از طرف ملکہ	۱۰۲۲
ملکہ کا تخت حضرت سلیمان کے پاس کس طرح آیا	〃
علم اور قوت جسمانی کا مقابلہ	۱۰۲۳
تخت بلقیس میں آپ نے کیا تبدیلی کی اور اس	〃
کی غرض کیا تھی۔	〃
بلقیس کو اس کی ناپسندیدگی کا علم ہو جانا۔	۱۰۲۴
کشف عن الساق کے معنی۔	〃
بلقیس کی پنڈلیوں پر بالوں کا قصہ۔	〃
حضرت سلیمان کے محل میں شیشوں کے نیچے پانی	۱۰۲۵
بہانے کی غرض۔	〃
تصویر کے ذریعہ تعلیم دینا۔	〃
آنحضرتؐ کے نو بڑے دشمن اور آپ کے	۱۰۲۶
خلاف منصوبہ	〃
اصحاب رسول کا اصطفاء	۱۰۲۷
اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر تین دلائل۔ خلق۔ اجرائے	〃
قوانین۔ انسان سے تعلق۔	〃
داؤد اور سلیمان کے ذکر سے غرض۔	〃
قرآن یہود و نصاریٰ میں فیصلہ کرتا ہے۔	۱۰۲۹

خلاصہ مضامین	صفحہ
پیغمبر کا مردوں کو سنانا۔	۱۰۳۰
دابۃ الارض کا خروج	"
أئمۃ الکفر کی سزا۔	۱۰۳۱
مسئلہ رجعت	"
مخالفت کے پہاڑوں کا دور کرنا۔	۱۰۳۲
مکہ کی حرمت من جانب اللہ ہے۔	"
سورۃ القصص[۲۸]۔ از ۱۰۳۳ تا ۱۰۵۱	
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول۔	۱۰۳۳
فرعون اور موسیٰ کی تاریخ کا آج تاریخ اسلام میں دہرایا جانا۔	"
فرعون کا بنی اسرائیل کو حقوق سے محروم کرنا اور ان سے ذلیل کام لینا۔	۱۰۳۴
کمزوروں کو طاقتور بنانے کا وعدہ الٰہی۔	"
ھامان۔	"
فرعون کا بنی اسرائیل سے خائف ہونا۔	"
اسلام کے غالب آنے کی ایک دلیل۔	"
غیر انبیا کو وحی یقینی کا ہونا۔	"
لام عاقبت۔	۱۰۳۵
فہم و علم کا قبل نبوت ملنا۔	۱۰۳۶
حضرت موسیٰ پر قبطی کے مرجانے سے کوئی اعتراض نہیں وارد ہوتا	"
قرآن کی اصلاح بائیبل کا ایک اور واقعہ۔	"
نفس پر ظلم سے مراد۔	"
جرم میں اعانت۔	۱۰۳۷
انبیا کا فطرتاً کمزوروں کا حامی ہونا۔	۱۰۳۸
عورت کی چال میں حیا۔	"
کام کی اجرت	"
لڑکی کے نکاح میں دینے کا عوض لینا جائز نہیں۔	۱۰۳۹
مدین میں حضرت موسیٰ کے آٹھ اور دس سال کے واقعہ میں آنحضرت صلعم کی اقامت مدینہ کی پیشگوئی۔	"
بائیبل کی ایک اور اصلاح۔	"
ضم الجناح سے مراد	۱۰۴۰
آنحضرت صلعم اور حضرت موسیٰ کی مماثلت اور ایک دوسرے کی تائید۔	۱۰۴۲
بنی اسمٰعیل میں کوئی نبی نہیں آیا۔	۱۰۴۳
مماثلت موسیٰ پر فرعون کی ہلاکت جیسے نشان کا مطالبہ۔	"
مختلف وحیوں کا باہم تعلق وحی الٰہی کی صداقت پر دلیل ہے۔	۱۰۴۴
دوسرے مذاہب کے لوگ اسلام میں داخل ہوتے رہیں گے۔	"
عذاب ہلاکت اور اہل عرب	۱۰۴۶
شرکاء سے مراد گمراہ کرنے والے لوگ ہیں۔	"
قارون	۱۰۴۸
کیمیا۔	۱۰۴۹
معاد سے مراد مکہ ہے۔	۱۰۵۰
عین ہجرت میں آنحضرت صلعم کو مکہ واپس لانے کی پیشگوئی۔	"
انبیا کو قبل بعثت اپنے نبی بنایا جانے کا علم نہیں ہوتا۔	۱۰۵۱
کل شئ ھالك سے مراد	"
سورۃ العنکبوت[۲۹]۔ از ۱۰۵۲ تا ۱۰۶۴	
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول۔	۱۰۵۲
جہاد نفس۔	۱۰۵۳
اللہ کی معصیت میں مخلوق کی طاعت نہیں	"
حضرت نوح کی عمر	۱۰۵۴
مذہب کا غلط استعمال۔	۱۰۵۶
حضرت ابراہیم کی ہجرت	"
عقاید باطلہ کی کمزوری کی مثال۔	۱۰۵۸
نماز کے بدی سے روکنے پر عقلی دلیل۔	۱۰۵۹
اس پر واقعات کی شہادت۔	"
اللہ کے ذکر سے شرف اور بزرگی کا ملنا۔	۱۰۶۰
طریق مجادلہ۔	"
رسول اللہ صلعم کے امی ہونے سے قرآن کی حقانیت پر ایک دلیل۔	۱۰۶۱
بعد نبوت آنحضرت صلعم لکھنا پڑھنا جانتے تھے یا نہیں۔	"
قرآن میں ان باتوں کا وجود جو کتب سابقہ میں نہیں۔	"
قرآن خود کس طرح نشان ہے۔	۱۰۶۲
عذاب دنیا۔	"
سورۃ الروم[۳۰]۔ از ۱۰۶۵ تا ۱۰۷۵	
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول۔	۱۰۶۵
المروم	۱۰۶۵
فارس کا روم پر غالب آنا۔	"
ادنی الارض	۱۰۶۶
دو عظیم الشان پیشگوئیاں رومیوں کا ایران پر اور مسلمانوں کا کفار پر ایک ہی وقت میں غالب آنا	"
حضرت ابوبکر اور اُبیّ بن خلف کی شرط۔	"
دنیا کا عظیم ترین معجزہ۔	۱۰۶۷
نظام عالم کا خاتمہ	"
روضٰت الجنات میں علوم و اخلاق حسنہ کی طرف اشارہ۔	"
پانچ نمازوں کا ذکر اور ان کے اوقات میں اشارہ	۱۰۶۸
مردہ سے زندہ نکالنے سے مراد۔	"
سب انسانوں کا مٹی سے پیدا ہونا۔	۱۰۶۹
سب کے لیے ان کے نفسوں سے بیبیاں ہونا۔	"
زبانوں اور رنگوں کا اختلاف	"
فطرت کو اپیل	۱۰۷۰
فطرت کا مذہب اسلام ہے۔	"
فطرت بدل نہیں سکتی۔	"
اہل مذاہب کا توحید کے ساتھ شرک ملا کر دین میں تفرقہ پیدا کرنا۔	۱۰۷۱
ایک کے مال میں دوسروں کا حق۔	۱۰۷۲
اصل مال پر زیادہ دیا یا لینا۔	"
آنحضرتؐ کی بعثت سے قبل کل عالم میں فساد کا پیدا ہونا۔	۱۰۷۳
کفر پر اصرار	۱۰۷۴
سماع موتیٰ۔	"
سورۃ لقمٰن[۳۱]۔ از ۱۰۷۶ تا ۱۰۸۱	
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق	۱۰۷۶
لھو الحدیث سے مراد	"
گانا بجانا۔	۱۰۷۷
لقمان۔	"
چلنے میں میانہ روی۔	۱۰۷۹
نبوت کی نعمت عامہ	"
نعمائے ظاہری و باطنی۔	"
نعمۃ سے مراد۔	۱۰۸۱
پانچ باتوں کا علم کسی کو نہیں۔	"

خلاصہ مضامین	صفحہ
سورۃ السجدۃ ۳۲ - از ۱۰۸۲ تا ۱۰۸۷	
نام۔خلاصہ مضمون۔تعلق اور زمانہ نزول۔	۱۰۸۲
بنی اسمٰعیل میں نذیر نہیں آیا۔	"
زید بن عمرو قیس بن ساعدہ۔	"
خالد بن سنان۔	"
امر اسلام کا استحکام اور ایک ہزار سال کے لیے	۱۰۸۳
اس میں روک کا واقع ہونا۔	"
ہر انسان میں روح اللہ کا نفخ ہونا۔	۱۰۸۴
جہنم کو بھرنے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قول۔	"
انعمائے جنت کی اصل حقیقت۔	۱۰۸۵
عذاب دنیا اور عذاب آخرت۔	۱۰۸۶
سورۃ الاحزاب ۳۳ - از ۱۰۸۷ تا ۱۱۱۴	
نام۔خلاصہ مضمون۔تعلق۔زمانہ نزول	۱۰۸۷
تقویٰ اور اطاعت کفار نہ کرنے کا حکم	۱۰۸۸
دو دل نہ ہونے سے مراد۔	"
رسم ظہار	۱۰۸۹
متبنٰی بنانے کا رواج	"
مومنوں سے آنحضرتؐ کے جسمانی رشتہ کی نفی۔	"
خطا و عمد۔	"
آنحضرتؐ کا تعلق مومنوں سے۔	"
آپؐ کی شفقت۔	۱۰۹۰
مومنوں کی آپؐ سے محبت	"
آنحضرتؐ کی ازواج مومنوں کی مائیں ہیں۔	"
آنحضرتؐ مومنوں کے باپ ہیں۔	"
آنحضرتؐ کی ازواج مومنوں کی روحانی پرورش	"
کرتی ہیں۔	"
نبیوں کا عہد	"
آنحضرتؐ کن معنوں میں اول النبیین ہیں۔	"
جنگ احزاب۔	۱۰۹۱
آنحضرت صلعم کا معجزہ۔	"
زاغت الابصار۔	"
بلغت القلوب الحناجر سے مراد۔	"
آنحضرتؐ کی مدینہ تشریف آوری پر سب قوموں کا	۱۰۹۲
عہد مشترک۔	"
آنحضرت صلعم کل نوع انسان کے لیے اور جملہ	۱۰۹۴
حالات انسانی میں کامل نمونہ ہیں۔	"
ایک بین النبوت معجزہ۔	"
صحابہ کی وفاداری کا کمال۔	۱۰۹۵

خلاصہ مضامین	صفحہ
قبائل یہود اور مسلمان۔	۱۰۹۶
بنو قریظہ کی غداری۔	"
ان کے حق میں سعد کا فیصلہ مطابق توریت تھا۔	"
عرب سے باہر کی زمینوں کی فتح کی پیشگوئی۔	"
ازواج مطہرات بھی امت کے لیے نمونہ ہیں۔	۱۰۹۷
بیبیوں کے مطالبات خاوندوں پر۔	"
واقعہ تخییر۔	"
عورتوں کا اجنبی مردوں سے کلام کرنا جائز ہے۔	۱۰۹۸
ازواج مطہرات کے گھر میں ٹھیرنے کا حکم۔	"
صدیقہ اور واقعہ جمل۔	"
اھل البیت	"
اہل بیت نبوی سے مراد اولاً ازواج مطہرات ہیں۔	"
ازواج مطہرات کا رجس سے پاک کیا جانا۔	۱۰۹۹
ازواج نبیؐ کا کام کہ نبیؐ کے اقوال و افعال کو محفوظ	۱۱۰۰
رکھیں۔	"
مسلمان عورتیں مقامات عالیہ کے حاصل کرنے	"
میں مردوں کی ہم پایہ ہیں۔	"
نکاح میں قومی تفرقات کا مٹانا۔	"
زید کا تعلق آنحضرت صلعم سے۔	۱۱۰۱
زینب کو طلاق دینے میں قصور زید کا تھا۔	"
آنحضرتؐ کے زینب سے نکاح کی وجوہات	۱۱۰۲
آنحضرتؐ کے زینب سے نکاح کے متعلق جھوٹے	"
قصے۔	"
خاتم النبیین	۱۱۰۳
خاتم النبیین کی تفسیر احادیث نبوی سے۔	"
لو عاش ابراھیم لکان نبیاً پر بحث۔	"
حضرت عائشہ کا قول قولوا خاتم النبیین۔	"
ختم نبوت اور نزول عیسیٰ۔	۱۱۰۴
آنحضرتؐ کی ابوت روحانی کا سلسلہ تا قیامت	"
غیر منقطع ہے۔	"
علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔	"
اللہ اور ملائکہ کی صلوٰۃ مسلمانوں پر۔	"
آنحضرتؐ کا شاہد ہونا۔	۱۱۰۵
آنحضرت بمنزلہ آفتاب ہیں۔	"
انوار نبوت کا انعکاس یا ظلی نبوت۔	"
طلاق پر متاع کا دینا۔	"
قبل مساس طلاق میں عدت نہیں۔	۱۱۰۶
آنحضرت صلعم کو چار ازواج کی حد بندی سے	"
مستثنےٰ کرنا اور اس کی وجہ	"

خلاصہ مضمون	صفحہ
دشمن یا غیر قوم کی بیبیوں سے نکاح اور اسکی غرض	۱۱۰۶
بیکس بیبیوں کی خبرگیری بھی اغراض نکاح میں	۱۱۰۷
سے ایک تھی۔	"
ازواج مطہرات کی زوجیت آنحضرتؐ میں آنے	"
کی تاریخیں۔	"
آنحضرتؐ کی ازواج کی کثرت پر اعتراض اور اس	"
کا جواب۔	"
آپ کی قوائے شہوانی پر حکمرانی۔	۱۱۰۸
تجرد۔ایک بی بی اور تعدد ازدواج کے نمونے۔	"
واقعہ ایلاء اور نبی صلعم کو طلاق کا اختیار دیا جانا	"
آنحضرتؐ کا اور نکاحوں سے روکا جانا۔	"
وقت کی قدر اور فضول باتوں سے روک۔	۱۱۰۹
نبی صلعم کے اشغال کثیرہ۔	"
امہات المومنین کے لیے حجاب کا حکم۔	"
آنحضرت کے متعلق غلط روایات کی تشہیر ایذا ہے	۱۱۱۰
ازواج مطہرات سے نکاح کی ممانعت۔	"
ماریہ قبطیہ ازواج میں داخل ہیں۔	"
آنحضرت صلعم پر درود۔	"
پردہ کا پہلا حکم اور اس کی غرض۔	۱۱۱۱
حضرت موسیٰ کی بریت کے ذکر میں آنحضرتؐ کے	۱۱۱۳
متعلق ان ناپاک قصوں کی تردید جو زینب کے	"
نکاح کے متعلق مشہور کیے گئے ہیں۔	"
حمل امانت سے مراد۔	"
سورۃ السبا ۳۴ - از ۱۱۱۴ تا ۱۱۲۵	
نام۔خلاصہ مضمون۔تعلق۔زمانہ نزول۔	۱۱۱۴
بنی اسرائیل کی شوکت۔	۱۱۱۶
عین القطر سے مراد	۱۱۱۷
حضرت سلیمان کے لیے تسخیر ہوا۔	"
حضرت سلیمان کے مجسمے	"
حضرت سلیمان کے عصا کو دیمک کے کھانے کا	۱۱۱۸
قصہ۔	"
سلیمان کی سلطنت کا ان کے بیٹے کے ہاتھ سے	"
تباہ ہونا۔	"
مارب کے بند کا ٹوٹنا۔	"
یمن اور شام کے مابین تجارت۔	۱۱۱۹
شیطان کا تسلط کسی انسان پر نہیں۔	۱۱۲۰
جنگ کی پیشگوئی۔	۱۱۲۱
آنحضرتؐ کی رسالت عامہ اور ختم نبوت۔	"

خلاصہ مضامین	صفحہ
ملائکہ اور مسیح کے پرستار شیاطین کے پرستار ہیں۔	۱۱۲۴

سورۃ فاطر ۳۵ ۔ از ۱۱۲۵ تا ۱۱۳۴

خلاصہ مضامین	صفحہ
نام خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول۔	۱۱۲۵
فرشتوں کی دو طرح کی رسالت۔	۱۱۲۶
فرشتوں کے بازو۔	〃
عرب کی اخلاقی موت اور نبی کریم صلعم کا ورود۔	۱۱۲۷
روحانی قیامت	〃
تعلق باللہ سے حصول عزت۔	۱۱۲۸
اقرار صداقت اور عمل۔	〃
نیکی اور بدی کا مقابلہ	۱۱۲۹
قبروں والوں سے مراد کفر پر مُصر لوگ ہیں۔	۱۱۳۰
تمام قوموں میں رسولوں کا آنا۔	〃
اسلام میں نظام مذہب۔	〃
اختلافات قدرت میں تردید تناسخ اور ہستی باری پر دلیل۔	۱۱۳۱
امت محمدیہ کی برگزیدگی اور اس کے تین گروہ۔	〃
دار المقامہ سے مراد	۱۱۳۲
زمین کی حرکت اور رستہ	۱۱۳۳
اجرام سماوی۔	〃
دابۃ سے مراد زمینی لوگ ہیں۔	۱۱۳۴

سورۃ یٰسٓ ۳۶ ۔ از ۱۱۳۴ تا ۱۱۴۷

خلاصہ مضامین	صفحہ
نام۔ قلب قرآن۔ خلاصہ مضمون تعلق اور زمانہ نزول	۱۱۳۴
اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کی قسم کھانا۔	۱۱۳۵
اقسام قرآن	〃
قرآن کی قسم سے مراد۔	〃
〃 دائمی اور زندہ معجزہ ہے۔	〃
〃 کا پُرحکمت ہونا آنحضرتؐ کی صداقت پر دلیل ہے۔	〃
قرآن کی قبولیت علم کے ساتھ ترقی کرتی ہے۔	〃
آنحضرتؐ کے کام کی مشکلات	۱۱۳۶
رسم و رواج کے طوق	〃
کفار کے آگے اور پیچھے سد سے مراد۔	۱۱۳۷
قرآن کریم کا احیائے موتی کا عظیم الشان معجزہ۔	〃
انطاکیہ اور حواری عیسےٰ	〃
لفظ رسول کا استعمال بطور مجاز	〃
اِصلاح عرب میں یہود اور نصاریٰ کی کوششوں کی ناکامی۔	۱۱۳۷
اعدائے حق کی ہلاکت کے لیے آسمان سے فرشتے نہیں اُترتے۔	۱۱۳۹
عرب کی مردہ زمین کے زندہ ہونے میں نشان۔	۱۱۴۰
سب چیزوں میں تعلق زوجیت۔	〃
آنحضرتؐ کے ظہور سے پہلے دنیا پر ظلمت کا چھا جانا۔	〃
مستقر آفتاب۔	۱۱۴۱
سیاروں کا اپنے دوائر میں گردش کرنا۔	〃
کشتیوں والی قوم۔	〃
متیٰ ھذا الوعد میں اشارہ عذاب دنیا کی طرف	۱۱۴۳
ہاتھ پاؤں کے کلام سے مراد۔	۱۱۴۴
قوموں کا عروج و زوال ایک قانون کے ماتحت ہے	۱۱۴۵
اسلام پر زوال نہیں آسکتا۔	〃
روح کی ترقیات غیر متناہی۔	〃
شعر اور نصیحت	〃
آنحضرت صلعم اور شاعری۔	〃
مسلمانوں میں شعر کا مرض۔	〃
احیائے موتیٰ کا انکار برنگ استبعاد۔	۱۱۴۷
دوسری خلق	〃
سبز درخت سے آگ۔	〃

سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷ ۔ از ۱۱۴۸ تا ۱۱۶۴

خلاصہ مضامین	صفحہ
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق و زمانہ نزول۔	۱۱۴۸
توحید الٰہی پر راستباز وں اور مومنین کی شہادت	〃
مشرقی ممالک اور روحانیت۔	۱۱۴۹
اسلام پہلے کیوں مشرق میں پھیلا۔	〃
کاہنوں کا دعویٰ علم غیب اور ان پر ملامت۔	〃
خطف شیطان سے مراد	۱۱۵۰
اہل حق کے مقابل پر باطل نہیں رہ سکتا۔	〃
کفر کی مغلوبیت کی پیشگوئی۔	〃
معبودوں سے مراد سردار	۱۱۵۱
نعمائے بہشتی میں پینے کی چیزیں۔	۱۱۵۲
بیضۃ الاسلام سے مراد۔	۱۱۵۳
بہشت میں عورتیں ہونگی۔	〃
حور نعمائے جنت میں سے ایک نعمت ہے۔	〃
حضرت ابراہیم کی طرف جھوٹ منسوب کرنا غلط ہے	۱۱۵۶
ابراہیم کو آگ میں ڈالنا خفیہ تدبیر تھی۔	۱۱۵۷
حضرت ابراہیم کو بیٹا قربان کرنے کا حکم۔	〃
ذبیح اسمٰعیل تھے نہ اسحاق۔	۱۱۵۷
حضرت اسمٰعیل کے حکم ذبح کا مفہوم۔	۱۱۵۸
انسان کی قربانی کا منسوخ ہونا۔	〃
حضرت موسیٰ اور ہارون دونوں کو ایک کتاب کا ملنا۔	۱۱۵۹
الیاسین۔ حضرت الیاس۔	〃
ذکر انبیاء میں ترتیب۔	〃
حضرت یونس کا بھاگنا۔	۱۱۶۰
یونس کے متعلق بائیبل اور قرآن میں اختلاف	〃
کیا حضرت یونس مچھلی کے پیٹ میں رہے۔	۱۱۶۱
حضرت یونس اور کدو کا درخت	۱۱۶۲
رسولوں کی نصرت اور مومنوں کا غلبہ۔	۱۱۶۴

سورۃ صٓ ۳۸ ۔ از ۱۱۶۵ تا ۱۱۷۹

خلاصہ مضامین	صفحہ
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق اور زمانہ نزول۔	۱۱۶۵
قرآن سے شرف انسانیت کا حاصل ہونا۔	〃
آنحضرتؐ کا عزم اور کفار کی مایوسی۔	۱۱۶۶
توحید کا سب مذاہب سے گم ہوجانا۔	〃
کفار کی جنگ اور انکے عظیم الشان لشکروں کی شکست کی پیشگوئی۔	۱۱۶۷
ذکر مکذبین انبیا میں ترتیب۔	〃
جبال اور طیر سے مراد انسان ہی ہیں۔	۱۱۶۸
حضرت داؤد اور اوریا کی جورو کا باطل قصہ۔	۱۱۶۹
حضرت سلیمان اور گھوڑوں کا واقعہ۔	۱۱۷۱
انبیاء اور مال دنیا۔	۱۱۷۲
حضرت سلیمان کا بیٹا۔	〃
انگشتری کا قصہ	〃
حضرت سلیمان کی دعا ھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی	〃
حدیث عفریت۔	۱۱۷۳
حضرت سلیمان کے لیے ہوا کا مسخر ہونا۔	〃
معمار اور غوطہ زن شیطان انسان ہی تھے۔	〃
حضرت ایوب۔	۱۱۷۴
حضرت ایوب کی تکالیف	〃
شیطان تکلیف دینے پر قادر نہیں۔	〃
ایوب کے ذکر میں آنحضرتؐ کا ذکر۔	۱۱۷۵
حضرت ایوب کے جھاڑو سے مارنے کا قصہ	〃
اتراب کیا ہیں۔	۱۱۷۶
حدیث رویت باری تعالیٰ۔	۱۱۷۸

خلاصہ مضامین	صفحہ
اختصام ملأ اعلیٰ	۱۱۶۸
خواب میں رویت باری تعالیٰ	″
ملأ اعلیٰ کے اختصام سے مراد۔	″
انسان کو دو ہاتھوں سے پیدا کرنے میں اشارہ	۱۱۶۹
سورۃ الزمر ۳۹ - از ۱۱۸۰ تا ۱۱۹۲	
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق اور زمانہ نزول۔	۱۱۸۰
نیکی فرائض انسانی میں داخل ہے	″
غیر اللہ کی عبادت سے اللہ کا قرب نہیں مل سکتا	″
عقیدۂ ابنیت۔	″
ابن اللہ کا استعمال پہلی کتابوں میں۔	۱۱۸۱
چارپایوں کا اتارنا۔	″
تین اندھیرے۔	″
جنت کی غیر متناہی ترقی۔	۱۱۸۳
قرآن کے متشابہ اور مثانی ہونے سے مراد۔	۱۱۸۴
قرآن یا کسی اور کلام کو سنکر اپنے آپ کو بے ہوش بنانا	″
یا تواجد کرنے لگنا ناجائز ہے۔	″
موحد اور مشرک کی مثال۔	۱۱۸۵
توفی نفس سے مراد	۱۱۸۷
مردہ زندہ کر کے اس دنیا میں واپس نہیں بھیجا جاتا۔	″
رحمت الٰہی کی وسعت۔	۱۱۸۹
اسلام کی تعلیم اعتدال بمقابلہ دیگر مذاہب۔	″
دو نفخے۔	۱۱۹۱
مخفی نتائج کا ظہور	
سورۃ المومن ۴۰ - از ۱۱۹۳ تا ۱۲۰۷	
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق اور زمانہ نزول۔	۱۱۹۳
الحم	″
صفات الٰہی میں غلبۂ رحم	″
حاملین عرش سے مراد۔	۱۱۹۴
وسعت رحمت۔	″
دو موتیں اور دو زندگیاں۔	۱۱۹۵
رفیع الدرجات سے مراد	۱۱۹۶
یوم التلاق سے مراد۔	″
لقاء اللہ	″
آنحضرتؐ کے بعد مجددین کا مامور کیا جانا۔	″
حدیث مجدد	″
رجل مومن کا ذکر۔	۱۱۹۸
حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصہ میں حق و باطل کی تمثیل۔	″

خلاصہ مضامین	صفحہ
یوم التناد سے مراد۔	۱۱۹۹
یوسف پر اہل مصر ایمان نہیں لائے۔	″
فرعون اور مسئلہ ختم نبوت	۱۲۰۰
عالم برزخ میں ثواب و عذاب	۱۲۰۱
کفار کی دعا۔	۱۲۰۲
رسولوں اور مومنوں کی نصرت	″
آنحضرتؐ کے استغفار سے مراد۔	″
دجال ایک گروہ کا نام ہے۔	۱۲۰۳
انبیا جن کا ذکر قرآن میں نہیں۔	۱۲۰۶
انبیا کا علم اور دنیا داروں کا علم۔	۱۲۰۷
بدی کی کھلی سزا قومی بدلیوں پر آتی ہے۔	″
رجوع کب فائدہ دیتا ہے۔	″
سورۃ حٰمٓ السجدۃ ۴۱ - از ۱۲۰۷ تا ۱۲۱۶	
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔	۱۲۰۷
مخالفین کے اعراض کی حالت	۱۲۰۸
عارضی نجات	″
زمین کا تدریجی طور پر بننا اور چھ مراتب۔	۱۲۰۹
طوعاً او کرھاً سے مراد۔	″
آسمان کی طرف وحی۔	″
آسمانوں کے دو دن میں بننے سے مراد۔	″
آسمانوں کا شیاطین سے محفوظ ہونا۔	۱۲۱۰
عتبہ کا پیغام اور آنحضرتؐ کا جواب	″
منحوس دن سے مراد۔	۱۲۱۱
بدی کا اثر جوارح پر	″
اللہ تعالیٰ کب شیطان کو انسان پر مقرر کرتا ہے۔	۱۲۱۲
قرآن کریم کے اثر کو باطل کرنے کی تدابیر۔	″
استقامت سے مراد۔	۱۲۱۳
مومنوں پر ملائکہ کا نزول۔	″
داعی الی اللہ	″
عجمی قرآن سے مراد۔	۱۲۱۵
اسلام کا غلبہ عرب میں اور اطراف عالم میں۔	۱۲۱۶
سورۃ الشوریٰ ۴۲ - از ۱۲۱۷ تا ۱۲۲۹	
نام۔ زمانہ نزول۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔	۱۲۱۷
اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت۔	۱۲۱۸
یوم الجمع	۱۲۱۹
اختلافات مذاہب کا فیصلہ وحی الٰہی سے ہو سکتا تھا	″
لیس کمثلہ شیء سے مراد۔	″

خلاصہ مضامین	
اصل اصول ادیان۔	۱۲۲۰
اسلام کا قیام اس کی صداقت کی دلیل ہے۔	۱۲۲۱
مودت فی القربیٰ سے مراد۔	۱۲۲۲
سماوات میں جانداروں کا ہونا۔	۱۲۲۴
ترقی درجات کے لیے مصائب۔	″
مشورہ کا حکم۔	۱۲۲۵
حکومت اسلامی کی بنیاد مشورے پر ہے۔	″
سزاؤں کا اصول۔	۱۲۲۶
طاقت کے وقت عفو۔	″
سزا کا فلسفہ	″
عورت کی عزت۔	۱۲۲۸
لڑکیوں کی پرورش میں خدمت انسانی	″
وحی کی اقسام۔	″
وحی الٰہی سے زندگی۔	۱۲۲۹
آنحضرتؐ کا قبل از بعثت کتاب اور اس پر ایمان	″
کو نہ جاننا۔	″
سورۃ الزخرف ۴۳ - از ۱۲۳۰ تا ۱۲۴۳	
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔	۱۲۳۰
قرآن کا علو و حکمت۔	″
انسان کی خطاکاری پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کو نہیں	۱۲۳۱
روکتا۔	″
ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دینا۔	۱۲۳۲
زیورات کا پہننا۔	۱۲۳۳
بتوں کا زیورات سے بنانا۔	″
بتوں کو ملائکہ کا مظہر قرار دینا۔	″
حضرت ابراہیم کی نسل میں توحید۔	۱۲۳۴
اہل دنیا کا معیار عظمت	۱۲۳۵
اختلاف مراتب مصالح الٰہی سے ہے۔	″
شیطان کس انسان کا قرین بنتا ہے۔	۱۲۳۶
بدی کب اچھی معلوم ہوتی ہے	″
اخت ہارون	۱۲۳۷
عصا اور ید بیضا سے زبردست نشان۔	″
سونے کے کڑے پہننے سے مراد۔	۱۲۳۸
حضرت عیسیٰ اور معبودان عرب	″
حضرت عیسیٰ کا مثل ہونا۔	۱۲۳۹
خلیفۃ اللہ انسان ہی ہو سکتا ہے۔	″
انہ لعلم للساعۃ سے مراد۔	″
جنت کی نعمتیں اور آرزوئیں	۱۲۴۱

خلاصہ مضامین	صفحہ
مالک	۱۲۴۱
عیسائیوں کا عقیدۂ ابنیت	۱۲۴۲
ولد حقیقت پر محمول نہیں۔	″
شفاعت آنحضرت صلعم	۱۲۴۳
سورۃ الدخان ۴۴ - از ۱۲۴۴ تا ۱۲۵۰	
نام۔ خلاصۂ مضمون۔ تعلق۔	۱۲۴۴
ابتدائے نزول قرآن۔	″
لیلۃ القدر اور اس میں قضائے امور	″
آنحضرتؐ کی دعا پر اہل مکہ پر قحط کا آنا۔	۱۲۴۵
دخان نشانات قیامت میں سے ہے۔	″
بطشۃ الکبری سے مراد	۱۲۴۶
غلام بنانا حق نہیں۔	″
حضرت موسیٰ کا سمندر کے سکون کے وقت پار ہونا	۱۲۴۷
بنی اسرائیل کو نعمتوں کا عطا کیا جانا۔	″
آسمان اور زمین کا رونا۔	″
موت اولی سے مراد	۱۲۴۸
بہشت میں زوج کا تعلق	۱۲۴۹
حور سے کیا مراد ہے۔	″
سورۃ الجاثیۃ ۴۵ - از ۱۲۵۰ تا ۱۲۵۴	
تمہید سورت۔	۱۲۵۰
مومنوں کا کفار کو معاف کرنا حکم قتال سے منسوخ نہیں	۱۲۵۱
خواہشات کی پیروی بھی شرک ہے۔	۱۲۵۳
ان اللہ ھو الدھر سے مراد	″
تناسخ۔	″
نامۂ اعمال کی گویائی۔	۱۲۵۴
سورۃ الاحقاف ۴۶ - از ۱۲۵۵ تا ۱۲۶۲	
تمہید سورت	۱۲۵۵
رسول کا علم بھی محدود ہوتا ہے۔	۱۲۵۶
حضرت موسیٰ کی شہادت آنحضرت صلعم کے لیے۔	″
انبیا کی عمر بوقت بعثت	۱۲۵۷
غذا و لباس میں سادگی کی ضرورت۔	۱۲۵۹
بار بار دہرانے میں حکمت۔	۱۲۶۰
جنوں کے وفد کے متعلق روایات مختلفہ	″
یہ جن غیر مرئی ہستیاں نہ تھیں۔	۱۲۶۱
سورۃ محمد ۴۷ - از ۱۲۶۳ تا ۱۲۷۱	
نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول۔	۱۲۶۳

خلاصہ مضامین	صفحہ
کافروں کے اعمال کی بربادی اور ایک کھلی پیشگوئی	۱۲۶۳
قیدی یا غلام بنانے کی ضروری شرط۔	۱۲۶۴
قیدیوں یا غلاموں کی آزادی کا حکم۔	″
قیدی کا قتل جائز نہیں۔	″
کفار پر عذاب بصورت جنگ آنے میں حکمت	″
جنت کا اسی دنیا میں دینا۔	۱۲۶۵
مخالفین پر متعدد سزائیں	″
آنحضرتؐ کا مکہ سے نکالا جانا۔	۱۲۶۶
جنت میں چار قسم کی نہریں۔	″
بہشت میں مغفرت	۱۲۶۷
اشراط الساعۃ	″
ہر مسلم اپنے اور دوسروں کے لیے استغفار کرے۔	″
انبیاء کا استغفار	۱۲۶۸
مومنوں اور منافقوں کی حالت نزول احکام جنگ پر۔	″ ″
کفر یا نفاق کا نشان جسم پر نہیں ہو سکتا۔	۱۲۶۹
ہمت ہار کر دشمن کو صلح کی طرف بلانا۔	۱۲۷۰
اموال کا فی سبیل اللہ خرچ کرنا انسان کی اپنی بھلائی کے لیے ہے	۱۲۷۱
خدا کی راہ میں مال خرچ نہ کرنے والی قوم باقی نہیں رہ سکتی۔	″ ″
سورۃ الفتح ۴۸ از ۱۲۷۳ تا ۱۲۸۳	
نام و خلاصہ مضمون تعلق و تاریخ نزول۔	۱۲۷۲
صلح حدیبیہ فتح مبین ہے۔ اس کی وجہ۔	″
آنحضرتؐ کے غفر ذنب سے مراد۔	۱۲۷۳
حضرت عیسیٰ کی تطہیر۔	″
مسلمانوں کے دلوں میں سکینت کا پیدا ہونا۔	″
آنحضرتؐ کا شاہد ہونا۔	۱۲۷۴
بیعت رضوان اور اس کی عظمت۔	۱۲۷۵
ید اللہ سے مراد۔	″
اعراب کی کمزوری۔	″
عذاب میں رحمت	۱۲۷۶
تبدیل کلام اللہ سے مراد۔	″
تلوار اور اسلام۔	۱۲۷۷
بیعت الرضوان۔	″
بیعت سے قوت کا پیدا ہونا۔	۱۲۷۸
فتح خیبر کی پیشگوئی۔	″
خاص مقصد کے لیے بیعت۔	″

خلاصہ مضمون	صفحہ
صحابہ کے اخلاص کی سند	۱۲۷۸
فتوحات بلاد فارس و روم	″
آنحضرتؐ کا رک جانا اور شرائط صلح۔	۱۲۷۹
شرائط صلح میں مسلمانوں پر سختی۔	″
مسلمانوں کا خونریزی سے اجتناب	۱۲۸۰
آنحضرت صلعم کی رویائے طواف بیت اللہ۔	۱۲۸۱
پیشگوئی میں اجتہادی غلطی	″
رویا کا پورا ہونا۔	″
اسلام کا غلبہ کل مذاہب پر	″
صحابہ کے اوصاف جلیلہ	۱۲۸۲
نیکی کا نشان ظاہر پر	″
حق کی مثال بیج سے۔	″
سورۃ الحجرات ۴۹ - از ۱۲۸۳ تا ۱۲۹۱	
نام و خلاصہ مضمون تعلق و تاریخ نزول۔	۱۲۸۳
اخوت اسلامی کی بنیاد اللہ اور رسول کی اطاعت ہے	۱۲۸۴
تعلیم ادب۔	″
آواز کی پستی کا اخلاق پر اثر۔	۱۲۸۵
نبی کریم کی بیبیوں کے حجرے۔	″
آنحضرتؐ کی مصروفیتیں اور اہم کاموں کا مقدم رکھنا۔	″ ″
خبروں کی تحقیقات	۱۲۸۶
صحابہ کا مقام محفوظیت	۱۲۸۷
دو مسلمان گروہوں کی جنگ میں جماعت اسلامی کا کیا طرز عمل ہونا چاہیے	″ ″
باغی کافر نہیں۔	″
صحابہ کی باہمی جنگ۔	۱۲۸۸
دوسروں کی تحقیر سے بچنے کی نصیحت	″
بدگمانی	۱۲۸۹
تقویٰ عزت کا معیار ہے۔	۱۲۹۰
مومن اور مسلم۔	″
ایمان کے تین پہلو۔	″
سورۃ ق ۵۰ - از ۱۲۹۲ تا ۱۲۹۸	
تمہید سورت	۱۲۹۲
کتاب حفیظ۔	″
دوسری پیدائش اعمال سے ہے۔	″
آسمان میں فروج نہ ہونے سے مراد۔	۱۲۹۳
بعث بعد الموت خلق جدید ہے۔	۱۲۹۴

خلاصہ مضامین	صفحہ
اعمال کے لکھے جانے سے مراد	۱۲۹۴
سائق اور شہید۔	۱۲۹۵
بدی کے بدنتائج کو انسان کیوں نہیں دیکھتا۔	"
عالم آخرت میں نئے حواس۔	"
تثنیہ کا استعمال واحد پر	"
اللہ کے دوزخ میں وضع قدم سے مراد	۱۲۹۶
دوزخ کا ھل من مزید کہنا۔	"
نوافل بعد نماز	۱۲۹۸
منادی کون ہے۔	"
مکان قریب سے مراد۔	"

سورۃ الذٰریٰت ۵۱ - از ۱۲۹۸ تا ۱۳۰۴

خلاصہ مضامین	صفحہ
تمہید سورت	۱۲۹۸
حق کی کامیابی پر مناظر قدرت سے دلیل۔ اور	۱۲۹۹
ذاریات وغیرہ سے مراد	"
آسمان میں راستے اور صداقت وحی پر ایک دلیل	۱۳۰۰
تمام مخلوق میں زوجیت کا قانون اور صداقت	۱۳۰۳
قرآنی پر ایک دلیل۔	"
اللہ تعالیٰ سے تعلق کے بغیر کمال انسانی حاصل	"
نہیں ہوتا۔	"
منہ پھیر لینے سے مراد۔	"
انسان کی پیدائش کی غرض۔	۱۳۰۴

سورۃ الطور ۵۲ - از ۱۳۰۵ تا ۱۳۱۱

خلاصہ مضامین	صفحہ
تمہید سورت	۱۳۰۵
بیت معمور	"
نیکوں کی ذریت	۱۳۰۷
کہانت کا ملک عرب سے نابود ہونا۔	۱۳۰۸
کہانت اور قرآن۔	"
سپرت پچھ ملزم	"
قرآن کی ہمیشگی	۱۳۰۹
شیاطین کے آسمان سے اخبار غیبی لانے	"
کی قطعی تردید۔	"
علم غیب اور اس کا لکھنا۔	"
جنگ بدر کی پیشگوئی۔	۱۳۱۰

سورۃ النجم ۵۳ - از ۱۳۱۱ تا ۱۳۲۰

خلاصہ مضامین	صفحہ
تمہید سورت	۱۳۱۱
نجم سے مراد۔	"
آنحضرتؐ کی عصمت عملی اور اعتقادی دونوں	۱۳۱۱
پہلوؤں سے ثابت ہے۔	"
آپ کا حرص سے خالی ہونا۔	۱۳۱۲
آنحضرت صلعم کے جملہ قویٰ کا حالت اعتدال	"
پر ہونا۔	"
آنحضرت صلعم کے جملہ قویٰ کا کمال کو پہنچنا۔	۱۳۱۳
آنحضرت کا قرب اللہ تعالیٰ سے۔	"
آنحضرت کا قرب اللہ تعالیٰ سے تمام انسانوں پر فوقیت	"
لے گیا۔	"
معراج جسد عنصری سے نہ تھا۔	۱۳۱۴
آنحضرت کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا کس طرح تھا۔	"
سدرۃ المنتہیٰ۔	۱۳۱۵
آنحضرت کے علم کا انتہائے کمال کو پہنچ جانا۔	"
معراج میں کیا دکھایا گیا۔	"
لات۔ عزیٰ۔ منات۔	"
غرانیق کا جھوٹا قصہ۔	۱۳۱۶
شفاعت کس کے لیے ہے۔	"
تزکیۂ نفس کا رستہ سعی ہے۔	۱۳۱۷
انسان کا زمین سے پیدا ہونا۔	۱۳۱۸
اصول سعی اور اس کا صحیح مفہوم۔	"
میت کو ثواب۔	"
علت العلل۔	۱۳۱۹
ساعت ہلاکت اعداء۔	۱۳۲۰
کفار کا سجدہ کرنا۔	"

سورۃ القمر ۵۴ - از ۱۳۲۱ تا ۱۳۲۷

خلاصہ مضامین	صفحہ
تمہید سورت۔	۱۳۲۱
شق القمر پر روایات متواترہ۔	"
قرب ساعت سے مراد۔	"
انشق القمر کے دوسرے معنی اور معجزہ کے نیچے حقیقت۔	"
انشقاق قمر کا وقوع خلاف قانون قدرت	"
نہیں۔	"
انشقاق قمر اور خسوف۔	۱۳۲۲
ساعت وسلی۔	"
طوفان نوح میں التقاء ماء سے مراد۔	۱۳۲۳
لوح محفوظ۔	"
حضرت صالح کی اونٹنی اور پانی کا قصہ۔	۱۳۲۴
آنحضرت کا جنگ بدر کو الساعۃ قرار دینا۔	۱۳۲۶
جنگ بدر کی پیشگوئی کی عظمت	"

سورۃ الرحمٰن ۵۵ - از ۱۳۲۷ تا ۱۳۳۶

خلاصہ مضامین	صفحہ
تمہید سورت۔	۱۳۲۷
اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت۔	۱۳۲۸
ایک قانون کا نافذ کرنے والا ایک ہی خدا ہو سکتا ہے	"
میزان اجرام سماوی۔	"
میزان جو انسان کے لیے قایم کی گئی ہے۔	"
مشرقین و مغربین۔	۱۳۲۹
دو سمندر۔	۱۳۳۰
سب مخلوق قانون فنا کے ماتحت ہے۔	"
اللہ تعالیٰ کے شان میں ہونے سے مراد۔	"
شعلوں اور دھوئیں کی سزا۔	۱۳۳۱
قیامت میں نتائج اعمال کا ظہور۔	۱۳۳۲
فبای الاء کا تکرار۔	"
اللہ کے خوف سے مراد۔	۱۳۳۳
مومن کے لیے دو بہشتوں کا وعدہ۔	"
قاصرات الطرف سے کون مراد ہیں۔	۱۳۳۴
جنوں اور انسانوں کے تعلقات مناکحت۔	"
کیا جن جنت میں جائیں گے۔	"
مقربین اور اصحاب الیمین کے لیے جنت۔	۱۳۳۵
فتوحات ملکی کی طرف اشارہ۔	"

سورۃ الواقعۃ ۵۶ - از ۱۳۳۷ تا ۱۳۴۴

خلاصہ مضامین	صفحہ
تمہید سورت۔	۱۳۳۷
پہلوں میں سابقین کیوں زیادہ ہیں۔	۱۳۳۸
صحابہ میں سے اولین مہاجرین کے کثیر حصہ کا مقرب	"
بارگاہ الٰہی ہونا اور عیسائیت اور اہل تشیع پر	"
اتمام حجت۔	"
جنت میں اس دنیا کی عورتیں۔	۱۳۳۹
نعمائے جنت میں بقا اور سرور کا سامان	"
مقربین اور اصحاب الیمین کی جنت میں فرق کا رنگ۔	۱۳۴۰
بعث بعد الموت میں یہ جسم نہیں۔	۱۳۴۱
مواقع النجوم سے مراد۔	۱۳۴۲
قرآن کی عزت اور حفاظت۔	"
لایمسہ الا المطہرون سے مراد۔	۱۳۴۳

سورۃ الحدید ۵۷ - ۱۳۴۴ تا ۱۳۵۲

خلاصہ مضامین	صفحہ
تمہید سورت۔	۱۳۴۴
الاول۔ الاخر سے مراد۔	۱۳۴۵

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
الظاہر۔ الباطن سے مراد۔	۱۳۴۵
مومنوں کو نور کس طرح مل سکتا ہے۔	۱۳۴۶
اعمال اور جزا کا تعلق۔	۱۳۴۷
بہشت اور دوزخ۔	"
دوزخ بطور علاج۔	"
مسلمانوں کی آئندہ حالت کا نقشہ۔	۱۳۴۸
دین کے لیے بھاگنے والوں کا حضرت عیسیٰ کے ساتھ ہونا۔	"
آخری زمانہ میں مصائب اہل اسلام۔	۱۳۴۹
شگون لینا جائز نہیں فراست حضرت عائشہ	۱۳۵۰
میزان عمل رسول ہے۔	"
لوہے کا اتارنا۔	"
بدعت رہبانیت۔	۱۳۵۱
اسلام میں بدعت کیا ہے۔	"
سورۃ المجادلۃ ۵۸ - از ۱۳۵۲ تا ۱۳۵۸	
تمہید سورت۔	۱۳۵۲
خولہ بنت ثعلبہ کا واقعہ۔	۱۳۵۳
انسان اور خدا میں عرض و معروض کے لیے کوئی واسطہ بکار نہیں۔	"
ممانعت ظہار۔	"
اسلام کے خلاف خفیہ مشورے۔	۱۳۵۴
تین قوموں اور پانچ قوموں کے خفیہ مشورے	"
آداب مجلس۔	۱۳۵۶
رسولوں کا غلبہ۔	۱۳۵۷
کفار سے موالات۔	"
مومنوں کی تائید روح القدس سے۔	۱۳۵۸
صحابہ کا مرتبہ۔	"
سورۃ الحشر ۵۹ - از ۱۳۵۸ تا ۱۳۶۴	
تمہید سورت۔	۱۳۵۸
بنی نضیر کی جلاوطنی کی وجہ۔	۱۳۵۹
یہودیوں کی دوسری جلاوطنی کی طرف اشارہ۔	"
اموال بنی نضیر اور حضرت عباسؓ و حضرت علیؓ کا جھگڑا۔	۱۳۶۰
حدیث پر عمل پر نص قرآنی۔	۱۳۶۱
انصار کی تعریف۔	"
صحابہ کی مال دنیا سے بے رغبتی۔	"
اہل تشیع کے غور کے لیے۔	۱۳۶۲

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
بنی قینقاع۔	۱۳۶۳
قرآن کی پہاڑوں کو گرا دینے کی طاقت۔	"
القدوس	۱۳۶۴
آریہ سماج کا شرک۔	"
سورۃ الممتحنۃ ۶۰ - از ۱۳۶۴ تا ۱۳۶۸	
تمہید سورت۔	۱۳۶۴
حاطب بن ابی بلتعہ کا واقعہ۔	۱۳۶۵
اسلام کے دشمنوں سے دوستی کی ممانعت۔	"
قریش کے اسلام لانے کی پیشگوئی۔	۱۳۶۶
کفار سے احسان اور انصاف کی تعلیم۔	"
ترک موالات۔	۱۳۶۷
عورتوں کی مکہ سے ہجرت۔	"
مہاجر عورتوں سے نکاح کی شرط۔	"
عورتوں سے بیعت۔	۱۳۶۸
صدوقی۔	"
سورۃ الصف ۶۱ - از ۱۳۶۹ تا ۱۳۷۲	
تمہید سورت۔	۱۳۶۹
صحابہ کا محبوب الٰہی ہونا۔	"
احمد آنحضرتؐ کا اسم علم ہے۔	۱۳۷۰
حضرت عیسیٰ کی بشارت آنحضرت صلعم کے متعلق۔	"
روح القدس اس پیشگوئی کا مصداق نہیں۔	"
حضرت عیسیٰ کی پیشگوئی کے مصداق آنحضرت صلعم ہیں۔	۱۳۷۱
احمد کا لفظ اختیار کرنے کی وجہ۔	"
اتمام نور سے مراد۔	"
نصرت دین بذریعہ اشاعت۔	۱۳۷۲
سورۃ الجمعۃ ۶۲ - از ۱۳۷۲ تا ۱۳۷۵	
تمہید سورت۔	۱۳۷۳
آخرین منہم سے مراد۔	"
آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔	"
طاعون کے مقام سے نکلنا۔	۱۳۷۴
زندگی کی قدر اور موت کا خوف۔	"
سب سے پہلا جمعہ۔	۱۳۷۵
جمعہ کی فرضیت۔	"
جمعہ کے دن کاروبار کی ممانعت نہیں۔	"

خلاصہ مضامین	صفحہ
سورۃ المنٰفقون ۶۳ - از ۱۳۷۶ تا ۱۳۷۸	
تمہید سورت۔	۱۳۷۶
منافقوں کا جھوٹ بولنا۔	"
منافقوں کا ایمان اور کفر۔	"
سورۃ التغابن ۶۴ - از ۱۳۷۸ تا ۱۳۸۱	
تمہید سورت۔	۱۳۷۸
خلق سب کی فطرت صحیحہ پر ہے کفر پر کوئی پیدا نہیں ہوتا۔	۱۳۷۹
شقی اور سعید ماں کے پیٹ میں لکھا جانا۔	"
ہدایت کا تعلق قلب سے ہے۔	۱۳۸۰
بیبیاں اور اولاد کس معنی میں انسان کے دشمن ہیں۔	۱۳۸۱
سورۃ الطلاق ۶۵ - از ۱۳۸۲ تا ۱۳۸۶	
تمہید سورت۔	۱۳۸۲
سورتوں کی پرحکمت ترتیب۔	"
عورتوں سے حسن سلوک کی اہمیت۔	"
طریق طلاق۔	"
تین طلاق۔ طلاق بلاوجہ مکروہ ہے۔	۱۳۸۳
طلاق اور مراجعت پر شہادت۔	"
متقی کے لیے مخرج اور رزق کا وعدہ۔	۱۳۸۴
حیض نہ آنے کی صورت میں عدت۔	"
حاملہ کی عدت۔	"
عورت امت کے لیے مثال ہے۔	۱۳۸۵
رسول کا نزول	۱۳۸۶
سات آسمان اور سات زمینیں اور ان میں امر الٰہی کا نفوذ	"
سورۃ التحریم ۶۶ - از ۱۳۸۶ تا ۱۳۹۱	
تمہید سورت۔	۱۳۸۶
لم تحرم ما احل اللہ لک میں کس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔	۱۳۸۷
واقعہ ایلاء	"
تحریم زوجہ پر کفارہ۔	۱۳۸۸
آپ کے ازواج سے حسن سلوک پر شہادت۔	"
آنحضرتؐ اور آپ کی بی بی میں راز کی بات۔	"
آنحضرت صلعم کا اصل تعلق محبت صرف اللہ تعالیٰ سے تھا۔	۱۳۸۹
آنحضرتؐ کی ازواج کے اوصاف	"

خلاصہ مضامین	صفحہ
بہشت میں غیر متناہی ترقیات اور قرآن کا امتیاز۔	۱۳۹۰
عورت اور اُمت کی مماثلت۔	۱۳۹۱
مومن کی روحانی ترقی کے دو مرتبے۔	"
انتہائی مرتبہ۔	"
اُمت محمدیہ اور اُمم سابقہ۔	"
سورۃ الملک۔ از ۱۳۹۲ تا ۱۳۹۶	
تمہید سورت۔	۱۳۹۲
موت و حیات پر اللہ تعالیٰ کا تصرف تام۔	"
تمام مخلوق پر ایک ہی قانون حاوی ہے اور یہ توحید پر دلیل ہے۔	"
تثنیہ کا استعمال کثرت کے لیے۔	"
عقل سے کام نہ لینے پر گرفت۔	۱۳۹۳
خلق سے علم پر دلیل۔	۱۳۹۴
حصول رزق کے لیے جدوجہد۔	"
اللہ کے آسمان پر ہونے سے مراد۔	"
عذاب جو مخالفین پر آئے۔	"
قانون پر عمل اور اس سے انحراف کے نتائج	۱۳۹۵
وحی اور اخلاق کا تعلق	"
سورۃ القلم۔ از ۱۳۹۶ تا ۱۴۰۰	
تمہید سورت۔	۱۳۹۶
آنحضرتؐ کی صداقت پر شہادت علوم۔	"
عظیم الشان پیشگوئی۔	"
آنحضرتؐ مالک خلق عظیم تھے۔	"
خلقہ القرآن سے مراد	"
آپ کی بعثت سے تکمیل اخلاق۔	۱۳۹۷
طاقت اور اخلاق کا اجتماع کمال اخلاق ہے	"
آنحضرتؐ کے اخلاق کا مداہنہ سے پاک ہونا اور	"
دنیاداروں کے نمائشی اخلاق۔	"
بندگان سیم و زر کے اخلاق۔	"
ناک پر داغ لگانے سے مراد۔	۱۳۹۸
مخالفین کے عذاب کی نوعیت کی صراحت اور پیشگوئی کہ آخر یہ مسلمان ہونگے۔	۱۳۹۹
کشف عن الساق سے مراد عمل کے مطابق جزا۔	۱۴۰۰
حضرت یونس کی ہجرت بلا اذن۔	"
قرآن سب قوموں کیلئے عزت کا موجب ہے	"

خلاصہ مضامین	صفحہ
سورۃ الحاقۃ۔ از ۱۴۰۱ تا ۱۴۰۵	
تمہید سورت۔	۱۴۰۱
الحاقۃ سے مراد۔ ما ادراک سے مراد۔	"
فرشتوں کے کناروں پر ہونے سے مراد۔	۱۴۰۲
حاملین عرش سے مراد۔	"
ستر ہاتھ کی زنجیر۔	۱۴۰۳
مفتری پر گرفت۔	۱۴۰۴
علم کے تین مراتب	۱۴۰۵
سورۃ المعارج۔ از ۱۴۰۵ تا ۱۴۰۸	
تمہید سورت۔	۱۴۰۵
مراتب عالیہ حاصل کرنے کی ترغیب۔	"
روح سے مراد۔	"
پچاس ہزار سال کا دن۔	۱۴۰۶
صبر جمیل سے مراد۔	"
دوزخ کا طاقت کو سلب کر دینا۔	"
کن کن صفات کو اندر لے کر مومن ترقی کر سکتا ہے۔	۱۴۰۷
کفار کے آخر کار گروہ در گروہ آنحضرتؐ کی طرف آنے کی پیشگوئی۔	۱۴۰۸
سورۃ نوح۔ از ۱۴۰۹ تا ۱۴۱۱	
تمہید سورت۔	۱۴۰۹
مسئلہ ارتقاء۔	۱۴۱۰
روحانی ترقیات۔	"
پہلی زندگی اور دوسری زندگی میں فرق۔	"
ود۔ سواع۔ یغوث۔ یعوق۔ نسر۔	۱۴۱۱
سورۃ الجن۔ از ۱۴۱۲ تا ۱۴۱۶	
تمہید سورت۔	۱۴۱۲
مومن جنوں کا نوع انسانی سے ہونا۔	"
عیسائی جن۔	"
شہابوں کا گرنا۔	۱۴۱۳
شیاطین کے آسمانوں سے روکا جانے سے مراد	"
رسولوں پر کامل انکشاف غیب نہیں ہوتا۔	۱۴۱۵
غیر رسول کو غیب پر اطلاع ملنا۔	"
رسول کے پہرہ سے مراد۔	۱۴۱۶
سورۃ المزمل۔ از ۱۴۱۶ تا ۱۴۱۹	
تمہید سورت۔	۱۴۱۶

خلاصہ مضامین	صفحہ
وحی کے وقت آنحضرتؐ کی حالت میں تبدیلی۔	۱۴۱۷
تہجد کی برکات۔	"
آنحضرتؐ کو مثیل موسیٰ قرار دینا۔	۱۴۱۸
سورۃ المدثر۔ از ۱۴۲۰ تا ۱۴۲۴	
تمہید سورت۔	۱۴۲۰
زمانہ فترت۔ بعد فترت پہلی وحی۔	"
تطہیر ثیاب سے مراد۔	"
نیکی کر کے اجر نہ چاہنا۔	۱۴۲۱
آنحضرتؐ کے متعلق اعتراف کفار۔	۱۴۲۲
دوزخ کے داروغے۔	"
اھل التقوی اھل المغفرۃ۔	۱۴۲۳
سورۃ القیمۃ۔ از ۱۴۲۴ تا ۱۴۲۹	
تمہید سورت۔	۱۴۲۴
قیامت پر شہادت۔	۱۴۲۵
نفس لوامہ۔	"
ہڈیاں جمع کرنے سے مراد۔	"
سورج اور چاند کے جمع ہونے سے مراد۔	۱۴۲۶
انسان کی اپنے نفس پر شہادت۔	"
جمع قرآن۔	۱۴۲۷
اہل تشیع اور جمع قرآن۔	"
بیان قرآن	"
سورۃ الدھر۔ از ۱۴۲۹ تا ۱۴۳۳	
تمہید سورت۔	۱۴۲۹
انسان کیوں مکلف احکام و نواہی ہے۔	"
کاس کافوری۔	۱۴۳۰
غیر مسلم پر خیرات۔	"
نعمائے بہشتی میں اعمال حسنہ کا نقشہ۔	۱۴۳۱
کاس زنجبیلی۔	"
انسان کا ارادہ مشیت الٰہی کے ماتحت۔	۱۴۳۲
سورۃ المرسلٰت۔ از ۱۴۳۳ تا ۱۴۳۶	
تمہید سورت۔	۱۴۳۳
پہلے رسولوں اور مومنین کے حالات سے شہادت	"
طمس نجوم وغیرہ سے مراد۔	۱۴۳۴
پرستاران صلیب کو خطاب۔	۱۴۳۶
تین شاخوں والا سایہ	"

خلاصہ مضامین	صفحہ
سورۃ النبا[78]۔ از ۱۴۳۷ تا ۱۴۳۹	
تمہید سورت۔	۱۴۳۷
نبأ عظیم۔	"
نظام شمسی۔	۱۴۳۸
عذاب دنیا کا نقشہ عذاب آخرت کے رنگ	"
میں۔	"
جزا کا مطابق اعمال ہونا۔	"
فرشتوں اور روح کا قیام۔	۱۴۳۹
سورۃ النازعات[79] از ۱۴۴۰ تا ۱۴۴۳	
تمہید سورت۔	۱۴۴۰
نازعات۔ ناشطات وغیرہ سے مراد۔	"
انسان کی ترقیات روحانی۔	"
کامیابی کا رستہ۔	۱۴۴۱
راجفۃ رادفۃ سے مراد۔	"
زمین کیونکر بنی۔	۱۴۴۲
زمین کا پانی زمین سے نکلا۔	"
روحانی ترقی: آنحضرت اور قرب ساعت	۱۴۴۳
سورۃ عبس[80]۔ از ۱۴۴۳ تا ۱۴۴۶	
تمہید سورت۔	۱۴۴۳
ابن ام مکتوم کا واقعہ۔	"
خادمان قرآن کے لیے عظیم الشان خوش	۱۴۴۵
خبری۔	"
سورۃ التکویر[81]۔ از ۱۴۴۶ تا ۱۴۴۹	
تمہید سورت۔	۱۴۴۶
قیامت کبریٰ اور اس دنیا کی خبروں کو ملانے	۱۴۴۷
میں حکمت۔	"
آئندہ زمانہ کی عظیم الشان پیشگوئیاں۔	"
قرآن کا دنیا کی ترقیات علمی سے تعلق۔	۱۴۴۸
آفتاب صداقت کا طلوع اور ہر قسم کی تاریکی	۱۴۴۹
کا دور ہونا۔	"
رسول کی صفات۔	"
سورۃ الانفطار[82]۔ از ۱۴۵۰ تا ۱۴۵۱	
تمہید سورت۔	۱۴۵۰
قبروں سے نکالا جانے سے مراد۔	"
کراماً کاتبین۔	۱۴۵۱
اس دنیا میں بھی دوزخ ہے۔	"
قیامت کے دن الامر للہ سے مراد۔	۱۴۵۱
سورۃ التطفیف[83]۔ از ۱۴۵۱ تا ۱۴۵۴	
تمہید سورت۔	۱۴۵۱
کتاب فجار کے سجین میں ہونے سے مراد۔	۱۴۵۲
دل پر زنگ کس طرح بیٹھتا ہے۔	"
ابرار کی کتاب کے علیون میں ہونے سے مراد۔	۱۴۵۳
مومنوں کے کفار پر ہنسنے سے مراد۔	۱۴۵۴
سورۃ الانشقاق[84]۔ از ۱۴۵۴ تا ۱۴۵۶	
تمہید سورت۔	۱۴۵۴
قیامت انسان کی مخفی طاقتوں کے ترقی پذیر	۱۴۵۵
ہونے کا نتیجہ ہے۔	"
انسان کی ترقیات روحانی کی شہادت۔	۱۴۵۶
امر اسلام کی ترقی۔	"
عذاب کی بشارت میں روحانی ترقیات کیطرف	"
اشارہ۔	"
سورۃ البروج[85]۔ از ۱۴۵۶ تا ۱۴۵۸	
تمہید سورت۔	۱۴۵۶
خندق والوں سے مراد۔	۱۴۵۷
قرآن کے لوح محفوظ میں ہونے سے مراد	۱۴۵۸
سورۃ الطارق[86]۔ از ۱۴۵۸ تا ۱۴۶۰	
تمہید سورت۔	۱۴۵۸
آنحضرتؐ کی مشابہت صبح کے ستارہ سے۔	۱۴۵۹
آپ کے وجود سے قیامت پر شہادت۔	"
بعث رازوں کا ظاہر ہو جانا ہے۔	۱۴۶۰
ذات الرجع۔ ذات الصدع سے مراد۔	"
سورۃ الاعلیٰ[87]۔ از ۱۴۶۰ تا ۱۴۶۲	
تمہید سورت۔	۱۴۶۰
نماز سے علو کا ملنا۔	۱۴۶۱
خلق و ہدایت کا تعلق	"
آنحضرتؐ کا معجزہ کہ قرآن کو بھولتے نہ تھے۔	"
انبیا کی تعلیم ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔	۱۴۶۲
سورۃ الغاشیۃ[88]۔ از ۱۴۶۲ تا ۱۴۶۴	
تمہید سورت۔	۱۴۶۲
سورۃ الفجر[89]۔ از ۱۴۶۴ تا ۱۴۶۶	
تمہید سورت۔	۱۴۶۴
عبادت الٰہی پر روحانی ترقی کا مدار ہے۔	"
اللہ تعالیٰ کی آزمایش۔	۱۴۶۵
جہنم کا لایا جانا۔	۱۴۶۶
سورۃ البلد[90]۔ از ۱۴۶۶ تا ۱۴۶۸	
تمہید سورت۔	۱۴۶۶
ترقی درجات کے لیے مشقت کا اٹھانا ضروری	۱۴۶۷
ہے۔	"
ہمدردیٔ مخلوق کی تعلیم کی اہمیت۔	۱۴۶۸
سورۃ الشمس[91]۔ از ۱۴۶۹ تا ۱۴۷۰	
تمہید سورت۔	۱۴۶۹
نفس انسانی کا کمال انسان کامل۔	"
سورۃ الیل[92]۔ از ۱۴۷۱ تا ۱۴۷۲	
تمہید سورت۔	۱۴۷۱
رضائے الٰہی کی جنت۔	۱۴۷۲
سورۃ الضحیٰ[93]۔ از ۱۴۷۲ تا ۱۴۷۴	
تمہید سورت۔	۱۴۷۲
اسلام پر غربت کا زمانہ اور خوشخبری۔	"
اسلام کی ترقی رک نہیں سکتی۔	۱۴۷۳
آنحضرت صلعم کا طالب ہدایت ہونا اور ضال	"
سے مراد۔	"
سورۃ الانشراح[94]۔ از ۱۴۷۴ تا ۱۴۷۵	
تمہید سورت۔	۱۴۷۴
آنحضرتؐ کی شرح صدر کا واقعہ	"
سورۃ التین[95]۔ از ۱۴۷۵ تا ۱۴۷۶	
تمہید سورت۔	۱۴۷۵
انجیر اور زیتون کی شہادت سے مراد۔	"
انسان کے بہترین صورت پر بنانے سے مراد	۱۴۷۶
سورۃ العلق[96]۔ از ۱۴۷۶ تا ۱۴۷۸	
تمہید سورت۔	۱۴۷۶
آنحضرتؐ پر سب سے پہلی وحی۔	۱۴۷۷

خلاصہ مضامین	صفحہ
نزول وحی پر دوسرے عالم کی طرف انتقال۔	۱۴۷۷
آنحضرتؐ کا سب سے پہلا پیغام۔	"
اس میں انقلاب عظیم کی طرف اشارہ۔	"
سورۃ القدر ۹۷ - از ۱۴۷۸ تا ۱۴۷۹	
تمہید سورت۔	۱۴۷۸
لیلۃ القدر اور ہزار مہینے۔	۱۴۷۹
سورۃ البینۃ ۹۸ - از ۱۴۷۹ تا ۱۴۸۰	
تمہید سورت۔	۱۴۷۹
دنیا کے لیے ایک نجات دہندہ کی ضرورت۔	"
قرآن میں پہلی کتابوں کی تعلیم۔	۱۴۸۰
انسان اشرف المخلوقات ہے۔	"
سورۃ الزلزال ۹۹ - از ۱۴۸۱ تا ۱۴۸۲	
تمہید سورت۔	۱۴۸۱
روحانی بیداری کے لیے انقلاب عظیم کا واقع ہونا۔	"
نیکی اور بدی کے ثمرات کا اصول غیر متبدل۔	"
سورۃ العٰدیٰت ۱۰۰ - از ۱۴۸۲ تا ۱۴۸۳	
تمہید سورت۔	۱۴۸۲
جنگ کا ذکر بطور پیشگوئی۔	"
سورۃ القارعۃ ۱۰۱ - از ۱۴۸۳ تا ۱۴۸۴	
تمہید سورت۔	۱۴۸۳
دوزخ علاج کے طور پر ہے۔	۱۴۸۴
سورۃ التکاثر ۱۰۲ - از ۱۴۸۴ تا ۱۴۸۵	
تمہید سورت	۱۴۸۴
سورۃ العصر ۱۰۳ - از ۱۴۸۵ تا ۱۴۸۶	
تمہید سورت۔	۱۴۸۵
وقت کی قیمت۔	"
ہر مسلمان کے اولین چار فرض۔	۱۴۸۶
سورۃ الھمزۃ ۱۰۴ - ۱۴۸۶ تا ۱۴۸۷	
تمہید سورت۔	۱۴۸۶
دوزخ کی آگ پہلے انسان کے دل سے اٹھتی ہے۔	۱۴۸۷
سورۃ الفیل ۱۰۵ - ۱۴۸۷ تا ۱۴۸۸	
تمہید سورت	۱۴۸۷
واقعہ اصحاب فیل آنحضرتؐ کے لیے بطور ارہاص تھا۔	"
اصحاب فیل کس طرح تباہ ہوئے۔	۱۴۸۸
سورۃ القریش ۱۰۶ - ۱۴۸۸ تا ۱۴۸۹	
تمہید سورت۔	۱۴۸۸
قریش پر احسان	"
سورۃ الماعون ۱۰۷ - ۱۴۸۹ تا ۱۴۹۰	
تمہید سورت	۱۴۸۹
دین کا سب سے بڑا رکن۔	"
نماز کی حقیقت سے بےخبر ہو کر نماز پڑھنا دکھاوا ہے۔	"
سورۃ الکوثر ۱۰۸ - ۱۴۹۰	
تمہید سورت	۱۴۹۰
سورۃ الکٰفرون ۱۰۹ ۱۴۹۱	
تمہید سورت	۱۴۹۱
عمل میں توحید اور شرک سے بیزاری۔	۱۴۹۱
آنحضرتؐ نے کبھی غیر اللہ کی عبادت نہیں کی۔	"
سورۃ النصر ۱۱۰ - ۱۴۹۱ تا ۱۴۹۲	
تمہید سورت۔	۱۴۹۱
اللہ تعالیٰ کی نصرت کا نظارہ۔	۱۴۹۲
سورۃ اللھب ۱۱۱ - ۱۴۹۲ تا ۱۴۹۳	
تمہید سورت۔	۱۴۹۲
ابولہب۔ صفا کا واقعہ۔	"
ام جمیل اور اس کا واقعہ۔	۱۴۹۳
سورۃ الاخلاص ۱۱۲ - ۱۴۹۳ تا ۱۴۹۴	
تمہید سورت۔	۱۴۹۳
توحید کی جامع تعلیم اور شرک کی کامل تردید	۱۴۹۴
سورۃ الفلق ۱۱۳ - ۱۴۹۴ تا ۱۴۹۵	
تمہید سورت۔	۱۴۹۴
ہر امر کی ترقی کے مختلف مراتب اور ان میں حفاظت الٰہی کی ضرورت۔	۱۴۹۵
سورۃ الناس ۱۱۴ - ۱۴۹۵ تا ۱۴۹۶	
تمہید سورت۔	۱۴۹۵
شیطان کا وسوسہ تین رنگوں میں۔	۱۴۹۶
آنحضرتؐ کے مسحور ہونے کی روایت۔	"
دعائے ختم القرآن۔	"

تمت بالخیر

مکمل حلِّ رموز ــــ بابت بیان القرآن (دیباچہ ب۳ پیرا ۳)

	رمز	مختصر نام	پورا نام	فن و زبان	مطبع و سال طباعت	مؤلف کتاب
۱	ت	تاج العروس	تَاجُ العروسِ مِنْ جَوَاهِرِ الْقَامُوْسِ	لغت عربی	۱۰ جلد قاہرہ ۱۸۸۸ء	مُحِبُّ الدّین سید محمد مرتضےٰ زبیدی مصری ۱۱۴۵ - ۱۲۰۵ھ / ۱۷۳۲ - ۱۷۹۰ء
۲	ث	ابنِ کثیر	تفسیر القرآن العظیم	عربی تفسیر	میریہ پریس قاہرہ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء	عماد الدین ابو الفدا اسمٰعیل بن عمر بن کثیر شافعی قرشیؒ ۷۰۱ - ۷۷۴ھ / ۱۳۰۲ - ۱۳۷۳ء
۳	ج	ابنِ جریر	جَامِعُ الْبَیَانِ فِیْ تَفْسِیْرِ الْقُرْاٰنِ	عربی تفسیر	۳۰ جلد المیمنہ پریس، قاہرہ	ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید طبری ۲۲۴ - ۳۱۰ھ / ۸۳۸ - ۹۲۳ء
۴	ح	بحر	اَلْبَحْرُ الْمُحِیْط	"	۴ جلد سعادہ پریس، قاہرہ	ابو عبد اللہ اثیر الدین محمد بن یوسف ابو حیان غرناطی اندلسی ۶۵۴ - ۷۴۵ھ / ۱۲۵۶ - ۱۳۴۴ء
۵	ر	رُوح المعانی	رُوْحُ الْمَعَانِیْ فِیْ تفسیر القرآن العظیم والسَّبع المَثَانِیْ	"	۳۰ جلد	ابو الفضل شہاب الدین سید محمود آلوسی بغدادی حنفیؒ ۱۲۱۷ - ۱۲۷۰ھ / ۱۸۰۳ - ۱۸۵۴ء
۶	ز	تفسیر کبیر	مَفَاتِیْحُ الْغَیْب	" ۱۳۰۷ھ	۸ جلد العامرہ پریس، قاہرہ	ابو عبد اللہ فخر الدین محمد بن عمر رازی ۵۴۴ - ۶۰۶ھ / ۱۱۴۸ - ۱۲۰۹ء
۷	ض	بیضاوی	اَنْوَارُ التَّنْزِیْل وَ اَسْرَارُ التَّاوِیْل	" ۱۳۲۶ھ	۲ جلد مجتبائی پریس، دہلی	ابو الخیر قاضی ناصر الدین عبد اللہ بن عمر بیضاوی مصری ۵۸۵ھ / ۱۲۸۶ء
۸	غ	مفردات	اَلْمُفْرَدَاتُ فِیْ غَرِیْبِ الْقُرْاٰنِ	لغتِ قرآن عربی		ابو القاسم حسین بن محمد المعروف بامام راغب اصفہانی ۵۰۲ھ / ۱۱۰۸ء
۹	غق	غرائب القرآن تفسیر نیشاپوری	غَرَائبُ القرآن وَ رَغَائبُ الفُرقان	"		نظام الدین حسن بن محمد نیشاپوری المعروف بالنظام الاعرج ۸۵۰ھ / ۱۴۴۶ء
۱۰	ف	فتح البیان	فَتْحُ الْبَیَانِ فِیْ مَقَاصِدِ الْقُرْاٰن	" ۱۳۰۱ھ	۱۰ جلد المیریہ پریس، قاہرہ	نواب صدیق حسن خان بھوپالی ۱۲۴۸ - ۱۳۰۷ھ / ۱۸۳۵ - ۱۸۸۹ء
۱۱	ک	کشّاف	اَلْکَشَّافُ عَنْ حَقَایِقِ التَّنْزِیْل	"		ابو القاسم محمود بن عمر جار اللہ زمخشری ۴۶۷ - ۵۳۸ھ / ۱۰۷۵ - ۱۱۴۴ء
۱۲	ل	لسان	لِسَانُ الْعَرَب	عربی لغت	۲۰ جلد	ابو الفضل ابن المنظور جمال الدین افریقی ۶۳۰ - ۷۱۶ھ / ۱۲۳۲ - ۱۳۱۱ء
۱۳	ن	نہایہ	اَلنِّهَایَةُ فِیْ غَرِیْبِ الْحَدِیْثِ وَ الْاَثَرِ	عربی لغت حدیث		ابو سعادات ابن الاثیر مجد الدین المبارک بن محمد الجزری ۵۴۴ - ۶۰۶ھ / ۱۱۴۹ - ۱۲۱۰ء

آیاتہا ۷ (۱) سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ رکوعہا ۱

منزل ۱ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۞ ١ — اللہ بے انتہا رحم والے، بار بار رحم کرنے والے کے نام سے [1]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ ٢ — سب تعریف اللہ کے لیے ہے (تمام) جہانوں کے رب [2]

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۞ ٣ — بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۞ ٤ — جزا کے وقت کے مالک (کے لیے) [3]

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۞ ٥ — ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں [4]

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۞ ٦ — تو ہم کو سیدھے رستے پر چلا

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ — اُن لوگوں کے رستے (پر) جن پر تُو نے انعام کیا [5]

ع ۷/۱ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۞ ٧ — نہ اُن کے جن پر غضب ہُوا اور نہ گمراہوں کے [6]

نام اس سورۃ شریفہ کا سب سے مشہور نام الفاتحۃ یا فاتحۃ الکتاب ہے۔ سورتوں کے اسماء جن سے وہ مشہور ہیں بہت سے صحیح احادیث میں پائے جاتے ہیں اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مروی ہیں۔ سورتوں کے نام توقیفی ہیں: اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کے اسماء توقیفی ہیں، یعنی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ہونے کی وجہ سے منجانب اللہ ہیں۔ چنانچہ اس سورت کا نام الفاتحہ یا فاتحۃ الکتاب بھی حدیث میں مروی ہے۔ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی: جیسا کہ ابوداؤد اور ترمذی کی اس حدیث سے ثابت ہے، جس میں فرمایا: لاصلوٰۃ الا بقرأۃ فاتحۃ الکتاب یعنی فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اور بھی کئی حدیثوں میں یہ نام آتا ہے مثلاً صحیحین میں ابوہریرہؓ کی روایت سے ہے قال رسول اللہ صلعم لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب جو شخص فاتحۃ الکتاب نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ فاتحہ کے اور نام: خود قرآن شریف میں سورہ الحجر میں اس کا نام سبعًا من المثانی آیا ہے یعنی سات آیات جو بار بار دہرائی جاتی ہیں اور حدیث صحیح میں اس کا نام اُمّ القرآن یا اُمّ الکتاب بھی آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت قرآن کریم کی تعلیم کا نچوڑ اور خلاصہ ہے اور نام بھی وارد ہیں۔ جیسے الدعاء۔ الصلوٰۃ۔ الشفاء۔ الکنز۔ الحمد۔ امام سیوطیؒ نے پچیس [25] نام اتقان میں لکھے ہیں۔

خلاصۂ مضمون اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی چار صفات: اس سورت میں کل سات آیات ہیں جن میں سے پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی ان چار صفات کاملہ کا ذکر ہے، جن پر اس دنیا کا کل نظام قائم ہے۔ ربوبیت: یعنی پہلی آیت میں ربوبیت یا وہ صفت جو ہر ایک مخلوق کو اپنے دائرہ کے اندر کمال تک پہنچاتی ہے۔ رحمانیت: دوسری آیت میں رحمانیت یا وہ صفت جو ہر شے کے اپنے کمال تک پہنچنے کے لیے ضروری اسباب اس کے وجود میں آنے سے بھی پہلے مہیا فرماتی ہے۔ رحیمیت: اور رحیمیت یعنی وہ صفت جو ان سامانوں سے فائدہ اٹھانے پر اعلیٰ درجہ کے ثمرات مرتب فرماتی ہے۔ مالکیّت: اور تیسری آیت میں مالکیت یا وہ صفت جو ان سامانوں سے فائدہ نہ اٹھانے پر یا قوانین کی خلاف ورزی پر سزا دیتی ہے تاکہ نظام عالم قائم رہے اور چیزیں اپنے کمال کو پہنچتی رہیں۔ چوتھی آیت میں بندہ کا یہ اقرار ہے کہ صرف وہی ذات پاک جس کی محامد پہلی تین آیات میں مذکور ہیں لائق عبادت ہے اور صرف اسی سے ہر قسم کی مدد طلب کی جاتی ہے۔ فاتحہ کے دو حصّے اور ان کا باہم تعلق: آخری تین آیات میں راہِ راست پر چلنے اور تفریط و افراط سے بچنے کی دُعا ہے۔ پس پہلی تین آیات صرف محامد الٰہی کے لیے ہیں۔ آخری تین بندہ کے لیے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ انعامات کا وارث ہو اور درمیانی آیت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے عبد کا تعلّق ہے یعنی دونوں میں مشترک ہے اور اس سے پہلے حصّہ یعنی اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا تعلّق درحقیقت پہلی تین آیتوں سے ہے کیونکہ وہ کامل محامد جن کا ذکر ان آیات میں ہے اسے مستحق عبادت ٹھہراتی ہیں اور جب وہ مستحق عبادت ہُوا تو اعانت کا طلب کرنا بھی اُسی سے ضروری ہُوا۔ اب اس پچھلے حصّہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا تعلّق پہلے حصّہ سے قائم ہوگیا اور پھر اس استعانت کی تشریح آخری تین آیات میں فرمائی اور یوں اس کا تعلّق آخری تین آیات سے ہوگیا۔ یہی معنی ہیں اس حدیث کے جس کو ترمذی نے حسن قرار دیا ہے کہ صلوٰۃ یعنی فاتحہ مجھ میں اور میرے بندہ میں نصف نصف ہے۔ قال اللہ قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین ولعبدی ماسأل۔

فاتحہ کے ابتدا میں رکھا جانے کی وجہ اس کی عظمت ہے صحیح احادیث میں اس کو اعظم السور فی القرآن کہا گیا ہے یعنی قرآن کریم کی سب سے زیادہ عظمت والی سورت، اس کی عظمت اوّل تو خود اس سے ظاہر ہے کہ نماز میں جسے مومن کا معراج قرار دیا گیا ہے ہر رکعت میں اس سورت کا پڑھنا ضروری ہے اس کے ساتھ اور جہاں سے چاہے پڑھ لے۔

خلاصہ تعلیم قرآنی: پھر اس کا نام اُمّ الکتاب بتاتا ہے کہ یہ سورت گویا قرآن کریم کی تعلیم کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ قرآن کریم کی اصل غرض محامد الٰہی کا بیان کرنا اور انسان کو اپنے حقیقی کمال تک پہنچانا ہے۔ چنانچہ اس سورت کے پہلے حصّہ میں وہ محامد مذکور ہیں اور پچھلے حصّہ میں انسانی کمال کے حصول کا ذکر ہے۔ پھر اس سورت کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے شروع کرکے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کا ہی ذکر کر دیا، بلکہ نسل انسانی کی بھی وحدت کی بنیاد رکھ دی اور عٰلَمِیْن کا لفظ استعمال فرما کر ساری تفریقات قومی کو دور کر دیا

اور یہی مذہب کا خلاصہ ہے کہ وہ خدا کی ربوبیت اور انسانوں کی اخوّت کو قائم کرے اور ان الفاظ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے بہتر الفاظ میں یہ خلاصہ نہیں ہو سکتا۔

فاتحہ میں عقائد باطلہ کی تردید: پھر اس سورت کے اندر جن صفاتِ الٰہی کا ذکر ہے وہ گویا کُل صفاتِ الٰہی کے لیے بطور اُمّ یا جڑ کے ہیں، یعنی ربوبیّت، رحمانیّت، رحیمیّت مالکیّت۔ انہی سے باقی صفاتِ الٰہی بھی پیدا ہوتی ہیں اور ان چار صفات میں دوسرا کمال یہ ہے کہ مذاہبِ عالم کے کُل اصولِ باطلہ کی اُن میں تردید ہے۔ صفت ربوبیّت میں اس بات کا ردّ ہے کہ خدا کی ذات یا صفات میں کوئی شریک ہو سکتا ہے۔ وہ رُوح اور مادہ کا بھی ربّ ہے اس لیے رُوح اور مادّہ اس کی کسی صفت میں جیسے غیر مخلوق ہونا شریک نہیں ہو سکتے۔ ایسا ہی بُت پرستی اور ہر قسم کے شرک کی تردید ہے۔ کیونکہ مستحقِ حمد و عبادت وہی ذات ہو سکتی ہے جو دوسروں کی ربوبیّت کرے اور ربوبیّت کرنے والی ذات صرف ایک ہی ہے۔ صفتِ رحمانیت میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ بلا بدل رحم کرتا ہے۔ کفّارہ کے عقیدہ کی تردید ہے کیونکہ کفّارہ کے عقیدہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ رحم بلا بدل نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کا بیٹا انسانوں کے گناہوں کا معاوضہ بنایا جاتا ہے۔ مگر رحمانیّت چاہتی ہے کہ خدا کا رحم انسانوں پر بلا بدل بھی ہو، جیسا کہ اُس کی مخلوق میں ہم کو نظر آتا ہے کہ انسانوں کے پیدا ہونے سے بھی پہلے وہ ان کے لیے سامان مہیّا فرماتا ہے۔ صفت رحیمیت میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے اعمال پر جو اس کے قوانین کی فرمانبرداری میں ہوں اللہ تعالیٰ بڑے بڑے اجر دیتا ہے۔ ایسے عقائد کی تردید ہے جو انسان کے اعمال کے محدود ہونے کی وجہ سے ان کے اجر کو بھی محدود قرار دیتے ہیں اور اس لیے نجات کو عارضی قرار دیتے ہیں۔ صفتِ مالکیت میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گو قوانین کی نافرمانی پر سزا دیتا ہے مگر اس کا معاملہ اپنی خلق کے ساتھ مالک کا معاملہ اپنے مِلک کے ساتھ ہے تناسخ وغیرہ عقاید کی تردید ہے جن کی رُو سے اللہ تعالیٰ کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا اور اس لیے ہر گناہ کی پاداش میں انسان کو بے شمار جُونوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

میانہ روی کی تعلیم: اور جس طرح عقاید باطلہ کی تردید اس حصّہ میں ہے پچھلے حصّہ میں ہر ایک قوم کی افراط و تفریط کی تردید ہے۔ سوائے اسلام کے جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں وہ اپنی موجودہ حالت میں صرف ایک خاص شاخ اخلاقِ انسانی پر ہی سارا زور دیتے ہیں اور اس لیے ان میں تفریط و افراط کی غلطیاں پیدا ہو گئی ہیں، یعنی ایک شاخ پر حد سے زیادہ زور دیا اور دوسری کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اسلام کی تعلیم کا خلاصہ یہاں اعتدال یا میانہ روی قرار دیا گیا ہے جو ایک طرف تفریط سے بچاتا ہے اور دوسری طرف افراط سے محفوظ رکھتا ہے پس یوں سورہ فاتحہ میں ہر ایک باطل کی تردید بھی موجود ہے اور اس کے بالمقابل عقاید اور اعمال میں ان اصولِ حقّہ کی تعلیم ہے جو بطور بنیاد کے ہیں۔

بہترین دعا: پھر جو دُعا اس سورت میں سکھائی گئی ہے وہ دعا بھی اعلیٰ سے اعلیٰ دعا ہے، جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ **عیسائی دعا سے مقابلہ**: عیسائیوں کو اپنے خداوند کی دعا کے متعلق بہت کچھ دعویٰ ہے، مگر فاتحہ کے بالمقابل یہ دعا کچھ بھی نہیں، وہاں روز کی روٹی کی التجا ہے یہاں صراط مستقیم کی یعنی کمالِ انسانی کے حصول کی۔ اس سے دونوں دعاؤں کے مقاصد میں فرق ظاہر ہوتا ہے۔ پھر وہاں گناہوں کی معافی کی التجا ہے۔ یہاں اس مقام پر پہنچنے کی آرزو ہے جہاں گناہ ہی انسان سے سرزد نہ ہو اور نہ کسی قسم کے حقوق میں تفریط واقع ہو نہ افراط۔ گویا یہ بیگناہ یا معصوم بن جانے کی دعا ہے۔ پس کامل اصولِ حقّہ کے سکھانے میں اصولِ باطلہ کی تردید میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سکھانے میں اور کمالِ انسانی تک پہنچانے میں اس کی نظیر نہ تورات میں ملتی ہے نہ انجیل میں، ایسا ہی جو تعلق اللہ تعالیٰ اور اس کے عبد میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے مختصر فقرہ میں قائم کیا گیا ہے وہ بھی بے نظیر ہے۔ **بہترین وظیفہ**: جو لوگ وظائف کے پیچھے بھٹکتے پھرتے ہیں وہ اگر افضل الدعا سے کام لیں تو بہت جلد اپنے مقاصد کو پا سکتے ہیں۔ سورہ فاتحہ سے بہتر کوئی وظیفہ نہیں اور یہ وہ وظیفہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بندوں کو سکھایا ہے۔

زمانۂ نزول | نہ صرف اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ سورۃ مکّہ میں نازل ہوئی، **ابتدائی وحی**: بلکہ اس پر بھی کہ مکّی وحی میں بھی نہایت ابتدائی زمانہ کی ہے۔ **نماز باجماعت کی ابتدا**: یہ سورت ابتدا سے نماز میں پڑھی جاتی تھی اور نماز مکّہ میں برابر پڑھی جاتی تھی۔ بلکہ بعثتِ نبوی کے چوتھے سال کا یہ واقعہ کہ سعدؓ مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ مکّہ کے پاس ایک میدان میں نماز پڑھ رہے تھے جس پر کفار کے ساتھ جھگڑا ہو گیا اور اس کے بعد ارقم کا گھر نماز پڑھنے کے لیے منتخب کیا گیا بتاتا ہے کہ چوتھے سال سے پیشتر نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی اور اس لیے سورہ فاتحہ بھی پڑھی جاتی تھی۔ اس کے ابتدائی نزول کے متعلق صرف قیاس اور قرائن ہی نہیں، **نزول میں سب سے پہلی مکمّل سورت**: بلکہ ایک روایت میں یوں بھی آیا ہے کہ فاتحہ اوّل شئی انزل من القرآن ہے یعنی سب سے پہلے جو چیز قرآن سے نازل ہوئی۔ اس حدیث کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں بیان کیا ہے (ث) اس پر جرح یہ ہوئی ہے کہ بالاتفاق اقرأ باسم ربّک سب سے پہلے نازل ہوا ہے۔ مگر غالب مراد اوّل شئی سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ پوری سورت جس کا نزول سب سے پہلے ہوا فاتحہ ہے کیونکہ سورۂ علق کی صرف پانچ آیتیں صدر کی پہلے نازل ہوئیں اور بقیہ حصّہ بعد میں نازل ہوا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ قرآن کریم میں سوائے سورۂ برأۃ کے سب سورتوں کی ابتدا میں لکھی جاتی ہے۔ **بسم اللہ کا نزول ہر سورت کی ابتدا میں**: اور اس کا نزول ہر سورت کی ابتدا میں صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم ایک سورۃ کی علیحدگی کو نہیں پہچانتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ پر بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نازل ہوتی۔ اس سے یہ ثابت ہے کہ ہر سورۃ کے شروع میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوئی۔ البتہ یہ آیت قرآن کریم کی کسی سورۃ کی آیات کے اندر شمار نہیں ہوتی اور نہ ہی فاتحہ کے۔ **ہر سورت میں مستقل آیت ہے**: ابن کثیر میں ہے کہ داؤد نے کہا کہ ہر ایک سورۃ کی ابتدا میں یہ ایک مستقل آیت ہے۔ اس سورۃ میں سے نہیں اور یہی امام احمد بن حنبل سے روایت ہے اور یہی امام ابو حنیفہ کا صحیح مذہب ہے۔

بسم اللہ ہر سورۃ کا خلاصہ ہے | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کیوں ایک مستقل آیت ہے، اس لیے کہ جس طرح سورۃ فاتحہ خلاصہ ہے کل قرآن کریم کا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم خلاصہ ہے سورۂ فاتحہ کا اس لیے کل قرآن کریم کا بھی یہ خلاصہ ہے اور چونکہ قرآن کریم کی ہر ایک سورۃ بجائے خود بھی ایک کتاب ہے کہ اس کے اندر ایک مستقل مضمون ہے اس لیے ہر سورۃ کی ابتدا میں بھی اسے ایک مستقل آیت رکھا گیا ہے۔ **سورۃ فاتحہ کا خلاصہ**: اور سورۃ فاتحہ کا اس کا خلاصہ ہونا اس بات سے ظاہر ہے کہ فاتحہ میں جن چار صفاتِ الٰہی کا ذکر ہے ان میں سے یہاں دو کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یعنی وہاں ربوبیّت، رحمانیت، رحیمیّت، مالکیّت کی صفات ہیں، جو کل صفاتِ الٰہی کے لیے بطور اُمّ کے ہیں۔ یہاں ان میں سے دو صفات رحمانیت اور رحیمیت کا انتخاب کر لیا گیا ہے۔ **نظامِ عالم رحمانیت و رحیمیت پر ہے**: اور اگر غور کیا جائے تو سامانوں کا مہیّا ہونا اور جب ان سامانوں کو کام میں لایا جائے تو اس پر اجر کا مرتب ہونا یہی سلسلہ نظامِ عالم ہے جن پر کل کاروبار کا دارو مدار ہے جس قدر سامانِ زندگی اللہ تعالیٰ نے ہم کو دیئے ہیں جیسے ہوا، پانی، آگ، سورج وغیرہ ایسا ہی اس کے قوانین یہ سب

کچھ صفتِ رحمانیت کا ظہور ہے اور جب ان چیزوں کو ہم اپنے کام میں لاتے ہیں تو ان سے نتائج کا پیدا ہونا صفت رحیمیت کا ظہور ہے۔ نظام روحانی بھی رحمانیت و رحیمیت پر ہے۔ پس ہماری جسمانی زندگی کے سلسلہ میں یہی دو صفات اصلی کام کرنے والی ہیں۔ یہی حالت ہماری روحانی بقا کی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ صفت رحمانیت کے تقاضا سے ہمیں اپنی طرف سے قانون اور شرائع انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے عطا فرماتا ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ اور جب ان شرائع اور قوانین کو ہم اپنے عمل میں لاتے ہیں تو ان پر نتائج مترتب فرماتا ہے پس نظامِ جسمانی اور نظامِ روحانی دونوں کا قیام انہی دو صفات سے ہے۔ اسم اعظم: اس لیے بعض نے اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم اللہ۔ الرَّحْمٰن۔ الرَّحِیْم قرار دیا ہے (زرقانی) اور نہ صرف صفات الٰہی کا ہی بسم اللہ میں خلاصہ آگیا ہے بلکہ وہ نصف حصہ جو سورہ فاتحہ میں بندہ کے لیے ہے اس کو یہاں ایک با سے ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ وہ حصہ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ سے شروع ہوتا ہے اور یہاں بھی با استعانت کے لیے ہے۔ بسم اللہ میں عملی توحید: یوں بسم اللہ ہر مسلمان کی زندگی میں عملی توحید کا سبق ہے۔

بسم اللہ امر الٰہی کی تعمیل بھی ہے | یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم درحقیقت اس امر الٰہی کی بھی تعمیل ہے جو رسول اللہ صلعم کو سب سے پہلے ہوا۔ بخاری میں ہے کہ جب آپ غار حرا میں حسب معمول عبادتِ الٰہی میں مصروف تھے تو فرشتہ آیا اور کہا اِقْرَاْ یعنی پڑھ۔ آپ نے کہا ما انا بقارئ میں تو پڑھنا نہیں جانتا فرشتہ نے پھر وہی لفظ دوہرائے اور آپ نے بھی جواب کا اعادہ کیا اور اسی طرح تین مرتبہ ہوا۔ چوتھی مرتبہ فرشتہ نے کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ الخ۔ تو اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو سکھایا کہ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کس طرح پڑھا جاتا ہے۔ بسم اللہ کی ابتدا: چنانچہ بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد دوسری وحی جو نازل ہوئی وہ یہی تھی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سورت کے آخر تک۔ گویا اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو تعلیم دی کہ وہ خدا کی مدد کس طرح طلب کیا کرے۔ بسم اللہ سے کام میں برکت ہوتی ہے: اور ایک حدیث میں ارشاد نبوی یوں ہے کل أمر لا یُبدأ فیه ببسم الله الرّحمٰن الرّحیم فهو أجذم یعنی ہر ایک کام جسے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے اور یقیناً جو شخص اپنے کاموں میں اللہ تعالیٰ سے استعانت کا طالب ہوگا اسے برکت ملے گی۔

ع۱ با: بِسْمِ اللہ میں با استعانت کے لیے ہے یعنی اللہ کے نام کی مدد چاہتا ہوا پڑھتا ہوں اور یہ اِقْرَاْ کی تعمیل ہے (العلق ۹۶-۱)

اسم: اسم۔ سم سے ہے جس کے معنی بلندی ہیں پس اسم وہ ہے جس سے مسمّٰی کا ذکر بلند ہو اور وہ اس سے پہچانا جائے (غ) جوہر اور غرض یا ذات وصفات دونوں پر اس کا استعمال ہے۔ اللہ اسم ذات ہے اور الرحمٰن الرحیم صفاتی نام ہیں گویا پڑھنے والا اللہ کی صفات رحمانیت و رحیمیت کی مدد چاہتا ہے۔

اللہ اسم اعظم: اللہ باری تعالیٰ کا اسم ذات ہے اور یہی اسم اعظم ہے اور کل اسمائے الٰہی کے لیے یہ اسم جامع ہے۔ یہ اَلَهَ سے مشتق نہیں نہ اس کا اصل اِلٰه ہے کیونکہ اِلٰه غیر اللہ معبود پر بولا جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ کا لفظ نہ اسلام میں اور نہ اسلام سے پہلے کبھی دوسرے معبود پر بولا گیا ہے۔ نہ یہ اَلْاِلٰه کا مخفف ہے کیونکہ یَا اللّٰهُ کہا جاتا ہے یا الالٰه یا یَا الرَّحْمٰن نہیں کہا جاتا۔ پس اَلْ اس میں زائد نہیں۔ عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں اللہ کا اسم ذات موجود نہیں۔

الرحمٰن الرحیم فعلان اور فعیل کے مبالغہ میں فرق: اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ دونوں رَحِمَ سے مشتق مبالغہ کے صیغے ہیں۔ ایک فَعْلان کے وزن پر دوسرا فعیل کے۔ فَعْلان کا مبالغہ امتلا اور غلبہ کے لیے ہوتا ہے یعنی صفت کی زیادتی کے لیے فَعِیل کا مبالغہ تکرار کے لحاظ سے ہوتا ہے یعنی صفت کے بار بار تکرار سے (ح) اور بعض نے یوں فرق کیا ہے کہ رحمٰن کا لفظ اس صفت پر دلالت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات میں قائم ہے اور رحیم اس صفت پر جو اس شخص کے تعلق سے پیدا ہوتی ہے جس پر رحم کیا گیا پس رحمان وہ ذات ہے جس کا رحم بہت ہی بڑا ہے یہاں تک کہ انسان کی پیدائش سے پہلے وہ انسان کے لیے سامان مہیّا کرتا ہے اور یہ صفت مومن اور کافر دونوں پر حاوی ہے اور رحیم وہ ذات ہے جس کا رحم بار بار عود کرتا ہے اور یہ صفت اس شخص کے فعل پر ظہور پذیر ہوتی ہے (اور ہر فعل پر بار بار ظہور پذیر ہوتی ہے) جس پر رحم کیا گیا۔

رحمان دنیا۔ رحیم آخرت: اسی لیے حدیث میں آتا ہے دنیا کا رحمان، اور آخرت کا رحیم۔ کیونکہ رحمٰن نے انسان کی پیدائش سے پہلے محض اپنے رحم سے اس کے لیے سارے سامان پیدا کیے اور رحیم انسان کے صالح اعمال پر جزا دینے والا ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے گویا ابتدا میں جو سامان انسان کے لیے مہیّا کرتا ہے وہ رحمٰن ہے اور ان سامانوں سے فائدہ اٹھانے پر جب انسان کوشش صرف کرتا ہے تو اس کا نتیجہ دینے والا رحیم ہے۔ زمین، پانی، آگ وغیرہ کا پیدا کرنا صفتِ رحمانیّت کا تقاضا ہوا زمین میں ہل چلا کر پانی دے کر انسان ایک دانہ کا سو بنا لیتا ہے یہ تقاضائے رحیمیت ہے اسی طرح شرائع کا دینا نبوّت کا عطا کرنا صفتِ رحمانیّت کا تقاضا ہے۔ ان شرائع پر عمل کر کے فلاح حاصل کرنا صفتِ رحیمیّت کے ماتحت ہے۔ اسی لیے قرآن کا آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کو سکھانا بھی اَلرَّحْمٰن کا کام ہے۔ الرحمٰن علّم القرآن۔

رحمان غیر اللہ پر نہیں بولا جاتا: رحمان اللہ سے مخصوص ہے غیر پر نہیں بولا جاتا اور رحیم پر بولا جاتا ہے۔ بالمؤمنین رؤف رحیم (التوبہ ۹-۱۲۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا ہے۔

ع۲ ال۔ حمد: اَلْحَمْدُ میں اَلْ استغراقی ہے یعنی سب محامد یا ہر جنس کی حمد مراد ہے۔ حَمْد وہ تعریف ہے جو فضیلت کی وجہ سے کی جاتی ہے یعنی ان خوبیوں کی وجہ سے جو دوسرے کو مسخر کر لیتی ہیں۔ حمد مدح شکر میں فرق: مدح وسیع ہے کیونکہ مدح اختیار سے بھی کی جاتی ہے اور تسخیر سے بھی اور شکر کسی خاص نعمت کے مقابل پر ہونے سے اور بھی محدود ہے (غ)

رَبّ۔ اصل مصدر ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نشوونما دینا یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے (غ) اور اسم کے طور پر استعمال ہوا ہے پس ربّ وہ ذات ہے جو تدریجاً ایک چیز کو اپنے کمال تک پہنچاتی ہے۔ یہاں سے مسئلہ ارتقا کی بھی اصلیت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کی رو سے بھی ہر چیز تدریجاً اپنے کمال کو پہنچتی ہے مطلق لفظ ربّ صرف ذات باری پر بولا جاتا ہے دوسرے کی طرف منسوب کر کے اوروں پر بھی بول سکتے ہیں۔ جیسے رَبّ الدّار گھر کا مالک حضرت یوسفؑ کا قول منقول ہے اذکرنی عند ربك (یوسف ۱۲-۴۲) اس کی جمع ارباب آتی ہے ءارباب متفرقون خیر (یوسف ۱۲-۳۹)

عالَم: عَالَمِیْنَ۔ عَالَم کی جمع ہے جو علم سے مشتق ہے۔ کل مخلوق یا موجودات کو عَالَم اس لیے کہا جاتا ہے وہ آلہ ہے جو صانع کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔

مخلوق کی ہر قسم کو بھی عَالَم کہا جاتا ہے ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار سے بھی زیادہ عالم ہیں (ت) کل انسان بھی ایک عَالَم ہیں اور ہر ایک قوم بھی ایک عَالَم ہے ۔ بلکہ ہر زمانہ کے لوگوں کو بھی ایک عَالَم کہا جاتا ہے (ج) اس لیے جہاں بعض انسانوں یا قوموں کو عالمین پر فضیلت دینے کا ذکر ہے وہاں مراد اس زمانہ کے لوگ ہیں ۔ یہاں مراد جمع لانے سے موجودات کی سب اقسام کو شامل کرنا ہے ۔

الحمد میں رضا بالقضا کا سبق : اسلام کی تعلیم کی ابتدا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے ہوتی ہے ۔ جس میں انسان کو رضا بالقضا کا اعلیٰ سے اعلیٰ سبق سکھایا گیا ہے کیونکہ یہ وہ سورت ہے جس کو مسلمان دن میں پانچ نمازوں میں کئی کئی بار پڑھتا ہے اور راحت میں ہو یا تکلیف میں اس کے مُنہ سے حمد اور شکر کے کلمات ہی نکلتے ہیں ۔ قلب نبوی کی وسعت : اس سے نبی کریم صلعم کے قلب مبارک کی بھی کیفیت معلوم ہوتی ہے جس پر اس وحی کا نزول ہُوا ۔ آپ کے دل میں اس قدر حمدِ الٰہی بھری ہوئی تھی کہ کسی حال میں خدا کی شکایت کا وہم بھی آپ کے دل میں نہ آسکتا تھا صبحُ اٹھتے ہیں تو حمد ۔ دوپہر کو حمد سہ پہر کو حمد ۔ غروب آفتاب پر حمد ۔ رات کو سوتے وقت حمد ۔ رات کو اُٹھ کر حمد ۔ آپ کا سینہ حمدِ الٰہی سے لبریز تھا ۔

احمد : اسی حمد کی وجہ سے جو آپ نے سب انبیاء سے بڑھکر کی آپ کا نام احمد ہُوا جو آپ سے پہلے کسی انسان کا نام نہیں ہُوا ۔ محمد : اور جب آپ نے سب سے بڑھ کر خالق کی حمد کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی مخلوق سے سب سے بڑھ کر آپ کی حمد کرائی اور اس لیے آپ کا نام محمدؐ ہوا صلّی اللہ علیہ وبارک وسلّم ۔

اسلام کی تعلیم کی وسعت پر یہ دلالت ہے کہ اس کی ابتدا ہی تمام جہانوں کی ربوبیّت سے ہوتی ہے نہ ایک قوم کی ۔ وحدت نسل انسانی : اس ایک فقرہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں جہاں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی نسل انسانی کی وحدت بھی بیان کردی ۔ رب العالمین کا لفظ اختیار کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اگر پہلے متفرق طور پر نسل انسانی کی روحانی ربوبیّت ہوتی رہی تو اب ان سب کی ربوبیّت ایک ہی نبی کے ذریعہ سے ہو گی ۔ کیونکہ یہاں دبکم یا رب المسلمین یا اور کوئی ایسا لفظ اختیار نہیں کیا ۔ جس سے تفرقہ پیدا ہوتا ہو ۔ ضرورت وحی : پھر رب العالمین میں وحی الٰہی کی ضرورت کی طرف بھی صاف اشارہ ہے کیونکہ اسم رب کا تقاضا ہے کہ ہر مخلوق کو اپنے کمال کو پہنچائے مگر انسان کا حقیقی کمال صرف جسم کی پرورش تک محدود نہیں بلکہ وہ اخلاق سے ہے ۔ پس جس طرح جسم کے کمال کے لیے عالم جسمانی میں خارجی سامان ربّ نے پیدا کیے ہیں ضروری ہے کہ روحانی کمال کو حاصل کرنے کے لیے خارجی سامان عالم روحانی میں موجود ہوں یہی وحی الٰہی ہے ۔ اسی چھوٹے سے فقرہ میں یہ عظیم الشان سبق بھی ہے کہ استحقاق حمد ربوبیّت سے پیدا ہوتا ہے ۔ مخلوق کی خدمت کا سبق : پس وہی انسان قابلِ حمد ہو گا جو دوسرے انسانوں کی خدمت گزاری کرے اور وہ بھی صرف اپنے عیال یا خاندان یا قوم کی نہیں بلکہ سب قوموں کی بلکہ انسانوں کو چھوڑ کر دوسری مخلوق کی بھی ۔

ربّ اور اَب : یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ جہاں دوسرے مذاہب نے خدا تعالیٰ کو اَب یا باپ کرکے پکارا ہے ۔ قرآن کریم نے دعاؤں میں لفظ ربّ اختیار کیا ہے، کیونکہ ربّ کا تعلق اپنی مخلوق سے اس سے بہت بڑھ کر ہے جو باپ کا تعلق بیٹے سے ہے ۔ دعاؤں میں ربنا کا استعمال : قرآنی دعائیں عموماً رَبَّنَا سے شروع ہوتی ہیں، گویا ہر دعا کا مقصد انسانوں کا کمال حقیقی تک پہنچنا ہے کیونکہ ربّ وہ ہے جو ہر شے کو اس کے کمال تک پہنچاتا ہے مگر اَب انسان کو اس کے کمال تک نہیں پہنچاتا پس خدا کو اَب کرکے پکارنا بہت ادنیٰ مرتبہ ہے ۔

ع۳ مالک اور مَلِك یعنی بادشاہ میں فرق یہ ہے کہ مَلِك صرف بعض امور میں متصرف ہوتا ہے مالك اپنی مِلک پر پُورا تصرف رکھتا ہے ۔ کیونکہ حرف کے بڑھنے سے معنی میں قوت بڑھ جاتی ہے ۔ دوسرا مَلِك کا لفظ صرف انسانوں کی سیاست سے مخصوص ہے یعنی وہ جو جمہور میں امر و نہی کا تصرف رکھتا ہو جو ایک محدود تصرف ہے مَلِكِ النّاس کہا جاتا ہے اشیاء کا یا یوم الدّین کا مَلِك نہیں ہوگا مالِك ہو گا ۔

یَوْم ۔ سے عموماً مراد وہ وقت ہے جو طلوع آفتاب سے غروب تک ہے لیکن اکثر اس سے مراد زمانہ کی کوئی مدّت ہوتی ہے خواہ وہ بہت ہی کم ہو یا بہت ہی زیادہ (غ) چنانچہ کل یوم ھو فی شان (الرحمٰن ۵۵-۲۹) میں یوم سے مراد ایک آن ہے اور فی یوم کان مقدارہٗ خمسین الف سنۃ (المعارج ۷۰-۴) میں ایک یوم پچاس ہزار سال کا فرمایا ۔

دِین کے اصل معنی جزا ہیں (غ) بخاری میں ہے الدین الجزاء فی الخیر والشر یعنی یہاں دین سے مراد نیکی بدی کا بدلہ ہے ۔ بطور استعارہ دِین کا استعمال شریعت پر ہوتا ہے ۔ گویا شریعت کی تابعداری کا نام دِین ہے ۔

پس مالك یوم الدّین کے معنی ہوئے جزا و سزا کے وقت میں مالک ۔ جزا و سزا کا ایک عظیم الشان وقت وہ ہے جو قیامت یا محشر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ جزا و سزا اس عالم میں بھی ہے : مگر ایک رنگ جزا و سزا کا اس عالم میں بھی جاری ہے اور قرآن کریم کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کی جزا و سزا ایک کھلا کھلا رنگ ان نتائج کا ہے جو فی الحقیقت ہر فعل کے ساتھ ساتھ ہر آن یہاں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ مگر وہ نظر انسانی سے بسا اوقات مخفی رہتے ہیں ۔ بعض وقت بطور نمونہ ظاہر بھی ہو جاتے ہیں ۔

مالکیت میں گناہوں کی معافی کی طرف اشارہ : مالِك کا لفظ بجائے مَلِك کے اس لیے اختیار فرمایا کہ مَلِك محض ایک محدود اختیارات کا حاکم ہے جو فریقین میں انصاف کے لیے مامور ہے وہ کسی مجرم کو چھوڑ نہیں سکتا ۔ لیکن مالک کو اختیار ہے جسے چاہے معاف بھی کردے اس میں کفارہ اور تناسخ کا ابطال ہے کیونکہ ان دونوں کی رُو سے خدا گناہ کو معاف نہیں کرسکتا بلکہ سزا دینے کے لیے مجبور ہے یہ عقیدہ کس قدر خلاف واقعات ہے ایک نوکر کا آقا یا مالک جو حقیقت میں مالک نہیں اس کا گناہ معاف کرسکتا ہے مگر خدا جو مستجمع جمیع صفاتِ کاملہ ہے وہ معاف نہیں کرسکتا ۔ اور اگر معافی کی خواہش انسان میں ہے تو خالق میں کیوں نہیں ۔ جو صفت خالق میں نہ ہو وہ مخلوق میں نہیں ہو سکتی ۔

ع۴ نَعْبُدُ ۔ عَبُوْدِیَّۃ اظہار تذلّل کا نام ہے اور عِبادۃ اس سے بلیغ تر ہے یعنی انتہا درجہ کے تذلّل اور انکساری کا نام ہے اور اس کا حقدار صرف وہی ہو سکتا ہے جس کی فضیلت انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی ہو ۔ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے سوائے دوسرے کی عبادت جائز نہیں (غ) یا عبادت وہ طاعت ہے جس کے ساتھ

خضوع یعنی عاجزی ہو (ت) پس عبادت اصل میں یہ ہے کہ اپنے آپ کو پوری عاجزی کے ساتھ خدا تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری میں لگا دے۔ عبادت مقصدِ زندگی ہے: عبادت کو انسان کی زندگی کی غرض فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات ۵۱-۵۶) کیونکہ انسان اپنے کمال کو نہیں پا سکتا جب تک کہ اپنے قویٰ کو اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری میں نہ لگا دے۔ عبادت انسان کی اپنی بہتری کے لیے ہے اللہ تعالیٰ کی ذات غنی ہے اس کو نہ کسی کی عبادت سے فائدہ پہنچتا ہے نہ عدمِ عبادت سے نقصان۔

نَسْتَعِيْنُ۔ استعانۃ کے معنی ہیں طلب عون یعنی مدد چاہنا۔

عبادت استعانت پر مقدم ہے: جب اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا ذکر ہوا تو انسان بے اختیار بول اُٹھتا ہے کہ ہم اپنی طاقتوں کو ایسی ذات کی کامل فرمانبرداری میں لگاتے ہیں اور اس کے سوائے کسی دوسرے کی عاجزانہ فرمانبرداری اختیار نہیں کر سکتے اور اس کے ساتھ ہی انسانی رُوح اپنے عجز کا اعتراف کرتی ہوئی پکارتی ہے کہ اے خدا منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے تیری ہی مدد بکار ہے تو ہماری کمزوریوں کی اصلاح فرما اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہم کو منزلِ مقصود تک پہنچا۔ فطرتِ انسانی میں عبادت کی استعداد موجود ہونے پر ہم اِیَّاکَ نَعْبُدُ کہتے ہیں اور عملاً محتاجِ اعانت ہونے پر اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی خواہش موجزن ہوتی ہے جب تک انسان عبادت نہیں کرتا اپنے قوائے فطری کو کام میں نہیں لگاتا اس وقت تک وہ مدد کا مستحق بھی نہیں ہوتا۔

ع۵ اِهْدِنَا۔ ھدایۃ کے معنی ہیں الرشاد والدلالۃ بلُطف الی ما یُوصِل الی المطلوب (ت) یعنی لُطف کے ساتھ لے جانا اور رہنمائی کرنا اس کی طرف جو مطلوب یعنی منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ ہدایت چار طرح پر ہے: امام راغب نے ہدایت کو چار طرح پر بیان کیا ہے۔ اوّل فطری ہدایت ہے جو عام ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو خلق کے ساتھ ہی دے دی ہے اعطیٰ کل شئ خلقہ ثم ھدی (طٰہٰ ۲۰-۵۰) یا فرمایا والذی قدر فھدیٰ (الاعلیٰ ۸۷-۳) یہ ہر چیز کی فطرت میں موجود ہے دوسری وہ ہدایت ہے جو انسانوں کو نبیوں کے ذریعہ سے ملتی ہے۔ یعنی انبیاء کی دعوت الی الحق۔ جعلنا منھم ائمۃ یھدون بامرنا (السجدۃ ۳۲-۲۴) انبیاء ایک راستہ دکھا دیتے ہیں۔ اِنّا ھدیناہ السّبیل اِمّا شاکراً و اِمّا کفوراً (الدھر ۷۶-۳) تیسری ہدایت وہ توفیق ہے جو اس شخص سے خاص ہے جو ہدایت پا گیا۔ یہ سب انسانوں کے لیے عام ہے جس کے لحاظ سے قرآن شریف کو ھدی للناس فرمایا (البقرۃ ۲-۱۸۵) والذین اھتدوا زادھم ھدی (محمّد ۴۷-۱۷) ومن یومن باللہ یھد قلبہ (التغابن ۶۴-۱۱) چوتھی ہدایت جنت ہے (یعنی منزلِ مقصود تک پہنچا دینا) جیسے سیھدیھم ویصلح بالھم (محمّد ۴۷-۵) یا جیسے یہاں یا ھدی للمتقین میں جیسا کہ تاج العروس سے شروع میں حوالہ دیا گیا ہے۔

المستقیم۔ وہ راہ ہے جو ایک سیدھے اور ہموار خط پر ہو اور اس سے طریقِ حق کو تشبیہ دی گئی ہے (غ)

دعائے فاتحہ کا مقصد: معترض کہتا ہے کہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعا کرنے والے کو تا حال گمراہ ثابت کرتی ہے اس نے پہلے الفاظ پر غور نہ کیا۔ یہ دعا کرنے والا تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کو پہچان چکا۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کہہ کر اپنے قویٰ کو خدا کی کامل فرمانبرداری میں لگا چکا اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے ذریعہ اپنی کمزوری کو دور کرنے کی مدد اللہ سے طلب کر چکا: وان اعبدونی ھذا صراطٌ مستقیم (یٰس ۳۶-۶۱) میری عبادت کرو یہ صراطِ مستقیم ہے۔ پس اِیَّاکَ نَعْبُدُ کہنے والا صراطِ مستقیم پر تو ہے اس لیے ان الفاظ میں اس راہ پر قائم رہنے کی دعا مانگتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ اسی راہ پر چلتا رکھے اور راہ کو پا لینے کے بعد اس کا قدم نہ ڈگمگائے اور نہ سُست ہو۔ یہاں تک کہ وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے جیسا کہ ھدایت کے معنی سے ظاہر ہے۔ اصل مقصد اس دعا کا اس اعلیٰ منزل پر پہنچنا ہے جس کی تشریح آگے آتی ہے اور جس کی طرف ایک طرف رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور دوسری طرف اِهْدِنَا میں اشارہ ہے یعنی کمالِ انسانی کا معراج پس اصل مطلب یہ ہے کہ اے خدا ہمیں سیدھی راہ پر چلاتے رہیو یہاں تک کہ ہم اس کمال کو حاصل کر لیں جو انسان کی ترقی کی اصل منزلِ مقصود ہے۔ مقامِ عصمت سے اوپر کمالِ انسانی کا حصول ہے ـــ اس دعا میں انسان کے سامنے وہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر وہ پہنچ سکتا ہے اور مذہب تو صرف گناہوں کی معافی کی دعا سکھانے تک رہ گئے۔ اسلام نہ صرف گناہوں سے بچنے، لغزشوں سے محفوظ رہنے اور یوں مقامِ عصمت یا محفوظیت پر پہنچنے کی دعا سکھاتا ہے بلکہ اس سے بھی بہت آگے کمالِ انسانی پر پہنچنے کی یہ دعا ہے جس کے برابر کوئی دُعا کسی آسمانی کتاب میں نہیں۔ بلکہ خود قرآن شریف کی دعاؤں میں بھی یہ دعا سب سے افضل ہے۔

ع۶ اِنعام کے معنی ہیں انسان کو احسان پہنچانا غیر ناطق پر یہ لفظ نہیں بولا جاتا مثلاً یہ نہیں کہا جائے گا کہ میں نے اپنے گھوڑے پر انعام کیا (غ)

منعم علیہم کون ہیں: اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے کون مراد ہیں۔ قرآنِ کریم خود تشریح فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (النسآء ۴-۶۹) یعنی وہ انبیاء اور صدّیق اور شہید اور صالح ہیں۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے لے کر تمام مفسّرین نے قبول کی ہے۔ پس ثابت ہُوا کہ اھدنا کی دعا کرنے والا اعلیٰ سے اعلیٰ منازل پر پہنچنے کی دعا کرتا ہے جہاں نبی صدیق شہید صالح پہنچے وہیں ہر مسلم پہنچنے کی تڑپ اپنے اندر رکھتا ہے۔ عیسائیوں کی مشہور خداوند کی دعا میں گناہوں کی معافی کی التجا ہے۔ اسلام کس مقام پر پہنچاتا ہے: یہاں نہ صرف اس مقام کی دعا ہے کہ انسان سے گناہ ہی سرزد نہ ہو، بلکہ اس مقام پر پہنچنے کی دعا ہے جہاں بڑے بڑے برگزیدگان الٰہی پہنچے۔ یعنی بڑی بڑی خدمات کے بجا لانے اور بڑے بڑے کمالات کے حاصل کرنے کا اعلیٰ مقام یا اعلیٰ سے اعلیٰ مقام جس پر کوئی انسان پہنچا ہو۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دعا روپیہ، مال، مرتبہ کے ملنے کے لیے نہیں۔ کمالات، معرفت، محبّت کے حصول کے لیے ہے۔

انعمت علیہم میں مقامِ نبوت کی دعا نہیں: یہاں نبی کا لفظ آ جانے سے بعض لوگوں کو یہ ٹھوکر لگی ہے کہ خود مقامِ نبوت بھی اس دعا کے ذریعہ سے مل سکتا ہے اور گویا ہر مسلمان ہر روز بار بار مقامِ نبوت کو ہی اس دعا کے ذریعہ سے طلب کرتا ہے۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے۔ نبوّت موہبت ہے: اس لیے کہ نبوت محض موہبت ہے اور نبوت میں انسان کی جدوجہد اور اس کی سعی کو کوئی دخل نہیں۔ ایک وہ چیزیں ہیں جو موہبت سے ملتی ہیں اور ایک وہ جو انسان کی جدوجہد سے ملتی ہیں۔ نبوت اوّل میں سے ہے جیسا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ سے بھی ظاہر ہے۔ دنیا میں کوئی شخص کوشش کرے اور دعائیں مانگ مانگ کر اور خدا سے التجائیں کر کے نہ پہلے نبی بنا نہ آئندہ بنے گا۔ بلکہ خود اللہ تعالیٰ اَللّٰہُ اعلم حیث یجعل رسالتہ کے ماتحت جب چاہتا کسی کو نبوت و رسالت کے منصب پر کھڑا کر دیتا تھا یہاں تک کہ اپنی کامل ہدایت کی راہیں آنحضرت صلعم پر کھول کر تمام آنے والی نسلوں کے لیے مقامِ نبوت و رسالت کو ایک برگزیدہ انسان کے نام کے ساتھ مخصوص کر دیا اور اس کو النبی اور الرسول کے نام سے

پکار کر بتا دیا کہ اب دُوسرا نبی اور رسول نہیں ہو گا کیونکہ اگر دوسرا نبی بھی آجائے تو یہ الفاظ مشتبہ ہو جائیں پس مقامِ نبوت کے لیے دعا کرنا ایک بے معنی فقرہ ہے اور اسی شخص کے مُنہ سے نکل سکتا ہے جو اصول دین سے ناواقف ہے۔

کن کمالات کی دعا ہے: ایسے بھی لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ اس دعا میں حصولِ بادشاہت کی دعا ہے کیونکہ بادشاہت کو بھی اللہ تعالےٰ نے اپنا انعام قرار دیا ہے (المائدہ۵-۲۰) اور بعض نے اسے اور بھی وسیع کر کے دنیا کے تمام امور میں صراطِ مستقیم کی دعا قرار دیا ہے۔ادنیٰ تدبّر سے کام لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ سب باتیں دعا کے اصل مقصد سے دور ہیں۔بیشک بادشاہت ایک انعام ہے۔مال و دولت بھی ایک انعام ہے، مگر یہ وہ انعامات ہیں جن میں نیک و بد شریک ہیں۔بادشاہت ایک انعام ہے مگر ہر ایک بادشاہ منعم علیہ نہیں، دولت ایک انعام ہے مگر ہر دولتمند منعم علیہ نہیں۔اور یہاں منعم علیہم کی راہوں کا ذکر ہے نہ خاص خاص انعامات کا مطالبہ۔پھر منعم علیہم کے مقابلہ پر مغضوب علیہم اور ضالین ہیں جو دولت اور بادشاہت سے محروم نہیں اور نہ دنیا کے کاموں کو سرانجام دینے سے محروم ہیں بلکہ نیکی سے محروم ہیں، اخلاق فاضلہ سے محروم ہیں۔دعا صرف اس قدر ہے کہ جن راہوں پر نیک بندے چلتے رہے انہی راہوں پر چلنے کی ہمیں بھی توفیق دے بالفاظ دیگر یہ کہ ہمیں انبیاء شہدا، صلحاء کے نقشِ قدم پر چلا۔اس دعا کے مقابل پر امور دنیا کی خواہشات ایک نہایت پست مقام ہے۔

اگر دعا حصول نبوّت ہے تو امّت کی محرومی لازم آتی ہے: اگر یہ دعا نبوّت کے حاصل کرنے کے لیے ہوتی تو کم از کم آنحضرت صلعم کو ہی مقامِ نبوّت پر کھڑا ہونے سے پہلے سکھائی جاتی۔مگر قرآن کریم میں اس کا موجود ہونا بتاتا ہے کہ مقام نبوت ملنے کے بعد سکھائی گئی۔نبوت عطا فرما کر اس دُعا کا سکھانا صاف بتاتا ہے کہ حصول نبوت کے لیے یہ دعا نہیں۔اور اگر حصول نبوت کی دعا مانا جائے تو ماننا پڑے گا کہ تیرہ سو سال میں کسی مسلمان کی دعا قبول نہ ہوئی حالانکہ مقربین اور محبوبین الٰہی تو ہزاروں کی تعداد میں ہو گزرے۔خدا خود دعا سکھائے اس کی غرض یہ ہو کہ دعا مانگنے والے کو نبوت ملے، دعا کرنے والی اُمّت کو خیرِ اُمّۃ کہا جائے اور پھر تیرہ سو سال سب کے سب محروم رہیں حتّٰی کہ وہ بھی جن کے متعلق صریح سند ہے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔یہ نہیں ہو سکتا۔

ع۲۷ المغضوب علیہم۔غضب کے اصل معنی ہیں سزا کے ارادہ سے خون کا جوش مارنا (غ) اور حدیث میں غضب سے بچنے کی تاکید ہے اور اس کو قلب ابن آدم میں ایک انگارا قرار دیا گیا ہے۔غضب الٰہی: مگر چونکہ اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہے اس لیے جب اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ لفظ بولا جائے تو جو حصّہ جسم سے تعلق رکھتا ہے یعنی ثوران دم یا خون کا جوش مارنا۔وہ مراد نہیں ہوتا بلکہ صرف اصل غرض باقی رہ جاتی ہے جو ارادۂ سزا ہے اور یہی حالت تمام الفاظ کی ہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں کہ ان میں وہ حصّہ جو جسم سے تعلق رکھتا ہے باقی نہیں رہتا تفصیل کے لیے دیکھو ع۲۷ پس مغضوب علیھم وہ لوگ ہوئے جن کے متعلق ارادۂ الٰہی سزا کا ہوُا۔

ع۲۸ الضالّین۔ضالّ۔ضلال سے اسم فاعل ہے اور اس کے عام معنی ہیں سیدھی راہ سے ہٹ جانا عمداً ہو یا سہواً (غ) اور یہ ھدیٰ کے مقابل پر ہے اس لیے اس کے معنی یوں بھی کیے گئے ہیں سلوک طریق لا یوصل الی المطلوب (ت) ایسی راہ پر چلنا جو مطلوب تک نہیں پہنچاتی پس ضالّین وہ لوگ ہوئے جو سیدھی راہ سے ہٹ گئے۔یا ایسی راہ پر چل پڑے جو مطلوب تک نہیں پہنچاتی۔ضلال اور اضلال کے اور معانی اپنے اپنے موقعہ پر آئیں گے۔

مغضوب علیہم اور ضالین کون ہیں: اس آیت میں کن لوگوں کا ذکر ہے؟ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ مغضوب علیھم یہود ہیں اور ضالّین عیسائی۔اور ایک حدیث میں جس کو ترمذی نے حسن غریب کہا ہے یہی معنی آنحضرت صلعم سے مروی ہیں۔یہود کی صفات غالب جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے یہ ہیں کہ انہوں نے انبیاء کے بارہ میں تفریط کی راہ اختیار کی یعنی عموماً انبیاء کی تکذیب کرتے رہے اور ان کے قتل کے در پے رہے اور شریعت کے احکام کی نافرمانی کی یعنی ان پر عمل نہ کیا۔چنانچہ بنی اسرائیل کے ذکر کے شروع میں ہی آتا ہے۔وبآءُ بالغضب من اللّٰہِ ذٰلک بانّہم کانوا یکفرون بآیات اللہ ویقتلون النّبیّین بغیر الحق ذٰلک بما عصوا وکانوا یعتدون۔وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے اس لیے کہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھتے تھے (البقرۃ۲-۶۱) پس انبیاء کا انکار، تکذیب اور احکام الٰہی کی نافرمانی یہ وہ تفریط کی راہیں ہیں جن کی وجہ سے یہود پر غضب الٰہی آیا۔باوجودیکہ وہ پہلے ایک ایسی قوم تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا۔اور مسلمان کو جب یہ دعا سکھائی گئی کہ اس کا قدم مغضوب علیہم کی راہ پر نہ پڑے تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ وہ ان تفریط کی راہوں سے بچے اور عیسائیوں کی صفاتِ غالب جن کی وجہ سے وہ طریق مستقیم سے پھر گئے قرآن کریم میں غلو اور افراط بیان کی گئی ہیں یعنی ایک نبی کو خدا بنا لینا جیسا کہ فرمایا یآھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم غیر الحق ولا تتبعوا اھوآء قوم قد ضلّوا من قبل واضلّوا کثیرا وضلّوا عن سوآء السبیل (المائدہ۵-۷۷) اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو پہلے گمراہ ہو گئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھے رستہ سے بھٹک گئے۔گویا اب مسلم کی دعا یوں ہوئی اے اللہ ہم کو سیدھا رستہ دکھا ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے انعام کیا اور ان لوگوں کے رستہ پر چلنے سے بچا جو بوجہ تفریط غضب الٰہی کے نیچے آئے اور ان کے بھی جو بوجہ افراط و غلو گمراہ ہو گئے۔بالفاظ دیگر اس صراطِ مستقیم پر چلا جو تفریط و افراط سے تکذیب و غلو سے پاک ہے۔یہ معنی بر بنائے قرآن و حدیث ہیں۔حقوق میں تفریط و افراط: مگر یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ تفریط و افراط تمام حقوق میں ہو سکتی ہے۔اگر ایک نبی کا انکار تفریط اور اس کا خدا بنانا افراط ہے تو ہر ایک حق کا انکار یا اس کا ادا نہ کرنا تفریط ہے اور ہر ایک حق کو اپنے مرتبہ سے بڑھانا اور اس قدر اس پر زور دینا کہ دوسرے حقوق کی فرو گزاشت کا موجب ہو جائے افراط ہے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ یہود عملی رنگ میں نافرمان ہوئے یعنی شریعت کے مانتے ہوئے پھر اس پر عمل نہ کیا اور عیسائی علمی رنگ میں بھٹک گئے کہ ایک انسان کو خدا بنا لیا۔

عملی اور علمی غلطیوں سے بچنے کی دعا: پس یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اے خدا ہم کو یہود کی سی عملی اور نصاریٰ کی سی علمی غلطیوں سے بچا۔کیونکہ انسان اپنے کمال حقیقی کو نہیں پہنچتا جب تک دونوں پہلو عمل اور علم کے صحیح نہ ہوں۔

آمین: سورہ فاتحہ کے آخر پر آمین کا پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالّین کہے تو تم آمین کہو (بخاری)۔آمین اسم فعل ہے اور اس کے معنی ہیں اِسْتَجِبْ یعنی اے اللہ ہماری دعا کو قبول فرما۔

(٢) سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ

اٰیاتھا ٢٨٦ — رکوعاتھا ٤٠

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○ اللہ بے انتہا رحم والے، بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

نام | اس سورت کا نام البقرۃ اس تذکرہ سے لیا گیا ہے جو بنی اسرائیل کو ایک گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیئے جانے کے متعلق اس سورت کے آٹھویں رکوع میں کیا گیا ہے چونکہ اس سورت میں خاص طور پر یہودیوں کا ذکر ہے اور یہود میں جن کو اللہ تعالیٰ ایک موحد قوم بنانا چاہتا تھا۔ گائے کی پرستش کا مرض مصر میں رہ کر پیدا ہو چکا تھا۔ اس لیے گائے کے ذبح کا تذکرہ اس سورت کے اہم ترین مضامین میں سے ایک مضمون ہے۔

خلاصۂ مضمون | اس سورت کا خلاصۂ مضمون یہ بتایا ہے کہ مسلمان کس طرح ایک کامیاب اور زندہ قوم بن سکتے ہیں۔ چنانچہ رکوع (١) سب سے پہلے ان اصول کا ذکر کیا جو اسلام کی بنیاد ہیں اور بتایا کہ جو ان پر عمل پیرا ہونگے وہ کامیاب ہوں گے اور جو ان کی پروا نہ کریں گے دُکھ اُٹھائیں گے (٢) پھر ایک اور گروہ (منافقین) کا ذکر کیا جو منہ سے تسلیم کرتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے (٣) پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر کیا اور اس سے اس کی توحید کے دلائل دیئے اور اس کی عبادت کو ضروری ٹھہرایا (٤) پھر انسان کے کمال کا ذکر فرمایا اور اس کمال تک پہنچنے کی راہ بتائی کہ بغیر نبوّت کے وہ کمالِ حقیقی کو حاصل نہیں کرسکتا (٥) کمال کے بعد گرجانے کے خطرہ سے ڈرایا۔ یہود کا ذکر کیا جو ایک منعم علیہ قوم تھی مگر بوجہ اپنی نافرمانیوں کے رد کی گئی اور ان کو بتایا کہ اب بھی اگر اس نبی کو مان لو جو تمھاری اپنی پیشگوئیوں کے مطابق آیا ہے تو اللہ تعالیٰ تمھیں شوکت و عظمت دے گا (٦تا٩) پھر ان پر جو انعامات کیے اور جو جو نافرمانیاں انہوں نے کیں ان کا ذکر فرمایا اور ضمناً مسلمانوں کو سمجھایا (١٠) پھر بنی اسرائیل کے میثاق اور ان کی خلاف ورزی کا ذکر کر کے مسلمانوں کو سمجھایا کہ وہ ایسی غلطی نہ کریں (١١) پھر بنی اسرائیل کے ان اعتراضوں کا ذکر کیا جو انہیں اسلام پر تھے اور ان کا جواب دیا کہ کیوں بنی اسرائیل میں سے یہ نبی نہیں آیا (١٢) پھر ان کے عداوت میں اور ترقی کرجانے اور آنحضرت صلعم کے خلاف فریبیوں والے منصوبوں کا ذکر کیا (١٣) پھر بتایا کہ اگر پہلی شرائع کو ہم نے منسوخ کیا ہے تو ان سے بہتر شریعت تم کو دے دی ہے۔ اور بتایا کہ نجات تو صرف اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور مخلوق کے ساتھ احسان کرنے سے ملتی ہے نہ برائے نام کسی مذہب کا پیرو ہو جانے سے (١٤) پھر بتایا کہ تھوڑی بہت سچائی ہر مذہب میں ہے مگر اسلام کامل صداقتوں کا مجموعہ ہے (١٥) پھر فرمایا کہ موسیٰ کی پیشگوئی سے اوپر چلو تو ابراہیمؑ کے ساتھ بھی تو یہی وعدہ تھا کہ اس کی اولاد کو برکت دی جائیگی اور وہ اپنی اولاد کے ایک حصّہ کو مکہ معظمہ چھوڑ کر اور وہاں دعائیں کرکے اس میں بتایا گیا تھا کہ آخر رحمتِ الٰہی اس چشمہ سے پھوٹ کر تمام دنیا کو سیراب کرے گی اور کعبہ کو قبلہ قرار دیا۔ (١٦) پھر بتایا کہ اسی ابراہیمی مذہب پر یہود کی تفریط اور نصاریٰ کی افراط سے بچکر یہ نبی کھڑا ہوا ہے (١٧ و ١٨) پھر بتایا کہ جب ابراہیمؑ کی دعاؤں کی صداقت یوں ظاہر ہوئی تو یہ بھی ضروری تھا کہ اس نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قبلہ کعبہ قرار دیا جاتا اور مسلمانوں کو بھی سمجھایا کہ یہ ایک قبلہ تمھارے اتحاد کا مرکز ہے (١٩) پھر بتایا کہ کامیابی کے لیے مسلمانوں کو مال و جان کی بہت سی قربانیاں کرنی پڑینگی۔ ان اصولی باتوں کو طے کر کے اور (٢٠) پھر خدا تعالیٰ کی توحید کے مضمون کو دوہرا کر (٢١ تا ٣١) شریعت کی تفصیلات کی طرف رجوع کیا یہ دکھانے کے لیے کہ یہ شریعت تفصیلات میں بھی ویسی ہی باتیں یا ان سے بہتر باتیں بتاتی ہے جو یہود کی شریعت میں تھیں۔ چنانچہ غذاؤں کے حرام و حلال۔ قصاص۔ وصایا۔ روزوں۔ جنگ، حج، شراب، جُوا، یتامیٰ۔ زناشوئی کے تعلقات، طلاق، بیواؤں کا ذکر کے (٣٢ و ٣٣) پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا کہ جس طرح بنی اسرائیل ایک مردہ قوم تھی جہاد اور کوشش سے خدا نے اسے زندہ کر دیا اسی طرح مسلمانوں کو بھی اب جہاد اور کوشش کرنا ضروری ہے (٣٤) پھر خدا تعالیٰ کے حیّ و قیوم ہونے کا ذکر کر کے یہ اشارہ کیا کہ اب وہ اپنے نام لیواؤں کو زندگی بخشے گا اور انہیں بڑی قوم بنائے گا مگر ان کو اکراہ فی الدّین سے روکا۔ (٣٥) پھر بتایا کہ کیونکر وہ مردہ قوموں کو زندہ کیا کرتا ہے حضرت ابراہیمؑ اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے دو واقعات کا ذکر کیا (٣٦ و ٣٧) پھر کھول کر بتایا کہ اصل جڑ ساری کامیابیوں کی انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اگر اس وقت ایک ایک دانہ ڈالو گے تو کل کو سینکڑوں نہیں ہزاروں اور لاکھوں دانے تمھیں ملیں گے۔ (٣٨) پھر بتایا کہ قربانیاں کر کے جب دولتمند ہو جاؤ تو سود نہ کھانا کیونکہ سود خور قوم آخر تباہ ہو جاتی ہے اور اخلاقِ فاضلہ سے عاری رہتی ہے (٣٩) ہاں ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اپنے حقوق کی خوب نگہداشت کیا کرو اور لین دین کے معاملات کو لکھ لیا کرو (٤٠) اور سب سے آخر سب رسولوں پر ایمان لانے کا تذکرہ کر کے بتایا کہ کامیابی اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک کہ کامل اطاعت نہ کرو اور اس کے ساتھ خدا سے دعائیں نہ مانگو اپنا زور بھی پورا لگاؤ۔ پھر خدا کے حضور بھی گرے رہو تو ہم کافروں کے مقابلہ میں تمہاری نصرت کریں گے۔

سورہ بقرہ کا تعلق سورہ فاتحہ سے | اس سورت کا تعلق ایک تو بلحاظ ترتیب سورۂ فاتحہ سے ہے چونکہ سورۂ فاتحہ میں یہ دعا سکھائی گئی تھی کہ اھدنا الصراط المستقیم تو اس کا ابتدا یوں فرمایا ذٰلک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین گویا یہ اسی دعا کا جواب ہے اور بتایا کہ قرآن کریم وہ صراطِ مستقیم بتاتا ہے۔ اس سورت میں بتایا کہ انعمت علیہم کا گروہ وہ ہے جو ان اصولوں پر عمل پیرا ہوتا ہے جن کا ذکر صدر سورت میں ہے ساتھ ہی مغضوب علیھم یعنی یہود کا تذکرہ بالتفصیل اور ضالّین یعنی نصاریٰ کا مجملاً کیا۔

سورہ بقر کے ابتدا میں رکھے جانے کی وجوہات: لیکن چونکہ سورۂ فاتحہ ساری قرآنی تعلیم کا نچوڑ ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ قرآن شریف کی ابتدا اسی سورۂ بقرہ سے ہوتی ہے اور یہی سچ ہے چنانچہ یہاں شروع میں ہی اس پاک کتاب کی اغراض کو بیان فرما دیا ہے اور اکمل و اتم طور پر وہ باتیں بتادی ہیں جو ایک قوانین کا واضع بطور تمہید بیان کر دیا کرتا ہے۔ کہ اوّل یہ اس خدائے علیم کی طرف سے ہے جو نہ صرف فطرت انسانی اور ضروریات بشری کو جاننے والا ہے بلکہ گزشتہ اور آئندہ کی تمام باتوں کو بھی جانتا ہے۔ پھر یہ ایک کتاب ہے، پراگندہ الفاظ یا منتشر اوراق کا مجموعہ نہیں۔ پھر اس کی غرض ہدایت یا دنیا کو راہِ راست پر لانا ہے۔ **اصول اسلام کی قبولیت اور انکار کے نتائج**: پھر وہ اصول بیان فرما دیئے ہیں جن پر چل کر انسان ہدایت کو پاسکتا ہے اور وہ کل پانچ اصول ہیں۔ تین عقائد کے رنگ میں یعنی ایمان بالغیب (اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ پر ایمان) اللہ تعالیٰ کی وحی پر ایمان۔ اس پر جو نبی کریم صلعم

الٓمّٓ ۚ ①
میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں ۸؎

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ ۚ فِيْهِ ۛ ۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ②
یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں ۹؎ متقیوں کے لیے ہدایت ہے ۱۰؎

پر نازل ہوئی اور اس وحی پر جو آپ سے پہلے انبیاء پر دنیا میں نازل ہو چکی اور آخرت یعنی اعمال کی جزا و سزا پر یقین۔ اور دو عمل کے رنگ میں۔ صلوٰۃ یعنی نماز اور دعا جو حقوق اللہ کا خلاصہ ہے اور انفاق یعنی اپنی قوتوں اور مال کو مخلوقِ خدا کی بھلائی کے لیے خرچ کرنا جو حقوق العباد کا خلاصہ ہے۔ پھر اس کا آخری نتیجہ بتایا کہ وہ کامیاب اور بامراد ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ پہلے رکوع میں بیان فرما دیا اور یہ سورت ابتدا کے لیے ایسی موزون ہے کہ اگر اس کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو دوسری کوئی سورت اس کی جگہ نہیں رکھی جا سکتی۔ کیونکہ اور کسی سورت کی ابتدا میں اس طرح اصولِ اسلامی کو مکمل طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ اس سے قرآن کریم کی موجودہ ترتیب کا منجانب اللہ ہونا صاف ظاہر ہے۔

زمانۂ نزول | اس سورت کا نزول مدینہ میں ہجرت کے بعد ہوا اور اس کا اکثر حصّہ جنگ بدر سے پیشتر کا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ سب سے پہلی سورت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔ بعض آیات کا نزول آنحضرت صلعم کی زندگی کے آخری حصّہ کا ہے۔ اس کی خاص خاص آیات کو مکّی قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ صرف بعض لوگوں کا خیال ہے۔

مدنی سورتوں میں مکّی آیات: گو اس میں شک نہیں کہ بعض سورتوں کا نزول ایک لمبے زمانہ پر ممتد رہا ہے مگر جب تک کوئی صریح اور بیّن شہادت نہ ہو مدنی سورتوں کی بعض آیات کو مکّی اور پہلے کا نازل شدہ قرار دینا غلط طریق ہے۔ ہاں یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ مکّی سورتوں میں بعض آیات ایسی ہوں جو مدینہ میں نازل ہوئی ہوں۔ مگر یہ بھی محض قیاس کی بنا پر قبول نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ کوئی صاف اور واضح شہادت نہ ہو۔ پس جس طرح یہ غلط ہے کہ جو آیت یٰاَیُّھَا النَّاس سے شروع ہوتی ہے وہ مکّی ہے خواہ مدنی سورت میں ہو اور جو یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا سے شروع ہوتی ہے وہ مدنی ہے خواہ مکّی سورت میں ہو۔ اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ جن آیات میں یہود و نصاریٰ کا ذکر یا توریت و انجیل کا نام ہو وہ ضرور مدنی ہیں خواہ مکّی سورت میں ہوں۔

۸؎ الٓمّٓ۔ یہ حروف جو بعض سورتوں کی ابتدا میں آتے ہیں مقطّعات کہلاتے ہیں اور قرآن کریم کی ۲۹ سورتوں کی ابتدا میں آتے ہیں عام طور پر ترجموں میں ان کے معنی نہیں کیے جاتے۔ حالانکہ صحابہ رضؓ سے ثابت ہیں۔ یہ حروف الفاظ کے قائم مقام ہیں اور حروف سے الفاظ کی طرف اشارہ کرنا تمام زبانوں میں مروج ہے آج کل انگریزی میں تو یہ رواج بہت ہی بڑھا ہوا ہے۔ عرب میں بھی یہ دستور تھا چنانچہ اس مصرعہ میں قلت لھا قفی قالت قاف ق کے معنی قد وقفت ہیں یعنی میں ٹھہر گئی۔ اور بھی کئی مثالیں اس کی ہیں مگر عربی میں کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا کہ فلاں حرف سے فلاں لفظ کی طرف اشارہ ہوگا بلکہ سیاق و سباق سے معلوم کیا جاتا تھا۔ اس لیے قرآن کریم میں بھی یہ ضروری نہیں کہ ایک جگہ جو معنی ایک حرف کے لیے گئے ہیں دوسری جگہ بھی وہی ہوں۔ ہاں جو مجموعہ ایک ہی طرح پر آیا ہے اس کا مفہوم ایک ہی ہے جیسے الٓمّٓ کہ اس سورت کے علاوہ پانچ اور سورتوں کی ابتدا میں ہے۔ یعنی آل عمران جو البقرہ کے بعد آتی ہے اور العنکبوت ۲۹۔ الروم ۳۰۔ لقمان ۳۱۔ السجدہ ۳۲ جو چاروں مکّی ہیں اور ترتیب قرآنی میں ایک جگہ ہیں گویا کل چھ سورتوں کے شروع میں الٓمّٓ ہے۔

الٓمّٓ کے معنی حضرت ابن عباس سے انا اللہ اعلم مروی ہیں یعنی میں اللہ بہت جاننے والا ہوں۔

۹؎ ذٰلك: یہ لفظ عموماً اشارہ بعید کے لیے آتا ہے مگر عظمت کے ظاہر کرنے کے لیے بھی لایا جاتا ہے۔ یہاں بلحاظ عظمتِ کتاب ہی بولا گیا ہے دوسری جگہ ھذا کے لفظ سے بھی اشارہ فرمایا ہے۔ جیسے ھذا کتاب انزلناہ مبارك (الانعام ۶۔ ۱۵۵) یا ذٰلك سے اشارہ بعید کتاب موعود کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی وہ کتاب جس کا وعدہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دیا گیا تھا (ر)

الکتاب۔ کتاب مصدر ہے جو کتب سے مشتق ہے جس کے اصل معنی ایک دوسرے کے ساتھ ملانا یا جمع کرنا ہیں اور لکھنے کو بھی کہتے ہیں اس لیے کہ لکھنے میں حرف ایک دوسرے کے ساتھ ملائے جاتے ہیں اور کتاب اصل میں صحیفہ کا نام ہے مع اس کے جو اس میں لکھا گیا (غ) اور کلام اللہ کو کتاب کہا جاتا ہے۔ گو وہ لکھی ہوئی ہو یا نہ (غ) یہ لفظ قرآن شریف پر بھی بولا گیا ہے جیسے یہاں۔ کسی ایک سورت پر بھی پہلی شرائع پر بھی۔ ہر ایک نبی کی وحی پر بھی۔ جملہ انبیاء کی وحی پر بحیثیت مجموعی بھی۔

ریب۔ وہ شک جس کے ساتھ تہمت ہو (ت)

نفی ریب کا دعوےٰ اور اس کی دلیل: یہاں اس کتاب میں ریب کی نفی کی ہے یہ ایک دعویٰ ہے جس کی صداقت کے لیے آگے چل کر فرمایا و ان کنتم فی ریب ممّا نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ اس سے کوئی مخالف آج تک عہدہ برا نہیں ہو سکا۔ اس لیے یہ دعویٰ سچا اور ثابت شدہ قرار پایا۔

۱۰؎ ھدی یہاں بمعنی ہادی ہے یعنی ایسی راہ پر چلانے والی جو منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ دیکھو ۵؎

متقین۔ متقی۔ اِتّقٰی سے اسم فاعل ہے اور اتقی اصل میں اِوْتقی ہے جو وقی یقی سے باب افتعال ہے۔ اور مصدر وِقَایَۃ کے معنی ہیں حفظ الشئ مما یُؤذیہ ویَضُرّہ (غ) ایک چیز کی حفاظت کرنا اس سے جو اس کو ایذا دے اور نقصان پہنچائے اور تقویٰ کے اصل معنی ہیں جَعْلُ النَّفْسِ فِي وِقَايَةٍ مِمَّا يُخَاف (غ) یعنی اپنے آپ کو اس چیز سے بچانا جس کا خوف کیا جاتا ہے اسی وجہ سے اس کے معنی بعض وقت خوف بھی کر لیے جاتے ہیں اور اصطلاح شریعت میں تقویٰ اپنے آپ کو گناہ میں پڑنے سے بچانا ہے حِفْظُ النَّفْسِ عَمَّا يُؤْثِمُ (غ) متقی بروئے حدیث: اور نبی کریم صلعم نے فرمایا لایبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع مالا باس بہ حذرا مما بہ باس یعنی متقی ہونے کو انسان نہیں پہنچتا جب تک کہ ان چیزوں سے بچنے کے لیے جن میں برائی ہے ان چیزوں کو بھی چھوڑ نہ دے جن میں برائی نہیں۔ اور ایک حدیث میں توقہ نفس کے متعلق آتا ہے جس کے معنی ابن اثیر نے یوں کیے ہیں کہ اپنے نفس کو ہلاکت کے لیے پیش مت کرو اور آفات سے اس کی نگہداشت کرو۔ تاج العروس میں ہے کہ توقی اور اتقی کے ایک ہی معنی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ تقوی اللہ کیا چیز ہے یا اتقوا اللہ سے کیا مراد ہے کیونکہ متقی وہی ہے جو تقوی اللہ اختیار کرتا ہے۔ ظاہر ہے

الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ — جو غیب پر ایمان لاتے ہیں [11]

کہ اللہ کوئی ایسی چیز تو نہیں کہ انسان اس سے خائف ہو کر بچے یا اس سے اپنے آپ کو بچائے یا اس سے دُور ہو بلکہ اللہ کی طرف آنا اور اس کا قرب حاصل کرنا تو عین انسانی زندگی کی غرض ہے۔ قرآن شریف میں سورۃ النساء کے شروع میں آتا ہے وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِہٖ وَالۡاَرۡحَامَ اور اللہ کا تقویٰ کرو جس کے واسطہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔ اور رحموں کا تقویٰ کرو۔ ان دو لفظوں کو اکٹھا کر کے قرآن شریف نے تقوی اللہ کے معنی پر روشنی ڈالی ہے۔ ظاہر ہے کہ رحموں کے تقویٰ سے مراد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ رحموں کے حقوق کی حفاظت کرو۔ تقوی اللہ حقوق کی نگہداشت اور متقی حقوق کی نگہداشت کرنے والا ہے: پس اتقوا اللہ کے معنی بھی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ حقوق اللہ کی حفاظت کرو اور متقی وہی ہے جو حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو جو معنی امام راغب نے دیئے ہیں وہ بھی یہی ہیں کیونکہ گناہ میں پڑنے سے انسان اپنے آپ کو اسی طرح بچا سکتا ہے کہ حفاظت حقوق کرے اور کوئی حق تلف نہ ہونے دے اور یہی معنی حدیث میں ہیں۔ کیونکہ نبی کریم صلعم نے متقی اسی کو قرار دیا ہے جو اپنے آپ کو ہر قسم کی برائیوں سے بچاتا ہے (اور بدی کا مفہوم حق تلفی ہے) یہاں تک کہ اگر بُرائی سے بچنے کے لیے کسی ایسے کام کو بھی چھوڑنا پڑے جس میں کوئی بُرائی نہیں تو وہ اسے بھی چھوڑ دیتا ہے پس متقی اپنے آپ کو گناہ یا حق تلفی سے بچانے والا ہے اور اتقوا اللہ کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ حقوق اللہ کی حفاظت کرو اور چونکہ ہر قسم کے حقوق اللہ تعالیٰ نے ہی انسان کے ذمے رکھے ہیں اس لیے تقوی اللہ میں تمام حقوق کی نگہداشت آجاتی ہے اور اگر ڈرنا بھی اس کے معنی کیے جائیں تو خدا سے ڈرنا یا خوف کرنا اس کے عذاب سے ڈرنا یا اس سزا سے ڈرنا ہے جو گناہ پر ملتی ہے۔ پس اصل غرض پھر بھی گناہ سے بچنا ہوئی اور گناہ حقوق اللہ یا حقوق العباد کے ضائع کرنے کا نام ہے۔

قرآن ہدی للمتقین کس معنی سے ہے: یہاں قرآن شریف کو ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ فرمایا یعنی متقیوں کے لیے ہدایت۔ اور دوسری جگہ ھُدًی لِّلنَّاسِ فرمایا (۵ ۱۸) یعنی سب لوگوں کے لیے ہدایت۔ ہدی للناس کس معنی سے: ہدایت کے مختلف معنوں کے لحاظ سے یہ دونوں باتیں درست ہیں دیکھو ۵۔ اس معنی سے سب لوگوں کے لیے ہدایت ہے کہ رستہ سب کو دکھا دیا اور کسی کے لیے کوئی رُک نہیں جو چاہے اسے اختیار کرے جو نہ چاہے نہ کرے اور متقیوں کے لیے اس معنی سے ہدایت ہے کہ ان کو منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

متقی کو ضرورت ہدایت: یہ کہنا کہ جو متقی ہے اسے ہدایت کی ضرورت نہیں لغویات ہے متقی وہی ہے جو اپنے آپ کو حق تلفیوں سے ضرر دینے والی چیزوں سے گناہ سے بچاتا ہے۔ اس کو ضرورت ہے کہ اسے بتایا جائے کہ یہ حقوق تمہارے ذمہ ہیں۔ یہ چیزیں ضرر دینے والی ہیں حصولِ کمال کی یہ راہ ہے۔ ہدایت منجانب اللہ کے بغیر اور محض اپنی جدوجہد سے کوئی انسان کمال کو حاصل نہیں کر سکتا بلکہ اس جدوجہد کے ساتھ منجانب اللہ ہدایت بھی چاہیئے تاکہ وہ اسے روشنی کا کام دے ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ میں دونوں پہلوؤں کو روشن کر دیا۔ انسانی جدوجہد کی بھی ضرورت ہے اور وہ تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا کی طرف سے روشنی کی بھی ضرورت ہے اسی سے منزلِ مقصود حاصل ہوتی ہے جس طرح اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ کہنے والا اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کا اقرار کرنے والا اِھۡدِنَا کی دعا کا محتاج ہے اسی طرح متقی جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا اور دُکھ دینے والی چیزوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کتاب اس نُور کا محتاج ہے تاکہ منزلِ مقصود پر پہنچ سکے۔ متقی کے لیے غیر متناہی ترقی: علاوہ ازیں یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ انسان جس قدر بھی چاہے تقویٰ میں ترقی کرتا چلا جائے ہمیشہ اپنے لیے اس کتاب میں نئی سے نئی روشنی آئندہ ترقیات کے لیے پائے گا۔ کسی مقام پر پہنچ کر یہ کتاب عاجز نہیں ہو جاتی کہ اس سے بڑھ کر کسی درجہ پر پہنچانے کے لیے میرے پاس کوئی سامان نہیں۔ جس طرح ترقی انسانی غیر متناہی ہے۔ اسی طرح اس کتاب کا نور بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔

تقویٰ کمال کے حصول کی پہلی سیڑھی ہے: اور گو یہ سچ ہے کہ خود تقویٰ کے بھی مدارج ہیں اور جو شخص تقویٰ کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتا ہوا اس کتاب سے ہدایت کا طالب ہوتا ہے وہ اس کی آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے تاہم اس آخری منزل کا نام یہاں فلاح اور کہیں صدیقیت اور کہیں شہید کا مرتبہ رکھا ہے۔ تقویٰ یا دکھوں سے اپنے آپ کو بچانا ہی کمال انسانی نہیں بلکہ کمال انسانی کے حصول کی یہ پہلی سیڑھی ہے۔ اس کے مقابل پر وہ لوگ ہیں جو دکھوں اور تکلیفوں سے بچنے کی پروا نہیں کرتے۔ ان کا ذکر آیت ۶ میں ہے۔

ع [11] یومنون۔ ایمان امن سے ہے اور اٰمن کا استعمال دو طرح پر ہے متعدی جیسے اٰمنہ جس کے معنی ہیں میں نے اس کے لیے امن کر دیا۔ اسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا نام المؤمن ہے یعنی امن عطا کرنے والا (اپنے بندوں کو) ایمان کا دوہرا مفہوم: اور اس کا دوسرا استعمال غیر متعدی ہے جب آمن کے معنی ہونگے وہ امن والا ہو گیا اصطلاح میں اس کا استعمال بعض وقت صرف اقرار لسانی پر ہوتا ہے یعنی زبان سے یہ اقرار کرنا کہ محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لایا جیسے اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ ھَادُوۡا (۶۲) یا جیسے یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ (النساء ۴-۱۳۶) اور بعض وقت اس سے مراد ہوتی ہے اپنے آپ کو تصدیق کے طور پر حق کا بکلی فرمانبردار کر دینا اور اس کے لیے تین باتوں کا جمع ہونا ضروری ہے زبان سے اقرار کرنا، دل سے حق جاننا اور اس کے مطابق اعضا سے کام کرنا جیسے وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیۡقُوۡنَ وَالشُّھَدَآءُ (الحدید ۵۷-۱۹) اور پھر اس کا اطلاق اعتقاد اور سچے قول اور عمل صالح ہر ایک پر بھی ہو جاتا ہے (غ)

ایمان کے معنی پر حدیث سے روشنی: احادیث نبوی سے بھی ایمان کے اس معنی پر شہادت ملتی ہے بعض جگہ ایمان میں صرف اعتقاد کا ذکر کیا ہے اور بعض جگہ صرف اعمال صالح کا اور بعض جگہ دونوں کو ملا کر۔ اوّل تو ظاہر ہے۔ دوسرے کی مثال ہے۔ کہیں فرمایا کہ حیا ایمان سے ہے، کہیں فرمایا ایمان کی ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں اسی طرح دوسرے اعمال کو ایمان میں داخل کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ زبان سے اقرار ایمان کا بیج ہے لیکن اس کی نشو و نما اس کی تکمیل بغیر اعمال صالحہ کے نہیں ہوتی۔

ایمان کا مفہوم خاص اسلام میں: ایمان کا وہ مفہوم اسلام میں نہیں جو دوسرے مذاہب میں ہے جیسے مثلاً عیسائی مذہب میں کفارہ پر ایمان کہ محض ایک بات کے اقرار کر لینے کا نام ہے۔ اسلام میں ایمان ایک معنی رکھتا ہے اور اس کے مطابق ایک عمل ہے اللہ پر ایمان یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اخلاق اللہ کے رنگ میں رنگین کرے۔ اس کی محبت اور معرفت کے حاصل کرنے کو زندگی کی اصل غرض سمجھے۔ فرشتوں پر ایمان ان کی نیک تحریکوں کو قبول کرنا ہے۔ رسولوں پر ایمان ان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ کتابوں

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ — اور نماز قائم کرتے ہیں[12] اور اس سے جو ہم نے اُن کو دیا

پر ایمان ان کی باتوں پر عمل پیرا ہونا ہے۔ آخرت پر ایمان یہ ہے کہ ہر ایک فعل کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ کسی اپنے کام کو انسان لغو نہ سمجھے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

الغیب مصدر ہے، جو چیز انسان کی آنکھ سے چھپ جائے اس پر غاب کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ایسا ہی جو چیزیں حواس ظاہری سے مخفی ہوں اور غیب اور غائب کسی چیز کو محض لوگوں کے لحاظ سے کہیں گے اور اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ یعنی ان چیزوں کو جاننے والا جن کو انسان نہیں دیکھتا اور ان کو بھی جنہیں وہ دیکھتا ہے۔ اور یہاں الغیب سے مراد وہ امور ہیں جو حواس کے ماتحت نہیں آتے اور بداہت عقل ان کی مقتضی نہیں اور ان کا علم انبیاء علیہم السلام کے خبر دینے سے ہوتا ہے (غ) مفسرین میں سے کسی نے الغیب سے مراد یہاں قرآن کو لیا ہے (ج) حالانکہ اس کا ذکر علیحدہ مآ انزل الیک میں موجود ہے اور بعض نے اللہ اور فرشتوں اور رسولوں پر ایمان (ف) اور بعض نے اللہ تعالیٰ (م۔ ف) اس لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غیب در غیب اور نہاں در نہاں اور وراء الورٰی ہے یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ ہاں ملائکہ بھی اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

ایمان بالغیب کی حقیقت: ابتدا میں بجائے اللہ پر ایمان کے الغیب کا لفظ کیوں اختیار فرمایا، ایک یہ بتانے کو کہ اس کی صفات پر آگہی انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے ہی ہوتی ہے۔ دوسرے تمام ترقیات کا مدار ایمان بالغیب پر ہے۔ ہر ایک علم میں کچھ باتیں مان کر انسان چلتا ہے نتائج ان کی صحت کی تصدیق کر دیتے ہیں۔ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت پہلے دن حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ذات نہاں در نہاں ہے۔ ہاں اسی الغیب پر ایمان لا کر جب انسان قدم آگے بڑھاتا ہے تو آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کامل بھی حاصل کر لیتا ہے بلکہ اس سے ہمکلام بھی ہو جاتا ہے گویا یوں کہنا چاہیئے کہ غیب سے شروع کر کے قرآن شاہدہ تک پہنچا دیتا ہے۔

فلاح یا دینی اور دنیوی کامیابی کے لیے جو پانچ اصول اسلام نے یہاں ابتدائے سورت میں قرار دیئے ہیں ان میں سے پہلا یہ ایمان بالغیب یا ایمان باللہ ہے۔

ع۱۲ یقیمون۔ اقام کا مادہ قوم ہے اور اقام الامر کے معنی ہیں کام کو درست حالت میں رکھا۔ **صلوٰۃ کی اقامت کا مفہوم:** قرآن کریم میں جہاں مدح یا تحریص کے مقام پر صلوٰۃ کا ذکر آیا ہے وہاں اقام یا اس کے مشتقات کو استعمال کیا ہے جیسے اقیموا الصلوٰۃ۔ یقیمون الصلوٰۃ۔ المقیمین الصلوٰۃ اور صلوٰۃ کے ساتھ اقامت کو خاص کیا ہے۔ متنبہ کرنے کو کہ مقصود اس کے حقوق اور شرائط کا پورا کرنا ہے نہ صرف ظاہری صورت کا ادا کرنا اور اسی لیے یہ روایت ہے کہ مصلّی یعنی نماز پڑھنے والے بہت ہیں اور اس کے قائم کرنے والے تھوڑے (غ) اور یہی وجہ ہے کہ ذم کے مقام پر لفظ مصلّی اختیار کیا ہے نہ مقیم الصلوٰۃ۔ فویل للمصلّین (الماعون ۱۰۷-۴) اقامت کے حقوق و شرائط کا ذکر خود قرآن شریف میں موجود ہے (۱) طہارت جسمانی جیسے وضو غسل وغیرہ۔ (المائدۃ ۵-۶) (۲) اوقات مقررہ پر ادا کرنا ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتٰباً موقوتا (النساء ۴-۱۰۳) (۳) نماز پر دوام یعنی سب نمازوں کا ادا کرنا یہ نہیں کہ کوئی پڑھ لی، کوئی چھوڑ دی علی صلاتہم دائمون (المعارج ۲۳) (۴) نماز کی محافظت سفر ہو یا بیماری ہو جنگ ہو کوئی سی مشکلات ہوں نماز نہ چھوڑے ہم علی صلاتہم یحافظون (المعارج ۳۴) (۵) نماز کی اصل حقیقت سے غافل نہ ہو عن صلاتہم ساہون (الماعون ۱۰۷-۵) (۶) ریا سے پاک ہو الذین ہم یراؤن (الماعون ۱۰۷-۶) (۷) نماز کی ادائیگی میں طبیعت میں کسل نہ ہو منافقوں کے ذکر میں ہے لا یاتون الصلوٰۃ الا وہم کسالٰی (التوبۃ ۹-۵۴) رسول اللہ صلعم کی نسبت احادیث میں ہے کہ آپ نماز میں راحت محسوس کرتے تھے (۸) باجماعت ہو وارکعوا مع الراکعین (۴۳) (۹) نماز میں خضوع و خشوع ہو الذین ہم فی صلاتہم خاشعون (المؤمنون ۲۳-۲) (۱۰) بدیوں اور ناشائستہ امور سے رُک جائے ان الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر (العنکبوت ۲۹-۴۵)

الصلوٰۃ۔ صَلّی آگ کے جلانے پر بولا جاتا ہے اور آگ میں داخل ہونے پر یصلی النّار الکبریٰ۔ یصلون سعیرا۔ اور صلوٰۃ کے اصل معنی دعا اور برکت دینا ہیں۔ چنانچہ صلیت علیہ کے معنی دعوت لہ آتے ہیں یعنی میں نے اس کے لیے دعا کی اور شاعر کہتا ہے وصلّٰی علٰی دَنِّہَا وَارْتَسَمْ۔ اس کے مشکیزہ پر دُعا اور التجا کرتا رہا۔ قرآن شریف میں ہے وصل علیہم ان صلوٰتک سکن لہم (التوبۃ ۹-۱۰۳) اِنَّ اللہ وملٰئکتہٗ یصلّون علی النّبی (الاحزاب ۳۳-۵۶) اولٰئک علیہم صلوات من ربّہم (۱۵۷) اور عبادت کی جگہ کو بھی صلوٰۃ کہا جاتا ہے لہدّمت صوامع وبیع وصلوٰت (الحج ۲۲-۴۰) اور وہ نماز مخصوص بھی اس سے مراد ہے جو نبی صلعم نے مسلمانوں کو سکھائی اور وہ اقامت کے ساتھ صرف اسی ہیئت خاص سے ہی مخصوص ہے (غ) یعنی اقامت صلوٰۃ سے مراد نماز پڑھنا ہی ہے۔

نماز کی تفصیلات: نماز کے متعلق قرآن شریف میں یہ تو فرمایا کہ نماز کتٰبا موقوتا ہے یعنی اس کا اوقات مقررہ پر ادا ہونا ضروری ہے، لیکن اس کی تفصیلات کتنی دفعہ دن میں نماز ہو، کون کون سے وقت پر ہو، رکعات کی تعداد، ان کے ارکان اور ارکان کی ترتیب، اذکار کا ذکر قرآن شریف میں کسی ایک جگہ نہیں دیا۔ اشارۃ النص کے طور پر کوئی شخص کوئی نتیجہ نکال لے تو اور بات ہے۔ **ارکان و اوقات میں اتحاد اسلامی:** دوسری طرف ان تمام تفصیلات میں عالم اسلامی میں حیرت انگیز اتحاد پایا جاتا ہے۔ سُنّی، شیعہ، خوارج، مقلد، غیر مقلد۔ پھر وہ فرقے جو ایک دوسرے کے ہمیشہ دشمن رہے مشرق سے لیکر مغرب تک اور ابتدا سے لیکر آج تک ایک ہی نماز پڑھتے چلے آئے ہیں اور پڑھ رہے ہیں۔ چین ہو یا افریقہ کا جنگل جزائر بحرِ ہند ہوں یا روس کے دور دراز مقامات جہاں چلے جاؤ، ایک ہی اوقات ایک ہی تعداد رکعات، ایک ہی ترتیب پاؤ گے جس طرح اللہ ایک، رسول ایک، قرآن ایک، قبلہ ایک ہے اسی طرح نماز بھی ایک ہے۔ **آنحضرت ؐ کی نماز:** یہ اتفاق کبھی پیدا نہ ہو سکتا اگر یقیمون الصلوٰۃ کے سب سے پہلے عامل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی نماز نہ پڑھی ہوتی۔ اور پھر آپ کو دیکھ کر صحابہ اور ان کو دیکھکر تابعین نے علیٰ ہذا یہی نماز پڑھی۔ پس یہی وہ الصلوٰۃ ہے جس کی اقامت کا یہاں حکم ہے۔

ایمان بالغیب اور صلوٰۃ کا تعلق: یہ نماز اللہ کا قرب حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اس لیے ایمان بالغیب کے بعد فوراً اس کا ذکر کیا اور ایمان کے ساتھ عمل کا ذکر اصول میں داخل کر کے اس کی اہمیت بتا دی۔ خدا پر ایمان ایک منہ کی بات رہتی اگر اس کے ساتھ وہ ذریعہ نہ بتا دیا ہوتا جس سے اس نہاں در نہاں ہستی سے انسان کا تعلّق پیدا ہو سکتا۔ یعنی انسان اپنے کمال حقیقی کو پہنچ سکتا ہے۔ صلوٰۃ چونکہ خدا کے آگے گرنے اور عاجزی کا نام ہے اس لیے جس قدر زیادہ انسان خدا کے حضور گریگا اسی قدر زیادہ اخلاقِ الٰہی میں رنگین ہوگا اور ایمان کی اصل غرض پوری ہو گی۔ پس نماز دوسرا رکن ان پانچ ارکان میں سے ہے جو اسلام کی بنیاد قرار دیئے گئے اور عملی ارکان میں سے یہ پہلا ہے۔

يُنْفِقُوْنَ ۝۳	خرچ کرتے ہیں ع۱۳
وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ	اور جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اُتارا گیا اور جو
اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴	تجھ سے پہلے اُتارا گیا[۱۴] اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں ع۱۵

ع۱۳ رزقنٰھم۔ رزق کا لفظ کبھی عطائے جاریہ پر استعمال ہوتا ہے دنیوی ہو یا آخرت کے متعلق کبھی حصّہ یا نصیب پر کبھی غذا پر (غ) اس لیے یہاں ممّا رزقنٰھم میں نہ صرف مال داخل ہے بلکہ جاہ اور علم بھی (غ) بلکہ جو کچھ قواء انسان کو دیئے گئے ہیں سب اس میں شامل ہیں۔

ینفقون۔ انفاق نفق سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز گزر گئی اور نَفَق سرنگ کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین کے اندر چلی جاتی ہے اور اسی سے نفاق ہے جس کے معنی ہیں ایک رستہ سے دین میں داخل ہونا اور دوسرے سے نکل جانا (غ) اور اَنفَقَ جب لازم ہو تو اس کے معنی مال جاتا رہنے کے ہوتے ہیں جیسے اذاً لّا مسکتم خشیۃ الانفاق (بنی اسرائیل[۱۷]۔ ۱۰۰) جہاں انفاق کے معنی فناء ہیں۔ اور متعدی ہو تو خرچ کرنا معنی ہوتے ہیں (ت)

انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم: یہ تیسرا اصول ہے اور عملی رنگ میں دوسرا جس کو اختیار کئے بغیر فلاح حاصل نہیں ہو سکتی اور ماحصل اس کا یہ ہے کہ اپنی تمام طاقتوں کو اور مال کو اور علم کو خدا کی راہ میں یعنی مخلوق کی بھلائی کے لیے لگا دے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی محض اس کا ایک حصّہ ہے۔ نماز کے بعد اس کا ذکر ترتیب طبعی کے مطابق ہے اس لیے کہ مخلوق کی خیر خواہی صحیح رنگ میں وہی انسان کر سکتا ہے جس کا تعلق خالق سے پیدا ہو۔ اور خالق سے تعلق پیدا ہونے کا ذریعہ نماز ہے۔ پس جب نماز سے یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ انسان خدا سے تعلق پیدا کر کے اخلاقِ الٰہی کے رنگ میں رنگین ہوا اور صفات الٰہی میں سب سے پہلی صفت ربوبیت ہے تو انسان کے لیے مخلوق کی خدمت ضروری ٹھہری کیونکہ اگر بذریعہ نماز خدا سے تعلق پیدا کر کے مخلوق کی خدمت کا شوق پیدا نہیں ہوا، تو نماز کی اصل غرض ہی مفقود ہو گئی۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے اکٹھے ذکر میں حکمت: یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں ہمیشہ اقامت صلوٰۃ کے بعد زکوٰۃ کا یا خدمت مخلوق کا ذکر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جہاں نماز کی حقیقت سے بے خبری کا ذکر کیا۔ وہاں بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز صرف دکھاوے کی پڑھتے ہیں۔ کیونکہ مخلوق خدا کی خدمت کے چھوٹے چھوٹے کام بھی نہیں کرتے الذین ھم یراءُون ویمنعون الماعون (الماعون[۱۰۷] ۶، ۷) حسن و احسان: عملی طور پر تکمیل نفس انسانی کے یہ دو ہی پہلو ہیں۔ خدا کے حضور جھکنا اور مخلوق خدا کی خدمت۔ ایک کو حسن کہہ لو، دوسرے کو احسان۔ جب نماز کے ذریعہ سے حسن پیدا ہو تو ممّا رزقنٰھم میں احسان کی تعلیم دی۔

ع۱۴ انزل۔ نزول کے اصل معنی گو اوپر سے نیچے آنے کے ہوں مگر استعمال میں اوپر سے نیچے آنا اس کے معنی میں ضروری جزو نہیں اور انزال مطلق ایصال و ابلاغ ہے یعنی ایک چیز کا پہنچا دینا (غ) قرآن کریم میں ہے انزلنا علیکم لباسا یواری سوا تکم (الاعراف[۷]۔ ۲۶) وانزل لکم من الانعام ثمٰنیۃ ازواج (الزمر[۳۹]۔ ۶) انزلنا الحدید (الحدید[۵۷]۔ ۲۵) حالانکہ لوہا، چارپائے، لباس اوپر سے نہیں اُترتے۔ وحی اور رسول کا نزول: تنزیل یا انزال کا لفظ نہ صرف انبیاء علیہم السلام کی وحی پر استعمال ہُوا ہے بلکہ خود رسول اللہ صلعم کے مبعوث ہونے کو بھی انزل کے لفظ سے ہی تعبیر کیا ہے۔ قد انزل اللہ الیکم ذکرا رسولا (الطلاق[۶۵]۔ ۱۰) جس کی تفسیر کرتے ہوئے امام راغب فرماتے ہیں کہ یہاں رسول اللہ صلعم کا نام ذکر رکھا جیسا حضرت عیسٰی کا نام کلمۃ رکھا اور لکھتے ہیں کہ انزالِ ذکر سے مراد بعثت آنحضرت صلعم ہے۔

وحی الٰہی پر ایمان: اب چوتھا اصول بیان فرماتا ہے جس پر ایک متقی انسان کو عمل پیرا ہونا چاہیئے اور وہ ہے ایمان اس پر جو محمد رسول اللہ صلعم کی طرف اُتارا گیا اور اُس پر جو آپ سے پہلے اُتارا گیا۔ اور اعتقادی اصول میں سے یہ دوسرا ہے گویا پہلا ایمان باللہ اور دوسرا وحی الٰہی پر ایمان۔ کیونکہ اللہ پر ایمان پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وحی پر ایمان نہ ہو۔ وحی الٰہی خالق اور مخلوق کے درمیان سچّا تعلق پیدا کرتی ہے پس ایمانِ کامل اللہ تعالیٰ پر صرف وحی سے پیدا ہوتا ہے اور خالی نظارۂ قدرت سے کبھی ایمان پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں انسان اقرار کر سکتا ہے کہ اس کا کوئی صانع ہے مگر ایمان جس سے عمل کی طاقت پیدا ہوتی ہے وہ اس تعلق کے قیام سے پیدا ہوتا ہے جو فی الواقع خالق اور مخلوق میں ہے اور اس کا واحد ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ اسی کی طرف خود لفظ الغیب میں بھی اشارہ ہے۔

پہلی وحی پر ایمان میں حکمت: مگر یہاں وحی پر ایمان کی ضرورت میں صرف قرآن پر ایمان ہی ضروری قرار نہیں دیا بلکہ پہلے بھی وحی الٰہی انبیاء پر آتے رہنے کو جزو ایمان قرار دیا۔ تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ محمد رسول اللہ صلعم سے کوئی الگ معاملہ نہیں بلکہ خالق اور مخلوق کا یہ تعلق ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور اس لیے بھی ما انزل من قبلک کی ضرورت پیش آئی کہ قرآن کی وحی کل عالم کی طرف تھی اور کل قوموں کو اس پر اکٹھا کرنا تھا۔ اس لیے پہلی وحیوں کا ذکر کرنا اس کے لیے ضروری ہُوا۔ غرض ما انزل من قبلک کہہ کر ایک عظیم الشان اتحاد کی بنیاد رکھی، کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ربوبیت جسمانی سارے انسانوں کے لیے ہے اس کی ربوبیت روحانی بھی سب قوموں کے لیے ہے۔ ایک عرب کے اُمّی نے یہ اصول دنیا کو سکھلایا جس کو بڑے سے بڑے فلاسفر دریافت نہ کر سکے۔ جہاں ما انزل الیک یعنی قرآن کریم پر عمل ضروری ہے پہلی وحی پر عمل کی ضرورت نہیں۔ پہلی کتابوں کے متعلق چونکہ دوسری جگہ قرآن شریف نے خود بیان فرما دیا کہ ان میں تحریف ہو چکی ہے اس لیے ان پر عمل نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں ان کی تعلیم وقتی ضرورت زمانہ اور ضرورت مکان کے لحاظ سے تھی جس کا بہت سا حصّہ قابل عملدرآمد نہ رہا اور جو تعلیم ہمیشہ رہنے کے قابل تھی اسے قرآن شریف نے اپنے اندر کامل طور پر جمع کر لیا جیسا کہ فرمایا فیھا کتب قیّمۃ (البینۃ[۹۸]۔ ۳) پس عمل کی ضرورت صرف قرآن پر ہے۔

ع۱۵ اخرۃ۔ اٰخِر اوّل کے مقابلہ پر ہے اور اٰخَر واحد کے مقابلہ پر اور الدار الاخرۃ سے مراد النشاۃ الثانیۃ ہے یعنی دوسری زندگی اور کبھی دار کا لفظ محذوف کر کے الاٰخرۃ سے مراد دار الاٰخرۃ لیا جاتا ہے (غ) یہ تو لغت کی شہادت ہے قرآن شریف کو دیکھا جائے تو اس میں الاٰخرۃ کا لفظ جہاں ایمان بالآخرۃ یا کفر بالآخرۃ کا ذکر ہے اس موقعہ کے سوائے اٹھارہ موقعہ پر آتا ہے اور کسی ایک جگہ بھی سوائے النشاۃ الثانیۃ کے کوئی دوسرے معنی مراد نہیں پس یہ قطعی شہادت ہے۔ دیکھو الانعام[۶]۔ ۹۲ و ۱۱۳ و ۱۵۰، الاعراف[۷]۔ ۴۵، یونس[۱۰]۔ ۱۹، یوسف[۱۲]۔ ۳۷، النحل[۱۶]۔ ۲۲ و ۶۰، بنی اسرائیل[۱۷]۔ ۴۵، المومنون[۲۳]۔ ۷۴، النمل[۲۷]۔ ۳ و ۴، لقمان[۳۱]۔ ۴

أُولَٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝٥	یہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں[16]
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝٦	جنھوں نے انکار کیا (یہاں تک) کہ ان کے لیے برابر ہے کہ تو اُن کو ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ نہیں مانتے[17]

السبا۔ ۸ و ۲۱[34]، الزمر۔ ۴۵[39]، حم السجدہ۔ ۷[41]، النجم۔ ۲۷[53] پس الاٰخرۃ سے مراد الوحی الاٰخرۃ لینا اور پھر یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن کریم کے بعد کوئی اور وحی بھی نازل ہونیوالی ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہوگا خلاف قرآن کریم ہے۔

یوقنون یقین۔ علم کی وہ صفت ہے جو معرفت ودرایت وغیرہ سے بڑھ کر ہے (غ)

ایمان بالآخرۃ کا مفہوم: ایمان بالآخرۃ پانچواں اصول مذہب کا قرار دیا۔ الاٰخرۃ یا النشاۃ الثانیۃ وہ زندگی ہے جو انسان کے ان اعمال کا نتیجہ ہے جو وہ اس دنیوی زندگی میں کرتا ہے۔ اس زندگی پر یقین رکھنا یہی ہے کہ انسان اعمال کی جزا وسزا پر یقین کامل رکھے جب ایک انسان ایک فعل کے نتیجہ کو بُرا جانتا ہے تو وہ عموماً اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب اچھا جانتا ہے تو اُسے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اگر فوری نتیجہ ایک کام کا اچھا بھی ہو مگر آخر کار اس کا اثر بُرا ہو تو عقلمند انسان اس سے بھی بچتا ہے کھیل کود کو ایک نادان بچہ پسند کرے گا مگر ایک عقلمند انسان آج سے دس بیس بعض وقت سو سو سال آیندہ کے نتائج پر نگاہ رکھتا ہے۔ یورپ کے مدبرین کی چالیں اسی اچھی صفت کا استعمال بد ہیں جتنی وسیع نگاہ ہو گی اسی قدر زیادہ ایک شخص ضرر سے بچ سکے گا۔ مذہب کی اصل غرض: مذہب انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ اعمال کے نتائج صرف اسی انسانی زندگی تک محدود نہیں بس اور سو سال تک محدود نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں سالوں تک چلتے ہیں اور اس دنیا کی زندگی کے بعد بھی انسان پر اپنا اچھا یا بُرا اثر ڈالتے ہیں بلکہ جس طرح یہاں بعض وقت فوری نتیجہ ایک فعل کا اچھا نظر آتا ہے مگر اس کا انجام بُرا ہوتا ہے اسی طرح اس دنیا میں ایک فعل کا نتیجہ اچھا نظر آیا ہے مگر دوسری زندگی میں اس کا نتیجہ بد ہوتا ہے پس جو عمل فی نفسہٖ بُرا ہے اسکا نتیجہ یہاں اچھا بھی نظر آتا ہو تو بھی وہ ترک کرنیکے قابل ہے جو عمل فی نفسہٖ اچھا ہو اسکا نتیجہ یہاں بُرا بھی نظر آتا ہو تو بھی وہ کرنیکے قابل ہے یوں ہر ایک عمل کی ذمہ داری اس عمل کے اچھا یا بُرا ہونے کے لحاظ سے انسان کو سمجھنی چاہیئے نہ ان نتائج سے جو ممکن طور پر اس دنیا میں پیدا ہو سکتے ہیں ایک شخص جھوٹ بول کر دوسرے کا مال لے سکتا ہے اور سزا سے بھی بچ سکتا ہے ایک قوم بوجہ اپنی طاقت جسمانی کے دوسری پر ظلم کر سکتی ہے اور اس کا کچھ بگڑتا بھی نظر نہیں آتا۔ مگر ایک متقی انسان جو کچھ کرے محض اس بات کو مدنظر رکھ کر کرے کہ یہ کام اچھا ہے یا بُرا۔

جزا وسزا پر یقین گناہ سے بچاتا ہے: آخرۃ کے ساتھ یقین کا لفظ بتاتا ہے کہ اعمال کی جزا وسزا پر جب تک یقین کامل نہ ہو اس وقت تک انسان گناہ سے نہیں بچ سکتا۔ بہت لوگ ہیں جو آخرت پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر چونکہ دل میں یقین نہیں اس لیے گناہ کی غلامی میں زندگی بسر کرتے ہیں جس شخص کو یقین ہو کہ فلاں سوراخ میں سانپ ہے وہ اس میں ہاتھ نہیں ڈالتا پس کس طرح وہ اعمال کی جزا وسزا پر یقین رکھتا ہوا اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کر سکتا ہے؟

[16] علیٰ ھدًی یعنی ہدایت پر متمکن ہو گئے اور اس سے اِدھر اُدھر نہیں ہونگے اور ان کو ایک نور اور روشنی مل جاتی ہے یہ معنی ہدایت کے یہاں حضرت ابن عباسؓ نے کیے ہیں (ج)

المفلحون۔ فلح کے اصل معنی شق یعنی پھاڑنا ہیں۔ زمین میں ہل چلانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس لیے کسان کو فلّاح کہتے ہیں اور فَلاح کے معنی ظفر وادراکِ بُغیتہٖ ہیں (غ) یعنی کامیابی اور مطلوب کا پالینا۔ کیونکہ جس طرح ہل چلانے سے زمین کی مخفی طاقتیں اور اصلی جوہر باہر نکل آتے ہیں اسی طرح قوائے انسانی کا بھی حال ہے۔ ان کے مخفی جوہروں کا باہر نکل آنا ہی حقیقت میں کامیابی ہے پس فلاح سے مراد صرف دنیوی کامیابی نہیں بلکہ انسان کے مخفی قویٰ کا ظہور پذیر ہونا ہے محض دنیا کا مال کما لینا یا بادشاہت کا حاصل کر لینا فلاح نہیں اور نہ ایسا شخص مفلح کہلا سکتا ہے بلکہ فلاح کے معنی الفوز والخیر یعنی دنیوی اور دینی دونوں کامیابیوں کو شامل کرتے ہیں۔ چنانچہ تاج العروس میں ہے کہ ائمہ لسان کا اس پر اتفاق ہے کہ عربی زبان میں فلاح کے لفظ سے بڑھ کر دینی اور دنیوی دونوں بھلائیوں کو شامل رکھنے والا اور کوئی لفظ نہیں۔

مفلح کون ہیں: یہاں یہ فرمایا کہ ان پانچ اصولوں کو قبول کر کے قرآن کریم کو اپنا دستور العمل بنا لینے والے لوگ ہدایت پر ہیں۔ اور ان کے ہدایت پر ہونے کی یہ دلیل ہے کہ وہ فلاح حاصل کر لیں گے یعنی دینی و اُخروی کامیابی حاصل کر لیں گے اور ان کے جسمانی اور روحانی قویٰ اعلیٰ درجہ کا نشوونما پالیں گے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا ثبوت دنیا کو دے دیا۔ گویا علیٰ ھدًی دعوےٰ تھا۔ ھم المفلحون اس کی دلیل ہے۔

[17] کفر۔ کافر: کفروا۔ کُفر لغت میں سَتْرُ الشَّیْءِ یعنی ایک چیز کو ڈھانکنے کا نام ہے۔ چنانچہ رات کو کافر کہہ دیا جاتا ہے اور کسان کو بھی کافر کہہ دیا جاتا ہے اس لیے کہ وہ بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے اور کفر نعمت کی ناشکر گزاری ہے اس لیے کہ اس کا شکر ادا نہ کرنا گویا اس کو چھپانا ہے اور سب سے بڑا کفر انکار توحید یا شریعت یا نبوت ہے (غ)۔ ہر فعل مذموم کفر میں داخل ہے اصل اور فرع کا کفر: اور جس طرح ہر ایک فعل محمود یعنی قابل تعریف فعل ایمان سے ہے اسی طرح ہر ایک فعل مذموم کفر ہے (غ) اور ابن اثیر نے لکھا ہے کہ کفر دو قسم کا ہے ایک اصل ایمان کا کفر اور اس کی ضد اور دوسرا فروع اسلام میں سے کسی فرع کا کفر اس سے انسان اصل ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ چنانچہ ازہری کا قول نقل کیا ہے۔ قد یقول المسلم کفرا۔ پس اصطلاح شریعت میں کفر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار ہے اور اس کے نیچے جو بعض افعال کا نام کفر رکھ دیا ہے جیسے سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر یا من رغب عن ابیہ فقد کفر وغیرہ تو یہ محض فرع کا کفر ہے دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتا اور اصل معنی میں وسعت ہے۔

انذرت۔ نذر سے ہے جس کے معنی ہیں اپنے نفس پر کسی چیز کو واجب کر لینا (غ) اور اَنْذَرَ یا اِنْذَار کے اصل معنی قاموس میں صرف اَعْلَمَ ہیں یعنی ایک بات کا

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ

اللہ نے اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر مُہر لگا دی اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے ع۱۸

اس کو علم دے دیا رت)، اور یوں بھی کہا گیا ہے کہ انذار یہ ہے کہ ایک بات کے پہنچانے میں انسان کو محتاط کیا جائے اور ڈرایا جائے اور اصل معنی انذار کے اعلام ہی ہیں یعنی ایک بات سے آگاہ کر دینا رت)، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مُنذِر ایسا علم دینے والا ہے جو قوم کو خطرات سے آگاہ کرے جیسے دشمن وغیرہ سے پس انذار کے اصل معنی دھمکانا نہیں بلکہ ایک علم دینا ہیں اور بالخصوص وہ علم جو کسی آنے والے خطرہ سے آگاہ کرتا ہے۔

اضداد کا ذکر: قرآن کریم کا قاعدہ ہے کہ اضداد کا ذکر بالمقابل کر کے اصل مقصود کو ظاہر کرتا ہے جب متقیوں کا ذکر کیا اور ان کے فلاح پانے یعنی اپنے کمال حقیقی کو پہنچ جانے کا، تو اب اُن لوگوں کا ذکر کرتا ہے کہ جب ان کو یہ بتایا جاتا ہے کہ تمہارے یہ افعال بُرے ہیں اور ان کا نتیجہ اچھا نہیں تو وہ پرواہ بھی نہیں کرتے متقی تو وہ ہے جو ہر ایک دُکھ کی بات سے بچتا ہے اور اس کے مقابل پر وہ شخص ہے جس کو جب بتایا جاتا ہے کہ دُکھ دینے والی چیز ہے تو پرواہ بھی نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں ھدی للمتقین کہنے سے جو شبہ وارد ہوتا تھا کہ جب یہ کتاب تمام دنیا کے لیے ہے تو کیا بعض قسم کے لوگ اس سے محروم بھی رہ جائیں گے اس کا جواب دیا ہے کہ محروم وہی رہیں گے جن کو پرواہ نہیں۔

انذار کی پرواہ نہ کرنے والے: جملہ سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم جملہ معترضہ ہے جو انّ الّذین کفروا کی حالت کو بیان کرتا ہے بحر المحیط اور روح المعانی میں اس ترکیب کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ اور اس کو جملہ معترضہ نہ ماننے کی صورت میں کوئی معنی صحیح نہیں بنتے۔ کیونکہ اگر اسے ان الّذین کفروا کی خبر قرار دیا جائے تو معنی یوں ہونگے کہ جو کافر ہوئے ان پر نذیر ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ حالانکہ یہ خلاف واقعات ہے اور خلاف واقعات معنی قرآن کریم کے قبول نہیں ہو سکتے۔ آنحضرت صلعم کفار کو ہی ڈراتے تھے اور قرآن کریم میں بھی بار بار کفار کو ڈرانے کا حکم ہے۔ اور ان میں سے لوگ مسلمان بھی ہوتے گئے۔ پس اصل معنی یوں ہیں کہ جنھوں نے کفر کیا اور ایسا کفر کہ ان پر نذیر ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے وہ ایمان نہیں لاتے۔ اور یہ سچ بھی ہے جو شخص ڈرانے کی پرواہ نہیں کرتا وہ کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہاں جب دل کی اس حالت کو تبدیل کر لیتا ہے تو پھر وہ بھی فائدہ اُٹھا لیتا ہے۔ یہ حکم ایک خاص حالت پر ہے کسی خاص انسان پر نہیں۔

ع۱۸ ختم۔ ختم و طبع کے لغت میں ایک ہی معنی ہیں یعنی ایک چیز کو ڈھانک دینا اور ایسا مضبوط باندھ دینا کہ دوسری چیز اس میں داخل نہ ہو سکے رت)

دلوں پر مہر سے مراد: امام راغب نے مفردات میں دلوں پر ختم یا مہر کرنے کی تشریح یوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ جب ایک شخص اعتقاد باطل میں یا ارتکاب گناہ میں حد سے بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ کسی طرح بر حق کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا تو یہ اس میں ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو اس کو گناہ کے اچھا سمجھنے کا عادی کر دیتی ہے گویا اس کے ساتھ اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اور لکھتے ہیں کہ یہ ایسا ہی استعارہ ہے جیسے جعلنا علی قلوبھم اکنّۃ ان یفقھوہ (الانعام ۶۔ ۲۵) میں یا جعلنا قلوبھم قاسیۃ (مائدہ ۵۔ ۱۳) میں استعارہ ہے۔

غشاوۃ۔ غشی مادہ ہے جس کے معنی ڈھانکنا ہیں۔ اور غشاوۃ وہ ہے جس کے ساتھ کوئی چیز ڈھانکی جائے غَشِیَ۔ یَغْشٰی۔ تَغَشّٰی۔ غاشیۃ۔ مغشی۔ اِسْتَغْشَوْا وغیرہ بہت سے مشتقات اس سے قرآن شریف میں آئے ہیں۔

خدا کا مہر لگانا انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے: اس آیت میں انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کا پہلی آیت میں ہے علی قلوبھم میں جو ضمیر ھم ہے وہ عام کافروں کی طرف نہیں جاتی، بلکہ صرف انہی کفار کی طرف جن کے لیے ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے جو کفر کے کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ پس یہ مہر لگانا ابتدا کے طور پر نہیں کہ بعض انسانوں کو خدا نے پیدا ہی ایسا کیا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے بلکہ یہ مہر لگانا بطور نتیجہ کے ہے۔ جب ایک شخص اپنے دل سے غور و فکر کا کام نہیں لیتا تو وہ قوت سلب ہو جاتی ہے جس طرح اگر ہاتھ سے کچھ مدّت تک بالکل کام نہ لے تو وہ ہاتھ بیکار ہو جاتا ہے۔ ہاں جس طرح جسمانی قوتیں بھی خاص علاج سے لَوٹ آتی ہیں اسی طرح دلوں کی مُہر بھی جو اللہ تعالیٰ بطور سزا لگاتا ہے ٹوٹ جاتی ہے۔ قرآن کریم اس کا بھی علاج کرتا ہے کیونکہ شفاء لما فی الصدور ہے مگر علاج اسی کے لیے ہے جو علاج کرانا چاہے۔

قرآن و حدیث کی شہادت کہ بدی کا اثر ساتھ ساتھ پیدا ہوتا رہتا ہے: اس معنی کی تائید خود قرآن شریف سے ہوتی ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ فرماتا ہے بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون (التطفیف ۸۳۔ ۱۴) ان کے دلوں پر اسی نے زنگ لگا دیا ہے جو وہ کام کرتے تھے۔ پس انسان کے اپنے عمل جس طرح دل پر زنگ لگاتے ہیں مہر بھی کر دیتے ہیں۔ زنگ لگنا پہلا مرتبہ ہے مہر لگ جانا آخری مرتبہ۔ ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ داغ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کرے، تو اس کا قلب صاف ہو جاتا ہے (قلب سے مراد قلب روحانی ہے) اور اگر اور گناہ کرتا جائے تو وہ سیاہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ران علی قلوبھم کا مصداق ہو جاتا ہے گویا وہ روشنی جو خدا نے انسان کے اندر رکھی تھی وہ بالکل دب جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زنگ یا مہر کافر کے ساتھ خاص نہیں مسلمان بھی بدیوں کے ارتکاب کی عادت کر لے تو اس کے دل پر بھی مہر لگ جاتی ہے پس اس آیت نے ایک پُر حکمت فلسفہ بدی کا بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ بدی کا اثر ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔

عقل سے کام نہ لینا دل پر مہر ہے: مہر لگانے سے کیا مراد ہے۔ حضرت ابن مسعود اور کئی صحابہ سے ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم کی تفسیر میں مروی ہے لا یعقلون ولا یسمعون وہ نہ عقل سے کام لیتے ہیں نہ سنتے ہیں۔ خود قرآن کریم نے بھی یہی تشریح فرمائی ہے۔ ومنھم من یستمع الیک حتی اذا خرجوا من عندک قالوا للذین اوتوا العلم ماذا قال انفا اولئک الذین طبع اللہ علی قلوبھم (محمد ۴۷۔ ۱۶) اور ان میں ایسے لوگ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں یہاں تک کہ جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان لوگوں کو جن کو علم دیا گیا کہتے ہیں ابھی اس نے کیا کہا تھا، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے گویا مہر لگنا اس حالت کا نام ہے کہ انسان بات کو سنتا ہے سمجھتا نہیں۔ اور دوسری جگہ فرمایا لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا (الاعراف ۷۔ ۱۷۹) ان کے دل ہیں جن سے

ع وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ⑦	اور اُن کے لیے بڑا عذاب ہے ع۱۹
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ	اور لوگوں میں بعض ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے
الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ⑧	دن پر ایمان لائے اور وہ مومن نہیں ع۲۰
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ	وہ اللہ کو اور اُن کو جو ایمان لائے ہیں دھوکا دینا چاہتے ہیں اور

وہ سمجھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سُننے کا کام نہیں لیتے۔

بُرے کام کو اچھا سمجھنا دل پر مہر ہے: جب انسان ایک بُرے کام کے ارتکاب پر قائم ہو جاتا ہے تو اس کی حالت آہستہ آہستہ ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ اس بُرے کام کو اچھا سمجھنے لگتا ہے۔ یہ اس کے دل پر مہر ہے کیونکہ پھر اس کا خیال بھی اس طرف نہیں جاتا کہ یہ جو میں کر رہا ہوں کوئی بُرا کام ہے۔

مہر لگانے کی نسبت اللہ کی طرف: مہر کا لگانا اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے منسوب کیا کہ انسان کے ہر فعل پر جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے جس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب ایک شخص اپنے گھر کے دروازے بند کر لے تو اللہ تعالیٰ اس پر اندھیرا کر دیتا ہے یا ہاتھ سے کام لینا چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ ہاتھ کو بیکار کر دیتا ہے اسی طرح جب ایک انسان کو بدی کے بُرے انجام سے ڈرایا جائے اور وہ پروا بھی نہ کرے بلکہ بدی میں ترقی کرتا چلا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مُہر لگا دیتا ہے۔

زردشتی عقیدہ کی تردید: اس میں زردشتیوں کے اس غلط عقیدہ کی تردید بھی ہے کہ نور خدا کی طرف سے ہے اور ظلمت شیطان کی طرف سے۔ اسلام تمام اسباب کا مسبّب اللہ تعالیٰ کو قرار دیتا ہے۔

ع۱۹ عذاب اس کا مادہ عذب ہے اور مَاءٌ عَذْبٌ شیریں اور عمدہ پانی کو کہتے ہیں۔ قرآن شریف میں ہے هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ (الفرقان ۲۵-۵۳) اور عذاب سخت دُکھ کو کہتے ہیں جس کی وجہ یوں بیان کی جاتی ہے کہ عَذَبَ الرَّجُلُ کے معنی آتے ہیں اس نے کھانا پینا ترک کر دیا گویا تعذیب اصل میں یہ ہے کہ اس کو کھانے پینے نیند سے محروم کیا جائے اور بعض کے نزدیک تعذیب میں ازالۂ عذب ہے یعنی زندگی کی اچھی چیزوں کو دور کر دینا۔ جیسے تمریض مرض کے دور کر دینے کو کہتے ہیں۔ گویا اچھی چیزوں سے محروم ہو جانے کا نام عذاب ہے۔ عذاب کا استعمال قرآن میں: قرآن کریم نے ہر ایک سزا یا تکلیف کے پہنچنے پر اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ جہاں ایک باغ والوں کو اپنی محنت کا پھل نہیں ملا، اس کو بھی عذاب کہا۔ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ (ن ۶۸-۳۳) دنیا میں جو قوموں پر تباہیاں اور دُکھ آتے ہیں ان کو بھی عذاب کہا ہے۔ کسی جرم پر جو سزا دی جاتی ہے اس کو بھی عذاب کہا ہے۔ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا (النور ۲۴-۲) آخرت کی سزا کو بھی عذاب کہا ہے۔ انسان کا دل جو بدی کے بعد دُکھ محسوس کرتا ہے وہ بھی عذاب ہے۔

عذاب عظیم اور عذاب الیم: قرآن کریم میں کبھی عذاب کو بلحاظ اس کی ظاہری کیفیت کے عظیم کہا ہے یعنی بڑا عذاب اور کبھی بلحاظ اس دُکھ کے جو انسان اندر ہی اندر اُٹھاتا ہے الیم کہا ہے یعنی دردناک عذاب۔ اسی مناسبت سے یہاں کفار کے عذاب کو جو ظاہر میں واقع ہونے والا تھا عذاب عظیم کہا ہے اور آیت ۱۰ میں منافقوں کے عذاب کو عذاب الیم کہا ہے۔

ع۲۰ اللہ اور آخرت پر ایمان مسلمان ہونے کے قائم مقام ہے: یہاں اللہ اور آخرت پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے قائم مقام رکھا ہے۔ کیونکہ اللہ کی صفات اور آخرت کے مسئلہ کو کھول کر قرآن کریم نے ہی بیان کیا ہے اور دوسرے شروع میں جو اصول بیان کیے اُن میں سے پہلا اصول اللہ پر ایمان اور آخری آخرت پر یقین ہے پس اوّل و آخر کو سب کا قائم مقام بنا لیا۔ یہاں منافقوں کے ذکر میں جو منہ سے اسلام کا اقرار کرتے تھے ایمان باللّٰہ والیوم الاٰخر کو لا کر اس کے معنی کی وضاحت کر دی ہے یعنی اس سے مراد مسلمان ہونا ہے۔

پہلے رکوع میں دو گروہوں کا ذکر کیا اوّل کامل طور پر ماننے والے دوسرے کلی طور پر انکار کرنے والے، یہاں ایک تیسرے گروہ کا ذکر کیا ہے جو مُنہ سے کہتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے۔ مدینہ میں عبداللہ بن ابیّ قوم خزرج میں سے ایک بڑا سردار تھا جس کو اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانے والے تھے۔ نبی کریم صلعم کی مدینہ میں آمد سے صورت معاملہ بدل گئی اور سب قوموں نے یہودیوں سمیت آنحضرت صلعم کو سب جھگڑوں کا آخری فیصلہ کرنے والا تسلیم کیا۔ عبداللہ بن اُبیّ کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ اسلام کے اندرونی دشمن: جہاں اور کھلے دشمن اسلام کے پیدا ہوئے اس نے اپنے اردگرد ایک چھُپا ہُوا دشمنِ اسلام گروہ پیدا کر لیا۔ ان لوگوں کو اسلام سے فی الواقع کوئی تعلّق نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ ظاہرداری کے طور پر مسلمان ہونے کا اقرار کرتے تھے، مگر اندرونی طور پر پورا زور اسلام کے استیصال کے لیے لگاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ان سب حالات میں بچا کر دکھا دیا کہ اسلام کو نہ اس کے کھلے دشمن کچھ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ چھُپے ہوئے۔ کیونکہ خدا کا ہاتھ اس کی تائید میں ہے۔

منافقین زمانہ حال: اِس زمانہ میں بھی مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ ہے جو دشمنانِ اسلام کے ساتھ مل کر اسلام کو نقصان پہنچانے میں دریغ نہیں کرتے گو بظاہر مسلمان کہلاتے ہیں ان کے حالات ان منافقین سے جو آنحضرت صلعم کے وقت میں تھے بہت ملتے ہیں۔ عملی نفاق: لیکن ان کے علاوہ بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو منہ سے قرآن کریم پر ایمان لانے کا اقرار کرتے ہیں مگر عمل کے وقت اپنے رسوم اور خواہشات کی پیروی کرتے اور قرآن کو پسِ پشت ڈالتے ہیں۔ یہ عملی نفاق ہے اور اسی کا نتیجہ وہ ذلت و ادبار ہے جو آج مسلمانوں کے شامل حال ہے۔

اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۹)	سوائے اپنے آپ کے (کسی کو) دھوکا نہیں دیتے اور وہ سمجھتے نہیں ؏۲۱
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا	اُن کے دلوں میں بیماری ہے سو اللہ نے اُن کی بیماری کو بڑھایا ؏۲۲ اور
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (۱۰)	اُن کے لیے دردناک عذاب ہے اس لیے کہ جھوٹ بولتے تھے ؏۲۳
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا	اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو، کہتے
اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (۱۱)	ہیں ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (۱۲)	یقیناً یہ خود ہی فساد کرنے والے ہیں، پر سمجھتے نہیں ؏۲۴

؏۲۱ یخٰدعون۔ خدع اس کا مادہ ہے جس کے معنی دھوکہ دینا ہیں یعنی ظاہر کچھ کرنا اور دل میں دوسری بات چھپا رکھنا اس ارادہ سے کہ دوسرے کو نقصان پہنچائے اور خادع کسی کو دھوکا دینے کے قصد پر بھی بولا جاتا ہے (ت) یہی معنی یہاں مراد ہیں مفاعلۃ کا باب بعض وقت صرف ایک کے لیے بھی آتا ہے۔ جیسے عاقبت اللص میں پس یخٰدعون اللہ کے معنی ہیں اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

یشعرون۔ شعر بال کو کہتے ہیں اور اس کی جمع اشعار آتی ہے۔ واشعارھا (النحل ۱۶-۸۰) اور شَعَرْتُ کے معنی ہیں ایک چیز کا ایسا دقیق علم حاصل کیا گویا کہ اس کے بالوں تک پہنچ گیا۔ اور شِعر بھی اصل میں دقیق کلام کو کہتے ہیں (رغ) پس شعور علم سے زیادہ باریک بینی کو چاہتا ہے۔

منافقوں کی دھوکہ بازی: منافقانہ چال سے ان کا مطلب تو یہ تھا کہ مسلمانوں کو دھوکہ دیں جو گویا خدا کو ہی دھوکا دینا تھا یعنی مسلمان ان کو اپنے مددگار اور حامی سمجھیں۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ خود نقصان اٹھایا، مسلمانوں کا ان کی شرارتوں سے کچھ نہ بگڑا۔ یہی اپنے آپ کو دھوکہ دینا تھا۔

؏۲۲ مرض۔ مرض اس حالت اعتدال سے خروج کا نام ہے جو انسان سے خاص ہے اور یہ دو طرح پر ہے ایک جسمانی جیسے لاعلی المریض حرج (النور ۲۴-۶۱)

امراض روحانی: اور دوسرے اس سے مراد رذائل لیے جاتے ہیں جیسے جہالت، جبن، بخل، نفاق وغیرہ۔ یعنی اخلاقی بیماریاں (رغ) یہی معنی یہاں مراد ہیں اور قرآن شریف میں کثرت سے مرض کا ذکر اسی معنی میں آتا ہے اور اخلاقی رذائل کو مرض اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ فضائل کے حاصل کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔ جیسے بیماریاں۔

منافقوں کی بیماری: وہ بیماری نفاق ہے جس کا یہاں ذکر کر دیا یعنی منہ سے جو کچھ کہتے ہیں اس پر یقین نہیں رکھتے۔ اسی لیے عذاب الیم کو جھوٹ کا نتیجہ بنایا۔ یا یہ بیماری اسلام کی عداوت ہے جو اپنے دلوں میں مخفی رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا اس بیماری کو بڑھانا یوں تھا کہ جوں جوں اللہ تعالیٰ اسلام کو قوت اور شوکت عطا کرتا گیا اُن کا نفاق اور ان کی اسلام سے عداوت اور ترقی کرتی گئی۔ خدا کس طرح بیماری بڑھاتا ہے: اللہ تعالیٰ کی طرف بیماری کا بڑھانا منسوب کیا کیونکہ یہ بطور سزا تھا۔ یا اس لیے کہ وہ اسباب جن سے بیماری بڑھی اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیے تھے۔ گو وہ چاہتے تو انہی اسباب سے ہدایت حاصل کر سکتے حضرت نوحؑ کہتے ہیں فلم یزدھم دعاءی الا فرارا (نوح ۷۱-۶) میرے بلانے نے ان کو صرف بھاگنے میں زیادہ کیا۔ حالانکہ دعوت کی غرض تو اُن کا بلانا تھا۔ نہ بھگانا۔ مگر چونکہ جس قدر وہ بلاتے تھے اسی قدر وہ زیادہ دُور ہوتے تھے۔ اس لیے بھگانے کو دعا کی طرف منسوب کیا۔ گو وہ دعا کا مقصد نہ تھا۔

؏۲۳ یکذبون۔ کذب۔ صدق کی ضد ہے اور صدق کی طرح قول اور فعل دونوں پر بولا جاتا ہے (رغ) جھوٹ بول کر انسان کو کبھی راحت نہیں ملتی۔

جھوٹ منافق کا نشان ہے: منافق کی چار علامتیں حدیث میں لکھی ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑی یہی ہے کہ اذا حدث کذب جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے۔ مسلمانوں میں اس زمانہ میں یہ بیماری بہت بڑھی ہوئی ہے۔ باتوں میں جھوٹ بولتے، جھوٹی شہادتیں دیتے اور جھوٹے اقرار کرتے ہیں، حکام کو خوش کرنے کے لیے بھی جھوٹ بول دیتے ہیں کسی قوم میں ایسے لوگوں کی زیادتی سے قوم کی عزت باقی نہیں رہ سکتی۔ صحابی کی روایت پر جھوٹ کا احتمال نہیں: ان کے بالمقابل صحابہ رضی اللہ عنہم کی حالت دیکھو تو وہاں عمداً جھوٹ کا وجود بھی نہیں پایا جاتا یہاں تک کہ جو روایت صحابی تک پہنچ جائے اس پر جھوٹ کا احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔

؏۲۴ تفسدوا۔ فساد کسی چیز کا اعتدال سے نکل جانا ہے تھوڑا ہو یا بہت۔ اور اس کی ضد صلاح ہے اور اس کا استعمال نفس میں اور بدن میں اور اشیاء میں جو حدِ اعتدال سے نکل گئی ہوں ہوتا ہے (رغ)

الارض۔ ارض کے مصدری معنی الرِّعدۃ یعنی کانپنا یا الدّوار یعنی چکّر کھانا آتے ہیں (ت) زمین کا چکّر کھانا: اور اَرْض زمین کو کہتے ہیں گویا اس کے معنی میں ہی چکّر کھانے کی طرف اشارہ ہے۔ اور زمین کے خاص حصّہ یا خاص ملک کو بھی کہتے ہیں۔ مفردات میں ہے کہ ہر ایک چیز کے نیچے کے حصّے کو اس کی ارض کہہ دیا جاتا ہے جس طرح ہر چیز کے اوپر کے حصّہ کو اس کا سما کہہ دیا جاتا ہے۔ چٹائی کو، گھوڑے وغیرہ کی ٹانگوں کے نیچے کے حصّہ کو، جوتی کے تلوے کے نچلے حصّہ کو جو زمین سے لگتا ہے اس کی ارض کہہ دیا جاتا ہے اور مجازاً قلب انسانی پر بھی یہ لفظ بول دیا گیا ہے (رغ)

منافقوں کے فساد اور ان کے دعویٰ اصلاح سے مراد کیا ہے: یہاں زمین میں فساد کرنے سے مراد اُن کے خفیہ تعلقات اور سازشیں ہیں جو وہ اسلام کو تباہ کرنے کے لیے کرتے تھے یا اُن کا اندر سے کفر پر قائم رہنا فساد ہے۔ ان کا اپنے آپ کو مصلح کہنا اس لحاظ سے تھا کہ ہم دونوں فریقوں سے صلح رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی شرارتوں سے متنبہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ فی الواقع مفسد ہیں لیکن اپنے آپ کو مفسد نہیں سمجھتے۔ یہ عموماً مفسدوں کا قاعدہ ہے کہ وہ کوئی من سمجھوتہ کرکے

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا
اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ
السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾
وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا
خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا
نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾
اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ

اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جس طرح اور لوگ
ایمان لائے، کہتے ہیں کیا ہم مان لیں جس طرح بے وقوفوں نے
مان لیا۔ ع۲۵ یقیناً یہ خود ہی بیوقوف ہیں لیکن نہیں جانتے۔
اور جب انھیں ملتے ہیں جو ایمان لائے، کہتے ہیں ہم ایمان لائے
اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں کہتے ہیں
ہم تمہارے ساتھ ہیں (ان سے) ہم صرف ہنسی کرتے ہیں ع۲۶
اللہ اُن کو ذلیل کرے گا ع۲۷ اور وہ اُن کو مہلت دیتا ہے، وہ

اپنے فعل کا جواز کر لیتے ہیں۔ بہتیرے دوسروں کی جڑوں کو کاٹنا اصلاح خیال کرتے ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ اُن کے مفسد ہونے پر کسی کو اطلاع مل جائے گی اور یا یہ کہ ان میں جو عامۃ الناس ہیں ان کو یہی بتایا جاتا ہے کہ یہ کام اصلاح کا ہے۔ اس لیے وہ فساد کا کام کرتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ یہ فساد کا کام ہے۔

ع۲۵ السفہاء سفیہ کی جمع ہے سفہ کے اصل معنی ہلکا پن ہیں کمی عقل نفس انسانی کا ہلکا پن ہے اس لیے کم عقل یا بیوقوف آدمی کو سفیہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے اموال کو ٹھیک طور پر خرچ کرنا نہیں جانتے ان کو بھی قرآن کریم نے سفیہ قرار دیا ہے۔ (النساء ۴-۵)

منافقوں کے مسلمانوں کو بیوقوف کہنے کی وجہ: منافق مسلمانوں کو بیوقوف اس لیے کہتے تھے کہ انھوں نے اپنے مال و دولت گھروں رشتہ داروں کو ایک شخص کے پیچھے لگ کر چھوڑ دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کفار جلدی اُن کو کچل ڈالیں گے۔

ع۲۶ خلوا۔ خلا مکان اور زمانہ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بلحاظ زمانہ اس کے معنی ہیں مضی و ذھب یعنی گزر گیا، چلا گیا۔ تلك اُمة قد خلت (۱۳۴) قد خلت من قبله الرسل (آل عمران ۳-۱۴۴) وغیرہ میں یہی مراد ہے اور خلا الیہ یا خلا فلان بفلان کے معنی آتے ہیں اس کے ساتھ خلوت میں ہوا۔ یہی صورت اور معنی یہاں ہیں۔

شیطان۔ شطن سے ہے جس کے معنی ہیں دُور ہوا پس شیطان وہ ہستی ہے جو رحمت الٰہی سے دُور ہوئی۔ بعض نے شاط (یشیط) سے مشتق کہا ہے جس کے معنی ہیں غضب میں جل گیا۔ قرآن شریف میں شیطان کی خلقت نار یعنی آگ سے بیان فرمائی ہے۔ انسانوں میں سے شیطان: قوت غضبیہ میں بڑھے ہوئے انسان بھی شیطان کہلاتے ہیں۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ شیطان ہر ایک سرکش کا نام ہے جنّوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے یا حیوانوں میں سے۔ قرآن شریف میں بھی شیاطین الانس والجنّ آتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ انسانوں میں سے بھی شیطان ہوتے ہیں (ت) بُرے اخلاق پر شیطان کا اطلاق: امام راغب کہتے ہیں کہ ہر ایک بُرے خُلق کو بھی شیطان کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حسد بھی ایک شیطان ہے اور غضب بھی ایک شیطان ہے۔ شیطان کا انسان میں خون کی طرح پھرنا: ایک حدیث میں آتا ہے کہ شیطان انسان میں اس طرح پھرتا ہے جیسے خون پھرتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ میں۔ فرمایا ہاں الا ان اللہ اعاننی علیہ فاسلم صرف یہ فرق ہے کہ اللہ نے اس کے خلاف مجھے مدد دی پس وہ فرمانبردار ہو گیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ شیطان کو انسان پر نہیں بلکہ انسان کو شیطان پر تصرّف دیا گیا ہے بدی کا محرک شیطان ہے: نہایت باریک راہوں سے بُری تحریک کرنے والی ہستی شیطان ہے اسی طرح بُری تحریک کرنے والے انسان بھی شیطان ہیں۔ قیامت کے دن یہی عذر گنہگاروں کا مذکور ہے کہ ہمارے سرداروں نے ہم کو بُری راہ پر ڈالا اور حدیث میں جو آتا ہے الراکب شیطان تو وہاں مراد صرف یہ ہے کہ جب آدمی اکیلا نکلتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔

شیطان صفت انسان: اس جگہ شیاطین سے مراد قریباً تمام مفسرین کے نزدیک انسان شیطان ہی ہیں۔ بخاری میں امام مجاہد سے مروی ہے کہ شیاطین سے مراد ان کے منافق اور مشرک دوست ہیں۔ ابن عباس سے ہے رؤسائہم فی الکفر ان کے کافر سردار۔ اسی سورت کی آیت ۷۶ میں بجائے خلوا الی شیاطینھم کے ہے خلا بعضھم الی بعض۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہاں شیطان صفت انسان ہی مراد ہیں۔

ع۲۷ استہزاء کے معنی کشاف نے لکھے ہیں انزال الھوان والحقارۃ یعنی ذلت اور حقارت کا نازل کرنا۔ کیونکہ استہزا کرنے والے کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر کرنا ہوتا ہے۔ روح المعانی میں ہے کہ مجازاً استہزا سے مراد تحقیر اور ذلّت کا وارد کرنا ہے۔ امام غزالی کہتے ہیں کہ استہزا ایسے طریق پر تحقیر کرنے کو کہتے ہیں جس پر ہنسی آ جائے۔ بیضاوی میں ہے کہ استہزاء کی اصل ھزا ہے جس کے معنی خفت ہیں اور یہ معنی سرعت سے ماخوذ ہیں جس معنی میں یہ لفظ آتا ہے گویا استہزاء کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر ہے اور ہنسنا ایک ذریعہ ہے جس سے وہ تحقیر کی جاتی ہے۔ محض ہنسنا جس کی غرض دوسرے کی تحقیر نہ ہو استہزاء نہیں کہلاتا۔

ایک ہی الفاظ کے اللہ تعالیٰ اور انسان پر بولنے کے مفہوم میں فرق: اب یہ ایک اصول کے طور پر یاد رکھنا چاہیئے کہ جب کسی فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے تو وہی لفظ بولا جاتا ہے جو انسان کے لیے۔ مگر یہ فرق ہمیشہ ہوتا ہے کہ انسان چونکہ ہر فعل میں آلوں اور ذریعوں کا محتاج ہے اور خدا نہیں اس لیے اس لفظ میں جو آلہ

يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۵﴾

اپنی سرکشی میں حیران پھر رہے ہیں۲۸

اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰى فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُهُمۡ وَمَا كَانُوۡا مُهۡتَدِيۡنَ ﴿۱۶﴾

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کو دے کر گمراہی خرید لی۔ سو اُن کی تجارت فائدہ مند نہ ہوئی اور نہ ہی وہ ہدایت پانیوالے ہوئے۲۹

مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ الَّذِى اسۡتَوۡقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوۡرِهِمۡ وَتَرَكَهُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۷﴾

اُن کی مثال اس شخص کی مثال کی طرح ہے جس نے آگ جلائی، پھر جب اس (آگ) نے جو کچھ اُس کے گرد تھا روشن کر دیا اللہ اُن کے نور کو لے گیا اور انکو اندھیرے میں چھوڑ دیا وہ کچھ نہیں دیکھتے۳۰

یا ذریعہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوتا، صرف فعل کی آخری غرض مقصود ہوتی ہے مثلاً انسان دیکھتا ہے تو آنکھ اور روشنی کا محتاج ہوتا ہے مگر جب کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے تو آنکھ اور روشنی جو ذریعہ انسان کے دیکھنے کا ہیں وہ مراد نہیں ہونگے صرف جو غرض دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے وہ مراد ہوگی۔ ایسا ہی انسان سننے میں کان اور ہوا کا محتاج ہے مگر اللہ تعالیٰ کے سننے میں یہ ذریعہ مفقود ہوگا اور اصل غرض جو سننے سے حاصل ہوتی ہے وہ مراد ہوگی۔ ایسا ہی انسان کا رحم یا غضب اس کے قلب پر خاص حالت کے وارد ہونے کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے مگر خدا کا رحم اور غضب صرف نتیجہ کا نام ہے۔ **اللہ کا استہزا**: یہی صورت استہزاء کے متعلق ہے جب اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا تو ہنسنا جو ذریعہ تھا وہ مفقود ہوگیا۔ اور ذلیل کرنا جو اصل غرض تھی وہ باقی رہ گئی پس اللہ تعالیٰ کا استہزا صرف ذلیل کرنے کا نام ہے نہ ہنسنے کا۔

کسی فعل پر سزا کا ذکر انہی الفاظ میں: عربی زبان میں یہ بھی قاعدہ ہے کہ کسی کے ایک فعل پر جو سزا دی جائے اس کو اسی فعل کے الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ جب ایک فقرہ جواب کے طور پر ہو تو اس سے مراد فی الواقع وہ فعل نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کے کسی فعل کی سزا ہوتی ہے۔ خود قرآن شریف میں اس کی مثالیں ہیں جزاؤ سیئۃ سیئۃ مثلها (الشوریٰ ۴۲-۴۰) حالانکہ سزا فی الواقع بدی نہیں۔ فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیه (۲-۱۹۴) حالانکہ دوسرے اعتداء سے مراد صرف سزا ہے نہ فی الواقع زیادتی۔ امام راغب نے بھی اس معنی کی تائید کی ہے اور ایسا ہی لسان العرب میں ہے۔ **سزا کا فلسفہ**: اسی لفظ کو سزا کے لیے استعمال کرنے میں سزا کے فلسفہ کی طرف اشارہ ہے کہ اس کو ضرورت جائز کرتی ہے۔ پس یوں بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ اللہ ان کو اُن کے استہزا کی سزا دے گا۔

۲۸ یمدھم۔ مدّ کے اصل معنی جرّ (غ) یعنی کھینچنا یا بسط یعنی پھیلانا (ت) ہیں جیسے لاتمدن عینیك (الحجر ۱۵-۸۸) کیف مد الظل (الفرقان ۲۵-۴۵) پھر اس کے معنی امہال یعنی مہلت دینا بھی آتے ہیں (ت) اور مدد کرنا بھی۔ یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔ جب ایک انسان سرکشی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو اسی حالت میں چھوڑ دیتا ہے جیسا جو شخص گمراہی اختیار کرے اسے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے وہ کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ ابن مسعود اور صحابہ سے یہی معنی مروی ہیں واقعات بھی اسی معنی کے مؤید ہیں کیونکہ منافقوں کو سزا آنحضرت صلعم کے آخری ایام میں غزوہ تبوک کے بعد دی گئی۔

طغیان۔ طغی سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں نافرمانی میں حد سے گزر جانا (غ)

یعمھون۔ عمہ کے معنی ہیں حیرانی کی وجہ سے کسی امر میں متردد ہونا۔ **عمه اور عمی میں فرق**: یہ لفظ صرف رائے کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور عمی یعنی اندھا پن ظاہری نابینائی اور رائے کی نابینائی دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔

۲۹ اشتروا۔ اشتراء۔ شری سے ہے عموماً شراء کے معنی خریدنا اور بیع کے معنی بیچنا آتے ہیں یعنی اول میں قیمت دینا اور چیز لینا اور دوئم میں چیز دینا اور قیمت لینا ہے لیکن جب چیز کے عوض چیز ہی جائے تو دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوجاتے ہیں اس لیے اشتراء ہر معاملہ پر بولا جاتا ہے جس سے کچھ حاصل ہو (غ)

منافقوں کا انجام: ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لینا یہ ہے کہ ہدایت جو ان کے پاس آئی تھی اس کو رد کر دیا اور اس کی جگہ گمراہی اختیار کر لی۔ پھر اس کو ایک تجارت قرار دیکر فرمایا فما ربحت تجارتھم۔ ربح اس فائدہ کو کہا جاتا ہے جو تجارت سے ملے جس فائدہ کو انہوں نے مدنظر رکھا تھا وہ دنیوی منفعت تھی مگر وہ بھی ان کو نہ ملی۔ وما کانوا مھتدین اور ہدایت بھی نہ ملی یعنی دنیا بھی ہاتھ سے گئی اور دین بھی برباد ہوا۔ یہ ایک پیشگوئی کے رنگ میں کہا گیا تھا کہ جس دنیا کی خاطر دین کو چھوڑتے ہیں وہ بھی نہیں ملیگی اور ایسا ہی حال منافقوں کا ہوا۔

۳۰ مَثَل۔ مثل سے مراد کسی چیز کے متعلق کوئی بیان ہے جو کسی دوسری ملتی جلتی چیز کے بیان سے مشابہت رکھتا ہو تاکہ ان میں سے ایک دوسرے کو واضح کردے (غ)

ظلمات۔ ظلمۃ کی جمع ہے جو روشنی کے نہ ہونے کا نام ہے۔ یہ لفظ عموماً جمع میں لایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ تاریکیاں بہت قسم کی ہیں۔ جیسے جہالت۔ توہم وغیرہ، یا شدت ظلمت مراد ہے۔

آگ جلانے کی مثال: دو مثالیں بیان کی ہیں ایک اس آیت میں دوسری آیت (۱۹) میں۔ دونوں مثالیں بحیثیت کل ہیں یعنی پہلی مثال میں آگ جلانے والا منافق نہیں بلکہ رسول ہے جیسا دوسری مثال میں بارش کی تشبیہ منافقت سے نہیں بلکہ وحی الٰہی سے ہے اور بخاری میں ہے مثلی کمثل رجل استوقد نارا۔ یعنی نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ میری مثال اس شخص کی مثال ہے کہ اس نے آگ جلائی۔ پس اس مثال کا ماحصل یہ ہے کہ رسول نے ایک آگ روشن کی جس کے ساتھ نور پیدا ہوا اور چیزیں نظر آنے

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾
اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ
وَّ بَرْقٌ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ
الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَ اللّٰهُ مُحِیْطٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾
یَكَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا
فِیْهِ وَ اِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ قَامُوْا وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ
ع ۲ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۰﴾

بہرے، گونگے، اندھے ہیں سو وہ نہیں لوٹتے [۳۰]
یا جیسے مینہ (جو) بادل سے (برسا) اس میں اندھیرا اور کڑک اور
بجلی ہے ہولناک آوازوں سے اپنی انگلیاں موت کے ڈر سے اپنے
کانوں میں دیتے ہیں اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے [۳۱]
قریب ہے کہ بجلی اُن کی نظر کو اُچک لیجائے، جب کبھی وہ انکو روشنی دیتی ہے
اس میں چلنے لگتے ہیں اور جب اُن پر اندھیرا کرتی ہے ٹھہر جاتے ہیں اور اگر اللہ
چاہتا تو ضرور اُنکی شنوائی اور انکی بینائی کو لیجاتا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے [۳۲]

لگیں۔ مگر منافقوں کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے وہ طاقت جس کے ساتھ انسان دیکھتا ہے، گنوا دی۔ کیونکہ دیکھنے کے لیے دو نُوروں کی ضرورت ہے، ایک انسان کے اندر کی روشنی، اور دوسری بیرونی روشنی۔ سو جب اندر کا نُور جاتا رہا تو ان کے لیے بیرونی روشنی بھی جو رسول نے روشن کی تھی کچھ فائدہ مند نہ ہوئی۔ روشنی اسی کو فائدہ دے سکتی ہے جس کے اندر بھی نُور ہو۔

ع ۳۰ صُمٌّ۔ اَصَمّ کی جمع ہے۔ بہرا۔ بُكْمٌ اَبْكَم کی جمع ہے۔ گونگا۔ عُمْیٌ اَعْمٰی کی جمع ہے۔ اندھا۔ مجازی معنی مراد ہیں یعنی کلمۂ حق سنتے نہیں نہ کہتے ہیں۔ نشانات صداقت دیکھتے نہیں۔ یہ شدید نفاق والے ہیں جو حق کی شنوائی اور بینائی سے ہی محروم ہو چکے ہیں۔ یا منافقوں کے سردار ہیں اور دوسری مثال والے ان کے پیرو ہیں یا وہ جن کا نفاق محض بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے ہے۔

ع ۳۱ صَیِّب۔ صوب سے مشتق ہے صَواب وہ امر ہے جو فی ذاتہ پسندیدہ ہو اور صَوب یا صَیِّب بارش کو کہتے ہیں جب وہ ایسے اندازے پر برسے جو موجب نفع ہو اور صَیِّب ایسے بادل کو بھی کہتے ہیں (غ)

السماء۔ سماء ہر چیز کا اس کا اوپر کا حصّہ ہے (غ) اس لیے محض بلندی پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سماء مینہ کو بھی کہتے ہیں جب تک زمین پر نہ آ جائے اور سماء کے معنی سحاب یعنی بادل بھی ہیں السماء السحاب (ل)

الصواعق۔ صاعقۃ کی جمع ہے جو صعق سے ہے اور صاعقۃ اس ہولناک آواز کو کہتے ہیں جو گرج سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے مراد بعض وقت موت یا عذاب بھی ہوتا ہے مگر امام راغب کہتے ہیں کہ یہ چیزیں اس کی تاثیرات میں سے ہیں۔ پس اصل معنی اس کے ہولناک آواز کے ہی ہیں اور زلزلہ کے ساتھ یا آندھی میں جو ہولناک آواز آتی ہے اس پر بھی قرآن شریف میں اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے۔

بارش کی مثال: اس تمثیل میں صَیِّب یا رحمت کی بارش سے مراد وحی الٰہی ہے۔ اندھیرے سے مراد وہ مشکلات ہیں جو وحی الٰہی کے قبول کرنے میں پیش آتی ہیں۔ کڑک سے مراد بعض خوفناک امور ہیں جیسے مثلاً دشمنوں کے حملے جن سے کمزور دل خائف ہو جاتے ہیں۔ چمک سے مراد وہ کامیابیاں ہیں جو مطلع کو روشن کر دیتی ہیں۔ یہ دوسری قسم کے منافق ہیں جو بالکل اپنی روشنی نہیں کھو چکے مگر ان کے اندر کچھ کمزوری ہے۔ کوئی مشکلات سامنے آ جاتی ہیں تو فوراً گھبرا جاتے ہیں۔ دشمن کی طرف سے کچھ تیاری دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ بس اب مارے گئے۔ دوسری جگہ آتا ہے یحسبون کل صیحۃ علیھم (المنافقون ۶۳-۴) اور یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے تو اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ مسلمانوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

ع ۳۲ لَو۔ بعض وقت محض حرف شرط کا کام دیتا ہے۔ یہاں بھی محض اگر کے معنی میں ہے۔

شاء۔ مشیئۃ اور ارادہ بعض کے نزدیک یکساں ہیں مگر بعض کے نزدیک مشیت کسی چیز کو وجود میں لانے کا نام ہے اور اللہ کی مشیت ایجاد شے ہی ہے اور انسان کی مشیت اصابۃ الشی ہے یعنی ارادہ کے ہم معنی۔ اسی معنی کی رُو سے درست ہے جو کہا گیا ما شاء اللہ کان جو اللہ چاہتا ہے ہوتا ہے۔ پس اللہ کی مشیت وجود شے کی مقتضی ہے (غ) شئ، بعض کے نزدیک شئ وہ چیز ہے جو جانی جائے اور جس کی خبر دی جائے (ل) اور شئ اصل میں شاء کا مصدر ہے جو بمعنی مفعول ہے یعنی چاہی گئی چیز۔

قدیر قدرۃ سے ہے اور جب یہ انسان کی صفت ہو، تو مراد اس سے ایسی حالت ہے جس میں انسان کسی چیز کے کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو مراد اس سے ہر قسم کے عجز یا کمزوری کی نفی ہوتی ہے اور سوائے اللہ تعالیٰ کے قدرت مطلقہ کا لفظ دوسرے پر بولا نہیں جا سکتا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فلاں امر پر قادر ہے اور قدیر کے معنی ہیں الفاعل لما یشاء علی قدر ما تقتضی الحکمۃ لا زائدا علیہ ولا ناقصا عنہ یعنی کرنے والا اس کا ہے جسے وہ چاہے اس اندازے پر جو حکمت کا اقتضا ہے نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم (غ)

پچھلی آیت میں جب یہ بیان کیا کہ کافر اسلام کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور اسلام کامیاب ہوگا تو اب بتایا کہ اسلام کی کامیابیاں تو ایسی ہونگی کہ آنکھوں کو چندھیا دینگی۔ کمزور دل منافق: مگر منافقوں کی حالت یہ ہے کہ جب کوئی کامیابی دیکھتے ہیں تو کچھ قدم آگے اُٹھانا چاہتے ہیں لیکن پھر مشکلات نظر آتی ہیں پھر ٹھہر جاتے ہیں یہی حالت منافقوں کی تاریخی واقعات سے نظر آتی ہے۔ کامیابی دیکھتے تو مسلمانوں کے ساتھ ملاپ زیادہ ظاہر کرتے تکلیف دیکھتے تو طرح طرح کی باتیں اسلام کے خلاف بنانے لگتے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور انھیں جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی ہو جاؤ۳۳

ان کی روشنی پہلی مثال کے منافقوں کی طرح بکلّی نہیں جاتی رہی، اس لیے یہ آخر کار راہِ راست پر آجائیں گے۔

صفاتِ الٰہی اور صفاتِ مخلوق میں کامل و ناقص کا مابہ الامتیاز: یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تمام صفات جو اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ اس کی مخلوق کی بھی صفات ہیں۔ مگر مخلوق کبھی کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں شریک نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اشتراکِ کامل سے شرک پیدا ہوتا ہے۔ مخلوق میں وہ صفات ناقص طور پر موجود ہیں اور خالق میں کامل طور پر۔ مثلاً انسان میں بھی سننے کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ میں بھی اور انسان میں بھی دیکھنے کی صفت ہے اللہ تعالیٰ میں بھی مگر انسان کے سُننے اور دیکھنے کو اللہ تعالیٰ کے سننے اور دیکھنے سے کوئی نسبت نہیں۔ خدا کی مشیت انسان کی مشیت پر غالب ہے: اسی طرح انسان میں بھی قدرت ہے مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے وہ ہیچ ہے۔ انسان میں بھی مشیت ہے مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اس پر غالب ہے۔ انسان کی صفات ایک تنگ اور محدود دائرہ میں کام کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات تمام حدبندیوں اور تمام قیود سے پاک ہیں۔ یہ ایک اصول ہے جو صفاتِ الٰہی کے سمجھنے میں بڑا کام دیتا ہے۔ ہم جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت کے ماتحت ہیں اسی طرح اس کی مشیت کے بھی ماتحت ہیں۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت نہ ہوں تو ہماری مشیت بھی اس کی مشیت کی طرح کامل ہو گی اور یہ شرک ہے۔

توحید پر دلائل: قادرِ مطلق پر اعتراض اور اس کا جواب: اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس پر یہ اعتراض آریہ سماج کی طرف سے ہُوا ہے کہ پھر وہ اپنے جیسا قادرِ مطلق خدا بنا سکتا ہے یا نہیں؟ اپنی مملکت سے کسی کو خارج کر سکتا ہے یا نہیں؟ یہ امور اس کی صفاتِ کاملہ کے خلاف ہیں۔ اس لیے وہ ایسا نہیں کرتا۔ قدرت کا سوال ہی اس بات پر آتا ہے جو اس کی صفات کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ فلاں شخص اتنا امیر ہے کہ وہ جو چاہے کھائے اور جو چاہے پہنے تو یہ ایک احمقانہ سوال ہو گا کہ کیا وہ غلاظت کھا سکتا ہے یا گندے چیتھڑے پہن سکتا ہے علاوہ ازیں لفظ شئ کو اختیار کر کے قرآن شریف نے خود بتا دیا کہ اس کی قدرت ان چیزوں پر ہے جو وہ چاہتا ہے۔ یعنی جو اس کی صفات کے تقاضا کے خلاف نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ دوسرے قادرِ مطلق خدا کا ہونا یا اس کی مملکت سے باہر کسی اور مملکت کا ہونا اس کی صفات کے تقاضا کے خلاف ہے اور اس لیے شئ کا اطلاق ہی اس پر نہیں ہو سکتا۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ آج سے سینکڑوں سال پیشتر جب ان اعتراضات کا نام و نشان نہ تھا اس وقت بھی قدیر کے معنی ائمہ لغت نے یہی کیے کہ اس چیز کا کرنے والا جسے وہ چاہے اور اس اندازے پر جو اقتضائے حکمت کے مطابق ہو نہ اس سے زیادہ ہو اور نہ کم۔ پس خود لغت ہی ان اعتراضات کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

ع۳۳ خلق۔ خَلق کے اصل معنی التقدیر المستقیم ہیں یعنی صحیح اندازہ اور اس کا استعمال دو طرح پر ہے۔ اول فی ابداع الشئ من غیر اصل ولا احتذاءٍ یعنی ایک چیز کا بالکل نیا وجود میں لانا جس کی نہ کوئی اصل ہے اور نہ کوئی نمونہ ہے جیسے فرمایا خلق السمٰوٰت والارض کیونکہ دوسری جگہ فرمایا ہے بدیع السمٰوٰت والارض (جس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ خلق ہے جو بغیر مادہ اور آلہ کے ہے) خدا نیستی سے ہستی کرتا ہے: اور دوسرا۔ ایک چیز سے دوسری چیز کے وجود میں لانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے خلق الانسان من نطفۃ اور وہ خلق جو بمعنی اِبداع ہے یعنی نیستی سے ہستی کرنا وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے (غ) پس معلوم ہوا کہ لفظ خلق کا استعمال زبانِ عرب میں دونوں طرح پر ہے نیستی سے ہستی کرنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور ایک چیز سے دوسری چیز کے بنانے پر بھی چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو خالق کل شئ بھی کہا ہے اس لیے جہاں تک بھی یہ سلسلہ چلایا جائے کہ فلاں چیز فلاں سے بنی اور فلاں فلاں سے آخر جہاں تک علم انسانی پہنچ سکتا ہے اس کا خالق بھی وہی ہے پس وہ نیستی سے ہستی کرنے والا ہوا۔

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عظمت کا ذکر ہے اور انسان کو اس عظمت کے سامنے سر جھکانے کا حکم ہے اور اس سے اگلے رکوع میں انسان کے مقامِ بلند کا ذکر ہے کہ اس کو کس قدر تسلّط کائنات پر حاصل ہے بتایا کہ خدا کے آگے عاجزی اختیار کر کے وہ سب کائنات پر حکمران ہوتا ہے۔

عبادت اور اطاعت میں فرق: سب سے پہلا حکم جو قرآن کریم میں دیا جاتا ہے وہ اللہ کی عبادت کرنا ہے یعنی اپنے قوٰی کو اس کی فرمانبرداری میں لگا دینا اس طرح پر کہ انسان کی حالت خضوع کی ہو۔ اطاعت کے لیے خضوع ضروری نہیں عبادت کے لیے ہے اس لیے اطاعت دوسروں کی بھی ہو سکتی ہے مگر عبادت سوائے اللہ کے اور کسی کی جائز نہیں۔ پھر انسان کے وہ تمام کام جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہوں عبادت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ حفاظتِ دین کے لیے صحابہ کا جنگیں کرنا بھی عبادت میں داخل تھا۔

خلق سے توحیدِ الٰہی پر دلیل: جو پیدا کرنے والا ہے عبادت اسی کی ہونی چاہیئے نہ اس کے غیر کی اور سب مذاہب کا اتفاق ہے کہ پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ پس اس میں توحیدِ الٰہی پر بھی دلیل ہے۔

عبادت سے حصولِ کمال: ربّ کی عبادت کرو۔ اور ربّ وہ ہے جو انسان کو اس کے کمالِ حقیقی تک اور اس کی پیدائش کی علّتِ غائی کے حصول تک پہنچاتا ہے۔ اس کی عبادت کے حکم میں اشارہ یہ ہے کہ بدون عبادتِ الٰہی تم اس کمال کو حاصل نہیں کر سکتے اور یہ کہ ایک اللہ کی عبادت ہی کمالات کے حصول تک پہنچانے کا ذریعہ ہے اس لیے اس کا نتیجہ تتّقون فرمایا اور اتقاء ضرر رساں اشیاء سے بچنا یا حقوق کی نگہداشت کرنا ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے وہ کمالِ انسانی کو پہنچنا تو ایک طرف رہا حقوقِ انسانی کی بھی پوری نگہداشت نہیں کر سکتے۔ آج یورپ کی اقوام کیوں آدھی نسلِ انسانی کے حقوق کو پامال کر رہی ہیں۔ اس لیے کہ خدا کی عبادت نہیں کرتیں، بلکہ سونے کی اور حکومت کی پرستش کرتی ہیں۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

وہ جس نے زمین کو تمھارے لیے فرش بنایا اور آسمان کو عمارت ۳۴ اور اوپر سے پانی اتارا، پھر اس کے ساتھ تمھارے لیے پھلوں سے رزق نکالا ۳۵ پس تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ اور تم جانتے ہو ۳۶

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

اور اگر تمھیں اس میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو ایک سورت اس جیسی لے آؤ۔ اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے مددگاروں کو بلا لو اگر تم سچے ہو ۳۷

ع۳۴ فِراش کے معنی مفروش یا پھیلائی ہوئی چیز ہیں کیونکہ فرش کے معنی بسط یا پھیلانا ہیں۔ راغب کہتے ہیں مراد یہ ہے کہ ایسا بنایا جس پر انسان قرار پکڑ سکتا ہے۔
بناء بمعنی مَبْنی یا بنائی گئی چیز کے ہے (غ)، یعنی عمارت۔ تنکیر عظمت کے لیے ہے۔

خلق سے دلیل: اگر خلقِ انسان اللہ تعالیٰ کی عظمت پر دال ہے تو زمین و آسمان کی بناوٹ اس عظمت کا اور بھی بلند احساس پیدا کرتی ہے۔ بعض نے بناء کے معنی ڈیرہ یا خیمہ کیے ہیں۔ اس صورت میں ظاہری تشبیہ مراد ہے اور آسمان کو عمارت کہنے سے یہ مراد ہے کہ سب کچھ ایک نظم کے ماتحت ہے جیسے عمارت میں ایک ترتیب ہوتی ہے اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اس کے بنانے والی ایک مدبّر بالارادہ ہستی ہے۔ زمین کے فراش یا بچھا یا ہوا ہونے یا انسان کی قرارگاہ ہونے میں اس کی کرویت کے خلاف کوئی دلیل نہیں۔

ع۳۵ نظارۂ قدرت اور فطرت انسانی کا مقابلہ: آسمان سے پانی کا برسنا اور اس کے ساتھ زمین سے پھلوں کا نکلنا۔ اس میں بتایا کہ زمین جو پستی کا مظہر ہے آسمان سے جو بلندی کا مظہر ہے کس طرح فائدہ اُٹھاتی ہے اسی طرح جب انسان اپنے آپ کو عبادت میں لگا کر پستی کا مظہر بناتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے اور فطرت انسانی کی مخفی قوتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں گویا جو کچھ نظارہ قدرت میں نظر آتا ہے۔ وہی فطرت انسانی میں موجود ہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جب تک وحی الٰہی سے بندوں کو ہدایت نہ ملے جو اوپر کے پانی سے مشابہت رکھتی ہے اندرونی استعدادیں دبی کی دبی رہ جاتی ہیں۔ اسی تعلق کے لحاظ سے اگلی آیت میں کھول کر وحی الٰہی کا ذکر کیا ہے۔

ع۳۶ انداد۔ نِدّ کی جمع ہے اور نِدّ کسی چیز کا وہ ہے جو اس کے جوہر یعنی اصل میں شریک ہو (غ) یا اس کی مثل اور اس کی ضد ہو (ت)

شرک فی العبادت شرک فی الذات ہے: عبادت یا دیگر امور میں دوسروں کو شریک کرنا ان کو اللہ کی ذات میں ہی شریک کرنا ہے۔ کسی شخص نے آنحضرت صلعم کے سامنے کہہ دیا تھا ماشاء اللہ وشئت جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔ آپ نے فرمایا اجعلتنی للہ ندا کیا تم مجھے اللہ کا شریک کرتے ہو صرف ماشاء اللہ کہو کیونکہ اسی کی مشیت سب مشیتوں پر غالب ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ تم جانتے ہو تو مراد یہ ہے کہ اس بات کو جانتے ہو کہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے یہ بُت وغیرہ نہیں ہیں۔ پھر بتوں کو پرستش میں شریک کرتے ہو اور ایک اصول کو مان کر خود اس کے خلاف چلتے ہو۔

ع۳۷ سورۃ۔ سورۃ اصل میں بلند منزل یا بلند مقام کو کہتے ہیں (غ) اور سُور شہر کی فصیل کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم کی سورت کو سورت یا تو اس لیے کہا کہ اس کا مقام بلند ہے اور یا اس لیے کہ جس طرح فصیل شہر کا احاطہ کرتی ہے اسی طرح سورت مضامین کا احاطہ کرتی ہے (غ) اور ہر سورت بجائے خود ایک کامل کتاب ہے اور عرف میں قرآن کریم کا ایک حِصّہ ہے جو دوسرے حصّوں سے بسم اللہ کے ذریعہ ممیز ہے قرآن کریم میں کل ۱۱۴ سورتیں ہیں۔ اسی مادہ سے قرآن کریم میں اساور کڑوں کے معنی میں اور تسوّروا انھوں نے دیوار پھاندی کے معنی میں آئے ہیں۔

شہداء۔ شہید کی جمع ہے اور شہود اور شہادت حاضر ہونا ہے دیکھنے کے ساتھ۔ آنکھ سے ہو یا بصیرت سے اور کبھی محض حاضر ہونے کو بھی کہتے ہیں۔

شہید صفات باری میں: لفظ شہید مختلف معنی میں آیا ہے اللہ کی صفات میں بھی شہید ہے اور یہ بلحاظ اپنے کمال کے ہے یعنی وہ جس کے علم سے کوئی چیز غائب نہیں (ت) یا العلیم محض علم کے لحاظ سے ہے اور الخبیر امور باطنی کے لحاظ سے اور الشہید امور ظاہری کے لحاظ سے۔

شہید کون کون ہیں: انبیاء کو اپنی اپنی اُمّتوں پر شہید کہا گیا ہے۔ کیونکہ جس قدر زیادہ کوئی شخص فضیلت رکھتا ہے اسی قدر زیادہ شہادت دینے کا اہل ہے جو اللہ و رسول کی اطاعت کرتے ہیں ان کو بھی شہید کہا گیا ہے اور بالآخر اسے بھی جو اللہ کی راہ میں مارا جائے بلکہ حدیث میں جلے ہوئے، مبطون، غریق وغیرہ کو بھی شہید کہا گیا ہے۔ یہاں شہداء کے معنی میں مختلف روایات ہیں بعض کے نزدیک مددگار مراد ہیں۔ بعض نے معبودان باطل، بعض نے حکام الفصحاء مراد لیے ہیں اور بعض کے نزدیک ائمہ یعنی پیشرو مراد ہیں۔

رازِ توحید وحی نے کھولا ہے: توحید الٰہی کا اصل راز وحی الٰہی نے ہی کھولا ہے۔ اس لیے پچھلی آیت میں وحی الٰہی کی طرف اشارہ کر کے اب اس کامل وحی کا ذکر کرتا ہے جس نے محمد رسول اللہ صلعم پر نازل ہو کر حقیقی توحید کی راہ دنیا کو دکھائی۔ اس آیت میں قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر یہ دلیل دی ہے کہ یہ ایک بے نظیر کتاب ہے۔ جس کی مثل کوئی

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ
وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾
وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا
مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ
رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ

پھر اگر تم نے (ایسا) نہ کیا اور ہرگز نہ کر سکو گے، تو اس آگ سے
بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں یہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے [۳۸]
اور انھیں خوش خبری دے دو جو ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے
ہیں کہ ان کے لیے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں [۳۹]، جب
کبھی ان کو ان میں سے کوئی پھل رزق دیا جائے گا کہیں گے
یہ وہی ہے جو ہمیں پہلے دیا گیا، اور انھیں ملتا جلتا (رزق)

نہیں بنا سکتا۔ قرآن کی مثل کا مطالبہ: یہ دعویٰ قرآن مجید میں کئی جگہ ہے کہیں اس رنگ میں کہ اس قرآن کی مثل لاؤ، کہیں یوں کہ دس سورتیں اس کی مثل بنا کر دکھاؤ اور آخری اور اقل مطالبہ یہ ہے کہ ایک ہی سورت اس کی مثل بنا کر لے آؤ۔ یہ تصریح نہیں کہ کس بارہ میں مثل ہو۔ مثل تین باتوں میں چاہیئے: ایک کتاب یا کلام کا بے مثل ہونا تین باتوں میں ہو سکتا ہے، الفاظ کی ظاہری بندش کے لحاظ سے کمال اور جامعیت مضامین میں اور اس اثر کے لحاظ سے جو اس کلام سے پیدا ہو۔ فصاحت و بلاغت و حسن: فصاحت و بلاغت میں قرآن کریم کا بے مثل ہونا خود اس سے ظاہر ہے کہ یہ زبان عربی میں فصاحت و بلاغت کا معیار مانا جاتا ہے۔ حالانکہ اس وقت نازل ہوا جب عربی زبان میں نثر کا رواج نہ تھا۔ بلحاظ کمال مضامین یہ حالت ہے کہ نہ صرف تمام مذاہب کے اصول باطلہ کی تردید کرتا اور اصولِ حقّہ کو کھول کر بیان کرتا ہے بلکہ تمدن اور معاشرت اور سیاست کے اصول کو بھی بیان کرتا ہے پھر جس بات کا دعویٰ کرتا ہے اس کے دلائل بھی ساتھ دیتا ہے۔ جامعیت مضامین قرآن: بلحاظ جامعیت مضامین چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی اپنے اندر یہ کمال رکھتی ہے کہ ایک خاص مضمون کو کمال تک پہنچاتی ہے، اور ایک کتاب کا حکم رکھتی ہے۔ مگر سب سے واضح معیار مثل ہونے یا نہ ہونے کا یہ ہے کہ جو کام اس کتاب نے کر کے دکھایا ہے وہ دوسری کسی کتاب نے کر کے نہیں دکھایا اور چونکہ اس سورت کی ابتدا اس دعویٰ سے کی تھی کہ یہ کتاب ہدایت ہے۔ ہدایت دینے میں بے نظیری: پس اسی میں بے مثل ہونے کا بھی دعویٰ کیا ہے یعنی کوئی ایسی کتاب یا سورت لاؤ جو دنیا کے لیے اسی طرح موجب ہدایت بنی ہو۔ قرآن کریم نے جو انقلاب دنیا میں پیدا کیا اور جس طرح نہایت پستی کی حالت سے ایک قوم کو اٹھا کر اوج کمال تک پہنچایا اس کے متعلق دنیا کو اعتراف ہے کہ ایسا کام کسی اور کتاب نے کر کے نہیں دکھایا۔

ع [۳۸] یہاں پیشگوئی کی ہے کہ اس کتاب کی مثل کبھی کوئی نہ بنا سکے گا اور اس کی صداقت آج آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہے۔ باوجود ایسی کھلی دلیل کے جو شخص توحید کو چھوڑتا اور بت پرستی اختیار کرتا ہے۔ اس کا انجام آگ ہے۔ یہاں دوزخ کی آگ کے متعلق فرمایا کہ اس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ گویا شرک یا بت پرستی سے ہی یہ پیدا ہوتی ہے اور سارے گناہ شرک کی ہی فروع ہیں۔ جس طرح ساری نیکیوں کی جڑ توحید ہے۔ پتھر کن معنوں میں دوزخ کا ایندھن ہیں: پتھروں سے مراد یہاں معبودانِ باطل ہیں یا جیسا کہ امام راغب نے ایک قول نقل کیا ہے مراد ایسے لوگ ہیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سخت دل ہیں جیسے پتھر، اسی کی طرف فہی کالحجارۃ او اشد قسوۃ (۲:۷۴) میں اشارہ ہے اور عربی میں بڑے ہیبت ناک آدمی کو بھی حجر کہا جاتا ہے جس پر دوسرے کی بات کا اثر نہ ہو۔ پس ہو سکتا ہے کہ یہاں الحجارۃ سے مراد وہ قسی القلب لوگ ہوں جو ختم اللہ علی قلوبہم کے مصداق ہیں اور الناس سے مراد عام لوگ۔ لوگوں کا دوزخ کا ایندھن ہونا بتاتا ہے کہ دوزخ انسان کے ہی اعمال کا نتیجہ ہے حتیٰ کہ اس کا ایندھن یعنی جس سے یہ آگ جلتی ہے خود انسان ہیں کچھ اور نہیں۔

اعدت للکافرین میں بتایا کہ وہ کفر سے ہی تیار ہوتی ہے۔ مسلمان میں جس قدر حصّہ کفر کا ہے اسی قدر اس کے لیے دوزخ ہے۔ دوزخ پر فنا: یہی وجہ ہے کہ صحابہ اور تابعین اس بات کے قائل ہیں کہ دوزخ پر آخر فنا آ جائے گی۔ جیسا کہ ابن تیمیہ نے یہ قول ایک جماعت سے نقل کیا ہے۔ کیونکہ روایات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب اس میں کوئی نہ رہے گا۔ پس جب کوئی انسان اس میں نہ رہا اور اس کا ایندھن ختم ہو گیا تو وہ آگ بھی فنا ہو جائے گی۔ اس پر مفصّل بحث سورہ ہود میں آئے گی۔

ع [۳۹] جنات۔ جنّۃ کی جمع ہے جو جَنّ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا حواس ظاہری سے مخفی رکھنا (غ) اور جنّۃ اس باغ کو کہتے ہیں جس کے درختوں نے اس کی زمین کو ڈھانک لیا ہو (غ) لفظ جنّت صرف باغ کے معنی میں بھی قرآن شریف میں آیا ہے اور بہشت کو بھی جنّۃ کہا ہے یا تو اس لیے کہ اس کو دنیا کے باغوں سے تشبیہ دی ہے (غ) اور بہشت کا نقشہ جو قرآن کریم نے کھینچا ہے وہ گویا بطور مثال ہے جیسا کہ خود الفاظ قرآنی مثل الجنۃ التی وعد المتقون (الرعد ۱۳-۳۵۔ محمدؐ ۴۷-۱۵) سے بھی ظاہر ہے اور یا اس لیے کہ جنت کی نعمتیں انسان کے حواس ظاہری سے مخفی رکھی گئی ہیں (غ) جیسا کہ لفظ جنّ کے اصل معنی بتاتے ہیں اور قرآن کریم نے اس اخفا کو دوسری جگہ خود بیان فرمایا ہے فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین (السجدہ ۳۲-۱۷)

الانہار: نہر کی جمع ہے یعنی وہ مقام جہاں سے پانی بافراط بہتا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک مثال کے طور پر بیان کیا ہے اس کے لیے جو جنت میں لوگوں کو اس کے فیض اور فضل سے بافراط ملے گا اور تجری من تحتہا الانہار میں اور ان المتقین فی جنّات ونہر میں ان کے نزدیک یہی مراد ہے۔

فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً
فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ

دیا جائیگا اور انکے لیے اُن میں پاک ساتھی ہونگے اور وہ انہی میں رہیں گے[۱۳۹]
اللہ اس بات سے شرم نہیں کرتا کہ کوئی سی مثال بیان کرے مچھر کی اور
اس سے بڑھ کر[۱] سو جو ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ یہ اُن کے رب کی

ربط: جب آگ کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ یہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے تو اس کے مقابل پر مومنوں کا اور ان کی آیندہ حالت کا ذکر کیا اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے، اس کے احکام کی فرمانبرداری سے بجائے آگ کے باغ اور نہریں بنتی ہیں۔

بہشت کے باغ اور نہریں: قرآن کریم نے بہشتی زندگی کا نقشہ بسا اوقات ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ وہ جنّات یعنی باغوں میں ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یا کہیں فرمایا کہ وہ باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے۔ اس سے کیا مراد ہے۔ پہلی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ آیندہ زندگی کے متعلق جو کچھ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے وہ محض بطور مثال بیان ہوا ہے اور مثل الجنّۃ التی وعد المتقون (محمّد[۴۷]-۱۵، الرعد[۱۳]-۳۵) میں یہ صراحت موجود ہے اور ابن عباس سے ابن کثیر میں روایت موجود ہے لایشبہ شیء ممّا فی الجنۃ ما فی الدنیا الّا فی الاسماء یعنی جو چیزیں جنّت میں ہیں وہ دنیا کی کسی چیز سے سوائے نام کے مشابہت نہیں رکھتیں اور دوسری بات یہ ہے کہ جنت کی نعماء انسان کی اس آنکھ سے اور اس کے ظاہری حواس سے مخفی رکھی گئی ہیں۔ اس پر اول تو خود لفظ جنّت کے معنی سے شہادت ملتی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ پھر قرآن شریف میں صراحت سے ہے فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرۃ اعین (السجدہ[۳۲]-۱۷) یعنی کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کے لیے کیا آنکھوں کی ٹھنڈک یعنی نعمت مخفی رکھی گئی ہے اور حدیث صحیح میں اس سے بھی زیادہ صراحت ہے جہاں اسی آیت کی تفسیر میں آنحضرت صلعم نے فرمایا قال اللہ اعددت لعبادی الصّالحین مالاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر (بخاری) اللہ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا اور نہ کسی بشر کے دل پر وہ گزرا۔ جنت کی نعماء کا جہاں ذکر ہو اس میں ان دونوں باتوں کا یاد رکھنا ضروری ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ فی الواقع جنّات سے مراد ایسے باغ تو نہیں جیسے یہاں ہیں اور نہ نہروں سے مراد ایسی ہی پانی کی نہریں ہیں۔ وہ کیا ہیں۔ اس حقیقت کا علم وہیں ہوگا۔

ع[۱۳۹] متشابہ۔ شبہ سے ہے اور اس کے معنی ہیں ایک دوسرے سے ملتے جُلتے۔

ازواج۔ زوج کی جمع ہے۔ حیوانات میں جن کے جوڑے ہوتے ہیں جوڑے کے ہر فرد کو دوسرے کا زوج کہا جاتا ہے اور غیر حیوانات میں اور حیوانات میں بھی ہر ایک کو جو دوسرے کا قرین یعنی ساتھی ہو اس کا زوج کہا جاتا ہے (غ) چنانچہ احشروا الذین ظلموا وازواجهم (الصّٰفّٰت[۳۷]-۲۲) میں اور هم وازواجهم فی ظلل (یٰسٓ[۳۶]-۵۶) میں امام راغب نے ازواج کے معنی کیے ہیں ان کے ساتھی جنھوں نے ان کے افعال میں ان کا اقتدا کیا۔

مطهرۃ۔ طهارۃ بمعنی پاکیزگی سے ہے اور طہارت دو طرح پر ہے جسم کی اور نفس کی (غ) چنانچہ یہاں ازواج مطهرۃ کے معنی انہوں نے یوں کیے ہیں کہ دنیا کی آلائشوں اور اس کی نجاستوں سے پاک یا بُرے اخلاق سے پاک کیے گئے۔ قتادہ سے ہے گناہ اور اذی سے پاک کیے گئے (ج)

خالدون۔ خلد سے ہے اور خلود کے معنی ہیں کسی چیز کا فساد کے واقع ہونے سے بری رہنا اور اس کا بقا اس حالت پر جس پر وہ ہو (غ) اور خلود فی الجنۃ کے معنی امام راغب کے نزدیک یہی ہیں یعنی اشیاء کا بقا اس حالت پر جس پر وہ ہیں بغیر اس کے کہ ان میں فساد واقع ہو۔ بالفاظ دیگر وہاں تنزّل نہیں جس طرح اس دنیا میں ہے اور ہمیشگی کے معنی اس میں بطور استعارہ ہیں (غ) اور روح المعانی میں ہے کہ خلود معتزلہ کے نزدیک بقائے دوام یا ہمیشہ رہنا ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ اور اہل سنت کے نزدیک بقائے طویل یعنی زمانہ دراز تک رہنا ہے خواہ منقطع ہو جائے خواہ نہ ہو۔

جنت کے پھلوں کے متعلق یہ کہنا کہ یہ وہ ہے جو ہمیں پہلے یعنی دنیا میں دیا گیا۔ مراد جسمانی پھل تو ہو نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ پھل تو سب مومنوں کو دنیا میں ملتے نہیں۔ پس مراد اعمال حسنہ کے ثمرات ہیں جن کو روحانی طور پر مومن یہاں بھی پا لیتا ہے اور متشابہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ گو وہ آخرت کے پھل الگ ہوں گے مگر اعمال حسنہ کے مشابہ ہوں گے جس طرح بدی کی سزا اس کی مثل ہے اسی طرح نیکی کا پھل بھی اس عمل نیک سے ملتا جلتا ہے۔

بہشت میں ازواج: جنت میں ازواج بھی ہوں گے۔ ازواج کے صاف معنی تو ساتھی ہیں جیسے احشروا الذین ظلموا وازواجهم۔ (الصّٰفّٰت[۳۷]-۲۲) میں مومن مرد اور مومن عورتیں دونوں الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت میں شامل ہیں دونوں کے لیے بہشت کی نعماء ہوں گی دونوں کے لیے باغ اور نہریں ہوں گی دونوں کے لیے ازواج مطهرہ یعنی پاک ساتھی ہونے چاہئیں۔ اگر بیبیاں بھی مراد لی جائیں تو بہشت میں ان کا ہونا کوئی امر قابل اعتراض نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں جیسا کہ فرمایا ومن کل شیء خلقنا زوجین (الذاریات[۵۱]-۴۹) اور گو جوڑے پیدا کرنے کی ایک غرض اس دنیوی زندگی میں سلسلہ توالد و تناسل بھی ہے۔ مگر مرد و عورت کے جوڑے کی اور اغراض بھی ہیں وہ ایک دوسرے کے لیے تسکین و راحت کا موجب ہیں وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔ ان پاک تعلقات کے جنت میں ہونے پر کسی عقلمند کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور بہرحال اس بات کو تو سب نے مانا ہے کہ جنت کی نعماء کی حقیقت وہ نہیں جو اس دنیا کی ہے گو ناموں میں اشتراک ہو اور ازواج کے ساتھ مطهرۃ کا لفظ بڑھا کر بتایا کہ یہ رفاقت تمام آلائشوں سے پاک ہے اس پاک رفاقت پر اعتراض کرنا ناپاکوں کا کام ہے۔

ع[۱۴۰] یستحی۔ اس کا مادہ حیی ہے جس سے حیاۃ بمعنی زندگی بھی ہے اور حیاء کے اصل معنی ہیں بُری باتوں سے رُکنا اور ان کا ترک کرنا اور یہی معنی استحیاء کے ہیں (غ) اسی لیے حیا کو ایمان سے کہا ہے کیونکہ وہ بُری باتوں یعنی معاصی سے روکتا ہے۔ اچھے کام سے رکنے کا نام حیا نہیں۔

الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۚ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ
مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَ
يَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾
الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ
وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ
فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٢٧﴾

طرف سے سچ ہے اور جنھوں نے انکار کیا وہ کہتے ہیں اللہ نے اس مثال سے کیا چاہا ہے وہ بہتیروں کو اس سے گمراہ ٹھیراتا ہے اور بہتیروں کو اس سے ہدایت دیتا ہے اور وہ اس سے سوائے فاسقوں کے کسی کو گمراہ نہیں ٹھیراتا ۴۱ جو اللہ کے عہد کو اس کے پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور اُسے کاٹتے ہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہے کہ ملایا جائے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یہی نقصان اُٹھانے والے ہیں ۴۲

بعوضۃ۔ بعض سے مشتق ہے دوسرے حیوانات کے مقابل میں اس کے جسم کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بعوضۃ کہا جاتا ہے (رغ) عربی زبان میں غایت درجہ کی کمزور چیز کی مثال مچھر سے دی جاتی ہے ان کی امثال میں ہے اضعف من بعوضۃ یعنی مچھر سے بھی زیادہ کمزور۔

مچھر کی مثال: اصل مضمون رکوع کا اللہ تعالیٰ کی توحید اور عظمت ہے اسی کی تائید میں قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کا اثبات کیا گیا ہے۔ رکوع کے ولی آخر میں بھی یہی مضمون ہے اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو معبودان باطل کی مثالیں کہیں مکڑی سے اور کہیں مکھی سے دی ہیں تو یہ حق ہے اور اللہ تعالیٰ حق کے بیان کرنے سے نہیں رُکتا۔ مکڑی کی مثال سورہ عنکبوت میں دی ہے جہاں فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے سوائے اولیاء بناتے ہیں تو ان کی مثال مکڑی کے گھر کی ہے جو سب گھروں میں کمزور ہے یعنی ادھر بنتا ہے اُدھر بگڑتا ہے (العنکبوت ۲۹-۴۱) اور مکھی کی مثال یوں دی ہے کہ سارے معبودان باطل ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ مکھی ان سے کچھ لے جائے تو اسے بھی واپس نہیں لے سکتے (الحج ۲۲-۷۳) معبودان باطل کی ان مثالوں کو کفار بُرا مناتے تھے تو فرمایا کہ کمزور سے کمزور شے کی مثال بھی باطل معبودوں کی عاجزی کے اظہار کے لیے غیر محل نہیں حتیٰ کہ مچھر کی مثال بھی جس کو سب سے زیادہ کمزور سمجھا جاتا ہے اور یا چونکہ اوپر جنت کا ذکر تھا اور وہ بھی ایک مثال ہے اس لیے فرمایا کہ ان نعماء کو سمجھانے کے لیے اس دنیا کی چیزوں سے ان کی مثال دینے میں ہرج نہیں۔

ع۴۱ یضلّ۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ اضلال دو طرح پر ہے ایک یہ کہ اضلال نتیجہ ہو گمراہ ہو جانے کا مثلاً اگر کسی کا اُونٹ گم ہو جائے تو وہ کہے گا اضللت البعیر۔ اب اس کے یہ معنی نہیں کہ میں نے اونٹ کو گمراہ کر دیا۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ میرا اونٹ گمراہ ہو گیا یعنی گم ہو گیا۔ اسی طرح کسی پر گمراہ ہونے کا حکم لگایا جائے یعنی اس کے متعلق کہا جائے کہ وہ گمراہ ہو گیا تو بھی اضللتہ کہ دینگے۔ جیسے اس شعر میں۔ فما زال شربی الراح حتی ؛ اضلّنی صدیقی وساءنی بعض ذٰلک یعنی میں شراب پیتا رہا یہاں تک کہ میرے دوست نے مجھے گمراہ قرار دیا۔ حالانکہ لفظ اضلّ استعمال کیا ہے مگر مراد یہ نہیں کہ گمراہ کر دیا بلکہ گمراہ کہا۔ اور دوسرا یہ کہ اضلال کا نتیجہ گمراہی ہو یعنی ایک شخص دوسرے کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگا رہے یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو جائے مثلاً باطل کو اچھے اچھے پیرایوں میں بیان کرے۔ اب سوال یہ ہے کہ لفظ اضلال پہلے معنی میں خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہو سکتا ہے یا دوسرے معنی میں۔ دوسرے معنی میں منسوب کرنے سے یہ مراد ہو گی کہ خدا تعالیٰ انسانوں کے سامنے باطل باتوں کو اچھے اچھے پیرایوں میں بیان کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو جاتے ہیں یہ بالبداہت باطل ہے اللہ تعالیٰ اعمال حسنہ کو اچھے پیرایوں میں بیان کرتا ہے اور اُن کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے پس لازماً پہلے معنی میں لفظ لیا جائے گا اور مراد صرف اس قدر ہو گی کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو گمراہ پا کر گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے یا ان پر گمراہ ہونے کا فتویٰ لگاتا ہے یعنی ان کی گمراہی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر بطور سزا گمراہ ہونے کا فتویٰ لگ جاتا ہے لغت حدیث میں بھی ہے کہ اضللتہ کے معنی اس طرح پر بھی آتے ہیں جیسے احمدتہ کے معنی ہیں میں نے اُس کو محمود پایا اور ابخلتہ کے معنی ہیں میں نے اس کو بخیل پایا۔ اسی طرح اضللتہ کے معنی ہیں میں نے اُسے گمراہ پایا۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے ان النبی صلعم اتی قوما فاضلھم جس کے معنی ہیں کہ نبی صلعم ایک قوم کے پاس آئے اور ان کو گمراہ پایا۔ یہ معنی نہیں کہ ان کو گمراہ کر دیا (ت)۔

الفاسقین۔ فاسق فسق سے ہے جس کے معنی شریعت کی روک سے نکل گیا گویا ایک عہد کر کے اس سے پھر گیا کیونکہ قبولیت شریعت ایک عہد ہے اور فسق تھوڑے اور بہت ذنوب دونوں پر بولا جاتا ہے مگر عرف شریعت میں کثرت پر بولا جاتا ہے۔ یعنی جب ایک شخص بہت زیادہ خروج عن الشریعت کرے تو اسے فاسق کہا جاتا ہے اور کفار کو جو فاسق کہا ہے تو وہ بھی اسی لحاظ سے کہ وہ زیادہ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں اور اس عہد کو توڑتے ہیں جو انسان کی فطرت میں مرکوز ہے (رغ) اور یہ شرعی اصطلاح ہے۔ فاسق کا لفظ کلام عرب میں انسان کی وصف میں نہ بولا جاتا تھا (رغ) یہاں ما یضلّ بہ الا الفاسقین کہہ کر یہ بتا دیا کہ اضلال کے معنی گمراہ پانا یا گمراہی میں چھوڑنا ہیں کیونکہ فاسق تو خود ہی پہلے گمراہ ہے اسے اور گمراہ کیا کرنا ہے کیونکہ فاسق اس کو کہتے ہیں جو شریعت یعنی قانون کی حدود سے باہر نکل جاتا ہے تو وہ خود گمراہ ہو چکا ہوا ہے یہ دوسرا قرینہ ہے کہ اضلال کے معنی یہاں گمراہ ٹھیرانا یا گمراہی میں چھوڑ دینا ہیں۔

ع۴۲ عھد اللہ۔ عہد وہ اقرار موثق ہے جس کی حفاظت کرنی ضروری ہو۔ راغب لکھتے ہیں کہ عھد اللہ یعنی اللہ کا عہد کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس نے ایک بات ہماری عقل میں ودیعت کر رکھی ہے اور کبھی یہ کہ اس کے رسول کتاب وسنت سے ایک بات کا حکم دیتے ہیں۔ تیسری صورت یہ بھی لکھی ہے کہ انسان خود اپنے اوپر ایک امر کو واجب کرلے جسے نذر کہا جاتا ہے۔ پہلے کی مثال الست بربکم قالوا بلیٰ (الاعراف ۷-۱۷۲) ہے جس کو قرآن کریم نے خود عہد فرمایا ہے۔ اللہ کا سب سے بڑا عہد یہی ہے جس کو ہر انسان کی فطرت میں رکھ دیا کہ وہ اپنے خالق کی عبادت کرے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ
ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ
ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ
سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ ع ۳ ۹ ۳

تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو اور تم مُردہ تھے، پھر اُس نے تمھیں
زندگی دی، پھر تم کو ماریگا پھر تمکو زندہ کریگا، پھر اُسی کی طرف لوٹائے جاؤگے [۴۳]
وہی ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمھارے لیے پیدا
کیا، پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہُوا تو انھیں ٹھیک سات آسمان
بنایا اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے [۴۴]

میثاق عھد : من بعد میثاقہ۔ میثاقہ میں ضمیر عہد کی طرف بھی جاسکتی ہے اور اللہ کی طرف بھی۔ اور اللہ کا عہد کو مضبوط کرنا یا تو یہ ہے کہ وہ عہد خود مضبوط ہوتا ہے جیسے عقل وفطرت کی شہادت کہ وہ ایک نہایت مضبوط شہادت ہے اور یا جب رسولوں کے ذریعہ سے کوئی حکم دیا جاتا ہے تو اس کو بذریعہ نشانات و دلائل کے مضبوط کیا جاتا ہے اور میثاق عھد سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ایک شخص اس عہد کو قبول کرکے پھر اسے توڑتا ہے جیسے منافق ہوگیا۔

قطع مایوصل : یقطعون ما امراللہ بہ ان یوصل ان باتوں کو قطع کرنا جن کے ملانے کا حکم اللہ نے دیا ہے یعنی جن حقوق کے ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے ان کا ادا نہ کرنا۔ اس میں قطع رحمی بھی آجاتی ہے اور مخلوق کے تمام حقوق بھی آجاتے ہیں گویا حقوق مخلوق کا ادا نہ کرنا بھی فسق ہے۔ خواہ وہ اپنے عزیزوں، دوستوں کے حقوق ہوں خواہ اپنے ہمقوموں اور ہموطنوں کے، خواہ دوسری اقوام کے۔

فساد فی الارض : یفسدون فی الارض۔ وہ نہ صرف اللہ کے عہد کو توڑتے اور اللہ کی عبادت سے انحراف کرتے ہیں، نہ صرف مخلوق کے حقوق کو ادا نہیں کرتے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ زمین میں فساد پھیلاتے اور ظلم کرتے ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ادا نہ کرنے کا نتیجہ فساد فی الارض ہے اور آخر کار وہ ایک کھلی صورت اختیار کرلیتا ہے ایسی قوم کی آخری حالت کی تصویر اولٰئک ھم الخاسرون ہے یعنی وہ سخت نقصان اس دنیا میں بھی اُٹھاتے ہیں۔

خاسرون۔ خُسر اور خُسران راس المال کے گھاٹے کا نام ہے اور اس کا اکثر استعمال مال وجاہ کے نقصان پر ہوتا ہے مگر قرآن شریف میں عموماً عقل، ایمان اور ثواب کے نقصان پر بولا گیا ہے (غ)

ع [۴۳] اس آیت میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا ذکر ہے۔ پہلی موت سے مراد عدم ہے یعنی نیستی کی حالت سے عالم وجود میں آنا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے ھل اتٰی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئا مذکورا (الدھر ۷۶-۱) یہی معنی ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ سے ثابت ہیں۔

نیستی سے ہستی دلیل الوہیت ہے : پس یہاں اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یہ دلیل دی ہے کہ نیستی سے تم کو ہستی کی حالت میں لایا۔ اگر آریوں کی طرح محض یہ مانا جائے کہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال ہوتا ہے اور نیستی سے ہستی کوئی نہیں تو الوہیت پر دلیل پیدا نہیں ہوتی۔

ثمّ یمیتکم ثم یحییکم بطور دلیل نہیں بلکہ اس میں آئندہ کی ایک خبر بتائی کہ موت کے بعد وہ تمہیں پھر ایک زندگی عطا فرمائے گا۔ اللہ کی طرف رجوع : اور ثم الیہ ترجعون میں اس دوسری زندگی کی غرض بتائی کہ تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤگے بالآخر سب کا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہوگا۔

ع [۴۴] ثم کے معنی میں ترتیب شرط نہیں (مغنی) بعض وقت صرف فا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہاں یہی معنی ہیں کیونکہ دوسری جگہ صاف فرما دیا والارض بعد ذٰلک دحٰھا (النّٰزعٰت ۷۹-۳۰) یعنی زمین بعد میں بنی۔

استوٰی الیٰ۔ استوٰی۔ جب دو فاعل رکھتا ہو تو مساوی ہونے کے معنی میں ہوتا ہے جیسے لایستوون اور جب ایک ہی فاعل ہو تو ایک چیز کے اپنی ذات میں اعتدال کی حالت میں ہونے پر دلالت کرتا ہے جیسے ذومرّۃ فاستوٰی (النجم ۵۳-۶) اور جب اس کا صلہ الیٰ ہو جیسے یہاں تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی طرف پہنچنا اپنی ذات سے ہو یا تدبیر سے (غ)

السماء۔ لغت میں ہے سماء کل شی اعلاہ ہر ایک چیز کے اوپر جو ہو وہ اس کا سماء ہے۔ یہاں تک کہ وہی چیز اپنے سے اوپر والی چیز کے لحاظ سے ارض ہے اور اپنے سے نیچے والی چیز کے لحاظ سے سماء ہے (غ)

سبع یا سات کو اعداد تامہ میں سے سمجھا گیا ہے اور لسان العرب میں ہے کہ عرب لوگ سات اور ستّر اور سات سو کے اعداد کو کثرت کے موقعہ پر استعمال کرتے ہیں۔ ابن اثیر نے بھی ایسا ہی لکھا ہے اور مثال دی ہے کمثل حبّۃ انبتت سبع سنابل (۲۶۱) گویا سات خوشوں سے مراد بہت سے خوشے ہیں ان تستغفرلھم سبعین مرّۃ (التوبہ ۹-۸۰) گویا ستّر مرتبہ سے مراد کئی دفعہ ہے۔

سوّٰی : سوّٰھن۔ تسویۃ کے معنی ہیں کسی چیز کا ٹھیک بنانا یا حالت اعتدال پر یا حکمت کے موجب بنایا (غ) خلقک فسوّٰک (الانفطار ۸۲-۷) میں یہی معنی مراد ہیں اور یہاں بھی۔

علیم۔ علم سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا اس کی حقیقت کے ساتھ پالینا (غ) اور عالم اور علیم اور علّام اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہیں یعنی جاننے والا اس کا جو ہے اور جو اس کے ہونے سے پہلے ہے اور جو ہوگا اور جو اس کے بعد ہوگا اور اس کا علم تمام اشیاء پر محیط ہے ان کے ظاہر پر اور انکے باطن پر اور چھوٹی پر اور بڑی پر (ت)

زمینی مخلوق انسان کے فائدے کے لیے ہے : زمین میں جو کچھ ہے اس کو انسان کے فائدے کے لیے بنایا۔ اس آخری آیت میں اس اور اگلے دونوں رکوعوں کے مضمون کی طرف اشارہ ہے بنانے والے کی عظمت کی طرف بھی اور اس کے مقام بلند کی طرف بھی جس کے فائدے کے لیے یہ چیزیں بنائیں، رکوع کو اس بات سے

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں ع۴۵ انھوں نے کہا کیا تو اس میں (اسے) بنانا

شروع کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا اور اس پر ختم کیا کہ زمین میں سب کچھ انسانوں کے فائدے کے لیے پیدا کیا۔ اس میں یہ بھی سکھایا کہ تم ان چیزوں کو اپنے فائدے کے لیے اپنے کام میں لگانا سیکھو۔

آسمان: سماء کیا ہے اور سبع سمٰوات سے کیا مراد ہے لغت میں محض بلندی کا نام سماء ہے پس مراد ہے کہ اس کی طرف متوجہ ہوا جو زمین سے اوپر ہم کو نظر آتا ہے وہ کیا چیز ہے۔ آسمان دخان ہے: قرآن کریم میں فرمایا ثم استوٰی الی السماء وھی دخان (حٰم السجدۃ[41]-۱۱) یعنی اللہ تعالیٰ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دخان ہے یعنی دھواں ہے۔ پس سماء کوئی ٹھوس چیز نہیں۔ بلکہ محض ایک دخان ہے۔ سائنس کہتا ہے ایتھر ہے ہاں اس میں ستارے اور سیّارے ہیں۔

سات آسمان: سبع سماوات میں ممکن ہے محض تکثیر مراد ہو یعنی کئی آسمان۔ یوں جو اوپر کوئی عالم ہم کو نظر آتا ہے۔ ایک تو خود ہمارا نظام شمسی ہے جس میں زمین کے علاوہ سات بڑے سیارے ہیں۔ وہ سب چونکہ ہم کو زمین کے اوپر نظر آتے ہیں اس لیے بلحاظ ہماری زمین کے وہ سماء ہیں اور ایک جگہ ان کو سبع طرائق (المومنون[23]-۱۷) یعنی سات رستے بھی کہا ہے۔ اور کل فی فلك یسبحون (یٰس[36]-۴۰) میں یہ بھی بتا دیا کہ سیارے اپنے اپنے فلک میں گردش بھی کرتے ہیں پس ایک تفسیر سبع سماوات کی ہمارا نظام شمسی بھی ہو سکتا ہے اور دوسری تفسیر کل ستارے جو ہم کو نظر آتے ہیں۔ اب تک سائنسدانوں نے ان ستاروں کے جو کھلی آنکھ سے نظر آتے ہیں سات طبقے کیے ہیں اس لحاظ سے کہ کوئی ان میں سے بڑا اور کوئی چھوٹا نظر آتا ہے۔ ممکن ہے آئندہ جب افلاک کا علم اور بڑھ جائے تو کوئی اور سات تقسیمیں معلوم ہو جائیں۔ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ صدیوں بعد سچ ثابت ہوا ہے مثلاً فرمایا وجعلنا من الماء کل شئ حی (الانبیاء[21]-۳۰) یعنی زندگی پانی سے پیدا ہوتی ہے۔ یا فرمایا کہ ہم نے حیوانات نباتات ہر ایک قسم کے جوڑے پیدا کیے ہیں۔ ان دونوں باتوں کا علم سائنسدانوں کو پہلے نہ تھا۔

صفات علم و قدرت: اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ذکر کیا اور خاتمہ کمال علم الٰہی پر کیا اس لیے کہ قدرت کاملہ اور علم کامل ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو ہیں اور انہی دو صفات پر ایمان لانے سے انسان گناہ سے بچ سکتا ہے جب اس کا علم کامل ہے تو انسان دوسروں سے کتنا بھی چھپ کر کچھ کرے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہوگا۔ پھر ہر ایک فعل کی جزا و سزا پر اس کو قدرت بھی ہے۔

ع۴۵ قول: قال۔ مفردات میں ہے کہ قول سے مراد نطق بھی ہوتا ہے یعنی زبان سے الفاظ کا ادا کرنا اور جو دل میں تصوّر کر لیا جائے قبل اس کے کہ لفظوں میں اس کا اظہار ہو اسے بھی قول کہہ دیتے ہیں۔ ویقولون فی انفسھم لولا یعذبنا اللہ (المجادلہ[58]-۸) اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔ اور اعتقاد پر بھی قول کا لفظ بول دیتے ہیں۔ کسی چیز کی حالت کسی بات پر دلالت کرے تو اسے بھی قول کہہ دیتے ہیں امتلاء الحوض وقال قطنی یعنی حوض بھر گیا اور اس نے کہا مجھے بس ہے۔ قرآن کریم میں ہے قالتا اتینا طائعین (حٰم السجدۃ[41]-۱۱) راغب کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی تسخیر سے تھا نہ ظاہر خطاب سے قلنا یا نار کونی بردا میں یہی توجیہ کی ہے ابن اثیر کہتے ہیں کہ عرب لوگ قول سے تمام افعال مراد لیتے ہیں اور جہاں زبان سے کلام نہ ہو اس پر بھی اس کا اطلاق کرتے ہیں۔ قال بیدہ یعنی پکڑ لیا۔ قال برجلہ چلا گیا۔ قالت لہ العینان یعنی آنکھوں نے اشارہ کیا۔ قال بالماء علٰی یدہ پانی ہاتھ پر ڈالا۔ قال بثوبہٖ کپڑا اُٹھا لیا۔ احادیث میں قال بمعنی آرام کیا۔ آگے ہوا۔ مائل ہوا۔ مارا۔ غالب آیا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کا قول یا کچھ فرمانا بندوں سے ایک رنگ رکھتا ہے۔ اور فرشتوں سے دوسرا۔ حیوانات سے تیسرا، زمین و آسمان سے چوتھا۔ پھر خود انسانوں میں الگ الگ رنگ ہیں۔ ایک بات فطرت میں رکھ دیتا ہے وہ بھی اس کا ارشاد ہے ایک کی طرف عقل کے ذریعہ ہدایت فرماتا ہے وہ بھی اس کا قول ہے۔ انبیاء کی وحی اور ہی رنگ رکھتی ہے۔ بذریعہ الہام اور خواب بھی کچھ فرماتا ہے۔ باقی مخلوق کو وہ کس طرح فرماتا ہے اس کو انسان نہیں سمجھ سکتا۔ کیونکہ وہ اس کے تجربے سے باہر چیز ہے ایسا ہی ان کا خدا کے حضور کچھ عرض کرنا یہ بھی نہیں سمجھ سکتا ہے۔

ملٰئکۃ۔ ملأك کی جمع ہے جس کی دوسری صورت ملك ہے اور اس کا مادہ ألك ہے اور الوکۃ بمعنی رسالت ہے گویا مَلَك بمعنی رسول ہے اور یا یہ مِلك سے مشتق ہے۔

فرشتوں کا وجود: ملائکہ نورانی ہستیاں ہیں جن کو یہ آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول یعنی وسائط ہیں مسلمانوں میں سے بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ ملائکہ صرف قوتوں اور طاقتوں کا نام ہے حتّٰی کہ نبوّت کو بھی ایک ملکہ یا طاقت قرار دیکر اس کا نام جبرئیل قرار دیا ہے۔ اس عقیدہ کی رُو سے بھی یہ عقیدہ رکھنا پڑتا ہے کہ وحی الٰہی انسان کے اندر سے ہی ایک آواز کے پیدا ہونے کا نام ہے اور وہ کوئی خارجی شے نہیں۔ وحی الٰہی خارجی شے ہے: حالانکہ قرآن کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ کے انسان سے کلام کرنے کا ذکر ہے وہاں اگر کلام کی ایک صورت یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ دل میں ایک بات ڈال دیتا ہے تو دوسری صورت من وراء حجاب فرمائی اور تیسری یہ کہ وہ رسول بھیجکر اپنا کلام پہنچاتا ہے جہاں رسول سے مراد جبرئیل ہی ہے۔ پس اگر یہ محض اندر کی شے ہوتی تو یہ تیسری صورت قطعاً ناممکن تھی اور اگر وحی اندر کی آواز نہیں بلکہ خارجی شے ہے تو ملک یا فرشتہ بھی قوائے عالم یا قوائے انسانی کا نام نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ ملائکہ وہ وسائط ہیں جو ان قوائے عالم یا قوائے انسانی کے عمل میں آنے کا ذریعہ بنتے ہیں وہ ان قویٰ پر ایک گونہ حاکم ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ جب انسان کے قوائے ظاہری کے لیے ظاہری وسائط موجود ہیں اور انکے بغیر وہ قوتیں کام نہیں دیتیں مثلاً دیکھنے کے لیے نہ صرف انسان کے اندر ایک قوت ہے بلکہ باہر ایک واسطہ روشنی ہے جس کے بغیر وہ قوت کام نہیں دیتی اور سننے کے لیے نہ صرف انسان کے اندر ایک سننے کی قوت ہے بلکہ باہر ایک واسطہ ہوا ہے جسکے بغیر وہ قوت کام نہیں دیتی۔ اسی طرح اس

وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ

ہے جواس میں فساد کرتا اور خون گراتا ہے[46] اور ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں[47]۔

کے قوائے باطنی کے لیے باطنی وسائط کی ضرورت ہے اور یہ وسائط یا نیکی کی قوتوں کو تحریک میں لاتے ہیں اور ملک کہلاتے ہیں اور یا بدی کی قوتوں کو تحریک میں لاتے ہیں اور جنّ یا شیاطین کہلاتے ہیں۔ اسی لیے ملائک کی پیدائش نور سے اور جنّ کی پیدائش نار سے مانی گئی ہے۔ علاوہ ازیں دنیا کے بڑے بڑے راستبازوں کی شہادت اس بات پر ہے کہ ملائکہ علیحدہ ہستیاں ہیں۔ اور اگر غور کیا جائے تو جن لوگوں کا اس بات پر اعتقاد ہے کہ نیکی کے کوئی محرک ہیں جن کو ہم ملک کہتے ہیں انہی میں اعلیٰ درجہ کی نیکیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور فلسفی جو اس بات پر ایمان نہیں رکھتے وہ عملاً بھی ان نیکی کے محرکات سے فائدہ نہیں اٹھاتے جس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ کا علیحدہ ہستیاں ہونا ہی صحیح خیال ہے کیونکہ اس پر عملی شہادت ملتی ہے۔

خلیفۃ۔ خلف سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پیچھے آنا۔ اور خلافۃ کے معنی دوسرے کی نیابت کرنا ہے یا اس کے قائم مقام ہونا بوجہ اس کی غیر حاضری کے یا اس کے مرجانے کے یا کام کی ناقابلیت کے مگر بعض وقت جس کو خلیفہ بنایا جائے اس کی عزت افزائی کے لیے ہوتا ہے اور اسی آخری وجہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو زمین پر اپنا خلیفہ فرمایا ہے (غ) ذریت آدم خلیفہ ہے: یہاں خلیفہ کے معنی میں مفسرین نے عموماً اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اس سے مراد خود حضرت آدم علیہ السلام نہیں بلکہ حضرت آدم کی ذریت ہے ایک اس لیے کہ آگے فساد اور خونریزی کا ذکر ہے اور وہ نسل انسانی کی طرف ہی اشارہ ہے نہ خود آدم کی طرف اور دوسرے اس لیے کہ قرآن کریم میں نسل انسانی کو خلیفہ فرمایا ہے ھو الذی جعلکم خلائف الارض (الانعام ۶۵-۱۶۵) و یجعلکم خلفاء الارض (النمل ۲۷-۶۲) اللہ تعالیٰ کی نیابت یہ ہے کہ اس کے علم سے اور اس کی قدرت سے کچھ حصہ انسان کو ملا ہے۔

ضرورت نبوت: اس رکوع میں انسان کے مقام بلند کا ذکر کیا اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ جسمانی رنگ میں وہ اس مقام بلند کو حاصل کر سکتا ہے مگر اخلاقی اور روحانی رنگ میں بغیر اللہ تعالیٰ کی وحی کے کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس طرح شرف انسانی کے ساتھ ضرورت نبوّت کو وابستہ کر دیا۔

انسان کے خلیفہ ہونے سے مراد: سب سے پہلے جملہ میں اللہ تعالیٰ ملائکہ کو کچھ فرماتا ہے۔ ملائکہ چونکہ وسائط ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کا ان کو فرمانا یہ معنی رکھتا ہے کہ ارادہ الٰہی ظہور میں آئے۔ وہ ارادہ الٰہی یہ ہے کہ کوئی اس کی مخلوق زمین میں خلیفہ کا حکم رکھے۔ یہ مخلوق انسان ہے جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے یا جیسا کہ دوسری جگہ فرماتا ہے انی خالق بشرا (الحجر ۱۵-۲۸) میں ایک بشر کو پیدا کرنے والا ہوں۔ اور انسان کے خلیفہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت سے حصہ ملیگا۔ چنانچہ آگے انہیں دو باتوں کا ذکر ہے ایک علّم آدم الاسماء میں انسان کو علم دینے کا اور دوسرا ملائکہ کو فرمانبرداری کا حکم دیکر اپنی قدرت سے اس کو حصہ دینے کا۔ اور دوسری جگہ قرآن شریف میں آتا ہے سخّرلکم ما فی السمٰوات وما فی الارض جمیعا منہ (الجاثیہ ۴۵-۱۳) قدرت کی بہت سی طاقتیں ہیں وہ ایک دوسری پر حکمران نہیں ہو سکتیں مگر انسان ان سب پر حکمران ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کو ملک سے بھی بڑھ کر شرف حاصل ہے۔

ع ۴۶ یسفک۔ سفک سیال چیز کے گرانے پر بولا جاتا ہے (غ) اور عموماً اس کا استعمال خون گرانے پر یا آنسو بہانے پر ہوتا ہے (ل)

الدماء۔ دمٌ کی جمع ہے جس کے معنی خون ہیں۔

فرشتوں کا ذکر فساد: فرشتوں کا یہ کہنا نہ بطور مشورہ ہے اس لیے کہ مشورہ دینا ان کا کام نہیں یخلق ما یشاء اور نہ بطور اعتراض ہے اس لیے کہ وہ یفعلون ما یؤمرون کا مصداق ہیں۔ نہ وہ مشورہ دے سکتے ہیں نہ اعتراض کر سکتے ہیں نہ انکار کر سکتے ہیں۔ وہ وسائط ہیں جب ارادۂ الٰہی ایک امر کا ہو تو وہ اس کو عمل میں لے آتے ہیں پھر ان کا کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ ملائکہ کا کہنا فی الحقیقت اس رنگ کا نہیں جس رنگ کا انسان کا کہنا ہے بلکہ یہ محض ایک حالت کا اظہار ہے کہ انسان سے فساد اور خونریزی وقوع میں آئے گی اور یہ بالکل سچ ہے، یا مطلب یہ ہے کہ کیا ایک حاکم کی ضرورت اس لیے ہے کہ زمین میں فساد کرنیوالے لوگ ہونگے۔

ملائکہ کو انسان کی خونریزی کا علم کس طرح ہوا: دوسرا سوال ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا؟ اس لیے کہ انسان کے کمالات تو تدریجاً ظہور پذیر ہونے والے تھے لیکن فساد خونریزی پہلے ہی ظہور پذیر ہو جاتے ہیں مگر ابھی انسان پیدا ہی نہیں ہوا تو ملائکہ کو یہ علم کس طرح ہو گیا کہ فساد اور خونریزی ہوگی؟ دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ پہلے معنی کے لحاظ سے دو جواب ہیں۔ اوّل اللہ تعالیٰ ہمیشہ خلق کرتا رہا ہے پہلے کوئی ایسی مخلوق گزر چکی تھی۔ دوم خلیفہ کے لیے ضروری تھا کہ متضاد طاقتوں پر حکومت کرے اور یہ نہ ہو سکتا تھا جب تک خود اس کے اندر متضاد طاقتیں جمع نہ ہوں اور متضاد طاقتوں کے ایک ہی مخلوق میں جمع ہونے کا نتیجہ فساد اور خونریزی کو چاہتا ہے۔ بہرحال ملائکہ کی زبان سے انسان کو سمجھایا ہے کہ کس بلند مقصد کے لیے اسے پیدا کیا گیا تھا اور کس طرح وہ فساد اور خونریزی سے اس مقصد کو ترک کر رہا ہے۔

ع ۴۷ نسبح۔ تسبیح۔ سبح سے ہے جس کے معنی ہیں پانی میں اور ہوا میں تیزی سے گزرنا۔ کل فی فلک یسبحون (یٰس ۳۶-۴۰) اور عمل میں تیزی سے گزرنے پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے ان لک فی النہار سبحا طویلا (المزمل ۷۳-۷) اور تسبیح کے معنی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں تیزی سے گزرنا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ (غ) یا عیب سے پاک ہونا بیان کرنا۔ سُبحان اسی سے مصدر ہے اور سبحانک کے معنی ہیں تیری تنزیہہ ہو۔ اور بحمدک ساتھ بڑھایا کہ تیری ذات صرف عیوب سے پاک نہیں بلکہ انعامات کی وجہ سے حمد کی مستحق بھی ہے۔

نقدس لک۔ قُدُس کے معنی طہارت اور تقدیس کے معنی تطہیر ہیں (ل) نقدس لک کے معنی بعض نے یوں بھی کیے ہیں کہ ہم تیرے لیے اپنے آپ کو اور ان کو خونریزی اطاعت کرتے ہیں پاک رکھتے ہیں (ل) مگر القدوس اسمائے الٰہی میں سے ہے۔ تسبیح و تقدیس میں فرق: تسبیح اور تقدیس

قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ — فرمایا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے [۴۸]

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ — اور آدم کو سب کے نام سکھائے [۴۹] پھر اُن (چیزوں) کو فرشتوں کے

فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾ — سامنے کیا اور کہا مجھے اُن کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو [۵۰]

دونوں صلہ ل کے ساتھ اور اس کے بغیر بھی آتے ہیں پس مراد یہ ہے کہ ہم تیری نسبت طہارت کی طرف کرتے ہیں اور تسبیح اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بلحاظ اس کی ذات کے ہے جسم۔ ندّ وغیرہ سے پاک ہونا اور تقدیس اس کی تنزیہ بلحاظ صفات یا افعال ہے اور تسبیح و تقدیس کے ذکر سے مراد ہے کہ یہ کہنا بطور اعتراض نہیں کیونکہ تیری ذات اور صفات سب نقائص و عیوب سے مبرا ہیں۔

ع ۴۸ اعلم ما لا تعلمون یعنی اس کے اندر کمالات ہیں جن کا علم ملائکہ کو ابھی نہیں دیا گیا اور وہ کمالات ابھی ظاہر ہونے والے تھے۔

ع ۴۹ اٰدم۔ ابوالبشر کے لیے اسم معرفہ ہے مگر بعض وقت مورث اعلیٰ کا نام لیا جاتا ہے مراد اس کی نسل بھی ہوتی ہے۔ یہاں نسل انسانی شامل ہے کیونکہ علم صرف آدم کو نہیں دیا گیا بلکہ نسل انسانی کو بھی۔ امام راغب کہتے ہیں آدم کو آدم اس لیے کہا گیا کہ اس کو عقل و فہم دے کر جیسے دوسری جگہ روح سے تعبیر کیا گیا ہے تمام مخلوقات پر فضیلت دی گئی کیونکہ اٰدم کے معنی میں فضیلت ہے۔ یا اٰدم نام اس لیے رکھا کہ اس میں مختلف عناصر اور متفرق قوی رکھے گئے جیسے فرماتا ہے امشاج نبتلیہ (الدھر [۷۶]۔ ۲) کیونکہ اُدْمَہ کے معنی تخلیط یعنی ملانا جلانا آتے ہیں اور حدیث میں جہاں منسوبہ کو دیکھ لینے کی ہدایت فرمائی ہے تو اس کی وجہ بتائی ہے یؤدم بینکما جس کی تشریح ابن اثیر نے کی ہے تاکہ تمھارے درمیان محبّت اور اتفاق ہو۔

الاسماء۔ اسم کی جمع ہے دیکھو [۱]۔ بخاری میں اس کی تفسیر میں حدیث شفاعت نقل کی ہے جس میں حضرت آدم کے ذکر میں آتا ہے وعلمك اسماء كل شئ یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب چیزوں کے اسماء سکھائے پس الاسماء کلھا سے مراد سب چیزوں کے اسماء ہیں یعنی سب چیزوں کے نام یا سب چیزوں کی صفات یعنی ان کے خواص اور امام راغب کہتے ہیں کہ الاسماء سے یہاں الفاظ اور معانی مفردات اور مرکّبات سب مراد ہیں اور پھر وہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کا محض نام کسی زبان میں جاننا مفید نہیں ہوتا جب تک کہ اس نام کے ساتھ اس چیز کی صورت کی طرف ذہن منتقل نہ ہو پس محض نام کا جاننا ایک صوت یعنی آواز ہے اور کسی چیز کے نام کی معرفت تب ہی حاصل ہوتی ہے جب اس چیز کی معرفت حاصل ہو اور بعض نے الاسماء کلھا سے مراد اسمائے ملائکہ لیے ہیں اور بعض نے اسمائے ذریت آدم (ج)

بنی آدم اور علم اسماء: اب جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے حضرت آدم کے ذکر میں بنی آدم بھی شامل ہیں یعنی نسل انسانی کا بھی ذکر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ خلق الانسان علمہ البیان میں ہر ایک انسان کا ذکر ہے نہ صرف حضرت آدم کا۔ کیونکہ بیان سب کو سکھایا۔ تو پس چیزوں کے اسماء یعنی ان کے صفات یعنی خواص بھی سب کو ہی سکھائے اس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ انسان ان باتوں کو خود تدریجاً سیکھتے ہیں۔ خدا کا انسان کو علم دینا: اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کے سیکھنے کی استعداد انسان کے اندر رکھ دی ہے وہ گویا اس نے انسان کو سکھا ہی دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ایک طرف چیزوں کے اندر خواص رکھ دینا دوسری طرف انسان کے اندر یہ استعداد رکھ دینا کہ وہ ان کو معلوم کرے یہ انسان کو علم دے دینا ہے گو انسانی جدوجہد کی اس میں ضرورت باقی رہے۔ بعینہٖ جس طرح اللہ تعالیٰ کا انسانوں کو رزق دے دینا یہ ہے کہ ایک طرف اس رزق کے سامان عالم میں پیدا کر دیئے ہیں اور دوسری طرف انسان کے اندر استعداد رکھ دی ہے کہ ان کو حاصل کر لے اور قرآن کریم نے خود تعلیم یا علم دینے کا استعمال ایسے موقعوں پر کیا ہے جیسے علم بالقلم (العلق [۹۶]۔ ۴) میں جو علوم قلم کے ذریعہ سے حاصل ہوتے ہیں وہ تدریجاً ہی انسان کی جدوجہد سے حاصل ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف ہی منسوب کیا ہے۔ اسی طرح کاتب کے متعلق فرمایا کہ وہ لکھ دیا کرے۔ کما علمہ اللہ (۲۸۲) جس طرح اللہ نے اُسے سکھایا۔ حالانکہ کاتب خود اپنی محنت سے سیکھتا ہے۔ اسی طرح شکاری کُتّوں کو جو انسان سکھاتا ہے تو اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تعلمونھن مما علمکم اللہ (المائدۃ [۵]۔ ۴) گویا یہ علم بھی اسی علم میں سے ہے جو خدا نے تم کو تعلیم کیا ہے پس ان تمام موقعوں سے صاف ظاہر ہے کہ نسل انسانی بھی علم اٰدم الاسماء کلّھا میں شامل ہے کیونکہ ان کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی ذات اور ان کے خواص کو جاننے کی استعداد رکھ دی ہے۔ خواص اشیاء کا علم: اور بیضاوی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اجزائے مختلف اور قوائے متفرق سے پیدا کیا اور اس میں یہ استعداد رکھی کہ وہ قسم قسم کے مدرکات کو معقولات ہوں یا محسوسات یا متخیلات یا موہومات ادراک میں لا سکے اور اشیاء کی ذات کی معرفت اور ان کے خواص اور ان کے اسماء اور علم کے اصول اور صنعتوں کے قوانین اور آلات کی کیفیت اس کے دل میں ڈالی۔

ع ۵۰ عرضھم میں ضمیر مسمیات یعنی اشیاء کی طرف جاتی ہے جیسا کہ اگلے الفاظ باسماء ھٰؤلاء سے ظاہر ہے اور ضمیر مذکر بوجہ تعظیم ہے یا اس لیے کہ عقلاء کو ان میں غلبہ حاصل ہے (ر) ملائکہ پر اشیاء کا پیش کرنا: چیزوں کے پیش کرنے سے مراد قلوب ملائکہ میں ان کی صورت کا آنا یا ان پر اُن کا اظہار عالم مثال میں ہے (ر)

انبئونی۔ انباء۔ نباء سے ہے اس خبر کو کہتے ہیں جس میں عظیم الشان فائدہ ہو جس سے علم یا غلبۂ ظن حاصل ہو (غ) اس لفظ کے اختیار کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ ان اسماء پر اطلاع پانے میں کوئی فائدہ عظیم حاصل ہوتا ہے۔ انبئونی میں اشارہ: اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ مجھے خبر دو اس سے مراد صرف اظہار عجز ملائکہ ہے اور یہ بتاتا ہے کہ وہ صفات یا خواص اشیاء کا علم نہیں رکھتے۔ گویا اصل مراد ایک حالت کا اظہار ہے اور قول کا اس معنی میں آنا اوپر دکھایا جا چکا ہے۔

ان کنتم صادقین۔ صدق ضد کذب ہے۔ صادق ہونے سے مراد: اور مراد صادق ہونے سے اس خبر کے دینے میں صادق ہونا ہے جس کی طرف

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾

انھوں نے کہا تو پاک ہے ہمیں کوئی علم نہیں مگر وہی جو تو نے ہمیں سکھایا، بیشک تو علم والا، حکمت والا ہے ع۵۰

قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

کہا اے آدم ان کے نام انھیں بتا دو، پس جب اُس نے اُن کے نام اُنھیں بتا دیئے، فرمایا کیا میں نے تمھیں نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے تھے ع۵۱

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو تو انھوں نے فرمانبرداری ع۵۲

انبئونی میں اشارہ تھا مطلب یہ ہُوا کہ ملائکہ اٹکل پچّو ایک بات کے کہنے پر تو جرأت نہیں کرتے پس کیا تم ان اشیاء کے خواص سے واقف ہو یا اِنْ بمعنی اِذْ لے کر یوں بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ جب تم حق و صدق کہنے والے ہی ہو تو بتاؤ کہ تم ان اشیاء کے خواص پر آگہی رکھتے ہو۔ اور ایک تفسیر ان الفاظ کی حضرت ابن عباس سے یوں مروی ہے کہ ملائکہ نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے اعلم اور افضل مخلوق پیدا نہیں کریگا۔ تو ان کو اس خیال کی غلطی پر آگاہ کیا اور صدق بمعنی صواب بھی آسکتا ہے جس طرح کذب بمعنی خطا آجاتا ہے۔ اور مراد یہ ہوسکتی ہے کہ اگر تم اس خیال میں صواب پر ہو کہ وہ فساد اور خونریزی کریگا اور مراد اس سے نفی فساد و خونریزی نہیں بلکہ اس کے کمالات کی طرف توجہ دلانا ہے۔

ع۵۰ الحکیم۔ حَکَمَ کے معنی ہیں اصلاح کے لیے روکا۔ اور حکمۃ اللہ تعالیٰ ہیں اشیاء کی معرفت اور ان کا غایت درجہ کی مضبوطی پر وجود میں لانا ہے اور انسان میں حکمت موجودات کی معرفت اور اچھے کاموں کا کرنا ہے (رغ) اور اسمائے الٰہی میں الحکیم سے مراد وہ ہے جس میں حکمت علیٰ وجہ الکمال پائی جاتی ہو۔

ملائکہ اور علم خواص اشیاء: ملائکہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں صفات اشیاء کا علم نہیں۔ اور اس سے پہلے سبحانک کو پھر دوہرایا ہے یعنی ایسا علم نہ دینے میں اللہ تعالیٰ پر کوئی اعتراض نہیں اور آخر پر العلیم الحکیم کہہ کر بتایا کہ کامل علم تو اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اور وہ اپنی حکمت سے جس قدر اس میں سے چاہتا ہے کسی کو دیتا ہے ملائکہ کو جو وسائط ہیں خواص اشیاء کا علم نہ دینا اس کی حکمت پر مبنی ہے کیونکہ وسائط کو ایسے علم کی ضرورت نہیں۔

ع۵۱ آدم کا ملائکہ کو اسماء بتانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ آدم نے ان کو وہ علم دے دیا جو اللہ تعالیٰ نے نہ دیا تھا بلکہ یہ خبر دینا عمل سے ہے انسان کے اشیاء پر تصرف سے پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کو ان کی صفات پر اطلاع ہے کیونکہ بغیر صفات پر اطلاع کے تصرّف نہیں ہوسکتا۔

ماتبدون وما کنتم تکتمون۔ کتم کے معنی چھپانا ہیں مگر ایک چیز جب کسی کے عمل سے ظاہر نہ ہو تو اس پر بھی کتم کا لفظ بول دیا جاتا ہے جیسے بخل کرنے والوں کے بارہ میں ہے ویکتمون ما اٰتٰھم اللہ من فضلہ (النساء ۴-۳۷) جس کی تفسیر امام راغب نے کفران نعمت سے کی ہے۔ ایسا ہی لایکتمون اللہ حدیثا (النساء ۴-۴۲) نہ چھپا رکھنے سے مراد عملاً اس کا اظہار ہو جانا ہے۔ پس ماتبدون وہ باتیں ہیں جو ملائکہ نے ظاہر کیں یعنی انسان کا فساد اور خونریزی کرنا۔

ملائکہ کے کتمان سے مراد: اور ما کنتم تکتمون وہ جو اُن سے مخفی رہا یعنی انسان کا علم خواص اشیاء اور اس کا کمال اور اسی کا جاننا ان کی غرض تھی جب اتجعل فیھا کہا تھا کہ انسان کے خلیفہ بنانے میں کیا حکمت ہے۔

قوائے عالم پر انسان کے تصرف کی غرض: اس مضمون پر اتنا زور اس لیے دیا کہ معلوم ہو جائے کہ قوائے عالم پر جو حکمران ہستیاں یعنی ملائک ہیں ان سے بڑھ کر علم اور کمال انسان کو دیا گیا ہے پس انسان کو قوائے عالم کے سامنے جھکنا نہیں چاہیئے بلکہ ان پر تصرف حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

ع۵۲ سجدۂ اختیار و تسخیر: سَجَدَ اسجدوا۔ سُجود کے اصل معنی جھک جانا اور فرمانبرداری اختیار کرنا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی اور اس کی عبادت کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے اور وہ دو طرح پر ہے ایک سجدہ اختیار سے جو انسان کے لیے خاص ہے اور دوسرا تسخیر سے جو انسان، حیوان، نباتات غرض ہر مخلوق اپنے خالق کو کرتی ہے (رغ) اسجدوا لاٰدم کے معنی امام راغب نے دو طرح پر کیے ہیں ایک یہ کہ آدم کو بمنزلہ قبلہ رکھ کر اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے کا حکم تھا۔ اور دوسرا یہ کہ ان کو اس کی فرمانبرداری کا حکم دیا گیا اور اس بات کا کہ وہ اس کے اور اس کی اولاد کے مصالح کو قائم کریں۔ لغوی معنی میں سجدہ: اصطلاح شریعت میں سجدہ عبادت کے اس خاص رُکن کا نام ہے جب پیشانی زمین پر رکھ دی جاتی ہے اور یہ سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کے لیے جائز نہیں لیکن یہاں سجدہ کا لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہُوا ہے یعنی محض فرمانبرداری کے معنی میں جیسا کہ شاعر کے اس قول میں قلنا لہ اسجد للیلی فاسجدا جہاں اونٹ کے سر جھکانے پر اسجد کا لفظ بولا گیا ہے۔

ملائکہ کے سجدہ سے مراد: آدم (انسان) کے کمال کا پہلا مرتبہ تعلیم اسماء ہے یعنی اس میں استعداد علمی کا رکھنا۔ اب یہ اس کے کمال کا دوسرا مرتبہ آتا ہے جس میں ملائکہ کو آدم کی فرمانبرداری کا حکم دیا جاتا ہے۔ ملائکہ چونکہ قوائے عالم پر حکمران ہستیاں ہیں اس لیے ملائکہ کی فرمانبرداری سے مراد سارے عالم پر حکمرانی ہے۔ دوسری جگہ اسی کے مطابق فرمایا سخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعا منہ (الجاثیۃ ۴۵-۱۳) یعنی جو کچھ آسمانوں اور زمین کے اندر ہے سب کا سب تمھارے لیے

إِبْلِيسَ ۖ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٤﴾ کی مگر ابلیس (نے نہ کی) اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا ۵۳

مسخر کردیا۔ اس سے بھی مراد ایسی استعداد کا انسان کے اندر رکھنا ہے جس سے وہ کل عالم کو اپنے کام میں لگا سکتا ہے۔ یہی معنی بیضاوی نے لکھے ہیں او التذلیل والانقیاد بالسعی فی تحصیل ماینوط بہ معاشہم ویتم بہ کمالہم یعنی یا مراد اس سے فرشتوں کا جھک جانا اور فرمانبردار ہونا ہے۔ بذریعہ کوشش کے ان چیزوں کے حاصل کرنے میں جن سے ان کی معاش کا تعلق ہے اور جن سے ان کا کمال پورا ہوتا ہے جمع کے صیغہ میں اشارہ ہے کہ آدم میں نسل آدم بھی شامل ہے جیسا کہ فرمایا ولقد خلقنٰکم ثم صورنٰکم ثم قلنا للملٰئکۃ اسجدوا لاٰدم (الاعراف ۷-۱۱) ہم نے تم کو پیدا کیا پھر ہم نے ہی تمہاری تصویریں بنائیں پھر ہم نے فرشتوں کو کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو۔ گویا ہر بشر کے لیے وہی ہوتا ہے جو ابوالبشر کے لیے ہوا۔

۵۲ اِلّا بعض وقت استثنائے منقطع کے طور پر آتا ہے یعنی جس چیز کا استثنا کیا جاتا ہے وہ ان میں شامل نہیں ہوتی جن سے اس کا استثنا کیا جاتا ہے کیونکہ لفظ کا اصل مفہوم صرف مابعد کی ماقبل سے مخالفت ظاہر کرتا ہے۔

ابلیس۔ بلس سے ہے اور ابلاس اس حزن یعنی غم کو کہتے ہیں جو شدت نا امیدی سے پیدا ہو (غ) یبلس المجرمون (الروم ۳۰-۱۱) پس ابلیس کو ابلیس اس کی شدت نا امیدی کی وجہ سے کہا ہے جو وہ رحمت الٰہی سے رکھتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے الم تر الجن و ابلاسھا۔ ابلیس جیسا کہ قرآن شریف میں صاف لکھا ہے ملائکہ یا اعلیٰ نورانی ہستیوں میں سے نہیں بلکہ وہ جنّ یا ناری ہستیوں میں سے ہے کان من الجن (الکھف ۱۸-۵۰) یہ باتیں کہ ابلیس ملائکہ سے تھا اور وہ سب سے بڑھ کر علم رکھتا تھا اور آدم کی صورت سے یوں کیا کرتا تھا۔ یہودیوں سے سنے سنائے ہوئے قصے ہیں جو تفاسیر میں درج ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ابن کثیر ایک اس قسم کی روایت کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ اس میں بہت سے اسرائیلی قصے درج کر دیئے گئے ہیں جو کلام صحابہ سے نہیں۔

ابلیس اور شیطان: ابلیس کو ہی شیطان بھی کہا گیا ہے۔ جب تک وہ خود انکار کرتا ہے ابلیس ہے جب دوسروں کو ورغلاتا ہے شیطان ہے اور بلحاظ لغت بھی یہی درست ہے کیونکہ ابلیس وہ ہے جو خود رحمت الٰہی سے مایوس ہے اور شیطان جو شطن بمعنی بُعد یعنی دُوری سے ہے۔ وہ ہے جو دوسروں کو رحمت الٰہی سے دور کرتا ہے۔

ابلیس اور قوت وہمیہ: ابلیس سے مراد بعض لوگوں نے قوت وہمیہ کو لیا ہے چنانچہ سرسید احمد خاں کا یہی خیال تھا اور اس کی تائید میں انہوں نے شرح فصوص سے بعض حکما کا ایک قول نقل کیا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ابلیس اس وقت وہمیہ کلیہ کا نام ہے جو عالم کبیر میں پائی جاتی ہے اور اشخاص انسانی میں جو قوت وہمیہ پائی جاتی ہے یہ اسی کے افراد ہیں مگر ہمارے نزدیک جس طرح ملائکہ کو محض قوائے عالم یا قوائے انسانی قرار دینا غلطی ہے اسی طرح ابلیس اور اس کی ذریّت کو محض قوائے انسانی قرار دینا غلطی ہے بلکہ درحقیقت جس طرح ملائکہ ایک وجود رکھتے ہیں ابلیس اور اس کی ذریّت بھی ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے اور ان کو جنّ اسی لحاظ سے کہا گیا ہے کہ وہ آنکھوں سے مستور ہیں پس ہر انسان سے تعلق رکھنے والی ایک تو وہ ہستیاں ہیں جن کو ہم ملائکہ کہتے ہیں جو اس کے اعلیٰ قویٰ کو یا نیکی کے میلان کو تحریک میں لاتی ہیں۔

شیاطین محرک بدی ہیں: اور دوسرے وہ جن کو ہم جنّ یا شیاطین کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو اس کے قوائے بہیمیہ یا نفس امّارہ سے تعلق رکھتی ہیں اور اس کے بدی کے میلان کو تحریک میں لانے کا موجب ہوتی ہیں۔ انسان میں ایک قسم کی خواہشات وہ ہیں جو سفلی کہلاتی ہیں کیونکہ اس سفلی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک وہ جن کا تعلق اس کے اخلاق اور روحانیت سے ہے جو اس کو ایک بلند مقام کی طرف لے جاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ انسان کی ترقی کے لیے دونوں قسم کی خواہشات کا اس میں ہونا ضروری تھا سفلی خواہشات کا اس لیے کہ اس زندگی کے بغیر وہ ترقی حاصل نہیں ہو سکتی اور مَلکی خواہشات کا اس لیے کہ ان کے بغیر ترقی کی طرف قدم نہیں اٹھ سکتا۔

شیطان کو کیوں پیدا کیا: یہ کہنا کہ شیطان کو خدا نے پیدا ہی کیوں کیا گویا اس کا مرادف ہے کہ انسان کو یہ زندگی ہی کیوں عطا فرمائی حیوانی زندگی میں سے ہو کر ہی روحانی زندگی مل سکتی ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے الشیطان یجری من بنی اٰدم مجری الدم شیطان بنی آدم کے ساتھ ایسا ہی لگا ہوا ہے جیسے خون کا بہنا۔ یعنی جیسے اس کی حیوانی زندگی۔

نوری ناری مخلوق: اور ملائکہ کو جو نور سے مخلوق اور جنوں کو نار سے مخلوق قرار دیا گیا ہے تو وہ بھی اسی پُرحکمت فلسفہ کی طرف اشارہ ہے۔ ملائکہ کی تحریک سے انسان کے اندر نور پیدا ہوتا ہے اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور والذین کفروا اولیاؤھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمات (۲۵۷) کیونکہ وہ نار جس کے اندر نور نہ ہو وہ نرا دھواں ہونے کی وجہ سے ظلمت کے قائم مقام ہے۔

۵۳ ابیٰ - اِباء شدت امتناع کو کہتے ہیں یعنی نہایت سختی سے ایک بات سے رکنا۔ یا سختی سے انکار کرنا (غ)

استکبر۔ کِبر سے ہے اور یہ انسان کی وہ حالت ہے کہ وہ اپنے نفس پر فخر کرے اور اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھے اور سب سے بڑا تکبّر قبول حق سے رکنا ہے۔ اِستکبار دو طرح پر ہے ایک یہ کہ انسان یہ قصد کرے اور چاہے کہ بڑا ہو جائے اور یہ اگر ایسی حالت اور ایسے مکان اور ایسے وقت میں ہو جو واجب ہے تو محمود ہے یعنی اچھی چیز ہے اور دوسرا یہ کہ اپنی بڑائی کے خیال سے بھر کر اپنے نفس کے لیے وہ کچھ ظاہر کرے جو اس کے لیے نہیں، اور یہ مذموم ہے اور اسی معنی میں قرآن شریف میں یہ لفظ آیا ہے (غ) اور تکبّر کا استعمال بھی دو طرح پر ہے ایک یہ کہ کسی کی خوبیاں غیروں پر بہت بڑھی ہوئی ہوں اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں المُتکبّر ہے دُوسرا یہ کہ تکلّف سے اور اپنی بڑائی کے خیال سے بھر کر اپنے آپ کو بڑا بنائے اور یہ مذموم ہے (غ)

حکم تو ملائکہ کو تھا کہ سجدہ کریں، ابلیس کا ذکر درمیان میں کیونکر آ گیا؟ انسان میں امتیاز کا رکھنا اور ایک حد تک اسے اختیار نیک بد دینا انسان میں دو قسم کے قویٰ ضروری ٹھہراتا ہے ایک اعلیٰ یا مَلکی قویٰ اور دوسرے ادنیٰ یا بہیمی قویٰ۔ شیطان کو حکم فرمانبرداری: جس طرح ان اعلیٰ یا ملکوتی قویٰ کو تحریک میں لانے

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

اور ہم نے کہا اے آدم تو اور تیرا جوڑا باغ میں رہو اور اس میں سے بافراغت کھاؤ جہاں سے چاہو[۵۴] اور اس درخت کے پاس نہ جاؤ ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے[۵۵]

والے ملائکہ ہیں۔ اسی طرح ادنیٰ یا بہیمی قویٰ کے محرک شیاطین ہیں تو جب اعلیٰ ہستیوں کو انسان کی فرمانبرداری کا حکم ہوا تو ادنیٰ ہستیاں خود اس حکم میں شامل ہو گئیں یہی وجہ ہے کہ حالانکہ سارے قرآن شریف میں شیطان کو یہ حکم نہیں کہ تو سجدہ کر لیکن ایک جگہ اس کے متعلق لفظ اِذْ اَمَرْتُكَ (الاعراف ۷-۱۲) آگیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ بسبب ایک ادنیٰ ہستی ہونے کے وہ بھی اس حکم میں شامل تھا جو اعلیٰ ہستیوں کو دیا گیا۔

ابلیس کا انکار سجدہ: جس طرح ملائکہ کے سجدہ کرنے سے مراد ان کا انسان کی تکمیل نفس میں معاون ہونا ہے جیسا کہ مفسرین نے بھی مانا ہے اسی طرح ابلیس کا انکار یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ انسان کی ترقی کی راہ میں ہارج ہوگا اور یہ وہ قوت بہیمیہ کو اُکسا کر یا نفس امّارہ کو تحریک میں لا کر کرتا ہے یہاں تک کہ انسان اس کو اپنا فرمانبردار بنا لیتا ہے یعنی اس کے قوائے بہیمیہ حالتِ اعتدال پر آجاتے ہیں اور وہ کبھی ان کو غیر محل پر استعمال نہیں کرتا۔ شیطان کی فرمانبرداری: چنانچہ جب نبی صلعم نے شیطان کا مجری الدم ہونا بیان فرمایا تو صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ سے بھی۔ فرمایا ہاں مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر مدد دی سو وہ فرمانبردار ہو گیا ہے اور کمال انسانی کا پہلا مرتبہ یہی ہے کہ وہ شیطان کو اپنا فرمانبردار بنا لے اور اس کے قوائے بہیمی اور اس کا نفس امّارہ اس کی ترقی کی راہ میں روک نہ ہوں اور شیطان کو جو من الکافرین کہا ہے تو اس لحاظ سے کہ وہ ان نعماء کو ان اعلیٰ ملکوتی صفات کو جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیئے ہیں دبانا چاہتا ہے اور کفر کے معنی دبانا ہیں۔

ع ۵۴ اسکن۔ سُکُون کے اصل معنی حرکت کا جاتے رہنا یا ٹھہر جانا اور استقرار ہے (ت) اس لیے اضطراب نہ ہونے سے جو حالت اطمینان پیدا ہوتی ہے اس پر بھی لفظ سکون بولا جاتا ہے۔

خلق آدم میں یہ تیسرا مرتبہ ہے۔ پہلے مرتبہ پر اسے علم دیا جاتا ہے دوسرے مرتبہ پر اسے مسجودِ ملائک بنا کر طاقت دی جاتی ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ اسے جنت ملے یعنی راحت و آرام کی زندگی۔ اور یہاں آدم کے ساتھ اس کی بی بی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ راحت اور آرام کی زندگی اکیلا انسان حاصل نہیں کر سکتا، علم اور طاقت حاصل کر سکتا ہے۔ بہشت میں بیبیاں: چنانچہ دوسری جگہ فرمایا خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا (الروم ۳۰-۲۱) تمہارے نفسوں سے تمہارے لیے بیبیاں پیدا کر دیں تاکہ تم ان سے راحت پاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ جنت دار الخلد میں بھی بیبیوں کے موجود ہونے کا ذکر ہے اس پر اعتراض کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہاں سکون نہ ہو۔

آدم کی پہلی جنت: کیا اس جنت سے مراد وہ بہشت ہے جس کا وعدہ اعمال صالحہ پر ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ نہیں۔ کیونکہ وہ جنت جو بعد موت حاصل ہوتی ہے اس سے انسان کبھی نکالا نہیں جاتا۔ وماھم منھا بمخرجین (الحجر ۱۵-۴۸) اور اس سے آدم کو نکلنا پڑا۔ پس یہ جنت اس دنیا کی زندگی کی جنت ہے اور مفسرین نے اسے مانا ہے اور یہاں اس جنت کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ تم اس سے جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ۔ اور سورہ طٰہٰ ۲۰-۱۱۸ و ۱۱۹ میں اس جنت کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ تمہارے لیے اس میں یہ حاصل ہے کہ نہ تم اس میں بھوکے رہو نہ ننگے رہو اور نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ میں رہو پس جسمانی لحاظ سے تو انسان کو جنت یوں حاصل ہے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ نے وہ سب سامان پیدا کر رکھے ہیں جن سے انسان کی بھوک دور ہوتی ہے اور پیاس دُور ہوتی ہے اور جن سے لباس ملتا ہے اور مکان ملتا ہے۔ اور یہی انسان کی ضرورت کی چار چیزیں ہیں جو کوشش سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے معنی ظاہر ہیں ایک طرف عالم میں سامان موجود ہیں دوسری طرف انسان میں وہ طاقت ودیعت کی گئی ہے جس سے وہ ان کو اپنے کام میں لاتا ہے یا مسجود ملائکہ بنتا ہے۔ جوں جوں اس کا علم بڑھتا ہے توں توں اس کی طاقت بڑھتی ہے اور اسی طرح ہی تدریجاً اس کی راحت کے سامان بڑھتے ہیں۔ سکون روحانی کی جنّت: مگر ظاہر ہے کہ انسان کے لیے آرام اور راحت یا حالت سکون صرف خور و نوش اور لباس و رہائش سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لیے ایک روحانی سکون کی بھی ضرورت ہے اور وہی اس کی حقیقی جنت ہے۔ کھانے پینے کے سب سامان ہوں مگر سکون قلب نہ ہو تو ان سے کوئی راحت نہیں پہنچ سکتی۔ اطمینان قلب میسّر ہو تو بھوک پیاس اور ہر قسم کی تکلیف انسان خوشی سے برداشت کر لیتا ہے پس اصل وہ جنت جہاں سکون ملتا ہے گو سامان خور و نوش کی بھی اس کے لیے ضرورت ہے اور اس کے دینے کا ذکر بھی موجود ہے اس دنیا کی زندگی میں ایک روحانی جنت یا اطمینان قلب ہے۔ اب ظاہر ہے کہ روحانی سکون یا اطمینان قلب اس وقت تک رہتا ہے، جب تک انسان بدی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ بدی کے ارتکاب کے ساتھ سکون روحانی دور ہو جاتا ہے۔ پس وہ جنت روحانی یہ ہے کہ انسان معصومیت کے مقام پر ہو۔ سو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک انسان کو فطرتاً بیگناہ پیدا کر کے وہ مقام دے دیا ہے۔ اس لیے حکم ہوتا ہے کہ فطرتاً ہم نے تم کو جنت دے دی ہے اب تم خود اس کو ضائع نہ کر دینا ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا (طٰہٰ ۲۰-۱۲۴) جو شخص میرے ذکر سے مُنہ پھیرتا ہے اس کے لیے تنگی کی روزی ہے جس سے مراد اسی سکون روحانی کا جاتے رہنا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قصّہ عیسائیت سے لیا گیا ہے جب اس کی بنیاد ہی انسان کے فطری طور پر معصوم ہونے پر ہے حالانکہ عیسائی مذہب نے اسی کو انسان کے پیدائشی گنہگار ہونے کی دلیل ٹھہرایا ہے۔

ع ۵۵ الشجرۃ۔ شَجَرَ یا شَجَرَۃ اس نبات کو کہتے ہیں جس کا تنہ ہو (غ) یعنی درخت۔ اور شِجَار (ماضی شَجَرَ) اور مُشَاجَرَۃ اور تَشَاجُر کے معنی تنازع اور اختلاف کرنے کے آتے ہیں بعض لوگوں نے جو شجرۃ کے معنی جھگڑا کیے ہیں وہ لغت سے ثابت نہیں۔

الظالمین ظُلْم کے اصل معنی اہل لغت کے نزدیک وضع الشیء فی غیر موضعہ المختص بہ (غ) ہیں یعنی ایک چیز کا اس مقام سے جو اس کے لیے

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

پس شیطان نے اُن کو اس سے پھسلا دیا سو ان کو اس سے نکال دیا جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا اُتر پڑو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھیرنا اور فائدہ اُٹھانا ہے ع۵۶

خاص ہے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنا کمی سے ہو یا زیادتی سے یا اس کے وقت سے ہٹ کر یا مکان سے ہٹا کر اس لیے ظَلَمْتُ الْاَرْضَ کے معنی ہیں ایسے مقام سے اُسے کھودا جو کھودنے کی جگہ نہ تھی اور حق سے مجاوزت کا نام بھی ظُلْم ہے خواہ وہ نہایت ہی قلیل ہو اور خواہ بہت زیادہ ہو (غ) اور ظُلْم کو تین قسم پر تقسیم کیا ہے، اوّل بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اور اس میں کفر و شرک سب سے بڑھ کر ہے۔ اور دوسرا لوگوں پر ظلم اور تیسرا اپنے نفس سے ظلم۔ اور یہاں یہی اپنے نفس سے ظلم مراد ہے (غ) یعنی اپنے آپ کو کوئی نقصان پہنچانا۔

ھذہ الشجرۃ سے کونسا درخت مراد ہے۔ مفسرین نے گیہوں، کھجور، کافور، انجیر، حنظل وغیرہ نام گنے ہیں۔ مگر ان کا یہاں کیا مطلب؟ ھذہ میں اشارہ قریب موجود ہے پس اس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور ابھی آچکا ہے اور قریب ترین جو ذکر ہے وہ ابا اور استکبار کا ذکر ہے اور وہ سب سے بڑی بدی ہے جس کی وجہ سے شیطان خود گمراہ ہوتا ہے بلکہ اس کی تفسیر دوسری جگہ موجود ہے دیکھو سورہ اعراف آیت ۱۱ سے ۱۹ تک جہاں پہلے شیطان سجدہ سے انکار کرتا ہے تو اس کو حکم ہوتا ہے کہ اس حالت سے نکل جا۔ تب وہ کہتا ہے میں نسل انسانی کو سیدھی راہ سے پھیر دونگا اور اُن کے آگے پیچھے سے آؤں گا اور وہ شکر گذار نہیں رہیں گے یعنی بدیوں میں مبتلا ہوں گے۔ اس کے بعد آدم کو حکم ہوتا ہے اسکن انت و زوجک الجنۃ اور ولا تقربا ھذہ الشجرۃ (الاعراف۷-۱۹) تو یہاں سے صاف معلوم ہوا کہ ھذہ میں اشارہ اسی شیطان کے ورغلانے کی طرف ہے جو انسان کی ترقی کی راہ میں روک بننا چاہتا ہے۔ اور ھذہ الشجرۃ سے مراد سوائے بدی کے اور کچھ نہیں۔ اور یہی ذکر نسل انسانی کو گمراہ کرنے کا انکار سجدہ کے بعد الحجر۱۵-۳۹ و ۴۰ اور بنی اسرائیل۱۷-۶۲- اور ص۳۸- ۸۲ و ۸۳ میں موجود ہے اور بدی کو خود قرآن شریف نے ایک درخت سے تشبیہ دی ہے مثل کلمۃ خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ (ابراھیم۱۴-۲۶) اور ظاہر ہے کہ جس درخت سے آدم کو روکا اسی درخت سے بنی آدم کو بھی روکا ہوگا اور بنی آدم کو فرمایا لا تقربوا الفواحش (الانعام۶-۱۵۱) بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ۔

لا تقربا کا حکم فطری ہے: اس آیت کا سارا نقشہ حالت اور فطرت کا نقشہ ہے اور لا تقربا کا حکم بھی فطرت کے رنگ کا حکم ہے۔ یہ الہام نہیں وحی نہیں۔ کیونکہ الہام اور وحی اس فطری حکم کی خلاف ورزی کا علاج ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ پھر یہ میاں بی بی دونوں کو حکم ہے جہاں وحی کا ذکر آتا ہے وہاں فتلقی آدم ہے یعنی آدم کو وہ کلمات سکھائے گئے پس یہ فطری حکم ہے اور اوپر دکھایا جا چکا ہے کہ فطری حکم بھی اللہ تعالیٰ کے عہد میں داخل ہے دیکھو ع۴۲ مگر انسان کمزور ہے اس لیے اس فطری حکم کی تقویت کے لیے وہ ذکر کا محتاج ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی اسے عطا فرماتا ہے۔

بائبل کی غلطی کی اصلاح: بائبل نے ھذہ الشجرۃ کو نیکی اور بدی کی تمیز کا شجر کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ آدم کو اس سے روکنے کے یہ معنی ہوئے کہ اس کو تمیز کا جوہر خدا نے عطا نہ کیا تھا پھر حیوانوں پر اس کی فضیلت کیا؟ اور یہ کس قدر بیہودہ بات ہے کہ وہ عجیب جوہر جس سے انسان حیوان پر ممتاز ہوتا ہے خدا کے حکم کی نافرمانی کر کے انسان نے زبردستی حاصل کر لیا۔ قرآن کریم اس خیال کی تردید کرتا ہے۔

اس فطری حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہو گے یعنی اس اطمینان قلب اور راحت روحانی کو کھو دو گے جو فطرت نے تمہیں دی ہے۔ کس طرح اس کو کھو دیا اس کا نقشہ سورۂ اعراف میں کھینچا ہے۔

ع۵۶ ازلّ۔ زلّ سے ہے اور زَلَّۃٌ کے معنی اِسْتِرْسَالُ الرِّجْلِ مِنْ غَیْرِ قَصْدٍ (غ) ہیں یعنی بلا ارادہ پاؤں کا ڈگمگا جانا۔ اور اس لیے زَلَّۃٌ اُس قصور کو کہا جاتا ہے جو بلا ارادہ سرزد ہو (غ) پس ازلّھما کے معنی ہوئے ان سے زَلّۃ کا ارتکاب کرایا یعنی شیطان کے پھسلانے کی وجہ سے مگر بغیر عمد اور ارادہ کے آدم اور اس کی زوجہ سے کوئی قصور ہو گیا۔

عنہا میں ضمیر شجرۃ کی طرف بھی جا سکتی ہے یعنی اس درخت کی وجہ سے ان سے لغزش کرادی اور جنت کی طرف بھی۔ یعنی ایسی لغزش کرادی کہ جنت سے نکلوا دیا۔

اھبطو۔ ھَبَطَ کے وہی معنی ہیں جو نَزَلَ کے ہیں (ف) اوپر سے گرنے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے یھبط من خشیۃ اللہ (۷۴) اور کسی مقام پر اُترنے کے معنی میں بھی اھبطوا مصراً (۶۱) امام راغب ھبط اور نزل میں یہ فرق کرتے ہیں کہ ھبوط استخفاف کے رنگ میں ہوتا ہے اور نزول اکرام کے رنگ میں۔ اور حدیث میں آتا ہے اللّٰھم غبطاً لا ھَبْطاً جس کے معنی ابن اثیر یوں کرتے ہیں کہ ہم تجھ سے اچھی حالت کی التجا کرتے ہیں اور ذلّت اور انحطاط سے تیری پناہ چاہتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ نقل مکانی کے علاوہ اس کے معنی ایک حالت سے دوسری کی طرف نکل جانا بھی ہیں اور ھبط کے معنی نقصان بھی ہیں۔ چنانچہ ھبط القوم کے معنی لکھے ہیں پستی کی حالت میں ہو گئے اور نقصان اُٹھایا (ت) روح المعانی میں بھی ہے کہ ھبط مرتبہ میں گر جانے پر بولا جاتا ہے۔

شیطان کی وسوسہ اندازی: یہاں پر مفسرین نے بہت سے قصے اسرائیلیات سے داخل کر دیئے ہیں کہیں شیطان کو سانپ بنا کر اور کہیں چارپایہ بنا کر جنت میں داخل کیا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے خود فرما دیا ہے کہ یہ بذریعہ وسوسہ اندازی کے تھا۔ فوسوس لھما الشیطان (الاعراف۷-۲۰) اور ہر ایک انسان کے

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

پھر آدم نے اپنے رب سے (کچھ) باتیں سیکھ لیں پس اس نے اس پر (رحمت سے) توجہ کی بیشک وہ (رحمت سے) توجہ کرنے والا الرحم کرنے والا ہے ۵۷

دل میں شیطان وسوسہ اندازی سے ہی کام کرتا ہے یوسوس فی صدور الناس (الناس ۱۱۴-۵) چونکہ آدم جس جنت میں تھے وہ اطمینان قلب کی جنت ہے اور وہ دار الخلد نہیں جو انسان کو موت کے بعد بطور جزائے اعمال عطا کی جاتی ہے جہاں شیطان کا گزر نہیں اس لیے شیطان کے وسوسہ ڈالنے پر کوئی اعتراض نہیں فطری بیگناہی گو ایک اطمینان قلب کی حالت ہے مگر وہ کامل اطمینان کی حالت نہیں جہاں شیطان وسوسہ اندازی نہیں کرسکتا۔ اسی دوسری حالت پر انسان کو صرف وحی الٰہی پہنچاتی ہے جیساکہ آگے ذکر آئے گا۔

آدم کی لغزش: یہاں لفظ ازلّ یا ازَلَّہٗ اختیار کرکے بتا دیا کہ آدم سے جو کچھ ہوا بلا قصد ہوا اسی کی تائید دوسری آیت سے ہوتی ہے فنسی ادم ولم نجد له عزما (طٰہٰ ۲۰-۱۱۵) مطلب یہ ہے کہ گو فطری بیگناہی حاصل ہے مگر فطری کمزوری بھی ساتھ ہی لگی ہوئی ہے جب تک اللہ تعالیٰ سے وہ تعلق خاص حاصل نہ ہو جو وحی الٰہی سے پیدا ہوتا ہے اس وقت تک انسان کو ٹھوکریں لگتی رہتی ہیں۔

مما کانا فیہ سے مراد وہ حالت جنّت یا حالت اطمینان قلبی ہے جس میں وہ تھے اس سے نکلوا دیا۔ کیونکہ جب گناہ آیا تو اطمینان قلب گیا۔

ھبوط آدم سے مراد: قلنا اھبطوا۔ یہ کہنا بلحاظ اس حالت کے ہے جو پیدا ہوگئی۔ گویا پہلے فعل کا نتیجہ یہ ہوا نتیجہ بھی چونکہ حکم الٰہی سے وارد ہوتا ہے اس لیے اس پر قلنا کا لفظ فرمایا۔ دیکھو قول کے معنی میں ۴۵ اھبطوا میں ضمیر جمع ہے اس لیے خطاب آدم اور اس کی ذریّت سب سے ہے یعنی سب انسانوں سے جیساکہ فراء نے کہا ہے (ل) اور آدم اور حوّاء اور ہر ایک انسان کو یہ وحی تو ہوئی نہیں اس لیے قلنا اظہار حالت کے لیے ہی ہے۔ چونکہ یہ حالت نقصان کی تھی اس لیے ھبط کا لفظ استعمال کیا ہے۔

بعضکم لبعض عدو۔ اس میں شیطان کی عداوت کا ذکر نہیں۔ کیونکہ اس کی عداوت کو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے پہلے ہی جتلا دیا تھا ان ھذا عدو لك ولزوجك (طٰہٰ ۲۰-۱۱۷) پس یا تو انسانوں کی باہمی عداوت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تم فطرت کی حالت کو چھوڑتے ہو تو پھر ایک دوسرے کے دشمن بھی بن جاتے ہو اور یسفك الدماء کے مصداق بن جاتے ہو۔ نفس انسانی اور شیطان: اور یا یہ مراد ہے کہ ہر انسان کے اندر دونوں قسم کی تحریکات ہیں وہ جو اس کو بلند مقام کی طرف لیجاتی ہیں اور وہ جو اس کو پستی کی طرف لے جاتی ہیں۔ یوں گویا انسان کا اپنا ہی ایک حصّہ دوسرے کا دشمن بن جاتا ہے۔ اس معنی سے وجود شیطان کی نفی نہیں ہوتی۔ کیونکہ جس طرح انسان کا نفس بھی وسوسہ اندازی کرتا ہے ونعلم ما توسوس به نفسه (ق ۵۰-۱۶) اور شیطان بھی وسوسہ اندازی کرتا ہے الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنّة والناس (الناس ۱۱۴-۵، ۶) اور نفس بھی بدی کا حکم دیتا ہے ان النفس لامارۃ بالسوء (یوسف ۱۲-۵۳) اور شیطان بھی بدی کا حکم دیتا ہے ولاٰمرنھم فلیغیرن خلق اللہ (النساء ۴-۱۱۹) اسی طرح شیطان بھی دشمن انسان ہے جیساکہ بار بار قرآن میں فرمایا اور انسان کا نفس بھی جس پر حدیث بھی شاہد ہے اعدا عدوك نفسك التی بین جنبیك سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔ شیطان کا تعلق نفس امارہ سے ہے اور اسی کا وہ محرک ہے۔

۵۷ تلقّی۔ لقی سے ہے اور لقاء کے معنی کسی چیز کا سامنے آجانا اور اسے پالینا ہیں (غ) اور تَلَقِّیَ الشَّیْءَ کے معنی لَقِیَهٗ یعنی اس کو ملا، گو یا کلمات کو لے لینے اور قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے سے ان کا استقبال کیا۔

کلمات۔ کلمۃ کی جمع ہے۔ اور کلمہ وہ تاثیر ہے جو دو حاسوں میں سے کسی ایک کے ساتھ پائی جائے یعنی شنوائی کے حاسہ سے کلام یا بات اور بینائی کے حاسہ میں کلم یا زخم (غ) اور کلمۃ سے مراد صرف لفظ مفرد نہیں بلکہ کلام بھی ہوتا ہے کبرت کلمة (الکھف ۱۸-۵)

تاب۔ توب سے ہے جس کے معنی رجوع ہیں اور جب بندہ کے لیے استعمال ہو تو مراد اللہ کی طرف لوٹ آنا اور جھک جانا اور رجوع کرنا ہوتا ہے (ت) یہ ضروری نہیں کہ پہلی حالت بُری ہو بلکہ ایک اچھی حالت سے اس سے بہتر حالت کی طرف رجوع کرنا بھی توبہ ہے۔ ایک خدا پرست بھی جب خدا کی طرف اور زیادہ فرمانبرداری سے جھکتا ہے تو وہ اس کی توبہ ہے اور جب اللہ کے لیے ہو تو مراد اس سے بندہ کی طرف مغفرت کے ساتھ عود کرنا ہوتا ہے (ت) اسی سے تواب مبالغہ کا صیغہ ہے جو اسمائے الٰہی میں سے ہے۔

فطری کمزوری کا علاج: جب آدم نے اپنے رب سے کلمات سیکھے تو اللہ نے اس پر رجوع برحمت فرمایا، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو نقص اس میں تھا وہ دور کردیا گویا فطری کمزوری کے نقص کا علاج وحی الٰہی سے کیا گیا۔ پس بندہ کی روحانی ربوبیت کا سامان خدا کے کلام میں ہے۔

وحی الٰہی خارجی شے ہے: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کلام الٰہی انسان کے اندر کی آواز نہیں جیساکہ سرسید نے غلطی سے خیال کرلیا۔ کیونکہ اگر یہ بات پہلے فطرت میں ہی موجود تھی تو فطرت کی کمزوری کا علاج خود فطرت کی آواز کس طرح کرسکتی ہے۔ علاج صرف خارجی ہوسکتا ہے۔ اور خدا کے کلام سے یہ علاج ہوا۔ اس آیت میں ذکر صرف ابو البشر حضرت آدم کا ہے کیونکہ کلمات صرف اس نے سیکھے دوسرے انسان سیکھ سکتے ہیں یا نہیں اور کس طرح؟ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِيۡعًا ۚ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾

ہم نے کہا سب اس سے اُتر جاؤ^۵۸ پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو میری ہدایت پر چلا، نہ اُن کو ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ع۵۹

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۳۹﴾ ع

اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے ع۶۰

ع۵۸ اولادِ آدم کا ہبوط اور اس کا علاج: اھبطوا کا حکم تو پہلے بھی ہو چکا تھا دوبارہ کیوں فرمایا؟ پہلے آدم اور اس کی اولاد کا ذکر مشترک تھا۔ اس کے بعد فتلقی آدم من ربہ کلمات میں آدم کے ذکر کو الگ کر دیا۔ آدم ابوالبشر کو وحی عطا فرمائی، مگر اس کے بعد ہر ایک انسان کو وحی نہ دی جاتی تھی۔ اس لیے ان کے متعلق یہاں قانون بیان فرمایا کہ اس حالتِ ہبوط کا علاج یہ ہے کہ نسلِ انسانی میں وقتاً فوقتاً منجانب اللہ ہدایت آتی رہے گی۔ اس کی پیروی سے پھر انسان اس کھوئی ہوئی جنت کو اس اعلیٰ مقام روحانیت کو اُس راحت وسکون کو حاصل کر سکتا ہے جس سے پھر وہ نکلے گا نہیں۔ پہلے آدم میں ابن آدم بھی شامل تھا۔ یہاں آکر آدم نبی اللہ کو ابن آدم سے الگ کر کے دکھا دیا۔

ع۵۹ اِمّا مرکب ہے اِنْ حرفِ شرط سے اور ما سے جو تاکید کے لیے ہے اور اس کے بعد اکثر فعل تاکید آتا ہے۔

ھدی کے معنی پر دیکھو ع۵ یہاں وہ ہدایت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ انبیاء کے ذریعہ سے دنیا میں بھیجتا ہے۔

تبع کے معنی نقش قدم پر چلنا ہیں اور یہ کبھی حکم پر عمل کرنے سے ہوتا ہے جیسے یہاں (غ)

خوف کے معنی کسی مکروہ امر کی توقع جس کے مقابل پر رجاء ہے جو کسی محبوب امر کی توقع ہوتی ہے خوف امن کی ضد ہے (غ)

یحزنون۔ حُزْن اور حَزَن اصل میں زمین میں خشونت یعنی سختی کا ہونا ہے۔ پھر غم سے جو نفس میں خشونت پیدا ہوتی ہے اس پر بولا گیا ہے (غ)

نسلِ انسانی میں نزولِ وحی کا قانون: جب آدم پر وحی کے نزول کا ذکر فرمایا تو اب نسلِ آدم کے لیے بھی قانون بتایا کہ ہر ایک پر وحی نہیں آئے گی، بلکہ انسانوں میں کبھی کبھی کوئی ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آجایا کرے گی۔ دوسری جگہ فرمایا امّا یاتینّکم رسل منکم (الاعراف^۷-۳۵) تمہارے پاس کبھی رسول آجایا کریں گے۔ یہ نسلِ انسانی کے ہادی ہوں گے اس طرح پر کہ جو شخص اس ہدایت کی جو وہ لائیں پیروی کرے گا (لفظ تبع یہاں قابلِ توجہ ہے ایمان نہیں بلکہ اس ہدایت کی پیروی کی ضرورت ہے) وہ اس اصل حالت پر قائم ہو جائے گا جہاں نہ شیطان کے حملے کا خوف ہے کہ وہ وسوسہ اندازی سے پھسلا دے اور نہ یہ غم ہوگا کہ یہ راہ اختیار کی یا نہ کی کیونکہ انہوں نے صحیح راہ پر قدم مارا۔ فطری بیگناہی اور کامل عصمت: اس میں آخری کامیابی کی طرف اشارہ ہے گویا پہلی فطری حالت اس مقامِ امن تک نہ پہنچا سکتی تھی جہاں شیطان حملہ ہی نہ کر سکے مگر وحی الٰہی کی اتباع سے انسان اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق پیدا کرتا ہے کہ پھر وہ کبھی پھسلتا نہیں جیسا کہ فرمایا ان عبادی لیس لک علیہم سلطان (الحجر^۱۵-۴۲) فطری حالت بھی ایک بیگناہی کی حالت ہے مگر چونکہ اس میں اللہ تعالیٰ سے وہ تعلق پیدا نہیں ہوا جس کی طاقت اس کمزوری کا علاج ہو جائے اس لیے وہ ابھی خوف کی حالت ہے کہ شیطان حملہ آور ہو کر اس جنت سے نہ نکال دے۔

وحی کی ضرورت: لیکن جب حالتِ امن واطمینان پر وحی الٰہی کا اتباع پہنچاتا ہے وہ شیطان کے حملہ سے محفوظ ہے اور یوں بتایا کہ وحی الٰہی کی ضرورت دنیا میں کیا ہے۔ فطرت انسانی کی کمزوری کا علاج صرف اللہ تعالیٰ کے طاقتور ہاتھ سے ہوسکتا ہے اور وہی انسان گرنے سے بچ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں اپنے آپ کو دیدیتا ہے۔ لاخوف علیہم ولا ہم یحزنون نجاتِ کامل ہے جس کے متعلق دوسری جگہ فرمایا یایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی (الفجر^۸۹-۲۷ تا ۳۰)

ع۶۰ کذبوا۔ کذب سے ہے کذّبتہ کے معنی ہیں میں نے اس کی طرف جھوٹ منسوب کیا یعنی یہ کہا کہ تو جھوٹ کہتا ہے (غ)

اٰیات۔ اٰیۃ کی جمع ہے اور یہ تایّی سے ہے جس کے معنی ہیں کسی بات پر ثابت قدم ہونا اور اٰیۃ کے معنی ظاہر نشان ہیں اس لیے بلند عمارت کو بھی اٰیۃ کہتے ہیں۔ اتبنون بکل ریع اٰیۃ (الشعراء^۲۶-۱۲۸) اور اٰیۃ رسالت یعنی پیغام الٰہی کو بھی کہتے ہیں اور دلیل اور معجزہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (ت) اور یہی معنی اٰیۃ کے عموماً زیادہ تر موزون ہیں اس لیے آیات سے یہاں بعض مفسرین نے کتبِ منزلہ مراد لی ہیں (ر) اور قرآن کریم کے ہر ایک جملہ کو جو کسی حکم پر دلالت کرتا ہے آیت کہا جاتا ہے خواہ وہ ایک سورت ہو یا اس کی کئی فصلیں یا ایک فصل ہو (غ) اور بعض کے نزدیک آیت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آیت کے معنی جماعت ہیں۔ اور ہر آیت میں الفاظ وحروف کی ایک جماعت ہوتی ہے اور یا یہ وجہ ہے کہ آیت کے معنی نشان ہیں اور کلام الٰہی کی آیات بطور اعجاز کے نشان ہیں۔

اصحاب۔ صَاحِب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں مُلازِم یعنی کسی شے کے ساتھ لگ جانے والا۔ خواہ مصاحبت جسم سے ہو خواہ عنایت وہمت سے (غ)

اصحاب النار وہ لوگ ہوئے جنھوں نے نار سے تعلق پیدا کر رکھا ہے۔ گویا آگ کے ساتھ ان کا ہر وقت تعلق ہے۔ یہی تعلق آخرت میں کھلا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

اس دنیا کا دوزخ: اصل غرض تو انسان کو اس کے کمال کی راہ بتانا تھا مگر جب وہ بتادی تو جو لوگ ان کے مقابل پر ہیں ان کا بھی ذکر کر دیا کہ وہ جب الٰہی پیغام

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾

اے بنی اسرائیل میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمھیں عطا کی[۶۱] اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرو[۶۲]۔

آتا ہے تو نہ صرف اس کا انکار کرتے ہیں بلکہ اس کو جھوٹا بھی کہتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے اقوال وافعال میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں اور اس امن واطمینان کی بجائے جو اتباع آیات کرنے والوں کو حاصل ہے (لا خوف علیھم) ان کا تعلق نار کے ساتھ ہو جاتا ہے گویا ایک جلن اور قلق اور اضطراب ان کے اندر رہتا ہے یہ تو اس دنیا کی حالت ہے اور آخرت میں وہی جنّت ونار ایک ظاہری صورت اختیار کر لیں گے۔

ع[۶۱] بنی۔ بَنُو۔ اَبْنَاء اِبْن کی جمع ہے اور یہ لفظ بناء سے مشتق ہے جس کے معنی بنائی ہوئی چیز ہیں یا مصدر بنانا کے معنی ہیں، چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے، والسماء بنینھا (الذاریٰت ۵۱-۴۷) لا یزال بنیانھم الذی بنوا ریبۃ (التوبۃ ۹-۱۱۱) قالوا ابنوا لہ بنیانا (الصّٰفّٰت ۳۷-۹۷) کانھم بنیان مرصوص (الصف ۶۱-۴) اور بیٹے کو ابن اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا وجود باپ سے ہوا۔ پھر ہر چیز کو جو کسی شئے کی جہت سے یا اس کی تربیت سے یا اس کے تعاہد سے یا کثرت خدمت سے یا اس کے قیام امر سے حاصل ہو اس کا ابن کہا جاتا ہے۔ ابن حرب ابن العلم وغیرہ ابن السبیل مسافر ہے (رغ)۔

اسرائیل عبرانی ہے اَسْر بمعنی عَبْد ہے عربی میں اَسْر کے معنی قید کرنا ہیں جس سے اَسیر اور جمع اُسارٰی اور اَسْریٰ ہے اور ایل اللہ تعالیٰ کا نام ہے اسی نام سے اللہ تعالیٰ کو حضرت مسیحؑ نے صلیب پر پکارا۔ پس اسرائیل کے لفظی معنی عبداللہ یا اللہ کا بندہ ہوئے اور یہ حضرت یعقوب کا دوسرا نام ہے۔

بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل: توحید الٰہی اور ضرورت نبوت کا ذکر کر کے اب ایک قوم کا ذکر نمونہ کے طور پر کیا ہے۔ بنی اسرائیل سے مراد وہ قوم ہے جو حضرت یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم کی اولاد ہے۔ حضرت ابراہیم کی اولاد کی دوسری شاخ بنی اسمٰعیل ہیں یعنی حضرت اسماعیل کی اولاد۔ پس بنی اسرائیل قوم جس کو یہاں خطاب کیا ہے اور بنی اسمٰعیل جن میں سے حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کا ظہور ہوا دو بھائی بھائی قومیں ہیں۔ بنی اسمٰعیل پہلے سے ملک عرب میں آباد ہوئے اور بنی اسرائیل کوئی ڈیڑھ سو سال کنعان میں رہ کر حضرت یوسف کے زمانہ میں مصر میں چلے گئے۔ کوئی چار سو برس وہاں رہ کر حضرت موسٰی کے ساتھ ارض مقدس میں واپس آئے اور حضرت موسٰی کے بعد حضرت یوشع کے ماتحت ارض مقدس کو فتح کیا۔ عرب میں یہودی: آنحضرت صلعم کے ظہور سے کئی سو سال پیشتر بہت سے یہودی عرب میں آ کر آباد ہوئے اغلب یہ ہے کہ نبی آخر الزمان کی پیشگوئیوں کی بنا پر انہوں نے یہاں سکونت اختیار کی۔ ان میں سے تین قومیں خاص مدینہ میں آباد تھیں، بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع۔ خیبر میں بھی یہودی آباد تھے اور ان کی وہاں حکومت تھی۔

بنی اسرائیل کے ذکر سے اصل مقصود: قرآن شریف میں کسی انسان کا ذکر ہو یا کسی قوم کا سب مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ہے قصّہ کے طور پر نہیں۔ بنی اسرائیل کا ذکر سب سے پہلے کیا ایک اس لیے کہ اس کا خاص تعلق بنی اسمٰعیل سے ہے پھر اس لیے کہ یہ قوم تمام نعمتوں کی وارث بھی ہوئی، انبیاء ان کو کمال روحانی پر پہنچانے کے لیے مبعوث ہوئے، ظاہری کمال ان کو فتوحات کی صورت میں عطا فرمایا چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ اس نعمت کا ذکر کیا ہے اذجعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا (المائدۃ ۵-۲۰) یعنی اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی نعمتوں سے اور اعلیٰ سے اعلیٰ جسمانی نعمتوں سے متمتع فرمایا۔ پھر تمام نعمتوں کے بعد اپنی بدعملیوں سے غضب کے نیچے بھی آئے۔ یہ سب کچھ مسلمانوں سے بھی ہوا! گویا انہی کی تاریخ بنی اسرائیل کے قصّہ میں بطور ایک پیشگوئی کے لکھی گئی ہے اور یہ تفسیر زبان نبوی سے ہی سمجھنی چاہیئے۔ اس لیے کہ متفق علیہ حدیث میں ہے آپ نے فرمایا لتتبعن سنن من قبلکم تم بھی پہلوں کے طریق پر قدم بقدم چلو گے اور جب دریافت کیا گیا الیھود والنصارٰی یا رسول اللہ تو فرمایا ہاں اور کون۔ تو گویا اس آیت میں مسلمانوں کو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی اور جسمانی نعمتیں یاد دلائی جاتی ہیں جو ان کو دی گئی تھیں اور جن دونوں سے وہ آج محروم ہیں ہاں اوّل اپنے آپ کو اپنے عمل سے نعمت روحانی سے محروم کیا تو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو ان پر مسلّط کر کے نعمت جسمانی سے ان کو محروم کر دیا۔ اے کاش ہم قرآن سے کچھ سبق لیتے۔

ع[۶۲] ارھبون۔ رَھَب کے معنی ایسا خوف ہے جس میں احتیاط ملی ہوئی ہو اور اضطراب (رغ) لانتم اشد رھبۃ (الحشر ۵۹-۱۳) ترھبون بہ عدو اللہ (الانفال ۸-۶۰) وغیرہ۔ اسی سے تَرَھُّب بمعنی عبادت ہے اور رَھْبانِیَّۃ عبادت میں غلوّ کا نام ہے۔ فارھبون اصل میں فارھبونی ہے یعنی مجھ سے ہی خوف کرو ایّای حصر کے لیے بڑھا دیا یعنی اور کسی کا ایسا خوف نہ ہو۔

بنی اسرائیل کا خدا سے عہد: دونوں عہدوں کا ذکر کتاب استثناء ۲۶: ۱۷ و ۱۸ و ۱۹ میں ہے "تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کی شرعوں اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا اور خداوند نے بھی آج کے دن تجھ سے اقرار فرمایا جیسا کہ اس نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو اس کی خاص گروہ ہووے اور تو اس کے سب احکام کی محافظت کرے اور تجھے سارے گروہوں سے جنہیں اس نے پیدا کیا صفت اور عزّت اور نام میں بالا کرے"۔ خداوند کی آواز کا شنوا ہونے کا یہ مطلب تھا کہ نبی آخر الزمان کو تسلیم کریں۔ مسلمانوں کا عہد: ایسا عہد مسلمانوں سے بھی لیا گیا تھا ان اللہ اشترٰی من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ (التوبۃ ۹-۱۱۱) اللہ نے مومنوں سے ان کے مالوں اور ان کی جانوں کو خرید لیا ہے اور اس کا معاوضہ جنت ہے اب مسلمان اس عہد پر قائم نہیں رہے۔ اور یہی ان کی مصیبتوں کی اصل وجہ ہے۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

اور اُس پر ایمان لاؤ جو مَیں نے اُتارا، اُسے سچّا ٹھیراتا ہُوا جو تمھارے پاس ہے اور تم اس کے پہلے منکر نہ ہو[۶۳] اور میری باتوں کے بدلے تھوڑا مول نہ لو اور میرا ہی تقویٰ اختیار کرو[۶۴]

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور سچ کو جھوٹ کے ساتھ نہ ملاؤ اور (نہ) سچ کو چھپاؤ اور تم جانتے ہو[۶۵]

ع۶۳ مصدقا۔ صدق سے ہے اور صدّقت فلانا کے معنی ہیں مَیں نے اسے صدق کی طرف منسوب کیا (غ)۔

مصدقا لما معکم۔ اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے پاس ہے۔ تصدیق کے معنی ہیں کسی کو سچّا قرار دینا اور مصدق کے بعد صلہ ل لانے سے یہ غرض ہے کہ یہ تصدیق اس کے فائدہ کے لیے ہے جس کی تصدیق کی گئی ہے۔ قرآن کا سب کتابوں کا مصدق ہونا اور اس سے مراد: قرآن کریم کو صرف بنی اسرائیل کی کتب کا مصدق ہی نہیں کہا گیا بلکہ دوسری جگہ کل کتب منزلہ کا مصدق بھی کہا گیا ہے مصدقا لما بین یدیه من الکتٰب (المائدۃ ۵ - ۴۸) قرآن کریم ہی ایک کتاب ہے جس نے نہ صرف انبیائے بنی اسرائیل کو سچا قرار دیا بلکہ تمام دنیا کے انبیاء پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔ مصدقا لما معکم کے ایک اور معنی بھی ابن جریر میں مروی ہیں کہ آنحضرت صلعم کی پیشگوئیاں ان کے پاس تھیں پس آپ کے ظہور سے ان پیشگوئیوں کی تصدیق ہوئی ورنہ ان کے غلط ہونے میں کوئی شبہ ہی نہ تھا۔

مثیل موسیٰ کی پیشگوئی: مثال کے طور پر خود حضرت موسیٰ کی پیشگوئی کو لو "مَیں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا" (استثناء ۱۸:۱۸) اب موسیٰ جیسا ایک نبی آنا اس پیشگوئی کی رو سے ضروری ہے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ بنی اسرائیل کے کسی نبی نے موسیٰ کی مثل نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی بنی اسرائیل کا کوئی نبی موسیٰ جیسا ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا، کیونکہ وہ سب ایک رنگ میں حضرت موسیٰ کے خلفاء تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ تک تین نبیوں کا انتظار: یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک برابر یہودیوں کو اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا انتظار چلا آتا ہے۔ چنانچہ حضرت یحییٰ نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تو مسیح ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر دریافت کیا گیا تو الیاس ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر دریافت کیا کہ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ یہاں وہ نبی پر تمام بائیبلوں میں استثناء ۱۸:۱۸ کا حوالہ موجود ہے یعنی مثیل موسیٰ نبی (یوحنا ۱:۲۱) اب ظاہر ہے کہ اس وقت تک یہود کو تین نبیوں کی انتظار تھی۔ ان میں سے حضرت یحییٰ کو الیاس کی آمد کا مصداق خود حضرت عیسیٰؑ نے قرار دیا اور مسیح ہونے کا خود دعویٰ کیا مگر وہ مثیل موسیٰ نبی ابھی باقی رہ گیا اور حضرت عیسیٰ کے بعد کوئی نبی ہوا نہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں پر اتمام حجت: پس اگر آنحضرت صلعم ظاہر ہو کر مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ نہ کرتے تو اس پیشگوئی کو ہی غلط ماننا پڑتا۔ پس آنحضرت صلعم کے ظہور سے اس پیشگوئی کی سچائی ظاہر ہوئی اور دوسری طرف یہ عجیب بات ہے کہ آنحضرت صلعم کی بہت ہی ابتدائی وحی میں یہ لفظ آتے ہیں کہ یہی وہ موسیٰ جیسا نبی ہے جیسا کہ سورہ مزمّل سے ظاہر ہے کما ارسلنا الی فرعون رسولا اور یہ یہودیوں اور عیسائیوں پر آنحضرت صلعم کی صداقت کی ایسی اتمام حجت ہے جس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں ایسا ہی اور کئی پیشگوئیاں ہیں جن کا مصداق ان میں کوئی نبی نہیں ہوا اور نبی صلعم کے ظہور سے ہی ان پیشگوئیوں کی سچائی ثابت ہوئی۔ یہی بالخصوص یہاں مراد ہے یعنی تم کو اس نبی کے ماننے میں کیا عذر ہے جو ان پیشگوئیوں کو پورا کرتا ہے جو تمہاری اپنی کتابوں میں ہیں۔

ع۶۴ ثمن قلیل۔ تھوڑے مول سے مراد دنیوی زندگی کے فوائد ہیں۔ ان کی خاطر ہی اکثر انسان حق کو قبول کرنے سے رک جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے قل متاع الدنیا قلیل (النساء ۴ - ۷۷) دنیا کا سارا سامان ہی ایک قلیل شے ہے۔

ع۶۵ تلبسوا۔ لَبْس کپڑا پہننا ہے یا کپڑے سے اپنے آپ کو چھپا لینا۔ اسی سے لباس ہے دیکھو ع۲۳۳ پھر ظاہر سے باطن کی طرف معنی چلے گئے ہیں۔ اور لَبَسْتُ عَلَیْهِ اَمْرَهٗ کے معنی ہیں مَیں نے اس کا امر اس پر مخفی کر دیا (غ)۔

الحق۔ راغب کہتے ہیں کہ حقّ کے اصل معنی مطابقت اور موافقت ہیں۔ اور کئی وجہ پر اس کا استعمال ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بھی الحق کہا گیا ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ چیزوں کا اس کے مطابق جو اقتضائے حکمت ہے وجود میں لانے والا ہے ثم ردوا الی اللہ مولٰهم الحق (الانعام ۶ - ۶۲) اور خدا کی پیدا کی ہوئی اشیاء کو اس لحاظ سے حق کہا جاتا ہے کہ وہ اقتضائے حکمت کے مطابق وجود میں آئی ہیں اور ہر فعل و قول کو حق کہا جاتا ہے، جو اس کے مطابق جو واجب ہے اور اس اندازہ سے جو واجب ہے اور اس وقت پر جو واجب ہے ہو (غ)۔ اور حق کے بہت سے معنی ہیں سے صدق بھی ایک معنی ہیں (ت) اور حق نقیض باطل ہے۔

باطل۔ نقیض حق ہے وہ چیز جس کے لیے جب تحقیق کیا جائے تو کوئی ثبات نہ ہو۔

حق و باطل کی ملاوٹ: یہاں حق سے مراد وہ پیشگوئیاں ہیں جو اب تک ان کی کتابوں میں چلی آتی تھیں۔ اور باطل ان کی اپنی خواہشات جن کے ساتھ پیشگوئیوں کو خلط کرتے تھے۔ پیشگوئیوں کو چھپانے کا ذکر دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے قالوا اتحدثونهم بما فتح اللہ علیکم (۷۶) اپنے پیروؤں کو کہتے ہیں تم اُن سے وہ باتیں کرتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿٤٣﴾

اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جھک جانے والوں کے ساتھ جھکے رہو ٦٦ع

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٤٤﴾

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو، پس کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ٦٧ع

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ

اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگتے رہو اور یقیناً یہ بڑی مشکل ہے

ع٦٦ الزکوٰۃ۔ زکا سے مشتق ہے اور کھیتی میں نمو آنے یا اس کے بڑھنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اسی سے زکوٰۃ ہے اور یہ وہ مال ہے جو فقرا کو دیا جاتا ہے اور اسے زکوٰۃ اس لیے کہا گیا کہ حقیقتہً اس سے برکت ہوتی ہے یعنی مال بڑھتا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ اس سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے (رغ)

ارکعوا۔ رکوع کے اصل معنی جھک جانا ہیں اور ایسی فرمانبرداری پر بولا جاتا ہے جب انسان دوسرے کے آگے جھک جائے۔ اور اصطلاح شریعت میں ارکان نماز میں سے ایک رکن ہے جب انسان دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر اس قدر جھکتا ہے کہ پیٹھ اور گردن بالکل سیدھی ہو جائے۔ یہاں اصل معنی ہی مراد ہیں۔

نماز اور زکوٰۃ: پہلے ایمان کی طرف بلایا تھا اب بتایا کہ صرف منہ سے مان لینا ہی کافی نہیں، بلکہ ان دو باتوں کو بطور اصول قبول کرنا ضروری ہے جن کو اسلام نے پاکیزگی نفس یا کمال نفس کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ یعنی نماز کا قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا۔ اوّل کمال حسن کے لیے ہے دوئم کمال احسان کے لیے کیونکہ نماز سے زیادہ تر غرض ان کمالات انسانی کا حصول ہے جو اپنے نفس سے تعلق رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

وارکعوا میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے انسان کی گردن جھکی رہنی چاہیئے۔

ع٦٧ البرّ۔ برّ نیکی میں وسعت یا بڑی نیکی کو کہتے ہیں (رغ) کیونکہ برّ خشکی کے وسیع قطعہ کو کہتے ہیں۔

تنسون۔ نِسیان انسان کا اس چیز کے ضبط کو چھوڑ دینا ہے جس کی اُسے ودلیت کی گئی ہو۔ خواہ ضعف قلب سے یا لاپرائی سے یا ارادۃً یہاں تک کہ اس کی یاد دل سے جاتی رہے (رغ) وہ نسیان قابل مواخذہ ہے جو عمداً ہو۔ جیسے فذوقوا بما نسیتم لقاء یومکم ھذا (السجدہ ٣٢-١٤) یہاں بھی وہی نِسیان مراد ہے جو عمداً ہو کیونکہ دوسروں کو نصیحت کرنے والا عمداً ہی ترک کرتا ہے۔

تتلون۔ تلی کے اصل معنی ہیں اس کی پوری پوری پیروی کی خواہ جسم سے ہو یا اقتدائے حکم سے (رغ) اور تلاوت کتب منزل من اللہ سے مخصوص ہے خواہ قرأت سے ہو اور خواہ ان پر عمل کرنے سے (رغ) اس لفظ کو اللہ کی کتابوں سے مخصوص کر کے یہ بتا دیا کہ ان کی تلاوت کی اصل غرض ان کی پیروی ہے۔

تعقلون۔ عَقل کے اصل معنی روکنا اور پکڑ لینا ہیں جیسے عقال (اونٹ کا گھٹنا باندھنے کی رسّی) سے اُونٹ کا روک لینا (رغ) حدیث میں ہے اعقل وتوکل جہاں اعقل کے معنی گھٹنا باندھ دو ہیں۔ امام راغب کہتے ہیں عقل کا استعمال دو طرح پر ہے ایک اس قوت کو عقل کہا جاتا ہے جو قبول علم کے لیے انسان کو تیار کرتی ہے اور دوسرے اس علم کو بھی عقل کہا جاتا ہے جو اس قوت کے ذریعہ سے انسان حاصل کرتا ہے اور لکھتے ہیں کہ جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے عدم عقل کے لیے کفار کی مذمّت کی ہے وہاں یہ دوسرے معنی ہی مراد ہیں اور یہ بات صاف بھی ہے قوت تو اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کے اندر رکھی ہے قابلِ الزام وہی ہیں جو اس قوت سے کام نہیں لیتے۔

واعظ کے لیے ضرورت عمل: یہاں بالخصوص خطاب علما سے ہے جو دوسروں کو لمبے چوڑے وعظ کرتے ہیں اور اپنی اصلاح نہیں کرتے۔ اگر خطاب بنی اسرائیل کے علما سے لیا جائے تو رسول صلعم کی پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلائی ہے مگر میرے نزدیک خطاب مسلمانوں سے ہے۔ اس طرح دونوں خطابوں کو ملانے میں یہ اشارہ ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کہا گیا ہے۔ جب تک واعظ خود عامل نہ ہو اس کا وعظ دوسروں پر بھی اثر نہیں کرتا۔

مذہب میں عقل کے استعمال کی ضرورت: افلا تعقلون اس قسم کے فقرات قرآن شریف میں بکثرت آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل اللہ تعالیٰ نے انسان کو بڑا جوہر دیا ہے اور اس سے کام لیے بغیر انسان صداقت کو کبھی نہیں پا سکتا اور نہ سچے مذہب کی اور سچے طریق کی اسے شناخت حاصل ہو سکتی ہے مفردات میں حدیث نقل کی ہے ماخلق اللہ خلقا اکرم علیہ من العقل اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق پیدا نہیں کی جو اس کی نگاہ میں عقل سے زیادہ عزت والی ہو۔ اسی سے انسان کی فضیلت حیوان پر ہے۔ یہ کہنا کہ مذہب میں عقل کا دخل نہیں صریح قرآن شریف کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ملزم کرتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ عقل اور وحی: ہاں یہ سچ ہے کہ وحی سے وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کو عقل خود دریافت نہیں کر سکتی۔ لیکن عقل کا عجز ان باتوں کے معلوم کرنے سے اور چیز ہے اور ان باتوں کا عقل کے مطابق ہونا اور ان کی صداقت کو عقل سے معلوم کر لینا بالکل الگ ہے۔

وحی فطرت کی روشنی یعنی عقل کو جلا دینے والی اور تیز کرنے والی چیز ہے۔ ایک کو دوسرے کا مخالف بنانا دونوں کی حقیقت سے بے خبر ہونے کا نتیجہ ہے۔

اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ ﴿۴۵﴾
مگر نہ ان پر جن کے دل پگھلتے ہیں ع۶۸

الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّہُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّہِمۡ وَ اَنَّہُمۡ
جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور کہ وہ

اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۴۶﴾
اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ع۶۹

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ
اے بنی اسرائیل میری نعمت کو یاد کرو، جو میں نے تمہیں عطا کی

عَلَیۡکُمۡ وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۷﴾
اور یہ کہ میں نے تمہیں قوموں پر فضیلت دی ع۷۰

ع۶۸ الصبر۔ صبر اصل میں تنگی کے اندر روک رکھنے کا نام ہے اور پھر اپنے آپ کو روک رکھنے کا نام ہے اس چیز پر جس کو عقل اور شریعت چاہتی ہوں (غ)، بالفاظ دیگر طاعت پر قائم رہنے اور معصیت سے رُکے رہنے کا نام صبر ہے پس صبر ایک عام لفظ ہے اور مصیبت میں استقلال، جنگ میں ثبات اور روزہ کو صبر کہا ہے۔
کبیرۃ۔ کبیر کے اصل معنی بڑا ہیں مگر کبیرۃ کا استعمال اس چیز پر بھی ہے جو سخت اور دشوار ہو۔ کبر بھی اس معنی میں آیا ہے وان کان کبر علیك اعراضھم (الانعام ۶-۳۵)
خاشعین خشوع عاجزی، فروتنی (غ) سکون اور فرمانبرداری (ت) ہے۔ آواز کی پستی کے لیے اور نگاہ کے نیچا ہونے کے لیے یہ لفظ بالخصوص بولا جاتا ہے۔
قرآن شریف میں ہے خشعت الاصوات (طٰہٰ ۲۰-۱۰۸) خاشعۃ ابصارھم (القلم ۶۸-۴۳)

طریق استعانت: قرآن کریم نے مومن کو مشکلات کے وقت جو طریق استعانت بتایا ہے۔ وہ صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ ہے۔ صبر اصول حقہ پر مضبوط رہنے کا نام ہے۔ اور صلوٰۃ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کا۔ صبر تو یہ چاہتا ہے کہ انسان ایک بات پر ایسا اڑا رہے کہ کسی مخالفت کی اور کسی روک کی اُسے کچھ پروا نہ ہو تمام دنیا بھی اس کے خلاف ہو تو ایک مضبوط پہاڑ کی طرح اس کے قدم میں جنبش نہ آئے اور صلوٰۃ یہ چاہتی ہے کہ وہ اس قدر عاجز ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گرا رہے اور اپنے آپ کو کچھ بھی نہ سمجھے۔ جب انسانوں کے سامنے حد درجہ کی مضبوطی اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں حد درجہ کی عاجزی انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ تب کامیابی کی راہیں سہل ہو جاتی ہیں اور مشکلات کے پہاڑ بھی ہوں تو اُڑ جاتے ہیں۔

مصائب میں توجہ الی اللہ کی ضرورت: انّھا میں ضمیر بعض مفسرین نے استعانت کی طرف لی ہے یعنی صبر و صلوٰۃ سے مدد چاہنا عام لوگوں کو دشوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر بعض نے اسے صرف صلوٰۃ کی طرف لیا ہے اور میرے نزدیک یہی درست ہے جیسا کہ سیاق عبارت بتاتا ہے۔ کیونکہ خدا کے حضور عاجزی اختیار کرنا، مصائب میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا یہ انہی لوگوں کا کام ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایسا یقین کامل رکھتے ہیں کہ اس سے ملاقی ہونے کا بھی انہیں یقین حاصل ہوتا ہے۔ یہاں استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا حکم دے کر صلوٰۃ کے ذکر کو جاری رکھا ہے کیونکہ یہاں نبی کی شناخت یا اس پر ایمان کا ذکر ہے اور یہ مقصد دعا سے ہی زیادہ حاصل ہوتا ہے اور دوسری دفعہ بعینہٖ یہی حکم دیکر (دیکھو آیت ۱۵۳) صبر کے ذکر کو جاری رکھا ہے کیونکہ وہاں جنگ کا ذکر ہے اور دشمن کے مقابلہ کا۔ جہاں گو دعا کی بھی ضرورت ہے مگر مقدم استقلال ہے۔

ع۶۹ یظنون۔ ظن اس چیز کا نام ہے جو نشانات سے حاصل ہو اور جب یہ مضبوط ہو تو علم کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور جب بہت ہی کمزور ہو تو وہم کی حد سے آگے نہیں بڑھتا (غ) ظن شک اور یقین دونوں پر بولا جاتا ہے جب یقین مراد ہو تو ایسا یقین ہوتا ہے جو تدبّر سے حاصل ہو نہ وہ جو دیکھنے سے حاصل ہو کیونکہ جو یقین دیکھنے سے حاصل ہو اس پر صرف لفظ علم بولا جاتا ہے (ت) یہاں ظن سے مراد یقین ہی ہے اور اس پر مفسرین کا قریباً اتفاق ہے۔
ملاقوا۔ لقاء کسی چیز کے سامنے آجانے اور اسے پا لینے دونوں کو کہا جاتا ہے لیکن الگ الگ دونوں مضمونوں کے ادا کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔
راجعون۔ رُجوع لوٹ کر جانے کا نام ہے اس کی طرف جس سے ابتدا ہو یا تقدیر ابتدا خواہ بلحاظ مکان کے ہو یا فعل کے یا قول کے (غ) رب کی ملاقات سے کیا مراد ہے۔ یہ ذکر قرآن شریف میں بار بار آتا ہے اور کافروں کو ملزم کیا ہے کہ وہ لقاء اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔ ان الذین لا یرجون لقاءنا ورضوا بالحیٰوۃ الدنیا (یونس ۱۰-۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ محض دنیا کی زندگی کو غرض و غایت سمجھ لینا انکار لقاء اللہ ہے۔ سورۃ کہف کے آخر میں ان لوگوں کا ذکر کرکے جو سارا زور دنیا کی زندگی پر ہی صرف کر دیتے ہیں فرمایا اولٰئك الذین کفروا بایٰات ربھم ولقائہ اور ایک جگہ فرمایا انك کادح الی ربك کدحا فملٰقیہ (الانشقاق ۸۴-۶) پس لقاء اللہ سے مراد اعلیٰ زندگی ہے جو مومنوں کو میسّر آتی ہے اور گو کامل رنگ لقاء اللہ کا بعد موت یا قیامت میں ہی میسّر آئے گا لیکن جو لوگ اسی زندگی میں جنت کو پا لیتے ہیں یعنی نفوس مطمئنہ وہ یہاں بھی خدا کے حضور ہی زندگی بسر کرتے ہیں پس لقاء اللہ یا اللہ کو پا لینا اعلیٰ سے اعلیٰ مقصد انسانی زندگی کا ہے۔
رجوع الی اللہ: الیہ راجعون۔ موت کے بعد سب انسانوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا جانا آیت ۲۸ میں بیان ہو چکا ہے پس اس سے مراد حساب و کتاب کے لیے اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے۔

ع۷۰ جیسا کہ ع۲ میں دکھایا جا چکا ہے۔ ہر زمانہ کے لوگ ایک عالم کہلاتے ہیں۔ پس مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو اپنے زمانہ کی قوموں پر فضیلت دی گئی۔ اس کے مقابل پر مسلمانوں کے متعلق فرمایا کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تم تمام قوموں میں سے جن کو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کیا گیا بہترین قوم ہو۔ بنی اسرائیل کو یہاں دوسری مرتبہ خطاب کیا ہے پہلی مرتبہ خطاب کرکے ان کو وہ پیشگوئیاں یاد دلائی تھیں جو ان کی کتابوں میں رسول اللہ صلعم کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ اب دوسری مرتبہ خطاب کرکے ان کو وہ نعمتیں یاد دلائی ہیں، جو خدا تعالیٰ نے ان کو دی تھیں۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا
وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا
عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾
وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ
الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ
وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾

اور اُس دن سے بچاؤ کرو جب کوئی جی کسی جی کے کچھ کام نہیں
آئے گا اور نہ اس سے سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس سے
بدل لیا جائے گا اور نہ انھیں مدد دی جائے گی ۴۱؎
اور جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے چھڑا لیا جو تمھیں بُرا
دُکھ دیتے تھے، تمھارے بیٹوں کو مار ڈالتے اور تمھاری عورتوں
کو زندہ رکھتے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے ایک بڑی آزمائش تھی ۴۲؎

ع ۴۱؎ تجزی - جزا کے اصل معنی کام آنا کافی ہونا (غ) یا ادا کرنا اور عوض دینا ہیں (ج) یہاں مراد یہ ہے کہ جو حق ایک کے ذمہ ہے اُسے دوسرا کوئی ادا نہ کرسکے گا۔

شفاعۃ - شفع (جفت) سے مشتق ہے شفع کے اصل معنی ہیں ایک شے کو اس جیسی دوسری شے سے ملا دینا (غ) اور شفاعت کے معنی ہیں کسی دوسرے سے مل جانا اس کی مدد کرتے ہوئے اور اس کا حال دریافت کرتے ہوئے اور اکثر استعمال اس کا اس طرح پر ہے کہ ایک اعلیٰ عزّت اور مرتبہ والا اس کے ساتھ ہو جائے جو ادنیٰ ہے اور اسی سے قیامت کی شفاعت ہے (غ)

مسئلہ شفاعت: شفاعت کا مسئلہ شریعت اسلامی میں مسلم ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ بعض گناہ ایک انسان کے پاک لوگوں کے ساتھ تعلق کی وجہ سے معاف کر دیئے جائیں۔ اسلام کی اصل تعلیم یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے افعال کا ذمہ وار نہیں ہوسکتا۔ نہ ایک کی ذمہ واری کو دوسرا ادا کرسکتا ہے۔ شفاعت کا مسئلہ اس اصول کو باطل نہیں کرتا اور اس کے یہ معنی نہیں کہ جس کی سفارش چل گئی وہ بچ گیا۔ بلکہ جس طرح ہم اس دنیا میں شفاعت کو کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں کہ مثلاً نبی کریم صلعم کے ساتھ تعلق رکھنے والے کس طرح گناہوں سے پاک ہو گئے اور یہ محض آپ کی شفاعت یا آپ سے تعلق کا نتیجہ تھا اور آپ کی دعاؤں نے جو اپنے ساتھ تعلق رکھنے والوں کے حق میں آپ کرتے تھے یہ انقلاب پیدا کر دکھایا۔ اسی سے قیامت کی شفاعت کا قیاس ہوسکتا ہے۔ حق یہ ہے کہ انسان کی نجات اللہ کے رحم اور فضل پر موقوف ہے۔ پھر یہ فضل و رحم اوّلاً انسان کے اعمال پر ظہور پذیر ہوتا ہے پھر بعض نیکوں کے ساتھ سچے تعلق کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جب انسان نیک نیتی سے بعض غلطیاں کر بیٹھتا ہے، یا اپنی غفلت کی وجہ سے معذور ہوتا ہے۔ گو دل میں نیکی کی تڑپ رکھتا ہے تو صلحا کی دعا سے اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا رحم خالق و مالک ہونے کی حیثیت سے خود بھی جوش مار کر اپنی مخلوق کی دستگیری فرماتا ہے۔ چنانچہ شفاعت کی حدیث ذیل جو بخاری اور مسلم میں آئی ہے اس کی تصدیق کرتی ہے اور وہ حدیث یہ ہے شفعت الملئکۃ وشفع النبیون وشفع المومنون ولم یبق الا ارحم الراحمین فیقبض قبضۃ من النار فیخرج منھا قوما لم یعملوا خیرا قط یعنی اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ فرشتوں نے بھی شفاعت کی نبیوں نے بھی شفاعت کی مومنوں نے بھی شفاعت کی اور سوائے ارحم الراحمین کے کوئی باقی نہیں رہا پس وہ آگ میں سے ایک مٹھی بھر لیگا اور ایسے لوگوں کو باہر نکالیگا جنھوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی۔ یہاں تین شفاعتوں کا ذکر ہے ایک ملائکہ کی، ایک انبیاء کی ایک مومنوں کی۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ کا تعلق بہت وسیع ہے یعنی کل نیکی کرنے والوں سے۔ انبیاء کا تعلق صرف اپنی اپنی امتوں سے اور مومنوں کا تعلق بہت ہی محدود ہے پس ملائکہ ہر ایک نیکی کرنے والے کی شفاعت کرینگے، انبیاء اپنی اپنی اُمتوں اور مومن اپنے ساتھ خاص تعلق رکھنے والوں کی اور جنھوں نے کبھی کوئی نیکی نہیں کی یعنی نہ ان کا تعلق کسی مومن سے ہوا نہ کسی نبی سے نہ ملائکہ سے جو نیکیوں کے محرک تھے ان پر خود اللہ تعالیٰ کا رحم جوش ماریگا۔ اس میں مفہوم شفاعت بتایا ہے کہ اصل غرض گنہگاروں پر رحم ہے جس کے لیے ایک یا دوسرا سامان خدا تعالیٰ نے پیدا کر دیا ہے۔ یہاں عیسیٰ مسیح والی شفاعت نہیں کہ صلیب اور کفارہ پر ایمان لانیوالے تو سب بچ جائیں خواہ کچھ ہی کرتے رہے ہوں اور دوسرے لوگوں نے خواہ کتنی ہی نیکی کی ہو ان پر رحم قطعاً نہ ہوگا اور نہ یہ شفاعت سفارش ہے جو ایک انسان پیش کرسکے بلکہ یہ محض کامل مومنوں اور انبیاء کے اور خود خالق عالم کے رحم کے جوش میں آنے کا نتیجہ ہے۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کو توجہ دلائی ہے کہ ان کی نافرمانی کی حالت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ خدا کے رحم سے وہ بالکل دُور جا پڑے ہیں۔ انسان کے بچاؤ کے سامان یہی ہوتے ہیں کہ کوئی دوسرا کام آجائے۔ کوئی سفارشی ہو۔ کوئی معاوضہ لے لیا جائے کوئی رحم کرکے مددگار بن جائے مگر ان کو بتایا کہ انہوں نے اپنے آپ کو ان سب سامانوں سے محروم کرلیا ہے آج یہی حالت مسلمانوں کی ہے اور سبق لینے کا مقام ہے۔

ع ۴۲؎ نجینا - نجات کا مادہ نجو ہے اور نجوۃ بلند زمین کو کہتے ہیں پس نجات کے معنی الارتفاع من الھلاک ہیں یعنی ہلاکت سے بلند ہو جانا (ت) یا جس چیز میں خوف ہو اس سے مخلصی پالینا۔ راغب کہتے ہیں کہ نجاء کے اصل معنی کسی چیز سے الگ ہو جانا ہیں۔ پس نجات کے معنی اسلام میں گناہ سے جو ہلاکت پیدا کرتا ہے بلند ہو جانا یا اس سے بالکل الگ ہو جانا اور مخلصی پالینا ہے۔

اٰل - اھل کی بدلی ہوئی صورت ہے اٰل اور اھل میں فرق یہ ہے کہ اٰل صرف معرفہ کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اھل عام ہے نکرہ کی طرف یا مکان یا زمانہ کی طرف بھی منسوب ہوسکتا ہے اور دوسرے اٰل کا لفظ اشرف اور افضل لوگوں کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اھل ہر ایک کی طرف منسوب ہوسکتا ہے اور بعض کے نزدیک اس کا استعمال سوائے خصوصیت ذاتی کے نہیں ہوتا۔ خواہ وہ قریبی قرابت کے لحاظ سے ہو یا دوستی اور تعلق کے لحاظ سے ہو۔

آل محمد اور اُمت محمد: اس لیے آل محمد صلعم اور اُمت محمد صلعم میں یہ فرق ہے کہ اُمت محمد صلعم میں سب نام لیوا داخل ہیں۔ مگر آپ کی اٰل میں وہی لوگ کہلائینگے

وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۰

اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا پس ہم نے تمہیں بچا لیا اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے ۔ع۳۷

جو علم یقینی اور عمل مضبوط کی خصوصیت رکھتے ہوں۔ (رغ)

فرعون رعمیس: فرعون مصر کے بادشاہوں کا لقب تھا وہ خاص فرعون جس کا یہاں ذکر ہے رعمیس ثانی تھا۔

یسومون۔ سوم کے اصل معنی کسی چیز کی طلب میں نکلنا ہیں۔ پھر خالص جانے پر اور صرف طلب پر بھی اس کا استعمال ہو جاتا ہے اور یہاں طلب کے معنی ہی ہے (رغ) اور سامہ کے معنی یہ بھی آتے ہیں کہ ایک سخت کام اس پر ڈال دیا (ل)

یذبحون۔ ذبح کے اصل معنی جاندار چیز کا حلق کاٹنا ہے۔ مگر محض کاٹنے یا محض ہلاکت پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

بلاء۔ بلی سے ہے جو کپڑے کے پرانا ہونے پر بولا جاتا ہے اور بلی کے معنی آزمانا اس لیے آتے ہیں کہ گویا کثرت آزمائش سے اُسے بڈھا کر دیا غم اور تکلیف کو بھی اسی لیے بلاء کہتے ہیں اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش بعض وقت بذریعہ مصائب کے ہوتی ہے اور بعض وقت خوشی اور راحت پہنچانے سے اس لیے انعام کو بھی بلاء کہا جاتا ہے حضرت عمرؓ کا قول ہے بُلِيْنَا بِالضَّرَّاءِ فَصَبَرْنَا وَبُلِيْنَا بِالسَّرَّاءِ فَلَمْ نَصْبِرْ اور قرآن شریف میں بھی ہے ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ (الانبیاء ۲۱ - ۳۵) اور یہاں بلاء میں اس تکلیف و مشقت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے جس کا ذکر یذبحون میں ہے اور اس انعام کی طرف بھی جس کا ذکر نجات دینے میں ہے۔

بنی اسرائیل سے ذلیل کام کروانا: سُوء العذاب یا بڑا دُکھ جس کا یہاں ذکر ہے۔ بائبل میں اس کے متعلق ہے" اور مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی" (خروج ۱: ۱۳ و ۱۴)

بنی اسرائیلی لڑکوں کا مارنا: لڑکوں کے مارنے کا حکم بھی فرعون نے دیا تھا "تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائی جنائیوں کو..... یوں کہا کہ..... اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو اور بیٹی ہو تو جینے دو" (خروج ۱: ۱۵ و ۱۶) فرعون اور اس کی قوم نہ چاہتی تھی کہ ایک دوسری قوم ان کے ملک میں قوت پکڑے اس لیے ذلت اور بیگار کے سب کام ان سے لینے شروع کیے۔ لڑکوں کو مارنے اور لڑکیوں کو جیتا رکھنے سے بھی یہ منشاء تھا کہ قوم نابود ہو جائے، کیونکہ لڑکیاں مجبور ہو کر مصریوں کے نکاح میں آئیں۔ حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان تمام مصیبتوں سے چھڑایا۔

ع۳۷ فرقنا۔ فرق اور فلق کے ایک ہی معنی ہیں لیکن فرق علیحدہ ہونے کے لحاظ سے اور فلق پھٹ جانے کے لحاظ سے کہا جاتا ہے (رغ) مگر پانی کے پھٹ جانے سے مراد بھی اس کا ہٹ جانا ہی ہے دوسری جگہ فرمایا فانفلق۔ دریا پھٹ گیا (الشعراء ۲۶ - ۶۳)

البحر۔ بَحْر۔ اصل میں اس وسیع جگہ کا نام ہے جس میں بہت سا پانی جمع ہو (رغ) اس لیے دریا سمندر سب پر بولا جاتا ہے۔ پھر بلحاظ معنی وسعت پر بولا جاتا ہے جیسے تَبَحَّرَ فی العلم یعنی علم میں وسعت اور گھوڑے کو جو بہت چلنے والا ہو بحر کہہ دیتے ہیں۔ جیسے آنحضرت صلعم ابوطلحہ کے ایک گھوڑے پر سوار ہوئے تو فرمایا انا وجدنہ لَبَحْرًا۔ اور اسی لیے بَحَرَ کے معنی زیادہ پھاڑ دیا بھی ہیں جس سے بَحِیْرَۃ آتا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا اور شہروں اور بستیوں کو بھی بحار کہا جاتا ہے (ت)

بنی اسرائیل کا عبور دریا: قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے دریا پار ہونے کا ذکر کئی جگہ ہے۔ مگر کہیں یہ ذکر نہیں کہ دریا میں بارہ رستے بن گئے تھے اور پانی کی دیواریں کھڑی رہ گئی تھیں اور ان میں دریچے بن گئے تھے۔ نہ کسی صحیح حدیث میں یہ مضمون ہے۔ یہاں فرقنا بکم البحر فرمایا یعنی دریا کو تم سے الگ کر دیا۔ دو جگہ فرمایا وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر (الاعراف ۷ - ۱۳۸ یونس ۱۰ - ۹۰) یعنی بنی اسرائیل کو ہم نے دریا پار کر دیا۔ ایک جگہ فرمایا فانفلق (الشعراء ۲۶ - ۶۳) یعنی دریا پھٹ گیا۔ دریا پھٹنے سے مراد یہی ہوتی ہے کہ خشک راستہ ہو گیا اور ایک جگہ فرمایا فاضرب لھم طریقا فی البحر یبسا (طٰہٰ ۲۰ - ۷۷) دریا میں ان کو خشک راستہ پر لے جاؤ۔ اور ایک جگہ فرمایا واترک البحر رھوا (الدخان ۴۴ - ۲۴) دریا کو ٹھہرا ہوا یا درمیان میں چھوڑ کر پار ہو جاؤ۔ نہ کہیں بارہ رستوں کا ذکر ہے نہ پانی کی دیواروں کا۔ ہاں خشک راستہ کس طرح ہو گیا یا دریا کس طرح پھٹ گیا۔ یہ قرآن شریف نے بیان نہیں فرمایا۔ بائبل میں صرف اس قدر ہے کہ "خداوند نے بہ سبب پوربی آندھی کے تمام رات میں دریا کو چلایا اور دریا کو سکھا دیا۔" (خروج ۱۴: ۲۱)

اس قدر صاف ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر دشت سینا میں لائے دریا درمیان میں کہاں حائل ہوا۔ بائبل اور مفسرین بائبل نے اسے بحیرہ قلزم کا شمالی حصہ موجودہ شہر سویز سے کچھ اوپر قرار دیا ہے ممکن ہے وہاں کوئی تنگ حصہ سمندر کا اس زمانہ میں ہو جہاں سے پانی کے آندھی سے جیسا کہ بائبل کہتی ہے یا جوار بھاٹے سے ہٹ جانے سے خشک راستہ نکل آیا ہو۔ مگر زیادہ تر قرین قیاس یہ ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو اتنی دُور آنے کی مہلت نہیں دی اور شاید یہ واقعہ دریائے نیل سے تعلق رکھتا ہو یا کسی اور دریا سے جو درمیان میں حائل ہوا ہو۔ دریاؤں میں یہ بسا اوقات ہو جاتا ہے کہ ایک وقت دریا پایاب ہو جاتا ہے اور آناً فاناً ایک ایسی خطرناک رَو آتی ہے کہ سیلاب آ جاتا ہے۔ جو دریا پہاڑوں سے نکلتے ہیں ان میں یہ واقعات اکثر پیش آ جاتے ہیں۔ خود دریائے نیل کے متعلق یہ امکان ہے کہ پُرانے زمانے میں یہ اس قدر بڑا نہ ہو۔ اور کوئی حصہ اس کا پایاب ہوا اور فرعون نے جوش تعاقب میں کہ بنی اسرائیل کو پکڑ لے یہ خیال نہ کیا ہو کہ رَو کا پتہ لے لے۔ بہر حال وہ اسباب جو اس طرح پر گزارنے اور فرعونیوں کو غرق کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیئے معمولی ہوں یا غیر معمولی۔ اس سے احسان میں فرق نہیں

وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (۵۱)

اور جب ہم نے موسیٰؑ سے چالیس رات کا وعدہ کیا ۷۴ پھر تم نے اس کے پیچھے بچھڑا بنا لیا اور تم ظالم تھے ع۷۵

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۵۲)

پھر ہم نے تم کو اس کے بعد معاف کر دیا، تاکہ تم شکر کرو ع۷۵ ا

وَ اِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۵۳)

اور جب ہم نے موسیٰؑ کو کتاب اور فرقان دیا، تاکہ تم ہدایت پاؤ ع۷۶

آنا۔ اگر نبی کریم صلعم کو دشمنوں سے غار میں چھپا کر بچا لینا، اگر مدینے کے گرد محاصرہ کی ہوئی فوج کو ایک آندھی سے ہٹا دینا انعامات الٰہی ہیں تو معمولی اسباب سے ایک نتیجہ کا پیدا ہو جانا کسی طرح احسان کی نوعیت کو نہیں بدل سکتا۔

ع۷۴ واعدنا۔ وعد سے باب مفاعلہ ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم تھا اور حضرت موسیٰ کی طرف سے اس کا قبول کرنا۔

موسیٰ۔ عبرانی نام ہے۔ ہمارے مفسرّ اس کو مو بمعنی ماء یعنی پانی اور شیٔ بمعنی شجر سے مرکب بتاتے ہیں اور بعض اس کو ماس یمیس سے فعلی کا وزن بتاتے ہیں مفسرین بائبل اس کو ماشہ (نکلنا) سے مشتق بتاتے ہیں اور تازہ تحقیقات یہ ہے کہ یہ مصری لفظ ہے جس کے معنی بچہ یا بیٹا ہیں۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل میں سے نہایت اولوالعزم نبی ہیں۔ آپ کے والد کا نام عمران تھا اور مصر میں آپ پیدا ہوئے۔ آپ کی بہن مریم آپ سے بہت بڑی تھیں اور ہارون آپ سے تین سال بڑے تھے۔ آپ کا زمانہ عموماً پندرہ سو قبل مسیح سمجھا گیا ہے مگر تازہ تحقیقات یہ ہیں کہ آپ کا زمانہ تیرہ سو قبل مسیح کے قریب ہے۔ رعمیس ثانی کا زمانہ: کیونکہ رعمیس ثانی کا زمانہ جس کے ساتھ آپ کو معاملہ پیش آیا ساڑھے تیرہ سو سال قبل مسیح ہے۔ آپ کا عظیم الشان کام بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے آزاد کرنا اور ایک شریعت اپنی قوم کو دینا ہے۔ قرآن کریم میں آپ کا ذکر بہت آتا ہے جس کی وجہ سے آپ سے آنحضرت صلعم کی مماثلت ہے۔

لیلة عموماً غروب آفتاب سے صبح صادق تک کے وقت کو کہا جاتا ہے یوں تو چالیس راتوں میں چالیس دن بھی شامل ہیں، مگر عبادت کے لیے چونکہ رات زیادہ موزوں ہے شاید اس مناسبت سے لیلة کا لفظ اختیار کیا۔ الاعراف ۷-۱۴۲ میں چالیس کی جگہ تیس اور دس کہا وواعدنا موسٰی ثلٰثین لیلة واتممنٰھا بعشر۔

نزول شریعت موسوی: بائبل میں حضرت موسیٰ کا چالیس دن پہاڑ پر رہنا مذکور ہے" اور موسیٰ بدلی کے درمیان چلا گیا اور پہاڑ پر چڑھ گیا اور موسیٰ پہاڑ پر چالیس دن رات رہا" (خروج ۲۴: ۱۸) یہ وہ خلوت کا زمانہ تھا جب حضرت موسیٰ پر توریت کے احکام نازل ہوئے اور یہ واقعہ مصر سے آنے کے بعد کا ہے پہلا کام حضرت موسیٰ کے سپرد صرف یہی کیا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ سے نکال لائیں۔ جب وہ نکال لائے تب شریعت نازل ہوئی۔

ع۷۵ اتخذتم۔ اتخاذ کا جب ایک مفعول ہو تو بنانے کے معنی میں آتا ہے (ذ) پس مراد یہ ہے کہ انھوں نے ایک بچھڑے کی مورت بنائی۔

بنی اسرائیل اور گائے کی پرستش: مصر میں جہاں بنی اسرائیل چار سو سال رہے تھے گائے کی پرستش ہوتی تھی۔ اس کا اثر بنی اسرائیل پر ہوا جیسے ہندوستان میں ہندوؤں کی بہت سی باتوں کا اثر مسلمانوں پر ہوا ہے۔ پیر پرستی قبر پرستی کی ترویج عام کا یہ بھی ایک موجب ہے اور بہت سے رسوم و رواج ہندوؤں کے مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں حضرت موسیٰؑ چالیس دن کے لیے پہاڑ پر گئے تو بنی اسرائیل نے ایک بچھڑے کا بت بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی اس کی تفصیل قرآن شریف میں سورہ طٰہٰ میں اور بائبل میں کتاب خروج کے ۳۲ باب میں ہے۔

ع۷۵ ا عفونا۔ عفو کے اصل معنی کسی چیز کے لے لینے کا قصد کرنا ہیں (غ) اس لیے دو مختلف معنوں پر بولا جاتا ہے یعنی مٹانا اور بڑھانا اسی دوسرے معنی کی رُو سے حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے اعفاء اللحی کا حکم دیا جس کے معنی ابن اثیر نے کیے ہیں ھو ان یوفر شعرہ ولا یقص کالشوارب (ن) یعنی یہ کہ ڈاڑھی کے بالوں کو زیادہ کیا جائے مونچھوں کی طرح چھوٹا نہ کیا جائے اور عفوت عنہ کے معنی ہیں میں نے اسکے گناہ کے دور کرنے کا قصد کیا (غ) گویا اسے مٹا دیا۔

تشکرون۔ شکر کے معنی ہیں نعمت کا تصوّر اور اس کا ظاہر کرنا (غ) پس ایک شکر قلب یعنی دل کا شکر ہے جو محض تصور نعمت ہے اور ایک شکر لسان یعنی زبان کا شکر ہے جو دینے والے کی ثنا ہے اور ایک شکر بالجوارح یعنی اعضا سے شکر ہے جس سے مراد نعمت کی مکافات اس کے استحقاق کے مطابق دینا ہے (غ) اور شکر نعمت کفر نعمت کے مقابل پر ہے یعنی نعمت کو چھپانے کے (غ) اس لیے شُکر احسان یعنی نعمت کا پہچاننا اور اس کا پھیلانا ہے (ت) اور اللہ تعالیٰ شکور ہے یعنی تھوڑے عمل پر بہت بڑی جزا دینے والا (ت) یہی معنی شاکر کے ہیں جب اللہ تعالیٰ کی صفت ہو۔

ع۷۶ فرقان۔ حق و باطل میں فرق کو کہتے ہیں (غ) فرق عام ہے قرآن شریف میں جنگ بدر کو بھی فرقان کہا ہے یوم الفرقان یوم التقی الجمعٰن (الانفال ۸-۴۱) اور خود قرآن شریف کو بھی فرقان کہا ہے۔ تبارک الذی نزل الفرقان علٰی عبدہ (الفرقان ۲۵-۱) مومن کو جو نور حق و باطل میں فرق کرنے کا دیا جاتا ہے اسے بھی فرقان کہا ہے۔ ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقاناً (الانفال ۸-۲۹) پس موسیٰ کو فرقان دینے سے مراد وہ معجزہ بھی ہو سکتا ہے جس سے بنی اسرائیل کے دشمن تباہ ہو گئے اور فرقان توریت کا نام بھی ہو سکتا ہے اس لحاظ سے کہ وہ حق و باطل میں فرق کرنے والی چیز ہے اور وہ نور بھی مراد ہو سکتا ہے جس سے انبیاء حق و باطل میں فرق کرتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ
اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِىِٕكُمْ
فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ
فَتَابَ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝۵۴
وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرَى اللّٰهَ
جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۵

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم بچھڑا بنا کر تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے پس اپنے پیدا کرنے والے کی طرف پھر آؤ اور اپنے نفسوں کو مار ڈالو[۷۷] یہ تمہارے لیے تمہارے پیدا کرنے والے کے حضور بہتر ہے پس وہ تم پر رحمت سے متوجہ ہوا بےشک وہ رحمت سے متوجہ ہونیوالا رحم کرنے والا ہے۔

اور جب تم نے کہا اے موسیٰؑ ہم تیری بات کبھی نہ مانیں گے جب تک کہ کھلا کھلا اللہ کو (نہ) دیکھ لیں پس تم کو ہولناک آواز نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے[۷۸]

ع۷۷ قوم۔ قام یقوم سے ہے جس کے معنی کھڑا ہونا ہیں۔ اور یہ اسم جمع ہے۔ زبان عربی میں قوم کا لفظ صرف مردوں کی جماعت پر بولا جاتا تھا جس میں عورتیں شامل نہ ہوں کیونکہ وہی متکفل امور سمجھے جاتے تھے مگر قرآن شریف نے عموماً مردوں اور عورتوں دونوں کو اس لفظ قوم میں شامل کیا ہے۔ (غ) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی حیثیت کو قرآن شریف نے کس طرح بڑھایا ہے۔

بارئ۔ البارئ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے بَرَأَ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں ایسے طور پر پیدا کیا جس کی پہلے مثال یا نمونہ نہ ہو (ت) خلق اور برأ میں فرق: خلق اور بَرَأَ میں یہ فرق ہے کہ خلق عام ہے اور برأ حیوانات سے مخصوص ہے (ل) گویا البارى روح کا پیدا کرنے والا ہے ہاں بعض وقت جواہر اور اعراض کے پیدا کرنے پر بھی بولا جاتا ہے (ل) قرآن کریم میں مصیبت کے متعلق آتا ہے من قبل ان نبرأها (الحدید ۵۷۔ ۲۲)

اقتلوا۔ قتل کے اصل معنی روح کا جسم سے دور کرنا ہیں (غ) یا موت کا وارد کرنا مارنے سے یا پتھر سے یا زہر سے یا اور کسی طرح پر (ت) مگر بعض وقت یہ معنی مراد نہیں ہوتے مثلاً حدیث سقیفہ میں قتل اللہ سعداً کے معنی ابن اثیر نے لکھے ہیں ای دفع اللہ شرہ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے شر کو دور کرے اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا اقتلوا سعداً قتله اللہ یعنی سعد کو قتل کردو مطلب یہ نہ تھا کہ فی الواقع قتل کردو بلکہ ایسا کردو گویا کہ وہ قتل ہوگیا ہے اور مرگیا ہے۔ ایسا ہی دوسری حدیث میں جہاں دو خلیفوں کی بیعت کا ذکر ہے وہاں لفظ آتے ہیں فاقتلوا الآخر دوسرے کو قتل کردو جس کے معنی ابن اثیر لکھتے ہیں ابطلوا دعوته واجعلوه کمن مات (ن) یعنی اس کی دعوت کو باطل کردو اور اسے اس کی طرح کردو جو مرگیا ہے اور قتلت فلاناً کے معنی ذَلَّلْتُهٗ آتے ہیں (غ) یعنی میں نے اس کو فرمانبردار بنا لیا۔ قتل نفس سے مراد: اسی لیے فاقتلوا انفسکم میں امام راغب نے یہ معنی بھی قبول کیے ہیں قیل عنی بقتل النفس اماطة الشهوات یعنی قتل نفس سے مراد شہوات کا دور کرنا یا مارنا ہے۔

انفس۔ نفس کی جمع ہے اور نفس کے معنی روح بھی ہیں اور ایک چیز کے کل کے کل یا اس کی حقیقت پر بھی بولا جاتا ہے (ت) جیسے ظلمتم انفسکم یعنی اپنے آپ پر ظلم کیا اور اَخ یا بھائی بند کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے فسلموا علی انفسکم (النور ۲۴۔ ۶۱) میں ایسا ہی ظن المومنون والمومنات بانفسهم خیرا (النور ۲۴۔ ۱۲) میں انفس سے مراد اہل ایمان اور اہل شریعت لیے گئے ہیں۔ فاقتلوا انفسکم میں مراد بھائی بند بھی ہو سکتے ہیں اور اپنے نفس بھی جیسا ظلمتم انفسکم میں مراد ہے۔

قتل نفس کی مزید تشریح: توریت میں ہے کہ بنی لاوی کو حضرت موسیٰ نے حکم دیا تھا کہ "تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے اور ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو اور ہر ایک آدمی اپنے دوست کو اور ہر ایک آدمی اپنے قریب کو قتل کرے۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے قریب تین ہزار مرد مارے پڑے۔" (خروج ۳۲: ۲۷ و ۲۸) پس ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ درست ہو اور قرآن کریم نے فاقتلوا انفسکم میں اسی طرف اشارہ کیا ہو یعنی اپنے لوگوں کو جو اس شرک کے بانی مبانی اور قوم کو گمراہ کرنے والے ہیں قتل کردو۔ مگر دوسرے معنی جو امام راغب نے بھی نقل کیے ہیں کہ قتل نفس سے مراد اماطة الشهوات ہے۔ بلحاظ سیاق و سباق بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اوّل تو ظلمتم انفسکم میں نفسوں پر جس ظلم کا ذکر ہے اس سے مراد بھی ذلیل خواہشات میں مبتلا ہونا ہے۔ اور پھر توبہ کا یہاں صاف طور پر ذکر بھی ہے اور اس کے بعد گویا بتایا کہ توبہ ایسی ہو کہ دوبارہ اس قسم کی ذلیل حرکت تم سے سرزد نہ ہو۔ اس لیے اپنے نفسوں کو بہت فرمانبردار بناؤ۔ اور اگلے الفاظ فتاب علیکم بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں اور سورہ اعراف میں جہاں اس واقعہ کا زیادہ تفصیل سے بیان ہے صرف توبہ ہی کا ذکر ہے دیکھو (الاعراف ۷۔ ۱۵۳) یوں یہ دوسرے موقعہ کی تفصیل بھی دوسرے معنی کو ترجیح دیتی ہے۔

ع۷۸ بنی اسرائیل کا اللہ کو دیکھنے کا سوال: لن نومن لك سے مراد یہ ہے کہ محض آپ کے کہہ دینے سے ہم یہ نہ مانیں گے کہ خدا آپ سے کلام کرتا ہے جب تک خود بھی خدا کو نہ دیکھ لیں۔ یہ کہنے والے سارے بنی اسرائیل نہیں بلکہ وہ ستّر آدمی ہیں جن کو حضرت موسیٰ قوم میں سے منتخب کر کے ساتھ لے گئے تھے۔ جیسا کہ سورہ اعراف میں ہے واختار موسیٰ قومه سبعین رجلا لمیقاتنا (الاعراف ۷۔ ۱۵۵) اور موسیٰ نے اپنی قوم سے ستّر آدمی ہمارے میقات کے لیے چن لیے۔ یہ میقات اور واعدنا والا مواعدہ ایک ہی ہیں۔ یہ ستّر آدمی حضرت موسیٰ کے ساتھ طور پر گئے اور انہوں نے یہ لفظ کہے کہ جب تک ہم خدا کو اس طرح نہ دیکھ لیں جس طرح ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اس وقت تک محض تمہارے کہنے سے نہیں مان سکتے۔ حضرت موسیٰ کا ان کی درخواست پر سوال ربِّ ارنی کرنا: حضرت موسیٰ نے ان کی ضد

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾
وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ
وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا

پھر ہم نے تمکو تمھاری موت (کی سی حالت) کے بعد اُٹھایا، تاکہ تم شکر کرو ع۷۹
اور ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا ع۸۰ اور من اور سلویٰ تم پر اتارا ع۸۱ ان
ستھری چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں اور انھوں نے

دیکھ کر آخر یوں سوال کیا رب ارنی انظر الیک (الاعراف ۷-۱۴۳) جیسے حضرت مسیح نے حواریوں کی درخواست پر نزول مائدہ کے لیے التجا کی حالانکہ اس کو ناپسند بھی فرماتے تھے جیساکہ ان کے قول اتقوا اللہ ان کنتم مومنین (المائدہ ۵-۱۱۲) سے ظاہر ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنی ایک تجلی دکھائی جس سے پہاڑ میں زلزلہ آگیا، جعلہ دکًّا میں یہی اشارہ ہے اور یوں سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے کاموں اور عجیب قدرتوں سے پہچانا جاتا ہے ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جاتا۔

صاعقہ اور رجفہ ایک ہی ہیں: اسی کو یہاں صاعقۃ کہا ہے۔ سورہ اعراف میں اسی کو الرجفۃ یعنی زلزلہ بھی کہا ہے فلمّا اخذتہم الرجفۃ (الاعراف ۷-۱۵۵) جب ان کو زلزلہ نے آلیا۔ اسی طرح قرآن شریف میں ثمود کے عذاب کو ایک جگہ رجفۃ یعنی زلزلہ کہا ہے فاخذتہم الرجفۃ (الاعراف ۷-۷۸) اور دوسری جگہ اسی کو صاعقۃ کہا ہے۔ فاخذتہم الصاعقۃ (الذٰریٰت ۵۱-۴۴) پس صاعقۃ کے صحیح معنی ہولناک آواز ہیں اور شدید زلزلہ سے پہلے بھی ایک ہولناک آواز آتی ہے اس لیے زلزلہ کو صاعقہ کہا گیا ہے اور بائبل میں بھی زلزلہ کا ذکر ہے "اور پہاڑ سراسر ہل گیا" (خروج ۱۹:۱۸)

ع۷۹ بعثنا۔ بعث کا لفظ موت سے اُٹھانے اور نیند سے اُٹھانے دونوں پر بولا جاتا ہے (ت) ایسا ہی بیہوشی سے ہوش میں لانے پر بولا جاتا ہے (ض)

موت کے مختلف معنی: موت۔ امام راغب نے موت کے کئی معنی بیان کیے ہیں۔ اوّل قوت نامیہ کا نہ ہونا، جیسے یحي الارض بعد موتہا (الحدید ۵۷-۱۷) دوم قوت حسی کا زائل ہونا یعنی بیہوش ہوجانا یہی معنی یٰلیتنی مت قبل ھذا (مریم ۱۹-۲۳) میں لیے گئے ہیں۔ سوم قوت عقلی کا زائل ہونا یعنی جہالت جیسے او من کان میتا فاحیینٰہ (الانعام ۶-۱۲۲) میں چہارم وہ غم جو زندگی کو مکدّر کر دیتا ہے جیسے ویاتیہ الموت من کل مکان وما ھو بمیت (ابراھیم ۱۴-۱۷) پنجم اس کے معنی نیند ہیں۔ چنانچہ نیند کو موت خفیف اور موت کو نوم ثقیل یعنی بھاری نیند کہا جاتا ہے اور حدیث میں ہے الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا جو سوکر اُٹھنے کی دعا ہے یعنی سب تعریف اس کے لیے ہے جس نے ہم کو زندہ کیا بعد اس کے کہ ہم کو مار دیا تھا۔ احیا اور امانت دونوں کا ذکر ہے مگر مراد صرف بیداری اور نیند ہیں ششم معمولی معنی یعنی رُوح کی جسم سے مفارقت۔ اور لسان العرب میں ہے کہ موت کا لفظ کبھی استعارۃً احوال شاقہ پر بولا جاتا ہے جیسے فقر اور ذلت اور سوال اور بڑھاپا اور معصیت وغیرہ۔ اور موت کے معنی غشی بھی ہیں۔

بنی اسرائیل کی موت کے بعد زندگی: یہاں کون سے معنی مراد ہیں۔ اوپر ذکر تھا کہ ان کو صاعقہ نے آلیا۔ صاعقہ سے موت کا نہ واقع ہونا ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ فرمایا وانتم تنظرون۔ جب صاعقہ نے آپکڑا تو تم دیکھ رہے تھے۔ اور دیکھنا حالتِ زندگی پر دلالت کرتا ہے۔ مفسرین نے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے کہہ دیا ہے کہ نصف پہلے مرگئے اور دوسرے نصف ان کو دیکھتے رہے پھر وہ پہلے مرے ہوئے زندہ ہوگئے اور دوسرے نصف مرگئے۔ یہ بیفائدہ تکلّف ہے۔ موت کے معنی یہاں قوتِ حسی کا جاتے رہنا ہے۔ زلزلہ کی شدت سے ان کے ہوش وحواس جاتے رہے۔ پھر اللہ نے ان کو ہوش وحواس دیدیئے۔ یا قوت عقلی کا جاتے رہنا ہے یعنی یہ سوال تمہارا جہالت کا سوال تھا اور تم ایک جہالت کی موت میں تھے خدا نے تمہیں اس سے باہر نکالا اور تم کو نورِ ایمان عطا فرمایا جیسے او من کان میتا فاحیینٰہ وجعلنا لہ نورًا یمشی بہ فی الناس (الانعام ۶-۱۲۲) میں جہاں ایک مُردہ کو زندہ کرنے کا ذکر کرکے فرمایا کہ ہم نے اس کو ایک نور دیا ہے جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے گویا یہی نورِ ایمان کا ملنا ہی حیات ہے۔ یہ معنی روح المعانی میں بھی دیئے ہیں اور لکھا ہے کہ نظم ونثر میں یہ معنی مروج ہیں جیسا کہ شاعر کے اس قول میں

اخو العلم حی خالد بعد موتہ۔ واوصالہ تحت التراب رمیم ∴ وذو الجہل میت وھو ماش علی الثریٰ۔ یظن من الاحیاء وھو عدیم۔

اور ابن جریر میں ایک قول ثم بعثنٰکم کی تفسیر میں مروی ہے۔ ثم بعثنٰکم انبیاء یعنی تم میں سے نبی اُٹھائے کیونکہ لفظ بعث نبیوں کے بھیجنے پر بھی بولا جاتا ہے۔

ع۸۰ ظلّلنا۔ ظِلّ سے ہے جس کے معنی سایہ ہیں فَیٔ بھی سایہ کو کہتے ہیں مگر فَیٔ صرف اس سایہ کو کہتے ہیں جو دھوپ سے رکاوٹ ہو اور ظل عام ہے جہاں سورج نہ پہنچے اس لیے ظل اللیل اور ظل الجنۃ کہا جاتا ہے (رغ)

غمام۔ غمامۃ کی جمع ہے یعنی بادل۔ غمّ سے ہے جس کے اصل معنی ڈھانکنا ہیں بادل سورج کی روشنی کو ڈھانکتا ہے (رغ) اَمْرٌ غُمَّۃٌ مشتبہ یا تاریک امر ثم لا یکن امرکم علیکم غمّۃ (یونس ۱۰-۷۱)

بادل کا سایہ: مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کو دشتِ سینا میں سے گزرنا پڑا۔ جہاں شدت کی گرمی پڑتی ہے اور خیموں میں رہائش ناقابل برداشت ہوتی ہے شدت گرمی کے وقت ایسے بیابان میں بادل بڑی نعمت الٰہی ہے۔ قرآن شریف نے بائبل کے عجیب وغریب بادل کا ذکر نہیں کیا جو دن کے وقت سایہ کا کام دیتا ہو اور رات کے وقت روشنی کا۔

ع۸۱ مَنّ اصل میں مَنّ ایک مشہور وزن ہے۔ اور اس لیے بھاری نعمت کے دینے پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے گویا نعمت کے بوجھ کے نیچے دبا دیا۔ اور مَنّ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو شبنم کی طرح ایک درخت پر اُترتی ہے اور اس میں مٹھاس ہوتی ہے (رغ) جیسے ترنجبین بخاری میں ہے الکمأۃ من المن یعنی کھمبی بھی مَنّ سے ہے۔

ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾
وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا
حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا
وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾
فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ
لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ
السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع ۶/۱۳

ہمارا کچھ نقصان نہ کیا، بلکہ اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچاتے تھے ع۸۲
اور جب ہم نے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس سے جہاں چاہو بافراغت کھاؤ ع۸۳ اور دروازے میں فرمانبردار بنکر داخل ہو ع۸۴ اور کہو ہماری خطائیں معاف ہوں ہم تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے ع۸۵ اور احسان کرنے والوں کو اور زیادہ بھی دیں گے۔
پھر اُن لوگوں نے جو ظالم تھے بات کو بدل کر اسکے خلاف بنا دیا جو انھیں کہا گیا تھا ع۸۶ پس ہم نے اُن پر جو ظالم تھے اوپر سے ایک عذاب اُتارا اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ع۸۷

سَلْوٰی ۔ اس کا مادہ سلا ہے اور سَلْوٰی کے اصل معنی وہ چیز ہیں جو انسان کو تسلی دے (غ) اور سَلْوٰی ایک پرند ہے جو بٹیر سے مشابہ ہے۔

مَن وسلوٰی کا اُترنا: راغب نے ایک قول نقل کیا ہے کہ مَن اور سَلْوٰی ایک ہی چیز ہے مَنّ اس کو اس لیے کہا کہ اس کے ساتھ ان پر احسان کیا اور سَلْوٰی اس لیے کہ اس کے ساتھ ان کو تسلّی دی اور ابن عباس کا قول سلا کے ماتحت نقل کر کے کہ مَنّ وہ ہے جو اوپر سے اُترتا ہے اور سلوٰی پرند ہے بعض محققین کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے ابن عباس نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو گوشت اور نبات یعنی سبزیوں سے رزق دیا ہے اور یہ صرف بطور ایک مثال کے ہے۔

ع۸۲ طیبٰت ۔ طیب وہ چیز ہے جس سے حواس کو لذّت حاصل ہو اور جس سے نفس کو لذّت حاصل ہو اور شریعت میں طعام طیب وہ ہے جو اس طرز سے لیا جائے جو جائز ہے اور اس اندازہ سے لیا جائے جو جائز ہے اور اس مکان سے لیا جائے جو جائز ہے (غ) سڑی گلی چیزوں پر لفظ طیّب نہیں بولا جا سکتا۔

طیّبات کا حکم: بائبل میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل نے لالچ کر کے ان چیزوں کا ذخیرہ کرنا شروع کیا تو وہ چیزیں سڑ کر خراب ہو جاتیں۔ ستھری چیزوں کے کھانے کے حکم میں یہی اشارہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ طیب وہ چیز ہے جو سڑی گلی یا مضر صحت نہ ہو۔ یہاں ایک عام اصول سمجھایا ہے کہ خلاف ورزی احکام الٰہی سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا وہ غنی ہے بلکہ انسان خود ہی نقصان اُٹھاتا ہے ایسا ہی فرمانبرداری سے انسان خود ہی فائدہ اٹھاتا ہے۔

ع۸۳ القریۃ ۔ قری سے ہے جس کے معنی جمع کرنا ہیں اور قریۃ اس مقام کو جس میں لوگ جمع ہوں مع ان لوگوں کے جو جمع ہوں کہتے ہیں مگر ان دونوں معنوں پر الگ الگ بھی بولا جاتا ہے کبھی مراد صرف موضع ہوتا ہے اور کبھی صرف لوگ (غ)

ھذہ القریۃ ۔ کسی مشہور بستی کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے اور وہ مشہور بستی بیت المقدس ہی ہے جس میں داخل ہونے کا دوسری جگہ صاف حکم ہے یٰقوم ادخلوا الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم (المائدہ ۵۔ ۲۱) ان کو کہا گیا تھا کہ بیت المقدس کو فتح کر کے اس میں داخل ہوں۔ جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ میں بھی یہی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت فاتح داخل ہوں۔ اگلی آیت بتاتی ہے کہ انھوں نے اس حکم کو نہ مانا جیسا کہ مائدہ میں بھی ان کا انکار موجود ہے۔ اور یا سطیّم مراد ہے (گنتی ۲۵۔ ۱)

ع۸۴ امام راغب نے سجدا کے معنی کیے ہیں متذ للین منقادین یعنی فرمانبرداری اور اطاعت اختیار کرتے ہوئے یا تعمیل حکم کرتے ہوئے یہی معنی یہاں درست ہیں اسی کے مطابق سورہ مائدہ میں ہے ادخلوا علیھم الباب (المائدہ ۵۔ ۲۳) یہ مراد نہیں کہ سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو۔

ع۸۵ حِطَّۃ ۔ حطّ کے معنی اوپر سے نیچے اُتارنا ہیں (غ) اور حِطّۃ کے معنی ہیں حُطّ عنا ذنوبنا (غ) یعنی ہمارے گناہ دُور کیے جائیں۔ اسی کے قریب قریب معنی حسن قتادہ وغیرہم سے مروی ہیں۔ ابن عباس سے مغفرت مانگنا معنی مروی ہیں۔ نغفر لکم خطایکم جو حطۃ کی دعا کا جواب ہے اس سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے

ع۸۶ بنی اسرائیل کا جنگ میں جانے سے انکار: بات کے بدل دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسے قبول نہ کیا۔ فاتح بن کر داخل ہونے سے انکار کیا۔ اس کی تفصیل مائدہ میں ہے اور اس کی بجائے زراعت وغیرہ کو چاہا کہ کھانے کی چیزیں ملیں (۶۱) بخاری کی حدیث میں جو آتا ہے کہ حطۃ کی جگہ انہوں نے حبۃ فی شعرۃ کہا یعنی بال میں دانا جو زراعت کی طرف اشارہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ جو تبدیلی انہوں نے چاہی وہ یہی تھی کہ بجائے جنگ میں جانے کے ہم زراعت کریں گے اور یوں جنگ کو ناپسند کیا دیکھو ع۹۰ اور اسی کے مطابق دوسری جگہ ہے فاذھب انت وربك فقاتلا انّا ھٰھنا قاعدون (المائدہ ۵۔ ۲۴) یعنی ہم جنگ نہیں کریں گے تم اور تمھارا رب جنگ کرو۔

ع۸۷ رِجْز کے اصل معنی اضطراب ہیں اور اس عذاب کو رجز کہا جاتا ہے جو اپنی شدّت کی وجہ سے قلق پیدا کرے (ت) اور ایسے عمل کو بھی جو ایسا عذاب پیدا کرے۔ رجز کہا جاتا ہے اور نسائی کی حدیث میں طاعون کو بھی رجز کہا ہے۔

من السّماء ۔ یا اوپر سے آنے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ قضاء وقدر اٹل ہوگی۔ روح المعانی میں ہے اشارۃ الی الجھۃ التی یکون منھا القضاء

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۶۰

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا ، تو ہم نے کہا اپنا عصا چٹان پر مار۔ پس اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے سب قبیلوں نے اپنا اپنا گھاٹ جان لیا ۔ اللہ کے دیئے سے کھاؤ اور پیئو اور ملک میں فساد نہ پھیلاتے پھرو ع۸۸

او مبالغۃ فی علوہ بالقھر والاستیلاء یعنی من السماء میں اشارہ ہے اس جہت کی طرف جہاں سے قضا آتی ہے یا مبالغہ ہے اس کے علو میں قہر اور غلبہ کے ساتھ

رجز کا عذاب: دوسری جگہ ہے کہ وہ چالیس سال جنگل میں بھٹکتے پھرتے رہیں گے۔ یہی وہ قلق پیدا کرنے والا عذاب ہے اور اگر ھذہ القریۃ سے سطیم مراد لیا جائے تو عذابِ طاعون ہوگا جس سے اسرائیلی وہاں ہلاک ہوئے (گنتی ۲۵-۹)

ع۸۸ اضرب۔ ضرب ایک چیز کے دوسری پر مارنے کو کہتے ہیں اور ضرب فی الارض کے معنی زمین میں چلنا ہیں (غ) بلکہ تاج العروس میں ضرب بمعنی ذھب لکھا ہے یعنی چلا گیا۔ اسی لیے ضرب الغائط کے معنی ہیں قضائے حاجت کے لیے گیا اور ضرب کے معنی مارنا بھی آتے ہیں۔

عصا۔ آئمہ لغت نے عصا کے اصل معنی اجتماع اور ائتلاف لکھے ہیں (ل) یعنی اکٹھا ہونا۔ بلکہ اصمعی کہتے ہیں کہ عصا کے معنی سونٹا اس لیے آتے ہیں کہ اس پر انگلیوں کا اجتماع ہوتا ہے (ل)، اس لیے عصا کے معنی جماعت اور عصوت کے معنی میں نے جمع کیا لغت میں آتے ہیں۔ خوارج کے متعلق آتا ہے سقوا عصا المسلمین یعنی انہوں نے مسلمانوں کی جماعت میں اختلاف ڈال دیا۔ ایسا ہی ایاک وقتیل العصا کے معنی ہیں کہ جماعت اسلام میں تفرقہ ڈالنے والوں سے بچو۔ پس عصا کے معنی سونٹا اور جماعت دونوں ہو سکتے ہیں۔

اس لیے اضرب بعصاک الحجر کے معنی تین طرح ہو سکتے ہیں۔ اپنا سونٹا چٹان پر مارو۔ اپنے سونٹے سے چٹان پر چلے جاؤ۔ اپنی جماعت کے ساتھ چٹان پر چلے جاؤ۔

انفجرت۔ فجر سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا فراخ پھٹ جانا اور فجر صبح کو کہتے ہیں کہ وہ رات کو پھاڑ دیتی ہے (غ) تفجیر اور انفجار میں وسعت پائی جاتی ہے۔ سورہ اعراف میں اسی موقع پر انبجست ہے اس کے معنی بھی پھوٹ نکلنا ہیں۔ مگر یہ اوّل خروج پر بولا جاتا ہے (جو تھوڑا ہوتا ہے) اور تفجّر یا انفجار اس پر بھی بولا جاتا ہے جو منبع سے نکل کر باہر آجاتا اور وسعت اختیار کر لیتا ہے اور فُجور جس سے فاجر ہے دیانت کے پردے کو پھاڑنا ہے (غ)

عین۔ اصل معنی آنکھ ہیں۔ پانی نکلنے کی جگہ کو اسی لحاظ سے عین کہا جاتا ہے کیونکہ آنکھ سے بھی پانی نکلتا ہے۔ جاسوس کو عین کہتے ہیں اس لیے کہ وہ خصوصیت سے ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ سونے کو عین کہتے ہیں اس لیے کہ افضل الجواہر ہے جس طرح آنکھ افضل الاعضا ہے کسی چیز کی ذات کو بھی اس کا عین کہتے ہیں (غ)

اناس۔ الناس کی دوسری صورت ہے اناس یا الناس بعض وقت بمعنی قبیلہ اور طائفہ بھی آجاتا ہے (ت) یہاں یہی معنی لیے گئے ہیں بنی اسرائیل کے بارہ ہی قبیلے تھے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بارہ قبیلے علیحدہ علیحدہ چشموں پر خیمہ زن ہوئے تھے۔ اس لیے وہ بارہ چشمے الگ الگ مقامات پر اور ایک دوسرے سے فاصلہ پر ہوں گے۔

تعثوا۔ عثیٰ سے ہے عثیٰ اور عیث دونوں کے معنی فساد ہیں (غ) یا اس کے معنی حد سے گزر جانا ہیں اور پھر فساد میں حد سے گزر جانے پر بولا گیا ہے۔

ابتدائی مذاہب میں دعائیں: اس آیت میں بنی اسرائیل کے پانی مانگنے کا ذکر ہے اگلی آیت میں کھانا مانگنے کا۔ تمام ابتدائی مذاہب میں کھانے پینے کی دعائیں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ کی سب سے بڑی دعا بھی روزانہ روٹی کے لیے ہے۔ بارہ چشموں کا معجزہ: بیابان میں پانی کی ضرورت ایک اہم ضرورت تھی قوم کا ٹھکانا سوائے پانی کے نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو کسی خاص پہاڑ پر جانے کی ہدایت فرمائی، جہاں ان کو بارہ چشمے مل گئے۔ ایلیم ایک مقام ہے جہاں بارہ چشمے تھے (خروج ۱۵ : ۲۵-۲۷) اور آج تک یہ عیونِ موسیٰ کے نام سے مشہور ہے (بائبل ڈکشنری مطبوعہ اکسفورڈ پریس) ممکن ہے یہ یا اس کے قریب کوئی مقام ہو یا کسی خاص چٹان پر سونٹا مارنے کی ہدایت کی جہاں سے پانی کا چشمہ بہ نکلا اور پھر اس کے بارہ چشمے بن گئے۔ کسی پتھر کے شق ہو جانے سے پانی کے چشمے کا نکل آنا بھی ایک معمولی واقعہ ہے لیکن بارہ قبیلوں کے ان چشموں پر آباد ہونے کے لیے یہی معنی زیادہ موزون معلوم ہوتے ہیں کہ اپنی جماعت کے ساتھ پہاڑ پر چلے جاؤ۔ مفسرین کے اس قصّے کی بنیاد کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ تین گز مربع کا ایک پتھر رہتا تھا جہاں اسے جنگل میں رکھ کر سونٹا مارتے اس سے بارہ چشمے نکل پڑتے۔ قرآن و حدیث پر نہیں ہے۔ جو معنی ہم نے کیے ہیں وہ اس لحاظ سے بھی زیادہ موزون ہیں کہ اگلی آیت میں جب کھانا مانگنے کا ذکر آتا ہے تو یہ ہدایت ہوتی ہے کہ شہر میں اُتر پڑو۔ اور کھیتی باڑی کرو۔ اور دونوں واقعوں کا یکجا بیان بتاتا ہے کہ دونوں کی ایک ہی نوعیت ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ
فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ
مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ
قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ
خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ
ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ق وَبَآءُوْ
بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ
ع ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ع (۶۱)

اور جب تم نے کہا اے موسٰی ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کرسکتے، پس اپنے
رب سے ہمارے لیے دعا کر کہ وہ ہمارے لیے ان چیزوں سے نکالے
جو زمین اگاتی ہے اسکی ترکاریوں سے اور اسکی ککڑیوں سے اور اسکے
لسن سے اور اس کے مسور سے اور اسکے پیاز سے[۸۹] اُس نے کہا کیا تم وہ چیز
جو ادنٰی ہے اسکے بدلہ میں لینا چاہتے ہو جو بہتر ہے (کسی) شہر میں
اُتر پڑو جو تم مانگتے ہو تمہیں مل جائیگا[۹۰] اور اُن پر ذلت اور محتاجی
ڈالی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں آگئے یہ اس لیے (ہُوا) کہ وہ
اللہ کی باتوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے ۔
یہ اس لیے (ہُوا) کہ وہ نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ جاتے تھے[۹۱]

ع۸۹ بقل۔ بَقل کے معنی ہیں ظاہر ہُوا۔ ہر ایک چیز جس سے زمین سرسبز ہو بقل ہے مگر یہاں مراد وہ اعلٰی درجہ کی ترکاریاں ہیں جو انسان کھاتا ہے۔
فوم کے معنی لہسن بھی آتے ہیں اور گیہوں بھی، یہاں مراد لہسن ہی معلوم ہوتی ہے ابن مسعود کی قرأت ثوم ہے اور قرینہ بھی اسی معنی کو چاہتا ہے۔
بلا محنت مانگنے کی عادت بنی اسرائیل اور مسلمان: بنی اسرائیل کے سارے واقعات میں یہ بات خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ ہر چیز بلا محنت مانگتے ہیں۔ اسی لیے جنگ کا حکم ہوا، تو وہاں بھی کام سے دل چرایا فاذھب انت وربك فقاتلا انّا ھٰھنا قاعدون۔ تُو اور تیرا رب جاؤ اور جنگ کرو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ چاہتے تھے کہ فتح ہُوا ہوا یا ملک مُفت مل جائے۔ یہی حالت آج مسلمانوں کی ہے۔ محنت سے دل چراتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بادشاہت کے مالک ہوں یا امام مہدی علیہ السلام آئیں اور وہی سب کچھ کرکے دے جائیں اور مسلمانوں کو خزانوں کے مالک بنا دیں۔ اس کا جواب وہی ہے جو اللہ تعالٰی نے یہود کو دیا ہے کہ اللہ تعالٰی کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرو تو یہ چیزیں ملیں گی اور اھبطوا مصراً میں یہی ہدایت ہے دیکھو اگلا نوٹ۔
ع۹۰ ادنٰی۔ دنوّ سے ہے جس کے اصل معنی قرب ہیں۔ ادنٰی سے مراد بعض وقت اصغر یعنی چھوٹی چیز بمقابلہ بڑی کے اور بعض وقت ارذل یعنی زیادہ حقیر بمقابلہ بہتر کے اور بعض وقت اقرب یعنی زیادہ قریب بمقابلہ دور کے ہوتی ہے (غ) یہاں خیر کا مقابلہ ہے اس لیے ارذل مراد ہے۔
مصراً۔ مصر کے اصل معنی حد ہیں اس لیے ہر ایک محدود یعنی محدود شہر کو مصر کہتے ہیں اور مصر مشہور ملک کا نام بھی ہے۔ مگر یہاں نکرہ ہے اور مراد شہر ہے۔
زراعت اور فتوحات ملکی کا مقابلہ: ادنٰی اور خیر سے مراد یہاں ادنٰی اور بہتر حالت معلوم ہوتی ہے۔ وہ سبزیاں ترکاریاں چاہتے ہیں اور وہ بغیر کاشتکاری اختیار کرنے کے پیدا نہیں ہوسکتیں جو قوم زراعت میں لگ جائے گی وہ فاتح نہیں بن سکتی۔ اس لیے ان کو سمجھایا کہ گو تم کو کھانے کی مشکلات ہیں، مگر یہ حالت انجام کار تمہارے لیے زیادہ مفید ہے زراعت میں لگ جاؤگے تو فتوحات تمہیں میسّر نہیں آسکتیں۔ پھر اس کی طرز بھی بتا دی کہ شہری زندگی اختیار کرلو اور کھیتی باڑی کرو۔ یہ چیزیں مل جائیں گی۔ ان کی خواہشات کا میلان اس قسم کے کاموں کی طرف اس لیے بھی زیادہ تھا کہ مصر میں وہ ایسے ہی کام زیادہ تر کرتے تھے۔ مصر کے معنی شہر ہیں اور یہاں ملک مصر ہرگز مراد نہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ایک شہر کی صورت میں رہائش اختیار کرلو۔
ع۹۱ ضربت علیھم۔ یہ محاورہ ضَرَبَ الْخَیْمَۃَ سے لیا گیا ہے۔ یعنی اس نے خیمہ لگایا۔ مراد یہ ہے کہ ذلّت نے ان کو اس طرح اپنے اندر لپیٹ لیا جیسے خیمہ اس شخص کو جس پر وہ لگایا جاتا ہے۔
الذلۃ۔ ذُل اور ذِلّۃ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی مقہور یا محکوم ہونے کی حالت اور ذِلّ وہ ہے جو صعوبت کے بعد ہو (غ) مگر ذلّۃ ایسی محکومی کی حالت ہے جس کے ساتھ قتل و غارت بھی لگی ہو جیسا کہ آل عمران ۱۱۱ میں مفسرین نے لکھا ہے کیونکہ یہ محکومیت کی ذلیل ترین حالت ہے۔
المسکنۃ۔ سکن سے ہے جو حرکت کے بعد ٹھہر جانے کا نام ہے (غ) اور سَکَنٌ کے معنی زوال رعب بھی ہیں (غ) اور اس کے معنی میں جھکنا اور ذلّت اور حالِ بد داخل ہیں اور کبھی مسکنۃ سے مراد ضعف یعنی کمزوری ہوتی ہے (ن) گویا مسکنت کی حالت وہ ہے کہ پھر حکمران ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مار سکیں۔ پس یہ محکومیت کا دوام ہے۔
باؤ۔ بواء اصل میں مکان کے اجزا میں مساوات یعنی ہمواری کو کہتے ہیں اور باء بغضب من اللہ کے معنی ہیں ایسے مکان میں اترا کہ اس کے ساتھ اللہ کا غضب تھا (ع) اسی لیے یتبوّأ جگہ بنانے کے معنی میں ہے یا باء کے معنی اِحْتَمَلَ ہیں گویا وہ اس گناہ یا غضب کی جگہ بن گیا (ت) اور باء کے معنی رَجَعَ بھی آئے ہیں یعنی لوٹ آیا۔
یقتلون۔ قتل کے معنی ۷۷ میں بیان ہو چکے ہیں۔ روح المعانی میں آیت ۸۷ میں فریقا تقتلون (انبیاء کے ایک گروہ کو تم قتل کرتے ہو) کی تفسیر میں

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصٰرٰى
وَالصّٰبِـِٔينَ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾
وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ
الطُّورَ ۭ خُذُوا مَا آتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوا

جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور عیسائی اور صابی، جو کوئی
بھی اللہ اور پچھلے آنے والے دن پر ایمان لاتا ہے اور اچھے کام کرتا
ہے تو اُن کے لیے اُن کا بدلہ اپنے رب کے ہاں ہے اور اُن کو
کوئی ڈر نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۹۲ع
اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور تمھارے اوپر پہاڑ بلند کیا، جو
ہم نے تمھیں دیا ہے اسے زور سے پکڑ رکھو اور جو اس میں ہے

قتل کے معنی یوں کیے ہیں والمراد من القتل مباشرۃ الاسباب الموجبۃ لزوال الحیٰوۃ سواء ترتب علیہ اولا یعنی قتل سے مراد ان اسباب کا حصول ہے جن سے حیات زائل ہوسکتی ہے خواہ اس پر زوال حیات مرتب ہو یا نہ۔ قتل بمعنی اشراف علی القتل: اور یہ فی الواقع سچ ہے کہ ایک فعل کے اشراف پر عام طور پر وہ لفظ بول دیا جاتا ہے جو اصل فعل پر دلالت کرتا ہو خود قرآن شریف میں اس کی کئی مثالیں ہیں۔ جیسے فبلغن اجلھن آیت ۲۳۱ میں بلغ سے مراد واقعی پہنچ جانا نہیں بلکہ پہنچنے کے قریب ہوجانا ہے۔ پس یقتلون النبیین میں یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ نبیوں کے قتل کے درپے ہوتے تھے اور یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ نبیوں کو قتل کر دیتے تھے۔

النبیین۔ نبی کی جمع ہے جو نبأ سے مشتق ہے جس کے معنی خبر ہیں یا وہ خبر جو اپنے اندر عظیم الشان فائدہ رکھتی ہو اور نبی فعیل بمعنی فاعل ہے مگر ہمزہ ترک کر دیا گیا اس لیے نبیٔ اللہ صحیح نہیں نبی اللہ ہے جیسا حدیث میں مذکور ہے اور بعض کے نزدیک نبی نَبْوَۃ سے مشتق ہے جس کے معنی رفعت یعنی بلندی ہیں اور نبی کو اس کے مقام بلند کے لحاظ سے نبی کہا گیا (رغ) اور نُبُوّت سفارت ہے (یعنی پیغام رسانی) اللہ اور اس کی مخلوق میں سے ذوی العقول کے درمیان (رغ) اور قاموس میں ہے کہ نبی اللہ تعالیٰ کے متعلق خبر دینے والے کو کہتے ہیں جس کی مزید تشریح تاج العروس میں یوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی توحید کی خبر دیتا ہے اور اس کو غیب کی باتیں بتاتا ہے اور اسے علم دیتا ہے کہ وہ اس کا نبی ہے۔ نبی کے لغوی معنی اور اصطلاح شریعت: پس لفظ نبی کے لغوی معنی صرف خبر دینے والے کے ہیں۔ مگر اصطلاح شرعی میں یہ لفظ صرف ان رفیع القدر انسانوں پر بولا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان سفارت کا کام انجام دیتے ہیں گویا اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں کو انسانوں تک پہنچاتے اور ان کو ان پر چلنے کی راہ بتاتے ہیں۔ لغوی معنی کی رُو سے ہر ایک خواب بین یا الہام پانے والے پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔

نبی کے لیے کتاب ضروری ہے: مگر چونکہ شریعت نے خاص اصطلاح قرار دی ہے پس جو شخص سفارت کے کام پر مبعوث نہ ہو گو وہ کتنے بھی الہام پائے یا رؤیا دیکھے وہ نبی نہیں کہلا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حالانکہ نبی کریم صلعم کثرت سے سچے خواب دیکھتے تھے مگر جب تک اقرأ کا حکم نہیں پہنچا اس وقت تک اپنے آپ کو نبی نہیں سمجھا اور وہ احکام الٰہی جو نبی پہنچانے کے لیے مامور ہوتا ہے وہی اس کی کتاب ہے اس لیے آیت ۲۱۳ میں فرمایا کہ نبی کو جو خدا مبعوث کرتا ہے تو وہ بشارت بھی دیتا ہے اور ڈراتا بھی ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کتاب بھی نازل کرتا ہے وانزل معھم الکتاب تاکہ اس کتاب کے ساتھ وہ ان کے اختلافوں کا فیصلہ کرے پس نبی بغیر کتاب نہیں ہوسکتا۔ آنحضرت کے بعد نبی نہیں: اور چونکہ قرآن کے بعد کسی کتاب کی ضرورت نہیں اس لیے آنحضرتؐ کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں۔

بنی اسرائیل کی ذلّت و مسکنت: یہاں جو نقشہ ذلّت اور مسکنت کے بنی اسرائیل کے لازم حال ہونے کا کھینچا ہے اس کا تعلق پہلے مضمون سے صرف اسی قدر ہے کہ ان کی کجروی کا آخری نتیجہ یہ ہوا ورنہ یہ مراد نہیں کہ حضرت موسیٰؑ کے وقت میں ہی ایسا ہوگیا تھا۔ بلکہ یہ ایک زمانہ دراز کے بعد کا آخری نقشہ ہے اور اس کی وجہ بھی پیچھے نہیں بلکہ اگلے الفاظ میں بیان کی ہے اس لیے کہ انہوں نے آیات اللہ کا انکار کیا اور نبیوں کو ناحق مارتے تھے۔ خدا کی نافرمانی ہی نہیں کی بلکہ نافرمانی میں حد سے بڑھ گئے۔

قتل انبیاء سے مراد قتل کی کوشش یا ابطال دعوت بھی ہوسکتی ہے: نبیوں کے قتل سے کیا مراد ہے؟ بائبل کے بعض حوالجات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فی الواقع بھی بعض نبیوں کو قتل کیا۔ مگر قتل کے معنی ابطال دعوت بھی آتے ہیں یعنی اس کی دعوت کو باطل کر دینا۔ چنانچہ اس روایت کے اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الاٰخر منھما کی تشریح میں ابن اثیر لکھتے ہیں ای ابطلوا دعوتہ واجعلوہ کمن مات یعنی اس کی دعوت کو باطل کر دو اور اسے ایسا سمجھ لو جیسے کہ وہ شخص جو مر گیا۔ ایسا ہی قتل کا لفظ زبان عربی میں ان اسباب کے جمع ہوجانے پر بھی بولا جاتا ہے جن سے موت واقع ہوسکتی ہے خواہ واقع ہو یا نہ ہو پس ان دونوں معنی کے لحاظ سے بھی الفاظ قرآنی کی تفسیر ہوسکتی ہے یعنی انبیاء کی دعوت کو باطل کرنا یا ان کو قتل کرنے کی کوشش کرنا۔ روح المعانی میں ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کی حالت ایسی ہے کہ اگر کوئی مانع نہ ہو تو قتل ہی کر دیں زیادہ وضاحت کے لیے دیکھو ۲۲ع و ۹۱ع۔

۹۲ع ھادوا۔ ھَوْد کے اصل معنی نرمی کے ساتھ رجوع کرنا ہیں (رغ) اور انا ھدنا الیک (الاعراف ۱۵۶) میں ھدنا کے معنی تبنا ہیں یعنی ہم نے توبہ کی۔ اور ھاد فلان کے معنی ہیں فلاں شخص نے دین میں یہود کا طریقہ اختیار کیا۔

النصاریٰ۔ نصرانی کی جمع ہے اور یہ نام حضرت عیسیٰؑ کے گاؤں ناصرہ سے مشتق ہے۔ بعض نے اس کو عربی مادہ نصر سے ملانے کی کوشش کی ہے مگر یہ تاویل بعید ہے۔

مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ اس کو یاد رکھو تاکہ تم متقی بنو ۹۳

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾ پھر اس کے بعد تم پھر گئے سو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم یقیناً نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوتے۔

الصابئین۔ صابی کی جمع ہے جو صبأ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں چلا گیا (ت) اور اس کے اصل معنی ہیں ظاہر ہوا (غ) اسی وجہ سے کفار آنحضرتؐ کو صابی کہتے تھے۔ صابی کون لوگ ہیں اس کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں بعض کے نزدیک وہ ملائکہ کی عبادت کرتے تھے، بعض کے نزدیک ستاروں کی، بعض کہتے ہیں وہ دین نوحؑ پر تھے بعض کہتے ہیں یہود و نصاریٰ کے بین بین ایک فرقہ تھا۔ انسکلوپیڈیا بریٹینیکا میں ہے کہ یہ ایک نیم عیسائی فرقہ تھا جو یوحنا بپتسمہ دینے والے کے مریدوں سے بہت ملتا جلتا تھا۔ یہ رائے آخری خیال کے ساتھ ملتی ہے اور یہود و نصاریٰ کے ذکر کے ساتھ قرین قیاس ہے۔

ایمان باللہ والیوم الآخر: ایمان باللہ والیوم الآخر کو قرآن کریم نے مسلمان ہونے کے مرادف رکھا ہے دیکھو نوٹ ۲۰ سورہ مجادلہ کے آخر میں یہ ذکر کرتے ہوئے کہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانے والی قوم اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت نہیں رکھ سکتی فرمایا اولئك كتب فى قلوبهم الايمان وايدهم بروح منه یعنی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والے لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی روح کے ساتھ ان کی تائید کرتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ کامل مومنین کی جماعت ہے۔ پھر ان کے متعلق فرمایا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ یہ بھی کامل مومنین کے لیے ہی ہے۔

وسعت دائرۂ اسلام: پچھلے رکوع کے خاتمہ پر یہ بتایا تھا کہ نافرمانیوں کی وجہ سے ذلت اور مسکینی یہود کے اوپر لازم کردی گئی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے نیچے آگئے۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ رحمت الٰہی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کسی قوم پر بند نہیں ہوتا۔ اعمال کی سزا ہوتی ہے اور یہود اب بھی نجات حاصل کرسکتے ہیں اور قوموں میں ممتاز ہوسکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اسلام لائیں۔ اصل غرض تو یہودیوں کو رحمت کی راہ بتانے کی ہے مگر اس کو عام اصول کے رنگ میں بیان کیا۔ اس لیے کہ یہود سمجھتے تھے کہ قوم یہود ہی کو نجات مل سکتی ہے اور دنیا کی دوسری قومیں سب کی سب محروم کی گئی ہیں پس یہاں یہ اصول بیان کردیا کہ کوئی قوم بحیثیت قوم نہ نجات کی ٹھیکیدار ہے نہ نجات سے محروم ہے۔ اسلام کا دائرہ وسیع ہے ہر ایک قوم اس میں داخل ہوسکتی ہے ایمان اور اعمال صالحہ شرط ہیں الذین امنوا سے مراد مُنہ سے دعویٰ ایمان کرنے والے ہیں اور ان کو یہودیوں اور نصرانیوں کے ساتھ رکھ کر یہ بتا دیا کہ نرے دعویٰ ایمان سے چنداں فائدہ نہیں۔

کامل نجات صرف اسلام میں ہے: اسلام اس بات کا انکار نہیں کرتا کہ دوسرے مذاہب میں بھی صداقت ہے۔ ہاں اس صداقت میں باطل کی آمیزش ہوگئی ہے مگر وہ صداقت اپنے کمال میں صرف اسلام میں پائی جاتی ہے اس لیے لاخوف علیهم ولاهم يحزنون کی حالت جو اس دنیا میں ہی انسان کو بہشتی بنا دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کامل قرب عطا فرماتی ہے صرف اسلام سے ہی مخصوص ہے۔ ان الفاظ سے یہ مطلب نکالنا کہ عیسائی رہ کر اور تثلیث اور کفارہ پر ایمان رکھ کر بھی انسان نجات پاسکتا ہے قرآن کریم کی تمام تعلیم کے خلاف ہے ان الدين عند الله الاسلام (آل عمران ۳-۱۹) ومن يبتغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه (آل عمران ۳-۸۵) اور بیسیوں آیات نجات کامل کے لیے آنحضرت صلعم پر ایمان کو ضروری ٹھہراتی ہیں۔ بدوں وساطت خاتم النّبیین اب کوئی شخص خدا کے قرب کو حاصل نہیں کرسکتا۔ گو ایک حد تک گناہ سے پاک ہوجاتا ہو اور اگر یہ کہا جائے کہ ایمان باللہ سے مراد توحید الٰہی پر ایمان لانا ہے تو اوّل تو یہ یہاں لکھا نہیں کسی دوسری جگہ سے یہ قید نکالی جائے گی۔ دوسری جگہ سے ہی قید لگانا ہے تو پھر وہی قید کیوں نہ لگائیں جو خود قرآن شریف نے لگائی ہے۔ کہ ایمان باللہ والیوم الآخر سے مراد مسلمان ہونا ہے اور دوسرے پھر بھی نرے اعمال صالحہ تو کافی نہ ہوئے۔ کروڑہا کی تعداد میں وہ لوگ ہیں جو یا تین خدا مانتے ہیں یا بت پرستی کے ساتھ خدا مانتے ہیں یا بدھ مذہب کے پیروؤں کی طرح خدا کے منکر ہیں یا دھریہ ہیں پس ایمان باللہ سے مراد صرف توحید الٰہی لینے سے حاصل بھی کچھ نہ ہوا اور قرآن کریم کے دوسرے مقامات کی بھی مخالفت لازم آئی جہاں سچا دین اور خدا تعالیٰ تک پہنچنے کی حقیقی راہ صرف اسلام کو قرار دیا ہے۔

۹۳ اخذنا ميثاقكم۔ اخذ میثاق یا عہد لینے سے مراد بذریعہ نبی کے بعض احکام کا دیا جانا ہے۔ نبی پر ایمان لانا یہ اقرار کرنا ہے کہ ہم اس کے احکام کی تعمیل کریں گے۔

رفعنا۔ رفع کا استعمال امام راغب نے چار طرح پر بیان کیا ہے (۱) اجسام کے متعلق جب ان کو اپنی جگہ سے اوپر اُٹھایا جائے (۲) عمارت کے متعلق جب اسے اونچا کیا جائے جیسے واذ يرفع ابراهيم القواعد (۱۲۷) (۳) ذکر کے متعلق جب اسے شہرت دی جائے (۴) مرتبہ کے متعلق جب اسے شرف دیا جائے رفعنا فوقكم الطور کے معنی یہ نہیں کہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے اُٹھا کر اونچا کیا۔ بلکہ یہ کہ تم نیچے تھے اور پہاڑ تمہارے اوپر اُٹھا ہُوا تھا۔ بخاری کتاب المناقب میں آتا ہے فرفعت لنا صخرۃ جس کے معنی بحارالانوار میں کیے گئے ہیں ظهرت لابصارنا یعنی ہماری آنکھوں کے سامنے چٹان ظاہر ہوئی حالانکہ عام معنی کی رُو سے یوں کہنا چاہیئے تھا کہ ہمارے لیے صخرہ اونچا کیا گیا۔ مگر فی الحقیقت صخرہ اونچا نہیں ہوا بلکہ اس کی اونچائی آنکھوں کے سامنے آگئی۔

طور۔ پہاڑ کو کہتے ہیں (ت) ایک خاص پہاڑ کا نام بھی ہے۔

طور پہاڑ اٹھانے سے مراد: اس آیت کے یہ معنی کرنا کہ بنی اسرائیل کے سروں پر پہاڑ کو لا کر معلّق کردیا گیا تھا کہ اگر تم ان احکام کو نہ مانو گے تو ابھی پہاڑ تمہارے سروں پر آپڑے گا۔ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے لا اكراه فى الدين جب انسان کو حکم ہے کہ دین میں جبر نہ کرے تو خود خدا کا جبر کرنا کیا معنی، علاوہ ازیں اس جبر کا نہ کوئی جواب بنی اسرائیل کی طرف سے کافی ہے کہ ہم نے اقرار کوئی نہیں کیا۔ ڈرا کر اقرار لیا گیا۔ ایسا اقرار تو کسی عدالت میں بھی تسلیم نہیں ہوسکتا بلکہ صرف ان کو یاد دلایا ہے کہ

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ۝٦٥

اور بیشک تم ان کو جانتے ہو جو تم میں سے سبت کے معاملہ میں حد سے نکل گئے، پس ہم نے ان سے کہا کہ تم ذلیل بندر ہو جاؤ [94]

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝٦٦

پس ہم نے اُسے عبرت بنایا اُن کے لیے جو اُن کے سامنے تھے اور جو اُن کے بعد میں آنے والے ہیں اور متقیوں کے لیے نصیحت [95]

وَإِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝٦٧

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ گائے ذبح کرو، انھوں نے کہا کیا آپ ہم سے ہنسی کرتے ہیں، (موسیٰؑ نے) کہا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں [96]

جب حضرت موسیٰ پر احکام نازل ہوئے تو اس وقت بنی اسرائیل کے بزرگ پہاڑ کے نیچے موجود تھے اس لیے حکم ہوتا ہے کہ اس کو مضبوطی سے پکڑ رکھو یعنی اس پر عمل کرو۔ توریت میں یہ الفاظ ہیں "اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملا دے اور وے پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے" (خروج ۱۹ : ۱۷) اور ان کو حکم تھا کہ نیچے ہی رہیں اور حضرت موسیٰ کے ساتھ اوپر نہ آئیں (خروج ۱۹ : ۲۴)

ع۹۴ اعتدوا۔ عدا سے ہے اور عَدْو کے معنی تجاوز یعنی حد سے نکل جانا ہیں۔ اور اعتدا حق سے تجاوز کا نام ہے۔

سبت کے اصل معنی کاٹنا ہیں (رغ) اور اصطلاح میں ایک خاص دن تھا۔ یہودیوں کو ہفتہ میں ایک دن یعنی شنبہ کو کاروبار بند رکھنے کا حکم تھا اس لیے وہ دن کاروبار کے قطع ہونے کی وجہ سے سبت کہلایا۔ اعتداء فی السبت سے مراد سبت کے حکم کو توڑنا ہے ہفتہ میں ایک دن ان کی عبادت کے لیے مقرر تھا۔ جب اس دن بھی خدا کی طرف دھیان نہ لگایا اور اپنی دنیا میں ہی مبتلا رہے تو اخلاق فاضلہ سے آہستہ آہستہ عاری ہوتے چلے گئے۔

قردۃ۔ قِرْد کی جمع ہے بندر۔

خاسئین۔ خساء سے ہے جس کے معنی ذلیل ہو کر پیچھے ہٹ جانا ہیں (رغ) دوزخیوں کے متعلق آتا ہے قال اخسئوا فیھا (المومنون ۲۳-۱۰۸) اور سورہ ملک میں ہے ینقلب الیک البصر خاسئًا (الملک ۶۷-۴) جہاں متحیراً معنی لیے گئے ہیں۔

بنی اسرائیل کا بندر بننا: کونوا قردۃ خاسئین۔ امام مجاہد سے اس کی تفسیر یوں مروی ہے قال مسخت قلوبھم ولم یمسخوا قردۃ یعنی ان کے دل مسخ ہو گئے تھے اور صورتیں مسخ ہو کر بندر نہیں بنیں۔ مفردات میں بھی منقول ہے قیل بل جعل اخلاقھم کاخلاقھا یعنی ان کے اخلاق بندروں کے سے ہو گئے۔ اس تفسیر کی تائید قرآن کریم کے دیگر مقامات سے ہوتی ہے۔ النساء ۴، ۴۷ میں ہے او نلعنھم کما لعنا اصحاب السبت یعنی ہم ان پر لعنت کریں جیسا سبت والوں پر لعنت کی۔ اب رسول اللہ صلعم کے دشمنوں پر جو لعنت واقع ہوئی وہی لعنت اصحاب سبت پر ہوئی۔ لیکن اوّل الذکر بندر نہیں بنائے گئے بلکہ ذلیل کیے گئے۔ اسی طرح دوسری جگہ فرمایا جعل منھم القردۃ والخنازیر وعبد الطاغوت اولئک شر مکانا واضل عن سواء السبیل (المائدۃ ۵-۶۰) یعنی ان میں سے بندر اور سؤر بنائے اور وہ جس نے شیطان کی پرستش کی یہ لوگ بہت بُری حالت میں ہیں اور سیدھے رستہ سے بہت دُور بھٹکے ہوئے۔ اب جو لوگ بندر اور سؤر بنے انہی کے متعلق فرمایا کہ ان کی حالت بہت خراب ہے اور وہ سیدھی راہ سے دُور چلے گئے۔ یہ انسان کو ملزم کرنے کا طریق ہے نہ حیوان کو۔ اور قرآن کریم ایسے محاورات سے بھرا پڑا ہے کسی کو گدھے سے مثال دی ہے کمثل الحمار، کسی کو کتے سے کمثل الکلب۔ بندر ایک نقّال جانور ہے یعنی انسان کے فعل کی نقل کرتا ہے مگر اس کے نیچے حقیقت نہیں ہوتی پس ان کو بندر کہنے سے مراد یہ ہے کہ وہ محض نقالی کے طور پر رسوم ادا کرتے ہیں اور ان کے افعال حقیقت سے خالی ہیں۔ یا ذلت کے لحاظ سے اُن کو بندر کہا ہے اور اس کی طرف خاسئین میں اشارہ ہے۔ عربی زبان میں بندر کی مثال زنا کی کثرت کے لیے دی جاتی ہے ازنی من قرد۔ اور یہودیوں میں اس بدی کی کثرت پر بائبل گواہ ہے "تیرے بیچ وے ہیں جو فسق و فجور کرتے ہیں تیرے بیچ باپ کو بھی انہوں نے بے ستر کیا... کسی نے دوسرے کی جورو سے بُرا کام کیا ہے اور دوسرے نے اپنی بہو سے بدذاتی کی ہے اور کسی نے اپنی بہن اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے درمیان خراب کیا ہے" (حزقیل ۲۲ : ۹-۱۱) ان تمام باتوں کے لحاظ سے یہ لوگ بندر بن گئے۔

ع۹۵ نکال عبرتناک سزا کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ نکل کے معنی قید کرنے کے ہیں (رغ) اور نکال سے مراد وہ سزا ہے جو دوسرے کو ایسا کام کرنے سے روک دے (رغ) ما بین یدیھا سے مراد اس زمانہ کے لوگ اور ما خلفھا سے پیچھے آنے والی نسلیں ہیں۔

موعظۃ۔ وعظ ایسا روکنا ہے جس کے ساتھ تخویف ہو یعنی بُرے کام سے اس کا بدانجام بتا کر روکنا یا وہ اچھی باتوں کا یاد دلانا ہے جس سے قلب میں رقت پیدا ہو (رغ) موعظۃ اسی سے اسم ہے۔

ع۹۶ بقرۃ۔ اس کی جمع بقر ہے اور بقرۃ گائے کو اور ثور بیل کو کہتے ہیں اور بقر کے معنی شَقّ یعنی پھاڑنا آتے ہیں۔ اس لیے باقر خطاب ہے اس معنی کے لحاظ سے کہ وہ علوم کے دقائق کے پھاڑنے میں وسعت رکھتا ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿۶۸﴾

انھوں نے کہا اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے کہ وہ کیسی ہے، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جو نہ بوڑھی ہے نہ بچّہ، جوان ہے انکے بین بین، پس کرو جو کچھ تمھیں حکم دیا جاتا ہے ۹۶ الف

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿۶۹﴾

انھوں نے کہا اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے کہ اس کا رنگ کیا ہے، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک زرد گائے ہے اس کا رنگ گہرا زرد ہے دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے ۹۶ ب

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿۷۰﴾

انھوں نے کہا اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں کھولکر بتائے کہ وہ کیسی ہے کیونکہ ہمارے لیے گائیں ایک سی ہیں اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور پتہ لگا لیں گے۔

قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿۷۱﴾ ع ۸

کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جو کام میں نہیں لگائی گئی کہ زمین کو پھاڑتی ہو اور نہ کھیت کو پانی دیتی ہے صحیح وسالم ہے اس میں کوئی داغ نہیں، انھوں نے کہا اب آپ نے ٹھیک (پتہ) بتایا ہے، سو انھوں نے اُسے ذبح کیا اور وہ کرنا نہ چاہتے تھے ۹۷

ھزوا۔ ایسی مزاح کو کہتے ہیں جو خفیہ طور پر کی جائے۔

جاھلین۔ امام راغب نے جہل کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ اوّل نفس کا علم سے خالی ہونا یعنی ایک چیز کا علم نہ ہونا۔ یحسبہم الجاھل اغنیاء (۲۷۳) میں جاھل سے مراد وہ شخص ہے جو حالات سے ناواقف ہے۔ دوسرے ایک چیز پر خلاف اس کے اعتقاد رکھنا جس حالت میں وہ ہو۔ تیسرے ایک کام کرنا خلاف اس کے جو اس کا حق ہے کہ اس طرح کیا جائے۔ یہاں یہی تیسرے معنی مراد ہیں۔

گائے ذبح کرنے کا حکم: گائے کی پرستش ایک خاص قسم کا شرک تھا جو بنی اسرائیل میں سرایت کر گیا تھا۔ اس کا علاج ضروری تھا موسوی شریعت میں اس قسم کی گایوں کی قربانی کرنیکا حکم خاص خاص موقعوں پر تھا جو ہل میں نہ لگائی جاتی تھیں۔ دیکھو استثناء ۲۱: ۱-۹ "ایک بچھیا لیں جس سے ہنوز کچھ خدمت نہ لی گئی ہو اور جوئے تلے نہ آئی ہو" اس قسم کی گائے کو قتل کا پتہ لگانے کے لیے ذبح کرنے کا حکم ہے۔ اور گنتی ۱۹: ۱-۱۹ میں ایک لال گائے کے ذبح کرنے کا حکم ہے "جو بے داغ اور بے عیب ہو اور جس پر کبھی جُؤا نہ رکھا گیا ہو" یہ عام احکام بتاتے ہیں کہ گائے کی پرستش کے شرک کو دور کرنا بھی ان کا مقصود تھا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں آیا انہی عام احکام کی طرف اشارہ ہے یا یہ کسی خاص واقعہ کا ذکر ہے؟ میں دوسری توجیہہ کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ آیت کے آخری الفاظ بتاتے ہیں کہ ایک خاص گائے کے ذبح کرنے کا حکم تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں کسی خاص خوبصورت گائے کی عظمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ بچھڑے کی پرستش کی طرح اس کی پرستش کا خطرہ ہو گیا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ذبح کرنے کا حکم دیا۔

۹۶ الف ماھِیَ۔ سوال اس کی حالت اور صفت سے ہے یعنی وہ کیسی ہے۔

فارض۔ فرض سے ہے جس کے معنی سخت چیز کا کاٹنا ہیں اور احکام میں وہ حکم فرض ہے جس کے متعلق حکم قطع ہو چکا اور فارض اس بوڑھی گائے کو کہتے ہیں جس کی ولادت بوجہ بڑھاپے کے منقطع ہو چکی ہو (غ)

بکر۔ بُکرۃ۔ اول النہار یعنی دن کے پہلے حصّہ کو کہتے ہیں اور پہلے بچہ کو بکر کہتے ہیں اور یہاں بِکر سے مراد وہ ہے جس نے ابھی بچّہ نہیں جنا (غ)

عوان۔ عون کے معنی مدد ہیں اور عوان حیوانات میں اس کو کہتے ہیں جو اپنی عمر کے نصف حصّہ کو پہنچ چکا ہو۔ نہ بہت چھوٹا نہ بہت بڑا (ف)

۹۶ ب فاقع۔ گہرے زرد رنگ کو اصفر فاقع یا صفراء فاقع کہتے ہیں۔ گویا زردی کی گہرائی پر یہ لفظ دلالت کرتا ہے۔ ایسا ہی گہرے سیاہ کو اسود حالک کہتے ہیں۔ گہرے سُرخ کو احمر قان گہرے سفید رنگ کو ابیض ناصع گہرے سبز کو اخضر ناضر۔

۹۷ ذلول۔ ذُلّ یعنی مقہور ہونے سے ہے اور اس جانور کو کہتے ہیں جو کام میں لگایا گیا ہو اور اس کی سختی توڑ دی گئی ہو۔ یعنی اسے ماتحت کر لیا گیا ہو۔

تثیر۔ ثار غبار یا بادل کے پھیل جانے پر بولا جاتا ہے اور اثار کے معنی ہیں اس میں ہیجان پیدا کیا و اثاروا الارض (الروم ۳۰-۹) اور اثارۃ زراعت کے لیے زمین کے اوپر نیچے کرنے کو کہتے ہیں (غ)

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ ﴿۷۲﴾
اور جب تم نے ایک شخص کو (اپنی طرف سے) قتل کر دیا، پھر آپس میں اختلاف کیا اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا، جو تم چھپاتے تھے۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾
پس ہم نے کہا کہ اس کو اسکے بعض سے مارو، اس طرح اللہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمھیں اپنے نشان دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو[ع۹۸]

شیۃ - اس کا اصل وِشیۃ ہے اور وشی کے معنی ہیں ایک چیز پر ایسا داغ کرنا جو اس کے کھلے رنگ کا مخالف ہو۔

کادوا - کاد - افعال مقاربہ سے ہے۔ ایک قول کے رو سے اس کی نفی اثبات ہوتی ہے اور اس کا اثبات نفی گویا کاد یفعل کے معنی ہیں گو کرنے کے قریب تھا مگر کیا نہیں اور ما کاد یفعل کے معنی ہیں گو قریب تھا کہ نہ کیا ہوتا مگر کر لیا (غ) مگر کاد کے معنی بعض وقت اراد بھی آتے ہیں یعنی اس نے ارادہ کیا۔ اور اس کی مثال دی ہے کذالك کدنا لیوسف (یوسف[۱۲]-۷۶) اسی طرح ہم نے یوسف کے لیے ارادہ کیا۔ یا فرمایا اکاد اخفیھا (طٰہٰ[۲۰]-۱۵) جس کے معنی ہیں میں ارادہ کرتا ہوں کہ اسے ظاہر کر دوں اور اشعار عرب میں ہے کادت وکدن وتلك خیر ارادۃ۔ جہاں کادت کے معنی ہیں اس نے ارادہ کیا اور کدن کے معنی ہیں میں نے ارادہ کیا (ت)
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص گائے تھی اور چونکہ قوم کے دل میں اس کی محبّت اور عظمت تھی، اس لیے ذبح نہ کرنا چاہتے تھے بار بار کی ہیرا پھیری کا مطلب بھی یہی تھا کہ کسی طرح یہ حکم ٹل جائے۔ بعض مفسرین نے لکھ دیا ہے کہ یہ کوئی معمولی گائے نہ تھی بلکہ آسمان سے اُتری تھی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وانزل لکم من الانعام ثمٰنیۃ ازواج (الزمر[۳۹]-۶) سب چار پائے خدا نے ہی اتارے ہیں سو جس طرح دوسرے چار پائے اُترے اسی طرح یہ گائے اُتری یعنی اسی زمین پر پیدا ہوئی۔

ع۹۸ قتلتم - جیسا کہ یقتلون النّبیین کی تفسیر میں مانا گیا ہے۔ قتلتم کے معنی یا تو یہاں یہ ہیں کہ تم نے ان تمام اسباب کو جمع کر دیا جو زندگی کے منقطع کرنے کا موجب ہو سکتے ہیں اور یا یہ کہ تم نے اپنی طرف سے قتل کر دیا گو کوئی اور مانع ہو گیا ہو دیکھو ع۹۱

ادرأتم - درء سے ہے تفاعلتم کے وزن پر پس اس کا اصل تدارأتم ہے (ج) اور درء کے معنی نشوز یعنی جھگڑا کرنا اور اختلاف ہیں (ت) خلع کی حدیث میں ہے اذا کان الدرء من قبلھا جہاں درء کے معنی خلاف اور نشوز ہیں اس لیے ادرأتم کے معنی اختلفتم وتنازعتم کیے گئے ہیں یعنی تم نے اختلاف کیا اور جھگڑا کیا (ج-د) اور درء کے معنی دفع بھی آتے ہیں جس کی مثال دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے ویدرؤا عنھا العذاب (النور[۲۴]-۸) فادرؤا عن انفسکم الموت (آل عمران[۳]-۱۸۷) (غ)

گائے کے ذبح کے مقابل پر ایک اور واقعہ: استثناء ۲۱: ۱-۹ میں جو عام حکم ہے کہ جب مقتول کا پتہ نہ لگے تو ایک ایسی بچھیا لیکر جو جوئے تلے نہ آئی ہو، اسے ذبح کیا جائے اور اس پر ہاتھ دھوئے جائیں ممکن ہے کہ ان آیات میں اس کی طرف اشارہ ہو۔ مگر بظاہر جس طرح سارے واقعات جن کا ذکر پچھلے رکوعوں میں واذ کے ساتھ شروع ہوتا ہے الگ الگ واقعات ہیں۔ اسی طرح یہ بھی الگ واقعہ ہے۔ اس کا تعلّق گائے کے ذبح کے واقعہ سے کچھ نہیں، بلکہ اس کے مقابلہ پر ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے اور قرآن کریم میں اضداد کا ذکر بہت آتا ہے اس لیے جب پہلے رکوع کو اس آیت پر ختم کیا کہ ایک گائے کے ذبح کرنے میں تم نے کس قدر پس و پیش سے کام لیا تو اب یہ بتاتا ہے کہ اس کے مقابل پر تم اس حالت پر غور کرو جب تم نے ایک عظیم الشان انسان کو قتل کر دیا۔

قتلتم نفسا میں کسی نبی کے قتل کا ذکر ہے: مفسرین کہتے ہیں ایک بھتیجے نے چچا کو قتل کر دیا تھا تاکہ اس کی بیٹی سے شادی کر کے اس کی جائداد کا وارث ہو۔ مگر اس قسم کے قتل کے واقعات تو قوموں میں ہر روز ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا ہو تو قرآن کریم کو اس کے ذکر کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ قرائن سے یہ شہادت ملتی ہے کہ ان الفاظ میں کسی نبی کے قتل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اوّل تو جو دو جرم ان کے بیان کیے تھے ایک کفر آیات اللہ اور دوسرا قتل انبیاء ان میں سے اوّل کی مثالیں کئی ایک بیان کر دیں، مگر دوسرے کی مثال کوئی بیان نہ کی تھی۔ دوسرے نفساً میں تنکیر عظمت کے لیے ہے۔ کسی عظیم الشان انسان کا ذکر ہو سکتا ہے۔ تیسرے تمام قوم ایک معمولی انسان کے قتل پر ملزم نہیں ہو سکتی۔ ہاں انبیاء کے قتل پر کل قوم کو ملزم کیا جاتا ہے اگر بھتیجے نے چچا کو قتل کر دیا تھا تو قوم پر الزام بے معنی ہے لیکن اگر کوئی نبی قتل ہو تو قوم پر الزام درست ہے کیونکہ خود قرآن کریم نے قوموں کو انبیاء کے قتل کے لیے ملزم کیا ہے۔ پس یہ قرائن بتاتے ہیں کہ کسی نبی کے قتل کا ذکر ہے۔

یہ نبی حضرت مسیح ہیں: اب اس کے متعلق چند اور باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ اوّل یہ کہ اپنی طرف سے قتل کر دینے کے بعد پھر ان لوگوں میں اختلاف ہوا ہے جیسا فادرأتم فیھا سے ظاہر ہے۔ دوسرے وہ قتل میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ فرمایا کہ جو کچھ تم چھپانا چاہتے تھے اللہ نے اسے ظاہر کرنا تھا۔ اب ایسا قتل یا قتل کی کوشش جس میں اختلاف ہوا ہو اور پھر قتل بھی کسی نبی کا ہو حضرت مسیح کے صلیب پر چڑھانے کا واقعہ ہے اور کوئی واقعہ اس قسم کا تاریخ بنی اسرائیل میں نہیں پایا جاتا۔

مسیح کے قتل کی کوشش: قرآن کریم میں دوسری جگہ صاف فرمایا وقولھم انا قتلنا المسیح عیسی ابن مریم یعنی وہ تو یہی کہتے ہیں کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا۔ مگر فرمایا وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر مارا بلکہ ان کے لیے وہ مشابہ بالمقتول کر دیا گیا اور پھر فرمایا و انّ الذین اختلفوا فیہ لفی شك منہ (النساء[۴]-۱۵۷) جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا وہ اس کے متعلق شک میں ہیں۔ پس ایک طرف قرائن صفائی سے بتاتے ہیں کہ ان الفاظ میں کسی نبی کے قتل کا ذکر ہے تو دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسا نبی جس کے قتل میں اختلاف ہوا ہو اور کامیابی نہ ہوئی ہو وہ مسیح علیہ السلام ہیں۔ گویا قوم یہود کی بے اعتدالیوں کا نقشہ کھینچا ہے کہ ایک طرف تو گائے تک کو ذبح کرنے میں اس قدر لیت و لعل کرتے ہیں اور دوسری طرف ایک عظیم الشان نبی

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ
كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ
لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ
فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ
خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾
اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ
مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ
مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

پھر تمھارے دل اس کے بعد سخت ہوگئے، سو وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ سختی میں اس سے بھی بڑھ کر اور یقیناً پتھروں میں ایسے بھی ہیں جن سے نہریں بہتی ہیں اور بیشک اُن میں ایسے بھی ہیں جو پھٹتے ہیں تو اُن میں سے پانی نکلتا ہے اور بیشک اُن میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے گر جاتے ہیں اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو [99]
پس کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ تمھاری بات مان لیں گے اور اُن میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اللہ کے کلام کو سنتے، پھر اس میں تحریف کرتے بعد اس کے کہ اُسے سمجھ لیا اور وہ جانتے ہیں [100]

کو قتل کرنے میں اس قدر دلیری ہے۔ حضرت مسیح کی طرف اشارہ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فوراً بعد فرمایا ثم قست قلوبکم من بعد ذٰلک پھر تمہارے دل اس کے بعد سخت ہوگئے اور قرآن شریف سے ہی ثابت ہے فطال علیہم الامد فقست قلوبہم (الحدید ۵۷-۱۶) یعنی ایک لمبا زمانہ گزرنے کے بعد ان کے دل سخت ہوگئے تھے۔ پس یہ کوئی ایسا قتل ہے جو حضرت موسیٰؑ سے لمبا زمانہ گزرنے کے بعد وقوع میں آیا۔

قرآن کریم آپ اپنی تفسیر کرتا ہے: قرآن کریم بعض بعض کی تفسیر کرتا ہے۔ ان واقعات کا جو ذکر یہاں ہے وہی ذکر سورۃ النساء میں بھی ہے دیکھو آیت ۱۵۳۔ جہاں خدا کو دیکھنے کی درخواست ہے۔ پھر بچھڑا بنانے کا ذکر ہے۔ اور آیت ۱۵۴ جہاں میثاق کا ذکر ہے اور شہر میں فرمانبرداری سے داخل ہونے کا حکم ہے اور سبت کے معاملہ میں زیادتی سے روکا ہے۔ اور آیت ۱۵۵ جہاں نقض میثاق اور قتل انبیا کا ذکر ہے۔ یہ سب کچھ اس کے مطابق ہے جو یہاں سورۂ بقرہ میں بیان ہوا۔ اس قدر فرق ہے کہ یہاں تفصیل ہے سورۃ النساء میں انہی واقعات کا ذکر اختصار سے ہے اور پھر آیت ۱۵۷ میں حضرت مسیحؑ کے قتل کی کوشش اور اس میں ناکامی اور اختلاف کا ذکر ہے گویا جو کچھ یہاں سورہ بقرہ میں اشارۃً بیان فرمایا اس کو سورۃ النساء میں کھول کر بیان کر دیا۔ یہ کمال قرآن پاک کا ہے کہ یہ دو سورتیں کئی سال کے فرق پر نازل ہوتی ہیں لیکن ایک میں جو اختصار ہے اس کی دوسری میں تشریح کر دی ہے اور جس کو پہلے تفصیل سے بیان کر دیا تھا اس کا دوسرے موقعہ پر اختصاراً ذکر کر دیا۔ یہ مقابلہ بھی اس بات کا موید ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی کوشش کی طرف ہی اشارہ ہے۔

فقلنا اضربوہ ببعضہا سے کیا مراد ہے اضربوہ میں ضمیر نفس کی طرف جاتی ہے۔ کیونکہ بعض وقت نفس کی ضمیر بلحاظ معنی مذکر آجاتی ہے اور ببعضہا کی ضمیر فعل قتل کی طرف جاتی ہے۔ یعنی بعض قتل سے اس کو مار دو یا فعل قتل اس پر پورا وارد نہ ہونے دو۔ چنانچہ ضمیر کا قتل کی طرف جانا جو مصدر فعل سے مفہوم ہے بحر المحیط میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ حضرت مسیح اور واقعات صلیب: اور یہی سچ ہے کہ حضرت مسیح پر پورا فعل قتل وارد نہیں ہوا۔ صلیب پر آپ صرف تین گھنٹے رہے اور اتنی تھوڑی دیر میں کوئی شخص صلیب کی موت سے مر نہیں سکتا۔ آپ کے ساتھ جو چور صلیب دئے گئے تھے ان کی ہڈیاں توڑی گئیں آپ کی ہڈیاں نہیں توڑی گئیں یہی فاضربوہ ببعضہا ہے اور کذٰلک یحی اللہ الموتٰی کہہ کر بتا دیا کہ جس کو تم مُردہ خیال کر بیٹھے تھے اُسے خدا نے یوں زندہ رکھا یا زندہ کر دیا۔ اور یہ جو فرمایا ہے یریکم اٰیاتہ لعلکم تعقلون تو بتایا کہ مسیح جو تم کو مُردہ معلوم ہوتا تھا جس طرح اسے خدا نے زندہ کر دیا۔ کیونکہ اللہ کے نام کو بلند کرنا اس کی زندگی کا مقصد تھا اسی طرح اگر تم بھی اعلائے کلمۃ اللہ کا کام اختیار کرو تو گو تم ایک مُردہ قوم ہو اللہ تعالیٰ تمہیں زندگی عطا فرمائے گا۔

ع[99] قست۔ حجر قاس سخت پتھر کو کہتے ہیں اس لیے قسوۃ کے معنی دل کی سختی ہیں۔ اَوْ یہاں بمعنی بَلْ ہے۔

بنی اسرائیل کی قساوت قلبی: ان کی سخت دلی کو پہلے پتھروں سے مثال دی ہے لیکن با ایں اُمید دلائی ہے، مایوس نہیں ہونے دیتا۔ جب پتھروں میں سے بھی نہریں نکل آتی ہیں تو پتھر جیسے سخت دلوں میں سے علوم کی نہریں کیوں نہ نکلیں جو ایک عالم کو سیراب کر دیں اس سے نچلے درجہ پر وہ ہیں جن سے پھوٹ کر تھوڑا ہی پانی نکل آتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا نفع بہت وسیع نہیں اور بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کا نفع اگر دوسروں تک نہ پہنچے تو اپنی ذات میں ہی فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے جلال کے سامنے جھک جاتے ہیں۔

مسلمانوں کی حالت: بنی اسرائیل کی تاریخ تو سب اسلامی تاریخ کا نقشہ ہے۔ پس بنی اسرائیل سے بڑھ کر مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ باوجود قساوت قلبی کے بھی انہیں نا امید نہیں ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ فرمایا الم یان للذین اٰمنوا ان تخشع قلوبہم لذکر اللہ وما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیہم الامد فقست قلوبہم (الحدید ۵۷-۱۶) کیا ان لوگوں کے لیے جو مومن ہیں وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے اور جو حق اُترا اس کے لیے جھک جائیں اور وہ ان لوگوں کی مثل نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی پھر ان پر لمبا زمانہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہوگئے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ قساوت قلبی کے بعد علوم سے قوم ترقی کر سکتی ہے۔

ع[100] تطمعون۔ طمع نفس کا اشتیاق ہے کسی چیز کے لیے اس کو چاہتے ہوئے (غ) اور اس کا اکثر استعمال ذلیل خواہشات پر ہوتا ہے مگر اس کے معنی صرف رجا بھی ہیں یعنی کسی چیز کی امید رکھنا (ت)

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ

اور جب ان سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب ایک دوسرے کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں کہتے ہیں کیا تم ان سے وہ کہدیتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولا ہے تاکہ وہ اسکے ساتھ

کلام اللہ - کلام کلم سے ہے جس کے لیے دیکھو ع۵۷ اور کلام ان الفاظ کو کہتے ہیں جو ایک نظم میں ہوں مع اس معنی کے جو ان کے نیچے ہوں (غ) یعنی صرف لفظ بغیر معنی یا معنی بغیر لفظ پر کلام نہیں بولا جاتا پس کلام اللہ الفاظ مع معانی ہیں اور یہ عقیدہ کہ وہ صرف مفہوم ہے جو صاحب وحی کے قلب میں ڈالا جاتا ہے لفظ کلام کے معنی سے غلط ٹھہرتا ہے۔

یحرفون - تحریف حرف سے ہے جس کے معنی کنارہ یا حد ہیں اور تحریف کے معنی التغیر و التبدیل ہیں (ت) یعنی تغیر و تبدل کرنا - تغیر و تبدل لفظی بھی ہوسکتا ہے اور معنوی بھی - مگر اوّل مراد لفظی ہی لی جائے گی اور یہی جمہور کا مذہب ہے اور اسی کی تائید قرآن شریف کی اس آیت سے ہوتی ہے جو آگے آتی ہے یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ اپنے ہاتھوں سے کچھ لکھ کر کہہ دیتے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے ہے - ظاہر ہے کہ یہ تحریف لفظی ہے - پس یہاں تحریف لفظی ہی مراد ہے - بائبل میں تحریف لفظی: قرآن کریم کے اعجازوں میں سے ایک یہ اعجاز ہے کہ بائبل میں تحریف ہونے کا دعویٰ اس وقت کیا جب دنیا اس سے بے خبر تھی - اور آج تیرہ سو سال بعد خود عیسائی محققین کو یہ اعتراف ہے کہ بائبل میں تحریف ہوئی ہے - ایک اُمّی کو یہ علم تیرہ سو سال پیشتر کس نے دیا جب تحریف کا نام کوئی نہ جانتا تھا؟

اس بات کا جواب کہ تحریف شدہ کتاب کا نام توریت و انجیل کیوں رکھا: عیسائیوں کو قرآن کریم کے اس بیان پر کچھ اعتراض ہیں - اگر یہ کتابیں تحریف شدہ تھیں اصلی نہ تھیں، تو ان کا نام وہی کیوں رکھا - توریت اور انجیل ان کو کیوں کہا؟ یہ نہایت ہی لغو اعتراض ہے تحریف ہو جانے سے کتاب کا نام بدلنے کی ضرورت نہیں ہوتی دوسرا اعتراض ہے کہ ان پر عمل کے لیے کیوں بلاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ سے اقل مطالبہ ہے کہ جو کچھ یہ تمھارے ہاتھ میں ہے جس کو تم خدا کا کلام سمجھتے ہو اسی پر عمل کرو ورنہ تمھارے سارے دعوے نرے لاف و گزاف ہیں جیسا کہ فرمایا قل یا ھل الکتاب لستم علیٰ شئ حتّٰی تقیموا التوراۃ والانجیل (المائدہ ۵-۶۸) قرآن کریم کن معنوں میں مصدق ہے: تیسرا اعتراض ہے کہ قرآن کریم ان کا مصدق ہے تصدیق کے معنی اوپر بیان ہو چکے ہیں کہ ان کی پیشگوئیوں کو پورا کر کے ان کی سچائی کی شہادت دیتا ہے - یا زیادہ سے زیادہ اصول کا مصدق ہے - اگر ان کے سارے رطب یابس کا مصدق ہوتا تو خود ان کے غلط خیالات کی تردید کیوں کرتا؟ پھر اعتراض ہے کہ ان کو ہدایت و نور کیوں کہا؟ اس لیے کہ باوجود تحریف کے ان میں ہدایت و نور ہے - خود پیشگوئیاں ہدایت و نور ہیں - اب جبکہ بائبل میں تحریف ایک مسلم امر ہے - یہ اعتراض حضرت عیسٰیؑ پر آتا ہے کہ انہوں نے کیوں اس تحریف کو نہ سمجھا - وہ بات جو حضرت عیسٰیؑ کو خدا نے نہیں بتائی وہ رسول اللہ صلعم کو بتا دی ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء - ایک مفسر بائبل کا اقرار تحریف لفظی: اب ہم خود ایک مفسر بائبل کا اقرار دکھاتے ہیں کہ بائبل میں تحریف لفظی ہوئی ہے یہ مفسر پادری ڈملو صاحب ہیں جنہوں نے ایک جلد میں بائبل کی مکمل تفسیر انگریزی میں لکھی ہے وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ موسٰیؑ کی کتابیں حضرت موسٰیؑ کی اپنی لکھی ہوئی نہیں بلکہ اصل تحریروں میں کمی بیشی کر کے یہ بنائی گئیں' لکھتے ہیں:-

کتب خمسہ میں تحریف لفظی کی مثالیں: "مگر غور سے تحقیق کرنے پر ماننا پڑتا ہے کہ کتب خمسہ میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اس پرانے خیال سے کہ موجودہ صورت میں یہ موسٰی کی کتابیں ہیں مطابقت نہیں کھاتیں - مثلاً یہ اطمینان سے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ استثناء باب ۳۴ میں موسٰی نے اپنی موت کا حال خود نہیں لکھا - استثناء باب ۱ - ۱ میں یہ بیان کہ یہ وہ باتیں ہیں جو موسٰی نے یردن کے اس پار بیابان کے میدان میں ...... اسرائیل کو کہیں کسی ایسے شخص کے نقطۂ خیال سے لکھا گیا ہے جو کنعان میں رہتا تھا مگر موسٰی کنعان میں کبھی نہیں گئے۔"

اس قسم کی بہت سی مثالیں دیکر پادری صاحب کئی وجوہات اس بیان کی تائید میں دیتے ہیں کہ "موسٰیؑ کی پانچ کتابیں اصل میں ایک شخص کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ پہلی تحریروں کی بنا پر تالیف کی گئی ہیں۔"

اناجیل اور مسیح کی زبان کا اختلاف: نئے عہدنامہ یا اناجیل کی حالت اس سے بھی بدتر ہے - وہی مفسر لکھتا ہے:

"اناجیل کے لکھنے والے یسوع مسیح کے اقوال کو یونانی میں لکھتے ہیں حالانکہ وہ اغلباً اکثر ارمی زبان میں گفتگو کرتا تھا - نہ ہی یہ اغلب ہے کہ ان کاتبوں کا کبھی یہ خیال تھا کہ ان کی تحریریں ابتدائی کلیساؤں سے آگے جائیں گی جن سے وہ خود آشنا تھے - یہی حال پولوس کی تحریروں کا ہے - اس کے خطوط جن کی اب اس قدر عزّت کی جاتی ہے وہ اصل میں صرف انہی کلیساؤں کے لیے لکھے گئے تھے جن کے نام وہ تھے - جنہوں نے ان کو پہلے نقل کیا وہ ہرگز ان کو ان معنوں میں پاک نوشتے نہ سمجھتے تھے جن معنوں میں ہم سمجھتے ہیں۔"

اناجیل میں تحریف لفظی کا اقرار: پھر اس سے بھی واضح الفاظ میں وہی مفسر لکھتا ہے:-

"پچھلی صدیوں میں ہم مقدس الفاظ کی حفاظت میں وہ احتیاط کا خیال نہیں پاتے جو عہدنامہ قدیم کے پہنچانے میں پایا جاتا ہے - ایک نسخہ کا نقل کرنے والا بعض وقت وہ الفاظ درج نہ کرتا تھا جو اصل عبارت میں موجود ہوتے تھے بلکہ وہ درج کر دیتا جو اس کے خیال میں درج ہونے چاہیئے تھے - وہ ایک ناقابل اعتبار حافظہ پر بھروسہ کرتا یا بعض وقت اصل عبارت کو بدل کر اس فرقہ کے خیالات کے مطابق کر دیتا جس میں وہ خود ہوتا - ابتدائی عیسائی بزرگوں کی عبارات اور حوالجات کے علاوہ قریباً چار ہزار نئے عہدنامہ کے یونانی نسخے موجود ہیں نتیجہ یہ ہے کہ اختلاف عبارات بہت زیادہ ہے۔"

لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾
تمہارے رب کے حضور تم سے جھگڑ سکیں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ۱۰۱

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾
بھلا کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں -

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِىَّ
اور کچھ اُن میں سے اَن پڑھ ہیں جو کتاب تو جانتے نہیں مگر جھوٹے خیالات

وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾
کے پیچھے چلتے ہیں اور صرف اٹکل پچو خیال دوڑاتے ہیں ۱۰۲

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۤ ثُمَّ
سو اُن کے لیے حسرت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے

يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا
ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے عوض تھوڑی قیمت لے لیں

اناجیل میں تحریف کی مثالیں: بہت سی مثالیں موجودہ اناجیل سے دی جاسکتی ہیں جہاں صاف طور پر تحریف تسلیم کی گئی ہے اور نئے ترجموں میں اس کا اعتراف کیا گیا ہے مگر یہ مقام تفصیل نہیں۔ متی باب ۱۷، کی اکیسویں آیت "مگر اس طرح کے دیو بغیر دعا و روزہ کے نہیں نکالے جاتے" ترمیم شدہ ترجموں سے نکال دی گئی ہے۔ اسی انجیل کے انیسویں باب میں جہاں کوئی شخص مسیح کو نیک استاد کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور مسیح جواب میں کہتا ہے "تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے"۔ ترمیم شدہ ترجموں میں یہ لفظ ہیں "تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے" (متی ۱۹: ۱۷) اس پر پادری ڈملو مفسر مذکور مرقس ۱۰: ۱۷ کی تفسیر میں لکھتا ہے "متی کے مصنف نے یا کسی پہلے کاتب نے عبارت میں تھوڑی سی تحریف کر دی تاکہ قاری یہ خیال نہ کرے کہ مسیح اپنے نیک ہونے سے انکار کر رہا ہے"۔ مرقس کے آخری باب کی آیت ۹-۲۰ تک کے متعلق اسی مفسر کو یہ اعتراف ہے کہ یہ بعد میں بڑھائی گئیں۔ مرقس کا نسخہ ایک زمانہ کے بعد جب تلاش کیا گیا، تو نامکمل ملا۔ اس لیے ضرورت پورا کرنے کے لیے اس قدر آیات بعد میں بڑھا دی گئیں۔ غرض تحریف بائبل اب ایک اظہر من الشمس صداقت ہے اور اس کے ساتھ ہی قرآن کریم کا یہ اعجاز بھی کہ تیرہ سو سال پیشتر اس وقت تحریف بائبل کی خبر دی جب دنیا میں کسی کو خبر تک نہ تھی کہ بائبل میں تحریف ہوئی ہے نہ کسی یہودی کو یہ علم تھا نہ عیسائی کو، مگر آج سب مانتے ہیں۔ یہ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے کا نہایت بدیہی ثبوت ہے۔

ع ۱۰۱ فتح۔ فَتْح کے معنی زنجیر اور بیڑی کا دور کرنا ہے۔ جیسے دروازہ کا کھولنا۔ پھر برکات یا علوم کے کھولنے پر بھی بولا جاتا ہے اور فَتَحَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں ایک چیز کا اسے علم دیا (غ)

یحاجوکم۔ حج زیارت کے قصد کو کہتے ہیں (اور عرف شریعت میں بیت اللہ کی زیارت کے قصد کے لیے مخصوص ہے) اور حُجَّة دلیل کو کہتے ہیں جو مقصد مستقیم کو واضح کر دیتی ہے اور مُحَاجَّة یہ ہے کہ دو شخصوں میں سے ہر ایک دوسرے کی دلیل کو رد کرنا چاہے (غ)

منافق یہودی اور آنحضرت صلعم کے ظہور کی پیشگوئیوں کی عام شہرت: منافق طبع یہودی جب مسلمانوں سے ملتے تو کہہ دیتے کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے ہیں اور ہماری کتابوں میں ان کی پیشگوئیاں ہیں لیکن جب اپنے علما کے پاس آتے (یہاں اُن کو بعضہم کہا ہے شروع سورت میں شیاطینھم کہا ہے) تو وہ علماء ان کو کہتے کہ تم مسلمانوں سے پیشگوئیوں کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ اس سے اُن کے ہاتھ میں ایک دلیل آجاتی ہے جس کی بنا پر وہ یہودیوں کو ملزم کر سکتے ہیں۔ اس کا جواب اگلی آیت میں دیا ہے کہ خدا تو سب کچھ جانتا ہے تمہارے چھپانے سے کیا بنے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیشگوئیاں اس وقت یہودیوں میں عام طور پر مشہور تھیں۔

ع ۱۰۲ اُمیون۔ اُمّی کی جمع ہے اُمّی اس کو بھی کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ یعنی اُم کی طرف منسوب شخص گویا جیسا کہ ماں کے پیٹ سے نکلا تھا ایسا ہی ہے اور اکتساب سے علم حاصل نہیں کیا (ر) یا اس لیے کہ عورتیں ابتدا میں لکھنے پڑھنے سے محروم رہتی تھیں اور عرب کے لوگوں کو بھی اُمّی کہتے ہیں یعنی منسوب بہ اُم القریٰ (غ) کیونکہ اُم القریٰ مکہ کا نام ہے۔ یہاں اَن پڑھ یہودی بھی مراد ہو سکتے ہیں اور جو اہل عرب یہودی ہو گئے تھے وہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

امانی۔ اُمْنِيَّة کی جمع ہے اور یہ منی سے ہے جس کے معنی تقدیر یا اندازہ کرنا ہیں اور منی جس سے حیوانات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی مادہ سے ہے گویا حیوانات کا اندازہ اس سے ہوتا ہے (غ) اور اسی سے تمنّی ہے جس کے معنی خواہش کرنا ہیں۔ کیونکہ یہ بھی دراصل کسی چیز کا دل میں اندازہ کرنا ہے اور تمنّی کا لفظ اکثر ان چیزوں پر بولا جاتا ہے جن کی حقیقت کوئی نہ ہو (غ) اور اُمْنِيَّة وہ صورت حاصلہ ہے جو نفس میں کسی چیز کی تمنّی سے پیدا ہوتی ہے اور چونکہ جھوٹ بھی ایک ایسا تصوّر ہے جس کی حقیقت کوئی نہیں اس لیے تمنّی جھوٹ کے لیے مثل مبداء کے ہو گیا ہے یعنی تمنّی سے جھوٹ پیدا ہوتا ہے (غ) مجاہد نے یہاں تمنّی کے معنی اسی بنا پر جھوٹ مراد لیے ہیں۔ بعض نے بغیر معنی جاننے کے لفظوں کو پڑھ لینا بھی مراد لیا ہے۔

یہود کے ذکر میں اشارہ کہ سب مسلمان علم حاصل کریں: آج مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہے کہ بغیر معنی جاننے کے قرآن کریم کو پڑھ لینا کافی سمجھتے ہیں۔ یہودیوں پر ایک وقت وہ آگیا کہ عوام الناس علم دین سے بالکل بے خبر ہو گئے اور جو کچھ ان کے علماء یا سجادہ نشین کہتے اُسے مانتے چلے جاتے۔ معلوم ہوا کہ قرآن کریم اس کو پسند نہیں کرتا کہ علم دین صرف خاص لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ بلکہ چاہتا ہے کہ ہر ایک شخص بجائے خود علم حاصل کرے تاکہ اندھا ہو کر دوسروں کے پیچھے نہ لگے بلکہ خود بھی کچھ بصیرت سے کام لے سکے رسول اللہ صلعم کا ایک کام یعلمھم الکتاب والحکمۃ بھی ہے اور آپ نے تمام ہی صحابہ کو کتاب و حکمت سکھائی کسی خاص گروہ کو نہیں۔ اسی لیے ایک اُمی قوم دنیا میں علوم کی مشعل بردار ہو گئی۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت ان آیات کی روشنی میں قابل عبرت ہے وہ نہ صرف علوم سے بے بہرہ اور توہمات میں مبتلا ہیں بلکہ

قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ
وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

پس ان کے لیے حسرت ہے اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے
لکھا اور اُن کے لیے حسرت ہے اس کی وجہ سے جو وہ کماتے ہیں ع۱۰۳

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ
اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ
عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾

اور کہتے ہیں کہ سوائے گنتی کے دنوں کے ہمیں آگ نہیں چھوئیگی ۔ کہہ
کیا تم نے اللہ سے کوئی اقرار لیا ہے تو اللہ اپنے اقرار کے خلاف نہیں
کرتا ، بلکہ اللہ پر وہ بات بناتے ہو جو تم نہیں جانتے ع۱۰۴

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـــــَٔــتُهٗ
فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

ہاں جو بدی کماتا ہے اور اس کی بُرائیاں اُسے گھیر لیتی ہیں ، وہی
آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے ۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ
الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

اور جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں وہی جنت والے
ہیں ، وہ اسی میں رہیں گے ع۱۰۵

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ
اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَ
الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ سوائے اللہ کے تم
کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اور رشتہ داروں
اور یتیموں اور مسکینوں (کے ساتھ) اور لوگوں کو اچھی بات کہو اور نماز

ان کے دنیوی اور دینی لیڈر بھی ان کا علوم سے مستفیض ہونا پسند نہیں کرتے ۔ اس لیے کہ اس سے اُن کی جھوٹی سرداری میں فرق آتا ہے ۔

ع۱۰۳ پچھلی آیت میں عوام الناس کا ذکر تھا ، اس میں علمأ کا ذکر ہے جب عوام میں علم کتاب کا نہ رہا تو تحریف کا موقع خوب مل گیا ۔ یہ آیت بائبل کی تحریف لفظی پر قطعی شہادت ہے ۔ آخری الفاظ میں علماء کی بدعملوں کی طرف اشارہ ہے ۔

ع۱۰۴ یہودیوں اور عیسائیوں کا دعویٰ کہ عذاب چند روز ہوگا : یہود کہتے تھے ہم کو صرف چالیس دن عذاب ہوگا اور بعض کہتے تھے سات دن ۔ سیل کہتا ہے یہودیوں میں مسلّم ہے کہ کوئی یہودی خواہ کیسا ہی بدکار ہو گیارہ ماہ یا ایک سال سے زیادہ دوزخ میں نہ رہے گا عیسائیوں نے اس پر یہ ترقی کی ہے کہ مسیح کا تین دن دوزخ میں رہنا تمام بدکاریوں کے لیے کفارہ ہو گیا ۔ خدا کا کوئی حکم ایسا نہیں بلکہ انجیل میں بھی اعمال کو نجات کے لیے ضروری قرار دیا ہے متی ۷ : ۲۲ ۔ ۲۳ میں معجزات دکھانے والوں کو مسیح کہتا ہے "اے بدکارو میرے پاس سے چلے جاؤ" پس نجات بدکار کے لیے نہیں ۔

ع۱۰۵ سیئۃ ۔ سوء سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جو انسان کے لیے غم لاتی ہے خواہ امور دنیوی سے ہو یا امور اُخروی سے اور خواہ وہ حالت نفس کے متعلق ہو یا بدن کے یا خارجی امر ہو جیسے مال وجاہ کا جاتے رہنا (غ) اور سیئۃ اس فعل قبیح کو کہا جاتا ہے جو حسنۃ یعنی بھلائی کی ضد ہے پھر ہر سیئۃ اور حسنۃ دو قسم کی ہے اوّل جو حسب اقتضائے عقل و شریعت ہو اور وہی یہاں مراد ہے اور دوسری وہ جو باعتبار موافقت طبیعت ہو یعنی جو چیز طبیعت کو اچھی معلوم ہو اور طبیعت اس کو ہلکا سمجھے اس پر حسنۃ کا لفظ بول دیا جاتا ہے اور جو طبیعت پر گراں ہو اس کو سیئۃ کہہ دیا جاتا ہے (غ) اس معنی میں بہت جگہ قرآن شریف میں یہ دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں ۔

خطیئۃ ۔ خطاء سے ہے جس کے اصل معنی العدول عن الجہۃ یعنی ٹھیک سمت سے ایک طرف ہو جانا ۔ اور یہ کئی قسم کی ہے اوّل یہ کہ ارادہ کرے اسکے غیر کا جس کا ارادہ مستحسن ہے پھر اس کو کرے یہ خطاء تام ہے ۔ اور اس پر انسان ماخوذ ہوتا ہے اور یہی یہاں مراد ہے دوسرے یہ کہ ارادہ ایسی چیز کا کرے جس کا ارادہ مستحسن ہے لیکن جو کچھ ارادہ کیا ہے اس کے خلاف اس سے واقع ہو جائے یہ وہ خطاء ہے جس کے متعلق آتا ہے دفع عن امتی الخطاء والنسیان یا من اجتہد فاخطاء فلہ اجر یعنی جو شخص اجتہاد کرے اور اس کا اجتہاد غلط ہو جائے اُسے ایک اجر ملتا ہے (غ) یہی خطاء ان نسینا او اخطانا میں مراد ہے اور سیئۃ اور خطیئۃ میں امام راغب نے یہ فرق کیا ہے کہ خطیئۃ کا لفظ اکثر اس امر پر بولا جاتا ہے جو فی نفسہٖ مقصود الیہ نہیں ہوتا ۔

بدی کا مقابلہ : بدی کے لیئے کسب کا لفظ اختیار کر کے بتا دیا کہ انسان جب ہمہ تن ہی بدی کے پیچھے لگ جاتا ہے تو چاروں طرف سے بدیاں اس کو گھیر لیتی ہیں پھر اس کے لیے نکلنے کا رستہ نہیں رہتا ۔

نیکی کی قوت بدی سے زبردست ہے : جو شخص بدی کے مقابلہ کی کوشش کرتا ہے وہ بدیوں میں گھرتا نہیں بلکہ آخر کار غالب آتا ہے ۔ بدی کی کشش گو بہت سخت معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں وہ ایک کمزور چیز ہے اور نیکی کی قوت زبردست ہے کیونکہ فطرت نیکی کی معاون ہے اس لیے نیکی اور بدی میں جب مقابلہ ہوگا نیکی غالب آئے گی ۔

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا	قائم کرو اور زکوٰۃ دو، پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور
قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾	تم منہ موڑنے والے ہو[۱۰۶]۔
وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ	اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا کہ تم اپنے (لوگوں کے) خون نہ
وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ	گراؤ گے اور نہ اپنے لوگوں کو اپنے گھروں سے نکالو گے، پھر تم
وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾	نے اقرار کیا اور تم گواہ ہو[۱۰۷]۔
ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ	پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنے لوگوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے
فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ	ایک گروہ کو اُن کے گھروں سے نکالتے ہو، ان کے خلاف گناہ اور
بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى	زیادتی سے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو اور اگر قید ہو کر تمہارے
تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ	پاس آئیں فدیہ دیکر انھیں چھڑاتے ہو حالانکہ اُن کا نکالنا ہی تم پر
اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ	حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصّے کو مانتے ہو اور ایک حصّے
فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ	کا انکار کرتے ہو، تو اس کی سزا جو تم میں سے ایسا کرتا ہے سوائے
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى	اس کے کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن زیادہ

ع[۱۰۶] احسان: حُسن وہ شے ہے جو خوش کرتی ہے یا جس میں رغبت کی جاتی ہے۔ بروئے عقل یا بروئے خواہشات یا بروئے حس اور اس کا اکثر استعمال قرآن شریف میں اس پر ہے جو عقل کی رو سے اچھا لگے (رغ) یہاں حسن سے مراد کلمہ حسنہ ہے یعنی اچھی بات اور احسان ایک اپنے فعل میں ہوتا ہے جیسا اچھا علم یا اچھا عمل۔ جیسے حدیث میں آیا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ یا کم از کم یہ کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے اور اکثر استعمال اس کا دوسرے پر انعام پر ہے۔ گویا انسان کا حسن متعدّی ہو جاتا ہے۔

ذی القربیٰ۔ قرب کئی لحاظ سے ہوتا ہے۔ نسبت کے لحاظ سے جیسے یہاں، پھر نسبت بھی یا باپ کے لحاظ سے ہو گی یا ماں کے۔ پھر قرب مکان و زمانہ کے لحاظ سے ہوتا ہے یا مرتبہ کے لحاظ سے جیسے من المقربین ہیں۔ رعایت یعنی نگہداشت کے لحاظ سے جیسے ان رحمت اللہ قریب من المحسنین میں۔ قدرت کے لحاظ سے جیسے نحن اقرب الیہ من حبل الورید (رغ) مگر یہ علم کے لحاظ سے بھی ہو سکتا ہے۔

الیتامیٰ۔ یتیم کی جمع ہے۔ اور یُتم کے معنی انقطاع یعنی کٹ جانا ہیں۔ اور یتیم انسانوں میں سے وہ ہے جو بلوغ سے پہلے باپ سے منقطع ہو گیا ہو۔ یعنی اس کا باپ مر گیا ہو (رغ) اور ہر ایک منفرد کو یتیم کہتے ہیں جیسے دُرّۃ یتیمۃ۔

تولیتم۔ تولّی کا اصل ولی سے ہے جس کے معنی قرب ہیں اور جب اس کا صلہ عن ہو خواہ لفظاً یا تقدیراً جیسے یہاں تو اس کے معنی اعراض اور ترک قرب کے ہوتے ہیں (رغ)

معرضون۔ اعراض۔ عرض سے ہے جو طول کے خلاف ہے اور غیر اجسام میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے فذو دعاء عریض (حٰمٓ ۔۵۱) اور اعرض عنه کے معنی ہیں اس سے پھر گیا۔ تولّی اور اعراض میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ تولی یہ ہے کہ جدھر سے آیا تھا اُدھر واپس چلا گیا یعنی محض پیٹھ پھیر دی اور اعراض یہ کہ اس رستہ کو چھوڑ کر اس کی چوڑائی میں چلا گیا۔ گویا نہ صرف حق پر پیٹھ پھیر دی بلکہ باطل کو اختیار کر لیا۔

توریت کے احکام: پہلے جب اخذ میثاق کا ذکر کیا تو تفصیل نہ فرمائی تھی اب اسی میثاق کی تھوڑی سی تفصیل کر دی ہے کہ کیا کیا حکم تھے۔ یہ احکام گویا اصل الاصول کے رنگ میں ہیں۔ ایک خدا کی عبادت، دوسرے مخلوق خدا سے نیکی۔ توریت میں خدا تعالیٰ کی توحید پر بڑا زور تھا اس تاکید کو ظاہر کرنے کے لیے اخباری صورت اختیار کی ہے۔ دوسرے حصّہ میں سب سے پہلے والدین پھر رشتہ دار پھر یتیم پھر مسکین پھر عام لوگ۔ پھر اس کی دو نمایاں صورتیں بیان کیں۔ نماز اور زکوٰۃ توریت میں یہ سب احکام موجود ہیں۔ ایک خدا کی عبادت کے لیے دیکھو خروج ۲۰-۳۔ ماں باپ کی عزّت خروج ۲۰-۱۲۔ قریبی استثناء ۱۵: ۱۱۔ یتامیٰ استثنا ۱۲۔ ۲۹: مسکین استثناء ۱۵: ۱۱ عام لوگ خروج ۲۳ باب کا شروع نماز استثناء ۱۳: ۴ زکوٰۃ خروج ۲۲: ۱۰ و ۱۱۔ احبار ۲۵: ۱۰

ع[۱۰۷] اپنی قوم کے خلاف جنگ نہ کرنے کا حکم: یہاں خطاب براہ راست کیا ہے اس لیے کہ یہ بات یہود عرب سے خاص تعلق رکھتی تھی۔ اور ان کی ایک نمایاں عہد شکنی کا ذکر اس میں ہے اور اس لیے بھی کہ اس کی طرف خصوصیت سے مسلمانوں کو متوجہ کرنا مقصود ہے۔ اپنے خون نہ گرانے سے مراد ہے کہ اپنی قوم کے خلاف

اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾
سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں اور اللہ اس سے بیخبر نہیں جو تم کرتے ہو ع ۱۰۸

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ ز
یہی وہ ہیں جنھوں نے آخرت کے بدلے اس دنیا کی زندگی کو خرید لیا،

ع ۱۰ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع
پس نہ اُن سے عذاب ہلکا کیا جائیگا اور نہ وہ مدد دیئے جائیں گے ع ۱۰۹

جنگ نہ کرو گے یہ حکم خروج ۲۰: ۱۳ میں ہے۔ اپنے بھائیوں کو گھروں سے نکالنے سے مراد یا تو یہ ہے کہ ان کے گھروں پر قابض ہونے کا لالچ کرنا۔ دیکھو خروج ۲۰: ۱۷ اور یا مراد فساد ہے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ بعض لوگوں کو گھروں سے نکلنا پڑے۔

ع ۱۰۸ تظٰھرون۔ تظاھُر ایک دوسرے کی اعانت کرنا ہے اور ظَھر بمعنی پیٹھ سے مشتق ہے گویا ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی پیٹھ کی ٹیک اپنے ساتھی سے لگاتا ہے۔

اثم۔ اِثم اور اَثَام ان کاموں کو کہتے ہیں جو ثواب سے پیچھے رکھیں گویا اس کے اصل معنی ہیں تاخیر ہے (غ) اور حدیث میں اثم کی تعریف کی ہے ماحاك فی نفسك یعنی جو چیز تیرے اندر اثر کر جائے اور راسخ ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی ہے وکرھت ان یطلع الناس علیہ اور تو ناپسند کرے کہ لوگ اس کی اطلاع پائیں۔

عدوان۔ عدو بمعنی تجاوز سے ہے۔ اور یہ تجاوز کبھی دل سے ہوتا ہے تو اس کو عداوت یا معادت کہا جاتا ہے اور کبھی چلنے میں ہوتا ہے تو اس کو عَدْو یعنی تیز رفتاری کہتے ہیں اور کبھی معاملہ میں میانہ روی مدنظر نہ رکھنے سے ہوتا ہے تو اس کو عُدوان کہا جاتا ہے۔ اور اثم اور عدوان میں فرق یہ ہے کہ اثم اپنی ذات میں ایک فعل ہے اور عدوان دوسرے پر ظلم ہے پس ان کا فعل حکم الٰہی کے مخالف ہونے کی وجہ سے اثم ہے اور اپنے بھائیوں پر ظلم کی وجہ سے عدوان ہے۔

اساری۔ اسیر کی جمع ہے یا اَسرٰی کی جمع ہے جو اسیر کی جمع ہے۔ اور اَسر کے معنی زنجیر سے باندھنا ہیں اور ہر شخص جو پکڑا جائے خواہ زنجیر سے باندھا جائے یا نہ اسیر ہے۔

تفادوا۔ فداء اور فِدَی کے معنی ہیں انسان کو کسی مصیبت سے اس کی طرف سے کچھ خرچ کر کے محفوظ کرنا (غ)

الدنیا۔ دنوّ سے ہے جس کے معنی قرب ہیں اور دنیا قریب کی زندگی یا قریب کی منفعت ہے بمقابلہ آخرت کے۔

القیامۃ۔ قیام۔ قام یقوم سے مصدر ہے اور پھر ھا کے اضافہ سے قیامۃ بن گیا ہے اور اس کے معنی ہیں انسان کا ایک ہی مرتبہ کھڑا ہو جانا اور اس کے اچانک واقع ہونے کے لیے ہائے تنبیہ داخل کی گئی ہے (غ) اور قیامت یوم بعث ہے جس میں مخلوق حی وقیوم کے سامنے کھڑی ہو جائے گی (ت)

تین قیامتیں۔ کبرٰی، وسطٰی، صغرٰی: مفردات میں لفظ ساعۃ کے نیچے ہے کہ وہ ساعات جو قیامت ہیں تین ہیں کبرٰی یا حساب کتاب کے لیے لوگوں کا بعث۔ وُسطٰی ایک نسل کا گزر جانا جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے عبداللہ بن انیس کو دیکھ کر فرمایا ان یَطُلْ عُمُرُ ھذا الغلام لم یَمُتْ حتی تقوم الساعۃ اگر اس لڑکے کی عمر لمبی ہو تو یہ نہیں مریگا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔ چنانچہ روایت ہے کہ وہ صحابہ میں سے آخری بزرگ ہیں جو فوت ہوئے اور صغرٰی جو ہر انسان کی موت کے ساتھ قائم ہوتی ہے۔

اوس اور خزرج کی جنگوں میں یہودیوں کی شرکت: مدینہ میں خزرج اور اَوس دو بڑی قومیں تھیں جن کی باہم جنگ رہتی تھی۔ اور یہودیوں کی دو بڑی قوموں میں سے ایک بنو نضیر خزرج کے حلیف بن گئے تھے اور دوسرے یعنی بنو قریظہ اَوس کے۔ یوں یہ اپنے اپنے حلیف سے مل کر اپنے ہی بھائی بندوں کو قتل کرتے اور گھروں سے نکلواتے۔ مگر جب ایک فریق غالب آ کر دوسرے کے قیدی لے لیتا تو پھر دونوں قومیں مل کر چندہ کر کے اُنہیں چھڑاتیں۔ اس پر انہیں ملزم کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اپنی قوم سے جنگ کرنے کا، آپس میں فساد ڈالنے، اپنے بھائی بندوں کو وطن سے بیوطن کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں بھی ذلیل ہو جاؤ گے اور آخرت میں بھی جنت کی امید نہ رکھو بلکہ دنیا سے بدتر عذاب وہاں ملیگا۔ یہودیوں کی نظیر دیکر مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرنے سے روکا ہے: یہود کا قصّہ بیان کر کے توجہ مسلمانوں کو دلائی تھی مگر وہ بھی انہیں کے نقش قدم پر چلے اور جو نقشہ یہاں کھینچا ہے وہ پیشگوئی کے رنگ میں مسلمانوں کا نقشہ ہے۔ ایک طرف تو ہمدردی کا اظہار اس قدر ہے کہ جنگوں میں دنیا کے ایک حصّہ میں مسلمان زخمی ہو جائیں تو دوسرے حصّہ دنیا میں چندہ ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف ایک ملک دوسرے اسلامی ملک کو تباہ کرنے کی فکر میں ہے کبھی دوسروں سے مل کر کبھی خود بخود، ایک طرف خود مسلمان عیسائیوں کے ساتھ مل کر خلافت اسلامی کو تباہ کرتے ہیں اور دوسری طرف اس کے قیام کے لیے اپیلیں اور مظاہرے کرتے ہیں۔

مسلم کی تعریف: یہود کا قصّہ بیان کر کے سمجھایا ہے کہ کچھ بھی حالات ہوں مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کر کے ان کا خون گرانا اور اُن کا ملک چھیننا جائز نہیں۔ حدیث میں ہے المسلم من سلّم المسلمون من لسانہ ویدہ۔ مسلم وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان دُکھ نہ اُٹھائیں۔ ہاتھ سے دکھ دینا یہ ہے کہ ان کو قتل کریں، ان کا مال لوٹیں اُن کے ملک چھینیں۔ زبان سے یہ کہ ان کی عزّت پر حملہ کریں، گالی دیں، کافر کہیں، باہم جنگ کر کے باہم فساد کر کے دنیا کی زندگی میں پوری رسوائی حاصل کر چکے ہیں لیکن اس رسوائی میں بھی زندہ رہنا نہیں چاہتے۔ فتاویٰ کفر سے قوم کی تباہی: اور جب حکومت گئی تو اب ویسے ایک دوسرے کو کافر بنا کر اپنی قوم کی تباہی کے درپے ہیں علما اور مشائخ کو یہ فکر نہیں کہ کافروں کو مسلمان بنائیں یا اسلام پر جو حملے ہو رہے ہیں ان کا جواب دیں بلکہ مسلمانوں کو کافر بنانا ان کا شیوہ ہے۔

ع ۱۰۹ اب کلام کا رُخ اس طرف پھیرا ہے کہ یہ لوگ جنہوں نے عہد شکنیاں کیں۔ اب جب ان کی ہدایت کا سامان پھر آیا تو انہوں نے دنیا کی خاطر پھر دین کو ترک کر دیا۔ اگر وہ ہدایت کو اختیار کر لیتے تو اُن کا عذاب دُور کر دیا جاتا۔ ان کی نصرت ہوتی مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾	اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد ہم نے پے بہ پے رسول بھیجے[110] اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلے دلائل دیے اور روح القدس کے ساتھ اس کی تائید کی[111]۔ پس کیا جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس وہ چیز لایا جسے تمہارا جی نہیں چاہتا تھا، تو تم نے تکبر کیا، پس ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرنے لگے[112]

ع ۱۱۰ قفّینا۔ قفا کے معنی پیٹھ ہیں اور قفیتہ کے معنی اس کو اس کے پیچھے رکھا۔

الرسل۔ رسول کی جمع ہے اور رسول اصل میں وہ ہے جو کسی قول اور رسالت کا متحمل ہو (غ) پس بغیر کسی رسالت کے رسول کا لفظ حقیقی معنی میں اطلاق نہیں پا سکتا۔

لفظ رسول کا اطلاق مجاز کے طور پر: اللہ کے رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پیغام اس کی مخلوق کے لیے لاتے ہیں مگر مجازاً اس کا اطلاق دوسروں پر جائز ہے جیسے یایھا الرسل کلوا من الطیبات (المومنون ۲۳-۵۱) میں رسول اللہ صلعم اور آپ کے برگزیدہ صحابہ شامل ہیں دیکھو مفردات راغب اور ایسا ہی لفظ مُرسَل مجازاً حضرت عیسیٰ کے حواریوں پر بولا گیا ہے واضرب لھم مثلاً اصحاب القریۃ اذ جاءھا المرسلون (یٰسٓ ۳۶-۱۳) پس مجازاً اس کا اطلاق اس اُمت کے مجددین پر جو مامور بھی ہوتے ہیں جائز ہے نہ حقیقتاً۔ ملائکہ پر جو اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان وسائط ہیں اور انبیاء پر جو خدا کی طرف سے مخلوق کے لیے کوئی خبر لاتے ہیں۔ یہ لفظ بالخصوص بولا گیا ہے اور ایک فرستادہ یا قاصد پر بھی بولا جاتا ہے جیسے جاعل الملٰئکۃ رسلا (الفاطر ۳۵-۱) فلما جاءہ الرسول (یوسف ۱۲-۵۰)

سلسلہ رسل بنی اسرائیل: سلسلۂ بنی اسرائیل میں انبیاء کے آنے کو اب بطور نعمت بیان کیا ہے اور اول سلسلہ حضرت موسیٰؑ اور آخر سلسلہ حضرت عیسٰیؑ کا نام لیکر باقی ناموں کو چھوڑ دیا۔ کتاب سے مراد یہاں شریعت کی کتاب ہے۔ جو حضرت موسیٰؑ کو دی گئی۔ یہ شریعت سب انبیاء کے لیے ایک ہی رہی۔ ہاں اپنے اپنے وقت اور ضرورت کے لحاظ سے اس میں انبیاء کچھ کمی بیشی کرتے رہے جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے ولاُحلّ لکم بعض الذی حرم علیکم (آل عمران ۳-۵۰)۔

رسول کے لیے ہدایت لانا ضروری ہے: چنانچہ خود قرآن شریف میں حضرت عیسٰیؑ کو انجیل اور حضرت داؤدؑ کو زبور دیا جانے کا ذکر ہے۔ اسی لیے آیت کے آخر پر فرمایا کہ جو کچھ کوئی رسول تمہارے پاس لاتا تھا تم اس کو قبول نہ کرتے تھے معلوم ہوا کہ ہر ایک رسول کچھ نہ کچھ ہدایت بھی لاتا تھا جسے لوگ قبول نہ کرتے تھے جس کو بینات یعنی معجزات یا پیشگوئیوں سے الگ کر کے بیان کیا ہے۔ اور معجزات یا پیشگوئیاں محض تائید کے لیے ہوتی ہیں۔

ع ۱۱۱ عیسیٰ۔ اس کا اصل عیس اور وزن فعلی ہے (ل) اور عرب کے لوگ اس اونٹ کو اعیس کہتے ہیں جس کی سفیدی پر کچھ تاریکی ہو اور عَیْس ماء الفحل کو کہتے ہیں اور ممکن ہے کہ اسی سے لفظ عیسیٰ کا اشتقاق ہو (غ) مگر بعض اہل لغت کے نزدیک یہ عجمی ہے حالانکہ سریانی میں یہ لفظ عیسیٰ نہیں بلکہ الیسوع ہے اور انجیل میں یسوع آیا ہے۔ جس کے معنی سید یا مبارک ہیں (ر)

مریم کے معنی عبرانی میں خادمہ یا عابدہ ہیں مگر قاموس میں ہے کہ مریم عربی لفظ ہے اور اس عورت کو کہتے ہیں التی تحب محادثۃ الرجال ولا تفجر۔

بینات۔ بینۃ کی جمع ہے جو بان (ظاہر ہوا) سے ہے اور اس کے معنی ہیں کھلی دلیل خواہ عقلی ہو یا محسوس (غ) اس میں معجزات پیشگوئیاں دلائل سب شامل ہیں۔

روح القدس مفردات میں ہے کہ روح نفس کے معنی میں بھی آتا ہے اور اشراف الملائکہ کو بھی کہا ہے جبرئیل کو بھی جیسے روح القدس اور روح الامین کے نام سے یاد کیا ہے خود قرآن یعنی کلام الٰہی کو بھی روح کہا گیا ہے۔ جیسے وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا (الشوریٰ ۴۲-۵۲) کیونکہ اسی سے زندگی ملتی ہے۔ یہاں روح القدس سے مراد بعض کے نزدیک جبرئیل ہیں اور بعض کے نزدیک انجیل (ج)

ابن مریم نام کی وجہ: حضرت عیسیٰؑ کے نام کے ساتھ قرآن کریم نے لفظ ابن مریم بڑھایا ہے۔ یہ عیسائیوں پر اتمام حجت کے لیے ہے کہ وہ جسے تم خدا اور بے گناہ بناتے ہو وہ ایک عورت کا بیٹا تھا۔ اور انہی کی کتابوں میں لکھا ہے "اور وہ جو عورت سے پیدا ہوا ہے کیونکر پاک ٹھہرے" (ایوب ۲۵: ۴) پھر عیسائیوں کے خیال کے مطابق گناہ مرد دنیا میں نہیں لایا، بلکہ عورت لائی۔ کیونکہ عورت نے ہی آدم کو ممنوع پھل کھلایا۔ پس یہ بتایا ہے کہ جب اس کی ماں موجود ہے تو تم اُسے دوسرے انسانوں سے بیگناہی کا امتیاز اس بنا پر کیونکر دے سکتے ہو۔ کیونکہ جب اصلی گنہگار حواؑ ہوئی اور اس کے ورثہ میں گناہ کا چلنا ضروری ہے جیسا کہ عیسائیوں کا اعتقاد ہے، تو مریم اس سے کیوں کر پاک ٹھہری۔ علاوہ ازیں حضرت عیسیٰؑ کی والدہ کو جو شہرت دنیا میں حاصل ہے اس کا عشر عشیر بھی ان کے خاوند کو حاصل نہیں۔ اس لیے بھی مریم کی طرف منسوب کرنا اولیٰ تھا۔ جیسے حضرت فاطمہ کی فضیلت کی وجہ سے بنی فاطمہ۔

روح القدس کا تعلق حضرت عیسیٰؑ سے: حضرت عیسیٰؑ سے روح القدس کا تعلق وہی ہے جو ہر نبی کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ مومنوں کو بھی روح القدس کی تائید ملتی ہے فرمایا ایدھم بروح منہ (المجادلۃ ۵۸-۲۲) جہاں صحابہ کا ذکر ہے یعنی اپنی روح سے ان کی تائید کی اور حدیث میں ہے اللّٰھم اید حسان بروح القدس لے اللہ تو حسان کی تائید روح القدس سے فرما۔ حضرت مسیح کی بینات اور تائید روح القدس کا خصوصیت سے ذکر اس لیے کیا کہ یہودی ان کا انکار کرتے اور ان کو ناپاک قرار دیتے تھے۔

ع ۱۱۲ یہودیوں کا شیوۂ تکذیب و قتل انبیاء: اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ نبی کریم صلعم سے تمہاری عداوت اس وجہ سے نہیں کہ تم کو دلائل نہیں ملتے بلکہ تم اپنے قسی القلب ہو گئے ہو

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور کہتے ہیں ہمارے دل پردوں میں ہیں بلکہ اللہ نے اُن کے کفر کی وجہ سے اُن پر لعنت کی پس وہ بہت ہی کم مانتے ہیں ع۱۱۳

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک کتاب آئی اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اُن کے پاس ہے اور پہلے وہ ان پر جو کافر تھے فتح مانگا کرتے تھے مگر جب اُن کے پاس وہ آیا جسے انھوں نے پہچانا اس کا انکار کردیا پس انکار کرنیوالوں پر اللہ کی لعنت ہے ع۱۱۴

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

کیا ہی بُرا ہے جس کے عوض انھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا کہ اس کا انکار کرتے ہیں جو اللہ نے اتارا، اس حسد سے کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اتارے پس وہ غضب پر غضب میں آگئے اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے ع۱۱۵

کہ ہمیشہ ہی خدا کے رسولوں کی تکذیب کرتے رہے، بلکہ ایک گروہ کے قتل کے بھی درپے ہوئے چنانچہ کذبتم کو ماضی رکھ کر اور تقتلون کو مضارع رکھ کر یہ بتایا ہے کہ تم اس وقت بھی ایک رسول کے قتل کے درپے ہو اور اپنی طرف سے تو تم نے اسے قتل کر ہی دیا تھا اگر اللہ تعالیٰ اس کا بچانے والا نہ ہوتا۔ چنانچہ روح المعانی میں ہے انکم الاٰن فیه فانکم حول قتل محمد صلی اللّٰه علیه وسلم ولولا انی اعصمه القتلتموه ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کے قتل کے درپے ہونے پر یا اس کے اسباب قتل کے جمع کردینے پر بھی قتل کا لفظ بول دیا جاتا ہے گو وہ شخص فی الواقع مقتول نہ ہو۔

ع۱۱۳ غُلف ۔ یا اَغلف کی جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جو غلاف میں ہو اور اس سے اُن کی مراد علوم توریت کے غلاف ہیں اور یا غلاف کی جمع ہے یعنی ہمارے دل خود علم کے غلاف یا علم کے دعاء ہیں (غ) یعنی علم ان کے اندر بھرا ہُوا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تم سے کچھ سیکھنے کے محتاج نہیں۔

لعن ۔ لعن کے اصل معنی ہیں ناراضگی کی وجہ سے نکال دینا اور دُور کردینا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں لعنت کے ہونے سے مراد سزا کا دینا ہے اور دنیا میں لعنت یہ ہے کہ ایک شخص اس کی رحمت اور اس کی توفیق سے کٹ جائے (غ) اور شماخ بن ضرار کے شعر میں آتا ہے مقام الذئب کالرجل اللعین جہاں الرجل اللعین سے مراد دور پھینکا گیا انسان ہے (ج)

قلیلا ما ۔ ما قلیل کے لیے بطور تاکید بڑھایا گیا ہے ۔ یعنی بہت ہی کم۔

دلوں کے پردے: یہودیوں کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے دل ایسے پردوں کے اندر ہیں کہ آپ کی بات ان میں داخل نہیں ہوسکتی ۔ جیسے دوسری جگہ ہے قلوبنا فی اکنة مماتدعونا الیه (حٰم السجدہ ۴۱ ۔ ۵) گویا یہ خلقی پردے ہیں اور یا یہ کہ ہمارے دلوں میں پہلے ہی علم بھرا ہوا ہے ہم تم سے کچھ نہیں سیکھ سکتے ۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اصل وجہ یہ ہے کہ تم رحمت اور توفیق الٰہی سے دور جا پڑے ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ تم بہت کم ہی مانتے رہے ہو۔

ع۱۱۴ یستفتحون ۔ استفتاح فتح سے ہے اور اس کے ایک معنی ہیں کہ آنحضرت صلعم کی بعثت کے ذریعہ سے خدا کی مدد مانگا کرتے تھے ۔ اور یوں بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ اس کی خبر چاہتے تھے کبھی لوگوں سے پوچھتے کبھی کتابوں سے استنباط کرتے تھے یا یہ کہ دوسری قوموں پر اس ذریعہ سے غلبہ مانگتے تھے (غ) اور یستفتحون بمعنی یفتحون بھی ہوسکتا ہے (ض) یعنی نبی آخر الزمان کے آنے کی خبریں بُت پرستوں کو سنایا کرتے تھے۔

بنی اسرائیل اور نبیّ موعود: چونکہ ان کے ساتھ وعدہ تھا کہ نبی موعود پر ایمان لائیں گے تو اللہ تعالیٰ دنیا میں انہیں ممتاز قوم بنائے گا ۔ استثناء ۲۸ : ۱۲ و ۱۸ : ۱۵ ۔ ۱۸ ۔ اس لیے جب دنیا میں بوجہ انبیاء کے انکار کے ذلیل ہوگئے تو پھر خدا سے یہ دعائیں مانگنے لگے کہ وہ موعود نبی آئے تو ہمیں کافروں پر غلبہ ملے ۔ لیکن جب وہ کتاب آگئی جو ان کی وحی کی تصدیق کرتی تھی اور یہی موعود نبی کی سب سے بڑی علامت تھی کہ وہ دنیا کے کل انبیاء کی تصدیق کرے گا تو اسے ردّ کردیا۔

موعود نبی کی شناخت: یہاں یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کی صداقت کو خوب پہچانتے ہیں اس لیے کہ نہایت بیّن اور موٹے نشان آپ کی صداقت کے اُن پر کھل چکے تھے مثیل موسٰی ہونے کا دعویٰ اب تک کسی نبی نے نہ کیا تھا ۔ صرف آنحضرتؐ نے کیا ۔ دوسرے انبیاء کی تصدیق کسی نبی نے نہ کی تھی ۔ صرف آپؐ نے کی ۔

اس موعود نبی کا انکار اللہ کی جناب سے دوری ہے صرف اس کی ہدایت پر عمل کرکے وہ خدا تک رسائی حاصل کرسکتے تھے جب اس کو ردّ کردیا تو خود ہی دوری یا لعنت کو خرید لیا۔

ع۱۱۵ بئس ۔ بؤس سے ہے جس کے معنی شدّت اور مکروہ ہیں اور بئس ہر ایک مذمت کے مقام پر بولا جاتا ہے جیسے نعم ہر ایک مدح کے مقام پر (غ) باْس اور باساء اسی مادہ سے ہیں ۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوا
نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ
وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ
أَنْبِيَاءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾
وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ
الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿٩٢﴾
وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ
خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا ۖ قَالُوا سَمِعْنَا
وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ
بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ
إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٩٣﴾

اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ اس پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتارا ہے،
کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر اتارا گیا اور اس کا انکار کرتے
ہیں جو اس کے سوا ہے حالانکہ وہ حق ہے اسکی تصدیق کرنیوالا جو انکے
پاس ہے کہہ تو پہلے تم اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے تھے اگر تم مومن تھے[116]
اور بیشک موسٰی تمہارے پاس کھلی دلیلیں لایا پھر اس کے پیچھے تم نے
بچھڑا (معبود) بنالیا اور تم ظالم تھے[117]
اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور تمہارے اوپر پہاڑ بلند کیا، جو ہم
نے تم کو دیا ہے اسے زور سے پکڑو اور سُن لو اُنھوں نے کہا ہم نے
سُن لیا اور نہیں مانتے[118] اور ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں
بچھڑا رچ گیا[119] کہہ وہ بُرا ہے جس کے لیے تمہارا ایمان تمھیں حکم
دیتا ہے اگر تم ایمان والے ہو۔

بغیا۔ بغی کے معنی ہیں میانہ روی سے تجاوز کرنے کی خواہش کرنا (غ) اور بغی مذموم بھی ہے اور محمود بھی مگر اکثر استعمال اس کا محل ذم میں ہے۔ یہاں بغی سے مراد حسد ہے (غ)

مھین۔ اَھان سے اسم فاعل ہے اور ھوان دو طرح پر ہے ایک انسان کا اپنے آپ میں تذلّل اختیار کرنا اس سے پستی اس کے لاحق حال نہیں ہوتی اور مدح کے مقام پر بولا جاتا ہے جیسے یمشون علی الارض ھونا (الفرقان ۲۵ - ۶۳) یا حدیث میں ہے المومن ھیّن لیّن مومن انکسار اختیار کرنے والا نرم ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ دوسرا انسان اس پر متسلط ہو کر اس کی خفت کرنا چاہتا ہے (غ) اور یہ ذلّت ہے گویا دوسرے کا محکوم ہونے کی حالت خود ایک ذلّت یا عذاب مہین ہے۔

یہودیوں کا حسد آنحضرتؐ سے: جس انکار کا ذکر پچھلی آیت میں ہے اس کی وجہ بتائی کہ وہ صرف حسد ہے کہ اللہ نے اپنے فضل کا حصّہ سوائے بنی اسرائیل کے کسی اور قوم پر کیوں اتارا۔ چنانچہ اگلی آیت میں اس کی اور بھی تشریح فرمائی ہے۔ جہاں ان کا قول نقل کیا ہے کہ ہم صرف اسی پر ایمان لائیں گے جو بنی اسرائیل پر اُترے۔ غضب پر غضب اس لیے فرمایا کہ ایک غضب کے نیچے تو وہ پہلے ہی آئے ہوئے تھے اب آنحضرت صلعم کے انکار سے اور غضب کے نیچے آگئے۔ عذاب مھین یا رسوا کرنے والا عذاب یہ ہے کہ دوسرے کے ماتحت رہیں۔

۱۱۶ اس کا جواب کہ غیر بنی اسرائیل سے نبی آنا کیوں ضروری تھا: ان کے اس قول کا کہ سوائے بنی اسرائیل کے کسی دوسری قوم کے آدمی پر اگر وحی نازل ہو تو اس کو ہم نہیں مانیں گے ایک جواب تو یہ دیا ہے کہ یہ وحی تمہاری وحی کی مصدق ہے اور یہی اس موعود نبی کا نشان تھا۔ دوسرا یہ کہ تمہارا یہ دعوٰی بھی غلط ہے کہ بنی اسرائیل میں سے یہ نبی ہوتا تو تم ایمان لے آتے پہلے تم اسرائیلی نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے۔ پہلے جواب میں یہ بھی بتایا کہ اگر بنی اسرائیل کے باہر سے یہ نبی نہ آتا تو تمہاری پیشگوئیاں غلط ٹھہرتیں کیونکہ پیشگوئیوں میں بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے آنے کا وعدہ ہے اور پھر عرب کا نام بھی موجود ہے۔ پھر موسٰی کی مثل نبی موسٰیؑ کے خلفاء میں سے تو ہو نہ سکتا تھا اس لیے اس کا دوسری قوم سے آنا ضروری ہُوا۔

۱۱۷ ان کے انکار کے سارے قصّہ کو پھر دوہرایا ہے اور ملزم کیا ہے کہ اور انبیاء تو ایک طرف رہے خود موسٰیؑ کے زمانہ میں تم نے شرک کا ارتکاب کیا جب بچھڑا بنا کر اس کی عبادت کرنے لگے۔

۱۱۸ اسمعوا۔ سمع کے اصل معنی سننا ہیں مگر علاوہ شنوائی کے قرآن شریف میں کبھی اس سے مراد فہم اور کبھی طاعت لی گئی ہے (غ) یہاں سُن لینے سے مراد سمجھ لینا یا فرمانبرداری ہی ہے کیونکہ یہی سننے کی اصل غرض ہوتی ہے۔

منہ سے دعوٰی ایمان اور عملی نافرمانی: باوجود سخت عہد کے تم نے اس کی ایسی نافرمانی کی کہ گویا تم نے منہ سے ہی کہہ دیا کہ ہم نافرمانی کرتے ہیں۔ فی الحقیقت سمعنا یعنی ہم نے سن لیا منہ سے کہا اور عصینا یعنی ہم نے نافرمانی کی دل سے کہا۔ یا زبان قال سے کہا سمعنا اور زبان حال سے کہا عصینا۔ آج یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ منہ سے قرآن پر ایمان کا دعوٰی ہے مگر عملی حالت میں نافرمانی۔

۱۱۹ اشربوا۔ شرب پانی یا دوسری سیال چیزوں کے پینے پر بولا جاتا ہے (غ) جب کسی چیز کا اندر سرایت کر جانا بتانا ہو تو اس کو پینے کی چیز سے مشابہت دیتے ہیں۔

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ
خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ
إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾

کہہ اگر آخرت کا گھر اللہ کے ہاں اور لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمھارے لیے ہے، تو موت کی آرزو کرو، اگر تم سچے ہو[۱۲۰]

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

اور کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے بسبب اس کے جو اُن کے ہاتھ پہلے بھیج چکے ہیں، اور اللہ ظالموں کو جانتا ہے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚۛ وَ
مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ
اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ
ع ۱۱ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ ۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

اور یقیناً تُو اُن کو سب لوگوں سے بڑھ کر لمبی زندگی پر حریص پائے گا اور اُن سے بھی جنھوں نے شرک کیا ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اُسے ہزار برس کی عمر دیجائے اور یہ بات اُسے عذاب سے بچا نہیں سکتی کہ اُسے لمبی عمر دیجائے اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں[۱۲۱]

کیونکہ پانی فوراً روم روم میں پہنچ جاتا ہے اور بچھڑا رچ جانے سے مراد بچھڑے کی محبّت کا رچ جانا ہے (غ) مراد یہ ہے کہ وہ شرک کی بیماری جو بچھڑے کی پرستش میں تم سے ظاہر ہوئی وہی تمھارے اندر چلی آتی ہے۔

توریت کی غلطی کی اصلاح: توریت میں یہ ذکر ہے کہ بچھڑے کو جلا کر خاکستر کو پانی میں ملا کر بنی اسرائیل کو پلا دیا تھا، خروج ۳۲ : ۲۰۔ مگر یہ ایک بے معنی سی بات ہے۔ قرآن کریم نے فی قلوبھم بڑھا کر بتا دیا کہ یہ بھی یہود کو کوئی ظاہر الفاظ سے غلطی لگی ہے اور تحریف ہوگئی ہے۔ اسی لیے دوسری جگہ فرماتا ہے کہ خاکستر کو دریا میں ڈال دیا۔ لنحرقنه ثم لننسفنه فی الیم نفسا (طٰہٰ ۲۰-۹۷)

ع[۱۲۰] یہودیوں سے مباہلہ: موت کی آرزو کرنے سے مراد جھوٹے کی موت کی دعا کرنا ہے۔ جیسا کہ سورۂ آل عمران میں عیسائیوں کو مباہلہ کیلیے بلایا یہاں یہودیوں کو ایک قسم کے مباہلہ کے لیے بلایا۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے ادعوا بالموت علیٰ ای الفریقین اکذب دعا کرو کہ جو فریق جھوٹ پر ہے اس کو موت آجائے۔ اگر تم مقبولان بارگاہ الٰہی ہو جیسا کہ تمہارا دعوٰی ہے تو خدا تعالیٰ تمہاری دعا قبول کرلے گا۔ اگلی آیت میں بتا دیا کہ اپنی بدعملیوں کی وجہ سے وہ ایسی دعاء کی کبھی جرأت نہ کریں گے۔ آرزوئے موت: بعض نے موت کی آرزو کرنے سے اپنی ہی موت کی آرزو مراد لی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مومن موت سے خائف نہیں ہوتا، مگر تم موت سے خائف ہو۔ مگر یہ معنی کچھ موزوں نہیں اور دوسرے معنی کی تائید خود قرآن شریف سے ہوتی ہے اور حضرت ابن عباس جیسا مفسر بھی وہی معنی کرتا ہے۔

ع[۱۲۱] احرص۔ حریص سے افعل ہے۔ اور حرص کے معنی ہیں بہت زیادہ ایک چیز کو چاہنا (غ)

اشرکوا۔ شِرکۃ یہ ہے کہ ایک چیز دو یا دو سے زیادہ کے لیے پائی جائے اور دین میں شرک دو قسم کا ہے اوّل شرک عظیم یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ دوم شرک صغیر یعنی کسی امر میں غیر اللہ کی رعایت ملحوظ رکھنا (غ) حدیث میں ہے الشرك فی هذه الامة اخفی من دبيب النمل علی الصفا یعنی اس امت میں شرک چیونٹی کے صاف جگہ پر چلنے سے بھی زیادہ خفی ہے۔

بصیر۔ بَصَر آنکھ کو کہتے ہیں اور دیکھنے کی قوت کو بھی اور دل میں جو قوت مدرکہ ہے اس کو بَصِیرۃ بھی کہتے ہیں اور بَصَر بھی (غ) اور اَلْبَصِیر اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے اور اس سے مراد ہے کہ وہ تمام اشیاء کو دیکھتا ہے ظاہر کو بھی اور مخفی کو بھی بغیر کسی آلہ کے اور بَصَر اس کے حق میں وہ صفت ہے جس سے تمام اشیاء کے کمال اوصاف کا انکشاف ہوتا ہے (ت)

مزحزح۔ زَحْزَحَ۔ زحّ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا۔

یُعَمَّر۔ عِمارۃ آباد کرنا ہے یعنی ویرانی کا نقیض۔ اس لیے عَمْر اور عُمُر وہ مدت ہے جس میں جسم زندگی کے ساتھ آباد رہتا ہے اور قسم میں عَمْر کا لفظ آتا جیسے لعمرك انهم لفی سكرتهم (الحجر ۱۵-۷۲) اور تعمیر جس سے یُعَمَّر مضارع ہے عمر کا عطا کرنا ہے (غ)

ہزار سال کی زندگی: یہاں یہ بیان کیا ہے کہ ان یہودیوں کو تم دنیا کی زندگی کے لیے سب لوگوں سے زیادہ حریص پاؤ گے۔ یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی بڑھ کر حریص پاؤ گے اور مشرکوں سے مراد بعض لوگوں نے محض مشرک لیے ہیں اس لیے کہ وہ بعث بعد موت کے قائل نہیں اس لیے اس دنیا کی زندگی کو ہی وہ سب کچھ سمجھتے ہیں اور بعض نے مجوس کو مراد لیا ہے جو جیسا کہ ابن جریر میں ہے چھینک پر "ہزار سال بزی" کی دعا دیتے تھے یعنی ہزار سال زندہ رہو۔ اور ابن عباس سے روایت ہے کہ اس سے مراد عجمی لوگ ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ومن الذین اشرکوا سے نیا بیان شروع ہوتا ہے اور ان مشرکوں سے مراد اہل کتاب کے مشرک یعنی عیسائی لوگ ہیں بمقابلہ یہود کے گویا فرمایا کہ یہودی تو دنیا میں مبتلا ہو کر اس دنیا کی زندگی پر حریص ہیں ہی مگر ان کے مشرک بھائی یعنی عیسائی تو ایک ہزار سال کی زندگی چاہتے ہیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ
عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٩٧﴾
مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَ

کہہ جو کوئی جبریل کا دشمن (ہو)۱۲۲ اس نے تو اللہ کے حکم سے اس
کو تیرے دل پر اتارا، اس کی تصدیق کرتا ہُوا جو اس سے پہلے ہے
اور مومنوں کے لیے ہدایت اور خوش خبری (ہے)۱۲۳
جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرائیل

عیسائیت کی مخالفتِ اسلام: اس صورت میں ہزار سال کی زندگی سے مراد ایک قوم کی مخالفتِ اسلام کی ہزار سال کی زندگی ہوگی، جیسا کہ دوسری جگہ ہے ان بسنتم الالیوما ظنہ ۲۰۔۱۰۴) اور یوم بھی خدا کے ہاں ہزار سال کا ہے تو مراد ہوگی کہ عیسائی اگر ایک ہزار سال بھی اسلام کی مخالفت کرلیں اور غالب ہیں تو بھی سزا سے نہ بچ سکیں گے۔

۱۲۲ جبریل۔ بخاری میں عکرمہ کا قول ہے کہ جبریل، میکال، اسرافیل سب بمعنی عبداللہ ہیں جبر یا میك یا سراف کے معنی عبد اور ایل بمعنی اللہ۔ مگر جبریل جبر اور ایل سے مرکب ہوسکتا ہے۔ جُبر کے معنی کسی قسم کے غلبہ سے کسی چیز کی اصلاح کرنا ہے اور اس لیے جبر سلطان یعنی بادشاہ کو بھی کہتے ہیں (غ) اور ائل آؤل سے ہے یعنی رجوع کرنے والا پس جبرئیل وہ ہے جو اصلاح کرنے والے بادشاہ کی طرف بار بار رجوع کرتا ہے۔

جبرائیل اور یہودی: کئی ایک صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے وقت میں یہودی جبریل کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ چنانچہ بخاری میں آنحضرت صلعم کے سامنے عبداللہ بن سلام کا قول ہے ذاك عدو الیھود من الملئکۃ اور بعض روایات میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ وہ جبریل کو ملك التشدید والعذاب یعنی سختی اور عذاب کا فرشتہ سمجھتے تھے۔ جبرائیل کا وحی لانا: حالانکہ بائبل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ فرشتہ ہے جو وحی لاتا تھا۔ چنانچہ دانیال ۸: ۱۶ میں جبرئیل کو حکم ہوتا ہے کہ دانیال کو اس کی رویا کے معنی سمجھا دے۔ اور لوقا ۱: ۱۹ و ۲۶ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور قرآن کریم میں بھی یہی فرمایا ہے کہ جبرئیل اللہ کی وحی آنحضرت صلعم پر لاتے تھے۔ جیسا کہ یہاں بھی صاف فرمایا۔ اور احادیث سے حضرت جبرئیل کا آنحضرت صلعم کے ساتھ رمضان میں قرآن کریم کا دَور کرنا ثابت ہے اور بخاری سے ہی یہ بھی ثابت ہے کہ وہی فرشتہ جو آنحضرت صلعم پر وحی لایا حضرت موسٰی پر بھی وہی وحی لاتا تھا۔ دیکھو ورقہ کا قول کتاب کیف کان بدء الوحی میں۔ ھذا الناموس الذی نزل اللہ علی موسٰی۔ معلوم ہوتا ہے یہودیوں کا یہ عقیدہ اس لیے ہوگیا کہ جب جبرئیل کسی نبی پر وحی لاتا تو وہ اپنی قساوتِ قلبی کی وجہ سے انکار کرتے اور ان پر عذاب آتا اس لیے وہ عذاب کو جبرائیل کی طرف منسوب کرنے لگ گئے۔

پچھلے رکوع میں یہود اور عیسائیوں کی اسلام کے ساتھ عداوت کا اشارۃً ذکر کیا تھا۔ اس رکوع میں ان کی عداوت کا کھول کر ذکر کیا ہے کہ یہاں تک اُن کی عداوت ترقی کرگئی ہے کہ خود جبرئیل سے بھی دشمنی کرتے ہیں۔

۱۲۳ نزّل۔ تنزیل اور انزال میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ تنزیل اس موقعہ کے ساتھ خاص ہے جہاں اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوکر آنے کی طرف یا سورتوں اور آیات کے یکے بعد دیگرے نزول کی طرف اشارہ ہو اور انزال عام ہے (غ)

قلب کے اصل معنی ہیں ایک چیز کا ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف پھیرنا (غ) قلب دل کو کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ خون کو پھیرتا ہے یا اس لیے کہ خیالات کو پھیرتا ہے اور قلب کے معنی کسی چیز کا اصل یا اس کا لُبّ بھی ہیں (ت) حدیث میں ہے ان لکل شئ قلب وقلب القراٰن یٰس۔ ہر چیز کا ایک قلب ہے اور قرآن کا قلب یٰس ہے۔ یہاں ابن اثیر نے قلب کے معنی لُب اور اصل ہی کیے ہیں۔ قلب پر نزولِ قرآن سے مراد: پس انسان کے جسمانی قلب کے مقابلہ پر ایک قلب اس کی روحانیت کا مرکز ہے اور اسی کا یہاں ذکر ہے۔ نزولِ وحی اسی قلب پر ہوتا ہے۔ بعض نے نزلہ علی قلبك سے یہاں مراد لی ہے جعل قلبك متصفا باخلاق القراٰن (ر) تیرے دل کو اخلاقِ قرآنی سے متصف کیا۔

اذن۔ اُذُن کان کو کہتے ہیں اور اِذن یا اذان وہ چیز ہے جو سنی جائے اور علم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ سماع کے ذریعہ سے اسے حاصل کرتے ہیں۔ اور کسی چیز میں اذن اس کی اجازت کا علم دینا ہے اس لیے اذن اللہ سے مراد یہاں اس کا ارادہ اور اس کا امر ہے اور جہاں اذن بمعنی علم آتا ہے تو وہ ایسا علم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی ہو۔ اس لیے یہ خاص ہے اور علم عام ہے۔

بشریٰ۔ بَشَرۃ چمڑے کے ظاہر کو یعنی اوپر کے حصّہ کو کہتے ہیں جیسے اَدَمَۃ اس کے اندر کی طرف کو کہتے ہیں اور اسی لحاظ سے انسان کو بَشَر کہا جاتا ہے اور بشریٰ اور بشارۃ خوش کرنے والی خبر کو کہتے ہیں (غ) اس لیے کہ اس سے انسان کے چہرہ کے بشرہ میں بسط پیدا ہوتا ہے۔

جبرائیل کا آنحضرتؐ پر وحی لانا: جیسا کہ پچھلے نوٹ سے ظاہر ہے۔ بائبل سے بھی یہی ثابت ہے کہ حضرت جبرئیل انبیاء پر وحی لاتے تھے۔ گو یہودیوں نے غلطی سے جبرئیل کو عذاب کا فرشتہ سمجھ رکھا تھا۔ اس لیے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے جب جبرائیل کا ذکر آیا، تو فرمایا کہ جس طرح وہ پہلے انبیاء پر وحی لاتا تھا اسی طرح تیرے قلب پر بھی وحی الٰہی کا لانے والا ہے۔ اور یہ وحی پہلی وحی کی مصدق بھی ہے اور مان لینے والوں کے لیے اس میں بشارت بھی ہے پس وہ ملک عذاب نہیں۔ بلکہ ہدایت اور بشارت لانے والا ہے۔

جِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾	اور میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ (اُن) کافروں کا دشمن ہے ۱۲۴
وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾	اور یقیناً ہم نے تیری طرف کھلی باتیں اتاریں اور سوائے فاسقوں کے کوئی ان کا انکار نہیں کرسکتا ۱۲۵
اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾	اور کیا جب کبھی وہ کوئی عہد باندھتے ہیں انہی کا ایک فریق اُسے پھینک دیتا ہے بلکہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے ۔
وَلَمَّا جَآءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِھِمْ كَاَنَّھُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾	اور جب اللہ کی طرف سے اُن کے پاس ایک رسول آیا اسکی تصدیق کرنے والا جو اُن کے پاس ہے تو اُن میں سے جنھیں کتاب دی گئی تھی ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھ پیچھے پھینک دیا گویا وہ جانتے ہی نہیں ۱۲۶
وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰي مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ	اور ان باتوں کی پیروی کی جو شیطان سلیمانؑ کی نبوت پر افترا کرتے تھے ۱۲۷

ع۱۲۴ عدوٌّ ۔ عَدو کے معنی تجاوز یعنی حد سے گزرنا اور موافقت کا نہ ہونا ہیں، بلحاظ دل ہو تو عَداوۃ اور معاداۃ یعنی دشمنی ہے چلنے کے لحاظ سے ہو تو عَدو ہے۔ معاملہ میں یا عدالت میں خلل کے لحاظ سے ہو تو عُدوان اور عَدا یعنی زیادتی ہے اور عَدُوّ یعنی دشمن دو طرح پر ہوتا ہے ایک ارادہ اور قصد سے جیسے من قوم عدولکم (النساءؔ ۔ ۹۲) اور ایک وہ جو ارادہ اور قصد سے نہیں بلکہ دوسرے کے لیے ایسی حالت پیش کرے جس سے اسکو تکلیف پہنچے جس طرح دشمن سے پہنچتی ہے، جیسے بتوں کے متعلق حضرت ابراہیمؑ کا فرمانا فانھم عدولی الا رب العالمین (الشعراءؔ ۲۶ ۔ ۷۷) یا جیسے فرمایا ان من ازواجکم واولادکم عدوا لکم (التغابنؔ ۶۴ ۔ ۱۴) (رغ) اللہ تعالیٰ کا کافروں کا دشمن ہونا اسی لحاظ سے ہے یعنی ان کے ساتھ اس کا معاملہ ایسا ہو گا یا اس کی طرف سے ان کو سزا پہنچے گی۔
یہاں بتایا کہ جبرئیل کے ساتھ دشمنی اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ سب سے دشمنی ہے (میکائیل کا نام اس لیے بڑھایا کہ یہودی میکائیل کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ چنانچہ دانیال ۱۲: ۱ میں میکائیل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "وہ بڑا سردار جو تیری قوم کے فرزندوں کی حمایت کے لیے کھڑا ہے") اور جو شخص اللہ اور ملائکہ سے دشمنی کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ایسے شخص کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔ اللہ کی عداوت کا مفہوم: عداوت سے اللہ تعالیٰ پاک ہے اور اس لفظ کا استعمال محض ان کی عداوت کی سزا کے اظہار کے لیے ہے اس استعمال کے لیے دیکھو ع۲۷۔

ع۱۲۵ فاسق یہاں ان کو اس لیے کہا کہ ان سے نبی آخر الزمان کے متعلق عہد بھی لیا گیا تھا۔ اس عہد کو زیادہ واضح الفاظ میں اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔ فاسق کے معنی کے لیے دیکھو ع۴۱۔

ع۱۲۶ نبذ ۔ نبذ کسی چیز کا پھینک دینا ہے جب اس کی کچھ قدر و قیمت نہ سمجھی جائے (رغ)
اور بھی زیادہ تصریح فرمائی کہ ان لوگوں نے خدا کی کتاب توریت کی بھی پروا نہ کی کیونکہ اس میں نبی صلعم کے متعلق عہد مذکور تھا۔

ع۱۲۷ تتلوا الشیاطین علیٰ ۔ تلی یا تلاوت کا لفظ کتب منزل من اللہ کے لیے خاص ہے دیکھو ع۶۷ تلی علیہ کے ایک معنی تو یوں ہونگے کہ اس کو پڑھ کر سنایا۔ جیسے یتلوا علیھم اٰیاتہٖ مگر ظاہر ہے کہ یہ معنی یہاں نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ شیاطین ملک سلیمان کو تو کچھ پڑھ کر نہ سناتے تھے۔ اس لیے یہاں دوسرے معنی مراد ہیں یتلوا علیٰ فلان کے معنی ہیں یکذب علیہ یعنی اس پر جھوٹ بولا یا اس پر افترا کیا۔ گویا ملک سلیمان کی طرف جھوٹ باتیں منسوب کر کے ان کا کلام الٰہی ہونا ظاہر کرتے تھے۔
ملک ۔ ملک اور جتنے مادے ان حروف کو مقلوب کر کے بنتے ہیں ان سب میں قوت اور شدت کے معنی پائے جاتے ہیں (رت) اور مُلک اصل میں حکم کے ساتھ کسی چیز کا ضبط ہے جس میں تصرف حاصل ہو اور عام معنی اس کے بادشاہت ہیں۔ یہاں مراد نبوت ہے جیسا کہ اللھم مالک الملک کی تفسیر میں مجاہد سے ملک کے معنی نبوت مروی ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کا اصل ملک ہی نبوت ہی تھی۔
سلیمان ابن داؤد ۔ ان کا زمانہ حضرت مسیح سے ۹۷۰ سال پیشتر ہے اور بنی اسرائیل میں شان و شوکت کے لحاظ سے اور وسعت مملکت کے لحاظ سے ان کے برابر کوئی نہیں ہوا۔ آپ نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی۔
سلیمان پر یہودیوں کا افترا: یہ بتا کر کہ محمد صلعم کے ظہور پر یہودیوں نے کس طرح کتاب اللہ کو پس پشت پھینک دیا اب بتاتا ہے کہ بجائے کتاب اللہ کی پیروی کے یہ لوگ ان جھوٹی باتوں کے پیچھے لگ گئے ہیں جو شریر اور مفسد لوگ حضرت سلیمانؑ پر افترا کر کے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور ان باتوں کے ذریعہ سے حق کو مٹانا چاہتے ہیں۔ بہت سی جھوٹی باتیں یہودی سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے جن میں سے کچھ حصہ مسلمانوں نے بھی لیکر سحر سلیمانی اور نقش سلیمانی بنا لیے ہیں۔ شیاطین سے مراد وہی لوگ ہیں جو اس قسم کی باتیں حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے۔

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا
يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى
الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا
يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ
فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ

اور سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا ع۱۲۸ مگر شیطان کفر کرتے ہیں (جو) لوگوں کو سحر
سکھاتے ہیں ع۱۲۹ اور وہ بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر
نہیں اتارا گیا ع۱۳۰ اور نہ وہ دونوں کسی کو سکھاتے تھے یہاں تک کہ
کہتے ہم صرف فتنہ ہیں، پس کافر نہ بن ع۱۳۱ سو وہ ان دونوں ذریعوں
سے وہ باتیں سیکھتے ہیں ع۱۳۲ جن سے مرد اور اسکی جورو کے درمیان

ع ۱۲۸ سلیمان کی طرف کفر و شرک کی نسبت بائبل میں: یہ اس لیے فرمایا کہ یہودیوں کی بعض اقوام کو حضرت سلیمانؑ سے اس قدر بغض ہو گیا تھا کہ انہوں نے سلیمان کی طرف کفر و شرک کو منسوب کر دیا یہاں تک کہ یہ باتیں بائبل میں بھی داخل ہو گئیں۔ چنانچہ ۱ سلاطین ۱۱: ۴ میں ہے "جب سلیمان بوڑھا ہُوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا۔ اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کی طرف مائل نہ تھا۔" پھر آگے آتا ہے کہ سلیمان کا دل خداوند سے برگشتہ ہو گیا اور خداوند اس پر غضبناک ہُوا۔

بائبل میں تحریف اور قرآن کریم کا اس کی اصلاح کرنا: یہ اگر ایک طرف بائبل میں تحریف کا قطعی ثبوت ہے کہ ایک نبی کی طرف ایسی بیہودہ باتوں کو منسوب کیا ہے تو دوسری طرف قرآن کریم کے ان کتابوں پر محافظ ہونے کا ثبوت ہے کہ ان کی غلطی کو ظاہر کر دیا۔ آج عیسائی محققین بھی اسی بات کے معترف ہیں کہ بائبل کا یہ بیان غلط ہے۔ چنانچہ انسکلوپیڈیا ببلیکا میں ہے "غالباً یہ تو صحیح ہے کہ سلیمان کی بہت سی بیبیاں تھیں جن میں سے کچھ اسرائیلی قوم کی اور کچھ غیر اسرائیلی تھیں مگر اس نے ان سب کے لیے قربانگاہ نہیں بنائے تھے۔ نہ ہی اس نے ان بیبیوں کے دیوتاؤں کی پرستش کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ملانے کا کبھی ارتکاب کیا۔" قرآن کریم کی صداقت کی کیسی عظمت نظر آتی ہے کہ جو بات تیرہ سو سال پیشتر بغیر بائبل کو پڑھنے کے ایک اُمی کے منہ سے نکلی، آج تحقیق کے بعد وہی درست ثابت ہوتی ہے اور بائبل کا اپنا بیان غلط ثابت ہوتا ہے پس قرآن بائبل سے نقل نہیں کرتا۔ بلکہ بائبل کی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے۔

ع ۱۲۹ السحر۔ اَلسِّحْرُ الْخِدَاعُ وَتَخْيِيْلَاتٌ لَا حَقِيْقَةَ لَهَا (غ) سحر ان دھوکے کی باتوں اور تخیلات کو کہتے ہیں جن کی حقیقت کچھ نہ ہو۔ اور جوہری کا قول ہے کل ما لطف ودق ماخذہ فھو سحر (ت) وہ امر جس کی اصل دقیق اور لطیف ہو وہ سحر ہے اور حدیث میں ہے ان من البیان لسحرا یعنی بعض بیان سحر کا حکم رکھتا ہے مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پس شیطانوں کے لوگوں کو سحر سکھانے سے دھوکے کی باتیں اور تخیلات سکھانا مراد ہے جن کی اصلیت کچھ نہ تھی۔ جیسا کہ اب بھی بہتیرے شیطان ایسی باتیں لوگوں کو بتاتے رہتے ہیں۔ سحر کے معنی جو قلب ماہیت عام لوگوں نے بنا رکھے ہیں اس کی حقیقت کچھ نہیں۔

یہاں بتایا کہ شیاطین یعنی شریر لوگ ایک تو حضرت سلیمانؑ پر کچھ افترا کر کے لوگوں کو سناتے ہیں اور یہودی اس کی پیروی کرتے ہیں اور دوسرے یہ لوگ اس سحر کی پیروی کرتے ہیں جس کی تعلیم دینے والے بھی شریر لوگ ہیں۔ اس سحر کو وہ کس کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

ع ۱۳۰ بابل۔ ایک نہایت قدیم اور بہت بڑا شہر تھا، جو مدّت تک عراق عرب کا دار الخلافہ رہا۔ دریائے فرات پر واقع تھا جس کے دونوں طرف اب اس کے کھنڈرات باقی ہیں مسیح سے ۲۳۰۰ سال پیشتر بھی یہ دار الخلافہ تھا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس کے گرداگرد کی فصیل ۵۵ میل تھی۔ بخت النصر کے زمانہ میں بھی یہ عروج پر تھا بعد میں تباہ ہو گیا

ما انزل میں ما نافیہ ہے ابن جریر نے اس معنی کی روایت کی ہے۔ کیونکہ فرشتوں کو کبھی رسول بنا کر دنیا میں نہیں بھیجا جاتا چہ جائیکہ ان پر سحر نازل ہو۔

ہاروت ماروت کا قصہ یہودیوں نے ایرانیوں سے لیا: یہودیوں کے تعلقات ایرانیوں سے بھی تھے جن کو وہ اب اسلام کے خلاف اُکساتے بھی رہتے تھے۔ اور ایرانیوں سے ہی انہوں نے ہاروت ماروت کا قصہ لیا تھا جن میں یہ مشہور تھا جیسا کہ سیل نے لکھا ہے کہ بابل میں ہاروت ماروت نام دو فرشتوں پر کچھ نازل ہُوا تھا اور کہ وہ لوگوں کو کچھ سحر کی باتیں سکھاتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہاں دو قسم کی باتوں کی نفی کی ہے، ایک اُن کی جو سلیمانؑ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں دوسرے ہاروت ماروت کے قصہ کی اور ان پر سحر نازل ہونے کی اور جس طرح پہلے سلیمانؑ کی طرف منسوب شدہ باتوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا۔ یہاں سحر کا ذکر کر کے فرمایا کہ یہ یہودی یہ کہہ کر اس کا اتباع کرتے ہیں کہ یہ دو فرشتوں ہاروت ماروت پر اُترا تھا۔ اس کی نفی کی ہے کہ دو فرشتوں ہاروت ماروت پر سحر اتارا گیا ہو۔

ہاروت ماروت کے قصے پر محققین اسلام کے خیالات: ہاروت ماروت کے جسقدر بے سرو پا قصے بعض مفسرین نے لکھ دیئے ہیں انکی اصل یا مجوسیوں میں کچھ ملتی ہے یا یہودیوں میں۔ قرآن و حدیث ان خرافات سے پاک ہیں۔ امام رازی نے ان قصوں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ یہ روایت فاسد اور مردود ہے۔ شہاب عراقی نے کہا ہے کہ جو شخص ان باتوں کو مانتا ہے کہ ہاروت ماروت دو فرشتے ہیں جن کو زہرہ کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے وہ اللہ کا کافر ہے کیونکہ ملائکہ معصوم ہیں وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ روح المعانی میں ہے کہ ان قصوں میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی ثابت نہیں۔ اے کاش اسلام کی کتابوں میں ان خرافات میں سے کچھ نہ ہوتا جنکو کوئی عاقل قبول نہیں کر سکتا۔ غرض یہ قصے اہل علم کے نزدیک مردود ہیں

ع ۱۳۱ ہاروت ماروت کا قصہ بنانے والوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ فرشتے جو اوندھے منہ بابل کے کنوئیں میں لٹکے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں۔ مگر پہلے یہ کہہ لیتے ہیں کہ ہم ایک آزمائش ہیں پس ہم سے جادو نہ سیکھو اس سارے بے سرو پا قصہ کا انکار کیا ہے اور فرمایا کہ وہ کچھ سکھاتے ہی نہیں جو یہ کہنے کی نوبت آئے کہ ہم فتنہ ہیں تم ہم سے جادو سیکھ کر کافر نہ بنو۔ قرآن شریف نے سحر کا سیکھنا سکھانا شیاطین کا کام بیان فرمایا ہے مسلمانوں کو ان خرافات سے بچنا چاہیئے۔

ع ۱۳۲ منھما میں ضمیر ان دونوں ذریعوں کی طرف جاتی ہے جنکا ذکر اوپر ہے یعنی ایک وہ کفر کی باتیں جو سلیمان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں حالانکہ سلیمان کا ان سے کوئی تعلق نہیں اور دوسرے وہ سحر جس کا بابل میں ہاروت وماروت پر نازل ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ — تفریق کرتے ہیں[۱۳۳] اور اس سے وہ کسی کو ضرر پہنچانے والے نہیں ہونگے

بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا — سوائے اسکے جو اللہ کے حکم سے ہو[۱۳۴] اور وہ باتیں سیکھتے ہیں جو انھیں ضرر دیتی ہیں

يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ — اور انھیں نفع نہیں دیتیں اور یقیناً وہ جانتے ہیں کہ جس نے اسکو مول

اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَ — لیا اُس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں[۱۳۵] اور کیا ہی بُرا ہے جس کے عوض

لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ — انھوں نے اپنے آپ کو بیچ دیا، کاش وہ جانتے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ — اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقوے کرتے اللہ کی طرف سے بدلہ بہتر

ع ۱۲ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع — تھا کاش وہ جانتے[۱۳۶]

ع۱۳۳ فریمیسنری: اس ایک فقرہ میں اس کل منصوبہ کی اصلیت کو بیان کر دیا ہے جو آنحضرت صلعم کے خلاف کیا جاتا تھا۔ دنیا میں صرف ایک ہی سوسائٹی برنگ مذہب ایسی ہے جس نے مرد اور عورت میں تفرقہ کیا ہے یعنی مردوں کو اس کا ممبر بنایا جاتا ہے مگر عورتوں کو نہیں اور یہ فریمیسنوں کا طریق ہے پس یہاں بتا دیا کہ فریمیسن یعنی خفیہ سوسائٹیوں کے ذریعہ سے اسلام کو تباہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کی طرف اگلے الفاظ میں اشارہ ہے۔ اور یہودی فریمیسنوں سے مل کر خفیہ منصوبے آنحضرت صلعم کے خلاف کر رہے ہیں۔

ع۱۳۴ اسلام کے خلاف خفیہ منصوبے: یہاں یہ بتایا کہ ان کی غرض اسلام کو اور آنحضرت صلعم کو نقصان پہنچانا ہے مگر وہ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے کہ اہل کتاب خفیہ منصوبے مومنوں کو نقصان پہنچانے کے لیے کرتے ہیں انّما النجوٰی من الشیطان لیحزن الذین اٰمنوا ولیس بضارھم شیئا الا باذن اللہ (المجادلۃ ۵۸-۱۰) خفیہ مشورے شیطانی کام ہیں جن کی غرض یہ ہے کہ وہ یعنی شیطان مومنوں کو غم میں ڈالے اور وہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ہاں اللہ کے اذن سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ پہنچے گا۔ سو دونوں جگہ لفظ قریباً ایک ہی ہیں۔ پس درحقیقت ان الفاظ میں بھی انہی خفیہ منصوبوں کی طرف اشارہ ہے جو فریمیسنوں کے ساتھ مل کر یہود آنحضرت صلعم کو ہلاک کرنے کے لیے کر رہے تھے۔ فریمیسنری کی اصلیت: فریمیسن ایک سوسائٹی ہے جو بہت قدیم زمانہ سے چلی آتی ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ کی طرف اس کو منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے حالات کو دوسروں پر ظاہر نہیں کرتے نہ یہ بتاتے ہیں کہ ان کی تعلیم کیا ہے۔ اس زمانہ میں اس سوسائٹی کی باگ ان قوموں کے ہاتھ میں ہے جن کو دنیا میں سیاسی غلبہ حاصل ہے اور اس کی آخری منزل عیسائیت ہے۔ بعض بھولے بھالے مسلمان بھی اس جال میں پھنس کر اپنے دین و ایمان کو تباہ کر لیتے ہیں۔

یہاں چار باتیں بتا دی ہیں۔ اوّل یہ کہ کچھ خفیہ منصوبے ہیں جو شیطان صفت لوگ کر رہے ہیں۔ دُوسرا یہ کہ وہ ان باتوں کا جواز اس طرح کرتے ہیں کہ انبیاء (سلیمانؑ) اور ملائکہ (ہاروت ماروت) کی طرف ان کو منسوب کرتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ یہ منصوبے ان لوگوں کے ہیں جو مرد اور عورت میں تفرقہ کرتے ہیں یعنی فریمیسن۔ چہارم یہ کہ ان کی غرض اسلام کو تباہ کرنا ہے مگر وہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

مومنوں کو تکلیف پہنچنے کی وجہ: الّا باذن اللہ۔ اِلّا یہاں استثنائے منقطع کے طور پر ہے یعنی اس سے ایک نیا کلام شروع ہوتا ہے یعنی وہ تو تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے ہاں اللہ کے اذن سے کچھ تکلیف مومنوں کو پہنچ بھی جائے گی۔ اور یہاں اس قسم کے استثناء کی ضرورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قانون بیان فرمایا ہے کہ مومنوں کو بھی کچھ نہ کچھ تکلیفیں کچھ خوف کچھ بھوک کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی ضرور ہے کہ پہنچیں۔ کیونکہ بغیر تکالیف کے مومن کمال کو حاصل نہیں کر سکتے (۱۵۵) پس مطلب ان الفاظ کا یہ ہے کہ جو تکلیف یہ دشمن پہنچانا چاہتے ہیں۔ اور وہ منصوبۂ ہلاکت ہے وہ تو یہ نہیں پہنچا سکیں گے۔ ہاں مومنوں کو ان کے کمال تک پہنچانے کے لیے جو علم الٰہی میں بعض تکالیف کا پہنچنا ضروری ہے وہ پہنچیں گی۔

ع۱۳۵ اخلاق۔ خَلق پیدا کرنا ہے یعنی ظاہری بناوٹ اور خُلق خصائل سے تعلق رکھتا ہے گویا وہ اندرونی بناوٹ ہے اور خلاق وہ فضیلت ہے جو انسان اپنے خُلق سے حاصل کرتا ہے۔ اس لیے اس کے معنی حظ یا حِصّہ ہو گئے ہیں (غ)

منصوبہ کرنے والوں کا انجام: یہاں یہ بتا دیا کہ نہ صرف وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ بلکہ یہ باتیں خود ان کے نقصان کا موجب ہوں گی وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے بلکہ نقصان ہی اُٹھائیں گے۔ چنانچہ ایسا واقعہ ہی ہُوا کہ یہ اسلام کے خلاف منصوبے آخر اُن کی تباہی اور جلاوطنی کا موجب ہوئے۔

ع۱۳۶ مثوبۃ اور ثواب دونوں ثوب سے ہیں جس کے معنی ہیں کسی چیز کا اس اصل حالت کی طرف رجوع کرنا جس پر وہ تھی اور مثوبۃ یا ثواب کسی عمل کی جزا کو اس خیال سے کہا جاتا ہے کہ گویا وہی عمل ہی واپس آگیا (غ)

اس آیت میں قرآن شریف پر ایمان کو پیش کیا اور اس طرح سے آخر رکوع کا تعلق اگلے رکوع سے کیا جس میں قرآن شریف کی عظمت کا ذکر ہے اور یہ ذکر ہے کہ پہلی شرائع اس سے منسوخ ہوئیں اس لیے اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا
انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾
مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ
لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ
مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾
مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ
اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو رَاعنا نہ کہو اور اُنظُرنا کہو اور سُنو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے ۱۳۷ع

اہل کتاب میں سے جو کافر ہیں پسند نہیں کرتے اور نہ ہی مشرک کہ تمہارے رب سے تم پر کوئی بھلائی اتاری جائے اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے ۱۳۷عا

جو پیغام ہم منسوخ کرتے ہیں یا اُسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسا لے آتے ہیں ۱۳۸ع کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے

۱۳۷ع راعنا۔ راعَ۔ رعیٰ سے مشتق ہے جس کے معنی حفاظت کرنا ہیں چنانچہ حدیث میں ہے کُلّکم راعٍ پس راعنا کے معنی ہیں ہماری بات سنیئے۔

انظرنا۔ نَظَر آنکھ کے پھیرنے کا نام ہے کسی چیز کے دیکھنے کے لیے۔ کبھی اس سے غور اور تحقیق مراد ہوتی ہے اور نظر کے معنی انتظار کرنا بھی آتے ہیں (غ)
یہاں انظرنا کے معنی ہیں ہمارا انتظار کیجیے یا ہمیں مہلت دیجیئے تاکہ ہم آپ کی بات سمجھ لیں۔

یہودیوں کی شرارتیں: راعنا کہنے کی ممانعت کی وجہ دوسری جگہ یُوں دی ہے کہ یہودی کہتے ہیں راعنا لیا بالسنتھم (النساء ۴۔ ۴۶) راعنا کا لفظ اپنی زبانیں مروڑ کر بولتے ہیں یعنی راعنا کی بجائے رعن کہہ دیتے ہیں اور یہ لفظ رعونت سے ہے جس کے معنی جہالت و حماقت ہیں۔ یہودیوں کی شرارتوں میں یہ ادنیٰ قسم کی ایک شرارت تھی کہ بات بات میں استہزا کرتے تھے اور پھر فخر کرتے تھے کہ دیکھو ہم انہیں کیسا بناتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس لفظ سے اس لیے روکا کہ گو اُن کا منشاء بُرا نہ ہو مگر یہودی اس قسم کی باتوں سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ اور یوں بتایا کہ ان باتوں سے بھی اجتناب ضروری ہے جن کا گو منشاء بُرا نہ ہو مگر نتیجہ بُرا ہو۔

یہودیوں کی مخالفت نیک نیتی سے نہ تھی: مضمون کا تعلق پہلے مضمون سے ظاہر ہے وہاں بھی یہودیوں کی کچھ شرارتوں کا ذکر تھا مگر وہ ایسی شرارتیں تھیں جو خفیہ طور پر منصوبوں کے رنگ میں اسلام کو تباہ کرنے کے لیے وہ کرتے تھے۔ یہاں ان کی اس قسم کی شرارتوں کا ذکر ہے جو معمولی بول چال میں وہ استہزا کے رنگ میں کرتے تھے۔ ان کا اس طرح استہزا کرنا صاف بتاتا ہے کہ ان کے اندر نیک نیتی کوئی نہ تھی۔ مخالفت بعض وقت انسان نیک نیتی سے بھی کر بیٹھتا ہے مگر یہودیوں کی مخالفت بر بنائے شرارت تھی اور یہی ان کے منصوبوں اور استہزا کا ذکر کرنے سے مقصود ہے۔

۱۳۷عا یود۔ وَدٌّ کسی چیز کی محبّت رکھنا اور اس کے ہونے کی خواہش کرنا ہے اور دونوں معنوں میں سے ہر ایک پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

اھل الکتاب۔ اھل کسی شخص کے وہ ہیں جن میں اور اس میں ایک اتحاد یا جمعیت کا رنگ ہو بوجہ نسب کے یا دین کے یا اور کسی چیز کے جو اُن دونوں کے قائمقام ہو جیسے صنعت یا گھر یا شہر (غ) پس اھل الکتاب سے مراد وہ لوگ ہوئے جو ایک کتاب پر مجتمع ہیں اس لیے چونکہ کتاب کا لفظ بعض وقت صرف حضرت موسیٰؑ کی وحی پر بولا گیا ہے اور بعض وقت حضرت عیسیٰؑ کی وحی پر اور بعض وقت کل انبیاء کی وحی پر تو اہل کتاب سے مراد کبھی صرف یہود کبھی صرف نصاریٰ کبھی یہود و نصاریٰ دونوں ہوتے ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر جس طرح کتاب میں بعض وقت عمومیت ہوتی ہے اسی طرح اہل کتاب میں بھی عمومیت مراد ہو سکتی ہے۔

خیر۔ خَیر اصل میں وہ چیز ہے جس میں سب لوگ رغبت کریں (غ) یہاں مراد وحی الٰہی ہے (ر)

رحمتہ۔ رَحْمَة رِقّت ہے جس کا اقتضا مرحوم پر احسان ہو اور کبھی اس کا استعمال صرف رِقّت پر ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان پر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت صرف انعام و افضال کا نام ہے (غ)

الفضل۔ فضل۔ اقتصاد یعنی درمیانہ حالت سے زیادہ کا نام ہے مگر جہاں محل ذم ہو وہاں فُضول کہا جاتا ہے اور فضل کا اکثر استعمال محل مدح میں ہے اور ہر ایک عطیہ جس کا دینا دینے والے پر لازم نہیں، فضل کہلاتا ہے (غ) اور یہاں مراد ایسا ہی فضل ہے گو بعض وقت ان چیزوں پر اس کا استعمال ہو جاتا ہے جو بذریعہ اکتساب حاصل ہوتی ہیں جیسے مال و جاہ و قوت (غ)

یہاں الفاظ خیر اور رحمت اور فضل سب میں اس وحی کی طرف اشارہ ہے جو نبی کریم صلعم پر نازل کی گئی۔

۱۳۸ع ننسخ۔ نسخ کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز سے ازالہ کرنا۔ اس لیے یہ لفظ لکھنے یا اثبات کے معنی میں بھی آتا ہے اور صرف ازالہ کے معنی میں بھی اور ایک چیز کا ازالہ کر کے دوسرے کا اثبات کرنے کے معنی میں بھی۔ یہاں یہی آخری معنی مراد ہیں۔ یعنی ایک حکم کا دوسرے حکم سے ازالہ کرنا جو اس کے پیچھے آتا ہے (غ) اور نسخ کتاب صرف کتاب لکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے قرآن شریف میں اس معنی میں استنساخ بجائے نسخ کے آیا ہے جیسے انا کنا نستنسخ ما کنتم تعملون (الجاثیۃ ۴۵۔ ۲۹) اور نُسخة بمعنی تحریر ہے و فی نسختها هدی (الاعراف ۷۔ ۱۵۴)

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ کی ہی ہے

اٰیۃ ۔کے مشہور معنی العلامۃ الظاھرۃ یعنی ظاہر نشان ہیں۔ مگر تاج العروس میں ہے الاٰیۃ الرسالۃ وتستعمل بمعنی الدلیل والمعجزۃ یعنی اٰیۃ کے معنی رسالت یا پیغام الٰہی ہیں اور دلیل اور معجزہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ حضرت آدم کے ذکر کے بعد آتا ہے فاما یاتینکم منی ھدی (۳۸) میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آتی رہے گی پس جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو اُن پر کوئی خوف نہیں اور نہ حزن ہوگا۔ اور اس کے مقابل پر ہے والذین کفروا وکذبوا باٰیاتنا اور جو لوگ ہماری آیات کا انکار کریں اور انہیں جھٹلائیں۔ یہاں صاف طور پر آیات کے معنی الٰہی پیغام ہیں۔ ایسا ہی یٰس ۳۶ : ۴۶ میں ہے وما تاتیھم من اٰیۃ من اٰیات ربھم الا کانوا عنھا معرضین۔ کوئی آیت ان کے رب کی آیات میں سے ان کے پاس نہیں آتی مگر اس سے اعراض کرتے ہیں۔ جہاں اٰیات کے معنی روح المعانی میں ہیں الکتب المنزلۃ یعنی وہ کتابیں جو خدا کی طرف سے نازل ہوئیں۔ یہی وسیع معنی یہاں مراد ہیں۔

یہود کا اعتراض کہ شریعت موسوی کیوں منسوخ ہوئی: یہاں نسخ آیات یا ان کے فراموش کرا دینے سے کیا مراد ہے؟ سیاق مضمون یوں ہے کہ یہودی قرآن پر ایمان اس لیے نہیں لاتے کہ یہ بنی اسرائیل پر نازل نہیں ہوا۔ اگر موعود نبی بنی اسرائیل میں سے ہوتا۔ تو شریعت موسوی کلیتہً منسوخ نہ ہوتی۔ اسی بات کا جواب قرآن کریم نے یہاں دیا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں اصل مضمون کی طرف پھر توجہ دلائی ہے کہ یہ اہل کتاب تم پر (یعنی مسلمانوں یا بنی اسمٰعیل پر) وحی الٰہی کا آنا پسند نہیں کرتے۔

یہ شریعت کس معنی میں موسوی شریعت کی مثل ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ہم نے شریعت موسوی کو منسوخ کر دیا یا فراموش کرا دیا تو اس سے بہتر یا اس کی مثل شریعت ہم نے تم کو دیدی ہے۔ بہتر یا مثل اس لیے کہا کہ بعض احکام تو وہی رہتے ہیں لیکن اس کی تعلیم کا اکثر حصہ شریعت موسوی سے بہتر ہے وہ ایک قوم کے لیے تھی یہ کل قوموں کے لیے ہے وہ ایک زمانہ کے لیے تھی۔ یہ کل زمانوں کے لیے ہے۔ ایسا ہی بہت سی باریک باتیں ابتدائی زمانہ کے لحاظ سے پہلے ظاہر نہ کی گئی تھیں اب جب عقل انسانی میں پختگی بڑھ گئی تو زیادہ باریک باتیں نازل کی گئیں بخیر منھا او مثلھا کی ایک توجیہ یوں بھی ہوسکتی ہے کہ حقیقت کے لحاظ سے تو یہ شریعت موسوی شریعت سے افضل ہے مگر پیشگوئی میں بلحاظ ایک نئی شریعت ہونے کے اسے مثل بھی کہا گیا ہے۔ جیسا کہ استثناء ۱۸ : ۱۸ والی پیشگوئی ہے۔

وجوہات کہ یہاں نسخ شرائع سابقہ کا ذکر ہے نہ نسخ آیات قرآنی کا: سیاق وسباق کے لحاظ سے ان معنوں کی صحت پر کچھ شک نہیں ہوسکتا۔ مگر مفسرین نے اس آیت سے قرآن کریم کی بعض آیات کا بعض سے منسوخ ہونا مراد لے لیا ہے جو بالکل بے تعلق مضمون ہے۔ یہاں نہ پہلے نہ پیچھے کوئی ایسی آیت ہے جو دوسری سے منسوخ ہوئی ہو یا دوسری کی ناسخ ہو بلکہ اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ اس وقت تک کسی ایسی آیت کے نازل ہونے کا ثبوت نہیں ملتا جس نے کسی پہلی نازل شدہ آیت کو منسوخ کر دیا ہو۔ پس جب یہ جھگڑا ہی ابھی تک پیش نہیں آیا جب کسی کا اعتراض کرنا ہی ممکن نہ تھا تو یہاں نسخ آیات قرآنی کے مضمون کو بیان کرنا بالکل بے معنی بات ہے۔ یہ دوسری قطعی دلیل اس بات پر ہے کہ یہاں نسخ آیات قرآنی کا ذکر نہیں بلکہ نسخ شرائع سابقہ کا ذکر ہے۔

قرآن کریم کا معجزہ کہ آنحضرت کبھی اسے بھولے نہیں: تیسری قطعی دلیل یہ ہے کہ یہاں نسخ کے ساتھ فراموش کرا دینے کا ذکر ہے لیکن قرآن کریم کے متعلق قطعی طور پر فرمایا سنقرئک فلا تنسٰی (الاعلٰی ۸۷ : ۶) ہم جو کچھ تجھ کو پڑھائیں گے تو اسے نہیں بھولے گا۔ اور اس کے آگے جو یہ فرمایا الا ماشاء اللہ مگر جو اللہ چاہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ کچھ حصہ بھول بھی جاؤ گے۔ کیونکہ اس طرح عبارت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہیں بھولے گا مگر بھول جائے گا۔ یوں کوئی معمولی آدمی بھی گفتگو نہیں کرسکتا چہ جائیکہ قرآن جیسی پرحکمت کتاب کی طرف یہ بات منسوب ہو۔ الا ماشاء اللہ کے معنی صاف ہیں کہ اور بعض باتیں تو تم بھول بھی جاتے ہو مگر ہمارے پڑھانے کا یہ اثر ہے کہ جو ہم پڑھائیں گے اُسے ہرگز نہ بھولو گے۔ اور امر واقعہ بھی یوں ہی ہے نبی کریم صلعم پر بیس بیس رکوع کی سورت ایک وقت نازل ہوئی ہے اور آپ کو کبھی اس کا ایک لفظ نہیں بھولا۔ پھر بفرض محال اگر آنحضرت بھول جائیں تو ساتھ ساتھ جو لوگ حفظ کرتے چلے جاتے تھے اور جن کی تعداد گو پہلے تھوڑی تھی مگر اب مدینہ آکر سینکڑوں تک پہنچ چکی تھی وہ سب کے سب کس طرح بھول جاتے اور ایک بھولتا تو دوسرا فوراً اسے درست کر دیتا جس طرح آج بھی جب ایک حافظ قرآن ایک لفظ کو غلط پڑھتا ہے تو دوسرا اس کے پیچھے درست کرنے کو کھڑا ہوتا ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ نہ صرف ہر ایک آیت حفظ ہی کی جاتی ہے بلکہ لکھی بھی جاتی ہے اس تحریر کو کون محو کر دیتا تھا نہ اس کے محو کرنے کا یہاں کوئی ذکر ہے یہاں صرف فراموش کرانے کا ذکر ہے۔ ہاں فراموش پہلی شرائع کی بعض باتیں ہوگئیں جو مرور زمانہ سے بالکل دنیا سے نابود ہوگئیں۔ پس اس لحاظ سے بھی نسخ شرائع سابقہ کا ذکر ہے۔ نہ نسخ آیات قرآنی کا۔

نسخ کی کوئی روایت آنحضرت صلعم تک نہیں پہنچتی: رہا یہ سوال کہ قرآن کریم کی کوئی آیت جو اس وقت بین الدفتین موجود ہے آیا وہ منسوخ ہے؟ کچھ روایات ضرور ایسی ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان میں سے کوئی روایت نبی کریم صلعم تک نہیں پہنچتی۔ یعنی کسی روایت میں یہ نہیں کہ نبی کریم صلعم نے کسی آیت کو منسوخ فرمایا، حالانکہ اگر نسخ آیات قرآنی کا مسئلہ درست ہوتا تو کوئی نہ کوئی روایت نبی کریم صلعم تک بھی پہنچ جاتی۔ صحابی کا قول نسخ پر حجت نہیں: پس جب خود نبی کریم صلعم کسی آیت کو منسوخ قرار نہیں دیتے اور ہر آیت کا قابل عمل ہونا خود رسول اللہ صلعم کے منہ سے ثابت ہے تو محض کسی صحابی کے قول سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہوسکتی صحابی کا قول تو ویسے بھی حجت نہیں چہ جائیکہ آیات قرآنی کے بارہ میں جو قرآن شریف میں موجود ہیں کسی آیت کو محض ایک صحابی کے قول کی وجہ سے منسوخ مانا جائے۔

روایات نسخ میں ایک دوسرے کی تردید: دوسری بات روایات نسخ کے متعلق یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ صحیح بخاری میں اکثر ان روایات کی یہ حالت ہے کہ جہاں ایک صحابی کی رائے ایک آیت کے منسوخ ہونے کے متعلق ہے وہیں دوسرے صحابی کی رائے اس کے غیر منسوخ ہونے کے متعلق ہے پس معلوم ہوا کہ خود روایات ایک دوسری کی تردید کرتی ہیں پس نسخ کا مسئلہ اور بھی کمزور ہو جاتا ہے۔

روایات نسخ ضعیف ہیں: تیسری بات یہ ہے کہ ایسی کل روایات ضعیف ہیں۔ چنانچہ طبرسی کا قول ہے الروایات فی النسخ کلھا ضعیفۃ۔

وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾
اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی کارساز نہیں اور نہ کوئی مددگار ہے ۱۳۹

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾
بلکہ تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے سوال کرو جس طرح پہلے موسیٰؑ سے سوال کیا گیا تھا اور جو کوئی ایمان کے بدلے کفر لے لیتا ہے وہ ضرور سیدھے رستے سے بھٹک گیا ۱۴۰

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾
اہل کتاب میں سے بہت سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں لوٹا کر کافر بنا دیں اپنے حسد کی وجہ سے، اس کے بعد کہ اُن پر حق کھل گیا سو معاف کرو اور خیال میں نہ لاؤ یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۱۴۱

تعداد آیات منسوخ میں بھاری اختلاف: چوتھی بات یہ ہے کہ بعض نے صرف پانچ آیات کو منسوخ کہا اور بعض نے کئی سو آیات کو منسوخ کہدیا ہے۔ اس قدر اختلاف بتاتا ہے کہ یہ محض ایک رائے کی بات ہے اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب ایک شخص ایک آیت کو دوسری کے ساتھ تطبیق نہیں دے سکا تو اس نے اُسے منسوخ کہہ دیا۔

اختلاف قبول کر کے منسوخ کہنا قرآن کے خلاف ہے: یہ بھی نہیں سوچا کہ آیا فی الواقع جسے منسوخ کہدیا ہے وہ پہلے کی نازل شدہ ہے بھی یا نہیں اور تطبیق دینے کی بجائے منسوخ کہنا گویا قرآن کریم میں اختلاف قبول کرنا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اختلاف نہ ہونے کو بطور دلیل پیش کیا ہے ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا (النساء۴-۸۲) پس اگر قرآن کریم میں اختلاف قبول کیا جائے تو وہ من عند اللہ نہیں اور اگر اختلاف نہیں تو نسخ کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنے اپنے موقعہ پر دکھایا جائے گا کہ جہاں تطبیق نہ دے سکنے کی وجہ سے نسخ مانا گیا ہے وہاں تطبیق دی جا سکتی ہے پس نسخ آیات قرآنی کا مسئلہ بالکل باطل ہے اور یہاں سابقہ شرائع کے نسخ کا ذکر ہے۔

ع۱۳۹ یہاں ملک کے لفظ میں نبوت دینے کی طرف اشارہ ہے دیکھو ع۱۲۷ دوسری جگہ فرمایا فقد اٰتینا اٰل ابراھیم الکتاب والحکمۃ واٰتینٰھم ملکا عظیما (النساء۴-۵۴) یعنی اب بھی ہم نے آل ابراہیم (محمد رسول اللہ صلعم) کو ہی کتاب اور حکمت دی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کو بڑا ملک دیا ہے۔ "تو" میں ہر مخاطب مراد ہے جیسا کہ ضمیر جمع نے بعد میں آ کر صاف کر دیا۔

ع۱۴۰ یہودیوں کے گستاخانہ سوالات: یہاں یہودی مخاطب ہیں رسولکم سے مراد وہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا۔ ایسے گستاخانہ سوال یہودی ہی کرتے تھے جیسا کہ قرآن شریف میں دوسری جگہ صاف فرمایا یسئلک اھل الکتاب ان تنزل علیھم کتٰبا من السماء لقد سالوا موسٰی اکبر من ذٰلک (النساء۴-۱۵۳) اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو اُن پر آسمان سے کتاب اتارے سو موسیٰؑ سے انہوں نے اس سے بھی بڑھ کر سوال کیا۔ ایمان کے بدلے کفر لینے سے مراد یہی ہے کہ ایمان کو چھوڑ کر کفر اختیار کرے جیسا کہ یہودیوں نے کیا۔

ع۱۴۱ حسدا۔ حسد یہ ہے کہ ایک شخص سے ایک نعمت کے زوال کی خواہش کی جائے جس نعمت کا وہ مستحق ہے اور بسا اوقات اس میں اس کے دور کرنے کی بھی کوشش ہوتی ہے (غ) اور جو دوسرے جیسی نعمت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ غبطہ ہے اور ایک روایت میں ہے کہ اَلْمُؤْمِنُ يَغْبِطُ وَالْمُنَافِقُ يَحْسُدُ یعنی مومن غبط کرتا ہے اور منافق حسد کرتا ہے اور نہایہ میں ہے کہ حَسَد یہ ہے کہ دوسرے کی نعمت کا زوال چاہتا ہُوا اس کے خود حاصل کرنے کی خواہش کرے اور غَبْط یہ ہے کہ صرف یہ خواہش کرے کہ اسے بھی دوسرے جیسی نعمت مل جائے اور دوسرے سے زوال کی خواہش نہ کرے اور حدیث میں جو آتا ہے لاحسد الا فی اثنتین تو اس کے معنی کیے ہیں کہ کوئی حسد نہیں جو نقصان نہ پہنچائے مگر دو باتوں میں۔ مگر یہاں حسد کا استعمال غبط کے معنی میں ہے۔

اصفحوا۔ صفح کے معنی ہیں ترک ملامت کرنا اور یہ عفو سے بڑھ کر ہے (غ)

یہود کا بت پرستی کو توحید سے اچھا قرار دینا: یہاں بتایا کہ یہ یہود بھی گمراہ ہونے ہوتے اس حد تک پہنچے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان حالت کفر کی طرف لوٹ جائیں یہ محض حسد ہے ورنہ کم از کم توحید کے مذہب کو بت پرستی سے تو اچھا سمجھتے۔ دوسری جگہ اہل کتاب کا قول کفار کے متعلق نقل کیا ہے ھٰؤلاء اھدٰی من الذین اٰمنوا سبیلا (النساء۴-۵۱) یہ مومنوں سے زیادہ ہدایت کی راہ پر ہیں۔ کفار قریش اور یہود کی اسلام کی بیخکنی کے لیے غرض واحد تھی۔ ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمان دین اسلام پر نہ رہیں اور اسی غرض کے لیے جنگ کرتے تھے۔ ولا یزالون یقاتلونکم حتّٰی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا (۲۱۷)

جنگوں میں مسلمانوں کا عفو پر عمل: اللہ کے اپنا امر یا حکم لانے سے منشاء یہ ہے کہ اسلام کی بادشاہت قائم ہو جائے فرمایا اس سے پہلے یہ تو نہیں ٹلیں گے پس تم ہی عفو و درگزر سے کام لو۔ مسلمانوں کا جنگ کرنا صرف اپنی حفاظت کے لیے اور اسلام کی حفاظت کے لیے تھا انتقام کے طور پر کبھی جنگ نہیں کی۔ عین جنگ کے اندر پھر فتح کے بعد اسی تعلیم عفو و درگزر پر عمل رہا۔ فتح مکہ کے بعد لاتثریب علیکم الیوم اسی حکم کی تعمیل میں فرمایا۔ پس اس آیت کو منسوخ کہنا صریح غلطی ہے۔

وَ اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِكُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ تَجِدُوۡهُ عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۱۱۰﴾

اور نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ دو، اور جو کوئی بھلائی اپنے لیے آگے بھیجو گے اُسے اللہ کے پاس پاؤ گے، اللہ اُسے دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو ؏۱۴۲

وَ قَالُوۡا لَنۡ يَّدۡخُلَ الۡجَنَّةَ اِلَّا مَنۡ كَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى ؕ تِلۡكَ اَمَانِيُّهُمۡ ؕ قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۱۱﴾

اور کہتے ہیں کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا سوائے اُن کے جو یہودی ہوں یا عیسائی، یہ اُن کی آرزوئیں ہیں کہہ اپنی سند لاؤ اگر تم سچے ہو ؏۱۴۳

بَلٰى ۚ مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحۡسِنٌ فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ ۪ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ ع ١٣ ٩ ١٣

ہاں جس نے اپنے آپ کو اللہ کا فرماں بردار بنایا اور وہ احسان کرنے والا ہے تو اُس کا اجر اُس کے رب کے پاس ہے اور ان کو کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ؏۱۴۴

؏۱۴۲ نماز بطور علاج: کیا اس سے پہلے مسلمان نماز نہ پڑھتے تھے؟ کسی حکم کے دینے کا منشاء لازماً یہ نہیں ہوتا کہ اس سے پہلے اس کے خلاف ہو رہا تھا۔ یہاں اوپر کی آیت میں مسلمانوں کی مشکلات کا ذکر کیا کہ اہل کتاب اس قدر دشمن ہو رہے ہیں کہ اسلام سے ہی برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان مشکلات کا علاج یہاں بتایا کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ مصیبت میں نماز بہترین علاج ہے۔ گویا انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے مگر صرف نماز سے انسان اپنے کمال کو حاصل نہیں کرتا، جب تک کہ زکوٰۃ کی صورت میں ہمدردیٔ مخلوق ساتھ نہ ہو۔ آخر پر فرمایا کہ نماز پڑھ کر تم خدا کا کچھ نہیں بناتے اپنی ہی جان کی بھلائی کے لیے کچھ کام کرتے ہو جس کا نتیجہ بعد میں ظاہر ہوتا ہے۔ ضائع کچھ نہیں ہوتا اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔

؏۱۴۳ بَرِہ (روشن ہُوا) سے بُرھان وہ دلیل ہے جو دعویٰ کو روشن کردے جو نہایت مضبوط اور لامحالہ سچی ہو (غ)

اِلّا من کان ھودًا او نصارٰی۔ ھود جمع ھائد ہے اور ھاد کے لیے دیکھو ؏۹۲ قالوا میں یہود و نصاریٰ دونوں شامل ہیں اور یہ اصل میں دو جملوں کا اختصار کرکے ایک کردیا ہے یعنی یہودی کہتے تھے کہ یہودیوں کے سوائے کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔ عیسائی کہتے تھے کہ عیسائیوں کے سوائے کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔ جیسا کہ آیت ۱۱۳ سے ظاہر ہے ان کے اسی قول کو امانی یعنی آرزو یا دعویٰ باطل قرار دیا ہے اور ان سے دلیل مانگی ہے۔ یہودی کہتے تھے بغیر شریعت موسوی کے نجات نہیں، عیسائی کہتے تھے بغیر کفارہ کے نجات نہیں مگر کوئی دعویٰ بلا دلیل قبول نہیں ہوسکتا۔ قرآن دعویٰ کی دلیل دیتا ہے: دونوں کے پاس کوئی دلیل نہ تھی اس لیے عیسائیوں نے تو آخر مذہب ہی یہ بنالیا کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں۔ یہودی بھی محض کورانہ تقلید کے طور پر مذہب کو پیش کرتے ہیں۔ دونوں کے خلاف اسلام روشن دلائل سے کام لیتا ہے یہیں سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ اسلام ہر دعویٰ کی دلیل بھی پیش کرتا ہے۔

؏۱۴۴ اسلم۔ سَلم سے ہے جس کے معنی ہیں ظاہری اور باطنی آفات سے بچے رہنا اور اِسلام کے معنی ہیں سلامتی میں داخل ہونا اور اَسْلَمْتُ الشَّیْءَ اِلٰی فلانٍ کے معنی ہیں مَیں نے چیز دوسرے کو سونپ دی اور اسلام شریعت میں دو طرح پر ہے ایک محض زبان کے ساتھ اقرار کرنا اور یہ ایمان سے کمتر ہے مگر اس کے ساتھ اسلام کے ظاہری احکام جاری ہوجاتے ہیں جیسے قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا (الحجرات ۴۹ - ۱۴) ہیں اور دوسرا یہ کہ اقرار لسان کے ساتھ دلی اعتقاد اور عمل کے ساتھ وفا یعنی اقرار کو پورا کرنا اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے آپ کو بکلی سپرد کردینا بھی ہو۔ ان تمام باتوں میں جو اس کے قضا و قدر میں ہوں (غ) یہی دوسرے معنی یہاں مراد ہیں۔

وجہ۔ مُنہ ہے۔ اور چونکہ وجہ پہلی چیز ہے جو سامنے آتی ہے اور ظاہر بدن میں سب سے اشرف چیز ہے۔ اس لیے ہر سامنے آنے والی چیز پر اور ہر اشرف چیز پر اور اس کے آغاز پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات وجہ کہہ کر ذات یعنی خود وہ چیز مراد لی جاتی ہے اور اس کے معنی توجہ بھی ہیں (غ)

نجات عمل سے ہے نہ الفاظ سے: یہود و نصاریٰ کا دعویٰ تھا کہ ان کے سوائے دوسرے لوگ جنت میں داخل نہ ہونگے۔ جب آیت ماقبل میں اس کو دعویٰ بلا دلیل کہہ کر ردّ کیا تو اب یہ بتایا کہ مذہب دعوے کا نام نہیں بلکہ طریق عمل کا نام ہے اور جنت میں وہی داخل ہوتا ہے جو اس طریق عمل کو اختیار کرتا ہے جو جنت تک پہنچانے والی ہے منہ سے ایک یا دوسری بات کہہ دینا جنت میں نہیں پہنچاتا۔ اس میں ایک مسلمان کو تو یہ سمجھایا کہ نرا دعویٰ اسلام بھی جنت تک نہیں پہنچاتا جب تک وہ اس طریق عمل پر چلنے کے لیے پُورا زور نہ لگائے جو اسلام نے بتایا ہے اور دوسرے لوگوں کو یہ سمجھایا کہ وہ طریق عمل جو خدا تک پہنچاتا تھا وہ تم میں باقی نہیں رہا۔ طریق عمل جو جنت میں پہنچاتا ہے: وہ طریق عمل کیا ہے اپنی ساری توجہ کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگا دینا۔ اپنے آپ کو بکلی خدا کو سونپ دینا مگر نہ اس شخص کی طرح جو دنیا سے انقطاع کرلے۔ بلکہ خدا کی ایسی فرمانبرداری جس کا نتیجہ بنی نوع انسان کے ساتھ احسان اور مخلوق خدا کی خدمت گزاری ہو اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری جو نفس انسانی کا اپنی ذات میں کمال ہے اور مخلوق خدا کی خدمتگزاری جو دوسروں کی تکمیل میں معاون ہوتا ہے یہ سچے مذہب کے دو ستون ہیں

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ
وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ
وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا
يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١١٣﴾
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ
فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ
لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي
الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١١٤﴾

اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائی کسی (سچائی) پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں یہودی کسی (سچائی) پر نہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں اسی طرح انہی کے قول کی مانند وہ لوگ کہتے ہیں جو کچھ نہیں جانتے سو اللہ اُن کے درمیان قیامت کے دن ان باتوں کا فیصلہ کریگا جن میں وہ اختلاف رکھتے تھے ١٤٥

اور اُس سے بڑا کون ظالم ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکتا ہے کہ اُن میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے اور اُن کے ویران کرنے کی کوشش کرتا ہے انکو مناسب نہ تھا کہ اُن میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور انکے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے ١٤٦

اور ان کو کمال تک صرف اسلام نے پہنچایا۔

خوف و حزن سے نجات: اور آخر پر فرمایا کہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جنّت جو آخرت میں ملتی ہے اس کی ابتدا اسی زندگی سے ہوتی ہے اور اس زندگی میں وہ جنّت یہ ہے کہ انسان پر خوف نہ رہے نہ وہ غمگین ہو جس کی تشریح کے لیے دیکھو ع٥٩ یعنی وہ لوگ اللہ کی کامل فرمانبرداری جب کرتے ہیں تو شیطان بھی ان کا تابع ہو جاتا ہے اس لیے اس کے پھسلانے کا خوف ان کو باقی نہیں اور چونکہ ان کا وقت مخلوق خدا کی بہتری میں صرف ہوتا ہے اس لیے گزشتہ کے متعلق ان کو حزن بھی نہیں ہوتا۔ پس اس مقام پر پہنچ جانا یعنی ایک طرف گناہ کی غلامی سے آزاد ہونا اور شیطان کو فرمانبردار بنا لینا اور دوسری طرف مخلوق خدا کی بھلائی میں لگ جانا اس دنیا کی جنّت ہے اور یہی آخرت کی جنت کی دلیل ہے۔

ع١٤٥ ہر مذہب میں سچائی کے ہونے کی تعلیم: جب اس بات کو بیان کیا کہ نجات کس طرح حاصل ہوتی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ کسی مذہب کے متعلق یہ نہ کہنا چاہیئے کہ اس میں کوئی بھی سچائی نہیں۔ یہود اور نصاریٰ ایک ہی کتاب بائبل کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں مگر پھر بھی ضد میں آکر یہی کہتے ہیں کہ دوسرے فریق کے مذہب میں کچھ بھی صداقت نہیں۔ یہ جاہل لوگوں کا کام ہے کہ جب اپنے مذہب کی صداقت کو بیان کرنا شروع کیا تو دوسرے سب کو سراسر باطل اور تمام قسم کی خوبیوں سے خالی کہدیا۔ نجات کامل بیشک اسی میں ہے کہ کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگ جائے اور مخلوق خدا کے ساتھ احسان اس کی زندگی کا مقصد ہو۔ مگر تاہم کچھ نہ کچھ صداقت ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔ غلط عقاید پر اس دنیا میں گرفت نہیں: ہاں عقاید مذہبی کے اختلاف کا فیصلہ یہاں نہیں ہوگا۔ یعنی یہ نہیں کہ کسی کا عقیدہ ذرا غلط ہوا تو اللہ تعالیٰ اُسے فوراً ہلاک کردے یا کسی دُکھ میں مبتلا کردے جو کمی غلط عقاید کی وجہ سے رہ جاتی ہے اس کا کھلا ظہور قیامت کے دن ہی ہوگا اور وہیں اس کے پُورا کرنے کا سامان بھی ملیگا۔ اگلی آیت میں فرمایا کہ جو لوگ عباد تگاہوں کو ویران کرتے ہیں اور خدا کی عبادت سے روکتے ہیں ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے۔

ع١٤٦ مَسْجِد۔ سجدہ کرنے کی جگہ یعنی عباد تگاہ کا نام ہے (ت) بیت المقدس کو بھی مسجد ہی کہا ہے۔ مگر دوسری عباد تگاہوں کے بالمقابل خصوصیت سے یہ لفظ اسلام کی عباد تگاہ پر بولا جاتا ہے۔ جیسے لھدّمت صوامع وبیع وصلوٰت ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا (الحج ٢٢۔ آیت ٤٠)

خراب۔ عمارۃ یعنی آباد کرنے کی ضد ہے۔

خزی۔ انکسار کا پہنچنا ہے خواہ اپنی طرف سے ہو یا غیر کی طرف سے (غ) پس محض روکنے میں آخر کار ناکامی بھی خزی ہے اور دوسرے کا مغلوب ہو جانا بھی خدا کی عبادت سے روکنے کی سزا اسی دنیا میں ملتی ہے: پہلی آیت میں اختلاف عقاید کا ذکر کیا تھا کہ اس کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہوگا۔ یہاں فرمایا کہ جو لوگ دنیا میں شرارت میں حد سے بڑھ جاتے ہیں یہاں تک کہ مسجدوں میں خدا کی عبادت کو روکنے لگ جاتے ہیں اور ان کو ویران کرتے ہیں۔ ان کو سزا ابھی دنیا میں ہی مل جاتی ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے جس طرح ایک دوسرے کے مذہب کو ہر قسم کی خوبی سے عاری بتایا اسی طرح ایک دوسرے کو ان کی عباد تگاہوں سے بھی روکا اور ایک دوسرے کے ایسے دشمن ہو گئے کہ ہر فریق دوسرے کی بیخکنی کے درپے رہا جب اس کو طاقت ملی۔ اسی لحاظ سے مسجدوں سے روکنے کا ذکر کیا۔ مگر اس کو نبی کریمؐ کے اعدا کی حالت پر چسپاں کر کے بطور پیشگوئی ان اعدا کی ناکامی کا ذکر کیا۔ مساجد سے مراد مسجد حرام: نبی کریم صلعم کو اگر مشرکین نے مسجد حرام سے روکا (جس کی طرف لفظ مساجد میں اشارہ ہے اس لیے کہ وہ تمام دنیا کی مساجد کا مرکز ہے) تو یہود اور عیسائی بھی انہی کے معاون ہو گئے اس لیے ان کا انجام بھی اس پیشگوئی میں مذکور ہے اور جس طرح پہلی آیت میں یہ بتایا کہ کسی مذہب میں صداقت سے انکار نہیں کرنا چاہیئے یہاں یہ بتایا کہ تمام مذاہب

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور مشرق اور مغرب اللہ ہی کا ہے، پس جدھر تم متوجہ ہو گے اُدھر ہی اللہ کی توجہ بھی ہوئی، اللہ فراخی والا جاننے والا ہے ۱۴۷

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

اور کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا، وہ پاک ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا ہے، سب اس کے فرمانبردار ہیں ۱۴۸

کے پیروؤں کو عبادت میں آزادی دینی چاہیئے۔

مسلمانوں کا مسلمانوں کو مساجد سے روکنا: آنحضرت صلعم کے زمانہ میں تو کافر ہی مساجد سے روکتے تھے مگر آج تو مسلمان خود بھی اپنے مسلمان بھائیوں کو مساجد سے روکتے ہیں اور ایک فرقہ کا مسلمان دوسرے فرقہ کے مسلمانوں کو اپنی مسجد میں آنے نہیں دیتا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں ذلت اُٹھا رہے ہیں۔

دنیا کی سزا آخرت کی سزا پر بطور دلیل: یہاں دنیا کی سزا کو آخرت کی سزا کے لیے بطور پیش خیمہ اور ثبوت بیان فرمایا ہے جس وقت یہ لفظ نازل ہوئے اس وقت دشمنانِ اسلام کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی طاقت اور قوت کا خاتمہ ہو کر ان کو ذلت کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں یہ غیر متوقع امر صفائی سے پیش آیا اور یہودیوں اور دوسرے دشمنان اسلام کا چند ہی سال میں ذلیل ہو جانا قرآن شریف کی صداقت پر ایک بڑا بھاری نشان ٹھہرا۔

۱۴۷ ثَمَّ۔ ظرف ہے اور اس سے دور کے مکان کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

واسع۔ سَعَۃ فراخی ہے خواہ بلحاظ مکان ہو یا بلحاظ حالت یا فعل اور واسع اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک ہے اور اس کی قدرت اور علم اور رحمت اور فضلوں کی فراخی پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے ورحمتی وسعت کل شئ (الاعراف-۱۵۶) اور فرمایا وسع ربی کل شئ علما (الانعام-۸۰) (غ)

خانہ کعبہ سے روکا جانے پر مسلمانوں کو تسلی: یہاں قبلہ کا ذکر سمجھ کر جس پر کوئی قرینہ نہیں بعض نے اسے قبلہ بیت المقدس کے ناسخ اور بعض نے فول وجهك سے منسوخ بتایا ہے مگر اس آیت میں قبلہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ چونکہ پچھلی آیت میں بتایا تھا کہ مسلمانوں کو مساجد سے یا خدا کی عبادت سے روکا جاتا ہے تو یہاں مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ اگر ان کو خانہ کعبہ سے روکا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی توجہ خانہ کعبہ پر محدود نہیں بلکہ اے مسلمانو! اگر تم مسلمان ہو تو جہاں جاؤ گے اللہ کی توجہ وہیں تمہارے ساتھ ہوگی اور دوسرے جس طرح پہلی آیت میں پیشگوئی کی تھی کہ مسجدوں سے روکنے والوں یعنی اعدائے اسلام کے لیے بالآخر ناکامی ہے۔ بشارتِ فتوحات: یہاں اسی کی مزید وضاحت یوں کی کہ مسلمانوں کو غالب کیا جائے گا اور جن مسجدوں سے ان کو روکا جاتا ہے صرف یہی نہیں کہ ان پر ان کا پورا تصرف ہوگا بلکہ ان کو اس قدر فتوحات دی جائیں گی کہ وہ جدھر منہ پھیریں گے ادھر ہی فتح و ظفر ان کے ساتھ ہوگی اور ادھر ہی اللہ کی توجہ بھی ہوگی۔ کیونکہ مشرق و مغرب کا مالک اللہ ہی ہے ہمارے لیے اس میں یہ تسلی ہے کہ وہ خدا جس نے ایک زمانہ میں مشرق میں اسلام کو غالب کیا وہی اب مغرب میں بھی اسے غالب کرے گا۔

۱۴۸ ولد بمعنی مولود ہے جو جنا گیا۔ اور واحد جمع چھوٹے بڑے پر استعمال ہوتا ہے اور متبنّٰی کو بھی وَلَد کہا جاتا ہے او نتخذہ ولدا (یوسف ۱۲-۲۱) (غ)

لفظ ولد کا استعمال مجازی: اور مجازاً کہا جاتا ہے ارض البلقاء تلد الزعفران یعنی بلقاء کی سرزمین سے زعفران پیدا ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے اللیالی حبالی لیس یدری مایلدن۔ راتیں حاملہ ہیں کوئی نہیں جانتا ان سے کیا ظاہر ہونے والا ہے اور کہا جاتا ہے صحبۃ فلان ولادۃ للخیر فلاں کی صحبت سے خیر پیدا ہوتی ہے (ت) اور تولید بمعنی تربیت آتا ہے اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو فرمایا تھا انا ولدتک جس کے معنی ہیں میں نے تمہاری تربیت کی ہے۔ نصاریٰ نے اسے وَلَد سمجھ لیا اور تحریف کی (ت)

قانتون۔ قنوت خضوع کے ساتھ طاعت کو لازم کر لینا اور محض خضوع اور محض طاعت پر بھی بولا جاتا ہے (غ)

عیسائی عقیدہ کی بنیاد: یہاں عیسائیوں کے عقیدہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سورت میں زیادہ تر بحث یہود کی غلطیوں سے کی ہے اور کسی قدر عیسائیوں کی اور آل عمران میں عیسائیت پر مفصل بحث ہے، یہودیت سے کم۔ اتمام حجت کے لیے یہاں عیسائیوں کے عقیدہ کی اصل بنیاد کو لیا ہے یعنی مسیح کی ابنیت کا عقیدہ۔ کیونکہ کفارہ کا مدار بھی ابنیت مسیح پر ہی ہے۔

ابنیت مسیح کا عقیدہ: عیسائی کہتے ہیں کہ قرآن نے عیسائیوں کی طرف اتخاذ ولد کا عقیدہ منسوب کیا ہے حالانکہ وہ ابن مانتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ولد کا لفظ صرف حقیقت پر بولا جاتا ہے۔ اور ابن مجازاً بھی بولا جا سکتا ہے۔ یوں تو قرآن شریف نے دونوں لفظ بولے ہیں یعنی یوں بھی فرمایا ہے وقالت النصارٰی المسیح ابن اللہ (التوبہ ۹-۳۰) مگر اکثر ذکر اس عقیدہ کا لفظ اتخاذ ولد میں ہی کیا ہے۔ اس لیے کہ اس میں ان کے عقیدہ کی نامعقولیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ خدا کا بیٹا بطور مجاز: ظاہر ہے کہ اگر عیسائی مسیح کو مجاز کے رنگ میں خدا کا بیٹا مانتے ہیں تو مجازاً یہ لفظ اوروں پر بھی بولا گیا ہے اسرائیل خدا کا بیٹا بلکہ نخست زادہ کہلایا (خروج ۴ : ۲۲) اور خود مسیح کہتے ہیں "مبارک وے جو صلح کرنے والے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے" (متی ۵ : ۹) اور پھر کہتے ہیں "اور جو تمہیں دکھ دیں اور ستاویں ان کے لیے دعا مانگو تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ہو" (متی ۵ : ۴۴ و ۴۵) یعنی ہر ایک شخص راستباز بن کر خدا کا بیٹا بن سکتا یا کہلا سکتا ہے۔ انجیل کی شہادت کہ مسیح مجازاً خدا کا بیٹا کہلایا: اور یہی مجازاً استعمال اس لفظ کا ہے اور انجیل گواہ ہے کہ مسیح نے

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا
فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾
وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ
تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا

مادہ کے بغیر آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے[۱۴۹] اور جب ایک کام کا
حکم کرتا ہے تو اُسے کہہ دیتا ہے، ہو، سو وہ ہو جاتا ہے[۱۴۹الف]
اور جو لوگ کچھ نہیں جانتے، کہتے ہیں کیوں اللہ ہم سے کلام نہیں کرتا
یا ہمارے پاس نشان نہیں آتا، اسی طرح انہی کے قول کی مانند اُن
لوگوں نے کہا، جو اُن سے پہلے تھے اُن کے دل ایک ہی جیسے ہیں

اپنے لیے بھی یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا تھا جن معنوں میں دوسروں پر اس کا بولنا جائز ہے چنانچہ جب یہودیوں نے اسے کہا کہ ہم تجھے پتھراؤ کریں گے اس لیے کہ تو کفر بکتا ہے اور اپنے آپ کو خدا کہتا ہے تو حضرت مسیح نے یوں جواب دیا "اور کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا کہ میں نے کہا۔ تم خدا ہو جبکہ اس نے اُنہیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا ...... تم اس شخص سے جسے باپ نے مخصوص کر کے دنیا میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے اس لیے کہ میں نے کہا میں خدا کا بیٹا ہوں" (یوحنا ۱۰ : ۳۳-۳۶) پس مجاز کے رنگ میں خدا کا بیٹا بننے سے تو مسیح کی کوئی خصوصیت نہ رہی۔ اور اگر اس کی خصوصیت قائم کی جائے جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں تو پھر اسے حقیقی طور پر خدا کا بیٹا ماننا پڑے گا۔ اسی لیے قرآن کریم نے اتخذ اللہ ولدا کو ان کی طرف منسوب کیا اور اسی لیے اس پر یہ اعتراض کیا ولم تکن له صاحبة حقیقی بیٹا تو بغیر بی بی کے ہو نہیں سکتا اور تم خود بی بی کے قائل نہیں ہو۔

ابنیت کے عقیدہ سے خدا میں نقص ماننا پڑتا ہے: عیسائیوں کی اس خطرناک غلطی کا جہاں کہیں ذکر ہے اس کے بعد لفظ سبحان اللہ تعالیٰ کی شان میں بولا ہے سبحان کے معنی ہیں کہ وہ ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔ اور بیٹا بنانے میں نہ صرف اس کی طرف ایک ظاہری عیب ہی منسوب کرنا پڑتا ہے کہ جس طرح باپ بیٹے کا محتاج ہوتا ہے خدا بھی بیٹے کا محتاج ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں بھی عیب ماننا پڑتا ہے کیونکہ بیٹے کی ضرورت یہ بتائی جاتی ہے کہ خدا باپ میں عدل ہے رحم نہیں اور بیٹے میں رحم ہے پس خدا کی صفات ناقص ہوئیں جہاں رحم جیسی چیز ہی موجود نہیں۔ اس لیے جواب دیا کہ وہ عقیدہ صحیح نہیں ہو سکتا جو خدا کی طرف عیب منسوب کرتا ہے۔

ابنیت کے تعلق سے بڑھ کر مخلوق ہونے کا تعلق ہے: اس کے بعد یہ فرمایا کہ زمین اور آسمان میں سب کچھ اسی کا ہے اور سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔ یہاں بھی ابنیت کی تردید کی ہے اس لیے کہ فرمایا کہ خدا تو سب کا خالق اور سب کا مالک ہے اور سب اس کے پورے پورے فرمانبردار ہیں۔ حالانکہ باپ بیٹے کا نہ خالق ہوتا ہے نہ مالک اور نہ ہی بیٹا باپ کا کامل فرمانبردار رہ سکتا ہے پس جب خدا میں اور اس کی مخلوق میں باپ اور بیٹے کے تعلق سے بڑھ کر تعلق پہلے ہی موجود ہے تو پھر بیٹا بنانا لاحاصل ہوا۔

۱۴۹ بدع یا ابداع کے معنی ہیں ایسا بنانا جس کا پہلے نمونہ موجود نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے جب یہ لفظ استعمال ہو تو معنی ہوتے ہیں بغیر آلہ اور مادہ اور زمانہ اور مکان کے کسی چیز کا وجود میں لانا (غ) اور بدعت شریعت میں نئی بات داخل کرنے کا نام ہے۔

بغیر مادہ کے پیدا کرنے والا بیٹے کا محتاج نہیں: یہ آیت بھی ابنیت کے عقیدہ کی تردید کرتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ صاف فرمایا بدیع السموات والارض انی یکون له ولد ولم تکن له صاحبة وخلق کل شیء وھو بکل شیء علیم (الانعام ۶ : ۱۰۱) جب خدا چیزوں کا ایسا خالق ہے کہ اس کو آلہ اور مادہ کی ضرورت نہیں اور بیٹے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت ہے تو بیٹے کا تجویز کرنا خدا کی طرف پھر کمزوری کا منسوب کرنا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی درست نہیں کہ وحدت سے کثرت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ خدا ایک مدبر بالارادہ ہستی اور متصرف کامل ہے۔ بے جان قانون کی طرح نہیں۔

۱۴۹الف قضی۔ قضاء کے معنی ہیں ایک امر کا فیصلہ کر دینا قول سے ہو یا فعل سے اور اعلام یعنی اطلاع دیدینے اور حکم کے قطع کر دینے کو بھی قضاء کہا جاتا ہے پس قضی امرا کے معنی ہوئے کسی بات کا فیصلہ کر دیتا ہے یا کسی حکم کو جاری کرنا چاہتا ہے۔ اور قضاء اور قدر میں یہ فرق ہے کہ قدر کے معنی اندازہ کرنا ہیں اور قضاء اس پر اجرائے حکم کر دینا یا اس کا قطع کر دینا (غ) یا قدر اندازہ ہے اور قضاء اس کا نفوذ ہے گویا ہر ایک معاملہ قضاء سے پہلے حالت قدر میں ہوتا ہے لکھا ہے کہ نبی صلعم ایک غار کے پاس سے گزر رہے تھے جہاں کچھ پتھر گرنے کو تھے تو آپ بھاگ کر آگے نکل گئے کسی نے کہا اتفر من قضاء اللہ کیا آپ اللہ کی قضاء سے بھاگتے ہیں فرمایا افر من قضاء اللہ الی قدر اللہ میں اللہ کی قضاء سے اس کی قدر کی طرف بھاگتا ہوں۔

حکم کُن: مادہ کے غیر مخلوق ہونے کے قائل اعتراض کرتے ہیں کہ کن کا حکم کس کو دیتا ہے جواب ظاہر ہے کہ اس امر یا چیز کو جو علم الٰہی میں موجود ہے حکم ہوتا ہے کیونکہ قضاء سے پہلے قدر رہتے ہیں اور وہ چیز اندازہ الٰہی میں آچکی ہے گو ظاہر میں اس کا وجود نہیں۔ مادہ کا مخلوق ہونا تو خود بدیع لا کر بتا دیا۔ یہاں یہ بتاتا ہے کہ جو کچھ انسانوں کے نزدیک ناممکن ہے اللہ تعالیٰ وہ بھی کر دکھائے گا۔ اس کے ہاں ناممکن کچھ بھی نہیں اور انسان کی محدود طاقت پر اللہ تعالیٰ کی غیر محدود طاقت کا اندازہ کرنا غلط ہے۔

الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿١١٨﴾
اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّلَا
تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿١١٩﴾
وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ
مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ
اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ
الْعِلْمِ ۙ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١٢٠﴾ وقف منزل
اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ

ہم نے اُن لوگوں کے لیے کھولکر باتیں بیان کردی ہیں جو یقین رکھتے ہیں ١٥٠
ہم نے تجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے خوشخبری دینے والا اور ڈرانیوالا
اور تجھ سے دوزخ والوں کے متعلق بازپُرس نہ کی جائے گی ١٥١
اور یہودی تجھ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے اور نہ ہی عیسائی، یہاں تک
کہ تو اُن کے مذہب کی پیروی کرے، کہہ اللہ کی ہدایت وہی (کامل) ہدایت
ہے اور اگر تو اُن کی گری ہوئی خواہشوں کی پیروی کرے اسکے بعد جو
تیرے پاس علم آیا تو تیرے لیے اللہ (کی سزا) سے بچانیوالا نہ کوئی دوست اور نہ مددگار ہوگا ١٥٢
جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسکی پیروی کرتے ہیں جیسا اس کی پیروی کرنیکا

ع ١٥٠ یوقنون ۔ یقین کے معنی ع ٥ا میں بیان ہو چکے ہیں۔ تاج العروس میں ہے کہ یقین شک کے دُور ہونے اور علم اور تحقیق امر کو کہتے ہیں پس ایقن یا یوقن کے معنی یہ نہیں کہ ایک بات کو یوں ہی مان لے بلکہ اس کے لیے اس امر کا علم حاصل ہونا اور اس کی تحقیق بھی ضروری ہے یعنی قطعی طور پر اس کو درست پانا۔ پس قوم یوقنون سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس قوت یقین سے کام لیتے ہیں جو انسان کے اندر رکھی گئی ہے جس طرح قوم یعقلون سے مراد وہ لوگ ہیں جو قوت عقل سے کام لیتے ہیں اور قوت یقین سے کام لینا یہ ہے کہ جب انسان ایک امر کو تحقیق کے بعد درست پاتا ہے تو پھر چھوٹے چھوٹے شبہات اس کے دل میں نہیں اُٹھتے۔ اکثر لوگ جو حق سے محروم رہ جاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان میں قوت یقین نہیں ہوتی یا اس سے کام نہیں لیتے اور چھوٹے چھوٹے شبہات میں مبتلا رہتے ہیں۔

خدا کے عام لوگوں سے کلام نہ کرنے کا اعتراض: نصاریٰ کی غلطی کے ذکر کے بعد اب جاہل لوگوں کی ایک غلطی کا ذکر کیا ہے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ خدا اُن سے خود اس طرح کلام کرے جس طرح رسولوں سے کلام کرتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ ان کا قول نقل کیا ہے حتی نوتی مثل ما اوتی رسل اللہ (الانعام ٦ ۔ ١٢٤) یعنی کہتے ہیں کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہم کو بھی وہی کچھ نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں پر نازل کیا جاتا ہے۔ مطالبہ نشان ہلاکت: اور یا اگر ان سے کلام نہیں کرتا تو ان پر ایک عظیم الشان نشان بھیجے۔ اٰیۃ کی تنکیر اس کی عظمت کے لیے ہے اور مراد یہ ہے کہ ہلاکت کا نشان نازل ہو جیسا کہ دوسری جگہ صاف مذکور ہے فلیاتنا باٰیۃ کما ارسل الاوّلون (الانبیاء ٢١ ۔ ٥) یعنی جب پہلوں کی ہلاکت کا ذکر بار بار قرآن شریف میں ہے تو وہی ہلاکت کا نشان ہم پر کیوں نہیں اُترتا۔ دونوں باتوں کا جواب اگلی آیت میں دیا ہے۔

ع ١٥١ بالحق۔ حق کے معنی کے لیے دیکھو ع ٦٥ یہاں بالحق سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اقتضائے حکمت کے مطابق یعنی ضرورت حقہ کے پیش آنے پر تجھے بھیجا ہے اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حق یعنی صداقت دے کر تم کو بھیجا ہے کیونکہ وہ چیز جو رسول اللہ صلعم لائے حق ہی ہے۔

بشیر۔ بشارت دینے والا۔ بشارت کے لیے دیکھو ع ١٢٣ الف سب سے بڑی بشارت جو انبیاء اللہ لاتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق قرب کا پیدا ہونا ہے جو انسان کا کمال حقیقی ہے۔

نذیر کے معنی منذر ہیں یعنی انذار کرنے والا (انذار کے معنی کے لیے دیکھو ع ١٧) یعنی ایسی خبر دینے والا جس میں انسان کو انجام بد سے ڈرایا جائے۔

جحیم۔ جحمۃ۔ آگ کے شعلوں کی شدّت کو کہتے ہیں۔ اسی سے جحیم ہے

خدا کس سے کلام کرتا ہے: پہلی آیت کے سوال کا جواب دیا ہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا۔ اس کا جواب دیا ہے کہ ہم نے پیغمبر کو حق کے ساتھ خوشخبری دیکر بھیجا ہے اور وہ خوشخبری یہ ہے کہ اس کی اتباع سے انسان خدا کے قرب کو حاصل کر سکتا ہے اور جو خدا کے قرب کو حاصل کر لے گا خدا اس سے کلام بھی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ قدوس ہے ناپاک لوگوں سے جو طرح طرح کے گندوں میں مبتلا ہیں وہ کس طرح کلام کر سکتا ہے ہاں اگر وہ رسول کی بشیر کی حیثیت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، تو اس کا اتباع کریں۔ نشان ہلاکت کا آنا: اور دوسرا سوال تھا کہ ہم پر وہ نشان ہلاکت کیوں نہیں آتا جیسا پہلی قوموں پر آیا تو اس کا جواب دیا کہ اسی سے ان کو ڈرانے کے لیے تو ہم نے تمہیں بھیجا ہے۔ وہ تو آخر آئے گا۔ آخری الفاظ میں بتایا کہ راہ راست پر لانے کی ذمہ داری تم پر نہیں۔

ع ١٥٢ ملۃ۔ ملۃ کا اصل اَمْلَلْتُ الکتاب سے ہے یعنی میں نے کتاب لکھوائی۔ قرآن کریم میں ہے۔ ولیملل الذی علیہ الحق (٢۸٢) اور ملّۃ دین کی طرح ہے یعنی وہ رستہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ سے لوگوں کو بتایا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں

ملّۃ اور دین میں فرق: اور اس میں اور دین میں فرق یہ ہے کہ ملّۃ صرف اس نبی کی طرف مضاف ہوتی ہے جس سے وہ مذہب چلتا ہے۔ جیسے ملّۃ ابراھیم یا واتبعت ملّۃ اٰبائی اور اللہ کی طرف یا احاد اُمت کی طرف یہ لفظ مضاف نہیں ہوتا اور بحیثیت مجموعی کل قوم کی طرف مضاف

أُولَٰٓئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهٖ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع ۱۴/۹

حق ہے، وہی اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کوئی اس کا انکار کرتا ہے سو وہی نقصان اُٹھانے والے ہیں [۱۵۳]

يٰبَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾

اے بنی اسرائیل! میری نعمت کو یاد کرو، جو میں نے تم کو دی، اور یہ کہ میں نے تم کو قوموں پر فضیلت دی [۱۵۴]

ہو جاتا ہے جیسے یہاں ہے ملتہم اور دین خدا کی طرف یا احاد اُمت کی طرف جیسے دین اللہ یا دینی مضاف ہوتا ہے اور ملّۃ اس لحاظ سے کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے رستہ بنایا اور دین جس کے معنی طاعت ہیں اس کے لحاظ سے جو اس کو قائم کرتا ہے (غ)

اھواء۔ ھَوٰی کی جمع ہے جس کے معنی ہیں نفس کا میلان شہوت یا خواہشات کی طرف (غ) ھَوٰی کے اصل معنی نفس کا ارادہ ہیں اور خیر اور شر دونوں میں اس کا استعمال ہے (ت) مگر چونکہ اس کے معنی بلندی سے پستی کی طرف گرنا بھی ہیں (ت) اس لیے اکثر استعمال اس کا ان خواہشات پر ہے جو معاصی میں داخل ہیں۔ یا گری ہوئی خواہشات۔

عِلم کے معنی ہیں ادراك الشئ بحقيقته (غ) یعنی کسی چیز کا اپنی حقیقت کے ساتھ ادراک خواہ اس کی ذات کا ادراک ہو اور اس صورت میں ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے لا تعلمونهم الله يعلمهم اور خواہ کسی چیز کے لیے صرف یہ حکم ہو کہ اس کے لیے ایک دوسری چیز موجود ہے یا موجود نہیں جیسے فان علمتوهن مومنات (الممتحنۃ ۶۰-۱۰) پھر علم کی ایک تقسیم نظری اور عملی ہے۔ نظری وہ ہے جو صرف علم حاصل کر لینے سے کامل ہو جاتا ہے جیسے موجودات عالم کا علم اور عملی وہ جو بغیر عمل میں آنے کے کامل نہیں ہوتا جیسے عبادات کا علم۔ اور ایک تقسیم علم کی عقلی اور سمعی ہے یعنی وہ جو غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے اور وہ جو سماعت سے حاصل ہوتا ہے (غ) یہاں اھواء کے مقابل پر علم کا لفظ اختیار کر کے بتایا ہے کہ حقیقی مذہب ایک علم یا سائنس ہے اس کی کوئی بات دلائل سے خالی نہیں۔ اور وہ ایک قاعدہ اور قانون کا رنگ اپنے اندر رکھتا ہے۔ ڈھکوسلوں کا نام مذہب نہیں۔

اسلام ایک علم اور کامل ہدایت نامہ ہے: یہاں ہر ایک شخص مخاطب ہے اور بتایا ہے کہ یہود اور نصاریٰ حقیقت کی طرف تو غور نہیں کرتے کہ اسلام میں کیا کیا صداقتیں ہیں اور کس طرح مذہب کو کمال تک پہنچا دیا ہے۔ وہ صرف اسی شخص سے خوش ہو سکتے ہیں جو اُن کے مذہب کو اختیار کر لے۔ مگر ان کا مذہب کیا ہے؟ اس کا نام یہاں اھواء رکھا ہے۔ اپنی چند خواہشات ہیں جن کو دین میں داخل کر لیا ہے اور بالمقابل اسلام ایک علم ایک سائنس ہے جس نے مذہب کے سارے اصول کو کمال صفائی کے ساتھ بیان کیا اور ان کے باہم تعلقات قائم کیے اور ان کی حقانیت کے دلائل دیئے۔ اسی کو یہاں الھدٰی کہا ہے یعنی کامل ہدایت نامہ۔ پس صرف یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کے لیے ایک مسلم اس کامل ہدایت نامہ کو کیونکر چھوڑ سکتا ہے۔ آج بہتیرے لوگ محض عیسائیوں کو خوش کرنے کے لیے دین اسلام کے پاک اصول کو چھوڑ کر جو کچھ عیسائی کہتے ہیں ان کا تتبع کرتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ ایک اللہ کو راضی کرنے کی کوشش چاہیئے تھی۔

[۱۵۳] الکتاب سے مراد یہاں قرآن کریم ہے۔

يتلونه حق تلاوته کے معنی مجاہد سے مروی ہیں يعملون به حق عمله یعنی اس پر عمل کرتے ہیں جیسا عمل کرنے کا حق ہے۔ تلاوت کے معنی کے لیے دیکھو [۶۷]۔

کامل علم کے بعد عمل کی ضرورت: یہ رکوع قرآن کریم کے کامل ہدایت ہونے پر تھا۔ سو آیت ماقبل میں بالصراحت یہ ذکر کر کے اب رکوع کی آخری آیت میں عمل کی طرف توجہ دلائی ہے، بمقابلہ یہود و نصاریٰ کے اپنی کتابوں پر عمل نہ کرنے کے۔ اور بتایا ہے کہ کامل ہدایت نامہ ہونے سے بھی صورت میں فائدہ ہو سکتا ہے جب اس پر عمل کیا جائے۔ اس لیے فرمایا کہ یہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے یعنی آنحضرت صلعم کے صحابہ یہ اس کی پیروی کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں جیسا پیروی اور عمل کرنے کا حق ہے۔ اولئك يومنون به کہہ کر بتایا کہ اصل ایمان تو یہی ہے کہ انسان اس پر عمل کرے۔

صحابہ کا بے نظیر عمل قرآن پر: فی الواقعہ اگر غور کیا جائے تو جس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم پر عمل کیا کبھی کسی قوم نے کسی آسمانی کتاب پر اس طرح عمل کر کے نہیں دکھایا ہزاروں سالوں کی بدیوں اور ہزاروں سالوں کے رسم و رواج سے قرآن کی آیات کے نزول پر وہ یوں پاک ہوتے جاتے تھے کہ گویا کبھی ان میں یہ چیزیں تھی ہی نہیں۔ کوئی حکم قرآن شریف کا نازل نہیں ہُوا جس کو انہوں نے فوراً عمل میں لا کر نہیں دکھایا۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت: آج بھی لوگ مسلمان ہی کہلاتے ہیں مگر بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک بھی حکم قرآن شریف کا نہیں جس پر عمل ہو۔ الّا ماشاء اللہ معدودے چند اشخاص کو کچھ توجہ ہو تو الگ بات ہے۔ پس آج مسلمانوں کا شمار عملاً اس دوسرے حصّہ میں ہے جو فرمایا ومن يكفر به فاولئك هم الخاسرون کیونکہ جب حق عمل ادا نہیں کرتے تو اولئك يومنون به میں بھی داخل نہیں ہو سکتے۔

[۱۵۴] بنی اسرائیل کو تین مرتبہ خطاب: یہ تیسری مرتبہ بنی اسرائیل کو خطاب ہے۔ پہلے ان کو ان کی حالت موجودہ پر توجہ دلائی اور بتایا کہ رسول اللہ صلعم کے ساتھ ہو جانے سے وہ دنیا میں معزز بن جائیں گے۔ دوسری مرتبہ ان کو حضرت موسیٰ اور بعد کے زمانہ اور حضرت موسیٰ اور انبیائے بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں کی طرف

وَ اتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور اُس دن سے بچاؤ کرلو، جب کوئی جی کسی کے کچھ بھی کام نہ آئیگا اور نہ اس کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائیگا اور نہ اُسے سفارش نفع دے گی اور نہ ان کی مدد کی جائیگی۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور جب ابراہیمؑ کو اُس کے رب نے چند احکام سے آزمایا تو اُس نے اُن کو پورا کیا، فرمایا میں تجھے لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں،[۱۵۵] (ابراہیمؑ نے) کہا اور میری اولاد سے؟ فرمایا میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچیگا۔[۱۵۶]

توجہ دلائی اب تیسری مرتبہ حضرت موسیٰؑ سے بھی پہلے کا زمانہ اور ابراہیمی وعدہ یاد دلاتا ہے اور یہی اس کا تعلق پہلے مضمون سے ہے گویا اس طرح تین دفعہ خطاب کرکے اور ابتدائی وعدے یاد دلا کر بنی اسرائیل پر اتمام حجت کیا ہے۔

ع ۱۵۵ ابتلیٰ۔ بلی سے ہے جس کے لیے دیکھو ع۷۳۔ اَبْلٰی اور اِبْتَلٰی کے معنی میں امام راغب نے لکھا ہے کہ دو مفہوم شامل ہیں ایک اس کے حال سے واقفیت حاصل کرنا، دوسرے اس کی خوبی اور نقص کا ظاہر کردینا اور بسا اوقات یہ دونوں باتیں مقصود ہوتی ہیں اور بسا اوقات ان میں سے ایک ہی مقصود ہوتی ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ فاعل ہو تو صرف دوسرے معنی مراد ہوتے ہیں یعنی خوبی یا نقص کا ظاہر کردینا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ حالات سے تو واقف ہی ہے (غ) اور چونکہ اصل غرض ابتلا یا امتحان کی صرف خوبیوں یا نقصوں کا اظہار ہی ہوتا ہے اور حال سے واقفیت حاصل کرنا صرف ایک ذریعہ ہے جس کے بغیر انسان دوسرے کی جودت یا ردأت کا اظہار کرنے کے قابل ہی نہیں ہوسکتا اس لیے ع۷۲ میں جو اصول قائم کیا گیا ہے اس کے مطابق بھی ابتلیٰ کے یہی معنی ہیں یعنی مراد حضرت ابراہیمؑ کے کمالات کا ظاہر کرنا ہی ہے۔

ابراهیم۔ عبرانی نام ہے، بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دو عظیم الشان قوموں کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ان کا زمانہ غالباً کوئی ۲۳۰۰ سال قبل مسیح ہے۔ اور یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے نزدیک ایک عظیم الشان پیغمبر تھے۔ بلکہ مشرکین عرب بھی آپ کی اسی طرح عزت کرتے تھے۔ بائبل کے محرف ثابت ہونے کی وجہ سے یہ خیال بھی ہوا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کوئی تاریخی انسان نہ تھے۔ عرب سے تعلق: مگر عرب کی روایات اور عرب کا آپ سے تعلق اور خانہ کعبہ میں آپ کے نشانات اس خیال کو باطل ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

کلمات کے معنی ع۵۷ میں بیان ہوچکے کلمات اللہ سے مراد احکام الٰہی ہیں (غ) حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ یہ تیس احکام ہیں جن میں سے دس مومنوں کی صفت میں سورہ براءت میں ہیں دس احزاب میں دس معارج میں (ر)

اتم۔ کسی چیز کا تمام اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اپنے سے باہر کسی کی محتاج نہ رہے دوسری جگہ فرمایا وابراهیم الذی وفّی (النجم ۵۳۔ ۳۷) اور یہاں آگے آتا ہے اذ قال له ربّه اسلم قال اسلمت لربّ العالمین (۱۳۱)

امام۔ اَمّ سے ہے جس کے معنی ہیں اس نے قصد کیا اور امام وہ ہے جس کی پیروی کی جائے خواہ وہ انسان ہو جس کے قول یا فعل کی پیروی ہو، یا کتاب یا اس کے سوائے کچھ اور ہو حق پر ہو یا باطل پر (غ) باطل پیشرووں پر بھی یہ لفظ قرآن شریف میں آیا ہے وجعلنا هم ائمة یدعون الی النار (القصص ۲۸۔ ۴۱) اور یوم ندعوا کل اناس بامامهم (بنی اسرائیل ۱۷۔ ۷۱) میں امام کے معنی کتاب بھی لیے گئے ہیں۔

کلمات سے حضرت ابراہیمؑ کی تکمیل نفس: وعدہ ابراہیمی کے ذکر سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کی عظمت کا ذکر کیا ہے۔ جو تینوں قوموں، یہود، عیسائی اور مشرکین عرب کے نزدیک مسلّم راستباز تھے۔ پہلے احکام جو آپ کو دئے گئے وہ اپنی ذات کے کمال کے لیے تھے۔ جب آپ ان میں پورے اُترے تو پھر آپ کو امام بنایا گیا۔ یعنی دوسروں کا پیشرو مقرر کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی احکام الٰہی کا کامل فرمانبردار ہوتا ہے اسی لیے وہ دوسرے لوگوں کا پیشوا بنایا جاتا ہے مسلمانوں کو شهداء علی الناس یعنی دوسری قوموں کا پیشرو بنایا گیا تھا۔ مگر جب وہ اپنی تکمیل نفس سے ہی غافل ہوگئے تو دوسروں کے پیشرو بننے کے بھی اہل نہ رہے۔

ع ۱۵۶ ذریتی۔ ذریة اصل میں چھوٹی اولاد کو کہتے ہیں مگر چھوٹوں بڑوں سب پر بولا جاتا ہے۔ یہ یا ذرأ سے مشتق ہے جس کے معنے پیدا کرنا ہیں اور ہمزہ متروک ہوگیا ہے اور یا ذرّ سے مشتق ہے جس کے معنے پھیلانا ہیں (غ)

وعدہ ابراہیمی: چونکہ اصل مقصد وعدہ ابراہیمی کو یاد دلانا ہے اس لیے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کے متعلق جو وعدے تھے ان کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے اصل صحیفے تو اب نابود ہیں ہاں حضرت موسیٰؑ کی کتاب پیدائش میں کچھ ذکر حضرت ابراہیمؑ کا اور آپ کی اولاد کے ساتھ وعدوں کا اب بھی موجود ہے۔ ان کئی بابوں کے مضمون کو یہاں چند پُرمعنی الفاظ میں جن میں سے ایک ایک اپنے اندر وہ حکمت کی باتیں لیے ہوئے ہے، جو کتاب پیدائش میں مفقود نظر آتی ہیں بیان کیا ہے۔ قرآن بائبل سے نہیں لیا گیا، کیونکہ بائبل کی اصلاح کرتا ہے: بائبل کے کئی بابوں کے قائم مقام یہ چند لفظ ہیں

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ اور جب ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کے لیے مرجع اور امن بنایا ۱۵۷ اور ابراہیم

کہا اور میری اولاد سے" فرمایا میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا" یعنی تیری اولاد کو بھی ہم دنیا میں پیشرو بنائیں گے عزت دینگے برکت دینگے، لیکن اگر یہ لوگ ظلم کی طرف جھک جائیں تو پھر وہ اس وعدہ کے مستحق نہ رہیں گے۔ کیا حق و حکمت کی بھری ہوئی بات کہدی ہے۔ مگر بائبل میں یہ مفقود ہے وہاں لفظ عام ہیں "تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازہ پر قابض ہوگی اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پاوینگی (پیدائش ۲۲: ۱۷و۱۸) پس یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے بیانات بائبل سے نہیں لیے گئے۔ کیونکہ بائبل کے نقصوں کا وہ علاج کرتے ہیں اور مسلمانوں کو بھی ان الفاظ میں بتایا ہے کہ جب وہ ظلم اختیار کریں گے تو وہ بھی وعدہ الٰہی کی برکات سے محروم کردیئے جائیں گے۔

وعدہ ابراہیمی میں اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں شامل ہیں: من ذریتی کا لفظ یہاں لاکر یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس وعدہ میں حضرت اسماعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں شامل تھے اور گو یہود اور عیسائی اس کا انکار کرتے ہیں مگر بائبل سے اب بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اول اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں کی پیدائش سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کو فرمایا" میں تجھ کو ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دوں گا" (پیدائش ۱۲: ۲و۳) یہاں برکت دینے کے لفظ قابل غور ہیں۔ کیونکہ ابراہیمؑ کو برکت دینے والے مسلمان ہی ہیں جو پانچوں نمازوں میں کما بارکت علٰی ابراھیم وعلٰی اٰل ابراھیم پڑھتے ہیں۔ پھر حضرت ہاجرہ کے ساتھ وعدہ ہے" میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے نہ گنی جائے" (پیدائش ۱۶: ۱۰) پھر اسمٰعیلؑ کا نام لیکر فرمایا: " اور اسمٰعیلؑ کے حق میں میں نے تیری سُنی دیکھ میں اسے برکت دونگا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہونگے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا" (پیدائش ۱۷: ۲۰) یہی برکت دینے کا وعدہ حضرت ابراہیمؑ سے تھا وہی اسمٰعیلؑ سے بالخصوص ہے پس بائبل یہودیوں اور عیسائیوں کو جھوٹا ٹھہراتی ہے جو حضرت اسمٰعیلؑ کو ابراہیمی وعدہ میں شامل نہیں کرتے۔

وعدۂ ابراہیمی میں حضرت اسمٰعیلؑ کی شمولیت پر تاریخی شہادت: اگر تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو بھی وعدۂ ابراہیمی جس طرح بنی اسرائیل پر صادق آتا ہے۔ اسی طرح بنی اسمٰعیل پر بھی صادق آتا ہے" اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے"۔ دوسرا عہد اللہ تعالیٰ کا ابراہیمؑ کے ساتھ ہے" میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے دیتا ہوں کہ ہمیشہ کے لیے ملک ہو" (پیدائش ۱۷: ۷و۸) اب ایک طرف اگر بنی اسرائیل ختنہ کراتے ہیں اور اس عہد ابراہیمی کا نشان قائم رکھتے ہیں تو دوسری طرف بنی اسمٰعیل یعنی عرب کے لوگ بھی ختنہ کراتے اور اس عہد ابراہیمی کے نشان کو قائم رکھتے ہیں اور دنیا کی کسی اور قوم میں یہ نشان نہیں پایا جاتا۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت محمد مصطفٰے صلعم اصل موعود وعدہ ابراہیمی کے ظہور پر ایک ایسی قوم پیدا ہوتی ہے جو آپ کی روحانی اولاد ہونے کی وجہ سے اس عہد ابراہیمی کے نشان کو تاقیامت زندہ رکھتی ہے۔ دوسری طرف خدا کا عہد ابراہیمؑ کے ساتھ یہ تھا کہ کنعان کا ملک اس کی نسل کو ہمیشہ کے لیے دیا گیا۔ مگر وہ ملک اول یہود پھر عیسائیوں پھر مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اپنے وقت میں وہ اس وعدے کے صحیح مصداق تھے صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے اسی لیے بیت المقدس چھیننے کی کوشش کی گئی مگر آخرکار عیسائی ناکام رہے اور قریباً ایک سو سال کے بعد پھر مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔ اب پھر بظاہر یہ ملک مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے مگر ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ پھر کوئی سامان پیدا کرے کہ یہ ملک مسلمانوں کو واپس ملے یا اس کے مالک مسلمان ہوجائیں۔ بیت المقدس کا دو دو مرتبہ اصل حقداروں کے ہاتھ سے نکلنا: بنی اسرائیل کی تاریخ میں بھی دو ہی دفعہ بیت المقدس ان کے قبضہ سے نکلتا ہے پہلی مرتبہ وہ خود ہی دوبارہ اس میں آباد کردیئے جاتے ہیں جب خورس شاہ ایران نے بابلیوں کو تباہ کیا دوسری مرتبہ جب حضرت عیسٰیؑ کے ظہور کے بعد بیت المقدس تباہ ہوا تو اس کے تباہ کرنے والے یعنی رومی آخر خود عیسائی ہوگئے۔ اسی طرح پہلی مرتبہ مسلمانوں نے اپنی قوت بازو سے بیت المقدس کو عیسائیوں کے ہاتھ سے لیا۔ دوسری مرتبہ شاید یونہی مقدر ہو کہ جس قوم نے اس کو لیا ہے وہ مسلمان ہوجائے۔

۱۵۷ البیت۔ بیت اصل میں اس مقام کو کہتے ہیں جو رات کو جائے پناہ کا کام دے۔ کیونکہ بات کے معنی ہیں رات کاٹی اور بَیَّتَ کے معنی ہیں رات کو مشورہ کیا یا کام کیا فرمایا بیت طائفة منھم (النساء ۴-۸۱) (غ) مطلق البیت سے مراد بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ ہے۔

دنیا کی پہلی عبادت گاہ: قرآن کریم میں اس کو اول بیت وضع للناس (آل عمران ۳-۹۵) فرمایا یعنی سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی بھلائی کے لیے مقرر کیا گیا یعنی سب سے پہلی عبادت گاہ۔ اور ایک جگہ اس کو البیت العتیق (الحج ۲۲-۲۹) بھی فرمایا۔ یعنی قدیم گھر۔ ان دونوں ناموں کے علاوہ اس کا البیت کے نام سے مشہور ہو جانا صاف بتاتا ہے کہ اس گھر کو کوئی ایسی خصوصیت دنیا میں حاصل ہونے والی ہے جو کسی دوسرے گھر کو حاصل نہیں ہوئی۔

مثابة۔ ثوب سے ہے جس کے معنی کسی چیز کا پہلی حالت کی طرف رجوع کرنا ہیں (غ) اور اس کا مادہ وہی ہے جو ثواب اور مثوبة وغیرہ کا مادہ ہے اور مثابة وہ جگہ ہے جہاں لوگ بار بار لوٹ کر آئیں۔ تفرقہ کے بعد اجتماع مذاہب: اور بعض کے نزدیک اس کے معنی ہیں تفرقہ کے بعد لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ (ت) دونوں معنی کے لحاظ سے خانہ کعبہ اس لفظ کا مصداق ہے کیونکہ لوگ تاقیامت وہاں حج کے لیے آتے رہیں گے اور کیونکہ مذاہب عالم میں تفرقہ پیدا ہوجانے کی وجہ سے یہ مقام پھر ان کے اجتماع کا اور کل نسل انسانی کو ایک کرنے کا موجب ہوا۔

امن۔ مصدر ہے۔ بطور مبالغہ یہاں لایا گیا ہے اور مراد مقام امن ہے۔

خانہ کعبہ کی قدامت پر میور کی شہادت: البیت یا بیت اللہ یا خانہ کعبہ وہ پاک گھر ہے جس کی شہرت اور عزت عرب میں ایسے قدیم زمانہ سے چلی آتی ہے

وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴿۱۲۵﴾	کے مقام کو قبلۂ نماز بناؤ ع۱۵۸ اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو حکم دیا کہ میرے گھر کو پاک کرو طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں، سجدہ کرنیوالوں (کے لیے) ع۱۵۹

جس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ سر ولیم میور ایک مخالفِ اسلام یہ تسلیم کرتا ہوا لکھتا ہے "مکہ کے مذہب کی نمایاں خصوصیات کے لیے ایک نہایت ہی قدیم زمانہ تجویز کرنا پڑتا ہے۔ ڈائیڈورس سکولس سنہ عیسوی سے بھی نصف صدی پیشتر لکھتا ہوا عرب کے ذکر میں لکھتا ہے کہ اس ملک میں ایک معبد ہے جس کی عرب لوگ بہت ہی عزّت کرتے ہیں۔ ان الفاظ میں یقیناً خانہ کعبہ کا جو مکّہ میں ہے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اور کسی معبد کا عرب میں نام بھی نہیں جس کی عزّت عرب میں عام طور پر ہوئی ہو زبانی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ترین زمانہ سے خانہ کعبہ کا حج عرب کے ہر گوشہ کے لوگ کرتے رہے ہیں۔ یمن اور حضرموت سے خلیج فارس کے کنارہ سے۔ شام کے بادیہ سے۔ حیرہ اور عراق عرب سے لوگ ہر سال مکّہ میں جمع ہوتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اس قدر عام طور پر سارے ملک میں اس عزّت کا حاصل ہونا یقیناً ایک ایسے قدیم زمانہ سے ہونا چاہیئے جس کے پرے اور کوئی قدیم زمانہ تجویز نہیں ہو سکتا۔" بائبل میں بیت ایل اور اس سے مراد: بائبل میں بھی بیت ایل کا ذکر آتا ہے جس کا تعلق ابراہیم کے ساتھ ہے مگر بائبل کا بیان بیت ایل کے مقام کی تعیین میں قابل اعتبار نہیں اور اس پر بعد کے خیالات کا رنگ چڑھا ہُوا ہے۔ دنیا میں آج صرف ایک ہی مقام ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہا ہے جس پر بیت ایل یا بیت اللہ کا نام بولا گیا ہے اور وہ خانہ کعبہ ہے

کعبہ کے متعلق دو پیشگوئیاں: یہاں اس کے متعلق دو پیشگوئیاں بھی ہیں۔ اوّل یہ کہ یہاں لوگ تا قیامت جمع ہوتے رہیں گے یہ کبھی متروک نہ ہوگا، نہ برباد ہوگا، نہ دنیا کی کوئی طاقت لوگوں کو وہاں جمع ہونے سے روک سکے گی اور تفرقہ کے بعد لوگوں کا یہاں اجتماع ہوگا۔ دوسرا یہ کہ یہ ہمیشہ امن کا مقام رہے گا چنانچہ اس کا نام ہی حرم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا اولم یروا انّا جعلنا حرما اٰمنا ویتخطف الناس من حولھم (العنکبوت ۲۹-۶۷) کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم کو مقام امن بنایا ہے اور ان کے اردگرد کے لوگ زبردستی اُچک لیے جاتے ہیں۔ یعنی اس کے اردگرد دن رات جنگیں رہتی ہیں اور لوگوں کے لیے امن نہیں مگر اس مقام میں ایسا امن ہے کہ کسی کی مجال نہیں کہ اس کو توڑ سکے۔ عرب کی خونخوار طبائع کو جن میں دن رات جنگیں رہتی تھیں اس مقدس گھر کے سامنے اللہ تعالیٰ نے ایسا جُھکا یا کہ اس کی حدود کے اندر ان کی خونریزی کبھی ظاہر نہ ہوتی تھی۔ یہ خدائی تصرف تھا ورنہ اتنے بڑے ملک کا خود اتفاق کر کے اس بات کو عمل میں لانا اور عین جنگ کے جوش کے وقت میں اس پر قائم رہنا محال تھا جب مہذب سے مہذب قومیں بھی خونریزی کو اپنے انتہا تک پہنچا کر چھوڑتی ہیں۔ خانہ کعبہ پر کبھی اس کے دشمن قابض نہ ہوں گے: مقام امن کہنے میں یہ پیشگوئی بھی ہے کہ اس کا دشمن کبھی اس پر قابض نہ ہوگا بلکہ یہ انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہیگا جو دل سے اس کی عزت و احترام کرنے والے ہیں۔ چنانچہ ہمیشہ سے ایسا ہی رہا ہے اور گو بت پرست بھی اس پر قابض رہے مگر وہ بھی دل سے اس کا احترام کرنے والے تھے اور جب ایک عیسائی بادشاہ نے اسے منہدم کرنے کی نیت سے حملہ کیا تو وہ اور اس کا لشکر تباہ ہو گئے۔ حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ اس میں دجال اور طاعون کبھی داخل نہ ہونگے۔

ع۱۵۸ مقام ابراھیم۔ خانۂ کعبہ میں ایک معروف مقام ہے جو چھ ستونوں پر قائم اور آٹھ فٹ بلند ہے۔ یہاں طواف کے بعد دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے مگر یہاں مقام ابراہیم سے مراد بعض کے نزدیک مواقفِ حج، بعض کے نزدیک عرفات مزدلفہ وغیرہ ہیں اور بعض کے نزدیک سارا حرم اور بعض کے نزدیک خود خانہ کعبہ اور یہی درست ہے۔

مصلّٰی۔ نماز کی جگہ کو کہتے ہیں اور مجازاً قبلہ مراد ہے (ر) جیسا حدیث مسجدی اٰخر المساجد میں مسجد یا نماز کی جگہ سے مراد قبلہ ہے۔

خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم: یہاں مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز ادا کرنا ہے۔ بعض نے مزدلفہ، عرفات وغیرہ میں ذکر مراد لیا ہے۔ مگر بخاری میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا یا رسول اللہ لو اتخذت من مقام ابراھیم مصلّٰی۔ یا رسول اللہ اگر آپ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنائیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اب یہ سورت مدنی ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے عرض کرنے کا یہ منشاء نہ ہو سکتا تھا کہ خانہ کعبہ میں چل کر آپ دو رکعت نماز پڑھیں۔ یا مزدلفہ عرفات میں ذکر کریں۔ کیونکہ خود حج ہی رُکا ہُوا تھا پس اس سے مراد سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا تھا کہ خانہ کعبہ کو قبلہ بنایا جائے کیونکہ آنحضرت صلعم بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور سیاق مضمون بھی یہی چاہتا ہے۔ کہ جب یہ ذکر ہوا کہ خانہ کعبہ کو ہم نے لوگوں کے لیے مرجع اور امن بنایا ہے تو ساتھ ہی اس کے قبلہ بنانے کا ذکر ہو۔ یہی حکم یہاں دیا گیا ہے اور اس پر جو اعتراض ہوئے ان کا جواب سیقول السفہاء سے شروع ہوتا ہے۔

ع۱۵۹ عھدنا الی۔ عَھِدَ فلانٌ الی فلانٍ کے معنی ہیں کہ اس کے سامنے ایک عہد پیش کیا اور اس کی حفاظت کی تاکید کی (رغ)، یعنی عھد کا صلہ الی ہو تو اس کے معنی حکم دینا ہوتے ہیں۔

اسمٰعیل۔ حضرت ابراہیمؑ کے سب سے بڑے فرزند کا نام ہے جو حضرت ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوئے اور گو بائبل میں ان کو لونڈی کہا گیا ہے مگر وہ مصر کے شاہی خاندان میں سے تھیں۔ شاید قومی امتیاز کی وجہ سے ان کو لونڈی کہا گیا ہے۔ اسمٰعیل ان کا نام ان کی والدہ کو فرشتہ نے بتایا تھا جیسا کہ کتاب پیدائش میں مذکور ہے۔ اور یہ سمع اور ایل سے مرکب ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ نے سُن لیا۔ اسمٰعیلؑ اور ہاجرہ حکم خدا سے مکّہ میں چھوڑے گئے: حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ کو کسی دوسرے مقام پر چھوڑ آئیں۔ چنانچہ اسی حکم کے مطابق (جیسا کہ حدیث صحیح سے

وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ اٰمَنَ مِنۡهُمۡ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنۡ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيۡلًا ثُمَّ اَضۡطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۲۶﴾

اور جب ابراہیمؑ نے کہا میرے رب! اسکو امن والا شہر بنا دے اور اسکے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق دے جو کوئی ان میں سے اللہ اور پیچھے آنے والے دن پر ایمان لائے۔[ع۱۶۰] فرمایا اور جو کافر ہوگا تو اُسے بھی تھوڑا فائدہ اُٹھانے دونگا پھر اُسے آگ کے عذاب کی طرف بے بس کر دوں گا اور وہ بُرا ٹھکانا ہے[ع۱۶۱]

ثابت ہے کہ جب حضرت ہاجرہ نے حضرت ابراہیمؑ سے پوچھا کہ کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے تو انہوں نے فرمایا ہاں) نہ حضرت سارہ کے کہنے سے جیسا کہ بائبل میں ہے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ اور ہاجرہ کو خانہ کعبہ کے قریب چھوڑا جس کی صریح شہادت قرآن کریم کے ان الفاظ میں موجود ہے ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتك المحرم (ابراہیم ۱۴: ۳۷) بائبل میں ہے کہ فاران میں ان کو چھوڑا۔ عیسائی اس سے مراد ملک شام کا ہی کوئی جنگل لیتے ہیں جو واقعات سے غلط ثابت ہوتا ہے اور نہ صرف قرآن کریم اس کی تردید کرتا ہے بلکہ عرب کا اسمٰعیلؑ کی اولاد سے ہونا ایک امر مسلم ہے جس کا کوئی عیسائی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ قیدار جو حضرت اسمٰعیلؑ کے بڑے بیٹے کا نام ہے (پیدائش ۲۵: ۱۳) اس کا استعمال بائبل میں قوم عرب کی جگہ پایا جاتا ہے (زبور ۱۲۰: ۵۔ یسعیاہ ۴۲: ۱۱ و ۶۰: ۷ وغیرہ) عرب کا اسمٰعیل کی اولاد سے ہونا: دوسری طرف عرب کی روایات حضرت اسمٰعیلؑ کے یہاں آنے کو یقینی ٹھہراتی ہیں۔ خود خانہ کعبہ میں حضرت ابراہیمؑ کی یادگار موجود ہے۔ صفا اور مروہ میں حضرت ہاجرہ کی۔ اور عرب کا نہ صرف اپنا دعویٰ ہے کہ وہ اولاد اسمٰعیل ہیں بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ تک برابر اُن کے نسب نامے چلتے ہیں۔

طہرا۔ تطہیر کے معنی میں ظاہری طور پر اور باطنی طور پر پاک کرنا دونوں شامل ہیں یہاں بُتوں کی ناپاکی سے اور شرک باللہ سے تطہیر مراد ہے (ج)

طائفین۔ طائف۔ طوف سے ہے جس کے معنی کسی چیز کے گرد پھرنا ہیں۔ پس طائفین وہ ہیں جو اس کے طواف کے قصد سے آتے ہیں۔

عاکفین۔ عاکف۔ عکوف سے ہے جسکے معنی ہیں کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا اور اس کی تعظیم کے لحاظ سے اس کے ساتھ تعلق پیدا کر لینا (غ) اسی سے اعتکاف ہے جو آخری عشرہ رمضان میں مسجد میں رہنے کا نام ہے۔ عاکفین سے مراد بعض لوگوں نے مقیمین مکہ کو لیا ہے مگر مراد صرف عبادت کے لیے بیٹھنے والے ہیں۔ بحالت طواف طائف ہیں بحالت عبادت عاکف بحالت رکوع راکع (جمع رکع) بحالت سجدہ ساجد (جمع سجود)

تطہیر کعبہ: یہاں حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو خانہ کعبہ کی تطہیر کا حکم دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ خانہ کعبہ وہاں پہلے سے موجود تھا مگر وہاں بت وغیرہ رکھ دیئے گئے تھے جس طرح آنحضرت صلعم کے زمانہ سے پہلے۔ اور تطہیر سے مراد بتوں سے پاک کرنا اور بت پرستی اور شرک کو دور کرنا ہی ہے۔ ہاں اس کی کامل تطہیر نبی کریم صلعم کے ہاتھ سے ہونی مقدر تھی۔ حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے اس کی دوبارہ تعمیر بھی کی ہے جیسا آگے ذکر آتا ہے۔

ع۱۶۰ بلدا۔ بلد وہ مکان ہے جو خطوط سے محدود ہو اور اس کے ساکنوں کے اجتماع اور ان کی اقامت سے اس کے اندر انس کی حالت پائی جائے (غ) جس طرح مطلق لفظ البیت خانہ کعبہ پر بولا گیا ہے اسی طرح مطلق البلد مکہ معظمہ پر بولا گیا ہے لا اقسم بھذا البلد (البلد ۹۰: ۱)

مکہ کے لیے دعائے ابراہیم: حضرت ابراہیمؑ کی دعا تین باتوں کے لیے ہے ایک یہ کہ اس مقام کو بَلَد یعنی شہر بنا دے۔ کیونکہ پہلے وہاں شہر نہ تھا گو خانہ کعبہ تھا اور دوسرے امن والا۔ اور پھر اس جنگل میں اس کے رہنے والوں کے لیے پھل مہیا فرما دے وادی غیر ذی زرع یعنی بے آب و گیاہ جنگل میں رکھ کر یہ دعا بتاتی ہے کہ کس قدر ایمان اللہ کی قدرت پر تھا۔ اور آج فی الواقع دنیا بھر کے پھل مکہ میں ملتے ہیں۔ مگر دعا میں صرف مومنوں کی شرط رکھی۔ یعنی آپ یہ چاہتے تھے کہ یہاں صرف مومن ہی آباد رہیں۔

ع۱۶۱ امتعہ۔ متاع اس نفع کا حاصل کرنا ہے جو ایک وقت تک ممتد ہو (غ) پس امتعہ کے معنی ہوئے ایک وقت تک نفع اُٹھانے دُوں گا یعنی کفر یہاں ہمیشہ نہیں رہے گا۔

اضطر۔ اضطرار کے معنی ہیں انسان کو اس بات میں ڈالنا جو اس کے ضرر کا موجب ہو۔ اضطرار خارجی سبب سے بھی ہو سکتا ہے جیسے مغلوبیت سے بے بس ہونا اور داخلی سبب سے بھی بھوک وغیرہ سے (غ) مزید تشریح کے لیے دیکھو ع۲۱۱۔

مصیر۔ صیر کے معنی شق یعنی پھاڑنا ہیں اور صار کے معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کیا۔ اور مصیر وہ آخری حالت ہے جس میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کر کے انسان آخر کار پہنچتا ہے (غ)

عرب سے کفر مٹ جانے کی پیشگوئی: اللہ تعالیٰ کا رزق تو کافر و مومن کے لیے یکساں ہے اس لیے فرمایا دنیا کا رزق سب کو یکساں ملے گا کافر ہو یا مومن ہاں کافر کے لیے یہ تھوڑے دن کا رزق ہے یعنی حیات دنیا کا اور آخرت کے ثمرات سے جو اعمال کا نتیجہ ہیں وہ محروم رہ جاتا ہے۔ یا تھوڑے دن کے فائدہ سے یہ مراد ہے کہ کفر آخر کار اس ملک سے مٹ جائے گا۔ جیسا کہ آنحضرت صلعم کی تشریف آوری سے ہوا۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

اور جب ابراہیمؑ گھر کی بنیادیں اُٹھاتا تھا اور اسمٰعیلؑ (بھی) اے ہمارے رب! ہم سے قبول فرما، تو سُننے والا جاننے والا ہے ۱۶۲

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

اے ہمارے رب! اور ہم کو اپنا فرماں بردار بنا، اور ہماری نسل سے ایک گروہ اپنا فرماں بردار بنائیو اور ہمیں ہمارے حج کے اعمال بتائیو اور ہم پر رحمت سے توجہ فرما تُو رحمت سے توجہ فرمانیوالا، رحم کرنے والا ہے ۱۶۳

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ

اے ہمارے رب! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول اٹھا جو ان پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو پاک

ع۱۶۲ قواعد۔ قَاعِدَہ کی جمع ہے جس کے معنی بنیاد ہیں اور یہ قعد سے ہے جس کے معنی بیٹھنا ہیں (غ)

تقبل۔ قبل سے ہے جس کے معنی پہلے ہیں اور قَبِلَ کے معنی ہیں اس نے قبول کیا لا یقبل منھا شفاعۃ (۴۸) لا یقبل منھا عدل (۱۲۳) اور تَقَبُّلْ کے معنی ہیں ایسے رنگ میں کسی چیز کا قبول کرنا جس کا مقتضٰے ثواب ہو جیسے ہدیہ کا قبول کرنا اولٰئك الذین نتقبل عنھم احسن ما عملوا (الاحقاف ۴۶۔ ۱۶) — فتقبلھا ربّھا بقبول حسن (آل عمران ۳۔ ۳۷) انّما یتقبل اللہ من المتقین (المائدہ ۵۔ ۲۷)

السمیع۔ سمع اس قوت کا نام ہے جس سے سُنا جاتا ہے اور سُننے کے فعل کا بھی (غ) اور اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے جو سمیع ہے وہ بمعنی سامع ہے یعنی سننے والا۔ ہاں اس کا سُننا اس سے پاک ہے کہ وہ انسان کی طرح کان کا یعنی آلہ کا محتاج ہو (ت) اور یہی بات اس کی سب صفات میں پائی جاتی ہے۔

ابراہیم کا خانہ کعبہ کو تعمیر کرنا: اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے خانہ کعبہ کو بنایا۔ مگر یہ اس کے منافی نہیں کہ خانہ کعبہ ان سے پہلے بھی موجود تھا اس لیے کہ قرآن شریف اور احادیث سے اور خود تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ یہ دنیا میں خدا تعالیٰ کی عبادت کا سب سے پہلا گھر ہے دیکھو ع۱۵۷ پس چونکہ ہدایت و رشد کے اوّل معلّم حضرت آدمؑ ہیں۔ خانہ کعبہ پانچ مرتبہ بنایا گیا: اول مرتبہ انہی کے ہاتھ سے بنا۔ اور دوسری مرتبہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے اس کو بنایا۔ تیسری مرتبہ قریش نے آنحضرت صلعم کی بعثت سے کچھ پہلے اسے بنایا۔ جب حجر اسود سرورِ عالمؐ نے نصب فرمایا۔ اس کے بعد دو دفعہ پھر یہ بنایا گیا ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بنایا اور ایک دفعہ حجاج نے گویا کُل پانچ مرتبہ بنایا گیا۔ دو دفعہ آنحضرت صلعم سے پیشتر اور دو دفعہ آپ سے بعد اور ایک دفعہ آپ کی زندگی میں۔ جیسے معمار خانہ کعبہ کو ملے ایسے کبھی کسی اور گھر کو نہیں ملے۔ بیت المقدس کو حضرت سلیمانؑ نے بنوایا۔ خانہ کعبہ بنانے والے مزدور: مگر جس طرح حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور محمد رسول اللہؐ جیسے پاک اور فخر بنی نوع انسانوں نے خود کعبہ کے بنانے میں مزدوروں کا کام کیا ایسے مزدور نہ بیت المقدس کو نصیب ہوئے اور نہ کسی اور گھر کو۔

ع۱۶۳ مسلمین۔ مسلم کا تثنیہ ہے۔ اسلام کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۴۴ مسلم اس لیے مسلم کہلاتا ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے لیے اپنے آپ کو سپرد کر دیتا ہے یا شیطان کی غلامی سے محفوظ ہو جاتا ہے یا حق کا پورا پورا فرمانبردار ہو جاتا ہے (غ)

اُمّۃ۔ اُمّ کے معنی ماں ہیں۔ مگر اس کا استعمال بہت وسیع ہے یعنی ہر ایک چیز کو جو کسی شے کے وجود یا تربیت یا اصلاح یا آغاز کے لیے بطور اصل ہو اُمّ کہا جاتا ہے اور اُمّۃ کے معنی ہیں ہر ایک جماعت جن کو ایک امر جمع کرے خواہ ایک دین ہو یا ایک مکان یا ایک زمانہ اور خواہ یہ امر جامع تسخیر سے ہو یا اختیار سے (غ) جمع اُمَم ہے۔ اصطلاح شریعت میں اُمّۃ وہ ہے جسے ایک دین ایک جماعت بنائے۔

اَرِ۔ رُؤیۃ کا لفظ صرف آنکھ سے ادراک پر نہیں بلکہ وہم و تخیل یا تفکر یا عقل کے ساتھ ادراک پر بھی آتا ہے (غ)

مناسِك۔ مَنسِك اور مَنسَك کی جمع ہے اور نُسُك کے اصل معنی عبادت یا بہت عبادت ہیں اور مناسك بالخصوص اعمال حج پر بولا جاتا ہے۔ کیونکہ ان میں عبادت کے لیے معمولی حالت سے بہت کچھ بعد اختیار کرنا پڑتا ہے اور مَنسَك وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور اس کا قرب تلاش کیا جائے اور نسیکۃ ذبیحہ کو کہتے ہیں اور نہایہ میں ہے کہ نُسُك وہ امور ہیں جن کا شریعت حکم دیتی ہے اور ورع وہ جن سے وہ روکتی ہے۔

اس دعا میں دو امور کی طرف اشارہ ہے ایک اُمّۃ مسلمۃ کی طرف کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں کے پُورا کرنے والی ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ دنیا میں ایک ہی امت مسلمہ کہلائی گو سب انبیاء اللہ مسلم ہی تھے۔ ہاں جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت مسلمان معدودے چند آدمی تھے جو گھروں سے بھاگ کر دوسری جگہ پناہ گزین ہوئے تھے اور دشمن ان کو چاروں طرف سے تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ پس اس آیت کے نزول کے وقت یہ ایک پیشگوئی تھی۔ آج خدا کے فضل سے وہ اُمّۃ مسلمۃ چاروں طرف دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اعمال حج ابراہیمؑ کے قائم کردہ ہیں: دوسرے یہاں یہ بتایا کہ اعمال حج حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ

ع ۱۵/۸ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾	کرے، تو غالب حکمت والا ہے ۱۶۴
وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ ۚ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا ۖ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١٣٠﴾	اور کون ابراہیمؑ کے مذہب سے منہ موڑتا ہے سوائے اس کے جس نے اپنے آپ کو احمق بنایا اور یقیناً ہم نے اسے دنیا میں برگزیدہ کیا اور بے شک وہ آخرت میں اچھے لوگوں میں سے ہے ۱۶۵

کے ذریعہ سے قائم کیے گئے۔ یہ اعمال حج ہزارہا سال سے آج تک وہی چلے آتے ہیں پس یہ مشرکانہ رسوم نہیں بلکہ موحدین کے جد اعلیٰ کے قائم کردہ ہیں۔

۱۶۴ یزکی۔ زکا کھیتی پر بولا جاتا ہے جب اس میں نمو اور برکت حاصل ہو۔ اور تزکیۃ نفس کا خیرات اور برکات سے بڑھانا ہے اور فعل تزکیہ کبھی بندہ کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے لیے اکتساب کرتا ہے جیسے قد افلح من زکٰھا (الشمس ۹۱- ۹) اور کبھی خدا کی طرف کیونکہ فی الحقیقت وہی مزکّی ہے ولٰکن اللہ یزکی من یشاء (النور ۲۴-۲۱) اور کبھی نبی کی طرف اس لیے کہ وہ واسطہ ہوتا ہے یعنی اس کی باتوں اور اس کے نمونہ سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے جیسے یہاں۔

یعلّم۔ اعلام اور تعلیم میں یہ فرق ہے کہ اعلام اخبار سریع کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جلدی سے یا ایک دفعہ ایک بات کا علم دے دینا۔ اور تعلیم میں تکریر اور تکثیر پائی جاتی ہے یہاں تک کہ اس سے متعلم کے نفس پر اثر باقی رہ جائے اور بعض نے کہا ہے کہ تعلیم یہ ہے کہ معانی کے تصور کے لیے نفس کو آگاہ کیا جائے (غ) تعلیم کتاب تلاوت سے الگ رسول کا کام ہے: اور یہاں کتاب کے پڑھ دینے سے تعلیم کو الگ کر کے بتا دیا کہ تعلیم کتاب سے مراد اس کے معانی پر آگاہ کرنا ہے اور یہ رسول کے کاموں میں سے ایک کام ہے کہ وہ مومنوں کو کتاب کے معانی سمجھائے اور اس کی تشریح کرے جن لوگوں نے رسول کا کام صرف کتاب کا پڑھ دینا سمجھ لیا ہے انہوں نے سخت غلطی کھائی ہے۔

حکمۃ۔ حکم سے ہے جس کے اصل معنی ہیں اصلاح کے لیے روک دیا۔ اور حکمۃ کے معنی ہیں علم وعقل سے حق کو پا لینا (غ) یہاں حکمۃ سے مراد سنت۔ معرفت دینی۔ فقہ لی گئی ہے (ج) یہ ظاہر ہے کہ حکمۃ کتاب سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ اور اس کی تعلیم بھی رسول دیتا ہے اور وہ چیز وہی ہے جس کو سنت کہا جاتا ہے۔ یعنی تفصیلات شریعت کیونکہ دوسری وہی چیز ہے جس کی تعلیم رسول دیتا ہے۔

العزیز۔ اسمائے الٰہی میں سے ہے۔ عزّۃ انسان کی وہ حالت ہے جو اسے مغلوب ہونے سے بچاتی ہے۔ پس العزیز وہ ہے جو غالب ہے اور اس پر کوئی غالب نہیں۔

دعائے ابراہیم: حضرت ابراہیمؑ کی اسی دعا کی طرف جو اس آیت میں مذکور ہے اشارہ کرتے ہوئے نبی کریم صلعم نے فرمایا انا دعوۃ ابی ابراھیم میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا ہوں یعنی اس دعا کی قبولیت میرے ذریعہ ظاہر ہوئی ہے۔ دعا کا اثر: اس دعا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح بعض وقت اللہ تعالیٰ ایک دعا کا اثر ہزارہا سال بعد ظاہر کرتا ہے۔ اس میں یہ سبق ہے کہ دنیا کی بہبودی اور بہتری ایک دن کا کام نہیں۔ بڑے کام ایک لمبے وقت کو چاہتے ہیں۔

اُمّت مسلمہ اور تزکیہ کا ذکر پیشگوئی کے طور پر: قرآن کریم نے یہ دعا دنیا کو اس وقت یاد دلائی جب ابھی نہ امت مسلمہ کا وجود تھا اور نہ اس امت مسلمہ کی تعلیم و تزکیہ کا۔ صرف چند مسلمان تھے جن کی جانیں معرض خطر میں تھیں اور سارا جزیرہ نمائے عرب کفر و شرک فسق و فجور سے بھرا ہوا تھا اور پھر یہ دعا کس طرح پوری ہوئی کہ نہ صرف سارا عرب ہی امّت مسلمہ بنا بلکہ یہ امت مسلمہ دنیا کے سارے ملکوں میں پھیلی اور ان کا ایسا تزکیہ ہوا کہ پھر یہ دنیا کے مزکّی بنے اور ان کو ایسی تعلیم کتاب و حکمت دی گئی کہ پھر یہ دنیا کے معلّم بنے۔ جیسا کہ آگے اسی مطلب کو ظاہر کرنے کے لیے فرمایا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا یعنی رسول اللہ صلعم کی تعلیم اور تزکیہ کا یہ نتیجہ ہے کہ تم دنیا کے معلم اور مزکی بننے کے اہل ہو گئے ہو اور اس لیے ہم نے تم کو دوسرے لوگوں کا پیشرو بنایا ہے۔

رسول کے چار کام: یہاں رسول کے چار کام بیان فرمائے ہیں۔ اوّل ان آیات کی تلاوت اپنی امت پر کرنا ہے جو اس پر نازل ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ کتاب جو اس پر نازل ہوتی ہے اپنے پیروؤں کو سکھاتا ہے۔ تیسرے ان کو حکمت سکھاتا ہے۔ یعنی وہ باریک باتیں جو اس پر وحی خفی سے ظاہر ہوتی ہیں۔ چوتھے وہ ان کے لیے نمونہ بن کر اور اپنی قوت قدسی سے ان کو آلائشوں سے پاک کرتا ہے۔ جو شخص یہ چار کام نہیں کرتا وہ رسول نہیں۔ علمائے ربانی: ہاں علمائے ربانی اور امت کے لوگ بھی ایک رنگ میں یہ کام کرتے ہیں۔ مگر وہ رسول صلعم پر جو آیات نازل ہوئیں ان کی تلاوت کرتے ہیں اور رسول پر نازل شدہ کتاب کی تعلیم دیتے ہیں ان کی حکمت بھی رسول سے مستعار ہے اور ان کی قوت قدسی اسی رسول متبوع سے حاصل کی جاتی ہے۔

۱۶۵ یرغب۔ رغب کا اصل مفہوم کسی چیز میں وسعت ہے اور رغبۃ۔ رغبی۔ رغب ارادہ میں وسعت ہے رغب کا صلہ الٰی یا فی ہو تو مراد اس چیز کی خواہش اور آرزو ہوتی ہے جیسے انا الی ربنا راغبون (القلم ۶۸-۳۲) میں اور صلہ عن ہو تو مراد اس سے خواہش اور ارادہ کا پھر جانا ہوتا ہے جیسے یہاں۔ (غ)

اِذۡ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسۡلِمۡ ۙ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۳۱﴾

جب اسکے رب نے اسے کہا فرمانبردار رہ، کہا میں جہانوں کے رب کا فرماں بردار ہوں ع۱۶۶

وَوَصّٰى بِهَآ اِبۡرٰهٖمُ بَنِيۡهِ وَيَعۡقُوۡبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰى لَـكُمُ الدِّيۡنَ فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ؕ ﴿۱۳۲﴾

اور ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو یہی وصیت کی اور یعقوبؑ نے (بھی) اے میرے بیٹو! اللہ نے یہ دین تمہارے لیے چُن لیا ہے پس نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم فرماں بردار ہو ع۱۶۷

اَمۡ كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ ۙ اِذۡ قَالَ لِبَنِيۡهِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ ؕ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۳﴾

یا کیا تم موجود تھے جب یعقوبؑ کو موت آئی جب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ انھوں نے کہا ہم تیرے خدا کی عبادت کرینگے اور تیرے بڑوں ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ کے خدا کی جو ایک ہی خدا ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں ع۱۶۸

سفہ نفسہ۔ سفہ جسمانی ہلکا پن پر بولا جاتا ہے۔ اور کم عقلی کی وجہ سے جو ہلکا پن نفس میں پیدا ہوتا ہے اس پر بھی استعمال ہوتا ہے سَفِہ لازمی ہے اور سَفِہ نَفْسَہ اصل میں سَفِہ نفسُہ تھا (غ) یا نَفْسَہ بطور تمیز ہے۔

اصطفینا۔ اصطفیٰ کا اصل صفو ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا ملاوٹ سے پاک ہونا اور اصطفاء کے معنی ہیں ایک چیز کے خالص حصّہ کو لینا۔ اللہ تعالیٰ کا اصطفاء دو طرح پر ہے ایک ملاوٹ اور کھوٹ سے پاک رکھنا۔ دوسرے چُن لینا اور برگزیدہ کرنا۔ ہمارے نبی کریم صلعم کا نام مصطفےٰ ہے کیونکہ آپ کو تمام کھوٹوں اور ملاوٹوں سے پاک پیدا کیا گیا۔

فیصلہ کے لیے ملّت ابراہیمی کا اصل: چونکہ حضرت ابراہیمؑ کا تقدس بہت سی قوموں میں مسلم تھا اس لیے اب ملّت ابراہیمی کے اصل الاصول کو بیان کیا اور بتایا کہ اس کو ایک امر مشترک کے طور پر قبول کر لو تو مذہبی جھگڑا آسان ہو جاتا ہے اور اس کو رد کرنا خود اپنے مذہب کے اصل الاصول کے خلاف چلنا ہے۔

ع۱۶۶ عملی اصول: پہلے ملّت ابراہیمی کا اصل عملی رنگ میں بیان کیا اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا کامل فرمانبردار ہو جو احکام الٰہی ہوں ان کے خلاف دنیا کے کسی مال، عزّت، شہرت، آرام، جان تک کی پروا نہ کرے۔ اسلام یعنی فرمانبرداری کے ساتھ ربوبیت عالمین کا ذکر اس بات کے بتانے کے لیے ہے کہ وہ فرمانبرداری مخلوق خدا کی بھلائی کے لیے ہے گویا جس خیال کو ایک جگہ اسلم وجھہ للہ و ھو محسن سے ظاہر کیا ہے۔ اسی کی طرف یہاں اسلمت لرب العالمین میں اشارہ کیا ہے۔

مسلم کا مقام بلند: اسلام جس کو یہاں ملّتِ ابراہیمی کا عملی اصل الاصول قرار دیا گیا ہے۔ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی وہ کامل فرمانبرداری جس کو اسلام کے نام سے ظاہر کیا گیا ہے اس امر کا مقتضی ہے کہ انسان کسی اور چیز کے آگے نہ جھکے خواہ دنیوی مال و عزت کا لالچ ہو، خواہ خدا کے نیچے کسی دوسری طاقت کا خوف، سارے لالچوں اور ساری مشکلات کے ہوتے ہوئے اپنے فرض کا بجالانے والا حقیقی معنی میں مسلم ہے۔ اور یہی اعلیٰ سے اعلیٰ مقام ہے جس پر انسان کھڑا ہو سکتا ہے۔

ع۱۶۷ وصّٰی۔ وصیۃ کے معنی ہیں دوسرے کے سامنے کوئی بات پیش کرنا جس پر وہ عمل کرے اس کو وعظ کے ساتھ ملاتے ہوئے (غ) اصل معنی کے لحاظ سے یہ ضروری نہیں کہ حالت استحضار میں یا بستر مرگ پر بات کہی جائے۔

یعقوب حضرت ابراہیمؑ کے پوتے اور حضرت اسحاقؑ کے بیٹے کا نام ہے ان کا دوسرا نام اسرائیل ہے۔ بائبل میں ہے کہ حضرت اسحاقؑ کے ہاں عیسو اور یعقوبؑ توام پیدا ہوئے اس طرح کہ یعقوب کا ہاتھ عیسو کی ایڑی پر تھا اس لیے ان کا نام یعقوبؑ ہوا۔ اسحاقؑ کے ساتھ جو برکات کے وعدے تھے وہ صرف یعقوبؑ کی نسل میں پورے ہوئے اور بنی اسرائیل یعقوب کی ہی اولاد ہیں۔

ابراہیمؑ کا توحید پر قائم ہونا: اس میں یہی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کیسے توحید الٰہی کے شیدا تھے کہ یہی وصیت انہوں نے اپنے بیٹوں کو کی اور ایسا ہی ان کے خاندان میں یہی اثر چلا یہاں تک کہ یعقوبؑ نے بھی اپنی اولاد کو یہی نصیحت کی۔ اس سے معلوم ہُوا کہ انبیاء کی وصیت بھی امور دینی کے متعلق ہوتی ہے یہ برگزیدہ وجود دنیا میں نیکی قائم کرنے آتے ہیں وہی ان کا ترکہ اور وہی ان کا ورثہ ہوتا ہے مال و دولت کا ورثہ نہیں چھوڑتے اسی لیے مخبر صادق نے فرمایا ما ترکنا ہ صدقۃ۔

ع۱۶۸ اٰبا۔ اب کی جمع ہے اور وہ والد ہے مگر اُمّ کی طرح اَبْ کا استعمال بھی ہر ایک اس چیز پر ہوتا ہے جو کسی چیز کے وجود میں لانے یا اصلاح یا ظہور کا باعث ہو (غ)، اور چچا اور باپ کو اکٹھے اَبَوَین کہہ دیتے ہیں اسی طرح باپ اور دادا کو بھی اور باپ اور ماں کو بھی۔ یہاں حضرت اسمٰعیلؑ کو جو یعقوبؑ کے

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۴﴾

یہ ایک جماعت ہے جو گزر چکی ان کے لیے ہے جو انھوں نے کمایا اور تمھارے لیے ہی جو تم نے کمایا اور اسکے متعلق تم سے باز پرس نہیں ہوگی جو وہ کرتے تھے ۱۶۹

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۳۵﴾

اور کہتے ہیں یہودی ہو جاؤ یا عیسائی تم ہدایت پالوگے، کہہ بلکہ (ہم) ابراہیمؑ کے مذہب (پر ہیں) جو راست رو تھا اور وہ شرک کرنیوالوں میں سے نہ تھا ۱۷۰

قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۶﴾

تم کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اسکی اولاد کی طرف اتارا گیا، اور اس پر جو موسٰیؑ اور عیسٰیؑ کو دیا گیا، اور اس پر جو نبیوں کو اپنے رب کی طرف سے دیا گیا ۔ ہم اُن میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں ۱۷۱

چچا تھے آباء میں شامل کیا ہے۔

اسحاق ۔حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے کا نام ہے جو حضرت سارہ کے بطن سے تھے۔

یہاں عبادت کا لفظ اختیار کیا جو اسی عملی اصل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔کیونکہ عبادت خود عمل سے ہے اور اصلی عبادت جوارح کی عبادت ہی ہے۔

ع۱۶۹ خلت ۔جب زمانہ کے لحاظ سے خلیٰ بولا جائے تو اس سے مراد ہوتی ہے مضی و ذھب یعنی وہ گزر چکا (غ) گویا دنیا سے ان کا تعلق منقطع ہو چکا اور وہ خدا سے جا ملے۔

انبیاء سب ایک امت ہیں: یہاں ان سب انبیاء اور برگزیدوں کو ایک امت کہا ہے۔کیونکہ وہ سب ایک ہی طریق کے پیرو تھے۔گو شرائع کی فروعات میں اختلاف ہو۔ مگر یہاں چونکہ عملی اصل الاصول اسلام کا ذکر ہے اور سب انبیاء یقیناً اس اصول پر قائم تھے اس لیے ان کو ایک اُمّت کہا ہے اور یہ کہہ کر کہ یہ امت گزر چکی بتایا ہے کہ ان کے اعمال اب تم کو فائدہ نہیں دے سکتے گو تم ان کی اولاد ہو۔

ع۱۷۰ حنیف ۔ حنف سے ہے جس کے معنی ہیں گمراہی سے استقامت کی طرف مائل ہونا (غ) اس کے خلاف جنف ہے جس کے معنی ہیں استقامت سے گمراہی کی طرف مائل ہونا۔پس حنیف وہ ہے جو استقامت کی حالت پر قائم ہے۔نہ افراط کی طرف جھکتا ہے نہ تفریط کی طرف۔

ملّت ابراہیمی کا اعتقادی اصل : ملّت ابراہیمؑ کے عملی اصل الاصول کا ذکر کرنے کے بعد اب اعتقادی اصل الاصول کا ذکر کرتا ہے اور پہلے مخالفوں کا قول نقل کرتا ہے کہ یہود تو کہتے ہیں کہ اعتقادات یہود کو قبول کرنے سے ہدایت ملتی ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ عیسائی مذہب کے اعتقادات کو قبول کرنے سے ہدایت ملتی ہے۔اس کے جواب میں فرمایا کہ نہیں تم دونوں شرک کی طرف جُھک گئے ہو۔ اصل الاصول ملّت ابراہیمی کا یہی ہے کہ شرک سے اجتناب کلی ہو۔پس اعتقادی رنگ میں مذہب کی بنیاد یہ قرار دی جائے گی کہ خدا تعالیٰ کی توحید کو ہر قسم کے شرک کی آمیزش سے خالص کر کے قبول کیا جائے۔

ع۱۷۱ اسباط ۔سِبْط کی جمع ہے جس کے معنی قبیلہ ہیں۔یعنی وہ لوگ جو ایک آدمی کی نسل سے ہوں ۔یہ لفظ بالخصوص اولاد اسرائیل پر بولا گیا ہے کیونکہ اسرائیل کے بارہ بیٹوں میں سے ہر ایک ایک قبیلہ کا جد بنا۔

نفرق ۔تفریق، فرق سے تکثیر کے لیے ہے انبیاء میں تفریق نہ کرنے سے یہ مراد ہے کہ بعض کو نہ مانا جائے بعض کو مانا جائے یہ مطلب نہیں کہ سب کا مرتبہ یکساں ہے کیونکہ اس کے خلاف فضلنا بعضھم علی بعض (۳ ۲۵) موجود ہے۔

احد ۔نفی میں لفظ اَحَد جمع کا فائدہ دیتا ہے اس لیے تفریق کو احد کی طرف منسوب کیا گیا۔

جامعیت مذہب اسلام : اس آیت میں نہ صرف مذہب کے اصل الاصول ایک اللہ پر ایمان کا ذکر کیا ہے بلکہ سچے اور کامل مذہب کی جامعیت کا ذکر بھی کیا ہے اور اس کی غرض یہی ہے کہ یہ اصل الاصول ایک خدا پر ایمان ملت ابراہیمی کا ہی نہیں۔ دنیا کے کل نبی ایک ہی مذہب پر تھے ؛ بلکہ دنیا میں جس قدر بھی نبی ہوئے سب کے مذہب کا اصل الاصول یہی تھا اس لیے ایک مسلمان سب انبیاء پر ایمان لاتا ہے ۔کیونکہ وہ سب ایک ہی اصول پر قائم تھے اور ایک ہی غرض کو پورا کرنے آئے تھے ۔ یہاں اوّل تو چار بڑے انبیاء کا ذکر کیا۔یعنی ابراہیمؑ ۔اسمٰعیلؑ ۔اسحاقؑ ۔یعقوبؑ ۔پھر سب انبیائے بنی اسرائیل کا مجمل ذکر اسباط کے لفظ میں کیا ۔پھر یہود کے سب سے بڑے نبی موسٰیؑ کا ذکر کیا۔پھر عیسائیوں کے نبی عیسٰیؑ کا ذکر کیا اور ان سب کے بعد ما اوتی النّبیون کہہ کر یہ بتا دیا کہ سلسلہ ابراہیمی یا سلسلہ موسوی کے سوائے اور بھی دنیا میں نبی ہوئے ہیں۔ان کی بھی یہی تعلیم اصلی تھی ان کو بھی ہم انبیائے برحق مانتے ہیں۔

ما انزل من قبلك کی تفسیر: اور یوں جو ابتدائے سورۃ میں فرمایا تھا کہ اس پر ایمان لائیں جو تجھ سے پہلے اتارا گیا ۔اس کی تشریح خود ہی فرما دی کہ اس سے

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٣٧﴾

پس اگر وہ ایمان لائیں اس کی مثل جو تم ایمان لائے تو یقیناً انھوں نے ہدایت پائی اور اگر پھر جائیں تو وہ صرف مخالفت پر ہیں پس اللہ ہی انکے مقابلے میں تیرے لیے کافی ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے ع۱۷۲

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿١٣٨﴾

اللہ کا رنگ، اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں ع۱۷۳

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿١٣٩﴾

کہہ کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو اور وہ ہمارا رب ہے اور تمھارا رب ہے اور ہمارے لیے ہمارے عمل اور تمھارے لیے تمھارے عمل ہیں اور ہم اسی کے لیے اخلاص رکھنے والے ہیں ع۱۷۴

مراد وہ کلام ہے جو انبیاء پر نازل کیا گیا خواہ وہ ایک قوم کے نبی ہوں یا دوسری کے۔

ع۱۷۲ شقاق۔ شق سے ہے یعنی شگاف جو کسی چیز میں ہو شققنا الارض شقا (عبس۸۰-۲۶) اور شِقَّة اس ٹکڑے کو کہا جاتا ہے جو الگ ہو جائے۔ اور اسی سے شقاق بمعنی مخالفت ہے۔ گویا شقاق میں شِقّ مخالف اختیار کر لی ہے اور شِق بمعنی مشقت بھی آتا ہے الا بشق الانفس (النحل۱۶-۷)

سیکفیکھم اللہ۔ کفایۃ کے معنی ہیں مشکلات کا سدِّ باب کر دینا اور کسی معاملہ میں مراد کو پہنچ جانا اور اس جملہ کے معنی ہیں کفاك اللہ شرھم یعنی اللہ ان کی شرارتوں سے بچا کر تمہیں مراد کو پہنچائے گا اور ان کی مخالفت تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔

اسلام کسی بزرگ کو جھوٹا نہیں کہتا: یہاں یہ بتایا کہ ایسے صاف اور جامع مذہب پر ایمان نہ لانے والے وہی لوگ ہوں گے جو حق کے دشمن ہیں کیونکہ اس مذہب کو مان لینا جو دنیا کے سارے انبیاء کو راستباز ٹھہراتا ہے۔ عین اقتضائے عقل و انصاف ہے اور یہ مذہب کسی بزرگ کو جھوٹا اور مفتری قرار نہیں دیتا۔ اگر یہ سیدھی سیدھی بات نہ مانیں تو سمجھ لو کہ صرف حق کی مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں مگر ان کی مخالفت کی پروا نہ کرو ان کی شرارتوں سے خدا تعالیٰ تم کو محفوظ رکھے گا۔

ع۱۷۳ صِبغۃ۔ صِبغۃ اصل میں رنگ کو کہتے ہیں اور یہاں مراد دین ہے۔ کیونکہ جس طرح رنگ کا اثر کپڑے پر ہوتا ہے اسی طرح مذہب کا اثر انسان پر ہوتا ہے۔ بعض نے اس کے معنی فطرت کیے ہیں اور مفردات میں ہے کہ صبغۃ اللہ میں اشارہ اس چیز کی طرف ہے جو انسانوں میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے یعنی عقل جس سے بہائم سے ان کی تمیز ہوتی ہے۔ مگر تاج العروس میں صبغۃ کے معنی دین دیتے ہیں اور ہر ایک وہ راہ جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو۔ اور قرآن شریف میں و صبغ للاٰکلین (المومنون۲۳-۲۰) آتا ہے جہاں مراد سالن ہے اور عیسائیوں کے بپتسمہ کو یعنی جو وہ بچے کو پانی میں غوطہ دیتے ہیں صبغۃ یا اصطباغ کہا جاتا ہے (غ)

دین اسلام کا مقابلہ عیسائی بپتسمہ سے: یہاں دین الٰہی کا جس کو رنگ کے ساتھ تشبیہ دی ہے لفظ صبغۃ اختیار کر کے عیسائیوں کے اصطباغ سے گویا اشارۃً مقابلہ کیا ہے کہ ایک طرف خدائی بپتسمہ یعنی دین الٰہی یا دین اسلام ہے جس کو لینے سے انسان کل انبیائے عالم کو راستباز قرار دیتا ہے اور دوسری طرف ایک انسانی بپتسمہ یعنی عیسائی مذہب ہے جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ سوائے مسیحؑ کے دنیا میں کوئی راستباز نہیں یہ گویا سب کو جھوٹا قرار دیتا ہے ایسا مذہب دنیا میں کبھی غالب نہیں ہو سکتا۔ صبغۃ اللہ میں نصب یا تو اس لیے ہے کہ یہ اٰمنا باللہ الآیۃ میں اٰمنا کے لیے مصدر موکد ہے۔ یا اس لیے کہ تحریص دلانے کے لیے ہے اور بعض نے اس کو ملۃ ابراہیم سے بدل کہا ہے۔

ع۱۷۴ خالص اور صافی میں فرق: مخلصون۔ خالص اور صافی یکساں ہیں یعنی کھوٹ وغیرہ سے پاک۔ مگر صافی ابتدا سے ہی ایسا ہے۔ اور خالص جو بعد میں صاف ہو جائے (غ) مسلمانوں کا اخلاص یہ ہے کہ وہ یہودیوں کی تشبیہ سے اور نصاریٰ کی تثلیث سے بری ہیں (غ) اور دوسری جگہ فرمایا مخلصین لہ الدین (البینہ۹۸-۵) گویا فرمانبرداری کو اس کے لیے خالص کرنے والے۔ یہی معنی یہاں ہیں۔ یعنی ایمان اور اطاعت دونوں کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنے والے۔ اور ہر قسم کے کھوٹ اور آمیزش سے پاک رکھنے والے۔

خدا کی ربوبیت کی وسعت: دنیا میں ہر ایک قوم اللہ تعالیٰ کی روحانی ربوبیت کو اپنے تک محدود کرتی ہے۔ مگر اسلام اس خدا کو پیش کرتا ہے جو ربنا و ربکم ہے یعنی ہم جو مسلمان ہیں وہ ہماری ربوبیت بھی فرماتا ہے۔ اور عیسائی اور یہودی جو مسلمانوں کی مخالفت کر رہے ہیں ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ وہ تمہارا بھی رب ہے۔ یہ گویا رب العالمین کی کھلی تفسیر کر دی۔

اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ	کیاتم کہتے ہو کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد
وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطَ كَانُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى ؕ	یہودی یا عیسائی تھے، کہہ کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اور
قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ	اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اس گواہی کو چھپا دے
كَتَمَ شَهَادَةً عِنۡدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ	جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے اور اللہ اس سے بے خبر
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۰﴾	نہیں جو تم کرتے ہو۔
تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا	یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی ان کے لیے ہی جو انھوں نے کمایا اور تمہارے لیے ہی جو تم نے
۱۶ ع ۱۲ ۱۶ كَسَبۡتُمۡ ۚ وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۱﴾ ع	کمایا اور تم سے اس کے متعلق باز پرس نہ ہوگی جو وہ کرتے تھے۔

مسلمانوں کو تعلیم کہ اپنے دشمنوں سے ہمدردی کریں: اور ایک مسلمان کو سمجھا دیا کہ جو تمہارے دشمن ہیں جو تمہارے دین کے مخالف ہیں ان کا رب بھی وہی خدا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ ان کی بھی ربوبیت فرماتا ہے اور ایک مسلمان جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے یعنی صفات الٰہی کو اپنے اندر لینے کی کوشش کرتا ہے اور جس کا مذہب تخلق باخلاق اللہ ہے اس کے لیے بھی ضروری ہوا کہ وہ اپنے قلب میں اس قدر وسعت پیدا کرے کہ اس میں اپنے دشمنوں کے لیے بھی سچی ہمدردی اور خیر خواہی موجود ہو۔ یہ نہایت ہی مشکل مقام ہے مگر ربنا و ربکم کی تعلیم دینے والی کتاب اسی مقام پر مسلمانوں کو پہنچانا چاہتی ہے اور یہی نقشہ نبی کریم صلعم کی زندگی میں اور صحابہ کی زندگی میں نظر آتا ہے کہ کس طرح عملی طور پر دشمنوں سے محبت اور پیار کرکے دکھایا اور کس طرح ان کے سارے مظالم پر یکسر قلم پھیر دیا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم میں بتایا کہ اصل کامیابی تو اعمال سے ہے پس تم بھی اچھے عمل کرو مگر یاد رکھو کہ خالص نیکی کی راہیں صرف اسلام میں ہی ہیں اور وہ قوم جس کے اعمال صرف خدا کے لیے ہوں ضرور کامیاب ہو جاتی ہے۔ چونکہ ایمان سے عبادت اور عمل پیدا ہوتے ہیں اس لیے یہ ذکر بھی کر دیا۔

ع ۱۷۵ کفارہ مسیح اور انبیائے سابق: قرآن کریم نے یہاں یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ الزام دیا ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ یہ پہلے نبی یہودی یا عیسائی تھے یعنی ان خاص عقائد کے پیرو تھے جن کی تعلیم تم دیتے ہو۔ یہ واقعات پر مبنی ہے۔ آج بھی عیسائی کہتے ہیں کہ یہ پہلے انبیاء کفارہ مسیح پر ایمان لاتے تھے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ نجات یافتہ نہیں ٹھہر سکتے۔ اس سے بڑھ کر کیا ظلم اور کیا اخفائے شہادت ہے کہ تمام انبیاء کی اصولی تعلیم مرجو خدائے واحد پر ایمان اور اعمال صالحہ کا بجالانا ہے یوں پردہ ڈالا جائے۔ یہی حالت یہود کی تھی کہ وہ بھی بوجہ انبیاء کی اولاد ہونے کے اپنے آپ کو اعمال سے مستغنی خیال کرتے تھے۔

ع ۱۷۶ ایمان صحیح سے ہی چونکہ عمل خالص پیدا ہوتا ہے اس لیے پھر دوہرایا کہ گزشتہ لوگوں کے اعمال تمہارے کام نہ آئیں گے۔

سَیَقُوۡلُ السُّفَہَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىہُمۡ عَنۡ
قِبۡلَتِہِمُ الَّتِیۡ کَانُوۡا عَلَیۡہَا ؕ قُلۡ لِّلّٰہِ الۡمَشۡرِقُ وَ
الۡمَغۡرِبُ ؕ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۱۴۲﴾
وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ
عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَہِیۡدًا ؕ

بے وقوف لوگ بول اُٹھیں گے کس چیز نے اُن کو اُن کے قبلہ سے
پھیر دیا جس پر وہ تھے۔ کہہ مشرق اور مغرب اللہ کا ہی ہے، وہ
جسے چاہتا ہے سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے[۱۷۷]
اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک اعلیٰ درجہ کا گروہ بنایا ہے تا کہ تم لوگوں
کے پیشرو بنو اور رسول تمھارا پیشرو ہو[۱۷۸]

ع ۱۷۷ قبلۃ۔ مقابلۃ سے لیا گیا ہے اور اصل میں اس خاص حالت کا نام ہے جس پر سامنے کھڑا ہونے والا ہو (غ) چنانچہ دو آدمی جو ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوں ان میں سے ہر ایک دوسرے کا قبلہ کہلائے گا (ج) اور اس کے مقابل دِبْرۃ ہے جو پیٹھ کی طرف کی چیز کو کہتے ہیں۔ اور عرف میں قبلہ اس مکان مقابل کا نام ہو گیا ہے جس کی طرف نماز میں مُنہ ہو۔

تحویل قبلہ: یہاں سے وہ مضمون شروع ہوتا ہے جو تحویل قبلہ کے نام سے موسوم ہے یعنی بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کا قبلہ قرار دیا جانا اس کا تعلق پچھلے مضمون سے ظاہر ہے کیونکہ وہاں حضرت ابراہیمؑ اور خانہ کعبہ کا ہی ذکر ہے۔ گو الفاظ قرآنی کی ہم اور تاویل بھی کر سکیں۔ تحویل قبلہ پر احادیث: مگر روایات صحیحہ میں تحویل قبلہ کا کھلا ذکر ہے۔ چنانچہ بخاری میں ہی متعدد روایات طرق مختلفہ سے اس بارہ میں آئی ہیں یعنی حضرت ابن عمرؓ کی روایت عبداللہ بن دینار کی روایت سے کہ مسجد قباء میں لوگ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے جب ایک شخص نے ان کو اطلاع دی کہ کعبہ کی طرف مُنہ کرنے کا حکم ہو چکا ہے اور لوگوں نے حالت نماز میں ہی شام سے مکّہ کی طرف منہ پھیر لیا یہ روایت کتاب التفسیر میں امام بخاری نے پانچ مختلف طریقوں سے بیان کی ہے۔ اور براء کی روایت کہ نبی کریم صلعم نے مدینہ میں آ کر سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تب آپ کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا۔ یہ بھی دو طریق پر آئی ہے۔ اور حضرت انسؓ کی روایت کہ انہوں نے فرمایا کہ اب ان لوگوں میں سے جنہوں نے دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی میرے سوا کوئی زندہ نہیں رہا اور پھر اس کی مؤید حضرت عمرؓ کی وہ روایت ہے جو واتخذوا من مقام ابراھیم مصلّٰی کے ماتحت امام بخاری کتاب التفسیر میں لائے ہیں کہ آپ نے فرمایا تین باتوں میں میری رائے کا توافق اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہوا جن میں سے پہلی بات یہ ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ لو اتخذت من مقام ابراھیم مصلّٰی۔ اگر آپ مقام ابراہیم یعنی کعبہ کو مصلّٰی یعنی قبلہ بنائیں۔ پس اس قدر روایات کے ہوتے ہوئے اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نبی کریم صلعم پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ ہجرت کے سولہ یا سترہ ماہ بعد خانہ کعبہ صریح وحی الٰہی کے ماتحت قبلہ قرار پایا۔

تحویل قبلہ دو دفعہ نہیں ہوئی: البتہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تحویل قبلہ دو دفعہ ہوئی وہ صریح غلطی پر ہیں۔ اس کے لیے نہ قرآن میں کوئی دلیل ہے نہ کسی حدیث صحیح میں۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ مکّہ میں بھی آنحضرت صلعم بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ البتہ وہاں خانہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں کو سامنے رکھ لیتے تھے مدینہ میں جب تشریف لائے تو یہ دِقّت پیش آئی کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے میں خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ ہوتی تھی۔ اس لیے آپ کا دل یہ چاہتا تھا۔ جیسا کہ روایات میں صاف آیا ہے کہ آپ کا قبلہ خانہ کعبہ ہو جس کا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے تھا۔ مگر چونکہ آپ سے پہلے انبیاء جو گزرے ان کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا اس لیے آپ نے بھی اسی کو قبلہ رکھا یہاں تک کہ وحی الٰہی سے تحویل قبلہ ہوئی۔

وحی الٰہی قلب نبوی سے نہ پھوٹتی تھی: اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وحی الٰہی کا سرچشمہ نبی صلعم کا اپنا قلب نہ تھا ورنہ سولہ سترہ ماہ تک آپ کا دل تو یہ چاہے کہ خانہ کعبہ قبلہ ہو مگر وحی نازل نہ ہو یہ بے معنی بات ہے۔

ما ولّٰہم کے معنی: اس تحویل قبلہ میں کیا راز تھا۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ رہا یہ کہ آیا الفاظ ما ولّٰہم میں اسی تحویل قبلہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ علیحدہ سوال ہے ان الفاظ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے جس پر یہ پہلے تھے یعنی بیت المقدس کس چیز نے پھیر دیا۔ یہ تو صریح تحویل قبلہ کا ذکر ہو گیا اور یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو ان انبیاء کے قبلہ سے (جن کا ذکر ابھی نام لے کر ہوا ہے) جس پر وہ انبیاء تھے یعنی بیت المقدس کس چیز نے پھیر دیا جس میں تحویل قبلہ ضروری نہیں ٹھہرتی۔ اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے جس پر وہ تھے یعنی خانہ کعبہ، کس چیز نے بھگا دیا۔ اور یہ اشارہ ہو گا ہجرت کی طرف کہ جب ان کا قبلہ خانہ کعبہ تھا تو وہاں سے بھاگ کر کیوں آئے لله المشرق والمغرب۔ جو جواب دیا ہے آخری معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ان کا وہاں سے چلا آنا قبلہ ہونے کے منافی نہیں اس لیے کہ مشرق و مغرب کا مالک اللہ ہی ہے وہ ان کو اس قبلہ کا مالک بھی بنا دیگا۔ پہلے دو معنی اختیار کرنے کی صورت میں لله المشرق والمغرب سے یہ مراد ہو گی کہ اللہ کا تعلّق تو کسی خاص سمت سے نہیں، سب سمتیں اسی کی ہیں۔ اگر ایک زمانہ میں قبلہ بیت المقدس تھا اور اب کعبہ ہے تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ ہاں یہ ضروری تھا کہ آخری نبی کا قبلہ وہ مقرر کیا جاتا جو دنیا میں خدا کی عبادت کا سب سے پہلا گھر تھا اور اسی کی طرف الفاظ صراط مستقیم میں اشارہ ہے کہ یہ یا یہ اشارہ ہے کہ یہ صحیح تعلیم کہ خدا کا تعلق کسی خاص سمت سے نہیں ہم نے مسلمانوں کو دی۔

ع ۱۷۸ وسطاً۔ وسط کسی چیز کا درمیان ہے اور بعض اوقات بلحاظ اطراف کے جو افراط و تفریط کو ظاہر کرتی ہیں اعلیٰ اور اشرف چیز کو بھی وسط کہا جاتا ہے (غ) چنانچہ بخاری میں الوسط کے معنی العدل لکھے ہیں اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ محاورہ عرب میں خیار یعنی بہترین لوگ وسط کہلاتے ہیں اور یہاں مراد ایسا گروہ ہے

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ
مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ
وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ
هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ

اور ہم نے اُسے جس پر تو تھا قبلہ نہیں بنایا، مگر اس لیے کہ ہم اس
شخص کو جو رسول کی پیروی کرتا ہے اس سے الگ کر دیں جو اپنی ایڑیوں
پر واپس ہوتا ہے اور بیشک یہ ایک بھاری بات تھی مگر (نہ) اُن لوگوں پر
جنھیں اللہ نے ہدایت کی ۱۷۹ اور اللہ (ایسا) نہیں کہ تمھارے ایمان کو ضائع

جو افراط و تفریط سے پاک ہونے کی وجہ سے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچا ہوا ہے۔

شہداء۔ شہید کے معنی کے لیے دیکھو ع ۳۷۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ شہداء سے مراد ایسے لوگ ہیں جو جس بات کو سنتے ہیں اس کو اپنے دل میں حاضر رکھتے ہیں اور گواہ ہونے سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو علم انہوں نے رسول اللہ صلعم سے حاصل کیا ہے اسے لوگوں کو پہنچائیں۔ اس لحاظ سے شہداء کے معنی مزکی بھی ہو سکتے ہیں اور پیشرو یا امام بھی۔ اور یہاں یہی مراد ہے۔

قبلہ کے مضمون میں ختم نبوت کی طرف اشارہ: کذالک میں اشارہ پچھلی آیت کے مضمون کی طرف ہے یعنی خانہ کعبہ کو جو توحید کا اصل مرکز ہے قبلہ مقرر کرنے میں ہم نے یہ بتا دیا ہے کہ یہ نبی آخری نبی ہے اور اب اسی کے پیرو دنیا میں علم دین کو پھیلانے والے اور دنیا کے حقیقی پیشرو اور امام ہونگے جس طرح رسول اللہ صلعم ان کے پیشرو اور امام ہیں ویکون الرسول علیکم شهیدا کو پیچھے رکھ کر یہ صاف طور پر سمجھا دیا ہے کہ جس قدر نیکی کی تعلیم اور نفوس انسانی کے تزکیہ کرنے والے اب دنیا میں ہوں گے۔ ان سب کے پیشوا اور سردار اور مزکی محمد رسول اللہ صلعم ہوں گے اور یوں وہ سب ایک ہی سردار کے ماتحت ہونے کی وجہ سے دنیا میں اتحاد قومی اور وحدت انسانی کی بنیاد رکھنے والے ہوں گے۔ کمالات اُمت محمدیہ: اس آیت میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے کمالات کی طرف بلکہ کل اُمت محمدیہ کے کمالات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو کام دنیا میں انبیاء علیہم السلام کرتے تھے وہ اب محمد رسول اللہ صلعم کے نام لیوا کریں گے اور یا کذالک کہ کر یہ اشارہ کیا کہ جس طرح یہ تعلیم کہ خدا کا تعلق کسی خاص سمت سے نہیں۔ تاہم ایک قبلہ یعنی سب کا ایک طرف منہ کرنا اتحاد کے لیے ضروری ہے ایک میانہ روی کی تعلیم ہے جو ہم نے تم مسلمانوں کو دی ہے اسی طرح ہر امر میں ہم نے تم کو میانہ روی کی تعلیم دی ہے تاکہ تم ہمیشہ کے لیے دنیا کے پیشرو بنو۔

ع ۱۷۹ تحویل قبلہ کے ذریعہ تمحیص: وما جعلنا القبلة التي كنت عليها۔ ان الفاظ کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ ہم نے اُسے قبلہ نہیں بنایا تھا جس پر تم اب تک تھے مگر اس لیے کہ کھرے کھوٹے کی تمیز ہو۔ یعنی بیت المقدس جو کچھ دیر تک قبلہ رہا اور اس کے بعد اب خانہ کعبہ کو قبلہ بنایا گیا۔ تو یہ تمحیص کے لیے تھا۔ اور یہاں جعلنا کا مفہوم ایسا ہی ہے جیسے وما جعلنا الرؤيا التي اريناك الا فتنة للناس (بنی اسرائیل ۱۷: ۶۰) میں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا تھا کہ رؤیا فتنہ ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم نہ دیا تھا۔ نہ ایسی کوئی وحی قرآن میں موجود ہے نہ کسی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی طرف آپ نے وحی کے حکم سے منہ کیا ہو۔ ہاں جب آپ کو مدینہ میں آ کر خانہ کعبہ اور بیت المقدس میں سے ایک کو انتخاب کرنا پڑا تو آپ نے بیت المقدس کی طرف منہ کیا اور کعبہ کی طرف پیٹھ۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایک مدت تک آپ کو اسی حالت پر چھوڑ دیا اور وحی الٰہی نازل نہ کی اور اس کی غرض جیسا آگے آتا ہے تمحیص تھی اور دوسرے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ کنت بمعنی صرت لیا جائے یعنی ہم نے اسے جس پر تو اب ہوا ہے قبلہ نہیں بنایا مگر اسی غرض کے لیے اور اس صورت میں مراد خانہ کعبہ ہو گا اور کنت علیها سے مراد معتقد الاستقبال لها بھی ہو سکتی ہے یعنی جس کی طرف تمہاری توجہ کا عقد تھا۔

علم بمعنی تمیز: لنعلم کے معنی تاہم الگ الگ کر دیں کیے گئے ہیں۔ کیونکہ علم بمعنی تمیز بھی آتا ہے خصوصاً جب اس کا صلہ من ہو جو تمیز کے لیے آتا ہے (ح) اور بعض نے علم بمعنی رویة لیا ہے (ج) یعنی تا ہم دیکھیں کہ کون ایسا ہے۔ اور کون ایسا۔ اور رویة معنی اس لیے صحیح ہیں کہ یہ وہ علم الٰہی ہے جو ایک واقعہ کے ظہور کے بعد ہوتا ہے۔ اور یہ فی الحقیقت رویة کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم انسانوں کے متعلق دو قسم کا ہے۔ ایک بندہ کا علم جب ابھی تمام امور پردہ غیب میں ہیں۔ ایک وہ علم جو اظہار واقعہ کے بعد ہوتا ہے جس پر ایک فعل کے واقعہ ہو جانے کی وجہ سے جزا و سزا مترتب ہوتی ہے

اس حصہ آیت میں تحویل قبلہ کی غرض بتائی ہے کہ کھرے کھوٹے الگ الگ ہو جائیں۔ ایک سچے دین کو تمحیص کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ تا گریزد ہر کہ بیرونی بود۔ اگر کچے پکوں کے ساتھ ملے رہیں تو دین کی اصل غرض پوری نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ تمحیص کے لیے بعض واقعات ایسے پیدا کر دیتا ہے یہ تمحیص کوئی چھوٹی سی نہ تھی کہ جب رسول اللہ صلعم مکہ میں تھے تو بیت المقدس قبلہ رہا۔ حالانکہ وہاں مشرک ہی مشرک تھے جو خانہ کعبہ کی عزت کرتے تھے۔ مگر بیت المقدس کی عزت نہ کرتے تھے اور جب مدینہ میں آئے جہاں یہودیوں کا زور تھا تو خانہ کعبہ قبلہ ہوا۔ تاکہ وہی لوگ مسلمان ہوں جن کے دلوں میں صداقت اسلامی مرکوز ہو چکی ہے اور کوئی ابتلا ان کے قدم کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ ایک اور غرض تحویل قبلہ میں یہ بھی تھی کہ قبلہ کوئی پرستش کی چیز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو شروع سے ایک ہی قبلہ ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ توحید کے احکام تو ابتدا میں ہی دیدیئے گئے پھر خانہ کعبہ کو قبلہ اس وقت بنایا جاتا ہے جب مشکلات کا زمانہ گزر گیا ہے اگر ابتدا میں ہی خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا جاتا تو شاید عرب کے لوگ یہ سمجھ کر بھی ساتھ شامل ہو جاتے کہ کیا ہرج ہے ہمارے آبائی دین کے ہی یہ ارکان ہیں۔ مگر نہ صرف اس کو ابتدا میں قبلہ قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ مدینہ میں سولہ مہینے اس کی طرف پیٹھ بھی کروائی۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ پرستش کی چیز نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾	کرے اللہ لوگوں پر مہربان رحم کرنے والا ہے ؏۱۸۰
قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ	ہم یقیناً تیرے آسمان کی طرف توجہ کرنے کو دیکھتے ہیں پس ضرور ہم تجھے
قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ	اس قبلہ کا متولی بنا دیں گے جسے تو پسند کرتا ہے سو تو اپنے منہ کو مسجد
الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ	حرام کی طرف پھیر دے اور جہاں کہیں تم ہو اپنے مونہوں کو اسی کی
شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ	طرف پھیر دو۔ ؏۱۸۱ اور وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی ہے یقیناً جانتے ہیں
اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ	کہ اُن کے رب کی طرف سے سچ ہے اور اللہ اس سے بے خبر نہیں

؏۱۸۰ ایمان کے معنی یہاں حضرت ابن عباسؓ سے بخاری میں صلوٰۃ مروی ہیں۔ یعنی یہ منشاء ہے کہ جو نمازیں بیت المقدس کی طرف پڑھی ہیں وہ ضائع نہیں ہوئیں۔ کیونکہ نماز تو خدا کی ہے اس کو قبلہ سے کوئی ایسا تعلق نہیں کہ اگر اس طرف منہ کر کے نہیں پڑھی گئی تو نماز ہی نہیں ہوئی۔ اس میں بھی اس غلط خیال کی تردید ہے کہ قبلہ مسلمانوں کی عبادت میں کوئی اصلی مقصود ہے۔ جیسا کہ مخالفین اسلام نے غلطی سے خیال کر لیا ہے۔ ایمان کا لفظ لانے میں بھی یہی اشارہ ہے کہ قبلہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس سے ایمان میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہو۔

رؤف کے معنی میں اشد درجہ کی رحمت پائی جاتی ہے جو اپنے الطاف کے ساتھ خود ہی اپنے بندوں پر مہربانی کرتا ہے (ل) اور رأفۃ جس سے یہ مشتق ہے رحمت سے زیادہ خاص اور زیادہ رقت والی شے ہے (ل)

؏۱۸۱ تقلب وجهك فی السماء۔ تقلب۔ قلب سے ہے اور اس کے معنی بار بار پھرنا ہیں فی یہاں بمعنی الی ہے۔ وجہ۔ توجہ یا منہ۔ توجہ یا منہ کے بار بار آسمان کی طرف پھیرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرنا یا اس کی طرف سے کسی امر کا انتظار کرنا ہے۔ مگر یہاں مراد اس حکم کا انتظار نہیں کہ کعبہ کو قبلہ بنا دیا جائے کیونکہ وہ حکم نازل ہو چکا اور اس پر اعتراضات کا جواب بھی ہو چکا۔ بلکہ یہ انتظار یا توجہ یا دعا اس لیے ہے کہ خانہ کعبہ جو مشرکین کے قبضہ میں ہے اور جسے اب قبلہ بنایا جاتا ہے کب بُت پرستی سے پاک ہو گا اور مسلمانوں کا اس پر کب قبضہ ہو گا۔

فلنولّینّك۔ ولّیته کذا کے معنی ہوتے ہیں میں نے اسے فلاں چیز کا والی یا متصرف بنا دیا (غ۔ ر) یہی معنی یہاں مراد ہیں۔ منہ پھیرنے کے معنی نہیں۔ اس لیے کہ یہ آئندہ کے متعلق ہے اور منہ پھیرنے کا حکم پہلے ہو چکا (ولّی مصدر تولیته) کبھی اقبال کے معنی میں آتا ہے جیسے فولّ وجهك یا لكل وجهة هو مولّیها یعنی اس طرف متوجہ ہونا اور کبھی انصراف کے معنی میں جیسے ثم ولّیتم مدبرین یا ماولّٰهم عن قبلتهم۔

شطر کسی چیز کے نصف یا وسط کو کہتے ہیں اور یہاں مراد اس کی جہت ہے (غ)

الحرام۔ حرام کے معنی ہیں الممنوع منه وہ جس سے روکا جائے خواہ بذریعہ تسخیر الٰہی ہو جیسے حرام علیٰ قریة اهلكنٰها (الانبیاء ۲۱-۹۵) میں (جہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہی ایسا ہے کہ جن پر موت وارد ہو جائے وہ اس دنیا میں واپس نہیں آ سکتے) یا عقل یا شریعت کی رو سے یا کسی حکم کی وجہ سے جس کی اتباع ہوتی ہے یا غلبہ کی وجہ سے اور حَرَم کو حرم اس لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی رو سے اس میں بہت سی باتیں ممنوع ہیں جو دوسری جگہ کرنی جائز ہیں (غ) اسی مادہ سے محروم ہے۔ گویا وہ شخص جو ایک چیز کے حصول سے روک دیا گیا ہے محروم ہے۔

المسجد الحرام۔ اس وسیع احاطہ کا نام ہے جس کے اندر خانہ کعبہ ہے۔ یہ احاطہ کوئی دو سو پچاس قدم لمبائی میں اور دو سو قدم چوڑائی میں ہے اور خانہ کعبہ اس کے قریباً وسط میں واقع ہے جو لمبائی میں اٹھارہ قدم اور چوڑائی میں چودہ قدم ہے اور اس کے شمال مشرقی کونہ پر حجر اسود ہے۔ مگر بعض وقت المسجد الحرام کل حَرَم پر بول دیا جاتا ہے جس کے اندر خود مکہ معظمہ اور میدان منیٰ اور عرفات واقع ہیں اور جس کے اندر جنگ کرنا یا ہتھیار اٹھانا یا شکار کرنا یا گھاس وغیرہ (سوائے اذخر کے) کاٹنا منع ہے۔ جیسے لمن لم یكن اهله حاضری المسجد الحرام (۱۹۶) میں یا لاتقاتلوهم عند المسجد الحرام حتیٰ یقاتلوكم فیه (۱۹۱) میں۔

خانہ کعبہ کی تولیت: خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا۔ مگر کعبہ کے اندر جو توحید کا مرکز تھا بُت بھرے ہوئے تھے۔ تو لازماً یہ خیال رسول اللہ صلعم کے قلب مبارک میں پیدا ہوتا ہو گا کہ اس آلائش سے یہ مرکز توحید کب اور کس طرح پاک ہو گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تسلّی دی کہ ہم تم کو ہی اس قبلہ کا متولی بنائیں گے، جسے تم چاہتے ہو۔ اور اس کے بعد جو فرمایا کہ فول وجهك تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ حکم ابھی ملتا ہے۔ کیونکہ یہ عبارت تو بے معنی سی ہو جاتی ہے کہ ہم تیرا منہ اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔ پس تو بھی اپنا منہ پھیر لے۔ بلکہ اصل مراد اسی خیال کا ازالہ ہے کہ خانہ کعبہ میں بُت ہیں تو فرمایا کہ اس وجہ سے مضائقہ نہ کرو۔ کیونکہ ہم تم کو اس کا متولی بنا دیں گے اور یہ مرکز توحید موحدین کے ہاتھ میں ہی رہے گا۔ اس لیے بغیر کسی خیال کو دل میں لانے کے اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب خانہ کعبہ کا متولی کوئی غیر مسلم نہیں ہو سکتا۔

عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٤﴾
جو وہ کرتے ہیں۔ ۱۸۲

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ
اور اگر تو ان لوگوں کے پاس جنھیں کتاب دی گئی ہے سب نشان

اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ
بھی لے آئے وہ تیرے قبلہ کی تابعداری نہ کریں گے اور نہ تو ان کے قبلہ

قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ
کا تابع ہے اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع ہیں۔ اور اگر

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ
تو ان کی گری ہوئی خواہشوں کی پیروی کرے اس کے بعد جو تیرے

وقف لازم
مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٥﴾
پاس علم سے آچکا تو بیشک اس وقت تو ظالموں میں سے ہوگا ۱۸۳

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا
وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی ہے اسے اسی طرح پہچانتے ہیں

يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ
جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور ان میں سے ایک فریق یقیناً

وقف غفران · منزل
لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤٦﴾
حق کو چھپاتا ہے اور وہ جانتے ہیں ۱۸۴

ع ۱۷
اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿١٤٧﴾
(یہ) حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس ہرگز جھگڑنے والوں میں سے نہ ہو۔ ۱۸۴ الف

وقف النبی علیہ الصلوۃ والسلام
وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ
اور ہر ایک کے لیے ایک طرف ہے جدھر وہ مُنہ کرتا ہے پس نیکیوں کو ایک

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ
دوسرے سے آگے بڑھ کر لو۔ ۱۸۵ جہاں کہیں تم ہوگے اللہ تم کو اکٹھا کر کے لائیگا

ع ۱۸۲ اہل کتاب پر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پوری طرح کھل چکی تھی پیشگوئیاں ان کی کتاب میں موجود تھیں جن کے پُورا ہونے کا ابھی تک اُن کو انتظار تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسمٰعیلؑ کے ساتھ وعدہ تھا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کو عرب میں چھوڑا گیا۔ بیت ایل سوائے عرب کے اور کہیں نہ تھا یعنی خانہ کعبہ کے سوائے کوئی گھر بیت اللہ نہیں کہلایا۔ حضرت ابراہیم کا تعلّق اسی گھر سے تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگاریں یہاں موجود تھیں پس جب ابراہیمؑ کی دعاؤں کا موعود نبی آیا تو ضروری تھا کہ اس کا قبلہ بھی کعبہ ہوتا۔ اس لیے بھی کہ وہ جانتے تھے کہ نبی موعود عرب میں ظاہر ہونے والا ہے۔ بلکہ یہی وجہ تھی کہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے یہودی ملک عرب میں کثرت سے آکر آباد ہو گئے تھے اور ان کی پیشگوئیوں میں اب تک بھی صراحت سے عرب کا نام پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یسعیاہ ۲۱: ۱۳ میں ان الفاظ کے بعد "عرب کی بابت الہامی کلام" آنحضرت صلعم کی ہجرت کی صاف پیشگوئی ہے۔ تو اس قدر روشن نشان آپ کی صداقت کے جمع تھے کہ دل صداقت کا انکار نہ کرسکتے تھے۔

ع ۱۸۳ قبلہ یہاں دین کے قائم مقام ہے کیونکہ یہ ایک ظاہر اور کھلا نشان دین کا تھا اور حدیث لاتکفر اھل قبلتک میں بھی اسی طرف اشارہ ہے اور یہ جو فرمایا کہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں تو حضرت موسیٰؑ کے پیروؤں میں یہودیوں کا قبلہ اور تھا سامریوں کا اور۔ پھر یہودیوں کا قبلہ بیت المقدس تھا تو عیسائیوں نے بجائے اس کے مشرق کو اپنا قبلہ قرار دیا۔ مسلمانوں میں بہت سے اختلافات کے باوجود قبلہ کا اختلاف نہیں ہوا۔ اور وہ اصول دین پر بھی مجتمع ہیں۔

ع ۱۸۴ اہل کتاب کا آنحضرت کو شناخت کرنا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت بوجہ ان پیشگوئیوں اور وعدوں کے جو اہل کتاب کو دیئے گئے تھے ان پر واضح ہو چکی تھی۔ مگر محض اس حسد کی وجہ سے قبول نہ کیا کہ بنی اسرائیل میں سے نہیں۔ دوسری جگہ بھی ہے فلمّا جاءھم ما عرفوا کفروا بہ تمام علامات شناخت یقینی طور پر ظاہر ہو چکی تھیں۔ اس لیے اسی طرح آپ کا نبی موعود ہونا پہچانتے تھے جس طرح ایک انسان اپنے بیٹے کو پہچانتا ہے یا ابناءھم سے مراد انبیائے بنی اسرائیل ہیں۔ یعنی جن نشانات سے ان کی صداقت کو پہچانتے تھے وہ سب نشانات یہاں بھی موجود ہیں۔

ع ۱۸۴ الف الممترین۔ مِرْیَۃ کسی امر میں تردد کو کہتے ہیں۔ جیسے فلا تکن فی مریۃ من لقائہ (السجدۃ ۳۲-۲۳) وغیرہ مقامات پر اور امتراء کے معنی ہیں المُحاجّۃُ فیما فیہ مِرْیَۃٌ (رغ) یعنی اس امر میں جھگڑنا جس میں تردّد ہو۔

یہاں خطاب مخالف کو ہے کیونکہ ابھی فرمایا تھا کہ یہ اہل کتاب جانتے ہیں انہ الحق من ربّھم تو اس لیے اب فرماتا ہے کہ یہ حق تمھارے رب کی طرف سے ہی ہے۔ پس جھگڑے کو چھوڑ دو اور حق کو قبول کرلو اور یا یہ خطاب عام ہے مگر اس صورت میں بھی مراد مخالف ہی ہیں۔

ع ۱۸۵ لِکُلٍّ سے مراد ہر ایک قوم یا ہر ایک اہل مذہب یا ہر ایک شخص ہے۔

وِجھَۃ۔ وَجْہ قصد کو اور جِھَۃ اور وِجھَۃ مقصد کو کہا جاتا ہے اور اصل میں جھۃ یا وجھۃ وہ ہے جس کی طرف ہم کسی چیز کے لیے توجہ کرتے ہیں (غ)

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۴۸﴾ اللہ ہر چیز پر قادر ہے[۱۸۶]

استبقوا۔ سَبَق ۔ اصل میں چلنے میں آگے ہونے کو کہا جاتا ہے اور استباق کے معنی ہیں تسابق یعنی ایک دوسرے سے آگے بڑھنا اور چلنے کے علاوہ اس قسم کے تقدم پر بھی بولا جاتا ہے جیسے بزرگی میں سبقت ۔ اور السّابقون السابقون میں اور کئی دوسرے مقامات پر یہی سبقت مراد ہے (غ)

اس رکوع میں ایک قبلہ اور پھر خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کرنے کی وجوہات بیان فرمائی ہیں مسلمانوں کا اگر ایک ظاہری قبلہ ہے تو ایک ان کے لیے باطنی قبلہ بھی ہے ۔ اس لیے فرمایا کہ دنیا کی ہر قوم نے اپنا ایک مقصد قرار دے لیا ہے اور وہ محض دنیا تک محدود ہے پس اے مسلمانو تم خیرات اور نیکیوں میں قدم بڑھاؤ اسی کو اپنا مقصد اسی کو قبلۂ ہمت قرار دو ۔ اور ظاہری معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہُوا کہ ہر ایک قوم نے اپنے لیے ایک قبلہ ٹھہرایا ہُوا ہے پس تم اس قبلہ کی طرف سبقت کرو جو توحید کا مرکزِ اصلی ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی خیرات اور نیکیوں کا تم کو حقدار بناتا ہے ۔ کیونکہ جس طرح شرک تمام بدیوں کی جڑ ہے توحید سے تمام نیکیاں پیدا ہوتی ہیں اور اگر لکل میں مراد ہر شخص لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ نماز پڑھنے میں ہر شخص کسی نہ کسی طرف منہ کرے گا اور الگ الگ طرف مُنہ کرنے میں سب کی توجہ ایک طرف نہیں رہ سکتی ۔ اس لیے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو ایک طرف منہ کرنے کی ہدایت کر کے ان میں یک جہتی اور اتحاد کی بنیاد رکھ دی اور اس پر قائم ہو جانا بہت سی نیکیوں کو لے لینا ہے درحقیقت ایک قبلہ پر اتفاق اسلام کی اخوت عالمگیر کی بنیاد ہے ۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے لا تکفروا اھل قبلتک اپنے اہل قبلہ کی تکفیر مت کرو ۔

مسلمان کعبہ کی پرستش نہیں کرتے : خانہ کعبہ کی جو کچھ عزّت مسلمانوں کے دلوں میں ہے وہ اس کی وجہ سے ہے کہ یہ توحید کا اصل مرکز ہے اور نسل انسانی کے اتحاد کا بھی اصلی مرکز یہی ہے ۔ بعض کوتہ اندیش مخالفین نے اس عزّت کو پرستش کا قائم مقام قرار دیکر اعتراض کیا ہے ۔ حالانکہ کسی چیز کی عزّت کرنا اور امر ہے اور اس کی پرستش امر دیگر ہے ۔ پرستش یا عبادت میں تین باتوں کا پایا جانا ضروری ہے اول اس چیز کی عظمت سے اس قدر متاثر ہونا کہ اس کی طرف توجہ تام ہو ۔ دوسرے اس کی حمد و ستائش کرنا ۔ تیسرے اس سے دعا مانگنا ۔ اب جب ایک مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منہ کرتا ہے تو ان تینوں باتوں میں سے ایک بات کا بھی وہم تک اس کے دل میں نہیں ہوتا ۔ وہ اللہ اکبر کہتا ہُوا خدا کی عظمت کے سامنے کبھی دست بستہ کھڑا ہوتا کبھی جھکتا کبھی زمین پر گرتا ہے ۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ہی حمد و ستائش کرتا ہے اور جو کچھ مانگتا ہے اپنے مالک حقیقی سے ہی مانگتا ہے ۔ اس وقت نہ اس کے دل پر خانہ کعبہ کی عظمت کا کوئی اثر ہوتا ہے نہ اسکی طرف اس کی توجہ ہوتی ہے ۔ نہ وہ خانہ کعبہ کی حمد و ستائش کرتا ہے ۔ نہ خانہ کعبہ سے کوئی دعا مانگتا ہے ۔ پس صرف حالت نماز میں خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کو خانہ کعبہ کی پرستش قرار دینا محض ایک جاہلانہ اور متعصبانہ خیال ہے ۔ پھر اس وقت بھی تو مسلمانوں کی نماز اسی طرح ہوتی تھی جب خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کیے ہوئے ہوتے تھے اور بیت المقدس کی طرف منہ ۔ تو کیا اس وقت وہ بیت المقدس کی پرستش کرتے تھے ۔

خود خانہ کعبہ کے مشرکین عرب نے بھی باوجود اس کی اس عظمت کے جو اُن کے دلوں میں تھی کبھی پرستش نہیں کی ۔ وہ ان بتوں کو ضرور پوجتے تھے جو انہوں نے اس کے اندر رکھے ہوئے تھے مگر اس گھر کی پرستش کبھی نہیں کی ۔ بلکہ حجر اسود کی بھی جسے بوسہ دیا جاتا ہے عرب میں کبھی پرستش نہیں ہوئی ۔ کیونکہ یہ بن گھڑا پتھر تھا نہ اس سے کبھی انہوں نے مرادیں مانگیں نہ اس کو اپنا معبود سمجھا ۔ ہاں صرف طواف میں بوسہ دینا ثابت ہے اور مسلمان بھی بوسہ دیتے ہیں ۔ مگر یہ محض ایک نشان محبت کے طور پر ہے کیونکہ وہ پتھر خود وہاں ایک نشان کے طور پر لگایا گیا ہے ۔ یہی وہ پتھر ہے جس کی طرف حضرت داؤدؑ نے اپنی زبور میں بھی اشارہ کیا ہے "وہ پتھر جسے معماروں نے ردّ کیا ہے کونے کا سرا ہو گیا ہے ۔ یہ خداوند سے ہوا جو ہماری نظروں میں عجیب ہے" (زبور ۱۱۸: ۲۲-۲۳) یہی وہ بن تراشا پتھر ہے "جیسا کہ تو نے دیکھا کہ وہ پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ اس کو پہاڑ سے کاٹ نکالے آپ سے آپ نکلا" (دانیال ۲: ۴۵) اب یہ ردّ کیا ہوا پتھر جو کونے کا سرا ہو گیا ہے ۔ ساری مقدس تاریخ کو تلاش کرو تو سوائے بنی اسمٰعیل کے اور کسی کے لیے نشان نہیں ہو سکتا ۔ مسیح کو یہودیوں کا ردّ کرنا ایک معمولی واقعہ ہے جو سارے انبیائؑ کے ساتھ پیش آیا ۔ مگر بنی اسمٰعیل کو بنی اسرائیل نے جن کی قوم مدت تک حکمران رہی بالکل ردّ کر دیا ۔ یہاں تک کہ اس قوم کو عہد ابراہیمی سے بھی اپنی طرف سے خارج کر دیا ۔ وہ نہ صرف اپنے ملک سے نکال کر ایک ریگستان میں رکھے گئے بلکہ ان کو ہمیشہ کے لیے ردّ شدہ تصوّر کر لیا گیا ۔ پس یہی وہ پتھر تھا جس کو معماروں نے ردّ کر دیا اور اسی کی یادگار میں خانہ کعبہ کا وہ پتھر ہے جو حجر اسود کے نام سے موسوم ہے اور اس کو بوسہ دینا اسی بات کی یادگار ہے کہ وہ ردّ کیا ہوا پتھر کونے کا سرا ہُوا ۔ اسی کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی انگورستان والی تمثیل میں اشارہ کیا ہے جہاں یہ کہا ہے ۔ کہ انگورستان کا مالک جب آئیگا تو انگورستان کو اور باغبانوں کے سپرد کر دیگا ۔ یہ انگورستان کیا ہے وہی خدا کی بادشاہت ہے جس کا ذکر خود حضرت مسیحؑ نے تمثیل کو واضح کرنے کے لیے ان الفاظ میں کیا ہے "یسوع نے انہیں کہا کہ تم نے نوشتوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو راجگیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہوا ۔ یہ خداوند کی طرف سے ہے اور ہماری نظروں میں عجیب ۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لی جائیگی اور ایک قوم کو جو اس کے پھل لائے دیجائیگی جو اس پتھر پر گریگا چور ہو جائیگا پر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالیگا (متی ۲۱: ۴۲ و ۴۳) یہاں مسیحؑ نے بنی اسرائیل کو صاف طور پر کہہ دیا کہ خدا کی بادشاہت تم سے لیکر ایک اور قوم کو دی جائے گی اور وہ قوم کونسی ہے وہ وہی قوم ہے جس کا نشان وہ پتھر ہے جسے راجگیروں نے ناپسند کیا یعنی قوم بنی اسمٰعیل ۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے حجر اسود کو بوسہ دیا جاتا ہے ۔

[۱۸۶] کعبہ کی طرف منہ اتحاد پیدا کرتا ہے : ان الفاظ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جہاں کہیں تم ہو اللہ تعالیٰ تم سب کا حشر ایک جگہ کرے گا اور یوں بھی ہو سکتے

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾

اور جہاں سے تو نکلے اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے، اور یقیناً یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ إِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۙ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۙ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

اور جہاں سے تو نکلے اپنے مُنہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے ع۱۸۷ اور جہاں کہیں تم ہو اپنے مونہوں کو اس کی طرف پھیر دو، تاکہ لوگوں کے لیے کوئی دلیل تمھارے خلاف نہ رہے مگر وہ جو اُن میں سے ظالم ہیں، سو اُن سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو ع۱۸۸ اور تاکہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور تاکہ تم ہدایت پاؤ ع۱۸۹

كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ

جیسا کہ ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم پر ہماری

ہیں کہ جہاں کہیں تم ہو تم سب پر موت وارد کرے گا اور یوں بھی کہ جہاں کہیں تم ہو اللہ تعالیٰ تمہاری نماز کو ایک ہی جہت کی طرف کرے گا (ض) فیات بکم مجاز عن جعل الصلوٰۃ متحدۃ الجھتہ (ر) اور مضمون کے لحاظ سے یہی آخری معنی ہی زیادہ موزوں ہیں۔ یعنی تم خواہ مشرق میں ہو خواہ مغرب میں خواہ شمال میں خواہ جنوب میں جہاں بھی دنیا میں پھیلے ہوئے ہو جب تم سب ایک خانہ کعبہ کی طرف منہ کرو گے تو تمہاری نماز اور اس کے ساتھ ہی تم میں ایک اتحاد ہو گا۔

اس میں ظاہر طور پر تو اسی قدر کہا ہے کہ جہاں کہیں تم ہو گے تم سب کی نماز ایک ہی جہت کی طرف ہو گی مگر اس میں ایک عظیم الشان پیشگوئی بھی ہے کہ اے مسلمانو! تم جہاں کہیں دنیا میں ہو گے اللہ تعالیٰ اس اتحاد ظاہری کے ساتھ ایک اور اتحاد قائم رکھے گا اور اگر مذاہب کی تاریخ کو دیکھا جائے تو اسلام کا یہ ایک امتیازی نشان ہے کہ قومیت اور ملک کی حدبندیوں کو بالکل توڑ دیتا ہے اور مسلمانوں کو وہ کہیں بھی ہوں ایک کرتا ہے۔

ع۱۸۷ قبلہ کی طرف منہ کرنے کے حکم کو تین دفعہ دہرانے میں حکمت: یہ حکم کہ جہاں سے تو نکلے اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے تین دفعہ دہرایا گیا ہے اوّل آیت ۱۴۴ میں دوئم آیت ۱۴۹ میں تیسرے اس آیت میں مگر یہ تین دفعہ لانا تین مختلف غرضوں کے لیے ہے پہلی مرتبہ تو اس اطمینان کے لیے کہا تھا کہ خانہ کعبہ بُت پرستوں کے تصرف میں نہ رہے گا بلکہ ہم تم کو اس کا متولی بنا دیں گے اس لیے تم اپنا منہ بیشک ادھر پھیر دو۔ دوسری دفعہ آیت ۱۴۸ میں یہ بتا کر کہ ایک قبلہ پر قائم کرنے سے اصل غرض یک جہتی پیدا کرنا ہے پھر فرمایا کہ جہاں سے نکلو اس کی طرف منہ پھیر لو۔ اور اصل غرض کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ تیسری مرتبہ یہاں فرمایا کہ تم اس کی طرف منہ پھیر لو تاکہ لوگوں کے لیے تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ رہے یعنی یہ درحقیقت ان پر ایک اتمام حجّت ہے۔ اگر خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر نہ کیا جاتا تو یہ اعتراض ہوتا تھا کہ جب دعائے ابراہیمی کا موعود نبی آ گیا تو اس کا قبلہ بھی وہی گھر چاہیئے جہاں حضرت اسمٰعیلؑ کو بطور نشان کے چھوڑا گیا تھا۔ چنانچہ آیت ۱۵۱ میں صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ یہی رسول ہے جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی تھی۔

ع۱۸۸ اہل کتاب کا اعتراض کہ کعبہ کو قبلہ بنانا عربوں کو ساتھ ملانے کے لیے تھا: الّا یہاں استثنائے منقطع ہے۔ مراد یہ ہے کہ لوگوں کے لیے حجت تو اب کوئی باقی نہیں رہی اور اتمام حجّت ہو گیا مگر ظالم تو اب بھی نہیں ٹلیں گے۔ یا یہ کہ اب بھی حجت کریں تو یہ ظلم ہے اور ایسا کرنے والے ظالم ہیں۔ یہودی اس وقت کہتے تھے اور عیسائی آج تک کہتے ہیں کہ کعبہ کو قبلہ بنانا عربوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے تھا۔ یہ اس شخص کی نسبت کہا جاتا ہے جس نے ہزارہا سال کی بت پرستی، شرابخوری، قماربازی، زناکاری، جنگ و جدال اور رسوم قبیحہ کو یوں ملک عرب سے مٹا دیا کہ گویا ان کا نام و نشان ہی نہ تھا۔ کیا اس کو ایک خانہ کعبہ چھڑانا مشکل تھا؟ نہیں اور ہرگز نہیں بلکہ اس نے خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کر کے نماز پڑھی تو کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور ڈیڑھ سال تک برابر نمازوں میں خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کرتے رہے اور سبھی مسلمان بھی کرتے رہے اور اس عرصہ میں اسلام کی ترقی کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پس یہ ناحق کی حجت بازی ہے۔

ع۱۸۹ عبادت الٰہی کا پہلا اور آخری گھر: دوسری غرض یہ بیان فرمائی کہ تا تم پر اتمام نعمت ہو اور تاکہ تم کامل ہدایت پانے والے بنو۔ ان سب چیزوں کا تعلق علم الٰہی میں خانہ کعبہ سے تھا جو خدا کی عبادت کا سب سے پہلا گھر دنیا پر تھا۔ اوّل را بآخر نسبتے است۔ جو سب سے پہلا گھر تھا اسی کو دنیا کا آخری قبلہ قرار دیا۔ جہاں سے لوگ روئے زمین پر منتشر ہوئے وہیں پر پھر ان کا اجتماع ضروری ہُوا۔ مکّہ یوں بھی ناف زمین ہے۔ کیونکہ ملک عرب پرانی دنیا کے عین مرکز میں واقع ہوا ہے۔ دنیا توحید کو بھی بھول گئی تھی اور خانہ کعبہ کو بھی۔ دونوں کو آنحضرت صلعم واپس لائے۔

اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ	آیتیں پڑھتا ہے اور تم کو پاک کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت
وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾	سکھاتا ہے اور تم کو وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے ۱۹۰
ع فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾	پس مجھے یاد کرتے رہو میں تمہیں یاد رکھونگا اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو ۱۹۱
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو،
الصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾	یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۱۹۲

ع ۱۹۰ دعائے ابراہیمی کا رسول اور قبلہ ابراہیمی: یعنی تمہارا قبلہ خانہ کعبہ کو اسی طرح قرار دیا ہے جیسا کہ تم میں دعائے ابراہیمی والا رسول بھیج دیا چنانچہ انہی الفاظ کو یہاں دوہرایا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں اوپر آچکے ہیں۔ یہ اسی طرف اشارہ کرنے کو ہے کہ جب وہ دعا پوری ہو کر وہ رسول آگیا تو ضروری ہوا کہ وہ گھر بھی اس کا قبلہ قرار دیا جائے تاکہ تم دنیا میں نیکی کے معلم بنو۔ اسی لیے تحویل قبلہ پر اعتراض کا ذکر کرکے فرمایا تھا لتکونوا شھداء علی الناس۔

ع ۱۹۱ اذکرونی۔ ذکر کے معنی حفظ الشئی ہیں (ت) یعنی کسی چیز کا یاد رکھنا اور یہ دو طرح ہے دل سے اور زبان سے اور ان میں سے ہر ایک دو قسم ہے۔ ایک بھولنے کے بعد کسی چیز کا ذکر دوسرے ہمیشہ اس کا محفوظ یعنی یاد رکھنا (غ) اور ذکر کے معنی ثناء بھی ہیں یعنی تعریف کرنا اور شرف بھی یعنی بزرگی دینا (ت) انہ لذکر لک ولقومک (الزخرف ۴۳-۴۴) میں اور ص والقراٰن ذی الذکر (ص ۳۸-۱) میں یہی آخری معنی مراد لیے گئے ہیں۔ اور الذکر قرآن شریف کا نام بھی ہے۔ یہاں اذکرونی میں بندہ کا اللہ کی ثناء کرنا مراد ہے اور اذکرکم میں بندہ کو اللہ کا شرف یا بزرگی دینا۔ دوسرے لفظوں میں مخلوق خدا میں اس کا ذکر پھیلا دینا یا جس طرح قرآن کریم نے بدی کی سزا کا ذکر انہی الفاظ میں کر دیا ہے دیکھو ۲۷ اسی طرح نیکی کی جزا کا ذکر بھی انہی الفاظ میں کر دیا ہے اور مراد ذکر اللہ کی جزائے خیر دینا ہے۔ یہاں کفر سے مراد ناشکر گذاری یا نعمت کا اخفاء ہے دیکھو ۱۷۔

اعلائے کلمۃ اللہ سے ہی مسلمان بڑے بن سکتے ہیں: یہ مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ تم میرا ذکر کرو یعنی میرے نام کو دنیا میں پھیلاؤ تو میں تمہیں بڑا بناؤں گا اور اگر تم اس نعمت کو چھپاؤ تو پھر تمہارے لیے سزا بھی ہے۔ چنانچہ اگلے رکوع کے دو حصے کیے ہیں ایک حصہ میں ہدایت کے پھیلانے میں مشکلات کے مقابلہ کا اور دوسرے حصہ میں کتمان ہدایت کا ذکر ہے۔ کاش آج مسلمان بڑا بننے کے لیے اس ارشاد الٰہی کی تعمیل کرکے اشاعت اسلام کے کام کو اپنا نصب العین بنائیں۔

ع ۱۹۲ صبر۔ صبر کے معنی کے لیے دیکھو ۶۸ اور یہ دو قسم ہے۔ ایک صبر حرام اور گناہ کی چیزوں کے ترک کرنے پر اور دوسرا صبر طاعات اور قربانیوں کے بجالانے پر۔ یہاں یہی دوسری قسم کا صبر مراد ہے کیونکہ جیسا کہ پچھلے رکوع کی آخری آیت سے ظاہر ہے۔ یہاں مضمون یہ ہے کہ ہدایت کے پھیلانے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کا مقابلہ ضروری ہے۔

مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اور اس کے حصول کے لیے مشکلات: مسلمانوں کو یہ وعدہ دیا تھا کہ خانہ کعبہ بت پرستوں کے ہاتھ میں نہیں رہے گا، بلکہ ہم تم کو اس کا متولی بنا دیں گے یہ ایک بڑا بھاری مقصد تھا ہدایت کا دنیا میں پھیلانا۔ شھداء علی الناس یعنی دنیا میں مزکی اور مبشر و نذیر بننا۔ لوگوں کو نیکی کی تعلیم دینا یہ عظیم الشان کام مسلمانوں کے سپرد کیا گیا تھا اب بتاتا ہے کہ ان مقاصد کا حاصل ہونا آسان نہیں بلکہ اس میں بڑی بڑی مشکلات پیش آئیں گی۔ ان مشکلات کے اندر مدد اللہ تعالیٰ سے چاہو۔ مگر دو ذریعوں سے ایک صبر کے ساتھ یعنی طاعات اور قربانیوں کے بجالانے پر مضبوط رہو اور جو تکلیفیں ان میں پیش آئیں ان کی پروا نہ کرو اور دوسرے نماز کے ساتھ یا دعا یعنی توجہ الی اللہ کے ساتھ کیونکہ نماز بھی اصل میں دعا ہی ہے۔ صبر اور صلوٰۃ کا مفہوم دو ضدوں کا ظاہر کرنے والا ہے۔ صبر کمال درجہ کی مضبوطی کا نام ہے۔ یہاں تک کہ انسان کسی مشکل اور رکاوٹ کی پروا نہ کرے۔ صلوٰۃ کمال درجہ کی عاجزی اور توجہ تام کا نام ہے یہاں تک کہ انسان اپنے مالک کے سامنے گر جائے۔ صبر اس علو کے مقام کو ظاہر کرتا ہے جو انسان کل دنیا کے مقابلہ پر اختیار کر سکتا ہے۔ صلوٰۃ اس انتہائی عاجزی کے مقام کو ظاہر کرتی ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے اختیار کرنا چاہیئے۔ ان دونوں صفات کو اپنے اندر جمع کرنے سے ہی انسان کمال کو حاصل کر سکتا ہے۔ یعنی دنیا اور دنیا کی مشکلات اور دنیا کے جبارین کے سامنے علو اور مضبوطی دکھائے اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی دکھائے۔ عاجزی اور توجہ الی اللہ سے اس کے سامنے راہیں کھل جاتی ہیں مضبوطی اختیار کرکے ان راہوں پر چل سکتا ہے۔ اگر راہ ہی نہ کھلے تو مضبوطی کس کام کی۔ اگر راہ کھل جائے اور اس پر مضبوطی سے قدم مارنے والا نہ ہو تو راہ کھلنے سے فائدہ کیا۔ اس لیے نہ خالی صبر کمال انسانی تک پہنچاتا ہے نہ نری صلوٰۃ۔

دو موقعوں پر استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا ذکر اور دونوں میں فرق: یہی حکم صبر اور صلوٰۃ سے مدد چاہنے کا پہلے بھی سورۃ کے شروع میں آچکا ہے۔ وہاں بنی اسرائیل کو کہا تھا کہ صبر اور صلوٰۃ سے مدد چاہو تو پیغمبر کی صداقت تم پر کھل جائے گی۔ مگر اس موقعہ پر صلوٰۃ کے ذکر کو جاری رکھا وانھا لکبیرۃ اور یہاں صبر کے ذکر کو جاری رکھا۔ ان اللہ مع الصّٰبرین۔ یہ فرق اس لیے ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی شناخت میں زیادہ ضرورت عاجزی اور دعا کی ہے اور کامیابیوں کے حصول میں زیادہ ضرورت صبر یعنی مضبوطی کی ہے۔ اس لیے ہر موقعہ پر جس کی زیادہ ضرورت تھی اس کے ذکر

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ
اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾
وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ
وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ
وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾

اور جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں اُنھیں مُردہ نہ کہو، بلکہ وہ
زندہ ہیں مگر تم محسوس نہیں کرتے ۱۹۳ع
اور ضرور ہم کسی قدر ڈر اور بُھوک اور مالوں اور جانوں اور
پھلوں کے نقصان سے تمہارا امتحان کریں گے اور صبر کرنے
والوں کو خوش خبری دو ۱۹۴ع

کو جاری رکھا۔ چنانچہ اس رکوع میں بلکہ آگے دور تک صبر کا ذکر ہی چلتا ہے۔ دیکھو۔ والصّابرین فی الباساء والضرّاء وحین الباس (۱۷۷) اس سے قرآن کریم کا اعجازی کلام ہونا ثابت ہوتا ہے کہ کس طرح ہر موقعہ پر اس کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ ہاں یہ باریک فرق بہت تدبّر کو چاہتے ہیں۔ اور اس کے لیے ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا بچہ بچہ قرآن شریف کو پڑھے اور اس پر غور کرے۔

۱۹۳ع سبیل اللّٰہ۔ سبیل اس رستہ کو کہتے ہیں جس میں سہولت ہو اور اس کی جمع سُبُل آتی ہے پھر ہر ایک اس ذریعہ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے جس کے ساتھ کسی چیز کی طرف پہنچ سکیں جیسے ادع الی سبیل ربّک (النحل ۱۶- ۱۲۵) اذا لا تبتغوا الی ذی العرش سبیلا (بنی اسرائیل ۱۷- ۴۲) پس سبیل اللّٰہ وہ راہ ہے جس پر چل کر انسان خدا کو پہنچ سکتا ہے اور جیسا کہ اللّٰہ تعالیٰ فرماتا ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینّھم سبلنا (العنکبوت ۲۹- ۶۹) یہ راہ جہاد ہے اسی لیے امام رازی نے لکھا ہے کہ فی سبیل اللّٰہ عرف قرآن میں جہاد کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ جہاد قتال نہیں مگر اس جہاد کے لیے بعض وقت قتال کی ضرورت پیش آجاتی ہے اور یہ اس وقت جب ان راہوں پر چلنے سے تلوار کے ذریعہ سے روکا جاتا ہے۔

اللّٰہ کی راہ میں قتل ہونے والے مُردہ نہیں: جب صبر کی ضرورت بتائی تو اب ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جو صبر میں کمال دکھاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں فرمایا کہ ایسے لوگوں کو مُردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں۔ کہنے والے کون تھے؟ دوسری جگہ منافقوں کا قول مذکور ہے لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا (آل عمران ۳- ۱۵۶) اور مراد چونکہ صرف ایک امر کا ظاہر کرنا ہے اس لیے ہر مخاطب مراد ہے۔

ان کی زندگی کا مفہوم: اس سے کیا مراد ہے کہ ان کو مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں؟ امام راغب نے اس کے ایک معنی یوں کیے ہیں کہ یہاں نفی موت سے مراد غم اور ناکامی کی موت ہے موت کے اس معنی کی تائید میں انہوں نے یہ آیت پیش کی ہے ویاتیہ الموت من کل مکان وما ھو بمیت (ابراہیم ۱۴- ۱۷) اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ خدا کی راہ میں کام کرتے ہوئے مارے جائیں ان پر حزن و ناکامی کی موت نہیں آتی۔ اس لیے ان کو ناکام مت کہو بلکہ وہ کامیاب ہوں گے اس صورت میں یہ استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا نتیجہ بتایا کہ ایسے لوگ ناکام کبھی نہیں ہوں گے۔

کافر کی بعد موت زندگی حیات نہیں: اگر عام معنی لیے جائیں تو ظاہر ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے۔ حالانکہ کافر موت کے بعد مطلق نیستی سمجھتے تھے۔ وہ زندگی بیشک سب کے لیے ہے نیکوں کے لیے بھی اور بدوں کے لیے بھی۔ مگر بدوں کے لیے چونکہ اس زندگی میں عذاب ہے جس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے لا یموت فیھا ولا یحیٰی (طٰہٰ ۲۰- ۷۴) وہ زندگی تو ضرور ہے اس لحاظ سے کہ نیستی نہیں مگر اس کو حیات یا زندگی بھی نہیں کہہ سکتے۔ پس زندگی حقیقت میں نیکوں کے لیے ہی ہے۔ پھر بالخصوص وہ لوگ جو یہاں شہید کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جیسے انبیاء علیہم السلام یا ان کے کامل متبعین جن کو صدیق اور شہید کہا گیا ہے یا وہ لوگ جو اپنی جانیں خدا کی راہ میں دیدیتے ہیں یہ لوگ اپنے مشاہدہ یالیقین سے گویا عینی گواہ اللّٰہ تعالیٰ کی ہستی کے ہو جاتے ہیں اور وہ حجاب جو اکثر اہل دنیا کی صورت میں اس عالم میں رہتا ہے ان کی صورت میں اُٹھ جاتا ہے وہ اسی زندگی میں ایک نئی زندگی پا لیتے ہیں اور موت کے ساتھ ہی ان کی وہ نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کو خصوصیت سے احیاء یعنی زندہ کہا گیا ہے۔

شہداء کی موت اور ان سے استمداد کا ناجائز ہونا: جن لوگوں نے ظاہر الفاظ پر زور دے کر اس آیت کے یہ معنی کرنے چاہے ہیں کہ شہداء کبھی مرتے ہی نہیں اور پھر اس خیال کو شرک کی حد تک پہنچایا ہے یہاں تک کہ ان سے استمداد کرتے ہیں بلکہ بعض بیہودہ باتوں کا اعتقاد بھی ان کے متعلق رکھتے ہیں وہ قرآن شریف کے منشاء سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ انبیاء، صدیق، شہید، صالح سب مرتے ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلعم کو ارشاد ہوتا ہے انک میت وانھم میتون (الزمر ۳۹- ۳۰) اور صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ شہداء کی روحیں (نہ جسم) جنت میں سبز پرندوں کی صورت میں ہوں گی۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے ان ارواح الشھداء فی حواصل طیور خضر تسرح فی الجنۃ حیث شاءت اور ایک حدیث میں بجائے حواصل کے صور کا لفظ ہے اور دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ مر کر انسان عالم الغیب نہیں بن جاتا کہ اس عالم میں کوئی شخص کچھ دعا کرے تو اس کا علم ایک ولی یا شہید کو ہو جائے عالم الغیب صرف ایک اللّٰہ کی ذات ہے وہی سب کی دعائیں سنتا ہے اور وہی حاجات کو پورا کرتا ہے۔ نیک لوگ ہمارے لیے شفیع ہوتے ہیں اور اللّٰہ تعالیٰ ان کی شفاعت کو ہمارے حق میں قبول بھی فرماتا ہے۔ مگر موت کے بعد وہ عالم برزخ میں جاتے ہیں اور اس عالم کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں اور نہ قرآن و حدیث سے بعد موت ان سے استمداد جائز ثابت ہوتی ہے۔

۱۹۴ع مصائب میں حکمت: خدا کی طرف سے بلیٰ اظہار کمالات کا نام ہے دیکھو ۱۵۵ع نیکوں پر جو تکالیف آتی ہیں۔ جن میں اظہار صبر کی ضرورت پیش آتی ہے ان

الَّذِينَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوٓا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ ﴿١٥٦﴾

جنھیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے کہتے ہیں ہم اللہ کے لیے ہی ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ع۱۹۵

أُولَٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ﴿١٥٧﴾

یہی وہ ہیں جن پر اُن کے رب کی طرف سے مغفرت اور رحمت ہے اور یہی وہ ہیں جو ہدایت پانے والے ہیں ع۱۹۶

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿١٥٨﴾

صفا اور مروہ اللہ کے نشانوں میں سے ہیں ع۱۹۷ پس جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے اور جو کوئی شوق سے نیکی کرتا ہے تو اللہ بڑا قدردان جاننے والا ہے ع۱۹۸

کی حکمت یہاں بیان کی ہے کہ ان کے ساتھ ان کے اندرونی کمالات کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کوئی قوم بڑی نہیں بنتی اور نہ کوئی انسان بڑا بنتا ہے جب تک کہ مصائب کی کٹھالی میں نہ پڑے پس قضاء وقدر کے مصائب انسان کو بڑا بنانے کے لیے ہیں، نہ عذاب کے طور پر، اصطفا کے رنگ میں نہ ہلاکت کے طور پر۔

صحابہ کا کمال صبر: اس آیت سے صحابہ کے کمال صبر پر شہادت ملتی ہے۔ وطن گھر بار اموال جائداد سب کچھ چھوڑ کر اور صرف دین کو لے کر مدینہ میں پہنچے مگر یہاں ابھی اور مصائب کی خبر سنائی جاتی ہے کس قدر کمال صبر ہے کہ اس سے گھبراتے نہیں بلکہ ان نئے مصائب کو خدا کی راہ میں خوشدلی سے برداشت کرتے ہیں۔

ع۱۹۵ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مصیبت کے وقت اس کلمہ کا منہ پر آنا رضا بالقضاء اور مقام توحید کا نہایت بلند مقام ہے۔ اس میں یہ بتایا کہ اگر مال و جان کا کچھ نقصان ہوا تو یہ چیزیں انسان کی زندگی کا اصل مقصود نہیں بلکہ اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے آپ کو لگا دینا ہے۔ دنیا کی چیزیں جن سے ہم فائدہ اُٹھاتے ہیں محض خدا کی امانتیں ہیں وہ جب چاہے اپنی امانتوں کو واپس لیلے۔ ہم خود بھی اس کی امانت ہی ہیں۔

ع۱۹۶ صلوات۔ صلوٰۃ کی جمع ہے جس کے معنی دعا ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ اپنے بندہ کے حق میں اس کا تزکیہ یعنی گناہوں سے پاک کرنا ہے (غ) یا بندہ یا فرشتہ کی صلوٰۃ بندہ کے حق میں دعائے مغفرت ہے اور اللہ کی صلوٰۃ خود مغفرت ہے۔ علاوہ صلوٰۃ کے رحمت کا لفظ بھی فرمایا۔ یعنی صرف حفاظت ہی نہیں فرماتا بلکہ انعام واحسان بھی کرتا ہے۔

ع۱۹۷ الصفا والمروۃ۔ صفا (صفاۃ کی جمع) صاف پتھروں کو کہتے ہیں اور مروۃ چھوٹے کنکروں کو۔ مکّہ معظمہ کے پاس دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے نام ہیں۔

شعائر۔ شعیرۃ کی جمع ہے اور یہ شعر سے ہے جس کے معنی ہیں باریک علم حاصل کیا دیکھو ع۲۲ اور شعائر سے مراد ہر ایک وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے علم بنائی گئی ہو۔ اس لیے اعمال حج کو شعائر اللہ کہا گیا ہے یا شعائر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ معالم یعنی نشان ہیں جن کے قیام کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس لیے قربانیوں وغیرہ کو بھی شعائر اللہ فرمایا ہے (ت)

صفا اور مروہ کے ذکر میں یہاں دوہرا اشارہ ہے۔ ایک تو صبر کے مضمون کے متعلق، کیونکہ صفا اور مروہ وہ مقام ہیں جہاں حضرت ہاجرہ حضرت اسمٰعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں دوڑتی تھیں ان کے عظیم الشان صبر کا یہ ثمرہ اللہ تعالیٰ نے دیا کہ ان دو پہاڑیوں کو الٰہی نشان قرار دیا اور ہمیشہ کے لیے اس صبر کے نمونہ کی یادگار بنایا۔ جب حضرت ہاجرہ کو حضرت ابراہیمؑ نے اس بے آب وگیاہ بیابان میں چھوڑا تو انہوں نے صرف اس قدر دریافت کیا ءَ اللّٰہ امرك بها۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ حکم آپ کو دیا ہے کہ ہمیں یہاں چھوڑ دو۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا ہاں۔ تو انہوں نے کہا اذا لا یضیعنا۔ پھر اللہ تعالیٰ ہم کو ضائع نہیں کریگا۔ اس کی طرف یہاں اشارہ کر کے یہ بھی بتا دیا کہ حضرت ابراہیمؑ کا ہاجرہ کو یہاں چھوڑنا حضرت سارہ کی خوشی کے لیے نہ تھا جیسا کہ بائبل میں مذکور ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت تھا پس دوسرا اشارہ صفا اور مروہ کے ذکر میں یہ بھی ہے کہ یہی وہ مقام ہے جس کا تعلق حضرت اسمٰعیلؑ سے ہے اور آپ کو یہاں چھوڑنے کے یہی معنے تھے کہ اس مقام سے ان کا کوئی خاص تعلّق ہے۔

ع۱۹۸ حج۔ حج کے معنی ع۱۰۱ میں بیان ہو چکے ہیں۔ عرف شریعت میں قصد بیت اللہ کا نام ہے۔

اعتمر۔ عمارۃ آباد کرنا ہے وعمروها اکثر مما عمروها (الروم ۳۰-۹) اور عمر گویا وہ مدت ہے جس میں روح سے جسم آباد رہتا ہے۔ اور اعتمار اور عُمرۃ کے معنی ہیں زیارۃ کرنا جس میں محبّت کی عمارۃ یعنی اس کا قائم رکھنا ہے اور شریعت کی اصطلاع میں بیت اللہ کا قصد ہے اور حج اور عمرہ میں فرق یہ ہے کہ حج صرف خاص ایام ماہ ذی الحج میں ہوتا ہے اور عمرہ ہر وقت ہو سکتا ہے اور حج میں میدان عرفات میں اجتماع ہوتا ہے عمرہ

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَآ أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ
وَالْهُدٰى مِنۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي
الْكِتٰبِ ۙ أُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُونَ ﴿۱۵۹﴾
إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولٰٓئِكَ
أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۶۰﴾
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولٰٓئِكَ
عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۶۱﴾

جولوگ اس کو چھپاتے ہیں جو ہم نے کھُلی باتوں اور ہدایت سے اُتارا ہے اس کے بعد کہ ہم نے اسے لوگوں کے لیے کھول کر کتاب میں بیان کردیا یہی ہیں کہ اللہ ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنیوالے ان پر لعنت کرتے ہیں۔۱۹۹
مگر وہ لوگ جنھوں نے توبہ کی اور اصلاح کی اور کھول کر بیان کردیا اُن پر مَیں (رحمت کے ساتھ) متوجہ ہوتا ہوں اور مَیں توبہ قبول کرنیوالا رحم کرنیوالا ہوں
جو کافر ہوئے اور مر گئے درآنحالیکہ وہ کافر ہی تھے یہی ہیں کہ اُن پر اللہ اور فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے ۲۰۰

میں نہیں۔

جناح۔ جُناح پرند کے بازو کو کہتے ہیں۔ اور ہر چیز کے دو طرفوں کو اس کے جناح کہا جاتا ہے۔ واضمم یدك الی جناحك (طٰہٰ۔۲۲) میں جناح سے مراد جانب ہے اور جَنَحَ کے معنی ہیں مائل ہُوا وان جنحوا للسلم۔ فاجنح لہا (الانفال۔ ۶۱) اور گناہ کو جو انسان کو حق سے ایک جانب مائل کردے جُناح کہا جاتا ہے۔

یطوف۔ طواف کسی چیز کے گرد گھومنے کا نام ہے یہاں صفا اور مروہ کے طواف سے مراد سعی بین الصفا والمروۃ ہے۔

تطوع۔ طوع کے معنی انقیاد یعنی فرمانبرداری کے ہیں اور اسی سے اطاعت اور استطاعت ہے اور اسی سے ہی فطوّعت لہ نفسہ قتل اخیہ (المائدہ۔ ۳۰) جو اطاعت سے ابلغ ہے اور تطوع کے معنی ہیں تحمّلہ طوعًا یعنی برضا ورغبت ایک بوجھ اٹھایا (غ) اس لیے تطوّع وہ عبادت ہے جو انسان خوشی سے اختیار کرتا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار سعی بین الصفا والمروۃ میں کچھ مضائقہ کرتے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صفا اور مروہ پر دو بُت اساف اور نائلہ تھے اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس رکن حج کو بجالانے میں ہرج نہیں۔ گویا یہ ایک پیشگوئی تھی کہ وہ بُت نہیں رہیں گے اور اس کے یہ معنی نہیں کہ سعی بین الصفا والمروۃ نہ کرے تو بھی ہرج نہیں کیونکہ اس کا ارکان حج میں سے ہونا احادیث صحیحہ اور تعامل اُمت سے ثابت ہے پس اشارہ صرف یہی ہے کہ سر دست ان حالات میں بھی ارکان حج کو نہ چھوڑو۔ عروہ نے جب حضرت عائشہ رضؓ سے کہا کہ اس آیت کی رُو سے اگر سعی بین الصفا والمروۃ نہ کی جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں اگر یہ منشاء ہوتا تو عبارت یوں ہوتی فلاجناح علیہ ان لا یطوف۔ حضرت ہاجرہ کے قصّہ کی طرف اشارہ کر کے پھر مضمون کو عام کردیا کہ جو کوئی بھی شوق سے نیکی کرتا ہے اسی کو بہتر بدلہ ملتا ہے کسی انسان سے اس کی خصوصیت نہیں۔

ع۱۹۹ یکتمون۔ ایک چیز کے اظہار کو عمداً ترک کردینا باوجودیکہ اس کی حاجت معلوم ہوتی ہو کَتْم یا کتمان کہلاتا ہے۔

کتمان ہدایت اور اس کے نتائج: کتمان ہدایت سے وہی مراد ہے جو پچھلے رکوع کے آخر میں کفران نعمت سے مراد ہے تعلق مضمون کے لیے دیکھو ۱۹۱ ہدایت کا چھپانا یہ ہے کہ انسان اس پر عمل نہ کرے دوسروں کو اس کی طرف نہ بلائے۔ اشارہ بالخصوص یہودیوں کی طرف ہے جو اس زمانہ میں کتمان ہدایت کرتے تھے مگر مسلمانوں کا بھی نقشہ کھینچ دیا ہے آج مسلمان نہ خود قرآن پر عامل ہوتے ہیں نہ دوسروں کو قرآن کی طرف بلاتے ہیں۔ اس لیے وہی بلائیں جن کے مستحق یہود تھے آج مسلمانوں کے لاحق حال ہو رہی ہیں۔ خدا کی رحمت سے دور پڑے ہوئے ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جس شخص سے علم کی بات پوچھی جائے اور وہ اسے چھپائے قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام دی جائے گی۔ یہاں اللہ کے لعنت کرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کا اُن کو اپنی رحمت سے اور اپنی جناب سے دور کردینا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والوں کی لعنت اپنی اپنی حالت کے مطابق ہے مثلاً فرشتوں کی لعنت یہ ہے کہ وہ نیکی کی تحریک سے دُور ہو جائیں لوگوں کی یہ کہ ان کو گھروں سے نکال دیں۔ یہودیوں کے لیے ان لعنتوں کا ذکر استثنا ۲۸ : ۱۵۔۲۰ میں ہے۔ "تو شہر میں لعنتی ہوگا اور تو کھیت میں بھی لعنتی ہوگا.. ..... تیرے بدن کا پھل تیری زمین کا پھل ...... لعنتی ہو جائیں گے۔ تو بھیتر آنے کے وقت لعنتی ہوگا اور تو باہر جانے کے وقت لعنتی ہوگا"۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہود کے ان تذکروں سے بڑا فائدہ اُٹھایا۔ جو کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پہنچایا تھا اسے انہوں نے ایک عظیم الشان امانت کے طور پر دوسرے لوگوں تک پہنچانے میں کمال احتیاط اور مستعدی سے کام لیا ایک طرف اگر اس میں کچھ گھٹانے بڑھانے میں ایسی احتیاط کی جس کی نظیر نہیں تو دوسری طرف اس کے پہنچانے میں جانیں تک دے دیں۔

ع۲۰۰ پچھلی آیت میں توبہ کرنے والوں کا ذکر ہے۔ اس میں ان کا جو توبہ نہیں کرتے۔ یعنی وہی لوگ جن کا ذکر گزشتہ سے پیوستہ آیت میں ہے اور وہ توبہ نہیں کرتے۔ اللہ کی لعنت رحمت الٰہی سے دور ہو جانا ہے ملائکہ کی لعنت نیکی کے محرکوں سے بُعد یعنی نیکی کی توفیق چھن جانا ہے۔ لوگوں کی لعنت دربدر کیا جانا ہے۔

خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ
وَلَا هُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۱۶۲﴾

اسی میں رہیں گے نہ اُن کا دُکھ ہلکا کیا جائے گا اور نہ اُن کو مہلت دی جائے گی۔

ع ۹ وَ اِلٰـهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۶۳﴾ ع

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اسکے سوا کوئی معبود نہیں وہ بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنیوالا ہے ۲۰۱

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ
الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ وَ الۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی
الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ
مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ
بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَ بَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪
وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ
السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾

آسمانوں اور زمین کی پیدایش میں اور رات اور دن کے ادل بدل میں اور کشتیوں میں جو سمندر میں چلتی ہیں کہ اس کے ساتھ لوگوں کو نفع دے اور پانی میں جو اللہ بادل سے اتارتا ہے پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور اس کے اندر ہر قسم کے جانور پھیلاتا ہے اور ہواؤں کے ہیر پھیر میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان کام میں لگایا گیا ہے اُن لوگوں کے لیے یقینی نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ ۲۰۲

ع ۲۰۱ اِلٰه - اس کا اشتقاق اَلَهَ سے ہے جس کے معنی ہیں اس نے عبادت کی اور اِلٰه کے معنی معبود ہیں۔ اس کی جمع اٰلِهَة آتی ہے (غ) معبودان باطل پر اس لفظ کا اطلاق ان کے معتقدین کے نقطہ خیال سے ہوا ہے۔

واحد - وَحۡدَة کے معنی انفراد یا اکیلا ہونا ہیں اور وَاحِد فی الحقیقت وہ ہے جس کی کوئی جزو نہ ہو مگر اس کا استعمال بہت وسیع ہے جس کا کوئی نظیر نہ ہو اس کو بھی واحد کہہ دیتے ہیں جیسے یگانہ کہہ دیتے ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی صفت میں واحد ہو تو اس کے معنی ہیں وہ جس کا نہ کوئی جزو ہو سکتا ہے اور نہ ہی جس میں کثرت ہو سکتی ہے (غ) اور اَحَدٌ مطلق سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے پر نہیں بولا جاتا (غ)

جس طرح پچھلے رکوع کی آخری آیت میں اس رکوع کے مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے اسی طرح اس رکوع کی آخری آیت میں اگلے رکوع کے مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے یعنی توحید الٰہی۔ اور اس رکوع میں چونکہ صبر کی تعلیم تھی اور صبر کے معنی طاعات پر قائم رہنا ہے اور نیز ہدایت کے پھیلانے کی تعلیم تھی اس لیے بتا دیا کہ ہدایت کا اصل الاصول توحید الٰہی ہے۔ اور اسی پر سب سے پہلے انسان کو قائم ہونا چاہیئے۔ توحید کی تعلیم جس کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے کیا ہے؟ اگر ایک طرف واحد کہہ کر یہ بتایا کہ نہ اس کا کوئی جزو ہو سکتا ہے نہ اس کی ذات میں کثرت ہے اور نہ اس کی صفات میں اس کا کوئی شریک ہے۔ تو دوسری طرف الٰهكم الٰه واحد کہہ کر بتایا کہ وہی انسان کا حقیقی محبوب اور مطلوب اور مقصود ہے۔ اسی لیے وہ ایک ہی عبادت کے لائق ہے اور دوسری کوئی چیز اس کے ساتھ عبادت کے لائق نہیں۔ وہ ذات میں بھی واحد ہے اور صفات میں بھی اور عبادت میں بھی مگر وہ انسانوں سے بے تعلق بھی نہیں۔ کیونکہ وہ رحمان و رحیم ہے۔

ع ۲۰۲ اختلاف - خلف کے معنی پیچھے ہیں اور اختلاف کے معنی یہاں ایک کا دوسرے کے پیچھے آنا ہے اور اختلاف یہ بھی ہے کہ ہر ایک دوسرے سے الگ رستہ اختیار کرے (غ)

نہار - نہر کے معنی ع ۳۹ میں بیان ہو چکے۔ نہار وہ وقت ہے جس میں روشنی کا انتشار ہو جو طلوع آفتاب سے غروب تک ہے۔ مگر اصطلاح شریعت میں طلوع فجر سے غروب آفتاب تک نہار ہے۔

فُلۡك - کشتی - واحد اور جمع دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور فَلَك وہ ہے جس میں سیارے چلتے ہیں اور یہ کشتی کی مشابہت کے لحاظ سے ہے (غ)

بث - کسی چیز کو پراگندہ کرنا اور اسے اٹھانا هباءً منبثًا (الواقعہ ۵۶-۶) اور بثّ غم کو بھی کہتے ہیں اس لیے کہ وہ فکر کو پراگندہ کرتا ہے (غ) اور بث فیها میں یہاں اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے وجود میں لانے اور ظاہر کرنے کی طرف اسے جو موجود نہ تھا (غ)

دابة - دبّ اور دَبِیۡب ہلکا چلنے کا نام ہے اور دابّة کا استعمال ہر حیوان پر ہوتا ہے (غ) یا ہر ایک زمین پر چلنے والے پر (ت)

تصریف - صَرۡف کے معنی ہیں ایک چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا اور یہی معنی تصریف کے ہیں مگر اس میں کثرت پائی جاتی ہے۔

ریاح - اس کا واحد ریح ہے اور یہ اس ہوا کو کہتے ہیں جو حرکت میں ہو۔ عموماً قرآن شریف میں جہاں یہ لفظ واحد آیا ہے وہاں مراد عذاب ہے اور جہاں جمع ریاح آیا ہے وہاں مراد رحمت ہے (غ) واحد کی مثالیں ہیں انا ارسلنا علیهم ریحًا صرصرًا (القمر ۵۴-۱۹) کمثل ریح فیها صرٌّ (آل عمران ۳-۱۱۷) اشتدت به الریح (ابراهیم ۱۴-۱۸) اور جمع کی مثالیں ہیں وارسلنا الریاح لواقح (الحجر ۱۵-۲۲) یرسل الریاح مبشرات (الروم ۳۰-۴۶) اور یرسل الریاح

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَہُمۡ کَحُبِّ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ وَ لَوۡ یَرَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ یَرَوۡنَ الۡعَذَابَ ۙ اَنَّ الۡقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے سوا (اس کے) ہمسر بنا لیتے ہیں، ان سے اللہ کی محبت کی طرح محبت کرتے ہیں اور جو ایمان لائے وہ اللہ کی محبت بہت بڑھ کر رکھتے ہیں اور اگر وہ جو ظالم ہیں دیکھیں، جب عذاب کو دیکھیں گے کہ سب طاقت اللہ کے لیے ہی ہے اور کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ ع۲۰۳

بشرا (النمل ۲۷-۶۳) اسی لیے ایک روایت میں نبی کریم صلعم کی یہ دعا ہے اللّٰھم اجعلھا ریاحا ولا تجعلھا ریحا (ر)

سحاب۔ سَحْب کے اصل معنی جرّ یعنی کھینچنا ہیں یوم یسحبون فی النار علےٰ وجوھھم (القمر ۵۴-۴۸) اور سحاب بادل کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ پانی کو کھینچ لاتا ہے۔

مسخر۔ تسخیر یہ ہے کہ بوجہ غلبہ کے خاص غرض کی طرف چلائے یعنی خاص کام میں لگا دے (غ) پس مُسَخَّر وہ چیز ہے جو خاص کام میں لگا دی گئی اور اس کا مادہ سخر ہے جس کے معنی ہیں دوسرے کی تحقیر کے لیے اس پر ہنسنا۔

مناظر قدرت سے توحید باری کی شہادت: جب ہدایت کے پھیلانے کے لیے مصائب کے مقابلہ کو بھی ضروری قرار دیا تو اب بتاتا ہے کہ ہدایت کی جڑ خدا کی ہستی اور اس کی توحید ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ اس پر اگر ایک طرف مناظر قدرت سے شہادت ملتی ہے تو دوسری طرف فطرت انسانی بھی اس پر گواہی دے اٹھتی ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں مناظر قدرت کی شہادت کو پیش کیا۔ مگر مناظر قدرت بھی وہ پیش کیے ہیں، جن سے دنیا کا کوئی حصہ خالی نہیں۔ پہلے خود زمین و آسمان کی پیدائش ہے جو کچھ زمین و آسمان کے اندر ہے وہ اس میں آ گیا۔ پھر تغیّرات زمانہ ہیں۔ رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات مناظر قدرت تو سب اس میں آ گئے۔ پھر ان کی تفصیل کی ہے اور اس تفصیل میں سب سے پہلے کشتی کا سمندر پر چلنا ہے جو بتاتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیگر مخلوق پر حکومت عطا کی ہے یہاں تک کہ وہ سمندروں پر بھی حکومت کرتا ہے۔ جب مخلوق پر حاکم ہوا تو پھر مخلوق کو معبود بنانے کے کیا معنی۔ پھر اس سمندر کو مردہ زمین پر جگہ جگہ پانی برسانے کا ذریعہ بنایا اور اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کیا۔ پانی سے سبزیاں اُگتی ہیں اور یہی پانی جانوروں کی زندگی کا مدار ہے۔ پھر ان ہواؤں میں جو اس پانی کو جگہ جگہ پہنچاتی ہیں۔ اس بادل کے ذریعہ سے جو آسمان و زمین کے درمیان کام میں لگایا گیا ہے۔ ان تمام اختلافات کے اندر ایک ہی قانون کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک ہی مدبر بالارادہ ہستی کے تصرّف میں ہے یہ ہو نہیں سکتا کہ سارے عالم میں ایک ہی قانون کام کر رہا ہو یہاں تک کہ آسمان کے ستاروں میں وہی قانون کام کرتا ہو جو زمین کے اندر کر رہا ہے اور اس قانون کے بنانیوالے دو ہوں۔

ع۲۰۳ حُبّ۔ حَبّ اور حَبَّۃ دانہ کو کہتے ہیں اور حَبَّۃ القلب قلب انسانی کا مرکز ہے۔ پس محبّ اصل میں حبّۃ القلب میں اثر کر جانے کا نام ہے (غ)

یریٰ۔ رأیٰ جب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو تو اس کے معنی عِلْم یعنی جاننا ہوتے ہیں (غ) یہاں جملہ ان القوۃ للّٰہ جمیعًا دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

لو یری۔ کا جواب محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں وہ شرک اختیار کرنے کی جرأت نہ کرتے۔

فطرت انسانی کی شہادت توحید باری پر: مناظر قدرت سے فطرت انسانی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے انسان کے دل میں محبت اس چیز کی ہوتی ہے جس سے اسے منفعت پہنچتی ہے اور مناظر قدرت میں جہاں تک غور کرو سب منفعت کے سامان انسان کے لیے خدا تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں۔ پس فطرت انسانی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ایک خدا کی محبّت سے ہی قلب لبریز ہوتا۔ مگر مشرک نہ مناظر قدرت پر غور کرتا ہے نہ فطرت کی شہادت کی پروا کرتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہمسر قرار دیکر اُن سے ایسی محبت کرتا ہے جیسی اسے خدا سے کرنی چاہیئے تھی۔ انداد یا ہمسروں سے مراد یہاں وہ بڑے لوگ ہیں جن کی فرمانبرداری کر کے لوگ معصیت میں پڑتے ہیں (ج) ہاں مومن کی محبت جو وہ اپنے مالک سے رکھتا ہے اس سے بھی بڑھ کر ہے جس قدر مشرک کو اپنے جھوٹے معبود سے ہوتی ہے۔

عقل اور محبت کا مقام: پہلی آیت میں اصول کی صحت معلوم کرنے کے لیے عقل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس آیت میں کام کرنے کا اصول محبت بیان فرمایا۔ چنانچہ والذین اٰمنوا اشد حبًّا للّٰہ یعنی جب عقل سے کام لیکر انسان ایمان لے آئے تو پھر کام کرنے کے لیے اپنے اندر وہ محبت کا ولولہ پیدا کرے جو تمام ولولوں سے بڑھ کر ہو۔ دنیا میں جس قدر لوگ کام کرتے ہیں وہ کسی نہ کسی جذبہ محبت کے ماتحت ہی کرتے ہیں مگر فرمایا کہ مومنوں کا جذبہ محبّت خدا کی راہ میں کام کرنے کے لیے سب جذبات محبت سے بڑھ کر ہونا چاہیئے۔ اگر حبّ وطن یا حبّ قوم یا کسی پیر یا لیڈر کی محبت کوئی جذبہ محبت پیدا کر سکتی ہے اور انسان سے بڑے بڑے کام کرا سکتی ہے تو ان تمام ولولوں سے بڑھ کر خدائی محبت کا

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾	جب وہ جو پیشوا بنائے گئے تھے ان سے بیزار ہو جائیں گے جو ان کے پیرو تھے اور عذاب کو دیکھیں گے اور انکے تعلقات کٹ جائیں گے[204]
وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع	اور وہ جو پیرو تھے کہیں گے کاش ہمارے لیے پھر کر جانا ہوتا تو ہم اُن سے اسی طرح بیزار ہوتے جس طرح وہ ہم سے بیزار ہیں اسی طرح اللہ ان کو اُن کے عمل اُن پر حسرتیں بنا کر دکھائے گا اور وہ آگ سے باہر نکلنے والے نہ ہوں گے[205]

جذبہ ہونا چاہیئے۔ اور صرف اللہ کی محبّت کے لیے کام کرنا جس کے سامنے دوسری تمام محبتیں ہیچ ہوں انسان کی زندگی کی اصل غرض ہونی چاہیئے۔ اشدّ حبّاً للّٰہ کا نظارہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی میں عملی طور پر نبی کریم صلعم نے پیدا کر کے دکھا دیا کہ یہ کوئی خیالی مقام نہیں بلکہ ایک قوم نے اس اصول پر کام کیا اور دنیا اور دین کی خیرات ان کے اندر جمع ہو گئیں اور کامیابی کے اعلیٰ سے اعلیٰ منازل پر وہ پہنچ گئے۔ آج مسلمان اسی جذبہ محبت سے خالی ہیں۔ قوم اس وقت بنے گی، کامیابی کا منہ اس وقت دیکھیں گے جب خدا کی محبّت کے جذبہ کے سامنے تمام دوسرے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ کیسا پُرحکمت کلام ہے۔ پہلے بتایا کہ صحیح راہ کو معلوم کرنے کے لیے عقل سے کام لو۔ اور جب اُسے معلوم کر لیا جب خدا کی ہستی کا یقین دل میں بیٹھ گیا تو پھر بتایا کہ محبت کے رنگ میں کام کرو۔ اکثر لوگ دنیا میں عقل اور محبّت میں فرق نہیں کرتے اور عقل کی جگہ محبت سے اور محبت کی جگہ عقل سے کام لیتے ہیں اصول دین کو عقل سے نہیں جانچتے بلکہ اندھا دھند مان لیتے ہیں۔ اور کام کرتے وقت عاشقانہ جوش سے کام نہیں کرتے بلکہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔

ع۲۰۴ تبرأ۔ بُرء اور براء اور تبری کے معنی ہیں اس چیز سے الگ ہو جانا جس کے پاس ہونا ناپسند ہو (غ) پس بیماری سے اچھا ہونے پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اور کسی چیز یا شخص سے علیحدگی یا بیزاری پر بھی جیسے براٰءۃ من اللّٰہ ورسولہ (التوبۃ ۹-۱) ان اللّٰہ بری من المشرکین ورسولہ (التوبہ ۹-۳) انا بُرَءٰؤُ منکم (الممتحنۃ ۶۰-۴) انني براء مما تعبدون (الزخرف ۴۳-۲۶)

اسباب۔ سبب کی جمع ہے اور سبب وہ چیز ہے جس کے ذریعہ دوسری چیز تک پہنچا جائے (غ) یہاں اسباب سے مراد تعلقات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ اپنا کام نکالتے تھے۔

جھوٹے پیشواؤں اور پیرووں کی ایک دوسرے سے بیزاری: یہاں بتایا کہ جن کی محبّت کی خاطر یہ لوگ خدا کی نافرمانی کرتے تھے وہ خود ان سے بیزار ہو جائیں گے قیامت کے دن تو اس بیزاری کا اور قطع تعلق کا نقشہ کامل طور پر ظہور پذیر ہوگا جو جھوٹے پیشواؤں اور ان کے پیرووں میں واقع ہوگا مگر اس دنیا میں بھی بسا اوقات یہ نقشہ نظر آجاتا ہے۔ ایک بدمعاش بعض وقت دوسروں کو دل خوش کن نقشے دکھا کر ان کو بدی میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن جب اس بدی کے بدنتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ خود بھی گرفتار بلا ہوتا ہے تو پھر اپنے دام افتادوں سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے اور وہ جو اس کے دام تزویر میں آگئے تھے وہ بھی جب بدی کے بدنتائج کو دیکھتے ہیں تو ان پیشواؤں پر لعنت بھیجتے ہیں جنہوں نے ان کو غلط راہ پر ڈالا تھا اسی کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے۔ بدی کا نتیجہ چونکہ لازماً بد ہے اس لیے جب اس بدنتیجہ کا اثر اپنی ذات پر پڑتا ہے تو اس وقت بدی سکھانے والے اور سیکھنے والے ایک دوسرے سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بالمقابل جو شخص دوسروں کو نیکی کی تعلیم دیتا ہے اس کے ساتھ تعلّق محبت ہمیشہ بڑھتا ہے۔

ع۲۰۵ اعمال۔ عمل کی جمع ہے اور عمل ہر اس فعل کو کہتے ہیں جس کو کوئی جاندار قصد سے کرتا ہے (غ) فعل بلا قصد ہو سکتا ہے مگر عمل نہیں۔

حسرات۔ حسرۃ کی جمع ہے اور حسر کے معنی ہیں جس چیز پر کوئی دوسری چیز اُڑھائی گئی ہے۔ اس کا اس سے اتار دینا یعنی ننگا کر دینا۔ اور حاسر یا حسیر یا محسور تھکے ماندہ کو کہتے ہیں۔ گویا اس کی قوتوں پر سے پردہ اٹھ گیا ہے، یا وہ ظاہر ہو گئی ہیں۔ فتقعد ملوما محسورا (بنی اسرائیل ۱۷-۲۹) ینقلب الیک البصر خاسئا وھو حسیر (الملک ۶۷-۴) اور حسرۃ غم اور ندامت کا اظہار ہے اس چیز پر جو ہاتھ سے جاتی رہی ہو۔ گویا اس کے قویٰ شدت غم سے ننگے ہو گئے۔ یا قصور کے تدارک کے مقابلہ میں اس پر درماندگی کی حالت طاری ہو گئی۔ (غ)

بدی پر حسرت عذاب بن جاتی ہے: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اعمال بد ایسی ندامت کا موجب ہوتے ہیں کہ وہی حسرت ہی اس کے لیے موجب عذاب اور ایک آگ ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا لیجعل اللّٰہ ذٰلک حسرۃ فی قلوبھم (آل عمران ۳-۱۵۶) اور ایک جگہ فرمایا انہ لحسرۃ علی الکٰفرین (الحاقہ ۶۹-۵۰) اور پھر اس دلوں کی حسرت کی طرف ہی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا نار اللّٰہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ (الھمزۃ ۱۰۴-۶ و ۷) خدا کی جلائی ہوئی آگ جو دلوں پر بھڑک اٹھتی ہے، یہ بھی فطرت انسانی کی شہادت ہے کہ نیکی پر خواہ اس کی وجہ سے کتنا ہی دُکھ کیوں نہ اٹھانا پڑے انسان کے دل میں ندامت پیدا نہیں ہوتی۔ مگر بدی پر خواہ اس سے کتنا ہی وقتی حظ کیوں نہ ملے آخر فطرت صحیحہ ملامت کرتی ہے یہانتک کہ انسان اس بدی کا اس قدر عادی ہو جائے کہ اس کی فطرت ہی مسخ ہو جائے مگر بایں بھی فطرت ملامت کرتی ہے خواہ وہ ملامت بدی کے غلبہ کی وجہ سے کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾

اے لوگو! اس سے جو زمین میں ہے حلال اور پاکیزہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں کے پیچھے نہ چلو، وہ تمھارا کھلا دشمن ہے ع۲۰۶

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

وہ تمھیں صرف بدی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ پر وہ بات بناؤ جو تم نہیں جانتے ع۲۰۶ا

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے اتارا ہے کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا۔ کیا اگرچہ انکے بڑے نہ کچھ عقل سے کام لیتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں۔ ۲۰۷

ع۲۰۶ حلالًا۔ حَلّ کی اصل گرہ کھولنے سے ہے۔ واحلل عقدۃ من لسانی (طٰہٰ[20]۔ ۲۷) اور کسی جگہ اُترنے کے وقت بوجھ کے اتارنے پر حَلَّ الاحمال بولا جاتا ہے اس سے مطلق نزول پر حُلول کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے او تحل قریبا من دارھم (الرعد[13]۔ ۳۱) اور احلّہ کے معنی دوسرے کو اتارا و احلوا قومھم دارالبوار (ابراھیم[14]۔ ۲۸) اسی سے لفظ مَحَلّہ ہے جس کے اصل معنی اُترنے کی جگہ ہیں اور حل عُقدہ سے ہی حَلال کے معنی لیے گئے ہیں۔ گویا وہ چیز اس کے لیے کھول دی گئی یا آزاد کر دی گئی، اور جو شخص حالت احرام سے باہر نکل آئے اُسے بھی اسی لیے حلال یا مُحِلّ کہا جاتا ہے (غ) اور اصطلاح شریعت میں حَلال وہ ہے جس کی اجازت شریعت نے دی ہے یا جس سے روکا نہیں۔

خطوات۔ خُطوۃ کی جمع ہے جو چلنے والے کے دونوں قدموں کے درمیانی فاصلہ کا نام ہے (غ) شیطان چونکہ نافرمانی کی راہوں پر چلتا ہے اس لیے اس کے خطوات سے مراد ہر ایک اللہ تعالیٰ کی معصیت ہے۔

غذاؤں کا اثر اخلاق پر: جب ہدایت کے اصل الاصول توحید کا ذکر کیا تو اب کسی قدر ذکر ہدایت کی تفصیلات کا کیا ہے اور بتایا ہے کہ کھانے پینے تک کے احکام بھی شریعت میں دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ غذاؤں کا اثر اخلاق و روحانیت دونوں پر پڑتا ہے یہاں سے لیکر اکتیسویں رکوع تک یہ ذکر چلے گا مگر عموماً انہی احکام کو بیان کیا ہے جن کا تعلق صبر سے ہے کیونکہ یہی اصل مضمون ہے جس پر بحث شروع ہے۔ اس میں سب سے پہلی ضرورت حلال کھانے کی بتائی۔ جو مال باطل طریق پر حاصل کیا جائے وہ حلال نہیں ہو سکتا۔ دوسری ضرورت طیّب کھانے کی بتائی یعنی ستھری چیز۔ اس ایک لفظ کو لا کر بہت سی تفصیلات سے مستغنی کر دیا اور کسی قدر اختلاف رواج سے بھی طیّب کا اختلاف پیدا ہو سکتا ہے اس لیے عام لفظ رکھا۔ یا یھا الناس میں جو حکم دیا ہے وہ عام ہے۔ حرام خوری کو ترک کرنے سے بھی اللہ تعالیٰ سے محبّت پیدا ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ سعد بن ابی وقاص نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں کس طرح مستجاب الدعوات بنوں تو آپؐ نے فرمایا اطب مطعمك تكن مستجاب الدعوة ستھرا کھانا کھاؤ مستجاب الدعواۃ ہو جاؤ گے۔ دنیا اور دین، ظاہری اور باطنی طہارت کے احکام کو کس طرح ملایا ہے۔

ظاہری اور باطنی طہارت کا تعلق: خود قرآن شریف نے بھی غذا کے حکم کے بعد یہ لفظ لا کر کہ شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ باطنی طہارت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غذا بھی اچھی کھاؤ۔ اخلاق بھی اچھے دکھاؤ۔ جیسا کہ اگلی آیت میں شیطان کی پیروی نہ کرنے کی وضاحت کر دی کہ بدی اور بے حیائی کی باتوں سے بچو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسان کی جسمانی اور روحانی حالتوں میں ایک تعلق بتاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات جسمانیات کی طرف سے مضمون کو روحانیات کی طرف اور روحانیات سے جسمانیات کی طرف منتقل کرتا ہے۔

ع۲۰۶ا الفحشاء۔ فحش اور فحشاء اور فاحشۃ کے معنی ہیں وہ اقوال یا افعال جن کی قباحت بہت بڑی ہو (غ)، یا ہر ایک قبیح خصلت فاحِشۃ ہے (ت) سوء کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۰۵ اور سوء اور فحشاء میں فرق یہ ہے کہ سوء وہ ہے جو اس کے کرنے والے کو نقصان پہنچائے اور فحشاء وہ ہے جس کا ذکر کرنا یا سننا بُرا معلوم ہو (ج)

تقولوا علی اللہ۔ قال علیہ کے معنی ہیں اس پر افترا کیا۔

بدی اور بیحیائی کا تعلق غذاؤں سے: یہاں یہ اشارہ ہے کہ حرام غذاؤں کے استعمال سے سوء اور فحشاء پیدا ہوتے ہیں جیسے مثلاً مُردار اور خون کے کھانے سے صحت جسمانی پر بُرا اثر اور گندے اخلاق، خنزیر کھانے سے بیحیائی۔ اور افترا علی اللہ اسے اس لیے کہا کہ وہ لوگ خود چیزوں کو حلال و حرام قرار دے کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے تھے آج یہ امر مسلّم ہے کہ ہر ایک قسم کی غذا اسی قسم کی صفات انسان کے اندر پیدا کرتی ہے۔ مگر قرآن کریم نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر اس حقیقت کی طرف توجہ دلا کر ایسی چیزوں سے روکا۔

ع۲۰۷ تقلید: قرآن کریم نے بسا اوقات کفار کا نقشہ پیش کر کے مسلمانوں کو سمجھایا ہے۔ آنکھیں بند کر کے تقلید بھی انہی کا طریق فرمایا۔ غرض یہ تھی کہ مسلمان اس راہ

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ
بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ
عُمْیٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

اور ان لوگوں کی مثال جو کافر ہوئے ایک شخص کی مثال کی طرح ہے کہ وہ اسے آواز دے رہا ہو جو بجز پکار اور آواز کے کچھ نہیں سُنتا بہرے گونگے اندھے ہیں سو وہ عقل سے کام نہیں لیتے ۲۰۸

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ
وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ان پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں اور اللہ کا شکر کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو ۲۰۹

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ
الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ
اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ

اس نے تم پر صرف مُردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لیے پکارا جائے حرام کیا ہے ۲۱۰ مگر جو شخص لاچار ہو جائے نہ خواہش کرنے والا ہو اور نہ حد سے گزرنے والا تو اس

پرنہ چلیں کہ چونکہ فلاں بات ہمارے بزرگ مانتے آئے ہیں، اس لیے اس کے خلاف ہم نہیں سن سکتے۔ مگر آج اندھا دھند تقلید کرنے میں مسلمان سب قوموں پر سبقت لے گئے ہیں یہاں تک کہ اپنے خیالات کے خلاف بات سن بھی نہیں سکتے غور کرنا تو ایک طرف رہا۔

۲۰۸ ینعق۔ نعق چرواہے کے بھیڑوں بکریوں کو آواز دینے پر بولا جاتا ہے (غ۔ ت)

دعاء ونداء۔ دعاء محض پکارنا یا بلانا ہے۔ اور نداء آواز کا بلند کرنا ہے اور مطلق صوت پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور نَدٰی اصل میں رطوبت کو کہتے ہیں اور نداء کا استعارہ اس سے لیا گیا ہے کہ جس کے منہ میں رطوبت زیادہ ہو اس کی آواز اچھی ہوتی ہے (غ)

عقل سے کام لینے کی ہدایت: اس تمثیل میں کفار کو جو عقل اور ہدایت کی پروا نہیں کرتے چار پایوں سے تشبیہ دی ہے اور آنحضرت صلعم کو راعی سے۔ فی الحقیقت انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز عقل ہے پس جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ حیوانوں کے حکم میں ہی ہیں۔ اس لیے آخر پر ان کو بہرے گونگے اندھے کہا ہے۔

۲۰۹ اِن۔ مغنی میں ہے کہ اِنْ بعض وقت بمعنی اذ بھی آتا ہے یعنی جب؛ یہاں یہی معنی ہیں۔ جیسے فاتقوا اللہ ان کنتم مومنین میں۔ دیکھو ۵۲۳۔

۲۱۰ انّما۔ کلمۂ تخصیص ہے۔ صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں مطلب یہ ہے کہ جو تم نے خود اپنے اوپر حرام کر رکھی ہیں۔ جیسے بحیرہ وغیرہ وہ خدا نے حرام نہیں کیں۔

المیتۃ۔ میتۃ حیوانات میں سے وہ ہے جس کی روح بغیر ذبح کرنے کے نکل جائے (غ) خواہ وہ اپنی موت مرے یا گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا گر جانے یا سینگ مارنے سے (ت) قرآن کریم نے یہ تصریح سورۂ مائدہ آیت ۳ میں کر دی ہے۔

اھل۔ ھلال پہلی اور دوسری رات کے چاند کو کہتے ہیں اور اِھلال چاند دیکھنے کے معنے میں آتا ہے۔ پھر اس کا استعمال اس آواز پر ہُوا جو چاند دیکھنے کے وقت بلند کی جاتی ہے پھر ہر آواز پر (غ) پس ما اھل بہ لغیر اللہ وہ ہُوا جس پر اللہ کے سوائے کسی دوسرے کا نام پکارا جائے۔ یعنی ذبح کرتے وقت بجائے اللہ کا نام لینے کے غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ جیسے کسی بُت کا یا اور کسی کا سوائے اللہ کے۔

مردار وغیرہ کی حرمت شریعت سے ہیں: یہاں ان چیزوں کی حرمت کا ذکر کیا جو اخلاق و روحانیت پر بُرا اثر ڈالتی ہیں ان کی حرمت کا حکم اس سے پہلے مکہ میں ہی سورہ الانعام اور سورہ النحل میں نازل ہو چکا تھا اور چوتھی بار زیادہ تصریح کے ساتھ اس کے بعد سورہ المائدہ میں نازل ہُوا ہے۔ ان چار چیزوں میں سے اول الذکر تین چیزوں کی حرمت کا ذکر یہود کی شریعت میں بھی ہے۔ چنانچہ مردار کی حرمت احبار ۱۷: ۱۵ میں خون کی حرمت احبار ۷: ۲۶ میں سؤر کی حرمت، احبار ۱۱: ۷ میں ہے۔ اور گو عیسائیوں نے سؤر کو حلال کر کے اسے اپنی محبوب ترین غذا بنا لیا ہے مگر حضرت مسیح کے کلام میں سؤر کو پلید ہی قرار دیا گیا ہے جیسے "اپنے موتیوں کو سوروں کے آگے مت پھینکو" (متی ۷: ۶) سؤروں کے چرانے کا بھی بُرے پیرایہ میں ذکر ہے (لوقا ۱۵: ۱۵) پلید روحیں انسان سے نکل کر سوروں کے گلہ میں داخل کی جاتی ہیں (متی ۸: ۳۲) حضرت عیسٰی نے جہاں بعض احکامِ شریعت موسوی میں ترمیم کی ہے وہاں سؤر کے گوشت کو ہرگز حلال قرار نہیں دیا۔ بلکہ خود پطرس بھی سؤر کے ساتھ ان لوگوں کو مشابہت دیتا ہے جو بار بار گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں یعنی اس کو ناپاک قرار دیتا ہے (۲ پطرس ۲: ۲۲)

حرمت کی وجہ: اسلام نے ان تین چیزوں کے علاوہ جن کا اثر صحت جسمانی کے علاوہ اخلاق پر بھی بُرا پڑتا ہے ایک چوتھی چیز حرام قرار دی ہے یعنی ہر جانور جو ویسے حلال ہو مگر ذبح کرتے وقت اس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے اور یوں شرک کو عملی رنگ میں جڑ سے کاٹا ہے۔ ان چیزوں کی حرمت کی وجہ دوسری جگہ خود کلام پاک میں دی ہے دیکھو الانعام ۱۴۵۔ جہاں پہلی تین چیزوں کو رجس کہا ہے یعنی پلیدی گویا ان کا اثر جسم اور اخلاق پر بُرا ہے اور ما اھل بہ لغیر اللہ کو فسق کہا ہے۔ مُردار اور خون اور سؤر کے گوشت میں زہروں کا ہونا آج ایک مسلم امر ہے اور اخلاق پر جو بد اثر پڑتا ہے اس پر خود واقعات شاہد ہیں۔ مردار خوار قومیں جیسے ہمارے ملک میں چوہڑے ہمیشہ سے نہایت ذلیل حالت میں رہے ہیں۔ خون پینا درندوں کا کام ہے اور اس سے درندگی پیدا ہوتی ہے اس لیے اسلام نے ذبح کرنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے تاکہ خون بہ جائے۔ سؤر کے گوشت کے کھانے سے جو دیوثی اور بے غیرتی انسانوں میں

إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۷۳﴾
إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَآ أَنزَلَ اللّٰهُ مِنَ
الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُونَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولٰٓئِكَ
مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ
اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۷۴﴾
أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى
وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾
ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ
الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتٰبِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع

پر کوئی گناہ نہیں اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔[۲۱۱]
وہ جو اُسے چھپاتے ہیں جو اللہ نے کتاب سے اُتارا ہے اور اس
کے عوض تھوڑی سی قیمت لیتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں سوائے
آگ کے کچھ نہیں ڈالتے اور اللہ قیامت کے دن ان سے کلام
نہیں کریگا اور نہ ان کو پاک کریگا اور اُن کے لیے دردناک دکھ ہے۔[۲۱۲]
یہی وہ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اور مغفرت کے بدلے
عذاب کو خرید لیا۔ سو اُن کا آگ پر جرأت کرنا کیسا عجیب ہے[۲۱۳]
یہ اس لیے ہے کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ اُتارا ہے اور جو لوگ
کتاب کا خلاف کرتے ہیں وہ یقیناً دُور کی مخالفت میں ہیں[۲۱۴]

پیدا ہوتی ہے۔ وہ آج کل کی مہذّب قوموں کے فحش تعلقات اور عورتوں کے ننگے جسموں سے خود ظاہر ہے۔

سؤر کا گوشت عرب کے لوگ اسی طرح محبوب رکھتے تھے جس طرح آج یورپ اور امریکہ کی عیسائی اقوام۔ لحم الخنزیر اسی لیے کہا ہے ورنہ جس طرح اس کا گوشت حرام ہے اسی طرح دوسری اشیاء بھی۔ میتۃ سے مچھلی کو حدیث میں مستثنیٰ کیا ہے اس لیے کہ اس میں خون نسبتاً اس قدر کم ہوتا ہے کہ اس کا اثر بد صحت پر نہیں پڑ سکتا۔

ع۲۱۱ اضطر۔ ضُرّ سے ہے اسی سے ضرورت بمعنی حاجت ہے اور اضطرار باب افتعال ہے جس کی تا کو طا سے بدل دیا ہے اور اس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف احتیاج، اور اضطرہ کے معنی ہیں اس کو کسی چیز کا محتاج اور اس کی طرف مجبور کر دیا (ت) اور اضطرار انسان کی اپنی بے اختیاری اور دوسرے کے مجبور کرنے سے بھی ہوتا ہے اور ایسی صورت میں بھی کہ خود انسان اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا جیسے غذا (غ)

غیر باغ۔ باغ۔ بغی سے ہے جس کے معنی ہیں میانہ روی سے تجاوز کی خواہش کرنا ع۱۱۵ پس غیر باغ سے مراد یہ ہوئی کہ وہ اپنے نفس میں اس کے لیے خواہش نہیں پاتا، جیسا کہ مفردات میں ہے غیر طالب مالیس له طلبه گویا دل کراہت کرتا ہے۔

لاعاد۔ عاد۔ عدو بمعنی تجاوز سے ہے ع۱۰۸ پس لاعاد سے مراد ہوئی کہ جس قدر کی ضرورت بقائے نفس کے لیے ہے اس سے تجاوز نہ کرے۔

ع۲۱۲ حرمت غذا اور تقویٰ کا تعلق: اس رکوع کا خاتمہ پھر کتمان ہدایت پر کیا ہے گویا ہدایت کے اصول و فروع کو بیان کر کے پھر اصل مضمون کی طرف توجہ دلا دی ہے اور ساتھ ہی پھر ظاہر سے باطن کی طرف رجوع کیا ہے۔ یہ قرآن کریم کا کمال ہے کہ برابر ظاہر سے باطن کی طرف اور باطن سے ظاہر کی طرف مضمون کا انتقال کرتا رہتا ہے توحید کے بعد غذاؤں کا ذکر کیا تا معلوم ہو کہ غذائیں بھی انسان کے خیالات پر اثر ڈالتی ہیں۔ غذاؤں کا ذکر کرتے ہوئے پھر کلام کا انتقال باطن کی طرف کیا اور آگ کھانے والوں کا ذکر کیا تا مسلمان قوم یہودیوں کی طرح ظاہر پرست نہ ہو جائے اور حقیقی نیکی اور تقویٰ کو صرف چند ظاہری امور کی پابندی پر محدود نہ کر دے اور اندرونی پاکیزگی اور حقیقی تقویٰ کی راہوں سے غافل نہ ہو جائے۔ آگ کھانے کا محاورہ اسی مناسبت سے اختیار کیا گیا ہے تا جسمانی غذاؤں کی حرمت کو ہی کافی نہ سمجھ لیا جائے۔

خدا کا دوزخیوں سے کلام نہ کرنا: یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا تو کلام سے مراد محبت کا کلام ہے جو ایک نعمت کے رنگ میں انسان کو دیا جاتا ہے اور یہ فرما کر کہ اللہ تعالیٰ ان کو پاک نہیں کرے گا اور نہ ان سے کلام کرے گا یہ بھی بتا دیا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں ہی گناہوں سے پاک کر دیتا ہے اور ان سے کلام کرتا ہے وہ گویا اسی عالم میں جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کتمان ہدایت میں دونوں باتیں داخل ہیں، خود ہدایت پر عامل نہ ہونا اور دوسروں کو اس کا نہ پہنچانا۔

ع۲۱۳ ما اصبرھم۔ صبر کے اصل معنی اپنے آپ کو روک رکھنا ہیں۔ مگر بعض وقت جیسے یہاں یہ لفظ جرأت کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (غ) اسی کے مطابق مجاہد سے اس کے معنی مروی ہیں کیونکہ صبر اپنے حقیقی معنی میں تو ان کو میسّر نہیں۔ صبر تو یہ تھا کہ وہ معصیت سے رُکتے۔ مراد یہ ہے کہ وہ ایسے اعمال کر رہے ہیں جو اُن کو آگ کی طرف لے جا رہے ہیں پس ان اعمال کی جرأت آگ پر جرأت ہے۔ ما یہاں تعجب کے لیے ہے استفہامیہ یا موصولہ بھی ہو سکتا ہے۔

ع۲۱۴ اختلفوا فی الکتاب۔ اختلاف کے معنی کے لیے دیکھو ع۲۰۲ اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے جیسا کہ نزل الکتاب بالحق سے ظاہر ہے اور ان کا اختلاف فی الکتاب یہ ہے کہ اس کے بارہ میں طریق حق پر چلنے سے پیچھے رہ گئے (ر) یعنی طریق حق پر نہ چلے اور کتاب کے بارہ میں اختلاف سے مراد اس کا

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

بڑی نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے مُونہوں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو، لیکن بڑا نیک وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبّت کے لیے قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو اور غلام آزاد کرنے میں مال دے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور اپنے اقرار کو پورا کرنے والے جب وہ اقرار کریں۔ اور صبر کرنے والے تنگی اور تکلیف میں اور مقابلہ کے وقت۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے سچ کر دکھایا اور یہی متقی ہیں ع۲۱۵

رد کرنا بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ انکم لفی قول مختلف (الذاریات ۵۱-۸) سے ظاہر ہے اور یہ اختلاف ان کا یہ تھا کہ کبھی اس کو سحر کہتے کبھی کہانت، کبھی شعر کبھی افترا۔ چونکہ یہ امر حق تھا اس لیے اس کے ردّ کرنے میں وہ کسی ایک قول پر قائم نہ رہ سکتے تھے۔

ع۲۱۵ البر من اٰمن۔ برّ کے اصل معنی التوسع فی الخیر ہیں یعنی نیکی میں وسعت اختیار کرنا۔ اس جملہ کی ترکیب ایسی ہے جیسے کہہ دیتے ہیں الجود حاتم مراد ہوتی ہے الجود جود حاتم یعنی سخاوت حاتم کی سخاوت ہے اسی طرح یہاں مراد ہے کہ راستبازی اس کی راستبازی ہے جو ایمان لاتا ہے وغیرہ۔ یا چونکہ زبان عربی میں مبالغہ کے وقت صفت کو بطور اسم استعمال کر لیتے ہیں جیسے بڑے سخی کو الجود کہہ دیتے ہیں اور جیسے قرآن کریم میں حضرت نوح کے بیٹے کو کہا گیا انہ عمل غیر صالح۔ اسی طرح یہاں برّ بطور مبالغہ بڑے راستباز کو کہا گیا ہے۔

علیٰ حبہ میں ضمیر عموماً مال کی طرف لی گئی ہے اور گو یہ سچ ہے کہ حقیقی ایثار یہی ہے کہ جس چیز سے محبّت کرتا ہے اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرے جیسے فرمایا لن تنالوا البر حتّٰی تنفقوا ممّا تحبون (اٰل عمران ۳-۹۲) مگر یہاں یہ ضمیر اللہ کی طرف بھی جاسکتی ہے جیسے دوسری جگہ یطعمون الطعام علیٰ حبّہٖ مسکیناً و یتیماً و اسیراً (الدھر ۷۶-۸) فرما کر علیٰ حبہ کی تفسیر اس سے اگلی آیت میں خود ہی یوں کر دی انما نطعمکم لوجہ اللہ پس دونوں جگہ علیٰ حبہ سے مراد اللہ کی محبّت کے لیے ہیں گویا یہ بتایا کہ خدا پر ایمان یہ ہے کہ اس کی محبت کے لیے اس کی مخلوق کی خدمت میں مشغول ہو جائے اور اپنے مال کو دوسروں کے لیے خرچ کرے اس لیے کہ وہ بھی اسی خدا کی مخلوق ہیں جس نے اس کو دیا ہے۔

ابن السبیل۔ ابن کے معنی کے لیے دیکھو ع۶۱ اور سبیل کے لیے ع۱۹۳ ابن السبیل مسافر کو کہتے ہیں۔

سائلین۔ سُؤال کسی چیز کے جاننے کی استدعا ہے یا مال کی استدعا یا اس چیز کی استدعا جو معرفت یا مال کی طرف پہنچا دے (غ) اور کسی شے کی معرفت کا سوال بعض وقت اس غرض کے لیے ہوتا ہے کہ ایک بات کا علم لیا جائے اور بعض وقت اس لیے کہ دوسرے کو ملزم کر کے خاموش کیا جائے (غ) اور اللہ تعالیٰ کا سوال بندوں سے کرنا اسی دوسری غرض سے ہے اور قرآن شریف میں اکثر استعمال لفظ سُؤال کا معرفت کی استدعا پر ہی ہے جیسے یسئلونک۔ سأل سائل۔ سئلھم۔ یسئلون وغیرہ اور سائل فقیر کو بھی کہتے ہیں (غ) یہاں سائلین سے مراد دونوں قسم کے سوال کرنے والے ہو سکتے ہیں۔

الرقاب۔ رَقَبَۃ کی جمع ہے جس کے معنی گردن ہیں مگر اس سے مراد کل بھی لے لیا جاتا ہے اور تعارف میں مملوک یعنی غلاموں اور لونڈیوں کو رقاب کہا جاتا ہے۔ جیسے راس بمعنی سر اور ظہر بمعنی پیٹھ سواری پر بولا جاتا ہے فتحریر رقبۃ مؤمنۃ (النسآء ۴-۹۲) (غ) اور یہاں جو فی الرقاب فرمایا تو اس لیے کہ وہ مال ان کو نہیں دیا جاتا بلکہ اُن کے آزاد کرنے کے لیے یا ان کے بارہ میں صرف کیا جاتا ہے اور چونکہ انسان کو عموماً گردن سے مارا جاتا ہے اس لیے رَقَب کے معنی آتے ہیں اس کی حفاظت کی جیسے لا یرقبون فی مومن الا ولا ذمۃ (التوبہ ۹-۱۰) اور اسی سے رَقیب حفاظت کرنے والے کے معنی میں صفات الٰہی میں سے ہے۔

الباساء۔ بُؤس اور باس اور باساء تینوں کے معنی شدت اور مکروہ ہیں یعنی سختی اور امر ناپسندیدہ (غ) اور بأس عذاب اور جنگ کی سختی کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کنا اذا اشتد الباس اتقینا برسول اللہ صلعم اور باس کے معنی صرف حرب یعنی جنگ بھی ہیں اور بَاساء کے معنی بھوک ہیں (ت)

الضراء۔ ضُرّ سے ہے جس کے معنی سوء حال ہیں نفس کے متعلق ہو جیسے علم و فضل کی کمی سے یا بدن میں مثلاً کسی عضو کے نہ ہونے کی وجہ سے یا ظاہری

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مقتولوں کے بارے میں تم پر

حالت میں جیسے مال وجاہ کی کمی سے (غ) اور بأساء کے مقابلہ پر نعماء ہے اور ضراء کے مقابلہ پر سراء اور باساء کے ساتھ ضراء میں باساء سے مراد فقر یا بھوک ہے اور ضراء سے مراد بیماری یا اور تکالیف۔

صدقوا۔ صدق اور کذب کا اصل استعمال قول میں ہے۔ صدق یہ ہے کہ قول ضمیر کے مطابق ہو اور جس بات کی خبر دی ہے وہ بھی سچ ہو اور یہ دونوں افعال جوارح پر بھی استعمال ہوتے ہیں جیسے رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ (الاحزاب ۳۳-۲۳) میں صدقوا کے معنی ہیں عہد کو سچا کر دکھایا ان افعال کے ذریعہ سے جو کیے (غ) یہی معنے یہاں ہیں۔

تفصیلات شریعت کے ذکر میں اصل اصول کی طرف توجہ دلانا: پچھلے رکوع سے تفصیلات شریعت کا ذکر شروع کیا تھا اور اسی ذکر کو آگے بھی جاری رکھا ہے۔ جیسے اس رکوع میں بھی قصاص اور وصیت کا ذکر ہے۔ چونکہ بعض قوموں نے تفصیلات شریعت پر اس قدر زور دیا کہ اصل غرض کو جو باطنی طہارت تھی بھول گئے اس لیے ان تفصیلات کے ذکر میں ایک خاص اصول سمجھایا اور وہ یہ کہ صرف ظاہری تفصیلات شریعت پر زور دینے سے جبکہ مغز شریعت کو مدنظر نہ رکھا جائے، کوئی انسان حقیقی راستبازی کو حاصل نہیں کر سکتا۔ تفصیلات شریعت میں سب سے بڑا حکم کعبہ کی طرف منہ کرنے کا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اسلام کا ظاہری نشان قرار دیکر فرمایا کہ اہل قبلہ کی تکفیر مت کرو۔ مگر باایں فرمایا کہ وہ راستبازی جس کی طرف اللہ تعالیٰ تم کو بلاتا ہے ان تفصیلات شریعت پر عمل کر لینے کا نام نہیں یہاں تک کہ ایک خاص سمت کی طرف منہ کر لینا بھی وہ نیکی نہیں۔ یہاں پھر ان معترضین کا بھی جواب ہے جو کہتے ہیں کہ مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے ایک مشرکانہ فعل کا ارتکاب کرتے ہیں کیونکہ فرمایا کہ کسی خاص سمت میں منہ کر لینا کوئی عظیم الشان نیکی بھی نہیں چہ جائیکہ اس سمت کی عبادت ہو۔ یہ آیت ان آیات قرآنی میں سے ایک ہے جنہوں نے اپنی علو مرتبت کا خراج سخت ترین دشمنوں سے بھی وصول کیا ہے۔

تکالیف میں صبر قوم کی کامیابی کا اصل گر ہے: اس آیت میں قوم کی کامیابی کا اصل گر یہ بتایا ہے کہ وہ مشکلات کے مقابلہ کے وقت گھبرائے نہیں اسی لیے اس کا خاتمہ والصابرین فی الباساء والضراء وحین الباس پر کیا ہے اور حالانکہ من اٰمن سے لیکر والموفون تک رفع ہے مگر والصّابرین کو منصوب کر دیا ہے اور یہ نصب علے المدح ہے۔ یعنی خصوصیت سے توجہ دلانا اس کی طرف مقصود ہے کہ یہی بڑا اہتم بالشان امر ہے یعنی تنگی اور تکلیف میں اور مقابلہ کے وقت نہ صرف انسان استقلال رکھے بلکہ قدم آگے بڑھائے اور یہی اصل مضمون اس سورت کا چلتا ہے۔

ایمان کا مفہوم: جن امور کو یہاں راستبازی صدق اور تقویٰ کا جزو قرار دیا ہے وہ یہ ہیں۔ اول اصول صحیحہ کا قبول کرنا جن میں سے پہلے اللہ پر ایمان ہے اللہ تعالیٰ کے علم کامل اور قدرت کاملہ پر ایمان لانے سے انسان کے اندر نیکیوں کی قوت پیدا ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو سرچشمہ قدوسیت جانتا ہوا خود پاک ہونے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اللہ پر ایمان لا کر سارے اخلاق الٰہی کو اپنے اندر لینے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح ہر ایک قسم کی بُری باتوں سے رکتا اور ہر ایک قسم کی نیکی کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ دوسرے آخرت پر ایمان یعنی ہر ایک عمل کی جزا و سزا کا قائل ہونا اور اس لیے اپنے ہر ایک عمل میں اپنی ذمہ واری کو مدنظر رکھنا۔ تیسرے فرشتوں پر ایمان یعنی نیکی کی تحریک کو جب دل میں پیدا ہو فوراً قبول کر لینا۔ چوتھے کتاب پر ایمان یعنی اللہ تعالیٰ نے جو ہدایات انسان کی بہتری کے لیے نازل کی ہیں ان پر عمل پیرا ہونا۔ پانچویں نبیوں پر ایمان، یعنی جس طرح پر انبیاء نے ان تعلیمات پر عمل کر کے دکھایا ان کے نمونہ اور نقش قدم پر چلنا۔

دوسرا عظیم الشان اصل کامیابی کا عملی رنگ رکھتا ہے اور وہ ایثار ہے یعنی اپنے مال کا دوسروں کی بہبودی کے لیے خرچ کرنا۔ ان میں مقدم انسان کے اپنے قریبی ہیں۔ اولاد۔ ماں۔ باپ۔ بھائی بہن اور رشتہ دار۔ پھر یتیم ہیں جن کا خبر گیر کوئی نہیں۔ اس لیے ہر ایک قوم کے فرد سے وہ ذوی القربیٰ کا ہی تعلق رکھتے ہیں۔ پھر مسکین ہیں جو خود کام کاج کرنے سے عاجز ہیں یا جن کے پاس کام کرنے کا ضروری سامان نہیں پھر مسافر ہیں، پھر سائل ہیں، پھر گردنوں کا آزاد کرنا یا غلامی کی حالت میں پڑے ہوئے لوگوں کو اس حالت سے باہر نکالنا۔ غلامی کی حالت میں وہی لوگ آتے تھے جو جنگوں میں قید ہو جاتے تھے اور وہ گویا دشمن ہیں پس یہاں دشمنوں سے پیار اور محبت کی نری منہ سے تعلیم نہیں بلکہ عملی رنگ میں ان سے نیکی کا حکم دیا کہ ان کی آزادی کا فکر کیا جائے۔ اس زمانہ میں تو کم ہی مسلمان ہیں جن کی گردنیں آزاد ہیں اور جو غلامی کی حالت میں نہیں پس مسلمانوں کی بہتری پر، ان کی تعلیم پر، ان کی ترقی پر روپیہ خرچ کرنا بھی اس کے اندر آ جاتا ہے۔

نماز اور زکوٰۃ: اس کے بعد تیسرا اصل فرمایا نماز قائم کرے جو انسان کے اپنے نفس کی تکمیل کے لیے ضروری ہے اور زکوٰۃ دے جو دوسروں کی بہبودی کے لیے ہے۔

اس کے بعد چوتھا اصل فرمایا کہ عہد کرے تو اس عہد کو پورا کرے خواہ اس کی وجہ سے کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے اور خواہ وہ اقرار کافر سے ہو یا مسلمان سے۔ آج مہذب ممالک میں اقرار کی پابندی اس وقت تک ضروری سمجھی جاتی ہے جب تک اپنا مطلب نکلتا ہو اور بس۔ اور آخر میں پانچواں اور سب سے ضروری اصل بیان کیا ہے اور وہ ہے صبر۔ تنگی میں جب فقر و فاقہ اُٹھانا پڑے۔ دکھ درد اور تکلیف کی حالت میں جب انسان کو جسمانی

فِي الْقَتْلَىٰ ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ
وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ
شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ
ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ
اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٨﴾

قصاص مقرر کیا گیا ہے[216] (قاتل) آزاد ہو تو آزاد ہی مارا جائے) اور غلام ہو تو غلام اور عورت ہو تو عورت[217]۔ مگر جس کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دی گئی ہے تو عمدگی سے پیروی کرنی چاہیئے اور نیکی کے ساتھ اسے ادا کیا جائے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے پھر جو کوئی اسکے بعد زیادتی کرے اسکے لیے دردناک عذاب ہے[218]۔

طور پر دکھ پہنچ رہا ہو۔ اور سب سے بڑھ کر حین الباس مشکلات سے مقابلہ کے وقت میں یا دشمن سے مقابلہ کے وقت میں، جیسے جنگ کی حالت میں ہی اصل گر کامیابی کا ہے۔ اسی لیے اس کو آخر پر رکھا اور منصوب علی المدح کیا۔ جن قوموں میں پہلی چار چیزیں نہیں، وہ بھی صبر سے کامیاب ہو جاتی ہیں مگر حقیقی نیکی اور راستبازی اُن کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔

آخر پر فرمایا کہ دعوٰی ایمان میں یہی لوگ سچے ہیں اور متقی بھی یہی ہیں۔

ع ۲۱۶ کتب۔ کتاب کے معنی کے لیے دیکھو ع ۹۔ مگر کتابۃ کے معنی اثبات یعنی ایک چیز کا قائم کرنا اور تقدیر یعنی اندازہ کرنا اور ایجاب یعنی واجب کرنا اور فرض کردینا اور عزم بھی آتے ہیں کیونکہ پہلے ایک چیز کا ارادہ کیا جاتا ہے پھر کہی جاتی ہے پھر لکھی جاتی ہے گویا اس کا مبداء ارادہ ہے اور اس کا منتہا لکھنا (غ) اس لیے مقرر کرنے یا فرض کرنے کے معنی میں کثرت سے یہ لفظ قرآن شریف میں آیا ہے جیسے یہاں اور آیت ۱۸۰ میں کتب علیکم..... الوصیۃ اور آیت ۱۸۳ میں کتب علیکم الصیام اور آیت ۱۸۷ میں وابتغوا ماکتب اللہ لکم اور آیت ۲۱۶ میں کتب علیکم القتال اور بہت سے دیگر مقامات پر اور اسی لیے کتاب اللہ سے مراد اللہ کا حکم بھی ہوتا ہے جیسے اولوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ (الانفال ۱۰ - ۷۵) میں کتاب اللہ سے مراد اللہ کا حکم ہے (غ)

قصاص۔ قَصّ سے ہے جس کے معنی نقش قدم کے پیچھے چلنا ہے۔ فارتدا علیٰ اٰثارھما قصصا (الکھف ۹ - ۶۴) وقالت لاختہ قصیہ (القصص ۲۸ - ۱۱) اسی سے قَصَص اخبار بیان کرنے کے معنی میں ہے نحن نقص علیک احسن القصص (یوسف ۱۲ - ۳) اور قصاص کے معنی ہیں تتبعُ الدَّم بالقَوَد (غ) یعنی خون کا پیچھا کرنا اس طرح پر کہ قاتل کو قتل کیا جائے اور حدیث میں ہے من قتل عمداً فھو قَوَدٌ جس کے معنی ہیں کہ جو شخص عمداً قتل کرے اس کو مقتول کے بدلہ میں قتل کیا جائے (ل۔ قَوَد) پس قصاص فی القتلی یہ ہے کہ جس شخص نے کسی دوسرے کو قتل کیا ہے اسے قتل کیا جائے قصاص کے اس معنی کو مدنظر رکھ کر اگلے الفاظ کے معنی میں کوئی دقت نہیں رہتی۔

اس آیت میں مقتول کے بارہ میں قصاص کا حکم دیا ہے یعنی قاتل کو قتل کر دیا جائے۔ اس کا ذکر یہاں اس مناسبت سے کیا ہے کہ مسلمانوں کے اب اپنے دکھ دینے والوں اور قتل کرنے والوں سے قصاص لینے کا وقت آگیا تھا۔ قرآن کریم میں قصاص کا حکم صرف قتل کی صورت میں ہے۔ زخموں میں قصاص کا حکم نہیں۔ صحابہ نے ضرورت زمانہ کے لحاظ سے کرلیا ہو تو جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا کے ماتحت ہے۔ اور اسی کے ماتحت ایک بدی کے مناسب حال اور سزا دی جاسکتی ہے۔ مگر قتل میں صراحت سے قصاص کا حکم ہے پس اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب میں قاتل کے لیے قتل کی سزا کو ہی ضروری قرار دیا ہے اس سزا کو دنیا سے اُٹھانے کے لیے جتنی کوششیں کی گئی ہیں سب ناکام ہوئی ہیں۔ فرانس میں کچھ عرصہ کے لیے سزائے قتل موقوف کی گئی تھی جس کا نتیجہ جرائم قتل میں خطرناک اضافہ ہوا۔ پس یہ بتایا ہے کہ قتل میں قصاص تمدن و تہذیب کی ضروریات میں سے ہے۔

ع ۲۱۷ جب اوپر قصاص کا حکم صاف الفاظ میں بیان کر دیا یعنی یہ کہ قتل کا حکم قاتل پر ہے نہ کسی دوسرے پر، تو یہاں ایک ایسے امر کی طرف توجہ دلائی جس میں ایک رسم قبیح کی بیخکنی مقصود تھی۔ عرب میں رواج تھا کہ بعض قومیں اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتی تھیں اس لیے ان کا غلام قتل ہو جائے تو وہ کہتے تھے کہ ہم اس کی جگہ آزاد کو قتل کریں گے۔ ایسا ہی یہ بھی رواج تھا کہ آزاد غلام کو قتل کردے تو اس آزاد کو قتل نہ کیا جاتا تھا۔ ایسا ہی اب بھی رواج ہے کہ بعض قومیں جو اپنے آپ کو زیادہ مہذب خیال کرتی ہیں ان کا کوئی آدمی کسی ماتحت قوم کے آدمی کو قتل کردے تو وہ اس سے قصاص نہیں لیتیں۔ پس جب اسلام نے قصاص کا حکم دیا یعنی یہ کہ قاتل کو قتل کیا جائے تو ساتھ ہی تمام امتیازات کو بھی اٹھا دیا۔ اور فرمایا کہ قاتل آزاد ہو تو وہی قتل کیا جائے۔ عورت قاتل ہو تو وہی قتل کی جائے غلام قاتل ہو تو وہی قتل کیا جائے اور سارے امتیازات قومی و امتیازات مرتبہ کو اٹھا دیا۔ چنانچہ حدیث میں بھی آتا ہے المسلمون تتکافأ دماءھم سب مسلمانوں کے خون برابر ہیں اور قاتل خواہ کوئی ہو یہ عذر نہیں کرسکتا کہ اس کا خون مقتول سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس لیے امام ابوحنیفہ کے مذہب میں آزاد غلام کو قتل کردے تو آزاد قتل کیا جائے گا اور یہی قرآن شریف کا مذہب ہے۔

ع ۲۱۸ خون بہا: اس حصہ میں یہ اجازت دی ہے کہ اگر مستغیث یعنی وارث قاتل خونبہا پر راضی ہو جائے تو دیت کا لے لینا جائز ہے۔ اس زمانہ میں بھی بعض حالات میں خون بہا لے لینا جائز ہے۔ جیسے ایک سلطنت کا باشندہ دوسری سلطنت کی کسی رعایا کو خاص حالات میں قتل کردے تو ہرجانہ ہی کافی معاوضہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے اس لیے ہر قسم کی گنجائش اس کی تعلیم میں موجود ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو تاکہ تم بچے رہو۔ع۲۱۹

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

تم پر جب تم میں سے کسی کے لیے موت آموجود ہو عمدگی کے ساتھ وصیت کرنا ضروری ٹھہرایا گیا ہے اگر وہ بہت سا مال ماں باپ کے لیے اور قریبیوں کے لیے چھوڑے یہ متقیوں پر لازم ہے۔ع۲۲۰

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ

پھر جو کوئی اس کے بعد جو اس نے سُن لیا ہے اسے بدل دے تو اس کا

ع۲۱۹ قصاص قوم کی زندگی کی بنیاد ہے: اگر دنیا میں قتل کی سزا قتل نہ ہوتی تو کسی قوم کے لیے بھی امن کی زندگی نہ ہوتی۔ جن قوموں نے قتل میں قصاص کو اُڑانے کی کوشش کی ہے۔ دنوں میں قتل کے واقعات ان میں اس قدر بڑھے ہیں کہ مجبوراً پھر اسی سزا کی طرف رجوع کرنا پڑا ہے۔ یہ بھی اشارہ ہے کہ مسلمانوں جب تم کو تلوار سے نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اب قصاص لیے بغیر تم بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔

ع۲۲۰۔ خیر کے معنی لغت میں اور صحابہ سے مال کثیر مروی ہیں چنانچہ مفردات میں ہے کہ بعض علماء کا یہ قول ہے کہ مال کو خیر نہیں کہا جاتا جب تک کہ وہ کثیر نہ ہو اور مکان طیب سے نہ ہو۔

حکم وصیّت منسوخ نہیں: یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جن پر منسوخ کا حکم قطعی سمجھا جاتا ہے۔ یعنی کہا جاتا ہے کہ پہلے وصیّت کا حکم دیا گیا پھر سورہ نساء میں وراثت کا حکم نازل کر کے اسے منسوخ کیا گیا۔ مگر اس کے متعلق غیر منسوخ ہونے کے اقوال بھی موجود ہیں۔ چنانچہ ابن جریر میں ہے کہ ایک جماعت نے قائلین منسوخ کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے اسے غیر منسوخ قرار دیا ہے۔ بیضاوی میں بھی اس کے منسوخ نہ ہونے کا قول موجود ہے۔

قرآن و حدیث کی شہادت: حق یہ ہے کہ اس کے غیر منسوخ ہونے کی قرآن شریف اور حدیث صحیح سے کھلی کھلی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف سے تو یوں تائید ہوتی ہے کہ وراثت کے حکم میں ہر جگہ ساتھ ساتھ من بعد وصیۃ کا لفظ موجود ہے یعنی تقسیم ترکہ وصیّت کے نفاذ کے بعد ہو پس وہ وصیّت اور کونسی ہے اگر یہ منسوخ ہے؟ اور دوسرے سورہ مائدہ میں جو آخری سورتوں میں سے ایک ہے صاف طور پر وصیت لکھا جانے اور اس پر عملدرآمد کرنے، گواہی لینے وغیرہ کا حکم موجود ہے (دیکھو المائدۃ ۵ آیت ۱۰۶ و ۱۰۷)

حدیث سے اس کا غیر منسوخ ہونا قطعی طور پر ثابت ہے۔ سعد بن ابی وقاص سے متفق علیہ حدیث ہے کہ میں فتح مکّہ کے سال بیمار ہو گیا (یعنی آیت وراثت کے نزول کے مدت بعد) رسول اللہ صلعم میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ تو میں نے کہا یا رسول اللہ میرے پاس بہت سا مال ہے اور ایک ہی بیٹی میری وارث ہے میں سب مال کی وصیت کر دوں؟ آپ نے فرمایا، نہ۔ پھر میں نے دو تہائی کے لیے عرض کی۔ پھر نصف کے لیے آپ نے انکار ہی کیا۔ پھر میں نے ایک تہائی کے لیے عرض کیا تو آپ نے ایک تہائی کی وصیت کرنے کو قبول کیا اور فرمایا اگر تم اپنے وارثوں کو غنی چھوڑو تو اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو غریب چھوڑو۔ اس حدیث سے جو نبی کریم صلعم کی زندگی کے آخری ایام کی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ حکم وصیت اس وقت تک غیر منسوخ سمجھا جاتا تھا اور نہ صرف ایک صحابی نے ہی اسے غیر منسوخ سمجھا بلکہ خود آنحضرت صلعم نے بھی اسے غیر منسوخ قرار دیا اور وصیّت کرنے کو جائز رکھا۔ ہاں نبی کریم صلعم نے یہ ضروری قرار دیا کہ ورثا کو بالکل محروم نہ کیا جائے۔ اس لیے ایک تہائی تک مال کی وصیّت کر دی جائے۔ دوسرے اس سے معلوم ہوا کہ اس وصیّت سے مراد خیراتی کاموں کے لیے وصیت ہے نہ رشتہ داروں اور قریبیوں کے لیے۔ اسی لیے میں نے آیت کے معنی کرنے میں یہ ترکیب اختیار کی ہے کہ للوالدین والاقربین کا تعلق ان ترك خیرا سے ہے یعنی جو شخص مال کثیر ماں باپ اور قریبیوں کے لیے چھوڑے وہ وصیت کرے۔ ماں باپ اور قریبیوں کے لیے وصیّت کرنا مراد نہیں۔ تیسرے معلوم ہُوا کہ خیر سے مراد آنحضرتؐ کے سامنے بھی مال کثیر ہی لیا گیا کیونکہ خود حضرت سعد نے یہ کہا کہ میرا مال کثیر ہے اور اسی بنا پر وصیت کی اجازت چاہی۔

ورثا کے لیے وصیت نہیں: پس حدیث متفق علیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کے معنی یوں سمجھے جاتے تھے اور خود آنحضرت صلعم نے یہی لیے کہ جب ایک شخص کا ترکہ بہت سا ہو تو وہ کچھ حصّہ کی وصیت خدا کی راہ میں کر دیا کرے، ورثا کے لیے وصیت کی ضرورت تو اس لیے بھی نہیں کہ ان کے حصّے خود قرآن شریف نے مقرر کر دیئے اور حدیث لا وصیۃ لوارث گو احاد میں سے ہے مگر قرآن کریم کے مطابق ہے۔ ہاں بعض صورتوں میں جب اقربا کو وراثت کا حصہ نہ ملتا ہو تو وہ بھی وصیت میں شریک ہو سکتے ہیں۔ دوسری روایات سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ کا فیصلہ: چنانچہ حضرت علیؓ کے متعلق روایت ہے کہ جب ان کے ایک آزاد کردہ غلام نے جس کا ترکہ سات سو درہم تھا وصیت کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے اُسے روک دیا اور فرمایا یہ خیر یعنی مال کثیر نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ کا فیصلہ: اور حضرت عائشہ سے کسی شخص نے پوچھا کہ میرے پاس تین ہزار درہم ہے اور چار وارث ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ تھوڑی سی چیز ہے اپنے عیال کے لیے چھوڑ دو۔ یہ خیر یعنی مال کثیر نہیں ہے۔ پس ایک حدیث متفق علیہ میں رسول اللہ صلعم کا اپنا فیصلہ دوسرے

عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ؕ﴿۱۸۱﴾
فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ
بَيْنَهُمْ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع ۲۲
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ
الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ﴿۱۸۳﴾

گناہ انہی پر ہے جو اسے بدلتے ہیں اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔
مگر جسے وصیت کرنیوالے کی طرف سے طرفداری یا گناہ کا خوف ہو پھر وہ
انکے درمیان صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اللہ بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے۔[۲۲۱]
اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمھارے لیے روزے ضروری
ٹھیرائے گئے ہیں جیسے کہ ان لوگوں کے لیے ضروری ٹھیرائے گئے
جو تم سے پہلے تھے[۲۲۲] تاکہ تم متقی بنو۔[۲۲۳]

حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ صدیقہ کا فیصلہ جن کا فہم قرآن مسلم امر ہے اس آیت کے معنی کا قطعی فیصلہ کرتے ہیں اور اسے غیر منسوخ قرار دیتے ہیں اور مراد اس سے صرف اسی قدر ہے کہ جو شخص اپنے ورثا کے لیے مال کثیر چھوڑے وہ کچھ حصّہ اس مال کا فی سبیل اللہ بھی وصیت کرے مسلمانوں میں آج اس پر عمل متروک ہے۔ مگر دوسری قومیں ایسی وصیتیں کرتی ہیں کس قدر مصیبت ہے کہ پیروانِ قرآن قرآن پر عامل نہیں، منکرین قرآن اس پر عامل ہیں۔

اور اگر یوں بھی معنی کیے جائیں کہ اگر کوئی شخص مال کثیر چھوڑے تو اس کے لیے اپنے والدین اور قریبیوں کے لیے وصیت کرنا مقرر کیا گیا ہے تو بھی آیت کو منسوخ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں وصیّت پر عملدر آمد کرانے والے والدین اور اقربین مراد لیے جائیں۔ یا ہو سکتا ہے کہ بعض صورتوں میں والدین کو ورثہ نہ ملتا ہو تو ان حالات پر یہ حاوی ہو، جیسے مثلاً والدین کا فر ہوں اور قریبی تو بہتیرے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو حصّہ نہیں پہنچتا ان کے لیے وصیّت ہو سکتی ہے یا اگر کوئی اور صورت تسلیم نہ کی جائے تو حدیث لا وصیۃ لوارث کو آیت کے مقابلہ میں منسوخ قرار دیا جائے گا۔

ع۲۲۱ جنف حکم یعنی فیصلہ کرنے میں ایک طرف جھک جانے کا نام ہے۔ حق سے باطل کی طرف جھکنا (غ)

وصیت کے وقت اصلاح: اثم سے مراد عمداً خلاف ورزی حکم الٰہی ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر وصیت کرنے والا کسی وارث کے حق کو تلف کر رہا ہو یا خلاف ورزی حکم الٰہی میں کوئی مال وصیّت کرنے لگے تو دوسروں کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کر دیں جیسا کہ سعد بن ابی وقاص کے معاملہ میں رسول اللہ صلعم نے کیا۔

ع۲۲۲ الصّیام۔ صَوم۔ اصل میں ایک فعل سے رُکنے کا نام ہے کھانا ہو یا کلام یا چلنا۔ انی نذرت للرحمٰن صوماً (مریم ۱۹۔ ۲۶) کلام سے رکنے کو صوم کہا ہے جیسے فلن اکلم الیوم انسیا سے خود ظاہر ہے۔ اصطلاح شریعت میں اس شخص کا جو احکام شریعت کا مکلف ہو چکا ہے، صبح کی سفیدی کے نمودار ہونے سے رات کی سیاہی کے نمودار ہونے (یعنی غروب آفتاب) تک ارادۃً کھانا کھانے پانی پینے اور جماع سے رکا رہنا ہے (غ) اور اس کے ساتھ جیسا کہ احادیث نے وضاحت کر دی ہے ہر ایک لغو یا ناجائز فعل یا قول کا ترک بھی شامل ہے۔

روزہ کا دنیا کی سب قوموں میں پایا جانا جس کی طرف یہاں قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے ایک حقیقت ہے اور دنیا کی کوئی قوم نہیں جس نے روزہ کو عبادات میں نہ رکھا ہو۔ صرف عیسائیوں نے شریعت کو جواب دیکر روزوں کا انکار کیا ہے گو اب ان کے حکما بھی کسی نہ کسی رنگ میں روزہ کی ضرورت کے گو جسمانی فوائد کی خاطر ہی سہی قائل ہو رہے ہیں۔ مگر تعجب یہ ہے کہ حضرت عیسےٰؑ کا انجیل سے نہ صرف خود روزے رکھنا ثابت ہے بلکہ اپنے پیروؤں کے لیے روزے رکھنے کی تعلیم موجود ہے۔ اور عیسائیت کا موجودہ خیال کہ شریعت پر عمل کرنیکا فائدہ نہیں، پولوس کا خیال ہے۔ متی ۴: ۲ سے مسیحؑ کا روزہ رکھنا ثابت ہے "اور جب چالیس دن اور چالیس رات روزہ رکھ چکا آخر کو بھوکا ہُوا"۔ اور متی ۶: ۱۶ میں ہے "کہ جب تم روزہ رکھو ریا کاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ۔ اور متی ۶: ۱۸ میں روزہ کے ثواب کا ذکر ہے" اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے آشکارا تجھے بدلہ دے"۔ اگر عبادت پر ثواب ملتا ہے اور مسیحؑ کی تعلیم بھی یہی ہے تو کفارہ کا عقیدہ باطل ہے اور لوقا ۵: ۳۳۔ ۳۵ سے ثابت ہے کہ حضرت مسیحؑ نے کہا تھا کہ ان کے شاگرد اُن کے بعد بہت روزے رکھیں گے"۔ پر وے دن آوینگے کہ دولہا ان سے جدا کیا جائیگا ان دنوں میں وے البتہ روزہ رکھیں گے"۔

ع۲۲۳ یہ روزہ کی علّت غائی ہے، پہلی قوموں میں جو روزہ رکھنے کا رواج تھا، وہ جیسا کہ پادری کروڈن نے نجوم بائبل میں لکھا ہے غم اور رنج اور مصیبت کے وقت تھا۔ گو یا ظاہر صورت میں غم اور مصیبت اختیار کی جاتی تھی۔ اسلام نے روزہ کی غرض یہ بیان کی ہے کہ تم متقی بنو یعنی تمہارے اندر بدی کی طاقتیں کمزور اور نابود ہوں اور نیکی کی قوتیں نشو ونما پائیں کیونکہ انسان کی ہر ایک قوت اپنے کمال تک پہنچنے کے لیے اس بات کی محتاج ہے کہ اسے نشو ونما دی جائے اور روزہ میں خدا کے حکم کی فرمانبرداری کے لیے حلال چیزوں کو ترک کیا جاتا ہے بس روزہ سے خواہشات کو ترک کرنے کی قوت انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے اور یہی قوت انسان کو اپنے نفس پر حاکم بنا کر اعلیٰ سے اعلیٰ پاکیزگی اور نیکی کے مقام پر پہنچاتی ہے۔ اسلام نے ہر ایک چیز کو ایک قاعدہ اور ضبط کے ماتحت کیا ہے اور وقت پر کھانا عین تعلیم اسلامی کے مطابق ہے۔ روزہ میں اس ضبط کو توڑنا مقصود نہیں بلکہ انسان کے اندر یہ قوت پیدا کرنا مقصود ہے کہ خواہشات حیوانی جو کھانے پینے اور زوج کی طرف رجوع کرنے سے تعلق رکھتی ہیں انسان کے اقتدار کے نیچے ہوں اور ایسا نہ ہو کہ انسان ان کا غلام اور محکوم بن جائے۔ روزہ میں خواہشات حیوانی پر قابو پانے کی عملی راہ بتائی ہے۔ پس اسلام دوسرے مذاہب سے یہ امتیاز رکھتا ہے کہ روزہ کو انسان کی زندگی کے اعلیٰ ترین

اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا	چند دن[۲۲۴]، پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اور دنوں
اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَ عَلَی	سے گنتی (پوری) کی جائے[۲۲۵] ۔ اور جو اس میں مشقت پاتے ہوں وہ
الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ فِدۡیَۃٌ طَعَامُ مِسۡکِیۡنٍ ؕ	ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں[۲۲۶] ۔

مقصد کے حصول کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔

ع۲۲۴ معدودات - آیت ۸۰ میں ایامًا معدودۃ آیا ہے۔ عدّ کے معنی اعداد کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانا یا گنتی کرنا ہے۔ وعدھم عدًّا (مریم[۱۹]-۹۴) فسئل العادین (المؤمنون[۲۳]-۱۱۳) یعنی گننے والے یا حساب رکھنے والے الف سنۃ مما تعدّون (السجدۃ[۳۲]-۵) اور پھر محض گنتی سے تجاوز کر کے کئی طرح پر عدّ کا استعمال ہوتا ہے مثلاً کسی چیز کو معدود کہا جاتا ہے جب قلّت ظاہر کرنا مقصود ہو اور اس صورت میں اس کا مقابلہ اس سے ہوتا ہے جو اپنی کثرت کی وجہ سے گنتی میں نہیں لائی جاسکتی (غ) اور یہی یہاں مراد ہے چنانچہ مقاتل کہتے ہیں کہ معدودیا معدودات کا لفظ جہاں جہاں قرآن شریف میں آیا ہے تو اس سے مراد چالیس سے کم ہے (د) خواہ چالیس ہوں جیسے آیت ۸۰ میں یا انتیس جیسے یہاں آگے شہر رمضان کہہ کر بتا بھی دیا ہے یا تین جیسے واذکروا اللہ فی ایّام معدودات (آیت ۲۰۳) میں اور آگے آتا ہے عدۃ من ایامٍ اخر اور لتکملوا العدۃ - تو عدّۃ کے معنی الشیئ المعْدُود ہیں یا گنی گئی چیز اور محض گننا بھی جیسے وماجعلنا عدتھم (المدثر[۷۴]-۳۱) اور عورت کی عدّت وہ دن ہیں جن کے گزرنے پر اس کا نکاح کرنا جائز ہے (غ)

یہاں ایامًا معدودات سے مراد رمضان کا مہینہ ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ عاشورا کا روزہ یا بعض اور روزے جو نبی کریم صلعم اس حکم کے آنے سے پہلے رکھتے تھے وہ محض نفل کے طور پر تھے نہ وحی الٰہی کے حکم سے اور اس لیے ایامًا معدودات میں ان کی طرف اشارہ نہیں۔ چنانچہ ابن جریر نے دونوں قسم کے اقوال نقل کر کے لکھا ہے کہ میرے نزدیک درست قول اسی شخص کا ہے جو کہتا ہے کہ ایامًا معدودات سے اشارہ شہر رمضان کی طرف ہے کیونکہ کوئی حدیث ایسی نہیں جس سے حجت قائم ہو سکے کہ کبھی اہل اسلام پر کوئی روزے سوائے رمضان کے فرض کیے گئے ہوں اور پھر وہ رمضان کے روزوں سے منسوخ ہو گئے ہوں (ج) اور بخاری میں جو عاشورا کا روزہ رکھنے کا حکم ہے تو یہ یا نزول آیت سے پہلے تھا یا صرف بطور نفل۔

ع۲۲۵ مرضٰی - مَرِیض کی جمع ہے اور مَرَض اس اعتدال سے خروج کا نام ہے جو انسان سے خاص ہے اور یہ جسم میں بھی ہو سکتی ہے اور اخلاق میں جہل، بخل، نفاق، بزدلی وغیرہ کو بھی مَرَض کہا جاتا ہے (غ) اور مَرَض کے اصل معنی نقصان ہیں اس لیے ارض مریضۃ اس زمین کو کہتے ہیں جو کمزور ہو۔ اسی طرح شمس مریضۃ جب سورج پوری روشنی نہ دے (ت)

سفر - سَفر کے اصل معنی کشف الغطاء ہیں یعنی پردہ کا اُٹھا دینا (غ) اسی لیے سَافِر لکھنے والے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک چیز کو کھول دیتا ہے اور واضح کر دیتا ہے۔ اس کی جمع سفرۃ ہے بایدی سفرۃ (عبس[۸۰]-۱۵) (ن) اور سِفر کتاب کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ حقائق کا انکشاف کرتی ہے۔ اس کی جمع اسفار ہے کمثل الحمار یحمل اسفارا (الجمعہ[۶۲]-۵) (غ) اور حدیث میں اسفروا بالفجر آتا ہے یعنی فجر کو اچھی طرح روشن ہو جانے دو (ن) اور مسافر کو مسافر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مکان سے الگ ہو گیا اور مکان اس سے (غ) پس سفر مکان سے دُور ہو جانے کا نام ہے۔

روزہ چھوڑنے کے لیے بیماری کی حد: بیماری کیسی ہو اس میں افراط و تفریط دونوں سے بچنا چاہیئے یہ کہنا کہ مرض ایسا خطرناک ہو کہ انسان کے فوراً مر جانے کا خطرہ ہو یا یہ کہ ادنیٰ سے ادنیٰ تکلیف ہو تو روزہ ترک کر دیا جائے دونوں غلط راہیں ہیں۔ اگر روزے رکھنے سے دوائی نہ پینا، یا بار بار ہلکی غذا کا نہ پہنچنا، یا اور کوئی وجہ بیماری کے بڑھانے کا موجب ہو تو روزہ ترک کرنا چاہیئے۔ ہاں بخاری میں عطا کا قول ہے۔ یفطر من المرض کلہ یعنی ہر ایک بیماری میں روزہ چھوڑ دے مگر اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ ادنٰے سے ادنٰے شکایت پر روزہ چھوڑ دے کیونکہ کچھ نہ کچھ شکایت تو ہر ایک انسان کو رہتی ہے۔

سفر کس قدر ہو؟ بعض نے کہا لفظ عام ہے خواہ کسی قدر ہو۔ بعض نے ایک دن رات اس کی حد قرار دی ہے۔ امام شافعی نے ۱۶ فرسخ اور امام ابو حنیفہ نے تین منزل یعنی تین دن کا سفر یا ۲۴ فرسخ۔ قول اوّل قرآن کریم کے عام الفاظ پر مبنی ہے۔ امام شافعی نے ایک حدیث پر بنیاد رکھی ہے جس میں آتا ہے کہ چار برد سے کم میں قصر صلوٰۃ نہ کرو۔ اور برید بعض کے نزدیک چار فرسخ اور بعض کے نزدیک دو فرسخ ہے، پس ۲۴ میل یا ۴۸ میل کی حد اس حدیث کی رُو سے ہوئی۔ مگر قرآن کریم کے ظاہر الفاظ سے قولِ اول کو ہی ترجیح ہے کیونکہ بعض وقت ۲۴ میل سے کم سفر میں بھی روزہ چھوڑنا ضروری ہو سکتا ہے۔ ہاں سیر اور سفر میں ہر شخص فرق کر سکتا ہے۔ پھر سفر خواہ پیدل ہو خواہ کشتی پر خواہ گھوڑے پر خواہ ریل پر سفر ہی ہے ان چیزوں سے سفر کے سفر ہونے کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

سفر اور بیماری میں روزہ ترک کرنے کی رخصت ہے یا وجوب: اس پر بہت بحث ہوئی ہے صحابہ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ سفر میں روزہ ترک کرنا ضروری سمجھتے تھے اور بعض اگر قابل برداشت پاتے تو رکھ بھی لیتے تھے۔ لیکن اگر رخصت بھی اسے تصوّر کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی رخصتیں فائدہ اٹھانے کے لیے ہی ہیں اور محتاط مذہب یہی ہے کہ سفر اور بیماری میں روزہ نہ رکھا جائے۔ لیکن بایں اگر کوئی شخص رکھ لے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے گناہ کیا ہے یا یہ کہ اس کا روزہ نہیں ہوا۔

ع۲۲۶ یطیقون - طاقۃ کے معنی میں مفردات میں ہے الطاقۃ اسم لمقدار ما یمکن للانسان ان یفعلہ بمشقۃ یعنی طاقت اس مقدار کا نام ہے جو انسان کے لیے ممکن ہے کہ اس کو مشقت کے ساتھ کر سکے۔ کیونکہ یہ لفظ طَوق سے مشتق ہے اور طوق وہ چیز ہے جو گردن میں ہو یعنی اس کا احاطہ

فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَهُوَ خَیۡرٌ لَّهٗ ؕ وَ اَنۡ
تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۴﴾
شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ
هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰی وَ
الۡفُرۡقَانِ ۚ فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡکُمُ الشَّهۡرَ

پھر جو کوئی تکلیف سے نیکی کرتا ہے وہ اس کے لیے بہتر ہے اور
روزے رکھنا تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو[۲۲۷]
رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت،
اور ہدایت کی اور حق اور باطل کو الگ کر دینے کی کھلی دلیلیں ہیں[۲۲۸]
پس جو کوئی تم میں سے اس مہینے کو پائے تو چاہیے کہ اس کے روزے

کیے ہوئے ہو۔ اسی تشبیہ کے لحاظ سے طاقۃ کے یہ معنی ہیں (غ) اس لیے یطیقونہ کے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ جن کو روزہ رکھنے میں سخت مشقت اُٹھانی پڑے اور تفسیروں میں ایک قول اس کے مطابق ہے۔ یصومونہ جھدھم و طاقتھم اور دوسری قراتیں جیسے یُطَیَّقونہ یا یطوّقونہ اس معنی کی مؤید ہیں کیونکہ اوّل کے معنی یتکلفونہ ہیں اور دوم کے معنی بھی یہی ہیں یعنی یکلفونہ یا یقلّدونہ ہیں جو طوق سے ہے اور مراد ہر صورت میں یہی ہے کہ ان کے لیے روزہ رکھنے میں سخت مشقت یا تکلیف ہے اور یطیقونہ کے معنی یتجشمونہ عبداللہ سے مروی ہیں (ث) یعنی تکلیف سے روزہ رکھ سکتے ہوں۔

فدیۃ۔ فدی اور فداء کے معنی ہیں انسان کا کسی مصیبت سے اپنی حفاظت کر لینا اس مال کے ذریعہ سے جو اس کے لیے خرچ کرے (غ)

آیت فدیہ صیام کی منسوخی میں اختلاف: بخاری میں ایک روایت حضرت ابن عمرؓ سے ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور سلمہؓ کی روایت میں ہے کہ جب یہ نازل ہوئی تو جو چاہتا روزہ رکھ لیتا اور جو چاہتا فدیہ دیدیتا۔ اور بخاری میں ہی حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ منسوخ نہیں بلکہ اس سے مراد بہت بوڑھے ہیں تو اختلاف کی اصل وجہ صرف یہ ہے کہ جو بزرگ اس آیت کے معنی کو دوسری آیت کے ساتھ تطبیق نہیں دے سکے انہوں نے اسے منسوخ کہدیا اور جن کے نزدیک تطبیق ہو گئی انہوں نے کہا غیر منسوخ ہے اور جب معنی میں تطبیق ہو سکتی ہے تو آیت کو منسوخ کہنا بے معنی ہے۔

روزہ کا فدیہ کون لوگ دے سکتے ہیں: ظاہر ہے کہ یطیقونہ میں ضمیر اسی کی طرف ہی جا سکتی ہے جس کا ذکر پہلے چلا آتا ہے نہ فدیہ یا طعام کی طرف جس کا ذکر ابھی نہیں آیا۔ پس یہ معنی کرنا ٹھیک نہیں کہ جو فدیہ کی طاقت رکھتے ہیں وہ فدیہ دیدیا کریں، اور نہ یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں اور پھر روزہ نہیں رکھتے وہ فدیہ دیدیا کریں کیونکہ یہ لفظ قرآن شریف میں نہیں، وہاں یطیقون ہے جس کے اس معنی پر جس کی تائید دوسری قراتوں سے ہوتی ہے غور نہیں کیا گیا۔ پس اصل معنی یوں ہونگے کہ جو اس کو مشقت کے ساتھ کر سکتے ہیں وہ فدیہ دیدیا کریں۔ اوپر ساتھ ہی ذکر بیمار اور مسافر کا ہے پس صاف اور واضح منشاء الفاظ قرآنی کا یہ ہے کہ بیمار اور مسافر پیچھے گنتی پوری کر لیا کریں لیکن وہ جن کو پیچھے گنتی پورا کرنے میں مشقت ہے وہ فدیہ دیدیا کریں، ظاہر ہے کہ بعض لوگ اپنی عمر کا بڑا حصہ سفر میں ہی گزار دیتے ہیں۔ اور بعض لوگ دائم المریض ہوتے ہیں اور اسی حکم میں بہت بوڑھے لوگ بھی ہیں کیونکہ بڑھاپا بھی حالت اعتدال سے انسان کو نکال دیتا ہے اور ابوداؤد کی حدیث کی رو سے اسی حکم میں حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت ہیں۔ کیونکہ اس میں حمل یا بچّہ کے ضائع ہونے کا خوف ہوگا اور وہ بھی حالت اعتدال میں نہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ فدیہ دیدیا کریں۔ پس اصل بات یہ ہے کہ یہ حکم صرف مریض اور مسافر کے لیے ہے جن کو رمضان کے روزوں کی جگہ پچھلے دنوں میں روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے کہ جب ان کی حالت ایسی ہو کہ وہ پچھلے دنوں میں بھی تعمیل حکم میں مشقت پاتے ہوں تو فدیۃ طعام مسکین دے دیا کریں اور حدیث نے یہ بتا دیا کہ بوڑھے مرد اور عورتیں بھی مریض کے حکم میں ہی داخل ہیں۔ چنانچہ بخاری میں ہے کہ حضرت انسؓ جب بہت بوڑھے ہو گئے تو روزہ کی بجائے فدیہ دے دیا کرتے تھے۔

اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ان الفاظ کو منسوخ صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ شہر رمضان والی آیت میں یہ دوہرائے نہیں گئے۔ حالانکہ یہ محض ایک رخصت کا رنگ ہے اور ضروری نہیں کہ اس کو بار بار دوہرایا جاتا۔ محض دوبارہ یہ لفظ نہ آنے سے ان کو منسوخ سمجھنا بالکل غلط استدلال ہے۔

اور ایک معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں اور یہ فدیہ صدقۂ فطر کی صورت میں بروئے حدیث ضروری ہے اور یہ معنی بھی اس آیت کو دوسری آیات کے خلاف نہیں رہنے دیتے اور یہاں ذکر بھی ایک مسکین کے کھانے کا ہے۔

ع۲۲۷ تطوع۔ تطوّع کے معنی گو عام طور پر شوق سے یا نفل کے طور پر نیکی کرنا ہیں۔ مگر اس کے اصلی معنی تکلف الطاعۃ ہیں (غ) یعنی طاعت بطور تکلّف اختیار کرنا اور یہی معنی یہاں مراد ہیں اور بطور نفل نیکی اختیار کرنا خود اسی سے ماخوذ ہے۔

یہاں روزے کی علّت غائی کی طرف پھر توجہ دلائی ہے کیونکہ روزہ رکھنا بطور تکلف اطاعت اختیار کرنا ہے اس لیے فرمایا کہ بطور تکلف اطاعت اختیار کرنا تمہارے لیے بہتر ہے۔ اس لیے اگر تم روزہ رکھو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ کیونکہ اس سے نیکی کی قوت ترقی پکڑتی ہے اور اگر شوق سے نیکی اختیار کرنا معنی لیے جائیں تو مراد یہ ہو سکتی ہے کہ زیادہ مسکینوں کو کھانا دیدے۔

ع۲۲۸ شھر۔ شُھرۃ کسی امر کی وضاحت ہے اور شھر مہینہ کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ایک مشہور مدّت ہے یا چاند دیکھنے کے وقت اس کی شہرت ہو جاتی ہے (غ)

رمضان۔ مہینہ کا نام ہے اور رمض سے مشتق ہے جس کے معنی دھوپ کی گرمی کی شدّت ہیں (غ) مہینوں کے نام جب دوبارہ رکھے گئے تو اس مہینہ

فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ
الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا
الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اور دنوں سے گنتی (پوری) کی جائے۔ اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمھارے لیے تنگی نہیں چاہتا اور کہ تم گنتی کو پورا کرو اور اللہ کی بڑائی کرو اس لیے کہ اس نے تمھیں ہدایت کی اور تاکہ تم شکر کرو۔ ع۲۳۰

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ
دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ
وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

اور جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو میں قریب ہوں میں دعا کرنے والے کی دعا کو جب وہ مجھے پکارتا ہے قبول کرتا ہوں پس چاہیئے کہ میری فرمانبرداری کریں اور چاہیئے کہ مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت پائیں۔ ع۲۳۱

میں گرمی کی شدت تھی۔

قران۔ قرأ سے مصدر ہے جس کے معنی پڑھنا ہیں۔ اور قرأ کے اصل معنی جمع کرنا ہیں اور پڑھنے میں حرف ایک دوسرے کے ساتھ ملائے جاتے ہیں (غ) پس ایک معنی کے لحاظ سے قرآن نام اس لیے رکھا گیا کہ یہ تمام علوم کو یا تمام کتب سماوی کی خوبیوں کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے (غ) اور دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ ایک پیشگوئی تھی کہ دنیا کی تمام کتابوں میں پڑھا جانے کے لحاظ سے اس کو خاص امتیاز حاصل ہوگا۔ چنانچہ یہ ایک امر واقعہ ہے جس کا اقرار مخالفین اسلام کو بھی ہے کہ قرآن کے برابر دنیا کی کوئی کتاب نہیں پڑھی جاتی (دیکھو انسکلوپیڈیا بریٹینیکا) لاکھوں انسان اسکے حافظ ہیں جو دن رات اسے پڑھتے ہیں اور کسی کتاب کے اتنے حافظ دنیا میں نہیں۔ پھر ہر مسلمان پانچ مرتبہ ہر روز اس کا کچھ نہ کچھ حصہ نماز میں پڑھتا ہے۔ یہاں بتا دیا کہ وہ گنتی کے دن جن کے روزے رکھنے کا حکم دیا رمضان کا مہینہ ہے اور اس مہینہ کو خاص فخر یہ حاصل ہے کہ اس میں قران اتارا گیا یعنی نزول قرآن اس میں شروع ہوا۔ ابن اسحاق کی روایت پر روح المعانی میں انہی معنوں کو ترجیح دی ہے۔ ای ابتدی فیہ انزالہ وکان ذلک لیلۃ القدر۔

یہاں قرآن کریم کے تین کمالات کا ذکر فرمایا۔ اوّل یہ کہ یہ ھدی ہے یعنی لوگوں کو سیدھی راہیں بتاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ بینات من الھدی ہے یعنی دلائل بھی دیتا ہے کہ کیوں فلاں راہ پر چلنا چاہیئے یا فلاں راہ سے بچنا چاہیئے۔ تیسرا یہ کہ اس کے دلائل حق و باطل میں فیصلہ کر دینے والے ہیں۔ یعنے فی الواقع ایک انسان کو حق الیقین کے مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔

ع۲۲۹ ان الفاظ کی رو سے ان مقامات کو خارج کر دیا جہاں بہت لمبے دنوں کی وجہ سے بارہ مہینوں کی تقسیم مشاہدہ میں نہیں آتی، نہ ہلال نظر آتا ہے، کیونکہ شھد میں مشاھدہ ضروری ہے خواہ کسی طرح پر ہو۔ دیکھو ع۳۷ ایسی صورت کے لیے دیکھو ع۲۳۵۔

ع۲۳۰ بیمار اور مسافر کے پیچھے روزے رکھنے کے حکم کو اس لیے دوہرایا ہے کہ رمضان کی خاص برکات کے ذکر کی وجہ سے لوگ تکلیف مالایطاق میں نہ پڑیں۔ یرید اللہ بکم الیسر سے بھی ظاہر ہے کہ بیمار اور مسافر کے لیے رخصت سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔

ع۲۳۱ قریب۔ لفظ قرب مکان و زمانہ کے لحاظ سے بھی استعمال ہوتا ہے اور نسبت، مرتبہ، علم و قدرت کے لحاظ سے بھی۔ اللہ تعالیٰ کا قرب بندہ سے جیسا کہ نحن اقرب الیہ من حبل الورید میں علم و قدرت کے لحاظ سے ہے اور کبھی بندہ کے اللہ تعالیٰ سے قرب کا ذکر ہوتا ہے اولٰئک المقربون وہ بلحاظ مرتبہ یا رعایت ہے۔ انی قریب میں اس قربِ مخصوص کا ذکر ہے جو خاص بندوں کو اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ اس کی طرز بھی آگے بتائی ہے کہ کس طرح ہوسکتا ہے وہ بذریعہ دعا ہے۔

اجیب۔ جوب کے معنی جوبۃ یعنی پست زمین کا قطع کرنا ہے۔ چنانچہ قطع کرنے یا تراشنے کے معنی میں ہی ہے جابوا الصخر بالواد (الفجر ۸۹ - ۹) اور کلام کا جَواب اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بھی جَوب کو قطع کرتا ہے اور کہنے والے کے منہ سے سننے والے کے کان تک پہنچتا ہے۔ لیکن ابتدائی خطاب کو جواب نہیں کہا جاتا۔ پھر جواب دو طرح پر ہے اگر سوال میں کسی بات کا مطالبہ ہے تو اس کا جواب بات ہے اور اگر سوال میں کسی فائدہ کا مطالبہ ہے تو وہ فائدہ پہنچانا جواب ہے (غ)، پس اجیب کے معنی جواب دیتا ہوں بھی ہو سکتے ہیں اور قبول کرتا ہوں بھی۔ اور استجابۃ اور اجابۃ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی قبول کرنا، اس فرق سے کہ اجابت میں ایسا جواب بھی ہو سکتا ہے جو درخواست کی نامنظوری لیے ہوئے ہو۔ اور استجابت میں قبولیت ضروری ہے۔ یہ فراء کا قول ہے (ر) پھر بندہ کی طرف سے استجابت یا اجابت فرمانبرداری کا اختیار کرنا ہے۔

یرشدون۔ رُشد کے معنی ہدایت پانا ہیں (غ)

اس آیت کو جس میں قرب الٰہی کا ذکر ہے۔ رمضان کے احکام میں لانے سے یہ اشارہ ہے کہ رمضان میں قرب الٰہی کی راہیں بہت کھل جاتی ہیں۔ اس کا طریق

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ
هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ
اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ
عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ
وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا

تمھارے لیے روزوں کی رات میں اپنی عورتوں کی طرف رغبت کرنا
حلال کیا گیا ہے[۲۳۲] وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو[۲۳۳]
اللہ جانتا ہے کہ تم اپنی جانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے سو اس
نے تم پر رجوع برحمت کیا اور تم کو معاف کیا پس اب ان سے میل جول
کرو اور جو اللہ نے تمھارے لیے مقرر کیا ہے چاہو[۲۳۴] اور کھاؤ اور پیو

یہ بتایا کہ دعا کرو تو میرا قرب مل سکتا ہے۔ رمضان میں نبی کریم صلعم کا طرز عمل بھی یہی بتاتا ہے کہ آپ عبادت اور دعا پر بہت زیادہ زور دیتے تھے اور سخاوت بھی دیگر ایام سے بڑھ کر کرتے تھے گویا یہی مہینہ مسلمانوں کے لیے مجاہدات کا مہینہ ہے جس کے اندر تزکیہ نفس ہو کر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکتا ہے اور انسانی زندگی کی اصل غرض پوری ہو سکتی ہے۔ اذا سألك عبادی عنی میں اس تڑپ کا ذکر ہے جو مومنوں کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور دعوۃ الداع سے مراد اسی تڑپ کا اظہار ہے جب انسان دعا میں اسے اختیار کرتا ہے۔ پس یہاں جس دعا کی قبولیت کا ذکر ہے وہ صرف قرب الٰہی کو حاصل کرنے کی دعا، اور جو انسان ایسی دعا کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ بھی ضرور قبول فرماتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ میری فرمانبرداری کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ سیدھی راہ پالیں گے یعنی وہ راہ جو میرے قرب میں پہنچا دیتی ہے۔ فی الواقع فطرت انسانی جب صفائی پر ہوتی ہے اور روزہ سے اس میں صفائی ضرور آتی ہے تو اس کے اندر یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ قرب الٰہی کو حاصل کرے۔ اس قرب کو حاصل کرنے کے لیے بتایا کہ نرے روزے سے ہی نہیں بلکہ پھر دعا بھی ساتھ کرو۔ گویا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ میں روزہ اگر صبر کا پہلو ہے تو صلوٰۃ دعا کا پہلو ہے۔ پس یہ مہینہ عبادات کے لیے مخصوص ہے۔

سیاق و سباق عبارت سے ظاہر ہے کہ یہاں انہی دعاؤں کی قبولیت کا ذکر ہے جو قرب الٰہی کے حصول کے لیے کی جائیں۔ عام دعاؤں کا یہاں ذکر نہیں جو بندہ اپنی مصائب کے لیے کرتا ہے۔ ان کا ذکر دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے۔ فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء (الانعام۶-۴۱) یعنی جس مصیبت کو دور کرنے کے لیے تم اسے پکارتے ہو اسے اگر چاہے تو دور کر دے۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ دنیوی معاملات میں اللہ تعالیٰ ساری دعاؤں کو قبول کرے، جسے چاہے اسے قبول کرے۔ اسی لیے دوسری جگہ فرمایا ولنبلونکم بشئی من الخوف الیٰۃ۔ یعنی آزمائش کے طور پر اللہ تعالیٰ کچھ تکلیف انسانوں پر بھی وارد کرتا رہتا ہے۔ ہاں قرب الٰہی کی راہیں اس قدر کھلی ہیں کہ جب انسان اس کے لیے قدم اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی پکار کو سن لیتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (العنکبوت۲۹-۶۹)

اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر بعض دعائیں قبول نہیں ہوتیں تو دعا ایک لغو امر ہے ایسا ہی ہے جیسا کوئی کہے کہ بعض وقت دوا مفید نہیں پڑتی تو دوا کرنا ہی لغو امر ہے جس قدر اسباب دنیا میں ہیں وہ ایک حد تک ہی فائدہ پہنچاتے ہیں اور ہر دعا کو قبول کرنے کے یہ معنی ہوئے کہ خدا حاکم نہیں بلکہ بندہ حاکم ہے کہ جو وہ مانگے خدا کو مجبوراً دینا پڑتا ہے۔ وہاں دعا کی قبولیت کا یقین اس سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض وقت اپنے بندوں کو قبل از وقت نتیجہ سے اطلاع دے دیتا ہے۔

ع۲۳۲ رفث۔ ازہری کہتے ہیں کہ یہ ایک کلمہ جامع ہے ان تمام باتوں کے لیے جو مرد عورت سے چاہتا ہے اور مفردات راغب میں ہے کہ اس کا استعمال جماع اور اس کے محرکات پر ہے جن کا کھلا ذکر اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں مراد جماع ہے۔

رمضان میں عورت سے رغبت: بخاری میں براء کی روایت سے ہے کہ جب رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا تو لوگ سارا مہینہ عورتوں کے پاس نہ جاتے تھے اور بعض روایتوں میں ہے کہ اگر سو جاتے تو پھر اس کے بعد کھانا پینا، عورتوں کے قریب جانا جائز نہ سمجھتے تھے پس یہ حکم نازل ہوا کہ رات کو بی بی کو بلانا جائز ہے۔

ع۲۳۳ لباس وہ ہے جو انسان کے قبیح امر کو ڈھانک دے (غ) امام راغب کہتے ہیں کہ میاں کو بی بی کا اور بی بی کو میاں کا لباس اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی محافظت کرتے اور ایک دوسرے کو امر قبیح کے ارتکاب سے بچاتے ہیں۔ مجاہد اور دیگر سلف سے اس کے معنی سکن مروی ہیں۔ یعنی عورتیں مردوں کے لیے سکون و اطمینان کا موجب ہیں مرد عورتوں کے لیے اور قرآن کریم نے خود اس معنی کو واضح کر دیا ہے۔ جہاں فرمایا وجعل منھا جھا لیسکن الیھا (الاعراف۷-۱۸۹) اسی سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا تاکہ وہ اس سے سکون پکڑے اور دوسری جگہ ہے خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا (الروم۳۰-۲۱) تمھاری جنس سے تمھاری بیبیاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون پکڑو۔ رات کو بھی ایک جگہ سکون اور ایک جگہ لباس کہا ہے اور خود لباس کی غرض قرآن شریف میں یوں بیان کی ہے یواری سوا تکم وریشا (الاعراف۷-۲۶) وہ تمھاری شرمگاہوں کو ڈھانکتا ہے اور تمھارے لیے زینت کا موجب ہے۔ پس ایک لطیف استعارہ میں بتایا کہ میاں بی بی کا تعلق کس طرح ایک دوسرے کے لیے تسکین کا موجب ہے اور کس طرح ایک کی کمی دوسرے سے پوری ہوتی ہے۔

ع۲۳۴ تختانون۔ اختیان سے ہے امام راغب اختیان اور خیانۃ کے معنی میں یہ فرق کرتے ہیں کہ اختیان کے معنی ہیں خیانت کا ارادہ کرنا گویا خیانت ابھی وقوع میں نہیں آئی۔

نزول حکم قرآنی سے پہلے روزہ میں تشدد: چونکہ بعض صحابہؓ کا یہ خیال تھا کہ روزہ میں رات کے وقت بھی بی بی کے پاس نہیں جانا چاہیئے گو کوئی حکم الٰہی نازل نہ ہوا

حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الۡخَیۡطُ الۡاَبۡیَضُ مِنَ الۡخَیۡطِ
الۡاَسۡوَدِ مِنَ الۡفَجۡرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی
الَّیۡلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوۡہُنَّ وَ اَنۡتُمۡ عٰکِفُوۡنَ ۙ
فِی الۡمَسٰجِدِ ؕ تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ فَلَا تَقۡرَبُوۡہَا ؕ
کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۷﴾
وَ لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَ تُدۡلُوۡا
بِہَاۤ اِلَی الۡحُکَّامِ لِتَاۡکُلُوۡا فَرِیۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ
النَّاسِ بِالۡاِثۡمِ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۸﴾ ع ۲۳ ۷

یہاں تک کہ تمھارے لیے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے
الگ ہو جائے پھر رات تک روزے کو پورا کرو [۲۳۵] اور جب تم مسجدوں
میں اعتکاف میں ہو تو ان سے میل جول نہ کرو [۲۳۶]۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں پس
تم ان کے قریب مت جاؤ [۲۳۷]۔ اس طرح اللہ اپنی باتیں لوگوں کے لیے
کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ کریں۔
اور اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور (نہ) ان کے
ذریعہ حاکموں تک پہنچو [۲۳۸]، تاکہ لوگوں کے مال کا ایک حصّہ گناہ کے
ساتھ کھا جاؤ، حالانکہ تم جانتے ہو۔

تھا اور خواہش طبعی چاہتی تھی تو اس صورت میں اس تحریک خواہش کو اختیان کہا ہے جو روایتیں اس موقعہ پر بیان کی جاتی ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ایک شخص بغیر کھائے پئے سو گیا اور اسی بھوک کی حالت میں روزہ رکھا تو اگلے دن اسے غش آ گیا۔ دوسری روایت حضرت عمرؓ کے متعلق ہے کہ وہ اپنی بی بی کے پاس گئے بعد اس کے کہ وہ سو گئی تھیں۔ یہ دونوں روایتیں کسی پہلے حکم کی موجودگی کو ظاہر نہیں کرتیں بلکہ اس حکم سے ایک غلط خیال کی تردید ہوئی۔ توبہ اور عفو کے لفظ عام ہیں ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پہلے کوئی برا فعل خلاف حکم الٰہی ہو چکا ہے۔ ایک سخت پابندی کی جگہ ایک نرم حکم دے دیا یہ توبہ ہے دیکھو [۵۷] نیز النساء ۲۶ جہاں کھول کر بیان کر دینے یا شریعت عطا فرمانے کو یتوب علیکم سے ظاہر کیا ہے اور عفو اس کو اس لیے کہا کہ ایک سختی جو مسلمانوں نے اپنے اوپر لازم کر لی تھی اللہ تعالیٰ نے اسے دور کر دیا۔

ع۲۳۵ الخیط الابیض۔ خیط دھاگے کو کہتے ہیں اور خیاط سوئی کو حتی یلج الجمل فی سم الخیاط (الاعراف ۷۔ ۴۰) اور الخیط الابیض صبح کی سفید دھاری کا نام ہے اور الخیط الاسود اس کی سیاہی کا۔ یہ معنی خود نبی کریم صلعم سے مروی ہیں۔ چنانچہ بخاری میں عدی کہتے ہیں کہ میں نے رات کو ایک سفید دھاگا اور ایک سیاہ دھاگا اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیے اور جب آنحضرت صلعم کو یہ واقعہ سنایا تو آپ نے فرمایا ان وسادک اذا العریض تمہارا تکیہ بڑا فراخ ہے۔ گویا یوں سمجھا دیا کہ وہ خیط ابیض اور خیط اسود تکیہ کے نیچے نہیں آ سکتے۔

یہاں روزہ کی حدود بیان کی ہیں۔ صبح صادق کے نمودار ہونے تک کھانا پینا جائز ہے اور آفتاب غروب ہوتے ہی افطار کر دینا چاہیئے۔ سحری کے وقت میں حتی الوسع تاخیر کی اور افطار میں حتی الوسع تعجیل کی تاکید نبی کریم صلعم نے فرمائی ہے۔

جہاں دن لمبے ہوں وہاں روزے کا حکم: ان حدود پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ بعض جگہ کئی کئی ماہ کا دن ہوتا ہے۔ سو اوّل تو یہ مقام آباد ہی بہت کم ہیں۔ دوسرے وہاں رمضان کا مہینہ ممیز نہیں ہوتا۔ پس شھد منکم الشھر میں وہ لوگ نہیں آتے۔ ہاں جہاں اٹھارہ انیس گھنٹے کا دن ہو وہاں روزہ رکھا جا سکتا ہے جن کے لیئے تکلیف مالا لیطاق ہو وہ فدیۃ طعام مسکین پر عمل کریں

ع۲۳۶ تباشروا۔ بشرۃ ظاہر جلد کو کہتے ہیں یعنی چمڑے کے اوپر کا حصّہ اور مباشرۃ دو انسانوں کے چمڑے کا ایک دوسرے کو لگنا ہے یعنی مرد اور عورت کے لمس بشرۃ الرجل بشرۃ المرأۃ (ن) اس کے اور لامستم کے جو لمس (چھونے) سے ہے ایک ہی معنی ہیں (ن) اور کنایۃً جماع مراد ہے جیسے اس قسم کے دوسرے الفاظ سے بھی اور یہی معنی یہاں مراد ہیں نہ مطلق چھونا۔

عاکفون۔ عاکف مقیم کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد اعتکاف ہے جو آخری عشرہ رمضان میں کیا جاتا ہے یعنی دس دن تک انسان بالکل مسجد میں رہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماہ رمضان کو مسلمان کا اصلی مجاہدہ قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے اس کے آخری دس یوم کو اور بھی اس مجاہدہ کے لیے خاص کیا گیا ہے ان ایام میں جو اعتکاف کرتا ہے اسے بی بی سے علیحدہ رہنا چاہیئے مگر کسی ضرورت کے لیے بی بی کا اس کے پاس آنا منع نہیں۔

ع۲۳۷ حدود۔ حدّ کی جمع ہے اور یہ اس روک کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان ہو اور ان کو ایک دوسرے سے ملنے سے روکے۔ اس لیے حدّ کسی چیز کا وہ وصف ہے جو اسے دوسری چیزوں سے ممیز کر دے (غ) اسی مادہ سے حادّ ہے۔ ان الذین یحادون اللہ ورسولہ (المجادلہ ۵۸۔ ۲۰) اور اسی سے حدید لوہا ہے اور حدید بمعنی تیز فبصرک الیوم حدید (ق ۵۰۔ ۲۲) اور حدود اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں اس لیے کہ وہ حق و باطل میں حاجز یعنی روک ہیں۔

یہاں حدود کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے فمن رتع حول الحمی یوشک ان یقع فیہ جو شخص رکھ کے ارد گرد پھرتا ہے قریب ہے کہ اس کے اندر چلا جائے۔

ع۲۳۸ تدلوا۔ ادلاء سے ہے جس سے مراد ڈول کا ڈالنا یا نکالنا ہے اور استعارۃً کسی چیز کو ذریعہ بنانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

تجھ سے ہلالوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ یہ لوگوں کے فائدہ کے لیے اور حج کے لیے مقرر وقت ہیں[۲۳۹]۔ اور یہ بڑی نیکی نہیں کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے آؤ، لیکن بڑا نیک وہ ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ۔ اور اللہ کا تقویٰ کرو تاکہ تم کامیاب ہو[۲۴۰]۔

روزہ اور حرام خوری سے اجتناب: اس حکم کو رمضان کے حکم کے ساتھ لانے کا منشاء یہ ہے کہ جب تم میں یہ قوت پیدا ہوگئی کہ تم اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حلال چیزوں کو بھی جب وہ ترک کر دینے کا حکم دے ترک کر دیتے ہو تو حرام اور باطل کو ترک کرنا کس قدر آسان ہے۔ زیادہ تر مال کی محبت ہی انسان سے گناہ کراتی ہے اس لیے روزہ گناہ سے بچانے کا بڑا موجب ہے۔ کیونکہ روزہ سے انسان کے اندر وہ قوت نشوونما پاتی ہے جس سے وہ مال کے ناجائز کھانے کو ترک کر سکتا ہے۔

ع[۲۳۹] اھلّہ۔ ھلال کی جمع ہے پہلی اور دوسری رات کے چاند کو ہلال کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد قمر (غ) ہلال کی رویت کے ساتھ قمری مہینہ کا آغاز ہوتا ہے۔

مواقیت۔ میقات کی جمع ہے اور یہ وہ وقت ہے جو کسی چیز کے لیے مقرر کیا جائے یا وہ وعدہ جس کے لیے کوئی وقت مقرر کیا جائے (غ) ان یوم الفصل کان میقاتا (النباء ۷۸-۱۷) الی میقات یوم معلوم (الواقعۃ ۵۶-۵۰)

ہلالوں کے متعلق سوال سے کیا مطلب ہے: ایسے جس قدر سوال ہیں ان سب میں احکام دریافت کیے ہیں یسئلونک عن الیتامی۔ یسئلونک عن الخمر والمیسر۔ یتیموں کے احکام دریافت کرتے ہیں۔ شراب اور جوئے کے احکام دریافت کرتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ یتیم کس طرح بنتا ہے۔ شراب کس طرح بنتی ہے۔ جوا کس طرح کھیلا جاتا ہے۔ پس ہلالوں کے بھی احکام دریافت کرتے ہیں اور ہلالوں سے مراد مہینے ہیں۔ یہ سوال خاص مہینوں یا ہلالوں کے متعلق ہے جیسا کہ جواب سے ظاہر ہے ھی مواقیت للناس والحج اور یہ خاص مہینے فی الواقع رمضان کے اختتام کے ساتھ ہی شروع ہو جاتے ہیں یعنی شوال، ذیقعد اور دس دن ذی الحج کے یہ حج کے مہینے ہیں۔ عرب میں یہ مشہور مہینے تھے جن کا نام لینے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ جیسا کہ فرمایا الحج اشھر معلومات جب رمضان کے اس قدر فضائل کا ذکر ہوا تو ان مہینوں کا سوال بھی پیدا ہوا، جو رمضان کے ساتھ شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر چونکہ حج کے مہینوں میں دو مہینے حرمت والے بھی ہیں ان کا ذکر بھی ساتھ ہی کر دیا۔ حرمت کے مہینے کل چار ہیں۔ یعنی محرم۔ رجب۔ ذیقعد۔ ذی الحج۔ عرب میں ان ایام میں جنگ بالکل بند ہو جاتی تھی۔ راستے کھل جاتے تھے۔ تجارتیں شروع ہو جاتی تھیں۔ انہی میں حج کے ایام بھی آ جاتے تھے۔ اس لیے مواقیت للناس فرمایا یعنی لوگوں کی بھلائی کے لیے اوقات مقررہ، ورنہ عرب جیسی جنگجو قوم تھی اگر ان مہینوں کی وجہ سے انکی تجارتیں وغیرہ سال میں چار ماہ نہ کھلی رہتیں، تو بالکل برباد ہو جاتے۔ اگر کل مہینوں کے متعلق سوال ہو تو بھی ہرج نہیں کیونکہ سبھی مہینے لوگوں کے لیے وقت مقرر ہیں۔

ع[۲۴۰] ابواب۔ باب کی جمع ہے۔ دروازہ کو کہتے ہیں۔ شہر کا ہو یا مکان کا یا کوٹھڑی کا۔ اور کسی چیز کا باب وہ ذریعہ ہے جس ذریعہ سے اس چیز تک پہنچ سکیں۔ جیسے حدیث میں ہے انا مدینۃ العلم وعلیؓ بابھا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فتحنا علیھم ابواب کل شیء (الانعام ۶-۴۴) اور الملئکۃ یدخلون علیھم من کل باب (الرعد ۱۳-۲۳) جس کے معنی کیے ہیں ہر ایک قسم کی خوش کرنے والی چیزوں سے (غ) امام راغب کے نزدیک ابواب الجنۃ اور ابواب جھنم سے وہ اسباب مراد ہیں جو انسان کو جنت یا دوزخ میں پہنچاتے ہیں۔

بیت۔ بات کے معنی ہیں رات کاٹی اور اس لیے بیت اصل میں وہ مکان ہے جہاں انسان رات کاٹے۔ پھر عام ہر ایک مسکن کو کہتے ہیں (غ) اور مجازاً دل کو جیسا کہ امام راغب نے اس حدیث کے معنی میں قول نقل کیا ہے۔ لاتدخل الملئکۃ بیتا فیہ کلب ولا صورۃ۔ فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا اور تصویر ہو۔ کہ بیت سے مراد یہاں دل اور کلب سے مراد حرص ہے اور بعض کے نزدیک گھر کے دروازہ سے داخل ہونا کنایہ ہے سیدھی راہ اختیار کرنا اور پچھواڑے کی طرف سے آنا کنایہ ہے سیدھی راہ سے انحراف کرنے سے۔

عرب کی توہم پرستی: حسن اور اصم کا قول ہے کہ اہل عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص کسی مقصد کو سامنے رکھ لیتا اور اس کا حاصل کرنا مشکل ہوتا تو وہ ایک سال تک گھر کے پچھواڑے کی طرف سے داخل ہوتا اور اس کو کامیابی کا ذریعہ سمجھتا۔ مسلمانوں کو بتایا ہے کہ تمہاری کامیابی کا مدار ایسی توہم پرستیوں پر نہیں بلکہ تقویٰ پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق اور ذمہ داریوں کی حفاظت پر۔ چونکہ اصل مضمون استعانت بالصبر والصلوٰۃ تھا اس لیے اس سے روکا ہے کہ کامیابی کا مدار توہم پرستی پر رکھا جائے۔ بخاری میں ہے کہ احرام کی حالت میں حمس کے سوائے دوسرے لوگ گھر کے پچھواڑوں سے داخل ہوتے تھے چونکہ حج کا ذکر آیا تھا اس لیے اس رسم کو دور کرنے کا حکم یہاں دیا ہے چونکہ رمضان کو حج کے ساتھ خاص تعلق ہے یعنی جیسے رمضان کی دس راتیں بڑی فضیلت والی ہیں، جن کا ذکر آخری سے پہلی آیت رکوع گذشتہ میں کیا ہے" اسی طرح ذی الحج کی دس راتیں بھی خاص فضیلت رکھتی ہیں۔ اس لیے حج میں جو توہم پرستی کی باتیں تھیں ان کو دور کر دیا اور جو ارکان روحانی معنی

وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا
تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾
وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ
مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ
الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں
اور زیادتی نہ کرو، اللہ زیادتی کرنے والوں سے پیار نہیں کرتا۔[241]
اور جہاں اُن کو پاؤ مارو اور انھیں نکال دو جہاں سے انھوں نے تمھیں
نکالا ہے[242] اور فتنہ قتل سے بڑھ کر سخت ہے[243] اور مسجد حرام کے قریب
ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ وہ اس کے اندر تمہارے ساتھ جنگ

رکھتے تھے ان کو باقی رکھا۔

ع۲۴۱ قاتلوا۔ مُقَاتلة کے معنی مُحارَبَۃ ہے یعنی ایک دوسرے سے جنگ کرنا یا ایک دوسرے کو قتل کرنے کا قصد کرنا۔

یہاں سے جنگ کا ذکر شروع ہوتا ہے اور اس کا تعلق ماسبق سے دو طرح پر ہے ایک تو پہلے صاف کہا گیا تھا کہ تم کو خانہ کعبہ کا متولی بنایا جائے گا مگر اس کے لیے صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ خدا کی مدد چاہو اور اس راہ میں تم میں سے لوگ شہید بھی ہوں گے پس اب اسی مضمون کو کھول کر بیان کیا ہے کہ جنگ کی اجازت کس حد تک ہے۔ دوسرے جب حرمت والے مہینوں کا سوال آیا اور ان میں جنگ کے بند رہنے کو لوگوں کے فائدہ کی بات قرار دیا، تو اب جنگ کے احکام کو بھی بیان کردیا جو دراصل یسئلونک کا جواب ہے اور خود حج کا ذکر بھی چاہتا تھا کہ بتایا جائے کہ اسلام کا یہ عظیم الشان رکن کس طرح ادا ہوسکتا ہے جب خانہ کعبہ کافروں کے ہاتھ میں ہے۔ اسی لیے آگے آتا ہے۔ واخرجوھم من حیث اخرجوکم یعنی مکہ سے تو یہ کافر ضرور نکالے جائیں گے مگر وہ بغیر جنگ کے ناممکن تھا۔ اس لیے احکام جنگ کا ذکر ضروری ہوا۔ سورہ حج میں بھی بعینہٖ اسی کے مطابق حج کے ذکر کے ساتھ جنگ کے اذن کا ذکر شروع ہوتا ہے اذن للذین یقاتلون (الحج ۲۲ ۔ ۳۹)

یہاں حکم فی سبیل اللہ جنگ کرنے کا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ فتوحات ملکی کے لیے یہ جنگ نہیں۔ حفاظت قومی کے لیے بھی نہیں بلکہ اس لیے کہ اللہ کا نام یہ کافر نہ مٹا دیں اور مسلمانوں کو خدا کی عبادت سے جو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ہے نہ روکیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے بدر کے دن جو آپ کی پہلی جنگ تھی ان الفاظ میں دعا کی اللّٰھم ان اھلکت ھٰذہ العصابۃ فلن تعبد فی الارض ابدا۔ اے خدا اگر تو نے اس چھوٹی سی جماعت کو ہلاک کردیا تو زمین میں تیری پرستش پھر کبھی نہ ہوگی، اور خود قرآن شریف میں دوسری جگہ اسی جنگ کی غرض کو یوں بیان کیا ہے۔ ولولا دفع اللّٰہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوٰت ومساجد (الحج ۲۲ ۔ ۴۰) اگر اللہ بعض لوگوں (یعنی کفار) کو بعض (یعنی مسلمانوں) کے ذریعہ سے نہ روک دیتا تو راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجا گھر اور دیگر مذاہب کے عبادت خانے اور مسجدیں سب ویران کردی جاتیں اور یوں اللہ کا ذکر دنیا سے مٹا دیا جاتا پس اسی مذہبی آزادی اور امن کا قائم کرنا ہی فی سبیل اللہ ہے اور اسلامی جنگوں کی پہلی شرط یہی ہے۔

مگر اسی آیت میں جنگ کرنے کے متعلق دو اور شرائط بھی لگا دی ہیں۔ ایک یہ کہ ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں جو فی الواقع جنگ میں شامل نہ ہوں یا جو جنگ میں ابتدا نہ کریں ان سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں، اور دوسرے یہ کہ حد سے نہ بڑھو یعنی حالت جنگ میں اپنے حق سے یا ضرورت جنگ سے تجاوز نہ کیا جائے۔ خواہ مخواہ اتلافِ جان ومال نہ ہو، جہاں کہیں قرآن شریف میں کسی قوم سے قتال کا حکم یا اجازت ہے وہ انہیں تین شرائط کے ماتحت ہے اور بغیر اس کے جائز نہیں۔ ان تین شرائط نے اسلامی جنگوں کو نہ صرف یہودی جنگوں کے مقابلہ پر رحمت ہی رحمت کردیا کیونکہ یہودی غیر قوم کے بوڑھوں بچوں عورتوں تک کو تہ تیغ کردیتے تھے، مویشیوں کو فنا کردیتے تھے اور مکانوں کھیتوں باغوں اموال کو آگ میں جلا دیتے تھے، بلکہ اس بیسویں صدی کی مہذب اقوام کی جنگ کے مقابل میں بھی اسلامی جنگ نری رحمت نظر آتی ہیں۔ پھر ساتھ تقویٰ اور اعتدال اور انصاف اور عفو کا حکم بھی موجود ہے۔

ع۲۴۲ ثقفتموھم۔ ثقف کے اصل معنی کسی چیز کے پانے یا کرنے میں دانائی ہیں (غ) اور گو اصل معنی سے تجاوز کر کے مطلق پا لینے پر بھی اسی لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ مگر یہاں اصل معنی ہی مراد ہیں جیسا کہ ابن جریر نے کہا ہے فی ای مکان تمکنتم من قتلھم وابصرتم مقاتلھم یعنی جہاں ان کو قتل کرنے کی قدرت ہو اور ان کے جنگ کرنے کو دیکھو۔

واقتلوھم میں ضمیر انہی لوگوں کی طرف جاتی ہے جن کا پیچھے ذکر ہے یعنی الذین یقاتلونکم وہ لوگ جو تم سے جنگ کرتے ہیں ان کو جہاں پاؤ مارو۔ یہ نہیں کہ کسی غیر مسلم کو جہاں پاؤ مارو۔ اور ثقفتموھم کا لفظ اختیار کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اندھا دھند مارنا مراد نہیں صرف جنگ میں مارنا جائز ہے۔

دوسرے فقرے میں جنگ کی حد کو بیان کیا ہے کہ کفار نے مسلمانوں کو بلا وجہ مکہ سے نکالا تھا اور اب وہ وہاں اغراض مذہبی کے لیے یعنی حج کے لیے بھی نہ جا سکتے تھے اس لیے بتایا کہ جنگ ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے تم کو مکہ سے نکالا ہے اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ مکہ سے نکالے جائیں۔ اس میں آخری فتح کی صریح پیشگوئی بھی ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ تمہاری جنگ اپنے حقوق کو واپس لینے کے لیے ہے۔

ع۲۴۳ فتنۃ۔ اصل معنی فَتَن کے سونے کا آگ میں ڈالنا ہے تاکہ کھرا پن اس کے کھوٹ سے الگ ہو جائے۔ اس لیے محض آگ میں ڈالنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے یوم ھم علی النار یفتنون (الذاریٰت ۵۱ ۔ ۱۳) اس لیے فتنۃ عذاب اور دُکھ وغیرہ دینے کے معنی میں آتا ہے (غ) قرآن شریف میں ان دکھوں اور تکلیفوں پر اس

حَتّٰی یُقٰتِلُوْکُمْ فِیْہِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْکُمْ فَاقْتُلُوْھُمْ ؕ کَذٰلِکَ جَزَآءُ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۱۹۱﴾

فَاِنِ انْتَہَوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۹۲﴾

وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ ؕ فَاِنِ انْتَہَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۹۳﴾

(نہ) کریں پھر اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم ان کو مارو۔ کافروں کی یہی سزا ہے [۲۴۴]

پھر اگر وہ رُک جائیں تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ [۲۴۵]

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو پھر اگر وہ رُک جائیں تو سزا ظالموں کے سوائے اور کسی کے لیے نہیں۔ [۲۴۶]

لفظ کا استعمال ہوا ہے جو کفار مومنین کو دیتے رہے ان الّذین فتنوا المؤمنین والمؤمنات (البروج ۸۵-۱۰) فاذا اوذی فی اللہ جعل فتنۃ الناس کعذاب اللہ (العنکبوت ۲۹-۱۰) جہاں صاف اللہ کی راہ میں ایذا دیا جانے کو فتنہ قرار دیا ہے اور بخاری میں ابن عمر کی روایت سے ہے کان الاسلام قلیلا فکان الرجل یفتن فی دینہ اما قتلوہ و اما یعذّبوہ حتی کثر الاسلام فلم تکن فتنۃ۔ اسلام حالت غربت میں تھا اس لیے ایک شخص کو اس کے دین کی وجہ سے دکھ دیا جاتا تھا یا اس کو قتل کر دیتے یا عذاب دیتے یہاں تک کہ اسلام بڑھ گیا پھر فتنہ نہ رہا اور مفردات میں ہے کہ فتنۃ بلاؤں اور مصیبتوں اور قتل اور عذاب وغیرہ افعال کریہہ پر بولا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف بھی منسوب ہوتا ہے اور وہ بمقتضائے حکمت الٰہی ہوتا ہے۔ پس مطلب ان الفاظ کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو دین کی وجہ سے دکھ دیئے جاتے ہیں اور ملک میں بے امنی کی حالت ہے وہ قتل سے بڑھ کر ہے۔

ع ۲۴۴ مسجد حرام میں جنگ کی ممانعت: باوجودیکہ یہ بھی بتا دیا کہ مسجد حرام یعنی مکّہ سے یہ لوگ نکال دیئے جائیں گے پھر بھی اس کی حرمت کی وجہ سے اس کے قریب بھی جنگ کرنے سے روک دیا۔ ہاں اگر کافر حدود حرم کے اندر جنگ میں ابتدا کریں تو پھر مسلمانوں کو بھی اجازت دی گئی۔

ع ۲۴۵ انتھوا۔ نہی کسی چیز سے روکنا۔ تنھون عن المنکر (آل عمران ۳-۱۱۰) ارایت الذی ینھٰی عبدا اذا صلّٰی (العلق ۹۶-۹و۱۰) اور انتھاء کے معنی اس چیز سے رُک جانا جس سے روکا گیا ہے (غ) فمن جاءہ موعظۃ من ربہ فانتھٰی (۲۷۵) لئن لم تنتہ لارجمنک (مریم ۱۹-۴۶)

کفار کے جنگ سے رک جانے کی صورت میں حکم: چونکہ اصل حکم جنگ کا اس لیے دیا تھا کہ یہ تم سے جنگ کرتے ہیں پس مطلب یہ ہے کہ اگر جنگ سے رُک جائیں یا چونکہ اوپر فتنہ کا ذکر ہے یعنی مسلمانوں کو دُکھ دینے کا تو مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو دکھ دینا چھوڑ دیں تو تم بھی جنگ نہ کرو اللہ ان کے پہلے قصور بخش دے گا۔

ع ۲۴۶ فتنۃ کے معنی ابھی لغت سے قرآن سے حدیث سے بیان ہو چکے (۲۴۳) پس قاتلوھم حتّٰی لا تکون فتنۃ سے مراد یہ ہے کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ مسلمانوں کو دین کی وجہ سے دُکھ نہ دیا جائے لیکن اس کے آگے جو الفاظ آتے ہیں ویکون الدین للّٰہ اور دین اللہ کے لیے ہو۔ ان سے یہ غلط نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام ہی اسلام ملک میں ہو۔ مگر یہ معنی اول تو خود لا تکون فتنۃ کے خلاف ہیں اور دوسرے قرآن شریف کی ان آیات کے بھی خلاف ہیں جن میں کفار سے صلح کر لینے کا حکم ہے۔ وان جنحوا للسلم فاجنح لھا (الانفال ۸-۶۱) پھر نبی کریم صلعم کے عمل کے خلاف ہیں کہ آپ نے اس وقت تک جنگ نہیں کی کہ اسلام ہی اسلام ہو صلح حدیبیہ میں کفار کی پیش کردہ شرائط پر صلح کی یہانتک کہ جو کافروں میں سے مسلمان ہو کر آپ کے پاس آئے ان کو بھی واپس کر دینا منظور کیا۔ پھر فتح مکّہ میں اہل مکہ کو حالتِ کفر پر چھوڑ کر معاف کر دیا۔ حتّٰی کہ کفر کی حالت میں ان میں سے بعض لوگ مسلمانوں کے ساتھ جنگوں میں شامل ہوتے رہے پھر آپ کے پاس نویں اور دسویں سال ہجرت میں وفد پر وفد مشرکوں کے آتے تھے۔ اگر مشرکوں سے جنگ کا حکم ہوتا تو یہ لوگ کس طرح حالت شرک میں رہ کر مدینہ میں آ سکتے تھے پھر آپ کی وفات کے وقت بھی یہود و نصاریٰ عرب میں موجود تھے دین اسلام تو پھر بھی اکیلا عرب میں نہ تھا۔ پھر لا اکراہ فی الدین میں تو اس کے بعد چل کر یہ کہا کہ دین میں جبر نہیں، تو یہاں بجبر مسلمان کرنے کی تعلیم کیونکر ہو سکتی ہے پس جو معنی خلاف سیاق و سباق، خلاف قرآن، خلاف عمل نبوی ہیں وہ کسی طرح قابل قبول نہیں۔

یکون الدّین للّٰہ کے معنی صاف ہیں دین اللہ کے لیے ہو۔ جب دین کے لیے کوئی دکھ دینے والا نہ ہو تو دین اللہ کے لیے ہوگا۔ یہی معنی لھدمت صوامع الآیہ میں ہیں کہ جنگ کی غرض دنیا میں مذہبی آزادی کا قائم کرنا ہے اور یہی معنی لا اکراہ فی الدین کے ہیں دین میں کوئی جبر نہ رہے۔ بخاری کی حدیث سے بھی یہی معنی ثابت ہیں جہاں یکون الدین للّٰہ کے ماتحت امام بخاری حضرت ابن عمرؓ کی اس حدیث کو لائے ہیں کہ جب ان سے ابن زبیر کے معاملہ میں شامل ہونے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے جواب دیا۔ قاتلنا حتی لم تکن فتنۃ وکان الدین للّٰہ وانتم تریدون ان تقاتلوا حتی تکون فتنۃ ویکون الدین لغیر اللّٰہ۔ یعنی ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ نہ رہا اور دین اللہ کے لیے ہو گیا اور تم جنگ کرنا چاہتے ہو یہاں تک کہ فتنہ ہو اور دین غیر اللہ کے لیے ہو جائے۔ جس کے صاف معنی ہیں کہ ہم نے جنگ کر کے مذہبی آزادی کو قائم کیا تم جنگ کر کے مذہبی آزادی کو دور کرنا چاہتے ہو۔ کیونکہ ابن زبیر کے معاملہ میں دو مسلمان گروہ جنگ کرنے والے تھے اور کافروں کے غلبہ کا کوئی سوال نہ تھا۔

عدوان کے معنی یہاں زیادتی کی سزا ہے۔ دیکھو [۲۴۸]۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے بدلے ہے اور تمام حرمت والی چیزوں میں بدلہ ہے[۲۴۷] پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم اس کو اسی کے مطابق سزا دو جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے[۲۴۸] اور اللہ کے تقوے پر رہو اور جان لو کہ اللہ ان کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

وَاَنْفِقُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ
ع اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَاَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے تئیں ہلاکت میں نہ ڈالو[۲۴۹] اور احسان کرو۔ اللہ احسان کرنے والوں سے پیار کرتا ہے۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْىِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْىُ مَحِلَّهٗ ؕ

اور حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو، پھر اگر تم روکے جاؤ تو جو کچھ قربانی آسانی سے میسّر آئے کرو اور اپنے سروں کو نہ منڈواؤ، یہاں تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے[۲۵۰]۔ پھر جو

ع۲۴۷ حرمت کے مہینوں میں جنگ سے رکنے کا حکم: یہاں صاف حکم دیا کہ حرمت والے مہینوں اور تمام حرمت والی اشیاء کا مسلمانوں کو پاس کرنا چاہیئے، یہاں تک کہ کافر ان میں ابتدا کریں، تب قصاص کے طور پر وہ بھی جنگ کریں۔ امام احمد نے جابر سے روایت کی ہے کہ نبی صلعم حرمت والے مہینوں میں جنگ نہ کرتے تھے اور جنگ کرتے کرتے حرمت والا مہینہ آجاتا تو وقفہ کر دیتے۔ چنانچہ واقعہ حدیبیہ میں آپ نے جنگ کرنے سے انکار کیا اور جنگ ہوازن میں حرمت والے مہینہ کی وجہ سے جنگ کو روک دیا (ت)

ع۲۴۸ اعتداء کے اصل معنی مجاوزۃ الحق ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جب دشمن نے حق سے تجاوز کیا ہے تو اب اس کے خلاف کارروائی حق سے تجاوز نہیں بلکہ عین حق ہے۔ اس لیے دوسرے اعتداء کے معنی مجازاۃ عدوان ہیں یعنی زیادتی کا بدلہ یا اس کی سزا۔ اور یہ اسی کے مطابق ہے جو جزاء سیئۃ کو قرآن کریم نے خود سیئۃ کہا ہے حالانکہ سزا فی الواقع بُرائی نہیں ہے۔ اسی لیے مفردات میں فاعتدوا علیہ کے معنی کیے ہیں قابلوہ بحسب اعتدائہ اس کی زیادتی کے مطابق اس کا مقابلہ کرو۔

ع۲۴۹ التھلک۔ هلك سے ہے اور هلاك موت کو بھی کہتے ہیں اور کسی چیز کے ہاتھ سے جاتے رہنے کو بھی گو وہ دوسرے کے پاس موجود ہو جیسے هلك عنى سلطانيه (الحاقۃ [۶۹]۔۲۹) اور بگاڑ اور فساد سے بھی ہلاک ہوتا ہے۔ يهلك والنسل (۲۰۵) اور تھلکۃ وہ ہے جو ہلاکت کی طرف لیجا۔ فی سبیل اللہ اموال کا خرچ نہ کرنا ہلاکت ہے: اپنے ہاتھوں سے اپنے تئیں ہلاکت میں نہ ڈالو۔ بخاری میں اس کے متعلق ہے نزلت فی النفقۃ یعنی یہ آیت خرچ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ پس مراد اس سے یہ ہوئی کہ خدا کی راہ میں جب جنگ کرو گے تو اموال کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔ اس لیے اپنے اموال کو بھی خدا کی راہ میں خرچ کرو یا یہ مراد ہے کہ حفاظت دین کے لیے اگر اس وقت تلوار اُٹھانے کی ضرورت ہے تو کبھی وہ وقت بھی آئے گا کہ صرف مال خرچ کرنے کی ضرورت ہوگی اس وقت مال خرچ کرنا اور ہلاکت سے بچنا۔ قسطنطنیہ کے حملہ میں جو صحابہ کے زمانہ میں ہوا ایک شخص صفوں کو چیرتا ہوا آگے نکل گیا تو بعض نے کہا القی بیدہ الی التھلکۃ اپنے آپ کو اپنے ہاتھ سے ہلاکت میں ڈال دیا۔ حضرت ابوایوب انصاری نے فرمایا اس آیت کے یہ معنی نہیں۔ فكانت التهلكة فى الاقامة فى الاهل والمال وترك الجهاد۔ ہلاکت تو اس میں تھی کہ ایک شخص اپنے اہل اور مال میں بیٹھا رہے اور جہاد کو ترک کر دے۔ اسی کے مطابق آیت کا خاتمہ احسان کی ترغیب پر کیا ہے۔ آج بھی گھروں میں بیٹھ رہنے میں ہلاکت ہے اور اشاعتِ اسلام پر اموال کو خرچ کرنے کی ضرورت ہے اور اسی میں مسلمانوں کا بچاؤ ہے۔

ع۲۵۰ احصرتم۔ اِحصار دشمن کے روکنے، اور بیماری کے روکنے دونوں پر بولا جاتا ہے اور حَصر صرف آخر الذکر پر (غ)

الھدی۔ ھَدِیَّۃ کی جمع ہے جس کے معنی تحفہ ہیں بل انتم بھدیتکم تفرحون (النمل [۲۷]۔۳۶) اور ھَدْی خاص ہے قربانی کے جانوروں کے لیے جو خانہ کعبہ کو لیجائے جاتے ہیں اونٹ ہو یا گائے بکری یا بھیڑ (غ)

مَحِلّ۔ حَلّ سے ظرف مکان بھی ہوسکتا ہے اور ظرف زمان بھی۔ قربانی کے اپنے مَحِلّ پر پہنچنے سے کیا مراد ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک محلھا الی البیت العتیق (الحج [۲۲]۔۳۳) کے ماتحت قربانی کا بہرحال خانہ کعبہ میں پہنچانا ضروری ہے۔ مگر نبی کریم صلعم نے دشمن کے روکنے پر حدیبیہ کے مقام پر جو مکّہ سے نو میل ہے قربانیاں کر دی تھیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ وہ جگہ بھی حرم میں داخل تھی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دشمن روک دے اور قربانیاں

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۥ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

٢٤ ع ٨ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ع ﴿۱۹۶﴾

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ

کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ دُکھ ہو تو اس کا فدیہ روزوں سے یا صدقہ سے یا قربانی سے دے[۲۵۱]۔ پھر جب تم امن میں ہو تو جو کوئی حج کے ساتھ عمرہ کا فائدہ اٹھائے تو جو قربانی آسانی سے میسر آئے کر دے اور جو نہ پائے تو تین دن کے روزے حج میں رکھے اور سات، جب تم لوٹ کر آؤ، یہ پورے دس ہیں۔

یہ اُس کے لیے ہے جس کے اہل مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں[۲۵۲]، اور اللہ کے تقویٰ پر رہو اور جان لو کہ اللہ بدی کی سزا دینے میں سخت ہے۔

حج کے معلوم مہینے ہیں، پس جس نے ان میں اپنے اوپر حج لازم کر لیا تو حج میں نہ فحش کلام اور نہ گالی گلوچ اور نہ کوئی جھگڑا ہو۔ اور جو کچھ نیکی تم کرتے ہو، اللہ اُسے جانتا ہے[۲۵۳] اور

حرم میں نہیں پہنچائی جا سکتیں تو کیا کرے پھر اس علم کا حاصل ہونا جیسا کہ امام صاحب نے شرط لگائی ہے کہ قربانی حرم میں پہنچ گئی ہے نہ صرف قرآن شریف میں مذکور نہیں بلکہ ویسے بھی مشکل ہے۔ پس ایسی صورت میں مَحِلّ وہی ہے جہاں روکا گیا یعنی وہیں قربانی کر دے۔ ہاں بیماری کی صورت میں قربانی خانہ کعبہ میں بھی پہنچائی جا سکتی ہے تو اس صورت میں مَحِلّ بھی وہی ہوگا آیت ماقبل سے یہ تعلّق ہے کہ وہاں جنگوں کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ دشمن حج کرنے سے روکتے تھے۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ جنگ کا ذکر یہاں بطور جملہ معترضہ آ گیا ہے۔ اصل مضمون حج ہے جس سے رکوع شروع کیا تھا اور حج پر ہی ختم کیا ہے اور اگلے رکوع میں بھی حج کا ہی ذکر ہے۔ چونکہ حج میں اس وقت رکاوٹ تھی اس لیے درمیان میں جنگوں کا ذکر کرنا پڑا۔ اور سر منڈوانے سے مراد حالت احرام سے باہر نکلنا ہے۔ یعنی اس حالت سے جب انسان احرام باندھتا اور صرف دو بن سلی چادروں میں ملبوس ہوتا ہے اور جب ارکان حج پورے ہو جاتے ہیں تو اس وقت سر منڈوا کر یا بال چھوٹے کرا کر حاجی حالتِ احرام سے باہر نکلتا ہے اس لیے سر منڈوانا گویا حالتِ احرام سے نکل آنا ہے۔

ع[۲۵۱] نُسُك کے اصل معنی ع[۱۶۳] میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہ نسیکۃ کی جمع بھی ہے جس کے معنی قربانی ہیں۔
یعنی بیماری کی وجہ سے سر کے بال کٹوانے پڑیں یا اور کوئی فعل حالت احرام کے خلاف کرنا پڑے۔ جیسے لباس کے معاملہ میں تو اس کا فدیہ دیدے صحیح بخاری میں تین دن کے روزے یا چھ مسکینوں کا کھانا یا قربانی سے اس کی تفسیر کی ہے۔

ع[۲۵۲] تمتع بالحج الی العمرۃ۔ متاع کے معنی ع[۱۶۱] میں بیان ہو چکے ہیں اور متعۃ الحج خاص اصطلاح ہے یعنی عمرہ کا حج کے ساتھ خاص طریق پر ملانا اور حج تین قسم پر ہے۔ افراد۔ قِران۔ تمتع۔ افراد یہ ہے کہ حج اور عمرہ علیحدہ علیحدہ کرے۔ مثلاً حج کے بعد عمرہ کے لیے احرام باندھے یا حج کے مہینوں سے پہلے عمرہ کر لے اور پھر اسی سال حج کے مہینوں میں حج کرے۔ قِران یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ اور حج کی اکٹھی نیت کرے اور دونوں کے لیے احرام باندھے اور جب تک دونوں نہ کر لے احرام نہ کھولے۔ یا حج کے مہینوں میں عمرہ کے لیے احرام باندھے اور احرام کھولنے سے پہلے حج کو ساتھ ملائے۔ اور تمتع یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کے لیے احرام باندھے۔ پھر عمرہ کر کے احرام کھول دے اور حج کے دنوں میں حج کے لیے احرام باندھے۔ گویا یوں عمرہ کو ساتھ ملا کر انسان فائدہ اٹھا لیتا ہے اس کے لیے بھی فدیہ قربانی یا دس روزے قرار دیئے۔

ع[۲۵۳] فَرَضَ۔ فَرْض سخت چیز کے کاٹنے اور اس میں اثر کرنے کو کہتے ہیں اور اس لیے کسی چیز میں حکم کے قطع کرنے کو بھی فرض کہا جاتا ہے اور وہ ایجاب کی طرح ہے مگر ایجاب یا واجب کرنا بلحاظ وقوع اور ثبات بولا جاتا ہے اور فرض قطع حکم کے لحاظ سے (غ) پس فَرَضَ کے معنی لازم کر دیا یا واجب کر دیا۔ اور سورۃ انزلنٰها وفرضنٰها (النور[۲۴]۔ ۱) میں فرضنا کے معنی ہیں ہم نے تجھ پر اس پر عمل کرنا واجب کر دیا اور یہی معنی ان الذی فرض علیك القرآن (القصص[۲۸]۔ ۸۵) میں ہیں یعنی وہ جس نے قرآن پر عمل کرنا تجھ پر واجب کر دیا۔
فسوق۔ فِسق کے معنی کے لیے دیکھو ع[۴۱] مگر ابن عباس، ابن عمر، مجاہد وغیرہ سے یہاں سباب یعنی گالی دینا معنی مروی ہیں۔ بئس الاسم الفسوق

اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ز وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ (وقف النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام)
لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ

زاد (راہ) لے لیا کرو البتہ بہترین توشہ تقویٰ ہے۔ اور اے عقل والو میرا تقویٰ اختیار کرو۔ ۲۵۴
تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے رب سے فضل کی طلب میں لگو۔ ۲۵۵ پھر جب تم عرفات سے نکلو تو مشعر الحرام کے پاس اللہ کا

سے ظاہر ہے کہ فسوق ہر وہ نام ہے جسے انسان ناپسند کرے چنانچہ یہی معنی تاج العروس میں دیئے ہیں حدیث میں بھی ہے سباب المسلم فسوق پس یہاں گالی مراد ہے۔
حج کا ذکر گزشتہ رکوع سے چلتا ہے۔ یہاں اول فرمایا کہ حج کے مہینے مشہور ہیں۔ شوال، ذیقعدہ اور دس دن ذی الحجہ کے۔ حج کا احرام صرف انہی دو ماہ اور دس دن میں باندھا جاسکتا ہے۔

حج کی غرض: حج میں تین باتوں سے خصوصیت سے روکا ہے۔ ایسی کلام سے جو مرد و عورت کے تعلقات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ گالی دینے سے۔ جھگڑا کرنے سے۔ ان تینوں باتوں میں یہ اشارہ ہے کہ حج کی غرض کیا ہے اور وہ انسان کو کس مقام پر پہنچاتا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ حج مومن کا عاشقانہ فعل ہے یعنی جذبۂ عشق الٰہی اس میں پایا جاتا ہے۔ اپنے محبوب کے کوچہ کی زیارت کے لیے وطن سے بےوطن ہوتا ہے۔ لباس بھی آسائش والا ترک کردیتا ہے۔ وہاں جاکر اس کے گھر کے گرد گھومتا ہے، دوڑتا ہے۔ پس جب حج میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جذبۂ عشق الٰہی کے سامنے سارے جذبات اور محبتیں ٹھنڈی پڑ جائیں تو عشق و محبت دنیوی میں جو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی محبت ہے یعنی مرد اور عورت کا تعلق اس کے متعلق کلام کرنے سے بھی روکا تاکہ اس اصل جذبہ عشق میں کسی اور محبت کی آمیزش نہ ہو۔ دوسری غرض حج کی مساوات انسانی کو دکھانا ہے۔ یہاں بادشاہ سے لیکر گدا تک ایک ہی لباس میں ملبوس کھڑے ہوں۔ کیونکہ خدا کے حضور سب انسان یکساں ہیں۔ اس لیے گالی دینے سے بھی روکا، مساوات انسانی مبنی ہے حفاظت خون پر، حفاظت مال پر، حفاظت عزت پر۔ اسی آخری بات کو لوگ جلد بھول جاتے ہیں۔ اسی لیے بتایا کہ حج میں کوئی ایسا فعل بھی نہ ہو جو مساوات نسل انسانی کے نقیض ہو۔ اور حج چونکہ روحانیت کی منزل کا آخری مقام ہے اور جھگڑے اطمینان قلبی کو تباہ کرنے والی چیز ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ حج میں جھگڑا بھی نہ کرو تاکہ تمہارے اس اطمینان روحانی میں جو حج میں حاصل ہونا چاہیئے کوئی امر مخل نہ ہو۔ اور آخر پر فرمایا کہ نیکی بھی کرو تاکہ اللہ جو تمہاری نیکیوں کو جانتا ہے تمہیں اجر دے گویا صرف چند ناپسندیدہ امور سے رکنا ہی ترقی کی آخری منزل نہیں بلکہ ان سے رکتے ہوئے ساتھ ہی نیکی میں ترقی کرنی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت میں ترقی کرے۔ دوسرے لوگوں کی خدمت کرے اور محبت اور الفت کے تعلقات کو جو محض خدا کے لیے ہوں بڑھائے۔

ع۲۵۴ تزوّدوا۔ اس کا مادہ زاد ہے اور زیادۃ بڑھانے کو کہتے ہیں (رغ) ونزداد کیل بعیر (یوسف ۱۲-۶۵) ما زادھم الا ایمانا وتسلیما (الاحزاب ۳۳-۲۲) فزادھم اللہ مرضا (۱-۱۰) اور زاد اس ذخیرہ کی گئی چیز کو کہا جاتا ہے جو مایحتاج وقتی سے زیادہ ہو اور تزوّد کے معنی زاد راہ لے لینا۔

حج میں زادراہ کی ضرورت ہے: حج میں عاشقانہ رنگ تو سکھایا مگر وہ امور جن کو بعض لوگوں نے عاشقانہ فعل تصور کرکے اختیار کیا ہوا تھا اور حقیقت میں وہ نقص تھے ان سے روک بھی دیا۔ ابوداؤد میں ہے کہ اہل یمن حج کرتے تو زادراہ نہ لیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں اور ایک روایت ابن عمرؓ کی ہے کہ بعض لوگ حالت احرام میں سفر خرچ کو پھینک دیتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یا سوال کرتے یا چوری یا کسی اور ناجائز ذریعہ سے مال لیتے کیونکہ اس کے بغیر تو زندہ رہنا ناممکن تھا اس لیے فرمایا کہ زاد راہ ساتھ لے لیا کرو ورنہ کم از کم سوال تو کرنا پڑے گا۔ اس میں مسلمان کو اعلیٰ درجہ کی خودداری سکھائی ہے۔

آخرت کا زادراہ: اس کے ساتھ ہی ظاہر سے باطن کیطرف کلام کو پھیر کر فرمایا کہ اس چھوٹے سے سفر کے لیے زاد راہ کی ضرورت ہے تو اس بڑے سفر کے لیے جو سفر آخرت در پیش ہے کس قدر زاد راہ کی ضرورت ہے اور وہ زاد راہ تقویٰ ہے۔

ع۲۵۵ تبتغوا۔ اس کا مادہ بغی ہے جس کے معنی میانہ روی سے آگے نکل جانے کو چاہتے ہیں۔ مگر ابتغاء میں تجاوز نہیں پایا جاتا بلکہ صرف کسی چیز کے طلب کرنے کی کوشش سے یہ لفظ مخصوص ہے (رغ)

فضل کے اصل معنی زیادۃ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل بغیر اکتساب بھی ملتا ہے لیکن جیسا کہ مفردات میں ہے ایک فضل وہ بھی ہے جو اکتساب سے ملتا ہے اور ابتغاء کے ساتھ لانے سے یہ بتادیا کہ وہ فضل طلب کرنے سے ملتا ہے جیسے فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ (الجمعۃ ۶۲-۱۰) یا واٰخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ (المزمل ۷۳-۲۰) ان تمام مقامات میں فضل سے مراد وہ مال ہے جو تجارت سے حاصل ہوتا ہے۔

بخاری میں ابن عباس کی روایت ہے کہ جاہلیت میں عکاظ اور مجنّہ اور ذوالمجاز میں منڈیاں لگتی تھیں مسلمانوں نے خیال کیا کہ حج میں تجارت کرنا شاید منافی اغراض حج ہو۔ اس لیے فرمایا کہ اصل نیت حج ہو۔ فرض فیھن الحج اور اس کے احکام کو بھی مدنظر رکھو تو تجارت کر لینے میں حرج نہیں۔ ابومسلم نے کہا ہے کہ یہ اجازت حج سے فراغت کے بعد ہے (ک) اگر حج روحانی ترقی کا کمال ہے تو تجارت دنیوی ترقی کا کمال ہے اور مسلمانوں کو دونوں قسم کی ترقی اپنے اندر جمع کرنی چاہیئے۔ حج کے ساتھ بھی تجارت کی اجازت دیکر تجارت کی ضرورت کو بتایا مسلمانوں نے اگر روحانی ترقی کی راہوں کو چھوڑا ہے تو ساتھ ہی دنیوی ترقی کی راہوں کو بھی چھوڑا ہے اور تجارت ان کے ہاتھوں سے نکل کر دوسری قوموں کے ہاتھوں میں جا چکی ہے۔

عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ
وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾
ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَ
اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

ذکر کرو[۲۵۶] اور اسے یاد کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت دی اور
گو اس سے پہلے تم یقیناً گمراہوں میں سے تھے[۲۵۷]
پھر تم وہاں سے ہو کر چلو جہاں سے لوگ ہو کر چلتے ہیں اور اللہ
کی حفاظت مانگو اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے[۲۵۸]

---

۲۵۶ افضتم۔ فاض الماء کے معنی ہیں پانی زور سے بہا۔ تری اعینھم تفیض من الدمع (المائدۃ ۵-۸۳) آنسوؤں کے جاری ہونے پر بولا گیا ہے اور لوگوں کے کثرت کے ساتھ ایک مقام سے آنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ گویا پانی کے بہنے کے ساتھ تشبیہ ہے (غ) جیسے یہاں اور اگلی آیت میں۔ اور افاضۃ فی الحدیث بات میں لگ جانے پر بھی بولا جاتا ہے جیسے لمسّکم فیما افضتم فیہ (النور ۲۴-۱۴) ھو اعلم بما تفیضون فیہ (الاحقاف ۴۶-۸)

عرفات۔ عرف سے ہے معرفۃ اور عرفان کسی چیز کے نشان میں تفکر اور تدبّر سے اس کا پا لینا ہے اور یہ علم سے زیادہ خاص ہے اور معرفۃ کے مقابلہ میں انکار ہے اور علم کے مقابلہ میں جہل اور عرفات اس میدان کا نام ہے جہاں یوم حج یعنی نویں ذی الحج کو تمام حاجی اکٹھے ہوتے ہیں جس طرح یوم عرفۃ اس دن کا نام ہے کیا اسم بامسمی میدان ہے کیونکہ واقعی اس میدان میں اور اس دن میں بندوں کو اللہ تعالیٰ کی ایک خاص معرفت حاصل ہوتی ہے اور سخت سے سخت دل بھی اللہ تعالیٰ کے حضور پگھل جاتے ہیں۔ لاکھوں انسان ایک لباس میں ایک ہیئت میں صرف خدا کی عظمت کے نعرے لگاتے ہوئے لبیك اللھم لبیك لاشریك لك لبیك سارے فرق مراتب کو فرق رنگ کو فرق قومیت کو پاؤں تلے روند دیتے ہیں اور نہ صرف خدا کی معرفت حاصل کرتے ہیں بلکہ نفس انسانی کی صحیح معرفت بھی یہاں حاصل ہوتی ہے میدان عرفات مکّہ سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اسی میں وہ جگہ ہے جس کو جبل رحمت کہتے ہیں جس پر کھڑا ہو کر خطیب خطبہ پڑھتا ہے۔

مشعر الحرام۔ مشعر کے معنی ظاہری نشان ہیں اور مشعر الحرام مُزدلِفہ کا نام ہے جہاں عرفات سے واپس ہو کر رات کاٹی جاتی ہے۔ وہیں نماز مغرب وعشاء جمع کر کے اور پھر فجر کی نماز پڑھی جاتی ہے۔

۲۵۷ اسلام نے کیا انقلاب پیدا کیا: وہ جھمگٹا جس نے صرف میلے کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اسلام نے ایسا داخل کیا کہ ایک اللہ ہی اللہ کا نام وہاں سنا جاتا ہے۔

۲۵۸ استغفروا۔ اِستِغفار کا مادہ غَفر ہے جس کے معنی ہیں الباس مایصُونُہ عن الدّنس (غ) اس کا پہنا دینا جو اسے میل سے (یا برائی سے یا معیوب ہونے سے) بچا رکھے اور اسی لیے کہتے ہیں۔ اغفر ثوبك فی الوعا یعنی اپنے لباس کو صندوق میں محفوظ رکھ اور کہا جاتا ہے کہ کپڑے کو رنگ لو فَاِنَّہٗ اَغفَرُ لِلوَسَخِ کیونکہ وہ مَیل سے زیادہ محفوظ رکھنے والا ہے (غ) پس غفر کے اصل معنی بروئے لغت محفوظ رکھنا ہیں۔ اور اِستِغفار کے معنی حفاظت چاہنا اور لسان العرب میں ہے کہ غفر کے معنی ہیں تَغطِیۃ اور ستر یعنی ڈھانکنا اور غفر اللہ ذُنُوبَہٗ کے معنی ہیں اللہ نے اس کے گناہوں کو ڈھانک لیا (ل) اور مِغفَر خود کو کہتے ہیں کہ وہ حفاظت کا کام دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ گناہ سے حفاظت دو طرح پر ہو سکتی ہے ان گناہوں سے جو انسان کر چکا ہے حفاظت کے معنی یہ ہیں کہ ان کی سزا سے بچ جائے مگر اس سے بڑھ کر حفاظت گناہ سے یہ ہے کہ انسان گناہ کرنے سے ہی بچ جائے اس لیے غفر اور اِستِغفار میں گناہ سے حفاظت دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہے اور کہیں اس سے مراد گناہ کی سزا سے بچنا ہوتا ہے اور کہیں خود گناہ سے بچنا چنانچہ قسطلانی شرح بخاری میں قد غفر لك ما تقدم من ذنبك کی تشریح میں لفظ غفر کے معنی برماوی سے یوں نقل کیے ہیں۔ الغفر الستر وھو اما بین العبد والذنب واما بین الذنب وعقوبتہ یعنی غفر کے معنی بچانا ہیں اور وہ یا بندہ اور اس کے ذنب کے درمیان ہے یعنی بندہ کو قصوروار ہونے سے بچایا جائے اور یا گناہ اور اس کی سزا کے درمیان ہے یعنی جو گناہ ہو چکا ہے اس کی سزا سے بچایا جائے اور غفار اور غفور اور غافر جو اللہ تعالیٰ کی صفت میں ہیں تو وہ بھی ان دونوں معنوں پر مشتمل ہیں اور ان کے معنی محفوظ رکھنے والا بچانے والا اور اول الذکر دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور نہایہ میں ان کے معنی میں لکھا ہے الساتر لذنوب عبادہ وعیوبھم المتجاوز عن خطایاھم وذنوبھم یعنی اپنے بندوں کے قصوروں اور عیبوں کو ڈھانک دینے والا (یعنی ان سے قصور اور عیب ظاہر نہ ہونے دینے والا) اور ان کی خطاؤں اور قصوروں سے درگزر کرنے والا۔ جہاں ساتر کے مقابلہ پر متجاوز لا کر بتا دیا ہے کہ پہلے حصّہ میں ان قصوروں اور عیبوں کا ذکر ہے جو سرزد نہیں ہوئے اور خود قرآن شریف میں ہے فانہ کان للاوّابین غفورا (بنی اسرائیل ۱۷-۲۵) اور اوّاب وہ ہے جو ہر وقت خدا کی طرف رجوع کرتا رہتا ہے۔ اس کے لیے خدا کا غفور ہونا یہی معنی رکھتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچاتا رہتا ہے اور ان میں مبتلا ہونے نہیں دیتا۔ اور اگر غفر کے معنی عذاب کے چھونے سے بچانا بھی لیے جائیں جیسا کہ بعض اہل لغت نے لکھ دیا ہے تو عذاب کے چھونے سے بھی انسان دونوں طرح سے بچتا ہے یعنی یہ کہ وہ بات ہی اس سے سرزد نہ ہو جو عذاب لاتی ہے یا اگر سرزد ہو گئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی سزا سے بچا لے۔

خود قرآن شریف میں اس لفظ کا استعمال دونوں معنوں میں یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہے۔ اول جہاں عفو اور غفر کا اکٹھا ذکر کیا ہے۔

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾

پھر جب تم اپنے حج کے ارکان کو پورا کر لو تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح تم اپنے بڑوں کا ذکر کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر[۲۵۹] پھر لوگوں میں سے کوئی کہتا ہے اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں (ہی) دیدے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾

اور کوئی ان میں سے کہتا ہے اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں (بھی) بھلائی (دے) اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا[۲۶۰]۔

دہاں ہمیشہ عفو کو پہلے رکھا ہے اور غفر کو پیچھے اور عفو کے معنی گناہ کو مٹانا ہیں یعنی اس کی سزا سے بچا لینا پس غفر کے معنی اس صورت میں سوائے گناہ سے حفاظت کے اور ہو ہی نہیں سکتے دیکھو ۳۶۵ دوسرے استغفار کا مرتبہ تمام نیکیوں میں بلند تر رکھا ہے الصابرین والصادقین والقانتین والمنفقین والمستغفرین بالاسحار (آل عمران ۳-۱۶) جہاں پہلے مرتبہ پر صبر کرنے والے ہیں یعنی جو اپنے آپ کو مشکلات میں روک رکھتے ہیں۔ دوسرے پر صدق دکھانے والے تیسرے پر عاجزی کے ساتھ فرمانبرداری اختیار کرنے والے چوتھے پر اپنی قوتوں اور طاقتوں کو اللہ کی راہ میں لگانے والے اور سب سے اوپر صبح کے وقتوں میں استغفار کرنے والے دیکھو ۳۸۸ تیسرے استغفار کی ضرورت جنت میں بھی بتائی ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ محض بلندی درجات کی دعا ہے کیونکہ جنت میں تو داخل ہی تب ہوگا جب گناہ بخشے جائیں گے۔ اس لیے جب جنتیوں کی اس دعا کا ذکر کیا ربنا اتمم لنا نورنا واغفرلنا (التحریم ۶۶-۸) تو معلوم ہوا کہ غفر اور استغفار سے یقیناً مراد اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہنا ہے۔

امتیاز قومی کو دور کیا: آیت کے پہلے حصہ میں جو ذکر ہے کہ جہاں سے لوگ لوٹیں وہاں سے لوٹو تو یہ بعض قوموں نے جو اپنے لیے امتیاز قائم کر رکھا تھا اس کو دور کیا ہے۔ قریش اور کنانہ جو حمس کے نام سے موسوم تھے۔ اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے ممتاز کرنے کے لیے میدان عرفات میں نہ جاتے تھے اور مزدلفہ سے واپس آجاتے تھے۔ ایسے امتیازات کو دور کر کے مساوات کو قائم کیا اور حکم دیا کہ سب لوگ عرفات میں جائیں اور وہاں سے لوٹیں۔

اس کے بعد استغفار کا ذکر ہے بخاری میں اس کی تفسیر میں ہے واستغفروا اللہ ان اللہ غفور رحیم حتی ترموا الجمرۃ گویا رمی جمار یا کنکریوں کا پھینکنا اسی استغفار کے ذکر میں ہی آگیا اور یوں رمی جمار کی اصل حقیقت بتا دی۔ انسان میں اپنے مولیٰ کے لیے عاشقانہ حالت پیدا کرنا اور اس کی عملی تصویر کھینچ دینا تاکہ قلب پر دیرپا اثر ہو حج کی اصل غرض ہے، اسی لیے سب لباس اُتروا کر دو چادروں کے لباس میں ملبوس کر دیا اور عزت، وجاہت، امارت، فیشن کے سارے امتیازات کو یکسر مٹا دیا۔ کنکریں پھینکنے میں ایک مسلمان کی یہ تصویر دکھانا مقصود ہے کہ وہ بدی کے ساتھ کبھی صلح نہیں کر سکتا، نہ بدی کی طاقتوں کی طرف سے لاپروا ہو سکتا ہے بلکہ ہمیشہ ان کے مقابلہ کے لیے تیار رہے اور ہر وقت ان کو اپنے آپ سے دور کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے کسی چیز کی طرف کنکر پھینکنے سے مراد ہوتی ہے کہ انسان اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیگا۔ اور اس کے خلاف جنگ کرے گا۔ اسی طرح ارکان حج میں دوڑنا اور تیز چلنا ہے جس میں بتایا ہے کہ ہر قسم کی ترقی روحانی ہو یا دنیوی جدوجہد سے ہے نہ حجروں میں بیٹھنے سے۔ توحید کے گھر کے گرد گھومنا کیا ہے نیکیوں کے اصل مرکز کے گرد پھرتے رہنا یہاں بھی استغفار کے معنی گناہوں سے اللہ تعالیٰ کی حفاظت چاہنا ہی ہیں۔

ع ۲۵۹ باپ دادوں کی بڑائی کرنے سے روکا ہے: زمانہ جاہلیت میں حج سے فارغ ہو کر میلے لگاتے اور ان میں اپنے اپنے باپ دادوں کی بڑائی کا ذکر کرتے اس کی بجائے اللہ تعالیٰ کا ذکر سکھایا جو حقیقی ترقی کی راہ ہے۔ باپ دادوں کی بڑائی کا ذکر شاہراہ مقصود میں رکاوٹ ہے اس سے روکا۔ آج مسلمانوں نے بڑا کمال اسی کو سمجھا ہوا ہے پدرم سلطان بود۔ اپنی بڑائی کے لیے یہی کافی سمجھا ہُوا ہے کہ ہم بادشاہوں اور سیدوں کی اولاد ہیں۔ اللہ کے ذکر سے انسان ان راہوں پر چل سکتا ہے جو خود اس کو مقام عظمت پر پہنچاتی ہیں جیسا کہ فرمایا فاذکرونی اذکرکم (۱۵۲)

ع ۲۶۰ دعائے جامع دین و دنیا: اس آیت میں اور اس سے پہلی میں دو دعاؤں کا ذکر ہے۔ پہلی دعا ان لوگوں کی ہے جن کی ہمتیں دنیا تک محدود ہیں۔ خدا سے بھی کچھ مانگتے ہیں تو اس دنیا کی زندگی کے لیے ہی مانگتے ہیں۔ آج کل کی مہذب دنیا کا یہ نقشہ ہے۔ مگر مسلمان کو اللہ تعالیٰ یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم کو دین و دنیا دونوں کے کمال پر پہنچنا اپنے مدنظر رکھنا چاہیئے صرف ایک کمال مت چاہو۔ حج کے ذکر کے ساتھ اس دعا کا لانا جو دینی اور دنیوی ترقیات کو مسلمان کے اندر جمع کرنے کی تعلیم دیتی ہے نہایت موزون ہے۔ حج بھی کرو تجارت بھی۔ معراج روحانی بھی حاصل کرو معراج دنیوی بھی۔

دنیا کی حسنات کی طلب: حدیث بخاری میں ہے کہ نبی کریم صلعم کی دعا ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ تھی اور امام احمد کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا کہ آنحضرت صلعم اکثر کونسی دعا مانگا کرتے تھے تو آپ نے یہی دعا بتائی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ایک شخص کی بیمار پرسی کو گئے اور اس کی حالت پوچھی تو اس نے کہا میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اے خدا جو سزا تو مجھے آخرت میں دینے والا ہے وہ دنیا میں ہی دے لے۔ تو آپ نے فرمایا بلکہ یوں دعا کیا کرو: ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾

یہی ہیں جنھیں اس سے حصّہ ملے گا جو انھوں نے کمایا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔[۲۶۱]

وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٠٣﴾

اور گنتی کے دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔ پھر جو کوئی جلدی کرکے دو دن میں چلا جائے اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو کوئی پیچھے رہے اس پر بھی) کوئی گناہ نہیں[۲۶۲] (یہ) اس کے لیے ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اور اللہ کے تقوے پر رہو اور جان لو کہ تم اس کے حضور اکٹھے کیے جاؤ گے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿٢٠٤﴾

اور لوگوں میں سے وہ (بھی) ہے کہ جس کی بات دنیا کی زندگی میں تجھے تعجب میں ڈالتی ہے اور وہ اللہ کو اس پر گواہ بناتا ہے جو اُس کے دل میں ہے اور وہ جھگڑا کرنے میں بہت سخت ہے۔[۲۶۳]

ع۲۶۱ سریع الحساب۔ سریع سرع سے ہے اور سُرعۃ ضد ہے بطاء کی یعنی ایک کام میں تاخیر یا دیر یا سستی نہ کرنا۔ اور سریع وہ ہے جو سستی یا تاخیر نہیں کرتا۔ انھم کانوا یسارعون فی الخیرات (الانبیاء ۲۱۔ ۹۰) یعنی نیکیوں کے کرنے میں تاخیر یا سستی نہ کرتے تھے۔ وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم (آل عمران ۳۔ ۱۳۲) اپنے رب کی مغفرت حاصل کرنے میں دیر نہ کرو۔ اور حساب کے معنی مشہور ہیں اور معاملات میں حساب کو حساب اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے وہ اندازہ معلوم ہوتا ہے جس میں کفایت ہے نہ اصل مقدار پر زیادتی ہے نہ کمی (ت) اسی لیے حسیب جو اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے اس کے معنی کافی ہیں اور یہ جو فرمایا کہ اللہ سریع الحساب ہے تو اس کا جلدی حساب لینا یہی ہے کہ جو فعل انسان کرتا ہے اس کا حساب ساتھ ساتھ ہی ہوتا جاتا ہے اور اس کو ایک کا حساب لینا دوسرے کے حساب لینے سے روکتا نہیں کہ ایک کے معاملہ میں تاخیر کرنی پڑے صرف یہ معنی نہیں کہ قیامت کے دن حساب لینے میں اسے بہت دیر نہ لگے گی، اسے دنیا میں بھی دیر نہیں لگتی۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ الٰہی محاسبہ ہر آن جاری ہے کوئی فعل نہیں مگر اس کا نتیجہ ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہاں قیامت کے دن وہ محاسبہ جو بوجہ اپنی لطافت کے یہاں نظر نہیں آتا کھلے طور پر محسوس ہونے لگے گا۔ اسی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہے لقد کنت فی غفلۃ من ھذا فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید (ق ۵۰۔ ۲۲) یعنی نتائج تو ساتھ ساتھ ہی ظاہر ہو رہے تھے مگر اے انسان تو ان کی طرف سے غافل تھا آج وہ غفلت کا پردہ ہم نے دور کر دیا اور تیری نظر تیز ہو گئی۔ ان نتائج کو اب تو دیکھ سکتا ہے۔ پس حساب تو ساتھ ساتھ ہو رہا ہے وہاں اس کا رنگ نیا ظاہر ہو گا جو کھلا محسوس ہو گا اور اسی کے مطابق ہے جو فرمایا وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ ونخرج لہ یوم القیامۃ کتابا یلقاہ منشورا (بنی اسرائیل ۱۷۔ ۱۳) یعنی ہر ایک انسان کے عمل کو ہم نے اس کے ساتھ لگا دیا ہے اور قیامت کے دن ایک کتاب ہم اس کے لیے نکال دیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔ گویا نتیجہ ہر عمل کا تو یہیں سے اس کے ساتھ لگا ہوا ہے ہاں قیامت میں وہ اس نتیجہ کو کھلا کھلا دیکھ لیگا۔ اسی لیے اس کے بعد فرمایا کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا (بنی اسرائیل ۱۷۔ ۱۴) یعنی آج کسی اور حساب کرنے والے کی ضرورت نہیں۔ تیرا اپنا نفس ہی تجھ پر حساب کے لیے کافی ہے۔

ع۲۶۲ یہ ایام تشریق کی طرف اشارہ ہے جو یوم النحر یعنی عید کے دن کے بعد تین دن ہیں۔ ہاں دو دن میں بھی کوئی چلا جائے تو ہرج نہیں۔

ع۲۶۳ یعجب۔ عجب اور تعجُّب اس حیرت کی حالت کا نام ہے جو انسان کو اس وقت پیش آتی ہے جب وہ کسی چیز کے سبب سے ناواقف ہو۔ اور اَعْجَبَ کے اصل معنی ہیں اسے تعجب میں ڈالا اور خوش کرنا بھی آتے ہیں (ت)

اَلَدّ اس جھگڑنے والے کو کہتے ہیں جو انکار میں نہایت سخت ہو جمع لُدّ ہے وتنذر بہ قوما لدا (مریم ۱۹۔ ۹۷) اور الد گویا شدید اللَدَد ہے۔ یعنی جس کی گردن کی دونوں طرفیں سخت ہوں یا اکڑی ہوئی۔ جس چیز کا ارادہ کر لیتا ہے اس سے پھرتا نہیں (غ)

خِصام مصدر بمعنی مخاصمۃ ہے یا خصم کی جمع۔ جھگڑا یا لڑائی کرنے والا۔

مفسرین کہتے ہیں اس میں شریق بن اخنس کا ذکر ہے مگر قرآن شریف کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ یہ ذکر عام ہے مفسدین کا ذکر ہے اب بھی بہتیرے ایسے مفسد ہیں۔ بہتیرے دل میں ایک قوم کی تباہی کو مدنظر رکھ کر ان کی جڑیں کاٹتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی یقین دلاتے جاتے ہیں کہ ہم تمہارے خیر خواہ ہیں اور یہ تجاویز تمہاری بہتری کے لیے ہیں۔ قرآن کریم کے عام الفاظ کو خاص خاص لوگوں پر محدود کرنا کلام الٰہی کی بیوقری کرنا ہے۔ اس مضمون کا تعلق پچھلے مضمون سے اس لحاظ سے ہے کہ پہلے ذکر جنگ کا تھا اور یہاں سمجھایا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ وہ باتیں تو چکنی چپڑی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو نسل انسانی کا بڑا ہمدرد ظاہر کرتے ہیں لیکن دل میں ظلم اور فساد ہوتا ہے گویا اسلام کے دشمنوں کا نقشہ کھینچا

وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

اور جب حاکم بنتا ہے تو ملک میں کوشش کرتا ہے کہ اس میں فساد ڈالے اور کھیتی اور نسل کو ہلاک کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا ۔[۲۶۴]

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

اور جب اسے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تو جھوٹی شیخی اسے گناہ میں لگا دیتی ہے سو اسکے لیے دوزخ بس ہے اور یقیناً وہ بُری جگہ ہے ۔[۲۶۵]

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اور لوگوں میں سے وہ (بھی) ہے جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو بیچ ڈالتا ہے اور اللہ بندوں پر بہت مہربان ہے ۔[۲۶۶]

ہے اور ایک یہ بھی تعلق ہے کہ ابھی حج کے احکام کا ذکر ہو رہا تھا اور حج میں رکاوٹ پیدا کرنے والے ایسے ہی لوگ تھے کہ اپنے آپ کو مصلح بھی بتاتے تھے۔ مگر فی الحقیقت فساد پھیلا رہے تھے۔

ع ۲۶۴ تولّٰی کے معنی ضحاک سے غلب وصار والیا مروی ہیں یعنی غالب آئے اور حاکم بنے معمولی معنی پھر جانا یہاں مراد نہیں۔

حَرْث - زمین میں بیج ڈالنے اور اس کو زراعت کے لیے تیار کرنے کو کہتے ہیں۔ اور جو چیز اس طرح ڈالی جائے یعنی کھیتی اس کو بھی حرث کہا جاتا ہے استعارۃً یہ لفظ عورت پر بھی استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ جس طرح دانہ کا بقا زمین سے ہے نوع انسان کا بقا عورت سے ہے۔ بعض لوگوں نے نسل کے قرینہ کی وجہ سے یہاں عورت مراد لی ہے اور امام صادق سے منقول ہے کہ حرث سے مراد دین اور نسل سے مراد لوگ ہیں۔ مگر ظاہر معنی زیادہ قرین قیاس ہیں۔

نسل کے اصل معنی انفصال عن الشئ کے ہیں یعنی کسی چیز سے علیحدہ ہو جانا، اسی سے تیزی سے نکل آنا بھی اس کے معنی ہیں وھم من کلّ حدب ینسلون (الانبیاء [۲۱] - ۹۶) اور نَسْل اولاد کو بھی کہتے ہیں اس لیے کہ وہ باپ سے نکلتی ہے (غ)

پچھلی آیت کے مضمون کو مکمل کیا ہے کہ باتیں کرنے والے تو بہت ہیں۔ اور بڑے بڑے اصول بھی نسل انسانی کی خیر خواہی کے قائم کرتے ہیں۔ لیکن جب حکومت ملتی ہے تو بجائے ہمدردی مخلوق کے خود اپنی یا اپنی قوم کی بہتری کے لیے زمین کو ویران کر دیتے اور نسل کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اسی کو فساد قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ حکومت کی اصل غرض زمین کو سرسبز و شاداب بنانا اور لوگوں کی بہی خواہی کرنا ہے۔ آج کل کی مہذب قومیں لفظوں میں بڑے بڑے لمبے چوڑے اصول باندھتی ہیں اور اپنے آپ کو نسل انسانی کا سچا بہی خواہ ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن جب موقعہ ملتا ہے تو دوسری قوموں کو ذلیل کرنے میں اور ان کو انسانیت کی صفات سے محروم کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتیں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے قرآن پر توجہ نہ کی اور حکومت کی اصل غرض کو نظر انداز کر کے اس حالت پر پہنچے کہ حکومت ان سے لے لی گئی۔ کیونکہ وہ نفس پرست بن گئے اور قوم کی بہتری ان کی اصلی غرض نہ رہی۔ بلکہ خود عیاشی کر لینے کو حکومت کی اصل غرض سمجھ لیا۔ اور آج بھی بہتیرے ایسے ہیں کہ قوم پرستی اور وطن پرستی کے بڑے بڑے جذبات کا اظہار کرتے ہیں لیکن کسی بلند مرتبہ پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں اور اپنی ہی قوم کی جڑیں کاٹنا شروع کر دیتے ہیں۔

ع ۲۶۵ عزۃ کے اصل معنی وہ حالت ہے جو انسان کو مغلوب ہونے سے بچانیوالی ہو۔ مگر کبھی اس کا استعمال مذموم حمیۃ اور انفۃ پر ہوتا ہے یعنی جھوٹی شیخی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا بغیر اس کے کہ بڑا ہو (غ) یہاں یہی معنی ہیں۔

مِہاد - مَہْد اور مِہاد وہ مکان ہے جو تیار کیا گیا ہے اور جس پر چلا جاتا ہے (غ) اور یا یہ دونوں مصدر ہیں (ت) اور مَہَد کے معنی ہیں تیار کیا۔

جھوٹی شیخی حصول کمال میں مانع ہے: یہاں تو کفار کا نقشہ کھینچا ہے اور یہ سچ ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے جو صحیح معنی میں تقوی اللہ ہے روکنے والی چیز جھوٹی شیخی اور انفۃ ہے۔ ناک رکھنے کے لیے بہت سی بیہودگیوں کا ارتکاب ہوتا ہے مگر آج کل اکثر مسلمانوں میں یہی جھوٹی شیخی پائی جاتی ہے ذلیل ہیں مگر اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھتے ہیں کہ گویا ان کے برابر عزت ہی کسی کی نہیں اور اسی جھوٹی شیخی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی بھی پروا نہیں کرتے۔ اخلاق انسانی کے کمال کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی بڑائی کے خیال کو دل سے نکال دے۔

ع ۲۶۶ صحابہ کا بلند مقام: پہلے مفسد گروہ کے مقابل پر یہ دوسرے گروہ کا ذکر ہے جو اللہ کی رضا کے حصول کو اپنا مقصد قرار دیکر اپنی ساری خواہشات کو اس ایک مقصد کے سامنے قربان کر دیتے ہیں ان کو بادشاہت بھی مل جائے تو ان میں اس سے کوئی شیخی اور بڑائی پیدا نہیں ہوتی بلکہ مخلوق الٰہی پر مہربانی کرنا یہ ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ اسی کی طرف واللہ رؤف بالعباد میں اشارہ ہے جب وہ اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے تو لازماً

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم سارے کے سارے فرمانبرداری میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، وہ تو تمھارا کھلا دشمن ہے ۲۶۷

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾

پھر اگر تم اس کے بعد جو تمھارے پاس کھلے دلائل آچکے پھسل جاؤ، تو جان لو کہ اللہ غالب حکمت والا ہے ۲۶۸

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ع ﴿۲۱۰﴾ ع ۲۵ ۹

وہ کسی بات کے منتظر نہیں مگر یہ کہ اللہ بادلوں کے سایوں میں اور فرشتے ان کے پاس آئیں اور معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے اور سب کام اللہ کی طرف ہی لوٹائے جاتے ہیں۔ ۲۶۹

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ

بنی اسرائیل سے پوچھ کہ کس قدر کھلے نشان ہم نے ان کو دیے اور جو اللہ کی نعمت کو بدل دے اس کے بعد کہ وہ اس کے پاس

ان کا شیوہ بھی مخلوق خدا پر مہربانی ہے اس آیت میں بھی کسی خاص آدمی کا ذکر نہیں ہاں صحابہ رضی اللہ عنہم کی حالت عامہ کا بیان کیا ہے جیسا دوسری جگہ فرمایا ان اللہ اشترٰی من المؤمنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ (التوبۃ ۹ - ۱۱۱) اور پھر یہ سند بھی اس گروہ کو عطا فرمائی رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ (المجادلۃ ۵۸ - ۲۲) پس یہی وہ گروہ ہے جس نے اللہ کی رضا کے حصول کے لیے اپنی ساری خواہشات کو قربان کر دیا۔

۲۶۷ سِلْم کے اصل معنی صلح بھی ہیں اور انقیاد و استسلام بھی آتے ہیں یعنی فرمانبرداری۔ صلح میں داخل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمھاری صلح ہو۔ اور اس کا مطلب بھی فرمانبرداری ہے۔

کافّۃ ۔ کفّ سے ہے جس کے معنے ہتھیلی ہیں اور روکنا بھی اس کے معنی آتے ہیں اس لیے کہ ہاتھ سے روکا جاتا ہے اور کافّ اور کافّۃ (جس میں تا مبالغہ کے لیے ہے) روکنے والے کے معنی میں ہے اور جماعت کو بھی کافّۃ کہا جاتا ہے یعنی سب کے سب (غ) اور ایک چیز کے کل کو بھی کافّۃ کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس کے اجزا کو پراگندہ ہونے سے روکنے والا ہے (ض)

اسلام میں کامل طور پر داخل ہونے کی ضرورت: ادخلوا فی السلم کافۃ سے مراد یہ ہے کہ کلّی طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ تمھارے ظاہر باطن سے کوئی چیز نہ ہو جو اسلام کے جوئے کے ماتحت نہ ہو یا یہ کہ پورے پورے فرمانبرداری میں داخل ہو جاؤ۔ کسی قسم کا نفاق تم میں باقی نہ رہے۔ یہاں سب ایمان لانے والوں کو، سب مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ اسلام کو اپنا مذہب کہتے ہو تو پھر اس میں پورے داخل ہو یہ نہیں کہ ایک حصّہ کو مان لیا اور ایک کو ترک کر دیا۔

۲۶۸ یعنی اگر تمھاری ذلت سے تم کو نقصان پہنچے تو یہ مت سمجھو کہ مسلمانوں کا خدا کمزور ہے ہاں تمھاری مصیبت بھی کسی حکمت پر مبنی ہے۔

۲۶۹ ھَلْ ۔ حرف استخبار ہے کبھی استفہام کے لیے آتا ہے، کبھی تنبیہ کے لیے یا نفی کے لیے یا دوسرے کو ملزم کرنے کے لیے (غ) یہاں نفی مراد ہے۔

ظلل ۔ ظلۃ کی جمع ہے اور ظلّۃ وہ بادل ہے جو سایہ کرے (ظِلّ سایہ کو کہتے ہیں) مگر اس کا اکثر استعمال ایسے موقعہ پر ہے جسے ناپسند کیا جاتا ہے چنانچہ قرآن شریف میں اس کا استعمال عذاب کے موقعہ پر ہی ہوا ہے عذاب یوم الظلّۃ (الشعراء ۲۶ - ۱۸۹) لھم من فوقھم ظلل من النار (الزمر ۳۹ - ۱۶) واذا غشیھم موج کالظلل (لقمان ۳۱ - ۳۲)

بادلوں کے سایے: اس آیت میں کلام کا رجوع پھر کفار کی طرف کیا ہے جو اسلام کی تباہی کے درپے تھے اور کہتے تھے کہ اگر اسلام سچا ہے تو ہم اس قدر مخالفت کے باوجود تباہ کیوں نہیں ہوتے۔ اور یہ بات کہ یہاں عذاب کا ذکر ہے خود لفظ ظلل کے استعمال سے ظاہر ہے۔ رہا یہ کہ اللہ کے آنے سے کیا مراد ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ہم قرآن کریم کے دوسرے مقامات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سورہ نحل میں ہے ھل ینظرون الّا ان تاتیھم الملٰئکۃ او یاتی امر ربّک کذٰلک فعل الذین من قبلھم (النحل ۱۶ - ۳۳) اس آیت کا مضمون آیت زیر بحث سے بہت ملتا ہے صرف یاتیھم اللہ فی ظلل من الغمام کی بجائے الفاظ یاتی امر ربک اختیار کیے ہیں اور یوں قرآن کریم نے اپنی تفسیر آپ کر دی ہے یعنی بادلوں کے سایوں میں آنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے امر کا آنا ہے۔ یعنی اس کی سزا جو وہ کفار پر وارد کرے (اور خود اس آیت میں قضی الامر کہہ کر بتا دیا ہے کہ مراد اللہ کے امر کا آنا ہے) اور ان الفاظ نے کہ کذٰلک فعل الذین من قبلھم اس کی اور بھی تشریح کر دی ہے۔ اسی طرح پہلے لوگوں نے کیا کیونکہ پہلے لوگ بھی حق کی مخالفت کر کے

مَا جَآءَتۡهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُیِّنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا وَ یَسۡخَرُوۡنَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۘ وَالَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا فَوۡقَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ وَاللّٰہُ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

آگئی تو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔[۲۷۰]

جو کافر ہیں ان کے لیے دنیا کی زندگی آراستہ کی گئی ہے اور وہ اُن سے ہنسی کرتے ہیں جو ایمان لائے اور جو تقوے کرتے ہیں۔ وہ قیامت کے دن ان سے اوپر ہونگے اور اللہ جسے چاہتا ہے بےحساب رزق دیتا ہے۔[۲۷۱]

عذاب استیصال مانگتے تھے۔ یہ مانگنا منہ سے ہو یا اپنے افعال سے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے آنے سے مراد اس کا خود آنا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ آنے جانے سے پاک ہے بلکہ اس کے آنے سے مراد اس کی اس سزا کا آنا ہے جس سے کفار کی کوششیں اسلام کے خلاف نیست و نابود ہو جائیں اور مسلمان مظفر و منصور ہوں جیسے کہ سورہ الحشر میں ہے فاتھم اللہ من حیث لم یحتسبوا (الحشر ۵۹-۲) اللہ ان کے پاس ایسی طرف سے آیا جدھر سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ حالانکہ وہاں ذکر سزائے استیصال کا ہے۔ جیسا کہ پہلے الفاظ سے ظاہر ہے ھو الذی اخرج الذین کفروا من اھل الکتٰب من دیارھم لاول الحشر ماظننتم ان یخرجوا وظنوا انھم مانعتھم حصونھم من اللہ فاتٰھم اللہ من حیث لم یحتسبوا پس یہود کے مدینہ سے نکالے جانے کو یعنی عذاب استیصال کو اور اسلام کے خلاف ان کی کوششوں کے نابود کر دینے کو اللہ کے آنے سے تعبیر کیا ہے اور یہی مراد یہاں ہے یعنی اللہ کے آنے سے مراد اس امر الٰہی کا آنا ہے جو ان کی مخالفت کا استیصال کلی کر دے اور ترکیب میں یا مضاف حذف ہے جیسا کہ اکثر کلام میں آیا ہے اور مراد یاتیھم امر اللہ ہے اور یا مفعول محذوف ہے اور مراد ہے یاتیھم اللہ بما وعدھم بہ یعنی اللہ ان پر وہ چیز لائے جس کا ان کے ساتھ وعدہ کیا ہے۔

ملائکہ کے آنے سے مراد بھی کفار پر عذاب کا آنا اور مومنوں کی نصرت ہی ہے۔ سورہ فرقان میں ہے یوم یرون الملائکۃ لابشرٰی یومئذ للمجرمین (الفرقان ۲۵-۲۲) یعنی فرشتوں کا آنا تو مجرموں کی سزا کے لیے ہی ہوا کرتا ہے اور قرآن کریم میں ان تینوں جنگوں میں جن میں قریش کا مقابلہ رسول اللہ صلعم سے ہوا ہے، ملائکہ کے آنے کا ذکر ہے جس میں یہی اشارہ ہے دیکھو ع۵۱۱ اور ملائکہ کے آنے کی غرض کیا تھی اس کے لیے دیکھو ع۵۱۲۔

پس ملائکہ کے آنے سے مراد کسی قدر ان کو سزا کا مل جانا یا ان کی تھوڑی مغلوبیت ہے اور اللہ کے آنے سے مراد ان کی مخالفت کا آخری استیصال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تینوں جنگوں میں یعنی بدر، اُحد، احزاب میں نزول ملائکہ کا ذکر ہے، جب دشمن مسلمانوں پر چڑھ کر آیا مگر فتح مکہ کو جس میں نبی کریم صلعم خود مکہ پر چڑھ کر گئے اور کفار کی مخالفت کا پورا استیصال کیا گویا اللہ کے آنے سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس میں اسلام کا کامل غلبہ دکھایا گیا اور کفر کی طاقت ملک عرب میں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی۔ ان باتوں کو جنگوں کے نام سے ظاہر نہیں کیا اس لیے کہ اگر اسلام کا غلبہ ایک وقت جنگ سے مقدر تھا تو دوسرے وقت دوسری راہوں سے ہو سکتا ہے اور امر اللہ میں دونوں باتیں آجاتی ہیں۔

وقضی الامر کے یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ معاملہ کا فیصلہ ہو جائے اور یوں بھی کہ وہ انتظار کرتے ہیں حالانکہ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو ہو چکا ہے اور یہ ہو کر رہے گا۔ دوسرے معنی زیادہ موزون ہیں اور اس میں گویا اسلام کے آخری غلبہ اور کفر کی مغلوبیت کی کھلی پیشگوئی ہے۔

ع۲۷۰ سَلۡ میں ہر ایک مخاطب مراد ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ضرور ہر شخص سوال کرے بلکہ خود بنی اسرائیل کو اور ضمناً سب کو جتانا مقصود ہے کہ وہ غور کریں کتنے نشان اُن کو دیئے گئے۔

اٰیۃ بیّنۃ۔ یہ کھلے نشان کیا تھے؟ اول وہ کھلی پیشگوئیاں جو آنحضرت صلعم کے ظہور کے متعلق ان کی کتابوں میں تھیں اور جو خود ان میں مشہور چلی آتی تھیں۔ دوسرے نبی کریم صلعم کی صداقت کے نشان جو وہ خود دیکھ سکتے تھے کیونکہ یہ اہل کتاب تھے اور سنت انبیاء سے واقف تھے۔

یبدل نعمۃ اللہ۔ اللہ کی نعمت اسلام ہے (ج) اس کی تبدیلی سے مراد اس کا انکار ہے۔ اس انکار کا نام تبدیلی اس لیے رکھا کہ بنی اسرائیل نے پہلے جس بات کو عقیدتاً قبول کیا ہوا تھا، یعنی نبی آخر زمان کا آنا اب اس کا سرے سے انکار کر دیا۔ آج مسلمانوں نے بھی اس اللہ کی نعمت کو تبدیل کر رکھا ہے منہ سے اقرار اور عمل سے انکار ہے۔

پچھلے رکوع کے آخر پر ذکر تھا کہ مخالف نشان استیصال مانگتے ہیں کہتے ہیں کہ اگر یہ رسول سچا ہے تو ہم جو اس کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، تباہ کیوں نہیں ہوتے۔ اس لیے اس رکوع کی ابتدا اس آیت سے کی کہ نشانات صداقت تو بہتیرے ظاہر ہو چکے ہیں ان کو کیوں قبول نہیں کرتے اور اپنی تباہی کیوں چاہتے ہیں۔

ع۲۷۱ زُیِّنَ۔ زان یا زین۔ ایک چیز کے حسن کو ظاہر یا نمایاں کرنے کو کہتے ہیں قول سے ہو یا فعل سے (غ) فعل کے مجہول لانے سے یہ ظاہر کرنا مراد ہے کہ ان

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

سب لوگ ایک ہی جماعت ہیں، پس اللہ نے نبیوں کو بھیجا خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے اور جنھیں وہ (کتاب) دی گئی تھی، انہی نے آپس کی ضد کی وجہ سے اس میں اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی دلیلیں آچکی تھیں پس اللہ نے اپنے حکم سے ان کو جو ایمان لائے اس حق کی طرف ہدایت دی جس میں لوگ اختلاف کرتے تھے اور اللہ جسے چاہتا ہی سیدھے رستہ کیطرف ہدایت کرتا ہے[۲۷۲]

لوگوں کو یہ چیز اچھی معلوم ہوتی ہے اور اسی کی طرف ان کے دل کھچے چلے جاتے ہیں۔ اس سے اوپر نہیں اُٹھتے۔ کون اچھی کرکے دکھاتا ہے؟ ان کی اپنی گری ہوئی خواہشات اور پست خیالات۔ قرآن کریم میں اچھی چیزوں کی زینت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے جیسے ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینۃ فی قلوبکم (الحجرات[۴۹]۔۷) اور بری باتوں کے زینت دینے کو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے وزیّن لھم الشیطان ما کانوا یعملون (الانعام[۶]۔۴۳) زیّن لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاءھم (الانعام[۶]۔۱۳۸)

یسخرون۔ سخر کے معنی کسی پر ہنسنا اور اس کو اپنے ماتحت کرلینا یا اپنے کام میں لگالینا دونوں آتے ہیں۔ کافروں کا مومنوں پر ہنسنا تحقیر کے رنگ میں تھا اس لیے کہ انہوں نے دین کی خاطر دنیوی عزّت۔ مال۔ جائداد یں سب کچھ چھوڑ دیا تھا جن کی نظر میں دنیا کا مال ومتاع ہی سب کچھ ہو وہ ایک قوم کو غربت کی حالت میں دیکھ کر کہاں ان کی عزت کر سکتے ہیں۔ اس لیے بھی ہنستے ہونگے کہ مومنوں کے ساتھ بڑی بڑی فتوحات کے وعدے تھے اور یہاں حالت دگرگوں نظر آتی تھی۔ آخری الفاظ میں پھر فرمایا کہ ہم اس قدر اموال وفتوحات سے ان کو متمتع کریں گے جس کو یہ حساب میں بھی نہیں لاسکیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ عرب جن کے ہاں ایک ہزار سے آگے گنتی نہ تھی۔ ان میں سے ایک ایک لاکھوں اور کروڑوں کا مالک ہوگیا۔

والذین اتقوا فوقھم یوم القیامۃ اس بڑے دن جب سب حقائق آشکارا ہوجائیں گے معلوم ہوگا کہ فوقیت مالِ دنیا سے نہیں بلکہ تقویٰ سے یعنی رعایت حقوق الٰہی وحقوق العباد سے ہے صحیح اصول پر چلنے سے ہے حق والنصاف کی پیروی کرنے سے ہے۔ قرآن شریف محض دنیا کی زندگی کو اور اس دنیا کی چیزوں کو بُرا نہیں کہتا۔ قل من حرّم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہٖ (الاعراف[۷]۔۳۲) زینت کے سامان جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بندوں کے لیے پیدا کیے ہیں ان کو کس نے حرام کیا۔ ہاں جب دنیا کی زندگی ہی غایت مقصد بنالی جاتی ہے اور خورد ونوش کو ہی زندگی کی اصل غرض سمجھ لیا جاتا ہے تو یہ وہ دنیا کی زندگی ہے جس کی مذمت کلام الٰہی کرتا ہے جن لوگوں کو دنیا کی زندگی یہاں تک پیاری معلوم ہوتی ہے کہ حق اور انصاف کی پیروی کرنے والوں پر وہ محض ان کی غربت کی وجہ سے ہنسنے لگتے ہیں وہ اصل مقصد زندگی سے بہت دور نکل گئے۔ اس لیے بتایا کہ حقیقی فوقیت اخلاق فاضلہ کے حاصل کرنے سے ہے۔ نہ مال دنیا سے آج عیسائی اقوام اسی غلطی میں پڑ کر مسلمانوں کے ہاتھ سے ہر قسم کے سامانِ دنیا کو چھیننے پر تلی ہوئی ہیں لیکن اگر مسلمان اخلاق قرآنی اپنے اندر پیدا کرلیں تو اس دنیا میں بھی اپنی فوقیت کا مشاہدہ کرلیں۔

۲۷۲ کان کا استعمال کئی طرح پر ہے۔ گزرے ہوئے زمانہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اوصاف کے بیان میں ازلیت پر دلالت کرتا ہے جیسے کان اللہ بکل شئ علیما اور جب کسی شے کی جنس میں اس کے وصف کے متعلق استعمال کیا جائے جو اس میں موجود ہو تو یہ ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ وہ وصف اس میں لازم ہے جیسے کان الانسان کفورا۔ کان الانسان اکثر شئ جدلا جن کے معنی یوں ہونگے انسان ناشکر گزار ہے۔ انسان اکثر جھگڑالو ہے (رغ) اسی طرح کنتم خیر اُمۃ میں حال کے معنی مراد ہیں یعنی تم بہترین امت ہو یہی معنی یہاں مراد ہیں۔

یحکم۔ حُکم کے اصل معنی ہیں اصلاح کے لیے روکنا اور کسی چیز پر حکم کے معنی یہ ہیں کہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ یہ چیز یوں ہے یوں نہیں۔ خواہ دوسرے پر ایسا فیصلہ لازم کیا جائے یا نہ (رغ)

انبیاء کی بعثت کا عام قانون: اس آیت کا مطلب بعض نے یوں بیان ہے کہ پہلے سب لوگ نیک تھے پھر ان میں اختلاف شروع ہوئے جن کے مٹانے کو نبی آئے اور بعض نے یوں کہ پہلے سب گمراہی پر جمع تھے تب اللہ تعالیٰ نے نبی بھیج کر نیکوں کو بدوں سے الگ کر دیا۔ مگر یہ دونوں باتیں قرآن شریف کے خلاف معلوم ہوتی ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے سلسلہ رشد وہدایت کا جو انبیاء کے ذریعہ سے قائم ہوتا ہے آدم کے ساتھ ہی شروع ہونا صاف الفاظ میں بیان فرمایا ہے

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٤﴾

کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تمہیں اُن لوگوں کی سی حالت پیش نہیں آئی جو تم سے پہلے گزر چکے، ان کو سختی اور دُکھ پہنچے اور خوب ہلائے گئے یہاں تک کہ رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بول اُٹھے کہ اللہ کی نصرت کب آئے گی سنو اللہ کی نصرت قریب ہے۔ ۲۷۳

کان کے وہ معنی لیکر جو اوپر بیان ہوئے اس آیت کے معنی بالکل صاف ہو جاتے ہیں۔ سب لوگ ایک ہی جماعت ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ان سے یکساں ہی معاملہ ہوتا رہا۔ یعنی ان سب میں اللہ تعالیٰ نبی بھیجتا رہا۔ یہ نہیں کہ بعض قوموں کو محروم رکھا اور ایک کو نبی بھیجنے کے لیے خاص کر لیا۔ جیسا کہ بنی اسرائیل سمجھتے تھے اور فرمایا کہ سب نبی ہی حق کے پیروؤں کو کامیابی کی بشارت دینے والے اور حق کے مخالفوں کو ناکامی اور دُکھ کے انجام سے ڈرانے والے تھے اور ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے کتاب بھی دی تھی تاکہ وہ اس کے ذریعہ لوگوں کے باہمی اختلافوں کا فیصلہ کرے۔ یا ان نبیوں کے آنے کے بعد پھر لوگوں نے باہم اختلاف کیا۔ اس اختلاف کے فیصلہ کے لیے محمد رسول اللہ صلعم کو مبعوث کیا گیا۔ اور آپ پر ایمان لانے والوں کو صحیح راہ کی ہدایت دی گئی اور ایک عظیم الشان حق کا قائم کرنا ان کے سپرد کیا گیا۔ اس مطلب کی صحیح حدیث سے بھی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ بخاری میں حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم جب رات کو اُٹھتے تو ان الفاظ میں دعا کرتے اللھم رب جبرئیل و میکائیل و اسرافیل فاطر السموات والارض عالم الغیب والشھادۃ انت تحکم بین عبادك فیما کانوا فیه یختلفون اھدنی لما اختلف فیه من الحق باذنك انك لتھدی من تشاء الی صراط مستقیم۔ اے اللہ جبرائیل اور میکائیل اور اسرافیل کے رب آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے ان دیکھے اور ظاہر کے جاننے والے تو ہی اپنے بندوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ تو مجھے اپنے اذن سے اس بارہ میں ہدایت فرما۔ جو حق کے متعلق اختلاف کیا گیا ہے بیشک تو جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت فرماتا ہے۔ آیت اور حدیث کے پچھلے حصہ کے الفاظ بہت ملتے جلتے ہیں اور اسی سے یہ پتہ لگتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گویا ان الفاظ قرآنی کا اپنے آپ کو اور اپنی اُمت کو مصداق قرار دے رہے ہیں۔ پس آیت کے معنی یوں ہوئے کہ نبی سب قوموں میں آتے رہے تا اختلاف کو دور کریں پھر ان کے پیروؤں نے اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلعم کو ان اختلافوں کے مٹانے کے لیے بھیجا اس لیے ان کی مخالفت تم کیوں کرتے ہو۔

ایک اور امر جس پر یہ آیت قطعی شہادت دیتی ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک نبی کو خوشخبری دینے والا بھی بنایا ڈرانے والا بھی اور ہر ایک نبی کے ساتھ کتاب بھی اتاری۔ پس بغیر کتاب کے کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ جس طرح بغیر بشارت و انذار کے نہیں ہو سکتا۔ اور انزل معھم یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ہر نبی کے ساتھ ایک کتاب نازل ہوتی ہے اور یہ بھی آیت فیصلہ کرتی ہے کہ ہر نبی صاحب حکم ہوتا ہے۔ یعنی تمام اختلافات میں وہ خود اپنی وحی سے جو اس کی کتاب کہلاتی ہے فیصلہ کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ اسی لیے دوسری جگہ فرمایا لیطاع باذن اللہ یعنی وہ مطاع ہوتا ہے مطیع نہیں ہوتا۔

۲۷۳ مثل کے معنی ن۳۰ میں بیان ہو چکے مگر کبھی مراد اس سے کسی چیز کا وصف ہوتا ہے (غ) یہی معنی یہاں مراد ہیں یعنی حالت۔

زلزلوا۔ زلزال کے اصل معنی سخت حرکت دینا ہیں اور مراد مصائب کا آنا ہے (ت) لسان العرب میں اصابت القوم زلزلۃ (لفظی معنی قوم پر زلزلہ آیا) کے معنی تخویف و تحذیر کا آنا لکھے ہیں اور تاج العروس میں زلازل کے معنی بلایا شدائد و اھوال لکھے ہیں۔ یعنی بلائیں مصیبتیں خوفناک حالات۔ حدیث میں ہے اللھم اھزم الاحزاب و زلزلھم جہاں زلزلھم کے معنی ابن اثیر نے کیے ہیں کہ ان کے امر کو گھبراہٹ اور پریشانی کی حالت میں اور ناقابل قیام کر دے خود قرآن کریم میں جنگ احزاب کے ذکر میں ہے ھنالك ابتلی المؤمنون و زلزلوا زلزالا شدیدا (الاحزاب ۳۳۔ ۱۱) پس زلزلہ سے مراد یہاں شدائد و تکالیف کا آنا ہی ہے بالخصوص وہ شدائد جو جنگوں میں پیش آتی ہیں۔

حق کے قیام میں مشکلات: جب یہ بتایا کہ کتنا بڑا کام تم مسلمانوں کے سپرد کیا گیا ہے کہ کل دنیا کے اختلافات کو دور کرو۔ تو یہ بھی بیان کر دیا کہ حق کا دنیا میں قائم کرنا کس قدر مشکل کام ہے اور کس قدر دکھوں کا سامنا ہے چھوٹے پیمانہ پر حق قائم کرنے کے لیے بھی کیا کیا مصائب اٹھانے پڑے تو اب اس عظیم الشان امر کے قیام کے لیے کن کن تکالیف کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ مصائب ہی کامیابی کی کنجی ہیں ان میں پڑنے کے بغیر انسان پختہ نہیں ہوتا تو جنت میں کس طرح جا سکتا ہے۔ سوال تھا جنت میں داخل ہونے کے متعلق اور جواب میں فرمایا کہ اللہ کی نصرت قریب ہے پس مومنوں کے لیے جب خدا کی نصرت آتی ہے اور ان کو کامیاب کر کے منزل مقصود پر پہنچاتی ہے تو وہ بھی ان کے لیے ایک جنت ہی ہے۔ اس آیت میں صاف اشارہ جنگوں کی طرف ہے۔

یہ بھی بتایا کہ اللہ کی نصرت اسی کا نام ہے جب اسباب سے مایوسی ہو جائے اور چاروں طرف ناکامی ہی ناکامی نظر آئے اور دشمن کا غلبہ بڑھتا چلا جائے یہاں تک کہ وہ مومن جو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں بول اُٹھتے ہیں کہ اللہ کی نصرت کب آئے گی۔ تب نصرت الٰہی آتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے کوئی ایسے سامان پیدا کر دیتا ہے کہ دنیا حیران رہ جاتی ہے اور جو بات اَن ہونی معلوم ہوتی تھی وہ ہو جاتی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ
مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا
مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ جو کچھ بھی اچھے مال سے خرچ کرو وہ ماں باپ اور قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے اور جو کچھ بھی تم نیکی کرو گے، تو اللہ اسے جانتا ہے۔[۲۷۴]

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَ
عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ
عَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ
ع ۲۶/۱ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ ع

تم پر جنگ کرنی لکھی گئی اور وہ تم کو ناگوار ہے اور ہو سکتا ہے کہ تمھیں ایک چیز ناگوار ہو حالانکہ وہ تمھارے لیے اچھی ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بُری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔[۲۷۵]

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ
قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ
اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ

تجھ سے حرمت والے مہینہ کی نسبت پوچھتے ہیں (یعنی) اس میں لڑائی کی نسبت، کہہ دے اس میں جنگ کرنی بہت بُری ہے، اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روکنا) اور اس کے لوگوں کا اس سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے

ع۲۷۴ خیر کے معنی مال کثیر ع۲۲۰ میں بیان ہو چکے۔ مگر خیر اس مال کو بھی کہتے ہیں جو محمود طریق پر جمع کیا گیا ہو (غ)
جب حق کی خاطر دُکھ تکلیفیں اُٹھانے کا ذکر کیا اور جنگوں کی طرف اشارہ کیا تو ساتھ ہی انفاق یعنی مال خرچ کرنے کی ضرورت بھی بتائی۔ اور پہلے حصۂ آیت میں مال خرچ کرنے کا ذکر کر کے اور دوسرے میں نیکی کرنے کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ اپنے قویٰ کو اچھے موقعہ پر لگانا بھی انفاق میں ہی داخل ہے۔ کیا خرچ کریں؟ اس کا جواب یہ دیا کہ جو کچھ بھی خرچ کرو وہ ماں باپ وغیرہ کے لیے ہی ہے۔ گویا فرمایا کہ جو کچھ خرچ کر سکتے ہو کرو۔ آخر یہ خرچ کرنا تمھارے اپنے لوگوں کی بھلائی کے لیے ہی ہے۔ یا تو یوں کہ انفاق کا پہلا مصرف والدین اور قریبیوں یتیموں وغیرہ کی خبرگیری ہی ہے اور یا یوں کہ تمھارے بہت سے قریبی اور بہت سے ضعیف لوگ تمھارے جہاد پر مال خرچ کرنے سے مصائب سے باہر نکل آئیں گے، کیونکہ جو مسلمان بھاگ آئے تھے ان کے عزیز و اقربا ابھی مکہ میں کافروں کے تسلّط میں ہی تھے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کر کے کہ "کیا خرچ کریں" کا کوئی جواب یہاں نہیں ماذا کے معنی کیف کیے ہیں یعنی کس طرح خرچ کریں۔ مگر جیسا کہ میں نے کہا ہے، جواب موجود ہے اور آیت ع۲۱۹ میں اسی کی وضاحت ہے۔ یا مکرر سوال کی یعنی ایک یہاں اور ایک آیت ع۲۱۹ میں۔ یہ غرض ہے کہ یہاں اقربا اور یتامیٰ پر خرچ کرنے کا ذکر ہے وہاں دشمن کے مقابل پر۔

ع۲۷۵ کرہ کے معنی مشقت ہیں۔ یا وہ مشقت جو انسان کو خارج سے نہیں بلکہ اپنی طرف سے ہی پہنچتی ہے۔ یعنی ایک چیز کا ناگوار خاطر ہونا اور کَرہ وہ مشقت ہے جو خارج کی طرف سے پہنچتی ہے (غ) اور کراہت کا استعمال دونوں معنی پر ہوتا ہے مگر کُرہ پر زیادہ ہے (غ)
مسلمان جنگ کو ناپسند کرتے تھے: لطیف اشارہ سے صراحت کی طرف انتقال کیا اور فرمایا کہ دشمنان دین اس قدر حق کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں کہ تم کو چار و ناچار حق کی حفاظت کے لیے جنگ کرنی پڑے گی۔ مگر وہ کیسی جنگ ہے؟ وہ تمھارے لیے مشقت ہے۔ وہ تم کو ناگوار ہے۔ تم اسے پسند نہیں کرتے۔ وجہ ظاہر ہے چاروں طرف پھیلے ہوئے دشمنوں کے ساتھ ایک مٹھی بھر مسلمان کیونکر جنگ کر سکتے تھے، پھر بے سروسامانی کمال کی اور بالمقابل قوم وہ جس کا پیشہ ہی جنگ کرنا چلا آیا ہے۔ پھر اصل غرض تو توحید الٰہی کا پھیلانا تھی یہ درمیان میں ایک نئی بات پیش آگئی اس لیے ناپسند تھی۔ اسلام پر یہ الزام دینے والے کہ لوٹ کی خاطر جنگ کی، غور کریں کہ قرآن شریف کیسے صاف الفاظ میں ان کی تردید کرتا ہے۔ لوٹ مار کرنے والوں کے لیے تو جنگ کا حکم خوشی کا موجب ہوتا نہ ایک امر ناگوار۔
موجودہ حالت اور جنگ: ساتھ ہی مسلمانوں کو سمجھایا کہ ایک وقت ایک چیز تم کو ناگوار ہوتی ہے اور تمھاری بھلائی اسی میں ہوتی ہے۔ ایک بات کو تم پسند کرتے ہو وہ آخر کار نقصان کا موجب ثابت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان دو فقروں میں یہ اشارہ ہو کہ اس وقت تم جنگ کو ناپسند کرتے ہو مگر تمھاری بھلائی جنگ کرنے میں ہے کیونکہ اس کے بغیر تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ ایک وقت آئے گا کہ تم جنگ کو پسند کرو گے اس وقت وہ تمھارے لیے نقصان کا موجب ہو گی یہ دوسری حالت آج مسلمانوں پر ہے واقعات یہی بتاتے ہیں کہ ہر جگہ جنگوں میں مسلمانوں کا قدم پیچھے ہٹا ہے۔

اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ
حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۗ
وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ
هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى

بھی بُرا ہے اور فتنہ قتل سے بڑھ کر بُرا ہے[276] اور وہ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے
رہیں گے یہاں تک کہ تمھیں تمھارے دین سے لوٹا دیں اگر انھیں طاقت
ہو[277] اور جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھرے پھر مر جائے[278] حالانکہ
وہ کافر ہی ہو، سو یہی ہیں جن کے عمل دنیا اور آخرت میں

---

۲۷۶ کبیر۔ اصل معنی صرف بڑا ہیں مگر بُرائی کے بڑا ہونے پر یہ لفظ خصوصیت سے بولا گیا ہے جیسے کبرت کلمۃ (الکھف ۱۸-۵) ہیں اسی لحاظ سے کبیرۃ بہت بڑے گناہ کو کہتے ہیں۔ (رغ)
صَدّ کے معنی دونوں آتے ہیں یعنی پھرنا اور رُک جانا یا دوسرے کو پھیرنا اور روک دینا۔
حرمت کے مہینوں میں جنگ اور کفار کی مسلمانوں پر زیادتی: پچھلی آیت میں جنگ کے مسلمانوں پر فرض کرنے کا ذکر کیا تو یہاں چار حرمت والے مہینوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ ان میں جنگ ممنوع ہے۔ اور جب یہ بتایا کہ اسلام اس حرمت کا پاس کرتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ کافر جن کی طرف سے یہاں سوال ہوتا ہے خود سب حرمت والی چیزوں کی بے حرمتی کر چکے ہیں اللہ کی راہ سے لوگوں کو رُکا، مسجد حرام سے روکا بلکہ آخر کار مسلمانوں کو مسجد حرام سے نکال دیا۔ حالانکہ مسجدِ حرام کی حدود میں ان کے ہاں امن کا دیا جانا ایک مسلّم امر تھا۔ پھر ان سب باتوں کو لفظ فتنۃ سے تعبیر کیا ہے جب فرمایا کہ فتنۃ قتل سے بُرا ہے اس سے فتنہ کے معنی پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ قرآن شریف میں کم سے کم چار اور موقعوں پر یہ لفظ صراحت سے ان دکھوں اور تکلیفوں پر استعمال ہُوا ہے جو مسلمانوں کو دین اسلام اختیار کرنے کی وجہ سے دی جاتی تھیں۔ سورہ عنکبوت ۲۹-۲ و ۱۰۔ النساء ۴-۱۰۱۔ البروج ۸۵-۱۰۔
کفار کا اعتراض عبد اللہ بن جحش کے ابن حضرمی کو قتل کرنے پر تھا۔ ہجرت کے دوسرے سال میں جب کفار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جنگ کے رنگ میں چھیڑ چھاڑ شروع ہو چکی تھی۔ نبی کریم صلعم نے عبد اللہ بن جحش کو چند آدمیوں کے ساتھ قریش کی خبر لانے کے لیے بھیجا تھا اور جو ہدایت ان کو دی تھی اس میں صاف اسی قدر ذکر تھا کہ ان کی خبر لاؤ۔ اتفاق سے ان لوگوں نے تین قریش کے آدمیوں کو دیکھا اور ان پر حملہ کیا ان میں سے ایک یعنی عبد اللہ ابن الحضرمی قتل ہوا دو قید ہوئے۔ یہ جمادی الثانی کا آخری دن تھا اور یہ امر مشتبہ رہا کہ آیا رجب کا چاند دیکھنے کے بعد انہوں نے حملہ کیا یا پہلے۔ مگر خود عبد اللہ بن جحش کا بیان ہے کہ ہم نے ابن حضرمی کے قتل کے بعد رجب کا چاند دیکھا۔ انا قتلنا ابن الحضرمی ثم مسینا فنظرنا الی ھلال رجب فلا ندری افی رجب اصبناہ ام فی جمادی پس اس واقعہ سے حرمت کے مہینوں میں جنگ کا جائز ہونا ثابت نہیں ہوتا اس لیے حرمت کے مہینوں میں حرمت قتال کا حکم قائم ہے اور منسوخ نہیں ہُوا۔ چنانچہ جب ہجرت کے چھٹے سال آنحضرت صلعم حج کی نیت سے نکلے تو ہتھیار ساتھ لیکر نہیں نکلے۔ ہاں جب کفار کی طرف سے تیاری دیکھی تو اس وقت مجبوراً تیاری کی۔ ایسا ہی ایک اور موقعہ پر بھی آپ سے ثابت ہے کہ حرمت کے مہینوں میں جنگ کو روک دیا۔
۲۷۷ یَرُدّوا۔ رَدّ کے معنی کسی چیز کا اپنی ذات میں پھیرنا یا ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا آتے ہیں (رغ)
استطاعوا۔ طوع سے ہے جس کے معنی انقیاد (یعنی فرمانبرداری) ہیں۔ اور استطاعت میں نیت اور تصور فعل اور مادہ قابلہ اور آلہ کا ہونا ضروری ہے (رغ) ان استطاعوا (اگر طاقت رکھتے ہوں) سے یہاں یہ مراد ہے کہ باقی چیزیں تو موجود ہیں اور وہ اپنا زور لگا رہے ہیں مگر مادہ قابلہ نہیں یعنی مسلمان اپنے دین کو کبھی چھوڑ نہیں سکتے۔ معلوم ہوا کہ کافر مسلمانوں کے ساتھ اس لیے جنگ کرتے تھے کہ ان کو دین اسلام سے پھیر دیں۔ پہلے تکلیفیں دیں، پھر گھروں سے نکالا آخر تلوار لے کر کھڑے ہو گئے کہ اس کے زور سے مسلمانوں کو دین سے پھیر دیں گے۔ کس قدر خلاف واقعہ اتہام ہے کہ مسلمان کافروں کو مسلمان بنانے کے لیے جنگ کرتے تھے جس قدر صبر مسلمانوں نے جنگ سے رُکنے میں دکھایا ہے اگر آج اس کا دسواں حصّہ بھی مہذب قوموں میں ہو تو دنیا میں امن اور آشتی پھیل جائے۔ مسلمانوں نے جنگ اس لیے کی کہ ان کو دین اسلام سے پھیرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ نہ اس لیے کہ وہ دوسروں کو ان کے دین سے پھیرنا چاہتے تھے۔
۲۷۸ یرتدد۔ اِرْتِدَاد کے اصل معنی ہیں اس طریق پر لوٹ جانا جس سے ایک شخص آیا تھا۔ جیسے فارتدّا علیٰ اٰثارھما قصصًا (الکھف ۱۸-۶۴) ہیں۔ اور اسلام سے کفر کی طرف لوٹ جانے اور اسلام کو چھوڑ کر کفر میں داخل ہونے پر بالخصوص یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اور رِدّۃ صرف اسی معنی کے لیے خاص ہے۔ (رغ)
ہر مرتد کا حکم قتل نہیں: یہاں مرتد کے حالت کفر پر مرنے کا ذکر ہے نہ اس کے قتل کرنے کا۔ سورہ مائدہ کی آیت ۵۴ میں بھی مرتد کا ذکر ہے مگر وہاں بھی اس کو قتل کرنے کا حکم نہیں نہ قرآن کریم میں کسی دوسری جگہ قتل مرتد کا حکم ہے۔ احادیث میں صرف ایک حدیث ہے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کے زمانہ میں جب بعض زنادیق کو جلایا گیا تو یہ فرمایا کہ ان کو قتل کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ نبی کریم صلعم نے فرمایا تھا من بدّل دینہ فاقتلوہ

الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

کام نہ آئے[۲۷۹] اور یہی آگ والے ہیں، وہ اسی میں رہیں گے۔

جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اسے قتل کردو۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ اس حدیث کے الفاظ میں جو عمومیت ہے وہ قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ اس کی رو سے کوئی شخص کوئی سا ایک دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرے اسے قتل کرنا چاہیئے۔ مثلاً یہودی عیسائی ہوجائے یا عیسائی مسلمان ہوجائے، تو واجب القتل ہوگا۔ مگر یہ بالبداہت باطل ہے اس لیے حدیث کے الفاظ کو مقید کرنا پڑے گا اور چونکہ اس کے راوی حضرت ابن عباسؓ ہیں جو سنِ شعور کو اس وقت پہنچے جب لڑائیاں شروع ہوچکی تھیں اس لیے ماننا پڑے گا کہ اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو اسلام کو چھوڑ کر ساتھ ہی مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار سے جاملتے تھے اور ان کا قتل ضروری تھا۔ چنانچہ اس قید کی تحدید اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ نے عورتوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ عورتیں جنگ میں حصّہ نہ لیتی تھیں اور نبی کریم صلعم نے اسی بنا پر ان کے قتل کرنے کی ممانعت کردی تھی اور عکل کی سزا والی حدیث سے بھی مرتد کے قتل کا حکم اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ ان لوگوں نے آنحضرت صلعم کے پاس اسلام کا اظہار کرکے بعد میں بیماری کا عذر کیا تو آپ نے ان کو وہاں باہر رہنے کی اجازت دی جہاں بیت المال کے اونٹ تھے تاکہ کھلی ہوا میں رہنے سے صحت ہو اور دودھ پئیں، مگر انہوں نے چرواہے کو قتل کیا اور اونٹ لے کر چلتے بنے۔ پس ان کی سزا اس قتل اور ڈاکہ کی وجہ سے تھی نہ ارتداد کی وجہ سے۔ علاوہ ازیں اگر مدینہ میں کسی مرتد کو واجب القتل قرار دیا گیا ہو تو اس وجہ سے کہ جو شخص اس وقت اسلام کو ترک کرتا وہ دشمن سے جاملتا جو اس وقت اسلام کی تباہی پر تُلا ہوا تھا۔ گویا مسلمان اس وقت میدانِ جنگ میں ایک فوج کی صورت میں پڑے تھے اور ایک حدیث میں صاف لفظ ہیں کہ صحابہؓ نے شکایت کی کہ ہم کو دن رات ہتھیار باندھ کر رہنا پڑتا ہے پس اس وقت ارتداد کے معنی دشمن کے ساتھ جا ملنا تھا اور جو شخص اپنی فوج کو چھوڑ کر دشمن کے ساتھ جا ملتا ہے وہ آج بھی واجب القتل ہی سمجھا جاتا ہے۔ صلح کے وقت واجب القتل قرار نہ دینا خود اس سے ظاہر ہے کہ صلح حدیبیہ میں آنحضرت صلعم نے یہ شرط قبول کی تھی کہ کوئی مسلمان کفار کے ساتھ جاملے تو وہ واپس نہیں کیا جائے۔ اگر قرآن میں مرتد کی سزا قتل ہوتی تو آپ اس کے خلاف شرط کبھی قبول نہ کرتے پس من بدل دینه فاقتلوہ بھی انہی واقعات سے مخصوص معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے معنی کی عمومیت کو کوئی شخص بھی قبول نہیں کرسکتا۔

ہر مرتد کا نکاح فسخ نہیں ہوتا: پس مرتد کے لیے سزائے قتل از روئے قرآن و حدیث صحیح نہیں اور جس طرح وہ صحیح نہیں اسی طرح وہ احکام جو فقہاء نے اس پر متفرع کیے ہیں وہ بھی آج ان حالات میں جب مسلمان غیر مسلم سلطنتوں کے ماتحت ہیں درست نہیں مثلاً یہ کہ مرتد کے سارے حقوق زائل ہوجاتے ہیں پھر اس پر یہ حکم متفرع کیا گیا کہ اس کا نکاح بھی باقی نہیں رہتا۔ اب انگریزی عدالتوں نے باقی فتویٰ کو تو حالات ملکی کے لحاظ سے قبول نہیں کیا۔ یعنی مرتد کے حقوق کو زائل نہیں کیا مگر نکاح فسخ ہوجانے کو اس فتویٰ کی بناء پر مان لیا ہے حالانکہ حالات ملکی کے لحاظ سے دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں یا سارا فتویٰ مانا جائے یا سارا چھوڑا جائے اور چونکہ پہلی صورت پر عمل نہیں ہوسکتا دوسری اختیار کرنی چاہیئے۔ مگر ہمارے علماء کی حالت بھی عجیب ہے، دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح محض طلاق حاصل کرنے کے لیے آئے دن مسلمان عورتیں عیسائی ہوجاتی ہیں اور خاموش ہیں کیونکہ فقہاء کا فتویٰ ایسا ہی ہے یہ نہیں سوچتے کہ فقہاء کا فتویٰ تو ہندوستان میں ناممکن العمل ہے پھر اس کے ایک جزو پر جس سے قوم کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے عمل کے کیا معنی ہوئے قرآن و حدیث میں کوئی حکم نہیں کہ مرتد کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے فقہاء کا فتویٰ ہی ہے لیکن اسکی اصل کو انگریزی عدالتیں قبول نہیں کرتیں یعنی مرتد کے حقوق کو زائل قرار نہیں دیتیں، پھر اسی کی فرع کو کہ نکاح ٹوٹ جاتا ہے قبول کرنا محض مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ کیا علماء کا یہ فرض نہیں کہ جب اصل کو قابل قبول نہیں سمجھا گیا تو فرع پر عمل کے خلاف آواز بلند کریں۔ عامہ حالات میں ظاہر ہے کہ اگر عورت عیسائی ہوجائے تو نکاح نہیں ٹوٹتا کیونکہ عیسائی عورت کا نکاح مسلمان مرد سے جائز ہے لیکن مرد عیسائی ہوجائے تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ مسلمان عورت کا نکاح عیسائی مرد سے جائز نہیں۔

ع ۲۷۹ حبطت۔ حَبْط کے اصل معنی ہیں کہ جانور بہت سا کھالے یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھول جائے (رغ) گویا اس کا کھایا ہوا کام نہ آیا۔ پس حبطِ عمل سے مراد عمل کا بےنتیجہ رہنا یا کام نہ آنا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں حبط عمل تین طرح پر ہے۔ اول یہ کہ دنیوی کام ہوں تو یہ آخرت میں کام نہ آئیں گے انسان تجارت کرتا ہے صنعتیں بناتا ہے تاکہ روپیہ کمائے اس کی مثال دی ہے وقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلنٰه هباء منثورا (الفرقان ۲۵-۲۳) اس کی دوسری مثال عیسائی اقوام کی حالت ہے جو قرآن شریف نے بیان کی ہے الذین ضلّ سعیهم فی الحیوٰة الدنیا وهم یحسبون انهم یحسنون صنعا اور اس کے آگے آتا ہے فحبطت اعمالهم (الکهف ۱۸-۱۰۴ و ۱۰۵) جہاں خود ضلّ سعیهم کہہ کر بتا دیا کہ ان کی کاریگریاں دنیا تک محدود ہیں دنیا میں کام آگئیں آخرت میں ان کا نتیجہ کچھ نہیں۔ کیونکہ تکمیل نفس انسانی سے ان کو کچھ تعلق نہیں۔ دوسری صورت حبط عمل کی امام راغب نے یہ بیان کی ہے کہ عمل تو آخرت کے ہوں لیکن ان کے کرنے والے کی نیت ان میں اللہ تعالیٰ کی رضا نہ ہو جیسا حدیث میں ہے کہ ایک شخص کو کہا جائے گا کہ تو قرآن اس لیے پڑھتا تھا کہ لوگ تجھے قاری کہیں سو انہوں نے کہا اب یہ تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اعمال بھی صالح ہوں نیت بھی ٹھیک ہو لیکن ان کے مقابل پر بُرے کام بڑھے ہوئے ہوں (رغ) تو اس صورت میں اعمالِ صالح کی بوجہ ان کے ناکافی ہونے کے غرض پوری نہ ہوئی جس طرح پانی کے ایک قطرہ سے پیاس نہیں بجھ سکتی۔ ان کے علاوہ حبط عمل کی دو اور صورتیں ہیں۔ ایک وہ حبطِ عمل جو انبیاء کے مخالفین کے لیے خاص ہے۔ کیونکہ انبیاء دنیا میں حق پھیلانے کے لیے آتے ہیں ان کے مخالف اس کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں ان کی کوششیں رائیگاں جاتی ہیں کیونکہ ضرور ہے کہ حق آخرکار دنیا میں غالب آئے۔ جیسا سورۃ آل عمران ۲۱ میں نبیوں اور نیک لوگوں کے قتل کرنے والوں کا ذکر

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَ
جٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ یَرۡجُوۡنَ
رَحۡمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۱۸﴾
یَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَ الۡمَیۡسِرِ ؕ قُلۡ

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور
اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار
ہیں اور اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے [280]
تجھ سے شراب اور جُوئے کے متعلق پوچھتے ہیں[281]، کہہ

کر کے فرمایا اولٰئك الذین حبطت اعمالھم فی الدنیا والاخرۃ۔ دوسری صورت وہ ہے جس کا ذکر یہاں ہے مسلمان تھا اچھے عمل کرتا تھا پھر کافر ہو گیا بدی کی راہ اختیار کر لی۔ پہلی نیکیاں بھی ضائع ہوئیں کیونکہ زندگی کا رُخ ہی پلٹ گیا۔

ع[280] ھاجروا۔ ھَجْر اور ھِجْران انسان کا دوسرے سے الگ ہو جانا ہے جسم سے ہو یا زبان سے یا دل سے (غ) اور مھاجرۃ: ایک دوسرے سے قطع تعلق کر لینا ہے اور ظاہر معنی اس کے دارالکفر سے دارالایمان کی طرف خروج ہے (غ) جیسے آنحضرت صلعم اور صحابہؓ کا مکّہ کو چھوڑ کر مدینہ میں آجانا۔ کیونکہ گو کافر تو دونوں جگہ موجود تھے مگر مکّہ دارالکفر اس لیے ہوا کہ وہاں مسلمانوں کو دُکھ دیا جاتا تھا۔ اور امام راغب کہتے ہیں کہ ظاہری ہجرت کا اقتضائے اصلی یہی ہے کہ شہوات اور بُرے اخلاق اور خطاؤں کو چھوڑا جائے یہ وہ ہجرت باطنی ہے جس کی طرف حدیث میں اشارہ ہے المھاجر من ھاجر مانھی اللہ عنہ مہاجر وہ ہے جو ان باتوں سے الگ ہو گیا جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔

جاھدوا۔ جَھد اور جُھد طاقت اور مشقت کو کہتے ہیں اور جہاد اور مجاھدہ کے معنی ہیں دشمن کی مدافعت میں وسعت و طاقت کا لگا دینا اور خرچ کر دینا (غ) امام راغب کہتے ہیں جہاد تین قسم ہے: ظاہری دشمن سے جہاد، شیطان سے جہاد، نفس سے جہاد، اور جاھدوا فی اللہ حقّ جہادہٖ (الحج ۲۲-۷۸) میں وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ (التوبۃ ۹-۴۱) میں، اور یہاں تینوں قسم کا جہاد شامل ہے اور آنحضرت صلعم کا ارشاد نقل کیا ہے جاھدوا اھواءکم کما تجاھدون اعداءکم اپنی خواہشات سے جہاد کرو جس طرح اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو اور لفظ ھجر کی بحث میں ایک حدیث نقل کی ہے رجعتم من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے ہو۔ جہاں چھوٹے جہاد سے مراد دشمن کی جنگ اور بڑے جہاد سے مراد مجاہدہ نفس ہے ایسا ہی قرآن کریم میں ہے وجاھدھم بہٖ جہادا کبیرا (الفرقان ۲۵-۵۲) اس قرآن کے ذریعہ سے ان کفار کے ساتھ جہاد کبیر کرو۔ ایسا ہی منافقوں سے جہاد کا حکم ہے حالانکہ کوئی جنگ منافقوں سے نہیں ہوئی۔

مقدم کونسی ہجرت اور جہاد ہیں: یہ آیت بتاتی ہے کہ نرا ایمان کافی نہیں۔ خدا کی رحمت کے امیدوار وہ لوگ ہیں جو ایمان کے ساتھ بدیوں کو ترک کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا سارا زور لگا دیتے ہیں۔ یہ ہجرت اور جہاد ہمیشہ ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ دارالکفر سے خروج یا دشمن سے جنگ کبھی کبھی پیش آنے والی باتیں ہیں اور جب اللہ کی رحمت کی ہر وقت ضرورت ہے تو یہاں مراد بھی یہی ہجرت اور جہاد ہیں۔ اسی ہجرت اور جہاد کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمان اپنی اصلاح اور دین اسلام کی اشاعت کی طرف سے غافل ہو رہے ہیں اور تلوار اُٹھانے یا وطن چھوڑ جانے پر ہی سارا زور ہے۔ مسلمانوں کی زندگی اگر باقی رہ سکتی ہے تو اسی ہجرت اور جہاد کو اختیار کر کے۔ صحابہؓ نے بھی پہلے اس کو اختیار کیا تب ہجرت ظاہری اور جہاد سیف کی اجازت ان کو ملی۔ مؤخر کو مقدم کر کے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

ع[281] الخمر۔ خَمْر کے اصل معنی کسی چیز کا ڈھانک دینا ہے اسی لیے خِمار اوڑھنی کو کہتے ہیں جس کی جمع خُمُر قرآن شریف میں آتی ہے ولیضربن بخمرھن (النور ۲۴-۳۱) اور خَمر شراب کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ عقل کی جائے قرار پر پردہ ڈال دیتی ہے (غ) یعنی انسان عقل سے کام لینے کے قابل نہیں رہتا۔ پھر مفردات میں ہی ہے کہ بعض کے نزدیک خمر ہر ایک نشہ دینے والی چیز کا نام ہے اور بعض کے نزدیک صرف انگور اور کھجور کی شراب کا نام ہے اور یہ قیاس اس سے کیا گیا ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ خمر ان دو درختوں سے ہے یعنی کھجور اور انگور سے۔ مگر ظاہر ہے کہ ارشاد نبویؐ الخمر من ھاتین الشجرتین میں حصر مراد نہیں صرف دو زیادہ مروج قسموں کا نام لے دیا ہے۔ تاج العروس میں الخمر ما اسکر یعنی خمر وہ ہے جس سے نشہ ہو اصل قرار دے کر اس کے معنی پر اختلاف کا ذکر کیا ہے یعنی حضرت امام ابوحنیفہ کا قول کہ خمر صرف انگور سے ہے اور جمہور کا قول ہے کہ جس سے نشہ ہو وہ خمر ہے اور جمہور کے قول کو صحیح کہا ہے اور اس پر ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ شراب مدینہ میں حرام ہوئی حالانکہ وہاں انگور کی شراب قطعاً نہ ہوتی تھی صرف بُسر اور تَمر کی ہوتی تھی۔ یعنی تازہ اور خشک کھجور کی اور اسی کے مطابق حضرت عمرؓ کا قول بخاری سے نقل کیا ہے۔ پس خمر کے اصل معنی ہر ایک نشہ دینے والی چیز ہیں۔

المیسر۔ میسر مصدر ہے جس کے معنی جُوا ہیں یا اس لیے کہ یُسر کے معنی سہولت ہیں اور جوئے میں مال آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے اور یا اس لیے کہ یسر کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہیں اور میسر ان کے ہاں یہ تھا کہ اونٹ ذبح کیا جاتا اور اس کے ۱۸ یا ۱۰ حصّے کیے جاتے اور دس تیر ہوتے جن میں سے سات کے حصّے ایک سے لیکر سات تک ہوتے اور تین خالی ہوتے پھر جس شخص کیلئے جو تیر نکلتا اس کے مطابق اس کا حصّہ قرار پاتا۔ یہ بعینہٖ آج کل کی لاٹری ہے۔ میسر کے لفظ میں لاٹری اور ہر قسم کا جُوا داخل ہے۔

خمر و میسر کا آپس میں کیا تعلق ہے اور مضمون جنگ سے جو شروع ہے کیا تعلق ہے؟ خمر عقل کو تباہ کرنے والی چیز ہے میسر مال کو تباہ کرنے والی

فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَٰفِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ۗ وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۵

ان دونوں میں بڑی برائی ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں اور ان کی برائی ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے ۲۸۱ ؎ اور تجھ

چیز اور دونوں عداوت اور فساد پیدا کرنے والی چیزیں ہیں اس لیے دونوں کا اکٹھا ذکر کیا۔ اور جنگ سے یہ تعلق ہے کہ فی الحقیقت تو جنگ کے لیے عقل اور مال دونوں کی حفاظت بکار ہے مگر عموماً جنگوں میں بکثرت شراب پی اور پلائی جاتی ہے تاکہ سپاہی اندھے ہو کر لڑیں، مگر شراب سے جو وقتی جرأت پیدا ہوتی ہے وہ حقیقی جوہر شجاعت کو تباہ کرنے والی چیز ہے اس لیے شراب سے روکا اور عرب کے لوگ اخراجات جنگ کا روپیہ جمع کرنے کے لیے اکثر جوا کھیلتے تھے جیسے آج بھی لاٹری کا رواج ہے اسی لیے جوئے کی ممانعت کے بعد فوراً یہ سوال ہے کہ پھر کیا خرچ کریں۔

۲۸۱ ؎ شراب اور جوا مہذب قوموں کی اور بالخصوص عیسائی اقوام کی دو خطرناک بیماریاں ہیں اور ان کا علاج سوائے اسلام کے اور کسی مذہب نے نہیں کیا۔ بعض بدیاں ایسی موٹی ہیں کہ ان کے بد نتائج تک سب کی نظر پہنچ جاتی ہے اور بعض کے بد نتائج چونکہ ایک مدت کے بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لیے ہر ایک کی نظر ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ شراب مؤخر الذکر بدیوں میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکیلے کامل مذہب نے ہی شراب کے بد نتائج کو دیکھ کر اس سے روکا۔ یہودیوں میں شراب کی حرمت قطعی نہ تھی، بعض اوقات اس کی تعریف بھی کر دی ہے۔ دیکھو قاضیون ۹: ۱۳۔ ۲۔ سموئیل ۱۶: ۲۔ امثال ۳۱: ۶ حکمائے یہود نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جہاں شراب نہ ہو وہاں دوائیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہندوؤں میں بھی شراب کا استعمال کتب مقدسہ کی بنا پر جائز مانا گیا ہے۔ یجروید میں جو چیزیں دیوتاؤں کو پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک شراب بھی ہے۔ منوسمرتی میں ہے کہ "مانس اور شراب ان دونوں کے کھانے میں کچھ دوش نہیں۔" منوسمرتی سے ہی یہ ثابت ہے کہ بعض مذہبی تیوہاروں میں شراب پینے میں کچھ دوش نہیں۔ عیسائیت نے تو حد ہی کر دی کہ مذہب کی بنیاد ہی شراب پر گویا رکھ دی۔ انجیل یوحنا ۲: ۱-۱۱ میں حضرت مسیح کا سب سے پہلا معجزہ ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شادی میں جب شراب کچھ کم ہو گئی اور لوگ پورے بدمست نہ ہوئے تو حضرت مسیحؑ نے پانی کے مٹکوں کو شراب میں تبدیل کر کے اس کمی کو پورا کیا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ اس معجزہ میں عیسائی مذہب کی آئندہ تاریخ کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ قوم پانی کی جگہ شراب ہی پیئے گی، مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی شخص عیسائی رہ نہیں سکتا جب تک سال بھر میں ایک دفعہ شراب نہ پیئے۔ کیونکہ عید فسح میں شراب جزو لازم ہے بلکہ اسی شراب کے گھونٹ کو مسیح کے خون کا قائمقام قرار دے کر اتحاد عیسائیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ گویا عیسائیت کا اجتماع روٹی کے ٹکڑے اور شراب کے پیالہ پر ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ عیسائیت کو چھوڑ کر سب مذاہب میں نیک اور راستباز لوگ شراب سے مجتنب رہے ہیں۔ گو وہ دوسروں کو اس سے نہ روک سکے ہوں۔ اور یہودیوں میں تو دو فرقے ایسے تھے جو شراب نہ پیتے تھے مگر شراب کے خطرناک دیو کو ہلاک کرنے کے لیے اسی عظیم الشان قوت قدسی کی ضرورت تھی جو محمد رسول اللہ صلعم کے سوائے اور کسی کو نہیں دی گئی۔ اور آپ کی یہ قوت قدسی اس کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ چیز جس کی خطرناک گرفت سے ایک انسان کا بچانا بھی مشکل ترین کام ہے اس سے آپ نے آناً فاناً ایک قوم کی قوم اور ملک کے ملک کو ایسا پاک کر دیا کہ شراب تو کیا وہ برتن بھی باقی نہ رہے جن میں شراب بنائی جاتی تھی۔ حالانکہ آپ کے ظہور کے وقت عرب کے ملک میں اس قدر کثرت سے شراب پی جاتی تھی کہ اس کی نظیر سوائے موجودہ زمانہ کے یورپ کے اور کہیں نہیں ملتی۔ ادھر حرمت شراب کے حکم کا نازل ہونا تھا ادھر شراب مدینہ کی گلیوں میں بارش کے پانی کی طرح بہ رہی تھی۔ لوگ خارق عادت امور میں معجزات تلاش کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کون سا اعجاز ہو گا جس نے آن کی آن میں نسل انسانی کو اس خبیث چیز سے آزاد کر دیا۔ آج امریکہ بھی تیرہ سو سال بعد رسول اللہ صلعم کے اس فعل کی نقل کرنے لگا ہے مگر کہاں نبی کی قوت قدسی جو فوراً قوم کو پاک صاف کر دیتی ہے کہاں دنیاداروں کے ریزولیوشن جن سے بچنے کے لیے طرح طرح کے حیلے ابھی سے نکالے جا رہے ہیں۔

حرمت شراب کی تدریج میں حکمت: ہاں یہ بھی سچ ہے کہ اسلام نے جو فطرت انسانی کو پہچانتا ہے حرمت شراب کا حکم تدریجاً پہنچایا حالانکہ اور کسی بدی کی بیخکنی میں تدریج روا نہیں رکھی۔ چنانچہ اول یہ سمجھایا کہ اس میں کچھ فوائد تو ضرور ہیں جن کی وجہ سے دنیا آج تک اس میں مبتلا رہی مگر اس کا نقصان نفع سے بہت بڑھ کر ہے اور پھر فرمایا کہ نشہ کی حالت میں نماز میں مت آؤ لا تقربوا الصلوٰۃ و انتم سکاریٰ (النساء ۴: ۴۳) یعنی شراب نوشی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور بالآخر قطعی حکم حرمت سورہ مائدہ میں نازل فرمایا اس کو رجس (پلیدی) قرار دیا اس کو شیطان کا کام کہا۔ فاجتنبوا (اس سے بچو) کا حکم دیا اور آخر میں فھل انتم منتھون میں تاکید کے ساتھ زجر فرمایا۔ پس اس تدریجی مگر قطعی حکم حرمت شراب میں بھی ایک حکمت تھی۔

شراب تھوڑی اور بہت یکساں حرام ہے: یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ گو خمر کی حرمت اسی وجہ سے ہے کہ اس سے نشہ پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح دیگر نشہ پیدا کرنے والی اشیاء بھی اس حرمت کے اندر آ جاتی ہیں مگر یہ حرمت عام ہے یعنی یہ مطلب نہیں کہ تھوڑی شراب جس سے نشہ نہ ہو پی لینا جائز ہے۔ خصوصیت وجہ سے عمومیت حکم پر اثر نہیں پڑتا اور حدیث میں صاف ہے حرمت الخمر بعینھا قلیلھا و کثیرھا یعنی شراب فی ذاتہ حرام ہے تھوڑی ہو یا بہت اور یہ بھی ہے ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام جس چیز کی زیادہ مقدار سے نشہ ہو جائے یعنی انسان بدمست ہو جائے وہ تھوڑی بھی حرام ہے۔ اسی طرح خاص قسم کی شرابوں کا جواز نکالنا حکم قرآنی کا ابطال ہے۔ ہاں البتہ دوائی کے طور پر شراب کا استعمال ناجائز نہیں کہلا سکتا اس لیے کہ دوائی کے طور پر تھوڑی مقدار میں زہر بھی دی جا سکتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حرام سے دوا نہ کرو۔ مگر حالت اضطرار میں سؤر بھی جائز ہے اس لیے حالت اضطرار اس سے مستثنیٰ ہے۔

قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ — سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ جو کچھ (حاجت سے) بڑھ رہے ۲۸۲

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ — اسی طرح اللہ تمہارے لیے کھول کر باتیں بیان کرتا ہے تاکہ تم فکر کرو۔

فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ — دنیا اور آخرت میں۔ اور تجھ سے یتیموں کی نسبت پوچھتے ہیں کہہ ان کی

قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ — اصلاح کرنا اچھا ہے اور اگر تم ان سے میل جول کرو تو تمہارے بھائی ہیں

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ — اور اللہ بگاڑنے والے کو اصلاح کرنے والے سے (الگ) پہچانتا ہے اور اگر

اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ — اللہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈالتا۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔ ۲۸۳

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ — اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں اور یقیناً

مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ — ایک مومن لونڈی ایک مشرک (بی بی) سے بہتر ہے گو وہ تمہیں اچھی لگتی ہو

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ — اور مشرکوں کو (عورتیں) نکاح میں نہ دو یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں اور یقیناً

مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ — ایک مومن غلام مشرک (آزاد) سے بہتر ہے گو وہ تمہیں اچھا لگے۔ یہ آگ

ع۲۸۲ العفو۔ عفو کے اصل معنی ہیں کسی چیز کے لینے کا قصد اور اس لیے جس چیز کا قصد آسان ہو اس پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے۔ یہاں عفو کے معنی امام راغب نے مَا یَسْہُل اِنْفَاقُہٗ کیے ہیں یعنی وہ چیز جس کا خرچ کرنا سہل ہو اور ابن عمرؓ اور اکثر مفسرین تابعین نے اس کے معنی کیے ہیں وہ مال جو تمہارے اہل کی حاجت سے زیادہ ہو۔ اور ابن کثیر میں ہے کہ بعض نے اس کے معنی افضل اور طیّب مال کیے ہیں اور جُوئے کی ناپاک کمائی کے مقابل پر یہ معنی نہایت موزوں ہیں۔ اور حاجت سے بڑھا ہُوا مال بھی صحیح معنی ہیں جن کی تائید میں صحیح مسلم کی ایک حدیث بھی ہے کہ جب ایک شخص نے ایک دینار کا ذکر کیا تو آنحضرت صلعم نے فرمایا اپنے نفس پر خرچ کرو اور دوسرے کا ذکر کیا تو فرمایا اپنے اہل پر خرچ کرو۔ اور تیسرے کا ذکر کیا تو فرمایا اپنی اولاد پر خرچ کرو۔ اسلام کی تعلیم عملی رنگ میں ہے۔ ضروریات انسانی کو وہ نظر انداز نہیں کرتا۔ ہاں بقدر حاجت اپنے نفس اور اہل اور اولاد اور اقارب پر خرچ کر کے اگر باقی کو خدا کی راہ میں خرچ کیا جائے تو وہ بھی بہت بڑی بات ہے مسلمان اس پر عامل ہوں تو آج کروڑوں نہیں اربوں روپیہ ان کے قبضہ میں ہو سکتا ہے جو ضروریات دینی پر وہ خرچ کر سکتے ہیں۔

ع۲۸۳ تخالطوھم۔ خَلط سے ہے جس کے معنی دو یا زیادہ چیزوں کے اجزا کو باہم ملا دینا ہیں اور دوست اور شریک اور ہمسایہ کو خَلیط کہتے ہیں (غ) پس مخالطت سے مراد شرکت یا باہم مل جل کر رہنا ہے۔

اخوان۔ اَخ کی جمع ہے وہ جو ولادت میں ماں یا باپ یا دونوں کی طرف سے شریک ہو مگر استعارۃً قبیلہ یا دین یا صنعت یا معاملہ یا محبت کے شریک پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ)

اعنتکم۔ معانتۃ اور مُعاندَۃ ایک ہی ہیں۔ مگر معانتۃ زیادہ شدت کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ وہ ایسی معاندۃ ہے جس میں خوف اور ہلاکت ہو اور عَنَت کسی ایسے امر میں مبتلا ہونے کا نام ہے جس میں ضائع ہو جانے کا خطرہ ہو (غ) اور عنت مشقت، فساد، ہلاکت، گناہ، غلطی، خطا۔ زنا سب پر بولا جاتا ہے (ن) ذٰلک لمن خشی العنت منکم (النساء ۴۔ ۲۵) ودّوا ما عنتم (آل عمران ۳۔ ۱۱۷) عزیز علیہ ما عنتم (التوبۃ ۔ ۱۲۸) اور عنت الوجوہ للحی القیوم (طٰہٰ ۲۰۔ ۱۱۱) میں عنت بمعنی ذلّت وخضعت ہے (غ) یعنی ذلیل ہو گئے۔ یعلم المفسد من المصلح۔ چونکہ علم کے معنی میں تمیز یا دو چیزوں کا الگ الگ کرنا بھی داخل ہے اس لیے اس کا صلہ مِنْ بھی آتا ہے اور ایسے موقعہ پر عموماً معنی تمیز کرنے کے ہوتے ہیں۔

یتیموں سے مخالطت یہ ہے کہ ان کو کھانے پینے میں رہنے میں تجارت میں شریک کر لیا جائے۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ دوسری طرف یتیم کے مال کی حفاظت کی سخت تاکید تھی۔ چونکہ یتامٰی کے بالکل علیحدہ رکھنے میں بھی نقصان تھا اور یتیم کے ولی کے لیے بھی سخت مشکلات ہوتیں اس لیے مخالطت کی اجازت دی۔ کھانے پینے اور معمولی میل جول کی تجارت کی شراکت سے بھی بڑھ کر ضرورت ہے تاکہ ان کے اندر اعلیٰ اخلاق پیدا ہوں۔ ابو مسلم کے نزدیک مخالطت سے مراد مصاہرت ہے یعنی وہ تعلقات جو نکاح کے ذریعہ قائم ہوتے ہیں۔ آج کل جو اسلامی انجمنیں کچھ یتامٰی کی خبر گیری اپنے ذمہ لیتی ہیں تو ان کو ایسی صورت میں رکھا جاتا ہے کہ دوسرے کے ساتھ ان کا میل جول بہت کم ہوتا ہے اور ایسا رنگ اختیار کیا جاتا ہے جس سے ان کو اپنے یتیم ہونے کا احساس تازہ ہوتا رہتا ہے اور اس کا اثر آخر کار اخلاق پر بہت بُرا ہوتا ہے کیا ہی اچھا ہو کہ یتیموں کو بصورت طالب علمی وغیرہ دوسرے طالب علموں کے اندر ملا کر رکھا جائے۔ اس سے بدتر حالت یہ ہے کہ یتیموں کو گداگری پر مقرر کیا جاتا ہے کہ اپنا یتیم ہونا پیش کر کے ریلوے اسٹیشنوں پر اور بازاروں میں چندہ جمع کرتے پھریں۔ یہ اسلام کی تعلیم کے سراسر منافی ہے۔

يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ
وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ ع ۲۷

کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اور وہ اپنی باتیں لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ ۲۸۴

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ
فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ
حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ
حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ
وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾

اور تجھ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ یہ ضرر (کی بات) ہے۔ پس حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے نزدیک نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ صاف ہو جائیں پھر جب غسل کر لیں تو ان کے پاس جاؤ جس طرح تمھیں اللہ نے حکم دیا ہے۔ اللہ (اپنی طرف) رجوع کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے اور وہ پاکیزگی اختیار کرنیوالوں سے محبت رکھتا ہے۔ ۲۸۵

ع۲۸۴ تنکحوا۔ نکح اس کا اصل ہے اور نکاح کے اصل معنی عقد زوجیت ہیں یعنی مرد اور عورت کا عقد۔ اور زنا شوئی کے تعلق پر بھی بطور استعارہ بولا گیا ہے (غ)

امۃ۔ مادہ اموہے اور اَمَۃ مملوکہ عورت یعنی لونڈی کو کہتے ہیں۔

عَبْد۔ عبُودِیّۃ کے معنی تَذَلّل ہیں یعنی عاجزی اختیار کرنا اور عَبْد چار طرح پر بولا جاتا ہے اوّل بمعنی مملوک یعنی غلام اور اس کی جمع عَبِید آتی ہے۔ دوم وجود میں لایا جانے کے لحاظ سے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے ان کل من فی السمٰوٰت والارض الّا اٰتی الرحمٰن عبدا (مریم ۱۹-۹۳) تیسرا عبادت اور خدمت سے عَبْد اور یہ دو قسم ہیں ایک اللہ کے عَبْد یعنی خالص اس کی عبادت کرنے والے جیسے عبدنا ایّوب۔ نزل الفراٰن علیٰ عبدہ۔ انہ کان عبدا شکورا۔ جہاں کہیں نیک بندوں کا عَبْد ہونا بیان کیا ہے وہ بمعنی عابد ہے لیکن عَبْد۔ عابد سے ابلغ ہے اور دُوسرے وہ جو دنیا کے بندے بن جاتے ہیں جن کی غرض دنیا اور اس کا مال ہوتا ہے۔ جیسے آنحضرتؐ نے فرمایا تَعِسَ عبدُ الدِرھم تَعِسَ عبد الدینار اور عبد بمعنی عابد کی جمع عباد آتی ہے یہاں عَبْد بمعنی غلام ہے (غ)

مغفرت۔ غفر کے لیے دیکھو ع۲۵۸ الیہاں مغفرۃ بمعنی حفاظت ہے کیونکہ جنت کے بعد مغفرت کو رکھا ہے اللہ جنت کی طرف بلاتا ہے اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے جس سے مغفرت کا بلند مقام معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً اللہ کی مغفرت گناہوں کی معافی سے بہت بڑھ کر مقام ہے۔ کیونکہ گناہوں کی معافی سے انسان جنت میں داخل ہو جاتا ہے مگر مغفرت کی ضرورت جنت میں داخل ہونے کے بعد بھی ہے۔

مشرکین سے تعلقات نکاح کی ممانعت: جنگوں کی وجہ سے یہ ضرورت پیش آگئی تھی کہ کفار سے نکاح کے تعلقات جو باہم مؤدت و محبّت کو چاہتے ہیں قطع کیے جائیں مگر اس ضرورت پر جو حکم دیا گیا وہ اپنے اندر عمومیت کا رنگ رکھتا ہے اور سب مشرکوں کے متعلق ہے کیونکہ جنگ مشرکوں سے تھی۔ یعنی مسلمان مرد کا مشرک عورت سے اور مسلمان عورت کا مشرک مرد سے نکاح منع کر دیا۔ جو پہلے نکاح ہو چکے ہوئے تھے ان کا حکم دوسری جگہ سورہ ممتحنہ میں ہے اور گو مسلمان مردوں کا اہل کتاب کی عورتوں سے دوسری جگہ نکاح جائز قرار دیا گیا ہے۔ مگر مشرک عورت سے کسی صورت میں نکاح جائز نہیں۔ مشرک سے بیزاری عملی رنگ میں: قرآن کریم نے شرک کو تمام بدیوں کی جڑ قرار دیا ہے۔ اس لیے شرک کی تمام رسومات کی ایک ایک کر کے بیخکنی کی ہے یہاں تک کہ ان کھانے کی چیزوں کو بھی حرام قرار دیا ہے جو دیوتاؤں وغیرہ کے نام پر مخصوص کی گئی ہوں۔ اسی طرح مشرکین کے ساتھ تعلقات معاشرت کو بھی روکا ہے۔ یعنی نہ مشرک عورت مسلمان مرد کے گھر میں ہو، نہ مسلمان عورت مشرک مرد کے گھر ہیں۔ اور یوں شرک سے کامل بیزاری کی تعلیم عملی رنگ میں مسلمان کی زندگی میں داخل کر دی ہے۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ مشرک ہیں۔ عیسائی جو حضرت مسیح کو خدا مانتے ہیں وہ بھی اسی حکم میں داخل ہیں۔ مسیح پرست عیسائی عورتوں سے نکاح کا نتیجہ ہی ترک قوم کی تباہی ہے۔ یہ دنیوی نار ہے جس میں اس خلاف ورزئ حکم الٰہی نے مسلمانوں کو ڈالا ہے اور اس کے بالمقابل وہ جنت و مغفرت ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ بلاتا ہے یعنی شرک سے کامل بیزاری۔ بعض فقہا کے نزدیک مشرک میں اہل کتاب شامل نہیں بلکہ خاص عرب کے مشرک مراد ہیں اور اس لیے ان کے نزدیک عیسائی عورتوں سے نکاح جائز ہے خواہ وہ مشرکہ ہوں۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ مسلمان جن کو شرک اور مشرکانہ امور سے اس قدر قطع تعلق کی تعلیم دی گئی تھی آج سرتا پا خود مشرکانہ رسوم میں غرق ہیں اور قطع تعلق تو ایک طرف رہا خود ان تمام امور میں ملوث ہو گئے ہیں جن سے نہ صرف دُور رہنا بلکہ جن کا دور کرنا ان کا کام تھا۔

ع۲۸۵ المحیض۔ حیض وہ خون ہے جو خاص ایام میں خاص طور پر رحم سے جاری ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں ان کو ماہواری ایام کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ عموماً انتیس تیس دن میں ایک دفعہ یہ دن عورتوں پر آتے ہیں اور محیض حیض پر بھی بولا جاتا ہے اور اس کے وقت پر بھی اور موضع پر بھی۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى
شِئْتُمْ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ
وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾
وَ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا

تمہاری عورتیں تمہارے لیے کھیتی ہیں پس جب چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ
اور اپنے لیے (کچھ) آگے بھیجو اور اللہ کا تقوٰے اختیار کرو، اور
جان لو کہ تم اس سے ملنے والے ہو اور مومنوں کو خوش خبری دو۔[۲۸۶]
اور اللہ کو اپنی قسموں کی آڑ نہ بناؤ کہ نیک سلوک اور تقوٰے اور

اذی۔ المکروہ الیسیر (رت) یعنی چھوٹی سی مکروہ یعنی ناپسندیدہ بات یا الشر الخفیف یعنی تھوڑی سی تکلیف اور جب زیادہ ہو تو اس کو ضرر کہا جاتا ہے (رت)

اعتزلوا۔ اعتزال عزل سے ہے کسی چیز سے الگ ہو جانا یہاں عورتوں سے الگ ہونا بطور کنایہ ہے یہ مراد نہیں کہ اس گھر میں نہ رہو یا اُن کو چھوڑ نہیں جس طرح ہماری زبان میں کہتے ہیں عورت کے پاس نہ جانا۔

یطھرن۔ طہر نقیض نجاست بھی ہے اور نقیض حیض بھی اور عورت کو جب حیض سے نکل جائے تو طاھر کہا جاتا ہے اور پلیدی اور عیب سے پاک ہو تو طاھرۃ کہا جاتا ہے اور طھُرت کے معنی ہیں خون حیض بند ہو گیا اور تطھرت اور اطّھّرت کے معنی ہیں اس نے غسل کیا (رت) جس طرح انسان کی طہارت کی حالت وہ ہے جس میں وہ ترقی اور نشو و نما کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ کیونکہ نجاست مانع ترقی ہے اسی طرح عورت میں حالت طہر وہ ہے جس میں استقرار حمل ہو سکتا ہے اس لیے گو حالت حیض میں عورت بذاتہ نجس نہیں ہوتی لیکن اس حالت پر طہر کا لفظ اسلیئے نہیں بولا گیا کہ وہ اس حالت میں نسل انسانی کی ترقی کی اس غرض کو پورا کرنیکے قابل نہیں ہوتی جس کے لیے قدرت نے اسے بنایا ہے۔ زبان بھی پُر حکمت ہے۔

مسائل طلاق کا تعلق جنگ سے: یہاں سے اکتیسویں رکوع کے آخر تک حیض طلاق اور بیوہ عورتوں کے متعلق مسائل کا ذکر ہے۔ یہ چند ایک فروعی مسائل ہیں جن کا باہم بھی تعلق ہے اور جنگ سے بھی۔ جنگ سے عورتیں بیوہ ہوتی ہیں اور ان کے نکاح اور عدّت کے احکام کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ احکام مطلقہ عورتوں کی عدّت وغیرہ کے احکام سے ملتے جلتے ہیں اس لیے طلاق کے مسائل کا ذکر آیا اور مسئلہ طلاق کا تعلق ایام ماہواری سے ہے کیونکہ ان ایام میں طلاق ناجائز ہے۔ اس لیے یہاں سے ابتدا کی پھر طلاق کے مسائل بتائے پھر بیوہ عورتوں کے علاوہ ازیں جنگ کی حالت میں قومیں اپنے عامہ قوانین کو درست نہیں کر سکتیں۔ اس کے برخلاف اسلام کی قریبًا ساری شریعت حالتِ جنگ میں ہی نازل ہوئی گویا اگر ایک طرف جنگ درپیش ہے اور اس کا ایک لمبا سلسلہ کئی سالوں پر پھیلا ہُوا ہے تو دوسری طرف کل اصلاح قومی کے کام بھی انہی ایام میں تکمیل پاتے ہیں اور کون قوم اس کی نظیر پیش کر سکتی ہے۔

یہاں سوال ایام حیض میں مقاربت کا ہے جیساکہ جواب سے ظاہر ہے اس لیے ھو اذی میں اشارہ مقاربت کی طرف ہے یعنی ایام حیض میں عورت سے مقاربت ضرر رساں ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ حیض خود ضرر رساں ہے۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جب تک عورت حالتِ حیض سے نکل کر غسل نہ کرلے یا بوجہ کسی مجبوری کے تیمم کے ذریعہ سے طاہر نہ ہو جائے اس کے قریب جانا منع ہے اور قرآن کریم نے بھی لفظ تطھرن اختیار کر کے غسل کی طرف اشارہ کیا ہے مگر امام ابو حنیفہ رحؒ کے نزدیک جب حیض کی زیادہ سے زیادہ مدّت گزر جائے جو دس دن ہے تو پھر محض خون کا بند ہونا کافی ہے۔ آیت کے آخری الفاظ میں کہ اللہ تعالیٰ پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے محبّت رکھتا ہے۔ ظاہری طہارت کے ساتھ باطنی طہارت کی طرف توجہ دلائی۔

ع[۲۸۶] انّی مفردات میں ہے کہ انّی میں حالت اور مکان دونوں کا تعلق ہوتا ہے اس لیے وہ اَین یعنی جہاں اور کیف یعنی جس طرح دونوں معنی میں آتا ہے۔ ضحاک سے یہاں انّی کے معنی متٰی یعنی جب مروی ہیں۔ اور روح المعانی میں ہے کہ یہ تینوں معنی جم غفیر سے ثابت ہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں انّی شئتم من اللیل والنہار جب چاہو رات کو یا دن کو یہی معنی ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں۔

قرآن کریم ایک کامل کتاب ہے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ تمام حالات انسانی کے متعلق ضروری ہدایات دیتا۔ انہی میں مرد اور عورت کے تعلقات بھی ہیں۔ مگر قرآن شریف کا یہ کمال ہے کہ ان تعلقات کے اظہار میں بھی ایسے لفظ استعمال کیے ہیں جو نازک سے نازک کان پر گراں نہیں گزرتے اور بائیں سب باتیں بھی بتا دیں ہیں۔ بائبل میں فحش قصّے: بائبل جسے عیسائی دنیا مقدس کتاب کہہ کر اسے تمام عالم سے منوانا چاہتی ہے اس کے اندر ایسے مضامین محض قصّوں کے رنگ میں ہیں کہ جن کو تنہائی میں بھی ایک شخص پڑھ کر شرم سے پسینہ پسینہ ہو جائے۔ اس تہذیب کے زمانہ میں سوامی دیانند جی نے جو کچھ نیوگ کے بارہ میں ستیارتھ پرکاش کے چوتھے باب میں لکھا ہے اور پھر اسی باب کی دفعہ ۱۴۳ میں جن خیالات کا اظہار گربھا دان سنسکار کے نیچے کیا ہے وہ مرد اور عورت کے تعلقات میں ایسے ننگے الفاظ ہیں جن کو ایک عامی آدمی بھی کسی مہذب مجلس میں ہرگز استعمال نہیں کر سکتا۔ مگر زمین عرب کا ایک اُمّی آج سے تیرہ سَو سال پیشتر کس طرح ان نازک تعلقات کو پاک اور شستہ الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ یہ بجائے خود اس کا معجزہ ہے حالانکہ اسی زمانہ کے عربی اشعار میں جن تعلقات کا ذکر نہایت فحش الفاظ میں پایا جاتا ہے اور عام مذاق یہاں تک بگڑا ہوا ہے کہ ان اشعار کو فخریہ مجلسوں میں دہرایا جاتا ہے۔

عورت کے بمنزلہ کھیتی ہونے سے مراد: ایسا ہی یہ بھی ایک مضمون ہے جسے نجاست پسند لوگ خواہ مخواہ محل اعتراض بناتے ہیں۔ یہاں فرمایا کہ عورت تمہارے لیے بمنزلہ ایک کھیتی کے ہے گویا مرد و عورت کے تعلقات کا حقیقی مقصود نسل انسانی کا بڑھانا ہے تو چونکہ ایام حیض میں علاوہ بیماری اور ضرر کے اندیشہ کے

وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾
لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ
يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾
لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ
اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾

لوگوں کے درمیان اصلاح نہ کرو اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۸۷

اللہ تمہاری بلا ارادہ قسموں پر تمھیں نہیں پکڑتا، لیکن وہ اس پر تمھیں پکڑتا ہے جو تمھارے دلوں نے کمایا ہے اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔ ۲۸۸

ان لوگوں کے لیے جو اپنی عورتوں کے حق نہ دینے کی قسم کھا لیتے ہیں چار ماہ کا انتظار ہے پھر اگر وہ رجوع کریں تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ۲۸۹

یہ مقصود بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ایام حیض میں جو عورتوں کے قریب جانے سے منع کیا تھا کہ وہ ایک دُکھ اور ضرر کی بات ہے۔ انّٰی شئتم سے مراد اسی کی ایک دوسری وجہ یہاں بیان فرمائی ہے کہ جب اصل غرض نسل انسانی کی نشوونما ہے جس طرح کھیتی میں اصل غرض بیج کی نشوونما ہے تو ایام حیض میں عورت کے قریب جانا درست نہیں۔ بیشک ان کے پاس جاؤ مگر اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اس کی کوئی غرض ہے۔ اس غرض کو مدّنظر رکھو تو جب چاہو یا جس طرح چاہو یا جہاں چاہو، ان کے پاس جاؤ اور اس سے پہلی آیت میں صاف فرما دیا کہ ان کے پاس جس طرح تمھیں اللہ نے حکم دیا ہے جاؤ۔ اللہ کا حکم فطرت انسانی کے مطابق ہے اور مذہب اسلام کو اسی لیے فطرت کا مذہب بتایا فطرت اللّٰہ التی فطر الناس علیھا (الروم ۳۰-۳۰) پس خلاف فطرت کی تو خود یہاں تردید موجود ہے۔ ایسی پاک کتاب پر محض اس لیے کہ الفاظ میں کنایہ اختیار کیا گیا ہے وہ اعتراض کرنا جو اس کے صریح مقصود اور منشاء کے خلاف ہے ایک ذلیل حرکت ہے۔

ع ۲۸۷ عُرضۃ۔ عَرَض سے ہے دیکھو ع ۱۰۶ اور عُرضۃ وہ چیز ہے جو کسی چیز کے سامنے حائل کر دی جائے (غ) ڈھال کو بھی عرضۃ کہتے ہیں۔

ایمان۔ یمین کی جمع ہے۔ اصل معنی دایاں ہاتھ۔ استعارۃً قسم کے لیے استعمال ہوتا ہے باعتبار اس فعل کے جو حلف اُٹھانے والا یا معاہدہ کرنے والا کرتا ہے (غ)

تبروا۔ برّ کے معنی کے لیے دیکھو ع ۶۷ اور برّ الوالدین کے معنی ہیں ان کے ساتھ احسان میں توسّع یعنی فراخی (غ) یہی معنی تبروا کے یہاں ہیں اور یہی الممتحنہ ۶۰-۸ میں جہاں غیر مسلموں سے سلوک کا ذکر ہے۔

طلاق کے مسائل کے لیے ہی ایک امر کا ذکر ہو چکا اب اسی ذکر میں ایک دوسرے تمہیدی امر کا ذکر فرماتا ہے۔ طلاق کی ایک قسم عرب میں ایلاء کے نام سے مشہور تھی۔ جس کا ذکر اگلی سے اگلی آیت میں آتا ہے جس میں مرد قسم کھا لیتا تھا کہ وہ عورت کے پاس نہیں جائے گا۔ چونکہ سب سے پہلے اس قسم کی طلاق کا ذکر قرآن شریف نے کیا ہے اس لیے تمہیداً قسم پر کچھ فرمایا اور اس قسم کو ان قسموں میں سے ایک قرار دے کر جن میں انسان ایک نیکی یا نگہداشت حقوق یا اصلاح کے کام سے رک جاتا ہے اس سے روکا ہے اور ساتھ ہی ایک عام اور وسیع تعلیم دیدی ہے کہ کبھی اپنے آپ کو ایسے امر کا پابند نہ کرو جس میں اچھے کام کرنے سے رک جاؤ۔ یا جو حقوق تمہارے ذمہ ہیں ان کی رعایت نہ کر سکو یا اصلاح کی بات کو ترک کرنا پڑے خواہ اللہ کی قسم ہی کیوں نہ کھا لی ہو۔ یعنی اپنی طرف سے ایسا عہد اللہ کے ساتھ ہی کیوں نہ کر لیا ہو۔ جب ایسا عہد اللہ کے ساتھ جائز نہیں۔ کیونکہ وہ تو نیکی سکھاتا اور رعایت حقوق کی تاکید کرتا ہے تو دوسروں کے ساتھ کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ جن ملازمتوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کے حقوق چھیننے یا ان کو دکھ دینے کی نوبت پہنچے وہ بھی اس کے ماتحت آجاتی ہیں۔

ع ۲۸۸ اللغو۔ لغو کلام وہ ہے جو شمار کے قابل نہ ہو یعنی غور و فکر سے نہ کی جائے۔

حلیم۔ حلم کے معنی نفس اور طبیعت کو غضب کے جوش میں آنے سے روکنا ہے (غ) اور حلیم جو اللہ تعالیٰ کی صفات میں آیا ہے اس کے معنی لسان العرب میں الصبور دیئے ہیں جس کی تشریح یوں کی ہے کہ اسے نافرمانوں کی نافرمانی ہلکا نہیں بناتی نہ ان پر غضب اسے اپنے آپے سے باہر کر دیتا ہے۔ لغو قسموں سے مراد وہ قسمیں ہیں جو انسان معمولی بات چیت میں عادت کے طور پر کھا لیتا ہے۔ عرب کے لوگ بات بات پر کہہ دیا کرتے تھے لا واللہ۔ بلیٰ واللہ ہمارے بعض فاضل بھی اپنی فضیلت کے اظہار کے لیے واللہ باللہ تم تاللہ کے سوائے گفتگو نہیں کر سکتے۔ بما کسبت قلوبکم سے مراد وہ قسمیں ہیں جو انسان قصد اور ارادہ سے کھاتا ہے۔ اس طرح کی قسم کے لیے دوسری جگہ کفارہ کا دینا مذکور ہے (المائدۃ ۵-۸۹) لغو قسم کھانے کی ممانعت: مگر لغو قسم پر جو بے سوچے سمجھے کھائی جائے یہ سختی نہیں رکھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لغو قسمیں کھانے سے نہیں روکا بلکہ والذین ھم عن اللغو معرضون (المومنون ۲۳-۳) میں ہر لغو بات اور فعل سے روکا ہے اور خود قسم کی حفاظت کا ذکر دوسری جگہ ہے واحفظوا ایمانکم (المائدۃ ۵-۸۹)

ع ۲۸۹ یؤلون۔ اِلی حرف ہے جو ہر شش جہات میں کسی نہایت کو ظاہر کرتا ہے اور اَلوتُ فی الامر کے معنی ہیں میں نے اس امر میں کوتاہی کی۔ گویا اس میں کام کرنے والا انتہا کو دیکھ لیتا ہے اور آگے نہیں چلتا لا یالونکم خبالا (آل عمران ۳-۱۱۸) اور ایلاء وہ قسم ہے کہ جس کی غرض کسی کام میں یعنی کسی حق کی ادائگی میں کوتاہی کرنا ہو۔ اصطلاح شریعت میں ایلاء یہ ہے کہ مرد قسم کھالے کہ میں اپنی بی بی کے پاس نہ جاؤں گا۔ یعنی ایسی قسم جس میں عورت کے حقوق کی ادائیگی میں کمی واقع ہو (غ)

وَ اِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۲۷﴾ — اور اگر طلاق کا پختہ ارادہ کریں تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۹۰

وَ الۡمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ ؕ — اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں ۲۹۱ اور

وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنۡ يَّكۡتُمۡنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِىۡۤ — ان کے لیے جائز نہیں کہ اسے چھپائیں جو اللہ نے اُن کے رحموں میں پیدا کیا ہے

فاؤ۔ فَیْءٌ سے ہے جس کے معنے ہیں اچھی حالت کی طرف لوٹ آنا (غ)

عورت کے پاس جانے کی قسم: سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی آدمی کسی عورت کو نہ چاہتا اور یہ بھی پسند نہ کرتا کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح کرے تو قسم کھا لیتا کہ میں اس کے قریب نہ جاؤں گا اور اس طرح پر اسے معلقہ چھوڑ دیتا نہ وہ خاوند والی ہوتی نہ دوسری جگہ نکاح کر سکتی۔ اور اس کی غرض صرف عورت کو دُکھ پہنچانا تھا۔ اس لیے طلاق کے مسائل میں سب سے پہلے اس بد رسم کا علاج فرمایا۔ قرآن کریم نے اوّل تو ایلاءٌ کو ان قسموں میں داخل کر کے جو نیکی اور نگہداشت حقوق سے رُکنے کی قسمیں ہیں منع فرمایا ہے لیکن اگر کوئی ایسا کر بیٹھے تو پھر صرف چار ماہ کی مہلت دی ہے یا اس عرصہ میں رجوع کرے اور رجوع کو اچھی حالت ٹھہرایا ہے جیسا کہ لفظ فاؤ کے استعمال سے ظاہر ہے۔ چار ماہ گزرنے کے بعد بعض کے نزدیک طلاق واقع ہو جاتی ہے لیکن دوسری جگہ نکاح کرنے کے لیے اسے پھر عدّت پوری کرنی چاہیئے اور بعض کے نزدیک چار ماہ گزرنے پر عورت بذریعہ حاکم خاوند کو مجبور کر سکتی ہے کہ یا وہ رجوع کرے اور یا طلاق دیدے الفاظِ قرآنی پہلے خیال کے موید ہیں۔

ع۲۹۰ عزموا۔ عَزْم کسی کام کے کر گزرنے پر دل کو مضبوط کر لینا ہے۔

الطلاق۔ طلاق کے اصل معنی بندش سے آزاد کرنا ہیں اور معاہدہ نکاح سے آزاد کرنے پر بالخصوص بولا گیا ہے۔

یہاں سے طلاق کا مضمون شروع ہوتا ہے۔ عربوں میں طلاق کے متعلق حد درجہ کی آزادی تھی۔ عورت کی کوئی منزلت نہ تھی۔ نہ معاہدہ نکاح کو کچھ وقعت دی جاتی تھی جب چاہا طلاق دیدی جب چاہا واپس لے لیا۔ یہودیوں کی شریعت میں بھی نسبتاً طلاق میں زیادہ آزادی تھی بالمقابل بعض اقوام مثلاً ہندوؤں میں نکاح کا فسخ ہونا کسی حالت میں بھی جائز قرار نہیں دیا ہے۔ عیسائی مذہب کی جو بنیادی اینٹ طلاق کے مسئلہ میں ہے وہ ایسا تنگ قانون ہے کہ آج عملاً تمام عیسائی اقوام خود اسے ترک کر چکی ہیں۔ انجیل میں ہے "یہ بھی کہا گیا کہ جو کوئی اپنی جورو کو چھوڑ دے اسے طلاق نامہ لکھ دے پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی جورو کو زنا کے سوائے کسی اور سبب سے چھوڑ دیوے اس سے زنا کرواتا ہے اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرے زنا کرتا ہے (متی ۵: ۳۱-۳۲) اس بنیاد پر جو عمارت عیسائی اقوام نے قانونِ طلاق کی بنائی تھی آج اسے زمانہ نے پاش پاش کر دیا۔ کونسا عیسائی ملک ہے جس میں آج ان الفاظ کو ردّی کی ٹوکری میں نہیں پھینکا گیا آئے دن ان کے خلاف قانون بنتے ہیں اور مسیح کو خدا خدا کر کے پکارنے والے پارلیمنٹوں میں اکٹھے ہوتے اور ان الفاظ کو ناممکن العمل قرار دیتے ہیں۔ کیوں نہ ہو خدا نے خود آ کر تھوڑی یہ شریعت بنائی تھی۔ پھر اس مذہب کو دنیا میں پیش کرنا کیا شرم کی بات نہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہودیوں نے جب طلاق کے معاملہ میں افراط کی تو حضرت مسیحؑ نے جن کی تعلیم خود مختص القوم اور مختص الزمان تھی۔ وقتی علاج کے طور پر یہ ہدایت دی تھی اور ہمیشہ تک رہنے والی شریعت جو تمام معاملات میں اعتدال کی راہ پر چلاتی بعد میں آنے والی تھی۔

اسلام نے طلاق میں اعتدال قائم کیا: چنانچہ اسلام نے طلاق کے مسئلہ کو صحیح بنیاد پر قائم کیا نہ تو یہودیوں اور عربوں والی آزادی باقی رکھی نہ ہندوؤں اور عیسائیوں کی تنگی کو ممکن العمل قرار دیا اور ایک ایسے میانہ راہ کی ہدایت کی جس کی طرف آج خود ساری دنیا کا رجحان ہو رہا ہے یعنی ایک طرف اگر طلاق کی اجازت دی تو دوسری طرف بہت سی قیود اور شرائط کے ماتحت اسے کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے اصل منشاء کو سمجھ کر فرمایا اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰهِ الطَّلَاقُ تمام حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسند چیز خدا کو طلاق ہے۔ یہ لفظ ہر ایک مسلمان کے لیے سوائے اشد ضرورت کے کافی روک ہیں۔ طلاق کے مسئلہ میں جس قدر حد بندیاں قرآن شریف نے قائم کی ہیں ان کا ذکر آگے آتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اسلام نے ان وجوہ کو معین اور مخصوص نہیں کیا جن پر طلاق دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اسلام کا وسیع قانون سب زمانوں اور سب قوموں کے لیے تھا۔ ایسی وجوہات کا معین کرنا درست نہ ہوتا۔ آج عیسائی اقوام کی جو اب ایک ہی مذہب کے پیرو ایک ہی درجہ تعلیم و ترقی پر یکساں قوانین معاشرت و تمدن کے پیرو ہیں یہ حالت ہے کہ ان میں سے کوئی دو قومیں اس بات پر متفق نہیں کہ وجوہات طلاق کن کن امور کو رکھا جائے پس اسلام نے ایک ایسی راہ بتائی ہے جو تمام نقصوں سے خالی ہے آج سے تیرہ سو سال پیشتر عرب کا ایک اُمّی اپنے ذہن سے یہ قانون نہ بنا سکتا تھا جب آج بڑے بڑے مہذب اور تعلیم یافتہ بھی اس سے عاجز ہیں۔

ع۲۹۱ قروء۔ قرء کی جمع ہے اور قُرء حقیقت میں حالتِ طہر سے حالتِ حیض میں داخل ہونے کا نام ہے اور چونکہ دونوں باتوں کا جامع ہے یعنی طہر اور حیض کا اس لیے بعض وقت دونوں پر الگ الگ بھی بولا جاتا ہے (غ) مفردات میں ہے کہ ہر ایک اسم جو دو صفتوں کو اکٹھا چاہتا ہو وہ الگ الگ بھی ہر ایک پر بولا جا سکتا ہے پس ثلٰثة قروء یہ ہے کہ عورت تین دفعہ حالت طہر سے حالت حیض میں داخل ہو۔

طلاق حالت طہر میں ہو سکتی ہے: ان الفاظ میں گو بظاہر عدت کا ہی ذکر ہے مگر لفظ قروء کو لا کر یہ بتا دیا ہے کہ طلاق دینے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ حالت طہر میں دی جائے۔ کیونکہ عدت شروع نہیں ہو سکتی جب تک حالت طہر موجود نہ ہو جس سے حالت حیض کی طرف انتقال ہو بر خلاف بیوہ کے کہ وہاں عدت دنوں

أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا
إِصْلَاحًا ۚ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ
ع ۲۸ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۲۸﴾

اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں ۲۹۲ اور اس (اثناء) میں ان کے
خاوند ان کو واپس لینے کے زیادہ حقدار ہیں اگر وہ اصلاح چاہیں ۲۹۳ اور
ان کے لیے پسندیدہ طور پر (حقوق) ہیں جیسے ان پر (حقوق) ہیں اور مردوں
کو ان پر ایک فضیلت ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ ۲۹۴

اور مہینوں کی گنتی سے ہوتی ہے) طلقوھن لعدتھن میں اسی طرف اشارہ ہے اور صحیح حدیث میں ہے کہ جب حضرت ابن عمرؓ نے حالت حیض میں طلاق دی تو آنحضرت صلعم سخت ناراض ہوئے اور رجوع کا حکم دیا۔ یہ شرط درحقیقت طلاق پر ایک روک ہے۔ کیونکہ حالتِ حیض میں تو مرد اور عورت الگ الگ ہوتے ہیں اس وقت طلاق کا دینا سہل ہے مگر حالت طہر میں میاں بی بی میں تعلقات محبّت قائم ہوتے ہیں اس وقت طلاق دینا زیادہ مشکل ہے۔

دوسری حدبندی جو انہی الفاظ میں طلاق پر رکھی ہے وہ عدّت یا زمانہ انتظار ہے۔ اس کی ایک بڑی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ تھوڑی علیحدگی میں ایک دوسرے کی قدر معلوم ہو جائے اور خیالات محبّت اگر اس تعلق میں فی الواقع موجود ہیں تو ان خیالات منافرت پر جو عارضی طور پر پیدا ہو گئے ہیں غالب آجائیں۔ گویا طلاق دینے کے ساتھ فوراً واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ قریباً تین ماہ کا وقفہ دیا جاتا ہے جس میں اگر ممکن ہو تو اصلاح ہو جائے۔ نکاح تو بغیر میاں بی بی میں مودت و محبّت کے اصل غرض کو پورا ہی نہیں کر سکتا اور اگر محبت نہ ہو تو نہ صرف میاں بی بی کے اخلاق ہی تباہ ہوتے ہیں۔ بلکہ اولاد کے اخلاق بھی بگڑ جاتے ہیں ہاں بعض وقت اصل محبت تو موجود ہوتی ہے، مگر عارضی طور پر کوئی اسباب منافرت کے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے دُور ہونے اور خیال محبّت کے پھر غالب آنے کے لیے یہ وقفہ رکھ دیا۔ عدت کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ اگر عورت حاملہ ہو تو اس مدّت میں حمل ظاہر ہو جائے۔ جیسا کہ اس سے اگلے الفاظ میں ذکر بھی کر دیا ہے۔

ع۲۹۲ ارحام۔ رَحِم کی جمع ہے اور یہ معروف ہے۔

عدّت کی ایک غرض تو ظاہر تھی جس کی طرف اوپر کے نوٹ میں توجہ دلائی گئی ہے اور وہ طلاق کی آزادی پر ایک حدبندی ہے۔ یہاں عدّت کی ایک دوسری غرض کی طرف توجہ دلائی ہے یعنی یہ کہ اگر عورت کو حمل ہو تو اس میعاد میں وہ بھی ظاہر ہو جائے گا۔ چونکہ اولاد میاں بی بی کے تعلقات محبّت میں ایک بڑا واسطہ بن جاتی ہے اس لیے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ اکثر حالات میں بی بی کا صاحبِ اولاد ہونا طلاق کے لیے مانع ہو جاتا ہے

ع۲۹۳ بعولۃ۔ بَعل کی جمع ہے۔ بَعل اصل میں وہ ہے جو دوسرے پر فوقیت رکھتا ہو اور خاوند کو بھی بَعل کہتے ہیں۔

یہ طلاق پر تیسری حدبندی ہے یعنی اس وقفہ عدت کے اندر اگر اصلاح چاہیں (اور اصلاح کا تو حکم ہے) تو خاوند اس بات کا حق دار ہے کہ بی بی کو اس کی طرف لوٹا یا جائے اس میں ہر ایک قسم کی جلد بازی کا جو طلاق کے معاملہ میں اختیار کی جا سکتی ہے علاج منتصور ہے تین ماہ کے عرصہ میں انسان کو خوب غور و فکر کا موقعہ مل سکتا ہے اور عارضی رنجشیں دور ہو کر انسان ٹھنڈے دل سے غور کر سکتا ہے۔ اور اگر میاں بی بی میں کچھ بھی حقیقی محبّت ہے تو وہ چنگاری تمام عارضی رنجشوں کو جلا کر اصلی تعلق کو قائم کر دیگی اور یہاں اصلاح کا ذکر کر کے اور احق کا لفظ لا کر بتایا کہ جہاں تک ممکن ہو پہلے تعلق کو قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

ع۲۹۴ معروف۔ عرف سے ہے دیکھو ع۲۵۶ اور معروف اس امر کو کہتے ہیں جس کا اچھا یا پسندیدہ ہونا شریعت کی رُو سے پہچانا جا سکے (رغ)

دَرَجۃ۔ منزلۃ یا بلندی کا مرتبہ۔

عورتوں اور مردوں میں مساوات حقوق اور مردوں کی فوقیت: ان الفاظ میں قرآن کریم نے دو مشکلات کو کمال خوبی سے حل کیا ہے یعنی اوّل تو اس اصول کو قائم کیا کہ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ گویا بلحاظ حقوق مرد و عورت میں مساوات ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تمام مذاہب بے خبر معلوم ہوتے ہیں بلکہ آج تک مہذب اقوام نے بھی پورا پورا اس اصول کو قبول نہیں کیا۔ لیکن دوسری طرف مساوات حقوق سے ایک نقص پیدا ہوتا تھا۔ کہ پھر خانگی امور میں نظم کیونکر قائم رہے۔ کیونکہ کوئی نظم قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس میں ایک کو دوسرے پر کچھ فوقیت نہ دی جائے اور معاشرت یا خانہ داری جس پر نسل انسانی کی ساری بہبودی کا دارومدار ہے۔ تمدنِ انسانی کی پہلی کڑی ہے کیونکہ تمدن باہم مل جل کر رہنے کا نام ہے اور اس کی ابتدا معاشرت یا خانہ داری سے ہوتی ہے جس طرح تمدّن میں مساوات کے ساتھ ایک فوقیت کی ضرورت ہے اسی طرح معاشرت میں یا گھر کے انتظام میں مساوات کے ساتھ ایک فوقیت کی ضرورت ہے تاکہ نظم قائم رہے پس مساوات حقوق کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی فرمایا کہ مردوں کو عورتوں پر ایک فوقیت بھی ہے، اگر نری مساوات ہوتی تو خانہ داری تباہ ہو جاتی، اگر سلسلہ نظام عالم پر غور کیا جائے تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ مرد کو عورت پر ایک فوقیت حاصل ہے مردمیں قوت و شجاعت کے جوہر عورت سے بڑھ کر ہیں۔ گو عورت میں رحم و محبّت کے جوہر مرد سے زیادہ ہوں مگر نظام عالم میں قوت و شجاعت حکومت کرنے کے لیے فوقیت دیتی ہے۔ پس نہ تو مردوں کو عورتوں کے حقوق کی مساوات کا انکار کرنا چاہیئے نہ عورتوں کو مردوں کی اس فوقیت کا جو قدرت نے

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ

(یہ) طلاق دو دفعہ ہے پھر پسندیدہ طور سے رکھنا یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرنا ہے[295] اور تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم اس (مال) سے کچھ لو جو تم نے

ان کو دی ہے یہ ایک توازن ہے جس کے بغیر نظم خانگی برباد ہو جائے گا جس طرح تمدن میں ایک طرف مساوات حقوق قائم کی اور رعایا کے حقوق حکام پر قائم کیے ہیں۔ اسی طرح معاشرت میں مرد و عورت کے حقوق کی مساوات قائم کرکے عورت کے حقوق مرد پر قائم کیے ہیں۔

طلاق کے مضمون میں عورتوں کے حقوق کی طرف توجہ دلانا اس غرض سے ہے کہ مرد یہ نہ سمجھ لیں کہ چونکہ طلاق کا دینا ان کے اختیار میں دیا گیا ہے اس لیے عورتوں کے کوئی حقوق ہی نہیں ان کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں اور یوں یہ چوتھی حد بندی طلاق پر ہے۔

۲۹۵ امساك۔ کسی چیز سے تعلق رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے (غ)

تسریح۔ سرح اونٹ کو چرنے کے لیے آزاد چھوڑنا ہے اور عقدہ نکاح سے آزاد کرنا تسریح ہے (غ) حین تسرحون (النحل۱۶-۶)

طلاق دو دفعہ ہے۔ مفسرین کہتے ہیں وہ طلاق مراد ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہے جس کی عدت میں خاوند رجوع کر سکتا ہے۔ جس کو اصطلاح میں طلاق رجعی کہا جاتا ہے مگر حق یہ ہے کہ قرآن شریف نے دوسری کسی طلاق کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اور نہ قرآن شریف میں اور نہ حدیث صحیح میں کہیں یہ حکم ہے کہ طلاق دینے کے لیے تین دفعہ طلاق کا کہنا ضروری ہے۔ تمام مفسرین کا اسباب پر اتفاق ہے کہ یہ آیت ان تکالیف کو دور کرنے کے لیے نازل ہوئی جو عورتوں کو بار بار طلاق دیکر اور پھر عدت کے اندر رجوع کرکے پہنچائی جاتی تھیں۔ ترمذی میں اس مضمون کی حدیث بھی ہے کہ ایک شخص طلاق دیتا اور پھر رجوع کر لیتا گو ہزار مرتبہ ایسا کرے اس کا علاج قرآن شریف نے ان الفاظ میں کیا کہ طلاق اور پھر عدت کے اندر رجوع بار بار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ صرف دو دفعہ ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر تیسری دفعہ طلاق دے تو پھر عدت کے اندر رجوع کا اختیار نہیں اور یہ طلاق پر پانچویں حد بندی ہے۔

پس الطلاق مرّتان میں صرف عرب کی اس بیماری کا علاج ہے جو بار بار طلاق دیکر رجوع کرتے تھے۔ لیکن اس سے لوگوں نے طلاق رجعی اور طلاق بائن کی تفریق نکالی ہے اور وہ اس طرح کہ قرآن شریف جو دو مرتبہ طلاق کے بعد رجوع کی اجازت دیتا ہے تو اس کو باطل کرنے کے لیے لوگ عورت پر تین طلاق اکٹھی کہہ دیتے ہیں۔ یعنی بجائے ایک دفعہ کہنے کے کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں تین دفعہ طلاق ایک ہی وقت میں کہہ دیتے ہیں اور اس کو طلاق بائن قرار دے لیا ہے یعنی اس کے بعد خاوند نہ عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے جیسا کہ آیت ۲۲۸ کا منشاء تھا۔ اور نہ بعد عدت کے دوبارہ اسے اپنے نکاح میں لا سکتا ہے جیسا آیت ۲۴۲ کا منشاء ہے فقہاء کے ایک گروہ نے اس قسم کی طلاق کو طلاق بائن تو قرار دیا لیکن فی الواقع یہ بتانے کو کہ یہ طریق اسلامی کے خلاف ہے اس کا نام طلاق بدعی رکھا ہے اور افسوس یہ ہے کہ اس بدعت کو دور کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ اس کو تسلیم کر لیا۔ حالانکہ نبی کریم صلعم نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ ابو داؤد و ترمذی و ابن ماجہ کی حدیث ہے کہ رکانہ نبی کریم صلعم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں نے اپنی بی بی کو طلاق بتہ دی ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ تیرا ارادہ کیا تھا؟ تو کہا کہ میرا ارادہ ایک ہی طلاق دینے کا تھا۔ جس پر آپ نے رجوع کی اجازت دی اور نسائی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلعم کو کسی شخص کے متعلق خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بی بی کو تین مرتبہ اکٹھی طلاق دی ہے فقام غضبان ثم قال ایلعب بکتاب اللہ عز وجل وانا بین اظهرکم (مشکوٰۃ) آپ سخت ناراض ہو کر اٹھے اور کہا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ ہنسی کی جاتی ہے اور میں تمہارے درمیان ہوں۔ پس آنحضرت صلعم اس کو کتاب اللہ کے ساتھ ہنسی قرار دیں اور آج یہ حالت ہے کہ مسلمانوں میں جب کوئی طلاق دے تو اس کا پہلا لفظ ہی تین طلاق ہوتا ہے اور یہ سارا الزام علما کے ذمہ ہے کہ وہ عوام کو اس سے آگاہ نہیں کرتے کہ یہ طریق طلاق وہ ہے جسے رسول اللہ صلعم نے کتاب اللہ کے ساتھ ہنسی قرار دیا ہے اگر مسلمانوں کو یہ علم ہو تو وہ کبھی جرأت نہ کریں کہ جب طلاق ایک مرتبہ کہنے سے بھی ہو سکتی ہے، تو خواہ مخواہ وہ طریق اختیار کریں جسے محمد رسول اللہ صلعم کتاب اللہ کے ساتھ ہنسی قرار دیں۔ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین دفعہ اکٹھی طلاق دینے کا رواج جاہلیت میں تھا اور نبی کریم صلعم نے تعلیم قرآنی کے ماتحت اسے روکا تھا مگر یہ بیماری آہستہ آہستہ پھر زور پکڑ گئی۔ یہاں تک کہ آج شاذ و نادر ہی کوئی مسلمان اس کے اثر سے خالی رہا ہے۔

اس بارہ میں حضرت عمرؓ کے فیصلہ سے بھی ایک غلط نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم اور ابو بکرؓ کے زمانہ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے پہلے دو سال میں تین طلاق کو ایک ہی طلاق سمجھا جاتا تھا لیکن (لوگوں نے جب یہی طریق اختیار کر لیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لهم فیہ اناۃ فلوا مضینا علیهم فامضاہ یعنی لوگ اس معاملہ میں جلدی کرتے ہیں جس میں انہیں ڈھیل دی گئی تھی بہتر ہو کہ ہم ان پر اسی طرح حکم لگا دیں۔ سو ایسا ہی لگا دیا۔ اوّل تو ایک صحابی کا فعل حجت شرعی نہیں۔ دوسرے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ حکم بطور سزا جاری کیا تھا تاکہ لوگ تین دفعہ اکٹھی طلاق دینے سے رک جائیں۔ جب ان کی اصل غرض بھی اس بدعت سے لوگوں کو روکنا تھا تو ان کے فعل سے اس کا جواز کیونکر نکالا جا سکتا ہے اور ترمذی میں ہے فروی عن عمر بن الخطاب انہ جعل البتۃ واحدۃ یعنی عمرؓ بن خطاب سے روایت ہے کہ انہوں نے طلاق بتہ یعنی تین طلاق کو ایک ہی قرار دیا پس ممکن ہے کہ آپ نے وہ حکم صرف عارضی طور پر جاری کیا ہو۔ بہرحال ان کا یہ فعل کسی صورت میں تین اکٹھی طلاق کو تین علیحدہ علیحدہ طلاقوں کا قائم مقام نہیں بنا سکتا جب نبی کریم صلعم سے اس کے خلاف مروی ہے۔

فقہا نے طلاق کو تین قسم قرار دیا ہے۔ طلاق بدعی۔ یہی جس کا ذکر اوپر ہوا اور جو کسی صورت میں جائز نہیں مسلمانوں کو اس سے رُکنا چاہیئے۔ دوسری قسم کی طلاق

اٰتَیۡتُمُوۡہُنَّ شَیۡئًا اِلَّاۤ اَنۡ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ
اللّٰہِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ ۙ فَلَا
جُنَاحَ عَلَیۡہِمَا فِیۡمَا افۡتَدَتۡ بِہٖ ؕ تِلۡکَ
حُدُوۡدُ اللّٰہِ فَلَا تَعۡتَدُوۡہَا ۚ وَ مَنۡ یَّتَعَدَّ

انھیں دیا ہے[۲۹۶] سوائے اس کے کہ دونوں کو ڈر ہو کہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے پس اگر تمھیں یہ ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو پھر ان پر اس میں کچھ گناہ نہیں جو عورت فدیہ میں دیدے[۲۹۷] یہ اللہ کی حدیں ہیں پس ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور جو اللہ کی حدوں سے آگے

وہ ہے جسے وہ حسن کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مرد تین طہروں میں الگ الگ تین طلاقیں دے اس کو بھی بائن قرار دیا ہے اس کی کوئی سند بھی صراحت سے نہیں ملتی۔ قرآن شریف میں تو قطعاً یہ ذکر نہیں کہ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں بلکہ صاف الفاظ ہیں فطلقوھن لعدتھن یعنی جب ایک طلاق دی تو اب اس کے لیے ایک عدت ہے جو تین قرء ہے اور جب ایک طلاق کے بعد تین قرء انتظار کا حکم صراحت سے قرآن شریف میں موجود ہے تو پھر دوسری تیسری طلاق کیا ہوئی؟ اور اس کے بعد وہ انتظار بموجب حکم قرآن کیوں نہ ہو؟ کسی حدیث میں بھی جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے کوئی ایسا حکم موجود نہیں کہ طلاق اس طرح دی جائے کہ ہر طہر میں ایک طلاق ہو۔ اس لیے یہ صورت بھی اختیار کرنے کے قابل نہیں۔

تیسری قسم طلاق کی وہ ہے جسے احسن کہا جاتا ہے یعنی یہ کہ مرد عورت کو طہر میں بغیر اس کے کہ اس کے پاس گیا ہو طلاق دے یعنی ایک ہی مرتبہ اور یہی وہ طلاق ہے جو قرآن کریم کی آیات سے صاف معلوم ہوتی ہے اور جس کا پتہ احادیث سے بھی لگتا ہے اور یہی وہ طریق طلاق ہے جسے اختیار کرنا چاہیئے دوسرے طریق اختیار کرکے مسلمانوں کو اس قدر ذلت دیکھنی پڑی ہے کہ جس کا بیان نہیں ہوسکتا اور قرآن شریف کی صراحت کے یہ خلاف ہے کہ مرد عورت کو طلاق دے تو اسے عدت میں رجوع کا اختیار نہ رہے۔ دوسرے طریقوں کو اختیار کرنے کا نتیجہ ہی وہ حیوانیت کا طریق ہے جسے حلالہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

طلاق ایک ہی ہے خواہ سو دفعہ کہے یا تین دفعہ اور خواہ اسے ہر روز کہتا جائے یا ہر ماہ میں ایک دفعہ کہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ ہاں جب پہلی دفعہ طلاق کا لفظ منہ سے نکالا ہے۔ اس وقت سے عدّت شروع ہوجاتی ہے بشرطیکہ عورت کی حالت طہر میں ایسا کہا ہو اور اگر طہر میں ایسا نہیں کہا تو جیسا کہ حضرت ابن عمر کا واقعہ صحیح احادیث میں بتاتا ہے رجوع کرنا پڑے گا جیسا کہ نبی کریم صلعم نے خود ابن عمرؓ سے کرایا۔ باقی رہا یہ کہ حالت حیض کی طلاق، ایک طلاق گنی جائے گی یا نہ، سو نبی کریم صلعم کے فیصلہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ طلاق نہیں گنی جائے گی۔ کیونکہ فرض کرو ایک شخص نے دو دفعہ اپنی بی بی کو طلاق دیکر رجوع کیا تیسری دفعہ حالت حیض میں وہ طلاق دیتا ہے تو اگر یہ طلاق سمجھی جائے تو رجوع ہو نہیں سکتا۔ حالانکہ نبی صلعم نے رجوع کو ضروری ٹھہرایا کہ سوائے حالت طہر کے طلاق نہیں۔

طلاق میں حسن سلوک کا حکم: طلاق کے مسئلہ میں فامساک بمعروف نہایت اعلیٰ درجہ کا قانون ہے اس میں خاوند کی طرف سے بی بی کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا حُسن سلوک ضروری ٹھہرایا ہے اور حدیث میں ہے خیرکم خیرکم لاھلہ پس اگر طبائع میں کوئی ایسی ناموافقت ثابت ہو یا کوئی ایسے تنازعات پیدا ہوجائیں جن کی اصلاح نہیں ہوسکتی تو یہ چونکہ امساک بمعروف کے خلاف ہے اس لیے تسریح باحسان ضروری ہے یعنی عورت کے ساتھ کچھ احسان کرکے رخصت کردینا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے اس کے کہ عورت کی طرف سے کسی فحش وغیرہ کا ارتکاب ہو اس کے ساتھ طلاق میں حسن سلوک کو قرآن کریم نے ضروری ٹھہرایا ہے۔ نبی کریم صلعم کو خود بھی ایک موقعہ پر جب بیبیوں نے کچھ زیادہ اخراجات طلب کیے یہی حکم ہُوا تھا کہ یہ دنیا کا مال چاہتی ہیں تو انہیں کہہ دو امتّعکنّ واسرحکن سراحاً جمیلا (احزاب[۳۳]-۲۸)

۲۹۶ مہر کی ادائیگی ضروری ہے: ممّا اٰتیتموھن سے مراد مہر ہے کیونکہ مہر عورت کو دیدیا جاتا تھا اور قرآن کریم نے جہاں کہیں مہر کا ذکر کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مہر کی رقم عورت کو ادا کردی جاتی تھی آج کل کی طرح ایک فرضی رقم نہ تھی۔ البتہ یہ جائز ہے کہ انسان کسی مجبوری کی وجہ سے فوراً اس رقم کو ادا نہیں کرسکتا تو اسے بطور قرضہ اپنے ذمّے سمجھے اور جس قدر جلد ممکن ہو ادا کرے۔ اور یہ طلاق پر چھٹی حدبندی ہے۔ کیونکہ عموماً مہر کی رقم اس قدر ہوتی ہے کہ خاوند کو بلا وجہ طلاق دینے میں مانع ہوتی ہے اور مہر امیر اور غریب کی حیثیت کے مطابق علیحدہ علیحدہ ہے۔ آج کل جو لوگوں نے ایک فرضی شرعی مہر بتیس روپیہ کا تجویز کیا ہُوا ہے اس سے بہت قباحت پیدا ہورہی ہے کیونکہ اس طرح پر جو ایک بڑا منشا مہر کا تھا کہ وہ طلاق کی آزادی پر روک رہے وہ باطل ہوگیا ہے اور مرد عورتوں کو جس طرح چاہتے ہیں تکلیف دیتے ہیں۔ مہر کا کوئی حصّہ واپس لینے کی صرف دو صورتیں ہیں جن میں سے ایک کا ذکر تو آگے آتا ہے اور دوسری کا ذکر سورۂ نساء میں ہے الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ (النساء[۴]-۱۹)

۲۹۷ جس صورتِ طلاق کا ذکر یہاں ہے اسے اصطلاح شرعی میں خلع کہتے ہیں یعنی وہ صورت جہاں عورت طلاق حاصل کرنا چاہتی ہے مگر الفاظ یہ ہیں کہ دونوں حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب عورت کی طرف سے خواہش طلاق ہوگی تو یہ خطرہ ہے کہ مرد اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے زیادتی کرے اور یوں گویا دونوں حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکے، عورت اس لیے کہ وہ طلاق چاہتی ہے اور مرد اس لیے کہ وہ زیادتی کریگا اور اسے روکنے کی کوشش کریگا۔ برخلاف پہلی صورت کے جہاں زیادتی صرف مرد کی طرف سے ہے یا خواہش طلاق صرف اسی کی طرف سے ہے،

حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾
فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى
تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا
حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا
لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

بڑھتے ہیں وہی ظالم ہیں ۲۹۸
پھر اگر وہ اسے (تیسری بار) طلاق دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرے پھر اگر وہ اسے طلاق دیدے تو ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں اگر وہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں اگر ان کو یقین ہو کہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھیں گے ع۲۹۹ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں وہ انھیں ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں۔

فان خفتم میں حکام مراد ہیں یعنی اگر عورت طلاق حاصل کرنا چاہے تو اسے قاضی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ وہ اگر دیکھے کہ خلع ہونا چاہیئے تو خلع کرا دے۔ گویا جس طرح مرد پر ایک بھاری روک مہر کی رقم ہے عورت پر طلاق حاصل کرنے میں روک یہ ہے کہ اسے قاضی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

جمیلہ کی طلاق کا واقعہ: صحیح حدیثوں میں جمیلہ بنت عبداللہ بن ابی اور اس کے خاوند ثابت بن قیس بن شماس کا ذکر موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کو طلاق حاصل کرنے کا حق اسی طرح ہے جس طرح مرد کو طلاق دینے کا حق ہے۔ جمیلہ طلاق چاہتی تھی اور قیس طلاق دینا نہ چاہتا تھا۔ جمیلہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئی آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تم اس کا باغیچہ جو اس نے مہر میں دیا تھا واپس کر دوگی؟ اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو آپ نے قیس کو حکم دیا کہ طلاق دیدو۔ حدیث میں اس بی بی کے یہ لفظ موجود ہیں ما اعیب علیه فی خلق ولا دین میں نہ اس کے اخلاق پر عیب لگاتی ہوں نہ دین پر۔ اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں لا اطیقه بغضا یعنی بغضا میں اس کی برداشت نہیں کرتی یعنی مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو مرد سے طلاق حاصل کرنے کا حق نہ صرف اس صورت میں حاصل ہے کہ اس کے اخلاق پر وہ عیب لگا سکے یعنی وہ اس سے بدسلوکی کرتا ہو یا دین پر عیب لگا سکے مثلاً جو زانی ہو یا فاسق فاجر ہو بلکہ محض ناموافقت طبع کی وجہ پر بھی طلاق مل سکتی ہے چونکہ عورت کو اس قدر وسیع حق طلاق حاصل کرنے کا دیا گیا۔ اس لیے جس طرح مرد کو طلاق میں جلدی کرنے کے متعلق فہمائش کی گئی ہے عورت کو بھی خصوصیت سے طلاق میں جلدی کرنے سے روکا گیا ہے۔ ابوداؤد ترمذی وغیرہ میں حدیث ہے ایما امراة سألت زوجها طلاقا فی غیر ما باس فحرام علیها رائحة الجنة یعنی جو عورت اپنے خاوند سے بلا کسی تکلیف کے طلاق مانگتی ہے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ناموافقت طبع خود ایک تکلیف ہے۔

ناموافقت طبع کو کیوں وجہ طلاق قرار دیا گیا ہے: بظاہر خیال ہوگا کہ اسلام نے اس طرح پر عورتوں کو طلاق حاصل کرنے میں بہت آزادی دے رکھی ہے کیونکہ وہ محض ناپسندیدگی اور ناموافقت پر بھی ایک عورت کو طلاق دلا دیتا ہے۔ مگر اسلام کی تعلیم فطرت انسانی کے صحیح علم پر مبنی ہے اگر مرد اور عورت میں ناموافقت ہے تو وہ نکاح کی غرض کو پورا نہیں کر سکتے کیونکہ ایک غرض نکاح کی یہ بھی ہے کہ میاں بی بی ایک دوسرے کا لباس بنیں ایک دوسرے کے لیے تسکین اطمینان اور راحت کا موجب ہوں جیسا ھن لباس لکم وانتم لباس لھن (البقرة ۲ - ۱۸۷) اور لتسکنوا الیها وجعل بینکم مودة ورحمة (الروم ۳۰ - ۲۱) سے ظاہر ہے۔ وہ بصورت ناموافقت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اولاد کا پیدا کرنا اور اس کی تربیت جو ایک اور غرض ہے وہ بھی پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ ماں باپ کے جھگڑوں کا اثر اولاد کے اخلاق پر بہت برا ہوتا ہے۔

ع۲۹۸ ہندوستان میں عورت کی حق طلاق سے محرومی اور اس کے بد نتائج: طلاق کے مسئلہ میں ایک بڑا بھاری ظلم جو ہندوستان میں عورتوں پر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ عورت کا حق طلاق حاصل کرنے کا سوائے بہت ہی محدود صورتوں کے تسلیم نہیں کیا گیا۔ عورتوں کے ان حقوق سے جو قرآن شریف نے ان کو دیے ہیں محروم کرنے کا یہ نتیجہ ہے کہ ہزارہا عورتیں بلکہ لاکھوں مصیبت اور درماندگی کی حالت میں ہیں جن کو خاوند نہ بساتے ہیں نہ چھوڑتے ہیں۔ پھر سینکڑوں عیسائی اور آریہ بن جاتی ہیں یا کوئی اور مذہب اختیار کر لیتی ہیں۔ محض اس لیے کہ خاوند کے ظلم سے نجات حاصل ہو۔ مگر ہمارے علماء اور لیڈروں کے کان پر جوں نہیں رینگتی اور مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے تباہ ہوتا دیکھ کر خاموش ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عورت کے حق طلاق کے بعد کس قدر زجر کے الفاظ بھی فرمائے ہیں۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو اور ان سے آگے بڑھنے والے ظالم ہیں۔ مسلمان ان الفاظ پر غور کریں کہ خدائے تعالیٰ ان کو ان کے رویہ کے لحاظ سے کس گروہ میں داخل کرتا ہے۔

ع۲۹۹ یہ طلاق کی آزادی پر ساتویں حدبندی ہے اصل میں پہلی دو طلاقیں عارضی علیحدگی ہیں کیونکہ ان کے بعد میاں بی بی پھر پہلی صورت پر رہ سکتے ہیں لیکن اس عارضی علیحدگی کا فائدہ صرف دو دفعہ دیا ہے۔ کیونکہ اگر عارضی جدائی پر حدبندی قائم نہ کی جاتی تو یہ خود ایک بیماری بن جاتی اس لیے فرمایا کہ تیسری مرتبہ طلاق کا لفظ انسان خوب سوچ کر منہ سے نکالے کیونکہ پھر وہ ہمیشہ کے لیے اس تعلق کو دوبارہ قائم کرنے سے محروم کر دیا جائے گا۔ سوائے ایک صورت کے کہ وہ بی بی کسی اور خاوند سے نکاح کرے پھر وہ خاوند بھی اسے طلاق دیدے۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ
فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ
بِمَعْرُوفٍ ۠ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ
وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۗ وَلَا
تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ
اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ
وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا
ع ۲۹ / ۱۴ أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۲۳۱﴾

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو پھر وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو یا انھیں اچھی طرح رکھو یا حُسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دو اور اُن کو دُکھ دینے کے لیے نہ روک رکھو تاکہ تم زیادتی کرو۔ اور جو ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔ اور اللہ کی باتوں سے ہنسی نہ کرو اور اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے، یاد کرو اور اس کو بھی جو تم پر کتاب اور حکمت اتاری جس کے ساتھ تمھیں نصیحت کرتا ہے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔[۳۰۰]

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ
فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ
إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ
بِهِ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو پھر وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں، تو انھیں (اس بات سے) مت روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کرلیں جب آپس میں پسندیدہ طور پر راضی ہوں۔ اس کے ساتھ تم میں سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے یہ تمھارے لیے بہت پاکیزہ اور بہت صفائی

ان الفاظ سے جو ایک مسئلہ حلالہ کا اخذ کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کی جہالت کی وجہ سے اسلام پر ایک اور بدنامی کا دھبّہ ہو رہا ہے۔ عام رواج یہ پڑا ہُوا ہے کہ جہاں کوئی شخص بیوی پر ناراض ہُوا جھٹ تین طلاق کہہ دی بعد میں پچھتایا تو مُلّا صاحب نے حلالہ کا مسئلہ پیش کر دیا یعنی ایک رات کے لیے کسی دوسرے شخص سے ایک فرضی نکاح ہو جائے اور صبح کو وہ طلاق دیدے یہ ایک لعنت ہے جو مسلمانوں کے گلے پڑی ہے اس لیے کہ وہ خلاف قرآن چلتے ہیں۔ حلالہ کی رسم بھی دراصل ایک جاہلیت کی رسم تھی اور حدیث میں صاف آتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے حلالہ کرنے والے پر اور اس پر جس کے لیے حلالہ کیا گیا ہے لعنت کی ہے (مشکوٰۃ) اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میرے پاس حلالہ کرنے والا اور کرانے والا لایا جائیگا تو میں دونوں کو سنگسار کروں گا۔ اور حضرت عثمانؓ سے روایت ہے ایک مقدمہ آپ کے سامنے لایا گیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا ہے تاکہ اس کے خاوند کے لیے حلالہ کرے۔ تو آپ نے نکاح کو فسخ کرکے دونوں کو الگ الگ کر دیا اور فرمایا کہ وہ پہلے خاوند کے پاس نہیں جا سکتی جب تک کہ خوشی سے نکاح نہ کرے اور اس نکاح میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو (روح المعانی) تو جس لعنت کو رسول اللہ صلعم اور صحابہؓ نے دُور کیا تھا وہ آج مسلمانوں کے گلے پڑی ہوئی ہے اور اس کو اتارنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔

نکاح عارضی نہیں ہوسکتا: اگر کسی شخص کا یہ خیال ہو کہ قرآن شریف کے الفاظ سے اس مسئلہ کی تائید ہوتی ہے تو وہ اُصولِ قرآنی سے بے خبر ہے۔ قرآن شریف ایک رات یا مقرر وقت کے نکاح کو جائز ہی نہیں رکھتا۔ نکاح تو قرآن کریم کی اصطلاح میں وہی ہے جو زندگی بھر کے لیے ہو۔ پھر مرد و عورت کی رضامندی نکاح کے لیے ضروری ہے وہ حلالہ کے لعنتی طریق میں کہاں پائی جاتی ہے یہ صریح زناکاری ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کو دور کرنے کے لیے پُورا زور لگائے۔

[۳۰۰] بلغن۔ بلوغ یا بلاغ۔ اصل میں تو کسی مقصد کے انتہا کو پہنچ جانے کا نام ہے مگر کبھی اس کے قریب پہنچ جانے پر بھی بولا جاتا ہے (غ)
یہاں اختتام میعاد کے قریب پہنچنا ہی مراد ہے کیونکہ اگر واقعی میعاد کو پورا کرلیں تو پھر امسکوھن یعنی روک رکھنے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔
اجل۔ کسی چیز کے لیے جو وقت مقرر کر دیا جائے وہ اس کی اجل کہلاتا ہے (غ) یہاں مراد عورت کی عدت ہے۔ یہاں سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک طلاق ایک ہی ہے کیونکہ اس میں رجوع کا اختیار باقی ہے ورنہ عدت گزرنے کو ہو تو روک رکھنا بے معنی ہے۔
عورت کو خاوند کی طرف سے دُکھ ہو تو قاضی طلاق دلوا سکتا ہے: دوسری بات جو اس آیت سے ظاہر ہے یہ ہے کہ عورت کو دکھ دینے کے لیے روک رکھنا ناجائز ہے پس وہ تمام حالات جن میں عورتوں کو محض دکھ دینے کے لیے روک رکھنا ثابت ہو ایسے ہیں کہ قرآن شریف کے ماتحت قاضی طلاق دلوا سکتا ہے کثرت سے ایسے واقعات ہیں کہ جن میں خاوند یہ کہہ کر عورتوں کو معلقہ چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم نہ تمہیں طلاق دینگے نہ بسائیں گے۔ یہ قرآن شریف کے ساتھ ہنسی ہے

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾
وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ
كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ
وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ
بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا
تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ
بِوَلَدِهٖ ۗ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ
اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا

(کی بات) ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔[۳۰۱]
اور مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دُودھ پلائیں، اس
کے لیے جو دودھ پلانے کے زمانہ کو پورا کرانا چاہتا ہے
اور جس کا بچہ ہے اس پر اچھے طور پر ان کا کھانا اور ان کا
کپڑا ہے۔ کسی شخص پر بوجھ نہیں ڈالا جاتا مگر جہاں تک اس کی طاقت
ہے نہ ماں کو اپنے بچّے کی وجہ سے تکلیف دی جائے اور نہ باپ کو
اپنے بچّے کی وجہ سے اور وارث پر بھی ایسی ہی (ذمہ داری) ہے۔
پھر اگر وہ دونوں آپس کی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا
چاہیں تو اُن پر کوئی گناہ نہیں[۳۰۲]، اور اگر تم چاہتے ہو کہ اپنی اولاد کے

جیسا کہ اس آیت میں صاف فرمایا۔

ع۳۰۱ تعضلوھن۔ عضل کے اصل معنی ہیں عَضَلَۃ (سخت گوشت جو پٹھے میں ہوتا ہے) کے ساتھ باندھنا اس لیے سختی کے ساتھ روکنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ)

ازکیٰ۔ اطھر۔ ذکا کے معنی میں برکت اور نشو ونما کا خیال غالب ہے اور طھر کے معنی میں نجاست وغیرہ مانع ترقی اشیاء سے پاک ہونا۔

دیکھو ع۶۶ و ع۲۸۵۔

طلاق میں عدت گزرنے پر پہلے خاوند اور بیوی کا نکاح جائز ہے: جس طرح طلاق کے بعد عدت کے اندر رجوع کا حق حاصل ہے اسی طرح عدّت گزر جانے پر پھر اسی خاوند اور بی بی کا نکاح بھی جائز ہے۔ چنانچہ یہی معنی حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ یہ آیت ایسے شخص کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جو اپنی بی بی کو ایک بار یا دو بار طلاق دے چکا ہو۔ پھر اس کی عدت گزر جائے تب وہ یہ چاہے کہ پھر اس سے نکاح کرے۔ صحیح بخاری میں معقل بن لیسار کا واقعہ بھی اسی معنی کی وضاحت کرتا ہے معقل کی ہمشیرہ کو ان کے خاوند نے طلاق دیدی، جب اس کی عدّت گزر گئی تو پھر دوبارہ اس نے نکاح کی خواہش ظاہر کی۔ معقل نے انکار کیا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی تو معقل نے اپنی ہمشیرہ کا نکاح پہلے خاوند سے کر دیا۔ بی بی رضامند تھی۔

تین طلاقوں کا عدم جواز: یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ اکٹھی تین طلاقیں ناجائز ہیں کیونکہ طلاق کے بعد جو میاں بی بی کو پھر دوبارہ نکاح کر لینے کی اجازت اس آیت سے ملتی ہے وہ اکٹھی تین طلاقوں سے باطل ہو جاتی ہے اور اس کو جواز کی اور اطھر کہا تو یہ بھی ظاہر ہے کیونکہ اس کے خلاف کر کے حلالہ کا گند قبول کرنا پڑا۔

ع۳۰۲ یرضعن۔ تسترضعوا۔ اَرْضَعَ دودھ پلایا اور اِسْتَرْضَعَ دودھ پلانے والی کو رکھا۔

تضارّ۔ گو باب مفاعلہ ہے مگر اس باب میں بعض وقت ایک ہی مراد ہوتا ہے پس اس کے معنی ضرر پہنچانا ہی ہیں۔

وعلی الوارث۔ عطف ہے وعلی المولود لہ پر اور وارث سے مراد باپ کا وارث ہے یعنی باپ مرگیا ہو تو کھانے اور کپڑے کی ذمہ واری اس کے وارث پر ہے۔

فصالا۔ فصل ایک چیز کو دوسری سے علیحدہ کرنا اور فصال بچّہ کو دودھ پینے سے علیحدہ کرنا ہے۔

تشاور۔ اس کا اصل شِرْتُ الْعَسَلَ سے ہے یعنی میں نے شہد نکالا پس تشاور اور مُشْوَرَۃ کے معنی ہیں بات کو ایک دوسرے کی طرف لوٹا کر استخراج رائے کرنا یعنی رائے کا نکالنا (غ)

دودھ پلانے کی مدّت: طلاق کے مسائل میں اولاد کو دودھ پلانے کا سوال بالخصوص پیدا ہوتا ہے۔ گو مسئلہ عام طور پر بیان کر دیا ہے گو روٹی اور کپڑا بوجہ دودھ پلانے کے دینا صاف بتاتا ہے کہ اصل ذکر مطلقہ عورتوں کا ہی ہے۔ دودھ پلانے کی مدّت دو سال بیان فرمائی۔ مگر یہ حکم نہیں کہ ضرور اس عمر تک دودھ پلایا جائے کیونکہ خود اس آیت میں ہی فرمایا کہ اگر دونوں چاہیں تو دو سال سے پہلے دودھ چھڑا دیں جیسے کہ مجاہد سے یہ معنی مروی ہیں دو سال کی مدّت دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ ہے اور دودھ پلانے سے جو حرمت رشتوں کی پیدا ہوتی ہے یہ اس کی میعاد ہے۔ دو سال سے زیادہ کے بچّے کو دودھ پلانے سے حرمت پیدا نہیں ہوتی گویا ضمناً یہاں اس طرف اشارہ کر دیا ہے۔

اور دوسری جگہ جو فرمایا وحملہ وفصالہ ثلثون شھرا جس میں حمل اور دودھ چھڑانے کی میعاد اڑھائی سال قرار دی ہے تو یہ اس کے خلاف نہیں اس لیے کہ ادنیٰ مدت حمل چھ ماہ ہے اور اس لیے بھی کہ وہاں ماں کی تکلیف کا ذکر ہے اور حمل کا بوجھ چوتھے مہینہ میں ہی شروع ہوتا ہے اور یوں حمل کی تکلیف چھ ماہ اور دودھ

اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ
اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٣﴾

لیے (اور) دودھ پلانے والی رکھ لو تو تم پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ جو تم نے دینا تھا عمدگی سے پورا دے دو اور اللہ کا تقویٰ کرو اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے ۳۰۲ا

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا
يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ
فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا
فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٣٤﴾

اور تم میں سے جو مر جائیں اور وہ عورتیں چھوڑ جائیں، وہ اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن انتظار میں رکھیں پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے حق میں پسندیدہ طریق پر کریں۔ اور جو تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے خبردار ہے ۳۰۳

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ
خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ
اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ
سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا
عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَ
اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

اور اس کے لیے تم پر کوئی گناہ نہیں جو تم اشارۃً (بیوہ) عورتوں کو پیغام نکاح دو یا اپنے دلوں میں چھپائے رکھو اللہ جانتا ہے کہ تم ان کا خیال رکھو گے، لیکن ان سے خفیہ وعدہ مت کرو ہاں پسندیدہ بات بیشک کہو۔ اور نکاح کی گرہ کو پختہ مت کرو یہاں تک کہ مقرر کیا ہوا وقت اپنی انتہا کو پہنچ جائے اور جان لو کہ اللہ اسے جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے پس اس سے خبردار رہو

پلانا دو سال کل اڑھائی سال ہوئے۔

۳۰۲ا سلمتم۔ تسلیم کا مادہ بھی اسلام کی طرح سلم ہے اور سلم اور سلامۃ تو ظاہری اور باطنی آفات سے محفوظ ہونا ہے (غ) اور سلّم کے معنی وقاہ ہیں یعنی اسے بچا یا (ت) جیسے ولکنّ اللہ سلّم (الانفال۔ ۴۳) اور سلمتہ الیہ کے معنی ہیں میں نے اس کو دیدیا (ت) اور یہی معنی سلّمتم کے یہاں ہیں اور تسلیم اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر راضی رہنے کو بھی کہتے ہیں۔ اور حکم کی پوری پوری فرمانبرداری کو بھی۔ جب اس پر کوئی اعتراض نہ کیا جائے (ت) جیسے ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً ممّا قضیت ویسلموا تسلیماً (النساء۴۔ ۶۵) اور تسلیم سلام کہنے کو بھی کہتے ہیں اور وہ دعا ہے کہ ایک شخص اپنے دین اور نفس میں آفات سے بچا رہے (ت)۔ فاذا دخلتم بیوتاً فسلموا علیٰ انفسکم (النور۲۴۔ ۶۱)

اٰتیتم۔ ایتاء کے اصل معنی دینا ہیں۔ ما اٰتیتم سے مراد عورت کا مہر ہے دیکھو ۲۹۶ خواہ دیدیا ہو یا ابھی دینا ہو۔ مراد یہ ہے کہ کسی دوسری دودھ پلانے والی کے رکھنے سے مطلقہ کے حقوق میں کوئی کمی نہ ہو یا اس کے مہر کا کوئی حصہ واپس نہ لیا جائے۔

۳۰۳ یتوفون۔ مادہ وفی جس کے معنی ہیں بلوغ التمام (غ) یعنی انتہا کو پہنچ جانا۔ وفی العھد اور اوفی کے معنی ہیں عہد کو پورا کیا اور توفیۃ کے معنی پورا دینا اور استیفا کے معنی پورا لینا ہیں (غ) چنانچہ وفیت کل نفس ما کسبت۔ توفون اجورکم۔ توفی کل نفس میں وفی کے معنی (جو توفیۃ یعنی باب تفعیل سے ہے) پورا دیدیا ہے وقد عُبّر عن الموت والنوم بالتّوفّی (غ) یعنی توفّی (باب تفعّل) سے مراد موت اور نیند ہے اور موت اور نیند میں امر مشترک قبض روح ہے سو یہی معنی توفی کے ہیں اور اہل لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ توفاہ اللہ کے معنی قبض روحہ ہی ہیں یعنی اس کی روح قبض کر لی نہ کچھ اور۔

یذرون مادہ وذر ہے مگر اس سے ماضی نہیں آتی مضارع اور امر ہی آتے ہیں۔ اور اس کی مصدر بھی استعمال میں نہیں آتی بلکہ اس کی جگہ لفظ ترک استعمال کرتے ہیں جو اس کے ہم معنی ہے یعنی چھوڑ دینا۔

کچھ مسائل طلاق کا ذکر ابھی باقی ہے اور درمیان میں تعلق دکھانے کے لیے بیوہ عورتوں کا ذکر دیا ہے اور کچھ ذکر بیوہ عورتوں کا پھر بعد میں آئے گا۔

بیوہ کی عدت چار ماہ اور دس یوم ہے لیکن حمل ہو تو اس کی عدت دوسری جگہ مذکور ہے اور وہ وضع حمل تک ہے خواہ چار ماہ سے کم ہو یا زیادہ (الطلاق ۶۵۔ ۴)

اپنے بارہ میں پسندیدہ طریق سے کچھ کرنے سے مراد یا نکاح ہے یا نکاح کی غرض سے زینت وغیرہ کرنا۔ یہاں بیوہ عورت کے نکاح کرنے کو امر معروف قرار دیا گیا ہے جو مسلمان ہندوؤں کی طرح اس سے عار کرتے ہیں وہ قرآن کریم کے صریح حکم کے خلاف کرتے ہیں۔ فیما فعلن میں فعل کو خود ان کی طرف منسوب کرنے میں اشارہ

ع ۳ ۱۴ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ | اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا بردبار ہے ۔ ۳۰۴

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًاۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾

تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دیدو جب کہ تم نے ابھی ان کو چھوا نہ ہو، یا مہر مقرر نہ کیا ہو۔ اور ان کو کچھ سامان دو فراخی والا اپنی قدر کے موافق اور تنگدست اپنی قدر کے مطابق اچھے طریق پر نفع پہنچانا ہے یہ نیکی کرنے والوں پر ایک حق ہے۔ ۳۰۵

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ

اور اگر تم اُن کو طلاق دے دو اس سے پہلے کہ تم نے اُن کو چھوا ہو، اور تم ان کے لیے مہر مقرر کر چکے ہو تو اُس کا آدھا دے دو جو مقرر کیا ہو، مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے (اپنا حق) معاف کر دے اور یہ کہ تم (مرد) معاف کرو تقوٰے سے بہت نزدیک

یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے نکاح کی خود مختار ہیں۔

۳۰۴ عرضتم عرض سے ہے تعریض ذو وجہین کلام کو کہتے ہیں جو صدق پر بھی محمول ہو سکتی ہے اور کذب پر بھی یا ظاہر پر بھی محمول ہو سکتی ہو اور باطن پر بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہر لفظوں میں پیغام نہ دے کہ میں تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں البتہ ایسے لفظ کہدے جیسے یہ کہ تم جمیلہ ہو یا مرغوب ہو جس سے اشارہ پایا جاتا ہو تو ہرج نہیں اور یہ حکم صرف ایام عدت کے لیے ہے۔

خِطبۃ۔ خَطب کلام میں مراجعت کو کہتے ہیں۔ اور خُطبۃ وہ کلام ہے جس میں وعظ ہو اور خِطبۃ وہ جس کا مقصد نکاح کے لیے عورت سے درخواست کرنا ہو (غ)

اکننتم۔ کِنّ وہ ہے جس میں ایک شے کی حفاظت کی جائے اور اس کی جمع اکنان ہے وجعل لکم من الجبال اکنانا (النحل ۱۶۔ ۸۱) اور کَنَنْت کے معنی ہیں کِنّ میں کر دیا یا محفوظ کر دیا جیسے لؤلؤ مکنون (الطور ۵۲۔ ۲۴) بیض مکنون (الصٰفّٰت ۳۷۔ ۴۹) کتاب مکنون (الواقعہ ۵۶۔ ۷۸) اور اکننت دل میں چھپانے سے مخصوص ہے اور وجعلنا علی قلوبھم اکنّۃ ان یفقھوہ (الانعام ۶۔ ۲۵) بنی اسرائیل ۱۷۔ ۴۶، الکھف ۱۸۔ ۵۷ میں اور قلوبنا فی اکنّۃ (حٰمٓ السجدۃ ۴۱۔ ۵) میں اکنّۃ کنان کی جمع ہے اور وہ وہ پردہ ہے جس میں ایک چیز چھپائی جائے (غ)

ستذکرونھن۔ ذکر کے ایک معنی کسی چیز کا خیال دل میں کرنا بھی ہیں (غ)

کتاب۔ یہاں بمعنی ما کُتِبَ ہے اور کُتِبَ کے معنی فُرِضَ ہیں کیونکہ کتاب کے معنی فرض کر دینا بھی آتے ہیں اور مراد عدّت ہے جو فرض کی گئی ہے۔

عدت میں بیوہ کو پیغام: بیوہ کی عدت کے اندر نہ اس سے صراحتاً نکاح کا ذکر کرنا جائز ہے نہ نکاح کا فیصلہ کرنا۔ اشارہ کے طور پر پتہ دینا جائز ہے۔

۳۰۵ تمسّوھن۔ مَسّ چھونا اور کنایۃً عورت کے پاس جانے پر بولا جاتا ہے (غ)

تفرضوا۔ فریضۃ چونکہ کسی چیز پر عمل واجب کر دینا بھی فرض ہے دیکھو ۲۵۳ پس فریضۃ وہ مہر ہے جو واجب کر دیا گیا اور تفرضوا اس کے مقرر کرنے پر کہا گیا ہے اَوْ تفرضوا میں اَوْ بمعنی وَ یا حتیٰ ہے

متعوھن۔ متاع ایک لمبے وقت تک نفع پہنچانا ہے۔ یہاں مراد اس سے وہ چیز ہے جس سے مطلقہ اپنی عدت میں فائدہ اُٹھائے۔

مُقتِر۔ قتر۔ اِسراف کے مقابل پر ہے تھوڑا خرچ کرنے کو کہتے ہیں جیسے لم یسرفوا ولم یقتروا (الفرقان ۲۵۔ ۶۷) کان الانسان قتورا (بنی اسرائیل ۱۷۔ ۱۰۰) یعنی بخیل اور مقتر تنگدست کو کہتے ہیں اور قُتار دھوئیں کو کہتے ہیں جو بھنے ہوئے گوشت یا لکڑی وغیرہ سے اٹھتا ہے اور وہ بھی ایک قلیل یا غیر نافع چیز ہوتی ہے (غ)

طلاق قبل از تقرر مہر: یہاں اس حالت کا ذکر ہے جب میاں بی بی میں خلوت نہیں ہوئی بلکہ مہر بھی مقرر نہیں ہوا (اس سے معلوم ہوا کہ اگر مہر مقرر نہ ہُوا ہو تو نکاح باطل نہیں ہوتا۔ البتہ خلوت سے پہلے مہر کا مقرر ہو جانا یا دیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اگلی آیت میں ہے) اس صورت میں اگر طلاق دینے کی ضرورت پیش آئے تو مہر نہیں دیا جائے گا (اور عدت بھی کوئی نہیں جیسے دوسری جگہ مذکور ہے یعنی عورت کا نکاح دوسری جگہ فوراً طلاق کے بعد ہو سکتا ہے) لیکن ایسی صورت میں بھی کچھ سامان دینا ضروری ہے وہ رقم حالات کے لحاظ سے ہو گی امیر کے لیے زیادہ غریب کے لیے کم خواہ انسان خود

بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (٢٣٧)
حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۤ
وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (٢٣٨)
فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ

ہے اور آپس میں نیک سلوک کرنا نہ بھلاؤ جو تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔[306]
تم اپنی نمازوں اور درمیانی نماز کی محافظت کرو اور اللہ کے فرمانبردار
بن کر کھڑے ہو جاؤ۔[307]
پھر اگر تم کو ڈر ہو تو پیدل یا سوار (جس طرح ہو نماز پڑھ لو)[308] پھر

دیدے یا حاکم مقرر کردے یہ محسنوں یا نیکی کرنے والوں پر بالخصوص ایک حق ہے اور گویا عورت کی دل شکنی کے لیے ایک معاوضہ ہے لکھا ہے کہ نبی کریم صلعم چونکہ طلاق دینے سے بہت کثرت سے روکتے تھے اس لیے لوگوں کو گمان ہوا کہ ایسی صورت میں تو طلاق ناجائز ہوگی تو یہ آیت اتری کیونکہ فی الواقع حالات انسانی کے بعید اختلافات میں ایسی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔

۳۰۶ الذی بیدہ عقدۃ النکاح ۔ چونکہ طلاق دینے یا عقدہ نکاح کو کھولنے کا مجاز خاوند ہے اس لیے اس سے مراد خاوند ہی ہے اور یہی تفسیر نبی کریم صلعم سے مروی ہے (ث ۔ ج)

الفضل ۔ وہ عطیہ جس کا دینا دینے والے پر لازم نہیں دیکھو ۱۳۷ پس یہاں فضل ترک نہ کرنے سے مراد ہوئی ایسے عطایا کا دینا جس کو ہماری زبان میں سلوک کرنا کہتے ہیں۔

طلاق قبل از خلوت جب مہر مقرر ہو چکا ہو: خلوت نہیں ہوئی اور مہر مقرر ہو چکا ہے تو طلاق پر نصف مہر ادا کرنا ہوگا لیکن اس صورت میں عورت کو اختیار ہے کہ بغیر خلع کے بھی چاہے تو مہر چھوڑ سکتی ہے ۔ لیکن زور اسی بات پر دیا ہے کہ رعایت حقوق یہ چاہتی ہے کہ مرد ہی اپنا حق معاف کریں یعنی اس صورت میں نصف نہیں بلکہ پورا مہر دیدیں ۔ جیسا جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک بی بی سے نکاح کیا اور قبل خلوت کے طلاق دیدی تو سارا مہر ادا کیا اور فرمایا کہ مجھ پر زیادہ حق ہے کہ میں اپنے حق کو چھوڑ دوں۔

۳۰۷ محافظۃ ۔ حافظوا باب مفاعلہ سے ہے ۔ مفردات میں ہے کہ باب مفاعلہ کے استعمال میں یہ تنبیہ ہے کہ نماز پڑھنے والے نماز کی حفاظت کرتے ہیں اس کے اوقات کو نگاہ رکھتے ہوئے اور اس کے ارکان کی رعایت کرتے ہوئے اور پورے زور کے ساتھ اس کے قیام میں کوشش کرتے ہوئے، اور نماز اُن کی حفاظت کرتی ہے وہ حفاظت جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے کہ نماز بیحیائی اور بدی سے بچاتی ہے ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر ـــــ (العنکبوت ۲۹ ۔ ۴۵)

الوسطیٰ ۔ وَسَط کا استعمال کبھی مکان کے لحاظ سے ہوتا ہے اور کبھی درجہ کے لحاظ سے یعنی جو چیز افراط و تفریط سے محفوظ ہو کر میانہ ہو (غ) گویا اعلیٰ درجہ کی چیز پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اس چیز پر بھی جو دوسری دو چیزوں کے درمیان ہو۔

مسائل طلاق کے ذکر میں نماز کا ذکر بے ربط خیال کیا جاتا ہے ۔ ذیل کے امور ربط بتاتے ہیں ۔ اول اصل ذکر جنگ کا تھا اور طلاق کے مسائل بھی اسی ذیل میں آئے تھے اور یہاں بھی بالخصوص جنگ کی نماز کا ذکر ہے ۔ جیسے اگلی آیت سے ظاہر ہے دوم طلاق کے مسائل میں بار بار تقویٰ کی ہدایت کی ہے ۔ نماز تقویٰ اللہ کی کنجی ہے اس لیے اس مضمون کو ختم کرنے سے پیشتر اس کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ہے ۔ سوم یہ بتانا مقصود ہے کہ نکاح طلاق وغیرہ سب فروعی مسائل ہیں ۔ اصل جڑ نیکیوں کی نماز ہے پس تعلقات دنیوی میں پھنس کر ذکر الٰہی سے غافل نہیں ہو جانا چاہیئے۔

صلوٰۃ الوسطیٰ نماز عصر ہے: الصلوٰۃ الوسطیٰ کے متعلق بہت بحث ہوئی ہے ۔ بخاری میں نبی کریم صلعم سے مروی ہے حبسونا عن الصلوٰۃ الوسطیٰ حتی غابت الشمس ۔ یعنی (خندق کے دن کفار نے) ہمیں وسط کی نماز سے روک رکھا ۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے نماز عصر کو صلوٰۃ وسطیٰ فرمایا ہے ۔ یہ بلحاظ وقت بھی درمیان میں ہے اور بلحاظ مرتبہ بھی اعلیٰ درجہ کی ہے ۔ کیونکہ کاروبار کا وقت ہے ۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نمازیں پانچ ہیں کیونکہ صلوات جو جمع ہے تین یا زائد پر بولا جائے گا مگر ایک نماز کے وسط میں ہونے کے لیے تعداد جفت چاہیئے یعنی کم از کم چار نمازیں اور ہونی چاہئیں۔

۳۰۸ رکبانا ۔ رکبان ۔ راکب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں سوار اور رُکُوب اصل میں حیوان کی پیٹھ پر چڑھنے کا نام ہے اور پھر ہر سواری پر بولا جاتا ہے جیسے کشتی یا ریل ۔ رجالا ۔ رجال ۔ رجل یا راجل کی جمع ہے جس کے معنے پیادہ چلنے والا ۔ کیونکہ رِجْل پاؤں کو کہتے ہیں۔

حالت خوف میں نماز: جب نماز کی حفاظت کے لیے تاکید فرمائی تو یہ بھی بتا دیا کہ نماز ترک کسی صورت میں نہیں ہو سکتی یہاں تک کہ کسی قسم کا خوف ہو ۔ دشمن کا خوف ہو یا کوئی اور مثلاً یہی کہ انسان ریل پر سوار ہے اور خوف ہے کہ اُتر کر نماز پڑھے تو ریل چلی جائے، تو فرمایا کہ حالت خوف میں بھی نماز ترک نہ کرو ۔ ہاں جس حالت میں ہو اسی حالت میں پڑھ لو ۔ یہاں تک کہ اگر انسان پیدل چل رہا ہے اور ٹھہرنے میں خوف ہے تو اسی حالت میں نماز پڑھ لے اور گھوڑے یا گاڑی یا کشتی یا ریل پر سوار ہے تو اسی حالت میں پڑھ لے ۔ مگر نماز ترک نہ کرے ۔ کتنے مسلمان ریل میں سفر کرتے ہیں اور بالکل فارغ ہوتے ہیں ۔ مگر نماز نہیں پڑھتے۔ جو حکم اس قدر مؤکد تھا اس کی آج کیا گت بنی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک نماز سے بڑھ کر غیر ضروری چیز ہی کوئی نہیں۔

خوف میں نماز باجماعت: دشمن سے خوف کی حالت بھی یہاں آجاتی ہے ۔ گو سورۃ النساء ۴ ۔ ۱۰۱ میں دشمن کے فتنہ کا صریح الفاظ میں ذکر ہے مگر ان دونوں صورتوں

اٰمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

جب امن میں ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تمھیں سکھایا جو تم نہیں جانتے تھے۔ ۳۰۹

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

اور تم میں سے جو مر جائیں اور وہ عورتیں چھوڑ جائیں، اپنی عورتوں کے لیے وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک گھر سے نکالے بغیر خرچ دیا جائے۔ پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں جو انھوں نے بھلائی سے اپنے حق میں کیا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے ع۳۱۰

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا

اور طلاق دی ہوئی عورتوں کو پسندیدہ طور پر فائدہ پہنچانا چاہیے۔

میں فرق یہ ہے کہ وہاں پھر بھی جمع ہو کر نماز پڑھنے کی صورت باقی ہے۔ یہاں ایسی صورت نہیں جس سے معلوم ہوا کہ یہ خوف اس سے بھی زیادہ ہے۔ بالفاظ دیگر جب تک دشمن سے خوف کی صورت میں اجتماع کی حالت میں نماز پڑھنا ممکن ہو۔ سورۃ النساء کی آیت ع۱۰۱ کے مطابق پڑھی جائے۔ اگر اس طرح ممکن نہ ہو تو پھر جس طرح انسان پڑھ سکے پڑھ لے۔ پیدل چلتا ہوا، سوار سواری کی حالت میں۔ اسی کی تائید میں بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے الفاظ ہیں جو اس حدیث کے آخر میں ہیں جس میں ایک ایک رکعت نماز باجماعت پڑھنے کا اور دوسری اپنی جگہ پوری کرنے کا ذکر ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر خوف اس سے زیادہ ہو تو پھر پیدل یا سوار قبلہ کی طرف یا غیر قبلہ کی طرف جس طرح ہو نماز پڑھ لو۔

ع۳۰۹ امنتم۔ امن کے اصل معنے ہیں خوف کا جاتے رہنا اور اطمینان نفس یعنی بے آرامی کے بعد سکون کا ملنا (غ)

نماز ذکر اللہ کی بہترین صورت ہے: اذکروا اللہ۔ ذکر کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۹۱ اللہ کی یاد یا اللہ کی ثناء کو یہاں نماز کے قائم مقام رکھا ہے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی اصطلاح میں نماز ہی اللہ تعالیٰ کے ذکر کی اعلےٰ سے اعلےٰ صورت ہے۔

اہل قرآن کی غلطی: جب خوف کی حالت کا ذکر کیا کہ اس میں جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو تو ساتھ ہی امن کی نماز کا بھی ذکر فرمایا کہ پھر وہ اس تعلیم کے مطابق ہو، جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہے جس سے معلوم ہوا کہ امن میں نماز کی صورت اللہ تعالیٰ اس سے پہلے مسلمانوں کو سکھا چکا تھا۔ مگر تعجب ہے کہ جو لوگ اہل قرآن کہلاتے ہیں وہ اس ارشاد خداوندی کے صریح خلاف نماز خوف سے نماز امن کے احکام کا قیاس کرتے ہیں۔ حالانکہ نماز تو مکّہ میں ہی فرض ہوئی تھی جہاں بہرحال اس قسم کا خوف دشمن سے کوئی نہ تھا اور یہ ناممکن ہے کہ نماز کی فرضیت تو مکّہ میں ٹھہرائی گئی ہو لیکن یہ نہ بتایا گیا ہو کہ وہ نماز کس طرح ادا کرنی ہے بلکہ اس کے لیے مسلمانوں کو اس وقت تک انتظار کرنا تھا۔ جب جنگ شروع ہو جائیں اور پھر خدائے تعالیٰ نماز خوف کی صورت بتائے تب وہ اس سے نماز امن کا قیاس کریں۔ لیکن اس آیت نے فیصلہ کر دیا۔ کیونکہ فرمایا کہ نماز امن تو ہم تم کو سکھلا چکے ہیں مگر اس کی تفصیلات تو قرآن شریف میں موجود نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ یہ تعلیم اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی خفی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ اور آپ نے آگے لوگوں کو یہ تعلیم دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کو اللہ تعالیٰ کا اپنی طرف منسوب کرنا صاف بتاتا ہے کہ یہ بھی وحی الٰہی سے تھی۔ مگر چونکہ وہ وحی متلو قرآن شریف میں تو ہے نہیں اس لیے اسے وحی خفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بہرحال یہ خدا کی وحی سے تھا۔ وحی کی اقسام کے لیئے دیکھو الشوریٰ ۴۲ ع ۵۱۔

نماز کی تفصیلات قرآن میں برنگ اشارہ: اور اگر یہ کہا جائے کہ اشارات کے رنگ میں نماز کی رکعات ارکان وغیرہ کا ذکر قرآن شریف میں پہلے بھی ہو چکا تھا۔ تو اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن ان اشارات سے کوئی شخص نماز کی ایک صورت قائم نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہوتا کہ نماز کی ساری تفصیلات کو قرآن کریم میں ہی بیان فرما دے تو جس طرح روزوں کا ذکر ایک جگہ کر دیا۔ طلاق وغیرہ کے احکام کا ذکر ایک جگہ کر دیا۔ اور ان باتوں کو اشاروں پر نہیں چھوڑا اسی طرح نماز اس کے ارکان، اس کی رکعات اس کے اوقات اس کی ترتیب کا بھی ذکر بصراحت ایک جگہ کر دیتا اور یا اگر اشارات ہی دینے تھے تو باقی احکام کے متعلق بھی اشارات ہی ہوتے۔ حالانکہ اگر دوسرے احکام اشارات میں بھی ہوتے تو ہرج نہ تھا وہ فروعی امور تھے اور نماز کو تو عملی رنگ میں اصول دین میں سے قرار دیا ہے اور یہ ہر مومن کو روزانہ پانچ وقت پڑھنی ضروری ہے اور کوئی حکم ایسا نہیں جس کا اس قدر تعلق ہر انسان کی زندگی سے ہو کہ بار بار روز دہرایا جائے۔ پس حق یہی ہے کہ نماز کی اصل ہیئات چونکہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں اور اس کی تفصیلات بہت بسط کی محتاج تھیں۔ اس لیے ان تمام باتوں کو اپنی وحی خفی سے نبی کریم صلعم پر ظاہر کر کے تمام امت کو اس طریق پر تعلیم دیدی۔ اور پھر یہ بھی بتا دیا کہ یہ نماز ہماری سکھائی ہوئی نماز ہے۔ محمد رسول اللہ صلعم کی تجویز کردہ نہیں ہے۔

ع۳۱۰ وصیۃ۔ نصب کی تقدیر یوں ہے۔ یوصون وصیۃ یا کتب اللہ علیہم وصیۃ۔ اور ایک قرأت کتب علیکم الوصیۃ ہے جو اس کی موید ہے۔

بیوہ کے ایک سال متاع کا حکم آیت ورثاء کے خلاف نہیں۔ اس آیت کے معنی ایسے صاف ہیں کہ اس کو منسوخ قرار دینے پر تعجب آتا ہے اس رکوع کا اصل

عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿٢٤١﴾
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ
ع ۳۱ ۱۵ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٤٢﴾ ع
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ
وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ص فَقَالَ لَهُمُ
اللّٰهُ مُوْتُوْا قف ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ
فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٢٤٣﴾

یہ متقیوں پر ایک حق ہے۔
اسی طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے
تاکہ تم سمجھو۔ ۳۱۱
کیا تونے ان کے حال پر غور نہیں کیا جو موت کے ڈر سے
اپنے گھروں سے نکل پڑے اور وہ ہزاروں تھے۔ پس اللہ نے
ان کو فرمایا کہ تم مرجاؤ، پھر ان کو زندہ کیا یقیناً اللہ لوگوں پر
بڑے فضل کرنے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں
کرتے۔ ۳۱۲

مضمون مطلقہ اور بیوہ عورتوں سے احسان ہے۔ پہلی اور آخری آیتوں میں مطلقہ کو متاع دینے یا اس کے ساتھ احسان کا حکم ہے اس میں بیوہ کو متاع دینے یا اس کے ساتھ احسان کا حکم ہے یہ قیاس کہ اس کو ورثہ کی آیت نے بیوہ کو حصّہ وارثت دیکر منسوخ کر دیا اس لیے غلط ہے کہ جب مطلقہ کو مہر سے علاوہ متاع یا سامان دینے کا حکم ہے جیسا کہ آگے آتا ہے تو بیوہ کو حصّہ وراثت کے ساتھ متاع دینے کے حکم میں کیا ہرج ہے مطلقہ کا متاع عدت تک کا خرچ ہے بیوہ کی حالت اس سے زیادہ بیکسی کی ہوتی ہے اس لیے اس کو عدّت سے کچھ زیادہ متاع کا حکم دیا اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ممکن ہے حمل ہو تو اس صورت میں نو دس ماہ حمل کے اور ایک دو ماہ اس کے بعد تکلیف کے کل ایک سال بن جاتا ہے اور مطلقہ کے لیے بھی تو حکم ہے کہ اگر حمل ہو تو وضع حمل تک اس کے اخراجات برداشت کیے جائیں۔ (الطلاق ۶۵-۶)

اسی طرح یہ آیت آیت ۲۳۴ع کے مضمون کے بھی خلاف نہیں، کیونکہ وہاں بیوہ کی عدت چار ماہ دس یوم بتائی ہے، تو یہاں عدت کو منسوخ نہیں کیا بلکہ یہاں متاع کا ذکر ہے جو بیوہ کو دیا جائیگا ہاں یہ سچ ہے کہ وہ متاع اسی صورت میں ہے جب بیوہ نکاح نکرے۔ کیونکہ جب نکاح کرلے گی تو پھر اس کا دوسرا کفیل پیدا ہوجائیگا۔ اسی لیے اس آیت میں صاف فرمادیا ہے کہ اگر بیوہ عدّت پوری کرکے خود نکل جائے اور نکاح کرلے تو پھر اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں فی ما فعلن فی انفسھن من معروف میں صاف نکاح کی طرف اشارہ ہے۔ پس وصیت صرف عورت کی ضرورت کے لیے ہے۔ اگر اس کو ضرورت نہیں تو وہ اختیار رکھتی ہے کہ اس سے فائدہ نہ اُٹھائے

نسخ اور عدم نسخ کے اقوال: رہا یہ کہ روایات میں اس آیت کی منسوخی کا ذکر ہے تو ساتھ ہی اسکی عدم منسوخی کا بھی ذکر ہے۔ اوّل تو جب تطبیق معنی ہوگئی تو خواہ کسی صحابی کا بھی قول ہو کہ یہ آیت منسوخ ہے وہ روایت صحیح نہیں مانی جائے گی اور اگر اس کو صحیح مانا جائے تو صحابی کی غلط فہمی ہوسکتی ہے۔ دوسرے جب دو متضاد اقوال موجود ہوں تو کیا وجہ ہے کہ منسوخی کے قول کو صحیح مانا جائے اور غیر منسوخی کے قول کو صحیح نہ مانا جائے چنانچہ جہاں ابن زبیر کا قول منسوخی کے متعلق ہے وہیں بخاری میں مجاہد کا قول غیر منسوخی کا موجود ہے جو فرماتے ہیں کہ پہلے آیت ۲۳۴ع نازل ہوئی اور وہ عدت اس کے خاوند کے اہل کے نزدیک گنی جاتی تھی۔ فانزل اللہ والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیۃ لازواجھم متاعاً الی الحول غیر اخراج یعنی اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی پس جب یہ آیت بعد میں نازل ہوئی تو اس کا منسوخ ہونا بے معنی ہے۔ پھر اس کا نزول ہی بے معنی ہے کیونکہ جس آیت کو ناسخ کہا جاتا ہے وہ پہلے نازل ہوچکی تھی پھر مجاہد نے صاف الفاظ میں اسے غیر منسوخ بھی قرار دیا ہے جس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ محض عورت کو اختیار دیا گیا ہے وہ چاہے اس سے فائدہ اُٹھائے چاہے نہ اٹھائے پس یہ منسوخ کیونکر ہوئی۔ بلکہ نسخ کے قول کو لاکر پھر عدم منسوخی کے دلائل لانے سے امام بخاری نے اپنا مذہب بھی عدم نسخ کا ہی ظاہر کیا ہے۔

اور حدیث لاوصیۃ لوارث بھی جو خود احاد میں سے ہے قرآن کریم کی اس صریح تعلیم کی ناسخ نہیں ہوسکتی بلکہ خود اس حد بندی کے ماتحت مانی جائیگی جو قرآن شریف نے یہاں کردی۔ یعنی بیوہ کے لیے ایک سال تک نان ونفقہ اور مکان کی وصیت جائز ہے البتہ تعامل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم کے رنگ میں نہیں بلکہ محض سفارش کے رنگ میں فرمایا گیا ہے یا اجازت کے رنگ میں کہ اگر خاوند ایسی وصیّت کرے تو جائز ہے۔

ع۳۱۱ ان آیات سے ثابت ہے کہ ہر قسم کی مطلقہ عورتوں کو سامان دینا چاہیئے اور یہ مزید بطور احسان ہے۔ جو لوگ دوسروں کے حقوق کی پوری رعایت کرنے والے ہیں ان پر یہ بھی ایک حق ہے اس لیے فرمایا حقاً علی المتقین۔

ع۳۱۲ الم تر تعجب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس واقعہ پر استعمال ہوتا ہے جو کمال شہرت حاصل کرچکا ہو اور مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ مخاطب اس امر پر غور کرے کیونکہ روئیت جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے۔ کئی طرح پر ہے۔ آنکھ سے۔ تخیل سے۔ فکر سے۔ عقل سے اور لکھا ہے کہ صلہ الی ہو تو اس

وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان لو کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۳۱۳

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

کون ہے جو اللہ کے لیے اچھا مال الگ کرے تو وہ اسے اس کے لیے کئی گنا بڑھاتا ہے اور اللہ گھٹاتا اور بڑھاتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۳۱۴

کے معنی ہوتے ہیں ایسی نظر جس سے اعتبار یعنی غور کرنا مقصود ہو۔ ابن جریر نے بھی اس کو رویۃ القلب ہی قرار دیا ہے۔

دیار۔ دار کی جمع ہے اور دار منزل کو کہتے ہیں یعنی جہاں کوئی شخص رہتا ہے۔

الوف۔ الف کی جمع ہے جس کے معنی ہزار ہیں۔ کیونکہ الف ایسے اجتماع کو کہتے ہیں جس میں اتحاد ہو۔ اور ہزار میں گویا اعداد کا اجتماع ہوتا ہے (رغ) ابن زید الوف کو الف کی جمع قرار دیکر اس کے معنی مؤتلفی القلوب کرتے ہیں (ر) یعنی ھم الوف کے معنی ہوئے وہ اجتماع و اتحاد کی حالت میں نکلے یا قوم کی قوم یا جماعت کی جماعت نکل پڑی۔

بنی اسرائیل کا مصر سے خروج اور اس کا ذکر قرآن کریم میں۔ اصل مضمون ضرورت جنگ پر ہے۔ اگلی آیت میں یہ صراحت ہے اور سارے رکوع کا مضمون یہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسی قوم تھی جو گھروں سے نکلی؟ مفسرین کہتے ہیں داوردان کے رہنے والے تھے طاعون سے بھاگے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو مار کر پھر زندہ کیا تاکہ ان کو معلوم ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ دوسرا قول ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک قوم تھی ان کے بادشاہ نے ان کو جہاد کی طرف بلایا انہوں نے انکار کیا خدا نے انہیں آٹھ دن تک مار کر پھر زندہ کیا۔ تاریخی ثبوت ان میں سے کسی کا نہیں۔ البتہ دوسری توجیہ مضمون رکوع کے مطابق ہے مگر الم تر بتاتا ہے کہ یہ کوئی بڑا مشہور واقعہ ہے اور یہ واقعہ جو مفسرین نے لکھا ہے نہ صرف غیر مشہور ہے بلکہ اس کی اصلیت ہی کوئی نہیں۔ وہ واقعہ جس کی طرف قرآن کریم نے توجہ دلائی ہے کوئی مشہور تاریخی واقعہ ہونا چاہیئے فی الحقیقت ایسا ہی ہے اور خرجوا کا استعمال اس کی تعیین کرتا ہے کیونکہ ساری تاریخ میں خروج کا ایک ہی واقعہ ہے جس کو سب لوگ جانتے ہیں۔ یعنی بنی اسرائیل کا خروج مصر سے جس کا ذکر حضرت موسیٰ کی کتاب میں ہے جس کا نام ہی خروج ہے قرآن کریم نے وہی لفظ خرجوا اختیار کرکے اس مشہور واقعہ کا صاف پتہ بتا دیا ہے۔ دوسری تعیین اس کی لفظ الوف سے ہوتی ہے کیونکہ بنی اسرائیل کے سوائے جن کی تعداد بائبل میں چھ لاکھ لکھی ہے ہزاروں کی تعداد میں اور کسی قوم کا خروج ثابت نہیں۔ الوف کے دوسرے معنی جماعت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ بنی اسرائیل پر ہی صادق آتا ہے کیونکہ کتاب خروج میں ان کو بار بار جماعت کے نام سے پکارا گیا ہے اور یہ امر کہ یہ حضرت موسیٰ کے زمانہ کے بنی اسرائیل کا ذکر ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دو آیتیں چھوڑ کر جو اس مضمون کے متعلق ہیں پھر صاف الفاظ میں "موسیٰ کے بعد" کے بنی اسرائیل کا ذکر کیا ہے۔ یہ تیسرا قرینہ ہے اور جو تھا یہ کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ کے ساتھ نکل کر جنگ کرنے سے انکار کیا اور چالیس سال جنگل میں بھٹکتے رہے جو قومی موت تھی پس یہ جہاد کا انکار تھا اور یہی مضمون رکوع کا ہے۔

بنی اسرائیل کی موت اور زندگی: آیت کے دوسرے الفاظ بھی اس مفہوم کے خلاف نہیں بلکہ موافق ہیں مصر کو جہاں سے بنی اسرائیل نکلے تھے۔ دیارھم کہا اس لیے کہ چار سو سال سے وہاں ان کی بود و باش تھی بلکہ وہ تو ان کے لیے بمنزلہ وطن ہی تھا۔ الوف کی تشریح ہوچکی ہے حذر الموت موت کے خوف سے نکلے وہ موت فرعون کی غلامی تھی جو اُن کو کمزور کرکے ادنیٰ اور بیگار کا کام لیکر ان کو ذلت کی موت مارنا چاہتا تھا۔ جعل اھلھا شیعا یستضعف طائفۃ منھم یذبح ابناءھم و یستحی نساءھم (القصص ۲۸-۴) اور شروع سورۃ میں یسومونکم سوء العذاب آہی چکا ہے۔ پس یقیناً وہ موت کے خوف سے نکلے تھے۔ تو پھر فقال لھم اللہ موتوا کس طرح ہوا؟ جب انہوں نے حضرت موسیٰ کے ساتھ ہو کر جنگ کرنے سے انکار کیا تو حکم ہوا فانھا محرمۃ علیھم اربعین سنۃ یتیھون فی الارض (المائدۃ ۵-۲۶) چالیس سال تک اس سرزمین دعدہ سے جوان کی حیات قومی کا موجب ہونے والی تھی، محروم کر دیئے گئے، بیابان میں بھٹکتے رہے اور بائبل میں لکھا ہے کہ وہ نسل ہلاک ہوگئی گنتی ۱۴: ۲۹-۳۰، اور اس کے ساتھ ہی ہے کہ تمہاری دوسری نسل یعنی تمہارے بچے اس زمین میں داخل ہونگے۔ سو یہ ان کی موت تھی ثم احیاھم۔ پھر ان کو زندہ کیا کیونکہ آخر کار وہ اس موعود سرزمین میں داخل ہوئے اور ایک بڑی قوم بنے۔ فاتح اور حکمران ہوئے اعلیٰ اخلاق سے متصف ہوئے۔ یہی قوم کی موت اور زندگی ہوتی ہے۔

۳۱۳ تاریخ اسرائیل سے مسلمانوں کے لیے سبق: بنی اسرائیل کے واقعات کے اندر مسلمانوں کو یہ حکم دینا بتاتا ہے کہ یہ ذکر کہانیوں کے طور پر نہیں بلکہ بتایا کہ تم بھی اگر خدا کی راہ میں جنگ کرنے سے انکار کرو گے تو موت وارد ہوگی۔ سو مسلمان جب غافل ہوگئے تو دوسری قوموں نے انہیں دبانا شروع کر دیا جس کا نتیجہ موجودہ موت ہے۔ نبی کریم صلعم کے صحابہؓ نے قرآن کریم سے فائدہ اُٹھایا۔ اور جنگ کے موقعہ پر گو وہ بہت تھوڑے تھے اور دشمن بہت زبردست، عرض کیا کہ ہم حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کی طرح نہیں کہتے بلکہ ہم آپ کے حکم کے ماتحت چلیں گے جہاں آپ لے جائیں۔

۳۱۴ یقرض۔ قرضا۔ قرض اصل میں ایک قسم کا کاٹنا یا قطع کرنا ہے تقرضھم ذات الشمال (الکھف ۱۸-۱۷) میں سورج کے غار کو سایہ میں چھوڑ کر آگے نکل جانے پر

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ
بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا
مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ
عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا
تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِىْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ
اَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا
اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾
وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ
طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ
عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ
يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ

کیا تو نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں رکے حال) پر
غور نہیں کیا جب انھوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ ہمارے لیے
ایک بادشاہ مقرر کر دو، تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ اس نے کہا
کہ تم سے کچھ بعید نہیں کہ اگر جنگ کرنا تم پر ضروری ٹھہرایا گیا تو
جنگ نہ کرو، انھوں نے کہا کہ ہمارا کیا عذر ہے کہ ہم اللہ کی
راہ میں جنگ نہ کریں حالانکہ ہم اپنے گھروں سے اور اپنے بیٹوں سے
جدا کیے گئے ہیں پھر جب ان کے لیے لڑائی کرنا ضروری ٹھیرایا گیا ان
میں سے تھوڑوں کے سوائے رباقی) پھر گئے اور اللہ ظالموں کو جانتا ہے ۳۱۵ع
اور ان کے نبی نے انھیں کہا کہ اللہ نے تمھارے لیے طالوت کو
بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسے ہم پر بادشاہی کس طرح
مل سکتی ہے اور ہم اس کی نسبت بادشاہی کے زیادہ حق دار ہیں،
اور اسے مال کی فراخی نہیں دی گئی۔ رنبی نے) کہا اللہ نے اُسے تم پر

یہ لفظ بولا گیا ہے۔ قرض جسکو ہماری زبان میں ادھار کہتے ہیں اس کے معنی ہیں وہ مال جو انسان کو دیا جائے اس شرط پر کہ اس کا بدل لوٹایا جائیگا رغ) اس لیے اس کا استعمال ہر اس فعل پر ہوتا ہے جس کا بدلہ دیا جائے۔ تاج العروس میں ہی کہ قرض جو اصل میں قطع کرنے کو کہتے ہیں اس سے حسب مراتب بہت سے معانی نکل آئے ہیں اور جوہری کا قول نقل کیا ہے کہ قرض وہ ہے نیکی سے ہو یا بدی سے جسے تم نے پہلے کیا ہے یعنی جس کا کوئی بدلہ ملنے والا ہے۔ اس پر امیۃ بن ابی الصلت کا شعر بطور شہادت پیش کیا ہے۔ کل امرئ سوف یجزی قرضه حسنا۔ او سیئا مدینا مثل مادانا۔ اور لکھا ہے کہ عرب کا محاورہ ہے وہ کہتے ہیں لك عندی قرض حسن وقرض سیئ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ تم نے مجھ سے کوئی اچھا یا برا فعل کیا ہے جس کا اچھا یا بُرا بدلہ تمہیں ملیگا۔ واصل القرض ما یعطیه الرجل او لفعل لیجازی علیه یعنی اصل قرض یہ ہے جو آدمی دے یا کرے تاکہ اسے اس پر بدلہ ملے اور اس آیت میں لفظ قرض کے معنی ابو اسحاق سے نقل کیے ہیں کہ وہ ہر وہ فعل ہے جس پر جزا چاہی جائے اور اخفش سے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع اور اس کی فرمانبرداری میں نیک کام کرے کیونکہ جب کوئی شخص دوسرے کے ساتھ کوئی بھلائی کرے تو عرب کے لوگ کہتے ہیں۔ قد احسنت قرضی یا قد اقرضتنی قرضا حسنا۔ اور بیضاوی میں ہے کہ اللہ کا قرض مثال ہے ایسے عمل کے آگے بھیجنے سے جس پر ثواب کی امید ہو اور اسی میں ہے کہ قرض حسن مجاہدہ اور انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

یضاعف۔ اضعاف۔ ضِعْف کی جمع ہے اور کسی چیز کا ضعف وہ ہے جو اسے دوچند کر دے اور ضاعف کے معنی ہیں ایک چیز کے ساتھ اس کی ایک مثل یا کئی مثلیں زیادہ کر دیں یا دوچند کیا یا کئی گنا کیا رغ) اور ضَعْف اور ضُعْف کے معنی کمزوری ہیں۔

یقبض۔ قَبْض کے اصل معنی ہیں پورے ہاتھ کے ساتھ کسی چیز کا لے لینا۔ اور اس کا استعمال دونوں طرح پر ہے یعنی ایک چیز کو دوسرے سے لیکر اپنے پاس رکھنا یا ایک چیز دوسرے کو دینے سے ہاتھ روک لینا۔ امام راغب نے یقبض ویبصط کی کئی توجیہات کی ہیں۔ اللہ کبھی ایک چیز لے لیتا ہے کبھی دیدیتا ہے۔ یا ایک قوم سے لے لیتا ہے اور ایک کو دیدیتا ہے۔ یا کبھی مارتا ہے، کبھی زندہ کرتا ہے اور ایک معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیکی کو اپنی طرف لے لیتا ہے پھر اس کو بڑھاتا ہے۔

یبصط۔ اصل بسط ہے جس کے معنی ایک چیز کا پھیلانا اور اس کو وسعت دینا ہیں۔

پہلی آیت میں جنگ کا حکم دیا اب انفاق فی سبیل اللہ کا مجاہدات نیک عمل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ فرماتا ہے کہ جو اعمال للّٰہی ایثار کے رنگ میں کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کبھی ضائع نہیں کرتا بلکہ انہیں بہت بڑھاتا ہے اضعافا کثیرۃ کا بڑھانا گویا بیحد وحساب اجر دینا ہے۔ اسلام کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔ مفصل ذکر انفاق کا آگے آتا ہے۔ آخر پر الیہ ترجعون اس لیے فرمایا کہ مال کمانے کو زندگی کی غرض نہ سمجھ لینا۔

ع۳۱۵ الملاء۔ ملاء کے اصل معنی بھرنا ہیں۔ ملئ الارض ذھبا رال عمران ۳۔ ۹۰) اور مَلَاء اس جماعت کو کہتے ہیں جو ایک رائے پر جمع ہوں۔ پس آنکھوں کو تازگی اور نظارے سے بھر دیں اور نفسوں کو خوبصورتی اور جلال سے رغ)

اصۡطَفٰىهُ عَلَيۡكُمۡ وَزَادَهٗ بَسۡطَةً فِى الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ‌ؕ وَاللّٰهُ يُؤۡتِىۡ مُلۡكَهٗ مَنۡ يَّشَآءُ‌ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۴۷﴾

برگزیدہ کیا ہے اور علم اور جسم میں اس کو بہت بڑھایا ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنا مُلک دیتا ہے اور اللہ فراخی والا جاننے والا ہے[ع۳۱۶]۔

وَقَالَ لَهُمۡ نَبِيُّهُمۡ اِنَّ اٰيَةَ مُلۡكِهٖۤ اَنۡ يَّاۡتِيَكُمُ التَّابُوۡتُ فِيۡهِ سَكِيۡنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوۡسٰى وَاٰلُ هٰرُوۡنَ تَحۡمِلُهُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ ‌ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّکُمۡ اِنۡ

اور اُن کے نبی نے انھیں کہا کہ اس کی بادشاہی کا نشان یہ ہے کہ تمھارے پاس تابوت آئے جس میں تمھارے رب کی طرف سے سکون اور اس کا بقیہ ہے جو موسیٰ کے سچے تابعداروں اور ہارون کے سچے تابعداروں نے چھوڑا ہے فرشتے اُسے اُٹھائے ہوں گے[ع۳۱۷] یقیناً

البعث ۔بَعث کے اصل معنی کسی چیز کا اُٹھانا اور سامنے لانا ہیں ۔مردوں کے اُٹھنے نیند سے اُٹھنے نبیوں کے بھیجا جانے کسی کے کسی کام پر مقرر کیا جانے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے (رغ)

مَلِکا ۔ مَلِکْ وہ ہے جو لوگوں کے معاملہ میں امر و نہی پر متصرف ہو اور یہ انسانوں کی سیاست سے مخصوص ہے ملك الناس کہا جاتا ہے ملك الاشیاءً نہیں ۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بادشاہ کا تصرّف لوگوں پر ایک محدود تصرف ہے ۔مالک کی طرح نہیں جس کا تصرف تام ہے دیکھو ع۳ ۔

عسیتم ۔ عسیٰ خواہش اور امید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے طمع اور ترجّی کے لیے (رغ) اور یہ افعالِ مقاربہ میں سے ہے ۔امر محبوب میں امید دلانے کے لیے اور امر مکروہ میں ڈرانے کے لیے آتا ہے (ت)

سموئیل کا ذکر اور مسلمانوں کو نصیحت؛ یہاں سے بنی اسرائیل کی ایک مثال شروع کی ہے جو حضرت داؤدؑ کے ذکر پر ختم ہوتی ہے یہ نبی جس کی طرف یہاں اشارہ ہے سموئیل تھے دیکھو ا سموئیل ۸ : ۱۸ و ۱۹ ۔اس وقت بنی اسرائیل فلستیوں سے مغلوب ہو چکے تھے اور کئی دفعہ شکستیں کھا کر ان کے ہزارہا آدمی کٹ چکے تھے قد اخرجنا من دیارنا سے مغلوب ہو کر ملک دے بیٹھنا اور من ابناءنا سے آدمیوں کا کٹ جانا یا غلامی میں لیا جانا مراد ہے ۔یہ تاریخی مثال اس رکوع کے باقی حصّہ میں اور کچھ اگلے رکوع میں مذکور ہے ۔غرض مسلمانوں کو سمجھانا تھا جو اپنے گھروں سے نکل چکے اور اپنے عزیز و اقارب سے الگ ہو چکے تھے کہ اب سوائے جنگ کے تم زندہ نہیں رہ سکتے ۔یہ بھی سمجھایا کہ دشمن کی کثرت سے مرعوب نہ ہونا۔

ع۳۱۶ بسطۃ کے معنی سعۃ یا فراخی ہیں ۔بخاری میں بسطۃ کے معنی زیادۃ و فضلا دیئے ہیں۔

طالوت ۔بائبل میں اس بادشاہ کا نام ساؤل لکھا ہے ۔قرآن شریف نے طالوت استعمال کیا ہے جو طول سے مشتق ہونے کی وجہ سے قد کی لمبائی پر دلالت کرتا ہے اور ساؤل قد میں بھی سب سے لمبا تھا ۔ا سموئیل ۱۰ : ۲۳ ساؤل پر اعتراضات کا ہونا بھی بائبل سے معلوم ہوتا ہے ۔ ا سموئیل ۹ : ۲۱ اور ۱۰ : ۲۷ ۔

بادشاہ کے انتخاب کے اصول: لوگوں کا اعتراض یہ ہے کہ یہ بادشاہ اس لیے نہیں ہو سکتا کہ اس کا کوئی خاص حق بادشاہت کے لیے نہیں ۔یعنی بادشاہت کے خاندان سے نہیں اور نہ مال و دولت اس کے پاس زیادہ ہے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ان اللّٰہ اصطفٰہ علیکم یعنی اللہ نے نیکی کی وجہ سے اُسے تم پر برگزیدہ کیا ہے اور دوسرے اس کو علم زیادہ دیا ہے ۔تیسرے اس کو جسمانی قوت میں فضیلت ہے ۔بادشاہت وراثت سے نہیں: اس سے معلوم ہوا کہ بادشاہت کے انتخاب میں قرآن کریم ان اصول کو مدنظر رکھنے کی تعلیم دیتا ہے ۔اور وراثت کی بادشاہت یا دولتمند ہونے کے لحاظ سے بادشاہت کا انتخاب اس کے نزدیک ٹھیک نہیں ۔مسلمانوں نے بالکل خلاف تعلیم قرآن اور نمونہ خلفائے راشدین بادشاہت کو وراثت قرار دیا ۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ بجائے قوت کا موجب ہونے کے کمزوری کا موجب ہو گئے ۔کیونکہ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہے کہ بادشاہ بنانے کی اصل غرض یہ ہے کہ وہ قوم کو دشمن کے مقابل میں قوی بنائے لیکن بادشاہت جب بطور وراثت آجاتی ہے تو عیش پسندی کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے اور اصل غرض مفقود ہو جاتی ہے ۔پس بادشاہت یا امارت انتخاب سے ہے وراثت سے نہیں ۔اور انتخاب کے اصول یہ ہیں کہ جو شخص نیکی میں بڑھ کر اور علم میں زیادہ اور طاقتور ہو اسے بادشاہ بنایا جائے ۔یہ بھی معلوم ہوا کہ نظم و نسق ملکی کے لیے بادشاہت کی ضرورت بھی ہے یعنی ایک ایسے شخص کی جو نظام حکومت کو قائم رکھنے والا ہو ۔نبوت اور بادشاہت چونکہ عموماً دو الگ الگ منصب رہے ہیں ۔اس لیے باوجود نبی کی موجودگی کے بادشاہ کی ضرورت پڑی ۔

ع۳۱۷ التابوت ۔تابوت کے ایک معنی صندوق مشہور ہیں اور اسے توب سے مشتق کہا گیا ہے کیونکہ چیزیں اس میں لوٹ لوٹ کر آتی ہیں ۔مگر دوسرا قول یہ ہے کہ تابوت کے معنی پسلیاں اور جو کچھ ان کے اندر آ گیا ہے جیسے دل وغیرہ ہیں ۔اور صندوق پر بھی اس کا اطلاق ہو گیا ہے (ت) لسان العرب میں بھی تابوت کے معنی قلب یعنی دل دیئے ہیں اور مثل نقل کی ہے ما اودعت تابوتی شیئاً ففقدتہ میں نے اپنے تابوت یعنی دل کے سپرد کبھی کوئی شئے نہیں کی جسے گم کر دیا ہو اور مفردات میں بھی

۳۲ع ۱۶ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٤٨﴾ ع اس میں تمھارے لیے نشان ہے اگر تم مومن ہو ۳۱۷ء

یہ قول منقول ہے کہ تابوت سے مراد قلب اور سکینت ہے اور جو علم اس میں ہے۔ اور لکھا ہے کہ قلب کو سَفَطُ العِلْم کہا گیا ہے یعنی علم کا ڈبا دراسے حکمت کا گھر اور اس کا برتن اور اس کا صندوق کہا گیا ہے اور قلب کا نام تابوت رکھا جانے کی وجہ سے ہی حضرت عمرؓ نے ابن مسعود کے متعلق کہا کہ وہ ایک برتن ہے جو علم سے بھرا ہُوا ہے۔ تفسیروں میں بھی تابوت کے معنی قلب منقول ہیں۔ بیضاوی میں ہے کہ ایک قول ہے کہ تابوت کے معنی قلب ہیں اور سکینۃ وہ علم ہے جو اس میں ہے اور ایسے تابوت یا دل کے آنے سے منشاء یہ ہے کہ اس کا قلب علم اور وقار کی جگہ ہو جائے گا حالانکہ پہلے ایسا نہ تھا۔

سکینۃ۔ سکن سے ہے اور حرکت کے بعد کسی چیز کے ٹھہر جانے کو سُکون کہتے ہیں۔ پس سکینۃ اطمینان قلب ہے یا مرعوب نہ ہونا اور یہ جو بعض مفسرین نے یوں ہی لکھ دیا ہے کہ وہ ایک شے ہے جس کا سر بلّی کے سر کی طرح ہے۔ امام راغب کہتے ہیں یہ صحیح نہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ سکینت اس حالت کا نام ہے جب انسان کا میلان شہوات کی طرف سے رک جائے۔

بقیّۃ۔ بقاء کسی چیز کی پہلی حالت پر رہنا ہے اور باقیات سے مراد وہ عمل ہیں جن کا ثواب انسان کے لیے باقی رہ جاتا ہے اور بقیۃ اور باقیات کے معنی کل عبادۃ یقصد بھا وجہ اللہ بھی دیئے ہیں (رغ) یعنی ہر ایک عبادت جس کے ساتھ اللہ کی رضا چاہی جائے اور بقیۃ کے معنی تاج العروس میں الحالۃ الباقیۃ من الخیر بھی دیئے ہیں یعنی خیر کی حالت جو باقی رہنے والی ہو۔

موسیٰ اور ہارون دونوں صاحب امت اور صاحب کتاب ہیں: آل موسیٰ وآل ھارون۔ آل کے معنی کے لیے دیکھو ۷۲۔ حضرت موسیٰ اور ہارون دونوں کی علیحدہ علیحدہ آل کا ذکر بتاتا ہے کہ قرآن شریف دونوں کو صاحب اُمت نبی قرار دیتا ہے موسیٰ کی آل وہ لوگ ہوئے جو حضرت موسیٰ کی خاص برکات سے حصّہ لیتے ہیں اور حضرت ہارونؑ کی آل وہ لوگ ہوئے جو حضرت ہارون کی برکات سے حصّہ لیتے ہیں اور دوسری جگہ دونوں کو صاحب کتاب نبی بھی قرار دیا ہے اٰتینٰھما الکتاب المستبین الصّٰفّٰت ۳۷-۱۱۷)

۳۱۷ء بائبل کا تابوت اور توریت و انجیل کا باہم اختلاف: تابوت جس کے یہاں بطور نشان آنے کا ذکر ہے وہ کیا تھا؟ ایک مشہور تابوت وہ ہے جس کا ذکر بائبل کے دونوں مجموعوں یعنی پرانے اور نئے عہدناموں میں پایا جاتا ہے۔ جو لمبائی میں اڑھائی ہاتھ اور چوڑائی اور اونچائی میں ڈیڑھ ڈیڑھ ہاتھ تھا اور اوپر سے خالص سونے میں منڈھا ہوا تھا اور اس کے اوپر سونے کا کلس تھا (خروج ۲۵: ۱۰ اور ۳۷: ۱) اور اس صندوق میں اسلاطین ۸: ۹ کے مطابق "سوا پتھر کے ان دو لوحوں کے جنھیں موسیٰ نے حورب پر اس میں رکھا تھا" اور کچھ نہ تھا۔ مگر عبرانیوں ۹: ۴ کے مطابق "اس میں ایک سونے کا برتن من سے بھرا ہُوا اور ہارون کا عصا جس میں شاخیں پھوٹی تھیں اور عہدنامہ کی تختیاں اور اس پر جلالی کروبی تھے" (اب یہ فیصلہ عیسائی کریں کہ ان دونوں الہامی کتابوں میں سے کونسی غلط ہے) یہ تابوت یا صندوق ایک مرتبہ بنی اسرائیل کے قبضہ سے نکل کر فلستیوں کے قبضہ میں چلا گیا اور کچھ مدت بعد انہوں نے اسے واپس کر دیا اور آخرکار حضرت داؤد اسے یروشلم میں لے آئے اور حضرت سلیمان کے زمانہ میں بیت المقدس میں رکھا گیا اس کے بعد اس کا پتہ نہیں چلتا۔

قرآن میں کس تابوت کا ذکر ہے اور عیسائیوں کا اعتراض: بعض مفسرین نے یہی مذکورہ بالا تابوت مراد سمجھا ہے بعض کہتے ہیں کوئی اور تابوت تھا جو حضرت آدم پر اترا بعض کہتے ہیں وہ تابوت ہے جس میں حضرت موسیٰ کو رکھ کر دریا میں ڈال دیا تھا۔ ان میں سے قول اوّل کو لیکر عیسائیوں نے بزعم خود قرآن شریف کی بڑی بھاری تاریخی غلط بیانی ثابت کی ہے کیونکہ انہوں نے سمجھا ہے کہ یہ تابوت بروئے تاریخ مذکورہ بائبل طالوت سے بہت پیشتر واپس آ چکا تھا پس قرآن الہامی نہ ہُوا۔ حالانکہ اسی تابوت کے قصّہ میں پُرانے اور نئے عہدنامہ میں اتنا بڑا اختلاف موجود ہے اور وہ دونوں الہامی مانے جاتے ہیں اور کبھی کوئی ایماندار عیسائی سوال نہیں کرتا کہ ان میں سے کس کو جھوٹا کہا جائے۔ بہرحال اگر التابوت سے مراد یہی تابوت لیا جائے تو بائبل میں جہاں فلستیوں کے اس تابوت کو لے جانے اور پھر واپس کرنے کا ذکر ہے۔ وہاں سے ہرگز پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے۔ چنانچہ پادری ڈملو کی تفسیر بائبل میں اس کا صاف اعتراف موجود ہے۔ اوّل تو سموئیل کی دونوں کتابوں کے متعلق یہ مسلّم ہے کہ یہ خود کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ ان کا ماخذ کوئی اور ابتدائی تحریر ہے۔ دوسرے تابوت کا ذکر اسموئیل کے پانچویں چھٹے باب میں ایسے بے ربط طریق پر ہے کہ پادری ڈملو اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ تابوت کا ذکر جو پانچویں اور چھٹے باب میں ہے اس سے اس بات کا پتہ نہیں ملتا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے سوائے اس کے کہ یہ جنگ افیک کے بعد کا ہے۔" چھٹے باب کی پہلی آیت میں لکھا ہے کہ "صندوق سات مہینے تک فلستیوں کے ملک میں رہا" اور ساتویں باب کی دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تابوت بیس برس تک قریت یعاریم کے لوگوں کے پاس رہا" اور سارے بنی اسرائیل نے خداوند کے لیے نالے کیے۔" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی وہ مغلوب تھے۔ حالانکہ تابوت کا ان کے درمیان آنا بطور نشان تھا کہ وہ مظفر منصور ہونگے پس یہ واقعات ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ اگر قرآن کریم میں اسی تابوت کا ذکر سمجھا جائے تو چونکہ اس کی واپسی بنی اسرائیل کی فتح وظفر کی نشانی تھی اور فلستیوں پر ان کا فتحیاب ہونا ساؤل یعنی طالوت کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے اس بنا پر قرآن شریف کا بیان ہی صحیح قرار پاتا ہے۔

لیکن لغت اس بات پر شاہد ہے کہ تابوت کے معنی قلب یعنی دل ہیں۔ اور مفسرین نے ان معنوں کو لیا ہے۔ پس قرآن کریم کے الفاظ کا منشاء صرف طالوت کے قلب کی طرف اشارہ کرنا ہی معلوم ہوتا ہے وہ اس پر معترض تھے ان کو بتایا گیا کہ اس کا قلب وہ پہلا سا نہیں۔ خدا کے اس میں سکینت وغیرہ عطا کر دی ہے گویا اسے ایک دوسرا دل دیدیا ہے۔ خود سموئیل ۱۰: ۹ میں ہے" اور ایسا ہُوا کہ جونہی اس نے سموئیل سے رخصت ہو کر پیٹھ پھیری وہیں خدا نے اسے دوسرا

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا

پھر جب طالوت فوجوں کے ساتھ روانہ ہوا، اس نے کہا کہ اللہ نہر کے ذریعے تمہارا امتحان کرنے والا ہے پس جو اس میں سے پانی پی لیگا وہ مجھ سے نہیں ہے اور جو اسے نہ چکھے وہ مجھ سے ہے، مگر وہ جو اپنے ہاتھ سے ایک چُلّو بھر لے، پھر اُن میں سے تھوڑوں کے سوائے (باقیوں نے) اس سے پیا[۳۱۸] پس جب وہ اس سے گزر گیا اور وہ جو ایمان لائے اس کے ساتھ تھے انھوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلے کی طاقت نہیں۔ جنھیں یقین تھا کہ وہ اللہ سے

طرح کا دل دیا" خود الفاظ قرآنی اسی معنی کے موید ہیں۔ یہ تابوت وہ نہیں جس میں الواح ہوں یا من کا طشت ہو بلکہ وہ ہے جس میں سکینت تھی اور سکینت قلب پر ہی نازل ہوا کرتی ہے جیسے فرمایا ھوالذی انزل السکینۃ فی قلوب المومنین (الفتح[۴۸]۔۴) وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی اور اسی سکینت نے ہی دشمن کا رعب ان کے دلوں سے دور کر دیا۔ پھر فرمایا کہ اس میں وہ اچھی باتیں تھیں جو آل موسیٰ یعنی موسیٰ کے برگزیدہ پیروؤں اور آل ہارون یعنی ہارون کے برگزیدہ پیروؤں نے چھوڑیں۔ موسیٰ قوم کے سردار تھے اور ان کے متبعین کامل اسی سرداری کے حقدار۔ ہارون عبادات وغیرہ کراتے تھے خدا نے طالوت کو دونوں اچھی باتوں کا وارث بنا دیا۔ پھر فرمایا تحملہ الملائکۃ اس تابوت کو فرشتے اٹھائے ہوئے تھے۔ حالانکہ بائبل میں اس تابوت کے ذکر میں ہے کہ گائے رتھ میں جوڑ کر اس پر وہ صندوق واپس کیا گیا اور یہ سنت اللہ نہیں کہ فرشتے لکڑی کا صندوق اُٹھائے پھرتے ہوں۔ ہاں قلب کے حامل ملائکہ ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ لسان العرب میں حدیث کا یہ ٹکڑا درج کیا گیا ہے نزلت علیھم السکینۃ تحملھا الملائکۃ یعنی ان پر سکینت نازل ہوئی جس کو فرشتے اُٹھائے ہوئے تھے۔

ع۳۱۸ جُنُوْد۔ جُند کی جمع ہے لشکر کو کہتے ہیں اور ہر ایک جماعت کو بھی۔ جنود ابلیس، جنود ربک۔ اور یہ جُند سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں سخت زمین جس میں پتھر ہوں۔

نَھَر۔ نَھْر اور نَھَر پانی پینے کی جگہ اور نَھَر کے معنی فراخی یا وسعت بھی ہیں (غ) فی جنات ونھر (القمر[۵۴]۔۵۴) کی تفسیر میں ہے کہ اس سے مراد فراخی اور روشنی بھی لی جا سکتی ہے (ل) اور نہار یا دن وہ ہے جس میں روشنی پھیل جاتی ہے (غ)

مِنّی سے مراد ہے وہ میرے ساتھیوں میں سے ہے۔ حدیث میں ہے لیس منّا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا۔

یطعمہ۔ طعم کا لفظ چکھنے پر بولا جاتا ہے۔ خواہ کھانے کی چیز ہو یا پینے کی۔

اغترف۔ غرفۃ۔ غَرْف کے معنی ہیں کسی چیز کا اُٹھانا اور لے لینا اور غرفۃ وہ ہے جو اس طرح لیا جائے یعنی چُلّو بھر۔ اور غُرْفَۃ کے معنی عِلّیّۃ یعنی چوبارہ یا بلند عمارت بھی ہیں (غ) اولٰئک یجزون الغرفۃ (الفرقان[۲۵]۔۷۵) لنبوئنّھم من الجنۃ غرفاً (العنکبوت[۲۹]۔۵۸) وھم فی الغرفات اٰمنون (السبا[۳۴]۔۳۷) جو دونوں غرفۃ کی جمع ہیں۔

نہر سے آزمائش: یہ آزمائش ہو سکتا ہے محض اس لیے کی گئی ہو کہ کون شخص بھوک اور پیاس کی شدّت پر صبر کر سکتا ہے اگر مراد اس سے پانی کی نہر لی جائے اور اس طرح پر بہادروں اور دل کے کمزوروں کو الگ الگ کرنا ہو اور ہو سکتا ہے کہ نَھَر سے مراد وسعت اور فراخی ہو۔ کیونکہ یہاں طالوت کی اس فوجکشی کا ذکر ہے جب جالوت کے مقابلہ میں وہ نکلا اور اس سے پہلے ان کو عمالیقوں پر فتح حاصل ہو چکی تھی اور بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا تھا جس کا ذکر اسموئیل کے باب ۱۵ میں ہے اور حالانکہ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ مال غنیمت کو حرام کریں (یعنی تباہ کر دیں اور اپنے استعمال میں نہ لائیں) مگر طالوت کی فوجوں نے اس وقت عمدہ عمدہ مال غنیمت کو لے لیا اور اپنے تصرف میں لائے اور اس کے بعد یہ لوگ پھر فلستیوں کے مقابلہ میں بہت کمزور ہو گئے۔

جدعون کے ذریعہ سے پہلی آزمائش: لیکن اگر نَھَر سے مراد پانی کی نہر بھی ہو تو بھی عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ اس واقعہ کے یہاں لکھنے میں قرآن کریم نے تاریخی غلطی کی ہے صحیح نہیں۔ یہ سچ ہے کہ بروئے بائبل طالوت کے زمانے سے کوئی ڈیڑھ سو سال پیشتر جدعون کو پانی کے ذریعہ سے لشکر کو آزمانے کا حکم ہوا تھا۔ جس کا ذکر قاضیون کی کتاب کے ساتویں باب کے شروع میں ہے "سو تو انہیں پانی پاس نیچے لا کہ وہاں میں تیری خاطر انہیں آزماؤں گا...... اور خداوند نے جدعون کو فرمایا کہ جو شخص پانی چپڑ چپڑ کے کتّے کی مانند پیوے۔ تو ہر ایک ایسے کو علیحدہ رکھ اور ویسے ہر ایک کو بھی جو اپنے گھٹنوں پر جھک کے پیوے"۔ اب قاضیون کی کتاب جس میں یہ واقعہ درج ہے اس کے متعلق بھی یہ امر مسلّم ہے کہ یہ اصلی نہیں بلکہ پُرانے مسودات کی بنا پر لکھی گئی ہے۔ اس لیے اس کے بیان واقعہ پر اس قدر وثوق نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی تاریخی صحت پر شبہ نہ ہو سکے۔ خود اسی واقعہ میں کئی ایک غلط بیانیاں ہیں۔ پادری ڈملو اپنی تفسیر بائبل میں اعتراف

اللّٰہِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾	ملنے والے ہیں وہ بولے بسا اوقات چھوٹا گروہ بڑے گروہ پر اللہ کے حکم سے غالب آگیا ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۳۱۹
وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾	اور جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے نکلے، انھوں نے کہا اے ہمارے رب ہم پر صبر ڈال دے اور ہمارے قدموں کو مضبوط رکھ اور کافر قوم پر ہمیں مدد دے ۳۲۰
فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ ۛ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰہُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ	پس اللہ کے حکم سے انھوں نے اُن کو بھگا دیا اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا اور اللہ نے اسے بادشاہی اور حکمت دی اور جو کچھ چاہا اُسے سکھایا ۳۲۱ اور اگر اللہ بعض لوگوں

کرتے ہیں کہ "جن مقامات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ مشتبہ ہیں" اور کوہ جلعاد کے ذکر پر لکھتے ہیں "جلعاد یردن کے مشرق کو ہے یہاں مراد کوئی اور مقام ہونا چاہیئے" پس جب یہ واقعات اس قدر مشتبہ ہیں تو ان کی بنا پر قرآن کریم کے بیان کی تردید کس طرح ہو سکتی ہے۔

علاوہ ازیں خود بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ پکے اور کچے لوگوں میں امتیاز کے لیے اور بھی امتحان ہوئے اور ایک کا ذکر استثناء ۲۰: ۸ میں ہے اس لیے اگر جدعون کے وقت بھی ایسا واقعہ ہوا ہو اور طالوت کے وقت بھی تو کونسا امر بعید ہے۔ ایک کا ذکر بائبل نے کر دیا ایک کا قرآن شریف نے۔ یہ تو شاید کسی عیسائی کو دعویٰ نہیں کہ بنی اسرائیل کی ایسی مکمل تاریخ بائبل میں ہے کہ جس واقعہ کا وہاں ذکر نہ ہو وہ تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ بائبل میں یہ ذکر ہے کہ کتے کی طرح چپڑ چپڑ کر کے پانی پئے۔ قرآن شریف میں ہے کہ ایک چُلّو بھر پانی پئے پیٹ بھر کر نہ پئے۔ یہ کلام زیادہ پُر حکمت ہے۔

ع ۳۱۹ جالوت۔ جال سے ہے اور جال فی الحرب کے معنی ہیں جنگ میں شدّت سے حملہ کیا۔ بائبل میں اس کا نام جاتی جولیت دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ اس قدر شدت سے حملہ آور ہوتا تھا کہ باوجود اس کے بار بار للکارنے کے بنی اسرائیل میں سے کوئی اس کے سامنے نہ نکلتا تھا۔

فئۃ۔ فَیٔ سے ہے جس کے معنے ہیں اچھی حالت کی طرف لوٹ آنا اور فئۃ وہ گروہ ہے جو ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوں اور ان کے بعض بعض کی مدد کے لیے لوٹ لوٹ کر آئیں (رغ)

چھوٹا گروہ بڑے گروہ پر بسا اوقات دنیا میں غالب آتا رہتا ہے۔ یہ لوگ ایک بڑے امتحان میں سے ہو نکلے اور حکم کے ماتحت ہر دُکھ اور تکلیف کے اٹھانے کے لیے عزم کر چکے تھے اس لیے اس بات کے اہل تھے کہ تھوڑے ہونے کے باوجود بھی بہتوں پر غالب آئیں اصل غرض مسلمانوں کو تشفی دینا تھا اور ہے بشرطیکہ وہ صابر بنیں۔ پھر جس صفائی سے تھوڑوں کے بہتوں پر غالب آنے کا نقشہ آنحضرت صلعم کی زندگی میں نظر آتا ہے اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی ہمیشہ دشمن کی کثرت رہی اور مسلمان تھوڑے رہے ہمیشہ سامان زیادہ دشمن کے پاس رہا مگر مسلمانوں میں قوت ایمانی صبر برداشت کی طاقت ان کو نصرت الٰہی کا حقدار ٹھہراتی رہی۔ آج مسلمانوں کی مغلوبیت قوت ایمانی اور صبر ہی کی کمی کا نتیجہ ہے۔

ع ۳۲۰ برزوا۔ بَراز کھلے میدان کو کہتے ہیں اور بَرَزَ کے معنی ہیں کھلے میدان میں آگیا۔ بعض وقت کسی شخص کی جو حالت پہلے چھپی ہوئی ہو اس کے ظاہر ہو جانے پر بھی بَرَزَ بولا جاتا ہے جیسے وبرزوا للہ الواحد القہار (ابراھیم۔ ۴۸) وبرزوا للہ جمیعا (ابراھیم۔ ۲۱) یوم ھم بارزون (المومن۔ ۱۶) (رغ)

افرغ۔ فراغ خلاف شغل ہے اور اَفرَغتُ الدّلو کے معنی ہیں جو پانی اس میں تھا بہا دیا اسی سے اِفراغ کے معنی بہا دینا لیے گئے ہیں (رغ) اور فَرَّغ کے معنے فراخی اور بہانے کے بھی آتے ہیں (ل)۔ یہاں افراغ صبر سے مراد صبر کا ثبات کے ساتھ عطا فرمانا ہے اور صبر سے مراد یہاں استقلال ہے۔

ثبّت۔ ثبات اصل میں خلافِ زوال ہے اور بعض وقت ثبوت یا اِثبات دلائل سے ہوتا ہے اور تثبیت کے معنی قوت دینا ہیں یعنی قوی یا مضبوط کرنا (رغ)

یہاں سے معلوم ہوا کہ دشمن کے مقابلہ میں غلبہ صبر اور ثابت قدمی سے ملتا ہے۔ اس لیے یہ دعا سکھائی جو لوگ ذرا ذرا مقابلہ پر ہمت ہار دیتے ہیں اور پیچھے ہٹ جاتے ہیں وہ غالب نہیں ہو سکتے۔ جنگ میں بالخصوص صبر ہی سب سے زیادہ کام دینے والی چیز ہے۔

ع ۳۲۱ داؤد۔ بنی اسرائیل میں ایک عظیم الشان نبی ہیں جو نبوت کے ساتھ بادشاہت بھی رکھتے تھے ان کا زمانہ ۱۰۱۷ قبل مسیح ہے آپ کے والد کا نام یسی تھا جو بیت اللحم کا رہنے والا تھا۔

بِبَعۡضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الۡاَرۡضُ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۵۱﴾

کو بعض سے دفع نہ کرے تو زمین تباہ ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ جہانوں پر فضل کرنے والا ہے ۳۲۲

تِلۡکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتۡلُوۡہَا عَلَیۡکَ بِالۡحَقِّ ؕ وَ اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۲۵۲﴾

یہ اللہ کی باتیں ہیں، جن کو ہم حق کے ساتھ تجھ پر پڑھتے ہیں اور یقیناً تو مرسلوں میں سے ہے ۳۲۳

الحکمۃ حِکمۃ کے اصل معنی تو علم وعقل کے ساتھ حق کو پالینا ہیں (غ) یا علم وعمل کے ساتھ (ت) اور مختلف موقعوں پر مختلف معنی میں اس کا استعمال ہُوا ہے۔ کبھی کتاب کے مقابلہ پر اس کا استعمال ہوا ہے تو اس سے مراد کتاب کا فہم یا تفصیلات شریعت یا سنت ہیں دیکھو ۱۶۴ یہاں ملک یا بادشاہت کے مقابلہ پر مراد اس سے نبوت ورسالت ہے۔ کیونکہ اس کے معنی نبوت ورسالت بھی آئے ہیں (ت) اور فی الحقیقت نبوت اور رسالت سے بھی انسان حق کو پاتا ہے اور اللہ کی طاعت تفقہ فی الدین اور عمل فہم وخشیت۔ ورع امر اللہ میں تفکر اور اس کا اتباع ان سب معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور حلم کے معنی میں بھی آیا ہے اور قرآن شریف اور توریت اور انجیل پر بھی بولا گیا ہے (ت) اور سدی سے بھی حکمۃ کے معنی نبوت مروی ہیں (غ)

بائبل میں طالوت کے متعلق متضاد بیان: بائبل میں حضرت داؤد کے ساؤل یعنی طالوت کے پاس جانے کے متعلق دو متضاد بیان ہیں دیکھو اسموئیل ۱۶: ۱۸ سے ۲۲۔ اور ۱۷: ۲۶ و ۵۵۔ ۵۸۔ پہلا بیان یہ ہے کہ ساؤل نے داؤد کو بلا کر بربط بجانے پر رکھا تھا اور دوسرا یہ کہ جالوت کے مقابلہ میں دیکھا تو اسے معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے اور یہ امر بائیل کی رو سے مسلم ہے کہ داؤد نے ہی جالوت کو قتل کیا اور ملک اور حکمت دونوں داؤد کو دینے سے منشا یہ ہے کہ بادشاہت اور نبوت دونوں دیئے۔

۳۲۲ دفع۔ دَفع کا صلہ جب الیٰ ہو تو اس کے معنی اِنالۃ یعنی دوسرے کو کسی چیز کا پہنچا دینا ہوتے ہیں جیسے فادفعوا الیھم اموالھم (النساء ۴-۶) جہاں مراد ہے کہ ان کے مال ان کے حوالے کردو اور جب صلہ عن ہو تو اس کے معنی حمایت ہوتے ہیں جیسے ان اللہ یدافع عن الذین اٰمنوا (الحج ۲۲-۳۸) (غ) یہاں دفع اپنے اصل معنی میں ہے الازالۃ بقوۃ (ل) یعنی قوت سے دور کر دینا۔ جس سے مراد لوگوں کی شرارت کا دور کرنا ہے۔

یہاں مذہبی جنگ کی حکمت بیان فرمائی۔ جب شریر لوگ دنیا میں زور پکڑ جاتے ہیں اور حق اور انصاف کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو تباہ کر دیتا ہے اور ذو فضل کہہ کر بتا دیا کہ جنگ ایک وقت فضل ہوتا ہے۔ اس میں نبی کریم صلعم کی جنگوں کی طرف اشارہ ہے اس اصول کی تعلیم کہ جنگ کبھی فضل ہوتی ہے پہلے قرآن شریف نے ہی دی۔

۳۲۳ عیسائیوں کے اعتراض اور قرآن کی حقانیت: اس اور گزشتہ رکوع کی بیشتر باتوں پر عیسائیوں نے تاریخی طور پر غلط ہونے یا گڈ مڈ ہونے کا اعتراض کیا ہے مگر کیسی حقانیت قرآن شریف کی نظر آتی ہے کہ جہاں اعتراض ہونا تھا وہیں خود ہی ان باتوں کا ذکر کر کے فرما دیا کہ یہ جو کچھ پڑھا گیا بالحق ہے یعنی یہ واقعات صحیح بھی ہیں اور ایک ضرورتِ حقہ کے لیے بیان کیے گئے ہیں اور جس قدر ضرورت تھی اسی قدر بیان کیے گئے ہیں۔ ضرورت یہ تھی کہ مسلمانوں کو جنگ درپیش تھی، وہ تھوڑے تھے۔ ان کو سمجھانا مقصود تھا کہ وہ بہتوں پر کس طرح غالب آئیں گے۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ منافق یا کچے لوگ تم سے جنگوں میں الگ ہو جائیں تو یہ تمہارے لیے کمزوری نہیں بلکہ قوت کا موجب ہوگا اور پھر فرمایا کہ ان جنگوں کی ضرورت اب فساد کو دُور کرنے کے لیے ہے۔ لقیناً تو مرسلوں میں سے ہے یعنی خود ان باتوں کو بیان نہیں کرتا بلکہ خدا کی بتائی ہوئی باتیں ہیں اور پھر پہلے بھی رسولوں کو جنگ کرنی پڑی تو اب اس رسول کی جنگوں پر کیا اعتراض ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ
مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ
وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ

اِن رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے[۳۲۴]،
ان میں سے وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کو مراتب میں (اور)
بلند کیا[۳۲۵] اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلے دلائل دیئے اور روح القدس

ع ۳۲۴ تلك ۔ یہ اشارہ ان رسولوں کی طرف ہے جن کا ذکر اسی سورت میں ہو چکا ہے ۔ اور غور کیا جائے تو ما انزل من قبلك میں اور ما اوتی النبیّون من ربھم میں کل دنیا کے انبیاء کا ذکر ہو چکا ۔ پس تلك الرسل میں کل دنیا کے رسولوں کی طرف اشارہ ہے ۔

فضلنا ۔ تفضیل ۔ فَضِیْلَۃ ۔ فضل میں درجۂ بلند ہے اور تفضیل فضیلت کا عطا کرنا یا کسی ایسی صفت یا خصلت کا ایک میں رکھ دینا ہے جو اس کو دوسروں سے ممیّز کر دے (ت)

رسولوں کی فضیلت کا ذکر یہاں کس تعلق سے شروع کیا ؟ پیچھے فرمایا تھا تم رسولوں میں سے ایک ہو اور یہاں فرمایا ان رسولوں کو ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت دی تھی ۔ گویا یوں فرمایا کہ تم رسولوں میں سے ایک ہو اور سب پر فضیلت رکھتے ہو اور یہ کوئی امر مستبعد نہیں اس لیے کہ رسولوں کو ایک دوسرے پر فضیلت ہونے میں کوئی ہرج نہیں ۔ بغیر اس کے سلسلہ مضمون ٹھیک نہیں رہتا اسی کے مطابق روح المعانی میں ہے استئناف مشعر بالترقی کانہ قیل انك لمن المرسلین وافضلھم فضلا اور اصل میں یہ اشارہ یہاں اس لیے کیا کہ متعدد موقعوں پر رسول کریم صلعم کی فضیلت کا ذکر ہو چکا تھا ۔ مثلاً کل جہانوں کی طرف مبعوث ہونے میں پھر قرآن کریم کی سب کتابوں پر فضیلت میں ۔ پھر اس کے پہلی ساری شرائع کے ناسخ ہونے اور ان سے بہتر ہونے میں پھر آنحضرت صلعم کے تمام مذاہب عالم کے جھگڑوں میں فیصلہ کرنے والا ہونے میں اس لیے فرمایا کہ تم جو ان سب رسولوں کی جگہ لیتے ہو ، یہ تمہاری فضیلت لا نفرق بین احد منھم (۱۳۶) کے خلاف نہیں ۔ کیونکہ پہلے رسولوں کو بھی ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے ۔ اور یہاں چونکہ حضرت داؤد کو بادشاہت اور نبوت دونوں دینے کا ذکر آیا تھا ۔ جو دوسرے انبیائے بنی اسرائیل پر ان کی ایک فضیلت تھی ۔ اس لیے رسول اللہ صلعم کی فضیلت کا ذکر کیا کیونکہ آپ کو بھی نبوّت کے ساتھ اب بادشاہت مل رہی تھی ۔ اور ایک کو دوسرے پر فضیلت دینے سے یہ منشاء نہیں کہ وہ دوسرا ناقص ہے ۔ بلکہ دو کامل انسانوں میں جو چیز ایک کو دوسرے سے ممیّز کرتی ہے یا جو کوئی زاید بلند مرتبہ دیا جاتا ہے وہی اس کی فضیلت ہے ۔ گویا کمال انسانی کے بھی مختلف مدارج ہیں ۔

آنحضرتؐ کا جامع کمالات انبیاء بنی اسرائیل ہونا : ایک اور بات اس جگہ یاد رکھنے کے قابل ہے ۔ نبی کریم صلعم کی اس فضیلت کا ذکر سلسلہ موسویہ کے دو عظیم الشان انبیاء داؤد اور عیسیٰ کے درمیان کیا ہے ۔ حضرت داؤد ظاہری شان و شوکت کے لحاظ سے ان انبیاء میں سب سے بڑھ کر ہیں تو حضرت عیسیٰ اخلاقی اور روحانی تعلیم کے لحاظ سے ۔ نبی کریم صلعم ان دونوں پہلوؤں سے دونوں سے بلند تر ثابت ہوئے علاوہ بریں ان دونوں نبیوں نے آنحضرت صلعم کے متعلق جو پیشگوئیاں کی ہیں ان میں آپ کی آمد کو خدا کی آمد قرار دیا ہے دیکھو زبور (۱۱۰) اور متی ۲۱ : ۳۳-۴۴ گویا باوجود اپنے اپنے کمالات ظاہری و باطنی کے انہوں نے آنحضرت صلعم کے کمالات ظاہری و باطنی کو اس بلند مرتبہ پر پایا کہ آپ کی ہر دو شانوں میں ان کو خدا کی شان نظر آئی ۔

آنحضرت صلعم کی یہ فضیلت جس کا ذکر اس لطیف پیرایہ میں کلام الٰہی میں پایا جاتا ہے اس کے برخلاف وہ احادیث نہیں جن میں ایسے الفاظ آتے ہیں کہ مجھے موسیٰ پر فضیلت مت دو ۔ یا یونس پر فضیلت مت دو ۔ کیونکہ اصل میں وہ خاص موقع کی باتیں ہیں ۔ بخاری کی اس حدیث میں جس میں موسیٰ پر فضیلت نہ دینے کا ذکر ہے یہ واقعہ درج ہے کہ ایک صحابی کا ایک یہودی کے ساتھ اسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا اور آپ کو غالباً یہ خیال گزرا ہوگا کہ ایسا نہ ہو کہ اس طرح مقابلہ میں ایک نبی اللہ کی تحقیر ہو جائے ۔

ع ۳۲۵ کلم اللہ ۔ کلام ۔ الفاظ منظومہ کا نام ہے جو معنی رکھتے ہوں دیکھو ع۱۱ اللہ کا کلام کرنا کس طرح ہوتا ہے اس کی تصریح خود قرآن کریم نے الشوریٰ ۴۲ : ۵۱ میں فرمائی ہے جہاں فرمایا کہ صرف تین طرح پر اللہ تعالیٰ کا کلام بندہ کے ساتھ ہوتا ہے ۔ ایک دل میں ڈال کر یعنی وحی خفی ۔ ایک پردہ کے پیچھے سے یعنی رؤیا کشف الہام کی صورت میں ۔ ایک ملک یعنی جبرئیل کو بھیج کر ۔ ان کے علاوہ اور کوئی طریق کلام کا نہیں ۔ امام راغب نے بھی دنیا میں اللہ کے انسان کے ساتھ کلام کرنے کو انہی تین طریقوں پر قرار دیا ہے ۔

رَفَعَ ۔ رَفْع کے چار معنی ع۹۳ میں بیان ہوئے ہیں ان میں سے یہاں شرف منزلت مراد ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انسان کو رفع کرنا صرف اسی معنی میں آتا ہے نہ اس کو نیچی جگہ سے اُٹھا کر بلند جگہ پر رکھ دینے میں جس پر خود اللہ تعالیٰ کا اسم الرافع شاہد ہے جس کے معنی ہیں الذی یرفع المؤمن بالاسعاد واولیاءہ بالتقریب (ل) وہ جو مومن کو نیک بخت بنا کر اور اپنے اولیاء کو اپنا قرب عطا فرما کر رفع کرتا ہے ۔

درجات کے پہلے یا کچھ محذوف ہے جیسے فی ۔ اور یا درجہ بمعنی رفعۃ لیکر انتصاب علی المصدر ہے یا حال ہے اور مراد ذو درجات ہے ان الفاظ کا کیا منشاء ہے ؟ صورت کلام سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف بعض رسولوں کے ساتھ کلام ہوا اور بعض کے مرتبے بلند ہوئے ان سے کلام نہیں ہوا ۔ اس لیے کسی نے کہا یہاں کلام بلا واسطۂ ملک مراد ہے جیسے طُور پر حضرت موسیٰ سے اور معراج کی رات آنحضرت صلعم سے مگر یہ ما کان لبشر (الشوریٰ ۴۲ - ۵۱) کے حصر سے خارج ہے ۔ اس لیے وہ کلام بھی ان تینوں اقسام میں سے ایک قسم کا ہو سکتا ہے جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے اور کسی نے کہا کلم اللہ سے مراد

بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقۡتَتَلَ الَّذِیۡنَ
مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُمُ الۡبَیِّنٰتُ
وَ لٰکِنِ اخۡتَلَفُوۡا فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ وَ مِنۡہُمۡ
مَّنۡ کَفَرَ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقۡتَتَلُوۡا ۟ وَ لٰکِنَّ
ع اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یُرِیۡدُ ﴿۲۵۳﴾
یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ
مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡہِ وَ لَا
خُلَّۃٌ وَّ لَا شَفَاعَۃٌ ؕ وَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۵۴﴾

سے اس کی تائید کی ۳۲۶ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ جو اُن کے بعد ہوئے
آپس میں نہ لڑتے۔ اس کے بعد اُن کے پاس کھلی دلیلیں آ چکی تھیں،
لیکن انھوں نے اختلاف کیا، پس اُن میں سے وہ ہے جو ایمان لایا
اور ان میں سے وہ ہے جس نے انکار کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس
میں نہ لڑتے لیکن اللہ جو کچھ ارادہ کرتا ہے، کر دیتا ہے۔ ۳۲۷
اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے
خرچ کرو اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت
ہوگی اور نہ کوئی دوستی اور نہ ہی کوئی سفارش اور کافر ہی ظالم ہیں ۳۲۸

حضرت موسیٰ اور رفع بعضھم درجات سے مراد آنحضرت صلعم ہیں مگر یہ تخصیص بلا وجہ ہے۔ کلام تو سب سے ہوا۔ اصل میں یہ ترکیب ایسی ہی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا: ففریقاً کذبتم وفریقاً تقتلون (۸۷) ایک فریق کو تم نے جھٹلایا اور ایک فریق کو قتل کرتے ہو۔ یہ مراد نہیں کہ جن کو قتل کرتے ہو ان کو جھٹلایا نہیں بلکہ وہ پہلا مرتبہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایک کے ساتھ تو اسی قدر مخالفت کی کہ ان کے جھٹلانے پر بس کی مگر دوسرے کے لیے قتل کے منصوبے بھی کیے اسی طرح پر یہاں مراد یہ ہے کہ کلام تو پہلا مرتبہ ہے۔ بعض رسولوں کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ نے کلام ہی کیا یعنی ان کو صرف تعلیم اور ہدایت کے ساتھ بھیجا اور بعض کو کچھ اور مراتب بھی دیئے جیسے بادشاہت جس کا اوپر حضرت داؤد کے ذکر میں بیان ہوا۔ نبوت اور بادشاہت دونوں اکٹھی بہت کم کو ملی ہیں اور ان سب کے سرتاج ہمارے حضرت محمد مصطفےٰ صلعم ہیں۔

ع ۳۲۶ ان الفاظ کی تشریح پہلے ہو چکی ہے ع ۱۱۱ یہاں حضرت عیسیٰ کا نام اس لیے لیا کہ جب ایک طرف حضرت داؤد کی فضیلت اس رنگ میں بیان کی کہ ان کو نبوت کے ساتھ بادشاہت دی تو حضرت عیسیٰ جو بادشاہت سے بالکل خالی گذرے ان کا نام بھی لیا کہ ان کو اور رنگ کے کمالات دیدیئے گئے یا اس لیے کہ حضرت عیسیٰ قومی نبیوں میں سے آخری نبی ہیں اور اس سے اگلے الفاظ میں اس نبی کی طرف اشارہ ہے جو کل دنیا کی طرف آیا۔

ع ۳۲۷ اقتتل۔ اقتتال اور مُقَاتَلَۃ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی باہم جنگ کرنا۔

سب قوموں کی طرف ایک رسول کے آنے کی ضرورت: یہاں فرماتا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو پہلے جو رسول قوموں قوموں کی طرف بھیجے گئے تھے ان کے بعد اُن کے پیرو باہم جنگ نہ کرتے لیکن چونکہ ارادہ الٰہی یہی ہو چکا تھا کہ سب نبیوں کے آخر میں ایک نبی آئے اور وہ سب دنیا کی قوموں کو بھائی بھائی بنائے اس لیے اہل مذاہب نے باہم جھگڑے کیے اور گو مشیت کا بمعنی ارادہ بھی استعمال ہو جاتا ہے مگر اصل میں اللہ کی مشیت اس کا چیزوں کو خاص رنگ میں وجود میں لانا ہے پس چونکہ اس نے انسان کو بنایا ہی ایسا ہے کہ اس کے اندر قوائے مختلفہ جمع ہوں جن سے اس کی تمام ترقیات پیدا ہوتی ہیں اور قوائے مختلفہ کے غلط استعمال سے ہی جھگڑا پیدا ہوتا ہے اس لیے لوشاء اللہ ما اقتتلوا کے معنی صرف یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو انسان کو ایسا بناتا کہ اس کے اندر قوائے مختلفہ نہ ہوتے مگر اس کی مشیت نے یہی چاہا کہ وہ دوسری مخلوق سے بڑھ کر ترقی کرے اس لیے قوائے مختلفہ اس کے اندر رکھے یفعل ما یرید میں یا تو یہی اشارہ ہے کہ انہی قویٰ کے اچھے استعمال سے وہ نیک نتیجہ پا لیتا ہے اور بد استعمال سے برا اور یا یہ کہ ارادہ الٰہی یہ ہے کہ کل دنیا کے جھگڑوں اور اختلافوں کے فیصلہ کے لیے ایک رسول کل دنیا کی قوموں کی طرف بھیجے

ع ۳۲۸ خُلَّۃ۔ خلل دو چیزوں کی درمیانی کشادگی کو کہتے ہیں اور خُلَّۃ محبّت ہے یا اس لیے کہ وہ دل کے وسط میں ہوتی ہے اور یا اس لیے کہ وہ دل کے اندر گھس جاتی ہے۔ محبّت کو بھی محبّت اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ حَبَّۃ القلب کے اندر داخل ہوتی ہے (غ)

قیامت میں بیع، خلت، شفاعت کے نہ ہونے سے کیا مراد ہے: قیامت کے دن جن تین چیزوں کے نہ ہونے کا ذکر کیا ہے یعنی تجارت، تعلقاتِ محبت۔ سفارش۔ وہ وہی ہیں جو انسان کے لیے خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے میں روک ہو جاتی ہیں۔ ایک شخص اپنی تجارت میں اس قدر غرق ہوتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا ایک پیسہ بھی اس تجارت سے باہر لگے۔ اس لیے خدا کی راہ میں دینے سے رکتا ہے۔ یا جہاں تعلق محبت ہوتا ہے وہیں سارا مال خرچ کر دیتا ہے اور خدا کی راہ میں نہیں دیتا یا سفارش یعنی کسی بڑے آدمی کا تعلق مانع ہو جاتا ہے۔ اس لیے جب ضرورت جنگ کا مضمون ختم ہوا تو اسلام کی کامیابی کی بشارت دیتے ہوئے انفاق کی ضرورت اول ظاہر کی جس مضمون کو آگے دو رکوعوں میں بسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور مال کے خدا کی راہ میں دینے میں جو چیزیں مانع ہیں ان کے متعلق فرمایا کہ یہ قیامت کے دن تمہارے کسی کام نہ آئیں گی۔ اور تلافیٔ مافات نہ کریں گی۔ یہاں اصل مقصد بیان کرنے کا صرف اسی قدر ہے کہ اس دنیا کی تجارت۔ اس دنیا کی دوستی۔ اس دنیا کی سفارش وہاں نہ ہوگی۔ کیونکہ یہی چیزیں خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے سے روک ہیں۔ اُس عالم کی خُلت اور شفاعت اور چیزیں ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا الاخلاء یومئذ بعضھم لبعض عدو الا المتقین (الزخرف ۴۳ : ۶۷) دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہونگے سوائے متقیوں کے۔ معلوم ہوا

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۬ۚ لَا تَاْخُذُهٗ
سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا
فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ
اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا
خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا
بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ

اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہمیشہ زندہ خود قائم، قائم رکھنے
والا ہے۔[۳۲۹] اس پر نہ اونگھ غالب آتی ہے اور نہ نیند، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں
میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کون ہے جو اس کے پاس سوائے اس
کی اجازت کے سفارش کرے وہ جانتا ہے جو کچھ اُن کے سامنے ہے اور
جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز پر احاطہ نہیں کر
سکتے سوائے اس کے جو وہ چاہے[۳۲۹ا] اس کا علم آسمانوں اور زمین پر حاوی

کہ وہ خُلّت جو اتقا سے پیدا ہوتی ہے اور جو درحقیقت اس عالم کی چیز نہیں، وہ باقی رہے گی اس دنیا کی دوستی نہ رہے گی۔ اسی طرح فرمایا لا تغنی شفاعتھم شیئًا الّا من بعد ان یّاذن اللہ لمن یشآء ویرضٰی (النجم ۵۳-۲۶) پس وہ شفاعت جس کی بنا اللہ تعالیٰ کی رضا ہے وہ اس کے اذن سے وہاں ہوگی۔ مگر وہ شفاعتیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف ہیں اور جن کا تعلّق محض اس دنیا سے ہے وہ باقی نہ رہیں گی۔

کفار سے مشابہت نہ ہو: آیت کے آخری الفاظ۔ کافرہی ظالم ہیں۔ دو باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ مومنوں کو جو یہ ضرورت جنگ پیش آئی، تو یہ اُن کی خواہش سے نہیں بلکہ ظلم کافروں کی طرف سے ہے کہ وہ حق کو نیست ونابود کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خدا کی راہ میں مال نہ خرچ کرنا جو ظلم ہے کیونکہ اس کا حق ادا نہیں ہوتا یہ کافروں کا کام ہے۔ مومن کے لیے یہ شایاں نہیں یا ڈرا یا کہ انفاق سے انکار کر کے کافروں سے مشابہت پیدا نہ کریں۔

ع ۳۲۹ الحی۔ وہ جس کے لیے ہمیشہ کی زندگی ہے (ج) یعنی نہ اس کے اوّل کی کوئی حد بندی ہے نہ آخر کی۔ امام راغب نے جو اقسام حیات بیان کی ہیں ان میں سے چھٹی قسم جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص کی ہے وہ ہے جس پر موت کا لفظ کبھی صادق نہیں آسکتا۔ پھر بعض لوگوں نے توجیہات کی ہیں کہ وہ حیّ بالتدبیر ہے یعنی جس طرح چاہتا ہے امور میں تصرّف کرتا ہے اور جو اندازے چاہتا ہے مقرر کرتا ہے مگر حق یہ ہے کہ اگر حیات مخلوق کی ایک صفت ہے تو خالق کی صفت حیات ضرور ہے کیونکہ جو صفت خالق میں نہیں وہ مخلوق میں پیدا نہیں ہوسکتی وہ حیّ ہے اور حیات کا سرچشمہ ہے۔

القیوم وقیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ القائم الحافظ لکلّ شیٔ والمُعطی لہٗ مابہ قِوامہ (غ) یعنی خود قایم اور ہر چیز کا حافظ اور اس کو وہ اسباب عطا فرمانے والا جن کے ساتھ اس کا قیام ہے۔ اس کے معنی میں دونوں باتیں شامل ہیں القائم بذاتہ والمقوّم لغیرہ یعنی اپنی ذات میں قائم دوسروں کو قائم رکھنے والا۔

ع ۳۲۹ا تاخذہ۔ اَخذ یعنی پکڑنا کبھی قہر یعنی غلبہ کے ساتھ ہوتا ہے (غ) تاخذ کے معنی یہاں یہی ہیں یعنی اس پر غالب آتی ہے۔

سِنَۃ۔ اس کا مادہ وَسَن ہے دونوں کے معنی غفلت اور خواب ہیں (غ) یا سِنَۃ اونگھ ہے جو نیند تک نہ پہنچے جس پر یہ شعر بطور شہادت ہے فی عینہ سِنَۃٌ ولَیْسَ بنا یمٍ (ل) اس کی آنکھ میں اونگھ ہے وہ سویا ہوا نہیں۔ سنۃ کو نوم پر مقدم کرنے کی وجہ: نیند سے پہلے اونگھ کا ذکر اس لیے کیا کہ تاخذہ کے معنی میں غلبہ ہے۔ اونگھ اس پر غالب نہیں آتی بلکہ نیند جو اس سے شدید تر ہے وہ بھی اس پر غالب نہیں آسکتی۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص پر اونگھ تو غالب نہ آئے مگر نیند سے وہ مغلوب ہوجائے۔

شفاعت کے لیے ضرورت اذن: یشفع عندہ الا باذنہ۔ شفاعت پر دیکھو ۱۷ یہاں شفاعت کے لیے اذن الٰہی کو ضروری قرار دیا ہے اور اس اذن کی ضرورت نہ صرف شفاعت کرنے والے کے لیے ہی بکار ہے بلکہ جس کے لیے شفاعت کی جائے اس کے متعلق بھی فرمایا لا یشفعون الا لمن ارتضٰی (الانبیآء ۲۱-۲۸) شفاعت کرنے والے بھی اسی کے متعلق شفاعت کریں گے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرے۔ پس شفاعت نہ تو شفاعت کرنے والے کے اختیار کی کوئی چیز ہے کہ جب چاہے شفاعت کرے اور نہ جس کیلئے شفاعت کی جائے اسے کوئی حق ہے کہ وہ اپنا شفیع پیش کرے۔ شفاعت میں اذن کا مفہوم اصل میں کیا ہے اس کی حقیقت حدیث شفاعت سے منکشف ہوتی ہے اس میں آتا ہے کہ نبی کریم صلعم فرماتے ہیں۔ کہ میں قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں سجدہ میں گر جاؤں گا یہاں تک کہ مجھے حکم ہوگا کہ کہو تمہاری بات قبول کی جائے گی اور شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کی یہ شفاعت بھی درحقیقت قیامت کے دن دعا کا ہی ایک رنگ ہے جس طرح اس دنیا میں آپؐ نے اپنے صحابہ رضؓ کے لیے اور اپنی امت کے لیے دعائیں کر کے ان کو گناہوں سے پاک وصاف کیا۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی آپؐ ان کے لیے دعا کریں گے اور وہ آپؐ کی دعا قبول ہو کر آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اس دنیا میں نیک لوگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں وہ اِس رنگ کی شفاعت کا انکار نہیں کرسکتے اور یہ بات بالکل صاف ہے کہ جب ہمارے نبی کریم صلعم کی شفاعت اس دنیا میں بھی ظاہر ہوئی، یہاں تک کہ صحابہؓ کو نہ صرف روحانی طور پر تزکیہ کے مقام پر ہی پہنچایا بلکہ ظاہری طور پر بھی بادشاہت ان کو عطا فرمائی، تو قیامت کے دن آپؐ کی شفاعت کا ظہور ہونا خود ایک ثابت شدہ امر ہے۔ اسلام نے ہر ایک سچائی پر ایسی کامل روشنی ڈالی ہے کہ اس کے کسی پہلو کو تاریکی میں نہیں چھوڑا۔

وَ لَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ

ہے اور ان دونوں کی حفاظت اس پر بوجھ نہیں ۳۲۹ب اور وہ بہت بلند عظمت والا ہے ۳۲۹ج۔ دین میں کوئی زبردستی (منوانا) نہیں ۳۳۰ ہدایت (کی راہ) گمراہی سے واضح ہو چکی ہے، پس جو شخص شیطان کا انکار کرتا ہے اور اللہ پر ایمان لاتا ہے،

ما بین ایدیھم وما خلفھم جو کچھ سامنے ہے وہ امر دنیا ہے اور جو پیچھے ہے وہ امر آخرت ہے (ج) یا اس کے خلاف (غ) یا مراد ہیں پہلی گزری ہوئی باتیں اور آئندہ ہونے والی یا محسوس اور غیر محسوس۔

یحیطون - احاطۃ - دو طرح پر ہے۔ ایک اجسام میں دوسرا علم میں۔ علم میں احاطہ سے مراد ہے کہ ایک چیز کے وجود اور جنس اور کیفیت اور غرض کو جو اس سے مقصود ہے پوری طرح جانا جائے۔ اور یہ بات سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو حاصل نہیں (غ) حتّٰی کہ ایک ریت کے ذرّہ کے پورے علم کا بھی انسان احاطہ نہیں کر سکتا۔

۳۲۹ب کُرسی عرف عام میں وہ چیز ہے جس پر بیٹھا جاتا ہے۔ مگر یہاں ابن عباس نے کرسی کے معنی علم کیے ہیں اور بعض نے ملک (غ)۔ ابن عباس کی روایت بخاری میں ہے۔ اس معنی پر ذیل کے اعتراض کیے گئے ہیں۔ اول لغت عرب میں کرسی کے معنی علم نہیں آئے۔ جواب کرسی کے مادہ کرس میں علم کا مفہوم پایا جاتا ہے بلکہ ابن جریر کہتے ہیں کہ کرسی کا اصل مفہوم علم ہے اس لیے ایسے صحیفہ کو جس میں علم کی بات لکھی ہوئی ہو کراسۃ کہا جاتا ہے اور ایسا ہی نکرّس کے معنی علم یعنی جان لیا پر ایک راجز کا قول نقل کیا ہے اسی وجہ سے علماء کو کراسی (کرسی کی جمع) کہا جاتا ہے (ت) اور زمخشری نے قطرب سے یہ ضرب المثل نقل کی ہے خیر ھذا الحیوان الاناسی وخیر الاناسی الکراسی (ت) یعنی حیوانوں میں سے سب سے بہتر انسان ہیں اور انسانوں میں سب سے بہتر علماء۔ پس جب اصل معنی میں علم موجود ہے تو قرآن شریف کا اس لفظ کو صفات الٰہی میں استعمال کرنا بالکل درست ہے۔ کیونکہ نئے مفہوم کو پُرانے الفاظ میں ہی ادا کرنا تھا۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کرسی بمعنی علم کی روایت صحیح نہیں اور ابن عباس سے موضع قدمیہ اس کے معنی ثابت ہیں۔ جواب وہ معنی بلحاظ ظاہر ہیں اور نہ صرف بخاری اس روایت کو قبول کرتے ہیں بلکہ اور کئی ذرائع سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ حدیث میں ہے ما السموات السبع والارضون السبع عند الکرسی الا کحلقۃ ملقاۃ بارض فلاۃ یعنی ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے سامنے ایسی ہیں جیسے ایک انگوٹھی بیابان میں۔ جواب یہ حدیث کرسی بمعنی علم لیکر بھی ویسے ہی صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے آسمان اور زمین کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ خود قرآن شریف سے کرسی کے معنی علم ہی صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ اول سیاق وسباق میں علم کا ذکر ہے کیونکہ حفاظت بھی بذریعہ علم ہی ہے دوئم قرآن کریم میں ایسے بیانات تو بکثرت ہیں کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا ہے یا اس کو وہ جانتا ہے۔ مگر یہ نہیں آتا کہ جو کچھ کرسی میں ہے وہ اس کا ہے یا اس کو وہ جانتا ہے اور یہ تو بہرحال ظاہر ہے کہ جیسے خدا کا ہاتھ ہمارے ہاتھوں کی طرح نہیں۔ اس کی کرسی بھی ہمارے بیٹھنے کی جگہوں کی طرح نہیں بلکہ جیسے کرسی اہل علم کے لیے ہوتی ہے اور اصل غرض اس پر بیٹھنے کی علم ہے بس وہی غرض یہاں مراد ہے (دیکھو ۲۷) جو اونگھ اور نیند سے بالا ہے وہ بیٹھنے اور لیٹنے سے بھی غنی ہے ولا کرسی فی الحقیقۃ ولا قاعد (ض) فی الحقیقت نہ کرسی ہے نہ بیٹھنے والا۔

۳۲۹ج - یئود - اَوْد سے ہے جس کے معنی جہد و مشقت کو پہنچنا ہیں۔

یہ آیۂ کریمہ آیت الکرسی کے نام سے مشہور ہے اور حدیث میں اس کی بڑی عظمت مذکور ہے۔ ہر فرض نماز کے بعد اس کے پڑھنے کی تاکید ہے ایک حدیث میں ہے کہ یہ سب سے زیادہ عظمت والی آیت ہے اور ایک میں ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے اور احمد، ابوداؤد و ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اس آیت اور آل عمران کی پہلی آیت کو پڑھ کر فرمایا ان دونوں میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے اور ایک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم سورۂ بقرہ آل عمران۔ طٰہٰ میں ہے اور تینوں میں یہی اسم الحی القیوم آئے ہیں جو اور کسی سورت میں نہیں آئے اور یہ بھی ثابت ہے کہ جنگ بدر میں جب علیحدہ عریش بنا کر آنحضرت صلعم دعا میں مصروف تھے تو آپ کی زبان پر یہی لفظ بار بار آتے تھے یا حی یا قیوم۔

پس اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ حی و قیوم خدا مسلمانوں کو کافروں کے ہاتھ سے تباہ ہونے سے بچائے گا اور انہیں ایک زندہ قوم بنائے گا۔ نیز اس میں مذاہب باطلہ کا ردّ ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی توحید کو بیان کیا۔ پھر الحی میں بتایا کہ زندگی اس کی صفت ہے اور اس دنیا میں جو کچھ حیات یا زندگی ہم دیکھتے ہیں یہ اسی کی صفت الحی کا ظہور ہے۔ یہ ردّ ہے ان لوگوں کا جو مادہ اور روح کو غیر مخلوق مانتے ہیں۔ پھر یہ بتایا کہ اسے اونگھ نہیں آتی عیسیٰ مسیح جس کو خدا بنایا جاتا ہے سوتے تھے۔ ایسا ہی شفاعت کے مسئلہ میں افراط و تفریط کی غلطیوں کو دور کیا۔ جیسے مثلاً عیسائیوں نے تو ایسا دروازہ کھولا کہ جو مسیح کے کفارہ پر ایمان لایا جو چاہے کرے عیسیٰ مسیح اس کے شفیع بن جائیں گے۔ اس کے مقابل بعض لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو ایسا قانون کے پنجہ میں جکڑا ہوا سمجھا کہ شفاعت سے کلی انکار کر دیا قرآن شریف نے باذنہ کے ساتھ دونوں غلطیوں کو دور کیا کوئی شخص کسی پر ایمان لانے سے شفاعت کا حقدار نہیں ہو جاتا۔ اور احادیث سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن آنحضرت صلعم سجدہ میں گر کر دعا کریں گے یہاں تک کہ آپ کو شفاعت کی اجازت دی جائے گی پس جو لوگ یہاں نیکوں کی دعا کے قبول ہو جانے کو مانتے ہیں وہ شفاعت کا جو وہ بھی ایک دعا کا رنگ اپنے اندر رکھتی ہے انکار نہیں کر سکتے۔

۳۳۰ اکراہ - انسان سے ایسا بوجھ اٹھوانا جسے وہ پسند نہ کرتا ہو۔

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (٢٥٦)
اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ

اس نے ایک محکم جائے گرفت کو مضبوط پکڑ لیا جو ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۳۳۱
اللہ اُن لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے، وہ اُن کو سخت اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اور جو کافر ہیں ان کے ولی شیطان ہیں وہ انھیں روشنی سے نکال کر اندھیرے کی طرف لے جاتے ہیں یہ

الدین میں ال عہد کا ہے یا اضافت سے بدل ہے اور مراد دین اللہ ہے۔
غَیّ۔ غیّ وہ جہالت ہے جو اعتقاد فاسد سے پیدا ہو مگر مطلق جہل کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے (غ) اس کے خلاف رُشدٌ ہے یعنی ہدایت۔ رُشد و غی سے حق و باطل مراد ہیں۔

انصار میں بچے کو بطور نذر یہودی بنانے کا دستور: لکھا ہے کہ اہل مدینہ میں یہ دستور تھا کہ بعض عورتیں جب اولاد زندہ نہ رہے تو نذر مان لیتیں کہ بچّہ کو اہل کتاب کے دین میں داخل کردیں گے کیونکہ اس دین کو وہ اپنے دین سے بہتر سمجھتے تھے جب اسلام آیا تو انصار نے چاہا کہ جو اس طرح دین یہود میں داخل ہو گئے تھے ان کو اسلام میں داخل کریں تو یہ آیت نازل ہوئی جس میں اصول یہ بتایا کہ ایک دین سے دوسرے دین میں داخل ہونا اپنی خوشی کی بات ہے جبر اس میں جائز نہیں۔ اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قبیلہ بنی سالم بن عوف میں سے ایک شخص کے دو بیٹے عیسائی تھے جب وہ مسلمان ہُوا تو آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اُنہیں اسلام میں داخل ہونے کے لیے مجبور نہ کروں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی۔

آیت لا اکراہ منسوخ نہیں: یہ الفاظ ایسے صاف اور اس قدر وسیع ہیں کہ دین اسلام بزور جبر پھیلایا جانے کے جس قدر اعتراضات ہیں ان سب کا ایک ہی جواب کافی ہے اور اس کو منسوخ کہنا محض ایک غلط خیال ہے زید یا بکر کے کہنے سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی۔ ہاں رسول اللہ صلعم کا کوئی فرمان ہو تو تسلیم کر لیا جائے اس کو آیت جاھد الکفار والمنفقین سے منسوخ قرار دینا اور بھی غلطی ہے۔ اس حکم کے ماتحت کسی ایک شخص کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا جسے بجبر مسلمان کیا گیا ہو۔ اور ایسا حکم تو اس سے پیشتر مکّہ میں نازل ہو چکا تھا جاھدھم بہ جھادًا کبیرا۔ جب جاھد کا حکم اس کے دونوں طرف موجود ہے یعنی اس کے نزول سے پہلے بھی اور اس کے نزول کے بعد بھی تو اس کو منسوخ کہنا بالکل بے معنی بات ہے۔

حکم لا اکراہ اہل کتاب سے مقید نہیں: ایسا ہی اس کے حکم کو اہل کتاب پر محدود کرنا بھی صریحًا خلاف قرآن ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس حکم کے ساتھ تو دلیل بھی موجود ہے۔ پھر حکم کو منسوخ یا محدود کرنا اس دلیل کو غلط قرار دینا ہے اور وہ دلیل یہ ہے کہ ہدایت کی راہ گمراہی سے متمیز ہو چکی ہے اس لیے بجبر داخل کرنے کی ضرورت نہیں اب حکم منسوخ تب ہو جب یہ تمیز دور ہو جائے جو بالبداہت باطل ہے کیونکہ ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔ بلکہ اس کو اہل کتاب سے مقید کرنا تو ایک طرف رہا میں کہتا ہوں جو دلیل دی ہے اس کی رو سے تو دعویٰ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف اپنے پیروؤں کو بھی بجبر کچھ نہیں منواتا۔ بلکہ جو چیز منواتا ہے اس کی دلیل بھی دیتا ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ ہدایت کی راہ واضح ہو چکی بجبر منوانے کی ضرورت ہی کوئی نہیں۔ سب مذاہب کچھ نہ کچھ حصّہ انسان سے بجبر منواتے ہیں جسے طبیعت قبول نہیں کرتی مگر اسلام کچھ بجبر نہیں منواتا پس جبر کا کلی استیصال مذاہب میں سے اسلام نے ہی کیا ہے۔

۳۳۱ الطاغوت۔ طغی سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں حد سے گزر گیا لمّا طغا المآء (الحاقّة ۶۹-۱۱) اور طغیان نافرمانی میں حد سے گزرنا ہے۔ طاغوت اس مادہ سے وزن فَعَلُوت پر ہے اور اس سے مراد ہر ایک سرکش اور ہر معبود اللہ کے سوائے ہے واحد اور جمع میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ساحر، کاہن مارد جن اور نیکی کے رستے سے پھیرنے والے کو طاغوت کہا جاتا ہے (غ) یہاں طاغوت کے معنی شیطان حضرت عمرؓ سے مروی ہیں۔ بعض نے کاہن بعض نے ساحر بعض نے باطل معبود۔ بعض نے اصنام یعنی بُت معنی لیے ہیں۔ فی الحقیقت غیّ یا گمراہی کی طرف لے جانے والی سب چیزیں طاغوت کے مفہوم میں شامل ہیں۔

استمسک۔ ایسی مضبوطی سے پکڑنا کہ اس پر ثبات کا قصد ہو۔

عُروة۔ اصل میں عُریٰ سے ہے جس کے معنی ننگا ہونا ہیں۔ عراء وہ مکان جو بالکل کھلا ہو اور اس میں کسی قسم کا ستر نہ ہو لنبذ بالعرآء (القلم ۶۸-۴۹) اور عُراء کے معنی جانب یا پہلو ہیں اور عروہ وہ چیز جو کسی کی جانب میں ہو اور جسے پکڑا جائے (غ) اس لیے ڈول اور کوزہ کی جائے گرفت کو عروہ کہا جاتا ہے۔

انفصام۔ فَصْم سے ہے جس کے معنی توڑنا ہیں۔

یہاں کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ کو اکٹھا بیان کیا ہے اور جس طرح کفر بالطاغوت سے مراد صرف یہی ہے کہ شیطان کی بات نہ ماننے ایمان باللہ سے مراد صرف یہی ہے کہ اللہ کے احکام کی تعمیل کرے جو شخص اس اصول صحیح پر قائم ہو جاتا ہے اس نے ایک مضبوط جائے گرفت کو پکڑا ہے جو ٹوٹتی

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٥٧﴾ ع ۳۴

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ ۖ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥٨﴾

آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔ ۳۳۲

کیا تونے اس (کی حالت) پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا اس لیے کہ اللہ نے اُسے مُلک دیا جب ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جو زندگی بخشتا اور مارتا ہے اس نے کہا میں بھی زندگی دیتا اور مارتا ہوں، اور ابراہیم نے کہا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو تُو اسے مغرب سے نکال، پھر وہ جو کافر تھا حیران رہ گیا اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔ ۳۳۳

نہیں یعنی اس کا عمل ضائع نہیں جاتا۔ جیسا کہ معاذ بن جبل کا قول ہے لا انفصام لھا دون الجنۃ ایمان یا اسلام کو عُروہ سے تشبیہ دی ہے اور اس کو زور سے پکڑنا یہ ہے کہ انسان پوری کوشش سے اس پر عمل کرے۔ مجاہد سے روایت ہے کہ ان الفاظ کو پڑھ کر آپ نے فرمایا ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم آج وہی عُروہ وثقیٰ موجود ہے مگر اس پر مسلمانوں کی گرفت نہیں۔

۳۳۲ وَلِیّ - وَلاء اور توالی قرب کے لیے استعمال ہوتے ہیں خواہ مکان کے لحاظ سے ہو یا نسبت کے لحاظ سے یا دین کے یا صداقت کے یا نصرت کے یا اعتقاد کے اور وِلایۃ کے معنی نصرت اور وَلایۃ کے معنی تولّی امر ہیں یا دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی تولّی امر یعنی کسی معاملہ کا متولی ہونا اور وَلِیّ اور مَوْلیٰ دونوں فاعل کے معنی میں بھی آتے ہیں اور مفعول کے بھی یعنی بمعنی مُوالی - ولایت کرنے والا - یا موالی جس کی ولایت کی گئی - اور اللہ تعالیٰ (بمعنی موالِی) بندہ کا وَلِی بھی کہلاتا ہے اور مَولیٰ بھی اور بندہ کو بھی خدا کا وَلِیّ کہا جاتا ہے (بمعنی مُوالَی) مگر مولیٰ نہیں کہا جاتا (غ) اور چونکہ وَلاء کے اصل معنی شدید تعلق قرب ہیں لیس بینھما مالیس منھما (غ) اس لیے اللہ کا بندہ کا ولی ہونا یا بندہ کا اللہ کا ولی ہونا اسی شدید قرب پر دلالت کرتا ہے اور دونوں میں نصرت دینے یا نصرت دیا جانے کے معنی بھی شامل ہیں اور وَلِیّ کے معنی محب بھی ہیں اور صدیق بھی اور نصیر بھی (ت) گویا وَلِی میں قرب اور محبت اور صداقت کا تعلّق ہے جس کے ساتھ نصرت ملی ہوئی ہو۔ اس لیے قرآن کریم میں مومنوں کو مومنوں کے ولی کہا گیا ہے اور منافقوں کو منافقوں کے اور کفار کا وَلِیّ شیطان کو کہا گیا ہے جیسے یہاں بھی ہے اولیاؤھم الطاغوت (اولیاء ولی کی جمع ہے) اور قیامت میں کفار کی ایک دوسرے سے ولایت اور شیطان کی موالاۃ کو منقطع قرار دیا ہے جیسے فرمایا یوم لا یغنی مولی عن مولیً شیئًا (الدخان ۴۴-۴۱)

اللہ کی ولایت مومنوں سے کیا ہے: اللہ کا مومنوں سے تعلق ہے وہ ان کا ولی ہے۔ اور اس کی ولایت یہ ہے کہ جب ایک شخص عملی رنگ میں ایمان لاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو کفر شرک معاصی گندے رسم و رواج فاسد اعتقادات جہالت غرض ہر قسم کی تاریکی سے نکال روشنی میں لے آتا ہے پس سچے ایمان کی یہ علامت ہے کہ انسان تاریکی سے باہر نکل آئے کافر جو نیکی کی طرف قدم اُٹھانے سے انکار کرتا ہے اس کا تعلق روز بروز ظلمت سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک بدی سے دوسری بدی کی طرف قدم اُٹھاتا ہے اور ایک نیکی سے دوسری نیکی کی طرف۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن شریف نے ہمیشہ نور کو واحد میں استعمال کیا ہے اور ظلمات کو جمع میں۔ کیونکہ نور یعنی حق ایک ہی ہے اور ظلمات یعنی باطل بہت سے ہیں۔ نور کے کمال کو ظاہر کرنے کے لیے بھی نورٌ علیٰ نور فرمایا (النور ۲۴-۳۵) اور اسی کے مطابق ہے وانّ ھذا صراطی مستقیمًا فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل (الانعام ۶-۱۵۳) خدا کی طرف لے جانے والا رستہ ایک ہی ہے اس سے دور لیجانے والے بہت ہیں۔

۳۳۳ بہت کے معنی ہیں دہشت زدہ اور متحیر رہ گیا۔ بُہتان ایسا جھوٹ جو سُننے والے کو متحیر کر دے (غ) بخاری میں ہے بُہِتَ ذَھَبَتْ حُجَّتُہٗ یعنی اس کو کوئی دلیل نہ سوجھی یا دلیل میں ہار گیا۔

لا یھدی القوم الظالمین - قرآن کریم میں بار بار آتا ہے کہ اللہ ظالموں یا کافروں کو ہدایت نہیں کرتا - حالانکہ قرآن کریم کو ھدی للناس بھی فرمایا ہے امام راغب کہتے ہیں کہ ہدایت اور تعلیم دو چیزوں کو چاہتی ہے - ہدایت یا تعلیم دینے والے کی طرف سے اس کا دیدینا، اور جس کو ہدایت یا تعلیم دی جاتی ہے اس کا اس کو حاصل کرلینا - دونوں باتوں سے ہدایت اور تعلیم کامل ہوتی ہے۔ پس جب ہدایت یا تعلیم دینے والے نے اپنا کام کر دیا ہو اور جس کو ہدایت یا تعلیم پہنچائی گئی ہے اس نے اُسے قبول نہ کیا ہو تو نہ قبول کرنے کے لحاظ سے کہا جائیگا کہ اس نے ہدایت اور تعلیم نہیں دی (غ) کیونکہ وہ کام اپنے کمال کو نہیں پہنچا - مگر یہاں ہدایت سے مراد صحیح دلیل کا نہ ملنا ہے (ت)

اِس رکوع میں تین آیتیں ہیں اور تینوں میں کسی نہ کسی رنگ میں احیائے موتٰی کا ذکر ہے۔ گو باقی باتیں مختلف ہوں۔ پس اس رکوع کا اصل منشاء احیائے موتٰی پر روشنی ڈالنا ہے اس سے پہلے رکوع میں مسلمانوں کو بشارت دی گئی تھی کہ وہ انہیں ایک زندہ قوم بنائے گا - اب تین مثالوں سے سمجھایا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ کیا کرتا ہے۔

أَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ
عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ
بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ
ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ
يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ
عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ
يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ
اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ
نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ

یا اس کی مثال پر غور نہیں کیا جو ایک بستی پر گزرا اور وہ ویران تھی اس کی عمارتیں گری ہوئی تھیں۔ اس نے کہا اللہ اسے اس کی موت کے بعد کب زندہ کرے گا۔ سو اللہ نے اسے ایک سو سال موت کی حالت میں رکھا پھر اسے اُٹھایا کہا تو کتنا ٹھہرا، اس نے کہا میں ایک دن یا دن کا کوئی حصہ ٹھہرا ہوں، کہا بلکہ تو سو سال ٹھہرا۔ پس تو اپنے کھانے اور پانی کو دیکھ، وہ نہیں سڑا اور اپنے گدھے کو دیکھ اور تاکہ ہم تجھے لوگوں کے لیے نشان بنائیں اور ہڈیوں کو بھی دیکھ، ہم انھیں کیوں کر اُٹھاتے ہیں پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں[۳۳۴]۔ پس جب اس کے لیے بات کھل گئی تو اس نے کہا میں

حضرت ابراہیم کا بادشاہ سے جھگڑا: پہلی مثال حضرت ابراہیم کی ہے۔ حضرت ابراہیم کا ایک شخص کے ساتھ جھگڑا ہوتا ہے بظاہر وہ کوئی بادشاہ ہے جیسا کہ اس کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے انا احی وامیت۔ مگر ان آتٰہ اللہ الملک میں ضمیر حضرت ابراہیم کی طرف جاتی ہے اور مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو دیا تھا کہ زمین مقدس کا وارث آپ کو بنایا جائے گا اور ہمیشہ کے لیے آپ کی نسل میں رہے گی۔ اسی پر جھگڑا ہے۔ ایک مادہ پرست انسان جس کے سر میں حکومت کا نشہ ہے کہتا ہے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ یہ طاقتور قومیں جو اس وقت اس سرزمین کی مالک ہیں نابود ہو جائیں اور تمہاری نسل سے ایک زبردست قوم پیدا ہو جائے۔ تو حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ وہ جو میرا رب ہے وہی قوموں کو زندہ کرتا اور وہی مارتا ہے۔ یہ میری طاقت کی بات بیشک نہیں مگر اللہ تعالیٰ کا یہی قانون ہے کہ آج ایک قوم طاقتور ہے تو کل اس کو تباہ کر کے دوسری اس کی جگہ لے آتا ہے۔ اس کا جواب اس بادشاہ کی طرف سے یہ ہے کہ میں بھی تو بڑا صاحب اقتدار ہوں میں خود جس کو چاہوں زندہ رکھوں جس کو چاہوں ماروں جس زمین کو چاہوں آباد کروں جس کو چاہوں ویران کر دوں۔ تو میری طاقت بھی خدا کے برابر ہوئی۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ اگر تمہاری طاقت خدا کے برابر ہے تو پھر خدا تو اپنے قانون کے مطابق سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ جس پر وہ کافر بادشاہ مبہوت رہ گیا اور کوئی بات نہ سوجھی۔ ویسے بھی عموماً بت پرست قوموں میں بادشاہ کو خدا کا اوتار سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے حضرت ابراہیم اس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر تم میں خدائی طاقتیں ہیں تو پھر خدا کے قانون کو ادل بدل کر کے دکھاؤ۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس نے حضرت ابراہیم کو یہ جواب کیوں نہ دیا کہ تمہارا خدا اس کو مغرب سے نکال کر دکھائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کا تو یہ دعویٰ نہ تھا کہ وہ اپنے خدا سے جو چاہیں کرا سکتے ہیں بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے اٹل قانونوں کی طرف ہی توجہ دلا رہے ہیں۔ اُنہیں قانونوں میں سے ایک قانون قوموں کے گرنے اور بننے کا ہے جس کا ایک متکبر بادشاہ انکار کر رہا ہے۔

۳۳۴ کالذی۔ کسائی اور فراء اور اکثر نحویوں نے الذی کے پہلے ک کو اسمیہ بمعنی مثل قرار دیا ہے۔ گویا عبارت یوں ہے او رایت مثل الذی مر (ر) کیا تو نے اس شخص کی مثال پر غور کیا۔

خاویۃ۔ خواء اصل میں خالی ہونے کو کہتے ہیں (غ) خوت الدار کے معنی ہیں گھر میں کوئی رہنے والا نہ رہا (ل) بخاری میں ہے خاویۃ لا انیس فیھا۔

علیٰ عروشھا۔ عروش۔ عرش کی جمع ہے جس کے معنی ہیں چھتی ہوئی چیز اور یہاں بخاری نے معنی کیے ہیں ابنیتھا یعنی اس کی عمارتیں پس علیٰ عروشھا سے مراد ہے اس کی عمارتیں گری ہوئی تھیں۔

اماتہ اللہ مائۃ عام۔ یعنی سو سال تک ایک حالت میں رکھا جس کو موت کی حالت سے تعبیر کیا ہے۔

یتسنہ۔ سنہ سے ہے اور سنۃ سال کو کہتے ہیں سنھت النخلۃ یا تسنھت کے معنی ہیں اس پر سال گزر گئے اور یہی معنی سنۃ الطعام وتسنۃ کے ہیں (ل) مگر چونکہ کھانے پینے پر ایک مدت گزر جانے سے وہ بُس جاتا ہے۔ اس لیے طعام یا شراب پر جب تسنہ بولا جاتا ہے تو اس کے معنی لیے جاتے ہیں اس میں تغیر واقع ہو گیا یا سڑ گیا اور فراء نے لم یتسنہ کے معنی کیے ہیں لم یتغیر بمرور السنین علیہ یعنی سالوں کے گزرنے کی وجہ سے اس میں تغیر پیدا نہیں ہوا۔

ننشز۔ نشز کے اصل معنی بلند زمین ہیں پھر بلند زمین کی طرف اُٹھ کر جانے پر بھی استعمال ہوا ہے اس لیے محض اُٹھنے پر بھی۔ واذا قیل انشزوا فانشزوا (المجادلۃ ۵۸-۱۱) اور اسی سے نشوز ہے جو میاں بی بی کے جھگڑے پر بولا جاتا ہے اور الانشاز کے معنی مردہ کا زندہ کرنا بھی ہیں۔

نکسو۔ کساء سے ہے جس کے معنی لباس ہیں۔ کسوۃ بمعنی لباس قرآن شریف میں آیا ہے اوکسوتھم (المائدۃ ۵-۸۹) فکسونا العظام لحما (المومنون ۲۳-۱۴) میں انسان کی پیدائش کے ذکر میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔

قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾
وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ
الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ

جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۳۳۴ا
اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب مجھے دکھا تو کس طرح مُردوں
کو زندہ کرتا ہے، کہا کیا تو نے نہیں مانا کہا ہاں مگر اس لیے کہ میرے دل

۳۳۴ا یہ دوسری مثال احیائے موتٰے کی ہے جو مسلمانوں کو بطور تشفی دی گئی ہے۔ گویا سمجھایا ہے کہ اگر کبھی تم پر موت بھی آجائے تو اللہ تعالیٰ پھر تم کو زندہ کرے گا۔ کالذی سے صاف ثابت ہے کہ یہ مثالی واقعہ ہے۔ گویا معنی یوں ہوئے کیا تو نے اس شخص کی مثال یعنی اس کی مثالی حالت پر غور نہیں کیا پس یہاں کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو ایک شخص کو عالم مثال یا عالم رویا میں پیش آیا ہے۔ جب ہم واقعات کو دیکھتے ہیں جن کا ذکر الفاظ قرآنی میں پایا جاتا ہے تو اس کو بالکل حزقیل کی اس رویا کے مطابق پاتے ہیں جس میں ان کو بتایا گیا تھا کہ یروشلم سو سال کی تباہی کے بعد پھر آباد ہوگا۔ اور یہ بخت النصر کے یروشلم کو تباہ کرنے کے بعد کا واقعہ ہے۔ بائبل میں اس رویا کا ذکر حزقیل چھتیسویں باب کے آخر اور سینتیسویں باب میں الفاظ ذیل میں ہے:۔

"خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا۔ اور اس نے مجھے خداوند کی روح میں اٹھا لیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے بھرپور تھی مجھے اُتار دیا..... اس نے مجھے کہا اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں؟ میں نے جواب میں کہا اے خداوند یہوداہ تو ہی جانتا ہے۔ پھر اس نے مجھے کہا کہ تو ان ہڈیوں کے اوپر نبوت کر اور ان سے کہہ کہ اے سوکھی ہڈیو تم خداوند کا کلام سنو خداوند یہوداہ ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ دیکھو تمہارے اندر میں روح داخل کروں گا اور تم جیو گے اور تم پر نسیں ٹھہلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تمہیں چمڑے سے مڑھوں گا اور تم میں روح ڈالوں گا اور تم جیو گے اور جانو گے کہ میں خداوند ہوں سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی اور جب میں نبوت کرتا تھا تو ایک شور ہوا اور دیکھ ایک جنبش اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے اور جو میں نے نگاہ کی تو دیکھ نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور چمڑے کی ان پر پوشش ہوگئی پر ان میں روح نہ تھی ...... اور ان میں روح آئی اور وے جی اُٹھے ...... تب اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد! یہ ہڈیاں سارے اسرائیل ہیں۔ دیکھ یہ کہتے ہیں کہ ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری اُمید جاتی رہی ہم تو بالکل فنا ہوگئے اس لیے تو نبوت کر اور ان سے کہو کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے میرے لوگ میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تمہیں تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا اور اسرائیل کی سرزمین میں لاؤں گا۔"

حزقیل کے مکاشفہ کا ذکر قرآن کریم میں: اس سے ظاہر ہے کہ بائبل حضرت حزقیل کے ایک کشف کا ذکر کرتی ہے جس کی ابتدا یہ ہے کہ وہ ایک ہڈیوں سے بھری ہوئی وادی میں بحالتِ کشف گزرے گویا وہ ایک ویران بستی تھی جیسا کہ قرآن شریف نے فرمایا اور بائبل میں بھی سوال ہے اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں قرآن شریف میں بھی ہے انی یحی ھذہ اللہ بعد موتھا اور کشف میں ان کو دکھایا گیا کہ کس طرح ہڈیوں کو اُٹھایا جاتا اور ان پر گوشت چڑھایا جاتا ہے۔ جس کو قرآن شریف نے کیف ننشزھا ثم نکسوھا لحمًا میں بیان فرمایا۔ اور بائبل میں ہے کہ یہ ہڈیاں بنی اسرائیل ہیں۔ قرآن شریف میں بھی ہے ولنجعلک اٰیۃ للناس اور الناس سے مراد یہاں انہی کی قوم بنی اسرائیل ہے۔ پس یہ مطابقت صاف بتاتی ہے کہ دونوں جگہ ایک ہی واقعہ کا ذکر ہے اور وہ واقعہ عالم مثال کا ہے جسے بائبل نے ان الفاظ میں ظاہر کیا کہ خداوند کی روح مجھ پر تھی اور قرآن شریف نے ایک لـ سے اس واقعہ کے مثالی ہونے کی طرف اشارہ کر دیا۔ ہاں قرآن شریف میں کچھ امر زائد ہے۔ اور وہ ہے حالت موت کا سو سال رہنا۔ سو یہاں بائبل کی کمی کو بھی پورا کر دیا ہے۔ یروشلم کے لیے پیشگوئی: اور ایک پیشگوئی بھی کی ہے کیونکہ امر واقع یہ ہے کہ بنی اسرائیل پر وہ مُردہ ہونے کی حالت ایک سو سال رہی تھی گو بائبل میں اس کا ذکر نہیں۔ بخت النصر نے ۶۱۳ قبل مسیح میں یروشلم پر چڑھائی کر کے اس کو فتح کیا اور ۵۳۶ قبل مسیح میں بابلیوں کی تباہی کے بعد خورس شاہ ایران نے یہودیوں کو واپس آکر آباد ہونے کی اجازت دی اور ۵۲۰ قبل مسیح تک یہ دوبارہ آباد ہوتا رہا گویا یہ ۹۳ یا قریبًا ایک سو سال کا زمانہ موت کا گزرا اور پیشگوئی یہ تھی کہ قریبًا بالکل اسی قدر زمانہ یروشلم پر وہ گزرا جب عیسائیوں نے صلیبی جنگوں میں اسے مسلمانوں کے ہاتھ سے لے لیا تھا اور پھر دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھ میں اس کا آنا اس کی زندگی تھی اور شاید انہی واقعات کا اب پھر اعادہ ہونے والا ہے یا خدا چاہے تو مسلمانوں کو اب یروشلم پھر جلد دوبارہ دلا دے۔ قرآن شریف کا اس سو سال کے واقعہ کا ذکر کرنا اور بائبل میں اس کا ذکر نہ ہونا مگر تاریخی واقعات سے اس کا صحیح ثابت ہونا اور پھر پیشگوئی کے طور پر بھی اس کا ٹھیک صادق آنا ایسا باریک علم غیب ظاہر کرتا ہے جو عرب کے ایک امی کو تو کیا کسی انسان کو بھی حاصل نہ ہو سکتا تھا۔

قبل اس کے کہ میں کچھ اور الفاظ کی تشریح کروں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ تفاسیر کے مختلف اقوال میں جو اس آیت کے متعلق ہیں۔ عکرمہ اور ربیع اور وہب نے کہا ہے کہ یہ بیت المقدس کا ذکر ہے جس کو بخت النصر نے برباد کر دیا تھا اور روح المعانی میں ہے کہ یہ قول سب سے زیادہ مشہور ہے پس یوں سلف کی شہادت بھی اسی پر ہے۔

رویا میں سو سال کی موت کیوں دکھائی گئی: قابلِ تشریح یہ امر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پوچھا تو کتنا ٹھہرا، تو جواب میں نبی کہتا ہے دن یا دن کا کچھ حصہ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بلکہ تو سو سال ہی ٹھہرا۔ سو بلحاظ رویا کے تو دن کا کچھ حصہ ہی گزرا تھا اور اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ سو سال تو ٹھہرا ہے تو یہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے تھا کہ اصل غرض تم کو یہ سو سال کی موت کا رویا دکھانے کی یہی ہے کہ تمہاری قوم پر یہ موت سو سال تک رہے گی۔ سو چونکہ تم اپنی قوم کے قائم مقام ہو

لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۶۰ ع ۳۵

کو اطمینان حاصل ہو کہا تو چار پرندے لے پھر انھیں اپنے ساتھ ہلا لے پھر ان میں سے ایک ایک حصہ ہر ایک پہاڑ پر رکھ دے، پھر ان کو بلاؤ، تیرے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے اور جان لے کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔ ۳۳۵

اس لیے حالت لبث یا حالت موت فی الحقیقت سو سال ہی ہے ہاں تم کو ہم نے یہ نقشہ ایک رویا میں دکھایا ہے سو دیکھ لو تمہارا کھانا پینا سب اسی طرح موجود ہے اور تمہارا گدھا بھی اسی طرح زندہ موجود ہے (قرآن کریم نے کہیں نہیں فرمایا کہ گدھا مردہ تھا اس کی ہڈیوں پر گوشت چڑھایا تھا۔ بلکہ صاف فرمایا کہ اپنے کھانے پینے کو دیکھ لو اور اپنے گدھے کو دیکھ لو) اس میں یہ اشارہ تھا کہ جس طرح تمہارے یہ کھانے پینے کے سامان اور تمہاری سواری کا سامان اصلی موجود ہے اسی طرح پر تمہاری قوم پھر اپنی اصلی حالت پر آجائے گی اور اپنے اصل وطن میں آباد ہو جائے گی۔ اور سو سال کو ایک دن میں گزار دینا اس میں یہ اشارہ تھا کہ وعدہ ابراہیمی کے اس کو خلاف نہ سمجھا جائے کہ یروشلم تمہارے ہاتھ میں نہیں۔ سو سال خدا کے ہاں ایک دن کی طرح ہے۔

۳۳۵ صُرْ۔ باب صاد یصور مادہ صَوْر سے ہے جس کے معنی اَلْمَیْلُ یعنی مائل ہونا ہیں (غ۔ل) خود اس آیت میں فَصُرْھن کی تفسیر وَجْھُنّ سے کی ہے (ل) یعنی ان کو اپنی طرف متوجہ کر اور زجاج کا قول نقل کیا ہے کہ اہل لغت کے نزدیک فُصُرھن الیك کے معنی اَمِلْھن واجمعھن الیك ہیں (ل) ان کو مائل کر اور اپنی طرف اکٹھا کر اور یہ جو معنی منقول ہیں کہ صُرْتُ الشیٔ قطعتُہ فصلتُہ یعنی میں نے اس کو قطع کر دیا اور اس کا فیصلہ کر دیا جس کی سند میں شعر پیش کیا ہے صرنا بہ الحکم تو اس قطع کرنے سے مراد قیمہ کرنا نہیں بلکہ فیصلہ کے طور پر کسی بات کا قطع کرنا ہے اور دوسرے صُرْ کا صلہ جب الٰی ہو جیسے یہاں قرآن شریف میں ہے تو اس کے معنی قطع نہ موزوں ہیں اور نہ ہی لغت میں آئے ہیں۔ بلکہ اس صلہ کے ساتھ معنی صرف مائل کرنا ہی ہیں۔ مگر مفسرین کے خیال میں چونکہ یہ سمایا ہوا ہے کہ یہاں مراد قیمہ کرنا ہی ہے اس لیے یا تو نصرھن کے بعد فقطعھن محذوف فرض کرتے ہیں گویا مطلب یہ ہوا کہ پہلے ان کو ہلا لے پھر ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور یہ آخری حصہ اپنی طرف سے فرض کیا ہے اور یا صلہ الٰی کی تقدیم و تاخیر کر لی ہے یعنی یوں عبارت بناتے ہیں فخذ الیك اربعۃ من الطیر فصرھن (ل) مگر یہ بالبداہت غلط ہے کیونکہ اس طرح ایک فعل کا صلہ دوسرے فعل کی طرف منتقل کرنے سے امن اٹھ جاتا ہے۔ راغب نے صُرْ کے ایک معنی صِحْ بھی کیے ہیں یعنی ان کو آواز دو مگر اس سے مراد بھی وہی ہے بیضاوی نے صرف یہی معنی قبول کیے ہیں۔ فاَملھن واضممھن یعنی ان کو مائل کر اور ان کو ہلا لے مگر پھر جزئھن محذوف مانا ہے یعنی ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر

جزءً۔ جُزء کسی شئے کا حصہ ہے۔ چار پرندوں کی جز وہی نہیں کہ سب کو قیمہ کیا جائے اور پھر ملایا جائے اور پھر حصہ لیا جائے۔ بلکہ چاروں میں سے ہر ایک چار کا جز ہے۔ قرآن شریف میں ہے لکل باب منھم جزء مقسوم (الحجر ۱۵۔ ۴۴) اس کے یہ معنی نہیں کہ سب لوگوں کو اکٹھا کر کے ان کا قیمہ کر کے پھر حصے بنائے جائیں گے۔ بلکہ کل لوگوں میں سے چند لوگ ان کا ایک جز ہیں۔

یہ تیسری آیت ہے جس میں احیائے موتٰے کا ذکر ہے۔ پہلی آیت میں احیائے موتٰے کا دعوٰی ہے۔ دوسری میں ایک نظیر احیائے موتٰی کی تاریخ اسرائیل سے پیش کی ہے اور اب تیسری میں کیفیت احیائے موتٰی کا بیان کیا ہے۔ حضرت ابراہیم کا ایمان تو اس وعدہ الٰہی پر تھا وہ اطمینان قلب کے لیے اس کی کیفیت کا سوال کرتے ہیں۔ یہاں شک کوئی نہیں کیونکہ شک ایمان کے منافی ہے ایک کام کو ہم ہوتا ہوا دیکھتے اس کو صحیح مانتے ہیں۔ نطفہ سے انسان بنتا ہے۔ بیج سے درخت بنتا ہے۔ مگر کیفیت سے ناواقف ہیں کہ یہ کیونکر ہو جاتا ہے۔ پس واقعہ میں تو حضرت ابراہیم کو شک نہیں کہ احیائے موتٰی ہو جائے گا۔ وہ مانتے ہیں بلکہ ابھی ایک کافر بادشاہ سے بحث کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ احیائے موتٰے کیا کرتا ہے اب صرف وہ کیفیت احیائے موتٰے کا سوال کرتے ہیں۔

مُردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں: اس کیفیت کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک مثال دی ہے چار جانوروں کو لو اور ان کو ہلا لو پھر چار مختلف سمتوں میں ان کو ایک ایک کر کے رکھ دو، پھر بلاؤ اور دیکھو کہ کس طرح تمہاری آواز پر بھاگے چلے آتے ہیں۔ اس مثال سے حضرت ابراہیم کو سمجھ میں آگیا۔ یعنی کیفیت کا پتہ لگ گیا کہ باوجودیکہ ایک پرند انسان سے بہت دور رہنے والی اور بھاگنے والی چیز ہے لیکن انسان جب اسے ہلا لے تو یہاں تک اسے اپنے حکم کے تابع کر سکتا ہے کہ اس کی آواز پر وہ اڑا چلا آتا ہے۔ تو جب انسان میں اور اس کی ہلائی ہوئی چیز میں ایسا شدید تعلق محض ایک عارضی تدبیر سے پیدا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا تصرف جو خالق و مالک ہے کیوں اس سے بڑھ کر نہ ہو۔ ایک مردہ قوم کس طرح زندہ ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں وہ بھلائی کے کام جو ان کی فلاح کا موجب ہوں ان کو کرنے کی توفیق مل جاتی ہے اللہ تعالیٰ جس قوم کو زندہ کرنا چاہتا ہے اس کی زندگی کے اسباب جمع کر دیتا ہے کیونکہ وہی خالق اسباب ہے اس کے تصرف میں سب چیزیں ہیں خود لفظ طیر کے استعمال میں نیک و بد اعمال کی طرف اشارہ ہے کیونکہ لفظ طائر نیک و بد اعمال پر استعمال ہوا ہے وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ (بنی اسرائیل ۱۷۔ ۱۳) جہاں طائر کے معنی ہی اعمال ہیں۔ اور چونکہ اس مثال سے حضرت ابراہیم کو اصل کیفیت معلوم ہو جاتی ہے اس لیے ان کو یہ ضرورت بھی پیش نہیں آتی کہ وہ ایسا کر کے بھی دیکھیں اور نہ ان کے قرآن شریف میں ایسا کرنے کا ذکر ہے کیونکہ یہ ایک مثال بر رنگ دلیل تھی اور حضرت ابراہیم جانتے تھے کہ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اور اگر اس کو وہی واقعہ سمجھا جائے جو مفسرین بیان کرتے ہیں تو اس سے کئی وساوس پیدا ہوتے ہیں کیونکہ اس صورت میں یہ معلوم ہوگا کہ حضرت ابراہیم کو واقعی شک تھا کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے جب تک چار مردہ جانوروں کو زندہ ہوتے نہیں دیکھ لیا ان

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ
فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ
يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں
ایک دانہ کی مثال ہے جو سات بالیں اُگائے ہر ایک بال میں سو
دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے کئی گنا کرکے دیتا ہے
اور اللہ کشایش والا جاننے والا ہے۔ ۳۳۶

کو یقین نہ آیا جو ایمان کے منافی ہے اور با ایں ایک واقعہ کو ہوتا دیکھ کر اس کی کیفیت کا پتہ نہیں لگتا۔ ہم ہر روز درخت سے بیج اور نطفہ سے انسان بنتا دیکھتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ کس طرح ایسا ہوتا ہے۔ پس کیف تحی الموتٰی کا یہ جواب کوئی نہیں کہ مُردہ جانوروں کو پھر زندہ ہوتے دیکھ لیا۔ کیف کا جواب صرف وہی دلیل ہوسکتی ہے جو قلب کو مطمئن کر دیتی ہے کہ فی الواقع عالم میں ایسا ہی ہو رہا ہے اور مزید برآں اس اطمینان قلب کی جو حضرت ابراہیم کو حاصل ہوگیا کیا ہم کو ضرورت نہیں۔ اگر تو ان کو اطمینان یوں ہوا تھا کہ ان کے سامنے چار مُردہ جانور زندہ ہوگئے تو ہم کو یہ اطمینان کبھی میسر آسکتا ہی نہیں اور اگر وہ دلیل ان کے لیے موجب اطمینان ہوئی تھی تو ہمارے لیے بھی وہی دلیل کام دے سکتی ہے اور سکون و اطمینان کا موجب ہوسکتی ہے۔ بخاری میں جو حدیث اس آیت کی تفسیر کے رنگ میں مروی ہے وہ اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ یہ ایک دلیل ہے کوئی واقعہ نہیں۔ اس حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ اِذْ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى۔ ہم ابراہیم سے زیادہ شک کے حق دار ہیں جب اس نے کہا اے میرے رب مجھے دکھا کہ تو کس طرح مُردے زندہ کرتا ہے یعنی اگر حضرت ابراہیم کو شک پیدا ہوا ہوتا تو ہم کو اس سے بھی زیادہ ہونا چاہیئے تھا۔ بالفاظ دیگر جس اطمینانِ قلب کی ضرورت حضرت ابراہیم کو تھی اس کی ہم کو بھی ہے اس لیے جس راہ سے حضرت ابراہیم کو اطمینان ہو، ہمیں بھی ہونا چاہیئے لیکن ہم تو چار جانوروں کو قیمہ کرکے پھر بلائیں تو وہ کبھی اُڑتے ہوئے نہیں آتے، نہ نبی کریم صلعم کی موجودگی میں ایسا ہوا پس وہ کونسا امر ہے جس سے ہمارا اطمینانِ قلب ہو۔ وہ یہی صورت ہے کہ ان الفاظ میں جو مثال ہے وہ ایک دلیل کے رنگ میں ہو تو دلیل ایک ایسی چیز ہے جو جس طرح آج سے ہزارہا سال پیشتر کسی کو مطمئن کرسکتی تھی اسی طرح آج کرسکتی ہے مگر واقعہ جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے وہ جب تک ہر شخص نہ دیکھے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ رہا ایمان کہ حضرت ابراہیم کے سامنے ایسا ہوا ہوگا سو وہ تو پہلے بھی حاصل ہے کہ خدا ایسا کرسکتا ہے۔ حضرت ابراہیم کے سامنے ایسا ہونے سے اس میں کچھ زیادتی نہیں ہوسکتی۔ یہ دلیل نہ صرف دنیا میں احیائے موتٰی پر صادق آتی ہے بلکہ قیامت میں احیائے موتٰی پر بھی وہی کام دیتی ہے۔

ع ۳۳۶ سبیل اللہ۔ دیکھو ع ۱۹۳ اللہ کی راہ یا اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی راہ اس کا دین ہے پس انفاق فی سبیل اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت یا ترقی کے لیے اموال کا خرچ کرنا ہے اور چونکہ جہاد بھی حقیقتاً دین کی ترقی اور حفاظت میں کوشاں ہونا ہے اس لیے بعض نے کہا ہے کہ عرف قرآن میں فی سبیل اللہ جہاد سے مختص ہے۔ جہاد بالسیف ایک خاص اور وقتی ضرورت ہوتی ہے، جہاد کبیر وہ ہے جو ہر وقت ہوسکتا ہے جیسا کہ فرمایا وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۔ (الفرقان ۲۵ - ۵۲) یعنی اس قرآن کے ذریعہ سے ان کے ساتھ جہاد کبیر کرو۔ پس انفاق فی سبیل اللہ کا اصل مفہوم ترقی دین اسلام پر خرچ کرنا ہے۔ گویا دیگر خیراتی کام بھی اس میں شامل ہوجاتے ہیں۔

سنبلۃ۔ اس کا اصل بھی سبل ہے اور معنی خوشہ ہیں۔ جمع سَنابل۔

قوم کی زندگی کے اسباب کیا ہیں: اس سے پہلے ضرورت انفاق کا مضمون چلا آتا ہے اس رکوع میں یہ ذکر ہے کہ انفاق کا نتیجہ کیا ہے اور اس نتیجہ کو ضائع ہونے سے کیونکر بچایا جاسکتا ہے اسی لیے اس میں اخلاص کی ضرورت اور ریا سے بچنے کا ذکر کیا ہے۔ پچھلے رکوع میں مسلمانوں کو زندگی کی بشارت دی اور اس سے پچھلی آیت میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو زندہ کرنا چاہے تو اس کے اسباب اکٹھے کر دیتا ہے۔ اب انہی اسباب کا ذکر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ افراد کی قربانیاں قوم کی زندگی کا موجب ہوتی ہیں۔ اور مالی قربانیوں کی ضرورت ہر وقت ہر قوم کو پڑتی ہے اس لیے ان کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی۔

بیج کی مثال اور انجیل سے مقابلہ: خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کو اس بیج کے بونے سے مشابہت دی ہے جس سے ایک دانہ سے سات سو دانہ بنتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی دو چند اور کئی گنا ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بغیر حساب رزق بھی اس کا نتیجہ ہے۔ جیسا موقعہ ہو جس قدر اس میں اخلاص ہو جس قدر اس کے لیے کوشش کی جائے اسی کے مطابق نتیجہ ہوگا۔ حضرت مسیح نے بھی انجیل میں ایک دانہ کے بڑھنے کی مثال دی ہے۔ مگر تیس گنا۔ ساٹھ گنا حد سو گنا بڑھنے کا ذکر کیا ہے (متی ۱۳: ۲۳) قرآن کریم سات سو گنا سے شروع کرکے اسے چند در چند کرنے کا وعدہ دیتا ہے اور یہ نرا وعدہ ہی نہیں بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں ہی اس وعدہ کا ثبوت بھی مل جاتا ہے۔ سیکڑوں دیئے تو لاکھوں اور کروڑوں پائے عرب کی دولت کیا ہوگی اس کو خرچ کرکے قیصر و کسریٰ کے خزانوں کے مالک ہوگئے بعض لوگوں کو ایک یہ غلطی لگتی ہے کہ وہ ایک پیسہ جیب سے دیکر یہ چاہتے ہیں کہ فوراً دس پیسے ان کی جیب میں غیب سے آپڑیں دہٰ در دنیا سنا ہوا ہے مگر نظر اتنی تنگ ہے کہ کبھی اس کے معنوں پر غور نہیں کرتے دہٰ در دنیا تو ادنےٰ سے ادنےٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ تو سات سو گنا بلکہ اس سے بھی چند در چند کا وعدہ دیتا ہے مگر وہ آتا یوں ہے کہ قومی اور دینی مفاد پر جو اموال خرچ کیے جاتے ہیں وہ قوم کو خدا کے فضلوں کا وارث بنا دیتے ہیں اور جب قوم میں دولت آتی ہے تو بحصۂ رسدی اس کے سب افراد اس میں حصہ دار ہوجاتے ہیں۔ قومی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔ اسی کی طرف قرآن شریف بار بار توجہ دلاتا ہے۔ مگر تنگ دل انسان اپنا مال صرف اسی کو سمجھتا ہے جو اس کی جیب میں ہو۔

اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ
اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتۡبِعُوۡنَ مَاۤ اَنۡفَقُوۡا مَنًّا وَّ لَاۤ
اَذًی ۙ لَّهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَ لَا
خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۶۲﴾
قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّ مَغۡفِرَۃٌ خَیۡرٌ مِّنۡ صَدَقَۃٍ
یَّتۡبَعُهَاۤ اَذًی ؕ وَ اللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیۡمٌ ﴿۲۶۳﴾
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِکُمۡ

وہ لوگ جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں،
پھر اس کے پیچھے جو خرچ کیا نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ دُکھ دیتے
ہیں اُن کے لیے ان کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور انھیں
کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ؏۳۳۷
نیک بات کہنا اور معاف کر دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے
پیچھے دکھ پہنچایا جائے اور اللہ بے نیاز بردبار ہے ؏۳۳۸
اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ستا کر

اسلام کی ترقی انفاق فی سبیل اللہ سے ہوگی: اب بھی مسلمانوں پر سے ذلت وادبار کی حالت دور نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ خدا کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرنا نہ سیکھیں۔ اپنے شغلوں پر شادیوں اور ماتموں کے موقعہ پر بیدریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں مگر خدا کی راہ میں دینے کے وقت مفلس بن جاتے ہیں۔ دین اسلام کی ترقی انفاق فی سبیل اللہ سے وابستہ ہے جب تک اس اصول قرآنی کو اپنی زندگیوں کا عملی رہنما نہ بنائیں کامیاب نہیں ہو سکتے مسلمانوں میں مال و دولت کی کمی نہیں مگر وہ دل نہیں جو خدا کے وعدوں پر سچا ایمان رکھتا ہو اس کی راہ میں مال و دولت کو لٹا دے۔

؏۳۳۷ مَنّ ۔ مِنّۃ کے معنی بھاری نعمت ہیں (مَنّ مشہور وزن ہے چالیس سیر) اور مَنّ ایک تو فعل سے ہے جس کے معنی ہیں اس کو بھاری نعمت دی اتنی بڑی نعمت جس کے بوجھ کے نیچے وہ دب گیا۔ جیسے فرمایا مَنّ اللہ علی المؤمنین (آل عمران ۳۔ ۱۶۳) فمنّ اللہ علیکم (النساء ۴۔ ۹۴) مَنَنّا علیٰ موسیٰ وھارون (والصفّٰت ۳۷۔ ۱۱۴) نرید ان نمن علی الذین استضعفوا (القصص ۲۸۔ ۵) اور یہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور دوسرا مَنّ قول سے ہے یعنی لفظوں میں جتانا کہ ہم نے یوں کیا ہے اور یہ قبیح ہے (غ) اسی مَنّ کا یہاں ذکر ہے اسی کی مثل ہے یمنّون علیک ان اسلموا (الحجرات ۴۹۔ ۱۷) اور مَنّ کے معنی قطع بھی آتے ہیں۔ گویا احسان جتانا اس نعمت کو قطع کر دیتا ہے۔

انفاق کی پہلی غرض ترقی دین ہے: یہاں بھی فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے مراد اولاً ترقی دین کیلئے خرچ کرنا ہی ہے جیسا کہ مفسرین نے اس کے ماتحت غزوۂ تبوک میں حضرت عبدالرحمٰن رضؓ کے آٹھ ہزار درہم میں سے جو اُن کے پاس تھے چار ہزار درہم دینے کا اور حضرت عثمان رضؓ کے ایک ہزار اونٹ بمع سامان دینے کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ اس پر آنحضرت صلعم حضرت عثمان رضؓ کے لیے باربار دعا کرتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی یارب ان عثمان بن عفان رضیت عنہ فارض عنہ اے میرے رب عثمان بن عفان سے میں راضی ہوا تو بھی اس سے راضی ہوجا۔ ان واقعات کو جن کا تعلق غزوۂ تبوک سے ہے۔ اس آیت کے شان نزول میں بیان کرنا جو مدت پہلے کی نازل شدہ ہے بتاتا ہے کہ شان نزول سے مراد کسی واقعہ کا کسی آیت کے ماتحت آنا ہے نہ کچھ اور۔ ایسے چندوں کی صورت میں مَنّ یہ ہے کہ چندہ دیکر فخر کرے کہ میں نے اس قدر چندہ دیا ہے جیسے دوسری جگہ ہے یمنون علیک ان اسلموا خدا کی راہ میں دیکر یہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک فرض تھا یا ایک امانت تھی جو ادا ہوگئی کیونکہ مومن کا مال تو خدا کا مال ہے جیسا ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم واموالھم سے ظاہر ہے اور اذی یہ ہے کہ دوسروں کو یہ کہکر دکھ پہنچائے کہ فلاں نے تھوڑا دیا ہے یا فلاں نے نہیں دیا۔

بغیر انفاق خوف وحزن کی حالت دور نہ ہوگی: انفاق فی سبیل اللہ کا نتیجہ نہ صرف اجر ہے جس کو بلحاظ اس کی عزت یا مکرمت کے یا تاکید کے طور پر عند ربھم فرمایا، بلکہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کی حالت بھی اسی کا نتیجہ ہے یعنی مالی قربانیوں سے قوم خوف وحزن کی حالت سے نکل کر کامیابی کی منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہے یعنی دشمن کا خوف باقی نہ رہے گا اور جس قربانی پر انسان کو کامیابی حاصل ہو اس پر وہ کبھی پچھتاتا نہیں۔ آج بھی مسلمان اگر خوف وحزن کی حالت سے نکلنا چاہتے ہیں تو یہی راہ ہے لیکن قربانی کے بغیر کچھ نہ بنے گا۔

؏۳۳۸ غَنِیّ ۔ الغنیّ جو اسمائے الٰہی میں سے ہے اس کے معنی ہیں وہ جو کسی کا محتاج نہیں اور ہر ایک شخص اس کا محتاج ہے (ن) اور یہ غنائے مطلق ہے اور وہ المُغْنِی بھی ہے یعنی اپنے بندوں کو غنی کرتا ہے مگر یہ غنائے مطلق نہیں جسے عدم حاجت سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ حاجات کا کم کر دینا ہے جیسا کہ فرمایا وجدک عائلاً فاغنی (الضحیٰ ۹۳۔ ۸) یا جیسا حدیث میں ہے اَلْغِنَی غِنَی النَّفْسِ (غ) اور محض مال کی زیادتی پر بھی بولا جاتا ہے جیسے من کان غنیًّا فلیستعفف (النساء ۴۔ ۶)

بھلی بات بتانا بھی صدقہ ہے: قول معروف سے مفسرین نے سائل کو اچھی بات کہہ کر رد کر دینا اور مغفرۃ سے سائل کی پردہ پوشی یا خدا کی حفاظت مراد لی ہے۔ مگر چونکہ یہاں ذکر مال کے دینی ترقیات میں خرچ کرنے کا ہے اس لیے قول معروف سے مراد لوگوں کو بھلائی کی باتیں بتانا ہو سکتا ہے اور مغفرۃ یہ ہے یہ کہ ایسا شخص خود دوسروں کو معاف کرے یا اللہ تعالیٰ کی مغفرت حاصل کرے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ دے نہیں سکتے تو پھر قول معروف اور دوسروں کی پردہ پوشی سے ہی کام لو۔ یہ بھی ایک خدمت دینی بلکہ ایک صدقہ ہے۔

بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ
رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ
تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ
لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ
لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦٤﴾

باطل نہ کرو [ع۳۳۹] اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتا۔ سو اس کی مثال اس صاف چٹان کی سی ہے جس پر مٹی ہو، پھر اس پر زور کا مینہ برسے اور اسے بالکل صاف کر کے چھوڑ دے اس میں سے کچھ بھی نہ پا سکیں گے جو کمایا تھا اور اللہ کافر لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔[۳۴۰]

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ
مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ
جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا
ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٦٥﴾

اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ کی رضا چاہتے ہوئے اور اپنے آپ کو مضبوط رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں، اس باغ کی مثال کی طرح ہے جو اعلیٰ درجہ کی زمین پر ہو پھر اس پر زور کا مینہ پڑے تو وہ اپنا پھل دو چند دے اور اگر اس پر زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکا مینہ ہی (کافی ہے) اور اللہ جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔[۳۴۱]

ع۳۳۹ تبطلوا۔ باطل نقیض حق ہے یعنی وہ چیز جس کو ثبات نہ ہو اور البطال یہ ہے کہ کسی چیز کو فاسد کر دیا جائے یا اسے بالکل نیست و نابود کر دیا جائے خواہ فی نفسہ وہ چیز حق ہو یا باطل (غ)

صدقات کا باطل ہونا یہ ہے کہ وہ عظیم الشان نتائج جو ان پر مترتب ہوئے تھے ان سے انسان محروم ہو جائے۔ صدقہ مثل ایک بیج کے ہے جو پھل لاتا ہے من اور اذیٰ ایسی آفات ہیں جو اس پھل کو تباہ کر دیتی ہیں جیسا کہ اس رکوع کی آخری تمثیل میں بتایا۔

ع۳۴۰ رِئَاءَ۔ رای کے معنی دیکھا اور رِئَاء دوسروں کو دکھانا اور شائع کرنا (غ)

صفوان اور صفا کے ایک ہی معنی ہیں صاف پتھر ۱۹۷ واحد صَفْوَانَۃٌ ہے۔

وَابِل۔ اس بارش کو کہتے ہیں جو وزنی قطروں والی ہو یعنی زور کی بارش۔ اور اصل مادہ میں ثقل یا بوجھ کے معنی ہیں اسی لحاظ سے ہی وبال ایک امر کے ضرر دینے والے نتیجہ کو کہا جاتا ہے ذاقوا وبال امرھم (الحشر ۵۹-۱۵) اور وبیل وہ ہے جس کے وبال کا خوف ہو فاخذنا ہ اخذا وبیلا (المزمل ۷۳-۱۶) (غ)

صَلْد وہ سخت پتھر جس پر کوئی چیز نہیں اُگتی اس لیے رَأْسٌ صَلْدٌ اس سر کو کہا جاتا ہے جس پر بال نہ اُگیں (غ)

ریا سے مال خرچ کرنے کی مثال اس پتھر سے دی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہے اور بیج جو ڈالا جائے اُگتا نظر آتا ہے، مگر جڑ نیچے نہیں جاتی اور زور کی بارش جو زمین کی روئیدگی کو ترقی دیتی ہے اس پتھر کی اوپر کی مٹی کو بیج سمیت بہا لے جاتی ہے۔

اس آیت میں اصل مقصود تو مسلمانوں کو ریا سے روکنا ہے۔ مگر اس کا پیرایہ یہ اختیار کیا کہ تم ریا سے خرچ کرنے والوں کی طرح نہ ہو جانا۔ کیونکہ ریا سے خرچ کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے یعنی یہ تو کافروں کا کام ہے مومن کا کام ہی نہیں۔ یوں اس فعل کو حد سے زیادہ قبیح بنا کر دکھایا ہے۔ انجیل میں بھی ریا سے روکا ہے مگر قرآن شریف نے بلاغت کو کمال تک پہنچایا ہے۔ رسوم و رواجات پر جو روپیہ خرچ ہوتا ہے وہ سب ریا سے ہے، کیونکہ اس میں مدنظر صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ ایسا کہیں اور ایسا نہ کہیں۔ اگر خرچ نہ کریں تو لوگوں میں ناک کٹتی ہے۔ یہی ریا کی شناخت ہے۔ افسوس ہے کہ جس فعل کو ایسا قبیح بنا کر دکھایا گیا تھا کہ یہ مسلمان کا کام ہی نہیں ہو سکتا۔ اس میں آج اس کثرت سے مسلمان ملوّث ہیں کہ شاذ و نادر ہی کوئی بچا ہوگا۔ رسم و رواج پر قرضے لینے اور مکانات اور جائدادیں بیچ دیتے ہیں۔ لیکن خدا کی راہ میں دینے کے لیے پاس موجود ہو تو بھی حیلے تلاش کرتے ہیں۔ مومن کہلا کر کام کافروں سے بدتر ہیں پھر نتیجہ کیا ملے۔ کیوں ان کے علماء اور مشائخ ان کاموں سے ان کو نہیں روکتے۔

لایقدرون علی شئ مما کسبوا میں صاف پیشگوئی ہے کہ کفار جو کچھ خرچ کر رہے ہیں وہ محض ریاکاری ہے۔ جب خدا کی رحمت کی بارش آئے گی تو ان کا سب کیا کرایا اس طرح تباہ ہو جائے گا جس طرح صاف پتھر پر سے مٹی۔ اور ہر ایک ریا سے خرچ کرنے والے کا یہی انجام ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

ع۳۴۱ من انفسہم۔ میں من تبعیضیہ ہے یعنی کسی قدر اپنے نفسوں کو ایمان پر مضبوط کرنے کے لیے۔ انفاق مال سے کچھ مضبوطی ایمان کی حاصل ہوتی ہے اور اپنے سارے

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ
نَّخِيلٍ وَّأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهٰرُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ
أَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا
إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٦﴾ ع

کیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا ہو اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں اس کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل ہوں اور اسے بڑھاپے نے آگیا ہو اور اس کی اولاد چھوٹی چھوٹی ہو، پھر اسے ایک بگولا پہنچے جس میں آگ ہو، پس وہ جل جائے اسی طرح اللہ تمھارے لیے باتیں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم فکر کرو۔[۳۴۲]

يٰأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ
الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ
تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيهِ إِلَّا أَنْ
تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿٢٦٧﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اُن اچھی چیزوں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو اور اس سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا ہے اور ردّی چیز (دینے) کا قصد نہ کرو اس میں سے تم خرچ کرو گے حالانکہ تم خود اس کو لینے والے نہیں سوائے اس کے کہ اس کی قیمت کم کراؤ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔[۳۴۳]

قوٰی کو خدا کی راہ میں لگا دینے سے پوری قوتِ ایمانی حاصل ہوتی ہے۔

رَبْوَۃٍ۔ رَبا کے معنی ہیں بڑھا اور بلند ہوا۔ اور رَبْوَۃ اعلیٰ درجہ کی زمین کو کہتے ہیں (غ)

اکل۔ جو چیز کھائی جائے۔ اس لیے پھل کو بھی کہتے ہیں۔

طل۔ نہایت کمزور بارش جس کا اثر بہت ہی کم ہو (غ)

یہ دوسری مثال ان لوگوں کی ہے جو اللہ کی رضا کے لیے مال خرچ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بڑھایا ہے کہ اپنے نفسوں کے ثبات کے لیے۔ یہ انفاق مال کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ یعنی خدا کی رضا کے لیے مال خرچ کرنے سے ایمان پر ثابت قدمی بڑھتی ہے کیونکہ مال انسان کی محبوب چیز ہے اور جس چیز پر وہ اپنا مال خرچ کرے گا اسی سے اسے محبّت پیدا ہو گی پس خدا کی رضا کے لیے مال خرچ کرنے سے خدا کی راہ میں ثابت قدمی اور وفاداری بڑھتی ہے۔

۳۴۲ نخیل۔ نخل کی جمع ہے کھجور۔

اَعْناب۔ عِنَبٌ کی جمع ہے۔ انگور کی بیل اور انگور کے پھل دونوں پر بولا جاتا ہے۔

ثمرات۔ یا تو یہ مراد ہے کہ کھجور انگور کے سوائے اور بھی سب پھل ہیں اور یا یہ کہ اس میں ہر قسم کے منافع ہیں کیونکہ ثمر سے مراد بعض وقت مال بھی ہوتا ہے جس سے انسان فائدہ اُٹھاتا ہے (غ)

اعصار۔ عَصْر کے معنی نچوڑنا ہیں۔ جیسے فیه یعصرون (یوسف[۱۲]۔ ۴۹) اور اعصار وہ ہوا ہے جو زمین سے اٹھتی ہے اور غبار کو اٹھاتی ہے پھر ستون کی طرح آسمان کی طرف بلند ہو جاتی ہے یعنی بگولا (ل)

من واذیٰ کا اثر صدقہ پر: یہ تیسری مثال من واذیٰ کے اثر کی ہے اصل مضمون من واذیٰ کا ہی تھا۔ اس سے روکتے ہوئے ریا کا ذکر کیا پھر رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرنے کا اور رکوع کے آخر پر پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا اور سمجھایا کہ ابتدا میں انسان رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرتا ہے۔ اس لیے وہ جڑ پکڑتا اور باغ بن جاتا ہے لیکن من واذیٰ کا اثر اس پر ایک بگولے کی طرح ہوتا ہے جو ہری بھری کھیتی کو جلا دیتا ہے۔ گویا اس رکوع میں رضائے الٰہی کے لیے اور دین حق پھیلانے کے لیے خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے من واذیٰ اور رِئا سے روکا ہے اور تینوں باتوں کی وضاحت تین مثالوں سے کر دی ہے۔

۳۴۳ کسبتم۔ کَسْب وہ ہے جس میں انسان اپنے آپ کو لگاتا ہے جس میں نفع اُٹھانے اور فائدہ حاصل کرنے کی غرض ہو۔ لفظ کسب کے مقابل پر مما اخرجنا لکم من الارض فرمایا۔ گویا پہلے میں تجارت صنعت وغیرہ ہے اور دوسرے میں پھل، کھیتیاں، معدنیات۔

تیمّموا۔ تَیَمُّم کے معنی قصد کرنا ہیں (اصطلاح شریعت میں خاص معنی ہیں) اور اس کا اصل اَمٌّ ہے جس کے معنی ہیں قصد کیا (ل)

الخبیث۔ وہ چیز جس سے کراہت کی جائے بوجہ اس کے ردّی ہونے یا اس کے خسیس ہونے کے خواہ محسوس ہو یا معقول اور اس میں باطل اعتقاد اور جھوٹ باتیں اور بُرے فعل سب شامل ہو جاتے ہیں یحرّم علیهم الخبائث (الاعراف[۷]۔ ۱۵۷) ونجیناه من القریة التی کانت تعمل الخبائث (الانبیاء[۲۱]۔ ۷۴) الخبیثات للخبیثین (النور[۲۴]

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۸﴾

شیطان تم کو تنگدستی سے ڈراتا ہے اور تمھیں بخل کا حکم دیتا ہے اور اللہ تمھیں اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ دیتا ہے اور اللہ کشایش والا جاننے والا ہے۳۴۴۔

یُّؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا ؕ وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت دی جائے تو اُسے بہت بھلائی دی گئی ۔ اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر وہی جو عقل والے ہیں۳۴۵۔

---

۲۶ (رغ) یہاں مراد ردّی چیز ہے۔

تغمضوا۔ غمض اور اغماض کے اصل معنی نیند ہیں (غ-ل) اور لبطور استعارہ تغافل اور تساہل پر استعمال ہوتا ہے اور اغماض فی البیع کے معنی ہیں، جب فروخت والی چیز کو زیادہ مانگے اور قیمت کو کم کردے (ن) یا اس کے ردّی ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت میں کمی کا مطالبہ کرے۔

اس سے پہلے رکوع میں بتایا تھا کہ انفاق کس طرح پھل لاتا ہے کس طرح بیج ضائع ہونے سے بچایا جاسکتا ہے کس طرح آفات سے محفوظ رہ سکتا ہے اس رکوع میں بتایا ہے کہ کونسا مال خرچ کرنا چاہیئے۔ کس طرح پر یعنی علانیہ یا چھپ کر خرچ کرنا چاہیئے اور کس پر خرچ کرنا چاہیئے۔ یوں انفاق کی تمام اصولی تفصیلات کو ان دو رکوعوں میں بیان کردیا ہے۔

کونسا مال ہو جو خدا کی راہ میں دیا جائے۔ اوّل شرط یہ ہے کہ مال طیّب ہو یعنی جائز طور پر کمایا ہوا ہو اور اچھا ہو، دوسری یہ کہ ردّی مال نہ ہو جس کی تمہارے نزدیک بھی کوئی وقعت نہیں۔ ردّی چیز کو دیکر اعلیٰ درجہ کے نتائج حاصل نہیں ہوسکتے۔ آج کل کی بڑی اسلامی ہمدردی یہ ہے کہ کاروبار سے فارغ ہوکر دل بہلانے کے لیے چار باتیں اسلامی ہمدردی کی بھی کردیں۔ یہ بھی وہی ردّی متاع ہے اور خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کا تو نام بھی مسلمانوں کو بھولا ہوُا ہے۔ حالانکہ انفاق کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے کیسا محبوب بناتا ہے کہ کوئی ناقص چیز بھی خدا کی راہ میں دینے کو پسند نہیں کرتا بلکہ یہی چاہتا ہے کہ جب کوئی دے اعلیٰ درجہ کی چیز دے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وشان کے لیے پاسِ ادب بھی سکھایا ہے۔ کیونکہ جب خدا کا نام درمیان میں آگیا تو پھر چیز خواہ کسی کو دی جائے اعلیٰ اور افضل دینی چاہیئے اسی کے مطابق آیت کا خاتمہ غنی حمید پر کیا ہے۔

۳۴۴ یَعِدُ۔ وَعْد کا لفظ خیر و شر دونوں پر بولا جاتا ہے یعنی اچھی چیز کے وعدہ دینے پر اور بُرے انجام سے ڈرانے پر اور وعید کا لفظ شر سے خاص ہے۔

الفحشاء۔ اصل میں ہر ایک قبیح فعل یا قول پر بولا جاتا ہے۔ لیکن عرب کے لوگ بخیل کو بھی فاحش کہتے تھے (ل) اس لیے بلحاظ قرینہ یہاں بخل معنے کیے گئے ہیں۔

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ جو خیالات بعض وقت اللہ کی راہ میں دینے میں مانع ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت میں شیطانی خیال ہیں کہ خدا کی راہ میں دیکر ہم غریب ہوجائیں گے۔ ایک حدیث میں آتا ہے نبی کریم صلعم نے فرمایا تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں جن میں سے ایک یہ ہے کہ خدا کی راہ میں دینے سے مال کم نہیں ہوتا اور حق بھی یہی ہے کہ آج تک کوئی شخص خدا کی راہ میں دینے سے فقر وفاقہ میں مبتلا نہیں ہوُا گو سارا مال بھی خدا کی راہ میں دیدے۔ البتہ رسم ورواج کی پابندیوں سے بہتیرے تباہ ہوگئے ہیں۔ حضرت ابن مسعود سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ انسان کے لیے ایک لمہ شیطانی اور ایک لمہ ملکی ہوتا ہے۔ شیطانی تحریک بُرے کاموں کے لیے اور حق کی تکذیب کے لیے ہوتی ہے۔ اور ملک کی تحریک بھلائی کے لیے اور حق کی تصدیق کے لیے ہوتی ہے علاوہ ازیں ایسے معاملات میں اندازہ قومی حالت سے لگانا چاہیئے نہ افراد کی حالت سے۔ جب افراد قومی اپنے اموال کو قومی یا دینی ترقی کے لیے خرچ کرتے ہیں تو قوم غریب نہیں ہوتی بلکہ خدا کا فضل زیادہ سے زیادہ اس کے شاملِ حال ہوتا ہے۔

۳۴۵ الباب۔ اَلْبَاب لُبّ کی جمع ہے اور لُبّ کسی چیز کے خلاصہ یا مغز کو کہتے ہیں اور انسان میں لُبّ اس عقل خالص کو کہتے ہیں جو ہر قسم کے شائبوں سے پاک ہو یعنی نہایت خالص عقل۔ پس ہر لُبّ عقل ہے اور ہر عقل لُبّ نہیں (رغ)

جب یہ بتایا کہ انفاق سے تنگدستی کا پیدا ہونا محض شیطانی ڈراوا ہے تو اب بتاتا ہے کہ مال خیر نہیں بلکہ اصول حقہ کو سمجھ لینا خیر کثیر ہے۔ اور یہ اصول مقر یا اصول دین کی سمجھ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے دیتا ہے گویا اس اصول کو سمجھ لینا کہ خدا کی راہ میں مال دینے سے انسان تنگدست نہیں ہوتا اصول دین میں سے ایک اصل ہے اور اس کو سمجھ کر انسان خیر کثیر کا مالک ہوجاتا ہے اس کا بگڑ نا کیا ہے۔ اس حکمت کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمجھا۔ اور باوجودیکہ وہ غریب تھے اپنے مالوں کو انھوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا، نتیجہ یہ ہوُا کہ دنیا میں بھی خیر کثیر کے مالک ہوگئے اس لیے کہ ایک زندہ اور کامیاب قوم بن گئی۔ آج مسلمان ان سے بہت زیادہ مالدار اور تعداد میں ہزار ہا گنے زیادہ ہیں مگر اسی حکمت کی بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ان کا مال ان کے ہاتھوں سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ
نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ
مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

اور جو کچھ خرچ کرنے کی چیز تم خرچ کرو یا کوئی منت مان لو، تو اللہ اُسے جانتا ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں [۳۴۶]

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ
تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ
لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

اگر تم خیرات کھلے طور پر دو تو کیا ہی اچھی بات ہے اور اگر تم اُسے چھپاؤ اور محتاجوں کو دو تو وہ تمھارے لیے اچھا ہے اور وہ بعض تمھاری برائیاں تم سے دور کر دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے [۳۴۷]

ہیں جا رہا ہے اور پھر بھی وہ قرآن کریم کی اس حکمت کی بات پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔

ع۳۴۶ نذر۔ امام راغب نے نَذر کے یہ معنی کیے ہیں کہ کسی امر کے حدوث کی وجہ سے تم اپنے نفس پر کسی ایسی بات کو واجب کر لو جو واجب نہیں۔ مگر قرآن کریم میں جہاں جہاں لفظ نذر آیا ہے کوئی شرط ساتھ نہیں۔ مثلاً انی نذرت للرحمٰن صوما (مریم ۱۹- ۲۶) انی نذرت لك ما فی بطنی محررًا (آل عمران ۳: ۳۵)۔ نہایہ میں ابن اثیر نے نذر کے معنی صرف اس قدر لکھے ہیں کہ جب تم اپنے نفس پر عبادت یا صدقہ وغیرہ سے کوئی چیز بطور نفل واجب کر لو تو وہ نذر ہے اور پھر لکھا ہے کہ احادیث میں اس سے روکنے کا مکرر ذکر آیا ہے اور اس کا منشاء یہ ہے کہ یہ ایک ایسا امر ہے جو نہ کوئی نفع کھینچ لاتا ہے نہ کسی نقصان کو دُور کرتا ہے نہ کسی قضاء و قدر کو رد کر دیتا ہے پس اگر اس اعتقاد کے ساتھ انسان کسی امر کو اپنے اوپر واجب کر لے تو اس کا پورا کرنا یوفون بالنذر کے ماتحت ضروری ہے اور گو مفسرین لکھتے ہیں کہ نذر شرط کے ساتھ یا بلا شرط ہو سکتی ہے مگر قرآن شریف میں یا حدیث میں شرط کا ذکر نہیں۔

یہاں ظالمین ان لوگوں کو کہا ہے جو خدا کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ نہیں کرتے یا معصیت میں اور رسم و رواج کی پابندی میں خرچ کرتے ہیں۔

ع۳۴۷ نِعِمّا۔ نِعمَ اور ما سے مرکب ہے اور نِعمَ فعل مدح ہے پس نعمّا کے معنی ہوئے کیا اچھی چیز ہے۔

یکفّر۔ کفر اصل معنی ڈھانکنا ہیں (اور ابن اثیر نے بڑھایا ہے ایسا ڈھانکنا جو اسے ہلاک کر دے یعنی ایک چیز کی ترقی کو روک دے) اور تکفیر کے معنی ہیں ایک چیز کا ڈھانک دینا اور اس کا دبا دینا یہاں تک کہ وہ بمنزلہ اس چیز کے ہو جائے جو کی نہیں گئی اور اسی سے کفارہ ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جو گناہ کو ڈھانک دے (غ)

من سیاٰتکم۔ من بعضیہ ہے۔ صدقات سے ساری بُرائیاں دُور نہیں ہوتیں۔ بعض قسم کی بُرائیاں دُور ہو جاتی ہیں۔ اسلام نے جو کفارہ بتایا ہے وہ یہی ہے کہ بعض قسم کی نیکیوں سے بعض قسم کی بدیاں دُور ہو جاتی ہیں اور دب جاتی ہیں یعنی ظاہر نہیں ہوتیں۔

علانیہ صدقات انجیل کی ناقص تعلیم: اِس آیت میں انفاق کا طریق بتایا قرآن کریم ہر ایک مسئلہ پر انسانی ضروریات کے سارے پہلوؤں کو مدّنظر رکھ کر بحث کرتا ہے انجیل کی مشہور پہاڑی تعلیم میں صدقات کا مضمون اتنی ہی بات پر ختم ہو جاتا ہے کہ تم دکھاوے کے لیے خیرات نہ کرو، بلکہ تمہارا دایاں ہاتھ دے تو بائیں کو خبر نہ ہو۔ مگر یہ بھی ایک غلطی ہے کہ جو صدقات علانیہ طور پر دیئے جائیں ان کو دکھاوے کے لیے سمجھ لیا جائے اور نہ ہی ضروریاتِ انسانی کو مدّنظر رکھتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ انسان جب صدقہ کرے تو ایسے ہی طور پر کرے کہ دایاں ہاتھ دے تو بائیں کو خبر نہ ہو۔ بڑے بڑے قومی چندے جن سے ضروریاتِ قومی پوری ہوتی ہیں وہ کبھی اس طریق پر نہیں دیئے جا سکتے اور جس کتاب نے اپنی تعلیم کو یہیں تک ختم کر دیا وہ یقیناً ناقص ہے۔ قرآن شریف جس نے تعلیم کو کمال تک پہنچانا تھا وہ یوں تعلیم دیتا ہے کہ علانیہ طور پر بھی مال خدا کی راہ میں دینا بہت اچھّا ہے بلکہ اسے پہلے بیان کیا۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دوسروں کو نیکی کی تحریک ہوتی ہے اور درحقیقت بڑے بڑے قومی کام علانیہ چندوں سے ہی سرانجام پا سکتے ہیں۔ آج عیسائی لوگ ان قومی چندوں میں علانیہ حصّہ لیکر اپنے عمل سے انجیل کی تعلیم کو جھٹلا رہے اور قرآن کریم کی تعلیم کو سچّا قرار دے رہے ہیں۔ ہاں جہاں اس قسم کی ضروریات کی عظمت اور وقعت کے لحاظ سے انہیں مقدم کیا۔ ساتھ ہی دوسرے پہلو کا بھی ذکر کر دیا کہ غربا کی کچھ مدد کرو تو وہ چھپا کر دو۔ وہ بھی ایک ضرورت قومی ہے اور بہت لوگ مستحق امداد ہوتے ہیں جن کو علانیہ دینا موزوں نہیں اور نہ وہ علانیہ لینا پسند کرتے ہیں خصوصیت سے ایسے لوگ کون ہیں اُن کا ذکر اگلی سے اگلی آیت میں ہے۔

مخفی صدقات: قرآن شریف نے صرف ایک لفظ اخفاہی ایسے صدقات کے متعلق استعمال فرمایا ہے مگر احادیث میں ایسے صدقات کا ذکر بہت پایا جاتا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے سایہ میں لے گا۔ امام عادل۔ جوانی میں عبادت الٰہی کرنے والا۔ دو شخص جو اللہ کے لیے محبت کرنے والے ہوں۔ وہ شخص جو مسجد سے نکلتا ہے تو اس کا دل مسجد میں معلّق ہوتا ہے۔ وہ جسے حسین مالدار عورت بلائے تو صرف خدا کے خوف سے بچے۔ اور وہ شخص جو صدقہ کرتا ہے تو اسے اتنا چھپاتا ہے کہ اس کا بایاں ہاتھ نہیں جانتا جو اس کا دایاں ہاتھ خرچ کرتا ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ مخفی صدقہ رب کے غضب

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

ان کی ہدایت تیرے ذمے نہیں لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور جو کچھ مال تم خرچ کروگے وہ تمھارے اپنے ہی لیے ہے۔ اور تم خرچ نہیں کرتے سوائے اس کے کہ اللہ کی رضا چاہو اور جو کچھ مال تم خرچ کروگے وہ تمھیں پورا دیا جائے گا اور تمھیں نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔[۳۴۸]

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِى الْاَرْضِ ؗ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ ع ۳۷ / ۵

ان محتاجوں کے لیے جو اللہ کی راہ میں روکے گئے ہیں، زمین میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے (سوال سے) بچنے کے باعث ناواقف ان کو دولت مند سمجھتا ہے، تو انھیں ان کی نشانیوں سے پہچان لیگا۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے اور جو کچھ مال تم خرچ کرو اللہ اسے یقیناً جانتا ہے۔[۳۴۹]

کو دور کرنا ہے مگر ظاہر صدقہ بسا اوقات مقدم ہوتا ہے۔ خود زکوٰۃ جو ظاہر صدقہ ہے بوجہ فرضیت نفلی صدقات پر مقدّم ہے

۳۴۸ لیس علیك ھدٰھم حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ پہلے پہلے مسلمان (بوجہ ان سختیوں کے جو کفار سے پہنچی تھیں، فی سبیل اللہ) اپنے مشرک رشتہ داروں کی امداد کرنا ناپسند نہیں کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی قرآن شریف نے غیر مسلموں کی امداد بھی فقر اور تنگی کی حالت میں ضروری قرار دی ہے اور انسانی ہمدردی کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا اور فرمایا کہ ہدایت امر دیگر ہے۔ مگر احتیاج کے وقت انسان کی دستگیری ایک فرض انسانی ہے۔ یہ ذکر محتاجوں کو دینے کے ذکر کے ساتھ ہی کیا تا اس مضمون کی تکمیل ہو جائے۔

صدقہ سے فائدہ اپنے آپ کو اور قوم کو ہوتا ہے: اور یہ جو فرمایا فلانفسکم تو مراد یہ ہے کہ اس کا فائدہ خود تم کو یا تمھارے لوگوں کو ہی پہنچتا ہے۔ کیونکہ انفسکم میں دونوں مفہوم داخل ہیں انسان کا اپنا نفس بھی اور اس کے بھائی بند بھی۔ اپنے نفس کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ اس کے اندر نیکی کی قوت نشو و نما پاتی ہے ہمدردیٔ انسانی جو انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے ترقی کرتی ہے۔ قوت ایمانی بڑھتی ہے اور اپنے بھائی بند کو یہ فائدہ ہے کہ قومی بہبودی کے کاموں سے ساری قوم کو فائدہ پہنچتا ہے وما تنفقون الا ابتغاء وجہ اللّٰہ میں یا تو یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کا جو انفاق ہوگا وہ رضائے الٰہی کے لیے ہی ہوگا۔ اور یا یہ کہ تم اس بات کا فکر مت کرو کہ جس کو دیا ہے وہ کون ہے تم نے تو خرچ محض رضائے الٰہی کے لیے کیا ہے سو وہ مل جائے گی پس صدقہ دینے کے وقت لوگوں کے اعمال کی فکر نہ کرو صحیحین کی ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے کہا میں آج رات صدقہ کرونگا تو وہ صدقہ ایک زانیہ کے ہاتھ چلا گیا۔ دوسری رات صدقہ کیا تو وہ ایک غنی کے ہاتھ چلا گیا۔ تیسری رات کیا تو وہ ایک چور کے ہاتھ چلا گیا تو اسے کہا گیا تمہارا صدقہ قبول ہو گیا ہے، رہے وہ لوگ جن کے ہاتھ میں گیا ہے سو شاید زانیہ زنا سے بچ جائے، غنی صدقہ دینے کی توفیق پائے۔ چور چوری سے رک جائے۔ ماحصل اس تعلیم کا یہ ہے کہ ادنیٰ عذروں پر انسان صدقہ کو نہ روک رکھے۔ ایک سرسری نظر سے دیکھ لے جو مستحق نظر آئے یا جہاں نیکی کا کام ہو رہا ہو وہاں اعانت میں شامل ہو جائے۔ اسی کی طرف آیت کے آخری الفاظ میں اشارہ کیا کہ تمہارا انفاق ضائع نہیں جائے گا بلکہ اس کا اجر تم کو پورا پورا ملے گا اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

۳۴۹ التعفف۔ عفّ سے ہے اور عِفّۃ کے اصل معنی ہیں تھوڑی چیز پا کر صبر کر لینا (غ) اور پھر اس کے معنی ہو گئے ہیں اس چیز سے رکنا جو حلال نہیں یا اچھی نہیں (ل)۔ اِستِعفاف اور تعفُّف کے ایک ہی معنی ہیں یعنی حرام سے اور لوگوں سے سوال کرنے سے بچنا (ل)

سِیما۔ سَوْم کے اصل معنی ہیں کسی چیز کی تلاش میں جانا (غ) اس سے سِیْما اور سِیمیاء کے معنی علامت ہو گئے ہیں۔

الحافا۔ الحاف۔ سوال کرنے میں سخت الحاح کو کہتے ہیں (ل) اور یہ لحاف سے ہے کیونکہ اس سے انسان اپنے آپ کو سارا ڈھانک لیتا ہے۔ پچھلی سے پچھلی آیت میں جب محتاجوں کو دینے کا ذکر فرمایا تو یہ بیان کر کے کہ محتاج مسلم ہو یا غیر مسلم دیدو۔ اب یہ بتایا ہے کہ خصوصیت سے کونسے محتاج مستحق ہیں۔ وہ وہ فقراء ہیں جو اللہ کی راہ میں رُک گئے ہوں یعنی اپنے کاروبار نہ کر سکتے ہوں اور یہ تین قسم کے لوگ ہیں (۱) وہ مجاہدین یا خدا کی راہ میں کوشش کرنے والے جو اس لیے کہ ساری قوت اسی کام پر لگاتے ہیں اپنا ذریعہ معاش نہ رکھتے ہوں۔ نبی کریم صلعم کے زمانہ میں اصحاب الصفہ کا گروہ اسی ذیل میں شامل تھا۔ اب بھی جو لوگ تعلیم دین پاتے ہوں یا خدمت دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کر چکے ہوں اس ذیل میں آتے ہیں (۲) وہ لوگ جو کفار کے ظلم کی وجہ سے یا امن اُٹھ جانے کی وجہ سے اپنا کاروبار نہ کر سکتے ہوں (۳) وہ لوگ جو دینی جنگوں میں زخمی ہو گئے ہوں یا خدمت دینی ادا کرتے ہوئے کام کے ناقابل ہو گئے ہوں۔ لا یستطیعون ضربًا فی

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ
سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ج
وقف منزل وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾
اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا
يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ط
وقف لازم ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا

جو لوگ رات اور دن چھپ کر اور ظاہر اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں تو ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کو کوئی ڈر نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ع۳۵۰

جو لوگ سُود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہیں ہونگے، مگر اس طرح جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا بنا دیا ہو ع۳۵۱۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ خرید و فروخت بھی سود ہی کی طرح ہے

الارض میں بتا دیا کہ وہ اللہ کی راہ میں ایسے روکے گئے ہیں کہ زمین میں چل پھر کر اپنی معاش پیدا نہیں کر سکتے اور ان کی نشانی یہ بتائی ہے کہ ایسے لوگ سوال نہیں کرتے مانگتے نہیں۔ یوں ان کام کرنے والوں کو بھی کیا اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے۔ ان واعظوں کے لیے جو وعظ کر کے مداری کی طرح دستِ سوال کرتے ہیں اس میں سبق ہے اور فی سبیل اللہ دینے والوں کو بھی نصیحت ہے کہ وہ زیادہ تر اپنے اموال کن لوگوں پر صرف کریں۔

یہاں لفظ تعفف کے استعمال سے اور مستحقین کے متعلق یہ بتا کر کہ وہ سوال نہیں کرتے یہ بھی بتا دیا ہے کہ سوال کرنا اچھی بات نہیں کیونکہ تعفف بُری بات سے بچنے کا نام ہے تو معلوم ہُوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سوال کرنا مذموم امر ہے۔ مگر آج جدھر دیکھو بھیک مانگنے والے مسلمان نظر آتے ہیں۔ بخاری کی حدیث میں جو ان الفاظ کی تفسیر ہے یہ لفظ آتے ہیں کہ مسکین وہ نہیں جس کو ایک یا دو کھجوریں یا ایک دو لقمے دیدیئے جاتے ہیں اِنما المسکین الذی یتعفف مسکین یعنی لینے کا حقدار صرف وہی ہے جو سوال سے بچے اور ایک اور حدیث میں یہ لفظ آتے ہیں کہ وہ مسکین نہیں جو در بدر گھومتا پھرے اور تم اسے لقمہ لقمہ دو۔ اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے یہ خطبہ پڑھا کہ جو شخص اپنی حاجت غیروں کے پاس نہیں لے جاتا اللہ اسے غنی کر دیتا ہے اور جو سوال سے بچتا ہے اللہ اسے بچاتا ہے اور جو اپنے آپ کو روکتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے (من استغنی اغناہ اللہ ومن استعف اعفہ اللہ ومن استکف کفاہ اللہ) اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص سوال کرے اور اس کے پاس ایک اوقیہ کی قیمت کی قدر ہو تو وہ الحاف کرتا ہے۔ پس ان احادیث کی رو سے وہ بھیک مانگنے والے جو لقمہ لقمہ کے لیے در بدر پھرتے ہیں مستحق خیرات نہیں ہیں اور ایسا سوال کرنے کو اسلام نے بہت مذموم قرار دیا ہے۔ پس ایسے سائلین کے روکنے کا انتظام عین مطابق منشائے تعلیم اسلامی ہے۔

قرآن نے صدقات کی تعلیم کو کامل کیا: قرآن کریم کا یہ دعویٰ کہ اس میں تعلیم کمال کو پہنچ گئی ہے۔ اس کی تعلیم کے ہر شعبہ سے ظاہر ہے ان دو رکوع میں صدقات کے مضمون کا کوئی پہلو جس پر اصولی رنگ میں بحث ہو سکتی تھی نہیں چھوڑا صدقات کی ضرورت بتائی نتیجہ بتایا، نتیجہ کے ضائع ہونے سے بچنے کی راہ بتائی۔ ریا سے روکا۔ بتایا کہ کیسا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ پھر بتایا کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے کوئی قوم غریب نہیں ہوتی۔ بلکہ خدا کے فضل کی زیادہ حقدار ہوتی ہے۔ پھر بتایا صدقات کس طرح دو، قومی کاموں میں علانیہ بھی دو۔ محتاجوں کو چھپا کر بھی دو پھر مسلمان محتاجوں کو بھی دو غیر مسلموں کو بھی دو۔ پھر دو تو یہ فکر نہ کرو کہ کس کے ہاتھ میں گیا۔ پھر بتایا کہ بھیک مانگنا مذموم فعل ہے اور مستحق امداد وہ لوگ ہیں جو بھیک نہیں مانگتے اور اپنی معاش کی فکر اس لیے نہیں کرتے کہ کسی دینی کام میں مصروف ہیں۔ اب انجیل اس تعلیم کا کیا مقابلہ کرے گی جس کی ساری دوڑ اس ایک دل خوش کن فقرہ پر ختم ہو جاتی ہے کہ دکھاوے کے لیے نہ دو۔ یہاں تمام ضروریاتِ انسانی کو مدِّنظر رکھ کر تمام پہلوؤں پر بحث ہے۔

ع۳۵۰ صدقات اور سُود کا تقابل: اس رکوع کا اصل مضمون تو حرمت سود ہے مگر یہاں بطور خلاصہ صدقات کے مضمون کو پھر بیان کر دیا ہے کیونکہ صدقہ وہ چیز ہے جو اغنیاء سے لیکر غربا کو دی جاتی ہے اور سود وہ چیز ہے جو غربا سے چھین کر اغنیاء کو دی جاتی ہے تو اس تعلّق کے لحاظ سے سود کے ذکر سے پہلے پھر صدقات کی طرف توجہ دلائی کہ وہی اصل الاصول ہے جس پر دنیا کی خوشحالی کا انحصار ہے۔ کیونکہ مال کی تقسیم میں جب تک مساوات کے پہلو کو مدّنظر نہ رکھا جائے کبھی دنیا میں خوشحالی نہیں رہ سکتی۔ صدقات کا دینا اور سود کا نہ لینا اسی مساوات کے دو پہلو ہیں۔

ع۳۵۱ یاکلون۔ اکل ابتداءً کھانے کے معنی میں آتا ہے۔ پھر ہر قسم کے انفاق مال پر بولا جاتا ہے کیونکہ کھانا سب سے بڑا امر ہے جس کے لیے انسان مال کا محتاج ہوتا ہے ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل (۱۸۸) ان الذین یاکلون اموال الیتامیٰ ظلما (النساءؔ-۱۰) اور اکل المال بالباطل سے مراد اس کا ایسے طور پر خرچ کرنا ہے جو حق کے منافی ہو۔ اور یاکلون فی بطونہم نارا (النساءؔ-۱۰) میں آگ کا کھانے کی طرح پیٹ میں ڈالنا مراد ہے۔

الربٰو۔ رَبَا الشیُٔ کے معنی ہیں ایک چیز بڑھ گئی اور اس نے ترقی کی (غ) قرآن شریف میں سبزی کے بڑھنے پر آتا ہے ربت (الحج۲۲-۵) اور ایسا ہی مال کے بڑھنے پر ہے لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ (الروم۳۰-۳۹) اور ربٰو راس المال پر بڑھوتی کا نام ہے لیکن شریعت میں خاص قسم کی بڑھوتی پر یہ لفظ بولا گیا ہے (غ) ابو اسحاق کا قول ہے کہ جو ربٰو حرام ہے اس کی صورت اس قرض کی ہے جس کے ذریعہ سے جتنا دیا تھا اس سے زیادہ لیا جائے یا جس کے ذریعہ کوئی اور فائدہ اٹھایا جائے اور جو حرام نہیں وہ یہ ہے کہ انسان بطور ہبہ یا تحفہ کوئی چیز دے یہ چاہتا ہوا کہ اس سے بڑھ کر اسکو ملے (ا) ابن جریر نے مجاہد سے روایت کی ہے

وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ
جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ
مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ

حالانکہ اللہ نے خرید و فروخت کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا ہے،
سو جس کے پاس اپنے رب سے نصیحت آگئی پھر وہ رک گیا تو اس کے
لیے ہے جو گزر چکا اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو پھر لینے

کہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ ایک شخص کا دوسرے پر قرضہ ہوتا تو وہ کہتا کہ تم اس قدر اصل میں بڑھا لو اور ادائیگی میں مہلت دید و اور قتادہ کہتے ہیں کہ ربائے جاہلیت یہ تھا کہ ایک شخص دوسرے سے ایک وقت مقرر کے لیے خرید و فروخت کا معاملہ کرتا، جب وہ وقت آجاتا اور رقم ادا نہ ہوتی تو رقم بڑھا دی جاتی اور مہلت دیدی جاتی۔

یتخبط۔ خبط سے ہے جس کے معنی سخت مار نا (ل) ہیں جیسے درخت پر پتے جھاڑنے کے لیے سونٹا مارا جاتا ہے اور حدیث میں تیخبطنی الشیطان آتا ہے اس کے معنی کیے ہیں یصرعنی ویلعب بی (ن) یعنی مجھے پچھاڑ دے اور مجھے کھیل بنائے۔

مَسّ کے اصل معنی چھونا ہیں پھر ہر ایک ضرر جو انسان کو پہنچے بولا جاتا ہے مستھم البأساء۔ اور کنایتہً جنون پر بھی بولا جاتا ہے (غ) اور یہی معنی یہاں مراد ہیں جیسا اکثر تفاسیر میں ہے۔

صدقات اور ربا کے مضمون میں جو تعلّق ہے وہ پچھلے نوٹ میں بیان ہو چکا ہے اور گو صدقات اور ربا کی آیات کا نزول مختلف زمانوں کا ہے مگر ترتیب میں ان کو ایک جگہ رکھنا صاف بتاتا ہے کہ ترتیب آیات آنحضرت صلعم کے ارشاد سے ہوتی تھی۔ مگر بخاری میں ابن عباس کے جو یہ لفظ ہیں کہ اخر اٰیۃ نزلت علی النبی صلعم اٰیۃ الربٰو۔ یعنی آخری آیت جو نبی صلعم پر نازل ہوئی آیت ربا ہے یہ اس معنی میں درست نہیں کہ ربا کی حرمت کا حکم نزول قرآن کریم میں آخری آیت ہے حجۃ الوداع میں آنحضرت صلعم کا ربا سے منع کرنا صاف ثابت ہے۔ سو یہ آیت اس سے پہلے کی ہے اور حجۃ الوداع میں اکملت لکم دینکم کا نزول ثابت ہے اس لیے اس کے بعد کوئی حکم کی آیت نازل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ربا سے روکنے کا حکم بھی اخر اٰیۃ نزلت نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ اسے سورہ بقرہ میں بلحاظ نزول آخری آیت مانا جائے مگر اس سے بہتر توجیہہ اس حدیث کی وہ ہے جو ۳۵۸ میں کی گئی ہے یعنی آیت ربا سے مراد اس رکوع کی آخری آیت ہے اور سورہ آل عمران میں بھی لاتاکلوا الربٰو اضعافاً مضاعفۃ آتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ حرمت سود کا حکم دیر سے نازل ہوا ہو اور حرمت شراب کی طرح حرمت سود بھی تدریجاً ہوئی ہو اور سورہ آل عمران میں صرف سود در سود سے روکا ہو۔

اور یہ جو روایات میں آیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ربا کی تفسیر نہیں کی جیسا حضرت عمرؓ کا قول جو مسند احمد میں مروی ہے اور اسی قسم کے اور بھی اقوال ہیں حالانکہ ربا جاہلیت میں ایک مشہور و معروف امر تھا تو اس سے مراد صرف اس قدر ہے کہ وہ امور جو ربا سے ملتے جلتے ہیں ان کا ذکر نہیں کیا جیسا کہ ان اقوال میں ربا کے ستّر یا تہتّر دروازوں کا ذکر آتا ہے اور جیسا کہ حضرت عمرؓ کے ان الفاظ سے ظاہر ہے فدعوا الربٰو والریبۃ سو ربا اور شک کو چھوڑ دو یعنی ان امور کو جن کے متعلق شک ہو کہ وہ ربا سے ملتے جلتے ہیں ان میں سے بعض ملتی جلتی صورتوں کا ذکر احادیث میں آبھی گیا ہے۔ جیسے یہ کہ مخابرۃ سے روکا یعنی معین حصّہ پر زمین کاشت کرنے سے یا مزابنۃ سے یعنی خشک کھجوروں سے تازہ کھجوریں خریدی جائیں جو خوشے میں ہوں۔ یا محاقلۃ سے یعنی اس دانہ کے خریدنے سے جو ابھی خوشوں میں ہو۔

سود کی ممانعت عام ہے: بعض لوگوں نے کہا ہے کہ صرف سُود در سُود منع ہے نہ کہ سود۔ حالانکہ ربا کے معنی میں سود صاف آتا ہے بعض نے کہا کہ یہ حکم صرف دارالاسلام کے لیے ہے لیکن اس طرح قرآن کریم کے کل احکام سے امن اُٹھ جائے گا جو مدینہ میں نازل ہوئے کہ وہ صرف دارالاسلام سے مخصوص ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ سود کے حکم کی علت غربا سے ہمدردی ہے۔ جیسا کہ صدقات اور ربا کے مضمون کو ایک جگہ کرنے سے ظاہر ہے مگر علت گو کچھ ہو حرمت تو عام ہے جیسے شراب کی حرمت کی علت تو یہ ہے کہ اس سے نشہ ہو جاتا ہے نقصان پہنچتا ہے مگر ایک قطرہ بھی جائز نہیں گو اس سے نشہ نہ ہو۔ کیونکہ حکم عام ہے۔ البتہ سود دینے والے کے لیے بعض صورتیں اضطرار کی پیدا ہو سکتی ہیں کہ اس کے بغیر اس کی زندگی قائم نہ رہ سکے۔

بنکوں کا سود: ایک سوال یہ ہے کہ بنکوں میں جو روپیہ حفاظت کے لیے رکھا جائے اور اس پر حسب قواعد بنک سُود ملے اُس کا لینا جائز ہے یا نہیں اِس میں شک نہیں کہ ربا میں یہ لازم بات ہے کہ روپیہ کسی کو قرض دیا گیا ہو۔ جتنی ربائے جاہلیت کی صورتیں بیان کی گئی ہیں ان میں یہ ضروری ہے اور بنک میں ایک شخص روپیہ قرض نہیں دیتا بلکہ بطور امانت رکھتا ہے تو گو یہ صورت کسی قدر مختلف ہے۔ مگر پھر بھی صورت ربا سے مشابہ ہے اس لیے محتاط طریق یہی ہے کہ وہ روپیہ سود کا مخالفین اسلام کے مقابل پر اشاعت اسلام یا جہاد میں خرچ کیا جائے اور اپنے مصرف میں نہ لایا جائے جیسا کہ نوٹ ۳۵۶ میں ہے۔ اور زمیندارہ بنکوں کی صورت بھی کسی قدر عام صورت ربا سے اختلاف رکھتی ہے کیونکہ وہاں وہی لوگ قرض لے سکتے ہیں جو خود حصّہ دار ہوں اور یوں ایک رنگ میں نفع نقصان دونوں کے مالک ہو جاتے ہیں۔ مگر وہاں بھی احتیاط کا طریق یہی ہے جو بنک کے سود کے متعلق لکھا گیا۔ ہاں یہ جائز ہے کہ ایک شخص قرضہ لے اور واپس کرتے وقت اصل رقم سے کچھ بڑھ کر محض ھل جزاء الاحسان الّا الاحسان کے طور پر دیدے۔ یہ سود نہیں کیونکہ قرض دینے والے کو اس کا لینا مدنظر نہ تھا۔

ربا کی حرمت میں کئی ایک احادیث ہیں۔ ایک حدیث میں ربا کے کھانے اور کھلانے اور گواہ اور کاتب سب پر لعنت کی ہے۔ کیونکہ وہ سب سود کو مروج کرتے ہیں اور ایک اور حدیث میں ہے جو ابو داؤد نے روایت کی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ سود کھائیں گے عرض کیا گیا سب لوگ؟ فرمایا من لم یاکلہ منھم نالہ من غبارہ جو ان میں سے سود نہیں کھائے گا اس کا غبار اس کو پہنچ رہے گا۔ آج یہ الفاظ مخبر صادق کے کیسے سچے نظر آتے ہیں۔

اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷۵﴾ لگے تو وہی آگ والے ہیں وہ اس میں رہ پڑیں گے۔ ٣٥٢
يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرۡبِى الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی

سود کی ممانعت کی کیوں ضرورت ہوئی؟ اس کی دو بڑی وجوہ اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمائی ہیں جن میں سے پہلی وجہ ان الفاظ میں ہے یتخبطہ الشیطان من المس سود خوار کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے ایک شخص کو شیطان نے مجنون بنا کر گرا دیا ہو گویا وہ مال و دولت کی محبت میں مجنون ہو جاتا ہے اور پھر وہ گر جاتا ہے یعنی شرف انسانیت کھو دیتا ہے۔ یہ الفاظ نہایت سچے ہیں جب ایک انسان یا ایک قوم سود خوری میں ترقی کرتی ہے تو آخر مال و دولت کو اپنا معبود بنا لیتی ہے اور ہمدردی انسانی کی اعلیٰ صفات سے محروم ہو جاتی ہے یہودیوں نے سود خوری میں ترقی کی ہمارے ملک کے بنئے بھی اسی کی مثال ہیں۔ ان کی مال و دولت کی محبت اس حد تک ترقی کر گئی ہے کہ اپنے آرام اور آسائش پر اپنی اولاد پر بھی صرف کرنا ان کو دشوار نظر آتا ہے۔ وہ مہذب قومیں جنہوں نے آج سود خوری میں ترقی کی ہے ان کا معبود صرف ایک مال رہ گیا ہے اسی کی وہ پوجا کرتے ہیں اس پر دین ایمان عزت عفت سب کچھ بیچنے کو تیار ہیں۔

شراب اور سود کے بدنتائج بہت باریک ہیں آنحضرت صلعم کی تعلیم اور کامل قوت قدسی: جس طرح اسلام سے پہلے کسی مذہب نے شراب کو حرام نہیں کیا اسی طرح سود کو بھی حرام نہیں کیا۔ بات یہ ہے کہ ان دونوں کے خطرناک نتائج اس قدر باریک ہیں اور ان کا دور کرنا اس قدر مشکل ہے کہ اس کام کا اہل وہی انسان تھا جس نے سب نبیوں اور رسولوں کا سرتاج ہو کر آنا تھا۔ اس کی وحی کو یہ کمال عطا کیا گیا کہ باریک سے باریک بدنتائج جو مدتوں بعد ظاہر ہوتے ہیں اسے دکھائے جائیں اور اسی کو یہ قوت قدسی عطا کی گئی کہ خطرناک سے خطرناک بدیاں جو انسانوں کی طبائع کے اندر اس قدر دخل پا گئی ہیں کہ بظاہر جزو فطرت ہی ہوئی نظر آتی ہیں دنیا سے دور کرے جس طرح شراب کے بدنتائج اگر انسان یوں دیکھنا چاہے کہ ایک شخص حد اعتدال تک شراب پیتا ہے یا دو چار گھونٹ پیتا ہے تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح پر بظاہر اس میں کسی کا نقصان نظر نہیں آتا کہ زید بکر کو دس روپے قرض دے اور اس پر سال بھر میں دو روپے یا چار روپے سود لے لے اور بکر ان دس روپوں کو تجارت میں لگا کر اُن سے فائدہ اُٹھائے۔ اتنے عظیم الشان مسائل میں ایک وسیع پیمانہ پر اور لمبے زمانہ میں نتائج کو پھیلا کر دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یوں تو بدی اور نیکی چیزیں ہی ایسی ہیں کہ ان کے نتائج فوری اور بدیہی نہیں ہوتے بلکہ کھلا نتیجہ ان کا اسی وقت نظر آتا ہے جب ان کا بار بار کثرت سے اعادہ ہو۔ مگر جس قدر بدی باریک ہو گی اسی قدر اس کے نتائج اور لمبے زمانہ پر پھیلانے سے نظر آئیں گے۔ خود زنا کی بدی ایسی ہے کہ اس کے بھی فوری بدنتائج لوگوں کو نظر نہیں آتے۔ اس لیے آج طرح طرح کے پیرایوں میں زنا کاری کو رواج دیا جاتا ہے۔ پس سود خوری کے نتائج کو جب لمبے زمانہ پر پھیلا کر دیکھا جائے تو خود واقعات شہادت دے اٹھتے ہیں کہ وہ اخلاق انسانی اور عامہ آسائش انسانی کی ترقی میں بڑی بھاری روک ہے سود خوری کے ساتھ جوں جوں مال کی محبت ترقی کرتی ہے۔ اصول، اخلاق، ہمدردی انسانی کی وقعت کم ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ آخر کار ایسا انسان یا ایسی قوم روپے کی محبت کے عوض تمام اعلیٰ اخلاق کو بیچ دیتی ہے۔ اخلاق فاضلہ کی اعلیٰ منزل پر پہنچانے کے لیے ایک چھوٹی سی مالی منفعت کو قربان کر کے اسلام نے بتا دیا کہ واقعی وہ دنیا کا آخری اور کامل مذہب ہے سود خوری کے دوسرے عظیم الشان نقصان کی طرف اگلے الفاظ میں توجہ دلائی گئی ہے۔ دیکھو اگلا نوٹ۔

٣٥٢ بیع چیز کے دینے اور قیمت کے لینے یعنی فروخت کو کہتے ہیں اور شراء خرید کو۔ مگر دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ اور معاملہ خرید و فروخت پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔

سَلَفَ متقدم یعنی پہلے آنے والے کو کہا جاتا ہے۔ فله ما سلف سے یہاں مراد ہے کہ جو اس کا گناہ پہلے گزر چکا اس پر گرفت نہیں کی جائے گی (رغ)

اَمْر کے اصل معنی شان یعنی معاملہ یا حالت ہیں اور وہ ہر قسم کے اقوال و افعال کے لیے عام لفظ ہے (رغ) امرہ الی اللہ ایسا ہی محاورہ ہے جیسے ہم کہہ دیتے ہیں اس کا معاملہ سپرد خدا۔ یعنی تم انسان اس کے متعلق زبان مت کھولو کہ پہلے یوں کرتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ جب ایک شخص ایک برائی سے رک جائے تو اس کی گذشتہ کمزوریوں کا ذکر کرنا قرآن شریف کی رُو سے ایک نہایت قبیح امر ہے۔

سود اور تجارت میں فرق: یہاں بتایا کہ لوگ سود کے جواز کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ جیسا سود ویسی تجارت۔ حالانکہ لین دین خرید و فروخت کو اللہ تعالیٰ حلال قرار دیتا ہے اور سود کو حرام پس معلوم ہوا کہ وہ دونوں یکساں نہیں۔ ظاہری مساوات جس کی طرف لوگوں کی نظر جاتی ہے وہ تو یہ ہے کہ جب انسان مال خرید کر اس سے منفعت حاصل کر سکتا ہے اسی طرح روپے سے بھی اسے منفعت حاصل کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے مگر خدا کے ہاں ان دونوں میں فرق ہے ادنیٰ تامل سے کام لیا جائے تو وہ فرق نظر آتا ہے کہ سود میں محنت نہیں خرید و فروخت میں محنت کرنی پڑتی ہے۔ اسلام نے چونکہ محنت کو انسانی ترقی کا ضروری جزو قرار دیا ہے اس لیے ایک ایسے معاملہ کو جس میں محنت نہیں ناجائز ٹھہرایا ہے اور نہ صرف سود خوری محنت سے خالی ہے بلکہ اس سے محنت کی بیوقری بھی ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ سرمایہ دار جب سود پر روپیہ دیتا ہے تو وہ شخص جو اس سے تجارت کرتا ہے اور اس پر محنت کرتا ہے بعض وقت نفع اُٹھاتا ہے بعض وقت نقصان۔ مگر سرمایہ دار ہمیشہ نفع لیتا ہے اور نقصان سے اُسے کچھ واسطہ نہیں۔ اگر بالفرض تجارت میں سارے مال کا بھی نقصان ہو جائے تو بھی سرمایہ دار نہ صرف اپنے سرمایہ کا حقدار ہے بلکہ وہ اس پر نفع بھی لیگا، گویا محنت کی بمقابلہ سرمایہ یعنی روپیہ کے کچھ بھی قدر نہیں نقصان کی ذمہ دار وہ اور نفع سے فائدہ اُٹھانے والا سرمایہ۔ شراکت کی افضلیت: اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جہاں ایک شخص دوسرے سے روپیہ قرض لیکر تجارت چلاتا ہے تو سرمایہ دار اور محنت کرنے والا دونوں نفع نقصان میں حصہ دار ہوں یعنی بجائے قرض کے شراکت کا رنگ ہو۔ اسلام کا اصل الاصول معاملات دنیا میں محنت کے وقر کو بڑھاتا ہے۔ اسی لیے اس نے ان امتیازات کو دور کر دیا ہے جو مال کی کمی یا زیادتی

لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ ﴿۲۷۶﴾

ناشکر گزار گنہگار کو پسند نہیں کرتا۔ ۳۵۳

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ
اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ
عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا
ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۷﴾

جو لوگ ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں ان کے لیے ان کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور ان کو کوئی ڈر نہیں، اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔ ۳۵۴

سے پیدا ہوتے ہیں۔
سود خواری میں سرمایہ کی عزت محنت سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ یورپ کی موجودہ سود خوار قوموں میں اس اصول کا نتیجہ یہ ہُوا ہے کہ انسانوں کا وہ حصّہ جن کا مدار زندگی محنت پر ہے غریب اور مفلس ہو گیا ہے اور ان کا افلاس روز بروز ترقی کر رہا ہے اور سرمایہ اور روپیہ چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں اکٹھا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اکثر حالات میں یہ سرمایہ بھی محنت سے پیدا ہُوا ہے۔ مگر جب ایک دفعہ وہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر کوئی اصول ایسا نہیں کہ اس کو محنت کرنے والوں کی طرف واپس کرے بلکہ اصول سود خواری کی رو سے یہ سود خوار کے ہاتھ میں بلا محنت ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ اس غلط اصول کا نتیجہ ہی پہلے سوشلزم کا اور اب بولشوزم کا پیدا ہونا ہے جنہوں نے اس سرمایہ کے چند ہاتھوں میں اجتماع کو دیکھ کر اس کے خلاف یہ اصول قائم کیا کہ کوئی شخص اپنے کمائے ہوئے مال کا آپ مالک نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ سب مل کر کمائیں اور مل کر کھائیں۔ گو اس میں محنت کی عزت نظر آتی ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں اور اس میں بھی محنت کی بے وقری ہے کیونکہ جب محنت کے نتیجہ کا انسان مالک نہ ہوگا تو ترقی کے لیے اور زیادہ محنت کرنے کے لیے کوئی تحریک باقی نہ رہے گی۔

اصول محنت و مساوات دولت میں توازن اسلام نے قائم کیا: اِن مشکلات کا حل اسلام نے کیا کہ ایک طرف تو محنت کو یہ عزت دی کہ محنت سے کمائے ہوئے مال کو محنت کرنے والے کا حق قرار دیا تاکہ محنت کے لیے یہ موجب تحریک ہو اور دوسری طرف جب محنت سے سرمایہ ایک جگہ جمع ہونے لگے تو پھر اس کے واپس لوٹانے اور ایک حد تک دوسرے لوگوں میں تقسیم کرنے کا انتظام کیا۔ گویا اصول محنت مساوات دولت کے خلاف تھا۔ اور مساوات دولت اصول محنت کے خلاف، اسلام نے ان دونوں کو نہایت خوبی سے جمع کیا ہے۔ یعنی اصول محنت کو بطور بنیاد قائم رکھا کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا اور مساوات دولت کے لیے کئی ایک قانون بنا دیئے۔ جیسے زکوٰۃ کا اصول کہ جمع شدہ دولت کا چالیسواں حصّہ ہر سال لازماً غربا کو دیا جائے۔ یا جیسے تقسیم ورثہ کا اصول کہ روپیہ ایک جگہ جمع ہو کر ایک شخص کی موت کے ساتھ تقسیم ہوتا رہے۔ ایسا ہی یہ اصول سود کی حرمت کا ہے کہ اس کی رو سے اغنیاء سے غربا کو مدد ملتی رہتی ہے۔

بخاری میں حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت آنحضرت صلعم پر نازل ہوئی تو آپ نے اسے پڑھ کر سُنایا۔ پھر شراب کی تجارت کو منع فرمایا۔

یہ اس لیے کہ احل اللّٰہ البیع میں بیشک ہر قسم کی تجارت جائز ہے مگر وہ تجارت جائز نہیں جو کسی حکم الٰہی کی خلاف ورزی میں معاون ہو۔

۳۵۳ یمحق۔ مَحْق نقصان کو کہتے ہیں اور مَحَقَہٗ کے معنی ہیں ایک چیز کو گھٹا دیا اور اس کو بے برکت کر دیا۔

کفار۔ کُفر سے کَفُور اور کَفَّار مبالغہ کے صیغے آئے ہیں اور کافر کی جمع کفّار ہے۔ کفّار کفر پر اصرار کرنے والا ہے گویا وہ خدا کے حکم کے مقابلہ پر حلت ربا پر مصر ہے

اثیم۔ اِثم سے مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی وہ باوجود عقیدہ حرمت کے گناہ میں پڑتا ہے۔

یہاں بیان فرمایا ہے کہ سود سے بے برکتی پیدا ہوتی ہے اور صدقات سے برکت پیدا ہوتی ہے۔ مسند امام احمد میں ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ان الربا وان کثر فان عاقبتہ تصیر الی قل یعنی سود گو بہت ہو جائے مگر انجام اس کا کمی کی طرف ہوتا ہے۔ اور صدقات کے متعلق بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جو شخص ایک کھجور کے برابر پاک کمائی سے صدقہ کرتا ہے اور اللّٰہ تعالیٰ پاک مال کے سوائے قبول نہیں کرتا تو اللّٰہ تعالیٰ اس کو اپنے دائیں ہاتھ سے قبول کرتا ہے پھر اس کو اس کے دینے والے کے لیے بڑھاتا ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنے بچھیرے کو پالتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے (کتاب الزکوٰۃ)

قوم کا مال کس طرح بڑھتا ہے: ان باتوں کی صداقت پر واقعات عالم شاہد ہیں کسی قوم کی دولت یوں نہیں بڑھتی کہ اس میں سے چند لوگوں کے صندوقوں میں بیشمار روپیہ پڑا ہو بلکہ قومی دولت بڑھی ہوئی اس وقت سمجھی جائیگی جب ہر ایک شخص کو اس دولت سے فائدہ پہنچ رہا ہو۔ اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ سود خواری اس کے منافی اور صدقات اور صرف صدقات ہی اس کے معاون ہیں۔

۳۵۴ جب ان لوگوں کا ذکر کیا جو احکام الٰہی کی اعتقاداً یا عملاً نافرمانی کرتے ہیں اور فرمایا کہ ایسے لوگ خدا کے محبوب نہیں ہو سکتے تو ساتھ ہی تقابل کے طور پر نیکیوں کا ذکر کیا اور اعمال صالحہ کے دو ارکان نماز اور زکوٰۃ کا خصوصیت سے ذکر کیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۲۷۸ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝۲۷۹ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۸۰ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۣ ثُمَّ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقوٰے کرو اور جو کچھ سُود سے باقی رہ گیا ہے اُسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔[۳۵۵]
پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کے لیے خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کرو تو تمھارے لیے تمھارے اصل مال ہیں نہ تم نقصان پہنچاؤ اور نہ تمھیں نقصان پہنچایا جائے۔[۳۵۶]
اور اگر مقروض تنگدست ہو تو فراخی تک مہلت دینی چاہیئے اور اگر تم خیرات کر دو تو تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔[۳۵۷]
اور اس دن سے اپنا بچاؤ کرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤگے

ع[۳۵۵] بقایا سود کا ترک کرنا حجۃ الوداع کا خطبہ: یہاں یہ حکم دیا ہے کہ جب حرمت سود کا حکم نازل ہوا یا جب کوئی شخص توبہ کر کے حکم الٰہی کی فرمانبرداری کی طرف رجوع کرتا ہے تو جو کچھ سود وغیرہ اس وقت باقی ہے اسے چھوڑ دے حجۃ الوداع میں نبی کریم صلعم نے جو خطبہ پڑھا تھا اس میں اور امور میں یہ بھی ذکر تھا کہ جس قدر جاہلیت کے سود کی رقمیں تھیں وہ سب موقوف کی جاتی ہیں یعنی اب قابل وصول نہ ہونگی اور فرمایا کہ پہلا ربا جو موقوف کیا جاتا ہے وہ عباس بن عبدالمطلب کا ہے یعنی آپ کے چچا کا۔ یہ تعلیم کیوں مؤثر نہ ہو جس میں اصلاح گھر سے شروع کی جائے۔

ع[۳۵۶] اذنوا۔ اذن سے ہے اَذِن کے اصل معنی سُنا ہیں (کیونکہ اُذُنٌ کان کو کہتے ہیں) اور پھر اس کا استعمال اس علم پر بھی ہوتا ہے جو سننے سے حاصل ہو اور بالآخر مطلق علم پر بھی کیونکہ اکثر علم سننے سے حاصل ہوتا ہے (غ) ابن جریر نے اذنوا کے معنی کیے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم پالو اور ابن عباس نے (استیقنوا معنی کیے ہیں یعنی لقیناً جان لو (ج)

یہاں سود لینے کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرنا قرار دیا ہے۔ بعض لوگوں نے ظاہر الفاظ کا تتبع کر کے یہ خیال کر لیا ہے کہ سود لینے والے کو قتل کر دینا جائز ہے مگر یہ درست نہیں اور نہ حدود شرعی میں اس کا کہیں ذکر آتا ہے۔ یہ الفاظ صرف تنبیہ و تہدید کے لیے ہیں۔ مال کی محبت بعض وقت انسان کو اندھا کر دیتی ہے اس لیے اس سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔

سود کا روپیہ اشاعت اسلام پر خرچ کرنا: یہاں سود لینے کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرنا قرار دیا ہے تو اس سے بطور اشارہ لطیفہ یہ استنباط ہو سکتا ہے کہ اگر انسان کے پاس کوئی ایسا روپیہ سود کا آ جائے جو اس نے سود حاصل کرنے کی نیت سے نہیں لیا یا جس میں کچھ شائبہ سود کا ہو تو اگر ایسے روپے کو اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں کے مقابلہ پر خرچ کر دیا جائے تو جائز ہے۔ اسی طرح جو لوگ بنکوں میں یا ڈاک خانوں میں روپیہ محض پس انداز کرنے کیلئے یا حفاظت کے لیے رکھوا دیتے ہیں ان کے لیے جائز ہے کہ سود کے روپے کو وصول کر کے اشاعت اسلام کے کام پر لگا دیں مگر اپنے کسی مصرف میں نہ لائیں۔ اسی طرح جن ملازمین کو بونس کا روپیہ ملتا ہے اگر اس میں کچھ حصّہ سود کا ہو تو تقوٰے کا طریق یہ ہے کہ سود کے روپے کو تبلیغ دین پر لگا دیں یا جہاد میں صرف کر دیں۔ ایسا ہی اگر کوئی شخص بنک میں روپیہ محض اس غرض سے جمع کرتا ہے کہ اس کے پسماندگان کے لیے کچھ اندوختہ رہ جائے تو یہ بھی اس شرط پر جائز ہو سکتا ہے کہ اصل رقم کے علاوہ جو روپیہ ہے وہ اشاعت اسلام کے کام پر لگا دیا جائے۔ اگر کسی شخص کے پاس ناجائز کمائی کا روپیہ ہے اور وہ آیندہ اس طریق سے توبہ کرتا ہے اور مال مشتبہ کا الگ کرنا یا اصل حقداروں کو پہنچانا مشکل امر ہے تو اس کا بھی خیراتی کاموں پر لگا دینا جائز ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ناجائز طریق پر روپیہ کما کر خیرات میں دیا جا سکتا ہے بلکہ یہ محض ایک حالت مجبوری ہے کہ روپے کو دوسری صورت میں تباہ کرنا پڑتا ہے تو اس صورت میں بہتر ہے کہ اسے اشاعت اسلام پر یا کسی خیراتی کام پر لگا دیا جائے۔

ع[۳۵۷] نَظِرَۃ۔ نظر سے ہے ڈھیل یا مہلت دینا۔

مَیْسَرَۃ۔ یُسر عُسر کی ضد ہے اور میسرۃ سے مراد یہاں غنا ہے۔

تصدقوا تَصَدَّق کے اصل معنی ہیں صدقہ دیا۔ لیکن جب انسان کا ایک حق ہو اور اسے وہ چھوڑ دے تو اس پر بھی تصدق بولا جاتا ہے (غ)

احادیث میں بھی قرضدار کو معاف کر دینے یا ڈھیل دینے کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ یہاں یا حکم ہے اور اس کی فرمانبرداری ضروری ہے یا سفارش ہے اور خدا کی سفارش سے بڑھ کر کیا چیز مومن کو محبوب ہونی چاہیئے۔ یہ وہ ہمدردی ہے جو اسلام سکھاتا ہے۔ مقروض تنگ دست ہو تو یا مہلت دو یا معاف ہی کر دو۔ آج کل کے قوانین کی طرح جیل خانہ میں نہیں بھجوانا۔

ع ٣٨ / ٧ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٨١﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ
اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ
بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ
اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ
الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا
يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ
الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ
يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ
وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ
فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ
مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ
اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ
وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا

ع٣٥٨ پھر ہر شخص کو جو اس نے کمایا پورا دیا جائیگا اور انھیں نقصان نہیں پہنچایا جائیگا۔
اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم آپس میں مقرر وقت کے لیے قرض کا
معاملہ کرو تو اسے لکھ لو۔ ع٣٥٩ اور چاہیئے کہ تمھارے درمیان لکھنے
والا عدل کے ساتھ لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے
جیسا اللہ نے اُسے سکھایا، اور ضرور لکھ دے اور چاہیے
کہ وہ جس پر حق ہے لکھائے اور وہ اللہ اپنے رب کا تقوے
اختیار کرے اور اس سے کچھ کمی نہ کرے، پھر اگر وہ شخص جس پر
حق ہے کم عقل یا ضعیف ہو یا لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو
تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوائے۔ اور دو گواہ
اپنے مردوں میں سے گواہی کے لیے بلا لیا کرو۔ پھر اگر
دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں
میں سے ہوں جن کو تم پسند کرو، تاکہ اگر ایک بھول جائے
تو ایک ان دونوں میں سے دوسری کو یاد دلا دے۔
اور گواہ جب بلائے جائیں انکار نہ کریں اور اس کے وقت

ع٣٥٨ آخری آیت جو آنحضرت پر نازل ہوئی آیات کی ترتیب آنحضرت کے حکم سے: اس آیت کے متعلق متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری آیت ہے جو نبی کریم صلعم پر نازل ہوئی اور اس کا نزول آپ کی وفات سے چند ہی یوم پیشتر تھا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا اجعلوھا بین اٰیۃ الربٰوا و اٰیۃ الدّین یعنی اس کو آیت ربا اور آیت دَین کے درمیان رکھ دو (آیت دَین آگے آتی ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم ہر ایک آیت کا مقام خود بتاتے تھے، اور بخاری کی یہ روایت جو ابن عباسؓ سے ہے کہ آخری آیت جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوئی آیت ربا تھی، اس کے خلاف نہیں امام بخاری نے جس باب کے نیچے اس حدیث کو بیان کیا ہے وہ واتقوا یومًا ترجعون فیه ہے چونکہ ربا کا مضمون اس آیت پر ختم ہوتا ہے اس لیے اسی کو آیت ربا کہدیا ہے مضمون ربا کا خاتمہ اس آیت پر کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ یہ مال و دولت جس کی محبت کے لیے تم اپنے اخلاق کو تباہ اور روحانیت کو برباد کرتے ہو یہ انجام کار تمھارے کچھ کام نہیں آئے گی:۔

ع٣٥٩ تداینتم۔ دَین قرضہ کو کہتے ہیں اور مُداینۃ اس سے مفاعلہ ہے ایک دوسرے سے قرض کا معاملہ کرنا۔

حفاظت مال کی تعلیم: پچھلے تین رکوعوں میں ایک طرف انفاق فی سبیل اللہ پر زور دے کر اور دوسری طرف سود کو حرام قرار دے کر مال کی محبت کی جڑ کاٹی ہے تو اب یہ بھی بتادیا کہ مال کی حفاظت کی کس قدر ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ مال کی حفاظت کو ایک دینی حکم قرار دیا بلکہ ان لوگوں کو جو اپنے مال کی حفاظت نہیں کرسکتے سفیہ قرار دیا۔ یہی اسلام کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ انسانی قوٰے کے نشوونما میں اعتدال کے پہلو کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔ مال سے محبت نکرنا، اخلاق فاضلہ کے لیے ضروری ہے مگر یہ نہیں کہ حقوق کی حفاظت نہ کی جائے کیونکہ مال سے انسان کے کام چلتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا التی جعل اللہ لکم قیامًا (النسآء ۔۵) اور جو شخص مال کی حفاظت نہ کریگا وہ دوسروں کا محتاج ہوجائے گا اور احتیاج بھی اخلاق فاضلہ سے محروم کرتی ہے۔

لین دین کے معاملات چار طرح پر ہوسکتے ہیں: (۱) بیع العین بالعین لینے دینے کی دونوں چیزیں موجود ہوں اس کو تجارت حاضرہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ قیمت دی اور چیز لی۔ تحریر کی ضرورت نہیں (۲) بیع الدین بالدین یعنی لینے دینے کی دونوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ یہ فرضی بیع ہے جیسا آج کل تجارت کے رنگ میں جوا کھیلا جاتا ہے جسے سٹہ کہتے ہیں۔ اسے اسلام نے منع کیا ہے (۳و۴) بیع العین بالدین یا بیع الدین بالعین یعنی ایک چیز موجود نہ ہو اور دوسری ہو یہی مُداینہ ہے اس میں حکم ہے کہ ایسے معاملات کو لکھ لیا کرو اور گواہ بھی رکھ لیا کرو تا جھگڑے کم ہوں۔

عرب اُمی قوم تھی۔ معاملات سادہ رنگ کے تھے ان میں لکھنے کا رواج نہ تھا۔ کاغذ بھی کمیاب تھا۔ ایسی قوم کو تحریر معاملات کا اتنا موکد حکم بتاتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کے ایک عظیم الشان متمدن قوم بننے کا اشارہ تھا۔ اس لیے اس قوم کی بنیاد ہی ایسی رکھی کہ آئندہ ضرورتوں کا سامان پہلے سے کردیا۔

تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى
اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ
وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً
حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ
جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ
وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۵ وَاِنْ
تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ
وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۲۸۲

تک اسے لکھنے میں کاہلی نہ کرو تھوڑا ہو یا بہت۔ یہ اللہ
کے نزدیک بہت انصاف کی بات ہے اور گواہی کو بہت
مضبوط رکھنے والی ہے اور اس سے بہت قریب ہے کہ تم شک میں نہ
پڑو لیکن اگر نقد سودا ہو جس کو تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو پھر تم پر کوئی
گناہ نہیں کہ اُسے نہ لکھو اور جب خرید و فروخت کرو تو گواہ رکھ لیا
کرو اور نہ لکھنے والے کو نقصان پہنچایا جائے اور نہ گواہ کو۔ اور
اگر تم (ایسا) کرو گے تو یہ تمہاری طرف سے نافرمانی ہوگی اور اللہ کا
تقویٰ کرو اور اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ع۳۶۰

ع۳۶۰ کما علمہ اللہ میں کما کے معنی لِاَجل کے بھی ہو سکتے ہیں یعنی اس لیے کہ اللہ نے اسے سکھایا اور کَ بمعنی مثل بھی ہو سکتا ہے یعنی جس طرح اللہ نے اُسے سکھایا۔ کاتب کے سیکھنے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا کیونکہ اسی نے انسان کو استعداد دی اور اسی نے سامان مہیا کیے۔

بالعدل۔ اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ کسی فریق کی طرف میلان نہ ہو اور یہ بھی کہ کتابت میں عدل ہو یعنی ایسی کتابت ہو جس پر وثوق کیا جا سکے (د) پس ہر شخص کتابت کا اہل نہیں یوں وثیقہ نویسی کو ایک فن قرار دیا ہے۔

یُملل۔ مَلَل کے اصل معنی ملال ہونے کے ہیں (ل) حدیث میں ہے فان اللہ لا یَمَلُّ حتی تَمَلُّوا (وہ عمل اختیار کرو جس کی طاقت رکھتے ہو کیونکہ) اللہ ملول نہیں ہوتا یہاں تک کہ تم ملول ہو جاتے ہو۔ ملول ہونا انسان کے لیے ہے خدا کے لیے نہیں۔ اور اَمْلَلْتُ الکتاب اور اَمْلَیْتُ الکتاب کے ایک ہی معنی ہیں اسے کاتب پر ڈالا یعنی بول کر تاکہ وہ اسے لکھ لے (ل) قرآن شریف میں دوسری جگہ اِملاء آتا ہے فھی تملی علیہ بکرۃ واصیلا (الفرقان ۲۵-۵) اور لفظ مِلّۃ بمعنی مذہب بھی مللت الکتاب سے ہی اخذ کیا ہے الذی علیہ الحق جس شخص پر حق قائم ہو رہا ہے وہ لکھوائے اس سے بہت سے مظالم کا سد باب ہوتا ہے جو آج ساہوکاروں کی طرف سے غریب مدیونوں پر ہو رہے ہیں جو چاہتے ہیں خود بہیوں میں لکھ لیتے ہیں۔

یَبْخَس۔ بَخس۔ ظلم کے طور پر کسی چیز کا کم کرنا (غ)

سفیھا۔ دیکھو ع۲۵ جو لوگ اپنے اموال کو ٹھیک طرح سے خرچ کرنا یا اپنے حقوق کی حفاظت کرنا نہیں جانتے ان کو سفیہ کہا ہے۔

ضعیفا۔ لڑکا ہو یا بہت بوڑھا۔

لا یستطیع ان یمل ھو۔ املا نہ کرا سکنے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں گونگا ہو۔ زبان سے ناواقف ہو۔ کوئی اور عارضہ ہو۔

ان لم یکونا رجلین۔ دو گواہ مرد نہ ہوں۔ یعنی نہ ملیں یا نہ رکھنا چاہو۔

تضل۔ طریق مستقیم سے عدول کا نام ضلال ہے عمداً ہو یا سہواً تھوڑا ہو یا بہت (غ) چنانچہ محض نسیان یعنی بھول جانے پر بھی بولا جاتا ہے (غ)

تذکر۔ اس کے معنی کیے ہیں۔ تعید ذکرہ (غ) یعنی اس کے ذکر کا اعادہ کر دے۔

حاضرۃ۔ موجود یعنی نقد تجارت۔

یضارّ۔ یہاں ضرّ بمقابلہ نفع ہے (غ) یعنی مالی نقصان نہ پہنچایا جائے جب شہادت میں بلایا جائے اس کو اس کی صنعت یا معاش کا عوضہ دیا جائے۔

باہم معاملات میں اصول قوانین: اس ایک آیت میں ایک ترقی یافتہ قوم کی لین دین کی جملہ ضروریات کو مدّنظر رکھا گیا ہے۔ اوّل کاتبوں یا وثیقہ نویسوں کی ضرورت بتائی۔ وہ لکھنے سے انکار نہیں کر سکتے اور لکھانے والے کو معاوضہ دینا ضروری ہے۔ دوم گواہ ہوں وہ گواہی دینے سے انکار نہیں کر سکتے۔ مگر جو اُن کو بطور گواہ بلاتا ہے وہ ان کے کاروبار کے ہرجہ کا معاوضہ دے۔ سوم معاملہ کرنے والا بچّہ ہو یا بوڑھا یا مال کی حفاظت نہ کر سکتا ہو یا کوئی اور امر مانع ہو تو اس کا ولی مقرر کیا جائے۔ غرض ایک ایک فقرہ میں ایک ایک قانون کی بنیاد قائم کر دی ہے آگے اس پر قانون بن سکتے ہیں۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شہادت میں دو گواہوں کا ہونا بلحاظ حالات عامہ ہے۔ عموماً دو گواہوں سے بات مضبوط ہو جاتی ہے۔ جھوٹ کی ملاوٹ کا احتمال کم ہو جاتا ہے۔ بیان کا جو حصّہ ایک دوسرے کی تائید میں ہو وہ وزنی ہو جاتا ہے یہ حکم نہیں کہ اگر ایک ہی گواہ ہو تو فیصلہ نہ کیا جائے یا قرائن کی شہادت پر فیصلہ نہ کیا جائے بلکہ حضرت یوسف کے معاملہ میں جہاں قمیض کے آگے یا پیچھے سے پھٹنے کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا کہ قرائن کی شہادت پر بھی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا
فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ
بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ
اللّٰهَ رَبَّهٗ ۭ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ وَمَنْ
يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿٢٨٣﴾ ع ۳۹

اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو (کچھ) باقبضہ گرو رکھ
لیا جائے پھر اگر تم میں سے ایک دوسرے کا اعتبار کرے تو جس کا اعتبار
کیا گیا ہے چاہیئے کہ وہ امانت کو ادا کرے اور اللہ اپنے رب
کا تقویٰ اختیار کرے۔ اور گواہی کو نہ چھپاؤ، اور جو شخص اسے
چھپاتا ہے تو اس کا دل ضرور گنہگار ہوتا ہے اور جو کچھ کرتے ہو
اللہ اسے جانتا ہے ۳۶۱

عورت کی گواہی: اور ایک مرد کی جگہ جو دو عورتوں کی شہادت رکھی تو اس کی وجہ بھی خود ہی بتا دی کہ عورتوں کو چونکہ معاملات لین دین سے واسطہ کم پڑتا ہے، اس لیے ایسی باتوں کو شاید وہ اچھی طرح یاد نہ رکھ سکیں تو ایک کی کمی کو دوسری پورا کر دے۔ اکیلی عورت کی شہادت ناقابلِ قبول ہونے کا ذکر کہیں نہیں۔ بلکہ لعان کے معاملہ میں جو وزن مرد کی چار مرتبہ شہادت کو دیا ہے وہی وزن عورت کی چار مرتبہ شہادت کو دیا ہے گویا مرد اور عورت کی شہادت میں کوئی فرق نہیں کیا۔ ولادت بکارت وغیرہ معاملات میں فقہا نے بھی عورت کی شہادت کو پورا وزن دیا ہے۔

ع۳۶۱ رھان۔ رَھن کی جمع بھی ہے اور خود رَھن کی طرح مصدر بھی ہے اور وہ چیز ہے جو بطور ضمانت قرض کے لیے رکھی جائے (رغ)

امانۃ۔ اَمن اور اَمَانَۃ اور اَمَان اصل میں مصدر ہیں جن کے معنی نفس کی طمانیت اور خوف کا جاتے رہنا ہے اور اَمَان اس حالت کا نام بھی ہے جس میں انسان ہو اور اس چیز کو بھی کہدیا جاتا ہے جس کے متعلق انسان کا اعتبار کیا جائے یا اسے امین سمجھا جائے اسی معنی میں امانت ہے (رغ) اور یہاں جس چیز کے متعلق اعتماد کیا گیا ہے وہ قرضہ ہے پس اسی کو امانت کہدیا ہے۔

قرض کا معاملہ تحریر سے دو صورتوں میں مستثنےٰ کیا۔ اول رہن باقبضہ کی صورت میں۔ دوم اعتماد ہو۔ رہن باقبضہ کا جواز تو یہاں صریح ہے۔ مگر آیا یہ شرط سفر اور کاتب کے نہ ملنے سے ہے، یا جواز تو عام ہے اور یہاں صرف یہ توجہ دلائی ہے کہ اگر سفر وغیرہ میں کاتب نہ ملے تو تمہارے لیے ایک دوسری صورت بھی جائز ہے۔ دوسری صورت کا صحیح ہونا جمہور کا مذہب ہے یعنی رہن باقبضہ بہرحال جائز ہے خواہ سفر میں ہو یا حضر میں، کاتب ملے یا نہ ملے احادیث صحیحہ سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ صحیحین میں حضرت انسؓ سے ہے ان رسول اللہ صلعم توفی ودرعہ مرھونۃ عند یھودی علی ثلثین وسقا من شعیر رھنھا قوتا لاھلہ یعنی رسول اللہ صلعم فوت ہو گئے اور آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس وسق جو پر رہن تھی جو آپ نے اپنے اہل کے گزارہ کے لیے لیے تھے۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم نہ تو سفر میں تھے کیونکہ اہل کے گزارہ کا ذکر ہے اور نہ ہی کاتبوں کی آپ کے پاس کمی تھی پس رہن باقبضہ کا جواز عام ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کس طرح گزارہ کرتے تھے اور بیت المال سے کس قدر لیتے تھے۔ آپ وفات کے وقت عرب کے بادشاہ تھے خراج کا لاکھ سے زیادہ درہم صرف بحرین سے آپ کے پاس آیا اور آپ نے مسجد کے صحن میں اسے رکھوا دیا اور تب اٹھے جب تقسیم کر چکے۔ مال غنیمت سے ایک ایک کو سو سو اونٹ بھی دیئے۔ اپنی ذات کے لیے لیتے تو کون اعتراض کر سکتا تھا۔ مگر اپنی یہ حالت ہے کہ تھوڑے سے جو کے لیے اپنی زرہ گرو رکھی ہوئی ہے جو لوگ آپ پر نفسانیت کا اعتراض کرتے ہیں کاش ان کے سینوں میں دل ہوتا۔

اس آیت سے اور احادیث سے جو اس بارہ میں مروی ہیں یہ بھی ثابت ہے کہ رہن باقبضہ ہی جائز ہے۔ بلا قبضہ رہن جائز نہیں اور وہ درحقیقت سود کی ایک صورت ہے۔ البتہ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ رہن باقبضہ کی صورت میں مرہونہ چیز سے نفع اٹھانا جائز ہے۔ مثلاً گھوڑا رہن رکھا تو اس کو چارہ دیا جائے اور اس سے سواری کا کام لیا جائے۔ جائداد غیر منقولہ کے رہن باقبضہ کا مسئلہ بھی اس سے اخذ کیا جا سکتا ہے یعنی زمین یا مکان کا رہن باقبضہ جائز ہے اور زمین کی پیداوار اور مکان کے کرایہ سے فائدہ اٹھانا بھی جائز ہے بشرطیکہ لگان یا اخراجات وغیرہ بھی ادا کیے جائیں۔ البتہ جو لوگ زمین یا مکان کو اپنے قبضہ میں نہیں لیتے اور مالک سے کچھ سالانہ منافع مقرر کر لیتے ہیں تو وہ صریح سود ہے۔

معاملہ دنیوی میں راستی کی اہمیت: پہلے ذکر کیا تھا کہ گواہ انکار نہ کرے۔ اب یہ حکم دیا ہے کہ گواہی کو نہ چھپائے اور جو چھپائے اس کا دل گنہگار رہتا ہے۔ دل گنہگار کہنے سے یہ منشاء ہے کہ انسان ان لین دین کے معاملات کو معمولی نہ سمجھے جو شخص ان معاملات میں راستبازی سے کام نہیں لے سکتا وہ راستباز نہیں ہو سکتا۔ قلب چونکہ تمام نیکیوں کا مرکز ہے اس پر اثر پڑنے سے دوسری نیکیوں کی توفیق بھی چھن جاتی ہے پس یہ سمجھایا ہے کہ یہی چھوٹے چھوٹے معاملات ہی انسان کے قلب کو سفید یا سیاہ کر دیتے ہیں جو شخص انسانوں کے باہم معاملات اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں صداقت کا طریق اختیار نہیں کرتا وہ نماز اور روزہ سے نیک نہیں بن سکتا۔

یہاں صرف کتمان شہادت کو اس قدر برا بتایا ہے یعنی سچی شہادت چھپانے کو۔ تو جھوٹی شہادت کس قدر بڑا گناہ ہے۔ اگر سچی شہادت کا اخفا بھی

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۸۴﴾

اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اسے چھپاؤ، اللہ اس کا تم سے حساب لیگا، پھر وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔[۳۶۲]

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ

رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا

انسان کے دل کو سیاہ کر دیتا ہے تو اس شخص کی کیا حالت ہو گی جو جھوٹی گواہی دیتا ہے اور ابھی وہ لوگ مسلمان کہلاتے ہیں جو آٹھ آٹھ آنے پر کچہریوں میں جا کر جھوٹی شہادتیں دیتے اور علاوہ اپنا قلب سیاہ کرنے کے اسلام کو بھی بدنام کرتے ہیں۔ یہی سیاہ دلی ان لوگوں کے حصہ میں بھی آئی ہے جو حکام کے سامنے جھوٹے واقعات بیان کرتے ہیں یا سچے واقعات کا اخفا کرتے ہیں محض اس لیے کہ حکام ان سے خوش ہو جائیں۔

۳۶۲۔ یہ رکوع سورت کو ختم کرتا ہُوا اس کے مضمون کا خلاصہ بیان کرتا ہے۔ یعنی مذہب اسلام کی وسعت کہ سب رسولوں پر ایمان لاؤ اور کامیابی کی بشارت جو دعا کے رنگ میں فانصرنا علی القوم الکافرین میں سکھائی۔ ابتداء میں فلاح کا وعدہ اور آخرت پر نصرت کی دعا ایک ہی بشارت دیتے ہیں۔

الفاظ ان تبدوا ما فی انفسکم آیت کے آخر تک کو کئی مفسرین نے منسوخ قرار دیا ہے۔ ابن عمر سے بخاری میں دو روایتیں ان کی منسوخی کی ہیں مگر ابن جریر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عمر اس کی منسوخی کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ ابن جریر میں ہے کہ ابن عمر نے اس آیت کو پڑھا تو بہت روئے ابن عباس کے پاس ذکر ہُوا تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے اس کو پچھلی آیت نے منسوخ کر دیا۔ یہاں ابن عباس کو منسوخی کا قائل قرار دیا گیا ہے مگر ابن جریر کی دوسری روایت سے پایا جاتا ہے کہ ابن عباس اس کی منسوخی کے قائل نہ تھے۔ اسی بنا پر خود ابن جریر نے اس کے منسوخ ہونے سے انکار کیا ہے۔

پھر سورہ آل عمران میں جو اس کے بعد ہے بعینہٖ ایسے الفاظ ہیں قل ان تخفوا ما فی صدورکم او تبدوہ یعلمہ اللہ (آل عمران ۳: ۲۸) جہاں یعلمہ اللہ سے وہی مراد ہے جو یہاں یحاسبکم اللہ سے ہے اگر ان الفاظ کو لا یکلف اللہ نے منسوخ کر دیا ہوتا تو دوبارہ اسی مضمون کے لفظ کیوں نازل ہوتے اور یہ روایت کہ اس آیت کے نزول پر صحابہؓ نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ یہ ہماری طاقت سے باہر ہے تو آیت لا یکلف اللہ نازل ہوئی خود عدم نسخ کی مؤید ہے اس لیے کہ اس میں یہ لفظ کہیں نہیں آتے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا ہو کہ پہلی آیت منسوخ ہو گئی۔ ہاں یہ کہا جائیگا کہ دوسری آیت نے پہلی کے معنی واضح کر دئیے۔

نسخ کا استعمال صحابہ میں: اور بتا دیا کہ وہ مراد نہیں جو بعض صحابہؓ نے خیال کر لیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ انسان کی وسعت سے بڑھ کر کوئی حکم نہیں دیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے اس قسم کی وضاحت معنی پر ہی صحابہ نسخ کا لفظ مجازاً استعمال کر لیتے تھے جہاں سے ناسخ منسوخ کی غلط فہمی پیدا ہوئی۔ چنانچہ روح المعانی میں اسی کے مطابق خیال نقل کیا گیا ہے۔ ان المراد من النسخ البیان والیضاح المراد مجازاً مسند احمد کی روایت اس معاملہ کو بالکل صاف کر دیتی ہے جس میں ابن عباس سے ہے کہ جب یہ آیت ان تبدوا ..... نازل ہوئی تو لوگوں کے دلوں میں ایک خیال گزرا جو پہلے کبھی نہ گزرا تھا (اور دوسری روایت میں ہے وہ سخت مغموم ہوئے کہ ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے) تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ قولوا سمعنا و اطعنا و سلمنا فالقی اللہ الایمان فی قلوبھم یعنی کہو ہم نے سنا اور فرمانبرداری کی اور تسلیم کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان ڈالا اور پھر اٰمن الرسول ..... نازل ہُوا جس سے معلوم ہُوا کہ دوسری آیت کے نزول سے پہلے ہی وہ سمجھ چکے تھے اور ارشاد نبوی سمعنا و اطعنا بتاتا ہے کہ یہ طاقت سے باہر کوئی چیز نہ تھی۔ پس یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ نسخ کا لفظ محض واضح کرنے کے معنی میں صحابہؓ نے استعمال کیا ہے گویا ایک غلط خیال جو کسی کے دل میں ان الفاظ سے پیدا ہوا وہ منسوخ ہُوا اصل الفاظ منسوخ ہونے کا منشاء نہیں ہوتا۔

چھپی اور کھلی باتوں پر خدا کا محاسبہ: اب معنی پر غور کرو تو اور بھی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منسوخ نہیں۔ ایک بات کو دل میں چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو اللہ اس کے مطابق تم سے حساب لیگا۔ ظاہر ہے کہ دل میں وہ بات چھپائی جاتی ہے جس کا انسان عزم کر چکا ہو کہ میں ایسا کروں گا۔ پھر اس کو چھپاتا ہے کہ لوگوں پر ظاہر نہ ہو اور جو کوئی وسوسہ دل میں گزرے اور نکل جائے اس پر دل میں چھپانا صادق نہیں آتا۔ جن کو غلطی لگی وہ یہی لگی کہ انہوں نے سمجھا کہ جو خیال دل میں گزرے اس پر محاسبہ ہو گا۔ حالانکہ یہ مراد نہ تھی جیسا کہ آنحضرت صلعم نے قولوا سمعنا و اطعنا سے سمجھا دیا اور لا یکلف اللہ نے اس کی مزید توضیح کر دی۔ اس کی تائید دوسرے مقامات سے ہوتی ہے جہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ گرفت اس پر کرتا ہے جو دل کر گزرے اور محض خیال یا وسوسہ پہلے سے مستثنیٰ ہے جیسا کہ سورہ النجم میں ہے اِلَّا اللَّمَمَ (النجم ۵۳: ۳۲) اور دل کا کر گزرنا پختہ طور پر ٹھان لینا ہے جیسا فرمایا بما کسبت قلوبکم اور بما تعمدت قلوبکم اور پھر محاسبہ بھی ہر ایک فعل پر برابر نہیں فیغفر لمن یشاء میں خود بتا دیا کہ بہتیری باتیں اللہ تعالیٰ معاف بھی کرتا رہتا ہے اسی کے مطابق صحیحین میں ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب بندہ بدی کا قصد کرے تو اس کے خلاف نہ لکھو اگر وہ فعل کر دے تو اس کو ایک بدی لکھو۔ اور جب وہ نیکی کا قصد کرے اور وہ نیکی عمل میں نہ آئے تو اسے ایک نیکی لکھو اور اگر عمل میں آ جائے تو دس نیکیاں لکھو۔ یہ وسعتِ رحمت ہے۔

آیت کے پہلے حصہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اور دوسرے میں علم کامل کا ذکر ہے اور یہی دو چیزیں ہیں جن سے جزا و سزا پر ایمان پیدا ہوتا ہے۔

وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ
وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ
مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۟
غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا
مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا
تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا
وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ
عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا
مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَ اعْفُ عَنَّا ۫ وقفة

گیا اور مومن (بھی) سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں
اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں ہم اس کے رسولوں میں سے
کسی میں کچھ تفرقہ نہیں کرتے، اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور ہم نے فرمانبرداری
کی اے ہمارے رب تیری حفاظت (چاہیئے)[ع۳۶۳] اور تیری طرف ہی انجام کار پہنچنا ہے۔
اللہ کسی پر کچھ لازم نہیں کرتا مگر جس قدر اس کی طاقت ہو اسی کے لیے ہے
جو وہ (اچھی) کمائی کرے اور اسی پر ہے جو وہ (بُری) کمائی کرے[ع۳۶۴] اے ہمارے
رب ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں اے ہمارے رب اور
ہم پر بھاری بوجھ نہ ڈال[ع۳۶۵] جیسا تو نے اُن پر ڈالا جو ہم سے پہلے تھے
اے ہمارے رب اور ہم پر ایسا بوجھ نہ رکھ جس کی طاقت ہم میں نہیں
اور ہمیں معاف فرما اور ہماری حفاظت فرما[ع۳۶۶] اور ہم

ع۳۶۳ غفرانك ۔ غفران ۔ غفر سے مصدر ہے معنی کے لیے دیکھو ع۲۵۸ نیز ع۳۶۶ تقدیر یوں ہے نسالك غفرانك ۔

سب انبیاء پر ایمان: اس سورت کے شروع میں وسعتِ اسلامی کی طرف توجہ دلائی یؤمنون بما انزل الیك وما انزل من قبلك ۔ درمیان میں بھی جہاں فرمایا کہ ہم صرف ابراہیم موسیٰ عیسیٰ پر ہی ایمان نہیں لاتے بلکہ جو کچھ بھی دنیا میں کہیں نبیوں کو دیا گیا اس کو بھی مانتے ہیں وما اوتی النبیّون من ربّھم (۱۳۶) اور اب پھر اور ما انزل من قبلك کی تفسیر ما اوتی النبیّون من ربھم سے کر دی یعنی ما اُنزل میں صرف وہی چیز ہے جو نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی کیونکہ وحی الٰہی غیر انبیاء کو بھی ہوتی ہے جیسا کہ قرآن شریف میں کئی جگہ ذکر ہے اور پھر دونوں کی تفسیر یہاں لفظ کتبہ لا کر کر دی یعنی وہ ما انزل من قبلك اور ما اوتی النبیون من ربھم اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں جو اُن نبیوں کو دی گئیں اور اسی طرح کتبہ و رسلہ کی تفسیر ما انزل من قبلك سے کر دی کہ وہ کتابیں اور رسول وہی ہیں جو تجھ سے پہلے دنیا میں ہو چکے بعد میں ہونے والا کوئی نہیں ۔ اگر آپ کے بعد بھی رسول آنے والے ہوتے تو من قبلك کی حدبندی عائد نہ کی جاتی ۔

ع۳۶۴ یکلّف ۔ کلف سے ہے کَلَّفَہٗ کے معنی ہیں اس کو ایسا حکم دیا جو اس پر مشقت ہے (غ)

اِلّا وسعھا ۔ وُسع کے معنی فراخی بھی ہیں اور قدرت یا طاقت بھی جو مکلّف کے اندازہ سے بڑھ کر ہو (غ) مشقت سے راحت پیدا ہوتی ہے ؛ صورت ثانی میں معنی یوں ہونگے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر اس سے کم مشقت ڈالتا ہے جس سے اس کی طاقت درماندہ ہو جائے اور صورت اوّل میں یوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر جو مشقت ڈالتا ہے اس کا پھل وسعت ہوتا ہے یا جنّت (غ) یعنی جو باتیں تکلیف یا مشقت کی معلوم ہوتی ہیں انہی سے فی الحقیقت انسان کے لیے وسعت پیدا ہوتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا انّ مع العسر یسرا (الانشراح ۹۴-۶) یا فرمایا یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (۱۸۵)

کسبت ۔ اکتسبت ۔ گو کسب اور اکتساب دونوں بھلائی اور بُرائی پر استعمال ہوتے ہیں ۔ مگر یہاں کسب بھلائی کے لیے اور اکتساب بُرائی کے لیے ہے جیسا لھا اور علیھا سے ظاہر ہے اصل فرق دونوں میں یہ ہے کہ کسب اپنے لیے بھی ہو سکتا ہے اور اپنے غیر کے لیے بھی اور اکتساب صرف اپنے لیے ہوتا ہے اس لیے بعض کے نزدیک کسبت سے مراد وہ افعال ہیں جو فعل خیر سے انسان دوسرے کے لیے کرتا ہے اور اکتسبت سے مراد وہ افعال ہیں جو اپنی ذات کے لیے کرتا ہے ۔ گویا جو کچھ دوسرے کی بھلائی کو مدّنظر رکھ کر کیا جائے وہ بہرحال لھا ہے یعنی بموجب نفع اور جو کچھ اپنے آپ کو مدّنظر رکھ کر کرتا ہے وہ علیھا ہے یعنی وبال کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔

ع۳۶۵ تؤاخذنا ۔ گناہ کی سزا پر لفظ مُؤَاخَذَۃ جو اخذ سے مفاعلہ ہے اس لیے اختیار کیا گیا کہ اس میں مجازات اور مقابلہ کے معنی ہیں ۔ کیونکہ انہوں نے نعمتوں کو اللہ تعالیٰ سے لیا پھر اُن کے مقابلہ پر شکر نہ کیا ۔

اِصر کے اصل معنی بوجھ اور مضبوط باندھ دینا پھر کسی عہد کا گناہ جب اسے ضائع کر دیا جائے یعنی عہد شکنی کا گناہ (ل) ، اور حدیث میں بادشاہ کے متعلق آیا ہے کہ وہ زمین پر ظل اللہ ہے جب اچھا کرے تو اس کے لیے اجر اور تم پر شکر ہے اور جب بُرا کرے تو اس پر اِصر ہے (ل) یعنی اس عہد کے توڑنے کا گناہ جو سلطان اور رعایا کے درمیان ہے

ع۳۶۶ اغفر ۔ یہاں اور قرآن شریف کے بہت سے موقعوں پر غَفر کے معنی خصوصیت سے گناہ سے محفوظ کرنا ہیں دیکھو ع۲۵۸ کیونکہ گناہ کی سزا سے بچانے

وَ اغۡفِرۡ لَنَا ۟ وَ ارۡحَمۡنَا ۟ اَنۡتَ مَوۡلٰىنَا فَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۸۶﴾ ع ۳ ۸

پر رحم فرما تو ہمارا مولیٰ ہے۔ پس ہمیں کافر قوم پر مدد دے ۳۶۷

کا ذکر واعف عنا میں موجود ہے۔ پہلا مرتبہ گناہوں کی سزا سے بچانے کا تھا اس کا ذکر عفو میں ہے۔ دوسرا مرتبہ خود گناہ سے بچانے کا ہے اس کا ذکر غفر میں ہے اور اسی لیے عفوؔ کو پہلے مرتبہ پر اور غفر کو دوسرے پر رکھا ہے اور جہاں کہیں قرآن شریف میں عفو اور غفر کا ذکر اکٹھا آیا ہے۔ عفو کو پہلے رکھا ہے کیونکہ وہ ادنیٰ مرتبہ ہے اور غفر کو پیچھے۔ بلکہ جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی صفات عُفُوّ اور غَفُور کو اکٹھا کیا ہے وہاں بھی عفو کو پہلے اور غفور کو پیچھے رکھا ہے۔ دیکھو النساء ۴۔ ۴۳ و ۹۹۔ الحج ۲۲۔ ۶۰۔ المجادلہ ۵۸۔ ۲۔ وغیرہ مقامات اور یہ یقینی شہادت اس بات پر ہے کہ قرآن شریف نے لفظ غفر سے مراد عفو سے بڑھ کر کچھ لیا ہے۔ اور چونکہ عفو گناہوں کے مٹانے کا نام ہے یعنی ان کی سزا سے درگزر کرنا اس لیے غفر سے ان موقعوں پر صرف گناہوں سے بچانا ہے جیسا کہ ۲۵۸ میں لغت کی شہادت سے دکھایا گیا ہے۔ اس جگہ اوّل عفو ہے دوم غفر سوم رحم اور یہ تینوں لفظ تین پہلے جملوں کے مقابل پر ہیں یعنی لاتؤاخذنا یا مواخذہ سے بچنے کے مقابل پر عفو کی دعا ہے گناہ یا عہد شکنی کے ارتکاب سے بچنے کے مقابل پر غفر یعنی گناہ سے حفاظت کی دعا ہے اور بوجھوں سے بچنے کے مقابل پر رحم کی درخواست ہے اسی طرح فاعف عنہم واستغفر لہم وشاورھم فی الامر (آل عمران ۳۔ ۱۵۸) میں ان لوگوں سے جو جنگ میں بھاگ گئے تھے۔ پہلے عفو کا حکم ہے پھر ان کے لیے استغفار کا حکم ہے یعنی آئندہ ایسے گناہوں سے بچے رہیں۔ پھر ان کو مشورہ میں شریک کرنے کا حکم ہے جو ان کی اور بھی زیادہ عزت افزائی پر دلالت کرتا ہے پس عفو اور غفر جہاں اکٹھے ہوں وہاں غفر سے مراد گناہ سے حفاظت ہے نہ کچھ اور۔

۳۶۷ سورہ بقرہ کی آخری دو آیات کی احادیث میں بہت فضیلت آئی ہے۔ بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جو شخص سورہ بقرہ کی دو آخری آیات کو ایک رات میں پڑھے وہ اس کے لیے کافی ہو جاتی ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ خواتیم سورہ بقرہ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ مسلم اور نسائی میں ہے کہ آپ کو بشارت دی گئی کہ فاتحہ اور خواتیم بقرہ دو ایسے نور ہیں کہ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیے گئے۔ فاتحہ کی عظمت کا ذکر پہلے ہو چکا ان دو آیتوں کو یہ عظمت حاصل ہے کہ اگر ایک میں مسلمان کے مذہب اور اس کے قلب کی وسعت بتائی گئی کہ وہ سب انبیاء پر ایمان لاتا اور کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا تو دوسری میں اسے یہ دعا سکھائی گئی کہ وہ کبھی کفر اور باطل پر راضی نہیں ہوتا بلکہ اس پر غالب آنے کے لیے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہے۔ آج بھی مسلمانوں کو ضرورت ہے کہ اس دعا سے کام لیں۔

خاص اس دعا میں تین باتیں ہیں۔ اول انسان کے عجز کا پہلو کہ نسیان اور خطا اس سے واقع ہو جاتا ہے۔ تو دعا سکھائی کہ اس پر گرفت نہ ہو۔ ایسی دعا انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ وہ غافل نہ ہو ایسا نہ ہو کہ وہ احکام الٰہی کو بھول جائے اور احکام الٰہی کی فرمانبرداری میں بہت محتاط اور چست ہو تا کہ خطا سے بچا رہے اور جو نسیان و خطا باوجود کوشش کے واقع ہو جائے اس کے نتائج سے حفاظت سکھائی ہے دوسری دعا ہے کہ عہد شکنی کے بوجھ سے بچایا جائے یعنی اس قدر مخالفت احکام الٰہی کی نہ ہو کہ عہد کو توڑ ڈالے جس طرح پہلی قومیں توڑتی رہیں۔ اگر پہلی غفلت و عجز کے بدنتائج سے بچنے کی دعا ہے تو دوسری عمد کے بدنتائج سے اور تیسری دعا یہ ہے کہ ہم پر وہ بوجھ مصائب قضاء و قدر کا نہ ڈالا جائے جس کے اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ تکالیف شرعی تو اللہ تعالیٰ وسعت سے بڑھ کر نہیں ڈالتا مگر مصائب قضاء و قدر انسان پر بعض وقت ایسے آجاتے ہیں کہ ان کے بوجھ کے نیچے پس جاتا ہے پس ان سے بچنے کی دعا سکھائی ہے ان تینوں کے مقابل پر پھر تین دعائیں سکھائی ہیں۔ نسیان و خطا کے بالمقابل عفو کی درخواست یعنی یہ کہ نسیان و خطا انسان کی عاجزی سے واقع ہوتے رہتے ہیں ان کے بدنتائج سے بچایا جائے اور عہد شکنی کے بوجھ سے بچنے کے مقابل پر دعائے غفر (حفاظت) یعنی دیدہ دانستہ انسان سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو اور قضاء و قدر کے مصائب کے مقابلہ پر رحم کی درخواست اور ان سب کا آخری مقصد کیا ہے کہ کافر قوم کے خلاف اللہ تعالیٰ کی نصرت ملے۔

سورت کی غرض و غایت مسلمانوں کو ایک زندہ اور کامیاب قوم بنانا: سورۃ کا خاتمہ اس پاک دعا پر کیا ہے جس میں سورۃ کی غرض و غایت بھی بتا دی ہے جس طرح اس کی ابتدا میں۔ یعنی یہ کہ یہ سورت مسلمانوں کو کامیابی کی راہ بتاتی ہے۔ شروع میں وعدۂ کامیابی دیا تھا۔ پھر کامیابی کے ذرائع اور وسائل بیان کیے کہ ان کو اختیار کرو۔ اور آخر پر دعا کی طرف متوجہ کیا کہ جو راہیں بتائی ہیں ان پر چلو پھر خدا سے بھی دعائیں کرو۔ اس سورت کی غرض مسلمانوں کو ایک زندہ اور کامیاب قوم بنانا اس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔

اٰیاتُھا ۲۰۰ (٣) سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِیَّۃٌ رُکُوعَاتُھا ۲۰

نام اس سورت کا نام آل عمران ہے عمران حضرت موسیٰ اور ہارون کے والد کا نام ہے اور چونکہ اس سورت میں نبوت کے سلسلہ موسویہ سے رخصت ہونے کا ذکر ہے اور اس سلسلہ کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروؤں کی غلطیوں کا بالتفصیل ذکر ہے۔ اس مناسبت کے لحاظ سے اس کا نام آل عمران رکھا گیا اس میں بیس ۲۰ رکوع اور ۲۰۰ آیتیں ہیں۔

خلاصہ مضمون اس سورت میں عیسائی مذہب کے دعووں کی تردید کی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بتا کر کہ عالمگیر مذہب اسلام ہے جو ساری دنیا میں پھیلے گا جنگ احد کا ذکر کیا ہے جس میں بظاہر مسلمانوں کی ناکامیابی نظر آتی تھی مگر اس کی تہ میں بھی ایک عظیم الشان کامیابی تھی۔ غرض یہ ہے کہ اگر کفر کے مقابلہ میں اسلام کی حالت کسی وقت مصیبت اور درماندگی کی نظر آئے تو اس سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ فی الواقع جو حالت جنگ اُحد میں مسلمانوں کی قریش کے مقابل پر ہو گئی تھی ویسی ہی حالت آج عیسائیت کے مقابلہ میں ہے یعنی بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کچلا گیا۔ مگر اس بلا کے نیچے بھی ایک گنج کرم ہے۔

پہلے رکوع میں عقیدۂ الوہیت مسیح کی تردید کرتے ہوئے بتایا ہے کہ عیسائیوں کو ٹھوکر اس سے لگی کہ انہوں نے محکم اصول دین کو چھوڑ کر متشابہات کی پیروی کی اور یہ ذکر ایسے پیرایہ میں کیا ہے جس سے مسلمانوں کو بھی ساتھ ہی متنبہ کر دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کے معنی کرنے میں اس غلط راہ پر قدم نہ ماریں۔ بلکہ فروع کو اصول دین کے ماتحت کریں جن کا ذکر محکم الفاظ میں ہے برخلاف فروع کے جن کا ذکر متشابہ الفاظ میں بھی آجاتا ہے دوسرے رکوع میں یہ بتاتے ہوئے کہ جنگ بدر میں قدرت خداوندی کا ایک نظارہ تھا کہ کس طرح باطل اپنی ساری طاقتوں کے ساتھ حق کے سامنے مغلوب ہو جاتا ہے توحید الٰہی کو جسے عیسائیوں نے چھوڑ دیا سب مذاہب کی اصل بنیاد قرار دیتے ہوئے ضمناً پیش گوئی کی ہے کہ آخرکار توحید ہی غالب رہے گی۔ تیسرے رکوع میں بیان فرمایا کہ نبوت بنی اسرائیل کی قوم سے سلب ہوتی ہے اور ایک دوسری قوم کو دی جاتی ہے جو اس کی اہل ہے۔ چوتھے رکوع میں سلسلہ موسوی کے آخری برگزیدہ افراد کا ذکر فرمایا یعنی ذکریا اور ان کے فرزند یحییٰ کا اور مریم صدیقہ کا۔ پانچویں اور چھٹے رکوع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، بچپن، بڑھاپے، نبوت، تعلیم نشانات وفات وغیرہ کا ذکر کر کے بتایا کہ وہ کسی بات میں انسان سے بڑھ کر نہیں اور دلائل کو پس پشت پھینکنے والوں کو مباہلہ کی طرف بلایا۔ ساتویں رکوع میں انہی عیسائیوں کو اصول مقابلہ مذاہب کی طرف بلایا یعنی سب مذاہب میں امر مشترک خالص توحید الٰہی ہے پس اس کو قبول کرو، اس کے ساتھ ہی حضرت ابراہیم کا ذکر کیا جن کا وجود عیسائیوں یہودیوں مشرکین عرب اور مسلمانوں میں بطور مشترک مسلّم تھا۔ آٹھویں رکوع میں مثیل موسیٰ والی پیشگوئی کی طرف توجہ دلائی اور اہل کتاب کو ملزم کیا کہ تم دنیا کی امانتوں کی پرواہ نہیں کرتے اسی لیے خدا کی امانت کو بھی جو پیشگوئی کے رنگ میں تھی ضائع کر رہے ہو۔ نویں رکوع میں بتایا کہ موسیٰ ہی نہیں کل انبیائے عالم نے رسول اللہ صلعم کے ظہور کی پیشگوئیاں کی تھیں اسی لیے مذہب اسلام سب کا مصدق ہے۔ دسویں رکوع میں بتایا کہ یہ نبی ہی سب انبیاء کا موعود نہیں بلکہ خانہ کعبہ جو اس کا قبلہ ہے وہ دنیا میں خدا کی عبادت کا سب سے پہلا گھر ہے۔ گیارھویں رکوع میں بتایا کہ اس خیر و خوبی کے مذہب کو دنیا میں پھیلانے کے لیے مسلمان کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں حقوق کی نگہداشت کریں، وحدت اسلامی کو قائم کریں۔ دعوت الی الاسلام کے کام کو ترک نہ کریں۔ بارھویں رکوع میں بتایا کہ دشمنان اسلام سے کیسے تعلقات ہوں۔ تیرھویں رکوع میں جنگ اُحد کی ابتداء اور نصرت الٰہی کے وعدہ کا ذکر کیا۔ چودھویں میں کامیابی کے موٹے موٹے اصول بتائے پندرھویں میں بتایا کہ کوئی بھی مصیبت پیش آجائے مسلمان اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف نہیں جا سکتا۔ سولھویں میں تکلیف و غم و ہم کا ذکر کرتے ہوئے جو مسلمانوں کو پہنچا بتایا کہ اس کی وجہ نافرمانی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ سترھویں میں بتایا کہ اس جنگ نے مومنوں اور منافقوں میں تمیز کر دی اور آنحضرت صلعم کے اخلاق فاضلہ کا ذکر کیا کہ کس وسعت قلبی سے آپ نے کام لیا۔ اٹھارھویں میں بتایا کہ سچے مومن دشمن کی طاقت یا اس کی کثرت سے گھبراتے نہیں۔ انیسویں میں اہل کتاب کے بیہودہ اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ دُکھ پہنچتا ہی رہے گا اور اس پر صبر کی تلقین کی آخری رکوع میں پھر دعا سکھا کر کامیابی کا وعدہ دیا اور فرمایا کہ کامیاب اسی صورت میں ہو سکتے ہو کہ دشمن کے مقابلہ پر پورے تیار رہو۔

اس سورت کا تعلق سورۂ بقرہ سے اس قدر شدید ہے کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث کے مطابق ان دونوں کو الزھراوان کے نام سے پکارا گیا ہے۔ جو زھرا کا تثنیہ ہے یعنی روشن و سفید دونوں میں توحید الٰہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اثبات ہے پہلی پیشگوئیوں سے بھی اور دوسرے ذرائع سے بھی پس حدیث نے ان دونوں سورتوں کو بلحاظ ان کے شدید تعلق کے ایک کے حکم میں رکھا ہے یہ تعلق مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ جو باتیں سورہ بقرہ میں اشارہ کے رنگ میں بیان کی گئی ہیں ان کو یہاں واضح کر دیا ہے اور جو وہاں واضح کر دی گئی ہیں ان کا ذکر یہاں اشارہ اور کنایہ کے رنگ میں ہے۔ سورہ بقرہ میں زیادہ تر خطاب یہودیوں سے اور تھوڑا سا عیسائیوں سے ہے یہاں زیادہ عیسائیوں سے اور تھوڑا یہودیوں سے۔ سورہ بقرہ کو حضرت آدم کے ذکر سے شروع کیا جو پہلے نبی ہیں تو اس سورت کو حضرت عیسیٰ کے ذکر سے شروع کیا جو قومی نبیوں میں سے سب سے پیچھے آئے۔ وہاں توحید کا ذکر بت پرستی کے مقابلہ میں ہے تو یہاں عیسیٰ پرستی کے مقابلہ میں۔ وہاں نظائر قدرت سے توحید پر دلائل دیئے تو یہاں فطرت اور مذاہب کی متفقہ شہادت سے۔ وہاں خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا ذکر ہے تو یہاں اس کے اول بیت ہونے کا۔ وہاں جنگ کی ضرورت اصولی رنگ میں بیان کی تو یہاں ایک جنگ کے واقعات کا مفصل ذکر کیا۔ اس تفصیل کو جتنا چاہو بڑھا لو اور دونوں سورتوں کی ابتدا میں اور انتہا میں بھی تعلق ہے۔ سورہ بقرہ کی ابتدا میں اگر اصول فلاح بتائے تو آل عمران کا خاتمہ بھی تفلحون پر کیا۔ گویا دونوں کا ایک ہی مضمون تھا اور دوسری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓـمّٓ ۝۱ — مَیں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔

اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ؕ ۝۲ — اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہمیشہ زندہ خود قائم قائم رکھنے والا ہے ۳۶۸۔

نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَ اَنۡزَلَ التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ ۙ ۝۳ — اس نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے ہے ۳۶۹ اور توریت اور انجیل کو۔

طرف اگر سورہ بقرہ کا خاتمہ فانصرنا علی القوم الکافرین پر کیا یعنی کافر قوم کے خلاف ہماری نصرت فرما تو آل عمران کی ابتداء میں ہی اس قوم کا ذکر کیا جس کے ساتھ اسلام کا سب سے بڑھ کر مقابلہ ہونا تھا۔ یعنی عیسائی قوم۔

زمانہ نزول | ترتیب نزول کے لحاظ سے اس سورت کا تعلق سورہ بقرہ سے وہی ہے جو ترتیب قرآنی کے لحاظ سے یعنی اس کا اکثر حصہ سورہ بقرہ کے اکثر حصہ کے بعد نازل ہُوا ہے سورہ بقرہ پہلے اور دوسرے سال ہجرت کی نازل شدہ ہے تو یہ تیسرے سال ہجرت کی تیرھویں رکوع سے لیکر قریباً آخر تک اس سورت میں جنگ احد کے واقعات کا ذکر ہے جو ۳ سنہ ہجری میں ہوئی اس لیے یہ حصہ یقیناً ۳ سنہ ہجری کا نازل شدہ ہے۔ ابتدائی حصہ میں بالخصوص عیسائی مذہب کا ذکر ہے اسی میں آیت مباہلہ بھی ہے اور یہ مباہلہ وفدِ نجران سے تھا جو ۹ سنہ میں آیا مگر سورت کا یہ حصہ ۹ سنہ کا نازل شدہ یقیناً نہیں اور اندرونی شہادت سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ مدینہ کا نازل شدہ ہے اور وفد نجران کے مقابلہ پر انہی پہلے کے نازل شدہ امور کو ہی آنحضرت صلعم نے پیش کیا۔ علاوہ ازیں اس حصہ میں جو اصول مقابلہ مذاہب قائم کیا ہے تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم یہ آیت ان خطوط میں موجود ہے جو ۶ سنہ ہجری کے آخر میں آپ نے قیصر وغیرہ کو لکھے۔ پس یہ حصہ یقیناً ۶ سنہ سے پہلے کا نازل شدہ ہے اور قرین قیاس یہی ہے کہ ۳ سنہ کا ہی ہے۔ ہاں ممکن ہے کہ صرف آیت مباہلہ کا نزول وفد نجران کے آنے پر ہُوا ہو۔

ع۳۶۸ اس آیت کے الفاظ بعینہٖ وہی ہیں جو آیۃ الکرسی کے صدر کے الفاظ ہیں جس کے لیے دیکھو ع۳۲۹ و ع۳۲۹ ج ؛

چونکہ اس سورت کے ابتدائی حصہ میں عیسائیت کی تردید ہے اس لیے اس کی ابتدا میں ان صفات الٰہی کا ذکر کیا ہے جو عیسائی مذہب کے بطلان پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ اوّل توحید کا ذکر فرمایا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر فرمایا کہ وہ حی اور قیوم ہے۔ ابن جریر نے ربیع سے ایک روایت بیان کی ہے جس کے رُو سے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صفات سے اور اگلی آیات کی مندرجہ صفات سے مسیح کی خدائی کے خلاف استدلال کیا ہے۔ میں اس روایت کا لفظی ترجمہ یہاں دیتا ہوں۔ آنحضرت صلعم کی وفد نجران سے گفتگو: نصاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عیسیٰ بن مریم کے متعلق آپ سے بحث کی اور آپ کو کہا کہ اس کا باپ کون ہے اور اللہ پر جھوٹ اور بہتان کہا۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جس نے نہ اپنی جورو بنائی اور نہ بیٹا۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کہا کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی بیٹا نہیں ہوتا مگر وہ اپنے باپ سے مشابہ ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہمیشہ زندہ ہے، کبھی نہیں مرے گا اور عیسیٰ پر فنا آئی۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہر چیز کو قائم رکھنے والا۔ اس کی نگہبانی کرتا ہے اور حفاظت کرتا ہے اور اس کو رزق دیتا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ عیسیٰ ان میں سے کسی چیز کا اختیار رکھتا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ پر آسمان و زمین کی کوئی چیز مخفی نہیں؟ (آیت ۴) انہوں نے کہا ہاں۔ فرمایا کیا عیسیٰ کوئی بات جانتا ہے سوائے اس کے جس کا علم اسے دیا گیا؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا ہمارے رب نے عیسیٰ کی صورت جس طرح چاہا رحم میں بنائی (آیت ۵) اور آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب کھانا نہیں کھاتا اور نہ پانی پیتا ہے اور نہ قضائے حاجت کرتا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰ کو ایک عورت نے حمل میں لیا جس طرح عورت حمل میں لیا کرتی ہے۔ پھر اس کو جنا جس طرح عورت اپنا بچہ جنا کرتی ہے پھر اس کو غذا دی گئی جس طرح بچوں کو غذا دی جاتی ہے۔ پھر وہ کھانا کھاتا تھا اور پانی پیتا تھا اور پاخانہ کرتا تھا۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا پھر جو تم دعوے کرتے ہو وہ کیسے ہو سکتا ہے۔

اس گفتگو سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جن خاص صفات الٰہی کا ذکر یہاں کیا ہے۔ ان کی خاص غرض حضرت عیسیٰ کی الوہیت کی نفی ہے۔ روایت میں جہاں حضرت عیسیٰ پر فنا آنے کا ذکر ہے وہاں اصل الفاظ ہیں ان عیسیٰ یاتی علیہ الفناء یعنی عیسیٰ پر فنا آتی ہے یا آئے گی مگر مضارع کبھی ماضی کے معنی میں بھی آجاتا ہے اور ممکن ہے کہ الفاظ روایت میں ہی کمی بیشی ہوگئی ہو کیونکہ عیسائیوں کا عقیدہ یہ کبھی نہیں ہوا کہ عیسیٰ پر فنا اب تک نہیں آئی اور آئندہ آئے گی۔ بلکہ ان کا کھلا کھلا عقیدہ یہی ہے کہ عیسیٰ پر فنا آئی مگر آئندہ نہیں آئے گی۔ اس لیے اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے کہ عیسیٰ پر فنا آئے گی تو اس کا جواب ان کی طرف سے ہاں کبھی نہ ہوتا وہ ہرگز اس بات کے قائل نہیں کہ عیسیٰ پر آئندہ کوئی فنا آئیگی۔ اس لیے یقیناً آپ نے الفاظ ایسے فرمائے ہونگے جن کا ترجمہ یہ ہو کہ عیسیٰ پر فنا آئی اس کا جواب عیسائی بلاشبہ اثبات میں دیں گے کیونکہ وہ مانتے ہیں کہ عیسیٰؑ پر موت آئی مگر پھر وہ موت پر فتح پا گیا اور ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا۔

ع۳۶۹۔ حق کے اصل معنی ع۶۵ میں بیان ہو چکے ہیں کسی چیز کو جو وجود میں آئے مقتضائے حکمت کے مطابق ہونے کی وجہ سے حق کہا جاتا ہے اور انہی معنوں میں یہاں قرآن کو بالحق نازل کرنے کا ذکر فرمایا ہے یعنی وہ مقتضائے حکمت کے مطابق نازل ہوا ہے۔ پہلی وحی کے ہوتے ہوئے نزول قرآن کی ضرورت: یہ اس بات کا جواب

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ لوگوں کو راہ دکھانے کے لیے پہلے سے نازل کیا[۳۷] اور حق و باطل میں فیصلہ

ہے کہ جب پہلے بھی کوئی وحی نازل ہوتی رہی تھی تو قرآن کے نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی اور عموماً عیسائیوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ توریت و انجیل کے ہوتے ہوئے قرآن شریف کی کیا ضرورت تھی۔ اس سورت میں آگے زیادہ تفصیل کے ساتھ بھی اس کا جواب آئے گا۔ مگر یہاں بھی اس کی ایک وجہ بتادی ہے اور وہ وجہ یہ ہے کہ پہلی کتابوں میں جو رسول اللہ صلعم کے متعلق پیشگوئیاں تھیں ان کی تصدیق کے لیے ضروری تھا کہ یہ کتاب نازل ہوتی گویا سابقہ وحی الٰہی بغیر نزول قرآن خود سچی نہ ٹھہرتی تھی۔ چنانچہ اس کو کھول کر آیت ۸۳ میں بیان فرمایا ہے۔ جہاں تصدیق کا صاف منشاء بتایا ہے واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما اٰتیتکم من کتاب وحکمۃ ثم جاء کم رسول مصدق لما معکم۔ اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے ذریعہ سے یہ عہد لیا تھا کہ جو کچھ تم کو کتاب و حکمت سے دیا جاتا ہے پھر تمہارے پاس ایک رسول تمہاری وحیوں کی تصدیق کرتا ہوا آئے تو اس پر ایمان لانا ہوگا۔ پس ان کی پیشگوئیوں کا پورا کرنا بھی درحقیقت ان کی تصدیق ہے۔ قرآن کریم کے نزول کی دوسری ضرورتوں کو بھی اس سورت میں آگے چل کر بیان فرمایا ہے۔

ع۳۷ التوراۃ اصل لفظ کے عبرانی ہونے میں شبہ نہیں مگر عربی اور عبرانی زبانیں بہت ملتی جلتی ہیں۔ یہ لفظ بھی ان دونوں زبانوں میں ملتا جلتا ہے۔ اہل عرب کے نزدیک توریت وری سے ہے اور کوفیوں کے نزدیک اصل میں تَفْعِلَۃ وزن پر ہے اور بصریوں کے نزدیک فَوْعَلٌ وزن پر۔ جس کا اصل وَوْرَاۃ تھا اور و۔ ت سے بدل گئی (رغ) اور وری کے معنی وری الزند سے آگ نکالنا ہیں جس سے قرآن شریف میں بھی آتا ہے النار التی تورون ..... (الواقعۃ ۵۶-۷۱) اور وَارَیْتُ کے معنی سترت ہیں یعنی ایک چیز کو چھپا دیا جس سے ہے لباسا یواری سواٰتکم (الاعراف ۷-۲۶) حتّٰی توارت بالحجاب ..... (صٓ ۳۸-۳۲) پس توریت کو توریت یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ پتھر سے آگ نکالنے کی مثال ہے۔ یعنی بڑی مشقت سے اس سے کچھ روشنی پیدا ہوتی ہے۔ جیسا ابتدائے تاریخ عالم میں پتھر سے آگ نکالی جاتی تھی جس کے بالمقابل قرآن کریم کو ایسا نور بیان فرمایا ہے یکاد زیتھا یضیٓء ولو لم تمسسہ نار (النور ۲۴-۳۵) اس کا تیل خود بخود جل اٹھتا ہے، گو اسے آگ نہ چھوئے اور یا اس لیے کہ اس میں بعض مضامین مستتر یعنی مخفی حالت میں ہیں۔ جیسا جزا و سزا کا مسئلہ۔ ان مسائل پر پوری روشنی قرآن کریم نے ہی ڈالی ہے۔

توریت اس مجموعہ کتب کا نام ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوا قرآن کریم نے ایک جگہ اس کے حضرت موسیٰ اور ہارون دونوں کو دیئے جانے کا ذکر فرمایا ہے واٰتینٰھما الکتاب المستبین (والصّٰفّٰت ۳۷-۱۱۷) یہ جیسا کہ اب موجود ہیں کل پانچ کتابیں ہیں جو بائبل کی ابتدا میں ہیں اور ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔ پیدائش یا تکوین۔ خروج۔ احبار۔ اعداد یا گنتی۔ استثناء پرانے عبرانی نسخوں میں پانچ کتابوں کی تقسیم بیّن نہیں ہے بلکہ پیدائش سے لیکر استثناء تک ایک ہی مجموعہ ہے جس کو کئی چھوٹے اور بڑے بابوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

الانجیل۔ سریانی میں بھی اس سے ملتا جلتا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی خوش خبری ہیں۔ اہل عرب نے انجیل کا مادہ نجل لیا ہے اور نجل کے معنی نسل اور ولد بھی ہیں اور اِنْتَجَلَ الْاَمْرُ کے معنی ہیں اِسْتَبَانَ واضح ہوگیا اور نَجَلْتُ الْاَرْضَ کے معنی ہیں زراعت کے لیے اسے پھاڑا (ل) انجیل کی جمع اناجیل ہے اور حدیث میں صحابہ کی صفت میں آتا ہے صدورھم اناجیلھم (ل) ان کے سینے ان کی انجیلیں ہیں اور یہ انجیل بمعنی بشارت سے ہی ماخوذ معلوم ہوتا ہے اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سینے بشارتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یا یہ کہ جو عظیم الشان بشارت انجیل لائی تھی وہ اب صحابہ کے سینوں میں ہے کیونکہ وہ بشارت محمد رسول اللہ صلعم کے ظہور کی تھی۔

انجیل قرآن کریم کے نزدیک وہ کتاب ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اور جس شکل و صورت میں وہ عیسائیوں کے پاس تھی اس کو انجیل ہی کہا گیا ہے گو وہ چار کتابیں جو عیسائیوں کی اصطلاح میں اناجیل کے نام سے موسوم ہیں ان میں سے کوئی بھی حضرت عیسیٰ پر نازل شدہ انجیل نہیں بلکہ وہ چار الگ الگ اشخاص کی تصنیف ہیں ایک متی کی۔ ایک مرقس کی۔ ایک لوقا کی۔ ایک یوحنا کی۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بائبل صرف توریت و اناجیل کے مجموعہ کا نام نہیں۔ یہودیوں کے نزدیک تو بائبل اس مجموعہ کا نام ہے جس کے شروع میں حضرت موسیٰ کی پانچ کتابیں ہیں۔ اور ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں انبیاء کی وہ اس میں شامل کرتے ہیں۔ ایوب۔ یونس۔ حزقیل۔ دانیال وغیرہم کی کتب کے علاوہ حضرت داؤد کی زبور بھی اسی مجموعہ میں شامل ہے۔ اور بعض کتب کی شمولیت کے متعلق اختلاف بھی چلا آیا ہے۔ یعنی عام مروج نسخہ میں ۳۵ کتابیں شامل نہیں جو سیپٹو ایجنٹ نسخہ میں ہیں اور عیسائی اس مجموعہ کا نام تو پرانا عہد نامہ رکھتے ہیں اور ہر چہار اناجیل اور اعمال حواریین اور پولوس اور دیگر رسولوں کے خطوط اور مکاشفات یوحنا کے مجموعہ کو نئے عہد نامہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور پھر پرانے اور نئے عہد نامہ کل کو بائبل کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس الہامی کتاب کی بھی عجیب کیفیت ہے کہ کتابوں کی کتابیں بعض نسخوں میں شامل ہیں اور بعض سے خارج کر دی گئی ہیں۔

اناجیل کے مصنف: اناجیل کے متعلق جیسا کہ ذکر ہوا۔ عیسائیوں کے ہاتھ میں نہ صرف مسیح ہی کی کوئی انجیل نہیں بلکہ وہ چار اناجیل جو انکے پاس ہیں وہ بھی ان لوگوں کی لکھی ہوئی ثابت نہیں ہوتیں جن کے ناموں پر وہ مشہور ہیں بلکہ ان کے لکھنے والے کوئی اور لوگ ہیں متی کی انجیل کی تصنیف پر بحث کرتا ہوا پادری ڈملو اپنی تفسیر میں لکھتا ہے "جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس سے یہ ظاہر ہے کہ اس انجیل کا براہ راست متی کی تصنیف ہونا غیر اغلب ہے"۔ (صفحہ ۶۲۰) اور آگے چل کر دکھایا ہے کہ متی نے کوئی کلمات وغیرہ مسیح کے جمع کیے ہونگے جس کو اس مصنف نے استعمال کیا ہے اور اس کی تصنیف کا زمانہ جو خود پادری صاحبان بتاتے ہیں ۸۰ ء ہے۔ مگر

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَہُمْ عَذَابٌ
شَدِیْدٌ ؕ وَ اللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ④

اُتارا۔[٣٧١] وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب سزا دینے والا ہے[٣٧٢]

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ
وَلَا فِی السَّمَآءِ ؕ ⑤

یقیناً اللہ تعالیٰ پر نہ زمین میں کوئی چیز چھپی ہے اور نہ آسمان میں[٣٧٣]

ہُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ
یَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ⑥

وہی ہے جو تمھاری تصویریں رحموں میں جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، غالب حکمت والا ہے[٣٧٤]۔

واقعات سے ١٥٠ء عیسوی سے پیشتر مروجہ اناجیل اربعہ میں سے کسی انجیل کا کتاب کی صورت میں موجود ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ لوقا اور مرقس کی اناجیل کو عموماً ان مصنفوں کا سمجھا گیا ہے مگر نئی تحقیقات کی رو سے ان اناجیل کے ان کے مصنف ہونے پر شبہ کیا گیا ہے اور یہی حال یوحنا کی انجیل کا ہے جو پہلی صدی کے آخر کی لکھی ہوئی سمجھی جاتی ہے۔

محرّف کتابوں کا نام بھی توریت و انجیل ہی ہے: پس توریت و انجیل کا لفظ اپنی حقیقت کی رو سے تو انہی اصل کتابوں پر بولا جا سکتا ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح علیہما السلام پر نازل ہوئی تھیں۔ مگر موجودہ محرف کتابیں جن میں ان کا کچھ لقیہ ہے ان کو بھی اسی نام سے موسوم کیا جائے گا اور یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ یہ کتابیں بھی ہم نے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل کی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ اب بھی ان میں ہدایت کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ اور سب سے بڑی ہدایت ان میں یہی موجود ہے کہ دونوں کتابیں نبی کریم صلعم کی آمد کی پیشگوئی کرتی ہیں اور انجیل تو صاف طور پر کہتی ہے کہ کامل ہدایت کی راہیں سکھانے والا میرے (یعنی مسیح کے) بعد آنیوالا ہے۔

٣٧١ فرقان کے اصل معنی تو جیسا ع٦٦ میں دکھایا جا چکا ہے حق و باطل میں فرق کرنے والا ہیں۔ اور قرآن کریم کا بھی یہ ایک نام ہے۔ قتادہ سے روایت ہے کہ یہاں فرقان سے مراد قرآن کریم ہے (ث) اور گو پہلے قرآن کریم کے نزول کا ذکر فرما چکا ہے مگر دوبارہ دوسرے لفظ کو لا کر بیان کرنے سے خاص مقصود ہے۔ وہاں فرمایا تھا کہ یہ کتاب مقتضائے حکمت کے مطابق نازل ہوئی ہے یعنی ضرورت حقہ کو پورا کرنے والی ہے تو ایک دلیل اس کی تو وہاں دی تھی کہ یہ مصدق ہے دوسری دلیل لفظ فرقان میں دی ہے۔ توریت و انجیل کے نزول کا ذکر کر کے ان کی تحریف کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جس کو بالتفصیل سورہ بقرہ میں بیان کر دیا تھا۔ تو اس لیے جب تحریف ہو گئی تو حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کوئی کتاب نہ رہی پس اللہ تعالیٰ نے فرقان حمید کو نازل کیا کہ اس سے حق و باطل میں فرق کرے۔

٣٧٢ انتقام۔ نقم سے ہے نَقِمْتُ الشَّیْءَ وَنَقَمْتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اس چیز کو ناپسند کیا۔ زبان سے ہو یا سزا دیکر۔ اس لیے نقمۃ کے معنی عقوبت ہیں (غ) اِنْتَقَمَ اللّٰہُ مِنْہُ کے معنی ہیں عَاقَبَہٗ یعنی اسے سزا دی (ل)، اسی معنی سے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں منتقم یا ذو انتقام ہے یعنی سزا پہنچانے والا (ل)

٣٧٣ حضرت مسیح کے اعتراف لاعلمی کی اناجیل سے مثال: یہاں اللہ تعالیٰ کی وسعت علم کو مؤکد الفاظ میں بیان فرمایا ہے اور غرض جیسا کہ نوٹ ٣٦٨ سے ظاہر ہے حضرت مسیح کے صفات باری سے عاری ہونے کا ذکر ہے۔ قرآن کریم ہمیشہ ایسے لطیف طریق پر بات کو بیان کرتا ہے کہ کسی دوسرے کو ناگوار نہ گزرے اور پھر ایک لفظ میں بہت سا مضمون بیان کر دیتا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ بیان فرماتا کہ مسیح کو کوئی علم نہ تھا مگر جس قدر ایسے برگزیدہ انسانوں کو ہوتا ہے جیسا کہ نبی کریم صلعم نے اس آیت سے استدلال کر کے بیان فرمایا۔ اور اناجیل سے ان مثالوں کو پیش کرتا کہ کس طرح حضرت مسیح کا علم انسانی علم تک محدود تھا یوں فرمایا کہ وہ اللہ ہی ہے جس پر آسمان و زمین کی کوئی چیز مخفی نہیں گویا یہ بتا دیا کہ مسیح پر بہتیری چیزیں مخفی تھیں۔ چنانچہ اس کی شہادت خود اناجیل سے ملتی ہے۔ مثلاً انجیر کے درخت کا واقعہ، دوسرے دن جب وہ بیت عنیاہ سے نکلے اس کو بھوک لگی اور دور سے انجیر کا ایک درخت جس میں پتے تھے دیکھ کر گیا کہ شاید اس میں کچھ پائے مگر جب اس کے پاس پہنچا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا" (مرقس ١١: ١٢ و ١٣) اس واقعہ میں یہ الفاظ کہ "شاید اس میں کچھ پائے" اور "انجیر کا موسم نہ تھا" قابل غور ہیں جو بتاتے ہیں کہ حضرت مسیح کو باوجود انجیر کا موسم نہ ہونے کے یہ خیال تھا کہ شاید وہاں کچھ انجیریں مل جائیں کس قدر علم کی عاجزی کا اظہار ہے۔ یہ تو عملی اعتراف عجز ہے دوسری جگہ لفظوں میں بھی اپنے علم کے ناقص ہونے کا اظہار کیا ہے "لیکن اس دن اور اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا۔ مگر صرف باپ (متی ٢٤: ٣٦)

٣٧٤ یصور۔ تصویر صورت بنانے کا نام ہے۔ اور صورۃ وہ ہے جس سے کسی چیز کے عین کا نقش ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ دوسری اشیاء سے الگ ہوتی ہے۔ پھر یہ دو طرح پر ہے ایک محسوس جسے خاص و عام بلکہ حیوان بھی پہچان سکتے ہیں اور دوسرے معقول جسے صرف خواص ہی پہچان سکتے ہیں۔ جیسے وہ صورت جس سے انسان مخصوص ہے یعنی عقل اور رویّہ۔ اور وہ معانی جن سے ایک شے دوسری سے مخصوص ہوتی ہے اور جہاں اللہ تعالیٰ کے انسان کی صورت بنانے کا ذکر ہوتا ہے وہاں یہ دونوں صورتیں مراد ہوتی ہیں (غ) جیسے خلقنٰکم ثمّ صوّرنٰکم (الاعراف ۷-۱۱) وصوّرکم فاحسن صورکم (المؤمن ٤٠-٦٤) فی اَیِّ صورۃ ما شاء رکّبک (الانفطار ٨٢-٨) اور یہاں بھی۔ اور یہ جو حدیث میں آیا ہے اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ تو امام راغب کہتے ہیں اس سے وہ صورت مراد ہے جس سے انسان مخصوص ہے یعنی وہ ہیئت جس کا ادراک آنکھ سے اور عقل سے ہوتا ہے جس سے انسان کو دوسری مخلوق پر فضیلت ہے اور صورتہ کی ضمیر

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ

وہی ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری اس میں سے (کچھ) محکم آیتیں ہیں جو کتاب کی اصل ہیں اور کچھ اور متشابہ ہیں ع۳۷۵۔ پھر جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اُس کے

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تشبیہ کے لیے نہیں یا اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بھی کوئی صورت ہے بلکہ علی سبیل الملك ہے یعنی اس کی ملک ہونے کے لحاظ سے اور علی سبیل التشریف لہ یعنی اس کی عزت کے لحاظ سے جیسے بیت اللہ ۔ ناقۃ اللہ وغیرہ میں روحی میں ضمیر: اور ایسا ہی نفخت فیہ من روحی یا روح منہ میں بھی ملکیت اور عزت کے لحاظ سے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے۔

حضرت مسیح کا معمولی بچوں کی طرح حمل میں لیا جانا اور پیدا ہونا: اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا ذکر کہ وہ انسان کی صورت رحم میں جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے اس کی کمال قدرت کے اظہار کے لیے ہے کہ کس طرح تاریکیوں پر تاریکی میں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا فی ظلمٰت ثلٰث (الزمر ۳۹-۶) انسان کی نہ صرف جسمانی بلکہ اس کی اخلاقی اور روحانی تصویر بناتا ہے ۔ یہ بھی الوہیت مسیح کے بطلان کی دلیل کے طور پر ہے جیسا کہ روایت منقولہ بالا سے ثابت ہے ۔ یعنی یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جو حالات انسانوں پر گزرتے ہیں وہ حضرت عیسٰی پر بھی گزرے ، اور رحم میں اس پر وہ سب حالتیں یکے بعد دیگرے آئیں جیسا کہ عام انسانوں پر آتی ہیں ۔ اور ابن جریر میں حضرت ابن مسعود اور ابن عباس اور دیگر صحابہ سے اس روایت کا اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ پہلے نطفہ ہوتا ہے پھر چالیس دن کے بعد علقہ کی صورت اختیار کرتا ہے الخ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح پر نطفہ سے لیکر وہ تمام حالات انسانی آئے ہیں جو دوسرے انسانوں پر آتے ہیں کوئی خصوصیت بر بنائے پیدائش ان کے حالات میں نہیں ۔ اسی کی طرف دوسری جگہ اشارہ ہے جہاں فرمایا فحملتہ پھر مریم نے ان کو حمل میں لیا (مریم ۱۹-۲۲) اور ع۳۶۸ میں جس روایت کا ترجمہ دیا گیا ہے اس میں نبی کریم صلعم کے یہ الفاظ ہیں ان عیسٰی حملتہ امرأۃ کما تحمل المرأۃ ثم وضعتہ کما تضع المرأۃ یعنی عیسٰی کو ایک عورت نے حمل میں لیا جس طرح عورتوں کو حمل ہوتا ہے اور اس کو جنا جس طرح عورتیں جنتی ہیں ۔ تعجب ہے کہ ایسی صراحت کے ہوتے ہوئے مفسرین نے بعض عجیب قصے بنالیے ہیں اور بعض نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ایک ہی گھڑی کے لیے حضرت مریم صدیقہ کو حمل ہوا تھا اور فوراً حضرت مسیح پیدا بھی ہو گئے ۔

ع۳۷۵ محکمٰت ۔ مُحْکَم کی جمع ہے اور محکم وہ ہے جس میں لفظ اور معنی کی حیثیت سے کوئی شبہ وارد نہ ہو (غ) حَکَمْتُ ۔ اَحْکَمْتُ ۔ حَکَّمْتُ کے اصل معنی مَنَعْتُ ہیں یعنی روک دیا (ل) پس فساد یا خلل کو روکنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جس طرح حاکم کو حاکم اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو ظلم سے روکتا ہے اور یہ وجہ بھی مُحکم کی دی گئی ہے کیونکہ اس کا بیان خود اپنے آپ میں مضبوط ہوتا ہے اور دوسرے کا محتاج نہیں ہوتا (ل) روح المعانی میں ہے ۔ واضحۃ المعنی ظاھرۃ الدلالۃ محکمۃ العبارۃ ۔

اُمّ ۔ ماں کو کہتے ہیں اور ہر اُس چیز کو بھی اُمّ کہا جاتا ہے جو کسی چیز کے وجود یا اس کی تربیت یا اس کی اصلاح یا اس کی ابتدا کے لیے بطور اصل ہو (غ) پس اُمّ درحقیقت وہ اصل ہے جس سے ایک چیز پیدا ہوتی ہے یا جس پر دوسری چیزیں متفرع ہوتی ہیں پس امّ الکتاب سے مراد اصول ہیں ۔ جبیر سے مروی ہے ۔ ھن ام الکتاب لانھن مکتوبات فی جمیع الکتب (ث) وہ امّ کتاب اس لیے ہیں کہ سب آسمانی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں یعنی اصول دین ہیں ۔

اُخَرُ ۔ اُخْریٰ کی جمع ہے جو اٰخر کی تانیث ہے اور محذوف یعنی آیات کی صفت ہے ۔ اصل اس کا تاخیر یعنی پیچھے رہنے کے لیے ہے مگر محض ایک چیز کے غیر پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔

متشٰبِھٰت ۔ متشابہ شبہ سے ہے اور کسی چیز کا شِبْہ وہ ہے جو بلحاظ کیفیت اس کی مثل ہو (غ) ، اور قرآن میں متشابہ اسے کہا جاتا ہے جس کی تفسیر بوجہ اس کی غیر کے ساتھ مشابہت کے مشکل ہو ۔ خواہ مشابہت لفظ کی حیثیت سے ہو یا معنی کی حیثیت سے (غ)

محکم اور متشابہ آیات پر راغب کی بحث: مفسرین میں اس بات کے متعلق کہ محکمات کون آیات ہیں اور متشابہات کون ۔ مختلف آرائے ہیں ۔ امام راغب نے مفردات میں اس پر بڑی لمبی اور جامع بحث کی ہے ۔ اوّل وہ کل آیات کی تقسیم تین طرح پر کرتے ہیں ۔ محکم مطلق اور متشابہ مطلق اور ایک وجہ سے محکم اور ایک وجہ سے متشابہ پھر متشابہ تین قسم ہے ۔ لفظ کی حیثیت سے ، معنی کی حیثیت سے اور لفظ اور معنی دونوں کی حیثیت سے ۔ پھر لفظ کی حیثیت سے جو تشابہ ہے وہ دو قسم ہے ایک الفاظ مفردہ ہیں ، دوسرا کلام مرکب ہیں ۔ الفاظ مفردہ میں تشابہ یا تو بوجہ غرابت لفظ کے ہوتا ہے جیسے اَبّ ۔ یَزِفُّوْن اور یا اشتراک لفظی کی وجہ سے جیسے ید ۔ عین وغیرہ کے استعمال میں اور کلام مرکب میں اختصار سے تشابہ واقع ہوتا ہے جس کی مثال دی ہے وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامٰی فانکحوا ما طاب لکم من النساء اور یا بسط سے جیسے لیس کمثلہ شئ اور معنی کے لحاظ سے متشابہ ہیں اللہ تعالیٰ کے اوصاف اور یوم القیامۃ کے اوصاف داخل ہیں جسکی وجہ یہ دیتے ہیں کہ یہ صفات ہمارے تصور میں نہیں آسکتیں کیونکہ ہمارے ذہن میں وہی چیز آسکتی ہے جسکو ہم محسوس کرتے ہیں یا اس جنس کی چیز ہو جس جنس کی چیزوں کو ہم محسوس کرتے ہیں پس جنت دوزخ حساب کتاب وغیرہ کے متعلق جس قدر امور ہیں وہ متشابہات میں داخل ہیں اور جن میں تشابہ بحیثیت لفظ بھی ہو اور معنی بھی اس کو پانچ قسم بیان کیا ہے جن میں سے میں صرف یہاں اول دو قسم کو لیتا ہوں ۔ کمیّت کے لحاظ سے جیسے عموم وخصوص جس کی مثال ہے فاقتلوا المشرکین (التوبۃ ۹-۵) جہاں لفظ عام ہے مگر مراد خاص مشرک ہیں ۔ وجوب وندب کے لحاظ سے جیسے فانکحوا ما طاب لکم اور آخر پر لکھا ہے کہ

فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ج وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ م وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ لا كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ج وَمَا يَذَّكَّرُ

وقف النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام — وقف لازم — وقف منزل

پیچھے پڑ جاتے ہیں جو اس میں سے متشابہ ہے فتنہ پیدا کرنے کے لیے، اور یہ چاہتے ہوئے کہ اس کی (من مانی) تاویل کریں[۳۷۶] اور اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور ان کے جو علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کی طرف سے ہے[۳۷۷]

مفسرین نے جو جو تشریحات محکم و متشابہ کی کی ہیں وہ سب اس تقسیم کے اندر داخل ہیں۔

ایک اور رنگ میں متشابہ کو تین قسم کیا ہے ایک وہ جس کی حقیقت پر انسان واقفیت حاصل نہیں کر سکتا جیسے امور متعلق قیامت وغیرہ ایک وہ جس پر واقفیت حاصل کر سکتا ہے جیسے الفاظ غریبہ اور مشکل احکام اور ایک ان دونوں کے درمیان جن سے راسخ فی العلم واقفیت حاصل کر سکتے ہیں مگر ہر شخص نہیں۔

ع۳۷۶ زیغ۔ استقامت سے ایک طرف جھک جانا زَیغ ہے فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم (الصف ۶۱-۵) ما زاغ البصر و ماطغٰی (النجم ۵۳-۱۷)

ابتغاء۔ بَغیٌ سے ہے جس کے معنی ہیں میانہ روی سے بڑھنے کو چاہنا اور بَغَیت الشیٔ اور ابتغیتہٗ کے معنی ہیں قدر واجب سے بڑھ کر کسی چیز کو طلب کیا یا چاہا (غ) فتنہ کے متعلق اس کا استعمال خاص طور پر ہوا ہے لقد ابتغوا الفتنۃ من قبل (التوبۃ ۹-۴۸) یبغونکم الفتنۃ (التوبۃ ۹-۴۷)

الفتنۃ۔ فتنۃ کے اصل معنی ع۲۴۳ میں بیان ہو چکے ہیں۔ مگر یہاں وہ معنی مراد نہیں اور اس لفظ کے کئی اور معنی بھی آتے ہیں منجملہ ان کے حق سے پھیر دینا بھی اس کے معنی آتے ہیں۔ چنانچہ فَتَنَ الرَّجُلَ کے معنی ہیں ازالہ عما کان علیہ (ل) یعنی جس حالت پر وہ تھا اس سے اس کو ہٹا دیا۔ اور اسی لحاظ سے وان کادوا لیفتنونک عن الذی اوحینا الیک (بنی اسرائیل ۱۷-۷۳) میں یفتنونک کے معنی لکھے ہیں یمیلونک ویزیلونک یعنی تجھے مائل کر دیں اور ہٹا دیں۔ اور پھر لکھا ہے کہ لفظ فتنہ کے معنی کلام عرب میں حق سے ایک طرف جھکا دینا ہیں اور فتنہ بمعنی اضلال بھی آتے ہیں (ل) اور اس حدیث میں کہ انی اری الفتن خلال بیوتکم (میں فتنوں کو تمہارے گھروں کے اندر دیکھتا ہوں) فتنۃ سے مراد وہ اختلاف ہے جو مسلمانوں کے فرقوں میں ہو گا (ل) اور ان تینوں معنوں میں سے یعنی حق سے پھیرنا۔ گمراہ کرنا۔ اختلاف کوئی سے معنی یہاں مراد ہو سکتے ہیں پس ابتغاء الفتنۃ کے معنی ہوئے حق سے پھیرنے کو چاہتے ہوئے۔ یا گمراہی چاہتے ہوئے یا اختلاف چاہتے ہوئے۔ گویا متشابہات کی پیروی سے ان کی غرض حق کی بجائے غلطی کا پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یا لوگوں کو دین حق سے گمراہ کرنا یا اختلاف ڈالنا۔ حضرت مجاہدؓ سے یہاں فتنہ کے معنی شبہات مروی ہیں (ج) یعنی لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرنے کے لیے جیسا کہ اکثر مفسرین نے اسے کھول کر لکھا ہے کہ مراد یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں شکوک اور شبہات پیدا کر کے دین سے پھیر دیں۔

تاویل۔ اَوْل سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کا اصل کی طرف رجوع کرنا اور تاویل کے معنی ہیں رَدُّ الشیٔ اِلَی الغَایَۃِ الْمُرَادَۃِ منہ عِلمًا کان او فعلًا (غ) ایک شئے کا اس غایت کی طرف لوٹانا جس کا اس سے ارادہ کیا گیا ہو علمی طور پر ہو یا فعلی طور پر یہاں تاویل بلحاظ علم مراد ہے۔ اور ھل ینظرون الّا تاویلہ یوم یاتی تاویلہٗ (الاعراف ۷-۵۳) میں اور ذالک خیر و احسن تاویلا (بنی اسرائیل ۱۷-۳۵) میں تاویل فعلی یعنی مآل یا انجام مراد ہے۔

اپنی خواہش کے مطابق تاویل: ابتغاء تاویلہ۔ تاویل کی ضمیر کہا گیا ہے کہ عہد کے لیے ہے۔ یعنی اس سے مراد مخصوص تاویل یا ایسی تاویل ہے جو محکمات کے خلاف ہو اور اپنی خواہش کے مطابق (ر) اس لیے مفسرین نے عموماً ابتغاء تاویلہ کے معنی کیے ہیں طلب تاویل الذی یشتھونہٗ یعنی اس تاویل کو چاہتے ہوئے جو ان کی اپنی خواہش ہوتی ہے اور یا یہ مراد ہے جیسا لفظ ابتغاء کے معنی بھی اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اس کی تاویل کی طلب میں حد سے تجاوز کرتے ہیں اور وہ حد سے تجاوز کرنا یہ ہے کہ اسے محکمات کی طرف نہیں پھیرتے۔ متشابہ الفاظ کے معنی میں ابتغاء یہی ہے کہ انسان ایسا ان الفاظ کے پیچھے پڑے کہ دوسرے الفاظ یا اصول کی طرف توجہ نہ کرے اور اکثر متشابہ کی پیروی کرنے والوں کو یہی غلطی لگتی ہے کہ وہ ان الفاظ کے ایسا پیچھے پڑتے ہیں کہ باقی بڑی بڑی اور روشن اور واضح باتوں کی پرواہ تک نہیں کرتے اور اس میں بھی شک نہیں کہ یہ محض اپنی خواہش کی پیروی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پہلے انسان اپنے دل میں ایک خیال بٹھا لیتا ہے۔ پھر متشابہ الفاظ لیکر اور الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہے۔

ع۳۷۷ راسخون۔ رُسُوخ کے معنی ہیں کسی چیز کا نہایت ہی مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جانا اور راسخ فی العلم علم میں متحقق کو کہتے ہیں (غ)

یہاں اللہ اور الراسخون فی العلم دونوں جگہ پر وقف ہے۔ اس لیے والراسخون فی العلم دونوں طرف ملتا ہے یعنی اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور راسخون فی العلم کے اور یہ بتانے کو وہ راسخ فی العلم کس طرح اس تاویل کو جانتے ہیں۔ یہ الفاظ بڑھا دیئے ہیں یقولون اٰمنّا بہ کل من عند ربنا یعنی ہم متشابہات اور محکمات دونوں کو خدا کی طرف سے مانتے ہیں۔ گویا ان کا اصول یہ ہے کہ متشابہات کو محکمات پر عرض کرتے ہیں چنانچہ بخاری میں اسی طرح پر ان الفاظ کے معنی کیے ہیں والراسخون یعلمون یقولون اٰمنا بہ۔ یعنی راسخ بھی ان معنوں کو جانتے ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے اور حضرت ابن عباس سے مجاہد کی وساطت سے یہ قول مروی ہے کہ آپ نے فرمایا انا من الراسخین الّذین یعلمون تاویلہ (ث) میں ان راسخوں میں سے ہوں جو اس کی تاویل کو جانتے

اِلَّآ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ⑦ اور عقل والوں کے سوائے کوئی نصیحت قبول نہیں کرتا[۳۷۸]

ہیں اور حضرت ابن عباس کے متعلق صحیح حدیث میں آتا ہے اللّٰھم فقّھہ فی الدین وعلّمہ التاویل اے اللہ اس کو دین میں سمجھ دے اور اس کو تاویل سکھا۔ اور محکمات کے معنی تو واضح ہوتے ہیں اس لیے یہ دعا متشابہات کی تاویل کے متعلق ہی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر متشابہات کے معنی راسخین فی العلم کو بھی معلوم نہیں ہو سکتے تو ان کا انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل کرنا بے معنی ہے۔ باقی رہیں بعض اشیاء جیسے جنت و نار وغیرہ کی حقیقت تو اس کے معلوم کرنے کی ہمیں یہاں کوئی ضرورت بھی نہیں، ہاں جب اس عالم سے کوچ کر کے دوسرے عالم میں منتقل ہو جائیں گے تو ان کی حقیقت بھی کھل جائے گی۔

ع[۳۷۸] اس آیت کریمہ میں قرآن شریف نے محکم اور متشابہ کا ایک اصول بیان فرمایا ہے اس میں عیسائیت کے لطلان کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ عیسائیوں نے محکمات اور متشابہات میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے ہی غلطی کھائی ہے عیسائی مذہب کی بنیاد صرف متشابہات پر ہے سب سے بڑی دلیل حضرت مسیح کی خدائی کی یہ دیجاتی ہے کہ پیشگوئیوں میں آپ کو خدا کہا گیا تھا اور آپ کی آمد کو خدا کی آمد قرار دیا گیا ہے مگر یہ کس قدر بودی بنیاد ہے پیشگوئی تو خود متشابہات میں سے ہوتی ہے اور پیشگوئیوں کی زبان میں استعارہ اور مجاز کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ چنانچہ خود مسیح کی آمد کے جو نشانات ہیں ان کو ہی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کس قدر مجاز اور استعارہ ان کے اندر ہے اور حق تو یہ ہے کہ جن پیشگوئیوں میں خدا کا لفظ آیا ہے وہ حضرت مسیح کے لیے نہیں بلکہ ہمارے نبی صلعم کی آمد کے متعلق ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ خود حضرت مسیح نے بھی خدا کے آنے کی پیشگوئی کو بیان کیا ہے۔ دیکھو متی ۲۱: ۳۳-۴۰ جہاں انگورستان کے مالک کی تمثیل میں بیٹے کے آنے کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ پھر انگورستان کا مالک خود آئے گا اور آگے آیت ۴۳ میں صفائی سے بتا دیا ہے کہ "خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور ایک اور قوم کو جو اس کے میوہ لاوے دی جائے گی"۔ پس وہ خدا جس کے آنے کی پیشگوئیاں بائبل میں ہیں محمد رسول اللہ صلعم ہیں مگر باوجود ان پیشگوئیوں کے وہ خدائی کا دعویٰ نہیں کرتے۔

لیکن اس بات کو چھوڑ کر بائبل میں لفظ خدا کا استعمال بطور مجاز نیک لوگوں کے حق میں موجود ہے "میں نے تو کہا کہ تم اللہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو"۔ (زبور ۸۲: ۶) یوحنا ۱۰: ۳۴ میں حضرت مسیح اسی قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں "جبکہ اس نے انہیں جن کے پاس خدا کا کلام آیا خدا کہا"۔ پس اوّل پیشگوئی خود ایک استعارہ ہے اس لیے اس میں خدا کی آمد کا ذکر ایک استعارہ سے بڑھ کر نہیں۔ پھر وہ پیشگوئیاں بھی مسیح کے لیے نہیں بلکہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہیں۔ پھر بغیر پیشگوئیوں کے بھی اسی بائبل میں لفظ خدا بطور مجاز نیک لوگوں کے حق میں استعمال ہوا اس لیے اس کے معنی دوسری جگہ بھی یہی مراد ہوں گے۔ پس ایک متشابہ امر کی بنیاد پر تمام محکمات کو ردّ کرنا یہ عیسائی مذہب کی خطرناک غلطی ہے۔ اور خود حضرت مسیح نے بھی ان کو بتا دیا تھا کہ وہ جو لفظ خدا کا بیٹا اپنے لیے استعمال کرتے ہیں تو اسی مجازی معنی کی رُو سے، جس مفہوم کو مدنظر رکھ کر سارے راستبازوں کو خدا اور خدا کا فرزند قرار دیا گیا ہے چنانچہ جب یہودیوں نے حضرت مسیح کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی تو حضرت مسیح نے ان سے دریافت کیا کہ میں نے خدا کی طرف سے بہت سے نیک کام کیے ہیں میرے کس نیک کام کے عوض مجھے سنگسار کرتے ہو تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اچھے کام کے لیے ہم تم کو سنگسار نہیں کرتے بلکہ اس لیے کہ تو کفر کہتا ہے "اور انسان ہو کے اپنے تئیں خدا بناتا ہے"۔ (یوحنا ۱۰: ۳۳) تو حضرت مسیح نے اس کا جواب یہ دیا "کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں نے کہا تم خدا ہو۔ جبکہ اس نے انہیں جن کے پاس خدا کا کلام آیا خدا کہا...... تم اسے جسے خدا نے مخصوص کیا اور جہان میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے کہ میں نے کہا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں" (یوحنا ۱۰: ۳۴-۳۶) اب اس سوال وجواب پر غور کرو اگر حضرت مسیح کا دعویٰ واقعی خدائی کا ہوتا تو جب آپ پر یہ الزام لگایا گیا کہ تم انسان ہو کر اپنے آپ کو خدا کہتے ہو تو اس کا جواب یوں دیتے کہ میں تو خدا ہی ہوں اور تمہاری پیشگوئیوں میں خدا کا آنا لکھا ہے مگر بجائے اس کے آپ یہ جواب دیتے ہیں کہ تمہارے بزرگوں کو بھی خدا کے کلام میں خدا کہا گیا ہے اگر ان کا خدا کہلانا کفر نہیں تو میرا خدا کا بیٹا کہلانا کیوں کفر ہو گیا۔ بالفاظ دیگر جن معنوں میں وہ خدا کہلائے انہی معنوں میں میں خدا کا بیٹا ہوں۔ نہ وہ حقیقت میں خدا تھے نہ میں حقیقت میں خدا کا بیٹا ہوں مگر مجازی طور پر ان کو بھی خدا کہا گیا۔ مجازی طور پر میں بھی خدا کا بیٹا ہوں اس قدر صفائی کے ہوتے ہوئے عیسائیوں نے متشابہات کو لیا اور محکمات کو چھوڑ دیا اس لیے ان کے عقیدہ کے لطلان میں اس مسئلہ کی توضیح کرنی ضروری تھی۔ پس اس بحث کی ابتدا میں اصولی طور پر یہ بیان کر کے کہ خدا کی صفات مسیح میں نہ پائی جاتی تھیں۔ اب بتاتا ہے کہ ان کو ٹھوکر متشابہات سے لگی ہے اور یہ ان کے دلوں کی کجی کا نتیجہ ہے کہ محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اسی اثناء میں مسلمانوں کو بھی متنبہ فرماتا ہے کہ تم ایسی غلطی میں نہ پڑنا۔

حضرت مرزا صاحب کی طرف دعویٰ نبوت منسوب کرنا متشابہات کی پیروی ہے: مگر افسوس ہے کہ آج بعینہٖ یہی غلطی وہ لوگ کرتے ہیں جو حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی طرف دعویٰ نبوت منسوب کرتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں بھی دلیل صرف یہی ہے کہ پیشگوئی میں آنے والے مسیح کے لیے لفظ نبی کا آ گیا ہے۔ حالانکہ اوّل تو پیشگوئی میں استعارہ ہونا ایک مسلّم امر ہے دوسرے خود وہ پیشگوئی جس میں لفظ نبی ہے ساری کی ساری استعارات سے بھری ہوئی ہے بعینہٖ اسی طرح جب اس مسیح ثانی پر یہ اعتراض ہوا کہ تم نے اپنی تحریروں میں لفظ نبی استعمال کیا ہے تو آپ نے جواب دیا کہ کیا پہلے کسی بزرگ نے نہیں کہا "او نبی وقت باشد اے مرید" یعنی مرشد نبیٔ وقت کا حکم رکھتا ہے جس میں صاف بتا دیا کہ میری تحریر میں لفظ نبی اصطلاح شرعی میں نہیں بلکہ لغوی معنی میں ہے اور مجازی رنگ میں جس طرح پہلے بزرگوں نے بھی مجازی رنگ میں اسے استعمال کر لیا ہے اور اسی پر بس نہیں کی بلکہ آخر تک صاف لفظوں میں لکھ دیا کہ سمّیتُ نبیًا من اللہ علی طریق المجاز لا علی وجہ الحقیقۃ میرا نام خدا کی طرف سے مجاز کے طور پر نبی رکھا گیا نہ حقیقت کے طور پر۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم نے محکمات اور متشابہات کی تفسیر میں اصول کیا بیان فرمایا ہے کیونکہ یہاں آ کر ایک دوسری دقت پیش آتی ہے کہ ایک ایک لفظ

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا
وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ
اَنْتَ الْوَهَّابُ ⑧

اے ہمارے رب! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ ہونے دے اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت کی اور اپنے پاس سے ہمیں رحمت عطا فرما، بیشک تو ہی بہت عطا کرنے والا ہے۔[ع۳۷۹]

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ
ع ۹ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ⑨

اے ہمارے رب! ضرور تو لوگوں کو اس دن کے لیے اکٹھا کرنے والا ہے جس میں کچھ شک نہیں بیشک اللہ وعدہ کا خلاف نہیں کرتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ
وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ
هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ⑩

جنھوں نے انکار کیا، ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) کے سامنے ان کے کسی کام نہ آئے گی اور وہی آگ کا ایندھن ہیں۔[ع۳۸۰]

کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں۔ خود غرض لوگ اپنے حسب منشاء جس کو چاہتے ہیں متشابہ بنا کر اسے کسی دوسری آیت کے ماتحت کر دیتے ہیں یا اس کی تاویل اپنے حسب منشاء کر لیتے ہیں۔ ایک شخص اسی کو محکم کہتا ہے دوسرا اسی کو متشابہ کہتا ہے تو پس اس کا بھی کوئی علاج قرآن کریم نے بتایا ہے یا نہیں؟ اگر الفاظ قرآنی پر غور کیا جائے تو ایک ایسی پکی بات بتادی ہے کہ تمام جھگڑے اُٹھ جاتے ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ محکمات کے متعلق فرمادیا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ هن ام الکتاب وہ کتاب کی اصل یا جڑ ہیں۔ اب اُم یا جڑ اس چیز کو کہتے ہیں جو بطور اصل ہو۔ تو پس قرآن کریم ہمیں یہ ہدایت دیتا ہے کہ محکمات سے مراد اصولی امور ہیں۔ اور طرز تاویل یہ ہوگی کہ فروعات اور مخصوصات کو جو بطور شاخوں یا ولد کے ہیں۔ جڑ اور ام کی طرف لوٹانا پڑے گا یعنی اصول کے ماتحت کرنا پڑے گا۔ کیونکہ حق یہی ہے کہ جب تک مخصوصات اور فروعات کو اصول کے ماتحت نہ لایا جائے اس وقت تک حق بات انسان معلوم نہیں کرسکتا۔ مخصوصات کو اگر اصول اور قانون سے الگ کیا جائے تو اس کا نتیجہ وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان فرمایا ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ ایک مخصوص امر کی تاویل کے پیچھے پڑ کر ایک فتنہ پیدا ہوجاتا ہے کہ بعض کا مفہوم بعض کے خلاف ہو جاتا ہے پس ضروری ہوا کہ کسی امر مخصوص کے صحیح معنی سمجھنے کے لیے پہلے ایک اصول قائم کیا جائے اور اس اصول کے ماتحت اس کی تاویل کی جائے۔ یہی وہ راہ ہے جو قرآن کریم نے سکھائی ہے اور اس راہ پر چل کر نہ صرف بیرونی تفرقوں کا علاج ہی ہوسکتا ہے بلکہ مسلمانوں کے جس قدر اندرونی اختلافات ہیں ان کا بھی ایک حد تک فیصلہ ہوجاتا ہے اور جو اختلافات باقی رہ جائیں گے وہ اصولی اختلافات نہ ہوں گے کیونکہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے تمام امور ضروریہ کی تکمیل کر دی ہے۔ اب فروعات تو اس قدر وسیع دائرہ رکھتی ہیں کہ تاقیامت بھی ان کو ایک دفتر میں اکٹھا نہیں کیا جاسکتا روز نئی نئی فروعات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ پس یہ ماننا پڑے گا کہ سب اصول کو قرآن کریم نے واضح کرکے بیان کردیا ہے اور فروع میں سے حسب ضرورت کچھ لے لیا ہے اس لیے بھی فروع کو اصول کے ماتحت کرسکتے ہیں نہ اصول کو فروع کے ماتحت۔ اسی بات کی طرف عدم توجہی نے مذاہب میں غلطیاں پیدا کیں اور اسی اصول کو مدنظر نہ رکھنے کی وجہ سے مختلف اسلامی فرقوں نے ایک دوسرے کے خلاف قرآن سے ہی نتائج اخذ کیے اگر سب لوگ اس بات پر کاربند ہوں کہ اصول کو تو چونکہ محکم کرنے کا ذکر خود قرآن کریم میں ہے پس ہر ایک فراع کو قرآن کریم کے قائم کردہ اصول پر پیش کیا جائے تو بہت سے جھگڑے اُٹھ جاتے ہیں۔

ع۳۷۹ الوھاب۔ اسمائے الٰہی میں سے ہے ھِبَۃ کے معنی ہیں اپنی ملک بلا عوض غیر کو دے دینا (غ) اور الوھّاب اس امر کو ظاہر کرنے کے لیے ہے اِنَّهٗ يُعْطِي كُلًّا عَلٰى قَدْرِ اسْتِحْقَاقِهٖ (ع) یعنی ہر ایک کو بقدر استحقاق دیتا ہے۔

اس دعا کی اس مقام پر تعلیم صاف اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ متشابہات کی پیروی میں لگ کر دین میں فتنہ پیدا کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو پہلے ہدایت پا چکتے ہیں کیونکہ ان کے متعلق فرمایا تھا کہ ان کے دلوں میں زیغ یعنی کجی ہوتی ہے اس لیے اب مومنوں کو اسی زیغ سے بچنے کی دعا سکھاتا ہے۔ نبی کریم صلعم کے دل میں اپنی امّت کے لیے اس قدر رحمت جوش مارتی تھی کہ ان کی تعلیم کے لیے آپ اس دعا کو بہت کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے ان النبیّ صلعم کان یقول یا مقلب القلوب ثبت قلبی علٰی دینك ثم قرأ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنك رحمۃ انك انت الوھاب (ت) یعنی نبی کریم صلعم یوں دعا کیا کرتے تھے اے دلوں کے پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر مضبوط رکھیو۔ پھر آپ یہ آیت ربنا لا تزغ قلوبنا پڑھا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نسبت بھی روایت ہے کہ آپ سورۂ فاتحہ کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اس میں مومن کو سکھایا ہے کہ اپنے نفس پر بھروسہ نہ کرے۔ بلکہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا طالب ہو۔

ع۳۸۰ لن تغنی عنھم۔ اَغنی عنه کذا کے معنی ہیں کفاہ (غ) یعنی وہ شے اس کے لیے کافی ہوگئی اور یہی معنی اغناہ کے ہیں۔ جیسا کہ لکل امرئ منھم یومئذ شان یغنیه (عبس ۸۰۔ ۳۷) اور اغنی عنه کا زیادہ استعمال ہے۔ ما اغنٰی عنّی مالیه (الحاقۃ ۶۹۔ ۲۸) ما اغنٰی عنھم ما کانوا یمتّعون (الشعراء ۲۶۔ ۲۰۷) لا تغن عنی شفاعتھم (یٰس ۳۶۔ ۲۳) ولا یغنی من اللھب (المرسلات ۷۷۔ ۳۱) انھم لن یغنوا عنك من اللہ شیئا (الجاثیۃ ۴۵۔ ۱۹)

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿١١﴾

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٢﴾

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِىْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ

(ان کا حال) فرعون کے لوگوں اور ان کے حال کی طرح ہے جو ان سے پہلے تھے، انھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا پس اللہ نے انکو ان کے گناہوں کے سبب پکڑا اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے[٣٨١]۔

جنھوں نے انکار کیا ان سے کہہ دے کہ تم جلد مغلوب کیے جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور کیا ہی بُرا بچھونا ہے[٣٨٢]۔

ان دو گروہوں میں جن کی آپس میں مٹ بھیڑ ہوئی یقیناً تمھارے لیے

من اللہ۔ مِنْ ابتدائے غایت کے لیے ہے اور مراد ہے من عذاب اللہ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اگلی آیت میں جو مثال دی ہے اس میں اللہ کے عذاب کا ہی ذکر ہے بعض نے من کو یہاں بدل کے معنی میں لیا ہے (مغنی) یعنی اللہ کی طاعت یا اس کی رحمت کے بدل میں یہ چیزیں کچھ کام نہ آئیں گی۔

کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی: جیساکہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ خاص خطاب اس سورت کے صدر میں عیسائیوں سے ہے۔ چنانچہ بعض نے یہاں مراد وفد نجران لیا ہے (د) یعنی وہ وفد جو عیسویت کا قائم مقام ہو کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے مالوں اور جتھے پر جس قدر فخر عیسائی اقوام کو ہے شاید ہی کسی قوم کو ہوا ہو۔ مگر چونکہ الفاظ عام ہیں اس لیے ہر قسم کے کفار اس کے اندر شامل ہیں جو اسلام کو نابود کرنا چاہیں۔

ع[٣٨١] دأب۔ دَأَبَ کے معنی ہیں کوشش کی اور تھک گیا۔ پس دَأْب اور دَأَب دونوں کے معنی عادت اور شان یعنی حالت آتے ہیں (ل) مگر ازہری نے کہا ہے کہ دَأَب سے مراد ان کا کفر میں سخت زور لگانا (اجتہادھم فی الکفر) اور نبی صلعم کی مخالفت پر ایک دوسرے کے مددگار بننا ہے۔ جیساکہ فرعون کے لوگ حضرت موسیٰ کے خلاف ایک دوسرے کے مددگار رہوئے (ل)

ذنوب۔ ذَنْب کی جمع ہے وَالذَّنْبُ فِى الْاَصْلِ الْاَخْذُ بِذَنَبِ الشَّئِ (غ) ذَنْب اصل میں کسی چیز کی ذَنَب یعنی دم یا موخر حصّہ کے پکڑنے کا نام ہے وَيُسْتَعْمَلُ فِىْ كُلِّ فِعْلٍ يُسْتَوْخَمُ عُقْبَاهُ اعتبارا بِذَنَبِ الشَّئِ (غ) اور ذَنْب ہر ایک اس فعل پر استعمال ہوتا ہے جس کا انجام ناگوار اور گراں ہو۔ گویا وہ بمنزلہ ایک چیز کی دم کے ہے لسان العرب میں ہے اَلذَّنْبُ اَلْاِثْمُ وَالْجُرْمُ وَالْمَعْصِيَةُ یعنی ذنب اثم جرم اور معصیت تینوں پر شامل ہے اب اثم ہر ایک اس فعل کا نام ہے جو ثواب سے انسان کو روکتا ہے۔ جرم ان افعال کا نام ہے جن کی وجہ سے گویا جناب الٰہی سے قطع تعلق ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا اشتقاق جَرم بمعنی قطع سے ہے اور معصیت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو کہتے ہیں۔ خواہ عمداً ہو یا سہواً۔ گو جو نافرمانی سہو سے ہو وہ قابل مواخذہ نہیں پس معلوم ہوا کہ ذنب کا لفظ زبان عربی میں نہایت وسیع ہے اور اس سے مراد وہ افعال بھی ہو سکتے ہیں جو فی الحقیقت گناہ نہیں اور نہ نافرمانیاں ہیں۔ مگر ان کا انجام ناگوار ہے اور ایسی نافرمانی بھی اس سے مراد ہو سکتی ہے جس میں عمد اور ارادہ کا کوئی دخل نہیں اور ایسے سخت گناہ بھی اس سے مراد ہو سکتے ہیں جو جناب الٰہی سے قطع تعلق کا موجب ہو جائیں پس لفظ ذنب کا صحیح ترجمہ گناہ نہیں بلکہ قریب تر لفظ جو اس کے مفہوم کو ادا کرتا ہے قصور ہے اور کبھی وہ اتنا چھوٹا ہوگا کہ اس میں کرنے والے پر کوئی الزام نہیں اور بعض وقت بہت بڑا جیسے یہاں۔

فرعون کے لوگوں کی حالت کا ذکر کرکے یہ بتا دیا کہ جس طرح وہ دنیا میں مغلوب و ذلیل ہوئے اسی طرح مخالفین اسلام کی حالت بھی ہوگی۔

ع[٣٨٢] تحشرون۔ حَشْر۔ کسی جماعت کو اپنی جائے قرار سے نکال دینا اور وہاں سے بے آرام کرکے جنگ وغیرہ کی طرف لے جانا ہے۔ چنانچہ اس روایت النِّسَاءُ لَا يُحْشَرْنَ میں معنی یہ ہیں لَا يُخْرَجْنَ اِلَى الْغَزْوِ (غ) یعنی عورتوں کو جنگ کے لیے نکلنے پر مجبور نہ کیا جائے گا اور حشر کا لفظ سوائے جماعت کے نہیں بولا جاتا (غ) وابعث فی المدائن حاشرین (الشعراء[٢٦]-٣٦) والطیر محشورة (صٓ[٣٨]-١٩) واذا الوحوش حشرت (التکویر[٨١]-٥) وحشر لسلیمٰن جنوده (النمل[٢٧]-١٧) ھو الذی اخرج الذین کفروا من اھل الکتٰب من دیارھم لاول الحشر (الحشر[٥٩]-٢) اور قیامت میں لوگوں کے اکٹھا کیے جانے پر بھی لفظ حشر بولا گیا ہے۔

کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی سخت ترین مخالفت کے وقت: اس آیت میں اور بھی صفائی سے بیان کیا ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہونگے وہ ضرور پہلے اسی دنیا میں مغلوب ہونگے پھر جہنم کی طرف اکٹھے کرکے چلائے جائیں گے اور اس دنیا میں ان کی مغلوبیت آخرت میں جہنم کا ثبوت ہوگی۔ یہ پیشگوئی اس زمانہ کی ہے کہ ابھی نبی کریم صلعم کی جمعیت ملک عرب میں دشمنوں کے مقابلہ پر کچھ بھی نہ تھی اور مخالفت ایک مشرکین عرب کی طرف سے ہی نہ تھی بلکہ اندرونی مخالف منافق۔ اور بیرونی مخالف عرب کے سب مشرک اور یہود اور نصاریٰ اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو چکے تھے۔ ان حالات میں ایسے صاف الفاظ میں کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی کرنا اور پھر اس پیشگوئی کا آنحضرت صلعم کے سامنے پورا ہو جانا اسلام کی صداقت کے چمکتے ہوئے نشانوں میں سے ایک نشان ہے اور آج ایک مسلمان کے قلب کو اس بات سے قوت ملتی ہے کہ وہ خدا جس نے اپنا وعدہ ان حالات میں پورا کیا۔ وہ اسلام کی ہر ایک بیکسی کے وقت اس کا حامی ہوگا اور اس کے مخالفین کو مغلوب کرے گا۔

فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ

نشان تھا[۳۸۳] ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑتا تھا، اور دوسرا کافر تھا وہ اُن کو ظاہر آنکھ سے اپنے سے دو چند دیکھتے۔ اور اللہ اپنی مدد کے ساتھ جس کو چاہے قوت دیتا ہے بصیرت والوں

---

۳۸۳ اس آیت میں بالخصوص اہل کتاب مخاطب ہیں۔ کیونکہ اس سورت کے ابتدائی حصہ میں اصل خطاب انہیں کے ساتھ چلتا ہے علاوہ ازیں اس میں مشرکوں اور مسلمانوں کے مقابلہ اور جنگ کی طرف توجہ دلائی ہے پس جس کو توجہ دلائی ہے وہ کوئی تیسرا گروہ ہے اور یہ عیسائی ہیں جن کے ساتھ اصل بحث چلتی ہے دو گروہوں کی مٹ بھیڑ سے مراد جنگ بدر ہے جیسا کہ اگلے الفاظ میں صاف اشارہ بھی ہے کہ ایک گروہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتا تھا اور دوسرا گروہ کافروں کا تھا جو دیکھنے میں ان سے دو چند تھے۔

جنگ بدر میں آنحضرت صلعم کی صداقت کا نشان ایک تو اس طرح تھا کہ قرآن کریم کی مکی سورتوں میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان ایک مٹ بھیڑ کی خبر بار بار دی گئی تھی جس میں کفار کی ہزیمت اور مسلمانوں کی فتح کی پیشگوئی کی گئی تھی یہاں تفصیل کے ساتھ ان پیشگوئیوں کے ذکر کا موقعہ نہیں۔ صرف ایک پیشگوئی پر کفایت کی جاتی ہے۔ سورہ القمر میں آخری رکوع میں ہے ام یقولون نحن جمیع منتصر سیھزم الجمع و یولون الدبر بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر۔ کیا یہ (کفار) کہتے ہیں کہ ہم ایک جماعت ہیں ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ان کی جماعت کو ہزیمت دی جائے گی اور وہ پیٹھیں پھیر کر واپس ہو جائیں گے۔ ہاں ایک گھڑی ان کے وعدے کا وقت ہے اور وہ گھڑی بڑی سخت اور تلخ ہو گی۔ کہا جائے گا کہ یہ تو قیامت کے متعلق ہے مگر جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں قرآن کریم نے پیشگوئی میں ایسی لطیف طرز اختیار کی ہے کہ قیامت کی رسوائی کے ساتھ اس دنیا کی مغلوبیت کا ذکر بھی کیا ہے تاکہ ایک کے پورا ہو جانے سے دوسرے کی صداقت پر شہادت ہو مگر یہاں ساعۃ سے مراد وہی ہزیمت کی ساعت ہے ورنہ قیامت کے دن ہزیمت اور جنگ کا کیا ذکر ہے۔ وہ تو اسی دنیا میں ہو گی اور یہ بھی ایک معنی میں ان کے لیے قیامت ہی ہے۔ ہاں پھر قیامت میں اس سے بھی زیادہ سختی اور تلخ کامی دیکھیں گے۔ اس بات کا ثبوت کہ خود نبی کریم صلعم اس پیشگوئی سے بدر کی جنگ مراد لیتے تھے صحیح احادیث سے ملتا ہے چنانچہ اسی آیت کی تفسیر میں بخاری میں ہے عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال وھو فی قبۃ لہ یوم بدر انشدك عھدك ووعدك اللّٰھم ان شئت لم تعبد بعد الیوم ابدا فاخذ ابوبکر بیدہ وقال حسبك یا رسول اللہ فقد الححت علیٰ ربك وھو فی الدرع فخرج وھو یقول سیھزم الجمع ویولون الدبر بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ بدر کے دن نبی صلعم ایک چھوٹے سے خیمہ میں تھے اور بارگاہ الٰہی میں یوں دعا کر رہے تھے۔ میں تیرے عہد اور تیرے وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں۔ اے اللہ اگر تیری ایسی ہی مشیت ہے (یہ نظر بحالت ظاہر تھا کیونکہ بظاہر مسلمان کفار کے سامنے اتنے تھوڑے اور بے سامان تھے کہ ان کے ہاتھوں ان کا کچلا جانا صاف نظر آتا تھا) تو آج کے دن کے بعد زمین میں تیری پرستش نہیں کی جائے گی۔ ابوبکرؓ نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا یا رسول اللہ بس کیجیے۔ آپ نے اپنے رب پر الحاح کیا ہے۔ آپ نے زرہ پہنی ہوئی تھی پس آپ نکلے اور یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ سیھزم الجمع ویولون الدبر بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر۔ اسی قسم کی اور بہت سی پیشگوئیاں اسی جنگ کے متعلق قرآن کریم میں تھیں۔ پس ایک طرف پیشگوئیوں کا پہلے موجود ہونا دوسری طرف باوجود مسلمانوں کی قلت اور بے سروسامانی اور دشمن کی کثرت اور مسلح ہونے کے کفار کا ہزیمت اٹھانا ان دونوں باتوں نے جنگ بدر کو ایک عظیم الشان نشان بنا دیا تھا۔ تو اب دوسرے مخالفت کرنے والوں کو کہا جاتا ہے کہ اسی نشان پر غور کرو۔

بائبل میں جنگ بدر اور ہجرت کی پیشگوئیاں: اور اہل کتاب یعنی عیسائیوں کے لیے بالخصوص ایک نشان جنگ بدر میں یہ تھا کہ جنگ بدر کی پیشگوئی ان کی کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلعم کی ہجرت اور بدر میں قریش کی طاقت کو کمزور کیا جانے کی پیشگوئی صاف الفاظ میں یسعیاہ نبی کی کتاب میں موجود ہے دیکھو یسعیاہ ۲۱: ۱۳ سے ۱۷ آیت تک

"عرب کی بابت الہامی کلام" "عرب کے صحرا میں تم رات کو کاٹو گے۔ اے ددانیوں کے قافلو۔ پانی لے کے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو روٹی لیکے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو۔ کیونکہ وے تلواروں کے سامنے سے ننگی تلوار سے اور کھینچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں۔ کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا۔ ہنوز ایک برس۔ ہاں مزدور کے سے ایک ٹھیک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔"

اب صاف ظاہر ہے کہ بھاگنے والے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی طرف اشارہ ہے جس میں حضرت ابوبکرؓ آپ کے ساتھ تھے اور درحقیقت ساری تاریخ مقدس میں ایک ہی شخص کے بھاگنے کو یہ عظمت حاصل ہوئی کہ اس سے ایک سنہ چل پڑا۔ پس اس بھاگنے میں آپ کی ہجرت کی طرف اشارہ ہے اور الفاظ "عرب کی بابت الہامی کلام" اس واقعہ کو عرب پر ہی محدود کرتے ہیں۔ اب بھاگنے کے ذکر کے تعلق میں یہ کہا کہ ایک سال کے اندر قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی۔ اور قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے سو ایسا ہی ہوا۔ کہ جنگ بدر کا وقوع جو ہجرت کے ایک سال کے گزر جانے کے بعد ہوا۔ اس میں قیدار کی حشمت جاتی رہی اور ان کے بہادر لوگ گھٹ گئے۔ قیدار کا لفظ بائبل میں بہت مرتبہ بنی اسماعیل کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ پس اہل کتاب کے

فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ⑬

کے لیے اس میں یقینی عبرت ہے۔[۳۸۴]

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ⑭

لوگوں کو نفسانی خواہشوں کی محبّت بھلی معلوم ہوتی ہے (جیسے) عورتیں اور بیٹے اور ڈھیروں ڈھیر سونا اور چاندی اور پلے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی، یہ اس ورلی زندگی کا سامان ہے اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔[۳۸۵]

لیے یہ کھلا کھلا نشان جنگ بدر میں تھا۔

۳۸۴ عبرۃ۔ عَبْر کے اصل معنی ہیں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف تجاوز کرنا۔ اسی سے عُبُور ہے اور اعتبار اور عِبْرۃ سے وہ حالت مراد ہے جس کے ساتھ ایک دیکھی ہوئی چیز کی معرفت سے اس چیز کی معرفت حاصل کی جائے جو دیکھی نہیں گئی (غ)

یرونہم مثلیہم رای العین۔ ان کو ظاہر نظر میں اپنے سے دوچند دیکھتے تھے۔ یعنی مسلمان کفار کو بظاہر اپنے سے دوچند دیکھتے تھے اور سورہ انفال میں ہے واذ یریکموھم اذ التقیتم فی اعینکم قلیلا ویقللکم فی اعینھم اور جب تم میں مٹ بھیڑ ہوئی تو ان کو تمہاری نظر میں کم دکھاتا تھا اور تم کو ان کی نظر میں کم دکھایا۔ ان دونوں بیانات میں کوئی مخالفت نہیں ہے۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ کفار کی کل جمعیت ایک ہزار کے قریب اور مسلمان تین سو کے قریب تھے۔ تو یرونہم مثلیہم سے یہ ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو وہ کوئی چھ سو کے قریب نظر آتے تھے وجہ یہ تھی کہ بقیہ حصّہ پہاڑ کی اوٹ میں تھا اور یہ دوچند دکھانا بے معنی نہ تھا بلکہ اس میں حکمت یہ تھی کہ یہ بھی ارشاد الٰہی ہو چکا تھا فان یکن منکم مائۃ صابرۃ یغلبوا مائتین وان یکن منکم الف یغلبوا الفین باذن اللہ (الانفال۔ ۶۶) کہ اگر تم میں سے ایک سو صابر ہونگے تو دو سو پر غالب آئیں گے۔ اور ایک ہزار تم میں سے ہونگے تو دو ہزار پر غالب آئیں گے۔ تو چونکہ یہ وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو چکا تھا کہ تم دوچند جمعیت پر غالب آؤ گے گو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زیادہ پر غالب نہیں آئیں گے۔ تاہم اس لیے کہ مسلمانوں کے حوصلے مضبوط رہیں اور انہیں یقین کامل رہے کہ ہم دشمن پر غالب آئیں گے ان کو اسی قدر حصّہ دکھایا گیا جو تعداد میں انکی اپنی جمعیت سے دوچند تھا۔ تو اس طرح پر کفار مسلمانوں کو تھوڑے کرکے دکھائے گئے اور مسلمان بھی کفار کو تھوڑے سے دکھائے گئے۔ کیونکہ وہ تو واقعی تھے ہی تھوڑے پس انہوں نے مسلمانوں کو ہیچ سمجھا اور یہ خیال کیا کہ ہم فوراً ان کو نابود کر دیں گے۔ اگر یہ خیال ان کے دلوں میں نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ جنگ کو ٹال دیتے لیکن اللہ تعالیٰ اس میدان میں پیشگوئیوں کے مطابق کفار کی طاقت کو توڑنا چاہتا تھا۔ پس قرآن کریم کی سب آیات ایک دوسری کی مؤید ہیں۔

۳۸۵ شہوات۔ شہوۃ کی جمع ہے اور اس کے اصل معنی نفس کا اس چیز کا اشتیاق ہے جس کا تم ارادہ کرو اور دنیا میں شہوات انسانی دو طرح پر ہیں ایک سچی اور ایک جھوٹی۔ شہوت صادقہ وہ ہے کہ اس خواہش کے پورا ہوئے بغیر بدن میں اختلال واقع ہو۔ اور کاذبہ وہ ہے جو ایسی نہ ہو اور کبھی مُشْتَہٰی کو (یعنی اس چیز کو جس کی خواہش کی گئی ہے) بھی شہوۃ کہا جاتا ہے (غ) اور یہاں مراد مشتہیات ہی ہیں۔

القناطیر المقنطرۃ۔ قناطیر قنطار کی جمع ہے قَنْطَرَۃ جِسْر یعنی پُل کو کہتے ہیں اور بلند عمارت کو بھی کہتے ہیں۔ اور قنطار ایک معیار ہے۔ جس کے متعلق اختلاف ہے۔ کسی نے کہا چالیس اوقیہ سونا ہے کسی نے کہا بارہ سو دینار۔ کسی نے کہا بارہ سو اوقیہ۔ کسی نے کہا سترہ ہزار دینار۔ مگر حق وہ ہے جو ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ عرب قنطار کا وزن نہیں جانتے (ل) اور قَنْطَرَ الرجلُ کے معنے ہیں مال کثیر کا مالک ہُوا (ل) امام راغب کہتے ہیں کہ قناطیر قَنْطَرَۃ کی جمع ہے اور قَنْطَرَۃ اس مال کو کہتے ہیں جس سے انسان کی زندگی گزر جائے گویا پُل پر سے عبور کے لحاظ سے یہ معنی ہیں اور یہ غَیْرُ مَحْدُوْدِ الْقَدْرِ فِیْ نَفْسِہٖ ہے یعنی اس کا اندازہ محدود نہیں بلکہ جس طرح غنا کے لیے کوئی خاص مقدار معین نہیں اسی طرح قنطرۃ ہے اور القناطیر المقنطرۃ کے معنی کیے ہیں المجموعۃ قِنْطَارًا قِنْطَارًا۔

الخیل۔ خَیل کا لفظ اصل میں گھوڑے اور سوار دونوں پر یکجائی حالت میں بولا جاتا ہے (اس کی وجہ راغب نے لفظ خیال سے لی ہے کیونکہ خُیَلَاء متکبر کو کہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بڑھ کر خیال کرتا ہے اور جو شخص گھوڑے پر سوار ہوتا ہے وہ بھی ایسا ہی خیال کرتا ہے) پھر علیحدہ علیحدہ گھوڑے اور سوار دونوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ) اور یہ اسم جمع ہے۔ واحد کے لیے فَرَس بولا جاتا ہے۔

المسوّمۃ۔ سَوْم کے معنی کے لیے دیکھو ۲۷ اونٹ کو چراگاہ میں چھوڑنے پر بھی بولا جاتا ہے اور سَوَّمَہٗ کے معنی اَعْلَمَہٗ بھی آتے ہیں (ح) یعنی میں نے اس پر نشان لگایا۔ پس الخیل المسوّمۃ کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں اَلْمَرْعِیَّۃُ۔ وَالْمُعَلَّمَۃُ یعنی چرنے کے لیے چھوڑے گئے یا پلے ہوئے اور نشان لگائے گئے۔ مجاہد کہتے ہیں الخیل المسومۃ المطھمۃ الحسان (بخاری) یعنی خیل مسومۃ سے مراد موٹے خوبصورت گھوڑے ہیں۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۚ ۱۵

کہہ کیا میں تم کو اس سے اچھی بات بتاؤں، ان لوگوں کے لیے جو تقوٰے اختیار کرتے ہیں ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں رہنے والے ہیں اور پاک ساتھی اور اللہ کی رضامندی ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔[۳۸۶]

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ ۱۶

وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے۔ پس ہمارے گناہ بخش اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔[۳۸۷]

اَلصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۱۷

صبر کرنے والے اور سچ کر دکھانے والے اور فرمانبردار اور خرچ کرنے والے اور صبح کے وقتوں میں استغفار کرنے والے۔[۳۸۸]

الانعام - نَعَم کی جمع ہے اور یہ لفظ اونٹ گائے اور بکری پر بولا جاتا ہے - مگر خصوصیت سے اونٹ پر بولا جاتا ہے - کیونکہ اونٹ ان کے لیے سب سے بڑی نعمت تھی -
ماٰب - اَوْب سے مصدر بھی ہے اور اسم مکان و زمان بھی اور اَوْب رجوع ہے مگر اَوْب صرف اس جاندار پر بولا جاتا ہے جو ارادہ رکھتا ہے اور رجوع عام ہے۔
عیسائیوں کے ساتھ بحث میں دنیا کی محبوب چیزوں کا ذکر بالخصوص کیا ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ یہ قوم دنیا کی مرغوب چیزوں کی محبت میں پڑ کر اللہ کو بالکل بھول جائے گی۔ بالخصوص یہاں ڈھیروں ڈھیر سونے چاندی کا ذکر بتاتا ہے کہ یہ عرب کے لوگوں کا نقشہ نہیں جن کے پاس سونا چاندی اگر ہوگا بھی تو برائے نام اور آیت کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے کہ حسن مآب اللہ کے پاس ہے گویا یہ بتایا ہے کہ مرغوبات دنیا کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا انجام کار مفید نہیں ان سے بیشک فائدہ اٹھائے مگر مدّ نظر خدا کی رضا ہو جیسا اگلی آیت میں کھول دیا۔

ع۳۸۶ رضوان - رضا سے ہے اور رضائے کثیر کو رضوان کہا جاتا ہے (رغ) اور چونکہ سب سے بڑی رضا اللہ کی رضا ہے اس لیے قرآن کریم میں لفظ رضوان رضائے الٰہی سے مخصوص ہے جیسے اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ (الحدید[۵۷]-۲۷) يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (الفتح[۴۸]-۲۹، الحشر[۵۹]-۸) يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ (التوبۃ[۹]-۲۱) اور رضا کو راغب نے دو طرح پر لکھا ہے۔ بندہ کا اللہ سے راضی ہونا اور وہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کی قضا و قدر اس پر وارد ہو اسے بُرا نہ سمجھے اور اللہ کا بندہ سے راضی ہونا کہ اللہ تعالٰی بندے کو اپنے امر پر چلنے والا اور اپنی نہی سے رُکنے والا دیکھے۔
نعمائے جنت۔ خلود۔ ازواج کے متعلق دیکھو ع۳۹ یہاں انہی امور کا ذکر کر کے جن کا ذکر سورہ بقرہ میں کیا تھا۔ آخر پر لفظ رضوان من اللہ اور بڑھا دیئے ہیں اور دوسری جگہ رضوان من اللہ کو جنت کی سب سے بڑی نعمت فرمایا ہے ورضوان من اللہ اکبر (التوبۃ[۹]-۷۲) پس نعمائے جنت میں رضائے الٰہی کو داخل کر کے بتا دیا ہے کہ مومن کی اصل خوشنودی کا سامان رضائے الٰہی ہے اور پھر صحابہؓ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچ کر کہ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہ بتایا کہ نعمائے جنت کا حصول بلکہ اعظم ترین نعمت جنت کا حصول اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔
اس آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ بعض قومیں محض مرغوبات دنیا میں منہمک ہو گئیں یا ہو جائیں گی۔ مگر مرغوبات دنیا میں انہماک کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ ہاں رضائے الٰہی اصل چیز ہے جس کے حصول کے لیے انسان کو پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہی دنیا و آخرت کی سب سے بڑی نعمت ہے واللہ بصیر بالعباد یعنی اللہ بندوں کے عملوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ وہ ان کے اعمال حسنہ پر ان کو جزائے احسن عطا فرماتا ہے۔

ع۳۸۷ یہاں جو دعائے مغفرت ذنوب یعنی کمزوریوں کی حفاظت کی دعا ہے اس میں بالخصوص مراد کمزوریوں کے سرزد ہونے سے حفاظت ہے۔ ایمان لانے سے پچھلے گناہ تو معاف ہو ہی جاتے ہیں۔ پس وہ سب گناہوں سے پاک ہو کر پھر اللہ تعالٰی کے حضور دعا کرتے ہیں کہ آئندہ ان سے کمزوریاں سرزد نہ ہوں۔

ع۳۸۸ الصادقین - صدق اوّلاً قول کے لیے ہی آتا ہے۔ مگر اس کا استعمال لغت میں اور قرآن کریم میں افعال کیلئے بھی کثرت سے ہوا ہے۔ مثلاً صَدَقَ فی القتال کے معنی ہیں۔ جنگ کا حق پورا کیا اور جو کرنا واجب تھا اور جس طرح کرنا واجب تھا اسی طرح کیا اور قرآن کریم میں آتا ہے رجال صدقوا ما عاهدوا اللّٰه عليه (الاحزاب[۳۳]-۲۳) یعنی انہوں نے عہد کو سچ کر دکھایا ان افعال کے ذریعہ سے جو انہوں نے ظاہر کیے (رغ) ایسا ہی لقد صدق اللّٰه رسوله الرؤيا بالحق (الفتح[۴۸]-۲۷) میں صدق بالفعل مراد ہے یعنی سچ کر دکھایا چونکہ یہاں صبر کے بعد صدق کا مرتبہ رکھا ہے اور صبر کے معنی امساک فی ضیق یعنی تنگی کی حالت میں اپنے آپ کو روک رکھنا ہے اس لیے صادقین سے صادق بالفعل یا جو کچھ کہا ہے اس کو سچ کر دکھانیوالے مراد ہیں صبر میں صرف اپنے آپ کو روک رکھنا ہے صدق میں قدم آگے بڑھانا ہے۔
القانتین - قنوت طاعت یعنی فرمانبرداری کو خضوع کے ساتھ لازم کر لینا ہے۔ صبر اور صدق کے ساتھ تیسرا مرتبہ قنوت کا ہے یعنی صبر اور صدق دکھائے۔ مگر ایسی حالت میں کہ اللہ تعالٰی کی فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم کیا ہو اور پھر فرمانبرداری بھی ایسی ہو، جس میں خضوع یعنی عاجزانہ حالت پائی جائے۔ اپنے کیے پر فخر نہ ہو

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٨﴾

اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور فرشتے اور علم والے بھی انصاف پر قائم ہو کر۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں غالب حکمت والا ہے۔[389]

بڑائی نہ ہو۔

المنفقین۔ یہ چوتھا مرتبہ ہے۔ صبر بھی دکھائے صدق بھی۔ فرمانبرداری بھی ہو۔ لیکن جب تک انسان انفاق فی سبیل اللہ نہیں کرتا یعنی اپنے سارے مال کو اپنی ساری طاقتوں کو خدا کی راہ میں لگا نہیں دیتا وہ کسی بڑی کامیابی کا وارث نہیں ہو سکتا۔

المستغفرین دیکھو ع۲۵۸ یہ پانچواں مرتبہ ہے۔ اور چاروں مراتب کے بعد اس کے لانے سے صاف بتا دیا ہے کہ یہ ترقی کے لیے آخری مرتبہ ہے۔ پس اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی حفاظت چاہنے والے ہیں یعنی باوجود صبر اور صدق دکھانے کے باوجود فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم کر لینے کے باوجود اپنے مال اور قویٰ کو خدا کی راہ میں لگا دینے کے اپنے نفس پر کوئی بھروسہ نہیں کرتے۔ بلکہ حفاظت الٰہی کے طالب ہوتے ہیں۔ اور جس قدر زیادہ انسان استغفار کرتا ہے اسی قدر زیادہ وہ حفاظت الٰہی کے ماتحت آتا ہے اور اس لیے ہر قسم کے خطرات سے مامون ہو جاتا ہے۔

الاسحار۔ سَحَر کی جمع ہے اور سَحَر اصل میں آخر شب کے اندھیرے کا دن کی روشنی کے ساتھ مختلط ہو جانے کا نام ہے اور اس وقت کو بھی سَحَر کہتے ہیں (غ) صبح کے وقت استغفار سے مراد بعض نے اس وقت کی نماز کو لیا ہے جیسے کہ قتادہؓ سے روایت ہے (ج) اور بعض نے محض استغفار، مگر نماز میں بھی استغفار ہی ہوتا ہے صبح کے وقت کی خصوصیت کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح کے وقت دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ سحر کا وقت درحقیقت ایسا وقت ہے کہ ایک تو دنیا کے شور و شغف اس وقت کم ہوتے ہیں۔ دوسرے قوائے حیوانی بھی اس وقت کسی قدر کمزور ہوتے ہیں اور اس لیے انسان کی توجہ اور قوائے روحانی کے کمال کا وقت ہوتا ہے آج کل کی عیاشی بھی رات کے دو تین بجے ختم ہو جاتی ہے اور لمبی یا دبائی بیماریوں میں عموماً یہی وقت نزع کا ہوتا ہے جو سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ وقت قوائے حیوانی کی کمزوری کا ہوتا ہے اس لیے اس وقت کو دعائے استغفار کے لیے مخصوص کیا ہے۔ حدیث صحیح میں جس پر صحیحین اور سنن کا اتفاق ہے یہ آتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا ینزل اللّٰہ تبارک وتعالٰی فی کل لیلۃ الی السماء الدنیا حین یبقی ثلث اللیل الاخیر فیقول ھل من سائل فاعطیہ ھل من داع فاستجیب لہ ھل من مستغفر فاغفر لہ یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ ہر رات جب رات کا آخری تیسرا حصہ باقی ہوتا ہے سماء الدنیا پر نزول فرماتا ہے۔ پس فرماتا ہے کیا کوئی سائل ہے میں اس کو دوں گا کیا کوئی دعا کرنے والا ہے میں اس کی دعا قبول کروں گا کیا کوئی مغفرت مانگنے والا ہے میں اس کو اپنی مغفرت میں لے لوں گا۔ اللہ تعالیٰ تو مکان کی قید سے پاک ہے پس اس کے نزول سے مراد بھی اس کی رحمت اور فضل کا خاص جلوہ ہے جس کے لیے کوئی جاذب دل ہونا چاہیئے افسوس کہ مسلمان اب اس قدر غفلت کی نیند سو رہے ہیں کہ اس قبولیت کے وقت سے کوئی فائدہ اٹھانے والا نہیں الّا ماشاء اللہ۔ بلکہ دوسری قوموں کا تتبع کر کے رات کو لغویت یا عیاشی میں گزار کر اس وقت جو جاگنے کا وقت ہے سو جاتے ہیں۔

الصابرین وغیرہ یا تو الذین کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور یا خود نصب علی المدح ہے۔

ع۳۸۹ قسط۔ قِسْط کے معنی عدل یا انصاف کا حصّہ ہیں (اور مراد اس سے انصاف ہے) اور یہی وجہ ہے کہ قَسَطَ کے معنی ہیں اس نے ظلم کیا گویا دوسرے کا حصّہ لے لیا اور اَقْسَطَ کے معنی ہیں اس نے انصاف کیا گویا دوسرے کا حصّہ دیدیا (غ) اسی لیے قَاسِط ظالم کے معنی میں آیا ہے۔ واما القاسطون فکانوا لجھنم حطبا (الجن ۷۲-۱۵) اور مُقْسِط اچھے معنی میں آتا ہے ان اللّٰہ یحب المقسطین (المائدہ ۵-۴۲)

قائما بالقسط کی دو توجیہیں ہو سکتی ہیں۔ جمہور مفسرین نے تو اسے شہد سے حال لیا ہے مگر یہ بھی جائز ہے کہ اولوا العلم سے حال ہو اور تقدیر یوں ہوگی واولوا العلم حال کون کل واحد منھم قائما بالقسط (ر) یعنی اولوا العلم کی گواہی بھی یہی ہے اس حال میں کہ ان میں سے ہر ایک انصاف کے ساتھ کھڑا ہوا۔ میرے نزدیک یہ دوسری وجہ ہی درست ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پر تین قسم کی شہادت پیش کی ہے اوّل خود اللہ تعالیٰ کی شہادت۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اس قول کی شہادت اس کی فعلی کتاب سے ملتی ہے اور اس کے ہاتھ کی نکلی ہوئی چیزیں خود توحید پر دلالت کرتی ہیں۔ دوسری شہادت ملائکہ کی ہے جن کا تعلق پاک فطرت انسانوں سے ہے کیونکہ فطرت انسانی جب گردوپیش کے حالات سے متاثر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی توحید پر گواہی دیتی ہے۔ عموماً تمام لوگ یہاں تک کہ خدا کے منکر بھی مصائب کے وقت میں خدا تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرتے ہیں اور بت پرست اور دوسری قسم کے مشرک جب مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے بتوں کو اور دوسرے شرکاء کو بھول جاتے ہیں اور خالص اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں۔ اور علم والوں کی شہادت درحقیقت دنیا کی الہامی کتابوں کی شہادت ہے کہ وہ سب بھی بہت سی باتوں میں باہم اختلاف رکھتی ہوئی اس بات پر متفق ہیں کہ خدا ہے اور ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولوا العلم کے ساتھ قائما بالقسط کی شرط لگا دی ہے کہ اہل علم اگر انصاف پر قائم ہوں تو وہ بھی یہی گواہی دیں گے۔ یہاں توحید پر ایسی جامع شہادت پیش کرنے کا منشاء یہی ہے کہ عیسائیت پر اتمام حجت کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی گواہی جو اس کی فعلی کتاب قدرت سے ملتی ہے اور ملائکہ کی گواہی جو نیک دل انسانوں کی صحیح فطرت سے ملتی ہے کیونکہ ملائکہ کا ان کے ساتھ

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا
اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ
مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ⑲
فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِىَ لِلّٰهِ وَ
مَنِ اتَّبَعَنِ ۭ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ
اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ
وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ⑳ ع
اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ
النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ
بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ㉑

دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ اور انھوں نے جن کو کتاب دی گئی اختلاف نہیں کیا۔ مگر اس کے پیچھے کہ ان کے پاس علم آچکا ہے آپس کی ضد سے اور جو شخص اللہ کی آیتوں کا انکار کرتا ہے تو اللہ جلد حساب لینے والا ہے ع۳۹۰

پھر اگر تجھ سے جھگڑا کریں تو کہہ دے کہ میں نے اپنی توجہ کو اللہ کی فرمانبرداری میں لگا دیا ہے اور انھوں نے (بھی) جو میرے پیچھے چلتے ہیں اور ان لوگوں کو جنھیں کتاب دی گئی اور اُمیّوں کو کہہ دے کہ کیا تم فرمانبردار ہو؟ پھر اگر وہ فرمانبردار ہو جائیں تو یقیناً انھوں نے راہ پالی اور اگر پھر جائیں تو تجھ پر پہنچانا ہی ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ ۳۹۱

وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور جو ان کو قتل کرتے ہیں جو لوگوں میں سے انصاف کا حکم دیتے ہیں، تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے دے ع۳۹۲

تعلق ہوتا ہے اور اہل علم کی انصاف کے ساتھ شہادت سب اس بات پر متفق ہیں کہ خدا ایک ہے۔ اور تثلیث کی کوئی شہادت ان تینوں ذرائع سے نہیں ملتی یعنی نہ قانونِ قدرت اس پر شاہد ہے، نہ فطرت انسانی اپنی صحیح حالت میں اسکی گواہی دیتی ہے اور نہ ہی دنیا کی الہامی کتابیں یہ شہادت دیتی ہیں حتیٰ کہ مروجہ اناجیل باوجود اپنی تحریفات کے تین خداؤں کی کوئی شہادت نہیں دیتی ہیں پس جب توحید الٰہی پر اس قدر زبردست شہادت موجود ہے اور ان تین ذرائع یعنی قانون قدرت۔ فطرت انسانی اور الہامی کتابوں کی شہادت کے سوا کوئی اور ذریعہ شہادت مسلّمہ فریقین نہیں ہوسکتا تو یہ عیسائی مذہب کے بطلان کی صریح دلیل ہے۔

ع۳۹۰ بغیا۔ بغی کے اصل معنی خواہش ہیں اس لیے بعض نے یہاں بغیا سے مراد لیا ہے طلب الریاسات والملك والسلطان (ج) یعنی ریاست حکومت اور غلبہ کی خواہش سے۔ اور یا اس سے مراد ضد اور حسد ہے۔

جب یہ بتا دیا کہ توحید الٰہی پر ہی تمام شہادتوں کا اتفاق ہے اور دین اسلام ہی وہ دین ہے جس نے توحید خالص کو سکھایا پس اسلام ہی اب سچا دین ہے جس کو قبول کرنے کے سوا کوئی شخص توحید خالص پر قائم نہیں ہوسکتا اور واقعات شہادت دیتے ہیں کہ یہ دعویٰ بالکل سچا ہے۔ ہر مذہب میں توحید کا کسی قدر شرک کے ساتھ اختلاط ہوگیا ہے مگر اسلام کی پاک کتاب نے اگر ایک طرف شرک کے خفی مراتب تک کو بیان کر دیا تو دوسری طرف وہ تعلیم تحریف سے بھی پاک ہے۔

ع۳۹۱ البلاغ۔ بلاغ کے معنی انتہائے مقصد کو پہنچنا بھی ہیں۔ جو بلوغ کے معنی ہیں اور تبلیغ یا پہنچا دینا بھی اس کے معنی ہیں اور یہاں پیغام کا پہنچا دینا ہی مراد ہے۔

آنحضرتؐ کی بعثت اسود واحمر کی طرف: یہاں اہل کتاب اور اُمی دونوں کو خطاب کے لیے حکم دیا ہے اور اس میں درحقیقت کل دنیا آجاتی ہے۔ خواہ اُمی سے مراد مکہ کے لوگ لیے جائیں دیکھو ع۱۰۲ کیونکہ انہی لوگوں کی طرف کوئی رسول نہ آیا تھا باقی کل دنیا کی قوموں کی طرف رسول آچکے تھے۔ پس وہ سب اہل کتاب میں داخل تھے اسی لیے اس آیت کے ماتحت مفسرین نے ان احادیث کو نقل کیا ہے جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعثت الی الاسود والاحمر میں اسود اور احمر کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ بغیر آنحضرت صلعم پر ایمان لانے کے نجات نہیں گو پہلے وہ لوگ کتاب بھی رکھتے ہوں۔ گویا آنحضرت صلعم کا پیغام صرف اُمیوں کے لیے نہ تھا بلکہ اہل کتاب کے لیے بھی تھا۔

ع۳۹۲ بشّر۔ تبشیر۔ خیر اور شر یعنی اچھی اور بُری دونوں خبروں پر بولا جاتا ہے (ل) کیونکہ جس طرح خوشی کی خبر چہرہ (بشرۃ) پر انبساط پیدا کرتی ہے

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ز وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

یہ وہ لوگ ہیں جن کے عمل دنیا اور آخرت میں کام نہ آئے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہ ہوں گے ع۳۹۳

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

کیا تو نے اُن کو نہیں دیکھا، جن کو کتاب کا ایک حصّہ دیا گیا ہے وہ اللہ کی کتاب کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے پھر ایک گروہ ان میں مُنہ موڑتا ہُوا پھر جاتا ہے ع۳۹۴

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ص وَّغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

یہ اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ سوائے گنتی کے دنوں کے ہمیں آگ نہیں چھُوئے گی اور اس بات نے ان کو اُن کے دین میں دھوکا دیا ہے جو وہ افترا کرتے تھے ع۳۹۵

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ قف وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ

پھر کیا حال ہوگا، جب ہم ان کو اس دن اکٹھا کریں گے جس میں کوئی شک نہیں اور ہر ایک جان کو پورا دیا جائے گا، جو

اسی طرح ایک بُری خبر بھی چہرہ پر ایک تغیر پیدا کرتی ہے۔ بعض نے کہا کہ عذاب پر بشیر کا لفظ لانے کا یہ مطلب ہے کہ زیادہ سے زیادہ خوشی کی خبر جو وہ سنیں گے وہ بھی عذاب کی خبر ہے (رغ) بالفاظ دیگر خوشی کی کوئی خبر وہ نہ سنیں گے۔ جیسا شاعر کہتا ہے تَحِيَّةُ بَيْنِهِمْ ضَرْبٌ وَجِيْعٌ۔

نبیوں کا قتل: دکھ کی خبر تو موجود لوگوں کو یا بعد میں آنے والوں کو ہی دی جاسکتی ہے۔ اس لیے یا تو مراد یہ ہے کہ جو لوگ نبیوں کو قتل کرتے تھے اب جو اُن کے نقش قدم پر چل کر مخالفت کرتے ہیں ان کو عذاب کی خبر دے دو۔ اور یا نبیوں کے قتل سے مراد ان کی دعوت کا ابطال ہے یا ایسی مخالفت کہ گویا اپنی طرف سے تو قتل کا پورا سامان کر چکے گو حفاظت الٰہی نے بچا لیا۔ دیکھو ع۹۱۔

ع۳۹۳ حبط عمل پر دیکھو ع۲۷۹ جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے یہاں ان اعمال کے حبط کا ذکر ہے جو آنحضرت صلعم کی مخالفت میں حق کو مٹانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔

ع۳۹۴ نصیب۔ نَصْب سے ہے جس کے معنی وضع ہیں اور نصیب حظ منصوب یعنی معین حصّہ کا نام ہے (رغ)

تحریف بائبل: ان لوگوں سے جن کو کتاب کا ایک حصّہ دیا گیا۔ یہود و نصاریٰ مراد ہیں جن کو کتاب دی گئی مگر وہ اصل کتاب الٰہی ان کے ہاتھوں میں نہ رہی بلکہ صرف اس کا ایک حصّہ موجودہ محرف کتابوں میں باقی رہ گیا۔ قرآن کریم نے اس بیان کے ساتھ کہ اصل کتاب ان کے پاس نہیں بلکہ اس کا صرف ایک حصّہ ہے اپنا منجانب اللہ ہونا ثابت کر دیا ہے۔ اس لیے کہ اس حقیقت پر جو اس وقت دنیا کی نظروں سے مخفی تھی۔ آج تیرہ سو سال بعد روشنی پڑتی ہے اور خود عیسائیوں کو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ توریت و اناجیل میں اصل کتابوں کا صرف ایک حصّہ باقی رہ گیا ہے اس لیے فرمایا کہ وہ کتابیں اب حق کے ساتھ فیصلہ نہیں کر سکتیں کیونکہ حق ان میں بہت کم رہ گیا اور اب ان کو کامل کتاب اللہ قرآن کی طرف بلایا جاتا ہے اور فیصلہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ جو مذہبی اختلافات ان کے درمیان ہیں ان کا فیصلہ کرے کیونکہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے اور آج یہ ثابت شدہ دعویٰ ہے کہ تمام اختلافات مذہبی کا یہ فیصلہ کرتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا وما انزلنا علیك الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ (النحل ۱۶-۶۴) یعنی ہم نے قرآن کو اسی غرض سے اتارا ہے کہ جو اصولی اختلافات مذاہب میں پڑ گئے ہیں ان کا یہ فیصلہ کر دے۔

ع۳۹۵ غَرَّہٗ۔ غَرَّہٗ کے معنی ہیں اُسے دھوکہ دیا اور باطل کے ساتھ اس کو طمع دی (ل) نیز دیکھو ع۵۸۲۔

یفترون۔ فَرْی سے ہے جس کے اصل معنی قطع یا شق کرنے کے ہیں۔ مفردات میں ہے کہ فری ایسے قطع کرنے کو کہتے ہیں جو اصلاح کے لیے ہو اور اِفْرَاء وہ جو افساد کے لیے ہو اور افتراء دونوں میں آتا ہے اور فِرْيَةٌ کذب یعنی جھوٹ کو کہتے ہیں جس سے اِفْتَرٰى بمعنی اِخْتَلَقَ ہے۔ یعنی جھوٹ بنایا۔

دوزخ سے بریت کا دعویٰ: یہی مضمون البقرہ ۲-۸۰ میں ہے مگر یہاں مزید وضاحت موجود ہے کہ عیسائی بھی شامل ہیں کیونکہ یہاں دین کے بارہ میں کسی افترا کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ سب سے بڑا افترا دین کے بارہ میں جو کیا گیا اس کی مرتکب عیسائی قوم ہوئی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ رسول اور نبی کو خدا بنا دیا۔ اس سے اگلی آیت میں جو جواب دیا ہے ووفیت کل نفس ما کسبت وہ بھی عیسائی مذہب کے عقیدۂ کفارہ پر ایک زد ہے کیونکہ کفارہ کی رو سے صرف مسیح کے خون پر ایمان لانے سے ایک شخص نجات پا جاتا ہے۔ مگر اس کے خلاف قرآن کریم یہ اصول سکھاتا ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنے اپنے اعمال کا پورا بدلہ ملے گا۔

لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾
قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾

اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔[396]
کہہ اے اللہ ملک کے مالک تو جسے چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں (سب) بھلائی ہے تو ہر چیز پر قادر ہے۔[397]

ع۳۹۶ فکیف۔ اس دن کے ہول اور عظمت کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے۔ اور مراد ہے کیف تکون حالھم ان کی حالت کیسی ہوگی۔
لیوم سے مراد فی یوم ہے یعنی اس دن یا لجزاء یوم یعنی اس دن کی سزا کے لیے۔

فعل اور اس کی جزا میں اتصال: وفیت کل نفس ما کسبت۔ جو کچھ کسی جی نے کام کیا ہے یا کمائی کی ہے وہی اس کو پورا دیا جائیگا۔ یہاں کام کی جزا دینے کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ خود اس کمائی کا ذکر کیا جو ہر جان کر رہی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے ہر ایک عمل کسی کمائی کا موجب ہے یعنی اس کا کوئی نتیجہ ساتھ ساتھ پیدا ہوتا جاتا ہے اور یہ وہ کمائی ہے جو ہر جان کر رہی ہے اور یہی نتائج پورے کے پورے قیامت کے دن مل جائیں گے۔ روح المعانی میں ہے کہ کمائی کا پورا دیا جانا اس لحاظ سے کہا ہے کہ کسب یعنی کام اور اس کی جزا میں کمال اتصال ہے۔

ع۳۹۷ اللّٰھمّ اصل میں یا اللہ ہے اور یا کی بجائے آخر میں میم مشدد لایا گیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی دعا سے مخصوص ہے۔ بعض کے نزدیک اس کی اصل ترکیب ہے یا اللہ امّنا بخیر۔ اے اللہ ہمارے ساتھ بھلائی کا قصد فرما (غ)۔ یا قرآن کریم میں اللّٰھم سے جس قدر دعائیں آئی ہیں ان میں اللّٰھم کے ساتھ کسی اور صفت الٰہی کا بھی ذکر ہے۔ جیسے یہاں۔ اور اللّٰھم فاطر السمٰوٰت (الزمر ۳۹-۴۶) سبحانك اللّٰھم (یونس ۱۰-۱۰)

الملك۔ مُلك کے معنی ہیں جس شے میں تصرف حاصل ہے حکم کے ساتھ اس کو ضبط میں رکھنا (غ) اور مِلك اس سے بمنزلہ جنس کے ہے یعنی ہر مُلک مِلک ہے مگر ہر مِلک مُلک نہیں۔ اور لسان العرب میں ملک اور ملکوت کے جب اللہ کی طرف مضاف ہوں ایک ہی معنی دیئے ہیں سلطانہ و عظمتہ یعنی اللہ تعالیٰ کا تسلّط اور اس کی عظمت۔ مجاہد نے یہاں صرف نبوت معنی لیے ہیں اور قتادہ نے حکومت اور بادشاہت (ج) اور حق یہ ہے کہ دونوں شامل ہیں۔

تنزع۔ نزع کے معنی ہیں ایک چیز کو اس کی جائے قرار سے کھینچ لیا اور اس کا استعمال اعراض پر بھی ہوتا ہے مثلاً محبت اور عداوت کے نکال دینے پر ونزعنا ما فی صدورھم من غل (الحجر ۱۵-۴۷) اور اسی سے تنازع اور مُنازعۃ ہے ایک دوسرے کو کھینچنا جس سے مراد باہم جھگڑا ہے (غ)

خدا کی بادشاہت: یہاں مسلمانوں کو بتایا ہے کہ دنیا اور آخرت کی بادشاہت سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنی مشیت سے جس کو چاہتا ہے بادشاہت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے اور ان تغیرات پر تاریخ عالم شاہد ہے۔ مگر یہاں لفظ مُلك میں جس کے حقیقی معنی سلطان عظمت ہیں نبوت اور بادشاہت دونوں شامل ہیں اور خاص لفظ ملك کو اختیار کرنے میں یہ حکمت ہے کہ تا یہ معلوم ہو جائے کہ یہ وہی خدا کی بادشاہت ہے جس کی انتظار چلی آتی تھی اور جس کے قرب کی خوشخبری حضرت مسیح علیہ السلام نے دی تھی اور جس کے جلد آنے کے لیے اپنے پیروؤں کو روزانہ دعا میں یہ سکھایا تھا کہ "تیری بادشاہت آوے" (متی ۶: ۱۰) سلسلہ بنی اسرائیل میں بھی یہ خدا کی بادشاہت موجود تھی مگر اس کا اپنے کمال کو پہنچنا محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے مقدر تھا۔ اس لیے خدا کی بادشاہت کا لفظ بالخصوص اسی پر بولا گیا ہے اور ان الفاظ میں یہ خوش خبری مسلمانوں کو سنائی اور دُوسرے یہود و نصاریٰ کو توجہ دلائی کہ خدا کی بادشاہت اب بنی اسرائیل سے نکل کر دوسری قوم کے پاس جانے والی ہے اور یہ اس وعدہ کے مطابق تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کیا تھا اور جس کی خبر تمام نبیوں کے ذریعہ سے دی گئی تھی۔ چنانچہ سلسلہ موسوی کے آخری نبی حضرت مسیح علیہ السلام بھی بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے صاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ "جس پتھر کو معماروں نے ردّ کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا یہ خداوند کی طرف سے ہُوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دیدی جائے گی" (متی ۲۱: ۴۲ و ۴۳) یہ وہی خدا کی بادشاہت تھی جو اب اللہ تعالیٰ کے قدیم وعدے کے مطابق محمد رسول اللہ صلعم کو دی گئی تھی۔

لفظ عزت میں حکومت کی خوشخبری: یہاں علاوہ ملك کے عزت دینے کا ذکر بھی فرمایا ہے جس سے صاف مطلب یہ ہے کہ وہ مغلوب اور محکوم نہیں رہیں گے اور یہ پیشگوئی ملک و حکومت دینے کی اور مسلمانوں کو دنیا میں ایک معزز قوم بنانے کی اس وقت کی جاتی ہے جب ابھی عرب کے اندر مسلمان چاروں طرف کفار میں گھرے ہوئے تھے اور کفار کا ہی غلبہ تھا اور یہودی اور عیسائی اور مشرک سب اس بات پر اتفاق کر چکے تھے کہ اس چھوٹے سے گروہ کو نابود کر دیں۔ پس یہ مسلمانوں کے لیے بطور تسلّی نازل ہوئی اور نہ صرف اس حالت میں ان کی تسلّی کے لیے تھی بلکہ آئندہ بھی یہ ہمیشہ ان کے لیے جب

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (٢٧)

تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور مُردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مُردہ کو نکالتا ہے، اور تو جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے ۳۹۸

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ

مومن مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں ۳۹۹ اور جو ایسا کرے تو اس کا اللہ کے ساتھ کچھ تعلق نہیں

کبھی اسلام اسی قسم کی مشکلات میں مبتلا ہو موجب تسلّی رہے گی۔

۳۹۸ تولج۔ وُلُوج تنگ جگہ میں داخل ہونے کو کہتے ہیں (غ) حتّٰی یلج الجمل فی سم الخیاط (الاعراف۔ ۴۰) اور اِیلاج اس طرح پر داخل کرنا۔ یہاں تاریکی کے روشنی میں اور روشنی کے تاریکی میں داخل کرنے پر یہ لفظ بولا ہے۔

عموماً مُردہ سے زندہ اور زندہ سے مُردہ کے نکالنے سے مراد نطفہ سے جاندار کا اور جاندار سے نطفہ کا پیدا کرنا مراد لیا گیا ہے۔ مگر یہاں مراد یہ نہیں جس کو پچھلی آیت میں بادشاہت کا دینا، معزز بنانا کہا تھا اسی کو یہاں دن اور زندگی قرار دیا ہے اور جس کو وہاں بادشاہت کا لے لینا اور ذلیل کرنا فرمایا تھا اسے یہاں رات اور مردگی سے تعبیر کیا ہے۔ قوموں کی زندگی اور مردگی عزت اور ذلّت یہی چیز ہے۔ انقلابات زمانہ کی طرف توجہ دلائی ہے مسلمان بھی غور کریں اور جو آج برسر حکومت ہیں وہ بھی۔

۳۹۹ دون۔ یقال للقاصر عن الشئ دون یعنی کسی چیز سے پیچھے رہنے والے کے متعلق دُوْن کہا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک وہ دنُوّ سے مقلوب ہے (غ) پس من دُون المؤمنین کے معنی ہوئے مومنوں کو چھوڑ کر یا مومنوں سے پیچھے رہتے ہوئے یا ان کے معاملہ میں کوتاہی کرتے ہوئے۔

موالات کفار: ان الفاظ کے معنی نہایت صاف ہیں مگر قرآن کریم کے پرحکمت کلام کو مدنظر نہ رکھنے سے بڑی بڑی مشکلات پیش آئی ہیں یہاں مومنوں کو کفار کی جس ولایت سے روکا ہے اس کے ساتھ من دون المؤمنین کے لفظ بڑھائے ہیں تو گویا یوں فرمایا کہ مومنوں کو نہیں چاہیئے کہ مومنوں کو چھوڑ کر یا مومنوں کے معاملہ میں پیچھے رہتے ہوئے یعنی ان کے فوائد کو نقصان پہنچاتے ہوئے کفار کی ولایت اختیار کریں ولی اور ولایۃ کے معنی کے لیے دیکھو ۳۳۲ جہاں دکھایا گیا ہے کہ اس کے معنی میں قرب و محبت کے تعلقات کے ساتھ نصرت بھی شامل ہے۔ پس یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ شدید تعلق قرب و محبت و نصرت جو مومنوں کو باہم ہوتا ہے کفار کے ساتھ وہ نہیں ہو سکتا۔ گویا یہاں یہ فرمایا کہ کفار کے ساتھ بھی تم کو معاہدات نصرت وغیرہ کرنے ہوں گے مگر ایسا نہ ہو کہ کفار کے ساتھ تمہارے تعلقات نصرت ایسے ہوں جیسے مومنوں کے ساتھ یا ایسے جن سے مومنوں کو ہی نقصان پہنچے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفار کے ساتھ تعلق یا معاہدہ نصرت ہو سکتا ہے مگر ایسا کوئی معاہدہ جائز نہیں جس میں مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک عظیم الشان سلسلہ اخوت کل اقوام عالم میں قائم کرتا ہے اور تمام قومی اور ملکی تفرقوں کو مٹاتا ہے۔ خدائے عالم الغیب جانتا تھا کہ مسلمان مختلف ملکوں میں رہیں گے ان کے تعلقات مختلف قوموں سے ہوں گے اور غیر مسلم اقوام سے بھی تعلقات اور معاہدات نصرت ہوں گے پس شرط یہ لگا دی کہ کسی دوسری قوم کے ساتھ ایسا تعلق یا معاہدہ نصرت کا نہ ہو جس کی غرض اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو نقصان پہنچانا ہو کیونکہ اس کے بغیر اسلام کی اخوت عالمگیر کا سلسلہ قائم ہی نہ ہو سکتا تھا۔ پس جب مسلمانوں کو حکومت اور بادشاہت کی خوش خبری سنائی تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اصولِ اخوت اسلامی کو کسی حالت میں نہ بھولیں اور کفار کے ساتھ مل کر اپنے ہی بھائیوں کو تباہ نہ کریں۔ اخوت اسلامی کا تعلق تمام تعلقات پر مقدم ہو اور اس کا ذکر بالخصوص ایسے موقعہ پر کرنا جہاں عیسائی مذہب کا ذکر ہو رہا ہے یہ بھی اس کلام کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت ہے۔ گویا بتا دیا کہ عیسائی قوموں کے ساتھ بالخصوص تمہیں یہ معاملہ پیش آنے والا ہے کہ وہ تم سے ایک دوسرے کے خلاف فوائد معاہدے کر کے تمہاری بیخکنی کے درپے ہوں گے اور تمہیں نقصان پہنچائیں گے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی سلطنت شوکت عظمت کو نقصان پہنچنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہوئی ہے کہ وہ غیر قوموں کے ساتھ مل کر اپنے بھائیوں کو نقصان پہنچاتے رہے ہیں اور غیر قوموں بالخصوص عیسائی اقوام نے ہمیشہ اس ہتھیار کو استعمال کر کے مسلمانوں کی قوت و شوکت کو توڑا ہے اسی لیے خدا کے پُرحکمت کلام میں تؤتی الملک کے ساتھ تنزع الملک کا بھی ذکر ہے کہ کیا اب بھی مسلمان سمجھیں گے؟ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ کفار کے ساتھ تعلقات نصرت وغیرہ ہو سکتے ہیں تو یہ خود نبی کریم صلعم اور صحابہ رضؓ کے نمونہ سے ظاہر ہے۔ حبش میں جو مسلمان ہجرت کر کے گئے تھے وہ حبش کے عیسائیوں کی حمایت میں ان کے دشمنوں کے خلاف لڑے نبی کریم صلعم نے کئی مشرک قبائل سے معاہدات کیے اور یہودیوں سے بھی معاہدات کئے جن میں دشمنان اسلام کے مقابلہ میں ان قبائل نے یا غیر جانبدار رہنا منظور کیا اور یا مسلمانوں کو امداد دینا منظور کیا اس شرط پر کہ ان پر حملہ کے وقت مسلمان ان کی امداد کریں۔ جنگ حنین میں مشرکین مسلمانوں کی فوج میں موجود تھے۔ صحابہ کے وقت میں ایران کی جنگوں میں عیسائی فوج مسلمان فوج کے پہلو بہ پہلو لڑی۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام سب غیر مسلموں کے ساتھ یکساں سلوک کا حکم نہیں دیتا۔ اور ترک موالات بھی مدارج

مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۲۸

سوائے اس کے کہ تم ان سے کسی طرح بچاؤ کرو[400] اور اللہ تم کو اپنی سزا سے ڈراتا ہے۔ اور اللہ ہی کی طرف انجام کار پہنچنا ہے[401]

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا

کہہ اگر جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو اللہ اسے جانتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے

رکھتی ہے۔ اس پر اصولی بحث سورہ ممتحنہ میں آئے گی۔

ع۴۰۰ لیس من اللہ فی شیء ۔ من اللہ قائم مقام من ولایۃ اللہ ہے اور فی شیء میں تنوین تحقیر کے لیے ہے۔ یعنی اللہ کی ولایت سے وہ کسی چیز میں نہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کو اللہ کی کچھ ولایت حاصل نہیں۔ یا اللہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

تتقوا منہم تقٰۃ ۔ وقایۃ کے معنی بیان ہو چکے ہیں ایذا اور ضرر کی باتوں سے اپنے آپ کو بچانا ع۱۰ اور یہی معنی تقوٰی کے ہیں جعل النفس فی وقایۃ مما یخاف (رغ) جس سے خوف ہو اس سے اپنی حفاظت کر لیں اور اسی معنی کے لحاظ سے یہاں تتقوا کا صلہ من آیا ہے۔ یعنی ان کی طرف سے کسی نقصان کا خوف ہے تو اس سے تم اپنا بچاؤ کر لو۔ تقٰۃ بھی اسی سے ہے یہ اصل میں وُقَیَۃ تھا و تا سے بدل گئی اور یائے متحرکہ نے الف کی صورت اختیار کر لی۔ پس تقاۃ کے معنی بچاؤ ہوئے اور نکرہ لانے میں یہ بتانا مقصود ہے کہ کسی طرح کا بچاؤ کر لیں۔

مسئلہ تقیہ: مفسرین نے یہاں تتقوا کے معنی تخافوا لیے ہیں اور معنی یوں کیے ہیں کہ کافروں کو کسی صورت میں دوست نہ بناؤ سوائے اس کے کہ ان سے تم کو خوف ہو اس چیز کا جس کا خوف واجب ہے یا کچھ خوف ہو گویا اس صورت میں ان سے ظاہر طور پر دوستی کا تعلق کر لو گو دل میں کچھ نہ ہو اور پھر اس سے مسئلہ تقیہ کو اخذ کیا ہے۔ مگر درحقیقت ان الفاظ کو مسئلہ تقیہ سے کچھ تعلق نہیں۔ قرآن کریم میں اکراہ یا جبر کی حالت میں دوسری جگہ یوں فرمایا ہے الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان (النحل۱۶ - ۱۰۶) یہ مکی آیت ہے اور مفصل بحث اس پر اپنے موقعہ پر ہو گی مگر اس میں صرف اس قدر اجازت دی ہے کہ اگر قتل وغیرہ کے خوف کے وقت انسان کے منہ سے جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر نکل جائے تو اللہ معاف کر دے گا مگر ظاہر طور پر دوستی کا رنگ رکھنا حالانکہ دل میں دشمنی ہو یا بات بات پر جھوٹ بول کر پیچھا چھڑانا اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے یہ زندگی کا منافقانہ رنگ ہے جسے اسلام سخت ترین نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے پس اکراہ کی صورت میں اگر کوئی شخص کوئی بات کہہ دے تو وہ اسے معاف ہے گو یہ اعلیٰ مقام مومن کا نہیں۔

اہل تشیع میں تقیہ: لیکن اہل تشیع نے اس کو بہت وسیع کیا ہے اور ان کے نزدیک بوقتِ ضرورت ہر قول میں تقیہ جائز ہے ظاہر ہے کہ اس طرح جھوٹ پر جرأت ہوتی ہے اور ایک شخص کے کلام سے امن اٹھ جاتا ہے۔ کیونکہ اپنی ضرورت کا فیصلہ کرنے والا وہ خود ہوا دوسرے کو کیا علم ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہے یہ صدق دل سے کہہ رہا ہے یا جھوٹ کہہ رہا ہے اور اس طرح پر منافقت دنیا میں بڑھتی ہے۔ چنانچہ ان کے بعض آئمہ کا ایک یہ بھی قول مشہور ہے کہ من صلی وراء سنی تقیۃ فکانما صلّی وراء نبی (د) یعنی جو شخص سُنّی کے پیچھے تقیہ کر کے نماز پڑھ لے گویا اس نے نبی کے پیچھے نماز پڑھی۔

کفار سے موالات کی ایک صورت: الفاظ الا ان تتقوا منہم تقٰۃ کے معنی صاف ہیں مگر یہ کہ ان سے بچاؤ کر لو کسی طرح کا بچاؤ کر لینا۔ یعنی پورا پورا بچاؤ کر لو۔ گویا کفار سے یہ موالات کی صورت رکھی ہے کہ اس میں تمہارا اپنا بچاؤ مدنظر ہو یعنی کسی بڑے نقصان سے بچنے کے لیے اس کو اختیار کر لینا جائز ہے مثلاً جنگ کی صورت میں ہی جب مسلمان مغلوب ہو جائیں تو مجبوراً اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لیے جو صورت اختیار کرنی پڑے کر لیں۔ مگر جو کچھ عہد کریں اس کی پابندی ضروری ہو گی۔ جیسے نبی کریم صلعم نے صلح حدیبیہ میں مغلوب فریق کی شرائط قبول کیں تو پھر ان کا ایفا بھی کیا یہاں تک کہ کفار نے خود اس عہد کو توڑ دیا۔ ایسا ہی جو کفار جنگ نہیں کرتے مگر ویسے اسلام کے نابود کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان سے بھی مسلمانوں کو بچاؤ کی صورت کر لینی جائز ہے مگر یہ بچاؤ اور حفاظت قومی ہے نہ فرداً فرداً۔

ع۴۰۱ یحذرکم اللہ ۔ حَذَر کسی خوف والے امر سے بچنا ہے (رغ) اسی سے تحذیر ہے۔ نفسہ سے مراد عقاب نفسہ ہی ہے نفس کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے اس سے مراد ذات ہے۔ سزا کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرنے میں سخت تہدید ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو کفار کا خوف ہے تو اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی سزا کا خوف ہونا چاہیئے۔ پس ایسا نہ ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کے حکم کی پروا نہ کرتے ہوئے دشمن سے خوف کرتے ہوئے اس کے ساتھ مل جاؤ۔ اور بعض کے نزدیک نفسہ میں نفس کی اضافت اللہ کی طرف مِلک کی اضافت ہے اور نفس سے مراد انسانی نفس امارہ ہے (رغ) گویا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے نفوس امارہ سے ڈراتا ہے۔

فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾
يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ
مُّحْضَرًا ۚۛ وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ
اَنَّ بَيْنَهَا وَ بَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ
ع اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾
قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ
يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ
وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾

اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ع۴۰۲
جس دن ہر شخص جو کچھ اس نے نیکی کی ہے موجود پائے گا
اور جو کچھ اس نے بدی کی ہے، آرزو کرے گا کہ
اس کے اور اس کے درمیان لمبا فاصلہ ہوتا اور اللہ تم کو اپنی
سزا سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر مہربان ہے ع۴۰۳
کہہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو کہ اللہ تم سے
محبت کرے اور تمہیں تمہارے گناہ بخش دے اور اللہ بخشنے والا
رحم کرنے والا ہے۔ ع۴۰۴

ع۴۰۲ دشمنان اسلام کی مخفی تدابیر: پچھلی آیت میں اعدائے اسلام کا ذکر تھا اور اہل اسلام کو ہدایت کی تھی کہ وہ انہیں اپنا دوست نہ بنائیں اس آیت میں اعدائے اسلام کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ خواہ تم اپنی تدابیر کو جو اسلام کی بیخکنی کے لیے کر رہے ہو۔ اپنے دلوں کے اندر مخفی رکھو اور خواہ ان کو ظاہر کرو یعنی خواہ پوشیدہ طور پر دشمنی کرو یا ظاہر طور پر اللہ تعالیٰ کو سب علم ہے اور وہ کسی تمہاری تدبیر کو کارگر نہ ہونے دیگا۔ بلکہ اس کی سزا تم کو دے گا۔ ہمارے نبی کریم صلعم کا زمانہ تو ایسا تھا کہ اس وقت سب لوگ علی الاعلان ہی دشمن تھے سوائے تھوڑوں کے۔ اس لیے مخفی دشمنی کے ذکر میں اسلام کے آخری زمانہ کے دشمنوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ دوستی کا اظہار کرتے اور ان کی دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ مگر ہر وقت ایسی تدابیر کے سوچنے میں مصروف ہیں جن سے اسلام اور مسلمانوں کی بیخکنی ہو۔ سو یہ آیت مسلمانوں کے لیے باعثِ تسکین ہے کہ ان کا خدا مخفی تدابیر کا بھی وہی حشر کرے گا جو کھلی تدابیر کا کیا تھا۔ اس سورۃ کے صدر کا اصل مضمون اسی نتیجہ کا موید ہے۔

ع۴۰۳ وما عملت من سوء۔ مراد تو یہی ہے کہ جو کچھ بدی کی ہے اسے بھی موجود پائے گا لیکن محضرا کے لفظ کو خیر کے ساتھ رکھا ہے۔ کہ اصل غرض وہی ہے اور بدی کی سزا اتفاقاً ضرورت ہے اور نیز ما عملت من سوء کو اس لیے بھی علیحدہ رکھا گیا ہے کہ اس کے متعلق کسی تمنی کا ذکر اگلے الفاظ میں آتا ہے۔ بینھا میں ضمیر بعض نے یوم کی طرف لی ہے یعنی اس جزا و سزا کے دن میں اور اس میں زمانہ دراز ہوتا مگر چونکہ جو نیک اعمال کی جزا پاتا ہے وہ یہ خواہش نہیں کر سکتا اس لیے ما عملت کی طرف ہی اس کی ضمیر پھیرنا صحیح ہے۔

امد۔ اَمَد اور اَبَد کے معنی قریب قریب ہیں۔ لیکن ابد اس زمانہ کو کہا جاتا ہے جس کے لیے کوئی حد محدود نہیں اور امد اس کو جو جب مطلق ہو تو اس کی حد مجہول ہوتی ہے اور زمان میں اور اَمَد میں یہ فرق ہے کہ اَمَد بلحاظ غایت بولا جاتا ہے (رغ)

اس آیت میں اسلام کے چھپے اور کھلے دونوں قسم کے دشمنوں کو یہ بتایا ہے کہ بدی کرنے والا انسان آخر اپنی بدی پر ضرور پچھتاتا ہے۔ اور ایک وقت آتا ہے جب وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش اس نے وہ بُرا کام نہ کیا ہوتا۔ اس میں فطرت انسانی کی شہادت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ پیشگوئی بھی کی ہے کہ جو لوگ اسلام کے ساتھ بدی کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آخر کار پچھتائیں گے۔ اس میں یہ بشارت بھی ہے کہ وہ انجام کار مسلمان بھی ہوں گے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ اس یوم مذکور کو دنیا کا یوم سمجھا جائے اور کوئی شبہ نہیں کہ اس زندگی میں بھی انسان پر ایک وقت آتا ہے جب وہ اپنی بدیوں پر افسوس کرتا ہے لیکن اگر اس یوم کو یوم قیامت لیا جائے تو آخرت کی جزا و سزا مراد ہو گی اور یہ محض وعید ہو گا۔ بدی اور نیکی کے نتائج پانے کے اس قانون میں الطال کفارہ بھی کیا ہے۔

ع۴۰۴ کفار کے ذکر میں مسلمانوں کو ہدایات: یہ قرآن کریم کا کمال ہے کہ ان تمام آیات میں جن میں کسی خاص قوم سے خطاب ہے ایک طرف اگر ان پر اتمام حجت کرتا چلا جاتا اور لطیف سے لطیف امور کی طرف ان کو توجہ دلاتا ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کو بھی کامل ہدایات دیتا چلا جاتا ہے۔ ان آیات میں جیسا کہ بیان ہو چکا خاص خطاب عیسائیوں سے ہے اور اس لیے ان کو بتایا ہے کہ تم خدا کے محب اور محبوب ہونے کے بڑے دعویدار ہو اور اس بات کے مدعی ہو کہ تمہارا مذہب خدا سے محبت سکھاتا ہے مگر خود مسیح جس کی پیروی سے تم خدا کی محبت کے مقام تک پہنچ سکتے تھے تم کو ہدایت دے گیا ہے کہ تمہاری خدا سے محبت اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ میرے پیچھے آنے والے کو مانو اور اس کی اتباع کرو۔ اور یوں یہاں مسیح کے ان الفاظ کی طرف اشارہ ہے جو یوحنا ۱۴: ۱۵ و ۱۶ میں مذکور ہیں "اگر تم مجھ سے پیار کرتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو اور میں اپنے باپ سے درخواست کرونگا اور وہ تمہیں دوسرا تسلی دینے والا بخشے گا" جس لفظ کے معنی تسلی دینے والا کیے گئے ہیں اس کے معنی شفیع بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ بائبل کے نئے ترجموں کے حواشی پر صاف نوٹ دیا ہوا ہے۔ اب جائے غور ہے کہ یہ دوسرا تسلی دہندہ دوسرا شفیع جو مسیح کے بعد دنیا میں آیا کون ہے؟ عیسائیوں کو حکم تھا کہ جب دوسرا شفیع آجائے تو اس کی اتباع کریں اور اسی بات پر قرآن کریم یہاں ان کو ملزم کرتا ہے۔

قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۳۲﴾
کہہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ پھر جائیں تو اللہ انکار کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۳۳﴾
اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور ابراہیمؑ کے گھرانے اور عمران کے خاندان کو قوموں پر چن لیا۔[۴۰۵]

ذُرِّیَّۃًۢ بَعۡضُہَا مِنۡۢ بَعۡضٍ ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۳۴﴾
(یہ) ایک دوسرے کی نسل سے (تھے) اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔[۴۰۶]

دوسری طرف مسلمانوں کو بھی بتاتا ہے کہ وہ نرے زبانی دعووں سے یا اپنے تجویز کردہ طریقوں سے خدا کے محبوب نہیں بن سکتے بلکہ ضروری ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کے نقش قدم پر چلیں۔ اس بات کو بیان کرنے کی ضرورت اس لیے تھی کہ اس رکوع میں ذکر یہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن قوموں کو پہلے چنا، کس طرح وہ آخر رضائے الٰہی کی راہ سے دور پڑ گئیں۔ اس لیے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ رضائے الٰہی کے مقدم کرنے کو کبھی نہ چھوڑیں اور نہ دنیا کی مرغوبات میں حد سے زیادہ منہمک ہوں تاکہ ان کا حشر دوسری قوموں کی طرح نہ ہو۔

الفاظ یغفر لکم ذنوبکم میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ گناہوں سے حفاظت کفارہ پر ایمان سے نہیں ہوتی۔ بلکہ ان راہوں پر چلنے سے ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والی ہیں اور جن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کامل طور پر دنیا پر ظاہر کیا جیسا کہ خود مسیح نے بھی کہا تھا "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔" پس جب تمام سچائی کی راہیں دکھانے والا ابھی آنا تھا تو کفارہ گناہوں سے کیونکر چھڑا سکتا ہے۔

ع۴۰۵ نوح عربی میں ناح کے معنی ہیں نوحہ کیا۔ رویا۔ اور اس کا مصدر نوح ہے حضرت نوح ایک عظیم الشان نبی گزرے ہیں جن کی پیدائش بائبل والوں نے کوئی تین ہزار سال قبل مسیح بیان کی ہے مگر نئے مفسرین بائبل اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم سے قبل کے واقعات کے متعلق کوئی صحیح تاریخی اندازہ موجود نہیں قرآن کریم سے ایسا قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضرت آدم کے بعد ایک عظیم الشان نبی حضرت نوح ہوئے ہیں۔ جن سے ایک نئے سلسلہ کی بنیاد پڑی۔ لیکن موجودہ نسل انسانی کا حضرت نوح کی اولاد سے ہونا قرآن شریف سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

عمران۔ یہ امر تاریخی طور پر ثابت ہے۔ کہ حضرت موسیٰ کے والد کا نام عمران تھا اور اس لیے موسیٰ اور ہارون سے جو سلسلہ نبوت شروع ہوا وہ آل عمران کے اندر داخل ہوگا۔ گویا آل عمران سلسلہ موسویہ کے قائم مقام ہے۔ مقاتل نے یہاں عمران سے مراد حضرت موسیٰ کے والد کو ہی لیا ہے۔ بہت سے مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ حضرت مریم کے والد کا نام بھی عمران تھا مگر اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ گو اس کے خلاف بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔

حضرت عیسیٰ کے ذکر کی ابتداء: اس آیت سے اس رکوع بلکہ اس سورۃ کا اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ اصل غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصّہ کو صاف کرکے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کو ظاہر کرنا ہے۔ اس قصّہ کو شروع کرنے کے لیے ابتدا یوں کی ہے کہ عیسیٰ خدا کا ایک ہی برگزیدہ بندہ نہیں بلکہ جب سے نسل انسانی کی ابتدا ہوئی اسی وقت سے اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو برگزیدہ کرتا رہا ہے۔ حضرت آدم ان کے بعد ان کی نسل سے حضرت نوح جنہوں نے ایک نئے سلسلہ کی بنیاد رکھی پھر آل ابراہیم اور آل عمران جو آل ابراہیم کی ایک شاخ ہے اور اس آل عمران یعنی سلسلہ موسویہ کے بہت سے انبیاء میں سے ایک حضرت عیسیٰ ہیں۔ آل ابراہیم کے بعد آل عمران کا ذکر کرکے یہ اشارہ کیا ہے کہ آل ابراہیم کا دوسرا عظیم الشان سلسلہ، سلسلۂ محمدیہ ہے جیسا کہ بالتفصیل آگے آئے گا۔ آدم سے شروع کرنے میں اور پھر قومی نبیوں کا ذکر کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح آدم اول کا پیغام بتقاضائے ضرورت تمام نبیوں سے ایک الگ رنگ رکھتا تھا۔ اسی طرح آدم آخر یعنی محمد رسول اللہ صلعم کا پیغام بھی بتقاضائے ضرورت تمام نبیوں سے الگ رنگ کا ہونا ضروری تھا۔ اور جس طرح پہلے آدم کا پیغام اس کی ساری ذریت کی طرف تھا گو وہ محدود ہو، کیونکہ یہ موجودہ نسل انسانی کی ابتدا تھی اور حضرت آدم اپنی ہی ذریت کی طرف مبعوث ہوئے اسی طرح آدم آخر کا پیغام ساری نسل آدم یعنی نسل انسانی کی طرف ہوا۔ گو وہ اسی وجہ سے سب سے زیادہ وسیع ہو گیا۔ کیونکہ آدم آخر کے وقت نسل انسانی تمام روئے زمین پر پھیل چکی تھی۔ آدم اور حضرت نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا پیغام تمام نسل انسانی کی طرف تھا۔ اور درمیان میں جس قدر نبی ہوئے ہیں ان کا پیغام ایک ایک قوم کی طرف تھا۔

تمام جہانوں پر چن لینے سے یہ مراد ہے کہ اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں یا قوموں پر ان کو چنا۔ کل دُنیا لازمی طور پر مراد نہیں۔ کیونکہ کل دنیا پر اصطفا کے لیے صرف ایک کا ذکر چاہیئے تھا۔ بہتوں کا ذکر بتاتا ہے کہ اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں پر ہی اصطفا مراد ہے۔

ع۴۰۶ ذریۃ۔ یہ بدل ہے۔ آل ابراہیم اور آل عمران سے یا حال ہے۔ اس لیے منصوب ہے۔

بعضھا من بعض۔ مراد ایک دوسرے کی نسل سے ہونا ہے۔ یعنی آل عمران آل ابراہیم کی نسل ہے یا آل ابراہیم نوح کی نسل سے ہے۔ اور بعض کے نزدیک بعضھا من بعض سے اشارہ اتحاد نسل کی طرف نہیں بلکہ ایک اور قسم کی یگانگت کی طرف ہے جو دین سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ قتادہ سے مروی ہے۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾

جب عمران کی ایک عورت نے کہا[۴۰۷] میرے رب جو کچھ میرے پیٹ میں ہے میں نے آزاد کر کے تیری نذر مانا ہے پس مجھ سے قبول فرما کیونکہ تو سننے والا جاننے والا ہے[۴۰۸]

اللہ تعالیٰ کی صفات سمع و علم کے آخر لانے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی دعاؤں کو سنتا اور پھر جانتا ہے کہ کون شخص کس بلند مقام پر کھڑا کیا جانے کے لائق ہے۔

ع۴۰۷ امراۃ عمران۔ امرأۃ عمران کے معنی دونوں طرح پر ہو سکتے ہیں۔ عمران کی بی بی (اس صورت میں عمران مریم کے والد کا نام ہوا اور بزرگوں کے ناموں پر نام رکھنا یہ ایک عام رواج تھا) یا آل عمران کی عورت۔ چونکہ اوپر آل عمران کی برگزیدگی کا ذکر تھا اور اسی کے متعلق مضمون چلتا ہے اس لیے اس دوسرے معنی کو ترجیح ہے۔ اور عمران کا آلِ عمران کی جگہ رکھا جانا عام محاورہ کے مطابق ہے چنانچہ بائبل میں بھی ایک بڑے مورث کے نام سے ایک قوم کو پکارا گیا ہے جیسا بنی اسرائیل کی جگہ بہت دفعہ صرف اسرائیل ہی آیا ہے اور بنی اسمٰعیل کو قیدار کے نام سے پکارا ہے جو عربوں کے مورث اعلیٰ تھے۔ پس اس لحاظ سے قرین قیاس یہی ہے کہ عمران سے مراد سلسلہ آل عمران ہے اور یہاں ذکر انہی میں سے ایک عورت کا ہے اور چونکہ اوپر آل عمران کے اصطفا کا ذکر ہے جو عام ہے یہاں ان میں کی ایک خاص عورت کا ذکر فرمایا جس کے ذریعہ آل عمران کے آخری برگزیدہ انسان کا ظہور ہونا تھا۔ ایک دوسری مثال جو اسی ذکر کے اندر آئے گی وہ بھی آل عمران کی آخری یادگاروں یعنی زکریا اور یحییٰ علیہما السلام کے متعلق ہے یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ مریم کو اخت ھارون (مریم[19] - ۲۸) اور ابنت عمران (التحریم[66] - ۱۲) کر کے پکارا گیا ہے اور گو بعض مفسرین نے ان دونوں ناموں عمران اور ہارون کی یہ توجیہ کی ہے کہ عمران حضرت مریم کے والد کا نام تھا اور ہارون آپ کے ایک بھائی کا نام تھا۔ اور اس کے خلاف شہادت نہ ہونے کی وجہ سے یہ بات بھی قابل قبول ہے۔ لیکن چونکہ اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ اور جس عمران کا اوپر ذکر کیا اس سے صاف طور پر مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ہیں۔ اور ہارون جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ بھی اسی عمران کے بیٹے ہیں۔ اسی لیے اقرب الی الفہم یہی بات ہے کہ امرأۃ عمران اور اخت ھارون دونوں لفظوں میں انہیں اعلیٰ مورثوں کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام کا کوئی نسب نامہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ مگر یہ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ مریم کے والدین کا تعلق بنی اسرائیل میں خاندان کہانت سے تھا۔ اور اسی خاندان سے حضرت زکریا کا بھی تعلق تھا اور مریم کا ہیکل کی خدمت کے لیے مخصوص کیا جانا بھی اسی بات کو ظاہر کرتا ہے۔ اور چونکہ کہانت کا تعلق حضرت ہارون کے خاندان سے تھا اس لیے مریم کو اُخت ہارون اور اس کی والدہ کو امراۃ عمران کے نام سے پکارا ہے عربی زبان میں لفظ اب۔ ام۔ اخ۔ اخت سب کے سب وسیع معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ نبی کریم صلعم فرماتے ہیں انا دعوۃ ابی ابراھیم میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔ یہاں ابراہیم کو صاف طور پر اپنا اَب کہا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت صفیہؓ نے شکایت کی کہ مجھے یہودی عورت کہا جاتا ہے تو آپ نے فرمایا تو نے جواب میں یوں کیوں نہیں کہا ان ابی ھارون وعمی موسٰی وزوجی محمدؐ میرا باپ ہارون ہے اور میرا چچا موسیٰ ہے اور میرا خاوند محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ یہاں صفیہؓ کا باپ اور چچا ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کو قرار دیا ہے اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ ایک ہی جملہ میں زوج تو اپنے حقیقی معنوں پر ہے اور اَب اور عَم دُور کے تعلق والوں پر بولے ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ عمران اور ہارون کے لفظوں سے وہی عمران اور ہارون مراد نہ لیے جائیں اور امرأۃ اور اُخت کے وسیع معنی نہ لیے جائیں۔

ع۴۰۸ محررا۔ تحریر کے معنی انسان کا حُرّ کر دینا (غ) اور مفردات میں ہے کہ انسان حُرّ دو طرح پر ہوتا ہے ایک وہ جس پر کسی شے کا حکم جاری نہ ہو۔ جیسے الحر بالحر یعنی جسمانی طور پر آزاد۔ اور دوسرا اخلاقی طور پر آزاد ومن لم تتملکہ الصفاتُ الذمیمۃ من الحرص والشَّرَہِ علی المقتنیات الدُّنیویّۃِ (غ) یعنی وہ شخص جس پر بری صفات حکمران نہیں۔ جیسے دنیوی مال و دولت پر حرص اور لالچ۔ راغب کے نزدیک محررا سے مراد اسی قسم کی صفات ذمیمہ سے آزادی ہے جیسا کہ اس کے مقابل پر کسی شخص کو عبد الدرھم کہہ دیتے ہیں۔ یا عبد الشھوۃ کہہ دیتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک محرر سے مراد صرف اس قدر ہے کہ وہ اس سے دنیوی نفع نہ اُٹھائے گی، بلکہ اس کو عبادت الٰہی کے لیے مخصوص کیا جائیگا۔ اس لیے شعبی نے اس کے معنی مُخلَص کیے ہیں۔ مجاہد نے خادماً للبِیْعَۃِ کیے ہیں یعنی عبادتگاہ کی خادم اور بعض نے امر دنیا سے آزاد اس کے معنی کیے ہیں (غ) بظاہر ان سب کا ماحصل ایک ہی ہے یعنی اس کو خدمت دین کے لیے وقف کر دیا جائے گا۔

اولاد کو خدمتِ دین کے لیے وقف کرنا: گزشتہ قصّے تو سب مسلمانوں کی عبرت کے لیے بیان ہوئے ہیں۔ اس بیان میں یہ اشارہ ہے کہ بنی اسرائیل کی اس گئی گزری حالت میں ان کے اندر ایسے لوگ ابھی موجود تھے جو محض خدمت دین الٰہی کے لیے اپنی اولاد کو وقف کر دیتے تھے اور درحقیقت کوئی دین قائم نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کے اندر وہ لوگ موجود نہ ہوں جو اپنی زندگیوں کو دین کے لیے وقف کر دیں۔ کاش مسلمان آج اس سے سبق حاصل کریں اور ان میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو اپنی اولاد کو خدمت دین کے لیے وقف کر دیں اور بچپن سے ان کو خدمت دین کے لیے تیار کریں۔ مگر یہاں تو عربی پڑھانے سے بھی بھاگتے ہیں اس لیے کہ بی اے میں روٹیاں اچھی مل جاتی ہیں۔ رونے کا مقام ہے کہ اس قوم کی نظر اس قدر تنگ ہو جائے جس کے اصول دین میں آخرت پر ایمان تھا۔ مگر مسلمان یاد رکھیں کہ گو وہ ساری دنیا

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

پھر جب اسے جنا، کہا میرے رب میں نے یہ لڑکی جنی ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے جو اس نے جنا، اور لڑکا اس لڑکی کی طرح نہیں[۴۰۹]۔ اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی نسل کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں[۴۱۰]۔

کے بادشاہ بھی پھر بن جائیں مگر دینِ اسلام کی شوکت وعظمت دنیا میں قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان میں وہ لوگ کثرت سے نہ ہوں جو خدا کے دین کے لیے اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

ع۴۰۹ عورتیں بھی خدمتِ دین کر سکتی ہیں: واللہ اعلم بما وضعت جملہ معترضہ ہے۔ جب مریم کی والدہ نے بچہ جنا اور اس بچہ کو اس نے خدمتِ دین کے لیے وقف کرنے کی نذر مانی ہوئی تھی تو اس نے تعجب سے کہا کہ میں نے تو ایک لڑکی جنی ہے! اللہ تعالیٰ نے ایک جملہ میں بتایا کہ لڑکی بھی اس خدمت کو ادا کر سکتی ہے جس کے لیے اس نے لڑکے کو وقف کرنا چاہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے علم کے ذکر سے یہ مقصود ہے کہ اس بات پر تعجب نہ کرو کہ یہ خدمتِ دین کیونکر کر سکے گی۔ اللہ اس کے مقامِ عظمت سے خوب واقف ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ جو مریم کی والدہ نے نذر مانی ہے اس کو یہ لڑکی بھی پورا کر سکتی ہے۔

ولیس الذکر کالانثیٰ۔ یہ دوسرا جملہ معترضہ ہے اور الذکر اور الانثیٰ میں لام عہد کا ہے یعنی وہ لڑکا جسے تو چاہتی تھی اس لڑکی جیسا نہیں وہ تو صرف ایسا لڑکا چاہتی تھی جس کی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف ہو اور یہ ایک معمولی خواہش تھی کہ اس کے ہاں خادم دین لڑکا ہو اور خادم دین لڑکے ہر حیثیت کے ہو سکتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے ایک بہت بلند مرتبہ کی لڑکی عطا فرمائی جسے اس زمانہ کی ساری عورتوں پر بلند درجہ دیا جیسے واصطفاكِ علٰی نسآءِ العالمین سے ظاہر ہے۔

بعض مفسرین نے اسے جملہ معترضہ قرار دینے کے بجائے مریم کی والدہ کا قول قرار دیا ہے اور مراد یہ لی ہے کہ لڑکے لڑکیوں جیسے نہیں ہوتے یعنی ال جنس کا لیا ہے جو کچھ کام لڑکا کر سکتا ہے وہ لڑکی نہیں کر سکتی۔

ع۴۱۰ اعیذ۔ عَوْذ کے معنی ہیں کسی دوسرے کی طرف پناہ چاہنا اور اس کے ساتھ تعلق (رغ) پس اعاذ کے معنی ہوئے اس کی پناہ میں دیا۔

رجیم۔ رَجم کے اصل معنی الرَّمْیُ بالرجام ہیں (رغ) یعنی کنکروں کے ساتھ مارنا مگر بطور استعارہ یہ لفظ رمی بالظن پر یعنی ظنون کے پھینکنے پر اور توہم پر اور شتم یعنی گالی دینے پر اور طرد یعنی دھتکارنے یا دور کرنے پر بولا جاتا ہے اور الشیطان الرّجیم میں الرجیم کے معنی ہیں بھلائی سے اور ملاءِ اعلیٰ کے منازل سے دُور کیا گیا (رغ)

مریم کا بیاہا جانا اور صاحب اولاد ہونا: حضرت مریم کی والدہ کی اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ مریم کو باوجود ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کرنے کے ان کا یہ منشا نہ تھا کہ وہ کنواری رہے گی بلکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ جوان ہو کر بیاہی جائیگی اور صاحب اولاد ہو گی اس لیے انھوں نے نہ صرف مریم کے لیے دعا کی بلکہ مریم کی اولاد کے لیے بھی۔ رہبانیت یا تارک دنیا ہونے کا طریق عیسائیوں کی ایجاد ہے۔

حدیث مَسّ شیطان: اس آیت کی تفسیر میں بخاری میں ہے عن ابی ھریرۃ ان النّبیّ صلعم قال ما مِنْ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ اِلَّا والشَّیْطٰنُ یَمَسُّہٗ حِیْنَ یُوْلَدُ فَیَسْتَھِلُّ صَارِخًا من مَسِّ الشیطانِ اِیَّاہُ اِلَّا مَرْیَمَ وابنھا۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر کہ شیطان اسے چھوتا ہے جب وہ پیدا ہوتا ہے۔ پس وہ شیطان کے اس کو چھونے سے فریاد کرتا ہوا آواز بلند کرتا ہے سوائے مریم اور اس کے بیٹے کے۔ اس کے بعد آتا ہے کہ ابوہریرہؓ کہا کرتے تھے کہ اگر چاہو تو پڑھو انی اعیذ ھا بك وذریتھا من الشیطان الرّجیم گویا یہ حدیث ان کے نزدیک اسی آیت کی تفسیر ہے۔

بظاہر جو کچھ اس حدیث کا منشاء معلوم ہوتا ہے یعنی یہ کہ تمام بنی آدم کو پیدائش کے وقت شیطان چھوتا ہے سوائے مریم اور اس کے بیٹے کے۔ یہ بوجوہات قطعیۃ الدلالت باطل ہے۔ اوّل آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ نے جو مریم اور اس کی ذریت کے لیے شیطان سے پناہ مانگی ہے وہ مریم کے پیدا ہونے کے بعد بلکہ اس کا نام بھی رکھنے کے بعد مانگی ہے اور ظاہر ہے کہ نام کبھی بچہ کے فوراً پیدا ہوتے نہیں رکھا جاتا اور حدیث جسے اس کی تفسیر قرار دیا جاتا ہے اس میں یہ ہے کہ ہر بچہ کو پیدا ہوتے ہی شیطان مس کرتا ہے پس یا اس اعاذہ کو اس مس شیطانی سے کوئی تعلق نہیں جس کا ذکر حدیث میں ہے ورنہ جب مس شیطانی کا وقت ہی گزر چکا تو پھر دعا کرنے کا کیا فائدہ تھا اور یا حدیث اس آیت کی تفسیر نہیں بلکہ حدیث کا ظاہری مفہوم آیت کے خلاف ہے۔

دوم۔ اگر بچہ کا پیدا ہوتے ہی رونا مس شیطانی کا نتیجہ ہوتا ہے تو پانچ منٹ بعد رونا کس بات کا نتیجہ ہے یا کیا حضرت مریم اور حضرت مسیح بچپن میں کبھی روئے ہی نہیں۔ اگر بچپن میں کبھی نہ روئے تھے تو بڑے ہو کر کیوں رونے تھے۔ حضرت مسیح کے متعلق تو صاف لکھا ہے کہ وہ رو رو کر دعائیں کرتا تھا اور حضرت مریم کا دردِ زہ کے وقت یٰلیتنی متّ قبل ھذا کہنا بتاتا ہے کہ اس وقت وہ بھی روئی ہو نگی۔ جن وجوہات سے تمام بچے بعد میں روتے ہیں انہی میں سے کسی وجہ سے پیدا ہوتے ہی روتے ہیں اور حضرت مریم اور ان کا بیٹا بچپن کے ایام میں اسی طرح روتے تھے۔ جس طرح دوسرے بچے روتے ہیں ورنہ وہ بڑے ہو کر کیوں روتے۔ سوم۔ شیطان کا چھونا دو معنوں میں آتا ہے۔ ایک کسی تکلیف کے پہنچانے کے معنی میں جیسے انی مسنی الشیطان بنصب وعذاب

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا سو اس کے رب نے اس کو اچھی قبولیت سے قبول کیا اور

(ق۳۸-۴۱) اس معنی میں حضرت مسیح کو بھی دکھ پہنچا جب یہودیوں نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں اور آخر صلیب پر چڑھایا اور دوسرے وسوسہ ڈالنے کے معنی میں جیسے اذا مسہم طائف من الشیطن تذکروا (الاعراف۷-۲۰۱) مگر بچہ کے دل میں عین پیدائش کے وقت شیطان کا وسوسہ ڈالنا بے معنی بات ہے۔ شیطانی وساوس کا تعلّق سن تمیز سے ہے جس کو ہوش ہی نہیں اس کے دل میں شیطان کیا وسوسہ ڈالیگا۔ چہارم قرآن شریف اور حدیث صحیح کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر بچّہ پیدائش کے وقت معصوم پیدا ہوتا ہے قرآن کریم میں ہے فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا (الروم۳۰-۳۰) یعنی اللہ تعالےٰ نے سب لوگوں کو فطرت صحیح پر پیدا کیا ہے اور حدیث میں اسی کی تفسیر میں ہے ما من مولود یولد الا علی الفطرۃ کوئی بچہ نہیں مگر صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور یہ بات اصول اسلام میں داخل ہے کہ ہر بچّہ معصوم پیدا ہوتا ہے پس وہی مذہب یہ تعلیم نہیں دے سکتا کہ ہر بچہ کو پیدائش کے وقت شیطان چھوجاتا ہے۔

احادیث میں یحییٰ کا گنہگار ہونے سے استثناء: سوال ہوگا کہ کیا یہ حدیث صحیح نہیں بلاشبہ اس کے وہ معنی صحیح نہیں جو پادری صاحبان لیتے ہیں کہ اس سے تمام انبیاء کا سوائے مریم اور ابن مریم کے گنہگار ہونا لازم آتا ہے۔ گنہگار نہ ہونے کے بارہ میں تو اس سے زیادہ صریح الفاظ اور موجود ہیں ایک حدیث میں ہے ما من عبد یلقی اللہ الا ذا ذنب الا یحیی بن زکریا (ث) کوئی بندہ نہیں مگر وہ خدا کو گنہگار ہونے کی حالت میں ملے گا سوائے یحییٰ بن زکریا کے اور اسی کی روایت حضرت ابوہریرہ سے یوں ہے کل ابن اٰدم یلقی اللہ بذنب یعذبہ علیہ ان شاء او یرحمہ الا یحیی بن زکریا (ث)

یحییٰ۔ مریم۔ ابن مریم کا ذکر بطور مثال: ان احادیث کی رو سے تو مریم اور ابن مریم دونوں ذا ذنب قرار پاتے ہیں۔ مگر نہیں ایسی احادیث میں صرف ان لوگوں کی پاکیزگی پر زور دینا مقصود ہوتا ہے جن پر جھوٹے الزامات لگائے گئے ہوں اور جس طرح یحییٰ سے مراد صرف حضرت یحییٰ نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو اس زمرہ صالحین میں داخل ہے جن میں سے یحییٰ ایک ہے مراد ہے اسی طرح مریم اور اس کے بیٹے سے بھی ہر وہ شخص مراد ہے جو مریم صفت ہے اور جو ابن مریم والے زمرۂ صلحا میں داخل ہے۔ اور یحییٰ اور مریم اور ابن مریم یہاں سب بطور مثال ہیں اور ان کے ناموں کا انتخاب اس لیے ہُوا کہ ان پر بہت سخت الزام لگائے گئے اور زمرۂ صلحا میں یہی لوگ آنحضرت صلعم سے قریب تر تھے۔

حدیث مسّ شیطان کا اصل مفہوم: اگر حدیث کے الفاظ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ واقعی وہی توجیہ درست ہے جو اوپر کی گئی کہ مریم وغیرہ یہاں صفاتی نام ہیں اور بطور مثال رکھے گئے ہیں اصل میں حدیث میں بچّہ کے رونے کا ذکر نہیں بلکہ بڑے آدمی کے فریاد رسی کے طور پر آواز بلند کرنے کا ذکر ہے اور مدد مانگنے کا ذکر ہے چنانچہ استہلال کے معنی رونا نہیں بلکہ آواز بلند کرنا ہے جس طرح رویت ہلال کے وقت آوازیں بلند کی جاتی ہیں تاکہ لوگوں کو خبر ہو جائے اسی سے اہلال ہے اور صارخ کے معنی بھی رونے والا نہیں بلکہ بالاتفاق صارخ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو مدد کے لیے کسی کے پاس فریاد لے جائے یعنی مستغیث کو (ل) اور صَرَخَ فُلَانٌ کے معنی ہیں استغاث فقال واغوثاہ اس نے فریاد کی اور کہا کوئی میری مدد کے لیے پہنچے اور قرآن کریم میں ہے فلا صریخ لہم (یس۳۶-۴۳) جہاں صریخ کے معنی فریادرس یا مددگار ہیں نہ رونے والا۔ پس مسِّ شیطان کا جو نتیجہ لکھا ہے فیستہل صارخا تو وہ صرف اس قدر ہے کہ وہ شخص جس کو شیطان چھوتا ہے وہ فریاد کرتا ہوا آواز بلند کرتا ہے پس یولد سے مراد یہاں بچّہ کا پیدا ہونا نہیں بلکہ انسان کی پیدائش روحانی ہے یا گناہ کا احساس اس کے اندر پیدا ہونا۔ اور اس پیدائش روحانی کو دو قسم پر تقسیم کیا ہے ایک وہ لوگ جو مریم صفت ہیں اور ان کو شیطان چھوتا بھی نہیں یعنی وسوسہ اندازی نہیں کر سکتا۔ اور دوسرے وہ لوگ جن کو شیطان چھوتا ہے۔ پھر وہ خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں تو آخرکار شیطان پر غالب آجاتے ہیں اور یہ صرف اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتا بلکہ خود قرآن کریم نے اس کو بتصریح بیان فرمایا ہے وضرب اللہ مثلا للذین منوا امرأت فرعون اذ قالت رب ابن لی عندک بیتا فی الجنّۃ ونجّنی من فرعون وعملہ ونجنی من القوم الظالمین ○ ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجہا فنفخنا فیہ من روحنا وصدّقت بکلمٰت ربّہا وکتبہ وکانت من القانتین (التحریم۶۶-۱۱ و۱۲) یہاں مومنوں کی مثال دو عورتوں سے دی ہے اوّل فرعون کی بی بی۔ دوسرے مریم۔ اول کی صفت میں بیان فرمایا کہ ان کے دلوں میں یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے معلوم ہوا کہ ان لوگوں پر شیطان اپنی وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے مگر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے اور بار بار تڑپ تڑپ کر اس کی طرف آتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ تو ہم کو فرعون سے نجات دے۔ اسی کے مطابق حدیث میں ہے فیستہل صارخا مومن پر جب شیطان حملہ کرتا ہے تو وہ خدا کی طرف فریاد لے جاتا ہے اور خدا سے مدد چاہتا ہے یہ اس کی روحانی پیدائش ہے۔ اور دوسرے کی صفت میں بیان فرمایا کہ وہ مریم صفت ہیں التی احصنت فرجہا۔ فرج کے معنی مواقع مخافت ہیں یعنی انہوں نے ان تمام راہوں کو مضبوط کر لیا ہوتا ہے جن سے شیطان حملہ آور ہو سکتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو محفوظیت کے مقام پر پہنچ چکے ہیں جس کو انبیاء میں مقام عصمت کہا جاتا ہے اور حدیث گویا انہی روایتوں کی تفسیر ہے نہ آیت اعیذ ھابک کی جس کے ساتھ اس کا کچھ تعلّق نہیں پس جس طرح آیت قرآنی میں مریم صفت مومنوں کا ذکر ہے اسی طرح حدیث میں مریم کا نام لیکر مریم صفت مومنوں کا ذکر کیا اور یہی وجہ ہے کہ مریم کے ذکر کو مقدم کیا کہ وہی اصل مقصود ہے اور ابنہا یعنی ابن مریم کو پیچھے رکھا ہے کہ وہ بطور نتیجہ ہے۔ کیونکہ جب مومن بھی اس محفوظیت کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو پھر انبیاء بدرجہ اولیٰ اس مقام پر ہیں اگر ابن مریم کی کوئی بڑائی مقصود ہوتی تو حضرت عیسٰی کا نام پہلے لیا جاتا۔ یہی اصل توجیہ اس حدیث کی ہے جو اس کو قرآن اور حدیث اور واقعات کے مطابق ٹھہراتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اصل اصول مذہب کے قرآن شریف سے لیے جاتے ہیں اور احادیث کو قرآن کریم کے ماتحت کیا جاتا ہے کیونکہ احادیث میں اکثر روایت بالمعنی ہے اور لفظوں میں کمی بیشی ہے پس حین یولد کے لفظ کے معنی اگر ولادت

نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ
عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ
قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ
يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣٧﴾

اس کو عمدہ پرورش سے بڑھایا اور اسے زکریا کے سپرد کیا ع۴۱۱ جب
کبھی زکریا اس کے پاس عبادت گاہ میں آتے اس کے پاس رزق پاتے
کہا اے مریم یہ تجھے کہاں سے ملا، اس نے کہا یہ اللہ کی طرف سے
ہے۔ بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب
رزق دیتا ہے ع۴۱۲

روحانی نہ کیے جائیں تو ان الفاظ کو زائد کہنا پڑے گا۔ جو کسی راوی کی غلطی سے داخل ہو گئے۔

ع۴۱۱ تقبّلها ربّها بقبول حسن۔ تقبل کے معنی کے لیے دیکھو ۱۶۳ تقبل کے بعد قبول کے لانے میں راغب لکھتے ہیں حکمت یہ ہے کہ تقبل میں اقتضائے ثواب ہے اور قبول میں اقتضائے رضائے الٰہی ۔

انبتها نباتا۔ نبت اور نبات اصل میں نامیات یعنی بڑھنے والی چیزوں میں سے وہ ہے جو زمین سے اُگتی ہے اور خاص استعمال اس کا ان اشیاء میں ہوتا ہے جن کی ساق یعنی تنہ نہ ہو پھر اس کا استعمال ہر بڑھنے والی شے پر ہوتا ہے خواہ وہ سبزی میں سے ہو یا درخت یا حیوان ہو یا انسان (رغ) انبت کے بعد مصدر انباتا کی بجائے نباتا آیا ہے اور یہ اسی کی جگہ ہے گو بعض نے نباتا کو یہاں حال کہا ہے مگر ابن جریر کہتے ہیں کہ عرب یہ کثرت سے کرتے ہیں کہ مصادر کو اصول افعال پر لاتے ہیں گو لفظ مختلف ہوں مثلاً تکلم فلان کلاما کہیں گے تکلما نہیں۔ اس لحاظ سے تقبل کے بعد قبول اور انبت کے بعد نبات آیا ہے مفردات میں ہے کہ انبت کا لفظ انسانوں پر بولنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بھی ایک وجہ سے نبات ہی ہیں۔ کیونکہ ان کی ابتداء بھی زمین سے ہی ہوتی ہے۔ گو نبات سے ان میں ایک وصف زائد ہو۔ پس یہاں انبت سے مراد اس کا انماء یعنی بڑھانا ہے۔

کفّل۔ کِفْل یا کَفِیْل وہ حصّہ ہے جس میں کفایت ہو اس لیے کَفَالَۃ بمعنی ضمانت ہے اور تَکْفِیْل دوسرے کی کفالت میں دیدینا (رغ)

زکریا۔ حضرت یحییٰ کے والد کا نام ہے اور یہ نام قرآن کریم میں زمرۂ انبیاء میں بھی آتا ہے۔ لوقا ۱ : ۵ میں زکریا کے متعلق ذیل کے الفاظ ہیں: "یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں اَبیّاہ کے فریق میں سے زکریا نام ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی...... اور وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانونوں پر بے عیب چلنے والے تھے"۔ (اناجیل میں ایسے صریح بیانات کے ہوتے جہاں ایک کاہن اور اس کی بی بی خداوند کے سارے حکموں اور قانونوں پر بے عیب چلنے والے بتائے جاتے ہیں اس کے پیروؤں کا یہ دعویٰ کہ شریعت پر کوئی شخص نہیں چل سکتا۔ ایک مضحکہ انگیز حرکت ہے) اناجیل میں زکریا کو صرف کاہن بیان کیا گیا ہے۔ البتہ پرانے عہدنامے میں ایک نبی زکریاہ نام بیان کیا گیا ہے اور اس کی کتاب بھی مجموعہ عہدنامہ قدیم میں موجود ہے پس ممکن ہے کہ جہاں قرآن کریم نے زکریا کو زمرۂ انبیاء میں سے فرمایا (الانعام ۶ - ۸۶) وہاں اشارہ زکریاہ کی طرف ہی ہو کیونکہ جہاں زکریا کو انبیاء میں سے گنا ہے وہاں ان کے ہاں یحییٰ کے پیدا ہونے کا کوئی ذکر نہیں اور جہاں زکریا کے ہاں یحییٰ کے پیدا ہونے کا ذکر ہے جو تین جگہ آیا ہے یعنی یہاں اور سورۃ مریم میں اور سورۃ انبیاء میں وہاں زکریا کو نبوت عطا فرمانے کا کوئی ذکر نہیں اور ذکریاہ اور زکریا دونوں ناموں میں اس قدر مشابہت ہے کہ عربی میں آکر ان کا ایک ہی صورت اختیار کر لینا کوئی بعید بات نہیں۔ بلکہ بعض مقامات کے الفاظ قرآنی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ امر کہ مریم قرعہ اندازی سے زکریا کی سپردگی میں آئیں۔ اگر وہ نبی ہوتے تو کاہنوں پر خود ہی ان کا حق فائق ہوتا۔ یا زکریا کا یحییٰ کے متعلق دعا کرتے ہوئے یہ کہنا یرثنی ویرث من اٰل یعقوب (مریم ۱۹ - ۶) میرا وارث ہو اور آل یعقوب کا وارث ہو۔ ظاہر ہے کہ نبوت کی طرف اشارہ آل یعقوب میں ہے۔ ورنہ یرثنی کافی تھا۔ ایسا ہی سورۃ انبیاء میں زکریا اور اس کی بی بی کا اکٹھا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے انھم کانوا یسارعون فی الخیرات ویدعوننا رغبا ورھبا (الانبیاء ۲۱ - ۹۰) وہ بھلائیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور ہم کو امید اور خوف رکھتے ہوئے پکارتے تھے۔ ان قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زکریا نبی اور زکریا والد یحییٰ دو الگ الگ شخص ہیں۔

مریم کے متعلق بعض مفسرین کے خیالات: عجوبہ پسند طبائع نے یہاں بھی کچھ قصّے بنا لیے ہیں کہ مریم ایک دن میں اتنا بڑھتی تھی جتنا کوئی دوسرا ایک سال میں بڑھے۔ حالانکہ یہاں صرف نباتاً حسنا عمدہ پرورش کا ذکر ہے۔ زکریا کی سپردگی میں ان کا دیا جانا حصول علم دین کے لیے تھا۔ یہ کہنا کہ پیدا ہوتے ہی اس کی ماں اس کو ہیکل میں لے گئی تھی۔ اسی عجوبہ پسندی کی وجہ سے ہے جو بہت سی تفاسیر میں دیکھی جاتی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کفالت کا وقت وہی ہوتا ہے جب بچہ تربیت کے قابل ہوتا ہے۔ مروجہ اناجیل میں مریمؑ کی پیدائش تربیت وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔

ع۴۱۲ کُلّما۔ کُلّ زمانٍ اَوْ کل وقت۔ جب کبھی۔

المحراب۔ حرب اس کا مادہ ہے جس کے معنی جنگ ہیں۔ مفردات میں ہے کہ مسجد کے محراب کو محراب اس لیے کہا جاتا ہے لِاَنَّہٗ مَوْضِعُ مُحَارَبَۃِ الشیطان والھویٰ یعنی وہ شیطان اور خواہشات کے جنگ کا مقام ہے۔ لیکن لسان العرب میں ہے کہ اَلْمِحْرَابُ صَدْرُ الْبَیْتِ وَاَکْرَمُ مَوْضِعٍ فِیْہِ یعنی محراب گھر کے صدر اور سب سے معزز مقام کا نام ہے اور زجاج کا قول نقل کیا ہے کہ محراب اَرْفَعُ بَیْتٍ فی الدار کا نام ہے یعنی گھر میں سب سے اعلیٰ درجہ کے

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ وہیں زکریاؑ نے اپنے رب سے دعا کی ۔ کہا میرے

کمرہ کو کہتے ہیں (ل) لیکن یہ بنی اسرائیل کے ذکر میں ہے اور بنی اسرائیل میں محراب مسجد کو کہتے تھے جس میں وہ بیٹھا کرتے تھے (ل) یا جہاں نماز کے لیے جمع ہوا کرتے تھے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محراب وہ خاص جگہ تھی جہاں عبادت کے لیے وہ بیٹھا کرتے تھے اور یہ ان کی مساجد ہی تھیں۔

رِزْق کے اصل معنی راغب کے نزدیک عطاء جاری ہیں خواہ دنیوی ہو یا اُخروی ۔ مال ہو یا جاہ یا علم ۔ اس لیے رُزِقْتُ عِلْماً علم دیا جانے پر بولتے ہیں۔ مفسرین نے تو حسب معمول اس کو غیر معمولی رزق قرار دیا ۔ حالانکہ یہاں کوئی ایسے لفظ نہیں ۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں فاکھۃ الصیف فی الشتاء وفاکھۃ الشتاء فی الصیف یعنی گرمی کے پھل سردیوں میں اور سردی کے پھل گرمیوں میں ۔ حالانکہ قرآن شریف میں نہ روٹی کا ذکر ہے نہ پھلوں کا ۔ اول تو رزق سے مراد پھل ہی لینا اس پر کوئی دلیل نہیں ۔ پھر پھل بھی خلاف موسم اور یہ بھی لکھا ہے کہ زکریا اس پر سات دروازوں پر قفل لگایا کرتے تھے ان قفلوں میں تو معمولی پھلوں کا پہنچنا بھی کافی اعجاز تھا خلاف موسم بتانے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور مجاہد سے روایت ہے وجد عندھا رزقاً ای علماً او قال صحفا فیھا علم (رث) یعنی رزق سے مراد یہاں علم ہے یا صحیفے جن میں علم تھا۔

من عند اللہ ۔ عند ظرف مکان اور زمان ہے اور اس کے معنی حضُورُ الشَّیْءِ وَدُنُوُّہٗ یعنی کسی شے کا حضور اور اس کا قرب اور اس پر من داخل ہوتا ہے جس طرح لدن پر من داخل ہوتا ہے ۔ یعنی من عند نا ۔ من لدنّا ۔ مفردات میں ہے کہ عند میں قرب ہے وہ بعض وقت بلحاظ مکان ہوتا ہے اور بعض وقت بلحاظ اعتقاد جیسے عندی کذا یعنی میرے اعتقاد میں یوں ہے اور کبھی مرتبہ کے لحاظ سے جیسے بَلْ اَحْیَاءٌ عند ربھم ہیں اور کبھی محض حکم میں جیسے عندہ علم الساعۃ (الزخرف [٤٣]-٨٥) ومن عندہ علم الکتاب (الرعد [١٣]-٤٣) ایسا ہی فاولٰئک عند اللہ ھم الکاذبون (النور [٢٤]-١٣) وھو عند اللہ عظیم (النور [٢٤]-١٥)۔ ان تمام مقامات پر فی حکمہ مراد ہے یعنی اللہ کے حکم میں اسی طرح پر وان من شیء الّا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم (الحجر [١٥]-٢١) اور یہی صورت یہاں ہے من عند اللہ یعنی اللہ کے حکم سے یہ چیزیں پہنچتی ہیں ۔ مفسرین کا خیال ہے کہ اس کو من عند اللہ اس لیے کہا گیا ہے کہ بلا واسطہ بشر پہنچتا تھا مگر یہ ضروری نہیں ان من شیء الّا عندنا خزائنہ جب سب چیزوں کے خزانے اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہیں تو جو کچھ پہنچتا ہے سب من عند اللہ ہی ہے چنانچہ ایک جگہ فرمایا کہ جب ان لوگوں کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ھٰذہ من عند اللہ یہ اللہ کا احسان ہے اور جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ھٰذہ من عندک یعنی تمہاری بے تدبیری سے ہے ۔ اس کے جواب میں فرمایا قل کل من عند اللہ (النساء [٤]-٧٨) بھلائی برائی ہر چیز اللہ کی طرف سے ہی ہے حالانکہ اسی کی تشریح آگے چل کر یوں کی ہے کہ بدنتائج انسان کے اپنے بداعمال سے ہیں اسی طرح فرماتا ہے ما النصر الا من عند اللہ (اٰل عمرٰن [٣]-١٢٥) حالانکہ نصرت اسباب کے ساتھ ہی آتی ہے ۔ اگر مسلمان قتال نہ کرتے اور حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کی طرح انکار کر دیتے تو یہ نصرت بھی نہ ملتی ۔ پس بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ ہر چیز من عند اللہ ہی ہے۔

مریم کے پاس رزق کا پہنچنا: ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بلا اسباب بھی کوئی امر مہیّا کر دے یا ایسے اسباب سے مہیا کر دے جن کے سمجھنے پر انسان قادر نہیں جیسے ویرزقہ من حیث لا یحتسب (الطلاق [٦٥]-٣) اللہ تعالیٰ متقی کو ایسے ذرائع سے رزق پہنچاتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا اور اگر یہ مریم صدیقہ کی کرامت ہو کہ کسی ظاہری سبب کے بغیر ان کو پہنچ جاتا ہو، تو اس سے بھی ہمیں انکار نہیں ۔ لیکن سوال صرف یہ ہے کہ آیا قرآن کریم نے یہاں ایسا فرمایا ہے یا کسی حدیث صحیح میں ایسا آیا ہے کہ مریم کو بے موسم کے پھل سات قفلوں کے اندر پہنچ جایا کرتے تھے ۔ اس کا جواب نفی میں ہے نہ اللہ تعالیٰ نے ایسا فرمایا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور الفاظ ظاہری سے سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ مریم کے پاس کچھ رزق پہنچ جاتا تھا ۔ ممکن ہے زائرین پہنچاتے ہوں جیسا کہ دستور ہے کہ جو لوگ خلوت نشینی اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں ڈال کر ان کو پہنچا دیتا ہے ۔ اور ممکن ہے یہاں رزق سے مراد جیسا مجاہد نے کہا ہے علم ہو اور اس علم کو ہی مریم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا ہو ۔ تو اس پر ایک دن جب زکریا نے سوال کیا کہ اے مریم یہ تم کو کہاں سے پہنچتا ہے تو اس نے وہی خدا پرستوں والا جواب دیا ۔ جن کی نظر وسائل سے بلند ہوتی ہے اور وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی سمجھتے ہیں ۔ حضرت ابراہیم تو یہاں تک فرماتے ہیں والذی ھو یطعمنی ویسقین (الشعراء [٢٦]-٧٩) وہ اللہ ہے جو مجھے کھانا کھلاتا اور پانی پلاتا ہے ۔ حالانکہ اپنے ہاتھ سے کھاتے اور پیتے تھے۔

کہا جائیگا کہ اگر کوئی غیر معمولی بات نہ تھی تو اس کا ذکر یہاں کیوں کیا ۔ لیکن کیا قرآن کریم معمولی امور کا ذکر نصیحت کے لیے نہیں کرتا ؟ بلکہ سبق تو انسان معمولی امور سے ہی حاصل کر سکتا ہے ۔ اگر یہ کوئی غیر معمولی امر تھا تو ہمیں اس سے فائدہ کیا یہ کوئی معجزہ تو ہے نہیں کہ مخالفین پر اتمام حجت کے لیے دکھایا گیا ہو ۔ نہ کوئی ایسی کرامت ہے جو منکرین کے لیے ظاہر ہوئی ہو، بلکہ بات صاف ہے مسلمانوں کو سمجھانا مقصود ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کے دین کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کرتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے بھی رزق کا کچھ سامان کر دیتا ہے اور کسی نہ کسی ذریعہ سے اس کو رزق پہنچا دیتا ہے ۔ بلکہ آخر پر ان الفاظ میں کہ واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب یہ بھی بتا دیا کہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ بے حساب رزق دیتا ہے انہی الفاظ میں مسلمانوں کو بھی مخاطب فرمایا ہے۔

ایک اور بات قابل توجہ یہ ہے کہ زکریا ہمیشہ ہی جب اس کے پاس جاتے تو رزق پاتے ۔ اگر یہ کوئی غیر معمولی رزق ہوتا تو یہ سوال پہلے دن ہی ان کو کرنا چاہیئے تھا کہ اے مریم یہ تم کو کہاں سے ملا ۔ حالانکہ عبارت قرآنی بتاتی ہے کہ وہ جب کبھی مریم کے پاس جاتے ایسا پاتے اور سوال نہ کرتے ۔ پھر انہوں نے کسی ایک موقعہ پر ایسا سوال کیا ہے جب انہوں نے مریم میں خدا پرستی کے آثار دیکھے ہیں ۔ اگر یہ مراد ہوتی کہ پہلی مرتبہ ہی دیکھ کر سوال کیا تھا تو عبارت یوں ہونی چاہیئے

لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ ذُرِّیَّۃً طَیِّبَۃً ۚ اِنَّکَ سَمِیۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

رب اپنی جناب سے مجھے پاکیزہ اولاد عطا فرما، تو دُعا سُننے والا ہے[۴۱۳]

فَنَادَتۡہُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ ہُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیۡ فِی الۡمِحۡرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکَ بِیَحۡیٰی مُصَدِّقًۢا

پھر فرشتوں نے اسے پکارا جبکہ وہ عبادت گاہ میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا، کہ اللہ تجھے یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے[۴۱۴] جو اللہ

تھی لما دخل علیھا۔

ع۴۱۳ ھنالك۔ ھنا ظرف مکان ہے۔ ل بُعد کے لیے اور کاف خطاب کے لیے۔ یعنی جہاں وہ (مریم کے پاس محراب میں) تھے وہیں یہ دعا کی۔

نیک اولاد کی خواہش: معلوم ہوتا ہے حضرت زکریا بنی اسرائیل کی حالت کو دیکھ کر یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اب یہ قوم اس قابل نہیں رہی کہ اس کے اندر وہ پاک لوگ پیدا ہوں جو اس قوم کو راہ راست پر رکھ سکیں اور اسی لیے انہوں نے کبھی اولاد کے لیے دعا بھی نہیں کی تھی۔ چنانچہ دوسری جگہ ان کے یہ الفاظ مذکور ہیں۔ وانّی خفت الموالی من ورائی۔ ان کا خوف اسی وجہ سے تھا کہ ان لوگوں کی عملی حالتیں ان کو اچھی نظر نہ آتی تھیں۔ ورنہ انبیاء اور اولیاء کو مال و جائداد کے ورثوں کا فکر نہیں ہوا کرتا۔ پس جب مریم کے اندر انہوں نے ایسی نیکی اور سعادت دیکھی تو ان کی طبیعت میں بھی ایک جوش پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی ایسی نیک اولاد عطا کرے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکوں کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے تو نیک اولاد کیلئے ہی پیدا ہوتی ہے باوجود بوڑھا ہو جانے کے زکریا نے اولاد کیلئے دعا نہ کی۔ کی تو یہی کی کہ اے خدا نیک اولاد دے یہ کہنا کہ دعا کی خواہش ان کے دل میں اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا اس بات پر قادر ہے۔ درست نہیں۔ اس لیے کہ وہ پہلے بھی مقبولین بارگاہ الٰہی میں سے تھے۔ ہر ایک راستباز انسان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعائیں قبول کیا کرتا ہے۔ اور حضرت زکریا کا تو اپنا قول دوسری جگہ قرآن میں منقول ہے ولم اکن بد عائك رب شقیا (مریم ۱۹-۴) یعنی جو دعا کی وہ قبول ہوئی۔ پھر عورت کے بانجھ ہونے کا یقین تو بے اولادی سے ہوا پہلے وہ دعا کیوں نہ کرتے تھے۔ اصل بات یہی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی حالت کو دیکھ کر یہی خیال کرتے تھے کہ یہ قوم اب اس قابل نہیں رہی کہ ان میں نیک لوگ پیدا ہوں۔ مریم کی نیکی کو دیکھ کر ان کی طبیعت میں ایک جوش پیدا ہُوا اور ان کی رُوح بے اختیار بارگاہِ الٰہی میں پکار اُٹھی فھب لی من لدنك ولیا یرثنی ویرث من اٰل یعقوب واجعلہ رب رضیا (مریم ۱۹- ۵ و ۶) اے خدا مجھے بھی اپنی جناب سے ایک وارث عطا فرما جو میرے علوم اور نیکیوں کا وارث ہو۔ اور یعقوب کے سچّے پیروؤں کے علوم اور نیکیوں کا وارث ہو اور اے میرے رب اسے اپنی بارگاہ میں پسندیدہ بنائیو۔ نیکوں کو دیکھ کر نیکوں کے دل میں نیک تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اسی کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی۔

ع۴۱۴ ملائکہ کا کلام: فنادتہ الملائکۃ بعض کے نزدیک یہاں ملائکہ سے مراد جبرائیل ہے اور بعض کے نزدیک جماعت ملائکہ اللہ تعالیٰ کا کلام اور الہام بھی ملائکہ کی وساطت سے ہی نازل ہوتا ہے دوسری جگہ فرمایا یا زکریا انّا نبشّرك بغلام اسمہ یحییٰ (مریم ۱۹- ۷) پس یہ وحی تھی جو زکریا کو ہوئی۔ خواہ کوئی سے ملائکہ اس کے لانے والے ہوں اور دوسری جگہ قرآن کریم نے حصر کر کے بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام انسان سے تین ہی طرح پر ہوتا ہے۔ دل میں بات ڈال کر رویا کشف الہام سے بذریعہ جبرائیل علیہ السلام جو انبیاء سے مخصوص ہے عام ملائکہ کا کلام کشف یا الہام کے رنگ میں ہوگا۔

یحییٰ۔ مفردات میں ہے سَمَّاہُ بذٰلك من حَیۡثُ انہ لم تَمِتۡہُ الذنوب کما اماتت کثیرا من وَلَدِ اٰدم صلعم یعنی اس کا نام یحییٰ رکھا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کہ گناہ سے اس پر موت نہیں آئے گی۔ جیسا کہ بہت سے آدم کے بیٹوں پر آئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یحییٰ نام بتانے میں اشارہ یہ تھا کہ جیسے کہ بنی اسرائیل کی عامہ حالت اس وقت تھی کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا تھے اور اعلیٰ درجہ کے نیک اور راستباز انسان ان میں عموماً نہ تھے۔ یہ لڑکا ایسا نہ ہوگا بلکہ وہ ایک روحانی زندگی کا وارث ہوگا اور گناہ کی موت اس پر نہ آئیگی۔ بعض نے کہا ہے کہ یحییٰ نام اس طرف اشارہ کے لیے بتایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو ایمان سے زندہ کرے گا۔ یا اس لیے کہ وہ علم و حکمت سے زندہ ہوگا (ل) یا اس لیے کہ اس کے ذریعہ سے لوگ ہدایت کے ساتھ زندہ کیے جائیں گے (ر) اناجیل میں یہ نام یوحنا آتا ہے اور یوحنا بپتسمہ دینے والے کے نام سے یہ مشہور ہیں۔ انہوں نے ہی حضرت مسیح کو بپتسمہ دیا تھا۔ ان کا اور حضرت مسیح کا زمانہ ایک ہی تھا ان کا ظہور کچھ حضرت مسیح سے پہلے ہوا یہ عجیب بات ہے کہ سلسلہ موسوی کی ابتدا بھی دو نبیوں موسیٰ اور ہارون سے ہی ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ بھی دو نبیوں یحییٰ اور عیسیٰ پر ہی ہوتا ہے جس طرح حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی اصلاح کا سارا کام اکیلے نہ کر سکتے تھے اسی طرح حضرت مسیح بھی اکیلے اس قابل نہ تھے۔ حضرت موسیٰ اور مسیح دونوں کا کام بڑا تھا اور یہی وجہ ہوئی کہ ان کے ساتھ دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت پیش آئی۔ حضرت موسیٰ کے کام کا کچھ حصہ حضرت ہارون نے کیا۔ حضرت یحییٰ نے حضرت مسیح کے لیے لوگوں کو تیار کیا۔

حضرت یحییٰ اور عیسیٰ دونوں کے لیے کتب سالقہ میں کچھ پیشگوئیاں تھیں۔ حضرت یحییٰ کے متعلق پیشگوئی ان الفاظ میں ملاکی نبی کی کتاب میں تھی۔ "دیکھو خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پیشتر میں الیاہ نبی کو تمہارے پاس بھیجوں گا۔" (ملاکی ۴: ۵) بظاہر اس پیشگوئی میں الیاس کے آنے کا ذکر ہے اور الیاس کے متعلق یہودیوں کا یہ خیال تھا کہ وہ زندہ آسمان پر چلا گیا ہُوا ہے اور یہ صرف خیال ہی نہ تھا بلکہ ان کی کتاب میں یہ لفظ بھی تھے کہ "ایلیاہ بگولے میں ہو کے آسمان پر جاتا رہا" (۲-سلاطین ۲: ۱۱)

الیاس کی دوبارہ آمد کی پیشگوئی کیوں کر پوری ہوئی: اب جب حضرت مسیحؑ نے دعویٰ کیا تو یہودیوں نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ ہماری پیشگوئیوں میں لکھا ہے کہ مسیح سے پیشتر ضروری ہے کہ الیاس آئے۔ چنانچہ شاگردوں نے یہ اعتراض حضرت مسیح کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا "ایلیاہ تو آچکا اور انہوں نے اس کو نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا اسی طرح ابن آدم بھی ان کے ہاتھ سے دکھ اُٹھائے گا۔" اس کے بعد لکھا ہے "تب شاگرد سمجھ گئے کہ اس نے ہم سے یوحنا بپتسمہ

بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ | کے ایک کلام کو سچا کرنے والا اور سردار اور بدیوں سے رُکنے والا اور نبی نیکوکاروں میں سے ہوگا۔[۴۱۵]

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ﴿۴۰﴾ | اس نے کہا میرے رب میرے بیٹا کیوں کر ہوگا اور مجھ پر بڑھاپا آچکا ہے اور میری عورت بانجھ ہے فرمایا اسی طرح ہوگا اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔[۴۱۶]

دینے والے کی بابت کہا ہے" (متی ۱۷: ۱۲ و ۱۳) اور دوسری جگہ اس کی وجہ یوں دی ہے" اور وہ ایلیا کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا"
گویا یحییٰ کی آمد ہی الیاس کی دوبارہ آمد تھی اس لیے کہ وہ اس کا مثیل ہو کر آیا۔ مگر یہودی اس تشریح سے مطمئن نہ ہوئے۔

ع۴۱۵ کلمۃ۔ یہ لفظ قرآن کریم میں وسیع معنی میں استعمال ہُوا ہے یعنی کلام کے ہم معنی جیسے عیسائیوں کے حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے پر فرمایا۔ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم (الکھف ۱۸: ۵) اور ایک جگہ کافر کی طرف اس قول کو منسوب کرکے رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت (المومنون ۲۳: ۱۰۰) فرمایا انھا کلمۃ ھو قائلھا۔

یہ تو کلمہ کے عام معنی ہیں۔ یہاں کس کلمہ کی تصدیق ہے؟ مفردات میں تین قول دیئے ہیں کلمۃ التوحید توحید کی بات کتاب اللہ یعنی اللہ کی کتاب عیسیٰ۔ اور عیسیٰ کا نام کلمۃ اس لیے رکھا گیا کہ دوسری جگہ کلمۃ القاھا الی مریم قرآن شریف میں آتا ہے۔ میرے نزدیک یہاں کلمہ عام معنی میں ہے یعنی اللہ کے ایک کلام کو سچا کر دکھائیگا اور اس کلمہ کے لفظ میں اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے جو یحییٰ کے متعلق بائبل میں پائی جاتی ہے اور جو پچھلے نوٹ میں مذکور ہو چکی ہے۔

سیدا۔ سید سود سے ہے اور سواد سیاہی کو کہتے ہیں اور بڑی جماعت کو بھی اسی لحاظ سے سواد کہتے ہیں اور سیّد وہ ہے جو سواد یا جماعت کثیر کا متولی ہو (غ) یحییٰ کو سیّد اس لیے کہا کہ وہ بھی ایک جماعت کا پیشوا بننے والا تھا۔

حصورا۔ حصر سے ہے جس کے معنی تضییق یعنی روکنے کے ہیں۔ مفردات میں ہے کہ حصور وہ ہے جو عورتوں کے پاس نہیں جاتا۔ یا نامردی کی وجہ سے یا پاکدامنی کی وجہ سے اور شہوت کے دُور کرنے میں کوشش کی وجہ سے اور پھر لکھا ہے کہ اس آیت میں یہ دوسری قسم کا ہی حصور مراد ہے یعنی پاکدامنی کی وجہ سے عورتوں کے پاس نہ جانے والا۔ کیونکہ اس سے ایک شخص تعریف کا مستحق ہو سکتا ہے اور یہی بات صحیح ہے۔ ورنہ نامرد تو دنیا میں بہتیرے ہوئے اور ہونگے۔ یہ کسی تعریف کے موقع پر نہیں بولا جا سکتا اور ابن عباس کی ایک روایت میں بھی یہ لفظ آئے ہیں الذی لا یاتی النساء مع القدرۃ علے ذٰلک (د) اور روح المعانی میں ہی یہ بھی ہے کہ جائز ہے کہ حصور سے مراد یہ ہو کہ جو شخص نفس کے روکنے کو کمال تک پہنچادے اور باوجود قدرت کے شہوات سے اسے روک رکھے۔

یحییٰؑ اور عیسیٰؑ: عیسائی لوگ حضرت عیسیٰ کا یہ کمال بیان کیا کرتے ہیں کہ انہوں نے شادی نہیں کی۔ قرآن کریم اس کے بالمقابل یحییٰ کو پیش کرتا ہے کہ اگر یہ کوئی خوبی ہے تو پھر حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ سے کم نہیں۔ حضرت یحییٰ کی زندگی دنیا کی ان معمولی آسائشوں سے بھی خالی تھی جو حضرت عیسیٰ کو میسر تھیں۔ چنانچہ انجیل میں ان کا یہ نقشہ کھینچا ہے کہ وہ مے نہ پیتے تھے اور کھاؤ پیو نہ تھے۔ اور حضرت مسیح کو لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ کھاؤ پیو ہے اور مے پیتا ہے" کیونکہ یوحنا نہ کھاتا آیا نہ پیتا اور وہ کہتے ہیں کہ اس میں بدروح ہے۔ ابن آدم کھاتا پیتا آیا اور وہ کہتے ہیں دیکھو کھاؤ اور شرابی آدمی" (متی ۱۱-۱۹)

قرآن کریم تو یحییٰ کو انبیاء میں سے ایک نبی بیان فرماتا ہے۔ مگر حضرت مسیح نے یوحنا کو نبیوں سے بھی بڑھ کر کہا ہے کہیں مسیح کے متعلق ایسا فقرہ ہوتا تو اس کی بنا پر اسے خدا بنا لیا جاتا، مگر یوحنا کو کچھ بھی نہیں سمجھا جاتا حالانکہ مسیح صاف کہتا ہے" تو پھر کیوں گئے تھے؟ ایک نبی کے دیکھنے کو؟ ہاں میں تم سے کہتا ہوں بلکہ نبی سے بڑے کو...... میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورت سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی بڑا نہیں ہوا" (متی ۱۱: ۹-۱۱)

سوال یہ ہے کیا مسیح عورت سے پیدا نہیں ہوئے؟ پھر اس صریح بیان کے مطابق بڑا کون ہُوا؟ یحییٰ یا عیسیٰ؟ عیسائی خود ہی اس کا جواب دیں۔ اور جہاں فرشتہ زکریا کو یحییٰ کی بشارت دیتا ہے وہاں ان الفاظ میں بشارت ہے" اور بہت سے لوگ اس کی پیدائش کے سبب خوش ہونگے۔ کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پیئے گا اور اپنی ماں کے پیٹ سے ہی روح القدس سے بھر جائے گا" (لوقا ۱: ۱۴-۱۵) اور احادیث میں بھی آتا ہے۔ ما من عبد یلقی اللہ الا ذا ذنب الا یحییٰ بن زکریا۔ کوئی بندہ نہیں جو خدا کو ملے مگر وہ قصوروار ہوگا سوائے یحییٰ بن زکریا کے۔ یہ تمام باتیں اگر ان کو ظاہر پر حمل کیا جائے تو حضرت یحییٰ کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بڑی فضیلت ثابت کرتی ہیں۔ عیسائی صاحبان اس پر غور کریں۔

ع۴۱۶ غلام۔ غلام اس کو کہتے ہیں جس کی مونچھیں نکل رہی ہوں (غ) یعنی نوجوان۔ یا پیدا ہونے سے لے کر جوانی تک غلام کہلاتا ہے اور کہل کو بھی غلام کہہ دیتے ہیں (ت) قرآن کریم میں اکثر لڑکے کی بشارت غلام کے لفظ سے دی گئی ہے جس میں شاید یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ موعود لڑکا جوانی کی عمر کو پہنچے گا۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ؏ ﴿٤١﴾ ع ۱۱/۱۲

اس نے کہا میرے رب میرے لیے کوئی نشان مقرر کردے فرمایا تیرے لیے نشان یہ ہے کہ تین دن سوائے اشارہ کے لوگوں سے بات نہ کرے اور اپنے رب کو بہت یاد کر اور شام اور صبح تسبیح کر[۴۱۷]

اور یہاں یعنی حضرت زکریا کے سوال میں شاید یہ بھی اشارہ ہو کہ وہ لڑکا جس کے اب پیدا ہونے کی بشارت دی جاتی ہے وہ کب نوجوان ہوگا۔

الکبر۔ کِبَر یا بڑائی بعض وقت بلحاظ جسامت کے ہوتی ہے اور بعض وقت بلحاظ زمانہ کے اور بعض وقت بلحاظ منزلت اور رفعت کے (غ) یہاں کبر بلحاظ زمانہ کے مراد ہے یعنی مُسِنّ ہونا یا بڑھاپا۔

عاقر۔ عَقْر کے اصل معنی کسی چیز کا اصل ہیں یعنی اس کی جڑ اور اس سے عقرت النخل کے معنی آتے ہیں قَطَعْتُهٗ من اَصْلِه (غ) یعنی میں نے کھجور کو جڑ سے کاٹ دیا اس طرح عقر کے معنی ذبح کردینا یا کاٹ دینا ہو گئے ہیں چنانچہ عَقَرْتُ الْبَعِيْرَ کے معنی ہیں نَحَرْتُهٗ اسے ذبح کردیا انہی معنوں میں آتا ہے فعقروھا (الشمس ۹۱-۱۴) فتعاطی فعقر (القمر ۵۴-۲۹) اور امرأة عاقر۔ اس عورت کو کہتے ہیں جو بچہ نہیں جنتی کَاَنَّھَا تَعْقِرُ ماءَ الْفَحْل گویا وہ نر کے پانی کو کاٹ دیتی ہے یا ضائع کردیتی ہے (غ)

کذالك اللہ یفعل مایشاء کی ترکیب یوں ہے۔ الامر کذالك یعنی ایسا ہی ہونا ہے اللہ یفعل مایشاء۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ پس یہ دو الگ الگ جملے ہیں پہلے میں مبتدا محذوف ہے۔

یہ سوال اللہ تعالیٰ کی قدرت کے استعظام پر اور ایک ایسے بڑے نشان کے ظاہر ہونے پر ہے۔ جو انسان بطور تعجب کرتا ہے۔ کیونکہ ظاہر حالات اس کے مخالف ہیں۔ اس میں کسی قسم کی بے ادبی خیال کرنا درست نہیں۔ اس لیے کہ ایسا ہی سوال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کی بشارت پر کیا ہے قال ابشرتمونی علیٰ ان مسنی الکبر فبم تبشرون (الحجر ۱۵-۵۴)

ع[۴۱۷] ثلثة ایام۔ سورہ مریم میں اسی تذکرہ میں فرمایا ثلث لیال۔ یعنی تین راتیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض وقت ایک کا ذکر کرکے دونوں مراد لے لیتے ہیں جیسے سرابیل تقیکم الحر (النحل ۱۶-۸۱) میں اصل مراد ہے الحر والبرد۔ یعنی گرمی اور سردی سے بچاتے ہیں۔ یا مشرق کہہ کر مراد مشرق و مغرب لے لیتے ہیں اسی طرح ایام میں لیالی بھی شامل ہیں اور لیالی میں ایام شامل ہیں۔ اور ایک جگہ ایام اور ایک جگہ لیال کہہ کر اس کو واضح کردیا۔

رمزا۔ رَمْز کے معنی ہیں ہونٹوں سے اشارہ کرنا اور آواز مخفی اور آنکھوں سے اشارہ (غ) رَمْز کے اصلی معنی تحرک یعنی ہلانا ہیں۔ اور ابن عباس سے رمزا کے معنی الاشارة بالید والوحی بالراس (ر) مروی ہیں یعنی ہاتھ سے اشارہ اور سر سے اشارہ۔

العشی۔ عَشِیّ اس وقت کا نام جو آفتاب کے ڈھلنے سے لیکر صبح تک ہو (غ) چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے الاعشیة او ضحاھا (النزعٰت ۷۹-۴۶) اور عشاء صلوٰة مغرب سے لیکر عَتَمَة تک بولا جاتا ہے یعنی تاریکی کے وقت تک وجاء و اباھم عشاء یبکون (یوسف ۱۲-۱۶)

ابکار یعنی بُکْرة دن کے پہلے حصّہ کو کہتے ہیں (غ) اور ابکار اسی معنی میں مصدر ہے۔

زکریا کی خاموشی اضطراری تھی یا اختیاری: زکریا کا نشان مانگنا اس بات پر دلیل نہیں کہ آپ کو وعدہ الٰہی پر ایمان نہ تھا۔ حسن کہتے ہیں لیتلقی تلك النعمة بالشکر (م) تاکہ اس نعمت پر شکر کرے۔ یہاں لوگوں نے بعض لغو قصے بڑھا دیئے ہیں کہ شیطان نے زکریا کو کہہ دیا تھا کہ تمہیں فرشتے کی آواز نہیں آئی، بلکہ یہ شیطان کی آواز تھی اور کہ اسی لیے زکریا نے کہا تھا انّٰی یکون لی غلام اور اسی لیے نشان مانگا تھا۔ اس بات کی طرف تو مفسرین گئے ہیں کہ حضرت زکریا کا نہ بولنا کسی آفت کی وجہ سے نہ تھا۔ کیونکہ سورہ مریم میں صاف لفظ سویا بڑھا دیا ہے یعنی حالت صحت میں ہونے کے باوجود کلام نہ کرو۔ مگر اکثر کا خیال یہی ہے کہ زکریا کا نہ بولنا بطور اضطرار تھا۔ لیکن ابو مسلم کہتے ہیں کہ یہ بطور اختیار تھا اور عطاء کہتے ہیں کہ یہ ...... روزہ رکھنے کی طرف اشارہ تھا۔ کیونکہ ان میں دستور تھا کہ روزہ رکھتے تھے تو کلام نہ کرتے تھے (ر) یہ توجیہ بہت لطیف ہے۔ ایک تو اس پر انی نذرت للرحمٰن صوما فلن اکلم الیوم انسیا (مریم ۱۹-۲۶) شاہد ہے یعنی مریم کہتی ہیں میں نے رحمٰن کے لیے روزہ نذر مانا ہے اس لیے آج میں کسی انسان سے گفتگو نہ کرونگی۔ کیونکہ جہاں نہ بولنے کا حکم ہے وہیں یہ بھی حکم ہے کہ اپنے رب کو بہت زیادہ یاد کرو اور صبح اور شام تسبیح کرو۔ اگر حضرت زکریا بولنے پر قادر نہ تھے تو تسبیح کا حکم ٹھیک نہیں رہتا۔ یہ کہنا کہ اختیاری طور پر نہ بولنا نشان نہیں لفظ نشان کے معنی کی غلط فہمی پر مبنی ہے حضرت زکریا نے یہی عرض کیا تھا کہ اجعل لی اٰیة میرے لیے کوئی نشان مقرر کردو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے لیے یہ نشان مقرر کرتے ہیں کہ تین دن روزہ رکھو اور لوگوں سے بات چیت نہ کرو۔

لوقا کا قصّہ: انجیل لوقا میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے وہ قابل قبول نہیں۔ وہاں لکھا ہے کہ فرشتہ نے زکریا کو یوں کہا "اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا اس لیے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہونگی یقین نہ کیا" اور آگے لکھا ہے کہ جب زکریا باہر نکلا تو وہ لوگوں سے اشارے کرتا تھا اور گونگا ہی رہا" (لوقا ۱: ۲۰-۲۲) حالانکہ زکریا نے جو کچھ کہا وہ اس سے بڑھ کر نہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسے ہی حالات میں کہا۔ اور یہ مفسرین بائبل کو خود اعتراف ہے۔ پھر ایک ہی سوال پر ایک جگہ کوئی بات خلاف یقین نہیں اور دوسری جگہ یہ کہنا کہ یقین نہ کیا صحیح نہیں ہے۔

وَ اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ
اصۡطَفٰکِ وَ طَہَّرَکِ وَ اصۡطَفٰکِ عَلٰی
نِسَآءِ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۲﴾
یٰمَرۡیَمُ اقۡنُتِیۡ لِرَبِّکِ وَ اسۡجُدِیۡ وَ

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور
تجھے پاک بنایا ہے[۴۱۸] اور قوموں کی عورتوں میں سے تجھے
چُن لیا ہے[۴۱۹]۔
اے مریم! اپنے رب کی فرمانبرداری کر اور سجدہ کر اور

ع۴۱۸ قالت الملائکۃ۔ دیکھو ع۴۱۴ فنادتہ الملائکۃ پر۔ دونوں کا منشاء ایک ہی ہے۔ یہاں پر یہ بحث ہوتی ہے کہ آیا حضرت مریم نبیہ تھیں یا نہیں بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ نبیہ تھیں۔ بعض نے انکار کیا ہے۔ قائلینِ اثبات نے اس بات سے حضرت مریم کی نبوت کا استدلال کیا ہے کہ ملائکہ نے ان سے کلام کیا اور لقانی نے کہا ہے کہ ملائکہ کا کلام کرنا ایسے لوگوں سے ثابت ہے جو بالاجماع نبی نہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص اپنے ایک بھائی کی زیارت کے لیے محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے نکلا تو فرشتوں نے اسے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم سے ایسی محبّت کرتا ہے جیسی تم اپنے بھائی سے محبت کرتے ہو۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں من توھم ان النبوۃ مجرد الوحی ومکالمۃ الملك فقد حاد عن الصواب (ر)

محض مکالمہ نبوت نہیں: یعنی جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ مجرد وحی اور مکالمہ کا نام نبوت ہے وہ صواب سے پھر گیا۔ اس کے ساتھ اختلاف بھی لوگوں نے کیا ہے غور کیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ غیر انبیاء سے مکالمہ الٰہی ایک امر مسلم ہے اور حدیث صحیح رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء (یعنی ایسے لوگوں کا وجود جن سے کلام الٰہی ہوتا ہے حالانکہ وہ نبی نہیں) اس پر ایسی کھلی دلیل ہے کہ جس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ پھر ایک مریم سے ہی کلام الٰہی از روئے قرآن ثابت نہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی وحی کا ہونا ثابت ہے۔ واوحینا الی ام موسٰی (القصص ۲۸۔ ۷) پھر اوحیت الی الحواریین (المائدۃ ۵۔ ۱۱۱) بھی موجود ہے۔ یعنی حواریوں کی طرف وحی کی۔ اب بہرحال حواریوں کی نفی نبوت پر حدیث شاہد ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لم یکن بینی وبینہ نبیٌّ یعنی میرے اور عیسٰی کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا۔ پس صرف وحی پانا نبوت نہیں۔ ہاں لفظ نبی کے لغوی معنی چونکہ یہ ہیں کہ وہ خدا سے خبر پا کر پہنچاتا ہے گو وہ خبر کسی ہدایت دینی سے تعلق نہ رکھتی ہو بلکہ محض ایک ذاتی امر ہو یا ایک پیشگوئی ہو اس لیے لغوی معنی کے لحاظ سے بلاشبہ ہر اس شخص پر جس سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا لفظ نبی کا صادق آسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل میں صرف خواب بینوں کو بھی نبی کہہ دیتے تھے۔ مگر چونکہ اصلاح شریعت میں لفظ نبی انہی لوگوں پر صادق آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت دینی لے کر آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان سفیر ہوتے ہیں جیسا کہ راغب نے لکھا ہے (نوٹ ع۹۱) اس لیے جب محض مکالمہ مخاطبہ والے پر لفظ نبی بولا جائے گا تو صرف مجازی معنی میں بولا جائے گا۔ پس جن لوگوں نے حوّا اور اسیۃ اور اُم موسٰی اور سارۃ اور ھاجرہ اور مریم کو نبیہ کہا ہے (ر) وہ محض اس لغوی یا مجازی معنی کی رو سے ہے اور اسی لیے انہوں نے لفظ رسول ان پر نہیں بولا جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ گو اللہ تعالیٰ ان سے کلام کرتا تھا مگر وہ کلام کسی دینی ہدایت کے متعلق نہ تھا۔ اور جن معنوں میں مریم نبیہ تھیں ان معنوں میں اس اُمت کے برگزیدہ لوگ بھی نبی ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے بھی ہمکلام ہوتا ہے۔ اور سورۃ تحریم میں صاف طور پر اس امت کے برگزیدہ لوگوں کو مریم بنت عمران سے مثال دی ہے۔

طھرك۔ طھارۃ کے معنی دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں۔ طُھارۃ دو قسم پر ہے۔ طہارت جسمانی اور طھارۃ نفس۔ اور گو بعض جگہ دونوں معنوں پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے ویحب المتطھرین (البقرۃ ۲۔ ۲۲۲) یحبون ان یتطھروا (التوبۃ ۹۔ ۱۰۸) مگر یہاں مقصود بالذات طہارت نفس ہی ہے۔ ایمان کی وجہ سے کفر سے پاک کیا۔ اور طاعت کے ساتھ نافرمانی سے پاک کیا (ر) یا جیسا کہ کہا گیا ہے اخلاق ذمیمہ سے پاک کیا۔

ع۴۱۹ عالمین پر فضیلت سے مراد: علیٰ نساء العالمین۔ بنی اسرائیل کے ذکر میں فرمایا تھا وانی فضلتکم علی العالمین۔ ایسے موقعوں پر مراد ہمیشہ عالمی زمانہم یعنی اس زمانہ کے لوگ ہوتے ہیں چنانچہ ایک حدیث مرسل میں یہ تشریح آئی بھی ہے مریم خیر نساء عالمھا (د) مریم اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے بہتر تھیں۔ عورتوں میں فضیلت: ہاں احادیث اس بارہ میں مختلف طور پر آئی ہیں اور ان میں سے جو ایک میں دوسری کے ساتھ اختلاف نظر آتا ہے کہ مثلاً کسی حدیث میں تو محض چار عورتوں کے افضل النساء ہونے کا ذکر آتا ہے جیسا ابن مردویہ کی روایت میں، مریم، آسیہ، خدیجہ اور فاطمہ کا نام ہے اور ایک میں یوں آتا ہے کہ عورتوں میں سے سوائے تین کے کسی کی تکمیل نہیں ہوئی۔ مریم۔ آسیہ۔ خدیجہ اور عائشہ کی فضیلت سب عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت کھانوں پر (ث) اور ایک حدیث میں ہے کہ بہترین عورتوں کی مریم بنت عمران اور بہترین عورتوں کی خدیجہؓ بنت خویلد ہیں (ث) معلوم ہوتا ہے یہ فضیلت بعض پہلوؤں سے ہے۔

عیسائیوں کا مریم کی فضیلت سے حضرت عیسٰی کی فضیلت پر استدلال: بعض عیسائی یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت عیسٰی کی والدہ کو اتنی بڑی فضیلت حاصل ہے جو محمد رسول اللہ صلعم کی والدہ کو حاصل نہیں۔ اس سے حضرت عیسٰی کی فضیلت لازم آتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ماں کی فضیلت کے بغیر اولاد افضل نہیں ہوسکتی؟ اگر اولاد کو فضیلت اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب ماں کو فضیلت حاصل ہو تو مریم کی ماں کو تو کوئی فضیلت حاصل نہ تھی مریم کو کیونکر فضیلت حاصل ہوگئی اور اگر یہ سلسلہ اور آگے چلایا جائے تو حضرت عیسٰی کی دادیوں نانیوں میں تو بعض ایسی عورتیں ملیں گی جن کے متعلق عیسائیوں کی کتابوں میں جو کچھ پایا جاتا ہے

ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝۴۳ — جھک جانے والوں کے ساتھ جھک جا۔[۴۲۰]

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ — یہ غیب کی خبروں میں سے ہے، جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں[۴۲۱] اور تو ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنی قلمیں ڈالتے تھے کہ ان میں سے کون مریم کا کفیل بنے اور نہ تو ان کے پاس تھا جب

کوئی مسلمان اس کو مان بھی نہیں سکتا۔ عجیب بات ہے کہ قرآن کی رو سے مریم صدیقہ کو جو فضیلت ملتی ہے وہ پہلے مل چکتی ہے اور وہ بیٹا جس کو اس وجہ پر افضل کہنے کی جرأت کی جاتی ہے نہ صرف ابھی پیدا ہی نہیں ہوا بلکہ ماں کے رحم میں بھی موجود نہیں اگر وہ پیدا نہ بھی ہوتا تو مریم کو جو فضیلت ملنی تھی وہ مل چکی۔ کیسا پُر حکمت کلام ہے مریم کے اصطفا اس کی تطہیر اس کی فضیلت کے ذکر میں جو اس آیت میں موجود ہے حضرت عیسٰی کے پیدا ہونے کی بشارت تک بھی نہیں۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ مریم کا ذکر اناجیل میں: ہاں جس ماں کی فضیلت کو حضرت عیسٰی کی فضیلت کی وجہ قرار دیا جاتا ہے اناجیل کو اُٹھا کر دیکھو وہاں اسی ماں کو کس زمرہ میں داخل کیا گیا ہے "کسی نے اس سے کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے باتیں کرنی چاہتے ہیں اس نے خبر دینے والے کے جواب میں کہا کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں۔ کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وہی میرا بھائی اور بہن اور ماں ہے۔" (متی ۱۲: ۴۸-۵۰) اب اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کے خیال میں اس کی ماں آسمانی باپ کی مرضی پر چلنے والی نہ تھی۔ ورنہ ماں کی طرف سے یوں بیزاری کا اظہار اور شاگردوں سے جو اس کی رائے میں آسمانی باپ کی مرضی پر چلنے والے تھے یوں محبّت کا اظہار نہ ہوتا۔ پھر ایک جگہ مریمؓ نے کچھ کہنا چاہا تو آپ یوں اپنی والدہ محترمہ سے مخاطب ہوتے ہیں "اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام ہے" (یوحنا ۲: ۴) کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح اپنی والدہ محترمہ کی اس قدر عزّت کرتے تھے کہ ان کو تمام دنیا کی عورتوں سے بلند مرتبہ سمجھتے ہوں اور اپنی فضیلت کو بھی ماں کی بزرگی کی طرف منسوب کرتے ہوں بلکہ یہاں تو حالات کچھ اس کے برعکس نظر آتے ہیں۔ آنحضرتؐ کا اپنی بیٹی کی عزت کرنا: جائے غور ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی کی اس سے بہت بڑھ کر عزّت کرتے ہیں جس قدر حضرت مسیح نے اپنی والدہ کی کی۔ آپ کبھی فاطمہؓ کو ایسے الفاظ میں خطاب نہیں کرتے۔ بلکہ ہمیشہ پیار محبّت عزّت کے الفاظ سے پکارتے ہیں۔ بلکہ حضرت فاطمہؓ کی تعظیم کے لیے بعض وقت اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بہرحال حضرت مریم کی فضیلت سے کوئی استدلال حضرت عیسٰی کی فضیلت پر نہیں ہو سکتا۔

ع۴۲۰ حکم دینے سے خلاف ورزیٔ حکم پر استدلال غلط ہے: جب کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو کوئی حکم ہو (بلکہ عام حکم بھی ہو) تو عیسائی کہا کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خلاف کیا تھا۔ اس لیے یہ حکم ہوا کہ ایسا کرو۔ اس موقعہ پر بھی انہیں غور کرنا چاہیئے کہ کیا مریم پہلے خدا کی فرمانبرداری یا عبادت نہ کرتی تھیں؟ سیدھی بات ہے۔ بعض دفعہ مشکلات کے لحاظ سے ایک بات کی تاکید کی جاتی ہے۔ مریم پر بھی بڑے ابتلاؤں کا وقت آنے والا تھا کہ لوگ اس پر طرح طرح کے الزام لگائیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمانبرداری کی تاکید فرمائی۔

ع۴۲۱ اِنباء۔ نباء کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایسی خبر جس میں کوئی عظیم الشان مطلب ہو۔ اور اس سے علم یا غلبہ ظن حاصل ہو (غ)
الغیب اس کا استعمال ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو حاسہ سے مخفی ہو یا انسان کے علم میں نہ ہو (غ) واقعات گزشتہ بھی اس لحاظ سے غیب میں داخل ہو جاتے ہیں جب ان کا صحیح علم نہ رہا ہو۔

واقعات گزشتہ کس صورت میں غیب میں داخل ہو جاتے ہیں۔ عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ تاریخی باتوں کو قرآن شریف نے انباء الغیب کہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت مریم صدیقہ اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق واقعات دنیا میں دشمن اور دوست دونوں میں نہایت غلط طور پر مروج ہو گئے اس لیے قرآن کریم نے اصل واقعات پر عالم کو مطلع فرما کر واقعی ایک غیب سے پردہ اُٹھایا ہے۔ اور مسیح اور مریم کی اصل حیثیت کو دنیا میں ظاہر فرمایا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسی گڑبڑی میں جہاں مسیح کے اصل حالات پر خطرناک تاریکی کا پردہ پڑ چکا تھا۔ ان کی اصلیت پر اطلاع پانا کسی عالم کا کام بھی نہ ہو سکتا تھا۔ چہ جائے کہ عرب کا ایک اُمی ان اصل حالات کو ظاہر کرتا۔ اصل انجیل جس میں خالص حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم تھی وہ دنیا سے بالکل نابود ہو چکی تھی اور اس کی جگہ بہت سی انجیلیں لے چکی تھیں۔ جن میں سے بعض کو کلیسا نے بلا دلیل الہامی مان لیا اور بعض کو وضعی قرار دے کر رد کر دیا اور مسیح کو خدائی کا مرتبہ دے کر اس کے خون کے کفارہ کو نجات کا موجب قرار دیا اور شریعت کو لعنت قرار دیا۔ اعمال کی ضرورت باقی نہ سمجھی۔ یہودیوں نے بوجہ اپنی عداوت کے جو اُن کو مسیح کے ساتھ تھی کوئی صحیح حالات حضرت مسیح علیہ السلام کے باقی نہ رکھے تھے ہاں وہ ان پر طرح طرح کے ناپاک الزام لگاتے تھے۔ جب اہل کتاب کے دونوں گروہ ایک شخص کے معاملہ میں اس طرح حد بندیوں کو توڑ کر دور نکل چکے تھے اور کوئی صحیح علم حضرت مسیح کے متعلق باقی نہ رہا تھا تو اب سوائے اللہ تعالیٰ کی وحی کے ان واقعات کا صحیح علم دنیا پر دوبارہ نہ آ سکتا تھا۔ یہ واقعی غیب کی خبر تھی جو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر فرمائی اور آج دنیا آہستہ آہستہ اس بات کی قبولیت کی طرف چلی آتی ہے جس کا اعلان آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک اُمی نے جو ایک ناخواندہ قوم میں سے تھا دنیا میں کیا۔

مریم کی عصمت پر شہادت انباء الغیب سے ہے: اس لیے ذٰلک من انباء الغیب نوحیه الیك کے الفاظ ایک اعلیٰ درجہ کی صداقت کی طرف اشارہ کرتے

لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وہ آپس میں جھگڑتے تھے۔۴۲۲

ہیں اور دوسری وجہ کہ حضرت مریم علیہا السلام کی عصمت کی شہادت کو انباء الغیب سے کیوں قرار دیا یہ ہے کہ واقعی گواہ تو اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی کی معرفت اس کی شہادت ادا کی تا دنیا اس حقیقت پر بذریعہ وحی آگاہ ہو جس سے آگاہی کا اور کوئی واقعی ذریعہ نہ رہا تھا۔

۴۲۲ اقلام۔ قَلَم کی جمع ہے اور قلم (ل) یا قلم (غ) کی جمع بھی اقلام آتی ہے جو اس تیر کا نام ہے جو قمار میں کام دیتا تھا۔ اور قَلَم تیر کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کاٹا جاتا ہے۔ کیونکہ قَلَم کے اصل معنی کاٹنے کے ہیں اس لیے ناخن کٹوانے پر بھی بولا جاتا ہے اور یہاں زجاج وغیرہ نے اقلام سے مراد قداح یعنی قرعہ اندازی کے تیر ہی لیے ہیں اور بعض کے نزدیک معمولی قلمیں مراد ہیں جن سے کاہن لوگ لکھا کرتے تھے اور قلم کا لفظ تقدیر الٰہی کے متعلق بھی بولا جاتا ہے گو اس کی کیفیت کا علم کسی انسان کو نہیں دیا گیا۔ جیسا کہ ابن سیدہ کا قول لسان العرب میں منقول ہے والقلم الذی فی التنزیل لا اعرف کیفیتہ اور ایک اعرابی کا قول نقل کیا گیا ہے سَبَقَ الْقَضَاءُ وَ جَفَّتِ الْاَقْلَامُ یعنی قضا و قدر کا فیصلہ ہو چکا اور قلمیں خشک ہو چکیں۔ مراد یہ ہے کہ جو فیصلہ ہونا تھا وہ پہلے ہو چکا۔ پس لوح و قلم میں بغیر کسی تشبیہ کے مراد قضا و قدر ہے۔

اس آیت میں کس واقعہ کی طرف اشارہ ہے؟ بعض کے نزدیک یہ مراد ہے کہ صغر سنی میں جب وہ تعلیم و تربیت کے لیے ہیکل میں آئیں تو اس وقت کاہنوں میں جھگڑا ہوا کہ ان کا کفیل کون ہو اور بذریعہ قرعہ اندازی جو خواہ تیروں سے ہوئی یا قلموں سے حضرت زکریا مریم صدیقہ کے کفیل ہوئے اس صورت میں ماکنت لدیھم وغیرہ میں ضمیر کاہنوں کی طرف ہوگی جن کا کوئی ذکر پہلے نہیں۔ مگر یہ کہا گیا ہے کہ چونکہ زکریا کی کفالت میں مفہوم یہ پایا جاتا ہے کہ یہ کفالت کسی جھگڑے کے بعد ہوئی تھی اس لیے ان جھگڑنے والوں کی طرف ضمیر جاتی ہے یہ بہت بعید تاویل ہے۔

حضرت مریم کی دوسری کفالت مریم کی بلوغت پر تھی: بعض مفسرین کے نزدیک یہ اشارہ کسی ایسی کفالت کی طرف ہے جو مریمؑ کے بلوغ کو پہنچ جانے کے بعد وقوع میں آئی۔ جب زکریا اس کی کفالت سے عاجز آ گئے (ر) یعنی پہلے کوئی جھگڑا نہیں ہوا اور بعض نے دو دفعہ قرعہ اندازی لیکر اس آیت کو اسی دوسری قرعہ اندازی کے متعلق مانا ہے اور گو روح المعانی میں اس قول کو مرجوح لکھا ہے مگر فی الحقیقت اسے ترجیح ہے۔ کیونکہ قرآن کریم ایک پُر نظم کلام ہے اور تمام واقعات کا ذکر ایک ترتیب سے ہوتا چلا آ رہا ہے پہلے مریم کی پیدائش کا ذکر کیا پھر اس کی کفالت زکریا کا ذکر۔ اسی ذکر میں زکریا علیہ السلام کی دعا اور یحییٰ کی بشارت کا ذکر ضمنی طور پر آ گیا۔ اس کے بعد پھر اصل ذکر کی طرف رجوع کیا تو مریمؑ کے اصطفا و پاکیزگی و برگزیدگی کا ذکر کیا۔ اسے فرمانبرداری اور نماز کا حکم دیا۔ یہ واقعات یقیناً زمانہ بلوغت سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے اس کے بعد پھر ایک گزشتہ واقعہ کی طرف اشارہ کرنا بلاغت کے خلاف ہے۔ پس یہ آیت یقیناً اس وقت کی طرف اشارہ کرتی ہے جب مریم صدیقہؑ سن رشد کو پہنچ چکی تھیں اب ان کی تربیت کا زمانہ ختم ہو گیا اور وہ ہیکل میں نہ رہ سکتی تھیں۔ اس لیے بھی کہ بلوغت کے ساتھ ایام حیض کا آنا ضروری تھا اور یہودیوں میں ایامِ حیض کے اندر عورت کو ناپاک سمجھ کر الگ رکھا جاتا تھا۔ مریم صدیقہ کا نکاح: پس یہاں جس کفالت کا ذکر ہے اس سے مراد کفالت نکاح ہے۔ ایک سن بلوغ کو پہنچی ہوئی عورت کے لیے اب یہ ضروری تھا کہ اس کے نکاح کا فکر کیا جاتا۔ اور مریم کی ماں نے مریم کو خدمتِ دین کے لیے نذر کر دینے کے بعد بھی یہ دعا مانگ کر کہ انی اعیذھا بك وذریتھا بتا دیا تھا کہ تارکہ بٹھانا اس کا منشا ہرگز نہ تھا۔ اور نہ تارکہ بٹھانے کا بنی اسرائیل میں کوئی دستور معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ ہیکل کی خدمت کے لیے وقف ہو چکی تھیں اس لیے انہیں یہ اختیار نہ تھا نہ ان کی والدہ کو یا والد کو اختیار تھا کہ ان کے نکاح کی تجویز کریں۔ بلکہ اس کے متعلق قرعہ اندازی سے فیصلہ کرنا مناسب سمجھا گیا۔ کیونکہ وہ بہت سے کام قرعہ اندازی سے کر لیا کرتے تھے اور اسے خدائی فیصلہ سمجھتے تھے۔ جیسا کہ خود کہانت کے کام کے سرانجام دینے میں قرعہ اندازی کو خدائی فیصلہ سمجھا جاتا تھا جیسا کہ اناجیل میں مرقوم ہے "اور جب وہ خدا کے حضور اپنے فریق کی باری پر کہانت کا کام انجام دیتا تھا تو ایسا ہوا کہ کہانت کے دستور کے موافق اس کے نام کا قرعہ نکلا کہ خداوند کے مقدس میں جا کر خوشبو جلائے" (لوقا ۱-۸ و ۹) باقی رہا ذکر خصومت سو یہ بھی کوئی بعید از قیاس بات نہیں ایسی نیک اور پاک بی بی کو اپنی زوجیت میں لانے کی خواہش بہتیرے دلوں میں پیدا ہوئی ہوگی علاوہ ازیں وہ ہیکل کی نذر ہو چکی تھیں گو ماں باپ کا اپنا اختیار تو اس معاملہ میں رہا نہ تھا۔ اس لیے مناسب یہی سمجھا گیا کہ بذریعہ قرعہ اندازی ہی اس کا فیصلہ ہو۔ پس یہاں گویا درحقیقت یہ ذکر ہے کہ مریم کے لیے خاوند کا فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا گیا اور ضمیریں اس صورت میں عام ہیں یعنی وہ لوگ جو اس وقت تھے۔

اور یہ جو فرمایا کہ تم ان کے پاس نہ تھے تو اس میں یا تو یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مریم علیہا السلام کی بریت کی شہادت ایک ایسے شخص کی طرف سے ہے جس کا تعلق فریق مقدمہ سے کوئی نہیں اس لیے یہ نہایت سچی اور بے لوث شہادت ہے اور یا اس لحاظ سے کہا کہ وہ واقعات تمہارے ذریعہ سے ظاہر کیے جاتے ہیں جن کا علم دنیا میں مفقود ہو چکا تھا تم تو ان کے پاس نہ تھے پس یہ علم غیب سوائے خدا کے کون ظاہر کر سکتا تھا۔

ہاں ایک امکان یہ بھی ہے کہ یہ مریم کے اصطفائے روحانی کی طرف اشارہ ہو۔ ملائکہ کا ذکر پہلے آ چکا ہے اور قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کی برگزیدگی کے وقت ملاء اعلیٰ میں ایک خصومت ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ ما کان لی من علم بالملاء الاعلیٰ اذ یختصمون (ص ۳۸-۶۹) مجھے ملاء اعلیٰ کے متعلق کوئی علم نہ تھا، جب وہ جھگڑتے تھے۔ اس صورت میں اقلام سے مراد قضا و قدر ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ اس لفظ کے معنی میں پہلے بیان ہو چکا ہے اور ملائکہ کی طرف اس کو منسوب کرنا اس لیے درست ہے کہ گو سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے مگر وہ ملائکہ کی وساطت سے ہی ہوتا ہے جیسا کہ خدا ہی کلام کرنے والا ہے مگر یہاں قول ملائکہ کی طرف منسوب ہے۔

اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرۡيَمُ اِنَّ اللّٰهَ — جب فرشتوں نے کہا، اے مریم! اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک
يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنۡهُ ۖ اسۡمُهُ الۡمَسِيۡحُ — کلام کے ساتھ خوش خبری دیتا ہے[۴۲۳]۔ اس (مبشّر) کا نام مسیح عیسیٰ بن
عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ وَجِيۡهًا فِى الدُّنۡيَا — مریم ہے[۴۲۴] جو دنیا اور آخرت میں وجاہت والا اور مقربوں

ع۴۲۳ کلمۃ اللہ سے مراد: ان اللّٰه يبشّرك بكلمة منه اس کے معنی میں نے یوں کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلام کے ذریعہ بشارت دیتا ہے۔ مگر عام طور پر اس کے معنی یوں کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تجھے اپنے ایک کلمہ کی بشارت دیتے ہیں اس معنی کے لحاظ سے گویا مسیح کو اللہ تعالیٰ کا ایک کلمہ کہا گیا ہے۔ اور عیسائیوں کا اس پر بہت زور ہے کہ مسیح کو کلمۃ اللہ کہہ کر قرآن شریف نے ایک ایسی خصوصیت دیدی ہے جو دوسرے کسی نبی کو نہیں دی۔ اور پھر اس خصوصیت کی بنیاد پر مسیح کو خدا بنایا جاتا ہے۔ یہی وہ دلیل ہے جو وفد نجران نے نبی کریم صلعم کے مقابلہ پر پیش کی اور یہی وہ دلیل ہے جس پر آج بھی عیسائی زور دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم نے کیسا لطیف جواب بھی ان لوگوں کو دیدیا تھا کہ اس کی بشریت یا خدائی کا فیصلہ اصولی رنگ میں کرو۔ کیا جس شخص کے ساتھ کھانے پینے، قضائے حاجت کی ضروریات، ماں کے رحم میں رہنے، پیدا ہونے بڑھنے، جوان اور پھر بوڑھا ہونے کے پھر وفات پانے کے عوارض پائے جاتے ہوں اس کو بشر کہیں گے یا خدا۔ مگر ہر ایک باطل پرست کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ اصولی بحث سے گریز کرتا ہے اور خصوصیات میں جاکر پناہ ڈھونڈھتا ہے۔ اب اگر یہ بھی مان لیں کہ مسیح کو کلمۃ من اللہ کہا گیا ہے اور اور کسی نبی کا نام لیکر اس کے ساتھ کلمۃ اللہ کا لفظ نہیں بولا۔ تو کیا اس سے مسیح کی خدائی ثابت ہو سکتی ہے یا بشریت کے دائرہ سے وہ نکل جاتا ہے یہ محض ایک دعویٰ ہے جس کی دلیل کوئی نہیں کہ کیونکر صرف اس خصوصیت سے دائرہ بشریت سے نکل کر مسیح خدا بن جاتا ہے۔

بروئے قرآن کلمات اللہ بہت ہیں: پھر مسیح کو تو کلمۃ منه کہا یعنی اپنی طرف سے ایک کلمہ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکیلا ہی کلمہ نہیں بلکہ کلموں میں سے ایک کلمہ ہے اور اپنے کلمات کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قل لو كان البحر مدادا لكلمات ربي لنفد البحر قبل ان تنفد كلمات ربي (الکھف ۱۸: ۱۰۹) کہو اگر میرے رب کے کلمات کے لیے سمندر بھی سیاہی بن جائیں تو میرے رب کے کلمات اس قدر لاتعداد لاتحصے ہیں کہ سمندر ختم ہو جائیں مگر وہ کلمات ختم نہ ہوں۔ تو کیا صاف ظاہر نہیں کہ اس لاانتہا تعداد میں سے جو اللہ تعالیٰ کے کلموں کی ہے ایک کلمہ مسیح بھی ہے۔ پس خصوصیت بھی کوئی نہ رہی۔ پھر کلمۃ منه کے معنی تو صرف اس قدر ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک کلام ہے۔ کلمہ یا قول کے آنے سے مراد: اب جب کوئی شخص کوئی بات کرے اور وہ بات پوری ہو جائے تو کہتے ہیں جاء كلامه یا جاء قوله۔ اس کا کلام یا اس کا قول آگیا۔ اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ کلام یا قول مجسم ہو کر آگیا۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جو اس نے کہا تھا وہ پورا ہو گیا ہے پس اس معنی میں مسیح کو کلمۃ اللہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے ایک بات کہی تھی وہ مسیح کے آنے سے پوری ہو گئی۔ پس مسیح کے آنے میں گویا خدا کا کلام آگیا۔ چنانچہ یہی توجیہ مفسرین نے پسند کی ہے جیسا کہ امام رازی کہتے ہیں انه قد وردت البشارة في كتب الانبياء الذين كانوا قبله فلما جاء قيل هذا هو تلك الكلمة۔ یعنی ان نبیوں کی کتابوں میں جو اس سے یعنی مسیح سے پہلے گزر چکے تھے مسیح کے متعلق بشارت تھی۔ پس جب مسیح آیا تو کہا گیا کہ وہ کلمہ آگیا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نسبت فرماتے ہیں انا دعوة ابي ابراهيم میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔ حالانکہ آپ کوئی دعائے مجسم تو نہ تھے۔ مگر چونکہ آپ کے وجود میں حضرت ابراہیم کی دعا پوری ہوئی اس لحاظ سے آپ نے اپنے آپ کو دعا کہہ دیا ہے۔

کلمہ کی دوسری توجیہ: دوسری توجیہ یہ ہے کہ يبشرك بكلمة منه میں با ذریعہ کے لیے ہے یعنی معنی یہ ہیں کہ اے مریم اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلمہ کے ساتھ بشارت دیتا ہے اور یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے حضرت ابراہیم کو اسحاق کی بشارت ملی تو آپ نے فرمایا فبم تبشرون تو جواب اس کا یوں دیا گیا بشرناك بالحق ہم تمہیں حق کے ساتھ بشارت دیتے ہیں یہ مراد نہیں کہ الحق کی بشارت دیتے ہیں۔ اب يبشرك بكلمة منه اور بشرناك بالحق بالکل ایک جیسی مثالیں ہیں اگر ایک کے ذریعہ سے مسیح کلمۃ اللہ بن سکتا ہے تو دوسرے کے ذریعہ اسحاق الحق بن سکتا ہے۔ حالانکہ بات صرف اس قدر ہے کہ ایک جگہ تو یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے ساتھ بشارت دیتا ہے اور دوسری جگہ مراد ہے کہ ہم تم کو حق کے ساتھ بشارت دیتے ہیں۔ اس صورت میں مفعول کو محذوف کر کے اس کی بجائے فرمادیا اسمه المسيح وہ جس کی بشارت ہم دیتے ہیں اس کا نام مسیح ہے۔ تو کلمۃ منه سے مراد صرف اللہ تعالیٰ کی پیشگوئی ہے اور اسی کی موید یہ بات ہے کہ کلمۃ منه کے بعد فرمایا اسمه۔ حالانکہ کلمۃ مونث ہے۔ پس اسمه میں ضمیر مبشّر بہٖ کی طرف جائے گی یعنی اس کا نام جس کی بشارت دی جاتی ہے۔

ع۴۲۴ اسم وہ ہے جس سے ایک چیز کی ذات اور اس کا اصل پہچانا جائے (غ) اسم سے مراد عَلَم بھی ہوتا ہے اور اسم سے مراد بلحاظ معنی لغوی علامت ممیزہ بھی ہوتے ہیں (رد) یہاں دونوں معنوں کو جمع کر دیا ہے۔ کیونکہ المسیح جس کو مقدم کیا ہے وہ لقب ہے جو بعد نبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ملتا ہے اور ابن مریم آپ کی کنیت ہے۔ المسیح۔ مَسح کے معنی کسی چیز پر ہاتھ کا پھیرنا اور اس سے اثر کا دور کر دینا ہے (غ)، اور پھر ان دونوں معنوں میں الگ الگ بھی استعمال ہوتا ہے وعُبّرَ عن السير بالمَسح (غ) اور سیر یعنی چلنے کو بھی مسح کہتے ہیں۔ قيل سُمّيَ عيسى عليه السلام مسيحا لكونه ماسحًا في الارض اى ذاهبًا فيها یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام مسیح اس لیے رکھا گیا کہ وہ زمین میں چلنے والے یا سیاحت کرنے والے تھے۔ اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت مسیح علاوہ ملک شام کے دوسرے ممالک میں بھی پھرتے رہے اور کہ وہ افغانستان اور کشمیر میں آئے اور اس کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل زمانہ قید میں کچھ جلا وطن ہو کر افغانستان وغیرہ کی طرف

وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٤٥﴾ ہیں سے ہوگا[425]
وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا اور وہ لوگوں سے جھولے میں اور ادھیڑ عمر میں باتیں کریگا
وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٤٦﴾ اور نیکوں میں سے ہوگا[426]

چلے آئے تھے اور افغان اپنے آپ کو بنی اسرائیل کہتے ہیں اور افغانستان اور کشمیر کے شہروں کے ناموں میں اور افغانوں اور کشمیریوں کے رسم و رواج میں بھی اس کی شہادت ملتی ہے ضرور تھا کہ مسیح ان اسرائیلی اقوام کی طرف بھی آتے۔ دیگر وجوہات یہ دی ہیں کہ آپ کے ہاتھ لگانے سے بیمار اچھے ہوجاتے تھے یا آپ ماں کے پیٹ سے مَمسوح بالدُّھن پیدا ہوئے تھے اور پھر لکھا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ مسیح وہ ہے جس کی ایک آنکھ ماری ہوئی ہو۔ وقد رُوِی ان الدجال ممسوحُ الیمنی وعیسٰی ممسوح الیسرٰی قال ولیعنی بان الدجال قد مُسِحَتْ عنہ القوۃ المحمودۃ من العلم والعقل والحلم والاخلاق الجمیلۃ وان عیسٰی مسحت عنہ القوۃ الذمیمۃ من الجھل والشَّرَہِ والحِرصِ وسائر الاخلاق الذمیمۃ (غ) اور روایت کی گئی ہے کہ دجال کی دائیں آنکھ ماری ہوئی ہوگی اور عیسٰی کی بائیں آنکھ ماری ہوئی ہوگی اور مراد اس سے یہ ہے کہ دجال سے علم اور عقل اور حلم اور اچھے اخلاق کی قابل تعریف قوت جاتی رہی ہوگی۔ اور عیسٰی سے جہل اور لالچ اور حرص اور بُرے اخلاق کی قابل نفرت قوت جاتی رہی ہوگی۔ امام راغب کی اس تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کا کانا ہونا محض بلحاظ صفات ہے اور ان بزرگوں نے ان پیشگوئیوں کو مجاز اور استعارہ پر حمل کیا ہے۔

ع[425] وجیہ کے معنی ہیں ذوجاہ یا ذووجاھۃ یعنی مرتبہ یا وجاہت والا۔ حضرت موسٰی کے متعلق فرمایا وکان عند اللہ وجیھا (الاحزاب[33]۔ ٦٩) اللہ تعالیٰ کے انبیاء سب ہی وجاہت والے ہوتے ہیں۔ مسیح کو وجیہ کہنے کی وجہ: یہاں اشارہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ سمجھیں گے کہ یہ شخص ذلیل ہوگیا مگر ایسا نہ ہوگا بلکہ اسے دنیا میں بھی ضرور وجاہت حاصل ہوگی اور آخرت میں بھی۔ جس قدر تاریخ حضرت مسیح کی عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے وہ بظاہر انہیں ایک ذلت کی حالت میں چھوڑتی ہے۔ کیونکہ ان کا خاتمہ چوروں کے ساتھ صلیب پر ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ انبیاء کو کچھ نہ کچھ کامیابی دیکر اُٹھاتا ہے۔ حضرت عیسٰی کے متعلق وجیہ فی الدنیا فرمانا یہی معنی رکھتا ہے کہ لوگ انہیں ناکام سمجھیں گے مگر فی الحقیقت وہ کامیابی کے بعد اٹھائے جائیں گے۔ یہ کامیابی حضرت عیسٰی کو یہودیت المقدس میں حاصل نہیں ہوئی۔ ان الفاظ سے یہ خیال اور بھی قوت پکڑتا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام واقعہ صلیب کے بعد بنی اسرائیل کی دوسری قوموں کی طرف چلے گئے جو بخت النصر کے زمانہ میں جلاوطن ہوکر دوسرے ممالک میں آباد ہو چکی تھیں۔

ومن المقربین۔ یعنی حضرت عیسٰی خدا کے مقربوں میں سے ایک ہیں۔ کہتے ہیں ڈوبتا ہُوا تنکے کا سہارا ڈھونڈھتا ہے۔ وہی حالت بعض وقت عیسائی مشنریوں کی ہوجاتی ہے۔ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ قرآن نے مسیح کو مقرب کہا اور مقرب ملائکہ ہوتے ہیں اس لیے مسیح کو بشر سے اوپر مانا ہے۔ چونکہ قرآن کریم سے محض بے خبر ہیں ان کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ جن مقربین میں سے مسیح کو کہا ہے ان مقربین میں اُمت محمدیہ کا ایک گروہ بھی داخل ہے السابقون السابقون اولٰئک المقربون (الواقعہ[56] ١٠۔ ١١) یعنی سابقین اس امت کے مقربین بارگاہ الٰہی ہیں۔ اور دوسری جگہ ہے عینا یشرب بھا المقربون (المطففین[83]۔ ٢٨) وہاں بھی امتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گروہ کو ہی مقرب قرار دیا ہے جیسا کہ اس سے پہلے الفاظ ان کتاب الابرار سے ظاہر ہے۔ پس جب صلحاء بھی مقربین بارگاہ الٰہی ہیں تو حضرت مسیح کو خصوصیت سے مقربوں میں سے ایک کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ انبیاء بدرجہ اولیٰ مقرب ہوئے۔ سو بات یہ ہے کہ یہودیوں نے عداوت سے اور عیسائیوں نے بیوقوفی سے (ضلالت محبت میں) حضرت عیسٰی علیہ السلام کو نعوذ باللہ ملعون قرار دیا۔ کیونکہ دونوں ان کی صلیب پر موت مانتے ہیں اور ملعون وہ ہے جو خدا سے دُور کیا گیا ہو اس لیے اس الزام لعنت سے صاف کرنے کے لیے قرآن کریم نے مسیح کو من المقربین کہا ہے اور دوسری جگہ اس قرب کو لفظ رفع سے ظاہر کیا ہے اور من المقربین خود بتاتا ہے کہ مسیح کے علاوہ اور بھی مقرب ہیں۔

ع[426] المھد۔ مَھد کے ایک معنی ع[265] میں بیان ہوئے ہیں۔ خصوصیت سے اس جگہ کو کہا جاتا ہے جو بچے کے لیے تیار کی جاتی ہے یعنی جھُولا۔

کھل۔ کَہل کی عمر کی مختلف حدیں اہل لغت نے بیان کی ہیں مگر صحیح وہ ہے جو راغب نے لکھا ہے اور لسان العرب میں بھی ہے کہ کَہل وہ ہے جس کے سیاہ بالوں کے اندر سفید مل گئے ہوں۔

الصالحین۔ صالح۔ صلاح سے ہے جو فساد کی ضد ہے اور ان دونوں کا اکثر استعمال افعال میں ہے (غ) مگر خود قرآن شریف میں لئن اٰتیتنا صالحا (الاعراف[7]۔ ١٨٩) میں صالح سے مراد صحیح سالم ہے جیسا کہ اس سے اگلی آیت میں فلما اٰتٰھما صالحا کہہ کر واضح کر دیا۔ کیونکہ جب بچہ پیدا ہو تو اس کی صلاحیت افعال کی فوراً معلوم نہیں ہوتی صلاحیت جسم کی معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے وہاں صالحا کے معنی ولدا اسویا قد صلح بدنہ کیے ہیں (ض) اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ صلاح کبھی استوائے خلق یعنی صحیح سالم ہونے میں ہوتی ہے اور کبھی دین میں۔

اس آیت میں تین باتیں بیان کی ہیں۔ حضرت مسیح کا جھولے میں باتیں کرنا۔ بڑھاپے میں باتیں کرنا۔ صالح ہونا۔ سب بچے عموماً جھولے میں ہی باتیں کرنا سیکھتے ہیں۔ کیونکہ دو سال کی عمر تک جھولے میں رہتے ہیں۔ لیکن حضرت مسیح کے متعلق جو یہ الفاظ آئے ہیں تو ان سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ آپ کا بچپن میں باتیں کرنا معجزہ تھا اور اس کی بشارت دی گئی ہے اور اس کے ساتھ چونکہ کہولت میں باتیں کرنے کا ذکر ہے اس لیے اس کو بھی معمولی حالت سے الگ کرکے نزول ثانی میں باتیں کرنے

قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ وَلَدٌ وَّلَمۡ يَمۡسَسۡنِىۡ بَشَرٌ ‌ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ‌ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ

اس نے کہا میرے رب میرے بیٹا کیوں کر ہوگا اور مجھے کسی انسان نے چھوا نہیں ، فرمایا اسی طرح ہوگا ، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جب کسی امر کا فیصلہ کر دیتا ہے تو اُسے

پر محمول کیا گیا ہے لیکن اس کی غلطی خود اسی سے ظاہر ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کو یہ بشارت دینے کے کیا معنی ؟ کیا ان کو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے نزول ثانی کا مسئلہ بھی بتا دیا گیا تھا ؟ اور اگر بتانا ہی تھا تو یہ بتایا جاتا کہ اسے آسمان پر زندہ اُٹھایا جائے گا۔ اور پھر آخری زمانہ میں نزول ہوگا۔ اتنی بات بتانے سے کہ وہ حالت کہولت میں لوگوں سے باتیں کریگا ان کو یہ کس طرح پتہ لگ سکتا تھا کہ یہ کسی نزول ثانی کا ذکر ہے پھر یہ دو تو معجزے ہو گئے۔ تیسری بات آپ کا صالح ہونا آیا یہ بھی معجزہ تھا ؟

جھولے کے کلام پر بحث : انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا انکار کوئی مسلمان نہیں کر سکتا لیکن مفسرین کو یہاں خود یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ حضرت مسیح کا جھولے میں باتیں کرنا کس کا معجزہ تھا ؟ حضرت مسیح کا ؟ تو وہ ابھی نبی نہیں بنے۔ اس لیے اس کو ارہاص کہنا پڑا حضرت مریم کا ، تو وہ نبی نہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ ایک بچہ کو چھوڑ کر خشک لکڑی سے بھی کلام کرا دے۔ جیسا کہ نبی کریمؐ کے ٹیک لگانے کی لکڑی کی آواز آپ کے معجزات میں سے ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ آیا قرآن و حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ معجزہ ہے۔ اوّل۔ حضرت مریم کو یہ تو بتایا نہیں گیا کہ یہ بچہ نبی ہوگا۔ صرف یہ بتایا گیا کہ وجیہ ہوگا ، مقرب ہوگا۔ اور مقرب ہونے کے لیے نبی ہونا ضروری نہیں۔ پھر آپ کے معجزات پر کیونکر ایک بے محل کلام شروع کر دیا۔ دوم ماں کو بچہ کی بزرگی ، دینی اور دنیوی صلاح کی خبر سے تو خوشی پہنچتی ہے اور اس بشارت سے کیا حاصل کہ وہ ایک معجزہ بھی دکھائے گا۔ سوم اگر معجزات کی بشارت ہی مریم صدیقہ کو سنانی تھی تو جو اس سے بڑے بڑے معجزات تھے ان کا ذکر کیوں نہ کیا۔ چہارم جو کلام اس سے مراد لیا گیا ہے وہ وہ ہے جس کا ذکر سورۃ مریم ہے انی عبد اللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبیا وجعلنی مبارکاً این ماکنت واوصنی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادمت حیّا وبرا بوالدتی (مریم ۱۹ ۔ ۳۰ سے ۳۲) اس پر مفصل بحث تو اپنے موقعہ پر ہو گی۔ لیکن اس قدر یہاں ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ یہ کلام جھولے کے بچہ کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب[۱] دی ہے۔ مجھے نبی[۲] بنایا ہے۔ مجھے بابرکت[۳] بنایا ہے۔ جہاں کہیں جاؤں مجھے نماز[۴] کا حکم دیا ہے اور زکوٰۃ[۵] کا حکم دیا ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں ماں[۶] سے نیکی کرنے والا بنایا ہے۔ اب یہ سب کلام ایک بالغ انسان کا ہے جو نہ صرف مکلف ہو چکا ہے بلکہ جس کو کتاب و نبوت مل چکی ہے اور ظاہر ہے کہ کتاب و نبوت ملنے کے یہ معنی ہیں کہ انجیل آپ پر وحی ہوتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے پہلے فرما دیا تھا کہ ہم تم کو نبی بناتے ہیں اور یہ بالبداہت غلط ہے علاوہ ازیں ابھی آگے آتا ہے ویعلمہ الکتاب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل جس سے معلوم ہوا کہ انجیل کے نزول سے پہلے آپ لکھنا بھی جانتے تھے اور حکمت کی باتوں سے بھی آگاہ ہو چکے تھے اور تورات بھی پڑھ چکے تھے آخر اس معمہ کو بھی حل کرنا چاہیئے کہ ایک دن کا بچہ یہ سب کچھ سیکھ چکا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی اس پر نماز اور زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی اور مادمت حیا کی شرط نے بتا دیا کہ اس وقت بھی فرض تھی۔ جب یہ کلام کر رہے تھے۔ اگر بچپن کا کلام ہوتا تو بجائے اس کے یوں ہوتا کہ مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب میں بلوغت کو پہنچ جاؤں۔

پھر ان الفاظ کا کیا مطلب ہے ؟ تین باتیں بتائی ہیں۔ طفولیت میں کلام کرنا۔ کہولت کی حالت میں کلام کرنا صالح ہونا۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں صالح سے مراد نیک کام کرنے والا نہیں بلکہ صحیح سالم تندرست بچہ مراد ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اوپر آپ کو مقرب بارگاہ الٰہی کہدیا تو اب یہ بتانا کہ وہ نیک کام کرنیوالا ہوگا تحصیل حاصل ہے۔ نیک کام کرنے والے ہی مقرب ہوا کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں حضرت مریم کو جب فرزند کی خوشخبری دی تو فرزند کے متعلق جن باتوں کا خیال والدین کو ہوتا ہے وہ بھی بتا دیں دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا۔ مقرب بارگاہ الٰہی ہوگا یعنی کمال روحانی کو حاصل کرے گا۔ کوئی جسمانی نقص بھی اس میں نہ ہوگا اور وہ بڑھاپے کی عمر کو بھی پہنچے گا۔ یعنی لمبی عمر بھی پائے گا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے قویٰ کے صحیح سالم ہونے کا علم تو فوراً ہو جاتا ہے مگر یہ بات کہ وہ باتیں بھی کرے کچھ مدّت بعد ظاہر ہوتی ہے اس لیے اس کی الگ خوشخبری بھی سنا دی، پھر یہ بات کہ وہ عمر بھی پائے گا یہ بھی دیر میں ظاہر ہوتی ہے اس لیے اس کی خوش خبری بھی سنا دی، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہو کہ بچپن میں اس کی باتیں معمولی بچوں سے بڑھ کر دانش کی باتیں ہوں گی اور بڑی عمر کو پہنچ کر اس کا کلام معمولی لوگوں سے بڑھ کر پُر حکمت کلام ہوگا۔

بشارت کے ذکر میں نفی الوہیت مسیح : لیکن قرآن کریم ایک ایسا پُر حکمت کلام ہے کہ ایک ذکر کرنے سے کئی کئی باتیں بتا دیتا ہے۔ حضرت مریم کو جو خوشخبری دی اس کا ذکر قرآن شریف میں آخر کیوں کیا۔ ظاہر ہے کہ اس سارے بیان کی اصل غرض تو عیسائیوں پر اتمام حجت ہے۔ اس لیے جب وجیہ فی الدنیا کہا تو بتا دیا کہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ درست نہیں کہ دنیوی طور پر حضرت مسیح کو کوئی عزت حاصل نہیں ہوئی بلکہ ان کا خاتمہ ماریں کھاتے کھاتے ہو گیا۔ اور آخرت میں وجیہ کہہ کر یہ بتا دیا کہ یہودی بھی غلطی پر ہیں۔ اور مقرب کہہ کر یہودیوں اور عیسائیوں کے اس خیال کی تردید کی کہ آپ نعوذ باللہ من ذٰلک ملعون ہوئے کیونکہ ملعون یعنی مطرود یا راندہ درگاہ کے مقابلہ پر مقرب بارگاہ الٰہی ہے اور عیسائی بھی آپ کو تین دن کے لیے ملعون قرار دیتے ہیں اور مہد اور کہولت کا ذکر کر کے یہ بتا دیا کہ آپ پر وہ تمام تغیرات آئے جو بچوں پر جھولے کی حالت سے لیکر کہولت تک آتے ہیں۔ یعنی بڑھے، جوان ہوئے، پھر بڑھاپا یعنی انحطاط شروع ہوا اور یوں

لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ کہتا ہے ہو پس وہ ہو جاتا ہے۔ ۴۲۷ء

تردید الوہیت کی۔ اور اس کا اعتراف مفسرین کو بھی ہے وذکر احوالہ المختلفۃ المتنافیۃ ارشاد الی انہ بمعزل عن الالوہیۃ (رض) جن لوگوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان باتوں کو صرف بوجہ ان کے معجزہ ہونے کے ہی ذکر کیا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے حضرت مسیح اور ان کی والدہ کے متعلق کھانا کھانے کا ذکر کیا کانا یاکلان الطعام (المائدۃ ۵-۷۵) جس میں مراد نفی الوہیت ہے۔ ورنہ کھانا تو ساری دنیا کھاتی ہے حضرت مریم کے آپ کو حمل میں لینے کا ذکر کیا۔ درد زہ کے ساتھ جننے کا ذکر کیا۔ یہ سب کچھ عام طور پر ہوتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ یہ خدا نہیں ہو سکتا اور مھلا اور کھولت کے ذکر کی اصل غرض ہے کہ خدا تعالیٰ پر یہ تغیرات نہیں آسکتے۔

۴۲۷ء جس طرح حضرت زکریا کو باوجود دعا کے اور اس یقین کے کہ اس کی دعا ردّ نہ ہو گی بیٹے کی خوشخبری ملی تو ان کا خیال فوراً اس طرف گیا کہ اس قدر رکاوٹ کے باوجود کہ میں بڈھا ہو گیا اور میری عورت بانجھ ہے۔ بچہ کب ہو گا، کس طرح ہو گا۔ اسی طرح حضرت مریم کو جب بیٹے کی بشارت ملتی ہے تو وہ متعجب ہوتی ہیں کہ بچہ کب پیدا ہو گا یا کس طرح ہو گا جب ابھی تک مرد کے ساتھ تعلق ہی نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ایک ہی جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے یا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

حضرت مسیح کی بن باپ پیدائش اسلامی عقاید میں داخل نہیں عیسائیت کا اصول ہے: عیسائی حضرت مسیح کی پیدائش بن باپ مانتے ہیں اور مسلمان بھی عموماً ایسا ہی مانتے ہیں مگر عیسائیوں میں بھی ایسے لوگ ہیں جو بن باپ نہیں مانتے اور مسلمانوں میں بھی۔ ہاں ان دونوں میں ایک فرق ہے۔ اگر فی الواقع حضرت مسیح بن باپ پیدا نہیں ہوئے تو اس سے مسلمانوں کے کسی عقیدہ میں ذرّہ بھر فرق نہیں آتا۔ کیونکہ ان کو بن باپ پیدا شدہ ماننا ان کے عقاید میں داخل نہیں۔ لیکن عیسائیت کی عمارت کی بنیاد ہی اکھڑ جاتی ہے اگر یہ ثابت نہ ہو سکے کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ اگر وہ باپ رکھتے تھے تو نہ روح القدس سے حضرت مریم حاملہ ہوئیں۔ نہ مسیح میں الوہیت تھی نہ کفارہ صحیح رہا۔ پس حضرت مسیح کا بن باپ پیدا نہ ہونا عیسائیت کو بیخ و بن سے اکھاڑتا ہے اور اسلام کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ ایک مسلمان حضرت مسیح کی نبوت کا اس صورت میں بھی قائل ہے کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے ہوں اور اس صورت میں بھی کہ بن باپ پیدا نہ ہوئے ہوں۔ وہ صرف اس قدر دیکھ لے گا کہ قرآن کریم نے کیا فرمایا ہے یا نبی کریم صلعم کی احادیث سے کیا ثابت ہے اگر ان دونوں میں بن باپ پیدا ہونا مذکور ہو تو وہ مان لیگا ورنہ نہیں نہ ہی اگر وہ بن باپ پیدا ہوئے ہوں تو اس سے ان کی کوئی فضیلت ان انبیاء پر ثابت ہوتی ہے جو باپ سے پیدا ہوئے۔ کیونکہ یوں تو حضرت آدم اور حوّا بھی بن باپ پیدا ہوئے اور بائبل میں ملک صدق کا ذکر موجود ہے جو "بے باپ بے ماں" تھا دیکھو عبرانیوں ۷: ۳۔ تو اس صورت میں یہ تینوں حضرت مسیح سے بھی افضل ٹھہرے مگر یہ استدلال ہی غلط ہے کہ بن باپ پیدا شدہ انسان بڑا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک مسلمان یہ بھی نہیں مانتا کہ حضرت مریم روح القدس سے حاملہ ہوئی تھیں۔ اگر وہ بن باپ بھی پیدا ہوئے تو یہ محض ایک عجوبہ قدرت خالقیت ہے کہ حضرت مریم میں دونوں قسم کی طاقتیں رکھ دی تھیں بلکہ یہ معجزہ بھی کوئی نہیں اس لیے کہ معجزہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس پر کسی کی شہادت ہو کوئی دیکھنے والا اس کا گواہ ہو مگر بغیر خاوند کے حمل ہونے کی گواہی سوائے مریم کے کوئی دوسرا دے ہی نہیں سکتا یہ کرامت یا معجزہ کیا ہوگا پس ہم نے صرف اس قدر دیکھنا ہے کہ قرآن شریف یا احادیث نبوی سے اس بارہ میں کیا معلوم ہوتا ہے۔

نسل انسان کی پیدائش کے متعلق خدا کا بیان کردہ قانون: اب اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اس نے نسل انسانی کے لیے یہ قانون بنایا ہے ثم جعل نسلہ من سللۃ من ماء مھین (السجدۃ ۳۲-۸) یعنی آفرینش اول کے بعد اس کی نسل کو نطفہ سے چلایا ہے اور فرماتا ہے انا خلقنا الانسان من نطفۃ امشاج (الدھر ۷۶-۲) ہم انسان کو مرد و عورت کے ملے ہوئے نطفہ سے پیدا کرتے ہیں پس جب تک اللہ تعالیٰ بالتصریح یہ نہ فرمائے کہ عیسیٰ کو ہم نے اپنے اس قانون کے خلاف یا الگ رنگ میں پیدا کیا تھا اس وقت تک یہی ماننا ہو گا کہ وہ اسباب جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے وہ اسی رنگ کے تھے یہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کوئی سوال نہیں کہ اس کو ایسا کرنے کی قدرت ہے یا نہیں۔ اس کو بغیر باپ چھوڑ کر ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا کرنے کی قدرت ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ قرآن شریف سے یا حدیث صحیح سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کیا اور جب وہ خود ایک قانون بتاتا ہے تو جب تک خود ہی نہ فرمائے کہ فلاں معاملہ میں اس نے اس قانون کے خلاف اپنی قدرت کا اظہار کر دکھایا اس وقت تک خود بخود ہمارا کسی امر کو اس قانون کے خلاف سمجھ لینا جائز نہیں۔ پس اگر کوئی شخص قرآن کریم کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ حضرت عیسےٰ کا بن باپ پیدا ہونا تسلیم کیا گیا ہے تو وہ ایسا مانے میرے نزدیک یہ نتیجہ الفاظ قرآنی سے نہیں نکلتا۔ گو میں اس مسئلہ کو اس قدر اہمیت نہیں دیتا مگر تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ نیک نیتی سے جو کچھ منشائے قرآن سمجھے اس کو ظاہر کر دے۔ حضرت عیسیٰ کو باپ والا یا بن باپ ماننے سے ہمارے دینی اعتقادات یا ہمارے عمل پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوتا۔

مس بشر: کیا الفاظ لم یمسسنی بشر سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے لم یمسسنی میں گزشتہ کا ذکر ہے کہ مجھے بشر نے نہیں چھوا؟ اس میں آئندہ کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن کہا جائیگا کہ ہر ایک عورت جانتی ہے کہ بیٹا خاوند سے ہوتا ہے۔ مریم کو یہ کہنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ یہ اس لیے کہ حضرت مریم ہیکل میں رہتی تھیں اور انہیں ابھی علم بھی نہ تھا کہ ان کا نکاح ہونے والا ہے۔

توریت و انجیل کی تاریخی شہادت: توریت و انجیل میں بیشک تحریف ہوئی لیکن آخر ان کی پیشگوئیوں میں بہت کچھ صداقت موجود رہی ہے۔ اسی طرح تاریخی واقعات میں جس بات کو قرآن کریم نہ جھٹلائے اس کے رد کرنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں۔ اب اناجیل سے ثابت ہے کہ حضرت مریم کے ساتھ یوسف کا تعلق زوجیت

وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۝۴۸

اور وہ اسے کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل سکھائے گا ۴۲۸

وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّيْ قَدْ

اور وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوگا ۴۲۹ - کہ میں تمہارے

کا تھا۔ اور اسی تعلق سے آپ کے ہاں بہت سی اولاد بھی ہوئی۔ ذیل کی عبارتیں قابل غور ہیں:-
"پس یوسف...... اپنی بیوی کو اپنے ہاں لے آیا اور اس کو نہ جانا جب تک وہ بیٹا نہ جنی" (متی ۱: ۲۴ و ۲۵) "جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ رہا تھا تو دیکھو اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور اس سے باتیں کرنی چاہتے تھے۔ کسی نے اس سے کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے باتیں کرنی چاہتے ہیں" (متی ۱۲: ۴۶ و ۴۷) "کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں؟ اور اس کی ماں کا نام مریم اور اس کے بھائی یعقوب اور یوسف اور شمعون اور یہوداہ نہیں؟ اور کیا اس کی سب بہنیں ہمارے ہاں نہیں؟" (متی ۱۳: ۵۵) بہنوں کے لیے جمع کے صیغہ سے مفسرین بائبل نے یہ صاف استدلال کیا ہے کہ کم سے کم تین بہنیں آپ کی تھیں۔ بعض مفسرین نے اس مصیبت کو یوں ٹالنا چاہا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ یوسف کی پہلی بیوی کی اولاد تھی اور حضرت مریم ان کی دوسری بیوی تھیں۔ مگر ایک طرف تعلق زوجیت کا حضرت مریم اور یوسف میں موجود ہونا خود انجیل سے ظاہر ہے دوسری طرف ماں کے ساتھ بھائیوں کا آنا صاف بتاتا ہے کہ یہ اسی ماں کی اولاد تھے۔ سوتیلے بھائی ہوتے تو مریم سے ان کا کیا تعلق تھا۔ تیسرے کہیں بھی سوتیلے بھائی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا اور جب لفظ بھائی مطلقاً استعمال کیا جائے گا تو اس سے مراد حقیقی بھائی لیا جائے گا۔ پس یہ انجیلی شہادت صاف بتاتی ہے کہ حضرت مریم کا تعلق زوجیت تو یوسف کے ساتھ ضرور ہوا اور اس تعلق سے اولاد بھی پیدا ہوئی اور اگر ایک طرف لم یمسسنی بشر اس وقت کے بعد مس بشر سے مانع نہیں تو دوسری طرف تاریخی ثبوت کھلا کھلا موجود ہے کہ واقعی میاں بیوی کے تعلقات حضرت مریم اور آپ کے شوہر میں رہے۔
حدیث کی شہادت کہ حضرت مسیح معمولی حالات میں حمل میں آئے اور پیدا ہوئے: والتی احصنت فرجھا (الانبیاء۲۱-۹۱) سے بھی اس کے خلاف دلیل نہیں پکڑی جا سکتی کیونکہ احصان کے معنی قید نکاح میں آنا ہے جیسا کہ اپنے موقعہ پر دکھایا جائے گا۔ حدیث ایک بھی ایسی نہیں ملتی کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا ہو کہ حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے بلکہ آپ کی جو گفتگو وفد نجران کے ساتھ لکھی ہے جس کو میں اوپر ع۳۶۸ میں نقل کر چکا ہوں اس میں نبی کریم صلعم کے یہ صاف الفاظ مروی ہیں الستم تعلمون ان عیسیٰ حملتہ امرأۃ کما تحمل المرأۃ کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰ کو اس کی ماں نے حمل میں لیا جس طرح عورتیں بچوں کو حمل میں لیا کرتی ہیں اور عورتیں بچوں کو اپنے خاوندوں سے ہی حمل میں لیتی ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر صفائی سے جب عیسائیوں نے یہ سوال کیا فقالوا من ابوہ یعنی اس کا باپ کون ہے؟ تو آپ نے یہ جواب نہیں دیا کہ اس کا باپ کوئی نہیں بلکہ جواب میں فرمایا الستم تعلمون انہ لایکون ولد الا وھو یشبہ اباہ کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی بیٹا نہیں مگر وہ اپنے باپ سے مشابہ ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے یہ بتا دیا کہ حضرت عیسیٰ کا باپ انسانوں میں سے ہی کوئی ہے کیونکہ اس کی شکل انسانوں سے ملتی ہے اگر آنحضرت صلعم نے اسباب کو ظاہر کرنا ہوتا کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوا تو جیسا کہ اکثر مفسرین نے لکھا ہے یوں فرماتے کہ وہ آدم کی طرح بن باپ ہے یا کلمہ کن سے پیدا ہوا ہے پس یہ تمام امور اس بات پر دلیل ہیں کہ قرآن کریم حضرت عیسیٰ کی پیدائش بن باپ بیان نہیں کرتا اور لم یمسسنی بشر آیندہ مس بشر سے مانع نہیں ہوا۔
ع۴۲۸ ویعلمہ الکتاب...... یہ کس پر عطف ہے کسی نے کہا کہ یبشرك (آیت ۴۴) پر عطف ہے۔ بعض نے کہا آیت سابقہ میں یخلق پر عطف ہے یعنی کذالك اللہ یخلق ما یشاء ویعلمہ الکتاب...... مگر صحیح یہ ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے اور واؤ استئناف کیلئے ہے جو ابتدائے کلام میں آجاتی ہے گویا یہ الگ کلام ہے۔
الکتاب سے یہاں مراد کتابت ہے یعنی ہاتھ سے لکھنا (ر۔ ث) حکمت کے معنی بھی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں حضرت عیسیٰ کو چار چیزوں کے سکھانے کا ذکر فرمایا ہے۔ تعلیم کے معنی ع۸۱ میں بیان ہو چکے ہیں۔ جہاں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انسان کو علم دینا دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک جو بذریعہ وحی دیا جاتا ہے۔ دوسرا جو ان ذرائع سے انسان حاصل کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے دیئے ہیں اس طرح پر انبیاء کو بھی علم حاصل ہوتا ہے۔ یہاں کس قسم کی تعلیم مقصود ہے۔ بعض نے کہا بذریعہ وحی۔ بعض نے کہا بذریعہ توفیق و ہدایت جو علم حاصل کرنے کے لیے دیدی۔ مگر صورت اول صحیح نہیں اس لیے کہ کتابت یعنی لکھنے کا علم تو معمولی طور پر حاصل کیا جاتا ہے اور اسی طرح توریت کا علم بذریعہ استاد کے حضرت مسیح نے حاصل کیا جیسا کہ بعض روایات سے ثابت ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کتاب سے مراد جنس کتب الٰہی ہو تو اس صورت میں کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل کا علم دینے سے مراد ان کا فہم بذریعہ وحی خفی دینا مراد ہو۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ ان چار چیزوں کا علم الگ الگ طریق پر دیا گیا ہو یعنی کتابت اور توریت کا علم تو اسباب معمولی سے ہو اور حکمت یعنی فہم اور انجیل کا علم بذریعہ وحی دیا گیا ہو۔
ع۴۲۹ ورسولا الی بنی اسرائیل۔ اس کو یعلمہ پر عطف قرار دے کر یجعلہ مقدر مانا گیا ہے یعنی ویجعلہ رسولا الی بنی اسرائیل اور اللہ تعالیٰ اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنائیگا اور وہ یوں یوں کہے گا۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ صاف بتاتا ہے کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان سب اقوال کے بعد فلما احس عیسیٰ منھم الکفر قال من انصاری الی اللہ ہے جس سے صاف معلوم ہوا کہ درمیان

جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ

پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک بات لایا ہوں۴۳۰ کہ میں تمہارے لیے کیچڑ سے پرند کی شکل کی مانند تجویز کرتا ہوں۴۳۱ پھر اس کے اندر پھونکتا

میں سے ان تمام واقعات کو جو حضرت مریم کے آپ کو حمل میں لینے، جننے، آپ کے بلوغ روحانی کو پہنچنے وغیرہ کے متعلق ہیں ترک کر دیا گیا اور بعض ان واقعات کا ذکر سورہ مریم میں جو اس سے پہلے کی نازل شدہ ہے آ بھی چکا ہے) اور اس زمانہ کا ذکر شروع کر دیا ہے۔ جب حضرت عیسٰی کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا اور تقدیر عبارت یوں سمجھی جائے گی وجعل رسولا الی بنی اسرائیل یعنی حضرت عیسٰی جب پیدا ہو کر بلوغ روحانی کو پہنچے تو انہیں بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اسی دقت کو دیکھ کر بعض مفسرین نے بھی فلما احسّ عیسٰی منہم الکفر کے نیچے لکھ دیا ہے کہ رسولا الی بنی اسرائیل سے نیا کلام شروع ہوتا ہے جو کلام ملائکہ میں داخل نہیں اور تقدیر عبارت یوں نکالی ہے نجاء عیسٰی کما بشر اللّٰہ تعالٰی رسولا الی بنی اسرائیل یعنی جب عیسٰی آ گئے جیسا کہ اللہ تعالٰی نے بشارت دی تھی درآنحالیکہ وہ رسول تھے بنی اسرائیل کی طرف۔

اس موقعہ پر قرآن کریم نے یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ حضرت عیسٰی اصل میں صرف قوم اسرائیل کی طرف رسول تھے۔ جس زمانہ میں نبی کریم صلعم کی بعثت ہوئی اس وقت عیسائی مذہب بہت سی قوموں میں پھیلا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ عیسائی بعض اقوام عرب کو بھی عیسائی کر چکے تھے اور باقی کو کرنے کی کوشش میں تھے۔ پس کوئی شخص عیسائی مذہب کی حالت کو دیکھ کر ہرگز یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ حضرت عیسٰی صرف بنی اسرائیل کی طرف رسول ہو کر آئے لیکن جب اصلیت پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصل پیغام حضرت مسیح کا بنی اسرائیل تک ہی محدود تھا۔ چنانچہ متی میں ذیل کا قصہ جو ایک کنعانی عورت کے متعلق لکھا ہے صاف اسی نتیجہ پر پہنچاتا ہے "اور دیکھو ایک کنعانی عورت ان سرحدوں سے نکلی اور پکار کر کہا اے خداوند ابن داؤد مجھ پر رحم کر...... اس نے جواب میں کہا کہ میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ مگر اس نے آ کر اسے سجدہ کیا اور کہا اے خداوند میری مدد کر، اس نے جواب میں کہا کہ لڑکوں کی روٹی لیکر کتوں کو ڈال دینی اچھی نہیں۔ اس نے کہا ہاں خداوند کیونکہ کتے بھی ان ٹکڑوں میں سے کھاتے ہیں جو ان کے مالکوں کی میز سے گرتے ہیں۔ اس پر یسوع نے جواب میں اس سے کہا اے عورت تیرا بڑا ہی ایمان ہے جیسا چاہتی ہے تیرے لیے ویسا ہی ہو" (متی ۱۵ و ۲۲ سے ۲۸) اب اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مسیح سوائے بنی اسرائیل کے "اور کسی کے پاس" نہیں بھیجے گئے۔ ہاں دوسروں پر وہ اتنے مہربان ہو سکتے ہیں کہ جو روٹی بچے نہ کھائیں وہ کتوں کے آگے پھینک دی جائے اس لیے جب یہودیوں نے آپ کے پیغام کو رد کر دیا تو دوسری قوموں کو معلوم ہوتا ہے اسی حیثیت سے جس کا اوپر ذکر ہوا حضرت مسیح کے حواریوں نے داخل کر لیا۔ چنانچہ پولوس کی تقریروں سے اسبات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ جب یہودیوں کی طرف سے مایوسی ہو گئی تو پھر دوسری قوموں کی طرف رُخ شروع ہُوا۔ مگر حضرت مسیح کا پیغام بلاشبہ فی الاصل صرف بنی اسرائیل تک محدود تھا۔ جب مذہب نے ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیا اور اس کو بت پرستوں کی قبولیت کے قابل بنا دیا گیا۔ کیونکہ بُت پرستی سے ملتے جُلتے عقائد اس میں داخل ہو گئے تو پھر سارا رُخ دوسری اقوام کی طرف ہو گیا۔

ایک اور امر جس کا یہ آیت فیصلہ کرتی ہے یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اُمتِ محمدیہ کی اصلاح کے لیے نہیں آ سکتے۔ نہ ہی دین اسلام کی توسیع تمام اقوام میں ان کا کام ہو سکتا ہے اگر انہوں نے امت محمدیہ کے لیے بھی رسول ہونا ہوتا تو قرآن کریم میں یہ لفظ جو ان کے کام کی صریح حدبندی کرتے ہیں وارد نہ ہوتے۔ پس جس شخص پر یہ حکم لگ چکا ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کے لیے رسول ہو گا۔ اس کا ساری دنیا کی طرف رسول بننا محال ہے مسلمانوں کو آنحضرت صلعم کے بعد کسی دوسرے نبی سے مستغنی کرنے کے لیے ہی یہ کلمات سکھائے تھے رضیت باللّٰہ ربا وبالاسلام دینا و بمحمد نبیا محمد صلعم کے بعد جو کافۃ الناس کی طرف مبعوث ہو گئے اور جن کا زمانہ نبوت قیامت تک ممتد ہے کسی دوسرے رسول یا نبی کا محتاج اپنے آپ کو سمجھنا اس نعمت عظمٰی کی ناشکر گزاری ہے پس حدیث میں جو ابن مریم کے آنے کی پیشگوئی ہے اس کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ اس امت میں سے کوئی شخص ابن مریم کے رنگ میں آ جائے جس طرح الیاس کے دوبارہ آنے کی پیشگوئی یوں پوری ہوئی کہ حضرت یحیٰی الیاس کے رنگ میں آ گئے دیکھو ع۴۱۴ حضرت عیسٰی کو قرآن کریم کی یہ تصریح امت محمدیہ میں آنے سے روکتی ہے۔

ع۴۳۰ انی قد جئتکم۔ بعض نے یہاں مخبرا یا ناطقا مقدر سمجھا ہے۔ مگر خود لفظ رسول میں پیغام کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے جب رسول بنائے جانے کا ذکر آیا تو ساتھ ہی جو کچھ اس رسول کی بعثت کا عظیم الشان مقصد تھا وہ ظاہر کر دیا اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالٰی کی طرف سے ایک عظیم الشان بات لائے ہیں۔

ع۴۳۱ اخلق۔ خلق کے معنی کے لیے دیکھو ع۳۳ وَالْخَلْقُ لَا یُسْتَعْمَلُ فِیْ کَافَۃِ النَّاسِ اِلَّا عَلٰی وَجْھَیْنِ اَحَدُھُمَا فِیْ مَعْنَی التَّقْدِیْرِ...... وَالثَّانِیْ فِی الْکَذِبِ (غ) اور کل لوگوں کے حق میں لفظ خلق صرف دو معنی میں بولا جاتا ہے ایک اندازہ کرنے کے معنی میں اور دوسرا جھوٹ کے معنی میں۔ اندازہ کے معنی کی مشہور مثال شاعر کا قول ہے وَلَاَنْتَ تَفْرِیْ مَاخَلَقْتَ۔ وَبَعْضُ الْقَوْمِ یَخْلُقُ ثُمَّ لَایَفْرِیْ یعنی تو جو ارادہ یا اندازہ یا تجویز کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے اور عمل میں لے آتا ہے لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تجویزیں تو کرتے رہتے ہیں مگر ان کو عمل میں نہیں لاتے۔ اسی طرح ضرب المثل ہے

فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اُڑنے والا ہو جاتا ہے۔[۴۳۲]

ما خلقت الا فریت وما وعدت الا وفیت یعنی میں نے کوئی تجویز نہیں کی مگر اسے عمل میں لا دکھایا اور میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا مگر اسے پورا کر دکھایا۔ جھوٹ کے معنی میں تخلقون افکاً قرآن شریف میں آیا ہے احسن الخالقین (المومنون ۲۳-۱۴) کے صحیح معنی احسن المقدرین ہی ہیں کیونکہ جہاں یہ لفظ آتا ہے وہاں وقتاً بعد وقت مختلف حالتوں میں انسان کے رہنے کا سوال ہے یعنی حالت نطفہ، حالت علقہ، حالت مضغہ وغیرہ اور صحیح یہی ہے کہ خلق کا لفظ پیدا کرنے کے معنی میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے پر بولنا جائز نہیں۔ گو بعض نے یہ کہہ دیا ہے کہ حضرت عیسےٰ کے لیے یہ لفظ بولا گیا ہے مگر جیسا کہ میں آگے چل کر ثابت کروں گا قرآن کریم اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اور یہ کہنا کہ چونکہ یہاں لفظ من الطین موجود ہے اس لیے مادہ سے خلق کرنے میں اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے امتیاز ہو گیا یہ بھی درست نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بھی دونوں طرح خلق کرتا ہے مادہ سے بھی اور بغیر مادہ بھی۔ جیسے کہ ع۳۳ میں دکھایا گیا بیضاوی نے اخلق لکم کے معنی کیے ہیں اقدر لکم اور یہی درست ہے۔

لکم میں ل انتفاع کے لیے ہے اور مراد ہے تمہاری بھلائی کے لیے۔

الطین۔ طین اس مٹی کو کہتے ہیں جس میں پانی ملا ہوا ہو۔ اور اگر اس سے پانی کا اثر جاتا بھی رہے تو بھی اس کو طین ہی کہا جاتا ہے (غ) قرآن کریم میں خلق انسان کو طین سے قرار دیا گیا ہے۔ بالمقابل وہ ہستیاں جو جنّ کے نام سے موسوم ہیں ان کی پیدائش نار یعنی آگ سے بتائی گئی ہے۔ بہ نسبت دوسرے عناصر کے طین یا مٹی میں اثر کی قبولیت کی استعداد بہت زیادہ ہے۔

ھیئۃ۔ ھیئۃ اس حالت کا نام ہے جس پر کوئی چیز خواہ وہ حالت محسوس ہو یا معقول (غ) یعنی حواس سے اس کا علم حاصل ہو تا ہو یا عقل سے۔ اسی مادہ سے ہے وھیئی لنا من امرنا رشدا (الکھف ۱۸-۱۰) ویھیئی لکم من امرکم مرفقا (الکھف ۱۸-۱۶)

الطیر۔ طائر ہر ایک جانور کو کہتے ہیں جو پر رکھتا ہے اور ہوا میں اڑتا ہے اور طائر بمعنی عمل بھی قرآن مجید میں آیا ہے وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ (غ) اور طائر انسان کا وہ حظ ہے جو علم الٰہی میں اس کے لیے مقدر ہو ما حصل لہ فی علم اللہ مما قدر لہ (ن) اور طیر۔ طائر کی جمع ہے اور واحد پر بھی بولا جاتا ہے (ل) اور طیر کی جمع طیور آتی ہے اور حدیث میں آتا ہے الرؤیا لاوّل عابرٍ وھی علٰی رِجلِ طائرٍ۔ جہاں طائر کی تشریح یوں کی گئی ہے کُلُّ حَرَکَۃٍ من کلمۃٍ اوجارٍ یجری فھو طائر مجازاً اراد علٰی رجلِ قدرٍ جارٍ وقضاءٍ ماضٍ من خیرٍ او شرٍ (ل) یعنی ہر ایک حرکت کسی کلام کی یا کسی جاری ہونے والے امر کی مجازاً طائر ہے اور حدیث میں علی رجل طائر کہنے سے منشاء یہ ہے کہ وہ ایک ایسے قدر یا اندازہ کے جو چلا جا رہا ہو اور ایسی قضاء کے جو گزر رہی ہو پاؤں پر ہے۔ قرآن کریم اور حدیث سے یہ مثالیں طائر کے معنی پر یہ دکھانے کے لیے بیان کی گئی ہیں کہ مجازاً اس لفظ کا استعمال ایسے معنوں پر کیا گیا ہے جو پہلے لغت میں موجود نہ تھے۔

ع۴۳۲ انفخ۔ نفخ کے معنی پھونکنا ہیں۔ روح کے ساتھ بھی یہی لفظ نفخ آتا ہے جیسے آدم کے متعلق ونفخت فیہ من روحی (الحجر ۱۵-۲۹) ہر انسان کے متعلق ونفخ فیہ من روحہ (السجدۃ ۳۲-۹) مریم کے متعلق فنفخنا فیھا من روحنا (الانبیاء ۲۱-۹۱) مگر جہاں بغیر روح کے لفظ نفخ آیا ہے وہاں نفخ روح مراد نہیں بلکہ محض پھونکنا ہے خواہ حقیقی طور پر ہو یا بطور استعارہ جیسے قال انفخوا حتّٰی اذا جعلہ نارا (الکھف ۱۸-۹۶) جہاں آگ پر پھونکنا یا آگ کا جلانا مراد ہے یا نفخ فی الصور میں جہاں بگل میں پھونکنا یا بگل بجانا مراد ہے اور لفظ نفخ کا استعمال بطور حقیقت و بطور استعارہ احادیث میں بھی ہوا ہے۔ انہ نھی عن النفخ فی الشراب پانی میں پھونک مارنے سے آپ نے منع فرمایا۔ کیونکہ اس کے اندر تھوک پانی کے اندر جاتا ہے اور کراہت کا موجب یا بعض امراض کا موجب ہوتا ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے اعوذ باللہ من نفخہ ونفثہ جہاں نفخ سے مراد شیطان کا حقیقی طور پر پھونکنا نہیں بلکہ روح شیطانی کا انسان کے اندر آ جانا ہے۔ اور وہ روح شیطانی استکبار ہے۔ چنانچہ نفخہ کی تشریح شارحین حدیث نے کبرہ کی ہے (ن) یعنی استکبار شیطانی۔ چونکہ یہاں لفظ نفخ کے ساتھ روح نہیں اس لیے نفخ روح یہاں مراد لینا صحیح نہیں یہ اسی قسم کا مگر پاک نفخ ہے۔ جیسے حدیث میں ایک نفخ کا ذکر ہے گو وہ ناپاک شیطانی نفخ ہے۔ شیطان کا نفخ کرنا اپنی ناپاکی یا کبر کا دوسرے میں پھونکنا ہے اور نبی کا نفخ کرنا اپنی پاکیزگی یا فرمانبرداری کا دوسرے میں نفخ کرنا ہے۔

باذن اللہ۔ اذن کے معنی کیلئے دیکھو ع۱۲۳ گو اذن میں مشیت پائی جاتی ہے۔ مگر مشیت سے اس صورت میں کیا مراد ہے اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے ایمان لانے پر بھی باذن اللہ بولا گیا ہے جیسے وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ (یونس ۱۰-۱۰۰) اور نیکی میں ترقی کرنے پر بھی ومنھم سابق بالخیرات باذن اللہ (فاطر ۳۵-۳۲) مشیت کے ہونے سے جیسا کہ راغب نے لکھا ہے مراد یہی ہے کہ چونکہ انسان کے قویٰ کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے پس جو کچھ اثر وہ قویٰ قبول کرتے ہیں وہ بھی باذن اللہ ہی ہوتا ہے اس لیے جب ظالم کسی پر ظلم کرے اور اس کو دکھ پہنچے تو اس پر بھی باذن اللہ کہہ دیا جائے گا۔ گو اس کا یہ منشا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہوتا ہے کہ ایسا ہو پس باذن اللہ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ کوئی خاص امر ہے جو اصل میں اللہ تعالیٰ ہی کرتا تھا مگر حضرت مسیح کو اس نے اپنی طرف سے اجازت دیدی تھی اور اس لیے اس صفت میں وہ اللہ تعالیٰ کی خاص اجازت سے شریک ہو گئے درست نہیں۔ اذن کے لیے مشیت ضروری ہے اور اس کی مشیت کے یہ خلاف ہے کہ اس کی مخلوق اس کی کسی صفت میں کامل طور پر شریک ہو۔

مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام واقعی پرند بنایا کرتے تھے اور مشہور یہ ہے کہ آپ نے سوائے چمگادڑ کے اور کوئی جانور پیدا نہیں کیا (ر) اب یہاں

وَ اُبۡرِئُ الۡاَکۡمَہَ — اور اللہ کے حکم سے

آکر دو گروہ ہو گئے ہیں ابن جریر کی ایک روایت میں تو ہے کہ حضرت عیسٰی لڑکوں کے ساتھ کھیلتے تھے تو آپ نے کچھ گیلی مٹی لیکر کہا کہ میں اس سے پرند بنا دوں تو انہوں نے کہا کہ کیا تم ایسا کر سکتے ہو۔ عیسٰی نے کہا ہاں۔ تب عیسٰی نے ایک پرندہ کی شکل بنا کر اس میں پھونکا تو وہ پرند بن گیا۔ اور دوسری روایت کی رُو سے یہ ایک اقتراحی معجزہ تھا۔ اور بنی اسرائیل نے کہا تھا کہ چمگادڑ بنا کر بتاؤ تب ہم ایمان لائیں گے اس لیے حضرت عیسٰی نے چمگادڑ کو بنایا مگر تعجب یہ ہے کہ اقتراحی معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے۔ حالانکہ دوسری طرف یہ بھی مذہب ہے کہ اقتراحی معجزات نہیں دکھائے جاتے۔ لیکن وہب کہتے ہیں کان یطیر ما دام الناس ینظرون الیہ فاذا غاب عن اعینہم سقط میتا لتمیز عن خلق اللہ تعالیٰ بلا واسطۃ (ر) یعنی وہ اُڑتا تھا جب تک لوگ اسے دیکھتے رہتے تھے جب نظر سے غائب ہو جاتا تو مُردہ ہو کر گر جاتا تا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق بلا واسطہ میں اور اس خلق میں تمیز رہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ جب نظر سے غائب ہو کر گرا تو تمیز کہاں رہی لوگوں کے نزدیک تو خدا کی خلق میں اور حضرت عیسٰی کی خلق میں کوئی تمیز نہ رہی۔ پھر اگر یہ بچپن کا قصہ ہے تو معلوم نہیں بچپن میں جب ابھی عموماً نبوت نہیں اس معجزہ کے دکھانے سے حاصل کیا۔ اور معجزہ دکھایا بھی ہم عمر لڑکوں کو جاتا ہے۔ اب اگر حضرت عیسٰیؑ فی الواقع پرند بناتے تھے تو وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ پرند دوسرے پرندوں کی طرح جاندار بن کر ان میں ملجل جاتے ہونگے اور یا محض پرندوں کی شکل تو بن جاتی ہو گی مگر ایک تماشہ کے طور پر ان کا اُڑنا ایک آنی نظارہ ہوگا۔ اور پھر وہ مٹی کی مٹی رہ جاتی ہو گی۔ اس دوسرے خیال کی تائید میں وہب سے روایت ہے اور اسی کو حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مجدد صدی چہاردہم نے بھی قریب قریب تسلیم کیا ہے۔ اب ہم اس کو ایک اصول کے ماتحت لا کر محکمات اور متشابہات کے قانون کے رنگ میں اس پر بحث کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ کیا کوئی شخص فی الواقع خدا کی مخلوق جیسی مخلوق بنا سکتا ہے گو وہ خدا کے اذن سے ہی ایسا کرے اور گو وہ نبی ہو اور یہ امر بطور ایک اعجاز کے ہو۔ اب جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو خلق بمعنی پیدا کرنا صرف ذات باری کا خاصہ قرار دیا گیا ہے خواہ وہ خلق مادہ سے ہو یا بغیر مادہ کے اس کے ثبوت میں اوّل یہ آیت ہے ام جعلوا للہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیہم (الرعد[13] - ۱۶) جس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ اپنا ایک عام قانون بیان فرماتا ہے۔ قل اللہ خالق کل شیئ یعنی نہ صرف یہی غلط ہے کہ معبودان باطل نے کسی چیز کو پیدا کیا ہو۔ پھر وہ دونوں قسم کی مخلوق مل جل گئی ہو بلکہ دنیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی کسی چیز کا خالق نہیں۔ دوسری جگہ فرماتا ہے خلق کل شیئ فقدرہ تقدیرا (الفرقان[25] - ۲) اسی نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا۔ پھر اس کے لیے ایک قانون اور ایک حد بست مقرر کر دی۔ پھر فرمایا ربنا الذی اعطٰی کل شیئ خلقہ ثم ھدٰی (طٰہٰ[20] - ۵۰) ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر ایک چیز کو اس کی پیدائش بھی عطا فرمائی پھر اس کو اس کا کمال حاصل کرنے کی راہ بھی بتائی۔ اور اس سے بڑھ کر ان لوگوں کے متعلق جن کو خدا بنا لیا گیا ہے۔ اور بھی صراحت فرمائی جیسا کہ سب سے پہلی آیت میں ایسا ہی فرمایا والذین یدعون من دون اللہ لا یخلقون شیئاً وھم یخلقون اموات غیر احیاء وما یشعرون ایّان یبعثون (النحل[16] - ۲۰ و ۲۱) اور وہ لوگ جنھیں یہ کافر سوائے اللہ کے پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور وہ سب فوت بھی ہو چکے ہیں کوئی بھی ان میں سے زندہ نہیں اور ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔ اسی کے مطابق سورہ فرقان میں فرمایا۔ پس اللہ تعالیٰ نے خلق یا پیدا کرنے کے متعلق اپنا قانون اصولی رنگ میں یہ بیان فرمایا کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے اور کہ اللہ کے سوائے کوئی خالق نہیں۔ اور جن لوگوں کو معبود بنایا گیا ہے۔ انہوں نے کوئی خلق نہیں کی اور ایسا کبھی ہو نہیں سکتا کہ انسان کی بنائی ہوئی چیز اور خدا کی خلق کی ہوئی چیز ایسی مل جل جائیں کہ ان میں امتیاز نہ رہے۔ ایسا ہی فرمایا افمن یخلق کمن لا یخلق (النحل[16] - ۱۷) کیا جو خلق کرتا ہے وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو خلق نہیں کرتا؟ اب اگر مسیح کا خلق طیور مانا جائے تو مسیح من یخلق ہونے کی وجہ سے انسانوں جیسا نہ ہوا بلکہ خدا جیسا ہوا تو چونکہ قرآن کریم میں اختلاف نہیں ہے لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا۔ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اختلاف ہوتا۔ اس لیے یہ کسی صورت میں قابل تسلیم نہیں کہ بار بار یہ قانون باندھ کر کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی چیز کا خالق نہیں اور پھر یہ بتا کر کہ جن لوگوں کو معبود بنایا گیا ہے انہوں نے ہرگز ہرگز کسی چیز کو پیدا نہیں کیا۔ پھر خود ہی یہ کہہ دے کہ مسیح نے بھی کچھ پرند پیدا کیے تھے۔ اس طرح پر صورت اوّل یعنی مسیح کا سچ مچ کے پرند بنا دینا جن پر ظاہری لغوی معنی کی رُو سے لفظ طیر کا صادق آسکے باطل ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ محکمات قرآنی اور تصریحات کلام ربانی کے خلاف ہے اور یہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا کہ حضرت مسیح خدا کے اذن سے خلق کرتے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے خلاف اذن نہیں دیتا۔ جب خلق کو اس نے اپنی صفت خاص میں بیان فرمایا ہے جس میں مخلوق کسی صورت میں شریک نہیں ہو سکتی تو اس کے خلاف اذن دینا گویا اپنی صفت کو ہی باطل کرنا ہے۔

طیر کی توجیہ کہ وہ جلد مٹی ہو جاتے تھے: اب دوسری صورت یہ ہے کہ جو کچھ حضرت مسیح بناتے تھے وہ اصلی اور حقیقی پرند تو نہ تھے۔ بلکہ محض پرند کی شکل ہوتی تھی جیسے مٹی کے کھلونے پرندوں کی شکل کے بنائے جاتے ہیں۔ بال و پر رُوح وغیرہ ان کے اندر کچھ چیز نہ تھی جس کی وجہ سے حقیقی طور پر لفظ پرند یا طیر کا ان کے لیے استعمال ہو سکے جیسے مٹی کے کھلونے پرندوں وغیرہ کی شکل میں بنے ہوئے بازار میں ملتے ہیں۔ ایسے ہی وہ بھی ہونگے اور حضرت مسیح کے نفخ سے صرف ایک آنی نظارہ اُن کے پرواز کا نظر آجانا ہوگا جیسا کہ وہب نے بیان کیا ہے۔ تو اس صورت میں گو تشابہ فی الخلق واقع نہ ہونے کی وجہ سے محکمات مذکورہ بالا کے خلاف تو یہ امر نہیں ٹھہرتا مگر اس صورت میں اول تو لفظ طیر کا استعمال مجاز کے رنگ کا ہوا نہ حقیقت کے طور پر کیونکہ وہ واقعی پرند نہ تھے بلکہ ان کی شکل پرند سے مشابہ تھی۔ در باوجود لفظ طیر کے مجازی معنی لینے کے اس میں اعجاز کا رنگ یا نبی کی شان کے شایان کوئی کام نہ رہا۔ بلکہ زیادہ تر ایک کھیل اور تماشہ کی صورت رہی اور نبی کی شان سے یہ امر بعید ہے کہ ان لوگوں کی طبائع کو جن کی اصلاح کے لیے وہ آتا ہے ایسے کھیلوں کی طرف متوجہ کرے کیا اس سے کسی پر اتمام حجت ہو سکتا ہے یا کوئی غرض

وَالْاَبْرَصَ وَ اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ ج وَ شب کور اور پھلوہری والے کو اچھا کرتا ہوں[ع۴۳۳] اور اللہ کے حکم سے مُردوں

اصلاح نفوس کی پوری ہوسکتی ہے نہ تو یہ فعل مخالف کے لیے مسکت ہوسکتا ہے اور نہ مسیح کے پیرو خود اس سے کوئی روحانی فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔
اب بحث مذکورہ بالا سے یہ تو عیاں ہے کہ طیر کے ظاہری لغوی معنی پرند مفہوم آیت محکمات قرآنی کے خلاف ٹھہراتے ہیں۔ پس یہاں مجاز اور استعارہ کے رنگ کا کلام ماننا لازمی ہے۔ اور جب قرآن کریم میں مجاز اور استعارہ بہت مقامات پر پایا جاتا ہے اور اصول یہی ہے کہ جب قرائن یا محکمات ظاہر معنے لینے کے مانع ہوں تو مجاز ماننا پڑتا ہے تو یہاں مجاز ماننے پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ اور وہب نے جو صورت پیش کی ہے وہ درحقیقت طیر کے استعمال کو برنگ مجاز اور استعارہ ہی قرار دیتی ہے نہ بطور حقیقت علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے کلام میں مجاز اور استعارہ کا استعمال بہت پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ شاگردوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ آپ تمثیلوں میں لوگوں سے باتیں کرتے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں تو مسیح نے کہا "اس لیے میں ان سے تمثیلوں میں بات کرتا ہوں کہ وے دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے"۔ (متی ۱۳ : ۱۲) حالانکہ یہ بھی تمثیل ہی ہے پھر لکھا ہے کہ "یہ سب باتیں یسوع نے ان جماعتوں کو تمثیلوں میں کہیں اور بے تمثیل ان سے نہ بولتا تھا۔ تاکہ جو نبی نے کہا تھا پورا ہو کہ میں تمثیلیں لاکر کلام کرونگا" (متی ۱۳-۳۴ و ۳۵) پس یہ وجہ ہے کہ کیوں مسیح کا کلام اللہ تعالیٰ نے بھی تمثیل کے رنگ میں بیان فرمایا ہے۔ اب اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم اور کتب مقدسہ نے جہاں اس رنگ کے مجاز کو استعمال کیا ہے وہاں عموماً صورت یہی ہے کہ وہ جسمانیات سے اکثر روحانیات کی طرف لے جاتے ہیں مثلاً زمین کے مردہ ہونے کا ذکر ہے تو مراد اس سے روحانی موت ہے۔ اندھوں اور بہروں کا ذکر ہے تو مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی آنکھوں اور کانوں سے کام نہیں لیتے۔ بارش کا ذکر ہے تو مراد وحی الٰہی کا نزول ہے۔ تاریکی کا ذکر ہے تو جہالت مراد ہے۔ دن اور روشنی کا ذکر ہے تو نور اور ایمان مراد ہے۔ اسی طرح چارپایوں سے کسی قوم کو مشابہت دی۔ تو مراد فہم سے کام نہ لینا یا زمینی باتوں پر جھکے رہنا ہے۔ کسی کو گدھا کہا تو مراد یہ ہے کہ جو کتابیں اس نے پڑھی ہیں وہ ایک بوجھ کے طور پر تو ہیں لیکن انسان جو ان سے فائدہ حاصل کرتا ہے وہ نہ ہُوا۔ کسی قوم کو بندر بنایا تو مراد یہ ہے کہ وہ اچھے افعال کی نقل کرتے ہیں مگر حقیقت ان میں کوئی نہیں۔

طیر کے مجازی معنی: اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ طیر کو جو امتیاز دوسرے جانداروں پر حاصل ہے وہ پرواز کرنا یا زمین سے اوپر اڑنا ہے پس جب طیر کا لفظ کسی نبی کے کلام میں بطور استعارہ استعمال ہو جیسا کہ میں اوپر ثابت کرچکا ہوں کہ یہاں سوائے استعارہ ماننے کے چارہ نہیں تو استعارہ میں اصل ذکر اسی مابہ الامتیاز امر کا ہوگا یعنی زمین سے اوپر اُٹھ کر پرواز کرنا۔ جیسا کسی کے متعلق فرمایا اخلد الی الارض وہ زمین کے ساتھ لگ گیا۔ مراد یہ ہے کہ زمینی چیزوں کی طرف مائل ہوگیا اور اوپر کی طرف اس کی توجہ نہ ہوئی۔ پس برنگ استعارہ یہاں طیر سے مراد ایسے لوگ ہیں جو زمین اور زمینی چیزوں سے اوپر اُٹھ کر خدا کی طرف پرواز کرسکیں اور یہ بات آسانی سے سمجھ میں بھی آسکتی ہے کہ کس طرح نبی کے نفخ سے انسان اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ زمینی خیالات کو ترک کرکے عالم روحانیت میں پرواز کرے۔

طیر کا استعمال بطور مجاز قرآن وحدیث میں: لفظ طیر کے اس مجازی استعمال پر ممکن ہے بعض طبائع میں خلش پیدا ہو۔ لیکن جب ظاہری معنی ممتنع ہوئے تو سوائے مجاز کے چارہ نہیں اور لفظ طیر بطور مجاز قرآن کریم میں بھی استعمال ہُوا ہے اور حدیث میں بھی۔ تو ان حالات کے اندر اس آیت کے معنی کرنے میں سوائے اس مجاز کو ماننے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اور پھر یہ معنی بھی نرے قیاس پر ہی مبنی نہیں، بلکہ احادیث میں شہدا کو جو اعلیٰ سے اعلیٰ مقام روحانیت پر پہنچ چکے ہیں طیر یعنی پرندوں سے مشابہت دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ بہشت میں سبز پرندوں کی شکل میں پھر رہے ہیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ابن مسعود کی روایت سے ہے ان ارواح الشھداء فی اجواف طیر خضر شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہیں۔ اور ابن ماجہ میں حضرت ابن مسعود کی ہی روایت سے ہے ارواح الشھداء عند اللہ تعالیٰ کطیر خضر یعنی شہیدوں کی روحیں اللہ تعالیٰ کے ہاں سبز پرندوں کی طرح ہیں اور بعض روایات میں ہے کہ شہیدوں کی روحیں سبز پرندے ہیں اور بعض میں ہے کہ سفید پرندے ہیں۔

پس احادیث میں اس صراحت کے ہوتے ہوئے یہاں طیر یا پرندوں سے مراد شہداء کی قسم کے لوگ لینا یعنی ایسے لوگ جو عالم روحانیت میں پرواز کرنے والے ہوں یا سفلی تعلقات سے بلند پرواز کرتے ہوں عین مطابق منشائے قرآن کریم معلوم ہوتا ہے۔

اس استعارہ کو مدنظر رکھتے ہوئے باقی الفاظ کی تشریح میں کچھ مشکل باقی نہیں رہتی خلق کے معنی اندازہ کرنا نہ پیدا کرنا انسان کے لیے آتے ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔ طین کا لفظ استعارہ کے رنگ میں فرمانبرداری کو چاہتا ہے۔ گویا طینی مخلوق میں فرمانبرداری کی استعداد زیادہ ہے نفخ سے مراد نفخ روحانی ہونے پر بھی اوپر دلائل دی جاچکی ہیں پس اب اس سارے کلام انی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن اللہ سے مراد استعارہ کے رنگ میں یہ ہوئی کہ حضرت مسیح اپنے اس نفخ روحانی کا ذکر کرتے ہیں جس سے وہ استعدادیں جو طینی ہونے کی وجہ سے قبولیت کی استعداد زیادہ رکھتی ہیں۔ ان کا وہ طیر کی ہیئت پر اندازہ کرتے ہیں اور ان کے اندر بلند خیالی پیدا کرنے کی تجویز کرتے ہیں اور زمین سے ان کے تعلقات کم کرنا چاہتے ہیں۔ پس وہ ان کے اندر ایک نفخ روحانی کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا کے نبی درحقیقت نفخ روحانی ہی کرنے آتے ہیں اور نفخ روحانی سے قابل استعدادوں کو اعلیٰ مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔

ع۴۳۳ اکمہ۔ سورج کے متعلق کَمِھَتْ کہا جاتا ہے تو مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے سامنے غبار آگیا پس وہ تاریک ہوگیا۔ اسی سے کَمِہَ بَصَرُہٗ ہے اور اَکْمَہُ اس اندھے کو بھی کہتے ہیں جو ماں کے پیٹ سے اندھا پیدا ہو اور بعد میں جس کی بصارت پر تاریکی آجائے اس کو بھی کہتے ہیں۔ اور اس معنی میں یہ لفظ اشعار میں بہت آیا ہے اور ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ اَکْمَہُ وہ ہے جو دن کو دیکھتا ہے اور رات کو نہیں دیکھتا (ل)، اور روحانی رنگ میں ایسے لوگ جو سورج کی تیز

أُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ — کو زندہ کرتا ہوں[434] اور جو تم کھاؤ اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ رکھو اس

روشنی میں تو حق کو دیکھ لیتے ہیں مگر ذرا سی مشکلات سامنے آتی ہیں تو کچھ نہیں دیکھتے۔

ابرص۔ بَرَص۔ اس سفیدی کو کہتے ہیں جو جسم میں نمودار ہوتی ہے جسے پھلوہری کہا جاتا ہے اور روحانی رنگ میں ایسی بدی جو ظاہر میں نیکی معلوم ہو۔

حضرت مسیح کے کلام میں بیماریوں سے مراد روحانی بیماریاں ہیں: حضرت مسیح کا معمولی بیماریوں کا علاج کرنا ان کی نبوت کے متعلق کوئی خاص امر نہیں۔ حالانکہ یہاں نشان کے طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر یہاں کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل کے علم کے بعد ان باتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ جن میں خلق طیر اور اکمہ اور ابرص کے علاج کا ذکر ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں کتاب و حکمت اور توریت اور انجیل کی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ کیونکہ حکمت سے مراد یہاں علم طب نہیں۔ بلکہ حقیقت تک پہنچنا اور اصل بات کا فہم حاصل کرنا ہے۔ پس قرینہ چاہتا ہے کہ یہاں روحانی بیماریوں کے علاج کا ذکر ہے۔ کیونکہ تورات و انجیل روحانی بیماریوں کے علاج کے لیے نازل ہوئی تھیں نہ جسمانی بیماریوں کے علاج کے لیے۔ اور خود انجیل میں حضرت مسیح کے اقوال اسی کے موید ہیں۔ متی ۱۳-۱۵ میں یہودیوں کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مسیح فرماتے ہیں "کیونکہ اس قوم کا دل موٹا ہوا اور وے اپنے کانوں سے اونچا سنتے ہیں اور انہوں نے اپنی آنکھیں موند لیں تا ایسا نہ ہو کہ وے آنکھوں سے دیکھیں اور کانوں سے سنیں اور دل سے سمجھیں اور رجوع لاویں اور میں انہیں چنگا کروں"۔ اب یہاں سب روحانی حالت اور روحانی بیماریوں کا ذکر کر کے آخر پر یہ الفاظ ہیں کہ میں انہیں چنگا کروں جو ابری الاکمہ والابرص کے بالکل مطابق ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ چنگا کرنے سے آپ کا منشا یہ تھا کہ روحانی بیماریوں سے شفا دوں۔ پھر متی ۹-۱۲ میں فرماتے ہیں "بھلے چنگوں کو حکیم درکار نہیں بلکہ بیماروں کو"۔ اب یہاں تینوں لفظ یعنی بھلے چنگے حکیم اور بیمار۔ ظاہری معنی کے لحاظ سے استعمال نہیں کیے گئے۔ بلکہ روحانی صحت۔ روحانی طبیب اور روحانی بیمار مراد ہیں۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر صفائی اس سوال و جواب سے ہوتی ہے جو متی ۱۱-۳ تا ۵ میں مذکور ہے۔ جہاں یہ ذکر ہے کہ یوحنّا نے دو آدمیوں کو مسیح کے پاس بھیجا تھا کہ دریافت کریں کہ وہ وہی مسیح ہے جس کی ان کو انتظار تھی۔ تو اس کے جواب میں حضرت مسیح نے یوں فرمایا "یسوع نے جواب میں انہیں کہا۔ کہ جو کچھ تم سنتے اور دیکھتے ہو جا کے یوحنّا سے بیان کرو۔ کہ اندھے دیکھتے اور لنگڑے چلتے۔ کوڑھی پاک صاف ہوتے اور بہرے سنتے اور مردے جی اٹھتے ہیں اور غریبوں کو خوش خبری سنائی جاتی ہے"۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں آخری فقرہ میں غریبوں سے مراد مال و دولت سے محروم نہیں بلکہ دل کے غریب ہیں اور خوشخبری لفظ گاسپل یا انجیل کا ترجمہ ہے اس ایک فقرہ نے درحقیقت پہلے تمام فقروں کے معنوں پر روشنی ڈال دی ہے کہ یہاں بھی مراد روحانی بیماریاں ہی ہیں۔ ورنہ جسمانی بیماریوں کے ذکر میں غریبوں کو انجیل کا سنایا جانا ایک بے معنی بات ہے۔ پس ان تمام حوالجات سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اپنے کلام میں جیسا کہ وہ انجیل میں اب ملتا ہے بیماروں کو شفا دینے سے مراد روحانی بیماریوں کا دور کرنا ہے۔

قرآن کریم میں بیماریوں اور شفا سے مراد: اب ہم دوسری طرف قرآن کریم پر غور کرتے ہیں تو یہاں بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں روحانی بیماروں کو شفا دینا ہی نبیوں کا کام لکھا ہے وہ جن اندھوں، بہروں اور گونگوں کو اچھا کرتے ہیں ان کے متعلق فرماتا ہے فانّھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور (الحج ۲۲-۴۶) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ اندھے وہ دل ہیں جو سینوں کے اندر ہیں اور اسی نابینائی کا ذکر قرآن کریم بار بار فرماتا ہے صم بکم عمی فہم لا یرجعون یہ ان کافروں کی حالت ہے جو انذار کی پروا نہیں کرتے۔ نہ باتیں سنتے ہیں نہ ان پر غور کرتے ہیں، نہ منہ سے کلمۂ حق کہتے ہیں نہ خدا کے نشانات کو دیکھتے ہیں اس لیے حق کی طرف رجوع نہیں کرتے اور یہی نہیں کہ روحانی امراض کا ذکر ہی بار بار فرمایا ہے بلکہ شفا کا ذکر بھی اسی رنگ میں فرمایا۔ چنانچہ قرآن کریم کے متعلق ایک جگہ فرمایا ھدی و شفآء (حٰمٓ ۴۱-۴۴) وہ ہدایت بھی ہے اور شفا بھی۔ لفظ شفا کو ہدایت کے ساتھ لگا کر بتایا کہ روحانی بیماریوں کی شفا مراد ہے نہ جسمانی بیماریوں کی۔ اور پھر فرمایا شفآء لما فی الصدور (یونس ۱۰-۵۷) یہ سینوں کے اندر کی بیماریوں کے لیے شفاء ہے۔

عیسائیوں کی لفظ پرستی: پس انجیل اور قرآن کریم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء کا کام اور ان کی تعلیم روحانی بیماریوں سے نجات دینے کے لیے ہوتے ہیں اور کتب مقدسہ میں جن بیماریوں کا ذکر اکثر آتا ہے۔ وہ روحانی بیماریاں ہوتی ہیں۔ اور اسی قسم کی بیماریوں کا علاج حضرت مسیح کرتے تھے۔ عیسائیوں نے لفظ پرستی کی اور آپ کے کلام میں جو مجاز اور استعارہ تھا اسے حقیقت پر محمول کیا اور عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مریض دیئے گئے کہ ان کا علاج کرو، ان کا مرض مسیح کے مریضوں کے مرض سے بہت بڑھ کر ہے۔ یہاں تو شبکورا اور برص والے ہیں۔ مگر آنحضرت صلعم کو اندھے اور گونگے اور بہرے دیئے جاتے ہیں۔ گونگا اور بہرہ صفاتِ حسنہ سے محروم ہو جاتا ہے اور پھر وہ ساتھ اندھا بھی ہو تو کوئی ذریعہ اس کے علوم حاصل کرنے کا باقی نہیں رہتا۔ اس میں درحقیقت یہ بتایا ہے کہ مسیح کے وقت کی بیماری ایسی خطرناک نہ تھی، جیسے نبی کریم صلعم کے زمانہ کی بیماری اور جس قدر بیماریاں خطرناک ہوں اسی قدر فاضل طبیب بھی بکار ہوتا ہے۔ پس دنیا کا سب سے بڑا طبیب ہی اس قابل تھا کہ ایسے لوگوں کو بھی شفا دے جو اندھے بھی ہیں اور گونگے بھی ہیں اور بہرے بھی ہیں۔

[434] موت اور حیات کے معنی ع ۷۹ میں بیان ہو چکے ہیں۔ قوت نامیہ، قوت حاسہ۔ قوت عاقلہ ہر ایک کے زوال کا نام عربی میں موت ہی ہے۔ یہاں کون سے مردے مراد ہیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم مُردوں کے اس دنیا میں دوبارہ واپس آنے کے متعلق اصولی رنگ میں کیا تعلیم دیتا ہے۔

مُردوں کا اس دنیا میں واپس آنا بروئے تصریح قرآنی ممنوع ہے: قبض روح کے متعلق اللہ تعالیٰ اپنا عام قانون ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسك التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخری الی اجل مسمی (الزمر ۳۹-۴۲) اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے

بُیُوۡتِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کی خبر دیتا ہوں، یقیناً اس میں تمھارے لیے نشان ہے اگر

روحوں کو ان کی موت کے وقت ۔ اور جو مرتے نہیں ان کی نیند میں پھر روک رکھتا ہے اس کو جس پر موت وارد کردی اور واپس بھیجتا ہے دوسرے کو ایک وقت مقرر تک ۔ اس آیت کریمہ کی رُو سے قبض روح دو طرح پر ہوتا ہے ۔ ایک موت کی حالت میں اور دوسرے نیند کی حالت میں ۔ گویا ان دونوں حالتوں پر قبض روح کا لفظ بولا جاتا ہے ۔ قبض روح کی تیسری کوئی طرز بیان نہیں فرمائی اور ان دونوں طرزوں میں سے بھی ایک کے متعلق فیصلہ قطعی صادر فرما دیا کہ جس پر موت وارد کردے اس کو پھر اس دنیا میں واپس نہیں بھیجتا ۔ ان کے زندہ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قیامت کا وقت مقرر فرمایا ہے پس اس آیت کی رو سے کوئی شخص جس پر موت وارد ہو چکی ہے زندہ ہو کر اس دنیا میں نہیں آسکتا ۔

پھر یہی اصول ایک اور آیت میں بیان کیا گیا ہے حتّٰی اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحًا فیما ترکت کلا انھا کلمۃ ھو قائلھا ومن ورائھم برزخ الی یوم یبعثون (المؤمنون[۲۳] - ۹۹ - ۱۰۰) یہاں تک کہ جب ان میں سے ایک پر موت آجاتی ہے تو پھر وہ کہتا ہے میرے رب مجھے لوٹاؤ تاکہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں نیک عمل کروں ۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا ۔ یہ ایک بات ہے جو وہ کہتا ہے اور ان کے ادھر (یعنی بعد موت) ایک حالت برزخ ہے ۔ اس دن تک کہ انکو اُٹھایا جائے ۔ اب اس آیت میں بھی یہی اصول بیان فرمایا کہ موت کے بعد اس دنیا میں واپس آنا ممنوع ہے اور ایسی خواہش پوری نہیں کی جاسکتی بلکہ یوم البعث تک یعنی قیامت کے دن تک حالت برزخ میں رہنا ہوگا پس اس آیت کی رو سے بھی مردوں کا قبل از بعثت اس دنیا میں واپس آنا باطل ثابت ہوتا ہے ۔

تیسری آیت جو اس پر شاہد ہے وہ ذیل کی آیت قرآنی ہے وحرام علی قریۃ اھلکنھا انھم لا یرجعون (الانبیاء[۲۱] - ۹۵) اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کردیا ان کے لیے یہ قطعی ہو چکا کہ وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے ۔ قریۃ سے مراد بستی کے لوگ ہیں یعنی جو لوگ مرجاتے ہیں وہ لوٹ کر اس دنیا میں نہیں آیا کرتے ۔ اس آیت کی تفسیر میں ایک حدیث نسائی اور ابن ماجہ میں مذکور ہے عن جابر بن عبد اللہ قال لقینی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا جابر مالی اراک منکسرا قلت یارسول استشھد ابی وترک عیالا ودینا فقال الا ابشرک مالقی اللہ بہ اباک قال بلٰی .... قال یا عبدی تمن علی اعطک قال یا رب تحیینی فاقتل فیک ثانیۃ قال الرب تعالٰی قد سبق منی انھم لا یرجعون یعنی جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلعم ملے اور فرمایا اے جابر کیا وجہ ہے میں تم کو غمگین پاتا ہوں ۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ میرا باپ شہید ہو گیا اور عیال اور قرضہ پیچھے چھوڑ گیا ۔ فرمایا ۔ میں تم کو خوش خبری دوں کہ تیرے باپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور کیا معاملہ پیش آیا ۔ عرض کیا فرمائیے (یہاں حدیث کا درمیانی ٹکڑا چھوڑ دیا گیا ہے) ...... اللہ تعالیٰ نے (جابر کے والد کو) فرمایا اے میرے بندے تو میرے سامنے کوئی خواہش کر تاکہ میں تجھے دوں ۔ اس نے عرض کیا اے میرے رب مجھے زندہ کر دیجئے تاکہ میں دوبارہ تیری راہ میں مارا جاؤں ۔ رب تعالیٰ نے فرمایا یہ میں پہلے وعدہ کر چکا ہوں کہ (جو مرجائیں گے) وہ لوٹ کر (اس دنیا میں) نہیں جائیں گے ۔ اب یہ حدیث قطعی طور پر اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ مُردہ کبھی اس دنیا میں واپس نہیں آسکتا ۔ اور مردہ کا واپس آنا قانون الٰہی کے خلاف ہے کیونکہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود جابر کے والد کو یہ کہا تھا کہ جو چاہتے ہو مانگو میں دونگا ۔ مگر جب اس نے دوبارہ دنیا میں بھیجا جانے کی خواہش ظاہر کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ نہیں ہوسکتا ۔ کیونکہ یہ میرے وعدہ کے خلاف ہے ۔ اب یہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کا فرمانا ، کہ جو مانگو دونگا ۔ دوسری طرف مسلمانوں میں اس وقت ایسے آدمیوں کی سخت ترین ضرورت ہونا جو خدا کی راہ میں اپنی جانیں قربان کریں ۔ یہ دونوں باتیں اس امر کی مقتضی تھیں کہ اگر خدا کے قانون میں کوئی مُردہ اس دنیا میں واپس آسکتا ہے تو جابر کا والد سب سے بڑھ کر واپسی کا مستحق تھا مگر اللہ تعالیٰ نے باوجود یہ فرمانے کے جو مانگو میں تم کو دونگا ۔ پھر بھی دوبارہ دنیا میں اُس کے آنے کی خواہش کو پورا نہیں کیا ۔ اس بنا پر کہ یہ میرے وعدہ کے خلاف ہے ؛ تو کیا یہ وعدہ خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح کے زمانہ کے بعد کیا تھا کہ اب میں مُردوں کو زندہ نہیں کیا کرونگا ۔ پھر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر خدا مسیح کے ذریعہ سے مُردوں کو زندہ کرتا تھا تو خود ایک مُردہ کو زندہ کرکے کیوں واپس نہ بھیج دیا ۔ قریبًا اسی مضمون کی ایک حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے جہاں اللہ تعالیٰ شہداء کی ارواح کو فرماتا ہے ماذا تبغون تم کیا چاہتے ہو ؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ ہمیں کچھ حاجت نہیں ۔ پھر یہ سوال ہوتا ہے یہاں تک کہ فلما راؤا انھم لا یترکون من ان یسئلوا قالوا نرید ان تردنا الی الدار الدنیا فنقاتل فی سبیلک حتّٰی نقتل فیک مرۃ اخرٰی لما یرون من ثواب الشھادۃ فیقول الرب جلّ جلالہ انّی کتبت انھم الیھا لا یرجعون ۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ان سے بار بار سوال کیا جاتا ہے تو کہیں گے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں دار دنیا کی طرف واپس لوٹا دیں تب ہم تیری راہ میں جنگ کریں ۔ یہانتک کہ تیری راہ میں دوسری مرتبہ قتل کیے جائیں کیونکہ وہ شہادت کا اس قدر ثواب دیکھ چکے ہونگے تو رب جل جلالہٗ فرمائے گا میں یہ لکھ چکا ہوں کہ اس دنیا کی طرف پھر ان کو نہیں لوٹایا جائیگا ۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی مردہ دنیا میں زندہ ہو کر آسکتا ہے تو شہداء سب سے بڑھ کر حقدار ہیں کیونکہ ان کی زندگیاں محض اللہ کے لیے ہیں ۔ پھر اللہ تعالیٰ خود اُن کو فرماتا بھی ہے کہ تم جو کچھ مانگو میں دونگا ۔ لیکن بایں ہمہ دوبارہ ان کو دنیا میں نہیں بھیجتا کیوں ؟ اس لیے کہ فرماتا ہے یہ میرے وعدہ کے خلاف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین اصول کے رنگ میں کیسے محکم ہیں ۔

قرآن کریم میں روحانی مُردوں کے احیاء کا ذکر : پس یہ آیتیں اور حدیثیں اس بات پر شاہد ہیں کہ مُردے ہرگز اس دنیا میں واپس نہیں آیا کرتے اور اب سوائے اس کے چارہ نہیں کہ یہاں بھی روحانی مُردوں کا احیاء مراد لیا جائے اور قرآن کریم میں روحانی مردوں کے احیاء کا ذکر بھی کثرت کے ساتھ اور بار بار آتا ہے چنانچہ ایک جگہ فرمایا اومن کان میتًا فاحییناہ وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمت لیس بخارج منھا (الانعام[۶] - ۱۲۳) کیا وہ شخص جو مُردہ ہو،

کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۹﴾ تم مومن ہو[۴۳۴]

وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىۃِ اور اس کی تصدیق کرنے والا جو توریت میں سے مجھ سے پہلے ہے[۴۳۶]

پھر اُسے ہم زندہ کریں اور اس کو ایک روشنی دیدیں جس کے ساتھ وہ لوگوں کے اندر چلے اس شخص کی مثل ہو سکتا ہے جو تاریکیوں کے اندر ہی رہے۔ ان میں سے باہر نکلنے والا نہ ہو۔ اب یہاں ایک مردہ کا ذکر ہے اور اس کے زندہ کرنے کا بھی ذکر ہے مگر یہ کس قسم کا مردہ ہے اور اس کا احیاء کیا ہے۔ اس مردہ کو جب اللہ تعالےٰ اپنی جناب سے نور ایمان عطا فرماتا ہے تو اس نور کے ذریعہ سے پھر وہ لوگوں میں چلتا ہے۔ اور اس زندگی کے مقابل اس مردہ کی حالت ہے جو تاریکیوں میں ہی رہتا ہے۔ پھر فرمایا۔ یایھا الذین اٰمنوا استجیبوا للّٰہ والرسول اذا دعاکم لما یحییکم (الانفال۸-۲۴) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو فرمانبرداری کرو اللہ کی اور رسول کی جب وہ تم کو بلائے اس کے لیے جو تم کو زندہ کرے۔ پھر فرمایا وما یستوی الاحیاء ولا الاموات ان اللّٰہ یسمع من یشاء وما انت بمسمع من فی القبور (فاطر۳۵-۲۲) زندے اور مُردے یکساں نہیں، اللہ جسے چاہتا ہے سناتا ہے اور جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں تم ان کو نہیں سنا سکتے۔ یہاں نہ صرف رُوحانی زندوں کو احیاء اور روحانی مردوں کو اموات کے نام سے پکارا ہے۔ بلکہ اُن کو من فی القبور بھی قرار دیا ہے۔ یعنی ایسے لوگ جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں۔

مسیح کے احیائے موتٰی سے روحانی مردوں کی زندگی مراد ہے: پس قرآن کریم مُردوں کے اس دنیا میں واپس آنے کا دروازہ قطعاً بند کرتا ہے۔ اور روحانی مُردوں کو قرآن کریم میں مُردے ہی کہا گیا ہے۔ بلکہ انبیاء کا یہ کام بتایا گیا ہے کہ وہ روحانی مردوں کو زندہ کریں۔ تو ہم احی الموتی باذن اللّٰہ کے ایک ہی معنی لے سکتے ہیں کہ اللہ کے اذن سے میں روحانی مردوں کو زندگی دیتا ہوں۔

نبی کی قوت قدسی کا اظہار دو رنگوں میں: یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ دراصل یہ تینوں فقرے یعنی اوّل خلق طیر۔ دوم اکمہ اور ابرص کو شفا دینا۔ سوم مردوں کو زندہ کرنا ایک ہی مطلب کے ظاہر کرنے والے ہیں۔ یعنی نبی کے نفخ روح سے ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے پھر وہ مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے جو طینی فطرت کے لوگ ہیں یعنی بوجہ فرمانبرداری کے مادہ کے استعدادِ قبولیت زیادہ رکھتے ہیں۔ ان میں تو نفخ روح کا اثر اس قدر ہوتا ہے کہ ان کے زمینی تعلقات منقطع ہو کر وہ بالکل خدا کے لیے ہی ہو جاتے ہیں۔ اس سے ادنیٰ حالت ان لوگوں کی حالت ہے جن کو بیمار کہا یعنی اکمہ اور ابرص ان کی بیماریاں دور ہو کر وہ بھلے چنگے ہو جاتے ہیں۔ مگر سب سے ردی حالت ان لوگوں کی ہے جن میں سے روحانی زندگی مفقود ہو چکی ہے اور وہ مُردوں کے حکم میں داخل ہو چکے ہیں۔ مگر ان پر بھی نبی کی قوت قدسی کا اثر ہوتا ہے اور ان کو از سر نو زندگی دی جاتی ہے۔ اصل غرض بہرحال ایک ہی ہے یعنی انسانوں میں نفخ روح کرنا اور تین مختلف پیرائے اس کے صرف اس لیے بیان فرمائے کہ تا انسانوں کے تین مراتب پر یعنی اس حالت پر جس میں نبی ان کو پاتا ہے شاہد ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ان تینوں کو ایک ہی آیت قرار دیا ہے اور یوں فرمایا ہے انی قد جئتکم باٰیۃ من ربکم میں تمہارے رب کی طرف سے ایک بات لایا ہوں۔ حالانکہ آگے ذکر تین باتوں کا ہے۔ اس سے اسی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ درحقیقت یہ تینوں باتیں ایک ہی مطلب کو ظاہر کرنے والی ہیں اور نبی کی قوت قدسی کا فیضان ہی وہ بات ہے جس کا یہاں ذکر مطلوب ہے۔

ع۴۳۵ بما تاکلون۔ یہاں یا تو ما مصدریہ ہے اور مراد یہ ہے کہ تمھارے کھانے اور تمہارے ذخیرہ کرنے کی خبر دیتا ہوں یعنی اس امر کی کہ کیا کھانا ہے اور کیا ذخیرہ کرنا ہے اور یا ما موصولہ ہے اور اس صورت میں خبر بمعنی امر ہے یعنی اس امر کی خبر دیتا ہوں کہ کیا کھاؤ اور کیا ذخیرہ کرو۔

تدخرون۔ اِدِّخار اصل میں اذتخار ہے جو ذخر سے ہے اور ادّخرتہ کے معنی ہیں اَعۡدَدۡتُہٗ لِلۡعُقۡبٰی (غ) یعنی آئندہ کے لیے اسے سامان بنا کر رکھا۔ ذخیرہ کیا۔

مسیح کے متعلق غلط قصّے: اس موقعہ پر جو قصّے لکھے گئے ہیں کہ حضرت مسیح چھوٹے ہوتے باہر لڑکوں میں کھیلا کرتے تھے تو لڑکوں کو بتا دیا کرتے تھے کہ تمہاری ماں نے فلاں چیز فلاں جگہ چُھپا کر رکھی ہے۔ اور اس طرح لڑکے گھر میں جا کر ماؤں کو تنگ کیا کرتے تھے۔ پھر لکھا ہے کہ ایک دن محلّہ والوں نے سارے لڑکوں کو ایک مکان میں بند کر دیا اور جب مسیح اُن کو بلاتے ہوئے آئے تو اُن کے متولیوں نے کہہ دیا کہ وہ یہاں نہیں ہیں اور جب مسیح نے اس مکان کی طرف جہاں وہ لڑکے بند تھے اشارہ کر کے کہا کہ یہاں کون ہے۔ تو اُنہوں نے کہہ دیا کہ سؤر۔ تو وہ سب لڑکے سؤر بن گئے۔ یہ بے سروپا قصّے گھڑ لیے گئے ہیں۔ جن کی غرض صرف مسیح کی ہر بات کو عجوبہ بنانا ہے حالانکہ مسیح میں دیگر انبیاء بنی اسرائیل سے بڑھ کر کوئی بات نہ تھی۔ اس آیت کے معنی صاف اس قدر ہیں کہ حضرت مسیح ان کو بتاتے ہیں کہ کیا چیزیں کھاؤ اور کس قدر ذخیرہ کرو۔ گویا حلال وحرام کے متعلق بھی کچھ احکام دیتے تھے اور زیادہ تر ان کی تعلیم کا زور اس بات پر تھا کہ دنیا کے مال و دولت کا زیادہ ذخیرہ مت کرو اور اپنے لیے زمین پر خزانے مت جمع کرو۔ گو آپ کے پیرووں نے آپکی ہر ایک تعلیم کی خلاف ورزی ہی کی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے پیروانِ مسیح کی حالت دیکھو جو دن رات دولت جمع کرنے کی فکر میں ہیں اور جن کا خدا ہی اب سیم وزر ہے اور حضرت مسیح کی اس تعلیم کو دیکھو "اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں، بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ۔ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں کیونکہ جہاں تیرا مال ہے وہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا۔" (متی ۶: ۱۹ تا ۲۱)

۴۳۶ ومصدقا عطف ہے باٰیۃ پر یعنی قد جئتکم باٰیۃ۔ وجئتکم مصدقا۔

حضرت مسیح کا توریت کا مصدق ہونے سے منشاء اس کی کمی کو پُورا کرنا ہے: یہاں حضرت عیسٰی اپنے آپ کو توریت کا مصدق قرار دیتے ہیں۔ اس تصدیق کا منشا کیا ہے اس پر مفصل بحث ح۶۳ میں گزر چکی ہے جہاں دکھایا گیا ہے کہ اس تصدیق سے جس کا صلہ لام آئے مراد یہ ہوتی ہے کہ پہلی کتاب اس بات کو چاہتی تھی کہ اس کی کسی کمی

وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾

اور تا کہ اس کا کچھ حصہ تمہارے لیے حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام کیا گیا ہے ۴۳۷۔ اور میں تمہارے پاس تمہارے رب سے ایک پیغام لایا ہوں، پس اللہ کا تقوٰی اختیار کرو اور میری اطاعت کرو ۴۳۸

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾

اللہ ہی میرا رب اور تمہارا رب ہے، پس اس کی عبادت کرو یہی سیدھا رستہ ہے ۴۳۹

پورا کرنے کے لیے یا اس کی پیشگوئیوں کو پورا کرنے کے لیے کوئی دوسرا نبی آئے۔ پس جب وہ دوسرا نبی آتا ہے تو اس پہلی کتاب کی تصدیق کرتا ہے یعنی اس کا منجانب اللہ ہونا بھی تسلیم کرتا ہے اور اس کی اس کمی یا نقص کو بھی پورا کرتا ہے۔ توریت اور انبیائے بنی اسرائیل: توریت کی تعلیم جس طرح بعض پہلوؤں کی رُو سے مختص القوم تھی، یعنی صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی اسی طرح اس کی تعلیم کے بعض پہلو مختص الزمان بھی تھے۔ اور انبیائے بنی اسرائیل وقتاً فوقتاً ظاہر ہو کر ایسی کمی کو پورا کرتے رہے اس لیے شریعت توریت ان میں بطور ایک بنیاد کے رہی۔ اور باقی انبیاء کی تعلیم اپنے اپنے زمانہ تک محدود رہی۔ وہ اپنے اپنے وقت میں تعلیم توریت کی کمی کو پورا کرتے رہے۔ اس لیے حضرت عیسٰی دنیا کی ساری کتابوں کے یا سارے رسولوں کے مصدق نہیں ہوئے بلکہ صرف توریت کے مصدق ہوئے کیونکہ ان کی بعثت کی غرض توریت کی تعلیم کی کسی کمی کو ہی پورا کرنا تھا اور اس تصدیق سے یہ نتیجہ قطعاً نہیں نکلتا کہ حضرت عیسٰی کے وقت تک توریت میں کوئی تحریف نہ ہوئی تھی۔ ہاں اللہ تعالیٰ انبیاء کو اس لیے مامور نہیں کرتا کہ وہ پرانی کتابوں کے ایک ایک حرف کو درست کر دیں۔ بلکہ اصل غرض اصلاح نفوس ہوتی ہے اسکے لیے موٹی موٹی ہدایات وہ انہیں دیدیتا ہے۔ یہ امر کہ حضرت مسیح نے توریت کی تعلیم کی کمی کو پورا کیا، خود قرآن کریم کے اگلے الفاظ سے ظاہر ہے اور بعثت انبیاء کی اصل غرض چونکہ بروئے قرآن کریم ہدایت کا لانا ہے جیسا کہ فامّا یاتینّکم منّی ھدیً سے ظاہر ہے اس لیے ہر نبی کوئی نئی ہدایت لاتا ہے خواہ وہ بزرنگ شریعت ہو یا بزرنگ نصیحت یا بزرنگ نمونۂ عمل۔

۴۳۷ حضرت عیسٰی کا بعض احکام توریت کو منسوخ کرنا: بعض الذی حرم علیکم یعنی بعض اس کا جو موسوی شریعت میں تم پر حرام کیا گیا ہے۔ اور یہ روایت قتادہ سے ابن جریر نے دی ہے کان الذی جاء به عیسٰی الین مما جاء به موسٰی یعنی جو کچھ حضرت عیسٰی لائے اس میں نرمی کا پہلو غالب تھا بہ نسبت اس کے جو موسٰی لائے۔ بعض مفسرین نے اس کے یوں معنی کیے ہیں کہ بعض وہ باتیں جو تم نے غلطی سے اپنے اوپر حرام کر رکھی تھیں ان کو حلال کرتا ہوں اور اس لیے انہوں نے کہا ہے کہ حضرت عیسٰی نے توریت کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کیا۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ اس وقت بھی اناجیل میں باوجود اس اقرار کے کہ میں توریت کو منسوخ کرنے نہیں آیا۔ توریت کے بعض احکام کے خلاف احکام موجود ہیں اور ان الفاظ سے کہ توریت کو منسوخ کرنے نہیں آیا حضرت عیسٰی علیہ السلام کا یہی منشاء تھا کہ بطور بنیاد وہ قائم رہے گی۔ لیکن کچھ تغیر و تبدل یا ترمیم اس میں ضرورت زمانہ کے لحاظ سے ہوگی اس سے شریعت توریت منسوخ نہیں ہوتی جیسا کہ انجیل کی اس قسم کی عبارات سے ظاہر ہے مثلاً تکمیل کے رنگ میں "تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ خون نہ کر..... لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے بھائی پر غصے ہوگا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا اور جو کوئی اپنے بھائی کو پاگل کہے گا وہ صدر عدالت کی سزا کے لائق ہوگا اور جو اس کو احمق کہے گا وہ آگ کی جہنم کا سزاوار ہوگا۔" (متی ۵: ۲۱ و ۲۲) اس سے حکم توریت کہ خون نہ کر منسوخ نہیں ہوتا بلکہ اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایسا ہی "تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ زنا نہ کر۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس کسی نے بری نظر سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔" (متی ۵: ۲۷ و ۲۸) یا مثلاً ترمیم کے رنگ میں" یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑے اسے طلاق نامہ لکھ دے۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے وہ اس سے زنا کراتا ہے۔" (متی ۵: ۳۱ و ۳۲) یا تنسیخ کے رنگ میں" تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے" (متی ۵۔ ۳۸ و ۳۹) اب یہ جس قدر باتیں "کہا گیا تھا" میں حضرت مسیح نے بیان کی ہیں۔ وہ توریت کے احکام ہیں جس سے صاف معلوم ہوا کہ انبیائے بنی اسرائیل اس اختیار کے ساتھ آتے تھے کہ وہ توریت کو بطور بنیاد شریعت تسلیم کرتے ہوئے ان ہدایات کی تکمیل کریں یا ان میں ترمیم تنسیخ کریں۔

۴۳۸ حضرت عیسٰی کا اپنی اطاعت کی طرف بلانا اور اس کی غرض: اطیعون۔ میری اطاعت کرو۔ یہ تعلیم ہر ایک نبی دیتا ہے۔ چنانچہ سورہ شعراء میں جہاں بہت سے انبیاء کا ذکر کیا ہے قریباً ہر ایک نبی کی تعلیم میں یہ حصہ بھی پایا جاتا ہے فاتقوا اللہ و اطیعون۔ اللہ کا تقویٰ کرو اور میری اطاعت کرو۔ باوجودیکہ شریعت حضرت موسٰی کی تھی جس پر حضرت مسیح نے بھی عمل کرنا اور کرانا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں کہتے کہ موسٰی کی اطاعت کرو۔ اس لیے کہ وہ خود مطاع ہیں اور کسی دوسرے کے مطیع نہیں بلکہ جو کچھ پاتے ہیں براہِ راست اللہ تعالیٰ سے پاتے ہیں۔ گویا ہر نبی بمنزلہ ایک بادشاہ کے ہوتا ہے اس کو بڑی صراحت سے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے وما ارسلنا من رسول الّا لیطاع باذن اللہ (النساء۔ ۶۴) یہاں حضرت مسیح کا اپنی اطاعت کے لیے حکم دینا یہی سمجھانے کو ہے کہ اگر وہ احکام توریت میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کریں تو ان کی بات ماننی ہوگی اور وہ اس بنا پر رد نہیں ہو سکتی کہ توریت کے خلاف ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کی اطاعت جزو دین ہے۔

۴۳۹ اناجیل میں توحید کی تعلیم: قرآن کریم نے جو کچھ حضرت مسیح کی تعلیم کا یہاں خلاصہ بیان کیا ہے وہ اب بھی اناجیل میں باوجود ان کی خطرناک تحریف کے موجود

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيۡسٰى مِنۡهُمُ الۡكُفۡرَ قَالَ مَنۡ اَنۡصَارِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ‌ؕ قَالَ الۡحَـوَارِيُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ‌ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ‌ۚ وَاشۡهَدۡ بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۵۲﴾

پھر جب عیسیٰؑ نے اُن سے کفر محسوس کیا تو کہا، کون اللہ کے (دین) میں میرے مددگار ہیں[۴۴۰]۔ حواریوں نے کہا، ہم اللہ کے (دین) کے مددگار ہیں۔ ہم اللہ پر ایمان لائے۔ اور گواہ رہ کہ ہم فرمانبردار ہیں[۴۴۱]

ہے "تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (متی ۴: ۱۰) یہ کسی قائلِ تثلیث کی تعلیم نہیں ہو سکتی اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں پر اتمام حجت کے لیے اس قسم کے فقروں کو ان کی کتابوں میں باقی رہنے دیا ہے۔

ع۴۴۰ احسّ۔ احساس کے معنی ہیں حواس ظاہری سے کسی چیز کا معلوم کر لینا۔ حضرت عیسیٰ کا ان سے احساس کفر کر لینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا کفر اس حد تک ظاہر ہو چکا تھا کہ فہم کے لیے اس کا ظاہر ہونا تو ایک طرف رہا حواس کے لیے بھی وہ ظاہر تھا (غ) دوسرے معنی کے لیے دیکھو ۵۳۸

من انصاری الی اللہ۔ انصار نصیر کی جمع ہے بمعنی مددگار۔ ابن جریر نے من انصاری الی اللہ کی تشریح یوں کی ہے۔ من اعوانی علی المکذبین بحجۃ اللہ یعنی کون تکذیب کرنیوالوں کے خلاف اللہ کی حجت کے ساتھ میرا مددگار ہوگا اور وہ کہتے ہیں الی اللہ یہاں بمعنی مع اللہ ہے اور بعض نے اس کے معنی کیے ہیں، ملتجأ الی اللہ او ذاھبا او ضاما الیہ (ر) یعنی میرا مددگار کون ہے اس حال میں کہ میں اللہ کی طرف پناہ ڈھونڈھنے والا یا اس کی طرف جانے والا یا اس کے ساتھ تعلّق کرنے والا ہوں اور آگے جو انصار اللہ آتا ہے تو اس سے مراد انصار دین اللہ ہے یا انصار رسول اللہ یعنی اللہ کے دین یا اللہ کے رسول کے مددگار۔

ع۴۴۱ الحواریون حواری کی جمع ہے اور یہ حَوْر سے مشتق ہے حَوْر کے معنی ہیں ایک چیز سے لوٹ آنا یا ایک چیز کی طرف لوٹ جانا اور اسی سے یحور ہے انہ ظن ان لن یحور (الانشقاق ۸۴-۱۴) اور تحاور جو ایک دوسرے کی طرف کلام کو لوٹانے کا نام ہے واللہ یسمع تحاورکما (المجادلۃ ۵۸-۱) اور حَوَر اصل میں بیاض یعنی سفیدی کو کہتے ہیں اور حَوْراء اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کی آنکھ کی سفیدی اعلیٰ درجہ کی سفید اور سیاہی شدت سے سیاہ ہو اور جس کا رنگ بھی سفید ہو۔ اسی وجہ سے اعراب یعنی بادیہ نشین لوگ شہروں کی عورتوں کو حواریات کہتے تھے۔ کیونکہ ان کے رنگ اعراب کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کے سفید تھے (ل) اور تحویر کے معنی تبییض آتے ہیں یعنی سفید کرنا۔ حواری نام کی وجہ: ابن اثیر راغب وغیرہ کے نزدیک لفظ حواری اسی سے مشتق ہے۔ اور یہ لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے برگزیدہ احباب پر کیوں بولا گیا ہے اس کی وجہ اکثر نے یہی دی ہے کہ حواری قَصَّار کو کہتے ہیں یعنی جو کپڑے دھو کر ان کو سفید کرتا ہے اور حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے خاص احباب کو حواری کا خطاب اس لیے دیا گیا کہ وہ دھوبی کا کام کرتے تھے۔ اور حضرت عیسیٰ کے حواریوں پر یہ نام آ کر ہر ایک ناصر اور پسندیدہ دوست پر بولا جانے لگا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے والزبیر ابن عمتی وحواریّ من امتی یعنی زبیر میری پھوپی کا بیٹا اور میری امت سے میرا حواری ہے۔ اور زجاج کا قول لسان العرب میں منقول ہے کہ الحواریون خلصان الانبیاء و صفوتہم یعنی نبیوں کے خالص اور برگزیدہ دوست حواری کہلاتے ہیں جس کی وجہ بعض نے یہ دی ہے کہ وہ اپنی خلوص نیت اور سیرت کی پاکیزگی کی وجہ سے حواری کہلائے بعض نے کہا ہے اس لیے کہ وہ لوگوں کو گناہوں کی میل سے صاف کرتے تھے۔

بارہ حواریوں کے نام: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری بارہ تھے جن کے نام اناجیل میں حسب ذیل دیئے گئے ہیں:۔ (لوقا ۶-۱۴، مرقس ۱۰-۳)

(۱) شمعون جو پطرس کہلاتا ہے (۲) اس کا بھائی اندریاس (۳) زبدی کا بیٹا یعقوب (۴) اس کا بھائی یوحنّا (۵) فلپس (۶) برتلمائی (۷) توما (۸) متی محصول لینے والا (۹) حلفئی کا بیٹا یعقوب (۱۰) تدّی (۱۱) شمعون قنانی (۱۲) یہودا اسکریوطی جس نے حضرت مسیح کو پکڑوا بھی دیا۔ ان بارہ کو یہ حکم دیا گیا۔ "انہیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے۔" ان کا کام یہ قرار دیا گیا "بیماروں کو اچھا کرنا۔ مُردوں کو جلانا۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا۔ بدروحوں کو نکالنا۔" اور ان کو حکم تھا کہ اپنے پاس کچھ نہ رکھیں۔ "نہ سونا اپنے کمر بند میں رکھنا۔ نہ چاندی نہ پیسے راستے کے لیے نہ جھولی لینا نہ دو دو کرتے نہ جوتیاں نہ لاٹھی" (متی ۱۰: ۵-۱۰) ان بارہ کی ایمانی حالت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ایسے سخت الفاظ ہیں کہ یہ تسلیم کرنا مشکل نظر آتا ہے کہ واقعی ان کی حالت ایسی ہو۔ کہیں ان کو "کم اعتقاد" کہا گیا ہے (متی ۱۶: ۸) کہیں "بے اعتقاد اور کجرو قوم" (متی ۱۷: ۱۷) کہیں ان کو "رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان" سے محروم قرار دیا گیا ہے (متی ۱۷: ۲۰) کہیں پطرس کو جو اُن سب کا سردار تھا شیطان کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ان میں سے ایک یہودا اسکریوطی آخر صرف تیس روپے لیکر حضرت مسیح کو پکڑوا دیتا ہے اور بارہ کے گیارہ رہ جاتے ہیں مگر الفاظ کو پورا کرنے کے لیے پیچھے پولوس کو داخل کر کے بارہ کی تعداد پھر بنائی جاتی ہے۔ مگر باقی کی کمزوری کا بھی یہ حال ہے کہ پطرس جس پر مسیح نے کلیسا کی بنیاد رکھی تھی (متی ۱۶: ۱۸) تین دفعہ مسیح کا انکار کرتا ہے اور جب لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کے ساتھ تھا تو جھوٹ بول کر اپنی جان چھڑاتا ہے کہ میں نہیں تھا (لوقا ۲۲: ۵۷-۶۲) اور باقی حواری حضرت مسیح کی گرفتاری کے وقت بھاگ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ساتھ جو وعدے کیے گئے تھے وہ بڑے عظیم الشان تھے۔

حواریوں کے ساتھ وعدے: چنانچہ پطرس کو کہا "میں آسمان کی بادشاہت کی کنجیاں تجھے دوں گا اور جو کچھ تو زمین پر باندھیگا وہ آسمان پر بندھے گا اور جو کچھ تو زمین پر کھولے گا وہ آسمان پر کھلے گا" (متی ۱۶: ۱۹) اور بارہ حواریوں کے لیے یہ وعدہ تھا "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہو لیے ہو بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے" (متی ۱۹: ۲۸) قرآن کریم نے حواریوں کی ان کمزوریوں کا ذکر نہیں کیا صرف ان کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے یہ ان کی خدمت اور نصرت کی عزت کی ہے۔ یہ قرآن شریف کا احسان عیسائیوں پر تھا کہ ان کے رسول کو چھوڑ کر رسول

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۵۳
اے ہمارے رب ہم اس پر ایمان لائے جو تو نے نازل کیا اور رسول کی پیروی کی پس تو ہمیں گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ ۴۴۲

ع۱۳ وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۵۴
اور (کافروں نے) تدبیر کی اور اللہ نے بھی تدبیر کی اور اللہ سب تدبیر کرنیوالوں سے اچھا ہے ۴۴۳

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ
جب اللہ نے کہا، اے عیسیٰؑ میں تجھے وفات دینے والا ہوں ۴۴۴

کے اصحاب کی بھی خوبیوں کا ذکر کیا کمزوریوں کا نام تک نہیں لیا مگر اس احسان فراموش قوم نے سارا زور اس محسن کی عیب شماری پر لگا دیا اور وہ بھی سب جھوٹ۔

ع۴۴۲ الشاھدین یہاں شاھدین کی تفسیر میں کئی قول ہیں میرے نزدیک زجاج کا قول سب سے بہتر ہے ھم الشاھدون للانبیاء بالتصدیق (ر) یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو انبیاء کی سچائی پر ایمان لاکر ان کے لیے بمنزلہ گواہوں کے ہوجاتے ہیں یہ معنی اس لیے بھی چسپاں ہیں کہ انبیاء کی قوت قدسی کے یہ لوگ گواہ بن جاتے ہیں کیونکہ وہ عملی رنگ میں پاک ہو کر بمنزلہ گواہوں کے ہوجاتے ہیں۔

ع۴۴۳ مکروا۔ اَلْمَكْرُ اِحتیال فی خُفیۃ (ل) یعنی مکر خفیہ طور پر احتیال کو کہتے ہیں اور احتیال کیا ہے۔ اَلْحَوْلُ وَالْحِيْلُ والحَوَل والحِيْلَة .... والاحتیال ...... کل ذٰلک الحذق وجودۃ النظر والقُدرۃ علی دِقّۃِ التصرّف (ل) یعنی حَوْل۔حِیل۔حِوَل۔حِیلۃ۔احتیال ان سب الفاظ کے معنی دانائی اور نظر کی ذہانت اور باریک تصرفات پر قدرت رکھنا ہے گویا احتیال یا حیلۃ باریک مضبوط تدبیر کو کہتے ہیں پس مَکْر کے معنی ہوئے مخفی طور پر باریک مضبوط تدبیر کرنا۔ اور مفردات راغب میں مَکْر کے معنی دیئے ہیں صَرْفُ الغَیْرِ عَمّا یَقْصِدُہٗ بِحِیْلَۃٍ یعنی کسی غیر کا اس سے جس کا وہ قصد کرتا ہے باریک مضبوط تدبیر سے پھیر دینا اور پھر لکھا ہے کہ مَکْر دو طرح پر ہے ایک محمود یعنی قابل تعریف اور وہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اچھا کام کرنے کا ارادہ کیا جائے اور اس کی مثال دی ہے ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔ اور دوسرا مذموم جس کے ساتھ فعل قبیح کا قصد کیا جائے اور اس کی مثال دی ہے واذ یمکر بک الذین کفروا پس خیر اور شر دونوں پر مَکْر کا استعمال ہوتا ہے اور تفسیر کبیر میں بھی اس پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ مَکْر وہ رائے محکم اور مضبوط ہے جو نقص و فتور سے محفوظ ہو۔ پس اس قدر تصریح کے ہوتے ہوئے معترضین اسلام کا اپنے ذہن میں اس مفہوم مکر کو رکھ کر جو زبان اُردو میں اس لفظ نے اختیار کرلیا ہے قرآن کریم پر یہ اعتراض کرنا کہ اللہ تعالیٰ کا نام مکار ہے کم فہمی یا شرارت کی وجہ سے ہے۔ بسا اوقات ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں آکر ایک خاص مفہوم کو اختیار کرلیتا ہے۔ پس اگر لفظ مَکْر اُردو زبان میں بُرے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ عربی زبان میں یہ لفظ بُرے معنی میں استعمال ہوتا ہے صریح غلطی ہے اور قرآن کریم نے تو ایک جگہ لفظ مکر کے ساتھ خیر کا لفظ لگا کر جیسا واللہ خیر الماکرین اور دوسری جگہ سیئ کا لفظ لگا کر جیسا ولا یحیق المکر السیّئ الا باھلہ (فاطر۔۴۳)[35] میں یہ بتا دیا ہے کہ اصل لفظ مکر میں بدی کا مفہوم نہیں کیونکہ جو فعل فی نفسہٖ بُرا ہو اس کے ساتھ خیر یا بھلے کا لفظ تو لگ ہی نہیں سکتا اور اس کے ساتھ ذم کا لفظ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی ومکروا میں ضمیر ان لوگوں کی طرف ہے جن کا ذکر ان الفاظ میں ہے فلمّا احسّ عیسٰی منھم الکفر۔ یعنی اعدائے مسیح کی طرف۔

اعدائے مسیح کے جس مکر یا باریک تدبیر کا یہاں ذکر ہے وہ یہ تھی کہ انہوں نے حضرت مسیح کو جھٹلانے پر کفایت نہیں کی اور نہ صرف انہوں نے یہ کافی سمجھا کہ اس کو مروا دیں۔ بلکہ انہوں نے باریک تدبیر کے ذریعہ اسے احکام وقت سے صلیب پر کھچوانے کی تدبیر کی جیسا کہ دوسری جگہ اس کی طرف اشارہ آتا ہے۔ اور جیسا اناجیل میں مفصل مذکور ہے۔

مسیح کو آسمان پر اٹھانا مخفی تدبیر نہیں کہلا سکتا: ومکر اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے بھی کوئی باریک تدبیر کی۔ یہ باریک تدبیر کیا تھی؟ عام طور پر یہ خیال ہے کہ حضرت مسیح کو آسمان پر اُٹھا لینا اور آپ کا ہمشکل ایک حواری کو بنا کر اس کو مصلوب کرا دینا یہ خدائی تدبیر تھی۔ لیکن اس پر تین اعتراض پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ ایک شخص کو یوں دشمنوں کے تصرف سے نکال لینا کہ اسے آسمان پر اٹھا لیا جائے یہ کوئی باریک مخفی تدبیر نہ ہوئی۔ دوسرا یہ کہ مکر تو اس تدبیر مخفی کو کہا جاتا ہے جو جہات نقص وفتور سے خالی ہو جب ایک حواری مارا گیا اور اسی صلیب کی موت سے مارا گیا تو یہ تدبیر تو سخت ناقص ہے مسیح تو لعنتی موت سے بچے لیکن ان کی جگہ ایک حواری جو انصار اللہ میں سے تھا اُسی لعنتی موت میں گرفتار ہوا۔ تیسرا اور سب سے بڑا اعتراض اس پر یہ ہے کہ یہودیوں کی غرض تو پوری ہوگئی کہ مسیح کے کاروبار کا اور تبلیغ کا خاتمہ ہوگیا اور بنی اسرائیل اس کی ہدایت سے محروم رہ گئے۔ پھر یہ کیسی ناقص تدبیر ہوئی۔ واللہ خیر الماکرین کا لفظ اس پر نہیں بولا جا سکتا۔ الٰہی تدبیر جیسا کہ دوسری جگہ دکھایا جائے گا یہ تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو ایک نہایت مخفی باریک تدبیر سے موت صلیب سے بچا کر باقی بنی اسرائیل کی طرف بھیج دیا اور اس طرح پر یہود کی کوشش دونوں طرح پر ناکام ہوئی۔ حضرت مسیح اپنی نبوت کا کام بھی کرتے رہے اور باریک رنگ میں صلیب کی موت سے بھی بچا دیئے گئے۔

ع۴۴۴ متوفیک۔ توفاہ اللہ اذا قبض نفسہ (ل) قبض روحہ (ت) یعنی محاورہ توفاہ اللہ کے معنی قبض نفس یا قبض روح ہیں توفاہ اللہ کے کوئی معنی سوائے قبض نفس یا روح کے کسی لغت میں نہیں آئے چونکہ یہاں زیر بحث خالی لفظ توفی نہیں بلکہ متوفیک زیر بحث ہے جس میں اللہ تعالیٰ فاعل اور حضرت عیسیٰ بطور مخاطب مفعول ہیں اس لیے متوفیک پر صرف توفاہ اللہ کے معنی سے ہی سند لائی جا سکتی ہے۔ اور تمام اہل لغت نے توفاہ اللہ کے محاورہ کو تسلیم کرکے الگ لکھا اور اس کے خاص معنے قبض روح یا قبض نفس دیئے ہیں اور یہ معنی نہ صرف لغت سے ثابت ہیں بلکہ خود قرآن کریم نے بھی صراحت فرمائی ہے اللہ یتوفی الانفس

رَافِعُكَ اِلَیَّ اور تجھے اپنی طرف

حین موتہا والتی لم تمت فی منامہا (الزمر ۳۹-۴۲) اللہ کا نفوس کا توفی کرنا یا موت کے وقت ہوتا ہے اور جو مرتے نہیں ان کی نیند میں بھی توفی نفس کرتا ہے تیسری کوئی صورت نہیں پس متوفیك کے معنی سوائے تیری قبض روح کرنے والا کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ ہاں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ یہاں مراد نیند میں قبض نفس ہے یا موت کے وقت۔ سو اس پر آگے بحث ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ توفی وفی سے ہے جس کے معنی پورا کرنا ہیں۔ مگر خاص ابواب میں یا خاص محاورات میں جا کر جو معنی ایک لفظ اختیار کرتا ہے ان کا مدار قیاس پر نہیں بلکہ سماع پر ہے۔ اگر لغت کا مدار بجائے سماع کے قیاس پر رکھا جائے تو آج سب الفاظ کے معانی سے امن اُٹھ جاتا ہے۔ پس وفی نے جو معنی باب تفعّل میں اور اس باب کے اس خاص محاورہ توفاہ اللہ میں آکر اختیار کر لیے ہیں ان پر سماع کی شہادت سوائے قبض روح کے چونکہ اور کچھ نہیں اس لیے قیاس سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ وفی کے معنی پورا کرنا ہے اس لیے توفاہ اللہ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے اسے مع جسم لے لیا توفاہ اللہ میں صرف نفس یا روح کا لینا اہل لغت کا فیصلہ ہے اور اشعار جاہلیت کی قرآن کریم کی حدیث کی علم ادب کی ایک بھی مثال اس کے خلاف پیش نہیں کی جا سکتی۔

اور توفاہ اللہ صرف انسانوں پر بولا جاتا ہے نہ دوسرے حیوانات پر اور صرف نیند پر یا موت پر ہی بول سکیں گے اور جس طرح مجنون پر باوجود اس کی قوت عاقلہ ممیزہ کے جاتے رہنے کے توفاہ اللہ کا استعمال جائز نہیں حالانکہ نیند پر توفی کے استعمال کی یہی وجہ بیان کی گئی ہے کہ قوت ممیزہ عاقلہ جاتی رہتی ہے اسی طرح پر اگر یہ ممکن ہے کہ ایک شخص مع جسد عنصری آسمان پر چلا جائے تو اس پر بروئے لغت عرب توفاہ اللہ کا محاورہ بولنا جائز نہیں اس کے لیے کوئی اور لفظ چاہیئے اور لغت اور قرآن کریم کی اس شہادت کے مطابق ہی امام المفسرین حضرت ابن عباس سے متوفیك کے معنی خود بخاری میں ممیتك مروی ہیں یعنی تجھے موت دینے والا ہوں۔

متوفیك پر مفسرین کے خیالات: چونکہ یہ معنی اس عقیدہ کے خلاف تھے جو عیسائیوں میں مروج ہونے کی وجہ سے غلطی سے مسلمانوں میں بھی پیدا ہوگیا۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ ہیں۔ اور دوسری طرف اس کو نزول ابن مریم کی پیشگوئی کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے قوت مل گئی اس لیے ان معنوں کی کسی نے تو یوں توجیہ کر دی کہ موت کے بعد پھر زندہ کر دیا جو احیائے موتٰی کے اصول کے خلاف ہے جس کا ذکر ۴۳۴ میں ہو چکا اور بعض نے کہا تقدیم و تاخیر ہے اور یہ بات حضرت ابن عباس کی طرف بعض روایات میں منسوب کر دی گئی ہے۔ حالانکہ امام بخاری نے ابن عباس سے متوفیك کے معنی ممیتك روایت کرتے ہوئے تقدیم و تاخیر کو قبول نہیں کیا اور اسی لیے روایت کے اس حصہ کو غلط سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ پس قرآن و حدیث لغت اور امام المفسرین کی شہادت سب اس بات پر ہے کہ یہاں متوفیك کے معنی موت دینے والا ہیں اور جن لوگوں نے متوفیك کے معنی مستوفی شخصك من الارض کیے ہیں یعنی تیرے وجود کو زمین سے پورا لینے والا ہوں یا اٰخذك وافیا بروحك کیے ہیں تجھے تیری روح کے ساتھ پورا لینے والا ہوں یا موت تو انہوں نے لغت میں قیاس کو دخل دے کر خود معنی بنا لیے ہیں جن پر کوئی شہادت لغت کی قطعاً نہیں۔ اسی لیے محتاط مفسرین کو باوجود اس خیال کے بھی اسی طرف جانا پڑا کہ متوفیك کے معنی موت دینے والا ہوں ہی ہیں۔ ہاں انہوں نے اپنے خیال کے قائم رکھنے کو یہ بات بڑھا دی کہ کچھ وقت وفات پا کر پھر حضرت عیسٰی زندہ ہو گئے تھے۔ جیسا کہ ابن جریر نے وہب سے یہ روایت کی ہے قال توفی اللہ عیسٰی ثلاث ساعات من النہار یعنی انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی کو تین گھڑی دن کی مردہ رکھا اور حاکم نے ان ہی سے روایت کی ہے ان اللہ توفی عیسٰی سبع ساعات ثم احیاہ کہ اللہ تعالیٰ نے عیسٰی کو سات گھڑی مُردہ رکھا پھر زندہ کیا اور بعض نے کہا یہاں متوفیك سے مراد ہے تجھے سلانے والا ہوں اور پھر اس کی وجہ یہ بتائی ان اللہ تعالیٰ رفع عیسٰی الی السماء وھو نائم رفقا بہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی سے نرم معاملہ کرنے کے لیے ان کو آسمان پر نیند کی حالت میں اٹھایا۔ پھر اتارتے وقت ایک اور توفی وارد کرنی ہوگی اس کا بھی کہیں ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ مگر قرآن شریف نے ایسا ذکر نہیں کیا نہ کسی حدیث میں ہے اور بعض نے کہہ دیا کہ یہاں ترتیب مراد نہیں یعنی توفی پہلے نہیں بلکہ رفع کے بعد ہے مگر یہاں چار باتیں ہیں: توفی، رفع، تطہیر، فوقیت متبعین۔ متوفیك کو اگر اپنی جگہ سے اُٹھایا جائے تو پھر اس کے لیے کوئی بھی موزوں جگہ نہیں رفع کے بعد تطہیر سے پہلے اسے نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ تطہیر تو ہو چکی اور توفی قائلین حیات کے نزدیک ابھی ہوئی نہیں۔ تطہیر کے بعد اور فوقیت سے پہلے بھی اسے نہیں رکھا جا سکتا۔ کیونکہ فوقیت بھی ہو چکی اور فوقیت کے بعد بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس کا زمانہ قیامت تک ممتد ہے۔ تو اس صورت میں وفات گویا بعد قیامت ہوئی جو بالبداہت باطل ہے۔ پس حق یہی ہے کہ جو ترتیب قرآن کریم نے رکھی ہے وہی درست ہے پہلے توفی ہے پھر رفع پھر تطہیر پھر فوقیت۔

حضرت مسیح کی وفات کے نام پر بعض لوگ باوجود اس تصریح کے جو قرآن شریف میں موجود ہے بہت گھبراتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ یہ کوئی نیا عقیدہ ہے جو اسلام میں داخل کیا جا رہا ہے اور سمجھتے ہیں کہ قرآن شریف اور احادیث میں حضرت عیسٰی کے زندہ بر آسمان ہونے کا ذکر ہے۔ حالانکہ نہ صرف قرآن شریف و حدیث میں حیات مسیح کا مطلق کوئی ذکر نہیں بلکہ دونوں جگہ آپ کی وفات کا ذکر ہے۔ اور حیات مسیح پر جو اجماع اُمت سمجھا جاتا ہے اس کا یہ حال ہے کہ چار ائمہ میں سے ایک امام مالک کھلے طور پر وفات مسیح کے قائل ہیں۔ چنانچہ یہ ان کا عقیدہ عتبیہ اور مجمع البحار میں صاف الفاظ میں لکھا ہوا موجود ہے۔ قال مالك مات اور باقی تین اماموں میں سے صراحت سے کوئی حیات مسیح کا قائل نہیں۔ پس اصل عقیدہ اہل سنت والجماعت کا وفات مسیح ہے نہ حیات مسیح۔ پھر یہ بھی غور نہیں کیا جاتا کہ اس وقت عیسائی کس قدر مسلمانوں کے اس شہرت یافتہ خیال سے کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ آسمان پر ہیں فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ناواقف مسلمانوں کو یہ کہہ کر گمراہ کر رہے ہیں کہ تمام رسول بروئے قرآن کھانے کے محتاج تھے مگر مسیح علیہ السلام کا جسم ایسا ہے کہ وہ دو ہزار سال سے زندہ آسمان پر موجود ہیں مگر اس طرح کھانے پینے کے محتاج نہیں جس طرح تمام بشر حتّٰی کہ رسول بھی اس جسم عنصری کی زندگی میں ہوتے ہیں اور اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے اس کا انکار نہیں ہو سکتا کہ اس صورت میں مسیح الاٰن کما کان کے مصداق ہوئے ان کے جسم خاکی میں کوئی تغیر نہیں آتا اور یہ مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی صفت لازم ہے۔ اس لیے مسیح بشر سے

وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بلند کرنے والا ہوں[ع۴۲۵] اور تجھے ان (کے الزام) سے پاک کرنیوالا

نرالا اور خالق کی صفات میں شریک ہے۔ اس طرح پر مسیح کی خدائی کو جس کے لیے ایک بھی دلیل کسی عیسائی کے ہاتھ میں نہیں، ثابت کرنے کیلئے مسلمانوں کا حیات مسیح کا عقیدہ کافی ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات ہیں جن سے حضرت مسیح کا وفات یافتہ ہونا ثابت ہوتا ہے مگران پر اپنے اپنے موقعہ پر بحث آئیگی۔ آیت زیر بحث اکیلی بھی اس کو ثابت کر رہی ہے۔ کیونکہ اگر متوفیك کا وعدہ پورا نہیں ہوا تو باقی وعدے جو اس کے بعد آتے ہیں وہ بھی پورے نہیں ہوئے اور یہ بالبداہت باطل ہے اور یہ درحقیقت پچھلے رکوع کی آخری آیت کا جواب بھی ہے کہ دشمن تو تم کو صلیب کی موت مارنا چاہتے ہیں جو لعنتی موت ہے میں باریک تدبیر سے تمہیں بچاؤں گا اور طبعی موت ماروں گا۔ احادیث میں جہاں کوئی حدیث مرفوع حضرت مسیح کے زندہ ہونے پر یا آسمان پر مع جسد عنصری اُٹھائے جانے پر نہیں ہے۔ بہت سی احادیث سے حضرت مسیح کی وفات ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً مشہور حدیث معراج، جس میں آپ نے حضرت عیسٰی اور حضرت یحیٰی کو ایک ہی جگہ پر دیکھا۔ حالانکہ اگر حضرت عیسٰی زندہ تھے تو وفات یافتہ انبیا میں ان کا کیا کام تھا۔ پھر وہ حدیث جس میں صاف یہ لفظ آتے ہیں لو کان موسٰی وعیسٰی حیین لما وسعهما الّا اتباعی اگر موسٰی وعیسٰی زندہ ہوتے تو انہیں میرا اتباع کرنا پڑتا۔ اور وہ حدیث جس میں ہے ان عیسٰی عاش عشرین ومائة سنة عیسٰی ایک سو بیس[۱۲۰] برس زندہ رہے اور یہ وہ بات ہے جو نبی کریم صلعم فرماتے ہیں جبرائیل نے مجھے بتائی۔ پس وفات مسیح کا عقیدہ نہ صرف قرآن وحدیث سے ثابت ہے بلکہ آئمہ اہل سنت والجماعت کے چار ائمہ میں سے ایک امام کا کھلا مذہب ہے اور باقی تین خاموش ہیں اور آج وفات مسیح کو مان کر مسلمان عیسائی مذہب کی قوت کو ایسا توڑ سکتے ہیں کہ پھر یہ سر اُٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔

ع۴۲۵ رافعك الی۔ رفع کے چہارگونہ استعمال پر دیکھو ع۹۳ اور انسان کے رفع سے مراد بلندی درجات ہونے پر دیکھو ع۳۲۵ لسان العرب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الرافع ہے جس سے مراد ہے وہ جو مومن کو سعید بنا کر اور اپنے اولیاء کو قرب عطا کر کے رفع فرماتا ہے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں اس لفظ کا آنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے انسانوں کو رفع کرنے کا ذکر ہو۔ وہاں مراد بلندی درجات اور قرب کا عطا کرنا ہوتا ہے نہ ایک نیچی جگہ سے اٹھا کر کسی بلند جگہ پر ان کو رکھ دینا پس امام راغب نے جو چار معنی رفع کے دیئے ہیں ان میں سے چوتھے معنی یعنی مرتبہ کی بلندی یہاں صادق آئیں گے کیونکہ یہ انسان کا رفع ہے جو اللہ تعالیٰ کرتا ہے اور یہ رفع اس کے اسم الرافع کے تحت ہی ہوگا رفع کے یہ معنی عام طور پر زبان عرب میں مروج ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں نساء مرفوعات جس کے معنی لسان العرب میں دیئے ہیں نساء مکرمات یعنی معزز عورتیں۔ اور فرش مرفوعة قرآن کریم میں آتا ہے (الواقعة[۵۶]۔ ۳۴) اس کے معنی دیئے ہیں ای مُقَرَّبَةٍ لهم یعنی جوان کے قریب کیے جائیں گے۔ ایسا ہی قیامت کے متعلق قرآن شریف میں آتا ہے حافضة رافعة (الواقعة[۵۶]۔ ۳) جس کے معنی زجاج نے یوں کیے ہیں کہ گنہگاروں کو ذلیل کر دے گی اور فرمانبرداروں کا رفع کرے گی یعنی ان کے مراتب بلند کرے گی۔ اور فی بیوت اذن الله ان ترفع (النور[۲۴]۔ ۳۶) میں ترفع کے معنی لکھے ہیں تعظم (ل) ان کو عظمت دی جائے۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کے انسانوں کو رفع کرنے کا ذکر آتا ہے وہاں رفع کے معنی صرف قرب ہیں نہ جسم کا بلند کرنا۔ ولو شئنا لرفعنٰه بها (الاعراف[۷]۔ ۱۷۶) جہاں تفاسیر میں بھی رفع الی منازل الابرار (ض) یا الی منازل العلماء الی الجنة (ف) وغیرہ لکھا ہے یعنی نیکوں یا علماء کے مقام کی طرف یا جنت کی طرف اور اسی آیت کے نیچے ابن جریر لکھتے ہیں والرفع یعم معانی کثیرة منها الرفع فی المنزلة عنده ومنها الرفع فی شرف الدنیا ومکارمها ومنها الرفع فی الذکر الجمیل والثناء الرفیع۔ یعنی "رفع بہت سے معنوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے اللہ تعالیٰ کے حضور بلندی مرتبہ ہے ان میں سے دنیا میں عزت اور مکرمت کا مقام ہے اور ان میں سے اچھے ذکر اور ثنائے بلند میں رفع ہے۔" لیکن اللہ تعالیٰ کا انسان کو رفع کرنا صرف ایک ہی معنی یعنی بلندی درجات میں آتا ہے اور کبھی کسی دوسرے معنی میں نہیں آیا۔

احادیث رفع کے معنی کا قطعی فیصلہ کر دیتی ہے۔ سب سے زیادہ قابل غور وہ دعا ہے جو بین السجدتین کی جاتی ہے جس میں یہ لفظ آتے ہیں وارفعنی اے خدا مجھے رفع دے کیا آج تک کسی مسلمان کے وہم میں یہ گزرا ہے کہ اس دعا کا منشاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جسم سمیت آسمان پر اُٹھا لے۔ بلکہ اگر اللہ کے انسان کو رفع کرنے کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں تو یہ دعا تو آج تک کسی مسلمان کی قبول نہ ہوئی۔ کیونکہ کوئی مع جسم آسمان پر نہ گیا۔ ترمذی میں ایک حدیث میں ہے:۔ یرید الناس ان یضعوهم ویابی الله الا ان یرفعهم لوگ چاہتے ہیں کہ ان کو ذلیل کریں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے رفع کے سوائے اور کچھ نہیں چاہتا۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو مع جسم آسمان پر اٹھالے جانا چاہتا ہے پھر احادیث تواضع میں باربار آتا ہے کہ جو تواضع کرے اللہ تعالیٰ اس کا رفع کرتا ہے تواضعوا یرفعکم الله اور ایک حدیث میں آتا ہے فاذا تواضع رفعه الله بالسلسلة الی السماء السابعة (کنز العمال جلد ۲ ص۲۶) جب بندہ تواضع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے زنجیر کے ساتھ ساتویں آسمان پر رفع کرتا ہے۔ یہاں رفع بھی ہے ساتواں آسمان بھی ہے زنجیر بھی ہے مگر پھر بھی رفع جسم مراد نہیں بلکہ قرب مراد ہے۔ پس لغت قرآن شریف۔ حدیث سب اسبات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے انسان کو رفع کرنے سے ہمیشہ اور ہر حال میں مراد قرب عطا کرنا ہوتا ہے خواہ کتنے بھی قرائن اس کے خلاف ہوں اور ایک بھی نظیر نہیں جہاں اللہ کے انسان کو رفع کرنے کے معنی سوائے اس کے کچھ اور آتے ہوں۔

خدا کی طرف جانا یا رفع سے مراد: اسی معنی پر ایک قرینہ رافعك الیّ میں لفظ الیّ بھی ہے۔ کیونکہ یہ رفع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے آسمان کی طرف رفع کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کوئی جسم نہیں جو آسمان پر ہو اور اس پر اتفاق ہے کہ اللہ کا مکان میں ہونا ممتنع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں اللہ کی طرف یا رب کی طرف جانے کا ذکر ہو کبھی بھی مراد انتقال جسمانی نہیں ہوتا بلکہ قرب روحانی مراد ہوتا ہے جیسے ارجعی الی ربك۔ انا الیه راجعون۔ انی ذاهب الی ربی اتخذ الی ربه سبیلا۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں صفائی سے لکھ دیا ہے رفعه فی قوله ورافعك الیّ هو الرفعة بالدرجة والمنقبة لا بالمکان و

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ ہوں جو کافر ہیں[۴۴۶] اور جنھوں نے تیری پیروی کی انھیں ان پر جنھوں نے انکار کیا قیامت
كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ کے دن تک فوقیت دینے والا ہوں[۴۴۷] پھر میری ہی طرف تمھارا لوٹ آنا ہے پس

الجهة یعنی رافعك الیّ میں رفع سے مراد درجہ اور مرتبہ میں بلندی ہے نہ مکان اور جہت کی بلندی۔

۴۴۶ حضرت عیسٰی کی تطہیر: مطهرك من الذين كفروا۔ طہارت دو طرح پر ہے ایک طہارت جسم اور دوسرا طہارت نفس۔ طہارت جسمانی تو یہاں مراد ہی نہیں ہوسکتی۔ طہارت نفس کے معنی عموماً مفسرین نے لیے ہیں اور معنی یوں کیے ہیں۔ مُخْرِجُكَ من جُمْلَتِهم ومُنَزِّهُكَ اَنْ تَفْعَلَ فِعْلَهُمْ (غ) یعنی ان کی (یعنی کافروں کی) جماعت سے باہر نکالنے والا اور تمہاری تنزیہ کرنے والا اس امر سے کہ تم ان کے افعال کرو مگر ظاہر ہے کہ یہ معنی یہاں نہیں لگتے اس لیے کہ کافروں کے فعل کرنے سے پاک کرنا تو نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے نہ نبی بنایا جانے کے بعد کا بلکہ نبی تو فطرتاً ہی گناہ سے پاک کیا جاتا ہے پھر ایسا وعدہ دینے کی ضرورت کیا تھی اور بعض نے کہا تطهيره عليه السلام بتبعيده منهم بالرفع (ر) یعنی رفع کرکے ان سے دور کر دینا ہی تطہیر تھی مگر یہ بھی تحصیل حاصل ہے اس تبعید کا ذکر تو رافع میں آچکا دوبارہ اس کے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ مطهرك من الذين كفروا میں درحقیقت ایک اور قسم کی تطہیر مراد ہے۔ انبیاء ویسے تو مطہر ہی ہوتے ہیں۔ مگر لوگ ان پر جھوٹے الزامات لگا کر ان کو نعوذ باللہ ناپاک مشہور کرتے ہیں۔ ان جھوٹے الزامات کی قرار واقعی تردید بھی درحقیقت ایک تطہیر ہے۔ اور یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح ہمارے نبی کریم صلعم کے متعلق فرمایا ليغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تأخر جہاں مراد وہ ذنوب ہیں جو دوسرے لوگ آپ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ پس انبیاء کی تطہیر اور غفر تو پہلے سے ہو چکا ہوتا ہے آئندہ جس تطہیر اور غفر کا وعدہ ہوتا ہے وہ ان امور سے تطہیر اور غفر ہے جو دشمن ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

۴۴۷ اتبعوك۔ تَبِعَ اور اِتَّبَعَ کے معنی ہیں اس کے نقش قدم پر چلا (غ) حقیقی معنی تو یہی ہیں۔ مگر چونکہ ہر ایک متبع کامل طور پر نقش قدم پر چلنے والا نہیں ہوسکتا، اس لیے الذين اتبعوك میں وہ لوگ بھی داخل ہوسکتے ہیں جو صرف نقش قدم پر چلنے کا دعویٰ کرتے ہوں جن مفسرین نے اس سے مراد مسلمانوں کو لیا ہے سخت غلطی کھائی ہے اس سے مراد صرف عیسائی ہیں اور مسلمان حضرت عیسٰی کے متبع نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلعم کے متبع ہیں ابھی حدیث نقل ہو چکی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر موسٰی اور عیسٰی زندہ ہوتے تو وہ میرے متبع ہوتے۔ پس مسلمان حضرت عیسٰی کے متبع نہیں اور اسی کی طرف قرآن کریم نے خود بھی رہنمائی فرمائی ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ صاف فرمایا: فاٰمنت طائفة من بني اسرائيل وكفرت طائفة فايّدنا الذين اٰمنوا على عدوهم فاصبحوا ظاهرين (الصف[۶۱]۔۱۴)

فوق کا استعمال بلحاظ مکان اور زمانہ اور جسم اور عدد اور مرتبہ کے ہوتا ہے۔ یہاں مفسرین کو بالاتفاق تسلیم کرنا پڑا ہے کہ فوقیت مکانی مراد نہیں اور یہاں فوقیت سے غلبہ بلحاظ دلائل مراد لیا ہے یا ظاہری غلبہ یعنی حاکم و محکوم کا۔ يعلونهم بالحجة او السيف (ض)

الذين كفروا سے مراد کل غیر عیسائی یا غیر مسلم نہیں بلکہ صرف وہ لوگ جو بالخصوص حضرت مسیح کا کفر کریں اور اس لیے ان الفاظ میں صرف یہود کا ذکر مقصود ہے کہ وہ کل انبیائے بنی اسرائیل کو مانتے چلے آئے مگر حضرت عیسٰی کا انکار کر دیا۔

یہاں حضرت مسیح کو کل چار وعدے دیئے گئے ہیں۔ جو بجواب تدابیر کفار ہیں جن کا ذکر پچھلی آیت میں الفاظ مکروا میں صاف طور پر فرمایا ہے۔ ان چار وعدوں میں سے پہلا وعدہ ہے کہ تمہیں طبعی موت سے وفات دوں گا۔ دوسرا وعدہ ہے کہ تمہارا اپنی طرف رفع کروں گا یعنی اپنا قرب عطا فرماؤں گا تیسرا وعدہ ہے کہ ان الزامات سے جو تم پر لگائے جائیں گے تم کو پاک وصاف کرونگا اور چوتھا وعدہ ہے فوقیت یعنی حضرت مسیح کے نام لیوا آپ کے منکروں پر بذریعہ دلائل یا قہری طور پر غالب رہیں گے۔ قرآن کریم کا لفظ لفظ اپنے اندر اعجاز رکھتا ہے۔ یہودیوں کی تدبیر کا ذکر تھا۔ وہ تدبیر کیا تھی؟ حضرت عیسٰی کو بذریعہ صلیب مارنا۔ تو اول تو بذریعہ صلیب مارنے کی نفی کی اور اس کا جواب دیا متوفيك بذریعہ صلیب تمہیں نہیں مار سکیں گے بلکہ تم اپنی طبعی موت سے مروگے۔ پھر صلیب پر مارنے کا نتیجہ تھا کہ ایسا شخص ملعون ہو۔ کیونکہ استثناء ۲۱ : ۲۲ و ۲۳ میں صلیب کا ذکر کرکے لکھا ہے "کیونکہ وہ جو پھانسی دیا جاتا ہے خدا کا ملعون ہے"۔ اور گلیتیون ۳:۱۳ میں پولوس کہتا ہے "کیونکہ لکھا ہے جو کوئی کاٹھ پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے"۔ اور ملعون کے معنی ہیں خدا سے دُور۔ اس لیے اس نتیجہ کی نفی کی کہ وہ خدا سے دور نہیں بلکہ مرفوع یعنی خدا کا مقرب ہوگا پھر صلیب پر مار کر اور کذاب مشہور کرکے غلط الزامات کا آپ پر لگانا تھا جیسے مثلاً یہ کہ آپ ناجائز تعلق سے پیدا ہوئے جیسا کہ قولهم على مريم بهتانا عظيما سے ظاہر ہے اس کی نفی مطهرك من الذين كفروا میں کی یعنی فرمایا کہ تم پر سے یہ الزامات بھی دور کر دوں گا۔ یا یہ کہ تم پر سے ملعون ہونے کے الزام کو بھی دور کرونگا جو دوسرا نتیجہ صلیب کا ہے اور پھر وہ مصلوب کرکے تم کو ناکام کرنا چاہتے ہیں سو میں تمہارے پیروؤں کو تمہارے منکروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔

اور چاروں وعدوں میں ایک اور بھی لطیف ترتیب ہے۔ رفع یعنی حقیقی قرب کا مقام بعد وفات ہی حاصل ہوتا ہے جب سارے حجاب دور ہو جاتے ہیں پس توفی کے بعد رفع فرمایا تو جب مقام قرب عطا ہوتا ہے تو دوسری طرف مخلوق میں بھی محبت اور عزت بڑھتی ہے یہی آپ کی تطہیر یعنی الزامات سے پاک کیا جاتا ہے اور عزت اور محبّت کے بعد متبعین کی کثرت اور غلبہ کا ہونا لازمی امر ہے۔ اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ خیال کہ کبھی حضرت عیسٰی پھر آئینگے تو سارے اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے قرآن کریم کے خلاف ہے اس لیے کہ قرآن شریف قیامت تک مسیح کے پیروؤں اور مسیح کے منکروں کا وجود ضروری قرار دیتا ہے۔

فَاَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ فِيۡمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۵۵﴾

میں تمہارے درمیان ان باتوں میں فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۴۴۸

فَاَمَّا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فَاُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا شَدِيۡدًا فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۵۶﴾

سو وہ جنھوں نے انکار کیا میں ان کو دنیا اور آخرت میں سخت دکھ کا عذاب دوں گا، اور ان کے لیے کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۴۴۹

وَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۵۷﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے سو ان کے اجر اُن کو پورے دے گا اور اللہ ظالموں سے محبّت نہیں کرتا۴۵۰

ذٰلِكَ نَتۡلُوۡهُ عَلَيۡكَ مِنَ الۡاٰيٰتِ وَالذِّكۡرِ الۡحَكِيۡمِ ﴿۵۸﴾

یہ ہم آیتوں اور حکمت والے ذکر سے تجھ پر پڑھتے ہیں۴۵۱

اِنَّ مَثَلَ عِيۡسٰى عِنۡدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ‌ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ

بیشک عیسیٰؑ کی حالت اللہ کے نزدیک آدم کی حالت کی مانند ہے اسے مٹی سے پیدا کیا پھر اسے کہا ہو جا، پس وہ

---

۴۴۸ ان الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ اختلاف عقائد کا فیصلہ قیامت کے دن ہی ہوگا۔ یعنی دنیا میں اختلاف عقائد کا فیصلہ کبھی نہیں ہوتا اور اختلاف عقائد قیامت تک رہے گا۔ اس سے بھی ان لوگوں کا خیال باطل ثابت ہوتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت عیسےٰ پھر آئیں گے تو اختلاف عقائد دنیا سے مٹ جائے گا اور اس دنیا میں ہی سب فیصلے ہو جائیں گے۔

۴۴۹ مسیح کے منکروں کیلئے عذاب دنیا۔ جس اختلاف پر فیصلہ کا ذکر پچھلی آیت میں کیا تھا اب اس کی تفصیل فرماتا ہے کہ اختلاف کرنے والوں میں سے ایک گروہ تو حضرت عیسےٰ کے منکروں کا ہے ان کو دونوں جگہ سزا ملے گی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سو یہود کی دنیا کی سزا اظہر من الشمس ہے۔ یہ قوم باوجود مالدار ہونے کے ہمیشہ دنیا میں ذلیل رہی ہے اور جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کوئی ان کا یار و مددگار نہیں بنتا۔ ذلّت سے بڑھ کر کوئی دکھ کا عذاب نہیں۔

۴۵۰ الظالمین۔ ظلم کے معنی کے لیے دیکھو ۵۵ جہاں دکھایا گیا ہے کہ شرک بھی ایک ظلم ہے اور قرآن کریم میں ہے ان الشرك لظلم عظيم (لقمٰن ۳۱ - ۱۳) سب سے بڑا ظلم شرک ہے اور وہی یہاں مراد ہے اس لیے کہ یہ مسیح کو خدا بنانے والوں کا ذکر ہے۔

عیسائیوں کے دو گروہ: یہ ماننے والوں کا گروہ ہے جس کے یہاں دو حصّے کر دیئے ہیں ایک حصّہ الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات والوں کا ہے یعنی وہ جو عقیدہ بھی صحیح رکھتے تھے اور عمل بھی اچھے کرتے تھے اور دوسرا حصّہ الظالمین کا ہے جس سے مراد حضرت عیسٰی کو خدا ماننے والے ہیں اور لا یحب الظالمین میں اسی طرف اشارہ ہے کیونکہ وہ خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ وہ مشرک ہیں ان کا دعویٰ محبّت جھوٹا ہے خدا ان سے محبّت نہیں کرتا۔ اس لیے بھی پہلے گروہ کے ساتھ جو حضرت مسیح کے صحیح معنی میں متبع تھے عملوا الصالحات کی شرط لگا دی ہے کہ یہ دوسرا گروہ کفارہ کو اصل بنیاد قرار دے کر اعمال صالحہ سے محروم ہو گیا ہے۔

۴۵۱ الاٰیات سے مراد یہاں حجج یا دلائل ہیں جو اوپر گزر چکی ہیں جن کی طرف لفظ ذٰلك میں اشارہ بھی کیا ہے کیونکہ اٰیۃ کا استعمال محسوسات اور معقولات دونوں میں ہوتا ہے۔

الذکر۔ اصل میں یاد کرنے یا یاد دلانے کو کہا جاتا ہے اور یہاں ذکر سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ ذکر قرآن شریف کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور ذکر اس کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ان تمام باتوں کو جو فطرتِ انسانی میں مرکوز ہیں یاد دلاتا ہے۔ یا اس لیے کہ وہ انسان کو شرف اور بزرگی کے مقام پر پہنچاتا ہے۔

الحکیم۔ یہاں ذکر یا قرآن شریف کی صفت ہے اور یہ لفظ قرآن شریف کی وصف میں اور جگہ بھی آیا ہے یٰسٓ والقراٰن الحکیم (یٰسٓ ۳۶ - ۱) قرآن کریم کو حکیم اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں اعلیٰ درجہ کی حکمت کی باتیں ہیں (غ) جس پر قرآن کریم بھی شاہد ہے۔ ولقد جاءهم من الانباء مافيه مزدجر حكمة بالغة (القمر ۵۴ - ۴ و ۵)

حضرت مسیح کے حالات ان کی اُلوہیت کے خلاف دلیل ہیں: یہاں بالخصوص آیات یعنی دلائل کا لفظ لانا اور پھر ان باتوں کو پُرحکمت قرار دینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ اوپر حضرت عیسٰی کے متعلق کہا گیا ہے وہ دعویٰ نہیں بلکہ دلائل ہیں اور پُرحکمت باتیں ہیں۔ ان کی پیدائش، اُن کا بچپن، ان کی وفات کے حالات، ان کی تعلیم، ان کے نشانات یہ سب کچھ دلائل ہیں جو عیسائیت کے لبطلان پر دی گئی ہیں جو لوگ ان باتوں کو محض قصوں کہانیوں کی حد تک سمجھتے ہیں وہ یہاں لفظ

فَيَكُوْنُ ﴿٥٩﴾

ہو جاتا ہے۔ [۴۵۲]

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٦٠﴾

حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس تو جھگڑا کرنے والوں میں سے نہ ہو۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ
مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا
وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا
وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ
اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦١﴾

پھر اگر کوئی اس کے بعد جو تیرے پاس علم آ چکا، اس کے بارے میں تجھ سے جھگڑا کرے تو کہہ آؤ ہم اپنے بیٹوں اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے لوگوں اور تمہارے لوگوں کو بلائیں پھر گڑگڑا کر دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔ [۴۵۳]

حکیم کے لانے پر غور کریں۔

ع۴۵۲ مثل کے معنی کے لیے دیکھو ع۳۸۔ یہاں مراد صفت یا حالت ہے اور فرمایا کہ عیسٰی کی حالت اللہ کے نزدیک آدم کی حالت کی طرح ہے۔ اسے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اسے کہا ہو، سو وہ ہو گیا۔ آدم کا ذکر قرآن کریم میں دو رنگ میں آیا ہے۔ ابوالبشر ہونے کے لحاظ سے یعنی بشریت کے لوازمات تامہ اس میں پائے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ایک ہونے کے لحاظ سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق جو کچھ اوپر ذکر ہوا۔ اس میں بھی انہی دو باتوں کا ذکر ہے یعنی حضرت عیسٰی میں بشر ہونے کی ساری صفات پائی جاتی ہیں اور دوسرے وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ایک ہیں۔ چنانچہ بشریت کے لحاظ سے آپ کی پیدائش، طفولیت، کہولت، وفات کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ یہی باتیں بشر کو خدا سے الگ کرتی ہیں۔ بشریت کے تقاضوں میں سے ہی پیدا ہونا اور مرنا اور اس دنیا کی زندگی میں ان تغیرات کے ماتحت آنا ہے جو طفولیت سے لیکر کہولت تک انسان پر آتے ہیں۔ خدا نہ پیدا ہوتا ہے نہ مرتا ہے نہ اس پر تغیرات آتے ہیں کہ بچپن کی حالت سے ترقی کرتا کرتا ترقی کے آخری مرتبہ پر پہنچ کر پھر اس کے قویٰ میں تنزل واقع ہونا شروع ہو اور برگزیدگی کے لحاظ سے آپ کے رسول ہونے اور دنیا میں ایک روحانی انقلاب پیدا کرنے اور رفعت مرتبہ وغیرہ کا ذکر ہے پس جو کمال آدم میں اللہ تعالیٰ نے رکھا تھا۔ وہ کمال حضرت عیسٰی علیہ السلام کو بھی دیا اور اس طرح پر عیسائیوں پر اتمام حجت کی اور اس اتمام حجت کا خلاصہ اس آیت میں ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ اس سورت کے صدر میں عیسائیوں کے ساتھ ہی بحث ہے اور غرض اس سارے بیان کی حضرت مسیح میں لوازمات بشریت کا ثابت کرنا اور یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ خدا نہ تھا۔ پس ساری بحث کو اب بطور خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ جو کچھ باتیں آدم میں پائی جاتی ہیں یعنی بشریت اور برگزیدگی وہی عیسٰی میں پائی جاتی ہیں۔ خدا تم اس کو کس بنا پر بناتے ہو۔ مماثلت کے لیے تو یہی دو امر کافی ہیں بشریت اور برگزیدگی اور اگر یہ کہا جائے کہ صورت پیدائش میں مشابہت ہے تو کوئی مشابہت فی الواقع نہیں آدم کو جس طرح بنایا مسیح کو اس طرح نہیں بنایا۔ مسیح کو ماں کے پیٹ میں رکھا۔ پھر بچہ بنایا۔ پھر بڑھایا۔ آدم کی خلق کے متعلق جو کچھ صورت سمجھی جاتی ہے اس کی رو سے آدم پر یہ حالات نہیں گزرے پس مشابہت صورت خلق میں نہیں نہ صورت خلق کا یہاں ذکر ہے بلکہ بشریت اور برگزیدگی میں مشابہت ہے اس لیے ان اللہ اصطفٰی اٰدم بطور تمہید بھی اس سے پہلے بیان کیا ہے۔ کن فیکون کا استعمال بھی یہی بتاتا ہے یعنی ہو جاتا ہے کہا گیا نہ ہو گیا۔ جس میں استمرار پایا جاتا ہے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون رہا ہے کہ وہ انسانوں کو برگزیدگی کے مقام پر کھڑا کرتا رہا ہے۔

خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون۔ میں بھی انہی دو مذکورہ بالا باتوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے یعنی خلقه من تراب یا مٹی سے پیدا کرنے میں بشریت کی طرف اشارہ ہے اور کن فیکون میں برگزیدہ کیا جانے کی طرف کیونکہ خلق کے بعد کن کا امر یہی معنی رکھ سکتا ہے کہ اس کو ایک دوسری زندگی عطا فرمائی یعنی روحانی زندگی یا اپنا کلام اس میں نفخ کیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مٹی سے پیدا کیا جانا کوئی آدم اور عیسٰے علیہ السلام کے ساتھ مخصوص امر نہیں۔ بلکہ ہر فرد بشر کو اللہ تعالیٰ مٹی سے ہی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ کہف میں مومن اور کافر کے مکالمہ میں مومن کافر کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ اکفرت بالذی خلقك من تراب ثم من نطفة ثم سوّٰك رجلا (الکھف ۱۸:۳۷) تو اس ذات پاک کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے پھر تجھے ٹھیک مرد بنایا۔ ایسا ہی سورۃ الحج میں فرمایا۔ یاایھا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقنٰکم من تراب (الحج ۲۲:۵) اے لوگو اگر تم بعثت کے بارے میں شک میں ہو تو غور کرو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پس مٹی سے ہی سب نوع بشر پیدا ہوئی ہے۔ ہاں پھر بعض کو اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے اور ایک روحانی زندگی عطا فرماتا ہے۔ بن باپ پیدائش کا نہ یہاں کوئی ذکر ہے، نہ کوئی ایسا اعتراض موجود ہے جس کا جواب دیا ہو۔ کیونکہ اس کا ذکر اگر ہونا تو وہاں ہوتا جہاں پیدائش کے حالات کا ذکر تھا۔ یہاں تو حضرت عیسٰی کی وفات کے تذکرہ کے ساتھ ساری بحث کو ختم کر کے اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے بلکہ فیکون کا لفظ آخر پر مضارع لا کر بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہر حال میں جاری ہے صرف دو مخصوص مثالوں پر محدود نہیں۔

ع۴۵۳ تعالوا۔ اصل میں یہ لفظ (علو سے مشتق ہونے کی وجہ سے) کسی بلند مکان کی طرف بلانے کے لیے آتا ہے پھر ایک مکان کی طرف بلانے کے لیے

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ یقیناً یہی سچا بیان ہے اور اللہ کے سوا کوئی بھی معبود

یہاں مراد ہے۔ رائے اور عزم کو پختہ کر کے آؤ۔
نبتھل۔ اَلْبَہْلُ وَالْاِبْتِہَالُ فِی الدُّعَاءِ الاسترسال فیہ والتضرّع (غ) یعنی بہل اور ابتہال دعا میں ٹھہر ٹھہر کر مانگنا اور تضرع کرنا ہے۔ اور آگے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے ابتہال کی تفسیر لعنت سے کی ہے وہ اس لیے ہے کہ اس میں ٹھہرنا لعنت کی غرض سے ہے۔ اور لسان العرب میں بھی ہے ابتھل فی الدعاء اذا اجتھد یعنی ابتہال دعا میں اجتہاد یا زور سے دعا کرنا ہے۔
دعوت مباہلہ عیسائیوں پر اتمام حجت کے لیے: اس مضمون کو ان الفاظ سے شروع کیا ہے کہ اس کے بعد جو تیرے پاس علم آچکا یعنی دلائل جو اوپر دی گئیں۔ دلائل کی رُو سے جب اتمام حجت کر دیا اور عیسائیوں نے دلائل کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پھر مباہلہ کے لیے بلایا یعنی بالمقابل دعا کرنے کیلئے اور دعا پر پورا زور لگانے کے لیے یہ گویا ایک دوسرے رنگ کا اتمام حجت تھا۔ دعا کی قبولیت کے عیسائی بھی قائل ہیں اور انجیل میں ہے کہ متقی کی دعا سنی جاتی ہے چنانچہ عبرانیوں ۵: ۷ میں جہاں مسیح کے صلیب کی موت سے بچنے کے لیے رو رو کر دعائیں کرنے کا ذکر ہے "بہت رو رو اور آنسو بہا بہا کے اس سے جو اس کو موت سے بچا سکتا تھا دعائیں اور منتیں کیں" وہاں اس دعا کی قبولیت کا ذکر ان الفاظ میں ہے وسمع لہ من اجل تقوٰلہ یعنی اس کے تقویٰ اور پرہیزگاری کی وجہ سے اس کی دعا سنی گئی۔ پس جب عیسائیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ ساری دنیا گنہگار ہے اور ہم ہی کفارہ پر ایمان لا کر متقی بنے ہیں تو ضرور تھا کہ اس پہلو سے بھی ان پر اتمام حجت کیا جاتا اور یہی اس آیت میں ذکر ہے۔
واقعہ مباہلہ وفد نجران سے: بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ میں روایت ہے۔ جاء العاقب والسید صاحبا نجران الی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یریدان ان یلاعناہ قال فقال احد ھما الصاحبہ لاتفعل فو اللہ لئن کان نبیا فلاعناہ لا نفلح نحن ولا عقبنا من بعدنا یعنی عاقب اور سید نجران کے قائمقام رسول اللہ صلعم کی طرف آئے کہ آپ سے ملاعنہ کریں راوی (حذیفہ) کہتا ہے پھر ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو کہا ایسا مت کر و خدا کی قسم اگر یہ نبی ہو اور ہم نے اس سے ملاعنہ کیا تو نہ ہم اور نہ ہماری نسل ہمارے بعد کامیاب ہونگے۔
اور محمد بن اسحاق نے سیرۃ میں لکھا ہے کہ وفد نجران (جو عیسائی تھے) ساٹھ سوار رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں سے چودہ ان کی قوم کے سردار تھے۔ جن میں عاقب (جس کا نام عبدالمسیح تھا) اور سید (ایہم) کا نام بھی لیا ہے اور عاقب ان کا سردار تھا اور سید ان کا لاٹ پادری تھا۔ ان لوگوں کو ڈیرہ نبی کریم صلعم نے مسجد نبوی میں کرایا اور جب ان کی نماز کا وقت آیا تو مسجد میں ہی انہوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی (اس سے نبی کریم صلعم کی وسعت قلبی کا اندازہ کرو کہ اپنی مسجد میں عیسائیوں کو نہ صرف ٹھہراتے ہیں بلکہ انکو اپنی طرز پر عبادت کرنے کی بھی اجازت دیتے ہیں) پس جب انہوں نے دلائل کو نہ مانا اور الوہیت مسیح کے عقیدہ پر اصرار کیا تو نبی کریم صلعم نے ان کو مباہلہ کے لیے بلایا۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں انہوں نے کہا کہ ہم کو مہلت دیجئے کہ ہم مشورہ کر لیں۔ سو جب انہوں نے مشورہ کیا تو یہی مشورہ قرار پایا کہ مباہلہ کرنے میں ہماری خیر نہیں اس لیے انہوں نے مباہلہ سے انکار کر دیا اور جیسا کہ بخاری کی روایت میں آیا ہے جزیہ قبول کیا اور ابوعبیدہ ان کے ساتھ گئے اور ابن مردویہ کی روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ صلعم نے ان کو مباہلہ کے لیے بلایا تو انہوں نے کہا ہم کل کریں گے۔ سو اگلے دن رسول اللہ صلعم علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ، حسینؓ کو ساتھ لیے نکلے اور ان کو بلایا۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔
پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وفد نجران نے مباہلہ سے انکار کر دیا۔ ان کے عیسائی حمایتی کہتے ہیں کہ وہ بددعا کرنا نہ چاہتے تھے۔ یہ وکالت اس لیے بھی بے سود ہے کہ عیسائی تو اب تک نعوذ باللہ آنحضرت صلعم کو دجال کہتے ہیں وہ کونسے ان کے بزرگ تھے جو دجال کے لیے بد دعا کرنا جائز نہ سمجھتے تھے۔ احادیث صحیحہ سے صاف ثابت ہے کہ وہ ڈر گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کو اللہ تعالیٰ نے یہ علم دیا تھا کہ عیسیٰ پرستی کا عقیدہ دنیا میں بہت زور پکڑنے والا ہے اس لیے اس کے خلاف ہر رنگ سے اتمام حجت کیا ہے۔ اوّل دلائل کی رو سے، پھر بارگاہ الٰہی میں بالمقابل دعا سے فیصلہ کے طریق سے۔ اور سب سے آخر ایک اور طریق پر ان کو بلایا ہے جس کا ذکر اگلے رکوع میں آتا ہے۔
مباہلہ میں حضرت علیؓ کا نکلنا اور اہل تشیع: شیعہ کہتے ہیں علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ، حسینؓ کے ساتھ لانے میں آپ نے حضرت علیؓ کی فضیلت کی طرف اشارہ کیا ہے حالانکہ بات تو صاف ہے ابناء میں حسنؓ حسینؓ بلکہ حضرت علیؓ داخل ہیں کیونکہ داماد بھی بیٹا ہی ہوتا ہے اور نساء میں حضرت فاطمہ اور انفسنا میں خود نبی کریم صلعم۔ مراد تو صرف یہ تھی کہ جو شخص جھوٹا ہے اللہ تعالیٰ اس کا ایسا استیصال کر دے کہ اس کے پیچھے بھی تباہ ہو جائیں اور سلسلہ نسل منقطع ہو جائے۔ یہاں فضیلت کا کوئی سوال نہیں۔ دوسرے ایک روایت میں یہ لفظ بھی آتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور ان کے بیٹے اور حضرت عمرؓ اور ان کے بیٹے اور حضرت عثمانؓ اور ان کے بیٹے اور حضرت علیؓ اور ان کے بیٹے بھی نکلے تھے (م)، بہرحال یہ تو ظاہر ہے کہ ابھی آنحضرت صلعم گھر سے ہی نکلے تھے۔ اور اگر فی الواقعہ مباہلہ ہوتا تو شاید بڑے بڑے صحابہ کو مع ان کی اولاد اور بیبیوں کے بھی بلاتے لیکن عیسائیوں نے پہلے ہی انکار کر دیا۔ پس اس روایت سے تو کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔
مباہلہ کب جائز ہے: ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مباہلہ اب بھی جائز ہے؟ نبی کریم صلعم نے بغیر امر الٰہی مباہلہ نہیں کیا اور جب امر ہوا تو صرف انہی لوگوں کو مباہلہ کے لیے بلایا جن کے ساتھ مباہلہ کرنے کا صراحت سے حکم آچکا تھا۔ اس لیے بدون امر الٰہی مباہلہ کرنا جائز معلوم نہیں ہوتا۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اصلاح کیلئے مامور کرے وہ اپنے اعدا سے خدا کی طرف سے حکم پانے پر مباہلہ کر سکتا ہے۔ ہاں ابن عباس کے متعلق ایک روایت عبد حمید نے بیان کی ہے کہ آپ کا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا ہو گیا تھا تو آپ نے اسے مباہلہ کے لیے بلایا (د) مگر اوّل حضرت ابن عباس کا فعل کوئی حجت شرعی نہیں، دوسرے اگر باہمی جھگڑوں پر مباہلہ ہونے لگے تو دن رات مسلمانوں

إِلَّا اللّٰهُ ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾
فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾
قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ
بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا
مِّن دُونِ اللّٰهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا
بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٦٤﴾

نہیں اور یقیناً اللہ ہی غالب حکمت والا ہے ۴۵۴
اور اگر وہ پھر جائیں تو اللہ فساد کرنے والوں کو جانتا ہے۔
کہہ اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے اور اگر وہ پھر جائیں تو تم کہو گواہ رہو کہ ہم فرماں بردار ہیں ۴۵۵

کے باہم مباہلے ہی ہوتے رہیں اور بجائے اخوت اور محبت کے جس کا پیدا کرنا اسلام کی اصل غرض ہے ایک دوسرے کی بیخ کنی اور استیصال کے درپے ہی رہیں۔

ع۴۵۴ قصص کے معنی اثر یعنی نقش قدم بھی ہیں۔ اور قصص اخبار مُتَتَبَّعَۃ کو بھی کہتے ہیں یعنی خبریں کا تتبع کیا جائے۔ الحق قصص کی صفت ہے۔
آیت کے اخیر پر عزیز حکیم کی صفات لانے کا اشارہ کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ نصرانیت کا غلبہ آخر دنیا سے دور ہو جائے گا۔ اور ما من الٰہ الا اللہ یعنی ایک ہی خدا کی عبادت رہ جائے گی۔

ع۴۵۵ سواء کے معنی وَسَط ہیں جب مکان سے تعلق ہو۔ اور کلمۃٌ سواءٌ سے مراد امام راغب عدل من الحکم لیتے ہیں۔ یعنی انصاف کی بات۔ اور ابن عباس سے بھی عدل معنی مروی ہیں۔ مگر سواء مصدر بمعنی مستویۃ بھی ہو سکتا ہے اولا یختلف فیہ التوراۃ والانجیل والفرقان (ر) یعنی مشترک بات جس میں تورات انجیل اور قرآن اختلاف نہیں کرتے اولا اختلاف فیہا بکل الشرائع (ر) یعنی تمام شریعتیں اس پر متفق ہوں۔

شرک فی الصفات: لا نشرك به شيئا۔ شرک کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۲۱ یہاں مراد شرک عظیم ہی ہے۔ یعنی کسی چیز کو باری تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا اور یہ اس طرح پر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی دوسرے کو کامل شریک ٹھہرایا جائے۔ جیسے مجوسیوں کا دو خالق تجویز کرنا۔ یا عیسائیوں کا مسیح کو صفات کاملہ باری تعالیٰ ازلیت ابدیت قدرت وغیرہ میں شریک ٹھہرانا۔ یا آریہ سماج کا مادہ اور روح کو باری تعالیٰ کی صفت ازلیت اور خود بخود اور غیر مخلوق ہونے میں شریک ٹھہرانا۔ یہ سب شرک عظیم میں داخل ہیں۔

اربابا من دون اللہ۔ رب کی جمع ہے دیکھو ع۲۔ اور ارباب سے مراد یہ ہے کہ ان کو مسبب الاسباب اور مصالح عباد کا متولی سمجھا جائے اور اس لیے ان کی اطاعت اس طرح کی جائے جس طرح رب کی اطاعت کی جاتی ہے خود قرآن کریم نے اس کی تصریح فرما دی ہے۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ (التوبۃ۔ ۳۱) انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا ہے۔ ترمذی نے عدی بن حاتم سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ صلعم سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم ان کی عبادت نہ کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا اما کانوا یحللون لکم ویحرمون فتاخذون بقولھم کیا یہ نہیں تھا کہ وہ تمہارے لیے حرام اور حلال ٹھہراتے اور تم انہی کے قول کے پیچھے چلتے۔ تو انہوں نے کہا ہاں ایسا ہی کرتے تھے پس جو مسلمان اپنے پیروں اور علماء کے پیچھے اس طرح آنکھیں بند کر کے چلتے ہیں کہ اپنی عقل و فکر سے کبھی کام نہیں لیتے۔ وہ بھی اسی فتویٰ کے ماتحت ہیں۔ اس آیت میں تین قسم کے شرک سے منع فرمایا ہے۔ ایک شرک فی العبادت، دوسرے شرک فی الصفات، تیسرے شرک فی الاطاعت۔ شرک فی العبادت کو الا نعبد الا اللہ میں لیا ہے یہ بہت موٹا شرک ہے کہ کسی چیز کے آگے سجدہ کیا جائے یا اس سے دعا کی جائے جیسے بت پرست کرتے ہیں۔ یا بعض عیسائی بھی حضرت مسیح سے یا حضرت مریم سے دعا کرتے ہیں بلکہ رومن کیتھولک ان کے بت بھی رکھتے ہیں۔ اس سے اُتر کر شرک فی الصفات ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی چیز کو کامل شریک ٹھہرانا جس کا ذکر لا نشرك به شيئا میں کیا ہے کسی چیز کے شریک کرنے سے مراد یہی ہے کہ اس میں کامل طور پر کوئی صفت ایسی مانی جائے جیسے اللہ تعالیٰ کی صفت ہوتی ہے۔ اور تیسرا شرک فی اطاعت ہے جس کا ذکر اربابا من دون اللہ میں کیا اور ان تمام قسم کے موٹے شرکوں سے منع فرمایا۔

اصول مقابلہ مذاہب اور صداقت اسلام: جیسا کہ پچھلے رکوع کے آخر میں میں نے کہا تھا جب دلائل اور دعاء دونوں سے اتمام حجت ہو چکا اور دلائل کے قبول کرنے سے انہوں نے انکار کیا اور دعا میں مقابلہ سے خائف ہوئے تو اب اُن پر ایک اور رنگ میں اتمام حجت کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمہارے اور ہمارے مذہب میں جو امر مشترک ہے اس کو دونوں بنیاد کے طور پر مان لیں تو بہت سا فساد مٹ جاتا ہے ایک عیسائیت کیا جملہ مذاہب پر اسلام کی یہ حجت قائم ہے کہ اگر سب مذاہب میں امر مشترک کو نکالا جائے تو وہ اسلام کا مذہب ہے اور اس لیے کسی مذہب کا پیرو بھی اسلام کی حقانیت کا انکار نہیں کر سکتا۔ ایک رنگ میں سب قومیں ہی اہل کتاب ہیں گو مخصوص طور پر یہود یا عیسائیوں کو اہل کتاب کے نام سے پکارا گیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر قوم میں ہم نے رسول بھیجا پس اس رسول کی تعلیم ہی اس قوم کی کتاب ہے۔ اب اگر دنیا کی ساری قوموں کے معتقدات اور ساری مذہبی کتابوں کو دیکھا جائے تو ذات باری کے عقیدہ میں جو امر مشترک ان میں پایا جاتا ہے وہ ایک خدا کی ہستی ہے

يٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِىۡٓ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمَآ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰٮةُ وَالۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ‌ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۵﴾

اے اہل کتاب تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ توریت اور انجیل اس کے بعد ہی اتاری گئیں۔ پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ع۴۵۶

هٰۤاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡـتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾

سنو! تم وہ ہو جو اس میں جھگڑ چکے جس کا تم کو علم تھا، پھر اس میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تم کو علم نہیں۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ع۴۵۷

مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۶۷﴾

ابراہیمؑ نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی، لیکن وہ راست رو فرمانبردار تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا ع۴۵۸

حتیٰ کہ کتب مقدسہ کے پیروؤں کو چھوڑ کر بت پرستوں تک کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ ان کے بتوں سے اوپر ایک خدائے واحد ہے اور بُت بھی اسی کے دربار تک پہنچانے والے ہیں مانعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی پس تمام مذاہب دنیا میں اگر امر مشترک تلاش کیا جائے تو وہ خدائے واحد کی پرستش کا عقیدہ ہے پھر ہر قوم نے اس خدائے ذوالجلال کے نیچے اپنے لیے طرح طرح کے خدا تجویز کر لیے کہیں رامچندر اور کرشن ہیں تو کہیں مسیح۔ پس اللہ تعالیٰ مذاہب میں فیصلہ کے لیے ایک سیدھی راہ بتاتا ہے کہ سب مذاہب میں امر مشترک کو لیلو اسی کو کلمۃ سواء فرمایا ہے تو یہ امر مشترک یہی ہوگا کہ صرف ایک خدا کی پرستش کی جائے۔ اس کلمۃ سواء میں درحقیقت مقابلۂ مذاہب کے عظیم الشان اصول کی طرف دنیا کو توجہ دلائی ہے اور گویا یہ اشارہ فرمایا ہے کہ جب اور کسی راہ سے نہ مانیں تو پھر مقابلہ مذاہب کا اصول پیش کرو اور امر مشترک کو بطور ایک بنیادی اصول کے مان کر آگے چلو تو اس سے بھی اسلام کی صداقت ہی نکلے گی۔

مقوقس کے نام آنحضرت صلعم کا خط: یاھل الکتاب تعالوا۔ الایۃ یہ وہ الفاظ ہیں جن الفاظ میں صلح حدیبیہ کے زمانہ میں آنحضرت صلعم نے ہرقل اور مقوقس شاہِ مصر کو مخاطب فرمایا تھا۔ مؤخر الذکر چٹھی کا اصل مسودہ مصر کی کسی خانقاہ میں ملا اور اب اس کا فوٹو شائع ہو چکا ہے جس میں بعینہٖ وہی الفاظ ہیں جو صحیح بخاری وغیرہ دیگر کتب حدیث میں ملتے ہیں۔ اس سے صداقت حدیث پر بڑی بھاری شہادت ملتی ہے۔

ع۴۵۶ مذہب ابراہیمی بطور امر مشترک: لم تحاجون فی ابراھیم۔ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔ حضرت ابراہیم کا ذکر بھی اسی اصول کے لحاظ سے کیا جس کا اوپر ذکر ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم کا وجود بھی چاروں قوموں مشرکین عرب، یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں بطور ایک امر مشترک کے تھا کہ چاروں آپ کی بزرگی کو مانتے تھے۔ گویا یہ بتایا ہے کہ توریت اور انجیل تو حضرت ابراہیم کے بعد کی کتابیں ہیں۔ اصل الاصول وہ ہے جس پر ابراہیم بھی قائم تھے۔ اور وہی خدائے واحد کی عبادت ہے اسی لیے آیت ۶۸ میں فرمایا ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین اٰمنوا۔ کیونکہ یہ نبی اور مومن اس اصل الاصول یعنی خدائے واحد کی عبادت پر قائم ہیں۔ حالانکہ تم لوگ طرح طرح کی افراط و تفریط میں پڑ گئے ہو اور خدائے واحد کی عبادت کے ساتھ کسی نے اپنے احبار اور کسی نے اپنے مسیح کی عبادت کو ملا لیا ہے۔

ع۴۵۷ ھا۔ حرف تنبیہ ہے اور ھٰؤلاء میں دوبارہ تاکید کے لیے آیا ہے اور اخفش کے نزدیک ھا قائم مقام ہمزہ استفہام کے ہے اور استفہام یہاں تعجب کے لیے ہے (ر)

یہودیوں اور عیسائیوں پر اتمام حجت: فیما لکم بہ علم سے مراد حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کا معاملہ ہے کہ ان کے بارہ میں اہل کتاب یعنی یہود حضرت موسیٰ کے مذہب کے بارہ میں اور عیسائی حضرت عیسیٰ کے مذہب کے بارہ میں جھگڑا کر چکے اور ان جھگڑوں کا ذکر سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران میں ہو چکا۔ تو اب جب اصل الاصول یعنی حضرت ابراہیم کے مذہب کی طرف توجہ دلائی۔ کیونکہ اسی کے ساتھ وعدہ کے ماتحت یہود و نصاریٰ کا وجود پیدا ہوا۔ تو فرمایا کہ حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ کے مذہب کے علم کا تو تم کو کچھ دعویٰ بھی ہے مگر حضرت ابراہیم کے مذہب کا ذکر تو تمہاری کتب مقدسہ میں بھی جیسی کچھ وہ تحریف شدہ موجود ہیں نہیں ہے پس اس پر تمہارا جھگڑا کرنا بالکل فضول ہے۔ یا فیما لکم بہ علم سے مراد وہ پیشگوئیاں ہیں جو اُن کی کتابوں میں آنحضرت صلعم کے متعلق پائی جاتی تھیں یعنی پیشگوئیوں کے بارہ میں تو تم نے جھگڑا کر لیا۔ مگر یہ اصول مقابلہ مذاہب اور اصول مشترکہ کی طرف رجوع کرنا ایک ایسا امر ہے جس کا تم کو علم نہیں تھا۔ مگر بات صاف ہے اس میں جھگڑا کیوں کرتے ہو۔

ع۴۵۸ ابراہیم سے نفی یہودیت و نصرانیت: مطلب یہ ہے کہ یہودیت اور نصرانیت کے خاص عقاید ابراہیم کے نہ تھے۔ یہودیت اور نصرانیت کی نفی کے ساتھ لفظ حنیف کے لانے پر دیکھو ع۱۷۰ اور آخر پر حضرت ابراہیم سے مشرک ہونے کی نفی مشرکین عرب پر اتمام حجت کے لیے ہے۔ گویا ان تینوں قوموں کو ایک اصول کی طرف بلایا ہے کہ جس پر ہم

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾	یقیناً ابراہیم سے بہت نزدیک وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ جو ایمان لائے اور اللہ مومنوں کا ولی ہے[۴۵۹]
وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾	اہل کتاب کا ایک گروہ چاہتا ہے کہ تم کو گمراہ کریں، اور وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کرتے ہیں اور وہ محسوس نہیں کرتے[۴۶۰]
يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾	اے اہل کتاب اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو، حالانکہ تم گواہ ہو[۴۶۱]
يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع ۸/۱۵	اے اہل کتاب کیوں حق کو باطل کے ساتھ ملاتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو[۴۶۲]
وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ	اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا کہ دن کی ابتدا میں اس پر ایمان لے آؤ جو اُن لوگوں پر اتارا گیا ہے جو

سب کا اتفاق ہے اسی کو بطور اصل الاصول لو۔ اور اس لیے بھی حضرت ابراہیم کا ذکر کیا ہے کہ اصل وعدہ اسی کے ساتھ ہے جس کے ماتحت عرب میں بھی ایک نبی پیدا ہوتا ہے پس یہ نبی اس کے مذہب کے اصل الاصول پر بھی قائم ہے۔

ع ۴۵۹ اولٰی۔ وَلِیَ یلی سے افعل التفضیل ہے اور وَلاء کے اصل معنی قرب ہیں۔ پس اولٰی کے معنی اقرب یا قریب ترین ہوئے۔ اور اولٰی بکذا سے مراد اَحْرٰی بکذا ہے (رغ) یعنی اس کا سب سے بڑھ کر اہل۔

اتبعوہ۔ نبی کے متبعین اس کی اُمت ہوتی ہے جو اس کے نقش قدم پر چلتی اور اس کی ہدایات سے نور حاصل کرتی ہے۔ اسی لیے یہاں ھذا النبی والذین اٰمنوا کو الذین اتبعوہ سے الگ کر دیا ہے یعنی محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان ابراہیم کے متبعین میں سے نہیں ہیں گو آپ کا ملّتِ ابراہیمی پر ہونا بیان کیا گیا ہے۔ مگر وہ بحیثیت ایک متبع کے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہی اصول دین آپ کو بھی وحی ہوتے ہیں الذین اتبعوہ سے مراد حضرت ابراہیم کے پیرو ہیں جو آپ کے زمانہ نبوت میں آپ کی شریعت پر تھے۔

ع ۴۶۰ طائفۃ۔ طوف سے ہے جس کے معنی گھومنا ہیں اور طائفۃ کا لفظ جب انسانوں پر بولا جائے تو اس سے مراد جماعت ہوتی ہے اور کسی چیز کے حصّہ یا ٹکڑہ کو بھی اس کا طائفہ کہا جاتا ہے (رغ)

یضلونکم۔ اضلال کے ایک معنی صراط مستقیم سے پھیرنے کے ہیں۔ لیکن ضَلَّ بمعنی ضاع و ھَلَکَ (ل) بھی آتا ہے اس لیے اضلال اِہلاک کو بھی کہتے ہیں ــــ اگر پہلے معنی مراد لیں تو ما یضلون الا انفسھم کے معنی ہونگے اپنے آپ کو اور بھی گمراہ کرتے ہیں۔ کیونکہ جب ایک شخص دوسرے کی گمراہی کے درپے ہو جاتا ہے تو اور بھی راہ حق سے دور چلا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ پہلے بھی گمراہ ہی ہوتا ہے۔ دوسرے معنی کی رُو سے مراد یہ ہوگی کہ تم کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں خود ہی ہلاک ہونگے۔

عیسائیوں کی مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوششیں: یہاں ایک پیشگوئی بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اصل مخاطب تو ان آیات کے نصاریٰ ہی ہیں جیسا کہ سفیان نے بھی کہا ہے کل شیٔ فی اٰل عمران من ذکر اھل الکتاب فھو فی النصارٰی (ر) یعنی آل عمران میں جو کچھ اہل کتاب کے متعلق آیا ہے وہ اصل میں نصاریٰ کے متعلق ہے۔ گو بعض وقت یہود یا دوسرے اہل کتاب بھی ان میں شامل ہو جائیں۔ اشارہ یہ ہے کہ یہ اہل کتاب یعنی نصاریٰ باوجود باطل پر ہونے کے اور ہر طرح سے ملزم ہونے کے اس قدر زور پکڑینگے کہ مسلمانوں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کریں یعنی اپنے دین کی طرف لے جانے کی۔ سو اس پیشگوئی کا ظہور اس زمانہ میں ہو رہا ہے۔

ع ۴۶۱ اللہ کی آیتوں سے مراد یہاں قرآن کریم ہے جس کی صداقت وہ مشاہدہ کر رہے تھے۔ اور خود اس بات کے بھی گواہ تھے کہ ان کی کتابوں میں ایک رسول کے آنے کا ذکر ہے۔

ع ۴۶۲ یہاں انہی پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلائی جن کی طرف پچھلی آیت میں اشارہ کیا تھا۔

النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۷۲
وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ
الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ
مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ
اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

ایمان لائے ہیں اور اس کے آخر میں انکار کردو تاکہ وہ لوٹ آئیں ۴۶۳
اور سوائے اس کے کسی پر ایمان نہ لاؤ جو تمہارے دین پر چلے ۴۶۴
کہہ (کامل) ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے کہ کسی شخص کو اس کی مثل
دیا جائے، جو تمہیں دیا گیا یا وہ تمہارے رب کے نزدیک تمہارے
ساتھ جھگڑا کریں گے کہہ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے

---

۴۶۳ وجہ النہار۔ وجہ چونکہ بدن کا وہ حصّہ ہے جو سب سے پہلے سامنے آتا ہے اس لیے اس کا استعمال ہر چیز کے پہلے آنے والے حصّہ اور اس کے اشرف اور اس کی ابتدا پر ہوا ہے (غ) اس لیے وجہ النہار کے معنی اول النہار ہیں۔

یہودیوں کی چال کہ منافقانہ طور پر اسلام میں داخل ہو جائیں: اس آیت کے معنی کئی طرح پر کیے گئے ہیں۔ ایک معنی تو یوں ہیں کہ دن کے پہلے حصّہ میں دین اسلام کو قبول کرلو اور پچھلے حصّہ میں اس کا انکار کردو۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ یہودیوں نے دین اسلام کو بدنام کرنے کے لیے یہ تجویز کی تھی کہ اپنے چند لوگوں کو تیار کیا کہ صبح جا کر نفاق کے طور پر مسلمان بن جائیں اور شام کو کہہ دیں کہ ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں۔ ہم نے دیکھ لیا کہ اس دین میں کوئی حق نہیں اور لعلھم یرجعون کے معنی ہوئے تاکہ مسلمان بھی اپنے دین سے لوٹ آئیں یعنی اس طرح وہ سمجھیں گے کہ اہل کتاب کو کوئی دشمنی تو نہیں وہ مسلمان تو ہو گئے تھے۔ لیکن جب انہوں نے اس دین کے اندر داخل ہو کر اس کو جھوٹا پایا تو اسے چھوڑ دیا یہی بات درست ہو گی یوں وہ بھی اسلام چھوڑ کر پھر کفر کی طرف لوٹ آئیں گے۔ چونکہ دین اسلام کی یہ خوبی تھی کہ جب ایک شخص اس کے اندر داخل ہو جاتا تو پھر مرتد نہیں ہوتا تھا جیسا کہ ہرقل والی حدیث میں ابوسفیان کی زبان سے بھی شہادت موجود ہے کہ جب اس نے پوچھا ھَلْ یَرْتَدُّ اَحَدٌ مِّنْھُمْ سُخْطَۃً لِّدِیْنِہٖ بَعْدَ ان یدخل فیہ۔ کیا ان میں سے کوئی شخص دین میں داخل ہونے کے بعد اس سے بیزار ہو کر مرتد بھی ہو جاتا ہے تو ابوسفیان نے جواب دیا کہ نہیں اور یہ دین اسلام کی صداقت پر بڑی بھاری شہادت تھی کہ مرتدین کا وجود باوجود سخت ایذا رسانیوں کے اور طرح طرح کی مشکلات کے لنادر کالمعدوم کے حکم میں تھا اور مسلمانوں کی اس مضبوطی کو دیکھ کر ہی اہل کتاب اس قسم کے حیلے سوچتے رہتے تھے کہ کس طرح دین اسلام بدنام ہو یہ دلائل میں عاجز ہونے کا نتیجہ تھا جب دین اسلام کا ہر پہلو سے غلبہ دیکھا تو ان مخفی تدابیر پر اُتر آئے کہ شاید اسی طرح اسلام مٹ جائے، جیسا کہ آج بھی اہل کتاب اس قسم کی تدبیریں اسلام کے تباہ کرنے کے لیے کرتے رہتے ہیں۔

ایک معنی ابومسلم نے کیے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ دن کے پہلے حصّہ میں ایمان لانے اور پچھلے میں انکار کرنے سے مراد یہ ہے کہ نفاق کے طور پر مسلمانوں کی ہاں میں ہاں ملا دیا کرو۔ مگر فی الواقع اپنے دین پر مضبوط رہو اس لیے جب اپنے لوگوں کے پاس آؤ تو پھر اس کا انکار کرو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے واذا لقوا الّذین اٰمنوا قالوا اٰمنّا واذا خلوا الی شیاطینھم قالوا انّا معکم (البقرۃ ۲-۱۴) جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ معنی بھی صحیح اور مناسب موقع ہیں اہل کتاب میں سے بہت سے لوگ محض نفاق کے طور پر مسلمانوں کے ساتھ مل گئے تھے تا اس طرح دین اسلام کو بدنام کریں۔

احکام اسلام میں تفریق کی چالبازی: تیسرے معنی اصم سے منقول ہیں۔ معناہ تفریق احکام الاسلام الی قسمین وذٰلک انہ قال لبعضھم لبعض ان کذبتموہ فی جمیع ما جاء بہ علم عوامکم کذبکم لان کثیرا مما جاء بہ حق ولکن صدقوہ فی بعض وکذبوہ فی بعض لیحملوا کلامکم علی الانصاف فیقبلوا قولکم ویرجعوا من دین الاسلام والرغبۃ فیہ (غق) اس کا مطلب یہ ہے کہ احکام اسلام میں تفریق کر کے ان کو دو قسم کے ٹھہرایا جائے اور وہ اس طرح کہ ان میں سے بعض نے بعض کو کہا کہ اگر تم اس کو ساری باتوں میں جھوٹا کہو گے تو عوام تم کو جھوٹا سمجھیں گے کیونکہ بہت سی وہ باتیں جو وہ لایا ہے حق ہیں اس لیے بعض باتوں میں اس کی تصدیق کرو اور اس کو سچا کہو اور بعض میں جھوٹا تاکہ لوگ تمہارے کلام کو انصاف پر حمل کریں اور تمہاری بات کو قبول کریں اور دین اسلام سے اور اس کی طرف میلان سے باز آجائیں۔ اس قسم کی چالبازیاں اب بھی کی جاتی ہیں۔ بعض عیسائی یہ جتانے کے لیے کہ ہم بڑے انصاف پسند ہیں اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے یوں کہہ دیتے ہیں کہ بیشک پہلے آنحضرت صلعم صداقت پر تھے اور محض عرب کو بُت پرستی سے نکالنا چاہتے تھے۔ لیکن بعد میں دنیوی اغراض مل گئی اور ایک نیا دین بنا لیا گیا۔ اور جنگوں میں ناحق کا کشت وخون ہوا۔ آج کل پادریوں کی ایک اور چالبازی بھی ہے کہ جھوٹے قصوں کے طور پر ایک عیسائی اور ایک مسلمان کا مکالمہ شائع کر دیتے ہیں۔ جس میں مسلمان کے منہ میں کمزور دلائل ڈال کر مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی صداقت پر شبہات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ غرض حق کے مقابل چالبازیوں سے کام عیسائی پہلے بھی لیتے رہے، اب بھی لیتے ہیں انہی چالبازیوں سے کہ دوست بنکر دشمن کا کام کرتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے۔

۴۶۴ یہ اہل کتاب کے قول کا بقیہ حصّہ ہے۔ اور مراد اس پر ایمان لانے سے جو تمہارے دین کا پیرو ہے یہ ہے کہ حقیقی ایمان تمہارا صرف اسی نبی پر ہو جو شریعت اسرائیلی کا پیرو ہو۔ پس جبکہ ایک طرف بعض لوگوں کو اس چالبازی کے لیے تیار کیا کہ وہ جھوٹے طور پر ایمان کا اظہار کر کے پھر انکار کر دیں یا کچھ حصّہ کو صحیح تسلیم کر لیں تو دوسری طرف اپنے پیروؤں کو یہ بھی کہہ دیا کہ تم صرف ایسے نبی کو مانو جو تمہاری شریعت کا پیرو ہو۔ اور اس طرح آنحضرت صلعم پر ایمان لانے سے روکا کیونکہ آپ کی

وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿ۚۙ۷۳﴾
اسے دیتا ہے اور اللہ کشایش والا جاننے والا ہے۔[۴۶۵]

یَّخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۷۴﴾
وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

وَ مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡہُ بِقِنۡطَارٍ یُّؤَدِّہٖۤ اِلَیۡکَ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡہُ بِدِیۡنَارٍ لَّا یُؤَدِّہٖۤ اِلَیۡکَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَیۡہِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡا لَیۡسَ عَلَیۡنَا فِی الۡاُمِّیّٖنَ سَبِیۡلٌ ۚ وَ یَقُوۡلُوۡنَ
اور اہل کتاب میں سے وہ ہے کہ اگر تو اس کو مال کے ڈھیر پر امین بنائے تو وہ اسے تجھے واپس دیدے اور ان میں سے وہ ہے کہ اگر تو اسے ایک دینار پر امین بنائے تو وہ اسے تجھے واپس نہ دے سوائے اس کے کہ تو اس (کے سر) پر کھڑا رہے یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر ان امیوں کے بارے میں کوئی (الزام کی) راہ نہیں اور وہ اللہ پر

شریعت میں بہت سی باتیں شریعت موسوی کو منسوخ کرنے والی تھیں اور یہ انکا قول اس کے مطابق ہے جو پچھلی سورت میں مذکور ہے قالوا نؤمن بما انزل علینا ویکفرون بما وراءہ (البقرۃ ۱۱-۹۱) اور اسی پر یہود آج تک قائم ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ جو نبی آئے شریعت موسوی پر ہی آنا چاہیئے۔

۴۶۵ مثیل موسیٰ کی پیشگوئی اور یہودیوں کے اس سے گریز کے حیلے: قل ان الھدیٰ ھدی اللہ ان یؤتی احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم۔ ان الفاظ کی تفسیر کئی طرح پر کی گئی ہے لیکن سیاق وسباق کے لحاظ سے دو توجیہیں درست ہو سکتی ہیں اور ان میں کچھ اشکال بھی نہیں۔ اول یہ کہ الفاظ قل ان الھدی ھدی اللہ جملہ معترضہ کے طور پر ہوں اور ان یؤتی احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم پھر انہی لوگوں کا قول ہو اور اس سب کا جواب قل ان الفضل بید اللہ میں دیا تو گویا جب یہودیوں نے اپنے پیروؤں کو یہ سکھایا کہ لاتؤمنوا الا لمن تبع دینکم سوائے اس نبی کے جو تمہاری شریعت کا پیرو ہو اور کسی کو نہ مانو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا (ولا ان یؤتی احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم) اور قل ان الھدی ھدی اللہ جملہ معترضہ کے طور پر رہا کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے ان کی ان فضول گوئیوں سے کیا بنے گا) یعنی اور اس بات پر بھی ایمان نہ لاؤ کہ کسی شخص کو اس کی مثل دیا جائے گا جو تم کو دیا گیا یعنی جیسی شریعت تم کو دی گئی اس کی مثل کسی اور کو دی جا سکتی ہے۔ گویا استثناء ۱۸: ۱۵ کی مثل والی پیشگوئی کو نہ مانو۔ کیونکہ اگر تم نے اس بات کو مان لیا کہ مثل والی پیشگوئی سوائے بنی اسرائیل کے کسی اور پر بھی پوری ہو سکتی ہے تو وہ یعنی مسلمان تمہارے رب کے نزدیک تمہارے ساتھ جھگڑا کریں گے۔ رب کے نزدیک جھگڑا کرنے سے مراد ہے فی کتابہ وحکمہ دیکھو ۱۷۹ اور یحاجوکم کے معنی کے لیے بھی اسی نوٹ کو دیکھو۔ یحاجوکم میں ضمیر احد کی طرف جائے گی۔ کیونکہ وہ جمع کے معنی کے حکم میں ہے اور مراد مسلمان ہوں گے یا بنی اسمٰعیل جن کی طرف احد میں اشارہ ہے۔ یہ معنی بعینہٖ اس کے مطابق ہیں جو البقرۃ ۷۶ میں ذکر کیا کہ یہودیوں کے علماء اپنے پیروؤں کو کہتے ہیں اتحدثونہم بما فتح اللہ علیکم لیحاجوکم بہ عند ربکم۔ تم ان پیشگوئیوں کو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں مسلمانوں کو جا کر بتا دیتے ہو تا کہ وہ تمہارے رب کے حکم میں تمہارے ساتھ جھگڑا کر سکیں۔ گویا اسی بات سے یہاں منع کیا ہے کہ جب تم ان کے ساتھ ملو تو یہ پھر بھی تسلیم نہ کرو کہ مثل والی کوئی پیشگوئی ہے ورنہ مسلمانوں کو تمہارے خلاف یہ حجت مل جائے گی۔

اور دوسرے معنی یوں ہونگے کہ قل ان الھدی سے عند ربکم تک سب قل کے ماتحت یہودیوں کی اس بات کا جواب ہو کہ لاتؤمنوا الا لمن تبع دینکم اس صورت میں الھدیٰ انّ کا اسم ہوگا اور ھدی اللہ۔ الھدی سے بدل ہوگا۔ گویا اس بات کا جواب کہ سوائے موسوی شریعت کے پیرو کے اور کسی نبی کو نہ مانو۔ اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے کہ ان کو کہہ دو کہ کامل ہدایت (جو اللہ کی ہدایت ہے) یہ ہے کہ جو کچھ اے اہل کتاب تم کو دیا گیا یعنی موسوی شریعت اس کی مثل کسی اور کو دی جائے کیونکہ تمہارے ہاں تو یہ پیشگوئی موجود ہے کہ موسیٰ کی مثل ایک نبی آئے گا اور اس لیے یہ ضروری ہے کہ جو تم کو دیا گیا یعنی شریعت موسوی اس کی مثل کسی اور کو دیا جائے یا (یعنی اگر ایسا نہ ہو تو) مسلمان تمہارے رب کے حکم میں تمہارے ساتھ جھگڑا کر سکیں گے (اور وہ جھگڑے میں غالب رہیں گے اور اس غلبہ کی طرف لفظ یحاجوکم میں بھی اشارہ ہو سکتا ہے یا ایسے لفظ مقدر ہو سکتے ہیں جیسے فیدحض حجتکم کیونکہ سیاق عبارت اس کا مقتضی ہے) دونوں صورتوں میں اشارہ اس عظیم الشان پیشگوئی کی طرف ہے جس کا کوئی جواب اہل کتاب کے پاس نہیں جو حضرت موسیٰ نے کی تھی اور جس کی صداقت کو کل انبیائے بنی اسرائیل نے تسلیم کیا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ نے بھی اس کو تسلیم کیا یعنی حضرت موسیٰ کی مثل ایک پیغمبر کا دنیا میں ظاہر ہونا جس کا ذکر استثناء ۱۸: ۱۵-۱۸ میں ہے۔ اب یہ موسیٰ کی مثل نبی کا کھڑا کیا جانا سوائے اس کے کیا معنی رکھتا ہے کہ جس طرح ایک شریعت بنی اسرائیل کو موسیٰ کے ذریعہ سے دی گئی اسی طرح ایک شریعت بنی اسمٰعیل میں سے ایک نبی کے ذریعہ سے دنیا کو دی جائے۔ یوں تو بنی اسرائیل میں نبی بہت ہوئے مگر موسیٰ کی مثل ہونے کا کسی نے دعویٰ نہ کیا حتّٰی کہ حضرت مسیح نے بھی نہیں کیا۔ جیسا کہ یوحنا ۱: ۲۱ سے ثابت ہے کہ یہودی تین کے منتظر تھے۔ الیاس کی دوبارہ آمد، سو وہ حضرت یحییٰ میں پوری ہوئی۔ مسیح کی آمد جس کا دعویٰ حضرت عیسیٰ نے کیا۔ موعود نبی کی آمد، جس کا دعویٰ نہ حضرت عیسےٰ نے کیا نہ حضرت یحییٰ نے اور نہ بنی اسرائیل کا کوئی نبی جو شریعت موسوی کا پیرو ہوا ایسا دعویٰ کر سکتا

عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔ ۴۶۶

تھا کیونکہ نہ صرف وہ نبی بنی اسمٰعیل سے ہونا چاہیئے بلکہ پیشگوئی کے مطابق یہ بھی ضروری تھا کہ اسے حضرت موسیٰ کی مثل ایک شریعت دی جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت جو آپ کو بنی اسرائیل کے کل انبیاء میں ممتاز کرتی ہے۔ یہی ہے کہ آپ ایک جدید اور مستقل شریعت لائے اس لیے پیشگوئی میں موسیٰ کی مثل کا لفظ لانے سے سوائے اس کے کچھ منشاء نہیں ہو سکتا کہ وہ نبی بھی ایک جدید اور مستقل شریعت لانے والا ہو اس لیے قرآن کریم بنی اسرائیل کے اس اعتراض کے جواب میں کہ ہم اسی نبی کو مانیں گے جو ہماری شریعت کا پیرو ہو۔ اس پیشگوئی کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اس کے مطابق تو یہ ضروری ہے کہ جو شریعت تم کو موسیٰ کے ذریعہ سے دی گئی ویسی ہی شریعت کسی اور کو دی جائے۔ تم اصرار کرتے ہو کہ ہم اپنی ہی شریعت کے پیرو نبیوں کو مانیں گے۔ حالانکہ حضرت موسیٰ کی پیشگوئی اس امر کی مقتضی ہے کہ اس جیسی ایک اور شریعت بھیجی جائے پس تم اپنے اصرار میں غلطی پر ہو۔

نبوت ایک قوم سے مخصوص نہیں: اس کے بعد جو الفاظ آتے ہیں قل ان الفضل بید اللہ یؤتیہ من یشاء اور یختص برحمتہ من یشاء یہ اہل کتاب کے اسی اعتراض کا جواب ہیں یہاں نبوت کو ایک فضل فرمایا۔ تو فضل ایک قوم سے مخصوص نہیں یہ موہبت ہے جس کو اللہ چاہے دے دے۔ اس کا مقابلہ البقرہ ۲۔ ۱۰۵ سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح کا اعتراض اور جواب وہاں دیا ہے۔ وہی دوسرے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ کیونکہ وہاں بھی یہ کہہ کر کہ مایود الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم جواب دیا تھا واللہ یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔

۴۶۶ ما دمت علیہ قائما۔ بعض نے یہاں لفظی معنی مراد لیے ہیں کہ واقعی اس کے سر پر کھڑا رہے اور اس سے ادھر ادھر نہ ہو مگر یہ بلاضرورت تکلف ہے اس سے مراد مطالبہ اور تقاضا ہے جیسا کہ ابن قتیبہ نے کہا ہے اصلہ ان الطالب للشیٔ یقوم بہ والتارک لہ یقعد عنہ (غ) اصلیت اس محاورہ کی یہ ہے کہ ایک شے کا طالب اس کی رعایت کو ملحوظ رکھتا ہے گویا وہ اس پر کھڑا ہوتا ہے اور ترک کرنے والا اس کی طرف سے سست ہو جاتا ہے یا بیٹھ جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں آتا ہے امۃ قائمۃ (ال عمران ۳-۱۱۲) اور مراد ہے عاملۃ بامر اللہ یعنی اللہ کے حکم پر عمل کرنے والی۔

سبیل کے معنی راہ پھر ہر سبب جس کے ذریعہ سے دوسری چیز تک پہنچا جائے بُرا ہو یا بھلا (غ) یہاں مراد یہ ہے کہ ہم تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں۔ یعنی ہم پر کوئی پرسش یا الزام نہیں۔

اہل کتاب کے معاملہ میں اسلام کا منصفانہ رویہ: اہل کتاب کے بارہ میں قرآن کریم نے باوجود انکی خطرناک عداوتوں کے اور دن رات اسلام کی بیخکنی کے درپے رہنے کے نہایت انصاف کا معاملہ کیا ہے۔ اگر ان کی بدیوں کا ذکر کیا ہے تو ان کی نیکیوں کا بھی اعتراف کیا ہے یہاں صرف ان کی بددیانتی کا ذکر نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی اس کے ان میں نیک لوگوں کے وجود کا بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ سونے کے ڈھیر پر بھی امین بنائے جائیں تو اس میں خیانت نہیں کرتے۔ گویا مسلمانوں کو بتایا ہے کہ کسی قوم کو بعض افراد کی وجہ سے بلاتمیز بُرا کہہ دینا یا بُرا سمجھ لینا ٹھیک نہیں اگر کسی کو اس میں بُرائی دیکھ کر بُرا کہو تو اس میں نیکی پاؤ تو اس کا بھی اعتراف کرو اور بلاتفریق مذہب وملت قوم و رنگ ہر ایک کے ساتھ نیکی اور انصاف کا معاملہ کرو۔

اصل ذکر تو یہاں دینی معاملات اور پیشگوئیوں کا تھا۔ اسی ذکر میں دنیوی معاملہ کا ذکر بھی کر دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین و دنیا کو کس طرح پر قرآن شریف نے اکٹھا کیا ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف اہل کتاب کو یہ الزام دیا ہے کہ جب دنیوی معاملہ میں ان کی حالت ایسی خراب ہے کہ ایک دینار کی امانت کا حق ادا نہیں کر سکتے تو دینی معاملہ میں کتاب کی حفاظت میں پیشگوئیوں کی حفاظت میں وہ کیونکر قابل اعتبار ہو سکتے ہیں تو دوسری طرف مسلمانوں کو بھی سمجھایا ہے کہ دین و دنیا الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ دنیوی معاملات میں امانت و دیانت کا حق ادا نہیں کر سکتے، تو دین میں ان کا راہ راست پر ہونے کا دعویٰ کس کام کا ہے۔ چنانچہ یہاں معمولی دیانت کا ذکر کرتے ہوئے معاً روحانیت کی طرف انتقال کر کے فرماتا ہے ان الذین یشترون بعھد اللہ وایمانھم ثمنا قلیلا وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑا سا مال یعنی اس دنیا کی زندگی کا سامان لے لیتے ہیں وہ یوں تکلیف اٹھائیں گے۔ یوں قرآن کریم نے ایک مسلمان کو یہ بتایا ہے کہ وہ روحانیت کوئی چیز نہیں جس کے ساتھ لوگوں سے اچھا معاملہ نہیں۔

امی سے مراد: یہاں اُمّیوں کے متعلق مفسرین نے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ بعض کے نزدیک تو مطلقاً عرب کے لوگ مراد ہیں اور یہ حالت اہل کتاب کے ان کے ساتھ معاملہ کی اسلام سے پہلے کی ہے۔ مگر بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد مسلمان ہیں یعنی مشرکوں کے ساتھ اہل کتاب کا معاملہ ہوتا رہتا تھا جب اسلام آیا اور بعض لوگ مسلمان ہو گئے تو اہل کتاب نے ان کے اموال کو دبا لیا اور یہ عذر کر دیا کہ یہ لوگ چونکہ مرتد ہو گئے ہیں اس لیے اب ان کا کوئی حق ہم پر نہیں رہا۔ دونوں قسم کی روایات کو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے مگر الفاظ میں عمومیت ہے اور ان تامنہ میں خطاب بھی عام ہے یعنی اے مخاطب۔ اور وجہ یہی ہے کہ اہل کتاب اپنے آپ کو عرب کے لوگوں سے بڑھ کر سمجھتے تھے اس لیے ان کے حقوق کو اپنے برابر خیال نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا قول دوسری جگہ منقول ہے نحن ابنٰٓؤا اللہ واحبّاؤہ (المائدہ ۵-۱۸) ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں اور دوسرے لوگ ہمارے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ یہ غلط خیال اب بھی اہل کتاب میں مروج ہے کہ وہ عیسائی اقوام یا یورپین اقوام کے مقابل میں دوسری اقوام کے حقوق کو کمتر سمجھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام یورپین قومیں باوجود ادعائے تہذیب کے ایک نہایت ذلیل حالت میں ہیں جس سے ان کو صرف اسلام کی بلند تعلیم ہی نکال سکتی ہے جو یوں تعلیم دیتا ہے بلیٰ من اوفیٰ بعھدہ عہد کسی شخص کے ساتھ ہو سپید رنگ کے آدمی سے ہو یا سیاہ رنگ کے فلاسفر سے یا جاہل سے اپنے ہم مذہب اور ہم قوم سے ہو یا غیر مذہب اور غیر قوم سے سب کے ساتھ پورا کرنا چاہیئے

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٧٦﴾

ہاں جو شخص اپنے اقرار کو پورا کرتا ہے اور تقوےٰ کرتا ہے تو یقیناً اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔[٤٦٧]

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٧﴾

وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے تھوڑی قیمت لے لیتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں اور نہ اللہ ان سے کلام کریگا اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کریگا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔[٤٦٨]

وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ

اور ان میں سے ایک گروہ ہے جو کتاب کے متعلق جھوٹ بناتے ہیں تا کہ تم اسے کتاب سے سمجھو، حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے اور وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور

ایسا ہی امانت کا معاملہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایام جاہلیت کے خون وغیرہ انتقامات اور حقوق کو کالعدم قرار دیا تو ساتھ ہی امانت کے متعلق تاکید بھی فرمادی الا الامانۃ فانہا مودّاۃ الی البر والفاجر۔ مگر امانت کے حقوق باطل نہیں ہوتے اور امانت نیک کی ہو یا بد کی سب کی طرف ادا ہونی چاہیئے۔ اور چونکہ امانت اور معاہدات میں ہر ایک قسم کی ذمہ واریاں آجاتی ہیں اس لیے گویا یہ سمجھایا ہے کہ انسان کی ذمہ داری نیکوں کی طرف ہو یا بدوں کی، بڑوں کی طرف ہو یا چھوٹوں کی پوری ادا ہونی چاہیئے۔ حضرت ابن عباس کے متعلق روایت ہے کہ کسی شخص نے کہا کہ اہل ذمہ کی بعض چھوٹی چھوٹی چیزیں جیسے مرغی بکری وغیرہ جنگ کے وقت ہم لے لیا کریں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ تو اہل کتاب کے قول کی مانند ہے کہ لیس علینا فی الامیین سبیل جب وہ جزیہ ادا کردیں تو ان کے اموال میں کسی قسم کا تصرّف جائز نہیں سوائے اس کے جو وہ اپنی خوشی سے دیں۔

ع٤٦٧ اس چھوٹی سی آیت میں اسلام کی تعلیم کی وسعت ظاہر فرمائی ہے۔ ذکر تو صرف امانت کا تھا مگر ہر ایک قسم کی ذمہ داری کو اس کے اندر داخل کرنے کے لیے پہلے عہد کے پورا کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ اور پھر تقویٰ کی طرف۔ عہد کو تو ہر ایک شخص سمجھتا ہے یعنی کوئی ذمہ داری جو انسان علی الاعلان اپنے اوپر لے لیتا ہے عہد میں داخل ہوجاتی ہے۔ مگر تقویٰ کے اختیار کرنے میں اشارہ زیادہ باریک امور کی طرف ہے۔ جن کا تعلق امانت سے ہے۔ کیونکہ امانت کی ادائیگی میں ہر قسم کے ان حقوق کی ادائیگی داخل ہے جو انسان کے ذمہ بطور امانت ہوں۔ خواہ وہ عہد کے اندر آتے ہوں یا نہ آتے ہوں۔ گویا کھلا عہد ہو یا بطور امانت کوئی ذمہ واری ہو خواہ کسی کے متعلق ہو تو ان عہدوں اور امانتوں کو ادا کرنا ضروری ہے اور اسی طرح پر انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب بنتا ہے اور چونکہ اتقا کا مرتبہ ایسا کامل ہے کہ ایفائے عہد بھی اس میں آجاتا ہے اس لیے آخر پر صرف یُحِبُّ الْمُتَّقِیْن فرمایا اور ان عہود میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد بھی داخل ہے جس کے ایفا سے مراد یہ ہے کہ اس کے احکام کی جن کو انسان ایمان لاکر علی الاعلان قبول کرچکا ہے تعمیل کرے اسی لیے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے عہد کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔

ع٤٦٨ اس آیت میں ان لوگوں کا انجام بتایا ہے جو اللہ کے ساتھ عہد کرکے اور قسمیں کھا کر پھر ان کو ضائع کردیتے ہیں۔ یعنی اول ایمان کا اقرار کرتے بلکہ اس کے اوپر قسمیں کھاتے ہیں۔ پھر دنیا کے ادنےٰ ادنےٰ فوائد کے لیے یا اپنی اغراض نفسانی کے لیے اس عہد کی اور ان قسموں کی پرواتک نہیں کرتے۔ ثمنا قلیلا سے مراد متاع الدنیا قلیل ہے اور اشترا یہی ہے کہ وہ اس عہد کو ترک کردیتے اور دنیا کے حقیر فائدہ کو لے لیتے ہیں۔

عیسائی اور معاہدات: روئے سخن بالخصوص عیسائیوں کی طرف ہی ہے جن کے ساتھ یہ بحث چلتی ہے اس زمانہ میں تو عیسائیوں کی کیا طاقت تھی پیشگوئی کے رنگ میں آئندہ کا حال بتایا ہے اور آج ہم کو تمام عیسائی اقوام کی یکساں حالت نظر آتی ہے کہ معاہدات کو وہ ردّی کاغذ کے ٹکڑے سمجھتے ہیں اور اپنا مطلب نکالنے کا ذریعہ۔ ان کے انجام میں پانچ باتوں کا ذکر کیا ہے اوّل ان کا آخرت میں کوئی حصّہ نہیں۔ یعنی صرف دنیا ہی دنیا۔ دنیا کا مال، دنیا کی حکومت ان کے مدّنظر ہے اور دنیا تک ہی ان کی سب کوششیں محدود ہیں۔ دوم اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں کرے گا نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ دنیا میں مکالمہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے سے پیدا ہوتا ہے آخرت کا مکالمہ اسی کا نتیجہ ہے۔ سوم اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھے گا نہیں یعنی اس کی جناب میں ان کی کچھ قدر نہ ہو گی۔ کسی کی طرف نہ دیکھنے سے مراد یہی ہوا کرتی ہے کہ اس کی نگہ میں اس کی کچھ قدر قیمت نہیں۔ چہارم یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو گناہوں سے پاک نہیں کرے گا۔ کفارہ کا عقیدہ کس طرح ناپاکیوں سے باہر نکال سکتا ہے بلکہ اس سے اور گناہوں پر دلیری پیدا ہوتی ہے اور سب سے آخر فرمایا کہ آخری نتیجہ اس دنیا پرستی کا دردناک دُکھ ہے۔

الْكِتٰبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾
مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ
وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ
كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ
كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ
وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾

وہ جانتے ہیں ع۴۶۹
کسی بشر کے لیے (شایاں) نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور
حکم اور نبوّت دے، پھر وہ لوگوں کو کہے کہ تم اللہ کو
چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ لیکن (وہ کہتا ہے)
تم ربّانی ہو جاؤ اس لیے کہ تم کتاب سکھاتے تھے
اور اس لیے کہ تم (اسے) پڑھتے تھے ع۴۷۰

ع۴۶۹ یلوون السنتھم۔ اَلْسِنَۃِ لسان کی جمع ہے اور یلوون السنتھم بالکتاب کے معنی مجاہد کے نزدیک یحرفونہ ہیں (ج) یعنی کتاب کی تحریف کرتے ہیں۔ اَللّیّ کے (جو یلوون سے مصدر ہے) اصل معنی فَتْلُ الحَبْلِ ہیں یعنی رسّہ کا بٹنا یا مروڑنا مگر لَوّی لسانہ' بکذا ایک خاص محاورہ ہے جس کے معنی ہیں راغب نے لکھا ہے کِنَایَۃٌ عَنِ الْکَذِبِ وتخرصِ الحدیث یعنی جھوٹ اور بات کے بنانے سے کنایہ ہے اور اسی کے مطابق مجاہد نے معنی کیے ہیں پس یہاں لفظی معنی زبان کو مروڑنے کے مراد نہیں بلکہ کتاب میں تحریف کے معنی ہیں یا کتاب کے متعلق جھوٹ بنانے کے۔ اور لَوَّیتُ عَنْہُ الْخَبَرَ کے معنی بھی ایسے ہی آتے ہیں اخبرتہ بہ علےٰ غیر وجھہ (ل) یعنی جو اصل حقیقت معاملہ تھی اس کے خلاف اسے خبر دی۔ اور اللوّ اور اللّیَ کے معنی الباطل یعنی جھوٹ ہیں جس طرح الحوّ اور الحیّ کے معنی الحق سچ بھی آتے ہیں۔

یہاں اب صاف طور پر ان کی تحریف کتاب اللہ کو بیان کیا ہے جس کی طرف پہلے امانت کے ادا نہ کرنے کا ذکر کر کے اشارہ کیا تھا اور جس طرح سورہ بقرہ میں یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ کہہ کر یہ بتایا تھا کہ وہ تحریر میں تحریف کرتے ہیں۔ یہاں کتاب کے پڑھنے میں ان کی تحریف کا ذکر ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ کچھ عبارتیں جھوٹ کے طور پر کتاب اللہ کی طرف منسوب کر کے پڑھ دیتے ہیں تاکہ تم ان عبارتوں کو کتاب کا حصّہ سمجھو حالانکہ وہ کتاب کا حصّہ نہیں یعنی جو کتاب ان کے پاس ہے اس میں بھی وہ عبارتیں نہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں۔ یہاں دو باتوں کی نفی الگ الگ کی ہے۔ ایک یہ فرمایا کہ وہ کتاب میں سے نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود کتاب بھی ساری من عند اللہ نہیں یعنی پہلے اس میں تحریف موجود ہے مگر یہ اب پڑھنے میں اور بھی تحریف کر رہے ہیں اور کتاب کا لفظ من عند اللہ سے پہلے اس لیے آیا ہے کہ یلوون السنتھم بالکتاب میں کتاب کے متعلق جھوٹ بنانے کا ذکر تھا سو پہلے اس کی تردید کی۔ بعض مفسرین نے کتاب سے مراد توریت کو اور من عند اللہ سے مراد توریت سے پہلے انبیاء کی کتابوں کو لیا ہے (غق)

ع۴۷۰ ولکنی کونوا۔ تقدیر اس کی یوں ہے ولکن یقول کونوا۔

ربانیین۔ ربانی کی جمع ہے۔ مفردات میں ہے کہ ربانی یا تو ربان کی طرف منسوب ہے۔ جیسے عطشان۔ سکران آتا ہے اور یا ربّ کی طرف منسوب ہے اگر ربّ کو مصدر تربیت کرنے کے معنی میں لیا جائے اور ربانی وہ عالم ہے جو علم کو نشوونما دیتا ہے اَلَّذِیْ یُرَبُّ الْعِلْمَ اور یا وہ جو علم کے ساتھ اپنی تربیت کرتا ہے اَلَّذِیْ یُرَبُّ نَفْسَہٗ بِالْعِلْمِ (غ) راغب کہتے ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے متلازم ہیں۔ کیونکہ جو شخص اپنے نفس کی تربیت علم سے کرتا ہے وہ علم کو بھی نشوونما دیتا ہے اور ایسا ہی اس کے برعکس اور بعض کے نزدیک ربّ کی طرف منسوب ہے جب اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہو اور یہ اس طرح ہے جیسے ایک شخص کے متعلق کہہ دیا جائے الٰھیّ (غ) یعنی اللہ کی طرف منسوب اور اس سے مراد ہوگی مقبلا الی معرفۃ الالٰہ وطاعتہ (غق) یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اطاعت کی طرف بڑھنے والا۔ اسی لیے ربانی سے مراد بعض نے اہل علم کو لیا ہے یا فقیہ کو بعض نے عالم حکیم کو بعض نے حکیم متقی کو۔ اور حضرت علی کا قول منقول ہے انا ربانی ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ میں اس امّت کا ربانی ہوں اور جب حضرت ابن عباس فوت ہوئے تو ابن حنفیہ نے کہا مات ربانی ھذہ الْاُمَّۃِ اور بخاری میں ہے الذی یربی الناس بصغار العلم قبل کبارھا۔ یعنی ربانی وہ (فقیہ) ہے جو لوگوں کو علم کی آسان باتیں اس کی مشکل باتوں سے پہلے سکھاتا ہے۔ لفظ ربانی میں بھی عیسائی عقیدہ پر ایک زد کی ہے یعنی انسان ربّ کو پہنچنے والا تو ہو سکتا ہے مگر ربّ نہیں ہو سکتا۔

تدرسون۔ درس الدّار کے معنی ہیں بقی اثرھا (غ) یعنی اس کا اثر باقی رہا۔ اس لیے دَرَسْتُ الْعِلْمَ کے معنی ہیں تَنَاوَلْتُ اَثَرَہٗ (غ) یعنی اس کے اثر کو لیا اور چونکہ علم کا ایک دوسرے سے لینا قرأت کے ہمیشہ رہنے سے ہوتا ہے اس لیے درس سے مراد قرأت کا ہمیشہ رکھنا بھی ہے یہاں تعلیم سے الگ درس کا ذکر اسی معنی میں ہے۔

عیسائیت کی تحریف: تحریف کتاب کے ذکر میں اب ان کی ایک عظیم الشان تحریف کا ذکر کرتا ہے کہ انہوں نے بعض کلمات حضرت عیسیٰ کی طرف ایسے منسوب کر دیئے ہیں جن سے یہ معلوم ہو کہ وہ یہ تعلیم دیتے تھے کہ وہ خدا ہیں حالانکہ انہی کی کتابوں میں حضرت عیسےٰ کے ایسے اقوال بھی موجود ہیں کہ مجھے خدا نے بھیجا ہے اور اپنی عبودیت کا بھی اقرار ہے تو اس لیے فرماتا ہے کہ ایک ایسے بشر کے لیے جسے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکم اور نبوت دے یہ کہاں شایاں ہے کہ وہ پھر لوگوں کو یہ بھی کہے کہ اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر میری عبادت کرو اور مجھے اپنا خدا مانو۔ وہ تو یہی تعلیم دیگا کہ تم ربانی بنو یا خدا تعالیٰ کی طرف قدم آگے بڑھانے والے بنو۔ یا

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَ
النَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ
بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨٠﴾ ع

اور نہ یہ کہ وہ تم کو حکم دے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو خداوند بنالو کیا وہ تم کو کفر کا حکم دے گا اس کے بعد کہ تم مسلم ہو چکے ہو۔[ع۴۷۱]

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ
اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ
رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ
وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ
عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ
فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٨١﴾

اور جب اللہ نے نبیوں کے ذریعہ سے عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تمھیں کتاب اور حکمت سے دیا ہے پھر تمھارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو، جو تمھارے پاس ہے تو تم نے ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی کہا کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرے عہد کا بوجھ لیتے ہو انھوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں کہا پس گواہ رہو اور میں تمھارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔[ع۴۷۲]

عالم و فقیہ بنو۔ کیونکہ عیسائیوں نے جو بعض استعارات کی بنا پر مسیح کو خدا بنایا ہے تو درحقیقت انہوں نے تفقاہت سے کام نہیں لیا ورنہ اگر تدبّر کرتے تو ان کو صاف سمجھ آجاتا کہ حضرت مسیح کے کسی کلمہ میں اگر خدا کے بیٹے کا لفظ اپنے لیے آگیا ہے تو وہ خود ہی فرماتے ہیں کہ میرا خدا کا بیٹا اپنے آپ کو کہنا اس لیے قابل الزام نہیں کہ تمہارے بڑے بڑے یعنی بنی اسرائیل کے بزرگوں پر تو خدا کا لفظ بھی بولا گیا ہے گویا ان کی مراد یہ تھی کہ جس طرح وہ مجاز اور استعارہ کے رنگ میں خدا کہلائے اسی طرح میں مجاز اور استعارہ کے رنگ میں خدا کا بیٹا کہلایا۔ لیکن ایک قوم اُٹھی جس نے نہ تو خدا کی طرف قدم اٹھانے میں ترقی کی نہ علم و تفقاہت سے کام لیا اور لفظ پرستی اختیار کر کے مسیح کی طرف اس عقیدہ کو منسوب کر دیا کہ وہ یہ تعلیم دیتا تھا کہ میں ہی خدا ہوں اس لیے میری ہی عبادت کرو۔

علمائے ربانی مثیل اور وارث انبیاء ہیں: تم ربانی بنو اس لیے کہ تم تعلیم کتاب اور درس کتاب دیتے ہو۔ معلوم ہُوا کہ ربانیت کا مرتبہ محض تعلیم و تدریس سے اوپر ہے ایسے ہی علماء یعنی علمائے ربانی کے حق میں کہا گیا ہے العلماء ورثة الانبیاء کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انہی کے حق میں ہے علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں۔

یہاں اشارہ صاف حضرت عیسٰی کی طرف ہے۔ اور آپ کو اور آپ کی طرح ہر نبی مرسل کو تین چیزیں دینے کا ذکر ہے۔ کتاب، حکم، نبوۃ۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہر نبی کو لازماً کتاب و حکم ملتا ہے، حکم سے مراد فیصلہ کرنے کا اختیار ہے یعنی وہ خود صاحب اختیار ہوتا ہے اور وحی الٰہی کے ماتحت فیصلہ کرتا ہے دوسری جگہ اٹھارہ نبیوں کا ذکر کر کے فرمایا ہے اولٰئك الذین اٰتینٰھم الکتاب والحکم والنبوۃ (الانعام ۶ - ۹۰)

ع۴۷۱ ولا یامرکم۔ یامر پر نصب ہے اس لیے کہ یقول پر عطف ہے اور لا مزید تاکید کے لیے ہے۔ یا ترکیب عبارت یوں ہے ما کان لبشر ان ..... یقول ..... ولا ان یامرکم۔

وفد نجران کا خیال کہ آنحضرت خود خدا بنتے ہیں: بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد نجران کو بہت سمجھایا تو انہوں نے کہا اتریدان نعبدك ونتخذك ربا کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں اور آپ کو رب بنا لیں تو آپ نے فرمایا معاذ اللہ۔ انہوں نے سمجھا ہوگا کہ یہ اس قدر زور جو حضرت مسیح کی خدائی کے خلاف دے رہے ہیں تو شاید اپنے آپ کو خدا منوانا چاہتے ہیں اور کیا غرض ہوسکتی ہے؟ اس آیت میں اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے کہ یہ تو کسی نبی کو بھی شایاں نہیں کہ وہ لوگوں کو یہ کہے کہ نبیوں یا فرشتوں کو اپنے خداوند مانو کیونکہ نبی تو مسلم فرمانبردار بنانے آتا ہے اور کسی دوسرے کی عبادت یا اس کو خدا ماننا یہ کفر میں داخل ہے پھر نبی اپنے کیے پر آپ پانی کیوں پھیرے گا۔ اس آیت میں اس استدلال کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی نبی کو یہ شایاں ہوتا تو کوئی نبی دنیا میں اور بھی ایسا ہُوا ہوتا جس نے یہ تعلیم دی ہوتی مگر حضرت مسیح کے متنازعہ اقوال کو چھوڑ کر کیا دنیا کے کسی اور نبی کا ایسا قول دکھایا جا سکتا ہے؟ جب اس قدر نبی دنیا میں آئے اور کسی نے ایسی تعلیم نہیں دی تو معلوم ہوا کہ مسیح کی طرف ایسی تعلیم منسوب کرنا بھی درست نہیں۔

ع۴۷۲ میثاق النبیین۔ میثاق کی اضافت النبیین کی طرف دو طرح پر ہو سکتی ہے۔ یا تو انبیاء معاہدٌ منہ ہیں اور میثاق النبیین سے مراد وہ میثاق ہے جو نبیوں سے لیا گیا اور یا انبیاء معاہد ہیں یعنی عہد لینے والے اور میثاق النبیین سے مراد وہ عہد ہے جو انبیاء نے لیا جیسے میثاق اللہ اس عہد کو کہہ سکتے ہیں جو اللہ نے لیا۔ قرآن کریم میں آتا ہے میثاقه الذی واثقکم به (المائدۃ ۵ - ۷) جہاں میثاقہ سے مراد اللہ کا میثاق یا وہ عہد ہے جو اللہ تعالٰی نے لیا اور چونکہ انبیاء علیہم السلام نے تو آنحضرت صلعم کے وقت تک زندہ نہ رہنا تھا اور میت مکلف نہیں اس لیے دوسرے معنی ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ گویا ترکیب یوں ہوئی اذا اخذ

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

پھر جو کوئی اس کے بعد پھر جائے تو وہی بدعہد ہیں۔

الله المیثاق الذی وثقه النبیون علٰے اممهم یہی معنی حضرت ابن عباس نے کیے ہیں جب آپ سے کہا گیا کہ فلاں شخص میثاق الذین اوتوا الکتاب پڑھتا ہے (اور یہ قرأت گویا تفسیر اصل الفاظ کی تھی) تو آپ نے فرمایا انما اخذ الله میثاق النبیّین علٰے اممهم (د) یعنی اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا میثاق ان کی امتوں پر لیا۔ اور بعض نے یہاں النبیین سے مراد حذف مضاف پر اہم النبیین لیا ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں کی اُمتوں کا عہد لیا۔ ایک اور صورت وہ ہوسکتی ہے جو ترجمہ میں اختیار کی گئی۔ یعنی وہ عہد جو انبیاء کے ذریعہ سے لیا گیا قرآن کریم میں اس کی اور مثال بھی موجود ہے الم یؤخذ علیهم میثاق الکتاب (الاعراف۔ ۱۶۹) کیا ان سے میثاق کتاب نہیں لیا گیا۔ یہاں میثاق کتاب سے مراد وہ میثاق ہے جو کتاب میں مذکور ہے یا جو بذریعہ کتاب لیا گیا۔ کثیر علماء جیسا کہ امام رازی نے لکھا ہے اسی طرف گئے ہیں کہ یہاں مراد وہی میثاق ہے جو نبی اپنی امتوں سے لیتے تھے۔ المراد ان الانبیاء کانوا یاخذون المیثاق من اممهم بانه اذا بعث محمد فانه یجب علیهم ان یومنوا به وان ینصروه وهذا قول کثیر من العلماء۔

لَمَا۔ اس کے معنی یہاں دو طرح پر ہوسکتے ہیں۔ یا تو ما موصولہ اور لام ابتدا کے لیے ہے اور معنی یوں ہونگے وہ جو میں نے تم کو کتاب و حکمت سے دیا اور یا ما متضمن معنی شرط ہے اور اخذ میثاق کو قسم لینے کے معنی میں لیکر لتومنن به کو جواب قسم سمجھا جائے اور جواب شرط یا جزا کے علیحدہ ذکر کی ضرورت جواب قسم کے آجانے کی وجہ سے نہ رہی۔

اخذ تم سے مراد یہاں قبلتم ہے یعنی تم نے قبول کیا۔ جیسے ان اوتیتم هٰذا فخذوه میں۔

اِصْری۔ اِصر کے اصل معنی ع۲۶۵ میں بیان ہوچکے ہیں۔ الثقل والشد۔ بوجھ اور مضبوط باندھ دینا۔ اس کے معنی عہد شکنی کا گناہ بھی آتے ہیں ع۲۶۵ اور اِصر اس عہد موکد کو بھی کہتے ہیں جو توڑنے والے کو ثواب سے پیچھے رکھتا ہے (غ) اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اصر کے معنی یہاں مطلق بوجھ یا ثقل ہوں جو اس کے اصل معنی ہیں اور اخذ تم اصری سے مراد ہو کہ یہ بوجھ جو میں تم پر ڈالتا ہوں کہ رسول موعود کی نصرت کرنا ہوگا اس بوجھ کو تم قبول کرتے ہو۔ چنانچہ دوسری جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرمایا یضع عنهم اصرهم ان کے بوجھ کو ان سے ہٹاتا ہے۔ یعنی اس رسول کو قبول کرنے سے وہ بوجھ جو انسانوں پر رکھا گیا تھا قبول کرنے والوں کے ذمہ سے ہٹ گیا۔

آنحضرتؐ جملہ انبیائے عالم کے موعود ہیں: اصل بحث اہل کتاب سے تھی ان پر کامل اتمام حجّت کرکے اور پچھلے رکوع میں ان کو پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلا کر اب تبایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کی پیشگوئیاں صرف یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں میں ہی نہیں بلکہ اسلام جملہ انبیائے عالم کا موعود مذہب ہے اور اس رکوع میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم سب نبیوں کے موعود ہونے کے لحاظ سے اوّل النبیین اور بعثت میں آخری نبی ہیں۔ اور اس سے اگلے رکوع میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ خانہ کعبہ سب سے پہلا خدا کا معبد ہے جو زمین پر مقرر کیا گیا اور وہ آخری معبد بھی ہے اس لحاظ سے کہ اس کی خیر و برکت دائمی ہے اور کبھی منقطع نہ ہوگی گویا یہ دونوں رکوع اسلام کی کمال عظمت کو ظاہر کرنے والے ہیں۔

اس بات پر کہ رسول مصدق جس کے آنے کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد آنحضرت صلعم ہیں قریباً اُمّت کا اتفاق ہے۔ اور ابن جریر میں حضرت علیؓ سے یہ روایت ہے لم یبعث الله تعالی نبیاً ادم فمن بعده الا اخذ علیه العهد فی محمد صلعم یعنی آدم سے لیکر آخر تک اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی مبعوث نہیں کیا جس سے محمد صلعم کے متعلق عہد نہ لیا ہو اور یہی صحیح ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں بار بار ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک قوم میں اور ہر ایک امت میں ایک رسول مبعوث کیا یا بعض قوموں میں ایک سے زیادہ رسول بھی مبعوث کیے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ جس قدر رسول آنحضرت صلعم سے پہلے آتے رہے یہ سب خاص خاص قوموں کی طرف آتے رہے۔ کل دنیا کی طرف مبعوث ہونا یہ صرف ایک ہی رسول کے لیے مخصوص رکھا گیا جو سب سے آخر اور سب کو ایک دین پر جمع کرنے کے لیے آیا۔ تو چونکہ اس رسول نے ساری قوموں کو ایک دین پر جمع کرنا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ساری قوموں سے بذریعہ اُن کے نبیوں کے یہ عہد لیا کہ جب وہ رسول آجائے تو تم سب نے اس کے دین پر چلنا ہوگا۔ کیونکہ اصل غرض یہی تھی کہ نسل انسانی کے اندر سے قومیت کی تفرقیوں کو مٹایا جائے اور سب کو بھائی بھائی بنایا جائے مگر مختلف قوموں میں مختلف نبیوں کے آنے سے قومی امتیازات ایک حد تک مضبوط ہوتے چلے گئے۔ کیوں کہ ہر قوم ہدایت کے لیے اپنے ہی نبی کو دیکھتی تھی اور اس کو دوسری قوم کے نبی کی تعلیم سے کوئی سروکار نہ تھا اور چونکہ تعلقات بین الاقوام بھی اس وقت نہ تھے۔ سب قومیں اپنے اپنے ملکوں میں علیحدہ علیحدہ پڑی ہوئی تھیں۔ اس لیے ان حالات کا اقتضا بھی یہی تھا کہ ہر قوم کے اندر جدا جدا نبی مبعوث ہو مگر یہ علیحدگی جو ملکوں اور قومیتوں کی حد بندی سے پیدا ہوئی ہمیشہ کے لیے رہنے والی نہ تھی اس لیے یہ ضروری ہُوا کہ جب وہ وقت آجائے کہ تعلقات بین الاقوام کی راہیں کھل جائیں تو قومی رسولوں کی بجائے ایک ہی رسول ساری دنیا کی طرف مبعوث ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی رسول دنیا میں ہوا جس نے علی الاعلان بار بار کہا کہ میں کُل عالمین کی طرف آیا ہوں اور جس کے متعلق ارشاد ہُوا کہ ہم نے تم کو کافة للنّاس بھیجا ہے جس نے قومیتوں کی ساری تفریقوں کو مٹایا اور نسل انسانی کو وہ حکم خداوندی سنایا جو ان کو بھائی بھائی بنانے والا تھا، یاَیّها النّاس انّا خلقنٰکم من ذکر وانثٰی وجعلنٰکم شعوبًا وّقبائل لتعارفوا انّ اکرمکم عند الله اتقٰکم (الحجرات ۴۹۔ ۱۳) اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تم کو شاخیں اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، اللہ کے نزدیک تم میں سب

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

تو کیا اللہ کے دین کے سوا کچھ اور چاہتے ہیں اور جو آسمانوں اور زمین میں ہیں خوش اور ناخوش اسی کے فرمانبردار ہیں اور اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے[۴۷۳]

سے معزز وہ ہے جو سب سے متقی ہے۔ تو چونکہ اس رسول نے سب قوموں کو دین واحد پر جمع کرنا تھا۔ اس لیے سب قوموں سے یہ عہد لیا گیا کہ تم نے اس رسول پر ایمان لانا اور اس کی نصرت کرنی ہوگی اور یہ عہد ہر ایک قوم سے بذریعہ ان کے نبی کے لیا گیا۔ یہی وہ مضمون ہے جس کو اس آیت میں بیان فرمایا ہے اسی کی طرف اشارہ ہے جو ایک حدیث میں آیا ہے انا اوّل النبیین خلقا واٰخرھم بعثا۔ کیونکہ اگر آپ اوّل النبیین خلقاً نہ ہوتے تو آپ کے متعلق ہر نبی سے وعدہ کس طرح لیا جاتا۔ اور بعثت میں آخری اس لیے ہوئے کہ تا کل نبیوں سے آپ کے متعلق عہد لیا جائے اور آپ بھی کل کی تصدیق کریں۔

آخری رسول کی سب سے بڑی علامت تصدیق رسل عالم ہے: اس رسول کی سب سے بڑی علامت جو یہاں بتائی وہ یہ ہے کہ وہ مصدق لما معکم ہے یعنی اس کی تصدیق کرتا ہے جو پہلی قوموں کے پاس ہے۔ یہ ایک امتیازی نشان ہے جو رسول عربی فداہ امی وابی میں پایا جاتا ہے کیونکہ یہی ایک رسول ہے جس نے اپنے سے پہلے دنیا کے تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا، چنانچہ اس کا ذکر قرآن کریم میں بار بار ہے۔ ابتدائے قرآن میں ہی فرمایا یومنون بما انزل الیك وما انزل من قبلك (البقرۃ ۲۔ ۴) جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا اس سب پر ایمان لاتے ہیں اور پھر بار بار فرمایا لانفرق بین احد من رسلہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں بھی اس رسول مصدق کے اس امتیازی نشان کا ذکر فوراً کر دیا جیسا کہ آیت ۸۳ میں فرمایا قل اٰمنا باللّٰہ وما انزل علینا وما انزل علٰی ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسٰی وعیسٰی والنبیون من ربھم لانفرق بین احد منھم پس درحقیقت یہاں بتا دیا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم دنیا کے کل نبیوں کی تصدیق فرماتے ہیں اور اس طرح پر قرآن نے خود ہی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ رسول مصدق لما معکم سے کیا مراد ہے۔ کیونکہ محمد رسول اللہ صلعم ہی دنیا میں ایک رسول ہوا ہے جس نے دنیا کے کل نبیوں کی تصدیق کی ہے اور ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔

حواریان مسیح کی شہادت آنحضرتؐ کے لیے: حضرت مسیح کے حواریوں نے بھی اس بات کی شہادت دی ہے کہ وہ نبی مثل موسٰی جس کی پیشگوئی استثناء ۱۸۔ ۱۵ و ۱۸ میں ہے اس کے متعلق دنیا کے کل نبیوں نے شہادت دی ہے۔ چنانچہ اعمال رسل باب ۳ آیت ۲۱ میں ہے "ضرور ہے کہ آسمان اسے لیے رہے اس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آویں۔ کیونکہ موسٰی نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیے ایک نبی میری مانند اٹھائے گا جو کچھ وہ تمہیں کہے اس کی سب سنو۔" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کے بعد تک اس پیشگوئی کا انتظار تھا۔ اور دنیا میں ایک ہی شخص ہُوا ہے جس نے یہ دعوٰی کیا کہ میں وہ نبی ہوں جس کی بابت کل نبیوں نے خبر دی تھی اور جس طرح اس کی خبر سب نبیوں نے دی۔ اسی طرح اس نے سب نبیوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔ قرآن کریم اگر تفصیلات میں پڑتا تو اتنی بڑی کتاب تو صرف نبیوں کی پیشگوئیوں کے ذکر کیلئے کافی ہوتی اس لیے یہاں یہ بتا کر کہ کل نبیوں سے یہ عہد لیا گیا تھا اس کا موٹا نشان یہ بتایا کہ کل نبیوں کا موعود کل کی تصدیق کرنے والا ہے اور ان من امۃ الا خلا فیھا نذیر کہنے والا دوسرا کوئی انسان دنیا میں نہیں گزرا اور یہ موٹا نشان بتا کر صرف سلسلہ بنی اسرائیل کے جد امجد اور اُنکے آخری نبی کی پیشگوئیوں کا ذکر صراحت سے کر دیا یعنی حضرت ابراہیم کی اس دعا کا ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم اٰیاتك ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم (البقرۃ ۲۔ ۱۲۹) اور حضرت مسیح کی اس پیشگوئی کا ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد (الصف ۶۱۔ ۶) اور باقی سب کے متعلق کہہ دیا یجدونہ مکتوباً عندھم فی التوراۃ والانجیل (الاعراف ۷۔ ۱۵۷) وانہ لفی زبر الاولین (الشعراء ۲۶۔ ۱۹۶) چونکہ کثرت سے کتابوں میں اب بھی آپ کی پیشگوئی موجود ہے اس لیے اگر کسی کتاب میں سے ضائع بھی ہو گئی ہو تو اس پر تعجب نہیں۔

ع۴۷۳ یبغون۔ بغی کے اصل معنی میانہ روی سے تجاوز کو چاہنا ہے دیکھو ع۱۱۵ گویا دین اللہ یا اسلام میانہ روی سکھاتا ہے اور جو اس کو چھوڑ کر کچھ اور چاہتا ہے وہ میانہ روی سے تجاوز کو چاہتا ہے۔

اَسْلَمَ۔ اسلام کے اصل معنی فرمانبرداری کرنا ہیں اور یہی وسیع معنی یہاں مراد ہیں جیسا کہ تمام مخلوق ارضی و سماوی کی طرف اَسْلَمَ منسوب کرنے سے ظاہر ہے۔

طوعًا و کرھًا دونوں مصدر ہیں جو حال کی جگہ پر آئے ہیں یعنی مراد ہے طائعین و کارھین۔

طوع کے معنی ہیں فرمانبرداری اختیار کرنا یعنی رضا و رغبت سے اور کرہ اس کی ضد ہے۔

اس آیت میں اسلام کے عالمگیر مذہب ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ گویا پہلی آیت میں بتایا تھا کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کا موعود مذہب ہونے کے لحاظ سے ساری نسل انسانی کا مذہب ہے۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اسلام اپنی حقیقت میں کل عالم کا مذہب ہے صرف زمین میں انسانوں کا ہی نہیں بلکہ من فی السمٰوات ومن فی الارض کا مذہب ہے کیونکہ اسلام کے اصل معنی فرمانبرداری ہیں اور مذہب کے رنگ میں قوانین شریعت کی فرمانبرداری کا نام اسلام ہے اور عام رنگ میں قوانین الٰہی کی فرمانبرداری بھی اسلام ہی ہے۔ پس اسلام جمیع مخلوقات کا مذہب ہے کیونکہ اس وسیع عالم میں جو چیز قوانین الٰہی کی

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ
مَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ
اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ
مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪
لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَ نَحْنُ
لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿٨٤﴾

کہہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور (اس کی) اولاد پر اتارا گیا۔ اور جو موسےٰؑ اور عیسٰےؑ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اُسی کے فرماں بردار ہیں ۴۷۴ع

وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ
يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِى الْاٰخِرَةِ
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٨٥﴾

اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہتا ہے، تو اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ ۴۷۵ع

كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ

اللہ ان لوگوں کو کس طرح ہدایت کرے جو اپنے ایمان کے

فرمانبرداری نہ کرے گی اس کا وجود ہی نہیں رہ سکتا بالفاظ دیگر ہر شے کا وجود ہی قوانین کی فرمانبرداری پر ہے۔ پس حقیقی معنی میں اسلام ہی عالمگیر مذہب ہے کیونکہ چھوٹے سے چھوٹے ذرہ سے لیکر بڑے سے بڑے کرہ تک سب اللہ تعالیٰ کے قوانین کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔

طوعاً وکرہاً فرمانبرداری سے مراد: طوعًا وکرھًا سے یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ خواہ کچھ ہو کوئی چیز قانون الٰہی کی فرمانبرداری سے باہر نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ فرمانبرداری تو طوعاً ہی ہوتی ہے یعنی اپنی رضا و رغبت سے۔ لیکن اگر ان چیزوں کو اختیار ہوتا کہ وہ فرمانبرداری کریں یا نہ کریں اور اپنی رضا و رغبت سے وہ فرمانبرداری نہ کرتیں تو کرہاً بھی ان کو فرمانبرداری اختیار کرنی پڑتی یا طوعاً وکرہاً میں دو قسم کی فرمانبرداری کا ذکر ہے۔ ایک تو وہ چیزیں ہیں جن کی خواہش فرمانبرداری کے خلاف ہوسکتی ہی نہیں جیسے مثلاً ملائکہ یا خود زمین و آسمان اور ان کی طاقتیں جیسا کہ (اتینا طائعین (حٰم السجدۃ ۴۱-۱۱) سے ظاہر ہے طبعی امور میں انسان بھی اسی طرح فرمانبرداری اختیار کرتا ہے۔ مگر وہ امور جن کا تعلق اختیار و ارادہ سے ہے ان میں کرہ بمعنی مشقت کے ساتھ فرمانبرداری ہے یعنی اس کام کو انسان طبعاً نہیں کرتا بلکہ مشقت اس کے لیے بکار ہے اور یا کرہ بمعنی ناخوشی سے یوں فرمانبرداری ہے کہ کافر جب خوشی سے ان قوانین کی فرمانبرداری نہیں کرتا تو ناخوشی سے بھی اس کو کرنی پڑتی ہے کیونکہ ایسے قوانین میں فرمانبرداری دو طرح پر ہے جو شخص ان قوانین پر چلتا ہے وہ سُکھ پاتا ہے جو نہیں چلتا وہ دکھ اُٹھاتا ہے۔ پس جس نے قانون کی فرمانبرداری طوعاً نہ کی اس کو کرھاً یعنی دکھ اور سزا کے رنگ میں کرنی پڑی۔ اسی لحاظ سے مفسرین نے طوعًا فرمانبرداری مومن کے لیے اور کرھًا کافر کے لیے لکھی ہے (ت)

۴۷۴ع اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ واقعی یہی رسول مصدق ہے جو سب کا موعود تھا کیونکہ اس نے سب انبیاء پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔

۴۷۵ع الخاسرون۔ خسر اور خسران راس المال کے کم ہو جانے کا نام ہے (غ)

اسلام کو چھوڑنا فطرت بگاڑنا ہے: جب دین اسلام سب انبیاء کا موعود بھی ہُوا سب رسولوں کا مصدق بھی ہُوا بلحاظ اپنے معنی کے تمام ذراتِ عالم کا مذہب بھی ہوا، تو جو شخص ایسے کامل دین کو چھوڑ کر ناقص چیز کو قبول کرے وہ واقعی خسارہ میں ہے اور چونکہ خسران راس المال کے ضائع ہو جانے کا نام ہے اس لیے اس نے گویا اپنے راس المال کو بھی تباہ کر دیا۔ انسان کا راس المال مذہب کے معاملہ میں اس کی فطرت ہے اور حدیث شاہد ہے کہ کل مولود یولد علی الفطرۃ ہر ایک انسانی بچہ اسی فطری دین پر پیدا ہوتا ہے۔ پس جو شخص اسلام یا کامل فرمانبرداری کی راہوں کو ترک کرکے ادھر اُدھر کھٹکتا پھرتا ہے اس نے اپنی فطرت کو بھی بگاڑ دیا۔

نجات اور دوسرے مذاہب: یہ آیت اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ کامل راہیں نجات کی صرف اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ گو قرآن کریم دوسرے مذاہب میں خوبیوں کا اعتراف کرتا ہے گو اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ سب مذاہب کی ابتدا خدا کی طرف سے ہی ہے مگر ساتھ ہی اس امر حق کا بھی اظہار فرماتا ہے کہ سب مذاہب میں غلطیوں کے راہ پا جانے سے اب انسان ان کے ذریعہ سے گناہ سے نجات یا اخروی نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی معنی ہیں اس حدیث صحیح کے من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھو رد (ش) جو شخص ایسا عمل کرتا ہے جس پر ہمارا امر نہیں وہ مردود ہے۔ ہاں ہر ایک نیکی کے کام پر خدا اور اس کے رسول کا امر موجود ہے پس نیکی کا کام کوئی بھی کرے مردود نہیں اور اس لیے یہ ضروری ہے کہ سب لوگ دین واحد پر جمع ہو کر گناہ کی غلامی سے بھی نجات حاصل کریں اور دنیا میں ایک عظیم الشان اخوت نسل انسانی کے قائم کرنے کا موجب بھی ہوں۔

اِیۡمَانِہِمۡ وَ شَہِدُوۡۤا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ
وَّ جَآءَہُمُ الۡبَیِّنٰتُ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی
الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۸۶﴾

بعد کافر ہوئے اور وہ گواہ ہیں کہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس کھلی دلیلیں آچکیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۴۷۶

اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُہُمۡ اَنَّ عَلَیۡہِمۡ لَعۡنَۃَ
اللّٰہِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۸۷﴾

ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور لوگوں سب کی لعنت ہے۔

خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنۡہُمُ الۡعَذَابُ
وَ لَا ہُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۸۸﴾

اس میں رہیں گے نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ اُن کو مہلت دی جائے گی ۴۷۷

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَ
اَصۡلَحُوۡا ۟ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۸۹﴾

مگر وہ جنھوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کی تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۴۷۸

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِہِمۡ ثُمَّ
ازۡدَادُوۡا کُفۡرًا لَّنۡ تُقۡبَلَ تَوۡبَتُہُمۡ ۚ
وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الضَّآلُّوۡنَ ﴿۹۰﴾

جو اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے، پھر کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ قبول نہیں ہوتی اور وہی گمراہ ہیں۔ ۴۷۹

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ مَاتُوۡا وَ ہُمۡ کُفَّارٌ

جو کافر ہوئے اور مرگئے اور وہ کافر ہی تھے،

---

۴۷۶ اہل کتاب کا باوجود مشاہدہ صداقت نبوی سے انکار: گو بعض نے کہا ہے کہ اس آیت میں ایک خاص گروہ کا ذکر ہے جو اسلام لا کر پھر مرتد ہو گئے اور اہل مکہ سے جا ملے اور ان میں ابو عامر راہب کا نام بھی لیا گیا ہے۔ مگر حسن اور ابن عباس سے روایات صریحہ ہیں کہ ان آیات میں اہل کتاب کا ہی ذکر ہے اور یہی سیاق و سباق عبارت چاہتا ہے۔ اصل مخاطب تو اس رکوع میں اہل کتاب ہی ہیں۔ اسلام پر اس قدر کھلے دلائل کے باوجود ان لوگوں نے کوئی توجہ اسلام کی طرف نہ کی کفروا بعد ایمانھم سے یہ مراد ہے کہ وہ پہلے انبیاء پر ایمان لائے اور اس کے بعد اب محمد رسول اللہ صلعم کا کفر کرتے ہیں وشھدوا ان الرسول حق میں یہ اشارہ ہے کہ در حقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا یہ لوگ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے ہیں۔ جیسا دوسری جگہ فرمایا یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم (البقرۃ ۲ ۱۴۶) اور دوسری جگہ فرمایا لم تکفرون بایات اللہ وانتم تشھدون (۶۹) بینات سے مراد وہ کھلے دلائل ہیں جن میں سے کئی ایک یہاں بھی بالتفصیل بیان ہو چکے ہیں۔ اللہ کے ان کو ہدایت نہ دینے سے یا تو یہ مراد ہے کہ ان کو ہدایت کی منزل مقصود پر نہیں پہنچاتا۔ یا یہ کہ ان کو کامیاب نہیں کرتا یا جنت میں نہیں پہنچاتا اور یا یہ کہ ایسے ظالموں سے ہدایت کی توفیق چھین لیتا ہے اور یہ ان کے دلائل کی طرف توجہ نہ کرنے اور باوجود مشاہدہ حق کو قبول نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

۴۷۷ ان لعنتوں کے متعلق دیکھو ۱۹۹ دونوں جگہ اس لعنت کو دوزخ قرار دیا ہے اسی لیے فرمایا خالدین فیھا۔

۴۷۸ توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے: اسلام کوئی ایسی مُہر کفار کے قلوب پر تجویز نہیں کرتا جو ٹوٹ نہ سکتی ہو۔ ان لوگوں کی زیادتیوں اور کفر پر اصرار وغیرہ کا سارا ذکر کر کے اور ان کی خطرناک سزا کا ذکر کر کے فرماتا ہے پھر بھی جو لوگ توبہ کریں اور توبہ کے ساتھ اصلاح کریں وہ اس سزا کے پانے والے نہیں ہونگے مگر توبہ کے ساتھ اصلاح شرط ہے اور اس پر غفر کا وعدہ ہے یعنی ان کی وہ طاقتیں جو ان سے بدیاں کراتی تھیں اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کرے گا۔

۴۷۹ ازدیاد کفر: ازدادوا کفرا سے مراد اصرار علی الکفر ہے کیونکہ جب کفر پر اصرار ہوتا ہے تو وہ بڑھتا رہتا ہے اور یا عداوت میں بڑھتے جانا ہے بعض لوگوں نے اسے یہودیوں سے مخصوص کیا ہے کہ انہوں نے پہلے حضرت موسیٰ پر ایمان لا کر پھر حضرت عیسیٰ کا انکار کیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے کفر میں بڑھ گئے۔ مگر یہ بلا وجہ تحدید ہے۔ سارے اہل کتاب مراد ہیں جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ اور کفر میں ان کا ترقی کرتے جانا مخالفت حق میں بڑھتے جانا ہے۔ ایسے لوگ اگر گھر میں بیٹھ کر توبہ بھی کریں تو یہ توبہ قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کے اعمال اس کے خلاف ہوتے ہیں۔ اور حق کو وہ ملیامیٹ کرنا چاہتے ہیں تو بہ کیسی! اور یا جیسا کہ ابن الانباری اور قفال نے کہا ہے یہ متعلق ہے ان لوگوں کے جن کا ذکر الا الذین تابوا میں پہلے آچکا ہے اور مراد یہ ہے کہ اگر توبہ کر کے پھر کفر کی طرف لوٹ گئے اور کفر میں بڑھتے گئے تو وہ ان کی پہلی توبہ قبول نہ ہوئی۔

فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ
ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾ ع
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ
وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾
كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا
مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ
اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ
فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾

تو ان میں سے کسی سے زمین بھر کر[ع۴۸۰] سونا بھی قبول نہ کیا جائے گا اگرچہ وہ اسے فدیہ دے ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کے لیے کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا۔

تم راستبازی کو ہرگز حاصل نہ کرو گے یہانتک کہ اس سے خرچ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو اور جو کوئی چیز بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔[ع۴۸۱]

کھانے کی سب چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں قبل اس کے کہ تورات اتاری جائے، سوائے اس کے جو اسرائیل نے اپنی جان پر حرام کر لیا۔ کہہ تو تورات لاؤ[ع۴۸۲] پھر اسے پڑھو، اگر تم سچے ہو۔

ع۴۸۰ ملءُ الارض ۔ ملءُ الشئ سے مراد ہوتی ہے۔ مقدار مایملاء یعنی وہ مقدار جس سے وہ شے بھر جائے ۔پس اس قدر سونا مراد ہے جس سے زمین بھر جائے۔

مال دنیا آخرت میں کام نہ دیگا: اس آیت میں صاف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب جو دین حق سے منحرف ہو کر اس قدر سونا کمائیں گے کہ گویا ساری زمین ہی سونے سے بھر جائے گی تو اس قدر سونا بھی اس نقصان کی تلافی نہ کرسکے گا۔جو دین سے انحراف میں انہوں نے اُٹھایا ہوگا لو افتدی بہ اس لیے فرمایا کہ یوں قبول نہ کرنے میں اس قدر اظہار ناراضگی نہیں جس قدر اس میں لبطور فدیہ کوئی چیز پیش کی جائے تو اسے قبول نہ کیا جائے ۔گویا یوں فرمایا کہ ان کا ساری زمین کو سونے سے بھر دینا تو کسی کام ہی نہیں بطور فدیہ بھی دیں تو قبول نہیں ہوگا۔اور من احدھم اسلیے فرمایا کہ جس قدر سونا سب مل کر پیدا کر سکتے ہیں اتنا اتنا اکیلا بھی کرے تو اسے کچھ کام نہ دے گا۔بتایا ہے کہ اخلاق اور روحانیت کے مقابلہ میں سونا ہیچ ہے۔

ع۴۸۱ مال دنیا کو معبود بنانے والوں کے مقابل پر خیر و برکت حاصل کرنے کی راہ: ممّا میں مِن تبعیضیہ بھی ہوسکتا ہے یعنی بعض حصّہ اس کا خرچ کرو جس سے تم کو محبّت ہے اور بیانیہ بھی ہوسکتا ہے۔

پچھلے رکوع میں اسلام کی صداقت کی اس عظیم الشان دلیل کی طرف توجہ دلائی تھی کہ یہ سب انبیاء کا موعود ہے اس رکوع میں ایک ایسی ہی اور عظیم الشان دلیل کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کا مرکز یعنی خانہ کعبہ دنیا کا سب سے پہلا معبد ہے اس لیے ضروری تھا کہ الگ الگ قوموں میں نبی بھیجنے کے بعد دنیا کا آخری معبد اور ساری نسل انسانی کی عبادتگاہوں کا مرکز اسی کو قرار دیا جاتا اور یوں اصولی طور پر دو عظیم الشان امور کی طرف اہل کتاب کو توجہ دلائی ہے مگر چونکہ سلسلہ مضمون اس رنگ میں چلتا تھا کہ اہل کتاب اگر ساری زمین کو بھی سونے سے بھر دیں تو وہ اُن کی بدیوں کا فدیہ نہیں ہوسکتا۔اس لیے اب مسلمانوں کو بتایا ہے کہ وہ البر خیر وسیع یا سب قسم کی خیر کے ابواب میں کس طرح داخل ہوسکتے ہیں۔کیونکہ سونے سے زمین بھرنے والوں کے بالمقابل جنہوں نے اپنی ساری طاقتوں کو اس سفلی زندگی پر لگا دیا ہے اس گروہ کا ذکر ضروری تھا جو ہر قسم کی خیر اور نیکی کو حاصل کرے تو اس کا گُر یہ بتایا کہ جن چیزوں سے تم کو محبت ہے وہ خرچ کردو تو جمیع ابواب خیر میں داخل ہوسکتے ہو بعض نے یہاں البر کے معنی جنت لیے ہیں مگر ماحصل دونوں کا ایک ہے کیونکہ جس نے جمیع خصائل خیر حاصل کرلیے وہ اسی دنیا میں جنت میں داخل ہوگیا۔اب مما تحبون صرف مال اور زر ہی نہیں بلکہ اگر ضرورت ہو تو اپنے وقتِ عزیز کو خدا کی راہ میں لگانا اپنی عزت اور مرتبہ کو جس سے انسان محبّت کرتا ہے خدا کی راہ میں خرچ کردینا اپنی ساری قوتوں اور طاقتوں کو لگا دینا یہ سب کچھ اس کے اندر داخل ہے۔ہاں مال و دولت جائداد سب سے زیادہ محسوس ہونے والی چیزیں ہیں بعض لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ یہ آیت حکم زکوٰۃ سے منسوخ ہے حالانکہ یہ ایک ایسا محکم اور پختہ اصول ہے کہ جب تک انسان اس دنیا میں ہے یہ کبھی منسوخ نہیں ہوسکتا۔نسل انسانی کی ساری ترقیات کا مدار ہی محبوب اشیاء کے انفاق پر ہے صحابہ نے اس اصول کو خوب سمجھا تھا اور اپنی جانیں مال جائداد یں سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کرکے ہر قسم کی بڑائی کے وارث ہوئے۔

ع۴۸۲ الطعام میں ال عہد کے لیے ہے یعنی وہ طعام جو مسلمان کھاتے ہیں اور طعام ہر وہ چیز ہے جو لبطور غذا کھائی جاتی ہے۔

یہودیوں کا اعتراض اونٹ کے گوشت کے متعلق: واحدی نے کلبی سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ ہم دین ابراہیم پر ہیں (ان اولی الناس بابراھم للذین اتبعوہ وھذا النبی) تو یہودیوں نے کہا کہ آپ اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں اور اونٹ کا گوشت نوح اور ابراہیم علیہما السلام پر بھی حرام تھا۔ تو یہ آیت ان کی تکذیب کے لیے اُتری (ر) گویا یہ الفاظ اس اعتراض کے جواب میں ہیں کہ کھانے کی چیزوں میں مسلمانوں کا ملّت ابراہیمی سے کوئی اختلاف ہے اور دعویٰ

فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ
ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾
قُلْ صَدَقَ اللّٰہُ ۟ فَاتَّبِعُوْا مِلَّۃَ اِبْرٰہِیْمَ
حَنِیْفًا ؕ وَ مَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۹۵﴾
اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ
مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۶﴾

پھر جو کوئی اِس کے بعد اللہ پر جھوٹ بنائے تو وہی
ظالم ہیں۔
کہہ اللہ نے سچ فرمایا ہے، پس راست رو ہو کر ابراہیم کے دین
کی پیروی کرو اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا ۴۸۳ؑ
پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا، یقیناً وہی ہے جو مکّہ میں ہے
برکت دیا گیا اور سب قوموں کے لیے ہدایت ہے ۴۸۴ؑ

کیا ہے کہ وہی چیزیں جو ابراہیم کے لیے بھی حلال تھیں بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں مگر اسرائیل نے کچھ اپنے اوپر حرام کر لیا تھا وہ کیا تھا؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کا گوشت تھا۔ اور حضرت یعقوب نے ایک لمبی بیماری میں مبتلا ہونے پر یہ نذر مانی تھی کہ وہ محبوب ترین طعام کو جو اونٹ کا گوشت تھا ترک کر دینگے بعض نے چربیوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے بعض نے کہا ہے کہ حضرت یعقوب نے عبادت کے رنگ میں اس کو ترک کیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ایسا کیا تھا۔ بہرحال اہل کتاب کا جو اعتراض تھا کہ یہ چیزیں ہمیشہ سے حرام تھیں اور ملّت ابراہیمی میں بھی حرام تھیں اس کا جواب دیا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو توریت لا کر پڑھو اور اس میں دکھاؤ کہ کہاں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم پر بھی یہ چیزیں حرام تھیں اسی کی طرف توجہ دلانے کے لیے فرمایا فاتبعوا ملۃ ابراھیم حنیفا اور توریت میں جو بہت سی چیزیں ان پر حرام کی گئیں تو اس کی وجہ قرآن کریم نے دوسری جگہ یوں بیان فرمائی ہے فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم (النساء ۴۔ ۱۶۰) اور دوسری جگہ فرمایا ذٰلک جزینٰھم ببغیھم وانا لصادقون (الانعام ۶۔ ۱۴۷) یعنی حقیقت یہی ہے کہ توریت کے نزول سے پہلے بنی اسرائیل پر ہر ایک قسم کا طعام جو مسلمانوں کے لیے حلال ہے حلال تھا اور بنی اسرائیل پر بھی بہت سی چیزوں کی حرمت کی وجہ ان کی حرمت اصلی نہیں بلکہ سزا کے طور پر تھا۔

۴۸۳ؑ قل صدق اللہ میں ہو سکتا ہے کہ اشارہ اس بیان کے متعلق ہو جو آیت ۹۲ میں پایا جاتا ہے مگر قرین قیاس یہ ہے کہ اس میں دین اسلام کی صداقت کا اظہار ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے وہ سب سچ ہے۔

یہود و نصاریٰ کو ملت ابراہیم کے اتباع کی دعوت: اس کے بعد فرمایا فاتبعوا ملۃ ابراھیم حنیفا یعنی اصول دین اسلام وہی ہیں جو ابراہیم کی ملّت کے اصول تھے اور چونکہ وہ تم سب کا مسلّم بزرگ ہے۔ اس کے اصول دین سے تمہارا انحراف کرنا کسی صورت میں ٹھیک نہیں چونکہ گذشتہ ساری بحث میں اصول پر ہی توجہ دلائی گئی ہے۔ اس لیے ملّت ابراہیم سے مراد یہاں اصول ملّت ابراہیمی ہیں نہ اس کے فروع۔ اس سے پہلی آیت میں جو اللہ پر جھوٹ بنانے کا ذکر ہے اس میں بھی ان افتراؤں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو یہود و نصاریٰ نے دین کے معاملہ میں کر رکھے تھے۔

۴۸۴ؑ اول سے مراد یہاں متقدم فی الزمان ہی ہے یعنی زمانہ کے لحاظ سے سب سے پہلا۔ جیسا کہ دوسری آیات و احادیث سے واضح ہوتا ہے اور مرتبہ کے لحاظ سے بھی وہ اول ہے کیونکہ آخری مرجع عالم بھی وہی قرار پایا۔

وضع۔ وُضِع کا استعمال کئی طرح پر ہوتا ہے۔ ایجاد اور خلق کے معنی میں بھی آتا ہے (غ) جیسے والارض وضعھا للانام (الرحمٰن ۵۵۔ ۱۰) اور بچہ جننے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے فلما وضعتھا قالت ربّ انی وضعتھا انثٰی واللہ اعلم بما وضعت (ال عمران ۳۔ ۳۵) اور وَضْعُ الْبَیْتِ سے مراد ہوتی ہے بِنَاؤُہٗ (غ) یعنی اس کی تعمیر۔ اور وضع الکتاب سے مراد ہے ابرازُ اعمالِ العِبَادِ (ر) یعنی بندوں کے اعمال کا ظاہر کرنا۔ ووضع الکتاب (الکہف ۱۸۔ ۴۹)

بکّۃ۔ بکۃ اور مکۃ ایک ہی نام کی دو مختلف صورتیں ہیں چنانچہ راغب نے بھی مجاہد کے اس قول کو ہی ترجیح دی ہے کہ بکۃ مکۃ ہے اور ب اور م کے ایک دوسرے کی جگہ آ جانے کی بہت سی مثالیں ہیں جیسے سَبَدَ اور سمد۔ لازب اور لازم۔ بعض لوگوں نے ان دونوں میں کچھ فرق کیا ہے۔ بعض کے نزدیک بطن مکہ کا نام بکّہ ہے بعض کے نزدیک مسجد کا نام بکہ ہے اور بعض کے نزدیک خاص البیت کا اور مکہ شہر کا نام ہے پھر اس کے اشتقاق کی وجہ میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ تباکّ سے ہے جس کے معنی ازدحام ہیں۔ کیونکہ لوگ طواف کے لیے اس میں اکٹھے ہوتے ہیں اور بعض نے کہا کہ مکّہ کا نام بکّہ اس لیے رکھا گیا ہے لانھا تَبُکّ اعناق الجبابِرَۃِ یعنی وہ جباروں اور سرکشوں کی جو اس کے اندر یا اس کے متعلق زیادتی کرنا چاہیں گردنیں توڑتا ہے۔

مبارکا۔ برک کی اصل اہل لغت نے بَرَکَ البعیر سے لکھی ہے جس کے معنی ہیں اونٹ بیٹھ گیا اور اس جگہ کے ساتھ لگا رہا (ل) اس وجہ سے لزوم اور ثبات کے معنی کے اظہار کے لیے بَرَکَۃ کا لفظ بولا جاتا ہے اور گو اہل لغت نے نمو اور بڑھنا بھی بَرَکَۃ کے معنی لکھے ہیں مگر اصل معنی اسکے لزوم اور ثبات ہی ہیں۔ جیسا کہ لسان العرب میں بھی ہے اور مفردات میں ہے البرکۃ ثبوت الخیر الالٰھیّ فی الشئ یعنی کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کا ثابت ہو جانا اور مبارک کے معنی ہیں ما یاتی من قبلہ الخیر الکثیر (ل) جسکی طرف سے خیر کثیر آتی رہی اسلیئے اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی یہ لفظ بولا گیا ہے فتبارک اللہ۔ پس بکۃ کو مبارک کہا کہ اس کی طرف سے خیر کثیر آتی رہے گی یہ خیر کثیر صرف عبادت میں اور اس کے ثواب میں یا قبولیت دعا میں یا یجبٰی الیہ ثمرٰت کل شئ (القصص ۲۸۔ ۵۷) میں محدود نہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ انسان

فِيهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ۬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

اس میں کھلے کھلے نشان ہیں مقام ابراہیم، اور جو وہاں داخل ہُوا امن والا ہو گیا اور لوگوں پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج کرنا ہے اس پر جو اس تک راہ پا سکے اور جس نے انکار کیا تو اللہ جہانوں سے بے نیاز ہے ع۴۸۵

کے لیے تمام خیرات دینی کا یہ مرکز رہے گا۔ یہاں سے وہ سرچشمہ توحید کا پھوٹا جو قیامت تک منقطع نہیں ہوگا۔

ھدی۔ مراد ہے ذا ھدی یعنی ہدایت والا۔ کیونکہ یہیں سے وہ ہدایت نکلی جو تمام دنیا جہان کے لیے تھی تمام ہدائتیں ایک ایک قوم کے لیے آئیں۔ صرف ایک ہی ہدایت ہے جو علی الاعلان ساری دنیا کے لیے آئی اور وہ ہدایت اسی مقام مبارک سے نکلی۔

آیا خانہ کعبہ اول بیت یعنی دنیا کا سب سے پہلا معبد ہے، اس پر مخالفانہ شہادت کا ذکر ع۱۵۷ میں ہو چکا ہے۔ احادیث نبوی میں بھی صراحت سے اس کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ بخاری اور مسلم میں ہے کہ ابوذر رضؓ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ ای مسجد وضع اوّل کونسی مسجد سب سے پہلے بنائی گئی؟ تو آپ نے جواب دیا المسجد حرام یعنی مسجد حرام یا خانہ کعبہ اور یہ جو ایک روایت حضرت علیؓ سے ابن ابی حاتم نے بیان کی ہے کہ ایک شخص نے حضرت علیؓ سے سوال کیا اھو اوّل بیت وضع فی الارض قال لا ولکنہ اوّل بیت وضع فیہ البرکۃ (ت) کیا وہ سب سے پہلا گھر ہے جو زمین پر بنایا گیا، تو آپ نے فرمایا نہیں لیکن وہ پہلا گھر ہے جس میں برکت ڈالی گئی۔ تو یہ بخاری اور مسلم کی حدیث کے خلاف نہیں اور حضرت علی سے بھی ابن ابی حاتم کی دوسری روایت اس کی توضیح کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت علی نے کہا کانت البیوت قبلہ ولکنہ اوّل بیت وضع لعبادۃ اللہ (ت) یعنی گھر تو اس سے پہلے بھی تھے مگر وہ پہلا گھر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے مقرر کیا گیا اور یہی منشاء حدیث متفق علیہ کا ہے کہ سب سے پہلی مسجد یا سب سے پہلا اللہ تعالیٰ کی عبادت کا گھر جو دنیا میں مقرر ہُوا وہ خانہ کعبہ ہے۔

آدم کا کعبہ کو بنانا: اور بیہقی کی حدیث ذیل اسی کی موید ہے جس کو گو بعض لوگوں نے ابن لہیعہ کے نام کی وجہ سے کمزور کہا ہے۔ مگر چونکہ قرآن کریم کے صریح الفاظ اوّل بیت اور حدیث متفق علیہ کے مطابق ہے اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا اور وہ حدیث عمرو بن العاص سے مرفوع یوں ہے۔ بعث اللہ جبرئیل الی اٰدم وحواء فامرھما ببناء الکعبۃ فبناہ اٰدم ثم امر بالطواف بہ (ت) یعنی اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو آدم اور حوا کی طرف بھیجا اور ان کو کعبہ کے بنانے کا حکم دیا پس آدم نے اُسے بنایا پھر اسے اس کے طواف کا حکم دیا گیا۔ اور یہ جو حدیث میں آتا ہے کہ بیت الحرام کے بعد بیت المقدس ہے اور دونوں میں چالیس سال کا فرق ہے۔ تو اس کا منشاء صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے ان دونوں گھروں کے بنانے میں چالیس سال کا فرق ہے کیونکہ پہلے حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل کے ساتھ خانہ کعبہ کو دوبارہ بنایا اور پھر اپنی نسل کی دوسری شاخ کے لیے بیت المقدس کو قبلہ بنایا۔

مکّہ کے نام: مکّہ کے کئی ایک نام آئے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ مثلاً ام القریٰ (الانعام-۹۳) بستیوں کی ماں۔ اور یہ نام مکّہ کی وجہ تسمیہ کے ساتھ ملتا ہے کیونکہ مکّہ بھی مَلَقّ سے ہے جس کے معنی ماں کی چھاتیوں سے دودھ چُوسنا ہے اور ام القریٰ یا بستیوں کی ماں اسے اس لیے کہا کہ اس کی چھاتیوں سے ساری زمین توحید الٰہی اور دین حق کا دودھ چُوسے گی۔ اس لیے ساری دنیا کا یہی حقیقی مرکز ہے اور مفسرین نے اسے زمین کا مرکز کہا ہے جس سے مراد روحانی مرکز ہے اور البلد یا خاص شہر بھی اس کا نام آیا ہے اور البلد الامین یا امن والا شہر بھی۔ کیونکہ اس جیسی کوئی جائے امن اور دنیا میں نہیں۔ اور احادیث میں دو عظیم الشان فتنوں کا ذکر کرکے جن میں سے ایک روحانی فتنہ ہے اور ایک جسمانی یہ بتا دیا ہے کہ اس میں دجال اور طاعون داخل نہیں ہونگے۔ یعنی ہر قسم کے فتنوں سے امن میں رہے گا اور خانہ کعبہ کے جو نام ہیں وہ بھی سب گویا مکّہ کے ہی نام ہیں جیسے مقام ابراہیم۔ البیت خاص گھر۔ البیت العتیق قدیم گھر۔ البیت المحرم پاک گھر یا عزت والا گھر۔ البیت الحرام۔ الکعبۃ۔ دوسرے نام جو بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ہیں الحاطمۃ یعنی توڑ دینے والا جس میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے جو مکّۃ میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی ظالموں کی جو اس کی بے حرمتی کرنا چاہیں گردنیں توڑنے والا۔ الماموں۔ ام رحم۔ صلاح۔ عرش۔ القادس۔ المقدس۔ الراس۔ کوثاء۔ البینۃ وغیرہ (ت)

آخری عبادت گاہ: جس طرح اس گھر کو اوّل بیت کہا ہے اسی طرح لفظ مبارک میں یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ خاتم النبیین کا یہ قبلہ خدا کی عبادت کا آخری گھر بھی ہے کیونکہ مبارک کے معنی ہیں جس کی خیر و برکت کبھی منقطع نہ ہو اور دائمی ہو۔ گویا جس طرح پہلے قبلے ایک وقت کے لیے تھے اور آخر ان کی خیر و برکت ایک وقت آکر منقطع ہونے والی تھی۔ یہ صورت اس پاک گھر کی نہ ہو گی۔ کیونکہ اس نے دنیا کی ساری بستیوں کا مرکز بننا تھا۔ اس کے بعد اور کوئی عبادتگاہ خدا کی اس دنیا پر قائم نہ ہو گی اور تاریخ خود اس پر شاہد ہے کہ اس کے بعد کوئی مقام اس قسم کا مرکز دنیا میں نہیں بنا۔ ھدی للعالمین کے لفظ میں انہی مطالب کی تصریح فرما دی کہ یہاں سے ہدایت ملیگی اور وہ ہدایت عرب کے لیے نہیں بلکہ دنیا کی کل قوموں کے لیے ہو گی۔

ع۴۸۵ حِجّ اور حَجّ کے ایک ہی معنی ہیں دیکھو ع۱۰۲۔ فرق صرف اس قدر اہل لغت نے کیا ہے کہ حَجّ مصدر ہے اور حِجّ اسم ہے (غ)

استطاع الیہ سبیلا۔ استطاعت کے معنی دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں۔ استطاعت حد وسعت کا نام ہے۔ یعنی جس کو سہولت سے انسان کر سکے۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استطاع الیہ سبیلا کا مطلب پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا الزاد والراحلۃ (ت) یعنی زادراہ اور سواری۔ اور بعض نے صحت کو بھی داخل کیا ہے اور حق یہ ہے کہ سارے امور اس کے اندر داخل ہیں۔ مثلاً خود وہاں کا امن۔ رستہ کا امن۔ متعلقین کا گزارہ۔ امن کے نہ ہونے کی وجہ سے

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾	کہہ اے اہل کتاب کیوں اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو اور اللہ اس پر گواہ ہے جو تم کرتے ہو۔
قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ	کہہ اے اہل کتاب کیوں اسے اللہ کی راہ سے روکتے ہو جو ایمان لائے تم اس کے لیے ٹیڑھا پن چاہتے ہو، حالانکہ تم گواہ ہو اور

خود نبی کریم صلعم نے مدینہ میں آکر کئی سال تک حج نہیں کیا اور چھٹے سال میں حدیبیہ سے واپس آنا پڑا۔

مقام ابراہیم۔ یہ آیات بینات کی تشریح ہے یعنی وہ کھلی کھلی نشانیاں کیا ہیں۔ سب سے پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ مقام ابراہیم ہے۔ مقام ابراہیم کی تشریح
ح ۱۵۵ میں ہو چکی ہے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ سارا حرم ہی مقام ابراہیم ہے (ث)

مقام ابراہیم سے شہادت: خانہ کعبہ کا مقام ابراہیم ہونا یا اس میں مقام ابراہیم کا ہونا ایک کھلا نشان قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ خانہ کعبہ کے ساتھ اور عبادات حج کے ساتھ حضرت ابراہیم کا نام نامعلوم زمانہ سے چلا آیا ہے۔ اگر واقعی حضرت ابراہیم یہاں نہ آئے ہوتے، تو عرب کے بت پرستوں کو جن کی روایات میں یہ ایک مسلّم امر چلا آیا ہے کیا ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ ایک ایسے شخص کے نام کا تعلق جو علی الاعلان بت شکن تھا، اس گھر سے قائم کرتے اور اس میں ایک مقام ابراہیم قائم کرکے اس کے مراسم حج وغیرہ کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض باتیں جن کی شہادت زبانی روایات میں پوری پوری نہیں رہ سکتی۔ ان کی شہادت ایک تعامل قومی میں رہ جاتی ہے اور وہ شہادت ایسی زبردست ہوتی ہے کہ جس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ سو ایسی ہی ایک شہادت خانہ کعبہ کے ساتھ حضرت ابراہیم کے نام کے تعلق میں رہ گئی ہے جو آج بھی اہل کتاب پر اتمام حجت کے لیے کافی ہے کہ جس بیت اللہ یا بیت ایل کا ذکر بائبل میں ہے وہ حقیقت میں خانہ کعبہ تھا کیونکہ دنیا میں یہی ایک گھر ہے جس کا نام بیت اللہ ہے اور یہی ایک گھر ہے جس کے ساتھ حضرت ابراہیم کے نام کا تعلق ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور جس کی ساری عبادات اور رواجات حضرت ابراہیم کی طرف منسوب ہیں۔

دوسرا کھلا نشان خانہ کعبہ کے متعلق یہ ہے کہ من دخلہ کان امنا یعنی یہ ایک امن کا مقام ہے۔ یہ بھی خصوصیت ساری دنیا میں صرف خانہ کعبہ کو ہی حاصل ہے کہ وہ امن کا مقام ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ مکہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں ہوا (یعنی ہمیشہ مقام حرمت رہا ہے) اور نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال ہوگا اور وہ میرے لیے بھی صرف دن کی ایک گھڑی حلال ہوا (یعنی وہ وقت جب فتح مکہ کے وقت آپ اس میں داخل ہوئے ہیں) سن رکھو کہ وہ اس وقت سے حرمت کا مقام ہے۔ نہ اس کے کانٹے کاٹے جائیں گے، نہ اس کے درخت قطع کیے جائیں گے نہ اس کی گری ہوئی چیز اٹھائی جائے گی، مگر اس شخص کے لیے جو اس کے (اصل مالک کو) پہنچانے والا ہو۔ پس مکہ کی حدود کے اندر کسی قسم کی جنگ جائز نہیں، یعنی ان حدود کے اندر (مکہ معظمہ میں جنگ کرنا منع ہے۔ اور یہ حرمت اس کی عرب کے اندر ابتدا سے اللہ تعالیٰ نے ایسی محکم رکھی تھی کہ عرب جیسی جنگجو قوم جن کا شغل ہی دن رات جنگ کرنا تھا اور جہاں قبیلہ قبیلہ کے ساتھ اور قوم قوم کے ساتھ ہر وقت برسر پیکار تھے اس قوم میں بھی مکہ کی حدود کے اندر کسی کی طاقت نہیں تھی کہ تلوار کو نیام سے باہر نکال سکے۔ اور جو ہزارہا سال کی تاریخ میں کوئی ایک دو مثالیں اس حکم کی خلاف ورزی کی پیش کی جاتی ہیں تو وہ النادر کالمعدوم کے حکم میں ہیں۔ پھر ایک حدیث میں مکہ کی حرمت کے متعلق یہ لفظ بھی آئے ہیں کہ اس کے اندر نہ دجال داخل ہوگا اور نہ طاعون۔ یہ امن اس مقدس سرزمین میں کیوں رکھا گیا اور کیوں ساری دنیا میں یہ ایک ہی جگہ امن کے لیے مخصوص ہوئی؟ درحقیقت یہ قوم کا خیال نہ تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایک جنگجو قوم کے اندر اپنی طاقت اور قدرت کا ایک نشان رکھا ہوا تھا تاکہ یہ ایک نشان ہو اس روحانی امن و امان کا جس کا جھنڈا اس مقام پر بلند ہو کر دنیا کی کل قوموں میں صلح و اتحاد اور اخوت کی بنیاد رکھی جانی تھی۔ پس یہ دوسرا کھلا نشان ہے جو اس گھر کو عطا کیا گیا۔

خانہ کعبہ کا حج کبھی نہ رکے گا: تیسرا نشان ان الفاظ میں مذکور ہے وللہ علی الناس حج البیت۔ لوگوں کے لیے (من استطاع الیہ سبیلا کی شرط کے ماتحت) اللہ کے لیے اس مقدس گھر کا حج کرنا ضروری ٹھہرایا گیا ہے۔ ہر ایک مقدس مقام پر کوئی نہ کوئی زمانہ ابتلا کا بھی آجاتا رہا ہے۔ بیت المقدس کو کس شان و شوکت کے ساتھ سلیمان علیہ السلام نے بنایا، مگر تھوڑا ہی عرصہ بعد اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ حج اور زیارت کہاں کی؟ اسی طرح پر دنیا کے کل مقدس مقامات ایک نہ ایک وقت اپنے مخالفوں کے ہاتھ میں پڑ کر تباہ و برباد ہو گئے ہیں تو اس کے قیام کی طرف اشارہ فرمایا۔ کہ یہ نہ صرف ہمیشہ کے لیے قائم رہے گا بلکہ اس کا حج بھی لوگ ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ گویا کسی وقت یہ اپنے مخالفوں کے ہاتھ میں نہ پڑے گا۔ اور یہ خصوصیت بھی ایسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو شروع سے قائم رکھا ہے۔ چنانچہ جب خانہ کعبہ کے اندر بت بھی تھے اور اس کے متولی مشرکانہ عقائد رکھتے تھے اس وقت بھی جب ایک عیسائی بادشاہ نے اس پر چڑھائی کی اور اس کو تباہ کرنے اور اس کے حج اور زیارت سے لوگوں کو روکنا چاہا۔ اور اس وقت اس کے متولیوں میں اس بادشاہ کی فوجوں سے مقابلہ کی کچھ بھی طاقت نہ تھی تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایسے سامان پیدا کر دئے کہ وہ بادشاہ مع اپنی ساری فوج کے تباہ ہوگیا۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک نشان ہے کہ ایک عالمگیر جنگ کے اندر بھی جب خود وہ سلطنت بھی جنگ میں مبتلا تھی، جو اس کی اصل متولی ہے یعنی ترکی قوم، خانہ کعبہ کا حج نہیں رکا۔ اس آیت کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ بڑے بڑے لوگ اس کا کفر بھی کریں گے مگر وہ اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اگلی آیت میں صاف بتا دیا کہ یہ بڑے بڑے کفر کرنے والے اہل کتاب ہی ہیں۔ بعض نے یہاں کفر سے مراد صرف اس رکن کا کفر لیا ہے۔

وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۹﴾

اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔ ۴۸۶

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِیۡعُوۡا فَرِیۡقًا مِّنَ
الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ یَرُدُّوۡکُمۡ بَعۡدَ
اِیۡمَانِکُمۡ کٰفِرِیۡنَ ﴿۱۰۰﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم ان لوگوں میں سے ایک گروہ کے پیچھے لگ جاؤ گے جن کو کتاب دی گئی ہے تو وہ تمھیں تمھارے ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے۔ ۴۸۷

وَ کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ وَ اَنۡتُمۡ تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ
اٰیٰتُ اللّٰهِ وَ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلُهٗ ؕ وَ مَنۡ یَّعۡتَصِمۡ
ع بِاللّٰهِ فَقَدۡ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۱۰۱﴾

اور تم کس طرح کفر کر سکتے ہو حالانکہ تم وہ ہو کہ تم پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول ہے اور جو اللہ کو مضبوط پکڑتا ہے وہ یقیناً سیدھی راہ کی طرف ہدایت پا گیا۔ ۴۸۸

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ کرو جیسا کہ اس کے تقوے کا

ع ۴۸۶ عِوَجًا۔ عَوَج قائم رہنے کی حالت سے مڑ جانے کا نام ہے (غ) یعنی ٹیڑھا پن اور عَوَج اور عِوَج میں فرق یہ ہے کہ عَوَج اس ٹیڑھا پن پر بولا جاتا ہے جو آنکھ سے دیکھا جا سکے جیسے گڑی ہوئی لکڑی کا ٹیڑھا ہونا یا دیوار کا ٹیڑھا ہونا وغیرہ۔ اور عِوَج اس ٹیڑھا پن پر بولا جاتا ہے جس کا ادراک فکر اور بصیرت سے ہو (غ) جیسے دین معاش وغیرہ کے معاملہ میں اور تبغونہا عِوَجًا کی تقدیر ہے تبغون لہا عِوَجًا کیونکہ بغی ایک مفعول کو چاہتا ہے اور جب دوسرا مفعول آئے تو لام بڑھایا جاتا ہے۔ اور بعض نے عِوَجًا کو حال لے کر ذا عِوَج معنی کیے ہیں یعنی تم اس کو تلاش کرتے ہو ٹیڑھے رہ کر۔ سچی بات میں وساوس کا پیدا کرنا اس میں ٹیڑھا پن چاہنا ہے۔

ع ۴۸۷ تطیعوا۔ طَوْع۔ اِنْقیاد یعنی برضا ورغبت فرمانبرداری ہے اور اس کی ضد کُرْہ یا ناپسندیدگی (غ) ابھی آ چکا ہے لہ اسلم من فی السمٰوٰت والارض طوعًا وکرھًا اور طاعۃ اور طوع ایک ہی ہیں مگر طاعۃ کا اکثر استعمال اس طرح ہے کہ جو حکم دیا گیا تھا اسے بجا لایا اور جو طریق مقرر کر دیا گیا تھا اس پر چلا (غ) اور اَطاعَ کے معنی ہیں ایک امر کی پیروی کی اور اس کی مخالفت نہ کی (ن) یا اس کے معنی ہیں لَانَ وانقادَ (ت) اس کے لیے نرم ہو گیا اور اس کا منقاد ہو گیا۔

کفار کی اطاعت: یہاں اہل کتاب کی اطاعت سے روکا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی اطاعت کرو گے تو وہ ایمان کے بعد تمھیں کافر بنا کر چھوڑیں گے۔ کسی دوسرے کی اطاعت یہ ہے کہ انسان برضا ورغبت جو وہ کہے مانتا چلا جائے اور جو وہ کرے اسی طرح کرتا چلا جائے پس اطاعت صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہی ہو سکتی ہے یا اولوالامر کی جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔ صرف انہی کے حکم کے ماتحت کسی دوسرے کا حکم مانا جا سکتا ہے۔ اس لیے کفار کی اطاعت فی الواقع کوئی نہیں۔ اور سیاق عبارت کو دیکھا جائے تو اوپر ذکر شکوک وشبہات کا تھا۔ پس یہاں اطاعت سے مراد اُن کے انہی وساوس کا قبول کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بعض بے ایمانوں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ایک وسوسہ دل میں پیدا کر دیا، انسان اگر اس کے پیچھے لگ جائے اور خود غور سے کام نہ لے تو ہلاک ہو جاتا ہے۔ ابن جریر نے مجاہد سے یہ روایت کی ہے کہ یہ آیت اَوس اور خزرج کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی۔ اَوس اور خزرج مدینہ کے دو بڑے قبیلے تھے جن میں مدت سے باہم جنگ چلی آتی تھی۔ جب یہ لوگ مسلمان ہو گئے تو پرانے کینے سب دُور ہو گئے اور جنگ بند ہو گئی۔ ایک دن ایک اَوس اور ایک خزرج کا آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک یہودی آ گیا اور اس نے موقعہ پا کر اوس اور خزرج کے پرانے جھگڑوں کا ذکر شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ یہ دونوں مسلمان ان واقعات کو یاد کر کے ایک دوسرے کے خلاف لڑنے کو تیار ہو گئے اور دونوں نے اپنی اپنی قوم کو پکارا جو ہتھیاروں کے ساتھ نکل آئے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ لگا تو آپ ان کے درمیان آئے اور آپ کی وجہ سے سب لوگوں کا غضب جاتا رہا اور وہ نادم ہوئے تب یہ آیت نازل ہوئی۔

ع ۴۸۸ یعتصم باللہ۔ عَصْم کے معنی روک رکھنا اور اعتصام کے معنی اپنے آپ کو روک کر بچا رکھنا ہیں (غ) قرآن کریم میں آتا ہے لاعاصم الیوم من امر اللہ (ھود ۱۱-۴۳) آج کے دن کوئی شخص اللہ کے امر سے بچانے والا نہیں، ایسا ہی مالھم من اللہ من عاصم (یونس ۱۰-۲۷) میں۔ اور معصوم وہ ہے جو بچایا گیا ہو۔ اور اسی مادہ سے عِصْمَۃ ہے جس کی تشریح آگے آتی ہے اور فاستعصم (یوسف ۱۲-۳۲) میں استعصم کے معنی امام راغب نے کیے ہیں تَحَرّٰی مایَعْصِمُہٗ یعنی اس چیز کا قصد کیا جو اس کو بچا لے پس اعتصام باللہ سے مراد ہے اللہ کو پکڑ کر یعنی ذریعہ بنا کر اپنے آپ کو بچا لے۔ اور اعتصام کے معنی کسی دوسری چیز کو پکڑنا بھی ہیں (غ) جیسا آگے آتا ہے واعتصموا بحبل اللہ (۱۰۲)

یہاں اہل کتاب کے ان وساوس سے بچنے کا طریق بتایا ہے کہ جب وہ ایسے وساوس ڈالیں تو ان کے اثر بد سے مسلمان اس طرح بچ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آیت ماقبل میں اطاعت سے مراد وساوس کے پیچھے لگنا ہے۔

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ حق ہے اور تم نہ مرو مگر ایسی حالت میں کہ تم فرماں بردار ہو۔[489]
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا اور سب کے سب اللہ کے عہد کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ نہ کرو[490]

ع۴۸۹ اسلام کے کمالات اور امتیازی نشانوں کا ذکر کر کے اب مسلمانوں کو بتایا ہے کہ وہ کن اصول کو مدّنظر رکھ کر دنیا میں ایک کامیاب قوم بن سکتے ہیں اور اس رکوع میں کامیابی کے تین عظیم الشان گر بتائے ہیں جن میں سب سے پہلی بات ہے اتقوا اللہ حق تقاتہ تقویٰ اللہ کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں ع۱ یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق کی نگہداشت۔ یا ان حقوق اور ذمہ واریوں کی حفاظت جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ذمہ ڈال رکھی ہے خواہ ان کی طرف شریعت ہدایت کرتی ہو یا عقل انسانی، گویا قوم کے ہر فرد کے اندر پہلے فرداً فرداً ذمہ داری کا احساس پیدا ہونا ضروری ہے اور یہی کامیابی کی عمارت کی خشتِ اوّل ہے مگر صرف اس احساس کا پیدا ہونا بھی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ حق تقاتہ بڑھا کر بتایا کہ اس ذمہ واری کو ادا کرنے کے لیے قوم کے ہر فرد کو اپنی اپنی جگہ پر پورا زور لگانا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کا حق اس انسان نے ادا کر دیا جس نے اپنی طرف سے پورا زور لگا دیا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی فرماتا ہے لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا پس اتقوا اللہ حق تقاتہ سے وہی مراد ہے جو فاتقوا اللہ ما استطعتم (التغابن ۶۴-۱۶) سے ہے اور جن لوگوں نے پہلے الفاظ کو دوسرے الفاظ سے منسوخ سمجھا ہے انہوں نے سخت غلطی کھائی ہے اور اسی کے مطابق دوسری جگہ جہاد کا حکم ہے جاھدوا فی اللہ حق جھادہ (الحج ۲۲-۷۸) دونوں میں اپنی مقدرت کے مطابق زور لگانا ہے تکلیف مالایطاق اس میں داخل نہیں اور آخر پر فرمایا کہ لا تموتن الا وانتم مسلمون جس میں یہ بتایا کہ تم پر کوئی آن ایسی نہ آئے کہ کامل فرمانبرداری کی حالت نہ ہو۔ کیونکہ موت کا وقت تو مقرر نہیں اور یہ بھی بتا دیا کہ اتقوا اللہ حق تقاتہ سے مراد مسلم یا کامل فرمانبردار بننا ہے اور مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے ہر ایک مسلم بچا رہتا ہے۔

ع۴۹۰ حبل اللہ۔ حبل رسّہ کو کہتے ہیں اور استعارۃً ہر ایک اس ذریعہ یا سبب پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جس سے کسی چیز کی طرف پہنچ سکیں استعیر للوصل ولکل ما یتوصل بہ الی شیٔ (غ) والحبل العھد والذمّۃ والامان یعنی حبل عہد اور ذمّہ اور امان کو بھی کہتے ہیں (ل) اور حدیث دعا میں آتا ہے یا ذا الحبل الشدید جہاں حبل کے معنی ابن اثیر نے قرآن یا دین کیے ہیں اور حبل اللہ کے معنی حضرت ابن مسعود سے سند صحیح سے قرآن مروی ہیں (ر) ابو سعید خدری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی معنی روایت کیے ہیں کتاب اللہ حبل متین ممدود من السماء الی الارض۔ کتاب اللہ وہ مضبوط رسہ ہے جو آسمان سے زمین تک ممتد ہے (ث) اور حضرت علیؓ کی روایت میں نبی کریم صلعم نے جب فرمایا کہ فتنہ ہو گا تو دریافت کیا گیا اس سے نجات کی راہ کیا ہے تو آپ نے فرمایا کتابُ اللہِ فیہِ نبأُ ما قبلکم وخبر ما بعدکم وحکم ما بینکم وھو حبلُ اللہِ المتین (غق) یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب جس میں تم سے پہلے کی اطلاع اور تم سے بعد کی خبر اور جو اختلاف تمہارے درمیان ہو اس کا فیصلہ ہے۔

تفرقوا۔ فَرق جمع کے خلاف ہے اور اسی سے تفرق ہے جو جماعت کے خلاف ہے۔ اختلاف کے ساتھ جماعت رہ سکتی ہے لیکن تفرقہ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ تفرقہ میں دو چیزیں الگ الگ ہو جاتی ہیں اور باہم ان کا تعلق نہیں رہتا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی کا دوسرا گر بتایا ہے اور وہ اتحاد اور جماعت کا رنگ ہے کتنا بھی افراد قوم کے اندر انفرادی ذمہ داری کا احساس موجود ہو صرف اس سے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ افراد قوم کے اندر ایک اجتماعی رنگ پیدا نہ ہو۔ وہی کوشش عظیم الشان نتائج پیدا کر سکتی ہے جس کے کرنے والی ایک قوم کی قوم ہو پس بتایا کہ انفرادی احساس اور انفرادی کوشش کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ سب مل کر ایک کام کو کریں۔ اور یوں وحدت قومی کو کامیابی کا دوسرا اصول قرار دیا۔ پھر یہ اصول وحدت نامکمل ہوتا اگر یہ نہ بتایا ہوتا کہ وہ کونسی خاص بات ہے جس پر اس اتحاد کی بنیاد رکھی جائے پس کمال بلاغت سے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اتحاد اسلامی کی بنیاد حبل اللہ یعنی قرآن کریم ہے۔ اس میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ قرآن شریف کے متعلق مسلمانوں کا کبھی باہم اختلاف نہ ہو گا اور سب کے ہاتھ میں ایک ہی قرآن کریم ہو گا کیونکہ اتحاد کی بنیاد اسی چیز پر ہو سکتی ہے جس کے بارہ میں اختلاف کوئی نہ ہو۔ اور یہ کس قدر صداقت اسلام کی ایک بیّن شہادت ہے کہ آج تیرہ سو سال گزر جانے پر سارے عالم اسلامی میں سُنّی، شیعہ، خارجی سب کے ہاتھ میں قرآن شریف ایک ہی ہے اور ایک زیر و زبر تک کا فرق نہیں۔ وہ مذہب جو مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ساری رُوئے زمین پر پھیلا ہوا ہے جس کے پیرو ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف ایک دوسرے کے حالات سے ناواقف ہیں وہ سب قرآن کریم ایک ہی اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ اس لیے جہاں مسلمانوں کو ان کی کامیابی کا گر بتایا ہے وہیں درحقیقت یہ بھی پیشگوئی کر دی ہے کہ قرآن کریم پر مسلمانوں کا کبھی اختلاف نہ ہو گا۔

پس اس اتحاد کے ہوتے ہوئے اگر مسلمان باہم تفرقہ کریں تو کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ ان کے پاس اتحاد کی ایک ایسی مستحکم بنیاد ہے جو دنیا کی کسی قوم کے پاس نہیں۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ بعض لوگوں نے اتحاد کی اس بنیاد کو چھوڑ کر اپنی اپنی روایات کو اصل بنیاد قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ جانتے ہیں کہ ایک فرقہ کی روایات مثلاً اہل تشیع کی روایات کو دوسرا فرقہ تسلیم نہیں کرتا پس جب امر متحد کو چھوڑ کر امر مختلف فیہ کو بنیاد قرار دیا جائے گا تو نتیجہ لازماً تفرقہ ہو گا۔ اسی لیے ساتھ ہی فرما دیا ولا تفرقوا یعنی تفرقہ سے بچنے کی یہی راہ ہے۔

قرآن کریم کو بنیاد اتحاد قرار دینے سے کیا منشا ہے؟ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے تمام اصول امور کو جن کی ضرورت دین کو ہے اپنے اندر جمع کر لیا ہے اور تمام اختلافات کا فیصلہ درحقیقت اس قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ اس لیے جب قرآن شریف کو اتحاد کی بنیاد مانا جائے گا تو تمام روایات کو جو کسی فرقہ کے ہاتھ میں ہوں اصول قرآنی پر پرکھا جائے گا اور جو روایت قرآن کریم کے خلاف ہو اسے ترک کرنا ہو گا۔ یہ ایک بڑی سیدھی راہ ہے جس پر مسلمانوں کا اتحاد

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ

اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم باہم دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں اُلفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی باتیں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ ۴۹۱

اور چاہیئے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائیں ۴۹۲

قائم رہ سکتا ہے پھر قرآن کریم ہماری تمام تعلیم وتعلم کا اصل سرچشمہ ہونا چاہیئے۔ ہر ایک مسلمان اور کچھ جانے یا نہ جانے مگر قرآن ضرور جانتا ہو مگر آج اس کے خلاف یہ نظر آرہا ہے کہ جس چیز کو مسلمان نہیں جانتے وہ قرآن ہے۔

ع۴۹۱ شَفَا کوئیں یا دوسری چیز کا شفا اس کے کنارہ کو کہتے ہیں اور ہلاکت سے قریب ہونے کو اس کے ساتھ مثال دی جاتی ہے (غ) شفۃ (ہونٹ) شفا سے چھوٹا ہے۔

نار۔ نار آگ کو بھی کہتے ہیں جو حواس کے لیے ظاہر ہو اور مجرد حرارت کو بھی کہا جاتا ہے اور نار جہنم کو بھی اور نار حرب یعنی جنگ کی آگ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے اوقدوا نارا للحرب میں (المائدہ ۵-۶۴) (غ)

انقذ۔ انقاذ۔ ہلاکت سے بچا لینے کا نام ہے (غ)

قرآن میں اتحاد پیدا کرنے کی طاقت: اس حصہ آیت میں مسلمانوں کو یہ توجہ دلائی ہے کہ ہم نے جو تم کو حبل اللہ یعنی قرآن کو اپنے اتحاد کی بنیاد قرار دینے کو کہا ہے تو یہ اس لیے کہ قرآن میں اللہ تعالےٰ نے ایک ایسی طاقت رکھی ہے کہ یہ سخت سے سخت دشمنوں کو بھی بھائی بھائی بنا دیتا ہے عرب کی قومیں اور قبیلے جن کی دشمنیوں پر صدیاں گذر کر ایک دوسرے کی عداوت اب ان کے خونوں میں داخل ہو چکی تھی اور دن رات وہ ایک دوسرے سے جنگ پر آمادہ رہتی تھیں۔ گویا آگ کے گڑھے میں گر کر بالکل بھسم ہو جانے کو تھیں۔ بیس سال کے عرصے میں قرآن کریم نے ان کے اندر ایک ایسا اتفاق اور ایسی اخوت پیدا کر دی کہ جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں۔ پھر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایسی پاک کتاب کے پاس ہوتے ہوئے مسلمان ایک دوسرے کی تخریب کے درپے ہیں اور ایک دوسرے کو ہی دنیا سے نابود کرنا چاہتے ہیں پہلے حصہ میں دعویٰ تھا کہ قرآن کریم تم میں اتحاد پیدا کر سکتا ہے۔ دوسرے حصہ میں دلیل ہے کہ عرب جیسی جنگجو قوموں کے اندر اس نے اتحاد پیدا کر کے دکھا دیا۔

ع۴۹۲ اس آیت میں کامیابی کا تیسرا اصول دعوت الی الخیر کو بیان فرمایا ہے اور منکم کہہ کر بتا دیا کہ قوم میں ایک ایسا گروہ رہنا چاہیئے اس کی وجہ دوسری جگہ مذکور ہے ما کان المومنون لینفروا کافۃ (التوبۃ ۹-۱۲۲) یعنی سب کے سب اس کام کے لیے نہیں نکل سکتے۔ دعوت الی الخیر کیا ہے، اس سے مراد دعوت الی الاسلام یا دعوت الی القرآن ہے دوسری جگہ خود قرآن کو خیر فرمایا دیکھو البقرۃ ۲-۱۰۵) اور ع۱۳۷ د اور خیر کے معنی بھلائی ہیں۔ اور حقیقی بھلائی کی سب راہیں قرآن کریم میں ہی ہیں۔ اس لیے ارشاد الٰہی یہاں یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی موجود رہے جو دعوت الی الاسلام کے کام میں لگی رہے۔ ابتدائے اسلام کا زمانہ تو وہ تھا کہ ہر ایک مسلمان کے اندر ایک ایسی روح دعوت الی الاسلام کی پھونکی گئی تھی کہ وہ سب کے سب ہی داعیان اسلام تھے۔ اور اس جوش اور تڑپ کو لیکر وہ دنیا کے مختلف ممالک اور مختلف شہروں اور جزیروں میں نکل گئے اور تھوڑے ہی سالوں میں دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ یعنی اسلام کا نام دنیا کے دور دور ملکوں میں روشن کر دیا ہر ملک اور ہر شہر میں اسلام کا جھنڈا لگا دیا پھر بعد اس کے ایک ایسا زمانہ آیا کہ بادشاہوں اور امراء کی توجہ دعوت الی الاسلام کی طرف سے کم ہو کر وہ تو اپنے تعیشات میں گرفتار بلا ہو گئے۔ علماء کی توجہ بھی زیادہ تر فروعی اختلافات میں صرف ہونے لگی۔ پھر بھی بہت سے خدا کے بندے ان تمام جھگڑوں سے الگ ہو کر دعوت الی الاسلام کے کام میں لگے رہے۔ بہت سے وہ بزرگ جن کے ناموں پر آج ہزارہا لوگ قربان ہوتے ہیں ان کی یہ عزت محض اسلام کی خدمت گزاری سے ہوئی۔ وہ درحقیقت روحانی بادشاہ تھے اور جب دنیوی بادشاہوں نے دعوت الی الاسلام کے کام کو چھوڑ دیا تو ان روحانی بادشاہوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ مگر یہ کس قدر افسوسناک نظارہ ہے کہ آج ان داعیان اسلام کی گدیاں محض دنیا کے چند پیسے کمانے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں اور ہر ایک گدی جس میں ہزاروں اور لاکھوں کی آمد ہے، وہ چند لوگوں کے پیٹ بھرنے یا ان کے تعیش کا سامان پیدا کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں اور نہ صرف دنیا کی محبت اور دنیوی جھگڑوں میں ہی گرفتار بلا ہو رہی ہے بلکہ طرح طرح کی بدعات میں مبتلا ہو کر خود مسلمانوں کو چاہِ ضلالت میں گرا رہی ہے اور دعوت الی الاسلام کا وہاں نام بھی نہیں، کیسے کیسے پاک اصول فلاح کے مسلمانوں کو اس پاک کتاب کے اندر دیئے گئے تھے، دوسرے لوگوں نے ان سے فائدہ اُٹھایا اور کامیابیاں حاصل کیں مگر مسلمانوں نے ان قومی اتخذوا ھذا القراٰن مھجورًا کا مصداق اپنے آپ ہی کو ثابت کر دکھایا۔

دعوت الی الاسلام کی اہمیت: اللہ تعالیٰ نے کیوں دعوت الی الاسلام کے کام کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اسلام میں ایک جماعت کا موجود رہنا ضروری قرار دیا ہے،

وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے روکیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں ۴۹۲ ؎

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾

اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے تفرقہ کیا اور اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی باتیں آ چکی تھیں اور انہی کے لیے بڑا عذاب ہے ۴۹۳ ؎

جو دعوت الی الاسلام کے کام میں ہی لگی ہوئی ہو۔ اس جماعت کے افراد کی زندگیوں کا مقصد اصلی اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے سوائے اور کچھ نہ ہو۔ اس لیے کہ بغیر اس کے مسلمان قوم ایک زندہ قوم نہیں رہ سکتی۔ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ جس قوم نے اپنی ترقی کے لیے اپنی تعداد کو بڑھانے کے لیے جد و جہد ترک کر دی ہے، اس میں تنزل اور انحطاط شروع ہو گیا ہے۔ زندگی کے آثار اس میں سے دُور ہو گئے ہیں۔ اور وہ آخر کار مردگی کی حالت تک پہنچ گئی ہے۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا تنزل ان کی سلطنت اور حکومت کے جاتے رہنے سے ہُوا ہے۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ مسلمانوں کا تنزل اس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے انہوں نے دعوت الی الاسلام کے کام کی طرف کم توجہی کر دی ہے اور سلطنتوں کا جاتے رہنا محض اس کے نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے۔ پھر جب مسلمان دعوت الی الاسلام کے کام پر پوری توجہ کریں گے تو پھر وہی کامیابیاں اور وہی شان و شوکت اُن کے لیے ہو گی جس کا وعدہ اولٰئک ھم المفلحون میں ہے۔

مجدد صدی کا دعوت الی الاسلام کے لیے جماعت تیار کرنا: اس زمانہ میں جب دعوت الی الاسلام کے کام کی طرف سے اکثر مسلمان غافل ہو رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو اپنی جناب سے یہ الہام کیا کہ وہ ایک جماعت اس غرض کیلئے تیار کریں اور یہ بھی اُن کو الہام کیا کہ "بخرام کہ وقت تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں بر منار بلند تر محکم افتاد" جس میں درحقیقت وہی وعدہ ہے جو اولٰئک ھم المفلحون میں ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ نے بارہا یہ اعلان کیا کہ میرے آنے کی اصل غرض یہی ہے کہ تا اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔ اور آپ جو اقرار اس سلسلہ میں داخل ہونے والوں سے لیتے تھے یا جو اقرار اب آپ کے جانشین لیتے ہیں وہ یہی ہے کہ "میں دین کو دنیا پر مقدّم رکھوں گا"۔ اس اقرار کا اصل منشا بھی یہی ہے کہ ایک ایسی جماعت تیار ہو جن کی متحد غرض خدمت دین ہو۔ گویا آپ نے مسلمانوں کے اندر اس حکم کی تعمیل کے لیے ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ایک جماعت بنانی چاہی ہے۔ پس ہر ایک شخص جو اس جماعت میں داخل ہوتا ہے وہ درحقیقت یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا اصل نصب العین صرف دعوت الی الاسلام رکھے گا۔ اور ظاہر ہے کہ بغیر ایک جماعت اور نظم و اتحاد کے کوئی کام نہیں ہو سکتا جو لوگ اس کام میں رکاوٹ ڈالتے ہیں وہ اسلام کی خیر خواہی نہیں کرتے کیونکہ جسقدر یہ جماعت ترقی کریگی اسی قدر دعوت الی الاسلام کا کام بھی ترقی کرے گا۔

۴۹۲ ؎۔ دعوت الی الاسلام کے ساتھ دو باتیں اور بیان فرمائی ہیں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ معروف وہ کام ہے جسے فطرت انسانی پہچانتی ہے یعنی نیک کام۔ اور منکر وہ ہے جس سے فطرت انکار کرتی ہے یعنی بُرا کام۔ بدترین حالت کسی قوم کی وہ ہوتی ہے جب اپنے لوگوں کو بُرا کرتے دیکھیں اور اس سے روکیں نہیں یہودیوں کی بدترین حالت کا نقشہ یوں کھینچا ہے کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ (المائدۃ ۵ - ۷۹) اور گو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر ایک مسلمان کے فرائض میں سے ہے۔ مگر دعوت الی الاسلام کا کام کرنے والے گروہ کے فرائض میں اسے خصوصیت سے داخل فرمایا ہے حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر افضل الجہاد ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا خدا کی زمین میں اس کا خلیفہ اور اس کے رسول کا خلیفہ ہے۔ اسلام کا یہ فخر تھا کہ اس میں چھوٹے سے چھوٹا انسان بڑے سے بڑے کو نصیحت کر سکتا تھا۔ اور اس کی غلطی پر اسے بیدھڑک آگاہ کر سکتا تھا حضرت ابو بکر صدیقؓ جیسا کامل راستباز خلافت کے منصب پر آتے ہی کہتا ہے فان زغت فقوموني اگر میں کجروی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کرو۔ فاروقؓ جیسے رعب والے انسان کے سامنے ایک بڑھیا یوں کہہ سکتی ہے کہ یا ابن الخطاب اللہ یعطینا وانت تمنعنا قرآن تو عورتوں کے مہر کے متعلق فرماتا ہے ان آتیتم احداھن قنطارا فلا تاخذ وا منہ شیئا۔ اور آپ کہتے ہیں بڑے بڑے مہر نہ دو۔ تو حضرت عمرؓ اپنی رائے سے رجوع کرتے ہیں لیکن آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ہر حلقہ میں ایک پیر یا گدی نشین ہے اور اس کا حکم ان کے لیے خدا کے حکم کے قائم مقام ہے۔ اس کو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم میں یہ غلطی ہے یا فلاں بات تم نے ٹھیک نہیں کہی۔ گویا دعوت الی الاسلام کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ان کے درمیان سے اُٹھ گئے۔

۴۹۳ ؎ پہلے مذاہب کا تفرقہ اور اصولی اختلاف: اس آیت میں یہود و نصاریٰ کا بلکہ سب پہلے مذاہب کا ذکر ہے اور دو باتیں الگ الگ بیان کی ہیں ایک یہ کہ انہوں نے تفرقہ کیا اور دوسرے یہ کہ اختلاف کیا۔ تفرقہ سے مراد ان کی پراگندگی ہے یعنی الگ الگ راہوں پر ہو جانا اور کسی اصول پر متحد نہ رہنا۔ چنانچہ تمام مذاہب جو اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں ان میں اس قدر تفرقہ موجود ہے کہ باہم اصول میں وہ اختلاف رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنے دین سے خارج قرار دیتے ہیں (گو بعض مسلمانوں نے بھی حماقت سے باوجود اصول میں متحد ہونے کے ایک دوسرے کو کافر اور بیدین کے فتوے دینے شروع کیے ہوئے ہیں) اور اختلاف کو چونکہ اس سے علیحدہ بیان کیا ہے اس لیے یہ اختلاف تعلیم حقّہ سے ہے یعنی وہ سب کے سب فرقے تعلیم حقّہ سے اختلاف کر رہے ہیں اور اس پر من بعد ما جاءھم البینات سے بھی شہادت ملتی ہے کہ منشاء تعلیم حقّہ سے اختلاف کرنا ہے اور بینات سے مراد اسلام کی صداقت کی دلائل ہیں۔ جن میں سے بہت سی سورت میں بیان ہو چکی ہیں۔

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا
الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ
اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

جس دن (کچھ) مُنہ سفید ہونگے اور (کچھ) منہ سیاہ ہوں گے ۴۹۴ پس جن کے منہ سیاہ ہوئے کیا تم اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے ہو تم عذاب چکھو اس لیے کہ تم کفر کرتے تھے ۴۹۵

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ
اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

اور جن کے مُنہ سفید ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہیں وہ اسی میں رہیں گے ۴۹۶

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَمَا
اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

یہ اللہ کی باتیں ہیں جن کو ہم تجھ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اللہ جہانوں کے لیے ظلم کا ارادہ نہیں کرتا۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ
ع وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

اور اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کی طرف ہی (سب) کام لوٹائے جاتے ہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ
بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ

تم سب سے اچھی جماعت ہو جو لوگوں (کی بھلائی) کے لیے ظاہر کی گئی ہے تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو ۴۹۷ اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو یقیناً ان کے لیے اچھا ہوتا،

ع ۴۹۴ مونہوں کی سفیدی اور سیاہی سے مراد: تبیضّ وجوہ وتسودّ وجوہ سفیدی اور سیاہی اصل رنگوں میں ہے لیکن عزّت اور ذلّت پر بھی ان الفاظ کا استعمال ہے جیسا کہ مفردات میں ہے لمّا کانَ البَیاضُ اَفْضَلَ لَونٍ عندھم ..... عُبِّرَ عن الفضل والکرم بالبیاض حتّٰی قیل لم یُدَنَّس بمَعَابٍ ھو اَبیَضُ الوجہ یعنی چونکہ سفید عرب کے نزدیک سب سے افضل رنگ ہے اس لیے بیاض سے مراد فضل وکرم ہوگیا ہے۔ یہاں تک کہ جو شخص عیب سے آلودہ نہ ہو اس کو ابیض الوجہ یا سفید منہ والا کہا جاتا ہے اور پھر اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے ابیاضُ الوُجُوہِ عبارۃ عن المسَرَّۃِ واِسوادھا عن الغم۔ یعنی مونہوں کی سفیدی کے معنی خوشی ہیں اور سیاہی سے مراد غم ہے۔ مفسرین کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تو اسی طرف گیا ہے اور دوسرا گروہ لفظی سفیدی اور سیاہی مراد لیتا ہے۔ مگر خود قرآن کریم نے اس محاورہ کو دوسری جگہ استعمال کرکے بتا دیا ہے کہ اس کا منشاء کیا ہے جہاں فرمایا واذا بشّر احدھم بالانثٰی ظل وجھہ مسودا (النحل ۱۶
۵۸) جب لڑکی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ فی الواقع سیاہ نہیں ہوتا، بلکہ مراد مغموم ہونا ہے اور لکھا ہے کہ جب حضرت امام حسنؓ نے حضرت معاویہ کو امارت سپرد کردی تو ایک شخص نے کہا یا مسود وجوہ المؤمنین اے مومنوں کے منہ سیاہ کرنے والے۔ جو لوگ ظاہر کی طرف گئے تھے انہوں نے بھی مراد نُور اور ظلمت کا مونہوں پر ہونا لیا ہے۔

ع ۴۹۵ اکفرتم بعد ایمانکم سے کون لوگ مراد ہیں؟ منافقوں کا یہاں کوئی ذکر نہیں بلکہ ذکر پہلے لوگوں کا ہے جنہوں نے تفرقہ کیا اور دین حق سے اختلاف کیا۔ اس لیے ایمان سے مراد اُن کا پہلے انبیاء پر ایمان ہوگا اور کفر سے مراد دین اسلام سے انکار۔ بعض نے بعد ایمانکم کی تاویل یوں کر لی ہے کہ بعد اس کے کہ تمہارے لیے وہ امور ظاہر ہو گئے جن کا تقاضا یہ تھا کہ تم ایمان لاتے۔

ع ۴۹۶ ففی رحمۃ اللہ۔ یہاں جنت کی بجائے رحمۃ اللہ کا لفظ اختیار کیا ہے اور اسی میں خلود بتایا ہے۔ سچ ہے کہ اللہ کی رحمت ہی مومن کی حقیقی جنت ہے۔ اور اس میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان جنت میں اپنے اعمال سے داخل نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی رحمت اور فضل سے ہی جنت ملتی ہے۔

ع ۴۹۷ کنتم۔ یہاں کنتم کے استعمال کی کئی ایک توجیہیں کی گئی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کنتم فی علم اللہ تم اللہ کے علم میں بہترین اُمت تھے۔ بعض نے کہا کنتم فی الامم قبلکم مذکورین بانکم خیر امۃ یعنی پہلی امتوں میں تمہیں بہترین اُمت کے نام سے یاد کیا گیا۔ جیسا کہ ذٰلک مثلھم فی التوراۃ ومثلھم فی الانجیل (الفتح ۴۸-۲۹) سے ظاہر ہے اور بعض نے کان کو زائد کہہ کر معنی انتم خیر امۃ کیے ہیں مگر دیکھو ع ۲۷۲ جہاں دکھایا گیا ہے کہ وصف لازم کسی چیز کا ذکر کرنے کے لیے بھی کان کا استعمال ہوتا ہے پس یہاں خیر ہونا گویا اس اُمت کا وصف لازم قرار دیا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ تم بہترین امت ہو اور ہمیشہ بہترین اُمت ہی رہو گے۔

اخرجت۔ خرج کے معنی ہیں اپنی قرارگاہ یا اپنی حالت سے ظاہر ہوگیا یا نکل آیا خواہ اس کی قرارگاہ گھر ہو یا شہر یا لباس اور خواہ اس کا حال۔ اپنے نفس میں اس کی کوئی حالت ہو یا اسباب خارجی میں (رغ) یہاں اخرجت کے معنی اظھرت کیے گئے ہیں یعنی ظاہر کیے گئے (ر)

مِنۡهُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ اَكۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾ ان میں کچھ مومن ہیں اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں ۴۹۸

امت محمدیہ کا کام دوسروں کی تکمیل ہے: للناس یہاں لام انتفاع کے لیے ہے یعنی تمہارا ظہور لوگوں کی بھلائی کے لیے ہے۔ اسی لیے آگے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر کیا ہے یعنی تمہارا کام دنیا میں نیکیوں کی تعلیم دینا اور نیکیوں پر لوگوں کو قائم کرنا اور بدیوں سے روکنا ہے۔ اور اسی لیے تومنون باللہ کو جو کمال نفس کا مرتبہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے جو دوسروں کی تکمیل کے لیے ہے پیچھے رکھا ہے کیونکہ اصل غرض یہاں یہی ظاہر کرنے کی ہے کہ تمہارا کام دوسروں کی تکمیل ہے اور تومنون باللہ یا ان کے اپنے کمال نفس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ تا یہ معلوم ہو کہ وہ ایسی باتیں دوسروں کو نہیں کہتے جو خود نہ کرتے ہوں بلکہ اگر دوسروں کی تکمیل چاہتے ہیں تو اپنے نفس کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔

امت کی افضلیت: اس آیت میں مسلمانوں کو بہترین امت قرار دیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے ہے مگر اوّل تو یہاں لفظ کان کا استعمال اس کے خلاف ہے دوسرے کوئی وجہ اس قید کی نہیں۔ تیسرے حدیث سے بھی ثابت ہے کہ ساری اُمت کو ہی خیر الامم کہا ہے چنانچہ امام احمد نے یہ حدیث روایت کی ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعطیت مالم یُعط احد من الانبیاء نُصِرت بالرُّعب واُعطیتُ مفاتیح الارض و سُمّیتُ اَحمد وجُعِلَ التراب لی طَهُوْرًا وجُعِلت اُمّتی خیر الاُمم۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے وہ کچھ دیا گیا جو اور کسی نبی کو نہیں دیا گیا میری نصرت رعب سے کی گئی اور مجھے زمین کے خزانے دیئے گئے اور میرا نام احمد رکھا گیا اور میرے لیے مٹی پاک کرنے والی بنائی گئی اور میری امت بہترین امت بنائی گئی۔ بیشک صحابہ رضی اللہ عنہم خود اس امت میں سے بھی بہترین گروہ ہے اور اس کی شہادت قرآن کریم سے ملتی ہے کہ ان کو رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کی سند دی، لیکن یہاں ساری امّت کی افضلیت کا دوسری امتوں پر ظاہر کرنا مقصود ہے اور اگر اس امت کے معلّم اور مزکّی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے تمام روحانی معلّموں اور مزکیوں سے افضل ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آنجناب کے شاگرد تمام انبیاء کے شاگردوں سے افضل نہ ہوں۔

یہ افضلیت کس بات میں ہے؟ اس کی وجہ خود بتا دی ہے۔ ایک یہ کہ اُمت دنیا کے تمام لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ ہر ایک نبی کی اُمت زیادہ تر اپنی قوم کی بہتری میں ہی کوشاں رہی مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی امّت میں سے قومیت کا نشان مٹا کر ان کو تمام لوگوں کی بھلائی چاہنے والے قرار دیا گیا، وہ صرف مسلمانوں کا ہی بھلا نہیں چاہنے بلکہ ہر ایک قوم اور ہر ایک ملّت کے لوگوں کا بھلا چاہنے والے ہیں۔ قومی تفرقوں کو اسلام نے ہمیشہ کے لیے مٹا دیا اور دوسری وجہ ان کی فضیلت کی ان کا آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہونا ہے یعنی بھلائیوں کا حکم دینے والے اور بدیوں سے روکنے والے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے انبیاء کی امتیں یہ کام نہ کرتی تھیں؟ اصل بات یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام انبیاء کا کام ہے اور گو سابقہ امتیں بھی ایک حد تک اس کام کو کرتی تھیں، مگر ان کا کام بہت محدود تھا اور کئی رنگ میں محدود تھا۔ اور پھر ان کے اند وقتاً فوقتاً انبیاء کی بعثت بھی ہوتی رہتی تھی۔ مگر یہ انبیاء کا کام اب پہلے سے ایک نہایت وسیع پیمانہ پر اسی اُمت کے سپرد کیا گیا ہے۔ کل دنیا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اور قوائے انسانی کی ساری شاخوں کی پرورش کرنا اور سب کا تزکیہ کرنا یہ وہ عظیم الشان کام ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی نبی نے بھی کر کے نہیں دکھایا۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں اس وجہ افضلیت کو صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا وکذٰلک جعلنٰکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (البقرۃ ۲-۱۴۳) یوں ہم نے تم کو اعلیٰ درجہ کی امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کے بشیر و نذیر بنو اور رسول تمہارا بشیر و نذیر ہو اور یہی وجہ ہے کہ احادیث میں اس امت کے علماء کو ورثۃ الانبیاء انبیاء کے وارث اور کانبیاء بنی اسرائیل انبیائے بنی اسرائیل کے مثیل قرار دیا گیا ہے اگر اس امت میں کسی نبی نے آکر بھی کام کرنا ہوتا تو امت کی بحیثیت اُمت افضلیت دیگر امم پر جاتی رہتی۔ پس نہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسرائیلی اس اُمت کے اندر آکر کام کر سکتے ہیں کیونکہ اس طرح بھی امّت کی فضیلت جاتی رہتی ہے اور نہ کوئی دوسرا نبی اس امّت کے اندر پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ اس طرح بھی امت کی افضلیت دوسری اُمم پر نہیں رہتی۔

فضیلت کا ثبوت: اور یہ دعویٰ کہ تم بہترین امت یا خیر الامم ہو بلا ثبوت نہیں چھوڑا گیا جس ردّی حالت میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کو پایا کیا بلحاظ عقاید کے اور کیا بلحاظ اعمال کے اور کیا بلحاظ جہالت کے ایسی بدترین حالت کی قوم اور کسی نبی کو اصلاح کے لیے نہیں دی گئی۔ مگر باوجود ایسی ردّی حالت میں پانے کے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی نے ان کو ایمانی اور عملی پہلو کے لحاظ سے اور تعلیم اور تہذیب کے لحاظ سے ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچایا کہ کسی نبی نے اپنی امت کو اس مقام پر نہیں پہنچایا وہ نہ صرف زہد و عبادت میں تمام دنیا کی قوموں سے آگے بڑھ گئے بلکہ ہر طرح کے اخلاق فاضلہ کے زیور سے آراستہ ہو کر ہر پہلو میں دنیا کے ہادی اور رہبر بنے۔ کیا فتوحات ملکی کے لحاظ سے، کیا سیاست کے لحاظ سے، کیا تمدّن اور معاشرت کے لحاظ سے، کیا علوم کے لحاظ سے، کیا تہذیب کے لحاظ سے، کیا آزادئ خیال کو قائم کرنے کے لحاظ سے اور کیا مساواتِ نسل انسانی کے قائم کرنے کے لحاظ سے۔

ع۴۹۸ اھل الکتاب۔ اہل کتاب کا لفظ یوں تو وسیع معنی میں آتا ہے۔ مگر اکثر جگہ صرف عیسائیوں اور یہودیوں کو اس سے خطاب کیا ہے اور بعض جگہ صرف عیسائیوں کو بھی اس سے خطاب کیا ہے۔ مثلاً یا ھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم (النساء ۴-۱۷۱) اور یہاں اہل کتاب سے صرف یہودی مراد ہیں۔ جیسا کہ آیت ۱۱۱ کے مضمون سے ظاہر ہے جہاں الفاظ ضربت علیھم الذلّۃ وباءو بغضب من اللہ وضربت علیھم المسکنۃ استعمال کر کے جو مخصوص طور پر یہود کی سزا کے بارہ میں سورہ بقرہ میں آچکے ہیں صاف بتا دیا کہ یہاں انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کی یہ سزا پہلی سورت میں بیان ہو چکی ہے۔ ایسا ہی الفاظ یقتلون الانبیاء بغیر حق سے بھی یہی ظاہر ہے کہ صرف یہود کا یہاں ذکر ہے کیونکہ قتل انبیاء کا الزام ہمیشہ انہی پر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اب اس سورت کے مضمون کو جنگ احد کے واقعات

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ
يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾
ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا
بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاۗءُوْ
بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ
ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ
بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾
لَيْسُوْا سَوَاۗءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ
قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ

وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑیں گے سوائے ستانے کے اور اگر تم سے لڑیں گے تو
تمہارے سامنے پیٹھ پھیر لیں گے پھر ان کو مدد نہ دی جائے گی[۴۹۹]
اُن پر ذلّت کی مار ہے، جہاں کہیں وہ پائے جائیں سوائے اس
کے کہ) اللہ کے عہد اور لوگوں کے عہد کے ذریعہ سے (پناہ لیں) اور وہ
اللہ کا غضب کما لائے اور ان پر مسکینی کی مار ہے[۵۰۰]۔ یہ اس لیے
کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے،
اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اس لیے کہ انہوں
نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جاتے تھے۔
(سب) برابر نہیں، اہل کتاب میں سے ایک جماعت (حق پر)
قائم ہے جو اللہ کی آیتوں کو رات کی گھڑیوں میں پڑھتے ہیں

کی طرف لاتا ہے۔ اور ان جنگوں میں ہمیشہ یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں کو شرارت کا خطرہ رہتا تھا۔ کیونکہ ایک بڑی یہودی آبادی مدینہ منورہ میں تھی اس لیے اس جنگ کی تمہید میں ان کے ساتھ تعلقات کا ذکر کر دیا ہے اور واقعات جنگ کے ذکر کے اختتام پر بھی یہودیوں کا ذکر ہے اور بجائے کافر کے فاسق اس لیے کہا کہ ان لوگوں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق عہد بھی لیا گیا تھا۔

ع۴۹۹ اذیٰ بمقابلہ ضر و شر خفیف کو کہا جاتا ہے دیکھو ع۲۸۵ تکلیف دینے والی باتوں کو بھی اس سورت کے اخیر میں اذیٰ کے نام سے موسوم کیا ہے ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم و من الذین اشرکوا اذی کثیرا (۱۸۵) حدیث میں جمعہ کے دن لوگوں کے اوپر سے گزر کر آنے جانے کو بھی اذیٰ کہا ہے اور رستہ میں چھوٹی چھوٹی تکلیف دینے والی چیزوں کو بھی اذیٰ کہا ہے اماطۃ الاذی عن الطریق۔

یہود کی شکست کی پیشگوئی: اس میں پیشگوئی کی ہے کہ یہودیوں سے اہل اسلام کو کوئی زیادہ تکلیف نہ پہنچے گی اور اگر وہ مسلمانوں سے جنگ کریں گے تو شکست کھائیں گے اور اس کے آخر پر ثم لا ینصرون بڑھایا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ منافق اور مشرک ان یہودیوں کو یہ وعدے دیتے رہتے تھے کہ اگر تم جنگ کرو گے تو ہم تمہاری مدد کریں گے جیسا کہ دوسری جگہ ذکر ہے الم تر الی الذین نافقوا یقولون لاخوانھم الذین کفروا من اھل الکتاب لئن اخرجتم لنخرجن معکم ولا نطیع فیکم احدا ابدا وان قوتلتم لننصرنکم واللہ یشھد انھم لکاذبون (الحشر ۵۹ - ۱۱) سو انہی وعدوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کی مدد کے لیے وہ ہرگز نہ نکلیں گے۔ بعض کے نزدیک مراد یہ ہے کہ جنگ میں شکست کھانے کے بعد پھر ان کی کبھی عزت نہ ہو گی یعنی ایسا نہ ہو گا کہ شکست کھا کر پھر ہی غالب آجائیں بلکہ ہمیشہ کے لیے خذلان ہی ان کے شامل حال رہے گا۔

ع۵۰۰ ذلّۃ کے معنی ع۹۱ میں بیان ہو چکے ہیں۔ گو یہ لفظ محض محکومیت پر بھی صادق آتا ہے مگر انتہا اس کی یہ ہے کہ ایسی قتل و غارت ان پر واقع ہو کہ کسی حالت میں آرام نہ ملے۔ چنانچہ مفسرین نے بھی عموماً القتل والاسر وسبی الذراری مراد لیا ہے (ر) اور چونکہ محض محکومیت مسکنت میں شامل ہے اس لیے یہاں ذلّت سے مراد یہی انتہائی ذلّت قتل اور غارت کی ہے۔

حبل کے معنی عہد اور ذمگی اوپر بیان ہو چکے ہیں ع۴۹۰ حبل من اللہ سے مراد اللہ کا عہد یا ذمگی ہے یعنی حکومت اسلامی جیسا کہ امر اللہ سے بھی کئی جگہ حکومت اسلامی ہی مراد لی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان بموجب فرمان الٰہی ان سے معاملہ کریں گے۔ اس لیے مسلمانوں کا عہد گویا اللہ کا عہد ہے اور حبل من الناس سے لوگوں کا عہد یعنی کوئی غیر اسلامی حکومت مراد ہے۔

یہود کا انجام: اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہود کا انجام ذلّت مسکنت اور اللہ کے غضب کے نیچے آجانا ہے اور یہی انجام ان کا دوسری جگہ سورۃ بقرہ میں بھی بیان ہو چکا ہے (البقرۃ ۲ - ۶۱) ذلّت اور مسکنت ان کی دنیوی حالت کے متعلق ہے اور غضب من اللہ ان کی دینی حالت کے متعلق ہے۔ مگر ذلت یعنی قتل و غارت کی حالت سے وہ اس طرح سے نکل سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذمگی میں آجائیں۔ یعنی حکومت اسلامی کے ماتحت آجائیں اور یا کسی دوسری حکومت سے معاہدہ کر کے رہیں (و یہاں بمعنیٰ اَوْ ہے) اور چونکہ غیر اسلامی سلطنتوں میں ان کو پورا آرام ملنا مقدر نہ تھا اس لیے حبل من الناس کو بعد میں رکھا ہے اور یا الناس سے مراد مسلمان ہیں یعنی اللہ کے عہد اور اہل اسلام کے عہد کے ذریعہ سے ہی یہ پورا امن حاصل کر سکیں گے اور اس طرح و سے ان دونوں کو حکم واحد میں رکھا ہے۔ مگر مسکنت یا محکومیت سے اور اللہ کے غضب سے یہ کسی حالت میں نہ نکلیں گے۔

يَسْجُدُوْنَ ﴿١١٣﴾
اور سجدے کرتے ہیں۔

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ
فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١١٤﴾

وہ اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں اور اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں اور نیکیوں کو جلدی لیتے ہیں اور وہی نیکوں میں سے ہیں ع۵۰۱

وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ
عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿١١٥﴾

اور جو کچھ وہ نیکی کریں گے تو اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی اور اللہ متقیوں کو خوب جاننے والا ہے ع۵۰۲

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ
وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١١٦﴾

جنھوں نے کفر کیا اُن کے مال اور ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) کے سامنے ان کے کسی کام نہ آئیں گے اور وہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے ع۵۰۳

ع۵۰۱ قائمۃ - قیام مختلف معنی میں آتا ہے۔ ایک قیام ایک وجود کا ہے جو تسخیر سے ہو یا اختیار سے تسخیر سے جیسے قائم وحصید (ھود۱۱-۱۰۰) اختیار سے جیسے امن ھو قانت اٰناء الیل ساجدا وقائما (الزمر ۳۹-۹) اور کسی چیز کا قیام اس کا نگاہ رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے یہی معنی یہاں ہیں اور ایک قیام کسی چیز پر عزم کر لینا ہے جس کی مثال ہے اذا قمتم الی الصلوٰۃ (غ) مفسرین نے مستقیمۃ عادلۃ یا قائم بحق العبودیۃ (غق) یا مستقیمۃ علی طاعۃ اللہ (ر) معنی کیے ہیں یعنی حالت استقامت میں رہنے والی عادل۔ یا حق عبودیت کی حفاظت کرنیوالی یا اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر استقامت اختیار کرنیوالی جماعت۔

اٰناء - انی یا اِنیٌ کی جمع ہے رات کی گھڑی۔ اور اَنیٰ کے معنی ہیں ایک چیز اپنے وقت اور انتہا کو پہنچ گئی حانَ وَاَدْرَکَ اسی سے ہے۔ الم یان للذین اٰمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ (الحدید ۵۷-۱۶) اور اَنیَ الحرُّ کے معنی ہیں گرمی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ یطوفون بینھا وبین حمیم اٰن (الرحمٰن ۵۵-۴۴) اور عین اٰنیۃ (الغاشیۃ ۸۸-۵) میں یہی معنی ہیں اور اسی سے اِنیٰ کے معنی پکنا ہیں۔ غیر ناظرین اِنٰہُ (الاحزاب ۳۳-۵۳) اور اِنَاء برتن کو کہتے ہیں جس کی جمع اٰنیۃ۔ ویطاف علیھم باٰنیۃ من فضۃ (الدھر ۷۶-۱۵) (ل)

اہل کتاب کے مومن: ان دو آیات میں اہل کتاب میں سے ایک گروہ کا ذکر کیا ہے۔ مگر اہل کتاب میں سے ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ یہودیوں کے مذہب پر ہیں بلکہ وہ لوگ جو اُن میں سے نکل کر اسلام میں آ گئے تھے جن میں سے عبد اللہ بن سلام اور اسد بن عبید اور ثعلبہ بن شعبہ وغیرہم ہیں جیسا کہ اس سورت کے آخر پر فرمایا وان من اھل الکتٰب لمن یؤمن باللہ وما انزل الیکم وما انزل الیھم (ال عمرٰن ۳-۱۹۹) چونکہ پچھلی آیت میں یہود کی ذلت اور ان پر غضب کا ذکر تھا تو اس لیے اب فرمایا کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی قوم کے ساتھ یہ کوئی خصوصیت ہے بلکہ یہ ان کے اعمال کی وجہ سے ہے اسی لیے اس دوسرے گروہ کا ذکر کر دیا جو اپنے اعمال و اعتقادات کی وجہ سے ان تمام باتوں سے نکل کر ایک اعلیٰ مقام پر پہنچ چکے ہیں۔

یہاں ان لوگوں کی کچھ صفات بیان فرمائی ہیں۔ پہلی صفت یہ ہے کہ وہ مستقیم ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی طاعت پر استقامت اختیار کرنے والے۔ دوسری صفت یہ ہے کہ رات کی گھڑیوں میں آیات اللہ کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ بھی مسلمانوں کا ہی خاصہ ہے۔ تیسری صفت یہ ہے کہ ھم یسجدون جس سے مراد یا نماز ہے کیونکہ رکوع اور سجدہ دونوں لفظ بوجہ اپنی عظمت کے نماز پر بولے گئے ہیں اور یا یسجدون سے مراد یخضعون ہے یعنی خدا کے حضور جھکے رہتے ہیں یہ مراد نہیں کہ حالت سجدہ میں تلاوت آیات کرتے ہیں کیونکہ نبی کریم صلعم سے روایت ہے انی نھیت ان اقرأ راکعا وساجدا (غق) یعنی مجھے روکا گیا ہے کہ حالت رکوع یا حالت سجدہ میں قرآن شریف پڑھوں۔ ان تین صفات کے بعد جو عمل سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے عقیدہ کا ذکر فرمایا اور چوتھی صفت ان کی یہ فرمائی کہ وہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں۔ ان الفاظ میں ہمیشہ قرآن شریف میں مسلمانوں کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ پانچویں صفت ان کی یہ ہے کہ دوسروں کی تکمیل کرتے ہیں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور چھٹی یہ کہ ہر قسم کی بھلائیوں میں سبقت کرتے ہیں کیونکہ ان تمام امور کو ایک انسان اس حالت میں بھی کر سکتا ہے کہ سستی سے اور کمزوردلی سے ان کی طرف رغبت کرے مگر ان کی صفت یہ ہے کہ تمام بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں کہ پیچھے نہ رہ جائیں جس سے معلوم ہوا کہ ان کا دل ان باتوں کے اندر رہے۔

ع۵۰۲ یکفروہ - کفر کے اصل معنی ستر الشئ یعنی کسی چیز کا ڈھانک دینا ہیں پس یہاں لن یکفروہ سے مراد ہے لن یحرموا ثوابہ یعنی اس کے ثواب سے محروم نہیں کیے جائیں گے۔ یا کفر بمقابلہ شکر ہے۔ چونکہ پہلی دو آیات میں کامل صالحین کا نقشہ کھینچا تھا۔ اس لیے اب بتایا ہے کہ ہر ایک اگر اس کمال کو حاصل نہ کر سکے تو جتنی بھی نیکی کرے اس کی بھی اللہ کے ہاں قدر ہے۔

ع۵۰۳ قریبًا یہی الفاظ سورۃ آل عمران کے شروع میں بھی آئے ہیں جہاں خاص طور پر نصاریٰ مخاطب تھے دیکھو ع۳۸۰ یہاں یہود اور مشرکین عرب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگیں کر رہے تھے خاص مخاطب ہیں

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ
قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ
اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

اس کی مثال جو اس دنیا کی زندگی کے متعلق خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ہوا، جس میں سخت سردی ہو وہ ان لوگوں کی کھیتی کو پہنچے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اسے تباہ کر دے اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔[۵۰۴]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً
مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا
عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ
وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا
لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنوں کے سوائے (اپنے) رازدار نہ بناؤ، وہ تمھاری خرابی میں کمی نہیں کرتے، وہی چاہتے ہیں جو تمھیں تکلیف دے ان کے مونہوں سے بغض ظاہر ہو چکا ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں وہ بڑھ کر ہے، یقیناً ہم نے تمھارے لیے باتیں کھول کر بیان کر دی ہیں اگر تم عقل سے کام لو۔[۵۰۵]

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ
وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ
قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ

سنو! تم وہ ہو جو ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے حالانکہ تم ساری کی ساری کتاب پر ایمان لاتے ہو اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو سخت

ع۵۰۴ صِرّ۔ صِرّ اور صِرّة سردی کی شدت کا نام ہے (ل) کیونکہ صَرّ کے اصل معنی شدّ یعنی کس کر باندھنا ہیں اور اسی سے اصرار ہے اور صُرّة یعنی تھیلی جس میں روپے باندھے جاتے ہیں اور ریح صِرٌّ اور ریح صَرصَرٌ اس ہوا کو کہتے ہیں جس میں سخت سردی ہو یا بعض کے نزدیک سخت آواز ہو (ل) اور زجاج نے صر کے معنی صوت لہیب النار (ر) کیے ہیں یعنی آگ کے شعلے کی آواز اور ابن عباس سے ایک روایت میں اس کے معنی نار یعنی آگ بھی آئے ہیں (رغ ق) مراد اس سے ایسی ہوا ہے جو بوجہ شدت سردی (یا بوجہ شدت گرمی کے) کھیتی کو تباہ کر دے۔

پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ ان لوگوں کے مال اور اولاد جن کے فخر پر وہ تخریب اسلام کے درپے ہیں ان کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے۔ یہاں ان کی ان کوششوں کا انجام ایک مثال کے رنگ میں سمجھایا ہے۔ ان کے خرچ کرنے کو ما ینفقون فی ھٰذہ الحیٰوة الدنیا قرار دیا ہے۔ کیونکہ جو کچھ وہ اس وقت کر رہے تھے محض نمود اور ریا کے لیے تھا۔ ان کے لشکروں کی تیاری اور دیگر ایذا رسانی پر مال خرچ کرنے کو ایک کھیتی سے تشبیہ دی ہے جس کو آخر ایک عذاب کی ہوا تباہ کر دے گی اور ان کے ہاتھ میں سوائے حسرت اور ندامت کے کچھ نہ آئے گا اور آخر پر فرمایا کہ ان کی کوششوں کی ناکامی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظلم کے طور پر نہیں بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ کیونکہ بجائے نیکی اور تائید حق کے اپنے اموال کو معصیت اور تخریب حق پر خرچ کرتے ہیں اور اس لیے وہ سزا کے مستحق ہیں۔

ع۵۰۵ بطانة۔ بَطن اصل میں پیٹ ہے لیکن ہر چیز میں اس کے ظاہر کے خلاف کو اس کا بطن کہہ دیتے ہیں اور اسی طرح بطانة خلاف ظھارة ہے اور بطور استعارہ بطانة کا استعمال اس شخص پر ہوتا ہے جس کو تم اپنے معاملہ کے باطن یعنی راز پر اطلاع دینے کے لیے خاص کر لو (غ) اور ایک حدیث میں جس کو بخاری نسائی وغیرہما نے روایت کیا ہے بطانة اس ملک اور شیطان پر بولا گیا ہے جو انسان کا قرین ہے۔ مَا بَعَثَ اللّٰهُ مِن نَّبِيٍّ وَّلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِيْفَةٍ اِلَّا كَانَتْ لَهٗ بِطَانَتَانِ بِطَانَةٌ تَاْمُرُهٗ بِالْخَيْرِ وَتَحُضُّهٗ عَلَيْهِ وبطانة تَاْمُرُهٗ بِالشَّرِّ وَتَحُضُّهٗ عليه والمعصوم مَنْ عَصَمَهُ اللّٰهُ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور نہ کوئی خلیفہ بنایا ہے مگر اس کے لیے دو صاحب سِرّ ہوتے ہیں ایک صاحب سر جو اسے نیکی کا حکم کرتا ہے اور اس کی ترغیب دلاتا ہے۔ اور ایک صاحب سِرّ جو اسے بُرائی کا امر کرتا ہے اور اس پر اسے برانگیختہ کرتا ہے۔ اور معصوم وہ ہے جسکو اللہ تعالیٰ بچا لے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے خلفائے مامورین یعنی مجددین بھی یوں تو اس قانون کے ماتحت ہیں جس کے ماتحت سب انسان ہیں مگر اللہ اپنے فضل سے ہی جس کو چاہتا ہے بچا لیتا اس سے انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر بھی دلیل ملتی ہے۔

خبالا۔ خبال وہ فساد ہے جو کسی جاندار کو پا کر اس میں اضطراب پیدا کر دے جیسے جنون یا ایسی بیماری جو عقل و فکر پر اثر ڈالے (غ)
البغضاء۔ بُغض نفس کا اس چیز سے نفرت کرنا ہے جس کو تم ناپسند کرو (غ) اور بغضاء شدت بغض ہے۔
افواہ۔ اس کا واحد فم ہے جس کے معنی منہ ہیں مگر اصل اس کا فوہ ہے۔

الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾
اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ شَيْـــًٔـا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع ۱۲

غصے کے مارے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں کہہ اپنے غصے میں مرجاؤ۔ اللہ سینوں کی باتوں کو خوب جاننے والا ہے ۵۰۶
اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچے اُن کو بُرا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی بُرائی پہنچے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو اور تقوٰے کرو تو اُن کی تدبیر تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے گی اللہ اس کا جو وہ کرتے ہیں احاطہ کیے ہوئے ہے ۵۰۷

اس آیت میں اپنے دشمنوں کو راز دار دوست بنانے کی ممانعت کی ہے اور یہ امر ظاہر ہے کہ اپنے دشمن کو راز دار دوست بنانا اپنی ہی تخریب ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ من دونکم عام الفاظ ہیں ان کو دشمنوں کے ساتھ خاص کیوں کیا جائے تو اس کی وجہ خود آگے بیان کر دی ہے۔ کیونکہ ان کے متعلق خود فرمایا کہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ بلکہ چاہتے ہیں کہ ان پر کوئی ہلاک کرنے والی مصیبت آئے۔ پھر یہ ان کی باتیں مخفی ہی نہیں بلکہ یہ بغض ان کے الفاظ سے ظاہر ہو چکا ہے۔ ہاں جس قدر انہوں نے ظاہر کیا ہے اس سے بہت بڑھ کر ابھی ان کے سینوں میں مخفی ہے۔ یہ سب کچھ کھول کر مسلمانوں کو بتا دیا تاکہ وہ جلد ان کی ہلاک کر دینے والی دوستی سے بچیں۔

یہودیوں کی منافقت اور بدزبانی: یہود نے جیسا کہ اگلی آیت سے معلوم ہوگا۔ منافقانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ ادھر نبی کریم صلعم کے ساتھ معاہدہ کر رکھا تھا ادھر اندر ہی اندر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے اور مسلمانوں کے دشمنوں کو مسلمانوں پر چڑھائی کرنے کے لیے اکساتے رہتے تھے۔ ان مخفی شرارتوں کے علاوہ ان کی بدزبانی بھی انتہا کو پہنچ چکی تھی جیسا کہ قد بدت البغضاء من افواھھم سے ظاہر ہے نبی کریم صلعم کے سامنے بھی شرارت کے الفاظ بول دیتے تھے جیسا کہ سورہ بقرہ میں ذکر آچکا ہے مگر اس سے بڑھ کر بھی مسلمانوں کو بدزبانی سے ایذا پہنچاتے رہتے تھے۔ اور اشعار میں پاک دامن مسلمان عورتوں پر گندے حملے کرتے رہتے تھے۔

۵۰۶ وتؤمنون بالکتاب کلہ میں واؤ حالیہ ہے اور الکتاب سے مراد جنس کتاب ہے یعنی تم سب کتب الٰہی پر ایمان لاتے ہو جن میں ان کی کتاب بھی شامل ہے۔
عضوا علیکم الانامل۔ عَضّ دانتوں سے کاٹنے کو کہتے ہیں اور انامل۔ انملۃ کی جمع ہے۔ اور اس کے معنی انگلیوں کی اطراف یعنی پورے ہیں۔ اور عضّ انامل خاص محاورہ ہے جس سے مراد اظہار ندامت ہوتا ہے (غ) کیونکہ یہ لوگوں کی عادت ہے کہ ندامت کے وقت ایسا کرتے ہیں۔ اور سخت غصہ کے وقت بھی انسان ایسا ہی کرتا ہے۔ گویا اپنے آپ کو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔
الغیظ۔ غیظ شدید غضب کو کہتے ہیں اور یہ وہ حرارت ہے جو انسان قلب کے خون کے جوش میں آنے سے اپنے اندر پاتا ہے (غ)
قل موتوا بغیظکم۔ یہ ان کی حالت کا اظہار ہے گویا عملاً ان کو یہ کہہ دینا چاہیئے کہ وہ غیظ میں ہی مرجائیں اور مطلب یہ ہے کہ یہ غیظ ان کا جو مسلمانوں کی کامیابیوں پر پیدا ہوتا ہے روز بروز بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اور یوں بھی یہ الفاظ ان کو پہنچا ہی دیئے گئے۔
اس آیت میں اوّل مسلمانوں کو ان کی محبت سے روکا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود ان کی شرارتوں کے مسلمان اپنی پاک فطرتوں کی وجہ سے ان سے محبت ہی کرتے تھے۔ اور اگر معمولی حالات رہتے خواہ وہ اسلام میں داخل نہ ہوتے تو مسلمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ نہ روکتا۔ مگر روکنے کی وجہ بھی بتا دی کہ ان کا غیظ و غضب تم پر حد سے بڑھا ہوا ہے۔ پہلے فرمایا ولا یحبونکم وتؤمنون بالکتاب کلہ۔ یعنی حالانکہ تم تو ان کی کتاب پر بھی ایمان لاتے ہو پھر بھی وہ تم سے محبت نہیں کرتے حالانکہ حق یہ تھا کہ جب مذہب کے رو سے بھی مسلمان ان کی کتابوں کو اصولاً منزل من اللہ مانتے تھے تو وہ ان سے محبت کرتے تو فرمایا کہ جب باوجود اس کے تم ان کی کتاب پر ایمان لاتے ہو وہ تم سے محبت نہیں کرتے تو وہ تو نہ صرف تمہاری کتاب پر ہی ایمان نہیں لاتے بلکہ تمہارے ساتھ اس قدر بغض رکھتے ہیں کہ تمہارا سُکھ ان کے لیے موجب دُکھ ہے۔

۵۰۷ حسنۃ۔ حُسن۔ ہر ایک خوش کرنے والے امر کو کہتے ہیں جس میں رغبت کی جائے اور اسی سے حسنۃ جس سے مراد ہر ایک نعمت ہے جو انسان کو اس کے نفس یا بدن یا حالت میں پہنچے اور اس کی ضد سیئۃ ہے (غ) مزید تفصیل کے لیے دیکھو ۱۰۵
کید۔ کید کے اصل معنی زبان عربی میں احتیال اور اجتہاد ہیں یعنی باریک یا خفیہ تدبیر اور کوشش کرنا (ل۔ غ۔ ن) اور امام راغب کہتے ہیں کبھی کید مقام مدح میں ہوتا ہے اور کبھی مقام ذم میں گو اس کا اکثر استعمال مقام ذم میں ہے کئی احادیث میں یہ لفظ آتا ہے۔ ایک میں ہے نی عقول کا دھا خالقھا۔ جس کے معنی ابن اثیر کرتے ہیں ارادھا بسوء یعنی ان کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ کیا ہے۔ ایک میں ہے دخل الی سعد وھو یکید بنفسہ جہاں معنی کیے گئے ہیں۔ النزع یعنی آپ سعد پر داخل ہوئے اور وہ حالت نزع میں تھے۔ کیونکہ کید کے معنی السوق یعنی چلانا بھی آتے ہیں۔ گویا وہ اپنی جان کو نکال رہے تھے۔ اور ایک میں آتا ہے ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزا غزوۃ کذا فرجع ولم یلق کیدا یعنی آپ فلاں غزوہ میں گئے اور آپ واپس آئے اور

وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾

اور جب تو سویرے اپنے گھر والوں سے چلا مومنوں کو لڑائی کے لیے مورچوں پر بٹھاتا تھا اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۵۰۸

کوئی کید نہیں ملا۔ جہاں کید کے معنی حرب یعنی جنگ آئے ہیں یعنی جنگ کوئی نہیں ہوئی۔

اس آیت میں ان کی خطرناک عداوت کا مزید بیان کیا ہے اور پھر ان کی چالوں اور تدبیروں سے بچنے کی راہ بتائی ہے۔ پہلے فرمایا کہ ان کی عداوت کا یہ حال ہے کہ تم کو سکھ چھو بھی جائے تو ان کو برا لگتا ہے۔ اور تم پر دکھ کی مصیبت وارد ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ یہاں سکھ کے لیے تمسسکم استعمال کیا ہے اور دکھ کے لیے تصبکم یعنی وارد ہو جانا۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ سکھ کا محض چھو جانا یعنی ذرا سے سکھ کا تم کو ملنا بھی ان کے لیے باعث تکلیف ہوتا ہے۔ حالانکہ دکھ اور تکلیف جب کبھی کسی شخص کو پہنچے تو فطرت انسانی اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ رنجش اور کدورت جو تھوڑی بہت باہم ہو وہ دور ہو کر اس کی جگہ ہمدردی پیدا ہو جائے مگر ان کی عداوت اس قدر شدید ہے کہ مسلمانوں پر مصیبت وارد ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں۔

ع۵۰۸ غدوت۔ اس کا مادہ غدا ہے اور غُدْوَة اور غداة دن کے ابتدا کو کہتے ہیں اور غداء اس طعام کو کہتے ہیں جو صبح کے وقت کھایا جائے (غ) پس غدوت کے معنی ہوئے صبح کے وقت نکلا۔

حضرت عائشہؓ کا جنگِ اُحد میں شریک ہونا: من اھلك۔ اھل کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۳۷ ا خصوصیت سے یہ لفظ بی بی پر بولا جاتا ہے (غ) تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اس جنگ میں نبی کریم صلعم کے ساتھ تھیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں غزوہ اُحد کے بیان میں حضرت انسؓ کی روایت میں حالت جنگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے حضرت عائشہؓ اور اپنی والدہ ام سلیم کو دیکھا کہ پانی کی مشکیں بھر بھر کر اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لاتیں اور زخمیوں کو پلاتی تھیں اور ام سلیط کے بھی زخمیوں کو پانی پلانے کا ذکر بخاری میں ہے اور ام عمارہ کا ذکر ہے کہ وہ نبی کریم صلعم سے دشمنوں کا دفاع بھی کرتی تھیں۔ عورتوں کا جنگوں میں شامل ہونا تاریخی امر ہے اور اُحد کے میدان میں بھی ان کی شمولیت ثابت ہے پس اھلك سے مراد یہاں حضرت عائشہ صدیقہ ہیں اور انہی کے گھر سے نبی کریم صلعم نے اٹھ کر ہفتہ کے دن صبح ہی مومنوں کو لڑائی کے موقعوں پر آراستہ کیا۔

تبوّئ ۔ بواء سے ہے اور بواء اصل میں مکان میں اجزا کی مساوات کو کہتے ہیں یعنی ہمواری کو، دیکھو ع۹۱ اور بَوّأتُ له مكانا کے معنی ہیں سَوَّيْتُهُ (غ) یعنی اس کے لیے مکان کو ہموار کیا۔ مطلب یہ کہ اس کو ایسا مکان دیا جس میں وہ مضبوطی سے قدم جما سکے اور صرف جگہ یا مکان دینے پر بولا جاتا ہے ان تبوّءا لقومکما بمصر بیوتا (یونس۱۰ - ۸۷) ولقد بوّأنا بنی اسرائیل (یونس۱۰ - ۹۳) یتبوأ منها حیث یشاء (یوسف۱۲ - ۵۶)

مقاعد۔ مَقْعَدْ کی جمع ہے جس کے معنی بیٹھنے کی جگہ ہیں اور مقاعد للقتال قتال کے لیے بیٹھنے کی جگہیں ہیں جس سے مورچے مراد ہیں (غ) یہاں سے جنگ احد کا ذکر شروع ہوتا ہے اور طرز عبارت واذ غدوت من اھلك گویا یہ کسی پہلے بیان پر بطور عطف ہے ایسی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ مضمون ایک ہی چل رہا ہے ابو مسلم نے اسے لقد کان لکم اٰیة فی فئتین التقتا پر عطف قرار دیا ہے یعنی ایک تو نشان جنگ بدر میں تھا اور ایک نشان جنگ اُحد میں ہے مگر میرے نزدیک اس کا تعلق پچھلے رکوع کی آخری آیت سے ہے کیونکہ وہاں فرمایا تھا کہ تم کو کوئی دکھ پہنچے تو اہل کتاب خوش ہوتے ہیں اور تم کو خوشی پہنچے، تو انھیں برا لگتا ہے تو اب اس واقعہ کا ذکر آتا ہے جس میں مسلمانوں کو کچھ دکھ پہنچا اور وہ واقعہ جنگِ اُحد کا ہے اور اس رکوع میں اس جنگ کی طرف نکلنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے لشکر کو مورچوں پر بٹھانے اور نصرت ملائکہ کا ذکر ہے۔

جنگِ بدر میں سخت ہزیمت اٹھانے کے بعد قریش مکہ نے ایک بڑی بھاری کوشش اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے اور پہلی ہزیمت کا داغ مٹانے کے لیے کی اور اگلے سال یعنی ۳ھ ہجری میں تین ہزار کا لشکر لیکر جس میں دو سو سوار تھے شوال کے مہینہ میں اُحد کے مقام پر جو مدینہ کے شمال میں صرف چار میل کے فاصلہ پر ہے پہنچ گئے ان کا وہاں ٹھہر جانا اس لیے تھا کہ تا مسلمان کسی طرح مدینہ سے باہر نکل آئیں کیونکہ مدینہ کے اندر رہنے سے ان کی حالت زیادہ مضبوط رہتی۔ چنانچہ بدھ کے دن وہ مقام اُحد پر پہنچے۔ ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تیاری کی اور جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ آپ چلے اور ہفتہ کے دن صبح صف آرائی کی اور اسی دن جنگِ اُحد ہوئی۔ بعض نے لکھا ہے کہ ۱۱ شوال تھی اور بعض نے اسے نصف شوال کہا ہے۔

جنگ اُحد کے متعلق مشورہ: نکلنے سے پہلے نبی کریم صلعم نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ ہم کو باہر نکل کر ان کے ساتھ جنگ کرنی چاہیئے یا مدینہ کے اندر رہ کر۔ اور اس مشورہ میں عبد اللہ بن ابیؔ کو بھی جو بعد میں رأس رئیس المنافقین کے نام سے مشہور ہوا بلایا، اس سے پہلے آپؐ نے اسے کبھی نہ بلایا تھا۔ عبد اللہ نے یہ مشورہ دیا کہ مدینہ کے اندر ہی رہ کر جنگ کرنی چاہیئے۔ انصار کے بعض لوگوں نے بھی یہی مشورہ دیا مگر دوسرے لوگوں نے عرض کیا کہ ہم کو باہر نکلنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر ہم باہر نکل کر نہ لڑیں تو ان کا خیال ہوگا کہ مسلمان ہم سے ڈر گئے اور محصور ہو کر جنگ کی۔ رسول اللہ صلعم کی اپنی رائے بھی پہلے گروہ کے ساتھ تھی۔ آنحضرتؐ کی تین رؤیا: اور آپؐ نے تین خواب بھی اس بارہ میں دیکھے تھے ایک یہ کہ میرے لیے ایک گائے ذبح کی گئی ہے اس کی تعبیر آپؐ نے کی کہ ہمارے لیے بہتری ہے۔ دوسرا یہ کہ میں نے اپنی تلوار کی دھاریں بعض جگہ شکستہ دیکھی ہیں اور اس کی تعبیر آپؐ نے یہ کی کہ ہمارے غلبہ میں کچھ آثار ہزیمت کے ہونگے تیسرا یہ کہ میں نے اپنا ہاتھ ایک مضبوط زرہ میں داخل کیا ہے اور اس کی تعبیر آپؐ نے مدینہ سے کی یعنی اگر ہم مدینہ میں رہیں گے تو یہ ہمیں ایک مضبوط زرہ کا کام دیگا۔ مگر کثرت رائے یہی تھی کہ باہر نکلنا چاہیئے۔ اسی کے مطابق آپؐ نے فیصلہ کیا۔ یہ ہے مشورہ کی عزت اور شوریٰ کے فیصلہ کی عزت جو نبی کریم صلعم نے جو خود مہبط وحی تھے کر کے دکھائی کہ اپنی رائے بلکہ اپنی رؤیاء کے خلاف شوریٰ کے فیصلہ کو ترجیح دی۔

إِذْ هَمَّت طَّآئِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا ۙ وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۲۲﴾
وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ

جب تم میں سے دو گروہوں نے ارادہ کیا کہ ہمت ہار دیں اور اللہ ان دونوں کا ولی تھا اور اللہ پر ہی مومنوں کو بھروسہ کرنا چاہیئے ۵۰۹
اور یقیناً اللہ نے تم کو بدر میں مدد دی جب تم کمزور

واقعات جنگ اُحد: غرض جمعہ کے بعد ایک ہزار آدمی کو لیکر آپ باہر نکلے جب ایک مقام شوط پر پہنچے تو عبداللہ بن ابی ایک تہائی آدمیوں کو ساتھ لیکر اس لیے واپس آگیا کہ میرے مشورے کے مطابق کیوں کام نہیں کیا گیا۔ سو آپ چھ اور سات سو کے درمیان آدمیوں کو لیکر اُحد کے مقام پر پہنچے اور اگلے دن علی الصباح پہاڑ کو اپنی پشت پر رکھ کر اپنے لشکر کو جنگ کے لیے تیار کیا اور ایک مورچہ پر عبداللہ بن جبیر کے ماتحت پچاس تیر اندازوں کو کھڑا کیا اور ان کو حکم دیا کہ ہم کو فتح ہو یا شکست، تم نے کسی صورت میں اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا ہوگا۔

جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں نے ایسے جوش سے حملہ کیا کہ سات سو کے سامنے تین ہزار کے پاؤں اکھڑ گئے ان کے علمبردار یکے بعد دیگرے مارے گئے اور بہت سے آدمی ان میں سے زخمی ہوگئے آخر وہ قائم نہ رہ سکے اور بھاگ اُٹھے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور خوب دُور نکل گئے۔ تیر اندازوں نے سمجھا اب فتح کامل ہوگئی ہے اور اب اس جگہ کی حفاظت کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے اپنے امیر کے حکم کے خلاف جگہ کو چھوڑا۔ قریش کے رسالہ پر خالد بن ولید اور عکرمہ تھے انہوں نے جب اس مورچہ کو خالی دیکھا تو فوراً رسالہ کے ساتھ عقب سے حملہ کیا ادھر قریش کا بھاگتا ہوا لشکر سنبھلا۔ مسلمان تعاقب کی وجہ سے پہلے ہی منتشر تھے۔ اب دو طرف سے حملہ ہوا۔ یہ ایک بڑا سخت وقت تھا اور فوج تتر بتر تھی اتنے میں نبی کریم صلعم نے اس حالت کو دیکھ کر بلند آواز سے پکارا الی عباد اللہ انا رسول اللہ اے اللہ کے بندو میری طرف آجاؤ میں اللہ کا رسول ہوں۔ کفار کی اصل غرض تو یہی تھی کہ سب سے پہلے آنحضرتؐ کو ماریں۔ ان الفاظ کے ساتھ اگر ایک طرف کچھ صحابہؓ آنحضرت صلعم کے گرد جمع ہوگئے تو دوسری طرف کفار کے حملے کا سارا زور اسی موقعہ پر ہوگیا۔ آنحضرتؐ کے سر میں زخم آیا اور کچھ دانت بھی زخمی ہوگئے اور آپؐ گر گئے مگر ساتھ ہی آپؐ کے صحابہؓ نے آپؐ کے اردگرد اور دشمن کے مقابل پر ایک مضبوط دیوار بنالی اور سب مسلمان آہستہ آہستہ یہاں جمع ہوگئے۔ اور چند ایک نفوس مدینہ کی طرف بھاگ گئے۔ جب دشمن نے دیکھا کہ مسلمانوں کی پراگندہ جمعیت پھر اکٹھی ہوگئی ہے تو انہوں نے فوراً واپسی کی ٹھان لی اور مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں چھوڑ کر مکہ کو واپس ہوئے۔ مسلمانوں کو نقصان ضرور پہنچا مارے بھی گئے زخمی بھی ہوئے مگر انہوں نے شکست نہیں کھائی۔ کفار سخت نقصان اور کھلی ہزیمت سے ضرور بچ گئے مگر انہوں نے فتح حاصل نہیں کی بلکہ صرف مسلمانوں کے تعاقب سے محفوظ ہوکر گھر کی راہ لی۔

آنحضرت صلعم کے مختلف کام: اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم ہر قسم کی ذمہ داری کے کام کو خود ہی کرتے تھے۔ یہاں مسلمان فوج کو مورچوں پر بٹھانا بھی آپ کا کام بتایا ہے۔ گویا جرنیل یا کمانڈر کا اصل کام آپؐ خود ہی کرتے تھے۔ کس قدر مختلف شعبے کام کے آپ کی ذات میں جمع تھے خود ہی نمازوں کی امامت کرائیں خود ہی تعلیم دین دیں، خود ہی جھگڑوں کے فیصلے کریں۔ خود ہی قوانین بنائیں۔ خود میدان جنگ میں جاکر لڑیں اور خود ایک جرنیل کا کام بھی کریں۔ غرض کوئی پہلو ایسا نظر نہیں آتا جس میں آپؐ نے خود ہی ایک نمونہ قائم نہ کیا ہو۔

۵۰۹ھمّت۔ ھَمّ ایسے غم کو کہتے ہیں جو انسان کو پگھلا دے (غ) اس لیے اَھَمَّہٗ الْاَمْرُ کے معنی ہیں اَقْلَقَہٗ۔ اَحْزَنَہٗ (ل) یعنی اس امر نے اس کو قلق میں یا حزن میں ڈالا۔ اسی لیے مھمات الامور ان سخت امور کو کہتے ہیں جو حزن میں ڈالنے والے ہوں اور ھَمَّ بالشئی کے معنی ہیں اس کی نیت یا ارادہ کیا یا اس پر عزم کیا (ل) ھِمّۃ اور ھُمام اسی سے ہیں ھِمّۃ کسی امر کے کرلینے کے قصد کا نام ہے اور ھمام۔ عظیم الھمّۃ آدمی کو کہتے ہیں اور یہاں ھَمّت کے معنی صرف دل میں ایک خیال کا لانا ہیں۔ جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے کہ ان سے وہ کمزوری سرزد نہیں ہوئی۔

تفشلا۔ فشل سے ہے جس کے معنی ہیں وہ کمزوری جس کے ساتھ بزدلی ملی ہوئی ہو (غ)

بتوکّل۔ وکل سے ہے وَکَلْتُ امری الی فلان کے معنی ہیں دوسرے کی طرف ایک امر کو لے گیا اور اس بارہ میں اس پر اعتماد کیا (ل) اور توکُّل کا استعمال دو طرح پر ہے ایک صلہ لام کے ساتھ توکلت لفلان کے معنی ہیں توکلت لہ یعنی اس کی خاطر میں اس کا متولی ہوگیا اور توکلت علیہ کے معنی ہیں اعتمدت علیہ یعنی اس پر میں نے اعتماد کیا (غ) اور اللہ تعالیٰ کا وکیل ہونا اسی معنی میں ہے کہ وہ سب امور کا متولی ہے (غ)

یہ دو گروہ جن کا ذکر اس آیت میں ہے کون تھے؟ بخاری میں جابر بن عبداللہ سے روایت ہے فِینَا نَزَلَتْ اِذْھَمَّتْ طَائفتان منکم ان تفشلا واللہ ولیّھما قال نحن الطائفتان بنو حارثۃ وبنو سَلِمَۃَ وما نُحِبُّ انّھا لم تنزل لقول اللہ واللہ ولیھما یعنی یہ آیت ہمارے متعلق اتری اور ہم بنو حارثہ اور بنو سلمہ وہ دو گروہ ہیں اور ہم کو یہ پسند نہیں کہ یہ نہ اُترتی کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ ان دونوں کا کارساز اور مددگار ہے۔ ان کا ھَمّ یا ارادہ محض حدیث نفس کے طور پر تھا۔ اس لیے کہ اگر عزم ہوتا تو وہ کر بھی گزرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فوج کفار کے مقابلہ پر اس قدر قلت کو دیکھ کر کہ ایک اور چار کی نسبت سے بھی کفار زیادہ تھے ان کے دلوں میں یہ کمزوری کا خیال آیا۔

اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ | تھے پس اللہ کا تقویٰ کرو تاکہ تم شکر گزار بنو۔ ۵۱۵
اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ | جب تو مومنوں سے کہتا تھا کہ کیا یہ تمھارے لیے
يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ | کافی نہیں کہ تمھارا رب تین ہزار اتارے ہوئے فرشتوں

اللہ پر توکّل کرنے سے کیا مراد ہے؟ لفظی معنی بھروسہ یا اعتماد کرنا ہیں مگر کیا خدا پر بھروسہ کرنے سے یہ مطلب ہے کہ ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہیئے اور کام کو خدا پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ جو چاہے کرے۔ یہی معنی آجکل مسلمانوں نے توکّل کے سمجھے ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ اگر یہی معنی توکّل کے نبی کریم صلعم اور آپ کے صحابہ نے سمجھے ہوتے تو نہ وہ جنگ کو نکلتے نہ دشمن کی خبر رکھتے نہ دُور دُور دشمنوں کی سرکوبی کے لیے فوجیں بھیجتے نہ مہمات کا فکر کرتے نہ ان کے لیے روپیہ جمع کرتے نہ ہتھیار فراہم کرتے، نہ دن رات مسلح رہتے اور یہ سب کچھ وہ کرتے تھے۔ خود اسی موقعہ پر جو توکّل کی ہدایت ہوئی ہے تو کس معنی میں؟ دو گروہوں نے ارادہ کیا کہ جنگ سے واپس ہو جائیں مگر خدا نے ان کو اس ارادہ کے عمل میں آنے سے بچا لیا اور فرمایا کہ مومن خدا پر توکّل کیا کرتے ہیں تو معلوم ہُوا کہ جنگ کرنا توکّل تھا اور جنگ نہ کرنا خلاف توکّل تھا۔ پس قرآن کریم کے اس استعمال نے بتا دیا کہ توکّل اسباب سے کام لینے کا نام ہے اسباب کو ترک کرنے کا نام نہیں۔ اور فی الحقیقت وہ شخص خدا پر بھروسہ کرنے والا نہیں کہلا سکتا جو خدا کے پیدا کیے ہوئے اسباب سے کام نہیں لیتا بلکہ حقیقتِ توکّل یہ ہے کہ اسباب خواہ کمزور بھی نظر آئیں تو بھی ان سے کام لے۔ کیونکہ یہاں دو گروہوں کو جنگ نہ کرنے کا خیال اس لیے پیدا ہوا کہ دشمن طاقتور تھا۔ اور ادھر تین ہزار کے مقابلہ میں سات سو تھے۔ تو حکم ہُوا کہ تم اپنا پورا زور لگاؤ اور یہ پروا نہ کرو کہ کیا ہوگا۔ بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ اسباب سے پورا کام لیکر نتیجہ خدا پر چھوڑے یہ توکّل ہے۔ کام کرے گو نتیجہ خلاف امید بھی ہو تو بھی کام نہ چھوڑے اور یہ سمجھ لے کہ میرا فرض تو کام کرنا ہے اس پر نتیجہ مترتب کرنا خدا کا کام ہے پس خدا پر بھروسہ کرنے کے یہ معنی ہوئے کہ اسباب پر پورا زور لگائے نتیجہ کو سپرد خدا کرے یہ توکّل انسان کی ہمت بڑھانے والی چیز ہے اور مصائب کے نیچے اس کو ہمت ہارنے سے روکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے صبر کے ساتھ توکّل کو جمع کیا ہے یہاں بھی یہی صورت ہے اور دوسری جگہ ہے وما لنا الا نتوکل علی اللہ وقد ھدنا سبلنا ولنصبرن علی ما اذیتمونا وعلی اللہ فلیتوکل المتوکلون (ابراہیم [۱۴]-۱۲) الذین صبروا وعلی ربھم یتوکلون (النحل [۱۶]-۴۲) اور ایک جگہ کمال صفائی سے عمل اور صبر اور توکّل کو جمع کیا ہے نعم اجر العملین الذین صبروا وعلی ربھم یتوکلون (العنکبوت [۲۹]-۵۸، ۵۹) عمل یعنی کام کرنے والوں کا اجر کیا ہی اچھا ہے وہ جو صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر توکّل کرتے ہیں پس قرآن کریم کی اس صریح تعلیم کے مطابق توکّل یہ ہے کہ انسان اسباب سے خوب کام لے اور نتیجہ خلاف بھی ہو تو گھبرائے نہیں بلکہ نتیجہ کو خدا پر چھوڑے۔

احادیث سے توکّل کے معنی پر روشنی: احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ حج میں جو لوگ زاد راہ لیے بغیر جایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے نحن المتوکلون ان کو قرآن کریم نے وتزودوا کہہ کر روکا بتا دیا کہ اسباب سے کام نہ لینا یہ توکّل نہیں۔ نبی کریم صلعم سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ اونٹ کو خدا کے توکّل پر کھلا چھوڑ دوں تو فرمایا اعقلھا وتوکل اس کے گھٹنے کو رسّی سے باندھ دو اور توکّل کرو۔ یعنی اسباب سے کام لو اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑو۔ اور اس کے خلاف جن احادیث سے نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے مثلاً یہ حدیث لو انکم تتوکلون علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصا وتروح بطانا۔ یعنی اگر تم اللہ پر توکّل کرو جو حق توکّل کا ہے تو تم کو رزق دے جس طرح پرندوں کو رزق دیتا ہے کہ صبح کے وقت بھوکا نکلتا ہے اور شام کو پیٹ بھر کر آتا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ طلب معاش کی ضرورت نہیں حدیث کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ حدیث میں یہ نہیں کہ پرندہ کو گھونسلے میں رزق بھیج دیتا ہے بلکہ پرندہ تلاش رزق کے لیے نکلتا ہے تو اسے بھی مل جاتا ہے۔ تو مطلب صاف یہ ہُوا کہ تم اگر تلاش کرو گے تو تم کو بھوکا نہیں مارے گا۔ مسلمانوں کے ادبار کے اسباب میں سے توکّل کا غلط مفہوم بھی ایک بھاری سبب ہے۔

ع۵۱۵ بدر مکّہ اور مدینہ کے درمیان (مدینہ سے تین منزل اور مکّہ سے دس منزل دور) ایک مقام کا نام ہے اور یہ ایک کنوئیں کے نام پر ہے جو اسی نام کے ایک شخص نے لگوایا تھا۔ اس مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی جنگ قریش مکّہ سے ہوئی جس میں قریش مغلوب ہوئے۔

اذلّۃ۔ ذلیل کی جمع ہے اور ذُلّ نقیض عزّ ہے اور ذِلّ کے معنی رفق اور رحمت بھی آتے ہیں (ل) اور دوسری جگہ اذلۃ علی المؤمنین (المائدہ [۵]-۵۴) میں یہی مراد ہے اور یہاں اذلۃ کا لفظ محض ان کی تعداد کی قلت کو ظاہر کرنے کے لیے بولا گیا ہے بدر میں مسلمانوں کو اذلّۃ اس لحاظ سے کہا ہے کہ وہ بسبب اپنی قلت تعداد کے غالب آنے کے قابل نہ تھے بلکہ بظاہر مغلوب کی حیثیت میں تھے اور ذلّ کے معنی مقابلہ سے عاجز ہونا بھی ہیں۔

اوپر کی آیت میں دو گروہوں کی کمزوری کے خیال کا ذکر کیا تھا۔ تو اب ان کی ہمّت بندھاتا ہے کہ اگر یہاں تم تھوڑے ہو تو یہی حالت تمھاری بدر میں بھی تھی کہ وہاں بھی تم قلیل تھے۔ بلکہ سامان جنگ کے لحاظ سے تو بالکل مقابلہ کے قابل ہی نہ تھے۔ پھر جب وہاں اللہ تعالیٰ نے تمہیں مدد دی تو کیا اب نہ دیگا۔

فاتقوا اللہ لعلکم تشکرون۔ اللہ کا تقویٰ کرو تاکہ تم شکر کرنے والے بنو۔ مومن تو پہلے شکر گزار تھے۔ پھر یہاں تقویٰ کرنے کا نتیجہ شکر گزار بننے سے کیا مراد ہے؟ اللہ تعالیٰ جب انسان کو کوئی نئی نعمت عطا فرماتا ہے تو اس کے لیے ایک نئی شکر گزاری کا موقع ہوتا ہے۔ پس شکر گزار بننے میں اس نئی نعمت کی طرف اشارہ ہے یعنی جیسا پہلے تمہیں نصرت ملی تو اس نعمت کی وجہ سے ایک شکر گزاری کا موقع ملا۔ اسی طرح اگر اب بھی تقویٰ اختیار کرو تو پھر تمہیں نصرت عطا ہوگی اور اس نعمت کی وجہ سے شکر گزاری کا موقع ملے گا۔

مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ سے تمہاری مدد کرے ۱۱۵ء

۱۱۵ء فَوْر - فور شدت جوش کا نام ہے اور اس کا استعمال آگ کے متعلق ہوتا ہے جب وہ بھڑکے اور ہانڈی کے متعلق (جب وہ اُبلے) اور غضب کے متعلق (جب اس میں سخت جوش پیدا ہو) (غ) نار جہنم کے متعلق آتا ہے وھی تفور (الملک ۶۷ - ۷) فَعَلْتُ کذا من فوری سے مراد ہے ایسا کام جوش کی حالت میں کیا (غ) فار الشیٔ فورًا ...... جاش یعنی فور کے معنی جوش میں آنا ہیں (ل) اور اسی سے بطور استعارہ فور کے معنی فی الحال بھی ہیں اور یہی لفظ ہماری زبان میں فورًا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اصل معنی جوش اور غلیان ہی ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔

مسوِّمین - اصل اس کا سَوْم ہے جس کے معنی میں امام راغب لکھتے ہیں کہ اس کا اصل کسی چیز کی تلاش میں جانا ہے مگر پھر اس کا استعمال اس مرکب معنی کے دونوں اجزا پر الگ الگ ہوا ہے یعنی صرف ذھاب (جانا) اور صرف ابتغاء (تلاش کرنا) اور لسان العرب میں ہے کہ سام چار معنی میں آتا ہے - چرنے کے لیے چھوڑا۔ اور طلب کیا اور بیچا اور عذاب دیا - اور یہاں مُسوِّم میں یہی آخری معنی مراد ہیں - یعنی عذاب دینے والے اور اسی کے مطابق سَوَّمْتَ علی القوم آتا ہے اذا أغرْتَ علیھم فَعَثَتَ فِیھِمْ (ل) یعنی ان پر گھوڑے کو دوڑایا اور ان میں تباہی ڈالی - پس مُسوِّمین سے مراد ہے تباہی ڈالنے والے یا عذاب دینے والے اور عام طور پر نشان لگانے والے معنی کیے گئے ہیں۔

ان دو آیات میں سے پہلی آیت میں تین ہزار فرشتوں کے نزول کا ذکر ہے اور دوسری میں پانچہزار کا۔ بعض مفسرین نے یہ کوشش کی ہے کہ ان تمام کو جنگِ بدر کے متعلق ہی لگایا جائے۔ حالانکہ سورۃ انفال میں صراحت سے فرمایا - انی ممدکم بالف من الملٰئکۃ مردفین (الانفال ۸ - ۹) یعنی جنگ بدر میں کھلے طور پر ایک ہزار ملائکہ کی امداد کا ذکر ہے اور یہاں تین ہزار فرشتوں کی امداد کا ذکر ہے - اس لیے یہ واقعہ بدر کے متعلق نہیں - علاوہ ازیں یہاں اذ کے ساتھ بار بار جنگ اُحد کے واقعات کی طرف ہی توجہ دلائی ہے واذ غدوت من اھلك - اذ ھمت طائفتان - اور یہاں تیسری مرتبہ اذ تقول فرمایا - پھر اسی سورت میں دوسری جگہ یہ بھی فرمایا ولقد صدقکم اللہ وعدہ اذ تحسونھم باذنہ (ال عمرٰن ۳ - ۱۵۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی وعدہ نصرت کا بھی اس جنگ کے متعلق تھا۔ اور وہ وعدہ صرف انہی الفاظ میں ہے - الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلٰثۃ الاف من الملٰئکۃ منزلین اور بالآخر یہ بات قابل غور ہے کہ جہاں بدر میں ایک ہزار دشمن ہے تو ایک ہزار ملائکہ کی نصرت کا ذکر ہے اور چونکہ اُحد میں تین ہزار دشمن ہے اس لیے تین ہزار ملائکہ کا تعلق اسی جنگ سے قرین قیاس ہے۔

اس کے بعد جو دوسری آیت میں پانچہزار ملائکہ کی آمد کا ذکر ہے وہ ایک تیسری جنگ کے متعلق ہے بدر اور اُحد کے متعلق نہیں اور وہ جنگ احزاب ہے جس کا ذکر یہاں ان الفاظ میں کیا گیا ہے ویاتوکم من فورھم ھذا اپنے پورے جوش میں تم پر ٹوٹ پڑیں - اور جہاں جنگِ احزاب کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے وہاں بھی اسی قسم کا نقشہ کھینچا ہے اذ جاءکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنونا ھُنالك ابتلی المؤمنون وزلزلوا زلزالا شدیدا (الاحزاب ۳۳ - ۱۰، ۱۱) یہ نقشہ صریحًا وہی دشمن کے جوش میں ٹوٹ پڑنے کا نقشہ ہے اور اس جنگ میں دس ہزار یا بعض اقوال میں چوبیس ہزار فوج کے ساتھ دشمن آیا تھا - کیونکہ قریش نے دوسری قوموں کو بھی اکسا کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا - قریش خود بمشکل کوئی پانچہزار کے قریب ہی ہونگے اور اصل دشمن وہی تھے۔

تین ہی بڑی جنگیں تھیں جن میں دشمن یعنی کفار قریش مسلمانوں پر چڑھ کر آئے - جنگِ بدر، جنگِ اُحد، جنگِ احزاب - ان تینوں لڑائیوں میں مسلمانوں کی تعداد کفار کی تعداد کے مقابل کچھ نسبت نہ رکھتی تھی - تینوں جنگوں کی غرض مسلمانوں اور اسلام کا استیصال تھا - تینوں میں کفار اپنے مقصد میں ناکام ہو کر واپس ہوئے اور تینوں کے متعلق ہی نزول ملائکہ کا ذکر بھی ہے اور دشمن کی تعداد سے خاص نسبت رکھتا ہے - جنگ احزاب کے بعد پھر دشمن کو مدینہ پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد چڑھائی ہوئی وہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کا دس ہزار صحابہؓ کے ساتھ مکّہ میں داخل ہونا تھا - اور اس موقعہ پر کفار کو مقابلہ کی جرأت مطلق نہ ہوئی - اب دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ کفار کو دو قسم کا وعدہ دیا گیا تھا جس کے متعلّق وہ بار بار مطالبہ بھی کرتے تھے - ھل ینظرون الّا ان تاتیھم الملٰئکۃ او یاتی امر ربك (النحل ۱۶ - ۳۳) کیا وہ اس امر کا انتظار کرتے ہیں کہ فرشتے ان پر آئیں یا تیرے رب کا امر ہی آجائے - سو اللہ تعالیٰ نے ان تینوں جنگوں میں جہاں کفار کی چڑھائی مسلمانوں پر تھی ملائکہ کے ساتھ مسلمانوں کی نصرت فرمائی اور کفار کو سزا دی اور انکو اپنے ارادوں میں ناکام رکھا اور فتح مکّہ میں گویا امر رب ہی آگیا - کیونکہ اسلام کی حکومت قائم ہو گئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ چڑھائی ایسی پُرشوکت تھی کہ وہ کفار جو ہزار ہا کا لشکر لیکر مٹھی بھر مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے جایا کرتے تھے - اب ان میں اتنی بھی ہمت اور جرأت نہ رہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے دس ہزار قدوسیوں کے مقابلہ میں میدان میں بھی نکل سکیں اور امر رب کا مقابلہ کر کون سکتا تھا - پس ملائکہ کے نزول میں گویا درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو پورا فرمایا ہے جس کا مطالبہ بار بار کفار کی طرف سے ہوتا تھا۔

یہ نزول ملائکہ کوئی فرضی بات نہ تھی - بلکہ ایک حقیقت تھی ورنہ یہ ناممکن تھا کہ معدودے چند مسلمان اس قدر فوجوں کا مقابلہ کر کے کامیاب ہو سکتے - غور کا مقام ہے کہ ایک آدھ میدان میں اگر تھوڑے بہتوں پر غالب آجائیں تو اسے اتفاق کہا جا سکتا ہے - گو وہاں بھی کوئی نہ کوئی وجوہ کامیابی کی ضرور ہونی چاہئیں مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ اول میدان بدر میں کفار کی جمعیت تگنی، میدان کا اچھا حصّہ ان کے ہاتھ میں - پانی ان کے قبضہ میں، ان کی فوج میں تجربہ کار جنگی جوان

بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

ہاں اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کرو اور وہ اپنے پورے جوش میں تم پر حملہ کریں تمہارا رب پانچہزار (دشمن کو) تباہ کرنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَ لِتَطْمَىٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾

اور اللہ نے اُسے صرف تمہارے لیے خوش خبری ٹھیرایا، اور تاکہ تمہارے دل اس سے اطمینان پکڑیں اور مدد تو اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے ہی ہے ۵۱۲ؔ

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآىِٕبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

تاکہ ان لوگوں سے جو کافر ہوئے ایک حصّہ کو کاٹ دے یا ان کو ذلیل کرکے لوٹا دے سو وہ نامراد واپس جائیں ۵۱۳ؔ

بالمقابل مسلمانوں میں بچے اور بوڑھے شامل ہتھیار ندارد۔ میدان کی مشکلات۔ پھر بھی کفار سخت نقصان اُٹھاتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ پھر میدان اُحد میں بجائے تگنے کے اب کفار کی تعداد مسلمانوں سے چوگنی ہے۔ سواروں کی ایک بڑی جمعیت ان کی فوج میں ہے۔ خالد جیسے بہادر بھی ساتھ ہیں۔ مگر پھر بھی کفار خالی ہاتھ اور ناکام واپس جاتے ہیں۔ جنگِ احزاب میں کفار کی تعداد مسلمانوں سے دس گنی۔ علاوہ ازیں اندر یہودی دشمن۔ منافق جاسوسوں کا کام کرنے والے موجود۔ مگر وہاں بھی خدا نے اس بڑی فوج کو ناکام اور نامراد کرکے واپس پھیرا۔ اور وہ سخت پریشانی کی حالت میں بھاگے۔ یہ نزول ملائکہ کا ہی نتیجہ تھا۔

۵۱۲ؔ یہاں فرمایا کہ نزول ملائکہ کے وعدہ کو اللہ تعالیٰ نے صرف تمہارے لیے بشارت ٹھہرایا اور تاکہ تمہارے دل اس کے ساتھ مطمئن ہوجائیں۔ اسی طرح سورۃ انفال میں فرمایا وما جعله الله الا بشرٰی ولتطمئن به قلوبكم (الانفال ۸-۱۰) اور وہاں آگے چل کر فرمایا اذ يوحي ربك الى الملئكة انى معكم فثبتوا الذين اٰمنوا سالقى فى قلوب الذين كفروا الرعب (الانفال ۸-۱۲) جب تیرا رب ملائکہ کو وحی کرتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں سو ان لوگوں کو جو ایمان لائے ثابت قدم رکھو میں ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے کفر کیا رعب ڈالوں گا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ مومنوں کو ثابت قدم کرتا اور کفار کے دلوں میں رُعب ڈالتا ہے اور شاید یہی وجہ ہو کہ ملائکہ کی تعداد کو کفار کی جمعیت سے ہر میدان میں ایک خاص نسبت نظر آتی ہے۔

ملائکہ نے قتال نہیں کیا: اگر ملائکہ کا نزول ہُوا تو کیا انہوں نے انسانوں کی شکل میں ہو کر جنگ بھی کی؟ جس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو نازل کیا وہ تو خود ہی بتادی ہے اور حق یہی ہے کہ ملائکہ کا تعلق قلوب سے ہوتا ہے۔ پس مومنوں کو اطمینان قلب عطا کرنا اور کفار کے دل میں رعب ڈالنا یہ وہ غرض تھی جس کے لیے قرآن کریم کی تصریح کے مطابق ملائکہ کا نزول ہُوا۔ بعض مفسرین نے بھی اسی کے مطابق لکھا ہے۔ چنانچہ غرائب القرآن میں یہ قول مذکور ہے ومنهم من قال ان نصر الملائكة بالقاء الرعب فى قلوب الكفار و باشعار المؤمنين بان النصرة لهم۔ یعنی بعض نے کہا ہے کہ ملائکہ کی نصرت کافروں کے قلوب میں القائے رعب تھی اور مومنوں کو یہ علم دینے سے کہ نصرت ان کے لیے ہے۔ یہ جنگِ بدر اور جنگِ اُحد دونوں کے متعلق ہے اور جنگِ اُحد کے متعلق تو قریبًا قریبًا اتفاق ہے کہ وہاں ملائکہ نے قتال نہیں کیا۔ چنانچہ امام مجاہد کا قول منقول ہے عن مجاهد انه قال حضرت الملئكة يوم احد ولكنهم لم يقاتلوا یعنی آپ نے فرمایا کہ فرشتے اُحد کے دن موجود تھے لیکن انہوں نے جنگ نہیں کی۔ ایسا ہی حضرت ابن عباس سے مروی ہے عن ابن عباس انه لم تقاتل الملئكة سوى يوم بدر وفيما سواه كانوا عددا و مددا لا يقاتلون ولا يضربون یعنی سوائے بدر کے دن کے ملائکہ نے جنگ نہیں کی اور اس کے سوائے جہاں وہ آئے وہ تعداد اور مدد دینے کے لیے تھے۔ انہوں نے قتال نہیں کیا اور نہ کسی کو مارا۔ بدر کے دن ملائکہ کے قتال کرنے یا نہ کرنے پر بحث سورہ انفال میں ہو گی۔

۵۱۳ؔ يقطع۔ قطع کے اصل معنی کاٹنا ہیں مگر ہلاک کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مفردات میں ہے ليقطع طرفا اى ليهلك جماعةً منهم یعنی ان میں سے ایک جماعت کو ہلاک کردے۔

طرفا۔ کسی چیز کی طَرَف سے مراد اس کی ایک جانب ہے اور اس کا استعمال اجسام میں اوقات میں اور اس کے سوائے بھی ہوتا ہے (غ) ليقطع طرفا میں مراد ایک حصّہ یا ایک جماعت ہے۔ جیسا اوپر ذکر ہُوا اور امام راغب کہتے ہیں کہ طرف کی تخصیص اس لیے کی کہ کسی چیز کی طرف یا ایک جانب کے کم کرنے سے اس کی توہین اور اس کے نابود کرنے کی طرف پہنچا جاتا ہے۔

يكبت۔ کَبْت سختی کے ساتھ اور ذلیل کرکے رد کردینا ہے (غ) اور لسان العرب میں ہے الكبت الصّرف والاِذلالُ۔ یعنی کبت کے معنی پھیر دینا اور ذلیل کرنا ہے پس كبت الله العدُوَّ کے معنی ہیں صرفه واذلّه (ل) اسے واپس پھیر دیا اور ذلیل کیا اور کبت کسی چیز کے منہ کے بل گرا دینے کو بھی کہتے ہیں۔

خائبين۔ خاب لَمْ يَنَلْ ما طَلَبَ (ل) خاب کے معنی ہیں جو کچھ طلب کیا تھا وہ نہ پایا۔ یعنی حصول مقصد میں ناکام ہُوا اور خيبة ظفر کا نقیض ہے پس جو خائب ہو وہ مظفر نہیں کہلا سکتا۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

اس کام میں تیرا کچھ (دخل) نہیں خواہ وہ ان پر رحمت سے لوٹے یا انہیں عذاب دے کہ وہ ظالم ہیں ۵۱۴

اُحد میں کفار کی ناکامی: جنگ اُحد میں نصرت الٰہی کی دو اغراض بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک کر دے اور دوسرا یہ کہ ان کو سختی اور ذلت سے لوٹا دے اور وہ بلا نیل و مرام اور بلا حصول مقصد واپس جائیں۔ چنانچہ یہ دونوں باتیں اسی طرح وقوع میں آئیں۔ ابتدائے جنگ میں مسلمانوں نے کفار کے ایک حصّہ کو ہلاک کیا اور بہتوں کو زخمی کیا اور آخر کار بھی وہ ذلیل ہو کر لوٹے۔ اور جس غرض کو مدّنظر رکھ کر آئے تھے اسے حاصل کیے بغیر واپس ہوئے اور یوں یہ آیت اس بات پر قطعی دلیل ہے کہ جنگ احد میں کفار کو فتح نہیں ہوئی بلکہ قرآن کریم نے انہیں نامراد قرار دیا ہے۔ کفار کا حملہ اس غرض سے تھا کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیں اور اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی اس غرض کو حاصل کیے بغیر واپس ہوئے اور یہ ان کیلئے بڑی ذلت تھی مسلمانوں کا لشکر اسی طرح میدان جنگ میں موجود تھا اس لیے وہ مدینہ پر حملہ آور نہیں ہو سکے اور وہ مسلمانوں کا ایک برائے نام قیدی بھی پکڑ کر نہ لے گئے۔ پس ایک طرف قرآن کریم اور دوسری طرف واقعات قریش کے لشکر کو ناکام ٹھہراتے ہیں۔

۵۱۴ لیس لك من الامر شئ۔ اسی سورت میں آگے آتا ہے لو کان لنا من الامر شئ ما قتلنا ھٰھنا (ال عمرٰن ۳ - ۱۵۳) اگر ہمارا بھی معاملہ میں کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔ یہی معنی یہاں ہیں۔ یعنی تیرا اس معاملہ میں کچھ دخل نہیں۔ اور وہ امر یا معاملہ کیا ہے۔ کفار کی سزا یا ان پر رجوع برحمت کرنا یعنی یہ معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے اور کسی انسان کا خواہ وہ نبی ہی ہو اس میں کچھ دخل نہیں۔

آنحضرت کا بد دعا کرنا: بخاری میں حضرت انسؓ کی روایت ہے شجّ النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم یوم اُحُدٍ فقال کیف یفلح قومٌ شجّوا نبیّھم فنزلت لیس لك من الامر شئ۔ یعنی اُحد کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر میں زخم آیا تو آپ نے فرمایا کس طرح وہ قوم کامیاب ہو گی جنہوں نے اپنے نبی کو زخمی کیا۔ تو یہ آیت لیس لك من الامر شئ نازل ہوئی۔ لیکن سالم نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلعم سے سُنا کہ جب آپؐ فجر کی نماز میں دوسری رکعت میں رکوع سے اُٹھتے تو سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لك الحمد کہنے کے بعد کہتے اللّٰھم العن فلانًا وفلانًا وفلانًا اے اللہ فلاں فلاں پر لعنت کر۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری لیس لك من الامر شئ اور دوسری روایت میں سالم نے ہی ابن عمر سے بجائے اللّٰھم العن فلانا کے یہ الفاظ روایت کیے ہیں کہ آپ صفوان ابن اُمیّہ اور سہیل بن عمرو اور حارث بن ھشام پر بد دعا کیا کرتے تھے تو یہ آیت اُتری۔ یہ غزوۂ اُحد کے ذکر میں ہے اور اسی کے قریب قریب نسائی میں بھی روایت ہے۔ اور غزوۂ اُحد میں علاوہ اس کے بہت سے مسلمان شہید ہوئے اور نبی کریم صلعم کو زخم پہنچے۔ کفار نے مسلمانوں کی لاشوں کی بھی بےحرمتی کی اور ان کا مثلہ کیا اور یہ واقعات ایسے دردناک تھے کہ ان پر ظالموں کی سزا کی خواہش بالکل حق بجانب تھی۔ لیکن ایک دوسری روایت کی بنا پر بعض مفسروں نے اس آیت کا نزول غزوہ بئرمعونہ کے واقعہ کے متعلق بیان کیا ہے۔ اور وہ واقعہ یہ ہے جیسا کہ صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ نبی کریم صلعم نے اپنے ستّر قاریوں کو ایک سردار قوم کی درخواست پر اس قوم کی تعلیم کے لیے بھیجا تو جب یہ رستہ میں ہی تھے تو ایک کنوئیں کے پاس جس کا نام بئرمعونہ ہے اس قوم کے چند قبیلوں نے غداری سے ان سب کو قتل کر دیا اور یہ قبائل رِعل اور ذکوان اور عُصَیَّۃ اور بنی لحیان تھے۔ تو نبی کریم صلعم نے ایک مہینہ قنوت میں جو آپؐ نماز صبح کی دوسری رکعت میں بعد رکوع پڑھتے تھے ان پر بد دعا کی اور بخاری نے کتاب التفسیر میں جو حدیث ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے اس میں یہ لفظ آتے ہیں وکان یقول فی بعض صلاتہ فی صلاۃ الفجر اللّٰھم العن فلانا وفلانا لاحیاء من العرب حتّٰی انزل اللہ لیس لك من الامر شئ یعنی آپ نماز فجر کے کسی حصّہ میں کہا کرتے تھے اے اللہ فلاں فلاں پر لعنت کر عرب کے کچھ قبیلوں کا نام لیکر یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری لیس لك من الامر شئ تو اس حدیث کی رو سے آیت کا نزول واقعہ بئرمعونہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر یہ درحقیقت اختلاف نہیں اور دونوں روایتیں درست ہیں اور اصل بات یہ ہے کہ بئرمعونہ کا واقعہ اور جنگ اُحد کا واقعہ بالکل قریب قریب ہیں اور ابن ہشام نے لکھا ہے کہ جنگِ اُحد کے صرف چار ماہ بعد غزوہ بئرمعونہ ہُوا۔ تو اس لیے یہ واقعہ اور جنگ احد کا واقعہ ایک ہی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں اور غالباً دونوں پر نبی کریم صلعم نے اکٹھی بد دعا کی ہے اور امام احمد نے جو روایت سالم بن عبد اللہ سے کی ہے تو اس میں حضرت ابن عمر کے الفاظ ان دونوں بد دعاؤں کو اکٹھا کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ قال سمعت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یقول اللّٰھم العن فلانًا وفلانًا اللّٰھم العن الحرث بن ھشام اللّٰھم العن سھیل بن عمرو اللّٰھم العن صفوان بن امیّۃ فنزلت ھٰذہ الایۃ لیس لك من الامر شئ۔ یعنی میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ کہتے سنا ہے کہ اے اللہ فلاں پر لعنت کر، فلاں پر لعنت کر اے اللہ حرث بن ہشام پر لعنت کر۔ اے اللہ سہیل بن عمرو پر لعنت کر اے اللہ صفوان بن اُمیّہ پر لعنت کر پس یہ آیت نازل ہوئی لیس لك من الامر شئ۔ اب اس میں فلاں اور فلاں کا ذکر الگ بھی ہے اور اس سے مراد وہی قبائل عرب ہیں جیسا کہ ابوہریرہؓ کی روایت میں یہ لفظ فلاں فلاں کی تشریح میں موجود بھی ہیں یعنی رعل اور ذکوان وغیرہ اور سرداران قریش کا ذکر الگ ہے تو پس اگر سالم بن عبد اللہ کی دونوں روایتوں کو جو بخاری میں ہیں اکٹھا کیا جائے جن میں سے ایک میں لفظ فلاں وفلاں ہیں اور دوسری میں حرث بن ہشام وغیرہ کے نام ہیں تو وہ روایت بالکل صحیح ٹھہرے گی جس کو امام احمد نے بیان کیا ہے اور اس طرح پر معلوم ہوگا کہ درحقیقت نبی کریم صلعم نے ایک طرف اُحد کی تکلیفیں اُٹھا کر اور دوسری طرف اپنے ستر قاریوں کے دھوکے سے قتل کیا جانے پر دونوں قوموں پر اکٹھی بد دعا کی۔ اور تیس دن تک آپؐ کے بد دعا کرنے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ہے جس میں آپؐ کو اس بد دعا سے روکا گیا۔

وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع

اور اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡکُلُوا الرِّبٰۤوا اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَۃً ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۳۰﴾ۚ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو بڑھا بڑھا کر سود نہ کھاؤ، اور اللہ کا تقوٰے اختیار کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ۵۱۵ع

آنحضرتؐ کو بددعا سے روکنے میں سبق: نبی کریم صلعم کو باوجود اس قدر خطرناک مصائب اعدا کے ہاتھ سے پیش آنے کے بددعا سے روکا جانے میں یہ سبق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں کیا کہ آپ کا وجود رحمۃ للعالمین کسی پر بددعا بھی کرے یہ عجیب بات ہے کہ وہ تینوں شخص جن پر آپ نے بددعا کی بعد میں مسلمان بھی ہو گئے۔ ایسا ہی وہ قبائل بھی مسلمان ہو گئے اس میں ان لوگوں کے لیے سبق ہے جو بات بات میں اپنے مسلمان بھائیوں پر لعنت کرتے۔ اور ان کو بددعاؤں کی دھمکیاں دیتے ہیں بلکہ بددعائیں کرتے رہتے ہیں یہ محمد رسول اللہ صلعم کے طریق کے خلاف ہے۔

یہ سوال کیا جائے گا کہ تیس دن تک نبی کریم صلعم کیوں بددعا کرتے رہے؟ سو وہ واقعات جن پر آپؐ نے بددعا کی ہے ایسے دلخراش ہیں کہ ایک شخص جو مخلوق الٰہی پر رحم کرے یہی خیال کریگا کہ ایسے ظالموں کا وجود دنیا سے مٹ جائے۔ پس ایسے ظالموں کے لیے بددعا کرنا بالکل حق تھا۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے دوسرے پہلو کی طرف نبی کریم صلعم کو توجہ دلائی ہے کہ وہ گناہوں کو معاف کر کے ایسے لوگوں پر بھی رجوع برحمت کر سکتا ہے۔ پس گو بددعا کرنے میں نبی کریم صلعم حق پر ہوں مگر درحقیقت آپ کا کام نہ تھا جس طرح اگر آپؐ اہل مکّہ کو جنہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا فتح مکّہ پر قتل کر دیتے تو آپ حق بجانب ہوتے مگر آپ نے افضل طریق کو اختیار کیا اور سب کو معاف کر دیا بلکہ اُن پر ملامت تک نہ کی، اسی طرح بتقاضائے بشریت آپؐ نے بددعا کی اور اس بددعا میں کوئی ناانصافی نہ تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایک افضل مقام کی طرف توجہ دلائی۔ اور اب ہم مسلمانوں کے لیے وہی طریق مناسب ہے جس پر چلنے کی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ہدایت کی۔

رحمت کا غضب پر سبقت لیجانا: اس آیت میں رجوع برحمت کرنے کو عذاب پر مقدم کیا ہے (حالانکہ فانہم ظالمون میں صاف بتا دیا ہے کہ مستحق تو بیشک یہ عذاب کے ہیں)، اور اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور عذاب کے ذکر میں مغفرت کو عذاب پر مقدم کیا اور اس طرح پر بتا دیا ہے کہ مغفرت اور رحمت کا جوش کس قدر وسیع ہے اور رحمت غضب پر سبقت لے گئی ہے پھر اس آیت کا خاتمہ تو فانہم ظالمون پر کیا یعنی لوگوں کی حالت کیسی ہے اور اگلی آیت کا خاتمہ واللّٰہ غفور رحیم پر کیا یعنی اس کی صفات کا تقاضا غفر و رحم ہے گو انسان ظلم ہی کرے۔

۵۱۵ع اضعافًا مضاعفۃ۔ اضعاف۔ ضعف کی جمع ہے ۳۱۴ع اور اضعافا مضاعفۃ۔ دبٰوا سے حال واقعہ ہُوا ہے۔ عرب میں یہ دستور تھا اور ایسا ہی دستور قریبًا تمام سود خواروں میں ہے کہ جب قرضہ کی میعاد پوری ہو جاتی اور قرضہ ادا نہ ہوتا تو سود کو اصل رقم میں بڑھا کر پھر از سر نو اس پر سود لگایا جاتا اور یوں تھوڑی مدّت میں مدیون کی ناداری سے ایک چھوٹی سی رقم بڑی بھاری رقم بن جاتی۔ اور مطلب یہ نہیں کہ صرف کئی گنا کر کے سود مت کھاؤ اور تھوڑا کھا لو بلکہ مراد توبیخ ہے یعنی سود کی تو حالت یہی ہے کہ وہ کئی کئی گنا بن جاتا ہے پس تم سود مت کھاؤ۔

حرمت سود جنگوں کے روکنے میں معاون ہے: چونکہ جنگ اُحد میں مسلمانوں کو اپنی کسی غلطی کی وجہ سے بہت سی تکلیف اُٹھانی پڑی اس لیے اسی جنگ کے ذکر میں اب اس رکوع میں یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کو کن راہوں پر چلنا چاہیئے اور ان کی کامیابی کی اصل راہیں کیا ہیں۔ سب سے پہلی آیت میں حرمت سود کا ذکر ہے تعلق یہ ہے کہ پہلے رکوع میں جنگ اُحد کا ذکر تھا اور اسی اثنا میں اہل اسلام کی نصرت اور کفار کے کاٹنے کا ذکر کیا تو اب ایک ایسے امر کی طرف توجہ دلاتا ہے جس پر عمومًا دنیا نے جنگوں کی کامیابی کا دارومدار رکھا ہے اور وہ سود ہے اور یہ صرف آج کی بات ہی نہیں کہ سود کے روپے کے ساتھ جنگوں کو جاری رکھا جاتا ہے اور جس قدر کوئی قوم زیادہ سُودی روپیہ لے سکتی ہے اسی پر اس کی جنگ میں کامیابی کا دارومدار ہے بلکہ عرب میں بھی جنگوں کا انحصار بہت کچھ سود پر تھا کیونکہ یہ لوگ جو روپیہ جنگوں پر خرچ کرتے تھے وہ عمومًا سُود اور جوئے کی کمائی کا روپیہ ہوتا تھا۔ اسی لیے سورۃ البقرہ میں جنگوں کے ذکر میں شراب اور جوئے سے منع کیا تھا۔ تو اب جنگ کے ہی ذکر میں سود سے روکا ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان اکثر اموال المشرکین کانت قد اجتمعت من الربا و کانوا ینفقون تلک الاموال علی العساکر یعنی اکثر مال مشرکوں کے سود سے جمع ہوتے تھے اور یہی جمع شدہ مال وہ لشکروں پر خرچ کرتے تھے۔ اسلام نے جہاں ایک طرف ضرورتِ جنگ کو تسلیم کیا ہے اور ان حالات میں جب ایک قوم کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہو اُسے ضروری قرار دیا ہے۔ دوسری طرف ان تمام موجبات کو جو جنگ کے بلا ضرورت جاری رکھنے کا موجب ہو سکتے ہیں دُور یا کم کرنا چاہا ہے اب سود پر روپیہ ملتا جانے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو اشخاص برسر حکومت ہوں وہ بلا ضرورت اور بغیر قوم کی خواہش کے جنگ کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ اگر سود کو اُڑا دیا جائے تو ہر قوم صرف اس حد تک جنگ جاری رکھ سکے گی، جب تک اس کی اپنی ہستی معرض خطر میں ہو اور اس حال میں قوم کا ہر ایک ہی خواہ اپنے مال اور اپنی طاقت کو جنگ میں کامیابی حاصل کرنے پر لگائے گا لیکن اگر قوم اپنے آپ کو ایسا معرض خطر میں نہیں سمجھتی اور اپنی طاقت اور مال کو جنگ پر لگانے کے لیے تیار نہیں بلکہ وہ جنگ کو بھی محض سود سے روپیہ حاصل کرنے کا اور دوسری

وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ع۵۱۶

قوموں کو سودی روپیہ دیکر اپنے نیچے دبا کر رکھنے کا ایک ذریعہ بنانا چاہتی ہے تو یہ جنگ بلا ضرورت ہے اگر ہمدردی انسانی جنگ کی محرک ہے تو روپیہ اور طاقت اس پر بلا معاوضہ خرچ ہونا چاہیئے۔ سود پر روپیہ دینا کسی ہمدردی انسانی کے باعث نہیں ہوتا بلکہ روپیہ کمانے کی غرض سے ہوتا ہے اس لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو سمجھایا جاتا کہ تمہاری جنگوں کا صرف ایک ہی موجب ہوسکتا ہے بقائے قوم یا قیامِ امن کی ضرورت۔ سو اس ضرورت پر بتقاضائے ہمدردئی انسانی اپنے مال اور طاقت کو لگاؤ اور یہ نہ کرو کہ جنگوں کو روپیہ کمانے کا ذریعہ بنا کر بلاوجہ ان جنگوں کو طول دیتے جاؤ۔

حرمت سود کے دو موقعوں پر ذکر کرنے میں ایک بہ تعلق صدقات والفاق اور دوسرے جنگوں کے تعلق میں ایک اور حکمت بھی معلوم ہوتی ہے۔ پہلی سورت میں اصل خطاب یہود سے تھا اور یہودیوں میں سود خواری نے بخل کا مرض پیدا کیا تھا کہ وہ خیراتی کاموں پر روپیہ لگانے میں بہت مضائقہ کرتے۔ اس لیے وہاں صدقات کا ذکر کرتے ہوئے سود سے روکا۔ اور اس سورت میں عیسائی بالخصوص مخاطب ہیں اس لیے یہاں عین جنگ کے ذکر میں سود خواری سے روکا ہے۔ کیونکہ عیسائی قوم نے سود خواری سے بڑا فائدہ یہ اٹھانا تھا کہ اس کے ذریعہ سے بلا ضرورت جنگیں کر کے نسل انسانی کو تباہ کریں۔

ع۵۱۶ مسلمانوں کی کامیابی اللہ اور رسول کی اطاعت میں ہے: اس آیت میں بتایا ہے کہ اصل کامیابی تمہاری یہ نہیں کہ تم جنگ کر کے بڑی فاتح قوم بن جاؤ۔ بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر قائم رہو۔ مسلمانوں نے جنگیں کیں بڑے فاتح بھی دنیا میں بنے۔ دنیا کے مالک بھی بنے مگر جب اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت چھوڑ دی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ترقی کے اوج سے قعر مذلت میں گرے۔ اب بھی اگر وہ دنیا میں اُٹھ سکتے ہیں تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے نہ اپنی تجویز کردہ راہوں سے۔

رسول کی اطاعت شرک نہیں اور اللہ کی اطاعت میں داخل ہے: اس زمانہ میں جب مسلمانوں نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی بجائے اربابًا من دون اللہ کی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں پر رکھ لیا اور آنکھیں بند کر کے اپنے علماء اور پیروں کے پیچھے لگ گئے تو ایک گروہ نے تفریط میں مبتلا ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے جوئے کو بھی پھینک دینا چاہا اور اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کے شامل کرنے کو بھی شرک قرار دیا۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ انہوں نے شائد اطاعت اور عبادت کا مفہوم ایک لے لیا ہے۔ عبادت غیر اللہ کی خواہ نبی ہو بیشک شرک ہے لیکن اطاعت تو اولوا الامر یعنی حکام کی بھی ہوسکتی ہے پھر نبی کی اطاعت شرک کیونکر ہوگئی۔ یہ کہنا کہ رسول اللہ کی اطاعت ان آیات کے خلاف ہے ان الحکم الا للہ یقص الحق وھو خیر الفاصلین (الانعام[۶]۔ ۵۷) ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ (یوسف[۱۲]۔ ۴۰) یعنی حکم صرف اللہ کے لیے ہی ہے اور لا یشرک فی حکمہ احدا (الکھف[۱۸]۔ ۲۶) وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا صحیح نہیں اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ خود ہی یہ حکم دے کہ تم رسول کی اطاعت کرو تو پھر رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت میں داخل ہوئی اور وہ کوئی علیحدہ بات نہیں جس طرح ایک بادشاہ جب بعض وزرا کے سپرد ایک کام کر دیتا ہے یا وزرا گورنروں کے سپرد ایک کام کر دیتے ہیں علیٰ ہذا تو ان گورنروں اور وزرا کے حکم کی اطاعت بادشاہ کے حکم کی اطاعت ہی ہے سوائے اس صورت کے کہ وہ لوگ بادشاہ کے حکم کے خلاف کوئی حکم جاری کریں اسی طرح اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کرو اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (النساء[۴]۔ ۵۹) تو کیا اب اولی الامر کی اطاعت شرک میں داخل ہے اور نعوذ باللہ خدا نے خود ہی شرک کی تعلیم دی؟ نہیں بلکہ ان کی اطاعت بھی اللہ کی اطاعت ہی ہے چونکہ اسی کے حکم کے ماتحت ہے اس کی اور مثالیں بھی ہیں ایک جگہ ہے افغیر اللہ ابتغی حکما (الانعام[۶]۔ ۱۱۴) کیا میں اللہ کے سوائے کوئی حکم چاہوں۔ دوسری جگہ ہے فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا (النساء[۴]۔ ۳۵) ایک حکم مرد کے اہل سے اور ایک عورت کے اہل سے مقرر کر لو۔ خدا بھی حکم اور یہ بھی حکم، مگر چونکہ وہ خدا کے حکم کے ماتحت حکم ہیں اس لیے یہ شرک نہیں۔

اور اطیعوا اللہ والرسول کی جو تاویل کی جاتی ہے کہ یہاں واؤ تفسیری ہے اور رسول کے معنی یہاں پیغام ہیں۔ نہ پیغامبر تو اس کے لیے کوئی دلیل چاہیئے۔ لیکن نہ صرف دلیل اس کی تائید میں کوئی نہیں بلکہ کئی دلائل سے اس کا بطلان ہوتا ہے اول یہ کہ واؤ تفسیر کے لیے آیا کرتی ہے یہ دعویٰ بلا دلیل ہے جس کی کوئی سند زبان عربی میں نہیں۔ ہاں واؤ کا استعمال بعض وقت عطف علی المرادف کے لیے ہوتا ہے دیکھو مغنی اللبیب بیان واؤ یعنی دو مرادف لفظ (ایسے لفظ جن کے معنی قریبًا یکساں ہیں اور بہت باریک فرق ہے ایک دوسرے پر واؤ کے ذریعہ سے عطف ہو جاتے ہیں جیسے انما اشکوا بثی و حزنی الی اللہ (یوسف[۱۲]۔ ۸۶) میں بثّ اور حزن ایک دوسرے پر عطف ہیں مگر اللہ اور رسول کو آج تک کسی نے مرادف نہیں کہا کہ یہاں واؤ کا استعمال عطف علی المرادف کے طور پر لیا جائے۔ دوم رسول کے بہرحال دو معنی ان تاویل کنندگان کو بھی مسلّم ہیں ایک پیغامبر اور دوسرے پیغام۔ اور اللہ کے معنی ایک کے سوائے دوسرے آج تک کسی نے نہیں سُنے اور تفسیر مبہم یا ذومعنی لفظ کی واضح سے ہوا کرتی ہے نہ واضح لفظ کی مبہم سے۔ اب اللہ واضح ہے اس کی تفسیر ایسے لفظ سے جو دو معنی رکھتا ہے انسان بھی نہیں کرے گا۔ چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس بات کو منسوب کیا جائے۔ سوم اگر واضح لفظ کی تفسیر کی ضرورت ہی تھی تو ایک دفعہ تفسیر کر دینا کافی تھا۔ بار بار اس تفسیر کی کیا ضرورت تھی۔ چہارم گو لغت میں رسول کے معنی پیغام بر اور پیغام دونوں لکھے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے خود فیصلہ کر دیا جب فرمایا محمد رسول اللہ حالانکہ القرآن رسول اللہ کہیں نہیں فرمایا۔ پس جب قرآن شریف نے خود تصریح کر دی کہ رسول اللہ محمدؐ ہیں تو اس معنی کو چھوڑ کر ہم دوسرے معنی کیوں اختیار کریں۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جلدی کرو جس کی وسعت آسمانوں اور زمین (کے برابر) ہے وہ متقیوں کے لیے تیار کی گئی ہے ۵۱۷

۵۱۷ عَرْض ۔ عرض کے اصل معنی چوڑائی ہیں جو طول کے خلاف ہے اور اصل استعمال اس کا اجسام کے متعلق ہے۔ لیکن غیر اجسام میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے فذو دعآءٍ عریضٍ (حٰم السجدۃ ۴۱ - ۵۱) اور کہا گیا ہے کہ اس کے عرض سے مراد اس کی وسعت ہے مگر نہ بلحاظ مساحت کے بلکہ بلحاظ مسرت کے (رغ) اور اس کی مثال امام راغب نے یہ دی ہے کہ جیسا کہ اس کے خلاف کہہ دیا جاتا ہے الدُّنیا علیٰ فُلانٍ حَلْقَۃُ خاتمٍ دنیا فلاں پر ایک انگوٹھی کا حلقہ بن گئی ۔ یا کہا جاتا ہے وسعۃ ھذہ الدار تسعۃ الارض اس گھر کی وسعت زمین کی وسعت کی طرح ہے ۔ اور تیسرے معنی عرض کے امام راغب نے یہاں بَدَل اور عِوَض کیے ہیں یعنی اس کی قیمت زمین و آسمان ہیں۔

کیا پاک تعلیم ہے ۔ کہاں جنگوں کا ذکر اور کہاں یہ ہدایات ۔ کیا خوبی سے بتا دیا کہ جنگ کوئی اصل غرض نہیں بلکہ اصل غرض اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا حاصل کرنا ہے ۔ اس کو حاصل کرنے کے جو سامان مختلف کسی وقت میں ہوں ان کے حصول کے لیے جلدی کرنی چاہیئے اور چونکہ اوپر ذکر کیا تھا کہ نار کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے تو یہاں بتایا ہے کہ متقیوں کے لیے تو جنت تیار کی گئی ہے ۔ پس اس کے حصول کے لیے جلدی قدم اُٹھانا چاہیئے اور جیسے کافر کے لیے آگ اور متقی کے لیے تو جنت آخرت میں ہے اسی طرح اس دنیا میں بھی کافر کے دل پر آگ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

وسعتِ جنت : یہاں جنت کے متعلق فرمایا کہ اس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اس سے کیا منشا ہے بعض کے نزدیک آخرت کے آسمان اور زمین اور ہوں گے اس لیے مراد یہ ہے کہ جنت کی چوڑائی اس دنیا کے آسمان و زمین کے برابر ہو گی ۔ اور اس پر یوم تبدل الارض غیر الارض والسمٰوٰت (ابراھیم ۱۴ - ۴۸) کو بطور شہادت پیش کیا ہے (رغ) اور بعض نے اس کے معنی قیمت کر لیے ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا ۔ اور بعض نے کہا کہ یہ کلام کنایہ ہے حد درجہ کی فراخی سے (ر) گویا اتنی وسیع جنت ہو گی جو انسان کے وہم و گمان میں آ سکتی ہے ۔ مسند امام احمد حنبل میں ایک حدیث ہے کہ ہرقل نے نبی کریم صلعم کو لکھا تھا کہ آپ مجھے اس جنت کی طرف بلاتے ہیں جس کا عرض آسمان اور زمین ہیں ۔ تو پھر دوزخ کہاں ہے آپ نے فرمایا سبحان اللہ این اللیل اذا جاء النہار ۔ پاک ہے ذات اللہ کی رات کہاں ہوتی ہے جب دن آ جاتا ہے اور ابن جریر میں بھی ایسی ہی روایت ہے اور ایک روایت سے حضرت عمرؓ کا یہی جواب یہود کو دینا معلوم ہوتا ہے اور ایک میں حضرت ابن عباس نے یہی جواب ایک اہل کتاب کو دیا ۔ اور ایک روایت ابو ہریرہ سے انہی الفاظ کی ہے کہ نبی کریم صلعم نے ایسا فرمایا تھا (ث) پس اس قدر مختلف طریقوں سے یہ روایت آتی ہے کہ الفاظ قرآنی کی تفسیر میں مقدم اسی کو کرنا ہو گا ۔

مکانِ جنت کی کیفیت اس عالم کی طرح نہیں : اس مثال کی مفسرین نے عموماً یہ توجیہ کی ہے کہ جب ایک حصّہ پر دن ہوتا ہے تو دوسرے حصّہ پر رات ہوتی ہے ۔ یہ توصحیح ہے مگر اس صورت میں کوئی شخص یہ نہ کہے گا کہ دن سارے آسمان اور زمین پر محیط ہے ۔ اصل یہ ہے کہ حضرت نبی کریم صلعم نے جنت و نار کی وسعت کو سمجھانے کے لیے مکان کی بجائے کیفیت کی مثال دی ہے ۔ کیونکہ دن اور رات یا نور و ظلمت درحقیقت دو کیفیات ہیں ۔ اِس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جنت و نار کی تمام چیزوں کی کیفیات وہ نہیں جو اس عالم کی ہیں ۔ کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین (السجدۃ ۳۲ - ۱۷) اور حدیث فرماتی ہے مالا عین رأت ولا اذن سمعت و ماخطر علیٰ قلب بشر تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم اس عالم کے مکان کے تصوّر کے ماتحت جنّت و نار کو نہ لاؤ ، بلکہ اس کو سمجھانے کے لیے دو کیفیات روشنی اور تاریکی کی مثال دی ہے اور جب ہم زیادہ غور کرتے ہیں تو حق یہی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ قرآن کریم میں جو نقشہ جنت و نار کا کھینچا گیا ہے اس میں ایک طرف تو ان دونوں میں اس قدر بُعد ہے کہ فرمایا لا یسمعون حسیسھا (الانبیاء ۲۱ - ۱۰۲) اہل جنّت تو دوزخ کی آہٹ کو بھی نہ سُنیں گے ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہیں کہ دوزخ کو اپنی آنکھوں سے تو دیکھیں گے مگر اس کی آواز کو نہ سنیں گے بلکہ اصل غرض صرف اظہار بعد ہے اور دوزخ کا نظارہ آنکھ کے سامنے رہنا اس حقیقی راحت کے ساتھ کیونکر جمع ہو سکتا ہے ، جس کا اہلِ جنّت کو حاصل ہونا قرآن کریم سے صاف معلوم ہوتا ہے دوسری طرف اہلِ جنت اور اہلِ نار باہم بات چیت بھی کرتے ہیں اور دوزخ والے جنتیوں سے پانی بھی مانگتے ہیں اور دیگر نعماء کا بھی سوال کرتے ہیں اور جنتی ان کو جواب بھی دیتے ہیں پس وہ ایک دوسرے کی باتوں کو سنتے ہیں مگر اس خطرناک آگ کی آہٹ کو نہیں سنتے جس کی زفیر و شہیق کی دنیا میں کوئی نظیر ہی نہیں ۔ پھر وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں فاطلع فراٰہ فی سوآءِ الجحیم (والصّٰفّٰت ۳۷ - ۵۵) مگر آگ کی لپٹوں اور اس کی خطرناک اذیتوں کو نہیں دیکھتے اس سے معلوم ہُوا کہ اس عالمِ مکان کا وہ رنگ نہیں جو اس عالم میں ہے ۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض کے نزدیک اتنی بڑی جنت جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے وہ ایک ایک شخص کیلئے ہو گی وقیل ان الجنۃ التی عرضھا عرض السمٰوٰت والارض انما تکون للرجل الواحد لان الانسان انما یرغب فیما یصیر ملکا لہ (رغق) اس سے معلوم ہُوا کہ ہر ایک شخص کی جنّت اس قدر وسیع ہے کہ سارے آسمانوں اور زمین پر محیط ہو گی لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کے دخل سے محفوظ ہو گی کیونکہ خاص اسی کی ملک ہو گی جس طرح ہر ایک شخص اللہ تعالیٰ کی پوری پوری مغفرت کو حاصل کر سکتا ہے مگر اس کا اسے حاصل کرنا دوسرے کے لیے مانع نہیں اسی طرح ہر ایک شخص ساری جنت کو بھی حاصل کر سکتا ہے مگر اس کا اس کو حاصل کر لینا دوسرے کے حاصل کر لینے سے مانع نہیں ۔ اس کی مثالیں اس دنیا میں بھی ملتی ہیں جیسے مثلاً سورج ہم میں سے ہر ایک کا بھی ہے اور سب کا بھی ہے جو فائدہ میں اس سے اُٹھاتا ہوں وہ دوسرے کے لیے مانع نہیں ۔ اور حق تو یہ ہے کہ کچھ رنگ اس دنیا میں

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۱۳۴ ۚ

جو لوگ آسودگی اور تنگی میں خرچ کرتے ہیں اور سخت غضب کو دبا لینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ع۵۱۸

وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪

اور وہ کہ جب وہ کوئی بُرا کام کرتے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں اللہ کو یاد کرتے ہیں پھر اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں

جنت و نار کا ہر ایک کو مل جاتا ہے۔ اس سے جو کچھ ہر ایک انسان خود سمجھ سکتا ہے وہ دوسرے کو الفاظ میں سمجھا نہیں سکتا۔

ع۵۱۸ السرّاء۔ الضرّاء۔ سراء سُرور سے ہے (مادہ سر رسے ہے) اور ضراء ضرر سے ہے اور ضراء کے مقابلہ پر سراء بھی آتا ہے۔ اور نعماء بھی۔ پہلے کی مثال یہی ہے اور دوسرے کی مثال ہے۔ ولئن اذقناہ نعماء بعد ضراء۔ اور سراء حالت غناء کا نام ہے اور ضراء حالت فقر کا۔

الکاظمین۔ کظم۔ مَخْرَجُ النفس کو کہتے ہیں یعنی سانس کے مخرج کو اور کُظُوم احتباس النفس یعنی سانس کا رکنا ہے اور اس سے مراد خاموش ہونا لیا جاتا ہے اور کظم غیظ سے مراد غضب کا روکنا ہے اور کَظَمَ السقاء کے معنی ہیں مشکیزہ کو بھر کر اس کا منہ باندھ دیا تاکہ پانی باہر نہ نکلے (غ) کظم غیظ کا استعارہ بھی اسی سے لیا گیا ہے غیظ کے لیے دیکھو ع۵۰۶

خوشحالی اور تنگی میں انفاق: اس آیت میں متقیوں کے چار اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ اوّل وہ خوشحالی اور تنگی میں برابر خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ دونوں آخری حدود کے اندر تمام درمیانہ حالتیں خود ہی آجاتی ہیں اور انسان کے لیے دو حالتوں میں خرچ کرنا ہی بہت مشکل ہوتا ہے ایک جب وہ حد درجہ کے آرام اور راحت میں ہو کہ اس وقت خدا کو بھول جاتا ہے۔ اور دوسرے جب حد درجہ کی تنگی کی حالت میں ہو کہ اس وقت جو کچھ اسے ملے بمشکل اپنی ہی ضرورت پورا کرنے کے لیے مکتفی ہوتا ہے پس ان حالتوں کا ذکر کر کے بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ایسا تعلق ہونا چاہیئے کہ جب تمام طرف راحت کے ہی سامان نظر آتے ہوں اور دنیا میں انسان اپنے آپ کو کسی کا محتاج نہ سمجھتا ہو تب بھی خدا کا محتاج اپنے آپ کو جان کر اس کی راہ میں دے اور مال کی محبت پر اللہ تعالیٰ کی محبت کو ترجیح دے اور جب یہ سمجھتا ہو کہ میں اس قدر تنگدست ہوں کہ میری ضرورتوں سے کچھ نہیں بچتا تب بھی اپنی ضرورتوں کو پیچھے کر کے اور محرومی کے باوجود اپنے آپ کو محروم کرتے ہوئے خدا کی راہ میں خرچ کرے ایک حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے پوچھا کہ تم میں سے کون ہے جس کے نزدیک اپنے مال سے اپنے وارث کا مال زیادہ محبوب ہو تو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ سب کے نزدیک اپنا مال وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا نہیں بلکہ حالت اس کے برعکس ہے۔ مالک من مالک الاّ ما قدمت وما نوارثک الاّ ما اخرت (ث) تیرے مال سے کچھ بھی تیرے لیے نہیں مگر وہی جو تو آگے بھیجے اور جو تو پیچھے رکھتا ہے وہی تیرے وارث کا مال ہے۔

غضب کا دبانا: دوسری صفت کظم غیظ ہے۔ جو شخص اس بات پر قادر ہو کہ وہ غیظ یعنی سخت سے سخت غضب کو روک لے وہ گویا اپنے کل جذبات پر قادر ہو گیا۔ صحیح حدیث میں ہے۔ لیس الشدید بالصرعۃ ولکن الشدید الذی یملک نفسہ عند الغضب یعنی پہلوان وہ نہیں جو کشتی میں دوسروں کو پچھاڑ لیتا ہے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غضب کے وقت اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے (متفق علیہ) اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا من کظم غیظا وھو یقدر علی انفاذہ ملأ اللّٰہ جوفہ امنا وایمانا (ث) جو شخص سخت غضب کو روک لے درآنحالیکہ وہ اس کے نکالنے پر قدرت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے پیٹ کو امن اور ایمان سے بھر دیتا ہے اور ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان کو غضب آئے تو اس کے دبانے میں اس سے بھی مدد ملتی ہے کہ اس حالت میں وضو کرے اس سے غضب کی آگ فرو ہو جاتی ہے۔

تیسری صفت عافین عن الناس کی ہے۔ لوگوں کی خطاؤں پر درگزر کرنے والے یہاں تک کہ ان خطاؤں کو مٹا ہوا سمجھیں۔ یہ کظم غیظ سے بڑھ کر صفت ہے۔ اس لیے کہ کظم غیظ صرف غصّہ کو روک لینے کا نام ہے اور عفو یہ چاہتا ہے کہ خطا کو بالکل کالعدم سمجھا جائے اور اس پر کسی قسم کی گرفت نہ کی جائے نہ کسی قسم کے انتقام کا خیال دل میں لایا جائے۔ حدیث میں آتا ہے ثلث اقسم علیھن ما نقص مال من صدقۃ وما زاد اللّٰہ عبدا بالعفو الا عزا ومن تواضع اللّٰہ رفعہ اللّٰہ (ث) تین باتوں پر میں قسم کھاتا ہوں ایک یہ کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ جو شخص عفو کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو عزت میں ہی بڑھاتا ہے اور تیسرے یہ کہ جو اللہ کے لیے تواضع کرے اللہ اس کا رفع کرتا ہے۔

پھر خطاؤں کے عفو سے بڑھ کر محسنین کا مرتبہ ہے۔ جو کسی کی خطا پر غضب کو ہی نہیں روکتے اس سے عفو ہی نہیں کرتے بلکہ اس پر احسان بھی کرتے ہیں یہ کمال کا آخری مرتبہ ہے۔

اُحد کی جنگ میں بعض لوگوں کی غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا۔ اس لیے اب ان کو بھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ نہ صرف اپنے غصّہ کو دبا جائیں نہ صرف ان کی خطاؤں کو معاف کریں بلکہ ان پر احسان بھی کریں۔ ایسا ہی معاملہ احد کے موقع پر اور فتح مکّہ میں قریش کے ساتھ نبی کریم صلعم نے کیا۔

وَمَنۡ يَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ ۚ۟ وَلَمۡ يُصِرُّوۡا عَلٰى مَا فَعَلُوۡا وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾

اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو بخشتا ہے اور جو کر بیٹھیں اس پر اصرار نہیں کرتے درآنحالیکہ وہ جانتے ہوں ع۵۱۹

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَجَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ وَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ ﴿۱۳۶﴾

یہ لوگ ان کا بدلہ اپنے رب کی مغفرت اور باغ ہیں جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں، ان میں رہیں گے اور کام کرنے والوں کا اجر کیا ہی اچھا ہے ع۵۲۰

قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ ۙ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۱۳۷﴾

تم سے پہلے واقعات گزر چکے ہیں - پس تم زمین میں پھرو، پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہُوا ع۵۲۱

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوۡعِظَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۳۸﴾

یہ لوگوں کے لیے بیان اور متقیوں کے لیے ہدایت اور وعظ ہے ع۵۲۲

ع۵۱۹ فاحشۃ - فعل ہو یا قول جس کی قباحت بھاری ہو ع۲۰۶ ا - یہاں اوظلموا انفسہم کے بالمقابل فاحشۃ کو لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ فاحشۃ سے یہاں وہ امور مراد ہیں جن کی قباحت کا اثر دوسرے پر ہوتا ہے اور ظلموا انفسہم سے مراد وہ ذنوب ہیں جن کا بداثر دوسروں پر تو نہ ہو مگر اپنے آپ کو ہی ان کا نقصان پہنچے -

یصرّوا - صَرّ کے اصل معنی مضبوط باندھنا ہیں اور اصرار کے معنی ہیں کسی قصور پر پختہ ہو جانا اور اس میں مضبوط ہو جانا اور اس سے جدا ہونے سے رُکنا (غ) پہلی آیت کے متقی تو نہایت اعلیٰ درجہ پر ہیں - جو دوسروں کے قصوروں کو معاف کرنے والے اور ان سے احسان کرنے والے ہیں - اس آیت میں اس سے کم مرتبہ کے متقیوں کا ذکر ہے - ان سے بعض وقت کوئی بڑی قباحت والا کام سرزد ہو جاتا ہے یا اپنی ہی جان پر ظلم کرتے ہیں تو وہ استغفار کرتے ہیں - یہاں استغفار میں دونوں باتیں داخل ہیں جو کچھ کر چکے ہیں اس کے بداثرات سے بچنے کی دعا اور آئندہ ایسے گناہ میں پڑنے سے بچنے کی دعا -

ع۵۲۰ عاملین - عَمَل ہر وہ فعل ہے جو ایک جاندار قصد سے کرتا ہے - پس فعل عام ہے اور عمل خاص ہے - انسان کے سوائے دوسرے حیوانات سے بھی فعل سرزد ہو سکتا ہے مگر عمل نہیں (غ) عمل وہی ہے جو انسان کو کسی اچھے یا بُرے اجر کا مستحق ٹھہراتا ہے اور گو عمل اچھے اور بُرے دونوں پر آتا ہے مگر قرینہ صاف بتاتا ہے کہ یہاں عاملین سے مراد اچھے کام کرنے والے ہیں - آیت ۱۳۲ میں فرمایا تھا کہ مغفرت اور جنت کی طرف جلدی آؤ تو درمیان میں ان لوگوں کی صفات بیان کر کے جو مغفرت اور جنت کے حقدار ہوتے ہیں یہاں پھر ان کا اجر بیان فرمایا کہ ایسے لوگوں کو ضرور مغفرت اور جنت عطا ہوتی ہے - مغفرت کو قرآن کریم نے جنّت کے ساتھ جمع کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت ہی اعلیٰ مقام ہے - آیت کے آخر پر پھر نعم اجر العاملین لا کر بتا دیا کہ یہ عظیم الشان اجر کام کرنے پر ہی ملتا ہے -

ع۵۲۱ سنن - سُنّۃ کی جمع ہے (جس کا مادہ سنن ہے) اور سُنّۃ طریقہ کو کہتے ہیں اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے مراد آپؐ کا طریقہ ہے جس پر آپؐ چلتے تھے اور سُنّۃ اللہ کے معنی ہیں طریقۃ حکمتہٖ وطریقۃ طاعتہ (غ) یعنی اس کی حکمت کی راہ اور اس کی فرمانبرداری کی راہ اور یہاں لفظ عام ہے اور مراد اس کی سیاق عبارت سے ظاہر ہے یعنی اُمم سالقہ کی ہلاکت اور استیصال کے طریق - یا ان کے ساتھ جو واقعات گذرے اور مفضل نے یہاں مراد محض امم لی ہے کیونکہ عرب کے کلام میں سنّۃ بمعنی اُمّۃ بھی آیا ہے (ر) اور عطاء نے معنی شرائع اور ادیان لیے ہیں - پس مراد یہ ہے کہ تم سے پہلے قومیں گزر چکی ہیں یا دین ہو چکے ہیں یا واقعات ہلاکت ہو چکے ہیں - غرض سب کی ایک ہے -

المکذبین - تکذیب کے معنی کسی شخص کو جھوٹ کی طرف منسوب کرنا یعنی اسے اپنے کلام یا دعوے میں کاذب قرار دینا - خواہ وہ سچا ہو یا جھوٹا - مگر قرآن شریف میں صادق کی تکذیب پر ہی یہ لفظ بولا گیا ہے - اس لیے کوئی قرینہ نہ ہو تو مکذّب سے مراد سچائی کا جھٹلانے والا ہوگا - اس آیت سے پھر جنگ اُحد کی طرف رجوع کیا ہے اور پہلے مومنوں کو تسلی دی ہے کہ مکذبین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے - تم سے پہلے بہت مثالیں گزر چکی ہیں - اگر کوئی شخص چاہے تو زمین میں پھر کر دیکھ لے - فسیروا فی الارض میں سیر فی الارض کا امر لازمی نہیں بلکہ صرف ان کا حال معلوم کرنے کی ایک راہ بتائی ہے کہ چاہو تو زمین میں پھر کر دیکھ لو - ہر زمین میں یہی خدا کا قانون پاؤ گے کہ حق کی تکذیب کرنے والے برباد ہو گئے -

ع۵۲۲ ھذا میں اشارہ قرآن کریم کی طرف ہے یا جو کچھ کفار اور متقیوں کے متعلق بیان ہوا ہے اس کی طرف یا انجام مکذبین کی طرف بیان - بان سے ہے اور بیان کے معنی الکشف عن الشئ (غ) کسی چیز کی اصل حقیقت کا واضح کرنا - اور یہ لفظ نطق سے عام ہے کیونکہ نطق انسان سے خاص ہے اور بیان

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾
اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ
قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ
النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ
مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

اور نہ سست ہو اور نہ غمگین ہو اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو ۵۲۳

اگر تم کو کوئی زخم پہنچا ہے تو یقیناً اسی طرح کا زخم (مخالف) قوم کو (بھی) پہنچا ہے اور ان دنوں کو ہم لوگوں میں نوبت بنوبت لاتے رہتے ہیں اور تاکہ اللہ ان کو جان لے جو ایمان لائے اور تم میں سے شہید بنائے اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا ۵۲۴

کسی خاص حالت پر دلالت کرنے کو بھی کہا جاسکتا ہے اور خبر دینے کو بھی خواہ وہ بذریعہ نطق ہو یا لکھ کر یا کنایہ کے طور پر (غ) اور بیان اور ہدیٰ میں یہ فرق ہے کہ بیان عام ہے یعنی خواہ کسی قسم کا بھی اظہار معنی ہو اور ھُدیٰ خاص ہے۔ موعظۃ کے لیے دیکھو ۹۵

یہاں قرآن کریم کو یا جس حالت کا یہاں ذکر کیا ہے اسے لوگوں کے لیے کھول کر بتادینے والا کہا ہے۔ پھر اسے ہدایت کہا ہے یعنی بھلائی کی راہ بتانے والا بیان۔ یہ دونوں للناس ہیں یعنی سب لوگوں کے لیے اور بالآخر اسے متقیوں کے لیے وعظ کہا ہے۔ یعنی متقیوں کو بُری راہ سے ہٹادینے والا اور خیر کی راہ پر چلانے والا۔

۵۲۳ تھنوا۔ وَھْن سے ہے جس کے معنی ہیں کمزوری جو جسمانی بناوٹ کے سبب سے ہو یا خُلق کے (غ) وھن العظم منّی (مریم ۱۹-۴)

اِنْ بعض نے اِنْ کو اس موقعہ پر شرطیہ لیا ہے اور کہا ہے کہ یہ طرز محض زیادہ ترغیب کے لیے اختیار کی گئی ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کو کہے ان کنت ابنی فلا تفعل کذا۔ اگر تو میرا بیٹا ہے تو ایسا مت کر۔ مگر کوفیوں کے نزدیک یہاں اِنْ بمعنی اِذْ ہے یعنی جب۔ کیونکہ شرط تو ہمیشہ آئندہ کے متعلق ہوتی ہے اور یہ امر واقع ہوچکا ہے اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ مثلاً لتدخلن المسجد الحرام انشاء اللہ اٰمنین (الفتح ۴۸-۲۷) اور نبی صلعم کا قول اِنّا ان شاء اللہ بکم للاحقون پس جہاں فعل محقق الوقوع ہے وہاں اِنْ کے معنی اِذْ ہوں گے (مغنی)

جنگ اُحد میں ستّر مسلمان شہید ہوگئے اور بہت سی تکلیف ان کو پہنچی اور یہ امر طبائع میں کچھ سستی اور کمزوری پیدا کرسکتا تھا اور اس سے مسلمانوں کو غم بھی پہنچا تھا۔ تو تقویت کے لیے فرمایا کہ اس پر تم سے کوئی کمزوری ظاہر نہ ہو اور نہ اب جو کچھ ہوچکا ہے اس پر غمگین ہو۔ اور پھر ان کی تسلی کے لیے فرمایا کہ وہ جو وعدے تمہارے غلبہ کے ہیں وہ تو سچ ہوکر رہیں گے کیونکہ تم مومن ہو اور ہلاکت مکذبوں کا انجام ہے نہ مومنوں کا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جب اُحد کے دن رسول اللہ صلعم کے ساتھی دشمن کے واپس لوٹنے پر گھبرا اُٹھے اور ادھر خالد کا لشکر عقب کی طرف سے حملہ آور ہوا تو مسلمان فوج کے گھر کر بالکل تباہ ہوجانے کا خطرہ ہوگیا تو اس وقت آنحضرت صلعم نے دعا کی اللھم لا یعلنّ علینا اللھم لا قوۃ لنا الا بک اللھم لیس یعبدک بھذہ البلدۃ غیرھو لاء النفر (غنی) اے اللہ یہ ہم پر غالب نہ آئیں۔ اے اللہ ہمیں کوئی قوت نہیں مگر تیرے ساتھ۔ اے اللہ سوائے اس گروہ کے اس شہر میں کوئی تیری عبادت کرنے والا نہیں۔ اور لکھا ہے کہ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بطور تسلّی نازل کی۔

۵۲۴ قَرْحٌ۔ قَرْح اس زخم کے اثر کو کہتے ہیں جو کسی خارجی شے سے انسان کو پہنچے اور قُرْح اس کو جو داخلی شے سے ہو اور قَرح اور قُرح میں بعض وقت یہ فرق بھی کیا جاتا ہے کہ اول الذکر کا استعمال زخم پر ہوتا ہے اور دوسرے کا درد پر جو اس سے پیدا ہو (غ) اور یہاں قَرح سے مراد وہ تکلیف ہے جو مسلمانوں کو جنگ اُحد میں پہنچی۔

الایام۔ ایام۔ یوم کی جمع ہے اور اس کا اصل اطلاق تو زمانہ کی ایک مدّت پر ہی ہوتا ہے ع۳۔ مگر عرب ایام کو بمعنی وقائع یعنی واقعات بھی استعمال کرتے ہیں (ل) مثلاً کہتے ہیں ھو عالمٌ بایام العرب یعنی وہ عرب کے واقعات کا عالم ہے اسی لحاظ سے وذکرھم بایّام اللہ (ابراھیم ۱۴-۵) میں ایام اللہ سے مراد نعم اللہ ونقم اللہ لیے گئے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کی عقوبتیں۔ اور مجاہد نے اس کے معنی صرف نعم اللہ کیے ہیں (ل)

نداولھا۔ دول سے ہے اور دَوْلۃ اور دُوْلۃ گردش یا نوبت کو کہتے ہیں۔ دَوْلۃ مال میں اور دُولۃ جنگ میں اور تداول القوم کذا اسے مراد تناولوہٗ من حیث الدَّوْلۃ یعنی ایک چیز کو نوبت بنوبت لیا اور اسی سے ہے داول اللہ کذا بینھم یعنی اللہ تعالیٰ ایک شے کو نوبت بنوبت ان پر لایا۔

یعلم اللہ۔ لفظ علم کے اس استعمال کے لیے دیکھو ۱۷۹

قرآن کریم نے عموماً اللہ کے علم کو اس جگہ بیان کیا ہے جہاں مقصود اعمال کی جزا و سزا ہے۔ پس یہاں لیعلم اللہ سے مراد وہ علم بھی ہوسکتا ہے جس کا تعلق جزا و سزا سے ہے کیونکہ گو اللہ تعالیٰ کو سب موجود و غیر موجود کا علم ہے عالم الغیب والشھادۃ اس کا نام ہے۔ مگر اس کی جزا و سزا محض علم پر نہیں ہوتی بلکہ وقوع پر ہوتی ہے پس لیعلم اللہ سے مراد ہوئی تاکہ جزا دینے کے لیے جان لے اور یوں بھی معنی ہوسکتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ایسے علم

وَ لِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٤١﴾	اور تاکہ اللہ ان لوگوں کو کھرا کردے جو ایمان لائے اور کافروں کو مٹا دے ۵۲۵
اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٢﴾	کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے اُن لوگوں کو نہیں جانا جو جہاد کرتے ہیں اور (تاکہ) وہ صبر کرنے والوں کو جانے ۵۲۶
وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۪ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿١٤٣﴾ ع ۱۴ ۵	اور یقیناً تم جنگ چاہتے تھے قبل اس کے کہ اُسے ملو، سو اب تم نے اسے دیکھ لیا اور تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو ۵۲۷

کے ساتھ جان لے جو ان کو ان کے غیر سے ممیز کر دے۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ اُحد کی جنگ میں اگر تم کو کچھ تکلیف پہنچی ہے تو ویسی ہی تکلیف تمہارے دشمنوں کو بھی پہنچی ہے کیونکہ جنگ کے شروع میں کفار نے بھی نقصان اٹھایا تھا۔ یہ جنگ بدر کے متعلق نہیں ہے کیونکہ جنگ بدر کے واقعہ کو لیکر قرح مثلہ نہیں رہ جاتا بلکہ جیسا کہ خود قرآن کریم نے آگے چلکر فرمایا ہے اولما اصابتکم مصیبۃ قد اصبتم مثلیھا (آل عمران ۳-۱۶۴) جہاں دو مثلوں میں جنگ بدر اور جنگ اُحد ہیں۔

اس کے بعد ان الفاظ میں وتلك ایام نداولھا بین الناس فرمایا کہ دکھ اور تکلیفوں کے واقعات جیسے کافروں پر آتے ہیں مومنوں پر بھی آتے ہیں اور جنگوں میں ایسا ہو جاتا ہے کہ کبھی ایک فریق کو دکھ پہنچ جاتا ہے کبھی دوسرے کو۔ اس کا تعلق فتح وظفر سے کچھ نہیں۔

تکالیف کی غرض: اگر دُکھ اور تکلیفیں نوبت بہ نوبت آتی رہنے والی چیزیں ہیں تو اس کی غرض کیا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کو جو خدا پر ایمان لاتے ہیں دُکھ اور تکلیفیں پہنچیں؟ اس لیے کہ یہ دکھ اور تکلیفیں مومنوں کو منافقوں سے اور کھرے کو کھوٹوں سے الگ کرتی ہیں اور یہ ضروری ہے کہ ایسا امتیاز ہوتا رہے۔ اور مومنوں کا ایمان ظاہر ہو کر وہ اس اجر کے مستحق قرار پائیں جو ایمان پر ملتا ہے اور دوسری ضرورت یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے اور اس اعلیٰ مقام پر پہنچائے کہ وہ خدا کی راہ میں اپنی جانیں دیدیں اور جو بچ گئے وہ بھی اسی مقام پر ہیں کیونکہ اپنی طرف سے انہوں نے بھی اپنی جانیں خدا کی راہ میں دیدی تھیں گو اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا۔ اور یا شہداء سے مراد پیشرو اور امام ہے۔ یعنی تم سے یہ قربانیاں کرا کر تم کو دنیا کے لوگوں کے لیے پیشرو اور امام بنائے کیونکہ بغیر دکھوں اور تکلیفوں میں پڑنے کے اور ان میں ثابت قدمی دکھانے کے کوئی شخص لوگوں کا پیشرو اور امام نہیں بن سکتا۔

۵۲۵ یُمَحِّصَ۔ مَحَصَ کے اصل معنی ہیں ایک چیز کا ہر عیب سے جو اس میں ہو پاک کر دینا۔ سونے کا محص یا تمحیص اسے کہتے ہیں کہ جو اس میں میل ہے اُسے دُور کر کے خالص سونا بنا دیا جائے (غ)

یمحق محق کے معنی ہیں بے برکت کرنا یا کم کرنا ۳۵۳ ایک چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے یا تدریجاً کم کرنا (ض)

تکلیف سے فائدہ اُٹھانا مومن کا کام ہے: یہاں دو مزید نتائج بیان فرمائے ہیں۔ مومنوں کی تمحیص اور کافروں کی بے برکتی یا نقصان یعنی جو تکلیف مومن کو پہنچتی ہے وہ اس کے ذنوب اور عیوب سے تطہیر کا موجب ہو کر اس کی ترقی کا موجب ہوتی ہے وہ تکلیف کے آنے سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کافر چونکہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا اس لیے اس کے لیے تکلیف کا نتیجہ نقصان اور بے برکتی ہوتی ہے۔

۵۲۶ لمّا۔ اصل میں لَمْ نافیہ اور ما ہے

یہ آیت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ علم سے مراد جزا و سزا کا علم ہے کیونکہ یہاں فرمایا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے گویا تمہارے جنّت میں داخل ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اللہ تم میں سے جہاد کرنیوالوں اور صبر کرنیوالوں کو جان لے۔ اب جنت میں داخل ہونا جہاد کرنے اور صبر کرنے پر منحصر ہے، یعنی ان امور کے واقع ہونے پر۔ پس یہاں اللہ کے علم سے مراد ان چیزوں کے وقوع کا علم ہے جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جزا ملے کہ وہ لوگ جنت میں داخل ہوں۔

۵۲۷ الموت یہاں موت کا لفظ اسباب موت پر بولا گیا ہے (ج) آگے آتا ہے تم اسے دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ موت کو کوئی شخص نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں اسباب موت دیکھے جا سکتے ہیں اس لیے بھی موت سے مراد اس کا سبب یعنی جہاد اور قتل ہے اور یا موت کی تمنی سے مراد صرف خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَوَددت انی اُقتل فی سبیل اللہ ثم اُحیٰی ثم اقتل ثم احییٰ ثم اقتل میں اس

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ

اور محمد ایک رسول ہی ہے اس سے پہلے (سب) رسول مر چکے ہیں ۔ پھر اگر وہ مر جائے یا قتل کیا جائے تو کیا تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ ع۵۲۸ اور جو کوئی اُلٹے پاؤں

بات سے محبت رکھتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو سب آرزوؤں سے بہتر ہے۔

تمنون الموت سے اشارہ بعض صحابہؓ کی اس خواہش کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم کھلے میدان میں دشمن کے ساتھ جنگ کریں گے یا بعض صحابہؓ جو جنگ بدر میں رہ گئے تھے اس بات کے آرزو مند تھے کہ انہیں بھی کسی جہاد میں شامل ہونے کا موقعہ ملے۔

ع۵۲۸ محمّد اس کا مادہ حمد ہے اور یہ سب سے زیادہ مشہور اسم ہمارے نبی کریم صلعم کا ہے اور اس کے معنی ہیں الذی کثرت الخصالۃ المحمودۃ (ل) وہ جس کی قابل تعریف خصلتیں بہت بڑھی ہوئی ہوں اور محمد اور احمد ہمارے رسول مصطفےٰ صلعم کے ناموں میں سے ہیں (ل) لسان العرب میں سات نام دیئے ہیں جن کا نام ایام جاہلیت میں محمد رکھا گیا اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کے دادا عبد المطلب نے یہ نام آپ کا رکھا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ یہ نام آپ کا مجھے رویا میں بتایا گیا ہے (ر) اور حدیث متفق علیہ میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا انا محمد وانا احمد میں محمّد ہوں اور میں احمد ہوں۔ اور ایک حدیث میں ہے الم ترکیف صرف اللہ تعالیٰ عنی لعن قریش وشتمھم یشتمون مذمّماً وانا محمد کیا تم نہیں دیکھتے کہ کس طرح اللہ تعالےٰ نے مجھ سے قریش کی لعنت اور ان کی گالی گلوچ کو پھیر دیا ہے وہ اسی مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور میں محمّد ہوں۔

خلت۔ خلا کے معنی ع۲۶ و ع۱۶۹ میں بیان ہو چکے ہیں۔ لیکن جب کسی انسان کے متعلق کہا جائے خلا تو اس سے مراد اس کی موت ہوتی ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ابن الاعرابی کا قول منقول ہے خلا فلان اذا مات اور یہ ظاہر بھی ہے کیونکہ انسان کا گزر جانا یہی ہے کہ وہ اس عالم سے دوسرے عالم کی طرف انتقال کر جائے اور اس کا دروازہ موت ہی ہے اور یہاں خلت کے مقابلہ پر مات اوقتل لا کر صاف بتا دیا کہ جن کے خلا کا ذکر ہے وہ ان کا گزر جانا بذریعہ موت یا قتل ہی ہوا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ محمد رسول اللہ صلعم کا بھی ان دو طریقوں میں سے کسی ایک طریق پر گزر جانا ضروری ہے۔ پس قد خلت من قبلہ الرسل سے ثابت ہے کہ آنحضرتؐ سے پہلے رسول بذریعہ موت یا قتل گزر چکے۔ اگر کوئی تیسری صورت گزر جانے کی بھی قد خلت میں شامل ہوتی تو ضرور تھا کہ اس کا ذکر بھی خلت کے مقابلہ پر کر دیا جاتا۔ جیسے کہ مات کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہاں خبر تو مشہور صرف قتل کی ہوئی تھی۔ پس اگر پہلے رسولوں کے گزر جانے کے ساری صورتوں کا ذکر مقصود نہ ہوتا تو صرف افائن قتل کہنا چاہیئے تھا۔ اس کے ساتھ مات کہنے کی ضرورت نہ تھی۔

مات اوقتل۔ موت سے مراد موت علی الفراش ہے۔ یعنی طبعی موت اور قتل سے مراد وہ موت ہے جو کسی ایسے واسطہ سے ہو جو جسم انسانی کا ناقص ہو۔

انقلبتم۔ انقلاب۔ قلب سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کا ایک رُخ سے دوسرے رُخ کی طرف پھیرنا اور انقلاب کے معنی انصراف ہیں یعنی پھر جانا (غ)

اعقاب۔ عقب کی جمع ہے اور عقب ایڑی کو کہتے ہیں اور رجع علیٰ عقبہ کے معنی کئے ہیں انثنیٰ (غ) اُلٹا پھر گیا۔ یہی معنی انقلب علیٰ عقبیہ کے ہیں اور یہ بعینہٖ وہی خیال ہے جو ہماری زبان میں اُلٹے پاؤں پھر جانے سے ادا ہوتا ہے افائن مات اوقتل انقلبتم علی اعقابکم میں ہمزہ انکاری ہے اور انکار سے مراد انکار انقلاب علی الاعقاب ہے یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مرتد ہو جاؤ۔ اور بعض نے انقلاب علی الاعقاب سے مراد محض جنگ سے فرار لیا ہے۔ اس صورت میں اشارہ ان چند نفوس کی طرف ہے جو میدان جنگ سے بھاگ گئے تھے اور بعض نے انقلاب علی الاعقاب سے مراد صرف ایمانی کمزوری کا دکھانا لیا ہے۔ کیونکہ فرار کسی کمزوری کا نتیجہ ہی تھا اور چونکہ یہ آیت آنحضرت صلعم کی وفات کا ذکر کرتی ہے اس لیے اس میں ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے جو آنحضرتؐ کی وفات پر مرتد ہو گئے تھے۔

اُحد میں آنحضرتؐ کے قتل کی خبر کا مشہور ہو جانا: اس آیت میں جنگ اُحد کے اس نازک ترین موقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ جب تیر اندازوں کے جگہ چھوڑ دینے کی وجہ سے قریش مکہ کا رسالہ خالد کے ماتحت لشکر اسلامی کی عقب کی طرف سے حملہ آور ہوا اور بھاگتا ہوا لشکر کفار بھی لوٹا اور مسلمان پریشانی کی حالت میں ہو گئے۔ اس حالت میں نبی کریم صلعم نے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کے لیے بلند آواز سے یہ کہنا شروع کیا الیّ عباد اللہ انا رسول اللہ۔ اے اللہ کے بندو میری طرف آجاؤ میں رسول اللہ ہوں۔ اس آواز کے بلند ہوتے ہی کفار نے نہایت تندی سے آنحضرت صلعم پر حملہ کیا اور ابن قمئہ حارثی نے رسول اللہ صلعم پر ایک بڑا پتھر پھینکا جس سے آپ کے سامنے کے دانت مبارک شہید ہو گئے اور منہ اور سر زخمی ہو گیا اور یہ شخص آگے بڑھا کہ آپ کو قتل کر دے کہ مصعب بن عمیرؓ صاحب الرایۃ درمیان میں حائل ہو گئے اور خود شہید ہو کر نبی کریم صلعم کو بچا لیا اور آہستہ آہستہ رسول اللہ صلعم کے سامنے صحابہؓ کی ایک دیوار حائل ہو گئی۔ مگر آپ زخم کی شدت سے گر گئے۔ ادھر جب ابن قمئہ آپ کو قتل نہ کر سکا تو اس نے یہ خبر اُڑا دی کہ محمد رسول اللہ صلعم قتل ہو گئے اور یہ آواز سارے لشکر میں بلند ہو گئی۔ اسی واقعہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہے وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افائن مات اوقتل انقلبتم علی اعقابکم

عَلٰی عَقِبَیۡهِ فَلَنۡ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیۡـًٔا ؕ وَ سَیَجۡزِی اللّٰهُ الشّٰکِرِیۡنَ ﴿۱۴۴﴾

پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑے گا اور اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو جلد بدلہ دیگا۔

مگر صحابہؓ کے قدم میں اس خبر سے کوئی تزلزل نہیں آیا سوائے چند نفر کے جو لشکر سے کٹ جانے کی وجہ سے بھاگ گئے بلکہ ان میں وہ لوگ تھے جنہوں نے کہا، ان کان محمّد قد قتل فان ربّ محمّد حیّ لا یموت ..... فقاتلوا علیٰ ما قاتل علیه اگر محمد صلعم قتل ہو گئے ہیں تو رب محمد زندہ ہے جو کبھی نہیں مریگا سو تم بھی اس بات کے لیے جنگ کرو جس کے لیے آپؐ جنگ کرتے تھے۔

اس آیت وما محمّد اِلّا رسول قد خلت من قبله الرسل سے ایک اور اہم مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے یہ وہ آیت ہے جس سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت صلعم کی وفات پر استدلال کیا اور جس استدلال کے سامنے سارے صحابہؓ کی گردنیں جھک گئیں۔ نبی کریم صلعم کی وفات کی خبر جب شائع ہوئی تو کون مسلمان ہوگا جس کا دل چاہتا ہو کہ اس خبر پر یقین کرے۔ صحابہ کو جو آپؐ سے محبّت تھی وہ ایسی تھی کہ وہ لوگ آپ کی وفات کا کلمہ بھی منہ پر لانا پسند نہ کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عام مجمع میں یہ کہہ دیا کہ جو شخص رسول اللہ صلعم کو وفات یافتہ کہے گا میں اس کا سر اڑا دونگا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ اتنے میں آئے اور سیدھے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر میں چلے گئے۔ کپڑا چہرہ مبارک سے اٹھایا اور دیکھا کہ آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے ہیں۔ تو آپ نے واپس مسجد میں آکر ایک خطبہ پڑھا۔ جس میں آپ نے فرمایا ایها النّاس من کان یعبد محمّدًا فان محمد اقد مات ومن کان یعبد اللّٰه تعالیٰ فان اللّٰه حیٌّ لا یموت۔ اے لوگو! جو کوئی محمد (صلعم) کی عبادت کرتا تھا تو محمد (صلعم) فوت ہو گئے اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا۔ پھر آپ نے یہ آیت قرآن کریم کی پڑھی وما محمّد الا رسول قد خلت من قبله الرسل محمد صلعم ایک رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے سب رسول گزر چکے۔ اور اس سے یہ استدلال کیا کہ آنحضرت صلعم فوت ہو گئے تو سب لوگ خاموش ہو گئے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ استدلال اسی صورت میں کام دے سکتا تھا جب حضرت ابوبکر صدیق اور دیگر صحابہؓ کا یہ اعتقاد ہو کہ آنحضرت صلعم سے پہلے تمام رسول وفات پا چکے ہیں۔ کیونکہ اگر پہلے رسولوں میں سے کچھ ایسے بھی مانے جائیں کہ انہوں نے وفات نہ پائی ہو تو پھر ایک رسول کی وفات پر یہ کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اگر بعض رسولوں نے وفات پائی اور بعض نے نہیں پائی تو پھر کیوں رسول اللہ صلعم ان میں نہ ہوں جنھوں نے وفات نہیں پائی۔ ہاں اگر سب رسول ہی وفات پا چکے تو پھر آنحضرت صلعم کی وفات پر کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔ پس حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس استدلال کی صحت کے سامنے سارے صحابہ کا خاموش ہو جانا ایک قطعی شہادت اس بات پر ہے کہ وہ آنحضرت صلعم سے پہلے کل رسولوں کو وفات یافتہ مانتے تھے۔ گویا آنحضرتؐ سے پہلے کل نبیوں کی وفات پر صحابہ کا اجماع ہو گیا۔ یہ امر کہ اس سے سارے رسولوں کا وفات یافتہ ہونا ثابت ہوتا ہے مفسرین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اور تمام رسولوں کا آنحضرت صلعم سے پہلے موت یا قتل سے جنکو قرآن کریم نے بمقابلہ خلا استعمال کیا ہے گزر جانا ہی مانا ہے۔ چنانچہ بیضاوی میں ان الفاظ وما محمّد الّا رسول قد خلت من قبله الرسل کی تفسیر یوں کی ہے فسیخلو کما خلوا بالموت او القتل پس آپ بھی گزر جائیں گے جیسے وہ گزر گئے موت سے یا قتل سے جس سے سارے پہلے انبیاء کا موت یا قتل سے گزر جانا ثابت ہے۔ اور تفسیر غرائب القرآن میں ان الفاظ وما محمّد الّا رسول قد خلت من قبله الرسل میں دو دلیلیں مانی ہیں۔ جن میں سے دوسری دلیل کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے وثانیهما القیاس علےٰ موت سائر الانبیاء وقتلهم یعنی دوسری بات تمام کے تمام انبیاء کی موت یا ان کے قتل پر قیاس ہے اور تفسیر روح المعانی میں انہی الفاظ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا ہے وبیّن ان حکم النبی صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وسلم حکم من سبق من الانبیاء صلوٰت اللّٰه تعالیٰ وسلامه علیهم اجمعین فی انهم ماتوا وبقی اتباعهم متمسکین بدینهم۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہاں کھول کر بیان کر دیا ہے کہ نبی کریم صلعم کا حکم ان انبیاء کا حکم ہے جو پہلے گزر چکے سب پر اللہ کی صلوٰت اور سلام ہو اس بارہ میں کہ وہ مر گئے اور ان کے پیرو اُن کے دین پر متمسک رہے۔ اور پھر لکھا ہے فتکون جملة قد خلت الخ صفة لرسول منبئة عن کونه صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وسلم فی شرف الخلوفان خلو مشارکیه فی منصب الرسالة من شواهد خلوه لا محالة کانه قیل قد خلت من قبله امثاله فسیخلو کما خلوا۔ یعنی اس صورت میں یہ جملہ قد خلت رسول کی صفت ہوگا۔ خبر دینے والا اس بات کی کہ آنحضرت صلعم کو شرف گزر جانے کا حاصل ہے کیونکہ منصب رسالت میں جو آپ کے شریک ہیں ان کا گزر جانا لا محالہ آپ کے گزر جانے کے شواہد میں سے ہے گویا یوں کہا گیا ہے کہ اس کی مثل اس سے پہلے گزر گئے۔ پس جس طرح وہ گزر گئے اسی طرح یہ بھی گزر جائے گا۔

علاوہ ازیں اس آیت کا مقابلہ اگر ایک دوسری آیت قرآنی سے کیا جائے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر انہی الفاظ میں آتا ہے تو اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلعم سے پہلے کل رسول اس آیت کے نزول سے پیشتر مر چکے تھے اور وہ آیت یوں ہے ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبله الرسل (المائدة ۵-۷۵) مسیح ابن مریم ایک رسول ہی ہے اس سے پہلے رسول گزر چکے۔ اب اس میں شک نہیں کہ یہ آیت حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات پر استدلال کے طور پر ہے کہ جس طرح پہلے رسول گزر چکے وہ بھی گزر گئے اور یہاں جو قد خلت من قبله الرسل فرمایا تو اس پر بہرحال قریبًا سب کا اتفاق ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے تمام رسول وفات پا چکے۔ اب تعجب ہے کہ یہ آیت تو حضرت مسیح سے پہلے سارے رسولوں کے مرنے پر دلیل ہو اور بعینہٖ ایسی ہی آیت ما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل آنحضرت صلعم سے پیشتر کے تمام رسولوں پر وفات کی دلیل نہ

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ	اور کسی شخص کے لیے یہ نہیں کہ وہ اللہ کے اذن کے سوا مر جائے
كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ	موت کا وقت لکھا ہوا ہے ۵۲۹ اور جو کوئی دنیا کا بدلہ چاہتا ہے ہم
مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ	اُسکو اس سے دیتے ہیں اور جو کوئی آخرت کا بدلہ چاہتا ہے ہم اس کو
مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾	اس سے دیتے ہیں اور شکر کرنے والوں کو ہم جلد بدلہ دیں گے ۵۳۰

مانی جائے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ آیت ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل سے تو حضرت مسیح سے پیشتر تمام رسولوں کی وفات ثابت ہے مگر آیت ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل سے ایک بھی رسول کی وفات ثابت نہیں کیونکہ باقی سب تو دوسری آیت کی رُو سے مرچکے اور اس آیت کی رو سے ایک حضرت مسیح بھی نہ مرے۔

ع ۵۲۹ باذن اللہ ۔ اِذن کے معنی اجازت اور رخصت کا اعلام ہے اور علم کے معنی میں بھی آتا ہے ع ۱۲۳ اور ابو مسلم نے یہاں اذن کے معنی امر کیے ہیں (غق) اور بعض نے اس کے معنی تخلیۃ اور اطلاق یعنی چھوڑ دینا لیے ہیں اور مراد ما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ سے یہ لی ہے کہ کوئی شخص قتل کے ذریعہ سے نہیں مرسکتا سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ قاتل کو چھوڑ دے کہ وہ مقتول کو مار ڈالے (عق) گویا یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلعم پر ان لوگوں کو غالب نہیں آنے دیا کہ باوجود اسباب قتل کے جمع ہوجانے کے وہ آپ کے قتل پر مسلّط ہوجاتے۔

کتابا مؤجلا ۔ کتاب ۔ مصدر ہے جو یہاں مقدر کتب الموت کے لیے بطور تاکید لایا گیا ہے اور مؤجل کے معنی وہ جس کے لیے اجل مقرر کی گئی ہے اور اجل وہ مدّت معینہ ہے جو کسی چیز کے لیے مقرر کی گئی ہو اور عام طور پر انسان کی زندگی کی مدت معینہ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ ان الفاظ میں ان لوگوں کی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جنہوں نے یہ مشہور کیا تھا کہ آنحضرت صلعم فوت ہوگئے اور بالخصوص بعض منافقین نے یہ کہنا شروع کیا کہ ہم عبداللہ بن ابی کے ذریعہ سے ابوسفیان سے امان طلب کرینگے (حالانکہ ابوسفیان خود مکّہ کی طرف بہت دور نکل چکا تھا) اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کوئی انسان بھی اذن الٰہی کے بغیر نہیں مرتا اس لیے گو محمد رسول اللہ صلعم کی موت کے سب سامان جمع ہوچکے تھے مگر اللہ تعالیٰ کا یہ اذن نہ تھا کہ آپؐ اس وقت وفات پائیں ۔ گو الفاظ میں عمومیت ہے مگر اصل غرض آنحضرت صلعم کی حفاظت کی طرف ہی توجہ دلانا ہے ۔ بیشک ایسے اسباب اس جنگ میں جمع ہوچکے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت نہ ہوتی تو آنحضرتؐ وفات پاجاتے ۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا تھا کہ آپ کو مخالفین پر غالب کرے گا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان وعدوں کو پورا فرمایا اور آنحضرتؐ کی حفاظت فرمائی اور الفاظ کو عام کرکے یہ بتایا ہے کہ کسی شخص کو بھی نہ چاہیئے کہ جب اس کا فرض اس کو موت کے مقام پر کھڑا ہونے کے لیے بلاتا ہو تو گھبرا کر وہاں سے بھاگے ۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ اسباب موت کے جمع ہونے کے باوجود بھی اس کو بچالے۔

ع ۵۳۰ ثواب ۔ ثوب سے مشتق ہے جس کے اصل معنی دو طرح پر ہیں ۔ یعنی اول ایک چیز کا اپنی پہلی حالت کی طرف جس پر وہ تھی لوٹ آنا اسی معنی میں آتا ہے ۔ ثاب فلان الی دارہ فلاں شخص اپنے گھر کی طرف لوٹ آیا اور دوسرے معنی ہیں رجوع الشئی الی الحالۃ المقدّرۃ بالفکرۃ یعنی ایک چیز کا لوٹ کر ایسی حالت کی طرف آجانا جو اس کے لیے بروئے فکر و عقل مقدر تھی اس معنی کے لحاظ سے ثوب لباس کو کہتے ہیں کیونکہ سوت کا کاتنا اس غرض کے لیے تھا کہ اس سے کپڑا بنے اور اسی معنی میں ثوابِ عمل ہے یعنی وہ چیز جو انسان کے اعمال کے بدلہ سے اس کی طرف لوٹ کر آتی ہے اور جزا یا بدلہ کو ثواب اس خیال سے کہا جاتا ہے کہ گویا وہ اصل چیز ہی ہے ۔ چنانچہ قرآن کریم میں بعض جگہ جزا کو نفس فعل ہی قرار دیا گیا ہے جیسے فرمایا من یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ جو کوئی شخص ایک ذرہ کے برابر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لیگا اور یہ نہیں کہا کہ وہ اس کی جزا کو دیکھ لیگا (غ)

لفظ ثواب کو جزائے اعمال کے لیے اختیار کرکے فلسفۂ اعمال کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جب انسان ایک اچھا یا بُرا فعل کرتا ہے تو اس کے کرنے کے ساتھ وہ فعل ختم نہیں ہوجاتا (گو انسان ایسا ہی سمجھتا ہے کہ بس جو ہونا تھا ہوچکا ، اسی لحاظ سے عمل کو دوسری جگہ طائر کہا ہے ۔ گویا کرنے والے کے نزدیک وہ اُڑ جاتا ہے ۔ گو قرآن کریم فرماتا ہے کہ وہ اڑتا نہیں بلکہ فی عنقہ یعنی اس کے ساتھ لازم ہوجاتا ہے) بلکہ وہی فعل ایک دوسرے رنگ میں لوٹ آتا ہے اور ہر ایک نتیجہ درحقیقت اصل فعل کی ہی ایک دوسری صورت ہے۔

لفظ ثواب خیر اور شر دونوں پر استعمال ہوتا ہے گو اس کا زیادہ استعمال خیر پر ہے

اس حصّہ آیت میں دو گروہوں کا ذکر کیا ہے من کان یرید ثواب الدنیا ۔ اور من کان یرید ثواب الاٰخرۃ ۔ مفسرین نے عموماً یہاں گروہِ اوّل سے مراد تیر اندازوں کا وہ حصّہ لیا ہے جنھوں نے مال غنیمت کی خاطر نبی کریم صلعم کے حکم کے خلاف کیا اور اپنی جگہ کو چھوڑ دیا ۔ مگر میرے نزدیک اس سے مراد منافق ہیں جنکو جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اڑتی اُڑتی افواہ آنحضرت صلعم کی وفات کی مدینہ میں پہنچی تو وہ خوش ہوئے کہ وہ ساتھ نہ تھے اور ان کو وہ تکلیف نہ پہنچی جو مسلمانوں کو پہنچی ، تو ان کو بتاتا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اگر کوئی شخص دنیوی فائدہ اپنے عمل سے حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ دیدیتا ہے اور جو انجام کی بھلائی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ وہ بھی دیدیتا ہے ۔ جو انجام میں بھلائی کے لیے کوشش کرتا ہے اس کو ضرور ہے کہ ابتدا میں کچھ دُکھ اُٹھانا پڑے اور جو موجودہ وقت کی بھلائی

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾

اور کتنے نبی ہوئے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے ربّانی لوگ لڑے [۵۳۱] پھر اس وجہ سے وہ سُست نہ ہوئے جو ان کو اللہ کی راہ میں مصیبت پیش آئی اور نہ کمزور ہوئے اور نہ عاجزی اختیار کی اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے [۵۳۲]

وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

اور اُن کی بات سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ اُنھوں نے کہا ہمارے رب ہمارے گُناہ اور جو ہم سے زیادتی ہوئی ہمیں بخش دے اور ہمارے قدموں کو مضبوط رکھ اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے [۵۳۳]

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ

سو اللہ نے اُن کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا اچھا ثواب دیا اور

چاہتا ہے اس کو وہ مل جاتی ہے ۔ مگر انجام کار دکھ اٹھانا پڑتا ہے ۔

[۵۳۱] کاین ۔ بعض کے نزدیک اس میں نون اصلی ہے اور یہ لفظ بسیط خاص اسی معنی کے لیے موضوع ہے اور مشہور یہ ہے کہ یہ مرکب ہے کاف تشبیہ سے ۔ اور ایٍّ سے جو ابہام کے لیے آتا ہے اور ایٍّ کی تنوین نے نون کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس کی مثال کذا ہے جو ك اور ذا سے مرکّب ہے اور کاین بمعنی کَم ہے یعنی کتنے ۔

رِبیون ۔ رِبّی کی جمع ہے ۔ امام راغب کے نزدیک رِبّی اور رَبّانی کے ایک ہی معنی ہیں جس کے لیے دیکھو [۴۷۰] اور لسان العرب میں رِبّی کو منسوب الی الرب ہی لکھا ہے گویا ربّی اور ربّانی کے ایک ہی معنی ہیں ۔ مگر ابن عباس رضؓ سے اس کے معنی جموع یعنی جماعتیں مروی ہیں (د) اور یہی معنی فرّاء اور زجاج نے کیے ہیں (غق) اور اس صورت میں یہ رِبۃ یا ربوۃ سے مشتق ہے جس کے معنی جماعت ہیں اور ضحاک نے اس کو ایک ہزار کے ساتھ مخصوص کیا ہے مگر یہاں تعداد اور گنتی کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہیں اور اس کا ذکر لفظ کثیر میں موجود ہے بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو جنگیں کرنی پڑیں اور ان کے ساتھ بڑے بڑے ربانی لوگوں کو علماء فقہا کو بھی جنگیں کرنی پڑیں تو ان کو ان جنگوں میں تکلیفیں بھی اُٹھانی پڑیں مگر اس کا نتیجہ یہ نہیں ہُوا کہ وہ کمزور ہو گئے ہوں ۔

[۵۳۲] وھنوا ۔ وھن کے معنی بیان ہو چکے ہیں ۔ ضعفِ خُلق یا خَلق اور حدیث میں آتا ہے لا داھنا فی عزم جس کے معنی ہیں ضعیفا فی رای (ل) اور چونکہ یہاں ضعف کا الگ ذکر ہے اس لیے اس سے مراد ضعف رائے ہے یعنی ارادہ میں سُست ہو جانا ۔ لسان العرب میں فما وھنوا کے معنی بیان کیے ہیں ما فتروا وما جَبُنُوا من قتال عدوھم یعنی دشمن کی جنگ میں نہ وقفہ کیا اور نہ بزدل ہوئے ۔ استکانوا اس کے اشتقاق میں اختلاف ہے مفردات میں اس کا اشتقاق کان سے باب استفعال میں مانا ہے اور معنی تضرع ہیں یعنی عاجزی اختیار کی اور لسان العرب میں استکانۃ کا اصل سکن یا سکون سے مانا ہے اور معنی اس کے خضع و ذل ہی کیے ہیں یعنی عاجزی اور فرمانبرداری اختیار کی اور اس صورت میں تعلق اصل معنی سے ظاہر ہے اور لسان العرب میں ہے کہ اصل میں استکنوا تھا اشباع سے استکانوا ہو گیا ہے ۔ دوسری جگہ قرآن شریف میں آتا ہے فما استکانوا لربھم (المؤمنون ۲۳-۷۶) اور غرائب القرآن میں ہے وھن وہ ضعف ہے جو دل سے تعلق رکھتا ہے اور ضعف مطلق قوت جسمانی میں کمزوری ہے اور استکانۃ اس عاجزی اور ضعف کا اظہار ہے ۔

یہاں جو تین لفظ اختیار کیے ہیں یہ تین الگ الگ مراتب کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ سب سے پہلے وھن یا رائے کی سستی اور ارادہ کی کمزوری ہے جس کا تعلق گویا دشمن کی تیاری سے ہے اور اس کی جموع کثیرہ اور اس کے سامان جنگ سے ۔ دوسرا ضعف یا کمزوری کا پیدا ہو جانا ہے جس کا تعلق بعض کے قتل ہو جانے اور بعض کے زخمی ہو جانے سے ہے اور تیسرا اظہار عاجزی ہے جس کا تعلق دشمن کی آنی فتحیابی سے ۔ گویا بہر حال انسان کو دشمن کے مقابلہ پر مضبوط اور قوی رہنا چاہیئے اور دب نہیں جانا چاہیئے ۔

[۵۳۳] اسرافنا ۔ اسراف ۔ سَرَف سے ہے ۔ ہر فعل میں جو انسان کرے حد سے گزر جانے کا نام سَرَف یا اسراف ہے ۔ (غ) گو مال کے متعلق اس کے معنی کی زیادہ شہرت ہے ۔

ثبت اقدامنا ۔ لفظی معنی تو یہی ہیں کہ ہمارے قدموں کو مضبوط کر ۔ مگر مراد اس سے یہ ہے کہ دلوں سے خوف دور ہو ۔ اور ہر قسم کے خیالات فاسدہ سینوں سے نکلے رہیں (غق) قدموں کی مضبوطی کو دل کی قوت سے شدید تعلق ہے ۔

یہاں بتایا ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ سے اپنی کمزوریوں کا علاج اور خطاؤں کی معافی چاہو دوسری طرف دشمن پر نصرت کے طالب بنو ۔ اگر اپنے ہی نفسوں میں کمزوریاں بھری رہیں تو دشمن پر فتح پانے سے انسان کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے ۔

ع الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ۵۳۴

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تم اُن کی اطاعت کرو گے جو کافر ہوئے تو وہ تم کو اُلٹے پاؤں لَوٹا دیں گے، پس تم نقصان اُٹھانے والے ہو کر پھر جاؤ گے ۵۳۵

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

بلکہ اللہ ہی تمھارا مولیٰ ہے اور سب سے اچھا مددگار ہے ۵۳۶

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

ہم عنقریب اُن لوگوں کے دلوں میں رُعب ڈال دینگے جو کافر ہوئے اس لیے کہ اُنھوں نے اللہ کے ساتھ شریک بنایا ہے جس کی اُس نے کوئی سند نہیں اُتاری اور اُن کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کی کیا ہی بُری جگہ ہے ۵۳۷

ع۵۳۴ اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں کوشش کرتے ہیں اور دنیا کو دین پر قربان کر دیتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ دنیا کا ثواب بھی ضرور دیتا ہے اور آخرت کا ثواب تو نہایت اعلیٰ درجہ کا ملتا ہے۔ ان لوگوں کو یہاں محسن کہا ہے احسان کے معنی حدیث میں آئے ہیں تعبد اللہ کانك تراہ اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ اسے دیکھ رہا ہے اور جو شخص اپنے فوائد دنیوی کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیتا ہے یہاں تک کہ اپنا سر بھی خدا کی راہ میں دیدیتا ہے یا دینے کے لیے تیار ہوتا ہے وہ واقعی احسان کی اس تعریف کے نیچے آتا ہے۔

ع۵۳۵ اطاعت کفار: ان تطیعوا الذین کفروا۔ اطاعۃ کے معنی گزر چکے کسی کے امر کی پیروی کرنا ع۴۸۷ یہاں اطاعت سے مراد یا تو کافروں کے سامنے کمزور ہو کر عاجزی اختیار کر لینا اور ان کی ماتحتی قبول کر لینا ہے جیسا کہ آیت (۱۴۵) میں فرمایا تھا کہ نبی کے ساتھی ایسے کمزور نہیں ہوتے کہ دشمن کو ذرا غالب دیکھا تو فوراً اس کے آگے جھک گئے اور یہ اس لیے فرمایا کہ منافق جو راستہ سے واپس ہو گئے تھے اب اس مصیبت کو دیکھ کر اس بات پر تلے بیٹھے تھے کہ ابوسفیان مدینہ کا رُخ کرے تو فوراً اس کی اطاعت کر لیں۔ اس لیے مومنوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ان کافروں کی اطاعت کا نتیجہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ وہ دین اسلام سے تم کو پھیر دیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ولا یزالون یقاتلونکم حتیٰ یردوکم عن دینکم ان استطاعوا (البقرۃ ۲-۲۱۷) اور یا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی رائے کو دین کے بارے میں مت قبول کرو اور ان کو اپنے خیر خواہ سمجھ کر ان کے پیچھے نہ چلو۔ فیما یامرونکم بہ وفیما ینھونکم عنہ فتقبلوا رایھم فی ذٰلك (ج) اور فی الحقیقت دونوں معنی درست ہیں اگر مسلمانوں کو کفار کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے یا وہ کہیں میدان جنگ میں غالب بھی آجائیں تو مسلمانوں کو نہیں چاہیئے کہ فوراً ہمت ہار کر ان کی اطاعت قبول کر لیں اور امور دینی میں بالخصوص اور ہر حال میں کافروں کے تتبع سے بچنا چاہیئے الذین کفروا سے مراد بعض نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو لیا ہے اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ منافق مراد ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو کہا کہ اپنے بھائیوں کی طرف لوٹ جاؤ اور ان کے دین میں داخل ہو جاؤ پہلے معنی کے لحاظ سے یہ آیت دونوں پر صادق آتی ہے۔ اور حسن کا قول ہے کہ یہود و نصاریٰ مراد ہیں جو مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات ڈال کر دین اسلام سے منحرف کرنا چاہتے تھے اور یہ تطیعوا کے دوسرے مفہوم کے لحاظ سے درست ہے اور بعض نے کہا کہ یہ آیت عام ہے اور صحیح یہی ہے کیونکہ ہر زمانہ میں ہی کافر ایک یا دوسرے معنی کے لحاظ سے اسلام کے خلاف لگے رہتے ہیں۔

ع۵۳۶ آنحضرتؐ کی غیرت توحید باری کی ایک مثال: بخاری میں ہے کہ اُحد کے دن جب مسلمان بہت سا نقصان اُٹھا کر آخر پھر ایک جگہ آنحضرت صلعم کے گرد جمع ہو گئے اور آنحضرتؐ زخموں سے نڈھال ہو کر گر گئے تھے اور آپؐ کی وفات کی خبر بھی دشمنوں میں مشہور ہو چکی تھی تو ابوسفیان نے میدان سے واپس ہوتے وقت بلند آواز سے کہا کہ کیا قوم میں محمد صلعم ہیں تو آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جواب نہ دو۔ پھر اس نے کہا کیا قوم میں ابوبکر ہیں، پھر آپ نے فرمایا کہ جواب نہ دو۔ پھر اس نے کہا قوم میں عمر ابن الخطاب ہیں اور ساتھ ہی کہا اگر یہ لوگ زندہ ہوتے تو جواب دیتے۔ تب حضرت عمر نے کہا کہ ہم سب تم کو ذلیل کرنے کے لیے زندہ ہیں۔ تب ابوسفیان پکارا اُعْلُ ھبل یعنی ہبل کی جے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا اس کو جواب دو اللہ اعلیٰ و اجلّ۔ اللہ ہی سب سے بلند اور سب سے زیادہ جلال والا ہے۔ پھر ابوسفیان نے کہا لنا العُزّٰی ولا عُزّٰی لکم۔ ہمارا بُت، عزّیٰ ہے اور تمہارا کوئی عزّیٰ نہیں۔ پھر آنحضرت صلعم نے فرمایا اس کو جواب دو اور کہو، اللہ مولٰینا ولا مولیٰ لکم اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں۔ آیت کے الفاظ بل اللہ مولٰىکم میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کو توحید الٰہی کے لیے کس قدر غیرت تھی۔ جب اپنی زندگی یا موت کا سوال ہُوا تو خاموشی کا حکم دیا لیکن جب بُت کی بڑائی کی گئی تو چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر حملہ تھا اس لیے آپ نے فوراً جواب دینے کا حکم دیا اور بتایا کہ ہم یعنی مسلمان کبھی ذلیل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہمارا مولیٰ اور مددگار اللہ تعالیٰ ہی ہے اور بالآخر کافر ہی ذلیل ہونگے گو درمیان میں وہ مسلمانوں کو کچھ نقصان بھی پہنچا لیں۔

ع۵۳۷ الرُّعب۔ رُعب انقطاع ہے جو خوف سے بھر جانے سے پیدا ہو اسی لیے باعتبار بھرنے کے رَعَبْتُ الحَوْض کے معنی ہیں میں نے حوض کو بھر

وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِی

اللہ نے یقیناً اپنا وعدہ تم سے سچا کر دکھایا جب تم اس کے اذن سے اُن کو کاٹ رہے تھے ۵۳۸ یہاں تک کہ تم نے نامردی کی اور

دیا اور باعتبار انقطاع کے رَعَبْتُ السَّنَامَ کے معنی ہیں میں نے سنام کو کاٹ دیا (غ)

سلطان۔ اس کا مادہ سلط ہے۔ اور سلاطۃ کے معنی ہیں غالب آکر مضبوط ہو جانا اور اسی معنی میں سلطان آتا ہے جیسے ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطٰنا (بنی اسرائیل ۱۷-۳۳) انہ لیس لہ سلطان علی الذین اٰمنوا (النحل ۱۶-۹۹) انما سلطانہ علی الذین یتولونہ (النحل ۱۶) لاتنفذون الا بسلطان (الرحمٰن ۵۵-۳۳) (غ) اور حجۃ یعنی دلیل کو سلطان اس لیے کہا گیا ہے کہ دلوں کو وہ پکڑ لیتی ہے اور ان پر غالب آجاتی ہے لیکن اس کا تسلط بیشتر اہل علم و حکمت پر ہوتا ہے (غ)

مادی۔ أوی الی کذا کے معنی ہیں اِنْضَمَّ الیہ اس کے ساتھ یا اس کی طرف مل گیا۔

مثوی۔ ثوی سے ہے اور ثواء کے معنی ہیں استقرار کے ساتھ ٹھہرنا یا قرارگاہ بنا کر ٹھہرنا (غ)

واقعات سے ظاہر ہے کہ اُحد کے میدان میں باوجود مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچانے کے کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب تھا۔ ان کو صاف معلوم ہو گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلعم بھی زندہ ہیں ابوبکرؓ و عمرؓ بھی زندہ ہیں جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث سے ظاہر ہے جس کا ترجمہ اوپر دیا گیا ہے تاہم ابوسفیان نے جب دیکھا کہ مسلمان آنحضرت صلعم کے گرد جمع ہو گئے ہیں تو اس نے اپنی بہتری اسی میں دیکھی کہ فوراً مکّہ کی راہ لے اور یہ بھی بعض روایات میں آیا ہے کہ رستہ میں خود ان کو اپنی کرتوت پر ندامت بھی ہوئی اور انہوں نے باہم کہا کہ ہم نے اچھا نہیں کیا اور بغیر استیصال کے مسلمانوں کو چھوڑ آئے مگر پھر بھی اس رُعب کی وجہ سے لوٹ نہ سکے بلکہ اُلٹا نبی کریم صلعم نے ان کا تعاقب اگلے دن حمراء الاسد تک کیا۔ اور پھر رعب کی وجہ سے ہی تھا کہ اگلے سال باوجود وعدہ کر جانے کے ابوسفیان مقابلہ کے لیے نہ نکلا۔ اور جنگ احزاب میں جب دس ہزار آدمیوں کو ساتھ لیکر آیا تب بھی راتوں رات یہ عظیم الشان لشکر جس کے سامنے مسلمانوں کی کوئی حقیقت نہ تھی بھاگ اُٹھا۔ اور پھر اس کے بعد تو ایسے مرعوب ہوئے کہ نہ صرف خود ان کے حملوں کا انقطاع ہو گیا بلکہ جب آٹھویں سال ہجرت میں نبی کریم صلعم نے ان کی عہد شکنی کی وجہ سے دس ہزار صحابہؓ کے ساتھ چڑھائی کی تو وہ کچھ بھی مقابلہ نہ کر سکے۔ غرض ایک چھوٹی سی جماعت کے سامنے سارے ملک کا عاجز آجانا اسی رُعب خداوندی کی وجہ سے تھا۔

آنحضرتؐ کا رعب آپؐ کی خصوصیات میں سے ہے: کئی صحیح حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے اپنی جو خصوصیات دیگر انبیاء پر بیان کی ہیں ان میں آپ کے رعب کا دیا جانا بھی ہے۔ چنانچہ یہ حدیث متفق علیہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ ان میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نُصِرْتُ بالرعب مَسِیْرَۃَ شَھْرٍ میری امداد ایک مہینہ کی مسافت کے برابر رُعب سے کی گئی ہے اور یہ رعب کوئی فرضی بات نہیں۔ نبی کریم صلعم کی زندگی آپؐ کے بعد صحابہؓ کی زندگی اور ایک مدّت تک مسلمانوں کی حالت اس کا کھلا کھلا نقشہ پیش کرتی ہے حتّٰی کہ آج سے ایک صدی پیشتر تک یورپ کی عورتیں اپنے بچوں کو ترکوں کے نام سے ڈراتی تھیں گو وہ ان سے میسرت شہر کے فاصلہ سے بھی زیادہ دور رہتے تھے۔ اور آج مسلمانوں کی اس گئی گذری حالت میں بھی اکثر عیسائی مدبرین کی یہ حالت ہے کہ وہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح کمزور کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کی قوت سے ڈرتے ہیں۔ کہیں پین اسلامزم کا ایک فرضی بت بنا کر اس سے یورپ خائف ہو رہا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کی سیاسی طاقت جو کچھ ہے اس سے اتنی بڑی عظیم الشان سلطنتوں کا خائف ہونا جو کروڑوں کی تعداد میں افواج رکھتی ہیں اور جن کے آہن پوشوں ان کے ہوائی جہازوں کی سترہ انچ دہانوں کی توپوں کے سامنے مسلمان بالکل نہتے ہیں ایک مضحکہ انگیز خیال ہے۔ ایسا ہی حالانکہ مسلمان اپنے دین کی اشاعت کی طرف سے بالکل غافل ہیں اور قریباً ایک مردگی کی حالت کو پہنچے ہوئے ہیں مگر عیسائی مشنوں کو اگر کسی مذہب کا خوف ہے تو وہ اسلام ہے۔ یہ رعب حق ہے اور یہ اسی طرح رہے گا کیونکہ مخبر صادق کے الفاظ غلط نہیں ہو سکتے اور خدائی وعدہ جھوٹ نہیں ہو سکتا۔

اس رعب کی وجہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان فرما دی ہے بما اشرکوا باللہ اس لیے کہ وہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ مشرک بزدل اور کمزور ہوتا ہے کیونکہ جو شخص ادنیٰ سے ادنیٰ طاقت کے سامنے سر جھکا دینے کو تیار ہے حتّٰی کہ باد و باران کی اور دوسری ارضی و سماوی طاقتیں تو ایک طرف رہیں بیجان چیزوں جیسے پتھروں اور بتوں اور مردہ انسانوں کو بھی اپنا خدا سمجھ کر ان کی عبادت کرتا اور ان سے دعائیں کرتا ہے اس کا دل کمزور ہو جاتا ہے برخلاف اس کے ایک خدا پر ایمان رکھنے والا موحد مسلمان ایک اللہ تعالیٰ کی طاقت کو ہی اپنے اوپر سمجھتا ہے۔ باقی سارے عالم کی طاقتوں کو وہ اپنے نیچے سمجھتا ہے اس لیے چونکہ حقیقی طور پر کسی چیز سے اس کا دل خائف نہیں ہوتا وہ قوی القلب ہوتا ہے اور ساری دنیا کی مخالفت کی بھی اسے کچھ پروا نہیں ہوتی۔

ع ۵۳۸ تحسّون۔ حس سے ہے حاسّۃ اس قوت کا نام ہے جس کے ساتھ اعراض حسیہ کا ادراک ہوتا ہے۔ مفردات میں ہے کہ اَحْسَسْتُ کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک قوت حاسہ کے ساتھ ایک چیز کو پا لینا دیکھو ع ۴۴۲ اور دوسرا کسی چیز کے حاسہ کو لے لینا جس سے اس کا قتل مراد ہے اس لیے حَسَسْتُہٗ کے معنی قتلتہ آتے ہیں اور حسیس قتیل کو کہتے ہیں۔

ابتدائے جنگ میں کفار کا شکست کھا جانا اور وعدہ نصرت الٰہی کا پورا ہونا۔ یہاں سے جنگ اُحد کے واقعات کا ذکر پھر شروع ہوتا ہے تیرھویں رکوع کی ابتدا میں کہا تھا و اذ غدوت من اھلک تبوئ المؤمنین مقاعد للقتال دوسرا واقعہ وہیں فرمایا تھا اذ ھمت طائفتان منکم ان تفشلا تیسرا واقعہ تھا

الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ

حکم میں جھگڑا کیا اور نافرمانی کی اس کے بعد کہ جو کچھ تم پسند کرتے تھے تم کو دکھایا[539]۔ تم میں سے کچھ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور کچھ تم میں سے وہ تھے جو آخرت چاہتے تھے[540] پھر تم کو اُن سے ہٹا

اذ تقول للمؤمنین الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلثة آلاف من الملئکة منزلین اس کے بعد اب چوتھے واقعہ کا ذکر فرماتا ہے ولقد صدقکم اللہ وعدہ اذ تحسونھم باذنہ اور درمیان میں وعظ و نصیحت کو بیان کیا ہے اور مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرنے کا سامان اور کامیابی کی راہیں بتائی ہیں اور یوں ملائکہ کی نصرت کے وعدہ کے بعد گویا اب فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ وعدہ سچا بھی کر دکھایا۔ اور اصل غرض کو اذ تحسونھم میں بیان کیا ہے یعنی تم نے ان کو قتل کرنا شروع کیا۔ لیکن باوجودیکہ صاف فرمایا کہ تین ہزار ملائکہ سے تمہاری نصرت کریں گے اور پھر صاف فرمایا کہ وہ وعدہ بھی ہم نے سچ کر دکھایا یعنی ملائکہ کو نازل بھی فرما دیا۔ مگر یکس طرح ہوا اذ تحسونھم باذنہ جب اللہ تعالیٰ کے خاص ارادہ سے تم نے انھیں قتل کرنا شروع کیا۔ یہ نہیں کہ ملائکہ نے انھیں قتل کرنا شروع کیا بلکہ تم مسلمانوں نے قتل کرنا شروع کیا۔ گویا ملائکہ صرف معاون ہیں یا کفار کے دلوں میں رعب ڈالنے والے ہیں جیسا سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب سے ظاہر ہے اور جنگ کرنے والے کافروں کو قتل کرنے والے مسلمان ہیں۔

مسلمانوں کا کافروں کو قتل کرنا اور یہاں تک قتل کرنا کہ وہ میدان جنگ سے بھاگ اُٹھے تاریخی واقعات ہیں کفار کے لشکر کو مسلمانوں نے یہاں تک تہ تیغ کیا کہ اُن کا صاحب لواء مارا گیا، بلکہ نو آدمی جن کے ہاتھ میں یکے بعد دیگرے جھنڈا آیا سب مارے گئے اور یہ بھی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اس قدر لوگ زخمی ہو گئے تھے کہ آخر سواریوں کے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے ایک دوسرے کو پیٹھوں پر اُٹھا کر لے گئے اور کثرت سے زخمی ہو جانے کی وجہ سے ہی ان کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ باوجود مسلمانوں کے منتشر ہو جانے کے ان کا استیصال کر سکتے یا ان کو قید ہی کر لیتے اور یہ جو بعض عیسائی مورخوں نے لکھ دیا ہے کہ فی الحقیقت کوئی شکست کفار کو نہ ہوئی تھی بلکہ یہ ان کی ایک چال تھی۔ کوئی واقعہ جنگ کا اس کی تائید نہیں کرتا۔ جن کی تباہی کے لیے اس قدر سامان کر کے آئے ہوں ان کا اسی طرح میدان جنگ میں چھوڑ کر چلے جانا صاف بتاتا ہے کہ یہ چال کوئی نہ تھی بلکہ مسلمانوں کی غلطی سے خالد نے ایک فائدہ اٹھایا۔ اور صحیح روایات سے ثابت ہے کہ فی الواقع ان کا لشکر ہزیمت اُٹھا چکا تھا اور قرآن کریم نے یہ صاف دعویٰ کیا ہے۔

[539] تنازعتم۔ نزع کے معنی ہیں ایک چیز کو اس کی جائے قرار سے کھینچ لیا اور اعراض پر بھی استعمال ہوتا ہے جیسے دل سے محبت یا عداوت کے نکال دینے پر ونزعنا ما فی صدورھم من غل (الاعراف ۔ ۴۳) اور سلب یا ایک چیز کے لے لینے پر بھی استعمال ہوتا ہے جیسے تنزع الملک ممن تشاء (آل عمران۔ ۲۵) اور تنازع اور منازعة کے معنی ہیں ایک دوسرے کو کھینچنا اور مراد اس سے مخاصمت اور مجادلہ ہے یعنی ایک دوسرے سے جھگڑنا گویا ہر جھگڑنے والا دوسرے کو اپنی جگہ سے کھینچتا ہے۔

یہ جنگ کی پانچویں حالت کا ذکر ہے۔ فشلتم اور تنازعتم اور عصیتم سب میں اصل ذکر صرف تیر اندازوں کے گروہ کا ہے گو بظاہر مخاطب سب نظر آتے ہیں قرآن کریم کا یہ قاعدہ ہے کہ جب قوم کے بعض افراد کے کسی کام کا اثر کل قوم پر پڑے تو وہ کل قوم کا ہی ذکر کرتا ہے۔ جو کچھ تیر اندازوں نے کیا اس کا خمیازہ سارے مسلمانوں کو اُٹھانا پڑا اس لیے سب کو ہی مخاطب کر لیا ہے۔

تیر اندازوں کی پہلی حالت کو فشلتم سے تعبیر کیا ہے یعنی تم میں بزدلی ظاہر ہوئی۔ یہ بزدلی دشمن کے مقابلہ کے معاملہ میں نہ تھی بلکہ جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے مال غنیمت کے خیال کے سامنے رسول اللہ صلعم کے حکم کی نافرمانی تھی۔ یہ درحقیقت بڑی بزدلی تھی کہ تھوڑے سے دنیوی فائدہ کے سامنے دل کمزور ثابت ہوا۔ پھر ان کی دوسری حالت کو تنازعتم فی الامر سے تعبیر کیا ہے۔ امر سے مراد نبی کریم صلعم کا امر ہے جس میں آپ نے صاف طور پر فرمایا تھا لا تبرحوا ان رایتمونا ظھرنا علیھم فلا تبرحوا وان رایتموھم ظھروا علینا فلا تعینونا (بخاری) تم نے اپنی جگہ نہیں چھوڑنا اگر تم دیکھو کہ ہم ان پر غالب آگئے ہیں تو اپنی جگہ نہ چھوڑو اور اگر دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آگئے ہیں تو تم ہماری مدد کے لیے نہ آؤ۔ اور تنازع یوں واقع ہوا کہ جب تیر اندازوں نے دیکھا کہ دشمن بھاگ گیا یہاں تک کہ ان کی عورتیں پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا کر بھاگیں جیسا کہ شدت کے وقت کی حالت ہوتی ہے تو تیر اندازوں نے کہنا شروع کیا الغنیمة الغنیمة۔ ان کے امیر نے انہیں سمجھایا کہ رسول اللہ صلعم نے ہم کو یہ حکم دیا ہے مگر اس وقت تھوڑے سے لالچ نے حکم کی تاویل کرا دی پچاس تیر اندازوں میں سے چالیس نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ پس یہ تنازع بھی باہم تیر اندازوں کا تھا اور کوئی تنازع قطعاً ثابت نہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات تیر اندازوں کے متعلق ہیں۔ تیسری حالت ان کی یہ ہے کہ وہ نافرمانی کے مرتکب ہو گئے یعنی اپنی جگہ کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ نافرمانی کرنے والے صرف چالیس آدمی تھے۔ مگر یہاں بھی سب کے متعلق ہی فرمایا عصیتم تم نے نافرمانی کی کیونکہ ان کی نافرمانی کا اثر سب پر پڑا۔

[540] مال غنیمت کے حصول کو غرض بنانا خلاف تعلیم قرآنی ہے: ان الفاظ میں انہی تیر اندازوں کے دو گروہوں کا ذکر صاف الفاظ میں ہے من یرید الدنیا وہ گروہ ہے جو مال غنیمت کو حاصل کرنے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ گیا اور حکم کی نافرمانی کی اور من یرید الاخرة میں عبد اللہ بن جبیر اور ان کے وہ ساتھی داخل ہیں جنہوں نے اپنی جگہ کو نہیں چھوڑا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مال غنیمت کو لینا گو اسلام نے جائز رکھا ہے مگر اس کو حاصل کرنے کی غرض کو مد نظر

لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو — دیا تاکہ تمھیں امتحان میں ڈالے[541] اور یقیناً اس نے تمہیں معاف کر دیا
فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٥٢﴾ — اور اللہ مومنوں پر فضل والا ہے[542]
إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ — جب تم دور نکلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف التفات نہ کرتے
يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ — تھے اور رسول تمھیں تمھارے پیچھے بلاتا تھا[543]۔ پھر تم کو ایک غم کے

رکھنے والوں کو یرید الدنیا کا خطاب دیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے سبق ہے جو اسلام پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اس کی جنگیں مال غنیمت کو حاصل کرنے کے لیے تھیں۔ ایسی غرض کو قرآن کریم صریح الفاظ میں ایک گرا ہوا خیال قرار دیتا ہے اور جن لوگوں کے دل میں کبھی ایسا خیال آیا ان کو کیسے سخت الفاظ میں سرزنش کی ہے۔

۵۴۱ صحابہ کی جانفشانی اور شجاعت کا اظہار: یہ جنگ کی چھٹی حالت ہے جب تیر اندازوں میں جھگڑا اٹھا اور ان کا کثیر حصہ نافرمانی کا مرتکب ہوا۔ تو پہلا نقشہ اذ تحسونھم باذنہ کا یعنی مسلمانوں کے کافروں کو قتل کرنے کا بدل گیا اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کفار سے ہٹا دیا۔ یعنی پہلے کافر بھاگ رہے تھے اور مسلمان ان کو مار رہے تھے۔ اب مسلمان بھاگ رہے ہیں اور کافر ان کو مار رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف ہٹانا منسوب کیا ہے نہ اس لیے کہ خدا تعالیٰ نے زبردستی مسلمانوں کو پکڑ کر ہٹا دیا تھا بلکہ اس لیے کہ جب ایک گروہ نے غلطی کی اور اس غلطی کا خمیازہ بموجب قانون الٰہی ساری قوم کو بھگتنا پڑا تو چونکہ یہ ایک غلطی کی سزا تھی جو اللہ تعالیٰ نے دی اس لیے اس کا فاعل اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے۔ مگر یہ سزا ایک رحمت کے رنگ میں تھی اور اس کی اصل غرض جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے یہ تھی کہ تا جن لوگوں کے اندر کوئی کمالات ہیں ان کا اظہار ہو جائے اور جن کے اندر کچھ کمزوری ہے یا جن کے اندر کچھ خباثت ہے ان کی کمزوری یا خباثت ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ جانفشانی جوانمردی شجاعت اور ہمت کا اظہار جو کچھ صحابہ نے اس میدان میں کیا اس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ باوجود اس خبر کے کہ محمد رسول اللہ صلعم قتل ہو گئے وہ دشمن کے مقابلہ سے رکے نہیں اور قتال میں مصروف رہے رسول اللہ صلعم پر ابن قمئہ حملہ کرنے لگتا ہے تو مصعبؓ بن عمیر صرف رسول اللہ کو بچانے کے لیے اپنا سر کٹوا لیتے ہیں ایک شخص تلوار کا وار آنحضرت صلعم پر کرتا ہے تو طلحہؓ اپنا ہاتھ آگے کر کے کٹوا لیتے ہیں اور نبی کریم صلعم کو بچا لیتے ہیں۔ صحابہ ایک آہنی دیوار سے زیادہ مضبوط دیوار کی طرح نبی کریم صلعم کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اس آہنی دیوار میں سے جب ایک شخص گرتا ہے تو دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لیتا ہے اور دشمن اپنی سخت سے سخت کوششوں کے باوجود نبی کریم صلعم تک جن کا قتل کرنا اس کا اصل مقصد تھا پہنچنے میں ناکام رہتا ہے۔ ابو دجانہ دشمن کی طرف پیٹھ کر کے رسول اللہ صلعم کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں ان کے مقابل پر پانچ یا دس آدمیوں کے بھاگ جانے پر کیا سات سو صحابہ پر بزدلی کا الزام کوئی عقلمند دے سکتا ہے البتہ خبیث طبع منافقین اور یہودیوں کی خباثت اس سے ظاہر ہو گئی۔

۵۴۲ ولقد عفا عنکم تم کو معاف کر دیا۔ یعنی غلطی تو ایسی خطرناک تھی کہ معمولی حالات میں ایک قوم کے استیصال کے لیے کافی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ چونکہ مومنوں پر فضل کرتا ہے اس لیے اس نے اس غلطی کی پوری سزا تم پر وارد نہیں کی بلکہ عفو سے کام لیا اور تم کو استیصال سے بچا لیا۔ یہاں عفو عن الاستئصال مراد ہے (ر) اور اگر عفو گناہ مراد ہے۔ تو یہاں تیر اندازوں کی نافرمانی پر عفو کا ذکر ہے اور دوبارہ جو آیت ۱۵۴ میں ولقد عفا اللہ عنھم آتا ہے تو وہ بھاگنے والوں سے عفو کرتا ہے۔

ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے بڑے بھاری گناہوں کو جن کو کبیرہ گناہ کہنا چاہیئے۔ انسان کی بعض دوسری خوبیوں کی وجہ سے بلا توبہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کی صفات میں دوسری جگہ آتا ہے۔ غافر الذنب وقابل التوب (المؤمن ۴۰-۳) (بغیر توبہ) گناہوں کو معاف کرنے والا اور توبہ کا قبول کرنے والا۔

۵۴۳ تصعدون۔ صعد سے ہے اور صُعُود کے معنی ہیں بلند مکان میں جانا (غ) اور اصعاد (جس سے یہاں تصعدون آیا ہے) زمین میں دور نکل جانا ہے خواہ اوپر کی طرف جا رہا ہو یا نیچے کی طرف (غ) گو اس کا اصل صعود سے ہی ہے۔ یعنی بلند مقامات کی طرف جانے سے لیکن پھر صرف دور نکل جانے پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ گو اس میں صعود یعنی اوپر چڑھنے کا اعتبار نہ ہو۔ امام راغب نے اسی کو صحیح تسلیم کیا ہے اور اس کی مثال انہوں نے تعال سے دی ہے جس کی اصل علو سے ہے مگر اب اس کے معنی محض آنا ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اصعاد سے مراد ابعاد فی الارض نہیں۔ بلکہ اس سے اشارہ کیا ہے کہ جس بات کا انہوں نے قصد کیا اور جس کی طرف گئے اس میں انہوں نے علو اختیار کیا یعنی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ (غ)

تلوون۔ لوی کے اصل معنی فتل حبل یعنی رسّہ کا بٹنا ہے مگر لَوَیْتُ علیہ کے معنی ہیں عَطَفْتُ (ل) میں اس کی طرف مڑا اور حدیث میں آتا ہے لایلوی احدٌ علیٰ احدٍ جس کے معنی ابن اثیر نے کیے ہیں اس کی طرف التفات نہیں کرتا تھا اور نہ اس کی طرف پھر کر دیکھتا تھا۔

آنحضرت صلعم کی شجاعت: فی اخرٰکم سے مراد یا تو فی جماعتکم الاخری ہے یعنی تمہاری پچھلی جماعت میں گویا ایک جماعت آگے نکل گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک گروہ میں پیچھے رہ گئے تھے اور یا اس سے مراد فی ورائکم ہے یعنی تمہاری پچھلی طرف کیونکہ جاء فلان فی اٰخر الناس و اٰخرھم کے معنی ہوتے ہیں جاء خلفھم ان کے پیچھے آیا۔

لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ | بدلے (دوسرا) غم دے دیا، تاکہ تم اس پر غمگین نہ ہو جو تم سے جاتا رہا اور نہ اس (مصیبت) پر جو تمہیں پہنچی اور اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔ ۵۴۴

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً | پھر غم کے بعد تم پر امن نازل کیا (یعنی) اونگھ جس نے تم میں سے ایک گروہ

یہ جنگ کا ساتواں مرحلہ تھا کہ جب مسلمان دشمن کی زد میں آکر بھاگ اُٹھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اجتماع کے لیے بلا رہے تھے اور آواز بلند کہہ رہے تھے الیّ عباد اللہ الیّ عباد اللہ انا رسول اللہ۔ اے اللہ کے بندو! میری طرف آجاؤ میں اللہ کا رسول ہوں۔ ایسے خطرناک موقعہ پر اپنے آپ کو آگے بڑھانا اور دشمن کے حملہ کی زد میں لانا نبی کریم صلعم کی کمالِ شجاعت کو دکھاتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ آپ کو اللہ کی نصرت پر کس قدر بھروسہ تھا کہ میدانِ جنگ میں دشمن کے غلبہ کے وقت آپ سب سے آگے ہوتے اور گویا دشمن کو اپنے اوپر حملہ کرنے کے لیے بلاتے ہیں۔ یہی نقشہ آپ کی قوتِ قلبی کا میدانِ حنین میں نظر آتا ہے۔ جب مسلمانوں کی جمعیت دشمن کی تیر اندازی کی وجہ سے پریشان ہوگئی اور لوگ بالکل تاب مقابلہ نہ لاکر منتشر ہوئے ہوئے بھاگ رہے تھے تو اُس وقت آپ دشمن کی صفوں کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھ رہے تھے انا النبیّ لاکذب انا ابن عبد المطلب۔ میں نبی ہوں کوئی جھوٹ نہیں، میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔ احد کے میدان میں منتشر فوج کو جمع کرنے کے لیے آپ نے اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ اور اس طرح یہ نمونہ دکھایا کہ ایک جرنیل کو میدانِ جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو کس طرح آگے کرنا چاہیئے اور اپنے سپاہیوں کو یہ دکھانا چاہیئے کہ وہ اپنی جان کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی آواز کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے آپ کے گرد جمع ہونا شروع کیا اور ان کی منتشر جمعیت مجتمع ہوگئی۔

۵۴۴ اثابکم۔ اثاب کے معنی اصل میں جزا دینا یا ایک فعل کے نتیجہ کا لوٹا کر لانا ہے دیکھو ع۱۳۱ مگر بعض وقت صرف دینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسے اثابہ اللہ ثوابہ میں اثابہ کے معنی صرف اعطاہ ہیں (ل) یعنی اس کو دیا اور ثواب چونکہ خیر اور شر دونوں میں استعمال ہوتا ہے اس لیے غلطی کی سزا پر بھی اثابہ بولا جاسکتا ہے۔

غمًّا۔ غم کے اصل معنی ستر الشئ ہیں کسی چیز کا ڈھانک لینا اسی لیے غمام بادل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سورج کی روشنی کو ڈھانک لیتا ہے اور غم کو غم اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ لذت و سرور کو ڈھانک لیتا ہے۔

بغم۔ ب مصاحبت کے لیے ہے اور معنی یوں ہوں گے کہ تمہاری غلطی کی سزا میں ایک غم کے ساتھ دوسرا غم دیا اور یا معاوضہ کے لیے ہے اور معنی یوں ہونگے کہ ایک غم کے بدلے دوسرا غم دیا، پہلا غم تو یہ تھا کہ ان کے ہاتھ سے شکست خوردہ دشمن نکل گیا اور مسلمان مارے گئے اور زخمی ہوئے اور دوسرا غم یہ تھا کہ دشمن کا حملہ الیّ عباد اللہ کہنے پر نبی کریم صلعم پر ہو کر آپ کو سخت زخم لگے اور قریب تھا کہ آپ کو شہید کر دیا جاتا بلکہ جھوٹ طور پر آپ کے قتل کی افواہ بھی اُڑائی گئی۔

ما فاتکم۔ فوت کسی چیز کا انسان سے اس طرح دور ہو جانا ہے کہ اس کا پانا محال ہو جائے پس ما فاتکم سے مراد وہ فوائد ہیں جو مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتے رہے اور وہ فتح کے ثمرات تھے مالِ غنیمت کا ہاتھ آنا دشمن کا قید کرنا وغیرہ۔

ما اصابکم۔ مسلمانوں کی اپنی مصیبت اور ان کا زخمی ہونا اور مارا جانا ہے۔

ان الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک غم کی جگہ یا ایک غم کے ساتھ دوسرا غم تم کو دیدیا تاکہ تم غم نہ کرو نہ اس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور نہ اس پر جو تم کو مصیبت پہنچی۔ یہ جنگ احد کا آٹھواں مرحلہ ہے۔

صحابہ کی محبت آنحضرت صلعم سے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر دشمن نے اپنے حملہ کا پورا زور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈالا۔ اور قبل اسکے کہ صحابہ آپ کے گرد جمع ہوسکیں، آپ کو سخت زخم پہنچے، یہاں تک کہ آپ گر گئے۔ ادھر اس آواز نے منتشر ہوئے ہوئے مسلمانوں کو اکٹھا کر دیا۔ مسلمانوں کو پہلا غم تو یہ تھا کہ دشمن ان کے تعاقب سے بچ گیا اور اُلٹا ان کو مصیبت پہنچی مگر اب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت کو دیکھا تو وہ اپنا غم بھول گئے اور اس کی جگہ اللہ تعالےٰ نے یہ دوسرا غم دیدیا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ تا جو غنیمت تمہارے ہاتھ سے نکل گئی اور دشمن بچ کر چلا گیا اس پر تم کو افسوس نہ رہے اور نہ ہی جو دُکھ اور مصیبتیں تم کو پہنچیں ان پر کچھ افسوس ہو کیونکہ رسول اللہ صلعم سے جو محبت مسلمانوں کو تھی وہ ایسی شدید تھی کہ آپ کی تکلیف کو دیکھتے ہی اُنہیں اپنے سب غم بھول گئے۔ وہاں میدانِ جنگ میں تو مرد تھے جو رسول اللہ صلعم کو ادنیٰ تکلیف سے بچانے کے لیے اپنی گردنیں کٹوانے کو تیار تھے بلکہ اسی میں راحت پاتے تھے۔ مدینہ میں عورتوں نے اپنے رشتہ داروں اور بیٹوں بھائیوں وغیرہ کی شہادت پر افسوس نہیں کیا جب ان کو یہ معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ صلعم زندہ ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر ایک واقعہ ایک بی بی کا لکھا ہے کہ اسے خبر دی گئی کہ اس کا باپ اور اس کا بیٹا اور اس کا خاوند جنگ میں شہید ہوگئے تو اس نے دریافت کیا کیا رسول اللہ صلعم تو زندہ ہیں؟ لوگوں نے کہا ہاں۔ تو اس نے کہا کلّ مصیبۃٍ بعدک جلل۔ آپ کے بعد ہر ایک مصیبت ایک حقیر شے ہے۔ یہ وہ محبت تھی جو رسول اللہ صلعم کے ساتھ صحابہؓ مرد اور عورتوں کو تھی۔ اور درحقیقت صحابہؓ کی محبت کا نقشہ ہی اس حدیث میں کھینچا گیا ہے لا یؤمن احدکم حتّٰی اکون احبّ الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔ تم میں سے کوئی ایمان نہیں لاتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور اس کے بیٹے اور

نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

کو ڈھانک لیا[545] اور ایک گروہ کو اپنی جانوں کی فکر پڑ رہی تھی، وہ اللہ پر ناحق بدگمانی جاہلیت کی سی بدگمانی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کیا ہمارا بھی کچھ اختیار ہے، کہہ اختیار تو سب کا سب اللہ کا ہی ہے[546]۔ وہ اپنے دلوں میں وہ باتیں چھپاتے ہیں جو تجھ پر ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں اگر ہمارا بھی کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے ۔ کہہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو جن کے لیے قتل ہونا لکھا جا چکا تھا وہ ضرور اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے اور تا کہ اللہ اُسے ظاہر کر دے جو تمھارے سینوں میں ہے اور اسے خالص کر دے جو تمھارے دلوں میں ہے

سارے لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہُوں۔ اس کامل ایمان کا نقشہ صحابہ کی زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتا ہے۔
نبی کریم صلعم کا تنہا یا نو یا سات آدمیوں کے ساتھ رہ جانا احادیث سے ثابت ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی سب لوگ بھاگ گئے تھے بلکہ نبی کریم صلعم ایک طرف اکیلے رہ گئے اور فوج منتشر حالت میں تھی اور اسی حالت میں نبی کریم صلعم پر سخت حملہ ہُوا یہاں تک کہ سات آدمی انصار میں سے یکے بعد دیگرے آپ کی حفاظت میں جنگ کرتے ہوئے مارے گئے اور حضرت طلحہؓ کے جسم پر ستر سے زیادہ زخم آئے اور ان کی انگلیاں بھی کٹ گئیں۔ اور آخر میں جب ابی بن خلف نے نبی کریم پر حملہ کیا تو آپ نے اپنا نیزہ اُسے مارا اور ساتھ ہی یہ لفظ بھی فرمائے اشتدَّ غضب اللّٰہ علےٰ من قتلہ رسول اللّٰہ صلعم بیدہ فی سبیل اللّٰہ۔ اللہ کا سخت غضب اس شخص پر ہے جس کو رسول اللہ صلعم نے اپنے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں قتل کیا۔ اور کسی جنگ میں آپ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل نہیں کیا۔

ع۵۴۵ امنۃ۔ امن کی طرح مصدر ہے اور ترکیب میں انزل کا مفعول ہے۔
نعاسا۔ نعاس تھوڑی نیند کو کہتے ہیں جیسے اونگھ اور ایک قول یہ بھی ہے عبارۃ عن السُّکُوْنِ وَالْھُدُوِّ (غ) یعنی اس سے مراد سکون اور اطمینان ہے۔ یہاں نعاسًا امنۃ سے بدل واقع ہُوا ہے۔
یہ جنگ احد کا نواں مرحلہ ہے۔ مسلمان آنحضرت صلعم کے گرد جمع ہو گئے اور کفار اُن کے انتشار کو پھر اجتماع کے رنگ میں دیکھ کر میدانِ جنگ چھوڑ گئے اور مسلمان اسی میدان میں رہے اور دشمن کی طرف سے ایسے مطمئن ہوئے کہ بعض کو نیند آ گئی یا کامل سکون کی حالت وارد ہو گئی۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مسلمانوں نے گو تکلیف اُٹھائی مگر شکست نہیں کھائی۔ کیونکہ میدانِ جنگ میں وہ موجود رہے اور ایسے اطمینان کی حالت میں تھے اور دشمن کی طرف سے ایسے بےخوف کہ بعض کو نیند بھی آ گئی۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر دشمن کی طرف سے کچھ خوف و خطر ہوتا تو نیند نہ آ سکتی تھی۔ بعض احادیث میں جو یہ لفظ آتے ہیں کہ راوی کہتا ہے میدان جنگ میں مجھے اس قدر نیند آئی کہ تلوار ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ پڑتی تھی۔ اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ جب مجھے اونگھ آ رہی تھی تو میں نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سُنا۔ لو کان لنا من الامر شیٔ ما قتلنا ھٰھُنا اور مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ میں خواب میں سُن رہا ہوں (ث) ظاہر ہے کہ یہ جنگ کا خاتمہ ہے۔

ع۵۴۶ اھمتھم۔ اھمت ھَمّ سے ہے جس کے معنی غم یا حزن ہیں۔ اور جب کوئی امر تمہیں قلق و حزن میں ڈالے تو کہا جاتا ہے اھمنی الامر (ل)
یظنون باللّٰہ غیر الحق۔ غیر الحق یا مصدر کے حکم میں ہے غیر ظن الحق۔ اور ظن الجاھلیۃ اس سے بدل ہے اور یا ظن الجاھلیۃ مصدر موکد ہے اور غیر الحق یظنون کی تاکید ہے۔
ظن الجاھلیۃ میں موصوف کی اضافت اس کی صفت کے مصدر کی طرف ہے اور مراد ہے ظن المختص بالجاھلیۃ یعنی ایسا ظن جو جاہلیت سے مخصوص ہے یا حذف مضاف پر مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے اور مراد ہے ظن اھل الجاھلیۃ یعنی اہل جاہلیت کا سا ظن۔ اہل جاہلیت سے مراد مشرک لوگ ہیں کیونکہ جاہلیت کا زمانہ قبل اسلام کا زمانہ ہے۔
الامر سے مراد یا تو معاملہ ہے ...... یعنی اس معاملہ جنگ میں کچھ ہمارا دخل یا اختیار ہے اور یہی معنی میں نے اختیار کیے ہیں اور حکومت بھی بعض مفسرین

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿١٥٤﴾ — اور اللہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے ۵۴۷
اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ — وہ لوگ جنھوں نے اس دن تم میں سے پیٹھ پھیری جس دن دو گروہ (جنگ میں)
اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ — ملے شیطان نے ہی ان کی کسی کمائی کی وجہ سے ان کو پھسلانا چاہا اور یقیناً اللہ
ع وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿١٥٥﴾ ع — نے ان کو معاف کر دیا ہے اللہ بخشنے والا حلم والا ہے ۵۴۸

تے مراد لی ہے اور اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کیا وہ حکومت جس کا وعدہ محمد صلعم دیتے ہیں ہمیں مل سکتی ہے ۔ یہ خیال اس لیے پیدا ہُوا کہ اُحد میں سخت تکلیف اُٹھانی پڑی ۔

منافقوں کی چہ میگوئیاں : یہ گروہ جن کو اپنی ہی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی منافقین کا گروہ تھا جو عبداللہ بن ابیؓ کے ساتھ جنگ کے شروع ہونے سے پہلے ہی واپس ہو گیا تھا ان کو اسلام کی حفاظت سے بہت بڑھ کر اپنی فکر تھی کہ کہیں مارے نہ جائیں اس لیے وہ ساتھ شامل نہ ہوئے ۔ یظنون باللہ غیر الحق ظن الجاھلیۃ میں جس ظن کا ذکر ہے اس کی تصریح قرآن کریم نے خود دوسری جگہ فرما دی ہے جہاں منافقوں کے ایسے ہی ظنوں کا ذکر ہے بل ظننتم ان لن ینقلب الرسول والمومنون الی اھلیھم ابدا (الفتح ۴۸ : ۱۲) اُحد کی جنگ میں بھی منافقوں کو یہی خیال تھا کہ اتنے بڑے لشکر کے ہاتھ سے کھلے میدان میں مسلمان مارے جائیں گے ۔ اب جو واقعات جنگ کی خبر ان کو پہنچی تو اور بھی باتیں بنانے لگے اور کچھ اپنے مشوروں کو اہمیت دینی شروع کی یقولون ھل لنا من الامر من شیء ہمارا بھی اس معاملہ میں کچھ اختیار ہوتا یعنی اگر ہماری بات مان لی جاتی تو یہ تکلیف پیش نہ آتی ۔ عبداللہ بن ابی کا مشورہ یہ تھا کہ مدینہ میں ہی رہ کر جنگ کی جائے ۔ اب اس نے اپنے اس مشورہ کے درست ہونے پر زور دینا شروع کیا کہ اگر میری بات مان لی جاتی تو یہ مصیبت کیوں پیش آتی اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یوں دیا ہے کہ سب اختیار اللہ کا ہی ہے ۔ کیونکہ شوریٰ اسی کا حکم ہے اور شوریٰ پر عمل کر کے ہی نبی صلعم نے باہر نکلنے کا حکم دیا تھا ۔ ایک تکلیف کے ڈر سے ایک اصول کو چھوڑنا درست نہیں ۔ یہ وہ سبق ہے جو اللہ تعالیٰ نے سکھایا ہے اور یا مراد یہ ہے کہ جس حکومت میں سے تم کچھ حصہ چاہتے ہو وہ سب ہی اللہ تعالیٰ تمہیں دینے والا ہے ۔

ع ۵۴۷ مضاجع ۔ مضجع کی جمع ہے اور ضجع کے معنی لیٹ جانا یعنی اپنی کروٹ کو زمین کے ساتھ لگانا یا سو جانا ہیں ۔ پس مضجع لیٹنے یا سونے کی جگہ ہے تتجافی جنوبھم عن المضاجع (السجدہ ۳۲ : ۱۶) میں سونے کی جگہ ہی مراد ہے ۔

صحابہؓ کی جان نثاری پر قرآن کی شہادت : یہاں منافقوں کے دل میں جو خیال اٹھا اس کا ذکر کیا ہے اور اس کا جواب دیا ہے ۔ فرمایا ان کے دل میں کچھ ہے جس کو ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں یعنی دل میں اگر ہمارا کچھ اختیار ہوتا یعنی ہماری بات مان لی جاتی یا معاملہ جنگ میں ہم کو اختیار دیدیا جاتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے ۔ ما قتلنا سے مراد ان کے بعض لوگوں کا قتل ہونا ہے ۔ کیونکہ منافق ان لوگوں کے رشتہ دار ہی تھے جو میدان اُحد میں جنگ کر رہے تھے ۔ ان کی ان بیہودہ گوئیوں کا یہ جواب دیا ہے کہ جن مسلمانوں نے جان نثاری کی ہے اور خدا کی راہ میں شہید ہو گئے ہیں وہ تو خدا کی راہ میں اس طرح جان دینے کو تیار تھے کہ مدینہ میں رہ کر جنگ ہوتی تو وہ کوئی اپنے گھروں میں چھپے نہ بیٹھے رہتے ۔ بلکہ دشمن کے مقابلہ پر نکل کر جان نثاری کا سچا نمونہ دکھاتے لو کنتم فی بیوتکم سے مراد یہی ہے کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کرتے ۔ ورنہ یوں تو منافق اپنے گھروں میں ہی رہے تھے ۔ یہ بتانا مقصود ہے کہ جو شہید ہوئے انہوں نے تو جان نثاری دکھائی اور خدا کی راہ میں اپنے آپ کو قربان کر دیا جنگ یہاں ہوتی یا وہاں وہ تو اسی طرح اپنے آپ کو قربان کر دیتے اور اگر کہنے والا گروہ ان لوگوں میں سے ہو جو جنگ میں شامل تھے مگر اُن کے دلوں میں کچھ کمزوری تھی تو مراد یہ ہوگی کہ اگر تم جنگ کے لیے نہ نکلتے تو تمہاری کمزوری کے سبب سچے مومن جنگ سے نہ رُک جاتے اور قتل کفار کے لیے ضرور باہر نکل آتے اور خدا کی راہ میں جانیں دیتے مگر جو کچھ ہُوا وہ بیفائدہ نہیں ہُوا ۔

ولیبتلی اللہ ما فی صدورکم ولیمحص ما فی قلوبکم اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ بعض سینوں کے اندر مخفی تھا وہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا جن دلوں میں منافقت اور کھوٹ تھا ان کا کھوٹ ظاہر ہو گیا اور جن کے دلوں میں بعض کمزوریاں تھیں ان کی تمحیص کر دی گئی یعنی ان کی کمزوریاں دور کر دی گئیں ۔

ع ۵۴۸ استزلھم ۔ زلّ سے ہے ذلّۃ اصل میں بلاقصد پاؤں کے پھسل جانے کو کہتے ہیں اور استزلّہ کے معنی ہیں تحرّی زلّتہ (رغ) یعنی اس کی زلّۃ کا قصد کیا ۔ لفظ زلّۃ کو ان کی طرف منسوب کر کے بتایا کہ جو کچھ بھاگنے والوں سے ہوا وہ بلاقصد تھا ارادۃً وہ میدان جنگ کو چھوڑ کر نہیں بھاگے ۔ مگر ببعض ما کسبوا میں بتا دیا کہ ان کا کچھ اپنا قصور بھی تھا بعض مفسرین نے اس کو ان کی پہلی کسی غلطی پر لگایا ہے ۔

جنگ احد میں بھاگنے والے : یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو جنگ میں شامل تو ہوئے مگر میدان جنگ سے بھاگ گئے کیونکہ منافق التقی الجمعٰن سے پہلے ہی واپس چلے گئے تھے ۔ بھاگنے کے وجوہات کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ۔ جب تیراندازوں کے جگہ چھوڑ دینے کی وجہ سے کفار کا ہزیمت خوردہ لشکر لوٹا اور مسلمانوں پر حملہ آور ہوا تو مسلمانوں کی فوج بوجہ تعاقب کے پراگندہ حالت میں تھی اور یکدم ایک بڑی فوج کے حملہ کے سامنے وہ اپنی جمعیت کو قائم نہ رکھ سکے ۔ اسی حالت میں نبی کریم صلعم نے آواز دیکر لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہا ۔ مگر ایسی حالت میں سب کا جمع ہونا محال تھا بعض لوگ بالکل علیحدہ ہو گئے اور ان کے لیے اصل جمعیت کے ساتھ ملنا مشکل ہو گیا بعض ایسے لوگ میدان جنگ سے بھاگ گئے اور ان کے قدموں کو لغزش آگئی ۔ خواہ کچھ بھی واقعات ہوں میدان جنگ سے بھاگنا اللہ تعالیٰ کو مسلمانوں کے لیے پسند نہ تھا ۔ اگر [illegible]

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کافر ہوئے اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں جب وہ زمین میں سفر کرتے ہیں یا لڑائی کرتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے تاکہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں حسرت بنائے اور اللہ زندہ کرتا اور مارتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے ع۵۴۹

انتظار کرتے تو اصل جمعیت کے ساتھ مل جاتے۔ ہر ایک کمزوری کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے شیطان کی طرف ہی منسوب کیا ہے مگر ساتھ ہی اس کو ذلت کہہ کر بتا دیا کہ وہ ارادۃً نہیں بھاگے۔

ان بھاگنے والوں کی تعداد کس قدر تھی روایات میں عموماً قیاس سے کام لیا گیا ہے۔ اس لیے بعض نے کہہ دیا ہے کہ فوج کی ایک تہائی بھاگ گئی تھی اور ایک تہائی مجروح ہو گئے تھے اور ایک تہائی نبی کریم صلعم کے ساتھ رہے۔ یہ بالبداہت غلط ہے کیونکہ سات سو کی کل جمعیت مسلمانوں کی تھی۔ اگر ان میں سے صرف دو سو آدمی نبی کریم صلعم کے ساتھ رہ گئے ہوتے، تو تین ہزار کفار کی فوج ان کو میدان جنگ پر قابض چھوڑ کر مکہ واپس نہ ہو جاتی۔ بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ چودہ یا سترہ آدمی رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہ گئے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد صرف وہ آدمی ہیں جو کفار کے دوبارہ حملہ کی ابتدا میں آنحضرت صلعم کے ساتھ رہ گئے تھے۔ کیونکہ سب لوگ تعاقب میں مصروف تھے۔ امام رازی جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہی درست معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں والذی تدل علیه الاخبار فی الجملة ان نفرا منهم تولوا والعدوا فمنهم من دخل المدینة ومنهم من ذهب الی سائر الجوانب واما الاکثرون فانهم نزلوا عند الجبل واجتمعوا هناك یعنی مختلف روایتیں جس بات پر دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک نفر بھاگ گئے تھے اور دُور چلے گئے تھے اور عربی زبان میں نفر کا لفظ تین سے نو تک یا دس سے کم آدمیوں کے گروہ پر بولا جاتا ہے ان میں سے بعض مدینہ میں داخل ہوئے اور بعض دوسری اطراف میں بھاگ گئے۔ لیکن کثیر حصہ فوج کا پہاڑ کے پاس ہی رہا اور وہیں جمع ہو گئے۔ اور یہی قول قفال کا ہے جس نے ان کو نفرا قلیلا بھی کہا ہے (رغق)

بھاگنے والوں میں کون کون تھے۔ اکثر روایات میں صرف حضرت عثمانؓ کا اور ان کے ساتھ دو انصار سعد اور عقبہ کا نام پایا جاتا ہے کسی ایک آدھ ناقابل اعتبار روایت میں حضرت عمرؓ کا نام بھی ہے مگر وہ آنحضرتؐ کے ساتھ میدان جنگ میں تھے۔ چنانچہ صحیح حدیث بخاری کا حوالہ دیا جا چکا ہے جس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ میدان جنگ میں نبی کریم صلعم کے ساتھ موجود تھے بلکہ یہ بھی کہ آپ نے دشمن کے مقابلہ میں خاموش رہنا بھی گوارا نہیں کیا اور ابوسفیان کو جواب دیا کہ ہم سب تجھے ذلیل کرنے کے لیے خدا کے فضل سے موجود ہیں۔ ہاں حضرت عثمانؓ بھاگنے والوں میں سے تھے اور شیعہ اور خوارج نے یہ طعن آپ پر کیا ہے گو یہ طعن تعجب کی جگہ ہے جب اللہ خود فرماتا ہے ولقد عفا الله عنهم۔ جو کچھ بھی ان کا اس میں قصور تھا اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔ چنانچہ حضرت ابن عمرؓ کے سامنے اس طعن کا ذکر ہوا جو جواب آپ نے دیا وہی دوہرا دینا کافی ہے۔ اس جواب میں حضرت عثمانؓ کے بدر اور بیعت رضوان سے غیر حاضر ہونے کی وجوہ بھی درج ہیں۔

حضرت عثمانؓ پر طعن: عثمان بن مواہب سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا ایک شخص نے بیت اللہ کا حج کیا اس نے وہاں کئی لوگوں کو بیٹھے دیکھا اور پوچھا یہ کون لوگ بیٹھے ہوئے ہیں انہوں نے کہا قریش ہیں اس نے کہا یہ بوڑھا ان میں کون ہے انہوں نے کہا ابن عمرؓ۔ سو وہ شخص حضرت ابن عمرؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا میں آپ سے کچھ سوال کرتا ہوں کیا آپ بتلائیں گے چنانچہ اس نے کہا میں تم کو اس گھر کی حرمت کی قسم دیتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ عثمان بن عفان اُحد کے دن بھاگ گئے تھے۔ فرمایا ہاں۔ اس نے کہا کیا تم جانتے ہو کہ وہ بدر کے دن غائب تھے اور اس میں شریک نہ تھے۔ فرمایا ہاں۔ کہا کیا تم جانتے ہو وہ بیعت رضوان سے پیچھے رہ گئے اور اس میں شریک نہیں ہوئے۔ فرمایا ہاں۔ اس شخص نے کہا اللہ اکبر (گویا حضرت عثمان پر یہ مطاعن قائم کیے) ابن عمرؓ نے کہا آ میں تم کو بتاؤں اور جو کچھ تم نے پوچھا ہے اس کو کھول دوں۔ اُحد کے دن ان کا بھاگ جانا، سو میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے اُسے معاف کر دیا۔ اور بدر کے دن ان کا غیر حاضر ہونا۔ سو بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کی صاحبزادی ان کے گھر میں تھیں اور وہ بیمار تھیں۔ سو نبی صلعم نے (ان کو تیمارداری کا حکم دیا اور) فرمایا کہ تم کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا ایک شخص کو جو اس جنگ میں شریک ہوگا اور ایک آدمی کا حصّہ بھی مال غنیمت سے ملیگا۔ اور آپ کا بیعت رضوان سے غیر حاضر ہونا۔ سو بات یہ ہے کہ اگر عثمان سے زیادہ کوئی عزت اور شان والا مکہ میں ہوتا تو آنحضرت صلعم اسی کو مکہ والوں کی طرف بھیجتے سو آپ نے عثمان کو ہی بھیجا اور بیعت رضوان حضرت عثمان کے مکہ کو جانے کے بعد ہوئی۔ پس آنحضرت صلعم نے اپنا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر مار کر فرمایا یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور اسے عثمان کی بیعت قرار دیا۔ اب اور ان باتوں کو ساتھ لے جا یعنی یاد رکھ۔

ع۵۴۹ لاخوانهم۔ ل تعلیل کے لیے ہے۔ یعنی لاجل اخوانهم اپنے بھائیوں کی خاطر۔ یا بمعنی فی یعنی ان کی بابت۔

ضربوا فی الارض کے لیے دیکھو ع۸۸ یہاں مراد زمین میں سفر تجارت یا طلب معاش کے لیے ہے۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾	اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کیے جاؤ یا مرجاؤ تو اللہ کی مغفرت اور رحمت یقیناً اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔
وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾	اور اگر تم مرجاؤ یا قتل کیے جاؤ تو یقیناً اللہ کی طرف ہی اکٹھے کیے جاؤ گے۔ ع۵۵۰

غُزًّی۔ غاز کی جمع ہے جو غزا سے ہے اور غزوہ کے معنی ہیں دشمن کی جنگ کے لیے نکلنا (غ) غاز کے جو معنی مشہور ہیں کہ جو شخص کسی غیر مسلم کو قتل کردے یا اس کے قتل کے لیے نکلے یہ صحیح نہیں بلکہ غازی وہ ہے جو دشمن کی جنگ کے لیے نکلے۔

لیجعل اللہ ذٰلک حسرۃ۔ لام عاقبت ہے یعنی ان کا ایسی باتیں کرنے کا نتیجہ سوائے حسرت کے کچھ نہیں۔ اور یا یہ لام لاتکونوا کالذین کفروا کے متعلق ہے۔ یعنی تمہارا ان جیسے نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ کافروں کے دلوں میں ایک حسرت رہے گی کہ یہ ہم سے کس طرح بڑھ گئے۔

مسلمانوں کو موت سے خائف نہ ہونا چاہیئے: اس آیت میں الذین کفروا کون ہیں یا تو یہ لفظ عام ہیں اور واقعی کافر مراد ہیں وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں ان کے بھائی بند جب تجارت کے لیے یا دشمن کے ساتھ جنگ کے لیے نکلتے اور مارے جاتے تو ان کو افسوس ہوتا کہ کاش وہ باہر نہ نکلے ہوتے اور ہمارے پاس ہی رہتے، تو موت سے بچ جاتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ محض ایک حسرت ان کے دل میں رہ جاتی ہے جس کا فائدہ کچھ نہیں۔ کیونکہ ایسا کہنے سے کہ یوں کرتے تو ایسا ہوتا فائدہ کچھ نہیں۔ باقی رہی موت و حیات سو وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے نہ گھر میں بیٹھنے والے سب موت سے بچے رہتے ہیں نہ باہر نکلنے والے سب مرجاتے ہیں مسلمانوں کو منع کیا ہے کہ تم ایسے نہ ہوجاؤ، بلکہ زمین میں تجارت یا طلب معاش کے لیے سفر کرنے یا دشمن کی جنگ کے لیے نکلنے میں موت کا خوف کبھی تمہارے لیے روک نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ کمزوردلوں کی باتیں ہیں جس کام کا کرنا ضروری ہے، خواہ اس میں موت آئے اس کو کرنا چاہیئے۔ بات بات میں موت سے ڈرنے والے کمزور دل ہوتے ہوتے آخر نکمّے ہوجاتے ہیں۔ آج یہی حالت کثیر حصّہ مسلمانوں کی ہے کہ موت سے ڈرتے گھروں سے باہر نہیں نکلتے حالانکہ ذلّت کی زندگی موت سے بدتر ہے اور واللہ یحیی و یمیت میں اس طرف اشارہ بھی ہے کہ حقیقی احیاء و امانت سانس آنے یا نہ آنے کا نام نہیں بلکہ جو لوگ تجارتوں کے لیے طلب معاش کے لیے خدا کے دین کو پھیلانے کے لیے دشمن کی جنگ کے لیے موت کو قبول کرکے نکل پڑتے ہیں ان کو کامیابی کی زندگی دی جاتی ہے اور جو موت کے خوف سے چھپ کر گھروں کے اندر بیٹھ رہتے ہیں وہ جہالت اور ذلّت کی موت میں رہتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے ان لم تقتلوا تموتوا والذی نفسی بیدہ لالف ضربۃ بالسیف اھون من موت علیٰ فراش یعنی اگر تم قتل نہ کیے جاؤ گے تو مرجاؤ گے اور قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تلوار کی ہزار ضرب بستر پر مرنے سے آسان تر ہے۔

اور یا الذین کفروا سے مراد منافق ہیں۔ منافقوں کو بعض جگہ الذین اٰمنوا میں داخل کیا گیا ہے اور بعض جگہ ان کو الذین کفروا سے یاد کیا گیا ہے اور اکثر اوقات ایک علیٰحدہ گروہ قرار دیا گیا ہے اور اگلی ایک آیت میں ان کے متعلق ہے کہ وہ بہ نسبت ایمان کے کفر سے قریب تر ہیں اور کہیں آتا ہے اٰمنوا ثم کفروا ایمان بھی لاتے ہیں کفر بھی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظاہر میں ایمان لاتے اور دل میں کافر تھے لیکن چونکہ شریعت کا تعلق ظاہر سے ہے اس لیے مسلمانوں کو ان سے مسلمانوں کی طرح ہی سلوک کرنے کا حکم تھا مگر غزوۂ تبوک کے بعد بحکم الٰہی نبی کریم صلعم نے چند آدمیوں کو مسجد سے نکال دیا کیونکہ انہوں نے اپنی اصلاح آخر تک نہ کی۔ اب مسلمان جو جنگ اُحد میں مقتول ہوئے (یا جو جب تجارت وغیرہ کے لیے نکلتے تو دشمن انہیں مار ڈالتے) تو ان کی نسبت منافقین نے یہ کہنا شروع کیا کہ اگر وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتے یعنی جس طرح سے ہم جنگ سے واپس آگئے تھے وہ بھی واپس آجاتے تو مارے نہ جاتے اور اخوان ان کو اس لیے کہتے تھے کہ قرابت میں وہ ان کے بھائی بند ہی تھے۔

ع۵۵۰ آیت ۱۵۶ و ۱۵۷ کا مضمون ملتا جلتا ہے اور جو کچھ پچھلی آیت میں فرمایا تھا اسی کی تائید ہے یعنی موت سے انسان کو خائف نہیں ہونا چاہیئے، مگر دونوں آیتوں میں ایک باریک فرق نظر آتا ہے آیت ۱۵۷ میں فرمایا اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کیے جاؤ یا مرجاؤ اور یہاں مرجانے سے مراد بھی اللہ کی راہ میں ہی مرجانا ہے کیونکہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہوا انسان قتل بھی ہوجاتا ہے اور مر بھی جاتا ہے اور گو قتل ہمیشہ تھوڑے ہی ہوتے ہیں اور اکثر اللہ کی راہ میں کام کرتے ہوئے معمولی موت سے ہی مرتے ہیں جیسا کہ صحابہؓ میں بھی گو بہتیرے قتل ہوئے مگر پھر بھی کثیر حصّہ معمولی موت سے عالمِ جاودانی کی طرف انتقال کرگیا۔ تاہم خدا کی راہ میں قتل ہونا چونکہ ایک عظمت کا مقام ہے اور چونکہ منافق زیادہ تر اسی سے ڈرتے تھے اور کمزور دل کو بھی قتل کا ہی زیادہ خوف ہوتا ہے اس لیے یہاں قتل کو مقدم کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ کی راہ میں کام کرتے ہوئے قتل ہوجاؤ یا مرجاؤ، تو زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ دنیا کا مال و دولت جمع کرنے میں کمی رہ جائے گی۔ سو یہ مال و دولت جس کو انسان جمع کرتا ہے کیا چیز ہے۔ اس سے بہت بڑھ کر اللہ کی مغفرت اور رحمت ہے جس کو خدا کی راہ میں کام کرنے والا پاتا ہے اس لیے مما یجمعون کی نسبت کفار کی طرف کی ہے کیونکہ مال و دولت کے جمع کرنے پر گرا رہنا یہ دنیا پرست کا کام ہے جسکو آخرت پر ایمان نہ ہو۔ اور آیت ۱۵۸ میں ترتیب لفظی کو بدل دیا ہے اور فی سبیل اللہ کا لفظ

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ
فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ
فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ
فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ

سو اللہ کی رحمت سے تو ان کے لیے نرم ہے - اور اگر تو سخت کلام، سخت دل ہوتا تو تیرے اردگرد سے بکھر جاتے ۵۵۱ پس ان کو معاف کر اور ان کے لیے بخشش مانگ اور معاملات میں اُن کا مشورہ لے - پھر جب پختہ ارادہ کر لے تو اللہ پر ہی بھروسہ

بھی اُڑا دیا ہے تو اس میں یہ بتایا ہے کہ اگر خدا کی راہ میں کام نہ کرو گے تو پھر بھی تو آخر مرو گے اور کچھ نہ کچھ قتل بھی ہو گے تو آخر معاملہ تو اللہ سے ہی پڑنا ہے اور اسی کے حضور تمہیں اکٹھا کیا جانا ہے یہ مال و دولت تو بہرحال ساتھ نہیں جائے گا۔

ع۵۵۱ فبما - ما تو مزید تاکید کے لیے ہے اور یا استفہامیہ تعجب کے لیے ہے یعنی کس قدر رحمت الٰہی ہے جو تم ان کے لیے نرم ہو۔

لنت - لین خشونت کی ضد ہے اور ان کا استعمال اوّلاً اجسام میں ہی ہے - پھر اخلاق پر بھی یہ لفظ بولے جاتے ہیں۔

فظ - فظظ کلام میں خشونت کو کہتے ہیں - اور فظّ سخت گو ہے یعنی کلام میں سختی کرنے والا (ل) اور فظّ کریہ الخُلق کو بھی کہتے ہیں (غ) یعنی بدخو کو۔

غلیظ القلب - غِلْظَۃ اور خشونت کے ایک ہی معنی ہیں - فظ اور غلیظ القلب میں فرق یہ ہے کہ فظّ بدخلق ہے جو دوسروں سے بری طرح پیش آئے اور غلیظ القلب وہ سخت دل ہے جس کا دل دوسرے کی مصیبت سے متاثر نہ ہو اور دوسروں کے لیے اس کے دل میں رقت محبّت اور ہمدردی پیدا نہ ہو گو وہ ان کے ساتھ سختی نہ کرے۔

انفضّوا - فض اصل میں کسی چیز کے توڑنے کو اور اس کے اجزا میں تفریق کرنے کو کہا جاتا ہے (غ) اور اسی سے انفضّ القوم استعارہ کے رنگ میں لیا گیا ہے۔ اور فضّ کے معنی ہیں لوگوں کے حلقہ کو ان کے اجتماع کے بعد پراگندہ کر دینا (ل) پس انفضوا کے معنی ہوئے اس طرح پراگندہ ہو گئے۔

آنحضرتؐ کی لینت : اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق لینت اور عفو کی طرف توجہ دلائی ہے - پچھلے رکوع کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا تھا کہ جو لوگ بھاگ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا اور درمیان میں ایک نصیحت کرتے ہوئے اب نبی کریم صلعم کے عفو کا ذکر فرمایا - لکھا ہے کہ جو لوگ اُحد کی جنگ میں بھاگ گئے تھے ان کے ساتھ نبی کریم صلعم نے کسی طرح کی سختی نہیں کی نہ کسی کو درشت لفظ کہا بلکہ محبّت بھرے کلام میں ان سے گفتگو کی - محبّت سے صرف اتنے الفاظ فرمائے لقد ذھبتم فیھا عریضۃ تم تو بہت دور نکل گئے اور جب حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کی بی بی کے سامنے حضرت عثمانؓ کے متعلق کچھ سخت لفظ کہے تو آنحضرت صلعم نے حضرت علیؓ کو روک دیا اور ان کی بات کو ناپسند کیا - سو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلعم کے خلق لینت کے کمال کو ظاہر فرمایا ہے - آنحضرتؐ کی ذات بابرکات میں ہر قسم کے اخلاق فاضلہ اعلیٰ سے اعلیٰ پایہ کے پائے جاتے تھے - جیسا کہ آیۂ کریمہ انک لعلی خلق عظیم (القلم ۶۸-۴) اس پر شاہد ہے - ان اخلاق کا ذکر قرآن کریم میں مختلف موقعوں پر آتا ہے - یہاں آپ کے خلق لینت کے کمال کو دکھایا گیا ہے۔

آپ کے اخلاق اور خُلق لینت کا کمال : ہر ایک خُلق کا اظہار کامل رنگ میں اس وقت ہوتا ہے جب اس کے اظہار کے مخالف موقعہ ہو - جنگ کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس میں نرمی کے اظہار کا موقعہ نہیں ہوتا - بلکہ انسان کے اندر جس قدر شدت ہے اس کا اظہار جنگ میں پورے زور کے ساتھ ہوتا ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ جب اُن احکام کی تعمیل میں جو کسی فوج کو دیئے گئے ہوں فروگذاشت ہو یا ان احکام کی تعمیل نہ ہو تو پھر قواعد جنگ اس امر کے مقتضی ہوتے ہیں کہ سخت سے سخت سزا دی جائے - پس اوّل تو موقعہ اظہار لینت کا نہیں بلکہ اظہار شدت کا تھا - دوسرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی گئی جس کی وجہ سے اس قدر عظیم مصیبت آپ کو اور مسلمانوں کو برداشت کرنی پڑی - اور یہ موقعہ سخت سے سخت سزا کو چاہتا تھا - مگر اس موقعہ پر نافرمانی کرنے والوں کو ایک حرف بھی ملامت کا نہ کہنا ظاہر کرتا ہے کہ نبی کریم صلعم میں کس قدر کمال خُلق لینت کا موجود تھا کہ سخت سے سخت حالات کے ماتحت بھی، ہاں ان حالات کے ماتحت بھی جو بظاہر خلق لینت کے اظہار کے منافی معلوم ہوتے ہیں - آپ کے اندر اس خلق کا اظہار رہتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسے تعریف کے موقعہ پر بیان فرمایا ہے - ورنہ آپ کے خُلق لینت کے تو بیشمار موقع تھے - دن رات خدام سے، بیبیوں سے، دوستوں سے، دشمنوں سے لینت کا برتاؤ آپ فرماتے تھے مگر یہ موقع اس خلق کے کمال کو دکھانے والا تھا۔

نبی کریم صلعم کی نرمی اور رحمت کے متعلق اور بھی بہت سی آیات قرآنی شاہد ہیں جیسا کہ فرمایا عزیز علیہ ما عنتم (التوبۃ ۹-۱۲۸) کوئی دُکھ تم کو پہنچے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے اور فرمایا واخفض جناحک للمؤمنین (الحجر ۱۵-۸۸) اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا انا لکم مثل الوالد بلکہ والد سے بہت بڑھ کر شفقت اور محبّت آپ کے دل میں بھری ہوئی تھی - نبی کریم صلعم کے اس خلق کے اظہار میں یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ کے پیرو بھی اور بالخصوص وہ لوگ جو دوسروں کے لیے پیشرو یا سردار کے طور پر ہوتے ہیں وہ اس قسم کے اخلاق اپنے اندر پیدا کریں تو ہی جماعت قائم رہ سکتی ہے - ورنہ کوئی جماعت نہیں بن سکتی - چنانچہ اس کی طرف ایک حدیث میں اشارہ ہے لاحلم احب الی اللہ من حلم امام ورفقہ ولا جھل ابغض الی اللہ من جھل امام وخرقہ (رغق) یعنی کوئی حلم اور نرمی امام کے حلم اور نرمی سے بڑھ کر اللہ کو پسند نہیں اور کوئی جہل امام کی جہالت سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾ کر۔ اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ع۵۵۲

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور

ع۵۵۲ استغفار کے معنی: نبی کریم صلعم کی لینت کا ذکر کرکے اب ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم پر آپ کو قائم کرتا ہے اوّل پچھلا گناہ معاف کر دینا آیت ۱۵۴ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے معافی دی تھی مگر چونکہ رسول کے حکم کی نافرمانی ہوئی تھی اس لیے اب آپ کو عفو کرنے کا حکم ہوا۔ دوم ان کے لیے استغفار یا آئندہ اس قسم کی نافرمانی سے حفاظت چاہنا۔ یہاں استغفار گو دوسروں کے لیے ہے مگر اس کے معنی گناہ کی سزا سے حفاظت چاہنا نہیں بلکہ خود گناہ سے حفاظت چاہنا ہیں کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ تو خود ان کے گناہ کو معاف کر چکا ہے۔ ولقد عفا اللہ عنھم (۱۵۴) پس جس کو خدا معاف کر چکا اس کے لیے سزا سے بچانے کی دعا کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یہ ایک اور قطعی شہادت ہے کہ استغفار سے مراد گناہ سے حفاظت بھی ہوتی ہے۔ سوم ان کو مشورہ میں شریک کرنا گویا ان کو اس قدر بلند مرتبہ دیا کہ پھر وہ مجلس شوریٰ کی شمولیت کے بھی اہل قرار دیئے گئے۔ شوریٰ کا حکم تو قرآن کریم میں پہلے سے موجود تھا وامرھم شوریٰ بینھم (الشوریٰ ۴۲-۳۸) یہاں اس کے ذکر میں دو غرضیں ہیں ایک تو یہ بتانا کہ ایک دفعہ نافرمانی سے مشورہ کی اہلیت نہیں چھن جاتی۔ آج مہذب قومیں جو پولیٹیکل مجرموں کو مجلس شوریٰ سے نہیں روکتیں اسلام کی تعلیم سے ابھی آگے نہیں بلکہ پیچھے ہیں اس لیے کہ یہ پولیٹیکل مجرم نہ تھے جنگی مجرم تھے جن کے لیے مہذب قوموں میں کورٹ مارشل ہے ان کے لیے یہ رعایت معاف کر دینا، ان کی بلندی درجات چاہنا۔ پھر مجلس شوریٰ کے ان کو ممبر بنانا اسلام کے ساتھ ہی یہ تعلیم خاص ہے دنیا میں اور کہیں نہیں ملے گی اور دوسری غرض یہاں شوریٰ کے حکم کو دوہرانے کی یہ ہے کہ جنگ اُحد میں جو مصیبت پیش آئی وہ شوریٰ کے فیصلہ پر عمل کرنے سے ہی پیش آئی کیونکہ نبی کریم صلعم کی اپنی رائے تو یہی تھی کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کی جائے اس لیے حکم دیا کہ گو نتیجہ شوریٰ کا بُرا بھی نکلا اور اس موقعہ پر کثرت رائے نے غلطی بھی کھائی۔ مگر اصول شوریٰ پھر بھی قائم رکھنے کے قابل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس نتیجہ کو دیکھ کر اصول شوریٰ سے ہی بیزاری ہو جائے۔ اس میں کس قدر دور اندیشی کی تعلیم ہے کہ ایک چیز کے ذرا سے نقصان کو دیکھ کر فوراً اس سے بیزار نہ ہو جاؤ۔ ممکن ہے اس کے فوائد اس سے بڑھ کر ہوں۔

آنحضرتؐ کا شوریٰ پر عمل: اس آیت کے ساتھ امرھم شوریٰ بینھم کو اس قدر قوت دیدی ہے کہ کسی مسلمان کو یہ جرأت نہ ہونی چاہیئے کہ اصول شوریٰ کا انکار کرے یا اسے استخفاف کی نظر سے دیکھے شوریٰ کو خود اللہ تعالیٰ نے اس قدر عزت کا مقام دیا ہے کہ اس کے نقصانات کو ناقابل التفات قرار دیا ہے اور پھر خود نبی کریم صلعم نے اس پر باقاعدہ عمل کرکے دکھایا کہ آپ کی امت کو اصول شوریٰ کسی حالت میں چھوڑنا نہ چاہیئے۔ تمام امور مہمہ میں آپ صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ بدر میں بعد مشورہ مدینہ سے نکلے۔ احد میں بھی۔ احزاب میں مشورہ کرکے خندق کھدوا دی اور محصور ہوئے پھر صلح کی اس تجویز پر کہ ایک تہائی مدینہ کے پھل کفار کو دیدیئے جایا کریں مشورہ کیا اور اسے چھوڑ دیا۔ حدیبیہ میں بھی مشورہ کیا بلکہ ایک ایسے معاملہ میں جو صرف آپ کی ذات سے تعلق رکھتا تھا یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ پر افک کا معاملہ اس میں بھی مشورہ کیا اور حدیث میں ہے ماتشاور قوم قط الا ھدوا لارشد امرھم کبھی کسی قوم نے مشورہ نہیں کیا مگر اپنے معاملہ میں نہایت سیدھی راہ کی طرف ہدایت کیے جاتے ہیں۔

کثرت رائے پر عمل۔ شوریٰ میں نبی کریم صلعم نے اپنی رائے کے خلاف بھی کیا ہے جیسے اُحد کے معاملہ میں بلکہ وہاں کچھ خواب بھی آپ کو آئے مگر چونکہ صریح وحی کوئی نہ تھی اس لیے مشورہ پر ہی عمل کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب کثرت رائے خلاف ہو تو امیر کو اپنی رائے ترک کر دینی چاہیئے اور کثرت کی رائے پر عمل پیرا ہونا چاہیئے اور یہ بات کہ کثرت رائے پر آپ عمل کرتے تھے اسی اُحد کے میدان میں نکلنے والے واقعہ سے ظاہر ہے کیونکہ وہاں کچھ آدمیوں کی رائے آنحضرت صلعم کے ساتھ بھی تھی۔ پس آپ کا اُن کی اور اپنی رائے کو چھوڑ دینا محض اسی وجہ سے تھا کہ کثرت رائے آپ کے خلاف تھی اور حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کا اجتہاد تک کے بارے میں کثرت رائے پر فیصلہ کرنا ثابت ہے جس سے معلوم ہوا کہ قانون سازی بالخصوص اور تمام امور مہمہ بالعموم کثرت رائے سے طے ہونے چاہیئیں مسلمانوں نے اس اصول شوریٰ کو بہت جلد ترک کر دیا اور یہی ان کی سلطنتوں کے تباہ ہونے کا موجب ہے۔

کیا اذا عزمت فتوکل علی اللہ سے شوریٰ کے خلاف کچھ نکلتا ہے ہرگز نہیں بلکہ وہ عزم شوریٰ کا ہی نتیجہ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ مشورہ کرکے جب بات پختہ کر لو تو پھر نتیجہ کو خدا پر چھوڑو۔ جیسا اُحد کے موقعہ پر آپ نے کیا کہ جب مشورہ کرکے حکم دیدیا پھر بعض لوگوں نے اپنی رائے سے رجوع کیا تو آپ نے اس کی پروا نہ کی۔ یہ خلاف عزم ہوتا۔ پھر جب نقصان پہنچا تب بھی آپ نے یہ نہ کہا کہ میری رائے پر کیوں نہ عمل کیا گیا۔ تفاسیر میں عزم سے مراد یہی لی گئی ہے کہ جو فیصلہ بعد شوریٰ قرار پائے اذا شاورتھم فی الامر وعزمت علیہ (ر) فاذا وطنت نفسک علی شیٔ بعد الشوریٰ (ض) اذا عقدت قلبک علی الفعل وامضائہ بعد المشاورۃ (ر) پس مسلمانوں کی حکومت کی بنیاد ان کے اہم معاملات کی بنیاد ان کے قوانین کی بنیاد قرآن و حدیث کی صریح تعلیم اور نبی کریم صلعم کے کھلے کھلے عمل کے مطابق مشورہ میں کثرت رائے پر ہونی چاہیئے۔

اس صدی کے مجدد کا کثرت رائے کے اصول کو زندہ کرنا: اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے جب اشاعت اسلام کے لیے ایک کام شروع کیا تو اس کی بنیاد بھی شوریٰ اور کثرت رائے پر رکھی اور تمام اموال سلسلہ کو ایک انجمن کے سپرد کیا جس کے متعلق بہ صفائی سے لکھ دیا کہ تمام معاملات میں جو فیصلہ انجمن کا کثرت رائے سے ہو گا اسی پر عمل کرنا ہوگا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ جب قوم بڑھ جائے تو پھر اس کی کثرت رائے کو معلوم کرنے کے لیے خاص آدمیوں کے انتخاب کی ضرورت پیش آتی ہے۔

يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ
بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾
وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ
يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى
كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾
اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾

اگر وہ تمھیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمھاری مدد کرے
اور اللہ ہی پر مومنوں کو توکل کرنا چاہیئے ۵۵۳
اور کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے اور جو خیانت کرے
وہ جو کچھ خیانت کی ہے قیامت کے دن لائے گا پھر ہر شخص کو
جو اس نے کمایا ہے پورا دیا جائیگا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا ۵۵۴
تو کیا جو شخص اللہ کی رضا کی پیروی کرے وہ اس کی طرح ہوسکتا ہے جو
اللہ کی ناراضگی کمالائے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا ہی بُری پہنچنے کی جگہ ہے ۵۵۵

---

۵۵۳ یخذل۔ خُذلان کے معنی ہیں اس شخص کا چھوڑ دینا جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہو کہ وہ اپنی نصرت سے اسے مدد دیگا۔ (غ)

۵۵۴ یَغُلّ۔ غَلَّ یَغُلُّ اذخان (غ) یعنی غَلّ جس کا مضارع یَغُلّ آتا ہے (جو یہاں ہے) اس کے معنی ہیں خیانت کی۔ اور بعض نے اسے غنیمت کی خیانت سے خاص کیا ہے مگر چونکہ الفاظ عام ہیں یعنی کسی نبی کو بھی یہ شایاں نہیں کہ وہ غلول کا ارتکاب کرے حالانکہ غنائم کا صرف آنحضرت صلعم کی امت کے لیے حلال ہونا حدیث سے ثابت ہے اور یہ آپ کی ایک خصوصیت ہے اس لیے یہاں یَغُلّ کے عام معنی خیانت ہی مراد ہیں۔

خیانت کی سزا کا ذکر بطور مثال ہے: ومن یغلل یأت بما غل۔ یہ لفظ عام ہیں اور یہ مراد نہیں کہ جو نبی خیانت کرے بلکہ نبی کے متعلق تو فرمایا کہ اس کی تو شان ہی یہ نہیں کہ وہ خیانت کرے یعنی ایسا ہوسکتا ہی نہیں اور جب خیانت کا ذکر آیا تو یہ بھی بتا دیا کہ خیانت چھپی نہ رہ جائے گی بلکہ ایک دن آنا ہے کہ وہ کھلی کھلی ظاہر ہوجائے گی۔ اکثر مفسرین نے اسکو ظاہر پر محمول کیا ہے کہ جس قدر خیانت کی ہے بزنگ سزا خود وہی خیانت کا مال اس پر وارد کیا جائے گا مگر یہ بے وجہ ہے۔ ایسے موقعہ پر مراد محض سزا ہوتی ہے جیسے توفی کل نفس ماکسبت میں مراد نیکی بدی کے اجر کا دیا جانا ہے۔ ابو مسلم نے اس کو سزا کے لیے تمثیل کہا ہے (غق) اور یہ جو بعض احادیث میں ذکر آتا ہے کہ ایک شخص اونٹ گردن پر اُٹھائے ہوئے ہوگا جس کی اس نے خیانت کی ہے تو وہ بھی سزا کیلئے بطور تمثیل ہے۔ اور کم از کم یہ تو ظاہر ہے کہ اس دنیا کی سزا و جزا میں اس عالم کی چیزیں بطور مثال ہی بیان کی گئی ہیں جیسے مثل الجنة التی وعد المتقون (الرعد ۱۳۔ ۳۵) سے ظاہر ہے۔

عصمت انبیاء پر شہادت: اس آیت پر یہ بتانا مقصود ہے کہ جنگ میں جو مصیبت پیش آئی وہ اس وجہ سے نہیں کہ محمد رسول اللہ صلعم میں کوئی نقص ہو یا آپ نے کوئی کوتاہی کی ہو۔ کیونکہ محمد رسول اللہ ؐ کا تو اتنا بلند مرتبہ ہے یہ کسی بھی نبی کی شان نہیں کہ وہ خیانت کرے اس لیے کہ نبی معصوم ہوتا ہے۔ اس بات پر کہ یہاں مصیبت کے اسباب کی طرف اشارہ ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے نہیں یہ بھی دلیل ہے کہ ان آیات کے بعد جن میں رسول اللہ صلعم کی عصمت اور آپ کی قوت قدسی کا اور آپ کے تزکیہ اور تعلیم قرآن وحکمت کا ذکر ہے فوراً بعد یہ آیت آتی ہے اولما اصابتکم مصیبة قد اصبتم مثلیہا قلتم انّٰی ھذا یعنی تم اس مصیبت کے متعلق سوال کرتے ہو کہ کہاں سے آئی یہاں لفظ خیانت یا غلول اسی طرح وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے جس طرح امانت کا لفظ وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس میں ہر ایک قسم کی کمی شامل ہے اور یہ خود اس بات سے ظاہر ہے کہ اس کے آگے فرمایا ہے کہ جو کوئی خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن اسے لائے گا یعنی جس قدر اللہ تعالیٰ کی امانتوں کے ادا کرنے میں کسی نے کمی کی ہے اس سب کے متعلق قیامت کے دن جوابدہی کرنی ہوگی اور پھر فرمایا کہ ہر جان کو جو اس نے کمایا پورا دیا جائے گا۔ اس میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس قدر کوتاہی کسی نے فرائض وحقوق کی ادائیگی میں کی ہے اسی قدر اس پر ذمہ داری ہوگی اور اس سے اگلی آیت نے اور بھی مضمون کو صاف کر دیا ہے کیونکہ وہاں دو گروہ کر دیئے ہیں ایک اللہ کی رضا کی پیروی کرنے والا گروہ اور دوسرا اللہ کی ناراضگی کو خریدنے والا۔ اور پھر آگے چل کر اور بھی صفائی سے کہا کہ نبی کی بعثت کی تو غرض ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو پاک کرے جس میں خود کسی قسم کی خیانت یا کوتاہی پائی جائے وہ دوسروں میں امانت اور کمال کس طرح پیدا کرسکتا ہے گویا یہاں ضمناً عصمت انبیاء کے اصول کو قائم کیا ہے۔

بعض لوگوں نے یہاں یَغُلّ کو خاص مال غنیمت سے مخصوص لیکر یوں توجیہ کی ہے کہ تیراندازوں نے جب اپنی جگہ کو چھوڑا تو انہوں نے گویا ایک رنگ میں نبی صلعم پر بدظنی کی کہ آپ ان کو مال غنیمت کا حصہ نہیں دلائیں گے تو اس لیے فرمایا کہ نبی مال غنیمت میں خیانت نہیں کیا کرتا۔ یہ اس کی شان سے بہت گری ہوئی بات ہے کہ ایسا کرے اور بعض وسعت کی طرف گئے ہیں یہاں تک کہ بعض کے نزدیک یہاں مراد امانت وحی کی ادائیگی میں خیانت نہ کرنا ہے۔

۵۵۵ سخط۔ سَخَط وہ غضب شدید ہے جو عقوبت یعنی سزا کا مقتضی ہو (غ) اور اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انزال عقوبت یعنی سزا وارد کرنے کے معنی میں ہے۔

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

وہ اللہ کے نزدیک درجے رکھتے ہیں ۔ اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں ع۵۵۶

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

یقیناً اللہ نے مومنوں پر احسان کیا ، جب اُن میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا ، جو اُن پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور اُنھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے ۔ اگرچہ وہ پہلے ضرور کھلی گمراہی میں تھے ع۵۵۷

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾

اور کیا جب تمھیں ایک مصیبت پہنچی کہ اُس جیسی دو چند تم پہنچا چکے ہو ، تم نے کہا یہ کہاں سے ہے ، کہہ یہ تمھاری اپنی طرف سے ہی ہے ۔ اللہ ہر شے پر قادر ہے ع۵۵۸

ع۵۵۶ تفاوت درجات: ھم درجات اس کی ترکیب ہے لھم درجات یعنی ان کے لیے درجات ہیں یا اسی قسم کا بیان ہے جیسے حدیث میں آتا ہے الناس معادن کمعادن الذھب والفضۃ لوگ کانیں ہیں سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح اور بعض نے ذو درجات مراد لیا ہے یعنی لوگ صاحب درجات ہیں۔ بعض بڑے درجوں والے بعض کم درجوں والے اور روح المعانی میں ہے کہ مبالغہ کے لیے ان کو نفس درجات کہا ہے ۔ ھم کی ضمیر کو بعض نے من اتبع رضوان اللہ کی طرف لیا ہے کیونکہ درجات کا لفظ عموماً ثواب میں استعمال ہوتا ہے مگر چونکہ لفظ درجات عام بھی آیا ہے جیسے ولکل درجات مما عملوا (الانعام ۶ ۔ ۱۳۲) اس لیے اہل ثواب اور اہل عقاب دونوں کا ذکر ہے ۔

درجات ۔ دَرَجَۃ کی جمع ہے اور دَرَجَۃ اور مَنْزِلَۃ ایک ہی ہیں لیکن درجہ اوپر چڑھنے کے لحاظ سے کہا جاتا ہے اور منزلۃ رفیعۃ یعنی بلند رتبہ یا بلند مقام پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ)

ع۵۵۷ چونکہ اصل غرض اس رکوع کی یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو پاک کرتا اور ان کی منافقوں سے تمیز کرتا ہے اور انہی سامانوں میں سے جنگ احد ایک سامان ہے ۔ اس لیے اب ان کو اپنا ایک عظیم الشان احسان یاد دلاتا ہے کہ ان میں سے ایسے رسول کا کھڑا کر دینا جو ان کو پاک کر دے کتنا بڑا احسان ہے اور دوسرے چونکہ اوپر فرمایا تھا کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے یعنی اس میں خود کوئی نقص اور کوتاہی ہو۔ تو اب بتاتا ہے کہ اس میں نقص اور کوتاہی کس طرح ہو سکتی ہے اور کوئی ناپاک امر اس کی طرف منسوب کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ اس کا منصب یہ ہے کہ وہ دوسروں کو آیات اللہ کے ذریعہ سے ہر قسم کی آلائشوں سے پاک کرے ۔

تعلیم اور تزکیہ کو چار دفعہ آنحضرت صلعم کا کام بیان کرنے میں حکمت: ہمارے نبی کریم صلعم کی تعریف ان الفاظ میں دو دفعہ پہلے آچکی ہے ۔ ایک حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں دوسرے اس دعا کے خانہ کعبہ کے تعلق میں پورا ہونے کے ذکر میں یعنی کعبہ کا قبلہ ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ رسول مزکی جو حضرت ابراہیم کی دعا کا مقصد تھا وہ یہاں ظاہر ہو چکا ہے ۔ اب تیسری مرتبہ مومنوں کے تزکیہ کو اس کی اصل غرض ٹھہرا کر پھر اس کو بیان کیا ہے اور یہاں ان کانوا من قبل لفی ضلٰل مبین کے لفظ بھی بڑھا دیئے ہیں یعنی معمولی حالات میں بھی تزکیہ کرنا ایک نہایت ہی مشکل کام ہے مگر اس رسول کے سامنے وہ قوم رکھی جاتی ہے جو حد درجہ کی جہالت اور گمراہی میں ڈوبی ہوئی ہے اور شاید اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح تم کو یہ رسول پاک کرتا ہے تمہارا بھی کام ہے کہ دوسرے لوگوں کو پاک کرو مگر اس کو کھول کر سورۃ جمعہ میں بیان فرمایا ہے جہاں چوتھی مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اوصاف بیان کیئے گئے ہیں۔ اثنائے ذکر جنگ میں ایسی آیات کے لے آنے سے یہ بھی تنبیہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ لڑائیاں یا ان میں کامیابی کوئی اصل غرض اسلام کی نہیں بلکہ اصل غرض تزکیہ نفوس اور تعلم و تعلیم کتاب و حکمت ہے ۔

ع۵۵۸ آیت ۱۶۰ میں جس امر کی طرف اشارہ کیا تھا اب اس کی تصریح فرماتا ہے یعنی اس مصیبت کی وجہ ذات پاک نبوی تو نہیں ہے لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کہاں سے آئی ۔ مگر اس کا جواب دینے سے پہلے فرمایا قد اصبتم مثلیھا جس کی دو چند ویسی تم پہنچا چکے ہو۔ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ تم کو مصیبت پہنچی تو تم کو اس قدر گھبراہٹ ہے کہ یہ کیوں آئی ۔ حالانکہ تم ویسی دو چند دشمن کو پہنچا چکے ہو۔ اس دو چند مصیبت میں ایک تو جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے کہ وہاں کفار

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ

اور جو کچھ تمھیں اس دن مصیبت پہنچی جب دو گروہ (جنگ میں) ملے تو اللہ کے اذن سے تھا اور تاکہ وہ مومنوں کو جان لے۔ اور تاکہ ان لوگوں کو جان لے جنھوں نے نفاق کیا[ع۵۵۹] اور ان کو کہا گیا آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا مدافعت کرو[ع۵۶۰]۔ انھوں نے کہا اگر ہم لڑائی جانیں تو ضرور تمھارا ساتھ دیں[ع۵۶۱] وہ آج

کے ستّر آدمی مارے گئے اور ستّر گرفتار ہوئے اور دوسرے جنگ اُحد کی ابتدائی حالت کی طرف کہ اس میں بھی بیس سے زیادہ آدمی قریش کے مارے گئے اور بہت سے آدمی زخمی ہوئے۔ پس جب تم ان کو دو چند مصیبت پہنچا چکے ہو تو پھر تھوڑی سی مصیبت اگر تم پر آگئی تو اس پر اس قدر گھبراہٹ کیوں؟ دو چند مصیبت کا ایک چھوٹے سے گروہ سے ایک عظیم الشان اور طاقتور قوم کو پہنچ جانا تو صاف بتاتا ہے کہ نصرت الٰہی تمہارے ساتھ ہے اور ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم کا ثبوت ملتا ہے۔ ہاں اگر یہ کہو کہ جب نصرت الٰہی ہمارے ساتھ تھی تو پھر مصیبت کیوں آئی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ھو من عند انفسکم یہ تمہاری اپنی طرف سے ہے یعنی تم سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی وجہ سے نصرت الٰہی رک گئی۔ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نافرمانی کی حتّٰی اذا فشلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم (۱۵۲)
آخری الفاظ ان اللہ علٰی کل شئ قدیر میں یا تو یہ اشارہ ہے کہ یوں اس نے تمہیں سمجھا دیا کہ اللہ تعالیٰ کیسا قادر ہے کہ جب اس کی نصرت شامل حال ہو تو کمزوری بھی قوت بن جاتی ہے اور یا یہ مراد ہے کہ جب مومن اطاعت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی نصرت کی قدرت نمائی کا نظارہ دکھاتا ہے اور جب اس سے نافرمانی وقوع میں آتی ہے تو اپنی نصرت کو روک دیتا ہے۔

ع۵۵۹ نافقوا۔ اس کا اصل نَفَقَ ہے جس کے معنی ہیں گزر گیا اور ختم ہوا۔ اس لیے خرچ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور اسی سے نَفَق ہے جس کے معنی ہیں جاری رستہ یا وہ رستہ جو دوسری طرف نکل جاتا ہو اور زمین میں سرنگ جو دوسری طرف نکل گئی ہو (غ) چنانچہ قرآن کریم میں بھی آتا ہے ان استطعت ان تبتغی نفقاً فی الارض (الانعام ۶۔ ۳۵) اسی لحاظ سے نفاق سے مطلب ہے الدُخُولُ فی الشرع من باب والخروج عنہ من باب (غ) یعنی ایک دروازہ سے شریعت میں داخل ہونا اور دوسرے دروازہ سے اس سے نکل جانا۔ اور منافق حقیقی طور پر وہ شخص ہے جو ظاہر میں ایمان لاتا ہے اور اندر سے کافر رہتا ہے۔ اسی سے نافقَ ہے یعنی اس نے نفاق کیا۔ پھر حدیث میں اس معنی کو وسیع کیا ہے جہاں یہ فرمایا کہ منافق کی چار علامتیں ہیں جس میں وہ چاروں پائی جائیں وہ منافق خالص ہے اور جس میں بعض پائی جائیں اس میں اسی قدر نفاق ہے اذا اؤتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا عَاھَدَ غَدَرَ واذا خاصَمَ فَجَرَ۔ یعنی جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرتا ہے اور جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب عہد کرتا ہے تو بیوفائی کرتا ہے اور جب جھگڑا کرتا ہے ناحق کی طرف جاتا ہے۔ پھر وہ لوگ جو منہ سے بات کہتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے ان میں بھی نفاق کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون (الصف ۶۱۔ ۳)

پچھلی آیت میں جنگ اُحد کی مصیبت کی وجہ بتائی تھی اس میں اس کی غرض بتائی ہے پہلے فرمایا فباذن اللہ یہ مصیبت اللہ کے اذن سے آئی ہے اذن کے معنی دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں۔ اس کی اجازت یا اس کے علم سے اور یوں کہنے کی غرض یہ ہے کہ یہ مصیبت محض تمہارے لیے دُکھ بن کر نہیں آئی جس کے نیچے کوئی غرض نہ ہو۔ بلکہ اس میں ایک خاص غرض بھی ہے اور وہ غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں اور منافقوں کو الگ الگ کر دے۔ جاننے سے کیا مراد ہے دیکھو ع۱۷۹ و ع۵۲۴

ع۵۶۰ ادفعوا۔ دفع کے معنی قوت کے ساتھ ازالہ کر دینا ہیں اور جب اس کا صلہ عن ہو تو اس کے معنی حمایت ہوتے ہیں (غ) یہاں کوئی صلہ مذکور نہیں مگر چونکہ قتال فی سبیل اللہ کے مقابل پر اس کو استعمال کیا ہے اس لیے مراد ہے ادفعوا عن انفسکم واھلیکم واموالکم یعنی اپنے آپ سے اور اپنے اہل سے اور اموال سے دشمن کو روکو یا ان کی حمایت کرو۔

قوم کو ہلاکت یا ذلّت سے بچانے کا فرض: قتال فی سبیل اللہ تو ایمان کو چاہتا ہے اس لیے پہلے ان کو یہی کہا جاتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو اللہ کے دین کی حفاظت کرنا اور اس کو نیست و نابود ہونے سے بچانا تمہارا فرض ہے اس لیے اللہ کی راہ میں جنگ کرو، لیکن اگر تمہارا اس پر ایمان نہیں تو کم از کم اپنے لوگو کو اہل و عیال کو دشمن سے بچانا تو ہر انسان کا فرض ہے پس تم اپنے اہل و عیال کو ہی بچاؤ اور ان کی حمایت میں ہی کھڑے ہو جاؤ۔ یہی آج مسلمانوں کی حالت ہے اور ان کے لیے اس میں سبق ہے۔ انہوں نے خدا کے دین کی خدمت کو چھوڑ دیا اور خدا کی راہ میں کوشش نہ کی مگر جس ذلّت کی حالت کو پہنچ چکے ہیں اس کا تقاضا کم از کم یہ تو ہے کہ اپنی قوم اور اپنی ناموس کی حفاظت کے لیے اب بیدار ہو جائیں اور دیکھیں کہ بدوں ایثار اور قربانی کے وہ دنیا میں زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔

ع۵۶۱ لو نعلم قتالاً۔ اگر ہم لڑائی جانیں یا لڑائی سمجھیں اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر ہم یہ جانیں کہ فی الواقع جنگ ہو گی۔ گویا یہ بہانہ کیا کہ ہمارے نزدیک کوئی جنگ ہونے والی نہیں ہے اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اگر ہم سمجھیں کہ یہ کوئی جنگ ہے جس میں سات سو آدمی تین ہزار بہادر کے مقابل پر نکلتا ہے

لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۚ ﴿۱۶۷﴾

کے دن ایمان کی نسبت کفر سے بہت نزدیک ہیں ۵۶۲ اپنے مونہوں سے کہتے ہیں جو اُن کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ (خوب) جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں ۵۶۳

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۗ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

جنھوں نے اپنے بھائیوں کے متعلق کہا اور خود بیٹھے رہے کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ کیے جاتے، کہہ تو اپنی جانوں سے موت کو ہٹا رکھو اگر تم سچے ہو ۵۶۴

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۗ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انھیں مُردے مت خیال کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق دیئے جاتے ہیں ۵۶۵

یہ جنگ نہیں کیونکہ جنگ میں کچھ نہ کچھ توازن فریقین کا ضروری ہے بلکہ یہ عمداً اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اگر آیت کے آخری الفاظ یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم اپنے مونہوں سے وہ کہتے ہیں جو اُن کے دلوں میں نہیں گو ان کے اسی قول کے متعلق لیا جائے تو پہلے معنی درست ہونگے۔

لا تبعنٰکم۔ تَبِع اور اِتَّبَعَ کے معنی پیچھے چلنا ہیں۔ یہاں پیچھے چلنے سے مراد جنگ میں ساتھ دینا ہے۔

ع۵۶۲ ھم للکفر۔ للکفر اور للایمان میں ل بمعنی الی ہے یعنی ان کا قرب کفر سے ایمان سے ان کے قرب سے بڑھ کر ہے اور یا حذف مضاف ہے اور مراد ہے کہ وہ اپنے فعل سے بہ نسبت مومنوں کے کافروں کی نصرت کے قریب تر ہیں کیونکہ ان کے الگ ہو جانے سے کفار کو مدد پہنچی۔ بعض کے نزدیک اقرب قَرَب ہے جس کے معنی طلب الماء ہیں (ر) یعنی پانی کا طلب کرنا پس اقرب بمعنی اطلب ہُوا یعنی وہ کفر کو بہ نسبت ایمان کے زیادہ طلب کرنے والے ہیں۔

ع۵۶۳ یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم۔ اس سے یا تو ان کے قول سابق کی طرف اشارہ ہے لو نعلم قتالا۔ دیکھو نوٹ ۵۶۱ اور یا اس سے مراد ہے کہ منہ سے ایمان لاتے ہیں مگر ان کے دل میں ایمان نہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم (الحجرات [۴۹]-۱۴)

واللہ اعلم بما یکتمون۔ بجائے محبت اسلام کے جس کا وہ منہ سے اظہار کرتے ہیں ان کے دلوں میں اسلام کا بغض ہے۔ مگر اللہ اس سے واقف ہے۔

ع۵۶۴ قعدوا۔ قُعُود اصل میں قیام کے مقابل پر ہے۔ یعنی بیٹھے رہنا۔ مگر قاعد (بیٹھنے والے) سے مراد المتکاسل فی الشئ (غ) لیا جاتا ہے۔ یعنی کسی چیز کے متعلق کسل یا سستی کرنے والا جو اس سے پیچھے رہ جائے۔

ادرؤا۔ دَرْءٌ کے معنی ہیں المیل الی احد الجانبین یعنی ایک جانب کی طرف مائل ہو جانا اور اس کا صلہ عن ہو تو دراْت عنہ کے معنی ہیں دفعت عن جانبہ (غ) اس کی جانب سے دفع یا رد کیا۔ یدرؤن بالحسنۃ السیئۃ (الرعد [۱۳]-۲۲) ویدرؤا عنھا العذاب (النور [۲۴]-۸)

ادائیگی فرض میں موت کی پروا نہ ہو: یہ بھی منافقین کا ذکر چلتا ہے جیسا کہ وقعدوا سے ظاہر ہے یعنی یہ کہنے والے وہ لوگ ہیں جو جنگ سے پیچھے رہے یعنی جنگ میں شامل نہ ہوئے۔ وہ اپنے بھائیوں کے متعلق (کیونکہ ان لوگوں کے قریبی سب مومن تھے) کہتے کہ اگر وہ بھی ہماری فرمانبرداری کرتے یعنی دل سے ایمان نہ لاتے اور ہمارے ساتھ نفاق میں شامل رہتے یا جنگ میں نہ نکلتے تو قتل نہ ہوتے مگر چونکہ ان کی اصل غرض تو موت پر افسوس کرنا تھا کہ ہمارے بھائی بے دم مر گئے اس لیے خصوصیت اعتراض کو چھوڑ کر ایک عام جواب دیدیا ہے۔ قتال تو خود مسلمانوں کی زندگی کے قیام کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ پس جب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تو خواہ اس کے کرنے میں جان رہے یا جائے وہ کام کرنا ہوگا۔ یہ کوئی اصول زندگی نہیں کہ اگر ایک کام کے کرنے میں جس کی ضرورت انسانی زندگی کے بقا کے لیے ہے موت کا خطرہ ہو تو انسان وہ کام نہ کرے۔ اس طرح پر موت سے بچنا گویا انسانی زندگی کی اصل غرض ہو گئی اس لیے جواب میں فرمایا کہ اگر تم موت سے بچنے کو ہی انسان کی زندگی کی اصل غرض قرار دینے میں سچے ہو تو ضرور اس کے حصول کا سامان بھی تمہارے پاس ہوگا۔ پس اپنی جانوں سے موت کو دُور رکھ کر بتاؤ کہ تم نے اس مقصد کو حاصل کر لیا ہے ورنہ انسانی زندگی کے مقصد کو یوں کھویا اور شرف انسانیت کو بٹا لگایا اور موت تو پھر بھی آخر کار آئیگی اسی کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے یعنی اپنی زندگی کا فرض ادا کرتے ہوئے مارے گئے۔ انہوں نے اصل مقصد زندگی کو تو پا لیا۔ پس وہ مُردے نہیں۔

ع۵۶۵ شہداء کی زندگی: ان الفاظ کا مطلب ع۱۹۳ میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ مگر وہاں فرمایا تھا بل احیاء (البقرۃ [۲]-۱۵۴) یہاں فرمایا بل احیاء عند ربھم جس میں صاف بتا دیا کہ یہ ان کی زندگی حضور رب میں ہے جسمانی زندگی نہیں جو اسی زمین پر ہے یا عند ربھم میں مراد ان کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا ظاہر کرنا ہے

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

اس سے خوش رہتے ہیں جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا اور اُن کی وجہ سے (بھی) خوش ہوتے ہیں جو اُن کے پیچھے سے اُنھیں نہیں ملے کہ اُن کو کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۵۶۶ع

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾

اللہ کی نعمت اور فضل سے خوش ہوتے ہیں اور کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ۵۶۷ع

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾

وہ جنھوں نے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی اس کے بعد کہ انھوں نے زخم کھایا، جنھوں نے ان میں سے احسان کیا اور تقوےٰ کیا ان کے لیے بڑا اجر ہے ۵۶۸ع

اور یہ کئی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شہداء کو خاص مراتب قرب کے عطا ہوتے ہیں اور یہاں آخر پر فرمایا یرزقون ان کو رزق بھی ملتا ہے۔ یہ رزق وہی رزق ہے جو جنت میں ملتا ہے۔ کلّما رزقوا منها من ثمرة رزقا (البقرہ ۲ - ۲۵) گویا ان سے اگر یہ جسمانی رزق منقطع ہُوا تو کیا ہرج ہے۔ ان کو وہ رزق ملتا ہے جو اُن کو حیات جاودانی کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

۵۶۶ع یستبشرون۔ استبشر سے مراد ہے کہ جو کچھ کشائش کی اس کو خوش خبری دی گئی تھی اس کو پالیا (غ) اور بشارۃ سے جو سرور حاصل ہُوا اس پر بھی استبشر بولا جاتا ہے۔ اس لیے بَشَّرہ کے بعد فاستبشر بطور فعل لازم لایا جاتا ہے یعنی اس نے اسے خوشخبری دی پس وہ خوش ہوگیا۔ گویا صرف خوش ہو جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔

من خلفهم سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان کے پیچھے زندہ باقی رہے ہیں۔

اس آیت اور اس سے بعد کی آیت میں مسلمانوں کو سمجھایا ہے کہ زندگی کے مقصد کے حاصل کرنے میں جو لوگ اپنی جانیں دیتے ہیں اور جو پیچھے رہ جاتے ہیں یہ دونوں گروہ خوش قسمت ہیں۔ گروہ اوّل یعنی شہداء کا گروہ تو ان خوشیوں اور راحتوں کو پالیتا ہے جو نیکوں کو زندگی بعد الموت میں ملنے والی ہیں اور جو پیچھے رہ جاتے ہیں ان کیلئے یہ بشارت ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے اور نہ ان کو اعداء کا یا شیطان کا خوف رہے گا اور نہ ان کو یہ حزن یا غم ہوگا کہ کیوں انہوں نے خدا کی راہ میں قربانیاں کیں اور جس طرح اللہ تعالیٰ اہل دنیا کو علم دیتا ہے کہ شہداء اس کی نعماء سے متمتع ہو رہے ہیں۔ اسی طرح وہ شہداء کو علم دے دیتا ہے کہ جو ان کے پیچھے رہے ہیں وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔

۵۶۷ع خوف وحزن سے مراد: اس آیت میں پچھلی آیت کے آخری حصّہ کے مضمون کو دوہرایا ہے اور یہ مزید تاکید اور تصریح کے لیے ہے وہاں فرمایا تھا کہ ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ خوف انسان کو کسی امر مکروہ کے پہنچنے کا ہوتا ہے یا مصائب پیش آنے کا۔ تو اس کے مقابل میں فرمایا کہ نہ صرف انہیں امر مکروہ نہیں پہنچے گا بلکہ وہ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل سے مالا مال ہونگے اور حزن یا غم اسبات پر ہوتا ہے کہ جب اس کے ہاتھ سے کوئی اچھا موقع نکل جائے یا اس کی کسی کام پر لگائی ہوئی طاقت یا لگایا ہوا مال برباد ہو جائے جس کا آئندہ کے لیے کوئی اچھا اثر پیدا نہ ہو تو اس کے مقابل پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ یوں خوف وحزن کی تشریح خود فرما دی۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ پہلی آیت میں تو صرف خوف وحزن سے ان کے بچ جانے کی بشارت ہے اور اس میں نعمت اور فضل کے ملنے اور ان کے کاموں پر اجر کے ملنے کی بشارت ہے گویا وہاں دفع مضار کی بشارت ہے تو یہاں حصول منافع کی اور یا لاخوف علیهم ولا هم یحزنون روحانی طور پر نجات کی خوشخبری ہے اور اللہ کی نعمت اور فضل میں دنیوی فلاح اور دنیوی نعمتوں کی بشارت ہے۔

۵۶۸ع اس آیت میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ غزوہ حمراء الاسد کے نام سے موسوم ہے۔ اُحد کے واقعہ سے اگلے ہی دن نبی کریم صلعم نے مسلمانوں میں یہ منادی کرائی کہ ہم دشمن کے تعاقب میں نکلنے والے ہیں۔ چنانچہ جس قدر آدمی ساتھ چل سکتے تھے وہ ساتھ ہو لیے۔ ادھر ابوسفیان روحاء کے مقام تک پہنچا تو مشرکین ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ نہ تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کیا نہ تمہارے ہاتھ کوئی قیدی آئے اس لیے انہوں نے مشورہ کیا کہ واپس لوٹ کر پھر مسلمانوں کو تباہ کریں مگر ابھی اسی سوچ میں ہی تھے کہ ان کو خبر پہنچی کہ مسلمان ان کے تعاقب میں آرہے ہیں۔ اس پر وہ ایسے مرعوب ہوئے کہ وہاں سے فوراً کوچ کیا اور مکہ کو چلے گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ معلوم کر کے کہ وہ بہت دور نکل گئے ہیں۔ حمراء الاسد سے جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے واپس آگئے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾

وہ جن کو لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمھارے (مقابلے کے) لیے (لشکر) جمع کیے ہیں پس ان سے ڈرو تو اس (بات) نے ان کا ایمان بڑھایا اور انھوں نے کہا اللہ ہمیں کافی ہے اور کیا ہی اچھا کارساز ہے[569]

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾

پس وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس آئے انھیں کوئی دکھ نہ پہنچا اور انھوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی اور اللہ بڑے فضل والا ہے[570]

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

یہ شیطان صرف اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے ۔ سو تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو اگر تم مومن ہو[571]

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِى الْاٰخِرَةِ ۚ وَ

اور وہ لوگ تجھے غمگین نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں یقیناً وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے ۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے اور

نبی کریم صلعم اور آپ کے صحابہ کس قدر باہمت قوم تھی کہ اس قدر تکلیف دشمن کے ہاتھ سے اٹھا کر پھر بھی اس کا تعاقب کرتے ہیں۔

یہاں الذین استجابوا للہ والرسول فرمایا جو اللہ اور رسول کی فرمانبرداری اختیار کرتے ہیں حالانکہ جس واقعہ کا ذکر ہے اس میں حکم صرف نبی کریم صلعم کا تھا یعنی دشمن کے تعاقب کے متعلق ۔ لیکن چونکہ قرآن کریم کی رُو سے رسول اللہ صلعم کے حکم کی فرمانبرداری اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے ۔ اس لیے بجائے صرف الرسول کہنے کے للہ والرسول کہا ہے۔

ع۵۶۹ جمعوا لکم ۔مفعول محذوف ہے ۔یعنی جمعوا الجموع لشکر اکٹھے کیے ہیں۔

حسبنا اللہ ۔حَسْبُ ۔ کفایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔ حسبنا اللہ یعنی اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور حسبھم جھنم جہنم ان کے لیے کافی ہے۔

جب ابوسفیان اُحد کے میدان سے چلا تو اس نے آواز بلند کہا کہ اے محمد (صلعم) ہمارے اور تمہارے درمیان اگلے سال بدر صغریٰ پر جنگ ہوگی سو جب اگلا سال آیا تو ابوسفیان اپنی قوم کے ساتھ نکلا جب مرالظہران کے مقام پر پہنچا تو اس کا دل مرعوب ہوگیا اور اس نے واپسی کی ٹھان لی ۔ اتنے میں نعیم ابن مسعود اشجعی سے ملا تو ابوسفیان نے اس سے کہا کہ میں نے محمد صلعم سے وعدہ کیا تھا کہ بدر صغریٰ پر اگلے سال ہماری تمہاری جنگ ہوگی ۔ مگر کچھ خشک سالی ہے اور ہم واپس ہونا چاہتے ہیں لیکن اس طرح یہ خوف ہے کہ مسلمانوں کی جرأت بڑھ جائے گی اور وہ خیال کریں گے کہ ان لوگوں میں ہمارے مقابلہ کی طاقت نہیں اس لیے تم مدینہ جاؤ اور مسلمانوں کو ڈراؤ تاکہ وہ جنگ کے لیے نہ نکلیں اور تمہیں دس اونٹ دوں گا۔ چنانچہ نعیم آیا اور اس نے مسلمانوں کو تیاری کرتے پایا تو اس نے کہا یہ بات ٹھیک نہیں ۔ پچھلے سال انہوں نے تم کو کس قدر نقصان پہنچایا اور اب وہ بہت بڑی تیاری کے ساتھ آرہے ہیں ۔ مگر مسلمانوں نے اس کی پروا نہ کی اور کہا حسبنا اللہ ونعم الوکیل ۔ چنانچہ مسلمان بدر صغریٰ پر پہنچ گئے جہاں بنی کنانہ کا ایک تجارتی میلہ لگا کرتا تھا اس میں مسلمانوں نے تجارت کرکے بہت سا فائدہ اُٹھایا اور چونکہ وہاں قریش نہیں آئے اِس لیے کوئی جنگ نہیں ہوئی ۔ ادھر ابوسفیان واپس مکّہ میں پہنچ گیا اور اہل مکّہ نے اس مہم کا نام جیش السویق رکھا یعنی صرف سُتّو پینے کی مہم تھی ۔مسلمانوں میں یہ غزوہ بدر صغریٰ کے نام سے موسوم ہے۔

ع۵۷۰ اس آیت میں غزوہ بدر صغریٰ سے لوٹنے کا ذکر ہے ۔ اللہ کی نعمت اور فضل میں ان تجارتی منافع کی طرف اشارہ ہے جو اُن کو وہاں حاصل ہوئے اور لم یمسسھم سوء میں یہ بتایا ہے کہ کسی قسم کی بھی تکلیف ان کو نہ پہنچی کیونکہ کوئی جنگ نہ ہوئی اور اللہ کی رضا کی پیروی یہ تھی کہ باوجود بھاری لشکر کا خوف دلائے جانے کے انہوں نے کچھ پروا نہیں کی بلکہ اللہ کی رضا کو اپنے جان و مال پر مقدم کیا۔

ع۵۷۱ ذٰلکم الشیطان ۔ اس سے مراد وہی نعیم یا وفد عبدقیس ہے اور ذٰلکم کے لفظ میں اسی کی طرف اشارہ ہے بعض نے حقیقی شیطان ہی مراد لیا ہے۔

یخوّف اولیآءہٗ ۔ اس کے دو طرح پر معنی ہو سکتے ہیں یخوفکم باولیاءہٖ (گویا مفعول اوّل محذوف ہے) تم کو اپنے دوستوں یا رفیقوں سے ڈراتا ہے یعنی مسلمانوں کو کفار سے ڈراتا ہے کہ ان کا لشکر بہت بڑا ہے جیسا دوسری جگہ ہے ویخوفونك بالذین من دونه (الزمر ۳۹-۳۶) یا اولیاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفار کی جمعیت کے خوف سے جنگ میں نہ نکلتے تھے یعنی منافقین اور مراد یہ ہے کہ شیطان اپنے دوستوں منافقوں وغیرہ کو ڈرا سکتا ہے مومن اس سے نہیں ڈرتے۔

لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٧٦﴾	ان کے لیے بڑا عذاب ہے ع۵۷۲
اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ	جنھوں نے ایمان کے بدلے کفر خریدا وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں
لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٧٧﴾	بگاڑ سکتے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔
وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ	اور جو کفر کرتے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم جو اُنھیں
لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ	مہلت دیتے ہیں یہ ان کے لیے اچھا ہے ہم انھیں مہلت دیتے
لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٧٨﴾	ہیں آخر وہ گناہ میں بڑھ جاتے ہیں اور انکے لیے ذلیل کرنیوالا عذاب ہے۔ ع۵۷۳
مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ	اللہ ایسا نہیں کہ وہ مومنوں کو اس حالت پر چھوڑ دے جس پر تم ہو
عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا	جب تک کہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر دے ع۵۷۴ اور اللہ
كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ	ایسا نہیں کہ تمھیں غیب پر اطلاع دے، لیکن اللہ اپنے

ع۵۷۲ الذین یسارعون فی الکفر۔ کفر میں شدت رغبت کا ذکر منافقین کے زیادہ موزوں حال ہے اور اگلی آیت میں الفاظ اشتروا الکفر بالایمان۔ ایمان کے بدلے کفر خریدا بھی منافقوں پر زیادہ چسپاں ہیں مسلمانوں کو تسلّی دی ہے کہ ان کے منصوبوں سے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا اور لن یضروا اللّٰہ شیئًا میں مراد اولیاء اللہ ہیں۔

اللہ کا یہ ارادہ کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہ ہو اُن کے اپنے افعال کا نتیجہ ہے کہ کفر کی طرف ان کی رغبت بہت زیادہ ہے۔ پھر انہوں نے اس کے خلاف منصوبہ بازیاں اور شرارتیں کر کے اسلام کو تباہ کرنا چاہا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ ان پر نافذ ہو گیا کہ آخرت میں ان کا کوئی حصّہ نہ ہو۔

ع۵۷۳ نملی۔ ملا سے مشتق ہے۔ طویل مدت کو مَلَاوَۃٌ من الدھر یا مِلیٌّ من الدھر کہا جاتا ہے (غ) جیسے واھجرنی ملیًّا (مریم ۱۹۔۴۶) اس سے املاء کے معنی اِمہال یعنی مہلت دینا ہے۔

لیزدادوا اثما۔ لام کا استعمال بمعنی انجام کا رہت ہُوا ہے۔ یہ لام عاقبت کہلاتا ہے جیسے قرآن شریف میں آتا ہے فالتقطہ اٰل فرعون لیکون لھم عدوا وحزنا (القصص ۲۸۔۸) دیکھو معنی حالانکہ آل فرعون کے اس کو اُٹھانے میں یہ غرض نہ تھی کہ وہ ان کا دشمن بنے بلکہ وہ اسے بیٹا بنانا چاہتے تھے یا اس سے کچھ نفع چاہتے تھے عسٰی ان ینفعنا او نتخذہ ولدا (القصص ۲۸۔۹) اسی طرح جعلوا للّٰہ اندادا لیضلوا عن سبیلہٖ (ابراھیم ۱۴۔۳۰) حالانکہ ان کی غرض اس اتخاذ سے قرب الٰہی حاصل کرنا تھا جیسا کہ فرمایا ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللّٰہ زلفٰی (الزمر ۳۹۔۳) پس لیضلوا سے مراد ہے وہ انجام کار ان کو گمراہ کر دیتے ہیں پس جب دوسری جگہ فرمایا۔ اولم نعمرکم ما یتذکر فیہ من تذکر (فاطر ۳۵۔۳۷) جس سے معلوم ہُوا کہ عمر اللہ تعالیٰ اس لیے دیتا ہے کہ تا انسان نصیحت حاصل کرے۔ پس لیزدادوا اثما میں لام عاقبت کا ہی ہو سکتا ہے۔ یعنی ہمارے مہلت دینے کا نتیجہ یہ ہے۔ بعض نے اس کو شبہ بالتعلیل کہا ہے مگر مآل ایک ہے۔

جنگ احد میں کفار کو قرار واقعی سزا نہ ملنے پر وہ سمجھتے تھے کہ بس اب ہم کامیاب ہو گئے فرماتا ہے کہ یہ تو ایک مہلت ہے۔ سو اگر وہ مہلت کو اپنی بھلائی کے لیے استعمال کرتے تو یہ ان کے لیے مفید تھا مگر وہ تو اس کو اور بھی شرارتوں اور منصوبہ بازیوں میں صرف کرتے ہیں اس لیے اس مہلت کا نتیجہ صرف یہ ہو گا کہ ان کا پیمانہ لبریز ہو جائے، اور ان پر گرفت کا موقعہ آ جائے اور یہ گرفت کا موقعہ کیا ہے۔ عذاب مہین۔ ذلیل کر دینے والا دُکھ یا ذلت کا دکھ سو آخر کار اس قوم کو ذلیل کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مغلوب اور مفتوح کی حیثیت میں لایا گیا۔

ع۵۷۴ یمیز۔ میز اور میز کے معنی ہیں الفَصْلُ بین المتشابہاتِ (غ) ملتی جلتی چیزوں کو الگ الگ کر دینا۔

الطیب۔ طیب طاب سے ہے دیکھو ع۸۲ اور انسانوں میں سے طیّب وہ ہے جو جہل اور فسق اور بُرے اعمال کی نجاست سے پاک ہو اور علم اور ایمان اور اچھے اعمال کے زیور سے آراستہ ہو (غ) جیسے تتوفٰھم الملئکۃ طیّبین (النحل ۱۶۔۳۲) یا سلام علیکم طبتم (الزمر ۳۹۔۷۳) یا ھب لی من لدنک ذریۃ طیبۃ (اٰل عمران ۳۔۳۸) اور اس کے مقابل پر خبیث ہے یعنی جس میں باطل اعتقاد جھوٹ بُرے اعمال ہوں دیکھو ع۳۴۳۔

مصائب کی غرض: اس آیت میں بتایا ہے کہ ایک پاک گروہ کو مصائب کے ہاون میں کیوں ڈالا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ منہ کی باتوں سے خوش نہیں ہو سکتا۔ ان میں کچے اور پکّے۔ منافق اور مومن یکساں ہو سکتے ہیں اس لیے ان دونوں گروہوں کو الگ الگ کرنے کے لیے مومنوں کی کمال وفاداری دکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ مصائب لاتا ہے اور اس طرح پر ایک ملے جلے گروہ میں سے خبیث و طیّب کو الگ الگ کر دیتا ہے۔

يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ
وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾
وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ
هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا
بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ
ع وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾
لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ

رسولوں سے جسے چاہتا ہے چُن لیتا ہے پس اللہ اور اس کے رسولوں
پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو تمہیں بڑا اجر ملے گا ۵۷۵
اور وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے
فضل سے دیا ہے یہ خیال نہ کریں کہ یہ اُن کے لیے اچھا ہے
بلکہ وہ اُن کے لیے بُرا ہے قیامت کے دن وہی اُن کے گلے کا ہار
بنایا جائیگا جس میں وہ بخل کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ
کی ہی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے ۵۷۶
یقیناً اللہ نے ان لوگوں کی بات کو سُن لیا ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ

ما انتم علیہ میں مخاطب منافق ہیں۔ کیونکہ انہی کا یہ اعتراض تھا کہ مصائب کیوں آتی ہیں اور کسی تکلیف کے آنے پر وہ بہت گھبرا اُٹھتے تھے۔

۵۷۵ یجتبی۔ جببت الماء کے معنی ہیں۔ میں نے حوض میں پانی جمع کیا اور اس لیے حوض کو جابیۃ کہا جاتا ہے جس کی جمع جواب آتی ہے جیسے جفان کالجواب (السبا ۳۴-۱۳) اور اِجتباء کے معنی ہیں۔ الجمع علی طریق الاصطفاء (غ) یعنی اصطفاء کے طریق پر جمع کر دینا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کے متعلق اجتباء کے معنی یوں کیے ہیں کہ وہ بندوں کو الٰہی فیض کے ساتھ بغیر بندہ کی کسی کوشش کے خاص کر لیتا ہے جس سے طرح طرح کی نعمتیں حاصل ہوں۔ اور یہ نبیوں کے لیے ہے اور بعض ان لوگوں کے لیے جو صدیقوں اور شہیدوں میں سے ان کا قرب حاصل کر لیتے ہیں (غ)

کیوں ہر شخص کو وحی نہیں ہوتی: جب یہ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ مصائب اس لیے بھیجتا ہے کہ تا مومن اپنے کمال کو حاصل کریں۔ تو پھر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ اگر کمال تک ہی پہنچانا مقصود ہے تو اللہ تعالیٰ ہم کو خود ہی کیوں غیب پر یعنی اپنی رضا کی راہوں پر اطلاع نہیں دے دیتا، تاکہ ہم ان راہوں پر چلیں اور کمال کو حاصل کریں۔ گویا ہر ایک کو خود وحی کیوں نہیں ہو جاتی تاکہ وہ اپنے کمال کو حاصل کرلے۔ تو اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ اللہ کی شانِ قدوسیت کا تقاضا نہیں کہ تم جیسے ناپاک لوگوں کا اس سے تعلق ہو۔ پہلے تمہارا پاک ہونا ضروری ہے اور تمہارے پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ راہ رکھی ہے کہ اپنے ایک رسول پر فیضانِ الٰہی بغیر اس کی کسی سعی کے جاری کر کے اس کے ذریعہ سے دوسروں کو پاک کرتا ہے یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا کہ کہتے ہیں لن نؤمن حتّٰی نوتٰی مثل ما اوتی رسل اللہ (الانعام ۶-۱۲۴) ہم تو ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہم کو وہ کچھ نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا جاتا ہے۔ وہاں بھی جواب یہی دیا ہے اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ (الانعام ۶-۱۲۴) اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کو کہاں رکھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یجتبی من رسلہ من یشآء کے بعد فوراً فرمایا فاٰمنوا باللہ و رسلہ یعنی اسی طریق سے تم کمال کو حاصل کر سکتے ہو۔ ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم کو منافقوں کے نام نہیں بتاتا مگر رسولوں کو بتا دیتا ہے۔

۵۷۶ یبخلون۔ بُخل۔ جُود یعنی سخاوت کی ضد ہے اور بُخل کے معنی ہیں مال کا وہاں سے روکنا جہاں سے روکنا مناسب نہیں (غ)

یُطَوَّقُوْنَ۔ طوق وہ چیز ہے جو گردن میں ڈالی جائے خواہ بلحاظ پیدائش ہو جیسے کبوتر کا طوق یا خود کیا جائے جیسے ہار۔ یطوّقون کے معنی ہیں ان کو طوق پہنایا جائے گا (غ) اور یہ تشبیہ کے طور پر ہے جیسا کہ خود حدیث میں ہے۔ یاتی احدکم یوم القیامۃ شُجاعٌ اَقْرَعُ لہٗ زَبِیْبَتَانِ فیتطوّق بہ فیقول انا الزکوٰۃ۔ یہاں بھی طوق بننے سے مراد اس سے تشبیہ ہے (غ) اور اصل یہ ہے کہ تمام اعمال کا قرآن کریم نے گلے میں ڈالا جانا ہی بیان فرمایا ہے وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہٖ (بنی اسرائیل ۱۷-۱۳) پس جس طرح تمام اعمال انسان کے گلے کا ہار بن جاتے ہیں اسی طرح بخل بھی گلے کا ہار بن جائے گا۔ ایسے مقامات پر یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ مال جس کے متعلق اس نے بخل کیا تھا اکٹھا کر کے اس کے گلے میں ہار ڈال دیا جائے گا۔ بلکہ منشاء یہ ہے کہ اس کا نتیجہ اسے بُھگتنا پڑے گا۔

میراث۔ ورث سے ہے۔ وراثۃ اور اِرْث کے معنی ہیں ایک شخص کی طرف کسی دوسرے سے مال کا منتقل ہونا بغیر کسی معاہدہ کے یا ایسے امر کے جو قائم مقام معاہدہ ہو (غ) اس لیے جو مال میّت سے منتقل ہوتا ہے اس کو اس نام سے پکارا جاتا ہے اور مال منتقل شدہ کو میراث کہا جاتا ہے اور اسی لحاظ سے اِرْث بمعنی اصل بھی آتا ہے جیسے نبی کریم صلعم نے فرمایا فانکم علی اِرْثِ اَبِیکُمْ جہاں مراد ہے کہ تم اسی اصل پر ہو جس پر تمہارا باپ تھا (غ) اسی طرح جو چیز کسی کو بغیر محنت و مشقت کے حاصل ہو جائے اس پر بھی وارث ہونے کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو بھی وارث کہا ہے اس لیے کہ سب کی سب اشیاء اللہ تعالیٰ کی طرف ہی پہنچنے والی ہیں (غ) اسی لحاظ سے یہاں میراث کا لفظ فرمایا۔ اور اسی کے مطابق دوسری جگہ ہے ونحن الوارثون (الحجر ۱۵-۲۳)

اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ
مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ
وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾
ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ
لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ ۚ
اَلَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَاۤ اَلَّا
نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ
تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ
مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ

فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ ہم لکھ رکھیں گے جو کچھ انھوں نے کہا ہے اور ان کا نبیوں کو ناحق قتل کرنا بھی۔ اور ہم کہیں گے جلنے کا عذاب چکھو ۵۷۷
یہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور کہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ۵۷۸
جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہماری طرف تاکیدی حکم بھیجا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ ہمارے پاس وہ قربانی (نہ) لائے جسے آگ کھاتی ہو۔ کہہ مجھ سے پہلے رسول تمھارے پاس کھلی دلائل کے ساتھ اور اس کے ساتھ جو تم کہتے ہو آئے تو ان کو

ع ۵۷۷ ذوقوا۔ ذوق کے معنی منہ کے ساتھ طعم کا پانا ہے۔ اور اصل میں لفظ ذوق تھوڑے کے متعلق استعمال ہوتا ہے کثیر کے لیے نہیں (غ) مگر قرآن کریم میں عذاب کے لیے لفظ ذوق ہی استعمال ہوا ہے بعض موقعہ پر تو یہ معنی لفظ کی صراحت سے نظر آتے ہیں جیسے ولنذ یقنھم من العذاب الادنی دون العذاب الاکبر (السجدۃ ۳۲-۲۱) کیونکہ عذاب ادنیٰ یا اس دنیا کا عذاب بمقابلہ آخرت کے ایک بہت تھوڑی چیز ہے اور بعض مقامات پر ذوق کا لفظ اختیار کرکے یہ اشارہ کیا ہے کہ جو کچھ عذاب آخرت ہے کچھ مزا اس کا انسان یہاں بھی چکھ لیتا ہے۔

الحریق۔ اَحْرَقَ کے معنی جلایا اور حریق کے معنی آگ ہیں (غ) عذاب الحریق کے معنی جلانے والا عذاب یا وہ عذاب جس میں جلن ہے۔

یہودیوں کا اسلامی چندوں پر استہزا؛ منافقوں کے جن کا ذکر ہو رہا تھا بڑے حامی اور جنگ اُحد کے بعد مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن جو منافقوں کی طرح اندرونی دشمن تھے کیونکہ بظاہر مسلمانوں سے معاہدہ بھی کر رکھا تھا یہودی تھے انھی کا یہاں ذکر ہے جیسا کہ قتل انبیاء کے لفظ میں صاف بتا دیا، ایک طرف اسلام میں زکوٰۃ کا قائم کرنا دوسری طرف صدقات کی ترغیب پھر جنگوں کے لیے مالی قربانیوں کی ضرورت۔ علاوہ ان سب کے مسلمان اس وقت حالت غربت میں تھے۔ ادھر یہود ہمیشہ سے بوجہ اپنی سود خواری کے ایک مالدار قوم رہی ہے اس لیے یہ لوگ ایسی باتوں پر بھی استہزا کرتے رہتے تھے کہ اللہ تو فقیر ہے کیونکہ اس کے مخلص پرستار تنگی کی حالت میں ہیں اور ہم امیر ہیں اور پھر چندوں اور مالی قربانیوں کے مطالبہ پر بھی استہزا کرتے تھے کہ کیا خدا فقیر ہے جو اسے چندوں کی ضرورت پڑ گئی حالانکہ اس بات سے خوب واقف تھے کہ سنت اللہ یہی ہے کہ مومنین کو مالی و جانی ہر قسم کی امداد میں شامل ہونا پڑتا ہے مگر نحن اغنیاء کہنے والوں کو کچھ عذاب الحریق اس دنیا میں بھی پہنچا دیا جب ان کا غنا حالت فقر سے بدل گیا اور ان کو اپنے املاک وغیرہ چھوڑ کر ملک بدر ہونا پڑا اور جن کو وہ فقیر کہتے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بے حساب رزق دیا۔ واقعی اس نظارہ کو دیکھ کر کیسی جلن ان لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہوگی۔ یہ آنے والے عذاب الحریق کا مزہ اسی دنیا میں چکھا دیا۔

ع ۵۷۸ لیس بظلّام۔ ظلّام مبالغہ کا صیغہ ہے۔ بہت ظلم کرنے والا۔ مگر نفی مبالغہ سے یہ مطلب نہیں کہ تھوڑا ظلم کر لیتا ہے کیونکہ قرآن کریم خود فرماتا ہے ولا یظلمون فتیلا (النساء ۴-۴۹) ان پر ذرہ بھر ظلم نہ کیا جائے گا۔ اور پھر فرماتا ہے ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ (النساء ۴-۴۰) اللہ تعالیٰ ایک ذرّہ کے وزن کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ مبالغہ کی نفی کی وجہ صاف ظاہر ہے ان کے جس عذاب کا ذکر ہے وہ ایک سخت جلانے والا عذاب ہے اس عذاب کے اگر وہ حق دار نہ ہوتے تو اس کا پہنچانے والا بڑا ظالم ہونا چاہیئے تھا اس لیے فرمایا کہ اتنا بڑا عذاب جو ان کو دیا تو کیا اللہ کوئی بڑا ظالم ہے؟ ہرگز نہیں اور یہ جو کہا گیا ہے کہ نفی کثرت سے اصل کی نفی نہیں ہوتی۔ یہ ہر موقع پر صحیح نہیں۔ اور یہاں بالخصوص، روح المعانی میں اس کی ایک لطیف وجہ یہ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جس قدر صفات ہیں وہ مبالغہ کے رنگ کی ہیں کیونکہ ہر ایک صفت اس میں اپنے کمال کو پہنچی ہوتی ہے پس اگر ظلم بھی اس کی صفات میں ہوتا تو وہ ظلام یعنی بڑا ہی ظالم ہوتا۔ اور جب اس میں ایک بات علی وجہ الکمال نہیں تو معلوم ہوا کہ وہ مطلق نہیں پس جب وہ ظلام نہیں تو اس کی صفت میں ظلم مطلق نہیں۔

عبید عبد ایک بلحاظ تسخیر کے ہے اور اس رنگ میں کل انسان اللہ تعالیٰ کے عبد ہیں بلکہ دیگر اشیاء بھی۔ اور ایک عبد بلحاظ اختیار بنتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرکے۔ عبید عبد کی جمع پہلے معنی میں ہے اس لیے عبد بمعنی غلام کی جمع بھی عبید آتی ہے کیونکہ وہ بھی تسخیر ہے اور دوسرے معنی میں اس کی جمع عباد ہے اسی لیے عباد کا لفظ اچھے موقع پر بولا گیا ہے جیسے عباد الرحمٰن (الفرقان ۲۵-۶۳) عبادہ الذین اصطفٰی (النمل ۲۷-۵۹) اسر بعبادی (طٰہٰ ۲۰-۷۷) من عبادنا (الکھف ۱۸-۶۵) پس عبید کا لفظ زیادہ وسیع ہے اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ نیک پر ظلم کرتا ہے نہ بد پر۔

قَتَلۡتُمُوۡهُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۸۳﴾ تم نے کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو۔ ۵۷۹

فَاِنۡ كَذَّبُوۡكَ فَقَدۡ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِكَ جَآءُوۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالۡكِتٰبِ الۡمُنِيۡرِ ﴿۱۸۴﴾ پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو تجھ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلے دلائل اور صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے۔ ۵۸۰

ع۵۷۹ قربان اصل میں وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے قرب الٰہی حاصل کیا جائے (غ)، مگر تعارف میں نسیکۃ یعنی ذبیحہ سے مخصوص ہو گیا ہے جیسے یہاں اور اذ قربا قربانا (المائدۃ ۵-۲۷)

سوختنی قربانی: اس آیت میں یہودیوں کے ایک اعتراض کا ذکر ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم کو یہ حکم ہے کہ کسی رسول کو نہ مانیں مگر اس کو جو ایسی قربانی لائے جسے آگ کھاتی ہو توریت میں ایسا کوئی حکم نہیں۔ البتہ توریت میں قربانیوں کے متعلق بہت سے احکام ہیں اور ایک قسم کی قربانی ان کے ہاں سوختنی قربانی کہلاتی تھی جو ساری کی ساری آگ میں جلا دی جاتی تھی۔ مگر ایسی قربانی کو انبیاء کہیں سے ساتھ نہ لاتے تھے۔ بلکہ وہی قربانیاں جو لوگ گزارتے تھے ان میں سے بعض قسم کی قربانیوں کو سالم آگ میں جلانے کا حکم تھا اور بعض قسم کی قربانیوں کا کچھ حصّہ آگ میں جلایا جاتا تھا اور باقی کاہن کھاتے تھے دیکھو احبار ۱: ۶-۹ و ۶: ۱۴-۱۶ و ۲۶ وغیرہ پس شریعت موسوی میں قربانی کا کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور آگ کھاتی تھی۔

شریعت موسوی کا ایک امتیازی نشان: پس قربان تاکلہ النار میں صرف شریعت موسوی یا اس کی سوختنی قربانیوں کا ذکر ہے نہ کچھ اور۔ سورۃ بقرہ میں یہ مفصّل ذکر ہو چکا ہے کہ یہودیوں کو جب قرآن شریف پر ایمان لانے کے لیے بلایا جاتا تھا تو وہ یہ جواب دیتے تھے کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہماری طرف اتارا گیا۔ اور دوسری کسی قوم کو شریعت کا دیا جانا نہیں مانتے۔ یہی اعتراض ان کا یہاں بھی ہے صرف اس جگہ شریعت موسوی کا ایک امتیازی نشان بتایا ہے اور وہ امتیازی نشان یہ ہے کہ ان کے ہاں قربانیوں کو آگ کھاتی تھی مگر اسلام میں قربانی کا کوئی حصّہ جلایا نہیں جاتا۔ گویا اسلام کی قربانی نے شریعت موسوی کی قربانی کو منسوخ کر دیا۔ اعتراض کا جواب یوں دیا ہے کہ تمہارے پاس تو ایسے رسول بھی آتے رہے جو شریعت موسوی پر عامل ہونے کی وجہ سے قربانیوں کو جلانے کا حکم دیتے تھے۔ پھر باوجودیکہ وہ بینات یعنی کھلے دلائل یا معجزات بھی لائے مگر تم نے ان کو قتل کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ انبیاء کی مخالفت تمہارے خمیر میں داخل ہو گئی ہے۔ یہاں بینات یعنی دلائل و معجزات کا بالذی قلتم سے الگ ذکر کر کے یہ بتا دیا ہے کہ ان کا مطالبہ ایسی قربانی کا جسے آگ کھائے معجزہ کے رنگ میں نہ تھا بلکہ معمولی شریعت کا امر تھا اگر معجزات میں یہ امر داخل ہوتا تو بالذی قلتم کو بینات سے الگ نہ کیا جاتا۔

آگ کا آسمان سے اترنا: اور یہ جو مفسرین نے لکھا ہے کہ ایسی قربانی ہوتی تھی جسے ایک سفید آگ آسمان سے اُتر کر کھا جاتی تھی۔ سو آسمان سے آگ اُترنے کا ذکر نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ ہاں بائبل میں ایک موقعہ پر آگ کے آسمان سے اُترنے کا ذکر ہے مگر وہ ایک خاص موقعہ ہے اور ہر اسرائیلی نبی کی صداقت کا یہ نشان بائبل سے ثابت نہیں ہوتا صرف ۲ تواریخ ساتویں باب کے شروع میں ہے "اور جب سلیمان دعا مانگ چکا تھا تو آسمان سے آگ اُتری اور سوختنی قربانی کو اور ذبیحوں کو کھا گئی اور وہ گھر خداوند کے جلال سے بھر گیا" مگر سلیمان کو بنی اسرائیل نے قتل نہیں کیا نہ ان کے قتل کے درپے ہوئے۔ اور یہاں آتا ہے فلم قتلتموھم پس اس کی طرف اشارہ نہیں۔

ع۵۸۰ زُبُر۔ زَبُور کی جمع ہے اور زَبُور کے معنی ہیں لکھی ہوئی کتاب کیونکہ زَبَرَ کے معنی ہیں کتب یعنی لکھا۔ بعض نے پتھر میں نقش کرنا بھی اس کے معنی لکھے ہیں (ل) اور زبور ہر ایک کتاب کو کہتے ہیں (ل) اور زُبَر۔ زُبْرۃ کی جمع ہے جو اسی مادہ سے الگ لفظ ہے اور جس کے معنے لوہے کا بڑا ٹکڑہ ہیں۔ جیسے اٰتونی زبر الحدید (الکھف ۱۸-۹۶) اور پھر استعارۃً اس کے معنی ٹکڑے کرنا بھی آتے ہیں۔ جیسے فتقطعوا امرھم بینھم زبرا جہاں زبرۃ کی جمع بجائے زُبَر کے زُبُر آ گئی ہے) زبرت الکتاب کے معنی کتبتہ کتابۃ عظیمۃ بھی ہیں (غ) یعنی میں نے اس کو بڑا بھاری لکھنا لکھا۔ اور زبور کے معنی ہیں کلّ کتاب غلیظ الکتابۃ ہر ایک کتاب موٹی کتابت والی۔

المنیر۔ نُور روشنی کو کہتے ہیں مگر یہ دو قسم ہے ایک وہ جو معاون بصارت ہے یعنی ظاہری روشنی اور دوسرا وہ جو معاون بصیرت ہے یعنی باطنی روشنی جیسے نور عقل یا نور قرآن۔ اور قرآن کریم کو نور مجسم کہا ہے قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین (المائدۃ ۵-۱۵) اور منیر کے معنی ذو نور ہیں۔ یعنی روشنی دینے والی۔

زبور اور کتاب: یہاں انبیاء کو تین چیزیں دینے کا ذکر ہے۔ بینات، زبور، کتاب منیر۔ بینات سے مراد دلائل نبوت یا معجزات ہیں۔ زبور کے معنی اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ بینات پر زبر کا عطف ہونے سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ معجزات الگ امور ہیں اور زبور و کتاب منیر الگ یہ تو ثابت ہو چکا کہ زبور سے مراد کتاب ہی ہے نہ کچھ اور۔ اور قرآن کریم میں صحف یا کتب انبیاء پر یہ لفظ بولا گیا ہے جیسے انہ لفی زبر الاولین (الشعراء ۲۶-۱۹۶) اور وامرلکم براءۃ فی الزبر (القمر ۵۴-۴۳) ان دونوں آیات سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ زُبُر سے مراد انبیا کے صحیفے ہی ہیں نہ کچھ اور پھر دو دفعہ یہ لفظ کیوں لایا گیا۔ یعنی زُبُر کے بعد پھر کتاب منیر کے لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا ہے کہ زبر سے مراد چھوٹے صحیفے اور کتاب منیر سے مراد توریت۔ انجیل و زبور ہیں۔ گویا بعض انبیا کو چھوٹے صحیفے دیئے اور بعض کو ایسی عظیم الشان کتابیں جیسے توریت وانجیل و زبور۔ اور قتادہ سے مروی ہے کہ الکتاب المنیر سے مراد زبر ہی ہیں اور بعض وقت ایک شے کا دوسرے اعتبار سے ذکر کر کے اسے دوبارہ لایا جاتا ہے اور الکتاب المنیر کو واحد اس لیے لائے ہیں کہ جملہ کتب سماوی ایک لحاظ سے ایک ہی کتاب

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ
أُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ
النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۱۸۵

ہر ایک شخص موت چکھنے والا ہے اور تم کو صرف قیامت
کے دن تمھارے پورے اجر دیئے جائیں گے [۵۸۱]۔ پس جو آگ سے
دُور رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ ضرور مراد کو پہنچ گیا
اور دنیا کی زندگی نرا دھوکے کا سامان ہے [۵۸۲]

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ۟ وَلَتَسْمَعُنَّ
مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ
الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْٓا أَذًى كَثِيْرًا ۗ وَإِنْ تَصْبِرُوْا
وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ ۝۱۸۶

ضرور تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں آزمائے جاؤ گے اور
ضرور تم ان لوگوں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے
اور اُن سے جو مشرک ہوئے بہت سی دُکھ دینے والی باتیں سنو گے
اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے [۵۸۳]

ہیں اور زجاج کا قول ہے کہ ہر ایک کتاب ذی حکمت کو زبور کہہ دیا ہے اور جس میں احکام شرعی ہوں اس کو کتاب کہہ دیا ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زبور کے معنی میں غلظت یا شدّت پائی جاتی ہے اور اس شدت کا تعلّق اعدا سے ہوتا ہے اور اس کے مقابل کتاب منیر میں نور کی طرف توجہ دلائی ہے گویا وہ پیروؤں کو ایک نور عطا کرتی ہے۔ پس زبور اسی کتاب کو بلحاظ اس کی شدّت کے کہا ہے اور کتاب منیر اسی کو نور اور روشنی کے لحاظ سے کہا ہے اور حضرت داؤد کی کتاب کو جو بالخصوص زبور کے نام سے پکارا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ حضرت داؤد کی کتاب میں زیادہ حصّہ شدّت کا ہے۔

ع۵۸۱ اس عبارت کا اس مضمون سے تعلّق یوں ہے کہ پچھلی آیات میں اُن لوگوں کا ذکر تھا جو انبیاء علیہم السلام کی معاندانہ مخالفت کرتے ہیں اور ہر مخالفت کا بدلہ فوراً تو ملتا نہیں اس لیے وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی مخالفت سے ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس لیے فرمایا کہ بیشک ہر عمل کا کھلا کھلا بدلہ تو اس زندگی میں نہیں ملتا مگر ہر شخص پر موت آنیوالی ہے اور کھلے کھلے اور کامل اجور کے لیے اللہ تعالیٰ نے بعث بعد الموت یا قیامت کا دن مقرر کیا ہے لیکن توفون یا پورا پورا دینا کہہ کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ کچھ نہ کچھ یہاں بھی انسان کو مل جاتا ہے اس میں معاندین اسلام کو دُوہرا زجر ہے ایک یہ کہ اپنی بداعمالیوں کی پوری سزا تو تم قیامت کے دن پاؤ گے اور دوسرے یہ کہ اس سزا کا کچھ حصّہ اس دنیا میں بھی مل رہے گا۔

ع۵۸۲ زحزح۔ بعض کے نزدیک اس کا مادہ زحح ہے اور زحّ (مصدر زحزحۃ) کے معنی ہیں اس کے موضع سے اس کو ہٹا دیا اور الگ کر دیا اور اس سے دور کر دیا (غ۔ل) اور بعض کے نزدیک زاح یزیح سے ہے۔ جس کے معنی ہیں تاخّر یعنی پیچھے رہ گیا (ل)

فاز۔ فوز کے معنی ہیں، بھلائی کا کامیابی سے پالینا مع سلامتی کے حصول کے اور مفازۃ اس سے مصدر ہے (غ)

غرور۔ غَرَّ سے مصدر ہے اور غَرَرْتُ فُلاناً کے معنی ہیں اس کو حالت غفلت میں پایا اور جو کچھ ارادہ کیا تھا اس سے حاصل کیا (غ) اور غرور۔ غارّ کی جمع بھی ہے جس کے معنی دھوکہ دینے والا ہیں۔

دنیا کی زندگی دھوکا ہونے سے مراد: اس آیت میں بتایا ہے کہ انسانی زندگی کے مقصد کے سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیئے۔ فوز مراد کو پالینا یا انسانی زندگی کے مقصد کو حاصل کر لینا یہ ہے کہ ایک شخص آگ سے دور کیا جائے اور جنت میں داخل کیا جائے، لیکن بعض لوگ اس دنیا کی زندگی کو ہی غرض و غایت سمجھ لیتے ہیں۔ یہاں الحیٰوۃ الدنیا سے مراد صرف دنیا میں رہنا نہیں۔ کیونکہ دنیا میں نیک و بد سب رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے خود ہی انسان کو پیدا کر کے دنیا میں رکھا ہے بلکہ جیسا کہ مقابلہ سے ظاہر ہے مراد یہ ہے کہ حیوانی زندگی کو غرض و غایت انسانی زندگی کی نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ حیوانی زندگی تو لازماً منقطع ہونیوالی ہے اس لیے جس نے اس کو غرض و غایت بنایا اس نے بڑا دھوکا کھایا۔ کیونکہ جب یہ منقطع ہو گی تو ایسا شخص گویا خالی ہاتھ رہ گیا۔ قرآن کریم میں جہاں دنیا کی زندگی کی مذمّت ہے انہی معنوں میں ہے۔

ع۵۸۳ عزم الامور۔ عزم کے لیے دیکھو ع۲۹۰ عزم الامور سے مراد معزومات الامور ہیں یعنی ایسے امور جن پر عزم کر لینا چاہیئے کیونکہ ان میں کمال خوبی اور شرف اور عزّت ہے۔ ہٹ اور ضد کا نام عزم نہیں۔ یا مراد ایسے امور ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے پختہ فیصلہ کر کے ان کو واجب کر دیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے مالی اور جانی نقصان اور ایذا کی پیشگوئی: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے دو سخت قسم کے ابتلاؤں کا ذکر کیا ہے جو ابھی پیش آنے والے تھے ایک مالی اور ایک جانی ابتلا۔ دوسرا اہل کتاب اور مشرکین سے ایذا کی باتیں سُننا۔ ظاہر ہے کہ یہ آیت جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی اس لیے ان مالی اور جانی ابتلاؤں کا اس میں ذکر نہیں ہو سکتا جو اس جنگ سے پہلے مسلمانوں کو اٹھانے پڑے ہجرت میں یا اس سے پہلے یا اس کے بعد جنگوں میں۔ اور نہ ہی ان ایذا کی باتوں کا ذکر ہو سکتا ہے جو مکّہ میں مشرکین سے اور مدینہ میں یہود سے سننی پڑیں کیونکہ ان کے بعد کی یہ آیت ہے اور اس میں آئندہ کا ذکر ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جس قدر مالی اور جانی ابتلا مسلمانوں کو جنگ اُحد میں یا اس سے پیشتر اُٹھانے پڑے اور جس قدر ایذا کی باتیں اس وقت تک سننی پڑیں۔ نبی کریم صلعم کے بقیہ حصّہ زندگی

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَهٗ٘ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

اور جب اللہ نے ان سے اقرار لیا جنھیں کتاب دی گئی ہے کہ ضرور تم اس کو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے رہو گے اور اسے نہیں چھپاؤ گے پھر انھوں نے اس کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت لے لی، سو کیا ہی بُرا ہے جو وہ لیتے ہیں[۵۸۴]

ہیں اس قدر ابتلا نہیں اُٹھانے پڑے نہ اس قدر ایذا کی باتیں سننی پڑیں۔ بلکہ بعد میں روز بروز اسلام کی قوت بڑھتی گئی یہاں تک کہ سارے ملک عرب پر مسلمانوں کا تسلّط ہو گیا پس یہ مالی اور جانی ابتلا اور یہ ایذا کی باتیں کسی آئندہ زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اُحد کی جنگ کے ذکر کے بعد ان کا ذکر اس لیے کیا کہ اس جنگ میں بھی مسلمانوں کو بہت مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ تو گویا فرمایا کہ اگر یہ مالی اور جانی نقصان تمکو پہنچا ہے تو ابھی اور بھی مالی اور جانی نقصان پہنچنے والے ہیں۔ اور یوں ان الفاظ میں یقیناً اہل اسلام کے ان مالی اور جانی نقصانوں کی طرف اشارہ ہے جو ہمارے اس زمانہ میں ان کو اٹھانے پڑے ہیں اور اسی لیے ان کے ساتھ ایذا کی باتوں کو جمع کیا ہے کہ یہ دونوں باتیں اسی زمانہ میں اکٹھی ہوئی ہیں۔ مالی اور جانی نقصان ظاہر ہیں ملکوں کے ملک چھن گئے۔ دولت اور املاک ہاتھوں سے نکل گئے۔ اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ شہید کیے گئے۔ مرد اور بچے اور عورتیں ہزارہا کی تعداد میں تہ تیغ ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی عیسائیوں اور مشرکوں کی طرف سے وہ کچھ ایذا کی باتیں اسلام کے مقدس پیشوا اور بزرگان دین کی نسبت سننی پڑیں کہ الامان۔ اس زمانے میں جو گندے اعتراض اسلام کے خلاف ہوئے ہیں اور جس قدر دشنام دہی کے رسائل تیار ہوئے ہیں ان کا اگر انبار لگایا جائے تو ایک پہاڑ بن جاتا ہے اور چونکہ اس سورت میں اصل عیسائیوں کا ذکر ہے اور اُحد کی جنگ کا ذکر بھی درمیان میں بطور ایک مثال کے آگیا تھا اس لیے سمجھایا کہ اسلام پر ایسے مصیبت کے زمانے پہلے بھی آئے ہیں کہ دشمنوں نے سمجھا کہ ہم نے اُسے کچل دیا ہے۔ مگر وہ مغلوب کبھی نہیں ہوا۔ ہمیشہ غالب ہی ہوا ہے۔ اس لیے اب بھی جب چاروں طرف سے مسلمان مصائب کا شکار بنے ہوئے ہیں یہ آیت قرآنی ہمیں تسلّی دیتی ہے کہ اسلام اب بھی مغلوب نہ ہو گا۔

ان مصائب کا علاج: ان مصائب کا علاج صبر اور تقویٰ بتایا ہے۔ سو صبر دو قسم ہے ایک مصائب میں ہمت نہ ہارنا۔ دوسرا اللہ تعالےٰ کی طاعت پر عمل کے لیے اور اس کے منہیات سے بچنے کے لیے مضبوط کھڑا ہو جانا۔ اور تتقوا کو بعد میں رکھ کر بتایا کہ یہاں تقویٰ سے مراد اپنا بچاؤ کرنا ہے ان تدابیر سے جو اس وقت عمل میں لائی جاسکتی ہیں اور حقوق کی نگہداشت بھی مراد ہو سکتی ہے۔

[۵۸۴] اہل کتاب کا اپنی کتاب کو چھپانا: جب اہل کتاب کے مسلمانوں کو مالی اور جانی نقصان پہنچانے کا ذکر کیا اور ان کی سب وشتم سے پیشگوئی کے طور پر آگاہ کیا تا کہ مسلمان یہ جان لیں کہ ان کا خدا ان کے مصائب سے غافل نہیں تو ساتھ ہی اہل کتاب کے معاہدات کی طرف توجہ دلائی کہ ان کی کتابوں میں صریح پیشگوئیاں آنحضرت صلعم کی تشریف آوری کی موجود تھیں اور ان کو حکم تھا کہ ان کو ظاہر کریں اور چھپا کر نہ رکھیں مگر انھوں نے محض دنیا کی دولت اور دنیا کی عزت کی خاطر جو ثمن قلیل ہے ان معاہدات کو ان کُتب کو پس پشت پھینک دیا مگر جیسا کہ قرآن شریف کا قاعدہ ہے صرف اہل کتاب کو الزام دینا مقصود نہیں۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو سمجھانا مقصود ہے کہ تم پر بھی وہ وقت آئیگا کہ خدا کی کتاب قرآن کریم کو کھولکر لوگوں کے لیے بیان نہ کرو گے بلکہ اس کو چھپاؤ گے اور تم بھی اس کے عوض دنیا کی زندگی کے عارضی فائدے چاہو گے۔ چنانچہ جب مسلمانوں میں مال و دولت اور آسائش اور حکومت آئی تو انھوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا اور دنیا کے پیچھے پڑ گئے۔

مسلمانوں کی بیماری قرآن کو بیان نہ کرنا ہے: یہاں دو باتیں الگ الگ بیان کی ہیں ایک کھول کر بیان نہ کرنا دوسرے اس کا چھپانا۔ کتاب کا کھول کر بیان کرنا یہ تھا کہ جو احکام اس میں قابل عمل تھے ان کو عمل کے لیے پیش کیا جاتا۔ بجائے اس کے تفسیر کرنے بیٹھے تو یا تو قصّوں میں پڑ گئے جن کا نام ونشان تک قرآن میں نہیں ہے یا دماغ سے عجیب عجیب نکتے اختراع کرنے شروع کیے یا اپنے معتقدات کی تائید میں الفاظ قرآنی کو توڑ مروڑ کر لگا لیا۔ اور پھر ان قصوں نے اور عدم تبیین نے توجہ کو آہستہ آہستہ قرآن شریف کی طرف سے ہی ہٹا دیا یہاں تک کہ اس کو بالکل چھپا ہی دیا گیا۔ یہ گویا دوسرا مرتبہ تھا اور یہی آج مسلمانوں کی حالت ہے کہ قرآن شریف ان کے اندر بظاہر بڑی عزت کے مقام پر ہے مگر فی الحقیقت وہ بالکل مخفی ہو رہا ہے۔ عدم بیان کے بعد کتمان کا مرتبہ دوسرا تھا اور پہلے سے بڑھ کر تھا اس لیے لاتکتمونہ کو لتبیننہ کے بعد رکھا ہے حالانکہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کتمان پہلا مرتبہ اور عدم تبیین دوسرا مرتبہ ہے۔ آج اگر غور کیا جائے تو اس قدر مصائب کا آماجگاہ ہونے کے باوجود بھی مسلمان قرآن کے کتمان کے مجرم ہیں۔ ہر طرف توجہ ہوتی ہے مگر قرآن کریم کی طرف نہیں ہوتی۔ سجادہ نشین، علماء اور سیاسی لیڈر عموماً قرآن کی طرف سے لاپرواہ ہیں۔ بہتیری راہیں مسلمانوں کے لیے تجویز کرتے ہیں مگر قرآن کو تجویز نہیں کرتے۔ پس اہل کتاب کے اس ذکر میں مسلمانوں کے اصل مرض کو بھی بتا دیا ہے۔

لتبیننہٗ للنّاس۔ کتاب کا کھول کر بیان کرنا للنّاس یعنی سب لوگوں کے فائدہ کے لیے ہو۔ اس میں اگر ایک طرف مسلمانوں کی حالت کی اصلاح آجاتی ہے کہ ان کو اس کتاب پر چلایا جائے تو دوسری طرف غیر مسلموں کے سامنے حق کو پیش کرنا بھی اسی میں داخل ہے مسلمان دونوں سے غافل ہیں مگر بالخصوص یہ دوسرا امر تو ایسا بھلایا ہے کہ اس زمانہ کے مجدّد کو تیس سال گزر گئے کہ اس نے مسلمانوں کو جگانا شروع کیا کہ اسلام کی اصلی کامیابی اسی میں ہے مگر کتنے ہیں جنھوں نے توجہ کی۔ جہاں اس قدر اسلام کی کامیابی کی راہوں پر کم و بیش عمل کر کے دیکھ لیا جاتا ہے اس بات کی طرف تجربہ کے لیے بھی لوگ نہیں آتے۔ حالانکہ تاریخ بتاتی ہے کہ

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا
وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا
فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ج
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

ہرگز خیال نہ کرو کہ جو لوگ اس پر خوش ہوتے ہیں جو انھوں نے کیا اور پسند کرتے ہیں کہ اس کے لیے ان کی تعریف کی جائے جو انھوں نے نہیں کیا - یہ ہرگز بھی خیال نہ کرو کہ وہ عذاب سے نجات پا گئے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ۵۸۵ع

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاللّٰهُ
ع ۱۹ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾

اور آسمانوں اور زمین کا ملک اللہ کا ہی ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۵۸۶ع

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ
الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾

یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اختلاف میں عقل والوں کے لیے نشان ہیں ۵۸۷ع

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى
جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ج رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج

جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں فکر کرتے رہتے ہیں، ہمارے رب تُونے اسے بے فائدہ پیدا ۵۸۸ع

یہی بات پہلے اسلام کی اصل کامیابی کا موجب ہوئی -

ع۵۸۵ اصل نقشہ تو اسلام کے دشمنوں کا کھینچا ہے جیسا روایات سے ثابت ہے - اہل کتاب ہوں یا منافق - اور اس زمانہ میں وہی لوگ جنہوں نے شوکت اسلامی کے مٹانے میں کوئی کوشش باقی نہیں چھوڑی خود مسلمانوں کے منہ سے اپنی تعریف سننے کے خواہاں ہیں - مگر سبق مسلمانوں کے لیے تھا - آج مسلمانوں کی قوم کو یہ بیماری کھا گئی ہے کام کرنے والے بہت قلیل ہیں اور تھوڑا سا کرتے ہیں تو اس پر اتراتے ہیں اور پھر اکثر کی حالت یہ ہے کہ کرتے کراتے کچھ نہیں - اپنی تعریف کے گیت لوگوں سے سننا چاہتے ہیں - سجادہ نشین، علماء، لیڈر اِلّا ماشاء اللہ سب اس بلا میں مبتلا ہیں - یہ لوگ عذاب الٰہی سے نڈر ہیں مگر وہ پہنچ کر رہے گا -

ع۵۸۶ معاندین اسلام کو بتایا ہے کہ حق کی مخالفت کرکے وہ اپنے آپ کو کامیاب نہ سمجھیں -

ع۵۸۷ اس رکوع میں اصل ذکر مومنوں کی کامیابی کا ہے اور اسی پر سورت کا خاتمہ ہے اور ان تمہیدی آیات میں کچھ صفات ان مومنوں کی بیان کی ہیں دو قسم کے نشانوں کی طرف اشارہ کیا ہے ایک وہ جو خلق سماوات والارض سے تعلّق رکھتے ہیں یعنی مخلوق الٰہی کے ساتھ خواہ وہ آسمانوں پر ہو اور خواہ زمین میں - اس میں بھی نظر انسانی کو بہت وسیع کیا ہے ایک ملک تک محدود رکھنا تو ایک طرف رہا ساری زمین تک بھی محدود نہیں کیا بلکہ مومن کی نظر کو اس قدر بلند کیا ہے کہ وہ آسمانوں کی پیدائش پر بھی غور کرے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ترقی کرتا کرتا آسمانوں کی مخلوق کے حالات کو بھی معلوم کر سکتا ہے - دوسری قسم کے نشان جن کا یہاں ذکر کیا ہے وہ ہیں جو لیل و نہار کے اختلاف سے تعلق رکھتے ہیں - ظاہر ہے کہ لیل و نہار کے اختلاف سے مراد زمانہ ہے - پس صرف مخلوق الٰہی میں ہی جیسے کہ وہ نظر آتی ہے نشان نہیں بلکہ زمانہ میں بھی نشانات ہیں اور قوموں اور اُمتوں پر جو اختلافات آتے رہتے ہیں وہ سب لیل و نہار کے اختلافات میں شامل ہیں -

یہ گیارہ آیات یعنی آخر سورت تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کو اُٹھتے ہوئے پڑھا کرتے تھے جیسا کہ بخاری میں حضرت ابن عباس کی روایت سے ثابت ہے -

ع۵۸۸ علیٰ جنوبهم - جنُوب - جَنْب کی جمع ہے جس کے اصل معنے پہلو یا کروٹ ہیں (غ)

یتفکرون - فِکر اس کا اصل ہے اور فکرۃ کے معنی ہیں وہ قوت جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہے (غ) اور تَفَکُّر اس قوت کے جولان کا نام ہے جو عقل کی نظر کے مطابق ہو اور یہ صرف انسان کے لیے ہے نہ حیوان کے لیے - (غ)

یہاں مومنوں کی دو بڑی صفات بیان فرمائی ہیں - ایک یہ کہ وہ اللہ کا ذکر ہر حال میں کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ مخلوق میں فکر کرتے ہیں - اللہ کا ذکر صرف زبان سے نہیں ہوتا دیکھو ع۱۹۱ بلکہ زبان اور قلب اور جوارح سب سے ہے اور ذکر قلب سے مراد یہ ہے کہ انسان کے دل میں ہر وقت عظمت الٰہی ہو اور عملی حالت میں ذکر الٰہی ہی وہ چیز ہے جس کو انسان اپنے تمام حالات میں آٹھوں پہر چلتا پھرتا ہو یا بیٹھا یا سوتا مدنظر رکھ سکتا ہے ان الفاظ سے صرف ذکر لسان اور اس سے نماز مراد لیکر استدلال بھی کیا گیا ہے کہ اس میں گویا یہ ہدایت ہے کہ انسان کھڑا ہو کر نماز ادا کرے - اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو بیٹھ کر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو لیٹ کر -

سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾
رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ
اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾
رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ
اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ڰ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا
ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾

نہیں کیا تو پاک ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ ۵۸۹
ہمارے رب جس کو تو آگ میں داخل کرے یقیناً اسے تو نے
رسوا کیا اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔
ہمارے رب ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ہے جو ایمان کے لیے بلاتا ہے کہ تم اپنے رب
پر ایمان لاؤ پس ہم ایمان لائے ہمارے رب تو ہماری کمزوریوں کی حفاظت فرما اور
ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہم کو راستبازوں کے ساتھ وفات دے۔ ۵۹۰

قرآنِ کریم نے عبادت اور حصول علم کو اکٹھا کیا ہے: دوسری صفت مومنوں کی یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کی خلق میں فکر کرتے ہیں اور ان کے فکر کا نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ وہ پکار اُٹھتے ہیں ربّنا ما خلقت ھذا باطلا یعنی ہر ایک چیز ایک حقیقت رکھتی ہے اور ایک غرض کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اس حصّہ میں علوم کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ جس قدر علوم دنیا میں پیدا ہوتے ہیں وہ حقیقت اشیاء میں فکر کرنے سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا رہا کہ جب ایک قوم خدا کے ذکر کی طرف متوجہ ہوئی تو علوم سے غافل ہو گئی اور جب علوم کی طرف جھکی تو خدا سے غافل ہو گئی۔ چنانچہ عیسائیت کی تاریخ میں اس کا بہترین نظارہ نظر آتا ہے۔ جب ابتدا میں ان لوگوں کا اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف میلان ہوا تو ایسی خطرناک رہبانیت اختیار کی کہ علوم میں ترقی کو کفر قرار دیا اور مدّت تک جو کوئی ان میں علوم طبعی یا حساب وغیرہ کی طرف توجہ کرتا اسے ملحد و بیدین قرار دیا جاتا اور علوم کو شیطانی خیالات سمجھا جاتا لیکن آج اس قوم کی یہ حالت ہے کہ یہاں تک علوم میں توغل ہے کہ خدا کا نام تک لینا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ اس سورت میں بالخصوص عیسائیت سے خطاب تھا۔ اس لیے اس کے خاتمہ پر جو صفات مومنوں کی بیان فرمائی ہیں ان میں ان دونوں باتوں کی طرف ایک ہی آیت میں توجہ دلائی ہے کہ ایک طرف ذکر الٰہی سے غافل نہ ہو اور دوسری طرف مخلوق میں تفکر سے کام لو۔ اور حقیقت اشیاء پر غور کر کے علوم کو حاصل کرو۔

ع۵۸۹ اشیاء میں فکر سے خدا کی طرف توجہ دلائی: آیت کے یہ آخری الفاظ سبحانك فقنا عذاب النار۔ گویا مخلوق الٰہی میں فکر کا نتیجہ ہیں۔ سبحانك میں جیسا کہ ع۴۷ میں دکھایا جا چکا ہے مقصود اس امر کا ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سب عیوب اور نقصوں سے پاک ہے یہاں یہ لفظ اس لیے لایا گیا کہ جب یہ فرمایا کہ کوئی چیز بھی باطل پیدا نہیں کی گئی اور سب کے اندر کچھ حقیقت اور غرض ہے تو اس دوسرے پہلو سے بچانا بھی ضروری تھا کہ انہی اشیاء کو اور اس مخلوقات کو ہی کامل سمجھ کر دوسری غلطی میں انسان پڑ جائے تو اس لیے فرمایا کہ تمام عیوب سے پاک اور تمام نقصوں سے مبرا ایک ذات الٰہی ہے اور یہ اشیاء سب مخلوقیت کی مہر اپنے اوپر رکھتی ہیں پس جب اللہ تعالیٰ ہی سب نقصوں سے پاک اور مبرا ہے تو واجب ہے کہ ہر انسان اسی کی طرف رجوع کرے اور اس کا محتاج اپنے آپ کو بنائے اور سب سے پہلے آگ سے بچنے کی دعا سکھائی۔ کیونکہ آگ ہی قیامت کا بدترین عذاب ہے اور آگ یا جلن ہی اس دنیا میں انسان کے سارے امن و اطمینان کو برباد کر دیتی ہے۔ دنیا کی کامیابی بھی یہی ہے کہ انسان آگ سے بچے اور آخرت کی بھی یہی ہے کہ دوزخ سے نجات پائے۔

ع۵۹۰ منادی۔ ندا سے ہے اور نداء آواز کے بلند کرنے اور اس کے ظہور کو کہتے ہیں اور بعض وقت صوت مجرد پر یہ لفظ بولا جاتا ہے خواہ اس سے کچھ معنی مفہوم ہوں یا نہ جیسے الا دعاء ونداء (البقرۃ ۲-۱۷۱) اور بعض وقت مرکب پر جس سے معنی مفہوم ہوں واذ نادٰی ربك موسٰی (الشعراء ۲۶-۱۰) و اذا نادیتم الی الصلوٰۃ (المائدۃ ۵-۵۸) اور نادٰی کا صلہ الٰی بھی آتا ہے اور لِ بھی اور للایمان کے معنی لاجل الایمان ہیں اور ان اٰمنوا اس کی تفسیر ہے اور منادی یہاں رسول اللہ صلعم کو ہی کہا ہے۔ کیونکہ آپ نے دنیا کو بہت ہی بلند آواز سے پکارا۔ یہاں تک کہ اس بلند آواز کی یادگار اذان میں موجود ہے جس میں اصول دین کی طرف بلایا ہے اور بعض کے نزدیک قرآن شریف مراد ہے اور امام راغب کہتے ہیں کہ منادی میں اشارہ ہے عقل کی طرف اور کتاب کی طرف جو اتاری گئی اور رسول کی طرف جو بھیجا گیا اور تمام نشانات کی طرف جو اللہ تعالیٰ پر ایمان کی طرف دلالت کرنے والے ہیں اور اس کو منادی اس لحاظ سے کہا کہ اس کا ظہور ندا کی طرح ہے۔

اَنْ مفسرہ ہے اور اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے پہلے بھی جملہ ہو جس میں قول کے معنی پائے جائیں اور بعد میں بھی جملہ ہو۔ اس صورت میں یہ پہلے جملہ کی تفسیر کرتا ہے۔

الابرار۔ بارّ کی جمع (برّ سے) ہے۔ دیکھو ع۶۷ اور بارّ سے ابلغ بَرّ ہے جس کی جمع بَرَرَۃ ہے بایدی سفرۃ کرام بررۃ (عبس ۸۰-۱۵-۱۶) (غ)

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ آگ سے بچاؤ کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ذریعہ محمد رسول اللہ صلعم ہیں۔ پس آپ پر ایمان لانا پہلی ضرورت ہے اور جب انسان ایمان لاتا ہے تو پھر وہ یہ دعا بھی کرتا ہے کہ اس کے قصوروں کی حفاظت ہوتی رہے اور اس کی برائیاں اور کمزوریاں دور کی جائیں غفر ذنوب کے لیے دیکھو ع۲۵۸ سیئات کا لفظ چونکہ تکالیف جسمانی پر بھی بولا گیا ہے۔ اس لیے غفر ذنوب کے ساتھ سیئات کے دور کیا جانے کی دعا میں تکالیف

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۱۹۴﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

ہمارے رب اور ہمیں وہ عطا فرما جس کا وعدہ تو نے ہمیں اپنے رسولوں کے ذریعہ سے دیا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کر بشک تو وعدہ کا خلاف نہیں کرتا ۔ ع۵۹۱

ان کے رب نے اُن کی دعا قبول کی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنیوالے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو ع۵۹۲ سو جنھوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے، اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے میں ضرور اُن کی تکلیفوں کو اُن سے دُور کردوں گا اور میں ضرور ان کو باغوں میں داخل کرونگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ۔ یہ اللہ کی طرف سے بدلہ ہے اور اللہ ہی کے پاس اچھا بدلہ ہے ع۵۹۳

جسمانی کے دور کیا جانے کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے زیادہ وضاحت کے لیے دیکھو ع۵۹۳ جہاں دعا کی قبولیت کا ذکر ہے ۔

ع۵۹۱ دین اور دنیا میں کامیابی کی دعا : اس سے پہلی آیت میں غفرِ ذنوب کی دعا تھی اس میں یہ دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے وہ وعدے پورے ہوں جن کا تعلق تصدیقِ رسل سے ہے یا جو رسولوں کی زبان پر کیے گئے تھے اور اس دعا کے دو حصّے ہیں پہلے حصّے میں اٰتنا ما وعدتنا اور دوسرے میں لا تخزنا یوم القیامۃ یہ مقابلہ صاف دکھاتا ہے کہ پہلے وعدے دنیا کے متعلّق ہیں اور دوسرے قیامت کے گویا لا تخزنا یوم القیامۃ کہہ کر یہ بتا دیا ہے کہ پہلے حصّہ دعا کا مطلب بھی یہی ہے کہ دنیا میں ذلیل اور رسوا نہ ہوں بلکہ نصرت الٰہی کے ساتھ منصور و مظفر ہوں ۔ اور سورۃ بقرہ میں ایسی ہی دعا پر خاتمہ کر کے صاف الفاظ میں فانصرنا علے القوم الکافرین کہہ دیا ہے ۔

وعدہ کے ساتھ دعا کی ضرورت : ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک امر کا وعدہ ہو تو پھر اس کے لیے دعا کی کیا حاجت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے جو نصرت وغیرہ کے متعلق ہوں ان کا تعلق اعمال سے ہوتا ہے نہ خاص انسانوں سے پس اگر اعمالِ صالحہ اس حد کو نہ پہنچیں یا کوئی بدعملیاں درمیان میں روک ہو جائیں تو ان وعدوں کا ایفا بھی نہیں ہوتا ۔ اس لیے مومن کی دعا ان اسباب کے پیدا کرنے میں معاون ہوتی ہے جن پر اس نصرت کا آنا لازم ہے اور ان اسباب کو پیدا ہونے سے روکتی ہے جو اس کے لیے رکاوٹ کا موجب ہوسکتے ہیں ۔

ع۵۹۲ بعضکم من بعض سے یا تو یہ مراد ہے کہ تم سب ایک ہی اصل سے ہو ۔ مرد سے عورت اور عورت سے مرد پیدا ہوتا ہے ۔ اور یا یہ مراد ہے کہ تم مرد اور عورتیں سب ایک ہی سیرت اور ایک ہی خلق پر ہو جیسے حدیث میں آتا ہے سلمان منّا اھل البیت سلمان ہم اہل بیت میں سے ہے یعنی ہمارے خلق اور سیرت پر ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے من غشّنا فلیس منّا جو ہم سے کھوٹ کرے وہ ہم میں سے نہیں یا اتحاد اور اتصال اسلامی کا ذکر کیا ہے کہ تم سب ایک ہی ہو یعنی تمہارے تعلقات یگانگت کے ہیں ۔

دعا کے ساتھ عمل کی ضرورت : سورۃ بقرہ کا خاتمہ بھی ایک دعا پر کیا تھا اور یہاں بھی دعا پر خاتمہ ہے مگر یہاں ساتھ قبولیت دعا کی بھی بشارت دیدی ہے یعنی یہ تمہاری دعا جو ہم نے خود تمہیں سکھائی ہے ضائع نہیں جائے گی بلکہ اللہ تعالیٰ قبول کر چکا ہے اور وہ قبولیت کا جواب جو مومنوں کی اس دعا پر دیا گیا یہ ہے کہ میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو خواہ مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرونگا یعنی ان کے عمل کو بار آور کیا جائے گا اور ان کا مقصود و مطلوب ان کو دیا جائے گا ۔ یہ قبولیت دعا ہے کہ کام کرو گے تو اجر پاؤ گے ۔ صرف دعا کوئی چیز نہیں جب تک کہ اس کے ساتھ عمل نہیں ۔ مسلمانوں نے دعا کے مسئلہ کو کس قدر غلط سمجھ رکھا ہے ۔ بعض تو قبولیت دعا کے ہی منکر ہو گئے ۔ بعض افراط کی طرف چلے گئے یعنی دعا کی طرف جھکے تو اسباب سے کام لینے کی طرف توجہ نہ کی ۔ مگر یہ قرآن کی تعلیم نہ تھی ۔

ع۵۹۳ سیّئاتکم ۔ سیّئات ۔ سیئۃ کی جمع ہے اور گو سیئۃ قبیح فعل کو بھی کہتے ہیں جو نیکی کے مقابل پر ہے مگر حسنۃ اور سیئۃ دونوں کا استعمال ایک اور معنی میں بھی ہوتا ہے یعنی وہ چیز جس کو طبیعت پسند یا ناپسند کرتی ہے جیسے فرمایا ان تمسسکم حسنۃ تسؤھم وان تصبکم سیئۃ یفرحوا بھا (اٰل عمرٰن ۳ - ۱۱۹) ایسا ہی ذھب السیئات عنی (ھود ۱۱ - ۱۰) میں بھی سیئات سے تکالیف جسمانی مراد ہیں ۔ دیکھو ع۱۰۵ ۔

وہ عمل جن پر کامیابی ملتی ہے : پہلے حصّہ آیت میں فرمایا تھا کہ عمل کرنے والوں کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا ۔ اب اس عمل کی کچھ تفصیل فرمائی ہے پہلا کام جو ان لوگوں نے کیا وہ ہجرت ہے چونکہ وطن سے نکالے جانے کا ذکر بعد میں آتا ہے اس لیے یہاں مراد صرف ترک ما نھی اللہ عنہ ہے اس کے بعد ہے کہ اپنے گھروں سے نکالے گئے اور رضائے الٰہی کو انہوں نے اس قدر مقدم کیا کہ وطن کی پروا بھی نہیں کی ۔ پھر گھروں سے نکال دینے کے بعد بھی خدا کی راہ میں ان کو ایذا پہنچائی گئی ۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾
مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾
لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ
عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

جو کافر ہیں اُن کا ملکوں میں تصرف تجھے دھوکے میں نہ ڈالے ۵۹۴
تھوڑا سا سامان ہے پھر اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے۔
لیکن جنھوں نے اپنے ربّ کا تقویٰ کیا اُن کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے
نہریں بہتی ہیں انہی میں رہیں گے یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہے اور جو
اللہ کے پاس ہے وہ راستبازوں کے لیے بہت اچھا ہے ۵۹۵

اوذوا فی سبیلی میں وہ ایذائیں مراد ہیں جو بعد ہجرت کے ان کو برداشت کرنی پڑیں اور ان ایذاؤں کی انتہا یہ ہوئی کہ اُن کے اوپر چڑھائی کی گئی۔ تاکہ تلوار کے ساتھ ان کو نابود کیا جائے۔ اس لیے ان کو بھی بالمقابل جنگ کرنی پڑی جس کا ذکر لفظ قتلوا میں کیا ہے۔ پھر ان جنگوں کے اندر ان میں سے لوگ مارے بھی جاتے ہیں اس لیے وقتلوا پر ختم کیا۔ گو سارے نہ مارے جائیں مگر ایک قوم نے جب اپنے سر خدا کی راہ میں دیدیئے تو جتنے بھی ان میں سے کٹیں سبھی کو کہا جائے گا کہ انہوں نے اپنے سر کٹوا دیئے یہ وہ عمل ہیں جن پر خدا کی طرف سے اجر ملتا ہے۔

مومنوں سے وعدہ: یہ تو ان کے عمل ہوئے۔ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان اعمال پر کیا وعدہ ہے اوّل یہ کہ مَیں اُن کی تکلیفوں کو ضرور ان سے دُور کردوں گا۔ یہاں سیئات سے مراد وہی تکلیفیں معلوم ہوتی ہیں جن کا ذکر اوپر ہوچکا گو لفظ ایسا اختیار کیا ہے جس میں بدیوں اور گناہوں کو دُور کر کے ایک پاکیزہ بہشتی زندگی عطا کرنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اور دوسرا وعدہ قبولیت دعا پر یہ ہے کہ ان کو جنّات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور یہ وعدہ گو اُخروی زندگی کے متعلق ہے مگر ہر ایک وعدہ کا کچھ نہ کچھ رنگ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس دنیا میں بھی دکھا دیا ہے اس لیے جس طرح سیئات کے دُور کیا جانے میں دونوں طرف اشارہ ہے قرین قیاس ہے کہ جنت آخرت کے وعدہ میں اشارہ کامیابی اور فتحمندی کی طرف بھی ہے۔ اور الفاظ قرآنی اس دنیوی وعدہ پر یوں صفائی سے صادق بھی آتے ہیں کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں صاف طور پر دجلہ (جس کی جگہ حدیث میں لفظ نیل ہے) اور فرات جیحون اور سیحون کو انہار الجنۃ قرار دیا ہے۔ پس اخروی جنّت کے وعدہ کے ساتھ اس دنیا میں بھی فتوحات کا وعدہ مخفی ہے۔ دو دفعہ لفظ ثواب کے لانے میں دونوں وعدوں کی طرف اشارہ ہے۔

گناہوں سے پاک کرنے والی چیزیں: یہ بھی قابل غور امر ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے کس قدر امور کو گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ضروری قرار دیا ہے مسیحی تو ایک صلیب مسیح کو لیے پھرتے ہیں کہ اس سے ساری دنیا گناہوں سے پاک ہوگئی۔ مگر یہاں ایک ایک مسلمان صلیب سے بڑھ کر مصیبت اٹھاتا ہے۔ منہیات کو ترک کرتا ہے وطن کو چھوڑتا ہے ایذا دیا جاتا ہے تلوار سے اس کی جان لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور حق یہی ہے کہ ایک کی صلیب سے دوسرا نہیں بچتا بلکہ ہر شخص کو بجائے خود صلیب سے بڑھ کر مصائب اٹھانی ضروری ہیں۔

۵۹۴ تقلب۔ تَقَلُّب سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کا ایک طرف سے دوسری طرف پھیرنا اور تقلب کے معنی تصرف ہیں (غ)۔ اور تَقَلَّبَ فِی الْاُمُوْرِ وَالْبِلَادِ کے معنی دیئے ہیں تَصَرَّفَ فیھا یعنی ان میں تصرف حاصل کیا (ل)۔

عیسائیوں کے تصرف کی پیشگوئی: یہاں الذین کفروا سے مراد مفسرین نے عموماً مشرکین مکّہ کو لیا ہے اور پھر ملکوں میں ان کے تقلب سے مراد ان کی تجارتوں وغیرہ کا ہونا لیا ہے۔ عمومیت الفاظ میں کفار قریش بھی شامل ہوسکتے ہیں۔ مگر یہاں ذکر اہل کتاب کا ہو رہا ہے پچھلے رکوع کی آخری آیات میں انہی کا ذکر تھا واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتاب اب آگے بھی انہیں کا ذکر آتا ہے وان من اھل الکتاب لمن یؤمن باللہ بلکہ سیاق عبارت صاف بتاتا ہے کہ یہاں کفار سے مراد اہل کتاب ہی ہیں کیونکہ پہلے ان کافروں کا ذکر کر کے پھر یہ کہہ کر کہ متقیوں کے لیے یہ اجر ہے یوں شروع کیا ہے وان من اھل الکتاب جہاں واؤ عاطفہ بتاتی ہے کہ انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کو ابھی والذین کفروا کہا تھا۔ یہودیوں کا تصرف تو نہ اس زمانہ میں تھا نہ بعد میں ہوسکتا تھا۔ کیونکہ ذلّت و محکومیت کی پیش گوئی ان کے لیے ہوچکی تھی۔ پس ظاہر ہے کہ اس سے مراد عیسائیوں کا تصرف ہے اور یہ آئندہ کے لیے ایک پیش گوئی ہے کہ کسی زمانہ میں تمام ممالک میں ان لوگوں کا تصرف ہوجائے گا۔ اور یہ اس کے مطابق ہے جو دوسری جگہ فرمایا۔ ھم من کل حدب ینسلون (الانبیاء ۲۱-۹۶) وہ ہر ایک بلند مقام سے نکل پڑیں گے یعنی تمام بلندیاں خواہ بلحاظ مکان ہوں یا بلحاظ مرتبہ ان کے تصرف میں آجائیں گی اور جب ان کے تصرفاتِ عالم کا نقشہ کھینچا تو ساتھ ہی ایک تسلّی بھی دیدی کہ اے مخاطب ان کا ملکوں پر قابض اور متصرف ہوجانا تم کو یہ دھوکہ نہ دے کہ اس عظیم الشان تصرف کے سامنے اب اسلام نہیں ٹھہر سکتا۔ بلکہ یہ چند روزہ سامان ہے۔

۵۹۵ نزل۔ مَایُعَدُّ للنازِلِ من الزّاد (غ) یعنی وہ زاد یا سامان جو نئے مہمان کے لیے تیار کیا جائے۔

یہاں جنّات اور نہروں کو متقیوں کے لیے نُزُل کہنے کی وجہ سے جو مہمان کے لیے پہلا پیشکش ہوتا ہے۔ یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ اگر جنات یعنی خود بہشت ہی نزل یعنی مہمانی کا پہلا پیشکش ہیں تو پھر اصل نعماء جو ملنی چاہئیں کچھ اور ہیں اس لیے بعض نے ان اصل نعماء کو ما عند اللہ کا مقام یا عندیت یا رؤیت الٰہی قرار دیا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جنات کے وعدہ میں دو وعدے مضمر ہیں ایک اس دنیا میں فتوحات کا وعدہ اور ایک آخرت کی جنت کا وعدہ اس لیے نُزُلًا من عند اللہ میں اوّل الذکر کی طرف اشارہ کیا ہے وما عند اللہ خیر للابرار میں موخر الذکر کی طرف۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ
خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۱۹۹
يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا
وَرَابِطُوْا ۣ

اور اہل کتاب میں سے وہ بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس پر جو تمہاری طرف اُتارا گیا اور اس پر جو اُن کی طرف اُتارا گیا۔ اللہ کے سامنے عاجزی کرتے ہوئے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی قیمت نہیں لیتے، انہی کے لیے اُن کے رب کے پاس اُن کا اجر ہے بیشک اللہ جلد حساب لینے والا ہے[ع۵۹۶]
اے لوگو جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور مقابلے میں بڑھ کر صبر دکھاؤ اور محافظت کرو[ع۵۹۷]

ع۵۹۶ عیسائیوں کے اسلام لانے کی پیشگوئی: اس آیت میں اہل کتاب میں سے بعض کے ایمان لانے کا ذکر ہے مفسرین نے عبداللہ بن سلام اور آپ کے ساتھیوں کی طرف جو یہود میں سے تھے۔ یا چالیس اہل نجران کی طرف اور تیس اہل حبش اور آٹھ اہل روم کی طرف جو عیسوی دین پر تھے اشارہ سمجھا ہے اور سب سے زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ نجاشی کی طرف اشارہ ہے جس کا غائبانہ جنازہ بھی نبی کریم صلعم نے پڑھا مگر میرے نزدیک جس طرح لتسمعن من الذین اوتوا الکتاب میں عیسائیوں کے آئندہ زمانے میں اسلام کے خلاف بدزبانی کی اور کافروں کے تقلب فی البلاد میں عیسائیوں کے دنیا میں تصرف کی پیشگوئی ہے۔ اسی طرح اب یہ بشارت سنا دی ہے کہ ہمیشہ حالت یکساں نہ رہے گی بلکہ اہل کتاب کا ایک حصہ آخر قرآن کریم پر ایمان لائے گا اور اس کی صداقت کو تسلیم کرلے گا۔ ایسے اشارات قرآن کریم میں بہت ہیں جن میں نصاریٰ کے آنحضرت صلعم پر ایمان لانے کی توقع دلائی گئی ہے چنانچہ یہ جو فرمایا لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین اٰمنوا الیہود والذین اشرکوا ولتجدن اقربھم مودۃ للذین اٰمنوا الذین قالوا انا نصٰری (المائدۃ ۵ - ۸۲) اس میں بھی یہی اشارہ ہے کہ یہودیوں میں سے بہت کم لوگ ایمان لائیں گے مگر عیسائیوں میں سے بہت اسلام لائیں گے۔ پس ان سابقین کے ساتھ ہم اس آیت میں ان تمام لوگوں کو بھی شامل کرسکتے ہیں جو وقتاً فوقتاً نصرانیت کے عقیدہ باطل کو ترک کرکے اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار کرتے رہے ہیں اور بالخصوص ان لوگوں کو جو ایک معقول تعداد میں اس زمانہ میں اسلام میں شامل ہو رہے ہیں اور جو آئندہ شامل ہوں گے۔

ع۵۹۷ صابروا۔ صبر سے مفاعلہ ہے راغب نے اس کے معنی کیے ہیں کہ اپنی خواہشات سے مجاہدہ کرو کیونکہ مصابرۃ میں مقابلہ پایا جاتا ہے اور لسان العرب میں اصبروا کے معنی کیے ہیں اثبتوا علیٰ دینکم اپنے دین پر مضبوط رہو اور صابروا کے معنی کیے ہیں صابروا اعداءکم فی الجھاد یعنی اپنے دشمنوں کے ساتھ جہاد میں ان سے بڑھ کر صبر دکھاؤ۔ بہر حال صبر میں تینوں قسم کا صبر شامل ہے جس کا ذکر حدیث میں ہے یعنی صبر فی المصیبۃ، صبر علی الطاعۃ، صبر عن المعصیۃ اور مصابرۃ سے مراد مقابلہ میں بڑھ کر صبر دکھانا ہے خواہ حرص وہوا کے مقابلہ میں ہو یا دشمن کے مقابلہ میں۔

رابطوا۔ ربط سے ہے اور رَبْطُ الفرس کے معنی ہیں گھوڑے کو حفاظت کے لیے مکان پر باندھنا۔ اور رباط اس مکان کو کہتے ہیں جس میں محافظین کا قیام ہو۔ مفردات میں ہے کہ مُرَابَطَۃ جس سے رابطوا ہے دو طرح پر ہے ایک حدود پر گھوڑوں کا باندھنا یعنی دشمن کے مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار رہنا اور دوسری مُرَابَطَۃ انسان کے نفس کے متعلق ہے گویا نفس کو حدود پر کھڑا کیا گیا ہے تاکہ وہ انسان کی حفاظت کرے اور نبی کریم صلعم سے اس کے معنی میں انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ بھی مروی ہے یعنی ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار۔ لسان العرب میں بھی دونوں معنی رباط یا مرابطۃ کے ہیں۔ یعنی ایک دشمن کی حد پر قائم رہنا اور دوسرا ایک امر کی محافظت کرنا۔

بدی اور دشمن دونوں کے مقابلہ کی ایک ہی وقت میں تیاری کی ضرورت: یہاں فلاح کے لیے تین باتیں بتائی ہیں۔ صبر۔ مصابرۃ۔ رباط ان تینوں الفاظ میں اگر ایک طرف نیکی پر قائم ہونے اور باہم اچھا معاملہ کرنے کی ہدایت ہے تو دوسری طرف بدی کے مقابلہ اور دشمن کے مقابلہ میں تیار رہنے کی ہدایت ہے۔ صبر تو یہ ہے کہ نیکی پر قائم ہو جائے اور معصیت سے رُک جائے یا جو مشکلات اور مصائب قضا وقدر سے یا دشمن کی طرف سے پیش آئیں ان کو برداشت کرے اور ان کے نیچے ہمت کو نہ ہارے مصابرۃ ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرنا یا اپنی خواہشات کے ساتھ جہاد کرنا۔ یا اپنوں اور قریبیوں اور ہمسایوں سے جو دُکھ پیش آئیں اُن کو برداشت کرنا۔ یا مصائب اور تکلیفوں کی برداشت میں اپنے دشمن سے فوقیت لے جانا ہے۔ گویا دشمن کے مقابلہ میں اس سے بڑھ کر مصائب کو برداشت کرنے کے عادی بنو اور رباط سے مراد لزوم اور ثبات ہے یعنی نیکیوں کے کرنے پر یا بدی سے رُکنے یا مصائب ومکارہ کے اُٹھانے میں دوام اور مضبوطی اختیار کی جائے اور دشمن کے مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار رہے اور ایک لمحہ بھی اس کی طرف سے غافل نہ ہو۔ دشمن سے مراد ملکی دشمن ہی نہیں۔ جو لوگ دین پر حملہ کرتے ہیں ان کے مقابلہ میں دلائل اور جواب سے اسی طرح تیار رہنا چاہیئے۔ مگر افسوس کہ مسلمان اس قدر غفلت کی نیند سو رہے ہیں کہ ملک اور حکومت تو ہاتھ سے نکلے تھے۔ اب ان کے مذہب پر حملہ پر حملہ ہو رہا ہے۔ کتابوں پر کتابیں نکل رہی ہیں۔ اور وہ تاریک کوٹھڑیوں کے اندر آنکھیں بند کیے ہوئے ہی سمجھ

ع ۲۰ ۱۱ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ ع اور اللہ کا تقوےٰ اختیار کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ ۱۵۹ء

رہے ہیں کہ کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ تیاری کیسی۔ یہاں تو ایسی غفلت اور نیند میں پڑے ہیں کہ موت قبول کرنے کو راضی ہیں مگر بیدار ہونا نہیں چاہتے۔ افسوس کہ جس قدر ہوشیار اور چوکس رہنے کی تعلیم اس قوم کو دی گئی تھی۔ اسی قدر زیادہ غفلت میں یہ مبتلا ہو گئے۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ اصول قرآنی کو محکم نہ پکڑیں۔

۱۵۹ء سورت کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا واتقوا اللّٰہ لعلکم تفلحون۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔ جیسا کہ میں نے اس سورت کی تمہید میں کہا تھا کہ یہ سورۃ اور سورۃ بقرہ دونوں ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں اس لیے جن الفاظ سے سورۃ بقرہ کی ابتدا کی تھی انہی پر آل عمرٰن کا خاتمہ کیا ہے کیوں کہ وہاں بھی ھدی للمتقین کہہ کر اور یہ بتا کر کہ متقی کون ہیں فرمایا تھا اولٰئك هم المفلحون یہی کامیاب ہونگے اب اسی کو آخر میں بیان کیا ہے فلاح، نجات، کامیابی سب تقویٰ میں ہے۔ چونکہ صبر اور مصابرہ اور رباط میں صرف مصائب اور دشمن کا مقابلہ بھی مراد تھا اس لیے یہ بتانے کو کہ مسلمان کے لیے صرف مقابلہ کر لینا ہی کافی نہیں۔ آخر پر تقویٰ اللہ کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ بغیر تقویٰ اختیار کیے اگر دشمن پر غالب بھی آ گئے تو اصل غرض زندگی کی پھر بھی حاصل نہ ہوئی۔ وہ اصل غرض تقویٰ اللہ کی ہے جس کی طرف بار بار قرآن شریف میں توجہ دلائی ہے اور حدیثوں میں بھی ہے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو عامل مقرر کرتے وقت بھی تقویٰ اللہ کی نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ معاذؓ کو جب آپ نے یمن پر حاکم کر کے بھیجا تو اس کو بدیں الفاظ نصیحت کی اتق اللہ حیثما کنت واتبع السیئۃ الحسنۃ تمحھا وخالق الناس بخلق حسن (ت) اللہ کا تقویٰ کرو جہاں کہیں تم ہو اور بدی کا پیچھا نیکی کے ساتھ کرو وہ اس کو مٹا دیگی اور لوگوں کے ساتھ اچھے خلق سے پیش آؤ۔

ایاتھا ۱۷۶ (۴) سُورَۃُ النِّسَآءِ مَدَنِیَّۃٌ رکوعاتھا ۲۴

نام | اس سورت کا نام النساء ہے کیونکہ اس میں عورتوں کے حقوق اور معاشرت اور خانہ داری کے متعلق اُمور کا ذکر ہے جو اُمور خانہ داری سے تعلق رکھتے ہیں جس قدر تفصیل کے ساتھ اس سورت میں ان کا ذکر ہے۔ دوسری کسی سورت میں نہیں اور خود قرآن شریف نے جس قدر ان امور کو ضروری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور جس قدر عورتوں کے حقوق پر زور دیا ہے دوسری کسی کتاب میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اس سورۃ میں ۲۴ رکوع اور ۱۷۶ آیات ہیں۔

خلاصہ مضمون | اس سورت کا خلاصہ مضمون تین بڑے بڑے عنوانوں کے نیچے آتا ہے یعنی یتیموں اور عورتوں کے حقوق اور ان سے تعلقات۔ منافقین۔ یہودی۔ ان تینوں مضامین کے باہمی ربط کی کنجی پچھلی سورت کے مضمون کے آخری حصّہ سے ملتی ہے۔ جہاں جنگ اُحد کا ذکر تھا۔ جنگ اُحد سے جو بڑے بڑے امور پیدا ہوئے وہ یہ تھے کہ اوّل بہت سے مسلمان مارے گئے اور اس طرح پر بہت سے یتیم بچے اور بیوہ عورتیں رہ گئیں اس لیے یتامیٰ اور عورتوں کے حقوق پر بحث کی ضرورت پیش آئی۔ دوم جنگ اُحد میں منافق الگ ہو گئے اور وہاں بھی کچھ ذکر ان کا آیا تھا۔ یہاں زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ سوم اس جنگ نے یہودیوں کی چھپی ہوئی خباثتوں اور ان کی عداوت قلبی کو ظاہر کر دیا۔ اسی لیے سورۃ آل عمران کے آخر پر بھی ان کا کچھ ذکر آیا تھا۔ اس سورت میں ان کی فتنہ پردازیوں کا کسی قدر کھول کر ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ پہلے بھی راستبازوں سے اسی طرح شرارتیں کرتے رہے۔ اسی اثنا میں حضرت مسیح کے ساتھ جو انہوں نے کیا اس کا ذکر کیا ہے اور پھر بالآخر ان کے مقابل پر عیسائیوں کے غلو کا ذکر کیا ہے۔

زیادہ تفصیل کے لیے رکوع وار خلاصۂ مضمون دیا جاتا ہے۔ پہلے رکوع میں یتامیٰ کے حقوق اور ولیوں کی ذمہ واریوں کا ذکر ہے اور اسی اثنا میں عورتوں کے حقوق کی طرف بھی کچھ توجہ دلائی ہے کیونکہ ان کے کمزور اور ضعیف ہونے کی وجہ سے ان کے حقوق بھی یتامیٰ کی طرح پاؤں تلے روندے جاتے تھے۔ دوسرے رکوع میں حقوق وراثت پر مفصل ہدایات دیں اور اولاد، والدین، میاں بی بی، بھائی بند سب کے لیے حصّے مقرر کیے۔ تیسرے رکوع میں یہ بیان فرمایا کہ عورتوں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیئے۔ چوتھے رکوع میں ان عورتوں کا ذکر فرمایا جن کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے۔ پانچویں رکوع میں کچھ عام نصائح بیان فرما کر اور یہ بتا کر کہ ایک دوسرے کے اموال کو ناحق نہ کھا جاؤ جیسا کہ عرب میں عورتوں اور بچوں کے مال کو کھا جاتے تھے فرمایا کہ عورتوں کے اپنے مال پر وہی حقوق ہیں جو مردوں کے اپنے مال پر ہیں۔ چھٹے رکوع میں میاں بی بی کے اختلاف کی صورت کا ذکر کر کے احسان کی تعلیم دی بخل سے روکا۔ اتفاق کی طرف توجہ دلائی اور رسول کی نافرمانی سے ڈرایا۔ ساتویں رکوع میں اصل غرض کی طرف توجہ دلائی یعنی تزکیہ نفس۔ اور چونکہ نماز تزکیہ نفس کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس لیے نماز اور وضو اور تیمّم کے متعلق کچھ امور بیان فرمائے۔ یہودی جن ناپاکیوں میں مبتلا ہو گئے تھے جن کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ سرچشمۂ قدوسیت یعنی ذات الٰہی سے دور پھینکے گئے اُن سے ڈرایا۔ اور شرک کے خطرناک نتائج سے بچنے کے لیے ہدایت فرمائی۔ آٹھویں رکوع میں بتایا کہ یہودی کس طرح خدا کے احکام سے انحراف کر کے شیطان کے پیچھے لگ گئے اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ اپنے معاملات کو نااہلوں کے سپرد مت کرو اور اللہ اور رسول اور اولوالامر کی اطاعت کرو۔ ہاں اولوالامر سے اختلاف ہو تو پھر اللہ اور رسول کے حکم پر عمل کرو۔ نویں رکوع میں یہ بتایا کہ وہ لوگ جو رسول کے فیصلہ کی طرف نہیں آتے اور رسول اللہ کی اطاعت نہیں کرتے منافق ہیں اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والے اعلیٰ سے اعلیٰ انعام پاتے ہیں اور ان کو نبیوں اور صدیقوں اور شہداء اور صالحین کی معیت عطا ہوتی ہے۔ دسویں رکوع میں یہ بیان فرمایا کہ حفاظت کے لیے جنگ کی ضرورت ہے مگر منافق اپنے آرام اور آسائش کو مدّنظر رکھ کر جنگ میں شامل نہیں ہوتے۔ حالانکہ بہت سے کمزور مرد اور عورتیں اور بچے کفار کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھا رہے ہیں۔ گیارہویں رکوع میں بیان فرمایا کہ منافق مصائب سے بچنے کے لیے جنگ سے دل چراتے ہیں اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مشورے کرتے ہیں اور مسلمانوں میں گھبراہٹ پھیلانا چاہتے ہیں اور فرمایا کہ نبی تو اکیلا بھی جنگ کے لیے مکلّف ہے اور اللہ تعالیٰ آخر اس جنگ کو روک دے گا۔ بارھویں رکوع میں بتایا کہ منافقوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔ تیرھویں رکوع میں مومن کو قتل کرنے کی سزا بیان فرمائی اور مومنوں کو ہدایت کی کہ ہر ایک شخص کو اپنا دشمن نہ سمجھ لیا کریں۔ ہاں خدا کی راہ میں جہاد کی ضرورت بیشک ہے اور مجاہد کا مرتبہ بیٹھ رہنے والے سے بہت بڑھ کر ہے۔ چودھویں رکوع میں ان کمزور لوگوں کا ذکر کیا جو ابھی تک ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ پندرہویں رکوع میں بتایا کہ گو جنگ درپیش آ گئی ہے۔ مگر نماز (جو اصل غرض ہے) اسے کسی طرح چھوڑنا نہیں چاہیئے اور بحالت جنگ میں بھی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنی چاہیئے۔ سولھویں اور سترھویں رکوع میں منافقوں کے خفیہ مشوروں کا ذکر کیا۔ اٹھارھویں رکوع میں شرک کے ہر ایک پہلو سے بچنے کی تاکید فرمائی۔ انیسویں رکوع میں پھر یتامیٰ اور عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی۔ بیسویں میں بتایا کہ اپنا ہو یا غیر ہر ایک کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو۔ اور بتایا کہ جو ایمان لا کر پھر کافر ہو جاتے ہیں یعنی منافق وہ سرسبز نہیں ہونگے۔ اکیسویں رکوع میں منافقوں کی سزا کا ذکر کیا۔ بائیسویں میں یہودیوں کی غلطیوں اور شرارتوں کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ کس طرح پر انہوں نے ایک پاک دامن عورت مریم پر بہتان باندھے اور اس کے بیٹے مسیح رسول اللہ کو صلیب کی سزا دلا کر ملعون ثابت کرنا چاہا۔ مگر خدا نے اس برگزیدہ انسان کو صلیب کی موت سے بچایا اور اپنے قرب کے مراتب عطا فرمائے۔ پھر ان کی دوسری شرارتوں کا ذکر کیا۔ تیئسویں رکوع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی طرف توجہ دلائی اور اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے نبیوں سے ایک ہی طرح کلام کرتا رہا ہے اور جس طرح اس نے پہلوں سے کلام کر کے ان کو اپنی رضا کی راہوں پر خبردار کیا۔ اسی طرح اب اس نے اپنی رضا کی راہیں محمد رسول اللہ کے ذریعے سے کھول دی ہیں۔ اور اہل کتاب کو بتایا کہ اگر ایک طرف یہودی مسیح کو دکھ دینے کی وجہ سے قابل الزام ٹھہرے تو دوسری طرف عیسائیوں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ
خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا

اللہ کے نام سے جو بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنے والا ہے۔
اے لوگو! اپنے رب کا تقوےٰ اختیار کرو، جس نے تم کو ایک
ہی اصل سے پیدا کیا ۵۹۸ اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔

نے بھی غلو کر کے ایک انسان کو خدا بنا لیا۔ چوبیسویں رکوع میں بتایا کہ مسیح خدا کا ایک بندہ ہے اور اسی میں اس کی شان ہے اور آخر سورت کا خاتمہ پھر وراثت کے ایک مسئلہ پر کیا جس میں یہ بتانا مقصود تھا کہ اب نبوت کی وراثت بنی اسرائیل سے نکل کر بنی اسمٰعیل کو پہنچی ہے۔

تعلق سورۃ بقرہ اور آل عمران میں اصل غرض اس بات کا بتانا تھا کہ مسلمان کس طرح پر ایک کامیاب اور زندہ قوم بن سکتے ہیں۔ اس کے بعد اندرونی معاملات قومی پر ہدایات ضروری تھیں اور چونکہ قوم کی زندگی کی بنیاد میاں بی بی کے تعلقات پر ہے اس لیے ترتیب قرآنی میں پہلی دونوں سورتوں کے بعد اسی بات کی ضرورت تھی جس کا ذکر اس سورۃ یعنی النساء میں پایا جاتا ہے۔ معاشرت کے صحیح اصول کو جو پایہ قوم کی زندگی میں حاصل ہے علاوہ اس کے کہ خود واقعات عالم اس کی شہادت دیتے ہیں۔ کیونکہ قوم کے وسیع نظام میں گھر بمنزلہ ایک اکائی کے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی طرف توجہ دلائی ہے جب فرمایا خیرکم خیرکم لاھلہ گویا بتا دیا کہ اخلاق انسانی جو انسان کے مختلف تعلقات میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان کا معیار گھر کے تعلقات یعنی بی بی سے سلوک ہے اور ان کی ابتدا گھر سے ہوتی ہے۔
ایک اور رنگ میں اس سورت کا ربط پہلی سورت سے اس سے ظاہر ہے کہ پچھلی سورت کے آخری حصہ میں جنگ اُحد کے واقعات کا ذکر تھا اور اس سورت میں انہی امور کا ذکر ہے جو جنگ اُحد سے پیدا ہوئے۔ جیسا کہ خلاصہ مضمون سورت ہذا کی ابتدا میں دکھایا گیا ہے۔ پس طبعی ترتیب یہی تھی کہ سورت النساء سورت آل عمران کے بعد رکھی جاتی۔

زمانہ نزول جیسا کہ اوپر کے نوٹوں سے ظاہر ہے۔ اس سورت کا نزول جنگ اُحد کے بعد کا ہے اور بیشتر حصہ کا نزول چوتھے سال ہجرت میں ہُوا لیکن خاص خاص آیات کا نزول پیچھے کا بھی معلوم ہوتا ہے۔
صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت موجود ہے کہ سورۃ النسآء اس وقت نازل ہوئی جب آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تھیں۔ پس اس کے مدنی ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔ ایک آیت کے متعلق البتہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مکی ہے یعنی ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا اس آیت کا شان نزول واقعہ مفتاح کعبہ ہے یعنی فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عثمان کو خانہ کعبہ کی کنجی دینا جس کے قبضہ میں پہلے سے یہ کنجی چلی آتی تھی۔ لیکن اس لحاظ سے بھی یعنی اگر اس آیت کو فتح مکہ کے وقت کا نازل شدہ مانا جائے۔ یہ آیت مکی نہیں کہلائے گی۔ کیونکہ اصطلاح میں جو کچھ بعد ہجرت نازل ہُوا وہ سب مدنی ہے۔ خواہ وہ مکہ میں ہی نازل ہُوا ہے۔ اصل تقسیم قبل ہجرت اور بعد ہجرت کی ہے کیونکہ ان دونوں زمانوں کی نازل شدہ وحی میں ایک بیّن فرق معلوم ہوتا ہے۔ قبل ہجرت زیادہ تر اُصولی تعلیم ہے یعنی توحید رسالت معاد وغیرہ پر بحث اور بعد ہجرت تفصیلات شریعت پر زیادہ زور رہے ۔ کیونکہ تفصیلات شریعت کی ضرورت بعد ہجرت پیش آئی جب مسلمان ایک قوم کے رنگ میں الگ ہو کر رہنے لگے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ عموماً لمبی سورتوں کا نزول ایک لمبے زمانہ پر ممتد رہا ہے اور یہ بات مدنی سورتوں کے متعلق بالخصوص صحیح ہے، کیونکہ تفصیلات شریعت وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہیں اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ جس طرح مثلاً سورۃ بقرہ میں جو پہلے سال ہجرت کی سورت ہے بعض آیات بہت پچھلے زمانہ کی ہیں۔ جیسے آیت ربا۔ اسی طرح اس سورت میں بھی بعض آیات بہت پچھلے زمانہ کی ہوں اور سورۃ احزاب کی بعض آیات کو جن میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں کا ذکر ہے۔ اس سورت کی آیت تعدد ازدواج کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت تعدد ازدواج پچھلے زمانہ کی ہے۔ یعنی غالباً فتح مکہ کے قریب کے زمانہ کی ہے۔ اس پر مفصل بحث دوسری جگہ آئے گی۔

۵۹۸ نَفْس۔ اس کے کئی معنی ہیں۔ روح جیسے اخرجوا انفسکم (الانعام ۶-۹۳) اور نفس ناطقہ یا وہ چیز جو انسان کو حیوانات سے متمیز کرتی ہے مایکون بہ التمییز (ل) اس کی مثال دی ہے اللہ یتوفی الانفس حین موتھا (الزمر ۳۹-۴۲) اور بعض نے روح اور نفس میں یہ فرق کیا ہے کہ روح وہ ہے جس سے زندگی ہے اور نفس وہ ہے جس سے عقل ہے اور زجاج کا قول ہے کہ ہر انسان کے دو نفس ہیں یعنی حیات اور تمیز اور نیند میں ہی موخرالذکر نفس قبض کیا جاتا ہے (ل) اور نفس سے مراد سارا انسان بھی لیا جاتا ہے۔ جیسے ان تقول نفس یحسرتی (الزمر ۳۹-۵۶) اور کسی چیز کا نفس اس کی ذات ہے اور کسی چیز کے عین اور اس کے جوہر اور اس کی کنہ کو بھی نفس کہتے ہیں (ل)

نفس واحدۃ سے کیا مراد ہے۔ عموماً یہاں اس سے حضرت آدم ابو البشر کو مراد لیا گیا ہے۔ مگر دوسری جگہ جہاں یہی لفظ استعمال ہوتے ہیں ھوالذی خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منھا زوجھا لیسکن الیھا (الاعراف ۱۸۹) شخص کا ذکر نہیں بلکہ جنس کا ذکر سمجھا گیا ہے (ث) اور امام رازیؒ نے قفال سے اسی کی مثل قول نقل کیا ہے۔ ھذہ القصۃ علی تمثیل ضرب المثل یعنی ہر انسان کو خطاب ہے کہ اسے ایک ہی انسان سے یعنی اس کے والد سے پیدا کیا اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہاں خطاب اہل عرب سے ہے اور مراد صرف ان کا مورث اعلیٰ ہے۔ پس وہی دو معنی یہاں بھی لیے جا سکتے ہیں اور یوں نفس واحدۃ سے مراد حضرت آدم بھی ہو سکتے ہیں۔ کسی ایک قوم کا مورث اعلیٰ بھی ہو سکتا ہے اور مثل کے طور پر ہر شخص بھی مراد ہو سکتا ہے۔
یہاں چونکہ حقوق انسانی کی طرف توجہ دلائی تھی اور اس میں بالخصوص کمزوروں یعنی یتامیٰ اور عورتوں کے حقوق کی طرف اس لیے فرمایا کہ اس نے تم کو

زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً ۚ اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں[۵۹۹] اور اللہ کے
وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَآءَلُونَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ (حقوق) کی جسکے ذریعہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رحموں

ایک نفس یا ایک ہی جی سے پیدا کیا۔ گویا تم سب ایک ہی کنبہ کے لوگ ہو۔ پس تم سب کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں۔ سب انسانوں کو ایک ہی جی سے پیدا کیا۔ یہ بڑی بھاری صداقت ہے اور اس میں نسل انسانی کے اتحاد کی بنیاد ہے۔ یورپ نے موجودہ دہریت کی رو کے نیچے یہ بھی خیال کر لیا ہے کہ ایک ماں باپ سے سب انسان پیدا نہیں ہوئے۔ کیونکہ خط و خال نقوش قد و قامت رنگت کے فرق بہت زیادہ ہیں۔ ایک یورپ کا آدمی خواہ کتنی مدت بھی افریقہ میں رہے اور گو کتنی بھی سیاہی اس کی رنگت پر آجائے مگر وہ پورا حبشی کبھی نہیں بن سکتا۔ اور نہ ایک حبشی یورپ میں رہ کر یورپین کی سفیدی اور خط و خال حاصل کر سکتا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ وہ لوگ جو بندر اور انسان کو متحد الاصل مان سکتے ہیں ایک یورپین انسان اور حبشی انسان کو متحد الاصل نہیں مان سکتے۔ اور اس طرح پر نسل انسانی میں ایک تفریق قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ سب نسل انسانی کے حقوق متساوی نہ سمجھے جائیں۔ جب تک نسل انسانی کا اتحاد قائم نہ ہو اس وقت تک تفریقات قومی مٹ نہیں سکتیں۔ اور چونکہ اسلام کا مقصد یہ تھا کہ سب نسل انسانی ایک ہو جائے اور سب تفریقات قومی مٹ جائیں۔ اس لیے اس حقیقت کی طرف بھی اس نے توجہ دلائی ہے۔

آدم سے پہلی نسل کا وجود: ہاں قرآن کریم نے بائبل کی طرح یہ نہیں کہا کہ نسل انسانی چھ ہزار سال سے ہے اور نہ ہی اسبات کو منوایا ہے کہ حضرت آدم جنکا ذکر دوسری جگہ قرآن شریف میں آیا ہے سب سے پہلے بشر تھے۔ بلکہ بعض روایات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اور بھی آدم ہوئے ہیں اور ابتدا نسل انسانی کی کب سے ہے یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ چنانچہ امامیہ کی روایات میں ایک روایت ہے ان اللہ تعالی خلق قبل ابینا اٰدم ثلثین اٰدم بین کل اٰدم واٰدم الف سنۃ وان الدنیا بقیت خرابا بعدھم خمسین الف سنۃ ثم عمرت خمسین الف سنۃ ثم خلق ابینا اٰدم علیہ السلام (م) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمارے باپ آدم سے پہلے تیس آدم پیدا کیے ہر ایک آدم اور آدم کے درمیان ایک ہزار سال گزرے، اور ان کے بعد دنیا پچاس ہزار سال ویران رہی پھر پچاس ہزار سال تک آباد ہوئی پھر ہمارے جد امجد آدم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور محمد بن علی الباقر سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا قد انقضی قبل اٰدم الذی ھو ابونا الف الف اٰدم او اکثر (ر) اس آدم کے پہلے جو ہمارے باپ ہیں دس لاکھ آدم یا اس سے بھی زیادہ پیدا ہوئے اور شیخ اکبر نے فتوحات میں لکھا ہے کہ ہمارے آدم سے چالیس ہزار سال پہلے ایک اور آدم تھے اور خصائص میں امام صادق سے روایت ہے ان اللہ تعالی اثنی عشر الف عالم کل عالم منھم اکبر من سبع سمٰوٰت وسبع ارضین (ر) یعنی اللہ تعالیٰ کے بارہ ہزار عالم ہیں ان میں سے ہر ایک عالم سات آسمانوں اور سات زمینوں سے بڑا ہے۔

۵۹۹ حوا کا آدم سے پیدا ہونا: الفاظ خلق منھا زوجھا میں یہ اشارہ سمجھا گیا ہے کہ آدم سے اس کے جوڑے یعنی حوا کو پیدا کیا اور یہ اس طرح ہوا کہ آدم کی ایک پسلی نکال کر اس سے حوا بنائی گئی۔ مگر قرآن کریم نے ایسے ہی الفاظ دوسری جگہ استعمال کیے ہیں۔ ومن اٰیٰتہٖ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ (الروم ۳۰ - ۲۱) اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے ہی نفسوں سے تمہارے لیے بیبیاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے تسکین قلب حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحم بنایا۔ اور دوسری جگہ ہے واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجا (النحل ۱۶ - ۷۲) اب یہاں تمام انسانوں کو یہ کہا ہے کہ تمہاری بیبیاں تمہارے نفسوں سے پیدا کیں۔ حالانکہ یہ مراد نہیں کہ تمہاری پسلیوں سے پیدا کیں پس مرد سے عورت کے پیدا کرنے کا منشاء بھی خود قرآن کریم نے بیان فرما دیا ہے یعنی یہ کہ تم ایک دوسرے سے تسکین حاصل کرتے ہو اور تم میں محبت و رحم باہم اس قدر ہے کہ گویا مرد اور عورت دونوں ایک ہی ہیں۔ اس لحاظ سے بھی ایک جگہ من انفسکم اور دوسری جگہ منھا کا استعمال بالکل درست ہے کیونکہ مرد اور عورت کا اس قدر گہرا تعلق ہے کہ گویا عورت مرد سے ہی بنی ہے یا خلق منھا زوجھا سے مراد یہ ہے کہ جس ایک جی سے اے مردو تم کو پیدا کیا اسی سے تمہاری ازواج کو پیدا کیا پس تم مرد اور عورت کے درمیان کوئی اس قسم کا تفرقہ نہ کرو کہ ایک کو تو گویا حقوق انسانیت حاصل ہیں اور دوسرے کو نہیں۔ انسان ہونے میں عورتیں تمہارے ساتھ یکساں حقوق رکھتی ہیں کہ جہاں سے مرد پیدا ہو وہیں سے عورت پیدا ہوئی۔ ہر رنگ میں یہ الفاظ عورت کو ایک نہایت ہی عزت کا مقام دیتے ہیں۔

عورت کا پسلی سے پیدا ہونا: اور یہ جو خیال ہے کہ حدیث سے حوا کا آدم کی پسلی سے پیدا ہونا ثابت ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں پسلی سے پیدا کرنے کا ذکر بیشک بائبل میں پایا جاتا ہے جہاں لکھا ہے "آدم پر ایک بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کے آدم کے پاس لایا" (پیدائش ۲ : ۲۱ و ۲۲) مگر کسی حدیث میں یہ نہیں اور جس حدیث سے یہ نکالا جاتا ہے وہ دو طرح پر بخاری میں کتاب النکاح میں آئی ہے ایک جگہ ہے المرأۃ کالضلع (باب المداراۃ) عورت پسلی کی طرح ہے اور دوسری جگہ ہے واستوصوا بالنساء خیرا فانھن خلقن من ضلع (باب الوصاۃ بالنساء) عورتوں کے حق میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ ان دونوں حدیثوں میں حضرت حوا کے حضرت آدم سے پیدا ہونے کا ذکر مطلق نہیں بلکہ عام طور پر تمام عورتوں کا ذکر ہے۔ اصل میں حدیث کی ایک روایت دوسری کی خود تشریح کرتی ہے خلق من ضلع سے کیا مراد ہے۔ المرأۃ کالضلع نے اس کو صاف کر دیا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ عورتیں پسلی سے تو پیدا نہیں ہوتیں پس مراد وہی ہے جو دوسری حدیث میں بیان کر دی کہ وہ پسلی کی طرح ہیں یعنی ان میں اعوجاج ہے۔ ایسی مثالیں خود قرآن شریف میں ہیں خلق الانسان من عجل (الانبیاء ۲۱ - ۳۷) مطلب یہ کہ اس میں جلد بازی پائی جاتی ہے اللہ الذی خلقکم من ضعف (الروم ۳۰ - ۵۴) یعنی تم میں ضعف پایا جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ① | کی نگہداشت کرو اللہ تم پر نگہبان ہے۔[۶۱]

انسان اوّل کی پیدائش کس طرح ہوئی کوئی فلسفہ اس کو کھول نہیں سکتا۔ قرآن کریم کی غرض بھی چونکہ یہ نہ تھی، کہ انسان کی ابتدائے پیدائش کا ذکر کرے۔ بلکہ اس کی غرض صرف یہ بتانا ہے کہ انسان کیا کمالات حاصل کرسکتا ہے اس لیے زمین و آسمان کس طرح پیدا ہوئے مادہ کس طرح پیدا ہوا۔ روحیں کس طرح پیدا ہوئیں حیوان کس طرح پیدا ہوئے۔ درخت کس طرح پیدا ہوئے انسان کس طرح پیدا ہوئے ان سوالوں کو یہ پاک کتاب نہیں چھیڑتی اور نہ "کس طرح" کا جواب کبھی انسان اپنے ان قویٰ کے ساتھ دے سکتا ہے بلکہ دے سکنا تو ایک طرف رہا سمجھ بھی نہیں سکتا۔ خواہ ہم مسئلہ ارتقا کو لے لیں اور خواہ عام طور پر جو مسلمانوں میں خیال پایا جاتا ہے اس کو لے لیں اور خواہ جو بعض دوسرے مذاہب پیش کرتے ہیں اس کو لے لیں۔ انسان اوّل کی پیدائش کسی عجیب رنگ میں ہی ہوئی جو دنیا کے موجودہ قوانین قدرت سے الگ کوئی قانون ہے خود قرآن کریم نے یبدئ ویعید میں بدء اور عود کے دو قانونوں کا ذکر کیا ہے۔ پس انسان اوّل کی پیدائش کے لیے کوئی الگ حالات تھے۔ پہلی عورت بھی انہی حالات کے ماتحت پیدا ہوئی ہوگی۔

سوال یہ ہوسکتا ہے کہ عورت میں کیا ٹیڑھا پن پایا جاتا ہے۔ ٹیڑھا پن سے مراد یہاں ایک طرف کا میلان ہے۔ آیا یہ ایک طرف میلان عورت میں مرد سے بڑھ کر ہے؟ واقعات مجبور کرتے ہیں کہ اس کا جواب ہم اثبات میں دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دو قسم کی صفات دنیا میں کام کر رہی ہیں ایک نرمی کی صفت اور دوسری صفت خشونت۔ نرمی کی صفت میں اثر پذیری زیادہ ہے اور صفت خشونت میں اثر ڈالنا زیادہ ہے اب قدرت نے مرد و عورت کے ملاپ کے لیے اور ایک کو دوسرے کا زوج بنانے کے لیے یہ تقسیم کی ہے کہ نرمی کی صفت کو عورت میں زیادہ رکھا ہے اور صفت خشونت کو مرد میں زیادہ رکھا ہے اسی لیے مرد و عورت کا تعلق ایک دوسرے کی تسکین قلبی کا موجب ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک میں جو کمال ہے وہ دوسرے کے نقص کو پورا کر دیتا ہے۔ صفت خشونت کا تقاضا یہ ہے کہ اس صفت کا مالک ہر قسم کی مخالفتوں وغیرہ کا مقابلہ خوب کرسکتا ہے مگر اس کا نقص یہ ہے کہ اس میں محبت اور ہمدردی کی کمی ہوتی ہے۔ نرمی کی صفت کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں محبّت اور ہمدردی زیادہ ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ صفت چاہتی ہے کہ اس کا مالک جلد اثر قبول کرے اس لیے اس میں نقص یہ ہے کہ وہ جلدی ایک طرف کا میلان اختیار کر لیتا ہے یہی وہ اعوجاج ہے جس کا ذکر حدیث میں ہے اور یہ عورت کے اس نقص کی طرف توجہ دلاتا ہے جو اس میں صفت محبّت و رحم کے غلبہ کی وجہ سے پیدا ہونا ضروری تھا۔ اسی لیے مرد کو منع کیا ہے کہ وہ اس کی اقامت کے درپے ہو جائے۔ چنانچہ خلقن من ضلع کے بعد آتا ہے فان ذھبت تقیمه کسرته حالانکہ اگر یہ کوئی ٹیڑھا پن اپنے معمولی معنی میں ہوتا تو اس کی اصلاح تو مرد کا فرض تھا۔ یہ عورت کا ایک طبعی تقاضا ہے۔ اس لیے وہ اس کے خلاف نہیں کرسکتی اور جو اس سے اس کے خلاف کرانا چاہے گا وہ اس طبیعت کو توڑے بغیر ایسا نہیں کرا سکتا۔

ع[۶۰] تساءلون۔ اس کا اصل تتساءلون ہے جو باب مفاعلۃ سے ہے یعنی ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔ اللہ کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے سوال کرنے سے یہ مراد ہے کہ اللہ کا واسطہ دیکر سوال کیا جاتا ہے اور یہ صرف عرب ہی نہ کرتے تھے کہ ان کو مخاطب سمجھا جائے بلکہ کل دنیا میں اللہ کا واسطہ دیکر سوال کیا جاتا ہے۔

الارحام۔ رَحِم کی جمع ہے یعنی عورت کا رحم اور استعارۃً قرابت پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ قریبی ایک ہی رحم سے نکلے ہوتے ہیں۔ اسی مادہ سے لفظ رحمۃ رحمان وغیرہ ہیں۔ اسی بنا پر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رَحِم کا لفظ میرے نام رحمان سے مشتق ہے۔ انا الرحمٰن وانت الرحم شققت اسمك من اسمی الارحام یہاں اللہ پر عطف ہے یعنی اتقوا اللہ و الارحام اور اتقوا الارحام سے مراد ہے ارحام کے حقوق کی نگہداشت کرو جیسا کہ اتقوا اللہ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کے حقوق کی نگہداشت کرو۔ دیکھو ع[۱]

رقیبا۔ رَقَبَۃ گردن کو کہتے ہیں اور رَقَبْتُہٗ کے معنی ہیں حَفِظْتُہٗ میں نے اس کی حفاظت کی۔ اسی سے رَقیب بمعنی حافظ یا نگہبان ہے اور الرقیب اسمائے الٰہی میں سے ایک ہے۔

حقوق العباد صلہ رحمی میں داخل ہیں: پہلے حصّہ آیت میں جو حکم اتقوا ربکم میں دیا گیا تھا اسی کی تفصیل یہاں کی ہے اور ایک طرف اگر حقوق اللہ کی طرف توجہ دلائی ہے تو دوسری طرف حقوق العباد کی طرف صلہ رحمی کا حکم دیتے ہوئے توجہ دلائی ہے اور حقوق العباد کو صلہ رحمی میں اس لیے داخل کیا ہے کہ ساری نسل انسانی کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دیکر گویا سب کو ایک ہی خاندان کے افراد قرار دیا اس لیے کہ اسلام کی صلہ رحمی کا حکم بھی درحقیقت کل نسل انسانی پر حاوی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس صلہ رحمی کا یہی وسیع مفہوم لیا ہے جہاں اہلِ مصر کو حضرت ہاجرہ کے تعلق کی وجہ سے اپنے ننہال قرار دیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہے کہ جب مصر کے لوگ نہایت تنگی کی حالت میں نبی کریم صلعم کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے لوگوں کو صدقہ کی تحریص دلاتے ہوئے یہی آیت پڑھی یایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ جس سے صاف معلوم ہوا کہ آپ نے خود ساری نسل انسانی کو ایک ہی کنبہ قرار دیا ہے اور سب کے ساتھ نیکی کو صلہ رحمی میں داخل کیا ہے اور دوسرے صلہ رحمی سے ہی حقوق العباد کی بنیاد پڑتی ہے۔ کیونکہ انسان کے تعلقات زیادہ تر قریبیوں سے ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے حقوق العباد کا بڑا حصّہ صلہ رحمی میں آجاتا ہے اور ایک انسان جب قریبیوں سے حسن سلوک کرتا ہے جن سے اسے دن رات واسطہ پڑتا ہے۔ تو وہ دوسروں سے حسن سلوک کا بھی عادی ہو جاتا ہے۔

صلہ رحمی کی تاکید: یہاں اللہ تعالیٰ نے اتقوا اللہ والارحام کہہ کر اور رحموں کے حقوق کی نگہداشت کو اپنے حقوق کی نگہداشت کے ساتھ بیان کر کے حقوق رحم کی عظمت کی طرف توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ صرف عبادت کوئی چیز نہیں جب تک کہ ہر طرح کے حقوق جو انسان کے ذمہ ہیں ادا نہ ہوں۔ احادیث میں صلہ رحمی کی

وَ اٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲

اور یتیموں کو اُن کے مال دو اور اچھی چیز کو ردی سے نہ بدلو اور ان کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ یہ بڑا گناہ ہے ع۶۰۱

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ

اور اگر تمھیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو (ایسی) عورتوں سے نکاح کرلو جو تمھیں پسند ہوں ع۶۰۲۔

بڑی تاکید آئی ہے۔چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ رَحِم کا نام میرے ہی نام سے مشتق ہے فمن وصلها وصلته ومن قطعها قطعته جو شخص صلہ رحمی کرتا ہے میں بھی اس کے ساتھ ملتا ہوں اور جو شخص قطع رحمی کرتا ہے میں بھی اس سے قطع کرتا ہوں اور ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا الصدقة علی المسکین صدقة وعلی ذی الرحم ثنتان صدقة وصلة۔یعنی مسکین پر صدقہ صدقہ ہے اور قریبی پر صدقہ دوہری نیکی ہے وہ صدقہ بھی اور صلہ رحمی بھی۔لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان اپنے قریبیوں کے سوائے دوسروں کو کچھ دے نہیں۔اصل سوال استحقاق کا ہے جب دو یکساں محتاج ہوں تو قریبی کا حق بیشک زیادہ ہے اسی لیے قرآن شریف نے جہاں احسان وغیرہ کا حکم دیا ہے وہاں ذوی القربیٰ کو مساکین پر مقدم کیا ہے۔

ع۶۰۱ الیتامیٰ اصطلاح شریعت میں یتیم صرف اس کو کہا جاتا ہے جو حدِ بلوغ کو نہ پہنچا ہو۔حدیث میں ہے لا یتم بعد الحلم یعنی بلوغت کے بعد یتیمی نہیں۔امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ۱۸ سال کی عمر بلوغت کی حد ہے۔

الخبیث بالطیّب۔خبیث کے معنی ردّی بھی ہیں اور باطل یا حرام بھی اور طیّب کے معنی ستھرا بھی ہیں اور پاکیزہ یا حلال بھی۔پس اس کے دو طرح پر معنی ہو سکتے ہیں۔حلال مال جو تم خود کما سکتے ہو اس کے بدلے میں یتیموں کا مال نہ لو جو تم پر حرام ہے۔یا اپنی ردّی چیزوں کے ساتھ ان کے مال کی عمدہ چیزوں کو نہ بدل دو اور الیٰ اموالکم میں الیٰ بمعنی مع ہے یعنی ان کے ساتھ ملا کر مت کھا جاؤ۔

حوبا۔حُوب کے معنی اثم یعنی گناہ ہیں۔اس کا اصل حَوب سے ہے جس کے معنی زجر یا روک دینا ہیں۔

یتامیٰ کی خبرگیری کی تاکید: چونکہ عورتوں کے حقوق کی طرح یتامیٰ کے حقوق بھی پامال ہوتے تھے اور یہ دونوں گروہ کمزور تھے جن کے حقوق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔اس لیے ابتدا یتامیٰ کے حقوق سے کی ہے۔یتامیٰ کی خبرگیری کے لیے اسلام میں اس قدر تاکید پائی جاتی ہے کہ مکّی وحی میں جب زیادہ زور صرف توحید باری پر تھا یتامیٰ اور مساکین کی خبرگیری پر بھی اسی طرح زور دیا جاتا تھا۔گویا بتا دیا کہ ایک خدا کو وہی مانتا ہے جو اس کی بیکس مخلوق پر شفقت کرتا ہے۔

ان آیات میں جن یتامیٰ کا ذکر ہے وہ صاحبِ جائداد یتامیٰ ہیں۔جس طرح آجکل دنیا میں ہو رہا ہے کہ اپنے بھائی کو کمزور دیکھا تو اس کا مال دبا لیا۔کسی قوم کو کمزور دیکھا تو اس کا ملک دبا لیا،یہی حالت ملک عرب میں تھی کہ ان لوگوں کی جائدادوں کو جو ابھی بلوغ کو نہ پہنچے ہوتے کھا جاتے تھے۔یہاں ان یتامیٰ کے بارے میں تین حکم دیئے ہیں۔اوّل یہ کہ یتیموں کو ان کے مال دو یعنی ان کی ضروریات کے مطابق ان پر خرچ کرتے رہو ایسا نہ ہو کہ ولی بنکر تم ایسے ان کے مالوں پر متصرف ہو جاؤ کہ ان پر اُن کے مال خرچ نہ کرو اور ان کی تعلیم و تربیت کیلئے ان کے مالوں کو نہ لگاؤ دوسرا حکم یہ ہے کہ ان کے مالوں کو جو تمہارے لیے حرام ہیں اپنی حلال کمائی کو چھوڑ کر نہ کھا جاؤ یا اپنی ردّی چیزیں ان کی اچھی چیزوں کی جگہ نہ رکھ دو۔اور تیسرا حکم یہ ہے کہ اپنے مالوں میں ملا کر ان کے مال نہ کھا جاؤ یعنی بظاہر شراکت کا رنگ ہو مگر اصل غرض ان کے مال کو کھانے کی ہو۔

ع۶۰۲ طاب کے معنی ہیں ایک چیز کا عمدہ اور پاکیزہ ہونا (ل) پس ماطاب لکم سے مراد ہے جس کی طرف بوجہ اس کی عمدگی اور اچھا ہونے کے نفس مائل ہو۔دیکھو ع۸۲ اور اگلی آیت میں اسی سے طِبْنَ خوشی سے دینے کے معنی میں آیا ہے۔

یتامیٰ کے ذکر میں عورتوں سے نکاح کے ذکر کا کیا تعلق ہے؟اس کی چار توجیہیں کی گئی ہیں اول وہ جو حضرت عائشہ رضؓ سے بخاری میں مروی ہے یعنی یہ کہ یتامیٰ سے مراد یتیم لڑکیاں ہیں جو اپنے ولی کی حفاظت میں ہوں اور ولی ان کے مال اور خوبصورتی کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ ان سے نکاح کرلیں مگر تھوڑے مہر پر اور پھر چونکہ ان کے حقوق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہیں۔اس لیے ان سے اچھا معاملہ نہیں کرتے تو اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اگر ایسی یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے میں تم کو اس بات کا خوف ہو کہ ان کے معاملہ میں انصاف نہیں کرسکو گے تو ان کو چھوڑ کر دوسری عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں نکاح کرلو۔دوسری توجیہہ یہ ہے کہ اس میں چار سے زیادہ نکاحوں سے روکا ہے۔کیونکہ عرب میں لوگ دس دس عورتوں تک نکاح کرلیتے پھر جب اپنا مال کفایت نہ کرتا تو یتامیٰ کا مال اس طرح اُڑا دیتے۔تیسری توجیہہ یہ ہے کہ یتیموں کے بارہ میں اگر تم کو ناانصافی کا خوف ہے تو عورتوں کے بارہ میں بھی ناانصافی سے بچو اور چار سے زیادہ بیبیاں نکاح میں نہ لاؤ۔اگر ان میں بھی عدل نہ کرسکو تو ایک ہی بی بی ہو۔چوتھی توجیہہ یہ ہے کہ وہ یتامیٰ کی ولایت کو ناانصافی کے خوف کی وجہ سے مشکل سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اس سے خوف کرتے ہو تو اسی طرح عورتوں کے بارہ میں زنا سے بھی خوف کرو۔یعنی اگر زنا میں پڑنے کا خوف ہو تو چار تک عورتوں سے نکاح کرلو۔

لیکن ان الفاظ کی ایک اور توجیہہ بھی ہوسکتی ہے اور وہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہاں مراد ما طاب لکم من النساء میں اُمہات الیتامیٰ ہیں یعنی یتیم بچّوں کی مائیں۔اور الّا تقسطوا فی الیتامیٰ میں مراد وہ یتیم بچے ہیں۔تو گویا آیت کا مطلب یوں ہُوا کہ اگر تم کو خوف ہو کہ یتیم بچوں کے بارہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو

وَ رُبٰعَ ج فَاِنْ خِفْتُمْ
دو دو اور تین تین اور چار چار[۶۰۳] اور اگر تمہیں خوف ہو

ایسی عورتوں سے جن کے وہ بچے ہیں نکاح کر لو۔ کیونکہ نکاح سے وہ بچے اولاد کی حیثیت حاصل کر لیں گے اور ان کی ذمہ داری ان کی والدہ کے شوہر پر ہوگی اس معنی کی آیت ۱۲۷ بھی مؤید ہے۔ اس لیے کہ اس آیت یعنی یستفتونک فی النساء کے بارہ میں یہ مسلّم ہے کہ یہ اُم کحت کے بارہ میں نازل ہوئی جو یتامٰی کی والدہ تھی۔ پس معلوم ہوا کہ وہ آیت اُمہات الیتامٰی کے بارہ میں ہے اور اس لیے اس آیت میں جو اس پہلی آیت کی طرف اشارہ ہے۔ واضح کرتا ہے کہ یہاں بھی ان عورتوں کے نکاح کا ذکر ہے جو امہات الیتامٰی ہیں اس توجیہہ کے لیے آیت میں کچھ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں اور سیاق مضمون بھی یہی چاہتا ہے کیونکہ اصل مضمون اس رکوع میں عورتوں سے نکاح کا نہیں بلکہ یتامٰی کی خبرگیری ہے پس یتامٰی کی خبرگیری کی ایک دِقّت رفع کرنے کے لیے اس نکاح کو ایک علاج کے طور پر بتایا ہے۔

ما طاب لکم سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ نکاح کے لیے پسندیدگی شرط ہے اور پسندیدگی کے لیے دیکھنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح مُسلم میں ایک حدیث ہے کہ ایک صحابی سے جو ایک انصاری بی بی سے نکاح کرنا چاہتے تھے نبی کریم صلعم نے دریافت کیا، کیا تم نے اسے دیکھ لیا ہے اس نے نفی میں جواب دیا تو آپؐ نے فرمایا جاؤ اسے دیکھ لو کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ نقص ہوتا ہے۔ اور جمہور علما کا یہی مذہب ہے کہ نکاح کے لیے عورت کو دیکھنا جائز ہے ہاں اس میں اختلاف ہے کہ عورت کی رضامندی سے دیکھے یا نہیں امام مالک کہتے ہیں دیکھنے کے لیے عورت کی رضامندی ہونی چاہیئے۔ جمہور اس کے خلاف ہیں۔ اور امام مالک کا قول قابل ترجیح ہے اور اس سے ایک اور استنباط بھی ہو سکتا ہے یعنی جب مرد عورت کو دیکھ سکتا ہے تو عورت کے بھی ایسے مرد کو دیکھ لینے میں کوئی امر خلاف شریعت نہیں۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کا عمل اس پر نہیں یعنی اکثر نکاح بن دیکھے ہوتے ہیں اسی کا نتیجہ بے اتفاقیوں کی کثرت اور طلاق کی زیادتی ہے۔

دوسری بات جو ما طاب لکم سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ نکاح چھوٹی عمر میں نہیں ہونے چاہئیں۔ اس لیے کہ ایک چھوٹی عمر کا بچّہ پسندیدگی یا ناپسندیدگی کس طرح کر سکتا ہے جب وہ اس کو سمجھنے کے ہی قابل نہیں۔

۶۰۳ مثنیٰ وثلٰث وربٰع۔ یہ لفظ اثنین اثنین اور ثلاثۃ ثلاثۃ اور اربعۃ اربعۃ کے قائم مقام ہیں یعنی دو دو، تین تین، چار چار۔ اور ان کے درمیان واؤ لانے سے مراد ان کا جمع کرنا نہیں یعنی یہ منشا نہیں کہ ایک ہی شخص دو دو بھی کر لے اور تین تین بھی کر لے اور چار چار بھی کر لے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر ایک کو اس کے حالات کے مطابق دو کی اجازت ہے، تو دوسرے کو اس کے حالات کے مطابق تین کی اجازت ہے اور کسی کو چار کی۔ دو اور تین اور چار کو جمع کر کے اس سے نو کی اجازت نکالنا یا دو دو، تین تین، چار چار کو جمع کر کے ۱۸ کی اجازت نکالنا خلاف قواعد تاویل ہے اور اَوْ کے ساتھ ان الفاظ کو اس لیے عطف نہیں کیا کہ پھر مراد یہ ہوتی کہ یا دو دو کی اجازت ہے یا تین تین کی یا چار چار کی۔ حالانکہ مطلب یہ تھا کہ کسی کو دو کی اور کسی کو تین کی اور کسی کو چار کی اجازت ہے اور اس ترکیب کے اختیار کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چار سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ جب یوں کہا جائے کہ اس مال کو دو دو اور تین تین اور چار چار کر کے تقسیم کر دو تو اس سے مراد صرف اسی قدر ہوتی ہے کہ کسی کو دو اور کسی کو تین کسی کو چار دے دو۔ اور چار سے زیادہ کی اجازت اس سے نہیں نکلتی۔ اور نہ ہی یہ مراد ہوتی ہے کہ ایک ہی آدمی کو دو اور تین اور چار یا نو دیدو۔

یہ الفاظ اِسلام میں مسئلہ تعدد ازدواج کی بنیاد ہیں۔ الفاظ صریحًا ایسے تھے کہ نہ مخالفین کو اعتراض کا موقعہ تھا۔ نہ موافقین کو غلطی لگ سکتی تھی۔ مگر تعجب ہے کہ جہاں ایک طرف مخالفین نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ گویا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس کے نکاح میں کئی بیبیاں ہوں بعض مسلمان کہلانے والوں نے بھی اپنی خواہشاتِ نفسانی کو پورا کرنے کے لیے اسے حکم قرار دیا ہے اور یوں اس کی تاویل کر لی ہے کہ سب سے افضل تو یہ ہے کہ چار بیبیاں ہوں ورنہ تین ورنہ دو۔ جس خیال کو قرآن شریف کے صاف الفاظ دھکے دے رہے ہیں سوالات غور طلب اس مسئلہ میں یہ ہیں (۱) کیا ایک سے زیادہ نکاح کرنے کا حکم ہے یا اجازت (۲) کیا اجازت ضرورت کے لیے ہے یا بلا ضرورت بھی ایک سے زیادہ بیبیاں نکاح میں لائی جاسکتی ہیں۔ (۳) کیا اگر قرآن کریم نے یہی تعلیم دی ہے کہ بوقتِ ضرورت تعدد ازدواج کی اجازت ہے تو اس مسئلہ پر اعتراض ہو سکتا ہے (۴) یہ کہ آیا ضرورت کے ہوتے ہوئے چار سے زیادہ بیبیاں نکاح میں لانا جائز ہے۔

یہ اجازت ہے نہ حکم: سب سے پہلے دیکھنا ہے کہ یہ حکم ہے یا اجازت۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دو تین چار بیبیوں سے نکاح کرنا کسی شرط سے مشروط ہے اور وہ شرط یتیموں کے بارہ میں انصاف نہ کر سکنے کا خوف ہے پس اوّل تو یہ آیت صرف ان لوگوں کے لیے ہوئی جن کو یتامٰی کی خبرگیری سے تعلّق پڑتا ہے اور عام نہ ہوئی اور یہ خود اس کے حکم ہونے کے خلاف دلیل ہے۔ دوسرے یہ بے معنی بات ہے کہ کہا جائے کہ اگر تم کو یتیموں کے بارہ میں انصاف نہ کر سکنے کا خوف ہو تو تمہارے لیے ضروری ہے کہ دو یا تین یا چار بیبیوں سے نکاح کر لو۔ پھر جس قدر توجیہات الفاظ ان خفتم الا تقسطوا فی الیتامٰی کی کی گئی ہیں باقی جاسکتی ہیں ان سب سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشروط اجازت ہے نہ حکم۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ تعدد ازدواج کی اجازت ہے، حکم نہیں تو دوسرا امر یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ اجازت ضرورت وقت پر استعمال کرنے کے لیے ہے یا بلا ضرورت بھی۔ سو اول تو لفظ اجازت خود بتاتا ہے کہ یہ صرف ضرورت کے لیے ہے۔ کیونکہ ہر ایک اجازت دنیا میں کسی ضرورت کے لیے ہی ہوا کرتی ہے۔ دوسرے خود قرآن کریم کے الفاظ اس بات کے مؤید ہیں۔ کیونکہ وہاں خود ایک شرط ساتھ لگا دی۔ گویا ایک ضرورت خود بتا دی۔ اب ضرورت میں توسیع تو ہو سکتی ہے یعنی جو کام ایک ضرورت کے لیے جائز ہے اس کا جواز اجتہادی رنگ میں کسی دوسری ملتی جلتی ضرورت کے لیے ہو سکتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اس ضرورت کو بالکل اڑا ہی دیا جائے۔

اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً — کہ عدل نہیں کر سکو گے

تعدد ازدواج کی ضرورتوں کی تصریح کیوں نہیں کی: ہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم نے ان ضروریات کی تصریح کیوں نہیں فرما دی اس کا جواب یہ ہے کہ جن امور کا تعلق انسانی ضروریات کے مختلف پہلوؤں سے ہے جو ملکوں اور قوموں اور زمانہ اور حالات کے تغیر سے بدلتے رہتے ہیں۔ وہاں قرآن حکیم ان ضروریات کو گننے کی لاحاصل کوشش سے احتراز فرماتا ہے۔ مثلاً طلاق کا مسئلہ ہے۔ قرآن کریم نے کہیں نہیں بتایا کہ فلاں فلاں ضروریات کے وقت طلاق دینا جائز ہے۔ حالانکہ یہ نہایت ہی بیّن امر ہے کہ طلاق کی اجازت ضرورت کے لیے دی ہے نہ بلا ضرورت۔ لیکن چونکہ طلاق کے لیے جو ضروریات پیدا ہوتی رہتی ہیں وہ نہ صرف انسانوں کی مزاجوں کے اختلاف کے ساتھ ہی بدلتی رہتی ہیں۔ بلکہ قومی اور ملکی اور زمانی حالات کے تغیر سے بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے ان کا بتانا ایک لاحاصل کام تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے ممالک میں جہاں سب قوموں کا ایک ہی مذہب ہے ایک سی تعلیم ہے ایک سے خیالات ہیں۔ ایک سے حالات ہیں۔ کوئی دو ملک ضروریاتِ طلاق پر اتفاق نہیں کرتے۔ اسی طرح تعدد ازدواج کی ضروریات کو خاص کرنا محال ہے۔

تعدد ازدواج کی ضرورت: اب تیسری بات جس پر ہم نے غور کرنا ہے یہ ہے کہ آیا جس صورت میں قرآن کریم نے تعدد ازدواج کی اجازت ضرورت کے وقت دی ہے تو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اس بات سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ ہر ایک قوم نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ اسلام نے ان ضروریات کا علاج تعدد ازدواج کی صورت میں رکھ دیا۔ دوسری قوموں نے اس کے لیے طرح طرح کے اور طریق اختیار کیے حتّٰی کہ بعض ملکوں میں قانوناً زنا کے پیشہ کو تسلیم کیا گیا ہے اور بعض نے اس کو اس حد تک رواج دیا ہے کہ قانونی جواز سے کچھ کم مرتبہ اس کا نہیں رہا۔ اسلام چونکہ عورت کی عزّت اور عفت کا حامی ہے اور اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ عورتیں پیسوں کے عوض اپنی عفت کو فروخت کریں۔ اس لیے تعدد ازدواج کی صورت میں ان تمام مشکلات کو حل کر دیا ہے۔ پھر علاوہ دوسری ضروریات کے جنگ ایک ایسی ہی ضرورت ہے کہ وہ بعض حالات میں تعدد ازدواج پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جنگ کا سلسلہ دنیا سے مٹ نہیں سکتا۔ اور جنگوں میں مردوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی رہتی ہے۔ اب چونکہ قدرتی حالت جس کے اندر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ وہ مرد و عورت کے باہمی تعلّق کی حالت ہے اور اسی پر نسل انسانی کی ترقی موقوف ہے۔ اس لیے نسل انسانی کی سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہر ایک مرد اور ہر ایک عورت اپنے اس فرض کو پورا کرے۔ اب اگر مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے تو چونکہ بچّہ کا پیٹ میں رکھنا جننا پرورش کرنا عورت کے فرائض میں داخل ہے۔ اس لیے نسل انسانی کا ہر ایک فرد جسے ممکن طور پر یہ موقعہ ہے اپنے اس فرض کو ادا کر سکتا ہے اور جو مرد بلا بیویوں کے رہ جائیں گے۔ وہ کسی صورت میں نسل انسانی کی ترقی کا موجب نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے، اور یہی وہ صورت ہے جو جنگوں اور مردوں کی دوسری ضروریات کی وجہ سے اکثر حالات میں دنیا میں پیش آتی رہتی ہے تو جو عورتیں بلا خاوندوں کے ہونگی وہ نسل انسانی کی ترقی میں صرف تعدد ازدواج کے ذریعہ سے معاون ہو سکتی ہیں۔ گویا اس صورت میں تعدد ازدواج ایک قومی فرض ہو جاتا ہے اور ایسے حالات میں جب پہلے ہی آبادی کم ہو جاتی ہے ان عورتوں کو خاوندوں کے بغیر چھوڑنا گویا عمداً نسل انسانی کی افزائش کی راہ کو روکنا ہے۔ اس سے علاوہ عموماً عورتوں کے معاش کا انحصار مردوں پر ہوتا ہے پس جو عورتیں جنگوں میں بیوہ رہ جاتی ہیں یا یتیم رہ جاتی ہیں ان کے متعلق پیچھے رہے ہوئے مردوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اُن کی خبر گیری اور پرورش کریں اور اس کے لیے ایک ہی راہ ہے، جو قدرت نے رکھی ہے یعنی ان کو نکاح میں لے آنا۔ یورپ بیشک تعدد ازدواج کا منکر ہوا ہے لیکن خدا تعالیٰ نے یورپ پر اتمام حجت بھی نہایت بیّن طور پر کیا ہے۔ کیونکہ وہاں باوجود امن کے عورتوں کی تعداد مردوں سے مدت سے بڑھی ہوئی چلی آتی تھی اور پچھلی باہمی جنگ نے اور بھی مردوں کی تعداد کو کم اور عورتوں کی تعداد کو زیادہ کر دیا ہے۔ آخر عقلمند غور کریں گے کہ جس صورت میں نسلِ انسانی کی افزائش کو جنگ سے سخت نقصان پہنچا ہے اور پیچھے کثرت سے عورتیں موجود ہیں جو اگر خاوندوں کے گھروں میں ہوں خواہ ایک خاوند کے گھر میں دو دو، تین تین، چار چار عورتیں ہی کیوں نہ ہوں نسل انسانی کی افزائش کا موجب ہو سکتی ہیں تو یہ کس قدر دور اندیشی سے بعید ہے کہ ایک فرضی روک پیدا کر کے نسل انسانی کی افزائش کو اس طرح جنگ کے ساتھ یہ دوسرا صدمہ پہنچایا جائے یا دوسری صورت یہ ہو گی کہ ناجائز تعلقات سے بچّے پیدا ہوں جو نہ صرف سوسائٹی اور قوم کے لیے ننگ اور عار کا موجب اور ماؤں کے لیے پرلے درجہ کی ذلّت کا باعث ہوں۔ بلکہ ان کی خبر گیری کا بھی کوئی اہتمام نہ ہونے کے باعث وہ حقیقی طور پر قوم کی ترقی کا موجب نہیں ہو سکتے۔ اور چونکہ ان کا کوئی کفیل بھی نہ ہوگا۔ عقلمند انسانوں کا یہی کام ہے کہ فرضی اور وہمی رکاوٹوں پر آخر وہ غالب آ جاتے ہیں۔ اسی طرح یورپ کے عقلمند مجبور ہو کر اس امر کو قبول کریں گے کہ واقعی بعض حالات میں تعدد ازدواج ایک فرض قومی ہو جاتا ہے۔ بلکہ اب بھی جبکہ ایک خطرناک عالمگیر جنگ نے یورپ کے بیشمار مردوں کو خاک کے نیچے سلا دیا ہے ایک قوم اس بات پر بحث کر رہی ہے کہ موجودہ حالات کے ماتحت سوائے تعدد ازدواج کے قوم کے تباہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ خود انگلستان میں ہر سو مرد کے لیے ایک سو دس عورتیں ہیں۔

سب الہامی کتابیں اور سب راستباز تعدد ازدواج کے مجوز ہیں: اس ہدایت کا منجانب اللہ ہونا اس سے بھی ثابت ہے کہ دنیا کی الہامی کتابوں میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جس نے تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا ہو۔ اور ہر قوم کے بڑے بڑے مقدس اور برگزیدہ لوگوں میں تعدد ازدواج کی مثالیں پائی جاتی ہیں حالانکہ اگر تعدد ازدواج جائز نہیں تو پھر یہ زنا ہے اور یہ کبھی وہم میں نہیں آ سکتا کہ تمام قوموں کے مقدس بزرگ نعوذ باللہ من ذٰلک ایک ایسے امر کا ارتکاب کرتے، وہ جنہوں نے اللہ کی رضا کے لیے سب کچھ دیدیا وہ ایک امر فاحش کا ارتکاب کبھی نہ کر سکتے تھے۔ پھر جب سب الہامی کتابوں نے ادنیٰ سے ادنیٰ گناہوں سے روکا تو کسی کتاب نے تعدد ازدواج سے کیوں نہ روکا؟ خود انجیل باوجود اس کے کہ اس وقت یہودیوں میں تعدد ازدواج پر عمل ہوتا تھا ایک حرف اس کے خلاف نہیں کہتی۔ ہاں پولوس کی تعلیم میں صرف پادریوں کو یہ ہدایت ہے کہ ایک بی بی پر قناعت کریں عوام کو پھر بھی اجازت رہی۔

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى تو ایک ہی[604] یا جس کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے[605] یہ زیادہ

چار کی حد بندی: اس دوا کو تجویز کرتے ہوئے اسلام نے دو اور روکیں ایسی تجویز کر دی ہیں کہ حدِ اعتدال سے اس کا استعمال نہ بڑھ جائے وہ دو روکیں یہ ہیں: کا اوّل تو چار تک حد بندی کر دی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چار کی حد بندی کوئی نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک تو اجازت دیتے ہوئے ایک خاص عدد پر بس کر دینا خود اس اجازت کی آخری حد کو بتاتا ہے۔ دوسرے تعامل اس پر شاہد ہے۔ تیسرے بعض روایات سے بھی گواہی ملتی ہے۔ مثلاً نوفل بن معاویہ ایمان لائے تو ان کے ہاں پانچ بیبیاں تھیں۔ نبی کریم صلعم نے حکم دیا کہ چار رکھ لو اور ایک کو طلاق دیدو (ک) یا غیلان بن سلمہ ایمان لائے اور ان کی دس بیبیاں تھیں تو نبی کریم صلعم نے چار رکھ کر باقی کو طلاق کا حکم دیدیا اور اس حدیث کو ترمذی ابن ماجہ بیہقی، دار قطنی اور امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔ اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت بیان کی ہے کہ عمیرۃ الاسدی ایمان لائے تو آٹھ عورتوں کے خاوند تھے نبی کریم صلعم نے چار رکھ کر باقی کو چھوڑنے کا حکم دیا۔ باقی رہا نبی کریم صلعم کی بیبیوں کا معاملہ سو چونکہ یہ مضمون بطور خود علیحدہ بحث چاہتا ہے اس لیے اس پر سورۃ احزاب میں مفصل بحث ہوگی جہاں یہ ذکر ہے۔ اس قدر یہاں بتا دینا کافی ہوگا کہ نبی کریم صلعم کو بھی یہ حکم ہوا تھا کہ وہ اور بیبیاں نکاح میں نہ لائیں بلکہ جو اس وقت آپ کے نکاح میں تھیں ان کو طلاق دیکر ان کی جگہ اور شادی کرنے سے بھی روکا گیا تھا۔ لایحل لك النساء من بعد ولا ان تبدل بهن من ازواج (الاحزاب ۳۳-۵۲) اس لیے آپ کے عقد میں جو نو بیبیاں تھیں تو چونکہ یہ شادیاں اغراض دینی کے لیے ہوئی تھیں اس لیے آپ کو یہ حکم نہ ہوا تھا کہ چار رکھ کر باقی کو طلاق دیدیں۔ دوسری روک جو تعدادِ ازدواج کے مسئلہ پر قرآن کریم نے ڈالی ہے وہ عدل کا قائم رکھنا ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

۶۰۴ اس حصہ میں بتایا ہے کہ اگر ضرورت بھی پیدا ہو مگر ایک شخص دو بیبیوں میں عدل قائم نہیں رکھ سکتا، تو پھر ایک شوہر اور ایک بی بی کے اصول پر ہی عمل کرے۔ اس سے دو کھلے نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ ایک شوہر اور ایک بی بی کا اصول ہی نکاح میں اصل الاصول ہے اور یہ ایسا مستحکم اصول ہے کہ گو یا ضروریات بھی دوسرے رنگ کی پیدا ہو جائیں جو تعدادِ ازدواج کو ضروری ٹھہرا دیں، تاہم اگر ایک شخص صرف اس بات پر قادر نہیں کہ وہ دو بیبیوں میں عدل قائم رکھ سکے تو بھی وہ ایک بی بی سے زیادہ نکاح میں نہ لائے پس قرآن کریم نے صاف طور پر سمجھا دیا کہ نکاح میں قاعدہ یہی ہے کہ ایک بی بی اور ایک شوہر ہو۔ ہاں جب ضروریات پیدا ہو جائیں تو پھر تعدادِ ازدواج کی طرف بطور ایک استثناء کے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

عدل کی شرط: دوسرا نتیجہ جو ان الفاظ سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ تعدادِ ازدواج پر عدل کی روک ایک بڑی بھاری روک ہے اور دوسری جگہ فرمایا: ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم (النساء ۴-۱۲۹) تم طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کر سکو خواہ تم کتنا ہی چاہو۔ ان الفاظ سے بعض لوگوں نے یہ غلطی بھی کھائی ہے کہ یہاں عدل کی شرط رکھ کر اور دوسری جگہ عدل کو انسانی استطاعت سے باہر قرار دیکر تعلیق بالمحال کر دی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شریعت میں ایک امر کی اجازت دینا اور پھر اس کو ایک محال امر کے ساتھ مشروط کرنا قرآن جیسی حکیم کتاب کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ اگر یہی منشاء تھا، تو صاف یوں ہی فرما دیا ہوتا کہ تعدادِ ازدواج کی تمہیں اجازت ہی نہیں۔ یہ محض یورپ کی تقلید نے باتیں کہلوائی ہیں۔ مگر مقلدین یورپ خوب یاد رکھیں کہ یورپ ایک سیہ کاری اور گند کے اندر مبتلا ہے جس سے اگر کبھی وہ باہر نکل سکتا ہے تو خدا کے بتائے ہوئے علاج تعدادِ ازدواج کے ذریعہ سے ہی نکل سکتا ہے۔ بات صرف اس قدر ہے کہ جہاں عدل کے ساتھ تعدادِ ازدواج کو مشروط کیا ہے تو وہاں مراد ظاہری سلوک میں عدل ہے یعنی نان ونفقہ میں باری میں اور ظاہری امور میں اور جہاں یہ فرمایا کہ تم عدل کر ہی نہیں سکتے وہاں محبت میں مساوات مراد ہے یعنی دو بیبیوں سے یکساں محبت ہونا یہ انسان کے اختیار سے باہر ہے اور اس پر خود قرینہ شاہد ہے کیونکہ وہاں آگے فرمایا فلا تمیلوا کل المیل۔ یعنی محبت کے معاملہ میں بالکل ایک طرف سے نہ جھک جاؤ۔ یہاں تک کہ ایک غریب عورت بی بی کہلا کر پھر درمیان میں لٹکی ہوئی ہو پس عدل کی اس تشریح کے سمجھانے کو ہی وہ لفظ اختیار فرمائے۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ اس میں پھر سمجھا دیا کہ تعدادِ ازدواج ایک بڑا مشکل مقام ہے جس کو بغیر سخت ضرورت کے اختیار نہ کیا جائے۔

۶۰۵ ما ملکت ایمانکم۔ ایمان۔ یمین کی جمع ہے جو یمن سے ہے جس کے اصل معنی برکت ہیں (ر) اور یمین اصل میں دائیں ہاتھ یا دائیں طرف کو کہتے ہیں مگر کئی اور معنی میں بھی آگیا ہے مثلاً حق کی جانب۔ جیسے تاتوننا عن الیمین (الصٰفّٰت ۳۷-۲۸) یا سعادت وبرکت کی جانب جیسے اصحاب الیمین (الواقعۃ ۵۶-۲۷) اور قسم کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے گزر چکا اور معاہدہ کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے مولی الیمین سے مراد وہ شخص ہے جس کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو (غ) اور لاخذنا منہ بالیمین میں زجاج نے یمین کے معنی قدرت کیے ہیں (ل) ایک حدیث میں آتا ہے اَلْحَجَرُ الْاَسْوَدُ یَمِیْنُ اللّٰہِ جس کے معنی میں امام راغب لکھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے اس سعادت کی طرف پہنچایا جاتا ہے جو اس کی طرف قریب کرنے والی ہے اور ابن اثیر میں ہے کہ یہ کلام تمثال کے طور پر ہے کیونکہ جب بادشاہ کسی شخص سے مصافحہ کرتا ہے تو وہ اس کے ہاتھ کو چومتا ہے۔ پس اس لیے کہ اسے چوما جاتا ہے اسے یمین اللہ کہا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ حجر اسود اس عہد کے لیے بطور ایک نشان کے تھا جو بائبل میں کونہ کے پتھر کے متعلق پایا جاتا ہے پس یمین اللہ میں اسی اللہ تعالیٰ کے عہد کی طرف اشارہ ہے۔ ملک یمین سے مراد امام راغب کے نزدیک صرف اسی قدر ہے جیسا فی یدی سے یعنی میرے ہاتھ میں یا میرے قبضہ میں۔ مگر جو مختلف معنی اوپر دیئے گئے ہیں ان کے لحاظ سے ما ملکت ایمانکم کے معنی ہونگے وہ جن کے مالک تمہارے معاہدات ہوئے یا جن پر تم قدرت پا کر مالک ہو گئے۔ چنانچہ اس حدیث میں کہ نبی کریم صلعم کے آخری الفاظ تھے الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم مراد زکوٰۃ لی گئی ہے (ن) اور الا ما ملکت ایمانکم (۲۴) میں ایک معنی منکوحہ عورتیں ہیں یعنی وہ جن کے تم بذریعہ معاہدات مالک ہوئے۔ اور قرآن کریم میں غلاموں اور لونڈیوں پر بھی یہی الفاظ بولے گئے ہیں جن سے مراد

أَلَّا تَعُولُوا ۝٣ — نزدیک ہے تاکہ تم ناانصافی نہ کرو[606]

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ فَإِن طِبْنَ لَكُمْ عَن شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا ۝٤ — اور عورتوں کو اُن کے مہر بلا بدل دو۔ پھر اگر وہ خوشی سے اس میں سے کچھ تمہارے لیے خود دیں تو اسے مزے سے خوش گواری سے کھاؤ[607]

یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر تم نے قدرت پالی یعنی جنگ کرکے ان پر متسلط ہو گئے۔

یہاں او ما ملکت ایمانکم سے کیا مراد ہے؟ عموماً لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ طریق چار کی حد بندی کو توڑنے کے لیے ہے کہ لونڈیاں جتنی چاہے کوئی رکھے حالانکہ اس سے اصل غرض ہی باطل ہو جاتی ہے۔ اگر حد بندی ضروری تھی تو اس کا اس طرح توڑ دینا جائز نہیں کہ لونڈیوں کی شکل میں جس قدر کوئی چاہے زیادتی کرلے۔ اب ترکیب عبارت میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو یہ کہ اَوْ کے ذریعہ سے عطف النساء پر ہو یعنی ترکیب یوں ہو فانکحوا ماطاب لکم من النساء او من ما ملکت ایمانکم یعنی نکاح کرو جو تم کو پسند ہوں عورتوں سے یا لونڈیوں سے الخ اس صورت میں لونڈیاں خود عورتوں والی حد بندی کے اندر ہیں یا واحدۃ کے بعد یہ کوئی الگ ہی صورت ہے اور مراد یہ ہے کہ اگر ایک بھی میسّر نہ آئے تو لونڈی سے نکاح کرلو اور اس کی مؤیّد وہ آیت ہے جس میں آگے چل کر لونڈی کے ساتھ نکاح اس شرط پر مشروط قرار دیا ہے جب زوجہ میسّر نہ آئے۔ چنانچہ فرمایا ومن لم یستطع منکم طَوْلاً ان ینکح المحصنٰت المؤمنٰت فمن ما ملکت ایمانکم من فتیٰتکم المؤمنٰت (النساء۴ - ۲۵) اور زیادہ سے زیادہ اس کو واحدۃ کے ساتھ جمع کیا جا سکتا ہے یعنی اگر عدل نہ کرسکو تو ایک بی بی کے ساتھ چار کی حد تک لونڈیوں کو جمع کرسکتے ہو۔ گو اس میں یہ لازم آئیگا کہ لونڈیوں کے معاملہ میں کسی عدل کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ ان کے حقوق نصف ہی سہی مگر پھر بھی عدل کی ضرورت تو ہے اس لیے پہلی یا دوسری توجیہ ہی درست ہے۔

[606] تعولوا۔ اس کا مادہ عَوْل ہے اور عَوْل اور غَوْل کا مفہوم ملتا جلتا ہے اس قدر فرق ہے کہ غَالَہٗ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ چیز ہلاک کردے اور عَالَہٗ اس وقت جب وہ بوجھ کے نیچے دبا دے اور عَوْل وہ مصیبت ہے جو بھاری ہو اور اسی سے تعولوا کے معنی لیے گئے ہیں زیادہ لیکر انصاف کا ترک کر دینا (رغ) عَوْل کے معنی ہیں فیصلہ میں ظلم کی طرف مائل ہونا (ل) اور اصل میں یہ معنی بھی ثقل سے لیے گئے ہیں اس لیے کہ عال المیزان اس وقت کہا جاتا ہے جب ترازو بوجہ ثقل کے ایک طرف مائل ہو جائے اسی لیے دل کے میلان پر یہ لفظ بولا گیا ہے اور امام شافعی رح نے اَنْ لَّا تَعُوْلُوْا کے معنی لیے ہیں تاکہ تمہارا عیال زیادہ نہ ہو اور کسائی نے بھی عال یعول کے معنی کثرت عیال فصحائے عرب سے نقل کیے ہیں (ر)

ذٰلك میں اشارہ فواحدۃ کی طرف ہے یعنی ایک بی بی سے ہی ایک شوہر کا نکاح ہونا زیادہ مناسب ہے تاکہ انسان ناانصافی سے بچا رہے گویا پھر دوسری بار فواحدۃ کے اصول پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ عام لوگوں کے لیے جو اعلیٰ درجہ کا ضبط اور انصاف نہیں رکھتے یہی مناسب ہے کہ وہ ایک ہی بی بی پر کفایت کریں، یا کثرت عیالداری کی مصیبت کے نیچے دب جانے سے بچنے کے لیے یہ زیادہ مناسب ہے کہ ایک ہی بی بی ہو پس ان الفاظ سے بھی یہی شہادت ملتی ہے کہ گو اسلام نے بعض ضروریات کے لیے مشروط اجازت تعدّد ازدواج کی دی ہے مگر آخر پر پھر سفارش یہی کی ہے کہ اصولاً ایک بی بی اور ایک شوہر کا ہونا ہی زیادہ مناسب طریق ہے اور دوسری بی بی کا عقد نکاح میں لینا اسی صورت میں ہے جب ضروریات انسانی مجبور کردیں۔ ان رکوں کا رکھنا خود بتاتا ہے کہ سخت ضرورت کے سوا تعدد ازدواج جائز نہیں۔

[607] صدقات۔ صَدُقَۃ کی جمع ہے جس کا اصل صدق ہے اور صَدَقَۃ وہ مال ہے جو انسان قرب حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے اور صَدُقَۃ صُداق اور صِداق عورت کے مہر کو کہا جاتا ہے (رغ)

نِحْلَۃ۔ وہ عطیہ جو تبرع کے طور پر ہو (غ) یعنی اس کا معاوضہ کوئی نہ ہو۔ اور یہ بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں کہ بغیر مطالبہ کے طیّب نفس سے دے۔ امام راغب رح کہتے ہیں کہ نحلۃ سے مراد ھبۃ اس لیے ہے کہ نحل یعنی شہد کی مکھی جب کسی چیز پر بیٹھتی ہے تو اس کو نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ موجب نفع ہوتی ہے اس لفظ سے مہر کی حقیقت پر قرآن کریم نے بڑی روشنی ڈالی ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ وہ کسی چیز کا معاوضہ یا بدل نہیں بلکہ وہ محض عطیہ بلا بدل کے طور پر خاوند کی طرف سے ایک تحفہ ہے۔

ھنیئا۔ ھَنِیْءٌ۔ ھناء سے ہے وہ چیز ہے جس میں کسی قسم کی مشقت نہ ہو۔ اور اصل میں یہ لفظ کھانے پر بولا جاتا ہے۔

مریئا۔ مرء سے ہے اور مَرِیْءٌ اصل میں راس معدہ ہے اور کھانے کے متعلق مَرُؤَ یا اَمْرَأَ اس حالت میں کہا جاتا ہے جب وہ طبیعت سے موافقت کی وجہ سے معدہ سے مخصوص ہو یا ھنیءٌ وہ ہے جس سے کھانے والا مزہ حاصل کرے۔ اور مریءٌ وہ جو انجام کار اچھا ثابت ہو۔

مہر دینے کی تاکید: چونکہ یتامیٰ کے ذکر میں عورتوں سے نکاح کا ذکر آگیا اور عورتوں کا ایک خاص حق جو اسلام نے ہی دیا ہے مہر ہے اور عورتوں کے حقوق پر بھی اس سورت میں بحث ہونی تھی اس لیے بہ تعلق مضمون نکاح مہر کا ذکر بھی کر دیا۔ اس آیت میں اوّل عورتوں کو مہر دینے کی تاکید فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کو بغیر ان کے مطالبہ کے مہر دیدو۔ اسی لیے لفظ نحلۃ بڑھایا ہے جس میں ساتھ ہی یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ مہر کسی چیز کا معاوضہ قطعاً نہیں بلکہ محض

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝

اور کم عقل لوگوں کو تم اپنے مال نہ دے دو جن کو اللہ نے تمھارے لیے سہارا بنایا ہے اور تم انھیں ان کے ذریعہ سے کھانے کے لیے دو اور انھیں کپڑا پہناؤ اور انھیں بھلی بات کہتے رہو۔ ۶۰۸

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ

اور یتیموں کا امتحان لیتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں تب اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کردو اور فضول خرچی سے اور جلدی کر کے اُن کو کھانہ

ہبہ بلا بدل کے طور پر ہے اور اس کو قرض کے طور پر تسلیم کرلینا جیسا کہ آج کل رواج ہے اصل غرض کو باطل کرنا اور عورت کو عملاً اس کے حق سے محروم کرنا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ نکاح کرنے سے پیشتر انسان کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی قوت بازو سے کما کر عورت کو مہر دے سکے اور اس میں مال کمانے کی اہلیت پیدا ہو چکی ہو۔

مہر پر لڑکی کے والد کا کوئی حق نہیں: دوسرا حکم اس لفظ میں اولیاء یعنی باپ وغیرہ کو ہے کہ مہر کوئی ایسی چیز نہیں کہ وہ لڑکی کی قیمت کے طور پر خاوند سے وصول کریں۔ بلکہ وہ عورت کا مال ہے جو اس کو ملنا چاہیئے۔ عرب میں لوگ ایسا کر لیتے تھے جیسا کہ یہ رواج بعض اطراف ہند میں بھی پایا جاتا ہے کہ جب لڑکی کا نکاح کر دیتے تو اس کے مہر کو خود وصول کر لیتے، پس اس رسم بد سے روکا ہے۔

ع۶۰۸ قیام۔ قام کا مصدر ہے۔ دیکھو ع۵۰۱ مگر قیام اور قِوام کا استعمال اس شے پر بھی ہے جس کے ذریعہ سے کوئی چیز قائم ہو یا ثابت رہے (رغ) یہی معنی یہاں ہیں۔ یہاں مال کو قیام کہا ہے یعنی وہ تمہاری زندگی کا موجب ہے اور دوسری جگہ انہی معنوں میں فرمایا جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس (المائدۃ ۵ - ۹۷)

ارزقوھم فیھا۔ اگر ارزقوھم منھا ہوتا تو اس کے معنی ہوتے کہ اس مال میں سے ان کو کھانے کے لیے دو اور یوں مال ضائع ہو جاتا لیکن فیہا کہہ کر یہ بتا دیا کہ ان اموال کے ذریعہ سے ان کو رزق دو یعنی ان اموال کو ایسے منافع اور آمدنی کا ذریعہ بناؤ کہ اس نفع یا آمدنی سے ان کا گزارہ ہوتا رہے۔ اس آیت میں یتامیٰ کے ذکر کی طرف رجوع کیا ہے مگر بجائے صرف یتامیٰ کا نام لینے کے اس قسم کے تمام لوگوں کو داخل کر لیا ہے۔ سفہاء سے کیا مراد ہے۔ وارزقوھم فیہا فرما کر بتا دیا ہے۔ کیونکہ جب ان کو مال نہ دیا تو اب یہ حکم دیا کہ راس المال کو ایسے کم عقلوں کے ولی تباہ نہ کریں بلکہ اس مال کو تجارت یا اسی اور کام پر لگا کر اس سے منافع یا آمدنی سے ان کا گزارہ چلائیں۔ پس جو لوگ کسی قسم کی تجارت یا کوئی اور شغل معاش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور اپنے راس المال کو تباہ کرتے چلے جاتے ہیں وہ سب کم عقلوں میں داخل ہیں۔ ان کے سپرد مال کرنے کی بجائے یہ حکم دیا کہ ان اموال کو تم کسی تجارت وغیرہ میں لگاؤ اور منافع سے اُن کو کھانے پینے کو دو۔ یہاں مخاطب حکام ہیں۔ اسی لیے اموالکم کہا کیونکہ فرداً فرداً جس قدر اموال ہیں وہ درحقیقت قوم کے اموال ہیں اور جس قدر مال ضائع ہوگا وہ قومی نقصان ہے اسی لیے اموال کو قیام یعنی قوم کے بقاء کا موجب قرار دیا ہے۔ جس قوم کا مال تباہ ہو جاتا ہے وہ گر جاتی ہے۔

یتامیٰ وغیرہ کی تربیت: علاوہ کھانے اور لباس کے ایک اور ضرورت بتائی وقولوا لھم قولاً معروفا۔ ان کو بھلی بات کہتے رہو۔ مفسرین نے عموماً نصیحت کے چند فقرے اس سے مراد لیے ہیں، مگر قفال کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ غلاموں کی سی معاشرت نہ کرو بلکہ ان کو نیکیوں کی طرف توجہ دلاتے رہو اور بتاتے رہو کہ اسراف مال کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک اس میں ان کی تربیت کے اہتمام کی ضرورت بتائی ہے اور اسی لیے کھانے اور پہننے کے ساتھ اس کو تیسری ضرورت بتایا ہے یعنی ان کی تربیت پر روپیہ خرچ کرتے رہو۔ چنانچہ اگلی آیت میں جو فرمایا وابتلوا الیتامیٰ وہ اسی کی طرف اشارہ ہے کہ جب ان کی تربیت کا اہتمام کرو تو ساتھ ہی ان کا امتحان بھی لیتے رہو کہ آیا وہ جائداد کو سنبھالنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قول معروف صرف معمولی نصیحت کا نام نہیں، بلکہ اچھے اصول پر تربیت کرنا بھی قول معروف میں داخل ہے۔

قرآن شریف میں بار بار اموال کی حفاظت کا حکم اور اس کے متعلق قوانین بتائے گئے ہیں جو شاید اور کسی مذہبی کتاب میں نہیں پائے جاتے۔ کہیں تجارتوں کا ذکر ہے کہیں لین دین کا ذکر ہے کہیں رہن کا ذکر ہے کہیں وصایا کو ضروری ٹھہرایا ہے کہیں مال متروکہ کے حصے بتائے ہیں کہیں عورتوں کو مہر میں سونے کے ڈھیر دینے کا ذکر ہے کہیں اموال کی حفاظت کے لیے تحریر اور گواہی کو ضروری بتایا جاتا ہے کہیں اموال کا ٹھیک انتظام نہ کرنے والوں کے لیے ولی مقرر کرنے کی ہدایت ہے۔ یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ مال دنیا کو اسلام نے حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا، بلکہ اس کی حفاظت کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ اور یوں اس کو ایک مذہبی فریضہ قرار دیا ہے۔ اور مال دنیا کی جہاں تحقیر کی ہے تو وہ صرف اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ زندگی کا مقصد حصول اور فراہمی مال کو نہ سمجھ لیا جائے۔

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ جاؤ کہ وہ بڑے ہوجائینگے ۶۰۹ اور جو آسودہ ہے چاہیئے کہ وہ بچا رہے
فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ اور جو حاجتمند ہے وہ مناسب طور پر لے لے ۶۱۰۔ پھر جب تم ان

ع۶۰۹ بلغوا النکاح۔ نکاح کے اصل معنی عقد یعنی شادی ہیں اور یہاں نکاح سے پہنچنے کو مراد حد بلوغ کو پہنچنا ہے۔ یعنی اس عمر کو جس میں انسان اس قابل ہوتا ہے کہ اس کی شادی کی جائے۔ بلوغ کی بجائے لفظ نکاح رکھنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ نکاح یا عقد کا تعلق بلوغ سے ہے کیونکہ یہاں نکاح اور بلوغ کو ہم معنی قرار دیا ہے۔ پس صغر سنی میں شادی کرنا ٹھیک نہیں۔ بلوغ کا سن امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک اٹھارہ سال اور امام شافعی رح کے نزدیک پندرہ سال ہے اور ابن عباس سے بھی لڑکے کے بلوغ کو پہنچنے کی عمر اٹھارہ سال ہونے پر روایت ہے (د) صحیحین میں حدیث ہے کہ حضرت ابن عمر رض نے فرمایا کہ میں اُحد کے دن چودہ۱۴ سال کا تھا تو جب میں آنحضرت ؐ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے جنگ میں نکلنے کی مجھے اجازت نہ دی اور خندق کے دن میں پندرہ سال کا تھا تو آپ نے اجازت دیدی۔ مگر جنگ میں نکلنے کا تعلق قوائے جسمانی پر ہے۔ اور یہ بھی حدیث سے معلوم نہیں ہوتا کہ ابن عمر رض کی عمر کا سوال نبی کریم صلعم کے سامنے پیش ہوا۔ اس لیے محض اس بنا پر سن بلوغ کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔

اٰنَسْتم ۔ اٰنَسَ الشئَ (مادہ انس) کے معنی ہیں۔ اَحَسَّہٗ یعنی اس کو محسوس کیا یا عَلِمَہٗ اس کو جانا (ل)

رُشْدًا ۔ رُشْد کے اصل معنی کسی امر کی طرف ہدایت پانا ہیں اور وہ غیّ کا نقیض ہے۔ حدیث میں ہے تؤنس منہ الرشد جس کے معنی ابن اثیر نے کیے ہیں کہ اس میں عقل کی پختگی اور فعل کی راستی اور اچھا تصرف جانا جائے (ن) یہاں یہی مراد ہے اور ایک وہ رُشد ہے جو امور اُخروی میں ہدایت کی طرف لیجاتا ہے ولقد اٰتینا ابراھیم رُشدہٗ من قبل (الانبیاء ۲۱ - ۵۱)

بدار ۔ بَدَرَ کے معنی اَسْرَعَ یا جلدی کے ہیں اور بدار مصدر ہے اور بَدْر پورے چاند کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ سورج کے غروب کے بعد فوراً نمودار ہوجاتا ہے گویا اس نے مبادرت سے غروب آفتاب کو پالیا۔

چونکہ پچھلی آیت میں یتامیٰ وغیرہ کی تربیت کا ذکر تھا۔ اس لیے اب فرمایا کہ اس تربیت کا نتیجہ بھی معلوم کرتے رہو کہ وہ کس قدر ترقی کر رہے ہیں۔ اور کس قدر اہلیت اپنے اپنے کاروبار کی موزونیّت کی ان میں پیدا ہو رہی ہے۔ اور یہ انتظام اس وقت تک رہے کہ وہ حدِ بلوغ کو پہنچ جائیں۔ لیکن حد بلوغ کو پہنچنے پر بھی مال اس صورت میں ان کے حوالہ کیا جائے کہ ان میں عقل کی پختگی اور اموال میں حسن تصرّف اور ضبط وغیرہ کی قوت ان میں دیکھو۔ گویا مال انکے سپرد کرنے کی دو شرطیں ہیں ایک بلوغ اور دوئم پختگی عقل اور پھر چونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب مالک اموال بلوغ کو پہنچنے والا ہوتا ہے تو ولی اس خیال سے کہ اب تو وہ اپنے مال کو اپنے تصرف میں لے لیگا۔ اس میں اسراف وغیرہ کرتے ہیں۔ اس لیے اس سے بھی روکا۔

تربیت اولاد: یہاں جو کچھ ہدایات یتامیٰ کے متعلق دی ہیں ان میں عام طور پر تربیت اطفال کی صورت بھی سمجھا دی ہے کیونکہ جو کچھ ایک ولی کا یتیم کے متعلق فرض ہے وہ باپ کا بیٹے کے متعلق بطریق اولیٰ ہے۔ پس ہر والد کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت قول معروف کے ساتھ کرے یعنی اس کو نیکی کی راہ بھی بتائے اور اس کو معاش پیدا کرنے کے قابل بھی بنائے۔ پھر دیکھتا رہے کہ کس قدر ترقی وہ کر رہے ہیں یہاں تک کہ بلوغ کو پہنچنے تک ان میں عام طور پر رُشد پیدا ہوجانا چاہیئے یعنی ان کو اموال میں ضبط وتصرف کے قابل ہوجانا چاہیئے اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں نے اس فرض سے سخت غفلت اختیار کر رکھی ہے اور وہ اپنی اولاد کو اس قابل بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ امرا کے بچّے تو عموماً ایسے فضول خرچ اور عیاش ہوجاتے ہیں کہ سوائے والدین کے مال کو تباہ کرنے کے اور کچھ جانتے ہی نہیں متوسط الحال لوگ بھی اپنی اولاد کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں ان کی تعلیم وتربیت پر کچھ خرچ کرنا بوجھ سمجھتے ہیں۔ ہر والد کا پہلا فرض یہ نہیں جیسا کہ آج کل مسلمانوں نے سمجھا ہُوا ہے کہ اس کی شادی کر دی بلکہ یہ ہے کہ اس کی تعلیم وتربیت کرکے اس کی حیثیت کے مطابق اسے معاش پیدا کرنے اور نیکی کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنائے شادی کرنا اس کا اپنا کام ہے جب کمانے کے قابل ہوجائیگا تو خود شادی کرلے گا۔

ع۶۱۰ یستعفف۔ اس کا مادہ عفّ ہے اور عِفّۃ کے اصل معنی ہیں تھوڑی چیز کے پا لینے پر اپنے آپ کو روک لینا۔ کیونکہ عُفَافَۃ یا عُفّۃ کسی چیز کے بقیہ کو کہتے ہیں (غ) اور اسی سے عِفّۃ کے مشہور معنی پاکدامنی ہیں یعنی انسان میں ایک ایسی حالت کا پیدا ہونا کہ غلبہ شہوت سے رُکا رہے۔ اور استعفاف میں بوجہ تکلّف مبالغہ ہے کیونکہ اس کے اصل معنی ہیں طلب عفت اور یہاں مراد صرف رُکے رہنا ہے یعنی یتیم کا مال کھانے سے رُکنا ہے۔

فقیر۔ فقر سے ہے جس کا استعمال چار طرح پر ہے۔ اوّل ضروری حاجت کا پایا جانا جو سب انسانوں کے لیے عام ہے۔ بلکہ کل موجودات کے لیے جیسا کہ فرمایا یاایّھا النّاس انتم الفقراء الی اللہ (فاطر ۳۵ - ۱۵) یعنی تم سب کے سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو۔ دوسرا فقر مال کا نہ ہونا ہے جیسے انّما الصدقات للفقراء تیسرا نفس کا فقر ہے جو تمنّائے نفس کے مقابل پر ہے اور یہ حرص اور لالچ ہے اور چوتھا فقر وہ ہے جو اللہ کی جناب میں انسان کو ہونا چاہیئے جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے اَللّٰھُمَّ اَغْنِنِیْ بِالْاِفْتِقَارِ اِلَیْکَ وَلَا تُفْقِرْنِیْ بِالْاِسْتِغْنَاءِ عَنْکَ اے اللہ مجھے اپنا فقیر بنا کر غنی کر دے اور اپنی طرف سے لاپرواہ رکھ کر فقیر نہ بنائیو۔ اسی معنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے ربّ انی لما انزلت الی من خیر فقیر (القصص ۲۸ - ۲۴) اور یہاں لفظ فقیر اول الذکر معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی حاجتمند کے معنی ہیں اور اس کے مقابلہ پر غنی سے مراد یہ ہے کہ اس کے ذرائع آمد وغیرہ ایسے ہیں کہ اس کو مال یتیم سے لینے کی کچھ احتیاج نہیں۔

چونکہ یتامیٰ کے ولیوں کو ان کے مال میں ہر قسم کے تصرف سے روکا تھا اس لیے اب یہ بھی بتانا ضروری تھا کہ بطور حق الخدمت بھی کچھ لینا جائز ہے یا نہیں

اِلَيۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ فَاَشۡهِدُوۡا عَلَيۡهِمۡ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيۡبًا ۝۶

کے مال اُن کے حوالے کرو تو اُن پر گواہ کرلو اور اللہ کافی حساب لینے والا ہے ۔ ع۶۱۱

لِلرِّجَالِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا تَرَكَ الۡوَالِدٰنِ وَالۡاَقۡرَبُوۡنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا تَرَكَ الۡوَالِدٰنِ وَالۡاَقۡرَبُوۡنَ مِمَّا قَلَّ مِنۡهُ اَوۡ كَثُرَ ؕ نَصِيۡبًا مَّفۡرُوۡضًا ۝۷

مردوں کے لیے اس سے ایک حصّہ ہے (جو اُن کے) والدین اور قریبی چھوڑیں اور عورتوں کے لیے اس سے ایک حصّہ ہے جو (اُن کے) ماں باپ اور قریبی چھوڑیں، خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت، ایک مقرر حصّہ ۔ ع۶۱۲

سو حق الخدمت کو بھی اس حد تک محدود کر دیا کہ جو شخص انتظام کرتا ہے وہ اپنا کوئی ذریعہ معاش نہیں رکھتا تو لے سکتا ہے ورنہ نہیں۔

ع۶۱۱ حسیب۔ حَسْب کے معنی کفایۃ ہیں جیسے حسبنا اللہ (التوبۃ ۔ ۵۹) حسبھم جھنم (المجادلۃ ۔ ۸) اور حساب کے معنی مشہور ہیں۔ پس حسیب کے معنی یا تو کافی ہیں اور یا محاسب یعنی حساب لینے والا اور گو حسیب اور محاسب کے معنی صرف حساب لینے والے کے ہیں لیکن مراد اس سے مکافی بالحساب ہیں یعنی حساب لیکر بدلہ دینے والا۔

اس میں اللہ تعالیٰ کی صفت حساب کی طرف توجہ دلا کر ہر قسم کی زیادتی سے روکا ہے ۔ کیونکہ صرف ہدایات کا دینا کافی نہیں جب تک کہ کوئی روکنے والی طاقت ساتھ نہ ہو۔ سو اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات ہی وہ چیز ہیں جو انسان کو مخفی سے مخفی گناہوں سے روک سکتی ہیں۔

ع۶۱۲ جاہلیت میں یتامیٰ کی ورثہ سے محرومیت: یہاں سے وراثت کا مضمون شروع ہوتا ہے مگر اصل غرض اب بھی یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت ہی ہے۔ کیونکہ یتامیٰ کو خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں میراث سے حصّہ نہ دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ عرب کے لوگ کہتے تھے لا یرث الا من قاتل علی ظھور الخیل کوئی ورثہ نہیں لے سکتا مگر وہ جو گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر جنگ کرتا ہے۔ چنانچہ جب اُم کحہ نے رسول اللہ صلعم سے شکایت کی کہ اس کے خاوند اوس بن ثابت کے ترکہ میں سے اس کی بیٹیوں کو کوئی حصّہ نہیں ملا اور کُل پر اس کے بھائی قابض ہوگئے ہیں تو انہوں نے رسول اللہ صلعم سے یہی عرض کیا تھا یا رسول اللہ ولدھا لا یرکب فرسا ولا یحمل کلا ولا ینکی عدوا ۔ یعنی اس کی اولاد نہ گھوڑے پر سوار ہوتی ہے نہ بوجھ اٹھاتی ہے نہ دشمن کو مارتی ہے پس اس آیت نے ایک نہایت قدیم رسم کو موقوف کیا اور زنرکہ میں مرد و عورت، بڑے اور چھوٹے، جنگ کرنے والے اور گھر بیٹھنے والے سب کو یکساں حصّہ دار قرار دیا۔

آنحضرتؐ کی قوت قدسی کا کمال: کسی پیغمبر کی زندگی میں اس کمال قوت قدسی کا نظارہ نظر نہیں آتا کہ سینکڑوں یا ہزاروں سالوں کی دیرینہ رسموں کو ایک لفظ سے نابود کر دیا ہو۔ تقسیم مال کے معاملہ میں کسی انقلاب کے ایک لفظ سے پیدا ہو جانے پر تاریخ شہادت دینے سے عاجز ہے۔ بڑے بڑے اولوالعزم نبی دنیا میں ہوئے مگر یہ قوت کسی کو نہ ملی جس کا نظارہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایک ایک واقعہ میں نظر آتا ہے تمام رسوم و رواج کی خطرناک زنجیریں اور طوق ایک اشارہ سے کٹ جاتے ہیں۔ صدیوں کی عادات جو طبائع انسانی میں پہاڑوں کی طرح قائم ہو چکے تھے۔ ایک پھونک سے اُڑ جاتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس انسان کے سامنے کوئی چیز انہونی نہیں کوئی کام ناممکن نہیں۔ ملک عرب میں خدا جانے کب سے یہ رواج جاری تھا کہ ورثہ صرف ان لوگوں کو پہنچ سکتا ہے جو ملک یا قوم کی حفاظت کر سکتے ہیں جو کما کر کھلانے کی طاقت رکھتے ہیں اور کس قدر استحکام یہ حاصل کر چکا تھا۔ عورتوں اور بچوں کی حمایت میں کب کسی نے آواز اُٹھائی۔ اور جب تمام ملک کے اہل الرائے تمام بہادر تمام سپاہی تمام شیخ اس بات پر متفق الرائے ہوں تو کون اس کے خلاف آواز اُٹھانے کی جرأت کر سکتا ہے۔

آپ کی یتیموں اور بیواؤں کی بے نظیر حمایت: بیکس یتیم اور عاجز عورتیں کیا اپنے ہی حامیوں، اپنے ہی محافظوں کے خلاف آواز اُٹھا سکتی تھیں؟ ہرگز نہیں۔ مگر آسمان سے ایک آواز آتی ہے اور اس کے سامنے تمام گردنیں جھک جاتی ہیں۔ ایک بادشاہ جس کی زندگی کا انحصار اس کے سپاہیوں کی بہادری پر اور ان کے تلوار چلانے پر ہو کیا وہ اُن سپاہیوں کے حقوق چھین کر دوسروں کو دے دینے کا کبھی خیال بھی کر سکتا ہے۔ محمد رسول اللہ ؐ کے دشمن آئیں اور یہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا کے کسی بادشاہ سے مقابلہ کر کے دکھائیں۔ آپ کو اپنے سپاہیوں کی اسی طرح رعایت اور دلداری منظور تھی جیسا جنگ کے وقت سب بادشاہوں کو ہوتی ہے مگر بیکس بچّوں اور ناتوان عورتوں کے حقوق کے سامنے اپنے سپاہیوں کی رعایت کرنا تو ایک طرف رہا ان سپاہیوں کے صدیوں کے قائم شدہ حقوق کو چھین کر یتیموں اور بیواؤں کو دلاتے ہیں اور آپ کے پیروؤں کی جان نثاری بھی دنیا میں ایسی عدیم المثال ہے کہ وہ بغیر چون و چرا کے اپنے حقوق کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی تھی جس نے دنیا میں ایسے ایسے انقلاب پیدا کر کے دکھائے جن کی نظیر دنیا میں کوئی دوسرا انسان نہیں دکھا سکتا۔ اور یہ انقلاب قوت ملکی کے بھروسہ پر نہیں، قوت قومی کی حمایت سے نہیں بلکہ قوت ملکی اور قوت قومی کے مقابلہ میں کر کے دکھائے۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا
لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۸﴾

اور جب تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور مسکین موجود ہوں تو ان کو اس میں سے کچھ دو اور ان کو اچھی بات کہو ع۶۱۳

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ
ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا
اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۹﴾

اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیئے جو اگر اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑیں تو ان کے لیے ڈرتے ہوں، پس چاہیئے کہ اللہ کا تقوٰی کریں اور چاہیئے کہ سیدھی بات کریں ع۶۱۴

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا
اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۖ
وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۰﴾ ع ۱/۱۲

جو یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ ہی کھاتے ہیں اور وہ بھڑکائی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے ع۶۱۵

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِىْۤ اَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ

اللہ تمہاری اولاد کے متعلق تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے ع۶۱۶ مرد کے

ع۶۱۳ تقسیم ترکہ کے وقت غرباء کو کچھ دینا: القِسمۃ سے مراد تقسیم مال وراثت ہے یا وصیّت کی تقسیم - اذا حضر القسمۃ سے یہ مراد نہیں کہ وہ اس وقت آکر دست سوال دراز کریں تو ہی ان کو کچھ دینا چاہیئے بلکہ ان کی محض موجودگی مراد ہے خواہ وہ کہیں ہوں۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ ایک تو وہ ہیں جن کے حصّے اللہ تعالٰی نے مقرر کر دیئے لیکن ان کے علاوہ دوسرے قریبیوں کو (جن کو یہاں اولی القربٰی کہا گیا ہے) اور مسکینوں اور یتیموں کو بھی فائدہ پہنچانا چاہیئے۔ یہ وسعت تعلیم اسلام سے خاص ہے۔ چونکہ بعض مفسرین نے قسمۃ کے معنی وصیّت کی تقسیم کو بھی لیا ہے۔ اس لیے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس میں دونوں قسمتیں مراد ہیں اگر شخص متوفی خود اپنے قریبی رشتہ داروں کے لیے (جو معین حصّہ نہیں لیتے) یا مسکینوں یتیموں کے لیے اپنے مال کے کسی حِصّہ کی وصیت کر دے تو بہتر ورنہ تقسیم ترکہ کے وقت ان کو کچھ دے دیا جائے۔ بعض لوگوں نے اس آیت کو بھی منسوخ کہہ دیا ہے جس کی تردید بخاری میں حضرت ابن عباس کی روایت سے موجود ہے، یعنی آپ نے فرمایا کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں۔

ع۶۱۴ سدید - سَدّ سے ہے جس کے معنی کسی اختلال کا بند کر دینا یا روک دینا ہیں۔ اسی لیے قول سدید اس بات کو کہا جاتا ہے جو صواب یعنی صحیح موقعہ پر پہنچنے والی ہو۔ کیونکہ وہ اختلال کو روک دیتی ہے یا سَداد یعنی قصد کو حاصل کر لیتی ہے۔

یہ فطرتِ انسانی کو اپیل کی ہے کہ جس طرح اگر تم مر جاؤ اور تمہاری چھوٹی چھوٹی اولاد رہ جائے تو تم یہ چاہتے ہو کہ دوسرے اس پر رحم کریں اور اس کے متکفل بنیں اسی طرح تم مسکینوں اور یتیموں کی خبر گیری کرو۔

ع۶۱۵ سعیرا۔ سَعر کے معنی التہاب النار یا آگ کا شعلے مارنا یا بھڑکنا ہیں۔ اور سعیر بمعنی مسعورۃ ہے یعنی بھڑکائی گئی آگ۔

اس آیت کے ساتھ چونکہ مضمون اور رکوع ختم ہوتا ہے اس لیے پھر یتامٰی کے مال کھانے کے جرم سے ڈرایا ہے اور بتایا ہے کہ مال یتیم کا کھانا گویا آگ کا کھانا ہے اور آگ کا کھانا بطور مجاز ہے اور ان اسباب کا مہیا کرنا مراد ہے جو انسان کو آگ میں لے جائیں گے۔

ع۶۱۶ اولاد - وَلد کی جمع ہے جس کے معنی مطلق مولود ہیں یعنی جنا گیا اور واحد اور جمع میں چھوٹے اور بڑے پر (غ) مذکر و مؤنث میں (غق) اور ولد الولد یعنی پوتے پر اس کا استعمال جائز ہے۔

اسلام کا قانون وراثت: اس رکوع میں ورثاء کے مختلف حصص بتائے ہیں۔ عرب میں جائداد متروکہ کا کوئی حِصّہ ضعفا یعنی عورتوں اور چھوٹے بچوں کو نہ ملتا تھا۔ اسلام نے ہر ایک شخص کی متروکہ جائداد کے چند حصّے کر دیئے ہیں۔ کچھ خاوند یا بی بی کو مل جاتا ہے۔ کچھ ماں باپ کو کچھ اولاد کو۔ اور بعض حالات میں بھائیوں بہنوں کو۔ یا قریبی رشتہ داروں کے نہ ہونے کی صورت میں دُور کے رشتہ داروں کو گویا ہر شخص کی جائداد میں سے ان لوگوں کو حِصّہ دیا ہے جن سے انسان کو کچھ نفع عام طور پر پہنچتا رہتا ہے۔ اس لیے وراثت کو سب میں تقسیم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ تا سب وہ لوگ جن سے انسان کو منفعت پہنچتی ہے اس سے منفعت حاصل کریں۔

اسلام کا اصول تقسیم وراثت حقوق انسانی کی مساوات پر مبنی ہے۔ اولاد میں ایک مساوات ہے وہ سب حِصّہ دار ہونے چاہئیں۔ یہ نہیں کہ بیٹیوں کو محروم کر دیا جائے اور بیٹوں کو ساری جائداد دیجائے اور نہ ہی یہ قرین انصاف ہے کہ ساری اولاد کو محروم کر کے ایک کے سپرد کل جائداد کر دیجائے جیسا کہ بعض ممالک

حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ — لیے دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہو پھر اگر (اولاد میں) دو (یا اس)

اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ — سے اوپر عورتیں ہوں تو ان کے لیے اس کی دو تہائی ہے[۶۱۶] جو چھوڑا اور اگر

میں سب سے بڑا بیٹا ساری جائداد کا مالک ہو جاتا ہے اور باقی سب اولاد محروم رہ جاتی ہے اسی طرح پر اگر میاں بی بی کی جائداد کا وارث ہو سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ بی بی میاں کی جائداد میں حصہ نہ لے۔ اسی طرح ماں باپ کے حقوق ہیں۔ گویا اس تقسیم وراثت میں بھی اسلام نے جمہوریت کا اصول قائم کیا ہے کہ جن کے یکساں حقوق ہیں وہ سب اپنے حقوق کو پائیں۔ رہا جائدادوں کا بننا یا تقسیم ہونا سو جس طرح ایک انسان اپنی سعی اور کوشش سے ایک جائداد بنا سکتا ہے اسی طرح دوسرا بھی بنا سکتا ہے۔ جو قوتیں ایک انسان کو اللہ تعالیٰ نے دی ہیں وہی دوسرے کو بھی دی ہیں جو سامان ایک کے لیے مہیا کیے ہیں وہی دوسرے کے لیے بھی مہیا کیے ہیں۔ پس جو مساوات قانون قدرت میں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے اسی کو تقسیم وراثت میں مدنظر رکھا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو اسلام نے چار اصول قائم کر کے تقسیم دولت کا صحیح اصول قائم کیا ہے۔ اور موجودہ زمانہ کی مشکلات تقسیم دولت کا علاج اگر یورپ کو کبھی ملیگا تو صرف تعلیم اسلام میں۔ یورپ میں دو خیالات کی رو اس وقت چل رہی ہے۔ ایک خیال تو یہ ہے کہ ہر ایک فرد اپنی کوشش اور محنت سے جس قدر مال حاصل کرلے وہ سب اس کا مال ہے۔ اسی خیال کے ماتحت یورپ میں حد درجہ کی خود غرضی بڑھ گئی ہے اور ملک کی دولت عوام کے ہاتھ سے نکل کر چند افراد کے ہاتھ میں آگئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر حصہ نسل انسانی کا معمولی سامان معیشت سے بھی محروم ہے اور چند کس کروڑپتی ہیں اس نقص کو دیکھ کر ایک دوسرا خیال پیدا ہوا ہے جو بولشوزم کے نام سے موسوم ہے جس کا اصول یہ ہے کہ سب انسان ملک کی دولت میں یکساں حصہ دار ہیں۔ سب کوشش کریں۔ مگر ان کی کوششوں کا ثمرہ جو کچھ ہو وہ سب مشترک ہونا چاہیئے اور سب کو دولت کا یکساں حصہ ملنا چاہیئے۔ مگر اس تحریک میں یہ نقص ہے کہ جب ہر ایک شخص اپنی کوشش سے جو کچھ حاصل کرے اس کا مالک نہیں تو زیادہ محنت اور کوشش کے لیے کوئی تحریص باقی نہ رہے گی۔ اسلام نے اگر ایک طرف لیس للانسان الا ما سعیٰ کا اصول قائم کیا ہے یعنی جو انسان جس کے لیے کوشش کرے وہ اس کا مال ہے۔

تقسیم دولت میں مساوات قائم رکھنے کے لیے چار علاج: تو دوسری طرف اس بات کو روکنے کے لیے کہ دولت چند مخصوص ہاتھوں میں جمع ہوتی چلی جائے کچھ علاج تجویز کر دیئے گئے ہیں۔ انہی علاجوں میں سے ایک زکوٰۃ ہے جس کے ذریعہ سے جمع شدہ دولت کا جو دولتمندوں کے قبضہ میں ہو چالیسواں حصہ ہر سال کے آخر میں نکل کر غربا کو ملتا رہتا ہے۔ دوسرا سُود کی ممانعت ہے یعنی ایسے لوگوں سے جو بوجہ تنگدستی قرضہ لینے کے محتاج ہوتے ہیں۔ سود نہ لیا جائے۔ تیسرا یہ ہے کہ ہر ایک شخص کو جو اپنی موت کے وقت مال چھوڑتا ہے یہ حکم دیا ہے کہ اس کا کچھ حصہ خیراتی کاموں کے لیے وصیت کرے اور چوتھا اصول خود تقسیم ترکہ کا اصول ہے جو ہر حال میں چند نہایت قریبی رشتہ داروں میں قریبًا یکساں تقسیم ہو جاتا ہے۔ عرب کے ملک میں آج سے تیرہ سو سال پیشتر ایک اُمّی محض ان مشکلات کا حل بتا دیتا ہے جو آج بڑی بڑی مہذب قوموں کو پیش آرہی ہیں۔ کیا یہ اسلام کے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منجانب اللہ ہونے کا ایک کھلا نشان نہیں؟

وراثت کے لیے اسلام نے ذیل کے حقوق قرار دیئے ہیں: اوّل قرابت۔ جیسے اولاد، ماں باپ، بھائی، بہن۔ دوسرے نکاح یعنی خاوند بیوی۔ ان دونوں کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے۔ تیسرا حق ولاء قرار دیا ہے جو مخصوص حالات سے تعلق رکھتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے یعنی جو شخص ایک غلام کو آزاد کرے۔ تو وہ آزاد کرنے والا اس کا وارث ہو جاتا ہے۔ اور چوتھا حق اخوت اسلامی کا ہے جو اس صورت میں قائم ہوتا ہے جب وارث کوئی نہ ملے اس صورت میں ترکہ بیت المال میں مسلمانوں کی عامہ بھلائی میں صرف ہوتا ہے جیسا کہ بعض ذمہ داریوں کی ادائیگی بھی خاص حالات میں بیت المال کے ذمہ ہوتی ہے اور اس کی بنا بھی حدیث پر ہی ہے کہ آپ نے فرمایا انا وارث من لا وارث له۔ جس کا کوئی وارث نہیں میں اس کا وارث ہوں۔

ظاہر ہے کہ اصل حق قرابت اور زوجیت کا ہی ہے، اور اسی پر قرآن کریم نے چند ہدایات دی ہیں اور ترتیب جس سے وارثوں کا ذکر کیا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی حکمت پر مبنی ہے یعنی سب سے پہلے اولاد کا ذکر کیا اور اس کے بعد ماں باپ کا۔ قرابت میں اوّل درجہ کا حق انہی دو کا ہے اس کے بعد خاوند بیوی کے حصوں کا ذکر کیا۔ اور بھائیوں کے حق کو پیچھے رکھا۔ اس لیے کہ گو بھائیوں کا حق قرابت کے لحاظ سے ہے۔ مگر حق زوجیت بھائیوں کے حق قرابت پر فائق ہے اور بہن بھائی عمومًا صرف اس صورت میں لیتے ہیں جب اوّل درجہ کی قرابت والے نہ ہوں۔

[۶۱۶] فوق اثنتین کے معنی دو سے اوپر ہیں۔ مگر چونکہ یہاں دو کا حکم علیحدہ نہیں اور وہ بھی جماعت میں داخل ہیں۔ اس لیے مراد فوق اثنتین سے دو اور دو سے اوپر ہیں۔ اس کی مثال حدیث میں ہے لا تسافر المرأة سفرا فوق ثلاثة ایام الا معها زوجها او ذو محرم لها۔ جس کے معنی ہیں کہ کوئی عورت تین یا تین دن سے زیادہ سفر نہ کرے مگر اس کے ساتھ اس کا خاوند یا ذو محرم ہو اور قرآن کریم میں ہے فاضربوا فوق الاعناق (الانفال-۱۲) جہاں مراد گردن کاٹنا ہے۔ نہ گردن کے اوپر۔ علاوہ ازیں اس سورت کے آخر پر بعض حالات میں دو بہنوں کا حصہ دو تہائی قرار دیا ہے فان کانتا اثنتین فلهما الثلثٰن مما ترک (۱۷۷) لیکن وہاں دو سے زیادہ بہنوں کے حصہ کا ذکر نہیں۔ تو چونکہ قرآن کریم کی بعض آیات بعض کی تفسیر کرتی ہیں۔ اس لیے اگر ایک جگہ دو لڑکیوں سے زیادہ کے حصہ کا ذکر ہے اور دو کا نہیں اور دوسری جگہ دو بہنوں کے حصہ کا ذکر ہے اور دو سے زیادہ کے حصے کا ذکر نہیں اور باقی امور میں وہ یکساں ہیں۔ تو صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ دو لڑکیوں کا حصہ دو بہنوں سے کم نہیں ہو سکتا اور دو سے زیادہ بہنوں کا حصہ دو سے زیادہ لڑکیوں کے حصہ سے زیادہ نہیں

وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ
وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ
كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ
وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ
لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ

اکیلی ہو تو اس کے لیے نصف ہے[617] اور اس کے ماں باپ کے
لیے دونوں میں سے ہر ایک کے لیے اسکا چھٹا حصّہ ہے جو چھوڑ رہا ہے
اگر اس کی اولاد ہو۔ لیکن اگر اس کی اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ
ہی اسکے وارث ہوں تو اس کی ماں کے لیے تیسرا حصّہ ہے اور اگر اسکے بھائی
ہوں تو اس کی ماں کے لیے چھٹا حصّہ ہے[618]۔ وصیّت (کی ادائیگی

ہو سکتا۔ پس قرآن کریم کا ایسے موقعوں پر اجمال کو اختیار کرنا اس طرف توجہ دلانے کے لیے ہے کہ اس کی وضاحت خود دوسری جگہ قرآن شریف میں موجود ہے۔

ع۶۱۷ اولاد کا حق وراثت: سب سے پہلے جیسا کہ حق تھا اولاد کا ذکر کیا۔ کیونکہ ایک تو اولاد کی پرورش ماں باپ کے ذمہ ہوتی ہے۔ دوسرے عموماً ماں باپ کی وفات سے اولاد ترکہ کو لیتی ہے۔ اور اولاد کی وفات سے ماں باپ کا ترکہ کو لینا کم واقع ہوتا ہے۔ سب سے پہلی صورت یہ ہے کہ صرف اولاد ہی لینے والی ہو۔ اور اس میں اول اس صورت کو لیا کہ لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ان میں تقسیم وراثت کا یہ قاعدہ بتایا ہے کہ لڑکے کا حصّہ لڑکی سے دوچند ہو۔ اور اس طرح ساری جائداد تقسیم ہو۔ اس صورت کا ذکر نہیں کیا جس میں صرف لڑکے ہوں۔ اس لیے کہ وہ خود اس سے ظاہر ہے اور جب صرف لڑکیاں ہی ہوں تو اس صورت میں فرمایا کہ ایک لڑکی ہو تو جائداد کی نصف کی وہ مالک ہو گی۔ باقی دور کے رشتہ داروں کو جائے گی اور اگر دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو وہ سب بحصّہ مساوی دو تہائی جائداد لیں گی اور باقی ایک تہائی اور رشتہ داروں کو جائے گی۔ یہ تقسیم صرف اس صورت میں ہے جہاں اولاد کے ساتھ ماں باپ یا خاوند لینے والے نہیں۔

پوتے کا حق: بظاہر یہاں صرف اولاد کا ذکر ہے یعنی بیٹوں اور بیٹیوں کا لیکن چونکہ لفظ ولد کا وسیع مفہوم ہے، اس لیے اس میں اولاد کی اولاد بھی داخل ہے مگر یہاں پر تعامل نے کچھ تفریق کر دی ہے۔ یعنی اوّل تو بیٹی کی اولاد کو ورثا میں شامل نہیں کیا اور دوسرے بیٹوں کی اولاد کو اس صورت میں ورثا میں شامل کیا ہے جب کوئی زندہ بیٹا موجود نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص کے دو زندہ بیٹے ہیں۔ اور ایک بیٹے کی جو مر چکا ہے اولاد موجود ہے تو اس بیٹے کی اولاد کو باقی بیٹوں کے ساتھ حصّہ نہ دیا جائے گا وہاں بروئے وصیت ان کو متوفی کچھ حصّہ دے سکتا ہے۔ جس کے لیے پہلے حکم بھی آ چکا ہے۔ اور اگر کوئی بیٹا زندہ نہ ہو تو پھر بیٹوں کی اولاد ان بیٹوں کے قائم مقام سمجھی جائے گی۔ مگر قرآن کریم کے کوئی لفظ یہ ہدایت نہیں کرتے نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسا فیصلہ کیا کہ ایک متوفی بیٹے کی اولاد کو زندہ بیٹوں کے ساتھ اپنے متوفی دادا کا حصّہ لینے سے محروم کر دیا ہو۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ولد کے لفظ میں شامل ہونے کی وجہ سے ایک متوفی بیٹے کی اولاد زندہ بیٹوں بیٹیوں کے ساتھ اپنے دادا کا حصّہ لینے کی حقدار ہے اور اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے جہاں پوتی کو بیٹی کے ساتھ شامل کر کے ابن مسعود نے دو بیٹیاں قرار دے کر دو تہائی جائداد ان دونوں کو دے دی (بخاری) گو اس میں ان کی آپس کی تقسیم میں پھر بیٹی کو ایک قرار دے کر اسے نصف دلایا اور بقیہ چھٹا حصّہ پوتی کو دلایا مگر بہر حال اس سے دلیل ملتی ہے کہ جب پوتی بیٹی کے قائم مقام ہو سکتی ہے تو پوتا بیٹے کے قائم مقام کیوں نہیں ہو سکتا۔ تعامل میں اصل تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعامل ہے۔ جب وہ نہیں تو باقی تعامل کوئی دلیل نہیں۔ اور بہر حال ایسی صورت میں آیت اذا حضر کے ماتحت ایسے پوتوں کے لیے وصیّت کرنا ضروری ہے اور اگر ایسی وصیّت نہ کی گئی ہو تو تقسیم وراثت کے وقت بھی ان کو حصّہ دیا جا سکتا ہے۔

ع۶۱۸ اس حصّہ میں ماں اور باپ کے حصّہ وراثت کا ذکر کیا ہے اور اس کی تین صورتیں قائم کی ہیں۔ اوّل یہ کہ ماں باپ ہوں اور اولاد بھی ہو اس صورت میں ماں اور باپ ہر ایک چھٹا حصّہ لیتا ہے اور باقی اولاد کو ملتا ہے۔ اگر اولاد میں لڑکے ہوں یا لڑکے اور لڑکیاں ہوں یا دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو سب ان کو مل جائے گا۔ اگر صرف ایک لڑکی ہو تو نصف وہ لے لیگی اور باقی چھٹا حصّہ پھر والد کو قریب ترین عصبہ ہونے کے لحاظ سے چلا جائے گا۔ کیونکہ اکیلی لڑکی کو بہر حال نصف سے زیادہ نہ ملے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ماں باپ ہوں اور اولاد کوئی نہ ہو تو اس صورت میں ماں کو ایک تہائی اور باقی دو تہائی باپ کو چلا جائے گا۔

تیسری صورت یہ بیان کی ہے کہ اولاد نہ ہو مگر بھائی ہوں۔ تو اس صورت میں ماں کو چھٹا حصّہ ملیگا۔ باپ کو کیا ملیگا؟ اس میں اختلاف ہے جمہور کے نزدیک بھائیوں کا ہونا صرف ماں کے تیسرا حصّہ پانے کے لیے روک ہے اور بھائیوں کو کچھ نہ ملیگا مگر حضرت ابن عباس کا مذہب ہے کہ جو ماں کا حصّہ کم ہوا ہے وہ بھائیوں کو ملے گا۔ بظاہر یہ کوئی وجہ نہیں کہ بھائی ہوں تو ماں کا حصّہ کم ہو جائے حالانکہ ورثہ پانے والا اور کوئی پیدا نہیں ہوا اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ بھائیوں کے ہونے سے باپ کا حصّہ بڑھ کر $\frac{5}{6}$ ہو گیا اور ماں کے لیے صرف چھٹا حصّہ رہ گیا اس میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی۔ کیونکہ عام اصولِ وراثت یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک کا حصہ کم ہونے کیلئے کوئی دوسرا اس کا پانے والا اور ہونا چاہیئے۔ مگر اس پر اعتراض ہے کہ یہاں یہ ذکر نہیں کہ بھائیوں کو کیا ملے۔ میرے نزدیک اس کا ذکر چونکہ آگے آ جاتا ہے اس لیے یہاں ذکر کی ضرورت نہ تھی اور ماں کا حصّہ اس لیے کم کیا گیا ہے کہ بھائی حصّہ پانے والے ہیں اور خود الفاظ قرانی بھی اس پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ پہلے جہاں ماں باپ کے ساتھ اور کوئی ورثہ پانے والا نہیں وہاں صاف لفظ بڑھا دیئے ہیں وورثہ ابواہ اس کے ماں باپ اس کے وارث ہوں۔ مگر جہاں بھائیوں

وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾

کے بعد جو اس نے کی ہو یا قرضہ کے۔ تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمھارے لیے فائدے کے لحاظ سے زیادہ نزدیک ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے، اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۶۱۹

کا ذکر کیا، وہاں یہ لفظ نہیں بڑھائے جس سے معلوم ہُوا کہ اب وہ بھائی بھی ساتھ وارث ہیں۔

دوسرا سوال اس صورت کے متعلق یہ ہے کہ اخوۃ سے کیا مراد ہے اس پر تو اتفاق ہے کہ ایک بھائی ہو تو وہ ماں کا تیسرا حصّہ پانے میں مانع نہیں ہوگا اور تین ہونگے تو وہ ضرور مانع ہونگے مگر دو کے متعلق اختلاف ہے بعض نے کہا کہ اخوۃ چونکہ جمع ہے اس لیے دو اس میں داخل نہیں بعض نے کہا کہ دو پر بھی جمع کا حکم ہے جیسا کہ نبی کریم صلعم سے بھی مروی ہے الاثنان فما فوقھا جماعۃ۔ دو یا اس سے بڑھ کر جماعت ہے اور اکثر صحابہؓ کا مذہب یہی ہے کہ دو اخوۃ کے لفظ میں شامل ہیں۔

میرے نزدیک قرآن کریم نے وراثت کے معاملہ میں الفاظ کو وسیع معنی پر محمول کیا ہے ولد کو واحد جمع مذکر مؤنث میں یکساں استعمال کیا ہے۔ اب میں اگر باپ نہ ہو تو دادا مراد ہوگا۔ امّ میں اگر ماں نہ ہو تو دادی مراد ہوگی۔ اسی طرح اخوۃ کا لفظ عام ہے اور اس میں بھائی اور بہنیں سب شامل ہیں خواہ ایک ہوں یا زیادہ۔ اور ان کے حصص کا ذکر آگے چل کر آتا ہے۔ جہاں کلالہ کی وراثت کا ذکر ہے۔ جہاں صاف یہ بیان فرمایا کہ اگر ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو اس کو چھٹا حصّہ ملے گا اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں شریک ہونگے پس ماں باپ کے ہوتے ہوئے اگر بھائی بہنیں ہوں تو اس کی صورت یہ ہے کہ ماں کو چھٹا حصّہ ایک بھائی یا بہن ہو تو اس کو چھٹا حصّہ اور باقی دو تہائی باپ کو۔ ایک سے زیادہ بھائی بہنیں ہوں تو ماں کو چھٹا حصّہ۔ سب بھائی بہنوں کو تیسرا حصّہ اور باقی نصف باپ کو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ صورت تعامل کے خلاف ہے۔ مگر مسئلہ وراثت میں تعامل میں اختلاف چلا آتا ہے۔ نہ صرف بہت سے مسائل میں شیعہ سُنّی کا اختلاف ہے بلکہ خود علمائے اہل سنت والجماعت میں بھی اختلاف ہے اور صحابہؓ میں بھی اختلاف ہے چنانچہ کئی مسائل میں حضرت ابن عباسؓ کا مذہب دوسرے صحابہ کے خلاف ہے۔ اگر لفظ کلالہ کے یہ معنی صحیح ہیں کہ کلالۃ اس کو بھی کہتے ہیں جس کا ماں باپ اور اولاد دونوں نہ ہوں جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے اور اس کو بھی کہتے ہیں جس کے ماں باپ ہوں اور اولاد نہ ہو۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ سے روایت ہے۔ تو دو جگہ مختلف کلالہ کے ذکر سے مراد یہ دونوں صورتیں ہوں گی۔ اور چونکہ قرآن کریم نے اس آیت میں صاف ذکر کیا ہے کہ اولاد نہ ہو اور ماں باپ کے ساتھ بھائی ہوں۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ اس صورت میں جو بھائیوں کو ملنا چاہیئے اس کا ذکر بھی قرآن شریف میں ہے اور یہی وہ صورت ہے جس کا ذکر زوجین کے بعد آتا ہے۔

۶۱۹ وصیت اور قرضہ: من بعد وصیّۃ یوصی بھا او دَین۔ یہ الفاظ ساری آیت پر حاوی ہیں۔ کیونکہ ان تمام کا ذکر کر کے آخر میں اس کا ذکر کیا ہے گویا خواہ صرف اولاد وارث ہو۔ یا ماں باپ اولاد کے ساتھ یا اولاد کے بغیر یا بھائیوں کے ساتھ وارث ہوں۔ تمام صورتوں میں اگر کوئی وصیت ہو یا قرضہ ہو تو پہلے اس کی ادائگی ضروری ہے اور جو باقی بچ رہے وہ بموجب حصص مذکورہ بالا تقسیم ہوگا۔ قرضہ اور وصیّت میں سے قرآن کریم نے پہلے وصیّت کا نام لیا ہے مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ قرضہ سے پہلے وصیّت کا مال ادا کیا جائے۔ اس لیے کہ مال متروکہ قرار وہی پائے گا جو بعد ادائگی قرضہ ہو۔ اور اَوْ ترتیب کے لیے نہیں آتا۔ وصیّت کے ذکر کو مقدم اس لیے کیا کہ جب کوئی وصیّت کرے گا تو اس وصیت میں قرضہ کا ذکر تو خود ہی کرے گا۔ اس لیے صرف وصیّت کی تعمیل میں قرضہ کی ادائگی آجاتی ہے۔ اور اس کے بعد اودین کا لفظ اس لیے بڑھایا کہ اگر کسی نے وصیّت نہیں کی مگر قرضہ اس کے ذمہ ثابت ہے تو قرضہ بہرحال ادا ہی کرنا ہوگا۔

اٰباؤکم و ابناءکم لا تدرون ایھم اقرب لکم نفعا۔ قرابت کے لحاظ سے اصل حقدار وراثت یا اولاد ہے یا ماں باپ مگر اولاد کو پہنچنا تو قوانین دنیا نے تسلیم کیا ہے۔ لیکن ماں باپ کو عموماً کچھ نہیں دیا جاتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب ماں باپ کے حصص کا ذکر فرمایا تو بتا دیا کہ ماں باپ کے حقوق کو کم مت سمجھو انسان کو نفع ماں باپ سے بھی پہنچتا ہے اور اولاد سے بھی۔ پس جن سے انسان نفع اٹھاتا ہے اس کے ترکہ سے ان کو نفع پہنچنا چاہیئے اس لیے ماں باپ کے حقوق کو چھوڑا نہیں جاسکتا۔

وصیّت کا حق کہاں تک ہے: ہر دفعہ جہاں حصص کا ذکر ہے ساتھ یہ لفظ بھی بڑھا دیئے ہیں کہ یہ تقسیم وصیّت کی تعمیل کے بعد ہوگی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وصیّت کی رو سے ایک شخص کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے مال کو اپنے ورثا میں تقسیم کر دے یا ان کو محروم کر دے۔ یہ ایک ظاہر امر ہے کہ ایسی وصیّت خود احکام آیت کو باطل کرتی ہے اور یہ ہو نہیں سکتا کہ خود ہی ایک تقسیم قائم کر کے پھر خود ہی ایسی بھی اجازت دے کہ وہ تقسیم باطل ہو جائے۔ اگر منشاء الٰہی یوں ہوتا کہ مال کی تقسیم تو وصیّت کے مطابق ہونی چاہیئے لیکن جس صورت میں وصیت نہ ہو تو پھر یوں تقسیم ہو تو حصص کے مقرر کرنے سے پہلے یہ ہدایت صاف طور پر دیدی جاتی کہ مال کی تقسیم تمہاری وصیتوں کے مطابق ہوگی۔ لیکن جہاں وصیت نہ ہو وہاں ذیل کی تقسیم ہو۔ برخلاف اس کے قرآن کریم نے پہلے حصص مقرر کر کے پھر وصیت

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ

اور تمھارے لیے اس کا نصف ہے جو تمھاری بیویاں چھوڑیں اگر ان کی اولاد نہ ہو۔ اگر ان کی اولاد ہو تو تمھارے لیے اس کا چوتھا حصّہ ہے جو انھوں نے چھوڑا ہے وصیت (کی ادائیگی) کے بعد جو انھوں نے کی ہو یا قرضہ (کے) اور ان کے لیے اس کا چوتھا حصّہ ہے جو تم نے چھوڑا ہے۔ اگر تمھاری اولاد نہ ہو اور اگر تمھاری اولاد ہو تو ان کے لیے اس کا آٹھواں حصّہ ہے جو تم نے چھوڑا ہے وصیت (کی ادائیگی) کے بعد جو تم نے کی ہو یا قرضہ (کے) ۶۲۰ؔ اور اگر کوئی مرد یا عورت جس کی میراث لی جاتی

کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وصیّت مال کے کسی خاص حصّہ کے متعلق ہونی چاہیئے اور چونکہ حدیث صحیح سے ثابت ہے جس کا ذکر مفصل نوٹ نمبر ۲۲۰ میں ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کی اجازت نہیں دی اس لیے پہلی شرط اس وصیت کے لیے جس کا ذکر اس آیت میں ہے یہ ہے کہ وہ ایک تہائی مال سے زیادہ کے لیے نہ ہو، دوسری شرط کا ذکر بھی ایک حدیث میں ہے کہ لا وصیة لوارث یعنی جو شخص حصص مقرر کردہ کے مطابق وارث پاتا ہے اس کے لیے وصیّت کوئی نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ حدیث نہ بھی ہوتی تب بھی یہ بات ظاہر تھی کہ جب ورثاء کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے حصص مقرر کر دیئے ہیں تو اب ایک شخص کو یہ اختیار ہوتا کہ وہ ورثاء میں سے کسی کے لیے کچھ وصیت بھی کر دے۔ پھر ایک ناانصافی ہو جاتی ہے کہ ایک وارث کو دوسرے سے بڑھ کر حقدار بنا دیا گیا۔ اس لیے حق یہی ہے کہ وارث کے لیے وصیت نہیں ہوسکتی پس یہ دو شرائط وصیت کے لیے ضروری ہیں۔ اوّل ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیّت نہ ہو دوسرے وارث کے لیے وصیّت نہ ہو۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ وصیت کس قسم کی ہو۔ نوٹ نمبر ۲۲۰ سے معلوم ہوگا کہ اس وصیت کی غرض خدا کے لیے کچھ مال کا چھوڑنا ہے خواہ وہ اشاعت دین کے لیے یا کسی غریب یا مفلس رشتہ دار کے لیے یا کسی یتیم کے لیے ہو بعض غریب اور یتیم رشتہ داروں میں بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو متوفی کے مال کا کچھ حصّہ بطور ورثہ نہیں پہنچتا۔ مثلاً موجودہ تعامل کے مطابق بیٹوں کی موجودگی میں کسی متوفی بیٹے کے بیٹے یعنی یتیم پوتے۔ لیکن زیادہ تر اس کی غرض محض فی سبیل اللہ یا اشاعت دین کے لیے کچھ چھوڑنا ہے جیسا کہ دکھایا جا چکا ہے جس طرح قرآن کریم کے بہت سے اصول مسلمانوں نے ترک کر دیئے اور غیر مسلموں نے لے لیے ہیں۔ اسی طرح فی سبیل اللہ وصیّت کا معاملہ بھی ہے۔ مسلمانوں میں بہت کم ہیں جو اپنے مال کا کچھ حصّہ خدا کی راہ میں وصیّت کر جائیں۔ لیکن عیسائیوں میں جا کر دیکھو تو جہاں بڑی بڑی جائدادیں ہیں کچھ نہ کچھ حصّہ مال کا قوم کی بہتری یا اور کسی نیک غرض کے لیے وصیّت کر دیا جاتا ہے۔ پھر قرآن کے حکموں کی تعمیل اگر دوسرے کریں تو کیوں ان سے نفع نہ اُٹھائیں اور مسلمان اگر قرآن کو اپنا رہنما نہ بنائیں تو کس طرح پر وہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

۶۲۰ؔ خاوند اور بیوی کے حصّے: یہ تیسری صورت ہے۔ اس میں متوفی کی بیوی یا خاوند زندہ ہے۔ اگر بیوی مر گئی ہے اور اولاد ہے تو خاوند کو چوتھا حصّہ اور نہیں ہے تو نصف اور اگر خاوند مر گیا ہے اور بیوی زندہ ہے اور اولاد ہے تو بیوی کو "آٹھواں" حصّہ اور نہیں ہے تو بیوی کو "چوتھا" حصّہ۔ ایک سے زیادہ بیبیاں ہوں تو اسی حصّہ میں شریک ہونگی اور باقی اولاد لے گی۔ لیکن اس صورت میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ خاوند یا بیوی بھی ہو اور ماں باپ بھی ہوں تو حصص کس طرح تقسیم ہونگے۔ اس صورت میں خواہ اولاد ہو یا نہ ہو بعض مشکلات پیش آتی ہیں۔ اگر اولاد نہ ہو ماں باپ ہوں اور خاوند ہو۔ تو نصف خاوند کو چاہیئے، ایک تہائی ماں کو اور اس طرح پر باپ کا حصّہ صرف چھٹا رہ جاتا ہے۔ جو ماں سے نصف ہے اور اگر اولاد میں مثلاً لڑکیاں ہوں اور خاوند ہو اور ماں باپ ہوں تو لڑکیوں کو دو تہائی چاہیئے ماں باپ کو ایک تہائی۔ تو خاوند کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ صورت اول میں یعنی جب اولاد نہ ہو ماں باپ ہوں اور خاوند یا بیوی ہو تو اکثر اس طرف گئے ہیں کہ خاوند یا بیوی پہلے اپنا حصّہ لے لیں گے اور باقی کی ایک تہائی ماں کو اور دو تہائی باپ کو جائے گا اور اس طرح پر حصص ٹھیک ہوں گے۔ یہی درست ہے اور یہ مذہب حضرت عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ و زیدؓ بن ثابت اور ابن مسعودؓ اور ساتوں فقہاء اور چاروں ائمہ اور جمہور علماء کا ہے (ث)۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ خاوند یا بیوی کو دیکر باقی مال ماں باپ کے حصص کے لیے کل مال قرار پائیگا اور ان کے حق میں ترکہ وہی ہے جو خاوند یا بیوی کو دینے کے بعد رہے اور اس پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ وہ ما ترک نہیں کیونکہ ما ترک ہر ایک کے لیے الگ الگ ہے۔ اگر قرضہ ہو تو پہلے ترکہ میں سے قرضہ جانا چاہیئے۔ اگر وصیّت بھی ہے تو قرضہ کے بعد وصیّت والوں کو ملنا چاہیئے۔ اگر خاوند یا بیوی ہے تو وصیّت کے بعد اسے ملنا چاہیئے۔ پھر اس میں سے جو رہ جائے اس میں سے ماں باپ کا حصّہ اور بقیہ اولاد کا حصّہ ہوگا اور جس طور پر قرآن کریم نے حصص قائم کیے ہیں وہ خود اس اصول کی صداقت پر شاہد ہے۔ کیونکہ اول یہ ذکر کیا کہ صرف اولاد ہو ماں باپ نہ ہوں۔ پھر یہ ذکر کیا کہ ماں باپ ہوں اور اولاد ہو یا نہ ہو تو اگر پہلی صورت میں اولاد فوراً لیتی ہے تو اس صورت میں پہلے ماں باپ لیتے ہیں باقی اولاد لیتی ہے تیسری صورت اب یہ

کَلٰلَۃً اَوِ امْرَاَۃٌ وَّلَہٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ ہے کلالہ ہو، اور اس کا بھائی یا بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر
فَلِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْہُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ ایک کے لیے چھٹا حصّہ ہے۔ اور اگر وہ اس سے

ہے کہ خاوند یا بیوی ہو تو ظاہر ہے کہ جس طرح ماں باپ کو دے کر بقیہ اولاد کے لیے جاتا ہے۔ اسی طرح اگر خاوند یا بیوی کے ساتھ ماں باپ بھی ہیں تو خاوند یا بیوی کو دے کر ماں باپ کو دیا جائے گا۔ اس صورت میں جس کو خود علمائے امت نے ایک مشکل کو حل کرنے کے لیے اختیار کیا ہے بعول وغیرہ کی تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ اور مسئلہ وراثت بالکل صاف ہو جاتا ہے اور اس میں سے بہت سی پیچیدگیاں دور ہو جاتی ہیں مسئلہ عول جو حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہے وہ بھی اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے کہ خاوند یا بیوی کے حق کو فائق نہ کیا جائے۔ کیونکہ عول کی صورت ایسی ہے کہ مثلاً بیوی زندہ ہے دو یا زیادہ لڑکیاں ہیں ماں باپ ہیں اب بیوی کو آٹھواں چاہیئے لڑکیوں کو دو تہائی ماں باپ کو ایک تہائی۔ اور یہ حصّے پورے نہیں ہوتے۔ حضرت علیؓ نے بذریعہ عول اس کا حل یوں کیا تھا کہ کل ستائیس حصّے کیے جائیں۔ جن میں سے سولہ لڑکیوں کو دیئے جائیں۔ آٹھ ماں باپ کو، تین بیوی کو اس طرح مال تو پورا ہو گیا۔ مگر دو تہائی ایک تہائی آٹھواں حصّہ کچھ بھی درست نہ رہا۔ اگر اس کی بجائے یوں کیا جاتا کہ بیوی کا حق نکال کر باقی میں سے ماں باپ کا تیسرا دیا جاتا اور پھر بقیہ لڑکیوں کو تو یہ مشکل ہی پیش نہ آتی۔ یا اگر بیوی کا حق پہلے نہ بھی نکالا جائے تو بھی لڑکیوں کو دو تہائی اس لیے نہیں دینا چاہیئے کہ ان کے ساتھ ماں باپ موجود ہیں اور لڑکیاں دو تہائی اس وقت لیتی ہیں جب دوسرا ساتھ لینے والا کوئی نہ ہو۔ پس آٹھواں حصّہ بیوی کا اور ایک تہائی ماں باپ کا نکال کر بقیہ لڑکیوں کو دیا جائے گا۔ کیونکہ اگر لڑکیوں کی بجائے لڑکے ہوتے یا لڑکے اور لڑکیاں ہوتیں تو ان کو بھی بقیہ ہی دیا جاتا اور لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ پانے کی بہر حال حقدار نہیں۔

اور اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ نا انصافی ہے کہ پہلے خاوند یا بیوی کو اپنا حصّہ مل جائے تو باقی میں سے والدین کا چھٹا چھٹا حصّہ نکلے اور پھر اس کا بھی بقیہ اولاد کو ملے تو یہ فی الحقیقت کوئی نا انصافی نہیں کیونکہ خاوند یا بیوی جو کچھ لینگے وہ بھی اولاد کی بہتری پر ہی صرف ہوگا اور حق یہی ہے کہ خاوند یا بیوی کا ایک گونہ اشتراک جائداد میں ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ دونوں اس کے بنانے والے ہیں خاوند کی جائداد کے بننے میں بیوی مددگار ہوتی ہے اور بیوی کی جائداد کے بننے میں خاوند مددگار رہتا ہے اور اس طرح مسئلہ وراثت کی تمام دقتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی فیصلہ اس کے خلاف مروی نہیں۔ صرف ایک فیصلہ سعد بن الربیع کی بیٹیوں اور بیوی کا مذکور ہے جس میں بیوی کو آٹھواں حصّہ، بیٹیوں کو دو تہائی اور بقیہ چچے کو دیا گیا۔ یہ روایت اوّل تو بہت اعلیٰ پایہ کی نہیں اور دوسرے اس میں کوئی تفصیلات نہیں جن سے ہمارے اس مفہوم کے خلاف کوئی نتیجہ نکل سکتا ہو۔

ع۶۲۱ کلالۃ۔ اس کا مادہ کلّ ہے جس کے معنی تھک جانا ہیں۔ راغبؒ کہتے ہیں یہ ان وارثوں کا نام ہے جو والد اور ولد کے سوا ہوں اور ساتھ ہی ابن عباسؓ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اولاد کے سوا جو وارث ہوں ان کا نام ہے اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کلالۃ وہ ہے جو مر جائے اور اس کی اولاد یا اس کا والد کوئی نہ ہو تو یہاں گویا میّت کو کلالہ قرار دیا ہے۔ امام راغبؒ کہتے ہیں کہ دونوں قول صحیح ہیں اور اس کی تطبیق یہ ہے کہ کلالہ مصدر ہے جو وارث اور موروث دونوں کو جمع کرتا ہے۔

کلالہ کی وراثت: مفسرین میں دو گروہ ہیں۔ بڑا گروہ تو اس طرف گیا ہے کہ کلالۃ وہ ہے جس کا نہ والد ہو نہ ولد۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کلالہ وہ ہے جس کا ولد نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کا خیال بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے گو ایک روایت میں آتا ہے کہ چونکہ حضرت ابوبکرؓ نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ اسکا والد و ولد نہ ہو اس لیے میں خاموشی اختیار کرتا ہوں۔ مگر ایک روایت میں حضرت عمرؓ نے اس کے وہی معنی کیے ہیں جو حضرت ابن عباسؓ نے کیے ہیں یعنی جس کا ولد نہ ہو۔ دیکھو غرائب القرآن وعن عمر رضی اللہ تعالی عنہ الکلالۃ من لا ولد لہ فقط اور ایک روایت حضرت عمرؓ سے یہ ہے کہ آپ کہا کرتے تھے اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے تین باتوں کو وضاحت سے بیان کر دیا ہوتا تو میرے نزدیک ساری دنیا سے زیادہ محبوب تھا۔ کلالہ۔ خلافت۔ ربا (رغ)

قرآن کریم میں دو جگہ کلالہ کا ذکر آیا ہے۔ ایک یہاں اور ایک اسی سورت کے آخر میں۔ یہاں بھائی یا بہن کا حصّہ چھٹا اور زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک اور وہاں بہن کا نصف۔ دو یا زیادہ بہنیں ہوں تو دو تہائی۔ صرف بھائی ہوں ایک یا زیادہ تو کل لیں۔ بھائی اور بہنیں ملے جلے ہوں تو سارا ورثہ مرد کو عورت سے دو چند حصّہ دیکر تقسیم ہو۔ مفسرین نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ یہاں بھائی بہن سے مراد اخیافی بھائی بہن ہیں یعنی ماں کی طرف سے اور دوسرے موقعہ پر یعنی آخر سورت میں بھائی بہن سے مراد عینی یا علاتی بہن بھائی ہیں یعنی ماں باپ دونوں کی طرف سے یا صرف باپ کی طرف سے۔ مگر نبی کریم صلعم کی کوئی حدیث اس کے متعلق نہیں۔ اس لیے دوسری توجیہ اس کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دونوں جگہ کلالہ سے الگ الگ مراد ہے۔

دو قسم کے کلالہ: یہاں کلالۃ سے مراد وہی صورت ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی اولاد نہ ہو۔ مگر ماں باپ ہوں اور بہن بھائی ہوں اور سورت کے آخر میں کلالۃ سے مراد وہ کلالہ ہے جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ اولاد اور یہی وجہ ہے کہ وہاں ساری جائداد بہن بھائیوں کو دلاتا ہے اور یہاں نہیں دلاتا کیونکہ وہاں اور کوئی وارث نہیں ہے اور یہاں ہی اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اوپر ایک صورت کا ذکر کیا تھا کہ بھائی ہوں اور اولاد نہ ہو تو ماں کو چھٹا حصّہ ملے مگر بھائیوں کا حصّہ بیان نہ کیا تھا۔ اس کا ذکر اب یہاں کر دیا ہے ورنہ یہ اعتراض باقی رہتا کہ ایک صورت کو قائم کر کے حصص کا ذکر نہیں کیا۔

كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ؕ ⑫

زیادہ ہوں تو تہائی میں شریک ہیں ۶۲۱ وصیت (کی ادائیگی) کے بعد جو کی گئی ہو یا قرضہ (کے) جو ضرر پہنچانے کے لیے نہ ہو۔ ۶۲۲ یہ اللہ کی طرف سے تاکیدی حکم ہے اور اللہ جاننے والا بردبار ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ⑬

یہ اللہ کی حدبندیاں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ اسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۧ ⑭

اور جو اللہ کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی حدبندیوں سے آگے نکلتا ہے اسے آگ میں داخل کریگا وہ اس میں رہیگا اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے ۶۲۳

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ⑮

اور تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا ارتکاب کریں تو اپنے میں سے چار گواہ اُن پر بلاؤ، سو اگر وہ گواہی دیں تو اُن کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ ان کو موت لے جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکال دے ۶۲۴

اس طرح پر ان چار احکام میں ذیل کی چار صورتیں بیان کر دی ہیں۔ اول صرف اولاد ہو۔ دوم ماں باپ ہوں اور اولاد ہو یا نہ ہو۔ سوم خاوند بیوی ہوں اور اولاد ہو یا نہ ہو۔ چہارم ماں باپ ہوں اولاد نہ ہو اور بھائی ہوں، اور پانچویں صورت سورت کے آخر پر یہ بیان کی ہے کہ نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں صرف بھائی بہن ہوں۔ ان پانچوں صورتوں میں اگر خاوند یا بیوی ہو تو اس کا حق پہلے نکالو۔ پھر ماں باپ ہوں تو ان کا حق دو پھر اولاد کو۔ اور اولاد نہ ہو، یا ماں باپ اور اولاد دونوں نہ ہوں تو بھائی بہنوں کو۔

۶۲۲ ضرر والا قرضہ: غَيْرَ مُضَآرٍّ۔ وصیّت اور قرضہ کے پہلے ادائگی کا حکم تو ہر جگہ دیا ہے مگر یہاں غیر مضارّ ساتھ بڑھا دیا ہے یعنی وصیت یا قرضہ ایسے ہوں جو ضرر پہنچانے والے نہ ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اولاد کوئی نہیں۔ اور جب اولاد موجود نہ ہو۔ تو ممکن ہے کہ محض دُور کے ورثا کو نقصان پہنچانے کے لیے کسی قرضہ کا اقرار کر لیا جائے یا بلا ضرورت کوئی قرضہ لے لیا جائے اور اسی طرح محض نقصان پہنچانے کو کوئی وصیّت کر دی جائے۔ اس لیے اس قید کی ضرورت یہاں پیش آئی ہے اور غیر مُضارّ کا لفظ وصیت اور دین دونوں پر حاوی ہے۔

۶۲۳ رواج اور قرآن: ان دونوں آیات میں بتایا ہے کہ یہ احکام گو دنیوی امور کے متعلق ہیں مگر ان کو استخفاف کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیئے کیونکہ اسلام کے احکام دینی اور دنیوی بہبودی سے یکساں تعلّق رکھتے ہیں اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان احکام کی مخالفت کرنے والے جہنم میں جائیں گے اور ساتھ خالدا فیہا کے الفاظ بھی بڑھا دیئے ہیں۔ باوجود اس تاکید شدید کے مسلمانوں نے اس زمانہ میں بالخصوص پنجاب و ہندوستان کے دیہات میں صریحًا ان احکام کو پس پشت ڈالا ہے یہاں تک کہ واجب العرض میں صاف یہ لفظ لکھوا دیتے ہیں کہ ہم قرآن کی پیروی نہیں کریں گے رواج کی پیروی کریں گے۔ کیا اسی مخالفت کا نتیجہ ہی وہ نہیں جو خود قرآن کریم نے بیان فرما دیا ہے ولہ عذاب مھین یعنی ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے؟ واقعی مسلمان احکام قرآنی کی خلاف ورزی کی وجہ سے ہی ذلیل ہو رہے ہیں۔

۶۲۴ یاتین۔ اتیان (اتیٰ) کے اصل معنی آنا ہیں۔ مگر خود کسی انسان کے آنے پر یا کسی امر کے کرنے پر یا کسی تدبیر کے کرنے پر بولا جاتا ہے کیونکہ آنا بالذات یا بالامر یا بالتدبیر ہو سکتا ہے (غ) پس یہاں مراد ارتکاب فاحشہ ہے۔

الفاحشۃ۔ ہر قول یا فعل جو بڑا قبیح ہو دیکھو ۲۰۶ع گو اس میں شک نہیں کہ فاحشۃ کا لفظ قرآن شریف اور زبان عربی میں زنا پر بھی بولا گیا ہے مگر اصل استعمال

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿١٦﴾

اور جو دو[۲] تم میں سے اس کا ارتکاب کریں تو ان کو سزا دو پھر اگر وہ توبہ کریں اور اصلاح کریں تو ان کو جانے دو اللہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۶۲۵

اس کا ہر قبیح کام پر ہے اور اسی معنی میں زیادہ تر قرآن شریف میں بھی آیا ہے۔ جیسے واذا فعلوا فاحشۃ (الاعراف ۷-۲۸) فانہ یامر بالفحشآء والمنکر (النور ۲۴-۲۱) اور ابن اثیر کہتے ہیں کہ حدیث میں فحش اور فاحشہ اور فواحش کا ذکر بار بار آیا ہے اور وہ ہر قسم کے ذنوب اور معاصی پر مشتمل ہے جن کی قباحت سخت ہو اور کثرت سے فاحشہ بمعنی زنا بھی آیا ہے اور اصل میں ہر ایک قبیح خصلت قول ہو یا فعل فاحشہ کہلاتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت عائشہؓ نے ان یہودیوں کو جنہوں نے آنحضرت صلعم سے گستاخی کی تھی کچھ سخت لفظ کہا تو آپ نے فرمایا البیامنت کہو لا ان اللہ لا یحب الفحش اللہ تعالیٰ فحش کو پسند نہیں کرتا۔ اور یہاں فحش سے مراد صرف سخت گوئی ہے۔

عورت کی عصمت کو محفوظ کرنے کے اسباب: پہلے دو رکوعوں میں عورتوں کے حقوق کو بیان کیا ہے اس رکوع میں کچھ ان کی ذمہ داری کا ذکر ہے جس طرح اسلام نے سارے مذاہب سے امتیاز کے طور پر عورتوں کو بہت سے حقوق دیئے ہیں اور ان کے ساتھ حسن معاشرت کو تعلیم الٰہی کا حصہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح ان کی کچھ ذمہ داریاں بھی رکھی ہیں۔ اور یہ چاہا ہے کہ جس طرح سے وہ حقوق کو حاصل کرنے میں تمام دنیا کی عورتوں پر فائق ہیں۔ اسی طرح اپنے چال چلن میں اعلیٰ درجہ کی پاکبازی اور راستبازی اختیار کرنے میں بھی فوقیت لے جائیں۔ چونکہ اسلام کا اصل منشا یہی تھا کہ عورت کی ذلت کے جس قدر اسباب ہیں ان سب کو دور کیا جائے اس لیے اگر ایک طرف اس کے حقوق کو محفوظ کیا ہے جس سے اس کی عزت اور مرتبہ بڑھتا ہے تو دوسری طرف اس کی عصمت کو محفوظ کرنے کے اسباب کا بھی ساتھ ہی ذکر کر دیا ہے تا عورت پر سے ہر قسم کی ذلت دور ہو۔ چنانچہ اس آیت کا مقصود بھی یہی ہے۔

مبادیٔ زنا کا علاج: اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں الفاحشۃ سے مراد زنا ہے اور یہاں زنا کی سزا بتائی ہے اور پھر اس کو سورۂ نور کی آیت جلد سے اور عملی حکم رجم سے منسوخ قرار دیا ہے بلکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ حدیث سے (یعنی مسلم کی حدیث جس میں ہے البکر بالبکر جلد مائۃ ونفی سنۃ والثیب بالثیب جلد مائۃ والرجم) اور حدیث منسوخ ہے آیت جلد سے اور آیت جلد منسوخ ہے دلائل رجم سے (رغق) لیکن جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے قرآن شریف میں کوئی حکم منسوخ نہیں نہ نبی کریم صلعم نے کسی حکم کو منسوخ قرار دیا۔ اور نہ کسی حدیث سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے یہاں الفاحشۃ کے معنی زنا بتائے ہیں۔ اس لیے ہم فاحشہ سے مراد یہاں عام معنی ہی لیں گے۔ کیونکہ الفاظ کے معانی میں ہمیں وہ راہ اختیار کرنی چاہیئے جس سے ایک آیت دوسری کے خلاف نہ ہو پس الفاحشۃ سے یہاں مراد بے حیائی کا ارتکاب ہے جسے مبادیٔ زنا کہنا چاہیئے اور یہاں قرآن کریم نے ایک راہ بتائی ہے کہ کس طرح عورتوں کو زنا سے بچانے کے لیے وقت پر اس کا انسداد کرنا چاہیئے اور وہ یہ علاج ہے کہ جب کسی عورت سے مبادیٔ زنا کا ارتکاب ثابت ہو تو اس کا فوری علاج یہ ہے کہ انہیں گھروں میں بند کر دیا جائے یعنی ان کی آزادی سلب کر دی جائے اور ان کو باہر نکلنے سے قطعاً محروم کر دیا جائے یہاں تک کہ اسی حالت میں ان پر موت آ جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکال دے اور وہ راہ توبہ ہے۔ یا اگر ایسی عورتیں ہیں جن کا ابھی نکاح نہیں ہوا تو نکاح سے ان کی حالت سدھر سکتی ہے (مفسرین نے بھی یجعل اللہ لھن سبیلاً میں نکاح مراد لیا ہے) اس طرح آزادی کے روک دینے سے دو غرضیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو خود بدی میں مبتلا ہونے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اور دوسرے یہ کہ وہ دوسروں کے لیے بدنمونہ نہیں بنتیں۔ ابومسلم نے یہاں الفاحشۃ سے مراد سحاقت کو لیا ہے یعنی عورت کا عورت سے ارتکاب فاحشہ۔

تعلیم اسلام میں زنا سے بچانے کے سامان: اگر غور کیا جائے تو اسلام کی تعلیم نہایت تدریجی اور خوبصورت ہے۔ زنا جیسی بلا سے بچانے کے لیے کس قدر رکاوٹیں تجویز کی ہیں اوّل تو مردوں اور عورتوں کے کھلے میل جول اور عورتوں کے غیر محرم مردوں سے خلوت اختیار کرنے کو روکا ہے۔ پھر عورتوں کو اس بات سے روکا ہے کہ وہ بن سنور کر اور سنگار کر کے باہر نکلیں۔ بلکہ حکم دیا ہے کہ جب باہر نکلیں تو ایک سادہ کپڑا اوپر اوڑھ لیں جس سے ان کے لباس وغیرہ کی زینت ڈھک جائے۔ پھر یہ حکم دیا ہے کہ باہر نکلیں تو مرد و عورت دونوں نگاہیں نیچی رکھیں۔ پھر فرمایا کہ اگر عورت سے مبادی زنا کا ارتکاب ہوتا دیکھو تو اس کے باہر نکلنے کو قطعاً روک دو یہاں تک کہ وہ توبہ کرے یا جائز طور پر نکاح ہو کر خیالات شہوانی ویسے رُک جائیں۔ اور سب سے آخر جب کسی طرح کوئی نہ رُکے تو پھر زنا کے لیے خطرناک سزا کوڑوں کی تجویز کی ہے۔ عصمت کو قائم کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر اصلاح کی صورت ناممکن ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو قرآن کریم کی تعلیم اخلاقی و روحانی کو کمال تک پہنچانے پر شاہد ہیں۔

۶۲۵ الّذٰن۔ گو اصل میں دو مردوں کے لیے ہے مگر بلحاظ تغلیب مذکر ایک مرد اور ایک عورت پر بھی بولا جا سکتا ہے

مبادیٔ زنا میں مرد کے لیے سزا: چونکہ پچھلی آیت میں عورتوں کی بیحیائی کے ارتکاب کا ذکر کیا تھا۔ تو یہ بتانے کے لیے کہ یہ امر صرف عورتوں میں ہی معیوب نہیں اور انہی کے لیے سزا نہیں بلکہ اگر مرد اور عورت دو کسی بیحیائی کا ارتکاب کریں اور دونوں سے مبادی زنا کا ظہور ہو تو دونوں کو سزا دی جائے۔ عورت کی سزا کا ذکر تو اوپر آ چکا کہ اس کو باہر نکلنے سے روک دیا جائے۔ مرد کی سزا کو خاص الفاظ میں بیان نہیں کیا اس لیے کہ عورت تو گھر کے اندر رہ کر گھر کے کاروبار میں مدد دے سکتی ہے

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١٧﴾

اللہ کے نزدیک توبہ صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو جہالت سے بدی کر بیٹھتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔پس انہی پر اللہ (رحمت سے) متوجہ ہوتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۶۲۶

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ

اور توبہ اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے جو بدیاں کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آ موجود ہوتی ہے کہتا ہے اب میں نے توبہ کی اور نہ ان لوگوں کے

کیونکہ اس کے کام کا دائرہ زیادہ تر گھر کے اندر محدود ہے لیکن مرد کو ایسی سزا دینا گویا اسے کاروبار سے روکنا تھا۔اس لیے عام الفاظ میں کہدیا کہ سزا تو دونوں کو دی جائے گی مگر اپنے اپنے حالات کے مطابق۔ الّذان سے مراد مفسرین نے بھی یہاں مرد و عورت ہی لیا ہے گو اٰذوھما کی سزا کو فہمائش یا تنبیہ و زجر یا ہلکی سزا تک محدود رکھا ہے۔ابومسلم نے الّذان سے مراد دونوں مرد لے کر یہاں لواطت کا ارتکاب مراد لیا ہے۔ جیسے پہلی آیت میں سحاقت۔اور یہی قول مجاہد کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ایسے لوگوں کے توبہ کرنے پر اُن سے اعراض کرنا صاف بتاتا ہے کہ یہاں کس قسم کے مبادی مراد ہیں۔اور یہاں توبہ کا لفظ پہلی آیت کے یجعل اللہ لھن سبیلا کی بھی تشریح کرتا ہے کہ وہاں بھی مراد اصل میں توبہ ہی ہے۔

ع۶۲۶ التوبۃ علی اللہ۔عام طور پر یہی معنی کیے گئے ہیں کہ توبہ کا قبول کرنا اللہ پر ایسے لوگوں کے حق میں ہے۔مگر چونکہ قبولیت توبہ کا ذکر صریح الفاظ میں آگے آتا ہے۔اس لیے یہاں علیٰ کو اگر بمعنی عند لیا جائے جیساکہ طبری نے لیا ہے (ر) تو وہ معنی ہونگے جو ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں کہ توبہ اللہ کے نزدیک صرف اُن لوگوں کی ہے جو ایسا کرتے ہیں اور یہ تو توبہ کرنے والوں کا ذکر ہوا، اس لیے آگے فرمایا کہ ایسوں کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے۔اور اگلی آیت کی ترکیب لیست التوبۃ کے ساتھ بھی یہی معنی موزوں ہیں۔یا توبۃ سے مراد توفیق توبہ بھی ہوسکتی ہے۔

جھالۃ۔جہل کے معنی کے لیے دیکھو ع۹۶ مجاہد کا قول ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے خطا سے ہو یا عمداً وہ جاہل ہے یہاں تک کہ گناہ سے باہر نکلے (ث) اور قتادہ سے روایت ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلعم سب کا اس پر اتفاق تھا کہ ہر ایک چیز جس کے ساتھ ایک شخص اللہ کی نافرمانی کرتا ہے وہ جہالت ہے خواہ عمداً ہو یا سہواً (ث) اور خود قرآن کریم میں بھی جھالۃ کا لفظ صرف معصیت کے لیے استعمال ہُوا ہے ھل علمتم ما فعلتم بیوسف واخیہ اذانتم جاھلون (یوسف ۱۲-۸۹) حالانکہ وہ جرم ان کا عمداً تھا۔

من قریب۔اس کے لفظی معنی تو جلدی کے ہی ہیں لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی موت سے پہلے کسی وقت بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا۔بشرطیکہ صدق دل سے ہو اور نہ کبھی کریگا۔اس لیے اس لفظ میں وسعت ہے چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ من قریب سے مراد ہے کہ اس وقت کے اندر جو اس کے اور اس کے ملک الموت کی طرف دیکھنے کے درمیان ہے۔گویا ملک الموت کے آنے یا حالتِ نزع سے پہلے پہلے کبھی ہو۔اور امام احمدؒ اور ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے ایک حدیث نبی کریم صلعم سے روایت کی ہے جس کے راوی حضرت ابن عمرؓ ہیں قال ان اللہ لیقبل توبۃ العبد مالم یغرغر یعنی آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ کو قبول کرتا ہے جب تک کہ اس پر موت کا غرغرہ نہیں آتا۔

توبہ اور اس کی قبولیت: چونکہ پچھلی دونوں آیتوں کے مضمون کا تعلّق توبہ سے بھی تھا یعنی حکم تھا کہ جن لوگوں سے زنا کے مبادی کا اظہار ہوا اگر وہ توبہ کریں تو پھر ان کو کچھ مت کہو۔اس لیے اب دو آیات میں توبہ کے مضمون کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔توبہ کے اصل معنی جیساکہ دوسری جگہ بیان ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ہیں خواہ ایسا رجوع کسی بدی کے ارتکاب کے بعد ہو یا ایک غفلت کی حالت سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو یہاں جیساکہ سیاق چاہتا تھا اس توبہ کا ذکر ہے جو بدی کے ارتکاب کے بعد ہو۔سو اوّل تو یہاں یہ فرمایا کہ توبہ یا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جو جہالت سے بدی کرتے ہیں اور پھر فرمایا کہ قریب ہی توبہ یا رجوع بھی کر لیتے ہیں۔جہالت کا لفظ اس لیے اختیار فرمایا کہ انسان جو بدی کرتا ہے وہ جہالت سے کرتا ہے۔ اور توبہ کے یہ معنی ہیں کہ اس جہالت سے نکل جائے اور اس کو سمجھ آجائے کہ یہ اچھا کام نہ تھا جو اس نے کیا۔جب تک انسان کے قلب پر یہ کیفیت وارد نہ ہو کہ وہ بدی کو بدی سمجھے اور اس سے متنفر ہو۔اس وقت تک رجوع بھی نہیں ہوسکتا اور من قریب کا لفظ گو موت سے پہلے ہر وقت پر حاوی ہے۔مگر اس کو اختیار فرما کر یہ توجہ دلائی ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ اگر اس سے بدی ہو بھی جائے تو فوراً رجوع کرے۔کیونکہ ایسی حالت میں رجوع کرنا بہت آسان ہوتا ہے اور بدی کا بیج جو انسان کے دل میں بویا گیا ہے ابھی اس نے جڑ نہیں پکڑی ہوتی۔لیکن اگر جلدی رجوع نہ کرے اور بدی پر اصرار کرے یعنی بار بار اس کا ارتکاب کرے تو وہی بیج جڑ پکڑ کر مستحکم ہو جاتا ہے اور وہ بدی ایک بد عادت کے طور پر طبیعت میں ایسی جاگزین ہو جاتی ہے کہ پھر انسان کا اس سے رہائی پانا بہت ہی مشکل

وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ
عَذَابًا اَلِيْمًا ⑱
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ
تَرِثُوا النِّسَاۗءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ
لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ
يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ

(یعنی) جو کافر ہونے کی حالت میں ہی مرجاتے ہیں یہی ہیں
جن کے لیے ہم نے دردناک دُکھ تیار کر رکھا ہے ۶۲۷
اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمھارے لیے جائز نہیں کہ عورتوں
کو زبردستی ورثہ میں لو ۶۲۸ اور نہ ان کو روک رکھو
اس لیے کہ اس کا کچھ حصّہ لے لو جو تم نے انھیں دیا
ہے سوائے اس کے کہ وہ کھُلی بے حیائی کا ارتکاب کریں ۶۲۹

ہو جاتا ہے گویا جتنی جلدی توبہ کرنے میں کرے گا اتنی ہی جلد توبہ قبول ہو گی۔ اور جتنی دیر ایک بدی سے رجوع کرنے میں لگائے گا اسی قدر دیر توبہ کی قبولیت میں لگے گی۔

ع ۶۲۷ عدم قبولیت توبہ: جس طرح پہلی آیت میں توبہ کی سہل ترین حالت یعنی قبولیت سے قریب ترین حالت کا ذکر کیا ہے اس آیت میں توبہ کے نہ قبول ہونے کی حالت یعنی قبولیت سے بعید ترین حالت کا ذکر کیا ہے اور وہ حالت یہ ہے کہ انسان بدیاں کرتا جائے اور کبھی انجام کو نہ سوچے۔ پھر جب موت کا غرغرہ آلگے اور دیکھ لے کہ اب جواب دہی سامنے ہے تو پھر توبہ کرے ایسے شخصوں کو مطلقاً توبہ فائدہ نہیں دیتی اس سے بھی سخت تر حالت ان لوگوں کی ہے یموتون وھم کفار موت بھی ان پر کافر ہونے کی حالت میں آتی ہے یعنی وہ موت کے وقت بھی یا حالت نزع میں بھی نہیں سمجھتے کہ توبہ کرنی چاہیئے ان کا کفر سخت ترین ہے۔ حالتِ نزع کی توبہ کیوں قبول نہیں ہوتی اس لیے کہ نزع کے وقت بھی انسان ایک گو نہ دوسرے عالم میں داخل ہو چکا ہوتا ہے اور وہاں اللہ تعالیٰ نے اصلاح کے لیے اور سامان رکھے ہیں۔ توبہ یا رجوع کا موقعہ اس زندگی کے اندر اندر ہے۔ کیونکہ یہ زندگی ایک خاص رنگ میں اصلاح کے لیے دی گئی ہے اور ان دونوں انتہائی حالتوں کے درمیان یعنی ایک وہ حالت جس کا ذکر پہلی آیت میں ہوا کہ نادانی سے کوئی بدی کی پھر فوراً اس سے رجوع کیا اور ایک یہ حالت جس کا ذکر اس آیت میں ہے کہ نزع کے وقت یا موت کے بعد رجوع چاہیئے مختلف حالات کے انسان ہیں جن کی توبہ کی قبولیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ کس قدر جرأت ارتکاب معاصی پر کرتے ہیں اور کس قدر دیر رجوع میں لگاتے ہیں جتنی جرأت کم اور توبہ جلدی ہے اس کی قبولیّت آسان جتنی جرأت زیادہ اور توبہ دیر سے ہے اسی قدر اس کی قبولیت مشکل ہے۔

ع ۶۲۸ یہاں سے عورتوں کی ان تکالیف کا ذکر شروع ہوتا ہے جو اسلام سے پہلے ان کے لاحق حال تھیں اور سب سے پہلے اس بدرسم کا ذکر کیا ہے جس کی رُو سے عورتیں مال متروکہ کی طرح وراثت کا حصّہ قرار پاتی تھیں گویا اوپر جب اسلام میں عورتوں کے حقوق وراثت کا ذکر کیا اور انکو مال متروکہ کا حصّہ دلایا تو اب جاہلیت کی رسوم کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ عورتوں کا مال متروکہ سے ورثہ پانا تو ایک طرف رہا وہ خود مال متروکہ کا حصّہ قرار دی جا کر ورثہ میں لی جاتی تھیں۔ چنانچہ بخاری میں ابن عباسؓ سے مروی ہے قال کانوا اذامات الرجل کان اولیاءہ احق بامراتہ ان شاء بعضھم تزوجھا وان شاءوا لم یزوجھا فھم احق بھا من اھلھا فنزلت ھٰذہ الایۃ۔ یعنی اہل جاہلیت کا یہ دستور تھا کہ جب ایک شخص وفات پا جاتا تو اس کے وارث اس کی عورت کے بھی حقدار ہوتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی چاہتا تو اس سے نکاح کر لیتا۔ اور اگر وہ چاہتے تو اس کا نکاح کسی سے نہ کرتے۔ پس اس کے اہل کی نسبت وہ اس کے (مال کے) زیادہ حقدار ہوتے یعنی جب وہ مرتی تو اس کے وارث وہ خود ہوتے اور بعض روایتوں میں ہے کہ بجائے خود نکاح کرنے کے جس سے چاہتے اس کا نکاح کر دیتے اور مہر خود لے لیتے۔ اس مضمون کی بہت سی روایات ہیں کسی میں اہل یثرب کا یہ طریق بیان کیا گیا ہے۔ کسی سے پایا جاتا ہے کہ اہل تہامہ اپنی عورتوں سے بہت بدسلوکی کرتے تھے اور تمام روایات کا اس پر اتفاق ہے کہ میّت کے مال کے وارث اس کی بیوی کے بھی وارث ہوتے تھے۔ پس اس رسم بد کی یہاں اصلاح کی ہے۔ زہری سے مروی ہے کہ وہ لوگ عورت کو بلا ضرورت روک رکھتے تھے یعنی حالانکہ اس سے بی بی کا تعلق نہ ہوتا تھا مگر اس غرض سے اسے طلاق نہیں دیتے تھے کہ جب وہ مرے تو اس کے مال کے وارث ہوں۔

ع ۶۲۹ فاحشۃ مبینۃ۔ فاحشۃ کے معنی ۶۲۴ میں بیان ہو چکے ہیں۔ باوجود مبینۃ کا لفظ ساتھ ہونے کے قتادہ، ضحاک، ابن عباس وغیرہم سے یہاں معنی نشوز اور سوء الخلق مروی ہیں یعنی خاوند کی نافرمانی یا اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونا اور بدخلقی۔ اور بعض نے زنا بھی معنی کیئے ہیں مگر حق یہ ہے کہ لفظ عام ہے اس لیے معنی اس کے وسیع ہیں اور زنا بھی یہاں مفہوم میں شامل ہو سکتا ہے اس کے لیے کوئی مانع نہیں۔

طلاق کے وقت عورت سے مال لینا: یہ دوسری تکلیف ہے جو عورتوں کو پہنچائی جاتی تھی۔ یعنی جب ایک شخص ایک بی بی کو ناپسند کرتا تو بجائے اس کے کہ اسے طلاق دے اسے روک رکھتا اور اس کو تنگی اور تکلیف میں رکھتا یہاں تک کہ وہ تنگ ہو کر اس بات کو منظور کرتی کہ اپنے مال میں سے کچھ اسے دے یا جیسا کہ اہل تہامہ کے ذکر میں لکھا ہے طلاق دیتے وقت یہ شرط کر لیتا کہ وہ اسی پہلے خاوند کے منشاء کے خلاف شادی نہ کرے گی اور غرض اس کی یہ ہوتی کہ جو کچھ مال اس کے پاس

بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ
تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ⑲
وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ
زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا
تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا
وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ⑳

اور ان کے ساتھ پسندیدہ طور سے میل جول رکھو پھر اگر تم انھیں ناپسند کرتے ہو تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی رکھ دے [۶۳۰]
اور اگر تم ایک بی بی کی جگہ دوسری بی بی (سے نکاح) کرنا چاہو اور تم اُسے سونے کا ڈھیر دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو، کیا تم اُسے بہتان سے اور کھلے گناہ کے ساتھ لو گے؟ [۶۳۱]

خرچ کیا تھا اس کا کچھ حصّہ اسے دوسرے خاوند کے نکاح میں دیکر خود وصول کرے (ث) اسلام نے مہر لینے سے روکا ہے سوائے ایک صورت کے ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ۔ ان سے زنا یا مبادی زنا یا نشوز کا ارتکاب ہو تو ایسی صورت میں چونکہ خلع ہو گا اس لیے یہ اختیار ہو گا کہ کچھ حصّہ مہر کا جو دیا گیا تھا، واپس لیا جائے۔

ع۶۳۰ عاشِرُوا۔ اس کا مادہ عشر ہے جس کے معنی دس ہیں اور چونکہ دس کو عدد کامل سمجھا گیا ہے اس لیے عَشِیرۃ ایک شخص کے اہل کو کہتے ہیں جن سے وہ کثرت حاصل کرتا ہے۔ گویا وہ اس کے لیے عدد کامل کے طور پر ہوتے ہیں (غ) پھر ایک شخص کے سارے اقارب پر یہ لفظ بولا گیا ہے اور عَاشَرتُہٗ کے معنی ہیں مصاہرت ہیں یں اس کے لیے دس کی مانند ہو گیا (خ)، یا عشرۃ کے معنی چونکہ مخالطت ہیں یعنی میل جول رکھنا۔ اسی سے معاشرہ کے معنی بھی مخالطت ہیں اور عشیر کے معنی قریبی اور صدیق یعنی دوست ہیں۔ اور عورت کا عشیر اسکا خاوند ہے اس لیے کہ وہ مرد اس عورت سے اور عورت اس مرد سے دوست کی طرح میل جول رکھتے ہیں۔

عورتوں سے سلوک: یہ تیسرا امر ہے جس کی طرف اسلام نے توجہ دلائی ہے۔ پہلے دو احکام میں صرف ایک بدرسم کو دور کیا ہے۔ مگر یہاں اس بدرسم کو کہ عورت کے ساتھ عام طور پر خانہ داری کی زندگی میں انصاف کا برتاؤ نہ ہوتا تھا۔ اس کی کوئی خاص عزّت و منزلت نہ تھی بلکہ صرف خواہشات کو پورا کرنے کا اسے ذریعہ سمجھا گیا تھا دور کرنے کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ عورت و مرد کا کیا تعلق ہے۔ اور ایک ہی لفظ عاشروھن میں مرد و عورت کے سارے تعلقات کو روشن کر دیا ہے۔ میاں بی بی کا تعلق ایک دوسرے سے صدیق یا سچّے دوست کا تعلّق ہے جو ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ اور صرف لفظ معاشرت پر ہی انحصار نہیں رکھا جو بجائے خود صادقانہ تعلّقات کا مقتضی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ تاکید کے طور پر لفظ بالمعروف بھی بڑھا دیا ہے یعنی ایسی معاشرت جو پہچانی گئی یا پسند کی گئی ہے اور ساتھ یہ بھی بڑھا دیا ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ وہ تمہیں ناپسند ہوں مگر ناپسندیدگی کا یہ نتیجہ نہ ہونا چاہیئے کہ ان سے اچھا میل جول نہ رکھا جائے بلکہ ایسی صورت میں اپنی طبیعت پر جبر کر کے بھی ان سے حسن اخلاق سے پیش آنا چاہیئے۔ کیونکہ جس طرح انسان کا یہ دن رات کا تجربہ ہے کہ ایک چیز کو وہ پہلے پسند نہیں کرتا مگر آخر کار اس سے بہت سے فوائد حاصل کرتا ہے۔ ایسا ہی عورتوں کے معاملہ میں بھی سمجھایا ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ تم بی بی کو ناپسند کرو لیکن اگر طبیعت پر جبر کر کے اس سے حسن سلوک کرو گے تو اللہ تعالیٰ ناپسندیدگی کو بھی دور کر دے گا۔ اور اس تعلق کو بہت سی بھلائی کا موجب کر دے گا۔

عورتوں سے حسن معاشرت کا حکم اسلام کی خصوصیات میں سے ہے اور اس کی نہایت عمدہ تفسیر حدیث و تعامل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں ملتی ہے۔ آپ نے فرمایا خیرکم خیرکم لاھلہ۔ تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل سے سب سے اچھا سلوک کرتا ہے اور حجۃ الوداع میں آپ کی آخری نصیحت تھی واستوصوا بالنساء خیراً۔ عورتوں سے اچھا سلوک کرنا اور یہ بھی فرمایا کہ یہ نری میری تعلیم ہی نہیں بلکہ میرا عمل بھی ہے وانا خیرکم لاھلہ اور تاریخ شاہد ہے کہ آپ کے اخلاق اپنے اہل سے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے تھے۔ آپ ان سے ہنستے کھیلتے بھی تھے اور ہمیشہ کشادہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ ان کو ہنساتے بھی تھے ان کے کاموں میں ان کی مدد بھی کرتے تھے۔ بعض دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ کے ساتھ آپ دوڑے بھی ہیں۔

ع۶۳۱ طلاق کب دینی جائز ہے۔ پچھلی آیت کے آخر پر فرمایا تھا کہ بی بی سے اچھا میل جول رکھو یہاں تک کہ ناپسند بھی ہو تو طبیعت پر جبر کر کے اس سے حسن سلوک کرو۔ لیکن بعض وقت ناپسندیدگی ناقابل علاج ہوتی ہے اور طبائع میں قطعاً میل جول نہیں ہو سکتا تو ایسی صورت میں ایک کو دوسرے کے ساتھ بندھے رکھنا ان کے اخلاق کو بھی تباہ کرتا ہے اور ان کی اولاد کو بھی۔ اس لیے اس آیت میں اس صورت کا ذکر کیا ہے۔ جب ناپسندیدگی قابل علاج نہ ہو۔ یوں یہاں یہ بھی بتا دیا ہے کہ طلاق اسی صورت میں دینی جائز ہے جب ناپسندیدگی یا ناموافقت طبع اس حد کو پہنچ جائے۔ یہاں یہ کیوں نہ کہا کہ تم اسے طلاق دینا چاہو اور یہ کہا کہ اس کی بجائے دوسری بی بی کرنا چاہو؟ اس لیے کہ اسلام انسان کی معمولی حالت اسی کو قرار دیتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہو۔ پس جب ایک بی بی کو طلاق دے گا تو لازماً دوسری سے نکاح کرے گا۔ اس آیت سے جو ایک نہایت ضروری حکم پر مشتمل ہے یعنی جب مرد کو عورت ناپسند ہو اور وہ اس سے حسن معاشرت نہ رکھ سکتا ہو تو اس بی بی کو چھوڑ کر دوسری سے نکاح کرلے۔ عورتوں کے ادل بدل کرتے رہنے کا نتیجہ نکالنا بگڑے ہوئے دماغ کا کام ہو سکتا ہے۔ یہاں

وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

اور تم اُسے کس طرح لے سکتے ہو حالانکہ تم میں سے ایک دوسرے تک پہنچ چکا ہے اور وہ تم سے مضبوط عہد لے چکی ہیں۔ ۶۳۲

توصرف یہ حکم ہے کہ ایسی صورت میں بیشک ایک بی بی کو طلاق دینا جائز ہے اور اس طلاق شدہ کی جگہ دوسری بی بی سے نکاح کرنا بھی جائز ہے عیسائیت کے قانون کی طرح نہیں کہ اگر ایک سے اَن بن ہوئی یہاں تک کہ میاں بی بی قانوناً الگ الگ بھی کیے جائیں، کیونکہ اکٹھے وہ زندگی بسر نہیں کرسکتے۔ تو اب نہ بی بی کو اجازت ہے کہ دوسرا نکاح کرے نہ خاوند کو اختیار ہے کہ دوسری بی بی سے نکاح کرے۔ بلکہ اس لفظ استبدال میں عیسائیت کے اس بیہودہ قانون کی طرف ہی اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جب ایک نکاح ناکامیاب ثابت ہُوا ہے اور کسی طرح پر وہ مودت والفت پیدا نہیں ہوسکتی جو نکاح کا اصل منشاء ہے تو پھر ایسا تعلق قطع ہوکر دوسرا تعلق کیوں قائم نہ ہو طلاق دی ہوئی عورت کو بھی دوسرا خاوند کرنے کا اختیار ہے جیسا دوسری جگہ بالصراحت آچکا ہے اور طلاق دینے والے خاوند کو دوسری بی بی سے نکاح کرنے کا اختیار اس لفظ استبدال میں دیا ہے اور ایسی صورت میں جب نشوز یا فساد باہمی میں خاوند پر الزام ہو وہ عورت سے ایک حبّہ اس مال کا واپس نہیں لے سکتا جو بطور تحفہ یا مہر اسے دیا یا دینا کیا ہو۔ گو وہ مال ایک قنطار یعنی سونے کے ڈھیر کے برابر بھی ہو۔ آیت کے آخری الفاظ میں فرمایا کہ کیا تم مال لینے کی خاطر عورت پر کوئی بہتان لگاؤ گے یعنی فاحشہ مبینہ کا الزام۔ یا کسی گناہ کا ارتکاب کروگے یعنی جاہلیت کی طرح عورت کو دکھ دینا شروع کروگے تاکہ وہ مال کا کچھ حصّہ واپس کرکے خلع کرالے پس اسلام دیئے ہوئے مال کے (یا جو معاہدہ کے نیچے دینا ہو اس کے) واپس لینے کی اس صورت میں اجازت نہیں دیتا۔

مہر کی مقدار: یہ آیت اس پر بھی صریح دلیل ہے کہ عورتوں کے مہر پر کوئی حد بندی نہیں یعنی جتنا مہر کوئی شخص چاہے دے سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بڑے بڑے فرضی مہر باندھے جائیں۔ بلکہ مہر وہی ہے جو ادا کردیا جائے ایسے مہر باندھنا جو ایک انسان ادا ہی نہیں کرسکتا صریحًا خلاف قرآن کریم ہے۔ یہاں بیشک قنطار کا دینا بھی جائز رکھا ہے جو ایک غیر محدود مقدار ہے مگر اٰتیتم کا لفظ بڑھا کر اور دوسری جگہ اٰتوا النساء صدقاتھن نحلۃ کا حکم دیکر یہ صاف بتا دیا کہ مہر دینے کی چیز ہے ایسا مہر باندھنا جو دے نہیں سکتا۔ یا جو دینے کا ارادہ نہیں۔ خلاف قرآن شریف ہے اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا من خیرا لنساء ایسرھن صداقا۔ بہترین عورت وہ ہے جس کے مہر میں سہولت ہو اور ایک حدیث میں ہے اعظم النساء برکۃ ایسرھن صداقا۔ سب سے بڑھ کر برکت والی عورت وہ ہے جس کے مہر میں سہولت ہو۔ ہاں اگر ایک امیر آدمی اپنی عورت کا مہر لاکھوں روپے بھی باندھتا ہے تو اسے روکنا بھی درست نہیں۔

حضرت عمرؓ کا خطبہ تعیین مہر پر: روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے منبر پر چڑھے اور فرمایا اے لوگو! تم کتنا اپنی عورتوں کے مہر کو بڑھاتے ہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے درمیان مہر چار سو درم یا اس سے کم ہی ہوتے تھے اور اگر مہر میں زیادتی اللہ کے نزدیک تقویٰ اور عزت کا موجب ہوتی تو تم ان سے اس بارہ میں سبقت نہ لے جاتے۔ اس لیے میں چار سو درہم سے زیادہ مہر کو تسلیم نہیں کروں گا (اور ایک روایت میں ہے جس قدر چار سو درہم سے زیادہ ہوگا۔ اسے بیت المال میں داخل کردونگا) پھر آپ منبر سے اُترے تو ایک عورت قریش میں سے سامنے آئی اور کہا اے امیر المومنین آپ نے لوگوں کو چار سو درہم سے زیادہ مہر دینے سے روکا ہے۔ آپ نے کہا ہاں! اس نے کہا کیا آپ نے نہیں سُنا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے وان اٰتیتم احدٰھن قنطارا فلا تاخذوا منہ شیئا۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا اللّٰھم اغفر کل الناس افقہ من عمر۔ اے اللہ معاف فرمائیو سب لوگ عمر سے زیادہ سمجھدار ہیں (اور ایک روایت میں ہے کہ اس عورت نے کہا اے خطاب کے بیٹے تو ہم کو روکتا ہے اور اللہ ہم کو دیتا ہے اور یہ آیت پڑھی تو آپ نے فرمایا نساء المدینۃ افقہ من عمر مدینہ کی عورتیں عمر سے زیادہ سمجھدار ہیں) تب حضرت عمرؓ پھر منبر پر چڑھے اور فرمایا اے لوگو! میں تم کو اس بات سے روکتا تھا کہ چار سو درہم سے زیادہ مہر دو۔ لیکن جو کوئی تم میں سے اپنے مال سے جس قدر چاہے دے سکتا ہے (ف)

یہ روایت بتاتی ہے کہ صحابہؓ کس طرح قرآن کریم کے سامنے گردنیں جھکاتے تھے۔ الفاظ کی صراحت کے بالمقابل آپ نے تاویل سے کام نہیں لیا۔ یہ نہیں کہا کہ یہ بطور فرض ہے جس طرح بعض مفسرین نے یہ تاویل کرلی ہے۔ بلکہ بھرے مجمع میں اپنی بات سے رجوع کیا یہی سب سے بڑی ضرورت اسلام کو آج ہے کہ اس کے پیرو اور اس کے علماء اور اس کے مشائخ احکام قرآنی کے سامنے سرتسلیم خم کردیں۔ عام لوگوں کے اندر یہ جرأت پیدا ہو کہ وہ اپنے پیروں اور علماء کو جب وہ خلاف قرآن وحدیث کہیں روک سکیں۔ اور ان پیروں اور علماء میں یہ تقویٰ ہو کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم سن کر اپنی بات سے رجوع کریں۔

۶۳۲ افضٰی۔ فضا فراخ مکان کو کہتے ہیں۔ اور اسی سے اَفْضٰی فُلَانٌ اِلٰی فُلَانٍ کے معنی ہیں۔ اس کی طرف پہنچ گیا گویا اس دوسرے شخص کو فضاء یا مکان قرار دیا گیا اور مفردات میں ہے کہ عورت کی طرف افضاء کنایہ میں زیادہ بلیغ اور تصریح میں زیادہ قریب ہے خلا بہا سے یعنی اس سے خلوت کی۔ گویا مراد اس سے عورت سے خلوت کرنا ہے یہی معنی امام ابوحنیفہ رح نے لیے ہیں۔

میثاقا غلیظا۔ غِلْظَۃ۔ رِقَّۃ کی ضد ہے گویا غلیظ کے معنی موٹا ہیں۔ اور اس کا اصل استعمال اجسام میں ہے لیکن بطور استعارہ ..... معانی میں مثل کبیر اور کثیر کے استعمال ہوتا ہے اور میثاق کے ساتھ لانے سے اس کے معنی عہد موکد یا مضبوط عہد کے ہونگے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ میثاق غلیظ سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے بارہ میں مردوں سے لیا ہے۔ جیسے فامساک بمعروف اوتسریح باحسان ہے مگر صحیح مسلم میں نبی کریم صلعم کے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ الفاظ مروی ہیں واستوصوا بالنساء خیرا فانکم اخذتموھن باما نۃ اللہ یعنی عورتوں کے ساتھ نیک معاملہ کرو۔ کیونکہ تم نے ان

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا
مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً
ع وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾
حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ
وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ
الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ
مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ
الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ
دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ
بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۫ وَحَلَآئِلُ
اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ

اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں مگر جو گزر چکا، یہ بے حیائی اور سخت بیزاری کی بات ہے اور بُری راہ ہے ۶۳۳

تم پر (یہ عورتیں) حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھائی کی بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں۔ اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے اور تمہاری رضاعی بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری پالی ہوئی لڑکیاں جو تمہاری حفاظت میں ہوں ان عورتوں (کے بطن) سے جن پر تم داخل ہو چکے ہو اور اگر تم ان پر داخل نہ ہوئے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اور تمہارے اُن بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پیٹھوں سے ہوں ۶۳۴

کو اللہ کی امانت سے لیا ہے گویا نکاح کو ہی امانت یا عہد قرار دیا ہے پس میثاق غلیظ سے مراد نکاح ہی ہے۔
عورت سے مہر کس صورت میں لیا جا سکتا ہے۔ اس آیت میں وجہ دی ہے کہ کیوں عورتوں سے مہر کا واپس لینا درست نہیں۔ اس لیے کہ تم ان سے خلوت کر چکے ہو۔ اور معاہدہ کر چکے ہو۔ اب جب تک ان سے کوئی امر خلاف معاہدہ سرزد نہ ہو۔ ان کو کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ بعض لوگوں نے اس آیت کو سورۂ بقرہ کی اس آیت کا جس میں بروئے خلع عورت سے مہر کا کچھ حصّہ لے لینا جائز ہے ناسخ قرار دیا ہے اور بعض نے اس آیت سے اسے منسوخ قرار دیا ہے۔ حالانکہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ سورۂ بقرہ کی آیت خُلع کا تو یہ منشاء ہے کہ اگر عورت بوجہ ناموافقت طبیعت یا کسی اور وجہ سے طلاق حاصل کرنا چاہتی ہے اور خاوند کا کوئی قصور نہیں تو اس صورت میں مہر کا کچھ حصّہ لے لینا جائز ہے۔ اور یہاں یہ فرمایا کہ اس صورت میں کچھ لے لینا جائز ہے۔ جب مرد عورت کو بوجہ فاحشۃ مبینۃ طلاق دینا چاہے۔ لیکن اور کسی وجہ پر طلاق دینا چاہے تو مہر کا لینا جائز نہیں۔ اور ان دونوں باتوں میں کوئی تناقض نہیں۔ عورت طلاق لینا چاہتی ہے تو مہر کا حصّہ دے۔ مرد طلاق دینا چاہتا ہے تو کچھ مہر سے نہیں لے سکتا۔ سوائے ایک صورت کے کہ عورت سے فاحشۃ مبیّنۃ کا ارتکاب ہو۔ پہلی حالت کا بیان سورۂ بقرہ میں ہے۔ اس دوسری حالت کا یہاں ذکر کیا ہے۔ کس قدر تعجب ہے کہ غور و خوض سے کام نہ لینے سے جھٹ ایک آیت کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دیا جاتا ہے حالانکہ دونوں حکم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں بلکہ اس سے نظم قرآنی کا کمال معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح حصّے حصّے کر کے مضامین کو مکمّل کر دیا ہے۔

۶۳۳ مقتًا۔ مقت۔ سخت بغض ہے اس شخص کے لیے جس کو تم فعل قبیح کرتا دیکھو (غ)

یہ پانچویں اصلاح ہے جو مرد و عورت کے تعلقات میں اسلام نے کی۔ عرب میں یہ رواج تھا جیسا کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اپنے باپوں کی بیبیوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ گو معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم اچھی نہ سمجھی جاتی تھی اور اسی لیے وہ لوگ اسے نکاح مقت کہتے تھے تاہم اس رسم پر عمل ہوتا تھا۔ اسلام نے اس کو جڑ سے کاٹ دیا۔

الا ما قد سلف کے لفظی معنی تو صرف اسی قدر ہیں کہ جو پہلے گزر چکا۔ حرمت سود کے معاملہ میں بھی یہی لفظ آتے ہیں۔ فمن جاءہ موعظۃ من ربّہٖ فانتہٰی فلہ ما سلف (البقرۃ ۲-۲۷۵) جہاں فلہ ما سلف کے معنی بتائے گئے ہیں کہ جو گناہ اس سے ہو چکا اس سے درگزر کی جائے گی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جس نے سودی معاملہ کیا ہوا ہے وہ سود لیتا رہے۔ بلکہ صاف الفاظ میں وہاں یہ ہدایت موجود ہے وذروا ما بقی من الرّبٰوا (البقرۃ ۲-۲۷۸) جو سود اس وقت لینا باقی ہے وہ بھی ترک کرنا پڑے گا۔ اسی طرح یہاں بھی الّا ما قد سلف کے معنی ہیں جو تمہارا فعل ہو چکا اس کی وجہ سے تم پر کوئی گرفت نہیں (غ) یہ مطلب نہیں کہ جو نکاح پہلے ہو چکا وہ اب باقی رہ سکتا ہے۔ چونکہ اس آیت کے نزول کے بعد ایسا نکاح ناجائز ہو گیا اس لیے وہ تو فوراً منسوخ ہو جائے گا۔ البتہ اس کے کرنے والے پر کوئی گرفت نہیں پس الا ما قد سلف میں استثنا گناہ سے ہے جواز فعل سے نہیں۔

۶۳۴ اُمّہات۔ اُمّ کی جمع ہے اور اس میں قریب کی والدہ جس نے اسے جنا ہے اور بعید کی والدہ جس نے اس کے جننے والوں کو جنا ہے جیسے دادی، نانی شامل ہیں (غ)

تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٢٣﴾

اور یہ کہ تم دو بہنوں کو اکٹھا کرو مگر جو گزر چکا۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

الجزء ٥ وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ

اور تمام بیاہی ہوئی عورتیں سوائے ان کے جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہو چکے[٦٣٥]۔ یہ تم پر اللہ کا فرض کیا ہُوا ہے اور جو

بنات ۔ بِنت کی جمع ہے اور اس میں اولاد کی بیٹی یا اولاد کی اولاد کی بیٹی بھی شامل ہیں۔

اَخوات ۔ اُخت کی جمع ہے یعنی بہن ۔ خواہ حقیقی بہن ہو، یا صرف باپ کی طرف سے یا صرف ماں کی طرف سے۔

عمات ۔ عَمَّۃٌ کی جمع ہے اور عَمّ باپ کا بھائی ہے اور عَمَّۃ اصل میں باپ کی بہن یا پھوپھی ہے ۔ ایسا ہی دادا کی بہن اور ماں کے باپ کی یا نانا کی بہن بھی عَمَّۃ کہلائے گی ۔

خالات ۔ خَالَۃٌ کی جمع ہے اور وہ ماں کی بہن یا ماسی ہے ایسا ہی نانی کی بہن اور باپ کی طرف سے بھی خالہ ہو سکتی ہے ۔ یعنی باپ کی ماں یا دادی کی بہن ۔

ربائبکم ۔ ربائب ۔ رَبِیبۃ کی جمع ہے جو فعیل بمعنی مفعول ہے یعنی مَرْبُوبَۃ یا وہ لڑکی جس کو تم نے پالا ہے اور لفظ ربیب یا ربیبۃ اس اولاد سے مخصوص ہے جو پہلے خاوند سے ہو اور دوسرا خاوند اس کی پرورش کرنے والا ہو ۔ یا پہلی بیوی سے ہو اور دوسری بیوی اس کی پرورش کرنے والی ہو (غ)

حجور ۔ حِجْر کی جمع ہے اور مراد اس سے حفاظت میں آنا ہے کیونکہ حِجْر کے اصل معنی منع ہیں یعنی روکنا ۔ جو پتھر کی سختی سے لیے گئے ہیں اور حجر حفاظت یا تربیت کو اس لیے کہتے ہیں کہ جو شخص بچے کو اپنی حفاظت میں لیتا ہے وہ اس کے اموال اور دیگر حالات میں تصرف سے اوروں کو روکتا ہے۔

حلائل ۔ حَلِیلۃ کی جمع ہے (جو حَلّ سے ہے جس کے معنی کھولنا ہیں) اور حلیل خاوند کو اور حلیلۃ بی بی کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کے لیے حلال ہیں۔

چودہ وجوہ حرمت نکاح : اس آیت میں تیرہ قسم کی حرمت نکاح میں بیان کی ہے اور اس سے پہلی آیت کو ساتھ شامل کر کے کل چودہ وجہ سے حرمت ہے اور اس سے بعد کی آیت میں ایک عام حکم حرمت کا اور ہے ۔ مگر اصل وجوہ حرمت نکاح چودہ ہی ہیں ۔ ان میں سے سات بلحاظ نسب ہیں اور سات دیگر وجوہ سے ۔ جو سات وجوہ حرمت بلحاظ نسب ہیں وہ بھی دو قسم ہیں یعنی اول بلحاظ ولادت ہے اور اس میں دو ہی قسم آتی ہیں یعنی مائیں اور فرع یعنی بیٹیاں اور قسم دوم ۔ بلحاظ اخوت سے جو پانچ ہیں ۔ اپنی بہن، باپ کی بہن، ماں کی بہن، بھائی کی بیٹی ۔ بہن کی بیٹی اور دیگر وجوہ میں سات وجہ حرمت ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔ دودھ مائیں، دودھ بہنیں ۔ بیبیوں کی مائیں ۔ بیبیوں کی پہلی بیٹیاں بشرطیکہ ان بیبیوں سے خلوت صحیحہ ہو چکی ہو اور بشرطیکہ وہ بیٹیاں بطور ربیبہ ہوں (بعض کے نزدیک یہ دوسری شرط نہیں بلکہ محض عام صورت حال کا بیان ہے) بیٹوں کی بیبیاں، باپوں کی بیبیاں (جس کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے) اور دو بہنوں کا ایک وقت نکاح میں رکھنا ۔ قرآن کا دعویٰ کامل شریعت ہونے کا کیسا صحیح ہے کہ ہر مسئلہ میں اصول خود قائم کر دیئے ہیں ۔ دوسری قومیں بھی کچھ نہ کچھ محرمات ضروری قرار دیتی ہیں ۔ مثلاً ماں یا بیٹی سے یا بہن سے نکاح کرنے کا رواج کسی قوم میں نہیں ۔ مگر ان کی کتب مقدسہ اس بارہ میں خاموش ہیں ۔ صرف توریت میں کچھ ذکر ہے۔ جس کے لیے دیکھو احبار باب ۱۸ : ۶-۱۸ ؛

رضاعت کے رشتے : جو وجوہات حرمت اوپر بیان ہوئی ہیں ان میں صرف دودھ ماؤں اور دودھ بہنوں کا ذکر بالتصریح آیا ہے ۔ اور رضاعت کے باقی رشتوں کا کوئی ذکر نہیں ۔ لیکن متفق علیہ حدیث میں ہے یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب یعنی جن جن رشتوں کی بوجہ نسب ممانعت ہے انہی رشتوں کی بوجہ دودھ پلانے کے حرمت ہے ۔ قرآن کریم ایک جامع کلام ہے ۔ اس لیے حرمت بوجہ نسب کو دو اقسام پر تقسیم کر دیا ہے ایک حرمت بوجہ ولادت اور ایک حرمت بوجہ اخوت ، اس لیے جب دودھ کے رشتوں کی حرمت کا ذکر آیا تو کمال بلاغت سے حرمت بوجہ ولادت کا اصل موجب یعنی ماں ہونا (جس میں بیٹی ہونا بھی شامل ہے) بیان کر دیا ہے اور حرمت بوجہ اخوت کا اصل موجب یعنی بہن ہونا (جس میں باپ کی بہن، ماں کی بہن ۔ بھائی کی بیٹی بہن کی بیٹی شامل ہیں) ذکر کر دیا ۔ اور تفصیل کو چھوڑ دیا ۔ کیسا پر حکمت کلام ہے کہ ضرورت سے زائد ایک لفظ بیان نہیں کیا ۔ ہاں اسی سے یہ بھی سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم صلعم کا فہم بھی کیسا الٰہی روشنی سے منور ہے کہ اصل حقیقت تک فوراً پہنچ کر یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب کا حکم دیدیا اسی طرح دو بہنوں کو ایک وقت میں نکاح میں رکھنے کی جو حرمت ہے ۔ حدیث نے اسی حکم میں پھوپھی اور بھتیجی کے جمع کرنے کو اور خالہ اور بھانجی کے جمع کرنے کو بھی شامل کیا ہے اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے ۔ کیونکہ اصل تعلق وہاں بھی اخوت کا ہے ۔ گویا ایک عورت کے ساتھ اس کی بہن اس کے باپ کی بہن ، اس کی ماں کی بہن کو جمع کرنے کا حکم یکساں ہے ۔ رضاعت کے متعلق یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس میں دو سال کی عمر کے اندر اندر کے بچہ کو دودھ پلانا شرط ہے جیسا کہ یرضعن اولادھنّ حولین کاملین (البقرۃ ۲ ۔ ۲۳۳) سے ظاہر ہے اور دوسری حدیث میں ہے الرضاعۃ من المجاعۃ یعنی وہ دودھ پلانا حرمت کے حکم میں لاتا ہے جو بھوک کے وقت بچہ کو دودھ پلایا ہو یوں ہی بچہ کا ایک دو دفعہ مُنہ مار لینا کافی نہیں ؛

٦٣٥ المحصنٰت ۔ مُحْصَنَۃ کی جمع ہے ۔ جو حِصْن سے ہے اور اس کے اصل معنی قلعہ ہیں اور جمع حُصُون آتی ہے ما نعتھم حصونھم من اللہ (الحشر ۵۹ ۔ ۲)

مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا

اس کے سوا ہیں وہ تمھارے لیے حلال ہیں (اس طرح) کہ تم اپنے مالوں کے ساتھ (ان کو) چاہو نکاح میں لا کر نہ شہوت رانی کرتے ہوئے۶۳۶ سو تم نے ان میں سے جس کے ساتھ نفع اٹھایا ہے انھیں ان کے مقرر شدہ مہر دے دو۔۶۳۷ اور تم

اور اسی سے تَحَصَّنَ ہے جس کے معنی ہیں قلعہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اور اس سے تجاوز کر کے ہر قسم کے تحرُّز پر یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے دِرْعٌ حَصِيْنَةٌ زرہ جو بدن کی حفاظت کرتی ہے۔ فَرَسٌ حِصَانٌ وہ گھوڑا جو اپنے سوار کو بچاتا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ (یوسف ۱۲: ۴۸) یعنی محفوظ مکان میں محفوظ کرو۔ اور امرأۃ حَصَانٌ کے معنی ہیں عفیفہ اور ذو حُرمۃ یعنی پاکدامن اور عزت والی عورت۔ اور اِحصان کے معنی نکاح کرنا ہیں فَاِذَآ اُحْصِنَّ (۲۵) اور مُحْصَنَۃٌ حَصان کو کہتے ہیں خواہ وہ بوجہ عِفّت کے محفوظ ہو یا بوجہ نکاح کے یا بوجہ اپنی بلند مرتبگی کے اور حریت کے (غ) اور عورت مُحْصَنَۃٌ ہوتی ہے بوجہ اسلام اور پاکدامنی اور آزادی اور نکاح کے (ل) اور ان چاروں معنوں میں اس لفظ کا استعمال قرآن کریم میں ہوا ہے۔ پس محصنات سے مراد مسلمان عورتیں یا پاکدامن عورتیں یا آزاد عورتیں یا منکوحہ عورتیں ہو سکتی ہیں۔

ملک یمین کا حکم: اس آیت کی تفسیر مفسرین نے چار طرح پر کی ہے۔ اوّل محصنات سے مراد خاوند والی عورتیں لی جائیں تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ما ملکت ایمانکم سے مراد وہ عورتیں لی جائیں جو جنگ میں قید ہو کر ملک یمین ہو جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ملک یمین سے ملک نکاح مراد لیا جائے تو پہلی صورت میں معنی یہ ہوئے کہ خاوند والی عورتوں سے نکاح کرنا منع ہے۔ سوائے ان خاوند والی عورتوں کے جو ملک یمین میں آ جائیں۔ اور دوسری صورت میں یہ معنی ہوئے کہ خاوند والی عورتیں تم پر حرام ہیں سوائے اس صورت کے کہ وہ تمہاری ملک نکاح میں آ جائیں بعد اس کے کہ ان کے پہلے خاوندوں سے جدائی واقع ہو جائے۔ کیونکہ جب تک پہلے خاوند سے جدائی نہ ہو، ملک نکاح میں ایسی عورت نہیں آ سکتی۔ دوم محصنٰت سے مراد آزاد عورتیں لی جائیں تو اس صورت میں بھی دو طرح پر معنی کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ما ملکت ایمانکم سے مراد وہ عدد لیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے حد مقرر کر دی ہے یعنی چار اور دوسرے یہ کہ ما ملکت ایمانکم سے مراد یہ لی جائے کہ وہ عورتیں جو تمہارے قبضہ میں جائز طور پر آ چکی ہیں یعنی ولی کی رضامندی سے اور گواہوں کی موجودگی و دیگر شرائط کے ساتھ۔ تو گویا ان دو صورتوں میں معنی یہ ہوئے کہ آزاد عورتیں چار کی تعداد سے زائد تمہارے لیے حرام ہیں یا یہ کہ آزاد عورتیں تمہارے لیے حرام ہیں سوائے اس کے کہ جائز طور پر وہ تمہارے نکاح میں آئیں۔ ان معانی میں سے مؤخر الذکر تین معنی پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا اور پہلے معنی بھی تھوڑے تدبر سے صاف ہو جاتے ہیں اس معنی کے لحاظ سے تمام منکوحہ عورتوں سے خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتی ہوں نکاح حرام ٹھہرایا گیا ہے اور یوں دوسرے مذاہب کی عورتوں کے نکاح کو بھی صحیح تسلیم کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ کسی مذہب یا قوم کی عورت سے جو نکاح شدہ ہو مسلمان کا نکاح کرنا ناجائز ہے سوائے ایک صورت کے کہ کوئی ایسی منکوحہ عورت ملک یمین ہو جائے تو اس صورت میں اس سے نکاح کر لینا جائز ہے۔ یہاں نکاح کے بغیر کسی قسم کا تعلق مرد و عورت کا ہونا ہرگز تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ صرف لونڈی سے نکاح کی اجازت ہے اور وہ نکاح دوسری شرائط کے ماتحت ہے جن میں سے بعض خاص شرائط کا ذکر آگے آیت ۲۵ میں آتا ہے اور عام شرائط دوسری جگہ قرآن کریم میں موجود ہیں مثلاً یہ کہ مشرک عورت سے نکاح جائز نہیں وغیرہ۔

ان الفاظ کے ایک اور معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ تمام بیاہی ہوئی عورتیں تمہارے اوپر حرام ہیں سوائے ان بیاہی ہوئی عورتوں کے جن کے تمہارے اپنے داہنے ہاتھ مالک ہوں یعنی جو تمہارے اپنے نکاح میں ہوں۔ اس صورت میں اِلّا گویا استثنائے منقطع کا کام دے گا۔ اور ترکیب اس طرح پر ہوگی کہ تمام بیاہی ہوئی عورتوں سے نکاح کرنا تمہارے لیے حرام ہے مگر جو عورتیں تم نے خود بیاہی ہیں وہ تم پر حرام نہیں ملک یمین سے مراد ملک نکاح نہ صرف مفسرین نے لیا ہے بلکہ لغت بھی اس پر شاہد ہے کیونکہ یمین کے معنی معاہدہ بھی ہیں اور نکاح ایک معاہدہ ہی ہے۔

۶۳۶ع كتب الله عليكم كتٰب یہاں مصدر مؤکد ہے اور اس سے مراد ہے واجب یا فرض کیا گیا۔

ما وراء ذٰلکم اس کے سوا باقی عورتوں سے نکاح کرنا حلال ہے۔ لیکن بعض حالات میں اور وجوہات سے نکاح جائز نہیں ہوتا۔ وہ دوسری آیات کے ماتحت آتی ہیں۔ مثلاً تین بار کی مطلقہ لا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره یا مشرکہ عورت ولا تنكحوا المشركات یا چار کے بعد پانچویں عورت۔ یا جس سے لعان ہو چکا ہے جس کے متعلق نبی کریم صلعم نے فرمایا لا يجتمعان ابدا۔

مُسافحین۔ سفح خون یا پانی کے بہانے کو کہتے ہیں اور سِفاح یا مُسافحۃ کے معنی ہیں عورت کا مرد کے ساتھ بدکاری کی حالت میں رہنا اور صحیح طور پر ان کا عقد نہ ہونا کیونکہ اس سے مقصود پانی کا بہانا یا شہوت رانی ہے اور فریقین کے کوئی حقوق اور ذمہ داریاں پیدا نہیں ہوتیں۔

یہاں پچھلی آیت کے مضمون کو صاف کر دیا۔ جو عورتیں حرام ہیں ان کو گن کر بتایا کہ جو عورتیں حلال ہیں ان کے ساتھ تعلق اس صورت میں ہو کہ مہر دے کر انہیں قید نکاح میں لایا جائے اور بغیر نکاح کے ان کے ساتھ فجور کی حالت میں نہ رہیں۔ قید نکاح میں لانے کی شرط کافی تھی مگر غیر مسافحین ان خیالات کی تردید ہے جو جدید تہذیب کیساتھ پھیل رہے ہیں کہ قید نکاح میں خواہ مخواہ کی پابندی ہے۔ قدرتی حالت میں مرد و عورت کا رہنا کافی ہے یعنی جس طرح حیوانات میں ایک جوڑا بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایک مرد اور ایک عورت بلا قید نکاح کے مل کر رہ لیا کریں۔

۶۳۷ استمتعتم۔ اصل اس کا متع ہے اور مَتاع کے معنی ہیں ایسا نفع اٹھانا جو لمبے وقت کے لیے ہو (غ) ومتعناهم الى حين (یونس ۱۰: ۹۸) نمتعهم قليلا

جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا تَرٰضَيۡتُمۡ بِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِ پر اس کے متعلق کوئی گناہ نہیں تم مقرر کرنے کے بعد آپس میں رضامند

(لقمان ۳۱-۲۴) سنمتعهم ثم نمسهم مناعذاب الیم (ھود ۱۱-۴۸) اور استمتاع کے معنی ہیں طلب تمتع یعنی انتفاع ممتد الوقت کا طلب کرنا۔ ربنا استمتع بعضنا ببعض (الانعام ۶-۱۲۸) فاستمتعوا بخلاقهم فاستمتعتم بخلاقكم كما استمتع الذين من قبلكم بخلاقهم (التوبة ۹-۶۹) اور عام محاورہ میں کہتے ہیں استمتع الرجل بولده یعنی آدمی نے اپنے بیٹے سے فائدہ اٹھایا پس استمتاع کے معنی محض نفع اٹھانے کے ہیں نہ تعلقات زناشوئی اور مُتعة کے معنی یوں کیے گئے ہیں۔ التمتع بالمرأة لا تريد ادامتها لنفسك (ل) یعنی عورت سے فائدہ اٹھانا جس کو تم اپنے لیے ہمیشہ رکھنا نہیں چاہتے ہو۔ یا جیسا کہ امام راغبؒ نے لکھا ہے۔ ان الرجل كان يشارط المرأة بمالٍ معلوم يعطيها الى اجلٍ معلوم فاذا انقضى الاجل فارقها من غير طلاقٍ یعنی ایک مرد ایک عورت سے شرط کر لیتا تھا کہ ایک معین مقدار مال کی اسے دیگا۔ اور ایک وقت مقرر تک اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ اور جب وہ مدت گزر جاتی تو بغیر طلاق کے اس سے الگ ہو جاتا۔

اجور۔ اَجر کی جمع ہے۔ جو اصل میں تو وہ چیز ہے جو ثواب عمل سے انسان کی طرف لوٹ کر آتی ہے۔ مگر عورت کے مہر پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

استمتاع اور متعہ میں فرق: ان الفاظ کی تاویل میں اہل تشیع کو یہ سخت غلطی لگی ہے کہ یہاں لفظ استمتعتم سے انہوں نے متعہ یا عارضی نکاح کا جواز نکالا ہے، حالانکہ استمتاع عام ہے اور مُتعة خاص معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ اوپر لغت کے حوالہ سے دکھایا گیا ہے۔ بڑے اور چھوٹے انسانوں کا ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانا اور باپ کا بیٹے سے فائدہ اٹھانا استمتاع ہے اور اس کے معنی عارضی نکاح لینا صریح غلطی ہے۔ زجاج کا قول لسان العرب میں منقول ہے کہ اس آیت کے معنی میں ایک قوم نے بوجہ لغت سے جہالت کے بڑی سخت غلطی کھائی ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ گو متعہ کا ذکر یہاں مقصود نہ ہو۔ مگر کیا ان الفاظ کے اندر فما استمتعتم به منهن متعہ کا مفہوم شامل نہیں ہو سکتا؟ کیونکہ استمتاع کے معنی طلب منفعت ہیں اور متعہ میں بھی طلب منفعت ہے۔ الفاظ قرآنی پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ قرآن شریف نے قید لگا دی ہے کہ تم اپنے مال عورتوں پر اس رنگ میں خرچ کرو کہ ان کو قید نکاح میں لاؤ اور قید نکاح جب ایک دفعہ عاید ہو جائے گی تو اس سے زوجین کی زندگی میں نکلنے کی صورت سوائے طلاق کے اور کوئی قرآن شریف میں مذکور نہیں پس فما استمتعتم به منهن جو بطور نتیجہ وارد ہوا ہے وہ بھی اسی حالت یعنی قید نکاح کے متعلق ہی ہو سکتا ہے۔

نکاح اور مسافحت: قرآن شریف نے احصان یعنی نکاح کے مقابلہ پر مسافحت یعنی شہوت رانی کو رکھا ہے محصنین غیر مسافحين گویا جو احصان نہیں وہ مسافحت ہے اس لیے متعہ کو ہمیں ان دونوں میں سے ایک میں شامل کرنا پڑے گا۔ احصان اور مسافحت میں امر مشترک اس قدر ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کا تعلق ہوتا ہے دونوں میں امتیاز یہ ہے کہ احصان میں مرد عورت کا تعلق ساری عمر کے لیے ہوتا ہے مسافحت میں نہیں احصان میں عورت کے مرد پر کچھ حقوق پیدا ہوتے ہیں مثلاً ایک دوسرے کی زوجیت میں مر جائے تو حق وراثت پیدا ہوتا ہے مسافحت میں پیدا نہیں ہوتا۔ احصان میں اولاد کی پرورش کا ذمہ دار باپ ہے مسافحت میں نہیں۔ پس احصان میں وہی امر داخل ہو سکتا ہے جو اس کے امتیازی پہلوؤں میں اس کا شریک ہو۔ اب متعہ میں ایک مرد و عورت کا تعلق ہے اس حد تک اس کا مسافحت کے ساتھ اشتراک ہے اور احصان کی کوئی امتیازی خصوصیت اس کے اندر نہیں پائی جاتی۔ متعہ میں نہ تو کوئی تعلق عمر بھر کے لیے ہوتا ہے اور نہ اگر مرد و عورت میں سے ایک دوسرے کی زوجیت میں فوت ہو جائے تو کوئی حقوقِ وراثت پیدا ہوتے ہیں نہ اولاد کی پرورش کا ذمہ دار باپ ہوتا ہے۔ اس لیے صریحاً متعہ مسافحت میں داخل ہے نہ احصان کے اندر اور اگر یہ کہا جائے کہ متعہ میں اعلان ہوتا ہے تو اعلان ایک گونہ مسافحت میں بھی ہوتا ہے مسافحت کے معنی ہی علی الاعلان مرد اور عورت کا اکٹھا رہنا ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مسافحت کے ساتھ ایک جگہ چھپی آشنائی کو الگ بیان کیا ہے۔ محصنين غير مسافحين ولا متخذى اخدان (المائدة ۵-۵) یہاں ان لوگوں کے لیے بھی جواب ہے جو نکاح کی غرض صرف شہوت رانی سمجھتے ہیں۔ اسلام نے نکاح کی غرض کو شہوت رانی سے اس قدر بلند قرار دیا ہے کہ شہوت رانی کو ناجائز قرار دیا ہے اور یوں بتایا ہے کہ نکاح صرف اس غرض کے لیے نہیں کہ مرد و عورت کے جذبات شہوانی پورے ہوں بلکہ اس کی غرض بعض حقوق و ذمہ داریوں کا پیدا کرنا ہے جن سے تمدن و معاشرت انسانی کی بنیاد پڑتی ہے نیز دیکھو ۶۳۹ میں اخدان کی تشریح۔

احادیث میں متعہ کی حرمت: ہاں یہ سچ ہے کہ متعہ عرب میں مروج تھا۔ اس لیے اگر نزول حکم قرآنی سے پہلے نبی کریم صلعم نے اس کی اجازت دی ہو تو وہ دوسری بات ہے۔ علاوہ ازیں اگر روایات میں اجازت پائی جاتی ہے تو ممانعت بھی پائی جاتی ہے۔ اجازت نزول حکم سے پہلے کی ہے اور جب قرآن شریف میں حکم نازل ہو گیا تو روایات میں بھی ممانعت آ گئی۔ اب اجازت کو پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسا کوئی شراب کے متعلق کسی روایت کو پیش کر دے کہ فلاں وقت فلاں صحابیؓ نے شراب پی تھی۔ چنانچہ اس کے مطابق صحیح مسلم میں سبرہ بن معبد کی روایت اپنے باپ سے ہے انه غزا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم فتح مكة فقال يا ايها الناس انى كنت اذنت لكم فى الاستمتاع من النساء وان الله قد حرم ذلك الى يوم القيامة فمن كان عنده منهن شئ فليخل سبيله یعنی اس نے فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جنگ کی تو آپ نے فرمایا کہ اے لوگو میں نے تم کو عورتوں سے متعہ کی اجازت دی تھی اور اللہ نے اس کو قیامت کے دن تک حرام کر دیا ہے پس جس شخص کے پاس ایسی کوئی عورت ہے اس کا راستہ آزاد کر دے اور دوسری روایت صحیحین کی حضرت علیؓ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن عورتوں کے متعہ سے روک دیا اور گھریلو گدھوں کے گوشت کے کھانے سے اور تیسرا واقعہ حضرت عمرؓ کے عہد کا نہایت صاف ہے جس کے متعلق ابن ماجہ میں اسناد صحیح سے روایت ہے کہ آپ نے خطبہ پڑھا فقال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذن لنا فى المتعة

الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿٢٤﴾
وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ
الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ
مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ
بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِهِنَّ
وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ
غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ
فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ
نِصْفُ مَا عَلَي الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۭ ذٰلِكَ
لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ وَاَنْ تَصْبِرُوْا

ہو جاؤ۔ اللہ جاننے والا حکمت والا ہے[٦٣٨]
اور جو شخص تم میں سے یہ مقدور نہیں رکھتا کہ آزاد مومن عورتوں
سے نکاح کرے تو تمہاری ان مومن لونڈیوں سے نکاح کرلے
جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے اور اللہ تمہارے ایمان کو خوب
جانتا ہے تم آپس میں ایک ہی ہو سو انہیں ان کے مالکوں کی اجازت سے
نکاح میں لاؤ اور ان کو دستور کے موافق ان کے مہر دیدو پاکدامن ہوں
نہ کھلی بدکاری کرنے والی اور نہ در پردہ آشنا رکھنے والی۔ پھر جب
وہ نکاح میں لائی جائیں تو اگر بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان کے لیے
آزاد عورتوں کی سزا سے آدھی ہے یہ تم میں سے اس کے لیے
ہے جسے ہلاکت میں پڑنے کا خوف ہو اور اگر تم صبر کرو تو تمہارے

ثلاثا ثم حرمها واللہ لا اعلم احدا تمتع وھو محصن الا رجمتہ۔ یعنی فرمایا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو تین مرتبہ متعہ کی اجازت دی پھر اس کو حرام کر دیا اور مجھے جس شخص کے متعلق علم ہوگا کہ اس نے باوجود نکاح شدہ ہونے کے متعہ کیا ہے میں اسے سنگسار کروں گا۔ اگر یہ بات غلط ہوتی تو صحابہؓ اس کی مخالفت کرتے۔ مگر کوئی شخص اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ کا خود اس پر اتفاق تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متعہ کو حرام کر چکے ہیں اور یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نبی کریم صلعم نے عام طور پر متعہ کی اجازت کبھی نہیں دی بلکہ صرف دو دفعہ جنگ کے موقعہ پر دی تھی اور وہ قریباً حالت اضطراری ہوتی ہے مگر بعد میں اسے بھی روک دیا۔ پس روایات متعہ کو مان کر بھی اس کا عام جواز جیسا اہل تشیع میں مروج ہے ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

متعہ کب حرام ہُوا: البتہ سوال تاریخ کے متعلق پیدا ہوتا ہے کہ کب متعہ حرام ہُوا۔ حضرت علیؓ کی روایت مندرجہ بالا میں یہ ذکر ہے کہ متعہ خیبر کے دن حرام ہُوا اور سبرہ کی روایت میں ہے کہ فتح مکّہ میں حرام ہوا۔ ہم کو اس بارہ میں کسی فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ آیت خیبر کے دن نازل ہوئی تو اس وقت حرام ہوا ہوگا اور اگر فتح مکہ کے دن تو اس وقت۔ البتہ اگر حرمت خیبر کے دن تسلیم کی جائے تو اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ غزوہ اوطاس میں جو اس کی اجازت پائی جاتی ہے جس کا وقوع فتح کے سال ہوا وہ بے معنی ٹھہرتی ہے۔ ممکن ہے اس روایت میں کسی راوی کو غلطی لگی ہو اور ممکن ہے جیسا کہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کی صحیحین والی روایت میں غلطی ہوگئی ہے۔ اور لفظ یوم خیبر بجائے اکل لحوم حمر کے متعۃ النساء کے ساتھ لگ گئے ہیں۔ اور اس کی تائید بلاشبہ کئی واقعات سے ہوتی ہے جیسا کہ امام ابن قیم نے لکھا ہے۔ اول امام احمد کی اس روایت سے جو سفیان بن عیینہ نے کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم حرم لحوم الحمر یوم خیبر وحرم متعۃ النساء یعنی رسول اللہ صلعم نے خیبر کے دن گدھے کے گوشت کو حرام فرمایا اور عورتوں کے متعہ کو حرام کیا۔ تو گویا یوں خیبر کا لفظ گدھوں کی حرمت کے متعلق تھا۔ کسی راوی نے اس کو متعہ النساء کے متعلق کر دیا۔ اور اس کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ خیبر کے دن کوئی متعہ کا سوال پیش نہیں ہُوا۔ اور حضرت علیؓ نے جو ان دو باتوں کو اکٹھا کیا تو اس لیے نہیں کہ ان کی حرمت ایک دن ہوئی۔ بلکہ اس لیے کہ ابن عباسؓ ان دونوں مسائل میں دوسرا پہلو اختیار کرتے تھے۔ اس لیے حضرت علیؓ نے ان دونوں کا اکٹھا ذکر کیا۔ گو وہ الگ الگ وقت کے واقعات تھے۔

متعہ کے بارہ میں ابن عباس کا مذہب: باقی رہا سوال حضرت ابن عباسؓ کے متعہ کو حلال کہنے کا، سو اس کی تشریح انہوں نے خود ان الفاظ میں کر دی "قلت انما تحل للمضطر کما تحل المیتۃ والدم ولحم الخنزیر لہ۔ میں نے کہا تھا کہ وہ مضطر کے لیے حلال ہے جس طرح اس کے لیے مردار اور خون اور سؤر کا گوشت حلال ہے۔ پس اضطرار کی حالت میں حلال قرار دینا یہ حلت کا فتویٰ نہیں۔ بلکہ حرمت کا فتویٰ ہے اور لعد میں حضرت ابن عباسؓ نے اس سے بکلی رجوع کر لیا۔

٦٣٨ یہاں جس رضامندی کا ذکر ہے وہ مہر کی کمی یا بیشی کے متعلق ہے۔ یعنی مہر مقرر ہو جانے کے بعد میاں بی بی کی رضامندی سے کم بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ بھی۔ اس آیت کا خاتمہ علیماً حکیماً پر کیا ہے۔ گویا بتایا ہے کہ قید نکاح کی پابندی بڑے علم و حکمت پر مبنی ہے اور یہ ان لوگوں کا جواب ہے جو مرد اور عورت کے آزادانہ تعلقات کے حامی ہیں اور نکاح کی قید کو بے ضرورت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرف اقوام یورپ کا میلان ہے جن میں ولد الزنا بچّوں کی نہ صرف کثرت ہوگئی ہے بلکہ [illegible] پر فخر کیا جاتا ہے۔

ع خَيْرٌ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٥﴾ لیے بہتر ہے اور اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۶۳۹

ع۶۳۹ طَول ۔ طُول لمبائی کو کہتے ہیں اعراض میں ہو، یا جواہر میں اور طَول ۔ فضل اور منّ سے یعنی بزرگی یا زیادتی مال اور احسان سے مخصوص ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی صفات میں بھی آتا ہے ذِی الطَّوْل (المؤمن ۴۰-۳) یعنی حقیقی فضل و منّ کا مالک وہی ہے اور اولوا الطّول (التوبۃ ۹-۸۶) سے مراد صاحب وسعت لوگ ہیں اور یہاں بھی معنی فراخی یا وسعت ہی ہیں ۔ اور مراد اس قدر مال ہے جس کو مہر اور نفقہ میں دے سکے (غ)

المحصنٰت سے مراد یہاں آزاد عورتیں ہیں کیونکہ ان کے مقابلہ میں لونڈیوں کا ذکر ہے ۔

فتیات ۔ فتاۃ کی جمع ہے جو فتٰی کی مونث ہے اور فتٰی اصل میں اس کو کہتے ہیں جو تازہ جوانی کو پہنچا ہو ۔ اور مراد اس سے غلام اور فتاۃ سے مراد لونڈی لی جاتی ہے ۔

باذن اھلھن ۔ اَھل کے معنی ع۱۳۷ الف میں بیان ہو چکے ہیں ۔ یہاں مراد اس سے مولیٰ یا مالک ہے ۔ مالک کی اجازت کی شرط اس لیے ہے کہ نکاح سے مالک کے بہت سے فوائد خدمت اور کام لینے کے کم ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ حدیث سے ثابت ہے کہ جس طرح لونڈیاں اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتیں اسی طرح غلام بھی اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتا ۔ ایما عبد تزوج بغیر اذن موالیہ فھو عاھر (ت)

اخدان ۔ خِدن کی جمع ہے جسکے معنی مصاحب یا صدیق ہیں اور اس کا اکثر استعمال ایسے شخص کے حق میں ہے جو شہوت کی وجہ سے مصاحب ہو (غ) مسافحت کے ساتھ اتخاذ اخدان کے ذکر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ میں چھپی ہوئی آشنائی کی طرف اشارہ ہے چنانچہ ابن عباسؓ نے مسافحات کے معنی الزوانی المعلنات کیے ہیں یعنی جو علی الاعلان زنا کرتی ہیں ۔ اور بیضاوی میں اخدان کے معنی کیے ہیں الاخلاء فی السراء ۔

لونڈیوں سے نکاح: اس آیت میں لونڈیوں کے ساتھ نکاح کے احکام اور شرائط بیان کیے گئے ہیں ۔ قرآن کریم میں دو جگہ آتا ہے لفروجھم حافظون الّا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم (المؤمنون ۲۳-۵و۶ ۔ المعارج ۷۰-۲۹و۳۰) پس جب ازواج یعنی بیبیوں کے متعلق احکام بیان کر دیئے تو ضروری تھا کہ ما ملکت ایمانھم کے متعلق بھی احکام کو بیان کر دیا جاتا جس طرح ایک آزاد عورت کو زوجیت میں لینے کی شرائط اللہ تعالیٰ نے بیان کر دی ہیں ۔ اسی طرح ما ملکت ایمانکم کے ساتھ تعلقات زناشوئی قائم کرنے کے احکام بھی اس جگہ بیان کر دیئے ہیں تا کہ نکاح کا مضمون مکمل ہو جائے اور لونڈیوں کا ذکر الگ کر کے ان کے ساتھ آزاد مردوں کے نکاح کو بعض سخت شرائط کے ساتھ مشروط کر کے یہ بتا دیا ہے کہ قرآن کریم ما ملکت ایمانکم کو ازواج سے الگ رکھتا ہے ۔ اور سوائے سخت مجبوری کے ان کے ساتھ نکاح سے روکتا بھی ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن شریف لونڈیوں کے متعلق یہی چاہتا ہے کہ وہ بلا نکاح یا حالت فجور میں رہیں ۔ بلکہ اس سے صاف منع کرتا ہے ولا تکرھوا فتیٰتکم علی البغآء (النور ۲۴-۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور مت کرو ۔ اور ان کو نکاح سے روکنا انہیں زنا پر مجبور کرنا ہے ۔ پھر صاف الفاظ میں حکم دیا ہے وانکحوا الایامٰی منکم والصّالحین من عبادکم وامآئکم (النّور ۲۴-۳۲) یہاں صاف صالح غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کر دینے کا حکم دیا ہے پس اصل منشاء قرآن کریم کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ لونڈیوں اور غلاموں کے آپس میں نکاح ہوں اور سوائے سخت ضرورت کے آزاد مرد یا عورت کی لونڈی یا غلام سے زوجیت نہ ہو ۔

بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف غلاموں اور لونڈیوں کو ایک ذلیل حالت میں رکھنا چاہتا ہے ۔ اس لیے باہمی تعلقات نکاح کو روکتا ہے اس کا جواب خود اسی آیت میں دیا ہے بعضکم من بعض تم سب ایک دوسرے سے ہو غلام اور لونڈیاں آزاد مرد اور آزاد عورتیں سب ایک ہی نسل انسانی کے افراد ہیں اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں ۔ اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل بتاتا ہے کہ غلاموں اور لونڈیوں سے کھانے پینے میں لباس میں کام کے لینے میں مساوات کا سلوک ہوتا تھا پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ نکاح کے تعلّقات پر ایسی سخت شرائط لگا دی ہیں یہاں تک کہ ان تصبروا خیر لکم میں فرما دیا ہے کہ ممکن ہو تو نہ ہی کرو ۔

پس جب مساوات کو بھی تسلیم کیا ہے ۔ بلکہ غلاموں لونڈیوں کے ساتھ مساوات کے سلوک کا حکم دیا ہے تو نکاح سے ممانعت اس بنا پر نہیں ہو سکتی کہ ان کو ہمیشہ کے لیے ذلیل اور کم حیثیت پر رکھنا چاہا ہے ۔ لیکن کوئی غرض ضرور ہے ۔ اس غرض کا پتہ ہم کو خود نبی کریم صلعم کی زندگی سے لگتا ہے اور بعض احادیث سے بھی اس مضمون پر روشنی پڑتی ہے ۔ نبی کریم صلعم نے کسی لونڈی سے اس کو لونڈی کی حیثیت میں رکھ کر نکاح نہیں کیا ۔ بلکہ آزاد کر کے اور اس کو زوجیت کے پورے حقوق دیکر نکاح کیا ہے ۔ چنانچہ اُم المؤمنین حضرت صفیہؓ ملک یمین میں داخل تھیں نبی کریم صلعم نے ان کو آزاد کیا اور ان کو قریشی بیبیوں کے برابر زوجہ ہونے کی حیثیت دی ۔ یہی حالت حضرت ماریہ قبطیہؓ کی معلوم ہوتی ہے جن کے بطن سے ابراہیم پیدا ہوئے شاہ مصر نے انہیں بطور ایک لونڈی کے آپؐ کی طرف بھیجا تھا مگر آپؐ نے اس کو بھی اتنا مرتبہ دیا کہ وہ حجاب میں رہتی تھیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زوجیت میں داخل تھیں اور یہی وجہ ہے کہ اس حکم کے ماتحت ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا (الاحزاب ۳۳-۵۳) یعنی تمہارے لیے جائز نہیں کہ آنحضرتؐ کی ازواجؓ سے آپ کے بعد کبھی نکاح کرو ۔ حضرت ماریہ قبطیہؓ کا نکاح آنحضرتؐ کے بعد نہیں ہوا ۔ اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ان کی وفات تک ان کو دیگر ازواجؓ کی طرح برابر نفقہ دیتے رہے ایسا ہی ریحانہؓ کا حال ہے جن کے متعلق ایک روایت میں صاف ذکر ہے کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کیا تھا اور جب آپ کی دوسروں کو یہ تعلیم تھی کہ لونڈیوں سے آزاد کر کے ان سے نکاح کرو تو خود ایسا کیوں نہ کرتے ۔ چنانچہ بخاری باب اجر من اسلم من اھل الکتابین میں ذیل کی روایت ہے: الرجل تکون لہ الامۃ فیعلّمھا

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾

اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرے اور تم کو اُن کی راہیں دکھا دے جو تم سے پہلے تھے اور تم پر توجہ فرمائے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ع۶۴۰

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ قف وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾

اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر توجہ فرمائے اور جو لوگ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں چاہتے ہیں کہ تم بہت زیادہ جھک جاؤ ع۶۴۱

فیحسن تعلیمها ویؤدّبها فیحسن ادبها ثم یعتقها فیتزوجها فله اجران۔ یعنی جس شخص کے پاس ایک لونڈی ہو پھر وہ اس کو تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے اور اس کو آداب سکھائے اور اچھے آداب سکھائے اور اسے آزاد کرے اور نکاح کرے تو اس کے لیے دوچند اجر ہے۔ پس لونڈیوں کے ساتھ نکاح کی ممانعت میں اوّل حکمت تو یہی تھی کہ تا مسلمان ان کو آزاد کر کے ان کو اپنی زوجیت میں لیں اور لونڈی کو ادنیٰ حالت میں نہ رہنے دیں۔ ہاں لونڈی کی یہ قدر آنحضرت صلعم نے سکھائی کہ اس کی احسن تعلیم اور احسن تادیب کی طرف توجہ دلائی مگر آج مسلمان اپنی بیٹیوں کی بھی اتنی عزت نہیں کرتے اور ان کی مناسب تعلیم و تادیب کا کوئی انتظام نہیں۔

دوسری حکمت اس میں یہ تھی کہ جو حالت ملک عرب میں غلاموں اور لونڈیوں کی تھی یا جو اور دنیا میں تھی۔ اس کی وجہ سے ان میں بہت سے ذلیل اخلاق آچکے تھے اور ماں چونکہ اولاد کی تربیت کرتی ہے۔ اور اولاد کے اخلاق ماں کے اخلاق سے ہی بنتے ہیں اس لیے اگر لونڈیوں سے عام اجازت نکاح کی ہوتی تو اخلاق قومی پر اس کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مشرک عورتوں کے نکاح سے بھی اسلام نے روک دیا اس لیے کہ ان کا اثر اولاد کی تربیت پر بُرا پڑتا تھا اور اخلاق بگڑتے تھے۔ یہاں چونکہ مومن ہو کر ان کو ایک موقعہ اپنے آپ کو بہتر بنانے کا بھی تھا اس لیے مشروط اجازت دی ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ بعض لونڈیاں اس ذلّت کی حالت سے نکل بھی سکتی تھیں تو ایسے غلاموں اور لونڈیوں کے لیے اسلام نے مکاتبت کی شرط رکھی ہوئی تھی اور ہر ایک غلام اور لونڈی کو جو اپنی حالت کی اصلاح کرنا چاہے یہ حق تھا کہ وہ مالک سے آزادی حاصل کرے پس ان کے لیے آزاد ہو کر اور زوجیت میں مساوات کے حقوق حاصل کر کے نکاح کر لینے کا رستہ کھلا تھا۔

لونڈیوں سے نکاح کی شرائط: تیسری حکمت اس میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو قیدی جنگ میں پکڑے جاتے تھے ان کے متعلق حکم تھا کہ ان کو بعد میں احسان سے یا فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے ایسی صورت میں بھی ممکن تھا کہ ان کے پہلے خاوند اگر زندہ ہوں تو اسلام لے آئیں اور اس صورت میں انہیں واپس اپنے خاوندوں کے پاس جانا چاہیئے۔ لونڈی کے ساتھ جو نکاح میں جو شرائط رکھی ہیں وہ یہ ہیں۔ اوّل یہ کہ ایک مرد اس قدر فراخی اور وسعت نہ رکھتا ہو کہ آزاد عورت سے نکاح کر سکے۔ کیونکہ لونڈی کا مہر اس کا نفقہ آزاد عورت سے بہت کم ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ عَنَت سے خائف ہو یعنی اگر نکاح نہ کرے تو کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے صحت جسمانی بگڑنے کا یا زنا میں پڑ کر ہلاکت میں پڑنے کا۔ تیسری شرط یہ ہے کہ مالک کے اذن کے ساتھ نکاح ہو۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ لونڈی مومنہ ہو۔

مالک اور مملوک لونڈی: ایک اور سوال یہ ہے کہ کیا مالک کے لیے محض ملک یمین کی وجہ سے لونڈی سے زن و شوہر کا تعلق رکھنا جائز ہے یا وہ بھی ان شرائط کے ماتحت ہے جن کا ذکر اوپر ہوا۔ جہاں تک موجودہ زمانہ کا سوال ہے نہ وہ دینی جہاد اس وقت ہیں نہ ملک یمین کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تاہم ایک مسئلہ کے رنگ میں یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن وجوہات کی بنا پر غیر مالک کو لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے سے حتی الوسع روکا ہے۔ وہی وجوہات مالک کے لیے موجود ہیں۔ بلکہ مالک کے لیے تو اور بھی آسان راہ ہے کہ اگر کوئی ملک یمین والی عورت اس کو پسند آئے تو وہ آزاد کر کے اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ اور چونکہ ایسی صورت میں آزادی عطا کرنا ہی مہر کے قائم مقام بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت صفیہؓ کی حالت میں ہوا۔ اس لیے اس کے لیے کوئی مشکل بھی نہیں۔ لیکن جب تک وہ اس کو لونڈی کی حیثیت میں رکھنا چاہتا ہے وہ ان تمام شرائط کا پابند ہے۔ ہاں بعض شرائط اس کی حالت میں خود زائل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مالک کے اذن سے نکاح کیا جائے سو اس کو کوئی اذن بکار نہیں۔ یا مثلاً یہ کہ مہر دیا جائے کیونکہ لونڈی کا مال مالک کا مال متصور ہوتا ہے اس لیے اس کو مہر دینے کی ضرورت نہیں۔ باقی رہا اعلان سو وہ ضروری ہے۔

ع۶۴۰ شرائع کا نزول: پچھلے رکوعوں میں عورتوں کی وراثت اور حقوق اور نکاح کے متعلق احکام دیئے ہیں۔ اس رکوع میں اصل غرض تو ان حقوق کی محافظت کی طرف ہی توجہ دلانا ہے۔ مگر پہلی تین آیتوں میں نزول شریعت کے متعلق چند باتیں بتائی ہیں یعنی یہ کہ کیا ضرورت پیش آئی، کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کے احکام نازل کرے چنانچہ اس آیت میں بتایا کہ اس کی غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کھول کر بیان کرے اور ساتھ ہی توجہ دلائی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قدیم قانون ہے کہ وہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں ایسا کرتا آیا ہے سنن الذین من قبلکم میں یہی اشارہ ہے۔

ع۶۴۱ نزول شریعت کی غرض: اس آیت میں بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اس طرح پر شریعت کو تم پر نازل کرنا اس لیے ہے کہ وہ تم پر خصوصیت سے توجہ فرمانے کا ارادہ کر چکا ہے تا کہ اس کی خاص توجہ سے صحیح اصول پر چل کر تم دنیا میں عظیم الشان قوم بن جاؤ۔ مگر جو لوگ نری خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی اُن کی طرح میانہ روی سے ایک طرف جھک جاؤ اور جادۂ اعتدال سے منحرف ہو جاؤ۔ یہ لوگ کون ہیں۔ بعض نے کہا زانی۔ بعض نے کہا یہود و نصاریٰ

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝۲۸

اللہ چاہتا ہے کہ تم سے (بوجھ) ہلکا کر دے اور انسان کمزور پیدا ہوا ہے۔[۶۴۲]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۟ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے مالوں کو آپس میں ناحق کے ساتھ مت کھاؤ سوائے اس کے کہ تمھاری باہمی رضامندی سے تجارت ہو[۶۴۳] اور اپنے لوگوں کو قتل نہ کرو۔ بیشک اللہ تم

بعض نے مجوس۔ لیکن قرآن کریم نے لفظ عام رکھے ہیں۔ شہوات کی پیروی کرنے والے جو کوئی بھی ہوں ہاں اگر خصوصیت سے کسی ایک قوم پر یہ لفظ چسپاں ہیں تو عیسائیوں پر کیونکہ وہ نہ صرف عملاً خواہشات کی پیروی کرتے ہیں بلکہ شریعت سے ایسے متنفر ہیں کہ اس کو نعوذ باللہ لعنت تک کہہ دیا ہے۔ عورتوں کے معاملہ میں بھی بجائے اسلام کی طرح سادگی کے ساتھ ان کے حقوق دینے کے اپنی خواہشات نفسانی کے لیے ان کے باہر بناؤ سنگار کرکے نکلنے پر ہی سارا زور دیتے ہیں۔ اور اسی کو عورت کا بڑا حق قرار دیتے ہیں حالانکہ اصل حقوق جو اسلام نے عورت کو دیئے ہیں ان کی طرف توجہ بھی نہیں اور وہ مسلمانوں کو بھی اپنی طرح شہوات کا پیرو بنانا چاہتے ہیں۔

ع۶۴۲ نزول شریعت کی ضرورت: اس آیت میں وجہ بیان فرمائی کہ انسان چونکہ کمزور پیدا ہوا ہے اپنی ہدایت کی مخفی راہوں پر خود اطلاع نہیں پا سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ اپنے کلام کے یہ ہدایات اسے عطا فرمائی ہیں۔ گویا ان تینوں آیتوں میں تین اصولی باتیں بیان فرمائی ہیں۔ یعنی اوّل نزول شریعت کوئی نئی بات نہیں پہلے لوگوں پر بھی شرائع نازل ہوتی رہیں۔ دوم خدا کی طرف سے مقرر کردہ شریعت نہ ہو گی تو لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کریں گے۔ سوم نزول شریعت اس لیے ضروری ہے کہ انسان ہدایت کی راہوں کو اپنی کوشش سے پانے سے عاجز ہے۔ جتنی دیر میں ایک راہ کے غلط ہونے کا اس کو تجربہ ہو گا اتنی دیر میں خود بوجہ اس غلط راہ پر چلنے کے ہلاک ہو جائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود شرائع نازل کرکے انسان کے اس بوجھ کو ہلکا کر دیا۔ چنانچہ اس کی وجہ بھی ساتھ ہی بیان فرما دی ہے وخلق الانسان ضعیفا یعنی انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے اس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ خود بخود اپنے لیے اپنی حقیقی فلاح کے رستے بنا سکے بلکہ وہ ایک طاقتور ہستی کا محتاج ہے جس کو آیت ع۲۶ میں علیم حکیم کہہ کر یہ بتا دیا ہے کہ ان راستوں کا بتانا اسی کا کام ہو سکتا ہے جو ہر شے کا عالم اور ہر ایک حکمت پر آگاہ ہے۔ انسان کا علم اور انسان کی حکمت چونکہ بہت کمزور ہیں۔ اس لیے اسے اللہ تعالیٰ کی امداد کی ضرورت ہے خلق الانسان ضعیفا کے یہ معنی نہیں کہ انسان شرائع پر عمل نہیں کر سکتا۔ بلکہ جیسا کہ ماقبل کی عبارت صاف بتاتی ہے۔ یہ مطلب ہے کہ وہ شریعت کو خود اپنے لیے تجویز نہیں کر سکتا یہی وہ بوجھ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اوپر سے ہلکا کر دیا ہے اس کو رستہ بتا کر اس پر چلنے کی ہدایت فرما دی ہے۔ باقی رہا شریعت کے بوجھ کے اٹھانے کی قابلیت یا ان راہوں پر جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں چلنے کی طاقت۔ سو اس کا ذکر دوسری جگہ فرمایا کہ خدا نے وہی راہیں انسان کو بتائی ہیں جن پر وہ چل بھی سکتا ہے جیسا کہ فرمایا لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی وسعت سے بڑھ کر مکلف نہیں کرتا۔

شرائع پر چلنے کی قابلیت اور عیسائی عقیدہ: عیسائیوں کا یہ کہنا کہ انسان شریعت کے بوجھ کو اُٹھا نہیں سکتا محض جھوٹ اور خدا پر ایک الزام ہے کیونکہ اگر انسان واقعی اس قابل نہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے جن اپنی رضا کی راہوں کو اس پر بذریعہ شرائع کھولا اُن پر وہ چل سکے۔ تو اس نے یہ عبث کام کیوں کیا کہ ہر زمانہ ہر ملک میں ہر قوم کے اندر نبی بھیجے۔ بلکہ بعض قوموں کے اندر جیسے بنی اسرائیل پے در پے نبی بھیجے اور ان انبیاء کے ذریعے اپنی رضا کی راہیں انسانوں پر کھولیں۔ حالانکہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق یہ بالکل ایک لغو امر تھا اور پھر کیوں خدا کو دو ایک نبی بھیجکر یہ پتہ نہ لگ گیا کہ انسانوں پر اپنی رضا کی راہوں کا کھولنا ایک لغو امر ہے وہ ان پر چل ہی نہیں سکتے۔ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں نبی بھیجتا چلا گیا۔ اسلام کا عقیدہ اس کے بالمقابل کیسا صاف اور کیسا واقعات حقّہ کے مطابق ہے۔ انسان ضعیف ہے۔ اس حد تک کہ وہ خود بخود خدا کی رضا کی راہوں کو نہیں پا سکتا۔ اس لیے ابتدائے دنیا سے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ ہر قوم پر ہر زمانہ میں ہر ملک کے اندر اپنی رضا کی راہیں بتانے والے بھیجتا رہا پس خود دنیا کے یہ واقعات کہ اللہ تعالیٰ اپنی رضا کی راہیں بذریعہ شرائع کے ظاہر فرماتا رہا۔ اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ انسان میں یہ قابلیت ہے کہ خدا کی رضا کی راہوں پر چل سکے اور اگر اس میں یہ قابلیت ہی نہیں تو پھر کفارہ نے اس کی مشکل کو کس طرح حل کیا۔ اگر اس طرح حل کیا ہے کہ انسانوں کے اندر یہ قابلیت پیدا کر دی ہے کہ خدا کی رضا کی راہوں پر چل سکیں تو پھر بھی آخر خدا کو یہی کرنا پڑا کہ ان کو اپنی رضا کی راہوں پر چلنے کے قابل بنائے اور یہ پہلے ہی کیوں نہ کر دیا۔ کیوں بلا وجہ انسانوں کو اس قدر مصیبت میں ڈالا کہ ان پر تکلیف مالا یطاق ڈالی۔ حالانکہ قصور اپنا تھا کہ انسان کو اپنی رضا کی راہوں پر چلنے کے قابل ہی نہ بنایا تھا، اور اگر یہ کہا جائے کہ انسانوں کی قابلیت تو اب بھی وہی ہے، مگر اب کوئی انسان اس کی راہوں پر چلے یا نہ چلے وہ سب کو معاف کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ کفارہ کو مان لیں تو اباحت اور گناہ کا دروازہ کھل جاتا ہے غرض صحیح اصول وہی ہے جو اسلام نے بیان کیا ہے۔

ع۶۴۳ لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل اس بات کو بیان کرکے کہ شرائع اور حقوق کا قائم کرنا ضروری تھا۔ اب نصیحت فرماتا ہے کہ جو جو حقوق کسی کے قائم

إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٢٩﴾ — پر رحم کرنے والا ہے ۶۴۴

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ — اور جو شخص حد سے نکل کر اور ظلم سے ایسا کرے گا ہم اسے آگ

نُصْلِيهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرًا ﴿٣٠﴾ — میں داخل کریں گے اور یہ اللہ پر آسان ہے ۶۴۵

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ — اگر تم ان بڑی بدیوں سے بچتے رہو جن سے تم کو روکا جاتا ہے ۶۴۶ تو ہم تمہاری

کر دیئے گئے ہیں ان کے خلاف اب ایک دُوسرے کا مال کھانے کی کوشش نہ کرو، اور اکل سے مراد ہر قسم کا تصرف ہے اور باطل حق کا نقیض ہے اور حق طریق وہی ہے جس کو قرآن کریم نے بیان فرمادیا۔ مثلاً ورثہ کے ذریعے سے، ہبہ کے ذریعہ سے اور حقوق جو ایک دوسرے پر قائم کیے گئے ہیں ان کے ذریعے سے تو حق طریق ہیں ان کے سوائے جو طریق ہوگا وہ باطل ہوگا۔ یہی حکم البقرہ ۱۸۸ میں بھی آچکا ہے۔ یہاں عورتوں اور یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے لیے اُس کو دوہرایا ہے۔ منسوخی کے شائقین نے اس آیت کو بھی منسوخ کہہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ سورہ نور کی وہ آیت جس کی رُو سے باپوں، بھائیوں، چچوں، دوستوں کے گھروں سے کھانا جائز ہے وہ اس کی ناسخ ہے۔ گویا یہ بالباطل کھانا ہُوا۔

الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم یہاں الّا استثنائے منقطع ہے تراضی دونوں کا ایک دوسرے سے اظہار رضامندی ہے۔ تجارت کا ذکر بوجہ اس کی عظمت کے یہاں خصوصیت سے کیا ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے تسعۃ اعشار الرزق فی التجارۃ (ر) رزق کے دس حصّوں میں سے نو تجارت میں ہیں اور ایک حدیث میں ہے الطیب الکسب کسب التجار۔

ع۶۴۴ ولاتقتلوا انفسکم کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اپنے لوگوں کو قتل مت کرو۔ گویا ایک طرف اگر ایک دوسرے کے حقوق مالی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ناحق ایک دوسرے کے مال مت کھاؤ تو دوسری طرف حقوق حفظ جان کی طرف توجہ دلائی ہے یعنی ایک دوسرے کو قتل مت کرو اور انفسکم کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ سب مسلمان گویا ایک ہی نفس کے حکم میں ہیں۔ دوسرے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو قتل مت کرو اور اس صورت میں یا تو یہ مراد ہو سکتی ہے کہ ایک دوسرے کی حق تلفی کرنا یا یتیموں بیواؤں کے حقوق نہ دینا درحقیقت اپنے آپ کو یا اپنی قوم کو ہی قتل کرنا ہے۔ امام راغبؒ نے یہاں قتل نفس سے مراد اپنے آپ کو ان باتوں سے محروم رکھنا لیا ہے جن سے حیاتِ ابدی ملتی ہے کیونکہ اس کے آگے آتا ہے ومن یفعل ذٰلک عدوانا۔ اور یا یہ مراد ہو سکتی ہے کہ خودکشی مت کرو۔ کیونکہ بہت سے جاہل جب ان کو غم یا خوف یا سخت بیماری یا کوئی ذلت پہنچتی ہے تو اس کو ناقابل برداشت سمجھ کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ اسلام نے خودکشی کو سخت جرم ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ خودکشی کرنے والا انسان درحقیقت تکلیف کے سامنے ہمت ہار دیتا ہے۔ اور جو تکلیف سے گھبرا کر ہمت ہار دے اس کا ایمان خدا پر نہیں۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ خودکشی کرنے والا جہنمی ہے (ث)، بلکہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ خیبر کی جنگ میں ایک شخص کے متعلق جو اسلام پر تھا نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اہل نار میں سے ہے لوگوں کو بہت تعجب ہوا اور زیادہ تعجب اس پر ہوا کہ اس دن اس نے خوب جنگ کی اور آخر زخمی ہوا۔ لیکن زخموں کی تکلیف کو برداشت نہ کر کے خودکشی کر لی۔ عمرو بن العاص نے اسی آیت سے استدلال کر کے شدت کی سردی میں حالت جنب میں ایک جنگ میں بغیر غسل کرنے کے تیمم کر کے نماز پڑھا دی۔ چنانچہ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ رات سخت سردی تھی اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولاتقتلوا انفسکم۔ اس لیے میں نے غسل نہیں کیا۔ تو نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے۔

شریعت کے احکام میں سب سے زیادہ وقعت اس بات کو دی ہے کہ ایک دوسرے کے مال باطل طور پر نہ کھائیں۔ درحقیقت دنیا کی اکثر بدیاں باطل طور پر مال کھانے سے ہی پیدا ہوتی ہیں مال کی محبت اور اس کی حرص ہی انسان سے اور قوموں سے اکثر ظلم کراتی ہے۔ اور قتل نفس کو اکل مال بالباطل کے بعد اس لئے رکھا کہ قتل کے واقعات بھی بہت سے مال کی وجہ سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ یورپ کی اس خطرناک جنگ کا موجب بھی جس میں لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں، یہی لالچ تھا۔

ع۶۴۵ آگ میں جلانا یا داخل کرنا اللہ پر آسان ہے۔ یہ اس لیے کہا کہ لوگ اس کو بڑا بعید سمجھتے ہیں بلکہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کہاں ہوگا فرماتا ہے اس میں استبعاد یا محال کوئی نہیں۔

ع۶۴۶ تجتنبوا۔ جنب سے ہے جس کے اصل معنی پہلو ہیں۔ اور اجتناب کے معنی کسی چیز سے ایک پہلو میں ہو جانا ہیں یعنی اس سے بچ جانا۔

کبائر۔ کبیرۃ کی جمع ہے جس کے اصل معنی صرف بڑا ہیں۔ اور کبیرۃ ہر اس گناہ کے معنی میں آتا ہے جس کی عقوبت بڑی ہو (غ) اور ابن اثیر میں ہے کہ کبیرہ وہ فعل قبیح ہے جس سے شریعت نے روکا ہو اور اس کا امر عظیم ہو۔ قرآن شریف میں دوسری جگہ ہے الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم (النجم ۵۳: ۳۲) کبیرہ خاص خاص گناہوں کا نام ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض احادیث کی بنا پر چند خاص گناہوں کو کبیرہ کہا جاتا ہے مثلاً صحیحین میں حدیث ہے اجتنبوا السبع الموبقات سات ہلاک کر دینے والوں سے بچو۔ اور وہ سات گناہ یہ گنے ہیں۔ شرک۔ سحر۔ قتل۔ مال یتیم کا کھانا۔ سود کھانا۔ جنگ کے دن پیٹھ پھیر دینا۔ پاکدامن مومن عورتوں پر الزام لگانا۔ اور دوسری حدیث میں بجائے سحر کے ہے الانقلاب الی الاعراب بعد الھجرۃ ہجرت کے بعد بادیہ نشینی کی طرف لوٹ جانا۔ ایک اور میں بجائے اس کے والدین کی نافرمانی کہا ہے اور صحیحین کی ایک حدیث میں صرف تین کو کبیرہ دیا اکبر الکبائر کہا ہے۔ شرک۔ والدین کی نافرمانی

عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿٣١﴾
وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى
بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ
وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا
اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ

بُرائیاں تم سے دُور کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ میں داخل کریں گے ٦٤٧
اور اس کی آرزو نہ کرو جس سے اللہ نے تم کو ایک دوسرے پر
فضیلت دی ہے، مردوں کا حصّہ ہے جو وہ کمائیں،
اور عورتوں کا حصّہ ہے جو وہ کمائیں۔ اور اللہ سے اس
کا فضل مانگتے رہو۔ اللہ ہر چیز کو جاننے

جھوٹی گواہی دینا اور ایک صحیحین کی حدیث میں ہی ای الذنب اعظم کا جواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں مروی ہے۔ اللہ کا شریک ٹھہرانا۔ دریافت کیا گیا اس کے بعد فرمایا قتل اولاد اس خوف سے کہ اس کو کھانا دینا پڑے گا۔ دریافت کیا گیا۔ اس کے بعد فرمایا ہمسایہ کی جورو سے زنا۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا اٰخر ولا یقتلون النفس التی حرّم اللہ اِلّا بالحق ولا یزنون (الفرقان ٢٥-٦٨) اور ایک حدیث میں ہے کہ شراب کے متعلق نبی کریم صلعم سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اکبر الکبائر ہے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ یہ بھی کبائر میں سے ہے کہ ایک شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے۔ اور اس کی کیفیت یوں بیان فرمائی کہ دوسرے کے ماں باپ کو گالی دے تو وہ اس کے ماں باپ کو گالی دے گا اور یہ بخاری کی حدیث ہے۔ اور بخاری ہی میں ہے سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر۔ اور ظاہر ہے کہ فسوق بھی کبائر میں سے ہے اور ترک صلوٰۃ کو بھی کفر کہا ہے۔ چنانچہ سنن میں ہے من ترک الصلوٰۃ فقد کفر اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا اکبر الکبائر میں سے ہے۔

ان تمام احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے کبائر کو معین نہیں فرمایا اور الگ الگ موقعوں پر الگ الگ جواب دینے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جیسا سائل کی حالت کا اقتضا تھا اس کے مطابق اس کو جواب دیا ہے۔ پس احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کبیرہ معین گناہوں کا نام نہیں۔ چنانچہ یہی حضرت ابن عباسؓ سے ثابت ہے۔ ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے کہا تھا، کہ کبیرہ سات ہیں تو آپ نے فرمایا وہ ستر سے زیادہ قریب ہیں اور دوسری روایت میں ہے سات سو سے زیادہ قریب ہیں اور ایک روایت میں آپ نے کبیرہ کے معنی یوں کیے ہیں۔ کل ما نھی اللہ عنہ فھو کبیرۃ جس چیز سے اللہ نے روکا ہے وہ کبیرہ ہے۔ اور دوسری روایت میں ہے کل ما عصی اللہ تعالیٰ فیہ فھو کبیرۃ۔ ہر ایک چیز جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہے وہ کبیرہ ہے۔ اگر عظمت یا کبر کے لفظ کو مدّنظر رکھا جائے تو قرآن کریم میں ایک طرف شرک کو ظلم عظیم کہا ہے۔ دوسرے موقعہ پر قتل اولاد کے متعلق فرمایا انّ قتلھم کان خطأً کبیرا۔ تیسرے موقعہ پر جوئے اور شراب کے متعلق فرمایا فیھما اثم کبیر۔ اور عیسائیوں کے عقیدہ اتخاذ ولد کے متعلق فرمایا کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم (الکھف ١٨-٥) ایک جگہ حرمت کے مہینوں میں جنگ کے متعلق فرمایا قل قتال فیہ کبیر (البقرۃ ٢-٢١٧) اور اس سے بڑھ کر کفر باللہ۔ اور مسجد الحرام کا کفر۔ اور اس کے اہل کا اخراج قرار دیا وکفر بہ والمسجد الحرام واخراج اھلہ منہ اکبر عند اللہ (البقرۃ ٢-٢١٧) اور اگر قتل کو کبیر کہا تو مسلمانوں کو اذیت دینا اس سے بھی بڑھ کر فرمایا والفتنۃ اکبر من القتل اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ کبیر یا اکبر الکبائر خاص قسم کے گناہوں کو نہیں کہا اور جس طرح کبائر سے چند خاص گناہ مراد نہیں اس کے مقابلہ پر جو صغائر کہلاتے ہیں ان سے بھی خاص گناہ مراد نہیں یوں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر ایک گناہ یکساں نہیں۔ جیسا جیسا جس جس گناہ کا اثر ہے اسی لحاظ سے اس کو بڑا یا چھوٹا کہا جائے گا مگر چھوٹے گناہوں پر اصرار بھی گناہ کو بڑا بنا دیتا ہے۔ اور یہ حضرت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے لا کبیرۃ مع الاستغفار ولا صغیرۃ مع الاصرار۔ استغفار کے ساتھ کوئی کبیرہ نہیں اور جس پر اصرار ہو وہ صغیرہ نہیں رہتا۔

ع٦٤٧ مُدخل۔ یا مصدر ہے بمعنی اِدخال اور یا اَدخَلَ یُدْخِلُ سے ظرف مکان ہے

کریم۔ کَرَم جب اللہ تعالیٰ کے وصف میں ہو تو اس کا احسان و انعام مراد ہوتا ہے اور جب انسان کے وصف میں ہو تو اخلاق اور افعال محمودہ پر استعمال ہوتا ہے جو اس سے ظاہر ہوں اور اس کا استعمال صرف محاسن کبیرہ پر ہوتا ہے اور ہر ایک چیز جو اپنی نوع میں معزز و ممتاز ہو۔ وہ کریم کہلاتی ہے (غ) کم انبتنا فیھا من کل زوج کریم (الشعراء ٢٦-٧) و زروع و مقام کریم (الدخان ٤٤-٢٦) انہ لقراٰن کریم (الواقعۃ ٥٦-٧٧) وقل لھما قولًا کریما (بنی اسرائیل ١٧-٢٣)

اس آیت میں ایک پُر حکمت فلسفہ بدی سے بچنے کا پایا جاتا ہے۔ بدی کسی ایک چیز کا نام نہیں ہر شے کا نیک و بد استعمال ہو سکتا ہے اور ہر انسان کی زندگی میں الگ الگ موقعے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں وہ نیکی یا بدی کر سکتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی مذہب تمام بدیوں کو گننے لگتا اور اپنے پیرووں کو یہ کہتا کہ.... اب تم ان باتوں سے بچو تو وہ ایک نہایت ہی ناکام کوشش ہوتی۔ قرآن کریم نے یہ پُر حکمت طریق اختیار کیا ہے کہ چند موٹی موٹی بدیوں سے جن کو ہر انسان جانتا ہے روک کر یہ فرمایا کہ اگر تم ان سے بچو تو ہم تمہاری بدیاں دُور کر دیں گے۔ ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ حکمت کیا ہے یہ تو ایک فرضی بات ہے کہ بڑی بڑی بدیوں سے بچ جاؤ گے تو ساری بدیاں دور کر دیں گے۔ مگر ایسا اعتراض وہی کرے گا جس نے بدی کے فلسفہ پر غور نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ بدی جس قدر زیادہ بیّن ہو گی یا جس قدر بڑی ہو گی اسی قدر انسان اس کا آسانی سے مقابلہ کر سکے گا۔ جو شخص فطرت انسانی پر غور نہیں کرتا وہ اسے مستبعد خیال کرے گا مگر فطرت انسانی ایسی ہی ہے کہ

شَیۡءٍ عَلِیۡمًا ﴿۳۲﴾ والا ہے ؏۶۴۸

جس چیز کا نقصان بہت بیّن ہوتا ہے اس سے بچنا انسان کے لیے آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ فطرت کے اندر جو خالق فطرت نے طاقتیں ودلیعت کر رکھی ہیں وہ ایک کھلے نقصان کو دیکھ کر مقابلہ کے لیے باہر نکل کھڑی ہوتی ہیں اور انسان کا بدی پر غالب آنا یہی ہوتا ہے کہ اس کے اندر جو نیکی کی طاقتیں ہیں وہ مقابلہ کے لیے باہر نکل آئیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس چیز کا نقصان بہت بیّن ہوگا وہی بڑی بدی کہلائے گی پس اصل یوں ہے کہ بڑی بدی کا نقصان بہت کھلا ہوتا ہے۔ اور کھلے نقصان کو دیکھ کر انسان کے اندر جو نیکی کی طاقتیں ہیں وہ مقابلہ کے لیے نکل آتی ہیں۔ اور جب نیکی کی طاقتیں مقابلہ کے لیے نکل آئیں تو گو اگر فطرت بدی کے نیچے دبی ہوتی ہے تو ابتدا میں وہ کمزور ہونے کی وجہ سے دب بھی جائیں گی مگر آخر مقابلہ کرتے کرتے ان میں طاقت آجائے گی جس طرح بچہ جب کھڑا ہونے لگتا ہے یا چلنے لگتا ہے تو پہلے پہلے گرتا ہے مگر اس کی بار بار کی کوشش اس کی طاقت کو مضبوط کر دیتی ہے۔ اسی طرح انسان کی روحانی طاقتیں مقابلہ کے وقت نشوونما پاتی ہیں۔ پس جب ایک شخص بڑی بدیوں کا مقابلہ کرنے کا اپنے آپ کو عادی بنائے گا تو اس کی نیکی کی اندرونی قوتیں نشوونما پائیں گی اور ان قویٰ کے نشوونما کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان چھوٹی بدیوں سے بھی بچ جائے گا جن کے نتائج ایسے بیّن نہیں ہیں۔ کیونکہ اس کے اندر سے آہستہ آہستہ بدی کا میلان ہی دور ہو جائے گا، اور اس کی بدی کی طاقتیں بالکل مر جائیں گی اور یہی وہ مقام ہے جس پر اسلام پہنچانا چاہتا ہے نکفر عنکم سیّاٰتکم سے مراد یہاں بدی کی طاقتوں کا دور کر دینا ہی ہے کیونکہ جب انسان سے بدی سرزد نہ ہوگی تو گویا اس کی بدیاں اس سے دور ہو جائیں گی۔

بدی کا کفارہ اسلام اور دیگر مذاہب میں: یہ وہ راہ ہے جس کو بدی کے کفارہ کے طور پر اسلام نے پیش کیا ہے۔ اس کے بالمقابل کسی مذہب کا کفارہ لے لیا جائے وہ محض ایک طفلانہ خیال معلوم ہوتا ہے مثلاً عیسائیوں کا کفارہ ہی لے لو۔ کہ ایک شخص کے (یا خدا کے) مصلوب ہو جانے پر ایمان لانے سے انسان بدیوں سے پاک ہو جاتا ہے لیکن آج تک کوئی عیسائی یہ نہیں بتا سکتا کہ کس طرح اس بات کو مان لینے سے کہ یسوع مسیح صلیب پر مر گئے تھے ایک انسان کی بدی کی قوت کمزور ہو جاتی ہے یا وہ بدی سے پاک ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ہندوؤں کا عقیدۂ تناسخ ہے۔ اگر کوئی شخص بیل یا کتے یا گدھے یا کیڑے مکوڑوں کی جون میں چلا جاتا ہے تو اس سے وہ گناہوں سے کیونکر پاک ہو جاتا ہے بالخصوص اس صورت میں جبکہ اس کو احساس تک نہیں ہوتا کہ فلاں جون اس کو کسی بدی کی سزا میں ملی ہے۔ تاکہ وہ آئندہ ہی اس سے رُکے۔ غرض اسلام کی پُرحکمت تعلیم کے سامنے واقعی یہ طفلانہ خیالات ہیں۔

؏۶۴۸ تتمنّوا۔ تمنی کا مادہ مَنی ہے جس کے اصل معنی تقدیر یا اندازہ کرنا ہیں اور تَمَنّی کے معنی ہیں کسی چیز کا صرف دل کے اندر اندازہ کرتے رہنا۔ اور دل کے اندر اس کی تصویر بناتے رہنا۔ اور اکثر تمنی یہی ہے کہ جس چیز کی حقیقت نہ ہو اس کا تصوّر کرتے رہنا (غ)

جب یہ حکم دیا کہ ایک دوسرے کا مال باطل طریق پر نہ کھاؤ تو ایک قدم اور بھی آگے بڑھایا کہ جو فضیلت تم میں سے ایک کو دوسرے پر ملی ہے اس کا باطل تصوّر بھی نہ کیا کرو۔ ایک دوسرے کے مال کو باطل طریق پر کھانا ایک ظاہر فعل ہے جس کا علاج برنگ سزا ظاہری حکومت بھی کرتی ہے اور ایک دوسرے کی فضیلت پر آرزوئے باطل کرنا ایک باطنی فعل ہے جس کا علاج صرف مذہب کر سکتا ہے۔ اور ظاہر کا علاج بہ نسبت باطن کے آسان بھی ہے اس لیے پہلے ظاہری فعل کی طرف توجّہ دلائی تو پھر باطنی فعل کی طرف۔

تمنی سے روکنے کا مطلب: ان الفاظ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جو چیز دوسرے کے قبضہ میں ہے مال یا جاہ اس کی آرزو مت کرو کہ وہ ہمارے پاس ہو اس کے پاس نہ ہو لیکن یہ چاہنا کہ جیسی چیز دوسرے کے پاس ہے ویسی ہی ہم کو مل جائے یہ رشک ہے حسد نہیں اور اصل بات یہ ہے کہ تمنی صرف دل میں تصوّر کرنے کا نام ہے اور جس فضیلت کا یہاں ذکر ہے اس سے وہ امور مراد ہیں۔ جو انسان خود بطور کسب نہیں لیتا بلکہ وہ وہبی امور ہیں یا ایسے حالات ہیں جن میں قدرت نے انسان کو رکھ دیا ہے۔ مثلاً کسی کو مرد بنایا۔ کسی کو عورت کسی کو قوی بنایا کسی کو ضعیف۔ کسی کو امرا کے گھر میں پیدا کر دیا کسی کو غربا کے گھر میں۔ کسی کو قوائے دماغی اعلیٰ درجہ کے دیدیئے کسی کو کم دیدیئے اور تمنی کے بالمقابل اکتساب کو لا کر اسے واضح بھی کر دیا۔ ایسی آرزوئیں کرتے رہنا کہ میں امیروں کے گھر کیوں پیدا نہ ہُوا۔ یا میں فلاں حالات میں کیوں پیدا نہ ہُوا۔ یا میرے گرد وپیش یہ امور کیوں نہ ہوئے یہ سب باطل آرزوئیں ہیں۔ اس لیے اوّل یہ حکم دیا کہ ایسی آرزوئیں مت کیا کرو۔ پھر اس کے بعد اصول بتایا کہ جن حالات میں انسان پیدا ہُوا ہے انہی حالات میں اس کو کام کرتے رہنا چاہیئے اور جس قدر طاقت اسے دی گئی ہے اسے خرچ کرتے رہنا چاہیئے اس کو عام فہم رنگ میں یوں بیان کر دیا کہ مرد جو کچھ کمائیں گے اس سے بہرہ ور ہونگے۔ عورتیں جو کچھ کمائیں گی اس سے بہرہ ور ہونگی۔ کیونکہ سب سے بڑی تقسیم مرد وعورت کی ہے مرد الگ حالت میں رکھا گیا ہے اور وہ اپنے کمال کو اور طریق پر حاصل کرتا ہے۔ عورت اور حالات میں رکھی گئی ہے اور وہ اپنے کمالات کو اور طریق پر حاصل کرتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ ہے وما خلق الذکر والانثیٰ ان سعیکم لشتّٰی (اللیل ۹۲-۳و۴) مگر باوجود علیحدہ علیحدہ حالات میں رکھے جانے کے دونوں کے لیے اکتساب کی راہ کھلی ہے دین میں بھی اور دنیا میں بھی۔ عورتیں دینی ترقیات اسی طرح حاصل کر سکتی ہیں جس طرح وہ دنیوی ترقیات حاصل کر سکتی ہیں جن کے لیے اسلام نے للنساء نصیب ممّا اکتسبن کہہ کر ہمیشہ کے لیے دروازہ کھول دیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ جب عورتوں نے نبی کریم صلعم سے یہ عرض کیا کہ مرد تو ہم پر بہت سبقت لے گئے کہ ان کو جہاد کا موقعہ ہے اور وہ بہت ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔ اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کر سکتے ہیں تو آپ نے فرمایا ان للحامل منکم اجرا کصائم القائم واذا ضربھا الطلق لم یدر احد ما لھا من الاجر فان ارضعت کان لھا بکل مصة اجر احیاء نفس (غق) یعنی تم میں سے حاملہ عورت کے لیے اس شخص کا اجر ہے جو دن کو روزے رکھتا اور رات کو ذکر الٰہی میں کھڑا رہتا ہے پھر جب

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ
وَالْأَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ
فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۳۳ ع

اور سب کے لیے اس میں جو وہ چھوڑے ہم نے ماں باپ اور قریبی وارث بنائے ہیں اور جن سے تمھارے داہنے ہاتھوں نے (عہد) باندھے ہیں تو ان کو اُن کا حصّہ دو ۔ اللہ ہر چیز پر گواہ ہے ۶۴۹

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ
اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ
اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ

مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں اس لیے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس لیے کہ انھوں نے اپنے مالوں سے کچھ خرچ کیا ہے ۶۵۰ سو نیک عورتیں فرمانبردار پیٹھ

وہ جنتی ہے تو کوئی نہیں جانتا کہ اس کے لیے کس قدر اجر ہے ۔ پھر اگر وہ دودھ پلاتی ہے تو ہر ایک مرتبہ جو بچّہ اس کا دُودھ چُوستا ہے اس کو ایک نفس کے احیاء کا اجر ملتا ہے ۔

لا تتمنوا میں یہ سبق بھی دیا ہے کہ انسان کو ان حالات پر راضی رہنا چاہیئے جن میں اس کو پیدا کیا گیا ہے اور جن سے نکلنا اس کے اختیار میں نہیں یہی اللہ کی رضا پر راضی ہونا ہے اور یہی قیام فی ما اقام اللہ ہے اور رضا بالقضاء کے یہ معنی نہیں کہ انسان ایک ذلّت اور دنو کی حالت سے نکلنے کی کوشش نہ کرے ۔

ع ۶۴۹ موالی ۔ مَولیٰ کی جمع ہے جو ولی سے ہے اور ولاء بمعنی قرب بھی استعمال ہُوا ہے ۔ خواہ وہ قرب کسی لحاظ سے ہو ۔ اس لیے وہ شخص جو غلام کو آزاد کرے ، وہ غلام جو آزاد کیا جائے ۔ حلیف یعنی جس سے معاہدہ ہو ۔ ابن العم ۔ وارث یعنی عصبتہ ان سب پر مولیٰ کا لفظ اطلاق پاتا ہے ۔ یہاں یہی آخری معنی مراد ہیں ۔

عقدت ایمانکم ۔ عقد کے اصل معنی ہیں کسی چیز کی اطراف کو اکٹھا کر دینا ۔ مگر اس کا استعمال بہت وسیع ہے ۔ مثلاً عقد بیع ۔ عقد عہد وغیرہ ۔ اور اَیمان سے مراد یا داہنے ہاتھ ہیں ۔ کیونکہ عہد میں ہاتھ پر ہاتھ رکھا جاتا ہے اور یا مراد قسمیں ہیں ۔ اور عقدت کا مفعول محذوف ہے یعنی عھودھم ۔ پس معنی یوں ہوئے جن لوگوں سے تمھارے داہنے ہاتھوں نے عہد باندھا ہے ۔

مال کے حصول کے دوسرے جائز ذرائع : جب یہ فرمایا کہ انسان بذریعہ اکتساب ہی کچھ حاصل کرتا ہے تو دوسرے حصول کے ذریعوں کی طرف بھی توجہ دلائی اوّل یہ کہ ہر ایک کے لیے ہم نے وارث بنائے ہیں جو اس کے ترکہ کو لیتے ہیں اور وہ وارث ماں باپ یا قریبی ہیں ۔ ورثہ کے علاوہ ایک حق بذریعہ معاہدات پیدا ہوتا ہے یعنی جس سے تم عہد کرو ۔ اس کا بھی حق ہو جاتا ہے اس میں خاوند کا بی بی سے عہد بھی شامل ہے ۔ مگر یہاں خصوصیت سے میاں بی بی کا عہد ہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ آگے الرجال قوامون علی النساء میں صاف بھی کر دیا ہے ۔

معاہدہ یا مواخاۃ کے ذریعہ سے ورثہ کی منسوخی : والّذین عقدت ایمانکم فاٰتوھم نصیبھم کو بعض لوگوں نے منسوخ کہا ہے اور اسکے تین طرح پر معنی کیے ہیں ۔ اوّل یہ کہ اس سے مراد وہ حلیف ہیں جو ایّام جاہلیت میں لوگ بنا لیا کرتے تھے یعنی وہ ایک دوسرے سے معاہدہ کر لیا کرتے تھے کہ میرا خون تیرا خون ہے ۔ میری صلح تیری صلح ہے ۔ میری جنگ تیری جنگ ہے ۔ تو میرا وارث ہوگا میں تیرا وارث ہونگا ۔ ایسے حلیف کو متوفی کے ترکہ میں سے چھٹا حصّہ ملا کرتا تھا اور اس آیت میں گویا اسی کو جائز رکھا ہے ۔ دوسرے یہ کہ اس سے مراد مُنہ بولے بیٹے ہیں جن کو مُتبنّٰی کہا جاتا ہے ۔ تیسرے یہ کہ آنحضرت صلعم نے ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کے درمیان مواخاۃ قائم کر دی تھی ۔ اور یہ مواخاۃ ایک کو دوسرے کا وارث بنا دیتی تھی ۔ اور پھر اس آیت میں اس قسم کے ورثہ کو جائز رکھ کر اس کو دوسری آیت واولوا الارحام بعضھم اولٰی ببعض فی کتاب اللہ (الانفال ۔ ۵۔۷) سے منسوخ قرار دیا ہے حالانکہ سورۃ انفال پہلے کی نازل شدہ ہے ۔ اور بخاری میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ” اس آیت ولکل جعلنا موالی میں موالی سے مراد وارث ہیں والّذین عقدت ایمانکم کے متعلق یہ ہے کہ جب مہاجر مدینہ میں آئے ۔ مہاجر انصاری کا وارث ہوتا تھا اس کے ذی رحم کو چھوڑ کر بسبب اس اخوت کے جو نبی کریم صلعم نے ان کے درمیان قائم کر دی تھی ۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی ولکل جعلنا موالی تو یہ بات منسوخ ہوگئی ۔ پھر کہا والذین عقدت ایمانکم ان کیلئے نصرت اور مہربانی اور نصیحت ہے اور میراث باقی نہیں رہی ۔ ہاں اس کے حق میں وصیّت ہو سکتی ہے “ ۔ پس جن لوگوں نے اس آیت کو منسوخ کہا ہے ان کو غلطی یہ لگی ہے کہ انہوں نے سمجھا کہ پہلے مواخاۃ والے کچھ ورثہ پاتے تھے تو وہ قرآن کریم کے اس حکم کے ماتحت پاتے تھے ۔ حالانکہ بخاری کی روایت سے معلوم ہوا کہ وہ کسی پُرانے رواج کے ماتحت ورثہ لے لیتے تھے اور خود اس آیت نے اس کو منسوخ کر دیا ۔ ہاں یہ جائز رہا کہ بذریعہ وصیّت ان کو کچھ دیدیا جائے ۔

ع ۶۵۰ قوامون ۔ قوّام کی جمع ہے جو قیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے قام الرجلُ علی المرأۃ کے معنی ہیں مانھا یعنی اس کی مُونت یا روزی مہیّا کی اور قوّامٌ علیھا کے معنی ہیں مائنٌ لھا معنی اس کی روزی مہیّا کرنے والا ۔ اور الرجال قوّامون علی النساء کے معنی ہیں متکفلون با مور النساء مُعْنِيُّوْن

بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ پیچھے حفاظت کرنیوالی ہوتی ہیں اس کی وجہ سے جو اللہ نے (اُن کی)
فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ حفاظت کی ہے[651] اور جن عورتوں کی سرکشی کا تمہیں ڈر ہو[652] تو ان کو وعظ کرو

بشؤنہن یعنی عورتوں کے امور کے متکفل ان کے حالات پر توجہ کرنے والے (ل) اور تاج العروس میں ہے کہ قام الرجل المرأۃ اور قام علیہا کے معنی ہیں مانہا وقام بشانہا متکفلا بامرہا یعنی اس کی مؤنت یا روزی مہیا کی اور اس کے امر کا تکفل کرتے ہوئے اس کی حالت کو قائم کیا اور قوام لہا کے معنی مائن لہا دیئے ہیں یعنی اس کیلئے روزی مہیا کرنے والا اور اس کے امر کا متکفل۔ پس قوّام کے اصل معنی متکفل ہیں اس کے معنی محض محافظ یا محض حاکم درست نہیں اور تکفل میں روزی کا مہیا کرنا حفاظت کرنا اور تادیب سب امور شامل ہیں کیونکہ جو شخص جس کا متکفل ہوتا ہے اس کی جسمانی اور اخلاقی حفاظت بھی اس کے ذمہ ہوتی ہے۔

مردوں کے عورتوں پر قوام ہونے سے مراد: عورتوں کے ذکر کے ساتھ مردوں کے حقوق کا بھی ذکر ضروری تھا اس لیے بتایا کہ مرد عورتوں کے قوام یعنی متکفل ہیں۔ گھر بمنزلہ ایک چھوٹی سی بادشاہت کے ہے حدیث میں ہے کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مسئول عن رعیتہ تم میں سے ہر ایک بادشاہ ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اپنی رعیّت کے متعلق سوال کیا جائے گا اور اس کی تفصیل میں یہ بھی فرمایا کہ مرد بھی ایک بادشاہ ہے اور اس کے گھر کے لوگ بمنزلہ ایک رعیت کے ہیں اور عورت بھی اپنے خاوند کے مال کو صرف کرنے میں بمنزلہ ایک بادشاہ کے ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جہاں باہمی حقوق اور ذمہ داریاں پیدا ہونگی وہاں ایک شخص کو رنگ حکومت بھی دینا پڑے گا۔ اسلام ایک عملی مذہب ہے اور جس مضمون کو قرآن شریف لیتا ہے ایک کامل حکیم کی طرح اس کے سارے پہلوؤں پر بحث کرتا ہے اس قدر باہمی حقوق اور ذمہ داریاں پیدا کرنے کے بعد یہ ضرور تھا کہ گھر کی چھوٹی سی سلطنت میں ایک کو دوسرے پر کچھ رنگ حکومت بھی دیا جاتا اور عملاً ساری دنیا کو دینا پڑا ہے کیونکہ اس کے بغیر نظم قائم نہیں رہ سکتا۔ اس رنگِ حکومت کو صراحت سے حکومت نہیں کہا اس لیے کہ خود دوسری جگہ فرما چکا ہے ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (البقرۃ ۲۲۸) جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ اور گھر کے نظم میں مرد و عورت کا اشتراک ہے تاہم ان کے حقوق اور ذمہ داریاں الگ الگ قسم کی ہیں پس ان تمام امور کو مدنظر رکھ کر فرمایا کہ آخری ذمہ داری مردوں کی ہے اور وہ رنگ حکومت جس سے گھر کے امور طے ہوں مرد کو دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ خود ہی بیان فرمائی ہے۔ اول وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ چنانچہ مردوں کو عورتوں پر قوائے جسمانی میں فضیلت ہے اس لیے روزی کمانے کا کام اور ملک و قوم کی حفاظت کا کام ان کے سپرد کیا اور جو ملک کا محافظ ہے وہی گھر کا محافظ بھی ہو سکتا ہے مگر بعضھم علی البعض کہہ کر یہ بھی اشارہ کر دیا کہ بعض معاملات میں عورتوں کو بھی فضیلت ہے مثلاً یہ کہ وہ ایک رنگ میں مردوں کی مخدوم ہو گئیں۔ کیونکہ روزی کا مہیا کرنا، گھر کی حفاظت کرنا۔ یہ ایک خدمت ہے اور دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ مرد عورتوں پر اپنے مال خرچ کرتے ہیں اور یہ وجہ اسی حکومت کے رنگ کے لیے بطور دلیل ہے جو تکفل کے مفہوم میں پایا جاتا ہے۔ یعنی مرد کو عورت پر اختیار اس لیے دیا گیا ہے کہ اس پر بوجھ بھی زیادہ ڈالا گیا ہے۔ کیونکہ وہ مال کمانے والا اور وہ مال کو خرچ کرنے والی ہے اور مال کے کمانے والے کو بہرحال اس کے خرچ کرنے والے پر اختیارات ہونے چاہئیں۔ اگر اس کے خلاف ہو گا تو موجب نقصان ہو گا۔ یہی معنی اس حدیث کے معلوم ہوتے ہیں لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ (بخاری) وہ قوم کامیاب نہیں ہو سکتی جو اپنے امر کا اختیار عورت کو دیدیں۔ یعنی کمانے والے کا اختیار نہ ہو بلکہ خرچ کرنے والوں کا ہو، یوں اس حدیث میں جمہوریت کا اعلیٰ سے اعلیٰ اصول بیان کر دیا ہے اور یہ نظم کیسا اعلیٰ درجہ کا ہے کہ مرد کمائے اور عورت خرچ کرے اور مرد اس کا نگران ہو اور یہی اصول جمہوریت ہے کہ عوام جن کے اموال نظم ملکی پر خرچ ہوتے ہیں حکام ان پر نگران ہوں۔

ع[651] قٰنِتٰتٌ - قنوت کے معنی چونکہ خضوع کے ساتھ فرمانبرداری کا لازم کر لینا ہیں۔ اس لیے قرآن کریم میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر ہی بولا گیا ہے۔

حافظٰت للغیب - حفاظت کا مفعول مقدر ہے یعنی حقوق خاوند اور للغیب سے مراد ہے فی غیبتہ یعنی اس کی پیٹھ پیچھے اس بات کا ذکر کرنے کے بعد کہ مرد عورتوں کے متکفل ہیں۔ اب دو قسم کی عورتوں کا ذکر کرتا ہے پہلے صالحات یعنی اچھی عورتوں کا ذکر کیا ہے اور اس میں دو امور کے ذکر پر بس کی ہے۔ اول یہ کہ وہ قانتات ہوں یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والی ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ خاوند کے حقوق کی پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والی ہوں۔ خاوند کے حقوق کا بلحاظ ان کی عظمت کے ذکر کیا۔ گویا خدا کی فرمانبرداری کے بعد ان پر خاوند کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری ہے اور للغیب یا پیٹھ پیچھے کی شرط اس لیے لگائی کہ قرآن کریم کمال کی حالت کا بیان کرتا ہے جو عورت پیٹھ پیچھے خاوند کے حقوق کی نگہداشت کرتی ہے وہ اسکے سامنے تو ضرور ہی کرے گی۔ ان میں سب سے بڑی بات خاوند کا حق زوجیت ہے۔ گویا عورت کی عفت کو اس کا سب سے بڑا جوہر قرار دیا ہے۔ مگر خاوند کے اور بھی حقوق عورت پر ہیں۔ مثلاً اس کی پردہ کی باتوں کو ظاہر نہ کرے، اس کے مال کی حفاظت کرے، اس میں کسی قسم کا ناجائز تصرف نہ کرے، اس میں فضول خرچی نہ کرے، ضرورت اور ذرائع آمد سے زیادہ خرچ نہ کرے بیہقی میں ایک حدیث بھی ہے جس میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا اذا غبت عنھا حفظتك فی مالك ونفسھا جب تم اس سے غائب ہو تو تمہارے مال کی اور اپنے نفس میں تمہاری حفاظت کرے۔

بما حفظ اللہ کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں یا تو ما موصولہ ہے اور عائد محذوف ہے یعنی بمقابلہ ان حقوق کے جن کو اللہ نے ان کے لیے محفوظ کر دیا ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے حقوق کو مردوں سے لیکر ان کو محفوظ کر دیا ہے اور ان میں خود یہ طاقت نہ تھی کہ وہ اپنے حقوق لیتیں اس لیے اب اس قدر حقوق لینے کے بعد ان پر یہ حق ہو گیا ہے کہ وہ بھی خاوندوں کے حقوق کی حفاظت کریں اور یہی معنی قابل ترجیح ہیں۔ مگر یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ عورتیں جو خاوندوں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں تو وہ اللہ کی حفاظت سے ہی ایسا کرتی ہیں۔

ع[652] تخافون - خوف کے معنی ہیں۔ کسی امر مکروہ کی توقع ایسی علامت سے جو ظنی ہو یا علم کی حد تک پہنچی ہوئی ہو (رغ) پس یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ خوف

وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

اور خوابگاہوں میں انکو الگ کردو اور ان کو مارو پھر اگر وہ تمھاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف کوئی راہ تلاش نہ کرو۔ اللہ بلند بہت بڑا ہے ۶۵۳

کسی فرضی خیال کا نام نہیں بلکہ کسی بدنتیجہ کے ظاہر ہونے کی توقع ہے جس کی علامات ظنی یا یقینی طور پر ظاہر ہوچکی ہوں۔ اور یہاں مراد یقینی طور پر ہی علامات کا ظاہر ہونا ہے جس طرح اس سے اگلی آیت میں خِفْتُم سے مراد ہے تم پہچان لو (غ) اور جس طرح دوسری جگہ وان امرأۃ خافت من بعلھا نشوزا او اعراضا (النساء ۔ ۱۲۸) میں خافت سے مراد علمت ہے یعنی جان لے۔ اسی طرح واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم علی سوآء (الانفال ۔ ۵۸) میں بھی خوف سے مراد جان لینا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں خوف کی بنا پر حقوق اور ذمہ واریوں پر اثر پڑتا ہو، وہاں محض ظنی علامات پر کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی بلکہ یقینی علامات ہونی چاہئیں۔

نشوز ۔ نشز سے ہے جس کے اصل معنی اُٹھنا ہیں جیسے واذا قیل انشزوا فانشزوا (المجادلۃ ۵۸ ۔ ۱۱) اور نشوز بین الزوجین یعنی میاں بی بی میں نشوز ان کا ایک دوسرے کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونا ہے یعنی ان میں موافقت کا نہ رہنا اس لیے لغت میں نشوز بین الزوجین کے معنی ہیں —— کراھیۃ کل منھما صاحبہ وسوء عشرتہ (ل) یعنی ہر ایک کا اپنے رفیق سے کراہت رکھنا اور اس سے بدسلوکی کرنا لیکن بلحاظ حالات کے الگ الگ معنی یوں کیے ہیں۔ یعنی عورت کا نشوز مرد پر یہ ہے کہ اس کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی نافرمانی کی اور اس سے بغض رکھا اور اس کی اطاعت سے نکل گئی اور اس سے سخت دشمنی کی اور خاوند کا نشوز عورت پر بھی یہی ہے اور یہ کہ اس کو مارے اور اس پر جفا کرے (ل) چنانچہ دوسری جگہ آتا ہے وان امراۃ خافت من بعلھا نشوزا (۱۲۸) اور عورت کے مرد پر نشوز کے معنی اپنے خاوند سے بغض رکھنا اور اس کی طاعت سے اپنے آپ کو بالکل باہر نکال دینا اور اس کا اس سے ہٹ کر دوسرے کی طرف دیکھنا بھی کیے گئے ہیں (غ)

نشوز کرنے والی عورتیں: صالحات کے ذکر کے بعد جو اپنے خاوند کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں اب ان عورتوں کا ذکر کرتا ہے جو حقوق خاوند کی حفاظت نہیں کرتیں اور جن سے خاوند کے خلاف ارتکاب نشوز معلوم ہو یعنی خاوند سے دشمنی بغض اس کی نافرمانی پر تلے رہنا ۔ گھر میں نہ بسنا وغیرہ ۔ یہ صرف وہ صورت ہے جس میں قصور صرف عورت کا ہو ۔ جب مرد اور عورت دونوں کی طرف سے فساد کا خطرہ ہو اس کا ذکر اگلی آیت میں کیا ہے اور جب عورت کا قصور کوئی نہ ہو مرد کا ہی قصور ہو تو اس کے لیے آیت ۱۲۸ میں علاج بتایا ہے۔

۶۵۳ واھجروھن فی المضاجع ۔ ھَجْر کے معنی انسان کا اپنے غیر سے الگ ہوجانا ہیں خواہ جسم سے الگ ہو یا زبان سے یا دل سے ۔ اور ھجر فی المضاجع یعنی خوابگاہوں میں عورتوں سے مفارقت ان کے قریب نہ جانے سے کنایہ ہے (غ)

عورت کے نشوز کی صورت میں تین علاج بتائے ہیں ۔ اوّل اوّل جب نشوز ظاہر ہو تو صرف نصیحت پر اکتفا کرنا چاہیئے ۔ اگر نصیحت سے فائدہ نہ ہو تو اس سے بجائے محبّت کے کسی قدر سختی کا برتاؤ کرنا چاہیئے اور اس سے محبّت کا میل جول اور محبّت آمیز کلام ترک کردیا جائے خوابگاہوں میں الگ کرنے سے یہی مراد ہے۔ ایک شریف عورت کے لیے خاوند کی طرف سے ایسا سلوک کافی سزا ہے ۔ اور وہ فوراً اپنے رویہ میں اصلاح کرلے گی ۔ لیکن جن عورتوں کو اس سے فائدہ نہ ہو اُن کی فطرت ہی ایسی ہو گی کہ سختی کے سوا ان کی اصلاح نہیں ہوسکتی اور چونکہ طلاق کا ذراسی بات پر دینا ٹھیک نہیں ۔ اس لیے ان کی اصلاح کے لیے ان کو مارنے کی اجازت بھی ہے۔

عورت کو مارنا کب اور کس حد تک جائز ہے: اس مارنے کی اجازت کو عیسائیوں نے اور بالخصوص آج کل کے مدعیان تہذیب عیسائیوں نے محل اعتراض ٹھہرایا ہے حالانکہ ظاہری ٹیپ ٹاپ کو چھوڑ کر بشیتر عیسائی گھروں میں جو سلوک عورتوں سے ہوتا ہے وہ اس سے بدتر ہے جو مسلمانوں کے گھروں میں ہوتا ہے ۔ اسلام کی تعلیم ایک خاص طبقہ کے لیے نہیں ۔ بلکہ تمام طبقات کے لیے ہے اس لیے اس کی ہدایات میں بھی وسعت پائی جاتی ہے ۔ قرآن کریم نے ان شریف عورتوں کا بھی ذکر کردیا جن سے اگر نادانی سے کوئی قصور سرزد ہو تو تھوڑی نصیحت ہی ان کیلئے کارگر ہوجاتی ہے اور وہ اپنے قصور سے رجوع کرتی ہیں ۔ پھر ان شریف عورتوں کا بھی ذکر کردیا جن کے لیے خاوند کا محبّت سے نہ بولنا ہی کافی سزا ہے ۔ پھر اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ ایک طبقہ عورتوں کا ہر ملک اور ہر قوم میں وہ ہے جن کے خیالات بہت سطحی ہیں ۔ اور جن کے لیے نہ نصیحت کارگر ہوتی ہے ۔ نہ محبت کے میل جول کے انقطاع سے ان پر کچھ اثر ہوتا ہے ۔ ایسی عورتوں کے لیے دو ہی راہیں کھلی تھیں یا یہ کہ ان کو طلاق دیکر ہمیشہ کیلئے الگ کردیا جائے یا یہ کہ ان سے کچھ اور زیادہ سختی برتی جائے ۔ اسلام چونکہ طلاق کو ابغض الحلال عنداللّٰہ قرار دیتا ہے ۔ اس لیے طلاق سے پہلے اصلاح کی ہر ایک مناسب صورت کی تلقین دیتا ہے اور عورتوں کے اس طبقہ کے لیے جن کا اخلاقی احساس گرا ہوا ہو بطور اصلاح مارنے کی اجازت بھی دی ہے۔

اس دلیل کی صداقت خود نبی کریم صلعم کے الفاظ سے ظاہر ہے ۔ چنانچہ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ نے اس حدیث کو بیان کیا ہے کہ ایک موقعہ پر جب خاوندوں کی سختی کی شکایت نبی کریم صلعم کے پاس پہنچی تو آپ نے فرمایا لقد اطاف بآل محمّد النساء کثیر یشتکین من ازواجھن لیس اولئک بخیارکم ۔ یعنی ہمارے

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

اور اگر تم کو دونوں (میاں بیوی) میں باہم دشمنی کا ڈر ہو تو ایک فیصلہ کرنیوالا اس (مرد) کے لوگوں میں سے اور ایک فیصلہ کرنیوالا اس (عورت) کے لوگوں میں سے مقرر کرو اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے اللہ ان میں موافقت کردے گا بیشک اللہ جاننے والا خبردار ہے[654]

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا

اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو

گھروں میں بہت سی عورتیں آئی ہیں جو اپنے خاوندوں کی شکایت کرتی ہیں۔ یہ لوگ تم میں سے اچھے لوگ نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ اجازت بی بی کو مارنے کی اعلیٰ طبقہ کے لیے نہیں بلکہ ادنیٰ طبقہ کے لیے ہے پس جب تک ایک ایسا طبقہ دنیا میں موجود ہے جن کے لیے مار کی سختی کی ضرورت بھی ہے اور بہتیرے عیسائی خاوند اپنی عورتوں کو بڑی بڑی بیدردی سے بھی مارتے ہیں، تو اسلام کا یہ حکم قابلِ اعتراض نہیں۔ ہاں مزید احتیاط کے لیے نبی کریم صلعم نے یہ بھی حکم دیدیا ہے کہ سخت ضرورت کے وقت اگر عورت کو مارا جائے تو وہ سخت مار نہ ہونی چاہیئے بلکہ ایسی مار ہو جس کا اثر نہ ہو۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع میں فرمایا واتقوا اللہ فی النساء فانھن عندکم عوان ولکم علیھن ان لا یوطئن فرشکم احدا تکرھونہ فان فعلن واضربوھن ضربا غیر مبرح یعنی عورتوں کے بارہ میں اللہ کا تقوےٰ اختیار کرو کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں اور تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ تمہارے گھر میں کسی دوسرے کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کو مارو مگر صرف ایسا جس کا اثر نہ ہو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مارنے کی اجازت سخت جرم پر ہے۔ نبی کریم صلعم کا اپنا پاک نمونہ یہی ہے کہ آپ نے اپنی ساری عمر میں کبھی کسی بی بی کو مارا نہیں۔ حالانکہ آپ کے پاس نو بیبیاں تھیں اور سوتوں میں اکثر جھگڑے ہو جاتے ہیں جن سے مرد غضب میں آکر ان پر زیادتی کر بیٹھتے ہیں۔ مگر آپ نے ایسے معاملات میں بھی ہمیشہ ایسی فراخدلی سے کام لیا کہ جو لوگ آنحضرت صلعم کو اپنا نمونہ بنانا چاہتے ہیں وہ کبھی بھی اپنی بیبیوں پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتے بلکہ خیرکم خیرکم لاھلہ کو مدّنظر رکھ کر کہ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بی بی کے ساتھ بہترین سلوک کرنیوالا ہو۔ اپنے حسن اخلاق کو گھر سے شروع کرنے کی کوشش کریں گے۔

آخر پر فرمایا کہ اگر بی بی اطاعت کرے تو پھر اس پر الزام لگانے کی راہ تلاش نہ کرو۔ اس کی اطاعت سے مراد یہاں اس کا اپنے نشوز کو ترک کر دینا ہی ہے۔ ان الفاظ سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اوپر کی ترتیب تدریجی ہے۔ اگر پہلے مرحلہ پر وعظ و نصیحت سے عورت مان جائے تو دوسرے مرحلہ کی نوبت نہیں آنی چاہیئے۔ ہاں پہلے مرحلہ پر نہ سمجھے تو پھر دوسرے طریق سے اس کو سمجھایا جائے۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ اوّل زبان سے نصیحت کرے اگر رُک جائے تو اس پر کوئی الزام نہیں لیکن اگر انکار کرے تو اس سے مفارقت کرے پھر بھی انکار کرے تو مارے پھر بھی انکار کرے تو دو حکم مبعوث کیے جائیں۔

ع۶۵۴ حکما۔ حَکَم اور حَاکِم قریباً ایک ہی معنی میں آتے ہیں اور الحکم اور الحاکم اور الحکیم اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے شمار کیے گئے ہیں اور حَکَمَ کے اصل معنی ہیں روک دیا۔ اور حاکم کو حَاکِم اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ظلم سے لوگوں کو روکتا ہے اور حَکَم حاکم سے زیادہ بلیغ ہے (رغ)

یوفق۔ وفق سے ہے اور وِفْق کے معنی دو چیزوں میں مطابقت ہیں جیسے جزآء وفاقا (النبأ۔ ۲۶)

میاں بی بی میں باہم فساد کی صورت میں دو حکم مقرر کرنے کا حکم یہ وہ صورت ہے جب دونوں یعنی میاں بی بی میں فساد اور عداوت کی صورت ہو۔ شقاق بینھما سے اس کو اس لیے تعبیر کیا کہ خاص طور پر ایک کی طرف فساد منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ پس یہ دیکھنے کو کہ ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے اور کس طرح پر موافقت میاں بی بی میں ہو سکتی ہے۔ دو حکم یا سرپنچ مقرر کرنے کا حکم ہے۔ ایک خاوند کے اہل میں سے ایک بی بی کے اہل میں سے۔ کیونکہ ایسے حکم بہ نسبت اجنبیوں کے اصل حالات سے اور دونوں کے مزاج سے زیادہ واقف ہونگے فابعثوا میں حکم حکام کو ہے۔ یعنی جو صاحب اختیار حاکم ہوں۔ اگر ایسے حاکم میسّر نہ آئیں تو مسلمانوں کی جماعت ہی کا یہ کام ہے بجائے اس کے کہ ایسے معاملات میں حاکم خود تحقیقات کرے اسے دو حکم مقرر کر دینے کا حکم ہے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ باہمی فساد یا رنجش کے معاملات میں بہت سے امور ایسے ہوتے ہیں جو عوام میں ظاہر کرنے کے قابل نہیں ہوتے اور عدالتوں کی کارروائی کھلی ہوتی ہے اور سب لوگوں کے علم میں آتی ہے جن لوگوں نے عیسائی ممالک میں مقدمات طلاق کی کارروائیوں کو عدالتوں میں دیکھا ہے اور پڑھا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ اس قسم کے مقدمات سے کس قدر فحش لٹریچر دنیا میں شائع ہوتا ہے اور اس کا کیسا مخرب اخلاق اثر دوسرے لوگوں پر ہوتا ہے۔ وہ اس حکم کی حکمت کو خوب سمجھ سکتے ہیں کہ بجائے عدالت میں فیصلہ کے حکم مقرر کرنے کی ہدایت کیوں کی ہے۔ پھر دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ حکم جو اہل میں سے مقرر کیے جاتے ہیں۔ وہ حالات سے طبائع سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور غرض انکی زیادہ تر اصلاح ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ نے ایسے جھگڑے میں حکم مقرر کرکے ان کے فیصلہ کو قطعی قرار دیا مسلمانوں کا عمل ان ہدایات پر بالکل نہیں رہا۔ اور اس لیے عورتیں سخت دُکھ اٹھا رہی ہیں کس قدر قابلِ تعریف ضابطہ تھا کہ اگر اختلاف بڑھتا ہُوا نظر آئے تو دو پنچ موافقت کرانے کی کوشش کریں۔ ہاں موافقت بالکل ناممکن ہو تو طلاق دلا دیں۔ اب ہر ایک گھر میں اپنی حکومت ہے اور مرد جس طرح چاہتے ہیں عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں جس کا نتیجہ ساری قوم بھگت رہی ہے اور قرآن کریم کی تعلیم پس پشت پھینکی جا رہی ہے۔

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى
وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ
وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ ﴿۳۶﴾

اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور قریبیوں کے ساتھ بھی اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور پاس والے ساتھی اور مسافر اور ان کے ساتھ بھی جن کے تمھارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے ۶۵۵ اللہ اسے پسند نہیں کرتا جو تکبر کرنے والا فخر کرنے والا ہے ۶۵۶

ع۶۵۵ الجار ذی القربیٰ۔ جار وہ ہے جس کی جائے سکونت تمہارے قریب ہو (غ) اور الجار ذی القربیٰ سے مراد یا قریب کا ہمسایہ ہے یا قریبی تعلق والا ہمسایہ بلحاظ نسب ہو یا اخوتِ دینی۔

الجار الجُنُب۔ جنب کے اصل معنی پہلو ہیں۔ جنب ۔ اجنب ایک پہلو پر یا دور ہوگیا۔ الجار الجنب دور کا پڑوسی ہے کیونکہ چالیس گھر تک پڑوس کا حق ہے اور یا مراد ایسا پڑوسی ہے جس سے نسب کا یا اخوت قومی کا تعلق نہیں۔ مثلاً ہندو یا عیسائی۔

الصاحب بالجنب کے لفظی معنی پاس کا ساتھی یا ہمنشین ہیں۔ رفیق سفر، رفیق تعلیم، رفیق پیشہ، رفیق مسجد سب اس کے اندر آجاتے ہیں۔

قرآن کریم ہمیشہ خاص سے عام اور عام سے خاص کی طرف رجوع فرماتا ہے۔ بیبیوں سے حسن سلوک کے نصائح کو تمام کرکے اور ان کے حقوق کی طرف توجہ دلاکر اب کل مخلوقات سے حسن سلوک کی طرف اور ان کے حقوق کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ مگر مخلوقات سے حسن سلوک کی اصل بنا یہ ہے کہ ان سب کا خالق ایک ہے اس لیے اللہ کی عبادت سے شروع کیا۔ پھر ماں باپ سے احسان کا ذکر کیا پھر قریبیوں سے پھر یتیموں اور مسکینوں سے۔ پھر پڑوسیوں سے۔ احسان یا نیکی کرنے کی تعلیم ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔ مگر اسلام نے پڑوسی کے حق کو بہت وسیع کیا ہے اور دو قسم کے ہمسایوں کا ذکر کیا ہے۔ اول قریبی یا قرابت والے ہمسائے۔ دوسرے دور کے یا اجنبی ہمسائے۔ اور یوں یہود و نصاریٰ مشرکین تک کو اس احسان میں شامل کرلیا ہے۔ احادیث اس بارہ میں بکثرت مروی ہیں کہ نبی کریم صلعم پڑوسیوں سے کس قدر حسن سلوک کی تاکید فرماتے تھے۔ چنانچہ صحیحین میں ایک حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جبرائیل مجھے ہمسایہ کے متعلق کہتے رہے یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ اس کو ورثہ دلایا جائیگا پھر صاحب بالجنب کے ساتھ احسان کی تاکید فرمائی۔ یعنی جو شخص ایک انسان کے پاس بیٹھتا ہو۔ مثلاً ایک استاد کے دو شاگرد یا ایک پیشہ کے دو شریک یا ایک دفتر کے دو ملازم یا ایک تجارت کے دو کرنے والے۔ یا ایسے شخص جو کبھی سفر یا حضر میں ایک دوسرے کے ہمنشین ہوئے ہوں۔ مسجد میں دو نماز پڑھنے والے بھی ایک دوسرے کے صاحب بالجنب ہوجاتے ہیں۔ پھر اس سے اُتر کر مسافر ہیں اس لیے کہ گو ان کا تعلق تو انسان سے کسی قسم کا نہیں مگر وہ مدد کے محتاج ہیں اور سب سے آخر وہ جن پر انسان کا تصرف ہے خواہ انسان ہوں جیسے نوکر یا غلام جو قید ہو کر انسان کے تصرف میں آجاتے ہیں۔ یا حیوان جو انسان کی ملک میں ہیں۔ کیونکہ حیوان بھی انسان کی نیکی کے محتاج ہیں۔ بیبیوں سے حسن سلوک کے ذکر کے بعد اس ذکر کو لانے کا منشاء یہ ہے کہ ایک نیکی سے دوسری نیکی کی طرف قدم اُٹھے جیسا کہ خیرکم خیرکم لاهله میں فرمایا ہے گویا بی بی سے حسن سلوک سے دوسروں سے حسن سلوک کی طرف قدم اٹھتا ہے

غلاموں سے حسن سلوک میں اسلام نے ایسا کمال دکھایا ہے جس کی نظیر کسی مصلح میں ہم کو نہیں ملتی۔ چنانچہ ہمارے نبی کریم صلعم کی آخری نصیحت مسلمانوں کو یہی تھی اور حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آخری وقت میں آپ یہ لفظ دوہراتے جاتے تھے۔ الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم نماز اور تمھارے مملوک یعنی ان ہر دو کی بہت خبر رکھو اور بعض احادیث میں آتا ہے کہ جو کھانا پکے یا انسان خود کھائے اس میں سے کچھ اپنے غلام یا خادم کو بھی کھلائے۔ چنانچہ بخاری اور مسلم کی حدیث ہے فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمه ممّا یاکل ولیلبسه ممایلبس ولا تکلفوھم ما یغلبھم فان کلفتموھم فاعینوھم۔ یعنی جس کے تصرف میں اس کا بھائی ہو تو چاہیئے کہ جو خود کھاتا ہے اسے کھلائے اور جو خود پہنتا ہے اُسے پہنائے اور ان پر اس قدر کام کی مشقت نہ ڈالو جس کے نیچے وہ دب جائیں اور اگر تم ان کو مشقت کا کام دو تو ان کی مدد کرو۔ ایسا ہی حیوانات کے ساتھ نیکی کا حکم بھی احادیث میں پایا جاتا ہے۔

ع۶۵۶ مختال۔ اس کا مادہ خیل ہے اور خیال ایک مشہور لفظ ہے اسی سے خیلاء ہے جس کے معنی تکبر ہیں۔ کیونکہ انسان اپنے نفس کے لیے ایک فضیلت کا خیال باندھ لیتا ہے (غ) اور اسی سے حدیث میں آتا ہے من جرّ ثوبہ خُیَلاء لم ینظر اللہ الیه جو اپنا کپڑا تکبر سے نیچا چھوڑتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔ اور اختال کے معنی ہیں وہ متکبر ہوا۔ اور مختال وہ مالدار بخیل ہے جو بڑا بنتا ہے۔ وہ جاہل جو اپنے قریبیوں سے جب وہ محتاج ہوں یا اپنے ہمسایوں سے جب وہ محتاج ہوں عار کرتا ہے (ل)

فخور۔ فخر سے ہے جس کے معنی ہیں ان چیزوں میں جو انسان سے باہر ہیں اپنی بڑائی ظاہر کرنا (غ) جیسے مال اور مرتبہ پس مختال اور فخور میں ایک فرق تو یہ ہے کہ مختال اپنے نفس کو فضیلت دینے سے کہلاتا ہے اور فخور مال و مرتبہ وغیرہ کی بڑائی کی وجہ سے۔ اور دوسرے یہ کہ مختال اپنے طرز عمل سے بنتا ہے یعنی اس کا سلوک دوسروں سے متکبرانہ ہوتا ہے اور فخور زبان سے اپنی بڑائی ظاہر کرتا ہے اور یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ انسان کے پاس مال کا ہونا یا اس کا بلند مرتبہ پر ہونا یا اس کا اپنے جسم اور لباس کو اچھی حالت میں رکھنا یہ امور تکبر میں داخل نہیں۔ بلکہ تکبر صرف وہی ہے جہاں دوسرے انسانوں کی حق تلفی ہو۔ چنانچہ

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ ﴿٣٧﴾

جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کرنے کا حکم دیتے ہیں، اور اسے چھپاتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا ہے اور ہم نے کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۶۵۷ع

وَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿٣٨﴾

اور جو اپنے مالوں کو لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور نہ پیچھے آنے والے دن پر اور جس کا ساتھی شیطان ہو تو وہ بہت ہی بُرا ساتھی ہے ۶۵۸ع

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿٣٩﴾

اور ان پر کیا وبال آجاتا اگر یہ اللہ اور پیچھے آنے والے دن پر ایمان لاتے اور اس میں سے خرچ کرتے جو اللہ نے ان کو دیا تھا اور اللہ ان کو خوب جانتا ہے ۶۵۹ع

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ

اللہ ایک ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر وہ نیکی ہو (تو) وہ اس کو کئی گنا بڑھاتا ہے اور اپنے پاس

ثابت بن قیس سے مروی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے تو آپؐ نے یہ آیت ان اللہ لا یحب من کان مختالاً فخوراً پڑھی اور تکبّر اور اس کی بُرائی کا ذکر کیا، تو ثابتؓ رو پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے دریافت کیا کہ کیوں روتے ہو۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ میں تو ایک ایسا آدمی ہوں کہ خوبصورتی سے محبّت رکھتا ہوں یہاں تک کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میری جوتی کا تسمہ بھی خوبصورت ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تو تم اہل جنت میں سے ہو۔ انہ لیس بالکبر ان تحسن راحلتك ورحلك ولكن الكبر من سفه الحق وغمص الناس (د) یہ تکبر نہیں کہ تم اپنی سواری اور پالان کو اچھا بناؤ بلکہ متکبّر وہ ہے جو حق کو ہلکا جانتا ہے اور لوگوں کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہے۔ آج کل کی تہذیب اکثر لوگوں کو مختال اور فخور ہی بناتی ہے وہ خود بڑے بنکر لوگوں کو حقیر و ذلیل جانتے ہیں اور ان کو پورا انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں دیتے۔ احسان یا نیکی کا کرنا تو ایک طرف رہا جب پہلے حصّہ آیت میں مخلوق خدا سے احسان کی تعلیم دی تو اسی مناسبت سے اس کا خاتمہ ان لوگوں کے ذکر پر کیا جو بجائے دوسروں سے احسان کرنے کے ان پر اپنی بڑائی جتاتے اور ان کے حقوق کو پاؤں تلے روندتے ہیں۔

ع۶۵۷ اس آیت میں مختال و فخور کا ایک وصف بیان کیا ہے کہ یہ لوگ خود بخل کرتے ہیں۔ اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی ہدایت کرتے ہیں۔ گویا یہ بدی ان کے نزدیک اس قدر محبوب ہو گئی ہے کہ وہ دوسروں کو بجائے نیکی کا حکم کرنے کے اس بدی کا حکم کرتے ہیں۔ پھر تیسرا مرتبہ ان کے انتہائے بخل کا یہ بیان کیا کہ جو کچھ اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا ہے اسے چھپاتے ہیں۔ مثلاً علم کے متعلق بھی بخل کرتے ہیں۔ یا اپنے اخلاق میں بھی دوسروں سے بخل کرتے ہیں۔ اگر خود کچھ علم حاصل کر لیں تو اب یہ نہیں چاہتے کہ دوسروں کو بھی وہ علم دیں۔ اور آخر میں واعتدنا للکافرین کہہ کر یہ بتا دیا کہ یہ اوصاف کافروں کے ہیں۔

ع۶۵۸ قرین قرن سے ہے جس کے معنی دو یا زیادہ چیزوں کا اجتماع ہے۔ خواہ وہ اجتماع کسی معنی میں ہو۔ شیطان کا قرین انسان ہونا بدی میں اس کا ساتھی ہونے کے لحاظ سے ہے۔

اس میں مختال فخور کا دوسرا وصف بیان کیا کہ اگر ایک طرف بخل کرتا ہے، تو دوسری طرف محض دکھاوے کے لیے نمود کے طور پر رسم و رواج کے اتباع میں برادری اور بڑائی کے خیال سے اپنا مال خرچ بھی کرتا ہے۔ اگر آج مسلمانوں کی حالت دیکھی جائے تو کثیر حصّہ اسی کا مصداق ثابت ہو گا۔ حکام کو خوش کرنے کے لیے، برادری میں ناک رکھنے کے لیے اور دکھاوے کے رنگ میں جائدادیں بھی بیچ لیں گے۔ مگر خدا کی راہ میں دینے کا نام آئے تو چند پیسے خرچ کرنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔

ع۶۵۹ ماذا علیہم۔ توبیخ کے لیے ہے اور مراد ہے کہ کیا وبال یا ضرر ان کو پہنچتا اگر یہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے۔
پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ دکھاوے کے لیے خرچ کرنے والوں کا ایمان اللہ اور یوم آخر پر کچھ نہیں ہوتا جو شخص خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے ہچکچاتا ہے درحقیقت اس کا ایمان اللہ اور یوم آخر پر بھی کم ہوتا ہے۔ اور یہاں اٰمنوا باللہ والیوم الاٰخر سے مراد ایمان کامل ہی ہے۔ وہی ایمان جس کا ذکر اس قسم کی آیات میں

اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٤٠﴾	سے بڑا اجر دیتا ہے ع۶۶۰
فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ	پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر ایک امت سے گواہ لائیں گے
وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿٤١﴾	اور تجھ کو ہم ان پر گواہ لائیں گے ع۶۶۱
يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ	اس دن وہ جنھوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی ،
لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ	آرزو کریں گے کہ کاش زمین اُن پر برابر کر دی جاتی اور اللہ
ع اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿٤٢﴾	سے کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے ع۶۶۲

آتا ہے یایہا الذین امنوا امنوا باللہِ وَرسولہ۔

ع۶۶۰ مثقال۔ثقل سے ہے اور مثقال کے معنی ہیں وہ جس کے ساتھ وزن کیا جائے اور وہ ایک خاص وزن بھی ہے جو چوبیس قیراط کے برابر ہے اور مطلق مقدار پر بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں مقدار ہی مراد ہے۔

ذرّۃ - ذرر سے مشتق ہے ذرّ الشیَٔ کے معنی ہیں کسی چیز کو انگلیوں کی پوروں سے لینا پھر اس کو کسی چیز پر چھڑک دینا اور ذرّۃ (جس کی جمع ذرّ آتی ہے) چیونٹی کے نئے پیدا ہوئے ہوئے چھوٹے بچوں کو کہتے ہیں۔ ان میں سے سو کا وزن ایک جو کے دانہ کے برابر ہوتا ہے اور بعض نے کہا کہ ذرّہ کا وزن کچھ نہیں ہوتا اور وہ وہ چیز ہے جو کسی مکان میں سورج کی کرنیں داخل ہوں، تو اُڑتی ہوئی نظر آتی ہے (ل) کچھ وزن نہ ہونے سے بھی مراد اتنا کم وزن ہوتا ہے کہ ہوا میں وہ ذرّات خود بخود اُڑتے ہیں بعض نے چھوٹی سُرخ چیونٹی کو ذرہ کہا ہے اور ابن عباسؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ اس چیونٹی کا سر ذرّۃ کہلاتا ہے (ر)

یہ آیت پچھلی آیت کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے۔ پچھلی آیت میں انفاق اور حقوق العباد کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا تھا کہ جو کچھ کوئی خرچ کرے گا اللہ اس کو جانتا ہے یعنی اس کا اجر دے گا۔ اگر اجر نہ دے تو گویا اس نے ایک نیک فعل کے اجر کو ضائع کر دیا۔ اور یہ ایک ظلم ہے مگر خدا کی ذات میں ایک ذرہ برابر بھی ظلم روا نہیں رکھا جا سکتا پس اصل غرض یہی سمجھانا ہے۔ کہ اللہ کسی اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اگر وہ فعل حسنہ یعنی نیکی کا ہے تو ضائع کرنا کہاں۔ اس کو اللہ تعالیٰ کئی گنا بڑھاتا ہے اور یہ بھی اشارہ ہے کہ ان اصول کو چھوڑ کر مسلمان دکھ اور تکلیف اُٹھائیں گے وہ خدا کی طرف سے ظلم نہیں۔

ع۶۶۱ یہاں بتایا کہ مسلمانوں کے مصائب رسول کی تعلیم سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے رسول کی شہادت کا ذکر کیا اور بتایا کہ جس طرح دوسری اُمتوں کے رسول ان اُمتوں پر گواہ ہوں گے۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّتِ محمدیہ پر گواہ ہونگے۔ ھٰؤلاء میں اشارہ بعض مفسرین نے انبیائے سابقین یا من کل اُمّۃ بشہید کی طرف لیا ہے مگر یہ درست نہیں۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ ھٰؤلاء سے مراد اُمّت محمدیّہ ہے اور یہ اسی کے مطابق ہے۔ جو دوسری جگہ فرمایا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا (البقرۃ ۲ - ۱۴۳) اور صحیح بخاری میں یہ حدیث ہے کہ حضرت ابن مسعود نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ تو ابن مسعود نے کہا یا رسول اللہ میں آپ کو پڑھ کر سناؤں اور آپ پر تو نازل ہی ہوا ہے۔ فرمایا ہاں مجھے پسند آتا ہے کہ میں دوسروں سے سنوں۔ تو حضرت ابن مسعود نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی۔ یہاں تک کہ آپ اس آیت پر آئے فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید وجئنا بک علی ھٰؤلاء شہیدا۔ تو آپ نے فرمایا بس کرو اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ابن ابی حاتم نے ایک دوسرے صحابی سے اس حدیث کو یوں بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابن مسعود اور صحابی تھے تو آپ اسی طرح قرآن کریم سن رہے تھے۔ جب پڑھنے والا اس آیت پر پہنچا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رو پڑے اور فرمایا یارب ھٰذا اشھدت علی من انا بین اظہرھم فکیف بمن لم ارہ (ث) اے رب ان پر تو میں گواہی دونگا (یعنی یہ کہ انہوں نے میری فرمانبرداری کی) جو میرے سامنے ہیں لیکن ان کی گواہی کس طرح دوں گا جن کو میں نے نہیں دیکھا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہاں ھٰؤلاء سے مراد آپ کے پیرو ہی ہیں اسی کی تائید میں ابن جریر نے ایک حدیث بیان کی ہے جس کے راوی ابن مسعود ہی ہیں کہ اس موقعہ پر پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا شہید علیہم مادمت فیہم فلمّا توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم یعنی میں ان پر گواہ ہوں جب تک میں ان میں ہوں۔ پھر جب تو مجھ کو وفات دے تو تو ہی اُن پر نگران ہے۔ اور اس کی تائید بخاری کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو آیت قرآنی فلما توفیتنی کے نیچے انہوں نے بیان کی ہے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا رونا اس لیے تھا کہ آپ کو اُمت کی پچھلی حالت کی خبر دی گئی تھی۔

ع۶۶۲ الّذین کفروا وعصوا الرسول میں بعض نے وَعصوا الرسول کو جملہ معترضہ قرار دیا ہے بمعنی وقد عصوا الرسول یعنی انہوں نے رسول کی نافرمانی کی تھی۔ اس سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کا کفر رسول کی نافرمانی ہے اور یا اصل مقصود تو رسول کی نافرمانی کرنے والوں کا ذکر ہے جیسا کہ پچھلی آیت سے ظاہر ہے۔ لیکن ساتھ کفار کا ذکر بھی بڑھا دیا ہے اور یوں بتا دیا ہے کہ رسول کی نافرمانی کرنے والا گروہ کافروں کے ساتھ ملتا ہے جزا وسزا کے وقت یہ خواہش کریں گے کہ مٹی میں ملے رہتے اور ان کی دوبارہ زندگی نہ ہوتی یا یہ کہ وہ پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے۔

جو لوگ حقوق العباد ادا نہیں کرتے یا حقوق اللہ ادا نہیں کرتے اور یوں رسول کی نافرمانی کرتے ہیں ان کے ذکر کو کفار کے ذکر کے ساتھ مقرون کرکے فرمایا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ
وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ
وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى
تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي
سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نماز کے نزدیک جاؤ
جب تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ سمجھنے لگو جو کہتے ہو
اور نہ جنابت کی حالت میں سوائے اس کے راستہ گزر رہے ہو،
یہاں تک کہ غسل کر لو[۶۶۳] اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو
یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے۔ یا

کہ جب جزا و سزا کا وقت آئے گا تو پھر ان لوگوں کو اپنی زندگی پر افسوس ہوگا اور وہ چاہیں گے کہ دوبارہ نہ اُٹھائے جاتے اور زمین میں ہی دبے رہتے۔ مگر وہ ایسا وقت ہوگا کہ جو کچھ کیا ہے سب ظاہر ہو جائے گا۔ اور جس طرح دنیا میں چھپ چھپ کر بدیاں کر لیتے ہیں وہ اخفا کا پردہ وہاں نہ رہیگا اور کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے اور یا لو تسوّٰی بھم الارض کی طرح یہ بھی ان کی خواہش ہے اور اس کا تعلق یود الذین سے ہے یعنی ایک تو یہ خواہش کریں گے کہ وہ دوبارہ زندہ نہ کیے جاتے اور دوسرے یہ کہ انہوں نے اللہ سے کوئی بات دنیا میں چھپائی نہ ہوتی اور اس کے دیئے ہوئے قویٰ کو ٹھیک محل پر لگایا ہوتا کیونکہ ان قویٰ کا اپنے محل پر نہ لگانا یہ بھی کتمان میں ہی داخل ہے۔

۶۶۳ الصلوٰۃ کے معنی بیان ہو چکے دیکھو ۱۲ء اور نماز کی جگہ کو بھی صلوٰۃ کہتے ہیں (رغ) لھدّمت صوامع وبیع وصلوٰت ومساجد (الحج ۲۲-۴۰) جہاں صلوات سے مراد عام عبادتگاہیں ہیں۔ یا کنائس یعنی یہودیوں کی عبادتگاہیں۔ یہاں لفظ صلوٰۃ سے مسجد مراد ہے اور چونکہ اصل نماز مساجد میں ہی ہے۔ اس لیے نماز کا مفہوم خود اس کے اندر شامل ہے۔

سکاریٰ۔ سکران کی جمع ہے۔ جو سُکر سے ہے۔ یعنی وہ حالت جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہوتی ہے (رغ) یعنی جب اس کے ہوش و حواس پورے درست نہیں ہوتے۔ اور اس کا اکثر استعمال شراب میں ہے یعنی شراب پی کر جب انسان کی عقل جاتی رہے تو اس کو سُکران کہا جاتا ہے۔ لیکن غضب و عشق وغیرہ سے بھی یہ حالت انسان کو پہنچتی ہے (رغ) اور لسان العرب میں ہے کہ سکر تین ہیں یعنی جوانی کا سکر اور مال کا سکر اور غلبہ کا سکر اور اسی میں آیت زیر بحث کی تفسیر میں لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک یہاں سکر النوم مراد ہے۔ یعنی نیند کا نشہ یا وہ حالت جب نیند کے غلبہ سے انسان کی عقل میں فتور آجاتا ہے اور سکرۃ الھمّ والنوم بھی کہا جاتا ہے یعنی غم اور نیند میں سکرۃ کی حالت ہو جانا۔ اور قرآن کریم میں سکرۃ الموت آیا ہے اور یہ وہ حالت ہے جب موت کی شدّت سے غشی آتی ہے۔

جنب۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو حالت جنابت میں ہو اور اس کا استعمال مذکر مونث واحد جمع میں یکساں ہوتا ہے اور اس کا اشتقاق جنب سے ہے جس کے معنی پہلو ہیں (رغ) اور اس کو حالت جنابت اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس حالت میں حکم شریعت میں نماز سے ایک طرف رہنا چاہیئے۔ اور نہایہ میں ہے کہ جُنُب وہ ہے جس پر جماع اور خروج منی سے غسل واجب ہے۔

عابری سبیل۔ عابری عبور کرنے والے۔ عابری سبیل سے مراد حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک راستہ گزرتے ہوئے ہے یعنی مسجد میں سے صرف گزر جانا حالت جنابت میں جائز ہے۔ بیٹھنا جائز نہیں۔ اور بعض نے عابری سبیل کے وسیع معنی مسافر لیے ہیں۔ یعنی حالت سفر کو حکم سے مستثنیٰ کیا ہے۔

پچھلے رکوع میں مسلمانوں کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی طرف توجہ دلائی تھی اس رکوع میں یہودیوں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے احکام سے انسان انحراف کرتا ہے تو اس کی نوبت کہاں تک پہنچتی ہے اور چونکہ پاکیزگی کی راہوں کو چھوڑ کر انسان بڑی بڑی بلاؤں میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لیے سب سے پہلے نماز کے ذکر سے اس مضمون کو شروع کیا۔ کیونکہ نماز تزکیہ نفس انسانی کے لیے سب سے بہتر علاج ہے مگر ایک مسلمان کی نماز کبھی ہو اس کے ساتھ سکر اور جنابت کی حالت جمع نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ وہ کسی دوسرے ذریعہ سے لذت کو حاصل کر چکا ہے اس لیے وہ کمال لذت جو ذکر الٰہی میں حاصل ہوتی ہے اس کو ادنیٰ لذات نفسانی سے ممتاز کر دیا ہے۔ جنابت اور حالت سُکر کو اکٹھا کرنے کی یہ بھی وجہ ہے کہ دونوں میں اعلیٰ درجہ کا جسمانی سرور انسان کو حاصل ہوتا ہے اور نماز کو دونوں حالتوں میں روک کر بتایا ہے کہ وہ روحانی سرور جو نماز سے حاصل ہوتا ہے اس کا کیسا بلند مقام ہے کہ ان جسمانی سروروں کو اس کے مقابلہ میں کوئی وقعت حاصل نہیں۔ اسی مضمون کی طرف اس حدیث میں بھی اشارہ ہے حُبّب الیّ من دنیاکم الطیب والنساء وجُعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ (بخاری) تمہاری دنیا سے میری طرف خوشبو اور عورت کو محبوب بنا دیا گیا ہے۔ مگر میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور میری حقیقی راحت نماز میں ہے یعنی گو ان چیزوں میں انسان کے لیے سرور اور لذت ہے مگر قرت عین یا حقیقی راحت صرف نماز میں یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں ہے۔

شراب کی قطعی حرمت سے پہلے حالت سکر سے روکنا: وانتم سکاریٰ کی تفسیر میں عموماً مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ یہاں سُکر سے مراد نشہ شراب ہے اور کہ یہ سورۃ مائدہ میں شراب کی حرمت کا قطعی حکم نازل ہونے سے پہلے کی آیت ہے جو حرمت شراب میں ایک ضروری تدریجی مرحلہ تھا اور بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی دعوت میں بعض مسلمانوں نے شراب پی لی اور جب نماز کا وقت آیا تو قرآن کریم کی سورۃ قل یاایّھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون کو غلط پڑھ دیا جس سے

أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ؕ ﴿۴۴﴾

تم نے عورتوں کو چھوا ہو پھر تم کو پانی نہ ملے، تو پاک مٹی کا قصد کرو پھر اپنے مونہوں اور ہاتھوں پر مسح کرلو بیشک اللہ معاف کرنے والا مغفرت کرنیوالا ہے ۶۶۴
کیا تو نے ان لوگوں (کے حال) پر غور نہیں کیا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا وہ گمراہی کو خریدتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم راستہ سے بہک جاؤ۔

معنی میں فرق آگیا۔ اور اس پر یہ تحریم نازل ہوئی۔ لیکن اگر سُکر سے مراد شراب کا ہی نشہ لیا جائے تو بھی اصل غرض یہاں سُکر سے روکنے کی ہے۔ کیونکہ پانچ اوقات نماز کی تقسیم دن رات میں اس طرح ہے کہ جو شخص حالت سُکر میں ہوگا وہ کسی نہ کسی نماز میں شامل ہونے سے رہ جائے گا اور اصل مقصود یہ نہیں کہ جب نشہ ہو جائے تو نماز مت پڑھو۔ بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ نماز تو تم نے پڑھنی ہے مگر حالت نشہ میں نماز بے معنی ہے اس لیے نشہ کی حالت سے بچو۔ اور حدیث صحیح میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا اذا نعس احدکم وھو یصلی فلینصرف ولینم حتی یعلم ما یقول جب تم میں سے کسی کو اونگھ آجائے جب وہ نماز پڑھ رہا ہو تو چاہیئے کہ واپس چلا جائے اور سو لے یہاں تک کہ جو کچھ کہتا ہے اسے جانے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے نیند کی حالت کو اسی حکم میں شامل کیا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے حالت سکر سے مراد یہاں صرف نیند کا نشہ لیا ہے۔

نماز کے لیے حضور قلب کی ضرورت: الفاظ حتّٰی تعلموا ما تقولون سے اس حکم کی علّت غائی معلوم ہوتی ہے کہ نماز ایک بے معنی حرکت نہیں۔ نہ صرف کھڑے ہونے رکوع کرنے اور سجدہ کرنے کا نام نماز ہے۔ حالانکہ یہ نماز کے ارکان ہیں۔ نہ صرف چند الفاظ منہ سے کہنے کا نام نماز ہے حالانکہ اسکے بغیر نماز نہیں ہوتی بلکہ اصل نماز یہ ہے کہ انسان کا دل کسی خاص طرف لگا ہو۔ اور اس کو یہ علم ہو کہ میرے اس فعل کا اور میرے ان الفاظ کا یہ منشاء ہے پس اصل نماز تو قلب کی ہے۔ یعنی قلب پر ایک خاص حالت کا وارد ہونا۔ اور ظاہر افعال صرف اس حالت قلبی کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ کس قدر معمولی الفاظ میں ایک باریک حکمت کی طرف یہاں اشارہ فرمایا ہے۔ دوسرے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کو نماز کے بالخصوص اور قرآن کریم کے عموماً معنی اور مفہوم معلوم ہونے چاہئیں جو لوگ صرف لفظوں کو بغیر ان کی اصلیت اور ان کے معنی جاننے کے رٹتے رہتے ہیں۔ وہ ایک نہ ایک رنگ میں حتّٰی تعلموا ما تقولون کے ماتحت آجاتے ہیں۔ پس مسلمانوں کے ہر بچّہ کے لیے تعلیم لازمی ہے۔ کیونکہ جس نے تعلیم حاصل نہیں کی وہ الفاظ کے معنی کس طرح جان سکتا ہے۔

۶۶۴ الغائط۔ غوط اس کا مادہ ہے اور غاط کے معنی ہیں کھودا۔ (ل) اس لیے غائط وسیع پست زمین کو کہتے ہیں اور چونکہ لوگ قضائے حاجت کے لیے پست زمین میں جاتے تھے تاکہ نظروں سے پوشیدہ ہو جائیں اس لیے اتی الغائط سے کنایۃً بول و براز وغیرہ مراد ہو گیا اور شریعت نے اس میں توسیع کر کے اخراج ہوا کو بھی شامل کیا ہے۔

لٰمستم۔ لمس۔ مَسّ کی طرح ظاہر جلد کے چھونے کو کہتے ہیں اور ملامسۃ جس سے لٰمستم آیا ہے کنایۃً مرد اور عورت کے تعلق پر بولا جاتا ہے۔

صعید۔ صعود کے معنی اوپر چڑھنا ہیں اور صعید وجہ الارض یعنی سطح زمین کو کہا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک غبار کو جو اوپر چڑھ جاتا ہے (غ) اس لیے تیمم میں بعض کے نزدیک سطح زمین پر ہاتھ مارنا کافی ہے خواہ اس میں گرد وغبار ہو یا نہ ہو جیسے پتھر اور بعض کے نزدیک غبار کا ہاتھ کو لگنا ضروری ہے۔

امسحوا۔ مَسْح کے معنی کسی چیز پر ہاتھ کا گزارنا اور اس سے نشان کو مٹا دینا ہیں۔ الگ الگ دونوں مفہوموں پر بھی استعمال ہوتا ہے۔

تیمم: جب حالت جنابت کا ذکر آیا اور اس کے ساتھ تطہیر یعنی غسل کا ذکر آیا جو اعلیٰ درجہ کی تطہیر ہے تو ساتھ ہی تیمم کا ذکر بھی کر دیا جو ادنیٰ درجہ کی تطہیر ہے اور گو بظاہر معلوم نہ ہو کہ مٹی سے تطہیر کس طرح ہو سکتی ہے لیکن سچ یہی ہے کہ پانی اور مٹی دونوں پاک کرنے والی چیزیں ہیں۔ اور تیمم کو اس لیے بھی ضروری ٹھہرایا کہ نماز کے لیے ایک قسم کی نیاری انسان کے اندر پیدا ہو۔ اور شاید مٹی پر ہاتھ مارنے میں انسان کے عجز کی طرف بھی اشارہ ہو۔ اور یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ گو وضو اور غسل سے طہارت ظاہری بھی حاصل ہوتی ہے اور وہ اچھی چیز ہے۔ مگر نماز کا اصل مقصود طہارت باطنی ہے۔ یہاں بیماری اور سفر اور حدث اصغر اور حدث اکبر کو اکٹھے ساتھ جمع کیا ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ انسان سفر میں نہ ہو اور پھر بھی پانی نہ ملے مثلاً پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا ایسے مقامات میں جہاں پانی بافراط دستیاب نہیں ہوتا یا صرف پینے کے لیے دستیاب ہو سکتا ہے۔

تیمم کا طریق: مسح کے طریق میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک دو دفعہ مٹی پر ہاتھ مارنا چاہیئے۔ پہلی دفعہ منہ پر پھیر لے اور دوسری دفعہ کہنیوں تک ہاتھوں پر۔ اور بعض نے ہاتھوں کو کفوں تک لیا ہے۔ مگر دو دفعہ ہاتھ مٹی پر مارنا ضروری قرار دیا ہے۔ مگر دو دفعہ ہاتھ مارنے کی روایات ضعیف ہیں اور احادیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی دفعہ ہاتھ مارنے اور صرف کفین تک ہاتھ پھیرنے کا طریق خود ہی بتایا ہے۔ چنانچہ عمارؓ نے یہ واقعہ خود بیان

وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِكُمۡ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ
وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيۡرًا ﴿۴۵﴾
مِنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا يُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ عَنۡ
مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوۡلُوۡنَ سَمِعۡنَا وَعَصَيۡنَا
وَاسۡمَعۡ غَيۡرَ مُسۡمَعٍ وَّرَاعِنَا لَـيًّۢا بِاَلۡسِنَتِهِمۡ
وَطَعۡنًا فِى الدِّيۡنِ ؕ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ قَالُوۡا سَمِعۡنَا
وَاَطَعۡنَا وَاسۡمَعۡ وَانْظُرۡنَا لَڪَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ
وَاَقۡوَمَ ۙ وَلٰڪِنۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ
فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۴۶﴾

اور اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور اللہ ہی کافی
دوست ہے اور اللہ ہی کافی مددگار ہے ؎۶۶۵
ان لوگوں میں سے جو یہودی ہوئے بعض باتوں کی ان کے موقعوں
سے تحریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے سُن لیا اور ہم نہیں مانتے
اور سُن تو نہ سنوایا جائے اور راعنا اپنی زبانیں مروڑتے ہوئے
اور دین میں طعن کرتے ہوئے اور اگر وہ (یوں) کہتے کہ ہم نے سنا
اور ہم فرمانبرداری کرتے ہیں اور سنیئے اور اُنظرنا تو ان کے لیے
بہت اچھا اور درست ہوتا لیکن اللہ نے اُن پر اُن کے کفر کی وجہ سے
لعنت کی سو وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں ؎۶۶۶

کیا ہے کہ ایک دفعہ جب وہ کسی سریہ میں تھے تو جنابت کی حالت میں ہو گئے تو آپ تیمم کے لیے مٹی کے اندر لوٹے کیونکہ پانی نہ تھا۔ جب آپ نے یہ ذکر نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم ہنسے اور فرمایا کہ تمہیں صرف اس قدر کافی تھا وضرب النّبی صلّی اللہ علیہ وسلّم بیدہ الارض ثمّ نفخ فیہا ومسح بہا وجہہ وکفیہ یعنی نبی کریم صلعم نے زمین پر ہاتھ مارے پھر اس پر پھونک ماری (تا کہ زائد مٹی اُڑ جائے) پھر آپ نے اپنے منہ اور دونوں کفوں پر مسح کیا۔

؎۶۶۵ آیت ۴۴ و ۴۵ میں یہود کا ذکر ہے۔ جیسا کہ تصریح سے آیت ۴۶ میں بیان کر دیا ہے۔ یہود کی حالت پر مسلمانوں کو اس لیے توجہ دلائی ہے کہ جب انسان نیکی اور پاکیزگی کی راہوں کو چھوڑتا ہے تو اس کی حالت کہاں تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ ان کی حالت کا انجام بتایا ہے کہ نیکی کی راہوں کو چھوڑ کر نیکی سے محبّت ہونے کی بجائے نیکی سے اس قدر عداوت اور بدی سے اس قدر محبّت ہو گئی ہے کہ بدی کو اختیار کرنے کے لیے اب اپنے مال بھی خرچ کرتے ہیں مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ پاکیزگی کی راہوں کو چھوڑ کر تمہاری بھی یہی حالت نہ ہو جائے۔

؎۶۶۶ عن مواضعہ۔ مواضع۔ موضع کی جمع ہے جو وضع سے ہے۔ کلمات کے مواضع ان کے مقام ہیں یا ان کے مفہوم مقام سے کلمات کا بدلنا تحریف لفظی ہے اور مفہوم سے بدلنا تحریف معنوی ہے۔ اور یہودی دونوں قسم کی تحریف کرتے تھے۔ مائدہ میں ہے من بعد مواضعہ (المائدہ ۵۔ ۴۱) ان کے موضعوں کے بعد ان کی تحریف کرتے ہیں یعنی حالانکہ ان کلمات کے موقع بیان کر دیئے گئے ہیں پھر بھی وہ تحریف کرتے ہیں۔

واسمع غیر مُسمَع کے ایک معنی تعریفی بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی سُن تجھے کوئی مکروہ بات نہ سنائی جائے اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اسمع مدعوا علیک بلا سمعت سُن لے تو نہ سُنے۔ کیونکہ سن وہ نہیں سکتا جو بہرہ ہو۔ اور غیر مسمع میں سمع کے معنی قبولیت بھی ہو سکتے ہیں یعنی تیری بات قبول نہ کی جائے پس یہ کلام راعنا کی طرح ذو وجہین ہے۔

طعن۔ اصل میں نیزہ مارنے پر آتا ہے مگر زبان کے ساتھ کسی کی عزت وغیرہ پر ہاتھ ڈالنے کو بھی طعن کہتے ہیں اس لیے طعن فیہ کے معنی ہیں اس کو عیب لگایا (ل)

اقوم۔ قام سے تفضیل ہے اور اقوم سے مراد اعدل ہے یعنی فی نفسہ زیادہ انصاف کی یا زیادہ راستی کی بات۔

یہودیوں کا نبی کریم صلعم سے طرزِ عمل: اس آیت میں یہودیوں کی قساوت قلبی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور نبی کریم صلعم کے ساتھ جو اُن کا سلوک تھا اس کا ذکر کیا ہے یہود و نصاریٰ کی اپنی کتب میں تحریف کا مفصل ذکر دوسری جگہ آ چکا ہے دیکھو ۱۰۱ مگر یہاں ان کی جس تحریف کا ذکر ہے وہ وہ ہے جو نبی کریم صلعم کے کلام میں وہ کرتے تھے۔ جیسا کہ سیاق کلام سے صاف ظاہر ہے۔ بعض یہودی آپ کے پاس آ بھی جاتے تھے۔ مگر بجائے اس کے کہ جو کچھ کہا جائے اس سے فائدہ اٹھائیں کبھی الفاظ کو توڑ مروڑ کر کبھی مفہوم کو بگاڑ کر کچھ اور کا اور بیان کرتے۔ یہ تحریف کلمات ہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ جب کوئی اچھی بات بھی سنتے خواہ وہ اُن کے معتقدات کے خلاف نہ ہو تو بھی کہہ دیتے کہ ہم تمہاری بات نہیں مانتے سمعنا و عصینا۔ تیسرا امر یہ تھا کہ ذو معنی کلام کرتے۔ اس کی یہاں دو مثالیں دی ہیں۔ اسمع غیر مسمع اور راعنا۔ ان تینوں قسم کی باتوں کا ذکر کر کے یعنی اوّل نبی کریم صلعم کے کلام کو بگاڑنا۔ دوسرا بھلی بات کا انکار کر دینا۔ تیسرا ذو وجہین کلام کرنا فرمایا کہ طعنا فی الدین ایسا کرتے ہیں یعنی دین اسلام میں عیب لگاتے ہوئے اور یہ اُن کے نبی کریم صلعم کو بُرا کہنے کی طرف اشارہ ہے اور فرمایا کہ اگر اس کی بجائے وہ اچھا طریق اختیار کرتے اچھی باتوں کو قبول کر لیتے۔ سمعنا و اطعنا۔ اور اگر بالمقابل کوئی بات اپنی پیش کرنا چاہتے تھے تو بجائے بد دعائیہ اور طنز کے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

اے لوگو! جن کو کتاب دی گئی ہے اس پر ایمان لاؤ، جو ہم نے اتارا ہے اس کی تصدیق کرتا ہُوا جو تمھارے پاس ہے قبل اس کے کہ ہم مونہوں کو مٹا دیں اور انھیں ان کی پیٹھ پر لوٹا دیں یا اُن پر لعنت کریں جس طرح کہ ہم نے سبت والوں پر لعنت کی اور اللہ کا حکم تو ہو ہی چکا ہوا ہے ع۶۶۷

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

اللہ نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شریک بنایا جائے اور جو اس کے علاوہ ہے وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے وہ ایک بھاری گناہ افترا کرتا ہے ع۶۶۸

کلمات کے کہنے کے صرف اسمع کہدیتے کہ ہماری بات بھی سنئے اور جو بات سمجھ نہ آتی تھی اس کے متعلق صرف کہہ دیتے کہ ہماری رعایت کیجئے یا ہمیں مہلت دیجئے کہ ہم اس پر غور کریں تو یہ ان کی بھلائی کی بات تھی اور درست طریق بھی یہی تھا۔ اور یوں ایک پُرحکمت طریق سے ان کو سمجھایا ہے کہ ان کا طریق کس قدر خلاف عقل اور خلاف آداب ہے۔

ع۶۶۷ نطمس وجوھا۔ طمس کے اصل معنی ہیں محو کرکے نشان کا دور کردینا (غ) فاذا النجوم طمست (المرسلٰت ۷۷-۸) ربنا اطمس علیٰ اموالھم (یونس۱۰-۸۸) اور لو نشآء لطمسنا علیٰ اعینھم (یٰس۳۶-۶۶) میں ان کی آنکھوں کی روشنی کا دُور کردینا اور آنکھوں کا محو کردینا مراد ہے (غ)

وجوہ۔ وجہ کی جمع ہے جس کے معنی منہ بھی ہیں اور توجہ بھی اور وجہ القوم کے معنی سردار بھی ہیں۔ وفلان وجہ القوم کعینھم وراسھم (غ)

پس نطمس وجوھا سے مراد تغیر حالت ہے ایسا تغیر جو ان کو ذلیل کردے جیسا کہ اگلے الفاظ فنردھا علیٰ ادبارھا سے ظاہر ہے اور یہ معنی بھی کیے گئے ہیں کہ ان کے سرداروں کو مٹا دیں یا ذلیل کردیں اور یہ بھی کہ انہیں گمراہی کی طرف لوٹا دیں (غ)

نردھا علیٰ ادبارھا۔ رَدّ کے معنی کسی چیز کے بذاتہ لوٹا دینے کے یا ایک حالت سے دوسری حالت میں کردینے کے ہیں اور ادبار۔ دُبر کی جمع ہے۔ جس کے معنی پیٹھ ہیں۔ اور مونہوں کو پیٹھوں پر پھیرنے سے مراد ہے کہ ان کی وجاہت اور اقبال کو سلب کرلیں اور ان پر ذلت اور ادبار نازل کردیں (ض) اور ایک قول یہ بھی ہے نردھم الی حیث جاء وا منہ وھی اذلمات الشام (غ) یعنی ان کو لوٹا دیں جہاں سے وہ آئے تھے یعنی ملک شام کی طرف گویا بنی نضیر کی جلا وطنی کی طرف اشارہ ہے۔ ایسے محاورات میں لفظوں کے پیچھے پڑنا اور یہ خیال کرنا کہ سچ مچ منہ پیٹھوں کی طرف ہوجائیں صحیح نہیں آخر اسی قسم کا محاورہ یہ بھی ہے یردوکم علیٰ اعقابکم (آل عمرٰن۳-۱۴۹) انقلبتم علیٰ اعقابکم (آل عمرٰن۳-۱۴۳) جیسے وہاں محاورہ کے خاص معنی ہیں ویسے ہی یہاں ہیں۔

اصحٰب السبت سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر دوسری جگہ آچکا ہے الذین اعتدوا منکم فی السبت (البقرۃ۲-۶۵)

مفعول۔ فعل تاثیر کا نام ہے جو مؤثر کی طرف سے ہو اور مفعول اصل میں تو وہ ہے جو واقع ہوچکا اور یوں بھی کہا جاتا ہے ھذا الامر مفعول جب اس کے حصول میں کوئی شک باقی نہ رہا ہو گو وہ فی الواقع وقوع میں نہ آیا ہو۔

یہود کی سزا: اس آیت میں یہود کو بتایا ہے کہ وہ اسی طرح پر عداوت اور قساوت قلبی پر اڑے رہیں گے تو ان کا انجام نہایت ہی بُرا ہوگا اور دو قسم کی سزا بیان کی گئی ہے۔ اول ان کا ذلیل کردینا اور اقبال کا ان سے لے کر اس کی جگہ ادبار وارد کردینا۔ دوسرے ان پر وہ لعنت وارد کرنا جو اصحاب سبت پر ہوئی تھی اور لعنت کے معنی چونکہ دور کردینا ہیں اس لیے ایسی سزا جس میں یہ لوگ دربدر پھریں لعنت کے مفہوم میں آتی ہے۔ پس مراد یہ ہے کہ یا ان کو عرب میں ہی ذلیل کردیں یا یہاں سے نکال دیں۔ اور وہ دربدر ہوتے پھریں۔ چنانچہ یہ دونوں قسم کی سزا ان پر وارد ہوئی۔

بندر بننے سے مراد: اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جو سزا اصحاب سبت پر وارد ہوئی وہ بندر بن جانا نہ تھا بلکہ بندروں کی طرح ذلیل ہوکر دربدر ہونا تھا کیونکہ اس سزا کو یہاں لفظ لعنت سے تعبیر کیا ہے اور دوسرے چونکہ ضروری تھا کہ وہی سزا نبی کریم صلعم کے اعدا پر بھی وارد ہو۔ اور نبی کریم صلعم کے اعدا بندر نہیں بنے بلکہ بندروں کی طرح تتر بتر ہوئے۔ اس لیے اعتداء فی السبت کرنے والوں کے بندر بننے سے بھی ان کا دربدر ہونا مراد ہے۔

ع۶۶۸ شرک کی اقسام: یہود کے ذکر میں شرک کا ذکر اس مناسبت سے ہے کہ یہودی بھی شرک میں مبتلا ہوگئے تھے۔ یہاں تک کہ قریش سے ساز باز کے لیے بتوں تک کو سجدہ کردینے سے پرہیز نہ کیا جیسا آگے مفصل ذکر آتا ہے اور دوسرے اس لیے کہ اصل غرض مسلمانوں کو پاکیزگی کی راہیں بتانا تھا تو ان کو سمجھایا ہے کہ شرک سب بدیوں کی جڑ ہے جس طرح توحید سب نیکیوں کی جڑ ہے اس سے سخت اجتناب کریں۔ شرک کیا چیز ہے؟ صرف بتوں یا چاند سورج ستاروں

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُزَکُّوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ وَ لَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا ﴿۴۹﴾

کیا تونے ان لوگوں (کے حال) پر غور نہیں کیا جو اپنے آپ کو پاکیزہ ظاہر کرتے ہیں بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور ان پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کیا جائیگا [۶۶۹]

ہواؤں وغیرہ کا پوجنا ہی شرک نہیں بلکہ یہ شرک کی وہ موٹی قسم ہے جس میں بُت پرست اور عناصر پرست قومیں گرفتار ہیں۔ اور نہ صرف یہی شرک ہے کہ کسی انسان کو فی الواقع خدا سمجھا جائے۔ جیسے ہندو کرشن یا رامچندر کو یا عیسائی مسیح کو سمجھتے ہیں۔ بلکہ ایک بڑا شرک جو اس وقت مسلمانوں میں پھیل رہا ہے وہ پیر پرستی یا علما پرستی کا شرک ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ عدی بن حاتم (جو اس واقعہ کے وقت نصرانی تھے) رسول اللہ صلعم کے پاس گئے تو آپ سورۃ توبہ پڑھ رہے تھے۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ۔ تو عدی نے کہا ہم ان کی عبادت نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا کیا یہ ٹھیک نہیں کہ جو چیز خدا نے حلال کی ہے وہ اسے حرام ٹھہراتے ہیں تو تم بھی حرام ٹھہراتے ہو۔ اور جو چیز خدا نے حرام کی ہے وہ اسے حلال بتاتے ہیں تو تم بھی حلال سمجھتے ہو۔ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا یہی ان کی عبادت ہے۔ گویا علماء اور پیروں یا سجادہ نشینوں کے اقوال کو جو کتاب اللہ کے خلاف ہوں بغیر سوچے سمجھے قبول کرتے جانا یہ بھی ایک شرک ہے اور یہ جو بعض مرید اپنے پیروں اور سجادہ نشینوں کے متعلق ایسے اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ ان کے پیر کہتے یا کرتے ہیں بس وہی حق ہے اور کتاب اللہ کی طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ اس کی پروا بھی نہیں کرتے جیسا کہ اکثر مسلمانوں کی حالت اس زمانہ میں ہے۔ یہ وہی شرک ہے جس کا ذکر اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ میں ہے اور اس شرک نے مسلمانوں کو بالکل ذلیل کر دیا ہے پھر اپنے پیروں کی دعاؤں پر اعتماد بھی شرک کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ ہر ایک گروہ اپنے اپنے پیر کے متعلق یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اس کی دعا سے یا توجہ سے ہماری مصائب ٹل جاتی ہیں۔ اس شرک میں اور اس بت پرست کے اعتقاد میں جو سمجھتا ہے کہ بت کی عبادت سے میری مصیبت ٹل جاتی ہے۔ بہت کم فرق ہے۔ یہ تو ظاہر قسمیں شرک کی ہیں۔ قرآن کریم نے ایک اور قسم کے شرک کا بھی ذکر فرمایا ہے یعنی اپنی خواہشات کی پیروی کو بھی شرک قرار دیا ہے ارأیت من اتخذ الٰھہ ھوٰہ (الفرقان ۲۵-۴۳) پھر بعض اس سے بھی باریک قسم کے شرک ہیں۔

شرک کے نہ بخشنے کی وجہ: شرک کو کیوں ایسا خطرناک جرم قرار دیا ہے؟ کیا خدا کی شان اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنے میں کچھ کم ہو جاتی ہے اس لیے وہ ایسا ناراض ہو جاتا ہے کہ بخشتا ہی نہیں؟ اگر ساری دنیا بھی خدا کے ساتھ شریک بنائے تو اس سے اس کی شان میں کوئی کمی نہیں آتی اور اگر ساری دنیا موحد ہو جائے تو اس سے خدا کی شان بڑھ نہیں جاتی۔ بات یہ ہے کہ خدا کے ساتھ شریک ٹھہرا کر انسان اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا۔ اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ صفات دیں۔ اس کو بتا دیا کہ اس عالم کی ساری طاقتیں اور ساری چیزیں ہم نے تیرے لیے مسخر کر دی ہیں وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعا منہ (الجاثیۃ ۴۵-۱۳) پس اس کو سب مخلوقات سے اشرف بنایا۔ پھر با ایں اگر وہ بتوں کے آگے یا عناصر کے آگے یا سورج چاند کے آگے یا خود اپنے بھائی انسان کے آگے عبودیت کی ذلت اختیار کرتا ہے تو وہ خود اپنے آپ کو اس اعلیٰ مرتبہ سے نیچے گرا دیتا ہے۔ پس خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا درحقیقت انسانیت کو ذلیل کرنا اور اس شرف کو چھوڑنا ہے جو خدا نے انسان کو دیا ہے اس لیے یہ سب سے خطرناک جرم ہے۔

شرک کی سزا: نہ بخشنے سے مراد کیا ہے؟ صرف یہ کہ ضروری ہے کہ انسان اس جرم کی سزا پائے۔ اس کے سوا جتنے گناہ ہیں ان کو خدا چاہے تو بغیر سزا دیئے معاف کر دے لیکن شرک کی سزا ضرور ملتی ہے۔ یہ حکم لگانا کہ شرک کی سزا کتنی بڑی ہوتی ہے۔ ہمارا کام نہیں لیکن چونکہ قرآن کریم سے یہ ثابت ہے کہ سزا کی اصل غرض انسان کو ان آلائشوں سے پاک کرنا ہے جو خود اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے اندر پیدا کر لی ہیں۔ اس لیے ہم یہ مانتے ہیں کہ جب یہ غرض پوری ہو جاتی ہے تو وہ سزا بھی اُٹھ جاتی ہے۔ اگر ایک مسلمان کے شرک کی سزا کبھی ختم ہو سکتی ہے تو ایک غیر مسلم کے شرک کی سزا بھی منقطع ہو سکتی ہے صرف مراتب ہیں ایک زیادہ خطرناک شرک میں گرفتار رہے اور اس کا شرک اس کی توحید پر غالب ہے۔ یہ ان لوگوں کی حالت ہے جو خدا کے ساتھ اعتقاداً شریک مانتے ہیں۔ جیسے بُت پرست، مسیح پرست۔ کیونکہ ان کے عقاید کی بنیاد ہی شرک پر ہے۔ ایک وہ ہیں جن کے اعتقاد کی بنا تو توحید الٰہی پر ہے۔ مگر غلطی میں پڑ کر وہ قبروں یا پیروں سے اپنی حاجات مانگتے ہیں، یا اُن کو ایسا مرتبہ دیتے ہیں۔ کہ عملاً وہ خدا کے احکام کی پروا اپنے پیروں کے احکام کے خلاف نہیں کرتے۔ ان کی چونکہ بنیاد درست ہے، اس لیے ان کا شرک اس خطرناک حد تک نہیں پہنچتا جیسے پہلوں کا۔ آریہ سماج کا شرک بھی قسم اوّل میں ہی آتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا کی صفات میں دو اور چیزوں کو کامل طور پر شریک مانتے ہیں۔

شرک سے توبہ: یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو شخص توبہ کرتا ہے وہ چونکہ اپنی اصلاح اسی زندگی میں کر لیتا ہے۔ اس لیے اس کا گناہ خواہ شرک بھی ہو معاف ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی اصلاح کرے۔ اس آیت کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ کسی گناہ پر بغیر توبہ یعنی رجوع کے انسان مر جائے تو اگر وہ گناہ شرک ہے تو اس کی سزا ضرور پائے گا۔ دوسرے گناہوں کو خدا چاہے تو بالکل بخشدے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے من قال لا الٰہ الا اللہ فقد دخل الجنۃ اور یہ قرآن کے صریح الفاظ سے ثابت ہے کہ توبہ سے شرک بھی بخشا جاتا ہے۔ اور شرک کو افترا اس لیے کہا کہ اس کو لوگوں نے انبیاء اور راستبازوں کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ کسی نبی یا کسی راستباز انسان نے کبھی شرک کی تعلیم نہیں دی پس یہ لوگوں کا افترا ہے۔

ع ۶۶۹ یزکّون۔ دیکھو ع ۶۶ و ع ۱۶۴ انسان کا اپنے نفس کا تزکیہ دو طور پر ہے۔ ایک فعل کے ساتھ یعنی اچھے کام کر کے انسان اپنے آپ کو بُرائیوں سے پاک کرے اور یہ وہ تزکیہ ہے جس کے حصول کے لیے قرآن کریم نے بار بار ہدایت فرمائی ہے جیسے قد افلح من زکّٰھا میں۔ اور دوسرا قول کے ساتھ یعنی انسان اپنے

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۠ ﴿۵۰﴾ ع ۸	دیکھ کس طرح اللہ پر جھوٹ بناتے ہیں اور یہی کھلا گناہ کافی ہے ع۶۷۰
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾	کیا تو نے اُن لوگوں (کے حال) پر غور نہیں کیا جن کو کتاب کا ایک حصّہ دیا گیا وہ سحر اور کاہنوں پر ایمان لاتے ہیں اور ان کے بارے میں جو کافر ہوئے کہتے ہیں یہ ان کی نسبت جو ایمان لائے زیادہ سیدھی راہ پر ہیں ع۶۷۱

منہ سے اپنے آپ کو پاک کہے اور اس سے منع کیا ہے کیونکہ اس سے انسان کے نفس کے اندر کبر پیدا ہوتا ہے (غ)

فتیلا ـ فتل اصل میں رسّہ کے بٹنے کو کہتے ہیں ـ اور فتیل وہ ہے جسے تم اپنی انگلیوں میں ملتے ہو جیسے دھاگا یا میل اور بطور مثال حقیر شے پر بولا جاتا ہے ـ اور فتیل اس کو بھی کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کی شق میں ہوتا ہے (غ)

مسلمانوں میں پیرپرستی کی بیماری: اصل ذکر یہود کا تھا ـ اور انہی کو توجہ دلانے کے لیے شرک جیسے ظلم عظیم پر توجہ دلائی تھی مگر چونکہ ان کا شرک خاص قسم کا تھا اس لیے اس کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ہے ـ اور وہ شرک وہی تھا جس کا ذکر اوپر بھی ہو چکا، کہ وہ اپنے راہبوں اور پیروں کے دعوئ بزرگی پر ایسے فریفتہ ہوتے تھے کہ جو کچھ وہ کہدیں اسی کو خدا کا حکم سمجھ لیتے تھے ـ شرک کے ذکر کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر جو اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور پاک بتاتے ہیں صاف بتاتا ہے کہ یہاں علماء اور پیروں کی طرف اشارہ ہے جو اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور پاک بتاتے ہیں اس لیے کہ وہ اتفاق سے دوسروں کے مرشد بن گئے ہیں پس یہودیوں کی حالت کا نقشہ کھینچکر مسلمانوں کو پیرپرستی کے خطرناک مرض سے ڈرایا ہے ـ اور اگر غور کیا جائے تو اس پیرپرستی کی بیماری نے بت پرستی کی طرح عوام کو کالانعام بنا دیا ہے ـ وہ بیچارے اپنی عقل وفکر سے کام لینے کے قابل ہی نہیں رہے ـ جو کچھ پیر نے کہدیا وہی حق ہے ـ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت مدح یعنی ایک دوسرے کی مدح کرنے اور ایک دوسرے کو پاک کہنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے ـ

ایک دوسرے کی مدح کرنے کی ممانعت: اور احادیث میں ایسی باتوں سے بہت ڈرایا ہے ـ مگر افسوس کہ یہی آجکل کی پیرپرستی کی بنیاد ہے ـ صحیح مسلم میں مقداد ابن الاسود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ہم کو حکم دیا ان نحثوا فی وجوہ المدّاحین التراب کہ ہم مدح کرنے والوں کے منہ پر مٹی پھینکیں اور صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دوسرے کی بڑی تعریف کرتے ہوئے سنا تو آپ نے فرمایا ویحك قطعت عنق صاحبك تجھ پر افسوس تو نے اپنے دوست کی گردن کاٹ دی ـ پھر فرمایا اگر اپنے دوست کی تعریف کرنی ہو تو یوں کہا کرو کہ میں اُسے ایسا سمجھتا ہوں ـ

ع۶۷۰ کفی بہ اثما مبینا ـ ان کا یہ دعویٰ کہ ہم پاک اور برگزیدہ ہیں یہی ان کا کافی گناہ ہے اثما مبینا اس لیے کہا کہ ہر ایک شخص جان سکتا ہے کہ ایسا دعویٰ ایک متکبرانہ دعویٰ ہے اور کسی شخص کو سزاوار نہیں کہ ایسا دعویٰ کرے اور کفی بہ اس لیے فرمایا کہ یہ تو پاک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ـ حالانکہ اگر اور کوئی امر ان کے گنہگار ہونے پر شاہد نہ بھی ہوتا تو بھی ان کا یہی گناہ کافی تھا کہ وہ ایسا دعویٰ کرتے ہیں ـ

ع۶۷۱ الجبت ـ جبت اور جبس کے معنی ہیں، دھوں دھان جس میں کوئی بھلائی نہ ہو اور کہا گیا ہے کہ تا اس میں س سے بدل ہے اور ہر ایک چیز جو اللہ کے سوائے پوجی جائے اسے جبت کہا جاتا ہے اور ساحر اور کاہن کو بھی جبت کہا گیا ہے (غ) اور حدیث میں آتا ہے ان العیافۃ والطرق والطیرۃ من الجبت یعنی پرندوں کا زجر اور زمین پر خط لگانا اور فال یہ سب کچھ جبت سے ہے اور حضرت عمرؓ کا قول بخاری میں منقول ہے کہ اَلجِبتُ السِّحرُ یعنی جبت سحر ہے ـ

طاغوت کے معنی ع۳۳۱ میں بیان ہو چکے ہیں ـ جابر بن عبداللہ کے متعلق روایت ہے کہ ان سے طاغوت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ھم کُهّانٌ یَنزِلُ علیھم الشیطانُ (بخاری) یہ کاہن ہیں جن پر شیطان اُترتے ہیں ـ اور اسی میں یہ بھی ہے کہ ہر ایک قبیلہ میں ایک کاہن تھا جس سے وہ فیصلہ کراتے تھے اور مجاہد کا قول منقول ہے الطاغوت الشیطان فی صورۃ الانسان ـ طاغوت شیطان ہے جو صورت انسان میں ہو جس سے فیصلہ کراتے ہیں اور وہ ان کا حاکم ہے (رث)

یہودیت پر عرب کی بت پرستی کا اثر: اس رکوع میں یہود کے ہی مزید حالات مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لیے بیان کیے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح حق سے انحراف کرتے کرتے ان کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ صریح کفر پر مائل ہو گئے ـ چنانچہ اس آیت میں یؤمنون بالجبت والطاغوت کہہ کر اسی کی طرف اشارہ کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت عرب میں رہکر عربوں کی بت پرستی اور کہانت پر یہودیوں کا بھی اعتقاد ہو گیا تھا ـ اور یہ حال ہر قوم کا ہوتا ہے جو حق کے پھیلانے پر زور نہیں لگاتی کہ وہ آہستہ آہستہ دوسروں کے اثر کے نیچے آنا شروع ہوتی ہے ـ وہ یہودی جو عرب میں توحید کا پیغام لیکر آئے تھے بجائے اس کے کہ بُت پرستوں کو توحید کی طرف لاتے خود بُت پرستی اور کہانت پر گر گئے ـ اس کی مثال مسلمانوں میں بھی ملتی ہے ـ جب تک وہ دوسروں کو توحید کا پیغام پہنچانے پر زور لگاتے تھے ان کے خیالات ہندوؤں میں اثر کرتے چلے گئے ـ مگر جب انہوں نے اس کو ترک کر دیا تو ہندوؤں کے بت

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿٥٢﴾

یہی وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جس پر اللہ لعنت کرے تو تو اس کے لیے کوئی مددگار نہ پائے گا۔

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾

کیا اُن کے لیے بادشاہت سے کچھ حصّہ ہے تو پھر وہ لوگوں کو تل برابر بھی نہ دیں گے ع۶۷۲

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾

بلکہ وہ لوگوں سے اس پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے اُن کو اپنے فضل سے دیا ہے سو ہم نے آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی بادشاہت دی ہے ع۶۷۳

فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ﴿٥٥﴾

پس بعض اُن میں سے وہ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو اس سے رُکتے ہیں ع۶۷۴ اور دوزخ جلانے کو کافی ہے

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ

جو لوگ ہماری آیتوں کا انکار کرتے ہیں ہم ان کو عنقریب آگ میں

سے خیالات ان میں مروج ہو گئے حتیٰ کہ بعض صوفیوں کے گروہ ایسے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کی دعاؤں اور وظیفوں کو لے لیا ہے۔ اور ہندوؤں کے رسم و رواج تو بہت سے مسلمانوں میں آ گئے ہیں۔ یہ پیر پرستی اور قبر پرستی جو مسلمانوں کے اندر پائی جاتی ہے وہ بھی درحقیقت بت پرستی کا ہی ایک رنگ ہے۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب کعب ابن اشرف اور حُیی بن اخطب قریش کو نبی کریم صلعم کے خلاف اُکسانے کے لیے مکّہ میں آئے اور خود بھی ان کی مدد کا وعدہ کیا تو قریش نے کہا کہ ہم تم پر اعتبار نہیں کر سکتے جب تک کہ تم ہمارے بتوں کو سجدہ نہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا اور کفار کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرنا بتاتا ہے کہ وہ بت پرستوں کو مسلمان موحدین سے اچھا سمجھتے تھے اور روایات میں صریحاً اُن کا ایسا کہنا بھی مذکور ہے۔

ع۶۷۲ نقیر۔ نقر کے اصل معنی کریدنا ہیں۔ چنانچہ منقار جانور کی چونچ کو کہتے ہیں جس سے وہ کریدتا ہے اور اس لوہے کو بھی کہتے ہیں جس کے ساتھ چکّی راہی جاتی ہے۔ اسی سے نقیر کھجور کی گٹھلی میں جو ننّھا سا گڑھا ہوتا ہے اس کو کہتے ہیں اور بطور مثل نہایت خفیف شے پر بولا جاتا ہے جیسے ہماری زبان میں تل رائی وغیرہ۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلعم پر اس وجہ سے حسد کرتے ہیں کہ وہ بنی اسماعیل سے ہے اور کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل سے ہونا چاہیئے۔ مگر ان کے اخلاق تو اس قدر ذلیل ہو چکے ہیں کہ یہ اب بادشاہت کے قابل بھی نہیں رہے نبوت تو بہت بڑا انعام ہے اور اس کے لیے بہت ہی بڑا دل بھی چاہیئے اس لیے فرمایا کہ بادشاہت سے ان کے پاس کوئی حصّہ نہیں ہے۔ اگر ان کے پاس ہوتا تو وہ اس قدر بخیل ہیں کہ دوسروں کو اس میں سے کچھ بھی نہ دیتے اس سے معلوم ہُوا کہ بادشاہت کے لیے بھی ایک وسیع دل چاہیئے۔ بخل اور بادشاہت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے مگر نبوّت کے لیے اس سے بھی وسیع دل چاہیئے۔ مسلمانوں کو چونکہ نبی کریم صلعم کا وارث بنایا گیا ہے گویا اب علوم نبوّت لتکونوا شھداء علی الناس کے ماتحت اسی سرچشمہ سے ملتے ہیں۔ اس لیے ان کو اپنے اخلاق انبیاء کی طرح وسیع کرنے چاہئیں۔

ع۶۷۳ یہاں آل ابراہیم کو یعنی مسلمانوں کو دو چیزیں دینے کا ذکر کیا۔ کتاب اور حکمت۔ اور ملک عظیم۔ کتاب اور حکمت میں تو نبوت کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ یہی دونوں چیزیں غرض و غایت نبوت ہیں اور نبوت کی عظمت کی وجہ سے مقدم اسی کو کیا ہے اور پھر ایک عظیم الشان بادشاہت کے دینے کا ذکر کیا حالانکہ ابھی مسلمانوں کو بادشاہت تو ملی نہ تھی۔ اور اگر تھی بھی تو مدینہ کی دیواروں کے اندر اور وہاں بھی ابھی یہودی مخالف۔ کچھ مشرک موجود اور کچھ منافق۔ پس ملک عظیم میں اسلام کی آئندہ بادشاہت کا وعدہ تھا۔ جو تھوڑے ہی سالوں میں دنیا کے کثیر حصّہ میں پھیل گئی۔ اس وعدہ میں اہلِ کتاب کو یہ بھی بتانا مقصود تھا کہ تم جس قدر چاہو ان کی مخالفت کر لو ان کو اللہ تعالیٰ اب عظیم الشان بادشاہت دنیا میں دینے والا ہے اور جس طرح وہ کتاب و حکمت جو مسلمانوں کو دی گئی اب ان سے چھن نہیں سکتی۔ کیونکہ ان کا نبی تاقیامت زندہ ہے۔ اسی طرح وہ بادشاہت بھی کبھی مسلمانوں سے چھن نہیں سکتی۔ ہاں اپنی سُستی اور غفلت سے عارضی طور پر اس میں کمزوری آ سکتی ہے اور یہاں بجائے مسلمانوں کے آل ابراہیم اس لیے کہا کہ یہ وعدہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ تھا اور یوں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ مسلمان بھی اسی ابراہیمؑ کی آل ہیں جس کی آل بنی اسرائیل تھے۔

ع۶۷۴ اٰمن بہٖ۔ اس سے مراد محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان ہے جیسا کہ امام مجاہد سے مروی ہے اور صدّ عنہ میں وہ لوگ داخل ہیں جو خود اسلام میں آنے سے

نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُهُمۡ بَدَّلۡنٰهُمۡ جُلُوۡدًا غَيۡرَهَا لِيَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿۵۶﴾

داخل کریں گے، جب اُن کی کھالیں پک جائیں گی ہم اُن کی جگہ ان کو اور کھالیں دے دیں گے تاکہ وہ عذاب چکھیں، بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے۶۷۵

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ لَهُمۡ فِيۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدۡخِلُهُمۡ ظِلًّا ظَلِيۡلًا ﴿۵۷﴾

اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے ان کو باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ہمیشہ اُنہی میں رہیں گے، ان کے لیے اُن میں پاک ساتھی ہوں گے اور ہم انھیں گھنے سایوں میں داخل کریں گے۶۷۶

اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهۡلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمۡتُمۡ بَيۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡكُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمۡ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيۡعًۢا بَصِيۡرًا ﴿۵۸﴾

اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اُن کے اہل کو ادا کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ کیا کرو، تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ بیشک یہ بہت ہی عمدہ بات ہے جس کی تمھیں اللہ نصیحت کرتا ہے اللہ سُننے والا دیکھنے والا ہے۶۷۷

رُکتے تھے، یا دوسروں کو روکتے تھے۔ اگلی آیت اس کو بالکل صاف کر دیتی ہے کہ یہاں ایمان اور انکار محمد رسول اللہ صلعم کا ہی مراد ہے۔

ع۶۷۵ نضجت۔ نَضِج گوشت کے ہانڈی میں یا کباب کے طور پر پک جانے پر بھی بولا جاتا ہے اور پھل وغیرہ کے پکنے پر بھی اور نضیج الرائے اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی رائے محکم ہو۔

جلود۔ جِلد کی جمع ہے اور بدن کے چھلکے یعنی چمڑے کو جلد کہا جاتا ہے مگر بعض وقت مراد بدن بھی لے لیا جاتا ہے جیسے فرمایا تقشعر منه جلود الذين يخشون ربهم جہاں جلود سے مراد ابدان ہیں (غ)

چمڑوں کے پک جانے اور ان کے بدلنے سے کیا مراد ہے؟ جس طرح نعمائے جنت کی حقیقت کو اس دنیا میں کوئی نہیں جان سکتا۔ اسی طرح آلام نار کی حقیقت کو بھی کوئی نہیں جان سکتا۔ لیکن ایسے الفاظ میں قرآن شریف نے ان امور کو بیان کیا ہے جو انسان کے ذہن کے قریب ان باتوں کو کر دیں۔ انسانی تجربہ میں یہ ہے کہ جب ایک جگہ دُکھ سے پک جاتی ہے تو پھر اس کو کوئی دکھ محسوس نہیں ہوتا۔ پس یہ سمجھانے کے لیے کہ جو صورت اس دنیا میں ہوسکتی ہے کہ ایک چیز جل کر اس حالت پختگی کو پہنچ جائے کہ پھر اس پر آگ سے کوئی تکلیف وارد نہ ہو وہ صورت وہاں نہ ہوگی۔ یہ محاورہ اختیار کیا ہے۔ بعض نے یہاں تک بھی کہہ دیا ہے، المراد الدوام وعدم الانقطاع ولا نضج ولا احتراق (غق) اور قرآن کریم نے خود اس پکنے اور اس تبدیلی کی غرض لیذوقوا العذاب بتائی ہے یعنی تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں۔ ایسا نہیں ہوگا کہ اس طرح عذاب کے عادی ہو جائیں کہ وہ عذاب ان کو پھر محسوس ہونے سے رہ جائے۔

ع۶۷۶ ظِلًّا ظلیلا۔ مفردات میں ہے کہ ظِلّ ضِحّ یعنی دھوپ کی ضد ہے۔ اور وہ فئے سے عام ہے کیونکہ ظِلُّ اللیلِ اور ظِلِ الجنۃ کہا جا سکتا ہے۔ ہر مقام کو جہاں سورج نہ پہنچے ظل کہا جا سکتا ہے اور فئے صرف اسی کو کہا جاتا ہے جس پر سورج پہنچکر ہٹ گیا ہو۔ اور ظل سے مراد عزّت اور حفاظت اور آسائش لی جاتی ہے اور ان المتقين فی ظلل (المرسلٰت۷۷۔ ۴۱) میں ظلال کے معنی عزّت اور حفاظت ہیں اکلها دآئم وظلّها (الرعد۱۳۔ ۳۵) هم وازواجهم فی ظلال (یٰسٓ۳۶۔ ۵۶) اور عام محاورہ میں اَظَلَّنِی فلانٌ کے معنی دیئے ہیں۔ میری نگہداشت کی اور مجھے اپنے ظل میں اور اپنی عزت (یعنی روک میں) اور اپنی حفاظت میں لے لیا اور یہاں ظلا ظلیلا کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ خوش زندگی سے کنایہ ہے۔ اور لسان العرب میں ہے کہ ظل سورج کی شعاع کی روشنی ہے اس کی شعاع کو الگ کر کے۔ کیونکہ اگر روشنی نہ ہو تو ظل نہیں بلکہ ظلمت کہیں گے اور ظلیل ظل سے تاکید کے لیے صفت مشتق ہے اور ظل اللہ حدیث میں بادشاہ کے لیے آیا ہے اور یہاں فی الحقیقت سایہ مراد نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ خدا کی ذات اس سے پاک ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے سبعۃ یظلهم اللّٰہ فی ظله اور دوسری میں اسی جگہ فی ظلل العرش ہے اور یہاں بھی سایہ معنی نہیں ہو سکتے جب آیات اللہ کے انکار کرنے والوں اور ان کی سزا کا ذکر کیا تو اس کے ساتھ ہی جیسا کہ قرآن کریم کی عادت ہے ایمان اور اعمال صالحہ والوں کا ذکر بھی کیا۔

ع۶۷۷ الامانات۔ امانۃ کی جمع ہے اور اَمَانۃ اور امان۔ اَمن سے مصدر ہے اور مفردات میں ہے کہ کبھی تو امان اس حالت کا نام ہوتا ہے جس پر انسان امن میں ہو اور کبھی اس چیز کا نام ہوتا ہے جس پر انسان کو امین بنایا جائے۔ جیسا تخونوا اماناتکم میں امانات سے مراد وہ چیزیں ہیں جن پر تم کو امین

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۵۹ ع ۹/۵

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحبان امر کی اطاعت کرو پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو، تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہو یہ بہتر اور انجام کار اچھا ہے ع۶۷۸

بنایا گیا ہے اور انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت (الاحزاب ۳۳ - ۷۲) میں حضرت ابن عباسؓ سے امانت کے معنی فرائض مروی ہیں (ل) اور نہایہ میں ہے کہ امانت کا لفظ طاعت اور عبادت اور ودیعت اور ثقۃ اور امان پر بولا جاتا ہے اور ان میں سے ہر معنی میں حدیث آئی ہے۔

اس آیت میں بظاہر ایک نیا مضمون نظر آتا ہے۔ ابھی یہودیوں کی بے اعتدالیوں کا ذکر تھا۔ اب امانتوں کے ادا کرنے کا ذکر شروع ہو گیا۔ اور اسی آیت میں ایک تیسرا مضمون یہ شروع کر دیا گیا کہ لوگوں کے درمیان فیصلے عدل و انصاف سے کیا کرو۔ مگر فی الحقیقت ان تینوں مضمونوں میں ایک نہایت گہرا تعلق ہے۔ یہودیوں کی بے اعتدالیوں کے ذکر میں اصل منشا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے مسلمانوں کو متنبہ کرنے کا تھا۔ یہودیوں کی بے اعتدالیاں کیا تھیں اور کس بات کا نتیجہ تھیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں۔ اس کی عبادت سے انحراف، اس کی ودیعت کی ہوئی طاقتوں کو غیر محل پر استعمال کرنا اور یہ درحقیقت امانت میں خیانت تھی۔ کیونکہ امانت کے اصل معنی اطاعت اور عبادت اور ودیعت وغیرہ ہی ہیں۔ یہود نے خدا کی امانتوں کو ضائع کیا۔ اس کی نافرمانی کی اس کی بتائی ہوئی راہوں سے الگ ہو گئے۔ اس کی دی ہوئی طاقتوں سے ٹھیک کام نہ لیا۔ پس مسلمانوں کو یہ حکم دیتے ہیں کہ تم امانتوں میں خیانت نہ کرنا۔ گویا اصل مضمون کی طرف اور یہودیوں کے ذکر کے اصل مقصود کی طرف رجوع کیا ہے۔ پس جو حکم ادائے امانت کا یہاں ہے اس میں اگر امانت مال داخل ہے تو اصلی امانت یعنی اللہ کی اطاعت اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوت کو ٹھیک طور پر لگانا بھی شامل ہے اور الیٰ اھلھا کا لفظ اس لیے بڑھایا کہ انسان کی نیکی کا اصل معیار دوسرے انسانوں سے تعلقات میں پورا اترنا ہے۔ جو شخص اس معیار پر پورا نہیں اُترتا اس کی نیکی برائے نام نیکی ہے۔ پس ہر انسان کو اس کا حق دینا اور اپنی ذمہ داری کو اس کے بارہ میں پورا کرنا فی الحقیقت ادائے امانت الیٰ اہلہا ہے۔ ایسا ہی ہم پیشوا بنائیں۔ تو ان لوگوں کو جو پیشوا بننے کے اہل ہیں۔ حاکم بنائیں۔ تو ان لوگوں کو جو حکومت کے اہل ہیں یہ سب کچھ ادائے امانت ہے۔ ایک تسبیح خوان زاہد کو اگر فوج کی سپہ سالاری دیدی جائے تو یہ ادائے امانت الیٰ اہلہا نہیں۔ ایک گوشہ نشین دنیا سے ناواقف کو اگر حاکم بنایا جائے تو یہ ادائے امانت الیٰ اہلہا نہیں۔

حاکم و محکوم کے تعلقات: لیکن انسان کا تعلق انسان سے ایک تو مساوات کی حیثیت میں ہے یعنی ہر انسان بحیثیت ایک انسان ہونے کے دوسرے پر کچھ حقوق اور دوسرے کے متعلق کچھ ذمہ داریاں رکھتا ہے۔ خاوند اور بی بی۔ آقا اور نوکر۔ بھائی اور اجنبی قریبی اور ہمسائے۔ ایک شہر اور ایک ملک کے رہنے والے ایک قوم کے افراد اور مختلف قوموں کے افراد یہ سب مساوات کی حیثیت میں ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اور یہی تعلقات انسان کی زندگی کا بیشتر حصہ ہیں۔ لیکن ایک اور قسم کے تعلقات بھی تمدن انسانی کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہو گئے ہیں اور وہ ہیں حاکم و محکوم کے تعلقات پس جب ادائے امانت الیٰ اہلہا کا ذکر کیا جس میں بیشتر تعلقات انسانی کا ذکر آ گیا تو ایک خاص صورت حاکم و محکوم کے تعلقات کو بھی بتا دیا۔ حاکم کا کیا فرض ہے یہاں بتایا محکوم کا کیا فرض ہے اس سے اگلی آیت میں بتایا۔ چنانچہ یہاں فرمایا کہ جب تم کو لوگوں پر حاکم مقرر کیا جائے اور تم کو لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے ہوں تو اللہ تعالیٰ کا یہ بھی حکم ہے کہ عدل کے ساتھ فیصلے کرو۔ یہاں الناس کا لفظ وسیع اختیار فرمایا ہے مسلمان ہوں یا ہندو یا عیسائی فیصلہ میں عدل ملحوظ ہونا چاہیئے۔ اور کسی خاص قوم کی طرف جھکنا نہیں چاہیئے۔

مفسرین نے عموماً اس آیت کی شان نزول میں عثمان بن ابی طلحہ کا قصہ لکھا ہے جس کے پاس خانہ کعبہ کی چابی تھی۔ یعنی وہ خانہ کعبہ کا حاجب یا محافظ تھا۔ کہ اوّل اس نے نبی کریم صلعم کو فتح مکّہ کے دن چابی دینے سے انکار کیا بعد میں جب اس سے لے لی گئی تو حضرت عباسؓ (یا علیؓ) نے چاہا کہ حاجب کا عہدہ بھی سقایہ (یعنی حاجیوں کو پانی پلانے) کے ساتھ جمع کر دیا جائے اس پر یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلعم نے چابی واپس عثمان کو دی اور اسی کے خاندان میں یہ آج تک ہے۔ لیکن اگر فی الواقع نزول آیت اس موقع پر بھی ہوا ہو تو حکم اس کا پھر بھی عام ہے۔ جیسا کہ مفسرین نے اعتراف کیا ہے۔ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک عثمان بن ابی طلحہ مسلمان نہ ہوئے تھے۔ اس سے نبی کریم صلعم کی دریا دلی کا اندازہ کرو۔

ع۶۷۸ اولی الامر۔ اَمَرْتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اسے مکلف کیا کہ وہ کچھ کرے پس اَمْر بمعنی حکم ہے اور اولی الامر سے مراد بعض کے نزدیک وہ امیر ہیں جو نبی کریم صلعم کے زمانہ میں مقرر کیے گئے اور بعض کہتے ہیں اہل بیت کے آئمہ مراد ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں امر بالمعروف کرنے والے اور ابن عباسؓ کا قول ہے کہ فقہاء اور اہل دین مراد ہیں۔ یہ سب اقوال امام راغبؒ نے نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ سب اولی الامر کے اندر داخل ہیں۔ کیونکہ اولی الامر جن کی وجہ سے لوگ رُکتے ہیں چار قسم ہیں۔ یعنی انبیاءؑ اور ان کا حکم عام اور خاص لوگوں کے ظاہر و باطن پر ہے اور والی یعنی بادشاہ اور ان کا حکم سب کے ظاہر پر ہے نہ اُن کے باطن پر اور اہل حکمت یا فلسفی جن کا حکم خاص لوگوں کے باطن پر ہے اور واعظ اور ان کا حکم عام لوگوں کے باطن پر ہے نہ ان کے ظاہر پر۔

اولی الامر کا حکم کس حد تک مانا جا سکتا ہے: پچھلی آیت میں بتایا تھا کہ باہمی تعلقات میں ایک دوسرے کے حقوق ادا کرو جو حاکم ہیں وہ محکوم کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کریں۔ اب بتایا ہے کہ محکوم کا تعلق حاکم سے کیسا ہونا چاہیئے لیکن اس کے بیان کرنے سے پہلے بتایا ہے کہ حقیقی اطاعت اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہے یعنی

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ
اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ
اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا

کیا تو نے ان (کی حالت) پر غور نہیں کیا جو دعوے کرتے ہیں کہ
وہ اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا
گیا وہ چاہتے ہیں کہ شیطان سے فیصلہ کرائیں حالانکہ ان کو حکم

اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکموں کا پابند کر دینا ان دو کے حکم کی فرمانبرداری بلا قید ہے۔ لیکن ان کے ساتھ جو تیسرا حکم ہے کہ اولی الامر کی فرمانبرداری کرو۔ اس کے ساتھ صاف قید لگا دی کہ اگر کسی معاملہ میں جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔ جس سے معلوم ہوا کہ اولوالامر کی فرمانبرداری کا اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی طرح مطلق اور بلا قید حکم نہیں بلکہ یہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ گویا اللہ اور رسول کا حکم ایک ذیل میں ہے۔ اولوالامر کا حکم دوسری ذیل میں۔ اللہ اور رسول حکم دینے میں غلطی نہیں کر سکتے۔ نہ رسول کا حکم اللہ کے حکم کے خلاف ہو سکتا ہے لیکن اولوالامر حکم دینے میں غلطی کر سکتے ہیں اور اولوالامر کا حکم اللہ یا رسول کے حکم کے خلاف بھی ہو سکتا ہے پس اللہ اور رسول کے حکم کی ہر حال میں اطاعت کرنی ہوگی۔ اولوالامر کے حکم کی بھی عموماً اطاعت کرنی ہوگی، لیکن اگر وہ اللہ اور رسولؐ کے حکم کے خلاف ہو تو پھر ان کی اطاعت نہیں کرنی ہوگی۔

احادیث اس بارہ میں کثرت سے ہیں۔ بخاری اور دیگر کتب احادیث میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایک لشکر بھیجا اور اس پر ایک انصاری کو امیر مقرر فرمایا۔ راستہ میں امیر کو اپنے ساتھیوں پر کچھ غصہ آیا اور اس نے کہا کہ کیا رسول اللہ صلعم نے تم کو حکم نہیں دیا کہ میری اطاعت کرو انہوں نے کہا بیشک دیا ہے۔ پھر اس نے آگ جلوائی اور کہا میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ اس کے اندر داخل ہو جاؤ۔ ایک نوجوان نے کہا ہم تو آگ سے بھاگ کر رسول اللہ صلعم کی طرف آئے ہیں۔ پس جلدی مت کرو یہاں تک کہ رسول اللہ صلعم سے ملو۔ چنانچہ جب واپس آئے تو یہ واقعہ آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ نے فرمایا اگر تم اس میں داخل ہو جاتے تو پھر نہ نکلتے انما الطاعۃ فی معروف۔ اطاعت (یعنی اولی الامر کی اطاعت) صرف معروف بات میں ہے یعنی اس بات میں جو خلافِ شریعت نہ ہو۔ اور ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا السمع والطاعۃ علی المرء المسلم فیما احب وکرہ مالم یؤمر بمعصیۃ فانا امر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ۔ مسلمان شخص پر واجب ہے کہ وہ قبول کرے اور فرمانبرداری کرے خواہ ایک بات کو پسند کرے یا اسے ناپسند کرے جب تک کہ اسے (اللہ اور رسول کی) نافرمانی کا حکم نہیں دیا جاتا۔ لیکن اگر (اللہ اور رسول کی) نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر قبول کرنا نہیں اور نہ اطاعت کرنا ہے اور بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا قبول کرو اور اطاعت کرو خواہ تم پر حبشی غلام کو امیر بنایا جائے اور صحیحین میں ہے کہ جو شخص اپنے امیر سے کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو اسے چاہیئے کہ صبر کرے کیونکہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر ہٹتا ہے پھر مرتا ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔

ان احادیث سے ظاہر ہے کہ اولی الامر کے احکام کی پابندی کی اصل بنیاد اتحاد جماعت ہے کیونکہ جب تک سب اپنے آپ کو ایک حکم کے ماتحت نہیں کرتے۔ اس وقت تک اتحاد قائم نہیں رہ سکتا اس لیے اگر امیر کوئی ایسا حکم دے جس کو ایک شخص ناپسند کرتا ہے تو بھی اسے ماننا چاہیئے بشرطیکہ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اگر خلاف ہو تو اس صورت میں امیر کے حکم کی اطاعت نہ کی جائے اولی الامر منکم میں جیسا کہ اوپر دکھایا گیا ہے انبیاء علماً آئمہ دین۔ بادشاہ حکام سب شامل ہیں۔ مگر چونکہ خطاب الذین اٰمنوا کو ہے اس لیے منکم کی قید سے صاف نظر آتا ہے کہ یہاں مراد مسلمان حکام ہی ہیں ہاں یہ سوال علیحدہ ہے کہ آیا اگر کسی جگہ مسلمان غیر مسلم بادشاہ کے ماتحت ہوں تو اس کے احکام کی اطاعت کریں یا نہ بشرطیکہ وہ احکام خلاف قرآن و حدیث نہ ہوں اس کے لیے نبی کریم صلعم کا اور ان صحابہؓ کا جو حبش میں گئے نمونہ کافی ہے۔ قرآن کریم سے اجتہاد کے رنگ میں اسی آیت سے ان کا حکم بھی مستنبط ہو سکتا ہے۔

یہ امر بھی یہاں یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی تنازعہ میں اصلی اور فیصلہ کن قول یا اللہ تعالیٰ کا کلام ہو سکتا ہے یا نبی کریم صلعم کی حدیث، پس جہاں کہیں مسلمانوں میں کوئی تنازعہ ہو اس پر فیصلہ کرنے کے لیے مقدم قرآن شریف اور بعدہٗ حدیث ہے۔ اور قرآن شریف کا تقدم اس سے بھی ظاہر ہے کہ دوسری جگہ بصورت تنازعہ فحکمہ الی اللہ ہی فرمایا۔ یعنی اس کا حکم اللہ کے اختیار میں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طرح پر قرآن محفوظ ہے اس طرح پر حدیث محفوظ نہیں بلکہ حدیث کے الفاظ میں کمی بیشی کا ہو جانا۔ اور بسا اوقات روایت کا بالمعنی ہونا ایک امر مسلّم ہے۔

اہلِ قرآن اور رسول اللہ کی اطاعت: ایک اور امر جس کا ذکر کرنا یہاں ضروری ہے ان لوگوں کا خیال ہے جو اہل قرآن کہلاتے ہیں جن کے نزدیک رسول اللہ صلعم کی اطاعت شرک میں داخل ہے اس کی تردید ع۵۱۶ میں ہو چکی ہے۔ اس موقعہ پر یہ لوگ یوں معنی کرتے ہیں "اے ایمان والو دین اسلام کے بارے میں حکم مانو اللہ تعالیٰ ہی کا، یعنی حکم مانو صرف کتاب اللہ ہی کا اور سلطنت کے بارے میں حکم مانو حکام وقت کا جو تم پر حکمران ہوں پس اگر جھگڑ پڑو تم آپس میں دین اسلام کے کسی امر میں تو اس کو رجوع کرو صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف یعنی خالص کتاب اللہ کے ہی حکم کی طرف" (ترجمۃ القرآن بآیات الفرقان مولفہ مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی) اب قرآن شریف کو اپنی رائے کے ماتحت کرنے کے لیے کس قدر باتیں اپنے پاس سے ڈال کر تحریف کا رنگ اختیار کیا ہے۔

پھر ایک اور دقت یہ ہوگی کہ اس قدر زوائد کے بڑھانے سے نتیجہ کیا نکلا۔ اوّل یہ کہ سلطنت کے امور کا کوئی تعلق دین اسلام سے نہیں۔ یہ کیسی لغو اور بے معنی

اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾	دیا گیا تھا کہ اس کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو گمراہی میں دور بھکالے جائے ۶۷۹
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿ۚ۶۱﴾	اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف آؤ جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف، تو تو منافقوں کو دیکھے گا کہ وہ تجھ سے ہٹتے ہوئے رُکتے ہیں۔
فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ	تو پھر کیا حال ہوگا جب ان کو اس کی وجہ سے مصیبت پہنچے گی جو اُن کے اپنے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے

بات ہے۔ وہ دین اسلام جو معاشرت کے بارہ میں احکام دیتا ہے۔ تمدن کے بارہ میں احکام دیتا ہے، معمولی انسانی تعلقات کے بارہ میں احکام دیتا ہے۔ کیا وہ سلطنت کے بارہ میں کوئی احکام نہیں دیتا۔ بلکہ سلطنت کے بارہ میں جس قدر احکام ہوں ان کے لیے حکام وقت کو مقرر کر دیتا ہے خواہ ایک بیدین ہی بادشاہ ہو سلطنت کے بارہ میں وہ جو حکم دے وہی ماننا ہوگا۔ یہاں تک کہ دین اسلام کے بارہ میں تو تنازع بھی جائز ہے مگر سلطنت کے احکام کے بارہ میں کوئی تنازع جائز نہیں۔ رسول سے اختیار چھینتے چھینتے ایک حصّہ دین اسلام میں بادشاہ کو رسول سے بڑھ کر مرتبہ دیدیا کہ جس طرح اللہ تعالٰے کی اطاعت بلا چون وچرا اور بلا تنازع کرنی چاہیئے اسی طرح بادشاہ کی اطاعت بلا چون وچرا اور بلا تنازع کرنی چاہیئے اور کسی قسم کا اختلاف بادشاہ وقت کے ساتھ گویا حکم الٰہی سے انحراف ہے۔

اہل تشیع اور قادیانی احمدی: اس آیت میں اہل تشیع کا بھی جواب ہے جنہوں نے امام معصوم کا وجود مانا ہے اور احمدیوں میں سے قادیانی گروہ کا بھی جواب ہے جنہوں نے حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو نبی اور رسول مانا ہے کیونکہ اگر کوئی امام معصوم ہونا ہوتا جو غلطی کر ہی نہ سکتا یا کوئی نبی اور رسول ہونا ہوتا جس کی اطاعت اسی طرح کرنی ضروری ہوتی جس طرح آنحضرت صلعم کی تو ایسے شخصوں کا ذکر اس آیت میں بھی ہوتا۔ ظاہر ہے کہ جو کوئی اس امت کے اندر ہوگا خواہ وہ کتنا ہی عظیم الشان انسان کیوں نہ ہو وہ اولی الامر میں ہی داخل ہوگا۔ اور اس کے ساتھ تنازع بھی ہو سکتا ہے اور ایسے تنازع کی صورت میں اصلی مرجع اللہ یعنی اس کی کتاب اور رسول یعنی سنّت نبوی ہی رہیں گے۔ الّذین اٰمنوا ایک حکم میں رہیں گے اور رسول ایک حکم میں یعنی وہ ہمیشہ مطیع رہیں گے اور رسول ہمیشہ مطاع رہے گا۔ یہ سچ ہے کہ اُن میں آئمہ اور علماء وفقہاء اور حکام کی اطاعت ضروری ہوگی مگر کوئی بھی ہو اس کے ساتھ تنازع ہو سکتا ہے اور اس لیے اصل مطاع بھی رسول اللہ صلعم ہی رہے حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے ساتھ بھی بعض صحابہ کو اختلاف ہو جاتا تھا، اور کتاب اللہ ہی فیصلہ کرتی تھی۔ امام بخاری اور مسلم اور امام ابوحنیفہ اور مالک اور شافعی اور احمد اور ہر صدی کے مجدد دین اور مسیح موعود کے ساتھ بھی اگر کسی کو اختلاف ہو تو حکم کتاب اللہ اور سنتِ نبوی ہونگے اور اصل اور صحیح مرجع ساری اُمت کے محمد رسول اللہ صلعم ہی ہونگے۔ اسی لیے خاتمہ پر فرمایا کہ یہ بہتر اور انجام کار اچھا ہے۔ کیونکہ اس میں امّت کا اتفاق اور اتحاد قائم رہ سکتا ہے اپنے لیے الگ الگ مطاع بنا لیے جائیں تو تفرقہ پیدا ہو کر ایک رسول کے بھیجنے کی جو غرض تھی وہ مفقود ہوتی ہے اور یوں بھی تمام کو ایک ذیل میں رکھ کر جمہوریت کا اعلیٰ درجہ کا اصول دنیا میں قائم کیا ہے۔

ع۶۷۹ یزعمون۔ زعم اس قول کا بیان کرنا ہے جس پر جھوٹ کا گمان ہو (غ) اس لیے قرآن میں یہ ایسے ہی مقامات پر بولا گیا ہے۔ جہاں اس کے کہنے والے کی مذمت مقصود ہو۔ جیسے زعم الذین کفروا ان لن یبعثوا (التغابن ۶۴-۷) بل زعمتم الّن نجعل لکم مّوعدا (الکھف ۱۸-۴۸) کنتم تزعمون (الانعام ۶-۲۲) زعمتم من دونه (بنی اسرائیل ۱۷-۵۶)

یہودیوں کے حالات سے عبرت دلا کر مسلمانوں کو اخلاص اور ادائے امانت کی نصیحت کرتے ہوئے ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے۔ جو مُنہ سے ماننے کا دعوٰی کرتے تھے یا ہیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں پر راضی نہیں ہوتے۔ مفسرین نے یہاں ایک مسلمان بشر اور ایک یہودی کے تنازع کا قصّہ لکھا ہے جس میں مسلمان نے (جو در پردہ منافق تھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو نہ مانا۔ لیکن گو آیت کے الفاظ ایک چھوڑ صدہا واقعات پر صادق آ سکتے ہیں کسی ایک خاص واقعہ سے اس کو مخصوص کرنا ٹھیک نہیں۔ آیت کے الفاظ عام ہیں اور اس میں عام منافقوں کا ذکر ہے۔ کیونکہ جب اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا تو ان لوگوں کا بھی ذکر کر دیا جو منہ سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے مگر دل سے احکام الٰہی کو نہ مانتے تھے۔ یہ لفظ کہ جو پہلے نازل کیا گیا اس پر بھی ایمان لانے کا دعوٰی کرتے ہیں یہ ظاہر نہیں کرتے کہ یہ یہود میں سے تھے۔ کیونکہ ہر ایک مسلمان سارے پہلے انبیاء اور ان کی وحی پر ایمان لاتا ہے اور نہ ان کے طاغوت کی طرف اپنے فیصلے لے جانے سے خاص جھگڑوں میں حکم بنانا ہی مقصود ہے بلکہ تمام دینی معاملات میں بجائے اللہ اور رسولؐ کے حکم پر سر تسلیم خم کرنے کے اللہ کے سوائے دوسروں کو حکم بناتے اور یتحاکموا الی الطاغوت سے یہ مراد ہوتا کہ وہ طاغوت کے پیچھے لگتے اور اس کا کہا مانتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ اس کے مقابل پر فرمایا وقد امروا ان یکفروا بہ۔ طاغوت کے کفر کا یعنی اس کی بات نہ ماننے کا حکم ان کو دیا گیا تھا اس کی مزید وضاحت اگلی آیت سے ہوتی ہے۔

إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَّتَوْفِيقًا ﴿٦٢﴾
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ
فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي
أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾
وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ
اللَّهِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ

آئیں گے کہ ہمارا تو سوائے بھلائی اور اتفاق کے اور کچھ منشا نہ تھا۶۸۰
یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے۔ پس ان
سے مُنہ پھیر لے اور اُن کو نصیحت کر اور ان سے ان کے حق
میں اثر کرنے والی بات کہہ۶۸۱
اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے اذن سے
اس کی اطاعت کی جائے۶۸۲ اور اگر وہ اس وقت جب اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا

ع۶۸۰ یحلفون۔ حلف اصل میں اس عہد کو کہتے ہیں جو قوم کے درمیان ہو اور چونکہ ایسا عہد قسم پر لیا جاتا تھا اس لیے حلف ایسی قسم کو کہا جانے لگا جس پر عہد لیا جائے اور پھر ہر ایک قسم پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔

توفیق۔ وفق۔ دو چیزوں کے درمیان مطابقت کا نام ہے اور اسی سے توفیق ہے جو اتفاق کے ہم معنی ہے۔

یہاں بتایا کہ یہ منافق عنقریب قسمیں کھائیں گے کہ ہم جو دوسرے لوگوں سے تعلقات رکھتے تھے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہم تم کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتے تھے، بلکہ یہ کہ ان لوگوں کے ساتھ ہم نیکی کریں اور فریقین میں موافقت پیدا ہو۔ ان کی ان قسموں کے جھوٹا ہونے کا قرآن شریف میں بار بار ذکر ہے ویحلفون علی الکذب (المجادلۃ ۵۸-۱۴) اتخذوا ایمانہم جنّۃ (المنفقون ۶۳-۲) وغیرہ اور یہاں بھی اگلی آیت میں یہ بتایا ہے۔ دوسری جگہ ان کا قول منقول ہے انما نحن مصلحون ہم دونوں فریق میں میل ملاپ کرانا چاہتے ہیں۔

ع۶۸۱ فی انفسھم یہاں فی انفسھم کے معنی تین طرح پر ہو سکتے ہیں۔ اوّل قولا بلیغا فی انفسھم یعنی قولاً مؤثرا فی قلوبھم ایسی بات جو ان کے دلوں میں اثر کرنے والی ہو۔ دوم فی شان انفسھم یعنی ان کے اپنے بارہ میں یا وہ بات جو ان کی حالت کو ظاہر کرنے والی ہے۔ سوم خالیا بھم لایکون معھم احد یعنی ان کو الگ کر کے یا خلوت میں۔

بلیغا۔ بلیغ۔ بلغ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک مقصد کی غایت کو پالینا (رغ) اور قول بلیغ یا بلاغت والا کلام دو طرح پر ہو سکتا ہے جیسا کہ امام راغب نے کہا ہے۔ ایک یہ کہ بذاتہ بلیغ ہو۔ اور اس کے لیے وہ کہتے ہیں کہ تین اوصاف ضروری ہیں۔ لغت کے لحاظ سے درست ہو۔ جو معنی مقصود میں اس کے ساتھ مطابقت ہو۔ اور فی نفسہٖ بات سچی ہو۔ اور دوسرے یہ کہ کہنے والے کے لحاظ سے اور جس کو بات کہی گئی ہے بلیغ ہو یعنی کہنے والا جو کہنے کا مقصد رکھتا ہو اس کو ایسے طور پر کہے کہ جس کو بات کہی گئی ہے وہ اسے قبول کر لے۔ اور یہاں ان دونوں معنوں کی طرف اشارہ ہے۔

ع۶۸۲ چونکہ اصل مضمون اس رکوع کا یہی تھا کہ رسول اللہ صلعم کی اطاعت کی جائے اور اسی اطاعت نہ کرنے والوں کو ہی جب وہ منہ سے اطاعت کا اقرار بھی کریں منافق بھی کہا گیا ہے۔ اس لیے اب کھول کر فرماتا ہے کہ رسول تو بھیجا ہی اس غرض کے لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے لیکن چونکہ اصل حق اطاعت کا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اس لیے ساتھ باذن اللہ فرمایا یعنی یہ کہ اس اجازت کا اعلام اللہ کی طرف سے ہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام رسول کے واسطہ سے ہی پہنچتے ہیں۔

ہر رسول مطاع ہوتا ہے مطیع نہیں ہوتا: یہ آیت رسولوں کے ایک امتیازی نشان پر فیصلہ کن ہے۔ امام رازیؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ کوئی رسول نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ایک شریعت ہو اور وہ اس شریعت میں مطاع ہو۔ اور اس کے بارہ میں اسی کی پیروی کی جائے۔ کیونکہ اگر وہ صرف اپنے سے کسی پہلے رسول کی شریعت کی طرف ہی بلاتا ہے۔ تو فی الحقیقت وہ مطاع نہ ہوا بلکہ مطاع وہ پہلا رسول ہوا جس کی وہ شریعت ہے اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ہر ایک رسول کے لیے لازمی ہے کہ وہ مطاع بھی ہو۔ پس اس آیت میں ایک ایسا حصر ہے کہ اس سے باہر نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہر ایک رسول کے لیے خود مطاع ہونا لازمی ہے اس لیے چونکہ قرآن نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اس اُمّت کے اندر ہمیشہ کے لیے حقیقی مطاع ایک محمد رسول اللہ صلعم ہی ہوں گے جیسا کہ فان تنازعتم فی شیءٍ فردوہ الی اللّٰہ والرسول سے ظاہر ہے اس لیے آپ کے بعد اس اُمّت کے اندر کوئی رسول نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی رسول ہو گا تو وہ خود مطاع ہو گا۔ اور اس لیے محمد رسول اللہ صلعم مطاع نہ رہیں گے اور یہ خلاف قرآن کے ہے پس ختم نبوت پر یہ آیت فیصلہ کن ہے۔ جب اس کو فان تنازعتم کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے اور اب تا قیامت کوئی رسول قطعاً نہیں آسکتا نہ کوئی پُرانا رسول آسکتا ہے اور نہ نیا۔ کیونکہ جو کوئی بھی رسول ہو کر آئے گا وہ خود مطاع ہو گا اور یہ ہو نہیں سکتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد: جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آنے کے منتظر ہیں وہ بھی اس آیت پر غور کریں اور جن لوگوں نے آج تیرہ سو سال بعد ایک رسول کا آنا مان لیا ہے وہ بھی غور کریں۔ اول الذکر سوچیں کہ اگر حضرت عیسیٰ آئیں تو لازماً منصب رسالت کے ساتھ آنے چاہئیں۔ کیونکہ ایک رسول کا منصب رسالت کسی صورت میں چھینا نہیں جا سکتا۔ یہ اللّٰہ اعلم حیث یجعل رسلتہ کے خلاف ہے اور پھر یہ بھی ماننا

فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾
فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

تیرے پاس آتے پھر اللہ کی بخشش مانگتے اور رسول ان کے لیے استغفار کرتا تو یقیناً وہ اللہ کو توبہ قبول کرنیوالا رحم کرنے والا پاتے ۶۸۳
سو نہیں تیرے رب کی قسم وہ ایمان ہی نہیں لاتے جب تک کہ وہ تجھے اس میں حکم (نہ) بنائیں جو ان میں آپس میں اختلاف ہو پھر اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی نہ پائیں جو تو فیصلہ کرے اور پوری پوری فرمانبرداری کریں ۶۸۴

پڑے گا کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی نعوذ باللہ کسی نا قابلیت کی وجہ سے ان کا یہ منصب چھینا گیا۔ لیکن اگر منصب رسالت کے ساتھ وہ آئیں تو پھر اس وقت مطاع وہ ہونگے نہ حضرت نبی کریم صلعم۔ گویا آنحضرت کی رسالت کا زمانہ ختم ہو جائے گا اور یہ عقیدہ نہایت فاسد ہے۔ اور وہ لوگ جو حضرت مرزا غلام احمد صاحب کو رسول بناتے ہیں وہ بھی غور کریں کہ وہ شخص جسے وہ رسول بناتے ہیں بار بار بیان کرتا ہے کہ میری گردن پر محمد رسول اللہ صلعم کی اطاعت کا جؤا اسی طرح پر ہے جیسے ہر ایک مسلمان کی گردن پر اور میں نے جو کچھ پایا اسی کی پیروی سے اور اسی کی اطاعت سے پایا۔ اس نے بار بار اپنا مطاع اور سب مسلمانوں کا مطاع رسول اللہ صلعم کو ہی بتایا۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے بعض انبیاء بھی تو حضرت موسٰی کی شریعت کے پیرو تھے لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گو ان کو نئی شرائع نہ دی گئی ہوں۔ مگر وہ سابق شریعت میں کمی بیشی تغیر تبدل اپنے زمانہ کی ضرورت کے مطابق کر سکتے تھے۔ اس لیے جو شریعت وہ پیش کرتے تھے وہ اپنی مہر سے پیش کرتے تھے۔ جس بات کو وہ درست کہہ دیں وہ درست اور جس کو وہ غلط کہہ دیں وہ غلط ماننی ضروری تھی۔ اس لیے بہرحال مطاع وہ خود ہی تھے۔ گو وحی الٰہی نے ان کو یہی ہدایت کی ہو کہ وہ موسوی شریعت کی پیروی کریں۔ لیکن اس امت کے اندر ایسا کوئی انسان نہیں ہو سکتا جو ایک شوشہ بھی شریعت کا کم و بیش کر سکے۔ اس لیے اس اُمت میں تا قیامت ایک ہی مطاع ہوگا اور وہ محمد رسول اللہ صلعم ہیں۔

ع۶۸۳ جب رسول کی اطاعت کے بارہ میں قطعی حکم دیدیا تو فرمایا کہ بعض وقت انسان سے غلطی ہو جاتی ہے۔ سو اگر ان لوگوں سے بھی کوئی غلطی ہو گئی تھی تو اس کا علاج تو یہ تھا کہ استغفار کرتے اور رسول اللہ بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو اللہ ان کو معاف کر دیتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلعم کا استغفار ساری اُمت کے لیے تھا۔ جس میں منافق تک بھی شامل تھے اور اپنی ذات تک محدود نہ تھا۔

استغفرلھم الرسول کے معنی مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی یوں کرتے ہیں "پھر معافی دیدے بالکل ان کو کتاب اللہ المجید"۔ مگر لطف یہ ہے کہ کتاب اللہ المجید کے معافی دینے کے بعد لوجدوا اللہ توابا رحیما ہے جس کے معنی مولوی صاحب کو بھی یہی کرنے پڑے ہیں "تو وہ ضرور پائیں گے اللہ تعالٰی کو بالکل معاف کرنے والا ہر طرح سے مہربان"۔ تعجب ہے کہ پہلے کتاب اللہ معافی دیتی ہے تو پھر اللہ تعالٰی معاف کر دیتا ہے حالانکہ کتاب اللہ کا معافی دینا اور اللہ کا معافی دینا ایک ہی ہے اور پھر استغفار کے معنی معافی دینا کسی لغت میں میری نظر سے نہیں گزرے اور نہ مولوی صاحب نے خود ان معنوں کی کوئی سند دی ہے۔

ع۶۸۴ فلا۔ لا کو یہاں بعض نے تاکید معنی قسم کے لیے صلہ مان کر گویا زائد مانا ہے۔ مگر درحقیقت ایسے مقامات پر لا نافیہ ہی ہوتا ہے اور نفی کسی پہلی چیز کی ہوتی ہے۔ خواہ مفہوم ہی ہو جیسے یہاں مراد ہے لیس الامر کما یزعمون۔ وہ بات نہیں جو گمان کرتے ہیں۔ کیونکہ شروع میں ان کے گمان کا ذکر تھا الم تر الی الذین یزعمون۔

وربک۔ واؤ قسم کے لیے ہے۔ قرآن کریم میں قسموں کا کیا منشا ہے اس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔ جہاں دوسری چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ یہاں قسم "تیرے رب" کی ہے۔ اس لیے جو اعتراض قسموں پر عموماً کیا گیا ہے وہ یہاں وارد نہیں ہوتا۔ لیکن اس قدر یہاں بھی بتا دینا ضروری ہے کہ الفاظ جیسے انسانوں کی طرف منسوب ہوئے ہیں۔ اللہ تعالٰی کے افعال کا ذکر بھی انہی الفاظ میں ہی ہوگا۔ حالانکہ دونوں استعمالوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ دیکھو ع۲۷ اسی طرح قسم میں ہے۔ انسان جب قسم کھاتا ہے تو وہ گویا ایک زبردست شہادت پیش کرتا ہے اس لیے خدا کی قسم کا اصل منشاء ایک زبردست شہادت کا پیش کرنا ہے اور جہاں جہاں اور جس جس چیز کی قسم قرآن کریم میں کھائی گئی ہے وہ ایک شہادت کی طرف اشارہ ہے یہاں وہ شہادت جس کی طرف اشارہ ہے خود لفظ ربک میں ہے یعنی محمد رسول اللہ صلعم کی ربوبیت کرنے والی ہستی۔ وہ خدا جس نے محمد رسول اللہ صلعم کی ربوبیت کرکے آپ کو ایک اعلٰی مقام پر پہنچایا اس کا رسول کو بھیجنا اس کی اپنے ہاتھ سے تربیت کرنا ایک بے معنی امر نہیں۔ اس نے اس لیے اس کی اپنے ہاتھ سے تربیت کی تا وہ انسانوں کی تربیت کرے اس لیے اگر اس کو مطاع اور حکم نہ مانا جائے تو وہ تربیت بھی نہیں کر سکتا۔ پس اللہ تعالٰی کے محمد رسول اللہ صلعم کی تربیت کرنے کا یہ تقاضا ہے کہ آپ مطاع ہوں۔

حَرَج۔ نہایہ میں ہے کہ حرج کے اصل معنی ضیق یعنی تنگی ہیں۔ اور اسی میں ایک قول ہے کہ حرج اضیق الضیق ہے یعنی خفیف سے خفیف تنگی اور اسی سے گناہ معنی ہو گئے ہیں اور مفردات میں ہے کہ حَرَج اصل میں مجتمع الشئ کو کہتے ہیں اور اس سے ضیق کے معنی نکلے ہیں۔ مجاہد نے حرج سے مراد یہاں شک

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾

اور اگر ہم ان پر یہ لازم کر دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کر دو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ، تو ان میں سے سوائے تھوڑے لوگوں کے یہ نہ کرتے اور اگر وہ کریں جو اُن کو نصیحت کی جاتی ہے تو یقیناً ان کے لیے بہتر اور ثابت قدم رکھنے میں زیادہ مضبوط ہوتا[۶۸۵]

لیا ہے اور بعض مفسرین نے کسی قسم کی کراہت کا شائبہ کہا ہے (ر)

یسلموا تسلیما ۔ تسلیم میں انقیاد ظاہر کی طرف اشارہ ہے جیسا لا یجدوا فی انفسھم حرجًا میں اس طرف اشارہ ہے کہ دل سے اس فیصلہ کو حق جانیں گویا جب یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلعم جو فیصلہ کریں اُسے دل سے سچّا سمجھو تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ظاہر طور پر بھی اس کے پابند ہو جاؤ۔ بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ بعض وقت انسان ایک بات کو سچ جانتا ہے مگر عناد کی وجہ سے اُسے قبول نہیں کرتا ۔ میرے نزدیک تسلیم کو بعد میں بطور ترقی اس لیے بیان کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کے فیصلوں کو دل سے سچّا ماننے والے تو بہت ہیں مگر ظاہر طور پر ان کی پابندی کرنے والے تھوڑے ۔ تو فرمایا کہ صرف یہی کافی نہیں کہ تم کہدو کہ ہم دل سے سچا مانتے ہیں بلکہ اس فیصلہ کے پابند بھی ہو جاؤ۔

اِس آیت کی ذیل میں بخاری نے ایک حدیث بیان کی ہے جس میں حضرت زبیر اور ایک انصاری کے جھگڑے کا ذکر ہے جو پانی کے متعلق تھا اور جس میں فیصلہ زبیرؓ کے حق میں ہُوا ۔ اس حدیث کے آخر میں آتا ہے کہ زبیرؓ نے کہا احسبُ ھٰذہ الایات اِلّا نزلت فی ذٰلك یعنی میں گمان کرتا ہوں کہ یہ آیات اسی بارہ میں نازل ہُوئیں ان الفاظ سے لازماً یہ مراد نہیں کہ یہ جھگڑا واقع ہوا تو اس کے فیصلہ کے متعلق یہ آیتیں نازل ہوئیں بلکہ ان آیات کا اس جھگڑے پر چسپاں ہونا مراد ہو سکتا ہے اور غالباً یہی مراد ہے کیونکہ جس اطاعت کا ذکر یہاں چلتا ہے وہ اطاعت عام معاملات میں ہے نہ خاص قضایا میں ۔ چنانچہ اس رکوع کی آخری سے پہلی آیت اس کا قطعی فیصلہ کرتی ہے جہاں فرمایا ومن یطع اللہ والرسول فاولئك مع الذین انعم اللہ علیھم جو شخص اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرے گا سو یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ۔ ظاہر ہے کہ یہاں اطاعت سے مراد امور دینی میں اطاعت ہے یعنی ان راہوں پر چلنا جو اللہ اور رسولؐ نے بتائی ہیں اور خود اس آیت کے الفاظ بھی یہی بتاتے ہیں ۔ کیونکہ یہاں فرمایا جو کوئی اختلاف باہم مسلمانوں میں ہو اس میں حکم رسول اللہ صلعم کو بنایا جائے ۔ تب ایک شخص حقیقت ایمان پر قائم ہوتا ہے اور جو شخص کچھ تو نبی کریم صلعم کی پیروی کرتا ہے اور کچھ اپنی خواہشات کی وہ حقیقت ایمان پر قائم نہیں اور پھر نبی کریم صلعم کے فیصلے پر شرح صدر سے راضی ہو یہاں تک اس فیصلے کو قبول کرنے میں کسی قسم کی تنگی بھی سینہ میں نہ آنے پائے اور پوری تسلیم کے ساتھ فرمانبرداری کریں ۔ باہمی اختلافات کا اس لیے ذکر کیا کہ جو شخص اختلاف میں اپنے فیصلہ کو نہ صرف قبول کرلے بلکہ اس فیصلہ پر اس کا شرح صدر ہو جائے ایسا شخص ہر بات میں پوری پیروی کر سکتا ہے ۔ اور اگر معمولی جھگڑے بھی یہاں مراد لیے جائیں تو بھی مطلب وہی ہے ۔ کیونکہ دنیا کے جھگڑوں میں مدعی مدعا علیہ دونوں کا کسی کے فیصلہ پر شرح صدر ہو جانا سوائے اس کے نہیں ہو سکتا کہ اس شخص کے احکام کی دل میں حد درجہ کی عزت ہو ۔ گویا یوں فرمایا کہ دین کے معاملات میں تو تم پر رسول اللہ صلعم کی پیروی لازم ہی ہے مگر اس پیروی کو اس کمال تک پہنچانے کی ضرورت ہے کہ اگر کوئی تمہارا دنیوی جھگڑا بھی ہو تو اس جھگڑے میں جو کچھ فیصلہ نبی کریم صلعم کریں اس کو نہ صرف تم قبول کرو بلکہ یہ خیال بھی تمہارے دل میں نہ آئے کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہے ۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے فیصلے محض قیاس اور اجتہاد سے نہیں ورنہ ان کے متعلق اس بات کا مطالبہ نہ ہوتا کہ دل میں بھی شرح صدر ہو اور ظاہراً بھی تسلیم کامل ہو اور نہ یہ آیت جائدادوں اور مال کے جھگڑوں کے متعلق ہے ۔ بلکہ دینی احکام کے بارہ میں ہے ۔

اجتہاد نبوی میں وحی خفی : اور یہ بھی صاف ثابت ہے کہ نبی کریم صلعم کا اجتہاد محض انسانی قیاسات کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ضرور ایک وحی کی روشنی تھی (جس کو ہم وحی خفی کہتے ہیں کیونکہ کھلی وحی اس بارہ میں نہ ہوتی تھی) جس کی وجہ سے آپ ان فیصلوں میں قطعاً غلطی نہ کر سکتے تھے ۔ ورنہ لا یجدوا فی انفسھم حرجًا غلط ٹھہرتا ہے ۔

ع۶۸۵ اپنے آپ کو قتل کر دینے کے حکم سے مراد : احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو بعض صحابہؓ نے کہا کہ اگر ایسا حکم ہوتا تو ہم اس کی تعمیل کرتے ، تو نبی کریم صلعم نے فرمایا للایمان اثبت فی قلوب اھلہ من الجبال الرواسی (ر ث) ایمان اس کے اہل کے دلوں میں مضبوط پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ہے ۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ خود شہادت دیتا ہے کہ تھوڑے ضرور ایسا بھی کرتے اور وقلیل من عبادی الشکور (السبا[۳۴] ۔ ۱۳) سے ثابت ہے کہ تھوڑے ہی اعلیٰ مقامات کو حاصل کیا کرتے ہیں ۔ تیسری بات غور طلب یہ ہے کہ یہاں فرمایا ہے کہ اگر ان پر ہم یہ فرض کر دیتے کہ اپنے آپ کو قتل ہی کر دو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ ۔ حالانکہ گھروں سے تو صحابہؓ کو نکلنا پڑا ۔ تو پھر ان دونوں حکموں کو ایک حکم میں رکھنے کا کیا مطلب ایک یہ کہ اپنے آپ کو قتل کر دو جو کسی نے نہیں کیا ۔ اور دوسرا یہ کہ اپنے گھروں سے نکل جاؤ جو تمام مہاجرین نے کیا ۔ اصل بات یہ ہے کہ اقتلوا انفسکم سے مراد بھی ایسا امر ہے جو اخرجوا من دیارکم کی طرح ممکن ہے یعنی دین کے لیے اس قدر قربانی کرنا کہ گویا انسان اپنے آپ کو اس راہ میں قتل کر دے کیونکہ اشراف علی القتل یا اپنے آپ کو قتل ہونے کے لیے پیش کر دینا یا اپنی جانوں کی پروا نہ کرنا گویا اپنے آپ کو قتل ہی کر دینا ہے ۔ اس کا تعلق اوپر کی آیت سے یہ ہے کہ اوپر بھی ایک حکم ۔ بظاہر سخت حکم ۔ رسول اللہ صلعم کے فیصلوں کو قبول کرنے اور کامل طور پر آپ کی اطاعت کرنے کا دیا ہے کہ ہمیشہ کے لیے ان سب انسانوں کا جو محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لائیں یہ فرض ہوگا کہ امور دینی میں آپ کے فیصلوں کو قبول کریں اور

وَّاِذًا لَّاٰتَيۡنٰهُمۡ مِّنۡ لَّدُنَّاۤ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۶۷﴾
وَّلَهَدَيۡنٰهُمۡ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ﴿۶۸﴾
وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓـئِكَ مَعَ
الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ
وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ ۚ
وَحَسُنَ اُولٰٓـئِكَ رَفِيۡقًا ﴿۶۹﴾

اور یقیناً تب ہم ان کو اپنی جناب سے بڑا اجر دیتے۔
اور یقیناً ان کو سیدھے رستہ پر چلاتے۔
اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہے تو یہ اُن کے ساتھ ہونگے
جن پر اللہ نے انعام کیا (یعنی نبیوں اور صدیقوں اور
شہیدوں اور صالح لوگوں (کے ساتھ) اور یہ اچھے
ساتھی ہیں ع۶۸۶

کسی قسم کا شائبہ کراہت کا ان کے دلوں میں نہ آئے ، بلکہ شرح صدر سے قبول کریں۔ تو اب فرماتا ہے کہ یہ حکم دراصل سخت نہیں انسان اپنے گھر میں رہ کر اپنے کاروبار کو سرانجام دیکر رسول اللہ صلعم کے احکام کی فرمانبرداری بھی کرسکتا ہے۔ اس سے سخت تر مقام یہ ہے کہ انسان دین کے لیے ایسے کام کرے کہ اپنی جان کی پروا بھی نہ کرے جو قتل نفس کے قائم مقام ہے۔ مثلاً اعدائے دین کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو جانا یہ قتل نفس سے کم نہیں۔ اور پھر یہ سخت مقام ہے کہ دین کے لیے اپنے گھروں کو چھوڑ دو جیسا کہ صحابہ کرامؓ نے چھوڑ کر دکھایا تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ مشکل کام ہم نے ساری اُمت پر ہمیشہ کے لیے فرض نہیں کر دیئے کیونکہ ان کے کرنے کے اہل بھی تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ ہاں سب لوگوں کو ہمیشہ کے لیے ہم یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ دین میں رسول اللہ صلعم کے فیصلوں اور آپ کی حدبندیوں سے باہر قدم نہ رکھیں۔ اپنے کاروبار دنیا کو بھی سرانجام دیں اپنے گھروں میں بھی رہیں اور ساتھ دین کی حدود کو بھی نگاہ رکھیں۔

لو انهم فعلوا ما يوعظون به میں یہ بتایا ہے کہ اگر وہ اطاعت رسول پورے طور پر کریں تو یہ ان کی دونوں طرح پر بھلائی کا موجب ہوگا۔ دنیا میں بھی ان کی بہتری کا موجب ہوگا اور ایمان میں بھی وہ مضبوط ہونگے اور ثابت قدمی میں بہت ترقی کریں گے۔ یا آخرت میں ان کی بھلائی کا موجب اور دنیا میں ان کی ثابت قدمی کا موجب ہوگا۔ اس سے یہ منشا نہیں کہ حفاظت دین کے لیے اپنے آپ کو قتل تک کے لیے پیش کرنا یا اپنے گھر کو چھوڑ دینا کسی پر بھی فرض نہیں بلکہ اس میں ایک پیشگوئی پائی جاتی ہے کہ وہ حالات دنیا میں پیدا ہو جائیں گے کہ ہجرت یعنی وطن کے چھوڑنے اور دین کی حفاظت کے لیے اپنی جان قربان کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ سوائے نادر صورتوں کے جو معدوم کے حکم میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں بھی آتا ہے لا هجرة بعد الفتح۔

ع۶۸۶ صدّیقین۔ صِدّیق مبالغہ کا صیغہ ہے اسی لیے اس کے اصل معنی ہیں راستی میں کمال کو پہنچا ہوا (ل) اور امام راغبؒ کہتے ہیں کہ صدیق وہ ہے جس کا صدق کثرت سے ظاہر ہو۔ اور کہا گیا ہے۔ بلکہ صدیق وہ ہے جو کبھی جھوٹ نہ بولے اور کہا گیا ہے بلکہ وہ جس کو اس قدر سچ بولنے کی عادت ہے کہ جھوٹ اس سے کبھی سرزد نہیں ہو سکتا اور بعض نے کہا ہے وہ شخص جو اپنے قول اور اعتقاد دونوں میں سچا ہو اور جس نے اپنے صدق کو اپنے فعل سے سچ ثابت کر دکھایا ہو یہ تو اس کے عام معنی ہیں اور اصطلاح شریعت میں ہر ایک شخص جو ہر ایک اللہ کے حکم کو سچا مان لے اور اس میں سے کسی کے بارہ میں اس کے دل میں کوئی شک واقع نہ ہو اور نبی کریم صلعم کی تصدیق کرے وہ صدیق ہے (ل) پس عام معنی سے یہ انتقال خاص معنی کی طرف یوں ہوا کہ ایک شخص اس قدر سچ بولنے کا عادی ہے کہ نہ صرف اس سے اپنی ذات میں کبھی کوئی جھوٹ سرزد نہیں ہوتا بلکہ جب راستی اس کے سامنے آتی ہے تو اس وجہ سے کہ اسے صدق سے گویا ایک قدرتی تعلق ہے وہ اس راستی کو فوراً پہچان لیتا ہے اور کسی دلیل کا محتاج نہیں ہوتا۔ اصطلاح شریعت میں یوں کہنا چاہیئے کہ نور ایمانی اس میں اس قدر غالب ہوتا ہے۔ یا ایمان کے لحاظ سے وہ ایسے کمال کو پہنچا ہوا ہوتا ہے کہ راستی سے اس کو ایک قدرتی تعلق ہو جاتا ہے۔ پس صدیقیت کا مرتبہ درحقیقت کمال ایمانی کا مرتبہ ہے۔

شہداء۔ شہید مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنی وہ کامل علم رکھنے والا جو اس علم کو بیان کردے یا ظاہر کردے گویا شہید کا کمال بلحاظ علم کے ہے جس طرح صدیق کا کمال بلحاظ ایمان کے ہے اس لیے کہا گیا ہے کہ شہید مرتبہ علم میں متقدم اور مرتبہ ایمان میں متاخر ہے اور صدیق مرتبہ ایمان میں متقدم اور مرتبہ علم میں متاخر ہے اور اسی لحاظ سے حضرت ابوبکرؓ صدیق کو مدار صدیقیت قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ کمال ایمانی کے لحاظ سے ان کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ اور حضرت عمرؓ کو شہید کیونکہ کمال علمی کے لحاظ سے ان کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔

صالحین۔ صالح کا مادہ صلح ہے اور صلاح۔ فساد کی ضد ہے۔ کثرت استعمال میں وہ افعال سے مخصوص ہیں (غ) اور قرآن کریم میں بکرّات امنوا وعملوا الصالحات کہہ کر صلاح کو عمل سے وابستہ کیا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ صالح کا کمال عمل سے وابستہ ہے۔ اس لیے بعض نے ولایت کو صالحیت کا مقام قرار دیا ہے اور اس کا مدار حضرت علیؓ کو ٹھہرایا ہے۔

رفیق۔ (رِفق بمعنی نرمی سے) وہ ہے جو تم سے نرمی کرے۔ بالخصوص وہ شخص جو سفر میں ساتھی ہو (ل)

رسول کی اطاعت سے منعم علیھم کی رفاقت ملتی ہے۔ اس سارے رکوع میں رسول اللہ صلعم کی اطاعت پر ہی زور دیا ہے۔ اطاعت نہ کرنے والوں کو منافق قرار دیا ہے اور اب اطاعت کرنے والوں کے اجر پر اس کا خاتمہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ جو لوگ رسول اللہ صلعم کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝ یہ فضل اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کافی جاننے والا ہے۔
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے بچاؤ (کا سامان) لے لیا کرو،

ہونگے جو بڑے بڑے انعامات کے وارث ہوتے ہیں۔ اور وہ بڑے انعام پانے والے کون لوگ ہیں۔ جو نبوت کے مقام تک پہنچائے گئے ہیں اور کمال ایمانی کو حاصل کر لیتے ہیں اور کمال علمی کو حاصل کر لیتے ہیں اور کمال عملی کو حاصل کر لیتے ہیں تو گویا یوں فرمایا کہ اطاعت رسول سے انسان کو کامل انسانوں کی رفاقت حاصل ہو جاتی ہے گو وہ خود اس کمال کو پہنچے یا نہ پہنچے اور اس میں کیا شک ہے کہ کمال ایمانی اور کمال علمی اور کمال عملی کو حاصل کرنیوالے تھوڑے لوگ ہوتے ہیں اور اکثر لوگ بوجہ طرح طرح کے اشغال اور کدورتوں کے یا دیگر حالات کے کمال کو نہیں پا سکتے پس یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ ایسے لوگوں کو بھی جنہوں نے حتی الوسع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی کوشش کی ہے گو انھوں نے ان کمالات کو حاصل نہ کیا ہو، ان کمالات والوں کی رفاقت عطا فرمائی۔ چنانچہ قرآن کریم کے اپنے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔ اوّل معیّت کا ذکر کیا پھر حسن اولٰٓئك رفيقا کہہ کر بتایا کہ ان کی رفاقت ان کو ملے گی۔ اور آخر آیت میں فرمایا ذٰلك الفضل من الله۔ یہ اللہ کی طرف سے فضل ہے کہ صرف اطاعت پر ہی اتنا بڑا اجر عطا فرمایا اور پچھلی آیت کا مضمون بھی یہی چاہتا ہے۔

احادیث کی شہادت: احادیث کو دیکھا جائے تو ان سے بھی اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ترمذی نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا التاجر الصدوق الامين مع النبيين والصديقين والشهداء تاجر صادق امین نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نبی بن جاتا ہے اور صحیح حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلعم سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جو ایک قوم سے محبت کرتا ہے اور ان میں ملا نہیں یعنی ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچا تو آپ نے فرمایا المرء مع من احب آدمی ان کے ساتھ ہوگا جن سے وہ محبت کرتا ہے (رخ) اور انس سے ایک روایت میں ہے انی لاحب رسول الله صلعم و احب ابابکر وعمر رضی الله عنهما وارجوان الله يبعثنی معهم وان لم اعمل كعملهم (رخ) میں رسول اللہ صلعم سے محبت کرتا ہوں اور حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے محبت کرتا ہوں اور میں اُمید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان کے ساتھ مبعوث کرے گا گو میں نے ان کے سے عمل نہیں کیے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے جنت کے بعض اعلیٰ منازل کا ذکر کیا تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ انبیاء کی منزلیں ہیں جن پر ان لوگوں کے سوا کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ تو آپ نے فرمایا والذی نفسی بیده رجال اٰمنوا بالله وصدقوا المرسلين (رخ) قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے وہ لوگ بھی (ان کو حاصل کریں گے) جو اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے رسولوں کی تصدیق کی۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایک شخص کو غمگین دیکھا تو دریافت فرمایا۔ اس نے عرض کیا کہ اب تو ہم صبح شام آپ کے ساتھ ہوتے ہیں آپ کے چہرہ کو دیکھتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ لیکن بعد وفات آپ اعلیٰ مقام پر ہونگے جہاں ہم نہیں پہنچ سکیں گے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

پس یہ تو صاف ظاہر ہے کہ یہاں مکملین کی رفاقت اور معیّت کا ذکر ہے۔ رہا یہ سوال کہ آیا یہ رفاقت محض آخرت کے لیے ہے یا دنیا میں بھی اس سے کچھ حظ ملتا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ اسلام نے جتنے انعامات کا وعدہ دیا ہے ان کو کسی نہ کسی رنگ میں اس عالم میں بھی پورا کر دیا ہے۔ اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ مومنین کو اس دنیا میں بھی کچھ حظ ان مراتب کمال سے مل جاتا ہے لیکن اس پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس صورت میں مومنین کو ایسا حظ مل جاتا ہے تو کیا وہ منعم علیہم میں داخل ہو کر نبی، صدیق، شہید اور صالح بن جاتے ہیں یا نہیں؟ صالح کے مرتبہ پر ایک مومن کا پہنچ جانا اس سے تو قرآن شریف بھرا پڑا ہے۔ شہید اور صدیق کے مرتبہ پر پہنچنے پر بھی بہتیری آیات شاہد ہیں۔ جیسے فرمایا لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا (البقرۃ ۲۔ ۱۴۳) والذین اٰمنوا بالله ورسله اولٰٓئك هم الصديقون والشهداء عند ربهم (الحدید ۵۷۔ ۱۹) لیکن بذریعہ ایمان بذریعہ اطاعت بذریعہ اعمال صالحہ کسی کا نبوت کے مرتبہ پر پہنچ جانا اس کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں ملیگا۔ بلکہ رسالت کے متعلق فرمایا الله اعلم حيث يجعل رسالته (الانعام ۶۔ ۱۲۴) اللہ خود بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں رکھے۔ صدیقیت کا مقام شہادت کا مقام صالح کا مقام یہ سب د الذين جاهدوا فينا کے ماتحت انسان کی کوشش اور سعی سے مل جاتے ہیں۔ جیسا کہ والذين اٰمنوا بالله ورسله اولٰٓئك هم الصديقون والشهداء عند ربهم سے صاف ظاہر ہے۔ ایمان جب اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو وہی صدیق اور شہید کا مقام ہے۔ ایمان کے لیے اس سے آگے کوئی مرتبہ نہیں۔ اکتساب کا کمال انسان کو صدیقیت کے مرتبہ تک ہی پہنچاتا ہے۔ جیسا کہ خود اس لفظ کے معنی میں بھی میں نے دکھایا ہے کہ یہ کمال ایمان پر دلالت کرتا ہے۔

اس اُمت میں صرف مبشرات یا نبوت اپنے لغوی معنی میں ہے: نبوت اگر کوئی کمال ایمان کا مرتبہ ہوتا تو اس کا ذکر قرآن شریف میں ہونا چاہیئے تھا کسی حدیث میں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر نہ تو قرآن شریف نے کہیں فرمایا کہ مومن جب ایمان میں ترقی کرتا ہے تو اسے نبی بنا دیا جاتا ہے نہ کسی حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ہاں قرآن کریم یہ ضرور فرماتا ہے کہ لهم البشرٰى فى الحيٰوة الدنيا (یونس ۱۰۔ ۶۴) مومنوں کو اس دنیا کی زندگی میں بشارتیں دی جاتی ہیں اور یہ بھی فرمایا کہ تتنزل عليهم الملائكة (حٰمٓ السجدۃ ۴۱۔ ۳۰) کہ ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔ اور صحیح حدیث میں ہے لم يبق من النبوة الا المبشرات نبوت سے کچھ باقی نہیں رہا مگر مبشرات۔ اور دوسری حدیث صحیح میں ہے لقد كان فی من كان قبلكم رجال يكلمون من غير ان يكونوا انبياء فان يكن فی امتی احد فعمر تم سے پہلے لوگوں میں ایسے لوگ ہوتے تھے کہ جن سے اللہ تعالیٰ ہمکلام ہوتا تھا گو وہ نبی نہ ہوتے تھے۔ میری امت میں اگر کوئی شخص ایسا ہے تو عمر ہے۔ پس معلوم

ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ پھر گروہ گروہ ہو کر نکلو یا اکٹھے نکلو ۶۸۷

وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ اور تم میں سے وہ بھی ہے جو ضرور پیچھے رہ جاتا ہے پھر اگر تم کو مصیبت

ہوا کہ نبوت کا ایک جزو۔ نبوت کا ایک رنگ یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے ہمکلام ہونا اس کا وجود اس امت میں قرآن وحدیث سے ثابت ہے یہی وجہ ہے کہ اس پر قریباً قریباً امت کا اتفاق ہے کہ نبوت اپنے لغوی معنی کی رُو سے یعنی محض خدا سے ہم کلام ہونے کے معنی میں تو اس امت میں جاری ہے مگر نبوت اپنے خاص یا اصطلاحی مفہوم میں مسدود ہے۔ چنانچہ روح المعانی میں ہے ان النبوّة عامة وخاصة والتی لا ذوق لهم فیها هی الخاصة اعنی نبوة التشریع هی مقام خاص فی الولایة واما النبوة العامة فهی مستمرة ساریة فی اکابر الرجال غیر منقطعة دنیا واخری یعنی نبوت عام ہے اور خاص۔ اور وہ جس میں اس امت کے لیے ذوق نہیں وہ نبوت خاصہ ہے یعنی تشریعی نبوت اور وہ ولایت میں مقام خاص ہے اور رہی نبوّت عامہ سو وہ اکابر امت میں جاری ساری ہے اور دنیا و آخرت میں غیر منقطع ہے۔

ولایت یا محدثیت: گویا نبوت عامہ درحقیقت ولایت کا ہی نام ہے اس لیے اس کو محدثیت کے نام سے بھی پکارا ہے۔ کیونکہ اس میں محض اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کا شرف ہے اور وہ دنیا اور آخرت میں حاصل رہے گا۔ لیکن نبوت خاصہ یعنی جسے اصطلاحی شریعت میں نبوت کہا جاتا ہے یا جس کا نام نبوت تشریعی ہے کیونکہ جو شخص اس منصب پر فائز ہوتا ہے وہ شریعت لاتا ہے یا شریعت میں کمی بیشی یا ترمیم تنسیخ کرنے کا مجاز ہے۔ وہ اس اُمت میں بند ہے کیونکہ شریعت کو نبی کریم صلعم نے کمال تک پہنچایا۔

اب ہم آیت کو چھوڑ کر واقعات کو لیتے ہیں تو صحابہؓ کی اللہ اور رسولؐ کی کامل فرمانبرداری سے قرآن شریف بھرا پڑا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے لیے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کی سند قرآن کریم میں موجود ہے۔ وہ اللہ سے راضی اور اللہ ان سے راضی، اس سے بڑھ کر کامل اطاعت کا کوئی مرتبہ تصوّر میں نہیں آسکتا۔ لیکن ایک طرف اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی کامل اطاعت ایسی صفائی سے ثابت ہے تو دوسری طرف یہ بھی صفائی سے ثابت ہے کہ کوئی صحابی نبوت کے منصب پر کھڑا نہیں کیا گیا یعنی نبی نہیں بنایا گیا، بلکہ آنحضرت صلعم نے فرمایا لو کان بعدی نبی لکان عمر۔ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا۔ گویا حضرت عمرؓ میں وہ جوہر موجود تھے۔ مگر نبی چونکہ اکتساب سے کوئی نہیں بنتا۔ اور اللہ تعالیٰ کی مصلحت نے نبوت کا دروازہ آنحضرت صلعم کے ساتھ بند کر دیا۔ اس لیے نبوت کسی کو نہیں مل سکتی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تیرہ سو سال تک کوئی نبی اس لیے نہیں بنا کہ کسی نے اللہ اور رسول کی کامل اطاعت نہیں کی۔ وہ دشمن اسلام ہیں اور اسلام کو دنیا میں بدنام کرتے ہیں۔ اگر صحابہؓ کے گروہ نے کامل اطاعت نہ کی تھی، تو کیا خدا نے بھی غلطی سے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کی سند اُن کو دیدی۔ غرض اگر کامل اطاعت سے کوئی نبی بن سکتا تو صحابہ کا گروہ اس کا حقدار تھا۔ کہ ان میں سیکڑوں نبی ہوتے۔ مگر چونکہ ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے اطاعت سے نبوت کا ملنا ایک غلط خیال ہے جس کی صاف تردید قرآن سے، حدیث سے اور واقعات سے ہوتی ہے۔ ہاں ایک رنگِ نبوت بیشک اس امت کے کاملین کو مل جاتا ہے اور یہ رنگ صحابہؓ کو بھی ملا۔ اس لیے حدیث میں آتا ہے کہ کسی صحابی کو کسی نبی سے اور کسی کو کسی نبی سے آنحضرت صلعم نے تشبیہ دی حتیٰ کہ ابوذر غفاری کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مشابہت دی۔

۶۸۷ حِذر۔ حذر کے معنی ڈرانے والی چیز سے اپنا بچاؤ کرنا ہیں۔ پس حِذر سے مراد ہے جس میں بچاؤ کا سامان ہو جیسے ہتھیار وغیرہ (غ)

انفروا۔ نَفر کے معنی ہیں کسی چیز سے بھاگنا یا کسی چیز کی طرف بھاگنا (غ) اس لیے نفور، نفرت کے معنی میں آتا ہے یعنی ایک چیز سے بھاگنا اور نفر لڑائی میں نکلنے کو بھی کہتے ہیں اور نفر خدا کی راہ میں علم سیکھنے کے لیے نکلنے کو بھی کہتے ہیں۔ جیسے فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین (التوبة ۹-۱۲۲)

ثبات۔ ثُبَة کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایک منفرد جماعت یا گروہ باقی سے الگ کیا گیا (غ) اس کا مادہ ثوب ہے جس کے معنی لوٹ کر آنا ہیں اسی مادّہ سے مثابة کے معنی ہیں تفرقہ کے بعد ان کے اجتماع کا مقام اسی سے ثبة ہے (ل)

دشمن کے مقابلہ کے لیے تیاری کی ضرورت: مومنوں کو یہ بتا کر کہ رسول اللہ صلعم کی اطاعت میں ان کے لیے کیسی کیسی برکات ہیں اب اس رکوع میں یہ بتایا ہے کہ سخت ترین حکم جس کی اطاعت کے لیے تم کو بلایا جاتا ہے وہ جنگ کا حکم ہے لیکن وہ بھی تمہاری اپنی بہتری کا ہی موجب ہے۔ کیونکہ دشمن تم کو نیست و نابود کرنے پر تُلا ہوا ہے اس لیے تم کو ہر طرح پر اپنا بچاؤ کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔ تو سب سے پہلی آیت میں یہ حکم دیا ہے کہ اپنے بچاؤ کا سامان کرلو۔ قرآن کریم الفاظ ایسے اختیار فرماتا ہے کہ وہ جنگ اور صلح دونوں حالتوں پر چسپاں ہو سکتے ہیں۔ اس حکم کے نزول کے وقت چونکہ دشمن نے تلوار کے ذریعہ سے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا چاہا اس لیے اسلحہ یعنی ہر قسم کے سامان حرب کی تیاری ہی ضروری تھی اور آئندہ بھی ضروری رہے گی۔ لیکن جہاں جیسا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کو قلم یا زبان یا تدابیر سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو تو اس وقت بالمقابل تیاری بھی انہی چیزوں کی چاہیئے۔ مقابلہ تو کسی نہ کسی رنگ میں قیامت تک لگا ہی رہے گا۔ پس جیسا مقابلہ ہے ویسی ہی تیاری کی ضرورت ہے اور اسی قسم کی احتیاط بکار ہے۔ اب مذہب پر حملہ ہے تو اسی رنگ میں مسلمانوں کو بھی مقابلہ کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ میں اگر مسلمان سلطنتیں ایک طرف سامان جنگ و فوج کی تیاری سے حد درجہ غافل ہیں، تو مسلمان علماء دوسری طرف دین پر حملوں سے لاپروا ہیں۔

مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿٧٢﴾

پہنچے، کہتا ہے اللہ نے مجھ پر انعام کیا، کہ مَیں اُن کے ساتھ موجود نہ تھا ع٦٨٨

وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٧٣﴾

اور اگر تم کو اللہ کی طرف سے فضل پہنچے تو بول اُٹھتا ہے گویا کہ تم میں اور اس میں کوئی دوستی نہ تھی، اے کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا ع٦٨٩

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٧٤﴾

سو چاہیئے وہ لوگ اللہ کے رستہ میں جنگ کریں جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچتے ہیں اور جو اللہ کی راہ میں جنگ کرے، پھر قتل کیا جائے یا غالب آجائے تو ہم اس کو جلد بڑا اجر دیں گے ع٦٩٠

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ؕ ﴿٧٥﴾

اور تمھیں کیا (عذر) ہے کہ تم اللہ کے رستے میں جنگ نہ کرو اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچّوں کے لیے جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی ولی بنا اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی مددگار بنا ع٦٩١

ع٦٨٨ لیبطئن۔ یبطئی۔ بطوٗ سے ہے جس کے اصل معنی ہیں چلنے میں جلدی نہ اٹھنا، بلکہ پیچھے رہ جانا (غ) اور اسراع یعنی جلدی چلنے کا نقیض ہے اور بطّاء متعدی بھی ہوسکتا ہے اور لازمی بھی یعنی دوسروں کو پیچھے رکھنا یا خود پیچھے رہ جانا اور چونکہ یہاں مفعول مذکور نہیں اس لیے لازمی ہی لیا جائیگا۔

ع٦٨٩ کان لم تکن بینکم وبینه مودّة ۔جملہ معترضہ ہے۔کیونکہ اس کا یہ کہنا یا لیتنی کنت معهم اے کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا۔گویا ظاہر کرتا ہے کہ اس میں اور تم میں کوئی تعلق محبّت نہ تھا۔یہاں باوجودیکہ مومنوں کو کامیابی ہوئی ہے لیکن اس شخص کے اس قول کو کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا محل اعتراض ٹھہرایا ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں دنیا کا مال حاصل کرلینا کوئی کامیابی نہیں۔

ع٦٩٠ چونکہ پچھلی دو آیتوں میں کچھ کم ہمتوں کا یا دُو دِلے لوگوں کا ذکر کیا تھا اس لیے اب یہاں ان کا ذکر کرتا ہے جو سب کچھ اللہ کی راہ میں دے چکے ہیں اور اپنا کچھ بھی باقی نہیں رکھا اور بتانا یہ مقصود ہے کہ ان کی غرض دنیوی کوئی باقی نہیں رہی حتی کہ جنگ کرنے میں بھی ان کی کوئی غرض دنیوی باقی نہیں نہ وہ اپنی فتح کا نقارہ چاہتے ہیں نہ کسی مال غنیمت کے طالب ہیں۔بلکہ پہلے وہ دنیا کے سارے سامان کو خدا کی راہ میں دے چکے ہیں۔یہ کتنی کڑی مشکل ہے۔خدا کی راہ میں جنگ کرنے کے لیے بلایا ہی اسے جاتا ہے جو اپنا سب کچھ خدا کے لیے قربان کرچکا ہو۔

مال غنیمت کا حاصل کرنا غرضِ جنگ نہ ہو: مال غنیمت کے خیال سے جنگ کرنا تو ایک طرف رہا۔جنگ جیسی خطرناک چیز کو کس قدر نفسانی خیالات سے پاک کیا ہے قرآن کریم کی دیگر آیات سے بھی اس بات کی تصریح ہوتی ہے۔مثلاً احد کی جنگ میں جب تیر اندازوں کے ایک حصّہ نے مال غنیمت کی خاطر اپنی جگہ کو چھوڑ دیا، تو ان کے ذکر میں فرمایا منکم من یرید الدنیا (اٰل عمرٰن۔١٥١) یہ دنیا طلبی تھی جو مسلمانوں کو شایاں نہ تھی۔ایسا ہی احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے۔چنانچہ ابوداؤد کتاب الجهاد میں ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایک شخص ہے کہ جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے وهو یبتغی عرضاً من اغراض الدنیا۔ اور وہ کچھ دنیا کی غرض بھی رکھتا ہے آپ نے فرمایا لا اجر له اس کے لیے کوئی اجر نہیں۔

ع٦٩١ مالکم کے معنی تو یہی ہیں کہ تمہیں کیا ہوا، یا تمہیں کیا عذر ہے۔مگر اصل غرض استفہام کی تحریص ہے اور یہ بتانا ہے کہ اب ترک جنگ کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا۔

المستضعفین۔ضعف سے ہے جو خلاف قوت ہے اور کمزور کو ضعیف کہتے ہیں اور اِسْتَضْعَفْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اس کو کمزور پایا۔ترکیب میں یا تو

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا ﴿۷۶﴾ ع

جو ایمان لائے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، اور جو کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس تم شیطان کے مددگاروں سے جنگ کرو شیطان کی جنگ یقیناً کمزور ہے ع۶۹۲

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ قِیْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَیْدِیَكُمْ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا

کیا تم نے ان (کے حال) پر غور نہیں کیا جن کو کہا گیا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو ع۶۹۳ پھر جب

مستضعفین مجرور ہے اور مراد ہے فی سبیل المستضعفین یا فی خلاص المستضعفین یعنی کمزوروں کی خاطر یا کمزوروں کی خلاصی کے لیے۔ اور یا منصوب علی الاختصاص یعنی بالخصوص کمزور لوگ جو ایسا ایسا کہتے ہیں۔

الولدان - ولید کی جمع ولدان آتی ہے بعض کے نزدیک ولد کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور ولید اصل معنی کے لحاظ سے نئے پیدا شدہ بچے اور بڑے پر یکساں استعمال ہوسکتا ہے۔ گو عام طور پر نئے پیدا شدہ پر بولا جاتا ہے (غ) اور ولید لڑکے کو بھی کہا جاتا ہے اور غلام کو بھی۔ اس لیے بعض نے یہاں ولدان سے غلام اور لونڈیاں مراد لی ہیں۔ مگر لڑکے مراد لینے میں بھی کوئی امر مانع نہیں اس لیے کہ چھوٹے بچوں پر ظلم کیا جاتا تھا اور دعا کرنے میں چھوٹے بچوں کے شامل ہونے میں بھی کوئی امر مانع نہیں، یہ صورت حال کا بیان ہے۔ یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں کہ ان پر دعا کرنا فرض تھا۔

ھٰذہ القریۃ اشارہ مکّہ کی طرف ہے جہاں اب تک مسلمانوں پر ظلم ہو رہے تھے جو وہاں سے بوجہ کمزوری کے ہجرت نہ کرسکتے تھے کیونکہ کفار مانع تھے۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ جنگ کرنے کی بڑی بھاری ضرورت کیا ہے۔ سو اوّل تو اس کو فی سبیل اللہ کہہ کر بتایا کہ جنگ کی ضرورت دین الٰہی کی حفاظت ہے کیونکہ مخالف اس کو تلوار سے نیست و نابود کرنا چاہتے تھے۔ اور دوسری ضرورت یہ بتائی کہ کمزور مرد عورتیں بچے اہل مکّہ سے دُکھ اُٹھا رہے ہیں اور ان پر مظالم ہو رہے ہیں اور وہ اس قابل نہیں کہ ہجرت کرسکیں۔ حضرت ابن عباس کی روایت بخاری میں ہے کہ میں اور میری ماں مستضعفین میں سے تھے۔ سلمہ بن ہشام۔ ولید بن ولید اور ابوجندل کے نام بھی بعض روایات میں آئے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکّہ کی طرف سے مسلمانوں پر کس قدر ظلم تھا کہ باوجودیکہ ان کا بیشتر حصّہ اب مدینہ میں جا چکا تھا، مگر پھر بھی جو بعض کمزور لوگ یا عورتیں یا بچے رہ گئے تھے وہ بھی ان کے ظلم کا تختۂ مشق ہو رہے تھے۔ ولی اور نصیر کے الگ الگ لانے میں یہ منشا معلوم ہوتا ہے کہ ولی تو محض حفاظت کے لیے بکار ہوتا ہے اور نصیر وہ ہے جو مدد دے کر ظلم سے ہمیشہ کے لیے چھڑا دے۔ جیسے وانصرنا علی القوم الکافرین سے ظاہر ہے۔ بعض کے نزدیک ولیا سے مراد ولایت اور نصیر سے مراد نصرت ہے اور جناب الٰہی سے ولایت و نصرت مانگنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ خود ولی و ناصر ہو۔

ع۶۹۲ یہاں مسلمانوں اور کفار کی اغراض جنگ کا قطعی فیصلہ کیا ہے۔ مومن اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، لیکن اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اس لیے جو شخص خدا کی راہ میں جنگ کرے گا وہ بھی جنگ کے ذریعہ سے کسی پر ظلم کرنا روا نہیں رکھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ سب مخلوق کو یکساں رزق دیتا ہے اور یکساں حقوق اس نے سب کو دیئے ہیں اس لیے جو اس کی راہ میں جنگ کرے گا وہ دوسروں کے حقوق دبانے کے لیے کبھی جنگ نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا اس لیے خدا کی راہ میں جنگ کرنے والا کسی فساد کی خاطر جنگ نہیں کرسکتا۔ طاغوت کے معنی ہی سرکشی کرنے والا یا حدبندیوں سے نکلنے والا ہیں۔ اس لیے یہاں فی سبیل الشیطان نہیں فرمایا بلکہ فی سبیل الطاغوت فرمایا حالانکہ ساتھ ہی دوسری جگہ قاتلوا اولیاء الشیطان اور کید الشیطان کے لفظ استعمال فرمائے ہیں۔ گویا مراد طاغوت اور شیطان سے ایک ہی ہے۔ لیکن فی سبیل الطاغوت کہنے میں اشارہ یہ ہے کہ کافر حدبندیوں سے نکلنے کے لیے زیادتی اور ظلم کے لیے جنگ کرتے ہیں۔ گویا ان کی غرض جنگ سے یہ ہے، ان کو کوئی تکلیف پیش نہیں آئی جس کے دور کرنے کے لیے جنگ کرتے ہوں۔ بلکہ ایک امن سے رہنے والی قوم پر ظلم اور زیادتی کرنے کے لیے جنگ کرتے ہیں۔

اس آیت میں یہ پیشگوئی صریح الفاظ میں ہے کہ کفار جنگ میں مغلوب ہوں گے۔ کیونکہ آخر پر فرمایا کہ شیطان کی جنگ کمزور ہے۔ کید کے لیے دیکھو ع۵۰۷ حالانکہ اس وقت تو کفار کا سخت غلبہ تھا بلکہ سارا ملک ہی مٹھی بھر مسلمانوں کے خلاف تُلا ہُوا تھا۔ پس یہاں شیطان کی جنگ کو کمزور کہنے سے اس کے انجام کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے یعنی انجام کار کمزور ثابت ہو گی۔ اس میں یہ بھی بتایا کہ ظلم اور زیادتی اگر غالب بھی ہوں تو چند روز کے لیے ہوتے ہیں۔

ع۶۹۳ اصلاح نفس جہاد پر مقدّم ہے: اس رکوع میں یہ ذکر ہے کہ منافق لڑائی میں نکلنے سے ڈرتے ہیں۔ ہاتھوں کو روکنے اور نماز کو قائم کرنے کا حکم تو عام ہے یعنی سب مسلمانوں کو، مگر ڈرنے والا اور باتیں بنانے والا گروہ مسلمانوں کا نہیں بلکہ منافقوں کا ہے اور ان کو فریق منہم اس لیے کہا کہ بظاہر منافق مسلمانوں کے اندر ہی ملے ہوئے تھے۔ لوگوں سے اس طرح ڈرنے والے جیسے خدا سے ڈرنا چاہیئے۔ متاع دُنیا کی آرزو کرنے والے۔ پھر آیت ۸۱ کے راتوں کو مشورہ کرنے والے، مومن نہیں ہو سکتے۔ اور یہ جو کہا گیا کہ ہاتھوں کو روک رکھو، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلعم کو یہ حکم تھا کہ جب تک دشمن جنگ میں ابتدا نہ کرے اس وقت

كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ
يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ
خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا
الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ
لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾
اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ

ان پر جنگ ضروری ٹھیرائی گئی تو اُن میں سے ایک گروہ لوگوں
سے اس طرح ڈرنے لگا جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہیئے بلکہ اس
سے بھی بڑھکر۔ اور بولے اے ہمارے رب تو نے ہم پر جنگ کرنا
کیوں ضروری ٹھیرایا، کیوں تھوڑی مدت تک ہم کو ڈھیل نہ دی ۶۹۴
کہہ دنیا کا سامان تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لیے بہتر ہے جو
تقوےٰ کرے اور تم پر ذرہ بھر بھی ظلم نہ کیا جائے گا ۶۹۵
جہاں کہیں تم ہو گے موت تمھیں آلے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں

تک جنگ نہ کریں، اس لیے جب تک دشمن نے پہل نہیں کی آپ کو یہی ہدایت تھی کہ جنگ نہ کی جائے اور اس کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا حکم ملانے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جنگ اسلام کی اصل غرض نہیں بلکہ ضرورت وقتی ہے اور اصل غرض جس کے لیے نبی آتا ہے تکمیل نفس انسانی ہے اس لیے جن باتوں سے تکمیل نفس انسانی ہوتی ہے اُنھیں اختیار کیا جائے، یعنی نماز کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی۔ جنگ سے رُکنے اور نماز و زکوٰۃ کا حکم دینے کا اکٹھا بیان کر کے یہ بتا دیا کہ انسان کے لیے دو جہاد ہیں۔ ایک جہاد اصلاح نفس کے لیے، دوسرا حفاظت دین کے لیے۔ ان میں جہاد اصلاح نفس مقدم ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت اس وقت دی اور وہ بھی مشروط جب پہلے ان کو اصلاح نفس کے جہاد میں کامیاب ثابت کر دیا۔ نماز یا عبادت سے انسان کے اندر فروتنی اور نرمی کے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ سے انسانی ہمدردی قوت پکڑتی ہے۔ جو قومیں اپنی تکمیل نفس کے بغیر جنگوں میں پڑ گئی ہیں ان میں صرف اخلاق خشونت ہی پرورش پاتے رہے اور نرمی اور فروتنی کے اخلاق بالکل دب گئے نتیجہ یہ ہُوا کہ ظلم خونخواری محکوم کو ذلیل حالت میں رکھنا، انتقام کی سخت خواہش یہ باتیں ان کے اخلاق میں پیدا ہوگئیں یہی نقشہ آج کل کی برائے نام مہذب اقوام میں بھی ہم کو نظر آتا ہے جو جہاں تک دوسری قوموں سے تعلقات کا سوال ہے حقیقی اخلاق سے محروم ہیں وہ دنیوی فوائد ان سے جس قدر چاہیں اُٹھالیں مگر اخلاق میں ان کے معلّم نہیں ہو سکتے۔ اور نہ محکوم قوموں کے دلوں میں ان کی کوئی عزت ہو سکتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے اعتدال اور میانہ روی کی حالت پر رکھنا تھا اور ان کو دنیا میں اخلاق کے معلّم بنانا تھا۔ اس لیے پہلے ان کے نرمی اور فروتنی کے اخلاق کو کمال کو پہنچایا اور جب مصائب برداشت کرتے کرتے اور خدا تعالیٰ کی عبادت اور انسانوں کی ہمدردی کرتے کرتے ان میں نرمی اور محبّت کے اخلاق کمال کو پہنچ گئے تب جنگ کی اجازت دی گئی۔ پس مسلمان سپاہی کو جنگ کے لیے تیار کرنیکے واسطے اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ کو ضروری ٹھہرایا۔ آج جو لوگ قوم کو ذلت کی حالت سے نکالنا چاہتے ہیں ان کے لیے ان الفاظ میں صحیح ہدایت موجود ہے اگر وہ غور کریں محض حصول سوراج کے پیچھے پڑ جانا اور اصل غرض کو جو اقامت صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا دینا تھا ایسا پس پشت ڈالنا کہ ان باتوں کا تقریروں اور لکچروں میں نام بھی نہ آئے اس میں اور جس کی چاہے پیروی ہو، قرآن کی پیروی نہیں اسلام کی غرض تکمیل نفس انسانی ہے اس کے دو ہی بڑے عملی ستون ہیں نماز اور زکوٰۃ جو سب سے پہلے ان کی تعمیر کا فکر نہیں کرتا اس کا قدم صحیح راہ پر نہیں اور نماز اور زکوٰۃ میں غفلت قوم کو عملی منافقت کی حالت سے باہر نہیں نکلنے دیگی۔

۶۹۴ کخشیۃ اللّٰہ میں مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے یعنی جس طرح ایک مومن خدا سے ڈرتا ہے کہ اگر اس نے بدی کی، اس کو ترک نہ کیا تو انجام ہلاکت ہے اسی طرح یہ منافق لوگوں سے خائف تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر (اَوْ بمعنی بَلْ بھی آتا ہے) کیونکہ مومن کے لیے خوف اور رجا دونوں ہیں یعنی اگر وہ ایک طرف بدی کی ہلاکت سے خائف ہے تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی وسعت رحمت پر بڑی بڑی امیدیں بھی رکھتا ہے۔ مگر منافقوں کے لیے سوائے خوف کے کچھ نہ تھا اس لیے وہ ان کا خوف بڑھتا ہی جاتا تھا کہ آج مارے گئے یا کل۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو فرمایا یحسبون کل صیحۃٍ علیھم (المنافقون ۶۳ - ۴)

جب نرم دلی اور محبّت کے اخلاق مسلمانوں کے اندر خوب پرورش پا چکے اور مصائب کی چکی میں وہ خوب پس کر ایک کمال انسانی کو حاصل کر چکے تو اب وہ وقت آگیا کہ جنگ ان کے لیے ضروری ٹھہرائی گئی۔ کیونکہ اب کفار نے اسلام کو نیست و نابود کرنے کے لیے تلوار ہاتھ میں اٹھالی۔ مگر ایک گروہ ایسا بھی تھا جو دشمن کی قوت کو دیکھ کر اس سے مرعوب تھے اور مرعوب بھی اس قدر کہ وہ سمجھتے تھے کہ اب دشمن ہم کو بالکل تباہ ہی کر دے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی قوت کس قدر تھی اور ایسے حالات میں مال غنیمت کے لالچ سے مسلمانوں کا جنگ کرنا محض ایک کہانی ہے جس کی ذرہ بھی صلیت نہیں۔ مال غنیمت کیا یہاں تو جان بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

۶۹۵ اس حصّہ میں بتایا کہ حق کی حفاظت اور حمایت کے لیے لڑتے ہوئے مرجانا اس ذلیل زندگی سے بہتر ہے جس میں صرف یہی غرض ہو کہ دنیا کا کچھ مال کما لیا جائے حفاظت حقوق کے سامنے مال دنیا کی کچھ عزت نہیں۔ اور پھر فرمایا کہ ظلم نہیں ہو گا یعنی جو کچھ دنیوی آرام یا مال یا مفاد حق کی خاطر ترک کر دگے تو وہ قربانی

فِیۡ بُرُوۡجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ وَ اِنۡ تُصِبۡہُمۡ حَسَنَۃٌ
یَّقُوۡلُوۡا ہٰذِہٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ۚ وَ اِنۡ تُصِبۡہُمۡ
سَیِّئَۃٌ یَّقُوۡلُوۡا ہٰذِہٖ مِنۡ عِنۡدِکَ ؕ قُلۡ کُلٌّ
مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ فَمَالِ ہٰۤؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَا
یَکَادُوۡنَ یَفۡقَہُوۡنَ حَدِیۡثًا ﴿۷۸﴾
مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ ۫ وَ مَاۤ
اَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَۃٍ فَمِنۡ نَّفۡسِکَ ؕ وَ اَرۡسَلۡنٰکَ

ہی میں رکیوں نہ) ہو ع۶۹۶ اور اگر ان کو بھلائی پہنچتی ہے ، کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر اُن کو دکھ پہنچتا ہے ، کہتے ہیں یہ تیری وجہ سے ہے ۔ کہہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے ۔ پھر ان لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ بات سمجھنا ہی نہیں چاہتے ع۶۹۷

راے انسان) جو کوئی بھلائی تجھے پہنچتی ہے سو وہ اللہ سے ہے اور جو دکھ تجھے پہنچتا ہے تو وہ تیرے ہی نفس سے ہے ع۶۹۸ اور ہم نے

ضائع نہ ہوگی۔

ع۶۹۶ بروج ۔ بُرْج کی جمع ہے اور وہ اصل میں ہر ظاہر مرتفع کو کہا جاتا ہے اور شہر کے بُرج اس کے قلعے ہیں جو شہر کی فصیل پر بنائے جاتے ہیں اور آسمان میں جو بروج کا ذکر ہے والسّمآء ذات البروج (البروج۸۵ - ۱) جعل فی السّماء بروجاً (الفرقان۲۵ - ۶۱) تو وہ کواکب یعنی ستارے ہیں ۔ اور قصر یعنی محل کو بھی بُرج کہا جاتا ہے رت) اسی مادہ سے عورت کا تبرّج اپنے محاسن کو ظاہر کرنا ہے ۔ یہاں بروج سے مراد قلعے ہیں۔
مشیّدۃ ۔ شِیْد سے ہے جس کے معنی ہیں ہر ایک چیز جس سے دیوار مزین کی جائے چونہ ہو یا پتھر اور تشیید البناء سے مراد عمارت کا مضبوط کرنا اور بلند کرنا ہے رل) دوسری جگہ قصر مشید (الحج۲۲ - ۴۵) آتا ہے اور وہ واحد کے لیے (ل) ہے۔
فرائض کی ادائگی میں موت سے خائف نہ ہو: یہاں لولا اخرتنا کا جواب دیا ہے اور وہ عام الفاظ میں ہے یعنی اگر جنگ میں مرنے سے بچ بھی جاؤ تو آخر موت سے تو نہیں بچ سکتے ۔ خواہ زندگی کے لیے کتنی ہی حفاظت کے سامان بنا لو حتٰی کہ بڑے بڑے مضبوط اور بلند قلعوں میں پناہ گزین ہو جاؤ ۔ اس کا یہ منشا نہیں کہ زندگی کی حفاظت نہیں کرنی چاہیئے ۔ زندگی خدا کی دی ہوئی ایک نعمت ہے اور اس کی قدر کرنی چاہیئے ۔ مگر تقویٰ یہ ہے کہ جو فرائض اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذمہ ڈالے ہیں ۔ ان کی ادائگی کے لیے بڑی سے بڑی نعمت الٰہی کو بھی قربان کردے ۔ فرائض کی ادائگی کے وقت موت سے خائف ہونا کم ہمتی اور نامردی ہے۔

ع۶۹۷ حسنۃ ہر ایک وہ چیز ہے جو انسان کو خوش کرے اور دنیوی اور دینی بھلائی دونوں پر یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سیئۃ اس کی ضد ہے یعنی جو چیز انسان کو غم میں ڈالے امور دنیوی سے ہو یا اُخروی سے ۔ دیکھو ع۱۰۵ و ع۵۰۷
بھلائی اور دکھ اللہ کی طرف سے ہونے سے مراد: جب جنگ احد میں کچھ تکلیف پہنچی تو منافقوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ نبی کریم صلعم کی سوءِ تدبیر سے ہے ۔ کیوں باہر نکلے حالانکہ اس کی اصل وجہ رسول اللہ صلعم کی نافرمانی تھی ۔ یوں اُنہوں نے آنحضرت صلعم کی نافرمانی کے لیے ایک راہ نکال لی تھی ۔ چنانچہ جنگوں میں یہی ان کا وتیرہ رہا کہ جہاں دشمن کو قوی اور زبردست دیکھا وہاں پیچھے ہٹ گئے جہاں مقابل پر دشمن کمزور ہوا آپ بھی قدم آگے بڑھ بڑھ کر رکھنے لگے ۔ جہاں کامیابی ہوئی اور کچھ مال ہاتھ لگ گیا ۔ کہدیا یہ اللہ کی طرف سے ہے ھٰذہ من عند اللّٰہ دوسری جگہ حضرت موسیٰ کے ذکر میں ہے (الاعراف۷ - ۱۳۱) کہ جب نعمت سے متمتع ہوتے ہیں تو کہتے ہیں لنا ھٰذہ یہ ہمارے لیے ہے ہم اسی کے حقدار ہیں ۔ یہی مطلب یہاں ہے اور جہاں کچھ تکلیف پہنچی اُسے رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کر دیا جیسا حضرت موسیٰ کے ذکر میں ہے کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں پر جب تکلیف آتی یطیّروا بموسٰی ومن معہ (الاعراف۷ - ۱۳۱) فرمایا کامیابی ہو یا کچھ تکلیف ہو سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے ہی ہے جیسا حضرت موسیٰ کی صورت میں جواب میں فرمایا انّما طائرھم عند اللّٰہ جس سے مراد ہے کہ یہ ان کے اپنے خیر و شر کی وجہ سے ہے یعنی اپنے اعمال سے ۔ کیونکہ جو دُکھ انسان کو اپنے اعمال کی وجہ سے پہنچتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے ہی ہیں اسی کی زیادہ تصریح اگلی آیت میں فرمائی۔

ع۶۹۸ من اللّٰہ اور من عند اللّٰہ میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ من اللّٰہ ان امور پر بولا جاتا ہے جو اللہ کی رضا اور اس کے حکم سے ہوں ۔ اور من عند اللّٰہ عام ہے جو کچھ قضا و قدر ہے خواہ وہ نتیجہ اللہ کی رضا سے واقع ہو یا اس کی ناراضگی سے اور خواہ خدا نے اس کام کا حکم دیا ہو یا اس سے منع کیا ہو وہ سب من عند اللّٰہ ہے اس لیے پچھلی آیت میں فرمایا تھا کل من عند اللّٰہ سب کچھ اللہ کی قضا و قدر سے ہے ۔ ہاں سب کچھ اللہ کی رضا کے مطابق نہیں اس لیے یہاں فرمایا اصابك من حسنۃ فمن اللّٰہ کیونکہ اللہ کی رضا تو یہی ہے کہ انسان کو حسنہ یعنی بھلائی پہنچے ۔ اور جو دُکھ پہنچتا ہے وہ انسان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہے ۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم (الشوریٰ۴۲ - ۳۰) اور فرماتا ہے ولا یرضٰی لعبادہ الکفر (الزمر۳۹ - ۷) وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پر راضی نہیں ہوتا گو اس کی قضا و قدر یہ ہے کہ کافر بھی ہوں پس جس راہ پر اللہ تعالیٰ انسان کو چلاتا ہے اس کا مآل حسنہ یعنی بھلائی ہے اس لیے رسول کی اطاعت سے انسان کو

لِلنَّاسِ رَسُوۡلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا ﴿۷۹﴾
مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ‌ ۚ وَمَنۡ
تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ عَلَيۡهِمۡ حَفِيۡظًا ؕ ﴿۸۰﴾
وَيَقُوۡلُوۡنَ طَاعَةٌ فَاِذَا بَرَزُوۡا مِنۡ عِنۡدِكَ
بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ غَيۡرَ الَّذِىۡ تَقُوۡلُ‌ ؕ وَاللّٰهُ
يَكۡتُبُ مَا يُبَيِّتُوۡنَ‌ ۚ فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ وَتَوَكَّلۡ
عَلَى اللّٰهِ‌ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿۸۱﴾
اَفَلَا يَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ‌ ؕ وَلَوۡ كَانَ مِنۡ
عِنۡدِ غَيۡرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا ﴿۸۲﴾

تجھے سب لوگوں (کی بھلائی) کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کافی گواہ ہے ۶۹۹
جو شخص رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ یقیناً اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور
جو پھر جائے تو ہم نے تجھے ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا ۷۰۰
اور کہتے ہیں اطاعت (قبول ہے) پھر جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں
ان میں سے ایک گروہ رات کو اس کے خلاف مشورہ کرتا ہے جو تو
کہتا ہے اور اللہ لکھ لیتا ہے جو یہ راتوں کو مشورہ کرتے ہیں سو اُن
کا کچھ خیال نہ کر اور اللہ پر بھروسہ کر اور اللہ کافی کارساز ہے ۷۰۱
پھر کیا قرآن میں تدبّر نہیں کرتے اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے
ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے ۷۰۲

کبھی دُکھ نہیں پہنچ سکتا وہ تکلیفیں جو انسان ایک غرض کے حصول کے لیے اٹھاتا ہے یا جو مومن اللہ کی راہ میں خوش دلی سے اٹھاتا ہے وہ سیئۃ میں داخل نہیں۔ جیسا ایک طالب علم کا امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے یا ایک شخص کا معاش کے لیے محنت اور مزدوری کرنا سیئۃ میں داخل نہیں۔

ع۶۹۹ اسی پہلی بات کی یہاں تائید کی۔ اسی لیے رسول بنا کر بھیجنے کا ذکر کیا تو الی الناس نہیں فرمایا بلکہ للنّاس فرمایا یعنی لوگوں کی بھلائی کے لیے پس رسول کی اطاعت میں لوگوں کی بھلائی ہے۔ اللہ کافی گواہ ہے یعنی نتیجہ ظاہر کر دے گا کہ واقعی اس کے احکام کی فرمانبرداری میں تمہاری بھلائی ہے۔

ع۷۰۰ حفیظ۔ حِفظ نسیان کی ضد ہے اور اس قوت کے استعمال پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے اس لیے اس کے معنی تعہد اور رعایت کے ہوگئے ہیں (غ) اور یہاں رسول کے حفیظ نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس کا کام نہیں کہ لوگوں سے اطاعت کرا بھی لے یا ان کو معاصی یا دُکھوں میں پڑنے سے بچا بھی لے ÷

اس آیت میں بالکل صاف کر کے بتا دیا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت خدا کی ہی اطاعت ہے۔ پہلی آیت میں وارسلنٰک للناس رسولًا فرما کر اور یہاں من یطع الرسول کہہ کر واضح کر دیا کہ رسول سے مراد خود محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اہل قرآن کی اس تفسیر کے لیے کہ رسول سے مراد رسالت ہے یہاں گنجائش باقی نہیں۔ اور آپ کی اطاعت ضروری ہے اور اسی اطاعت کا ذکر ہی اس رکوع میں ہے اور گو یہاں ذکر جنگ کا ہے جس سے منافق دل چُراتے تھے مگر حکم عام ہے رسول کی اطاعت کو خدا کی اطاعت کہہ کر بتا دیا کہ جو کچھ حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی ہوتا ہے۔ خواہ وہ بات اللہ تعالیٰ بذریعہ جبرئیل قلب رسولؐ پر نازل کرے یعنی وحی متلو ہو یا آپ کے دل میں ڈال دے یعنی وحی خفی ہو۔

ع۷۰۱ بیّت۔ بات کے معنی ہیں رات کاٹی اور بَیّت کے لیے دیکھو ع۱۵۷ اور بَیَات کے معنی ہیں رات کے وقت دشمنی کا قصد کرنا۔ یأتیھم باسنا بیاتًا (الاعراف۔ ۹۷) اور ہر ایک فعل جس کے متعلق رات کو تدبر کیا جائے اس پر بُیّتَ بولا جاتا ہے (غ)

معلوم ہوا کہ یہ ذکر منافقوں کا ہی چلا آتا ہے کیونکہ مومن آنحضرتؐ کے خلاف راتوں کو مشورے نہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ان مشوروں کو محفوظ کر لینے سے مراد یہ ہے کہ ان منصوبہ بازیوں کی سزا ان کو ضرور مل کر رہے گی۔ اور اللہ پر بھروسہ کرنے کی ہدایت میں اشارہ ہے کہ ان کے مشوروں سے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

ع۷۰۲ یتدبرون۔ دُبُر پیٹھ کو کہتے ہیں اس لیے اِدبار کے معنی پیٹھ پھیرنا آتے ہیں من ادبر وتولّٰی (المعارج۔ ۱۷) اور تدبیر کے معنی ہیں التفکیر فی دُبُرِ الامور (غ) یعنی امور کے نتائج میں فکر کرنا۔

رسول اللہ صلعم کے حالات میں اختلاف کثیر کے باوجود قرآن میں اختلاف نہ ہونا اس کے منجانب اللہ ہونے پر دلیل ہے: یہ جو کچھ منصوبے منافق کرتے تھے اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ آنحضرت صلعم کی نبوت پر ایمان نہ لاتے تھے بلکہ خیال کرتے تھے کہ یہ رسول اللہ صلعم خود ہی باتیں بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان کو قرآن شریف میں تدبّر کرنے کو کہا ہے اور فرمایا کہ اگر قرآن شریف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ رسول اللہ صلعم کو اس قدر مختلف حالات زندگی میں سے گزرنا پڑا کہ ایک منصوبہ باز انسان ان مختلف حالات میں ایک حالت پر نہ رہ سکتا تھا بلکہ آج اگر ایک تجویز اپنی کامیابی کی سوچتا تو کل دوسری۔ اور آج اگر ایک خیال اس کے دل میں موجزن ہوتا تو کل دوسرا۔ ایک طرح پر منافقوں کو ان کی اپنی حالت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کس طرح ان کے اپنے حالات میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اور یہ منصوبہ بازیوں کا لازمی نتیجہ ہے مگر محمد رسول اللہ صلعم کی حالت پر غور کرو کہ

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ	اور جب کوئی امن یا خوف کی بات ان کو پہنچتی ہے، تو اس کو پھیلاتے ہیں اور اگر وہ اسے رسول اور اپنے میں سے صاحبان امر کی طرف لوٹاتے تو اسے وہ جان لیتے جو ان میں سے بات کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں ۴۰۳ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی

کس طرح ایک زمانہ آپ پر وہ ہے کہ آپ اکیلے غار حرا میں مخلوق خدا کی بہتری کے لیے آہ و زاری کرتے ہیں تو دوسرا زمانہ وہ ہے کہ آپ اب مدینہ میں ایک چھوٹی سی ریاست کے بادشاہ ہیں۔ اور ایک زمانہ وہ ہے کہ چاروں طرف آپ کی صداقت اور راستبازی کا شہرہ ہے تو دوسرا زمانہ وہ ہے کہ سب لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں اور کوئی بات تک نہیں سنتا۔ کبھی چاروں طرف سے دکھوں اور تکلیفوں میں گھرے ہوئے ہیں تو دوسرے وقت چاروں طرف جاں نثار موجود ہیں۔ کبھی دشمن آپ کو نقصان پہنچا جاتے ہیں تو کبھی آپ فاتح اور غالب ہوتے ہیں۔ ایک وقت اگر امام نماز بن کر ساتھیوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ منازل روحانی کی سیر کراتے ہیں تو دوسرے وقت جرنیل بن کر مشکل سے مشکل مقامات میں سے اپنی فوج کو نکال کر ان کو میدان جنگ میں فاتح کے مقام پر پہنچاتے ہیں۔ کبھی عدالت کا کام آپ کے سپرد ہے تو کبھی قانون سازی بھی آپ کو خود ہی کرنی پڑتی ہے۔ ابھی بادشاہ کی حیثیت میں اختیار حکومت کو برت رہے ہیں تو دوسرے لحہ میں دوستوں کے اندر اس قدر انکساری سے بیٹھے ہوئے ہیں کہ آپ کو کوئی پہچان بھی نہیں سکتا۔ ابھی وعظ و نصیحت میں مصروف ہیں تو ابھی گھر میں بی بی کو کسی کام میں مدد دے رہے ہیں اور ان تمام حالات متفرقہ میں قرآن کریم آپ پر نازل ہوتا رہتا ہے۔ منصوبہ باز انسان کی حالت ایسے اوقات میں لازماً بدلتی رہتی ہے اور اسکے خیالات میں بھی اسی طرح تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ مگر قرآن کریم کو اوّل سے آخر تک پڑھ جاؤ وہ سب کا سب ایک ہی رنگ میں رنگین اور ایک ہی اثر سے متاثر ہے اس کے خیالات میں باوجود اختلاف مضامین کے ایک ہی رو دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے تاریخی بیانات میں کوئی اختلاف واقع نہیں ہوتا۔ اس کے نظم میں کوئی تغیر نظر نہیں آتا۔ اس کے احکام میں کوئی متضاد امر نہیں۔ اس کی فصاحت و بلاغت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اس آیت میں منافقوں پر ہی نہیں بلکہ قرآن کریم کے کل مخالفین پر اتمام حجت کیا ہے کیونکہ قرآن کریم میں اختلاف کا نہ ہونا اس کے منجانب اللہ ہونے پر ایک قطعی دلیل ہے اور یہ اختلاف کا نہ ہونا صرف ان حالات مختلفہ کے لحاظ سے اپنے اندر ایک اعجاز کا رنگ رکھتا ہے۔ جن میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تئیس سال کے عرصہ میں گزرنا پڑا۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے۔ لیکن دنیا کے سارے مذاہب پر قرآن شریف میں بحث ہے کبھی ان مذاہب کے پیرو آپ کی دوستی کا دم بھرتے ہیں کبھی سخت ترین دشمن ہیں، مگر قرآن کریم نے جو پہلو ان کے متعلق ایک دفعہ اختیار کیا وہی آخر تک قائم رکھا۔ پھر آپ نے ان کی کتابوں کو پڑھا نہیں بایں ہمہ مکّی اور مدنی دونوں سورتوں میں کثرت کے ساتھ ان کی تاریخ کے حوالجات پائے جاتے ہیں۔ کس قدر کمال ہے کہ ان واقعات میں نہ باہم کوئی اختلاف ہے۔ نہ صحیح تاریخ سے اختلاف ہے۔ مسیح کے حالات کو چار انجیل نویس جو ملہم مانے جاتے ہیں لکھنے بیٹھتے ہیں تو باہم اس قدر اختلاف ہو جاتا ہے کہ مسیح کے نسب نامے تک نہیں ملتے اور صریح متضاد بیانات ان اناجیل میں موجود ہیں یہ لکھے پڑھے ملہمین کی حالت ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمّی ہونے کے باوجود توریت اور انجیل کے بکثرت حوالجات قرآن کریم میں موجود ہیں پھر ان میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ جہاں بائبل اور قرآن کا اختلاف ہے وہاں آج واقعات کی شہادت سے حق قرآن کریم کے ساتھ ثابت ہو رہا ہے جس کی مثالیں اپنے موقعہ پر ان نوٹوں میں دی جا چکی ہیں اور قرآن کریم کا مشہور جرمن منتقد ہرشفلڈ جس نے بڑے غور سے قرآن شریف کو پڑھا ہے توریت وانجیل کے مضامین کے حوالجات کی کثرت کو قرآن کریم میں دیکھ کر یہاں تک گھبرایا ہے کہ اس کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے غور سے ان کتابوں کو پڑھ کر ان کے مضامین کو ایک نوٹ بک میں لکھ لیا تھا اور بطور اشارہ قرآن کریم میں ان کو لاتے رہے پھر بائبل کے پیغمبروں کے علاوہ دوسرے پیغمبروں کا ذکر بھی قرآن کریم میں آیا ہے مگر وہ بھی اختلاف سے اسی طرح پاک ہے۔ غرض کہ یہ ایک بے نظیر اعجاز قرآن کریم کا ہے۔

قرآن میں اختلاف کا نہ ہونا ناسخ منسوخ کو غلط ٹھہراتا ہے؛ ساتھ ہی ان الفاظ میں ان مسلمانوں پر بھی اتمام حجت کیا ہے جو قرآن کریم میں نسخ کے قائل ہوئے ہیں اس لیے کہ نسخ کو قبول کرنے کے یہ معنی ہیں کہ قرآن شریف کی بعض آیات کو بعض کے ساتھ تطبیق نہیں دی جا سکتی جس کے یہ معنی ہوئے کہ قرآن کریم میں اختلاف ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس میں اختلاف نہیں پس قرآن کریم میں نسخ کا قبول کرنا قرآن کریم کے اس صریح دعویٰ کے خلاف ہے جو یہاں کیا گیا ہے اور یہاں ایک اور بھی لطیف اشارہ موجود ہے کیونکہ یہاں جب قرآن میں اختلاف نہ ہونے کا دعویٰ کیا تو ساتھ ہی فرمایا کہ قرآن میں تدبّر کیوں نہیں کرتے اگر تدبّر کریں تو معلوم ہوگا کہ اختلاف کوئی نہیں اور یہی سچ ہے کیونکہ کوئی بھی آیت جس کی منسوخی کا ایک گروہ قائل ہوا ہو ایسی نہیں جس کی عدم منسوخی کا دوسرا قائل نہ ہو۔ کیونکہ اس دوسرے کے نزدیک تدبّر کرنے سے دونوں آیات میں تطبیق ہو گئی پس قرآن کریم کا دعویٰ ثابت شدہ ہے اور جہاں سطحی نظر سے اختلاف معلوم ہوتا ہے وہیں تدبّر کرنے سے وہ اختلاف دُور ہو جاتا ہے۔

۴۰۳ یستنبطون۔ استنباط کا اصل نبط سے ہے اور نَبطَ البئر کے معنی ہیں کنوئیں کو کھود کر اس کا پانی نکالا۔ اسی سے فقیہ کا استنباط ہے جب وہ اپنے فہم اور اجتہاد سے مخفی معنی کو نکال لیتا ہے اس لیے استنباط کے معنی استخراج ہیں (ت) یا ایک بات کی تہ تک پہنچ کر صحیح نتیجہ نکال لینا یہاں اولی الامر کے ساتھ استنباط کا لفظ لا کر بتا دیا کہ اصطلاح قرآن میں اولی الامر سے مراد صرف صاحب حکومت نہیں بلکہ فقہاء اور ائمہ اور مجتہدین بھی اس میں داخل ہیں۔

لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾
فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا
نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ
يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَاللّٰهُ اَشَدُّ
بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾
مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ
مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ
كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

رحمت نہ ہوتی تو تھوڑوں کے سوائے تم ضرور شیطان کے پیچھے لگے رہتے۔ ع۴۰۴
پس اللہ کی راہ میں جنگ کر، تجھے اپنی ذات کے سوا کسی اور کے لیے
مکلف نہیں کیا جاتا اور مومنوں کو بہت ترغیب دے قریب
ہے کہ اللہ ان کی جنگ کو روک دے جو کافر ہیں اور اللہ طاقت
میں سب سے زیادہ قوی اور عبرتناک سزا دینے میں سخت تر ہے ع۴۰۵
جو کوئی بھلی بات سفارش کرے اس کو اس سے حصہ ملے گا۔
اور جو کوئی بُری بات کی سفارش کرے اس کو اس سے
حصہ ملیگا اور اللہ ہر چیز پر قابو رکھنے والا ہے ع۴۰۶

پچھلی آیت گویا ایک جملہ معترضہ کے طور پر تھی۔ اب پھر منافقوں کی حالت کو بیان کرتا ہے کہ کوئی بات امن کی ہو۔ یعنی حالات عامہ کے متعلق یا خوف کے متعلق یعنی دشمن کی چڑھائی وغیرہ کے۔ تو یہ لوگ اسے بہت پھیلاتے ہیں تاکہ بدامنی پھیلے حالانکہ چاہیئے یہ تھا کہ ایسی باتوں کو اولی الامر کی طرف لوٹاتے۔ جو قوت استنباط رکھتے ہیں۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومت کے اہل بھی وہی لوگ ہیں جو قوت استنباط کو کام میں لا سکتے ہیں یعنی بعض حالات سے ایک صحیح نتیجہ نکال سکتے ہیں۔

اس آیت سے مسائل شرعی میں استنباط کا مسئلہ بھی نکلتا ہے۔ کیونکہ استنباط مسائل یہی ہے کہ ایک مسئلہ کا صریح حکم موجود نہیں ہوتا یعنی صورت پیش آمدہ میں کچھ حالات مختلف جمع ہوتے ہیں ان کو قرآن شریف اور سنت پر پیش کر کے ایک صحیح نتیجہ اخذ کرنا ہوتا ہے۔

ع۴۰۴ اللہ کا فضل اور رحمت محمد رسول اللہ صلعم کی بعثت ہی ہے۔ یہ اخلاق رذیلہ جن کا نظارہ منافقین میں نظر آتا تھا دور نہ ہوتے اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مکارم اخلاق کے ساتھ مبعوث فرما کر ان کا علاج نہ کیا ہوتا۔ یا منافقین کے انجام کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر بھی فضل کرے گا اور تم میں سے بہتوں کو شیطان کی پیروی سے نکال دے گا۔ ورنہ تم ایسی غلط راہ پر پڑے تھے کہ اس سے نکلنا مشکل تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے تمہاری دستگیری فرما کر تم میں سے اکثر کو اس حالت سے باہر نکال دیگا الا قلیلا کے معنی دونوں طرح پر ہو سکتے ہیں یوں بھی کہ تھوڑوں کے سوائے تم شیطان کے پیچھے لگے رہتے اور یوں بھی کہ تھوڑی صورتوں کے سوائے تم شیطان کے پیچھے لگے رہتے۔

ع۴۰۵ حرّض۔ حَرَض وہ ہے جو کسی گنتی میں نہ ہو اور جس میں کچھ بھلائی نہ ہو اس لیے جو ہلاکت کے قریب پہنچ جائے اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے حتّٰی تکون حرضا (یوسف ۱۲۔ ۸۵) اور تحریض کے معنی ہیں ایک چیز کی خوبیوں کو بکثرت بیان کر کے اس پر تحریض دلانا گویا اس میں حرض کا ازالہ ہے (رغ)

تنکیل۔ نکل سے ہے۔ جس کے معنی قید ہیں اور تنکیل اور نکال کے ایک ہی معنی ہیں یعنی ایسی سزا دینا جس سے دوسرے کو ایسا فعل کرنے سے روک دیا جائے یا عبرتناک سزا دیکھو ع۹۵۔

جنگ کے لیے آنحضرتؐ اکیلے مکلّف تھے؛ چونکہ منافقوں کے جنگ کے وقت پیچھے رہنے کا ذکر تھا اس لیے فرمایا کہ تمہارا جنگ کرنا تو دین اسلام کی حفاظت کے لیے ہے۔ پس کوئی اور کرے یا نہ کرے تم اکیلے ہی جنگ کرو۔ ہاں مومنوں کو بھی ترغیب دو۔ مگر مکلّف تم اپنی ذات کے لیے ہو، دوسروں کے لیے تم مکلف نہیں یعنی ان کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ اکیلے جنگ کرنے کا حکم بتاتا ہے کہ نبی کریم صلعم کا بھروسہ تعداد پر نہ تھا بلکہ نصرت الٰہی پر تھا۔ لکھا ہے کہ جنگ اُحد کے بعد جب لوگ بوجہ مصیبت اور تکلیف پیش آنے کے بہت پژمردہ ہو رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ میں اکیلا ہی دشمن کے تعاقب میں نکلوں گا۔ یہ آپ کا عزم تو آپؐ کی شجاعت پر دلالت کرتا ہے کہ قوتِ قلبی کس قدر تھی۔ مگر جاں نثاروں کا گروہ آپ کو تنہا کب چھوڑتا تھا۔ یہاں ساتھ ہی یہ پیشگوئی بھی کی ہے کہ کافر اس جنگ کو جو اسلام کے خلاف انہوں نے کی ہے جاری نہ رکھ سکیں گے اللہ تعالیٰ آخر کار ان کو مغلوب کر کے روک دیگا اور جنگوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ع۴۰۶ یشفع۔ شفع کے لیے اور شفاعت کے لیے دیکھو ع۷۱ یہاں مراد ہے کہ ایک شخص دوسرے کے ساتھ مل جائے اور اس کی اچھی یا بُری بات میں مدد کرے (رغ) اور ایک اور قول نقل کیا ہے کہ شفاعت سے مراد یہاں یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے کے لیے اچھا یا بُرا رستہ بنا دے جس پر وہ چلے اور یوں اس کا شفیع بن جائے جیسا کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا من سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فلهٗ اجرها واجر من عمل بها ومن سَنَّ سُنَّةً سيّئة فعليه وزرها وِزرُ من عمل بها جو کوئی اچھی راہ نکالے اس کے لیے اس کا اجر ہے اور اس کا اجر بھی جو اس پر عمل کرے اور جو کوئی بُری راہ نکالے اس پر اس کا بوجھ ہے اور اس کا بوجھ بھی جو اس پر عمل کرے (رغ)

کِفل اور کفیل کے ایک ہی معنی ہیں یعنی ایسا حظ جس میں کفایت ہو گویا وہ اس کے امر کا متکفل ہو جاتا ہے یؤتکم کفلین من رحمته (الحدید ۵۷۔ ۲۸) مگر امام راغب

وَ اِذَا حُيِّيۡتُمۡ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوۡا بِاَحۡسَنَ مِنۡهَاۤ اَوۡ رُدُّوۡهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ حَسِيۡبًا ۝۸۶

اور جب تم کو کسی دعا کے ساتھ دعا دی جائے تو اس سے بہتر کے ساتھ دعا دو، یا اسی کو لوٹا دو۔ بیشک اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے[۶۰۷]۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجۡمَعَنَّكُمۡ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ ؕ وَ مَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيۡثًا ۝۸۷

اللہ، اس کے سوائے کوئی معبود نہیں وہ ضرور تم کو قیامت کے دن تک جس میں کوئی شک نہیں جمع کرے گا اور اللہ سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہے۔

فَمَا لَكُمۡ فِى الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِئَتَيۡنِ وَ اللّٰهُ اَرۡكَسَهُمۡ بِمَا كَسَبُوۡا ؕ اَتُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَهۡدُوۡا مَنۡ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَ مَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ سَبِيۡلًا ۝۸۸

سو تمھارے لیے کیا وجہ ہے کہ منافقوں کے بارے میں دو گروہ ہو حالانکہ اللہ نے ان کو اس کی وجہ سے اوندھا کر دیا جو انھوں نے کمایا، کیا تم چاہتے ہو کہ اسے ہدایت کرو، جسے اللہ نے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور جس کو اللہ گمراہ چھوڑ دے تو تو اس کے لیے کوئی راستہ نہ پائے گا[۶۰۸]۔

کہتے ہیں کہ یہاں کِفل کے یہ معنی نہیں بلکہ وہ اس کِفل سے مستعار ہے جو ردّی شے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور شدّت کے معنی میں متعارف ہو گیا ہے گویا مراد یہ ہے کہ جو بُرے فعل میں دوسرے کا مددگار ہوتا ہے اور راستہ بناتا ہے وہ بھی اس فعل بد کے بُرے نتیجہ کی شدت کو پائے گا۔

مقیت۔ قوت سے ہے جو انسان کے بقا کا موجب ہے جمع اقوات ہے وقدّر فیہا اقواتہا (حٰم السجدۃ۴۱-۱۰) اور مقیت سے مراد ہے جو ہر چیز کو قوت دیتا اور اس کی حفاظت کرتا ہے اس لیے اس کے معنی مقتدر یا حافظ ہیں (رغ)

جب یہ فرمایا کہ نبی اکیلا ہی جنگ کرنے کا مکلّف ہے۔ اگر دین اسلام کی حفاظت معرض خطرہ میں ہو تو بتایا کہ یہ ایک نیک راہ کا قائم کرنا ہے جو لوگ آئندہ اس پر عامل ہونگے وہ خود بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے مگر ان کی اس نیکی کے ثواب کے مستحق محمد رسول اللہ صلعم بھی ہونگے۔ ایسا ہی منافق جو بری راہیں نکا لتے ہیں اُن کا بوجھ بھی اٹھائیں گے جو لبعد میں ان بُری راہوں پر چلیں گے۔ گو وہ چلنے والے خود بھی اپنا بوجھ اُٹھائیں گے۔

ع۶۰۷ تحیّۃ کا مادہ حیّ یا حیاۃ ہے جس کے معنی زندگی ہیں اور تحیّۃ اصل میں یہ ہے کہ دوسرے کو حَیَّاكَ اللّٰه کہے یعنی زندگی کی دعا دے پھر ہر ایک دعا پر اس کا استعمال ہوا ہے اور ایک دوسرے کو ملنے پر جو دعا دی جاتی ہے وہ بھی تحیّۃ ہے اور اسلام کا تحیۃ السّلام علیکم ہے (رغ) اور اس میں دعا بھی ہے حضرت عیسٰی نے بھی حواریوں کو اسی سلام سے خطاب کیا تھا (لوقا ۲۴: ۳۶) مسلمانوں نے السّلام علیکم کو ترک کر کے جس قدر طریق سلام کے نکالے ہیں وہ سب خلاف قرآن وسنّت ہیں۔

السلام علیکم کی سنت: پچھلی آیت میں جو اچھی راہ بنانے والے کو ہمیشہ کے ثواب کا مستحق ٹھہرایا تو یہاں دعائے ملاقات باہمی کا ذکر کر کے بتا دیا کہ چھوٹے چھوٹے امور میں بھی ایک انسان دوسرے کے لیے اچھی راہ قائم کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔ پس فرمایا کہ دعائے ملاقات جو باہم میل جول میں دن رات تم کو دینی پڑتی ہے اس میں بھی بھلائی کی راہ اختیار کرو اور اپنے بھائی کی دعا سے بہتر دعا اسے لوٹاؤ۔ کوئی السلام علیکم کہے تو جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہو جیسا کہ حدیث میں ہے اور یہ جو حکم ہے کہ چھوٹا بڑے کو پہلے السلام علیکم کہے تو اس میں بھی یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح وہ اپنے سے بڑے کی زیادہ دعا کا مستحق ہوگا اور آخر پر فرمایا کہ اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے تو مراد یہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بھلائی کا بھی حساب رکھتا ہے اور اسے ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اور یوں یہ بھی بتا دیا کہ چھوٹی باتوں سے ہی بڑے بڑے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو حقیر مت سمجھو مسلمانوں میں السلام علیکم باہمی محبّت کو بڑھانے کا موجب ہے اور حدیث میں افشائے سلام کا حکم ہے خواہ اپنے مسلمان بھائی کو پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو۔ مگر یہ سنت بھی مسلمانوں کے اندر سے متروک ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کے ترک کرنے میں پُرانے اور نئے فیشن کے لوگ یکساں شریک ہیں۔

ع۶۰۸ ارکسھم۔ رکس کے معنی ہیں کسی چیز کا سر کے بل اُلٹا کر دینا یا اس کے اوّل کا آخر کی طرف اُلٹا دینا۔ پس ارکسھم کے معنی ہیں ان کو ان کے کفر کی طرف لوٹا دیا (رغ)

بخاری مسلم وغیرہما نے زید بن ثابت سے روایت بیان کی ہے کہ جو لوگ اُحد کی جنگ میں رستہ سے واپس آ گئے تھے یعنی وہ تین سو آدمی جن کو عبداللہ بن ابیّ رستہ سے واپس لے آیا تھا یہ آیت اُن کے بارہ میں نازل ہوئی۔ کسی نے کہا یہ عرینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے مدینہ کی چراگاہ پر ڈاکہ مارا تھا۔ کسی نے کچھ خیال ظاہر کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ خود مدینہ میں اور مدینہ کے اردگرد منافقین کا ایک بڑا گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ جن کے نفاق کے مختلف مدارج تھے ان کا ذکر مجملاً یہاں کر دیا ہے۔ پچھلے رکوع میں یہ ذکر تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ نہیں کرتے بلکہ ان کے خلاف منصوبے کرتے ہیں۔ یہاں یہ بتایا کہ مسلمانوں کو اُن سے کیا سلوک کرنا چاہیئے۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے اور یوں برابر ہو جاؤ، سو اُن میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں ۷۰۹، لیکن اگر وہ پھر جائیں تو ان کو پکڑو اور ان کو قتل کرو جہاں کہیں انھیں پاؤ اور ان میں سے کسی کو دوست اور نہ مددگار بناؤ ۷۱۰

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾

مگر جو ایسی قوم سے جا ملیں کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہے ۷۱۱ یا تمھارے پاس آئیں اس حال میں کہ ان کے سینے تنگ ہیں کہ تمھارے ساتھ جنگ کریں یا اپنی قوم کے ساتھ جنگ کریں اور اگر اللہ چاہتا تو اُن کو تم پر قابو دے دیتا سو وہ تم سے ضرور لڑتے پس اگر وہ تم سے کنارہ کش ہوں پھر تم سے جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کی درخواست کریں تو اللہ نے تمھارے لیے اُن کے خلاف کوئی راہ نہیں رکھی ۷۱۲

ع۷۰۹ منافقوں کا پہلا گروہ: پہلے اس گروہ کا ذکر کیا جو باطن میں کافر ہیں مگر ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں ان کے متعلق صرف یہی حکم دیا کہ ان میں سے کسی کو اپنا ولی نہ بناؤ یعنی ان کے ساتھ قرب و نصرت کا تعلق نہ رکھو۔ ہاں ظاہر میں مسلمانوں والا تعلق ان سے رکھو۔ اللہ کی راہ میں ہجرت سے مراد ایک تو دار الکفر سے نکلنا ہے جہاں فرائض مذہبی ادا نہ کرنے دیئے جاتے ہوں۔ اور دوسرے بموجب حدیث المهاجر من هاجر ما نهى الله عنه مہاجر وہ ہے جو ان باتوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔ تیسرے حفاظت دین کے لیے وطن کا ترک کرنا یا ان حالات کے مطابق جنگ کے لیے نکلنا۔ یہی تیسری قسم کی ہجرت یہاں مراد معلوم ہوتی ہے۔

ع۷۱۰ یہاں اسی گروہ کی دوسری حالت کا ذکر ہے کہ در پردہ عداوت رکھتا ہوا وہ اب یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ علانیہ دین اسلام سے پھر کر دشمنوں کے ساتھ جا ملا ہے۔ ان کے لیے وہی حکم ہے جو کفار کے لیے حکم ہے۔ ایسے لوگ مدینہ کے ارد گرد تھے۔ جو مسلمانوں کا ذرا غلبہ دیکھ کر اظہار اسلام کرتے اور پھر موقعہ پاتے تو علی الاعلان اسلام سے منحرف ہو کر مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے جیسا کہ عرینہ نے کیا جنھوں نے اسلامی چراگاہ پر ڈاکہ مار کر مویشی لوٹ لیے اور محافظوں کو قتل کر دیا۔ پس جو منافق علانیہ دشمنوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ کرنے میں شامل ہوئے وہ اب دشمن ہوئے اور میدان جنگ میں مقابل نکل آنے کی وجہ سے قتل کی سزا کے مستحق ہوئے۔

ع۷۱۱ ان الفاظ میں منافقین کے ایک تیسرے گروہ کا ذکر ہے جو اسلام کے بعد پھر علی الاعلان کافر تو ہو گئے ہیں۔ مگر ایسی قوم کے ساتھ جا ملے ہیں جس کا مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ ہے جیسے نبی کریم صلعم نے ہلال بن عویمر اسلمی سے معاہدہ کر لیا تھا کہ نہ وہ آپ کے ساتھ مل کر قریش سے جنگ کریں گے اور نہ قریش سے مل کر آنحضرت صلعم کے خلاف جنگ کریں گے۔ پس اگر کوئی شخص ایسی قوم سے جا ملے تو گو بوجہ عہد کی خلاف ورزی کے وہ قتل کرنے کے قابل ہو مگر معاہد قوم میں چلے جانے سے اس کے بھی وہی حقوق پیدا ہو گئے جو اس معاہد قوم کے ہیں۔

ع۷۱۲ حصرت۔ حصر کے معنی تضییق یا تنگی ہیں اور یہاں مراد ہے کہ ان کے سینے بخل اور بزدلی کی وجہ سے تنگ ہو گئے ہیں۔ یہ چوتھے گروہ کا ذکر ہے جو دین اسلام سے پھر کر کسی معاہد قوم کی پناہ میں تو نہیں گئے مگر خود نہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم کے ساتھ یعنی کفار کے ساتھ۔ اور مسلمانوں سے صلح کی درخواست کریں تو ایسے لوگوں سے بھی جنگ جائز نہیں۔

مرتد کب قتل ہو سکتا ہے: اس سے صاف معلوم ہوا کہ مرتدین کے ساتھ اسی وقت جنگ جائز ہے جب وہ مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ جا ملیں یا خود مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں۔ لیکن اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہ کریں تو گو وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر کفار سے بھی جنگ نہ کریں تاہم ان کو مارنا یا ان سے جنگ کرنا جائز نہیں۔ بنی مدلج کے ساتھ اسی حکم کے ماتحت صلح کی گئی۔ یہ حکم کبھی منسوخ نہیں ہوا۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾ ع

تم کچھ اور لوگ پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں جب کبھی وہ فتنہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں اس میں اوندھے گر جاتے ہیں پس اگر وہ تم سے کنارہ کش نہ ہوں اور (نہ) تم سے صلح کی درخواست کریں اور (نہ) اپنے ہاتھ روکیں تو ان کو پکڑو اور ان کو قتل کردو، جہاں انھیں پاؤ اور یہ وہ ہیں جن کے خلاف ہم نے تم کو کھلی دلیل دی ہے [۶۱۳]

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

اور کسی مومن کو شایاں نہیں کہ وہ مومن کو مار ڈالے، مگر غلطی سے، اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خون بہا دے جو اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے سوائے اس کے کہ وہ معاف کر دیں [۶۱۴] پھر اگر (مقتول) ایسے لوگوں سے ہو جو تمھارے دشمن ہیں اور وہ مومن ہو تو ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیئے، اور اگر ایسے لوگوں سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہے، تو خون بہا دینا چاہیے جو اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے اور ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیئے۔ پھر جو شخص نہ پائے تو دو مہینے کے متواتر روزے رکھے (تاکہ) اللہ اس پر رحمت سے متوجہ ہو اور اللہ جاننے والا

---

۶۱۳ اس آیت میں ایک پانچویں گروہ کا ذکر ہے ان کی غرض صرف اسی قدر ہے کہ کبھی اسلام ظاہر کردیں تاکہ مسلمانوں کے دشمنوں میں نہ گنے جائیں مگر حالت یہ ہے کہ جب کافران کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے بلاتے ہیں (فتنہ سے مراد یہاں مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنا ہی ہے دیکھو روح المعانی جہاں اس سے مراد قتال المسلمین لی گئی ہے) تو اس میں اوندھے منہ گر جاتے ہیں یعنی مسلمانوں کے ساتھ اپنے عہد و پیمان کی کوئی پروا نہیں کرتے مگر یہاں ان کو بھی اس قدر موقعہ دیا ہے کہ اگر وہ پھر بھی مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے کنارہ کشی کرلیں اور صلح کی درخواست کریں اور عملاً مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے اپنے آپ کو روک دیں تو ان کو کچھ نہ کہا جائے لیکن اگر ان باتوں میں سے کوئی بھی نہ کریں تو پھر بلا شبہ مسلمان حقدار ہیں کہ جہاں ان کو پائیں قتل کر دیں کیونکہ سوائے اس کے اسلام باقی نہیں رہ سکتا تھا اور مسلمان مار دیئے جاتے۔

۶۱۴ دیۃ اس کا اصل وَدِی یَدِی سے ہے اور وَدْی کے معنی بہا ہیں اسی مادہ سے وادی ہے۔ یعنی وہ مقام جس میں پانی بہتا ہے اور دیۃ میں واؤ کے عوض ھا لائی گئی ہے (ت) اور دِیَۃ خون کا معاوضہ ہے جو مقتول کے وارثوں کو دیا جاتا ہے۔

مسلمان کا مسلمان کو غلطی سے مار دینا: جب منافقوں کے متعلق احکام کا ذکر کیا تو اب بعض ملتی جلتی صورتوں کا ذکر فرماتا ہے اور وہ یہ کہ بعض وقت شبہ میں لوگ قتل ہو جاتے تھے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں مگر ہو سکتا ہے کہ یہ محض دھوکہ دینے کے لیے ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک شخص غلطی سے یہ سمجھ کر کہ ایک دشمن اس کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے اسے قتل کر دے۔ پس شروع یہاں سے کیا کہ مومن تو مومن کو کبھی قتل کر ہی نہیں سکتا ہاں غلطی سے بعض وقت ایسا ہو جاتا ہے کہ مومن کے ہاتھ سے مومن قتل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک قوم دشمن تھی اور مسلمانوں کے ساتھ بر سر پیکار مگر ایک شخص ان میں سے مسلمان ہو گیا دوسرے نے اسے مسلمان نہیں سمجھا، یا کسی اور کو مارنے کا ارادہ تھا غلطی سے وہ فعل اس پر واقع ہو گیا۔ اور بعض وقت اجتہاد میں خطا سے بھی ایسا ہو جاتا ہے کہ مومنوں میں جنگ واقع ہو جاتی ہے ایک شخص نیک نیتی سے حق اپنی طرف سمجھتا ہے۔ دوسرا اپنی طرف جیسا کہ حضرت علی اور معاویہ کے معاملہ میں ہوا یہ بھی قتل خطاء کا رنگ ہے۔ مگر اس کا مفصل ذکر سورۃ الحجرات میں آئیگا جہاں دو مومن گروہوں کے باہم قتال کا ذکر آتا ہے۔

عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

حکمت والا ہے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ
جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ
وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

اور جو جان بُوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے، اسی میں رہے گا اور اللہ اس پر ناخوش ہے اور اس پر لعنت کرتا ہے اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کرے گا۷۱۵۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ
اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ
عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ
كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ
عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تم اللہ کی راہ میں نکلو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو تمھیں السّلام علیکم کہے اسے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔ تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو۔ پس اللہ تع کے پاس غنیمتیں بہت ہیں۔ تم بھی پہلے ایسے ہی تھے۔ پھر اللہ تع نے تم پر احسان کیا، سو تحقیق کر لیا کرو۷۱۶۔ اللہ تعالیٰ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔۷۱۷

لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ
اُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ

(دونوں) برابر نہیں مومنوں میں سے بیٹھ رہنے والے جن کو کوئی دُکھ نہیں، اور اپنے مالوں اور جانوں کے

---

۷۱۵ مومن کا قتل عمد: اس آیت کی شان نزول میں روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک مومن کو قتل کر دیا۔ پھر کفر کی طرف لوٹ گیا۔ مگر یہاں لفظ عام ہیں اس لیے یہاں یہ بحث ہوئی ہے کہ ایسے شخص کی توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں۔ الفاظ مذکورہ آیت سے عموماً یہ سمجھا گیا ہے کہ توبہ قبول نہیں ہوتی مگر چونکہ صراحت سے یہ بات ان الفاظ میں نہیں پائی جاتی کہ اس کی توبہ قبول نہیں ہو گی اور قرآن کریم نے اصول یہ قائم کیا ہے کہ ہر امر میں توبہ قبول ہوتی ہے وانی لغفار لمن تاب (طٰہٰ ۲۰ - ۸۲) اور قتل نفس کے بارہ میں ہے اِلّا من تاب واٰمن (الفرقان ۲۵ - ۷۰) اور جن کفار نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا آخر خود نبی کریم صلعم نے ان کو معاف کر دیا اور وہ مسلمان ہوئے اس لیے یہ دعویٰ کہ قاتل کی توبہ قبول نہیں ہوتی قرآن وسنّت کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔ ہاں ان الفاظ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص گویا کافر کے حکم میں ہے اور جس طرح یہاں قرآن شریف نے مومن کو قتل کرنے والے کو کافر کے حکم میں رکھا ہے اسی طرح حدیث نے مومن کو کافر کہنے والے کو کافر کے حکم میں رکھا ہے۔ جیسا کہ بخاری کی اس حدیث میں ہے ایما رجل قال لاخیہ یا کافر فقد باء بہا احدھما یعنی جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہتا ہے تو وہ کفران دونوں میں سے ایک پر ضرور پڑتا ہے۔

خلود کے معنی ع۳۹ میں بیان ہو چکے ہیں۔ اس موقعہ پر مفسرین نے بھی اس کے معنی لمبا زمانہ قبول کیے ہیں والمراد بالخلود المکث الطویل (ض)

۷۱۶ قتل بر بنائے کفر نہیں بر بنائے جنگ ہے: یہاں سمجھایا کہ گو چاروں طرف تمہارے دشمن پھیلے ہوئے ہیں تاہم جب تک یہ امر محقق نہ ہو جائے کہ ایک شخص تمہارا دشمن ہے اُسے قتل نہ کرو۔ پچھلے رکوع سے ظاہر ہو چکا ہے اور قرآن شریف کے اور مقامات سے بھی ثابت ہے کہ کافر کو صرف اس حالت میں قتل کرنا جائز ہے جب وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے والوں میں سے ہو۔ اس لیے عام الفاظ میں کہا کہ تحقیق کر لیا کرو کہ کون دشمن ہے اور کون نہیں اور صرف دشمن کو مارو، دوسرے کو نہیں۔

۷۱۷ سلام سے مراد تحیہ اسلامی ہے یعنی السّلام علیکم کہنا جو ظاہر نشان اسلام کا ہے اور ایک مسلمان اس کے ذریعہ سے فوراً پہچان سکتا ہے کہ اس کا مخاطب مسلمان ہے یا نہیں۔

مغانم۔ مَغْنَم کی جمع ہے۔ ما یُغْنَمُ اور غَنَم اصل میں بکریوں کو کہتے ہیں اس لفظ سے واحد نہیں آتا اور واحد کے طور پر شاۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے (ت) اور غَنْم جو اس سے مصدر ہے اس کے معنی ہیں بکریوں کا پا لینا اور فتح کر کے ان کا حاصل کر لینا۔ پھر جو کچھ دشمن کی طرف سے فتح کے ذریعہ سے حاصل ہو اس پر یہ لفظ بولا گیا ہے (غ) مگر مطلق الفوز بالشئ کے معنی میں بھی غنم آیا ہے (ح۔ ذ) جہاں اس کی سند میں اشعار نقل کیے ہیں اور حدیث میں ہے، الصوم فی الشتاء الغنیمۃ الباردۃ جہاں غنیمۃ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دوسری حدیث میں غَنْم بمعنی زیادت آیا ہے (ن) اور یہاں بھی مغانم وسیع

اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ
الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى
الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ
الْحُسْنٰى ؕ وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى
الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾

ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اللہ نے درجہ میں بزرگی دی ہے اور سب سے اللہ نے اچھا وعدہ کیا ہے اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر بڑا اجر دیکر بزرگی بخشی ہے ۶۱۸

دشمن قوم میں سے السلام علیکم کہنے والے کا حکم: یہاں اس مشتبہ حالت کا ذکر کیا ہے جب قوم تو دشمن ہو مگر ایک شخص اس میں سے مسلمان ہو چکا ہے تو اس کے مسلمان ہونے کا ثبوت اسی قدر کافی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو السلام علیکم کہے اس صورت میں گو وہ دشمن قوم کا ایک جزو ہو مگر اُسے قتل کرنا نہیں چاہیئے۔ بعض ایسے واقعات بھی ہوئے اور جب ایک شخص نے نبی کریم صلعم کے سامنے یہ عذر کیا کہ جس شخص نے اظہار اسلام کیا تھا وہ محض اپنی جان بچانے کے لیے تھا تو آپؐ نے فرمایا ھلّا شققت قلبہ تو نے اس کا دل پھاڑ کر دیکھ لیا تھا کذٰلك کنتم من قبل میں یہ بتایا کہ تم بھی کلمہ شہادت کے اقرار سے اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ جو بات تمہارے لیے کافی تھی وہ دوسرے کے لیے بھی کافی ہے۔

دوسری بات جو یہاں فرمائی وہ یہ ہے کہ مال غنیمت کے لالچ سے کسی کو قتل نہ کرو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حصول مقصد کے اور بہتیرے سامان بنا دیئے ہیں۔ مالِ غنیمت کے خیال کو یہاں دُنیا کا سامان کہا ہے اور یوں مسلمانوں کو بتایا ہے کہ جو شخص مالِ غنیمت کا خیال دل میں لاتا ہے وہ خدا کی راہ میں جنگ نہیں کرتا۔

السلام علیکم اسلام کا نشان ہے: یہاں قرآن شریف تو فرماتا ہے کہ السّلام علیکم کہنے والے کو بھی یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں مگر آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ اگر سارے حالات بھی ایک شخص کے ایک مسلمان کے دیکھتے ہوں تو پھر بھی کفر کا فتویٰ لگانے سے نہیں ٹلتے۔ اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض السلام علیکم کہنے والے کے متعلق فرمایا تھا کہ تم نے کوئی اس کا دل پھاڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بالکل خلاف جب ایک شخص عقاید اسلامی کا اظہار کرتا ہے تو کہدیتے ہیں کہ یہ باتیں یہ منافقانہ کہتا ہے۔ مسلمان کی شناخت قرآن کریم نے تو اتنی موٹی قرار دی ہے کہ وہ السلام علیکم کہتا ہو اور بس اور آج علماء کی یہ حالت ہے کہ ایک شخص کے اقوال کو لیکر بال کی کھال اُتارتے ہیں اور تب صبر کرتے ہیں جب کافر بنا لیتے ہیں۔

۶۱۸ جب یہ خطرات ساتھ لگے ہوئے تھے کہ غلطی سے کوئی مومن ہی قتل نہ ہو جائے تو بعض لوگ خیال کر لیتے کہ پھر ایسے حالات میں جہاد کرنے سے بہتر یہی ہے کہ انسان گھر میں ہی بیٹھ رہے۔ اس لیے فرمایا کہ جہاد بڑی افضل چیز ہے اور جہاد کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے نہ جہاد کرنے والوں پر بڑی فضیلت دی ہے۔ یہاں جہاد سے مراد صرف قتال لیکر اہل تشیع نے غلطی کھائی ہے اور کہا ہے کہ حضرت علیؓ چونکہ حضرت ابو بکرؓ کی نسبت زیادہ غزوات میں شامل ہوئے اس لیے وہ افضل ہوئے حالانکہ جہاد وسیع ہے خود نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم بھی سب جنگوں میں شامل نہیں ہوئے۔ مگر آپ کا کام اس سے بھی بالاتر تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کی خدماتِ دینی حضرت علیؓ سے بہت بڑھ کر ہیں اور وہ خدمات دینی عظیم الشان جہاد کا حکم رکھتی ہیں۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محض جہاد کا نہ کرنا خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں۔ کیونکہ نہ جہاد کرنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے حسنیٰ کا وعدہ دیا ہے۔ جماعت اسلامی میں دونوں قسم کے لوگ رہیں گے ایک وہ بلند مرتبہ لوگ جو جہاد میں لگے رہتے ہیں گو وہ اپنے دنیا کے کام بھی کرتے ہوں۔ مگر ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی وقت اعلائے کلمۃ اللہ سے غافل نہیں ہوتے۔ ان کے مال اور ان کی جانیں دین اسلام کی خدمت کیلئے وقف ہوتی ہیں۔ ان کا معاش کا سامان بھی خدمت دین کا ہی حصہ ہوتا ہے دوسرے وہ لوگ جو دنیا کے کاموں میں زیادہ منہمک رہتے ہیں ہاں احکامِ خداوندی کو بھی بجا لاتے ہیں اور اپنے مالوں میں سے ضروری حق ادا کرتے رہتے ہیں دونوں کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ ان کا انجام اچھا ہوگا۔ مگر جہاد کرنے والوں کے بلند مراتب سے ان دوسرے لوگوں کو کچھ نسبت نہیں۔ مگر یہ عامہ حالات کا ذکر ہے۔ خاص صورتوں میں بعض وقت ضروریات قومی ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جب ہر ایک متنفس کے لیے جہاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے ان حالات میں قدم پیچھے ہٹانے والا عتاب کے نیچے ہوتا ہے۔ جیسا کہ جنگ تبوک میں جو لوگ بلا وجہ پیچھے رہ گئے تھے، ان پر عتاب ہوا۔ کیونکہ انہوں نے رسول اللہ صلعم کے حکم کی پروا نہ کی اور یوں اس میں شک نہیں کہ اوپر (۸۴) فرمایا کہ قتال کے لیے مکلّف صرف رسول اللہ صلعم ہیں باقی مومنوں کو صرف تحریض دلانا ہے کہ وہ ان بلند مراتب کو حاصل کرنے کی کوشش کریں جو جہاد سے ملتے ہیں اور ناقص حالت پر راضی نہ ہو جائیں۔

غیر اولی الضرر۔ ضر رسوءِ حال یا نقصان ہے خواہ انسان کے نفس میں علم یا فضل یا عفت کی کمی سے ہو اور خواہ اس کے بدن میں کسی عضو کے نہ ہونے سے یا کسی اور نقصان بدنی کی وجہ سے ہو اور خواہ حالت ظاہری میں مال اور جاہ کی کمی سے ہو (غ)

اولوا الضرر سے مراد اور ان کا حکم: یہاں آخری دو قسم کا ضرر مراد ہے یعنی وہ لوگ جو اندھے یا لنگڑے وغیرہ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور بدنی نقصان کے سبب سے جہاد میں نکلنے سے معذور ہیں اور وہ لوگ جو سامان نہ رکھنے کی وجہ سے معذور ہیں۔ اور جہاد کو وسیع معنی میں لیکر یعنی اس میں اعلائے کلمۃ اللہ کو شامل کر کے علم کی کمی والے لوگ بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اولی الضرر مجاہدوں کے برابر ہیں اس لیے کہ اولی الضرر کی مختلف حالتیں ہیں ایسے لوگ جو جنگوں میں

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ ع ۱۳ ۵

اپنے ہاں مرتبے اور حفاظت اور رحمت۔ اور اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾

اُن کو جن کی فرشتے جان قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنیوالے ہیں وہ کہیں گے تم کس حال میں تھے کہیں گے ہم ملک میں بے بس تھے (فرشتے) کہیں گے کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ ایسے لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُری جگہ ہے [ع ۷۱۹]

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾

مگر وہ کمزور مرد اور عورتیں اور بچے، کہ نہ وہ حیلہ کر سکتے ہیں اور نہ راستہ پا سکتے ہیں [ع ۷۲۰]

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾

سو یہ امید ہے کہ اللہ انھیں معاف کرے اور اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔

زخمی ہوکر بیکار ہو گئے ہیں یا خدمتِ دین میں بیمار ہو گئے ہیں وہ خدا کے نزدیک ایسے ہی ہیں گویا کہ ان اعمال کو پھر بھی بجالا رہے ہیں۔ پھر ایسے لوگ جو دل میں تڑپ رکھتے ہیں مگر سامان ان کے پاس موجود نہیں وہ بھی قاعدین سے بہرحال بڑھ کر ہیں اور عنداللہ اپنی نیت کے مطابق اجر حاصل کرنے والے ہیں۔ جیسا ایک قوم کا ذکر قرآن شریف میں ہے تولّوا واعینھم تفیض من الدمع حزنا الّا یجدوا ما ینفقون (التوبۃ ۹-۹۲)

ع ۷۱۹ ظالمی انفسھم نفس پر ظلم کرنے والے سے مراد وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو دل سے صداقت اسلام کے قائل ہو گئے مگر باوجود استطاعت کے ہجرت اختیار کر کے مسلمانوں کے ساتھ نہ ملے اور کفار کے غلبہ کی وجہ سے اظہار اسلام نہ کر سکے اور ایسے منافق بھی مراد ہو سکتے ہیں جو اظہار اسلام بھی کرتے اور پھر کفار کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ بھی کرتے، مگر بظاہر مراد قسم اوّل کے لوگ ہی ہیں۔

پچھلے رکوع کے آخر پر یہ بتایا تھا کہ خدا کی راہ میں جہاد کرنا بیٹھ رہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس لیے اب ان لوگوں کو سمجھاتا ہے جو کسی کمزوری کی وجہ سے اپنے آپ کو بالکل بے بس سمجھ لیتے ہیں۔ مکّہ میں بھی بہتیرے ایسے لوگ تھے اور باہر بھی تھے جو دل سے مسلمان تھے مگر اپنے گھر بار کو نہ چھوڑ سکے۔ حالانکہ وہ یہ استطاعت رکھتے تھے کہ ہجرت کر کے دین اسلام کی خدمت بجالائیں اور اس حالت سکون پر راضی ہو گئے۔ ان لوگوں کو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے کہا گیا ہے۔ پھر ان لوگوں کی کیا حالت ہے جو آج دین اسلام کے غلبہ سے مایوس ہو کر سکون پر راضی ہو بیٹھے ہیں اور دین اسلام کے پھیلانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتے۔

ع ۷۲۰ حیلۃ۔ حَوْل سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا تغیر اور اس کا دوسرے سے انفصال اسی سے حال ہے جس میں انسان اپنے آپ کو پاتا ہے بلحاظ تغیرات جسمانی یا تغیرات نفس وغیرہ کے اور اسی سے حَوْل بمعنی قوت ہے جیسے لاحول ولا قوۃ میں اور اسی سے حَالَ بمعنی حائل ہونے کے ہے حیل بینھم وبین ما یشتھون (السبا ۳۴-۵۴) اور حیلۃ بھی اسی سے ہے جہاں واؤ یا سے بدل گئی ہے اور اس کے معنی ہیں ما یُتَوَصَّلُ به الی حالۃ ما فی خفیۃ، یعنی وہ تدبیر جس سے خفیہ طور پر کسی حالت کو پہنچا جائے (رغ) نیز دیکھو ع ۴۴۳ اور یہاں حیلۃ کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ کفار کے غلبہ اور اذیت کی وجہ سے کھلے طور پر ہجرت نہ کر سکتے تھے۔

پہلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو استطاعت کے باوجود کفار کے اندر سے نہ نکلے اور اس میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو فی الواقع نکلنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے نہ ان کو راستہ ملتا تھا۔ یہاں رستہ نہ پانے سے مراد ہجرت کے لیے رستہ پانا ہے اور ولدان سے مراد بچے بھی ہو سکتے ہیں اور غلام لونڈیاں بھی دیکھو ع ۶۹۱ لکھا ہے کہ اس آیت کا علم مکّہ میں ہوا تو جندب بن ضمرہ نے جو بہت بڈھے ہو گئے تھے اپنے بیٹوں سے کہا مجھے اُٹھا کر لے چلو کیونکہ میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کو استطاعت نہ ہو سو وہ اس کو چارپائی پر ڈال کر لے چلے مگر ان کا انتقال رستہ میں ہی ہو گیا۔ صحابہؓ میں احکام الٰہی کی تعمیل کی یہ روح وہ نمونہ ہے جس کی نظیر دُنیا کی اور کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي
الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ
يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى
اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾ ع

اور جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے وہ زمین میں بہتیری جگہ اور کشایش پائے گا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتا ہُوا اپنے گھر سے نکلے پھر اس کو موت آئے تو اس کا اجر ضرور اللہ کے ذمّہ ہو چکا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ع۷۲۱

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ
جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖۗ اِنْ خِفْتُمْ
اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ
كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۱﴾

اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کو کم کرلو۔ اگر تمھیں ڈر ہو کہ جو کافر ہیں وہ تمھیں تکلیف پہنچائیں گے۔ کافر تمھارے کھلے دشمن ہیں ع۷۲۲

ع۷۲۱ مراغم ۔ رغام اور رَغم کے معنی مٹی یا باریک مٹی ہیں اسی سے محاورہ علیٰ رغم الانف ہے جس سے مراد ذلت قبول کرنا ہے ۔ جیسے معقل بن یسار کی حدیث ہیں کہ انہوں نے نزولِ آیت پر اپنی ہمشیرہ کی شادی اسی خاوند سے جس نے طلاق دیدی تھی قبول کی تو کہا رغم انفی اللہ تعالیٰ (ت) یعنی خدا کے لیے ذلت کو قبول کرتا ہوں اور مجازاً مراغمۃ سے مراد کسی کو چھوڑنا اور ناراض ہونا ہے اور مراغم بھاگنے کی جگہ، اور جانے کی جگہ کو کہا جاتا ہے اور یہی یہاں مراد ہے (ت)

مطلب یہ ہے کہ جب واقعی ہجرت کی ضرورت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ جگہ بھی مہیّا کر دیتا ہے جیسے مسلمانوں کو مدینہ میں جگہ مل گئی۔ یا اس سے پیشتر حبش میں جگہ مل گئی۔ پس جب ضرورت ہجرت واقع ہو جائے اور بدوں ہجرت چارۂ کار نہ ہو تو پھر اس خیال سے ہجرت نہ کرنا کہ جگہ نہیں ملے گی صحیح نہیں اور یہ جو فرمایا کہ اگر رستہ میں ہی مرجائے تو اس کا اجر اللہ پر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت کی غرض تو خدمت دین تھی ایک شخص مرگیا خدمت کا موقعہ نہ ملا مگر اللہ تعالیٰ اس کو اس کی نیت کے مطابق اجر دے گا۔

حالات موجودہ میں ہجرت: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہمیشہ ہی سچّا ثابت ہوا ہے اور سچّا ثابت ہوگا۔ پس یہ نا ممکن ہے کہ واقعی تو ضرورت ہجرت ہو اور ہجرت محض اس لیے ترک کی جائے کہ ہجرت کی جگہ کوئی نہیں۔ یہ خدا کا وعدہ ہے کہ ہجرت کی جگہ ضرور مل جائے گی۔ اس لیے معلوم ہوا کہ پچھلے ایام میں جو تحریک ہجرت تھی۔ اس کے لیے فی الواقع ضرورت صحیحہ پیش نہ آئی تھی۔ روئے زمین پر چالیس کروڑ مسلمان ہیں اور کم وبیش سب عیسائی طاقتوں کے اثر کے نیچے ہیں۔ اب چالیس کروڑ کے لیے کوئی ہجرت کی جگہ نہیں جس سے صاف معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی مشکلات کا حل یہ نہیں کہ وہ سب کے سب عیسائی طاقتوں کی حکومت سے ہجرت کر کے نکل جائیں اگر علم الٰہی میں یہ علاج ان مشکلات کا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کے لیے سامان بھی پیدا کر دیتا۔ ان سامانوں کا نہ ہونا یقینی شہادت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں کی مشکلات کا علاج نہ ہجرت ہے اور نہ قتال جو بدوں ہجرت ہو نہیں سکتا۔ بلکہ ان کا علاج اپنی اصلاح ہے جس کی طرف مسلمان متوجہ نہیں ہوتے اور اس لیے قدم قدم پر ناکامی کا مُنہ دیکھتے ہیں۔

ع۷۲۲ قصر صلوٰۃ سے مراد: تقصروا من الصلوٰۃ ۔ قصر کم کرنے کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ تصریح نہیں کی کہ قصر ارکان صلوٰۃ میں ہو یا تعداد رکعات میں۔ مگر سنتِ صحیحہ سے سفر کی حالت میں قصر رکعات میں ہی ثابت ہے۔ من الصّلوٰۃ کہہ کر بتا دیا کہ یہ قصر بعض نمازوں میں ہے سب میں نہیں۔ چنانچہ ظہر، عصر، عشا میں ہی چار رکعت کی جگہ دو رکعت سفر میں پڑھی جاتی ہیں۔ قصر صلوٰۃ کی ضرورت اس صورت میں فرمائی ہے۔ جب حالتِ سفر ہو۔ ضرب فی الارض کے معنی کے لیے دیکھو ع۸۸ سفر کی حالت کیا ہے اس کے لیے دیکھو ع۲۲۵ یہاں گو قصر صلوٰۃ ایک رخصت کے رنگ میں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جب خود اس کو ایک ضرورت کے مقام پر رکھ کر رخصت دی ہے تو اس سے فائدہ نہ اُٹھانا بھی درست نہیں اور نبی کریم صلعم سے سفر میں قصر صلوٰۃ پر ہمیشگی اختیار کرنا ثابت ہے اور یہ حدیث کہ آپ قصر بھی کرتے تھے اور پُورا بھی کرتے تھے صحیح نہیں جیسا کہ ابن قیم نے لکھا ہے پس سفر میں نماز کو قصر کرنا چاہیئے یعنی صرف فرض ادا کرے اور وہ بھی جن نمازوں میں چار ہیں ان میں صرف دو ادا کرے جب فرض کم ہو گئے تو نوافل خود ساقط ہو گئے۔ فجر کی دو سنتیں جو مؤکدہ ہیں اور نبی کریم صلعم نے کبھی ترک نہیں کیں اور وتر ادا کرلے۔ اور اس آیت کا تعلق ماقبل سے یہ ہے کہ جب جہاد اور ہجرت کی تحریص دلائی اور اس پر زور دیا تو یہ صورتیں سفر کو چاہتی ہیں پس نماز سفر کا حکم اور اس کے ساتھ ہی نماز جنگ کا حکم بیان فرما دیا۔

مگر علاوہ سفر کے یہاں قصر کے لیے بظاہر ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ کافروں کے تکلیف پہنچانے کا خوف ہو۔ تو کیا قصر نماز صرف خوف کی حالت میں ہے اور امن کی حالت میں نہیں؟ جیسا کہ اوپر ثابت کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلعم سے ہر قسم کے سفر میں قصر ثابت ہے اور اسی پر امت کا تعامل ہے یعلیٰ بن اُمیّہ سے روایت ہے کہ مَیں نے حضرت عمرؓ سے سوال کیا کہ باوجود حالت امن میں ہونے کے آپ قصر کیوں کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ جس بات پر تمہیں تعجب ہوا ہے اس پر مجھے بھی تعجب ہوا اور

وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَوٰةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ قف فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰ أَن تَضَعُوٓا أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿۱۰۲﴾

اور جب تو ان کے درمیان ہو پھر ان کے لیے نماز قائم کرے، تو چاہیئے کہ ان میں سے ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو اور چاہیئے کہ وہ اپنے ہتھیار لے لیں پھر جب سجدہ کر چکیں تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائیں اور چاہیئے کہ ایک دوسرا گروہ جنھوں نے نماز نہیں پڑھی آئے پھر وہ تیرے ساتھ نماز پڑھیں اور وہ اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار لیے رہیں۔ کافر چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے اسباب سے غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اگر تمھیں بارش کی وجہ سے تکلیف ہو، یا تم بیمار ہو تو اپنے ہتھیار اتار رکھو اور اپنا بچاؤ لیے رہو، یقیناً اللہ نے کافروں کے لیے رُسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ع۴۲۳

میں نے رسول اللہ صلعم سے یہی دریافت کیا تو آپ نے فرمایا صدقۃ تصدق اللہ بھا علیکم فاقبلوا صدقتہ یعنی قصر صلوٰۃ ایک صدقہ ہے جو اللہ نے تم پر کیا پس اس کے صدقہ کو قبول کرو۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ قصر صلوٰۃ یعنی چار کی بجائے دو رکعت فرض خوف سے مشروط نہیں۔ پس اس حدیث اور سنت صحیحہ ثابتہ سے معلوم ہوا کہ قصر صلوٰۃ دو طرح پر ہے ایک چار رکعت کی بجائے دو رکعت ظہر، عصر، عشاء میں۔ اور یہ صرف حالت سفر سے مشروط ہے اور دوسرا وہ قصر جس کا ذکر اگلی آیت میں آتا ہے جو حالت خوف سے مشروط ہے یعنی دو رکعت کی بجائے ایک رکعت باجماعت ادا کر کے دشمن کے مقابلہ پر چلا جانا۔ اور قرآن کریم کے الفاظ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ کفار کے تکلیف پہنچانے کے خوف کا یوں کوئی ازالہ نہیں ہوسکتا کہ چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھ لی جائیں۔ صرف اتنے وقت کی کمی خوف کا علاج نہیں۔ دشمن اتنی دیر میں کہ دو رکعت ادا کی جائیں حملہ کر کے کام تمام کر دیگا بلکہ خوف کا علاج وہی ہے جو خود اگلی آیت میں بیان فرمایا کہ ایک گروہ دشمن کے مقابل پر رہے اور جب دوسرا گروہ ایک رکعت ادا کر کے دشمن کے مقابل پر چلا جائے تو پہلا گروہ امام کے ساتھ دوسری رکعت باجماعت ادا کر لے: تا دشمن نماز پڑھنے والوں پر حملہ ہی نہ کر سکے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بجائے چار کے امام نے بھی صرف دو رکعت ادا کی ہیں اور مقتدیوں نے امام کے ساتھ صرف ایک ایک رکعت ادا کی ہے۔ پس چار رکعت کی بجائے دو رکعت کا ہونا شرط اوّل کے ماتحت ہے یعنی سفر کی وجہ سے۔ اور دو رکعت کی بجائے صرف ایک ایک رکعت باجماعت ادا کرنا شرط دوم کی وجہ سے ہے یعنی دشمن کے خوف سے اور دشمن کے خوف کا یہی دوسرا قصر علاج ہے نہ پہلا قصر۔ اگر محض چار رکعت کی جگہ دو رکعت دشمن کے خوف کا علاج ہوتا۔ تو یہ دوسرا علاج نہ بتایا جاتا۔ پس اس سے صاف ثابت ہے کہ قرآن کریم کا منشاء یہی تھا جو رسول اللہ صلعم نے سمجھا اور عمل کر دکھایا یعنی سفر کی وجہ سے چار رکعت کی جگہ دو رکعت ادا کرو۔ اور خوف کی وجہ سے دو رکعت کی جگہ باجماعت صرف ایک رکعت ادا کر لو۔ اس سے اگر ایک طرف قرآن کا پُر حکمت کلام ہونا معلوم ہوتا ہے تو دوسری طرف نبی کریم صلعم کا وحی خفی سے اس کے باریک سے باریک مطالب پر آگاہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے من الصلوٰۃ کے بعد وقف اسی معنی کا موید ہے۔

ع۴۲۳ عین حالت جنگ اور میدان جنگ میں ہونے کی صورتیں الگ الگ ہیں؛ حالت جنگ میں جب دشمن کا خوف ہو ایک صورت فان خفتم فرجالاً او رکبانا (البقرۃ ۲۔ ۲۳۹) جیسا کہ ع۳۰۸ میں دکھایا گیا وہ ایسے خوف کی حالت ہے۔ جب جماعت کا قیام نہیں ہوسکتا۔ اور دوسری صورت یہاں بیان فرمائی ہے۔ اسی لیے یہاں فرمایا فاقمت لھم الصلوٰۃ یعنی ایسی حالت ہو کہ نماز باجماعت ہوسکتی ہے۔ ہاں دشمن کی طرف سے حملہ کا خوف ہے اور ظاہر ہے کہ میدان جنگ میں دشمن ایسے موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دے گا جب مسلمان مشغول نماز ہوں۔ پس یہ وہ صورت ہے جب میدانِ جنگ میں ہونے کی وجہ سے دشمن کے حملہ کا خوف ہے مگر فی الواقع حالت جنگ نہیں۔ کیونکہ اس میں اس قدر اہتمام بھی مشکل ہے اور اسی لیے یہاں بارش وغیرہ کی صورت میں ہتھیاروں کے رکھ دینے کی بھی اجازت ہے۔

غزوۂ ذات الرقاع میں میدانِ جنگ میں نماز: روایات میں اس بارہ میں اختلاف ہے کہ اس نماز کی کیفیت کیا تھی۔ مگر ترجیح اس روایت کو ہے جسے بخاری اور مسلم اور اصحاب سنن ثلاثہ اور امام احمد نے بیان کیا ہے اور جس کے مطابق حضرت علیؓ۔ ابن عباسؓ۔ ابن مسعودؓ و دیگر صحابہ کا مذہب ہے یعنی یہ کہ غزوۂ ذات الرقاع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں نماز ادا کی کہ ایک گروہ نے آپ کے پیچھے صف باندھی اور دوسرا گروہ دشمن کے مقابل پر رہا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت ادا کر چکے تو آپ حالتِ قیام میں رہے یہاں تک کہ جو گروہ آپ کے پیچھے تھا وہ دوسری رکعت ادا کر کے پیچھے ہٹ گیا اور دشمن کے مقابل پر ہو گیا اور دوسرا گروہ جو پہلے دشمن کے مقابل پر رہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑا ہوا اور آپ نے دوسری رکعت اس کے ساتھ ادا کی اور جب آپ نے سلام پھیرا تو اس گروہ نے اُٹھ کر بقیہ رکعت پوری کر لی۔ بعض روایات میں صرف ایک ہی رکعت کا ذکر ہے۔ یعنی مقتدیوں نے صرف ایک ہی رکعت باجماعت ادا کر کے نماز ختم کر لی۔

فَاِذَا قَضَيۡتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰى جُنُوۡبِكُمۡ‌ۚ فَاِذَا اطۡمَاۡنَنۡتُمۡ فَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ‌ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ﴿۱۰۳﴾

پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرو اور جب مطمئن ہو جاؤ تو نماز کو (اصلی حالت پر) قائم کرو، نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں فرض کی گئی ہے ۴۲۴

وَلَا تَهِنُوۡا فِى ابۡتِغَآءِ الۡقَوۡمِ‌ؕ اِنۡ تَكُوۡنُوۡا تَاۡلَمُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ يَاۡلَمُوۡنَ كَمَا تَاۡلَمُوۡنَ‌ۚ وَتَرۡجُوۡنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرۡجُوۡنَ‌ؕ

ع ۱۶ ۱۲ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۱۰۴﴾

اور (دشمن) قوم کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرو، اگر تم دکھ اٹھاتے ہو تو جس طرح تم دکھ اٹھاتے ہو وہ بھی دکھ اٹھاتے ہیں اور تم اللہ سے وہ امیدیں رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے۔

اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۴۲۵

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰٮكَ اللّٰهُ‌ؕ وَلَا تَكُنۡ لِّـلۡخَآئِنِيۡنَ خَصِيۡمًا ﴿۱۰۵﴾

یقیناً ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرے جو اللہ نے تجھے علم دیا ہے اور دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا نہ بننا۔ ۴۲۶

ع۴۲۴ یہاں اس حالت کی نماز کو قضائے صلوٰۃ سے تعبیر کیا ہے۔ اور حالت امن کی نماز کو اقامت صلوٰۃ سے تعبیر کیا کیونکہ اقامت میں سب شرائط کا پورا کرنا آتا ہے جو حالت خوف میں نہیں ہو سکتیں جس سے معلوم ہوا کہ نماز سفر بحالت خوف میں اور نماز سفر بحالت امن میں فرق صرف یہ ہے کہ حالت خوف میں سب شرائط پوری نہیں ہو سکتیں اور یہ گویا دوسری قسم کا قصر ہے۔ نہ قصر تعداد رکعات۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نے عام لفظ قصر صلوٰۃ ہی اختیار کیا ہے اور تعداد رکعات میں قصر کا ذکر نہیں کیا۔ گویا دو رکعت کی بجائے ایک رکعت جماعت کے ساتھ ادا کرنا بھی ایک رنگ قصر ہے اور اگر ایک ہی رکعت کا ادا کرنا لیا جائے، تو یہ قصر ظاہر ہے۔

ع۴۲۵ اس آیت کا تعلق ماقبل سے یہ ہے کہ وہاں دشمن سے اپنا بچاؤ کرنے کا ذکر ہے حتّٰی کہ نماز کے وقت بھی اپنا بچاؤ کر لینا چاہیئے اور یہاں یہ ذکر ہے کہ دشمن کا پیچھا کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر دشمن کا پیچھا کرنے میں ہشیاری دکھائی جائے تو یہ خود اپنے بچاؤ کا سامان ہے اور یہ جو فرمایا کہ تم وہ امید رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے تو یہ ان صریح پیشگوئیوں کی طرف اشارہ ہے جن میں اسلام کے آخری غلبہ کی خبر دی گئی تھی۔ اور جو مسلمانوں کے لیے قوت کا موجب تھیں۔

ع۴۲۶ ارٰىك الله کے معنی یہاں علمك الله ہیں جو اللہ نے تجھے علم دیا ہے (رغ) اور رؤیۃ بھی جب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو تو اس کے معنی علم ہوتے ہیں (رغ)

خائن۔ خیانت کرنے والا۔ اور خیانۃ اور نفاق اصل میں ایک ہیں خیانت باعتبار عہد و امانت کہا جاتا ہے اور نفاق باعتبار دین۔ اور خیانۃ سے مراد ہے حق کی مخالفت جو خفیہ طور پر نقض عہد سے کی جائے (رغ) اور خوّان جو آگے آتا ہے اس سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔

خصیم۔ خَصۡم جھگڑا کرنے کو کہتے ہیں۔ اور خصیم وہ ہے جو کثرت سے مخاصمت کرے (رغ)

طعمہ بن ابیرق کا واقعہ: منافق جو اسلام کا اظہار کرتے تھے، تو وہ سمجھتے تھے کہ ضرورت کے وقت مسلمان کہلانے کی وجہ سے ہماری رعایت ہو گی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم میں تو سخت ترین دشمن کے ساتھ اور بڑے سے بڑے دوست کے خلاف بھی عدل کا حکم تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کے بارے میں یہ خاص حکم اپنے نبی پر اُتارا۔ تاکہ ان کی یہ جھوٹی امیدیں منقطع ہو جائیں۔ ایک خاص واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ایک انصاری طعمہ بن ابیرق تھا۔ اس نے ایک دوسرے شخص کے گھر سے ایک زرہ چُرائی اور پھر اس کو ایک یہودی کے پاس رکھ دیا۔ جب تحقیقات شروع ہوئی اور زرہ کا اثر طعمہ کے گھر تک پہنچا اور آخر وہ یہودی کے گھر سے برآمد ہوئی تو اس نے طعمہ کا پتہ بتایا مگر اس نے انکار کیا اور اس کے ساتھیوں نے بھی رسول اللہ صلعم کے سامنے اس کی بریت کی مگر آپ نے فیصلہ اس کے خلاف دیا۔ اور اسی واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

آنحضرتؐ کی فوق العادت امانت اور دیانت: ان الفاظ سے کہ دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا نہ بننا یہ قیاس کر لینا کہ آپ نے کوئی طرفداری

وَّ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ﴿۱۰۶﴾

اور اللہ کی حفاظت مانگ بیشک اللہ حفاظت کرنیوالا رحم کرنیوالا ہے۔ ۴۲۷

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۙ﴿۱۰۷﴾

اور ان کی طرف سے مت جھگڑ جو اپنے نفسوں کی خیانت کرتے ہیں اللہ بڑے خیانت کرنیوالے گنہگار کو ہرگز دوست نہیں رکھتا۔

يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾

یہ لوگوں سے چھپنا چاہتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے۔ اور وہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کو مشورے کرتے ہیں جس بات کو وہ پسند نہیں کرتا اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۟ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾

دیکھو تم وہ لوگ ہو جو دنیا کی زندگی میں اُن کی طرف سے جھگڑتے ہو۔ پر قیامت کے دن کون اُن کی طرف سے اللہ کے ساتھ جھگڑے گا۔ یا کون اُن کا وکیل بنے گا۔ ۴۲۸

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْۤءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾

اور جو شخص بدی کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے بخشش چاہے وہ اللہ کو بخشنے والا رحم کرنے والا پائے گا۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾

جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ اپنی جان پر ہی اس کا وبال لیتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

کی ہوگی ایک نادانی کا خیال ہے۔ کسی حکم کا جو آپ کو قرآن میں دیا گیا ہے ہرگز یہ منشا نہیں کہ آپ نے اس کی خلاف ورزی کی تھی اس لیے اس حکم کی ضرورت پیش آئی۔ بلکہ اُمت کو تعلیم دینا مقصود ہے ورنہ آپ خود اعلیٰ سے اعلیٰ اصول پر قائم تھے اقم الصلوٰۃ کا حکم بار بار کیوں دیا جاتا تھا کیا اس لیے کہ آپ نے نماز ترک کر دی تھی؟ آپ نے جیسا کہ اوپر کی روایت سے ظاہر ہے۔ خائن کی طرف سے جھگڑا نہیں کیا تھا بلکہ اس کے خلاف فیصلہ کیا تھا۔ پس ان الفاظ کے لانے کا منشاء منافقین کی جھوٹی امیدوں کا منقطع کرنا تھا۔ نبی کریم صلعم کی صداقت اور دیانت تو قبل از نبوت بھی عرب میں مسلم تھی۔ اگر آپ میں اس قسم کی طرف داری کا مادہ ہوتا تو عرب الیسی اکھڑ قوم آپ کو الامین کا خطاب کیونکر دیتی۔ پس اگر قبل از نبوت بھی آپ کی امانت و دیانت پر کوئی شخص حرف نہ رکھ سکتا تھا تو بعد از نبوت ان باتوں کا قیاس آپ کے خلاف کرنا صریح واقعات کا انکار کرنا ہے ہاں بلاشبہ آپ کی زندگی میں ایسے ایسے واقعات پیش آئے کہ ان کے اندر بڑے بڑے لوگوں کا قدم ڈگمگا جاتا۔ مگر آپ کی فوق العادت دیانت اور امانت میں ایسے موقعوں پر کبھی بال برابر بھی فرق نہیں آیا۔ ایسے ہی مواقع پر وحی الٰہی نے بھی آپ کی دستگیری فرمائی ہے۔ چنانچہ خود طعمہ والے واقعہ سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب یہودیوں کے تعلقات آپ کے ساتھ کھلی دشمنی کے ہو چکے ہیں اور ادھر اسلام کو اس قدر مصائب و مشکلات کا سامنا ہے کہ ایک ایک متنفس جو اس کی حمایت کے لیے کھڑا ہو سکتا ہو اس کا وجود از بس غنیمت ہے۔ ادھر بہت سے گواہ شہادت دینے والے موجود ہیں جو طعمہ کو بری ٹھہرا رہے ہیں۔ مگر نبی کریم صلعم کو نہ یہ پروا ہے کہ یہودی ہمارے دشمن ہیں نہ یہ کہ طعمہ کو ملزم قرار دینے سے اس وقت بہت سے مسلمان اور بھی اس کے ساتھ ہاتھ سے جاتے ہیں۔ آپ عین حق و انصاف کے مطابق یہودی کے حق میں اور مسلمان کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں۔
ایسے عدل و انصاف کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کوئی اور ملتی ہے تو پیش کی جائے۔

ع ۴۲۷ جب ایک طرف اس اصول پر آپ کو قائم کیا کہ کسی خائن دغا باز کی حمایت آپ نہ کرینگے تو مشکلات کا اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس لیے فرمایا کہ مشکلات میں اللہ کی حفاظت چاہو۔ استغفار کے ان معنوں کے لیے دیکھو ع ۲۵۸ و ع ۳۸۸ خدا کی حفاظت کا کون انسان محتاج نہیں بلکہ جس نے ایک آن کے لیے بھی اپنے آپ کو خدا کی مدد سے مستغنی سمجھا وہ ہلاک ہو گیا۔ یا مراد یہ ہے کہ جو غلطی کرتے ہیں ان کے لیے استغفار کرو۔ اور سیاق اس کو بھی چاہتا ہے۔

ع ۴۲۸ یہ ایسے لوگوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو اپنی کم فہمی سے منافقوں کے دھوکہ میں آ کر ان کے حامی بن جاتے تھے۔ جیسا طعمہ والے واقعہ میں طعمہ کے رشتہ داروں نے اس کی حمایت کی تو ایسے لوگوں کو سمجھایا ہے کہ یہ منافق در پردہ دشمن اسلام ہیں اور حق اور راستی سے دُور پڑے ہوئے ہیں تم ان کے حامی نہ بنو بلکہ حق کے حامی بنو۔ آیت ۱۰۷ میں ولا تجادل میں خطاب عام ہے جیسا کہ آیت ۱۰۹ کے الفاظ ھانتم

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓـَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ
بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ ع ۱۶
وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ
طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ
اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ
وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ
فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ الثلثة
لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ
بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ
فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾

اور جو شخص خود قصور یا گناہ کرے پھر ایک بے گناہ پر اُس کی تہمت لگائے یقیناً وہ اپنے اوپر بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ لیتا ہے ۴۲۹

اور اگر تجھ پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ قصد کر ہی چکا تھا کہ تجھے گمراہ کریں اور وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کرتے ہیں اور تجھے کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل کی اور تجھے وہ سکھایا، جو تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے ۴۳۰

اُن کے بہت سے خفیہ مشوروں میں کوئی بھلائی نہیں سوائے اس کے کہ کوئی خیرات یا بھلے کام یا لوگوں میں اصلاح کے لیے حکم دے اور جو شخص اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ایسا کرے گا اسے ہم بہت بڑا اجر دیں گے ۴۳۱

ھٰؤلاء جادلتم عنھم جمع لا کر صاف کر دیا۔

ع ۴۲۹ خطیئۃ اور اثم کے معنی کے لیے دیکھو ع ۱۰۵ و ع ۱۰۸ بلحاظ ان کے اصل معنی کے فرق یہ ہے کہ خطیئۃ وہ ہے جو بلا عمد سرزد ہو اور اثم وہ ہے جو عمد سے ہو اور یہی فرق ابن جریر نے کیا ہے یا خطیئۃ وہ ہے جس کا اثر انسان کی اپنی ذات تک محدود ہو اور اثم وہ جس کا اثر بد دوسرے پر پڑے۔

اس قسم کی کمینہ حرکت کو کہ انسان خود بُرا کام کرے اور دوسرے کے ذمہ لگا دے قرآن کریم نے منافقوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ حتیٰ کہ ایک یہودی کے متعلق بھی یہ جائز نہ تھا کہ خود بُرے فعل کا ارتکاب کرکے اس کے سر پر وہ تھوپا جاتا۔ یہ تو وہ اخلاق تھے جو قرآن کریم نے دشمنوں تک کے متعلق سکھائے تھے مگر آج کتنے مسلمان ہیں جو اپنے بھائیوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ اور آج غیر مسلموں کا مال لے لینا تو ایک طرف رہا مسلمان بھائیوں پر کفر کے فتوے لگا کر ان کے مال بھی بالباطل لے لینا جائز قرار دیا جاتا ہے اس سے بڑھ کر کیا خیانت ہوگی۔

ع ۴۳۰ یضلوك۔ اضلال کے ایک معنی اِھلاك بھی آتے ہیں یعنی ہلاک کرنا اَضَلَّه۔ ضَيَّعَه و اھلكه (ت) یہی معنی یہاں مراد ہیں جس طرح اِنَّ المجرمین فی ضلال وسعر (القمر ۵۴ - ۴۷) میں ضلال کے معنی ہلاکت ہیں (ت) کیونکہ جب ان کے قصد اضلال کا ذکر کیا تو جواب میں تسلّی کے طور پر فرمایا کہ تجھے کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اس سے پہلے اور پیچھے بھی منافقوں کے خفیہ مشوروں اور ان کے منصوبوں کا ہی ذکر ہے۔ پس سیاق و سباق عبارت کے لحاظ سے یہی معنی درست ہیں۔ اور اگر گمراہ کرنا معنی لیے جائیں تو بھی کوئی ہرج نہیں۔

یہاں یہ بتایا کہ منافق صرف اتنی کمزوری ہی نہیں دکھاتے کہ جنگ سے پیچھے ہٹتے ہوں بلکہ وہ اسلام کے چھپے ہوئے دشمن ہیں اور ہمیشہ اسلام کو تباہ کرنے کے منصوبے سوچتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی تسلّی دی کہ پیغمبر کو کتاب و حکمت دیکر بھیجا گیا ہے جس کی اس نے دنیا میں تعلیم دینی ہے پس وہ ہلاک نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری جگہ فرمایا ھمّوا بما لم ینالوا (التوبۃ ۹ - ۷۴) جو کچھ قصد یہ منافق کرتے ہیں اس مقصد کو کبھی نہیں پائیں گے۔

ع ۴۳۱ نجویٰ۔ اس کا اصل بھی وہی ہے جو نجاۃ کا اصل ہے اور ناجیتُه کے معنی ہیں اس سے خفیہ طور پر مشورہ کیا اور اس کی اصل نجوۃ سے ہے جس کے معنی بلند زمین ہیں گویا وہاں اس کے ساتھ تنہا ہوا اسی سے نجویٰ مصدر ہے یعنی خفیہ مشورہ کرنا۔

یہاں منافقوں کے خفیہ مشوروں کا ذکر کرکے فرمایا کہ ان کے خفیہ مشوروں میں بھلائی کی کوئی بات تو ہوتی نہیں۔ کیونکہ وہ جب چھُپ کر مشورہ کرتے ہیں تو نقصان پہنچانے کے لیے ہی کرتے ہیں اسی لیے یہاں کثیر کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور پھر فرمایا کہ بھلائی کا کام تو یہ ہے کہ کوئی شخص دوسروں کو صدقات دینے کے لیے کہے یا نیک بات کی ہدایت کرے یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا کوئی کام کرے مگر یہ جب ملتے ہیں تو ان امور کے خلاف

وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الۡهُدٰی وَ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا ﴿۱۱۵﴾ ع ۱۷/۱۴

اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس کے لیے حق کھل چکا اور مومنوں کے رستے کے سوائے اور راستہ کی پیروی کرے ہم اسے پھیر دینگے جدھر وہ پھرتا ہے اور اُسے جہنم میں داخل کرینگے اور وہ بُری جگہ ہے ۴۳۲

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ مَنۡ یُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿۱۱۶﴾

اللہ یہ نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شریک بنایا جائے اور جو اس کے سوا ہو جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھیراتا ہے وہ گمراہی میں دُور نکل گیا ۴۳۳

اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَ اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَیۡطٰنًا مَّرِیۡدًا ﴿۱۱۷﴾

اُسے چھوڑ کر وہ سوائے بیجان چیزوں کے اور کسی کو نہیں پکارتے اور وہ سرکش شیطان کے سوا اور کسی کو نہیں پکارتے ۴۳۴

ہی کچھ کرتے ہیں۔ اصلاح بین الناس کی حدیث میں بڑی تعریف آئی ہے یہاں تک کہ ایک حدیث میں جس کو ابو داؤد ترمذی احمد نے بیان کیا ہے یہ لفظ آتے ہیں کہ نبی کریم صلعم نے صحابہ کو فرمایا کہ مَیں تم کو ایسے عمل کی خبر دوں جس کا درجہ نماز اور روزے سے بڑھ کر ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا ہاں، تو فرمایا کہ لوگوں میں اصلاح کرنا۔ صرف مسلمانوں میں نہیں کہا بلکہ سب لوگوں میں۔ آج کل مسلمانوں کو اس نصیحت پر عمل کی بہت ضرورت ہے۔ کیونکہ ترقی کی جڑ اتفاق اور اتحاد ہے آج ان میں تفرقہ ڈلوانے والے بہت ہیں مگر اصلاح کرنے والوں کا وجود کالعدم ہے۔

اس آیت میں بھلائی کی ان سب قسموں کو جو ایک انسان دوسرے کے ساتھ کر سکتا ہے جمع کر دیا ہے۔ اوّل صدقہ رکھا یعنی جو مالی امداد کا محتاج ہو اس کو مالی مدد دینا۔ دوسری قسم کی بھلائی یہ ہے کہ انسان کسی کو اچھی راہ پر ڈال دے یعنی اسے معروف کا حکم دے اور تیسری یہ کہ فساد کو دُور کر کے اصلاح کر دے یہ وہ کام تھا جو محمّد رسول اللہ صلعم اور آپ کے ساتھی کر رہے تھے۔

۴۳۲ نولّه ماتولی۔ تولیۃ۔ دوسرے کے ساتھ قرب کا تعلّق پیدا کرنا ہے پس نولہ ماتولی کے معنی ہوئے ہم اس کا تعلق اسی کے ساتھ ہونے دینگے جس کے ساتھ وہ خود تعلق پیدا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا انسان سے معاملہ اس کے عمل کے مطابق ہوتا ہے: انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت یوں ہی نظر آتا ہے کہ انسان جس سے تعلق پیدا کرنا چاہے اس سے اس کا لگاؤ ہو جاتا ہے۔ نیکوں کے ساتھ تعلق اور محبّت پیدا کرے ان کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ بدوں کے ساتھ کرے تو ان سے، پس جب ایک گروہ نے باوجود ہدایت کے کھل جانے کے، دن رات مسلمانوں میں رہنے کے، رسول اللہ صلعم کی دشمنی کے طریق کو اختیار کر لیا تو خُدا ان کو مجبور کر کے دوسری راہ پر نہیں ڈالتا بلکہ اس کے قانونِ قدرت کے مطابق ان کو پھر وہی راہ اچھی لگتی ہے۔ جس کا انجام جہنم ہے یا یہ محاورہ ولیت وجہی کذا سے ہے جس کے معنی ہیں مَیں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ گویا جدھر انسان توجہ پھیرتا ہے اسی طرف اللہ بھی اس کی توجہ کو پھیر دیتا ہے۔

اجماع اُمت: امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے تین سو مرتبہ قرآن شریف اس غرض کے لیے پڑھا کہ اجماع امت کے دلیل شرعی ہونے پر کونسی آیت حجّت ہے اور آخر انکو یہ آیت ملی۔ اس پر یہ اعتراض ہُوا ہے کہ سبیل المؤمنین کوئی الگ راستہ نہیں بلکہ قال اللہ وقال الرسول پر ایمان ہی سبیل المؤمنین ہے۔ اور وہ وہی ہدایت ہے جس کا ذکر یہاں موجود ہے۔ پس ان الفاظ سے اجماع اُمّت پر کوئی دلیل پیدا نہیں ہوتی اور اگر سیاق وسباق عبارت پر غور کیا جائے تو یہ اعتراض بالکل صحیح ہے۔ یہاں ذکر رسول اللہ صلعم سے دشمنی کا ہے کہ کوئی شخص ایمان اور محبّت کی بجائے کفر اور دشمنی کے طریق کو اختیار کرے اور ان میں سے اول الذکر مومنین کا رستہ ہے۔ اس سے بڑھ کر مومنین کے رستہ سے کچھ مراد نہیں اور نہ ہی اجماع کے کچھ معنی ہو سکتے ہیں کیونکہ تمام مسلمانوں کا کس طرح ایک بات پر اتفاق ہو سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ بات قرآن یا حدیث میں ہو۔

۴۳۳ پچھلے رکوع کے آخر پر منافقوں کے ذکر میں فرمایا تھا کہ صحیح رستہ وہی ہے جس پر مومن ہیں۔ اب اس رکوع میں ایک مشرک اور ایک موحد کا مقابلہ کر کے بتایا ہے کہ منافقین نے کونسا طریق اختیار کیا ہے اور کہ یہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ شرک چونکہ سب بدیوں کی جڑ ہے اس لیے اس کا ذکر کیا۔ شرک کے نہ بخشنے پر دیکھو ع۶۶۸ اور یہاں بتا بھی دیا کہ مشرک کو اللہ تعالیٰ کیوں نہیں بخشتا اس لیے کہ وہ گمراہی میں اس قدر دور نکل جاتا ہے کہ وہاں سے واپس آنا مشکل ہوتا ہے شرک اور بُت پرستی کے برابر کسی بیماری کی جڑیں گہری نہیں۔

۴۳۴ اناث۔ انثیٰ کی جمع ہے اور جن سے وہ سوائے خدا کے اپنی حاجت برآری چاہتے ہیں ان کو اناث کہا ہے یا اس لحاظ سے کہ ان کے ہاں اکثر بتوں کے نام مؤنث تھے جیسے لات اور عزیٰ اور منات (غ) اور حسن سے روایت ہے کہ ہر ایک قبیلہ کا ایک بُت ہوتا تھا جسے وہ انثیٰ بنی فلاں کہتے تھے یعنی فلاں قبیلہ کی دیوی۔ اور یا اس لحاظ سے کہ ان چیزوں کو جن میں روح نہ ہو اناث کہا جاتا تھا۔ اور یہ بھی حسن سے روایت ہے (ج) امام

لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ	اُسے اللہ نے پھٹکار دیا ہے اور اس نے کہا میں ضرور تیرے
نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾	بندوں سے ایک مقرر حصّہ لونگا۔
وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ	اور میں انھیں ضرور گمراہ کروں گا اور انھیں جھوٹی آرزوئیں دلاؤنگا
فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ	اور انھیں کہوں گا سو وہ جانوروں کے کان چیرینگے[۴۳۵] اور انھیں کہوں گا
خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ	سو وہ اللہ کے بنائے ہوئے (دین) کو بدل دیں گے[۴۳۶] اور جو شخص اللہ کو
دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾	چھوڑ کر شیطان کو دوست بناتا ہے وہ یقیناً کھلا نقصان اُٹھاتا ہے۔
يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ	وہ ان کو وعدے دیتا ہے اور ان کو جھوٹی آرزوئیں دلاتا ہے اور

راغب نے بھی اناث سے مراد جمادات ہی لیے ہیں کیونکہ ان میں صرف قوت منفعلہ ہے یعنی دوسرے کا اثر قبول کرنا اور وہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ ان کے معبودوں کے لیے اختیار کرکے ان کو ان کی جہالت پر متنبہ کیا ہے کہ وہ اشیاء جو نہ دیکھتی ہیں نہ سنتی اور نہ کوئی کام کرنے کی طاقت رکھتی ہیں۔ ان کو وہ اپنی مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ اسی کی مثل حضرت ابراہیمؑ کا قول ہے یا ابت لم تعبد ما لا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنك شیئا (مریم ۱۹۔ ۴۲) اور دوسری جگہ فرمایا: وجعلوا الملئکۃ الذین ھم عبد الرحمن اناثا (الزخرف ۴۳۔ ۱۹) تو یہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے (غ)

مرید۔ مرد سے ہے۔ شجرٌ اَمْرَدُ اس درخت کو کہا جاتا ہے جس پر پتے نہ ہوں اور امرد مردوں میں سے وہ ہے جس کے منہ پر ابھی بال نہ نکلے ہوں اس لیے مرید اور مارد (وحفظا من کل شیطان مارد۔ الصّٰفّٰت ۳۷۔ ۷) جنّوں اور انسانوں میں سے وہ ہے جو ہر قسم کی بھلائی سے خالی ہو اور ایک روایت میں ہے اھل الجنۃ مُرْدٌ تو یہ ظاہر پر بھی حمل ہو سکتا ہے اور یہ بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں کہ وہ ہر قسم کے نقصوں اور قباحتوں سے خالی ہونگے اور مردوا علی النفاق (التوبۃ ۹۔ ۱۰۱) سے مراد ہے کہ وہ ہر قسم کے محاسن سے خالی نفاق پر ہیں۔

شیطان کی عبادت سے مراد: ان الفاظ کے بڑھانے سے کہ وہ سرکش شیطان کے سوائے اور کسی کو نہیں پکارتے مطلب یہ ہے کہ جن کو وہ خدا کرکے پکارتے ہیں۔ انہوں نے تو کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا یہ صرف شیطان کے بہکانے سے ان کو اپنا معبود سمجھتے ہیں، پس گویا اس کی اطاعت کرکے اسی کی عبادت کرتے ہیں۔

ع۴۳۵ لیبتکن۔ یُبَتِّكَ کا مادہ بَتْك ہے اور بتك اور بتّ کے معنی ایک ہیں۔ یعنی قطع کرنا اس فرق سے کہ اعضاء اور بالوں کے کاٹنے میں بتك کہا جاتا ہے اور ذرائع اور ملاپ کے کاٹنے پر بتّ (غ)

کان چیرنے کی رسم: ایام جاہلیت میں رسم تھی کہ جب اونٹنی پانچ بچے جن لیتی اور پانچواں نر ہوتا تو اس کے کان چیر کر اس کو چھوڑ دیتے اور نہ اس پر سوار ہوتے نہ اس سے کوئی کام لیتے۔ یہ ایک مشرکانہ رسم تھی یعنی بتوں کے نام پر ایسا کرتے تھے۔ اس کو بحیرہ کہتے جس کا ذکر دوسری جگہ آتا ہے ماجعل اللہ من بحیرۃ ولا سآئبۃ (المائدۃ ۵۔ ۱۰۳) (ج) اور بعض نے کہا ہے کہ بتوں کی پرستش کا یہ ایک حصّہ تھا کہ جانوروں کے کان چیر دیتے تھے۔

ع۴۳۶ خلق اللہ سے یہاں کیا مراد ہے۔ خود قرآن کریم نے اس کی تصریح دوسری جگہ فرما دی ہے فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذلك الدین القیم (الروم ۳۰۔ ۳۰) اللہ کی دی ہوئی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی پیدائش میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہ مضبوط دین ہے پس خلق اللہ کی تبدیلی سے مراد دین الٰہی کی تبدیلی ہے اور یہی معنی حسن، ضحاک، مجاہد اور بہت سے ائمہ سے مروی ہیں (ث ج) اور صحیحین کی حدیث میں ہے کل مولود یولد علی الفطرۃ۔ یعنی ہر ایک بچّہ اسی فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے گویا ایک طرف اگر بڑی موٹی قسم شرک کی بتا دی یعنی جانوروں کے کانوں کا چیرنا تو دوسری طرف اس کی باریک سے باریک صورت کو بیان کر دیا یعنی الٰہی دین کو بدلنا جس سے مراد اللہ کے حلال کو حرام اور اسکے حرام کو حلال کرنا ہے اس کی تفسیر لعن اللہ الواشمات سے کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس سے خلق اللہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ ورنہ ہر ایک زینت خلق اللہ کی تبدیلی ہو جائے گی اور حدیث کا منشا صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان عورتوں پر آپ نے لعنت کی ہے جو دیکھنے والوں کو زنا کی طرف بلانے کی غرض سے ہاتھوں وغیرہ پر نیل بھر لیتی ہیں اور تغیر خلق اللہ میں ایک قول یہ بھی ہے کہ مراد اس سے اس غرض کی تبدیلی ہے جس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو پیدا کیا ہے مثلاً حیوانوں کو سواری کے لیے پیدا کیا بحیرہ سائبہ بنا کر ان کی پرستش کرنا تغییر خلق اللہ ہے سورج چاند کو انسان کے لیے مسخر کیا ان کی عبادت تغییر خلق اللہ ہے (ز)

الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿١٢٠﴾
اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۫ وَلَا يَجِدُوْنَ
عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿١٢١﴾

شیطان صرف ان کو دھوکا دینے کو ہی وعدے دیتا ہے[۴۳۷]
یہی ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ اس سے کوئی بھاگنے
کی جگہ نہ پائیں گے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ
مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿١٢٢﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان کو ہم باغوں
میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ہمیشہ انھیں میں
رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر
کون بات کا سچّا ہے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ
مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿١٢٣﴾

نہ تمھاری خواہشوں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی خواہشوں پر
جو کوئی بدی کرے گا اس کا بدلہ اُسے دیا جائے گا۔ اور اللہ
کو چھوڑ کر وہ نہ کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار پائے گا[۴۳۸]

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ
اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ
الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿١٢٤﴾

اور جو نیک کام کرے، خواہ مرد ہو یا عورت،
اور وہ مومن ہو۔ تو یہی جنت میں داخل ہوں گے
اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہ کیا جائے گا[۴۳۹]

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ
لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ
حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿١٢٥﴾

اور دین میں اس سے اچھا کون ہے جس نے اپنی ساری توجہ
کو اللہ کی فرمانبرداری میں لگا دیا اور وہ احسان کرنیوالا ہے اور راست رَو
ہو کر ابراہیم کے مذہب کی پیروی کرتا ہے اور اللہ نے ابراہیم کو (اپنا) پیارا بنایا۔[۴۴۰]

ع۴۳۷ یہ الفاظ بہت قابل غور ہیں نہ صرف شیاطین الجن کے وعدے ہی سراسر جھوٹ اور فریب ہوتے ہیں بلکہ شیاطین الانس جب لوگوں کو غلط راہ پر لگاتے ہیں تو وہ بھی جھوٹے وعدے دیکر ہی ایسا کرتے ہیں۔ جو شخص دوسرے کو بدی کی ترغیب دیتا ہے وہ اس کو خوب سجاتا ہے اور اکثر لوگ بدوں کی صحبت میں بیٹھ کر اسی لیے تباہ ہوتے ہیں کہ وہ ان کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔

ع۴۳۸ کیسا پاک مذہب ہے۔ آرزوؤں اور خواہشات پر اجر نہیں ملتے خواہ مسلمان ہوں خواہ یہود و نصاریٰ۔ جو مسلمان نام کو مسلمان کہلاتے ہیں اور قرآن شریف کو اپنا دستور العمل نہیں بناتے وہ محض امانی کے پیرو ہیں اور قرآن کریم کی یہ آیت فیصلہ کرتی ہے کہ نری آرزوؤں سے کچھ نہیں بنتا جب تک اعمال ساتھ نہ ہوں۔ مسلمان ہو کر بُرا کام کرے گا تو وہ بھی سزا پائے گا۔ غیر مذہب کا آدمی اچھا کام کرے گا تو اس کا اجر پائے گا۔ صحیح اعتقاد عمل سے مستغنی نہیں کرتا بلکہ اعتقاد صحیح کی اصل غرض ہی عمل صحیح پر قائم کرنا ہے۔

ع۴۳۹ مرد اور عورت میں نتائج اعمال کے لحاظ سے کامل مساوات ہے: پس جس طرح مرد کے لیے نعمائے جنّت ہیں اسی طرح اور وہی نعمائے جنت عورت کے لیے بھی ہیں۔ قرآن کریم نے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ نہ کہیں یہ فرمایا ہے کہ مرد کے لیے عورت کی نسبت زیادہ انعامات ہیں۔ پس اگر عیسائیوں نے اسلام پر یہ جھوٹا الزام دیا ہے کہ ان کے نزدیک عورت کی روح ہی نہیں تو خود مسلمان بھی اس غلط فہمی میں ہیں کہ بہشت میں جو انعامات مرد کے لیے ہیں۔ وہ عورت کے لیے نہیں۔ قرآن کریم نے اعمال کے نتائج کے متعلق مرد اور عورت میں مساوات کامل رکھی ہے۔

ع۴۴۰ خلیل خُلّۃ سے ہے جس کے معنی محبّت ہیں کیونکہ وہ نفس کے اندر داخل ہو جاتی ہے اور خَلَل اس شگاف کو کہتے ہیں۔ جو دو چیزوں کے درمیان ہو یا وسط کو فتری الودق یخرج من خلالہ (النور ۲۴-۴۳) فجاسوا خلل الدیار (بنی اسرائیل ۱۷-۵)
اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو خلیل بنایا، جب بندہ اپنے مالک سے محبّت کرتا ہے تو مالک بھی اپنے بندہ سے محبّت کرتا ہے لیکن یہاں جو خوشخبری سنائی ہے وہ یہ نہیں کہ حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا بلکہ یہ ہے کہ جو کوئی شخص بھی اس ملّتِ ابراہیمی پر چلتا ہے اپنی توجہ کو اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری میں لگا دیتا ہے

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ ع
وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ
فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ
يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ
لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ
مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ
وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ کا ہی ہے
اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔
اور تجھ سے عورتوں کے متعلق فتویٰ پوچھتے ہیں کہ اللہ تم کو ان کے بارے میں
فتویٰ دیتا ہے اور جو تم پر کتاب میں پڑھا جاتا ہے ان عورتوں کے
یتیموں کے بارے میں ہے جن کو تم جو کچھ اُن کے لیے اور ناتواں
بچّوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے نہیں دیتے ہو اور نہیں چاہتے ہو کہ
ان کے نکاح کرو اور یہ کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف پر قائم رہو
اور جو کچھ بھلائی تم کرو تو اللہ اسے جاننے والا ہے۔ ۷۴۱

اور مخلوقِ خدا کے ساتھ احسان کرتا ہے وہی خلیل اللہ یا اللہ کا پیارا بن جاتا ہے۔

اتباعِ ملّتِ ابراہیمؑ سے کیا مراد ہے؟ یہاں ملّت ابراہیم صرف حنیفیت کو کہا ہے یعنی ان اصول دین کو جو افراط و تفریط سے پاک تھے دیکھو ع۱۷۰ اور یہاں وہ اصول دین بھی بتا دیئے یعنی اسلم وجھہٗ للّٰہ۔ وھو محسن اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور مخلوقِ خدا سے احسان پس انہی اصول میں جو اسلام کے بھی اصل الاصول ہیں اتباع مراد ہے۔ اپنی اصلی حالت میں اصول سب مذاہب کا ایک ہی تھا۔ یعنی خدائے واحد کی پرستش اور مخلوق خدا سے احسان کی تعلیم۔

ع۷۴۱ یستفتون۔ یفتی۔ فتٰی کے معنی نوجوان۔ اور فتویٰ جواب ہے ایسے احکام سے جو مشکل ہوں (غ) اور استفتاء ایسے مسائل میں فتویٰ مانگنا افتونی فی امری (النمل ۲۷۔ ۳۲) فاستفتھم (الصّٰفّٰت ۳۷۔ ۱۱)

یتامی النساء کے معنی دونوں طرح ہو سکتے ہیں۔ عورتوں کے یتیم بچے یعنی بیوہ عورتوں کے۔ اور یتیم عورتیں۔ اور لسان العرب میں ہے کہ یتیم اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کا خاوند نہ ہو۔ اور دوسری قرأت اس کی ییامی النساء ہے اور ییامی۔ ایّم کی جمع ہے یعنی وہ عورت جس کا خاوند نہ ہو اور اس کی جمع ایامیٰ قرآن شریف میں آتی ہے وانکحوا الایامیٰ (النور ۲۴۔ ۳۲)

ماکتب لھن۔ جو حصّہ ان کے لیے مقرر ہوا ہے اس سے مہر مراد نہیں بلکہ میراث کا حصّہ مراد ہے کیونکہ اس کے ساتھ ہی کمزور بچوں کا بھی ذکر ہے عورتوں اور بچوں کو عرب لوگ میراث نہ دیتے تھے جیسا کہ ع۶۱۲ میں ذکر ہو چکا ہے اس لیے جب قرآن شریف میں عورتوں اور بچوں کے ورثہ پانے کا حکم آیا تو بعض لوگوں کو ناگوار گزرا (ج)

ترغبون ان تنکحوھن۔ رغب کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۶۵ یہاں صلہ کوئی نہیں اس لیے دونوں معنی ہو سکتے ہیں کہ انکے نکاح میں رغبت کرتے ہو اور یہ کہ ان کے نکاح نہیں چاہتے ابن جریر نے دونوں قسم کی روایات بیان کی ہیں مگر کثرت دوسرے معنی کی طرف ہے اور سیاق بھی یہی چاہتا ہے اس لیے کہ مال کا ورثہ لینے کے لیے وہ نہ چاہتے تھے کہ ایسی عورتیں نکاح کریں۔

مسئلہ تعدد ازدواج پر مزید روشنی: اس رکوع کا تعلّق ابتدائے سورت سے ہے اور اس میں اسی مضمون تعدد ازدواج کا ذکر ہے جس کا ذکر سورت کے شروع میں کیا تھا آیت ۱۲۹ اس امر کو بالکل واضح کر دیتی ہے۔ جہاں فرمایا کہ تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے۔ پچھلے رکوع سے اس کا تعلق یہ ہے کہ وہاں منافقوں کے ذکر میں جو شرک کی طرف جا رہے تھے مومنوں کا ذکر کر کے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور اس کی مخلوق سے احسان یہی دو ستون مذہب کے ہیں اس لیے اس رکوع میں پھر عورتوں کے حقوق کا ذکر کیا کہ ان سے احسان کرو۔

اس آیت کے شروع میں استفتاء اور افتاء کے الفاظ اختیار فرما کر اشارہ کیا ہے کہ لوگوں کو عورتوں کے مسئلہ میں ابھی کچھ مشکلات نظر آتی ہیں اور سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک تو یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فتویٰ دیتا ہے جو آگے آتا ہے اور دوسرے ما یتلی علیکم فی الکتاب کا حوالہ دیا ہے یعنی جو اس سورت میں پہلے پڑھا جاتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت بعد میں نازل ہوئی۔ اور جو پہلے پڑھا جاتا ہے اس کے متعلق فرمایا کہ وہ یتامی النساء کے بارہ میں ہے بخاری میں حضرت عائشہؓ سے ہے کہ اس سے مراد یتیم لڑکی ہے جس کا ولی اس کے مال کو اپنے ساتھ شریک کر لیتا ہے اور نہ خود اس سے نکاح کرنا چاہتا ہے نہ دوسرے سے نکاح کرنا پسند کرتا ہے اس خوف سے کہ اس طرح وہ مال اس کے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اور ابن عباسؓ سے ایک روایت میں ہے کہ یہ آیت اُم کحت کے بارہ میں نازل ہوئی جس کے یتیم بچّے تھے۔ حق یہ ہے کہ قرآن کریم عورتوں اور یتیم بچوں کے معاملہ میں زیادہ تاکید اور تصریح فرماتا ہے اور سورت کے اصل مضمون کو یاد دلاتا ہے۔ عورتوں اور یتامی سے اس قدر بدسلوکی ہوتی تھی کہ پھر اس حکم کے نزول کی ضرورت پیش آئی۔ اور مطلب یہ ہے

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ
اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا
بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ
الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ
اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾

اور اگر ایک عورت کو اپنے خاوند کی زیادتی یا بے رغبتی کا ڈر ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں صلح کرلیں اور صلح اچھی چیز ہے اور طبیعتوں میں بخل ہوتا ہی ہے اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ کرو تو اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے ۶۴۲

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ
وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ
فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾

اور تم طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کرسکو، خواہ کتنا ہی چاہو۔ پس بالکل بھی نہ جھک جاؤ یہاں تک کہ اُسے اُدھر میں لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دو اور اگر تم اصلاح کرلو اور تقویٰ کرو تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۶۴۳

کہ وہ حکم جو پہلے دیا جا چکا ہے کہ تم دو دو تین تین چار چار عورتوں سے نکاح کرلو۔ وہ یتامی النساء کے بارہ میں ہے یعنی ایسی عورتوں کے بارہ میں جو بلا خاوند رہ گئی ہیں۔ جیسا کہ جنگوں میں بہت سی عورتیں بیوہ ہوگئیں اور یا اگر یتامی النساء کے دوسرے معنی لیے جائیں یعنی عورتوں کے یتیم بچے تو آیت ۳ کے معنی یوں ہونگے کہ عورتوں کے یتیم بچوں کے بارہ میں انصاف نہ کرسکو تو ان عورتوں سے نکاح کرلو جو اُن کی مائیں ہیں جس سے تعدد ازدواج کے مسئلہ کی صراحت ہوتی ہے کہ یہ مشکلات پیش آمدہ کے حل کرنے کے تھا۔ جب بہت عورتیں بلا خاوند رہ گئیں یا یتیم بچّوں والی عورتیں رہ گئیں جن یتیموں کا کوئی خبرگیر نہ ہوتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایسی عورتوں سے دو دو تین تین چار چار تک نکاح کرلو اور یہ امر کہ یہاں اسی مسئلہ تعدد ازدواج کی طرف اشارہ ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس کے بعد عدل کا ذکر صفائی سے کیا ہے اور یہ جو فرمایا کہ انکو تم ان کا مقرر حصہ نہیں دیتے نہ چھوٹے بچوں کو تو اس میں عرب کے اس پرانے دستور کی طرف اشارہ ہے، کہ وہ عورتوں اور بچّوں کو محروم الارث کرتے تھے اور ترغبون ان تنکحوھن سے معلوم ہوتا ہے کہ بوجہ ان کی اولاد کی پرورش کی ذمہ داری کے وہ ان سے نکاح بھی نہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اسلام نے دونوں حکم دیئے کہ عورتوں اور کمزور بچوں کو حق ورثہ بھی دیں اور ایسی عورتوں سے جن کے یتیم بچے رہ گئے ہیں نکاح بھی کرلیں اور اس کے لیے تعدد ازدواج کی بھی اجازت دی کیونکہ اس صورت میں تعدد ازدواج کی اجازت نہ دی جاتی تو قوم تباہ ہوجاتی۔ اس کے ساتھ ہی آخر پر یہ کہہ کر کہ یتیموں کے معاملہ میں انصاف پر قائم رہو۔ اسی کی تاکید کی ہے۔ بیوہ عورتوں کی خبرگیری اور یتیم بچّوں کی پرورش دونوں کا تقاضا تھا کہ یہ صورت اختیار کی جاتی۔

۶۴۲ شُحّ اس بخل کو کہتے ہیں جس کے ساتھ حرص جمع ہو ومن یوق شح نفسه (الحشر ۵۹-۹) اشحة علی الخیر (الاحزاب ۳۳-۱۹) (رغ)

خاوند کا نشوز عورت پر: یہاں اس صورت کا ذکر کیا جب عورت کو خاوند کی طرف سے زیادتی یا بے رغبتی کا خوف ہو۔ جب بیوی کی طرف سے نشوز ہو، یا شقاق بینھما کی صورت ہو یعنی میاں بیوی میں جھگڑا ہو۔ تو ان دونوں صورتوں کا حکم پہلے گزر چکا ہے۔ اس خاص صورت کا ذکر کہ عورت کو خاوند کی طرف سے خوف ہو تعدد ازدواج کے جھگڑے سے ہی وابستہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اسی لیے ان دونوں حکموں سے الگ کرکے اس کو یہاں بیان کیا اور اگلی آیت میں تو واضح طور پر بیویوں میں عدل کا ذکر کرکے اس مضمون کو کھول دیا۔ فرمایا کہ جب خاوند کی دوسری شادی کرنے سے عورت کو یہ خوف ہو کہ وہ اس کی طرف سے بالکل بے رغبت ہوجائے گا یا اس پر زیادتی کریگا تو وہ دونوں کوئی صورت صلح کی اختیار کریں۔ اور وہ صورت یوں بھی ہوسکتی ہے کہ خاوند ہی ازدواج ثانی کے ارادہ کو ترک کردے یا یہ کہ عورت کو اطمینان کردے کہ اس کو نقصان نہیں پہنچے گا اور یہ بھی فرمایا کہ صلح بہتر چیز ہے لیکن صلح کے ہونے میں شُحّ مانع ہوجاتا ہے یعنی بخل وحرص۔ بخل تو یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی حق کو چھوڑنا نہیں چاہتا اور حرص یہ کہ کسی دوسرے کا حق چھیننا چاہتا ہے۔ اگر یہ بخل وحرص نہ ہوں اور انسان کچھ اپنے حقوق کو چھوڑ دے اور کچھ دوسرے کے حقوق پر دست درازی کو چھوڑ دے تو صلح آسانی سے ہوسکتی ہے۔ اسی لیے اس کے ساتھ احسان وتقویٰ کی ہدایت فرمائی۔ یعنی دوسروں کے ساتھ نیکی کرو اور ان کے حقوق لینے سے بچو اور یہاں بالخصوص مراد عورتوں کے ساتھ معاشرت میں احسان کرنا اور ان کی حق تلفی سے یا ان پر نشوز کرنے یا ان سے اعراض کرنے سے بچنا ہے۔

۶۴۳ تمیلوا۔ مَیل وسط سے ایک جانب جھک جانے کا نام ہے اور اس کا استعمال ظلم میں ہوتا ہے اور ملت علیه کے معنی ہیں اس پر حملہ کیا۔ یمیلون علیکم میلة واحدة (۱۰۲) اور مال کو مال اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ دوسری طرف جھکتا یعنی دوسرے ہاتھوں میں جاتا رہتا ہے آج ایک کے پاس ہے تو کل دوسرے کے (رغ)

وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾

اور اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی کشایش سے غنی کر دیگا اور اللہ وسعت والا حکمت والا ہے ۶۴۴؎

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾

اور اللہ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور ہم نے اُن کو جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تم کو بھی یہی حکم دیا کہ اللہ کا تقویٰ کرو اور اگر تم انکار کرو، تو جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ کا ہی ہے اور اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾

اور اللہ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کارساز بس ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾

اے لوگو! اگر وہ چاہے تو تم کو لے جائے اور اوروں کو لے آئے اور اللہ اس پر قادر ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ ع ۱۹ ۸ ۱۲

جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو اللہ کے ہاں دنیا اور آخرت (دونوں) کا ثواب ہے اور اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے ۶۴۵؎

مُعلّقة - عَلَق کسی چیز کے ساتھ لٹک جانا یا اس میں پھنس جانا ہے (غ) اسی سے علقة ہے جس سے بچّہ بنتا ہے اور معلّقۃ کے معنی ہیں التی فُقِد زوجہا (ل) یعنی جس کا خاوند گم ہو گیا ہو لا ایّم ولا ذات بعل - نہ وہ بلا خاوند ہوا اور نہ خاوند والی (ل)

مرد کا عورتوں میں عدل کرنا دو طرح پر ہو سکتا ہے - ایک ظاہر حالات میں یعنی خرچ دینے میں باری میں - دوسرا محبّت میں سورت کے شروع میں فرمایا تھا کہ اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ضرورت کی حالت میں بھی ایک سے زیادہ بیویاں نہ کرو - بلکہ ایک پر ہی اکتفا کرو - وہ عدل حالات ظاہر میں ہے یہاں خاوند اور بی بی میں رغبت اور محبت کا ذکر ہے - اس لیے ولن تستطیعوا ان تعدلوا میں جس عدل کی عدم استطاعت کا ذکر ہے وہ عدل تعلقاتِ محبّت میں ہے اور بتایا ہے کہ یہ انسان کی طاقت میں ہی نہیں کہ اگر دو بیبیاں اس کے گھر میں ہیں تو دونوں سے یکساں محبّت کر سکے - عدل ظاہری کی نفی یہاں نہیں ہے - کیونکہ وہ تو انسان کر سکتا ہے - یہ خیال کہ تعدد ازدواج کی اجازت دیکر پھر اسے ایک محال شرط سے وابستہ کر دیا ہے اور خود ہی اس شرط کو محال قرار دیدیا ہے صحیح نہیں اس لیے کہ تعدد ازدواج کی اجازت تو ایک خاص مشکل کو حل کرنے کے لیے دی تھی جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے اور خدا کے کلام کو یہ شایاں نہیں کہ خود ایک ضرورت کو بیان کرے پھر خود ہی اس کے پورا کرنے کو ایک محال شرط سے وابستہ کر دے - اگر ضرورت تعدد ازدواج کی ہے تو پھر اس کا انکار اس بنا پر نہیں ہو سکتا کہ تم عدل نہیں کر سکتے کیا یہ خود خدا تعالیٰ پر اعتراض نہیں کہ ایک طرف تعدّد ازدواج کی ضرورت کو بیان کرتا ہے اور دوسری طرف تعدد ازدواج کو ایک شرط محال سے وابستہ کرتا ہے - اس آیت کے معنی صاف ہیں - کہ عدل ظاہری کا حکم تو ہم دے چکے ہیں - محبّت میں مساوات کے لیے ہم تم کو مجبور نہیں کرتے - ہاں ایک عورت کی طرف اس قدر بے رغبتی کرنا کہ وہ نہ خاوند والیوں میں داخل ہو نہ بغیر خاوند والیوں میں - اُدھر میں لٹکی ہوئی ہو - اس سے منع فرمایا -

۶۴۴؎ اگر بے رغبتی اس حد تک بڑھ جائے یا میل موافقت نہ ہو سکے تو دونوں کا جدا ہو جانا ہی بہتر ہے - ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ دونوں کو پہلے سے بہتر حالت میں کر سکتا ہے -

۶۴۵؎ - خاتمہ کی چار آیات میں تقویٰ کی تاکید فرمائی اور اللہ تعالیٰ کی جبروت و قدرت کی طرف توجہ دلائی ہے - کیونکہ یہی چیز انسان کو تقویٰ پر قائم رکھ سکتی ہے دوسروں کے حقوق کی صحیح رعایت انسان تب ہی کر سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی قدرت و جبروت پر ایمان ہو ورنہ نیکی بھی خود غرضی کا رنگ رکھتی ہے -

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ
شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ
وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا
فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ
تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ
كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ
الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ
بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، انصاف پر قائم ہونیوالے اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو، گو (معاملہ) تمھاری اپنی ذات یا ماں باپ اور قریبیوں کے خلاف ہو اگر کوئی امیر ہو یا غریب تو اللہ دونوں کا (تمھاری نسبت) زیادہ خیر خواہ ہے سو تم خواہش کی پیروی نہ کرو تاکہ عدل کر سکو اور اگر تم پیچ دار بات کرو یا (حق سے) اعراض کرو تو یقیناً جو تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے ۴۷۶
اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور پچھلے دن کا انکار کرتا ہے وہ گمراہی میں دور نکل گیا ۴۷۷
بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کافر ہوئے، پھر ایمان

ع ۴۷۶ قوّامین - قیام کا استعمال دو طرح پر ہے کسی چیز کی مراعاۃ یا نگہداشت اور اس کی حفاظت اور دوسرا کسی چیز کا عزم اور یہاں مراد مراعاۃ ہے (غ) اور قوام چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے اس لیے مراد ہے مراعاۃ انصاف کو کمال تک پہنچانے والا۔ اور چونکہ قسط انصاف کا حصّہ ہے اس لیے مراد ہر قسم کے حقوق کی ادائگی میں پوری مراعاۃ ہے۔

شھداء للّٰہِ - اللہ کے لیے گواہی دینے والے یعنی گواہی میں ایسی حق بات کہنے والے کہ سوائے اللہ کی رضا کے اور کچھ مدّنظر نہ ہو۔

اولٰی بھما - اَولٰی بمعنی احری ہے - بڑھ کر اہل یا حقدار - اور مطلب یہ ہے کہ غنی کی رضا حاصل کرنا یا فقیر پر رحم کرنا حق سے تمہیں نہ پھیر دے کیونکہ غنی کے معاملہ میں اللہ کی رضا اور فقیر کے معاملہ میں اللہ کا رحم اس سے بڑھ کر ہے۔

تلوٗا - لَوی کے معنی جھوٹ بولنا بھی ہیں اور مائل ہونا بھی - چونکہ دو حکم اکٹھے ہیں یعنی انصاف کرنا اور سچی شہادت دینا - اس لیے ایسا لفظ اختیار کیا ہے جس سے دونوں مطلب نکلتے ہیں یعنی شہادت کے معاملہ میں جھوٹ بولو یا عدل سے ایک طرف مائل ہو جاؤ۔

عدل وانصاف پر قیام کی نصیحت: اصل ذکر تو منافقوں کا تھا اور اسی میں مشرک اور موحد کا مقابلہ کرتے ہوئے عورتوں کے معاملہ میں عدل وانصاف کی طرف توجہ دلائی تھی اس آیت میں اسی کو عام کیا ہے اور دوسری طرف چونکہ ذکر منافقوں کا تھا۔ اسی لیے فرمایا کہ ایمان والوں کو چاہیئے کہ انصاف کے قوام بنیں یعنی اس کو ہمیشہ مضبوطی سے قائم رکھنے والے اور ہر ایک قسم کے حقوق پورے انصاف سے ادا کرنے والے فیصلہ کرنا صرف ایک موقعہ پر ہے جو بعض انسانوں کو پیش آتا ہے - قرآن کریم کے الفاظ تمام قسموں کے حقوق کی ادائگی پر حاوی ہیں گو اس میں شک نہیں کہ فیصلہ کا وقت سب سے زیادہ انسان کے لیے آزمائش کا وقت ہے - دوسری جگہ یوں فرمایا کہ لا یجرمنّکم شنان قوم علےٰ الا تعدلوا (المائدۃ ۵ - ۸) کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے بھی عدل کے مقام سے نہ ہٹو - یہ مشکل سے مشکل مقام عدل کا ہے - انسان کی اپنی ذات یا اقربا کا معاملہ ہو یا کسی قوم سے عداوت ہو تو وہاں عدل قائم رکھنا مشکل ہے ایسا ہی شہادت حقہ کا ادا کرنا ایک مشکل بات ہے - بالخصوص جہاں اپنی ذات پر اس کا اثر پڑتا ہو یا ماں باپ یا قریبیوں پر - پھر بعض وقت انسان ایک امیر آدمی کے لحاظ سے انصاف اور شہادت حقہ کو چھوڑ دیتا ہے تاکہ اسے خوش کرے اور بعض وقت ایک غریب پر رحم کر کے - فرمایا تم دونوں باتوں کی پروا نہ کرو - اللہ کا حق ان پر تمہاری نسبت زیادہ ہے - اور اللہ کا حق یہی ہے کہ حق ظاہر ہو - اور کسی کی رعایت نہ ہو۔

عدل کی صفت سے انسان تب ہی متصف ہوتا ہے جب خواہشات کی پیروی ترک کر دے اس لیے بتایا کہ اس مقام پر پہنچنے کا طریق یہی ہے کہ تم خواہشات کی پیروی چھوڑ دو۔

ع ۴۷۷ پہلے ایمان سے مراد ایمان ظاہر یا اقرار باللسان ہے اور دوسرے ایمان سے مراد تکمیل ایمانی ہے جس میں تصدیق بالقلب اور اس کے مطابق عمل بھی شامل ہیں - دیکھو ع ۱۱ - چونکہ اصل ذکر منافقین کا تھا اس لیے فرمایا کہ صرف منہ کا ایمان فائدہ نہیں دیتا جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔

كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ
لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾

لائے پھر کافر ہوئے، پھر کفر میں بڑھ گئے، تو اللہ یہ نہیں کہ ان کی مغفرت کرے اور نہ یہ کہ ان کو راہ پر سیدھا چلائے ع۴۷۸

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۨ ﴿۱۳۸﴾

منافقوں کو خبر دیدے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ
دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ
فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ ﴿۱۳۹﴾

جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کے ہاں عزت چاہتے ہیں تو عزت سب اللہ کے لیے ہی ہے۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا
سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ
بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ
حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ
جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۨ ﴿۱۴۰﴾

اور وہ تم پر کتاب میں (یہ حکم) نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جاتا ہے اور ان پر ہنسی کی جاتی ہے تو ان کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی دوسری بات میں لگ جائیں ضرور تم بھی اس وقت انہی کی طرح ہو، اللہ منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں اکٹھا کرنے والا ہے ع۴۷۹

الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ
فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ
وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ
نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ

وہ جو تمہارے متعلق انتظار میں ہیں، پس اگر تم کو اللہ کی طرف سے فتح ملے تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم کو چڑھا نہیں لائے اور مومنوں سے تمہاری حفاظت نہیں کی۔ سو اللہ

ع۴۷۸ اس سے مراد منافق ہی ہیں۔ چنانچہ اگلی آیت میں تصریح موجود ہے۔ ایمان لانے پھر کافر ہونے پھر ایمان لانے پھر کافر ہونے سے مراد دو دفعہ کی گنتی ہی نہیں، بلکہ ان کے تردد کا ظاہر کرنا مقصود ہے اور یہ تردد بعض منافقوں کی صورت میں ظاہر بھی واقع ہوتا تھا اور بعض کی صورت میں صرف باطن میں تھا ثم ازدادوا کفرا سے مراد یہ ہے کہ آخری حالت ان کی یہ ہے کہ کفر میں ترقی کرتے چلے گئے۔ ایسوں کی حفاظت اور ہدایت اللہ تعالیٰ نہیں کرتا اس لیے کہ جب ایک شخص غلط راہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اسے مجبور کر کے نیک کام کی طرف نہیں لاتا جیسے نیک کو مجبور کر کے بدی کی طرف نہیں لے جاتا۔

ع۴۷۹ یخوضوا۔ خوض کے معنی پانی میں رستہ بنانا اور اس میں گزرنا ہیں۔ اور معاملات یا باتوں میں داخل ہونے پر استعارۃً بولا جاتا ہے اور اکثر استعمال اس کا ذم کے مقام میں ہے کنا نخوض ونلعب (التوبۃ ۹-۶۵) وخضتم کالذی خاضوا (التوبۃ ۹-۶۹) (غ) یعنی بیہودہ یا جھوٹی باتوں میں پڑنا۔ اور خوض کلام میں وہ ہے جس میں کذب اور باطل ہو (ل)

یہ حکم پہلے سورۃ الانعام میں نازل ہو چکا ہے۔ واذا رایت الذین یخوضون فی ایاتنا فاعرض عنھم حتیٰ یخوضوا فی حدیث غیرہ (الانعام ۶-۶۸) مکہ میں مشرکین عرب اپنی مجالس میں قرآن کریم پر ہنسی ٹھٹھا کرتے تھے۔ مدینہ میں یہودی اور منافق۔ روکنے کی وجہ یہاں بتا دی ہے کہ اس صورت میں تم بھی ان جیسے ہو گے۔ جب انسان ایک چیز کے متعلق استہزا کا طریق اختیار کرتا ہے تو جو شخص اس استہزا کو خوش ہو کر سنتا ہے اس کا قلب بھی اسی رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے یوں کفار کے ساتھ بیٹھنے سے بات چیت کرنے سے منع نہیں کیا۔ مگر اصول دین اور ائمہ دین کی تحقیر اور ان پر استہزا سننے سے روکا بالمقابل مسلمانوں کو یہ بھی تعلیم دی کہ تم ان کے معبودوں کی تحقیر و تذلیل نہ کرو ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ (الانعام ۶-۱۰۹) اصل میں منافقین کفار کے ساتھ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کی ہنسی اڑایا کرتے تھے مسلمانوں کو روکا کہ ان کے دام میں نہ آ جائیں۔

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَلَنْ
ع ۱۷ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾
اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ
وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ
يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾

تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اور اللہ ہرگز
کافروں کو مومنوں پر (غلبہ کی) راہ نہیں دے گا ع۷۵۰
منافق اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور وہ ان کو دھوکا بازی کی
سزا دیگا ع۷۵۱ اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں کاہلی سے کھڑے ہوتے
ہیں لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت کم ع۷۵۲

ع۷۵۰ یتربصون - ربص مادہ ہے اور تربُّص کسی شے کے انتظار کو کہتے ہیں - سامانِ تجارت ہو تو اس کے مہنگا ہونے یا ارزاں ہونے کا انتظار یا کسی معاملہ میں اس کے حصول یا زوال کا انتظار والمطلقات یتربصن (البقرۃ ۲ - ۲۲۸) تربّصوا فانّی معکم من المتربصین (الطور ۵۲ - ۳۱)

نستحوذ - حَوْذ کے معنی ہیں اونٹ کا چلانے والا اس کے چوتڑوں پر مار مار کر اس کو چلائے اور حاذ الابل کے معنی ہیں اونٹوں کو سختی سے چلایا اسی سے استحوذ ہے - استحوذ علیھم الشیطان (المجادلۃ ۵۸ - ۱۹) کے معنی ہیں شیطان نے ان پر غالب آ کر ان کو چلایا - یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ ہم تم کو بڑی ترغیب دیکر اور بڑا زور دیکر مسلمانوں پر چڑھا کر لائے -

نَمْنَعُ - مَنْع اصل میں عطاء یعنی دینے کی ضد ہے جیسے مَنّاع للخیر (ق ۵۰ - ۲۵) یمنعون الماعون (الماعون ۱۰۷ - ۷) اور حمایۃ یا حفاظت کے معنی میں بھی آتا ہے - یہی معنی یہاں ہیں (غ)

یہاں منافقوں کی دورخی چال کا ذکر کیا ہے - ایک طرف مومنوں کے ساتھ ملے رہتے ہیں انہیں غلبہ ہوتا ہے تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ تھے دوسری طرف کافروں کے ساتھ - جب کسی جنگ میں کچھ فائدہ کافروں کو ہو جاتا ہے تو ان کو جتاتے ہیں کہ ہم ہی تمہارے اس فائدہ کا اصل موجب ہیں کیونکہ ہم ہی تم کو چڑھا کر لائے اور ہم نے پھر مومنوں کا ساتھ چھوڑ کر تمہارا ان سے بچاؤ کر دیا یعنی وہ اس قابل نہ رہے کہ تم پر حملہ کر سکتے اور یوں تمہارا بچاؤ ہو گیا - پس جو کچھ تم کو حاصل ہوا صرف ہماری وجہ سے ہی حاصل ہوا ہے - یہ ان کی شرارتیں ہیں - جن کی وجہ سے ان کو اگلے رکوع میں انجام بد سے ڈرایا گیا ہے -

ایک نکتہ اور بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لڑائی کے اتار چڑھاؤ میں جو مسلمانوں اور کفار کے درمیان ہو رہی تھی - اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی کامیابی کے لیے لفظ فتح اختیار فرمایا ہے اور کفار کے لیے لفظ نصیب یعنی کچھ تھوڑا سا حِصّہ جس سے معلوم ہوا کہ کفار کو مسلمانوں کے مقابل پر فتح کبھی حاصل نہیں ہوئی - ہاں کچھ تھوڑی تکلیف مسلمانوں کو پہنچ گئی -

ع۷۵۱ یخادعون - خادع - یخادعون یا مخادعۃ سے مراد ہے دھوکا دینا چاہتے ہیں دیکھو ع۲۱ اور خادع اسم فاعل ثلاثی سے ہے یعنی خَدَع سے جس کے معنی ہیں خَتَلہ وارادبہ المکروہ من حیث لایعلم (ت) یعنی اسے چھپکر آ لیا اور اس سے ایسے معاملہ کا ارادہ کیا جسے وہ ناپسند کرتا ہے ایسے طریق سے جسے وہ نہیں جانتا - گویا اس کے اصل معنی ہیں چھپ کر امر مکروہ کا وار کرنا -

خدع کی نسبت اللہ کی طرف: پس اس تشریح کو مدِّنظر رکھتے ہوئے جو ع۲۷ میں کی گئی ہے کہ جب ایک فعل اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو اس میں صرف اس فعل کا نتیجہ باقی رہ جاتا ہے اور ذریعہ جس سے وہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے مفقود ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف فعل خدع منسوب کرنے کا منشاء صرف اس قدر ہوا کہ وہ ان پر ایسا امر وارد کرے گا جسے وہ ناپسند کرتے ہیں اور یا برطبق جزاء سیّئۃ سیّئۃ مثلھا معنی یہ ہیں کہ وہ ان کو ان کے خداع کی سزا دیگا (ل) اور مخادعۃ کے مقابل پر جب خَدَعَنْہ کہیں تو مراد ہوتی ہے ظفرت بہ (ل) یعنی میں اس پر غالب آیا اور ان تینوں میں سے کوئی سے معنی لیے جائیں مطلب وہی ہے اور خدع کا استعمال لغت میں وسیع ہے - خدعت الضب کے معنی ہیں گوہ چھپ گئی - اور خدع الریقُ فی الفم کے معنی ہیں تھوک خشک ہو گئی اور کان فلان الکریم ثم خدع میں خدع کے معنی اَمْسَكَ یعنی رُک گیا - خدع المطر کے معنی ہیں بارش تھوڑی ہوئی اور السنون الخوادع کے معنی ہیں قحط کے سال جن کی خیر کم ہے کیونکہ بارش نہیں ہوتی اور حدیث میں جو آتا ہے الحرب خَدْعۃ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو جنگ میں دھوکہ کھا گیا تو اس کا قدم پھسل جاتا ہے - یعنی دشمن کے مخفی وار سے اپنا بچاؤ کرنا چاہیئے اور یا یہ لفظ خُدَعۃ ہے اور مراد ہے کہ وہ اپنے اہل کو دھوکہ دینے والی چیز ہے (ن)

پچھلے رکوع کے آخر پر منافقوں کی دھوکہ بازی کا ذکر کیا تھا کہ کس طرح مسلمانوں کے دشمنوں کو ان پر چڑھا کر لاتے اور پھر کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں تو فرمایا کہ یہ مومنوں کو اس طرح دھوکہ دیکر گویا خدا کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں مگر وہ دھوکہ دے نہیں سکتے بلکہ آخر کار مغلوب ہو کر خود نقصان اٹھائیں گے - سورۃ البقرہ کے شروع میں منافقوں کے ذکر میں فرمایا تھا یخٰدعون اللہ والذین اٰمنوا اور یہاں صرف یخٰدعون اللہ ہے مگر مطلب ایک ہے وہاں اس کی سزا بیان فرمائی تھی وما یخدعون الا انفسھم خدا کو کیا دھوکہ دینا ہے بلکہ اپنے آپ کو ہی دھوکہ دے رہے ہیں - یہاں بجائے ان الفاظ کے فرمایا ھو خادعھم مطلب وہی ہے کہ آخر اس دھوکہ بازی کا بُرا نتیجہ پا کر رہیں گے -

ع۷۵۲ کسالیٰ - کسلان کی جمع ہے اور کَسَل کے معنی ہیں کاہلی یا بوجھل ہونا ایسے معاملہ میں جس میں سستی مناسب نہیں (غ)

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿١٤٣﴾

درمیان میں پریشان ہیں - نہ اِدھر کے، نہ اُدھر کے اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں چھوڑ دے، تو تُو اس کے لیے ہرگز راہ نہ پائے گا ۷۵۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿١٤٤﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ (کی سزا) کے لیے اپنے خلاف کھلی دلیل بناؤ ۷۵۴

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿١٤٥﴾

منافق آگ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہیں، اور تو ان کے لیے کوئی مددگار نہیں پائے گا ۷۵۵

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١٤٦﴾

مگر وہ جو توبہ کریں اور اصلاح کریں اور اللہ (کے احکام) کو مضبوط پکڑیں اور اپنی فرماں برداری کو اللہ کے لیے خالص کریں، تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں - اور عنقریب اللہ تعالیٰ مومنوں کو بڑا اجر دے گا۔

یراؤن - رای کے معنی دیکھا اور مُراأۃ یا رئاء دوسروں کو دکھانا اور شائع کرنا (غ) یعنی ایک کام کا کرنا اس غرض کے لیے کہ دوسرے لوگ دیکھ لیں۔

نماز میں کسل اور راحت: جب منافقوں کی مسلمانوں کے ساتھ دھوکہ بازی کا ذکر کیا تو ساتھ ہی بتایا کہ وہ نماز میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف آتے ہیں تو اس کی غرض بھی صرف دھوکہ بازی ہے یعنی لوگ یہ خیال کریں کہ یہ مسلمان ہیں۔ اس لیے نماز میں خوش دلی یا شرح صدر کس طرح پیدا ہو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب تک نماز میں انشراح اور خوشی کی کیفیت پیدا نہ ہو وہ نماز صرف دکھاوے کی ہے۔ نماز جو خدا کے حضور حاضر ہونے کا نام اور اس کے سامنے عاجزی کا اظہار ہے اگر اس میں ایسی کشش اور جذب پیدا نہ ہو کہ اس کی طرف انسان کھچا ہوا چلا جائے تو اس کا اصل مقصد پورا نہیں ہوتا اور بوجھ کے طور پر چند رکعت کا ادا کر لینا منافقوں سے مماثلت ہے۔ صحیح ایمان کا نشان یہ ہے کہ نماز میں راحت محسوس ہو اور وہ کیفیت پیدا ہو جس کا ذکر قرۃ عینی فی الصلوٰۃ میں ہے۔

۷۵۳ مذبذب - ذَبّ کے معنی دفع کرنا یا روکنا بھی ہیں اور طَرد یا دور کرنا بھی (ل) پس مُذَبْذَب وہ ہے جو دونوں طرف سے مطرود ہو (ل) مگر امام راغب کہتے ہیں کہ مذبذب سے مراد مضطرب ہے کیونکہ ذَبْذَبَۃ جو اصل میں ہوا میں لٹکی ہوئی چیز کی آواز پر بولا جاتا ہے۔ ہر ایک اضطراب اور حرکت پر استعارۃً استعمال ہوتا ہے (غ) اور ذُباب (واحد ذبابۃ) اسی مادہ سے ہے اور مکھی کو کہتے ہیں۔

یہاں بتایا کہ منافق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا ایک طرف چلا جاتا ہے کبھی دوسری طرف، ایمان کو اللہ تعالیٰ نے ثبات سے مثال دی ہے اور اس سے اطمینان قلب پیدا ہوتا ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد [13] - ۲۸) اور کلمۂ طیبہ کو اس درخت سے مثال دی ہے جس کی جڑ مضبوط ہے اصلھا ثابت (ابراھیم [14] - ۲۴) اور کلمہ خبیثہ کو اس سے جس کو قرار نہیں مالھا من قرار (ابراھیم [14] - ۲۶) پس یہی معیار ایمان کا ہے۔

۷۵۴ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو ولی بنانے پر دیکھو ۳۹۹ منافقوں کے ذکر میں اس آیت کا لانا بتاتا ہے کہ یہ بھی ایک نفاق کی علامت ہے اور منافقوں کے ذکر میں پیچھے آ چکا ہے کہ وہ کفار سے تعلقات پیدا کر کے عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں اسلام کے دشمنوں سے عزت کا خواہاں ہونا یہ بھی ان کی ولایت ہے۔

۷۵۵ دَرْك اور دَرَج ایک ہی خیال کو ظاہر کرتے ہیں یعنی اس سے بھی مراد درجہ ہی ہے۔ مگر استعمال میں یہ فرق ہے کہ اوپر کی طرف جانے کے لحاظ سے دَرَج بولا جاتا ہے اور پستی کی طرف جانے کے لحاظ سے دَرْك اس لیے جنت کے درجات ہیں اور دوزخ کے دَرْك اور دَرْك سمندر کی غائت درجہ کی گہرائی کو بھی کہتے ہیں (غ) اسی مادہ سے ادراك وغیرہ الفاظ ہیں۔

منافق ارتکاب کفر بھی کرتا ہے اور چھپ کر اسلام کے ساتھ دشمنی بھی۔ پھر وہ اسلام کی صداقت کے نشان بھی دیکھتا ہے اس لیے سب سے نچلے طبقہ میں ہے، ذلیل ترین لوگ دنیا میں بھی وہی ہیں جو منہ سے کچھ کہتے ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ آج مسلمانوں کے اسلام میں کس قدر اخلاص ہے؟ اگلی آیت میں لفظ اخلاص لا کر صاف اس طرف اشارہ کیا ہے۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

اللہ تمھیں عذاب دے کر کیا کرے گا، اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ، اور اللہ قدر کرنے والا جاننے والا ہے ۷۵۶

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾

اللہ بُری بات کے مشہور کرنے کو (کسی سے) پسند نہیں کرتا سوائے اس کے جس پر ظلم کیا گیا اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۷۵۷

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾

اگر تم بھلی بات کو ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ یا بدی سے درگزر کرو تو اللہ معاف کرنے والا قدرت والا ہے ۷۵۸

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾

وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان راہ نکالیں۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾

وہ سچ مچ کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ۷۵۹

---

۷۵۶ عذاب کی غرض اصلاح ہے: چونکہ منافقوں کا ذکر تھا اور ابھی ان کو یہ کہا گیا تھا کہ ان کے لیئے آگ کا سب سے نچلا طبقہ ہے اس لیے اب بتاتا ہے کہ اس قدر شدید وعید کے باوجود بھی اگر یہ لوگ شکر کریں اور ایمان لائیں تو پھر اللہ کو کوئی ضرورت نہیں کہ ان کو عذاب دے اس سے معلوم ہوا کہ عذاب کی اصل غرض انسان کی اصلاح ہے نہ کچھ اور۔ اگر انسان اپنے نفس کی اصلاح خود کرلے تو عذاب بھی ٹل جاتا ہے۔ دوزخ کا عذاب اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے ہے جو شکر اور ایمان کے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ شکر یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر کی جاتی اور ہر ایک طاقت سے اپنے محل اور موقعہ کے مطابق کام لیا جاتا دیکھو ۷۵ اور ایمان کا یہ تقاضا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت پر عمل کیا جاتا۔

۷۵۷ الجھر۔ جہر کسی چیز کے ظہور کو کہا جاتا ہے حاسۂ بینائی کی افراط سے ہو یا شنوائی کی۔ اوّل کی مثال ہے حتّٰی نری اللہ جھرۃ (البقرۃ ۲-۵۵) ارنا اللہ جھرۃ (النسآء ۴-۱۵۳) یہاں شنوائی کے لحاظ سے ہے ایسا ہی من اسرّ القول و من جھربہ (الرعد ۱۳-۱۰) یعلم الجھر من القول (الانبیاء ۲۱-۱۱۰) ولا تجھر بصلاتك ولا تخافت بھا (بنی اسرائیل ۱۷-۱۱۰) ولا تجھروا لہٗ بالقول کجھر بعضکم لبعض (الحجرات ۴۹-۲) اور جھیر الصوت بلند آواز والے کو کہتے ہیں (غ) مگر یہاں مراد صرف اعلان ہے خواہ آواز سے ہو یا تحریر سے۔ یہ آیت قانون ازالۂ حیثیت عرفی کی بنیاد ہے۔ یہاں بتایا ہے کہ کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے کی نسبت کسی بُری یعنی ہتک آمیز بات کو شہرت دے سوائے اس کے کہ ایک شخص مظلوم ہے۔ یعنی اس کو نقصان پہنچا ہے تو اس کو حق ہے کہ وہ ظالم کی نسبت ہتک آمیز بات کا اعلان کرے مگر اس سے مراد وہی ہتک آمیز باتیں ہیں جو سچ ہیں ورنہ جھوٹ بات کہنے کا کسی صورت میں بھی حق نہیں۔ منافقوں کے ذکر میں اس آیت کا کیا تعلق ہے؟ بات یہ ہے کہ کئی رکوعوں میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے حالات کو کھول کر بیان فرمایا اور جو کچھ ان کی چھپی ہوئی بدیاں تھیں ان کو ظاہر کیا اب ان کے ذکر کو ختم کرتے ہوئے یہ سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خفیہ بدیوں کا یوں اعلان نہ کرتا اگر یہ لوگ ظالم نہ ہوتے ان کی شرارتوں کا کھلا ذکر اس لیے کرنا پڑا کہ یہ مسلمانوں پر ظلم کر رہے تھے اور ان کو تباہ کرنا چاہتے تھے۔ آخر میں صفات سمیع علیم لانے سے مسلمانوں کی خوبیوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

۷۵۸ یہاں اپنے اسی قانون کو اور واضح کر کے بیان فرمایا ہے کہ کسی کے متعلق بھلی بات ہو تو اس کو بے شک ظاہر کرو یا چھپاؤ۔ اگر کسی نے بدی کی ہے تو اسے حتی الوسع معاف کرو۔ یہ وہ طریق ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ گویا بری بات کی تشہیر سے ہی نہیں روکا اسے معاف کرنے کی بھی ہدایت کی ہے ہاں اگر عفو سے اصلاح نہ ہوتی ہو اور ظلم انتہا کو پہنچ جائے تو پھر بیشک ظاہر کرے۔

۷۵۹ یہود و نصاریٰ اور منافقین کے باہم تعلقات تھے۔ اس لیے منافقوں کے ذکر کو ختم کر کے اب یہود و نصاریٰ کا ذکر اگلے رکوع میں شروع ہوتا ہے مگر ان آخری آیات میں ربط مضمون کو قائم کیا ہے۔ تعلقات کو چھوڑ کر حالت کے لحاظ سے منافقوں اور یہود وغیرہ میں یہ تعلق تھا کہ وہ دونوں ایمان اور کفر کے بین بین رستہ اختیار کر رہے تھے

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٥٢﴾ ع

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے یہی وہ ہیں جن کو اللہ ان کے اجر دے گا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَن تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَاءِ ۚ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرَ مِن ذَٰلِكَ فَقَالُوا أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ فَعَفَوْنَا عَن ذَٰلِكَ ۚ وَآتَيْنَا مُوسَىٰ سُلْطَانًا مُّبِينًا ﴿١٥٣﴾

اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو اُن پر آسمان سے ایک کتاب اتارے، سو موسیٰؑ سے انھوں نے اس سے بھی بڑھ کر سوال کیا اور کہا کہ اللہ کو ہمیں کھلا کھلا دکھا۔ سو اُن کے ظلم کی وجہ سے اُن کو عذاب نے آپکڑا، پھر انھوں نے بچھڑا بنا لیا، بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی دلیلیں آچکی تھیں، لیکن ہم نے یہ معاف کر دیا اور موسیٰؑ کو کھلا غلبہ دیا۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ بِمِيثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا ﴿١٥٤﴾

اور ہم نے ان کے اقرار کے وقت پہاڑ کو ان پر بلند کیا اور ہم نے ان کو کہا کہ فرمانبرداری کرتے ہوئے دروازے میں داخل ہو جاؤ اور ہم نے ان کو کہا کہ سبت کے بارے میں حد سے نہ گزر جائیو اور ہم نے اُن سے مضبوط وعدہ لیا۔

فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِم بِآيَاتِ اللَّهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٥٥﴾

سو اُن کے عہد کو توڑ دینے کی وجہ سے اور اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے اور ان کے نبیوں کو ناحق قتل کرنے اور ان کے یہ کہنے سے کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے اُن پر مہر لگا دی سو وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں ع[660]

وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا ﴿١٥٦﴾

اور ان کے کفر کے سبب سے اور ان کے مریم پر بڑا بہتان باندھنے کی وجہ سے۔[661]

جن کی طرف الفاظ یریدون ان یتخذوا بین ذٰلک سبیلا میں اشارہ کیا ہے۔ منافق تو یوں کہ کبھی ایمان لائے کبھی کافر ہو گئے یا ظاہر میں ایمان لائے اندر سے کافر رہے اور یہود و نصاریٰ یوں کہ بعض رسولوں پر ایمان لائے اور بعض کا کفر کیا۔ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق سے مراد صرف یہی نہیں کہ اللہ کو مان لیا اور رسولوں کا انکار کر دیا جیسے برہمو ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہ بعض رسولوں کو مان لیا اور بعض کا انکار کر دیا جیسے تمام اہل کتاب کی حالت ہے اور یہ اس لیے کہ اللہ کے کسی رسول کا انکار گویا اللہ کا ہی انکار ہے۔

ع۶۶۰ لکھی لکھائی کتاب کے اُتارنے کا سوال اور اس کا جواب: ان تمام امور کا ذکر سورۂ بقرہ میں ہو چکا ہے۔ یہاں چونکہ حضرت مسیحؑ کے متعلق ان کے جرم کا ذکر کرنا تھا، اس لیے خلاصتہً ان کے پہلے جرموں کو بھی دوہرایا ہے۔ اور کتاب آسمان سے اتارنے سے مراد یہ ہے کہ کاغذوں پر لکھی لکھائی کتاب آسمان سے اُترے جو گویا خدا نے اپنے ہاتھ سے لکھی ہو تو فرمایا کہ یہ ایسا ہی سوال ہے جیسا موسیٰؑ سے کیا تھا کہ خدا کو ان آنکھوں سے کھلا کھلا دیکھیں۔ جس طرح خدا تعالیٰ کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا، اسی طرح اس کا کلام بھی اس طرح پر لکھا ہُوا نازل نہیں ہوتا جس طرح انسانوں کی بنائی ہوئی کتابیں ہوتی ہیں۔ بلکہ وہ رسول کے قلب پر بتوسط جبرائیلؑ نازل کیا جاتا ہے چنانچہ یہ جواب صفائی سے اگلے رکوع کی پہلی آیت میں دیا ہے انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح ..... یعنی تمہاری طرف اسی طرح وحی ہوئی ہے جس طرح پہلے انبیاءؑ کی طرف ہوتی تھی۔

ع۶۶۱ ان کے کفر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت انکار ہے جیسا آگے ذکر آئیگا اور حضرت مریمؑ پر بہتان یہ تھا کہ ان کو نعوذ باللہ من ذٰلک زنا سے متہم کرتے تھے یہودیوں کی روایات سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے ان کو یوسف کے متعلق متہم کیا ہو۔ یعنی شادی سے پہلے یوسف کے ساتھ کسی ناجائز تعلق ہونے پر الزام لگایا ہو۔ بلکہ مسیحؑ کی ایک سوانحعمری یہودی نقطۂ خیال سے لکھی ہوئی کچھ عرصہ ہوا طبع ہوئی تھی۔ اس میں ایک یہودی پینتھر نام کے ساتھ ناجائز تعلق ہونے کا اتہام حضرت مریم صدیقہ پر لگایا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کو بہتان عظیم قرار دیکر حضرت مریم کا دامن پاک کیا ہے اور یہ حضرت محمد مصطفٰے صلعم کا احسان عیسائیوں پر تھا جس کا معاوضہ

وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ

اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کے رسول کو قتل کر دیا اور انھوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ اسے صلیب پر مارا مگر وہ ان کے لیے اس جیسا بنا دیا گیا^۶۶۲ اور بیشک وہ لوگ

اس ناشکر گزار قوم نے یہ دیا ہے کہ اس پاکوں کے سردار محمد صلعم پر طرح طرح کے ناپاک اتہام لگائے۔ مگر سچ ہے پاکوں کے منہ سے پاک باتیں ہی نکلتی ہیں اور ناپاکوں کے منہ سے ناپاک۔

۶۶۲ء قتلوہ۔ قتل کے معنی ہیں کسی شخص پر موت وارد کرنا ضرب سے یا پتھر سے یا زہر سے یا کسی وجہ سے (ل۔ت) یا جسم سے روح کو الگ کرنا (غ)

صلبوہ۔ صَلَب کے معنی ہیں الصدید الذی یسیل من المیت یعنی مخ یا پیپ جو مردہ جسم سے بہ نکلتی ہے والصَّلب ھٰذہ القتلۃ المعروفۃ مشتق من ذٰلک لانّ وَدَکہ وصدیدہ یسیل (ل) یعنی صَلْب قتل کرنے کا یہ مشہور طریق ہے (جس کی تشریح کی حاجت نہیں) جو اسی سے مشتق ہے کیونکہ اس کی مخ اور پیپ بہ نکلتی ہے اور یہی تاج العروس میں ہے۔ پس صَلْب لکڑی پر لٹکانے کا نام نہیں بلکہ قتل کرنے یعنی مارنے یا روح کو جسم سے الگ کرنے کا ایک خاص طریق ہے۔ پس جس طرح کسی شخص کے قتل کی نفی سے مراد یہ ہے کہ اس پر موت بذریعہ قتل وارد نہیں ہوئی نہ یہ کہ اسے کسی نے تلوار بھی نہیں ماری اسی طرح ما صلبوہ میں نفی صرف اس بات کی ہے کہ اس پر موت بذریعہ صلیب وارد ہوئی نہ اس بات کی کہ وہ لکڑی پر لٹکا یا گیا ہو اور یہودیوں میں صلیب کی یہ طرز تھی کہ ایک ٹی کی شکل کی لکڑی پر یعنی + اس قسم کی لکڑی پر ایک شخص کو لٹکا دیا جاتا تھا اور اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں لگا دی جاتی تھیں۔ بائبل کے انسکلو پیڈیا میں ہے کہ لاش صلیب پر رہتی تھی۔ یہاں تک کہ بالکل سوکھ جاتی۔ اور یہودی انسکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ مصلوب کی موت بھوک اور طاقت کے زائل ہو جانے سے واقع ہوتی تھی اور لاش بعض وقت تین دن صلیب پر لٹکی رہتی تھی۔ ہاں موت جلد واقع کرنے کے لیے بعض وقت ٹانگیں توڑ دی جاتی تھیں۔ پس اہل عرب یہود اور بائبل کے محاورہ کی رو سے مصلوب وہی شخص کہلا سکتا تھا جس کی موت اس ذریعہ سے واقع ہو جائے۔

یہاں حضرت عیسیٰؑ سے قتل و صلیب ہر دو کی نفی کی گئی ہے اور یہ عطف خاص علی العام ہے گویا یہ بتایا ہے کہ ان دونوں طریقوں میں سے کسی طریق سے حضرت مسیح کی جان ان کے جسم سے جدا نہیں ہوئی نہ بذریعہ قتل، نہ بذریعہ صلیب۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح اب تک زندہ ہیں۔ کیا اگر ایک شخص کے متعلق کہا جائے کہ وہ قتل یا صلیب سے نہیں مارا گیا تو اس کی مطلق موت کی نفی ہو جاتی ہے؟ یہ کبھی کسی کے وہم میں بھی نہیں آ سکتا۔ مگر تعجب یہ ہے کہ حضرت مسیح کی نفی قتل و صلیب سے ان کی موت کی نفی مراد لی جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن شریف خود بتاتا ہے کہ اگر حضرت مسیح کی موت بذریعہ قتل و صلب واقع نہیں ہوئی تو کیا ہوا۔ فرمایا ولکن شُبّہ لھم مگر وہ (یعنی مسیح) ان کیلئے مشابہ بنایا گیا۔ جس کے معنی غلطی سے یوں کیے جاتے ہیں کہ کوئی شخص مسیح کا مشابہ بنایا گیا۔ یہ صریح غلطی ایک قصّہ کو ذہن میں رکھ کر کی گئی ہے ورنہ الفاظ قرآنی اس کو ہرگز برداشت نہیں کرتے۔ ضمیر جو شُبّہ میں ہے وہ صرف حضرت مسیحؑ کی طرف جا سکتی ہے جن کا ذکر چل رہا ہے اور کسی ایسے شخص کی طرف ہرگز نہیں جا سکتی جس کا ذکر قرآن شریف میں کہیں بھی نہیں بلکہ کسی صحیح حدیث میں بھی نہیں جو مسیحؑ کی جگہ قتل و صلیب کی موت سے مرا ہو اور پھر تعجب پر تعجب یہ کہ اگر یہ معنی کیئے جائیں تو ما قتلوہ و ما صلبوہ کا جواب بھی کوئی نہیں بنتا۔ کیونکہ ان دونوں باتوں میں کیا تعلق ہے کہ مسیحؑ قتل یا صلیب کی موت نہیں مرا۔ بلکہ ایک اور شخص مسیحؑ کی طرح ہو گیا۔ اس دوسرے کے مقتول یا مصلوب ہونے کا یہاں اشارہ تک نہیں۔

انجیل کی شہادت کہ مسیح صلیب پر چڑھائے گئے مگر زندہ رہے: اب واقعات تاریخی کو لو تو کیسی صفائی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی معنی الفاظ قرآنی کے درست ہیں۔ ذیل کے واقعات بتاتے ہیں کہ مسیحؑ صلیب پر چڑھائے گئے مگر مصلوب نہیں ہوئے بلکہ زندہ اُترے البتہ صلیب پر چڑھنے کی وجہ سے وہ مصلوب یا مقتول سے مشابہ ہو گئے۔ اوّل حضرت مسیح ایک روایت کے مطابق صلیب پر چھ گھنٹے (مرقس ۱۵: ۲۵) اور ایک روایت کے مطابق تین گھنٹے سے بھی کم رہے (یوحنا ۱۹: ۱۴) دوم یوحنا ۱۹: ۳۲ سے ثابت ہے کہ مسیحؑ کے ساتھ جو دو چور صلیب پر لٹکائے گئے جب ان کو اتارا گیا تو ان کی ٹانگیں توڑی گئیں تب ان کی موت واقع ہوئی مسیحؑ بھی ساتھ ہی چڑھائے اور ساتھ ہی اتارے گئے مگر ان کی ٹانگیں نہیں توڑی گئیں۔ سوم سپاہیوں میں سے ایک نے مسیحؑ کی پسلی بھالے سے چھیدی تو اس سے لہو اور پانی نکلا۔ یوحنا ۱۹: ۳۴۔ یہ صریح زندگی کی علامت ہے۔ چہارم جب کسی نے پلاطوس کو جا کر کہا کہ مسیحؑ صلیب پر مر گئے تو اس نے متعجب ہو کر شبہ کیا کہ اس قدر جلد کس طرح مر گئے۔ مرقس ۱۵: ۴۴ پنجم مسیحؑ کو دفن نہیں کیا گیا بلکہ ایک کھلی جگہ میں رکھ کر سامنے ایک پتھر رکھ دیا گیا جس سے ہوا اندر جاتی رہی مرقس ۱۵: ۴۶۔ حالانکہ جس کو دفن کیا جاتا ہے اس کے لیے ہوا کے آنے جانے کا راستہ نہیں رکھا جاتا۔ ششم جب تیسرے دن مریم مگدلینی وغیرہ آئیں تو پتھر کو دروازے سے ہٹا ہوا پایا (مرقس ۱۶: ۴) جس سے معلوم ہوا کہ پتھر کو ہٹا کر مسیحؑ کو اندر سے نکالا گیا۔ ہفتم یوحنا ۲۰: ۱۵ سے ثابت ہوتا ہے کہ مریم مگدلینی نے حضرت مسیح کو دیکھا تو انھیں باغبان سمجھا جس سے معلوم ہوا کہ آپ نے بھیس بدلا ہوا تھا۔ ہشتم کئی دن بعد جب حواریوں نے مسیحؑ کو دیکھا تو اس کے ہاتھوں پر کیلوں کے زخموں کے نشان باقی تھے (یوحنا ۲۰: ۲۵ سے ۲۸) نہم لوقا ۲۴: ۳۹۔ ۴۴ سے ثابت ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد حواریوں کے ساتھ مل کر آپ نے بھونی ہوئی مچھلی اور شہد کھایا۔ دہم جلیل کو پیدل سفر کیا۔ متی ۲۸: ۱۰)

تاریخی واقعات اور اتمام حجت: اب ایک طرف یہ واقعات تاریخی ہیں کہ مسیحؑ صلیب پر چڑھے مصلوب کی طرح ہوئے مگر مصلوب نہیں ہوئے یعنی صلیب پر مرے نہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اناجیل کے بیانات ہیں اور محرف و مبدل کتابیں ہیں اس لیے قابل قبول نہیں۔ محرف و مبدل کے یہ معنی سمجھ لینا

لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ
اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝۱۵۷
بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

جنھوں نے اس کے متعلق اختلاف کیا اس بارے میں شک میں ہیں انکو ۶۶۳
اس کا کچھ علم نہیں صرف گمان کے پیچھے چلتے ہیں اور انھوں نے اسکو یقینی طور پر قتل نہیں کیا
بلکہ اللہ نے اسے اپنا قرب عطا فرمایا اور اللہ غالب

کہ ان میں جو کچھ واقعات تاریخی لکھے ہیں وہ سرتا پا غلط ہیں سخت غلطی ہے۔ تحریف عموماً عقاید کے معاملہ میں ہوئی ہے۔ ورنہ واقعات تاریخی جن پر سب اناجیل کا اتفاق ہو محرف کہہ کر رد نہیں کئے جا سکتے بھلا اگر یہ اناجیل محرف ہیں تو انجیل برنباس کے لئے کونسی سند قرآن شریف یا حدیث میں ہے کہ وہ غیر محرف ہے۔ اور یہاں اتمام حجت تو یہود اور نصاریٰ پر کرنا مقصود ہے۔ اب عقاید کے معاملہ میں اتمام حجت دلائل سے ہوگا اور واقعات تاریخی میں اتمام حجت کسی قوم کی مسلمہ تاریخ کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ اب مسلمہ تاریخ وہ ہے جو عیسائیوں کو مسلم ہے۔ ان پر اتمام حجت یوں تو ہو سکتا ہے کہ ان کو ان کی اپنی کتابوں سے دکھایا جائے کہ یہ واقعات جن کو تم تسلیم کرتے ہو صاف بتاتے ہیں کہ مسیحؑ صلیب پر نہیں مرا لیکن اگر ان کے سامنے ایک نئی کہانی بنا کر رکھ دی جائے کہ مسیحؑ کا ہمشکل مصلوب ہو گیا تھا اور حضرت مسیح آسمان پر چلے گئے تو اس سے کہانی بنانے والا صرف اپنا دل خوش کر سکتا ہے۔ دوسری قوم پر اس سے کچھ اتمام حجت نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کا کمال تو یہ ہے کہ عیسائیوں پر اتمام حجّت انہی کی تاریخ کو پیش کر کے کیا ہے۔ ایک اُمّی کا دوسری قوم کی کتابوں کی ایسی باریک باتوں تک پہنچنا بالکل ناممکن تھا۔ یہ خدائے عالم الغیب کا ہی کام تھا۔

مسیحؑ کے ہمشکل کا قصّہ: دوسری طرف جو روایت پیش کی جاتی ہے نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں نہ انجیل میں نہ کسی تاریخ میں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مسیحؑ کا ہمشکل کسی کو بنا دیا گیا کہ یہودی اسے صلیب دے لیں۔ اس کی ضرورت کیا تھی؟ بھلا اگر کسی کو ہمشکل بنائے بغیر خدا تعالیٰ مسیحؑ کو اُٹھا لیتا تو یہودی اس کو وہاں سے پکڑ لاتے، جو خدا نے ایک ہمشکل بنا کر ان کو دھوکہ میں ڈال دیا؟ پھر کیسی متضاد روایات بنائی گئی ہیں۔ ایک میں ہے کہ مسیحؑ کے کہنے پر ان کے ایک حواری نے ہمشکل ہونا قبول کر لیا اور مصلوب ہُوا۔ ایک نبی اپنی جان بچا کر اپنے بے گناہ صحابی کو بے ضرورت مروا دے یہ بے معنی ہی نہیں سخت قابل اعتراض ہے۔ اس لئے دوسری روایت یوں بنائی ہے کہ وہ ایک منافق تھا۔ تیسری یوں کہ جو پکڑنے آیا تھا وہ ہمشکل بنا دیا گیا۔ ان دونوں صورتوں میں شخص مذکور نے کچھ واویلا نہ کیا کچھ پتہ نہ بتایا کہ میں کون ہوں؟ یہ پہلے سے بڑھ کر تعجب کا مقام ہے اور ایک روایت میں ہے کہ یہودیوں نے جب مسیحؑ کو نہ پایا تو خود ہی ایک یہودی کو پکڑ کر صلیب دیدیا تاکہ لوگوں کو پتہ نہ لگ جائے کہ مسیحؑ آسمان پر چلا گیا ہے۔ اور کسی کو قریب نہ آنے دیا یہ سب اٹکل پچو باتیں ہیں ایک بات پر اعتراض ہوا تو دوسری بنالی، دوسری پر اعتراض ہوا تو تیسری بنالی۔ بھلا اگر مسیحؑ حوالات میں نہ ملتے تو نتیجہ یہ نکالا جاتا کہ کہیں بھاگ گئے ہیں یا یہ کہ آسمان پر چلے گئے ہیں؟ آج تک کسی جیل خانہ کے مفرور کی نسبت یہ خیال کسی شخص نے نہیں کیا کہ وہ آسمان پر چلا گیا ہوگا۔ آسمان پر جاتے ہوئے تو ایک شخص نے بھی نہ دیکھا اور یونہی ان کے حوالات سے غائب ہو جانے پر سب لوگ سمجھ لیتے کہ ضرور آسمان پر ہی گئے ہیں یہ کس قدر بعید از قیاس بات ہے۔

مسیحؑ کے آسمان پر جانے کا ذکر قرآن میں نہیں: علاوہ ازیں خود قرآن شریف سے ثابت ہے کہ مسیحؑ اگر مقتول مصلوب نہیں ہوا تو کیا ہوا۔ سورۃ آل عمران میں یٰعیسیٰ انّی متوفیک کا صریح وعدہ موجود ہے، یعنی میں تجھ کو طبعی موت سے مارنے والا ہوں اور یہ وعدہ وہاں کیا جہاں اس سے پہلے یہودیوں کی حضرت مسیح کے خلاف تدبیروں کا ذکر ہے اور وہ تدبیریں مصلوب کرنے کی تھیں سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم مصلوب کی موت نہیں مرو گے بلکہ میں تم کو طبعی موت سے ماروں گا اور سورۃ مائدہ میں اس وعدہ کے پورا ہو جانے کا ذکر ہے فلما توفیتنی جب تو نے مجھ کو طبعی وفات دی۔ آسمان پر زندہ لے جانے کا نہ کہیں وعدہ ہے نہ زندہ آسمان پر لیجانیکا کہیں ذکر ہے پس نفی قتل اور نفی صلب کر کے اور مقتول و مصلوب کا شبیہ قرار دے کر اور پھر طبعی وفات کا ذکر کر کے سارے معاملہ کو صاف کر دیا ہے۔

ع۶۶۳ وماقتلوہ یقیناً کے معنی تو صاف ہیں ماقتلوہ قتلاً یقیناً یعنی انہوں نے حضرت عیسیٰ کو یقینی طور پر قتل نہیں کیا بلکہ شکی طور پر قتل کیا اور تاریخ سے ظاہر ہے کہ خود ان کے اندر شکوک پیدا ہو چکے تھے۔ امام راغبؒ نے یوں معنی کیے ہیں ما علموا کونہ مصلوباً علماً یقیناً یعنی اس کے مصلوب ہونے کو علم یقینی کے ساتھ نہیں جانا اور یہ معنی بھی سیاق عبارت کے لحاظ سے درست ہیں کیونکہ پیچھے شک کا ذکر ہے اور بعض نے قتلوہ میں ضمیر کو علم کی طرف پھیرا ہے۔ کیونکہ قتلت العلم اور قتلت کذا علماً کے معنی ہیں اس کا پورا علم حاصل کیا (غ) اور دونوں معنوں کے لحاظ سے مطلب ایک ہے۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے اسے یقینی طور پر قتل نہیں کیا یعنی قتل شکی رہا اور دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ کہ اس کے قتل ہو جانے کے بارہ میں ان کو یقین نہیں ہوا وہ شک میں رہے کسی دوسرے کے قتل کا کوئی ذکر یہاں نہیں۔

شک کا ہونا آسمان پر جانے کو غلط ٹھہراتا ہے: اختلاف کرنے والے لوگ یہود و نصاریٰ دونوں ہیں۔ سو تاریخ سے ثابت ہے کہ فی الواقع دونوں شک میں رہے اور کسی کو بھی قتل کا یقین نہیں ہوا۔ تین گھنٹے کے اندر اندر صلیب سے اُتر آنا۔ ٹانگیں نہ توڑا جانا۔ پیلاطوس کا شک کرنا۔ پتھر کا ہٹا ہوا پایا جانا۔ حواریوں سے خفیہ ملاقاتیں۔ کیا یہ صریح امور نہیں جن کا لازمی نتیجہ شک ہونا چاہیئے۔ جو دونوں گروہوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ اگر مسیحؑ آسمان پر چلے گئے تھے اور ان کا ہمشکل مصلوب ہوا تھا تو شک کیسا اور علم کا نہ ہونا کیا معنی اور عدم یقین کی کیا وجوہات تھیں؟ یا تو یہودیوں نے مسیحؑ کو آسمان پر جاتے دیکھا ہوگا تو ان کو یقین ہوگا کہ مسیح مصلوب نہیں ہوا اور یا نہیں دیکھا تو ان کو یقین ہوگا کہ مسیحؑ مصلوب ہو گئے دونوں صورتوں میں شک کوئی نہیں۔ رہے عیسائی

عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٥٨﴾ — حکمت والا ہے ۶۶۴

وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿١٥٩﴾

اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر وہ اپنی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لانا ہے اور قیامت کے دن وہ اُن پر گواہ ہوگا ۶۶۵

ان کو تو اس قصہ کی رو سے یقین تھا کیونکہ یہ سارا قصہ حواریوں کے سامنے ہوا کہ ایک مسیح کا ہمشکل ہو گیا۔ پس وہ تو یقین کے ساتھ جانتے ہونگے کہ مسیح مصلوب نہیں ہُوا ان کو بھی شک کوئی نہیں ہو سکتا۔ شک کی صورت صرف وہی ایک ہے جو اوپر بیان ہوئی اور جس کا یقینی ثبوت اناجیل سے ملتا ہے۔

۶۶۴ بَلْ اضراب کے لیے آتا ہے اور اس سے مراد کبھی پہلے خیال کا ابطال ہوتا ہے اور کبھی ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف انتقال پہلے کی مثال ہے وقالوا اتخذ الرحمٰن ولدا سبحانہٗ بل عباد مکرمون۔ اور دوسرے کی قد افلح من تزکی وذکر اسم ربہ فصلی بل توثرون الحیٰوۃ الدنیا (مغنی)

رفعہ اللہ الیہ پر دیکھو ع۴۴۵ اور ابن جریر نے ابن جریج سے روایت کی ہے فرفعہ ایاہ توفیہ ایاہ وتطہیرہ من الذین کفروا یعنی اللہ تعالیٰ کے مسیح کے رفع کرنے سے مراد ہے ان کو وفات دینا اور کافروں سے ان کی تطہیر کرنا۔

پچھلے واقعات اور رفع مسیح میں کیا تعلق ہے؟ عام طور پر مفسرین نے یہ تعلق قائم کیا ہے کہ حضرت مسیح مقتول و مصلوب نہیں ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اُٹھا لیا۔ مگر یہ معنی رفع کے سراسر خلاف لغت ہیں اور ناقابل قبول۔ اصل بات یہ ہے کہ پیچھے ذکر اس بات کا تھا کہ یہودی ان کو مقتول و مصلوب سمجھتے ہیں مگر یہود و نصاریٰ دونوں کو ان کے مقتول و مصلوب ہونے کا یقین نہیں بلکہ اللہ نے اسے رفع عطا فرمایا یعنی بلندی درجات اب خواہ بل کو پہلے مضمون کے ابطال کے لیئے سمجھا جائے اور خواہ انتقال کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو مصلوب مان کر اسے قرب الٰہی سے دور پھینکتے ہیں مگر اللہ نے اسے قرب عطا فرمایا اب قرب بارگاہ الٰہی اور مصلوبیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لیے کہ یہودی جھوٹے مسیحوں کو مصلوب کرتے تھے اور اس لیئے بھی کہ استثناء ۲۱ : ۲۳ سے اور پھر گلتیوں ۳ : ۱۳ سے ثابت ہے کہ صلیب کی موت کو لعنتی موت سمجھا جاتا تھا۔ اور لعنت کا مفہوم اللہ تعالیٰ سے دُوری ہے۔ پس لعنت کے ابطال کے لیئے رفع کا ذکر کیا، کیونکہ لعنت دوری ہے اور رفع قرب۔

۶۶۵ حضرت ابوہریرہؓ کی طرف ایک روایت منسوب ہے جس میں نزول ابن مریم کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا فاقرؤا ان شئتم وان من اھل الکتاب یعنی جہاں رسول اللہ صلعم سے یہ روایت کی کہ ابن مریم حکم عدل ہو کر نازل ہوگا کسر صلیب کریگا اور قتل خنزیر کرے گا اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔ تو ساتھ اپنی طرف سے بڑھایا کہ چاہو تو یہ آیت پڑھ لو کہ اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر وہ اپنی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لانا ہے یا لائے گا اور مراد اس سے یہ لی گئی ہے کہ سب یہودی حضرت عیسیٰ پر ان کے دوسرے نزول کے وقت ایمان لے آئیں گے۔ جو شخص یہ روایت بیان کرتا ہے کہ نازل ہونے والا ابن مریم تمہارا امام تمہیں میں سے ہوگا وہ یہ عقیدہ نہیں رکھ سکتا کہ حضرت عیسیٰ خود دوبارہ آئیں گے پس حضرت ابوہریرہؓ کا مطلب اس آیت کی طرف توجہ دلانے سے یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت عیسیٰؑ کے دوسرے نزول میں سب یہودی ایمان لے آئیں گے علاوہ ازیں یہاں صاف فرمایا کہ یوم القیامۃ یکون علیہم شہیدا۔ کہ مسیح قیامت کے دن ان پر گواہ ہونگے کن پر؟ یہودی مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ دوسری جگہ خود بتا دیا کہ وہ کون لوگ ہیں جن پر حضرت عیسیٰ گواہ ہونگے وکنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم (المائدۃ ۵ - ۱۱۷) یعنی عیسائی لوگ حضرت عیسیٰؑ کی اپنی امت پس یہاں اہل کتاب سے یہودی ہرگز مراد نہیں عیسائی مراد ہیں اور پھر یہودیوں کا حضرت عیسیٰ پر دوبارہ نزول کے وقت ایمان لانا بے معنی ہے۔

حضرت عیسیٰ اگر دوبارہ آئیں تو لوگ ایمان اُن پر نہیں لائیں گے بلکہ آنحضرت صلعم پر لائیں گے: اگر دوبارہ نزول فرض بھی کر لیا جائے تو ایمان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ لائیں گے نہ حضرت عیسیٰ پر۔ اس وقت حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہوئے کہ اس وقت کے نبی حضرت عیسیٰ ہونگے حالانکہ عام عقیدہ کے مطابق بھی وہ محض مجدد ہو کر آئیں گے نہ نبی ہو کر پھر ان پر ایمان لانے کے کیا معنی۔ اور پھر جو حضرت عیسیٰ پر ایمان لائیں گے یہاں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ ان پر قیامت کے دن شہید ہونگے گویا اُمت محمدیہ کے ایک بڑے حصّہ پر جو حضرت عیسیٰ کے ذریعہ سے مسلمان ہوگا شہید حضرت محمد مصطفےٰ صلعم نہ ہونگے بلکہ حضرت عیسیٰ ہونگے حالانکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا فکیف اذا جئنا من کل اُمۃ بشہید وجئنا بک علیٰ ھٰؤلاء شہیدا (۴ : ۴۱) یعنی ہر امت میں اس کا رسول شہید ہوگا اور آپ یعنی محمد مصطفےٰ صلعم ان پر یعنی امت محمدیہ پر شہید ہونگے۔ مگر حضرت عیسیٰ کو دوبارہ لانے والے آنحضرت صلعم کو آدھی امت محمدیہ پر شہید ٹھہراتے ہیں اور باقی آدھی بلکہ زیادہ پر حضرت عیسیٰ کو شہید بناتے ہیں اور ساتھ ہی حضرت عیسیٰ کو اپنی ساری امت پر بھی شہید ٹھہراتے ہیں تلک اذا قسمۃ ضیزی۔ کاش مسلمان غور کرتے تو حضرت عیسیٰ کے نزول ثانی کا مسئلہ کس قدر آسان تھا۔

پھر یہ حصر کہ سب کے سب یہودی ایمان لائیں گے اوّل تو کروڑہا یہودی نزول سے پہلے مر چکے وہ کس طرح ایمان لائیں گے، دوسرے قرآن شریف صاف فرماتا ہے وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامۃ (آل عمران ۳ - ۵۵) پس حضرت عیسیٰؑ کے منکر بھی قیامت تک رہیں گے، اس لیئے سب یہودیوں کا ایمان لانا صریح اس آیت کے خلاف ہے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ
طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾

سو اُن لوگوں کے ظلم کی وجہ سے جو یہودی ہوئے ہم نے اُن پر اچھی چیزیں جو اُن کے لیے حلال کی گئی تھیں حرام کر دیں اور ان کے اللہ کی راہ سے بہت روکنے کی وجہ سے۔

وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ
اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ
مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾

اور ان کے سود لینے کی وجہ سے حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور ان کے لوگوں کا مال ناحق کے ساتھ کھانے کی وجہ سے اور ہم نے اُن میں سے کافروں کے لیے دردناک دکھ تیار کیا ہے۔ ع۷۶۶

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ
قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ
ع ۲۲ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع

لیکن اُن میں سے علم میں پختہ لوگ اور مومن اس پر ایمان لاتے ہیں، جو تیری طرف نازل کیا گیا، اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا اور نماز کے قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور آخر کے دن پر ایمان لانے والے، وہ ہیں جن کو ہم بڑا اجر دیں گے ع۷۶۷

اِنَّاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ
وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ

بے شک ہم نے تیری طرف وحی کی، جیسے ہم نے نوحؑ اور اُس سے پچھلے نبیوں کی طرف وحی کی اور ہم

جیسا کہ اوپر دکھایا گیا۔ یہاں اہل کتاب سے مراد عیسائی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں جب پھر یہودیوں کے ذکر کی طرف عود کیا تو صرف ضمیر پر اکتفا نہیں کیا نہ وہاں اہل کتاب کا لفظ استعمال کیا جیسے پہلے کیا تھا بلکہ صاف فرمایا فبظلم من الذین ھادوا اور مطلب صاف ہے کہ حالانکہ عیسائی خود حضرت عیسٰی کے صلیب پر مرنے کے معاملہ میں شک میں ہیں اور ان کو یقین نہیں مگر ان میں سے ہر ایک اس پر اپنی موت سے پہلے ایمان ضرور لاتا ہے۔ عیسائیت کی بنیاد حضرت مسیح کے مصلوب ہونے پر ہے اگر مسیحؑ صلیب پر فوت نہیں ہوئے تو نہ انہوں نے لوگوں کے گناہوں کی لعنت اٹھائی نہ وہ کفارہ ہو سکتے ہیں اور موت سے پہلے کا لفظ اس لیئے بڑھایا کہ موت سے پہلے ضرور ہے کہ پادری عیسائی عقیدہ کا اقرار کرائے پس مطلب صاف یہ ہے جو عین سیاق عبارت کے مطابق ہے کہ عیسائی خود شک میں ہی ہیں کہ صلیب پر موت واقع ہوئی یا نہیں مگر بایں اس بات پر اپنی موت سے پہلے ایمان ضرور لاتے ہیں گویا بتایا ہے کہ ان کا ایمان ان کی اپنی تاریخ کے خلاف ہے اور حضرت عیسٰی قیامت کے دن ان پر گواہ ہونگے یعنی بتائیں گے کہ کس طرح انہوں نے ان کی تعلیم کے خلاف اور واقعات کے خلاف ایک عقیدہ قائم کرلیا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے صحیح معنی نہ سمجھے تھے۔ تو خود حضرت ابن عباسؓ نے ان معنوں کی تردید کی ہے۔ کیونکہ ابن جریر میں متعدد روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اس کے معنی یوں کرتے تھے کہ ہر یہودی اپنی موت سے پہلے حضرت عیسٰی پر ایمان لاتا ہے کہ وہ خدا کے رسول تھے اور دوسری قرأت قبل موتہم (ث) اس کی موید ہے اور حضرت ابن عباسؓ کا فہم قرآن بہرحال حضرت ابوہریرہؓ سے بڑھ کر ہے۔

اور جو معنی میں نے کیے ہیں ان میں مضمون کا انتقال عیسائیوں کی طرف لیا گیا ہے اور یوم القیامۃ یکون علیہم شھیداً سے یہ ظاہر ہے اور اگلے رکوع کے شروع میں بھی اسی لیئے عیسائیوں کے عقیدہ باطلہ کا ذکر ہے۔ گویا قرآن کریم نے اگر ایک طرف یہود کی تفریط کا ذکر کیا تو ساتھ ہی عیسائیوں کو بھی ان کے غلو پر ملزم کیا ہے۔

ع۷۶۶ کونسی اچھی چیزیں ان پر حرام کی گئیں اور کس لیے؟ وجہ تو خود بیان فرما دی کہ ان کے ظلم کی وجہ سے اور سود اور ناحق مال کھانے سے۔ سود خوار ہو جانے کی وجہ سے اور لوگوں کا مال ناجائز لیکر ان میں دنیا کی محبت بہت بڑھ گئی ایثار اور قربانی کا مادہ کم ہو گیا۔ دوسری جگہ فرمایا ام لھم نصیب من الملک فاذاً لا یؤتون الناس نقیراً (النسآء - ۴ - ۵۳) بادشاہت ان کو کس طرح ملے یہ تو لوگوں کو نقیر بھی نہ دیں۔ ایسے بخیلوں کو حکومت نہیں ملا کرتی پس یہی وہ طیبات ہیں جو ان پر حرام کر دی گئیں۔ اور اس کے مقابل پر فرمایا کہ دردناک دکھ ہے سو وہ ذلیل اور دربدر ہونے کا دکھ ہے۔

ع۷۶۷ یعنی یہودیوں اور عیسائیوں میں سے جو راسخ فی العلم ہیں نرے تقلید کے طور پر پہلوں کے پیچھے نہیں لگے ہوئے بلکہ خود تحقیق کر لیتے ہیں۔ وہ قرآن پر

وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ عِیۡسٰی وَ اَیُّوۡبَ وَ یُوۡنُسَ وَ هٰرُوۡنَ وَ سُلَیۡمٰنَ ۚ وَ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ﴿۱۶۳﴾

نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور (اس کی) اولاد اور عیسٰیؑ اور ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف وحی کی اور ہم نے داؤد کو زبور دی ۶۸ع

وَ رُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَیۡكَ مِنۡ قَبۡلُ وَ رُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَیۡكَ ؕ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰی تَكۡلِیۡمًا ﴿۱۶۴﴾ۚ

اور (کچھ) رسول ہیں جن کا حال ہم تجھ سے پہلے بیان کر چکے ہیں اور (کچھ) رسول ہیں جن کا ذکر ہم نے تجھ سے نہیں کیا اور اللہ نے موسیٰؑ سے بہت باتیں کیں ۶۹ع

رُسُلًا مُّبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ لِئَلَّا یَكُوۡنَ

رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے تاکہ لوگوں

ایمان لاتے ہیں مقیمین الصّلوٰۃ میں نصب علی المدح ہے کیونکہ یہاں پھر حق کی شناخت کا ذکر ہے اور وہ سوائے رجوع الی اللہ کے حاصل نہیں ہو سکتا۔

۶۸ع وحی کے اقسام: اوحینا۔ وحی کے اصل معنی الاشارۃ السریعۃ ہیں یعنی تیزی سے اشارہ کرنا۔ اور یہ کبھی محض رمز کے طور پر ہوتا ہے یا جوارح کے اشارہ سے جیسے حضرت زکریاؑ کے ذکر میں فاوحیٰ الیھم (مریم ۱۹-۱۱) اور کلمہ الٰہیہ جو انبیاءؑ اور اولیاءؒ کی طرف ڈالا جاتا ہے وہ بھی وحی کہلاتا ہے اور یہ تین طرح پر ہوتا ہے جیسا کہ ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من ورآئ حجاب او یرسل رسولا (الشوریٰ ۴۲-۵۱) سے ظاہر ہے (رغ) اور یہ تین قسم یہ ہیں: اوّل دل میں ایک بات کا ڈالنا جیسے آنحضرت صلعم نے فرمایا ان روح القدس نفث فی روعی دوم من وراء حجاب جیسے رویا کشف، الہام اسی ہیں وہ مبشرات آتی ہیں جن کا ذکر حدیث میں ہے کہ اس اُمت میں بعد انقطاع نبوت وہ رہ گئی ہیں اور تیسرا بذریعہ رسول جس کو دیکھا جاتا ہے اور اس کا کلام سُنا جاتا ہے یعنی بذریعہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اور یہ تیسری قسم صرف انبیاءؑ سے مخصوص ہے اور پہلی دو میں اولیاء اللہ بھی شامل ہیں اور یہاں مراد یہی تیسری قسم کی وحی ہے جس سے انبیاءؑ مخصوص ہیں۔

آنحضرت صلعم کی وحی دیگر انبیاءؑ کی طرح تھی: پچھلے رکوع کی آخری آیت میں یہ ذکر کیا تھا کہ اہل کتاب میں سے بھی جو محقق ہیں وہ آنحضرتؐ پر ایمان لاتے ہیں جیسے پہلے انبیاءؑ پر ایمان لاتے ہیں۔ اس لیے اب فرماتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی وحی کوئی الگ وحی نہیں۔ ساتھ ہی اہل کتاب کے اس سوال کا جواب ہے کہ ان پر آسمان سے کوئی کتاب اتارو۔ جو پچھلے رکوع کے شروع میں ہے۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وحی آنحضرت صلعم کو اسی طرح ہوتی ہے جس طرح پہلے انبیاءؑ کو ہوئی یہاں تک کہ موسیٰؑ کو بھی۔ آسمان سے کتاب نہ نوحؑ پر اُتری اور نہ اس کے بعد کسی نبی پر نہ موسیٰؑ پر بلکہ جو طریق اللہ تعالیٰ کے وحی کرنے کا ہے اسی طریق پر اب آنحضرتؐ کو بھی وحی ہوتی ہے اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح تمہاری طرف توحید کی وحی ہوئی ہے اسی طرح سب انبیائے سابق کی طرف بھی توحید کی ہی وحی ہوئی تھی۔

آنحضرتؐ سب انبیاءؑ کے کمالات کے جامع ہیں: یہاں چند ایک نبیوں کا نام لیا ہے اور اس میں اشارہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سب کے کمالات کے جامع ہیں سب سے پہلے نوحؑ کا نام لیا کیونکہ وہ پہلے تاریخی نبی مرسل ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جد امجد اور سب قوموں کے نزدیک مسلّم بزرگ ہیں اور ان کی اولاد کا ذکر ہے اور ان کے بعد حضرت عیسٰیؑ کا جو سلسلہ بنی اسرائیل بلکہ قومی نبیوں کے سلسلہ کے خاتم ہیں۔ اور حضرت عیسٰی کے بعد پھر ان سے پہلے نبیوں کا ذکر ہے اور ان کو درمیان میں رکھ کر یہ بتایا ہے کہ سب کی تعلیم ایک ہی تھی یعنی توحید الٰہی اور حضرت عیسٰے کے بعد حضرت ایوبؑ کا ذکر کیا کہ اگر عیسٰےؑ نے کچھ تکلیفیں اٹھائیں اور موت کی حالت تک پہنچے تو ایوبؑ نے جو آپ سے بہت پہلے سلسلہ موسوی میں ہو چکے ان سے بھی بڑھ کر تکلیفیں اٹھائیں اور کمال صبر کا نمونہ دکھایا جس طرح حضرت عیسٰیؑ نے کمال روحانیت کا نمونہ دکھایا۔ اور یونسؑ میں یہ خصوصیت ہے کہ ان کی قوم تباہ کرنے والے عذاب سے بچ گئی۔ اور ہارونؑ میں خصوصیت ان کی عبادات کی امامت ہے اور سلیمانؑ اور داؤدؑ میں نبوت کے ساتھ شان و شوکت سلطنت ہے اور سلیمانؑ کا نام پہلے اسلئے لیا کہ ان کی شان و شوکت بہت بڑھ کر تھی اور داؤدؑ کا خصوصیت سے الگ ذکر اس لیے کیا کہ آپ کی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بہت ہے اور وہ تمام کمالات جو ان انبیاء میں الگ الگ تھے۔ ان سب کے جامع آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم ہوئے۔

۶۹ع اس آیت میں ایک تو یہ ذکر کیا ہے کہ ہم نے سب رسولوں کا ذکر قرآن شریف میں نہیں کیا جس سے معلوم ہوا کہ اور قوموں میں بھی خدا کے رسول ہوئے ہیں اور اس کی تفسیر ان من اُمۃ الا خلا فیھا نذیر (فاطر ۳۵-۲۴) میں ہے اور یہاں اس امر کا خاص ذکر کرنے سے یہ مقصود ہے کہ آنحضرت صلعم صرف انہی رسولوں کے کمالات کو اپنے اندر نہیں رکھتے جن کے نام یہاں یا دوسری جگہ لیے گئے ہیں۔ بلکہ کل انبیائے عالم کے کمالات کے جامع ہیں۔

حضرت موسیٰؑ پر نزول جبرائیلؑ: اور دوسرا ذکر حضرت موسیٰؑ کا الگ کیا اور ان کے متعلق فرمایا کلم اللہ موسیٰ تکلیما۔ اللہ نے موسیٰؑ سے بہت باتیں کیں یہ مطلب نہیں کہ کسی الگ طرز پر باتیں کیں۔ کیونکہ کلام تو سب رسولوں سے ایک ہی طرز پر ہوا۔ یعنی بذریعہ جبرئیلؑ اور بخاری کی روایت بھی اس پر شاہد ہے ھذا الناموس الذی نزل اللہ علٰے موسیٰ اور زیادہ باتوں کا ذکر اس لیے کیا کہ آنحضرت صلعم کو حضرت موسیٰؑ سے خاص مماثلت ہے اور ان کو بھی مفصل شریعت دی گئی اور ان کی پیشگوئیاں آنحضرت صلعم کی نسبت اس کثرت سے ہیں کہ دوسرے کسی نبیؑ کی نہیں۔

لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾	کو رسولوں کے بعد اللہ پر کوئی عذر نہ رہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے ع۷۷۰
لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰۤئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾	لیکن اللہ اس کے ساتھ گواہی دیتا ہے جو اس نے تیری طرف نازل کیا کہ اسے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا اور فرشتے گواہی دیتے ہیں اور اللہ ہی کافی گواہ ہے ع۷۷۱
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾	وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا اور اللہ کی راہ سے روکا، وہ گمراہی میں دُور نکل گئے۔
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۙ﴿۱۶۸﴾	وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا اور ظلم کیا اللہ ایسا نہیں کہ ان کو بخش دے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے۔
اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾	مگر دوزخ کی راہ، اس میں ابد تک رہیں گے اور یہ اللہ پر آسان ہے ع۷۷۲
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾	اے لوگو، رسول تمھارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ تمھارے پاس آیا، سو ایمان لاؤ تمھارے لیے اچھا ہے اور اگر تم انکار کرو تو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔
يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ	اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو ع۷۷۳ مت کرو، اور اللہ کی نسبت سوائے حق کے کچھ نہ کہو۔ مسیح عیسیٰؑ بن مریم صرف اللہ کا رسول اور اس کی پیشگوئی ہے، جو

ع۷۷۰ حجۃ سے مراد یہاں عذر ہے جیسا کہ دوسری جگہ ہے ربنا لولا ارسلت الینا رسولا فنتبع اٰیٰتک (طٰہٰ ۲۰-۱۳۴) رسولوں کی تبشیر اور انذار پیغام رسانی سے زاید ایک بات ہے اور پیغام کی تائید ہے تاکہ پورا پورا اتمام حجت ہو جائے۔

ع۷۷۱ قرآن کی صداقت پر خود قرآن ہی گواہ ہے: کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا علم کامل ظاہر کیا ہے۔ آخر دنیا دیکھ لیگی کہ جو کچھ قرآن میں بتایا گیا تھا وہی حق ثابت ہوا۔ یہ اللہ کی گواہی ہے جو اسکے فعل سے ظاہر ہوگی آج کتنی باتیں دین اسلام کی حق ثابت ہو رہی ہیں جن کو ایک زمانہ میں غلط سمجھا گیا تھا۔ تثلیث اور کفارہ کے بطلان کو خود عیسائی قبول کرتے جا رہے ہیں اور توحید اور عمل کا سکہ دنیا پر جمتا جاتا ہے۔

ع۷۷۲ انکار اور ظلم کا نتیجہ اگر وہی ہو جو ایمان اور احسان کا ہے تو پھر امن ہی اُٹھ جاتا ہے فعل ظلم و انکار کا ہو تو اس کا نتیجہ بھی ویسا ہی ہوگا۔ انکار اور ظلم طریق جہنم ہے پس اس پر چل کر جہنم میں ہی پہنچے گا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے صاف اور واضح قانون کا ذکر کیا ہے ؎ گندم از گندم بروید جو ز جو۔ از مکافاتِ عمل غافل مشو۔ ابد کے لیئے دیکھو ع۱۵۰۶

ع۷۷۳ تغلوا۔ مادہ غلا ہے اور غُلُوّ حد سے تجاوز کو کہتے ہیں۔ اور جب یہ کسی چیز کی قیمت میں ہو تو غَلا کہلاتا ہے اور جب قدر و منزلت کے متعلق ہو تو غُلُوّ۔ اور فعل دونوں سے غلا یغلو آتا ہے اور غَلْیٌ اور غَلَیان ہانڈی کے جوش میں آنے پر بولا جاتا ہے اسی سے ہے یغلی فی البطون کغلی الحمیم (الدخان ۴۴-۴۵-۴۶)

تقولوا علی اللہ۔ قال علیہ کے معنی ہیں اس پر افترا کیا یا جھوٹ بنایا۔

رکوع کی اس آخری آیت میں عیسائیت کی طرف مضمون کو منتقل کیا ہے اور بتا دیا ہے کہ سب انبیاء کی وحی کے ذکر میں یہی مقصود تھا کہ سب کی تعلیم توحید

اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا
بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۫ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا
خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ
اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ ع ۲۳
لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا
لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَ مَنْ
يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يَسْتَكْبِرْ

اس نے مریم کی طرف القا کی اور اس کی طرف سے روح ہے[474]
سو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو تین ہیں
باز آجاؤ، تمھارے لیے بہتر ہے اللہ صرف ایک ہی
معبود ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کا بیٹا ہو، اسی کا ہے
جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کافی کارساز ہے[475]
مسیح ہرگز بُرا نہیں مانتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ
ہی مقرب فرشتے اور جو کوئی اُس کی بندگی کو بُرا منائے
اور تکبّر کرے تو وہ ان سب کو اپنی طرف اکٹھا

ہی تھی۔ اور یہ بھی کہ سب دنیا میں نبیؑ آئے صرف ایک قوم کی طرف نہیں اور انسان کو خدا بنانے والے تثلیث کی تعلیم کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں یہ ان کا افترا ہے اور صرف بنی اسرائیل میں رسولوں کا آنا مانتے ہیں اور یہ بھی بتا دیا کہ اگر یہود تفریط کرکے اور حضرت مسیح کا انکار کرکے غلط راہ پر چلے تو ایک دُوسری قوم نے اس مسیحؑ کے حق میں غلو کیا اور کس قدر عجیب بات ہے کہ اگر یہود نے مسیحؑ کو مصلوب مان کر نعوذ باللہ من ذٰلک مفتری اور ملعون قرار دیا تو عیسائیوں نے بھی اسے مصلوب مان کر لعنت کو قبول کیا اور کہا کہ وہ ہمارے لیے ملعون ہوا۔ ایک طرف خدا اور دوسری طرف ملعون۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

ع۴۷۴ روح منہ۔ رُوح اور ریح ایک ہی مادہ سے ہیں اور روح کا لفظ کئی معنی میں استعمال ہُوا ہے۔ نفس یعنی سانس اور وہ جس سے انسان زندہ ہے۔ یعنی جان اور اس کے معنی وحی یا امر نبوت بھی آتے ہیں اور قرآن کو بھی روح کہا گیا ہے اور اس کے معنی رحمت بھی ہیں (ل) اور روح منہ سے مراد ہوئی اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح ہے اور حضرت عیسٰیؑ کو روح منہ کہا گیا ہے جس سے مراد زہری کے نزدیک رحمت ہے (ل) اور لوگوں نے بھی یہاں رحمت مراد لی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے ورحمۃ منّا (مریم[19]۔۲۱) اور اگر مراد حیات لی جائے تو جس طرح حضرت آدمؑ کے متعلق فرمایا ونفخت فیہ من روحی (الحجر[15]۔۲۹) اور جس طرح ہر بشر کے متعلق فرمایا ثم جعل نسلہٗ من سلٰلۃ من ماءٍ مھین ثمّ سوّٰہُ ونفخ فیہ من روحہ (السجدۃ[32]۔۸۔۹) اسی طرح حضرت مسیح کو روح منہ فرمایا اور روحی اور روح منہ دونوں کا ایک ہی رنگ ہے اور اضافت برسبیل تشریف ہے اور خصوصیت سے اس ذکر کی ضرورت اس لیئے پیش آئی کہ یہود حضرت مریمؑ پر زنا کا الزام لگاتے تھے اور زنا کی اولاد کو بوجہ تقدیس ذات باری اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا تو یہ بتایا کہ وہ جائز تعلق سے ہے ناجائز تعلق سے نہیں آدم کے ذکر میں بھی اپنی روح پھونکنے سے یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ عیسائی عقیدہ جو آدم کو فطرتاً گنہگار ٹھہراتا ہے صحیح نہیں کیونکہ اس میں خدائی روح ہے یعنی وہ روح جو فطرتاً پاک ہے۔ پس جس طرح ایک غلط عقیدہ کی تردید کے لیے آدم میں اپنی روح قرار دی اسی طرح ایک ناپاک خیال کی تردید کے لیے مسیحؑ کی روح کو اپنی طرف منسوب کیا۔

ع۴۷۵ یہاں تثلیث کی صاف تردید کی اور خدا کے رسولوں پر ایمان لانے کو ضروری ٹھہرایا یعنی حضرت عیسٰیؑ کو بھی رسولوں میں سے ایک رسول مانو عیسائیوں کا اسلام پر افترا ہے کہ قرآن نے خدا اور مسیح اور مریم کو عیسائیت کی تثلیث سمجھا ہے۔ قرآن شریف نے مریمؑ کی الوہیت کی تردید کی ہے مگر اس لیے کہ مریم کو خدا ماننے والا اس سے دعائیں مانگنے والا بھی ایک گروہ ہے۔ مریم کو تثلیث کا تیسرا اقنوم کہیں نہیں کہا۔ نہ تثلیث کے ذکر میں مریمؑ کی الوہیت کا ذکر کیا ہے۔

انتھوا میں صرف ایک زبردست حکم دیا ہے۔ اس کی تردید کے لیے علیحدہ دلائل نہیں دیئے سوائے اس کے کہ ابنیت سے اللہ تعالیٰ کو پاک بیان فرمایا، کیونکہ تثلیث کی بنیاد مسیحؑ کے بیٹا ہونے پر ہے اور تثلیث ایک ایسی بدیہی البطلان چیز ہے کہ اس کی تردید میں دلائل کی ضرورت بھی نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں۔ خدا باپ، خدا بیٹا، خدا روح القدس تین ہیں مگر تین خدامت کہو بلکہ خدا ایک ہے۔ یہ تین ہیں ایک اور ایک ہیں تین۔ تین بھی ہیں اور ایک بھی۔ ایک ایسا معمّہ ہے جو آج تک نہ کسی سے حل ہوا اور نہ ہوگا۔ عیسائیوں سے اس کی دلیل پوچھی جاتی ہے تو جواب ملتا ہے کہ عقل کو مذہب میں دخل نہیں۔ ایسا مذہب انسانوں کے لیے نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ مذہب کو خدا نے اسی مخلوق کے لیے بنایا ہے جس کو دوسری مخلوق سے عقل کا امتیاز حاصل ہے۔ اسی لیے قرآن شریف انتھوا کہکر چھوڑ دیا ہے جیسے بے سمجھ بچّہ کو جو بے عقلی کی بات کرے حکم دے کر روکا جاتا ہے۔ ابنیت اور کفارہ کی دلائل دی جاتی ہیں۔ اسی لیے قرآن شریف نے بھی ان کا رد دلائل سے کیا ہے۔ تثلیث کی دلائل عیسائی بھی کوئی نہیں دیتے۔ زبردستی اسے منوانا چاہتے ہیں۔ اس لیے قرآن شریف میں بھی ان کو زور سے حکم ہی دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ میں صفات مختلفہ تو تمام خدا پرستوں نے مانی ہیں مگر اقانیم مختلفہ یا تین الگ الگ وجود صرف عیسائیوں کی ایجاد ہے۔ سورج کی کرنوں کی جو مثال وہ بعض وقت دیتے ہیں وہ صفات مختلفہ پر صادق آتی ہے نہ اقانیم متعددہ پر۔

فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾

کرے گا[۶۷۶]

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

پھر جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے، توان کو وہ ان کے اجر پورے دے گا اور اپنے فضل سے ان کو زیادہ دے گا اور جنھوں نے بُرا منایا اور تکبر کیا توان کو وہ دردناک عذاب دے گا اور وہ اللہ کے سوائے نہ کوئی دوست اور نہ مددگار پائیں گے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾

اے لوگو یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے روشن دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمھاری طرف واضح کردینے والا نور نازل کیا ہے[۶۷۷]

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾ۭ

سو وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے اور اس کو مضبوط پکڑا تو اُن کو وہ اپنی طرف سے رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور ان کو وہ اپنی طرف سیدھی راہ پر چلائے گا۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً

تجھ سے فتوے مانگتے ہیں، کہہ اللہ تم کو کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے، اگر کوئی شخص مرجائے اس کی اولاد نہ ہو اور اس کی بہن ہو تو اس کے لیے جو اس نے چھوڑا اس کا نصف ہے اور اگر عورت کی کوئی اولاد نہ ہو تو وہ (بھائی) اس کا وارث ہوگا اور اگر دو (بہنیں) ہوں توان دونوں کے لیے جو اس نے چھوڑا اس کی

---

۶۷۶ یستنکف۔ نکف کے معنی علیحدہ کرنا ہیں۔ اور استنکاف کسی چیز سے عار رکھنے یا اس کو بُرا منانے کو کہتے ہیں (غ)
پچھلے رکوع کے آخر میں تثلیث کی غلطی کو رد کا تھا جس کی بنا مسیحؑ کی ابنیت پر ہے۔ اس لیے یہاں بتایا کہ کیا مسیحؑ کو عبودیت سے کچھ عار تھی وہ اپنے لیے کوئی الگ مقام ابنیت کا تجویز کرتا۔ موجودہ اناجیل بھی اس پر شاہد ہیں کہ مسیحؑ نے عبودیت کو کبھی عار نہیں سمجھا۔ بلکہ اس کو اپنا فخر سمجھا ہے۔ آخر یہ کس کا قول ہے کہ "تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اس اکیلے کی بندگی کر" (متی ۴: ۱۰) اور یہ کس نے کہا "تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے۔ نیک تو کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا" یہ دو قول قرآن کریم کی صداقت پر کافی گواہ ہیں اور بتاتے ہیں کہ حضرت مسیح جب زندہ تھے عبودیت کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے بعد وہ قوم پیدا ہوگئی جن کو جب یہ کہا جاتا ہے کہ مسیحؑ خدا کا بندہ تھا تو کہتے ہیں تم مسیحؑ کی تحقیر کرتے ہو۔ جس بات کو مسیحؑ اپنا فخر سمجھتا تھا یہ اس کو اس کی تحقیر قرار دیتے ہیں۔ مقرب فرشتوں کا ذکر اس لحاظ سے کیا کہ انسان تو انسان ہیں۔ وہ فرشتے جو ہر وقت بارگاہ الٰہی میں حاضر رہتے ہیں وہ بھی عبودیت کو ہی اپنا فخر جانتے ہیں۔ مخلوق کا کمال ہی عبودیت میں ہے اور اس لحاظ سے بھی ملائکہ کا ذکر یہاں کیا ہے کہ جس طرح عیسائی حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا بناتے ہیں عرب کے بت پرست فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے دونوں کی تردید ایک ہی جگہ کر دی۔
بُرا منانے اور تکبر کرنے والوں کی سزا کا ذکر چھوڑ دیا ہے صرف یہ کہہ کر کہ آخر اس کے حضور آئیں گے اور اگلی آیت میں پہلے مومنوں کا ذکر کرکے پھر منکروں کی سزا کا ذکر کیا۔

۶۷۷ ایک طرف اگر ایسے عقیدہ کا ذکر کیا جس کے ساتھ عقلی دلیل کوئی نہیں تو اس کے بالمقابل اب ایک روشن دلیل اور ایسے نور کا ذکر کیا جو سب چیزوں کو روشن اور واضح کر دیتا ہے۔ اور حق کو باطل سے الگ کر دیتا ہے جس کے سامنے عقل انسانی کو بیکار نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے جوہر ظاہر ہوتے ہیں اور خود اس پر روشنی پڑتی ہے۔ نور مبین قرآن کریم ہے اور برھان رسول اللہ صلعم کا وجود ہے۔ کیونکہ آپؐ قرآن کریم کی تعلیم کو اپنے عمل سے اس طرح واضح کر دیتے ہیں،

رِجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ ع

دوتہائی ہے اور اگر بہت بہن بھائی مرد اور عورتیں ہوں تو مرد کے لیے دو عورتوں کے حصّے کی مانند ہے اللہ تمھیں کھول کر بتاتا ہے تاکہ تم غلطی میں نہ پڑو اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ۶۷۸

جس طرح برہان دعویٰ کو روشن کر دیتی ہے۔

ع۶۷۸ کلالہ کی وراثت : لفظ کلالہ پر مفصل بحث کے لیئے دیکھو ع۶۲۱ یہ حکم اور آیت (۱۲) کا حکم چونکہ ملتے جلتے ہیں اس لیئے دو صورتوں سے خالی نہیں۔ یا کلالہ کے وہاں اور معنی ہیں یہاں اور، اور یا وہاں بھائی بہنیں اور ہیں یہاں اور۔ صورت اوّل میں آیت (۱۲) میں اس کلالہ کا ذکر ہے جس کی صرف اولاد نہ ہو اس لیے بھائی بہنوں کو تھوڑا حصّہ دیا ہے اور یہاں اس کلالہ کا ذکر ہے جس کے نہ اولاد ہو نہ والدین اس لیے بھائی بہنوں کو پورا وارث کیا ہے یا زیادہ حصّہ دیا ہے لیس لہ ولد اس کے مخالف نہیں، کیونکہ ایک طرف کا ذکر کر کے دونوں کا مراد لینا عام ہے اور دوسرے اس لفظ میں ایک خاص اشارہ ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے صورت دوم میں آیت (۱۲) میں اخیافی بھائی بہنوں کا ذکر ہے یعنی جو ماں کی طرف سے بھائی ہوں بوجہ بُعد ان کو کم حصّہ دیا ہے اور یہاں اعیانی یعنی حقیقی اور علاتی یعنی باپ کی طرف سے بھائی بہنوں کا ذکر ہے اس لیے حصّہ زیادہ دیا ہے میرے نزدیک پہلے معنی کو ترجیح ہے گو مروی نہیں۔

ایک لطیف اشارہ : سورت کا خاتمہ ورثہ کی آیت پر کر کے سورت کے اصل مضمون کی طرف پھر توجہ دلائی ہے اور ساتھ ہی اس طرف بھی کہ جس طرح کلالہ کے وارث اس کے بھائی ہوتے ہیں اسی طرح اب بنی اسرائیل حضرت مسیح کی آمد کے بعد جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ایک کلالہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ سلسلہ نبوت عملی طور پر ان میں منقطع ہو چکا۔ اس لیے اب نبوت بنی اسمٰعیل میں منتقل ہوتی ہے جو بنی اسرائیل کے بھائی ہیں اور دونوں خاندانوں کو بابرکت کرنے کا وعدہ ہی حضرت ابراہیمؑ سے تھا یہ ایک نہایت لطیف اشارہ ہے اور اسی لیے یہاں کلالہ کے ساتھ الفاظ لیس لہ ولد بڑھا دیئے ہیں یعنی اب وہ روحانی اولاد ان میں پیدا نہیں ہوتی۔

(۵) سُوْرَةُ الْمَآئِدَةِ مَدَنِيَّةٌ

اٰیَاتُهَا ۱۲۰ رُکُوْعَاتُهَا ۱۶

نام : یہ سورت جس میں ۱۶ رکوع اور ۱۲۰ آیات ہیں المائدۃ کے نام سے موسوم ہے اور یہ نام مائدہ کے اس ذکر سے لیا گیا ہے جو اس کے پندرھویں رکوع میں ہے مائدۃ کے معنی ہیں وہ خوان جس پر کھانا ہو یا خود وہ کھانا۔ اور ذکر یہ ہے کہ حواریوں نے حضرت مسیح علیہ السلام سے درخواست کی کہ ان کو کھانے کی چیزیں بکثرت ملیں عیداً لنا میں یہی اشارہ ہے کہ المائدہ سرور دائمی کا موجب ہوں۔ حضرت عیسیٰ نے انہیں روکا اور فرمایا کہ سرور تقویٰ اللہ سے پیدا ہوتا ہے مگر ان کے اصرار پر نزول مائدہ کی دعا کی۔ چونکہ اس سورت میں عیسائیت کی غلطیوں اور فاسد عقائد اور خیالات کا ذکر ہے اس لیے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا ہے کہ عیسائیوں کی طرح دنیا کی چیزوں کی حد سے زیادہ محبت میں مبتلا نہ ہو جائیں اور نہ دنیوی آسائشوں کی طلب میں منہمک ہو جائیں۔ اور اسی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے اس کا نام المائدہ رکھا ہے۔ علاوہ ازیں یہ سورت تمدن پر بھی بحث کرتی ہے اور متمدن قوموں کا میلان بھی عموماً دنیوی آسائشوں کی طرف حد افراط تک چلا جاتا ہے پس اس پہلو کے لحاظ سے بھی متنبہ کرنا ضروری تھا کہ متمدن بنو تو نرا روٹی کی فکر میں ہی نہ الگ جاؤ۔

خلاصۂ مضمون جس طرح پچھلی سورت میں معاشرت کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ بالخصوص یہودیوں کا اس سورت میں تمدن کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ بالخصوص عیسائیوں کا۔ اور دونوں باتوں کی طرف اشارہ کرنے کو اس کی ابتدا اوفوا بالعقود سے کی ہے۔ کیونکہ اگر ایک طرف تمدن کی بنیاد معاہدات پر ہے خواہ وہ معاہدات کھلے الفاظ میں ہوں یا ان کا مفہوم پایا جاتا ہو، تو دوسری طرف شریعت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے چند عقود کو ہی کہتے ہیں اور عیسائیت نے چونکہ شریعت کا نہ صرف استخفاف کر کے اسے بالکل غیر ضروری قرار دیا حالانکہ اپنی آسمانی کتاب کا نام بھی نیا عہدنامہ ہی رکھا ہے بلکہ اسے نعوذ باللہ من ذٰلک ایک لعنت قرار دیا ہے۔ اس لیئے عیسائیت کے ذکر کی ابتدا اس حکم سے موزوں تھی اور دونوں باتوں کو اکٹھا کر کے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ جب نظام عالم جسمانی بدون قوانین و معاہدات ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتا تو مذہب کا نظام بدون اتباع قوانین وبدون ایفائے معاہدات الٰہی کیونکر قائم رہ سکتا ہے اور اس حکم سے ابتدا کر کے پہلے رکوع میں کھانے پینے نکاح کے کچھ احکام کا ذکر کیا یہ بتانے کو کہ خواہشات حیوانی کی تعدیل کے لیے یہ احکام نہایت ضروری ہیں۔ اس رکوع میں تکمیل دین کی خوشخبری بھی ہے گویا بتایا ہے کہ تکمیل دین بغیر تکمیل شریعت نہ ہو سکتی تھی۔ دوسرے رکوع میں پھر ضرورت شریعت کو بتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور صفات ملکوتی کی طرف توجہ دلائی ہے اول الذکر کے لیے نماز کا ذکر کیا اور اس کی ایک چھوٹی سی فرع طہارت جسمانی کی طرف توجہ دلائی ہے اور اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچے تعلق کی ہدایت فرمائی تو دوسری طرف انسانوں کے تعلقات میں اعلیٰ درجہ کے اصول انصاف کی طرف توجہ دلائی یہاں تک کہ نہ صرف غیر قوموں بلکہ دشمن قوم سے بھی عدل و انصاف پر قائم رہنے کا صریح الفاظ میں حکم دیا۔ تیسرے رکوع میں یہودیوں اور عیسائیوں کی عہد شکنیوں کا ذکر ہے چوتھے میں بنی اسرائیل کی نافرمانی کا۔ پانچویں میں ان اہل کتاب کے جو بوجہ عہد شکنیوں کے حق سے بہت دور جا پڑے تھے منصوبوں کا ذکر ہے جو آنحضرت صلعم کے خلاف وہ کرتے تھے اور حفاظت جان و مال کی ضرورت کو واضح کیا ہے جس کے بغیر تمدن قائم نہیں رہ سکتا۔ چھٹے میں اسی ذکر کو جاری رکھتے ہوئے بتایا ہے کہ اہل کتاب کے باہمی مقدمات میں انہی کی شریعت کے مطابق فیصلے کر دو۔ ساتویں میں ان دنیوی جھگڑوں کے فیصلوں سے دینی جھگڑوں کے فیصلوں کی طرف رجوع فرمایا اور بتایا کہ دینی اختلافات میں فیصلے قرآن شریف ہی کرتا ہے جو کتب سابقہ پر محافظ ہے۔ آٹھویں رکوع میں یہود و نصاریٰ سے تعلقات کا اور نویں میں ان کی حالت کا ذکر ہے دسویں میں عیسائیت کے حق سے انحراف اور غلو کو واضح کیا۔ گیارھویں میں بتایا کہ باایں عیسائی دین اسلام سے بہت قریب ہیں اور ان کے حق کو قبول کرنے کی خوشخبری سنائی۔ بارھویں میں عیسائیوں کی غلطیوں سے مسلمانوں کو متنبہ کیا جنہوں نے ایک طرف تو یہاں تک غلو کیا کہ عبادت کی خاطر اللہ تعالیٰ کی حلال چیزوں کو بھی حرام کر دیا۔ اور دوسری طرف دنیا میں یہاں تک منہمک ہوئے کہ حرام چیزوں جیسے شراب وغیرہ کو بھی شیر مادر بنا لیا۔ تیرھویں رکوع میں خانہ کعبہ کی حرمت کا ذکر کیا کیونکہ اگر ایک دفعہ پہلے عیسائیوں نے اس پاک گھر کو ڈھانے کا ارادہ کیا تھا تو علم الٰہی میں وہ دوسرا وقت بھی آنے والا تھا۔ جب اس پاک گھر کے متعلق عیسائی اقوام کے بدارادے ہونگے چودھویں میں بتایا کہ شریعت گو ضروری شے ہے۔ مگر ہر امر میں افراط و تفریط سے بچو۔ اور چھوٹے چھوٹے غیر ضروری سوالات سے روک کر اہم امور کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت بتائی۔ پندرھویں میں حواریوں کے مائدہ طلب کرنے کے ذکر میں عیسائیوں کے لذات دنیوی میں انہماک کی طرف توجہ دلائی۔ اور بتایا کہ اس قوم کی توجہ امور روحانی سے بالکل ہٹ کر کھانے پینے اور خواہشاتِ نفسانی کی طرف رہ جائے گی اور سولھویں اور آخری رکوع میں بتایا کہ عیسائیت کا اصول باطلہ مسیحؑ کی خدائی مسیحؑ کی تعلیم نہیں۔

تعلق: اس سورت کا ربط پہلی سورت یعنی النساء سے یوں ہے کہ اس میں معاشرت کا ذکر تھا۔ اس میں تمدن کا ذکر ہے اور معاشرت اور تمدن کے اصول ایک دوسرے سے وابستہ ہیں دوسرا امر جو اس تعلق کو ظاہر کرتا ہے یہ ہے کہ جس طرح سورۂ بقرہ میں یہودیوں کا ذکر کر کے اس کے بعد آل عمران میں عیسائیوں کا ذکر کیا تھا۔ اسی طرح النساء میں یہودیوں کا ذکر کر کے اس سورت میں عیسائیوں کا ذکر بالتفصیل کیا ہے۔ تاکہ مغضوب اور ضالین کا تقابل جس کی طرف فاتحہ میں توجہ دلائی تھی قائم رہے زیادہ تفصیلی نگاہ ڈالی جائے تو دونوں سورتوں کا ربط اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ پچھلی سورت کے آخری حصّہ میں یہودیوں کی شرارتوں کا ذکر کرتے کرتے حضرت مسیح کے خلاف ان کی شرارت کا ذکر کیا تھا اور یہاں سے انتقال مضمون عیسائیت کی طرف ہو گیا تھا اور اس لیے وہیں عقیدۂ الوہیت مسیحؑ کی بھی تردید کی تھی اور چونکہ الوہیت مسیحؑ کے عقیدہ سے شریعت کی ہتک لازم آتی تھی۔ اس لیے سورۂ مائدہ کے شروع میں شریعت کی ضرورت پر اور اس کی پیروی پر بڑا زور دیا گیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ۬ؕ اُحِلَّتۡ لَکُمۡ بَہِیۡمَۃُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ ①

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔
اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اقراروں کو پورا کرو۔[۴۷۹] تمہارے لیے چوپائے جانور حلال کیے گئے ہیں، سوائے اس کے جو تم پر پڑھا جاتا ہے نہ شکار کو حلال جاننے والے جب تم حالتِ احرام میں ہو اللہ جو چاہتا ہے حکم کرتا ہے۔[۴۸۰]

غرض ہر رنگ میں اس سورت کے اس مقام پر رکھنے میں قرآن کریم کے مضامین میں ایک ترتیب ابلغ اور محکم نظر آتی ہے۔

تاریخ نزول: ان مضامین پر جن کا ذکر اس سورت میں ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور یہی رائے اکثر محققین کی بھی ہے کہ اس سورت کے اکثر حصّہ کا نزول پانچویں اور ساتویں سال ہجری کے درمیان ہے۔ خاص خاص آیات کی خاص خاص تاریخیں مقرر کرنا اکثر حالات میں ایک بے سود کوشش ثابت ہوتی ہے مثلاً عیسائی عموماً ان آیات کو جن میں یہودیوں یا عیسائیوں کے خلاف کچھ ہو اس زمانہ کی طرف منسوب کرنے کے عادی ہیں جب ملکی وجوہات کی بنا پر ان لوگوں اور مسلمانوں کے درمیان مناقشات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ معیار صحیح نہیں۔ اسی سورت میں ایک طرف یہودیوں اور عیسائیوں کے خفیہ منصوبوں کا ذکر کر کے ان کو دوست بنانے سے روکا ہے تو دوسری طرف عیسائیوں کی نرمی اور ان کے اسلام سے قریب ہونے کا ذکر بھی ہے۔ ہاں ایک آیت بالخصوص قابلِ ذکر ہے یعنی الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی جس کے متعلق صحیح بخاری میں روایت موجود ہے کہ یہودیوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ ایک آیت تمہاری کتاب میں ہے وہ ہم پر نازل ہوتی تو ہم اسے عید کا دن بناتے تو حضرت عمرؓ نے ان کا اشارہ اسی آیت کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ہاں ہم بھی خوب جانتے ہیں کہ یہ آیت کب اور کہاں اتری اور اس وقت جب اتری رسول اللہ صلعم کہاں تھے۔ یہ عرفہ کا دن تھا اور غالباً جمعہ) اور میں بھی اُس وقت عرفہ میں تھا جب یہ آیت نازل ہوئی یعنی حجۃ الوداع میں پس یہ آیت نزول میں بالکل آخری زمانہ کی ہے۔ لیکن ترتیب میں اس کو یہاں لا کر رکھا ہے تاکہ عیسائیت پر اتمام حجت ہو۔ اس سے نہایت صفائی سے معلوم ہوا کہ ترتیب قرآنی خود اللہ تعالیٰ کی وحی سے تھی اور آیات کو صورتوں میں اپنے مقام پر اور سورتوں کو اپنی اپنی جگہ خود نبی کریم صلعم نے رکھا۔

ع۴۷۹ عقود۔ عَقد کی جمع ہے جس کے اصل معنی ہیں ایک چیز کی دو طرفوں کو اکٹھا کرنا (غ) یعنی گرہ دینا۔ اور مراد ہر مضبوط ربط اور پھر معاہدہ یا اقرار ہے اور اس میں ہر قسم کے معاہدات داخل ہیں خواہ وہ انسان کی حیوانی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں اور خواہ اس کی صفات ملکی سے اور خواہ وہ تکالیف شرعی کے رنگ کے ہوں جیسے اللہ پر ایمان اور اس کی اطاعت کا عہد خواہ وہ باہمی معاہدات نکاح یا باہم لین دین یا قوموں کے تعلقات یا دیگر امور کے متعلق ہوں بلکہ ہر قسم کے معاملات اس میں شامل ہیں جو تمدن انسانی سے پیدا ہوتے ہیں اور جن میں گو صراحت سے کوئی معاہدہ نہ ہو مگر سمجھوتہ ہوتا ہے اور بعض مفسرین نے عقود سے یہاں مراد وہ معاہدات لیے ہیں جو جاہلیت میں باہم نصرت وغیرہ کے معاہدات کیے گئے تھے جس سے معلوم ہوا کہ کفار کے ساتھ معاہدات کے بھی پورا کرنے کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔

اس حکم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامل وفاداری کی تعلیم دی ہے جو منہ سے کہیں اسے کر دکھائیں مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ وفاداری کا جوہر اپنے اندر پیدا کرے اور اگر ایک طرف یہ ضروری ہے کہ خدا کا بندہ ہونے میں پورا وفادار ہو تو یہ بھی ضروری ہے کہ اولاد ہونے میں، ماں باپ ہونے میں، خاوند یا بیوی ہونے میں، حاکم یا رعیت ہونے میں، دوست یا دشمن ہونے میں، لین دین میں اور ہر قسم کے معاملات میں وفاداری دکھلائے۔

اس سورت کو پابندی معاہدہ کے حکم سے شروع کرنے میں کئی مصالح ہیں ایک تو یہ کہ تمدن کی بنیاد پابندی معاہدہ پر ہے اور یہ سورۃ تمدن پر ہے دوسرے یہ کہ پچھلی سورت کے آخر میں عیسائی مذہب کا ذکر کیا تھا اور اس سورت میں خصوصیت سے عیسائی مذہب کا ہی ذکر ہے اور اس مذہب نے چونکہ کفارہ کا مسئلہ سکھا کر ایک حصّہ یعنی خدائی عقود یا تکالیف شرعیہ کو تو بالکل ہی جواب دیا اور دوسرے حصّہ یعنی انسانوں یا قوموں کے باہمی معاہدات کی بھی اس مذہب کے پیرووں نے کم پروا کی ہے اس لیے مسلمانوں کو متنبہ کرنا ضروری تھا۔ تیسرے اس سورت میں یہودیوں اور عیسائیوں کی عہد شکنی کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اور پچھلی سورت سے اس کا یہ تعلق ہے کہ اس میں بھی بہت سے عقود کا ذکر ہے گویا ان کو بیان کر کے اور اور عقود کے لیے بطور تمہید فرمایا کہ سب عقود کو پورا کرو۔

ع۴۸۰ بھیمۃ۔ بُھْمۃ سخت پتھر کو اور پھر اس سے تشبیہ کے لحاظ سے شجاع کو کہا جاتا ہے اور بھیمۃ اس کو کہتے ہیں جس میں قوت گویائی نہیں اور عرف میں درندوں اور پرندوں کے سوائے دوسرے حیوانات پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے (غ) یا ہر ایک چارپایہ پر خشکی میں ہو یا سمندر میں۔

الانعام۔ نَعَمٌ کی جمع ہے اور نِعمۃ حالت حسنہ کا نام ہے اور قلیل و کثیر سب پر بولا جاتا ہے وان تعدّوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا (ابراھیم ۱۴-۳۴) نعمتی التی انعمت علیکم (البقرۃ ۲-۴۰) فانقلبوا بنعمۃ من اللہ (آل عمران ۳-۱۷۴) اور اَنعام خصوصیت سے اونٹ پر بولا جاتا ہے کیونکہ اونٹ ان کے لیے سب سے بڑی نعمت تھی اور اس میں گائے بھیڑ بکری بھی شامل ہیں (غ) اور بھیمۃ الانعام کی اضافت بیان کے لیے ہے اور بعض نے تشبیہ کے لیے اضافت لی ہے یعنی انعام سے ملتے جلتے جانور۔

مُحِلِّی۔ اصل میں مُحِلّین ہے حَلّ کے معنی گرہ کا کھولنا ہیں واحلل عقدۃ من لسانی (طٰہٰ ۲۰-۲۷) اور حلّ کا لفظ جو اترنے پر بولا جاتا ہے تو اس لحاظ سے کہ

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ
وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا
الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ
يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ
وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ
شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے نشانوں کی بے حرمتی نہ کرو،
اور نہ حرمت والے مہینے کی اور نہ قربانیوں کی اور نہ اُن کی
جو گانی پہنائے گئے ہوں اور نہ حرمت والے گھر کا قصد کرنیوالوں کی
وہ اپنے رب سے فضل اور خوشنودی چاہتے ہیں [۷۸۰]
اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کرو اور کسی قوم کی دشمنی
کہ انھوں نے تم کو حرمت والی مسجد سے روکا تم کو اس بات پر
آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کرو [۷۸۲] اور نیکی اور تقوٰے پر ایک دوسرے

اُترنے کے وقت بوجہ کھولے جاتے ہیں او تحلّ قریباً من دارھم (الرعد [۱۳]-۳۱) واحلّوا قومھم دار البوار (ابراھیم [۱۴]-۲۸) مَحَلّہٗ اصل میں مکان نزول ہے اور کسی چیز کا حلال ہونا حل عقدہ سے لیا گیا ہے (غ) اور کسی شخص کو حلال کہا جاتا ہے جب وہ حالت احرام سے نکل جائے (غ) واذا حللتم فاصطادوا (۲)

الصید۔ صاد سے مصدر ہے اور اس کے معنی ہیں جو چیز انسان کے لیے ممتنع ہے اس کو کامیاب ہو کر حاصل کر لینا اور عرف شریعت میں حیوانات کا پالینا جو انسان کے قبضہ میں نہیں جب تک کہ وہ دوسرے کی مِلک نہ ہوں اور اسی سے اصطیاد ہے فاصطادوا (۲) اور یہاں صید سے مراد ایسے حیوانات ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے کیونکہ حالت احرام میں سانپ اور بچھّو اور دوسرے موذی جانوروں کا مارنا جائز ہے (غ)
حُرُم۔ حَرام کی جمع ہے اور حَرام اور مُحرِم کے ایک معنی ہیں اور وہ وہ شخص ہے جو حالت احرام میں ہو (غ) یعنی اس خاص حالت میں جو حاجی اختیار کرتے ہیں۔
ما یُتلٰی علیکم سوائے اس کے جو تم پر پڑھا جاتا ہے۔ مراد مُردار وغیرہ ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔
جو چیزیں انسان سے احکام الٰہی کی پابندی تڑواتی ہیں وہ اس کی خواہشات ہیں اور ان خواہشات میں سب سے بڑھ کر کھانے پینے کی خواہش ہے اس لیے سب سے پہلے کھانے پینے کی حلت و حرمت کے احکام کو بیان کیا اور اس لیے بھی کہ عیسائیوں نے جن سے اس سورت میں خاص بحث ہے کھانے پینے کی حلت و حرمت کو بالکل اٹھا دیا ہے اور کھانے پینے کی خواہشات ان پر یہاں تک غالب ہوئی ہیں کہ اس بارہ میں انہوں نے ہر ایک قید کو توڑ دیا ہے اور شریعت کی بھی کوئی پروا نہیں کی۔
[۷۸۱] شعائر۔ شعیرۃ کی جمع ہے یعنی وہ چیز جو علامت یا نشان قرار دی جائے (غ) اور اس سے مراد وہ تمام امور ہیں جن میں انسان شرعًا مکلّف کیا گیا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی سب حدود اور فرائض اور امر اور نہی داخل ہیں (ج) اس لیے حسن کا قول ہے کہ شعائر اللہ سے مراد دین اللہ ہے۔ بعض نے خاص شعائرِ حج سے مخصوص کیا ہے مگر اس کی کوئی وجہ نہیں۔
الشھر الحرام۔ جنس کے طور پر نام لے دیا ہے مراد سارے حرمت کے مہینے ہیں۔
ھَدْی۔ ھَدِیَّۃٌ کی جمع ہے یعنی وہ چیز جو لے جائی جاتی ہے مگر ھَدْی ان قربانیوں سے مخصوص ہے جو خانہ کعبہ کو لے جائی جاتی ہیں (غ) اور ھَدِیّۃ تحفہ سے مخصوص ہے جو ہم ایک دوسرے کی طرف لے جاتے ہیں بل انتم بھدیّتکم تفرحون (النمل [۲۷]-۳۶) (غ)
قلائد۔ قِلادۃ کی جمع ہے قَلد کے اصل معنی بٹنا ہیں اور قِلادۃ وہ بٹی ہوئی چیز ہے جو گلے میں پہنی جاتی ہے یعنی ہار (غ) ان جانوروں کو جن کو قربانی کے طور پر لے جاتے تھے اور بطور عزّت یا نشان ان کے گلے میں گانی یا ہار پہناتے تھے قلاید کہتے تھے۔ اور حج کو جانے یا وہاں سے واپس آنے والے خود بھی اسی طرح ہار پہن لیتے تھے تاکہ ان کو کوئی دکھ نہ پہنچائے۔
آمّین البیت الحرام سے مراد وہ لوگ ہیں جو خانہ کعبہ کا قصد کرتے ہوں امّ کے معنی ہیں قصد کیا۔ کافر مراد نہیں ہو سکتے اس لیئے کہ یبتغون فضلاً من اللہ و رضوانا مومنوں کی ہی شان ہے۔
اوفوا بالعقود کی تفسیر میں پہلے شعائر اللہ یعنی حدود اللہ کا ذکر کیا کہ ان کی بے حرمتی نہ کرو یعنی حدود الٰہی کو پورا کرو۔ یہ تو عام سب حدود پر مشتمل ہے اور ان حدود الٰہی میں پھر خصوصیت سے خانہ کعبہ کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیزوں کا ذکر کیا کہ خواہ کیسی بھی ادنٰی سے ادنٰی چیز ہو مگر جب خدا کا حکم اس کے متعلق آگیا تو اس کی عزت کرو۔ مسلمانوں کو حکم ہے دوسری قوموں کو بھی ضمناً سمجھایا ہے کہ خانہ کعبہ سے تعلق رکھنے والی چیزوں کی بیحرمتی نہ کریں چہ جائیکہ خود خانہ کعبہ کے متعلق کوئی بُرا ارادہ کریں۔
[۷۸۲] یجرمن یجرم کا اصل جَرْم جس کے معنی ہیں درخت سے پھل کاٹنا اور اَجْرَم کے معنی ہیں صار ذا جَرْم اور ہر ایک ناپسندیدہ امر کے اکتساب پر بولا

وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲﴾

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَئِسَ

کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ اور اللہ کا تقویٰ کرو اللہ (بدی کی) سزا دینے میں سخت ہے[۴۸۳]

مُردار تم پر حرام کیا گیا ہے اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جس پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام پکارا جائے اور گلا گھُٹ کر مرا ہوا اور چوٹ لگ کر مرا ہوا اور گر کر مرا ہوا اور سینگ لگ کر مرا ہُوا اور وہ جسے درندوں نے کھایا ہو ہاں جسے تم ذبح کرلو[۴۸۴] (وہ کھالو) اور وہ بھی (حرام ہے) جو تھانوں پر ذبح کیا گیا ہو۔ اور یہ کہ تم پاسوں سے قسمت معلوم کرو، یہ سب نافرمانی ہے[۴۸۵]۔ آج وہ لوگ جو کافر

جاتا ہے اسی سے مُجْرِم ہے اور جَرَم بمعنی کسب بھی آتا ہے یعنی کمایا (غ) اور یہاں یجرمنّ کے معنی یجھلن بھی کیئے گئے ہیں (ن)
شنآن کے معنی لبغض ہیں اسی سے ہے اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (الکوثر ۱۰۸-۳)

حدود اللہ کی طرف توجہ دلا کر اب انسانوں کے ایک دوسرے پر حقوق کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ دشمن کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرنا یعنی اس کے حقوق اس کو دینا یہ سب سے مشکل کام ہے اس لیے اس کا ذکر کرکے سمجھا دیا کہ جو دشمن نہ ہوں یا جن سے تعلقات محبّت یا اتحاد ہوں ان کے حقوق کی نگہداشت کس قدر ضروری ہے اور پھر دشمن کے لفظ کو عام بھی نہیں رکھا کیونکہ بعض وقت محض غیریت قومی سے ایک قوم کو دشمن سمجھ لیا جاتا ہے بلکہ ان صدوکم عن المسجد الحرام کہہ کر بتا دیا کہ وہ دشمن جو تم کو انتہا درجہ کے دکھ پہنچا چکے ہیں تم کو گھروں سے نکال چکے ہیں اور تمہارے مذہبی فریضہ تک کی ادائگی میں حائل ہوئے ہیں ان سے بھی عدل کرو یعنی ان کے حقوق ان کو دو۔ پس پابندئ معاہدہ سخت ترین دشمن کے ساتھ بھی چاہیئے اور نہ صرف پابندی معاہدہ بلکہ حالت تمدن اور معاشرت سے جو حقوق پیدا ہوتے ہیں وہ بھی دینے چاہئیں۔

۴۸۳ قومیت کی بنیاد ایک دوسرے کی اعانت ہے، جب اس قدر انصاف کی تعلیم دی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قوم کیوں کر بن سکتی ہے۔ جو اپنی قوم کے حقوق تھے کہ ایک دوسرے پر زیادتی نہ ہو وہ تو دشمن قوم کو دیدیئے اس لیے دونوں باتوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے فرمایا کہ دشمنوں کو تو ان کے حقوق دیتے ہو مگر اپنی قوم کے حقوق تو یہ ہیں کہ ایک دوسرے کی اعانت کرو ہاں اعانت صرف نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ہو۔ گناہ اور زیادتی میں اعانت نہ ہو۔ کیسا پاک اصول ہے جو تمدن کی بنیاد کے طور پر قائم کرکے دنیا میں صلح اور آشتی کی بنیاد ڈالی ہے اور تمام قومی عناد دوں کی جڑ کاٹ دی ہے قوم اور ملک اور رنگ کے تفرقوں سے جو امتیاز لوگوں نے بنا رکھے ہیں اور اس طرح پر بعض قوموں نے دوسری قوموں پر محض قومیت کے فرق کی وجہ سے وہ سلوک جائز رکھا ہے جس کو اپنی قوم کے ساتھ ظلم قرار دیا گیا ہے ان تمام کو اسلام نے بکسر مٹا دیا ہے۔ ایک دوسرے کی اعانت کرکے قومیت بناؤ مگر اتلافِ حقوقِ نسلِ انسانی کا جہاں معاملہ ہو وہاں قومیت کی آڑ نہ تلاش کرو۔ کیونکہ قومیّت میں ایک دوسرے کی اعانت صرف اچھے کاموں میں ہونی چاہیئے۔

۴۸۴ منخنقۃ۔ خنق سے ہے جس کے معنی گلا گھونٹا ہوا یہاں تک کہ مرجائے۔ موقوذۃ۔ وقذ سے ہے جو چوٹ مارنے سے مرجائے۔ متردّیۃ۔ ردی سے ہے جس کے معنی ہلاک ہیں اور تردّی کے معنی ہیں ہلاکت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا۔ ما یغنی عنہ مالہ اذا تردّی (اللّیل ۹۲-۱۱) اور متردّیۃ وہ ہے جو گر کر مرگیا ہو۔ نطیحۃ۔ نطح سے ہے جو نطاح یعنی سینگ مارنے سے مرجائے (غ)

سبع۔ سَبْع عدد ہے یعنی سات اور سَبُع درندہ ہے گویا یہ نام اس کا قوت کے کمال کے لحاظ سے رکھا گیا ہے کیونکہ سات اعداد تامہ سے ہے (غ)

ذکّیتم۔ ذکا سے ہے جو اصل میں آگ کے جلنے پر بولا جاتا ہے اور ذکّیتُ الشاۃ کے معنی ہیں میں نے بکری کو ذبح کیا۔ گویا حرارت غریزی کا اخراج تذکیہ ہے یعنی خون کے نکل جانے کا۔ اس لیے شریعت میں اسے جانور کو ذبح کرکے مارنے پر بولا گیا ہے (غ)

یہاں حرمت کی چیزوں کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان جانوروں کو جو صدمات سے مرجائیں جیسے گلا گھُٹ کر یا چوٹ سے یا گر کر یا سینگ لگنے سے یا درندوں کے پھاڑ دینے سے مردار میں ہی شامل کیا ہے الّا ما ذکّیتم یہاں بطور استثنائے منقطع ہے۔ یعنی جس جانور کو ذبح کرو اُسے ہی کھاؤ اور اس میں یہ بھی شامل ہے کہ چوٹ سینگ لگا ہوا وغیرہ جانور اگر ابھی مرا نہ ہوا اور ذبح کے قابل ہو تو وہ بھی ذبح کرکے کھایا جاسکتا ہے۔

ذبح کی غرض: اور لفظ تذکیہ میں بتا دیا کہ اصل ذبح یعنی خون نکالنا ہے اس لیے بجائے ذبح کے تذکیۃ کا لفظ اختیار کیا کیونکہ خون میں بہت قسم کی زہریں ہیں۔ اور تذکیہ اسی جانور کا ہوسکتا ہے جس میں زندگی باقی ہو، یعنی کچھ حرارت غریزی موجود ہو اس لیے بھی یہی لفظ زیادہ موزوں تھا۔

۴۸۵ نُصُب کا واحد نصیب ہے، وہ پتھر جو کسی چیز پر گاڑا جائے اور نصب کے اصل معنی وضع یعنی رکھنا ہیں۔ یہ کچھ پتھر تھے جن کی وہ لوگ عبادت کرتے

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ ۔۔۔ ہیں تمھارے دین سے نا امید ہو گئے ، سو اُن سے نہ ڈرو

وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ۔۔۔ اور مجھ سے ڈرو ۷۸۶۔ آج میں نے تمھارا دین تمھارے لیے کامل

تھے اور ان پر جانور بھی ذبح کرتے تھے (غ) دوسری جگہ جمع انصاب بھی آئی ہے، والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان (المائدہ ۵-۹۰) یا وہ پتھر مراد ہیں جو کعبہ کے گرد گاڑے ہوئے تھے جن پر جانور ذبح کرکے خون ان پر چھڑکا جاتا تھا (ج) ماذبح علی النصب سے مراد ایسے جانور ہیں جو بتوں کے نام پر ذبح کیے جائیں۔

تستقسموا۔ استقسام قِسم سے ہے اور قسم حظ یا نصیب یعنی حصہ کو کہا جاتا ہے (ل) اور استقسام کے معنی ہیں اس کا طلب کرنا جو کسی کے لیے مقدر کیا گیا ہے یعنی ایک امر کو کرے۔ یا نہ کرے (ل) اور بعض وقت یہ صرف قَسْم یعنی حصّہ کے جدا کرنے پر بھی استعمال ہوتا ہے (غ)

ازلام۔ زُلَم یا زَلَم کی جمع ہے وہ تیر جس پر پَر نہ لگائے گئے ہوں (جن کی مدد سے تیر ہوا میں اُڑتا ہے۔ یعنی صرف تیر کی شکل پر لکڑی ہوتی تھی) اور اہل جاہلیت اس سے قسمت معلوم کرتے تھے (ل) اور قسم کے نیچے لکھا ہے کہ ازلام جُوئے کے تیر نہ تھے جن سے ذبح کردہ اونٹنی کے گوشت کے حصّے کیے جاتے تھے بلکہ قسمت معلوم کرنے کے تیر تھے۔

جاہلیت میں فال نکالنے کا دستور: اور حدیث ہجرت میں سراقہ کی روایت میں آتا ہے فاخرجت الازلام یعنی سراقہ کہتا ہے کہ جب میں رسول اللہ صلعم کے تعاقب میں گھوڑا دوڑاتا ہوا آپؐ کے قریب پہنچ گیا اور گھوڑے نے ٹھوکر کھائی تو میں نے تیر سے فال نکالی (ل) اور بعض کے نزدیک یہ تین تیر ہوتے تھے جن سے ہر ایک اہم کام کے کرنے میں مثلاً سفر پر جانا یا شادی کرنا یا بیع یا جنگ پر جانا وغیرہ فال لی جاتی تھی کہ یہ کام کرنا چاہیئے یا نہیں۔ ایک پر لکھا ہوتا امرنی ربی میرے رب نے اس کام کے کرنے کا مجھے حکم دیا ہے اگر وہ تیر نکل آتا تو کام کرلیا جاتا اور ایک پر نہانی ربی لکھا ہوتا وہ نکلتا تو نہ کیا جاتا۔ اور ایک خالی ہوتا جس کے نکلنے پر فال دوبارہ نکالی جاتی۔ اور بعض کے نزدیک اصل میں سات تیر تھے جو ہبل کے بُت کے پاس جو قریش کا سب سے بڑا بُت تھا اور کعبہ میں تھا رکھے ہوئے تھے جن میں سے کسی پر دیت کے کسی پر پانی کی تقسیم کے کسی پر کسی قوم میں سے ہونے یا نہ ہونے کے احکام لکھے ہوئے تھے۔ اور کاہن سے تیر نکلوا کر اس کے مطابق عمل کیا جاتا۔ اور ایسی فال نکلواتے وقت چڑھاوا چڑھایا جاتا جس میں سو درہم اور اونٹنیاں ہوتی تھیں (ج) اور بعض نے ان سے جوئے کے تیر مراد لیے ہیں جن سے اونٹنی ذبح کرکے اس کے گوشت کے حصّے کیے جاتے تھے۔

غیر اللہ کے نام پر جانور کا ذبح کرنا: یہاں ایک تو اس گوشت کو حرام کیا جو بتوں وغیرہ پر چڑھاوے چڑھا کر جانور ذبح کیے جاتے یا ان کا خون بتوں پر چھڑکا جاتا گویا اس کو بھی ما اھل لغیر اللہ بہ میں داخل کیا جس طرح گلا گھٹکر مرے ہوئے وغیرہ کو میتۃ میں داخل کیا۔ اور جس طرح ما اھل لغیر اللہ بہ کو دوسری جگہ فسق یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی قرار دیا اسی طرح یہاں بتوں وغیرہ کے چڑھاووں کو فسق کہا ہے۔ اسی سے قبروں اور مزاروں کے چڑھاووں کا قیاس ہوسکتا ہے مگر اس میں صرف وہی جانور داخل ہونگے جو قبروں پر ذبح کیے جائیں۔

اور دوسری چیز جس کو یہاں حرام کیا ہے گو وہ کھانے کی چیز نہیں وہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے میں فالوں کا نکالنا ہے جو پجاریوں کے ذریعہ سے بھی نکلوائی جاتی تھیں اور لوگ خود بھی نکال لیتے تھے اور چونکہ پجاریوں سے فال نکلوانے میں چڑھاوے بھی چڑھائے جاتے تھے تو شاید اس مناسبت سے اس کا ذکر یہاں کردیا ہے یا اس لیے کہ حرمت صرف کھانے پینے کی چیزوں میں نہیں دوسرے افعال میں بھی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فال نکالنا کیسا ہے۔ قرآن کریم کے اس بیان سے تو فال نکالنے کی صاف حرمت نظر آتی ہے اور یہ عذر نہیں ہوسکتا کہ وہ فال دیوان حافظ یا کسی اور اچھی کتاب سے نکالی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ قرآن کریم سے فال نکالنا بھی نعوذ باللہ قرآن کو ازلام کا مقام دینا ہے اور یہ جو نبی کریم صلعم کے فال حسن کا ذکر احادیث میں آتا ہے تو اس سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ نبی کریم صلعم کسی کام کے کرنے سے پہلے فال نکالا کرتے ہوں اور فال نکل آئی تو کام کرلیا ورنہ نہ کیا۔ بلکہ وہ صرف اس قدر ہے کہ کبھی کوئی اچھی چیز یا اچھا نام اتفاق سے سامنے آگیا تو اس سے آپ کو خوشی ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کام کا انجام بھی نیک کرے گا۔ اور اس میں بھی کسی بُرے نام سے بدشگونی کبھی نہ لیتے تھے۔ کہ اس کی وجہ سے کام کرنے سے رُک جائیں جس طرح اہل جاہلیت کرتے تھے۔ ایسا ہی احادیث میں جو ذکر استخارہ کا ہے اس سے بھی ہرگز یہ مراد نہیں کہ استخارہ سے فال لی جاتی ہے کہ کوئی اچھا خواب آجائے تو وہ کام کرلیا جائے ورنہ نہ کیا جائے بلکہ دعائے استخارہ میں صرف یہ دعا کی جاتی ہے کہ اے خدا اگر تیرے علم میں یہ امر جو میں کرنا چاہتا ہوں میرے دین و دنیا میں نافع ہے تو میرے لیے اس کے سامان مہیّا کردے اور اگر یہ میرے دین و دنیا کے لئے بُرا ہے۔ تو اس سے مجھے پھیردے اور ظاہر ہے کہ یہ صرف استعانت باللہ ہے نہ کچھ اور۔ اور قرعہ اندازی کو بھی فال نکالنے سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ قرعہ اندازی صرف یہ ہے کہ ایک تقسیم میں جب ترجیح کے لیے مرجح نہ ہو قرعہ اندازی سے جھگڑے کو ختم کردیا جائے مثلاً شرکاء میں مال کا تقسیم کرنا کہ جب حصّے ایک سے ہوگئے تو اب بجائے اس کے کہ کسی ایک کو دوسروں پر ترجیح دے کر اسے ایک حصّہ چننے کا اختیار دیا جائے۔ قرعہ اندازی سے جو جس کے حصّے میں آیا اسے دیدیا۔ ایسا ہی حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے وصیت میں چھ غلام آزاد کیے اور اس کا کوئی اور مال نہ تھا تو آنحضرت صلعم نے ایک تہائی کی وصیت کو جائز رکھ کر دو غلاموں کو بذریعہ قرعہ اندازی آزاد کردیا۔ کیونکہ مالک نے خود تعیین نہ کی تھی۔

ع۷۸۶ یئس۔ یأس۔ طمع یا آرزو کا باقی نہ رہنا ہے۔

وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ

کردیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کردیا اور تمہارا دین اسلام ہونے پر میں راضی ہوا۔ ۴۸۷ پھر جو شخص بھوک سے مجبور ہو جائے گناہ کی طرف جھکنے والا نہ ہو تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے

تخشوا ۔ خشیۃ ۔ وہ خوف ہے جس کے ساتھ تعظیم ملی ہوئی ہو۔ اور اکثر یہ اس کے علم سے ہوتا ہے جس سے خشیت ہو اسی لیے فرمایا انما یخشی اللہ من عبادہ العلمٰؤا (فاطر ۳۵ - ۲۸) (غ)

اسلام کے کمال غلبہ کی پیشگوئیاں: کافروں کے دین اسلام سے مایوس ہو جانے سے یہ مطلب ہے کہ یہ امیدیں جو اُن کو لگی ہوئی تھیں کہ دین اسلام کو مٹا دینگے یا مسلمانوں کو مجبور کرکے کفر کی طرف لوٹا لیں گے بوجہ غلبۂ اسلام کے منقطع ہوگئیں ۔ اور اس میں ایک پیشگوئی بھی ہے کہ اب کافر دین اسلام کو کبھی بھی مٹا نہ سکیں گے آج بھی کفار اپنی اَن تھک کوششوں کے باوجود خوب جانتے ہیں کہ وہ دین اسلام کو اب دنیا سے نہیں مٹا سکتے اور یہ جو فرمایا کہ ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو، تو مطلب یہ ہے کہ اب ان کے دوبارہ غلبہ سے مت خوف کرو۔ ہاں احکام الٰہی کی خلاف ورزی اور حدود اللہ کے توڑنے سے بچو اور اس سے ڈرو یعنی اگر تم کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اس وجہ سے پہنچے گا کہ تم اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرو گے ۔ اور اگر تم اپنے عہد پر مضبوط رہو تو کفر کا خوف مت کرو کہ وہ بھی کبھی تم کو کھا سکتا ہے ۔ اس میں بھی اشارہ دین اسلام کے کمال غلبہ اور اسلامی حکومت کے دنیا پر پھیل جانے کی طرف ہے یعنی اس قدر تمہارا غلبہ دنیا میں ہوگا کہ دنیا کی کوئی طاقت تم کو برباد نہ کرسکے گی ۔ لیکن اگر تم احکام الٰہی کی فرمانبرداری نہ کرو تو یہ تمہارا اپنا فعل تمہیں اس بلند مقام سے گرا دے گا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی خشیت جس کا ذکر بار بار قرآن شریف میں آتا ہے کیا ہے ؟ ایک ڈرنا انسان کا وہ ہوتا ہے کہ وہ ایک چیز سے خائف ہو کر بھاگتا ہے ۔ لیکن جیسا کہ امام راغبؒ نے خشیۃ کے معنی میں لکھا ہے اللہ تعالیٰ کے خوف سے مراد وہ خوف ہے جس میں تعظیم ملی ہوئی ہو یعنی اس چیز کی عزت اور محبّت دل میں ہو۔ اب ظاہر ہے کہ محبوب چیز کا خوف یہ نہیں ہوتا کہ انسان اس سے بھاگتا ہے، بلکہ اس کی صورت میں خوف یہ ہے کہ کوئی ایسی بات پیدا نہ ہو جائے کہ انسان اس اپنی محبوب چیز سے دُور ہو جائے یا کوئی امر اس کی ناراضگی کا انسان سے سرزد ہو۔ پس خشیۃ اللہ کے معنی یہی ہیں کہ حدود اللہ کے توڑنے کا خوف ہو اس لیے قرآن شریف نے فرمایا کہ خشیۃ اللہ صرف علماء کے قلوب میں پیدا ہوسکتی ہے ۔ کیونکہ وہ حدود الٰہی کا علم رکھتے ہیں اور صفات الٰہی سے واقف ہوتے ہیں اور حدود اللہ کے توڑنے کی کبھی جرأت نہیں کرسکتے اور اپنے میثاق اور عہد پر قائم رہتے ہیں۔

۴۸۷ اکملت ۔ کسی چیز کا کمال یہ ہے کہ جو اس سے غرض تھی وہ حاصل ہو جائے اسی لیے جب کسی چیز کے متعلق کہا جائے کہ وہ کامل ہوگئی تو مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ جو غرض اس سے تھی وہ حاصل ہوگئی اور حولین کاملین (البقرۃ ۲ - ۲۳۳) میں مراد یہ ہے کہ یہ اس مدّت کی غائت ہے جس کا تعلق بچّہ کی صلاحیت سے ہے اور لیحملوا اوزارھم کاملۃ یوم القیٰمۃ (النحل ۱۶ - ۲۵) میں کمال عقوبت مراد ہے (غ) پس اکملت لکم دینکم سے مراد یہ ہوئی کہ جو غرض دین سے حاصل ہوسکتی ہے وہ بدرجہ کمال تمہارے اس دین سے حاصل ہوگی ۔ اب اس کے بعد کسی اور نبی کی ضرورت نہیں کہ وہ دین کو کامل کرنے کے لیے آئے جیسے پہلے آتے تھے۔

اتممت کسی چیز کا تمام اس کا اس حد تک پہنچ جانا ہے کہ وہ اپنے سے خارج کسی چیز کی محتاج نہ رہے اور وہ چیز جو اپنے سے خارج کسی چیز کی محتاج ہے اسے ناقص کہا جاتا ہے وتمّت کلمت ربّک (الاعراف ۷ - ۱۳۷) واللہ متم نورہ (الصف ۶۱ - ۸) (غ)

رضیت ۔ بندہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے امر پر عمل کرنے والا اور اپنی نہی سے رکنے والا پائے (غ)

اسلام میں تکمیل: یہ آیت حجۃ الوداع میں عرفہ کے دن (جو جمعہ تھا) میدان عرفات میں بعد از عصر نازل ہوئی ۔ جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ یہود نے حضرت عمرؓ کو کہا کہ ایک آیت تمہاری کتاب میں ہے ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بناتے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں یہ آیت فلاں وقت فلاں دن نازل ہوئی آنحضرت صلعم سے پہلے جس قدر انبیاء آئے چونکہ وہ خاص خاص قوموں کی طرف خاص خاص زمانوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے اس لیے ابھی تکمیل دین کی ضرورت پیش نہ آئی تھی ۔ اور نہ وہ کامل دین ابھی آیا تھا جس نے ساری دنیا کو ایک ہی سلسلہ اخوت میں منسلک کرنا تھا چنانچہ اس کی شہادت مخصوص القوم نبیوں میں سے آخری نبی حضرت مسیحؑ کے کلام سے ملتی ہے "میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ مَیں تمہیں کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کرسکتے ۔ لیکن جب وہ یعنی روح حق آوے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتا دیگی"۔ (یوحنا ۱۶ : ۱۲ و ۱۳) پس معلوم ہوا کہ حضرت مسیحؑ کی تعلیم تک ابھی دنیا پر "ساری سچائی کی راہیں" ظاہر نہ ہوئی تھیں حضرت مسیحؑ کی زبان سے اس اعتراف کا اناجیل میں موجود ہونا اور نبی کریم صلعم پر دین کے کامل کیا جانے کی آیت کا نزول صاف بتاتا ہے کہ اسلام سے پہلے کوئی دین کمال کی حالت کو نہیں پہنچا، بلکہ ضروریات وقتی کو پورا کرنے والا تھا۔ مگر اسلام میں مذہب کمال کو پہنچا اور اس لیے ساری دنیا کا مذہب اسلام ہی ہوسکتا ہے نہ عیسائیت اور انہیں دو مذاہب کا اب مقابلہ دنیا میں ہے ۔ اس آیت کے اس موقعہ پر رکھنے میں یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سورت میں عیسائیوں سے ہی زیادہ بحث ہے ۔ ابتدا بھی انہی کے عقیدوں کی تردید سے کی ہے اور ختم بھی انہی کے عقیدوں کی تردید پر کیا ہے اور پھر اس کو وہاں رکھا ہے جہاں کمال درجہ کی تفصیلات شریعت ہیں یہ ظاہر کرنے کو کہ دین بغیر شریعت کوئی دین نہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کامل دین میں شریعت کی ضروری تفصیلات کو بھی کمال تک پہنچا دیا ہے ۔ اس کے

اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٣
يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ
لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ
مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ز
فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ
اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝٤
اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ

والا ہے [۴۸۸]
تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے کہہ تمھارے
لیے ستھری چیزیں حلال کی گئی ہیں اور وہ جو تم شکاری جانوروں کو
شکار کی تعلیم دیتے ہوئے سکھاؤ تم ان کو سکھاتے ہو اس (علم)
سے جو اللہ نے تمھیں سکھایا سو جس کو وہ تمھارے لیے پکڑ رکھیں اس سے
کھالو اور اس پر اللہ کا نام یاد کرو اور اللہ کا تقوٰی کرو۔ اللہ
جلد حساب لینے والا ہے [۴۸۹]
آج تمھارے لیے ستھری چیزیں حلال کی گئیں اور ان لوگوں
کا کھانا جن کو کتاب دی گئی تمھارے لیے حلال ہے اور

نزول کے بعد آنحضرت صلعم پر کوئی تفصیل شریعت یعنی امر و نہی نازل نہیں ہُوا اور آپؐ اس کے بعد ۸۲ دن زندہ رہے۔

دین اسلام کے کمال میں کیا کیا باتیں داخل ہیں؟ جو جو غرض دین کی ہوسکتی ہے ان سب اغراض کو اسلام نے پورا کردیا۔ یہ ایک بہت لمبا مضمون ہے نمونہ کے طور پر دیکھ لو کہ کتاب ایسی کامل کہ فیہا کتب قیّمۃ سب مضبوط کتابیں اس کے اندر ہیں یعنی پہلی کل صداقتیں جن کا دنیا میں رہنا ضروری تھا اس کے اندر جمع کردی گئیں۔ بلکہ آئندہ بھی کوئی ایسی صداقت دینی ظاہر نہ ہو گی جو قرآن کریم کے اندر نہ ہو ولا یاتونك بمثلٍ اِلّا جئنٰك بالحق (الفرقان ۲۵-۳۳) کوئی نادر بات پیش نہیں کرسکتے۔ مگر ہم حق کے ساتھ اسے پہلے ہی تجھے بتا چکے ہیں۔ سب مذاہب پر بحث موجود۔ ہر ایک عقیدۂ حقہ کی تائید اور عقیدۂ باطلہ کی تردید موجود حتّٰی کہ ان عقاید کی بھی جو اس وقت اہل عرب کے علم میں نہ تھے۔ پھر سب مذاہب کو خدا کی طرف سے مان کر ان کے اختلافات میں فیصلہ کی ایک نہایت ہی لطیف راہ بتائی۔ پھر ہر ایک دعوٰی بھی خود پیش کیا۔ دلائل بھی خود دیئے۔ کوئی حملہ اس پر ایسا نہیں ہوسکتا۔ کہ اس کے کسی اصول کو غلط ٹھہرا دے جس نیکی اور خلق کو سکھایا کمال کے رنگ میں سکھایا کہ اس سے آگے اس نیکی یا خلق کا کوئی مرتبہ نہیں جس بدی سے روکا اس کے مبادی سے بھی بچنے کی راہیں ساتھ ہی بتائیں۔ یہاں تک کہ باریک سے باریک باتیں جو کسی بدی کی طرف لے جاسکتی ہیں ان کو بھی واضح کردیا۔ جو وعدہ دیا اس کو اسی دنیا میں پورا کرکے دکھایا اور صرف آخرت کے انتظار پر نہیں چھوڑا جس مقام پر انسانوں کو پہنچانے کا دعوٰی کیا تھا اس مقام پر پہنچا کر دکھا دیا۔ تعلیم ایسی کامل کہ سب ملکوں سب قوموں سب زمانوں کی ضروریات کے لیے کافی۔ وہ تعلیم جس کا محتاج ایک وحشی سے وحشی انسان اور ادنی درجہ کی تہذیب والی قومیں ہوسکتی ہیں وہ بھی اس میں موجود ہے۔ اور وہ تعلیم جس کا ایک بڑے سے بڑا فلسفی اور سائنسدان اور تہذیب کی چوٹی پر پہنچی ہوئی قومیں محتاج ہوسکتی ہیں وہ بھی اس میں موجود ہے ما فرّطنا فی الکتاب من شیٔ (الانعام ۶-۳۸) پھر محمد رسول اللہ صلعم نے اپنی زندگی میں اخلاق کے سارے شعبے اور زندگی کے سارے پہلو عمل میں لا کر دکھا دیئے۔ اگر ہر ایک نبیؑ ایک روشن چراغ تھا جس نے ایک اندھیری رات میں ایک قوم کو روشن کیا تو محمد رسول اللہ صلعم آفتاب عالمتاب تھے جن کی شعاعوں نے سارے عالم کو منوّر کردیا۔ دنیا کے اور کسی نبیؑ یا کسی کتاب میں نہ یہ باتیں جمع ہوئیں اور نہ ہی کسی نے تکمیل تک پہنچانے کا دعوٰی کیا۔

اکمال دین کے ساتھ دو باتوں کا اور ذکر کیا۔ ایک اتمام نعمت اور وہ یہ کہ دینی اور دنیوی طور پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کسی چیز میں کسی دوسرے کا محتاج نہ رہنے دیا، بلکہ ہر قسم کی نعمتوں سے اُن کو یہاں تک حصّہ دیا کہ وہ دوسروں کے محتاج نہ رہے بلکہ دوسرے ان کے محتاج ہوگئے۔ یہ اتمام نعمت اکمال دین کا ہی نتیجہ تھا اور دوسری بات فرمائی کہ مَیں اس پر راضی ہوا کہ تم نے اسلام یعنی میرے امر کی فرمانبرداری اور میری اطاعت کی پابندی کو بطور دین اختیار کیا جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی کمال اطاعت کا ذکر ہے اور اس ذکر کی یہاں ضرورت اس لیے ہوئی (حالانکہ صحابہؓ تو شروع سے ہی اطاعت کرتے تھے) کہ یہاں اکمال دین کا ذکر ہے یعنی جس قدر ہدایات دین کی تھیں وہ سب دے دی گئیں تو ساتھ ہی فرمایا کہ ان سب میں تم نے فرمانبرداری کا بھی کمال دکھایا۔ مال و جان خدا کی راہ میں دیدینے کے بارہ میں۔ رسم و رواج کے چھوڑنے کے بارہ میں۔ عبادات کے بجالانے کے بارہ میں۔ ہر ایک قسم کی بدی سے اجتناب میں۔ غرض اللہ تعالیٰ کے ایک ایک حکم کی اطاعت میں جو کمال صحابہ نے دکھایا وہ نہ پہلے کسی قوم نے دکھایا نہ آئندہ دکھائے گی۔ گویا اسی اطاعت سے ہی اتمام نعمت ہُوا جب اطاعت چھوڑ دوگے اتمام نعمت بھی نہ رہے گا۔

ع۴۸۸ مخمصۃ۔ خامِص دُبلے پتلے آدمی کو کہا جاتا ہے پس مخمصۃ سے مراد بھوک ہے جس سے پیٹ دُبلا ہو جائے (غ)

ع۴۸۹ جوارح۔ جارحۃ کی جمع ہے شکاری جانور کو کہتے ہیں، پرندہ ہو یا درندہ یہ نام اس لیے ہے کہ وہ شکار کو زخمی کرتا ہے کیونکہ جَرْح کے معنی زخم ہیں یا اس لیے کہ وہ کچھ کما کر لاتا ہے اور اسی دوسرے معنی کے لحاظ سے انسان کے اعضا کو جوارح کہا جاتا ہے (غ)

حِلٌّ لَّهُمْ ۖ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ	تمھارا کھانا اُن کے لیے حلال ہے [۷۹۰] اور پاکدامن مومن عورتیں
وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	اور اُن میں سے پاکدامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی
مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ	جب تم اُن کو اُن کے مہر دے دو، نکاح میں لانے
مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ	والے، نہ کھُلی بدکاری کرنے والے اور نہ چھُپی دوستی رکھنے
اَخْدَانٍ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ	والے [۷۹۱]۔ اور جو شخص ایمان سے انکار کرے تو اس کا
حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ	عمل ضائع ہو گیا اور وہ آخرت میں نقصان اُٹھانے

مکلّبین۔ کَلب کتّا ہے اور کَلَب حرص اور کتّے کی حرص میں مثال دی جاتی ہے اَحْرَص من کلب اور مُکلّب وہ ہے جو کتّے کو تعلیم دے (رغ) یہاں شکار کو جائز قرار دیا ہے۔ اس قسم کے اشغال کو روکنے سے شجاعت کا جوہر انسان میں باقی نہیں رہتا۔ سدھائے ہوئے جانور کا مارا ہوا کھانا جائز ہے۔ بشرطیکہ اسے چھوڑتے وقت تکبیر پڑھ لی جائے اور بدیں شرط کہ وہ اس میں سے نہ کھائے اور بعض نے پرندوں کو اس سے مستثنےٰ کیا ہے اور بعض کے نزدیک ایک تہائی سے کم کھائیں تو وہ بھی امساک میں داخل ہے اس پر بندوق تیر وغیرہ کے شکار کو قیاس کر لینا چاہیئے یعنی بندوق یا تیر وغیرہ سے مارا ہوا جانور بشرطیکہ شکار کے طور پر ہو جائز ہے اس شرط کے ساتھ کہ چلاتے وقت تکبیر کہی ہو۔ اور گو اس صورت میں اگر جانور کو زندہ پا لیا جائے تو اس کا ذبح کرنا ضروری ہے لیکن اگر شکاری جانور کے پکڑنے سے یا بندوق وغیرہ سے شکار مر جائے تو بھی جائز ہے اور یہ استثنا ہے اور اس طریق سے خون بھی عموماً بہ نکلتا ہے۔

ف [۷۹۰] اہل کتاب کا کھانا کھانا اور دعوت کرنا: ان الفاظ میں مسلمانوں کے لیے ان لوگوں کا کھانا جائز قرار دیا گیا ہے جو کسی مذہب کے پیرو ہیں جس کی بنیاد آسمانی کتاب پر ہو۔ اور ان کے لیے مسلمانوں کا کھانا جائز ہے یعنی ایک مسلمان کے لیے جائز ہے کہ ان کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دے طعامکم حل لھم میں یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا کھانا یا ذبیحہ نہایت پاکیزہ ہونے کی وجہ سے اہل کتاب میں سے کوئی اس کی حلت میں شبہ نہیں کر سکتا۔

اہل کتاب کا ذبیحہ: ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہاں طعام سے مراد صرف ذبیحہ ہے۔ کیونکہ اسی میں اختلاف ہو سکتا تھا۔ بہرحال ذبیحہ اس میں شامل ہے۔ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہوا کہ اگر اہل کتاب اللہ کے نام پر کسی جانور کو ذبح کریں تو اس کا کھانا مسلمانوں کے لیے جائز ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اگر اہل کتاب اللہ کے نام پر ذبح نہ کریں تو اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں۔ اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ وہ جائز ہے حضرت ابن عمرؓ کے نزدیک جائز نہیں۔ قرآن کریم کے صریح الفاظ حضرت ابن عمرؓ کے قول کے مؤید ہیں ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ (الانعام ۱۲۱) اور اس سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ جس کی تاویل گروہ اوّل نے یوں کر لی ہے کہ اس سے مراد صرف بتوں کے ذبائح ہیں۔ پہلا مذہب سہل ہے مگر حق یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو سب سے زیادہ ضرورت پیش آتی ہے وہ عیسائیوں کے مارے ہوئے جانوروں کے متعلق ہے سو یہ لوگ نہ ذبح کرتے ہیں نہ خدا کا نام لیتے ہیں، اسلئے حالت اضطرار کے سوا اس کا کھانا جائز معلوم نہیں ہوتا۔ کوئی چیز جو اصولاً اسلام نے حرام قرار دی ہے وہ اہل کتاب کا طعام ہونے کی وجہ سے حلال نہیں ہو سکتی۔ مراد صرف یہ ہے کہ جو چیز پاک ہو تو اہل کتاب کے ہاتھ لگانے سے ناپاک نہیں ہو جاتی۔

ف [۷۹۱] اہل کتاب سے مناکحت: اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے کے احکام کے ساتھ مناکحت کے احکام بھی بیان کر دیئے۔ کیونکہ کھانے پینے کی طرح مناکحت بھی انسان کی فطری خواہش ہے پس ظاہری خواہشات فطری کے سارے احکام کو اس رکوع کے اندر جمع کر دیا ہے قرآن کریم میں دوسری جگہ مشرکہ عورتوں سے نکاح کو منع کیا ہے اور ایک جگہ لا تمسکوا بعصم الکوافر (۶۰: ۱۰) فرمایا۔ چونکہ اہل کتاب میں سے بعض مشرک ہو سکتے ہیں بعض نہیں۔ اس لیے ان دونوں حکموں میں کہ مشرکہ عورت سے نکاح نہ کرو اور اہل کتاب کی عورت سے نکاح جائز ہے کوئی تضاد نہیں۔ اور وہ جو کافر عورتوں سے مطلق روکا ہے تو وہ حکم خاص مکّہ والوں کے متعلق ہے اس لیے کہ وہ سب مشرک تھے اور علاوہ بریں جنگ کی وجہ سے بھی ان تعلقات کا قطع ہونا ضروری تھا۔ اور بعض کے نزدیک چونکہ اہل کتاب کی اصل بنیاد توحید باری پر ہے اس لیے سب اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے خواہ وہ عملاً یا اعتقاداً مشرک بھی ہوں مگر اقرب الی الصواب یہ ہے کہ صرف ان عورتوں سے نکاح جائز ہے جو اعتقاداً مشرک نہ ہوں۔

پس قرآن کریم نے یہ جائز رکھا ہے کہ ایک مسلمان مرد ایک غیر مسلم بی بی سے نکاح کر لے لیکن یہ جائز نہیں رکھا کہ ایک مسلم بی بی کا کسی غیر مسلم سے نکاح ہو کیونکہ غیر مسلم عورت مسلمان کے گھر میں آ کر ایک مسلم عورت کے حقوق حاصل کر کے فائدہ اُٹھاتی ہے مگر مسلم عورت غیر مسلم کے گھر میں جا کر پہلے حقوق کو بھی کھو بیٹھے گی۔ عورتوں کے حقوق کو ہر حال میں تلف ہونے سے بچایا ہے۔ علاوہ ازیں ظاہر ہے کہ اولاد باپ کے مذہب پر ہو گی۔ پس اس بات سے روکا ہے کہ ایک مسلمان بی بی کی اولاد شرک و کفر پر پرورش پائے۔ یہودی شریعت میں غیر یہود سے نکاح بالکل ناجائز تھا۔" نہ ان سے بیاہ کرنا اس کے بیٹے کو اپنی بیٹی نہ دینا

ع الْخٰسِرِيْنَ ⑤ — والوں میں سے ہے ۷۹۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ
فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ
وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى
الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تم نماز کو اُٹھو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھو لیا کرو اور اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں دھو لیا کرو ۷۹۳ اور اگر حالتِ جنابت میں ہو تو نہا لیا کرو،

نہ اپنے بیٹے کیلئے اس کی کوئی بیٹی لینا کیونکہ وہ تیرے بیٹے کو میری پیروی سے پھرا دینگے" (استثنا ۷: ۳ و ۴) مگر اسلام کو یہ خوف نہیں اور شریعت کو لعنت قرار دینے والے پولوس کا فتویٰ یہ ہے "تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوئے میں مت جتتے جاؤ" (۲۔ قرنطیوں ٦: ١٤) البتہ جہاں دوسری قومیں اپنی عورتوں کو مسلمانوں کے گھروں میں داخل کرکے ان سے حبائل الشیطان کا کام لینا چاہیں تو وہاں بچنا ہی مناسب ہے۔

آخری الفاظ میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض دوسری قوموں میں ایسے ناپاک تعلقات کو یعنی کھلی بدکاری کو یا خفیہ آشنائیوں کو جائز سمجھا جاتا ہے تم ایسی باتوں سے بچو۔

۷۹۲ ایمان کے انکار سے مراد یہاں اللہ تعالیٰ کی شرائع کا انکار ہے جس کا یہاں ذکر ہے۔ کیونکہ ایمان میں عمل بالجوارح بھی شامل ہے دیکھو ۱۱۔ پس اس معنی سے ایمان کا انکار خود اعمال صالح کا انکار ہے تو باقی اعمال کا حبط ہونا خود ظاہر ہے کیونکہ اصل غرض اعمال صالح سے ہے لیکن ایک طرف اگر ان شرائع کی طرف اس لفظ ایمان میں اشارہ ہے جن کا ذکر پیچھے ہوا ہے تو دوسری طرف اگلے رکوع کے مضمون کی طرف بھی اسی لفظ میں اشارہ ہے۔ یعنی یہ کہ اگر تمہاری خواہشات بہیمی کے پورا ہونے کا سامان اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو خواہشات ملکوتی کے پورا کرنے کا سامان بھی اس نے پیدا کیا ہے اور یہی ایمان ہے جو فطرت انسانی کے اس حصہ کا انکار کرتا ہے اس کے وہ اعمال جن کا اشتراک بہائم سے ہے بہیمی رہ جاتے ہیں اور آخرت میں کچھ کام نہیں دیتے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ضلّ سعیهم فی الحیٰوة الدنیا (الکھف ۱۸: ۱۰۴) اور انہی کے متعلق فرمایا اولٰئك الذین کفروا بآیٰت ربهم ولقائه فحبطت اعمالهم (الکھف ۱۸: ۱۰۵) حبط کے معنی پر دیکھو ۲۷۹۔

۷۹۳ قمتم۔ قیام کے ایک معنی عزم علی الشیٔ کے ہیں اور یہاں قمتم الی الصّلٰوة سے مراد یہی عزم نماز ہے (رغ)

مرافق۔ مرفق کی جمع ہے۔ رفق کے معنی لطف اور نرمی ہیں اور مرفق کسی معاملہ کے متعلق ہو تو مراد ہوتی ہے وہ جس سے فائدہ پہنچے ویھیٔی لکم من امرکم مرفقا (الکھف ۱۸: ۱٦) اور کہنی کو بھی کہتے ہیں (ل) جیسے یہاں۔ کہنی سے انسان ٹیک لگانے کا فائدہ اُٹھاتا ہے۔

جب پہلے رکوع میں ان عقود یا احکام کا ذکر کیا جو انسان کے کھانے پینے اور مرد اور عورت کے تعلقات کی فطری خواہشات سے تعلق رکھتے ہیں یعنی جن خواہشات میں انسان کا اشتراک بہائم سے ہے اور یوں صفات بہیمیہ کو حدِ اعتدال کے اندر لانے کی راہ بتائی۔ تو اب اس دوسرے رکوع میں مضمون کا انتقال ان عقود کی طرف کیا جو انسان کی اس اعلیٰ فطری خواہش سے تعلق رکھتے ہیں جو صلوٰۃ یا دعا کے نام سے موسوم ہے گویا اگر رکوع اول میں بہیمی خواہشات کا ذکر ہے تو اس رکوع میں ملکوتی صفات کا ذکر ہے کیونکہ اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی جو فطرت انسانی کا خالق و مالک ہے خواہش بھی انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اس لیے اس رکوع کو نماز کے متعلق بعض احکام سے شروع کیا ہے اور اسی قسم کے تفصیلی احکام سے شروع کیا ہے۔ یعنی وضو سے جیسے غذاؤں کے متعلق تفصیلی احکام دیئے تھے۔

تفصیل وضو کے ذکر میں حکمت وحی خفی: نماز کی تفصیل کا ذکر تو قرآن شریف میں نہیں کیا، لیکن وضو کا کسی قدر تفصیلی ذکر کر دیا ہے حالانکہ وضو اسی طرح برابر کئی سال سے نبی کریم صلعم اور مسلمان کرتے چلے آ رہے تھے۔ اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو نبی کریم صلعم کی وحی خفی کے منکر ہیں۔ کیونکہ جس طرح نبی کریم صلعم نے وضو کا طریق صحابہؓ کو سکھایا اسی کو سالہا سال بعد قرآن کریم کی وحی متلو میں بیان کیا گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلعم نے جب شروع میں وضو کا یہ طریق سکھایا تو وحی الٰہی سے ہی سکھایا تھا گو وہ وحی انہی الفاظ میں آپؐ پر نہ آئی تھی اسی کو وحی خفی کہتے ہیں۔

علاوہ بریں وضو کی جو نماز کے لیے محض ایک تمہیدی فعل ہے اور نماز کا کوئی حصہ نہیں تفصیل بیان کرنے میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ نماز کی وہ تمام تر تفصیلات جو نبی کریم صلعم نے بتائیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

موزوں پر مسح: یہ امر بھی قابل غور ہے کہ وضو کی بھی پوری تفصیل کا یہاں ذکر نہیں کیا پہلے ہاتھوں کا دھونا پھر کلّی کرنا پھر ناک صاف کرنا ان کو چھوڑ دیا ہے اور منہ دھونے کے ذکر سے شروع کیا ہے اس لیے کہ منہ کے دھونے سے پہلے خود ہی انسان ہاتھ دھو لے گا اور کلّی کرنا یا مسواک کرنا اور ناک صاف کرنا منہ کی ظاہری صفائی کے لازم اجزا ہیں۔ پاؤں کا دھونا ضروری ہے اور خود شیعوں میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ائمہ وضو میں پاؤں دھوتے تھے۔ ہاں حالت وضو میں موزے یعنی جراب پہن لی جائے تو پانچ نمازوں تک اس پر مسح جائز ہے۔ اور وہ اس آیت کے خلاف نہیں بلکہ اس کی تفصیل ہے جس طرح زخم وغیرہ میں کسی عضو پر مسح کر لینا اس کے خلاف نہیں۔

اِنۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤى اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ
مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ
تَجِدُوۡا مَآءً فَتَيَمَّمُوۡا صَعِيۡدًا طَيِّبًا
فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِكُمۡ وَاَيۡدِيۡكُمۡ مِّنۡهُ ؕ
مَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيَجۡعَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ
وَّلٰـكِنۡ يُّرِيۡدُ لِيُطَهِّرَكُمۡ وَلِيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ
عَلَيۡكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿٦﴾

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو، یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے ہو کر آئے یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو، پھر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو اور اس سے اپنے مونہوں اور ہاتھوں پر مسح کرلو۔ اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کسی طرح کی تنگی کرے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر کرو ۶۹۳ؔ

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ
الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا
وَاَطَعۡنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ
بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿٧﴾

اور اللہ کی نعمت یاد کرو (جو) تم پر ہے اور اُس کے اُس عہد کو بھی جو اس نے تم سے پختہ لیا جب تم نے کہا، ہم نے سُنا اور ہم اطاعت اختیار کرتے ہیں۔ اور اللہ کا تقویٰ کرو۔ اللہ سینوں کی باتوں کو جانتا ہے ۶۹۴ؔ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوَّامِيۡنَ لِلّٰهِ
شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ ۡ وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ
قَوۡمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ
لِلتَّقۡوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿٨﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ ۶۹۵ؔ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو یہ تقوے سے قریب تر ہے اور اللہ کا تقویٰ کرو، اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو ۶۹۶ؔ

۶۹۳ؔ ان تمام امور کا مفصل بیان ۶۶۴ؔ میں ہو چکا ہے۔ یہاں ان تفصیلات کو جو نماز کے لیے تمہیدی فعل ہیں دوہرانے کا منشا یہ ہے کہ اس کے متعلق بھی احکام اللہ تعالیٰ نے دے رکھے ہیں اسی لیے آخر پر نعمت پوری کرنے کا ذکر ہے۔ گویا شریعت کی ضروری تفصیلات کو بیان کر کے اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں پر اپنی نعمت کو تمام کر دیا اور اب کسی نئی شریعت کی ضرورت نہ رہی۔ اور تطہیر کے لفظ کو بیان کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ باطنی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ اسلام ظاہری پاکیزگی کے قواعد کو بھی مدّنظر رکھتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی الدّین علی النظافۃ۔ دین کی بنیاد نظافت پر رکھی گئی ہے۔

۶۹۴ؔ میثاق۔ واثق۔ وثِقت بہٖ کے معنی ہیں اس سے سکون پکڑا اور اس پر اعتماد کیا اور اوثق کے معنی اسے مضبوط باندھا اور میثاق وہ عہد ہے جو قسم سے موکد ہو (غ)

سدی کہتے ہیں کہ اس عہد سے مراد اس شریعت کی خوبی ہے جو عقول انسانی میں مرکوز ہے اور مقاتل نے کہا کہ یہ عہد الست بربکم قالوا بلیٰ والا ہے۔ اور بعض نے بیعت تحت الشجرۃ کو یہ عہد قرار دیا ہے (ج) شریعت کا دینا اور مسلمانوں کا دین اسلام میں داخل ہونا خود ایک عہد ہے مگر یہاں چونکہ اوپر انسان کی اس فطری خواہش کا ذکر ہے جو اس کو کشاں کشاں اللہ تعالیٰ کی طرف لے جاتی ہے اس لیے مراد وہی فطری عہد ہے جو الست بربکم میں لیا گیا ہے۔ اور نعمت اللہ سے مراد قرآن کریم ہے جو ان پر نازل کیا گیا۔ قرآن کے نزول نے جب اس فطری عہد کو یاد دلایا تو مومن سمعنا و اطعنا کہہ اُٹھے۔

۶۹۵ؔ انسان کی وہ صفات جو خواہشات سفلی سے بالاتر ہیں جن کی طرف اس رکوع میں توجہ دلائی ہے۔ ان کا خلاصہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں آجاتا ہے ان دونوں کے قیام کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے قوامین للہ میں حقوق اللہ کی طرف اور شھداء بالقسط میں حقوق العباد کی طرف۔ قوّام کے لیے دیکھو ۴۷۶ؔ ایک امر کے قیام کیلئے پورا زور لگانے والا۔ مگر یہاں بجائے اس امر کے ذکر کے صرف اللہ فرمایا۔ یعنی حقوق اللہ کی حفاظت پر پورا زور لگانے والے ہو (النسآء۔ ۱۳۵) میں جہاں صرف حقوق العباد کی طرف توجہ دلائی تھی۔ فرمایا قوامین بالقسط شھداء للہ۔

۶۹۶ؔ اعدلوا۔ عَدل کے معنی مساوات ہیں اور عَدل ان معاملات میں کہا جاتا ہے جن کا تعلق بصیرت سے ہے اور عِدل وزن ناپ وغیرہ میں جن کا تعلق حاسہ سے ہے اور عدل دو طرح پر ہے ایک احسان کے عوض احسان کرنا اور جو تکلیف دُور کرے اس کی تکلیف دور کرنا۔ اور دوسرا قصاص سزاؤں وغیرہ کے بارہ میں (غ)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ⑨

اللہ نے اُن سے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں وعدہ کیا ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ⑩

اور وہ جنھوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا، وہی دوزخ والے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑪ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی نعمت یاد کرو (جو) تم پر ہوئی، جب ایک قوم نے ارادہ کر لیا کہ اپنے ہاتھ تمھاری طرف بڑھائیں تو اس نے تم سے اُن کے ہاتھوں کو روکا اور اللہ کا تقویٰ کرو اور اللہ پر ہی مومنوں کو چاہیئے کہ بھروسہ کریں ع۹۷

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ

اور یقیناً اللہ نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا۔ اور ہم نے اُن میں سے بارہ ۱۲ سردار مقرر کیے ۔ اور اللہ نے کہا میں تمھارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو اور اچھا مال اللہ کو کاٹ کر دو گے ۔ تو میں بالضرور تمھاری برائیاں تم سے دور کر دونگا اور بالضرور تم کو باغوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں پس جو کوئی تم میں سے

حقوق العباد کی عظمت پر پھر زور دیا ہے۔ پچھلے رکوع میں صرف اس قدر فرمایا تھا کہ کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے تم اس پر زیادتی نہ کرو۔ یہاں انصاف کے لیے حکم دیا ہے اور انصاف حقوق میں یہ ہے کہ ان حقوق کو ادا کیا جائے۔ تقویٰ سے قریب ترکہہ کر بتا دیا کہ تقویٰ حفاظت حقوق سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ جب دشمنوں کے حقوق کی ادائیگی بھی ایسی ضروری ہے تو پھر اپنے عزیزوں اور دوستوں اور مسلمان بھائیوں کے حقوق کی ذمہ واری کس قدر بڑی ہے کہاں ہیں وہ مسلمان جو اس تعلیم میں مخاطب ہیں!

ع۹۷ یبسطوا۔ بَسْط کے معنی پھیلانا اور توسع ہیں اور بسط اللسان سے مراد گالی دینا اور بسط الید سے مراد کبھی پکڑنا کبھی حملہ کرنا یا مارنا ہوتا ہے (غ)
کَفَّ۔ کَفّ کے اصل معنی ہتھیلی ہیں اور پھر اس کے معنی ہیں کف سے دوسرے کو پہنچنا اور اس کو دفع کر دینا اور پھر جس طرح بھی کسی کو دفع کیا جائے اس پر بولا جاتا ہے (غ)

آنحضرتؐ کا دشمنوں سے بچانا: بعض مفسرین نے اس آیت کی تشریح خاص واقعات سے کرنی چاہی ہے مثلاً اس واقعہ سے کہ نبی کریم صلعم درخت کے نیچے سوئے ہوئے تھے اور تلوار درخت کے ساتھ لٹکائی ہوئی تھی تو ایک دشمن نے تلوار اُٹھا کر کہا کہ اب تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ تو آپؐ نے جواب دیا کہ خدا جس پر تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی تب آپ نے وہی تلوار اُٹھا کر اس سے یہی سوال کیا اور باوجود اس پر قابو پانے کے اسے مارا نہیں۔ یا اس واقعہ سے کہ یہود بنی نضیر نے نبی صلعم پر جب آپ دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے چکی کا پاٹ گرا کر آپؐ کو ہلاک کرنا چاہا تھا۔ مگر ان دو واقعات پر کیوں ان الفاظ کو محدود کیا جائے۔ جب ہم جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں طرف دشمن ہی دشمن تھے اور کیا قریش اور کیا دیگر مشرک قبائل عرب اور کیا یہودی اور کیا عیسائی اور کیا عرب اور کیا عجم سب آپ کو اور آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو ہلاک اور تباہ کرنے کے درپے تھے اور اللہ کے فضل نے ہی ان کو بچایا ہوا تھا۔ یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ تمہارے ساتھ ایسی عداوت کا اظہار تو یہ لوگ کر چکے ہیں مگر جب تم قوت پکڑو اور ان پر تم کو بادشاہت عطا ہو تو ان کے ساتھ انصاف ہی کرنا۔

ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿١٢﴾

اس کے بعد انکار کریگا وہ بلاشبہ سیدھے رستہ سے بھٹک گیا ٧٩٨

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٣﴾

سو اُن کے اپنا عہد توڑ دینے کی وجہ سے ہم نے اُن پر لعنت کی اور ان کے دل سخت کر دیئے لفظوں کو اپنی جگہ سے پھیرتے ہیں ۔ اور جو اُن کو نصیحت کی گئی تھی اس کا ایک حِصّہ بھول گئے اور ان میں سے تھوڑے لوگوں کے سوائے تو ان کی خیانت پر خبر پاتا رہے گا سو ان کو معاف کر اور درگزر کر، اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ٧٩٩

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿١٤﴾

اور ان سے جو کہتے ہیں ہم نصرانی ہیں ہم نے اُن سے عہد لیا مگر وہ اس کا ایک حِصّہ بھول گئے جو انھیں نصیحت کی گئی تھی سو ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا اور عن قریب اللہ ان کو اس کی خبر دیگا جو وہ کرتے تھے ع٨٠٠

---

٧٩٨ نقیب ۔ نَقْب سے ہے جس کے معنی سوراخ کرنا ہیں اور نقیب وہ ہے جو قوم کے حالات کی تحقیق اور تفتیش کرتا ہے رغ، پس مراد سردار ہے جو قوم کے حالات سے واقف ہو۔

عزرتموھم ۔ تعزیر اس مدد کو کہتے ہیں جو تعظیم کے ساتھ ملی ہوئی ہو اور تعزیر سزا دینے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ تادیب ہے اور تادیب بھی ایک نصرت ہے کیونکہ انسان کو نقصان دینے والی چیز سے روک دیتی ہے اسی معنی سے نبی کریم صلعم کی حدیث ہے اُنصرُ اخاك ظالماً او مظلوماً اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم ۔ جب دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ ظالم ہونے کی حالت میں اس کی کس طرح مدد کی جائے تو آپ نے فرمایا اس کے ظلم سے اس کو روک دو۔ (غ)

اس رکوع میں یہود و نصاریٰ کی خلاف ورزئ عہد کا ذکر ہے جب مسلمانوں کو دو قسم کے عہد بتا دیئے تو اب مثال کے طور پر پہلی قوموں کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے عہد شکنی کی ۔ مگر یہود کا ذکر پہلی دو آیتوں میں کر کے پھر اس کی تفصیل اگلے رکوع میں کی ہے اور اس رکوع میں عیسائیوں کی خلاف ورزئ عہد کا ہی بالخصوص ذکر ہے۔

زمین کنعان اور اسرائیلی سردار: جس عہد کا یہاں ذکر ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری کا عہد تھا اور بارہ سردار جو مقرر کیے گئے وہ سرزمین کنعان کے حالات کا پتہ لگانے کے لیے تھے اور نہروں والی زمین بھی وہی سرزمین کنعان ہے "پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج تاکہ کنعان کی زمین کی جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں جاسوسی کریں"۔ (گنتی ١٣ : ١ و ٢) اور پھر ٤ ۔ ١٥ آیات تک ان بارہ سرداروں کے نام دیئے ہیں ۔ اور واپسی پر اُن کا بیان اس سرزمین کے متعلق یوں دیا ہے "ہم اس زمین تک جہاں تو نے ہمیں بھیجا تھا پہنچے اس میں سچ مچ دودھ اور شہد بہتا ہے اور یہ وہاں کا میوہ ہے" (گنتی ١٣ : ٢٧)

ع٧٩٩ قاسیۃ ۔ قسوۃ دل کی سختی کو کہتے ہیں (غ) دل کی سختی یہ ہے کہ ذکر اللہ اس میں اثر نہیں کرتا جیسا کہ خود دوسری جگہ فرمایا فویل للقسیۃ قلوبھم من ذکر اللہ (الزمر ٣٩ ۔ ٢٢)

خائنۃ ۔ یہاں مصدر کے معنی میں ہے یعنی خیانت ۔ دوسری جگہ ہے یعلم خائنۃ الاعین (المؤمن ٤٠ ۔ ١٩) یا مراد خیانت کرنے والی بڑی جماعت ہے (غ)

نسیان بمعنی ترک کے لیے دیکھو ع٦٧ ۔

مسلمانوں کو بتا دیا ہے کہ اہل کتاب کی طرف سے ہمیشہ تم خیانت دیکھتے رہو گے ۔ با ایں حکم دیا ہے کہ معاف بھی کرتے رہو ۔ تحریف کے لیے دیکھو ع١٠١

ع٨٠٠ اغرینا ۔ غری کے معنی ہیں کسی چیز کے ساتھ لگ جانا یا چمٹ جانا اس لیے اغرا کے معنی ہیں کسی کے ساتھ لگا دینا (غ)

عیسائیوں کے اخذ میثاق سے مراد اُن کو احکام دینا ہے ۔ انجیل بھی اس پر شاہد ہے جس کی پہاڑی تعلیم میں بھی احکام پائے جاتے ہیں ۔ ایسا کرو ایسا نہ کرو ۔ ان کو بھی شریعت پر عمل کرنے کا حکم تھا ۔ نماز پڑھنے کا روزہ رکھنے کا بھی حکم تھا دوسرے لوگوں سے عدل و انصاف کرنے کا حکم تھا ۔

عیسائیوں میں باہم بغض: یہودیوں کی عہد شکنی کی سزا فرمائی تھی لعنت یعنی ان کا دور کر دینا اور دربدر کر دینا ۔ عیسائیوں کی عہد شکنی کی سزا بتائی ہے ان

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾

اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے، وہ بہت کچھ اس میں سے کھول کر بیان کرتا ہے جو تم کتاب سے چھپاتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کرنے والی کتاب آچکی ہے ع۸۰۱

يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

اس کے ساتھ اللہ اس کو جو اس کی رضا کی پیروی کرتا ہے سلامتی کی راہوں پر چلاتا ہے اور اپنے حکم سے ان کو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکال لاتا ہے اور ان کو سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾

وہ یقیناً کافر ہیں، جو کہتے ہیں کہ اللہ مسیح ابن مریم ہے — کہہ کس کو اللہ کے مقابلہ میں کچھ بھی اختیار ہوا، جب اللہ نے مسیح ابن مریم اور اس کی ماں اور ان سب کو جو زمین میں تھے ہلاک کرنے کا ارادہ کیا اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور جو ان کے درمیان ہے اللہ کے لیے ہی ہے وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ع۸۰۲

ہیں باہم دشمنی اور بغض کا رہنا۔ یا یہود و نصاریٰ میں قیامت تک دشمنی اور بغض کا رہنا مراد ہے۔ مگر اوّل کو ترجیح ہے دونوں باتیں آج تک صحیح پائی جاتی ہیں اور قرآن کریم کے الفاظ کی صداقت ہمیشہ ہی ظاہر ہوتی رہے گی۔ چونکہ عیسائی قوموں کی غرض محض مال دنیا کا جمع کرنا ہے اور اخلاق فاضلہ سے عاری ہیں اس لیے ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف منصوبے کرتے رہتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عیسائی قیامت کے دن تک رہیں گے اور ان میں باہم دشمنی بھی رہے گی پس یہ خیال کہ کسی وقت کل کے کل مسلمان ہو جائیں گے اس آیت کی رو سے غلط ٹھہرتا ہے۔

ع۸۰۱ یہاں بتایا کہ یہ رسول اہل کتاب کے لیے بھی ہے۔ اہل کتاب پیشگوئیوں کا بھی اخفا کرتے تھے اور تعلیم کا بھی پس دونوں مراد ہو سکتے ہیں اور نبی کریم صلعم کے معاف کرنے سے مراد ان کی بہت سی شرارتوں کا معاف کرنا بھی ہو سکتا ہے جو وہ رسول اللہ صلعم کے خلاف کرتے تھے۔

ع۸۰۲ مسیح کی موت ماننے کے سوائے الوہیت مسیح کا ابطال نہیں ہو سکتا: یہاں اوّل عیسائیوں کا قول نقل کیا ہے کہ مسیح خدا ہے اور ایسا کہنے والوں کو کافر قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ابطال الوہیت مسیح پر دلیل دی ہے۔ عام طور پر ان الفاظ کے معنی یوں کیے جاتے ہیں کہ اگر خدا یہ ارادہ کرے کہ مسیح ابن مریم اور اس کی ماں کو ہلاک کر دے تو پھر کون اللہ کے مقابلہ میں کچھ اختیار رکھتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس سے بودی اور کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ ایک طرف تو یہ فرض کر لیں کہ مسیح اب تک زندہ ہے اور اس سے جب ایک قوم اس کی الوہیت کی دلیل لے تو جواب میں ہم کہیں کہ خدا جب چاہے گا اسے مار دیگا اور تم اسے نہیں بچا سکو گے۔ جب یہ عقیدہ رکھا جائے کہ مسیح دو ہزار سال سے زندہ ہے اور وہ کھانے پینے کا محتاج بھی نہیں اور اس کے جسم میں کوئی تغیر بھی نہیں آتا تو یہ باتیں ظاہراً اسے بشر یا مخلوق کی حالت سے نکال کر صفات الوہیت اس کے اندر قرار دیتی ہیں اس حد تک تو ہم نے عیسائیوں کی بات کو مان لیا کہ بشر سے واقعی اس کو یہ فوقیت ہے کہ بشر کھانے پینے کا محتاج ہے مسیح نہیں اور بشر کے جسم میں تغیر آتا رہتا ہے مسیح کے جسم میں نہیں آتا۔ اور یہ صفات الوہیت کی ہیں۔ تو اب ہم انہیں گویا یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس میں اس وقت تو ضرور یہ صفات الوہیت ہیں مگر چونکہ جب خدا چاہے گا اسے مار دیگا۔ اس لیے وہ خدا نہیں۔ کیا ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی عقلمند انسان اس کو عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیت مسیح کے خلاف دلیل سمجھ سکتا ہے؟ پھر علاوہ ازیں اگر مسیح اس وقت تک نہیں مرے تو ان کی ماں بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق بھی وہی ان اراد کا لفظ پڑا ہوا ہے اور یہ ارادہ ابھی واقع نہیں ہوا۔ اور سارے لوگ بھی اسی ذیل میں آئے۔ گویا اس وقت سے جس قدر من فی الارض ہوئے ہیں ان سب کے متعلق ابھی ارادہ

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؗ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿١٨﴾

اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں، ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں کہہ پھر تمھارے گناہوں کی وجہ سے تمھیں کیوں عذاب دیتا ہے بلکہ تم انھیں میں سے بشر ہو جنھیں اس نے پیدا کیا^٨٠٣ وہ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے۔ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور وہ جو ان دونوں کے درمیان ہے اللہ کے لیے ہی ہے اور اسی کی طرف پھر کر جانا ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ؗ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى

اے اہل کتاب یقیناً ہمارا رسول تمھارے پاس آیا ہے وہ رسولوں کے بند ہو جانے پر تمھارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا نہیں آیا۔ اور نہ کوئی ڈرانے والا سو تمھارے پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانیوالا

الٰہی ہلاک کرنے کا نہیں ہوا نہ مسیحؑ اب تک مرے نہ مسیحؑ کی ماں نہ اُس زمانہ سے اس وقت تک کوئی انسان ہی مرا ہے۔
پس جب مسیحؑ کی ہلاکت کو بطور دلیل پیش کیا ہے اور دلیل یہ بن نہیں سکتی۔ اگر نزول قرآن کے وقت مسیحؑ زندہ ہوں تو لازماً ماننا پڑے گا کہ نزول قرآن کے وقت مسیحؑ فوت ہو چکے تھے جس طرح ان کی ماں فوت ہو چکیں جس طرح باقی اہل زمین فوت ہوتے رہے اور چونکہ ہلاکت کا ارادہ فعل محقق الوقوع ہے اس لیے اِنْ یہاں شرطیہ نہیں بلکہ بمعنی اِذْ ہے۔ یعنی جب خدا نے ایسا ارادہ کر لیا۔ جیسا کہ لتدخلن المسجد الحرام ان شآء اللّٰہ اٰمنین (الفتح ٤٨ - ٢٧) میں اور جیسا کہ اتقوا اللّٰہ ان کنتم مؤمنین (١١٢) میں اور جیسا کہ آنحضرت صلعم کے اس قول میں وانّا ان شاء اللّٰہ بکم للاحقون۔ کہ فعل کے محقق الوقوع ہونے کی وجہ سے اِنْ بمعنی اِذْ ہے اور یہ قول مغنی میں منقول ہے اور فمن یملك میں مضارع کا اختیار کرنا اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ جہاں فعل میں استمرار ہو وہاں گزشتہ کے متعلق مضارع کا استعمال ہوتا ہے جیسا کہ یحکم بہا النبیون الذین اسلموا (٤٤) میں یا جیسے فریقا کذبوا وفریقا یقتلون (٧٠) یا جیسے وکذٰلك نُری ابراھیم ملکوت السمٰوٰت والارض (الانعام٦ - ٧٥) میں۔ اور یہاں تو چونکہ من فی الارض کے متعلق ارادہ جیسا گزشتہ میں ہوا آئندہ بھی ہوتا رہتا ہے اس لیے فمن یملك نہایت ضروری تھا۔ یعنی اب بھی جب کبھی اللہ تعالیٰ اہل زمین کی ہلاکت کا ارادہ کرتا ہے تو کون اس کا مقابلہ کر سکتا ہے یا کون کسی کو بچا سکتا ہے۔ غرض دلیل ابطال الوہیت یوں بنتی ہے کہ جب مسیحؑ کو مارنے کا ارادہ کیا تو اس کو کون بچا سکا، جب مریمؑ کو مارنے کا ارادہ کیا تو اس کو کون بچا سکا۔ جب دوسرے اہل ارض کو مارنے کا ارادہ کیا تو ان کو کون بچا سکا۔ اور اب بھی جب وہ اہل ارض کو مارنے کا ارادہ کرتا ہے تو کون بچا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں مسیحؑ اور مریمؑ کے ذکر کے ساتھ من فی الارض لا کر یہ بھی بتا دیا کہ اپنے اپنے وقت میں یہ بھی من فی الارض ہی تھے اور دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہی تھے۔ جو زمین پر ہی رہے اور جب خدا نے چاہا تو انھیں مار بھی دیا پس یہ آیت بھی وفات مسیحؑ پر قطعی دلیل ہے اگر وفات مسیحؑ پر دلیل نہیں تو ابطال الوہیت پر بھی کوئی دلیل نہیں۔ اور یہ صریحاً باطل ہے۔
جب من فی الارض کو ہلاک کرنے کا ذکر کیا تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا یخلق ما یشآء جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے یعنی جیسے جیسے مارتا رہتا ہے پیدا بھی کرتا رہتا ہے۔
٨٠٣ع یہود و نصاریٰ کا دعویٰ ابنیت: یہاں فرمایا کہ عیسائی اور یہودی اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے اور اللہ کے پیارے قرار دیتے ہیں۔ ابن اللہ کا لفظ توریت و انجیل دونوں میں پایا جاتا ہے چنانچہ خروج ٤ : ٢٢ میں ہے۔ "اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا ہے۔" اور یرمیاہ ٣١ : ٩ میں ہے "میں اسرائیل کا باپ ہوں اور افرائیم میرا پلوٹھا ہے۔" اور انجیل متی ٥ : ٩ میں ہے "مبارک وے جو صلح کرنے والے ہیں کیونکہ وہ خدا کے فرزند کہلائیں گے۔" پس ابناء اللّٰہ کا لفظ تو یہود و نصاریٰ کے لیے توریت و انجیل میں موجود ہے مگر احبآؤہ یعنی خدا کا حبیب یا پیارا ہونا یہ گویا بطور نتیجہ تھا یعنی یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ چونکہ ہم خدا کے بیٹے ہیں اور بیٹا باپ کا پیارا ہوتا ہے اس لیے ہم اس کے پیارے بھی ہیں۔ گویا کل مخلوق میں سے اپنی خاص نسبت اوّل الذکر بوجہ اولاد اسرائیل ہونے کے اور عیسائی بوجہ کفارہ پر ایمان لانے کے اللہ تعالیٰ سے قائم کرتے تھے۔ اس لیے فرمایا کہ تمھارے گناہوں کی سزا تو یہاں بھی اسی طرح تم کو ملتی رہتی ہے جس طرح دوسری مخلوق کو، پس خاص تعلق ابنیت اور محبت کا تمھارا کوئی نہیں ہو سکتا۔ ابن اللہ کا لفظ نہ توریت میں اولاد اسرائیل ہونے کی وجہ سے کہا گیا تھا نہ انجیل میں کفارہ پر ایمان کی وجہ سے بلکہ وہ محض اعمال صالحہ اور اعلیٰ درجہ کے اخلاص کی وجہ سے تھا اُن کو چھوڑ کر اب تمھیں یہ حق نہیں پہنچتا۔ عیسائی کہتے ہیں حضرت عیسٰیؑ کے کفارہ سے آدم کا گناہ دُور ہو گیا۔ حالانکہ بائبل میں جو آدم کے گناہ کی سزا لکھی ہے کہ مرد پسینہ سے کمائے گا اور عورت درد سے جنے گی وہ سزا تو اسی طرح عیسائیوں میں باقی ہے۔ آج کل بھی عیسائی اقوام اپنے آپ کو تمام اقوام سے بڑھ کر قرار دیتی ہیں گویا دوسرے کبھی اس مقام کو حاصل کر ہی نہیں سکتے، جسے یورپ نے حاصل کیا ہے۔

ع۴ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝١٩

آگیا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۸۰۴

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا ۖ وَآتَاكُمْ مَا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ ۝٢٠

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کو کہا اے میری قوم اللہ کی نعمت (جو) تم پر (ہوئی)، یاد کرو جب اس نے تم میں نبی بنائے، اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ دیا جو قوموں میں سے کسی کو نہیں دیا ۸۰۵

يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ ۝٢١

اے میری قوم پاک سرزمین میں داخل ہو جاؤ، جسے اللہ نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے اور پیٹھ پھیرتے ہوئے واپس نہ ہو آنا ورنہ تم نقصان اُٹھانے والے ہو جاؤ گے ۸۰۶

---

۸۰۴ فترۃ تیزی کے بعد جو سکون ہو اور شدّت کے بعد نرمی اور قوت کے بعد ضعف اسے فتور کہا جاتا ہے (غ) اور فترۃ کا زمانہ وہ کہلاتا ہے جو دو نبیوں یا رسولوں کے درمیان خالی زمانہ گزرتا تھا کیونکہ اس وقت کوئی داعی نہ ہوتا تھا (ل) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کوئی فترت کا زمانہ نہیں کیونکہ دعوت الی الحق امت محمدیہ کا کام قرار پا گیا اور انقطاع رسالت ہو گیا۔ اس لیے کہ رسالت کی ضرورت کامل طور پر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں پوری ہو گئی ٭

کوئی چھ سو سال کا زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ایسا گزرا ہے کہ اس میں کوئی نبی دنیا میں ظاہر نہیں ہوا جس پر حدیث لیس بینی وبینہ نبی شاہد ہے یعنی میرے اور حضرت عیسٰی کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا تاریخ عالم بھی اس پر گواہ ہے۔

حضرت عیسٰی اور آنحضرت کے درمیان نبی: اور یہ جو بعض نے لکھا ہے کہ تین انبیاء اسرائیل سے اور ایک خالد بن سنان العبسی عرب سے ہوا سوان پر نبوت کا نام محض بطور مجاز بولا جاتا ہے۔ چنانچہ ان تین کے متعلق جن کا ذکر سورہ یٰسین میں اذ ارسلنا الیھم اثنین کے نیچے سمجھا گیا ہے صاف طور پر مانا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسٰی کے رسول تھے۔ اور ان پر مرسل کا لفظ بطور مجاز استعمال ہوا ہے اور خالد بن سنان یا حضرت عیسٰی سے پہلے کے ہیں۔ (اور اس صورت میں ان کی بیٹی سے جس کے نبی صلعم کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر ہے مراد ان کی نسل میں سے کوئی ہو جیسا کہ بعض محققین نے مانا ہے اور یا یہاں بھی لفظ کا استعمال بطور مجاز ہے اور وہ محض پیشگوئی کرنے والے تھے۔ اور حضرت عیسٰی قومی نبیوں کے خاتم ہیں۔ اس زمانہ فترت میں تاریکی کل عالم پر محیط ہو گئی۔ اور آنحضرت صلعم نے توحید الٰہی کو دوبارہ دنیا میں قائم کیا اس لیے آپؐ آدم ثانی ہیں کہ نسل انسانی کی روحانی زندگی کو دنیا میں آپ نے ہی قائم کیا۔ اسی انقطاع کی طرف یہاں عیسائیوں وغیرہ کو توجہ دلائی ہے ٭

۸۰۵ اس رکوع میں بتایا ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ جو خدائی وعدے تھے ان میں بنی اسرائیل کی عہد شکنی کی وجہ سے کس طرح التوا ہو گیا پچھلے رکوع میں ان کی عہد شکنی کا عام ذکر تھا۔ یہاں ایک خاص مثال دی ہے اور یہود کو خاص کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ اس رسول کے خلاف جو اُن کی اصلاح کے لیے آیا تھا کس طرح اب جنگ و جدال کے درپے ہیں۔ حالانکہ جب ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بت پرست قوم کے خلاف جنگ کا حکم ان کے نبی کی معرفت دیا گیا تھا تو اس وقت جنگ کرنے سے انکار کر دیا یوں ان کی عہد شکنی کا بھی ذکر کیا اور ان کی موجودہ منصوبہ بازی کی طرف بھی اشارہ کر دیا جس کا زیادہ صراحت سے ذکر اگلے رکوع میں آئے گا۔

نبی بنانے اور بادشاہ بنانے کا ذکر، یا بطور وعدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے وعدے ایسے ہیں کہ گویا جو کچھ اس نے کہا وہ ہو ہی چکا ہے یا انبیاء سے اشارہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کی طرف ہے جو اس وقت موجود تھے اور ابن جریر میں جو ایک قول ہے کہ وہ ستّر آدمی جو حضرت موسیٰؑ طور پر ساتھ لے گئے تھے، نبی بنانے میں ان کی طرف اشارہ ہے تو یہ صرف اس معنی سے درست ہو سکتا ہے کہ ان کو سچے خوابوں اور الہامات سے مشرف کیا گیا ہو اور اس معنی میں لفظ نبی کا اطلاق بنی اسرائیل میں ہو جاتا تھا۔ اور بادشاہ بنانے سے ان کا حالت غلامی سے نکال کر جس میں وہ مصر میں تھے خود مختار اور اپنی قسمت کا آپ مالک بنا دینا مراد ہے کیونکہ اصل بادشاہت دوسرے کی ماتحتی سے آزادی ہے۔ جب قوم اپنی قسمت کی آپ مالک ہو گئی، دوسری قوم کی غلامی سے نکل گئی تو وہ بادشاہ بن گئی اور ابن جریر کی روایات میں ہے کہ بنی اسرائیل میں جو شخص گھر اور عورت اور خادم کا مالک ہوتا تھا وہ بادشاہ سمجھا جاتا تھا تو اس میں بھی یہی اشارہ پایا جاتا ہے۔ کیونکہ فرعون کی ماتحتی میں وہ بوجہ غلامی کے نہ اپنے گھروں کے مالک تھے اور خدمتگار رکھنے کی بجائے خود ان سے خدمتگاری کا کام لیا جاتا تھا۔ اور نبی بنانے کے متعلق کہا کہ تم میں نبی پیدا کیے مگر بادشاہت کو ساری قوم کی طرف منسوب کیا اس میں بتایا کہ بادشاہت درحقیقت قوم کی ہوتی ہے نہ چند افراد کی۔ اور یہ فضیلت کہ جو کچھ تمہیں دیا وہ دنیا کی اور کسی قوم کو نہیں دیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس زمانہ کی اور کسی قوم کو یہ نہیں دیا (دیکھو ع۸۶) یعنی نبوت کا سلسلہ ان میں بہت وسیع کیا اور پھر نبوت کے ساتھ بادشاہت بھی دی۔

۸۰۶ الارض المقدّسۃ۔ تقدیس سے مراد اللہ تعالیٰ کا پاک کرنا ہے یعنی الٰہی تطہیر جو نجاست محسوسہ سے تعلق نہیں رکھتی۔ اس لیے بیت المقدس

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ
وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ
فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

انھوں نے کہا اے موسیٰؑ اس میں قوی ہیکل لوگ ہیں اور ہم ہرگز اس میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ اُس میں سے نکل نہ جائیں ہاں اگر وہ اس میں سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔[۸۰۷]

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ
اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا
دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ۬ وَعَلَى اللّٰهِ
فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾

اُن میں سے جو ڈرتے تھے دو شخصوں نے جن پر اللہ نے انعام کیا تھا کہا ان پر دروازے سے داخل ہو جاؤ، سو جب تم اس میں داخل ہو جاؤ گے، تو یقیناً تم غالب ہو گے۔ اور اللہ ہی پر توکل کرو، اگر تم مومن ہو۔[۸۰۸]

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا
مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ
فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾

انھوں نے کہا اے موسیٰؑ ہم ہرگز اس میں کبھی داخل نہ ہوں گے، جب تک کہ وہ اس میں ہیں پس تو اور تیرا رب جاؤ اور جنگ کرو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں[۸۰۹]

اور الارض المقدسۃ وہ جگہ ہے جو نجاست شرک سے پاک کی گئی (غ) اور قُدُس کے معنی برکت بھی ہیں (ل) اور الارض المقدسۃ سرزمین شام ہے جس میں بیت المقدس بھی شامل ہے اور فراء کا قول ہے کہ وہ دمشق اور فلسطین اور بعض علاقہ اُرْدُنّ ہے (ل۔ج) اور ابن جریر کہتے ہیں کہ اہل تاویل اور سیرت اور علمائے خیر کا اس پر اتفاق ہے کہ ارض مقدسہ عریش مصر اور فرات کے درمیان واقع ہے اور بائبل میں اس کی برکتوں کا یوں ذکر کیا کہ "اس میں سچ مچ دودھ اور شہد بہتا ہے" (گنتی ۱۳: ۱۷)

کتب اللہ لکم۔ اس میں اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے کی گئی تھی" خداوند نے ابرام سے عہد کرکے کہا کہ میں تیری اولاد کو یہ ملک دونگا مصر کی ندی سے لیکر بڑی ندی تک جو فرات کی ندی ہے"۔ (پیدائش ۱۵: ۱۸) اور پیدائش ۱۷: ۸ میں ملک کنعان کا نام لیکر یہی وعدہ ہے اور حضرت ابراہیم کے وعدہ میں بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں شامل ہیں۔

حضرت موسیٰؑ نے ان کو ارض مقدس میں بحیثیت فاتح داخل ہونے کو کہا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ یہ سرزمین تمہیں ملے گی لیکن اس کے لیے جدوجہد ضروری ہے اور لا ترتدّوا علیٰ ادبارکم سے مراد یہی ہے کہ دشمن سے ڈر کر پیٹھ نہ پھیر دو۔

۸۰۷ جبارین۔ جبّار۔ جَبْر سے ہے جس کے اصل معنی ہیں کسی قسم کے غلبہ سے کسی چیز کی اصلاح کرنا اور اس لیے کبھی صرف اصلاح اور کبھی صرف قہر یا غلبہ کے معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے (غ) اور الجبّار جو اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے تو اس کے معنی ہیں العالی فوق خلقہ۔ اس لیے انسان کو جبار کہیں گے تو اس سے مراد متمرد عالی یا متکبر ہوگا (کیونکہ جبار اور متکبر ہونا یعنی دوسروں پر علوا ور بڑائی اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کو شایاں ہے انسان کو نہیں اس لیے لم یکن جبّارا عصیّاً (مریم[۱۹]۔ ۱۴) اور لم یجعلنی جبّاراً شقیا (مریم[۱۹]۔ ۳۲) میں مراد متکبر ہے جو اللہ تعالیٰ کے آگے سر نہ جھکاتا ہو۔ اور جبّار اس کو بھی کہتے ہیں جو دوسرے پر مسلّط کیا گیا ہو و ما انت علیھم بجبّار (قٓ[۵۰]۔ ۴۵) میں یہی مراد ہے اور جبار ناحق قتل کرنے والے کو بھی کہتے ہیں واذا بطشتم بطشتم جبّارین (الشعراء[۲۶]۔ ۱۳۰) اور ان ترید الا ان تکون جبارا فی الارض (القصص[۲۸]۔ ۱۹) میں یہی مراد ہے اور جبار عظیم قوی طویل کو بھی کہتے ہیں اور یہ معنی نَخْلَۃٌ جبّارۃ سے لیے گئے ہیں یعنی بلند یا بڑی کھجور جہاں ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ اور یہی معنی فیھا قوماً جبّارین میں ہیں یعنی بڑے قوی ہیکل یا طاقتور یا زبردست لوگ (ل)

گنتی ۱۳: ۳۱ میں ہے" ہمیں زور نہیں کہ ان لوگوں پر چڑھیں کیونکہ وے ہم سے زیادہ زور آور ہیں"۔ اور ۳۳ میں ہے" ہم نے وہاں جباروں کو..... دیکھا"۔ اور ۱۴ باب کے شروع میں ذکر ہے کہ کس طرح بنی اسرائیل ان سے خائف ہوئے۔ اور اس سرزمین میں داخل ہونے سے انکار کیا اور مصر کو واپسی کی ٹھانی یعنی جنگ پر اس حالت غلامی کو ترجیح دی۔ اس سے زیادہ جو قوماً جبّارین کی تفسیر میں قصّے لکھے گئے ہیں وہ صرف قصّے ہی ہیں۔

۸۰۸ ان دو شخصوں کے نام گنتی ۱۴: ۶ میں دیئے گئے ہیں۔ یوشع بن نون اور کالب بن یفنّہ۔

۸۰۹ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے حکم کی نافرمانی کی اور دشمن سے خائف ہو کر جنگ کرنے سے قطعی انکار کر دیا فاذھب انت وربّک ایسی قوم کے منہ سے نکلا جو بات بات پر تمرد اور سرکشی دکھاتے تھے کوئی عجیب بات نہیں مطلب یہ ہے کہ تجھے اپنے رب کی مدد پر بھروسہ ہے سو تو اور تیرا رب جا کر جنگ کرو ہم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالتے اور جنگ میں نہیں جاتے۔

اصحاب موسیٰؑ اور اصحاب محمد صلعم: صحیح احادیث میں یہ ذکر ہے کہ بدر کے دن مقدادؓ نے نبی کریم صلعم سے عرض کی کہ ہم اصحاب موسیٰؑ کی طرح یہ نہ کہیں گے فاذھب انت

قَالَ رَبِّ إِنِّي لَآ أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝٢٥

(موسیٰ نے) کہا اے میرے رب میں سوائے اپنے اور اپنے بھائی کے اور کسی پر اختیار نہیں رکھتا سو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں فیصلہ کر دے۔ ع۸۱۰

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝٢٦ ع ۴ ۸

(اللہ نے) کہا اب وہ (زمین) ان پر چالیس سال کے لیے حرام کر دی گئی ہے، اسی زمین میں سرگرداں پھرتے رہیں گے سو تو ان نافرمان لوگوں پر افسوس نہ کر۔ ع۸۱۱

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ ۗ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ ۗ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝٢٧

اور ان پر آدم کے دو بیٹوں کی خبر حق کے ساتھ پڑھ دو، جب انھوں نے کوئی قربانی پیش کی سو وہ اُن دونوں میں سے ایک سے قبول کی گئی اور دوسرے سے قبول نہ کی گئی اس نے کہا میں ضرور تجھے قتل کروں گا (اس نے) کہا اللہ صرف متقیوں سے قبول کرتا ہے۔ ع۸۱۲

وَرَبُّكَ بلکہ ہم آپ کے ساتھ ہو کر آگے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں سے لڑیں گے۔ لیکن بعض احادیث میں یوم بدر کا لفظ ہے اور بعض میں نہیں۔ بخاری کتاب التفسیر میں بھی یوم بدر کا لفظ ہے اور ابن جریر نے روایت بیان کی ہے کہ یہ لفظ مقداد نے حدیبیہ میں کہے تھے اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ گو سورتوں کا نزول لمبے عرصہ پر ممتد رہتا تھا، مگر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سورۃ مائدہ کا کوئی حصہ جنگِ بدر سے پہلے نازل ہو چکا ہو اور حدیبیہ سے پہلے اس کا نازل ہونا قرین قیاس ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کس طرح ان قصّوں سے جو پہلی قوموں کے مذکور ہیں عبرت حاصل کرتے تھے۔

ع۸۱۰ حضرت موسیٰ کا یہ کہنا کہ میں اپنے نفس پر اور اپنے بھائی پر اختیار رکھتا ہوں اس لحاظ سے ہے کہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے مقام پر کھڑا کیا تھا پس ان کا تو تنہا بھی جنگ کرنے کے لیے اگر حکم الٰہی آئے نکلنا ضروری تھا۔ اسی لیے یہاں ان دو کو بھی شامل نہیں کیا جن پر انعام کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔

اُفرق۔ فَرَقْتُ بین الشیئین کے معنی ہیں دو چیزوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا خواہ وہ ایسی علیحدگی ہو جس کو آنکھ دیکھ سکے (یعنی مکانی طور پر تفریق) اور خواہ ایسی علیحدگی جو بصیرت سے معلوم ہو سکے (یعنی حکم اور فیصلہ میں الگ الگ کر دینا) (غ) اور یہاں معنی اقض ہی لیے گئے ہیں (ج) اور فاسق یا نافرمان قوم ان کو بلحاظ کثرت کے کہا گیا ورنہ وہ دو جن پر انعام ہوا انہی میں شامل تھے۔

ع۸۱۱ یتیھون۔ تاہ یَتِیْہ کے معنی ہیں تَحَیَّرَ یعنی حیران رہا (غ) مطلب یہ کہ کسی مقصد کو حاصل نہ کر سکیں گے۔

تأس مادہ اسا ہے اور اُسوۃ یا اِسوۃ وہ حالت ہے جس پر انسان دوسرے کی اتباع میں ہو خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بُری اور اسی کے معنی حزن یعنی غم ہیں گویا وہ فوت شدہ چیز کا اتباع غم سے کرتا ہے اور اسیت علیہ اور اَسِیْت لہٗ دونوں طرح پر آتا ہے اسی سے تاس ہے اور فکیف اٰسٰی علی قوم کفرین (الاعراف۔ ۹۳)

گنتی ۱۴: ۲۳ میں ہے "وے اس زمین کو جس کی بابت میں نے ان کے باپ دادوں سے قسم کی تھی نہ دیکھیں گے"۔ اور ۲۹ میں ہے "تمہاری لاشیں اور ان سب کی جو تم میں شمار کیے گئے ان کی کل جمع کے مطابق بیس برس والے سے لے کے اوپر والے تک جنہوں نے میری شکایتیں کیں اس بیابان میں گرینگی"۔ گویا یہ نسل یہیں تباہ ہو جائے گی اور ان کی اولاد فاتح ہو گی۔ قرآن کریم نے چالیس سال کا لفظ اختیار فرما کر اسی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ اوسط عمر ساٹھ سال ہے پس چالیس سال میں یہ لوگ جو اس وقت نافرمانی کر رہے ہیں اور جنگ کرنے کے قابل ہیں ہلاک ہو جائیں گے۔

ع۸۱۲ ہابیل اور قابیل کے قصّہ کی غرض: اس رکوع میں ایک مثال بیان کی ہے کہ کس طرح ایک انسان نے دوسرے کو محض اس کی نیکی پر حسد کی وجہ سے قتل کر دیا۔ اصل ذکر اہل کتاب کا تھا اور اس رکوع میں بھی بنی اسرائیل کا ذکر کیا ہے اور اگلے میں بھی ان کی تحریف وغیرہ کا ذکر ہے اور اس کے بعد بھی انہی کا ذکر چلتا ہے پس اصل غرض اس قصّہ میں بھی یہی بتانا ہے کہ یہود محض حسد کی وجہ سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے خلاف منصوبے کرتے ہیں۔ بلکہ بعض مفسرین نے واتل کو اسی تعلق کی طرف توجہ دلانے کے لیے آیت ۱۱۔ اذ ھمّ قوم ان یبسطوا الیکم ایدیھم پر عطف قرار دیا ہے (ج) اور بعض نے اس کو آیت ۱۸ پر عطف کہا ہے جہاں یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں گویا بتایا کہ یہ دعویٰ اور یہ کام۔ اور پھر اس رکوع میں حفاظت جان و مال کی ضرورت کی طرف اسی لحاظ سے توجہ دلائی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کا یوں سدّباب نہ کرتا تو پھر دنیا سے امن بالکل اُٹھ جاتا پس اس ذکر کو بطور ایک مثال کے یہ سمجھانے کے لیے بیان کیا کہ وہ یہود جو جنگ سے اس قدر خائف تھے کہ باوجود حکم الٰہی کے اس سے انکار کیا۔ اب آنحضرت صلعم سے محض بربنائے حسد برسرپیکار تھے۔ یہی حالت آج کل عیسائیوں کی ہے کہ ایک طرف دعویٰ صلح اور محبّت کا ہے اور یہی انجیل کی تعلیم کا ماحصل بتایا جاتا ہے اور دوسری طرف ذرا ذرا بات پر دنیا کی آزادی سلب کرنے کے لیے اور دوسری قوموں کو محکوم بنانے کے لیے لڑائیاں کرتے ہیں۔

آدمؑ کے یہ دو بیٹے اکثر کے نزدیک حضرت آدمؑ کے صلبی بیٹے ہابیل و قابیل تھے۔ حسن اور ضحاک کہتے ہیں بنی اسرائیل کے دو آدمی تھے۔ مضمون کی حیثیت کلی اسی خیال

لَئِنۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۸

اگر تو میری طرف اپنا ہاتھ بڑھائے گا کہ مجھے قتل کردے میں اپنا ہاتھ تیری طرف نہ بڑھاؤں گا کہ تجھے قتل کروں میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو سارے جہانوں کا رب ہے [۸۱۳]

اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۹ۚ

مَیں چاہتا ہوں کہ تو میرے (خلاف) گناہ اور اپنے گناہ کی سزا پائے اور یوں آگ والوں میں سے ہو جائے اور یہی ظالموں کا بدلہ ہے [۸۱۴]

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۳۰

سو اس کے نفس نے اس کے بھائی کے قتل پر اُسے راضی کر دیا پس اس نے اسے مار ڈالا اور نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو گیا [۸۱۵]

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ

تب اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کریدتا تھا، تاکہ اُسے

کی موید ہے کہ یہ کوئی بہت ابتدائی واقعہ ہے کہ کس طرح اوّل اوّل انسان کا ہاتھ اپنے ہی بھائی کے مارنے کے لیے اٹھا۔ خواہ وہ حضرت آدمؑ کے صلبی فرزند ہوں یا نہ ہوں، کیا قربانی کی تھی اور کس طرح اس کی قبولیت کا پتہ لگا یہ نہیں بتایا۔ اس لیے ان تفصیلات میں پڑنا درست نہیں۔ قربان اصل میں ہر ایک وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے اور مشہور معنی میں اس کا استعمال عام ہے ع ۵۷۹ اور قبولیت کے آثار بسا اوقات اس دنیا میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ابو عامر جیسے راہب کی مکّاری اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے آثار قبولیت کفار کی نظروں سے بھی مخفی نہ تھے صرف حسد کی وجہ سے آپؐ کی ترقی سے جلتے تھے اور آپؐ کو ہلاک کرنا چاہتے تھے۔

ع ۸۱۳ بسط ید سے مراد ہاتھ بڑھانا یا حملہ کرنا ہے۔ اس کو معلوم بھی ہو گیا کہ یہ میرا بھائی میرے قتل کا ارادہ رکھتا ہے تاہم اس نے کہا کہ مَیں تجھے قتل کرنے کے لیے کبھی ابتدا نہ کروں گا اور حدیث صحیح میں بھی ہے اذا التقی المسلمان بسیفیھما فقتل احدھما صاحبہ فالقاتل والمقتول فی النار یعنی جب دو مسلمان اپنی تلواروں سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوں تو قاتل اور مقتول دونوں آگ میں ہیں۔ اور جب دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلعم مقتول کیوں؟ تو فرمایا کہ وہ اپنے ساتھی کے قتل کرنے پر حریص تھا پس یہ وہ صورت ہے جہاں دونوں ایک دوسرے کو قتل کرنا چاہتے ہیں متقی کا یہ کام نہیں کہ گو اسے یہ بھی معلوم ہو کہ ایک شخص اسے قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تاہم بطور ابتدا اس پر ہاتھ اٹھائے ہاں جب حفاظت کا سوال ہو تو بلاشبہ تلوار اُٹھانا جائز ہے۔

ع ۸۱۴ اثمی کے معنی ہونگے میرا گناہ مگر حقیقت میں مراد ہے میرے خلاف گناہ کیونکہ اوپر اس کو متقی قرار دیا جا چکا ہے۔ ابن عباسؓ ابن مسعودؓ اور بہت سے صحابہ سے اثمی کے معنی اثم قتلی مروی ہیں (ج) یعنی میرے قتل کا گناہ جو تو اپنے ذمہ لیگا۔ اور اثمك سے مراد اس کے پہلے گناہ ہیں جن کی وجہ سے اس کی قربانی قبول نہیں ہوئی۔ یہ ادنیٰ تعلق کی اضافت قرآن کریم میں بہت جگہ آجاتی ہے جس کے نہ سمجھنے سے لوگ ٹھوکر کھاتے ہیں اسی قسم کا ادنیٰ تعلق ما تقدّم من ذنبك وما تاخّر (الفتح ۴۸ - ۲) میں ہے جہاں ذنبك سے مراد وہ ذنب ہے جو کفار آنحضرت صلعم کی طرف منسوب کرتے تھے۔

کسی کے ارادہ قتل پر اس کا قتل کرنا جائز نہیں؛ اصل نیت اور ارادہ اس کا تو وہی ہے کہ اپنے بھائی کے قتل کے لیے ابتدا نہیں کریگا گو وہ بھائی اس کے قتل کا ارادہ کر چکا ہے۔ یہاں اس کے نتیجہ کو بیان کیا ہے کہ میں ابتدا کر کے تمہارے وجود کو دنیا سے مٹانا تو نہیں چاہتا مگر چونکہ تم ارادہ کر چکے ہو کہ جب موقع پاؤ مجھ کو قتل کرد اس لیے نتیجہ یہ ہوگا کہ تم دوہرے گناہ کو اٹھاؤ گے ایک تو پہلے ہی تم قرب الٰہی سے دور پھینکدیئے گئے ہو اس لیے کہ نیکی کی طرف قدم نہیں اُٹھاتے بلکہ بدیوں کا ارتکاب کرتے ہو۔ دوسرے مجھے قتل کر کے ایک اور گناہ سر پر لے لوگے پس اگر تمہارا پہلا گناہ قابل معافی بھی ہے تو یہ عمداً گناہ ضرور تمہیں آگ میں لے جائے گا۔ یہ بھی درحقیقت اس کو گناہ سے روکنے کے لیے نصیحت تھی کہ اس حد تک تم اپنے آپ کو گناہ میں مبتلا نہ کرو۔

اسلامی تعلیم کا رنگ ہی یہاں ظاہر فرمایا ہے وہاں بھی یہی حکم ہے وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم۔ تم جنگ میں ابتدا مت کرو۔ آج بھی بہتیرے لوگ ہیں جو کھُلے طور پر نہیں تو مختلف تجاویز سے آہستہ آہستہ اسلام کا نام مٹانا چاہتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کو یہ اجازت نہیں کہ اُن کے ان ارادوں کی وجہ سے پہل کر کے ان کے خلاف ہاتھ اٹھائیں۔ ہاں اپنی حفاظت کر لینا امر دیگر ہے۔

ع ۸۱۵ طوّعت۔ طَوع کے اصل معنی انقیاد یعنی فرمانبرداری ہیں اور طوّعت لہٗ کے معنی ہیں انقادت لہٗ وسہّلت یعنی اسے اس کا فرمانبردار بنا دیا اور سہل کر دیا اور لکھا ہے کہ یہ تابّت عن کذا کے مقابلہ پر ہے یعنی نفس نے اس بات سے انکار کر دیا اور اس کو نہ مانا (غ) اور اس لفظ کے اختیار کرنے میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اوّل اوّل طبیعت میں اس کے متعلق روک تھی لیکن آہستہ آہستہ یہ امر اسے آسان نظر آنے لگا اور آخر کار نفس اس پر راضی ہو گیا اور ایسا ہی ہوتا ہے یعنی ایسے خطرناک گناہ پر بلکہ ہر گناہ پر نفس تدریجاً ہی راضی ہوتا ہے کیونکہ فطرتاً انسان گنہگار نہیں۔

لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ
يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا
الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ
مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿٣١﴾ۚۛ
مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ
اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ
فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ
وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ

دکھائے کہ کس طرح اپنے بھائی کی لاش کو چھپائے کہنے لگا مجھ پر افسوس مجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ اس کوّے کی مانند ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش کو چھپاتا، تب وہ پچھتانے والوں میں سے ہوا[۸۱۶]

اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ مقرر کر دیا کہ جو کوئی کسی جان کو بغیر جان کے (بدلہ کے) یا زمین میں فساد کے مار ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا اور جو کوئی اس کو زندہ رکھے تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ رکھا[۸۱۷]

ع[۸۱۶] بعث کے معنی یہاں قَیَّضَہٗ ہیں یعنی مقرر کر دیا (غ) انسان کی تعلیم کے لیے کوّے کا آجانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔

غُرابا۔ غَرْب سورج کے غائب ہونے پر بولا جاتا ہے اور ہر ایک دور ہو جانے والے کو غریب کہا جاتا ہے اور جو چیز اپنی جنس میں نظیر کم رکھتی ہو اسے بھی غریب کہا جاتا ہے اور غُراب کوّے کو اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ وہ بہت دور نکل جاتا ہے (غ)

یبحث۔ بَحْث کے معنی کَشْف یعنی ظاہر کرنا اور طلب ہیں اسی سے کسی امر کے متعلق بحث ہے (غ) اور اصل میں بحث کے معنی ہیں کسی چیز کا مٹی میں تلاش کرنا (ل) اسی لیے یہاں زمین کریدنا مراد ہے۔

یواری۔ وری سے ہے اور واری کے معنی سَتَر ہیں یعنی چھپایا۔ جیسے یہاں اور لباسا یواری سوأتکم (الاعراف۷۔۲۶) اور تواری کے معنی چھُپ گیا۔ حتّی توارت بالحجاب (صٓ۳۸۔۳۲) اور الوری کل مخلوق کو کہا جاتا ہے جو زمین پر ہے گویا وہ سطح زمین کو اپنے وجود سے چھپائے ہوئے ہیں اور وَرَاء کے معنی پیچھے ہیں جیسے ومن وراء اسحٰق یعقوب (ھود۱۱۔۷۱) فلیکونوا من ورآئکم (النسآء۴۔۱۰۲) یا آگے جیسے وکان ورآءھم ملك (الکھف۱۸۔۷۹) اور فنبذوہ وراء ظھورھم (اٰل عمران۳۔۱۸۷) میں مراد ان کا عمل اور تدبر نہ کرنا ہے اور فمن ابتغٰی ورآء ذٰلك (المؤمنون۲۳۔۷) میں اس سے مراد اس سے زیادہ ہے اور ویکفرون بما ورآءہ (البقرۃ۲۔۹۱) میں اس کے بعد معنی ہیں (غ) اور ان سب میں ستر یا چھپے ہوئے ہونے کا خیال پایا جاتا ہے۔

سَوْاَۃ۔ ساء سے ہے اور سَوْأۃ۔ العَورۃ اور الفاحشۃ کو کہا جاتا ہے یعنی ستر کی جگہ اور بے حیائی کی بات اور شرمگاہ کو بھی کہتے ہیں۔ اور ہر ایک عیب دار عمل اور امر پر بولا جاتا ہے (ل) اور مغیرہ کی حدیث میں لفظ سواۃ کا استعمال بیوفائی سے قتل کر دینے پر ہوا ہے جس کی تشریح میں ہے کہ سَواۃ اصل شرمگاہ ہے۔ پھر ہر ایک اس امر پر بولا جاتا ہے جس سے حیا کی جائے قول ہو یا فعل (ن)

یٰویلتی۔ وَیْل کے معنی قُبح ہیں یعنی برائی اور حسرت اور افسوس کے موقعہ پر بولا جاتا ہے جیسے وَیْح ترحم کے لیے فویل لھم مما کتبت ایدیھم (البقرۃ۲۔۷۹) اور وَیلتی اور وَیلَنا اپنے اوپر اظہار افسوس کے لیے ہیں۔

ندمین۔ نَدَم اور ندامۃ کسی امر پر جو ہاتھ سے جاتا رہا ہے تبدیل رائے کی وجہ سے افسوس کرنا ہے (غ)

جانوروں سے سبق: ظالم انسان طاقت کے نشہ میں اپنے بھائی کی کچھ پروا نہیں کرتا، بلکہ اس کو اپنی راہ میں روک سمجھ کر نیست و نابود کرنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ وہ چرند و پرند سے ہمدردی کا سبق سیکھ سکتا ہے۔ ایک حالت جہالت کی وہ ہوتی ہے جو ایک ہی قوم کا انسان اسی قوم کے دوسرے انسان کی تباہی کو اپنے لیے بہتری کا موجب سمجھتا ہے پھر اس سے اُتر کر جہالت کی حالت وہ ہے جو ایک قوم دوسری قوم کی تباہی کو اپنی ترقی کا موجب سمجھ لیتی ہے اور کسی میں ذرا سا عیب دیکھا تو اس کو نیست و نابود کرنے پر تل گئے۔ کوّے کو مٹی کریدتے دیکھ کر کیا سبق اس قاتل نے حاصل کیا۔ اے کاش میں اپنے بھائی کی سَواۃ کو چھپاتا اگر سَواۃ سے مراد شرمگاہ لی جائے تو اس سے لاش کا چھپانا مراد ہوگا۔ اور ابتداء میں انسان کا کسی جانور سے سبق حاصل کر لینا کوئی بعید بات نہیں۔ گو یہاں نہ دوسرے کوّے کا ذکر ہے نہ اس کی لاش کو چھپانے کا۔ اس لیے ابومسلم نے کہا ہے کہ کوئی چیز کوّے نے زمین کرید کر چھپائی اور اگر سَواۃ سے مراد امر شائن یا عیب ہے تو کوّے کا مٹی کریدنا اشارہ ہے کسی بات کے مخفی کرنے کے لیے تو قاتل کو یہ ندامت ہوئی کہ میں نے اپنے بھائی میں کوئی چھوٹا سا عیب دیکھ کر بجائے اس کے کہ اس عیب کو چھپاتا اس کے لیے اسے جان سے مار دیا۔ کوّے کا بھیجنا اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس لیے کہ انسان اس سے ایک مفید سبق حاصل کرتا ہے۔ کوّے میں دو باتوں کی خصوصیت ہے ایک یہ کہ اپنی جنس کی لاش کو کھلا نہیں رہنے دیتا دوسرے کوّوں کو جس قدر ہمدردی ایک دوسرے سے ہوتی ہے اس کی نظیر دوسرے جانوروں میں نہیں ملتی ایک کی آواز پر ہزاروں جمع ہو جاتے ہیں۔

ع[۸۱۷] اجل۔ اَجَل کے اصل معنی کسی شے کے وقت مقرر ہیں ن۳۰ اس لیے اٰجل۔ عاجل کی ضد ہے۔ یعنی دیر سے ہونے والی بات اور اس لیے اَجل وہ بُرا فعل

جَمِيعًا ۭ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۡ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾

اور یقیناً ہمارے رسول ان کے پاس کھلی دلائل لیکر آئے پھر اس کے بعد بھی ان میں سے بہت سے یقیناً زمین میں حد سے نکلنے والے ہیں۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾

ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، صرف یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا صلیب پر مارے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے کاٹے جائیں یا ان کو قید کیا جائے، یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے ۸۱۸

ہے جس کے نتیجہ سے ایک وقت کے بعد خوف ہو (غ)

بنی اسرائیل کو چونکہ اس وقت خاص مخالفت رسول اللہ صلعم سے تھی اس لیے ان کا خاص ذکر کیا کہ یہ اب آنحضرتؐ کے قتل کے درپے ہیں حالانکہ کسی کا قتل کرنا اس وقت جائز ہوتا ہے جب اس نے کوئی خون کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد پھیلائے۔ ان دونوں باتوں میں سے آنحضرت صلعم کی طرف کوئی بھی منسوب نہ ہوسکتی تھی اور شاید لفظ نفس میں اشارہ بلحاظ عظمت آنحضرت صلعم کی طرف ہو کہ ایسے عظیم معلّم نیکی اور مصلح کو جو شخص قتل کردے تو اس نے گویا سب کو ہی قتل کردیا اور جو شخص اس کے بچانے میں حصّہ لیتا ہے اس نے گویا سبھی لوگوں کو بچایا۔ یوں عام معنی کے لحاظ سے بھی درست ہے۔ بیگناہ کو جیسا ایک کو قتل کیا ویسا سب کو کیا اور ایک کی زندگی بچائی تو سب ہی کی بچائی اور یہ اسی کے مطابق ہے جو دوسری جگہ فرمایا تھا ولکم فی القصاص حیٰوۃ (البقرۃ ۲-۱۷۹) گویا قصاص بھی احیائے نفس ہے کیونکہ اس سے ہلاکت سے نجات ملتی ہے اور یا احیاء سے مراد کسی نفس کا رحمت اور شفقت کرکے موت سے بچانا ہے۔

ع۸۱۸ یحاربون۔ حَرْب کے معنی لڑائی ہیں۔ اور یہاں یحاربون سے مراد فی الواقع جنگ کرنے والی قومیں نہیں بلکہ مراد اس سے صرف معصیت ہے (ل) اور یہ اس کی مثل ہے جو سود خوار کے بارہ میں فرمایا فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ (البقرۃ ۲-۲۷۹) یا منافقوں کے ذکر میں آتا ہے وارصادا لمن حارب اللہ و رسولہ (التوبۃ ۹-۱۰۷) کہ دونوں صورتوں میں جنگ نہیں بلکہ مخالفت مراد ہے ینفوا من الارض۔ نَفْی کسی چیز کے الگ ہو جانے پر بولا جاتا ہے اور نَفَیْتُ الرجلَ کے معنی ہیں میں نے اسے نکال دیا اور ینفوا من الارض کے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ ان کا خون ہدر ہوگا اور یہ بھی کہ ان کو ساری عمر کیلئے قید کردیا جائے اور یہ بھی کہ ان کو جلاوطن کردیا جائے (ل) اور امام ابوحنیفہ اور احمد کے نزدیک یہاں مراد حبس یعنی قید کرنا ہی ہے۔

فساد یا ڈاکہ کی سزا: اس آیت میں کن لوگوں کا ذکر ہے اور کیا سزا ہے۔ اوپر فرمایا تھا کہ قتل کی سزا صرف دو صورتوں میں دی جاسکتی ہے ایک یہ کہ قتل کرے۔ دوسرے یہ کہ فساد کرے۔ اس لیے یہاں یحاربون اللہ و رسولہ سے مراد زمین میں فساد کرنے والے لیے گئے ہیں۔ اور بالخصوص ڈاکو جو جان سے مار کر یا جان سے مارنے کا خوف دیکر لوگوں کا مال لوٹتے ہیں اور گو ابن جریر نے بعض روایات ایسی بھی بیان کی ہیں کہ یہ آیات اہل کتاب کے بارہ میں نازل ہوئیں جنھوں نے نبی کریم صلعم سے بدعہدی کرکے فساد کیا۔ یا مشرکین کے بارہ میں۔ عرینہ کی سخت سزا کے وجوہات: مگر اکثر مفسرین نے اسے عرینہ کے بارہ میں لیا ہے جن کے چند آدمی آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے پھر بیمار ہوگئے تو نبی کریم صلعم نے انہیں وہاں بھیج دیا جہاں مدینہ سے باہر صدقہ کے اونٹ تھے۔ تاکہ دودھ پئیں اور علاج کریں۔ انہوں نے تندرست ہوکر چرواہوں کو مار ڈالا اور اونٹ لے گئے اور ابن جریر نے انس سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے ڈاکے بھی مارے اور عورتوں کی آبرو ریزی کی تو آپ نے ان کے ہاتھ اور پاؤں کٹوا دیئے اور ان کی آنکھیں نکلوا دیں اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ان کی آنکھیں اس لیے نکلوائیں کہ انہوں نے چرواہوں کی آنکھیں نکال دی تھیں (ث) اور پھر اسی حالت میں ان کو دھوپ میں ڈلوا دیا یہاں تک کہ وہ مر گئے۔ کیونکہ ان کا جرم خطرناک تھا اور عبرت ناک سزا کو چاہتا تھا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں ایسے لوگوں کی سزا خاص کردی گئی۔ گو قصاص کے رنگ میں وہ زیادہ سزا کے مستحق بھی ہوں۔

ڈاکہ کی چار قسم کی سزا: لیکن شان نزول کچھ بھی ہو یہاں حکم عام ہے اور ان لوگوں کے بارہ میں ہی یہ حکم تسلیم کیا گیا ہے جو ڈاکے مار کر بدامنی پھیلاتے ہیں اور چار قسم کی سزا ان کے لیے تجویز کی گئی ہے قتل، صلیب۔ ہاتھ پاؤں کا کاٹنا۔ قید۔ ظاہر ہے کہ چار قسم کی سزا جرم کی چار نوعیتوں کے لحاظ سے ہوسکتی ہے اور وہ نوعیتیں ڈاکہ کے جرم کی یہ ہیں کہ مال لینے کے ساتھ قتل بھی کریں۔ یا صرف قتل سے ڈرا کر مال لیں۔ پہلی صورت میں سزا قتل یا صلیب ہے دوسری میں ہاتھ پاؤں کاٹنا یا قید۔ گو بعض روایات میں یہ ہے کہ قید کی سزا اس صورت میں ہے جب صرف ڈراتے ہوں اور مال نہ لیا ہو۔ مگر بغیر مال لینے کے ڈرانا بے معنی ہے۔ پھر قتل کی صورت میں دو حالتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ بعض ڈاکو بہت وارداتیں کرکے ایک دھاک بٹھا دیتے ہیں یا قتل کے ساتھ اور جرائم کا بھی ارتکاب کرتے ہیں۔ ایسوں کی سزا قتل کے ساتھ صلیب بھی ہے

اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَقۡدِرُوۡا
عَلَيۡهِمۡ‌ ۚ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿٣٤﴾ ع
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابۡتَغُوۡۤا اِلَيۡهِ
الۡوَسِيۡلَةَ وَجَاهِدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِهٖ لَعَلَّكُمۡ
تُفۡلِحُوۡنَ ﴿٣٥﴾

سوائے اُن کے جو توبہ کرلیں اس سے پہلے کہ تم اُن پر قابو پالو
سو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۸۱۹
اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقوٰے کرو،
اور اس کا قرب چاہو اور اس کی راہ میں جہاد کرو
تاکہ تم کامیاب ہو ۸۲۰

تاکہ عبرت بھی ہو اور عام طور پر لوگوں کو پتہ بھی لگ جائے اور اسی طرح جب قتل نہ ہو اور مال لیا جائے تو بھی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی قسم کا نقصان جسمانی بھی پہنچایا جائے اور کسی جرم کا ارتکاب ہو تو اس صورت میں ہاتھ پاؤں کا کاٹنا ہے یا یہ کہ قتل کی حالت کی طرح بہت وارداتیں کی ہوں اور اس کے سوائے صرف قید کی سزا ہے۔ چونکہ ڈاکہ کا جرم ان چار قسم کا ہوسکتا ہے اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ چار قسم کی الگ الگ سزا ان جرموں کی نوعیت پر ہے۔ یہ سچ ہے کہ سزا کا تقرر امام کے اختیار میں ہے مگر امام خود فساد اور جرم کی نوعیت پر سزا دیگا ماحصل ایک ہے اور ابن جریر نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی اسناد میں نظر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت انس رضؓ نے عبدالملک بن مروان کو لکھا تھا کہ عرینہ کا گروہ اسلام سے مرتد ہوگئے اور اونٹوں کو لے گئے اور رستوں پر ڈاکے مارنے شروع کیے اور عورتوں کی آبروریزی کی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبرائیل نے کہا کہ جو شخص ڈاکہ مار کر مال لیتا ہے اس کا ہاتھ بوجہ مال لینے کے اور پاؤں بوجہ رستوں پر ڈرانے کے کاٹا جائے اور اگر قتل بھی کیا ہو تو اسے قتل کیا جائے اور اگر قتل کے ساتھ رستوں پر ڈراتا اور عورتوں کی آبروریزی کرتا ہے تو صلیب دیا جائے (مخالف اطراف سے ہاتھ پاؤں اس لیے کٹوائے کہ چل پھر بھی سکے)۔

ع۸۱۹ توبہ پر معافی سزا: یہ تعلیم صرف اسلام سے خاص ہے کہ جب سچے طور پر ایک شخص توبہ کرلے تو اسے معاف کردیا جائے گو کتنا بھی بڑا جرم ہو اور سچی توبہ کے لیے یہ شرط رکھ دی کہ ان پر قابو نہ پایا ہو اور انہوں نے ایسے افعال سے رجوع کر کے دوسری طرز زندگی اختیار کرلی ہو۔ جب جرم کی حالت میں پکڑے جائیں تو توبہ بے معنی ہے اور اگر ایک شخص توبہ کر کے پھر ایسا ہی فعل کرے تو اس کے لیے سخت تر سزا بھی موجود ہے۔

ع۸۲۰ وسیلۃ کے معنی امام راغب نے رغبت کے ساتھ کسی چیز کی طرف پہنچنا کیے ہیں۔ التَّوَصُّلُ الی الشئ برغبۃ۔ اور آگے لکھا ہے کہ یہ قربۃ کی طرح ہے۔ اور واسل اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت کرنے والا ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ وسیلۃ مرتبہ اور درجہ اور قربت کا نام ہے اور وَسَّل فلان الی اللہ وسیلۃ کے معنی ہیں ایسا عمل کیا جس کے ساتھ اس کا قرب حاصل کیا اور پھر لکھا ہے کہ وسیلۃ پہنچنے اور قرب کو کہتے ہیں اور حدیث میں دعائے اذان میں آتا ہے اٰتِ محمدن الوسیلۃ جہاں مراد ہے القرب من اللہ تعالیٰ یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب (ن) اور صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ آنحضرت صلعم نے اذان کی دعا سکھا کر فرمایا کہ وسیلۃ جنت میں اعلیٰ ترین درجہ ہے پس یہی معنی یہاں مراد ہے۔

حصول قرب الٰہی: اصل ذکر اہل کتاب کا تھا جنہوں نے دین کو چھوڑ کر اپنی نظر کو صرف دنیا تک محدود کردیا اور دین میں بجائے توحید کے شرک کے طریق کو اختیار کیا اور پچھلے رکوع کی آخری آیت میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو مسلمان کہلا کر ڈاکے مارتے اور زمین میں فساد پھیلاتے اور اللہ اور رسول کی کھلی مخالفت کرتے تھے اس لیے بتایا کہ مومن کا اصل کام کیا ہے۔ پہلے تقویٰ کی نصیحت فرمائی یعنی رعایت حقوق کی پس کسی کو بھی کسی قسم کا نقصان نہ پہنچانا چاہیئے۔ پھر فرمایا کہ دنیا کے مال پر بہت نہ گر جاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ کے قرب کو حاصل کرنے کی تڑپ اپنے اندر پیدا کرو کیونکہ یہی انسان کی زندگی کی اصل غرض ہے، مگر یہ غرض حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کے لیے زور نہ لگایا جائے اس لیے تیسری نصیحت جہاد کے لیے کی تاکہ کامیاب ہو جاؤ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (العنکبوت ۲۹ - ٦٩) اگلی آیت میں کھلے طور پر بتا دیا ہے کہ یہ دنیا کا مال جس پر اہل کتاب گر گئے ہیں اور جس کی خاطر حق اور صداقت کو اور خدا کو چھوڑ دیا ہے یہ صرف اس دنیا کی زندگی میں کچھ کام دیتا ہے آخرت میں یہ کام نہ آئے گا پس اس آیت میں صرف یہ بتایا ہے کہ اپنی زندگی کی اصل غرض کو چھوڑ کر مال دنیا پر بہت نہ جھک جاؤ کہ جائز و ناجائز طریق سے اسے جمع کرنے لگو۔ اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کی تڑپ اپنے اندر پیدا کرو یہی معنی وسیلہ کے ہیں۔ اور اسی معنی پر خود قرآن کریم کی بھی شہادت ہے اولٰئِک الذین یدعون یبتغون الیٰ ربھم الوسیلۃ (بنی اسرائیل ۱۷ - ۵۷) یعنی جن کو لوگ یہ سمجھ کر پکارتے ہیں کہ وہ ان کے مصائب دور کردیں گے وہ خود قرب الٰہی کو چاہنے والے تھے اور انہوں نے کبھی ایسا دعویٰ نہیں کیا اور ابن جریر نے وابتغوا الیہ الوسیلۃ کے معنی اطلبوا القربۃ الیہ کیے ہیں یعنی اس کا قرب مانگو اور اس معنی پر عنترہ کا شعر پیش کیا ہے ان الرجال لھم الیک وسیلۃ۔ اور حسن سے اور مجاہد سے اور قتادہ سے اس کے معنی قرب ہی روایت کیے ہیں اور اور کوئی معنی نہیں دیئے۔ دوسروں کو وسیلہ بنانا۔ اور اگر اس کے معنی ما یتوصل بہ یعنی پہنچنے کا ذریعہ بھی لیے جائیں تو بھی اس سے مراد صرف یہی ہے کہ ان راہوں پر چلو جن راہوں سے اللہ کی طرف پہنچ جاؤ یعنی اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اس سے یہ معنی نکالنا کہ جو لوگ مر چکے ہیں ان کو ذریعہ بناؤ ایک نہایت لغو حرکت ہے۔ یوں تو نبی کریم صلعم نے خود حضرت عمر رضؓ سے کہا تھا لا تنسنا یا اخی من دعائک اے بھائی اپنی دعاؤں میں ہم کو بھول نہ جائیو۔ اس لیے کسی سے دعا کرانا کوئی شرک نہیں۔ مگر جو لوگ وفات پا چکے ہیں ان سے استمداد صریح شرک ہے حتیٰ کہ جو دعا نبی کریم صلعم کے روضہ مبارک پر کی جاتی ہے اس میں بھی لازمی ہے کہ منہ خانہ کعبہ کی طرف کیا جائے اور قبر دائیں یا بائیں رہ جائے۔ قبر کو سامنے رکھ کر دعا نہ کی جائے۔ بلکہ امام ابوحنیفہ رحؒ کے نزدیک تو اس کی طرف دعا کے وقت پیٹھ کی جائے۔ قرآن کریم میں اس پر نصوص صریح ہیں کہ دعا سوائے

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٣٦﴾

جو لوگ کافر ہوئے اگر جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب ان کا ہو اور اس کی مثل (اور بھی) اس کے ساتھ ہو کہ اس کے ساتھ قیامت کے دن کے عذاب کا فدیہ دیں ان سے قبول نہ کیا جائیگا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

يُرِيدُونَ أَن يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٣٧﴾

چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے اور اُن کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے ؏۸۲۱

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٣٨﴾

اور چور مرد اور چور عورت سو اُن دونوں کے ہاتھ کاٹ دو (یہ) اس کی سزا (ہے) جو انھوں نے کیا اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا اور اللہ غالب حکمت والا ہے ؏۸۲۲

اللہ تعالیٰ کے دوسرے سے جائز نہیں ان تدعوھم لا یسمعوا دعاءکم ولو سمعوا ما استجابوا لکم (فاطر ۳۵-۱۴) لہ دعوۃ الحق والذین یدعون من دونہ لا یستجیبون لھم بشئ الا کباسط کفیہ الی الماء (الرعد ۱۳-۱۴)

پس اس قدر صراحت کے ہوتے ہوئے بزرگانِ دین کو وسیلے کہہ کر ان کے ذریعہ سے قضائے حاجات چاہنا یا ان کی قبروں پر جا کر دعائیں کرنا یا ان کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا یہ سب مشرکانہ افعال ہیں اور نیکوں یا بزرگوں کا توسل ان کی زندگی میں بذریعہ ان کی دعا کے ہے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ کا قول منقول ہے جب انہوں نے امساک باران کے موقع پر حضرت عباس کو دعا کے لیے آگے کیا اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ ہم رسول اللہ صلعم سے توسل کرتے تھے یعنی آپ سے دعا کراتے تھے تو تُو ہم پر باران رحمت نازل فرماتا تھا اب ہم تیرے نبی کے چچا سے توسل کرتے ہیں یعنی دعا کے لیے ان کو آگے کرتے ہیں۔ پس تو ہم پر باران رحمت نازل فرما پس توسل بزرگوں کا صرف اسی حد تک جائز ہے کہ ان کی زندگی میں ان سے دعا کرائی جائے۔

؏۸۲۱ دوزخ سے نکلنا: بہشت اور دوزخ کے ذکر میں قرآن کریم میں یہ ایک بین فرق نظر آتا ہے کہ جہاں بہشت کا ذکر ہے وہاں فرمایا وما ھم منھا بمخرجین (الحجر ۱۵-۴۸) یعنی وہ وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے۔ اور دوزخ کے ذکر میں ہے وما ھم بخارجین منھا جس کی تفسیر خود دوسری جگہ یوں کر دی ہے کلما ارادوا ان یخرجوا منھا اعیدوا فیھا (السجدۃ ۳۲-۲۰) یعنی جب نکلنا چاہیں گے تو اس سے نہیں نکل سکیں گے اور جو حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مٹھی بھر کر ان لوگوں کو نکال دیگا جنھوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی تو یہ اس آیت کے خلاف نہیں کیونکہ وہ اپنے ارادہ سے نہیں نکلیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کے رحم کے جوش میں آنے سے نکالے جائیں گے۔

؏۸۲۲ پچھلے رکوع میں حفظ جان و مال کی ضرورت یہود کے ذکر میں بتائی تھی۔ یہ آیت اسی کا تتمہ ہے درمیان میں صرف مسلمانوں کو کچھ نصیحت ہے۔ اور ڈاکوؤں کے ذکر کے بعد جو بالجبر مال لیتے ہیں چور کا ذکر کیا جو چھپ کر مال لیتا ہے۔

قطع ید سے مراد: اور اس کی سزا قطع ید یعنی ہاتھ کا کاٹنا قرار دی ہے۔ ہاتھ کے کاٹنے سے مجازاً ہاتھ کا روکنا بھی مراد ہو سکتا ہے جیسے تقطعون السبیل میں رستے کے قطع کرنے سے مراد راستہ سے مسافروں کو روکنا ہے ایسا ہی قطع رحم بھی مجازی معنی میں استعمال ہوتا ہے اور قَطَعَ لِسَانَہٗ کے معنی ہیں اسے خاموش کر دیا۔ حدیث میں ہے کہ ایک شاعر نے شعر سنائے تو آپ نے فرمایا اِقْطَعُوا عَنِّیْ لِسَانَہٗ یعنی اسے کچھ دیکر خاموش کر دو (ل) پس قطع ید سے مراد بھی مجازاً ہاتھوں کا روکنا ہو سکتا ہے اور ظاہر معنی کو لیکر امام شافعی کے نزدیک دینار کا چوتھا حصہ نصاب ہے اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک دس درہم۔ بعض کے نزدیک پانچ درہم یعنی اس سے کم مال کی چوری ہو تو قطع ید نہیں۔ مگر قرین قیاس ہے کہ ہاتھ کاٹنا چور کی انتہائی سزا ہے۔ اور امام کو اختیار ہے کہ اس سے کم سزا دے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی جو ڈاکوؤں کی سزا بتائی ہے اس میں امام کے اختیار کو بڑا وسیع کیا ہے قتل و صلیب سے لیکر قید محض تک جو سزا چاہے دے۔ اور جب یہ آیتیں ایک دوسرے کے حکم کی تکمیل کرتی ہیں تو ماننا پڑے گا کہ جس طرح وہاں انتہائی سزا قتل ہے یہاں صرف انتہائی سزا قطع ید بتا دی ہے۔ صحابہ کے عمل سے اس معنی پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا کیونکہ ڈاکو کو جو بجبر مال لیتا ہے جب قید کی سزا دینا جائز ہے تو چور کو کیوں نہیں۔ پھر ہاتھ پاؤں کا کاٹنا ڈاکو کی سزا بھی ہے۔ جیسے ہاتھ کا کاٹنا چور کی پھر ڈاکو کی سزا قتل و صلیب ہے جو چور کے لیے نہیں۔ اور یہ ڈاکو کی انتہائی سزا ہے اس سے نیچے اُتر کر ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا ہے جو چور کی انتہائی سزا قرار دی ہے اور اس سے اُتر کر قید کی سزا ہے جو ڈاکو کو دی جا سکتی ہے تو لازماً چور کو بھی دی جا سکتی ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور بات یہاں قابلِ غور ہے۔ اُبیّ کی قرأت میں بجائے سارق کے سَرّاق اور سارقۃ کے سَرّاقۃ ہے جو مبالغہ کے صیغے ہیں پس قرین قیاس یہ ہے کہ عادی چور کے لیے یہ سزا لازمی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ توبہ کی گنجائش بھی رکھی ہے ورنہ اگر پہلی چوری پر ہی سزائے قطع ید ہو تو توبہ کا کیا فائدہ۔ جب توبہ کی صورت

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ
فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾

پھر جو شخص اپنے ظلم کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو اللہ اس پر (رحمت سے) توجہ کریگا اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَغْفِرُ لِمَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾

کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ کے لیے ہی ہے جسے چاہے عذاب دے اور جسے چاہے بخش دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ
فِی الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ
وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛۚ
سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ
لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ
بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا
فَخُذُوْهُ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَ مَنْ
يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ
شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ
يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِی الدُّنْيَا خِزْیٌ ۚۖ
وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾

(مع ۔ الوقف علی الاول اجوز)

اے رسول وہ لوگ تجھے غمناک نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں ان میں سے جو اپنے مونہوں سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کے دل ایمان نہیں لائے اور اُن میں سے یہودی ہیں وہ جھوٹ بولنے کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں ایک اور گروہ کی جاسوسی کرنیوالے جو تیرے پاس نہیں آیا، باتوں کو ان کی جگہ (جاننے) کے بعد بدلتے ہیں۔ کہتے ہیں اگر تم کو یہ دیا جائے تو اُسے لیلو اور اگر یہ نہ دیا جائے تو بچو۔ اور جس کے دُکھ میں پڑا رہنے کا اللہ ارادہ کرلے تو اللہ کے سامنے تُو اس کے لیے کچھ اختیار نہیں رکھتا، یہی وہ ہیں کہ اللہ نے ارادہ نہیں کیا کہ اُن کے دلوں کو پاک کرے، ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے[۸۲۳]

ہیں ڈاکو کو بھی رعایت دی ہے تو چور کو رعایت کیوں نہ ملنی چاہیئے پس عادی چور کی لازمی سزا قطع ید ہے۔ اور معمولی چور کی انتہائی سزا۔ اور یوں امام کو قید کا اختیار ہے۔ قطع ید کو عبرتناک سزا قرار دینا بھی بتاتا ہے کہ یہ محض انتہائی سزا ہے اور سزا کے دینے میں امام حالات وقتی وملکی یا حالات قومی کو بھی مدنظر رکھ سکتا ہے اس لیے بعض حالات میں بلحاظ حالات قومی یا ملکی پہلی چوری پر بھی قطع ید کی سزا دیجا سکتی ہے۔ اس زمانہ میں اگر حالات وقتی کے لحاظ سے عادی چور کی سزا قطع ید ہو اور اس سے ادھر سزائے قید تو ہرج نہیں اور دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ عادی چور کی سزا سوائے ہاتھ کاٹنے کے اور کوئی مفید نہیں ہوسکتی۔ اگر غرض اصلاح ہو تو لمبی قیدیں ایسے حالات میں سوائے اخلاقی حالت پر بُرا اثر ڈالنے کے اور کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں اور ہاتھ کاٹنے سے نہ صرف جرم رک جاتا ہے بلکہ اصلاح کی بھی یہی ایک صورت ہے۔

ع۸۲۳ سمّٰعون للکذب کے معنی دو طرح پر ہوسکتے ہیں۔ ایک جھوٹ قبول کرنے والے۔ کیونکہ سمع کے معنی قبول کرنا بھی آتے ہیں۔ دوسرے جھوٹ بولنے کی خاطر باتیں سننے والے۔ ایسا ہی سمّٰعون لقوم اٰخرین کے معنی بھی دو طرح ہوسکتے ہیں ایک اور قوم کی باتیں قبول کرنے والے یا ایک اور قوم کی خاطر باتیں سننے والے۔

یہاں پھر کلام کو اصل موضوع کی طرف پھیرا ہے اور یہودیوں کے ساتھ منافقوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ منافقوں کی طرح یہودیوں کا ایک گروہ منافقانہ روش اختیار کیے ہوئے تھا ان کا ذکر ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو قبول نہیں کرتے، بلکہ مانتے اپنے سرداروں کی بات کو ہی ہیں۔ اور جو کچھ وہ کہدیتے ہیں اس کو پلے باندھا ہُوا ہے جس حد تک انہوں نے بات کو ماننے کو کہا مان لی اس سے آگے انکار کردیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آخری فیصلے یہ لوگ رسول اللہ صلعم سے کراتے تھے۔ اور یہ اس معاہدہ کے مطابق تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری پر ہوا تھا۔ ایسے حالات میں نبی کریم صلّے اللہ علیہ وسلم ان کے فیصلے توریت کے مطابق کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک زانی اور زانیہ یہودی آپ کے سامنے لائے گئے تو آپ نے سنگسار کرنے کا حکم دیا اور یہی حکم توریت میں تھا۔ مگر جب ان سے دریافت کیا گیا کہ تمہاری کتاب میں کیا حکم ہے تو کہا کہ ان کے منہ کالے کیے جائیں اور انہیں ذلیل کیا جائے۔ تب بعض علمائے یہود سے توریت منگوا کر پڑھوائی گئی تو انہوں نے اس کو قبول کیا کہ زنا کی سزا اصل میں رجم ہے۔ حضرت مسیح کے وقت تک اس حکم کا توریت میں موجود ہونا ثابت ہے۔ چنانچہ یوحنا ۸ : ۴ و ۵ میں ہے کہ فریسیوں نے کہا

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ
جھوٹ کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں حرام کھانے والے ہیں

فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ
سو اگر تیرے پاس آئیں تو اُن کے درمیان فیصلہ کر یا اُن سے منہ پھیر لے

عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ
اور اگر تو اُن سے منہ پھیر لے تو تیرا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں گے

شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ
اور اگر تو فیصلہ کرے تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر

بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۴۲
اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ۸۲۴

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ
اور کیوں کر تجھے فیصلہ کرنے والا ٹھیراتے ہیں اور انکے پاس توریت ہے

فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ
اس میں اللہ کا فیصلہ ہے پھر اس کے بعد پھر جاتے ہیں

ع ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۴۳
اور یہ مومن نہیں ۸۲۵

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ
ہمیں نے توریت اتاری اس میں ہدایت اور روشنی ہے ۸۲۶ اس

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا
کے مطابق نبی جو فرمانبردار تھے یہودیوں کے لیے فیصلے کرتے

لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ
تھے اور مشائخ اور علماء اس لیے کہ اللہ کی کتاب

"اے استاد یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی۔ موسیٰ نے تو توریت میں ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسوں کو سنگسار کریں پر تو کیا کہتا ہے"۔ حالانکہ موجودہ توریت میں رجم نہیں اس سے تحریف توریت کا فیصلہ ہوتا ہے۔
ایسے ایسے اور واقعات بھی پیش آتے تھے جس طرح پر علماء عام لوگوں کو کہہ دیتے تھے اسی حد تک وہ قبول کرتے اس لیے اگلی آیت میں حکم دیا ہے کہ ان حالات میں چاہو تو فیصلہ سے انکار کر دو۔
اس جگہ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یا محمد یا یا احمد کہہ کر قرآن شریف میں کہیں خطاب نہیں کیا گیا حالانکہ دیگر انبیاء و رسل کو نام سے خطاب ہوا ہے جیسے یا آدم۔ یا موسیٰ۔ یا عیسیٰ۔ یا داؤد۔ یا ابراہیم۔ یا نوح آنحضرت صلعم کو خطاب یا یہا الرسول یا یا یہا النبی سے کیا ہے یعنی النبی یا الرسول کے نام سے اس کی وجہ گو آپ کی تشریف بھی ہو مگر اصل حکمت یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی اور رسول ہونے والا نہ تھا۔ اس لیے النبی اور الرسول کہہ کر خطاب کیا ہے اور دوسرے چونکہ کمالات نبوت آپ میں جمع ہوئے اس لیے بھی دوسرا کوئی نبی اس کا مستحق نہ تھا کہ اسے النبی اور الرسول کہہ کر خطاب کیا جاتا۔

۸۲۴ سحت میں اصل میں بیخکنی کرنے یا چھل ڈالنے کا خیال پایا جاتا ہے جیسے فیسحتکم لعذاب (طٰہٰ ۲۰-۶۱) اور سحت اس حرام مال کو کہتے ہیں جو کمانے والے کے لیے موجب عار ہو کیونکہ وہ دین کا استیصال کرتا ہے۔ رشوت کو بھی سحت کہا جاتا ہے (غ) باوجود ان کی سب شرارتوں کے پھر بھی آنحضرت صلعم کو حکم یہی ہے کہ جب فیصلہ کرو تو انصاف سے کرو کیسے اعلیٰ اخلاق پر آپ کو کھڑا کیا گیا۔

۸۲۵ یہودیوں کا توریت کے فیصلوں کو قبول نہ کرنا: اسلام میں بہت سی باتوں میں بمقابلہ توریت سہولت اور نرمی تھی اس لیے یہودی سہل فیصلہ کی خاطر رسول اللہ صلعم کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس لیے فرمایا کہ یہودی رہ کر پھر رسول اللہ صلعم کو کس طرح حَکَم بنا سکتے ہیں۔ ان کے لیے توریت میں خدائی فیصلہ موجود ہے اگر اسی کو شریعت حقہ سمجھتے ہیں اور اسلام کو قبول نہیں کرتے تو پھر اس پر فیصلہ کریں۔ یہ کیا کہ مذہب تو یہود کا رکھیں اور فیصلہ یہودی شریعت کا قبول نہ کریں، ما اولٰئك بالمؤمنين میں یہی اشارہ ہے کہ ان کا ایمان نہ توریت پر ہے نہ یہ قرآن شریف کو مانتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا ایک قول منقول ہے کہ اگر میرے لیے حکومت ہو تو اہل توریت کو توریت کے مطابق فتویٰ دوں اور اہل انجیل کو انجیل کے مطابق (دیکھو روح المعانی) فاحکم بینہم بالقسط کے نیچے کس قدر فرق ہے کہ قرآن کریم اہل توریت کے فیصلے توریت کے مطابق اور اہل انجیل کے فیصلے انجیل کے مطابق کرتا ہے تو وہ لوگ ماننے کو تیار نہیں۔ اور مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کے فیصلے قرآن کریم کے مطابق ہوں تو انہیں میسر نہیں آتا

۸۲۶ پچھلے رکوع میں ان کے تنازعات باہمی کا ذکر تھا جو توریت کے مطابق نبی کریم صلعم کر دیتے تھے۔ اس رکوع میں باہمی تنازعات سے اسلام کے ساتھ ان کے اختلافات کی طرف رجوع کیا بلکہ کل مذاہب کے اسلام سے اختلافات کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ ان اختلافوں کا فیصلہ کرنے کے لیے قرآن نازل ہوا ہے۔ توریت ہدایت اور روشنی کو لیے ہوئے نازل ہوئی تحریف سے اس ہدایت اور نور کا کچھ حصہ ضائع کر دیا گیا، لیکن بلاشبہ اب بھی اس میں ہدایت اور نور موجود ہے۔ چونکہ اس رکوع میں اصل غرض ان کو قرآن شریف پر ایمان کی طرف بلانا ہے جسے سب کتب سابقہ کا محافظ قرار دیا گیا ہے (دیکھو آیت ۴۸) اس لیے

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا
عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ
وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا
قَلِيْلًا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٤٤﴾

کی حفاظت کرنے کو انھیں کہا گیا تھا اور وہ اس پر
گواہ تھے [۸۲۷] سو لوگوں سے مت ڈرو اور مجھ سے ہی
ڈرو۔ اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو
اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا، تو
وہی کافر ہیں [۸۲۸]

یہاں ھدی ونور میں بھی اشارہ ان پیشگوئیوں کی طرف ہے جو رسول اللہ صلعم کے ظہور کے متعلق ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

ع ۸۲۷ النبیون الذین اسلموا۔ تمام نبی خدا کے کامل فرمانبردار تھے۔ اس لیے ان سب کو مسلم کہا ہے۔ یہاں مراد وہ خاص نبی ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے بعد آئے جیسا کہ آیت ۴٦ سے ظاہر ہے۔

احبار۔ حِبْر یا حَبْر کی جمع ہے اور حِبْر کے معنی سیاہی ہیں (ل)، یا اثر مستحسن یعنی خوبصورت نقش (غ) فی روضۃ یحبرون (الروم ۳۰-۱۵) یعنی خوش ہونگے یہاں تک کہ اس کی نعمتوں کا اثر ان پر ظاہر ہوگا اور تحبیر کے معنی خوبصورت بنانا ہیں۔ اسی سے حِبر بمعنی عالم ہے حسن کا قول ہے کہ ربانی سے مراد علمائے انجیل اور احبار سے مراد علمائے توریت ہیں۔

حفاظت توریت: استحفظوا۔ اِسْتَحْفَظْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اس سے سوال کیا کہ وہ اسے نگہ میں رکھے یا اس کی حفاظت کرے (ل)، اس لفظ کو اختیار کرکے بتایا کہ توریت کی حفاظت ہم نے قرآن کی طرح اپنے ذمہ نہ لی تھی۔ انّا له لحافظون (الحجر ۱۵-۹) بلکہ مشائخ اور علمائے یہود کو کہا تھا کہ اس کی حفاظت کریں۔ الٰہی حفاظت اور انسان کی حفاظت میں یہ فرق ہے کہ توریت میں تحریف ہوگئی مگر قرآن محفوظ رہا۔

اس حصّہ میں یہ بتایا کہ توریت کو ہم نے کس قدر عظمت دی تھی کہ اسی کے مطابق انبیاء بھی فیصلے کرتے تھے اور علماء اور مشائخ بھی یعنی یہود کے فیصلے اسی شریعت پر ہوتے تھے کیونکہ وہی بنی اسرائیل میں بطور بنیاد کے تھی۔ غرض یہ ہے کہ اس توریت کو اب تم کس طرح پس پشت پھینک رہے ہو اور اس کی پیشگوئیوں کی پروا نہیں کرتے کیا اس لیے کہ ان سے نبی کریم صلعم کی صداقت ظاہر ہوتی ہے جیسا کہ آیت کے آخری حصّہ کے الفاظ میں صاف یہ اشارہ موجود ہے۔

کیا ان الفاظ سے توریت کا غیر محرف ہونا یا محفوظ رہنا ثابت ہوتا ہے؟ یہ عیسائیوں کا دعویٰ ہے مگر تعجب ہے کہ جب قرآن کریم صاف الفاظ میں توریت کی تحریف کا ذکر چکا ہے یحرفون الکلم من بعد مواضعه (۴۱) اور متعدد موقعوں پر تحریف کا ذکر ہے، بلکہ یہ بھی صاف الفاظ میں ذکر ہے کہ اپنے ہاتھ سے عبارتیں لکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ کلام اللہ ہے (البقرۃ ۲-۷۹)، اور آج توریت کی تحریف خود عیسائیوں کے نزدیک ایک مسلم امر ہے، تو پھر قرآن کریم کے دوسرے موقعوں کے خلاف اور واقعات کے خلاف الفاظ کے معنی کیونکر کیے جاسکتے ہیں۔ الفاظ قرآنی میں تو صرف اس قدر ہے کہ مشائخ اور علما کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ کتاب اللہ کی حفاظت کریں، مگر یہ کہیں ذکر نہیں کہ انہوں نے فی الواقعہ حفاظت بھی کی، بلکہ ان الفاظ سے تو صاف مترشح ہوتا ہے کہ توریت میں تحریف بھی ہوئی۔ کیونکہ اس کی حفاظت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ نہ لیا بلکہ انسانوں کو کہا کہ حفاظت کریں۔ اس سے محفوظ ہونے کا نتیجہ نکالنا ایسا ہی ہے جیسا یہ خیال کرلیا جائے کہ یہودیوں نے کبھی شرک نہیں کیا، نہ چوری کی، نہ خونِ ناحق کیا، اس لیے کہ ان کو حکم تھا کہ شرک نہ کرنا، چوری نہ کرنا وغیرہ۔ ہاں وہ حصّہ جو تعامل میں آگیا وہ محفوظ ہوگیا کیونکہ اس کے مطابق فیصلے ہوتے تھے اور پیشگوئیاں بھی ایک حد تک محفوظ رہیں اس لیے کہ ان میں قوم کے لیے ایک حالتِ منتظرہ باقی تھی اور وہ عام طور پر شہرت پاگئی تھیں۔

ایک اور سوال یہ ہوا ہے کہ جب انبیائے بنی اسرائیل بھی توریت کے مطابق ہی فیصلے کرتے تھے تو معلوم ہُوا کہ ان کو کوئی الگ کتابیں نہیں دی گئیں اور نہ اس شریعت میں کسی قسم کی کمی بیشی تغیر و تبدل ہوا۔ یہ دونوں نتائج غلط ہیں۔ الگ کتابیں ان انبیاء کو ملنے کا صریح ثبوت تو آیت ۴٦ سے ملتا ہے جہاں انہی میں سے ایک یعنی مسیح کو انجیل دینے کا ذکر ہے اور ایسا ہی داؤد کو زبور دینے کا ذکر ہے۔ اور پھر سب انبیاء کو کتابیں دینے کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے فان کذبوك فقد کذب رسل من قبلك جاءو بالبینٰت والزبر والکتاب المنیر (آل عمران ۳-۱۸۴) جہاں ذکر بنی اسرائیل کے رسولوں کا ہے جیسا کہ اس آیت کے سیاق سے ظاہر ہے، جس سے معلوم ہُوا کہ وہ سب زبوریں لائے تھے اور یہ کتابیں آج تک توریت کے ساتھ ملحق ہوکر بائبل کا جزو بنی ہوئی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ توریت میں بیشک ایک شریعت بنی اسرائیل کو دی گئی مگر وقتاً فوقتاً جو انبیاء ظاہر ہوتے رہے وہ اس شریعت کی تکمیل کرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی جو کچھ توریت میں تھا اس کے مطابق فیصلے بھی کرتے رہے۔ یہ دونوں امر ایک دوسرے کے نقیض نہیں۔ کیونکہ وقتی ضرورتوں کے مطابق تغیر و تبدّل اصل شریعت کو باطل نہیں کرتا، جس طرح باوجود تحریف ہوجانے کے فیصلے اس کے مطابق ہوتے تھے۔ اور یہ فرما کر "کہ انجیل میں ہدایت و نور ہے" (آیت ۴٦) جس طرح توریت میں ہدایت و نور تھا۔ یہ بھی بتادیا کہ توریت وانجیل کی نوعیت ایک ہے ایسا ہی ان جملہ کتب کی جو دیگر انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوئیں۔ مگر ایسی کسی کتاب کا قرآن کریم کے بعد آنا محالات سے ہے اور آیت اکملت لکم دینکم کے خلاف، اسی لیے قرآن کریم کے بعد کوئی نبی نہیں کیونکہ جس طرح توریت کے ہوتے ہوئے بنی اسرائیل کو مزید ہدایت و نور کی ضرورت تھی اس طرح قرآن کریم کے بعد کسی ہدایت و نور کی ضرورت نہیں، اور نبیوں کی بجائے اصلاح کے لیے مجدد دین کی ضرورت ہے۔ نیز دیکھو ع ۸۳۰۔

ع ۸۲۸ ان الفاظ میں صاف ان علمائے یہود کو ملزم کیا ہے جنھوں نے دنیا کی ریاست کو مدّنظر رکھ کر حق کے قبول کرنے سے انکار کردیا، پہلے توریت میں ہدایت اور نور کی

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ
وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ
وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ
وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِۦ
فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُۥ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ
أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ ﴿٤٥﴾

اور ہم نے اُس میں اُن پر یہ فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان، اور آنکھ کے بدلے آنکھ، اور ناک کے بدلے ناک، اور کان کے بدلے کان، اور دانت کے بدلے دانت، اور زخموں میں بدلہ ہے۔ پھر جو شخص اُسے معاف کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہوگا اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا تو وہی ظالم ہیں ع‍۸۲۹

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰٓ ءَاثَٰرِهِم بِعِيسَى ابْنِ
مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ
التَّوْرَىٰةِ ۖ وَءَاتَيْنَٰهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ
هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ
يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَىٰةِ وَهُدًى وَ
مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٤٦﴾

اور ہم نے ان کے قدموں پر عیسٰیؑ ابن مریم کو ان کے پیچھے بھیجا اس کی تصدیق کرتا ہُوا جو اس سے پہلے توریت میں سے تھا اور ہم نے اس کو انجیل دی، اس میں ہدایت اور نُور ہے اور اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے توریت میں سے تھا اور متقیوں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے ع‍۸۳۰

وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَآ أَنزَلَ
اللَّهُ فِيهِ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ

اور ہم نے کہا تھا کہ انجیل کے پیرو اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں اتارا اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ

طرف توجہ دلائی، تو اب بتایا کہ چند روزہ دنیوی زندگی کے فائدہ کے لیے اور لوگوں سے ڈر کر ان باتوں کو پس پشت نہ ڈالو اور اگر ان پیشگوئیوں کے مطابق فیصلہ کر کے حق کو قبول نہیں کرتے تو پھر تم کافر ہو۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں یہ مضمون نہایت صفائی سے موجود ہے وامنوا بما انزلت مصدقا لما معکم ولا تکونوا اول کافر به ولا تشتروا بایٰتی ثمنا قلیلا وایای فاتقون (البقرۃ ۲-۴۱) یا بما انزل اللہ سے مراد یہاں اور آیت ۴۵ و ۴۷ میں قرآن شریف ہے یعنی جو اب اللہ نے اتارا ہے اب اس پر عملدرآمد ضروری ہے اور یہ پچھلی آیت کے خلاف نہیں کیونکہ اس میں اسلام کی دعوت دی ہے کہ قرآن کریم کے کل فیصلوں کو صحیح تسلیم کریں، اور قرآن کریم کو مذہبی اختلافات میں حکم اور مہیمن قرار دیا ہے اور پچھلی آیت میں ان کے باہمی تنازعات میں توریت کے مطابق فیصلہ کرنے کا ذکر تھا۔

ع‍۸۲۹ جان کے بدلے جان کا حکم تو قرآن شریف میں بیان فرما دیا ہے کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ (البقرۃ ۲-۱۷۸) لیکن زخموں میں قصاص یا دانت کا بدلہ دانت وغیرہ کا حکم قرآن شریف میں نہیں پایا جاتا، صرف توریت میں ہے اور ان احکام کا ذکر یہاں اس لیے کیا ہے کہ یہ شریعت موسوی کی بنیاد کے طور پر تھے اور یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ ہدایت و نور صرف پیشگوئیوں کا نام نہیں۔ آخری الفاظ میں پچھلی آیت کے آخری الفاظ کا اعادہ ہے۔ سوائے اس کے کہ وہاں نہ قبول کرنے والوں کو کافر کہا ہے اور یہاں ظالم۔ کافر اس لحاظ سے کہ وہ منکر ہوئے، ظالم اس لحاظ سے کہ ان پیشگوئیوں کو دوسری جگہ لگاتے ہیں اور ظلم وضع الشئ فی غیر محلہ کا نام ہے۔

ع‍۸۳۰ حضرت عیسٰیؑ کا ذکر اس لیے علیحدہ کیا کہ وہ اس موسوی سلسلہ کے خاتم تھے، لیکن یہ صاف بتا دیا کہ حضرت عیسٰیؑ پہلے انبیائے اسرائیل کے نقش قدم پر آئے۔ اس لیے شریعت موسوی میں جو مقام ان انبیاء کا تھا وہی مقام حضرت عیسٰی کا تھا پس حضرت عیسٰی کو انجیل دینے کے یہ معنی ہوئے کہ ان پہلے انبیاء کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے اپنے وقت میں کتابیں دی تھیں چنانچہ دوسری جگہ ان انبیاء کا بیّنات اور زبر اور کتاب منیر کے ساتھ آنا صاف لکھا ہے (آل عمران ۳-۱۸۳)

اور یہ جو فرمایا کہ انجیل کو بھی ہدایت اور نور لیے ہوئے اتارا تو مطلب یہ ہے کہ یہ بھی اسی نوعیت کی کتاب ہے جیسے توریت، کیونکہ جس طرح وہ ایک نبی کی وحی ہے انجیل بھی ایک نبی کی وحی ہے اور ہر ایک نبی کے لیے چونکہ یہ ضروری ہے کہ وہ ہدایت لائے، اس لیے انجیل کے ذکر میں وہی لفظ بڑھا دیئے جو توریت کے ذکر میں تھے اور بتا دیا کہ انجیل صرف پیشگوئیوں کا نام نہیں بلکہ پیشگوئیوں کے نور کے علاوہ اس میں بھی ہدایت موجود ہے۔ پھر فرمایا کہ وہ متقیوں کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی یعنی اس میں ہدایت کی کچھ تفصیلات اور وعظ و نصیحت کی طرز بھی اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے۔

اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۷﴾
وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا
لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُہَیۡمِنًا
عَلَیۡہِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا
تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ
لِکُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡکُمۡ شِرۡعَۃً وَّ مِنۡہَاجًا ؕ
وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً

کرے جو اللہ نے اتارا تو وہی نافرمان ہیں ع۸۳۱
اور ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری اس
کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے کتاب میں سے ہے اور اُس پر
نگہبان ۸۳۲ سو اُن کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ
نے اتارا اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق آیا۔ اُن
کی خواہشوں کی پیروی نہ کر ۸۳۳ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک
شریعت اور طریق مقرر کیا ۸۳۴ اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی گروہ بنا دیتا

ع۸۳۱ ولیحکم یا تو بطور حکایت ہے یعنی ہم نے اہل انجیل کو انجیل دیکر یہ کہا تھا کہ جو کچھ اس میں اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرو اور یا رسول اللہؐ کے زمانہ کے نصاریٰ مخاطب ہیں کہ آخر اس انجیل میں آنحضرت صلعم کی صداقت کی پیشگوئیاں ہیں پھر ان کو کیوں رد کرتے ہو اور رسول اللہ صلعم کی صداقت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے۔

آیت کے آخر پر پھر انہی الفاظ کا اعادہ ہے مگر یہاں کافرون اور ظالمون کی بجائے فاسقون لکھا ہے، یعنی ایسے لوگ نافرمان ہیں۔ اس لیے کہ حضرت مسیحؑ نے فارقلیط کے متعلق کھلی پیشگوئی کی تھی کہ میرے بعد وہ آئے گا اور ان کو حکم تھا کہ آپؐ کی تصدیق کریں۔ پس حکم کی نافرمانی کے لحاظ سے وہ فاسق کہلائے۔ کافر ظالم فاسق انہی لوگوں کو کہا گیا ہے۔ کافر انکار کے لحاظ سے، ظالم پیشگوئیوں کو دوسری جگہ لگانے کی وجہ سے، فاسق حکم کی نافرمانی کی وجہ سے۔

گو اوپر کی آیات میں اہل کتاب مخاطب ہیں، لیکن تینوں آیتوں کے آخر میں یہ لفظ لا کر کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والے کافر ہیں، ظالم ہیں، فاسق ہیں، مسلمانوں کو بھی سمجھا یا ہے کہ اگر وہ قرآن کے مطابق اپنا عملدرآمد نہ رکھیں گے تو وہ بھی اسی حکم میں ہیں۔ چنانچہ ابن جریر نے ان روایات کو بیان کیا ہے جن کی رو سے یہ آیات مسلمانوں کے حق میں بھی ثابت ہوتی ہیں، البتہ کفر سے مراد کفر دون کفر لیا ہے، اور ایسا ہی ظلم اور فسق سے۔ چنانچہ وہیں ابن عباسؓ کا قول منقول ہے لیس کمن کفر باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ یعنی یہ کفر ایسا کفر نہیں جیسے اللہ کا انکار اور فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں کا۔

ع۸۳۲ الکتاب پہلی کتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور دوسری کتاب سے کل کتب سابقہ۔ گویا الکتاب وہاں جنس کے طور پر ہے۔

مھیمن بعض کے نزدیک ھیمن اس کا اصل ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز پر نگہبان ہونا، اس لیے اس کے معنی محافظ ہیں اور بعض کے نزدیک مادہ امن ہے اور مھیمن کے معنی امین ہیں (ل) پہلی کتابوں پر محافظ یا امین ہونے سے ایک ہی مراد ہے کہ ان کی ضروری اور صحیح تعلیم کو محفوظ کر لیا ہے۔

قرآن کتب سابقہ کا مصدق بھی ہے اور محافظ بھی: توریت و انجیل کا ذکر کرنے کے بعد اب قرآن شریف کے نزول کا ذکر فرماتا ہے اور اس کی دو شانوں کا بیان کیا ہے۔ یعنی ایک تو وہ پہلی کتابوں کا مصدق ہے یعنی ان کا منجانب اللہ ہونا مانتا ہے اور ان کی پیشگوئیوں کو پورا کر کے ان کو سچا ٹھہراتا ہے اور دوسرے وہ ساری کتب سابقہ کا محافظ ہے یعنی ان کی اصلی تعلیم کی حفاظت کرتا ہے اور جو ان میں تحریف ہوئی تھی اس کو غلط ٹھہراتا ہے اور یوں ان کے اختلافات کا بھی فیصلہ کرتا ہے۔ انجیل کو بھی توریت کا مصدق کہا ہے مگر اس پر مھیمن قرار نہیں دیا۔ لیکن قرآن کو کل کتب سابقہ پر مھیمن قرار دیا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے بھی توریت و انجیل وغیرہما کی تحریف کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ قرآن کریم میں تحریف نہ ہوگی اور مھیمن کہہ کر شرائع سابقہ کے منسوخ ہونے کا فیصلہ بھی کر دیا ہے کیونکہ اب وہی تعلیم دنیا میں رہے گی جس نے پہلی صحیح تعلیموں کی جن کی ضرورت نسل انسانی کو ہمیشہ کیلئے تھی حفاظت کر کے اپنے اندر لے لیا اور توریت و انجیل کے ذکر کے بعد قرآن کو مھیمن کہنے کے صاف معنی ہیں کہ انجیل میں بھی کوئی تعلیم ہے جو توریت کی طرح محفوظ رکھی جانے کے قابل ہے۔

ع۸۳۳ جب قرآن کریم کے مہیمن یعنی کتب سابقہ کے ناسخ ہونے اور ان کی صحیح تعلیم کے محافظ ہونے کا ذکر کیا تو اب فرمایا کہ مختلف مذاہب میں صحیح فیصلے اب قرآن شریف ہی کرے گا۔ اس لیے تم اسی کے مطابق ان کے اختلافات کا فیصلہ کرو۔ اس بات پر کہ یہاں ذکر مقدمات کا نہیں بلکہ اختلافات مذہبی کا ہے یہ قطعی شہادت ہے کہ اس کے بعد فوراً یہ ذکر ہے کہ ہم نے تم میں سے سب کے لیے یعنی مختلف قوموں کے لیے ایک شریعت اور ایک طریق مقرر کر دیا تھا اور پھر آیت کے آخر پر صاف فرما دیا کہ جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تم کو ان کی خبر دے گا۔ اور یہ اختلافات مذہبی ہی ہیں نہ مقدمات۔ اور یہاں خطاب بھی صرف یہود سے نہیں بلکہ یہود و نصاریٰ دونوں قوموں سے تو کھلا خطاب ہے اور ضمناً سب قومیں آ گئیں۔ کیونکہ قرآن شریف کو مہیمن صرف توریت و انجیل پر نہیں کہا بلکہ مابین یدیہ من الکتاب پر یعنی جتنی کتب پہلے نازل ہوئیں سب پر، پس سب قوموں کے مذہبی اختلافات کا ذکر ہے جن کا فیصلہ قرآن شریف کرتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ صاف فرمایا وما انزلنا علیک الکتاب الّا لتبیّن لھم الذی اختلفوا فیہ (النحل ١٦: ٦۴) اور ہم نے تیری طرف کتاب نازل نہیں کی مگر اس لیے کہ جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے ہیں تو ان کو کھول کر بیان کرے۔ اس فقرہ میں کہ "ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر" بھی یہی اشارہ ہے۔

ع۸۳۴ شرعۃ۔ منہاج۔ نہج طریق واضح یعنی کھلے رستہ کو کہتے ہیں، اور اسی سے منہاج ہے۔ اور شرع طریق واضح پر چلنا ہے، اور کھلے رستہ کو بھی شرع اور

وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا
الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا
فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٤٨﴾
وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا
تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ
عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ
تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ
بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ
النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿٤٩﴾

لیکن (وہ چاہتا ہے) کہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہارے جوہر پرکھے
سو نیکیوں کو آگے بڑھ کر لو[٨٣٥] تم سب کو اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے ۔ پس
جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے وہ تمھیں بتا دیگا[٨٣٦]
اور کہ ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو ، جو اللہ نے اتارا
اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر اور ان سے احتیاط کرتے رہو
مبادا بعض ان باتوں سے ہٹا کر تجھے دکھ میں ڈال دیں جو اللہ نے
تیری طرف اتاریں پھر اگر وہ پھر جائیں تو جان لو کہ اللہ چاہتا ہے
کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے ان پر مصیبت ڈالے ۔ اور
بہت سے لوگ بلاشبہ نافرمان ہیں[٨٣٧]

شریعۃ کہا جاتا ہے ، اور طریقہ الٰہیہ پر یعنی جو رسنۃ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بتایا ہے اس پر بطور استعارہ بولا جاتا ہے (رغ) امام راغب کہتے ہیں کہ ان دو لفظوں کے اختیار کرنے میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ۔ ایک تو جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک راہ پر چلنے کے لیے مسخر کیا ہے جس کا تعلق مصالح عباد اور عمارت بلاد سے ہے ، اور دوسرا وہ جس کا انسان اختیار سے قصد کرتا ہے جس میں شرائع کا اختلاف ہے یعنی جو دین اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے ۔ اور حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ شرعۃ وہ ہے جو قرآن شریف نے بتایا اور منہاج وہ جو سنت نے بتایا ۔ اور ابن جریر نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے یعنی سبیل اور سنت اور سنتیں مختلف ہیں ۔ ایک شریعت تورات کی ہے ، ایک شریعت انجیل کی ، ایک شریعت قرآن کی ، اس میں اللہ جو چاہتا ہے حلال کرتا ہے جو چاہتا ہے حرام کرتا ہے اور دین ایک ہی ہے یعنی توحید اور اخلاص ۔ اور حضرت ابن عباسؓ کا قول ہی اس بارہ میں اصول محکم ہے اس لیے کہ یہاں دین اور طریق کا ذکر ہے ۔ اور باتیں دو ہی ہیں جو نبی کے آنے سے تعلق رکھتی ہیں ایک وہ شریعت یا رستہ جو اس کی کتاب بتاتی ہے دوسرا وہ منہاج یا رستہ جو اس کا عمل بتاتا ہے ، اور دونوں کھلے طریق ہیں اور دونوں پر ہی عمل ضروری ہے اور ضروری رہا ہے ، اور اسی معنی سے ہر نبی صاحب شریعت ہے گو وہ کوئی نئی شریعت عمل کے لیے لایا ہو یا نہ ۔
ان الفاظ کے معنی یہ بھی لیے گئے ہیں کہ تم میں سے سب کے لیے ہم نے اب ایک شریعت اور منہاج مقرر کیا ہے یعنی اتباع دین محمدی ، اور یوں بھی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک امت کو ہم نے الگ الگ شریعت اور الگ الگ منہاج دیئے ۔ ایک شریعت اور منہاج اہل توریت کا ایک شریعت اور منہاج اہل انجیل کا اور یہی معنی سیاق کے لحاظ سے صحیح ہیں ، کیونکہ پہلے توریت اور اہل توریت کا ذکر کیا ، پھر انجیل اور اہل انجیل کا ، پھر قرآن اور متبعین قرآن کا ۔ اور لکل کہہ کر عام کر دیا کہ ہر امت یا قوم کے لیے اسی طرح شریعت اور منہاج مقرر کیے جس طرح ان کیلئے ہاں اس میں یہ اشارہ بھی ہے کیونکہ ذکر بالخصوص توریت اور انجیل کا ہے کہ اب ان طریق قابل عمل نہیں رہے نہ توریت کی حد درجہ کی سختی پر یہودی عمل کر سکتے ہیں ، نہ انجیل کی حد درجہ کی نرمی پر پس واقعات شاہد ہیں کہ یہ طریق وقتی تھے اور اب اتباع صرف ایک طریق کا ہی ہو سکتا ہے جو محمد رسول اللہ صلعم کی وساطت سے بتایا گیا ہے ۔

٨٣٥ یہاں ان اختلافات کی حکمت کو بیان کیا ہے جو طبائع انسانی میں پائے جاتے ہیں ۔ اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب مذہب اسلام ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی صداقت ہے تو کیوں نہ ایسا ہوا کہ سب لوگ فوراً قبول کر لیتے اور اختلاف نہ کرتے ۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اگر تم کو ایسا بنانا چاہتا کہ تم میں اختلاف طبائع ہی نہ ہوتا تو ایسا بھی کر سکتا تھا کہ سب ایک ہی گروہ بن جاتے ، لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا ہے کہ انسانوں میں اختلاف طبائع رکھے ۔ اس اختلاف طبائع کی وجہ سے بعض لوگ ایک بات کو قبول کر لیتے ہیں تو بعض رد کر دیتے ہیں ۔ مگر یہ اختلاف طبائع جو بعض انسانوں کو قبولیت حق سے محروم کر دیتا ہے ایک بے معنی اختلاف نہیں ، بلکہ اس کے اندر بڑی حکمت یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر قوٰی اور استعدادیں رکھی ہیں وہ یوں نشو و نما پائیں ۔ اگر اختلاف طبائع نہ ہوتا تو انسان کو کمالات حاصل کرنے کا بھی کوئی موقعہ نہ ہوتا ۔ اس لیے نصیحت کے طور پر فرماتا ہے کہ نیکیوں کو آگے بڑھ کر لو تا کہ تمہارے کمالات جو تمہارے اندر مخفی ہیں نشو و نما پائیں اور ظاہر ہوں ۔

٨٣٦ یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ اس رکوع میں اختلافات مذہبی کا جھگڑا ہے کیونکہ مذہبی اختلافات کا فیصلہ قیامت کے دن ہی ہوگا ، یعنی وہیں پتہ لگے گا کہ کون انسان غلطی پر تھا اور کون حق پر ۔

٨٣٧ یفتنوك ۔ فتن کے معنی ٢٤٣ میں بیان ہو چکے ہیں ۔ یہاں بلحاظ اس کے اصل معنی آگ میں ڈالنے کے ، دکھ اور تکلیف میں ڈالنا ہی مراد ہے ۔ یُوْقِعُوْنَكَ فِیْ بَلِیَّۃٍ وَشِدَّۃٍ (رغ) اس آیت سے بھی صاف ظاہر ہے کہ یہاں جس فیصلہ کا ذکر ہے وہ اختلافات مذہبی میں فیصلہ ہے کیونکہ یہاں ان اصول سے ہٹانے کا ذکر ہے جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوئے اور وہ دین اسلام ہی ہے ۔

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿٥٠﴾ ع

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٥١﴾

وقف غفران — وقف منزل عند البعض

کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں اللہ سے بہتر فیصلہ دینے والا کون ہے؟ ۸۳۸

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست مت بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو کوئی تم میں سے انھیں دوست بناتا ہے تو وہ انھی میں سے ہے اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۸۳۹

اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی: ان الفاظ سے کہ ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو اور ان سے احتیاط کرتے رہو کہ بعض باتوں سے ہٹا کر دُکھ میں نہ ڈال دیں" یہ نتیجہ نکالنا کہ نبی کریم صلعم نعوذ باللہ ان کی خواہشات کی پیروی کیا کرتے تھے پرلے درجے کی حماقت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ہدایت کی ضرورت نبی کریم صلعم کو تھی؟ جو مشکلات آنحضرت صلعم کو ان لوگوں کے ساتھ معاملات میں پیش آتی تھیں، اگر کوئی دوسرا آپ کی جگہ ہوتا تو یقیناً ان مشکلات کا مقابلہ نہ کر سکتا اور اس کا قدم ڈگمگا جاتا۔ پس یہ ہدایت درحقیقت آپ کے اس مقام بلند کو ظاہر کرتی ہے کہ حالات تو ایسے ہیں جن کے نیچے ایک بشر قائم نہیں رہ سکتا مگر آپ کو جس مقام پر خدا نے کھڑا کیا ہے اُس لحاظ سے آپ سے ایسا نہ ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں اس خطاب میں ساری اُمت شامل ہے اور وہ اس ہدایت کے یقیناً محتاج ہیں۔ آج کس قدر مسلمان ہیں جو اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکے اور کس قدر ظاہری کشش کے سامان عیسائیوں کی تہذیب میں ہیں جو مسلمانوں کو حق سے پھیر کر فی الحقیقت ان کو دکھوں میں ڈال رہے ہیں گو وقت پر سمجھ نہ آئے۔

ع۸۳۸ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں یعنی یہ یہود حق و حکمت کی باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جو اللہ تعالٰی نے قرآن میں نازل فرمائی ہیں۔ ممکن ہے اس آخری آیت میں پچھلے رکوع کی آخری آیات کے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہو تا کہ اس کی طرف پھر توجہ دلائی جائے یعنی جب ان میں جھگڑے ہوتے ہیں تو پھر جاہلیت کے مطابق فیصلہ چاہتے ہیں جس میں قوی کا حق کمزور پر فائق سمجھا جاتا تھا۔ بنی قریظہ اور بنی نضیر میں بھی اسی کے مطابق عمل تھا یعنی بنی نضیر زبردست تھے اور بنی قریظہ کمزور، اس لیے بنی نضیر بنی قریظہ سے دوچند دیت لیتے تھے۔

ع۸۳۹ اہل کتاب سے موالات: اولیاء سے کیا مراد ہے دیکھو ۳۳۲۔ آل عمران ۳ - ۲۷ میں عام طور پر کفار کو اولیاء بنانے سے روکا تھا، مگر وہاں شرط تھی کہ ایسی ولایت جو من دون المؤمنین ہو دیکھو ۳۹۹۔ یہاں بظاہر الفاظ عام ہیں، یہود اور نصارٰی کو ولی مت بناؤ۔ یعنی نہ ان سے مدد لو نہ مدد دو۔ اگلی آیت سے ظاہر ہے کہ منافق یہود اور نصارٰی کی پناہ تلاش کرتے تھے، اس خوف سے کہ اسلام مغلوب ہو جائے تو ساتھ ہی یہ بھی پس نہ جائیں اس لیے ان سے ساز باز رکھتے تھے۔ اور اگلے رکوع میں اسی مضمون کو دوہراتے ہوئے ان اہل کتاب کا مخصوص طور پر ذکر کیا ہے جو دین اسلام سے ہنسی کرتے ہیں (۵۷) اور وہیں اہل کتاب کی عداوت کا ذکر کیا ہے (۵۹) اور پھر ان کے فساد پھیلانے اور مسلمانوں کے خلاف لڑائی کی آگ جلانے کا ذکر کیا ہے (۶۴) پس یہ سیاق آیات اس بات پر قطعی شہادت ہے کہ یہاں انھی یہود کی ولایت سے روکا ہے جو اسلام سے عداوت رکھتے ہوئے اسلام کی تباہی کے درپے تھے اور اسلام کے خلاف لوگوں کو اُکساتے تھے۔ اور آیت کے شان نزول میں عبادۃ بن صامت کا یہود کی موالات سے بیزاری کا اظہار اور عبداللہ بن اُبیّ منافق کے ان کی موالات ترک کرنے سے انکار کا ذکر ہے (ج) اور دوسری روایت میں بنی قریظہ کے نقض عہد کا ذکر اسی آیت کے شان نزول میں ہے (ج) اور خود ابن جریر اس معنی کو ترجیح دیتے ہیں کہ یہاں ایسی ولایت سے روکا ہے جو من دون المؤمنین ہو یعنی مسلمانوں کے خلاف یا جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ روایات شان نزول قطعی طور پر صحیح نہیں، اس لیے عموم الفاظ قرآنی کو مدنظر رکھ کر یہی معنی ہو سکتے ہیں۔ اسلام میں نہ تو اس قسم کی تنگدلی ہے کہ اپنے متبعین کو دوسروں سے ملنے کی اجازت نہ دیتا ہو یا ان سے کسی قسم کے تعلقات ضروری سے جو مدنی حیثیت میں پیش آتے ہیں روکتا ہو بلکہ انھی اہل کتاب کی شریف بیبیوں کو زوجیت میں لانے کی اجازت دی ہے اور میاں بیوی میں جو تعلق محبت کا ہوتا ہے وہ خود ظاہر ہے۔ یہی اہل کتاب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایرانیوں کے مقابل جنگ میں شامل تھے اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑتے تھے۔ پھر دشمنوں تک کے ساتھ پورا عدل و انصاف مدنظر رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ پھر صاف فرمایا کہ جو لوگ تمہارے خلاف فی الواقع جنگ نہیں کر رہے یا اعلانیہ دشمن کو مدد نہیں دے رہے اُن کے ساتھ بڑا نیکی کا سلوک کرو (الممتحنۃ - ۸)۔ ہاں وہ حکیمانہ مذہب ہے جس بات سے مضرت پیدا ہوتی ہے اس کو سختی سے روکتا بھی ہے۔ گو ایک خواب بین فلاسفر جس نے عملی رنگ میں قوم نہیں بنائی اس کی مصلحت کو نہ سمجھ سکے اور اس پر معترض بھی ہو، ان لوگوں میں جو ہمارے مذہب کے دشمن ہیں اور ان میں جو ایسے نہیں اسلام نے فرق کرنا سکھایا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو ایسے لوگوں سے ساز باز رکھتا ہے وہ ان کے خیالات سے متاثر بھی ہوگا اور یوں انھی میں سے ہو جائیگا یہی معنی ہیں فانہ منھم کے ہاں اگر ایک طرف یہ معنی درست ہیں کہ جب ایک قوم دشمن اسلام ہو جائے تو تم فرداً فرداً اس سے تعلقات ولایت نہ رکھو تو دوسری طرف یہ بھی صحیح ہے کہ یہود اور نصارٰی کو بحیثیت قوم ہم اپنا ولی نہیں بنا سکتے کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ اسلام دنیا میں پھیلے پھر ان سے نصرت کی توقع رکھنے کے معنی ہی کیا ہوئے اور مسلمان کس طرح بحیثیت قوم ان سے نصرت کی توقع رکھ سکتے ہیں اور بڑی بات جس کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے یہی ہے کہ ان سے نصرت حاصل کرنے کا خیال

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ
فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ
فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ
مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا
فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ؕ ﴿٥٢﴾

پس جس کے دلوں میں بیماری ہے تو اُن کو دیکھے گا کہ اُن (کی دوستی) کے لیے جلدی کرتے ہیں کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ ہم پر کوئی گردش نہ آجائے سو قریب ہے کہ اللہ فتح یا اپنی طرف سے کوئی امر لائے ۔ پس ان باتوں پر جن کو اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں پشیمان ہوں گے عـ٨٤٠

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ
اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ
لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿٥٣﴾

اور جو ایمان لائے کہیں گے کیا یہ وہی ہیں جنھوں نے اللہ کی قسمیں بڑی مضبوط قسمیں کھائی تھیں کہ وہ یقیناً تمھارے ساتھ ہیں ان کے عمل ضائع ہوئے سو وہ نقصان اٹھانیوالے ہوگئے ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ
عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ
يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى
الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ز
يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ
لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ
مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٥٤﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ ایک قوم لائے گا وہ ان سے محبت رکھے گا اور وہ اس سے محبت رکھیں گے ۔ مومنوں کے سامنے نرم، کافروں کے مقابلہ میں غالب ، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے ۔ یہ اللہ کا فضل ہے ، جسے چاہے اس کو دے اور اللہ فراخی والا جاننے والا ہے عـ٨٤١

ترک کردو +

عـ٨٤٠ دائرۃ ۔ دَوْر کے معنی گرد پھرنا یا گھومنا ہیں، اور دار گھر کو اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ اس کو دیوار گھیرے ہوئے ہوتی ہے، اور پھر دار کے جائے قرار ہونے کے لحاظ سے شہر کو بھی دار کہا جاتا ہے، اور دار دنیا اور دار آخرت بھی کہا جاتا ہے، اور بہشت کو دار السلام اور دوزخ کو دار البوار یعنی امن کا گھر اور ہلاکت کا گھر کہا ہے، اور دائرہ وہ خط ہے جو گرد گرد پھرتا یا احاطہ کر لیتا ہے، اور پھر اس سے مراد حادثات یا آفات لی جاتی ہیں کیونکہ وہ انسان کو گھیر لیتی ہیں علیھم دائرۃ السوء (التوبۃ ٩ ۔ ٩٨) اور اس کی جمع دوائر ہے یتربص بکم الدوائر (التوبۃ ٩ ۔ ٩٨) اور دائرۃ مکروہ یا ناپسندیدہ امر میں ہے جیسے دولۃ محبوب امر میں (رغ)

غلبۂ کفر سے مرعوب نہ ہونا چاہیئے ؛ مرض سے مراد ایمانی کمزوری یا نفاق ہے (عـ٢٢ و عـ٢٢٥) منافق جیسا کہ اوپر عبد اللہ بن ابی کا ذکر ہوا یہودیوں سے اور کفار سے اس خوف سے خفیہ تعلقات رکھتے تھے کہ مسلمان آخر کار مغلوب ہو جائیں گے اور اس طرح ہم بچ جائیں گے ۔ اس زمانہ میں بہت سے مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ اسلام پر مصائب دیکھ کر عیسائیوں کی پناہ ڈھونڈھتے ہیں ۔ اگر خدائی وعدوں پر ایمان ہوتا تو خدا پر بھروسہ کرتے اور ان لوگوں سے دوستی نہ گانٹھتے جو اسلام کی بیخکنی کے درپے ہیں ۔ یہاں تسلی کے لیے دو باتیں کہی ہیں، یا تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنے مخالفوں پر فتح دیدے یعنی جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کی کھلی کھلی فتح ہو جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوا، اور اسی لیے اس کو مقدم کیا ہے ۔ اور اس کے لعد یہ ذکر کیا ہے کہ اگر فتح نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے کوئی اور امر پیدا کر دے جو دین اسلام کے غلبہ کا موجب ہو جائے، یعنی گو مسلمانوں کو فتح کی بجائے شکست ملے ۔ مسلمانوں کو موجودہ شکست میں یہ الفاظ تسلی دینے والے ہیں جن سے بشارت ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلام کا غلبہ کسی اور رنگ میں کر دیگا ۔

عـ٨٤١ اذلّۃ ۔ ذلیل کی جمع ہے اور ذُلّ جس سے یہ مشتق ہے مغلوب ہونے کا نام ہے (غ) مگر اپنے لوگوں کے سامنے ذلیل ہونا یا مغلوب ہونا یہ ہے کہ انسان ان کے سامنے حد درجہ کی نرمی اختیار کرے جیسے مغلوب انسان کرتا ہے ۔ چنانچہ والدین کے سامنے جناح الذل نیچا کرنے کو کہا گیا ہے جہاں ذُلّ سے مراد نرمی ہے یہاں بھی اذلّۃ سے مراد نرمی اختیار کرنے والے ہیں ۔ دوسری جگہ اسی خیال کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے رحماء بینھم، پس اذلۃ علی المؤمنین سے مراد ہے مومنوں کے سامنے ایسے نرم جیسے مغلوب آدمی جھک جاتا ہے، اس سے بڑھ کر آپس کے تعلقات محبت نہیں ہو سکتے ۔

اعزّۃ ۔ عزیز کی جمع ہے، اور عِزّۃ اس حالت کا نام ہے جب انسان مغلوب نہ ہو ۔ اس کی اصل ارض عَزاز سے ہے جو سخت زمین کو کہتے ہیں اور عزیز

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ﴿۵۵﴾

تمہارے دوست صرف اللہ اور اس کا رسول ہیں اور وہ جو ایمان لائے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں ع۸۴۲

وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُونَ ﴿۵۶﴾ ع ۸/۱۲

اور جو اللہ اور اس کے رسول کو اور ان کو جو ایمان لائے دوست بناتا ہے تو یقیناً اللہ کی جماعت ہی غالب ہے ع۸۴۳

وہ ہے جو غالب آئے اور مغلوب نہ ہو الذی یُقْہِرُ ولا یُقْہَرُ (رغ)۔ دشمن کے سامنے مغلوب نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کا اثر قبول نہ کرے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا اشداء علے الکفار۔ یوں تو مسلمانوں کو نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک کبھی نہ کبھی غیر مسلموں کے ماتحت بھی رہنا پڑا ہے۔ پس اعزۃ میں جسمانی مغلوبیت کی نفی مراد نہیں، بلکہ اخلاقی اور روحانی مغلوبیت کی نفی مراد ہے۔ بلکہ جب غیر مسلم حکام کے ماتحت رہنا پڑے تو اس صفت عزیز کے اظہار کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ اس وقت الناس علےٰ دین ملوکھم والا معاملہ ہوتا ہے۔ لوگ بادشاہوں کے دین ان کے اوضاع واطوار کی طرف زیادہ جھکتے ہیں۔ ان سے مرعوب ہو کر راہِ حق کو ترک کر دیتے ہیں۔ پس ایسے وقت میں مسلمان کو یہ تعلیم دی ہے کہ جسمانی طور پر ان سے مغلوب ہونے کے باوجود بھی اخلاقاً ان پر غالب ہو، اور اس قسم کی ذلّت ان کے سامنے اختیار نہ کرے جس سے اخلاق پر، مذہب پر، روحانیت پر بُرا اثر پڑے۔

جب ایسے لوگوں کا ذکر کیا جو دنیا کی چند روزہ آسائش کے لیے اپنے دشمنوں کو اپنا دوست سمجھ لیتے ہیں، تو اب یہ بھی ذکر کیا کہ یہ لوگ بعض وقت اس قدر دب جاتے ہیں کہ ان کے اثر کے نیچے آ کر دینِ حق سے ارتداد اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بشارت دی کہ اگر کوئی مرتد ہوتا ہے تو ہو اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ایسے ایسے مضبوط قدم لوگ پیدا کرے گا کہ وہ کسی قسم کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے اور دین اسلام کی حمایت میں لگے رہیں گے خواہ کیسے بھی حالات پیش آئیں۔ یہ بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک آدمی مرتد ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ ایک صادق الاعتقاد قوم کو اسلام میں لا داخل کرے گا۔

ابتدائی تاریخ اسلام میں واقعات ارتداد: نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے تو شاذ و نادر ہی کوئی ارتداد کا واقعہ ہوا ہو۔ یہاں تک کہ ابوسفیان کی شہادت حالت کفر میں ہرقل کے سامنے یہ تھی کہ مسلمانوں میں سے کوئی شخص اپنے دین سے بیزار ہو کر ارتداد اختیار نہیں کرتا۔ سب سے بڑا فتنۂ ارتداد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں اٹھا اور آپ کے ہاتھ سے فرو ہوا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کے آخری ایّام میں اسود عنسی، مسیلمہ کذّاب اور طلیحہ نے نبوت کے جھوٹے دعوے کیے اور ان کی قومیں یعنی بنو مدلج اور بنو حنیفہ اور بنو اسد اُن کی وجہ سے مرتد ہوگئیں۔ اُن سب کی سرکوبی حضرت ابوبکرؓ نے کی۔ ان کے علاوہ ذیل کے قبائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے بعد مرتد ہوئے یعنی فزارہ، غطفان، بنو سلیم، بنو یربوع، سجاح کی قوم جس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور مسیلمہ سے شادی کی، کندہ، بنو بکر بن وائل۔ حضرت ابوبکرؓ کا قدم اس عظیم الشان فتنہ میں انبیا کی طرح مضبوط رہا اور یہ تمام قومیں پھر اسلام میں داخل ہوئیں۔ پس ابوبکرؓ اور آپ کے ساتھی یحبّھم ویحبّونہ کے مصداق ہیں، یعنی خدا ان سے محبّت رکھتا تھا اور وہ خدا سے محبّت رکھتے تھے۔ اور قرآن کریم کی یہ شہادت آپ کے حق میں ان تمام زبان درازیوں کا کافی جواب ہے جو اہلِ تشیع نے کی ہیں۔ اس زمانہ میں یعنی آج سے کوئی پچاس سال پیشتر البتہ ارتداد زیادہ واقع ہوا ہے اور یہ ارتداد اسلام سے عیسائیت کی طرف ہے گو اب اس کی رَو بہت کچھ رُک گئی ہے اور اس کے رُکنے کا زمانہ وہی ہے جو مجدّد صد چہار دہم اور اس امّت کے مسیح حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی ماموریت کا زمانہ ہے، اور وہی اصول اس فتنۂ ارتداد کو روکنے کا موجب ہوئے ہیں جن کی تعلیم آپ کے ذریعہ سے دی گئی۔ کاش مسلمان غور کر کے اس سلسلہ کو قوت دیتے، پھر دیکھتے کہ دین اسلام کس طرح دنیا میں غالب ہوتا ہے۔

ع۸۴۲ یہود و نصاریٰ کی موالات یعنی ان کی مدد پر بھروسہ کرنے سے روکا تو اب یہ بھی بتاتا ہے کہ مسلمان کا بھروسہ کس پر ہو۔ فرمایا کہ اپنا کارساز خدا کو سمجھو اور اپنے دوست رسول اور مومنوں کو بناؤ۔ اسی لیے ولیکم اللہ فرمایا یعنی حقیقی ولی یا ناصر اللہ ہی ہے۔ اولیاءکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا نہیں فرمایا۔ گویا رسول اور مومن محض اس لیے ولی ہیں کہ وہ اللہ کے احکام کے فرمانبردار ہیں۔

حضرت علیؓ اور انگوٹھی دینے کا واقعہ: کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے حالت رکوع میں اپنی انگوٹھی ایک سائل کو دیدی تھی اور یہ آیت انہی کے لیے ہے کہ حالتِ رکوع میں وہ زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اوّل تو یہ فعل خود کوئی ایسا قابلِ تعریف فعل نہیں کہ ایک شخص نماز پڑھتے پڑھتے اپنی انگوٹھی سائل کو دیدے، اس سے بڑھ کر ایثار کے کام وہ ہیں جو حضرت ابوبکرؓ سے ظاہر ہوئے کہ بارہا اپنا سارا مال خدا کی راہ میں لٹا دیا مکّہ میں بھی اور مدینہ میں بھی۔ دوسرا لوگ مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے آتے ہیں نہ زکوٰۃ دینے کے لیے۔ تیسرا یہاں تو ہے کہ زکوٰۃ دیتے ہیں اور حضرت علیؓ کا انگوٹھی دینا زکوٰۃ نہ تھا، اور زکوٰۃ بیت المال میں دیجاتی تھی۔ ھم راکعون کے معنی تو صاف یہی ہیں کہ وہ احکام الٰہی کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا چونکہ دو عظیم الشان رکن اس فرمانبرداری کے تھے اس لیے ان کا علیحدہ ذکر کر دیا ہے اس سے حضرت علیؓ کی فضیلت اور امامت کی دلیل لینا بہت ہی بودی بات ہے۔

ع۸۴۳ حزب۔ حِزب وہ جماعت ہے جس میں شدّت ہو اور اس کی جمع اَحزاب ہے لمّا رأ المؤمنون الاحزاب (الاحزاب ۳۳: ۲۲) وغیرہ میں مراد وہ قومیں ہیں جو نبی صلعم کی جنگ کے لیے مجتمع ہوئیں (رغ)۔ اور لسان العرب میں ہے کہ احزاب وہ جماعتیں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی جنگ کے لیے اجتماع کریں، اور

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ
اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ
اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾
وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا
هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾
قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ
اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ
مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾
قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً
عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ
وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ
الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب
دی گئی ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جو تمھارے دین کو ہنسی
اور کھیل بناتے ہیں اور (نہ) کافروں کو اور اللہ کا تقویٰ
کرو اگر تم مومن ہو [۸۴۴]
اور جب تم نماز کے لیے بلاتے ہو تو اس کو ہنسی اور
کھیل بناتے ہیں یہ اس لیے کہ یہ لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے [۸۴۵]
کہہ اے اہل کتاب تم ہم پر کس لیے عیب لگاتے ہو صرف
اس لیے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا
اور اس پر جو پہلے اتارا گیا اور تم میں سے اکثر نافرمان ہیں [۸۴۶]
کہہ میں تم کو بتاؤں کہ اللہ کے نزدیک اس سے بدتر بدلہ پانے والا
کون ہے وہ جس پر اللہ نے پھٹکار کی اور اس پر ناراض ہوا۔
اور اُن میں سے بندر اور سؤر بنائے اور وہ جس نے
شیطان کی پرستش کی۔ یہ مرتبہ میں بدتر اور سیدھے راستہ

حِزْبُ الرَّجُل سے مراد ہے اَصْحَابُہٗ وجندہ الذین علی رایہ (ل) یعنی اس کے دوست اور اس کے لشکر جو اس کی رائے پر ہوں۔ اسی معنی سے کافر منافق حزب الشیطان ہیں اور مومن حزب اللہ ہیں جو امر اللہ کا اتباع کرتے ہیں۔ یہاں یہ خوشخبری دی کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بھروسہ رکھنے والے ناکام نہیں ہوتے بلکہ یقیناً وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہونگے یہ بھی صریح پیشگوئی اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کی ہے۔

۸۴۴ کن اہل کتاب سے موالات جائز ہے :- یہ نص صریح ہے کہ ایسے اہل کتاب جو دین اسلام کو تباہ کرنا نہیں چاہتے اور نہ اس پر استہزا کرتے ہیں ان سے معاہدات نصرت ہو سکتے ہیں، اور ان کو مدد دینا اور ان سے مدد لینا جائز ہے۔ اور چونکہ یہاں یہود و نصاریٰ کا نام نہیں لیا بلکہ اہل کتاب کا نام لیا ہے، اور اہل کتاب میں وہ سب قومیں شامل ہو سکتی ہیں جن میں انبیاء آئے اور وہ سب قوموں میں آئے، اس لیے سب قوموں کا قیاس اسی پر ہو سکتا ہے۔ یعنی مسلمان صرف ان لوگوں کو اپنا دوست بنا سکتے ہیں جو دین اسلام سے استہزا نہیں کرتے۔ اور الکفار کو یہاں الگ کرنے سے ان خاص کفار کی طرف اشارہ مقصود ہے جو اس وقت اسلام کی بیخکنی کے درپے تھے۔ اور چونکہ اس رکوع میں یہود و نصاریٰ کی حالت کا ذکر کیا ہے، تو ان کا دینِ اسلام سے استہزا کرنا بھی ان کی اندرونی حالت پر شاہد ہے، کیونکہ اس میں سوائے نیکی کے اور کسی چیز کی تعلیم نہیں۔ پس اسلام سے استہزا خود نیکی سے استہزا بھی ہے۔ آج عیسائیوں کا یہی شیوہ ہے کہ دین اسلام سے استہزا کرتے ہیں۔

۸۴۵ لعب۔ اصل اس کا لُعاب یعنی تھوک ہے جو بہتی ہے۔ اس لیے لَعِبَ کے معنی ہوئے ایسا فعل کیا جس سے کوئی صحیح مقصد مدنظر نہ تھا (غ) ندائے صلوٰۃ یعنی اذان کا ذکر کیا کہ اس کی بھی تحقیر کرتے ہیں اور اسے ایک لغو چیز سمجھتے ہیں۔ اذان کو یہاں اس قدر وقعت دی ہے کہ اسے شعار اسلامی میں سے ایک ایسی چیز قرار دیا ہے، جس کی تحقیر گویا دین اسلام کی ہی تحقیر ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے اس لیے کہ اذان اصول اسلامی کا ایک اعلان ہے اور یہ بات اسلام سے خاص ہے کہ اس کے اصول کی منادی اس قدر زور سے دنیا میں پانچ وقت ہوتی ہے تاکہ سب لوگ اسلام کے اصول سے واقف ہو جائیں۔ اور اس میں مذہب اسلام کی صداقت پر بھی ایک شہادت ہے۔ اس لیے کہ جب تک کسی کے دل میں صداقت کا پورا یقین نہ ہو اُسے یہ جرأت نہیں ہوتی کہ اپنی باتوں کا اس قدر زور سے بار بار دنیا میں اعلان کرے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہاں اذان کو دین اسلام کے عظیم الشان ارکان میں سے قرار دیا ہے، حالانکہ یہ کلمات ایک رؤیا میں حضرت عمرؓ اور ایک اور صحابی کو بتائے گئے تھے، مگر ان پر تصدیق نبوی کی مہر نے انھیں دین اسلام کے ارکان میں داخل کر دیا۔

۸۴۶ تنقمون۔ نَقِمَ منہ کے معنی ہیں اسے بُرا سمجھا یا اس پر عیب لگایا زبان سے یا سزا دینے سے (غ) اسی دوسرے معنی میں ہے فانتقمنا منہم فاغرقنہم (الاعراف۔ ۱۳۶) اور نہایہ میں ہے اس قدر بُرا سمجھا کہ اس پر غضبناک ہو گیا۔
ان کے استہزا کا ذکر کر کے اب بتایا کہ یہ استہزا بھی دشمنی کی وجہ سے ہے۔ اس لیے سوال کیا ہے کہ کس وجہ سے تم ہم کو برا سمجھتے ہو حالانکہ کفار کو تم ایسا بُرا نہیں سمجھتے لیکن مسلمانوں میں اور کافروں میں اگر فرق ہے تو یہی کہ مسلمان اللہ پر اور اس کی وحی پر ایمان لاتے ہیں۔ اصل وجہ مسلمانوں کو بُرا سمجھنے کی یہ بتائی ہے کہ اہل

عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ ﴿۶۰﴾
سے بہت دُور بھٹکے ہوئے ہیں ۸۴۷

وَاِذَا جَآءُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوۡا بِالۡكُفۡرِ وَهُمۡ قَدۡ خَرَجُوۡا بِهٖ‌ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا كَانُوۡا يَكۡتُمُوۡنَ ﴿۶۱﴾
اور جب تمھارے پاس آتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور وہ یقیناً کفر کے ساتھ آئے اور وہ یقیناً اس کے ساتھ ہی نکل گئے اور اللہ اس کو خوب جانتا ہے جو چھپاتے ہیں ۸۴۸

وَتَرٰى كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ يُسَارِعُوۡنَ فِى الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ وَاَكۡلِهِمُ السُّحۡتَ‌ؕ لَبِئۡسَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۲﴾
اور تو اُن میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور زیادتی میں اور حرام کھانے میں جلدی کرتے ہیں، بیشک جو وہ کرتے ہیں بُرا ہے۔

لَوۡلَا يَنۡهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِهِمُ الۡاِثۡمَ وَاَكۡلِهِمُ السُّحۡتَ‌ؕ لَبِئۡسَ مَا كَانُوۡا يَصۡنَعُوۡنَ ﴿۶۳﴾
کیوں ان کو مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے یقیناً بُرا ہے، جو وہ کرتے ہیں ۸۴۹

وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ يَدُ اللّٰهِ مَغۡلُوۡلَةٌ‌ ؕ غُلَّتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ وَلُعِنُوۡا بِمَا قَالُوۡا‌ ۘ بَلۡ يَدٰهُ مَبۡسُوۡطَتٰنِ ۙ يُنۡفِقُ كَيۡفَ يَشَآءُ‌ ؕ وَلَيَزِيۡدَنَّ
اور یہودی کہتے ہیں اللہ کا ہاتھ بندھا ہُوا ہے، انہی کے ہاتھ باندھے گئے ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس کی وجہ سے اُن پر پھٹکار کی گئی ۸۵۰ بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں جس

کتاب خود راستباز اور احکام الٰہی کے خاص کر فرمانبردار نہیں، بلکہ حالت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حصّہ فاسق ہے۔ آج یورپ کو دیکھ لو کہ باوجود اپنے سارے فسق و فجور کے اسلام اور مسلمانوں کو اچھا نہیں سمجھتا، اور دنیا کی کسی دوسری قوم کو دبانے کا اس قدر فکر نہیں جس قدر مسلمانوں کو دبانے کا ہے۔

ع ۸۴۷ بشر من ذٰلك۔ ذٰلك سے اشارہ اس کی طرف ہے جو وہ مسلمانوں پر عیب لگاتے تھے۔

قردۃ سے مراد اصحاب سبت اور خنازیر سے مراد حضرت عیسٰیؑ کے اصحاب مائدہ ہیں یعنی جن کے لیے حضرت عیسٰی نے مائدہ طلب کیا (د) ظاہر ہے کہ اصحاب السبت نے سبت کے دن جو ان کی عبادت کے لیے مقرر کیا گیا تھا عبادت کو ترک کر دیا اور دنیا میں غرق ہوگئے۔ اسی طرح یہ مائدہ والا گروہ حضرت عیسٰیؑ کے پیرؤں میں سے وہ گروہ ہے جو روٹیوں پر گر گیا، اور ان کے نزدیک مذہب کی غرض بھی سوائے حظ جسمانی کے اور کوئی نہ رہی۔ جس طرح بندر بننے سے مراد مسخ قلوب ہے، اسی طرح خنزیر بنانے سے مراد خنزیر صفت بنانا بھی ہوسکتا ہے (رغ) دیکھو ۹۴

مسیح موعود اور قتل خنزیر: حدیث میں مسیح موعود کے متعلق آتا ہے یکسر الصّلیب ویقتل الخنزیر۔ حالانکہ مراد صرف یہ ہے کہ عیسائیت کے مذہبی غلبہ کو توڑے گا۔ ورنہ یہ کسی مصلح کا کام نہیں ہوسکتا کہ جنگلوں میں جاکر سؤروں کو مارتا پھرے۔ پس مراد غلبہ صلیبی کا دُور کرنا اور صفت خنزیریت کی ہلاکت ہے جو ایک خنزیر خور قوم میں ترقی کر گئی ہے۔

وعبد الطاغوت کا عطف مَن کے صلہ پر ہے، یعنی انہی میں سے وہ لوگ ہوئے جنھوں نے طاغوت کی پرستش کی۔ طاغوت سے مراد سرکش سردار اور پیشوا ہیں۔ عوام الناس ان کے پیچھے ایسے لگ جاتے ہیں کہ ان کی عبادت کرتے ہیں۔

ع ۸۴۸ وہی لوگ جن کو اوپر بندر اور سؤر کہا ہے انہی کے یہاں آنے جانے کا ذکر ہے اور ساتھ ہی ان کی منافقانہ روش کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

ع ۸۴۹ اگلی آیت میں پھر یہود کا نام لیکر ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہاں یہود و نصارٰی دونوں کا ذکر ہے، اور حسن کا قول ہے کہ ربانی علمائے انجیل ہیں اور احبار علمائے توریت۔ جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ قردۃ میں بنی اسرائیل کے نافرمانوں کی طرف اور خنازیر میں عیسائی شہوت پرستوں کی طرف اشارہ ہے۔

ع ۸۵۰ مغلولۃ۔ غُلّ کے معنی ہیں قُیّد بہٖ یعنی باندھا گیا۔ خذوہ فغلوہ (الحاقۃ ۶۹ - ۳۰)، اور اسی سے اغلال (ہتھکڑیاں) ہیں۔ اور محاورہ میں مغلول الید بخیل کو کہا جاتا ہے۔ اور دوسری جگہ ہے لا تجعل يدك مغلولة الى عنقك (رغ) یہ یہودیوں کے استہزا کی مثال دی ہے۔ عیسائی آج اس سے بھی بڑھ کر استہزا کرتے ہیں یہودی تو مسلمانوں کے مالی مصائب پر یوں تمسخر کرتے تھے کہ مسلمانوں کا خدا بخیل ہوگیا ہے، اور عیسائی کہتے ہیں کہ اگر دین اسلام سچا ہوتا تو سیاسی رنگ میں اس کا زوال کیوں ہوتا۔ اس کا جواب جو غلت ایدیھم سے دیا ہے، اس سے مراد پیشگوئی کے طور پر یہ ہے کہ اسلام کی مخالفت میں ان کے ہاتھ ایسے باندھے جائیں گے کہ یہ مخالفت نہ کرسکیں گے۔

كَثِيرًا مِّنْهُم مَّآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ
طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ
وَالْبَغْضَآءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَآ أَوْقَدُوا
نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي
الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٦٤﴾

طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے [851] اور وہ جو تیرے رب سے تیری طرف اتارا گیا ضرور ان میں سے بہتوں کو سرکشی اور کفر میں بڑھائیگا [852] اور ہم نے اُن کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے۔ جب کبھی وہ لڑائی کے لیے آگ جلاتے ہیں اللہ اس کو بجھا دیتا ہے اور وہ زمین میں فساد پھیلاتے دوڑتے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا [853]

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا
عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأَدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٦٥﴾

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ کرتے تو ہم ضرور اُن سے اُن کی بُرائیاں دور کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ
وَمَآ أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا
مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم ۚ
مِّنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ
ع ٩ ١٣ سَآءَ مَا يَعْمَلُونَ ﴿٦٦﴾

اور اگر وہ توریت اور انجیل کو اور جو اُن کی طرف ان کے رب سے اتارا گیا ہے قائم رکھتے تو اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے کھاتے رہتے۔ ان میں سے ایک گروہ میانہ رو ہے اور بہت سے ان میں سے بُرے کام کرتے ہیں [854]

---

۸۵۱ یداہ مبسوطتان۔ یَدٌ ہاتھ اس کی جمع اَیْدِی ہے' اور استعارۃً کبھی ید نعمت کے لیے بولا جاتا ہے اور کبھی حفاظت اور ملک کے لیے اویعفوا الذی بیدہ عقدۃ النکاح (البقرۃ ۲۔ ۲۳۷) میں بھی یہی مراد ہے، جیسے کہتے ہیں مالی بہ یَدانِ (غ) یا جوج ماجوج کی حدیث میں ہے لایدان لاحد بقتالھم یعنی ان کے ساتھ جنگ کرنے کی کسی کو طاقت نہ ہوگی اور ید اللہ کنایہ ہے حفظ اور دفاع سے' اور ید اللہ علی الجماعۃ میں مراد یہی ہے کہ اہل اسلام کی جماعت متفقہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوگی ۔ اور یَدُہٗ مُطْلَقَۃٌ سے مراد ہے نعمتوں کا دینا اور یَدُہٗ مَغْلُوْلَۃٌ سے مراد ہے بخل اور ہاتھ کا روک رکھنا (غ) اسی سے ہے۔ اَیَّدَہٗ اس کی تائید کی' ایدناہ بروح القدس (غ) اور بَسط یَدٌ سے مراد بھی وہی ہے جو ہمارے محاورہ میں کھلے ہاتھ سے مراد ہے۔
جواب تو یہودیوں کے اعتراض کا دیا ہے کہ وہ کہتے تھے اللہ اپنے بندوں کو دیتا نہیں یعنی مسلمان غریب ہیں، جس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں یعنی وہ دونوں قسم کی نعمتیں دینی بھی اور دنیوی بھی اپنی عبادت کرنے والوں کو دیگا۔ اور یہ پیشگوئی ہے مگر لفظ ایسے اختیار فرمائے ہیں کہ جو کچھ عیسائی کہتے ہیں۔ اس کا بھی جواب آگیا ہے یَدٌ کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا بلحاظ اپنے اصل معنی کے ہے یعنی طاقت کے معنی سے کیونکہ ہاتھ ہی انسان کی طاقت کا موجب ہے۔
۸۵۲ اسی طرح حضرت نوحؑ کہتے ہیں۔ لم یزدھم دعاءی الا فرارا (نوح ۷۱۔ ۶) میرے بلانے نے ان کو بھاگنے میں ہی اور بڑھایا۔ مطلب یہ ہے کہ جوں جوں قرآن اُترتا ہے وہ مخالفت پر زیادہ اڑتے جاتے ہیں۔
۸۵۳ یہود اور نصاریٰ میں عداوت: بینھم میں ضمیر اہل کتاب کے دونوں گروہوں یہود و نصاریٰ کی طرف جاتی ہے کیونکہ اصل خطاب اہل کتاب کے دونوں گروہوں سے چلا آتا ہے لا تتخذوا الیھود والنصارٰی اولیاء (۵۱) - یہاں سے معلوم ہُوا کہ یہود و نصاریٰ دونوں کا وجود قیامت تک رہے گا اور ان میں عداوت اور بغض بھی قیامت تک رہے گا۔ حضرت عیسیٰؑ پر سب کا ایمان لانا خلافِ قرآن ہے۔
اوقدوا نارا للحرب۔ روح المعانی میں ہے کہ عرب میں دستور تھا کہ جب جنگ کا اعلان کرنا ہوتا تو ایک بلند مقام پر یا پہاڑ پر بڑی آگ جلا دیتے اور اس کو نار الحرب کہتے تھے۔ اس آگ کے بجھانے کا مطلب ان کے شر کو دور کرنا ہے اور حرب سے مراد یہاں رسول اللہ صلعم یا دین اسلام کے خلاف جنگ یا شر کا ارادہ ہے۔
۸۵۴ ما انزل الیھم من ربھم سے مراد قرآن شریف ہے۔ چنانچہ پچھلی آیت میں بجائے اقامت تورات و انجیل و ما انزل کے لو انھم اٰمنوا واتقوا ہے یعنی وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے' اور ایمان لانے سے مراد محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لانا ہی ہے، ما انزل کے ساتھ توریت و انجیل کی اقامت کا کیوں ذکر کیا، اس لیے کہ توریت و انجیل میں صریح پیشگوئیاں آنحضرتؐ کی تشریف آوری کی ہیں۔
لاکلوا من فوقھم و من تحت ارجلھم۔ اوپر کا رزق برکات سماوی ہیں اور نیچے کا رزق برکات ارضی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ صرف رزق تحت ارجل کی طرف جھک گئے ہیں۔ یعنی اس دنیا کی زندگی پر۔ حالانکہ اگر یہ قرآن شریف کو قبول کرتے تو روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی برکات سے متمتع

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾

اے رسول جو کچھ تیرے رب سے تیری طرف اتارا گیا، پہنچا دے اور اگر تو ایسا نہ کرے تو تُو نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور اللہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا ۸۵۵۔ اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۸۵۵

ہوتے۔

منھم امۃ مقتصدۃ۔ مقتصدۃ، قَصْد کے معنی رستہ کی استقامت ہیں اور اسی سے اِقْتِصاد ہے، جو دو طرح پر ہے، ایک اقتصاد ہر حال بیں قابلِ تعریف ہوتا ہے۔ اور یہ ایسے معاملات میں ہے جس میں افراط و تفریط کی دو طرفیں ہوں (گویا افراط و تفریط سے بچنے والا مقتصد ہے) جیسے جود اسراف اور بخل کے درمیان ہے۔ واقصد فی مشیک (لقمٰن ۳۱ - ۱۹) میں ایسا ہی اقتصاد ہے۔ اور دوسرا اقتصاد وہ ہے جو اچھے اور بُرے کے بین بین ایک چیز ہے جیسے عَدْل اور جَوْر کے درمیان، یا قریب اور بعید کے درمیان ایک کی مثال ہے فمنھم ظالم لنفسہ و منھم مقتصد (فاطر ۳۵ - ۳۲) دوسرے کی وسفرًا قاصدًا (التوبۃ ۹ - ۴۲) یعنی جو بہت لمبا نہ ہو (غ)۔ یہاں مقتصدۃ سے مراد نیک اور بُرے کے بین بین ہے۔

یہ وسعت مذہب اسلام میں ہی ہے کہ دوسرے مذاہب میں نیکی کو تسلیم کرتا ہے، ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ اسی میانہ رو گروہ کا اکثر حصہ اسلام میں آگیا۔ اور اب بھی یہی گروہ ہے جس کا قدم اسلام کی طرف اُٹھتا چلا آ رہا ہے۔

ع۸۵۵ عصمت انبیاء سے مراد۔ یعصمک۔ عصم کے معنی اِمْساک (غ) روک رکھنا یا مَنْع (ل) یعنی بچانا ہیں۔ امام راغب واللہ یعصمک من الناس کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ وعِصْمَۃُ الانبیاء حِفْظُہٗ اِیّاھم اوّلاً بما خَصَّھُمْ بہ من صفاءِ الجوھر ثم بما اَوْلاھم من الفضائل الجِسْمِیَّۃِ والنَّفْسِیَّۃِ ثم بالنُّصرۃ وبتَثْبِیْتِ اقدامھم ثم بانزالِ السکینۃ علیھم وبحفظ قلوبھم وبالتوفیق یعنی عصمت انبیاء سے مراد ان کا محفوظ رکھنا ہے اول تو اس جوہر کے صفا پیدا کرنے سے جس سے انبیاء کو مخصوص کیا گیا ہے یعنی وہ پیدائش سے گناہ سے پاک ہوتے ہیں۔ پھر جسمانی اور روحانی فضائل دینے سے، پھر ان کو نصرت اور ثابت قدمی عطا فرمانے سے، پھر ان پر سکینت نازل کرنے سے، اور ان کے قلوب کی حفاظت سے اور ان کو توفیق عطا فرمانے سے۔ پس یعصمک میں یہ سب باتیں داخل ہیں۔ اور روح المعانی میں ایک قول اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یعصمک سے مراد ہے صدورِ ذنب سے محفوظ رکھیگا، اور اس صورت میں من الناس سے مراد ہے من بین الناس یعنی لوگوں میں سے آپ کو اس پیغام رسانی کی وجہ سے گناہ کے صدور سے محفوظ رکھیگا اور یہ معنی بھی ہیں کہ لوگوں کے حملوں وغیرہ سے آپ کو محفوظ رکھے گا۔

تبلیغ حق اور عصمت کا تعلق: جب یہود و نصاریٰ کی عداوت و استہزا کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ ان میں سے میانہ روی تھوڑوں میں پائی جاتی ہے اور اکثر کی حالت بہت بُری ہے تو اب فرماتا ہے کہ تمہارا کام پیغام کا پہنچا دینا ہے۔ اور اگر کسی قوم کے غلبہ کی وجہ سے یا ان کے دنیوی جاہ و جلال سے ڈر کر ایک پیغام کو نہ پہنچاؤ گے تو تم نے کسی پیغام کو بھی نہیں پہنچایا۔ رسول میں اس کے پیرو بھی شامل ہیں جو اس کے بعد اس پیغام کو دنیا میں پہنچانے والے قرار پائے۔ ہاں ایسے حالات میں جب چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہوں تو اس پیغام کا پہنچانا جو سب کی غلطیوں کو دور کرتا ہے سب پر مہیمن ہے، سب کو اپنا دشمن بنا لینا ہے۔ اس لیے ساتھ ہی یہ وعدہ دیا کہ ان دشمنوں سے اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے دین کو محفوظ رکھے گا۔ اور ضمناً اس میں رسول اللہ صلعم کی عصمت کو بھی بیان کر دیا۔ اور فی الحقیقت اس عصمت کا اور دشمنوں کے شر سے بچانے کا بڑا تعلق بھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جب انبیاء کو ایک صفا جوہر سے بناتا ہے تو وہ غرض جس کے لیے وہ ایسا کرتا ہے پوری نہیں ہوتی اگر وہ ان کو دشمنوں کی شرارتوں اور منصوبوں سے محفوظ نہ رکھے یہاں تک کہ وہ اپنا پیغام پورے طور پر دنیا میں پہنچا دیں۔ پس عصمت حقیقی اور عصمت ظاہری ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، اور یہاں دونوں مراد ہیں۔ بعض لوگوں نے صرف عصمت ظاہری یعنی دشمنوں سے بچانا مراد لیا ہے اور بعض نے صرف عصمت باطنی یعنی صدورِ ذنب سے محفوظ رکھنا۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ الفاظ دونوں قسم کی عصمت پر حاوی ہیں۔

اہل تشیع کا یہ خیال کہ اس آیت میں تبلیغ سے مراد حضرت علیؓ کی خلافت کی تبلیغ ہے، الفاظ سے ہنسی ہے۔ ما انزل الیک سے مراد گویا پیغام توحید اور نیکی کی دعوت نہیں بلکہ حضرت علیؓ کو عرب کی بادشاہت کا مل جانا ہے اور یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم علیؓ کی خلافت کا ذکر کرنے سے ڈرتے تھے کہ صحابہؓ مخالف ہو جائیں گے بدترین حملہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا جا سکتا ہے، یہ اس کی مثل ہی نہیں اس سے بدتر ہے جو عیسائی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب سے شرک، بُت پرستی، شراب خوری، زنا، باہم جنگ و جدل سب کچھ چھڑا لیا مگر خانہ کعبہ کی عظمت کو نہ چھڑا سکتے تھے۔

اس موقع پر جو حضرت ابوہریرہؓ کی روایت بیان کی جاتی ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو علم محفوظ کیے ایک کو تو میں نے پھیلا دیا اور دوسرے کا نام لوں تو یہ میری گردن کاٹی جاتی ہے، تو اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ علم دین کا کوئی حصہ ایسا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کو نہ پہنچایا تھا، اور چھپا کر ابوہریرہؓ سے ذکر کر دیا تھا۔ یہ خیال کم فہمی سے پیدا ہوا ہے۔ سارے کا سارا علم دین قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا منشاء صرف احادیث فتن سے تھا جو اس زمانہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ چنانچہ اس کے مطابق ان کی دوسری حدیث ہے جس میں یہ لفظ آتے ہیں کہ میں ساٹھویں سال اور لڑکوں کی

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ لَیَزِیْدَنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْیَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۶۸﴾

کہہ اے اہل کتاب تم کسی (سچائی) پر نہیں، یہاں تک کہ توریت اور انجیل کو قائم رکھو اور اس کو جو تمھارے رب کی طرف سے تمھاری طرف اتارا گیا اور جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا یقیناً اُن میں سے بہتوں کو سرکشی اور انکار میں بڑھائے گا، سو تو کافر قوم پر افسوس نہ کر[۸۵۶]

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِـُٔوْنَ وَ النَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۹﴾

وہ جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور صابی اور عیسائی جو کوئی اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے، تو اُن پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ پچھتائیں گے[۸۵۷]

امارت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ اور یہی وہ سال تھا جس میں یزید کو بادشاہت ملی اور دین میں فساد اسی سے شروع ہوتا ہے۔ تو چونکہ یہ احادیث دین میں داخل نہ تھیں صرف واقعات کی خبریں تھیں اس لیے حضرت ابوہریرہؓ ان کو عام طور پر بیان نہ کرتے تھے۔ رہا کتمان ہدایت یعنی دین کے کسی حصّہ کا نہ پہنچانا اس میں سخت وعید ہے جو خود قرآن شریف میں موجود ہے ان الّذین یکتمون ما انزلنا من البیّنٰت والھدی من بعد ما بیّنٰہ للنّاس فی الکتاب۔ اولٰئك یلعنھم اللہ ویلعنھم اللاعنون (البقرۃ ۲۔ ۱۵۹) پس نہ تو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے دین کا کوئی حصّہ چھپایا، نہ حضرت ابوہریرہؓ نے،،

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعدا مکّہ کی نسبت بہت زیادہ ہوگئے تھے۔ وہاں صرف قریش تھے۔ یہاں ایک گروہ منافقوں کا، ایک یہود کا، ایک عیسائیوں کا۔ پھر سب قبائل عرب خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور قریش نے اب اپنی ساری طاقت کو اکٹھا کر کے مسلمانوں کو تباہ کرنے کی ٹھان لی تھی اسلئے وعدۂ حفاظت کی خاص ضرورت ہوئی۔ اور اس قدر دشمنوں میں جو شب و روز آپ کی جان کے درپے تھے آپ کا بچ رہنا ایک عظیم الشان معجزہ ہے اور چونکہ اس رکوع میں عیسائیوں کے غلو کا خاص ردّ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ مخالفت دین اسلام کی اس قوم کی طرف سے ہونے والی تھی اور یہی سب سے بڑے دشمن عصمت انبیاء کے بن جانے تھے۔ اس لیے ان کے غلو کا ذکر کرنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت کا ذکر کیا۔ تا ان پر اتمام حجت ہو اور نا مسلمان ان کی مخالفت سے گھبرائیں نہیں۔

کافر قوم کو ہدایت نہ دینے سے یہاں مراد یہ ہے کہ ان کے منصوبے کارگر نہ ہونگے۔

۸۵۶ آنحضرت صلعم کی عصمت کا ذکر کر کے اب عیسائیت کے خلاف دلائل کی طرف رُخ کیا ہے۔ اور اس بحث میں سب سے پہلے ان کو اہل کتاب کہکر اصولی بحث کی طرف بلایا ہے، یعنی یہ کہ توریت وانجیل اور ان کتابوں کو جو تمہارے انبیاء کی وساطت سے تمہاری طرف نازل ہوئیں (ما انزل الیکم من ربکم) ان کو قائم کرو۔ جو کچھ ان میں ہے وہ بطور اصول تم تسلیم کرو۔ اگر اس کو تسلیم نہیں کرتے تو تم نے حق کو بالکل ترک کر دیا۔ جب اپنی ہی کتب مقدسہ کی شہادت کو قبول نہ کیا تو پھر واقعی یہ کہنے کا حق ہے کہ تم کسی شے پر نہیں۔ یہاں چونکہ عیسائیت کے ساتھ بحث شروع ہوتی ہے اس لیے ان کو بتایا ہے کہ اس بحث میں تمہارے ہاتھ میں کوئی بات نہیں جس کی طرف توجہ کی جائے جب تک کہ اپنی کتب مقدسہ کے اصول کو تسلیم نہ کرو اور ان لوگوں کی وحی کو نہ مانو جن کو تم انبیاء تسلیم کرتے ہو۔ ما انزل الیکم من ربکم سے مراد یہاں توریت وانجیل کے علاوہ انبیائے بنی اسرائیل کی دیگر کتب ہیں جو بائبل میں شامل ہیں اس لیے جب قرآن شریف کا یہاں ذکر کیا تو ما انزل الیك فرمایا۔ ان تمام کتابوں کے متفقہ اصول توحید الٰہی اور خدا کی طرف سے شریعت اور ہدایت کا ملنا اور اعمال صالحہ کا بجا لانا ہے۔ نہ کہیں تثلیث کا ذکر ہے نہ کفارہ کا، یہاں تک کہ خود انجیل میں خدائے واحد کے ایک ہونے کی شہادت موجود ہے، لیکن عیسائی ان تمام باتوں کو رد کر کے ایک نیا مذہب بناتے ہیں جس کی بنا تثلیث اور کفارہ پر ہے جو تعلیم انبیاء کے سراسر مخالف ہے۔

۸۵۷ قریباً یہی الفاظ پہلے بھی آچکے ہیں جہاں ان پر مفصل بحث گزر چکی ہے (دیکھو ۹۲) یہاں اس آیت کے لانے کا منشاء یہ ہے کہ تمام قوموں کو اور تمام کتب مقدسہ کے ذریعہ سے اللہ تعالٰی نے ہمیشہ یہی تعلیم دی ہے کہ خدا ایک ہے اور اعمال صالحہ کی ضرورت ہے۔ تثلیث اور کفارہ علی الترتیب ان دونوں اصول کو غلط ٹھہراتے ہیں۔ پس ان کے خود غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ
رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا
كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿٧٠﴾

یقیناً ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور اُن کی طرف رسول بھیجے ، جب کبھی ان کے پاس رسول وہ چیز لے کر آیا جس کو ان کے دل نہیں چاہتے تھے ، ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرنے لگے ع۸۵۸

وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا
وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ
عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٧١﴾

اور اُنھوں نے گمان کیا کہ کوئی خرابی نہ ہوگی ، سو وہ اندھے اور بہرے ہوگئے ، پھر اللہ نے اُن پر رجوع برحمت کیا ، پھر اُن میں سے بہت سے اندھے اور بہرے ہوگئے اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں ع۸۵۹

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ
الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ
يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ
رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ
حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ
النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٧٢﴾

یقیناً وہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے ۔ اور مسیح نے کہا اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو ، جو میرا اور تمھارا رب ہے ؎۲ جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ع۸۶۰

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ
ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ
وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾

یقیناً وہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے اور معبود تو سوائے ایک معبود کے کوئی نہیں ، اور اگر وہ اس سے نہ رُکیں گے جو کہتے ہیں تو ضرور ان کو جو اُن میں سے کافر ہیں دردناک عذاب پہنچے گا ۔

اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٧٤﴾

توکیا یہ اللہ کے حضور توبہ نہیں کرتے اور اس کی بخشش نہیں چاہتے اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۔

ع۸۵۸ عہد بنی اسرائیل کو یاد دلا کر بھی یہی بتایا ہے کہ اس عہد میں اللہ تعالیٰ کی توحید پر ہی سارا زور ہے ۔ اور پھر فرمایا کہ تم لوگ ہمیشہ ہوائے نفس کے پیرو رہے ہو یہاں تک کہ انبیاء کو بھی جب انہوں نے تمہارے خلاف منشاء کچھ کہا جھٹلا دیا ۔ اب بھی تم ہوائے نفس کی وجہ سے آنحضرت صلعم کے قتل کے منصوبے کرتے ہو۔

ع۸۵۹ فتنۃ کے عام معنی مصائب یا دُکھ ہیں ، مگر یہاں حضرت ابن عباسؓ سے شرک معنی مروی ہیں (ج)
اندھے اور بہرے ہونے سے مراد یہی ہے کہ اصول حقہ کو ترک کرکے نئے اصول بنا لیے ۔ چنانچہ اس کی تشریح صاف اگلی آیت میں کر دی ہے ۔ پہلی مرتبہ اندھے اور بہرے ہونا حضرت عیسیٰؑ کے بعد کا فتنہ ہے جب عیسائیوں نے توحید اور شریعت کو ترک کر کے تثلیث اور کفارہ کے عقاید ایجاد کرلیے ۔ ان پر رجوع برحمت کرنا آنحضرت صلعم کا مبعوث فرمانا ہے ۔ مگر پھر بھی یہ راہِ راست پر نہ آئے ، اندھے اور بہرے ہی رہے بلکہ کثرت انہی کی ہوگئی اور موحد گروہ بالکل مٹ گیا مفسرین نے یہاں یہود مراد سمجھے ہیں مگر میرے نزدیک یہ عیسائیوں کا ذکر ہے ۔

ع۸۶۰ مسیح کی خدائی اور تثلیث : یہاں صراحت کر دی کہ وہ اندھا اور بہرہ ہونا جس کا ذکر اوپر ہے ، وہ توحید الٰہی سے انحراف ہی ہے ۔ عیسائیوں کے عقیدہ کو یہاں اور آیت ۱۷ میں یوں بیان کیا کہ وہ کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے ۔ اور اس سے اگلی آیت میں ، یعنی آیت ۷۳ میں اور النساء ۱۷۱ میں تین خداؤں کا ماننا

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۖ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ۗ انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٧٥﴾

مسیح ابن مریم صرف رسول ہے۔ اس سے پہلے بھی رسول گزر چکے۔ اور اس کی ماں صدیقہ تھی۔ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو کس طرح ہم اُن کے لیے باتیں بیان کرتے ہیں پھر دیکھو یہ کس طرح اُلٹے پھرے جاتے ہیں ؏۸۶۱

قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۚ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٧٦﴾

کہہ کیا تم اللہ کے سوائے اُس کی عبادت کرتے ہو جس کو نہ تمہارے نقصان کا اختیار ہے اور نہ نفع کا اور اللہ ہی سننے والا جاننے والا ہے ؏۸۶۲

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ ﴿٧٧﴾ ع ۱۱/۱۴

کہہ اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور اُن لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ جو پہلے گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے بھٹک گئے ؏۸۶۳

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿٧٨﴾

جن لوگوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا، اُن پر داؤدؑ اور عیسٰیؑ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور حد سے بڑھ جاتے تھے ؏۸۶۴

ان کا عقیدہ بتایا بعض لوگوں نے اسے اختلاف سمجھ کر یوں توجیہ کی ہے کہ بعض فرقوں کا ایک عقیدہ تھا، بعض کا دوسرا۔ مگر اصل یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں درست ہیں اور ما حصل ایک ہی ہے۔ عیسائی مانتے تو یہی ہیں کہ تین اقنوم ہیں باپ، بیٹا، روح القدس، لیکن عملی رنگ میں مسیح ہی مسیح رہ جاتا ہے۔ کیونکہ نجات دہندہ وہی ہے اور سارا تعلق اسی سے ہے۔ سارا زور اسی کی خدائی ثابت کرنے پر صرف کیا جاتا ہے اور اسی کی خدائی کی اشاعت دنیا میں ہوتی ہے۔ پس دونوں باتیں درست ہیں۔ ایک ان کا کتابی عقیدہ ہے اور ایک عملی۔ اس عقیدہ کے بالمقابل مسیح کا قول پیش کیا ہے کہ وہ خود خدا کی عبادت کی طرف بلاتا تھا۔ اگر خدا ہوتا تو خود کیوں خدا کی عبادت کرتا اور اس کی عبادت کی طرف بلاتا۔ آیت ۴۷ میں ان کے بالآخر حق کی طرف رجوع کا ذکر کیا ہے اور اگلے رکوع میں ان کے اسلام کے قرب کے ذکر میں اسی کی تائید پائی جاتی ہے۔

؏۸۶۱ مسیح کی خدائی کی تردید میں ان کی ماں کا ذکر قرآن شریف نے ہمیشہ کیا ہے یہ بتلانے کو کہ ایک عورت کے فرزند کو خدا بنایا جاتا ہے، اور دونوں کے کھانا کھانے کا ذکر اس لیے کیا کہ جو کھانا کھاتا ہے وہ تمام حوائج بشری کا محتاج ہے، جب کھانا کھائے گا تو پیشاب پاخانہ بھی کرے گا اور وہ خدا نہیں ہو سکتا جو کھانے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک نہایت ہی بیّن دلیل ہے۔ مگر افسوس ہے کہ عیسائی توجہ نہیں کرتے۔ مگر ان پر کیا افسوس ہے جب مسلمانوں کی اپنی ہی یہ حالت ہے کہ ان کھلے الفاظ کے ہوتے ہوئے کہ مسیح کھانے کے محتاج تھے یہ مان رہے ہیں کہ دو ہزار سال سے اسی جسد عنصری کے ہوتے ہوئے کھانے کے محتاج نہیں نہ دیگر حوائج بشری کے، اور عیسائی ایسے عقیدہ سے اس کی الوہیت کی دلیل لیکر خود مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔

؏۸۶۲ مسیح ان کو کوئی نفع نقصان نہیں پہنچاتے، اور مسیح کی پرستار قوم کا یہ خیال کہ ہمارا غلبہ مسیح کی پرستاری کی وجہ سے ہے باطل ہے۔

؏۸۶۳ یہاں یہ بتایا ہے کہ ایک انسان کو خدا بنانا یہ پہلی گمراہ قوموں کی پیروی ہے۔ یہ الزام جو قرآن کریم نے عیسائیوں پر دیا ہے اس کی صداقت کا اعتراف آج خود عیسائی کہلانے والے لوگوں کو ہے۔ پہلے بت پرستوں نے بھی اسی قسم کا مذہب بنایا ہوا تھا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کو خدا اور خدا کے بیٹے کہتے تھے اور آج یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ پولوس نے محض یونانی بت پرستی کی تقلید میں یہ مذہب بنایا۔ کیا ایک عرب کا امّی دنیا کی تاریخ سے ناواقف یہ کہہ سکتا تھا؟ نہیں یہ خدائے عالم الغیب کا کلام تھا جس نے اس حقیقت کو دنیا پر ظاہر کیا۔ اور آج خود یورپ کے محققین نے اس کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر یہ ایک بیّن شہادت ہے۔

؏۸۶۴ حضرت موسٰیؑ کے بعد حضرت داؤدؑ میں بنی اسرائیل نے جسمانی ترقی کا اور حضرت عیسٰیؑ میں روحانی ترقی کا کمال حاصل کیا۔ اور ان دونوں نبیوں نے آنحضرت

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٩﴾

وہ ایک دوسرے کو بُرے کام سے جو وہ کرتے تھے روکتے نہ تھے کیا ہی بُرا ہے جو وہ کرتے تھے ع۸۶۵

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿٨٠﴾

تو اُن میں سے بہتوں کو دیکھے گا کہ جنھوں نے کفر کیا انھیں دوست بناتے ہیں کیا ہی بُرا ہے جو انھوں نے اپنے لیے آگے بھیجا ہے کہ اللہ اُن پر ناراض ہُوا اور وہ عذاب میں رہنے والے ہوں گے۔

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨١﴾

اور اگر (یہی) اللہ پر اور نبی پر اور اس پر ایمان لاتے جو اس کی طرف اتارا گیا، تو ان کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے بہت نافرمان ہیں ع۸۶۶

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٨٢﴾

تو یقیناً ان کے لیے جو ایمان لائے، دشمنی میں سب لوگوں سے زیادہ سخت یہودیوں کو پائے گا اور ان کو جو مشرک ہیں اور ان کے لیے جو ایمان لائے دوستی میں سب سے قریب تُو ان لوگوں کو پائے گا جو کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں یہ اس لیے کہ ان میں سے عالم اور راہب ہیں اور اس لیے کہ وہ تکبر نہیں کرتے ع۸۶۷

صلعم کی بڑی مدح کی ہے اور آپؐ کی آمد کا بہت ذکر کیا ہے مگر دونوں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ قوم نہایت سخت دل ہوتی جاتی ہے اور احکام الٰہی کی فرمانبرداری نہیں کرتی۔ اس لیے دونوں نے ان سزاؤں کا بھی جو ان پر آنے والی تھیں ذکر کیا ہے۔ یہی لعنت یعنی دوری ہے۔ حضرت داؤدؑ کے بعد بخت النصر کے ذریعہ سے اس قوم پر تباہی آئی اور حضرت عیسیٰؑ کے بعد طیطوس رومی کے ذریعہ سے، اور ان دونوں تباہیوں سے جس کا اصل باعث ان کی نافرمانی تھی یہ قوم بالکل ذلیل ہو گئی۔ اس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل میں ہے جہاں پہلے فرمایا لتفسدن فی الارض مرّتین (بنی اسرائیل ١٧- ۴) اور پھر ان کی شرارت پر جو سزا ان کو دی گئی اس کا ذکر آیت ۵ و ۷ میں کیا۔

ع۸۶۵ قوم کی ترقی اسی وقت تک رہتی ہے جب ایک دوسرے کو بُرے کاموں سے روکنے والے ہوں۔ یہی مرض اب مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گیا ہے کہ بُرے کام ہوتے دیکھتے ہیں، خلاف قرآن و حدیث چاروں طرف ہو رہا ہے مگر جو خود شاید بچتے بھی ہوں وہ دوسروں کو کچھ نہیں کہتے اور انہی مجلسوں میں شامل ہوتے ہیں۔ غیرت اسلامی ہوتی تو کم از کم الگ ہی رہتے اور چاہیئے تو تھا کہ روکتے۔

ع۸۶۶ النبی کا لفظ قرآن شریف میں آنحضرت صلعم پر ہی بولا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے یہاں حضرت موسیٰؑ کو مراد لیا ہے۔ یعنی اگر یہ یہودی حضرت موسیٰؑ پر ایمان لاتے تو کافروں کو دوست نہ بناتے۔ مگر مراد اصل میں یہ ہے کہ کافروں اور مشرکوں کو تو ان لوگوں نے دوست بنا رکھا ہے جیسا کہ پچھلی آیت میں کہا اور وہ دوستی ملک عرب میں رہائش کی وجہ سے یا ہمسائیگی کی وجہ سے نہیں، کیونکہ اگر وہی لوگ آنحضرت صلعم پر ایمان لے آئیں تو پھر یہ ان کو کبھی دوست نہ بنائیں۔ گویا صرف اسلام کی دشمنی کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔

ع۸۶۷ قسیس۔ قِسّ کے اصل معنی رات کے وقت کسی شے کا طلب کرنا اور اس کا تتبع کرنا ہیں، اور قِسّیس نصاریٰ کے علماء کو کہتے ہیں اس لیے کہ یہ لوگ عابد بھی ہوتے تھے۔ (غ)

رھبان۔ راھب کی جمع ہے اور رُھب اور رَھْبَة کے معنی خوف ہیں جس میں احتیاط اور اضطراب ملا ہوا ہو۔ اور رَھبانیة وہ عبادت ہے جس میں خوف کی وجہ سے غلو کیا جائے (غ) ورھبانیة ن ابتدعوھا (الحدید ۵۷-۲۷) اور راھب وہ لوگ ہیں جو تعلقات دنیوی سے بالکل الگ

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨٣﴾

اور جب اُسے سُنتے ہیں کہ جو رسُول کی طرف اُتارا گیا، تو تُو دیکھے گا کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اِس لیے کہ اُنھوں نے حق کو پہچان لیا، کہتے ہیں ہمارے رب ہم ایمان لائے، سو تُو ہم کو گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے [۸۶۸]

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَن يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ﴿٨٤﴾

اور ہمارے پاس کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہمارے پاس آیا ایمان نہ لائیں اور ہم آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ داخل کرے۔

فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٨٥﴾

سو اللہ نے اُن کو ان باتوں کا بدلہ باغ دیئے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اُنہی میں رہیں گے اور یہ نیکی کرنے والوں کا بدلہ ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿٨٦﴾ ع

اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا، وہی دوزخ والے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ستھری چیزیں حرام نہ ٹھیراؤ

ہو کر عبادت میں ہی لگ جائیں اور ایسے لوگ عیسائیت میں بہت تھے۔

اصل منشا اِس رکوع میں یہی بتانے کا ہے کہ عیسائی لوگ باوجود اپنے غلو کے دین اسلام کے قریب ہیں۔ اس لیے یہودیوں کی عداوت اور قساوت قلبی کا ذکر کر کے اب اصل مضمون کو بیان کیا ہے کہ ان میں مسلمانوں کے ساتھ محبّت زیادہ ہے۔ کیونکہ ان کے علماء بھی عابد لوگ ہیں اور ان میں راہب بھی ہیں جو دنیا کو ترک کر کے عبادت میں لگے ہوئے ہیں اور عبادت سے دل نرم ہوتا ہے۔ اس وقت یہودیوں اور عیسائیوں میں فرق بیّن تھا کہ یہود بالکل دنیا پر گرے ہوئے تھے۔ سودخواری اور مال دنیا کا کمانا اس سے بڑھ کر ان کی کوئی غرض نہ تھی اور عیسائیوں میں عبادت کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ اس لیے یہود میں قساوت قلبی زیادہ تھی۔ اور عیسائیوں میں نرمی زیادہ تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں نجاشی شاہِ حبش مسلمان ہُوا۔ ہرقل نے بھی چاہا تھا کہ اسلام قبول کر لے مگر قوم کی مخالفت سے گھبرا گیا۔ مقوقس شاہِ مصر نے آپ کے خط کے جواب میں تحائف بھیجے۔ خود نجران کے وفد کو مباہلہ میں نکلنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بالمقابل اس کے یہودیوں نے سخت عداوت کی۔ اور گو لفظ عام ہیں لیکن جو وجہ عیسائیوں کی نرمی کی دی ہے اس نے ان الفاظ کو بھی محدود المعنی کر دیا ہے۔

موجودہ عیسائی اور اسلام: پہلی حالت عیسائی قوم کی بلاشبہ یہی تھی کہ ان میں علماء بھی عابد تھے اور تارک الدنیا عبادت کرنے والے بھی تھے۔ مگر آخری حالت یہ ہے جیسا کہ سورۂ کہف میں اس قوم کا نقشہ کھینچا ہے کہ بالکل مال دنیا پر گر گئی الذین ضل سعیہم فی الحیٰوۃ الدنیا (الکہف ۱۸-۱۰۴) اور خدا تعالیٰ کی عبادت کی بجائے دولت کے دیوتا اور حکومت کے طاغوت کی پرستش شروع کر دی اس لیے حق سے دور جا پڑے بلکہ حق کی مخالفت پر سارا زور صرف کر دیا۔ لیکن بایں آیت کے الفاظ یہ امید دلاتے ہیں کہ یہ لوگ پھر اسلام کی طرف متوجہ ہونگے اور واقعات سے بھی یہی شہادت ملتی ہے کہ ایک چھوٹے سے پیمانہ پر اس قوم میں تبلیغ کا یہ اثر ہوا کہ سیکڑوں کی تعداد میں قابل اور فاضل لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

ع۸۶۸ نجاشی اور مسلمان مہاجر: اسی گروہ میں سے نجاشی شاہ حبش تھا جو مسلمان قریش کی اذیت سے بھاگ کر حبش میں چلے گئے۔ ان کو نجاشی نے پناہ دی۔ ان کے پیچھے قریش بھی پہنچے اور بہت سے تحفے وزرا وغیرہ کو دیکر یہ درخواست کی کہ مسلمانوں کو یہاں امن نہ دیا جائے۔ نجاشی نے اس درخواست کو رد کر دیا تو انہوں نے اس کو یہ کہکر اکسانا چاہا کہ یہ لوگ ہمارے مذہب کو ہی بُرا نہیں کہتے بلکہ تمہارے مذہب کو بھی بُرا کہتے ہیں۔ نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں بلایا، حضرت جعفرؓ نے اصل حال کہہ سنایا کہ ہم کس طرح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے اور گناہوں میں غرق تھے پیغمبر نے ہمیں ضلالت سے نکال کر کس طرح اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا۔ تب اس نے پوچھا کہ حضرت عیسٰےؑ کے بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو۔ انھوں نے سورۃ مریم کی آیات پڑھ کر سنائیں جن سے نجاشی پر اس قدر اثر ہُوا کہ وہ رو پڑا۔ اور شہادت دی کہ جو کچھ قرآن نے عیسیٰؑ کے بارے

اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾
وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪
وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾
لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ
وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ
فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ
اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ
اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ
ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا
حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ
وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ

جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو اللہ
حد سے بڑھنے والوں سے محبّت نہیں رکھتا۔[۸۶۹]
اور اس سے جو اللہ نے تم کو دیا ہے حلال اور ستھری چیزیں کھاؤ
اور اللہ کا تقویٰ کرو، جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔
اللہ تمھاری بلا ارادہ قسموں پر تم پر گرفت نہیں کرتا، لیکن
اس پر گرفت کرتا ہے جو تم قسم کو مضبوط کرو۔ سو اس کا
کفارہ دس مسکینوں کا کھانا ہے، درمیانہ کھانے
سے جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان کو لباس دینا
یا گردن کا آزاد کرنا اور جو شخص نہ پائے، تو تین دن کے
روزے رکھنا ہے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے، جب تم
قسم کھالو۔ اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اس طرح اللہ
اپنی باتیں تمھارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔[۸۷۰]
اے لوگو! جو ایمان لائے ہو شراب اور جوا
اور بُت اور پاسے ناپاک کام صرف شیطان کے

میں بیان کیا ہے اس سے وہ ایک تنکے کے برابر بڑھ کر نہیں۔ آخر کار نجاشی مسلمان ہو گیا۔ یہ تو ایک نمونہ ہے اسی طرح کئی لوگ اسلام میں داخل ہوئے گو مقدر یہی تھا کہ عیسائیت جب پورا زور پکڑ لے تو اس کے بعد پھر اسلام کو اس پر پورے طور پر غالب کیا جائے۔ ہاں ایسے نمونے آج بھی بہتیرے ملتے ہیں لارڈ سٹینلے کے حالات میں ایک شخص نے لکھا ہے کہ وہ پچھلی رات تہجد کی نماز میں قرآن شریف پڑھ کر روتا تھا۔ اور بھی آج کئی ایک یورپین عیسائی ہیں جن کے دل قرآن کریم کے سامنے پگھل جاتے ہیں۔

الحق جو اس آیت میں اور اگلی آیت میں آتا ہے اس سے اشارہ حضرت عیسیٰؑ کی اس پیشگوئی کی طرف ہے جو یوحنا کے چودھویں اور سولھویں باب میں ہے جس میں موعود نبی کو روح حق کے نام سے پکارا گیا ہے۔

ع[۸۶۹] رکوع سابق میں عیسائیوں کا اسلام کے قریب ہونا بیان کرتے ہوئے ان کے راہبوں وغیرہ کا محل مدح پر ذکر کیا تھا مگر چونکہ اسلام رہبانیت کو جائز نہیں ٹھہراتا اس لیے ساتھ ہی مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ تم نے اس قسم کی غلطیوں میں نہ پڑنا جن میں یہ عیسائی پڑے ہیں کہ انہوں نے سمجھ رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے محبت نہیں کرتا جب تک کہ وہ خدا داد نعمتوں اور خدا داد طاقتوں کو ترک نہ کرے اس لیے فرمایا کہ جب ستھری چیزیں اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے حلال ٹھہرائی ہیں تو تم ان کو حرام نہ کرو۔ مثلاً بیوی بچوں کے تعلقات، کھانا پینا وغیرہ جو عبادت میں حد مقررہ سے گزر جاتے ہیں وہ بھی غلو کرتے ہیں، مگر اسلام غلو کو جائز نہیں رکھتا۔ اسی لیے رسول اللہ صلعم نے فرمایا ما بال اقوام حرموا النساء والطعام والطیّب والنوم ان قوموں کا کیا حال ہو گا جنہوں نے عورتوں کو اور کھانے کو اور خوشبو کو اور نیند کو حرام کر دیا اور اس کے آخر پر فرمایا کہ میری امت کی رہبانیت جہاد کرنا ہے۔ اور ایک حدیث میں فرمایا فمن رغب عن سنتی فلیس منّی جو شخص میری سنت سے دوسری طرف مائل ہوتا ہے وہ مجھ سے نہیں ہے۔ پہلی حدیث میں صاف عیسائی قوم کا نقشہ کھینچ کر مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے۔

ع[۸۷۰] عقّدتم۔ عَقْد کے معنی کسی چیز کی دونوں طرفوں کو اکٹھا کرنا یا گرہ دینا ہیں اور استعارۃً بیع، عہد، قسم وغیرہ کے موکد کرنے پر عَقْد۔ عَقَّد۔ عاقد وغیرہ بولا جاتا ہے (غ) سورہ بقرہ میں عقدتم الایمان کی جگہ جہاں مضمون یہی ہے کسبت قلوبکم فرمایا (البقرۃ ۲ - ۲۲۵) یعنی ٹھان کر یا ارادہ اور عمد سے ایک کام کا کرنا۔

کفّارۃ۔ کُفْر کے معنی چھپانا اور کفّارۃ وہ ہے جو گناہ کو چھپاوے اسی سے قسم کا کفارہ ہے (غ)

اوسط۔ وَسَط ما اَوْسَط کے معنی درمیان کی چیز ہیں ابن جریر کہتے ہیں یہاں وسط سے مراد قلّت وکثرت میں وسط ہے اور وہ کہتے ہیں کہ کفارہ میں نبی کریم صلعم

الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾
عمل سے ہیں سو اس سے بچو تاکہ تم کامیاب ہو۔ ۸۷۱

اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾
شیطان صرف یہ چاہتا ہے کہ تمھارے درمیان شراب اور جُوئے سے عداوت اور بغض ڈال دے اور تم کو اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روک دے۔ سو کیا تم رُک جاؤ گے ۸۷۲

وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۹۲﴾
اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور بچتے رہو۔ پھر اگر تم پھر جاؤ تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْۤا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ
ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے کوئی گناہ نہیں اس بارے میں جو وہ کھائیں جب کہ وہ تقویٰ کریں اور ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں پھر تقویٰ کریں اور مان لیں پھر تقویٰ

کی سنت اسی اندازے سے دے دینا تھا، نہ لازمی طور پر کھانا پکا کر کھلانا اور زیادہ سے زیادہ اندازہ جو نبی کریم صلعم نے حکم دیا ہے نصف صاع یا دو مُدفی مسکین ہے اور کم سے کم ایک مد جو ۹ چھٹانک ہے۔

تحریر ۴۰۸ ایک انسان کا آزاد کر دینا۔ رقبۃ کے لیے دیکھو ۲۱۵ چونکہ قیدی جب پکڑا جاتا تھا تو اس کے ہاتھ گردن کے ساتھ باندھ دیئے جاتے تھے۔ اس لیے رقبۃ جو گردن کے معنی میں ہے غلام پر بولا جانے لگا (ج)

حلفتم۔ حِلف اصل میں وہ قسم تھی جو ایک دوسرے سے عہد کے وقت لی جاتی تھی۔ پھر ہر قسم پر بولا جانے لگا۔ اسی لیے حلیف وہ ہے جس سے عہد کیا ہو۔ (رغ)

لغو قسم کے معنی پہلے گزر چکے ہیں دیکھو ۲۸۸ یہاں اس کا ذکر اس لیے کیا کہ بسا اوقات لوگ بلا ارادہ قسم کھا کر ایک حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ خدا کی قسم میں فلاں چیز نہیں کھاؤں گا وغیرہ۔ ہاں جب انسان پختہ طور پر اور پورا عزم کر کے ایک قسم کھالے تو پھر کفارہ دینا چاہیئے مگر قسم کے کفارہ کے یہ معنی نہیں کہ انسان ایک جائز عہد کر کے اس پر قسم کھا لیتا ہے تو کفارہ دیکر اس کو بھی توڑ دے اس کا توڑنا تو کسی صورت میں جائز نہیں بلکہ قسم کی حفاظت کرنی ضروری ہے۔ ہاں قسم کھا کر ایک جائز چیز کو اپنے لیے ناجائز کہدیا تو ایسی قسم کا کفارہ دے۔ کیونکہ جائز کا ناجائز کرنا خلاف حکم خداوندی ہے۔ قسموں کی حفاظت سے مراد یہ بھی ہے کہ قسم کو توڑو نہیں۔ اور یہ بھی مراد ہے کہ قسم کم کھاؤ۔

۸۷۱ رجس۔ پلیدی یا ناپاکی۔ جسے انسان کی طبیعت پلید قرار دے یا عقل یا شریعت (رغ) خمر اور میسر آخری دو لحاظ سے رجس ہیں۔ ایسا ہی انصاب وازلام۔ انصاب اور ازلام کا ذکر پہلے شروع سورت میں بھی آیا ہے۔ انصاب سے مراد وہ پتھر ہیں جن کی عبادت کرتے تھے اور ازلام سے مراد اُن تیروں کے ذریعہ سے فال کا نکالنا جن پر لا نعم وغیرہ لکھا ہوتا تھا۔ دیکھو ۷۸۵ چنانچہ حدیث کے الفاظ میں شارب الخمر کعابد الوثن اسی طرف اشارہ ہے یعنی شراب کا پینے والا بتوں کے پوجنے والے کی طرح ہے۔ بت پرستی کو شراب کے ساتھ ممنوع ٹھہرا کر بتایا ہے کہ مسلمانوں کو شراب سے ایسا ہی بچنا لازمی ہے جیسے بت پرستی سے۔

یہ چیزیں تو پہلے حرام کی جا چکی ہیں یہاں دوہرا کر یہ اشارہ کیا ہے کہ وہ عیسائی جنہوں نے ایک وقت رہبانیت اختیار کر کے حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر دیا۔ ایک دوسرا وقت آنے والا ہے کہ اس قدر دنیا میں غرق اور خدا سے دور ہونگے کہ حرام کو بھی حلال کر لیں گے اس لیے مسلمانوں کو شراب اور جوئے سے بالخصوص روکا ہے گو بتوں اور فال کے تیروں کا بھی ساتھ ذکر کیا ہے مگر اگلی آیت میں صرف شراب اور جوئے کے نقصانات کو بیان کر کے بتا دیا ہے کہ اصل غرض انہی سے روکنا ہے۔ یہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ اس آیت کے نزول پر حرمت شراب کی عام منادی کرائی گئی، تو اسی وقت مدینہ کی گلیوں میں تمام کی تمام شراب بہا دی گئی۔ دیکھو ۱۲۸۱۔

۸۷۲ جن قوموں نے شراب اور جوئے میں ترقی کی ہے۔ اللہ کے نام تک کو بھول گئی ہیں ذکر تو ایک طرف رہا اور پھر ظاہر نقصان یہ بھی ہے کہ شراب اور جوئے سے باہم عداوت اور بغض پیدا ہوتا ہے جس کا یورپ آج کھلا نقشہ دکھا رہا ہے۔ اس مقابلہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ وہ سرور جس کو شراب خوار شراب میں تلاش کرتا ہے۔ وہ اللہ کے ذکر میں ہی میسر آتا ہے۔

اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًاۢ بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ

کریں اور احسان کریں اور اللہ احسان کرنیوالوں سے محبت کرتا ہے ۸۷۳

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کچھ شکار سے تمھیں ضرور آزمائے گا، جس کو تمھارے ہاتھ اور تمھارے نیزے پہنچ سکتے ہیں تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس سے غیب میں ڈرتا ہے سو جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے اس کے لیے دردناک عذاب ہے ۸۷۴

اے لوگو جو ایمان لائے ہو شکار کو نہ مارو جب تم حالت احرام میں ہو، اور جو کوئی تم میں سے اُسے جان بوجھ کر مارے تو (اس کا) بدلہ چارپایوں سے اس کا مثل ہے جو مارا ہے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عدل والے کریں یہ قربانی کعبہ پہنچنے والی ہو یا کفارہ ہے مسکینوں کا کھانا یا اس کے برابر روزے رکھنا تاکہ اپنے کام کا بُرا نتیجہ چکھے جو گزر گیا، وہ اللہ نے معاف کر دیا اور پھر جو ایسا کرے تو اللہ اس کو اس کی سزا دے گا

ع ۸۷۳ اس آیت سے عموماً مراد یہ لی گئی ہے کہ جو لوگ تحریم خمر سے پہلے وفات پا گئے ان پر کوئی گناہ نہیں، مگر ظاہر ہے کہ یوں تو اور بیسیوں احکام ہیں جن کے نازل ہونے سے پہلے بعض مسلمان فوت ہو گئے وہ ان پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے زیر مواخذہ نہ تھے جو اس حکم کی ضرورت پڑتی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تقوی کریں تو حرج نہیں کہ اتنی تھوڑی سی شراب پی لیں جس سے عداوت اور بغض پیدا نہ ہو۔ یہ بھی خوب تقوی ہے۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ جب شراب کو جس قرار دیا جب اس کو بت پرستی کے ساتھ ملا کر اس کی حرمت کو بیان کیا۔ جب صاف کہہ دیا کہ اس سے بچو۔ تو تقوی اور شراب خوری ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

مراد اس آیت سے کیا ہے؟ اوپر حلال چیزوں کو حرام کرنے والوں کا ذکر تھا۔ اس لیے یہاں فرمایا کہ کھانے پینے سے انسان گنہگار نہیں ہوتا جو اُن چیزوں کا ترک کرنا بھی تقرب الی اللہ میں داخل ہو۔ چنانچہ سلف میں سے بھی بعض اس طرف گئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی جنہوں نے اپنے لیے گوشت حرام کر لیا تھا اور راہبانہ طریق اختیار کرنا چاہتے تھے۔ سو یہاں ایسے لوگوں کی غلطی کو بھی ظاہر کر دیا۔ ہاں قرب الٰہی کو حاصل کرنے کی راہ بھی ساتھ ہی بتا دی۔ اور اس میں تقوی کے تین مراتب بھی بیان کر دیئے۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ ایمان لائے اور اچھے کام کرے۔ دوسرا مرتبہ تقوی کا یہ ہے کہ تمام باتوں کو مان لے اور کسی پر اس کے دل میں خلش پیدا نہ ہو یعنی سب احکام الٰہی کی فرمانبرداری اختیار کرے اور تیسرا مرتبہ تقوی کا یہ ہے کہ مخلوق خدا کے ساتھ احسان کرے۔ رہبانیت میں زیادہ سے زیادہ پہلا مرتبہ تقوی کا آسکتا ہے کہ ایمان لا کر کچھ اچھے کام کر لیے مگر کل احکام الٰہی کی فرمانبرداری راہب کیونکر کر سکتا ہے۔ پھر اس آخری مرتبہ مخلوق خدا کے ساتھ احسان کو وہ کیونکر پا سکتا ہے۔ مسلم ترمذی نسائی میں ایک حدیث ہے جو اسی معنی کی موید ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مجھے کہا گیا ہے کہ تو بھی ان میں سے ہے یعنی یہ تینوں مراتب تقوی تم میں پائے جاتے ہیں۔

ع ۸۷۴ اس رکوع میں اصل ذکر خانہ کعبہ کی عزت و حرمت کا ہے۔ اسی کے متعلق یہ احکام شکار بھی ہیں۔ اس مضمون کو بھی عیسائیت کے ذکر سے خاص تعلق ہے نبی کریم صلعم کی پیدائش کے سال میں ایک عیسائی بادشاہ نے خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کا ذکر سورۃ فیل میں ہے۔ پھر آخری زمانہ میں غلبہ عیسائیت کی صریح پیشگوئیاں قرآن شریف اور حدیث میں موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ عیسائیت کے غلبہ سے خانہ کعبہ کی حفاظت کا سوال پھر پیدا ہوتا ہے اس لیے عیسائی مذہب کے ذکر میں اس کا ذکر کیا ہے۔

خانہ کعبہ کی حرمت کو اس قدر بلند مقام پر رکھا ہے کہ حالت احرام میں شکار کو بھی منع کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں ایسے موقعہ پر جب آدمیوں کا اس قدر اجتماع ہو شکار کھیلنا ویسے بھی نقصان جان کا موجب ہو سکتا ہے۔

ہاتھوں کے پہنچنے سے مراد جال وغیرہ سے شکار کا پکڑنا ہے اور یہ مراد نہیں کہ انسان اپنے ہاتھ سے ہی پکڑے اور نیزے کے شکار سے مراد ایسا شکار ہے جو اسے زخمی کر کے حاصل کیا جائے۔ تیر اور بندوق بھی اس میں آجائیں گے۔ مجاہد کہتے ہیں پہلے سے مراد چھوٹا شکار دوسرے سے بڑا ہے (ج)

وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۹۵
اور اللہ غالب سزا دینے والا ہے [۸۷۵]

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ ۚ وَ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۹۶
تمہارے لیے دریا کا شکار اور اس کا طعام حلال کیا گیا ہے تمہارے اور مسافروں کے فائدے کے لیے [۸۷۶] اور تم پر خشکی کا شکار حرام کیا گیا ہے جب تک کہ تم حالتِ احرام میں ہو اور اللہ کا تقویٰ کرو، جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۹۷
اللہ نے کعبہ عزت والے گھر کو لوگوں کے لیے قائم رکھنے والا بنایا ہے اور حرمت والے مہینوں کو اور قربانیوں کو اور گانیوں والے جانوروں کو۔ یہ اس لیے کہ تم جان لو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور یہ کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے [۸۷۷]

---

[۸۷۵] یہاں پہلی آیت کے حکم کی تصریح کر دی ہے اور حالت احرام میں شکار کرنا منع کیا ہے۔ درندوں یا موذی جانوروں کو مارنا اس میں شامل نہیں ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ ایسی صورت میں سزا کیا ہے کسی جانور کی قربانی کعبہ میں جو مقتول جانور کی مثل ہو۔ جس کا فیصلہ دو صاحب عدل کریں۔ صاحب عدل سے مراد ایسے لوگ ہیں جو فقاہت رکھتے ہوں اور حقوق کا موازنہ کر سکتے ہوں۔ خاص حالات میں قربانی ہو یا مساکین کا کھانا یا روزے اور کس قدر؟ یہ سب فیصلہ انہی دو آدمیوں پر چھوڑا ہے۔ قرآن کریم نے عموماً ایسے فیصلوں میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو رکھا ہے یہاں بھی دو کو رکھا ہے اور طلاق کے معاملہ میں بھی دو کو۔ منشا یہ ہے کہ دو آدمی ایک دوسرے سے آراء کا مقابلہ کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ ایک سے غلطی کا احتمال زیادہ ہو سکتا ہے۔ ججوں کے بنچ بٹھانا کوئی نیا خیال نہیں۔

[۸۷۶] طعام۔ طَعۡم کے معنی غذا کے طور پر کسی چیز کو لینا ہیں اور طعام وہ چیز ہے جو اس طرح لی جائے (غ) مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ ابن عباسؓ۔ ابن عمرؓ وغیرہم سے مروی ہے کہ صید وہ ہے جس کا شکار کر کے اسے مارا جائے اور طعام وہ ہے جسے دریا خود پھینک دے یا دریا کے پیچھے ہٹ جانے سے رہ جائے (ج)

سیارۃ۔ سیر سے ہے زمین میں چلنا۔ اور جو جماعت زمین میں چلے اسے سیارۃ کہا جاتا ہے وجاءت سیارۃ (یوسف ۱۲۔ ۱۹)

آبی شکار کو مستثنیٰ کر دیا ہے یعنی اس کا پکڑنا حالت احرام میں جائز ہے۔ دریا وغیرہ کے شکار میں اتلاف جان کا خطرہ نہیں۔

[۸۷۷] الکعبۃ۔ کعب ٹخنے کو کہتے ہیں یعنی وہ ہڈیاں جو پنڈلی اور قدم کے درمیان اٹھی ہوئی ہوتی ہیں اور کَعَبَتِ الْجَارِیَۃ اس لڑکی کے متعلق کہا جاتا ہے جس کے سینہ کا ابھار شروع ہو گیا ہو۔ اسی لحاظ سے کعب شرف اور علو کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے حدیث میں ہے لایزال کَعۡبُکَ عالیاً جو دعائے شرف و علو ہے و کُلُّ شَیۡءٍ علا وارتفع فھو کعبٌ یعنی ہر ایک چیز جو بلند اور مرتفع ہو وہ کَعۡب ہے (ل) اور کعبۃ کو اس کے ارتفاع اور مربع ہونے کے لحاظ سے ایسا کہا جاتا ہے (ل) مگر اصل یہی ہے کہ یہ نام صرف اس کے علو اور ارتفاع کی وجہ سے ہے اور علو و ارتفاع سے مراد ظاہری بلندی نہیں بلکہ درجہ میں علو ہے کیونکہ اس گھر کو ابتدا سے علو اور ارتفاع کا مرتبہ حاصل رہا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ کعبہ اس کا نام بطور پیشگوئی کے رکھا گیا کہ اس کو دنیا میں علو و ارتفاع حاصل ہوگا اور مربع ہونا کوئی خصوصیت نہیں جس کی وجہ پر یہ نام رکھا جاتا۔

قیاماً للنّاس۔ کسی چیز کے لیے قیام ہونا اس کی نگہداشت اور حفاظت کرنا ہے (غ) پس قیام للناس کے معنی ہوئے لوگوں کی نگہداشت اور حفاظت کا ذریعہ۔ اصمؒ نے اس کے معنی کیے ہیں قائماً یعنی خود قائم رہنے والا۔ یا کبھی منسوخ نہ ہونے والا (غ) یعنی نہ کبھی یہ برباد ہوگا۔ اور نہ اس کے بعد کوئی اور دین دنیا میں قائم ہوگا کہ یہ منسوخ ہو جائے۔

اس آیت میں اصل مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کعبہ کو خدا نے قیام بنایا ہے۔ گویا یہ لوگوں کی حفاظت کا ذریعہ ہے یہاں خاص اہل عرب کا ذکر نہیں کیا بلکہ سب لوگوں کے لیے قیام کہا ہے اس لیے صرف اس قدر مراد نہیں ہو سکتی کہ عرب کے لوگوں کے لیے یہ معاش کا ذریعہ ہے اس لیے کہ تجارت کا مرکز ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ جس طرح غذائیں جسمانی قیام کا موجب ہیں اسی طرح خانہ کعبہ لوگوں کے روحانی قیام کا موجب ہے جس کے ذریعہ سے دنیا کے امور دینی کی اصلاح ہوئی اور یہ بالکل سچ ہے کہ اگر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوتے تو توحید اور روحانیت کا نام دنیا سے مٹ جاتا۔ پس یوں خانہ کعبہ دنیا کی روحانی زندگی کا موجب ہو کر دنیا کے لیے قیام کا موجب ہو گیا اور اسی لیے خانہ کعبہ کو بربادی سے بھی ہمیشہ کے لیے بچایا گیا۔ کیونکہ اس کو ظاہری نشان اس بات کا ٹھہرایا گیا کہ حق کبھی تباہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح قیام اپنے دونوں معنوں کی رو سے خانہ کعبہ پر صادق آتا ہے۔ یہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے برباد نہ کر سکے گی اور

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ
اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾

جان لو کہ اللہ (بدی کی) سزا دینے میں سخت ہے اور کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۸۷۸

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ
مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾

پیغمبر پر سوائے پہنچا دینے کے کچھ نہیں۔ اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَ لَوْ
اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي
ع الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع

کہہ ناپاک اور ستھرا برابر نہیں، گو تجھے ناپاک کی بہتات تعجب میں ڈالے، سو اے عقل والو اللہ کا تقوےٰ کرو تاکہ تم کامیاب ہو ۸۷۹

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ
اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا
حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ
عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو (بہت) چیزوں کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر تمھارے لیے ظاہر کردی جائیں تو تمھیں تکلیف دیں اور اگر تم ایسے وقت میں ان کے متعلق سوال کرو جب قرآن نازل کیا جارہا ہے تو تمھارے لیے ظاہر کردی جائینگی اللہ نے اسے معاف کردیا اور اللہ بخشنے والا بُردبار ہے ۸۸۰

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا

تم سے پہلے ایک قوم نے اِن (باتوں) کا سوال کیا۔ پھر ان کا

جو روحانیت اس سے پیدا ہوئی ہے وہ بھی کبھی برباد نہ ہوگی بلکہ دنیا کی زندگی کا موجب ثابت ہوگی۔

باقی تین چیزوں کا ذکر بھی یہی بتانے کو ہے کہ نہ صرف خانہ کعبہ ہی آخر دنیا تک قائم رہے گا۔ بلکہ وہ چیزیں بھی جن کا اس سے تعلق ہے۔ حرمت والے مہینے جن میں حج کیا جاتا ہے اور ہدی اور قلائد جن کی قربانی کی جاتی ہے۔ پس مراد اس سے یہ ہے کہ اس کا حج بھی ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ اور اس کے حج کا بند ہونا لوگوں کی ہلاکت کی نشانی ہوگی۔ یہاں حاجیوں کا ذکر نہیں کیا، بلکہ ایام حج اور قربانیوں کا ذکر کردیا ہے جب ان کی بھی حفاظت ہوگی تو حاجیوں کی خود حفاظت ہوتی۔ چنانچہ عطاء سے یہ معنی مروی ہیں کہ جب تک لوگ اس گھر کا حج کرتے رہیں گے ہلاک نہیں ہوں گے اور جب حج ترک ہوجائے گا تو ہلاک ہوجائیں گے۔

اس کو بڑی عظیم الشان پیشگوئی قرار دیا ہے یعنی اس کی صداقت سے معلوم ہوجائے گا۔ کہ اللہ تعالیٰ غیب کا جاننے والا ہے۔ ایسا دعویٰ کسی گھر کے متعلق دنیا میں نہیں کیا گیا اور کیا عجیب بات ہے کہ باوجود ہزارہا قسم کے منصوبوں کے کوئی شخص خانہ کعبہ کو نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ عیسائیوں پر یہ سب سے بڑھ کر اتمام حجّت ہے کیونکہ سب سے زیادہ طاقت ان کو دی گئی ہے اور سب سے بڑھ کر زور بھی انہوں نے ہی لگایا ہے اشاعت مذہب کے ذریعہ سے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی اس میں کامیاب نہ ہوئے ملکی طور پر تصرف حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس میں ناکام ہوں گے۔

ع ۸۷۸ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کعبہ کو نقصان پہنچانا چاہو گے تو اللہ کی طرف سے سخت سزا آئے گی مگر اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے کئی قصوروں سے درگزر بھی کرتا رہتا ہے

ع ۸۷۹ ناپاک کی کثرت اب بھی ایک عالم کو تعجب میں ڈالے ہوئے ہے مگر ناپاک اور طیّب برابر نہیں اور طیّب آخر کار غالب آئے گا۔

ع ۸۸۰ اس ساری سورت میں شریعت پر زور دیا ہے اور اسکی تفصیلات کو بیان کیا ہے۔ مگر قرآن کریم نے ہر جگہ افراط و تفریط کے پہلوؤں کو مدّنظر رکھا ہے۔ جس طرح پچھلے سے پچھلے رکوع میں عبادت میں غلو کو روکا اسی طرح یہاں تفصیلات شریعت میں غلو کو روکتا ہے اس لیے فرمایا کہ تم بہت سوال نہ کیا کرو۔ اللہ خود جن احکام کو انسانوں کی رہبری کے لیے ضروری سمجھتا ہے دے دیگا۔ جس طرح شریعت کا نہ ہونا انسان کے لیے موجب تکلیف ہے۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے امور میں احکام شریعت موجب تکلیف ہوجاتے ہیں۔ اسلامی شریعت نے اعتدال کا پہلو اختیار کیا ہے۔ ضروری تفصیلات دے بھی دی ہیں۔ مگر بہت سی باتوں کو چھوڑ بھی دیا ہے تاکہ اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے اور چونکہ احکام قرآنی ہیں تو تبدیلی ہو نہیں سکتی، لیکن اجتہاد حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے اور بلاشبہ بہت سے تفصیلی امور میں تبدیلیٔ حالات کے لحاظ سے تبدیلیٔ حکم کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہی طریق امن تھا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں احکام قرآنی نہ دیئے جاتے اور ضروریات پیش آمدہ کے مطابق اجتہاد سے کام لیا جاتا۔ حدیثوں میں بھی آیا ہے کہ لوگ رسول اللہ صلعم سے چھوٹے چھوٹے سوالات کیا کرتے تھے جس پر آپؐ اظہار ناراضگی فرماتے، وہ بھی اسی کا موید ہے۔

عفا اللہ عنہا سے یہ مراد ہے کہ باوجود تمہارے ایسے سوالوں کے اللہ تعالیٰ نے تم پر مشقت نہیں ڈالی۔

بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

انکار کرنے والے ہو گئے ۸۸۱

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اللہ نے نہ کوئی بحیرہ بنایا ہے اور نہ صائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام۔ لیکن جو کافر ہوئے وہ اللہ پر جھوٹ افترا کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے ۸۸۲

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس کی طرف آؤ، جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف، کہتے ہیں ہمارے لیے وہ بس ہے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا۔ کیا اگرچہ ان کے بڑے نہ کچھ علم رکھتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی جانوں کی فکر کرو۔ جو گمراہ ہوا وہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جب تم ہدایت پر ہو تم سب نے اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے سو وہ تم کو اس کی خبر دیگا جو تم کرتے تھے ۸۸۳

ع۸۸۱ پہلی قوم سے جب نام نہ لیا جائے عموماً بنی اسرائیل ہی مراد ہیں۔ ان کی شریعت میں بہت سے چھوٹے چھوٹے امور کا ذکر ہے شاید وہ ایسے سوال بھی کرتے ہوں اور ابن عباسؓ سے روایت ہے جیسے عیسائیوں نے مائدہ کا سوال کیا پھر ناشکری کی (ج)

ع۸۸۲ بحیرۃ۔ بحر سے ہے جس کے معنی شق کرنا ہیں جس اونٹنی کا کان چیرا جائے اسے بحیرۃ کہتے تھے یعنی جب اونٹنی دس بچے جنتی اور آخری نر ہوتا تو اونٹنی کا کان چیر کر اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا اور اس سے کسی قسم کا کام نہ لیا جاتا۔

سائبۃ۔ ساب سے ہے جس کے معنی ہیں زمین پر چلا۔ وہ اونٹنی جو نذر مان لینے کی وجہ سے یا دس مادہ بچے جننے کی وجہ سے آزاد چھوڑ دی جاتی اور کسی چارہ یا پانی سے اس کو نہ روکا جاتا۔

وصیلۃ۔ وصل سے ہے جس کے معنی ملانا ہیں اس کی بہت سی تشریحات کی گئی ہیں بعض کے نزدیک وہ بکری ہے جو سات دفعہ دو دو بچے جنے۔ آخر میں اگر ایک نر اور ایک مادہ ہو تو ماں کا دودھ صرف مرد پیتے اور زجاج نے کہا ہے کہ وہ وہ بکری ہے جو نر جنتی تو دیوتاؤں پر چڑھایا جاتا۔ لیکن اگر مادہ کے ساتھ نر ہوتا تو پھر اسے بچا لیا جاتا۔

حام حمی سے ہے محفوظ رکھنا۔ وہ نر جس سے سواری کا کام نہ لیا جائے۔ عموماً ایسے نر جن کی نسل کی نسل شروع ہو جاتی یا دس بچے ایک مادہ سے ہو جاتے ان سے پھر سواری کا کام نہ لیتے تھے۔

یہ تمام رسوم شرک سے تعلق رکھتی تھیں گویا بتا دیا کہ گو تفصیلات شریعت میں آزادی بھی بہت دی ہے مگر شرک چونکہ سب بدیوں کی جڑ ہے اس لیے اس کے متعلق ہر قسم کی رسوم جڑ سے کاٹنی ضروری ہیں مسلمان غور کریں کہ مشرکانہ رسوم سے اللہ تعالیٰ نے کس قدر بچنے کی تاکید فرمائی ہے اور ان کے گھروں میں کس طرح مشرکانہ رسوم جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔

ع۸۸۳ ضال قوم کی کثرت کے وقت علاج: ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت ان قوموں کے لیے ہے جو بعد میں آنے والی ہیں۔ ابن مسعودؓ کہتے ہیں یہ آخری زمانہ کے لیے ہے (ج)، اور یہی بات حق بھی معلوم ہوتی ہے لا یضرکم من ضل میں بتا دیا ہے کہ جب ضالین کی کثرت ہو تو یہ مت گمان کرو کہ وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں بشرطیکہ تم خود ہدایت پر قائم ہو۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کو ہدایت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہدایت پر ہونے کا ایک جزو لازم ہے کہ دوسروں کو ہدایت کی طرف بلائے وتواصوا بالحق (العصر ۱۰۳: ۳) بلکہ ہدایت کی طرف بلانے میں تکلیفیں اٹھائے وتواصوا بالصبر (العصر ۱۰۳: ۳) پس یہ آیت مسلمانوں کو یہ نہیں بتاتی کہ جب چاروں طرف ضلالت پھیلی ہوئی دیکھو تو تم اپنی ہی فکر کرو۔ دوسروں کو دین کی طرف نہ بلاؤ بلکہ یہ مسلمانوں کی ایک گری ہوئی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ جب ضالین ان کے چاروں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا
حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ
اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ
غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ
فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا
مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ
ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِىْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا
قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا
لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾
فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ
يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ
عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ
اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ
اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمھاری آپس میں گواہی وصیت کے وقت جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آ موجود ہو۔ دو اپنوں میں سے صاحب عدل لوگوں کی ہے۔ یا کوئی اور دو تمھارے غیر میں سے، اگر تم زمین میں سفر کر رہے ہو پھر تم کو موت کی مصیبت پہنچے۔ ان دونوں کو تم نماز کے بعد روک لو۔ پس اگر تم کو شک ہو تو دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم اس کے عوض کچھ قیمت نہ لیں گے، گو وہ قریبی ہو۔ اور ہم اللہ کی شہادت کو نہ چھپائیں گے۔ بیشک اس صورت میں ہم گنہگاروں میں سے ہونگے [۸۸۴]

پھر اگر معلوم ہو کہ ان دونوں نے گناہ سے حق لیا ہے تو دو اور ان دو کی جگہ کھڑے ہوں اُن میں سے جن سے دو پہلوں نے (گناہ سے) حق لیا ہے سو وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ سچی ہے اور ہم حد سے نہیں بڑھتے۔ بیشک اس صورت میں ہم ظالموں میں سے ہوں گے [۸۸۵]

طرف ہونگے اور ان کو بتایا ہے کہ تم کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ دوسروں کی وجہ سے نہیں تم اپنی فکر کرو اپنے حالات کو درست کرو خود ہدایت پر قائم ہو جاؤ پھر تم کو کوئی ضال نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کاش آج مسلمان اس پر توجہ کریں اور بجائے دوسروں کا رونا رونے کے پہلے اپنی حالت کی اصلاح کریں۔ نبی کریم صلعم سے جو تفسیر اس آیت کی ایک حدیث میں آئی ہے وہ بھی یہی بتاتی ہے ترمذی میں ہے آپ نے فرمایا یا مروا بالمعروف وتناھوا عن المنکر فاذا رایتم شحا مطاعا وھوی متبعا واعجاب کل امرئ برأیه فعلیکم انفسکم لا یضرکم ضلالة غیرکم یعنی نیک باتوں کا حکم کرو اور بری باتوں سے روکو پھر جب تم دیکھو کہ بخل کی اطاعت کی جاتی ہے اور حرص وہوا کی پیروی کی جاتی ہے اور ہر ایک شخص اپنی رائے پر خوش ہے تو تم اپنی جانوں کی فکر کرو، غیروں کی ضلالت تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس حدیث کے آخر میں بھی ایسے الفاظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری زمانہ کے لیے ہے اور مسند احمد میں حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے خطبہ میں فرمایا کہ تم اس آیت سے غلط مطلب نکالتے ہو میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے فرماتے تھے کہ جب بُری بات کو دیکھ کر لوگوں کو اس سے نہیں روکیں گے اللہ تعالیٰ ان پر ایسی سزا بھیجے گا جو سب کو شامل کرے گی (رث) ایک معنی یہ بھی کیے گئے ہیں احفظوھا والزموا صلاحھا یعنی اپنی حفاظت کرو اور اپنی اصلاح کرو۔ یعنی ایک دوسرے کو امر و نہی کے احکام سناؤ۔

ع ۸۸۴ کہا جاتا ہے کہ یہ آیت تمیم داری اور اس کے بھائی عدی کے بارہ میں نازل ہوئی مگر کہنا یوں چاہیئے کہ وہ قصہ بھی اس آیت کے ماتحت آتا ہے اور آیت عام ہے اس آیت میں وصیّت کے متعلق شہادت کا حکم ہے اس کے یہاں لانے کی یہ وجہ ہے کہ جب چھوٹے چھوٹے سوالات سے روکا تو اب خود ہی یہ بھی بتا دیا کہ ضروری احکام کو قرآن شریف نے خود بیان کر دیا ہے۔ ایک طرف شرک کے متعلق ہر قسم کے رواجات کو روکا تو دوسری طرف حفاظت مال کے قوانین کی بھی ضروری تفصیلات کو بیان کر دیا یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وصیّت کا حکم جو سورۃ بقرہ میں ہے وہ کبھی منسوخ نہیں ہوا کیونکہ اس آیت کا نزول آیت توریث سے بہت بعد کا ہے۔

اخران من غیرکم میں گواہی اپنوں کی یعنی مسلمانوں کی بھی جائز رکھی ہے اور غیروں کی یعنی غیر مسلموں کی بھی اور یہ جو فرمایا ان انتم ضربتم فی الارض یعنی سفر کی حالت میں ہو تو یہاں صرف ایک سخت ضرورت کی حالت کو بیان کیا ہے یہ شرط نہیں کہ اس کے سوائے گواہ یا وصیت نہ ہوں تحبسونھما میں جو روکنے کا ذکر ہے وہ شہادت لینے کے وقت ہے نماز کے بعد اس لیے کہا کہ نماز میں انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور یہ معاملہ ایک مشکوک شہادت کا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ صلوٰۃ سے مراد ہر ایک اہل دین کی اپنی اپنی صلوٰۃ ہے یعنی اگر گواہ عیسائی ہوں تو ان کے مذہب کی صلوٰۃ کے بعد۔ پس یہاں مراد صلوٰۃ سے مطلق دعا ہی لینا چاہیئے۔

ع ۸۸۵ عثر۔ عُثر الرجلُ کے معنی ہیں وہ گر گیا پھر اس کا استعمال اس پر ہوتا ہے جو بغیر طلب کرنے کے کسی امر پر اطلاع پائے (رغ)

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ ع

یہ بہت قریب (طریق) ہے کہ وہ شہادت کو سچ سچ ادا کریں یا ڈریں کہ ان کی قسموں کے بعد اور قسمیں لوٹائی جائیں گی۔ اور اللہ کا تقویٰ کرو اور سنو اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۸۸۶

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾

جس دن اللہ پیغمبروں کو جمع کرے اور کہیگا تمھیں کس طرح قبول کیا گیا۔ کہینگے ہمیں کوئی علم نہیں۔ تو ہی غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے ۸۸۷

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِىْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۗ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـــَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِىْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِىْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ

جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم میری نعمت کو یاد کر (جو میں نے) تجھ پر اور تیری ماں پر (کی) جب میں نے روح القدس کے ساتھ تیری تائید کی تُو لوگوں سے جھولے میں اور اور بڑھاپے میں باتیں کرتا تھا اور جب میں نے تجھے کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل سکھائی اور جب تو میرے حکم سے مٹی سے پرند کی صورت کی مانند اندازہ کرتا پھر اس میں پھونکتا، سو وہ میرے حکم سے اڑنے والا ہو جاتا اور تو شب کور اور

استحقا۔ اِسْتَحَقَّ الشَّیْءَ کے معنی ہیں۔ اِسْتَوْجَبَهٗ یعنی اسے واجب کر لیا (ل) پس استحقا اثما سے مراد ہوئی کہ انہوں نے گناہ کو اپنے اوپر واجب کر لیا ہے یعنی گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور الذین استحق علیہم الاولین میں اوّلین استحق کا فاعل ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے یعنی اثم جو ابھی آچکا ہے اور علیہم سے مراد اُن کے خلاف ہے پس جملہ کے معنی یوں ہوئے کہ دو اور گواہ ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں جن کے خلاف پہلے دو نے ارتکاب جرم کیا ہے یعنی وارثان میّت سے۔

یہاں یہ بتایا ہے کہ گواہوں کی گواہی جب اس کے خلاف قرائن ہوں دوسرے گواہوں سے رد کی جاسکتی ہے یہ نہیں کہ جھوٹے گواہوں کی گواہی کا کوئی علاج نہیں اور مطلب یہ ہے کہ اگر پہلے گواہوں کے جھوٹ بولنے پر کوئی قرینہ ہے تو وہ لوگ جو مال کے حقدار ہیں ان کے خلاف گواہ پیش کر سکتے ہیں۔

۸۸۶ شہادت کے علیٰ وجہہا ادا کرنے سے مراد اس کا سچ سچ ادا کرنا ہے اس قانون کے ماتحت ہر گواہ کو یہ فکر ہو گی کہ اس کی گواہی اگر وہ جھوٹ بولے تو رد بھی ہو سکتی ہے قسموں کے لوٹائے جانے سے مراد قسموں کا دوسروں کی طرف لوٹانا ہے یعنی اور گواہ بلائے جائیں گے۔

۸۸۷ ماذا اجبتم۔ اجابت کے معنی قبول کرنا ہیں جیسے اجیبوا داعی اللہ (الاحقاف ۴۶-۳۱) پس یہاں معنی ہیں بای اجابۃ اجبتم کس قسم کی قبولیت سے تمہیں قبول کیا گیا۔ اور جواب دینا مراد نہیں ورنہ ماذا کی جگہ بماذا ہوتا۔

اس رکوع میں اصل غرض تو عیسائیوں کا انہماک لذات دنیوی کا بیان کرنا ہے۔ لیکن اس کا آغاز ایک عام بیان سے کیا ہے کہ قیامت کے دن سب رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہاری قبولیت جو تمہارے پیروؤں نے کی کس رنگ میں کی تھی۔ یعنی آیا ان کے مدّنظر رضائے الٰہی تھی یا دنیا کی طرف جھک گئے اور حق کو چھوڑ دیا۔ اگلے رکوع میں یہی عام سوال خصوصیت سے حضرت عیسیٰؑ سے کیا ہے۔ یہاں بھی سوال کی اصل غرض عیسائیوں کی حالت کی طرف توجہ دلانا ہے۔ جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے جو حضرت عیسیٰؑ کو قبول تو یہاں تک کرتے ہیں کہ غلو کر کے بشر سے خدا بنا دیا۔ مگر زندگی کی غرض صرف دنیا اور اس کی لذات کا حصول ہے اور سوال مائدہ میں بھی اسی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولوں کا جواب ہے کہ ہمیں کوئی علم نہیں۔ کیونکہ جو کچھ ان کی امّتوں نے ان کے بعد کیا اس کا علم صرف علّام الغیوب کی ذات کو ہی ہو سکتا ہے اور یہ سوال محض پیغمبروں کی امتوں پر بطور اتمام حجت ہے کہ انبیاء ان میں کس غرض کے لیے آئے تھے اور ان کا قدم کدھر جا رہا ہے۔ اگلا رکوع اسی کی مزید تشریح کرتا ہے اور خود اس رکوع کی آیت ۱۱۱ و ۱۱۲ بھی یہی بتاتی ہیں۔

وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى
بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ
اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾

مبروص کو میرے حکم سے اچھا کرتا اور جب تو میرے حکم سے مُردوں کو نکالتا اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا، جب تو ان کے پاس دلائل لے کر آیا تو جو اُن میں سے کافر ہوئے اُنھوں نے کہا یہ صرف کھلا جادو ہے ۸۸۸

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ
وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ انھوں نے کہا ہم ایمان لائے اور گواہ رہ کہ ہم فرمانبردار ہیں ۸۸۹

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ
هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا
مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

جب حواریوں نے کہا اے عیسٰی ابن مریم کیا تیرا رب طاقت رکھتا ہے کہ ہم پر آسمان سے کھانا نازل کرے (حضرت عیسیٰؑ نے) کہا، اللہ کا تقویٰ کرو۔ اگر تم مومن ہو ۸۹۰

ع ۸۸۸ کففت ۔ کفّ کے اصل معنی ہاتھ سے روکنا ہیں پھر عام ہوگیا ہے یعنی کسی طرح پر روکنا (غ) اس لفظ کے استعمال سے بھی یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ حضرت عیسٰی آسمان پر چلے گئے کیونکہ بنی اسرائیل کو روکنا بتاتا ہے کہ وہ ان کو پکڑ نہیں سکے اور نہ ان کو ہاتھ لگا سکے ۔ یہ استدلال بہت ہی عجیب ہے گویا سب پیغمبروں کو تو اُن کے دشمن ایذائیں پہنچاتے رہے مگر حضرت عیسٰی کچھ ایسے نرالے رسول تھے کہ کسی دشمن کا ہاتھ بھی ان کو نہ چھو سکا بنی اسرائیل کو روکنے کا منشا تو صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے منصوبہ میں جو حضرت عیسٰیؑ کے خلاف کیا کامیاب نہ ہو سکے ۔ ورنہ جو حالات دشمنوں سے سخت ترین تکلیفیں اُٹھانے کے اوروں کو پیش آئے وہ حضرت عیسٰی کو بھی آئے ۔ باوجود وعدہ لیعصمک من الناس کے اگر آنحضرت صلعم زخم کھا کر گر جاتے ہیں اور مشہور ہو جاتا ہے کہ محمد صلعم قتل ہو گئے ۔ اگر ایک یہودی عورت آپ کو زہر دے سکتی ہے تو کففت میں کوئی نقص واقع نہیں ہو سکتا اگر یہودی مسیح کو پکڑ کر صلیب سے لٹکا دیں مگر اللہ تعالیٰ آپ کی جان بچا لے ۔

سحر ۔ سحر کے معنی کے لیئے دیکھو ع ۱۲۹ کفار انبیاء کو ساحر ہی کہتے رہے ہیں ۔ حضرت موسٰی کے متعلق آتا ہے یٰاَیُّہَ السّٰحِر (الزخرف ۴۳ ۔ ۴۹) اور آنحضرت صلعم کو بھی ساحر کہتے تھے ۔ چنانچہ سورۂ یونس کے شروع میں ہے کہ لوگوں کو اس پر کیوں تعجب ہوتا ہے کہ ہم نے ایک شخص کی طرف وحی کی ہے کہ بدکرداروں کو ڈرائے اور نیکوں کو خوشخبری دے اور جب رسول یہ پیغام دیتا ہے تو کافر کہتے ہیں ان ھٰذا السحر مبین (یونس ۱۰ ۔ ۲) امام راغبؒ نے سحر کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کبھی کسی فعل کو اس کے حسن کی وجہ سے سحر کہا جاتا ہے جیسے ان من البیان لسحرا میں، اور کبھی اس کے فعل کی دقت یعنی باریکی کے لحاظ سے ایک چیز کو سحر کہا جاتا ہے ۔ جیسے غذا کو اس کی باریک اور لطیف تاثیر کی وجہ سے سحر کہہ دیا جاتا ہے ۔ انبیاء علیہم السّلام کی تعلیم میں بھی یہی دو باتیں ہوتی ہیں ۔ ایک طرف اس کا حسن اور دلکشی کہ طبائع سلیمہ مجبور ہو کر اس کی طرف کھینچی چلی جاتی ہیں اور ان کا اثر بھی بہت باریک اور لطیف ہوتا ہے ۔ پس یہی وجہ ہے کہ کفار انبیاء کو ساحر کہتے رہے اور اسی لیے یہودیوں نے بھی حضرت عیسٰی کے کاموں کو سحر کہا ۔

باقی تمام امور پر مفصل بحث سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے ۔ یہاں ان کو اس غرض کے لیے بیان کیا ہے کہ حضرت عیسٰی کا اصل مقصد تو روحانی مردوں کو زندہ کرنا، روحانی بیماروں کو شفا دینا اور مستعد فطرتوں کو زمینی خیالات سے بلند کر کے روحانیات کی بلندیوں میں پرواز کرانا تھا مگر ان لوگوں نے روحانی امور کو بھی جسمانی خیال کیا اور پستی کی طرف جھک گئے ۔

ع ۸۸۹ وحی کے معنی کیلئے دیکھو ع ۷۶۸ حواریوں کی طرف وحی کرنا صاف بتاتا ہے کہ وحی غیر انبیاء کو بھی ہوتی ہے یہ خیال کہ حواری بھی نبی ہوں گے بدیہی البطلان ہے ۔ ان کی اصلاح کے لیے تو حضرت عیسٰیؑ مبعوث ہوئے پھر آگے ان کا سوال کہ ہم پر مائدہ آئے ۔ تو ہم کو یقین آئے گا کہ تو ہم سے سچ بولتا ہے ۔ صاف بتاتا ہے کہ وہ نبی نہ تھے ۔ پس ان کی وحی انبیاء والی وحی نہ تھی اور باوجود اس وحی کے ان کو حضرت عیسٰی کی صداقت پر یقین کامل نہیں ہوا ۔

ع ۸۹۰ یستطیع ۔ استطاعۃ طاقت رکھنے کو کہتے ہیں لیکن بعض اہل لُغت نے یستطیع بمعنی یطیع یا یجیب بھی لکھا ہے یعنی قبول کرے گا ۔

مائدۃ ۔ مید سے ہے جس کے معنی کھانا دینا بھی آتے ہیں ۔ مادنی اَطْعَمَنِی (غ) اور مائدۃ اس خوان کو کہا جاتا ہے جس پر کھانا ہو اور کھانے کو بھی کہا جاتا ہے (غ) اور یہاں مراد کھانا ہے نہ خوان جیسا کہ عیدا لاوّلنا و اٰخرنا بتاتا ہے ۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مائدہ سے یہاں مراد علم ہے اور علم کو مائدۃ اس لحاظ سے کہا کہ وہ قلوب کی غذا ہے (غ) مگر یہ خیال حضرت عیسٰی کے خیالات کو مدّنظر نہ رکھنے سے پیدا ہوا ہے ۔

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

انھوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل اطمینان پائیں اور ہم جان لیں کہ ضرور تو نے ہم سے سچ کہا ہے اور اس پر گواہ ہو جائیں ۸۹۱

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

عیسیٰؑ ابن مریم نے کہا اے اللہ ہمارے رب ہم پر آسمان سے کھانا نازل کر وہ ہمارے لیے عید ہو ہمارے پہلوں کے لیے اور ہمارے پچھلوں کے لیے) اور تیری طرف سے نشان ہو اور ہم کو رزق دے اور تو ہی بہتر رزق دینے والا ہے ۸۹۲

یہ آیت اس رکوع کے اصل مضمون کی طرف توجہ کو پھیرتی ہے۔ باوجودیکہ حواریوں کو الہام بھی ہُوا کہ وہ رسول پر ایمان لائیں مگر اس زمانہ کے یہودیوں کی حالت ایسی پستی کی تھی کہ دنیوی آسائش کا خیال دل سے نہیں گیا۔ اور حواری تھے بھی معمولی درجہ کے لوگ، ماہی گیر، محصول لینے والے۔ اور ایسے لوگ عموماً بلند خیالات کے مالک نہیں ہوسکتے اس لیے کھانے کی درخواست کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کا جواب بڑا لطیف ہے۔ دعوٰی تو مومن ہونے کا کرتے ہو اور نبی مومنوں کو تقوٰی کی راہوں پر چلانے آتا ہے نہ جسمانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے۔ پس تم بھی مومن ہو تو تقوٰی کی راہوں پر چلو جو میری بعثت کی غرض ہے۔

۸۹۱ حواریوں کی روحانی حالت: ان الفاظ سے حواریوں کی اصل حالت کا اندازہ لگتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو بار بار شکایت کرتے ہیں جیسا کہ اناجیل میں ہے کہ تم میں ایمان نہیں، اور اگر تم میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہوتا تو تم یُوں کرتے اور ووں کرتے، اور کبھی پطرس جیسے مقرب حواری کو شیطان کے نام سے یاد کرتے ہیں، تو یہ بلا وجہ نہ تھا۔ اور وہ دیکھ رہے تھے کہ خواہشات دنیا کا ان پر غلبہ ہے۔ اور گو روحانیت میں کچھ ترقی کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مگر پھر بھی کھانے پینے کے جسمانی خیالات پیچھا نہیں چھوڑتے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں کی قوموں کی حالت کمزور نظر آتی ہے۔ ان کے بالمقابل نبی کریم صلعم کے صحابہؓ کا روحانی کمال ایک آفتاب کی طرح روشن ہے۔ تعجّب ہے کہ باوجود الہام کے ابھی تک ان کو یقین کامل نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ ان سے جو کچھ کہتے ہیں سچ ہے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ سچ مچ قبروں سے مُردے نکال کر زندہ کر دیا کرتے تھے اور مٹی کی شکلیں بنا کر ان کو سچ مچ کے پرند بنا دیتے تھے، ان کے لیے بھی یہاں سبق ہے کہ اگر ایسے کھلے معجزات ہوئے ہوتے تو حواری حضرت مسیحؑ کو سچا جاننے کے لیے ایک مائدہ کے اُترنے کے کیوں محتاج ہوتے۔ قبروں سے مُردوں کا نکل آنا اور مٹی کی شکلوں کا پرند بن جانا تو مائدہ کے اُترنے سے بہت زیادہ کھلے معجزے ہیں۔ جو لوگ یہ دیکھ چکے ہوں وہ مائدہ کے محتاج نہیں ہوسکتے۔ پس کم از کم قرآن کے نزدیک مُردوں کے نکالنے وغیرہ معجزات سے ظاہری معنی ہرگز مراد نہیں۔

۸۹۲ عید۔ عود سے ہے جس کے معنی لوٹ کر آنا ہیں، اور عید وہ ہے جو لوٹ کر آئے۔ اور خوشی کے دن کے ساتھ یہ لفظ مخصوص ہوگیا ہے اور شریعت میں یوم الفطر اور یوم النحر سے مخصوص ہے (غ)

حضرت عیسیٰؑ کی دعائے مائدہ: ایک مرتبہ نصیحت کر کے آخر حضرت عیسیٰؑ دعا کرتے ہیں اور اپنی قوم کی خواہش کو پورا کرتے ہیں جس طرح حضرت موسیٰؑ کو اپنی قوم کی خواہش اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً کی وجہ سے یہ دعا کرنی پڑی: ربّ ارنی انظر الیك۔ مگر بجائے مائدہ کے جو صرف حواریوں پر نازل ہوا آپ ایسے مائدہ کی درخواست کرتے ہیں جو پہلوں اور پچھلوں کے لیے یکساں موجب سرور ہو۔ اس دعا کی قبولیت میں موجودہ حالات کچھ شک باقی نہیں رہنے دیتے۔ کھانے کے معاملہ میں عیسائیوں کے ہاں عید ہی عید ہے۔ پہلوں اور پچھلوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ان کو روٹی کے ساتھ کچھ فکر آخرت کی بھی تھی اب روٹی اور پیٹ کی پُوجا ہی باقی رہ گئی ہے۔

آنحضرت صلعم کو اُمت کی روحانیت کا فکر: مگر کیا یہ حالت رشک کے قابل ہے؟ ہمارے نبی کریم صلعم نے جو دُعا اپنی امت کے برگزیدہ لوگوں کے لیے کی ہے وہ یہ ہے کہ اے خدا آل محمدؐ کا رزق کفاف ہو۔ یعنی اس قدر دنیا کے سامان میں انہماک نہ ہو کہ وہ آخرت کو بھول جائیں، یہ دنیا کا حقیقی روحانی معلّم ہے۔ جس کو اپنی امت کی روح کی فکر ہے۔ اس چیز کی فکر ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ مگر حضرت مسیحؑ پر کچھ الزام نہیں جس قسم کا قوم کا میلان دیکھا اسی قسم کی دعا کی اور وہ زمانہ بھی ایسا تھا کہ ابھی روحانیت کو ضروری کمال دنیا میں حاصل نہ ہوا تھا۔ اس لیے انبیاء اپنی اپنی قوم کی حالت کے مطابق ہی تعلیم دیتے تھے۔ حضرت مسیحؑ کے معجزات میں بھی کھانے پینے کا بہت ذکر ہے۔ کہیں تھوڑی سی روٹیاں بہت لوگوں کو کفایت کرتی ہیں (یوحنا ۶: ۱-۱۴) تو کہیں اٹھارہ من پانی کی شراب بن جاتی ہے اور لوگ پی پی کر بدمست ہوتے ہیں۔ (یوحنا ۲: ۱-۱۱) اور اسی معجزہ کا اثر آج یورپ میں نمایاں ہے دعا کرتے ہیں تو وہاں بھی روز کی روٹی کی دعا ہی سب پر مقدم کرتے ہیں "ہماری روزینہ کی روٹی آج ہم کو بخش" (متی ۶: ۱۱)۔ سو عیسائیوں کو روٹی بھی مل گئی اور شراب بھی۔ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ دنیا میں نیکی اور اخلاق کا معلّم بنے۔ روٹیاں بھی خدا دیتا ہے مگر سچ یہی ہے کہ انسانیت کا نصب العین کھانا پینا نہیں۔ بلکہ نیکی اور اخلاق ہیں۔ اتقوا اللّٰه ان کنتم مومنین۔

قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۱۵﴾ ع

اللہ نے کہا میں اس کو تم پر اتارنے والا ہوں۔ پھر جو کوئی تم میں سے (اس کے) بعد ناشکری کرے تو میں اُسے ایسا عذاب دونگا کہ تمام جہان میں اور کسی کو ایسا عذاب نہیں دونگا ۸۹۳

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ وقف النبی علیہ السلام

اور جب اللہ نے کہا اے عیسیٰؑ ابن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا (کہ) مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا دو معبود بنا لو ۸۹۴ (عیسیٰؑ نے) کہا، تو پاک ہے مجھے کہاں شایاں تھا کہ میں وہ کہوں، جس کا مجھے حق نہیں۔ اگر میں نے ایسا کہا ہوتا، تو تجھے ضرور اس کا علم ہوتا، تو جانتا ہے جو کچھ میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے تو ہی غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے ۸۹۵

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۱۱۷﴾

میں نے ان سے کچھ نہیں کہا مگر وہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا، کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب اور تمہارا رب ہے ۸۹۶ اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں تھا، پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو تو ہی ان پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے ۸۹۷

---

۸۹۳ یعنی دنیوی نعمتیں دی جائیں گی، لیکن ان کی ناشکری کا نتیجہ بھی پھر ویسا ہی بُرا ہوگا۔ عیسائی قوموں کے پاس دنیا کی دولت اور دنیا کی آسائشیں بہت جمع ہوگئی ہیں اور دنیا کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ حد درجہ کی آسائش کے بعد مصائب کا دور شروع ہوتا ہے۔

۸۹۴ حضرت عیسیٰؑ سے عالم برزخ میں سوال: یہ کلام عالم برزخ کا ہے جو نزول قرآن سے پہلے ہو چکا ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں اسی کی تفسیر میں حدیث ہے کہ قیامت کے دن نبی کریم صلعم اپنی امت کے بعض لوگوں کو دوزخ کی طرف جاتے دیکھیں گے۔ آگے لفظ ہیں فاقول کما قال العبد الصالح "میں کہوں گا، جیسے عبد صالح یعنی عیسیٰؑ نے کہا، جہاں اپنے لیے صیغہ مضارع اور حضرت عیسیٰ کے لیے صیغہ ماضی استعمال کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے۔

مریم کی الوہیت: حضرت عیسیٰؑ کا خدا بنانا تو ظاہر ہے۔ مریم کو بھی عیسائیوں کے بعض فرقوں نے صفات الوہیت دی ہیں۔ چنانچہ رومن کیتھولک اس کے بُت بنا کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ "خدا کی ماں" اس کا خطاب ہی بتاتا ہے کہ اس کو کیا مرتبہ دیا گیا ہے، اور انسکلوپیڈیا بریٹینیکا میں ہے کہ تھریس عرب وغیرہ مقامات میں بعض عورتیں مریم کو خدا کی طرح پوجتی تھیں۔ اور مریم سے دعاؤں کا مانگنا بھی جائز رکھا گیا ہے۔ گو قرآن شریف نے مریم کو کہیں تثلیث کا اقنوم ثالث کر کے بیان نہیں کیا۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر باپ، بیٹے، روح القدس کی بجائے تثلیث کے تین اقنوم ماں، باپ اور بیٹا تجویز کئے جاتے تو بہت زیادہ موزوں تھا۔

۸۹۵ پہلا جواب حضرت عیسیٰؑ نے یہ دیا ہے کہ میرے لیے یہ کہاں شایاں تھا کہ میں ایسا کہتا۔ مگر اس سے بھی پہلے کہا سبحانک یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات تمام عیوب سے پاک ہے اور اس کے ساتھ کوئی خدا یا معبود یا بیٹا بنانا اس کی صفات میں نقص پیدا کرنا ہے ما فی نفسی سے مراد ایسی باتیں ہیں جو انسان مخفی رکھے۔ کیونکہ دل میں جو بات رکھی جائے وہ مخفی ہوتی ہے ظاہر نہیں ہوتی۔ اور اسی طرح ما فی نفسک سے مراد وہ باتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ مخفی رکھے۔ ان کا علم بندہ کو نہیں ہو سکتا۔

۸۹۶ یہ دوسرا جواب ہے کہ میں نے انہیں کیا کہا۔ وہ وہی تھا جو خدا نے حکم دیا یعنی یہ کہ "اللہ کی عبادت کرو، جو میرا اور تمہارا رب ہے"۔ "تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اس اکیلے کی بندگی کر" (متی ۴ : ۱۰)

۸۹۷ حضرت عیسیٰؑ کا اقرار توحید اور تعلیم: یہ تیسرا جواب ہے کہ نہ صرف میں نے توحید کی تعلیم دی بلکہ جب تک ان میں تھا تو ان پر گواہ بھی تھا، یعنی دیکھتا رہا کہ وہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور میری عبادت نہیں کرتے۔ پس یوں تین طرح نفی کی اول یہ کہ یہ نبی کو شایاں نہ تھا کہ ایسی تعلیم دیتا، دوسرے یہ کہ اس کے خلاف خدائے واحد کی عبادت کی تعلیم دی، تیسرے یہ کہ آپ کی زندگی میں وہ لوگ واقعی اس تعلیم پر قائم بھی رہے۔ ہاں ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میری وفات کے بعد ان کی کیا حالت ہو گئی۔ اس کو تو ہی جانتا ہے۔ مراد

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَإِنْ تَغْفِرْ
لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١١٨﴾
قَالَ اللَّهُ هَٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ
صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ رَضِيَ اللَّهُ
عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١١٩﴾
لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا
فِيهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٢٠﴾ ع

اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر تو
ان کی حفاظت کرے تو تو ہی غالب حکمت والا ہے ع۸۹۸
اللہ نے کہا یہ وہ دن ہے کہ صادقوں کو ان کی سچائی نفع دیگی
ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ہمیشہ انہی
میں رہیں گے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے
راضی ہوئے یہ بڑی کامیابی ہے ع۸۹۹
آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور جو کچھ ان میں ہے اللہ کے لیے
ہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ع۹۰۰

ظاہر ہے کہ غلط تعلیم میری وفات کے بعد ان میں پھیلی۔ جب تک میں ان میں تھا تب تک وہ صحیح تعلیم پر قائم تھے۔
یہ آیت حضرت مسیح کی وفات کو قطعی طور پر ثابت کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں عیسائیوں کا عقیدہ بگڑنے کا زمانہ حضرت مسیحؑ کی وفات کے بعد کا قرار دیا ہے اور چونکہ وہ عقیدہ نزول قرآن سے پہلے بگڑا ہوا تھا۔ اس لیے حضرت عیسیٰؑ کی وفات بھی نزول قرآن سے پہلے ہو چکی تھی رہے لفظ توفی کے معنی سو اس پر بحث ہو چکی ہے۔ دیکھو ع۴۴۴) علاوہ ازیں اس آیت کی جو تفسیر خود نبی صلعم سے مروی ہے وہ بھی اس کا قطعی فیصلہ کرتی ہے۔ حدیث بخاری میں ہے کہ جب قیامت کے دن میری امت کے بعض لوگ پکڑ کر دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نہیں جانتا کہ تیرے بعد انہوں نے کیا کیا تا قول کما قال العبد الصالح وکنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم۔ "یعنی میں وہی بات کہوں گا جو عیسیٰؑ نے کہی تھی اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا پھر جب تو نے مجھے وفات دیدی تو تو ہی ان پر نگہبان تھا"۔ نبی کریم صلعم کا انہی الفاظ کو استعمال کرنا صاف بتاتا ہے کہ آپؐ کے نزدیک حضرت عیسیٰ کی امت بھی حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے بعد بگڑی۔ اور اسی طرح آپ کی امت آپ کی وفات کے بعد بگڑے گی۔ اس قطعیۃ الدلالت آیت اور اس حدیث صریح کے ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ کی وفات کا انکار کرنا نصوص صریح کو رد کرنا ہے اور توفیتنی کے معنی سوائے وفات کے کچھ اور کرنا لغت کے خلاف ہے اور بخاریؒ نے ابن عباسؓ کے اثر متوفیك ممیتك کو یہاں بیان کرکے بتایا ہے کہ توفیتنی کے معنی سوائے وفات دینے کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔

ع۸۹۸ یہاں حضرت عیسیٰؑ شرک کی معافی کے لیے سفارش نہیں کرتے، بلکہ چونکہ یہ کلام عالم برزخ کا ہے جو نزول قرآن سے پہلے ہو چکا، اس لیے تغفر لھم سے مراد ان کی حفاظت کر دینا ہے اور وہ حفاظت بذریعہ رسول کے ہے جو صحیح پیغام پہنچا کر ان کو ان کی غلطی پر متنبہ کرتا ہے۔ اسی لیے آخری الفاظ انت الغفور الرحیم نہیں حالانکہ معافی کی سفارش ہوتی تو یہی ہونے چاہیئے تھے، بلکہ انت العزیز الحکیم ہیں۔ جو حضرت ابراہیمؑ نے بھی اس موقعہ پر بولے ہیں۔ جہاں ایک رسول کی بعثت کے لیے دعا کی ہے۔ ربنا وابعث فیھم رسولا منھم .... انك انت العزیز الحکیم (البقرۃ ۲ ۔ ۱۲۹)۔ اور عزت یا غلبہ اور حکمت کی صفات کا ذکر ایسے ہی موقعہ پر موزوں ہے جہاں اصلاح کر دی جائے۔ یہی معنی سدی سے مروی ہیں ان تغفر لھم فتخرجھم من النصرانیۃ وتھدیھم الی الاسلام (ج) یعنی تغفر لھم سے مراد یہ ہے کہ ان کو نصرانیت سے نکال کر اسلام کی ہدایت فرمائے۔

ع۸۹۹ یوم سے مراد وہ یوم ہے جو اس حیات دنیا کے بعد شروع ہوتا ہے اور ینفع الصادقین صدقھم کے معنی اسی طرح پر ہیں جس طرح لیسئل الصادقین عن صدقھم (الاحزاب ۳۳ ۔ ۸) میں یعنی کہ جس نے زبان سے سچائی کا اقرار کیا ہے اس کے فعل کے صدق کا سوال کرے۔ کیونکہ اعتراف حق کافی نہیں۔ جب تک کہ اس پر افعال صادقہ کی مہر نہ ہو (غ) صدق کے معنی میں دونوں باتیں شامل ہیں، زبان سے سچ بولنا اور افعال سے سچ کر دکھانا۔ پس یہاں یہ بتایا ہے کہ اس زندگی کے بعد یا اس اُخروی زندگی میں انسان کو نفع پہنچانے والی دو چیزیں ہیں، ایک سچائی کا مان لینا، دوسرا اس پر عمل کرنا۔ تو وہ لوگ جنہوں نے سچائی کو قبول ہی نہ کیا وہ کیا نفع اٹھا سکتے ہیں۔

ع۹۰۰ سورت کے آخری الفاظ میں اپنی وسعت سلطنت پر فخر کرنے والی قوم کو بتایا ہے کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ کی ہی ہے انسانوں کا تصرف عارضی ہے حقیقی مالک ایک ہی ہے جو ہمیشہ رہے گا۔ ابن جریر میں ہے کہ مخاطب نصاریٰ ہیں۔

سُوۡرَۃُ الۡاَنۡعَامِ مَکِّیَّۃٌ (۶)

اٰیَاتُھَا ۱۶۵ — رُکُوۡعَاتُھَا ۲۰

نام - اس سورت کا نام الانعام ہے جس کے معنی چارپائے ہیں اور اس میں بیس رکوع اور ایک سو چھیاسٹھ آیات ہیں۔ سورت کا اصل مضمون توحید الٰہی کا بیان کرنا ہے اسی تعلق میں ان مشرکانہ رسوم کا ذکر آتا ہے جو چارپایوں کے متعلق عرب میں مروج تھیں یعنی بعض قسم کے اونٹوں، بکریوں وغیرہ کی عزّت و احترام جو شرک کی حد تک پہنچی ہوئی تھی ان کو سانڈھ کے طور پر چھوڑ دیتے تھے نہ ان پر کوئی سواری کر سکتا تھا نہ ان کو ذبح کیا جا سکتا تھا، نہ ان پر چرنے کے متعلق کوئی حد بندی عاید ہو سکتی تھی۔ اسی طرح کی اور بھی رسوم تھیں اسلام کی اصل غرض نہ صرف توحید کا وعظ تھا کہ چند بڑے بڑے عالی دماغ لوگ خوش ہو جائیں اور ان کے لیے ایک بلند خیالات کی دعوت کا سامان مل جائے بلکہ عوام الناس کی زندگی پر توحید کا عملی طور پر اثر ڈالنا اس کے مدّنظر تھا۔ ان کے رسوم و رواج سے شرک سے تعلق رکھنے والی ہر بات کی بیخکنی کرنا اصل مقصود تھا۔ اس لیے توحید کو جس صورت میں بیان کیا اس کا نام ایسا تجویز کیا جس کا تعلق ہر فرد بشر کے گھر سے تھا اور ان رسوم سے تھا جو ہر گھر میں صدیوں سے گھر کی زندگی کا حصّہ بنی ہوئی چلی آتی تھیں۔ یہ خیالی بات نہیں بلکہ حقیقت یہی ہے کہ توحید قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان رسوم کی بیخکنی نہ ہو جو شرک کے رنگ میں ہر گھر اور ہر انسان کی زندگی کا عملی طور پر جزو بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ملک ہندوستان کو لے لو۔ یہاں بُت پرستی اور زنگارنگ کی مِن دُونِ اللّٰہ پرستشیں ایک طرف رکھو اور گائے کی مشرکانہ عظمت کو دوسری طرف رکھو، ایک شخص کے لیے ان تمام قسم کی پرستشوں کو دور کرنا آسان ہے مگر گائے کی مشرکانہ عظمت کو جس کا تعلق ہر ہندو کے گھر سے اور ہر ہندو کی عملی زندگی سے ہے کوئی شخص دُور نہیں کر سکتا، سوائے اس کے جو توحید کامل کا زبردست معلم ہو۔ سوامی دیانند جی کے لیے یہ آسان امر تھا کہ ایک سطحی توحید کی تعلیم انہوں نے ہندوؤں کو دی اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو بُت پرستی سے چھڑایا مگر گائے کی مشرکانہ عظمت کو وہ دُور نہ کر سکے اور نتیجہ یہ ہُوا کہ حقیقی توحید سے یہ قوم اسی طرح دور پڑی ہوئی ہے۔ قرآن کریم کا اور رسول اللہ صلعم کا یہ کمال تھا کہ نہ صرف عملی طور پر خطرناک سے خطرناک بت پرستی کو دور کر کے توحید الٰہی کو قائم کیا۔ بلکہ شرک کی جڑوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اور اپنی اصلاح کو مکمل نہ سمجھا جب تک کہ مشرکانہ رسوم کی بیخکنی نہ کر دی۔

خلاصۂ مضمون - سورت کا اصل مضمون توحید الٰہی ہے اور اول سے آخر تک اسی ایک مضمون پر زور دیا ہے، ہاں ضمناً کہیں رسالت کا ذکر اس تعلّق سے آتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہی یہ توحید قائم ہوئی تھی۔ اور اسی ضمن میں مکذبین کی انجام کار ناکامی یا مومنین کی تدریجی اور آخری کامیابی کا ذکر بھی آ گیا ہے مگر اصل غرض کو نہیں چھوڑا۔ پہلے رکوع میں شرک فی الذات کی تردید کی یعنی ان لوگوں کے شرک کی جو دو خالق تجویز کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی کچھ ذکر اس پیغام کا اور اس کی تکذیب کرنیوالوں کا کیا جو توحید کو قائم کرنے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا، دوسرے رکوع میں شرک فی العبادت کی تردید کی، تیسرے میں بتایا کہ شرک ایک ایسی چیز ہے کہ مشرکوں پر بھی ایک وقت آئے گا کہ وہ خود شرک سے بیزاری کا اظہار کریں گے۔ اس میں فطرت انسانی کی شہادت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، چوتھے میں مکذبین کے انجام کا، پانچویں میں عذاب استیصال کا ذکر ہے، چھٹے میں توحید کے ماننے والوں پر انعام و احسان کا ذکر ہے، ساتویں اور آٹھویں میں محاسبہ اعمال اور اس کی غرض کو بیان کیا، نویں میں بتایا کہ اس مذہب توحید پر حضرت ابراہیم ابوالانبیاء بھی قائم تھے، اور ان کی اپنی قوم سے بحث کا ذکر کیا۔ دسویں میں بتایا کہ سب انبیاء کا مذہب توحید ہی تھا، گیارہویں میں آنحضرت صلعم کی وحی کا ذکر فرمایا۔ بارھویں میں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا ذکر کر کے توحید پر دلیل دی ہے اور ساتھ ہی حق کی تدریجی کامیابی کا ذکر کیا۔ تیرھویں میں شرک کے مختلف پہلوؤں کا ابطال کیا اور اللہ تعالیٰ کا بی بی اور بیٹے سے پاک ہونا بیان کیا۔ چودھویں میں پھر مشرکین کی مخالفت، اور پندرھویں میں منصوبہ بازوں کے انجام کا ذکر کیا۔ سولھویں اور سترھویں میں شرک اور مشرکانہ رسوم کا ابطال کیا۔ اٹھارہویں میں ممنوع غذاؤں اور مشرکین کے باطل عذروں کا ذکر کیا، انیسویں میں توحید کے عملی پہلو کو بیان کیا کہ غرض صرف ایک اقرار نہیں صرف مشرکانہ رسوم کا ترک کر دینا نہیں۔ بلکہ صحیح اصول زندگی پر عمل پیرا ہونا توحید کا اصل مقصد ہے، مال و جان کی حفاظت کے اصول بتائے اور بیسویں میں بتایا کہ توحید کامل کو علمی رنگ میں قرآن کریم نے پیش کیا ہے تو اس کا عملی نمونہ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم ہیں اور اسی بلند مقام پر پہنچنے کے لیے ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہیئے اور سورت کا خاتمہ اگر ایک طرف ابطال کفارہ پر کیا تو دوسری طرف آخری الفاظ میں یہ خوش خبری بھی سنائی کہ جب تم توحید کے ان صحیح اصول پر قائم ہو جاؤ تو ہم تمہیں زمین میں بادشاہ بھی بنا دیں گے کیونکہ مخلوق کا خیر خواہ گروہ ہی ان پر حکومت کا اہل ہے اور ساتھ ہی ڈرایا بھی کہ اگر تم نے ان اصول کو ترک کر دیا تو وہ بادشاہت تم سے لے بھی لی جائے گی۔

ترتیب قرآنی میں الانعام کا مقام: یہ سورت نزول میں پہلی چار سورتوں سے بہت پہلے کی ہے اور مکّی ہے۔ مگر ترتیب میں اس کو بعد میں رکھا ہے حالانکہ اس کا مضمون جو توحید ہے چاہیئے تھا کہ اس کو ابتدا میں رکھا جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ توحید کو قرآن کریم نے بنیاد ٹھہرایا ہے اس لیے قرآن شریف کی ابتدا الحمد للہ رب العلمین سے ہوتی ہے۔ پھر سورۃ بقرہ کی ابتدا بھی ایمان بالغیب سے ہوتی ہے۔ پھر سب سے پہلا حکم جو قرآن شریف میں ہے وہ بھی یایّھا النّاس اعبدوا ربکم اور فلا تجعلوا للہ اندادا ہی ہے۔ پھر سورۃ آل عمران کی ابتدا بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سے ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ مسئلہ توحید ایک علمی مسئلہ ہے اس لیے مسلمانوں کی تعلیم میں ابتدا ایک ایسی سورت سے کی جس میں ان کی فلاح و بہبودی کے طریق ان کو سمجھائے یعنی سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران اسی مضمون کی تکمیل کرتی ہے اور ساتھ ساتھ دونوں میں یہود اور نصاریٰ کے عقاید باطلہ کی بھی تردید کی ہے۔ پھر سورۃ النساء میں معاشرت کے اصول کو بیان کیا۔ اور سورۃ مائدہ میں تمدن کے اور اس ساری عملی تعلیم کے بعد توحید کے مضمون کو بیان کیا تاکہ مسلمان سمجھ لیں کہ ان کی مقدم ضروریات کیا ہیں۔

مائدہ سے تعلق: اور سورۃ مائدہ جس کے بعد یہ رکھی گئی ہے اس سے بھی اس کا خاص تعلق ہے کیونکہ اس سورت میں عقود کے ایفاء کی طرف توجہ دلائی تھی تو سب سے بڑا عقد اللہ تعالیٰ کی توحید کو ماننا ہے اس کا ذکر بالتفصیل بیان کیا۔ بلکہ سورۃ مائدہ کے آخر کا تعلق بھی الانعام سے خصوصیت سے ہے کیونکہ اس سورت کے آخر میں عیسائی عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید کی، جو ایک عظیم الشان شرک تھا۔ تو اب شرک کے تمام دوسرے پہلوؤں کا ذکر کر کے توحید کے مضمون کو کمال تک پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ سورت توحید پر ہے اس میں عیسائی عقیدہ کا ذکر بالتفصیل نہیں کیا۔ بلکہ نہایت مختصر الفاظ پر بس کی ہے۔ انی یکون لہ ولد ولم تکن لہٗ صاحبۃ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۵ؕ
ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ①
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰٓى

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنیوالے کے نام سے۔
سب تعریف اللہ کے لیے ہے، جس نے آسمانوں اور زمین
کو پیدا کیا اور اندھیرا اور روشنی بنائے، پھر بھی جو کافر ہیں
اپنے رب کے ساتھ (دوسروں کو) برابر ٹھیراتے ہیں ع۹۰۱
وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا - پھر ایک میعاد

تاریخ نزول: اس پر اتفاق ہے کہ یہ سورت مکّہ میں نازل ہوئی۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ سورت ساری کی ساری ایک رات میں مکّہ میں نازل ہوئی۔ دیگر روایات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورت سب کی سب ایک ہی مرتبہ مکّہ میں نازل ہوئی۔ اور اس کی دو یا تین آیات کو جو بعض لوگوں نے مدنی کہا ہے تو یہ غلط فہمی ہے۔ یہود کا ذکر یا بعض تفصیلات شریعت کا مکّہ میں نازل ہونا ایک مسلّم امر ہے۔ غذاؤں کی حلّت وحرمت کا حکم سورۃ نحل میں بھی موجود ہے۔ حالانکہ وہ بھی بالاتفاق مکّی ہے اور سورۃ انعام سورۃ النحل کے بعد کی ہے۔ اس لیے کہ اس سورت میں سورۃ نحل کے حکم حلت وحرمت غذا کا حوالہ موجود ہے قل لا اجد فی ما اوحی الیّ محرما (۱۴۶) قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کی مکّی زندگی کے آخری سال میں یہ سورت نازل ہوئی۔ ایک اتنی بڑی سورت کا یکمرتبہ نازل ہونا اور اس کا آنحضرت صلعم کو یاد رہ جانا قرآن کریم کے عظیم الشان اعجازوں میں سے ایک اعجاز ہے۔ بعض لوگوں کی قوتِ حافظہ بیشک بڑی زبردست ہوتی ہے بعض اشعار کو ایک ہی دفعہ سُن کر یاد کر لیتے ہیں بعض قصص کو ایک ہی دفعہ سن کر دہرا سکتے ہیں لیکن یہ سورت نہ تو اشعار میں سے ہے نہ ہی اس میں کوئی قصص ہیں، یہ چیزیں حافظہ کے معاون ہو جاتی ہیں بلکہ اس میں توحید کا علمی اور بظاہر خشک مضمون ہے جس میں بظاہر کوئی ربط نہیں پھر یہ کوئی قصّہ اور کہانی نہیں کہ دو چار لفظ ادھر ادھر ہو جائیں تو مضائقہ نہیں یا شعر نہیں کہ ایک لفظ کی جگہ دوسرے موزوں لفظ سے پُر ہو جائے تو ہرج نہیں۔ اس کی ایک زیر زبر میں فرق نہیں ہو سکتا ایک حرف کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اور پھر نزول کے ساتھ یہ لکھ بھی لی جاتی ہے اور اس لکھی ہوئی سے دوسرے لوگ اس کو یاد کرتے ہیں۔ حالانکہ نبی کریم صلعم لکھے ہوئے کو پڑھ نہیں سکتے۔ پھر آپ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے نمازوں میں پڑھیں۔ ان حالات کے اندر کس قدر سخت حفاظت ہر زیر و زبر کی ہر حرف کی بکار ہے اور یہ سب حفاظت آپ اس حالت میں کرتے ہیں کہ ایک ہی دفعہ آپ نے بیس رکوع اور ۱۶۶ آیات کی اتنی لمبی سورت کو فرشتے کے منہ سے سُنا ہے۔ یہ وہ اعجاز تھا جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے سنقرئك فلا تنسٰی (الاعلٰی: ۶) یعنی ہمارے پڑھانے کا نشان یہ ہے کہ تم اسے کبھی بھولو گے نہیں۔ کتنا بڑا دعویٰ ہے اور اس کا پورا ہونا جس پر تاریخ شاہد ہے کتنا بڑا اعجاز ہے اور یہ جو اس آیت میں آتا ہے سنقرئك فلا تنسٰی الّا ماشاء اللّٰہ تو بعض لوگوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ قرآن شریف بھول بھی جایا کرتے تھے نعوذ باللّٰہ من ذالك اس طرح تو آیت کا مطلب ہی خبط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پھر آیت کا یہ مطلب ہوا کہ ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہیں بھولے گا مگر جو اللہ چاہے بھول جایا کرے گا۔ تو نہ بھولنا ایک بے معنی بات ہوئی۔ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں تو یہاں الّا استثنائے منقطع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو ہم پڑھائیں گے وہ تو ہرگز نہیں بھولے گا مگر یہ اس لیے نہیں کہ تمہارا حافظہ اس قدر زبردست ہے کہ تم کبھی کوئی چیز بھولتے ہی نہیں بلکہ اور باتوں میں جو اللہ چاہے بھول بھی جاتے ہو لیکن جو بات وحی سے تم کو پہنچائی جاتی ہے وہ نہیں بھولتے اور یہی درحقیقت اللہ تعالیٰ کے پڑھانے میں اعجاز ہے کہ ایک انسان جو اور باتیں بھول بھی جاتا ہے وحی الٰہی کا ایک لفظ تک نہیں بھولتا اور پھر اس اعجاز کا کمال اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف اتنی اتنی لمبی سورتیں یکمرتبہ نازل ہوتی ہیں تو دوسری طرف کسی سورت کی کوئی آیت کسی وقت نازل ہوتی ہے۔ اور ان ٹکڑوں کو آپ اسی طرح لکھوا دیتے ہیں اور ساتھ ہی حافظوں کو اس ترتیب سے یاد کرا دیتے ہیں۔ لیکن کمال یہ ہے کہ آپ کے پڑھنے میں نہ کبھی کسی لفظ میں کمی بیشی ہوتی ہے اور نہ ترتیب وحی میں ہی تغیر واقع ہوتا ہے۔ حالانکہ اس ترتیب سے لکھا ہُوا قرآن بھی کوئی موجود نہیں۔ یہ بات بجائے خود نبی کریم صلعم کا اتنا بڑا معجزہ ہے کہ جس کی نظیر دوسرے انبیاء میں کوئی نہیں ملتی۔

ع۹۰۱ یعدلون۔ عَدْل کے معنی کے لیے دیکھو ع۷۹۶ اور بربھم یعدلون میں مراد ہے اس کا عدیل یعنی برابر یا شریک دوسرے کو ٹھہراتے ہیں اور عدل عن الحق کے معنی آتے ہیں جار یعنی ظلم کیا (غ)

اس سورت کی اصل غرض توحید الٰہی کو بیان کرنا ہے۔ اس لیے پہلی آیت میں ہی سب سے موٹی قسم کے شرک یعنی شرک فی الذات کی تردید کی ہے اور وہ شرک ثنویہ کا ہے یعنی جو لوگ دو خدا مانتے ہیں، ایک خالق خیر اور ایک خالق شر یا ایک نور کا بنانیوالا اور ایک ظلمت کا۔ یہ عقیدہ آتش پرستوں میں پایا جاتا ہے اسلام نے شر یا بدی کا کوئی مستقل وجود نہیں مانا بلکہ بدی چونکہ محض ان قویٰ کے غلط استعمال کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں اس لیے خالق ایک ہی ہے یہی وجہ ہے کہ آسمان اور زمین کے ساتھ خلق کا لفظ لگایا اور ظلمت اور نور کے ساتھ جعل کیونکہ جو چیزیں اچھے استعمال کے لیے پیدا کی گئی ہیں انہی کے بُرے استعمال کا نام بدی ہے۔ ہاں جعل کا فاعل اللہ ہے کیوں کہ مسبب الاسباب وہی ہے۔ شر کا خالق الگ ماننے میں یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ شر یعنی بدی کا مقابلہ کر کے انسان اس پر غالب نہیں آسکتا۔ بلکہ ضرور ہے کہ انسان اس میں ہمیشہ کے لیے ملوث رہے۔ برخلاف اس کے اسلامی توحید کی رو سے بدی کوئی ایسی چیز نہیں جس پر انسان غالب نہ آسکے بلکہ انسان کی ساری جد وجہد کی اصل غرض یہی ہے اور یہی اس کا نصب العین ہونا چاہیئے کہ بدی پر غالب آئے اور ان لوگوں کے نمونے ہمارے سامنے پیش کیے گئے ہیں جو بدی پر غالب آئے اور جنہوں نے شیطان کو بھی اپنا فرمانبردار بنا لیا۔

أَجَلًا ۖ وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِندَهُ ۖ ثُمَّ أَنتُمْ تَمْتَرُونَ ۝٢

ٹھیرا دی اور ایک (اور) میعاد اس کے ہاں معین ہے پھر بھی تم جھگڑتے ہو۔ ع۹۰۲

وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ ۖ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ ۝٣

اور آسمانوں اور زمین میں وہی اللہ ہے وہ تمہاری چھپی اور ظاہر (باتیں) جانتا ہے اور وہ جانتا ہے جو تم کماتے ہو ع۹۰۳

وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝٤

اور کوئی پیغام اپنے رب کے پیغاموں میں سے ان کے پاس نہیں آتا مگر وہ اس سے منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں ع۹۰۴

فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝٥

سو انھوں نے حق کو جھٹلا دیا جب وہ اُن کے پاس آیا سو اُن کے پاس (کے وقوع) کی خبریں آئیں گی جس پر وہ ہنسی کرتے تھے۔ ع۹۰۵

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّن لَّكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِم مِّدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ۝٦

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ کس قدر اُن سے پہلے ہم نے نسلیں ہلاک کر دیں، جن کو ہم نے زمین میں وہ طاقت دی تھی، جو طاقت تم کو نہیں دی اور ہم نے اُن پر زور سے مینہ برساتا ہوا بادل بھیجا اور نہریں بنا دیں جو اُن کے نیچے بہتی تھیں۔ پھر ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا۔ اور ان کے پیچھے دوسری نسل پیدا کر دی ع۹۰۶

ع۹۰۲ معلوم ہوا کہ ہر انسان مٹی سے ہی پیدا ہوتا ہے اس لیے کہ غذائیں جن سے انسان کا قیام ہے وہ مٹی سے ہیں گویا مٹی کا خلاصہ غذائیں ہیں اور غذاؤں کا خلاصہ وہ نطفہ جس سے انسان کی پیدائش ہوتی ہے۔ جب آسمان اور زمین کی پیدائش کا ذکر کیا تو انسان کی پیدائش کا بھی ذکر کیا۔ ایک میعاد ٹھہرانے میں انسان کی زمینی زندگی کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک وقت کے لیے ہے یعنی موت تک، اور اجل مسمّٰی جو اس کے حضور ہے وہ دوسری زندگی کے متعلق ہے یعنی اس کا کھلا ظہور بھی ایک وقت مقرر کے بعد ہوگا یعنی قیامت کے دن۔ اس لیے اسے مسمّٰی یا معین کہا ہے۔ یوں مضمون کا انتقال توحید سے بعث بعد الموت کی طرف کیا گیا ہے۔

ع۹۰۳ پہلی دو آیتوں میں یہ ذکر کر کے کہ خالق ایک ہی ہے اب فرمایا کہ آسمانوں میں اور زمین میں وہی ایک ہی اللہ ہے یعنی دوسرا کوئی اس کی ذات میں شریک نہیں اور اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی کہ اللہ جو ذات باری کا اسم ذات ہے اس میں ویسے بھی کوئی دوسرا شریک نہیں ہوا یعنی یہ نام کبھی کسی دوسرے معبود پر نہیں بولا گیا۔ حالانکہ اور ناموں میں لوگوں نے اشتراک کر لیا ہے، اور پھر اس کی قدرت کا ذکر کر کے جو خلق میں نمودار ہوئی جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوا اس کے علم کا ذکر کرتا ہے، اور ساتھ ہی چھپی اور ظاہر باتوں میں اور کمانے میں یہ اشارہ ہے کہ تمہارے اعمال سے ہی دوسری زندگی پیدا ہوتی ہے۔

ع۹۰۴ اس راز کو کہ اعمال سے دوسری زندگی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی وحی نے ہی انسان پر ظاہر کیا اور حالانکہ یہ بات انسان کی بھلائی کے لیے بتائی تھی، مگر لوگ ہمیشہ ہی ایسے پیغام کو سُن کر منہ پھیر لیتے رہے ہیں۔

ع۹۰۵ جس سے وہ استہزا کرتے تھے۔ وہ عذاب تھا جس سے ان کو ڈرایا جاتا تھا۔ اس کی خبریں آنے سے مراد خود اس عذاب کا آنا ہے۔ دوسری جگہ ہے ولتعلمنّ نباہ بعد حین (صٓ ۳۸ - ۸۸) یہاں بھی مراد وقوع ہی ہے۔

ع۹۰۶ قرن۔ قَرْن یا اقتران کے معنی ہیں دو یا زیادہ چیزوں کا اجتماع کسی رنگ میں، اس لیے قرن (جمع قرون) وہ لوگ ہیں جو ایک زمانہ میں جمع ہوں یعنی ایک نسل (غ) مکنا ھم۔ نمکن لکم۔ صلہ لام کے ساتھ اور بغیر صلہ کے دونوں طرح آتا ہے اور اس کا اصل مکان (یا مَکُن) سے ہے، اور مکّنہ کے معنی ہیں اس کو مکان یعنی ثبات اور قرار دیا یا مضبوطی اور قوت دی، اور مکّن لہ کے معنی بھی یہی کیے گئے ہیں اور یہ بھی کہ ان کو اسباب تصرّف اور نعمتیں وغیرہ دیں، جیسے کذالک مکنّا لیوسف (یوسف ۱۲-۲۱) مدرارا اس کا اصل دَرّ ہے جو دودھ یا آنسوؤں کے کثرت سے بہنے پر بولا جاتا ہے اور مطلق دودھ کو بھی کہتے ہیں (ل) اور استعارۃً بارش کی کثرت پر بولا جاتا ہے اور دَرّ اچھے یا بُرے عمل کو بھی کہا جاتا ہے جس سے للہ دَرُّك عام محاورہ ہے جو مدح اور ذم دونوں موقعوں پر بولا جاتا ہے (ا)

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۷)

اور اگر ہم تجھ پر کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب اتارتے پھر وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھوتے تو جو کافر ہیں وہ یہی کہتے کہ یہ صرف کھلا جادو ہے ع۹۰۷

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ (۸)

اور کہتے ہیں اس پر فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا اور اگر ہم فرشتہ اتاریں تو معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے گا، پھر ان کو ڈھیل نہ دی جائے گی ع۹۰۸

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ (۹)

اور اگر ہم اسے فرشتہ بناتے تو ہم اس کو ضرور انسان بناتے اور ان پر وہی اشتباہ ڈالتے، جو اشتباہ وہ اب ڈال رہے ہیں ع۹۰۹

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۱۰) ع

اور یقیناً تجھ سے پہلے رسولوں کے ساتھ ہنسی کی گئی، سو جو لوگ اُن میں سے ہنسی کرتے تھے ان کو اسی نے آگھیرا جس کے ساتھ وہ ہنسی کرتے تھے۔ ع۹۱۰

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۱۱)

کہہ زمین میں پھرو، پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہُوا۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ

کہہ، کس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے - کہہ، اللہ کا۔ اس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے وہ تم کو ضرور قیامت کے دن کے لیے جمع کر دیگا اس میں کوئی شک نہیں

پہلی نسلوں کی ہلاکت کا ذکر ان کی عبرت کے لیے کیا ہے، جن لوگوں کو دنیوی آسائشوں کا حصہ زیادہ مل جاتا ہے وہ آخرت کی طرف سے غافل ہو جاتے ہیں اور اس کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہلاک ہو جاتے ہیں اور کوئی دوسری قوم ان کی جگہ کھڑی ہو جاتی ہے۔

ع۹۰۷ روحانیت سے بے بہرہ لوگ امور روحانی کو بھی جسمانی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے چاہتے ہیں کہ کتاب لکھی لکھائی اوپر سے آئے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور اس لیے اس کا کلام قلب پر نازل ہوتا ہے اگر لکھا لکھایا کلام اوپر سے نازل ہوتا تو قلب انسانی سے اس کا کچھ تعلق نہ ہوتا اور نہ دلوں کے اندر اس سے انقلاب پیدا ہوتا اور جو اصل غرض اس کلام کے آنے کی تھی وہی مفقود ہو جاتی۔ اور یہ جو فرمایا کہ اگر ہم اس طرح بھی اتاریں تو اسے سحر کہیں گے۔ تو یہ صرف فرض کر لینے کے طور پر نہیں بلکہ آخر کار اسی قرآن کو اللہ تعالیٰ نے کتابا فی قرطاس بھی بنا دیا مگر پھر بھی نہ مانا۔

ع۹۰۸ یہ دوسرا اعتراض بھی روحانیت سے بے بہرہ لوگوں کا ہے۔ وہ جس طرح کلام الٰہی کو جسمانی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں اسی طرح فرشتوں کو بھی۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ فرشتے تو سزا دینے کے لیے ہوں گے، جب انسان نیکی کے محرک ملائکہ کی بات کو قبول نہیں کرتا تو پھر لازماً دوسری قسم کے ملائکہ یعنی سزا دینے والے اس کے لیے آتے ہیں۔

ع۹۰۹ یلبسون۔ لَبْسٌ کے معنی ڈھانکنا جس سے لباس ہے لبس امر سے مراد اس کا مشتبہ کر دینا ہے (رغ)
کبھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بشر کیوں رسول ہُوا۔ فرشتہ کو خدا رسول بنا کر بھیجتا تا یقین آ جاتا۔ جواب دیا ہے کہ فرشتہ بھی انسانوں کی طرف رسول بن کر آتا تو انسان کی صورت میں ہی آتا۔ کیونکہ رسول کا تو بڑا کام یہ ہے کہ نمونہ بن کر دکھائے۔ اور انسان کے لیے انسان ہی نمونہ کا کام دے سکتا ہے۔ علاوہ ازیں فرشتہ تو غیر مرئی ہستی ہے جب تک وہ تجسّم اختیار نہ کرے انسان اس کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اور جب ملک مجسّم ہو کر آتا تو پھر اعتراض ویسے کا ویسا ہی رہتا۔

ع۹۱۰ حاق کے معنی زجاج نے احاطہ کیے ہیں یعنی گھیر لیا، اور بعض نے اس کے معنی لیے ہیں عاد علیہ وبال امرہ اس کے امر کا وبال اس پر لوٹ کر آیا۔ راغبؒ نے لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک اس کا اصل حقّ ہے۔
جب رسول بدی کے بدنتائج سے ڈراتا ہے تو بدکردار لوگ طاقت کے نشہ میں اس پر ہنسی کرتے ہیں مگر وہ بدنتائج آخر کار آگھیرتے ہیں۔

خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

جنھوں نے اپنے آپ کو نقصان میں ڈالا وہ ایمان نہیں لاتے ع۹۱۱

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾

اور اسی کا ہے جو کچھ رات اور دن میں بستا ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے ع۹۱۲

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾

کہہ، کیا میں اللہ کے سوا دوست بناؤں، جو آسمانوں اور زمین کی ابتدا کرنے والا ہے ع۹۱۳ اور وہ کھانے کو دیتا ہے اور اسے کھانے کو نہیں دیا جاتا کہہ، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں (ان میں) سب سے پہلا بنوں جو فرمانبردار ہوئے اور تو ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو۔ ع۹۱۳

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

کہہ، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں، تو ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ع۹۱۴

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

جس سے وہ (عذاب) آج پھیر دیا جائے تو اس پر اس نے رحم کیا اور یہ کھلی کامیابی ہے ع۹۱۵

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ

اور اگر اللہ تجھے کوئی ضرر پہنچائے تو سوائے اس کے کوئی اس

ع۹۱۱ اس رکوع میں یہ بتایا کہ عبادت اور اطاعت صرف اللہ کے لیے ہی ہے کیونکہ وہی سب کا مالک ہے اور سب پر رحم کرتا ہے۔
اللہ کی رحمت کی وسعت: کتب علیٰ نفسہ الرحمۃ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت بے پایاں کا ذکر کیا ہے، اور دوسری جگہ فرمایا ورحمتی وسعت کل شیئ (الاعراف۔ ۱۵۶) اور حدیث میں ہے ان رحمتی سبقت غضبی میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی، اور یوں اپنے بندوں کو تسلی دی ہے، اور عیسائیوں کے اس عقیدہ کی بھی تردید کی ہے کہ خدا میں عدل ہے رحم نہیں، بتایا ہے کہ رحم تو اس قدر غالب ہے کہ اسکو اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے، اس کا رحم بے پایاں جس طرح جسمانی دنیا میں کام کر رہا ہے اسی طرح عالم روحانی میں کام کرتا ہے، اور یہ جو اس کے بعد فرمایا کہ تمہیں قیامت کے دن کے لیے جمع کریگا تو اس میں گویا اسی رحمت کی وسعت کا ہی ذکر ہے کیونکہ اس رحمت کا عظیم الشان ظہور اسی عالم میں ہوگا، اور جنھوں نے اچھے کام کیے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ اپنے انعامات سے مالا مال کریگا بلکہ بتا دیا کہ سب پر ہی رحمت ہوگی۔ ہاں جنھوں نے خدا کی رحمت کے سامانوں سے اس دنیا میں فائدہ نہیں اٹھایا وہ کچھ نقصان بھی اٹھائیں گے مگر آخر کار ان پر بھی رحمت ہوگی۔ رحمت کے غضب پر سبقت لے جانے کے کچھ معنی نہیں اگر یہ مانا جائے کہ کوئی حصّہ بلکہ کثیر حصّہ اور بڑا حصّہ مخلوق کا ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہے گا اور عذاب جہنم سے کبھی بھی نجات نہ پائے گا۔

ع۹۱۲ سکون کے مقابل پر تحرک ہے یعنی حرکت کرنا، اور رات کے مقابل پر دن، اور سکون کے لیے رات ہی زیادہ موزوں ہے اور مقابل کے لفظ کا ذکر نہیں کیا۔ جیسا کہ اکثر اضداد میں سے ایک کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ جس طرح مکان کے لحاظ سے سب کچھ اُسی کا ہے اسی طرح زمانہ کے لحاظ سے بھی سب کچھ اسی کا ہے اور عبادت اسی کی ہوسکتی ہے جو سب کا مالک ہے۔

ع۹۱۳ فاطر۔ فَطْر کے معنی شق یعنی پھاڑنا ہیں۔ اور اس کی جمع فُطُور ہے ھل تریٰ من فطور (ملک ۶۷۔ ۳) اور اللہ کے مخلوق کے فاطر ہونے کے معنی ہیں کہ وہ اس کی ابتدا اور اختراع کرنیوالا اور اسی سے فِطْرۃ ہے (ل) اور فاطر کا لفظ اختیار کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ اس کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ سے ہوئی خواہ ان کی پہلی حالت کیسی بھی ہو۔ اور قرآن شریف میں ہی ہے کانتا رتقا ففتقنٰھما (الانبیاء ۲۱۔ ۳۰) یعنی وہ پہلے ایک غیر ممیز حالت میں تھے پھر اللہ تعالیٰ نے یہ سب اجرام الگ الگ کر دیئے۔ پس جو کچھ بھی پہلی حالت فرض کی جائے اس کا بنانے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

ع۹۱۳ یہاں سب معبودان باطل کا رد کیا ہے۔ رزق کا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے نہ کوئی دوسرا معبود کیونکہ وہی خالق اسباب بھی ہے، اس لیے فرمانبرداری کا حقیقی مستحق وہی ہے نہ کوئی اور۔

ع۹۱۴ آنحضرت صلعم سے یہ لفظ کہلوانا کہ میں بھی اگر نافرمانی کروں تو عذاب سے ڈرتا ہوں، آپ کے پیروؤں کو سمجھانے کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے انھیں کس قدر خائف ہونا چاہیئے۔ اور کسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے صریح احکام کی نافرمانی کی جرأت ان کو نہیں کرنی چاہیئے۔

ع۹۱۵ جس شخص سے عذاب اس دنیا کی زندگی میں ہی پھیر دیا جاتا ہے وہ خدا کی رحمت بے پایاں کے نیچے آجاتا ہے۔ عذاب کا اس دنیا میں پھیر دینا یا دور کر دینا راہ راست کی ہدایت دینا ہے۔ یومئذ سے مراد قیامت کا دن بھی ہوسکتا ہے۔ مگر پہلے معنی کو ترجیح ہے۔

لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ بِخَیۡرٍ فَهُوَ
عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۷﴾
وَ هُوَ الۡقَاهِرُ فَوۡقَ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۸﴾
قُلۡ اَیُّ شَیۡءٍ اَکۡبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۟ۙ
شَهِیۡدٌۢ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ ۟ وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا
الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِهٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّکُمۡ
لَتَشۡهَدُوۡنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخۡرٰی ؕ قُلۡ
وقف لازم باختلاف لَّاۤ اَشۡهَدُ ۚ قُلۡ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیۡ
بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱۹﴾
اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَهٗ کَمَا
وقف لازم یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ۘ اَلَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ
ع ٨ فَهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۰﴾
وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا
اَوۡ کَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۱﴾

کا دُور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تجھے بھلائی پہنچائے، تو وہ
ہر چیز پر قادر ہے ع۹۱۶
اور وہ اپنے بندوں کے اوپر غالب ہے اور وہ حکمت والا خبردار ہے ع۹۱۷
کہہ، کون سی چیز شہادت میں سب سے بڑی ہے۔ کہہ، اللہ
میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے ع۹۱۸ اور یہ قرآن میری طرف وحی
کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اس کے ساتھ ڈراؤں اور اسے جس کو وہ پہنچے ع۹۱۹
کیا تم گواہی دیتے ہو، اللہ کے ساتھ اور معبود ہیں؟ کہہ، میں
گواہی نہیں دیتا۔ کہہ، وہ صرف ایک ہی معبود ہے اور
میں اس سے بری ہوں جو تم شرک کرتے ہو ع۹۲۰
جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اسے پہچانتے ہیں جس طرح اپنے
بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ وہ جو اپنے آپ کو نقصان میں
ڈالتے ہیں، وہی ایمان نہیں لاتے ع۹۲۱
اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے
یا اس کی باتوں کو جھٹلائے۔ ظالم کامیاب نہ ہوں گے ع۹۲۲

ع۹۱۶ کاشف۔ کشف کے اصل معنی ظاہر کردینا ہیں، جیسے کپڑے کا منہ سے اُٹھا دینا۔ اسی سے غم اور تکلیف کے اُٹھا دینے پر بولا جاتا ہے (غ)
یعنی کوئی معبود باطل اس دُکھ کو دور نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے ماتحت ملتا ہے۔ بھلائی پہنچانے کے ذکر کے بعد اس کے دور کرنے کا نام نہیں لیا، بلکہ فرمایا کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے کیونکہ اصل منشائے الٰہی تو اسے خیر پہنچانے کا ہی ہے۔

ع۹۱۷ القاهر۔ قهر کے اصل معنی غلبہ اور دوسرے کو ذلیل کرنا ہیں، اور الگ الگ دونوں معنوں میں بھی اس کا استعمال ہے (غ) اسی سے القاهر اور القهّار اسمائے الٰہی میں سے ہیں جن میں مراد صرف غلبہ ہے اور فاما الیتیم فلا تقهر (الضحٰی ۹۳-۹) میں اور وانّا فوقهم قاهرون (الاعراف-۱۲۷) میں ذلیل کرنا مراد ہے۔

ع۹۱۸ اللہ کی شہادت اس کے فعل سے ادا ہوتی ہے، وہ اسباب دنیا میں پیدا کر دیئے جنھوں نے رسول اللہ صلعم کا حق ہونا ظاہر کر دیا اور یہی سب سے بڑی شہادت ہے جو فعل سے ظاہر ہو۔

ع۹۱۹ فطری روشنی اور اس پر مواخذہ: یہاں قرآن کریم کے ذریعہ سے انذار کیلئے دو گروہوں کا ذکر کیا، ایک وہ جو اس کے براہِ راست مخاطب ہیں اور دوسرے من بلغ یعنی جن کو یہ پہنچے۔ ان الفاظ سے قرآن کریم کے انذار کا دامن سب قوموں اور تمام زمانوں پر قیامت تک پھیلا دیا ہے کیونکہ من بلغ سے باہر کوئی نہیں رہ جاتا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن کو قرآن کریم کی تبلیغ نہ پہنچے وہ اس کو نہ ماننے کی وجہ سے مواخذہ کے نیچے نہیں، بلکہ فطرت انسانی کے خلاف جو کام وہ کریں اس کی وجہ سے مواخذہ کے نیچے ہوں گے۔ گویا ایک تو انسان کی فطرت کی دھیمی روشنی ہے جو طرح طرح کے عوارض کے نیچے دب جاتی ہے، اور ایک قرآن کریم کے آفتاب عالمتاب والی روشنی ہے، اس دوسری روشنی میں نہ چلنے کی وجہ سے گرفت انہی لوگوں پر ہوگی جن کو یہ روشنی پہنچ گئی ورنہ فطری روشنی کے لحاظ سے ہر انسان مواخذہ کے نیچے ہے۔

ع۹۲۰ اس میں اصل غرض کو کھول کر بیان کیا۔ وہ سب چیز کا مالک ہے، سب پر رحم کرنے والا ہے، سب کا خالق ہے وہی سب پر غالب ہے، پس اس کے سوائے دوسرا معبود کسی کو نہ بناؤ۔ پھر یہی وحی الٰہی کی شہادت ہے اور یہی صحیح فطرت انسانی کی شہادت ہے۔

ع۹۲۱ پہلا حصّہ آیت کا وہی ہے جو البقرۃ ۲-۱۴۶ میں آچکا۔ وہ مدنی ہے، اور یہ مکّی۔ گویا جو کچھ مکّہ میں فرمایا وہی مدینہ میں، حالانکہ اس وقت ابھی یہودیوں کی طرف سے مخالفت کا اظہار نہ ہوا تھا۔ لکھا ہے کہ قریش نے یہودیوں سے دریافت کیا تھا کہ آنحضرت صلعم کی نسبت ان کا کیا خیال ہے۔

ع۹۲۲ اللہ پر افترا ان کا یہ تھا کہ خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے۔ اس سورت کے سولہویں رکوع میں نہایت صفائی سے ان کے شرک اور مشرکانہ رسوم کو بار بار افترا علی اللہ کہا ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوٓا أَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٢٢﴾

اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے تب ہم ان کو جنھوں نے شرک کیا کہیں گے وہ تمھارے شریک کہاں ہیں جن کے لیے تم جھوٹے دعوے کرتے تھے ۹۲۳

ثُمَّ لَمْ تَكُن فِتْنَتُهُمْ إِلَّآ أَن قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ﴿٢٣﴾

تب اُن کا فتنہ نہ ہوگا مگر یہ کہ وہ کہیں گے کہ اللہ ہمارے رب کی قسم ہم مشرک نہ تھے ۹۲۴

انظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾

دیکھ کس طرح اپنے اوپر جھوٹ بولتے ہیں اور جو وہ افترا کرتے تھے، اُن سے جاتا رہے گا ۹۲۵

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِيٓ آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوٓا إِنْ هَٰذَآ إِلَّآ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٢٥﴾

اور اُن میں سے وہ ہیں جو تیری طرف کان دھرتے ہیں اور ہم نے اُن کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ اُسے سمجھیں نہیں اور اُن کے کانوں میں بوجھ رہے) اور اگر یہ سارے نشان بھی دیکھ لیں تو اُن پر ایمان نہ لائیں۔ یہاں تک کہ جب تیرے پاس آتے ہیں تجھ سے جھگڑتے ہیں جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں ۹۲۶

---

۹۲۳ شرکاؤکم میں اضافت ادنیٰ ملابست ہے۔ مراد ان کے شریک نہیں بلکہ وہ ہیں جن کو وہ خدا کا شریک بناتے تھے۔
ایک اجتماع تو قیامت کے دن ہوگا، مگر نبی کریم صلعم کی تشریف آوری نے بھی ایک نمونہ قیامت صغریٰ کا دکھا دیا اور اس دنیا میں بھی ان مخالفین پر وہ وقت آگیا کہ جب ان سے سوال کیا گیا کہ وہ تمہارے خدائی کے شریک کہاں ہیں اور کیوں اب تمہاری مدد نہیں کرتے۔

۹۲۴ فتنتھم۔ فتنۃ سے مراد یہاں بعض مفسرین نے شرک لیا ہے، بعض نے جواب یا عذر، اور ان کے عذر کو فتنہ اس لیے قرار دیا کہ وہ جھوٹ ہے، مگر فتنہ کے اصل معنی بلا یا عذاب یا دکھ ہیں۔ اس لیے یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ایک تو یہ وقت ہے کہ مسلمانوں کو توحید کی وجہ سے دُکھ دیتے ہیں، لیکن وہ وقت بھی ان پر آئے گا کہ دکھ دینا تو ایک طرف رہا خود شرک سے اپنی بیزاری ظاہر کریں گے۔ الّا اس صورت میں استثنائے منقطع ہوگا۔
شرک نہ کرنے کا عذر: "ہم مشرک نہ تھے" یا تو جھوٹا عذر ہے اور اگلی آیت میں یہ اشارہ ہے، اور یا اشارہ ان کے اس خیال کی طرف ہے مانعبدھم الّا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ (الزمر ۳۹-۳) یعنی ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ اس ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں، اس صورت میں اگلی آیت میں یہ فرمایا کہ جس بات کا اقرار ان کی فطرتیں کرتی ہیں، جیسا کہ قیامت کے دن وہ بول اُٹھیں گے، اس کے آج خلاف کر رہے ہیں۔ دوسری جگہ بھی جہاں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کا نقشہ کھینچا ہے یہی دکھایا ہے کہ جب دکھ اور مصیبتیں انتہا کو پہنچ جاتی ہیں تب صرف خدا کو پکارتے ہیں۔ یوں بار بار اس فطرت کی شہادت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کی گواہی انسان کو اس دنیا میں بھی مل جاتی ہے۔ مگر پھر وہ جھوٹ بولتا ہے یعنی اپنی فطرت کی شہادت کے خلاف عمل کرتا ہے۔

۹۲۵ اپنے آپ پر جھوٹ بولنے میں ان کے اس دنیا میں عمل کی طرف اشارہ ہے کہ فطرت کی شہادت کچھ ہے لیکن یہ اپنے ہی خلاف جھوٹ بول کر کبھی تقرب کا عذر کرکے اور کبھی کچھ کہہ کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں اور یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن انکار شرک کرکے اپنے ہی خلاف جھوٹ بولتے ہیں۔

۹۲۶ یستمع۔ استماع کے معنی اصغاء ہیں (غ) یعنی مائل ہونا اور مراد کانوں کا مائل کرنا ہے یعنی کان لگانا۔
یفقھوہ۔ فِقہ اس علم سے جو موجود ہو علم غائب کی طرف پہنچتا ہے، اس لیے یہ عِلم سے زیادہ خاص ہے لا یکادون یفقھون حدیثا (النسآء ۴-۷۸) اور تَفَقَّہَ معنی ہیں فقاہت کو طلب کیا۔ اور اس سے مخصوص ہوا لیتفقھوا فی الدین (التوبۃ ۹-۱۲۲)، اور فِقہ احکام شریعت کا علم ہے (غ)
وقرا۔ وقر کان کے بوجھ کو کہتے ہیں، گدھے اور خچر کے بوجھ کو بھی وِقر کہا جاتا ہے، اور وَقار سکون اور علم کو کہتے ہیں (غ)
اساطیر۔ اُسطورۃ کی جمع ہے، اور یہ سَطر سے ہے جس کے معنی لکھنا ہیں۔ ن والقلم و ما یسطرون (القلم ۶۸-۱) وکتاب مسطور (الطور ۵۲-۲) کان ذٰلک فی الکتاب مسطورا (الاحزاب ۳۳-۶)۔ اور اساطیر کہنے سے مراد ہے کہ جھوٹ بنا کر خود لکھ لیا ہے۔
اس امر پر کہ اللہ تعالیٰ ابتدا کے طور پر مُہر نہیں لگاتا، یا پردے نہیں ڈالتا مفصّل لکھا جا چکا ہے (دیکھو ۱۸) ایسے الفاظ میں عموماً اس کفر پر اصرار کی حالت کو قرآن کریم بیان کرتا ہے جو کفار خود اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے پیدا کر لیتے ہیں، اور خود اس آیت اور اس سے اگلی آیت کے الفاظ سے یہی ظاہر ہے کیونکہ یہاں اول فرمایا کہ سارے

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَإِنْ يُّهْلِكُوْنَ إِلَّآ أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٦﴾

اور وہ اس سے روکتے ہیں اور خود بھی دُور رہتے ہیں۔ اور وہ صرف اپنے آپ کو ہی ہلاک کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے ۹۲۷

وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧﴾

اور اگر تو دیکھے جب آگ کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے۔ تو کہیں گے کہ اے کاش ہم لوٹائے جائیں اور رب کی باتوں کو نہ جھٹلائیں اور مومنوں میں سے ہوں ۹۲۸

بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٢٨﴾

بلکہ ان کے لیے ظاہر ہو گیا جو پہلے چھپاتے تھے اور اگر لوٹائے جائیں تو پھر وہی کریں جس سے روکے گئے تھے اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں ۹۲۹

وَقَالُوْٓا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿٢٩﴾

اور کہتے ہیں سوائے ہماری دنیا کی زندگی کے اور کچھ نہیں اور ہم نہیں اُٹھائے جائیں گے ۹۳۰

وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ قَالَ أَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۚ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۚ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿٣٠﴾ ع

اور اگر تو دیکھے جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے وہ کہیگا کیا یہ سچ نہیں، کہیں گے ہاں ہمارے رب کی قسم۔ کہے گا تو عذاب چکھو اس لیے کہ تم کفر کرتے تھے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ۚ حَتّٰٓى إِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا

وہ لوگ ضرور گھاٹے میں رہے جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا یہاں تک کہ جب (مقررہ) گھڑی ان پر یکایک آ جائے گی کہیں گے،

نشانِ صداقت بھی دیکھ لیں تو ایمان نہ لائیں، گویا وہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ کفر کو کبھی نہ چھوڑیں گے خواہ کتنا بھی بین ثبوت مل جائے پھر فرمایا کہ جب رسول اللہ صلعم کے پاس آتے ہیں تو ٹھنڈے دل سے باتوں پر غور کرنے کی بجائے جھگڑنے کے لیے آتے ہیں، اور اس سے اگلی آیت میں ہے کہ نہ صرف وہ خود حق سے دور جاتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس سے روکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دلوں پر پردوں کا ڈالا جانا عین قوانین آلٰہیہ کے مطابق ہے۔

۹۲۷ ینئون۔ نائی کے معنی اَعْرَضَ یعنی منہ پھیر لیا یا تباعد یعنی دور ہو گیا ونا بجانبہٖ (بنی اسرائیل ١٧-٨٣) (غ)

۹۲۸ وقفوا۔ وَقَفَ کے معنی ٹھہرانا یا کھڑا کرنا ہیں۔ اسی سے مُوْقِف ٹھہرنے کی جگہ ہے اسی سے وقف کرنا ہے۔

آگ کے سامنے لا کر کھڑا کر دینے سے مراد ہے کہ یقینی طور پر ان کو عذاب آنے کا مشاہدہ ہو جائے گا اور دوزخ سامنے ہو گا۔

۹۲۹ افعال بد کے بدنتائج اور ان کا اخفا و ظہور: پہلی آیت میں بتایا کہ آگ کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو پھر دوبارہ دنیا میں جانے کی خواہش ظاہر کریں گے اور کہیں گے کہ اب ہم خدا کی باتوں کو نہ جھٹلائیں گے۔ یہاں جواب دیا ہے کہ ایسا کہنے میں وہ جھوٹے ہیں اور اس کی وجہ یہ دی ہے کہ کوئی نئی بات تو ہوئی نہیں بل بدالھم ما کانوا یخفون من قبل جو پہلے چھپاتے تھے وہ ظاہر ہو گیا۔ یعنی ان کے افعال بد کے بدنتائج۔ اگر یہ چاہتے تو ان نتائج کو پہلے بھی دیکھ سکتے تھے، کیونکہ سچ یہی ہے کہ بُرے فعل کے بدنتیجہ کو انسان دیکھ سکتا ہے مگر خود ہی اس کی طرف سے آنکھیں بند کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ نتیجہ ایک خطرناک رنگ میں ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ قیامت کے دن ہو گا یا جیسا کہ بعض وقت اس دنیا میں بھی ہوتا ہے، جب بدی اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ اگر عالم دنیا میں دوبارہ جائیں تو پھر وہی کام کریں گے کیونکہ ان کے بد افعال کے نتائج تو پھر اسی رنگ میں ہوں گے جیسے اب ہیں۔ اور ان کے اندر اخفا کا رنگ ہو گا وہ کھلا رنگ نہ ہو گا جس کا ظہور قیامت میں ہوتا ہے اس لیے وہ ان کاموں سے رُکیں گے بھی نہیں۔ اس دنیا میں بھی انسان کی یہی حالت ہے کہ ایک فعل کے بدنتائج کو دیکھتا ہے مگر ذرا ان سے نجات ہوئی پھر اس بدفعل کا ارتکاب کرتا ہے۔

۹۳۰ بدی کی اصل وجہ یہی ہے کہ انسان زندگی بعد الموت کا انکار کرتا ہے۔ ہر ایک بدفعل کا نتیجہ چونکہ اس دنیا میں نہیں ملتا اس لیے وہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بدفعل کر لیا جائے تو کیا ہرج ہے۔ آخرت پر یقین ہی انسان کے اندر اپنے افعال کی ذمہ داری کا پورا پورا احساس پیدا کرتا ہے ان ھي الا حیاتنا الدنیا کہنے سے مراد یہ ہے کہ اپنی زندگی کی غرض کھانے پینے سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتے۔

عَلٰی مَا فَرَّطۡنَا فِیۡهَا ۙ وَ هُمۡ یَحۡمِلُوۡنَ اَوۡزَارَهُمۡ عَلٰی ظُهُوۡرِهِمۡ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوۡنَ ﴿۳۱﴾ وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهۡوٌ ؕ وَ لَلدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۳۲﴾ قَدۡ نَعۡلَمُ اِنَّهٗ لَیَحۡزُنُكَ الَّذِیۡ یَقُوۡلُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ لَا یُكَذِّبُوۡنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجۡحَدُوۡنَ ﴿۳۳﴾

اے ہم پر افسوس اس پر جو ہم نے اس میں کمی کی۔ اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اُٹھائیں گے۔ سنو وہ بوجھ بُرا ہے جو اُٹھائیں گے ۹۳۱
اور دنیا کی زندگی صرف کھیل اور بے حقیقت مشغلہ ہے اور آخرت کا گھر یقیناً اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ کرتے ہیں پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ۹۳۲
ہم خوب جانتے ہیں کہ تجھے وہ بات غم دلاتی ہے جو وہ کہتے ہیں، پر وہ تجھے نہیں جھٹلاتے لیکن ظالم اللہ کی باتوں کا انکار کرتے ہیں ۹۳۳

---

۹۳۱ الساعۃ۔ ساعۃ اصل میں زمانہ کے اجزا میں سے کسی جزو کا نام ہے، اور اس سے مراد قیامت بھی لی جاتی ہے اور ساعۃ بمعنی قیامت تین طرح پر بولا جاتا ہے، یعنی محاسبہ کے لیے لوگوں کا اُٹھایا جانا، یا ساعت کبریٰ ایک نسل کا یا ایک قوم کا فنا ہو جانا یا ساعت وسطیٰ۔ ایک انسان کی موت یا قیامت صغریٰ، جیسا کہ حدیث میں ہے من مات فقد قامت قیامتہٗ (دیکھو ۱۰۸)

بغتۃ۔ بَغْت کے معنی ہیں کسی چیز کا ناگہاں اس طرف سے آجانا جہاں سے گمان نہ ہو (غ)

فرطنا۔ فَرَطَ کے معنی ہیں قصد کر کے آگے بڑھا، اور فارِط یا فَرَط متقدم یعنی آگے جانے والے یا آگے بڑھنے والے کو کہا جاتا ہے، جیسا کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا انا فَرَطُکم علی الحوض، یا جیسے چھوٹے بچے کے جنازے کی دعا میں ہے اَللّٰھُمَّ اجعلہ لنا فرطاً اور افراط یہ ہے کہ آگے بڑھنے میں حد سے تجاوز کرے اور تفریط یہ کہ آگے بڑھنے میں کوتاہی کرے مافرطت فی جنب اللہ (الزمر ۳۹۔ ۵۶) ما فرطتم فی یوسف (یوسف ۱۲۔ ۸۰)

اوزار۔ وِزر کی جمع ہے جس کے معنی بوجھ ہیں اور مراد گناہ ہے۔ اور وَزَر کے معنی جائے پناہ ہیں جو پہاڑ میں ملے (غ)

اللہ کی ملاقات یا لقاء اللہ کا مرتبہ انسان کے اعلیٰ سے اعلیٰ کمال کا مرتبہ ہے اور اس کا جھٹلانا گویا انسان کے کمال کی ترقیات کا جھٹلانا ہے جتنی اعلیٰ غرض انسان اپنے سامنے رکھتا ہے اسی قدر اپنے خدا داد قویٰ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور لقاء اللہ سے یا اخلاق اللہ میں رنگین ہونے سے بڑھ کر کوئی مقصد انسانی زندگی کا نہیں ہو سکتا جو اس شخص مقصد کو چھوڑتا ہے وہ اپنی اغراض کو صرف دنیوی زندگی تک محدود کر لیتا ہے اور اپنے اعلیٰ قویٰ کو بیکار کر دیتا ہے اور جس بوجھ سے وہ بچنا چاہتا ہے، یعنی خدا کے لیے جد وجہد، اس سے بہت بڑھ کر بوجھ اسے اٹھانا پڑتا ہے۔

۹۳۲ لھو وہ چیز ہے جو انسان کو اس بات سے جو اس کے لیے ضروری اور اہم ہے روک کر دوسری طرف مشغول کر دے (غ)

لہو اور لعب میں فرق: لہو اور لعب (دیکھو ۸۴۵) فرق یہ ہے کہ لعب میں خوشی کو فوراً حاصل کرنے کا خیال ہوتا ہے اور لہو صرف اصل مقصد سے روکنے والی چیز ہے گو اس سے فوری خوشی مقصود نہ ہو۔

حیٰوۃ الدنیا یا دنیا کی زندگی سے یہاں اور ایسے دوسرے موقعوں پر مراد وہ حصّہ ہے جو لقاء اللہ کے اعلیٰ مقصد سے خالی ہے، جو صرف کھانے پینے اور سفلی خواہشات کے پورا کرنے تک محدود ہے، اسی لیے اس کا مقابلہ آخرت سے کیا ہے۔ پس وہ اعمال جن میں اللہ تعالیٰ کی رضا مدنظر ہے گو وہ کھانے پینے سے بھی تعلق رکھتے ہوں حیٰوۃ الدنیا کا نہیں بلکہ دار الآخرۃ کا حصّہ ہوں گے۔

یہاں یہ توجہ دلائی ہے کہ کھانا پینا اور خواہشات سفلی کا پورا کر لینا ان باتوں کا تو آخرت سے کوئی تعلق نہیں، یہ تو حیوانی زندگی کے ساتھ اشتراک ہے۔ پس جہاں تک آخرت کی تیاری کا سوال ہے، جہاں تک لقاء اللہ کے اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھنے کا سوال ہے، اس پر کھانے پینے وغیرہ سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ اس لحاظ سے یہ صرف ایک کھیل اور بے حقیقت بات ہے کیونکہ لھو وہ چیز ہے جو انسان کو اعلیٰ مقصد سے دور رکھتی ہے، اگر انسان خدا داد عقل سے کام لے تو اسے سمجھ آ جائے کہ ایک اعلیٰ مقصد کو ترک کرنا اس کے لیے کس قدر نقصان دہ ہے۔

۹۳۳ یجحدون۔ جحود یہ ہے کہ جس چیز کا دل میں اثبات ہے اس کی نفی کی جائے اور جس کی دل میں نفی ہے اس کا اثبات کیا جائے وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم (النمل ۲۷۔ ۱۴) (غ)

یہ آیت اس بات پر صریح دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم صلعم کا صدق دشمنوں تک کو مسلم تھا۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات جن میں ایسا اعتراف موجود ہے تاریخ میں موجود ہیں۔ حرث نے آپ سے کہا ماکذ بتنا قط تو نے ہم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا، ابوجہل کے لفظ ہیں ان محمد الصادق وماکذب قط محمد صلی اللہ علیہ وسلم صادق ہیں اور کبھی جھوٹ نہیں بولا، اور سب اہل عرب آپ کو الامین کے نام سے پکارتے تھے۔ یہاں جب ان کے لقاء اللہ کی تکذیب کا ذکر کیا، تو ساتھ ہی فرمایا کہ یہ تجھے تو جھوٹا کہہ نہیں سکتے کیونکہ آپ نے کبھی جھوٹ نہ بولا تھا نہ کبھی کسی نے آپ کی طرف جھوٹ منسوب کیا۔ ہاں یہ آیت اللہ کا انکار ہے کیونکہ آپ کی صداقت کا انکار نہیں بلکہ اس پیغام کا انکار ہے

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور تجھ سے پہلے رسول یقیناً جھٹلائے گئے، سو اُنھوں نے جھٹلایا جانے پر اور ایذا دیا جانے پر صبر کیا یہاں تک کہ ان کو ہماری مدد پہنچی اور اللہ کی باتوں کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں اور تیرے پاس پیغمبروں کی کسی قدر خبر بلاشبہ آچکی ہے ع۹۳۴

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِىَ نَفَقًا فِى الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾

اور اگر تجھ پر اُن کا مُنہ پھیر لینا دشوار گزرتا ہے، تُو اگر طاقت رکھتا ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ تلاش کرلے یا آسمان میں کوئی سیڑھی، پس ان کو کوئی نشان لادے اور اگر اللہ چاہے تو ان کو ہدایت پر جمع کردے، سو تو جاہلوں میں سے نہ ہو ع۹۳۵

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾ (وقف غفران) (وقف منزل عند البعض علی یسمعون)

صرف وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور مُردوں کو اللہ اُٹھائے گا پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے ع۹۳۶

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً

اور کہتے ہیں اس پر کوئی (بڑی) نشانی اس کے رب کی طرف سے کیوں نہ اتاری گئی، کہہ، اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ نشان اتارے

جو منجانب اللہ آپ کو دیا گیا۔

ع۹۳۴ لامبدل لکلمات اللہ۔ سیاق وسباق کی پروانہ کرکے پادریوں نے ان الفاظ سے وہ کام لیا ہے جو ڈوبتا ہُوا تنکے سے لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی تکذیب پر آپ کو یہاں تسلّی دیتے ہوئے یوں فرمایا ہے کہ پہلے رسول بھی جھٹلائے گئے یہاں تک کہ نصرت الٰہی آپہنچی ایسا ہی تمہارے ساتھ ہوگا۔ اور لامبدل لکلمات اللہ کا صاف مفہوم یہی ہے کہ اس پیشگوئی کو کوئی بدل نہیں سکتا یعنی یہ پوری ہو کر رہے گی۔ اور آگے ولقد جاءك من نبای المرسلین موجود ہے یعنی جیسا پہلے رسولوں کے دشمنوں سے ہُوا ایسا ہی تمہارے دشمنوں سے ہوگا۔ مگر پادری کہتے ہیں اس سے مراد ہے کہ کتب الٰہی میں کوئی تحریف نہیں کرسکتا حالانکہ قرآن شریف نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر سالقہ کتب الہامی میں تحریف ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور آج واقعات اور علوم نے اس کی تائید کی ہے۔

ع۹۳۵ سُلّم اس کا مادہ بھی سَلْم یا سلامتی ہے۔ اور مراد اس سے وہ چیز لی جاتی ہے جس سے بلند مکان پر پہنچ سکیں اور اس سے سلامتی کی امید رکھی جائے یعنی سیڑھی، پھر اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے کسی بلند شے کو حاصل کرسکیں جیسے سبب (غ) جیسے ام لھم سُلّم یستمعون فیہ (الطور ۵۲-۳۸)

یہاں خطاب ہر مخاطب کو ہے، لیکن اگر رسول اللہ صلعم کو بھی خطاب مانا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ نبی کریم صلعم کو جو ان کے ایمان لانے کی بڑی تڑپ تھی تو اس لیے ان کا اعراض بڑا شاق گزرتا تھا اور آپ چاہتے تھے کہ زمین و آسمان سے کوئی ایسے نشان ظاہر ہوں کہ وہ ایمان لائیں، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نشانوں کا دکھانا پیغمبر کی طاقت میں نہیں۔ اللہ تعالےٰ جب چاہتا ہے اس کے ذریعہ سے کوئی معجزہ دکھا دیتا ہے۔

اگر اللہ چاہے تو ان کو ہدایت پر جمع کردے یہ پیشگوئی تھی جو پوری ہوئی اور اگر معنی یوں کیے جائیں کہ اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت پر جمع کردیتا تو مراد یہ ہے کہ ان کو پیدا ہی ایسا کرتا کہ ان کو نیک و بد کی تمیز نہ دی جاتی اور نہ وہ عقل سے کام لے سکتے۔ جاہل اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جس کو کسی خاص بات سے ناواقفیت ہو مطلب یہ ہے کہ تم اس پیشگوئی یا اس قانون سے بے خبر نہ رہو۔

ع۹۳۶ بعث سے مراد بعث روحانی: مردوں کا بعث ایک تو قیامت کے دن محاسبہ کے لیے ہوگا، اور ایک بعث روحانی ہے جو نبی کریم صلعم کے ذریعہ ظہور میں آنا تھا۔ کیونکہ یہ بھی ایک موت سے اُٹھنا ہے (دیکھو ع۹۰) یہاں یوم قیامت کا ذکر نہیں۔ اس لیے مراد اس سے بعث روحانی ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو بالکل مردہ ہیں اور بات کو سنتے نہیں یہ بھی آخر اُٹھیں گے گو ابھی صرف وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے اعلموا ان اللہ یحیی الارض بعد موتھا (الروم ۳۰-۵) اللہ زمین کو موت کے بعد پھر زندہ کرے گا، زمین کی موت اس کے رہنے والوں کی روحانی موت ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾

لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے ۹۳۷ع

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ
يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ
مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ ثُمَّ
اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

اور زمین میں کوئی جان دار نہیں اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے مگر وہ بھی تمھاری طرح جماعتیں ہیں ۹۳۸ع ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔ پھر وہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے ۹۳۹ع

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى
الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ
يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾

اور جنھوں نے ہماری باتوں کو جھٹلایا ہے بہرے اور گونگے اندھیرے میں ہیں۔ جس کو اللہ چاہے گمراہی میں رہنے دے اور جسے چاہے اسے سیدھے راہ پر رکھے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ
اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾

کہہ، بتاؤ اگر اللہ کا عذاب تم پر آ جائے، یا (مقررہ) گھڑی تم کو آ لے، کیا تم اللہ کے سوائے (کسی اور کو) پکارو گے اگر تم سچے ہو۔

بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ
اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾ ع

بلکہ تم اسی کو پکارو گے سو جس کے لیے تم پکارو گے اگر چاہے تو اسے دور کر دیگا اور تم انھیں بھول جاؤ گے جنھیں تم شریک ٹھیراتے ہو ۹۴۰ع

ع۹۳۷ یہاں آیت سے مراد عذاب استیصال ہے، اور آیت کی تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ جب ان کو یہ کہا گیا کہ تم مردوں میں بھی اللہ تعالیٰ پیغمبر کے ذریعہ سے روح نفخ کرے گا تو بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کے وہ اعدائے حق کی عادت مستمرہ کے مطابق ہلاکت مانگتے ہیں، چنانچہ اس رکوع کی آخری آیات میں صاف اس عذاب کا ذکر ہے۔ یہاں نشانات یا معجزات کے دینے سے انکار نہیں بلکہ یہ کہہ کر کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے بتا دیا ہے کہ عذاب بھی آخر آ رہے گا۔

ع۹۳۸ دابہ اور طیر کے انسانوں جیسی اُمت ہونے سے مراد: چرند اور پرند سب تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے؟ یہاں ذکر کفار کا ہے جن کی نظر دنیا سے آگے نہیں جو لقاء اللہ کو جھٹلاتے ہیں اور اسی حیات دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ جن کی نظر کھانے پینے اور خواہشات سفلی سے اوپر نہیں اٹھتی ان کو بتایا ہے کہ اس لحاظ سے تو تم میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ دوسری جگہ ایسے ہی لوگوں کا ذکر کر کے فرمایا اولٰئك كالانعام بل هم اضل (الاعراف ۔ ۱۷۹) وہ چارپایوں کی طرح ہیں۔ بلکہ بہت زیادہ گمراہ۔ دوسری توجیہ ان الفاظ کی یوں ہو سکتی ہے کہ سب انسانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ دوسرے جاندار بھی تمھاری طرح ہیں۔ جو فطرت ان کو خدا نے دی ہے وہ اس کے مطابق چلتے ہیں، مگر تم اپنے فطری نور کی شہادت کو رد کرتے ہو جیسا کہ فرمایا وان من شئ الا يسبح بحمده (بنی اسرائیل ۔ ۴۴) تیسری توجیہ یہ ہے کہ انسانوں کے دو گروہوں کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے، ایک جو مثل چارپایوں کے زمین پر جھکے رہتے ہیں اور دوسرے جو طائر کی طرح عالم روحانیت میں پرواز کرتے ہیں یعنی کافر اور مومن۔

ع۹۳۹ الکتاب سے مراد یہاں قرآن شریف ہی ہے اس میں کوئی کمی نہیں رکھی یعنی خوب کھول کر سمجھایا ہے۔

ثم الی ربهم يحشرون۔ حشر کے اصل معنی اکٹھا کرنا ہیں آیا یہاں حشر سے مراد قیامت کے دن جمع کرنا ہے؟ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ بہائم کا حشر ان کی موت ہے (ر ج) بعض نے کہا کہ قیامت کے دن کا حشر مراد ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ بہائم میں بھی اللہ تعالیٰ عدل کرے گا لیکن اس طرح حیوانات کو بھی مکلف ماننا پڑتا ہے، پھر اس خیال کی کہ ان میں رسول مبعوث ہوتے ہیں کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی قرآن و حدیث میں نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اس خیال کے رکھنے والوں کو ملاحدہ کہا ہے اور انسانی شریعت کے مکلف حیوانات کو ٹھہرانا خلاف قرآن ہے، کیونکہ اس میں عقل و فکر سے کام لینے کی تاکید کی ہے جو ان کو عطا نہیں ہوا۔ پس یا تو جو معنی حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہیں وہی درست ہیں یعنی ان پر موت آ جاتی ہے اور یہ ان کی زندگی کا خاتمہ ہے۔ مگر اس سے بھی بہتر توجیہ ان الفاظ کی یہ ہے کہ ربهم اور يحشرون میں ضمیر لوگوں کی طرف پھرتی ہے جن کا ذکر اوپر چلا آیا ہے نہ حیوانات کی طرف جنکا ذکر صرف بطور مثال ہوا ہے۔ بلکہ ربهم میں ضمیر جو ذوی العقول کے لیے ہے اس کی تائید کرتی ہے۔ پس مراد یہ ہے کہ انسانوں کی مثال تو دوسری جاندار مخلوق کی طرح ہے، جہاں تک اس سفلی زندگی کا سوال ہے جو خورد و نوش سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر ان میں ایک بات ان سے بڑھ کر یہ ہے کہ ان کا حشر بھی اپنے رب کی طرف ہوگا، یعنی اعمال کی جزا و سزا کے لیے دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اگلی آیت میں اس دوسری زندگی کی تکذیب کرنے والوں کو صم بکم کہا ہے، یعنی جس طرح چارپایہ نہ آواز کا مفہوم سمجھ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے۔ یہی حالت ان کی ہے بما لا يسمع الا دعاء ونداء (البقرة ۲ ۔ ۱۷۱)

ع۹۴۰ ارایتکم (رائی بمعنی علم یا جاننے سے) اَخْبِرْنِی کی جگہ پر ہے یعنی اس کے معنی ہیں مجھے بتاؤ، اور ارأيت پر کاف داخل ہوتا ہے تو ارأيتك ۔ ارایتکم وغیرہ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور بلا شبہ ہم نے تجھ سے پہلے قوموں کی طرف رسول بھیجے، تب ہم نے ان کو تکلیف اور دُکھ میں مبتلا کیا، تاکہ وہ عاجزی کریں ۹۴۱

فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

تو جب ان پر ہمارا عذاب آیا کیوں نہ انھوں نے عاجزی اختیار کی، لیکن ان کے دل سخت ہوگئے اور شیطان نے اُسے انکے لیے خوبصورت کر دکھایا جو وہ کرتے تھے ۹۴۲

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾

سو جب انھوں نے اسے چھوڑ دیا جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب اس پر بہت خوش ہوگئے جو انھیں دیا گیا تھا ہم نے انکو اچانک پکڑ لیا تب وہ مایوس ہوگئے ۹۴۳

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾

یوں اس قوم کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کی پرورش کرنے والا ہے ۹۴۴

اس کی صورتیں ہوجاتی ہیں، اور ارأیت اور ارأیتم اپنی اصل صورت پر قرآن کریم کی آیات میں جہاں جہاں آیا ہے صرف تنبیہ کے معنے میں آیا ہے (غ)

یہاں عذاب اللہ اور ساعۃ کو الگ الگ کرکے بیان کیا ہے، کیونکہ ساعۃ سے مراد ان کی تباہی یا ان کی قوت وشوکت کے جاتے رہنے کی گھڑی ہے جو ان کی ساعۃ وسطیٰ ہے، اور عذاب سے مراد اس سے چھوٹا عذاب ہے۔ عذاب یا ساعۃ کے وقت ان کا اللہ تعالیٰ کو پکارنا اور اپنے شرکاء کو چھوڑ دینا تنسون ما تشرکون واقعات میں سے ہے جیساکہ دوسری جگہ بھی فرمایا دعوا اللّٰہ مخلصین لہ الدّین (یونس۱۰ - ۲۲) اور فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء میں بتایا کہ جب اضطرار کی حالت میں بندہ اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو بعض تکالیف کو جنھیں چاہے اللہ تعالیٰ دور بھی کر دیتا ہے۔ ان شاء میں بتا دیا کہ بعض وقت اس کی مشیت یہ بھی ہوتی ہے کہ جب عذاب استیصال آجاتا ہے تو پھر وہ دور نہیں کیا جاتا۔ اسی کے متعلق فرمایا ما دعاء الکافرین الّا فی ضلال (الرعد۱۳ - ۱۴)۔ اسی لیے اگلے رکوع کی پہلی آیت میں بتایا کہ معمولی عذاب بھیجنے سے ہماری غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کریں۔

ع۹۴۱ یتضرعون۔ ضرع اور تضرّع کے معنی ہیں عاجزی اور پستی کا اظہار کیا (ل)

یہاں ایک عام قانون بیان فرمایا ہے کہ دکھوں اور تکلیفوں کے بھیجنے سے اللہ تعالیٰ کی غرض صرف یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور تکبّر کو چھوڑ کر خدا کے حضور عاجزی کا اظہار کریں پس دکھ اور تکلیف کے آنے سے انسان کو یہ فائدہ اٹھانا چاہیئے کہ خدا کی طرف جھکے اور دنیوی زندگی کی ظاہری نمائشوں پر فریفتہ نہ رہے۔ یہ وہ دکھ اور تکلیفیں ہیں جو عذاب استیصال سے پہلے آتی ہیں۔

ع۹۴۲ یہاں صفائی سے بتا دیا کہ انسان جو عمل بد کرتا ہے تو ان کو مزین کرکے دکھانے والا شیطان ہوتا ہے نہ خدا۔ یہ آیت ان آیات کے حل کرنے میں اصول محکم کے طور پر ہے جہاں تزیین کے فاعل کا ذکر نہ ہوا اور جس فعل کو اچھا کرکے دکھایا گیا ہے وہ فعل بد ہو۔

ع۹۴۳ جب تھوڑی مصیبت سے قوم فائدہ نہیں اٹھاتی تو پھر بڑی مصیبت کا آنا لازمی امر ہے۔ مگر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تھوڑی تکلیف جب دور ہو جاتی ہے تو پھر ہر قسم کے آسائش کے سامان میسّر آجاتے ہیں اور لوگ اس پر خوش ہو کر سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ ایک معمولی بات تھی۔ قالوا قد مس اٰباءنا الضراء والسراء (الاعراف۷ - ۹۵)

ع۹۴۴ دابر۔ دُبُر کے معنی پیٹھ ہیں اور دابر متاخر اور تابع کو کہتے ہیں یعنی جو پیچھے رہ جائے، مکان کے اعتبار سے ہو یا زمانہ کے یا مرتبہ کے (غ) اور اصل یا جڑ بھی اس سے مراد لی جاتی ہے (ج) دابر قوم کے کاٹ دینے سے مراد قوم پر عذاب استیصال کا آنا ہے جس سے ان کی شوکت و قوت ٹوٹ جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب کے سب لوگ مر جائیں۔ اہل مکّہ کا عذاب استیصال ان کا مغلوب ہوجانا ہی تھا۔ اور جنگ بدر کے ذکر میں ہے ویرید اللّٰہ ان یحق الحق بکلمٰتہٖ ویقطع دابر الکٰفرین۔ (الانفال۸ - ۷) حالانکہ ان کے چند سردار مارے گئے تھے مگر چونکہ قوم کی قوت ٹوٹ گئی اس لیے اس کو جڑ کاٹنے سے تعبیر کیا ہے۔

قوم کب ہلاک ہوتی ہے: ظالم قوم کی ہلاکت کے بعد یہ لفظ لاکر الحمد للّٰہ رب العٰلمین یہ بتایا کہ کسی قوم کا استیصال اللہ تعالیٰ عالمین کی ربوبیت کے لیے کرتا ہے، یعنی جب قوم کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ ربوبیت عالمین میں حارج ہوتی ہے اور نیکی کی بالکل جڑ کٹنے لگتی ہے، تب اس کا استیصال کر دیا جاتا ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴٦﴾

کہہ، کیا تم نے غور کیا اگر اللہ تمھارے کان اور تمھاری آنکھیں لے جائے اور تمھارے دلوں پر مہر لگا دے اللہ کے سوائے کون معبود ہے جو تم کو یہ لادے۔ دیکھو ہم کس طرح باتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں پھر بھی یہ پھر جاتے ہیں ۹۴۵

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴٧﴾

کہہ، بتاؤ اگر اللہ کا عذاب تم پر اچانک یا کھلا کھلا آجائے (تو) کیا سوائے ظالم لوگوں کے کوئی (اور) ہلاک کیا جائے گا ۹۴٦

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴٨﴾

اور ہم پیغمبروں کو نہیں بھیجتے مگر خوش خبری دیتے ہوئے اور ڈراتے ہوئے۔ پس جو کوئی ایمان لائے اور اچھے کام کرے تو ان پر کوئی ڈر نہیں اور نہ وہ پچھتائیں گے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴٩﴾

اور جو لوگ ہماری باتوں کو جھٹلاتے ہیں انھیں عذاب پہنچے گا اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔

قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

کہدے، مَیں تم کو نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ مَیں تم کو کہتا ہوں کہ مَیں فرشتہ ہوں مَیں کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا سوائے اسکے جو میری طرف وحی کی جاتی ہے کہہ کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہیں سو کیا تم غور نہیں کرتے ۹۴٧

---

۹۴۵ نصرف الاٰیات ۔ تصریف کے معنی وہی ہیں۔ جو صرف کے ہیں یعنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا، مگر تصریف میں کثرت پائی جاتی ہے (رغ) یہ انہی لوگوں کو فرمایا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل میں سخت دلی اختیار کر رہے ہیں۔ پہلی قوموں کا حال سُنا کر اب ان کو تنبیہ کرتا ہے کہ اگر تم اسی طرح مخالفت میں لگے رہو گے تو جانتے ہو نتیجہ کیا ہوگا؟ تمہارے کان ہوں گے پر سنو گے نہیں، آنکھیں ہوں گی پر دیکھو گے نہیں، دل ہوں گے پر سوچو گے نہیں۔ اللہ تعالےٰ کا لے جانا یہی ہے کہ ان کے فائدے سے محروم کر دے گا، کیونکہ اس کا قانون یہی ہے کہ جب ایک قوت سے انسان کام نہیں لیتا تو وہ بیکار ہو جاتی ہے۔

۹۴٦ بغتة ۔ اچانک جس کے نشانات پہلے سے ظاہر نہ ہوں جھرۃ کھلا کھلا جس کے علامات بھی پہلے سے ظاہر ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب کبھی ایک رنگ میں ظاہر ہوتا ہے کبھی دوسرے میں۔

۹۴٧ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو خزانوں سے مالا مال کر دیا اور بہت سی آئندہ کی خبریں ان کو بتا دیں یہاں تک کہ جو جو حالات اس امت کو پیش آنے والے تھے۔ وہ سب بتا دیئے۔ اور جب چاروں طرف شرک و بے دینی کی ظلمت پھیل رہی تھی آپ ایک فرشتہ کی طرح ہر ایک قسم کی آلائش سے پاک رہے۔ لیکن ایمان لانے کے لیے، نیکی کرنے کے لیے یہ لالچ نہیں دیتے۔ نیکی کی خاطر نیکی کرنا اعلےٰ سے اعلےٰ رنگ میں اس کی تعلیم اگر کسی نے دی تو وہ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دی۔ اس لیے فرمایا کہ ان کو کہہ دو کہ اللہ کے خزانوں کا مالک مَیں نہیں وہ جسے چاہے دے، غیب کا مالک مَیں نہیں، فرشتہ مَیں نہیں، تمہاری طرح بشر ہوں پس میں تم کو حصول کمال انسانی کے لیے بلاتا ہوں، وہی اصل غرض میری دعوت کی ہے۔ مجھے قبول کرو تو اس میں کوئی دنیوی ملونی نہ ہو، کوئی نفسانی خواہش نہ ہو۔ فخر نوع انسان صرف کمال انسانی کی طرف بلاتا ہے۔

ان اتبع الا ما یوحیٰ الیَّ میں کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا، سوائے اس کے جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک تو رسول اللہ صلعم کی عصمت پر شہادت ہے کہ آپ صرف احکام الہٰی کی پیروی کرتے ہیں نہ کسی خواہش نفس کی، نہ کسی دوسرے کی۔ دوسرے آپ کے کمال کی طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ قرآن شریف میں وحی تعلیم کے رنگ میں موجود ہے آپ اس سب کی پیروی کرتے ہیں۔ گویا جن کمالات کا ذکر قرآن شریف نے کیا ہے وہ سب آپ میں موجود ہیں۔ قرآن علم ہے تو آپ عمل ہیں۔ تیسرے آپ کے پیروؤں کو بتایا کہ

وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾	اور اس کے ساتھ ان کو ڈرا جو خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے ان کے لیے اس کے سوائے نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا تاکہ وہ تقوٰے اختیار کریں ۹۴۸
وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾	اور اُن کو نہ نکال جو صبح اور شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اسی کی رضا چاہتے ہیں۔ تجھ پر اُن کے حساب میں سے کچھ (ذمہ داری) نہیں اور نہ ان پر تیرے حساب میں سے کچھ (ذمہ داری) ہے کہ تو ان کو نکال دے۔ پس ظالموں میں سے ہو جائے ۹۴۹
وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾	اور اسی طرح ہم ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ تکلیفوں میں ڈالتے ہیں تاکہ وہ کہیں کیا یہ وہی ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے احسان کیا ہے۔ کیا اللہ شکر کرنے والوں کو نہیں جانتا ۹۵۰
وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا	اور جب تیرے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری باتوں پر ایمان لاتے ہیں تو کہہ، تم پر سلامتی ہو، تمھارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے نادانی سے بُرائی کر بیٹھے

وہ اگر کمال کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اتباع قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ان کے لیے ایک راہ ہے۔ اسی لیے آیت کا خاتمہ اس پر کیا ہے کہ اعمیٰ اور بصیر برابر نہیں۔ اعمیٰ وہ ہے جو ان کمالات سے غافل رہا، بصیر وہ ہے جس نے ان کو دیکھ لیا اور پھر ان کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔

ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق عمل امور دینی میں قابل اتباع نہیں منشائے الفاظ کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں تو یہ بتایا ہے کہ جو عمل رسول اللہ صلعم سے ثابت ہو۔ وہ آپ کی خواہش نفسانی سے نہیں بلکہ وحی الٰہی سے ہے، خواہ وہ وحی جلی ہو یا خفی۔

ع ۹۴۸ قرآن کریم کا انذار تو سب کے لیے ہے۔ یہاں خصوصیت سے بعض لوگوں کے انذار سے مراد یہ ہے کہ انہی کی صورت میں انذار کی غرض حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ انذار کی پروا نہیں کرتے اس لیے ان کو انذار کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ یہ انذار جس کا یہاں ذکر ہے اس قبیل سے ہے جیسا فرمایا انما تنذر من اتبع الذکر (یٰس ۳۶-۱۱) یا انما تنذر الذین یخشون ربھم بالغیب (فاطر ۳۵-۱۸)

ع ۹۴۹ مسلمان غربا کے متعلق کفار قریش کا مطالبہ: پہلے مسلمان اکثر غربا میں سے تھے بعض حبشی غلام تھے۔ رسول اللہ صلعم ان کے ساتھ مل کر بیٹھتے اور باتیں کرتے تھے قریش اپنے فخر قومی پر نازاں تھے۔ رسول اللہ صلعم کو کہا کرتے تھے کہ ان لوگوں کو پاس سے اُٹھا دو تو ہم تمھارے پاس بیٹھیں گے۔ مگر اسلام کا تو اصل مقصد ہی یہی تھا کہ انسانیت کے اشتراک کے سامنے تفریق رنگ و قوم، تفریق وجاہت و مرتبہ، تفریق مال و دولت کو مٹا دے۔ خدا کی رضا کو چاہنے والا ہی بڑا انسان ہے، خواہ کسی قوم سے ہو، یا کسی رنگ کا ہو۔ اسی کے مطابق یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کا ہرگز یہ منشا نہیں، نہ کہیں لکھا ہے، کہ رسول اللہ صلعم نے ان کو نکال دینے کا ارادہ کیا تھا۔ بلکہ یہ کفار کے اس مطالبہ کا جواب ہے۔

ع ۹۵۰ فتن کے اصل معنی سونے کا آگ میں ڈالنا ہے تاکہ میل دور ہو جائے (غ)، اسی طرح جب ایک انسان کو دکھوں میں ڈالا جاتا ہے تو اس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، جب غرض یہ ہو کہ اس کے کمالات اور خلوص کو ظاہر کیا جائے۔ کیونکہ تکالیف شاقہ میں پڑے بغیر کمالات ظاہر نہیں ہوتے۔ نبی کریم صلعم کے ساتھ غربا و ضعفاء ملے، ان کو کفار نے نہ صرف حقارت کی نظر سے دیکھا بلکہ ان کو طرح طرح کی ایذائیں دیں نتیجہ کیا ہُوا (لیقولوا میں لام عاقبت کا ہے) کہ یہی غریب لوگ جب دکھوں میں ڈالے گئے تو ان کے کمالات دنیا میں ظاہر ہوئے، اور آخر کفار کو بھی تعجب ہُوا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر احسان کیا اور ان کو ایسے بلند مقام پر پہنچایا۔ مگر کس لیے؟ اس لیے کہ وہ شاکر تھے، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی انہوں نے قدر کی اور ان کو ضائع نہیں کیا۔ اس میں دنیا کی کمزور قوموں کے لیے خوش خبری ہے کہ اگر وہ بھی خدا کی

بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾

پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرلے، تو وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۹۵۱

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾ ع

اور اسی طرح ہم باتوں کو کھول کر بیان کرتے ہیں اور تاکہ مجرموں کا راستہ واضح ہو جائے۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

کہہ، مجھے روک دیا گیا ہے کہ میں اُن کی عبادت کروں، جن کو تم اللہ کے سوائے پکارتے ہو، کہہ، میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کرونگا اس صورت میں گمراہ ہونگا اور ہدایت پانیوالوں میں سے نہ ہونگا ۹۵۲

قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾

کہہ، میں اپنے رب سے ایک کھلی دلیل پر قائم ہوں اور تم نے اس کو جھٹلا دیا، وہ میرے پاس نہیں جس کے لیے تم جلدی کرتے ہو۔ حکم اللہ ہی کا ہے۔ وہ حق بیان کرتا ہے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے ۹۵۳

قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ

کہہ، اگر وہ میرے پاس ہوتا جس کے لیے تم جلدی کرتے ہو تو

دی ہوئی نعمتوں کی قدر کریں تو ان کو بھی اللہ تعالیٰ بڑا انبا دے گا۔

۹۵۱ ناواقفیت سے غلطی ہو جائے تو وہ قابل معافی ہے، لیکن عمداً بدیوں پر اصرار کرنا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو جان لینے کے باوجود بُری راہ کو چھوڑنے کی کوشش نہ کرنا اس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔

۹۵۲ نہیت۔ نَہی کے معنی کسی چیز سے روکنا، قول سے ہو یا فعل سے اس میں کوئی فرق نہیں۔ ونہی النفس عن الھوٰی (النّٰزعٰت ۷۹۔ ۴۰) میں یہ مراد نہیں کہ انسان اپنے نفس کو کہتا ہے کہ تو بدی نہ کر، بلکہ اس سے مراد ہے عملاً شہوات سے اس کا الگ کر دینا اور جس چیز کی طرف نفس کی خواہش ہو اس سے بچ جانا۔ اسی لیے نہی عن المنکر کبھی ہاتھ سے ہوتی ہے، کبھی زبان سے اور کبھی دل سے۔ پھر خدا کی نہی کچھ اس عقل کی وجہ سے ہے جو اس نے ہم میں رکھی ہے اور کچھ اس شریعت کی وجہ سے جو اس نے ہم کو دی ہے (غ)

آنحضرت ﷺ کا بت پرستی سے بچا رہنا: یہاں فرمایا کہ رسول اللہ صلعم کو غیر اللہ کی عبادت سے روکا گیا ہے۔ تو یہ روکنا قول سے تو نبوت کے بعد ہوا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فعل سے آپ کو بچپن سے بُت پرستی وغیرہ سے روکے رکھا، جیسا کہ تاریخ کی اس پر گواہی ہے کہ آپ کبھی مشرک نہیں ہوئے اور اسی طرف عقل اور فطرت سلیم نے آپ کو ہدایت کی۔ یہاں شرک کو ان کی اھواء قرار دے کر بتا دیا کہ فطرت اور عقل جو اللہ نے انسان کے اندر ودیعت کی ہے وہ توحید کی طرف ہی ہدایت فرماتی ہے۔

۹۵۳ الفاصلین۔ فصل کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری سے الگ کر دینا یہاں تک کہ دونوں میں فرق ہو جائے۔ اس لیے مکان سے الگ ہونے کو بھی کہا جاتا ہے۔ ولمّا فصلت العیر (یوسف ۱۲۔ ۹۴) اور یوم الفصل وہ دن ہے جو حق کو باطل سے الگ کر دیتا ہے۔ اسی سے فیصلہ کرنا ہے (غ)

مفردات میں ہے کہ بینۃ کھلی دلیل کو کہتے ہیں، عقلی ہو یا محسوس۔ اور یہاں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے توحید پر قیام اور بت پرستی سے عملی بیزاری کو بینۃ کی وجہ سے بتایا ہے، یعنی جس چیز کی طرف وحی و عقل نے ہدایت کی ہے وہ ایک واضح دلیل ہے۔

وسعت رحمت الٰہی: محمد رسول اللہ صلعم جیسا وسیع دل انسان کوئی نہیں ہوا۔ اپنے دشمنوں سے جسقدر عملی نرمی اور محبّت کا ثبوت آپ نے دیا ہے دوسرے کسی انسان کی زندگی میں وہ نہیں ملتا۔ لیکن خدا کا رحم اور محبّت بہت بڑھ کر وسیع ہیں۔ فرماتا ہے کہ ان کے جرائم اس قدر ہیں کہ اگر انسان کے اختیار میں ان کا سزا دینا ہوتا تو خواہ رسول اللہ صلعم ہی ہوتے، ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ جیسا کہ اگلی آیت میں صاف فرمایا۔ مگر خدا بہت بردبار ہے اور انسان کو بڑی مہلت دیتا ہے۔ آج بھی اس کا وہی قانون کام کرتا ہے۔ لوگ چاہتے ہیں فلاں قوم جلد تباہ ہو جائے مگر وہ جو فیصلہ کرنے والا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ کب کس کی تباہی کا وقت ہے۔

حکم خدا کے ماتحت حکم: ان الحکم الا للہ سے یہاں مراد صرف دشمنوں کی سزا کا حکم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کسی انسان کے نہیں جیسا کہ سیاق عبارت سے ظاہر ہے یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں اور کوئی حکم دینے والا ہے ہی نہیں کیونکہ یہ خلاف واقعات ہے۔ اہل قرآن کا اس آیت سے ان احکام دینی کے خلاف استدلال کرنا جو احادیث میں نبی کریم صلعم

لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ
اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۸﴾

میرے اور تمہارے درمیان معاملہ کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا
هُوَ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا
تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ
فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ
اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾

اور اس کے پاس غیب کے خزانے ہیں سوائے اس کے ان کو کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہے اور کوئی پتّا نہیں گرتا، مگر وہ اسے جانتا ہے اور کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں نہیں اور نہ تر اور نہ خشک - مگر وہ ایک کھلی کتاب میں ہے [۹۵۴]

وَ هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَ يَعْلَمُ مَا
جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ
لِيُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ
ع ۱۳ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾

اور وہی ہے جو رات کو تمہاری روح قبض کرتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم دن کو کرتے ہو پھر وہ تم کو اس میں اُٹھاتا ہے تاکہ ایک مقررہ وقت پورا کیا جائے پھر اسی کی طرف تمہارا لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تم کو خبر دیگا جو تم عمل کرتے تھے [۹۵۵]

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ

اور وہ غالب ہے اپنے بندوں سے بالا تر (ہے) اور تم پر نگہبان

کی زبان سے مروی ہیں سیاق وسباق عبارت کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں ادنیٰ عقل سے بھی جو شخص کام لے وہ دیکھ لیگا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کسی کا کسی کو حکم دینا خدا کے حکم میں ہی داخل ہے، اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہی سب احکام دیئے۔

[۹۵۴] مفاتح۔ مَفْتَح کی جمع ہے جس کے معنی خزانہ ہیں۔ مِفْتَح یا مِفْتَاح کی جمع بھی ہو سکتی ہے جس کے معنی کنجی ہیں۔ مگر اوّل معنی جو سدی سے مروی ہیں یہاں زیادہ موزوں ہیں۔ مفردات میں دوسرے معنی لیکر یوں توجیہ کی ہے کہ مراد اس سے وہ اسباب ہیں جن سے اس کے اس غیب تک پہنچا جاتا ہے جس کا ذکر فلا یظھر علیٰ غیبہٖ احد (الجن۔ ۷۲: ۲۶) میں ہے۔

کتاب مبین سے یہاں مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے جیسا کہ خود سیاق عبارت سے ظاہر ہے، کہ ہر ایک چیز کے علم کا ذکر کر کے آخر پر یہ لفظ لائے ہیں جو اس علم کے قائم مقام ہیں۔ اور مفردات میں ہے کہ کتاب اللہ سے مراد اس کا علم اور اس کا حکم بھی ہوتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت کو بیان کیا ہے۔ کیونکہ اعمال کی جزا و سزا کا تعلق علم سے ہے کوئی عمل ظاہر کرے یا چھپ کر کرے اللہ تعالیٰ اسے یکساں جانتا ہے۔ علاوہ ازیں خشک ہو کر گرنے والے پتے میں اس قوم کی طرف اشارہ بھی ہے جس کا عروج اب جانے والا ہے۔ زمین کی تاریکیوں میں دانہ جو اب اُگ کر درخت بنے گا خود اسلام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہونا ہے ہو کر تو رہے گا مگر اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ترقی تدریجاً ہوگی۔ بسا اوقات قرآن کریم کی دلیل دو کام کرتی ہے ایک طرف اللہ تعالیٰ کے علم کامل کا ذکر کیا جو اس کی توحید کی دلیل ہے، دوسری طرف یہ بھی بتایا کہ قوموں کا زوال و عروج کس طرح ہوتا ہے، اور کہ قوم کا زوال اس وقت ہوتا ہے جب وہ خشک پتہ کی طرح خوبیوں سے خالی ہو جاتی ہے اور عروج ایک دانہ کی طرح ہوتا ہے جو زمین میں بویا جاتا ہے اور درخت بن جاتا ہے۔

[۹۵۵] یتوفٰکم۔ توفی کے لیے دیکھو [۴۴۴]۔ مفردات میں ہے قد عُبِّرَ عن الموت والنوم بالتوفی یعنی توفی سے مراد موت ہوتی ہے یا نیند۔ توفی اصل میں قبض روح کا نام ہے۔ پھر اس کا استعمال دونوں حالتوں پر ہے قبض تام جو موت کے وقت ہوتا ہے، اور قبض ناقص جو نیند کے وقت ہوتا ہے۔ مگر یہ لفظ قبض روح کے لیے خاص ہے۔ جسم انسانی کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جانے پر کبھی نہیں بولا جاتا۔ نیند اور موت پر لفظ توفی کے مشترک طور پر بولنے میں یہ اشارہ ہے کہ جو چیز نیند کے وقت قبض کی جاتی ہے وہی موت کے وقت قبض کی جاتی ہے۔ اور وہ تمیز ہے جس پر انسان کے اعمال کا مدار ہے، اور جو حیوان اور انسان میں مابہ الامتیاز ہے۔ اسی لیے رات کی توفی کے بعد یہ فرمایا کہ جو دن کو تم کرتے ہو اسے جانتا ہے یعنی جب تمہاری تمیز تمہاری طرف لوٹ آتی ہے تب تمہارے اعمال محاسبہ میں آتے ہیں۔

جرحتم۔ جَرْح کے معنی ہتھیار کے ساتھ اثر کرنا یا زخم ہیں، اور جَرَحَ الشیٔ کے معنی کَسَبَ ہوتے ہیں یعنی کمایا (ل)۔ اور جوارح انسان کے اعضاء ہیں جن سے کھاتا ہے، اور اِجتراح کے معنی اکتساب اثم یا گناہ کا کمانا آتے ہیں (غ) (ام حسب الذین اجترحوا السیات (الجاثیۃ ۔ ۴۵: ۲۱)

پچھلی آیت کی طرح اس آیت میں بھی ایک طرف علم الٰہی کا ذکر کیا جو اس کی توحید پر دلیل ہے، اور دوسری طرف بتایا کہ جو کچھ انسان حالت بیداری میں کرتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے اور اس پر وہ نتائج مترتب فرماتا ہے یہ کس طرح ہوتا ہے اور اس کی غرض کیا ہے۔ اگلے رکوع میں بیان فرمایا۔

حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ
تَوَفَّتۡہُ رُسُلُنَا وَ ہُمۡ لَا یُفَرِّطُوۡنَ ﴿۶۱﴾

بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے
ہمارے بھیجے ہوئے اسکی روح قبض کرتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔ ٩٥٦

ثُمَّ رُدُّوۡۤا اِلَی اللّٰہِ مَوۡلٰىہُمُ الۡحَقِّ ؕ اَلَا
لَہُ الۡحُکۡمُ ۟ وَ ہُوَ اَسۡرَعُ الۡحٰسِبِیۡنَ ﴿۶۲﴾

پھر وہ اپنے مولا برحق کی طرف لوٹائے جاتے ہیں سنو حکم اسی کا ہے،
اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

قُلۡ مَنۡ یُّنَجِّیۡکُمۡ مِّنۡ ظُلُمٰتِ الۡبَرِّ
وَ الۡبَحۡرِ تَدۡعُوۡنَہٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفۡیَۃً ۚ لَئِنۡ
اَنۡجٰىنَا مِنۡ ہٰذِہٖ لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیۡنَ ﴿۶۳﴾

کہہ، کون تم کو خشکی اور تری کی مشکلات سے نجات دیتا ہے
(جب) تم اس کو عاجزی سے اور چھپ کر پکارتے ہو اگر وہ ہم کو
اس سے نجات دے تو ہم یقیناً شکر کرنے والوں میں سے ہونگے۔ ٩٥٧

قُلِ اللّٰہُ یُنَجِّیۡکُمۡ مِّنۡہَا وَ مِنۡ کُلِّ کَرۡبٍ
ثُمَّ اَنۡتُمۡ تُشۡرِکُوۡنَ ﴿۶۴﴾

کہدے، اللہ تم کو ان سے اور ہر سختی سے نجات دیتا ہے،
پھر تم شرک کرتے ہو۔ ٩٥٨

قُلۡ ہُوَ الۡقَادِرُ عَلٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَ عَلَیۡکُمۡ
عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِکُمۡ
اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا وَّ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ

کہہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر تمھارے اوپر سے عذاب بھیجے
یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے یا تمھیں کئی فرقے بنا کر
ملا دے اور تم میں سے بعض کو بعض کی لڑائی (کا مزہ) چکھا دے

---

٩٥٦ حَفَظَۃ۔ حافظ کی جمع ہے، مراد اعمال انسانی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا وان علیکم لحافظین کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون (الانفطار ٨٢: ١٠-١٢) اور یقیناً تم پر حفاظت کرنے والے مقرر ہیں معزز لکھ لینے والے جو تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں۔

حفاظتِ اعمال کا قانون: اور یہ جو فرمایا لہ معقبات من بین یدیہ ومن خلفہ یحفظونہ من امر اللہ (الرعد ١٣-١١) تو اس سے بھی مراد یہی اعمال کی حفاظت کرنے والے ملائکہ ہیں۔ اور یحفظونہ اس لیے فرمایا کہ یہی چیز انسان میں سے حفاظت کے قابل ہے کیونکہ اسی سے انسان کی دوسری زندگی یا زندگی بعد الموت پیدا ہوتی ہے۔ ایسا ہی فرمایا قد علمنا ما تنقص الارض منھم وعندنا کتاب حفیظ (ق ٥٠-٤) یعنی جو چیز زمین ان سے کم کرتی ہے اس کو ہم جانتے ہیں اور ہمارے پاس کتاب ہے جو محفوظ رکھ لیتی ہے، یعنی جو حفاظت کے قابل چیز ہے وہ محفوظ رکھ لی جاتی ہے اور اجزائے زمینی زمین میں مل جاتے ہیں۔ اس حفاظت اعمال کو بتانے کی غرض یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کی اصلاح کرے اور جو کام کرے یہ سمجھ کر کرے کہ اس کا ایک نتیجہ بھی پیدا ہوگا جسے وہ دیکھ کر رہے گا۔

توفی میں جسم نہیں لیا جا سکتا: توفتہ رسلنا۔ رسول یا بھیجے ہوئے یہاں وہ ملائکہ ہیں جو ارواح کو قبض کرتے ہیں۔ اگر توفی کے معنی جسم کو لینے کے ہوتے، تو یہاں الفاظ چاہئے ہیں کہ وہی معنی لیے جاتے کیونکہ یہاں نہ صرف خدا انسان کو پورا لینے کے لیے اپنے رسولوں کو بھیجتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ساتھ کہہ دیا کہ وہ کوئی کمی نہیں کرتے یعنی کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑتے جو لینے کے قابل ہو۔ پس اگر توفی میں جسم خاکی بھی کبھی لینے کے قابل ہوتا تو سب انسانوں کے جسم خاکی بھی ملک الموت کو ساتھ لے جانے چاہئیں ثم ردّوا الی اللہ (پھر اللہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں) اگلی آیت میں بھی قابل غور ہے۔ حالانکہ جسم خدا کی طرف نہیں لوٹائے جاتے بلکہ ارواح لوٹائی جاتی ہیں۔

٩٥٧ ظلمات سے مراد یہاں شدائد ہیں یعنی مشکلات، یومٌ مُظْلِمٌ اس دن کو کہتے ہیں جس میں بڑی تکالیف پیش آئیں (ل)

تضرعاً۔ حالت عاجزی میں چونکہ انسان بے بس ہو کر گڑگڑاتا ہے اس لیے مراد علی الاعلان پکارنا ہے یعنی بلند آواز سے۔ اور آخرت سے دنیا کے عذاب کی طرف مضمون کو منتقل کر کے سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف بندہ کی اصلاح چاہتا ہے۔ چنانچہ جب اس دنیا میں انسان پر دکھ آتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس تکلیف سے نجات عطا فرما دیتا ہے۔

٩٥٨ کرب شدید غم کو کرب کہتے ہیں اس کا اصل مفہوم زمین کو کھود کر الٹ پلٹ کرنا ہے پس ایسا غم جو نفس میں اس طرح ہیجان پیدا کرے کرب ہے (غ)

بتایا کہ اللہ تعالیٰ کا رحم اس قدر بڑا ہے کہ تم شرک کرتے کرتے بھی جب اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہو تو وہ تمہاری مصیبت کو دور کرتا ہے، مگر باوجود اس کے پھر جب تکلیف سے نکلتے ہو تو خدا کو چھوڑ دیتے ہو۔ اس مہذب زمانہ میں بھی یہی حال ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس وقت کے بت مال و دولت اور سلطنت ہیں۔ ان کی پرستش دلوں پر ایسی غالب ہے کہ اس کے سامنے خدا کا نام بھی بھول جاتا ہے۔ ہاں جب تکلیفیں انتہا کو پہنچتی ہیں تو خدا یاد آتا ہے۔

بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾

دیکھ ہم کس طرح باتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں ع۹۵۹

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٦٦﴾ؕ

اور تیری قوم نے اسے جھٹلا دیا، حالانکہ وہ حق ہے۔ کہہ میں تم پر داروغہ نہیں۔

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ز وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٧﴾

ہر ایک خبر کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم جان لو گے ع۹۶۰

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٨﴾

اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے، جو ہماری آیتوں کے متعلق بیہودہ باتیں کرتے ہیں تو اُن سے مُنہ پھیر لے۔ یہاں تک کہ اس کے سوائے کسی دوسری بات میں لگ جائیں اور اگر شیطان تجھے بھلا دے تو یاد آ جانے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ ع۹۶۱

ع۹۵۹ فوق اور تحت کے عذاب سے مراد: من فوقکم۔ او من تحت ارجلکم سے ایک مراد تو اوپر اور نیچے سے جیسے ہوائیں، آندھیوں یا زلزلوں غرق وغیرہ سے لی گئی ہے مگر زیادہ قرین قیاس ائمۃ السوء یعنی اعلیٰ اور سفلۃ الناس یعنی ادنیٰ طبقہ یعنی امرا یا ضعفاء ہیں (ج)۔ بعض وقت ایک قوم اس لیے ہلاک ہو جاتی ہے کہ اُن کا اعلیٰ طبقہ خراب ہو جاتا ہے، اور بعض وقت اس لیے کہ عوام الناس یا ادنیٰ طبقہ خراب ہو جاتا ہے، یا وہ لوگ جو کمزور سمجھے جاتے ہیں یعنی عوام الناس تو وہ بڑوں کو ہلاک کر دیتے ہیں جیسے بولشویک۔

یلبسکم شیعا۔ لبس کے معنی خلط ملط کر دینا ہیں یعنی باہم فساد ہو جائے۔

اعدائے اسلام میں باہم جنگ کا عذاب: اس آیت میں نبی کریم صلعم کے مخالفین کا ذکر ہے جو توحید الٰہی کو دنیا میں پھیلنے سے روکتے ہیں۔ مگر قرآن کریم چونکہ ہمیشہ کے لیے ہے اور اس کا پیغام توحید بھی دنیا میں ہمیشہ ہی پہنچتا رہے گا اور لوگ بھی اس کی مخالفت ہمیشہ ہی کرتے رہیں گے اس لیے آئندہ زمانہ کے مخالف بھی اس میں شامل ہیں۔ حدیث میں بعض قوموں کا ذکر آتا ہے جو آخری زمانہ میں اسلام کو مٹانا چاہیں گے، اور ان کے متعلق آتا ہے لایدان لاحد بقتالھم ان کے ساتھ جنگ کرنے کی مسلمانوں کو طاقت نہیں ہوگی، اس لیے ان کے لیے عذاب بھی اسی رنگ کا ہوگا کہ وہ خود باہم جنگ و جدال سے ایک دوسرے کو کمزور کر دیں اور قرآن کریم میں جو عیسائیوں کا ذکر آتا ہے والقینا بینھم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیامۃ (المائدۃ ۵-۶۴) وہ اسی کا موید ہے، یعنی باہم بغض و عداوت ان کے لیے عذاب کا رنگ اختیار کرے گا۔ آج اگر ایک طرف عالمگیر جنگ قرآن شریف کی اس پیشگوئی کو سچا ثابت کر رہی ہے، تو دوسری طرف بولشوزم کا خطرہ بھی یذیق بعضکم باس بعض کا نظارہ ہی پیش نظر کر رہا ہے۔ ہاں چونکہ قرآن کریم کے ہر بیان میں دوہری غرض ہے اسلیئے مسلمانوں کو بھی ضمناً سمجھا یا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدال نہ کریں ورنہ یہ ان کی کمزوری کا موجب ہو جائے گا۔

حدیث میں آتا ہے کہ اس امت کی ہلاکت کا موجب ان کا باہمی فساد ہوگا۔ ابوداؤد میں ہے لا یسلّط علیہم عدوّ من سوی انفسھم فیستبیح بیضتھم۔ یعنی ان کے اپنے لوگوں کے سوائے دوسرا کوئی دشمن ان پر مسلط نہ کرے گا جو ان کو بالکل نیست و نابود کر دے۔ بلکہ باہم جنگ و جدال سے ہلاک ہوں گے۔ مسلمانوں کی تاریخ پر جو شخص غور کرے گا وہ دیکھ لے گا کہ مسلمانوں کے باہمی فساد ہی ان کی ہلاکت کا موجب ہوئے ہیں

آنحضرت کے لیے سُرخ و سپید خزانوں کا وعدہ: اسی حدیث میں آتا ہے کہ مجھے دو خزانے دیئے گئے ہیں، ایک احمر یعنی سُرخ، اور ایک ابیض یعنی سپید۔ یہ سپید خزانہ ملنا ابھی باقی ہے آپ کے خزانے آپ کی امت ہی ہیں۔ اسلام کی پہلی ترقی مشرقی ممالک کی طرف رہی۔ اب مغربی ممالک میں اس کے ظہور کا وقت آیا ہے اور یہی سپید خزانہ ہے پس عذاب استیصال اللہ تعالیٰ نے اسلام کے پہلے دشمنوں پر بھی اسی رنگ کا بھیجا کہ ان کی شوکت ٹوٹ کر وہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ اور پچھلے مخالفوں کے لیے بھی ایسا ہی مقدر معلوم ہوتا ہے۔

ع۹۶۰ مستقر۔ قَرّ کے معنی ہیں ایسا ٹھہر گیا کہ وہاں سے ہلا نہیں۔ کیونکہ قُرّ ٹھنڈک کو کہتے ہیں جو سکون کو چاہتی ہے جس طرح گرمی حرکت کو چاہتی ہے اسی سے قُرّۃ عین ہے۔ آنکھ کی ٹھنڈک اور زمین کو قرار اس لحاظ سے کہا ہے کہ وہ انسان کے لیے استقرار کی جگہ ہے (غ)، اور مستقر استقرار کی جگہ ہے اور یہاں مراد وقت استقرار و وقوع ہے۔ مراد یہ ہے کہ پیشگوئی تو پوری ہو کر رہے گی مگر اپنے وقت پر۔

ع۹۶۱ خوض کے لیے دیکھو ع۴۷۹۔ مجلس استہزا میں شمولیت سے روکنے کی وجہ غیرت دینی ہے: یہاں مخاطب رسول اللہ صلعم نہیں ہیں بلکہ ہر ایک مسلمان سامع ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے اس لیے روکا ہے کہ ان کی صحبت کے اثر سے متاثر ہو جائے گا۔ اور دین کی عظمت دل سے نکل جائے گی۔ (دیکھو ع۴۷۹) جہاں منافقوں

وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ	اور ان لوگوں پر جو تقوٰے اختیار کرتے ہیں ان کے حساب میں سے کچھ
شَيْءٍ وَلَٰكِنْ ذِكْرَىٰ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿٦٩﴾	(ذمّہ واری) نہیں لیکن یہ نصیحت ہے تا کہ وہ بچیں ۹۶۲
وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا	اور ان لوگوں کو چھوڑ دے جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور بے حقیقت
وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهِ	تماشا بنا رکھا ہے اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈالا ہوا ہے اور
أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا	اس (قرآن) کے ساتھ نصیحت کر کہ کوئی جان اس کی وجہ سے جو اس نے کمایا ہلاک
مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ وَإِنْ	(نہ) کی جائے اس کے لیے اللہ کے سوائے کوئی دوست نہیں اور نہ کوئی سفارش
تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَا يُؤْخَذْ مِنْهَا أُولَٰئِكَ	کرنے والا۔ اور اگر ہر ایک قسم کا بدلہ دینا چاہے تو اس سے نہ لیا جائے گا۔
الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا لَهُمْ شَرَابٌ	یہ وہ ہیں جو اس کی وجہ سے جو انھوں نے کمایا ہلاک کیے گئے اُن
مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا	کے لیے کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب ہوگا اس
كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٧٠﴾ ع	لیے کہ وہ کفر کرتے تھے ۹۶۳
قُلْ أَنَدْعُو مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا	کہہ، کیا ہم اللہ کے سوائے اسے پکاریں جو ہم کو نفع نہیں دیتا اور
وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلَىٰ أَعْقَابِنَا بَعْدَ إِذْ	نہ ہی ہم کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور کیا ہم اپنی ایڑیوں پر لوٹائے جائیں
هَدَانَا اللَّهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِينُ	اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں سیدھا رستہ دکھایا اس شخص کی طرح جسے شیطانوں نے
فِي الْأَرْضِ حَيْرَانَ لَهُ أَصْحَابٌ يَدْعُونَهُ	زمین کے اندر حیران بنا کر خواہشات کی پیروی میں لگا دیا اس کے ساتھی ہوں جو
إِلَى الْهُدَى ائْتِنَا قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ	اس کو ہدایت کی طرف بلاتے ہوں کہ ہمارے پاس آجا۔ کہہ اللہ کی ہدایت وہی

کے ذکر میں پھر اس سے روکا ہے۔ قرآن کریم کی ہر ایک تعلیم اعلیٰ درجہ کے اعتدال پر مبنی ہے۔ تنگدل لوگوں کی طرح عام اصول نہیں بنا دیا کہ فلاں قوم چونکہ تمہاری مخالف ہے اس لیے ان کے پاس مت بیٹھو، ان سے بات چیت نہ کرو نہ ہی افراط کا پہلو اختیار کیا ہے کہ صحبت بد کے اثر کی پرواہی کوئی نہ کی ہوتی۔ صورت اول میں دنیا کے کاروبار رک جاتے، صورت ثانی میں لوگ اپنے اخلاق اور روحانیت کو تباہ کر بیٹھتے۔ اس لیے فرمایا کہ مل کر بیٹھنے باتیں کرنے کی ضرورتیں تو ناگزیر ہیں مگر ایسا نہ ہو کہ ایسی صحبتوں کو عام کرتے کرتے یہاں تک نوبت پہنچے کہ مذہبی بے غیرتی کو قبول کر لو۔ اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر علانیہ ہنسی ہو رہی ہو تو ایسی مجلسوں میں بھی شریک رہو۔ اس خاص بات کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ روحانیت کو ایک بدیہی نقصان پہنچانے والی چیز ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب انسان اپنے اخلاق اور روحانیت کو کھلا نقصان پہنچتا دیکھے تو ایسی صحبت کو ترک کرے۔ آج کل کی بیشتر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی مجالس بھی اس نقصان سے خالی نہیں۔ بوجہ ناواقفیت دین کے یہ لوگ بجائے کوئی مفید گفتگو کرنے کے ایسی باتوں میں لگے رہتے ہیں جن کا اثر دین کو نقصان ہے۔ کسی کی غیبت، کسی کی عیب جوئی کچھ ہنسی ٹھٹھا ہوتا ہے۔ پھر رات کو بہت دیر تک یہ مجالس گرم رہتی ہیں۔ نماز سے محروم رہتے ہیں۔ صبح دیر سے اٹھتے ہیں۔ دین و دنیا دونوں کو برباد کرتے ہیں۔

۹۶۲ یہاں بتایا کہ ساتھ بیٹھنے سے یہ تو نہیں کہ انسان ان کے افعال کا ذمہ دار ہو جاتا ہے، بلکہ یہ ایک نصیحت ہے تا کہ مسلمان خود ان کے اثر بد سے بچتے رہیں۔ یا مراد یہ ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے پاس خاطر سے وہ لوگ بھی دین کے ساتھ استہزا کرنے سے بچ جائیں گے۔

۹۶۳ تُبسل۔ بَسل کے معنی کسی چیز کا روک دینا ہیں، اور یہاں مراد ثواب سے محروم کر دینا ہیں (غ) حرام اور بسل میں فرق یہ ہے کہ حرام وہ ممنوع ہے جو حکم سے ہو، یعنی یہ کہہ دیا جائے کہ یہ چیز مت کھاؤ، یا قہر سے کہ اس سے جبراً روک دیا جائے۔ گویا یہ عام ہے اور بَسل خاص ہے یعنی جس سے قہراً روک دیا جائے (غ)

حمیم۔ سخت گرم یا کھولتے ہوئے پانی کو کہتے ہیں۔ اور حَمّام مشہور ہے اور حمیم دوست کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ دوست کی وجہ سے خشمناک ہوتا ہے اور حُمّٰی بخار کو کہتے ہیں (غ)

ہم صحبتوں کو نصیحت کی ضرورت: یہاں یہ بتایا کہ یہ کافی نہیں کہ ایسے ہم نشینوں سے ہی بچے جو دین سے استہزا کرتے ہیں، بلکہ جن کے پاس بیٹھے ان کو نصیحت بھی کرتا رہے۔ بہ میں ضمیر قرآن شریف کی طرف ہی جاتی ہے۔ اور نصیحت کا پیرایہ یہ بتایا کہ اپنے آپ کو ثواب یعنی اعلیٰ مقامات سے محروم کر لینا اچھا نہیں۔

هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾
وَ اَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ وَ هُوَ
الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾

(کامل) ہدایت ہے اور ہمکو حکم دیا گیا ہے کہ ہم جہانوں کے پروردگار کی فرمانبرداری کریں ۹۶۴
اور کہ نماز کو قائم کرو اور اس کا تقوٰے اختیار کرو اور وہی ہے جس کی
طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے۔

وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ
بِالْحَقِّ ؕ وَ يَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ۬ قَوْلُهُ
الْحَقُّ ؕ وَ لَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ
عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۷۳﴾

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا
اور جس دن کہے گا کہ ہو، تو وہ ہو جائے گا ۹۶۵ اس کا فرمانا
حق ہے۔ اور اسی کے لیے بادشاہت ہے، جس دن صور میں
پھونکا جائیگا ۹۶۶ ۔ وہ غیب و ظاہر کا جاننے والا اور وہ حکمت والا خبردار ہے۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ
اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ
فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۴﴾

اور جب ابراہیم نے اپنے بزرگ آزر کو کہا کیا تو بتوں کو معبود بناتا ہے
میں تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں
دیکھتا ہوں ۹۶۷

ع ۹۶۴ استہوت۔ اس کا مادہ ھویٰ ہے، جس کے معنی نفس کا شہوات کی طرف میلان ہے۔ اور ھُوِیّ کے معنی سقوط من عُلُوٍ الی سُفلٍ ہیں یعنی بلندی سے پستی کیطرف گرنا (غ) گویا شہوات کی طرف میلان بلندی سے پستی کی طرف گرنا ہے۔ استہوتہ کے معنی راغب نے کیے ہیں حَمَلَتْہُ علیٰ اتباع الھَویٰ یعنی اس کو خواہشات کی پیروی پر لگا دیا۔ اور دوسرے معنی کے لحاظ سے بلند مقام سے گرا دینا بھی معنی ہو سکتے ہیں، ماحصل ایک ہے۔ ھویٰ کے دوسرے معنی کے لیے دیکھو ع ۱۶۵۹۔

حَیْران۔ حَارَ یحار سے ہے جس کے معنی ہیں متردد ہُوا۔ پس حیران جو متردد ہو یعنی نہ ادھر کا نہ ادھر کا۔

خدا کی فرمانبرداری کے خلاف دوسری حالت خواہشات کی پیروی ہے۔ یہاں بتایا ہے کہ ایک مسلمان اگر اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی اتباع کرے، تو اس کی مثال اس شخص کی ہے جو شیاطین کے پیچھے لگ کر ایسا بھٹک جائے کہ پھر اسے رستہ نہ ملتا ہو۔ اور یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری میں انسان کے قلب کو اطمینان ملتا ہے مگر خواہشات کی پیروی میں ایک تردد اور اضطراب اس کے لاحق حال رہتا ہے۔ کبھی ایک طرف جھکتا ہے کبھی دوسری طرف اور یوں ایک بلند مقام سے گر کر ذلیل حالت میں آجاتا ہے اور اصحاب جو اسے بلاتے ہیں وہ اس کے پہلے ساتھی ہیں۔

ع ۹۶۵ یوم یقول کن فیکون۔ اس میں اشارہ بعث بعد الموت کی طرف ہے۔ آسمان اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا یعنی کسی غرض کے لیے، پس اسی غرض کے لیے جو تکمیل نفس انسانی ہے جو خلاصہ موجودات ہے۔ یہ ضروری ہوا کہ اس عالم کی کمی کو اس عالم میں پورا کیا جائے، اور اعمال انسانی سے انسان کو پیدا کرنا اس کے لیے مشکل نہیں جس نے پہلے اتنی مخلوق پیدا کی۔

ع ۹۶۶ صُوْر کے عام معنی قَرن یا سینگ کے ہیں جیسے بگل۔ لیکن لسان العرب میں صُوْر کو صُوْرَۃ کی جمع بھی قرار دیا ہے۔ اور قتادہ اور حسن کی قرأت بجائے صُوْر کے صُوَر ہے جو صُوْرَۃ کی عام جمع ہے۔ اس پر دونوں طرح اعتراض کیا گیا ہے یہ کہ صُوَر قرأت درست نہیں۔ دوسرے یہ کہ صورۃ کی جمع صُوْر غلطی ہے۔ مگر دوسری قرأت صریحًا منقول ہے اور صُوْر صُوْرَۃ کی جمع لسان العرب میں مسلّم ہے اور ابو عبیدہ نے بھی یہ کہا ہے اور جوہری نے کلبی سے یہ کہا ہے، ہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ حدیث میں صُوْر کی جگہ قَرن کا لفظ بھی آتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ نفخ فی الصور یا نفخ فی القرن سے سچ مچ کا سینگ مراد لینا بھی درست نہیں۔ ایسے الفاظ جو قیامت کے متعلق بولے گئے ہیں ان کی صحیح حقیقت کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں۔ صُوْر یا قَرن میں نفخ کرنے والے ملائکہ ہونگے، اور ملائکہ کا قرن بھی کسی اور رنگ کی شے ہی ہوگی نہ وہ سینگ جس کے ذریعہ سے انسان بگل بجاتے ہیں۔ اور اصل یہ ہے کہ مراد تو نفخ فی الصور سے حشر ہے نہ کچھ اور، بگل بھی جمع کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے۔ پس نفخ فی الصور سے اصل مراد صرف حشر یا اکٹھا کرنا ہی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ حشر جیسا کہ قرآن شریف کے متعدد مقامات سے ظاہر ہوتا ہے ارواح کا صورتوں میں پھونکا جانا ہے پس قرآن کریم نے ایسا لفظ اختیار کیا ہے جو دونوں مفہوموں پر حاوی ہے اور یہ دوسرے معنی پہلے معنی کے کسی طرح منافی نہیں۔

ع ۹۶۷ اب۔ ہر شخص کو جو کسی کے وجود میں لانے یا اس کی اصلاح یا اس کے ظہور کا سبب ہو اَب کہا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے معنی باپ بھی آتے ہیں، اور چچا، دادا، دیگر بزرگوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور معلّم پر بھی۔ وجدنا اٰباءنا علیٰ امۃ میں اٰبانا سے مراد علماء لیے گئے ہیں۔ جنھوں نے ان کی علم سے ربوبیت کی کیونکہ دوسری جگہ ہے انا اطعنا سادتنا وکبرأنا (غ)

مذہب توحید کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کیا ہے کیونکہ آپ سے موحدین کی ایک عظیم الشان نسل چلتی ہے جو دنیا میں معلم توحید ہوئی ہے اور یہ انبیاء میں آپ کا فخر ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾

اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہت دکھاتے رہے اور تا کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو[۹۶۸]

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿۷۶﴾

سو جب اس پر رات چھا گئی، اس نے ستارہ دیکھا۔ کہا، کیا یہ میرا رب ہے؟ سو جب وہ ڈوب گیا، کہا، میں ڈوب جانیوالوں سے محبت نہیں رکھتا[۹۶۹]

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿۷۷﴾

پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا۔ کہا، کیا یہ میرا رب ہے؟ سو جب وہ ڈوب گیا۔ کہا، اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی ہوتی تو میں یقیناً گمراہ لوگوں میں سے ہو جاتا۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾

پھر جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا۔ کہا، کیا یہ میرا رب ہے؟ یہ سب سے بڑا ہے — پھر جب وہ ڈوب گیا۔ کہا اے میری قوم میں اس سے بری ہوں جو تم شریک بناتے ہو[۹۷۰]

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ

میں نے یکسو ہو کر اپنا مُنہ اس کی طرف کیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین

آزر کون تھا: آزر کو ابراہیم کا اَب کہا ہے۔ آیا مراد اس سے باپ ہے یا کوئی اور بزرگ؟ اس میں شک نہیں کہ پہلے خیال اسی طرف جاتا ہے کہ وہ آپ کے والد ہوں۔ اس کے خلاف ایک تو یہ امر ہے کہ توریت میں حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام تارح لکھا ہے، اور پھر عرب کے نسّاب بھی اس پر متفق ہیں اور زرقانی نے بھی تارح ہی لکھا ہے۔ مگر اس کا جواب تو یہ ہے کہ عربی میں آکر نام کی صورت بدل جاتی ہے۔ اور علاوہ ازیں یوسیبئس ایک یہودی مورخ نے تارح کو آتھر لکھا ہے جو آزر سے بالکل ملتا ہے، لیکن دوسری دِقّت یہ ہے کہ خود قرآن کریم سے اس کے خلاف شہادت ملتی ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام آزر ہو۔ کیونکہ سورۃ ابراہیم میں یہ صاف ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم نے بڑھاپے میں یہ دعا کی ربنا اغفر لی ولوالدیّ وللمؤمنین یوم یقوم الحساب اے ہمارے رب میری حفاظت فرما اور میرے ماں باپ کی اور مومنوں کی جس دن حساب ہو (ابراہیم: ۴۱) حالانکہ اس اَب کے متعلق ہے وما کان استغفار ابراھیم لابیه الّا عن موعدة وعدھا ایاہ فلمّا تبیّن له انه عدو للّٰه تبرّا منه (التوبۃ ۹-۱۱۴) اور ابراہیم کا اپنے اب کے لیے استغفار صرف ایک وعدہ کے سبب سے تھا جو اس سے کیا تھا۔ پھر جب اس پر کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اس سے بریت کی۔ پس اس اب کے لیے بڑھاپے میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام مغفرت کی دعا نہ کر سکتے تھے۔ پس آزر حضرت ابراہیم کے والد نہ تھے کوئی اور بزرگ تھے۔

ع۹۶۸ انبیاء کے لیے نورِ عقل کی ہدایت: یہ بتایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ابتداء سے ہی شرک وغیرہ معاصی سے پاک ہوتے ہیں۔ اور قبل از وحی قانونِ قدرت کا مطالعہ بھی ان کو حق کی طرف لے جاتا ہے۔ ان کی فطرت صحیح ہوتی ہے۔ ان کا نور قلب دھندلا نہیں ہوتا ان کی عقل ٹھوکر نہیں کھاتی ان کا فکر ان کو صحیح نتائج پر پہنچاتا ہے۔

ع۹۶۹ ھذا ربی۔ موقنین میں سے تو ابراہیمؑ پہلے ہی ہو چکے ہیں اور بُت پرستی سے، شرک سے بیزار۔ بلکہ دوسروں کے شرک پر تعجب کرتے ہیں اتتخذ اصناما الھة۔ اس لیے وہ ستارہ کو دیکھ کر کبھی دل میں یہ وہم بھی نہیں لا سکتے کہ وہ ان کا رب ہے۔ اگلی دو آیات کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ ان کا اپنی قوم کے ساتھ مباحثہ ہو رہا ہے کیونکہ جب ان کی قوم کا سب سے بڑا دیوتا سورج بھی ڈوب جاتا ہے، تو وہ صاف اس قوم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ مَیں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ اور پھر آگے صاف آتا ہے وتلك حجتنا اٰتینٰھا ابراھیم علٰی قومه۔ پس ھٰذا ربی استفہام انکاری ہے جس میں حرف استفہام محذوف ہے۔ جیسے موسٰی کے قول میں فرعون کے لیے وتلك نعمة تمنھا علیّ ان عبدت بنی اسرائیل جس کے معنی ہیں کیا یہ نعمت ہے؟ یا بطور استعجاب ہے۔

فلما افل۔ افول اجرام نورانی کے غائب ہونے پر بولا جاتا ہے، جیسے چاند ستارہ وغیرہ۔ ستارہ کے ڈوب جانے سے حضرت ابراہیمؑ قوم پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جو چیز کبھی سامنے آ جائے اور کبھی غائب ہو جائے وہ خود انسان کی طرح کسی قانون میں جکڑی ہوئی ہے اور معبود نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک جسمانی چیز ہے جو کبھی آنکھوں کے سامنے اور کبھی غائب ہے۔ انی لا احب الاٰفلین میں یہ اشارہ ہے کہ جس چیز سے تم محبّت کرتے ہو وہ خود بے اختیار ہے۔ خدا سے محبت کرنے سے تو ایسا تعلق اس ذات پاک سے پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر وہ اس انسان سے الگ نہیں ہوتا۔ مگر ایسی چیز سے محبّت کا کیا فائدہ جو خود قانون کے اندر اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ محبّت کرنے والا تڑپتا رہ جائے وہ غائب ہو جاتی ہے۔

ع۹۷۰ معلوم ہوا کہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا سورج تھا کیونکہ اس پر لا کر ختم کر دیا۔ ھٰذا اکبر میں جو ھٰذا ربی کی طرح استفہام انکاری ہے یہ بتا بھی دیا ہے یہی

وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾

کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ
وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ
بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّيْ
كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾

اور اُس کی قوم نے اس سے جھگڑا کیا، کہا، کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو اور اس نے مجھے یقیناً ہدایت کی ہے اور مَیں اس سے نہیں ڈرتا جس کو تم اس کے ساتھ شریک کرتے ہو ہاں یہ کہ میرا رب کچھ چاہے۔ میرے ربّ کا علم تمام چیزوں کو لیے ہوئے ہے پس کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے ۹۷۱

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ
اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ
عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ
وقف لازم بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾

اور مَیں کس طرح اِس سے ڈروں جس کو تم شریک بناتے ہو اور تم نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کے ساتھ اسے شریک بنایا ہے جس کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نہیں اتاری، پس دونوں گروہوں میں سے کون امن کا زیادہ حقدار ہے اگر تم جانتے ہو ۹۷۲

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ
ع ۹/۱۵ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، انہی کے لیے امن ہے اور وہ ہدایت پانے والے ہیں ۹۷۳

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ
نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾

اور یہ ہماری دلیل تھی، جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے خلاف دی، ہم جس کو چاہتے ہیں مرتبہ میں بلند کرتے ہیں تیرا رب حکمت والا جاننے والا ہے ۹۷۴

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ
وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ
دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى
وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾

اور ہم نے اس کو اسحٰقؑ اور یعقوبؑ دیئے، ہر ایک کو ہم نے ہدایت دی اور نوحؑ کو ہم نے پہلے سے ہدایت دی اور اس کی نسل سے داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ اور یوسفؑ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ کو (ہدایت دی) اور اسی طرح ہم احسان کرنیوالوں کو بدلہ دیتے ہیں ۹۷۵

وجہ ہے کہ البقرۃ ۲ - ۲۵۸ میں حضرت ابراہیمؑ نے سورج کو مغرب سے نکالنے کا مطالبہ کیا ہے۔

۹۷۱ جیسا کہ باطل پرستوں کا قاعدہ ہوتا ہے، جب ابراہیمؑ کے دلائل کا کوئی جواب بن نہیں آیا تو معلوم ہوتا ہے اس کو ڈرایا ہے کہ ہمارے دیوتا تمہیں نقصان پہنچائیں گے، اسی کا جواب دیا ہے کہ مجھے ان سے کچھ خوف نہیں۔ ہاں مشیت ربی کے ماتحت کوئی نقصان پہنچے تو پہنچے۔ اس سے مَیں گھبراتا بھی نہیں۔

۹۷۲ مالم ینزل بہ سُلطٰنا۔ کسی نبی کی تعلیم میں یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے شرک کا حکم دیا ہے، یا صرف یہ مراد ہے کہ کوئی عقلی دلیل شرک کی موجود نہیں۔

۹۷۳ ظلم کے مختلف معنی میں سے ایک شرک بھی ہیں۔ اور حدیث متفق علیہ سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ظلم کے معنی شرک بیان فرمائے اور قرآن کریم کی اس آیت سے بھی استدلال فرمایا ان الشرک لظلم عظیم (لقمان ۳۱ - ۱۳)، اور خود اس سورت کا مضمون بھی توحید ہی ہے۔ پس ایمان کے بعد اگر شرک کی ملونی نہ ہو تو انسان امن کو پالے گا ورنہ نہیں۔

۹۷۴ یہ دلیل جس کا یہاں ذکر ہے توحید الٰہی پر ہے جیسا کہ اوپر ذکر آچکا، اور اسی توحید پر قائم ہونے کو ہی بلندی درجات قرار دیا ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ توحید پر مضبوطی سے قائم ہو جانا تمام نیکیوں کی جڑ ہے اور اسی سے مراتب بلند ہوتے ہیں۔

۹۷۵ یہاں ہدایت دینے سے مراد توحید الٰہی پر قائم کرنا ہے، ذریتہ میں ضمیر حضرت ابراہیمؑ کی طرف بھی جا سکتی ہے، مگر اولیٰ حضرت نوحؑ کی طرف پھیرنا ہے، اور قریب تر بھی نوحؑ ہی ہیں اور لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت سے نہیں۔

وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ ۸۵

اور زکریاؑ اور یحییٰؑ اور عیسےٰؑ اور الیاسؑ کو، (یہ) سب صالحین میں سے تھے۔

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ وَ لُوْطًا ؕ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ ۸۶

اور اسمٰعیلؑ اور الیسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ۔ اور (ان) سب کو ہم نے قوموں پر فضیلت دی ع۹۷۶

وَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ ۚ وَ اجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۸۷

اور ان کے باپ دادوں میں سے اور ان کی نسل سے اور انکے بھائیوں سے اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ہمنے ان کو سیدھی راہ کی طرف ہدایت دی۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۸۸

یہ اللہ کی ہدایت ہے اس کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کے وہ عمل ان کے کام نہ آتے جو وہ کرتے تھے ع۹۷۷

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ

یہ وہ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت دی ع۹۷۸ سو اگر یہ لوگ اس کا انکار کریں، تو ہم نے اس کو ایسے لوگوں کے

ع۹۷۶ بعض انبیاء کے ناموں کو اکٹھا کرنے کی وجہ اور غیر تاریخی ترتیب میں حکمت: ان آیات میں اٹھارہ انبیاء کے نام لیے ہیں۔ یعنی اول ابراہیمؑ پھر آپ کا بیٹا اسحاقؑ پھر اسحاقؑ کا بیٹا یعقوبؑ پھر ابراہیمؑ کے جدّ نوحؑ جن کی ذریت کا آگے ذکر کیا ہے۔ یہاں تک تو ایک ترتیب ہے مگر اس سے آگے بلحاظ زمانہ کوئی ترتیب نہیں رکھی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے زمانوں کی ترتیب کی خبر نہ تھی، کیونکہ اس سے اگلی ہی سورت میں نہایت صفائی سے انبیاء کا ذکر ترتیب تاریخی میں کیا ہے۔ بلکہ یہاں ایک اور رنگ کی ترتیب دی ہے یعنی اول ظاہری شوکت کے لحاظ سے داؤدؑ اور سلیمانؑ کا ذکر کیا۔ جن کو عظیم الشان بادشاہتوں کا مالک بنایا گیا۔ پھر دکھوں اور تکلیفوں میں صبر کے بلند مقام کے لحاظ سے ایوبؑ اور یوسفؑ کا ذکر کیا۔ ان دونوں کو صبر کے بعد اللہ تعالیٰ نے بلند مقام پر پہنچایا۔ پھر قوم کو نہایت ذلت کی حالت سے نکال کر اعلیٰ مقام پر پہنچانے کے لحاظ سے، اور قوم کو ایک قانون اور راہ بتانے کے لحاظ سے موسیٰؑ اور ہارونؑ کا ذکر کیا۔ یہ چھ نبی ایسے ہیں کہ کسی نہ کسی رنگ میں ان کو بادشاہت یا سرداری یا حکومت ملی ہے، اس لیے ان کے بعد نجزی المحسنین کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کے بعد زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ، الیاسؑ کا ذکر کر کے ان کو صرف صالحین کہنے پر اکتفا کیا ہے یعنی ان کے صرف ایک پہلو زہد کامل کی طرف توجہ دلائی ہے، اس لیے کہ دنیا میں ان کو کوئی حکومت کا رنگ نہیں ملا۔ زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ کا ایک ہی زمانہ اور ایک ہی رنگ، سادگی، زہد، عبادت کا ظاہر ہے۔ الیاس کا اسی رنگ میں آنا خود اس سے ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰ کی آمد کو الیاسؑ کی آمد ثانی قرار دیا گیا۔ اور اس بات کی شہادت انجیل میں موجود ہے کہ یحییٰ الیاسؑ کے رنگ اور اس کی روح میں آیا (لوقا ۱-۱۷)۔ پھر اس کے بعد اسمٰعیلؑ اور الیسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ کا ذکر کر کے ان کی فضیلت کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ ان چاروں کی تحقیر کی گئی ہے۔ جیسے حضرت اسمٰعیلؑ کی تو نبوت سے ہی انکار کیا گیا ہے اور ان کو کسی ابراہیمی وعدہ کا وارث نہیں سمجھا جاتا، اور لوط کی بھی نبوت کا انکار کیا جاتا ہے، اور یونسؑ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ خدا کے حضور سے بھاگ گئے تھے۔ ان کی فضیلت کا خصوصیت سے اس لیے ذکر کیا کہ ان کی تحقیر ہوئی ورنہ دوسرے انبیاء کو بھی فضیلت دی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح قرآن شریف ایک الزام کو دُور کرنے کے لیے ایک نبی کے متعلق بعض تعریفی الفاظ بیان کرتا ہے۔ اسی اصول کو نہ سمجھنے سے عیسائیوں نے یہ ٹھوکر کھائی ہے کہ حضرت مسیحؑ کے متعلق تعریفی کلمات سے ان کی دوسرے انبیاء پر فضیلت ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ مراد صرف الزامات کا دور کرنا تھا۔ اس طرح ظاہر الفاظ پر جائیں تو یہاں سے ان چار انبیاء کی دیگر سب انبیاء پر اور مسیحؑ پر فضیلت مانیں۔

ع۹۷۷ یہاں ہدایت کا مقابلہ شرک سے کر کے صاف بتایا کہ ہدایت دینے سے مراد توحید پر قائم کرنا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی نبی شرک کا مرتکب نہیں ہوا کیونکہ کسی کا حبط عمل نہیں ہوا۔ اور جتنے اس قسم کے قصے بن گئے ہیں وہ سب بائبل میں تحریف ہے۔

ع۹۷۸ باوجود اس کے کہ بعض کو بادشاہت ملی بعض کو نہیں، ایک امر میں ان سب کا اشتراک بیان فرمایا ہے کہ ان سب کو کتاب اور حکم اور نبوت ضرور ملے ہیں۔ کتاب وہ وحی ہے جو نبی پر اس کی امت کی ہدایت کے لیے نازل ہوتی ہے، حکم وہ اختیار ہے جو نبی کو دیا جاتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کا مطیع نہیں ہوتا، بلکہ دوسروں کو اپنی اطاعت کی طرف بلاتا ہے جو اس کی اُمّت کہلاتے ہیں۔ اور نبوت بلحاظ لغت وہ پیشگوئیاں ہیں جو اس کو دین کی تائید کیلئے دی جاتی ہیں اور بااس سے مراد یہاں سفارت ہے (ع۹۱) اور گو کتاب اور حکم نبوت میں شامل ہیں مگر ان دو خاص باتوں کا ذکر اس لیے کیا تا معلوم ہو جائے کہ منصب نبوت کی یہ ضروری شرائط ہیں یعنی ایک کتاب کا دیا جانا، دوسرا حکم یا اختیار کا دیا جانا۔

وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾
أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ
اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ؕ
ع إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٠﴾
وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ إِذْ قَالُوْا
مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ
مَنْ أَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى
نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ
تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ
تَعْلَمُوْٓا أَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ
ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٩١﴾

سپرد کیا ہے جو اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں [979]
یہ وہ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ، سو ان کی ہدایت کی پیروی کر ۔ کہہ میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا ۔ وہ صرف جہانوں کے لیے نصیحت ہے [980]
اور انھوں نے اللہ کو نہیں پہچانا (جس طرح) اس کے پہچاننے کا حق (تھا) جب یہ کہا کہ اللہ نے انسان پر کچھ نہیں اتارا ۔ کہہ ، کس نے وہ کتاب اتاری ، جو موسیٰؑ لایا ۔ لوگوں کے لیے نور اور ہدایت تھی ، تم اس کو ورق ورق کرتے ہو ۔ اس (کے ایک حصّہ) کو ظاہر کرتے ہو اور بہت سا چھپاتے ہو اور تمھیں وہ باتیں سکھائی گئیں جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمھارے باپ دادا ۔ کہہ ، اللہ ہی نے (اتارے) پھر ان کو چھوڑ دے اپنی بیہودہ بکواس میں کھیلتے رہیں ۔[981]

ع۹۷۹ ھٰؤلاء میں اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو ان انبیاء کے اتباع کہلاتے ہیں ۔ جیسے یہود و نصاریٰ ۔ دوسری قوم آنحضرت صلعم کے اتباع کی ہے جو سب انبیاء پر ایمان لاتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ جو انبیاء کے پیرو کہلاتے ہیں اور ضرورت نبوت سے واقف ہیں نہ مانیں ، تو ہم ایک اُمّی قوم کو وہ علوم دے کر کھڑا کر دیں گے یہاں سے صاف معلوم ہوا کہ یہاں انبیاء کے ذکر کے بعد اہل کتاب سے خطاب ہے آیت ۹۲ و ۹۳ میں اس خطاب کو واضح کر دیا ہے ۔

ع۹۸۰ اقتدہ میں ھا تسکیت کے لیے ہے اور اقتدا پیروی کو کہتے ہیں یعنی جس نمونہ پر ایک انسان پہلے چلا ہے اسی پر چلنا ۔
آنحضرت صلعم کو یہ ارشاد کہ تم ان انبیاء کی ہدایت کی اقتدا کرو اس سے کیا مراد ہے ، ظاہر ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے اللہ تعالیٰ وہ ہدایت تو خود آنحضرت صلعم کو دے چکا یعنی اپنی وحی سے دے چکا ، اور مزید برآں ان انبیاء کی کوئی کتابیں دنیا میں موجود نہ تھیں کہ ان کو پڑھ کر عمل کرنے کی ہدایت ہوتی ، اور جو کچھ ان کی تعلیم باقی رہ گئی وہ خود ظنیات میں سے تھی ۔ پس ان کی ہدایت کے اقتدا سے مراد صرف ان کے طریق کی موافقت ہے ، اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح توحید کے قائم کرنے میں انہوں نے مشکلات کا مقابلہ کیا اسی طرح تم بھی صبر سے اس کام کو کرو ۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ الفاظ قل لا اسئلکم علیہ اجرا بتاتے ہیں کہ یہاں مراد پیغام توحید کا پہنچانا ہے ۔ ہاں ان الفاظ میں ایک اور اشارہ معلوم ہوتا ہے ۔ ہدایت کے معنی منزل مقصود تک پہنچانا ہیں یعنی کمال انسانی کو حاصل کرنا ۔ اب اس رکوع کی سب سے پہلی آیت میں توحید الٰہی کو ہر قسم کی بلندئ درجات کا اصل موجب ٹھہرایا تھا اور فی الحقیقت مختلف قسم کے کمالات انسانی توحید کے مختلف پہلوؤں سے ہی پیدا ہوتے ہیں ۔ پس کسی نبی کی ہدایت اس کا ایک خاص کمال انسانی کو حاصل کرنا ہے ۔ کسی کمال انسانی کو ابراہیمؑ اپنے اندر لیتے ہیں ، تو کسی کو موسیٰؑ ، کسی کو ہارونؑ ، کسی کو داؤدؑ ، کسی کو سلیمان ، کسی کو عیسےٰ ، کسی کو یحییٰ ، کسی کو ایوبؑ ۔ وقس علیٰ ھذا ۔ پس فبھدٰھم اقتدہ کے معنی یہ ہوئے کہ جن جن کمالات کو ان انبیاء نے حاصل کیا ان تمام کمالات کو تم اکیلے اپنے اندر جمع کرو ۔ وہاں کوئی داؤد ہے ، کوئی سلیمانؑ ، کوئی ایوبؑ ، کوئی عیسیٰؑ وغیرہ تو جن کمالات انسانی کا اظہار کرنے کے لیے یہ الگ الگ نبی ہوئے ان تمام کمالات کو تم اکیلے اپنے اندر لو ۔ یہاں اقتداء سے مراد شرائع کی پیروی لینا بالکل غلط ہے ۔ ایسی پیروی کا حکم ہوتا تو پھر پہلے اللہ تعالیٰ ان تمام کی کتابوں کو تحریف سے پاک کرکے آپ کو دیتا ۔ اور آنحضرت صلعم کا عمل بھی یہ ثابت کرتا یعنی عملاً آپ پہلی شرائع کی باتوں کو لے کر ان پر اپنے دین کی بنیاد رکھتے مگر ایسا نہیں ہوا ۔ پس یہ معنی نبی کریم صلعم کے عمل کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ۔ آخری الفاظ میں قرآن شریف کو عالمین کے لیے نصیحت قرار دینا اسی معنی کی تائید کرتا ہے ، اور یا اولٰئک میں اشارہ اوپر والی قوم کی طرف ہے یعنی صحابہؓ کی طرف ۔ اور یہاں خطاب عام ہے یعنی اے مسلمانو تم صحابہ کا اقتدا کرو ۔ اور حدیث میں ہے اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم ۔ میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں جس کا اقتدا کرو گے ہدایت پالو گے ۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقتدا سے مراد صرف مطابقت ہے ۔

ع۹۸۱ قدروا اللہ ۔ قَدْر کے اصل معنی کسی چیز کی مقدار کا واضح کر دینا یا اس کا اندازہ کرنا ہیں ، اور یہاں مراد اس کا پہچاننا یا شناخت کرنا ہے (غ) بعض نے تعظیم کرنا یا وصف بیان کرنا بھی مراد لیا ہے غرض ایک ہی ہے ۔
قراطیس ۔ قرطاس کی جمع ہے جس کے معنی کاغذ ہیں ۔ قراطیس بنانے سے مراد ورق ورق کرنا یا ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے ۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ
الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى
وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا
اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ
وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ

اور یہ کتاب جسے ہم نے اتارا برکت دی گئی ہے اس کی تصدیق کرتی
ہوئی جو اس کے پہلے ہے تاکہ تو (اہل) مکہ کو ڈرائے اور ان کو
جو اس کے گرد ہیں — اور جو لوگ آخرت پر ایمان لاتے ہیں۔
اس پر (بھی) ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔۹۸۲
اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ افترا کرے۔
یا کہے میری طرف وحی کی گئی اور اس کی طرف کچھ وحی نہیں کی گئی۔
اور جو کہے، میں اس کی مثل اتار سکتا ہوں، جو اللہ نے اتارا۔۹۸۳

یہود کا انکار نبوت: پچھلے رکوع میں یہ ذکر تھا کہ سب انبیاء کا مذہب توحید تھا، اسی طرح محمد رسول اللہ کا مذہب ہے۔ بلکہ آپ سب کے کمالات کے جامع ہیں پس ان انبیاء کے پیرو کہلانے والوں کا رسول اللہ صلعم کا انکار کس قدر جائے تعجب ہے۔ مگر انہوں نے یعنی اہل کتاب نے انکار کیا بلکہ سرے سے ہی انکار کر کے کہدیا کہ اب کسی بشر پر کچھ بھی نہیں اترتا۔ ما انزل اللہ کا مطلب یہ نہیں کہ کبھی کچھ نہیں اتارا بلکہ یہ کہ اب کچھ نہیں اتارا۔ کیونکہ وہ دوسری شریعت کا انکار کرتے تھے۔ چنانچہ سدی کا قول ابن جریر میں منقول ہے کہ یہودی کہتے تھے ما انزل اللہ علی محمد من شیٔ ،اس کے جواب میں حضرت موسیٰ کی کتاب کی طرف توجہ دلائی جس میں صاف وعدہ ہے کہ ایک نبی موسیٰ کی مانند کھڑا کیا جائے گا، مگر ساتھ ہی فرمایا کہ تمہاری جو اس کے پیرو کہلاتے ہو اب یہ حالت ہے کہ تم نے اپنی کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے، ایک حصہ کو ظاہر کرتے ہو مگر بہت سی باتوں کو چھپاتے ہو یعنی ان کو عمل میں نہیں لاتے۔ اس کا جواب چونکہ ان کے پاس کوئی نہیں یعنی وجہ انکار کوئی نہیں، اس لیے آنحضرت صلعم کو ارشاد ہوا کہ تم کہو وہ اللہ تعالیٰ نے ہی اتاری تھی اور اسی کے وعدہ کے مطابق اب یہ کتاب اُترتی ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں اور تصریح کر دی کہ یہ اسی پہلی کتاب کی تصدیق کرتی ہے پس اس کا انکار کیونکر کر سکتے ہو۔ یہ آیات مدنی نہیں گو خطاب یہود سے ہے۔ جیسا کہ پچھلے رکوع میں بھی ان کا ذکر کیا ہے ان یکفر بہا ھٰؤلاء، جیسا کہ اسی سورت کی آیت ۲۰ میں ذکر ہے کہ اہل کتاب آنحضرت صلعم کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ ان متواتر خطابوں کے ایک ایسی سورت میں ہونے ہوئے جو بالاتفاق کلیۃً اور جملۃً واحدۃً مکہ میں نازل ہوئی یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوتا ہے کہ مکی سورتوں میں یہود یا اہل کتاب سے خطاب نہیں کیا سورۃ بنی اسرائیل مکی نہیں جس میں یہود سے خطاب ہے، یا سورہ مریم مکی نہیں جس میں عیسائیوں سے خطاب ہے۔

۹۸۲ مبارک۔ بَرْک کے اصل معنی کسی چیز کا لازم ہو جانا ہیں، اور بَرَکۃ کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کا مضبوطی سے قائم ہو جانا ہے۔ پس مبارک وہ ہے جس میں ایسی بھلائیاں ہوں (غ)، بالفاظ دیگر جس کی خیر لازم ہو جائے اور منقطع نہ ہو۔ اور درود شریف میں جو آتا ہے بارك علی محمد تو اس کے معنے کیے ہیں کہ اے اللہ جو تو نے محمد (صلعم) کو بزرگی اور کرامت عطا فرمائی ہے اسے ثابت اور دائم رکھ (ل)۔ اور ابن عباسؓ سے بَرَکۃ کے معنی الکثرۃ فی کل خیر مروی ہیں۔ یعنی ہر بھلائی میں کثرت، اور قرآن کریم کے لیے جو مبارك آتا ہے اس کے معنی کیے ہیں جس کی جانب سے خیر کثیر آتی رہتی ہے (ل)

اُمّ القریٰ۔ مکہ کا نام ہے اس لیے کہ زمین اس کے نیچے سے بچھائی گئی (غ) یعنی وہ زمین کا مرکز ہے۔ اور اس کے لفظی معنی بستیوں کی ماں ہیں۔ مگر صرف عرب کی بستیوں کی نہیں۔ ماں اس کو اس لیے کہا کہ ساری دنیا کے لیے روحانی غذا یہیں سے ملتی ہے اور پھر اسے کل اہل دنیا کا قبلہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ اور لوگ اس کی طرف اکٹھے ہوتے ہیں جیسے بچے ماں کی طرف، اور یوں بھی پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے اور نئی دنیا اس کے نیچے ہے۔ پس وہ معنی اپنے ظاہر میں بھی درست ہیں جو امام راغب نے کیے ہیں۔ یہاں ام القریٰ سے مراد اہل ام القریٰ ہیں۔

من حولہا۔ جب مکہ بستیوں کا مرکز ہوا تو ظاہر ہے کہ من حولہا میں کل دنیا آگئی۔

قرآن کی فضیلت دیگر کتب پر: یہاں اس کتاب کی مزید فضیلت کا ذکر کیا۔ اوّل یہ کہ وہ مبارک ہے یعنی اس کی خیر کبھی منقطع نہ ہو گی جس طرح پہلی کتابوں کی خیر منقطع ہو گئی۔ قرآن کریم کو توریت اور انجیل کے مقابل یا پہلی کتابوں کے مقابل پر مبارک کہنے سے منشا یہ ہے کہ اس کی برکات دائم رہیں گی، دوسرے وہ مصدّق ہے، تیسرے کل عالم کی طرف ہے جیسا کہ اُمّ القریٰ و من حولہا سے ظاہر ہے۔

یہ بھی بتا دیا کہ آخرت پر ایمان لانے والے اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ انکار صرف وہی کریں گے جو صرف دنیا پر جھکے ہوئے ہیں اور دنیا کی آلائشوں میں اس قدر مبتلا ہیں کہ کمال انسانی کے حصول کی طرف جو آخرت پر ایمان کی اصل غرض ہے، آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔

۹۸۳ یہ سب نبی کریم صلعم کے مختلف قسم کے مخالف ہیں۔ بعض شرک وغیرہ کے عقاید بناتے تھے، یا جیسے عیسائی جو اللہ تعالیٰ کی طرف ایک باطل تعلیم منسوب کرتے تھے اور یہ سب اللہ پر افترا تھا۔ بعض آپ کے مقابل پر جھوٹے مدعیانِ نبوت یا وحی تھے یا کہانت کرتے تھے۔ یا بعض جیسے نضر بن الحرث یہ کہتے تھے کہ ہم بھی قرآن جیسی وحی بنا سکتے ہیں۔ دوسری جگہ ان کا قول مذکور ہے لو نشاء لقلنا مثل ھٰذا (الانفال۔ ۳۱) اور یہ جو بعض مفسرین نے یہاں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کا نام لیا

وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذِ ٱلظَّٰلِمُونَ فِى غَمَرَٰتِ ٱلْمَوْتِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ بَاسِطُوٓا۟ أَيْدِيهِمْ ۚ أَخْرِجُوٓا۟ أَنفُسَكُمُ ۖ ٱلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ ٱلْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى ٱللَّهِ غَيْرَ ٱلْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ ءَايَٰتِهِۦ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿٩٣﴾

اور اگر تو دیکھے جب ظالم موت کی سختیوں میں ہوں، اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلا رہے ہوں۔ اپنی جانوں کو نکالو، آج تم کو رسوائی کا عذاب اس کے بدلے میں دیا جائے گا جو تم اللہ پر ناحق کہتے تھے، اور تم اس کی باتوں سے تکبر کرتے تھے ۹۸۴

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَٰدَىٰ كَمَا خَلَقْنَٰكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُورِكُمْ ۖ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ ٱلَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَٰٓؤُا۟ ۚ لَقَد تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ

ع وَضَلَّ عَنكُم مَّا كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٩٤﴾ ع

اور یقیناً تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو، جیسے ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا اور جو کچھ ہم نے تم کو عطا کیا تھا وہ تم اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے وہ سفارشی نہیں دیکھتے جو تم سمجھتے تھے کہ تمہارے بارے میں (ہمارے) شریک ہیں۔ یقیناً تمہارے تعلقات کٹ گئے اور وہ تم سے جاتا رہا جو تم جھوٹے دعوے کرتے تھے ۹۸۵

إِنَّ ٱللَّهَ فَالِقُ ٱلْحَبِّ وَٱلنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ ٱلْحَىَّ مِنَ ٱلْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ ٱلْمَيِّتِ مِنَ ٱلْحَىِّ ۚ ذَٰلِكُمُ ٱللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٩٥﴾

اللہ ہی دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے۔ زندہ کو مُردہ سے نکالتا رہتا ہے۔ اور مُردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔ یہی اللہ ہے پھر تم کہاں سے اُلٹے پھر جاتے ہو ۹۸۶

ہے کہ اس وحی کو لکھتے لکھتے ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین ...... ثم انشأنٰہ خلقاً اٰخر اس عجیب بیان کو سُن کر بول اُٹھا فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ اور یہی اگلی وحی کے الفاظ تھے جس پر وہ مرتد ہو گیا تو یہ روایت معتبر نہیں۔

۹۸۴ غمرات۔ غمر کے اصل معنی کسی شے کے اثر کو دور کرنا ہیں اور غَمْرۃ بہت سے پانی کو کہتے ہیں، جو اپنی جائے قرار کو ڈھانک لیتا ہے اور اسی سے غمرۃ جہالت کے معنی میں آتا ہے الذین ھم فی غمرۃ ساھون (الذاریٰت[51]۔ ۱۱) فذرھم فی غمرتھم (المؤمنون[23]۔ ۵۴) اور موت کے شداید کو بھی غمرات کہا جاتا ہے (غ)

اخرجوا انفسکم حکم کے طور پر نہیں بلکہ موت کی سختی کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ وہ دنیا سے اس قدر محبّت کرتے ہیں اور اپنے وقت کو ضائع کر دینے پر اس قدر متاسف ہوتے ہیں کہ نہیں چاہتے کہ ان کی جان نکلے۔ مسلم کو موت کے وقت یہ دُکھ نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ لقاء اللہ کا امیدوار ہوتا ہے۔

ع۹۸۵ فرادی۔ فرید اور فرد کی جمع ہے اور فرد وہ ہے جس کے ساتھ اس کا غیر نہ ملے لاتذرنی فرداً (الانبیاء[21]۔ ۸۹)

خوّلنا۔ خَوَل۔ مال یا مقبوضات کو کہتے ہیں اور تخویل کے معنی ہیں ان چیزوں کا عطا کرنا جنکے تعہد کا انسان محتاج ہے (غ)

تقطع بینکم کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں وقع التقطع بینکم یعنی تمہارے درمیان انقطاع واقع ہو گیا۔ اور یوں بھی تقطع وصلکم بینکم تمہارے درمیان جو ملاپ یا تعلق تھا وہ کٹ گیا۔

یہاں سمجھایا ہے کہ آخری ذمہ داری ہر انسان کی فرداً فرداً ہے۔ وہ مال و متاع جس کے بھروسہ پر انسان خدا کو چھوڑتا ہے سب یہیں رہ جاتا ہے اور اس وقت کوئی ساتھی ساتھ نہ ہو گا۔ بڑوں اور چھوٹوں میں جو تعلقات ہیں وہ بھی کٹ جائیں گے اور جن کی خاطر برائیاں کی تھیں وہ ساتھ نہ ہوں گے۔

ع۹۸۶ فلق۔ فَلْق کسی چیز کا پھاڑ دینا اور اس کے بعض کا بعض سے الگ کر دینا، اور فَلَق صبح کو بھی کہتے ہیں (غ)

الحب والنوٰی۔ حب اور حبّۃ گیہوں اور جو وغیرہ کے دانہ کو کہا جاتا ہے (غ) اور نَوٰی۔ نواۃ کی جمع ہے کھجور کی گٹھلی اور نوی کے معنی نیت بھی ہیں (ل)

تؤفکون۔ اِفک ہر ایک چیز جو اس حالت سے پھیری گئی ہو جس پر اسے ہونا چاہیئے تو فکون کے معنی ہوں گے۔ اعتقاد حق سے باطل کی طرف، اور سچائی سے جھوٹ کی طرف، اور اچھے افعال سے فعل قبیح کی طرف پھیرے جاتے (غ) اور لتا فکنا عن اٰلھتنا (الاحقاف[46]۔ ۲۲) وہ اپنے نقطۂ خیال سے کہتے ہیں اور اسی لیے اِفک جھوٹ کو کہا جاتا ہے۔ ان الذین جاءو بالافک (النور[24]۔ ۱۱) اسی سے افاک ہے افاک اثیم (الشعراء[26]۔ ۲۲۲)

اس رکوع میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے نظارے دکھا کر اس کی توحید کا اثبات کیا ہے، اور دوسری طرف ساتھ ساتھ ہی یہ بتایا ہے کہ وہ صداقت جو نبی کریم صلعم لائے ہیں ایک دانہ کی طرح نشوونما پاتے پاتے آخر کار دنیا میں غالب ہو گی۔ ایک ہی ترکیب لفظی میں دونوں خیالات کو ظاہر کرنا کمال بلاغت اور کمال علم پر

فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيۡلَ سَكَنًا وَّالشَّمۡسَ
وَالۡقَمَرَ حُسۡبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ ﴿۹۶﴾
وَهُوَ الَّذِىۡ جَعَلَ لَـكُمُ النُّجُوۡمَ لِتَهۡتَدُوۡا
بِهَا فِىۡ ظُلُمٰتِ الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا
الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۷﴾
وَهُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ
فَمُسۡتَقَرٌّ وَّمُسۡتَوۡدَعٌ ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰيٰتِ
لِقَوۡمٍ يَّفۡقَهُوۡنَ ﴿۹۸﴾
وَهُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا
بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَىۡءٍ فَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهُ خَضِرًا
نُّخۡرِجُ مِنۡهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخۡلِ
مِنۡ طَلۡعِهَا قِنۡوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنۡ
اَعۡنَابٍ وَّالزَّيۡتُوۡنَ وَالرُّمَّانَ مُشۡتَبِهًا
وَّغَيۡرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ

وہ صبح کو پھاڑنے والا ہے اور اس نے رات کو آرام کے لیے بنایا اور سورج اور چاند کو حساب کے لیے — یہ غالب علم والے کا اندازہ ہے ع۹۸۷

اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ ان کے ذریعے سے خشکی اور تری کے اندھیروں میں راہ پاؤ۔ ہم نے باتیں ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دیں جو علم رکھتے ہیں ع۹۸۸

اور وہی ہے جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔ پھر ایک ٹھیرنے کی جگہ ہے اور ایک سونپا جانے کی جگہ، ہم نے باتیں اُن لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دی ہیں جو سمجھ سے کام لیتے ہیں ع۹۸۹

اور وہی ہے، جس نے اوپر سے پانی اُتارا، پھر اس کے ساتھ ہم ہر طرح کی روئیدگی نکالتے ہیں، پھر اُس سے ہم سبز کونپلیں نکالتے ہیں اس سے ہم گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں، اور کھجور سے اس کے گابھے میں سے جھکے ہوئے گچھے۔ اور انگوروں کے باغ۔ اور زیتون اور انار۔ ایک دوسرے سے ملتے جُلتے، اور نہ ملتے جُلتے۔ اُس کے پھل کو دیکھو، جب وہ پھل لائے۔

دلالت کرتا ہے۔

دانا اور گٹھلی کو پھاڑ کر اس میں سے پودے اور درخت بنانا کتنی بڑی قدرت کا کام ہے۔ حق بھی مثل ایک دانہ یا گٹھلی کے ہے۔ جس طرح ایک گٹھلی ایک ناواقف کی نظر میں نہیں جچتی اور وہ نہیں جانتا کہ اس سے ایک عظیم الشان درخت بن جائے گا، اسی طرح حق کے مخالف اس سے ناواقف ہیں کہ وہ حق جس کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں کس طرح ایک دن دنیا میں مقبول ہوگا۔ زندہ کو مردہ سے نکالنے کے یہی معنی ہیں کہ ایک کام کے لیے بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتے مگر اللہ تعالیٰ اس کو سرسبز کر دیتا ہے۔ اور جس طرح ایک گٹھلی زمین میں پھٹ کر اپنے موافق غذاؤں کو زمین سے اور ہوا سے حاصل کر کے ایک درخت بن جاتی ہے، اسی طرح جو امر حق ہے وہ بھی اپنی قوت کے سامان گردوپیش سے حاصل کر کے دنیا میں آخر پھیل جاتا ہے۔ اور مُردہ کو زندہ سے نکالنا یہ ہے کہ مخالفت اور مقابلہ کی قوت کو جس میں زندگی کے سارے سامان نظر آتے ہیں توڑ کر بالکل مُردہ کر دے اور یا یہاں اہل کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم کو جو اپنے آپ کو زندہ سمجھتے ہو مُردہ کر دیگا۔ اور ایک ایسی قوم کو جسے مردہ سمجھا جاتا ہے کامیاب اور بامراد کر دیگا۔ جاہلوں میں سے عالم اور عالموں میں سے جاہل پیدا کر دیگا۔ یخرج میں استمرار ہے اور مخرج میں اور اگلی آیت میں فالق میں پیشگوئی کا رنگ ہے۔

ع۹۸۷ تقدیر۔ قَدَر اور تقدیر کے ایک ہی معنی ہیں ایک چیز کے اندازہ کا واضح کر دینا، اور تقدیر کے معنی قدرت عطا کرنا بھی آتے ہیں (غ) اور اللہ کی تقدیر اشیاء دو طرح پر ہے، ایک ان کو قدرت عطا کر کے، اور دوسرے ان کو اقتضائے حکمت کے مطابق ایک خاص اندازہ اور خاص وجہ پر بنانا (غ)

رات کی تاریکی بھی سکون اور آرام کا موجب ہوتی ہے۔ پس اس کی مخلوق میں کوئی چیز بے فائدہ نہیں۔ مگر اس رات کی تاریکی کو پھاڑ کر اب صبح نمودار ہونے والی ہے۔ سورج اور چاند کو حساب کے لیے کہہ کر بتا دیا کہ کس طرح یہ سب عالم ایک نظام میں منسلک ہے جس کے بنانے والی بڑی طاقتور ہستی ہے (حساب اور حُسبان کے ایک ہی معنی ہیں)

ع۹۸۸ جس خدا نے اس قدر سامان انسان کے فوائد جسمانی کے لیے بنا رکھے ہیں، کیا اس نے اس کی اصل تکمیل کی غرض کا ہی کوئی سامان پیدا نہیں کیا، یہ نہیں ہو سکتا۔ پس جس کو یہ علم ہے کہ انسان کا اصل کمال محض کھانے پینے میں نہیں، وہ یقیناً جان لے گا کہ تکمیل روحانی کا سامان بھی ضرور خدا تعالیٰ نے انسان کو دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے اصحابی کالنجوم میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں۔

ع۹۸۹ مستقر کے اصل معنی جائے قرار، مستودع کے معنی جائے سپردگی ہیں۔ مفسرین نے مختلف توجیہات کی ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے مستقر زمین میں اور مستودع قبور میں قرار دیا ہے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ دونوں زندگیوں کے لیے یعنی دنیوی اور اُخروی کے لیے ایک ایک مستقر ہے اور ایک ایک مستودع۔ دنیوی زندگی کے لیے

وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۹۹
وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَ
خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ
ع ۱۲ ۱۸ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۱۰۰
بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ
لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ
كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۰۱
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ
كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ

اور اسکے پکنے کو (دیکھو) یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ ع۹۹۰
اور اللہ کے لیے جنّ شریک بنا رکھے ہیں، حالانکہ اس نے ان کو پیدا کیا
اور اس کے لیے بے علمی سے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کر لیے ہیں۔
وہ پاک اور اس سے بلند ہے جو وہ بیان کرتے ہیں ع۹۹۱
آسمانوں اور زمین کا عجیب پیدا کرنے والا۔ اس کا بیٹا کس طرح
ہو سکتا ہے اور اس کی کوئی جورو نہیں، اور اس نے ہر ایک چیز
کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ع۹۹۲
یہ اللہ تمہارا رب ہے۔ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں
ہر چیز کا پیدا کرنے والا، سو اسی کی عبادت کرو اور وہ

مستقر رحم مادر ہے اور مستودع پیدائش کے بعد موت تک اور اُخروی زندگی کے لیے مستقر قبر ہے اور مستودع قیامت۔

ع۹۹۰ خضر مُخضر سبز رنگ کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد سبز کونپلیں ہیں فتصبح الارض مخضرّۃ (الحج ۲۲ - ۶۳) ثیابا خضرا (الکھف ۱۸ - ۳۱)

متراکباً۔ رکوب کے اصل معنی انسان کا حیوان کی پیٹھ پر ہونا ہیں، اور متراکب وہ ہے جس کا بعض بعض پر چڑھا ہُوا ہو یعنی تہ بتہ۔

طلع۔ طَلَع سورج کے نکلنے پر بولا جاتا ہے طلوع الشمس مطلع الشمس مطلع الفجر اور کھجور کے گابھ کو سورج کے طلوع سے مشابہت کے لحاظ سے طلع کہا جاتا ہے (رغ)

قنوان۔ قِنو گچھا یا خوشہ کو کہتے ہیں تثنیہ اور جمع قنوان ہے۔

دانیۃ۔ دُنو قرب کو کہتے ہیں ذات سے ہو یا حکم کے لحاظ سے۔ اور مکان اور زمانہ اور مرتبہ میں اس کا استعمال ہوتا ہے (رغ) اور دانیۃ سے مراد جو بوجھ سے جھک کر قریب ہو گئے ہوں۔

حَبّ اور نویٰ کو پھاڑ کر اللہ تعالیٰ کیا بناتا ہے، مردہ دانہ زندہ ہو کر سرسبز ہوتا ہے کونپلیں نکلتی ہیں، اور آخر پھر دانے بن جاتے ہیں۔ گٹھلی سے باغ۔ کھجور وغیرہ یہ بھی ایک وقت پھل لاتے اور پھر وہ پھل پکتے ہیں۔ اسی طرح حق بھی بڑھے گا، پھُولے گا اور پھر پھلے گا۔ ایمان والوں کے لیے اس میں نشان اس لیے کہا کہ حق پر ان کا ایمان ہے اس کے بڑھنے پھلنے کو مثال سے سمجھا دیا۔ آج پھر حق ایک دانہ یا گٹھلی کی طرح زمین کی تاریکی میں بظاہر غائب ہوتا نظر آتا ہے مگر وہ اسی طرح درخت بن کر نکلے گا جس طرح پہلے درخت بنا تھا۔

ع۹۹۱ الجنّ۔ جَنّ کے معنی کسی چیز کا حاسہ سے چھپانا ہیں۔ جنّ علیہ اللیل (۷۷)، اور جنّ روحانی یعنی غیر مرئی ہستیاں ہیں جو حواس سے چھپی ہوئی ہیں اور یہ انس کے مقابلہ پر ہیں۔ اور اس لحاظ سے ملائکہ کو بھی ان میں داخل کیا گیا ہے۔ مگر بعض کے نزدیک جنّ صرف خاص قسم کی غیر مرئی ہستیاں ہیں۔ یعنی کل غیر مرئی ہستیاں تین قسم ہیں، اوّل اخیار یعنی ملائکہ، دوم اشرار یعنی شیاطین، سوم درمیانی جن میں اخیار بھی ہیں اور اشرار بھی یعنی جنّ (رغ)

خرقوا۔ خَرق کسی چیز کا قطع کرنا ہے۔ فساد کے طور پر بغیر تدبر اور تفکر کے اخرقتھا لتغرق اھلھا (الکھف ۱۸ - ۷۱)۔ اور یہ خَلق کی ضد ہے۔ اور خَلق ایک فعل کا کرنا ہے جو اندازہ اور نرمی سے ہو اور خَرق بغیر اندازہ کے ہے (رغ)

دو قسم کے شرک کا ذکر کیا ہے۔ ایک جنوں کو شریک بنانے کا، دوسرے خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کرنے کا۔ بیٹا عیسائیوں نے بنایا ہے، اور بعض دیگر مذاہب نے۔ بیٹیاں عرب کے بُت پرست تجویز کرتے تھے۔ جن کے شریک بنانے میں مجوسیوں کے عقیدہ کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جو اہرمن کو خالق شر قرار دیتے ہیں اور تمام قسم کے شرکاء بھی اس میں آجاتے ہیں کیونکہ وہ نظروں سے مستور ہی ہوتے ہیں۔

ع۹۹۲ شرک کا سب سے زیادہ دھوکا دینے والا پہلو خدا کا بیٹا بنانا ہے۔ اسی کو پہلے لیا ہے۔ اس کی اصل تردید تو بدیع کے لفظ میں ہے (دیکھو ع۱۴۹) لیکن ایک لفظ پرست قوم کو جس نے صرف ظاہر الفاظ سے دھوکا کھایا ہے اور حقیقت پر غور نہیں کیا ظاہر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، کہ بیٹا اکیلے باپ سے کبھی پیدا نہیں ہوتا۔ جس جنس کا باپ ہے اسی جنس سے ماں تجویز کرو۔ ماں انسان اور باپ خدا! پھر تیسرا جواب دیا کہ سب چیز کا خالق اللہ ہے۔ اگر بیٹا ہے تو چاہیئے تھا کہ کچھ مخلوق وہ بھی پیدا کرتا۔ چوتھا جواب علم میں دیا ہے کیونکہ انجیل میں شہادت موجود ہے کہ بیٹا پورا علم نہ رکھتا تھا نہ اسے غیب کا علم تھا نہ قیامت کا۔ پس صفات میں کوئی اشتراک نہیں تو بیٹا کیسا، یوں اشتراک ناقص تو کل مخلوق کو حاصل ہے مگر اس سے اسے الگ کرنے کے لیے کسی بات میں اشتراک کامل بھی دکھانا چاہیئے اور وہ ہے نہیں۔

شَیۡءٍ وَّکِیۡلٌ ﴿۱۰۲﴾
ہر چیز کا کارساز ہے [۹۹۳]

لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ ۫ وَ ہُوَ یُدۡرِکُ الۡاَبۡصَارَ ۚ وَ ہُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۰۳﴾
نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے اور وہ باریک باتوں کا جاننے والا اخبردار ہے [۹۹۴]

قَدۡ جَآءَکُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ۚ فَمَنۡ اَبۡصَرَ فَلِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ عَمِیَ فَعَلَیۡہَا ؕ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ ﴿۱۰۴﴾
تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے روشن دلیلیں آچکی ہیں سو جو کوئی دیکھتا ہے تو وہ اپنی جان (کی بھلائی) کیلئے ہے اور جو اندھا رہا اسی پر (وبال) ہے اور میں تم پر نگہبان نہیں [۹۹۵]

وَ کَذٰلِکَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ وَ لِیَقُوۡلُوۡا دَرَسۡتَ وَ لِنُبَیِّنَہٗ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾
اور اسی طرح ہم باتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ کہیں تو نے (خوب) پڑھا ہے اور تاکہ ہم اُسے ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کریں جو جانتے ہیں۔ [۹۹۶]

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾
اس کی پیروی کر تا رہ جو تیری طرف تیرے رب سے وحی کی گئی ہے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں اور مشرکوں سے کنارہ کر۔

وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا ؕ وَ مَا جَعَلۡنٰکَ
اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے اور ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان

---

۹۹۳ یہاں ہر قسم کے شرک فی العبادت کی تردید کی۔ اکثر لوگ اپنے معبودوں کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ سب کا کارساز وہی ہے۔

۹۹۴ تدرك ۔ دَرْك کے لیے دیکھو ۷۵۵ نیچے جانے کے لحاظ سے دَرْك کہا جاتا ہے۔ جیسے اوپر جانے کے لحاظ سے دَرَج اور اس لیے سمندر کی انتہائی گہرائی کو بھی دَرْك کہا جاتا ہے اور پانی تک پہنچنے کے لیے جب ایک رسّہ کے ساتھ دوسرا رسّہ ملایا جاتا ہے تو اسے دَرَك کہا جاتا ہے اور انسان کو جو پیچھے آنے والی چیز سے پہنچتا ہے اسے بھی دَرَك کہتے ہیں۔ لا تخٰف درکا ولا تخشیٰ (طٰہٰ ۲۰۔ ۷۷) اور ادراك کے معنی کسی چیز کی غایت کو پہنچ گیا۔ بلغ اقصی الشئ۔ حتی اذا ادرکہ الغرق (یونس ۱۰۔ ۹۰) یہی لفظ یہاں ہے اور ابصار سے مراد بعض نے یہاں آنکھ کو لیا ہے اور بعض نے بصیرت اور اس کے معنی اس کے مطابق ہیں جو حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے۔ یَا مَنۡ غَایَۃُ مَعۡرِفَتِہٖ القصور عن معرفتہ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی غایت معرفت اشیاء کا جاننا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شئے اس سے نہیں یعنی اس جنس کی اور نہ اس کی مثل ہے بلکہ وہ ہر چیز کا موجد ہے جہاں تک انسان کی غایت معرفت پہنچ سکتی ہے اور تدارك فریاد رسی اور نعمت میں اکثر آتا ہے لولا ان تدارکہٗ نعمۃ من ربہ (القلم ۶۸۔ ۴۹) اور اِدَّارَكَ بھی اصل میں تدارك ہی ہے حتی اذا ادارکوا فیہا جمیعا (الاعراف ۷۔ ۳۸) یعنی ایک دوسرے کو مل گئے اور بل ادّٰرك علمھم فی الاٰخرۃ (النمل ۲۷۔ ۶۶) یعنی آخرت کو پانے میں ان کا علم انتہا کو پہنچ گیا سو وہ اس سے جاہل رہ گئے (رغ)

اللطیف۔ لطافۃ اور لُطف کے معنی ہلکی حرکت اور باریک امور کو پانا ہیں۔ اور لطائف ان امور کو کہتے ہیں۔ جن کو حواس نہ پا سکیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے لطیف ہونے سے یہ مراد بھی ہوتی ہے کہ وہ دقائق امور سے واقف ہے۔ اور یہی یہاں مراد ہے اور یہ بھی کہ وہ اپنے بندوں کی ہدایت کرنے میں ان سے نرمی کرتا ہے (رغ)

خدا تعالیٰ کا جسم نہیں کہ نظر انسانی اس کا احاطہ کرلے، اور نہ ہی عقل انسانی اس کی کُنہہ تک پہنچ سکتی ہے حالانکہ جس قدر شریک ٹھہرائے جاتے ہیں وہ سب احاطہ نظر انسانی میں آجاتے ہیں۔ اس سے قیامت میں اللہ تعالیٰ کی رویت کی تردید نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہاں دوسرے قوی دیئے جائیں گے اور یہاں ان آنکھوں یا اس عقل کے عجز کا ذکر ہے۔

۹۹۵ بصائر۔ بصیرۃ کی جمع ہے اور قلب کی قوتِ مدرکہ کو کہتے ہیں (رغ) مراد دلائل توحید باری تعالیٰ ہیں۔ میں حفیظ نہیں یعنی تمہارے اعمال کا نگران اور ان پر بدلہ دینے والا میں نہیں ہوں، خدا ہے۔

۹۹۶ دَرَسۡتَ ۔ دَرَس کے معنی ہیں اثر یا نشان باقی رہا اور چونکہ باقی رہنا مٹ جانے کو بھی چاہتا ہے اس لیے دُرُوس کے معنی مٹ جانا بھی آتے ہیں اور دَرَس العِلۡمَ کے معنی ہیں حفظ کرکے اس کے نشان کو پالیا (رغ) اور درست الکتاب کے معنی ہیں اس کو بار بار پڑھ کر مطیع کرلیا، یہاں تک کہ اس کا یاد رکھنا آسان ہوگیا (ل)

لیقولوا میں لام عاقبت ہے یعنی جب باتوں کو طرح طرح کے پیرایوں میں بیان کیا جاتا ہے، کبھی فطرت انسان کی طرف اور کبھی قانون قدرت کی طرف، اور کبھی امم سابقہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ باتیں پچھلی تعلیم سے لی ہوئی ہیں، اور خوب کوشش کرکے ان کو یاد کرلیا ہے۔ مگر صاحب علم لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیونکہ وہ امر حق کو پہچان لیتے ہیں اور یہ جان لیتے ہیں کہ مختلف قسم کے دلائل ایک ہی نتیجہ پر پہنچاتے ہیں یہی اس کی صداقت کا بین ثبوت ہے۔

عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾
وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ
زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ
مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾
وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ
اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ
اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

مقرر نہیں کیا اور نہ تو ان کا کارساز ہے ۹۹۷
اور اُن کو گالی نہ دو، جن کو یہ اللہ کے سوائے پکارتے ہیں (ایسا
نہ ہو) کہ وہ زیادتی کر کے بے علمی سے اللہ کو گالی دیں۔ اسی طرح ہم نے
ہر ایک گروہ کے لیے ان کا عمل اچھا کر کے دکھایا ہے۔ پھر ان کے رب کی
طرف اُن کا لَوٹ کر آنا ہے سو وہ اُنھیں بتا دیگا جو وہ کرتے تھے ۹۹۸
اور وہ بڑے زور کی قسموں کے ساتھ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے
پاس نشان آئے تو ضرور اس پر ایمان لائیں گے کہہ، نشان صرف اللہ کے
پاس ہیں، اور تمھیں کیا خبر ہے کہ جب وہ (نشان) آئیں گے تو
یہ ایمان نہیں لائیں گے ۹۹۹

---

۹۹۷ شاء کے معنی کے لیے دیکھو ۳۲۔ اس کے معنی کسی چیز کی ایجاد اور اس کا پا لینا ہیں۔ دوسرے معنی ارادہ کے مرادف ہیں۔ ارادہ میں شئے کا وجود میں لانا لازم نہیں گو اللہ تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہو۔ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (البقرۃ ۲ - ۱۸۵)۔ اور انسان کا ارادہ ہو سکتا ہے بغیر اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس چیز کے لیے ہو۔ جیسے انسان چاہتا ہے کہ نہ مرے اور یہ ارادہ الٰہی کے خلاف ہے، اور مشیت کے لیے پہلے اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ہونا لازمی ہے ما تشاؤن الا ان یشاء اللہ (غ)۔

لوشاء اللہ ما اشرکوا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت ایسی ہوتی تو یہ شرک نہ کرتے، اور دوسری جگہ کفار کا قول منقول ہے لوشاء اللہ ما اشرکنا (۱۴۹) حالانکہ کفار کے قول کی تردید کی ہے۔ ان دونوں مقامات میں فرق یہ ہے کہ کفار کے قول کا منشاء تو یہ ہے کہ خدا کی مشیت یہی ہے کہ ہم شرک کریں، اس لیے ان کو جواب بھی یوں دیا ہے لوشاء لھدٰکم اجمعین (۱۵۰) یعنی اگر مشیت سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور کرنا ہوتا تو ہدایت پر مجبور کرتا نہ شرک پر جیسا کہ دوسری مخلوق کو اپنی فرمانبرداری کے قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ اور اس جگہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ایسی ہوتی تو وہ شرک نہ کرتے تو مطلب یہی ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں پیدا ہی ایسا کرتا کہ تم نافرمانی نہ کر سکتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی انسان کا سارا شرف دوسری مخلوق پر اُڑ جاتا۔ اس لیے ماجعلنٰک علیھم حفیظا یہاں فرمایا کہ تم انہیں مجبور کر کے شرک نہیں چھڑا سکتے۔ اگر مجبور ہی کرنا ہوتا تو اللہ تعالیٰ پیدائش میں ہی ان کو مجبور کر دیتا، مگر اس کی مشیت ایسی نہیں ہوئی۔ اس نے قانون بنا کر راہ دکھا دی۔ اب انسان کا اختیار رہا اس پر چلے یا نہ چلے، شاید یہ بھی اشارہ ہو کہ آخر شرک ان سے مٹ جائے گا۔

۹۹۸ دوسرے معبودوں کو گالیاں نہ دینے کی تعلیم: مخالفین کی باتیں نہایت درجہ دکھ دینے والی تھیں۔ بُرا کہتے تھے، ہنسی اڑاتے تھے، گالیاں دیتے تھے، اس لیے مسلمانوں کو اب ایک اصول بتایا کہ ایسا نہ ہو تم بھی ان کے معبودان باطل کو اسی طرح سبّ و شتم کرنے لگو۔ اور چونکہ یہاں شرک کی بُرائیوں کا ذکر تھا اس لیے ساتھ ہی یہ بتانے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دوسرے کے عقاید میں جو بُرائی ہو اس کی اصلاح کے لیے اس کا بیان کر دینا تو ضروری ہے مگر حد سے تجاوز نہ ہو۔ گالی تک نوبت نہ پہنچے۔ ایک غلطی کا اظہار اور چیز ہے جس کی ضرورت ہمیشہ دنیا میں رہے گی مگر خواہ مخواہ بُرے الفاظ سے دوسرے کے دل کو دکھ پہنچانا جائز نہیں۔ یوں قرآن کریم ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم بھی دیتا چلا جاتا ہے۔ ایک ایسا عمدہ اصول بیان کر دیا ہے کہ جس سے مذہبی تنافر کی بجائے انسانوں میں باہم محبت پیدا ہو۔ عام طور پر اس اصول کو مدنظر نہ رکھنے سے مذہب کی خاطر انسان ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے ہیں۔ حالانکہ مذہب کی غرض یہ تھی کہ تمام انسانوں سے محبت اور آشتی ہو۔ اس زمانہ میں عیسائیوں اور آریوں نے اس اصول کو توڑ کر باہم بغض و تنفر کا خطرناک بیج بو دیا ہے۔ سینکڑوں کتابیں صرف دوسروں کی بُرائیاں بیان کرنے، ان پر ہنسی کرنے پر شائع ہوتی ہیں۔ اصول سے بحث نہیں کیونکہ وہاں اپنی کمزوری کو جانتے ہیں۔

تزئین اعمال: عملھم سے مراد ان کا وہ عمل ہے جو ان کو کرنا چاہیئے۔ وہ باتیں جو انسان کی بھلائی کا موجب ہیں ان کو قرآن کریم نے نہایت خوبصورت بنا کر دکھایا ہے تا کہ لوگ ان پر عمل کریں جیسے یہی اصول کہ جن کی دوسرے لوگ عزّت کریں تم انھیں گالی مت دو۔ جو بُرے عمل انسان کرتا ہے وہ بھی اس کو بعض وقت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا مزین کرنے والا خدا نہیں بلکہ شیطان ہے جیسا کہ صاف فرمایا وزیّن لھم الشیطان ما کانوا یعملون دیکھو آیت ۴۳، ایسا ہی دیکھو آیت ۱۳۸ جہاں بُرے کام کی تزئین شیطان کی طرف منسوب کی ہے ؎

۹۹۹ اس قدر کھلے دلائل کے باوجود پھر وہی نشان مانگتے ہیں (دیکھو آیت ۳۵)۔ فرمایا ایسے معجزات بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہیں۔ لیکن جو قوم اس قدر کھلے دلائل کو ردّ کر رہی ہے وہ ان معجزات سے کیا فائدہ اٹھائے گی۔ اس آیت سے انکار معجزات نکالنا آیت کے صریح منطوق کے خلاف ہے۔ اذا جاءت کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ جس قسم کے معجزات وہ چاہتے ہیں وہ بھی ان کو مل جائیں گے مگر ایمان تو دلائل سے ہی پیدا ہوگا نہ معجزات سے ؎

وَ نُقَلِّبُ اَفۡـِٕدَتَہُمۡ وَ اَبۡصَارَہُمۡ کَمَا لَمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِہٖۤ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّ نَذَرُہُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾ ع

اور ہم ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے جس طرح وہ اس پر پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں بہکا ہوا چھوڑ دیں گے ع۱۱۰

وَ لَوۡ اَنَّنَا نَزَّلۡنَاۤ اِلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ وَ کَلَّمَہُمُ الۡمَوۡتٰی وَ حَشَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ کُلَّ شَیۡءٍ قُبُلًا مَّا کَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ یَجۡہَلُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

اور اگر ہم اُن پر فرشتے اتارتے، اور مُردے اُن سے باتیں کرتے اور سب چیزوں کو اُن کے سامنے لا اکٹھا کرتے وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے، مگر یہ کہ اللہ چاہتا، لیکن اُن میں سے اکثر جاہل ہیں ع۱۱۱

وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیۡنَ الۡاِنۡسِ وَ الۡجِنِّ یُوۡحِیۡ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ

اور اسی طرح ہم نے ہر ایک نبی کے لیے انسانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو دشمن بنایا، وہ دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے

ع۱۱۰ نقلّب۔ قَلب کے معنی ایک رُخ سے دوسرے رُخ کی طرف پھیرنا ہیں۔ اور تَقلیب ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرتے رہنا۔ تقلیبُ اللہ القلوب والبصائر کے معنی ہیں صرفہا من رای الی رای ان کا ایک رائے سے دوسری رائے کی طرف پھیرتے رہنا (غ) یعنی کبھی کچھ خیال کرنا کبھی کچھ۔

اَفئِدۃ۔ فواد کی جمع ہے فَأَدَ کے معنی ہیں بھونا یا جلایا۔ اور اسی معنی کے لحاظ سے دل کو فؤاد کہا جاتا ہے (غ) اور فواد بعض کے نزدیک دل کا بیرونی پردہ ہے اور قلب اس کا مرکز (ل)

نذر۔ وذر اس کا مادہ ہے مگر اس کی ماضی استعمال میں نہیں آئی۔ اور یَذَرُ الشیٔ کے معنی ہیں ایک چیز کو بے حیثیت سمجھ کر اسے پھینک دیا۔ ونذر ما کان یعبد اٰباؤنا (الاعراف۔ ۷۰) ویذرک و اٰلھتک (الاعراف۔ ۱۲۷) فذرھم وما یفترون (الانعام۔ ۱۱۲) وذروا ما بقی من الربٰو (البقرۃ۔ ۲۷۸) ویذرون ازواجا (البقرۃ۔ ۲۴۰) (غ) آخری موقع پر اس لفظ کے استعمال میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بیوہ عورت کی حیثیت نہایت درجہ کی کس مپرسی کی رہ جاتی ہے اس لیے اس کی بے کسی کی طرف توجہ دلا کر وہاں اس کے حق میں کچھ وصیّت کی سفارش فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف دلوں اور آنکھوں کے پھیرنے کی نسبت ویسی ہی ہے جیسے ازدیاد مرض کی (دیکھو ع۲۲) افعال انہی کے ہیں مگر نتیجہ دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور ان کے افعال ہونا خود اس سے ظاہر ہے کہ لم یؤمنوا بہ اوّل مرّۃ کا نتیجہ اسے بنایا۔ پہلے ایمان نہیں لائے نتیجہ یہ ہے کہ اب کبھی ایک رائے بدلتے ہیں کبھی دوسری اور سرکشی میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ چونکہ پہلے ایمان کی طرف انھیں دلائل سے بلایا تھا اور دلائل کو انھوں نے قبول نہ کیا، پھر معجزات دیئے تو کبھی ساحر کہا، کبھی کاہن کہا، کبھی کچھ کہا، یہی تقلیب افئدہ ہے۔ حقیقت کی طرف دلائل رہنمائی کرتے ہیں، معجزات محض تائیدی امور ہیں۔ ان سے وہ شخص کیا فائدہ اُٹھائیگا جو دلائل پر غور نہیں کرتا۔

ع۱۱۱ قُبُلا۔ بعض نے اسے قابل کی جمع کہا ہے اور اس کے معنی ہیں ان کے حواس کے مقابل یا سامنے او یاتیہم العذاب قبلا (الکہف۔ ۵۵)، اور بعض نے قَبِیل کی، جس کے معنی جماعت ہیں۔ یعنی جماعت جماعت کر کے سب چیزوں کو لے آتے (غ)

معجزات کے باوجود ایمان نہ لانے والے۔ پچھلے رکوع میں شرک کے مختلف پہلوؤں کا ابطال کر کے خاتمہ اس آیت پر کیا تھا کہ جن لوگوں نے کھلے کھلے دلائل کو رد کر دیا ہے اور معجزات کے طالب ہیں وہ معجزات کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ جیسے دلائل سے انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور قوت متفکرہ سے کام نہ لیا، ایسا ہی معجزات کے وقت ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر وہ موٹے موٹے نشان بھی ظاہر ہو جائیں جو یہ مانگتے رہتے ہیں، تو بھی قساوت قلبی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ جن لوگوں نے مخالفت کی ٹھان لی ہے وہ کبھی نہ مانیں گے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ قوائے روحانی بالکل مُردہ ہو جاتے ہیں۔ پس معجزات دیکھ بھی لیں تو محض ایک عجوبہ دیکھ لینے سے قوائے روحانی زندہ نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہاں سب لوگوں کا ذکر نہیں بلکہ صرف ان لوگوں کا ہی ہے جو مخالفت میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ ٹھان لیتے ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ حق کو قبول نہ کریں گے۔ بلکہ اس کی مخالفت کریں گے، چنانچہ اگلی آیت میں ایسے لوگوں کو شیاطین کے نام سے موسوم کیا ہے۔

کلام موتٰی سے مراد: ہاں الّا ان یشاء اللہ کے لفظ آخر پر لا کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ گو اس قسم کے معجزات سے تو نہیں مگر اور اسباب سے جو اللہ تعالیٰ پیدا کر دے گا۔ لوگ مانیں گے بھی۔ فرشتے بھی آئے دیکھو ع۲۶۹ اور مُردوں نے بھی ان سے کلام کیا یعنی بہت سے لوگ جو قوائے روحانی کے لحاظ سے مر چکے تھے۔ ان کو خدا نے زندہ کر کے ایک روشنی عطا کی اگلے رکوع کی پہلی آیت کہ ایک شخص مردہ ہو ہم اسے زندہ کر دیں اور اس کو نور دیدیں تو وہ اس کی طرح نہیں جو اندھیروں میں ہے اور یا پہلی کتابوں کی شہادت کلام موتٰی ہے اور ہر چیز کے سامنے آ جانے سے ان کی سزا کے سب سامانوں کا اکٹھا ہو جانا مراد ہے۔

زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

کے دل میں ملمع کی باتیں ڈالتے رہتے ہیں۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے سو اُن کو چھوڑ دے اور اسے جو وہ افترا کرتے ہیں ع۱۰۰۲

وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور تاکہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل جھکے رہیں جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور تاکہ وہ اس پر راضی ہو جائیں اور تاکہ کیے جائیں جو وہ کر رہے ہیں ع۱۰۰۳

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

تو کیا میں اللہ کے سوائے فیصلہ کرنے والا تلاش کروں اور وہ وہی ہے جس نے تمھاری طرف واضح کتاب آتاری اور وہ جن کو ہم نے کتاب دی، جانتے ہیں کہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ آتاری گئی ہے سو تُو جھگڑنے والوں میں سے نہ ہو ع۱۰۰۴

ع۱۰۰۲ یوحی۔ وحی سے مراد یہاں اس کے اصل معنی اشارہ سریعہ کے ہیں یا دل میں ڈالنا اور ان کی وسوسہ اندازی کی طرف اشارہ ہے۔
زخرف زینت کو کہتے ہیں۔ جو ملمع یا نقش و نگار سے ہو اور زخرف القول ملمع کی بات ہے (غ) یعنی جو اوپر سے اچھی نظر آتی ہو مگر اس کا انجام زیان ہو۔

لفظ کذٰلک میں پچھلی آیت کے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی جس طرح تمہارے مقابل پر یہ دشمن ہیں جو کھلے کھلے نشانوں اور واضح دلائل کو قبول نہیں کرتے۔ ایسا ہی پہلے انبیاء کے مقابل میں بھی ہوتے رہے۔ شیاطین الانس سے مراد انسانوں میں سے سرکش لوگ ہیں۔ جن شیطان وہ ہے جو نظر سے مخفی ہے مگر انسان جب دوسرے کا شیطان بنتا ہے تو جنّ سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے کیونکہ جنّ صرف وسوسہ اندازی کرتا ہے اور یہ باتوں سے اور عمل سے ترغیب دیتا ہے۔ مایفترون میں بتا دیا کہ یہ افترا کرنے والے یعنی انسان ہی ہیں۔ کیونکہ اصل فعل انہی کا ہے اور دوسری جگہ صرف یوں فرمایا وکذٰلک جعلنا لکل نبی عدوا من المجرمین (الفرقان ۲۵ - ۳۱) پس شیاطین الانس والجن سے یہاں مراد مجرم ہی ہیں دیکھو اگلا نوٹ۔

ع۱۰۰۳ تصغیٰ۔ صَغْواسے ہے مائل ہونا۔ صَغَتِ الشَّمْسُ کے معنی ہیں۔ سورج غروب کی طرف مائل ہوا (غ) الیہ میں ضمیر زخرف القول یعنی ملمع کی باتوں کی طرف ہے یا شیاطین کی وحی کی طرف یا عداوت کی طرف۔
یقترفوا۔ قَرف اور اقتراف اصل میں یہ ہے کہ درخت کی چھال اتار دی جائے استعارۃً اکتساب کے معنی میں آتا ہے اچھا ہو یا بُرا (غ)

جن شیطان سے مراد: یہ آیت عطف ہے غرورا پر، یعنی وہ ملمع کی باتیں جو ایک دوسرے کے دل میں ڈالتے ہیں وہ محض دھوکہ دینے کے لیے ہوتی ہیں، اور اس غرض کے لیے عام لوگ، جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے، اعمال کی جزا سزا کو نہیں جانتے۔ ان کے دل ان ملمع کی باتوں کی طرف مائل ہو جائیں اور وہ ان کو پسند کرنے لگیں اور ایسے ہی کام کرنے لگیں جیسے وہ شیطان یعنی ان کے سردار خود کرتے ہیں۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیاطین صرف ان کے سردار ہیں جو پہلے خود حق کے دشمن بنتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے پیروؤں کو بھی اس پر راضی کر لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ پیرو بھی تمام وہ شرارت کی باتیں کرنے لگتے ہیں جو ان کے سردار کرتے ہیں۔ اور یہاں بالخصوص انبیاء کی مخالفت کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد صرف اعدائے حق انسان ہیں۔ گو ان پر عام نظروں سے مستور ہونے کی وجہ سے، جنّ کا لفظ بھی بولا گیا ہو، جیسا کہ مجاز کے رنگ میں ایک شاعر اپنی محبوبہ کو جنّی کے نام سے پکارتا ہے ویحک یا جنی، اگر سارے مضمون پر ایک یکجائی نظر ڈالی جائے، تو اس میں کچھ بھی شبہ نہیں رہتا۔ اس رکوع کے آخر پر آیت ۱۲۲ میں پھر شیاطین (یعنی سرداروں) کے اپنے اولیاء کو وحی کرنے کا ذکر ہے۔ اور آیت ۱۲۴ میں کذٰلک لفظ لاکر اور انہی لوگوں کو اکابر مجرمیھا کہہ کر بالکل واضح کر دیا کہ شیاطین والجن سے مراد مجرموں کے سردار ہیں نہ کچھ اور۔

ع۱۰۰۴ مفصّل۔ فصل کے معنی ہیں دو چیزوں کا ایک دوسرے سے الگ کر دینا (غ)، اور تفصیل کے معنی تبیین (ل) یا کھول کر بیان کرنا ہیں اور یہاں مراد ہے کہ جس بارہ میں میرا اور تمہارا جھگڑا ہے اسے کھول کر یہاں بیان کر دیا گیا ہے (غ)

مذہبی اختلافات میں کوئی شخص حکم نہیں بنایا جا سکتا: چونکہ قرآن کریم بار بار پہلے انبیاء کی شہادت کی طرف توجہ دلاتا تھا اس لیے مشرک یہ حیلہ کرتے تھے کہ یہودی یا عیسائی ہمارے اور تمہارے درمیان حَکَم بن جائیں۔ آج بھی بعض لوگ مسائل دینی میں بحث کرتے ہیں تو کہتے ہیں فلاں شخص کو حکم بنا لیں جس کے یہ معنی ہوئے کہ اس شخص کا فیصلہ مبرا عن الخطا ہے۔ اس کا جواب دیا ہے کہ جب کتاب مفصّل ہے یعنی اس کے اندر دعاوی بھی ہیں اور دلائل بھی تو پھر دوسرے کو حکم بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے دعاوی اور دلائل پر غور کر کے خود ہی فیصلہ کر لو۔ یہاں مفصّل سے مراد یہ نہیں کہ تمام فروعات دین اس کے اندر تفصیل سے موجود ہیں بلکہ اصل مضمون جو اثبات توحید و رسالت پر ہے جس میں جھگڑا ہو رہا ہے اسی کے دعاوی اور دلائل کے کھول کر بیان کرنے کا ذکر ہے اور آخری حصّہ میں اہل کتاب کا

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾

اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف میں کمال کو پہنچ گئی کوئی اُس کی باتوں کو بدلنے والا نہیں ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے ع۱۰۰۵

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

اور اگر تو اکثر ان لوگوں کی بات مانتا چلا جائے جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں، وہ صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور وہ محض اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں ع۱۰۰۶

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

تیرا رب اس کو خوب جانتا ہے جو اس کے رستے سے گمراہ ہوتا ہے اور وہ سیدھی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

سو اس سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اگر تم اس کی باتوں پر ایمان لانے والے ہو ع۱۰۰۷

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَاۗىِٕهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اور تمہارا کیا عذر ہے کہ تم اس سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اور اس نے تم کو کھول کر بتا دیا ہے وہ جو تم پر حرام کیا سوائے اس کے جس کے لیے تم لاچار ہو جاؤ اور یقیناً بہت سے اپنی گری ہوئی خواہشات سے لاعلمی کے ساتھ گمراہ کرتے ہیں۔ تیرا رب حد سے گزرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور کھلے اور چھپے گناہ کو چھوڑ دو، جو لوگ گناہ کماتے ہیں اُن کو ضرور اس کے موافق بدلہ دیا جائے گا، جو وہ کماتے ہیں ع۱۰۰۸

ذکر کیا کہ وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ محمد رسول اللہ صلعم کا نزول حق کے ساتھ ہے کیونکہ ان کی کتابوں میں اس کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔

ع۱۰۰۵ دعاوی اور دلائل کا قرآن میں ہونا: پچھلی آیت کے مضمون کو اور واضح کیا ہے۔ وہاں کتاب کو مفصّل کہا تھا یہاں بتا دیا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ صدق وعدل میں یہ کتاب اس حد کمال کو پہنچ گئی ہے کہ اپنے سے باہر کسی چیز کی محتاج نہیں رہی۔ اتمام کے اس معنی کے لیے دیکھو ع۴۸۷۔ صدق میں اشارہ اس کے دعاوی کی سچائی کی طرف ہے اور عدل میں اس کے دلائل کے حق ہونے کی طرف۔ چونکہ احکام دینی میں فروع دین اس کے اصول سے مستنبط ہوتے ہیں۔ اس لیے سارے فروع کا اس کے اندر تفصیل سے نہ ہونا خلاف اتمام نہیں ہاں اصول سب ضروری ہے کہ اس کے اندر مفصل ہوں یعنی دعاوی مع اپنے دلائل کے ہوں۔

لا مبدل لکلماتہٖ میں ذکر انہی کلمات کا ہے جن کا ذکر تمّت کلمت ربّک میں ہے یعنی مراد اس سے قرآن شریف ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کلام اس کمال کو پہنچ گیا کہ اب اس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ یعنی کوئی شخص اس کلام کی جگہ صدق وعدل کے لحاظ سے بہتر کلام نہیں لاسکتا اور یہ دنیا کی آخری مذہبی کتاب ہے۔

ع۱۰۰۶ یہاں بتا دیا کہ پیروی علم صحیح کی کرنی چاہیئے۔ اٹکل پچّو اور ظنی باتیں کرنے والے گو تعداد میں بہت ہوں مگر پیروی ان کی نہیں چاہیئے، بلکہ علم کی یعنی دلائل کی کرنی چاہیئے۔

ع۱۰۰۷ قرآن کریم نے توحید پر یہاں تک زور دیا ہے کہ جن غذاؤں کا تعلّق مشرکانہ افعال سے ہے ان کو بھی حرام کر دیا ہے۔ اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے۔

ع۱۰۰۸ ظاہری اور باطنی گناہ: غذاؤں کی حلّت وحرمت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بتا دیا کہ کھلے اور چھپے دونوں گناہوں سے بچو۔ یہ نہ ہو کہ باطنی احکام کی طرف متوجہ ہو تو احکام ظاہری کی پروا نہ کرو یا کھلے گناہوں سے بچو تو مخفی طور پر ان کا ارتکاب کر لو۔ عرب کے لوگ اس بات کو عیب نہ جانتے تھے کہ چھپکر کوئی گناہ کر لیا جائے مثلاً چھپکر زنا کر لینے میں کوئی ہرج نہ سمجھتے تھے۔ ہاں ظاہر طور پر اس کے ارتکاب کو برا خیال کرتے تھے۔ بعینہٖ یہی حالت آج یورپ کی ہے اور قرآن کریم کا نزول جس طرح عرب کے لیے ہوا اسی طرح آج یورپ کے لیے یہ نزول ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ
عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ
لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ
وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

اور اس سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا، اور یہ یقیناً نافرمانی ہے اور بیشک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ وہ تم سے جھگڑتے رہیں اور اگر تم ان کی بات مانو گے تو یقیناً تم مشرک ہو ع۱۰۰۹

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ
نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ
فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ
زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

اور کیا وہ جو مُردہ تھا، پھر ہم نے اُسے زندہ کر دیا اور اُسے روشنی دی جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلے، اس شخص کی مانند ہے جس کی مثال یہ ہے کہ وہ اندھیرے میں ہے اس سے نکلتا نہیں، اسی طرح کافروں کو وہ کام اچھے معلوم ہوتے ہیں جو وہ کرتے ہیں ع۱۰۱۰

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ
مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ
اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور اسی طرح ہم نے ہر ایک بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو بنایا تاکہ وہ اس میں منصوبے کریں اور وہ منصوبے نہیں کرتے مگر اپنی ہی جانوں کے ضرر کے لیے اور وہ محسوس نہیں کرتے ع۱۰۱۱

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ
حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؕ اَللّٰهُ
اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ

اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ ہم کو اس کی مثل دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا، اللہ خوب جانتا ہے کہ کہاں اپنی رسالت کو رکھے ع۱۰۱۲ ان لوگوں کو جنھوں نے

ع۱۰۰۹ یہ آیت اس بات کو بالصراحت بیان کرتی ہے کہ جس چیز پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کا کھانا جائز نہیں۔ پس ذبیحہ اہل کتاب اسی حد تک جائز ہے کہ وہ اس پر خدا کا نام لیں۔

آخر آیت میں پھر دشمنان دین کی طرف اشارہ کر کے اس رکوع کے اور اگلے رکوع کے اصل مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ع۱۰۱۰ میّت۔ موت کے معنی کے لیے دیکھو ع۷۹۔ مَیْت مَیِّت سے مخفف ہے اور یہاں مُردہ ہونے سے مراد جہالت ہے اور انّک میّت (الزمر۳۹۔ ۳۰) میں میّت سے مراد بعض کے نزدیک روح کا جسم سے الگ ہونا ہے اور بعض کے نزدیک محض تحلیل اور کمی ہے جو ہر آن واقع ہوتی رہتی ہے کیونکہ انسان جب تک اس دنیا میں ہے ہر آن اس پر ایک موت وارد ہوتی رہتی ہے جیسا شاعر کہتا ہے ؎ یَمُوْتُ جُزْءًا فَجُزْءًا (غ) حضرت ابن عباسؓ سے یہاں میّت کے معنی کافر ضال۔ احیاء سے مراد ہدایت۔ نور سے قرآن مروی ہیں (ر)

آنحضرتؐ کا مردوں کو زندہ کرنا: اسلام کے خلاف منصوبہ بازی کرنے والوں کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے پہلے بتایا کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ساتھ ان لوگوں کو جن کے قوائے روحانی مر چکے ہیں کس مقام پر پہنچائیگا، وہ نہ صرف ان کو زندگی عطا فرمائے گا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کو ایک نور بھی عطا فرمائے گا اور وہ بھی صرف اپنی ذات کے لیے نہ ہوگا، بلکہ دوسرے لوگوں میں اس کو لیکر چلیں گے یعنی اوروں کو بھی فائدہ پہنچائیں گے۔ یہ آنحضرت صلعم کی قوت قدسی کا کمال تھا جس نے مُردگی کی حالت سے اُٹھا کر ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچایا اس کے مقابل ان لوگوں کا ذکر کیا جو تاریکی میں رہتے ہیں اور نور ایمان سے متمتع نہیں ہوتے اور پھر اس تاریکی سے اس قدر پیار کرتے ہیں کہ اس میں سے باہر نہیں نکلتے گویا ان کو اپنے بدعمل ہی بھلے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

ع۱۰۱۱ اکابر۔ کبیر کی جمع ہے جس کے معنی رئیس یا سردار ہیں۔ انہ لکبیرکم الذی علمکم السحر (طٰہٰ۲۰۔ ۷۱)
یعنی جس طرح ان کو اپنے بدعمل بھلے معلوم ہونے لگتے ہیں اسی طرح پھر ان کو حق کے خلاف منصوبہ بازی سوجھتی ہے۔ تاریکی سے پیار کرنے والے کبھی روشنی کو پسند نہیں کر سکتے اس لیے جب وہ نور دنیا میں آتا ہے اس کے بجھانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ مگر مآل ان منصوبہ بازیوں کا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔

ع۱۰۱۲ رسالت موہبت ہے: آیت سے مراد یہاں عام ہے کوئی حکم الٰہی، کوئی شریعت یا کوئی رسول آتا ہے تو بجائے اس کے کہ ایک حق بات کو قبول کریں یہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ پیغامبری کا منصب ہم کو کیوں نہ ملا۔ دوسری جگہ آتا ہے بل یرید کل امرئ منھم ان یؤتی صحفا منشرۃ (المدثر۷۴۔ ۵۲) اس کا جواب دیا ہے کہ خدا پیغامبری کے منصب پر ہر کس و ناکس کو ممتاز نہیں فرمایا کرتا۔ تاریکی کے فرزندوں کو وہ پیغامبری دیدے تو پھر دنیا کی اصلاح کیا ہو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے

الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ
شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

جرم کیے اللہ کی طرف سے ذلت اور سخت عذاب پہنچ کر رہے گا،
اس لیے کہ وہ منصوبے کرتے تھے ۱۰۱۳ع

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ
لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ
صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى
السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ
عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

سو جسے اللہ ارادہ کرتا ہے کہ ہدایت دے اس کا سینہ اسلام کے
لیے کھول دیتا ہے اور جس کے لیے ارادہ کرتا ہے کہ اس کو گمراہی میں چھوڑ
دے اس کا سینہ تنگ گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ اوپر کو چڑھ رہا ہے،
اسی طرح اللہ ان لوگوں پر ناپاکی رہنے دیتا ہے، جو ایمان
نہیں لاتے ۱۰۱۴ع

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ
فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

اور یہ تیرے رب کا سیدھا رستہ ہے ہم نے باتیں اُن لوگوں کے
لیے کھول کر بیان کر دی ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ
وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

ان کے لیے ان کے رب کے ہاں سلامتی کا گھر ہے اور وہی ان کا دوست
ہے ان (اعمال) کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ
قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ
مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ
وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ
مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ
اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

اور جس دن ان سب کو اکٹھا کرے گا، اے جنوں کے گروہ تم نے
انسانوں میں سے بہت سے لے لیے ۔ اور انسانوں میں سے ان کے دوست
کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا اور ہم
اس اپنی میعاد کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کی تھی۔ کہیگا آگ
تمہارا ٹھکانا ہے اسی میں رہو گے، مگر جو اللہ چاہے بے شک تیرا
رب حکمت والا علم والا ہے ۱۰۱۵ع

کہ اللہ تعالیٰ اپنا پیغمبر جن لوگوں کو بناتا ہے وہ اس منصب کے لیے خاص اہلیت رکھتے ہیں جس سے دوسری عاری ہوتے ہیں۔ اسی سے عصمت انبیاءؑ پر بھی دلیل پیدا ہوتی ہے اور اس بات پر بھی کہ منصب رسالت کسی کو کوشش سے یا دعا سے نہیں ملتا۔ بلکہ یہ ایک امر وہبی ہے جسے خدا چاہتا ہے دیتا ہے۔

۱۰۱۳ع صغار سے مراد ذلت ہے عند اللہ اکثر مفسرین کے نزدیک من عند اللہ کے ہم معنی ہے یعنی اللہ کی طرف سے ان کو ذلت پہنچے گی اللہ کے ہاں بھی اگر معنی کیے جائیں تو مراد یہی ہے منصوبہ بازیوں اور مخالفتوں کا انجام بتایا ہے کہ ذلیل ہو جائیں گے اور قوت و شوکت جس کے بل بوتے پر یہ کچھ کر رہے ہیں جاتی رہے گی۔ یہی اہل مکہ کا انجام ہُوا یہی اب مخالفت کا انجام ہوگا۔

۱۰۱۴ع یشرح صدرہ۔ شرح کے اصل معنی بسط یا پھیلانا ہیں اور شرح صدر کے معنی امام راغبؒ نے کیے ہیں۔ الٰہی نور اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینت اور اطمینان کے ساتھ قلب میں وسعت پیدا ہو جانا۔

یجعل صدرہ ضیقا حَرَجًا۔ حَرَج سخت تنگی کا نام ہے جس کے اندر کوئی جگہ نہیں اور گناہ کو بھی حَرَج کہتے ہیں (غ) ضیق صدر عبارت ہے اس سے کہ اس میں بھلائی کے لیے کوئی رستہ نہیں امام راغبؒ کہتے ہیں اس سے مراد حزن ہے۔

یصعد فی السماء سے مراد اوپر کو چڑھنا ہے جس سے دم رکنے لگتا ہے یَصَّعَّدُ اصل میں یَتَصَعَّدُ ہے اور صُعُود اوپر کی طرف جانے کو کہتے ہیں۔

اس کا یہ منشا نہیں کہ خدا نے دو قسم کے انسان پیدا کیے ہیں اور بعض کا سینہ کھلا اور بعض کا تنگ پیدا کیا ہے۔ بلکہ یہ بتانا مراد ہے کہ امر حق کا فر کو ایک پہاڑ کی طرح نظر آتا ہے حالانکہ فی الحقیقت وہی باتیں جن سے اس کے سینہ میں اتنی تنگی پیدا ہوتی ہے سینے کے کھولنے والی ہیں، اور ان سے انسان کے اخلاق وسیع ہوتے ہیں کافر کا سینہ بوجہ اپنے کفر کے تنگ ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر تنگی کفر کا نتیجہ ہے کفر تنگی کا نتیجہ نہیں۔

۱۰۱۵ع مَعْشَر کا اصل عَشْر (دس) سے ہے اور چونکہ دس کو عدد کامل سمجھا گیا ہے۔ اس لیے عشیرۃ ایک شخص کے اقارب کو کہا جاتا ہے جس سے وہ کثرت

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا
بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع
يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ
رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ
وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا
شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ
كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

اور اسی طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیتے ہیں بہ سبب اس کے جو وہ کماتے ہیں۔
اے جنّوں اور انسانوں کے گروہ کیا تمھارے پاس تم میں سے رسول نہ آئے تھے جو تمھارے اوپر میری آیات کو بیان کرتے اور اس تمھارے دن کی ملاقات سے تم کو ڈراتے تھے کہیں گے، ہم اپنی جانوں کے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا اور وہ اپنی جانوں کے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے ع۱۰۱۵ الف

حاصل کرتا ہے (غ) اور اس سے معشر ہے جو اسی جماعت کو کہا جاتا ہے جن کا معاملہ ایک ہے کل جماعۃ امرھم واحد جیسے معشر المسلمین (ل) الجن۔ جنّ کے معنی ڈھانک دینا ہیں۔ اور جنّ وہ نوع ہے جس کو انسان کی آنکھ دیکھ نہیں سکتی اور وہ اس سے پوشیدہ ہے۔ اسی نوع میں سے قرآن شریف نے ابلیس کو قرار دیا ہے کان من الجن (الکھف ۱۸-۵۰) اور شیطان بھی دو طرح کے بتائے ہیں شیاطین الانس والجن یعنی ایک انسانوں میں سے اور ایک جن میں سے۔ لیکن تبریزی نے شرح حماسہ میں لکھا ہے کہ عرب کے لوگ ایسے شخص کو جو معاملات میں تیز اور زود رس ہو جن کہہ دیتے تھے چنانچہ اسی بنا پر فما نفرت جنّی میں جنّ سے مراد وہ رفیق لیے گئے ہیں جو جن کی طرح تھے اور لسان العرب میں ایک شعر نقل کیا ہے جس میں شاعر اپنی معشوقہ کو جنّی کے نام سے خطاب کرتا ہے جہاں لسان العرب میں اس لفظ کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ وہ عورت جو جنیۃ کی طرح ہو اپنے حسن و جمال میں یا اپنے تلوّن طبع میں کیونکہ انسان جنوں سے تعشق نہیں کرتا۔ اور اشعار جاہلیت میں ہے بخیلٍ علیھا جِنّۃٌ عَبْقَرِیَّۃٌ ایسے گھوڑوں پر کہ ان پر عبقری جن سوار تھے اور ایک میں ہے جن اذا فزعوا انس اذا امنوا جہاں باوجود جن اور انس کے مقابلہ کے جن سے مراد انسان ہی ہیں (یہ دونوں مصرعے میں نے سرسید احمد خاں کی تفسیر سے نقل کیے ہیں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے لوگ جن کو وسیع معنی میں استعمال کر لیتے تھے۔ یعنی خاص قسم کے آدمیوں کو بھی جن کہہ لیتے تھے۔

جن سے مراد خاص انسان ہونے پر دلائل: اس جگہ آیا جنّ سے مراد وہی غیر مرئی ہستیاں ہیں یا مراد خاص قسم کے انسان ہیں؟ اس کا فیصلہ خود قرآن شریف کی عبارت کرتی ہے۔ اوّل تو فرمایا استمتع بعضنا ببعض ہم ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اب انسان تو ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھاتے ہیں مگر وہ غیر مرئی ہستیاں انسانوں سے اور انسان اُن غیر مرئی ہستیوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ پھر اس آیت میں تو جن و انس کو ایک دوسرے کے اولیا کہا ہے اور اگلی آیت میں فرمایا کہ اسی طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کے اولیاء بنا دیتے ہیں۔ تیسرے اگلے رکوع کے شروع میں جنّوں اور انسانوں کا ایک ہی معشر فرمایا جس کا اصل اطلاق ایک شخص کے اہل پر ہے اگر الگ نوع والے جنّ یہاں مراد ہوتے تو انسانوں کے ساتھ انہیں ایک معشر قرار نہ دیا جاتا۔ چوتھے وہیں فرمایا کہ جنوں اور انسانوں کے پاس انہی میں سے رسول آئے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ غیر مرئی ہستیاں ایک الگ نوع ہیں۔ ان کے پاس انسانوں میں سے رسول نہ آسکتے تھے، مگر جہاں تک قرآن کریم نے رسولوں کا ذکر کیا ہے وہ سب انسان رسول ہی ہیں اور بنی آدم کے ساتھ ہی وعدہ تھا کہ اِمّا یاتینّکم رسل منکم یقصّون علیکم اٰیاتی۔ اور ان غیر مرئی ہستیوں کو بھی یہ رسول یا ان کے پیرو ہی مسلمان کرتے ہیں۔ جیسا حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میرا شیطان مسلمان ہو گیا۔ پس یہاں جنوں سے مراد وہ انسان ہیں جو جنوں کی طرح ہیں۔ وہی لوگ جن کو شروع میں اکابر کہا ہے اور بڑے لوگ اس لیے جن کہلا سکتے ہیں کہ وہ عوام النّاس کی نظروں سے عموماً چھپے رہتے ہیں اور سلیمان علیہ السّلام کے ذکر میں ان قوی ہیکل لوگوں کو جن اور شیاطین کہا ہے جن کو قید کر کے حضرت سلیمانؑ نے ان سے عمارتیں بنوانے اور غوطہ زنی وغیرہ کے کام لیے اور اگر شیاطین کا لفظ آئمہ کفار اور ان کے سرداروں پر بولا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ تمام مفسرین کا اتفاق ہے تو جن کا لفظ انہی لوگوں پر بولا جانا کوئی جائے تعجب نہیں۔

خلود جہنم سے استثناء: حالانکہ یہاں صاف کفار کا ذکر ہے مگر جہنم میں ان کے رہنے کے ساتھ ایک استثناء بھی موجود ہے الّا ماشاء اللہ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس حالت سے انہیں باہر بھی نکال دے۔

ع۱۰۱۵ الف اس رکوع میں اصل ذکر بعض رسوم مشرکانہ کا ہے۔ مگر اس مضمون کو شروع کرنے سے پہلے پچھلے رکوع کے مضمون کی تکمیل کی ہے اور بتایا ہے کہ جس بات سے اب انکار ہے آخر اس کا اقرار کریں گے۔ اپنی جانوں کے خلاف گواہی دینے سے مراد اپنے گناہ کا اقرار ہے۔

کیا جنّوں میں سے رسول آئے: اس آیت کے جنّوں کو نوع انسانی کے جن نہ قرار دینے سے مفسرین کو یہ مشکل پیش آئی ہے کہ آیا جنّوں میں علیحدہ جن رسول آئے۔ ظاہر ہے کہ یہاں منکم سے مراد یہ نہیں ہو سکتی کہ جنوں میں سے جن اور انسانوں میں سے انسان رسول آئے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جس نوع کے لیے رسول بھیجتا ہے وہ اس نوع میں سے بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب انسان یہ کہتے ہیں کہ ملک یعنی فرشتہ ان کی طرف رسول کیوں نہ بھیجا گیا، تو اس کا جواب یہ دیا کہ

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾
یہ اس لیے کہ تیرا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ ہلاک کرنے والا نہیں حالانکہ ان کے رہنے والے بے خبر ہوں ع۱۰۱۶

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾
اور سب کے لیے درجے ہیں اس کے مطابق جو انھوں نے عمل کیے اور تیرا رب اس سے بے خبر نہیں جو وہ کرتے ہیں۔

وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾
اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے، اگر چاہے تم کو لے جائے اور تمھارے بعد جن کو چاہے تمھارا جانشین بنا دے، جیسا تمھیں ایک اور قوم کی نسل سے پیدا کیا ع۱۰۱۷

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾
جس کا تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے وہ یقیناً آنے والا ہے اور تم اسے عاجز کرنے والے نہیں ع۱۰۱۸

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾
کہہ اے میری قوم تم اپنی طاقت کے مطابق عمل کرتے جاؤ، میں بھی عمل کرنے والا ہوں پھر تم کو معلوم ہو ہی جائے گا کہ کس کے لیے اس گھر کا (بہتر) انجام ہے۔ ہاں ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوتے ع۱۰۱۹

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ
اور کھیتی اور چارپایوں سے جو اس نے پیدا کیے ہیں اللہ کے لیے حصہ

اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو فرشتہ ان کی طرف رسول بھیجا جاتا قل لو کان فی الارض ملٰئکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیہم من السماء ملکا رسولا (بنی اسرائیل - ۹۵) یہ آیت اس بات پر قطعی شہادت ہے کہ ایک نوع دوسری نوع کی طرف رسول نہیں ہو سکتی اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ رسول صرف احکام پہنچانے والا نہیں بلکہ ان احکام پر عمل کر کے دکھانے والا ہے اور ظاہر ہے کہ فرشتہ انسان کے لیے نمونہ نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی انسان جنوں کے لیے نمونہ نہیں ہو سکتا اور جس طرح ملک انسانوں کے لیے رسول کا کام نہیں دے سکتا انسان جنوں کے لیے رسول کا کام نہیں دے سکتا پس جنوں اور انسانوں کو ایک معشر قرار دیکر پھر ان میں سے رسول بھیجنے کا ذکر صاف بتاتا ہے کہ ایک ہی نوع کا یہاں کا ذکر ہے اور اس دوسری نوع کا ذکر نہیں جو غیر مرئی ہستیاں ہیں۔

ع۱۰۱۶ ہلاکت سے پہلے تنبیہ ہوتی ہے: یعنی رسولوں کے بھیجنے کی غرض یہ تھی کہ بے خبری میں لوگ ہلاک نہ ہوں۔ ان کے فرائض سے ان کو آگاہ کرنے والا کوئی ہو۔ قرآن شریف میں جنوں کی کسی بستی کی ہلاکت کا ذکر نہیں اگر جنوں کی طرف بھی انسان رسول مبعوث ہوئے ہوتے تو ان کی ہلاکت کا بھی کہیں ذکر ہوتا۔ بظلم کے معنے دو طرح پر ہو سکتے ہیں یعنی ایک یہ کہ ظلم اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو یعنی اللہ ایسا نہ تھا کہ ظلم کر کے بغیر تنبیہ کیے اور رسول بھیجے ایک بستی کو ہلاک کر دے اور دوسرے یہ کہ محض لوگوں کے ظلم یعنی کفر یا شرک کی وجہ سے یا عقاید کی غلطی کی وجہ سے انہیں ہلاک نہیں کیا جب تک پہلے رسول بھیجکر تنبیہ نہیں کر دی۔ اور مطلب یہ ہے کہ گو بوجہ ظلم کے ان لوگوں کی حالت بہت خراب تھی کفر اور شرک کی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم اس قدر ہے کہ جب تک رسول بھیجکر ان پر اتمام حجت نہیں کر دیا اس وقت تک ان پر عذاب بھیجنا بھی پسند نہیں فرمایا۔ اسی کی طرف اشارہ آیت ع۱۳۴ کے الفاظ ذو الرحمۃ میں ہے۔

ع۱۰۱۷ اس میں صاف پیشگوئی ہے کہ اس کافر قوم کی جگہ دوسری قوم لے گی اور وہ مسلمان قوم تھی۔

ع۱۰۱۸ معجزین۔ عجز انسان کے مؤخر یعنی پچھلے حصہ کو کہتے ہیں اور اس لیے عَجْز کے معنی کسی شے سے پیچھے رہ جانا ہیں اور مراد اس سے لی جاتی ہے کہ کام کرنے میں کوتاہی کی جو قدرت کی ضد ہے اور معجزین سے مراد ہے کہ خدا کو عاجز نہیں کر سکتے یعنی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے (غ)

ع۱۰۱۹ مکانۃ - بہ ظرف ہونے کے لحاظ سے مکان یا حالت کے معنی میں بھی آتا ہے اور مصدر ہونے کے لحاظ سے اس کے معنی استطاعت بھی ہو سکتے ہیں۔

عاقبۃ الدار - الدار سے مراد دار دنیا ہے اور عاقبۃ سے مراد العاقبۃ الحسنٰی یا اچھا انجام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہی اعمال کا نتیجہ ظاہر ہو جائے گا۔ نیکی کا نتیجہ اچھا اور بدی کا نتیجہ بُرا ہونے پر جس قدر یقین اور وثوق نبی کریم صلعم کے قلب مبارک میں تھا اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ایک طرف دشمنوں کی طرف سے تکلیف پر تکلیف پہنچتی ہے اور یہ زمانہ آپؐ کی انتہائی بیکسی کا ہے۔ مگر کس قدر یقین حق کی آخری کامیابی پر ہے کہ ایک پہاڑ میں جنبش آ سکتی ہے مگر اس یقین کو جنبش دینے والی کوئی چیز نہیں۔

نَصِيبًا فَقَالُوا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا
لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ
إِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلٰى
شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿۱۳۶﴾

ٹھیراتے ہیں اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لیے ہے ان کے خیال میں اور یہ ہمارے شریکوں کے لیے ہے سو جو اُن کے شریکوں کے لیے ہوتا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا اور جو اللہ کے لیے ہوتا ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے ۔ بُرا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں ۱۰۲۰

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ
قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ
وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا
فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿۱۳۷﴾

اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے اُن کی اولاد کا قتل کرنا اُن کے شریک اچھا کر دکھاتے ہیں، تاکہ وہ انھیں ہلاک کردیں اور ان کا دین اُن پر خلط کر دیں اور اگر اللہ چاہتا تو ایسا نہ کرتے ۔ سو اُن کو اور جو وہ افترا کرتے ہیں چھوڑ دے ۱۰۲۱

وَقَالُوا هٰذِهٖٓ أَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا
يَطْعَمُهَآ إِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ
حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُونَ
اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۚ سَيَجْزِيهِمْ
بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۱۳۸﴾

اور کہتے ہیں یہ چار پائے اور کھیتی منع ہے ۔ اس کو کوئی نہیں کھا سکتا، مگر وہ جس کو ہم چاہیں، ان کے خیال میں اور چار پائے جن کی پیٹھوں (پر چڑھنے) کو حرام کر دیا گیا ہے اور چار پائے جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے اس پر افترا کرتے ہوئے وہ ان کو اس کا بدلہ دیگا جو وہ افترا کرتے تھے ۔

وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ
لِّذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى أَزْوَاجِنَا ۖ وَإِنْ
يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَآءُ ۚ سَيَجْزِيهِمْ

اور کہتے ہیں جو کچھ ان چار پایوں کے پیٹوں میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے اور اگر وہ (بچّہ) مرا ہوا ہو تو وہ سب اس میں شریک ہوتے ہیں، وہ اُن کو اُن کے

ف۱۰۲۰ آنحضرتؐ نے مشرکانہ رسوم کا استیصال کیا: مشرکانہ رسوم اس قوم کے روزمرہ کے افعال کے اندر داخل ہو کر قومی خون کے اندر رچ گئی تھیں اور ان رسوم کا ان سے دور کرنا اور سینکڑوں سالوں کی عادات قومی کو بدل دینا کسی انسان کی طاقت میں نہ تھا۔ یہ کمال محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی کو ہی دیا گیا کہ تمام رسوم کو چند سال کے عرصہ میں ایسا دور کیا کہ انکا کہیں نام و نشان بھی نہ رہا۔ خیرات کے لیے جو حصّہ الگ کرتے اس میں سے ایک حصّہ اللہ کے نام پر رکھتے اور مہمانوں مساکین وغیرہ پر خرچ کرتے اور ایک حصّہ بتوں کے لیے جو کاہنوں اور بتوں کے مجاوروں کو دیتے۔ پھر طرح طرح کی تجویزوں سے اس حصّہ کو جو خدا کے لیے ہوتا بتوں پر صرف کر دیتے۔ مثلاً اگر دیکھتے کہ جو حصّہ اللہ کے لیے مقرر کیا ہے وہ عمدہ حالت میں ہے تو اسے بھی بتوں کا چڑھاوا بنا دیتے۔ یا کچھ غلط واقع ہو جاتا تو سارا بتوں کا چڑھاوا قرار دے دیتے۔ آج مسلمانوں کے چندے خیراتی کاموں کے لیے اسی رنگ میں رنگین ہیں وعدہ کر لیتے ہیں مگر اپنی ضروریات آئیں تو جو حصّہ خدا کے لیے دینا کیا ہے اسے بھی وہیں خرچ کر لیتے ہیں اور یوں کبھی نہیں ہوتا کہ اپنی ضروریات کو کاٹ کر اللہ تعالیٰ کے لیے دیں۔ الّا ماشاء اللہ۔

ع۱۰۲۱ یردوا۔ رَدَی کے معنی ہلاک ہیں وما یغنی عنه ماله اذا تردّٰی (الیل ۹۲۔ ۱۱) تاللہ ان کدت لتردین (الصّٰفّٰت ۳۷۔ ۵۶)

قتل اولاد کی رسم: قتل اولاد۔ ایک تو بیٹیوں کا زندہ گاڑ دینا تھا۔ اس صورت میں شرکاؤھم سے مراد اُن کے اکابر ہوں گے جو ایک جھوٹی غیرت کی وجہ سے بیٹیوں کو زندہ نہ رہنے دیتے تھے۔ انہی کا تتبع عوام الناس کرنے لگے، اور علاوہ ازیں ان میں یہ بھی رسم تھی کہ جب بیٹوں کی تعداد دس تک پہنچ جائے تو ایک کو بتوں کا چڑھاوا چڑھا دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ عبد المطلب نے کیا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کو بت پر چڑھاوے کے طور پر ذبح کرنے کے لیے چڑھایا۔ اور آخر ایک سو اونٹ آپ کی جگہ دیا۔ اسی لیے رسول اللہ صلعم نے فرمایا انا ابن الذبیحین میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں یعنی ایک حضرت اسماعیلؑ اور دوسرے آپ کے والد عبداللہ۔

اولاد کو جاہل رکھنا بھی قتل کرنا ہے: اور قتلِ اولاد سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی پرورش ظلم شرک جہالت میں کرتے جیسا کہ امام راغبؒ نے لاتقتلوا اولادکم

وَصْفَهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾
قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا
بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَاۗءً
عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ ع ۱۷
وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ
مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا
اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ
مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ
اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ڮ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ
اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۴۱﴾
وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۭ كُلُوْا
مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ
الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴۲﴾

بیان کا بدلہ دیگا وہ حکمت والا علم والا ہے ع۱۰۲۲
بیشک وہ گھاٹے میں ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی سے
لاعلمی میں قتل کر دیا اور جو اللہ نے ان کو رزق دیا تھا اس کو اللہ پر افترا
کر کے حرام کر دیا۔ بیشک وہ گمراہ ہوئے اور وہ ہدایت پانے والے نہیں ع۱۰۲۳
اور وہی ہے جس نے باغ پیدا کیے ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے اور نہ
چڑھائے ہوئے اور کھجوریں اور کھیتی اس کے پھل مختلف قسم کے ہیں اور
زیتون اور انار، ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور نہ
ملتے جلتے۔ اس کے پھل سے کھاؤ جب وہ پھل لائے اور
اس کے کاٹنے کے دن اس کا حق دو اور بے جا خرچ نہ کرو،
وہ بے جا خرچ کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا ع۱۰۲۴
اور چار پایوں میں سے جو اٹھائے جاتے ہیں اور جن پر سوار ہوتے ہیں
اس سے کھاؤ جو تم کو اللہ نے رزق دیا ہے اور شیطان کے قدموں
کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے ع۱۰۲۵

من املاق (۱۵۲) میں لکھا ہے قیل ان ذٰلک نھیٌ عن شغل الاولاد بما یصُدُّھم عن العلم۔

لبس۔ دین کو غلط کرنے سے مراد ہے کہ اصل دین توحید جو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کا تھا اس پر نہ رہنے دیا۔

لوشاء اللّٰہ ما فعلوہ میں پھر پیشگوئی ہے کہ یہ رسوم بدسب ان کے درمیان سے دور کر دی جائیں گی۔

ع۱۰۲۲ حِجْر اصل حَجَر سے لیا گیا ہے یعنی پتھر اور اس میں روکنے کے معنی آگئے ہیں۔ جس طرح پتھر بوجہ اپنی صلابت کے روکتا ہے۔ اور اس لیے حِجر کے معنی میں تحریم کی وجہ سے ممنوع جیسے یہاں اور حِجر عقل کو بھی کہتے ہیں اس لیے کہ وہ اس چیز سے روکتی ہے جس کی طرف انسان کا نفس اسے بلاتا ہے جیسے قسم لذی حجر (الفجر ۸۹۔ ۵)

وصف کسی چیز کا ذکر اس کے حلیہ اور اس کی نعت کے ساتھ کرنا۔ اور وَصف حق بھی ہوتا ہے اور باطل بھی لما تصف السنتکم [illegible] سبحان ربک رب العزۃ عمّا یصفون (الصّٰفّٰت ۳۷۔ ۱۸۰)

یہ تمام مشرکانہ رسوم عرب میں مروج تھیں مگر اسلام نے ایسا ان رسوم سے ملک کو پاک کیا کہ پھر ان میں سے کسی رسم کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ یوں اسلام نے صرف عقیدتاً توحید نہیں پھیلائی بلکہ ان کی عملی زندگی میں سے ہر ایک قسم کے شرک کو دور کیا۔

ع۱۰۲۳ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل اولاد سے مراد ان کی جہالت اور مشرکانہ رسوم میں پرورش کرنا ہے۔

ع۱۰۲۴ معروشات۔ عَرش چھتی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ اور عَرَشْتُ الکَرْم کے معنی ہیں اس کے لیے چھت کے طور پر کوئی چیز بنا دی ومن الشجر وممّا یعرشون (النحل ۱۶۔ ۶۸) پس معروش کے معنی ٹٹی پر چڑھایا ہوا (غ) اور معروشات سے مراد انگور وغیرہ ہیں جس کو کسی سہارے کی ضرورت ہوتی اور غیر معروشات وہ جو خود اپنے تنہ پر کھڑے ہوتے ہیں۔ (ج)

اکل۔ اَکْل کھانا اور اکل یا اُکُل وہ چیز ہے جو کھائی جائے مگر اُکُل حظ یا رزق کے معنی میں بھی آتا ہے اور پھل کو بھی کہتے ہیں (ل)

مسرف۔ سرف کسی فعل میں حد سے تجاوز کرنے کا نام ہے، خاص طور پر مال خرچ کرنے میں اور حد سے تجاوز دونوں طرح پر ہے۔ ضرورت سے زیادہ خرچ کرے یا اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے باہر خرچ کرے خواہ قلیل ہی ہو (غ) رسوم و رواج پر جو خرچ کیا جاتا ہے۔ وہ سب طاعۃ اللہ سے باہر ہونے کی وجہ سے اسراف میں داخل ہے۔

اول نباتات میں جو اللہ تعالیٰ کی نعماء ہیں ان کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان میں حق صرف خالق کا ہو سکتا ہے اس کے سوا اور کسی کا حق نہیں۔ اور وہ حق زکوٰۃ ہے۔ مشرک نباتات یعنی کھیتیوں میں اور چار پایوں میں بتوں کے حقوق مقرر کرتے تھے۔ خود کھانے کا ذکر ترتیب طبعی کے لحاظ سے پہلے رکھا ہے۔

ع۱۰۲۵ حمولۃ۔ حمل سے ہے جس کے معنی اٹھانا ہیں۔ راغبؒ نے اس کے معنی کیے ہیں ما یُحْمَل جو خود اٹھایا جائے۔ یعنی چھوٹا۔

فَرْش۔ فرش کے معنی بچھانا ہیں اور زمین کو فراش کہا ہے کہ اس پر انسانوں کا استقرار ہے فَرْش کے معنی ما یُفرش ہیں اور اس سے مراد ما یُرکَب ہے

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

آٹھ نر اور مادہ، دو بھیڑوں میں سے، اور دو بکریوں میں سے ۔ کہہ، کیا دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ، یا وہ جو دونوں مادہ کے رحموں میں ہے؟ مجھے علم کے ساتھ خبر دو اگر تم سچے ہو ع۱۰۲۶

وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ ع ۱۷

اور اونٹوں میں سے دو، اور گایوں میں سے دو ۔ کہہ کیا دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ، یا وہ جو دونوں مادہ کے رحموں میں ہے؟
یا تم گواہ تھے جب اللہ نے تم کو یہ حکم دیا ۔ پس اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے تاکہ بے علمی سے لوگوں کو گمراہ کرے، اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا ع۱۰۲۷

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِىَ اِلَىَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

کہہ، میں اس میں جو میری طرف وحی کی گئی ہے کسی چیز کو جو کوئی کھانے والا کھائے حرام نہیں پاتا، سوائے اس کے کہ مردار ہو یا خون گرایا گیا، یا سؤر کا گوشت، کیونکہ یہ (سب) ناپاک ہیں یا وہ نافرمانی ہو کہ اس پر اللہ کے سوائے دوسرے کا نام پکارا گیا ہو ۔ پھر جو کوئی لاچار ہو جائے نہ خواہش کرنیوالا نہ حد سے بڑھنے والا تو تیرا رب بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ع۱۰۲۸

یعنی جس پر سواری کی جائے (رغ)
گزشتہ رکوع کی مشرکانہ رسوم کا ابطال کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان جانوروں کا پیدا کرنے والا خدا تعالیٰ ہے نہ تمہارے بُت ۔ پس اللہ تعالےٰ نے جس کام کے لیے انھیں پیدا کیا ہے وہ کام ان سے لو ۔ حمولۃ اور فرش کے معنی میں بہت سا اختلاف ہے میں نے امام راغبؒ کے معنوں کو ترجیح دی ہے اس لیے کہ اگلی آیات میں اس ترتیب سے ان جانوروں کا ذکر کیا ۔ پہلے چھوٹے اور پھر بڑے۔

ع۱۰۲۶ زوج ۔ نر اور مادہ میں سے ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے پس آٹھ ازواج سے مراد ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ لیکر کل تعداد آٹھ ہے ۔ جیسا کہ آگے خود تقسیم کرکے بتایا ہے۔
ضان ۔ ضائن کی جمع ہے ۔ بھیڑ ۔ نر کَبْش اور مادہ نعجۃ اور معز ۔ ماعز کی بکرا ۔ نر تیس ہے اور مادہ عنز۔
بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ نر کو حرام کیا ہے نہ مادہ کو نہ ان کے بچوں کو ۔ مشرک بعض وقت نر کو بتوں کا چڑھاوا قرار دیکر ان سے کام لینا حرام سمجھتے تھے ۔ بعض وقت مادہ کو ۔ اور جیسا کہ پچھلے رکوع میں ذکر ہے بعض وقت جو بچہ پیٹ میں ہو اسے مردوں کے لیے حلال اور عورتوں کے لیے حرام قرار دیتے تھے اس لیے نر اور مادہ کا ذکر الگ الگ کیا۔

ع۱۰۲۷ ابل میں سے دو جمل یعنی نر اور ناقۃ یعنی مادہ ۔
بقر میں سے دو ۔ نر کو ثور کہتے ہیں ۔ مادہ کو بقرۃ جس کی جمع بَقَر ہے ۔
ان تمام رسوم کو مشرکین اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرف منسوب کرتے تھے اور یہ سب ان کا افتراء تھا ۔
ع۱۰۲۸ اجب مشرکانہ رسوم کا ذکر ہوا جن کی رو سے حلال چیزوں کو حرام کیا جاتا تھا ۔ تو یہ بھی بتا دیا کہ وحی الٰہی کس چیز کو حرام ٹھہراتی ہے لا اجد فیما اوحی الیّ

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿١٤٦﴾

اور اُن پر جو یہودی ہیں ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کیے تھے اور گایوں اور بھیڑ بکری سے ہم نے ان کی چربی حرام کی تھی، سوائے اس کے جو اُن کی پیٹھ پر یا انتڑیوں پر لگی ہو یا جو ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے اُن کو اُن کی بغاوت کی وجہ سے سزا دی تھی اور یقیناً ہم سچے ہیں[۱۰۲۹]

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٤٧﴾

پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ، تمھارا رب وسیع رحمت والا ہے - اور اس کی سزا مجرم قوم سے نہیں ٹلتی -

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿١٤٨﴾

جنھوں نے شرک کیا، اب وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام کرتے، اسی طرح وہ لوگ جھٹلاتے رہے جو اُن سے پہلے تھے۔ یہاں تک کہ ہماری سزا کا مزا چکھا۔ کہہ کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے تو اس کو ہمارے لیے نکالو تم صرف ظن کی پیروی کرتے ہو اور تم نری اٹکلیں دوڑاتے ہو[۱۰۳۰]

بتانا ہے کہ یہاں اشارہ سورۂ نحل کی طرف ہے جو بلحاظ نزول سورۂ انعام سے پہلے کی ہے اور سب سے پہلے اسی میں غذاؤں کی حرمت وحلت کا ذکر آیا ہے۔ یہاں زاید یہ بیان کر دیا ہے کہ پہلی تین یعنی مردار اور خون جو بہ گیا ہو اور سؤر کا گوشت یہ تینوں اپنی ناپاکی کی وجہ سے حرام کیے گئے ہیں۔ ان میں وہ مضرات ہیں جو انسان کے جسم پر اور اس کے اخلاق پر بُرا اثر پیدا کرتے ہیں۔ اور ما اهل به لغیر الله کو ان تینوں سے الگ کر کے اسے فسق قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس کی ناپاکی اصل نہیں بلکہ وہ محض خدا کے حکم کی نافرمانی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ غذاؤں تک میں مشرکانہ رسوم کی بیخ کنی کر دی جائے۔

ع[۱۰۲۹] ذی ظفر۔ ظُفُر انسان اور اس کے غیر دونوں پر بولا جاتا ہے اور ذی ظفر سے مراد ذی مخالب ہیں (غ) یعنی پنجہ والے۔ بہائم اور پرندوں میں سے وہ جن کی انگلیاں پھٹی ہوئی نہ ہوں جیسے اونٹ اور شتر مرغ اور بطخ (ج)

حوایا۔ حَوِیّة کی جمع ہے انتڑیاں اور حویٰ کے معنی ہیں جمع کیا اور اسے نگاہ رکھا (ل)

حرمت بطور سزا: مطلب یہ ہے کہ یہودیوں پر جو ان ممنوعہ غذاؤں یعنی سؤر وغیرہ سے علاوہ کچھ حرام کیا گیا تھا تو یہ ان کی شرارتوں کی وجہ سے ایک وقتی سزا تھی۔ یعنی ان کے مادۂ سرکشی کو کم کرنے کے لیے بعض چیزوں سے انھیں بطور سزا محروم کر دیا گیا۔

ع[۱۰۳۰] تخرصون۔ خَرص۔ پھل کے تخمینہ کرنے کو کہا جاتا ہے اور تخرصون کے معنی ہیں تم جھوٹ بولتے ہو۔ اور قُتِل الخرّٰصون (الذٰریٰت ۵۱ - ۱۰) کے معنی ہیں کذابوں پر لعنت۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک قول جو صرف ظن اور تخمینہ کی بنا پر کہا جائے وہ خرص ہے خواہ ایک چیز کے مطابق ہو یا مخالف کیونکہ اس کا کہنے والا وہ بات علم یا غلبہ ظن یا سماع کی بنا پر نہیں کہتا بلکہ صرف گمان اور تخمینہ کی بنا پر اور اس طرح پر بات کہنے والا کاذب سمجھا جائیگا (غ)

لو شاء الله ما اشرکنا کی تفسیر: جب ہر قسم کے دلائل ابطال شرک کے ہو چکے۔ تو اب ان کے آخری عذر کا فیصلہ کرتا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو ہم ایسا نہ کرتے۔ مطلب یہ کہ ہمارا شرک بھی مشیت الٰہی سے ہے۔ اس کا جواب کئی طرح پر دیا ہے۔ اوّل یہ کہ یہ محض تکذیب ہے پہلے لوگ بھی اسی طرح کے بودے عذر بنا کر انبیاء کو جھٹلاتے رہے۔ آخر عذاب کا مزہ چکھا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا یہ منشا ہوتا کہ انسان شرک کریں تو پھر وہ شرک کی وجہ سے عذاب کیوں بھیجتا۔ دوسرا جواب اسی کے اندر ہے کہ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کیوں تکذیب کرتے ہو۔ اگر تم ایسے ہی مسلوب الاختیار رہو تو پھر تکذیب کیوں کرتے ہو۔ حق کے قبول کرنے میں مسلوب الاختیار بنتے ہیں۔ اس کی تکذیب کے وقت نہیں بنتے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ کوئی علم پیش کرو۔ اگر الٰہی منشا یہ ہوتا کہ لوگ شرک کیا کریں تو اس کی تعلیم بذریعہ انبیاء بھی یہی ہوتی مگر کسی نبی کی تعلیم شرک کی طرف نہیں بلاتی۔ اور آخر پر بتایا کہ یہ تمہاری باتیں نرے ظن اور اٹکلوں پر مبنی ہیں حالانکہ پیغمبر جو ابطال شرک کرتا ہے وہ یقینی علم کی بنیاد پر

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

کہہ دے، تو اللہ کی دلیل ہی فیصلہ کن ہے، سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دیتا ۱۰۳۱

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ ع

کہہ، اپنے وہ گواہ لاؤ، جو یہ گواہی دیں کہ اللہ نے اس کو حرام کیا ہے۔ پھر اگر یہ خود گواہی دیں تو تُو اُن کے ساتھ گواہی نہ دے اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کر، جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور ان کی جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور وہ (دوسروں کو) اپنے رب کے برابر ٹھیراتے ہیں ۱۰۳۲

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

کہہ، آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو تمھارے رب نے حرام کیا ہے تم پر واجب ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو۔ ہم تم کو رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی اور بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوئی ہوں اور اس جان کو جسے اللہ نے حرام ٹھیرایا ہے قتل نہ کرو مگر حق پر اس کا تم کو حکم دیتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو ۱۰۳۳

کرتا ہے۔

جو کچھ یہاں مشرکوں کی حالت بیان کی ہے آج وہی مسلمانوں کے کثیر حصّہ پر صادق آرہی ہے۔ ایک کثیر حصّہ مسلمانوں کا ایسا ہے جو طرح طرح کے فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر کہہ دیتے ہیں کہ خدا کے منشاء کے خلاف تو ہم چل ہی نہیں سکتے۔ پس وہ چاہتا ہی ہے تو ہم ایسا کرتے ہیں۔ اسی طرح مذہب کے معاملہ میں بڑی جرأت سے کام لیکر بغیر صحیح علم کے اٹکلیں دوڑاتے رہتے ہیں اور اس کو یہاں کذب قرار دیا ہے۔

ع۱۰۳۱ البالغة۔ بُلُوغ کے معنی غایت مقصد کو پہنچ جانا (رغ) پس حجة بالغة وہ دلیل قطعی ہوئی جو مدعا کو ثابت کر دے۔

جو دلائل اوپر دیئے ہیں ان کو حجّت بالغہ یا فیصلہ کن دلیل کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور آخر پر فرمایا کہ ارادہ الٰہی تو ہدایت کے لیے ہی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ وہ سامان بھی پیدا کر دیگا جو تم کو شرک سے نکال کر توحید پر قائم کر دیں یا لوشاء لهدٰىكم اجمعين کے معنی یہ ہیں کہ اگر اس کی مشیت انسانوں کو مجبور کرنا ہوتی تو وہ ہدایت پر مجبور کرتا۔

ع۱۰۳۲ هَلُمَّ۔ کسی چیز کی طرف بلانے پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کی اصل بعض کے نزدیک هَالُمَّ ہے اور لُمّ لَمَمْت سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کی اصلاح کی اور بعض کے نزدیک هَلْ اَمَّ یعنی کیا تمہارے لیے اس میں اَمّ یعنی قصد ہے (رغ)

مطلب یہ ہے کہ تم کوئی ایسا شخص پیش نہیں کر سکتے جس نے بر بنائے وحی الٰہی یہ کہا ہو کہ یہ مشرکانہ باتیں جائز ہیں۔

ع۱۰۳۳ حَرَّمَ رَبُّكم کے آگے آتا ہے کہ کسی کو شریک نہ کرو۔ مگر شرک کرنے کو حرام نہیں کیا۔ بلکہ بلحاظ تاکید لا بڑھا دیا ہے یا علیکم سے اگلا بیان شروع ہوتا ہے یعنی تم پر واجب ہے کہ شرک نہ کرو پس جو کرنے کی باتیں تھیں وہ بتا دیں ان کے خلاف حرام ہے۔

من املاق۔ مَلَق۔ مہربانی اور لطف یا نرمی اور مدارات کو کہا جاتا ہے اس سے تَمَلُّق بمعنی چاپلوسی ہے اس لیے دعا اور تضرع کو بھی ملق کہا جاتا ہے اور املاق فقیر ہو جانے کو کہتے ہیں اور اصل اس کا یہ ہے کہ سارا مال خرچ کر دیا۔ پس اس کے پاس کچھ نہ رہا (ل) یہاں من املاق فرمایا۔ یعنی مفلسی کی وجہ سے دوسری جگہ ہے خشية املاق یعنی مفلسی کے ڈر سے (بنی اسرائیل ۱۷-۳۱) ہو سکتا ہے کہ دونوں کے ایک معنی ہوں، ہو سکتا ہے کہ پہلے سے مراد وہ ہیں جو مفلس ہیں اور دوسرے سے وہ جو مفلس نہیں مگر مفلسی سے ڈرتے ہیں۔

توحید کا عملی رنگ: ہر قسم کے شرک کی بلکہ اس کے ساتھ ہی مشرکانہ رسوم کی تردید کر کے اب اس رکوع میں بتایا ہے کہ توحید کو قبول کرنا محض ایک عقیدہ کا مان لینا

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ
اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ
وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا
وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ
ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ
بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، مگر اس طریق سے جو بہت اچھا ہو، یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور ماپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو، ہم کسی جی کو مکلف نہیں کرتے مگر اس کی وسعت کے مطابق اور جب تم بات کہو تو عدل کرو اگرچہ قریبی ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ اس کا تم کو حکم دیتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو ۱۰۳۴

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ
وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ
سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

اور کہ یہ میرا راستہ سیدھا ہے سو اس کی پیروی کرو اور (دوسرے) راستوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ تم کو اس کے راستہ سے ہٹا دیں گے اس کا تم کو حکم دیتا ہے تاکہ تم تقویٰ کرو ۱۰۳۵

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِیْۤ
اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًى
وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ ع ۱۹/۴

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اس پر (نعمت کا) اتمام کرنے کے لیے جو نیکی کرتا ہے اور ہر (ضروری) چیز کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت تاکہ وہ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں ۱۰۳۶

نہیں بلکہ خاص اصول پر اپنی زندگی کو چلانے کا نام ہے۔ چنانچہ اوّل خلاصہ کے طور پر ہر قسم کے شرک کا ابطال یوں کیا کہ کسی چیز کو مسیح ہو یا ملائکہ ہوں یا بُت ہوں یا اور چیزیں ہوں یا اہرمن ہو خدا کے ساتھ شریک مت ٹھہراؤ۔ اور اس کے ساتھ ہی دوسرے احکام کا ذکر کیا جو انسان کی عملی زندگی کے لیے ہیں گویا بتا دیا کہ شرک سے بچنا یہی ہے کہ صحیح اصولِ زندگی پر عمل پیرا ہو۔ ان میں سب سے پہلے والدین کے حقوق کی طرف توجہ دلائی پھر اولاد کے قتل اولاد سے یہاں بعض نے مراد عزل وغیرہ سے بیج ضائع کرنا لیا ہے اور بعض نے لڑکیوں کا زندہ گاڑنا، مگر سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد جیسا کہ ع۱۰۲۱ میں دکھایا جا چکا ہے یہی ہے کہ اولاد کو علم وغیرہ سے محروم مت کرو۔ کیونکہ اکثر لوگ محض اس خیال سے اولاد کو تعلیم نہیں دیتے کہ ہم مفلس ہیں۔ یا مفلس ہو جائیں گے مفلسی کے خوف سے لڑکیوں کو مار تے تھے گویا والدین کے حقوق کے مقابل اولاد کے حقوق یہ بیان کیے کہ ان کو اچھی تعلیم و تربیت دی جائے پھر ہر قسم کی بے حیائی کی باتوں سے روکا خواہ ان کا اثر دوسرے پر نہ پہنچتا ہو اور بدترین بے حیائی زنا ہے جس سے نسل انسانی کی افزائش پر بھی بُرا اثر پڑتا ہے۔ پھر بقائے نسل انسانی میں جو سب سے بڑی ضرورت ہے یعنی حفاظت جان اس کی طرف توجہ دلائی ایک رنگ میں چاروں باتوں کا تعلق حفاظت جان سے ہے۔ ماں باپ کے ذریعہ سے جان پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کی تربیت ہوتی ہے پھر اولاد کے قتل سے روکا۔ پھر بے حیائی سے جس کی سب سے قبیح صورت زنا ہے جس سے اولاد ضائع ہوتی ہے۔ پھر دوسرے کو قتل کرنے سے روکا ہے۔ آخر پر عقل سے کام لینے کو کہا ہے کہ اس کے بغیر نوع انسان کا بقا نہیں رہ سکتا۔

ع۱۰۳۴ اشد۔ شِدّۃ کا استعمال مضبوطی عہد پر بھی ہے اور قوت بدنی پر بھی ھو اشد منھم قوۃ (حٰم ۴۱- ۱۵) اور اشُدّ وہ حالت ہے جب انسان کے قوائے جسمانی مضبوط ہو جائیں اور قوائے اخلاقی کی مضبوطی پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے حتّٰی اذا بلغ اشدہ و بلغ اربعین سنۃ (الاحقاف ۴۶- ۱۵) (غ) اور یہاں مراد قوائے بدنی کی مضبوطی ہے۔

اس آیت میں حفاظت مال کی طرف توجہ دلائی ہے۔ سب سے پہلے یتیم کے مال کی حفاظت کی۔ پھر ماپ اور تول کو ٹھیک رکھنے کا حکم دیا۔ پھر حقوق اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں انصاف کا حکم دیا۔ اور بالآخر اللہ کے عہد کی طرف توجہ دلا کر تمام احکام شریعت کی طرف توجہ دلائی۔ اس کا خاتمہ نصیحت پر کیا کیونکہ لوگ مال کے معاملہ میں یا شہادت کے ادا کرنے میں خدا کو یاد نہیں رکھتے۔

ع۱۰۳۵ حقوق اللہ یا اللہ کی توحید کے ساتھ حقوق العباد کو بیان کر کے اس سب کو صراطِ مستقیم کہا ہے جس سے معلوم ہوا کہ حقوق العباد کی ادائگی بھی صراط مستقیم میں شامل ہے۔

ع۱۰۳۶ ثُمَّ یہاں ترتیب کے لیے نہیں۔ بلکہ مراد صرف ایک اور چیز کا ذکر ہے۔ دیکھو ع۴۴۔

توریت کن معنوں میں اتمام نعمت ہے: تماماً یعنی اتمام نعمت کے لیے۔ اس قوم کے حالات کے مطابق توریت سے ہی ان پر اتمام نعمت ہُوا۔ ہاں کل دنیا پر اتمام نعمت قرآن سے ہُوا۔

علی الّذی احسن۔ اس سے مراد ہر ایک نیکی کرنے والا ہے۔ بعض نے مراد حضرت موسیٰ کو لیا ہے کہ انہوں نے تبلیغ میں احسان کیا یا مراد ہے احسن القیام یعنی کتاب

وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

اور یہ کتاب جس کو ہم نے اتارا ہے برکت دی گئی ہے سو اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ع۱۰۳۷

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾

ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ کتاب صرف ہم سے پہلے دو گروہوں پر اتاری گئی اور ہم ان کے پڑھنے سے یقیناً بے خبر تھے ع۱۰۳۸

اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

یا کہو اگر کتاب ہم پر اتاری جاتی تو ہم یقیناً ان سے زیادہ ہدایت پر ہوتے سو ضرور تمہارے پاس تمہارے رب سے کھلی دلیل اور ہدایت اور رحمت آ گئی۔ پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے، جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلائے اور ان سے پھر جائے۔ ہم ان لوگوں کو جو ہماری آیات سے پھرتے ہیں، بُرے عذاب کی سزا دیں گے اس لیے کہ وہ پھر جاتے تھے ع۱۰۳۹

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ

وہ کسی بات کا انتظار نہیں کرتے مگر یہ کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا رب آئے یا تیرے رب کے بعض نشان آئیں۔ جس دن تیرے رب کے بعض نشان آئیں گے کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہیں دے گا، جو پہلے ایمان نہ لایا تھا۔

کے قائم رکھنے میں نیکی کرے یا تماماً سے مراد اس کے عمل احسان پر خدا تعالیٰ کی طرف سے نعمت کی زیادتی ہے۔
تفصیل کل شئ سے مراد صرف اسی قدر ہے کہ اس قوم کی ضرورت کے مطابق اس میں ہر شے کی تفصیل تھی جیسا کہ ایک ملکہ کے ذکر میں ہے واوتیت من کل شئ (النمل ۲۳) مراد صرف اس زمانہ کی ضروریات ہیں۔
چونکہ اگلے رکوع میں قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال کا ذکر ہے اس لیے اس کا خاتمہ حضرت موسیٰؑ پر کیا ہے اور اس لیے بھی کہ موسیٰ کی کتاب قرآن کی صداقت پر گواہ ہے اور خود اس رکوع سے یہ تعلق ہے کہ جیسے احکام شریعت توحید کے ساتھ اب دیئے ہیں ایسے ہی احکام موسیٰ کو بھی دیئے تھے۔

ع۱۰۳۷ سورت کے خاتمہ پر اس رکوع میں دو باتوں کا ذکر کیا ہے، ایک تو یہ کہ توحید کی تعلیم دنیا میں گو پہلے بھی آتی رہی جیسا کہ ابھی حضرت موسیٰؑ کی کتاب کے ذکر میں فرمایا تھا اور اپنے اپنے وقت میں ہر قوم پر اتمام نعمت وہی تعلیم تھی، لیکن وہ کامل تعلیم جو دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے بھیجی جاتی ہے وہ اس کتاب میں ہے، جو مبارک ہے، جس کی خیر دائمی ہے اور کبھی منقطع نہ ہو گی (دیکھو ع۹۸۲) اور دوسرا اس توحید کا عملی نمونہ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کو پیش کیا ہے اور یوں بتایا ہے کہ توحید کی تعلیم علمی رنگ میں اپنے کمال میں اگر قرآن شریف میں موجود ہے تو عملی رنگ میں وہ محمد رسول اللہ صلعم میں ہے۔

ع۱۰۳۸ یہاں مخاطب خصوصیت سے اہل عرب ہیں، اور ان تقولوا کا تعلق انزلناہ سے ہے یعنی اگر ہم کتاب نہ اتارتے تو تم ایسا کہہ سکتے تھے۔ اور صرف دو گروہوں کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ دو گروہ ملک عرب میں آباد تھے اور انہوں نے عرب کی اصلاح کے لیے کوشش بھی کی تھی، چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلے یہودیوں اور پھر عیسائیوں نے اپنا پورا زور اہل عرب کو یہودی اور عیسائی بنانے پر لگایا، لیکن ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ اور ان کی دراست سے بے خبر ہونا اس لحاظ سے کہا کہ یہ کتابیں زبان عربی میں نہ تھیں اور ان کے ترجمے بھی وہ دوسری زبانوں میں کرنا جائز نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی خیال تھا کہ ان کی مقدس کتابوں کو صرف مذہبی آدمی ہی پڑھ سکتے ہیں۔ یہودیوں کا تو اب تک یہی خیال ہے اور عیسائیوں میں پراٹسٹنٹ فرقہ کے پیدا ہونے کے بعد ترجمے شروع ہوئے۔

ع۱۰۳۹ اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ لوگ جن پر اب ہم نے یہ کتاب اتاری ہے یہود اور نصاریٰ سے بڑھ کر اتباع کریں گے اور جس طرح حضرت موسیٰ کے ساتھیوں اور حضرت عیسیٰ کے حواریوں نے توریت اور انجیل کی پیروی میں کمزوری دکھائی ایسی کمزوری رسول اللہ صلعم کے اصحابؓ سے وقوع میں نہ آئے گی۔ آخر میں تکذیب کرنے والوں کو ڈرایا ہے

اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ۗ قُلِ انْتَظِرُوْٓا
اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿١٥٨﴾

یا اپنے ایمان میں کوئی نیکی نہ کمائی تھی۔ کہہ، انتظار کرو ہم (بھی) انتظار کرنے والے ہیں ع۱۰۴۰

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا
لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۗ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى
اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿١٥٩﴾

وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور (کئی) فرقے ہو گئے، تیرا ان سے کچھ سروکار نہیں ان کا معاملہ اللہ کی طرف ہے پھر وہ ان کو بتا دیگا، جو وہ کرتے تھے ع۱۰۴۱

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَ
مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا
وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١٦٠﴾

جو کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کے لیے دس اس کی مثل ہیں اور جو کوئی بدی کرتا ہے تو اس کی مثل ہی اس کو سزا دی جائے گی، اور اُن پر ظلم نہ کیا جائے گا ع۱۰۴۲

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ

کہہ، بے شک مجھ کو میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف ہدایت

ع۱۰۴۰ اشراط ساعۃ۔ اس آیت کی تفسیر میں صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں ایک حدیث مروی ہے جو الفاظ مختلفہ میں اور کئی طریقوں میں آئی ہے اس میں کہیں تو یہ لفظ ہیں لا تقوم الساعۃ حتّٰی تطلع الشمس من مغربہا فاذا راٰھا النّاس اٰمن من علیھا فذٰلک حین لا ینفع نفسًا ایمانھا لم تکن اٰمنت من قبل۔ قیامت نہیں آئیگی جب تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ کرے پس جب لوگ اسے دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے اور یہ وہ وقت ہوگا کہ جب کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہیں دیگا جو پہلے ایمان نہ لایا تھا اور کسی میں یہ لفظ ہیں کہ تین باتیں ہیں جب وہ ظاہر ہو جائیں گی تو کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہیں دیگا جو پہلے ایمان نہ لایا تھا یا اپنے ایمان میں خیر نہیں کمائی تھی۔ سورج کا مغرب سے طلوع کرنا اور دجال اور دابۃ الارض اور کسی میں یہ لفظ ہیں کہ قیامت نہیں آئے گی جب تک دس نشان نہ دیکھ لو۔ آفتاب کا مغرب سے طلوع اور دخان اور دابۃ اور خروج یاجوج و ماجوج اور ظہور عیسٰی بن مریم اور ظہور دجال اور تین خسف، ایک خسف مشرق میں اور ایک مغرب میں اور ایک جزیرۃ العرب میں اور آگ جو قعر عدن سے نکلے گی۔ اب پہلی بات یہ ہے کہ ان احادیث کو اس آیت سے کچھ تعلق نہیں سوائے اس کے کہ ان میں بھی یہ لفظ آئے ہیں کہ اس وقت کسی شخص کو ایمان نفع نہ دیگا اور آیت میں بھی یہ لفظ آتے ہیں مگر صرف اس بنا پر ان اشراط الساعۃ کو بعض اٰیات ربک کی تفسیر نہیں کہا جا سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں فرشتوں اور رب کے آنے کا ذکر ہے اور اسکے ساتھ بعض آیات رب کے آنے کا ذکر ہے اور ان احادیث میں ایسا کوئی ذکر نہیں بلکہ یہ کوئی اور نشانات ہیں۔ فرشتوں اور رب کے آنے سے کیا مراد ہے یہ ع۲۶۹ میں دکھایا جا چکا ہے اور دوسری دقّت یہ ہے کہ ان احادیث میں ان اشراط میں صاف طور پر دجال یا مسیح موعود کے آنے کا ذکر ہے اور یہ احادیث سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ دجال کو مسیح موعود ہلاک کرے گا اور غیر مسلم مسیح موعود کی وجہ سے ایمان لائیں گے۔ اگر ان کا ایمان لانا بے سود تھا تو مسیح کو بھیجنے کا فائدہ کیا تھا۔ پس ضرور ہے کہ ان احادیث کا مطلب کچھ اور ہو اور بعض باتیں ان میں استعارہ کے رنگ کی ہوں، مگر اس پر بحث کا یہ موقع نہیں۔ یہاں ہم نے صرف یہ دیکھنا ہے کہ بعض آیات ربک سے مراد کیا ہے سو اس تفسیر کو مدّنظر رکھتے ہوئے، جو ملائکہ اور اللہ کے آنے کی ع۲۶۹ میں کی جا چکی ہے یعنی یہ کہ فرشتوں کے آنے سے مراد جنگوں میں عذاب کا آنا ہے اور رب کے آنے سے مراد دشمن کا استیصال قطعی ہے۔ یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض آیات ربک کے آنے سے مراد موت کا آنا ہے۔ جو وہ بھی من مات فقد قامت قیامتہ' کے ماتحت قیامت ہی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جب موت کے آثار ظاہر ہو جائیں تو پھر کافر کو ایمان لانا کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ نہ ایسے شخص کو ایمان کچھ فائدہ دے سکتا ہے جو منہ سے ایمان لایا مگر اعمال اسکے مطابق نہ کیے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان بغیر اعمال کے کام نہیں دیتا۔ پہلی آیت میں جس عذاب کا ذکر تھا اس کی یہاں زیادہ صراحت کر دی ہے اور یہ سب تکذیب کرنے والوں کے لیے ہے اور یہی اشارہ فانتظروا میں ہے۔

ع۱۰۴۱ شیعا۔ شیاع کے معنی انتشار اور تقویت ہیں اسی سے خبر کا شائع ہونا ہے اور شِیْعَۃ وہ ہیں جن سے انسان قوت پکڑتا اور جس سے وہ پھیلتے ہیں (غ) اور ہر ایک قوم جو ایک امر پر جمع ہو۔ وہ ایک شِیْعَۃ ہیں اور ازہری کہتے ہیں وہ بعض بعض کی اتباع کرتے ہیں اور وہ سب متفق نہیں ہوتے اور یہاں مراد ایسے ہی فرقے ہیں جو ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں (ل)

اس سے مراد عموماً یہود و نصارٰی لیے گئے ہیں مگر ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ اس سے مراد اس اُمت کے اہل بدعت ہیں اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اوپر ایمان میں نیکی نہ کمانے والوں کا ذکر تھا۔ اس لیے ساتھ ہی ایسے لوگوں کا بھی ذکر کر دیا۔

ع۱۰۴۲ نیکی اور بدی کی جزا و سزا کا جو قانون یہاں بیان کیا ہے وہ دوسرے مقامات کے خلاف نہیں، ہر نیکی کا بدلہ ملتا ہے اور وہ دس گنا ہے یا اس سے بھی زیادہ' ہر بدی کا بدلہ ملتا ہے اور وہ اس بدی کی مثل ہوتا ہے یا اس سے بھی کم یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے بالکل معاف ہی کر دے۔

مُّسْتَقِيمٍ ۚ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٦١﴾

دی ہے۔ دین صحیح ابراہیمؑ راست رو کے مذہب (کی طرف) اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَٰلَمِينَ ﴿١٦٢﴾

کہہ، میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا، اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے ۱۰۴۳

لَا شَرِيكَ لَهُۥ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا۠ أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٦٣﴾

اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِي رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۚ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿١٦٤﴾

کہہ، کیا میں اللہ کے سوائے کوئی رب چاہوں اور وہ ہر چیز کا رب ہے اور کوئی جی (بدی) نہیں کماتا مگر (اس کا وبال) اسی پر ہے۔ اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا، پھر تمہارے رب کی طرف تمہارا لوٹ کر آنا ہے پھر وہ تم کو اس کی خبر دے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے ۱۰۴۴

۱۰۴۳ آنحضرت صلعم کے اوّل المسلمین ہونے کی دلیل: اس آیت میں عملی رنگ میں کمال توحید کو بیان کیا ہے۔ موحد انسان اپنے کمال کو اس وقت پہنچتا ہے جب اس کا ہر فعل خیر عبادت کے رنگ میں ہو یا قربانی کے رنگ میں، جب اس کا جینا مرنا اپنے لیے نہ ہو بلکہ صرف اپنے مولا کے لیے ہو رب العالمین کے لیے ہونے میں یہ اشارہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ عالمین کی ربوبیت میں لگ جاتا ہے اسی طرح موحد کامل بھی عالمین کی ربوبیت میں لگ جاتا ہے۔ پس توحید کا عملی رنگ مخلوق خدا کی ربوبیت ہے اور سب سے بڑی ربوبیت افضل المخلوقات انسان کی ربوبیت روحانی ہے جو انبیاءؑ کے سپرد کی جاتی ہے اور اس ربوبیتِ روحانی کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہمارے نبی کریم صلعم کو حاصل ہوا کیونکہ جس قدر اصلاح نسل انسانی کی آپ نے کی وہ کسی نبی کے حصّہ میں نہیں آئی۔ اس لیے آپ اوّل المسلمین کل مخلوقات میں سے ٹھہرے۔

چونکہ اس سورت میں اصل بحث توحید الٰہی پر تھی اس لیے اس کا خاتمہ اس پر کیا کہ محمد رسول اللہ صلعم توحید کے کس مقام کامل پر ہیں اور کہ توحید کا کمال عملی رنگ میں مخلوق خدا کی بھلائی میں لگ جانا ہے۔

ہر مسلم کا نصب العین: اسی طرح اگر غور کیا جائے تو جس قدر انسان کا فعل اغراض نفسانی سے دور ہوتا ہے اسی قدر اس کا پایہ بلند ہوتا جاتا ہے۔ ایک انسان اپنی ذات کے لیے کچھ کرتا ہے۔ دوسرا اپنے عیال کے لیے۔ تیسرا اپنی قوم کے لیے۔ چوتھا اپنے ملک کے لیے، یہ سب تدریجاً ترقی ہے۔ لیکن سب سے بلند پایہ اس انسان کا ہے جو مخلوق خدا کے لیے کچھ کرتا ہے اس اور اس سے اگلی آیت میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی توحید کامل کے عملی نمونہ کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ یوں پیش کرنے میں اصل غرض یہ ہے کہ ہر مسلمان کا نصب العین یہی ہو کہ اپنے آپ کو اس مقام عالی پر پہنچائے۔ یہی وجہ ہے کہ قبل از فاتحہ جو دعا سکھائی گئی اس میں یہی لفظ آتے ہیں اِنّ صلوتی ونسکی ومحیای و مماتی لِلّٰہِ ربّ العلمین لا شریك له وبذٰلك امرت وانا من المسلمین۔ جہاں صرف لفظ اوّل المسلمین کی جگہ جو آنحضرت صلعم کے لیے خاص ہے عام مسلمانوں کو من المسلمین کہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس دعا کے سکھانے میں غرض یہی ہے کہ ہر مسلمان توحید کامل کے اس عملی مقام پر پہنچنے کی کوشش کرے۔

۱۰۴۴ وازرۃ۔ وَزَر۔ پہاڑ میں جائے پناہ کو کہا جاتا ہے کلا لا وزر (القیمٰۃ ۷۵-۱۱) اور وِزْر کے اصل معنی بوجھ ہیں (رغ) اور امام راغبؒ نے لیحملوا اوزارھم کاملۃ یوم القیامۃ (النحل ۱۶-۲۵) کی تشریح میں لکھا ہے کہ یہ اس کی مثل ہے جو فرمایا ولیحملنّ اثقالھم واثقالا مع اثقالھم (العنکبوت ۲۹-۱۳) اور مطلب اس کا اس حدیث کے مطابق ہے مَنْ سَنّ سُنَّۃً سیئۃً کان له وِزرھا ووزر من عمل بھا یعنی وہ ایک بُرے رستہ پڑ ڈالنے کا بوجھ بھی اُٹھائیگا۔

یہ سنہرا قانون توحید کا ضروری نتیجہ تھا۔ ہر ایک انسان اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے۔ ایک کی ذمہ داری دوسرا نہیں لے سکتا۔ یہی اسلام کا اصل الاصول ہے اور کفارہ کے عقیدہ پر یہ ایسا سخت حربہ ہے جس کا جواب عیسائیوں کے پاس نہیں۔ ایک عجیب جواب البتہ انہوں نے تراشا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ایک گنہگار دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا بیگناہ دوسرے کا گناہ اُٹھا سکتا ہے یہ منطق تثلیث کی منطق سے کم نہیں۔ جو شخص دوسرے کا بوجھ یا گناہ اُٹھائے گا وہی وازرۃ بن جائے گا۔ یہ بھی عجیب بوجھ اٹھانا ہے کہ دوسرے کا بوجھ بھی لے لیا اور پھر بھی بوجھ کوئی نہیں قرآن کریم کی یہ تعلیم کہ بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا اس کے خلاف نہیں جو فرمایا کہ وہ یعنی سردار یا پیشوا دوسروں کے بوجھ بھی اٹھائیں گے جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا ہے کیونکہ وہاں مراد یہ ہے کہ ایک طریق بد قائم کرنے کا بوجھ ان کے سر پر ہوگا مگر یہ نہیں کہ اس طریق بد پر جو لوگ چلے ہیں وہ اس وجہ سے اس بدی کے بوجھ سے بچ جائیں گے۔ بدی کرنے کا بوجھ وہ خود ہی اُٹھائیں گے۔ بدراہ بنانے کا بوجھ بدی کرنے سے مزید شے ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ
بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ
فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖؗ
ع ۱۱ / ۷ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۶۵﴾

اور وہی ہے جس نے تم کو زمین کا حاکم بنایا اور تم میں سے بعض کو
بعض پر درجوں میں بلند کیا۔ تاکہ تم کو اس کے بارے میں آزمائے
جو تم کو دیا ہے تیرا رب جلدی بدی کی سزا دینے والا ہے اور
یقیناً وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۰۴۵

ع۱۰۴۵ مسلمانوں کی حکومت کمال روحانی کا نتیجہ تھی۔ سورت کا خاتمہ اس پر کیا کہ اللہ تعالیٰ تم کو زمین کا حاکم بناتا ہے جب انسان عملی رنگ میں توحید کے کمال پر پہنچ جاتا ہے تو وہ اس بات کا اہل ہو جاتا ہے کہ مخلوق خدا پر حکمران ہو۔ جس کے مدنظر سوائے دوسروں کی بہتری کے کچھ نہیں اسی کو حکومت شایاں ہے۔ مگر وہ حکومت بھی آزمایش ہوتی ہے جب تک اس کی اہلیت رہتی ہے اسے باقی رکھا جاتا ہے۔ یہی حالت فی الواقع تاریخ اسلام میں نظر آتی ہے۔ گویا یہ آیت تاریخ اسلام کا ایک نہایت ہی مختصر مرقع ہے۔ مسلمانوں کو بادشاہت ان کی قوت اور ان کے سامان حرب کی وجہ سے نہیں ملی بلکہ اس وجہ سے کہ وہ مخلوق خدا کے خیر خواہ تھے جب وہ توحید کامل کے مقام پر کھڑے ہوئے اور سب قوموں سے یکساں سلوک کرنے والے ہوئے اور ان کی زندگیوں کی غرض انسان کی خدمت ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کے بادشاہ بنا دیا۔ یہ وہ بات ہے جس کا اعتراف خود عیسائیوں نے کیا ہے اور جب اس مقام عالی سے گر گئے اور خواہشات کے بندے بن گئے تو حکومت بھی ان سے لے لی گئی پھر دوسری قوم کھڑی کر دی جاتی ہے۔ بدی کی سزا بھی ملتی ہے مگر غفر و رحم کی صفت سب پر فائق ہے۔

(۷) سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ

آیاتہا ۲۰۶ — رکوعاتہا ۲۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓصٓ ① میں اللہ بہت جاننے والا بہترین فیصلہ کرنے والا ہوں[1046]

نام: اس سورت کا نام الاعراف ہے اور اس میں چوبیس رکوع اور دو سو چھ آیتیں ہیں۔ الاعراف کے معنی بلند مکان ہیں اور اس سورت کے پانچویں اور چھٹے رکوع میں کچھ لوگوں کا ذکر ہے جو اعراف پر ہوں گے اور یہ لوگ جیسا کہ ع ۱۰۸۶ میں دکھایا گیا ہے، انبیاء کا گروہ ہے اور چونکہ اس سورت میں ضرورتِ نبوت پر بحث ہے اس لیے اس کے نام میں انبیاء کے مقام بلند کی طرف توجہ دلائی ہے۔

خلاصۂ مضمون: جس طرح پچھلی سورت میں توحید پر بحث تھی اس سورت میں نبوت پر بحث ہے۔ اسی اصل مضمون کے مطابق اس کی ابتدا اس بات سے کی ہے کہ نزولِ کتاب اللہ کی غرض کیا ہے اور اس کا فائدہ کیا ہے یہ پہلے رکوع کا مضمون ہے۔ دوسرے رکوع میں حضرت آدمؑ کا ذکر کر کے ضرورتِ نبوت کو بتایا ہے۔ تیسرے میں بتایا ہے کہ وحی الٰہی ہی انسان کو شیطان کے حملوں سے محفوظ کر سکتی ہے۔ چوتھے میں وحی الٰہی کے ردّ کرنے والوں کا انجام بتایا ہے اور پانچویں میں قبول کرنے والوں کا ذکر ہے۔ اسی رکوع کے آخر پر اور چھٹے رکوع کے شروع میں اعراف والوں کا ذکر ہے یعنی خود انبیاء علیہم السلام کے مقام بلند کا اور بقیہ رکوع ششم میں قبول کرنے والوں اور ردّ کرنے والوں کا مقابلہ ہے۔ ساتویں رکوع میں عالم جسمانی کی مثالیں دیکر حق کی تدریجی ترقی اور آخری کامیابی کی خوشخبری سنائی۔ آٹھویں میں حضرت نوحؑ کا، نویں میں حضرت ہودؑ کا، دسویں میں حضرت صالحؑ اور لوطؑ کا گیارہویں میں حضرت شعیبؑ کا ذکر کر کے سمجھایا کہ کس طرح حق کی مخالفت کرنے والے آخر کار ناکام ہوتے رہے اور بارھویں میں سزا کا عام قانون بیان فرما کر مخالفین قرآن کو تنبیہ کی اور پھر تیرھویں رکوع سے لیکر اکیسویں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مفصّل ذکر کیا۔ چنانچہ تیرھویں میں حضرت موسیٰؑ کی بعثت کا ذکر کیا۔ چودھویں میں ساحروں کے آپ سے مقابلہ کا۔ پندرھویں میں بنی اسرائیل کی تکالیف کا ذکر کر کے ان کا علاج بتایا اور یوں مسلمانوں کو سمجھایا کہ ایسی ہی تکالیف اُن پر آئیں تو وہ بھی یہی طریق اختیار کریں۔ سولھویں میں فرعونیوں پر وباؤں کے آنے اور بنی اسرائیل کی نجات کا ذکر کیا۔ سترھویں میں حضرت موسیٰؑ کو شریعت ملنے کا۔ اٹھارہویں میں بچھڑے کی عبادت کا، انیسویں میں حضرت موسیٰؑ کی قوم کی بے اعتدالیوں کا ذکر کرتے ہوئے اصل غرض کی طرف توجہ دلائی ہے جس کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کا اتنا لمبا ذکر کیا۔ یعنی موسیٰؑ کا آنحضرتؐ کی نسبت پیشگوئی کرنا اور ان پیشگوئیوں کا توریت میں موجود ہونا۔ بیسویں میں آنحضرت صلعم کی رسالت عامہ کے ذکر کے بعد پھر قوم موسیٰ کے ذکر کی طرف رجوع کیا اور اکیسویں میں یہود کی خلاف ورزیٔ میثاق اور ان کی سزا کا ذکر کیا۔ بائیسویں رکوع میں میثاق شریعت سے میثاق فطرت کی طرف رجوع کیا۔ کیونکہ میثاق شریعت میثاق فطرت کو ہی قوت دینے کے لیے آتی ہے اور ہر انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر گواہ ہے اور اسی کی طرف انبیاء بلاتے ہیں۔ تیئسویں رکوع میں آنحضرت صلعم اور اسلام کے اعدا کے انجام کا ذکر کیا کہ کس طرح ان پر سزا تدریجاً اور آہستگی سے وارد کی جائے گی۔ چوبیسویں اور آخری رکوع میں بتایا کہ اس مخالفت میں خود مسلمانوں کو کیا راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ یہ سورت کل کی کل نبوّت پر ہے۔

بلحاظ مضمون الانعام اور الاعراف کا تعلق ظاہر ہے۔ الانعام کا مضمون توحید ہے اور الاعراف کا نبوت اور توحید کے بعد نبوت کا ذکر لازم تھا۔ مذہب کی یہی دو عظیم الشان بنیادیں ہیں اور یہ بھی ضروری تھا کہ توحید کے ذکر کے بعد نبوت کا ذکر آتا، اس لیے الانعام گو اس قدر لمبی نہیں مگر اسے الاعراف سے پہلے رکھا گیا۔ کیونکہ ترتیب مضمون کا تقاضا یہی تھا اور الانعام کے آخری حِصّہ کو دیکھا جائے تو وہاں بھی نہایت صفائی سے توحید سے نبوت کی طرف مضمون کا رُخ بدل دیا ہے۔ جہاں آنحضرت صلعم کی توحید کے مقام بلند کو پیش کیا ہے قل انّ صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للّٰہ رب العالمین صرف یہ کہدینا کہ خدا ایک ہے انسان کو فائدہ نہیں دے سکتا جب تک کہ اس کی تمام حرکات وسکنات توحید باری کے رنگ میں رنگین نہ ہو جائیں اور یہ مقام بدون نبوت حاصل نہیں ہو سکتا۔ نظارۂ قدرت سے جس توحید پر انسان پہنچ سکتا ہے وہ محض ایک خشک عقیدہ ہے۔ مگر نبوت جس توحید پر لاکر کھڑا کرتی ہے وہ ایک باردار درخت ہے یوں توحید سے نبوت کی طرف مضمون کا انتقال سورۃ الانعام کے آخر میں کر کے سورۃ اعراف کے مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔

زمانۂ نزول: اس سورت اور سورۂ انعام کے نزول کا وقت قریباً ایک ہی ہے اور یہ دونوں سورتیں مکّی زمانہ کے آخر کی ہیں جب مخالفت کمال کو پہنچ چکی تھی۔ خاص خاص آیات اس سورت کی جن کو ظن کی بنا پر مدنی کہا گیا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کا تعلق سورت کے اصل مضمون سے اس قسم کا ہے کہ وہ علیحدہ زمانہ کی نہیں ہو سکتیں۔ عیسائی مورخین نے یہ کوشش کی ہے کہ آیت ۱۵۷ و ۱۵۸ کو جن میں آنحضرت صلعم کے متعلق پیشگوئیوں کا ذکر ہے جو توریت وانجیل میں ہیں مدنی قرار دیں کیونکہ ان میں توریت وانجیل کا نام آتا ہے مگر اس سے بڑھ کر بودی دلیل کوئی نہیں اور آیت ۱۵۶ جس میں قوم موسیٰ کا ذکر ہے اس کا تعلق ۱۵۷ سے جس میں نبی اُمّی کا ذکر ہے ایسا گہرا ہے کہ یہ دونوں آیتیں بلحاظ مضمون صاف طور پر ایک ہی وقت کی نظر آتی ہیں۔

ع ۱۰۴۶ الٓمّٓ کے ساتھ ص بڑھایا ہے جو صادق کے قائم مقام ہے جیسا کہ ضحاک سے روایت ہے (د) یا افصل سے یعنی بہترین فیصلہ کرنے والا، جیسا کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے (ج) نیز دیکھو ع ۸۔

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾

یہ کتاب ہے تیری طرف نازل کی گئی پس تیرے سینے میں اس کی وجہ سے کوئی تنگی نہ رہے کہ تو اس کے ساتھ ڈرائے اور مومنوں کے لیے نصیحت ہو۱۰۴۷

اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾

اس کی پیروی کرو جو تمھارے رب سے تمھاری طرف اتارا گیا۔ اور اس کو چھوڑ کر اور دوستوں کی پیروی نہ کرو بہت ہی کم تم نصیحت قبول کرتے ہو۔

وَ كَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ﴿۴﴾

اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں، سو ہمارا عذاب ان پر رات کو آیا یا دوپہر کو سوتے ہوئے ۱۰۴۸

فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾

سو اُن کی پکار جب ہمارا عذاب اُن پر آیا سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ انھوں نے کہا بیشک ہم ظالم تھے۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ لَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶﴾

سو یقیناً ہم ان سے پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور یقیناً ہم رسولوں سے بھی پوچھیں گے ۱۰۴۹

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّ مَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ﴿۷﴾

پھر ہم ان پر علم کے ساتھ بیان کرینگے اور ہم کبھی غیر حاضر نہیں ہوتے۔

وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸﴾

اور وزن اس دن حق ہے — سو جس کی نیکیاں بھاری ہو گئیں تو وہی کامیاب ہونے والے ہیں ۱۰۵۰

ع۱۰۴۷ ذکریٰ۔ ذِکْر سے زیادہ بلیغ ہے اور اس کے معنی کثرت ذکر ہیں اور ذِکْر کسی شے کا قلب میں حاضر کرنا ہے (غ) قرآن شریف کا نام ذِکْر یا ذِکْریٰ یا تَذْکِرَہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ ان باتوں کو یاد دلاتا ہے جو فطرت انسانی میں ہیں مگر غفلت کی وجہ سے دبی رہتی ہیں وحی الٰہی ان کو یاد دلا کر انسان کو فطرت کے صحیح قوانین پر چلاتی ہے یا چونکہ ذِکْر کے معنی شرف ہیں (ل) اس لیے قرآن کریم کا نام ذکر ہے کہ یہ انسان کو بلند مقام پر پہنچاتا ہے۔

فلا یکن فی صدرك حرج منه جملہ معترضہ کے طور پر ہے اور اصل غرض نزول کتاب کی بتائی کہ تو اس کے ساتھ ڈرائے اور مومنوں کے لیے وہ نصیحت ہو اور یہ جو فرمایا کہ تیرے سینہ میں تنگی نہ ہو تو یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس کتاب کے نزول نے پیغمبر خدا کو شرح صدر عطا کر دی تھی۔ جیسا کہ فرمایا الم نشرح لك صدرك (الم نشرح ۹۴۔۱) پس نزول کتاب کا فائدہ تو یہ بتایا کہ مصلح کے سینہ میں تنگی نہ رہے کیونکہ اصلاح میں جو جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ ایک آدمی کے گھبرا جانے کے لیے کافی ہوتی ہیں، لیکن جب ایک شخص کو خدا ایک کام پر کھڑا کرتا ہے تو اسے وسعت اخلاق، کامیابی پر ایمان اور دیگر ان صفات سے متصف فرماتا ہے جن کے بغیر اسے کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ سو اس جملہ معترضہ میں بھی ایک ضرورت نزول وحی کو ہی ظاہر کیا ہے اور ہوسکتا ہے کہ ان مشکلات کی طرف بھی اشارہ ہو، جو اس سورت کے نزول کے وقت آنحضرت صلعم کو پیش آ رہی تھیں کہ آپ کی دس بارہ سال کی کوششوں کے باوجود مخالفت بڑھ رہی تھی۔ تو گویا یوں فرمایا کہ مشکلات تو بیشک بہت ہیں مگر چونکہ کتاب خدائے علیم و صادق الوعد کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس لیے ان مشکلات کے سبب کوئی گھبراہٹ تمہارے سینہ میں نہ آئے۔

نزول کتاب کی اصل غرض دو لفظوں میں بتائی ہے۔ بدی کے انجام بد سے ڈرانا اور بتا دینا کہ بدی کا انجام نیک کبھی نہیں ہوسکتا۔ اور دوسرا مومنوں کے لیے ذِکْر یا ذِکْریٰ یعنی ان کے لیے موجب شرف اور بلندیٔ مرتبہ ہے یا ان کو فطرت کے صحیح قوانین پر چلانا ہے اس لیے یہاں بشارت کی بجائے ذِکْریٰ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

چونکہ اس سورت میں اصل نبوت کی بحث ہے جیسا کہ پچھلی میں اصل توحید کی بحث تھی اس لیے اس کی ابتدا اس کلام سے نہایت موزوں ہے۔

ع۱۰۴۸ بیاتا۔ بَیْت سے مصدر ہے اور اس کے اصل معنی قَصْد العدو لیلاً ہیں یعنی رات کے وقت دشمن کا قصد کرنا (غ)

قائلون۔ قال۔ یقیل سے ہے۔ دوپہر کے وقت آرام کرنے کو کہتے ہیں (غ)

ع۱۰۴۹ کیا سوال ہوگا جن کی طرف رسول بھیجے گئے ان سے سوال ہوگا الم یاتکم نذیر (الملك ۶۷۔۸) الم یاتکم رسل منکم (الانعام ۶۔۱۳۱) کیا تمہارے پاس رسول نہ آئے تھے اور رسولوں سے سوال ہے ماذا اجبتم (المائدۃ ۵۔۱۰۹) تمہاری قبولیت کیسی ہوئی۔

ع۱۰۵۰ الوزن۔ اصل میں کسی شے کے اندازہ کے پہچاننے کو کہتے ہیں۔ راغبؒ کہتے ہیں کہ عام طور پر وزن وہ سمجھا جاتا ہے جو ترازو کے ساتھ ہو (بلکہ حدیث میں بھی ترازو کا ذکر ہے) اور قرآن شریف میں ہے واقیموا الوزن بالقسط (الرحمٰن ۵۵۔۹) اور وزنوا بالقسطاس المستقیم (بنی اسرائیل ۱۷۔۳۵) اور یہاں مراد تمام افعال و اقوال انسانی

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ
خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ⑨

اور جس کی نیکیاں ہلکی ہوگئیں تو وہی ہیں جنھوں نے اپنا نقصان کیا، اس لیے کہ وہ ہماری آیتوں کے بارے میں ناانصافی کرتے تھے ـ

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ
ع فِيهَا مَعَايِشَ ۗ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ ⑩

اور یقیناً ہم نے زمین میں تمھارا ٹھکانا بنایا اور تمھارے لیے اس کے اندر روزی کے سامان رکھے، بہت کم تم شکر کرتے ہو ـ۱۰۵۱

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا
لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا
إِبْلِيسَ لَمْ يَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ⑪

اور یقیناً ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم نے تمھاری صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں کو کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو، سو انھوں نے فرمانبرداری کی مگر ابلیس نے (نہ کی)، وہ فرمانبرداروں میں سے نہ ہوا ۱۰۵۲

میں عدل و انصاف کا ملحوظ رکھنا ہے اور ایسا ہی وانبتنا فیھا من کل شئ موزون (الحجر ۱۵ - ۱۹) جہاں مراد ہے کہ جو کچھ پیدا کیا اعتدال کی حالت میں پیدا کیا جیسا کہ فرمایا انّا کل شئ خلقنٰہ بقدر (القمر ۵۴ - ۴۹) اس سے وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ الوزن یومئذ ن الحق (الاعراف - ۸) میں اشارہ محاسبہ میں عدل کی طرف ہے (غ) اور مجاہد کا قول ہے کہ وزن سے مراد یہاں قضاء یعنی فیصلہ ہے (ج)

وزن اعمال سے مراد: اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ میزان کا لفظ قرآن میں وسیع معنی میں آیا ہے۔ ایک جگہ رسولوں کے بھیجنے کے ذکر میں آتا ہے وانزلنا معھم الکتاب والمیزان ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری جس سے مراد کسی صورت میں ترازو نہیں اور نہ کسی مفسر نے ایسا کہا ہے۔ ایسا ہی والسّماء رفعھا ووضع المیزان میں میزان کے رکھنے سے مراد کسی ترازو کا رکھنا نہیں بلکہ مراد عدل کا قائم کرنا ہے جس پر سارے آسمانوں اور زمین کا بھی مدار ہے۔ اور حق یہ ہے کہ احادیث میں بھی جس ترازو کا ذکر ہے اس سے مراد بھی محض اس قسم کا ترازو لینا جس سے اجسام کو وزن کیا جاتا ہے صحیح نہیں۔ اس ترازو کی حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اس دنیا کی چیزوں پر اس کا قیاس نہیں ہوسکتا یہی وجہ ہے کہ احادیث میں اگر کہیں اعمال کے وزن کا ذکر ہے تو کہیں کتب اعمال کا اور کہیں صاحب اعمال کا اور ایک قوم کے اعمال دنیوی کا ذکر کرکے جو قیامت میں کسی کام نہ آئیں گے قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنا (الکھف ۱۸ - ۱۰۵) ان کے لیے ہم قیامت میں کوئی وزن قائم نہیں کریں گے یعنی قیامت کے دن ان کے دنیوی صنعتوں پر زور لگا دینے کو کوئی وزن نہیں دیا جائے گا۔

موازین۔ موزون کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور میزان کی بھی۔ پہلی صورت میں مراد اعمال موزونہ ہیں یعنی نیکیاں اور میزان یا میزانوں کا بوجھل یا ہلکا ہونے سے بھی مراد یہی لی گئی ہے کہ نیکیوں کا پلّہ بوجھل یا ہلکا ہوجائے جس میں علاوہ اس وقت کے کہ میزانیں بہت سی ہوئیں بہت کچھ محذوف ماننا پڑتا ہے۔ اس لیے صحیح یہی ہے کہ یہ موزون کی جمع ہے اور مجاہد سے موازین کے معنی حسنات یعنی نیکیاں ہی مروی ہیں۔

اعمال کا وزن یعنی ہر ایک عمل کا حساب میں آنا ایک ایسا امر ہے جس کی طرف صرف وحی الٰہی نے ہی ہدایت کی ہے۔ اس لیے قرآن کریم کے نزول کی اغراض کو بیان کرتے ہوئے وزن اعمال کا ذکر کیا ہے انسان کا کمال اسی پر منحصر ہے کہ جو اعمال اس کی فطرت کو صحیح راہ پر چلانے والے ہیں ان کو کرے اور جن سے فطرت انسانی کو نقصان پہنچتا ہے ان سے بچے۔ اسی لیے اگلی آیت میں فرمایا کہ جن کے وہ اعمال جو وزن میں آتے ہیں ہلکے رہے انہوں نے اپنی فطرت کو خسارہ میں رکھا۔

ع۱۰۵۱ معایش۔ مَعِیْشَۃ کی جمع ہے۔ یعنی عیش یا روزی کے سامان یلفظ عیش حیوان کی زندگی سے مخصوص ہے یعنی ایسی زندگی سے جس سے جسمانیت کا جزو غیر منفک ہے اور حیٰوۃ کا لفظ وسیع ہے اللہ تعالیٰ اور ملک پر بھی بولا جاتا ہے (غ) قرآن شریف میں معیشۃ ضنکا (طٰہٰ ۲۰ - ۱۲۴) میں اور عیشۃ راضیۃ (القارعۃ ۱۰۱ - ۷) میں روحانی زندگی پر بھی لفظ عیش بولا گیا ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا کہ جب تمہارے جسم کے لیے ہم نے زمین کے اندر ہر قسم کے سامان پیدا کر رکھے ہیں تو جو حصّہ تم میں حیوانیت سے بالاتر ہے یعنی ملکیت کا حصّہ یا تمہاری روحانیت کیا اس کے لیے کوئی سامان خدا تعالیٰ پیدا نہ کرتا۔ یوں اس آخری آیت میں ضرورت وحی کو بیان کرتے ہوئے اگلے رکوع کے ساتھ اس کا ربط کر دیا ہے۔

ع۱۰۵۲ اس رکوع میں ضرورت نبوت بتائی ہے اور آدم کا ذکر کیا ہے جو سورۂ بقرہ میں مفصل گزر چکا ہے۔ مگر یہاں اس ذکر کے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو بالکل نئے ہیں۔ آدم اور ابن آدم کا معاملہ ایک ہے: سب سے پہلے یہاں یہ غور طلب ہے کہ اوپر کی آیت میں سارے انسانوں کو خطاب تھا اس عام خطاب کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے تم سب کو پیدا کیا پھر تم سب کی صورت بنائی پھر فرشتوں کو آدم کی فرمانبرداری کے لیے کہا جس سے صاف معلوم ہوا کہ اس رنگ میں ہر ایک ابن آدم آدم ہے اور فرشتوں سے آدم کی فرمانبرداری کرانے میں ابنائے آدم کا بھی ذکر ہے۔ اور فی الحقیقت غور کیا جائے تو اگر وہ واقعات ہمکو پیش نہیں آتے جو آدم کو پیش آئے تھے تو اس قصّہ کا قرآن میں رکھنے سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے غرض تو ہماری تعلیم ہے پس آدم کے تذکرہ میں ہم کو سمجھایا ہے اور ابن آدم ہونے کی وجہ سے جو کچھ آدم کو پیش آیا وہی ابن آدم کو پیش آتا ہے ہاں جس طرح ابن آدم شیطان کو جسمانی رنگ میں نہیں دیکھتا بلکہ شیطان صرف وسوسہ اندازی کرتا ہے اسی طرح آدم کی صورت میں سمجھنا چاہیئے باقی امور کے لیے دیکھو ع۵۲ و ع۱/۵۲ و ع۵۳۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ۖ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ﴿١٢﴾

(اللہ نے) کہا، تجھے کس چیز نے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جب میں نے تجھے حکم دیا[۱۰۵۳] اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں، تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا[۱۰۵۴]

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَن تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ﴿١٣﴾

کہا، پھر اس حالت سے اُتر جا، تیرے لیے یہ شایاں نہیں تو اس پر تکبر کرے سو نکل جا، تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے[۱۰۵۵]

قَالَ أَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿١٤﴾

کہا، مجھے اس دن تک مہلت دے جو وہ اُٹھائے جائیں[۱۰۵۶]

ع۱۰۵۳ بظاہر جہاں جہاں سجدے کا حکم آتا ہے ملائکہ کو آتا ہے۔ لیکن یہاں اذ امرتك سے معلوم ہوا کہ شیطان کو بھی حکم تھا۔ ملائکہ چونکہ اعلیٰ ہستیاں ہیں اس لیے ان کو حکم دینے میں جنّ یا شیاطین جو ادنیٰ ہستیاں ہیں وہ بھی شامل ہو گئیں۔

ع۱۰۵۴ جنوں کا آگ سے اور انسان کا مٹی سے پیدا ہونا: سورۂ بقرہ میں فرمایا تھا کہ اس نے انکار اور تکبر کیا۔ یہاں اس کی تشریح کی ہے وہ اپنے آپ کو آدم سے افضل قرار دیتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ آدم کی پیدائش مٹی سے ہے اور میری پیدائش آگ سے ہے۔ دوسری جگہ عام طور پر جنّات کے متعلق ہے والجان خلقناه من قبل من نار السموم (الحجر[۱۵]۔[۲۷]) جنّوں کو ہم نے پہلے نارِ سموم سے پیدا کیا۔ یہ زمین بھی پہلے خود ایک شعلۂ نار تھی اس لیے پہلی مخلوق کا اسی رنگ کا ہونا عین قرینِ قیاس ہے اور آگ سے ہونے کی وجہ سے ہی وہ غیر مرئی ہستیاں بھی ہیں یعنی ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن اس سے علاوہ آگ یا مٹی سے پیدا ہونا یہ معنی بھی رکھتا ہے کہ وہی صفت ان میں غالب ہو جیسے انسان کے متعلق فرمایا خلق الانسان من عجل (الانبیاء[۲۱]۔ ۳۷) انسان جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی اس میں جلد بازی ہے۔ یا فرمایا خلقکم من ضعف (الروم[۳۰]۔ ۵۴) اب طین یا مٹی کی صفت نرمی ہے چنانچہ عرب کہتے ہیں مَرَرْتُ بصحیفۃٍ طین خاتمھا جس کے معنی کیے ہیں لَیّن خاتمھا یعنی طین سے مراد نرمی ہے (ل) اور قرآن مجید میں دوسری جگہ دوسری ترکیب اختیار کی ہے۔ اسجد لمن خلقت طینا (بنی اسرائیل[۱۷]۔ ۶۱) اے خلقته فی حال طینته (ل) اور آگ کی صفت تیزی ہے اور حدیث میں ہے اتقوا الغضب فانه جمرة توقد فی قلب ابن آدم غضب سے بچو وہ ایک انگارا ہے جو ابن آدم کے قلب میں جلایا جاتا ہے۔ پس شیطان کہتا ہے کہ میں ناری صفت ہو کر کس طرح طینی صفت انسان کے سامنے جُھک سکتا ہوں۔

ع۱۰۵۵ الصّاغرین۔ صِغَر کی ضد کبر ہے اور چھوٹا یا بڑا ہونا بلحاظ عمر بھی ہوتا ہے اور بلحاظ جسم بھی اور بلحاظ قدر و منزلت بھی اور صاغر وہ ہے جو ذلیل مرتبہ پر راضی ہو جائے (غ)

شیطان کے ہبوط سے مراد: منھا میں ضمیر کس طرف جاتی ہے یعنی کس سے نکل جا مفسرین میں سے کسی نے سماء کہا ہے کسی نے زمرہ ملائکہ، مگر یہ دونوں باتیں نہ سند رکھتی ہیں نہ قیاس صحیح یہ چاہتا ہے۔ سماء کا تو اوپر ذکر نہیں اور نہ یہ ہبوط مکانی تھا۔ ملائکہ کا ذکر اوپر ہے مگر دور کا اور شیطان ملائکہ میں سے نہ تھا جس پر کان من الجن (الکھف[۱۸]۔ ۵۰) نص صریح ہے۔ قریب تر ذکر اس کا اپنی فضیلت کو پیش کرنا ہے اور اسی سے ہبوط کا حکم ہے اس نے کہا تھا انا خیر منه اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس حالت سے نکل جا اور اگلے الفاظ خود اس معنی کے موید ہیں۔ کیونکہ فرمایا کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ خیر ہونا اور تکبر ایک جگہ جمع ہو سکیں۔ بلکہ متکبر ذلیل ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں بھی ہے من تواضع لله رفعه الله و من تکبر وضعه الله یعنی جو شخص اللہ کے لیے جھکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا رفع کرتا ہے اور جو تکبّر کرتا ہے اللہ اسے ذلیل کرتا ہے۔ اصل سبق انسان کے لیے ہے کہ تکبّر کا نتیجہ ذلّت ہے جتنا انسان دوسروں سے اپنی بڑائی جتاتا ہے اسی قدر ان کی نظر میں ذلیل ہوتا ہے۔

ع۱۰۵۶ یوم یبعثون سے کیا مراد ہے۔ اگر قیامت کا دن مراد لیا جائے جو مردوں کے جی اُٹھنے کا وقت ہے تو بھی کوئی ہرج نہیں کیونکہ جب تک یہ عالم موجود ہے اس وقت تک انسان کے ساتھ خواہشات سفلی اور ان خواہشات کے ساتھ شیطان کا رہنا ضروری ہے مگر بعث کا لفظ وسیع معنی میں آتا ہے والبعث یکون بعثا للقوم الی وجه من الوجوه (ل) وتاویل البعث ازالة ما کان یحبسه من التصرف (ل) یعنی جو چیز کسی امر میں تصرف سے روکتی ہو اس کا دور کر دینا بھی بعث ہے پس یوم یبعثون سے مراد ہر انسان کی بعثت روحانی کا وقت بھی ہو سکتا ہے یعنی وہ وقت جب شیطان پر انسان کو پورا تصرّف حاصل ہو جاتا ہے۔

شیطان کے مہلت مانگنے سے مراد: جیسا کہ ع۴۵ میں دکھایا گیا ہے یہ کوئی واقعی مکالمہ نہیں۔ شیطان جو رحمت الٰہی سے دُور پڑا ہوا ہے اس کو مکالمہ سے کیا حصّہ؟ صرف ایک حالت کا اظہار ہے۔ اور چونکہ مسلم کی حدیث سے ثابت ہے کہ ہر انسان کے لیے ایک الگ ملک یعنی فرشتہ اور ایک شیطان ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ میرا شیطان مسلمان ہو گیا۔ پس یوم یبعثون میں اگر ایک طرف ذریت آدم کی طرف اشارہ ہے تو دوسری طرف ذریت ابلیس کی طرف بھی اشارہ ہے۔ کیونکہ ہر انسان کو بدی کی تحریک کرنے والا وہی شیطان ہے جو اس کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ پس شیطان نے جو مہلت مانگی ہے وہ اپنی ذریت کے لیے مانگی ہے جس طرح آدم کے ذکر میں ابن آدم شامل ہے، شیطان کے ذکر میں ذریت شیطان شامل ہے۔ اس آیت میں اور اس سے اگلی آیات میں سب کو شامل کر لینا حالانکہ آدم کا ذکر شروع تھا صاف بتاتا ہے کہ اصل میں ذکر آدم میں بنی آدم کا ذکر ہی مقصود ہے۔

قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۱۵﴾

کہا، تُو ان میں سے ہے جن کو مہلت دی گئی ہے ۱۰۵۷

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾

کہا اس لیے کہ تو نے مجھے گمراہ ٹھہرایا میں ضرور تیری سیدھی راہ پر اُن کے لیے گھات میں بیٹھوں گا ۱۰۵۸

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾

پھر میں ضرور ان کے سامنے سے اور اُن کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے اُن پر آؤں گا۔ اور تو اُن میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا ۱۰۵۹

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾

کہا، اس (حالت) سے اُتر جا ذلیل دھتکارا ہوا جو کوئی ان میں سے تیری پیروی کرے گا، یقیناً میں تم سب سے جہنم کو بھروں گا ۱۰۶۰

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾

اور اے آدم، تو اور تیری بیوی باغ میں رہو۔ پھر جہاں سے چاہو کھاؤ اور اس درخت کے پاس نہ جاؤ، ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا

پھر شیطان نے اُن دونوں کو وسوسہ ڈالا تاکہ ان کے لیے

ع۱۰۵۷ انك من المنظرين ۔ ترکیب صاف بتاتی ہے کہ یہ تو پہلے سے ہی فیصلہ شدہ امر ہے ۔ یہ نہیں کہ شیطان کی درخواست منظور ہوئی ہے ۔ جب انسان کی اس زمینی زندگی کے لیے خواہشات سفلی کا اس میں رکھا جانا ضروری ہُوا ۔ تو ان خواہشات سفلی کے محرک شیطان کا وجود بھی ضروری ہوا۔ علاوہ ازیں بغیر مخالفت اور مقابلہ کے اور دشمن پر غالب آنے کے کوئی کامیابی کامیابی ہی نہیں کہلاسکتی۔ شیطان یا دشمن پر غالب آنے میں ہی انسان کی اصل کامیابی ہے۔ اگر مقابلہ کوئی نہ ہوتا تو انسان کے کمالات کا اظہار بھی نہ ہوسکتا۔

ع۱۰۵۸ اغویتنی غی سے ہے جس کے معنی ہیں امام راغبؒ کہتے ہیں الغی جهلٌ من اعتقادٍ فاسد یعنی غی وہ جہالت ہے جو اعتقاد فاسد سے پیدا ہو۔ اسی لیے عصی (دم ربه فغوی (طٰہٰ ۲۰ - ۱۲۱) میں غوٰی کے معنی جَہِلَ کیے گئے ہیں۔ اور غوٰی کے معنی خاب یعنی ناکام رہا بھی کیے گئے ہیں اور فسد عیشه بھی یعنی اس کی زندگی خراب ہوگئی ان کان الله یرید ان یغویکم (ھود ۱۱ - ۳۴) میں یغوی کے معنی دو طرح پر کیے گئے ہیں یعاقبکم علی غیّکم یعنی تمہاری غیّ کی تمہیں سزا دے یا یحکم علیکم بغیکم یعنی تمہاری غی کا تم پر حکم لگائے (غ) انہی دو معنوں میں سے کوئی سے معنی یہاں ہیں اور ابن جریر کہتے ہیں اغویتنی اهلکتنی یعنی مجھے ہلاک کیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اغواء کے جو معنی بدی کی تحریک کرنا یا دوسرے کو بدراہ پر لگانا ہیں وہ یہاں قطعاً مراد نہیں کیونکہ سارے قرآن کریم میں کسی جگہ بھی یہ ذکر نہیں کہ اللہ تعالٰے نے اسے نافرمانی کا حکم دیا تھا بلکہ حکم تو فرمانبرداری کا ہی دیا تھا۔

لاقعدن لهم ۔ کسی چیز کے لیے قعود سے مراد اس کے لیے انتظار یا گھات میں بیٹھنا ہے (غ)

ع۱۰۵۹ شیطان کے چاروں طرف سے آنے کے معنی ہر طرح کی وسوسہ اندازی کرنا ہیں۔ جیسا کہ آگے آدم کے ذکر میں فوسوس لهما الشیطان سے ظاہر ہے اور جیسا کہ شر الوسواس الخنّاس سے ظاہر ہے۔ یہ مراد نہیں کہ وہ چاروں طرف سے اس پر غلبہ پالے گا۔ شیطان کو انسان پر کوئی غلبہ نہیں دیا گیا۔ ان عبادی لیس لك علیهم سلطان (الحجر ۱۵ - ۴۲) اور الگ الگ چاروں کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ من بین ایدیهم سے مراد ان کی دنیا ہے یعنی دنیوی لالچ دونگا اور خلفهم سے مراد آخرت ہے یعنی وسوسہ اندازی کروں گا کہ اعمال کی جزا و سزا کچھ نہیں اور من ایمانهم سے مراد ہے کہ ان کو نیکیوں سے روکوں گا اور شمائلهم سے مراد ہے کہ بدی کے لیے اکساؤنگا (ج)

ع۱۰۶۰ مذؤمًا کے معنی مذموم ہیں یعنی عیب لگا یا گیا (غ) کیونکہ ذأم عیب کو کہتے ہیں۔

مدحورا ۔ دَحر کے معنی نکال دینا اور دور کرنا ہیں ویقذفون من کل جانب دحورا (الصّٰفّٰت ۳۷ - ۸ و ۹)

بدی اور اس کا مظہر شیطان واقعی مردود اور حقیر ہے۔ بدی کو اگر کرنے والے سے الگ کر دیا جائے تو خود وہ بھی اس کو اچھا نہ سمجھے گا۔ کوئی جھوٹ بولنے والا دوسرے کے جھوٹ کو اچھا نہیں کہتا۔ کوئی زنا کرنے والا دوسرے کے زنا کو اچھا نہیں سمجھتا۔ دنیا میں گو بدی کرنے والے رہیں مگر بدی ہمیشہ مردود اور ذلیل رہے گی۔ پس شیطان اور جس چیز کی طرف وہ بلاتا ہے فطرت انسانی دونوں کو دھکے دیتی ہے مگر پھر بھی انسان اس کا ارتکاب کرتا ہے۔

مَا وٗرِیَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا
نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ
اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝۲۰
وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝۲۱
فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ
لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا
مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ
اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ
لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۲۲

اُن کے وہ عیب کھول دے جو ڈھانکے گئے تھے [۱۰۶۱] اور
اس نے کہا تمھارے رب نے تم کو اس درخت سے نہیں روکا مگر اس لیے کہ
تم فرشتے نہ بن جاؤ یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ [۱۰۶۲]
اور ان سے قسم کھا کر کہا کہ یقیناً میں تمھارے خیر خواہوں میں سے ہوں [۱۰۶۳]۔
پس دھوکے سے ان کو گرا دیا، سو جب ان دونوں نے درخت
کو چکھا ان کے عیب اُن پر کھل گئے اور وہ باغ کے پتوں سے
اپنے آپ کو ڈھانکنے لگے۔ اور ان کے رب نے انھیں پکارا
کیا میں نے تمھیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور تمھیں (نہیں)
کہا تھا، کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے [۱۰۶۴]

ع[۱۰۶۱] وسوس۔ وَسْواس اصل میں اس ہلکی آواز کو کہتے ہیں جو ہوا سے پیدا ہوتی ہے اور شکاری کے چلنے کی آہٹ کو بھی وسواس کہا جاتا ہے (ل) اس لیے وسوسۃ ناقص خیالات ہیں۔ جو دل میں آئیں (غ)

سوات۔ سَوْأۃ کی جمع ہے جس کے معنی شرمگاہیں اور خلۃ قبیحۃ (ت) یعنی بری خصلت بھی اور اس کی اصل سوء یعنی بُرائی ہے۔ لیث نے اس آیت کے الفاظ میں سَوْأۃ کے معنی کیے ہیں کلّ عملٍ وامرٍ شائنٍ یعنی ہر ایک عمل یا امر جو عیب لگانے والا ہو (ل) اور ابن اثیر نے اس کے ایک معنی کیے ہیں کلّ امرٍ یُسْتَحْیَا منه ہر ایک امر جس سے حیا آئے قول ہو یا فعل (ت) اور بحر المحیط میں سوأۃ کے معنی لکھے ہیں ما یسوء هما من المعصیۃ یعنی نافرمانی جو ان کے دکھ کا موجب ہو۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ شیطان کا آدم کو پھسلانا وسوسہ کے ذریعہ سے تھا جس طرح ہر انسان کو وہ پھسلاتا ہے اور وسوسہ ڈالنے کی غرض بھی یہاں یہ بیان فرمائی ہے کہ ان کی سوآت جو ان سے چھپا کر رکھی گئی تھیں یعنی ظاہر نہ ہوئی تھیں وہ ظاہر کر دے۔ آیا فی الحقیقت اس سے مراد کوئی لباس ہے جو ان کو پہنایا گیا تھا اور شیطان کی غرض اس لباس کو اتار دینا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ کوئی ظاہری لباس ہو تو کسی ممنوع درخت کے پھل کے کھانے سے اس کے رہنے یا اُترنے کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ مفسرین نے بھی اس دِقّت کو محسوس کیا ہے۔ ابن جریر وہب بن منبہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ ان پر ایک نُور تھا جس کی وجہ سے ان کی سوآت دیکھی نہ جا سکتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ نُور جن سوآت کو ڈھانک سکتا ہے وہ ظاہری شرمگاہیں نہیں بلکہ باطنی عیوب اور قبائح ہیں اور سوأت کے یہ معنی اوپر بیان ہو چکے ہیں اور اس آیت کے معنی کو آیت ۲۷ حل کرتی ہے یٰبنی اٰدم لا یفتننّکم الشیطٰن کما اخرج ابویکم من الجنۃ ینزع عنهما لباسهما لیریهما سوٰاتهما اے آدم کے فرزندو! تمہیں شیطان دکھ میں نہ ڈالے جس طرح تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکالا ان سے ان کا لباس اُتروا دیا تاکہ ان کو اُن کی سوآت دکھا دے۔ جہاں مجاہد سے روایت ہے ھو لباس التقوٰی یعنی تقویٰ کا لباس تھا جو اتار دیا۔ پس سوآت سے مراد بھی عیوب اور قبائح ہی ہو سکتے ہیں اور حدیث میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جہاں مغیرہ بن شعبہ کے متعلق یہ لفظ ہیں ھل غَسَلْتَ سوْاتك الا اَمْس جہاں سَوْأۃ میں اشارہ اس بیوفائی کی طرف ہے جو مغیرہ سے ایام جاہلیت میں اپنے ساتھیوں سے وقوع میں آئی (ن)۔ اور روح المعانی میں ایک قول اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے قیل ھو کنایۃ عن ازالۃ الحرمۃ واسقاط الجاہ یعنی اس سے مراد حرمت کا دور کرنا اور مرتبہ سے گرانا ہے۔ پس خود قرآن کریم اور حدیث اور مفسرین کی رائے سے یہ ظاہر ہے کہ سوأت سے مراد یہاں ان کے عیوب اور کمزوریاں ہیں اور شیطان کی غرض پھسلانے میں یہ تھی کہ وہ پردہ جو انسان کی کمزوریوں پر پڑا رہتا ہے دور ہو جائے یعنی اس سے کمزوری کا اظہار ہو۔

ع[۱۰۶۲] شیطان چونکہ جھوٹا تھا اس لیے واقعات کے عین خلاف اُن کے دل میں وسوسہ ڈالا یعنی یہ کہ بدی سے تم کو اس لیے روکا گیا ہے کہ تم فرشتے نہ ہو جاؤ۔ یا موت سے بچے رہو۔ گویا بدی کو اس قدر سجایا اور اس قدر اچھا دکھایا کہ انسان یہ خیال کرنے لگا کہ یہی میری موت سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ پہلا میلان انسان کا بدی کی طرف یہیں سے پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ارتکاب میں وہ کوئی لذت دیکھتا ہے یا اسے اپنی زندگی کے سامانوں کا موجب سمجھتا ہے۔ شیطان چونکہ دھوکہ باز ہے اس لیے بدی سے جو حالت پیدا ہوتی ہے عین اس کے اُلٹ ہونے کا وسوسہ ڈالتا ہے۔ بدی انسان کو ملکوتی صفات سے بہیمی صفات کی طرف لے جاتی ہے اور زندگی سے موت کی طرف۔ اس لیے اس کا اُلٹ کہا کہ اس سے تم ملک بن جاؤ گے اور غیر فانی ہو جاؤ گے۔

ع[۱۰۶۳] قاسم۔ باب مفاعلہ یہ ظاہر کرنے کے لیے اختیار کیا ہے کہ اس نے یقین دلانے کے لیے قسم میں سخت زور لگایا۔

ع[۱۰۶۴] دلّٰی۔ دَلْوٌ ڈول کو کہتے ہیں اور اِدْلاء توسّل کو جس کے لیے دیکھو ع[۲۳۸] اور تَدَلّی بلندی سے پستی کی طرف آنا ہے اور دَلّی کے معنی یہاں اِطماع یعنی طمع دنیا بھی کیے گئے ہیں۔ جیسے پیاسے کو پانی کنوئیں کی طرف لیجاتا ہے اور پھر اس میں پانی نہ ملے اور دوسرے معنی اَدْفَع یعنی گرا دیا کیے گئے ہیں (ل)

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ
تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

انھوں نے کہا، اے ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اگر تو ہماری حفاظت نہ کرے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہونگے۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ
فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾

کہا اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور سامان ہے۔

قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ
ع ۲/۹ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾

کہا، اسی میں تم جیو گے، اور اسی میں تم مرو گے، اور اسی سے تم نکالے جاؤ گے ع۱۰۶۵

يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِىْ
سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ
ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اے بنی آدم! بیشک ہم نے تم پر لباس اُتارا جو تمھارے عیبوں کو ڈھانکے اور زینت ہو اور تقویٰ کا لباس۔ یہی بہتر ہے یہ اللہ کی باتوں میں سے (باتیں) ہیں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں ع۱۰۶۶

یخصفن ۔ خَصَفَ جوتی کے گانٹھنے یا اس کے بعض کو بعض پر چڑھانے پر بولا جاتا ہے اور حدیث میں ہے انّہ کان یَخْصِفُ نَعْلَہ یعنی آنحضرت صلعم اپنی جوتی خود گانٹھ لیتے تھے (ل)

ورق ۔ درخت کے پتوں کو کہتے ہیں وَرَقَۃٌ واحد ہے ما تسقط من ورقۃ (الانعام ۔ ۵۹) اور ورق درہم کو کہتے ہیں فابعثوا احدکم بورقکم ھٰذہٖ (الکھف ۔ ۱۹) اور اَوْرَقَ فلانٌ جس کے لفظی معنی ہیں وہ شخص پتوں والا ہوگیا ۔ اس سے مراد ہے وہ اپنی حاجت نہ پا سکا ۔ گویا کہ وہ بغیر پھل کے پتوں والا ہوگیا اور ثمر مال کو کہتے ہیں ۔ (غ)

پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنے سے مراد: جب اوپر کی تشریح سے ثابت ہوگیا کہ جو لباس اُترا تھا وہ لباس تقویٰ تھا اور جو سوأت ظاہر ہوئی تھیں وہ اندرونی کمزوریاں تھیں تو باغ کے پتے لگانے کا مفہوم بھی ظاہری نہیں ہوسکتا بلکہ استعارۃً مراد اس سے ایسا فعل ہے کہ انسان اپنی کمزوری کا اخفا کرنے لگے اور ورق یا پتوں کا لفظ لا کر بتادیا کہ یہ وہ انسانی کوشش ہے جو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتی جیسا کہ ورق والا ہوجانے سے مراد ہے حاجت کا نہ پانا گویا پھل اس سے نہیں ملتا صرف پتے ملتے ہیں اور پھل دینے والی وحی الٰہی ہے معصیت کا ارتکاب پہلے پہلے انسان پر پشیمانی لاتا ہے وہی حالت آدم اور ان کی بی بی کی ہوئی ۔ اور جب اپنی کمزوری کا احساس ہوگیا تو اب انسانی کوشش شروع کی۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو بظاہر ایک جسمانی فعل معلوم ہوتا ہے اس کا اشارہ ایک روحانی امر کی طرف ہے ۔ معصیت میں مبتلا ہونے سے لباس نہیں اُترا کرتا ہاں احساس پیدا ہوتا ہے کہ انسان سے کمزوری سرزد ہوئی، اسی کو زیادہ واضح کرنے کیلئے اگلے رکوع کی پہلی آیت میں لباس کا ذکر کیا ہے انزلنا علیکم لباسا یواری سوأتکم وریشًا ولباس التقوٰی ذٰلک خیر ۔ جہاں لباس التقوٰی سے صاف بتادیا کہ اسی لباس کا ذکر آدم کے متعلق ہے چنانچہ ینزع عنھما لباسھما میں مجاہد نے کہا ہے، ھو لباس التقوٰی یعنی وہ لباس جو اتار دیا وہ لباس تقویٰ تھا ۔ پس باغ کے پتے لگانے سے مراد بھی اپنی انسانی کوشش ہے کیونکہ فطرت انسانی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک دفعہ اگر بدی سے مغلوب بھی ہوجائے تو دوسری دفعہ پھر اُٹھنے کی کوشش کرتی ہے مگر یہ انسانی کوشش کافی نہیں ہوتی ۔ بلکہ حقیقی علاج انزلنا علیکم لباسا میں بتایا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے ذریعہ سے وہ علاج کرتا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہاں دو باتیں الگ الگ ہیں ۔ ایک کھانا ایک لباس کسی چیز کے کھا لینے سے کسی لباس کا اُتر جانا صحیح نہیں ہوسکتا جب تک کہ دونوں سے مراد روحانی امور نہ لیے جائیں ۔ یعنی کھانے سے مراد کسی بدی کا ارتکاب تھا لباس کے اُتر جانے سے مراد اپنی کمزوری کا احساس ہے ۔ یہی ہم دن رات بنی آدم میں دیکھتے ہیں ۔ اس لیے آدم کے لیے کوئی الگ معنی تجویز کرنا انسانی تجربہ کو باطل کرنا ہے۔

ع۱۰۶۵ فیھا تحیون میں بتایا کہ زمینی زندگی تمہارے لیے ضروری ہے یعنی اس سے تمہاری ترقیات پیدا ہوتی ہیں ۔ اور زمینی زندگی کا اختتام موت سے ہوتا ہے ۔ نہ کسی اور طریق سے اور اس موت کے بعد پھر اٹھنا ہے جس میں اس زمینی زندگی کے اعمال کا نتیجہ ملتا ہے ۔ یہ حصر اس بات پر قطعی شہادت ہے کہ ان انسانوں کی زندگی جو اس زمین پر ہیں ۔ اسی زمین پر محدود ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر زندہ اُٹھایا جانا اس آیت کے خلاف ہے ۔ ایسا ہی زمینی زندگی کا انقطاع صرف موت سے ہوسکتا ہے پس جس شخص کی زندگی اس زمین پر ختم ہو گی لازماً وہ موت کا مزہ چکھ کر ہو گی نہ کسی اور طرح ۔

ع۱۰۶۶ انزلنا ۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی نعمتوں اور نعمتوں کا انزال یا نازل فرمانا صرف ان کا عطا کرنا ہے اور بعض وقت صرف ان کے حصول کے اسباب پیدا کردینا اور ان اسباب کی طرف انسان کو ہدایت کردینا ہی ہوتا ہے (غ)

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ
اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا
لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ
مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ
اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٢٧

اے بنی آدم شیطان تم کو دُکھ میں نہ ڈال دے، جس طرح تمہارے ماں باپ کو باغ سے نکلوا دیا۔ اُن سے ان کا لباس اُتروا دیا تاکہ اُن کو اُن کے عیب دکھا دے[1066] وہ اور اس کی جماعت تم کو ایسی طرح پر دیکھتے ہیں کہ تم ان کو نہیں دیکھتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے[1068]

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ
اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا
لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٢٨

اور جب کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں، کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایسا کرتے پایا اور اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ کہہ اللہ (کبھی) بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے[1069]

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ

کہہ، میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے آپ کو

لباس۔ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو انسان کے کسی قبیح امر کو ڈھانک لے (غ) اسی لیے بی بی کو خاوند کا اور خاوند کو بی بی کا لباس کہا ہے۔

ریش۔ پرند کے پروں یا کلغی کو کہتے ہیں جو بمنزلہ انسان کے لباس کے ہے۔

پچھلے رکوع میں یہ بتایا تھا کہ انسان صرف اپنی کوشش سے وساوس شیطانی سے نہیں بچ سکتا۔ اس لیے وحی الٰہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی مضمون کو جاری رکھتے ہوئے تمام نسل انسانی کو خطاب کر کے بتایا ہے کہ وحی الٰہی کی پیروی سے تم شیطان سے بچ سکتے ہو۔

لباس کے آتارنے سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس میں شک نہیں کہ جس لباس التقوٰی کا یہاں ذکر ہے وہ ایمان اور اعمال صالحہ کا لباس ہے۔ جیسا کہ ابن عباسؓ قتادہؓ سے مروی ہے تو ایک معنی تو یوں ہونگے کہ وہ ظاہری لباس جو تمہاری پردہ پوشی کرتا ہے۔ پھر صرف پردہ پوشی ہی نہیں بلکہ زینت کا کام بھی دیتا ہے۔ وہ تمہارے جسموں کی حفاظت اور زینت کے لیے بھی آخر خدا نے ہی بہم پہنچایا ہے۔ پس جس خدا نے تمہارے جسموں کے لیے یہ سامان بنایا، کیا اس نے انسان کی روحانی کمزوری اس کے اخلاقی عیوب پر پردہ پوشی اور اس کی روحانی زینت کے لیے ہی کوئی سامان نہیں بنایا؟ یوں لباس ظاہری سے لباس باطنی کی طرف توجہ دلائی۔ مگر یوں بھی اس کے معنی ہو سکتے ہیں۔ کہ انزلنا علیکم لباسا سے مراد وحی الٰہی ہی ہو۔ جو انسان کے عیوب کو ڈھانکنے اور اس کی زینت کا موجب ہے کیونکہ اگلی آیت میں صاف طور پر آدم کے لباس کے اُتر جانے کا ذکر کر کے سب انسانوں کو متنبہ کیا ہے کہ جس طرح شیطان نے تمہارے باپ اور ماں کا لباس اُتروا دیا تھا اسی طرح تمہارا لباس نہ اتار دے۔ دیکھو اگلا نوٹ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جس لباس کا ذکر ہے وہ لباس روحانی ہے اور اسی لباس کو جو انسان کے عیوب روحانی کے دور کرنے اور اس کی زینت کا موجب ہے لباس التقوٰی کہا ہے اور ہدایت کی ہے کہ اس لباس کا پہن لینا یعنی وحی الٰہی پر عملدرآمد کرنا تمہاری بہتری کا موجب ہے اور انسان کی حقیقی زینت کا موجب یہی لباس روحانی ہے۔

[1067] قبیل۔ قبیلۃ کی جمع ہے اور اس جماعت کو کہتے ہیں جو اجتماع کا رنگ رکھتی ہو اور ان کے بعض بعض کی خاطر توجہ کرنے والے ہوں (غ) وجعلنٰکم شعوبًا و قبائل (الحجرات ۴۹-۱۳)

یہاں لفظ کما کے استعمال سے صاف بتا دیا کہ جو حملہ شیطان کا آدم پر تھا وہی ابن آدم پر ہوتا ہے۔ جس طرح اس کو دکھ میں ڈالا کہ باغ سے نکال دیا۔ اسی طرح ہر ابن آدم کو دکھ میں ڈالنے کا وہ موجب ہو سکتا ہے جس طرح شیطانی وسوسے سے ان میں ایک کمزوری نمودار ہو گئی۔ اسی طرح ہر انسان اس کمزوری کا شکار ہو سکتا ہے یہی معنی امام مجاہد نے کیے ہیں یعنی ینزع عنہما لباسہما کی تشریح کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں ...... ھو لباس التقوٰی یعنی اس لباس کے اتروا دینے سے مراد لباس تقوٰی کا اُتروا دینا یا معصیت کرانا ہے۔ مزید تشریح کے لیے دیکھو عـ١٠٦١ و عـ١٠٦٤

[1068] اس سے صاف شہادت ملتی ہے کہ آدم نے بھی شیطان کو نہیں دیکھا جس طرح ہم نہیں دیکھتے نہ کوئی انسان جنّوں کو دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ شیطان بھی جنّوں میں سے ہے۔ ہاں شیاطین الانس کو بیشک دیکھ سکتا ہے اور جنوں کو دیکھنے وغیرہ کے جو قصّے بنے ہوئے ہیں سب بے بنیاد ہیں ہاں کشفی نظر سے وہ دیکھے جا سکتے ہیں اور وہ انسانوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کے سوا اور کوئی دخل ان کے کاروبار میں نہیں دیتے جیسا کہ اکثر قصّے بنے ہوئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ شیطان کے لفظ کا استعمال اسم جنس کے طور پر ہوا ہے۔ کیونکہ شیطان کا ذکر کرتے کرتے یہاں اس کی جماعتوں کا ذکر بھی کر دیا۔

[1069] عرب کے لوگ اپنے مشرکانہ رسوم و رواج کو جو ان کے باپ دادا سے چلے آتے تھے خدا کے حکم کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اصول کیا عمدہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ جو سر چشمۂ قدوسیت ہے وہ ناپاکی اور بیحیائی کی باتوں کا حکم نہیں دے سکتا۔ پس جس بات کو فطرت انسانی بیحیائی میں داخل کرتی ہے وہ خدا کا حکم نہیں ہو سکتا۔

عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۬ۚ
كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿٢٩﴾
فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ
اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿٣٠﴾
يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ
مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ
ع اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْۤ اَخْرَجَ
لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ
لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً
يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

ہر سجدے کے وقت میں سیدھا رکھو اور فرمانبرداری کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے اسے پکارو جس طرح تم کو پہلے بنایا تم لوٹ کر (بھی) آؤ گے [ع۱۰۷۰] ایک گروہ کو ہدایت کی اور (دوسرا) گروہ اس پر گمراہی ثابت ہو گئی، کیونکہ انھوں نے اللہ کے سوا شیطانوں کو دوست بنایا۔ اور وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ سیدھی راہ پر چلنے والے ہیں [ع۱۰۷۱]
اے بنی آدم! ہر سجدے کے وقت اپنی زینت کو لے لیا کرو، اور کھاؤ اور پیؤ اور زیادتی نہ کرو۔ وہ زیادتی کرنے والوں سے محبّت نہیں کرتا [ع۱۰۷۲]
کہہ، کس نے اللہ کی زینت کو جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہے اور کھانے کی ستھری چیزوں کو حرام کیا ہے۔ کہہ وہ دنیا کی زندگی میں ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لائے قیامت کے دن خالص (ان کے لیے) اسی طرح ہم باتوں کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان

ع۱۰۷۰ قسط کے معنی عدل کا حصّہ ہیں۔ پس اس میں ہر قسم کی طاعات داخل ہیں کیونکہ جو دوسرے کا حق لیتا ہے یا اس کا حق دیتا نہیں وہ عدل نہیں کرتا۔ افراط و تفریط قِسط یعنی عدل کے خلاف ہیں۔

مَسْجِد۔ سجدہ کا وقت یا سجدہ کا مکان۔ مراد اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے۔

جب فواحش سے روکا تو ساتھ ہی بتایا کہ اللہ تعالیٰ حکم کن باتوں کا دیتا ہے۔ حقوق انسانی کی ادائگی تو قسط میں آ گئی۔ اصول عدل کو ملحوظ رکھو اور دوسرے حصّہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف توجہ دلائی۔

کما بداکم تعودون میں توجہ دلائی کہ تمہاری تیاری ایک اور زندگی کیلئے ہونی چاہیئے۔ جس خدا نے پہلے بنایا وہی تم کو تمہارے اعمال کی جزا و سزا کے لیے پھر بنائیگا۔

ع۱۰۷۱ فریقا حق علیہم الضلالۃ یہاں انہی لوگوں کے وصف میں ہے جن کے متعلق دوسری جگہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا اضلال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس لیے گمراہ ٹھہراتا ہے کہ گمراہی کا فتویٰ ان پر صادق آتا ہے۔ یا گمراہی ان پر ثابت ہوتی ہے اور گمراہی کن لوگوں پر ثابت ہوتی ہے؟ جو شیطانوں کو دوست بنا کر ان کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور پھر طرفہ یہ کہ اپنے آپ کو ہدایت پر سمجھتے ہیں جس نے بدی کو نیکی سمجھ لیا اس کا بدی سے نجات پانا محال تک پہنچ جاتا ہے۔

ع۱۰۷۲ سجدہ یا فرمانبرداری کے وقت میں زینت لینے سے مراد اکثر مفسرین نے کپڑوں کا پہننا لیا ہے اس لیے کہ عرب کے لوگ حج کے وقت یا دعا کے وقت کپڑے اتار دیا کرتے تھے یہاں تک کہ عورتیں بھی برہنہ ہو جایا کرتی تھیں۔ اس خیال سے کہ جن کپڑوں میں گناہ کیا ہے ان کپڑوں میں عبادت نہیں کرنی چاہیئے۔

لیکن ہو سکتا ہے کہ زینت سے مراد روحانی زینت ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو۔ تو ان سب سامانوں کو بھی ساتھ رکھو جو انسان کی حقیقی زینت کا موجب ہیں گویا اخلاق حسنہ سے اپنے آپ کو آراستہ کرو۔ چنانچہ اس رکوع کی سب سے پہلی آیت میں جب لباس کو پردہ پوشی اور زینت کا سامان قرار دیا تو ساتھ ہی فرمایا کہ اس سے بہتر ایک لباس اور بھی ہے، اور وہ لباس تقویٰ ہے یعنی نیکی سے آراستہ ہونا پس اگر زینتکم سے لباس کا پہننا یا اچھے لباس میں ملبوس ہونا مراد ہے تو ساتھ ہی یہ بھی مراد ہے کہ حقیقی زینت روحانیت ہے اس کو بھی ساتھ رکھو اور اپنے آپ کو تقویٰ سے آراستہ کر کے مسجدوں میں جاؤ۔ اور جس طرح اخلاق حسنہ کی طرف توجہ دلائی، ساتھ ہی کھانے پینے کے متعلق بھی ہدایت فرمائی جس کے چار پانچ لفظوں میں نصف طب آ جاتی ہے۔ کھاؤ اور پیو اور زیادتی نہ کرو۔ یعنی کھانے پینے تک میں افراط و تفریط سے بچو۔ اس میں ہر قسم کی افراط و تفریط آ جاتی ہے۔ مثلاً خاص قسم کی چیزیں کھانا یا خاص قسم کی چیزیں ترک کر دینا سب اسراف میں داخل ہے۔

گوشت کھاتا ہے تو سبزی نہیں کھاتا۔ یا سبزی کھاتا ہے تو گوشت نہیں کھاتا۔ ایسا ہی جس مقدار غذا کی انسان کے لیے ضرورت ہے اس میں ضرورت سے زیادہ کھا لینا یا جس قدر ضرورت ہو اس سے کم کھانا یہ سب افراط و تفریط میں داخل ہیں اور کھانے پینے میں اصول اعتدال نہ صرف صحت جسمانی کو قائم رکھنے والی چیز ہے بلکہ اس سے انسان کی ساری خواہشات سفلی حالت اعتدال پر آ جاتی ہیں۔ اور شیطان جو ان خواہشات سفلی کا محرک ہے وہ اس کا فرمانبردار ہو جاتا ہے۔

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں ۱۰۷۳

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

کہہ، میرے رب نے صرف بیحیائی کی باتوں کو حرام کیا ہے جو اُن میں سے ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوں اور گناہ کو اور ناحق بغاوت کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک کرو، جس کے لیے اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور یہ کہ اللہ پر وہ بات کہو، جو تم نہیں جانتے ۱۰۷۴

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور ہر ایک قوم کے لیے ایک میعاد ہے، پھر جب اُن کی میعاد آ پہنچتی ہے تو ایک گھڑی پیچھے نہیں رہ سکتے اور نہ پہلے جا سکتے ہیں ۱۰۷۵

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾

اے بنی آدم اگر کبھی تمھارے پاس تمھیں میں سے رسول آئیں میری آیات تم پر بیان کریں، تو جو کوئی تقوےٰ کرے اور اصلاح کرے ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ پچھتائیں گے ۱۰۷۶

ع۱۰۷۳ اچھی چیزوں کا استعمال خلاف شریعت نہیں: اچھی چیزوں کو روحانی ہوں یا جسمانی اللہ تعالیٰ نے منع نہیں کیا۔ نہ اچھے کھانوں کو نعمائے دنیا بھی اگر مومن کو میسر ہوں تو ان سے فائدہ اُٹھائے۔ آنحضرت صلعم حالانکہ نہایت درجہ کی سادگی سے گزارہ کرتے تھے۔ نہایت ہی سادہ غذا نہایت ہی سادہ لباس نہایت ہی سادہ مکان لیکن اگر کھانے کے لیے کوئی اچھی چیز آجائے تو اسے ردّ نہ کرتے تھے پہننے کے لیے اچھا کپڑا مل جائے تو اسے پھینک نہ دیتے تھے۔ مسلمانوں میں افراط و تفریط ہے ایک گروہ تو دنیا کی آسائش کی تلاش میں اتنا منہمک ہوا ہے کہ اس سے اوپر نظر نہیں اٹھتی اور ایک گروہ وہ بھی ہے جو صاف کپڑا رکھنا صاف جسم رکھنا یا اچھا کھانا کھانا حرام سمجھتا ہے قیامت کے دن نعماء خاص طور پر مومنوں کا ہی حصّہ ہیں۔ یعنی کافر اس دن نعماء سے متمتع نہ کیے جائیں گے یا خالصۃ سے یہ مراد ہے کہ اس دنیا میں نعماء کے ساتھ رنج اور حزن کی باتیں بھی ملی ہوتی ہیں۔ نعمائے قیامت ان سے پاک ہونگی۔ تعلق اس آیت کا اصل مضمون سے یہ ہے کہ وحی الٰہی اچھی چیزوں کو حرام نہیں کرتی بلکہ اچھی چیزوں کی طرف ہدایت کرتی ہے۔

ع۱۰۷۴ اس میں تبایا کہ وحی الٰہی صرف ان چیزوں سے روکتی ہے جو یا خود بُری ہیں یا ان کا انجام بُرا ہے۔ اول فواحش یعنی بیحیائی کی باتوں کا ذکر کیا خواہ وہ علانیہ کی جائیں یا چھپکر۔ مثلاً زنا اور اس کے مبادی سب فواحش میں داخل ہیں علی الاعلان ہوں یا چھپ کر خواہ کوئی دیکھتا ہو یا نہ دیکھتا ہو۔ پھر اثم کا یعنی جسے انسان کی ضمیر تبا دیتی ہے کہ وہ برا کام ہے یا جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے اور پھر بغی کا یعنی دوسرے لوگوں پر زیادتی۔ اثم کا اثر لازماً دوسرے پر نہیں۔ بغی صرف دوسروں پر زیادتی ہے۔

ع۱۰۷۵ لایستاخرون کے معنی پیچھے رہنے کا ارادہ نہ کریں گے اور لایستقدمون آگے جانے کا ارادہ نہ کریں گے (غ) یعنی وقت مقرر سے پہلے بھی وہ عذاب نہیں آسکتا اور جب آجائے تو ٹل بھی نہیں سکتا۔

ع۱۰۷۶ رسولوں کے بھیجنے کا عام قانون اور ختم نبوت: یہاں اور اس سے پیشتر چند باتیں عام طور پر ساری نسل انسانی کو مخاطب کرکے کہی ہیں۔ یٰبنی اٰدم قد انزلنا علیکم لباسًا۔ یٰبنی اٰدم لایفتننکم الشیطان۔ یٰبنی اٰدم خذوا زینتکم۔ اور یہاں یٰبنی اٰدم امّا یاتینّکم رسل جس کا مطلب یہ ہے کہ لباس سارے بنی آدم کے لیے ہے۔ شیطان کے فتنہ سے سب بنی آدم کو متنبہ کیا ہے۔ سب بنی آدم کو خدا کی عبادت کرتے وقت زینت اختیار کرنے کو کہا اور بالآخر سب بنی آدم کو تبایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کوئی اپنا رسول بھیجے تو اس کو قبول کرنا چاہیئے کیونکہ رسولوں کو قبول کرنے سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے اور ان کا رد کرنا موجب خسران ہے۔ بعض ختم نبوت کے منکر اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ اس کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی رسول آتے رہنے چاہئیں اس آیت سے رسولوں کے آنحضرت صلعم کے بعد آنے کا نتیجہ اول بہاء اللہ نے اور بعد میں ان کی نقل کرکے میاں محمود احمد قادیانی کے مریدوں نے نکالا ہے حالانکہ اس آیت کو نہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے خود اور نہ ان کی زندگی میں ان کے مریدوں نے کبھی پیش کیا۔ ایک شرطیہ جملہ سے یہ نتیجہ نکالنا کمال نادانی ہے۔ مطلب تو صرف اس قدر ہے کہ اگر بنی آدم کے پاس خدا کا رسول آئے تو اس کو قبول کرنے میں ان کی بہتری ہے۔ سو وہ رسول محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کی ذات بابرکات کے متعلق یہ اعلان ہے کہ اگر اس کو قبول کرلو گے تو تمہاری بہتری کا موجب ہے اگر ردّ کرو گے تو تمہارے نقصان کا موجب ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ رسل کا لفظ جمع کیوں استعمال کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس لیے کہ خطاب کل بنی آدم کو ہے اور بنی آدم کی طرف رسول بھیجنے کا عام ذکر ہے۔ تو بلاشبہ آنحضرت صلعم سے پہلے بنی آدم کے پاس رسول آتے رہے اور سب سے آخر حضرت

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا
اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ
مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا
يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾
قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ
قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا
دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا
فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا
هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۵
قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلائیں اور ان سے تکبر کریں، وہ آگ والے ہیں اسی میں رہیں گے ع۱۰۷۷

پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے ان لوگوں کو ان کا حصہ نوشتہ سے ملتا رہے گا یہاں تک کہ جب ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس آئیں گے کہ ان کو وفات دیں کہیں گے، وہ کہاں ہیں جن کو اللہ کے سوائے تم پکارتے تھے ۔ کہیں گے وہ ہم سے جاتے رہے اور اپنی جانوں پر گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے ع۱۰۷۸

کہے گا، ان قوموں میں جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں سے گزر چکیں آگ کے اندر داخل ہو جاؤ ۔ جب کبھی کوئی جماعت داخل ہو گی اپنی ساتھی (قوم) پر لعنت کرے گی یہاں تک کہ جب سب اس کے اندر ایک دوسرے کو پالیں گے اُن کے پچھلے ان کے پہلوں کو کہیں گے اے ہمارے رب انھوں نے ہمیں گمراہ کیا سو ان کو دو چند عذاب آگ کا دے کہے گا ہر ایک کے لیے دو چند ہے لیکن تم نہیں جانتے ع۱۰۷۹

محمد مصطفٰے صلعم کو بھیجا گیا کہ دنیا کی کل قوموں کو ایک سلسلہ اخوت میں منسلک کریں اور اس بات کی شہادت کہ آپ کے بعد رسول نہ آئیں گے دوسری جگہ سے ملتی ہے جہاں فرمایا الیوم اکملت لکم دینکم آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا ۔ رسول تو دین سکھانے کے لیے آتے تھے جب اللہ تعالیٰ نے دین کو کامل کر کے پہنچا دیا تو پھر رسولوں کے آنے کی ضرورت بھی باقی نہ رہی جب کمال شریعت اور شریعت کے آنے کیلئے مانع ہو گیا تو کمال نبوت بھی اور نبی کے آنے کے لیے مانع ہو گیا ۔ جو ضرورت تھی وہ پوری ہو گئی ۔ آفتاب رسالت شمس نصف النہار کی طرح چمک رہا ہے اس لیے اب کسی رسول کی ضرورت دنیا کو نہیں ۔ اور وہ لوگ جو رسول کے آنے کا جواز نکالتے ہیں مگر شریعت کا آنا نہیں مانتے ان کے لیے خود یہاں لفظ موجود ہیں یقصون علیکم اٰیتی یعنی رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پیغام بھی لائیں گے ۔ وہی پیغام شریعت ہے اور اگر کہا جائے کہ یہ کسی پہلے رسول کی آیات ہیں تو پھر تکذیب تو ان آیات کی ہے ۔ دیکھو اگلا نوٹ ایسے رسولں کی تکذیب کوئی شے نہ ہوئی ۔

ع۱۰۷۷ رسول کے ساتھ پیغام کا آنا ضروری ہے : اس آیت سے صاف شہادت ملتی ہے کہ رسولوں کے آنے سے مراد ایسے رسولوں کا آنا ہے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کوئی پیغام بھی ہوتا ہے چنانچہ جس طرح پہلے فرمایا تھا اِمّا یاتینکم منی ھدی (البقرۃ ۲ ۔ ۳۸) اور اس کے متعلق دو گروہوں کا ذکر کیا ایک فمن تبع ھدٰی اس ہدایت کی پیروی کرنے والے اور دوسرے والذین کفروا وکذبوا باٰیٰتنا یعنی اس ہدایت اس پیغام کا انکار کرنے والے اسی طرح یہاں دو گروہ ہیں ایک اصلاح کرنے والے دوسرے آیات یعنی پیغام الٰہی کی تکذیب کرنے والے پس دونوں آیتوں کا مطلب ایک ہے اور دونوں گروہوں کی جزا کا ذکر یکساں الفاظ میں ہے ۔ دونوں میں سزا تکذیب پیغام کی ہے ۔ اور رسولوں کے ختم ہو جانے پر واقعات عالم بھی گواہ ہیں جس قسم کے لوگ پہلے آیا کرتے تھے اور ایک عالم کو اپنے پیچھے لگا لیتے تھے اب تیرہ سو سال سے اس قسم کا کوئی انسان دنیا میں ظاہر نہیں ہوا ۔

ع۱۰۷۸ نصیبھم من الکتٰب ۔ کتاب بمعنی مکتوب بھی ہو سکتا ہے یعنی جو حصہ ان کے لیے لکھا گیا ہے ۔ مگر الکتٰب سے مراد یہی قرآن بھی ہو سکتا ہے ۔ یعنی وہ قرآن کو رد کر کے اس حظ سے بہرہ ور ہونگے جو رد کرنے والوں کے لیے قرآن نے قرار دیا ہے ۔

شھدوا علٰی انفسھم اپنے نفسوں پر شہادت دینے سے مراد یہ ہے کہ الزام قبول کر لیں گے اور اپنے گناہوں کا اقرار لیں گے یا یہ کہ ان کی حالت خود بتا دے گی کہ وہ کافر تھے اور جو طاقتیں انسان کی ترقی کے لیے انسان کے اندر ودلیت کی گئی تھیں ان کو انہوں نے دبا دیا ۔

ع۱۰۷۹ اختھا ۔ اخ اور اخت کا لفظ ہر قسم کی مشارکت پر بول دیا جاتا ہے ۔ خواہ ولادت کے لحاظ سے ہو یا رضاعت کے لحاظ سے یا دین یا صنعت یا معاملہ یا دوستی

وَقَالَتْ أُولَاهُمْ لِأُخْرَاهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٣٩﴾ ع ٨

اور ان کے پہلے ان پچھلوں کو کہیں گے تم کو ہم پر کوئی فوقیت نہیں۔ سو اس کے بدلے میں جو تم کماتے تھے، عذاب چکھو۔

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿٤٠﴾

جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور ان سے سرکشی اختیار کرتے ہیں، ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے ۔ اور وہ جنت میں داخل نہ ہونگے جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو ۔ اور اسی طرح ہم مجرموں کو سزا دیتے ہیں ع١٠٨٠

لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٤١﴾

ان کے لیے جہنم کا بچھونا ہے اور ان کے اوپر (اسی کے) اوڑھنے اور اسی طرح ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں ع١٠٨١

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ

اور جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں ہم کسی شخص پر کچھ لازم نہیں کرتے مگر اس کے مقدور کے مطابق، یہی جنت والے ہیں

کے لحاظ سے۔ کفر میں شریک بھی سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور اسلام میں شریک بھی سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ یہاں اخراہا بلحاظ سیاق ان کے اولیاء ہیں (غ) یا یہ کہ تابع متبوع پر لعنت کریں گے اور متبوع تابع پر۔

اخراہم۔ اولٰھم سے پچھلے اور پہلے بلحاظ مرتبہ مراد ہیں یعنی تابع اور متبوع۔ یا ضعفا اور کبرا۔

لکل ضعفٌ۔ یعنی اگر متبوع زیادہ عذاب کے مستحق ہیں اس لیے کہ انھوں نے دوسروں کو گمراہ کیا۔ تو تابع بھی زیادہ کے مستحق ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے آنکھیں بند کرکے تقلید کی۔ دوسری توجیہ دوچند عذاب کی یہ ہے کہ ظاہر و باطن کا عذاب مراد ہے۔ یوں ہر ایک کے لیے اس کا دوچند ہے جو نظر آتا ہے۔ گو دوسرا نہ جانتا ہو۔ امام راغب نے یہی معنی لیے ہیں۔

ع١٠٨٠ لاتفتح لھم ابواب السماء۔ مراد یہ ہے کہ ان کے اعمال اوپر نہیں جاتے یا ان کی ارواح کا رفع نہیں ہوتا۔ صالح عمل کو اللہ تعالیٰ رفع دیتا ہے والعمل الصالح یرفعہ (فاطر ٣٥-١٠) ایسا ہی مومنوں کو اللہ تعالیٰ رفع دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا اسم الرافع ہے اس لیے خواہ یہاں کفار کے اعمال مراد لیے جائیں یا ان کی ارواح مطلب ایک ہی ہے ان کو رفع عطا نہیں ہوتا۔ اسی لحاظ سے فرمایا کہ ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔

جمل۔ جمال حسن کو کہتے ہیں اور جَمَل اونٹ کو اس لیے کہ وہ اونٹ کو اپنے لیے خوبصورتی کا موجب سمجھتے تھے۔ اس کی جمع جِمَالَۃ قرآن شریف میں آتی ہے کانہ جمالۃ صفر (المرسلٰت ٣٣) اور جمال بھی آتی ہے۔

سم۔ تنگ سوراخ کو کہتے ہیں جیسے سوئی کا ناکہ یا ناک یا کان میں جو چھید کیا جاتا ہے اور سَمّ زہر کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ اپنے لطف تاثیر سے بدن کے اندر داخل ہو جاتی ہے اور سموم تیز گرم ہوا کو کہتے ہیں جو زہر کا سا اثر رکھتی ہے۔ فی سموم وحمیم (الواقعۃ ٥٦-٤٢) والجان خلقناہ من قبل من نار السموم۔ (الحجر ١٥-٢٧) (غ)

یلج الجمل فی سم الخیاط۔ جمل یا اونٹ کو عرب بڑائی میں بطور مثال بیان کرتے ہیں اور سوئی کے ناکے کو تنگی میں۔ یہاں یہ بتایا کہ ان کے اعمال نے ان کیلئے جنت میں داخل ہونا ایسا ہی مشکل کر دیا ہے جیسا اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا مشکل ہے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو وہاں پہنچا دے یا سزا دینے کے بعد تو یہ اور معاملہ ہے۔

اصل غرض بمقابلہ ردّ کرنے والوں کے وحی کو قبول کرنے والوں کا ذکر ہے اس مقابلہ کے اظہار کے لیے پہلی دو آیتوں میں پچھلے رکوع کے مضمون کو جاری رکھا ہے۔

ع١٠٨١ غواش۔ غاشیۃ کی جمع ہے ڈھانکنے والی چیز۔ اور ایسی مصیبت کو بھی کہا جاتا ہے جو ڈھانک لے تاتیھم غاشیۃ (یوسف ١٢-١٠٧) اور قیامت کو بھی ھل اتٰک حدیث الغاشیۃ (الغاشیۃ ٨٨-١)

جہنم کے اوڑھنا اور بچھونا ہونے سے مراد یہ ہے کہ چاروں طرف سے عذاب ان پر محیط ہوگا۔

هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾
وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ
الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۖ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ
لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ
رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۗ وَنُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ
اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ النصف
وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ
قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ
وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۗ قَالُوْا نَعَمْ ۚ
فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ
عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾
الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا
عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾
وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ
يَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ

وہ اسی میں رہیں گے
اور جو کچھ ان کے سینوں میں رنج ہونگے ہم نکال دیں گے[1082]
ان کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اور وہ کہیں گے سب تعریف اللہ کے
لیے ہے جس نے ہم کو اس کے لیے ہدایت دی اور ہم تو ہدایت نہ پا سکتے
اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ دیتا یقیناً ہمارے رب کے رسول حق کے
ساتھ آئے اور انھیں پکارا جائے گا کہ اس جنت کا تم کو اس
کے بدلے وارث بنایا گیا جو تم کرتے تھے[1083]
اور جنت والے آگ والوں کو پکاریں گے، کہ بے شک ہم نے
جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا تھا سچ پایا، تو کیا تم نے
بھی جو تمھارے رب نے وعدہ کیا تھا سچ پایا؟ کہیں گے ہاں!
تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ ظالموں پر
اللہ کی لعنت ہے۔
جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں اور وہ
آخرت کے بھی منکر ہیں[1084]
اور ان کے درمیان ایک پردہ ہوگا[1085] اعراف پر کچھ مرد
ہونگے، جو سب کو ان کے نشانوں سے پہچانتے ہونگے[1086] اور وہ جنت

۱۰۸۲ غِلّ۔ کے معنی عداوت ہیں (غ) یا کینہ رنج حسد۔
نعمائے دنیا کے ساتھ یہ بھی لگا ہوا ہے کہ سینوں میں کسی قدر غل و غش رہتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ کینہ یا حسد ہوتا ہے۔ جنت کی نعماء کے ساتھ یہ باتیں نہ ہونگی۔ درجات میں اگر ایک دوسرے سے بلند بھی ہونگے تو بھی دلوں میں کوئی حسد نہ ہوگا۔ وہ نعماء ہر قسم کی ردی آمیزش سے پاک ہوں گی
اور یا یہ مراد ہے کہ مومنوں میں بھی بعض وقت غلط فہمیوں سے ایک دوسرے سے رنج ہو جاتا ہے۔ قیامت میں وہ نہ ہوگا۔
۱۰۸۳ اورثتموھا۔ وراثۃ اصل میں اس کو کہتے ہیں کہ کوئی مال کسی غیر سے بلا کسی عہد کے یا بلا ایسی چیز کے جو عہد کے قائمقام ہو پہنچے۔ پھر اس کا استعمال ایسے مال پر ہوتا ہے جو میت سے پہنچتا ہے اور ایسے حصول مال پر بھی ہوتا ہے جو بلا مشقت ملے۔ اور ایسا ہی جب کسی کو کوئی نعمت عطا کی جائے جو اس کے لیے خوشگوار ہو (غ) یہاں جنّت کو مومن کے لیے ورثہ بتانے میں یہ اشارہ ہے کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتی ہے۔ اعمال کا بدلہ بھی ساتھ فرمایا مگر سچ یہی ہے کہ اعمال صالحہ جو انسان کرتا ہے تو وہ اپنا فرض ادا کرتا ہے۔ ان پر نعماء کا عطا کرنا یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔
۱۰۸۴ عوج۔ عَوَج وہ ٹیڑھا پن ہے جو آنکھ سے نظر آجائے اور عِوَج وہ جو بصیرت سے معلوم ہو۔ یبغونھا عوجا سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو دین کو استقامت دی ہے تو یہ اس حالت سے اس کو بدلنا چاہتے ہیں۔
۱۰۸۵ یعنی اہل جنت اور اہل نار کے درمیان پردہ حائل ہوگا۔ پس وہاں کے حواس الگ ہی ہیں اور وہاں کی کیفیات بھی الگ ہیں۔ دونوں کے درمیان پردہ بھی حائل ہے با ایں ایک دوسرے سے باتیں بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھتے بھی ہیں۔ یہاں کے مکان کی کیفیات وہاں کے مکان کی کیفیات نہیں۔
نیز دیکھو ۱۸۳۸۔
۱۰۸۶ الاَعْراف۔ عُرْف کی جمع ہے اور وہ ہر ایک بلند مرتفع مکان کو کہتے ہیں اور زجاج کا قول ہے کہ اعراف وہ بلند مکان ہیں جو دیوار کے اوپر ہوں اور ایسا ہی جو بلند زمین ہو وہ بھی عُرْف کہلاتی ہے۔ اور ہواؤں اور بادلوں کے اَعْراف وہ ہیں جو پہلے آئیں اور جو بلند ہوں (ل)

الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۣ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾

والوں کو پکاریں گے کہ تم پر سلامتی ہو وہ ابھی اس میں داخل نہیں ہوئے اور وہ امید رکھتے ہوں گے ۱۰۸۷

وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ ع

اور جب اُن کی آنکھیں آگ والوں کی طرف پھریں گی، کہیں گے اے ہمارے رب ہم کو ظالم قوم کے ساتھ نہ کیجیو ۱۰۸۸

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور اعراف والے کچھ مردوں کو پکاریں گے جن کو وہ ان کے نشانوں سے پہچانتے ہونگے کہیں گے تم کو تمھاری جمعیت نے کچھ فائدہ نہ دیا اور (نہ) اس نے جو تم تکبر کرتے تھے ۱۰۸۹

اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾

کیا یہ وہی ہیں جو تم قسمیں کھاتے تھے کہ اللہ اُن پر رحمت نہیں کرے گا۔ جنت میں داخل ہو جاؤ، تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم پچھتاؤ گے ۱۰۹۰

سیما۔ سام سے ہے اور اس کے معنی علامت ہیں۔

اصحاب اعراف کون لوگ ہیں۔ اکثر مفسرین کا یہ خیال ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہیں اور وہ اعراف کو حجاب قرار دیتے ہیں جو جنت اور دوزخ کے درمیان ہے۔ مگر لفظ کے لغوی معنی کی رُو سے یہ تاویل درست معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اعراف بلند مقاموں کا نام ہے۔ دوسرے ان کے مرتبہ کی بلندی اس سے ظاہر ہے کہ وہ سب کو پہچانتے ہیں یعنی اہل دوزخ کو اور اہل جنت کو نشانوں سے پہچانتے ہیں یہ ان کی معرفت بلند کا نتیجہ ہے۔ تیسرے ان کو رجال کہا ہے اگر وہ گروہ مراد ہوتا جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہیں تو رجال کی خصوصیت کے کوئی معنی نہیں۔ کیونکہ ایسی عورتیں بھی ہونگی اور مرد بھی ہونگے۔ رجال کی خصوصیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسل اور انبیاء کا گروہ ہے کیونکہ رسالت مردوں سے مخصوص رہی ہے اور لسان العرب میں ایک قول اصحاب الاعراف کے متعلق یہ بھی منقول ہے کہ وہ انبیاء ہیں۔ اور گو ایک گروہ مفسرین کا اس طرف بھی گیا ہے کہ اس سے مراد ملائکہ ہیں مگر اس میں بھی رجال کے لفظ کی خصوصیت باقی نہیں رہتی پس حق یہی ہے کہ یہ انبیاء کا گروہ ہے جو اپنی امتوں کو پہچانتے ہیں کہ کون جنت میں جائیں گے اور کون دوزخ میں، اس کی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے بھی ہوتی ہے کیونکہ انبیاء کو ایک خصوصیت دی گئی ہے کہ انہیں اپنی اپنی امتوں پر شہید کہا گیا ہے فکیف اذا جئنا من کل اُمۃ بشھید (النساء ۴-۴۱) اور یہ ایک الگ ہی گروہ قرار دیا گیا ہے۔ ہاں اُمت محمدیہ کو یہ فضیلت دی گئی ہے کہ اس کے کامل الایمان لوگوں کو بھی اس گروہ میں داخل کیا ہے جیسے فرمایا لتکونوا شھداء علی الناس (البقرۃ ۲-۱۴۳) اور اسی کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ قرآن کریم نے دوسری جگہ تین گروہ ہی بنائے ہیں، ایک سابقون یا مقربون کا گروہ، ایک اصحاب الیمین یا اہل جنت کا گروہ، ایک اصحاب الشمال یا اہل دوزخ کا گروہ دیکھو سورۃ الواقعۃ اس لیے یہاں اہل جنت اور اہل نام کے علاوہ جس تیسرے گروہ کا ذکر ہو سکتا ہے وہ یہی سابقین اور مقربین کا گروہ ہے۔ اور لسان العرب میں ہے کہ ابن عباس سے دریافت کیا گیا کہ اس قول کے کیا معنی ہیں اھل القراٰن عُرَفاء اھل الجنۃ تو آپ نے فرمایا رؤساء اھل الجنۃ یعنی عرفا سے مراد سرداران اہل جنت ہیں۔

۱۰۸۷ یعنی اہل جنت ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہاں امیدوار ہیں لیکن یہ مقربین کا گروہ چونکہ بلند مقام پر ہے اس لیے اہل جنت کو پہچانتا ہے۔

۱۰۸۸ یہ اس لیے کہیں گے کہ ابھی وہ جنت میں داخل نہیں ہوئے صرفت ابصارھم میں انہی اہل جنت کا ذکر ہے۔

۱۰۸۹ جمعکم سے مراد جمعیت بھی ہو سکتی ہے اور مال و دولت کا جمع کرنا بھی، یہ الفاظ کہ اعراف والے دوزخ والوں میں سے خاص لوگوں کو پکاریں گے اور ان کی جمعیت اور ان کا تکبّر یاد دلائیں گے اسی نتیجہ کی موید ہیں جس پر ہم اوپر پہنچے ہیں کہ اصحاب اعراف سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں اور وہ رجال جن کو وہ پکاریں گے وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں اپنے مال اور جتھے کو حق کی مخالفت پر لگایا۔ ان لوگوں کو جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں حق کے ان مخالفین سے کیا تعلق اور ان کے انہیں پہچاننے کا کیا مطلب؟ ہاں انبیاء ان کو پہچانتے ہوں گے اس لیے کہ ان کی مخالفت ان لوگوں نے کی اور اگلی آیت میں اپنے متبعین کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۰۹۰ یہ اہل جنت کی طرف اشارہ کر کے کہا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جو اب جنت میں جا رہے ہیں ان کے متعلق تم کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نہیں کرے گا کیونکہ مخالفین حق مومنوں کو ذلیل سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے اس قسم کے اقوال دوسری جگہ موجود ہیں اھٰؤلاء الذین من اللہ علیھم من بیننا (الانعام ۶-۵۳) کیا یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے احسان کیا ہے یعنی استہزا کے طور پر اُن کو کہتے تھے کیونکہ وہ غریب تھے آیت کے پچھلے حصہ

وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ اَنۡ اَفِیۡضُوۡا عَلَیۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَہُمَا عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ۙ﴿۵۰﴾

اور آگ والے جنت والوں کو پکاریں گے، کہ ہم پر کچھ پانی بہاؤ، یا اُس سے (دو) جو اللہ نے تم کو رزق دیا ہے۔ کہیں گے اللہ نے ان کو کافروں پر حرام کیا ہے ۱۰۹۱

الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا دِیۡنَہُمۡ لَہۡوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتۡہُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا ۚ فَالۡیَوۡمَ نَنۡسٰہُمۡ کَمَا نَسُوۡا لِقَآءَ یَوۡمِہِمۡ ہٰذَا ۙ وَ مَا کَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَجۡحَدُوۡنَ ﴿۵۱﴾

جنھوں نے اپنے دین کو تماشا اور کھیل بنایا اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا سو آج ہم ان کو چھوڑ دیں گے جس طرح وہ اپنے اس دن کی ملاقات کو بھول گئے، اور اس لیے کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے ۱۰۹۲

وَ لَقَدۡ جِئۡنٰہُمۡ بِکِتٰبٍ فَصَّلۡنٰہُ عَلٰی عِلۡمٍ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۲﴾

اور یقیناً ہم نے ان کو کتاب دی جسے ہم نے علم کے ساتھ کھول کر بیان کیا ہے ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔

ہَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا تَاۡوِیۡلَہٗ ؕ یَوۡمَ یَاۡتِیۡ تَاۡوِیۡلُہٗ یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ نَسُوۡہُ مِنۡ قَبۡلُ قَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ ۚ فَہَلۡ لَّنَا مِنۡ شُفَعَآءَ فَیَشۡفَعُوۡا لَنَاۤ اَوۡ نُرَدُّ فَنَعۡمَلَ غَیۡرَ الَّذِیۡ کُنَّا نَعۡمَلُ ؕ قَدۡ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ وَ ضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۵۳﴾ ع ۱۲

کیا وہ اس کے (بتائے ہوئے) انجام ہی کا انتظار کرتے ہیں جس دن اس کا (بتایا ہوا) انجام آئیگا وہ لوگ جنھوں نے اسے پہلے بھلا رکھا تھا کہیں گے بیشک ہمارے رب کے رسول حق کے ساتھ آئے پس کیا ہمارے کوئی سفارشی ہیں جو ہمارے لیے سفارش کریں یا ہم لوٹائے جائیں تو اور عمل کریں اس کے خلاف جو ہم عمل کرتے تھے انھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور وہ جو افترا کرتے تھے ان سے جاتا رہا ۱۰۹۳

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ

تمھارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ وقتوں میں پیدا کیے ۱۰۹۴

میں خطاب اہل جنت کو کرتے ہیں جو ان انبیا کے پیرو ہیں۔

۱۰۹۱ جو لوگ اس دنیا میں کھانے پینے کے ہی خیال میں منہمک رہے وہاں بھی یہی خیال سر میں رہے گا اور ان کو جواب یہ دیا گیا ہے کہ وہ رزق اب مانگنے سے نہیں مل سکتا۔ ان کے قویٰ ہی اس قابل نہیں کہ وہ روحانی ثمرات حاصل کریں جن کا موقعہ انہوں نے خود گنوا دیا۔ وجہ اگلی آیت میں بتائی ہے۔

۱۰۹۲ یعنی دنیا میں ان کو موقع دیا گیا تھا جس کو انہوں نے ضائع کر دیا، دین کو ایک کھیل سمجھا اور حیوانی خواہشات پر ہی گرے رہے، اس لیے ان کے روحانی قویٰ مر گئے اور وہ اس رزق کے اہل ہی نہیں رہے گویا اہل جنت بخل نہیں کرتے بلکہ انہیں بتاتے ہیں کہ وہ رزق تو خاص قویٰ کے حصول سے مل سکتا ہے مگر تم نے خود دنیا میں ان قویٰ کو بیکار کر دیا۔ نسیان کے معنی کے لیے دیکھو ح ۶۷۔

۱۰۹۳ تاویل کے معنی کے لیے دیکھو ح ۳۷۶ یہاں مراد اس کا بیان کردہ انجام ہے یعنی وہ وعید جو اُن کو دیئے گئے۔ مطلب یہ ہے کہ اصلاح کا وقت تو یہی ہے کہ وعید کے آنے سے پہلے پہلے کرلے جب بدی کا انجام بدظاہر ہو گیا تو پھر وہ ٹل کس طرح سکتا ہے۔

۱۰۹۴ یوم کے معنی ح ۳ میں بیان ہو چکے ہیں۔ ایک لمحہ سے لے کر پچاس ہزار سال کو بھی یوم کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ یوم جس کو ہم دن کہتے ہیں جو آفتاب کے طلوع اور غروب سے تعلق رکھتا ہے وہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بعد ظہور میں آیا۔ پس آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے ذکر میں کبھی بھی مراد چوبیس گھنٹے کا دن رات نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے عام معنی وقت ہی مراد ہیں جو تمام حدبندیوں سے آزاد ہے۔

آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کرنے سے مراد: اس رکوع میں یہ بتایا ہے کہ وہ حق جو وحی لائی ہے ضرور کامیاب ہوگا۔ مگر اس کی ترقی جیسا کہ قدرت کے تمام نظارہ میں ہے تدریجی ہوگی۔ اور اس لیے ابتدا یوں کی کہ آسمانوں کو اور زمین کو بھی اللہ تعالےٰ نے چھ وقتوں میں پیدا کیا یعنی ان کی پیدائش کی جو آخری حالت ہے چھ زمانوں میں چھ حالتوں سے گزار کر ان کو اس حالت تک پہنچایا۔ ان معنوں کی صحت پر یہ امر شاہد ہے کہ اللہ تعالےٰ نے سورۂ المؤمنون کے پہلے رکوع میں انسان کی پیدائش کے بھی چھ ہی مراتب بیان کیے ہیں۔ نطفہ، علقہ، مضغہ۔ مضغہ میں ہڈیوں کا پیدا ہونا، پھر سارے اعضا کا ٹھیک ہو کر ہڈیوں پر گوشت کا چڑھ

الْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ قف یُغْشِی الَّیْلَ النَّھَارَ یَطْلُبُہٗ حَثِیْثًا لا وَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِہٖ ط اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط

پھر وہ عرش پر متمکن ہے [۱۰۹۵] رات کو دن کا لباس پہناتا ہے وہ اس کے پیچھے لگاتار چلا آتا ہے اور سورج اور چاند، ستارے اس کے حکم سے کام میں لگائے گئے ہیں، سُن لو بنانا اور حکم دینا اسی کا کام ہے۔ اللہ

جانا، پھر اس میں زندگی کا پیدا ہونا۔ اور اس کے مقابل پر وہیں یعنی سورۂ المؤمنون میں چھ ہی مراتب خلق روحانی کے بیان فرمائے ہیں۔ زمین کی پیدائش کو اگر لیا جائے تو سائنس سے موجودہ حالت تک پہنچنے میں چھ مرتبے ثابت ہوتے ہیں۔ ایک وہ حالت جب یہ انگارے کی صورت میں تھی۔ دوسری وہ حالت جب وہ انگارہ ٹھنڈا ہونا شروع ہوا اور پانی وغیرہ الگ ہوئے۔ تیسری وہ حالت جب اس کی سطح کا اوپر کا حصّہ کافی موٹا ہو گیا اور پہاڑ وغیرہ بن گئے۔ چوتھی وہ حالت جب نباتات بنیں۔ پانچویں وہ حالت جب حیوانات پیدا ہوئے۔ چھٹی وہ حالت جب خلاصہ مخلوقات انسان بنا۔ اسی طرح زمین و آسمان کی ہر چیز کی پیدائش میں چھ مرتبے نظر آتے ہیں۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں بھی چھ مرتبے بتائے گئے ہیں یعنی اوّل مٹی کا پیدا ہونا پھر اس میں پہاڑوں کا بننا، پھر درختوں کا پیدا ہونا۔ پھر مکروہات کا پیدا ہونا، پھر نور کا پیدا ہونا، پھر جانداروں کا پیدا ہونا، پھر انسان کا پیدا ہونا۔ اور یوم الاحد یوم الاثنین وغیرہ کا جو ذکر بعض روایات میں ہے تو اس سے مراد واقعی یہی اتوار پیر وغیرہ کے ایام نہیں، بلکہ پہلا دوسرا دن مراد ہیں اور یوم الجمعۃ سے مراد جمع ہونے کا دن ہے یعنی جس میں آدم کی پیدائش کی وجہ سے ساری مخلوقات جمع ہو گئی ابن جریر میں ایسی ہی ایک روایت کے بعد یہ لفظ آتے ہیں کہ ان چھ دنوں میں سے ہر دن ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ پس معلوم ہوا یہ دن مراد کبھی نہیں لیے گئے بلکہ اس سے مراد چھ اور زمانے ہیں خواہ وہ ایک ہزار سال کے ہوں خواہ پچاس ہزار کے خواہ دس لاکھ کے۔

۱۰۹۵ استوٰی کے لیے دیکھو ع [۴۴] اس کا استعمال ایک چیز پر اس کی اپنی ذات میں حالت اعتدال پر ہونے پر ہوتا ہے اذا استویت انت (المومنون [۲۳] - ۲۸) لتستووا علی ظھورہ (الزخرف [۴۳] - ۱۳) فاستوٰی علیٰ سوقہ (الفتح [۴۸] - ۲۹) اس معنی میں استوٰی کے معنی متمکن اور مضبوط ہونا ہو سکتے ہیں یا قرار پکڑنا۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ استوٰی کا صلہ علیٰ ہو تو اس کے معنی استیلا یا غالب ہونا ہوتے ہیں اور استوٰی علی العرش کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں استوٰی لہٗ ما فی السمٰوات و ما فی الارض ای اِسْتَقَامَ الْکُلّ عَلٰی مُرادہ بِتَسْوِیَۃِ اللہ تعالیٰ اِیَّاہُ یعنی جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس کے لیے حالت اعتدال میں ہو گیا یا اس کے ارادہ کے مطابق حالت استقامت میں ہو گیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اعتدال پر بنایا (غ)

العرش۔ راغب کہتے ہیں کہ عرش اصل میں مسقف چیز کو کہتے ہیں اور بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ یعنی تخت کو عرش اس کے علو کے لحاظ سے کہا جاتا ہے اور پھر لکھتے ہیں کہ اس سے مراد عزّ یعنی غلبہ اور سلطان اور مملکت بھی لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے ثُلَّ عرشہٗ جیسا کہ حضرت عمرؓ کی روایت میں ہے اور مراد اس سے لی جاتی ہے کہ اس کا غلبہ اور قدرت جاتی رہی۔ اور پھر لکھتے ہیں کہ اللہ کا عرش ایک ایسی چیز ہے جس کو فی الحقیقت کوئی بشر نہیں جانتا۔ اور جو عوام الناس کا وہم ہے وہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں عرش اللہ تعالیٰ کو اُٹھانے والا ہوتا۔ حالانکہ اللہ کی ذات اس سے پاک ہے۔ اور پھر لکھتے ہیں کہ بعض کے نزدیک ذو العرش وغیرہ میں عرش سے مراد اس کی مملکت اور غلبہ ہے نہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ۔ جس سے وہ پاک ہے۔

استوٰی علی العرش سے کیا مراد ہے۔ سو اوّل الفاظ کے استعمال سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔ وہی لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جو انسان کے لیے ہوتے ہیں مگر ان کی حقیقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خدا کے بھی ہاتھ ہیں، وہ سنتا ہے، دیکھتا ہے مگر اس کو انسانوں کے ہاتھوں پر ان کے سننے پر ان کے دیکھنے پر قیاس کرنا صریح غلطی ہے۔ اسی طرح اگر ایک عرش بادشاہ کا ہے اور ایک عرش خدا کا ہے تو ان دونوں سے ایک ہی معنی تخت مراد لینا صریح غلطی ہے۔ بادشاہ کی بادشاہت تخت سے وابستہ ہے مگر خدا کی بادشاہت ان باتوں سے پاک ہے۔ بادشاہ کے تخت پر بیٹھنے سے مراد صرف اس قدر ہوتی ہے کہ اس کی قدرت اور حکومت کا نفاذ ہو گیا۔ یہی مراد نہ تخت پر بیٹھنے کا ظاہری فعل خدا کے استوٰی علی العرش سے ہو سکتی ہے دیکھو ع [۲۷] جہاں دکھایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف الفاظ منسوب ہوں تو جو ان میں آلہ یا ذریعہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوتا بلکہ صرف فعل کی آخری غرض منسوب ہوتی ہے اور چونکہ انسان کے لیے استوٰی علی العرش سے مراد تخت پر بیٹھنے کے ذریعہ سے اس کی حکومت کا نفاذ پانا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کا استوٰی علی العرش صرف نفاذ حکومت و قدرت ہے۔

قرآن کریم کو دیکھیں تو خود اپنے مطلب کو واضح کر دیا ہے سورۂ یونس میں فرمایا ثم استوٰی علی العرش یدبر الامر جہاں استوٰی علی العرش کی تفسیر خود ہی یدبر الامر سے فرما دی یعنی تدبیر امور کرتا ہے۔ پھر خاص اس موقعہ پر پہلے زمین و آسمان کی پیدائش کا ذکر ہے پھر استوٰی علی العرش کا اور آیت کا خاتمہ ان الفاظ پر ہے لہ الخلق والامر پیدا کرنا بھی اسی کا کام ہے اور امر بھی اسی کا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ استوٰی علی العرش میں امر الٰہی کے نفاذ کا ذکر ہے اور خود طرز بیان بھی اسی کو چاہتی ہے۔ کیونکہ پیدا کرنا ایک کام ہے اور پیدائش میں نفاذ امر دوسرا کام۔ قدرت دونوں سے کامل ہوتی ہے پیدا بھی کرے اور اسی کا امر بھی اس میں نفاذ پائے۔ یہی معنی قفال نے کیے ہیں (ر)

کرسی اور عرش دونوں کے متعلق عوام میں ایک غلط فہمی ہے۔ اول الذکر کو بخاری نے رفع کر دیا ہے کیونکہ انہوں نے کرسی کے معنی علم کیے ہیں دیکھو ع [۳۲۹] ب۔

تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾

بابرکت ہے جو جہانوں کا رب ہے ۱۰۹۶

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾ ۚ

اپنے رب کو عاجزی سے اور چھپ کر پکارو، وہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا ۱۰۹۷

وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَ ادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

اور زمین کے اندر اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔ اور خوف کرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے اس کو پکارو، اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں سے قریب ہے ۱۰۹۸

وَ هُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری دیتے ہوئے بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادل کو اٹھا لاتی ہیں ہم اس کو ایک مردہ زمین کی طرف چلاتے ہیں پھر ہم اس سے پانی اتارتے ہیں۔ پھر اس سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں اسی طرح ہم مُردوں کو نکال کھڑا کریں گے تاکہ تم نصیحت قبول کرو ۱۰۹۹

اس سے بھی عرش کے معنی قدرت یا نفاذ امر کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر کرسی سے مراد علم ہے تو عوام کا خیال تو خود باطل ثابت ہوا۔ مشہور معنی کے لحاظ سے جس قدر روایات بیان کی جاتی ہیں ان کو بیہقی نے بیان کرکے سب کو ضعیف قرار دیا ہے دیکھو روح المعانی۔ اور اس پر ایک یہ بھی شہادت ہے کہ قرآن کریم میں یہ بار بار ذکر ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ تعالیٰ کا ہے اور کہ اللہ تعالیٰ وہ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے مگر یہ کہیں نہیں کہ جو کچھ کرسی اور عرش میں ہے وہ بھی اس کا ہے یا وہ اسے جانتا ہے حالانکہ اگر کرسی اور عرش دو ایسے فلک ہوتے تو ایسا ذکر ضرور ہونا چاہیئے تھا۔

۱۰۹۶ حثیثا۔ حَثٌّ کے معنی ہیں ملنے ہیں جلدی کرنا اور حثیث کے معنی ہیں جلدی کرنے والا (ل)

مسخرات۔ تَسْخِیْر کے معنی ہیں غالب ہو کر کسی خاص غرض کی طرف چلانا۔ پس مُسَخَّر وہ ہے جو اس طرح کام میں لگاتا ہے (غ) اور مُسَخَّر وہ جو اس طرح کام میں لگایا جائے اور سُخْرِیّ وہ ہے جس پر دوسرا غالب آجائے پھر وہ اپنے ارادہ سے مسخر ہو جائے لیتخذ بعضکم بعضًا سخریا (الزخرف ۴۳-۳۲) مگر یہ تسخیر سے بھی ہو سکتا ہے اور سُخْرِیَّة سے بھی یعنی تمسخر کرنے سے (غ)

تبارك۔ بَرَکَة کسی چیز میں الٰہی خیر کا قائم ہو جانا۔ اور تبارک میں یہ تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ان خیرات کے ساتھ مخصوص ہے جن کا ذکر تبارک کے ساتھ ہے۔ رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں یہ اشارہ ہے کہ اس ظلمت کے بعد جو دنیا میں پھیل رہی ہے اب نور ظہور پذیر ہوگا، اسی مناسبت سے سورج چاند اور ستاروں کا ذکر ہے۔

۱۰۹۷ اسلام پر مصائب کا زمانہ ہے۔ اس لیے دعا کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اب بھی مسلمان دعا کی طرف متوجہ ہوں تو مصائب سے نکلیں۔ لا یحب المعتدین میں بتایا کہ جو لوگ خدا کے حضور عاجزی سے دعا نہیں کرتے وہ دنیا میں ظلم اور زیادتی کرنے لگ جاتے ہیں مگر زیادتی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اس لیے تم ہمہ تن دعا کی طرف متوجہ ہو جاؤ تاکہ کامیاب ہو کر ظلم اور زیادتی سے بچو اور اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے تضرع کی دعا وہ ہے جس میں انسان خدا کے حضور گڑگڑاتا اور زور سے دعا کرتا ہے۔ خفیہ یا چھپ کر دعا کرنا بھی اچھا ہے مگر دعا میں تضرع سے ایک خاص کیفیت انسان کے قلب پر پیدا ہوتی ہے۔

۱۰۹۸ یہاں مخلوق خدا کے ساتھ نیکی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کیونکہ مخلوق خدا کے ساتھ نیکی بھی رحمت الٰہی کی جاذب ہے اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ وہ کامیاب ہوں تو پھر فساد نہ پھیلائیں۔

۱۰۹۹ اقلت۔ اس کا مادہ قِلَّة ہے۔ اور اَقْلَلْتُ کے معنی ہیں میں نے اسے تھوڑے بوجھ کا یا ہلکا پایا۔ اور یہ بعض وقت دوسری چیز کی قوت کی نسبت سے ہوتا ہے پس اَقَلَّت کے معنی ہیں ہواؤں نے اُسے اُٹھایا اور اپنی قوت کے لحاظ سے اسے قلیل پایا (غ) اس لفظ کے استعمال میں لطیف اشارہ ہے کہ ہواؤں میں کس قدر طاقت ہے جو لاکھوں اور کروڑوں من پانی کا بوجھ اُٹھائے پھرتی ہیں۔

قدرت کا ایک عام نظارہ بیان کرکے کہ ٹھنڈی ہوائیں کس طرح بارش کی خوشخبری لاتی ہیں اپنی روحانی بارش کی طرف توجہ دلائی کہ اس کے آگے آگے بھی ٹھنڈی ہوائیں چلی آرہی ہیں۔ یہ ٹھنڈی ہوائیں اسلام کی ہلکی ہلکی قبولیت کی خوشخبریاں ہیں پھر اس کے بعد وہ وقت بھی آتا ہے کہ یہ روحانی بارش ایک مُردہ زمین پر پڑ کر اسے زندہ کر دے۔ کذلك

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۭ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ۵۸ ع

اور اچھی زمین کا سبزہ اس کے رب کے حکم سے (خوب) نکلتا ہے اور جو خراب ہے (وہاں) نکلتا بھی ہے تو ناقص ـــ اسی طرح ہم ان لوگوں کے لیے جو شکر کرتے ہیں بار بار باتیں بیان کرتے ہیں ع۱۱۰۰

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۵۹

بیشک ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، سو اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمھارے لیے کوئی معبود نہیں میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ع۱۱۰۱

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۶۰

اس کی قوم کے سرداروں نے کہا، ہم یقیناً تجھ کو کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۶۱

اس نے کہا اے میری قوم مجھ میں کسی طرح کی گمراہی نہیں، لیکن میں جہانوں کے رب کا رسول ہوں ع۱۱۰۲

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۶۲

میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمھاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ سے کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ع۱۱۰۳

تخرج الموتی میں مضمون کو بالکل صاف کر دیا ہے اور اشارہ انہی مردوں کی طرف ہے جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا او من کان میتا فاحیینٰہ (الانعام[۶] - ۱۲۲)۔

ع۱۱۰۰ نکد ۔ نَکَدَ یا نَکِدٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے طالب کی طرف تنگی سے نکلتی ہے (رغ)

قبولیت حق میں اختلاف استعداد: اس میں بتایا ہے کہ جس طرح بظاہر میں دیکھتے ہو کہ سب زمینیں یکساں نہیں۔ بارش تو ایک ہی سب پر ہوتی ہے مگر بعض کی استعداد قبولیت اچھی ہوتی ہے اور ان میں روئید گی بھی اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ بعض زمین ناقص ہوتی ہے اس لیے روئید گی اس میں نکلے بھی تو نہایت قلیل اور مردہ سی کہ ترقی نہیں کرتی ۔ اسی طرح طبائع انسانی کی استعداد میں اختلاف ہے۔ اپنی اپنی استعداد کے مطابق خدا تعالیٰ کی اس روحانی بارش سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ سب پر یکساں توقع غلط ہے۔

ع۱۱۰۱ نوح ۔ نبی کا نام ہے اور نَوْح کے معنی نوحہ کرنا ہیں (رغ)

انبیاء کے ذکر کی غرض: وحی الٰہی کے جھٹلانے کے بُرے نتائج سے قریش اور دشمنان اسلام کو آگاہ کر کے اب کچھ مثالیں پہلی تاریخ سے پیش کی ہیں کہ کس طرح جن لوگوں نے پہلے پیغمبروں کے ساتھ عداوت کر کے ان کو تباہ کرنا چاہا ان کا انجام خطرناک ہُوا۔ پیغمبروں کا ذکر جو قرآن کریم میں آتا ہے اس کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قصّوں کے رنگ میں نہیں اور اسی لیے ساری تفصیلات کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ صرف ان امور کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے ذریعہ سے اعدائے اسلام کو متنبہ کرنا مقصود ہو۔ مثلاً تعلیم میں سے عموماً یہ موٹا اصول لے لیا ہے جو سب انبیاء کی تعلیم میں مشترک ہے کہ خدا ایک ہے اسی کی عبادت کرو تقویٰ اختیار کرو۔ خلق خدا کے ساتھ نیکی کرو۔ لوگوں نے کیا سلوک کیا، اس کی تفصیلات کو عموماً چھوڑ دیا ہے امر مشترک کہ نبی کو جھوٹا کہا اس کے تباہ کرنے کی کوشش کی اس کی مخالفت پر کھڑے ہو گئے اس کو بیان کر دیا ہے ۔ اور پھر آخر بتا دیا ہے اعدا ہلاک ہو گئے اور تعلیم حق پھیل گئی۔ عموماً یہ ذکر مکّی سورتوں میں زیادہ پایا جاتا ہے ۔ جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا کسی کو وہم بھی نہ ہو سکتا تھا اور جہاں اعدا کی طاقت کے نیست و نابود ہونے کا کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا پس ان انبیاء کا ذکر درحقیقت ایک پیشگوئی کے طور پر ہے کہ جس طرح پہلوں کے اعدا تباہ ہو گئے اسی طرح محمد رسول اللہ صلعم کے دشمن بھی تباہ ہو جائیں گے۔

یہاں جن انبیاء کا ذکر کیا ہے وہ تاریخی ترتیب سے ہے اور چند نہایت مشہور انبیاء کا ذکر کر دیا ہے۔ آدم کا ذکر تو پہلے ضرورت وحی میں ہی آ چکا۔ اب سب سے پہلے نوحؑ کا ذکر کیا ہے ۔ گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ عرب کے اردگرد جس قدر نبی ہوئے ان میں سے تاریخی طور پر جن انبیاء کا ذکر باقی رہ گیا ہے ان میں حضرت نوحؑ ہی سب سے پہلے نبی تھے ۔ اس لیے ان کے ذکر سے ابتدا کی ۔ حضرت نوحؑ کا ذکر علاوہ اس موقعہ کے ذیل کے مقامات پر آتا ہے :۔

آل عمران[۳] - ۳۲ ؛ الانعام[۶] - ۸۵ ؛ یونس[۱۰] ۷۱ تا ۷۳ ؛ ہود[۱۱] - ۲۵ تا ۴۸ - ابراہیم[۱۴] - ۹ ؛ بنی اسرائیل[۱۷] - ۳ ؛ الانبیاء[۲۱] - ۷۶ - ۷۷ ؛ المؤمنون[۲۳] - ۲۳ تا ۲۹ ؛ الفرقان[۲۵] - ۳۷ ؛ الشعراء[۲۶] ۱۰۵ تا ۱۲۲ ؛ العنکبوت[۲۹] - ۱۴ - ۱۵ ؛ الصّٰفّٰت[۳۷] - ۷۵ تا ۸۲ ؛ الذاریات[۵۱] ۴۶ ؛ النجم[۵۳] - ۵۲ ؛ القمر[۵۴] - ۹ تا ۱۶ ؛ التحریم[۶۶] ۱۰ ؛ الحاقۃ[۶۹] - ۱۱ - ۱۲ ؛ نوحؑ ،،

ع۱۱۰۲ بتایا کہ رسول میں ضلالت نہیں ہو سکتی عصمت انبیاء پر قرآن کریم کی یہ شہادت بھی کافی ہے۔

ع۱۱۰۳ نصحت ۔ نُصْح ایسے فعل یا قول کا قصد ہے جس میں دوسرے کی صلاحیت یا بھلائی ہو اور اسی سے ناصح ہے اور نَصَحَ کے اصل معنی ہیں خالص کیا اسی سے ہے۔ توبۃ نصوحا (التحریم[۶۶] - ۸) یعنی خالص توبہ۔

أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٦٣﴾

اور کیا تم تعجب کرتے ہو کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے تم ہی میں سے ایک شخص کے ذریعہ سے نصیحت آئی تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور تاکہ تم تقوٰے کرو اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَأَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِى الْفُلْكِ وَأَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ
ع ١٥ ٨ إِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿٦٤﴾

پر انھوں نے اس کو جھٹلایا سو ہم نے اسے اور انھیں جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے بچالیا اور انھیں غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ اندھی قوم تھی ع۱۱۰۴

وَإِلٰى عَادٍ أَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ أَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٦٥﴾

اور عاد کی طرف اُن کے بھائی ہُود کو (بھیجا) اس نے کہا اے میری قوم ع۱۱۰۵ اللہ کی عبادت کرو تمھارے لیے سوائے اس کے کوئی معبود نہیں پس کیا تم تقوٰی اختیار نہ کرو گے

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ إِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦٦﴾

اس کی قوم کے سرداروں نے جو کافر تھے، کہا ہم تجھے بے وقوف دیکھتے ہیں اور ہم تجھے جھوٹوں میں سے سمجھتے ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٧﴾

اس نے کہا اے میری قوم مجھ میں بے وقوفی کوئی نہیں لیکن جہانوں کے رب کا رسول ہوں۔

أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِيْنٌ ﴿٦٨﴾

مَیں تمھیں اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمھارا امانت دار خیر خواہ ہوں ع۱۱۰۶

أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

اور کیا تم تعجب کرتے ہو کہ تمھارے پاس تمھارے رب

ع۱۱۰۴ طوفان نوحؑ: طوفان کے متعلق مفصل ذکر آگے آئے گا۔ لیکن کلام پاک کے یہ الفاظ واغرقنا الذین کذبوا بآیٰتنا صاف بتاتے ہیں کہ صرف وہی لوگ غرق ہوئے جن کی طرف حضرت نوحؑ پیغام لائے اور جنہوں نے آپ کو جھوٹا کہا اور آپ کی مخالفت کی اور حضرت نوحؑ کا پیغام صرف اپنی قوم کی طرف تھا جیسا کہ آیت ۵۹ سے ظاہر ہے نہ کل عالم کی طرف اس سے سارے عالم پر محیط ہونے والے طوفان کا خیال غلط ٹھہرتا ہے۔

ع۱۱۰۵ نوح کی قوم کے بعد بلحاظ ترتیب زمانی عاد کا ذکر کیا ہے یہ ایک بڑی زبردست قوم تھی جو عرب کے جنوب میں الاحقاف میں آباد تھی اور جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے ان کا عروج اس قدر ہوگیا تھا کہ یہاں سے نکل کر انہوں نے بہت سے ملکوں پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ خود عاد جس کے نام پر اس قوم کا نام ہوا ارم کا پوتا تھا۔ جو نوح کا پوتا تھا اور اس قوم کو بعض وقت عاد اولٰی بھی کہا جاتا ہے اور ثمود کو جو اس قوم کی ایک شاخ تھی عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔ اس قوم کے تاریخی نشانات اور کتبے بھی ملے ہیں۔ انہوں نے اپنے چار دیوتا قرار دیئے ہوئے تھے۔ ساقیہ۔ حافظہ۔ رازقہ۔ سالمہ یعنی بارش کا دیوتا۔ دشمنوں سے بچانے والا دیوتا۔ رزق کا دیوتا۔ صحت کا دیوتا۔ حضرت ہُودؑ کو جو ان کی طرف مبعوث ہوئے ان کا بھائی اسی قوم میں سے ہونے کی وجہ سے کہا ہے۔

عاد کا ذکر علاوہ اس واقعہ کے ذیل کے مقامات پر ہے:۔

ہود[11]۔ ۵۰ سے ۶۰؛ ابراہیم[14]۔ ۹؛ الفرقان[25]۔ ۳۸؛ الشعراء[26]۔ ۱۲۳ سے ۱۴۰؛ العنکبوت[29]۔ ۳۸؛ حٰم[41]۔ ۱۳ سے ۱۶؛ الاحقاف[46]۔ ۲۱ سے ۲۶؛ الذاریات[51]۔ ۴۱۔ ۴۲؛ النجم[53]۔ ۵۰؛ القمر[54]۔ ۱۸ سے ۲۱؛ الحاقہ[69]۔ ۴ و ۶ تا ۸؛ الفجر[89]۔ ۶ تا ۸۔

ع۱۱۰۶ امین۔ امن طمانینت نفس کا نام ہے اور امین وہ ہے جس کے متعلق ایسی طمانینت نفس حاصل ہو (غ) پس امین وہ ہے جو ایسی ہر طرح کی خوبیوں سے متصف ہو کہ اس کے متعلق سب کو طمانینت نفس حاصل ہو اور چونکہ امانۃ کا لفظ بھی ان تمام فرائض پر بولا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذمہ رکھے ہیں (ل) اس لیے امین وہ ہے جو تمام فرائض انسانی کو ادا کرنے والا ہو۔ ایک رسول کو امین یعنی ہر طرح سے راستباز قرار دے کر تمام رسولوں کی عصمت کے اصول کو بیان کر دیا۔ ورنہ یہ مطلب نہیں کہ حضرت ہُودؑ تو امین تھے اور حضرت عیسٰی امین نہ تھے اس لیے کہ ان کے متعلق یہ لفظ قرآن شریف میں نہیں آیا۔

عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۭ وَاذْكُرُوْٓا
اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ
وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا
اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۶۹

کی طرف سے تم میں سے ہی ایک شخص کے ذریعہ سے نصیحت آئی تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور یاد کرو جب اس نے تم کو نوح کی قوم کے بعد بادشاہ بنایا اور تم کو پیدائش میں قوت میں بڑھایا سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو ع۱۱۰۷

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا
كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ
كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷۰

انھوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ کی عبادت کریں اور اس کو چھوڑ دیں جس کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ تو ہم پر لے آ جو تو ہمیں وعدہ دیتا ہے اگر تو سچوں میں سے ہے۔

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ
وَّغَضَبٌ ۭ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَاۗءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ
اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ
فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝۷۱

اس نے کہا یقیناً تمھارے رب کی طرف سے تم پر پلیدی اور ناراضگی آ چکی۔ کیا تم میرے ساتھ (ان) ناموں پر جھگڑتے ہو، جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری سو انتظار کرو میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ع۱۱۰۸

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا
وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا
وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۷۲ ع ۹ ۱۲

سو ہم نے اس کو اور ان کو جو اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے بچا لیا۔ اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور وہ مومن نہ تھے۔

وَاِلٰي ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ
اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ قَدْ
جَاۗءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ هٰذِهٖ نَاقَةُ
اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ
اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۷۳

اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا ع۱۱۰۹ اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمھارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے کھلی دلیل آ چکی۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمھارے لیے نشان ہے سو اس کو چھوڑ دو، اللہ کی زمین میں چرے اور اس کو کوئی دکھ نہ پہنچاؤ ورنہ تمھیں دردناک عذاب پکڑ لے گا ع۱۱۱۰

ع۱۱۰۷ بصطة - بَسْط سے ہے جس کے معنی فراخی ہیں (رغ) وزادہ بسطة فی العلم والجسم (البقرۃ ۲ - ۲۴۷) اور بسطة یا بصطة سے مراد قوت اور زیادتی جسم ہے۔
الخلق سے مراد ابداع یعنی پیدائش یا بناوٹ بھی ہو سکتی ہے اور مخلوق بھی۔
قوم عاد قوت میں اور غالباً قوت جسمانی میں بھی اپنے ہمعصروں پر فوقیت لے گئی تھی اور بڑے حصّہ دنیا کو اپنی قوت سے اپنے تصرف میں کر لیا تھا۔

ع۱۱۰۸ اسماء کے لفظ میں ان دیوتاؤں کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اپنے لیے مقرر کر رکھے تھے دیکھو ع۱۱۰۵ ان کو محض نام کہا ہے جن کے نیچے حقیقت کوئی نہیں۔

ع۱۱۰۹ قوم ثمود جو ارم کے ایک دوسرے پوتے کے نام پر مشہور ہوئی قوم عاد سے قریبی تعلق رکھتی ہے مگر عاد کے دو سو سال بعد اس کا عروج ہوا۔ یہ قوم مدینہ کے شمال میں الحجر کے علاقہ میں آباد تھی جو پہاڑی علاقہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ثمود ان کا نام ثَمَد سے ہے جس کے معنی قلیل پانی ہیں جس کا مادہ کوئی نہ ہو (رغ) یہ پہاڑی علاقہ تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ بارش کا پانی اکٹھا کر کے گزارہ کرتے تھے اور چشموں کی بہت قلت تھی۔ اس قوم کا ذکر علاوہ اس موقعہ کے ذیل کے مقامات پر ہوا ہے:۔
ہود ۱۱ - ۶۱ تا ۶۸؛ ابراہیم ۱۴ - ۹؛ الحجر ۱۵ - ۸۰ تا ۸۴؛ الفرقان ۲۵ - ۳۸؛ الشعراء ۲۶ - ۱۴۱ تا ۱۵۹؛ النمل ۲۷ - ۴۵ تا ۵۳؛ العنکبوت ۲۹ - ۳۸؛ حٰم ۴۱ - ۱۳ و ۱۷ و ۱۸؛ الذاریات ۵۱ - ۴۳ تا ۴۵؛ النجم ۵۳ - ۵۱؛ القمر ۵۴ - ۲۳ تا ۳۱؛ الحاقۃ ۶۹ - ۴ و ۵؛ الفجر ۸۹ - ۹؛ الشمس ۹۱ - ۱۱ تا ۱۵۔

ع۱۱۱۰ ناقة الله - یہ اضافت محض تعظیم کے لیے ہے جیسے بیت اللہ میں۔ اور ادنیٰ ملابست کی اضافت ہے۔ کیونکہ اللہ کی طرف سے وہ اونٹنی بطور نشان قرار

وَاذْكُرُوٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِى الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٧٤﴾

اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد جانشین بنایا اور تمھیں زمین میں ٹھکانا دیا، تم اس کے میدانوں میں محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر کوٹھیاں بناتے ہو۔ سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد مچاتے مت پھرو ع۱۱۱۱

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿٧٥﴾

سرداروں نے جنھوں نے اس کی قوم میں سے تکبر کیا، ان سے جو کمزور تھے جو ان میں سے ایمان لائے کہا کیا تم جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے، بولے جو کچھ اسے دیکر بھیجا گیا ہے اس پر ایمان لانے والے ہیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِىْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿٧٦﴾

جو متکبر تھے بولے، جس پر تم ایمان لائے ہم اس کا انکار کرنے والے ہیں۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٧٧﴾

پس انھوں نے اونٹنی کو مار ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہا اے صالحؑ لے آ جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے، اگر تو پیغمبروں میں سے ہے ع۱۱۱۲

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِىْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٧٨﴾

سو اُن کو زلزلہ نے آ پکڑا، تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے ع۱۱۱۳

دی گئی کہ جو کوئی اس کو مارے گا وہ خود تباہ کر دیا جائے گا جس طرح بیت اللہ کو ایک نشان قرار دیا گیا کہ جو کوئی اس کو برباد کرنا چاہے وہ خود برباد کر دیا جائے گا۔ باقی باتیں کہ یہ اونٹنی پتھر سے پیدا ہوئی تھی اور تنہا ساری قوم کا پانی پی جاتی تھی محض قصے ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ اونٹنی کا نشان تکذیب کے بعد دیا گیا اور وہ عذاب کے آنے کے لیے محض ایک نشان کے طور پر تھا جیسا کہ جاء تکم بیّنة من ربکم سے ظاہر ہے یعنی حق کی دلائل تو آ چکیں مگر چونکہ ان دلائل کی پروا نہیں کی اس لیے اب عذاب آتا ہے۔ یہ ذکر زیادہ تفصیل سے سورۂ ہود میں اور سورۂ شعراء میں موجود ہے اور موخر الذکر سورت میں لمبی بحث کے بعد وہ خود نشان مانگتے ہیں فات باٰیة ان کنت من الصٰدقین (الشعراء[26]۔ ۱۵۴) اور اس اونٹنی کے مارنے میں بھی درحقیقت ایک تمہید معلوم ہوتی ہے۔ کہ اس کے بعد وہ خود حضرت صالحؑ کو مارنا چاہتے تھے۔ چنانچہ حضرت صالحؑ کے خلاف ان کی اس سازش کا ذکر سورۂ النمل[27]۔ ۴۸ و ۴۹ میں موجود ہے کہ آپ کے اور آپ کے سب ساتھیوں کو قتل کرنے کا منصوبہ وہ کر چکے تھے لنبیّتنّهٗ واهلهٗ پس اس اونٹنی کا مار دینا آخری نشان تھا کہ اب وہ حضرت صالحؑ کو قتل کر دیں گے۔ اور حضرت صالحؑ کا یہ فرمانا کہ اسے چھوڑ دو اللہ کی زمین میں چرے یا یہ کہ اس کو بھی پانی پینے دو یہ بتانے کو تھا کہ اگر تمہیں عداوت ہے تو مجھ سے ہے ایک بے زبان جانور کو دکھ نہ پہنچاؤ۔

ع۱۱۱۱ سہول۔ سَہْل کی جمع ہے۔ سہولت یا آسانی اور سَہْل صاف اور ہموار زمین کو کہتے ہیں جو حَزْن کی ضد ہے یعنی اونچی نیچی زمین۔ (غ)

اٰلاء۔ مادہ الیٰ ہے اور اس کے معنی نعمتیں ہیں واحد اَلیٰ یا اِلٰیٌ ہے (غ)

تنحتون۔ نحت لکڑی یا پتھر اور سخت اجسام کے تراشنے پر بولا جاتا ہے۔

ع۱۱۱۲ عقروا۔ عَقْر کسی چیز کا اصل ہے اور عَقَرْتہٗ کے معنی ہیں اس کے اصل یا سر کو کاٹ دیا۔ اور کھجور کا عقر اس کا کاٹ دینا اور اونٹ کا عقر اس کا ذبح کرنا یا مار دینا ہے (غ)

ع۱۱۱۳ الرجفة۔ رجف اضطراب شدید کو کہتے ہیں یوم ترجف الارض والجبال (المزمل[73]۔ ۱۴) ترجف الراجفة (النزعٰت[79]۔ ۶) اور ارجاف کے معنی ہیں اضطراب شدید میں ڈال دینا قول سے ہو یا فعل سے والمرجفون فی المدینة (الاحزاب[33]۔ ۶۰) اور رجفة زلزلہ ہے۔

فَتَوَلّٰى عَنۡهُمۡ وَقَالَ يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسَالَةَ رَبِّىۡ وَنَصَحۡتُ لَكُمۡ وَلٰكِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِيۡنَ ﴿٧٩﴾

پس اس نے اُن سے منہ پھیرا اور کہا اے میری قوم یقیناً میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمھارا بھلا چاہا، لیکن تم خیر خواہوں کو دوست نہیں رکھتے ١١١٤ؑ

وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمۡ بِهَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿٨٠﴾

اور لوطؑ کو (بھیجا) جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسی بیحیائی کرتے ہو جو تم سے پہلی قوموں میں سے کسی نے نہیں کی ١١١٥ؑ

اِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَهۡوَةً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ‌ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ ﴿٨١﴾

تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے آتے ہو، بلکہ تم حد سے نکل جانے والے لوگ ہو۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ‌ۚ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ ﴿٨٢﴾

اور اس کی قوم کا جواب کچھ نہ تھا مگر یہ کہ انھوں نے کہا ان کو اپنی بستی سے نکال دو یہ وہ لوگ ہیں جو پاک بنتے ہیں ١١١٦ؑ

فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۖ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ﴿٨٣﴾

سو ہم نے اُسے اور اس کے اہل کو بچا لیا، مگر اس کی عورت وہ پیچھے رہنے والوں میں سے تھی ١١١٧ؑ

جٰثمین۔ جَثم پرند کے متعلق کہا جاتا ہے جب وہ زمین پر بیٹھ جائے اور اس سے لگ جائے۔ پس جٰثمین سے مراد ہے جہاں تھے وہیں رہ گئے (غ) جیسا زلزلہ میں دبکر لوگ رہ جاتے ہیں یہاں الرجفۃ کا لفظ استعمال کرکے صاف بتا دیا کہ ثمود کی قوم کا عذاب بھونچال تھا صیحۃ صاعقۃ وغیرہ نام سب زلزلہ پر صادق آتے ہیں۔ کیونکہ سخت زلزلہ کے ساتھ خطرناک آواز بھی ہوتی ہے۔

١١١٤ؑ چونکہ اعدائے حق کی عادت ہمیشہ یہی چلی آئی ہے اور اس وقت بھی مخالفین حق کی یہی حالت تھی جیسے آج بھی ہے اس لیے استمرار کو ظاہر کرنے کے لیے مضارع استعمال کیا۔

١١١٥ؑ ترتیب زمانی کے لحاظ سے ثمود کے بعد ابراہیم کا ذکر چاہیئے تھا مگر اس ذکر کو بالکل چھوڑ کر لوط کا ذکر شروع کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کا ذکر پہلے الگ سورۃ الانعام میں کر دیا گیا ہے اور یہ علیحدہ ذکر بھی بلا وجہ نہیں جس قدر انبیاء کا یہاں ذکر کیا ہے وہ اس غرض کے لیے ہے کہ بتایا جائے کہ ان کے اعدا ہلاک ہو گئے اس لیے حضرت ابراہیم کو جن کی قوم پر ایسے عذاب کے آنے کا کوئی ذکر نہیں ان انبیاء سے الگ کر دیا۔ اور آنحضرت صلعم کے اعدا کے ساتھ سلوک حضرت ابراہیم کے اعدا والا ہوا یعنی ان کو تباہ نہیں کیا گیا مگر ان کی قوت توڑ کر ان کا استیصال کر کے ایک رنگ میں دوسرے انبیاء کے اعدا کے ساتھ ان کو شامل کر دیا۔

حضرت لوطؑ اور بائبل میں تحریف: حضرت لوط حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے مگر علیحدہ قوم کی طرف مبعوث ہوئے یعنی سدومیوں کی طرف بائبل میں جو ذکر لوط کا ہے اس میں حضرت لوط کو بدترین افعال شنیعہ کا مرتکب بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ نعوذ باللہ من ذٰلک اپنی بیٹیوں سے ناجائز تعلق کے مرتکب ہوئے۔ مگر جس طرح کئی ایک انبیاء کے متعلق بائبل میں تحریف ہو کر غلط باتیں راہ پا گئیں اسی قسم کی یہ ایک غلطی ہے جو بائبل کی تحریف کو ثابت کرتی ہے۔ چنانچہ خود سیل نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ لوطؑ انبیاء میں سے تھے اور عیسائی اس بارہ میں مجبور ہیں گو بائبل کو تحریف کے الزام سے بچانے کے لیے انکار بھی کر دیں کیونکہ پطرس کی شہادت ٢ پطرس ٢: ٧و٨ میں یوں مرقوم ہے " اور راستباز لوط کو جو شریروں کی ناپاک چالوں سے دق ہوا رہائی بخشی کہ وہ راستباز ان میں رہ کر ان کے بے شرع عملوں کو دیکھ سن کے ہر روز اپنے سچے دل کو شکنجے میں کھینچتا تھا" بھلا جو شخص ایسے گندے فعل کا ارتکاب کرے یعنی بیٹیوں سے ناجائز تعلق رکھے وہ راستباز کہلا سکتا ہے، اور اس کا دل دوسروں کے اسی قسم کے گندے فعل سے کیوں دکھے گا۔ پس بائبل کو خود بائبل غلط ٹھہراتی ہے اور صحیح فیصلہ قرآن کا ہے کہ لوطؑ انبیاء میں سے تھے۔

لوط کا ذکر علاوہ اس مقام کے ذیل کے مقامات پر آیا ہے الانعام[٦] - ٨٧؛ ہود[١١] - ٧٧ تا ٨٣؛ الحجر[١٥] - ٦١ تا ٧٤؛ الانبیاء[٢١] - ٧٤و٧٥؛ الشعراء[٢٦] - ١٦٠ تا ١٧٤؛ النمل[٢٧] ٥٤ تا ٥٨؛ العنکبوت[٢٩] - ٣٢ تا ٣٥؛ الصّٰفّٰت[٣٧] - ١٣٣ تا ١٣٦؛ الذاریات[٥١] - ٣٢ تا ٣٧؛ النجم[٥٣] - ٥٣ و ٥٤؛ القمر[٥٤] - ٣٣ تا ٣٨؛ التحریم[٦٦] - ١٠۔

١١١٦ؑ حضرت لوطؑ باہر سے آکر ان کی بستی میں آباد ہوئے تھے۔ یہ محض ان کی اصلاح کے لیے تھا اور حکم خداوندی کے ماتحت آئے تھے۔

١١١٧ؑ اھل۔ ایک شخص کے اہل میں وہ سب لوگ داخل ہیں جن کو ایک گھر یا ایک نسب یا ایک شہر یا ایک دین جمع کرے (غ) یہاں اھلہ سے مراد حضرت لوطؑ کے متبع ہی ہیں (ج) اور بلاشبہ انبیاء کے ساتھ ان کے متبع ہی بچائے جاتے ہیں اور اوپر اناس یتطھرون میں حضرت لوطؑ کے پیروؤں کا ہی ذکر تھا۔

وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا‌ ؕ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ۝٨٤ ع

اور ہم نے اُن پر ایک مینہ برسایا۔ پس دیکھ مجرموں
کا انجام کیسا ہوا [1118]

وَاِلٰى مَدۡيَنَ اَخَاهُمۡ شُعَيۡبًا‌ ؕ قَالَ يٰقَوۡمِ
اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ‌ ؕ
قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ بَيِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ
فَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَالۡمِيۡزَانَ وَلَا تَبۡخَسُوا
النَّاسَ اَشۡيَآءَهُمۡ وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ
بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ
كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ‌ ۝٨٥ ج

اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو (بھیجا) — اس نے کہا
اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمھارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں
یقیناً تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس کھلی دلیل آچکی [1119] — سو ماپ
اور تول کو پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔
اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد
نہ کرو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے
اگر تم مان لو [1120]

وَلَا تَقۡعُدُوۡا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوۡعِدُوۡنَ
وَتَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ
بِهٖ وَتَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا‌ ۚ وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ كُنۡتُمۡ
قَلِيۡلًا فَكَثَّرَكُمۡ‌ ص وَانْظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الۡمُفۡسِدِيۡنَ‏ ۝٨٦

اور ہر ایک رستہ پر مت بیٹھو تم ڈراتے ہو، اور
اللہ کی راہ سے اُسے روکتے ہو جو اس پر ایمان لاتا
ہے اور اس میں ٹیڑھا پن چاہتے ہو۔ اور یاد کرو جب تم
تھوڑے تھے پھر تم کو بہت کر دیا اور دیکھ لو کہ فساد کرنے
والوں کا انجام کیسا ہوا [1121]

وَاِنۡ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنۡكُمۡ اٰمَنُوۡا بِالَّذِىۡۤ
اُرۡسِلۡتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمۡ يُؤۡمِنُوۡا فَاصۡبِرُوۡا
حَتّٰى يَحۡكُمَ اللّٰهُ بَيۡنَنَا‌ ۚ وَهُوَ خَيۡرُ الۡحٰكِمِيۡنَ‏ ۝٨٧

اور اگر تم میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو اس پر ایمان لایا ہے
جو مجھے دیکر بھیجا گیا ہے اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا تو صبر کرو یہاں تک
کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کردے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

غابرین۔ غابر اس کو کہا جاتا ہے جو اپنے ساتھیوں کے چلا جانے کے بعد باقی رہ جائے اور غُبار وہ ہے جو مٹی اڑانے پر باقی رہ جاتا ہے اسی سے غَبَرَۃٌ ہے علیھا غَبَرَۃٌ (عبس ۸۰۔ ۴۱) اور یہ کنایہ ہے غم کی وجہ سے چہرہ پر تغیر آجانے سے (غ)

ع [1118] مَطَر مطلق بارش کو کہتے ہیں۔ لیکن مَطَرَ بھلائی میں اور اَمطَرَ عذاب میں استعمال ہوتا ہے (غ)

یہ بارش کیا تھی اس کا ذکر دوسری جگہ آتا ہے کہ پتھروں کی بارش تھی (ہود ۱۱۔ ۸۲۔ الحجر ۱۵۔ ۷۴) جس سے معلوم ہوا کہ آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا تھا۔

ع [1119] شعیبؑ حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں سے پانچویں پشت میں ہیں اس لیے ان کا ذکر تاریخی ترتیب میں حضرت لوط کے بعد آیا ہے۔ بائبل میں ہے کہ مدیان ابراہیمؑ کے ایک بیٹے کا نام تھا جو ان کی تیسری بی بی قتورہ کے بطن سے پیدا ہوا۔ اسی نام کا ایک شہر بحیرہ احمر پر ہے جہاں مدیان کی نسل آباد ہوئی۔ شعیبؑ کا ذکر ذیل کے مقامات پر بھی آیا ہے:۔ ہود ۱۱۔ ۸۴ تا ۹۵؛ الحجر ۱۵۔ ۷۸ و ۷۹؛ الشعراء ۲۶۔ ۱۷۶ تا ۱۹۱؛ العنکبوت ۲۹۔ ۳۶ و ۳۷۔

ع [1120] کیل۔ کَیل (ماضی کَالَ) کے معنی غلّہ کا ماپ کردینا اور اِکتَال علیہ دوسرے سے ماپ کر لینا اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم (التطفیف ۸۳۔ ۲،۳) اور یہ گو ماپ میں خاص ہے مگر مراد تمام معاملات میں جہاں لینا یا دینا ہو انصاف کا مدنظر رکھنا ہے اور کیل بعیر (یوسف ۱۲۔ ۶۵) سے مراد مقدار حمل بعیر ہے یعنی اونٹ کے بوجھ کی مقدار فارسل معنا اخانا نکتل (یوسف ۱۲۔ ۶۳) (غ)

میزان۔ دیکھو ع [1050] اور وزن کرنا یا وزن یا میزان کا قائم کرنا عام ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ تمام اقوال و افعال میں جنہیں انسان مدنظر رکھتا ہے عدل کی رعایت ملحوظ رکھے (غ)

تبخسوا۔ بَخس تھوڑی ناقص چیز کو کہتے ہیں وشروہ بثمن بخس (یوسف ۱۲۔ ۲۰) اور ظلم کے طریق پر کسی چیز کے کم کرنے کو کہا جاتا ہے (غ)

ع [1121] رستوں میں بیٹھنا حقیقی معنی میں بھی ہوسکتا ہے یعنی ڈاکہ مارنے کے معنی میں، جیسے قطع طریق آتا ہے اور مجازی معنی میں بھی۔ یعنی مراد اس سے صرف لوگوں کا

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ
لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ
مِنْ قَرْيَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ
اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۟ۚ ﴿۸۸﴾

سرداروں نے جنھوں نے اس کی قوم میں سے تکبّر کیا کہا ، اے شعیبؑ ہم تجھ کو اور ان کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ضرور اپنی بستی سے نکال دینگے یا تمھیں ہمارے مذہب میں لوٹ آنا ہوگا - کہا ، کیا اس حال میں بھی کہ ہم بیزار ہوں ؏۱۱۲۲

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ
مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا
يَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ
رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ
تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا
بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾

یقیناً ہم نے اللہ پر جھوٹ باندھا ، اگر ہم تمھارے مذہب میں لوٹ آئیں اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی اور ہمیں شایاں نہیں کہ ہم اس میں لوٹ آئیں مگر جو اللہ ہمارا رب چاہے ؏۱۱۲۳ ہمارے رب کا علم تمام چیزوں پر حاوی ہے - ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا - اے ہمارے رب ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ؏۱۱۲۴

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ
اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾

اور اس کی قوم کے سرداروں نے جو کافر تھے کہا اگر تم نے شعیبؑ کی پیروی کی ، تو تم یقیناً نقصان اٹھانے والے ہوگے -

---

ہو اور کل صراط سے مراد ہر ایک حق کا رستہ ہے - نبی کریم صلعم کے اعدا بھی ایسا ہی کرتے تھے اور انہی کی طرف اشارہ کرنے کو اس کا ذکر کیا -

؏۱۱۲۲ لتعودن - عود کے اصل معنی ہیں ایک چیز سے انصراف یعنی پھر جانے کے بعد اس کی طرف رجوع کرنا - خواہ اپنی ذات سے ہو یا محض قول سے یا عزیمت سے (غ) بعض اہل لغت نے عاد بمعنی صار بھی لیا ہے - انبیاء علیہم السّلام کبھی حالت ضلالت میں نہیں ہوتے چہ جائیکہ ان کی طرف کفر منسوب کیا جا سکے عود کا لفظ محض اس لیے استعمال کیا کہ قوم کی حالت عام طور پر کفر کی تھی - یا وہ ایک قومی مذہب تھا - یہی وجہ ہے کہ یہاں کفار ملّتنا کہتے ہیں یعنی اس مذہب کو اپنا مذہب قرار دیتے ہیں اور حضرت شعیبؑ جواب میں ملتکم کہتے ہیں یعنی تمہارا مذہب اور اس لیے بھی عود کا استعمال جائز ہے کہ یہاں اکیلے حضرت شعیب کا ذکر نہیں بلکہ والذین اٰمنوا کا ذکر بھی ساتھ ہے اور یہ لوگ بلاشبہ حالتِ کفر سے نکل کر حالتِ اسلام کی طرف آئے تھے - قرآن کریم کی اس دلیل پر کہ جب ہم ایک عقیدہ سے دل سے بیزار ہیں ، تو اس کی طرف کیونکر آ سکتے ہیں - وہ لوگ غور کریں جو ایسے مہدی کا آنا مانتے ہیں جو تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان کر لیگا - خواہ دل سے وہ ان عقاید کو ناپسند ہی کرتے ہوں -

؏۱۱۲۳ الّا ان یشاء اللہ ربنا - ایک طرف تو یہ زور سے کہا ہے کہ ہم کہاں کفر کی حالت میں جا سکتے ہیں - دوسری طرف استثنا بھی کیا ہے کہ اگر اللہ چاہے تو جس طرح وہ چاہے ہو - اس میں شک نہیں کہ ہر کہ عارف تر است ترساں تر - اور انبیاء کا ایمان بھی بین الخوف والرجاء ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی بشر ہیں لیکن اصل بات جس کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ حضرت شعیبؑ کو اور آپ کے ساتھیوں کو باکراہ کفر کی طرف لوٹانا چاہتے ہیں - اور مومن سب یکساں نہیں ہوتے بعض حالت اجبار واکراہ میں نبی کا ساتھ نہیں دے سکتے اس لیے فرمایا کہ اگر اللہ کو منظور ہے کہ کوئی ان مومنوں میں سے پھر جائے تو جیسا وہ چاہے ورنہ ہم اپنے اختیار سے تو کبھی پھر نہیں سکتے - اس اکراہ و اجبار کے ذکر میں بھی مسلمانوں پر جو جبر کیا جاتا تھا اس کی طرف اشارہ ہے اور یہ بھی دوسرے کے ذکر میں بتا دیا کہ مسلمان ہو کر پھر کوئی شخص کفر کی طرف نہیں لوٹ سکتا اور مسلمانوں کے متعلق تاریخی شہادت موجود ہے کہ سوائے ان لوگوں کے جو پہلے منافقت کے طور پر اور اسلام کی دشمنی کو مدّنظر رکھتے ہوئے اسلام میں داخل ہوئے مسلمانوں میں سے کوئی لوگ مرتد نہیں ہوئے -

؏۱۱۲۴ افتح - فاتح - فتح کے اصل معنی زنجیروں اور بیڑیوں کا دور کرنا ہیں پھر یہ یا مادی طور پر ہو سکتا ہے یعنی جو آنکھوں سے دیکھا جا سکے جیسے فتح الباب وغیرہ ولما فتحوا متاعھم (یوسف [۱۲] - ۶۵) یا ذہنی طور پر جو بصیرت سے معلوم ہو سکے جیسے ہم وغم کا دور کرنا مال و دولت دیکر فتحنا علیھم ابواب کل شئی (الانعام [۶] ۴۴) لفتحنا علیھم برکات من السّماء والارض (۷ - ۹۶) یا علوم کا عطا فرمانا جیسا کہ انّا فتحنا لک فتحا مبینا (الفتح [۴۸] - ۱) میں بعض لوگوں نے مراد لیا ہے کہ مراد اس سے ان علوم و ہدایات کا دیا جانا ہے جو ثواب اور مقام محمود تک پہنچانے کا اور یوں غفر ذنوب کا ذریعہ ہو گئے - اور دو شخصوں کے درمیان فتح یا فتح قضیۃ کے معنی ہیں باہمی اختلاف یا جھگڑے کا فیصلہ کر دینا اور یہی معنی یہاں مراد ہیں (غ)

فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ﴿۹۱﴾ ۛۚ
سو اُن کو زلزلے نے آپکڑا، پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا شُعَيۡبًا كَاَنۡ لَّمۡ يَغۡنَوۡا فِيۡهَا ۛۚ اَلَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا شُعَيۡبًا كَانُوۡا هُمُ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۹۲﴾
وہ جنھوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا گویا کہ وہ وہاں بسے ہی نہ تھے۔ وہ جنھوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا، وہی نقصان اٹھانے والے ہوئے۔

فَتَوَلّٰى عَنۡهُمۡ وَقَالَ يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّىۡ وَنَصَحۡتُ لَكُمۡ ۚ فَكَيۡفَ اٰسٰى عَلٰى قَوۡمٍ كٰفِرِيۡنَ ﴿۹۳﴾ ع
تب اس نے ان سے مُنہ پھیر لیا اور کہا اے میری قوم یقیناً میں نے تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے اور تمھارا بھلا چاہا، سو میں نہ ماننے والی قوم پر کیا افسوس کروں ۱۱۲۵ع

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِىۡ قَرۡيَةٍ مِّنۡ نَّبِىٍّ اِلَّاۤ اَخَذۡنَاۤ اَهۡلَهَا بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمۡ يَضَّرَّعُوۡنَ ﴿۹۴﴾
اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس کے رہنے والوں کو سختی اور دکھ نے پکڑا تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں ۱۱۲۵ع-الف

ثُمَّ بَدَّلۡنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الۡحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوۡا قَدۡ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۹۵﴾
پھر ہم نے دکھ کی جگہ سُکھ بدل دیا، یہاں تک کہ وہ بڑھ گئے اور کہنے لگے ہمارے باپ دادوں کو بھی دُکھ اور خوشی پہنچتے رہے تب ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور انھیں خبر بھی نہ ہوئی ۱۱۲۶ع

وَلَوۡ اَنَّ اَهۡلَ الۡقُرٰٓى اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ وَلٰكِنۡ كَذَّبُوۡا فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۹۶﴾
اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقوائے اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے، لیکن انھوں نے جھٹلایا، تب ہم نے ان کو پکڑ لیا اس کی سزا جو وہ کماتے تھے۔

اَفَاَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰٓى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا بَيَاتًا وَّهُمۡ نَآئِمُوۡنَ ﴿۹۷﴾ ط
تو کیا بستیوں والے نڈر ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر رات کے وقت آئے، جب وہ سوتے ہوں۔

ع۱۱۲۵ انبیاء میں غمخواری مخلوق کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے مگر جب حق تبلیغ ادا کر چکے تو اب افسوس کیا کریں جہاں تک ممکن تھا ان کی خیر خواہی کی جب انھوں نے نہ سنا اور نہ مانا تو پھر خدا کی قضا پر رضا کا اظہار کیا۔ اب افسوس کرنے سے کیا فائدہ۔ ہاں جب غمخواری کرنے کا وقت ہوتا ہے تو خطرناک مخالفت کے باوجود غمخواری بھی اس قدر کرتے ہیں اور کفار کی خاطر اس قدر ان کے دل میں درد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لعلك باخع نفسك الّا یکونوا مومنین (الشعراء ۲۶-۳) شاید تو اپنے آپ کو ہلاک کر دیگا کہ وہ مومن نہیں ہوتے۔

ع۱۱۲۵-الف یضرعون۔ اصل یتضرعون ہے ضَرع اونٹنی بکری وغیرہ کے پستان کو کہتے ہیں اور ضرع البھم کے معنی ہیں چارپایہ کے بچّے نے اپنی ماں کے پستان کو لیا۔ اسی طرح ضرع الرجلُ کے معنی ہیں وہ عاجز ہو گیا (غ) گویا اس میں عاجز ہو کر دوسرے سے قوت حاصل کرتا ہے اور یہی تضرع ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کر کے اس سے طاقت چاہنا۔ انبیاء اور ان کے مخالفین کی چند مثالیں پیش کر کے اب بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون اس دنیا میں عذاب کا اس لیے ہے کہ تا دکھوں اور تکلیفوں میں مبتلا ہو کر لوگ عاجزی اختیار کریں اور اللہ کی طرف رجوع کریں۔ گویا وہ بھی بندوں کی بھلائی کے لیے ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب آئے گا وہ محض سزا کے طور پر نہیں بلکہ انسان کی اصلاح اس کی اصل غرض ہے۔ اس لیے دوزخ کا عذاب بھی انسان کی اصلاح کے لیے اور بطور علاج ہی ہو سکتا ہے نہ صرف بطور سزا۔

ع۱۱۲۶ عفوا۔ عَفَی کے معنی نشان کا مٹانا بھی آتے ہیں اور بڑھنا بھی جیسے عفا النبت (غ) یہی معنی یہاں ہیں یعنی ایک دکھ جب ایک قوم پر آتا ہے اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ اُلٹا حق کے ساتھ عناد کرنے میں ترقی کرتی ہے تو پھر نتیجہ اس کا تباہی ہوتی ہے تاکہ کوئی دوسری قوم اس کی جگہ لے۔

أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا
ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿٩٨﴾

اور کیا بستیوں والے نڈر ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر دن چڑھے آئے ، جب وہ کھیلتے ہوں ۱۱۲۷ع

أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ
اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٩٩﴾ ع

سو کیا وہ اللہ کی تدبیر سے نڈر ہیں تو اللہ کی تدبیر سے کوئی نڈر نہیں ہوتا مگر وہی لوگ جو گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔

أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ
بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ ۚ
وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿١٠٠﴾

کیا ان کے لیے کھل نہیں گیا جو اس کے (پہلے) رہنے والوں کے بعد زمین کے وارث ہوئے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے گناہوں کی وجہ سے انھیں پکڑ لیں اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں سو وہ نہیں سنتے۔

تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَائِهَا ۚ
وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا
كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ
كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ﴿١٠١﴾

یہ بستیاں ان کے کچھ حالات ہم تجھ پر بیان کرتے ہیں اور یقیناً ان کے رسول ان کے پاس کھلی دلائل لیکر آئے مگر وہ ایسے نہ تھے کہ اس پر ایمان لاتے جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح اللہ نہ ماننے والوں کے دلوں پر مہر لگاتا ہے ۱۱۲۷ف

وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ ۖ وَإِنْ
وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ ﴿١٠٢﴾

اور ہم نے اُن میں سے بہتوں میں عہد (کا نباہ) نہ پایا اور یقیناً ہم نے ان میں سے بہتوں کو نافرمان پایا ۱۱۲۸ع

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا
إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَظَلَمُوا بِهَا ۚ فَانْظُرْ

تب ہم نے ان کے پیچھے موسیٰؑ کو اپنی آیات کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا مگر انھوں نے ان کا انکار کیا ، تو دیکھ

ع۱۱۲۷ پہلی آیت میں نائم یا سونے والوں سے اور دوسری میں کھیلنے والوں سے مراد غافل اور دنیا کے لہو ولعب میں مشغول اور حقیقت زندگی سے بےخبر لوگ بھی ہوسکتے ہیں۔ اس میں عرب والوں کو صاف تنبیہ ہے ؛

ف۱۱۲۷ یھد - ھَدَیْتُ لَکَ کے معنی ہیں بَیَّنْتُ لَکَ یعنی ایک امر کو واضح کر دیا (ل)، اور یہاں اس کا استعمال بمنزلہ لازم کے ہے ؛
یطبع - طَبع اصل میں یہ ہے کہ کسی شے کو کوئی سی صورت دی جائے اور یہ ختم سے عام اور نَقش سے خاص ہے اور طَبِیْعَۃ گویا نفس پر کسی صورت کا نقش ہونا ہے خواہ وہ پیدائش کی وجہ سے ہو یا عادت سے اور پیدائش کے لحاظ سے اغلب ہوتا ہے اور طبع اور ختم ایک ہی طرح پر ہیں اور بعض نے طَبَع کے معنی دَنَس لیے ہیں یعنی اسے زنگ آلود کر دیا جیسے فرمایا بل ران علی قلوبھم (غ)
مہر لگانے سے مراد : یہاں صفائی سے بتایا کہ پہلے انسان گناہ کرتا ہے تب خدا کی طرف سے مہر لگتی ہے۔ اور خود لفظ طَبَع کا استعمال یہی بتاتا ہے کیونکہ ایک خاص صورت کا نقش کرنا ہے اور جس طرح عادت طبیعت ثانیہ ہو جاتی ہے یہی حالت گناہ کی ہے کہ جب انسان بار بار گناہ کرتا ہے تو اس کا ایک نقش دل پر ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ بکثرت اس کو دُہرانے سے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ بوجہ عادت کے طبیعت کا ایک جزو ہو جاتا ہے اور مہر لگانا یہی ہے کہ جب انسان جھٹلا دیتا ہے تو پھر ایمان لانے کی توفیق نہیں ملتی۔ جھٹلانا حق کی مخالفت پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور مخالفت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کے کسی اچھے پہلو کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا بلکہ سارا زور اس کے نیست و نابود کرنے پر لگاتا ہے اس لیے دل کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ پھر ایمان کی طرف اس کا میلان ہی نہیں ہوتا پس یہی خدا کی مہر ہے۔

ع۱۱۲۸ عہد سے مراد یا تو عام ہے۔ یعنی جب کبھی وہ کوئی عہد کرتے ہیں۔ اس کو پورا نہیں کرتے۔ جو انسان کسی عہد کا پابند نہیں ہوتا وہ انسانیت کے اعلیٰ مقصد کو کبھی حاصل نہیں کرسکتا۔ اور یا عہد سے مراد عہد فطرت ہے یعنی جو کچھ ان کی فطرت میں مرکوز ہے اس پر وہ قائم نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ وہ نور فطرت بجھ جاتا ہے۔ دوسرے معنی قابل ترجیح ہیں۔

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾
فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا[۱۱۲۹]

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾
اور موسیٰؑ نے کہا اے فرعون میں جہانوں کے رب کی طرف سے رسول ہوں۔

حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾
اس پر قائم کہ اللہ پر سوائے حق کے کچھ نہ کہوں۔ میں تمھارے پاس تمھارے رب سے کھلی دلیل لایا ہوں، سو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے[۱۱۳۰]

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾
اس نے کہا اگر تو کوئی نشان لایا ہے تو وہ لے آ، اگر تو سچا ہے۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾
تب اس نے اپنا عصا ڈالا تو ناگہاں وہ صریح اژدہا تھا۔

وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ ع ۹/۳
اور اپنا ہاتھ باہر نکالا تو ناگہاں وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید تھا[۱۱۳۱]

ع۱۱۲۹ درمیان میں بہت سے انبیاء کا ذکر چھوڑ کر حضرت موسیٰؑ کا ذکر شروع کیا ہے اور اس کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے جس کی وجہ آنحضرت صلعم کو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ کئی ایک امور میں مماثلت کا ہونا ہے۔ کیونکہ آپ استثناء ۱۸: ۱۸ کی مثل والی پیشگوئی کا مصداق ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کا ذکر قرآن کریم میں ذیل کے مقامات پر آتا ہے:۔ البقرۃ[۲] - ۴۹ تا ۷۲؛ النساء[۴] - ۱۵۳؛ المائدۃ[۵] - ۲۰ تا ۲۶؛ الاعراف[۷] - ۱۰۳ تا ۱۵۶؛ یونس[۱۰] - ۷۵ تا ۹۲؛ ہود[۱۱] - ۹۶ تا ۹۹؛ بنی اسرائیل[۱۷] - ۱۰۱ تا ۱۰۴؛ الکہف[۱۸] - ۶۰ تا ۸۲؛ مریم[۱۹] - ۵۱ و ۵۲؛ طٰہٰ[۲۰] - ۹ تا ۹۸؛ المومنون[۲۳] - ۴۵ تا ۴۹؛ الشعراء[۲۶] - ۱۰ تا ۶۸؛ النمل[۲۷] - ۷ تا ۱۴؛ القصص[۲۸] - ۳ تا ۴۸؛ الصفت[۳۷] - ۱۱۴ تا ۱۲۲؛ المومن[۴۰] - ۲۳ تا ۵۵؛ الزخرف[۴۳] - ۴۶ تا ۵۶؛ الدخان[۴۴] - ۱۷ تا ۳۳؛ الذاریات[۵۱] - ۳۸ تا ۴۰؛ الصف[۶۱] - ۵؛ النازعات[۷۹] - ۱۵ تا ۲۶۔

ع۱۱۳۰ حقیق بمعنی جدیر ہے یعنی سزاوار اور علیٰ بمعنی ب یعنی اس بات کا اہل ہوں۔
حضرت موسیٰؑ کا اصل کام فرعون کو تبلیغ کرنا نہ تھا بلکہ بنی اسرائیل کو فرعون سے چھڑانا۔ کیونکہ وہ مبعوث صرف اپنی قوم کے لیے ہوئے تھے جیسا کہ فرمایا اخرج قومک من الظلمٰت الی النور (ابراہیم[۱۴] - ۵) اسی لیے سب سے پہلے انھوں نے اس بات کو پیش کیا ہے کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے ہاں جب ان کا واسطہ فرعون سے پڑنا ضروری تھا تو فرعون کو نصیحت بھی ضروری تھی یہ بھی انہوں نے کی۔

ع۱۱۳۱ عصا کے لیے دیکھو ح۸۸ اور بیضاء کے معنی سفید یا روشن اور الید البیضاء کے معنی ہیں الحجۃ المبرھنۃ (ل) یعنی روشن یا واضح دلیل۔
حضرت موسیٰؑ کے ان دونوں معجزات کا ذکر بائبل میں بھی ہے۔ ان دونوں معجزات کا ظہور دو دفعہ ہونا قرآن شریف اور بائبل میں بھی مذکور ہے۔ یعنی ایک اس موقعہ پر جب حضرت موسیٰ کو رسالت کے عہدہ پر ممتاز کیا جاتا ہے اور دوسرا فرعون کے سامنے جب پہلے گئے ہیں تو اس وقت ان معجزات کا ظہور ہوا۔ البتہ بائبل میں دوسرے موقعہ پر یعنی فرعون کے سامنے ید بیضاء کے معجزہ کا ذکر نہیں جو صریحًا تحریف ہے اس لیے کہ خروج ۴: ۸ میں حضرت موسیٰ کو خداوند کا یہ ارشاد ہے کہ "اگر وے تجھ پر ایمان نہ لاویں اور نہ پہلے معجزہ کے سننے والے ہوں تو وے دوسرے معجزہ کے معتقد ہونگے"۔ علاوہ ازیں دوسرے معجزہ کا دینا بے معنی تھا اگر فرعون کے سامنے اس کا اظہار نہ ہونا تھا۔
حضرت موسیٰ کے معجزات کا پہلا ظہور کن حالات میں ہوا: البتہ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ معجزہ کا ظہور عمومًا اعدائے حق کے مقابلہ میں ہوتا ہے اور انہی کو عاجز کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن حضرت موسیٰ کو پہلے یہ معجزات اس وقت دکھائے جاتے ہیں جب وہ اکیلے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہیں اور جب ان پر وہ حالت طاری ہے جس حالت میں اللہ تعالیٰ کا کلام انبیاء علیہم السلام سے ہوتا ہے یہ حالت جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں خاص حالت ہوتی ہے جس میں نبی ایک امر کو دیکھتا ہے اور ایک آواز کو سنتا ہے، مگر پاس بیٹھنے والے اسے نہیں دیکھتے اور نہ سنتے ہیں۔ چنانچہ احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض وقت حضرت نبی کریم صلعم اصحابؓ میں بیٹھے ہوتے تھے جب آپؐ پر حالت وحی وارد ہوتی اور آپؐ کی حالت بدل جاتی اور فرشتہ آپ کے سامنے آتا اور آپؐ سے کلام کرتا۔ مگر فرشتہ کو پاس بیٹھے ہوئے صحابہؓ نہ دیکھتے نہ ہی وہ فرشتہ کی آواز سنتے۔ اور آنحضرتؐ دیکھتے اور سنتے بھی۔ پس اس حالت میں بھی جب حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمکلام تھے۔ ان معجزات کا ظہور ایک کشفی رنگ رکھتا ہے ہاں فرعون کے سامنے بھی ان معجزات کا ظہور ہوا ہے۔ لیکن بعض اوقات کشفی نظارہ کے دیکھنے میں دوسرے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے تصرف تام سے شریک کر دیتا ہے اور یہی اعجاز ہے۔ ورنہ حضرت موسیٰؑ کے سونٹے میں یہ خاصیت نہ تھی کہ جب زمین پر ڈالیں تو اژدہا بن جائے۔ نہ ہی سوائے ان دونوں موقعوں کے اور کبھی دشمن کے بالمقابل بھی اس کے اژدہا بننے کا ذکر ہے وہ ایک معمولی سونٹا تھا۔ جیسا کہ خود حضرت موسیٰؑ کے الفاظ ہیں کہ میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور بکریوں کے لیے اس سے پتے جھاڑتا ہوں اور اور کام بھی لے لیتا ہوں۔ کہاں سے وہ سونٹا آیا تھا اس کے متعلق کوئی صحیح اور معتبر روایت پیش نہیں کی جاسکتی۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾

فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا یقیناً یہ کوئی دانا جادوگر ہے ع۱۱۳۲

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

چاہتا ہے کہ تمھیں تمھارے ملک سے نکال دے سو تم کیا مشورہ دیتے ہو ع۱۱۳۳

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾

بولے، اسے اور اس کے بھائی کو ڈھیل دے اور شہروں میں نقیب بھیج دے۔

يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾

وہ تیرے پاس ہر دانا جادوگر کو لے آئیں ع۱۱۳۴

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور جادوگر فرعون کے پاس آئے کہنے لگے ہم کو اجر تو ضرور ملے گا اگر ہم ہی غالب رہے۔

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

ہاں! اور تم یقیناً (میرے) مقربوں میں سے ہوگے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

انھوں نے کہا اے موسیٰؑ یا تو تُو ڈال، یا ہم (پہلے) ڈالنے والے ہوں۔

قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

کہا، ڈالو، سو جب انھوں نے ڈالا، لوگوں کی آنکھوں کو دھوکا دیا اور اُن کو ڈرایا، اور ایک بڑا فریب بنا کھڑا کیا ع۱۱۳۵

ہاں عصا کے اژدہا بننے اور یدبیضا کے ایک معنی بھی تھے یعنی اول میں یہ اشارہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ کے پیرووں کی جماعت (کیونکہ عصا کا لفظ جماعت پر بھی بولا جاتا ہے دیکھو ع۸۸) اپنے فریق مخالف پر غالب آئے گی اور یدبیضا میں اشارہ حضرت موسیٰ کی دلائل نیرہ کی طرف تھا جو دلوں کو کھا جائے گی۔ چنانچہ فرعونیوں کا غرق ہونا اور ساحروں کا حضرت موسیٰ پر ایمان لانا ان دونوں معجزوں کی اصل حقیقت پر شاہد ہے۔

ع۱۱۳۲ ساحر۔ سحر کرنے والا۔ اور سحر کے لیے دیکھو ع۱۲۹ لسان العرب میں ہے کہ سحر وہ افسون ہے جو آنکھ پر قبضہ کرلیتا ہے یہاں تک کہ یہ گمان ہوتا ہے کہ اصل بات اسی طرح ہے جس طرح وہ دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت ایسا نہیں اور پھر لکھا ہے کہ سحر افسون ہے اور ہر ایک چیز جس کا ماخذ لطیف اور دقیق ہو وہ سحر ہے۔ اور پھر لکھا ہے کہ سحر نہایت درجہ کی ذہانت کا بیان ہے اور حدیث اِنّ من البیان لسحرا کو پیش کیا ہے جس کے معنی ابوعبیدہ نے یوں کیے ہیں کہ ایک شخص کسی کی تعریف کرے یہاں تک کہ اپنی صداقت کا لوگوں کو قائل کرلے پھر مذمت کرے یہاں تک کہ لوگوں کو اپنی صداقت کا قائل کرلے اور ابن الاثیر نے اس کے معنی کیے ہیں کہ وہ سامعین کے دلوں کو اپنی طرف پھیر لیتا ہے گو سچ نہ بھی ہو (ل) الساحر العالم الفطن یعنی بڑے ذہین عالم کو ساحر کہا جاتا ہے (ت) انبیاء کو اُن کے مخالف کیوں ساحر کہتے تھے صرف اسی وجہ سے کہ ان کی باتوں کا اثر دلوں پر ہوتا تھا اور وہ دلوں کو پھیر دیتے تھے۔

ع۱۱۳۳ تامرون۔ امر سے ہے اور ائتمار مشورہ کو کہتے ہیں اور یہاں تامرون اسی مشورہ کے معنی میں ہے۔ فما ذا تامرون فرعون کا قول ہے جو ان کی بات سن کر کہا گیا ہے جیسا کہ سیاق عبارت سے ظاہر ہے۔

ع۱۱۳۴ ارجہ۔ اصل میں ارجئہ ہے اور ارجاء کسی معاملہ کو توقف یا تاخیر میں ڈال دینے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ فوراً ان کے معاملہ میں کارروائی نہ ہو جو اس علم کے ماہر ہیں وہ سب جمع ہوکر مقابلہ کریں۔

ع۱۱۳۵ حضرت موسیٰ کا ساحروں سے مقابلہ اور ان کی رسیاں اور سونٹیاں: وہ کیا چیز تھی جو انھوں نے ڈالی۔ دوسری جگہ آتا ہے حبالہم وعصیّہم (الشعراء ۲۶: ۴۴) ان کی رسیاں اور ان کی سونٹیاں۔ آیا یہ سچ مچ کی رسیاں اور سونٹیاں تھیں۔ حبل ہر ایک ذریعہ کو کہا جاتا ہے اس لیے اس سے مراد اس قدر ہوسکتی ہے کہ جو اُن سے بن پڑا اور عصا کا استعمال مجاز کے رنگ میں ہُوا ہے۔ مثلاً قرعہ لعصا الملامۃ کے لفظی معنی ہیں اسکو ملامت کے سونٹے سے مارا مگر مراد صرف یہ ہے کہ خوب ملامت کی۔ ایسا ہی قشرت لہ العصا کے لفظی معنی ہیں میں نے اس کے لیے سونٹے کا چھلکا اتارا اور مراد ہے جو کچھ میرے دل تھا زبان سے ظاہر کر دیا اور تاج العروس میں العصا کے معنی اللسان یعنی زبان بھی دیئے ہیں۔ پس ممکن ہے کہ کوئی رسیاں اور سونٹیاں وہ ساتھ لائے ہوں اور ان کو ڈالا ہو اور ممکن ہے کہ مراد اس سے صرف باطل کی حمایت

وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا
هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾
فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ ۚ
فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ ۚ
وَ اُلْقِىَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ ۚۖ
قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ ۙ
رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾
قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ

اور ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ تُو اپنا سونٹا ڈال، پس وہ
فوراً اُسے نگل گیا جو وہ جھوٹ بناتے تھے [۱۱۳۶]
سو حق ظاہر ہوگیا اور جو وہ کرتے تھے باطل ہوگیا۔
پس وہاں ہار گئے اور ذلیل ہو کر پھرے۔
اور جادوگر سجدے میں گر گئے۔
کہا، ہم جہانوں کے رب پر ایمان لائے۔
موسیٰؑ اور ہارونؑ کے رب پر [۱۱۳۷]
فرعون نے کہا تم اس پر ایمان لائے قبل اس کے میں تم کو

ہیں جھوٹے سامان اور جھوٹی تقریریں ہوں۔ ما یافکون سے جو آگے آتا ہے دوسرے خیال کی تائید ہوتی ہے اور دوسری جگہ انہی واقعات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ فحشر فنادٰی فقال انا ربکم الاعلٰی (النّٰزعٰت ۷۹-۲۳ و ۲۴) یعنی لوگوں کو اکٹھا کیا اور یہ اعلان کیا کہ مَیں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ جو اسی موقعہ کا ذکر ہے۔ گویا ساحروں سے یہ اعلان کرایا کہ وہی سب سے بڑا دیوتا ہے اور اس کے سوا کوئی خدا نہیں ما علمت لکم من الٰہ غیری (القصص ۲۸-۳۸) اور اس کے بالمقابل حضرت موسیٰؑ یوں فرماتے ہیں فلما القوا قال موسٰی ما جئتم بہ السحر ان اللّٰہ سیبطلہ ان اللّٰہ لا یصلح عمل المفسدین و یحق اللّٰہ الحق بکلمٰتہ و لو کرہ المجرمون (یونس ۱۰-۸۱ و ۸۲) یعنی جو کچھ تم لائے ہو یہ تو سحر ہے اور اللہ اس کو یوں باطل کر دے گا کہ اپنے کلمات کے ساتھ حق کو حق کر دکھائے گا۔ پس یہ تمام امور اس کے موید ہیں کہ ایک طرف سے فرعون کی خدائی پر زور دیا جاتا تھا دوسری طرف حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلائل دیں۔ لیکن ظاہر الفاظ کو بھی اگر لیا جائے اور واقعی لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے فرعون نے چالاک آدمیوں سے کچھ فریب کاری اس قسم کی کرائی ہو جس سے لوگوں کو خیال ہو جائے کہ فرعون میں کچھ خدائی ہے تو یہ امر بھی بالکل قرین قیاس ہے کیونکہ عموماً مشرک قومیں توہم پرست بھی بہت ہوتی ہیں جو لوگ ہواؤں اور بجلیوں اور بارشوں اور آگ اور درختوں اور پتھروں اور جانوروں کے سامنے سر جھکا دیتے ہوں ان کو اس قسم کی شعبدہ بازی سے مرعوب کر لینا بہت آسان ہوتا ہے۔ پس فرعون نے بڑے بڑے دانا آدمیوں کو اکٹھا کر کے ان سے کوئی اس قسم کی شعبدہ بازی کرائی اور اس خاص طرز کو ممکن ہے انہوں نے اس لیے اختیار کیا کہ فرعون کے سامنے حضرت موسیٰ کے عصا کے اژدہا بننے کا معجزہ مشہور ہو چکا تھا انہوں نے سمجھا یہ کوئی چالاکی ہے ہم بھی اسی قسم کی چالاکی سے کام نکال لیں گے۔ مگر اس کا پول حضرت موسیٰ نے کھول دیا جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔

۱۱۳۶ تلقف۔ لقف کے معنی ہیں ایک چیز کو دانائی سے لے لینا خواہ منہ سے ہو یا ہاتھ سے (غ)

یافکون۔ اِفک۔ حق سے باطل کی طرف پھیرنے کو کہتے ہیں اس لیے ہر چیز کو جو اس حالت سے پھری ہوئی ہو جس پر اسے ہونا چاہیئے اِفک کہا جاتا ہے۔ اسی لیے اِفک مطلق کذب کو بھی کہتے ہیں ان الذین جاؤ بالافک (النور ۲۴-۱۱) (غ)

ساحروں کی سونٹیاں اور عصائے موسیٰ: یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے عصا میں یہ صفت نہ تھی کہ جب ڈالا جائے تو اژدہا بن جائے اور حضرت موسیٰ نے اسے خود ڈالنے کی جرأت بھی نہیں کی جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نہیں ہوئی۔ عصا کے ڈالنے کا نتیجہ کیا ہُوا۔ جو کچھ ساحروں نے افک یا جھوٹ بنایا تھا یا جو حق کو باطل سے پھیرا تھا اس کو وہ عصا کھا گیا اور ان کا کچھ باقی نہ رہنے دیا، کس طرح پر ہُوا اس کی تفصیل قرآن شریف میں نہیں نہ کہیں یہ ذکر ہے کہ یہ عصا اژدہا بن گیا تھا نہ یہ ذکر ہے کہ ان کی سونٹیاں سانپ بن گئی تھیں۔ صرف اس قدر ذکر ہے کہ ان کے سحر سے وہ دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور حضرت موسیٰ نے جب عصا ڈالا تو وہ ساحروں کے جھوٹ کو کھا گیا اور حق ظاہر ہو گیا۔ اور یہ خیال کہ اژدہا بن کر ہی نگلا ہو گا۔ محض خیال ہی ہے۔ یہی عصا جب سمندر سے گزرنے کے لیے ضرورت پیش آئی تو وہاں اژدہا نہیں بنا اور جو کچھ ہُوا اس کا نتیجہ یہ تبایا کہ ساحر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئے اور ان کے اس قول سے کہ اٰمنّا باٰیٰت ربنا (۱۲۶) یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف عصا کا معجزہ نہ تھا کیونکہ وہ ایک ہی آیت ہوتی اور ایمان درحقیقت معجزات پر نہیں لایا جاتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر۔ پس کیا بعید ہے کہ ایک بُت پرست قوم کے دل اللہ تعالیٰ کی توحید کی دلائل سے کھائے گئے ہوں۔

۱۱۳۷ ساحروں کا ایمان لانا اور بائبل: جادوگروں کے ایمان لانے کا ذکر بائبل میں نہیں جہاں اس مقابلہ کا ذکر ہے مگر یہودیوں کی روایات میں یہ ذکر موجود ہے اور اس کی تائید خروج ۱۲: ۳۸ سے ہوتی ہے جہاں بنی اسرائیل کے مصر سے جانے کے ذکر میں لکھا ہے کہ "ایک دوسری بڑی گروہ مل جل کر اُن کے ساتھ گئی"۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلیوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تھے اور یہودی انسکلوپیڈیا میں ہے "کیونکہ مصری جب موسیٰ کی پہاڑ سے واپسی کا وقت گزر گیا ان میں سے چالیس ہزار اکٹھے ہو کر آئے دو مصری جادوگروں ینس اور یمبریس کے ساتھ" اور ینس اور یمبریس وہی جادوگر تھے جو حضرت موسیٰ کے مقابلہ پر آئے جیسا کہ ۲ تمطاؤس ۳: ۸ سے ظاہر ہے۔

لَكُمْ ۚ إِنَّ هَٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوهُ فِي الْمَدِينَةِ	اجازت دوں ، یہ ایک حیلہ ہے ، جو تم نے اس شہر میں بنا
لِتُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿١٢٣﴾	لیا ہے تاکہ اس کے رہنے والوں کو اس سے نکال دو سو تم (نتیجہ) جان لوگے۔
لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ	میں ضرور تمھارے ہاتھ اور تمھارے پاؤں مخالف طرف سے کاٹ دونگا
خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٢٤﴾	پھر میں ضرور تم کو صلیب کی موت ماروں گا۔
قَالُوا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ ﴿١٢٥﴾	انھوں نے کہا ، ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔
وَمَا تَنقِمُ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِآيَاتِ رَبِّنَا لَمَّا	اور تو ہم سے دشمنی نہیں کرتا مگر اس لیے کہ ہم اپنے رب کی باتوں پر ایمان
ع جَاءَتْنَا ۚ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ﴿١٢٦﴾	لائے جب وہ ہمارے پاس آگئیں اے ہمارے رب ہم پر صبر ڈال اور ہمیں مسلمان مار[1138]
وَقَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ	اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا ، کیا تو موسیٰؑ اور
وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ	اس کی قوم کو چھوڑتا ہے کہ ملک میں فساد کریں اور وہ تجھے اور تیرے
وَآلِهَتَكَ ۚ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي	معبودوں کو چھوڑ دے اس نے کہا ہم ان کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے
نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿١٢٧﴾	اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے اور ہم ان کے اوپر غالب ہیں۔
قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ	موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا ، اللہ سے مدد مانگو اور
وَاصْبِرُوا ۖ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن	صبر کرو ۔ زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے
يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٢٨﴾	جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور (اچھا) انجام متقیوں کے لیے ہے[1139]

ع ۱۱۳۸ مومن اور کافر میں یہ فرق دکھایا ہے کہ یہی جادوگر جو حالت کفر میں روپوں کا اجر فرعون سے طلب کرتے تھے اب جان تک کی ان کو پروا نہیں اس لیے کہ خدا کو پا لیا۔

ع ۱۱۳۹ بنی اسرائیل کے ذکر میں مسلمانوں کی مشکلات کا علاج : قرآن کریم نے جن گزشتہ واقعات کو بیان کیا ہے ان سب میں اور بالخصوص بنی اسرائیل کے ذکر میں اسلام کی تاریخ لکھی ہوئی ہے جو کچھ حالت بنی اسرائیل کو پیش آئی وہی مسلمانوں کو پیش آنے والی تھی۔ اس لیے بنی اسرائیل کے واقعات کا ذکر کر کے جو ان کو حضرت موسیٰ کی معرفت علاج بتایا ہے وہ مسلمانوں کی مشکلات کا علاج ہے۔ بنی اسرائیل ایک دوسری قوم کی غلامی میں تھے اور دوسری قوم ان پر حکمران تھی۔ حاکم قوم ان کو روز بروز کمزور کرتی چلی جاتی تھی اور ایسی تدابیر ان کے متعلق اختیار کرتی تھی کہ جن سے ان کی قومی زندگی مٹتی چلی جائے۔ سب ذلت کے کام ان سے لیے جاتے تھے۔ ان کے بیٹوں کو قتل کیا جاتا اور عورتوں کو زندہ رکھا جاتا تھا تاکہ یہ قوم آہستہ آہستہ فنا ہو جائے۔ آج یہی نقشہ مسلمانوں کا نظر آتا ہے صرف اس قدر فرق ہے جو حالات زمانہ سے پیدا ہونا لازم تھا۔ آج مسلمان عموماً ساری دنیا میں اور بالخصوص اس ملک ہند میں ایک دوسری قوم کی غلامی میں ہیں۔ وہ دوسری قوم ان پر حکمران ہے اور حکومت کی تدابیر اس قدر مضبوط ہیں کہ محکوم قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ محکوم قوم کے اعلیٰ درجہ کے جوہر مٹتے چلے جا رہے ہیں۔ دنیا کے مال کے لالچ کے لیے وہ دین ایمان بیچتے چلے جاتے ہیں۔ شجاعت اور مردانگی کا جوہر مفقود ہوتا چلا جاتا ہے دین اسلام کی محبت اور غیرت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ دنیوی شان و شوکت تو مدت سے رخصت ہو چکی جو کچھ باقی رہی تھی اس کا اس جنگ نے فیصلہ کر دیا۔ ہاں وہاں اگر بیٹوں کو قتل کرتے تھے تو یہاں مجازی طور کا قتل ہے کیونکہ مردانگی اور شجاعت کی اعلیٰ صفات کا مر جانا ہی مجازاً قوم کے فرزندوں کا قتل ہے۔ آرائش و زیبائش جسمانی مال دولت دنیا، دنیا کی دلفریبی کے ظاہری سامانوں پر فریفتگی یہ وہ زنانہ صفات ہیں جو نستحی نساءھم کے قائم مقام ہوئی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان مشکلات کا علاج کیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ آج ہماری قوم کو بالکل وہی حالات پیش آئے ہیں جو بنی اسرائیل کو فرعون کے ماتحت پیش آئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے جو حضرت موسیٰ کی زبان سے علاج بتایا ہے وہ ہماری ہی مشکلات کا علاج ہے اور وہ علاج کیا ہے استعینوا باللہ واصبروا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد چاہنا اور صبر اختیار کرنا۔ آج کل کے لیڈروں کی نظر میں یہ ایک لغو سی بات ہے وہ اس طرف توجہ نہیں کرتے ان کو اپنی قوت بازو پر بھروسہ ہے کہ ہم اس حاکم قوم کو عدم تعاون سے مار لیں گے اور اگر عدم تعاون سے یہ قوم نہ مری تو پھر ہم تلوار اٹھائیں گے۔ خدا کے کلام کی تصریح کے خلاف ان باتوں کی طرف جانا عمداً قوم کو ہلاکت میں ڈالنا ہے فرعون کی اس قدر زیادتیوں کے باوجود بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرنے کے باوجود خدا کی عبادت سے روکنے کے باوجود بنی اسرائیل کو جو ایک محکوم قوم تھی یہ حکم نہیں دیا جاتا کہ تم فرعون کے خلاف جنگ کرو۔ بلکہ یہ حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی مدد چاہو اور صبر کرو۔ یہی علاج آج ہماری مشکلات کا تھا ہم بنی اسرائیل کی طرح دوسری قوم کی غلامی

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٩﴾

انھوں نے کہا ہمیں دکھ دیا گیا اس سے پہلے کہ تو ہمارے پاس آتا اور اس کے بعد کہ تو ہمارے پاس آیا، اس نے کہا قریب ہے کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو ہلاک کردے، اور تم کو زمین میں جانشین بنائے، پھر دیکھے تم کس طرح عمل کرتے ہو ۱۱۳۹ع

وَلَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿١٣٠﴾

اور البتہ ہم نے فرعون کے لوگوں کو قحط اور پھلوں کی کمی میں پکڑا، تاکہ وہ نصیحت قبول کریں ع۱۱۴۰

فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣١﴾

سو جب ان کو سکھ پہنچتا، کہتے یہ ہمارا حق ہے۔ اور اگر ان کو دکھ پہنچتا، موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی شومی بتاتے سنو ان کی شومی صرف اللہ کی طرف سے ہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے ع۱۱۴۱

ہیں ہیں اس ذلت کی حالت سے ہم حاکم قوم سے جنگ کرکے نہیں نکل سکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرکے خدا کے آگے گڑگڑا اور اپنی کمزوری کا علاج اللہ تعالےٰ کی قوت کو سمجھ کر نکل سکتے ہیں۔ قرآن کریم کا ایک لفظ بھی اس بات کی تائید میں پیش نہیں کیا جا سکتا کہ محکوم ہو کر حاکم قوم کے ساتھ جنگ کرنے کی اجازت دی جائے اور درحقیقت یہ جنگ نہ ہوگی خودکشی ہوگی۔ قوم کے ملکی رہنماؤں کو اور علمائے اسلام کو یہ چاہیئے کہ حالات پیش آمدہ میں اپنی مشکلات کا حل قرآن کریم سے سوچیں۔ استعانت باللہ اور صبر سے ہی قوم کے اندر وہ جوہر پیدا ہونگے جن سے یہ قوم زندہ رہنے کے قابل بنے گی۔ رہا ان لوگوں کا سوال جو اس وقت اسلام کے دشمن ہمیں نظر آتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے کہ ان کی ہلاکت کے کوئی اسباب پیدا کردے اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ ان کو دشمنان اسلام کے حلقہ سے نکال کر حلقہ بگوشان اسلام بنادے عسى الله ان يجعل بينكم وبين الذين عاديتم منهم مودة (الممتحنة-۷) ہمارا فرض یہی ہے کہ ہم اپنی اصلاح کریں اور اسلام کی خوبیوں کو دوسروں کے سامنے کھول کر رکھیں۔ یہی وہ راہ ہے جو حالات پیش آمدہ میں قرآن کریم نے ہمیں صراحت سے بتادی ہے۔ جب تک مسلمان اس راہ سے منہ موڑے رہے ہیں ذلت وادبار کی حالت سے باہر نہیں نکل سکتے۔

ع۱۱۳۹ بادشاہت کے حصول کا طریق: اس سارے بیان میں یہی بتایا ہے کہ جب ایک قوم حد سے زیادہ مخلوق کو دکھ دیتی ہے تو بادشاہت اس سے لیکر دوسری قوم کو دیدی جاتی ہے۔ باوجود ان سارے دکھوں کے جو بنی اسرائیل کو ملتے ہیں، باوجود اس کے کہ ایک سخت غلامی کی حالت میں وہ پڑے ہوئے ہیں اور حاکم قوم بڑی زبردست ہے اور یہ صرف چند بیگار کے کام کرنے والے لوگ ہیں جن کو حکومت میں بھی کوئی رسوخ حاصل نہیں حضرت موسیٰ کا ایمان کس قدر ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ تمہارا دشمن ضرور ہلاک ہوگا اور تم بادشاہ بنوگے مگر پھر تمہارے عملوں کو بھی اللہ تعالیٰ دیکھے گا جب تم اس طرح مخلوق خدا کو دکھ دینے لگوگے تو تم سے بھی حکومت لے لی جائیگی موسیٰ کے ساتھیوں کی تکالیف میں مسلمانوں کی اس وقت کی تکالیف کا نقشہ کھینچا ہے گو دونوں رنگوں میں کچھ فرق ہو کہ دوسری قوموں کے ہاتھ میں یہ لوگ ذلیل و مقہور ہو رہے ہیں۔

ع۱۱۴۰ سنین۔ سنة کی جمع ہے جس کے معنی سال ہیں۔ مگر اس کا زیادہ استعمال قحط کے سال پر ہے (غ)، یہاں تک کہ اس سے مراد قحط کا سال ہی سمجھا جانے لگا۔

ع۱۱۴۱ یطیروا۔ طائرہ۔ طیر یعنی پرند سے ہے اور تطیّر اور اطّیّر پرندوں سے شگون لینے کو کہتے ہیں۔ پھر اس کا استعمال ہر ایک قسم کی بدشگونی اور بری فال لینے پر عام ہوگیا ہے (غ)، اہل عرب اگر پرندوں کو بائیں جانب اڑتا دیکھیں تو اسے بدشگونی سمجھتے تھے (ت)، اور طائرھم میں طائر سے مراد ان کی شوم یعنی وہ بدقسمتی ہے جس کے متعلق وہ بدشگونی لیتے تھے۔ طائر اصل میں انسان کے عمل کو کہتے ہیں خیر ہو یا شر، کیونکہ وہ اس سے اڑ جاتا ہے جیسا کہ کل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقه میں ہے (غ)، ابوعبیدہ کہتے ہیں حظ یا بہرہ جو انسان کو ملے یہ لفظ اطلاق پاتا ہے (ت) طائرھم عند الله سے مراد ہے کہ جو کچھ ان پر مصیبت آتی ہے وہ ان کا حظہ یا بہرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یعنی انہی کی بدعملیوں کی سزا ہے۔

مسلمانوں کے مصائب اور مجدد چہاردہم: جب کوئی راستباز آتا ہے اور وہ ایک اچھی راہ کی طرف بلاتا ہے اور بری راہ سے روکتا ہے اور لوگ اس کی بات کو نہ ماننے سے اور مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو بجائے اس کے کہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ کریں اور راہ حق کو قبول کریں یوں کہنے لگتے ہیں کہ یہ مصائب اس شخص کی وجہ سے ہی ہم پر آرہے ہیں۔ ان کو توجہ دلائی ہے کہ داعی خیر کی وجہ سے نہیں بلکہ انکے اپنے اعمال بد کی وجہ سے ان پر مصائب آتی ہیں۔ آج مسلمانوں کا یہی حال ہے جب چودھویں صدی کے سر پر ایک مجدد آیا اور اس نے بتایا کہ تمہاری کامیابی اپنی اصلاح اور اشاعت اسلام میں ہے تو بجائے اس کے کہ اس حق بات کو قبول کرتے اس کی مخالفت

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

اور انھوں نے کہا جو کوئی نشان بھی تو ہمارے پاس لائے تاکہ اس کے ساتھ ہم کو دھوکا دے تو ہم تیری بات کو نہیں مانیں گے ۱۱۴۲ء

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

سو ہم نے اُن پر طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈکیں اور خون الگ الگ نشانیاں بھیجیں مگر انھوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم قوم تھے ۱۱۴۳ء

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾

اور جب اُن پر عذاب پڑتا کہتے اے موسیٰؑ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر جیسا اس نے تجھ سے عہد کیا ہے اگر تو ہم سے عذاب اُٹھا دے ہم ضرور تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور ضرور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

پس جب ہم ان سے ایک وقت کے لیے جس کو وہ پہنچنے والے تھے عذاب اُٹھا دیتے تو فوراً عہد شکنی کرتے ۱۱۴۴ء

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

پس ہم نے اُن پر سزا بھیجی اور ان کو دریا میں غرق کر دیا، اس لیے کہ وہ ہماری باتوں کو جھٹلاتے تھے اور اُن سے لاپروا تھے۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا

اور ہم نے اس قوم کو جسے کمزور گنا جاتا تھا اس زمین کے مشرقی اور اس کے مغربی حصّوں کا وارث کر دیا، جس میں ہم نے برکت دی تھی اور تیرے رب کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی اس لیے کہ انھوں نے صبر کیا اور

کی اور غلط راہوں پر پڑے وہ مصائب اور بھی بڑھیں تو اب لگے کہنے کہ ہماری مصائب تو اس کے آنے سے اور بھی زیادہ ہوئیں۔ کاش مسلمان ان آیات قرآنی سے کچھ سبق لیں۔

۱۱۴۲ء مهما۔ مہ اور ما سے مرکب ہے اور مَہ اسم فعل بمعنی توقف ہے اور ما شرطیہ۔ یا ما ما سے مرکب ہے۔ پہلا ما شرطیہ ہے اور دوسرا تعمیم کے لیے۔
مطلب یہ تھا کہ یہ تمہارے معجزات محض دھوکہ ہیں۔ اس لیے ان کو دیکھ کر ہم ایمان نہیں لاتے۔

۱۱۴۳ء طوفان۔ طَوْف سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کے گرد گھومنا۔ اور طوفان ہر وہ حادثہ ہے جو انسان کو چاروں طرف سے گھیر لے (غ) اسی سے اس کا استعمال بڑے سیل پر ہوا ہے۔ طوفان کے معنی بخاری میں موت کثیر دیئے ہیں۔
جراد ٹڈی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین کو سبزی سے خالی کر دیتی ہے (غ) اور جَرْدَ کے معنی ہیں ایک چیز کا چھلکا اتار دیا۔
قُمّل۔ جوں، چچڑی، پسّو وغیرہ پر بولا جاتا ہے ضفادع۔ ضَفْدَعْ کی جمع ہے مینڈک۔

حضرت موسیٰ کے نو نشان: بائبل میں ذیل کی نشانیوں کا ذکر ہے۔ دریا کا لہو بن جانا۔ مینڈکوں کی آفت۔ جوئیں، مچھر، مویشی پر مری، پھوڑوں کی آفت۔ اولے، ٹڈی تاریکی۔ قرآن کریم نے جو آفات بیان کی ہیں وہ سات ہیں۔ جن میں سے پانچ یہاں اور دو آیت ۱۳۰ میں یعنی قحط اور پھلوں کی کمی اور ان سات کے ساتھ عصا اور ید بیضا کے معجزات ملا کر کل نو نشان ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ ذکر ہے۔

۱۱۴۴ء ینکثون۔ نکث کاتے ہوئے اور بنے ہوئے کے توڑنے پر استعمال ہوتا ہے اور استعارۃً نقض عہد پر (غ)، خروج ۸ سے ۱۱ باب تک ان نشانات کی تفصیل اور فرعون کے اقرار و عہد شکنی کا ذکر ہے۔

مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا
كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾
وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا
عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا
يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ
قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾
اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ
مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾
قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ
فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾
وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ

ہم نے وہ سب تباہ کر دیا جو فرعون اور اس کی قوم کرتے تھے
اور جو وہ عمارتیں بناتے تھے ۱۱۴۵
اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے گزار دیا۔ تب وہ ایک
قوم پر آئے جو اپنے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ بولے اے
موسیٰؑ ہمیں بھی ایک دیوتا بنا دے جیسے ان کے دیوتا ہیں۔
اس نے کہا تم لوگ جہالت کرتے ہو ۱۱۴۶
یہ جس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ تباہ ہونا ہے اور جو
وہ کرتے ہیں باطل ہے ۱۱۴۷
کہا، کیا میں اللہ کے سوائے تمھارے لیے معبود چاہوں
اور اس نے تم کو مخلوقات پر فضیلت دی ہے ۱۱۴۸
اور جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے بچایا وہ تمھیں

ع۱۱۴۵ الارض سے مراد ارض مقدس یعنی شام کی زمین ہے اس کے مشرق و مغرب کا مالک کر دیا۔ یعنی ساری ارض مقدس کا وارث کر دیا۔ گو یہ بہت بعد کا واقعہ ہے۔ تمت کلمة ربك الحسنى۔ تمام یا انتہا کو پہنچ جانے سے مراد اس کا پورا ہونا ہے۔ اور کلمة الحسنى یا اچھی بات وہ وعدہ ہے جو ان کو دیا گیا تھا کہ تمھیں ارض مقدس کا وارث بنایا جائے گا یا اس وعدہ کی طرف اشارہ ہے جو اوپر فرمایا عسى ربكم ان يهلك عدوكم (۱۲۹)

یعرشون۔ کے معنی ابوعبیدہ نے یبنون کیے ہیں یعنی جو عمارتیں وہ بناتے تھے (غ) یا باغات مراد ہو سکتے ہیں۔

اس امت کی کامیابی تلوار سے نہیں: یہاں بنی اسرائیل کی کامیابی کو ان کے صبر کا نتیجہ بتایا اور حسن سے مروی ہے کہ اگر لوگ جب ان کو اپنے بادشاہ کی طرف سے کسی قسم کی تکلیف پہنچے صبر کریں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تو بہت دیر نہ لگے گی کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت کو دور کر دے گا لیکن وہ گھبرا کر تلوار کی طرف جاتے ہیں سو اسی کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں اور انہی سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کو جو کچھ ملا ان کے صبر سے ہی ملا۔ اور یہ امت جب تلوار کی طرف دوڑے گی، تو کبھی نتیجہ اچھا نہ ہوگا (ر) ان روایات کو نقل کر کے مصنف روح المعانی لکھتے ہیں کہ ہم نے لوگوں کو ۱۲۴۸ سال تک دیکھا کہ وہ جب تلوار کی طرف دوڑے ہیں تو ان کو اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا، نہ ان کی مراد پوری ہوئی نہ کوئی محمود امر ہوا۔

ع۱۱۴۶ اصنام صَنَم کی جمع ہے اور وہ جسم ہے جو چاندی، تانبے لکڑی وغیرہ سے بنایا جائے۔ ان کی عبادت کرتے تھے اس خیال سے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اس سے حاصل ہوتا ہے اور بعض نے صنم سے مراد ہر اس چیز کو لیا ہے جس کی من دون اللہ پرستش کی جائے۔ بلکہ ہر چیز جو اللہ تعالیٰ سے دوسری طرف لے جانیوالی ہو (غ)

بنی اسرائیل پر مصریوں کا اثر: مصری لوگ ہر چیز کی پرستش کرتے تھے اس قسم کی بت پرست قوم میں رہ کر بنی اسرائیل کی عادات میں بت پرستی داخل ہو گئی تھی اس لیے بار بار بت پرستی کی طرف ان کا میلان پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں پر ہمسایہ قوم کا اثر بہت ہوا ہے یہاں تک کہ قبر پرستی پیر پرستی کے رنگ میں طرح طرح کے مشرکانہ عقیدے ان میں پھیل گئے ہیں اور ہر قسم کی مشرکانہ رسوم و رواج ان میں جڑ پکڑ گئے ہیں۔

ع۱۱۴۷ متبر۔ تِبْر اس سونے یا دوسری معدنی چیز کو کہتے ہیں جو ٹوٹی ہوئی حالت میں یعنی ذرات کی صورت میں مٹی میں ملی ہوئی ہو اور تَتْبِیْرٌ کے معنی ہیں ایک چیز کو توڑ دیا اور ہلاک کر دیا۔ پس مُتَبَّرٌ کے معنی توڑ کر ہلاک کر دیا گیا۔ اور تبار ہلاکت ہے ولا تزد الظالمين الا تبارا (نوح ۷۱۔ ۲۸) وكلا تبرنا تتبيرا۔ (الفرقان ۲۵۔ ۳۹)

ما هم فيه۔ جس معاملہ میں یہ ہیں یعنی بت پرستی یا ان بتوں کو حصول قرب بارگاہ الٰہی کا ذریعہ خیال کرنا بالفاظ دیگر مذہب بت پرستی آخر کار دنیا سے اُٹھ جائے گا اب تک دنیا کی تاریخ سے اس پر شہادت ملتی ہے کہ بُت پرستی کا مذہب دنیا میں علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتا چلا گیا ہے۔ اور یقیناً وہ وقت آنے والا ہے کہ یہ مذہب بالکل نابود ہو جائے گا اور خدائے واحد کی عبادت دنیا میں قائم ہوگی۔

ع۱۱۴۸ اس میں شرک کے خلاف اعلیٰ درجہ کی دلیل دی ہے جو فطرت انسانی کو اپیل کرتی ہے۔ یعنی فرمایا کہ خدا نے انسان کو تو ساری مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔ پھر کیا اسی مخلوقات میں سے تمہارے لیے معبود تجویز کیا جائے اور فطرت انسانی کو اس چیز کے آگے جھکایا جائے جس پر اس کو فضیلت حاصل ہے۔

سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾ ع

بُرا دکھ پہنچاتے تھے تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمہارے رب سے بڑی آزمائش تھی۔

وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

اور ہم نے موسیٰؑ سے تیس[۳۰] رات کا وعدہ ٹھیرایا اور ان کو دس (اور) سے پورا کیا تب اس کے رب کی مدت چالیس رات پوری ہوئی[۱۱۴۹] اور موسیٰؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا میری قوم میں میری جگہ کام کر اور اصلاح کرنا اور فساد کرنیوالوں کی راہ کی پیروی نہ کرنا[۱۱۵۰]

وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

اور جب موسیٰؑ ہمارے وقت مقررہ پر آیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا۔ کہا، میرے رب مجھے (اپنا آپ) دکھا کہ میں تیری طرف دیکھوں۔ کہا تو مجھے نہیں دیکھ سکتا لیکن پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر یہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تو تُو مجھے بھی دیکھ لے گا، پس جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلّی فرمائی اس کو ریزہ ریزہ کردیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہوکر گر گیا، پھر جب ہوش میں آیا تو کہا تو پاک ہے میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں[۱۱۵۱]

ع[۱۱۴۹] سورۂ بقرہ میں صاف فرمایا کہ موسیٰ سے ہم نے چالیس رات کا وعدہ کیا تھا اور یہاں بھی چالیس رات کو ہی میقات ربہ یعنی رب کا مقرر کردہ وقت کہا ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ پہلے تیس رات کا وعدہ کیا تھا اور اس کے گزر جانے کے بعد پھر دس راتیں اور بڑھا دیں، بلکہ مطلب صرف ایک ماہ اور دس دن کو ظاہر کرنے کا ہے۔ کیونکہ تیس رات کا ایک پورا مہینہ بنتا ہے اور اس تقسیم میں اشارہ اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ سنت انبیاء پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے بھی چالیس راتیں مقرر کی ہیں تیس راتیں رمضان کی اور دس ذی الحج کی جو خاص طور پر عبادت کی راتیں ہیں۔

ع[۱۱۵۰] اخلفنی۔ خَلَفَ فلانٌ فلانًا سے مراد ہوتی ہے اس کی طرف سے حکومت کے کام کو سنبھالا۔ قام بالامر عنه (غ)

ہارونؑ کی خلافت سے مراد: نبی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ دونوں تھے۔ مگر حکومت اور سرداری کا منصب حضرت موسیٰؑ کو حاصل تھا اس لیے اخلفنی سے مراد صرف یہی ہے کہ حکومت کا کام جو حضرت موسیٰ کے سپرد تھا وہ ان ایام میں حضرت ہارون کریں۔ نہ یہ کہ ان کی جگہ نبوت کا کام کریں۔ کیونکہ نبی وہ خود اصالتًا تھے (ل)

ع[۱۱۵۱] تجلّٰی۔ جَلْو کے معنی ہیں کھلے طور پر ظاہر یا الگ کردینا اسی سے جَلَاء ہے یعنی وطن سے نکال دینا لولا ان کتب اللہ علیهم الجلاء (الحشر[۵۹]۔ ۳) اور اسی سے جَلْوَة ہے اور تَجَلّی کبھی بالذات ہوتی ہے جیسے والنهار اذا تجلّٰی (الیل[۹۲]۔ ۲) اور کبھی امر اور فعل سے جیسے یہاں (غ)

صعقا۔ صَعِقَ الانسان کے معنی ہیں اس کو غش آگیا اور ایسے شخص کو صَعِق کہا جاتا ہے (ل)

موسیٰ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا سوال: جیسا کہ ع[۸۲] میں دکھایا جا چکا ہے۔ اصل سوال حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کا تھا لن نؤمن لك حتّٰى نری الله جهرة (البقرہ[۲]۔ ۵۵) انہی کی خاطر حضرت موسیٰؑ نے یہ سوال کیا تھا جس طرح حضرت عیسیٰؑ نے حواریوں کی درخواست کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا انزل علینا مائدۃ من السماء حالانکہ اس سوال کو ناپسند بھی کرتے تھے۔ اور اپنے متعلق درخواست اس لیے کی کہ بنی اسرائیل کے وہ سردار تو خدا سے بہت دُور پڑے ہوئے تھے اس لیے اگر انسان کے لیے ان آنکھوں سے خدا کو دیکھنا ممکن ہے تو خدا کا ایک نبی اسے دیکھ سکتا ہے جس کے ساتھ وہ کلام بھی کرتا ہے۔ جواب ملا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ بلکہ وہ اپنی تجلّیات سے دیکھا جاتا ہے۔ اور اس کی تجلّیات کیا ہیں۔ قدرت کے سب کام اس کی تجلیات ہیں ہیں۔ ہاں بعض تجلیات دوسروں سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس وقت اپنی تجلّی کا ایک زبردست نمونہ دکھایا جس سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا یہی وہ رنگ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا طاقتور ہاتھ دنیا میں کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بڑے بڑے انسان اور بڑی بڑی قومیں جو پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے طاقتور ہاتھ کے سامنے یوں پاش پاش ہوجاتے ہیں کہ گویا کچھ بھی نہ تھے۔ اور شاید اس تجلی کے دکھانے میں بھی یہ اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کے سامنے

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٤﴾

کہا اے موسٰی میں نے تجھے اپنے پیغاموں اور اپنے کلام سے (دوسرے) لوگوں پر چن لیا — سو جو میں نے تجھے دیا ہے وہ لے، اور شکر کرنے والوں میں سے ہو ع۱۱۵۲

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٤٥﴾

اور ہم نے اس کے لیے تختیوں میں ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل فرض کر دی — سو اس کو مضبوطی سے پکڑ اور اپنی قوم کو حکم دے کہ اس کی بہترین باتیں پکڑے میں تم کو نافرمانوں کا گھر (بھی) دکھا دوں گا ع۱۱۵۳

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِىَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَىِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٤٦﴾

میں اپنی آیات سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں اور اگر وہ ہر ایک نشان بھی دیکھ لیں تو اس پر ایمان نہ لائیں اور اگر وہ درستی کی راہ دیکھ لیں، تو اسے (اپنا) راستہ نہ ٹھیرائیں اور اگر وہ گمراہی کا رستہ دیکھ لیں تو اسے (اپنا) رستہ بنا لیں، یہ اس لیے کہ انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غافل رہے ع۱۱۵۴

مشکلات کے پہاڑ بھی ہونگے تو اُڑ جائیں گے۔

حضرت موسٰی کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس تجلی میں ایک اور اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی کامل تجلی حضرت موسٰی کے لیے مقدر نہ تھی، بلکہ اس کا ظہور محمد مصطفٰے صلعم کے لیے مقدر تھا۔ اسی لیے حضرت موسٰی کے اس ریزہ ریزہ شدہ پہاڑ کے مقابل پر رسول اللہ صلعم پر تجلی کے مقام کو بلد امین کے نام سے موسوم کیا ہے وطور سینین وھذا البلد الامین (التین ۹۵ - ۲و۳)

حضرت موسٰی کے ان آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھ سکنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قیامت کے دن بھی مومن اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھ سکیں گے کیونکہ وہ اور حواس ہونگے۔

ع۱۱۵۲ کلام الٰہی اور رسالت: یہاں رسالت اور کلام کو الگ الگ کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کلام ان سے بھی کرتا ہے جن کے سپرد رسالت کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ جیسے اس امت کے مجددین، رسالت پیغام ہے جو عموماً حکم کے رنگ کا ہوتا ہے اور کلام میں پیشگوئیاں وغیرہ داخل ہیں۔

ع۱۱۵۳ کتبنا۔ کتاب بمعنی اثبات۔ ایجاب۔ فرض بھی آتا ہے (غ) پس مراد یہاں فرض کر دینا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو انسان کی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ اس کی تحریر انسان کی تحریر کی طرح نہیں ہو سکتی اس کا لکھنا اس کا فرض کر دینا ہے جیسے کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی (المجادلۃ ۵۸ - ۲۱) میں بھی یہی مراد ہے۔ ایسا ہی کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت (البقرۃ ۲ - ۱۸۰) میں یا کتب علیکم الصیام (البقرۃ ۲ - ۱۸۳) میں۔

اللہ تعالیٰ کے توریت لکھنے سے مراد: ان تمام موقعوں پر فعل کتاب اللہ کی طرف منسوب ہے اس لیے اگر توریت کو الواح میں خدا نے خود لکھا تھا تو قرآن میں بھی یہ احکام خود ہی لکھے۔ یہ کہنا کہ توریت اپنے ہاتھ سے لکھی۔ اور قرآن اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا ایک بے معنی تفریق ہے۔ اس بارہ میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے اگر کتابوں میں کوئی کتاب خصوصیت سے ممتاز ہے تو وہ قرآن کریم ہے۔ اس کے مقابل میں توریت کے علوم سمندر کے مقابل میں ایک چھوٹی سی ندی کا حکم بھی نہیں رکھتے۔

توریت میں ہر چیز کی تفصیل سے مراد: لکل شیٔ یعنی ہر چیز جن کی ان کو اس وقت حاجت تھی۔ کیونکہ باوجود اس تفصیل کے بعد میں جو انبیاء آئے ان کو کتابیں بھی دی گئیں جیسے داؤد کو زبور اور عیسٰے کو انجیل اور ان کتابوں میں ان باتوں کی تفصیل تھی جن کی ضرورت ان انبیاء کے وقت میں پیش آئی۔

باحسنھا۔ تعلیم جو خدا کی طرف سے آتی ہے سب ہی احسن ہوتی ہے مگر چونکہ یہاں ایک بلند مقام کی طرف اشارہ ہے اس لیے خصوصیت سے احسن وجہ پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے۔ اگر نبی کے پہلے متبعین ہی اعلےٰ مقامات پر نہ پہنچیں تو پچھلے بہت ہی گر جائیں گے۔ اسی کی طرف دار الفاسقین میں اشارہ کیا ہے یعنی اس قوم کی حالت ایک وقت نافرمانی کی ہو جانیوالی ہے اور فاسقوں کا جو انجام ہوتا ہے وہ بھی تم دیکھ لوگے دار الفاسقین سے یہی مراد ہے یا یہ کہ تم کو دکھا دونگا کہ فاسقوں کا انجام کیسا ہوتا ہے۔

ع۱۱۵۴ ہو سکتا ہے کہ اس کلام کا خطاب کفار مکہ سے ہو اور ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل سے ہی یہ خطاب منقول ہو۔ متکبر اپنے کبر کی وجہ سے حق اور صداقت سے

وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ لِقَآءِ الْاٰخِرَةِ
حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع

اور جنھوں نے ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے عمل بے کار ہوئے ، ان کو کوئی بدلہ نہ ملے گا ، مگر وہی جو عمل کرتے تھے ۔

وَ اتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ
حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ
يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَ لَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ
اِتَّخَذُوْهُ وَ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

اور موسیٰؑ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنا لیا ، ایک جسم جس میں سے گائے کی آواز نکلتی تھی کیا انھوں نے نہ دیکھا کہ وہ ان سے کلام نہیں کرتا اور نہ ان کو رستہ دکھاتا ہے اس کو (معبود) بنالیا اور وہ ظالم تھے ۱۱۵۵

وَ لَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَ رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ
ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا
وَ يَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

اور جب وہ پشیمان ہوئے — اور دیکھ لیا کہ وہ یقیناً گمراہ ہوگئے کہنے لگے اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں نہ بخشا تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے ۱۱۵۶

وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ
اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ
بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ اَلْقَى

اور جب موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف لوٹ کر آیا غضبناک افسوس کرتا ہوا — کہا میرے پیچھے تم نے میری بُری نیابت کی ۱۱۵۷ ۔ کیا تم نے اپنے رب کے امر کو جلد چاہا ۱۱۵۸ اور تختیاں

دور جا پڑتا ہے یہاں تک کہ غلطی اسے اچھی معلوم ہوتی ہے اور دلائل اور نشانات کی وہ کچھ پروا نہیں کرتا ۔ تکبر تمام بدیوں کی جڑ ہے ۔

ع ۱۱۵۵ حُلِیّ ۔ حَلْی کی جمع ہے ۔ زیورات ۔ اسی سے ہے یحلون فیہا من اساور من ذہب (الکہف ۱۸ ۔ ۳۱) وحلّوا اساور من فضّة (الدھر ۷۶ ۔ ۲۱) اور حلیۃ کے معنی بھی زیور ہیں او من ینشؤا فی الحلیۃ (الزخرف ۴۳ ۔ ۱۸) جنگل میں اور مال و دولت تو کیا ہوگا ۔ زیورات جو کچھ پاس تھے ان کو اکٹھا کرکے یا ان میں سے بطور چندہ لیکر ایک بچھڑے کی صورت بنالی ۔

جسداً ۔ عجلاً سے بدل ہے یا اس کی صفت یعنی وہ محض ایک جسم تھا جس کے اندر کوئی جان نہ تھی ۔

خوار ۔ گائے کی آواز کو کہتے ہیں ۔

اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا منقطع نہیں ہوسکتا : بچھڑے کے معبود بنانے کے خلاف جو دلیل یہاں دی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ان سے بات نہیں کرتا تھا اور نہ رستہ بتاتا تھا پس معلوم ہوا معبود وہ ہوسکتا ہے جو کلام بھی کرے اور رستہ بھی دکھائے جو لوگ اس زمانہ میں خدا کا کلام کرنا بالکل منقطع مانتے ہیں وہ اس کی معبودیت کے خلاف اسی دلیل سے اپنے آپ کو ملزم ٹھہراتے ہیں ۔

ع ۱۱۵۶ سقط فی ایدیھم ۔ سُقُوط ایک چیز کا بلند مکان سے پست مکان میں گرنا ہے اور سقط فی ایدیہم بطور محاورہ کے نادم ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔

ع ۱۱۵۷ اسفا ۔ اَسَف وہ غم ہے جس کے ساتھ غضب بھی ملا ہوا ہو گو صرف بمعنی غم و بمعنی غضب بھی آتا ہے (رغ) حضرت موسیٰ کو بذریعہ وحی قوم کی اس لغزش کا علم ہوگیا تھا ۔ قال فانا قد فتنا قومک من بعدک و اضلھم السامری (طٰہٰ ۲۰ ۔ ۸۵) اس لیے آپ قوم کے اس مشرکانہ فعل پر غصہ میں تھے ۔ ایسے امور میں غضب کا آنا مذموم نہیں بلکہ مستحسن ہے ۔

ع ۱۱۵۸ عجلتم امر ربکم کے معنی کئی طرح پر کیے گئے ہیں عجلتم عما امرکم بہ ربکم یعنی تمہارے رب نے جو وعدہ تم سے کیا تھا اس کے بارے میں جلدی کی ۔ کشاف میں عجلتم عن امر ربکم مراد لیکر عجل عن الامر کے معنی کیے ہیں ترکہ غیر تام یعنی اسے نامکمل چھوڑا ۔ لیکن سورۃ طٰہٰ میں اس کی تفسیر خود موجود ہے جہاں آیۃ ۸۶ میں ایسا ہی ذکر کرکے فرمایا افطال علیکم العھد ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم یعنی کیا چالیس رات کا عہد تمہیں لمبا معلوم ہوا ۔ یا تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب نازل ہو ۔ پس امر ربکم سے مراد رب کی سزا یا اس کا غضب ہی ہے اور امر بمعنی سزا قرآن کریم میں آیا ہے ۔ مراد یہ ہے کہ سزا تو قوم پر پیچھے دیر سے آیا کرتی ہے مگر تم نے اس کو میری زندگی میں اور میرے سامنے اس قدر جلدی لانا چاہا ۔

الْاَلْوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ
اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ
وَ كَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۖ٘ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ
الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۱۵۰

ڈال دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اس کو اپنی طرف
کھینچا ۔ اس نے کہا ماں کے بیٹے قوم نے مجھے کمزور سمجھا
اور قریب تھا کہ مجھے مار دیں، سو دشمنوں کو مجھ پر مت ہنسا۔
اور مجھے ظالم لوگوں کے ساتھ نہ ملا ع۱۱۵۹

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِاَخِيْ وَ اَدْخِلْنَا فِيْ
رَحْمَتِكَ ۖ٘ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۱۵۱ ع

(موسیٰؑ نے) کہا میرے رب میری اور میرے بھائی کی حفاظت فرما اور
ہم کو اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب رحم کرنیوالوں سے بڑھ کر رحم کرنیوالا ہے ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ
غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ۱۵۲

جن لوگوں نے بچھڑا بنایا ، ان کو اُن کے رب کی طرف سے ناراضگی
اور دنیا کی زندگی میں رسوائی پہنچ کر رہے گی اور اسی طرح ہم
جھوٹ بنانے والوں کو سزا دیتے ہیں ع۱۱۶۰

وَ الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ
بَعْدِهَا وَ اٰمَنُوْۤا ؗ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ
بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۱۵۳

اور جنھوں نے برے کام کیے ، پھر اس کے بعد توبہ کی اور ایمان لائے
یقیناً تیرا رب اس کے بعد بخشنے والا رحم کرنے
والا ہے ۔

وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ
الْاَلْوَاحَ ۖۚ وَ فِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّ رَحْمَةٌ
لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ۱۵۴

اور جب موسیٰؑ کا غصہ کم ہوا تختیاں لیں — اور
ان کی تحریر میں اُن لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت
تھی جو اپنے رب سے خوف رکھتے ہیں ع۱۱۶۱

وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا
لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ

اور موسیٰؑ نے اپنی قوم کے ستر آدمی ہمارے وعدہ کے
لیے چُن لیے ع۱۱۶۲ پھر اُن کو زلزلے نے آلیا ۔ کہا، میرے

ع۱۱۵۹ تشمت ۔ شمت سے ہے اور شَمَاتَۃ اس خوشی کو کہا جاتا ہے جو دشمن کے مبتلائے مصیبت ہونے پر ہو اور تَشْمِیْت چھینکنے والے کو جو دعا دی جائے اسے کہتے ہیں گویا اس طرح اس سے شماتت کا ازالہ کیا جاتا ہے ۔ (غ)

ان الفاظ سے قرآن کریم نے حضرت ہارونؑ کے بچھڑا بنانے میں شرکت سے صاف انکار کیا ہے اور یوں بائبل کے اس بیان کو غلط ٹھہرایا ہے کہ ہارون نے ہی یہ بچھڑا بنایا تھا حضرت ہارون جیسا کہ یہاں سے معلوم ہوتا ہے صرف اس لیے خاموش رہے کہ انھیں خوف تھا کہ اگر انہوں نے حکماً روکا تو لوگ انھیں قتل کر دیں گے ۔ حضرت موسیٰ کا سر پکڑ کر ان کو کھینچنا اس غصہ کی وجہ سے تھا جو ان کو صحیح طور پر تھا ۔ اور انھیں یہ بھی خیال ہوگا کہ ہارونؑ نے کیوں ان کو حکماً اس سے نہیں روک دیا ۔ آخر جب وجہ سمجھی تو بھائی کو اپنے ساتھ دعا میں شامل کیا ۔ حضرت ہارون کا ابن اُم سے خطاب کرنا رحمت کی طرف توجہ دلانے کو ہے ۔

ع۱۱۶۰ ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ البقرۃ ۔ ۵۴ میں جو فاقتلوا انفسکم کا حکم ہے اس سے مراد فی الواقع قتل نہیں کیونکہ یہاں سزا صرف اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور دنیا میں رسوائی بتائی ہے اور اگلی آیت میں اس سزا کے ٹل جانے کی صورت توبہ بتائی ہے ۔

ع۱۱۶۱ خروج ۳۲ ۔ ۱۹ میں ہے کہ موسیٰ نے غصہ میں تختیاں توڑ ڈالیں مگر قرآن اس کا موید نہیں اور نہ یہ نبی کی شان کے شایاں ہے ۔ قوم پر ناراض ہو کر احکام خدا کا استخفاف نبی کا کام نہیں ہو سکتا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم توریت سے نقل نہیں کرتا بلکہ اصل سرچشمہ کوئی اور ہے اسی لیے موقعہ موقعہ پر بائبل کی غلطیوں کی اصلاح کرتا چلا جاتا ہے ۔ اسی ایک واقعہ میں تین اہم امور میں بائبل کے قصہ کی اصلاح فرمائی ہے اوّل حضرت ہارون کی شرک عجل میں علیحدگی حالانکہ بروئے بائبل ہارون ہی بچھڑا بنانے والے تھے ۔ دوم یہی تختیوں کا توڑنا ، سوم بچھڑے کو جلا کر اس کی خاکستر کو پانی میں ملا کر بنی اسرائیل کو پلانا جو ایک بے معنی بات ہے ۔

ع۱۱۶۲ ذکر عجل کے بعد کلام کا رجوع پھر اسی اصل واقعہ کی طرف کیا ہے جو حضرت موسیٰ کے طور پر جانے کا واقعہ ہے ۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ قرآن کریم نے حضرت موسیٰ کی صرف ایک ہی میقات کا ذکر کیا ہے توریت میں دو دفعہ طور پر جانے کا ذکر ہے جس کی وجہ توریت کی تختیوں کا ٹوٹ جانا ہے ۔ یعنی چونکہ پہلی دفعہ جو

رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ
اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاۗءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ
اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاۗءُ وَتَهْدِيْ
مَنْ تَشَاۗءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا
وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ١٥٥

رب اگر تو چاہتا ان کو اور مجھے پہلے سے ہی ہلاک کر دیا ہوتا
کیا تو ہم کو اس کے لیے ہلاک کرتا ہے جو ہم میں سے بیوقوفوں نے کیا۔ یہ صرف
تیری آزمایش ہے۔ تو اس کے ساتھ جسے چاہتا ہے گمراہ ٹھیراتا ہے
اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے تو ہی ہمارا ولی ہے سو ہماری حفاظت
فرما اور ہم پر رحم کر اور تو سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے ۱۱۶۳ع

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي
الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ قَالَ عَذَابِيْٓ
اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ
كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ
يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ١٥٦

اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ دے اور آخرت میں،
ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔ کہا، میرا عذاب اس
میں جسے چاہوں مبتلا کروں اور میری رحمت ہر شے پر
حاوی ہے سو میں اس کو ان کے لیے لکھ دوں گا جو تقوےٰ کرتے ہیں
اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں ۱۱۶۴ع

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ
الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ
وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ
عَلَيْهِمُ الْخَـبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ
وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ

اور وہ جو رسول نبی امّی کی پیروی کرتے ہیں، جسے
وہ اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں
وہ اُن کو بھلی باتوں کا حکم دیتا، اور ان کو بُری باتوں
سے روکتا اور ان کے لیے ستھری چیزیں حلال کرتا اور
ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا اور ان سے ان کا بوجھ
اتارتا ہے اور وہ طوق بھی جو ان پر تھے ــــ سو جو لوگ

تختیاں حضرت موسیٰ لائے تھے وہ غصّہ میں آکر توڑ دیں اس لیے دوبارہ پھر تختیاں وہیں سے لینے گئے مگر چونکہ قرآن کریم اس تختیوں کے توڑنے کے واقعہ کو ہی تسلیم نہیں کرتا اس لیے دوسری میقات کا اس میں نہ کوئی ذکر ہے اور نہ ہو سکتا ہے اور مفسرین کا یہ خیال کہ بچھڑے کی پرستش کی وجہ سے جو ناراضگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی اس کے لیے پھر جانے کی ضرورت پیش آئی یا حضرت موسیٰ پر ہارونؑ کے قتل کا الزام جب بنی اسرائیل نے لگایا تو اس کی صفائی کے لیے ہارونؑ کی قبر پر ان ستر آدمیوں کو لیکر حضرت موسےٰ گئے محض قصّے ہیں۔ پس یہ ستّر آدمی وہی تھے جو اس وقت حضرت موسیٰ کے ساتھ گئے جب آپ کو شریعت دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے طور پر بلایا تھا۔ اور انہوں نے ہی کہا تھا لن نومن لك حتى نرى الله جهرة (البقرۃ ۲۔ ۵۵) اور اس کے مطابق ابن جریر میں ایک روایت بھی موجود ہے اور ذکر عجل کے بعد پھر طور والے واقعہ کا ذکر اس لیے کیا کہ اس پیشگوئی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو توریت میں حضرت موسیٰ کو بتائی گئی۔ جیسا کہ آیت ۱۵۷ میں صاف اس کی تصریح فرما دی۔

ع۱۱۶۳ الرجفة کے لیے دیکھو ۱۱۱۳ع سورۂ بقرہ کی آیت ۵۵ میں اسی کو الصاعقة کہا ہے جس کو یہاں الرجفة کہا ہے اور دونوں جگہ ایک ہی واقعہ کا ذکر ہے فاخذ تهم الرجفة وهي الصاعقة (ج) اب گو الصاعقة کئی معنوں میں آتا ہے مگر الرجفة صرف زلزلہ کے معنی میں آتا ہے اور چونکہ صاعقة کے معنی صوت شدید یعنی سخت آواز ہیں اس لیے اس سے مراد وہ آواز ہے جو بڑے زلزلہ سے پہلے آتی ہے۔

یہاں بعض مفسرین نے صرف غشی کا واقع ہونا مراد لیا ہے قيل غشي عليهم ثم افاقوا (د) یعنی ان کو صرف غشی آئی تھی پھر افاقہ ہو گیا او اصعقهم فسلب افهامهم (ج) یعنی ان پر صاعقہ بھیجا اور ان کے فہموں کو سلب کر لیا اور یہی حق ہے جیسا کہ ع۹۰ میں دکھایا جا چکا ہے اور جو بیوقوفوں نے کیا اس سے مراد ان کا یہ کہنا ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کو کھلا کھلا نہ دیکھ لیں ہم ایمان نہ لائیں گے۔

ع۱۱۶۴ رحمتي وسعت كل شيء۔ اس قدر وسیع رحمت الٰہی کا علم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی اللہ تعالیٰ نے دیا، جو دنیا کی تمام اشیاء پر حاوی ہے جس میں مسلم اور کافر، فرمانبردار اور عاصی دونوں آ جاتے ہیں۔ وہ رحمان ہے اور اس کی رحمت بلا عمل کام کرتی ہے اس لیے کفار کو بھی اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ مگر مومنوں کے لیے خصوصیت سے اس کا اثبات کیا ہے۔

اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا
النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ ۱۵۷ ١٩ ع
قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ
جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ
بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۱۵۸

اس پر ایمان لائیں اور اس کی تعظیم کریں اور اس کو مدد دیں اور اس نور کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے وہی کامیاب ہوں گے [۱۱۶۵]

کہہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ وہ جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے۔ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی پر جو اللہ اور اس کے کلموں پر ایمان لاتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ [۱۱۶۶]

ع ۱۱۶۵ الامّی۔ اُمی ناخواندہ کو بھی کہتے ہیں اور اس شخص کو بھی جو ام القریٰ یعنی مکّہ کی طرف منسوب ہو دیکھو ع ۱۰۲ اور نبی اُمّی سے مراد نبی عربی ہی ہے جیسا کہ آگے دکھایا جائے گا۔

اِصرھم۔ اِصْر کے معنی کے لیے دیکھو ع ۳۶۵ یہاں مراد ایسا عہد ہے جس کا نقض خیرات سے محروم کر دیتا ہے جیسے وہ عہد جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ لیا جاتا ہے اور عام طور پر کسی امر کو کہا جا سکتا ہے جو خیرات سے روک دے (غ)

اغلال۔ غُلّ کی جمع ہے دیکھو ع ۸۵۰ وہ لوہا جس کے ذریعہ سے ہاتھ گردن سے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ اس سے مراد بھی ایسی چیز ہے جو انسان کو کام سے روک دے۔

عزروہ۔ تعزیر۔ اس نصرت کو کہتے ہیں جس کے ساتھ تعظیم ملی ہوئی ہو اور اسی سے تعزیر سزا کے معنی میں ہے کیونکہ وہ بھی ایک نصرت ہے جو ظلم سے روکتی ہے (غ)

حضرت موسیٰ کو توریت ملنے کے ذکر میں اس پیشگوئی کا ذکر کر دیا ہے اور ضروری تھا کہ کیا جاتا جو توریت میں آنحضرت صلعم کی آمد کے متعلق ہے بلکہ اسی غرض کے لیے حضرت موسیٰ کا ذکر بھی کیا تھا اس پیشگوئی میں رسول نبی امّی کا ذکر کیا ہے۔ اُمّی کے معنی اگر ناخواندہ لیے جائیں تو پیشگوئی میں کسی ناخواندہ رسول کے آنے کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن اس کے معنی اگر منسوب بہ اُم القریٰ یعنی مکّی یا عربی لیے جائیں تو پیشگوئی میں رسول عربی کا ذکر ہے کیونکہ حضرت موسیٰ کی اس پیشگوئی میں جو استثناء ۱۸: ۱۵۔ ۱۸ میں ہے۔ بنی اسرائیل کو خطاب کر کے یہ صاف ذکر ہے کہ تیرے بھائیوں میں سے ایک نبی اٹھاؤں گا اور ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کی بھائی قوم بنی اسمٰعیل ہی تھی۔ گویا یوں بتا دیا کہ وہ رسول عربی ہوگا۔ اور پھر فاران سے اس کے طلوع کا ذکر بھی موسیٰ کی کتاب میں موجود ہے۔

انجیل میں آنحضرتؐ کی پیشگوئی: دوسری بات اس رسول کے متعلق یہ بتائی کہ اس کا ذکر توریت میں ہی نہیں، بلکہ انجیل میں بھی ہے۔ انجیل میں یہ ذکر دو طرح پر موجود ہے۔ ایک اس طرح پر کہ اسی مثل موسیٰ رسول کا ذکر انجیل میں ہے دیکھو یوحنا ۱: ۲۱ کہ وہ اس وقت تک نہ آیا تھا اور دوسرے اس طرح پر کہ انجیل میں حضرت عیسیٰ کی پیشگوئی دوسرے فارقلیط کے آنے کی ہے۔ دیکھو یوحنا باب ۱۴۔ ۱۶۔ یہ کھلی کھلی پیشگوئیاں ہیں جو اور کسی کے حق میں پوری نہیں ہوئیں۔

رسول موعود کی صفات: اس کے بعد اس رسول کی صفات بیان کی ہیں۔ اِصر اور اغلال کے دور کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو دور کرتا ہے جن سے انسان نیکیوں کے کرنے میں رکتا ہے۔ گویا بدیوں کی جڑ کاٹتا ہے اور انسان کی ترقی کی حقیقی راہ کھولتا ہے۔ اہل کتاب کے لیے یہ ایک کھلا نشان آنحضرت صلعم کی صداقت کا تھا کہ کس طرح وہ لوگ جن کی اصلاح سے یہودی اور عیسائی دونوں عاجز آ چکے تھے آنحضرت صلعم کی قوت قدسی سے ہر قسم کی بدیوں سے پاک ہوتے چلے جاتے تھے۔ کس طرح صدیوں کی بدیوں اور رسم و رواج کی قیدوں سے وہ آزاد ہوتے چلے جاتے تھے۔ اس طرح پر نیکی کا دنیا میں پھیلانا سوائے صادق کے دوسرے کا کام نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے جب پیشگوئی کا ذکر کیا تو یہ بھی بتایا کہ جن بیڑیوں کو تم نہیں کاٹ سکے ان کو عرب کے ایک اُمی نے کاٹ دیا اور یہی اس کے منجانب اللہ ہونے کا کافی نشان ہے۔

ع ۱۱۶۶ ساری نسل انسان کا نبی: یہ اس نبی عربی کی خصوصیت بتائی اور بتایا کہ اس کے لیے ان پیشگوئیوں کا توریت و انجیل میں ذکر بے معنی نہ تھا۔ بلکہ اس قدر اہمیت اس کے ذکر کو اس لیے دی گئی کہ اس نے دنیا کی سب قوموں کی طرف رسول ہو کر آنا تھا۔ آپ سے پہلے تمام رسول ایک ایک قوم کی طرف آئے جیسا کہ خود ان انبیاء کے ذکر سے جو اس سورت میں ہو چکا ظاہر ہے کیونکہ اس وقت کے حالات اسی کے مقتضی تھے۔ لیکن اس کا نتیجہ قومی تفرقہ اور بُعد ہُوا اس لیے سب سے آخر اللہ تعالےٰ نے ایک ایسا رسول بھیجا جو ساری قوموں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرے اور ساری نوع انسانی میں وحدت پیدا کرے۔ دنیا کے جس قدر مذاہب اسلام سے پہلے ہوئے وہ سب قومی مذاہب تھے اور جس قدر نبی ہوئے وہ سب قومی نبی تھے۔ مگر کل نسل انسانی کا مذہب اور کل بنی نوع انسان کا نبی ایک ہی ہُوا ہے جس کے منہ میں یہ لفظ ڈالے گئے اِنی رسول اللہ الیکم جمیعا۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ
وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

اور موسیٰؑ کی قوم میں سے ایک جماعت ہے جو حق کے ساتھ ہدایت کرتے اور اس کے ساتھ عدل کرتے ہیں ع۱۱۶۷

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ
وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ
اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ
مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ
اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ
وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا
وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

اور ہم نے ان کو بارہ قبیلوں میں (الگ الگ) قومیں بنا کر تقسیم کر دیا اور ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی جب اس کی قوم نے اس سے پانی مانگا کہ اپنے عصا کو چٹان پر مار۔ تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، ہر ایک قوم نے اپنا گھاٹ جان لیا اور ہم نے ان پر بادلوں کا سایہ کیا، اور ہم نے اُن پر من اور سلوے اتارا۔ ستھری چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں کھاؤ اور انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا
حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ
سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

اور جب ان کو کہا گیا اس بستی میں رہ پڑو اور جہاں سے چاہو اس سے کھاؤ اور کہو ہمارے گناہ معاف کیے جائیں اور دروازے میں فرمانبرداری کرتے ہوئے داخل ہو، ہم تمھاری خطائیں بخش دیں گے احسان کرنے والوں کو ہم بڑھ کر دیں گے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِیْ
قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ
بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ ع

مگر ان لوگوں نے جو اُن میں سے ظالم تھے اس بات کے سوائے جو ان کو کہی گئی تھی دوسری بات بدل دی۔ سو ہم نے ان پر آسمان سے وبا بھیجی اس لیے کہ وہ ظلم کرتے تھے ع۱۱۶۸

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِیْ كَانَتْ حَاضِرَةَ
الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِی السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ
حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا
يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛۚ كَذٰلِكَ ۛۚ نَبْلُوْهُمْ
بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

اور ان سے اس بستی کا حال پوچھ جو دریا پر واقع تھی۔ جب وہ سبت کے بارے میں حد سے بڑھتے تھے۔ جب ان کے سبت کے دن ان کی مچھلیاں پانی کے اوپر ان کے سامنے آجاتیں اور جس دن اُن کا سبت نہ ہوتا ان کے سامنے نہ آتیں۔ اسی طرح ہم انکو آزماتے رہے اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ع۱۱۶۹

ع۱۱۶۷ یہ بتانا مقصود ہے کہ ساری قوم نافرمان نہ تھی، ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو حق کے ساتھ دوسروں کو ہدایت بھی کرتے۔ اس لیے خود بھی حق پر قائم ہوتے اور معاملات میں بھی حق کے ساتھ عدل کا معاملہ کرتے۔

ع۱۱۶۸ ان واقعات کو تیسری دفعہ بیان کیا ہے۔ پہلی دفعہ سورۂ بقرہ میں حضرت موسیٰؑ کے ذکر میں۔ دوسری دفعہ سورۂ نساء میں حضرت عیسیٰؑ کے ذکر میں، تیسری دفعہ یہاں آنحضرت صلعم کے ذکر میں اور ہر مقام پر لانے میں ایک خاص غرض ہے۔

ع۱۱۶۹ القریۃ اس بستی کو بعض نے ایلہ کہا ہے جو مدین اور طور کے درمیان بحیرۂ قلزم پر واقع ہے اور بعض نے خود مدین۔ حیتان۔ حوت کی جمع ہے مچھلی۔ شرعا۔ شارع کی جمع۔ شرع سے ہے جس کے معنی ہیں اظہار و تبیین ہے اس لیے شرعا کے معنی ہیں ظاہرۃ علی وجہ الماء یعنی پانی کے اوپر نظر آنے والیاں سبت کے دن مچھلیوں کا پانی کے اوپر آجانا اور دوسرے دنوں میں نہ آنا یہودیوں کے لیے موجب ابتلا ہوا۔ اس لیے کہ سبت کے دن ان کو شکار کی ممانعت تھی

وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَاۨ اللّٰهُ
مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا
مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۱۶۴
فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ
يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝۱۶۵
فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا
قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝۱۶۶
وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ
اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۚۖ وَ اِنَّهٗ
لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۶۷
وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ
الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ؗ وَ بَلَوْنٰهُمْ
بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۱۶۸
فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ
يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ

اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا تم کیوں اس قوم کو وعظ کرتے ہو جسے اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا ان کو سخت عذاب دینے والا ہے، انھوں نے کہا تاکہ تمھارے رب کے سامنے معذور ہوں اور شاید کہ وہ تقویٰ کریں

سو جب انھوں نے اسے چھوڑ دیا جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی، ہم نے ان کو بچا لیا جو بدی سے روکتے تھے اور جو ظالم تھے ان کو سخت عذاب میں پکڑ لیا اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔

سو جب انھوں نے اس سے سرکشی کی جس سے روکے گئے تھے۔ ہم نے انھیں کہا ذلیل بندر ہو جاؤ۔ ع۱۱۷۰

اور جب تیرے رب نے خبر دے دی کہ ان پر قیامت کے دن تک ایسے لوگوں کو اُٹھاتا رہے گا جو اُن کو بُرا عذاب دیتے رہیں۔ بیشک تیرا رب بدی کی سزا جلد دیتا ہے اور یقیناً وہ بخشنے والا رحم کرنے والا بھی ہے۔ ع۱۱۷۱

اور ہم نے انھیں فرقے بنا کر ملک میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ کچھ اُن میں سے صالح ہیں اور کچھ اَور طرح کے ہیں، اور ہم اُن کو سُکھوں اور دُکھوں سے آزماتے رہے تاکہ وہ رجوع کریں۔

پھر اُن کے پیچھے ایسے ناخلف لوگ آئے جو کتاب کے وارث ہوئے وہ اس ادنیٰ زندگی کا سامان لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم کو بخش

اور مچھلیوں کے اس دن اوپر آنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس دن اس کا شکار نہ کیا جاتا تھا اور جانور کی یہ عادت ہے کہ وہ وقت کو پہچانتا ہے۔

اس رکوع میں بھی یہود کی سرکشی کی مثالیں دی ہیں۔ نبی کریم صلعم کو تسلی دینے کے لیے ان مثالوں کو اس وقت پیش کیا ہے جب ابھی یہود سے آپ کا معاملہ نہیں پڑا تاکہ جب یہ قوم آپ کے ساتھ سرکشی سے پیش آئے تو آپ کو رنج نہ ہو اور یہ علم ہو کہ اس قوم کی عادت ہی سرکشی رہی ہے۔ ان لوگوں نے کس قدر غلطی کھائی ہے جنھوں نے یہ خیال کیا ہے کہ پہلے پہلے نبی کریم صلعم یہود کو اچھا کہتے تھے اور جب مدینہ میں اس قوم نے آپ کی مخالفت کی تب ان کو بُرا کہنا شروع کیا۔ حالانکہ یہ سورت بالاتفاق مکّی ہے۔ اور اس وقت بھی قرآن کریم یہود کے اسی نقشہ کو پیش کرتا ہے جس کو بعد میں سورۂ بقرہ میں مدینہ میں پیش کیا ہے۔

ع۱۱۷۰ ان کے قردۃ یا بندر بننے کی تشریح ع۹۴ میں گزر چکی ہے۔ یہاں یہ بات مزید قابل غور ہے کہ ایک طرف تو اُن کے بندر بنانے کا ذکر کیا اور ساتھ ہی دوسری آیت میں یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تک ان پر ایسے لوگوں کو حاکم بناتا رہے گا جو اُن کو سخت دُکھ دیتے رہیں گے۔ حالانکہ حاکم انسانوں پر بنائے جاتے ہیں اور عذاب بھی انسان کو ہی دیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان کی صورتیں بندروں کی سی نہ بنی تھیں بلکہ انسانوں ہی کی رہی تھیں۔

ع۱۱۷۱ تاذّن۔ اِذن کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۲۳ اور تاذّن کے معنی اَعْلَمَ ہیں یعنی یہ علم دیدیا یا خبر دے دی۔

یہودیوں کے متعلق پیشگوئی: یہودیوں کے ہاتھ سے حکومت اسلام کے آنے سے پہلے نکل چکی تھی اور جہاں جہاں یہ قوم محکوم ہونے کی حالت میں رہی سخت ذلت کی حالت میں رہی۔ ہاں اسلام کے آنے سے پہلے یہ قوم صرف چند ایک قریب قریب کے ممالک میں ہی آباد تھی۔ اسلام کے بعد دنیا کے تمام ملکوں میں پھیل گئی اور جہاں کہیں رہی حکام وقت کی طرف سے بڑی بڑی خطرناک تکلیفیں اٹھاتی رہی۔ اور اس مصیبت کے متعلق جس کے نیچے اس وقت یہودی تھے۔ قرآن کریم نے یہ پیشگوئی کی کہ آیندہ بھی وہ رہیں گے۔ ہاں انہ لغفور رحیم میں خوشخبری بھی دی کہ کچھ رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف کریں تو ان کی بدیوں کو بخش بھی دے گا۔ یعنی اس سزا سے ان کو نکال دے گا۔

سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَإِنْ يَّأْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ
يَأْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ
الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ
وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ
لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾
وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا
الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾
وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ
وَّظَنُّوْا اَنَّهٗ وَاقِعٌ ۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَا اٰتَيْنٰكُمْ
بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ ع
وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ
ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ
بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾

دیا جائے گا اور اگر ان کے پاس اسی قسم کا سامان اور آجاتا ہے، اسے
بھی لے لیتے ہیں۔ کیا ان سے کتاب کے ذریعے عہد نہ لیا گیا تھا،
کہ اللہ پر سوائے حق کے کچھ نہ کہیں گے اور جو کچھ اس میں ہے
اسے پڑھتے ہیں اور پچھلا گھر اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ کرتے
ہیں — کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ۱۱۷۲ع
اور جو لوگ کتاب کو مضبوط پکڑتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں ہم
کبھی اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔
اور جب ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو ہلایا گویا وہ سائبان تھا،
اور انھوں نے خیال کیا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے
مضبوطی سے پکڑ لو اور جو کچھ اس میں ہے یاد رکھو تاکہ تم بچ جاؤ ۱۱۷۳ع
اور جب تیرے رب نے بنی آدم سے (یعنی) ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد
نکالی اور ان کو اپنے آپ پر گواہ ٹھیرایا، کیا میں تمھارا رب نہیں انھوں نے
کہا ہاں! ہم گواہ ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن کہو، ہم تو
اس سے بے خبر تھے ۱۱۷۴ع

ع۱۱۷۲ خَلْف کے عام معنی پیچھے ہیں۔ لیکن بالخصوص یہ لفظ بُرے محل پر استعمال ہوتا ہے بمقابلہ خَلَف کے جو اچھی جگہ پر بولا جاتا ہے یعنی خَلْف کے معنی ہیں المتأخّر لِقُصُورِ مَنْزِلتہ یعنی ایسا پیچھے آنے والا جو مرتبہ میں گر گیا ہو (غ)

عَرَض۔ متاع دنیا کو کہتے ہیں یا ایسے مال کو جس کے لیے ثبات نہ ہو (غ)

یقولون۔ قول۔ یہاں بمعنی اعتقاد ہے یعنی دین کو چھوڑ کر دنیا کو لیتے ہیں اور پھر امید رکھتے ہیں کہ ہم بخشے جائیں گے۔ منہ سے کہنا مراد نہیں۔

میثاق الکتاب سے مراد وہ میثاق ہے جو کتاب یعنی توریت میں مذکور ہے گویا اضافت بمعنی فی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پہلے لوگوں میں تو صالح بھی تھے مگر جو پیچھے آئے وہ اکثر ناخلف ہی تھے۔ مال دنیا کے حصول کے لیے دین اور اخلاق کی ان کو پروا نہ رہی۔ اور اعتقاد یہ رکھا کہ گناہ تو اللہ تعالیٰ بخش ہی دے گا۔ لیکن حالت یہ تھی کہ اپنے گناہوں پر اصرار تھا۔ حالانکہ مغفرت کی امید تو اس حال میں رکھنی چاہیئے جب انسان گناہ پر اصرار نہ کرے۔ یہ اصول گناہوں کی مغفرت کا بتایا۔ یہ بنی اسرائیل کے قصہ میں مسلمانوں کا نقشہ ہے۔

ع۱۱۷۳ نتقنا۔ نَتْق کے اصل معنی لغت میں الزَعْزَعَۃُ والھَزُّ ہیں (ل) یعنی ایک چیز کو حرکت میں لانا اور ہلا دینا۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے وَنَتَقُوا احلامنا الاثاقلا ہاں اس کے معنی جذب اور اقتلاع بھی آئے ہیں یعنی ایک چیز کا کھینچ لینا اور جگہ سے اکھیڑ دینا لیکن جب نَتَقْتُ الشیئَ کے معنی حَرَّکْتُہٗ صاف لغت میں موجود ہیں اور ابھی پیچھے رجفۃ یعنی زلزلہ کا ذکر گزر چکا ہے تو یہی معنی یہاں مراد لیے جائیں گے۔ اس لیے بھی کہ پہاڑ کو جگہ سے اُٹھا کر موسیٰ کے لشکر پر لانا اور پھر اُن سے اقرار پابندیٔ معاہدہ لینا اللہ تعالیٰ کے اس قانون کے خلاف ہے جو اپنی شرائع کے بارہ میں اس نے رکھا ہے فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔ (الکہف ۱۸۔ ۲۹)

ظُلَّۃ۔ اس بادل کو کہتے ہیں جو سایہ کرے اور اکثر استعمال اس کا اس میں ہے جسے ناپسند کیا جائے۔ عذاب یوم الظلۃ (الشعراء ۲۶۔ ۱۸۹) اور اس کی جمع ظلل ہے فی ظلل من الغمام (البقرۃ ۲۔ ۲۱۰) واذا غشیھم موج کالظلل (لقمٰن ۳۱۔ ۳۲) (غ)

اسی کیفیت کا ذکر کیا ہے جب وہ پہاڑ کے دامن میں تھے اور اوپر سے زور کا زلزلہ آیا جس سے ان کو معلوم ہوا کہ بس پہاڑ ان کے اوپر ہی گر پڑے گا۔

ع۱۱۷۴ میثاق فطرت۔ یہود کی خلاف ورزیٔ میثاق کا ذکر کرتے ہوئے اس میثاق کا ذکر کیا جس کا تعلق کسی خاص قوم سے نہیں بلکہ فطرت انسانی سے تعلق ہونے کی وجہ سے اس کا دائرہ سب انسانوں پر محیط ہے یعنی فطرت انسانی میں ایک نُور رکھا گیا ہے جو اسے حق کی طرف ہدایت کرتا ہے یا جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر شہادت

أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِن قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّن بَعْدِهِمْ ۖ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ ﴿١٧٣﴾
یا کہو صرف ہمارے باپ دادا نے پہلے شرک کیا اور ہم ان کے پیچھے (ان کی) اولاد تھے۔ تو کیا تو ہم کو اس کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے جو غلط کاروں نے کیا ع۱۱۷۵

وَكَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿١٧٤﴾
اور اسی طرح ہم کھول کھول کر باتیں بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ رجوع کریں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿١٧٥﴾
اور ان پر اس شخص کی خبر پڑھ دے جس کو ہم نے اپنی آیات دیں پھر وہ انھیں چھوڑ نکلا تب شیطان اس کے پیچھے لگا سو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا ع۱۱۷۶

دیتا ہے۔ وحی الٰہی اسی نور کی معاون ہو کر اس کی تکمیل کرتی ہے۔ پس یہودیوں کو گویا دونوں طرح پر خطاب کیا۔ اس خاص میثاق کی طرف بھی توجہ دلائی جو اُن سے ہوا تھا اور اس فطری میثاق کی طرف بھی جو سب انسانوں سے ہُوا اور یوں بھی وحی الٰہی کا مضمون جس پر اس سورت میں خاص بحث ہے نامکمل رہتا اگر اس نورِ فطرت کی طرف توجہ نہ دلائی جاتی جس کو چمکانے کے لیے وحی الٰہی آتی ہے۔

آیا یہ عہد آدم کی ذریت کو بکبر نبہ پیدا کر کے لیا گیا تھا جیسا کہ حضرت عمرؓ کی حدیث میں ہے؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس حدیث کی تشریح میں بھی غلطی کی جاتی ہے الفاظ حدیث یہ ہیں ان اللہ تعالیٰ خلق ادم ثم مسح ظھرہ بیمینه فاستخرج منه ذریة فقال خلقت ھولاء للجنة الخ یعنی اللہ نے آدم کو پیدا کیا پھر اس کی پیٹھ کو دائیں ہاتھ سے چھُوا پھر اس سے ایک ذریت نکالی اور کہا ان کو میں نے جنت کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان الفاظ کو اس رنگ میں ظاہر پر محمول کرنا کہ گویا سچ مچ اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ بھی تھا جس کے ساتھ اس نے فی الواقع آدم کی پیٹھ کو چھُوا صحیح نہیں نہ ہی قرآن و حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ نے تمام ارواح انسانی کو پہلے پیدا کر دیا تھا۔ بلکہ اس سے مراد ارواح کی وہ پیدائش ہے جو علم الٰہی میں ہے یا یوں کہو کہ یہ محض عالم مثال کا ذکر ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت پیدائش ہر ایک روح کی جسم کے ساتھ ہوتی ہے جیسا کہ صاف فرمایا ثم انشانه خلقا اخر (المومنون ۲۳-۱۴) ہاں ہر ایک چیز جو ہونے والی ہے وہ علم الٰہی میں پہلے موجود ہے اس لیے حدیث میں ذکر عالم مثال کا ہے اور یہی بات آیت کے صریح الفاظ سے معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں آدم کی پیٹھ سے اولاد نکالنے کا ذکر نہیں بلکہ بنی آدم کی پیٹھ سے نکالنے کا ذکر ہے۔ اور پھر ایک طرف تو کہا کہ بنی آدم سے ان کی اولاد نکالی اور دوسری طرف ساتھ ہی بدل کے طور پر فرمایا من ظھورھم ان کی پیٹھوں سے۔ پس اس سے مراد ہر ایک نسل کا اپنے آبا کی پیٹھوں سے پیدا ہونا ہے من ظھورھم کے لفظ نے صاف بتا دیا کہ اس سے مراد ایک نسل کے بعد دوسری نسل کا پیدا ہونا ہے۔

اشھدھم علی انفسھم اپنے آپ پر گواہ ٹھہرانے سے مراد یہ ہے کہ دلائل ربوبیت ان کی فطرت میں رکھ دیئے اور عقل انسانی میں ان کو مرکوز کر دیا اور اسی کی طرف حدیث میں اشارہ ہے کل مولود یولد علی الفطرة یعنی ہر ایک بچہ فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے اور قرآن کریم میں فرمایا فطرة اللہ التی فطر الناس علیھا (الروم ۳۰-۳۰) اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت جس پر سب لوگوں کو پیدا کیا۔ پس ان دونوں آیتوں اور حدیث کا مطلب ایک ہی ہے اور ابن جریر میں ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلعم کی اس حدیث کو سنکر الا انھا لیست نسمة تولد الا ولدت علی الفطرة حسن نے فرمایا کہ یوں ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے واذ اخذ ربك من بنی آدم من ظھورھم ذریتھم جس سے معلوم ہوا کہ اس آیت سے یہی مطلب انہوں نے بھی نکالا پس اشھدھم علی انفسھم میں یہ بتایا کہ فطرت انسانی اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ انسان اپنا رب آپ نہیں بلکہ اس کا رب کوئی ذات کامل مستجمع جمیع صفات کاملہ ہے جہاں سے کچھ حصہ انسان بھی پاتا ہے۔

شھدنا۔ بلیٰ کے ساتھ انسانوں کا قول بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی ان کی فطرت اس صداقت کا اقرار کرتی ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے یعنی اس صداقت کی کہ فطرت انسانی اپنے رب کا اقرار کرتی ہے ہم گواہی دیتے ہیں۔

ع۱۱۷۵ مبطلون۔ باطل وہ ہے جس کے لیے کوئی ثبات نہیں۔ اور ابطال کے معنی کسی چیز کو بگاڑ دینا اور اس کو نابود کرنا ہیں۔ اور مُبطل سے مراد حق کا ابطال کرنے والا (غ)

اس اعتراض کا جواب کہ تقلیداً بدیاں کرنے والے قابل الزام نہیں: مطلب یہ ہے کہ اصل مُبطل یعنی ابطال حق کرنے والے تو وہ لوگ تھے جنہوں نے پہلے شرک کر کے اس کی بنیاد رکھی۔ اور پیچھے آنے والی نسل محض ناقل ہے کیونکہ آبا و اجداد کی تقلید فطرت انسانی میں ہے۔ اس لیے پیچھے آنے والے اپنی بریت ظاہر کرتے ہیں۔ اس کا جواب اسی فطرت انسانی کے میثاق میں ہے یعنی وہ عقل و فطرت جس میں ربوبیت الٰہی مرکوز ہے وہ تو سب انسانوں کو ہم نے یکساں دی ہے۔ اس لیے تقلید غلط کاری کے لیے کوئی حجت نہیں۔

ع۱۱۷۶ انسلخ۔ سلخ حیوان کا چمڑا اتارنے کو کہا جاتا ہے اور اس لیے محض کسی چیز کا کھینچ لینا یا نکال لینا مراد لیا جاتا ہے نسلخ منه النھار (یٰس ۳۶-۳۷) اور انسلخ نکل گیا۔ فاذا انسلخ الاشھر الحرم (التوبة ۹-۵) (غ)

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿١٧٦﴾

اور اگر ہم چاہتے تو ان کے ذریعے سے اس کا مرتبہ بلند کرتے لیکن وہ زمین کے ساتھ لگ گیا اور اپنی خواہش کی پیروی کی ع۱۱۷۷ سو اس کی مثال کتے کی مثال کی مانند ہے، اگر تو اس پر حملہ کرے تو ہانپے اور چھوڑ دے تو ہانپے۔ یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ سو یہ حال بیان کر دے، تاکہ وہ فکر کریں ع۱۱۷۸

سَآءَ مَثَلَا ۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿١٧٧﴾

ان لوگوں کی مثال بُری ہے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور اپنے آپ پر ہی وہ ظلم کرتے ہیں ع۱۱۷۹

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٧٨﴾

جس کو اللہ ہدایت دے تو وہی ہدایت پانے والا ہے اور جس کو وہ گمراہ چھوڑ دے تو وہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ ۚ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ

اور یقیناً ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں۔ اور اُن کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں

اتبعہٗ۔ تبع کے معنی پیروی کی اور اَتبعہٗ کے معنی ہیں لَحِقَہٗ یعنی اسے پالیا یا پکڑ لیا۔ فاتبعوھم مشرقین (الشعراء ۲۶-۶۰) واتبعناھم فی ھٰذہ الدنیا لعنۃ (القصص ۲۸-۴۲) (غ)

اس سے مراد کوئی خاص شخص نہیں گو بعض نے بلعم کا اور بعض نے کسی راہب اور بعض نے اُمیہ کا نام لیا ہے۔ اس کا عام ہونا خود اگلی آیت سے واضح ہے جہاں یہ لفظ صاف ہیں ذٰلک القوم مثل الذین کذبوا بایٰتنا یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو ہمارے احکام کو جھٹلاتے ہیں۔ پس جس شخص کو احکام الٰہی پہنچیں اور وہ ان کی پروا نہ کرے یا ان کو قبول کر کے ردّ کر دے اس کا وہ نورِ فطری بھی بجھ جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شیطان جو اس کے پیچھے لگا ہوا ہوتا ہے اسے آپکڑتا ہے پھر جدھر اسے شیطان چلاتا ہے اسی طرف چلتا جاتا ہے۔

ع۱۱۷۷ اَخلد ۔ اِخْلاد۔ خُلد سے ہے اور اس کے معنی کسی چیز کا باقی رکھنا یا اس پر باقی رہنے کا حکم لگانا ہے۔ پس اخلد الی الارض کے معنی ہوئے اس کی طرف مائل ہو گیا یہ خیال کرتا ہوا کہ وہ اس میں باقی رہ جائے گا (غ)

ان الفاظ نے لفظ رفع کے معنی جس کی بحث ع۴۴۵ میں گزر چکی ہے پوری وضاحت سے کھول دیئے ہیں۔ یہاں رفع کے بالمقابل اخلد الی الارض یا زمین سے پیوست ہو جانے کے لفظ بھی موجود ہیں مگر تاہم نہ رفع سے مراد آسمان پر جانا ہے نہ اخلاد الی الارض سے مراد سچ مچ زمین کے ساتھ لگا رہنا ہے۔ بلکہ دونوں جگہ مراد روحانی طور پر رفع اور روحانی طور پر زمین کے ساتھ لگنا ہے۔ یہاں مفسرین نے رفعناہ کے معنی الی منازل الابرار کیے ہیں یعنی بلند مراتب کی طرف رفع اور یہاں رفع الی السماء کا نام کوئی نہیں لیتا حالانکہ یہاں تو مذکور بھی نہیں کہ رفع کہاں ہوا ہے لیکن جہاں رفع کے ساتھ الی اللہ صاف پڑا ہوا ہے وہاں پرستی اللہ کو سماء پر بیٹھا ہوا مان کر آسمان پر رفع مراد لیا جاتا ہے یعنی حضرت عیسٰی کے متعلق۔ یہ ایک غلطی عیسائیت کے مروجہ خیال سے بعض مفسرین کو لگ گئی اور دوسروں نے اس کی پیروی کی ورنہ رفع قرآن کریم میں کہیں بھی جہاں انسانوں کے رفع کا ذکر ہو رفع جسمانی کے معنی میں نہیں آتا۔

ع۱۱۷۸ یلھث ۔ لَھَث کے معنی ہیں کتے کا زبان نکالنا درانحالیکہ اس کا سانس تیز ہو رہا ہو پیاس سے ہو یا تھک جانے سے (غ)

کتے کی مثال: ایسے لوگوں کی مثال جو احکام الٰہی کو جھٹلاتے ہیں کتے سے دی ہے جو ہر حال میں ہانپتا ہے خواہ کوئی اس پر حملہ کرے یا نہ کرے گویا قلق اور اضطراب ہر وقت ایسے انسان کے لیے لاحق حال رہتا ہے اور اطمینانِ قلب اسے کسی حال میں میسّر نہیں آتا۔ احکام الٰہی یا وحی الٰہی کی غرض تو یہی ہے کہ انسان کو سکون یعنی اطمینانِ قلب حاصل ہو پس اس کا رد کرنا لازماً موجب قلق و اضطراب ہے۔ اور اطمینانِ قلب صرف ذکر اللہ سے میسّر آتا ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد ۱۳-۲۸)

ع۱۱۷۹ مثلاً ۔ بطور تمیز واقع ہوا ہے اور اصل ترکیب یوں ہے ساء مثلاً مثل القوم الذین۔

لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

جن سے وہ سنتے نہیں - وہ چارپایوں کی طرح ہیں ، بلکہ زیادہ گمراہ - یہی بے خبر ہیں ع۱۱۸۰

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِىْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

اور اللہ کے سب اچھے نام ہیں سو ان کے ساتھ اس کو پکارو اور ان کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں ٹیڑھی راہ چلتے ہیں - انھیں اس کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کرتے تھے ع۱۱۸۱

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ ع ۲۲

اور ان میں جنھیں ہم نے پیدا کیا - ایک گروہ ہے جو سچی راہ بتاتے ہیں اور اسی پر انصاف کرتے ہیں ع۱۱۸۲

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ ج

اور جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہم ان کو تدریجاً پکڑیں گے جہاں سے وہ جانتے بھی نہیں ع۱۱۸۳

ع۱۱۸۰ جہنم کے لیے انسانوں کا پیدا کرنا: قرآن کریم کی بہترین تفسیر خود قرآن سے ہی ہوتی ہے جو فرماتا ہے وما خلقت الجنّ والانس الّا لیعبدون - (الذّٰریٰت ۵۱ - ۵۶) یعنی جنّ و انس کو پیدا کیا تو صرف اس غرض کے لیے کہ وہ عبادت کریں - پس جہنم کے لیے پیدا کرنا غرض پیدائش نہیں ہو سکتی - اس لیے جیسا کہ روح المعانی میں ہے اکثر مفسرین نے یہاں لام کو لام عاقبت کہا ہے جیسے فالتقطہ اٰل فرعون لیکون لھم عدوا وحزنا (القصص ۲۸ - ۸) یعنی ان کا انجام یہ ہے کہ وہ جہنم میں جاتے ہیں جس طرح شاعر کہتا ہے لد واللموت وابنوا للخراب - موت کے لیے اولاد پیدا کرو اور ویران ہونے کے لیے عمارتیں بناؤ مطلب یہ نہیں کہ ان میں تمہاری غرض یہ ہے بلکہ انجام تو یہی ہے کہ جو پیدا ہوگا وہ مریگا جو عمارت بنی سو ایک دن ویران ہوگی - اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کو پیدا کیا (اور پیدا کرنے کی غرض بھی دوسری جگہ عبادت بتادی) مگر نتیجہ یہ ہے کہ وہ گویا جہنم کے لیے ہی پیدا ہوئے تھے - کیوں؟ اس لیے کہ دل اور کان اور آنکھ سے کام نہیں لیتے یعنی اس لیے کہ کام ایسے کرتے ہیں جن کا نتیجہ جہنم ہے - اصل سوال یہ ہے کہ آیا وہ لوگ برے عمل اس لیے کرتے ہیں کہ خدا نے ان کو پہلے ہی جہنم کے لیے پیدا کیا ہے یا وہ جہنم کے لیے اس واسطے پیدا ہوئے کہ وہ بُرے کام کرتے ہیں - سو قرآن شریف کا ایک ایک لفظ اس پر شاہد ہے کہ کوئی شخص اس لیے بُرے عمل نہیں کرتا کہ خدا نے اسکو کوئی الگ قسم کے قویٰ کے ساتھ پیدا کیا ہے یہاں بھی یہی بات فرمائی - کہ ان کو بھی وہی دل دیئے ہیں جو دوسروں کو مگر دوسرے ان سے سمجھ کا کام لیتے ہیں وہ نہیں لیتے یوں نہیں فرمایا کہ ہم نے ان کو دل دیئے مگر فقاہت سے خالی یہ تو اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہوتا اس لیے فرمایا کہ دل بھی ہیں اور فقاہت کی قوت بھی ان میں ہے مگر وہ خود اس قوت فقاہت سے کام نہیں لیتے ایسا ہی ان کو دوسروں کی طرح آنکھ اور کان دیئے مگر وہ خود ان سے دیکھنے اور سننے کا کام نہیں لیتے یہ نہیں کہ ان میں دیکھنے یا سننے کی قوت نہیں! شرف انسانیت یہی تھا کہ انسان سُنکر اور دیکھ کر اور سمجھ کر ان نتائج پر پہنچتا جن پر حیوان نہیں پہنچ سکتا اس شرف کو انہوں نے گنوا دیا اسلیئے چارپایوں کی طرح ہو گئے آخر پر ان کو غافل اس لیے کہا کہ قصور اُن کا اپنا ہے کہ وہ اصل مقصد زندگی سے یا شرف انسانیت سے بے خبر ہیں وہ چاہتے تو خبردار ہو سکتے تھے -

ع۱۱۸۱ الاسماء - وہ الفاظ جو معانی مختلفہ پر دلالت کریں - یا صفات بھی معنی لیے جا سکتے ہیں - پہلے معنی کے لحاظ سے بھی مراد ان کا مفہوم احسن ہونا ہی ہے - یلحدون - اَلحد کے معنی ہیں حق سے باطل کی طرف مائل ہوا - الحاد فی الاسماء سے مراد اس کی طرف ایسی صفات منسوب کرنا ہے جو صحیح نہیں یا اس کی شان کے شایاں نہیں (غ)

اسمائے الٰہی سے حصول کمال: یہاں اسمائے الٰہی کا ذکر اس لیے کیا کہ انہی اسماء سے ہی انسان کمال کو حاصل کرتا ہے گویا جس اللہ تعالیٰ کے اسم کو پکارتا ہے اسی کمال کو اپنے اندر بھی چاہتا ہے اور ہر ایک غلط عقیدہ کسی اسم الٰہی میں الحاد سے پیدا ہوتا ہے اور غلط عقیدہ سے خراب عمل پیدا ہوتا ہے -

ع۱۱۸۲ اُمۃ یھدون کی تفسیر خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم سے مروی ہے ھذہ اُمّتی یعنی میری امّت آیت ۱۵۹ سے مقابلہ کرکے جہاں من قوم موسٰی امۃ یھدون فرمایا اسی نتیجہ کی تائید ہوتی ہے گویا وہاں قوم موسےٰ کا ذکر ہے تو یہاں اُمّتِ محمّدیہ کا *

ع۱۱۸۳ سنستدرجھم - دَرَجَۃ - مَنْزِلَۃ کی طرح ہے لیکن اوپر چڑھنے کے لحاظ سے اور اس سے مراد بلند مرتبہ بھی لیا جاتا ہے للرجال علیھن درجۃ (البقرۃ ۲ - ۲۲۸) ھم درجات عند اللہ (اٰل عمران ۳ - ۱۶۲) اور دَرْج کتاب یا کپڑے کے لپیٹنے کو کہا جاتا ہے اور جو لپیٹا جائے اسے بھی دَرْج کہا جاتا ہے اور اس لیے استعارۃً موت کو بھی دَرْج کہا جاتا ہے اسی سے استدراج ہے جس سے مراد ہے ان کا لپیٹ لینا جس طرح کتاب لپیٹ لی جاتی ہے گویا ان کی عادت غفلت کا ذکر ہے اور استدراج کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کو تدریج سے یعنی آہستہ آہستہ پکڑیں گویا وہ تھوڑا تھوڑا کرکے اپنی ہلاکت کے قریب آتے جاتے ہیں (غ)

ہلاکت میں تدریج: اس رکوع میں آنحضرت صلعم کے مخالفین کے انجام کا ذکر ہے کیونکہ جب نبوت اور اس کی ضرورت پر مفصل بحث ہو چکی تو اب اس قوم کا ذکر ضروری

وَ اُمۡلِیۡ لَهُمۡ ؕ اِنَّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡنٌ ﴿۱۸۳﴾
اور میں ان کو مہلت دیتا ہوں، میری تدبیر مضبوط ہے ١١٨٤

اَوَ لَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا ٜ مَا بِصَاحِبِهِمۡ مِّنۡ جِنَّةٍ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۸۴﴾
اور کیا انھوں نے فکر نہیں کیا کہ ان کے رفیق کو جنون نہیں ہے وہ صرف کھلے طور پر ڈرانے والا ہے ١١٨٥

اَوَ لَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَیۡءٍ ۙ وَّ اَنۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ قَدِ اقۡتَرَبَ اَجَلُهُمۡ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَهٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۸۵﴾
اور کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت میں نظر نہیں دوڑائی اور جو چیز اللہ نے پیدا کی ہے اور یہ کہ شاید ان کا وقت نزدیک آگیا ہو۔ سو اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔

مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ ؕ وَ یَذَرُهُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِهِمۡ یَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۸۶﴾
جس کو اللہ گمراہ قرار دے اس کے لیے کوئی ہادی نہیں، اور وہ ان کو ان کی سرکشی میں چھوڑتا ہے اندھے ہو رہے ہیں۔

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرۡسٰهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّیۡ ۚ لَا یُجَلِّیۡهَا لِوَقۡتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕۘ ثَقُلَتۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ لَا تَاۡتِیۡکُمۡ اِلَّا بَغۡتَةً ؕ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ کَاَنَّکَ حَفِیٌّ عَنۡهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ اللّٰهِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۷﴾
تجھ سے اس گھڑی کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا واقع ہونا کب ہوگا؟ کہہ، اس کا علم تو میرے رب کو ہی ہے اس کو اس کے وقت پر کوئی ظاہر نہیں کریگا مگر وہی۔ وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری بات ہے تم پر اچانک ہی آئے گی۔ تجھ سے پوچھتے ہیں، گویا کہ تو اس کے متعلق کاوش کرنے والا ہے۔ کہہ، اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ١١٨٦

تھا جو حق کو نابود کرنا چاہتی ہے تو اس کے متعلق فرمایا کہ ہم آہستہ آہستہ ان کو ہلاکت کی طرف لیجائیں گے اور ان کا نہ جاننا اس لحاظ سے ہے کہ جب ایسی حالت ہوتی ہے تو حق کے مخالف اس مخالفت کے نشہ میں اس قدر سرشار ہوتے ہیں کہ وہ آتی ہوئی ہلاکت کو محسوس بھی نہیں کرتے۔ یہ مکی سورت ہے بعینہٖ اسی طرح مدینہ میں جا کر اعدائے حق کی مخالفت کا انجام ہوا۔ ایسے رنگ میں کہ محسوس بھی نہیں کرتے تھے۔ حق کے مخالف اپنی تباہی کا سامان اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں مگر ایسے تدریج کے ساتھ پکڑے جاتے ہیں کہ وہ ہلاکت آتی ہوئی بھی ان کو نظر نہیں آتی۔

١١٨٤ متین۔ مَتْن بلند اور سخت زمین کو کہتے ہیں گو یا وہ پیٹھ کی دونوں طرف سے مشابہ ہے اس لیے مَتُنَ کے معنی ہیں مضبوط ہوا اسی سے متین ہے (غ) مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چھوٹے دل کے انسان کی طرح نہیں کہ ذرا کسی نے مخالفت کی تو فوراً پکڑ لیا۔ بلکہ وہ مہلت دیتا ہے اس لیے کہ انسان کی طرح اس کو یہ فکر نہیں کہ شاید پھر میرے قابو میں نہ آسکے بلکہ خدا تعالیٰ کی تدبیر بڑی مضبوط ہوتی ہے اور انسان اپنے اوپر قیاس کرکے جب ایک جرم پر ایک دفعہ نہیں پکڑا جاتا تو سمجھ لیتا ہے کہ پکڑنے والا ہی کوئی نہیں۔

١١٨٥ جنۃ۔ جَنّ کے معنی ڈھانکنا اور جِنّۃ جنوں کی جماعت کو بھی کہتے ہیں جیسے من الجنّۃ و النّاس (النّاس ١١٤۔ ٦) وجعلوا بینہ وبین الجنۃ نسبا (الصّٰفّٰت ٣٧۔ ١٥٨) اور جنون کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ نفس اور عقل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے (غ)

رسول کو جنون نہیں ہوتا: رسول تو بدی کے بدانجام سے ڈراتا ہے۔ اور یہ کوئی جنون کی بات نہیں قرآن کریم میں غور کرنے تو معلوم ہوتا کہ یہ کسی بلند مقام پر پہنچانا چاہتا ہے اور یہ کام مجنون کا نہیں ہوتا۔ یہ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ انہی لوگوں کو مجنون کہا گیا جو انسان کو بلند سے بلند مقام پر پہنچانا چاہتے ہیں اور بدی کے بدانجام سے ڈراتے ہیں۔ حالانکہ بدی کا انجام بد ہونے پر کل دنیا کا تجربہ شاہد ہے۔

١١٨٦ مرسیٰ۔ رَسَا کے معنی ایک چیز مضبوط ہو گئی۔ گڑ گئی اور اَرْسٰی اسے مضبوط یا قائم کر دیا قدورٍ رّٰسیٰت (السّبا ٣٤۔ ١٣) گڑی ہوئی دیگیں رواسی شٰمخٰت (المرسلٰت ٧٧۔ ٢٧) جہاں رواسی جمع ہے اور مراد پہاڑ ہیں بوجہ مضبوطی کے جیسا کہ فرمایا والجبال ارسٰھا (النّٰزعٰت ٧٩۔ ٣٢) اور مُرْسٰی مصدر بھی ہے اور اسم مکان اور زمان اور مفعول بھی۔ یہاں مراد اس کے قائم ہونے کا زمانہ ہے اور بسم اللہ مجرٖیھا و مُرسٰھا (ھود ١١۔ ٤١) کشتی کا ٹھہرنا یا لنگر ڈالنا (غ)
یجلی۔ جَلْو سے ہے جس کے معنے کھلے طور پر ظاہر کر دینا ہیں یہی معنی تجلیۃ کے ہیں۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا
مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ
لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَ مَا مَسَّنِيَ
السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ
لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۱۸۸ ع ۲۳

کہہ، میں اپنی جان کے لیے نفع کا مالک نہیں اور نہ نقصان کا مگر جو اللہ چاہے - اور اگر میں غیب جانتا ہوتا ، تو بہت بھلائی لے لیتا ، اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی میں صرف ڈرانے والا ہوں اور ان لوگوں کو خوشخبری دینے والا جو ایمان لاتے ہیں ۱۱۸۷

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ
وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ
فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ
بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ
اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۱۸۹
فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ

وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا، تاکہ وہ اس سے آرام حاصل کرے۔ پھر جب وہ اس پر پردہ ڈالتا ہے تو وہ ایک ہلکا سا بوجھ اٹھا لیتی ہے اور اس کے ساتھ چلتی پھرتی ہے پھر جب وہ بوجھ معلوم کرتی ہے دونوں اللہ اپنے رب کو پکارتے ہیں کہ اگر تو ہمیں صحیح وسالم (بچہ) دے تو ہم ضرور شکر کرنے والوں میں سے ہونگے ۱۱۸۸ پھر جب وہ ان کو صحیح وسالم (بچہ) دیتا ہے وہ اس میں جو ان کو دیا اسکے شریک ٹھیراتے ہیں

ثقلت - ثِقَل یا بوجھ کا لفظ اصل اجسام میں بولا جاتا ہے لیکن معانی میں بھی اس کا استعمال ہے فہم من مغرم مثقلون (القلم ۶۸ - ۴۶) اور ثُقل القول اس بات کو کہا جاتا ہے جس کا سننا پسند خاطر نہ ہو۔ اسی لحاظ سے یہاں ساعت پر ثقلت بولا ہے (غ)

حفی - اِحفا کے معنی ہیں سوال میں الحاح کرنا یا کسی چیز کا حال معلوم کرنے میں زیادہ کاوش میں لگے رہنا (غ)

یہاں الساعۃ سے کیا مراد ہے ۹۳۱ میں دکھایا گیا ہے کہ ساعتیں یا قیامتیں تین ہیں: صغریٰ - وسطیٰ - کبریٰ - ساعت وسطیٰ ایک قوم کی تباہی کا وقت ہے اب ظاہر ہے کہ یہاں اوپر ذکر صاف الفاظ میں اعدائے حق کے پکڑا جانے کا ہے۔ جیسا کہ رکوع کے شروع کی آیتوں میں صفائی سے فرمایا۔ تو پس جب ان کو استدراج کی خبر دی گئی - اور یہ کہ ان کو تھوڑے وقت کے لیے مہلت دی جاتی ہے تو وہ سوال کرتے ہیں کہ یہ ہماری تباہی اور ناکامی کا وقت کب آئے گا۔ کیونکہ اس وقت وہ زوروں پر تھے۔ اس کا جواب یہ دیا کہ کب وہ وقت آئے گا اس کے بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اوپر بتا دیا تھا کہ آہستہ آہستہ اور تدریجاً آئے گا۔ ہاں یہ فرمایا کہ وہ کوئی ایسی آسان شے نہیں جس کے متعلق تم بار بار جلدی کرتے ہو اور اس کا ثقیل ہونا اس لحاظ سے بھی ہے کہ وہ اس قوم کے لیے ایک امر ناخوشگوار ہے اور اس لیے بھی کہ اسے دوسری جگہ خافضۃ رافعۃ (الواقعۃ ۵۶ - ۳) کہا ہے یعنی بعض یعنی کفار کو ذلیل کردیگی اور بعض یعنی مومنوں کو بلند مقام پر پہنچا دے گی ٭

۱۱۸۷ مخالفین کو ان کے بدانجام سے ڈرانے کے بعد قبول کرنے والوں کو خوشخبریاں سُنا کر پھر بھی یہی فرمایا کہ رسول عالم الغیب نہیں جس قدر اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا اس قدر سنا دیا اپنے لیے بشر سے بڑھ کر طاقت کا دعویٰ نہ کرنا دکھاتا ہے کہ کس قدر سادگی آپ کے اصول دین میں تھی سب کچھ سنا تو دیا مگر یہ بھی بتا دیا کہ حق کو حق کی خاطر قبول کرو نہ اس لیے کہ بہت سی آسایش مل جائے۔ اسلام کے اصول کی کامیابی کا اصل راز ان کی سادگی ہے اور شروع سے ہی یہ رنگ نظر آتا ہے صاحب انجیل کی طرح بڑے بڑے دعوے نہیں کہ میں یہ ہوں اور میں وہ ہوں۔ مگر کام اتنا بڑا کیا کہ حضرت عیسٰی کا کام اس کے سامنے کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔

۱۱۸۸ تغشّٰہا - غِشیٰ کے اصل معنی سِتر یعنی ڈھانک دینا یا پردہ ڈالنا ہیں واذا غشیہم موج (لقمٰن ۳۱ - ۳۲) فغشیہم من الیم ما غشیہم (طٰہٰ ۲۰ - ۷۸) اذا یغشی السدرۃ ما یغشیٰ (النجم ۵۳ - ۱۶) وغیرہ اور کنایۃً اس سے مراد جماع لیا جاتا ہے (غ)

صالحا - صلاح - فساد کی ضد ہے اس لیے صالح بلحاظ افعال بھی ہو سکتا ہے یعنی اس کے افعال میں کوئی فساد نہ ہو اور بلحاظ جسم بھی یعنی جس کے جسم میں کوئی نقصان نہ ہو اور یہی یہاں مراد ہے اس لیے کہ بچہ کی صلاحیت اس کے جسم کے لحاظ سے ہی ہو سکتی ہے۔ اس رکوع میں یہ بتایا ہے کہ مخالفت میں کیا طریق اختیار کرنا چاہیئے۔ مگر پہلے بتایا ہے کہ انسان کس طرح ناشکری اختیار کرتا ہے جب دکھ اور تکلیف کا وقت ہوتا ہے تو خدا کو پکارتا ہے جب آسایش اور نعمت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔

آدم کی طرف شرک کی نسبت غلط ہے: یہاں لفظ تو عام ہیں مگر نفس واحدۃ کے لفظ نے بہت لوگوں کو اس طرف مائل کر دیا کہ یہاں آدم و حوا کا ذکر ہے حالانکہ کسی حدیث میں یہ نہیں اور دوسری طرف الفاظ کو عام رکھنے سے کوئی محذور لازم نہیں آتا۔ کیونکہ جو انسان پیدا ہوتا ہے وہ ایک ہی نفس سے پیدا ہوتا ہے اور بی بی یا جوڑے کا اسی نفس سے پیدا ہونا صرف حوا کے لیے مخصوص نہیں بلکہ تمام انسانوں کو یہی کہا ہے کہ تم سب کی بیبیوں کو تمہارے ہی نفسوں سے پیدا کیا ہے و من اٰیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیہا (الروم ۳۰ - ۲۱) جہاں سارے لفظ وہی ہیں جو یہاں ہیں۔ پس آدم و حوا پر ان کا لگانا اور اس پر یہ قصے بڑھانا کہ آدم و حوا کی اولاد نہ جیتی تھی تب انہوں

فِيمَآ اٰتٰهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾
اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾
وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ
اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾
وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ
سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ
اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ
اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾
اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۟ اَمْ لَهُمْ
اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۟ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ
يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۟ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ
بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ
فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾

سو اللہ اس سے بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔
کیا وہ اسکو شریک بناتے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔
اور وہ ان کی مدد نہیں کر سکتے، اور نہ ہی اپنی مدد کر سکتے ہیں۔
اور اگر تم ان کو ہدایت کی طرف بلاؤ، تو وہ تمھاری پیروی نہیں کرتے، تمھارے لیے یکساں ہے کہ تم اُن کو پکارو یا تم چپکے رہو۔[۱۱۸۹]
وہ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، تمھاری طرح بندے ہیں سو اُن کو پکارو، تو چاہیئے کہ تم کو جواب دیں اگر تم سچّے ہو۔[۱۱۹۰]
کیا اُن کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سُنتے ہیں کہہ، اپنے شریکوں کو پکارو، پھر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے کبھی مُہلت نہ دو۔[۱۱۹۱]

نے ایک بچّہ کا نام عبدالحارث رکھا اور حارث شیطان کا نام ہے سب بے بنیاد باتیں ہیں اور محقق مفسرین نے ان کو ردّ کیا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان آیات میں بت پرستی کے شرک کا ذکر ہے جیسا کہ آیت ۱۹۵ میں واضح کر دیا ہے اور کم از کم بت پرستی کی ابتدا حضرت آدم کی طرف آج تک کسی نے منسوب نہیں کی۔

ع۱۱۸۹ اس آیت میں خطاب مشرکوں کو ہے جیسا کہ اگلی آیت سے واضح ہوتا ہے اور ان کو بتوں کی بے بسی کی طرف توجہ دلائی ہے اور ھدی سے مراد حصول کامیابی کی راہ ہے اور اتباع یا پیروی کرنے سے مطلب حصول مراد میں امداد دینا ہے سواء علیکم اس کو واضح کرتا ہے کیونکہ اگر دعوت الی الحق مراد ہو اور خطاب مسلمانوں کو ہو تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ تمھارے لیے ان کا بلانا نہ بلانا یکساں ہے دعوت الی الحق سے بہرحال بلانے والے کو فائدہ پہنچتا ہے۔

ع۱۱۹۰ بتوں کا عبد ہونا: بتوں کو عباد امثالکم اس لحاظ سے کہا کہ وہ انسان کی طرح بندگی یعنی عاجزی کی حالت میں ہیں مسخر ہیں۔ محکوم ہیں۔ یا اس لیے کہ بُت انسانوں کی صورت پر بنائے جاتے تھے۔ یا انسانوں کی یادگار کے طور پر۔ تو مطلب یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ وہ تمھاری طرح عباد ہیں اور یہ جو فرمایا کہ تم دعا کرو، تو پھر چاہیئے کہ وہ جواب دیں (یا قبول کریں) تو اس سے معلوم ہُوا کہ خدا ضرور دعا قبول کرتا ہے بلکہ اس کا جواب بھی دیتا ہے اور موحد اور مشرک میں فرق یہی ہے کہ موحد اس ہستی کو پکارتا ہے جو دعاؤں کا جواب دیتی ہے اور مشرک جن کو پکارتا ہے وہ جواب نہیں دیتے۔

ع۱۱۹۱ یعنی مشرکوں کی اور ان کے فرضی خداؤں کی مخالفت حق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مکہ میں سورۂ اعراف کے نزول کا زمانہ وہ ہے جب مخالفت زور پر ہے اور ساتھی اوّل تو تعداد میں کچھ نہیں جو ہیں وہ بھی متفرق۔ پھر وطن سے بے وطن۔ مگر کس قدر تحدی ہے کہ سارا زور لگا لو، ساری تدبیریں میری ہلاکت کی کر لو مجھے کوئی مہلت بھی نہ دو ایک بیکس انسان جو چاروں طرف سے ستایا جا رہا ہو جس کی زندگی معرض خطر میں ہو جس کے چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہوں ایسے لفظ منہ سے نہیں نکال سکتا۔ یہ پُرشوکت الفاظ اسی خدائے قادر کے منہ سے نکلے ہوئے ہیں جس کے سامنے انسانوں کی مخالفت کوئی وقعت نہیں رکھتی جس کے مقابلہ پر ساری دنیا اگر کوشش کرے تو ناکام ہوتی ہے۔ ایسی بیکسی کی حالت میں اس قدر پُرشوکت تحدیانہ دعویٰ جو ساری دنیا کو مخالفت کے لیے بلا رہا ہو ثابت کر رہا ہے کہ وحی کے الفاظ نہ محمد رسول اللہ صلعم کے بنائے ہوئے ہیں نہ آپ کے قلب کا نقشہ ہیں بلکہ یہ کوئی خارجی شے ہے جو انتہائی درجہ کی بیکسی کے وقت مہبط وحی کی قوت کا باعث ہو رہی ہے۔ اگر آج بھی مسلمانوں کو اس کلام پر ایمان ہوتا تو وہ حالات پیش آمدہ میں اتنے مایوس نہ ہوتے۔ سب سے بڑی مایوسی جو آج مسلمانوں کے دلوں میں ہے وہ اسلام کے غلبہ کے متعلق ہے نہ اس امر کے متعلق کہ مسلمانوں کو بادشاہت نہیں ملے گی۔ اسی لیے اشاعت اسلام کے عظیم الشان مقصد کی طرف ان کا قدم نہیں اٹھتا۔ جب دل بیٹھے ہوئے ہوں تو

اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹۶﴾

میرا ولی اللہ ہے، جس نے کتاب اُتاری اور وہی نیکوں کی حمایت کرتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾

اور جن کو تم اُس کے سوا پکارتے ہو وہ تمھاری مدد نہیں کر سکتے اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں ؏۱۱۹۲

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

اور اگر تم اُن کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ نہ سُنیں اور تو اُن کو دیکھے گا کہ تیری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ دیکھتے نہیں ؏۱۱۹۳

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۱۹۹﴾

درگزر اختیار کر اور نیک کام کا حکم دے، اور جاہلوں سے کنارہ کر ؏۱۱۹۴

وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۰۰﴾

اور اگر شیطان کی فساد کی بات تجھے تکلیف دے تو اللہ کی پناہ پکڑ، وہ سننے والا جاننے والا ہے ؏۱۱۹۵

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ

جو بدی سے بچتے ہیں جب ان کو شیطان سے کوئی خیال پہنچتا ہے (خدا کو

قدم کس طرح اُٹھے۔

؏۱۱۹۲ اوپر کی آیات میں تو یہ بتایا تھا کہ وہ آنحضرت صلعم کے خلاف سارا زور لگا کر بھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہاں بتایا کہ نہ صرف یہی بلکہ جب مشرک مغلوب ہونگے تو یہ بُت ان کی کچھ مدد نہ کر سکیں گے۔ ان کی مدد کرنا تو ایک طرف رہا اپنے آپ کو بھی تباہی سے نہ بچا سکیں گے۔ یوں نہایت صفائی سے یہ بتا دیا کہ انجام کار مشرک مغلوب ہونگے اور ان کے بتوں کی صفائی ہو جائے گی۔ یہی وہ بات تھی جس نے آخر کار ابوسفیان اور دیگر اہل مکّہ پر اثر کیا کہ کس طرح جو کچھ بیکسی کی حالت میں رسول اللہ صلعم کے منہ سے کہلوایا گیا تھا وہ حرف بحرف پورا ہُوا اور مشرک باوجود اپنی ساری طاقت کے آخر کار مغلوب ہوئے۔

؏۱۱۹۳ اس آیت میں یا اس کے پچھلے حصّہ میں خطاب بدل دیا ہے یعنی مسلمانوں کو خطاب ہے کہ اگر تم ان کفار کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو یہ بھی نہیں سنتے۔ یہاں سننے سے مراد قبول کرنا ہے اور اسی طرح پر نظر تو تیری طرف کرتے ہیں مگر دیکھتے نہیں۔

؏۱۱۹۴ یہاں عفو کے معنی ما عفا وسھل وتیسر من اخلاق الناس حضرت عائشہؓ و مجاہد سے مروی ہیں یعنی جو کچھ لوگوں کے اخلاق سے آسانی سے میسر آئے اور سہل ہو اس کو قبول کر لو۔ اس پر راضی ہو جاؤ۔ اور ان پر مشقت نہ ڈالو۔ لیکن یہاں صاف ذکر مخالفین کا ہے۔ اور عفو سے مراد صاف یہی ہے کہ جو مخالفت کرتے ہیں دکھ دیتے ہیں۔ ان کے معاملہ میں تم عفو کرتے جاؤ۔ اور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہاں تک اس حکم پر عمل کیا کہ فتح مکّہ کے وقت بھی جو دنیا دار فاتح کے لیے انتقام کا وقت ہوتا کمال درجہ کا عفو دکھایا۔ پس حکم دیا کہ ان کی مخالفت پر عفو اختیار کرو۔ چنانچہ سلف سے یہ معنی بھی مروی ہیں بلکہ شعبی کی ایک روایت میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معنی مروی ہیں ان تعفوا عن ظلمك یعنی جو تم پر ظلم کرتا ہے تم اس پر عفو اختیار کرو۔ ہاں نیک باتوں کے لیے کہتے جاؤ اور جاہل جو معاملہ تمہارے ساتھ کرتے ہیں اس سے اعراض کرتے رہو۔

؏۱۱۹۵ ینزغن۔ نزغ کے اصل معنی سوئی یا کسی نوک کا چمڑہ میں داخل کرنا ہیں اس لیے اس کے معنی دخول فی الامر لافسادہ ہی ہیں یعنی کسی امر میں اس کو بگاڑنے کے لیے مداخلت کرنا چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ صاف یہی معنی آئے ہیں نزغ الشیطان بینی وبین اخوتی (یوسف ۱۲ – ۱۰۰) (رغ) شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈلوایا۔ اور لسان العرب میں ہے کہ نزغ وہ کلام ہے جس سے لوگوں کے درمیان فساد ڈال دیا جائے اور نزغ الرجل کے معنی ہیں ذکرہ بقبیح اس کا بُرے لفظوں میں ذکر کیا اور حدیث میں نوازغ کا لفظ آتا ہے جو نزغ بمعنی طعن وفساد سے ہے اور ایک اور حدیث میں ہے فنزغه انسان من اهل المسجد بنزیغة جس کے معنی کیے ہیں رماہ بکلمة سیئة یعنی اس کی نسبت بُرا کلمہ کہا (ن) اور نزغ کے معنی وسوسہ بطور مجاز ہیں اصل معنی نہیں اور نہ ہی وسوسہ یہاں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ حدیث میں صاف آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا قرین جنّ مسلمان ہو گیا اور وہ سوائے بھلائی کے اور مجھے کچھ نہیں کہتا اعاننی علیه فاسلم فلا یامرنی الّابخیر (مسلم) پس یہاں نزغ شیطان اپنے حقیقی معنی میں ہے یعنی شیطان تیرا کام بگاڑنا چاہے یا تیری نسبت بُری باتیں کہتا پھرے اور شیطان سے مراد انسان شیطان ہی ہیں جو دن رات آپ کے کام کو بگاڑنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے اور آپ کے متعلق بُرے کلمات کہہ کر لوگوں کو آپ کی باتیں سننے سے روکتے تھے۔ تو اس کا علاج بتایا کہ خدا کی پناہ میں آ جاؤ۔ ان شیاطین کے انسان ہونے پر آیت ؏۲۰۲ بھی شاہد ہے۔

الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾
یاد کرتے ہیں سو یکایک وہ روشنی حاصل کرنیوالے ہوجاتے ہیں ع۱۱۹۶

وَ اِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾
اور اُن کے بھائی بند اُن کو گمراہی میں بڑھا رہے ہیں۔ پھر وہ کمی نہیں کرتے ع۱۱۹۷

وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْ لَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾
اور جب تو اُن کے پاس کوئی آیت نہیں لاتا کہتے ہیں تو خود اسے کیوں نہیں بنا لاتا۔ کہہ میں صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب سے میری طرف وحی کیا جاتا ہے یہ تمھارے رب کی طرف سے روشن دلیلیں ہیں اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ع۱۱۹۸

وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾
اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سُنو اور چُپ رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ع۱۱۹۹

ع۱۱۹۶ طائف کے معنی طواف کرنے والا یا گھومنے والا ہیں طهّرا بیتی للطائفین (البقرۃ ۲۔ ۱۲۵) اور خیال یا لمّہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسے یہاں اور حادثہ پر جیسے فطاف علیها طآئف (القلم ۶۸۔ ۱۹) اور مجاہد اور ابن عباس سے مروی ہے کہ یہاں غضب مراد ہے (ج) کیونکہ وہ بھی ایک لمہ شیطانی ہے اور بعض نے کہا کہ طائف جنون ہے مگر چونکہ غضب بھی اپنے اندر جنون کا رنگ رکھتا ہے اس لیے اس پر بولا گیا۔

غضب کا علاج: پچھلی آیت میں ان باتوں کا ذکر کیا تھا جو شریر لوگ آنحضرت صلعم کے متعلق مشہور کرتے تھے اور آپ کو حکم دیا کہ تم ان کے معاملہ میں عفو سے کام لو اور اللہ کی پناہ چاہو اب اسی بات کو عام کیا ہے اور سب مسلمانوں کو بتایا ہے کہ اگر ان کو دکھ دینے والے کلمات سنکر غضب آئے تو یہ نہیں چاہیئے کہ ان کی طبائع انتقام کی طرف مائل ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ کو یاد کریں تو غضب فرو ہوجائیگا اور یہاں طائف من الشیطان سے مراد غضب ہی ہے جیسا کہ مجاہد سے روایت ہے سیاق عبارت بھی اسی معنی کو چاہتا ہے کیونکہ جب شیاطین کی طرف سے مخالفت ہوگی تو بعض وقت غضب آ ہی جائے گا اور غضب انسان کو اندھا کر دیتا ہے اس لیے اس کا علاج یہ بتایا کہ پھر خدا کو یاد کرو۔ غضب خود فرو ہوجائے گا اور بصارت پیدا ہوجائے گی۔ دعوت الی الحق کا کام کرنے والوں یا مبلغین اسلام کو اس پاک اصول کو کبھی ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے وہ کبھی غضب میں نہ آئیں بلکہ جب واقعات ایسے ہوں جن سے غصّہ پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ غضب میں آکر وہ دوسروں کو بُرا کہیں گے نتیجہ یہ ہوگا کہ حق کے ساتھ تنفر اور بڑھے گا بجائے اس کے اگر نرمی اختیار کی جائے تو اللہ تعالےٰ وہ راہ بھی بتا دیگا جس سے الزام کو دلائل سے دور کر دیا جائے اسی کی طرف لفظ مبصرون میں اشارہ ہے۔ مگر آج ہمارے علما کی یہ حالت ہے کہ غیروں سے تو کیا نرمی سے پیش آئیں گے اگر ایک مسلمان کے منہ سے کچھ خلاف طبیعت سن لیں تو غضب سے آگ ہوجاتے ہیں۔

ع۱۱۹۷ اخوانهم ضمیر شیاطین کی طرف جاتی ہے یعنی شیاطین کے بھائی ؞

يَمُدُّونهم ۔ مَدّ کے معنی لمبا کیا، مہلت دی۔ گمراہی میں لمبا کرنے سے مراد گمراہی میں بڑھانا ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ مَدَّ بُرے موقعہ پر بولا جاتا ہے اور امداد اچھے موقعہ پر۔ جیسے و امددنا هم بفاكهة (الطور ۵۲۔ ۲۲) يُمدد كم ربكم بخمسة الٰف (آل عمران ۳۔ ۱۲۵)

يقصرون ۔ قَصر چھوٹا کرنا ہے اور اَقصر عنه کے معنی ہیں كَفَّ مَعَ الْقُدْرَةِ عليه یعنی باوجود ایک امر پر طاقت رکھنے کے اس سے رُک گیا (غ)

شیاطین کے بھائی: یہاں سے معلوم ہوا کہ ایک تو شیطان ہیں اور دوسرے ان کے بھائی جو گمراہی میں ان کو بڑھاتے ہیں۔ اس لیے شیاطین سے مراد وہ شیطان نہیں ہو سکتے جو بدی کی تحریک کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کو ان کے اتباع گمراہی میں کیا بڑھائیں گے بلکہ شیاطین سے مراد وہی کفار کے رؤساء ہیں جن کا ذکر واذا خلوا الٰی شیاطینهم میں ہے جب لوگ ان کے پیچھے لگتے ہیں تو پھر وہ گمراہی میں اور ترقی کرتے ہیں اس لیے کہ ان کو معاون مل جاتے ہیں اگر ان کے معاون نہ ہوں تو ان کی شرارتیں خود ہی ختم ہوجائیں ؞

ع۱۱۹۸ اجتبیتها ۔ جبی کے معنی جمع کرنا ہیں یجبی الیه ثمرات کل شئ (القصص ۲۸۔ ۵۷) اسی لیے بڑے حوض کو جس میں پانی جمع ہوتا ہے جابیۃ کہا جاتا ہے جس کی جمع جواب ہے وجفان کالجواب (السبا ۳۴۔ ۱۳) اور اللہ کا اجتباء عبد طریق اصطفا پر جمع کرنا ہے اور یہاں اجتباء سے مراد یہ ہے کہ خود جمع کرکے کیوں نہیں لے آتا گویا یہ تعریض کی ہے کہ تم تو اختراع کے طور پر ایسی باتیں بنا لیا کرتے ہو (غ) اس کا ردّ یوں کیا ہے کہ میں تو صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں۔ مجھے خود کہاں اختیار ہے کہ نشان بنا لیا کروں ؞

ع۱۱۹۹ فاتحہ خلف امام کا مسئلہ: ظاہر ہے کہ یہاں خطاب کفار سے ہے جن کا قول تھا لا تسمعوا لهذا القراٰن والغوا فيه لعلكم تغلبون (حٰمٓ ۴۱۔ ۲۶) اس قرآن کو مت سُنو اور اس میں شور ڈال دو تاکہ تم غالب آجاؤ۔ مگر اس سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ سورۂ فاتحہ جماعت کی حالت میں مقتدی کو نہ پڑھنی

وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً — اور اپنے رب کو اپنے دل میں یاد کرتا رہ عاجزی سے اور ڈرتے ہوئے

وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ — اور ایسی آواز میں جو بہت بلند نہ ہو، صبح و شام کے وقتوں

وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۲۰۵ — میں اور غافلوں میں سے مت ہو عـــ۱۲۰

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ — جو تیرے رب کے پاس ہیں، اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے

عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يُسَبِّحُوْنَهٗ وَ لَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۲۰۶ (السجدة) — اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ کرتے ہیں عـــ۱۲۰ ع ۲۴

چاہیئے۔ چونکہ صریح احادیث موجود ہیں کہ بغیر فاتحہ کے نماز نہیں ہوتی اس لیے یہ استدلال درست نہیں۔ اول تو مقتدی کے فاتحہ پڑھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ امام کی قرأت فاتحہ کو سنتا نہیں۔ کیونکہ ہر ایک آیت پر جب امام وقفہ کرتا ہے تو اس وقفہ میں مقتدی اس فقرہ کو دوہرا سکتا ہے اور سورۂ فاتحہ کی آیات ایسی چھوٹی واقع ہوئی ہیں کہ اس وقفہ میں ان کو دوہرانا ذرا بھی مشکل نہیں۔ اس لیے فاستمعوا میں اگر مسلمانوں کو خطاب بھی لیا جائے تو بھی سورۂ فاتحہ کے پڑھنے سے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ دوسرے کل رکعتیں فرض نماز کی سترہ ہیں جن میں سے صرف چھ رکعتوں میں قراۃ بالجہر ہوتی ہے اور باقی گیارہ میں خفیہ ہوتی ہے تو گویا قریباً صرف ایک تہائی رکعات میں فاتحہ بلند آواز سے پڑھی جاتی ہے اور دو تہائی میں منہ میں پڑھی جاتی ہے۔ اب ان دو تہائی رکعات میں تو سنتا ہی نہیں۔ نہ اس پر فاستمعوا کا حکم وارد ہوتا ہے اور یہ کہنا کہ مقتدی کو علم ہے کہ امام کچھ پڑھ رہا ہے نہایت بودی بات ہے۔ اس علم سے آواز پیدا نہیں ہو جاتی۔ پس کل رکعتوں میں ایک حکم اگر لگایا جائے تو ترجیح اسی کو ہوگی جس کا تعلق زیادہ رکعات سے ہے اور زیادہ رکعات میں کوئی شے فاتحہ کے پڑھنے میں مانع نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ باقی قرأت مقتدی کیوں نہ پڑھے تو جواب یہ ہے کہ نبی کریم صلعم کا حکم ایسا نہیں۔ فاتحہ کے پڑھنے کے لیے ہے مگر باقی قرأت کے لیے نہیں۔ خود وہ لوگ جو فاتحہ خاموشی کی حالت میں بھی نہیں پڑھتے تسبیحات پڑھتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا حکم نبی کریم صلعم جیسا حکیم انسان نہ دے سکتا تھا کیونکہ فاتحہ کو تو ہر مقتدی جانتا ہے مگر باقی قرأت میں امام کا تتبع کرنا سو مقتدی میں سے ایک کے لیے بھی مشکل ہوتا اور لمبی آیات میں تو یہ ممکن ہی نہ ہوتا۔ اس لیے فاتحہ اور باقی قرأت کا حکم ایک نہیں۔ فاتحہ ایک خاص دعا ہے جو ہر ایک رکعت میں لازماً پڑھی جاتی ہے۔ باقی کسی حصۂ قرآن کو یہ امتیاز حاصل نہیں۔

عـــ۱۲۰ یہاں خطاب عام ہے جیسا کہ عمومیت حکم سے ظاہر ہے۔

فی نفسك دل میں ذکر کرنے سے کیا مراد ہے؟ آواز کا ذکر تو آگے آتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں مراد ایسا ذکر ہے جس میں انسان کا دل ذکر میں مصروف ہو۔ یعنی الٰہی عظمت اور ہیبت اور جلال کا اثر دل پر ہو۔

خیفۃ۔ اصل خوفۃ ہے۔ تضرع بندہ کا عاجزی اختیار کرنا ہے اور خوف عظمت الٰہی کا ہے۔

دون الجھر۔ عاجزی اور خوف کا یہ تقاضا ہے کہ انسان بہت شور نہ ڈالے دون الجھر سے مراد یہ نہیں کہ آواز اونچی نہ ہو بلکہ یہ منشا ہے کہ زیادہ شور نہ ڈالے گویا آواز میں بھی اقتصاد ہو۔

غدو۔ قاموس میں اسے غُدْوَۃ کی جمع لکھا ہے اور یا یہ مصدر ہے صبح کا وقت۔ اور مفردات میں ہے کہ قرآن کریم میں غُدُوٌّ کے مقابل پر آصال آیا ہے جیسے یہاں اور غداۃ کے مقابل پر عشی جیسے بالغدوۃ والعشی (الانعام۔ ۵۲)

آصال۔ اصل یا اصیل کی جمع ہے عصر اور غروب آفتاب کے درمیان کا وقت ہے۔ مراد مطلق شام ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ کے ذکر کا حکم ہے اور وہ دو رنگ میں ہے ایک دل میں اور ایک آواز کے ساتھ جو وہ بھی دون الجھر من القول ہو۔ پس اصل مطلب یہ ہے کہ جب نماز میں یا ویسے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو اور سب سے بڑھ کر ذکر اللہ تعالیٰ کا نماز میں ہی ہے تو ایسا نہ ہو کہ منہ سے کلمات نکلتے ہوں مگر دل اور کہیں ہو۔ اس لیے فرمایا کہ زبان سے ذکر ہو تو دل میں بھی وہی کیفیت ہو اور دل عظمت الٰہی اور ہیبت اور جلال سے بھرا ہوا ہو۔ تاکہ ذکر کا اصل مقصد پورا ہو اور بالغدو والآصال میں نماز کے اوقات بھی آجاتے ہیں یعنی ایک طرف فجر کا وقت دوسری طرف ظہر سے لیکر عشا تک کا وقت۔

عـــ۱۲۰ عند ربك۔ میں سب مقربین بارگاہ الٰہی داخل ہیں۔

ترتیب قرآن کریم میں یہاں سجدۂ تلاوت پہلی دفعہ آتا ہے۔ سجدۂ تلاوت قرآن کریم کی تلاوت میں خاص خاص موقعوں پر نبی کریم صلعم کا حکم ہے خواہ وہاں سجدہ کا حکم ہو یا اور کسی رنگ میں سجدہ کا ذکر ہو۔ سجدۂ تلاوت میں آنحضرت صلعم سے مختلف دعائیں مروی ہیں۔ مثلاً ایک یہ اللّٰھم لك سجد سوادی وبك امن فوادی۔ اللّٰھم ارزقنی علمًا ینفعنی وعملًا یرفعنی اور ایک حدیث میں آپ کی یہ دعا آتی ہے سجد وجھی للذی خلقه وشق سمعه وبصره بحوله وقوته فتبارك اللہ احسن الخالقین۔ سجدۂ تلاوت ایک شہادت ہے کہ مسلمان کو باقرآن پر ایمان لانے والے کو تعمیل حکم الٰہی میں کس قدر جلدی کرنی چاہیئے۔

(٨) سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ مَدَنِيَّةٌ

اٰيَاتُهَا ٧٥ رُكُوْعَاتُهَا ١٠

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ
لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ
بَيْنِكُمْ ۪ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔
تجھ سے مالِ غنیمت کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ، مالِ غنیمت
اللہ اور رسول کا ہے سو اللہ کا تقوٰے کرو اور اپنے اندر کے معاملات
کو سنوارو اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری
کرو اگر تم مومن ہو ۱۲۰۲

نام - اس سورت کا نام الانفال ہے اور اس میں دس رکوع اور ۷۵ آیات ہیں۔ الانفال کے معنی ہیں مال غنیمت یا وہ مال جو باقاعدہ جنگ میں دشمن سے ہاتھ آتا ہے۔ اس سورت میں اصل ذکر جنگ بدر کا ہے۔ اور یہ سب سے پہلی باقاعدہ جنگ ہے جو مسلمانوں اور کفار میں ہوئی اور اس میں دشمن سے مالِ غنیمت ہاتھ میں آیا اور قیدی بھی پکڑے گئے، ایسے مال کو جائز قرار دیا ہے۔ دوسری طرف ایک تجارتی قافلہ انہی قریش کا جا رہا تھا اور مسلمانوں میں سے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس قافلہ پر حملہ کر کے لوٹ لیا جائے۔ اس کو قرآن شریف نے عرض الدنیا یعنی دنیا کا مال قرار دیکر ناجائز قرار دیا تو گویا بتانا یہ مقصود تھا کہ جنگ میں جو مال دشمن سے ملے وہ جائز ہے لیکن مال کا حاصل کرنا اصل غرض نہیں، بلکہ جنگ کی اصل غرض کچھ اور ہے۔ اس لحاظ سے سورت کا نام الانفال قرار دیا۔

خلاصہ مضمون - اس سورت کا اصل مضمون جنگ بدر اور اس کے متعلقہ واقعات ہیں اس لیے پہلی ہی آیت میں انفال یا مالِ غنیمت کا ذکر کیا ہے، مگر اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے کہ اصل غرض جنگ یا جنگوں کے ذریعہ سے حصول مال نہیں فوراً اس طرف توجہ دلائی ہے کہ آپس میں اصلاح کرو اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، اللہ کا ذکر کرو نمازیں قائم کرو، زکوٰۃ دو تو پکے مومن بنتے ہو اور پھر اصل مضمون جنگ بدر کی طرف عود کیا اور بتایا کہ جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ احقاق حق کرنا چاہتا تھا اور یہ کہ دشمن جو اسلام کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں ان کا استیصال کر دے۔ دوسرے رکوع میں جنگ بدر میں فتح کا اور ان اسباب کا جن سے فتح ہوئی ذکر ہے اور وہ محض اللہ تعالیٰ کی نصرت تھی۔ تیسرے میں پھر بتایا کہ فلاح کی حقیقی راہیں کیا ہیں اور مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی۔ چوتھے میں فرمایا کہ جنگ بدر کے بعد بھی کفار لڑائی میں نکلتے رہیں گے مگر آخر کار مغلوب ہوں گے اور مسلمان خانہ کعبہ کے متولی ہمیشہ کے لیے قرار دیئے جائیں گے۔ پانچویں میں بتایا کہ اجتماع بدر مصلحت الٰہی سے ہوا ورنہ مسلمانوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اتنی بڑی جمعیت سے مقابلہ کے لیے نکلتے۔ چھٹے میں مسلمانوں کو جنگ میں ثابت قدم رہنے کی نصیحت کی تاکہ نصرت الٰہی کے جاذب بنیں۔ ساتویں میں کفار کی بدعہدیوں کا ذکر کیا۔ آٹھویں میں بتایا کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار اور مستعد رہنا چاہیئے۔ نویں میں تسلّی دی کہ کفار کی زیادتی تعداد سے نہ گھبرائیں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دُگنی اور دس گنی تعداد پر بھی غالب کر دکھائے گا اور اسی میں آخر پر بتایا کہ قیدی یا مالِ غنیمت باقاعدہ جنگ کی صورت میں لیے جا سکتے ہیں۔ دسویں میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات قومی بتائے اور فرمایا کہ دین کے معاملہ میں اگر کفار مسلمانوں پر زیادتی کریں تو دوسرے مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کی مدد کریں سوائے اس صورت کے کہ ایسی کافر قوم سے مسلمانوں کا عہد ہو۔

تعلق - اس سے پہلے سورۂ اعراف میں ضرورت نبوّت پر بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ گزشتہ اُمتیں جنہوں نے نہ صرف حق کو ردّ کیا بلکہ خود حق کا استیصال کرنا چاہا ان کا انجام کیا ہُوا اور اس سورت کے آخر پر بتایا تھا کہ آنحضرت صلعم کے اعدا کو بھی ہم تدریجاً پکڑیں گے۔ اس تدریجی گرفت میں سب سے پہلے جنگ بدر کا مقام ہے جس میں کفار کے لیے ایک عبرت آموز سبق تھا اور آنحضرت صلعم کی صداقت کی ایک یقینی دلیل تھی۔ کیونکہ مسلمانوں کے باوجود قلت کے غالب آنے کی پیشگوئیاں مدت پہلے قرآن شریف میں مکّہ میں ہو چکی تھیں۔ اس لیے سورۂ اعراف کے مضمون کا تقاضا تھا کہ اس کے بعد فوراً جنگ بدر کا ذکر ہوتا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کی تدریجی گرفت میں پہلی منزل تھی۔

زمانہ نزول - اس سورت کی تاریخ نزول جنگ بدر کا ہی زمانہ ہے یعنی دوسرا سال ہجرت۔ بعض آیات جن میں کفار کی بار بار عہد شکنی کا ذکر ہے۔ بعد کے زمانہ کی معلوم ہوتی ہیں۔ اور وہ آیات جن میں آنحضرت صلعم کے خلاف کفار مکّہ کے منصوبوں کا ذکر ہے یعنی ہجرت سے پہلے کے واقعات کا وہ درحقیقت مکّی نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کو گزشتہ واقعات کا حوالہ دیکر یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اس وقت بھی اسلام کی تائید میں تھا جب آنحضرت صلعم اکیلے دشمنوں کے اندر رہ گئے تھے اور وہ دشمن آپ کے قتل کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور یوں ان کو تسلّی دی ہے کہ وہ اسلام کی ہمیشہ تائید فرماتا رہے گا۔

۱۲۰۲۔ غنیمت اور انفال میں فرق: الانفال۔ نَفَل کی جمع ہے جو اصل میں زیادت ہے۔ یعنی جس قدر واجب ہو جو اس سے زیادہ ہو وہ نَفَل ہے۔ اسی معنی میں نفل عبادت ہے۔ اسی لیے مال غنیمت کو نَفَل کہا جاتا ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہوا ہے کہ کس قسم کی غنیمت پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔ بعض نے اسے عین غنیمت کہا ہے یعنی انفال اور غنیمت ایک ہی

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ	مومن وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل
وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ	ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جائیں وہ اُن کو
زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۲﴾	ایمان میں بڑھاتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں ع۱۲۰۳
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ	جو نماز کو قائم کرتے ہیں اور اُس سے جو ہم نے اُن کو
يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾	دیا ہے خرچ کرتے ہیں۔
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ	یہی سچے مومن ہیں ان کے لیے ان کے رب کے ہاں (بڑے) درجے
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۴﴾	اور حفاظت اور عزت والا رزق ہے ع۱۲۰۴
كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ	جس طرح تیرے رب نے تجھے تیرے گھر سے حق کے ساتھ نکالا اور
وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ﴿۵﴾	مومنوں میں سے ایک گروہ ناخوش تھا ع۱۲۰۵

شے ہے۔ دو نام دو حیثیتوں سے رکھے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے کہ وہ مال مظفر ہو کر ملتا ہے اسے غنیمت کہا جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فضل ہے اسے انفال کہا جاتا ہے۔ اور بعض نے غنیمت اور نفل میں عموم و خصوص کے لحاظ سے فرق کیا ہے۔ یعنی غنیمت عام ہے محنت سے حاصل ہو یا بلا محنت فتح سے پہلے حاصل ہو یا پیچھے، اور نفل وہ ہے جو مال غنیمت میں سے تقسیم سے پہلے حاصل ہو۔ یا وہ جو بغیر جنگ کے حاصل ہو مگر ایسے مال کو فئے کہا جاتا ہے۔ گو فئے کے لیے ضروری ہے کہ جنگ کی تیاری ہو چکی ہو اور دشمن نے ہتھیار ڈال دیئے ہوں نفل کے لیے یہ ضروری نہیں۔

لِلّٰہ والرسول سے مراد بیت المال ہے یعنی مسلمانوں کی عام اور مشترکہ ضروریات۔

اس سورت میں بالخصوص جنگ بدر کا ذکر ہے اور اس کا تعلق سورت ماقبل سے یوں ہے کہ وہاں انبیائے سابق کے مخالفوں کی ہلاکت کا ذکر ہے یہاں آنحضرت صلعم کے اعدا کی ہلاکت اور ان پر جو عذاب آیا اس کا ذکر ہے اس لیے اس کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ جنگ میں جو بعض قسم کا مال دشمن سے حاصل ہوتا ہے اس کو کس غرض پر صرف کیا جائے۔ اور اس کے متعلق یہ حکم دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی عام ضروریات پر خرچ ہو۔ لیکن یہ سمجھانے کے لیے کہ جنگ اصل ضروریات میں سے نہیں بلکہ محض ایک اتفاقی پیش آمدہ امر ہے۔ جنگ کے ذکر کو چھوڑ کر فوراً اس طرف توجہ دلائی کہ متقی باخلاق انسان بنو اور آپس میں صلح کرو۔

ع۱۲۰۳ وجل۔ استشعار خوف کا نام ہے یعنی خوف محسوس کرنا (رغ) انا منکم وجلون (الحجر ۱۵-۵۲) وقلوبہم وجلۃ (المومنون ۲۳-۶۰)

زادتہم ایمانا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کم و بیش بھی ہوتا رہتا ہے۔ گویا بُرے اعمال سے اس میں نقص واقع ہوتا ہے اور اچھے اعمال سے ایمان بڑھتا ہے۔ بخاری میں حدیث مروی ہے کہ ایمان کی ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں۔ جن میں سے لا الٰہ الا اللہ سب سے بلند اور رستہ سے دکھ دینے والی چیزوں کو دور کرنا سب سے نچلی شاخ ہے اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔ آج مسلمانوں کا دعویٰ ایمان اور عملی حالت ان آیات اور احادیث کی تکذیب کر رہے ہیں۔

ع۱۲۰۴ ان تین آیات میں مومنوں کی صفات کو بیان کیا ہے تاکہ زندگی کے اصل مقصد کو سمجھ لیں۔ مسلمانوں کی تیاری جنگ کے لیے اس طرح پر نہیں ہوئی کہ انھیں فنونِ جنگ میں مہارت کا سبق سکھایا جاتا۔ بلکہ قیام نماز اور انفاق فی سبیل اللہ کا سبق ان کو پڑھا کر اور یہ بتا کر کہ دل میں خوف الٰہی ہونا چاہیئے اور متکبرانہ روش سے بچنا چاہیئے۔ ان کو جنگ کے لیے تیار کیا ہے۔ اسی سبق کا نتیجہ تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جنگیں بوجہ خونریزی سے پاک تھیں اور بڑی بڑی فتوحات کے وقت دشمنوں کے ساتھ کمال عفو اور نرمی کا سلوک تھا اور مخلوق خدا کی ہمدردی مدّنظر تھی۔

ع۱۲۰۵ کما۔ میں اشارہ آیت ماقبل کے آخری الفاظ کی طرف ہے۔ یعنی مومن کا اصل کام تو وہی ہے جو ان آیات میں بیان ہوا یعنی دل میں عاجزی کا پیدا کرنا۔ نماز قائم کرنا۔ خدا کی راہ میں اپنی طاقتوں اور مال کا خرچ کرنا۔ اسی راہ پر چلنے سے بلند درجات اور رزق کریم ملتا ہے۔ چنانچہ انھی درجات بلند اور رزق کریم کے دینے کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہارے گھر سے حق کے ساتھ نکالا یعنی جنگ بدر کے لیے مدینہ سے تم کو حق کے ساتھ نکالا۔ بالفاظ دیگر اس وقت اللہ تعالیٰ نے تم کو نکلنے کا حکم دیا جب ضروریات حقہ پیش آ چکی تھیں۔

جنگ بدر جن حالات میں پیش آئی اس کے متعلق قرآن کریم سے بڑھ کر اور کوئی معتبر شہادت نہیں ہو سکتی۔ اور ان آیات میں مختصر مگر جامع الفاظ میں جنگ بدر کے تمام ابتدائی مراحل کی شہادت ہمیں ملتی ہے اس قدر تو مسلّم ہے کہ جب نبی کریم صلعم مدینہ سے نکلے ہیں اس وقت ایک طرف کفار کی ایک زبردست جمعیت ابوجہل کی کمانڈ کے ماتحت مکّہ سے نکل چکی تھی بلکہ اس کی خبر بھی نبی کریم صلعم کو پہنچ چکی تھی۔ کیونکہ مقام بدر جہاں مٹھ بھیڑ ہوتی ہے مکّہ سے آٹھ یا نو منزل اور مدینہ سے تین منزل پر ہے۔ دوسری طرف یہ بھی درست ہے کہ ایک تجارتی قافلہ شام سے ابوسفیان کی سرکردگی میں مکّہ کو واپس آ رہا تھا اور اس کی اطلاع بھی مسلمانوں کو تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا رسول اللہ صلعم اس قافلے کو لوٹنے کے لیے نکلے تھے یا اس لشکر کی مدافعت کے لیے۔ ارباب سیر نے بعض غیر محتاط روایات سے یہ غلطی کھائی ہے۔ کہ

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷

تیرے ساتھ حق کے بارے میں جھگڑتے ہیں اس کے بعد کہ وہ واضح ہو گیا گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جاتے ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں ۱۲۰۶ اور جب اللہ تمھیں دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ دیتا تھا کہ وہ تمھارے لیے ہے اور تم چاہتے تھے کہ جس کے پاس ہتھیار نہیں وہ تمھارے لیے ہو اور اللہ ارادہ کرتا تھا کہ اپنی پیشگوئیوں کے ذریعے سے حق کو ثابت کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے ۱۲۰۷

نبی کریم صلعم ابوسفیان کے تجارتی قافلہ پر حملہ کرنے کے گھر سے نکلے تھے۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ آپ ابوجہل کے لشکر کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے جو مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے مکہ سے نکلا تھا اس امر پر کہ دوسری بات صحیح ہے پہلی شہادت الفاظ اخرجك ربك من بيتك سے ملتی ہے ظاہر ہے کہ بیت تو مدینہ ہی ہے اور مدینہ سے آپ کے نکلنے کو اللہ تعالےٰ کے حکم کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ نبی کریم صلعم اپنی خواہش سے یا لوگوں کے مشورہ کی بنا پر نہیں نکلے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نکلے ہیں۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی قافلہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا ہوگا۔ تو یہ اس لیے غلط ٹھہرتا ہے کہ یہ واقع نہیں ہوا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا تو ضرور تھا کہ واقع ہو کر رہتا۔ دوسری شہادت بالحق سے ملتی ہے۔ کسی فعل یا قول کا حق ہونا یہ ہوتا ہے جیسا کہ راغب نے لکھا ہے جب اس کا وقوع بِحَسَبِ مایَجِبُ ولِقَدَرِ مایَجِبُ و فی الوقت الذی یجب ہو یعنی اس کے مطابق جو واجب ہو اور اس اندازہ سے جو واجب ہو اور اس وقت میں جو واجب ہو۔ اب اگر تجارتی قافلہ پر حملہ کے لیے نکلا ہوتا تو یہ تینوں لحاظ سے کسی طرح پر بالحق نہ تھا۔ اس لیے کہ اول تو کسی راہ چلتے قافلہ پر حملہ بحسب ما یجب نہیں اس کا واجب ہونا چھوڑ اس کی ضرورت ہی کوئی نہیں اور پھر لقدر ما یجب بھی نہیں اس لیے کہ آنحضرت صلعم پوری تیاری کر کے نکلے ہیں جو ممکن تھی۔ حالانکہ قافلہ کے لیے پچاس مسلح آدمی کافی تھے۔ اور فی الوقت الذی یجب بھی نہیں اس لیے کہ قافلہ تو اس وقت بہت دور نکل چکا تھا۔ یہاں تک کہ جنگ بدر میں فتح حاصل کرنے کے بعد اتنا قریب بھی نہ تھا کہ اس پر حملہ کیا جاتا۔ پس اخراج بالحق اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس لشکر کے مقابلہ کے لیے نکلیں جو مدینہ پر مسلمانوں کو کچلنے کیلئے حملہ آور ہو رہا ہے یہ ایک ضرورت حقہ تھی اور پھر تیاری بھی اسی کے مطابق کی گئی اور پھر وقت بھی اسی کے مقابلہ کا تھا۔ اور قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلنا اس لیے بھی بالحق نہیں کہلا سکتا کہ قرآن کریم میں حکم ہے وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم اور اس قافلہ نے آپ سے جنگ نہ کی تھی نہ ابھی تک قریش نے ہی آپ پر حملہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بدر کے دن نبی کریم صلعم پہلے کفار کے حملہ کے منتظر رہے اور جب انھوں نے حملہ کیا تب آپ نے مدافعت کا حکم دیا۔

تیسری قطعی شہادت اس بات پر کہ رسول اللہ صلعم جب مدینہ سے نکلے تو مدینہ پر حملہ آور لشکر کے مقابلہ کے لیے نکلے ان الفاظ سے ملتی ہے کہ آپ جب مدینہ سے نکلے تو اس وقت مومنوں کا ایک حصہ ناخوش تھا۔ اس ناخوشی کی وجوہات اگلی آیت میں بتائی ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ اگر قافلہ پر حملہ کا مطلب ہوتا تو کوئی فریق ناخوش کیوں ہوتا اور اس کو مصیبت کیوں سمجھتا، تین سو چھوڑ پچاس آدمی بھی ایک قافلہ کو لوٹنے کے لیے کافی تھے پس مدینہ سے نکلتے وقت مومنوں کی ایک جماعت کی ناخوشی صاف بتاتی ہے کہ وہ مدینہ پر حملہ آور لشکر کے مقابلہ کے لیے نکل رہے تھے۔

ع ۱۲۰۶ چوتھی شہادت اس بات کی من بعد ماتبین لھم الحق میں موجود ہے۔ کیونکہ نکلنے کو ناپسند کرنے والے اسے ضرورت حقہ نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ ضرورت ظاہر ہو چکی تھی۔ ضرورت ظاہر اسی صورت میں کہلا سکتی ہے جب مسلمانوں کی ہستی معرض خطر میں ہو۔ اور دشمن حملہ آور ہو چکا ہو کیونکہ جنگ کی اجازت ہی انہی لوگوں سے تھی جو پہلے جنگ کریں۔ جیسا اذن للذین یقاتلون (الحج ۲۲- ۳۹) سے اور پھر وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (البقرۃ ۲- ۱۹۰) سے ظاہر ہے۔ قافلہ تو مسلمانوں سے جنگ کرنے نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ جنگ کی ضرورت کو الفاظ قرآنی میں واضح اور بیّن کہا جا سکے۔ پانچویں اور نہایت کھلی ہوئی شہادت الفاظ کانّما یساقون الی الموت سے ملتی ہے۔ قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلنے کو کون موت کے منہ میں جانا کہہ سکتا ہے۔ ہاں وہ طاقتور لشکر جو مدینہ پر حملہ آور ہو رہا تھا اس سے مقابلہ کرنے کے لیے نکلنا واقعی موت کے مونہہ میں جانا تھا۔

ع ۱۲۰۷ غیر ذات الشوکۃ۔ شوك اصل میں کانٹوں کو کہتے ہیں اور اس سے مراد شدت اور ہتھیار بھی لیے جاتے ہیں (غ)

یحق۔ احقاق سے ہے یہاں مراد وہ احقاق حق ہے جو دلائل اور نشانات کے اظہار سے ہو۔

دو گروہوں کا ذکر اور خدائی ارادہ: اس آیت میں جنگ بدر کی وجوہات کو اور بھی کھول دیا ہے یہاں صاف بتا دیا ہے کہ دو گروہ تھے ایک مسلح اور ایک غیر مسلح یعنی تجارتی قافلہ اور تم (یعنی مسلمانوں میں سے وہ لوگ جن کے خوف کا ذکر اوپر ہے) چاہتے تھے کہ غیر مسلح گروہ یعنی قافلہ کے ساتھ مقابلہ ہو اور اللہ تعالیٰ اس کے خلاف چاہتا تھا یعنی مسلح لشکر سے مقابلہ ہو۔ تو جس صورت میں گھر سے نکالنے والا اللہ تعالیٰ تھا یعنی نکلنا اس کے حکم سے تھا تو صاف معلوم ہوا کہ یہ نکلنا مسلح لشکر کے مقابلہ کے لیے تھا۔ یعنی ابوجہل کے مقابلہ کے لیے اور تجارتی قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے نہ تھا جو محض بعض کمزور دلوں کی خواہش تھی۔ یہ چھٹی دلیل ہے جو ہمارے مدعا کو ثابت کرتی ہے۔ اور جن روایات میں قافلہ پر حملہ کو مدینہ سے نکلنے کی وجہ بتایا گیا ہے وہ اسی بنا پر محمول ہو سکتی ہیں۔ ساتویں دلیل ان الفاظ میں

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ۚ ⑧

تاکہ حق کو سچ اور باطل کو جھوٹا کر دے، گو مجرم ناپسند کریں۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ⑨

جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے سو اس نے تمہاری پکار سُنی کہ میں ایک ہزار آگے چلنے والے فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کرنے والا ہوں ۱۲۰۸

وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ⑩

اور اللہ نے اسے صرف ایک خوشخبری ٹھیرایا اور تاکہ اس کے ساتھ تمہارے دلوں کو اطمینان ہو اور مدد تو اللہ کی طرف سے ہی ہے اللہ غالب حکمت والا ہے ۱۲۰۹

ہے ویرید اللہ ان یحق الحق بکلمتہ یہ تو ظاہر ہے کہ کلمات سے مراد کوئی اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اب اللہ تعالیٰ کے کلام کو ایک جنگ سے کیا تعلق ہے۔ سوائے اس کے کہ اس جنگ کے متعلق کوئی پیشگوئیاں ہوں۔ چنانچہ قرآن کریم میں جنگ بدر کے متعلق اور مسلمانوں اور کافروں میں مقابلہ ہو کر مسلمانوں کے غالب آنے کے متعلق صریح پیشگوئیاں ہیں اور کلمات میں انہی پیشگوئیوں کی طرف اشارہ ہے یوں یہ جنگ محض جنگ نہ تھی بلکہ ایک دلیل اور نہایت واضح دلیل اسلام کی صداقت کی تھی لیکن قافلہ پر حملہ کرنے کی نہ کوئی پیشگوئی تھی نہ کوئی ایسی پیشگوئی پوری ہوئی۔ آٹھویں دلیل الفاظ یقطع دابر الکافرین میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا منشا تمہارے مدینہ سے نکالنے میں یہ تھا کہ کافروں کی جڑ کاٹ دے یعنی ان کی طاقت کو کچل دے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کفار کی طاقت ایک قافلہ کو لوٹنے سے نہ کچلی جا سکتی تھی بلکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنا پورا زور لگا کر ہلاک ہوں۔

۱۲۰۸ تستغیثون۔ غَوث کا استعمال نصرت کے محل پر ہوتا ہے۔ اور غَیث بارش ہے اور استغاثۃ طلب غوث اور طلب غیث دونوں پر بولا جاتا ہے (غ) یہاں طلب مدد ہی مراد ہے جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے۔ اور دوسری جگہ ہے فاستغاثہ الذی من شیعتہ (القصص ۲۸-۱۵) و ان یستغیثوا یغاثوا بماء کالمھل (الکھف ۱۸-۲۹)

مردفین۔ ردف تابع یعنی پیچھے آنے والے یا پچھلے حصّہ کو کہتے ہیں اور اَرْدَفتہ کے معنی ہیں اسے گھوڑے کے پچھلے حصّہ پر (یعنی اپنے پیچھے) سوار کر لیا اور رَادِف پچھلے کو کہتے ہیں۔ اور مُرْدِف متقدم کو یعنی جس کے پیچھے دوسرا ہو (غ) یعنی رَدِفَ اور اَرْدَفَ کے الگ الگ معنی ہیں جنھوں نے مردفین کے معنی پیچھے آنے والے کیے ہیں انہوں نے رَدِفَ اور اَرْدَفَ کے ایک معنی کر لیے ہیں۔ رہا یہ کہ آگے چلنے والے فرشتوں سے کیا مراد ہے اور ان کے پیچھے کون ہے۔ سو ظاہر ہے کہ ملائکہ جیسا کہ آگے صراحت سے مذکور ہے مسلمانوں کو ثابت قدم کرتے اور کفار کے دل میں رعب ڈالتے تھے۔ اذ یوحی ربک الی الملئکۃ انی معکم فثبتوا الذین اٰمنوا سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب (۱۲) اس لیے وہ عسکر اسلامی کے لیے متقدم تھے یعنی وہ آگے تھے اور ان کے پیچھے لشکر اسلامی تھا۔ راغب نے یہ معنی نقل کیے ہیں قیل المراد المتقدمین لِلعَسْکَرِ یلقون فی قلوب العِدَی الرُّعْبَ۔

یہ بھی اسی وقت کا ذکر ہے جیسا کہ اذ کے استعمال سے ظاہر ہے جب نبی کریم صلعم مدینہ سے نکلتے ہیں مسلمان اپنی کمزوری دیکھ کر اور دشمن کی طاقت دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے مدد چاہتے ہیں۔ اگر قافلہ پر حملہ مقصود ہوتا تو طلب مدد کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جب ایک گروہ ڈر رہا ہے کہ ہمیں موت کے مونہہ میں دیا جاتا ہے وہی وقت طلب مدد کا ہے۔ پس یہ نویں دلیل اس بات پر ہے کہ مسلمان گھر سے لشکر کفار کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے نہ قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے۔

ایک ہزار فرشتوں کی خصوصیت کیوں کی؟ ایک ہزار عدد کامل بھی ہے۔ مگر دوسری بات یہ بھی ہے کہ دشمن کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہی تھی اس لیے اسی قدر ملائکہ کی نصرت کا وعدہ دیا (دیکھو ۵۱۱)

۱۲۰۹ ملائکہ کے ذریعہ نصرت کا جو وعدہ دیا اس کے متعلق یہاں دو باتیں بیان فرمائیں۔ ایک یہ کہ تمہارے لیے یہ خوشخبری ہو کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ تین سو آدمی ایک ہزار کا مقابلہ کیا کر سکتے تھے۔ ملائکہ سے نصرت کا وعدہ دیکر فتح کی خوشخبری مسلمانوں کو دی اور بتایا کہ تمہاری تائید میں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے یہ تو مسلمانوں کو پہلے سے خبر دی گئی تھی کہ کفار کے ساتھ ان کی جنگ ہو گی تو وہ مظفر و منصور ہوں گے اور کفار پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے سیھزم الجمع ویولون الدبر (القمر ۵۴-۴۵) یہاں یہ بھی بتایا کہ وہ مدد کیوں کر ہو گی اس لیے ملائکہ کا ذکر فرمایا کیونکہ تین سو آدمی ایک ہزار پر غالب نہ آ سکتے تھے سوائے اس کے کہ کوئی اور اسباب ان کے موافق اور دشمن کے خلاف پیدا ہو جائیں۔ تو ملائکہ کی نصرت کے وعدہ میں یہ بتایا کہ وہ اسباب کوئی انسانی تجاویز کا نتیجہ نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسباب پیدا ہوں گے اور ملائکہ چونکہ وسائط ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کام لیتا ہے اس لیے ان وسائط کا ذکر کیا۔

دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ تا تمہارے دلوں کو اس سے اطمینان ہو۔ قلوب میں اطمینان کا پیدا کرنا بھی ملائکہ کا کام ہے اور یہ عام تجربہ ہے کہ وہی شخص

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ	جب اس نے تم پر اپنی طرف سے امن کے لیے اونگھ ڈال دی[۱۲۱۰] اور
عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ	اس نے تم پر بادل سے پانی اتارا تاکہ اس سے تم کو پاک کرے اور
وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ	تم سے شیطان کی ناپاکی کو دور کر دے اور تاکہ تمھارے دلوں کو

جب اس کے قلب میں اطمینان ہو تو بہت بڑے بڑے کام کر سکتا ہے۔ حالانکہ اگر اس کا قلب اطمینان سے خالی ہو تو اس کے جسمانی قویٰ اور ظاہری سامان اس کو کچھ بھی نفع نہیں دیتے۔

تیسری غرض سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب (۱۲) میں بیان فرمائی یعنی ملائکہ کے ذریعہ سے دشمنوں کے دل میں رعب ڈال دیا جائے گا اور یہ بھی صحیح ہے کہ مومن کتنے بھی ثابت قدم ہوتے لیکن اگر مقابلہ میں کفار بھی ثابت قدم ہوتے تو بھی مسلمانوں کو فتح نہ مل سکتی تھی اس لیے فرمایا کہ کافر مرعوب ہو جائیں گے اسی کی طرف ملائکہ کے لیے لفظ مردفین اختیار کرنے میں اشارہ ہے یعنی وہ مسلمان لشکر کے آگے آگے کفار کے دل میں رعب ڈالتے جائیں گے تاکہ کفار کے لشکر کے مسلمانوں کے سامنے قدم نہ جم سکیں۔

ان تین اغراض کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ صاف سمجھ آتا ہے کہ ملائکہ کا نزول ایک حقیقت تھی اور اسی نزول سے ہی مسلمانوں کے قلوب کو قوت ملی اور کفار کا لشکر مرعوب ہو گیا۔

ملائکہ نے بدر میں جنگ نہیں کی: رہا یہ سوال کہ آیا ملائکہ نے انسانوں کی صورت میں ہو کر یا کسی اور طرح پر فی الواقع کفار سے لڑائی بھی کی یا نہیں۔ اس بارہ میں مختلف رائیں ہیں۔ ایک روایت میں ایک انصاری کا ذکر ہے کہ وہ ایک کافر کا تعاقب کر رہا تھا کہ اتنے میں اس نے ایک کوڑے کی آواز سنی اور وہ کافر گر گیا۔ اور اس نے یہ ذکر رسول اللہ صلعم سے کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ ملائکہ کی امداد سے تھا۔ اور ایک میں ہے کہ ابوجہل نے ابن مسعود سے دریافت کیا کہ یہ کیا بات تھی کہ ہم آواز سنتے تھے اور شکل نہ دیکھتے تھے، تو انہوں نے کہا یہ ملائکہ تھے۔ ان دونوں سے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو کسی نے دیکھا نہیں اور وہ جنگ کرتے تھے اور بعض لوگوں نے کہا کہ انہوں نے سفید کپڑے پہنے ہوئے انسانوں کی صورت میں لڑائی کی مگر قرآن کریم کی صراحت ان دونوں کے خلاف ہے اور اس آیت کے الفاظ قطعی ہیں۔ چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں والذی یدل علی صحۃ ان الملائکۃ ما نزلوا للقتال قولہ تعالیٰ وما جعلہ اللّٰہ الا بشریٰ الخ یعنی یہ آیت اس بات کی صحت پر دلالت کرتی ہے کہ بدر کے دن ملائکہ جنگ کرنے کے لیے نازل نہیں ہوئے اور اس کی تائید میں ایک روایت حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے جس میں یہ لفظ آتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے عریش میں دعا کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو فرمایا البشر بنصر اللّٰہ ولقد رأیت فی مناھی جبرائیل یقدم الخیل یعنی اللہ کی مدد سے خوش ہو جاؤ میں نے اپنی خواب میں جبرائیل کو دیکھا کہ وہ لشکر کے آگے آگے چلتا ہے اور اس کے بعد امام رازی لکھتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انکے نزول کی غرض صرف یہی بشارت تھی اور اس سے ان کے جنگ پر اقدام کرنے کی نفی ہوتی ہے۔ اسی طرح روح المعانی میں اس آیت کے نیچے ہے۔ فی الایۃ اشعار بان الملئکۃ لم یباشروا قتالًا وھو مذھب لبعضھم اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے لڑائی نہیں کی اور یہ بعض کا مذہب ہے۔

نوٹ ع۵۱۲ سے ظاہر ہے کہ اس بات پر قریبًا اتفاق ہے کہ سوائے بدر کے اور کسی جنگ میں ملائکہ نے لڑائی نہیں کی اور جنگ بدر میں نہ لڑنا خود اوپر کی بحث سے ظاہر ہے اور اگر ادنیٰ تدبر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جب تین جنگوں میں ملائکہ کے نزول کا ذکر ہے اور دو کے متعلق اتفاق ہے کہ فرشتے لڑے نہیں۔ تو جس غرض کے لیے دو میں نزول ملائکہ ہوا اسی غرض کے لیے تیسری میں بھی ہوا، اس لیے جنگ بدر کو مستثنیٰ کرنا غلطی ہے۔ علاوہ ازیں خود قرآن کریم نے اس کا فیصلہ کیا ہے فارسلنا علیھم ریحا وجنودا لم تروھا (الاحزاب ۳۳-۹) ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر جنہیں تم نے نہیں دیکھا۔ یہ جنگ احزاب کے متعلق ہے۔ جہاں فرشتوں کو ایسے لشکر قرار دیا ہے جنھیں مسلمانوں نے نہیں دیکھا اور یہ قطعی شہادت اس بات پر ہے کہ فرشتوں کی امداد اور رنگ کی تھی۔ ان کا آنا یوں نہ تھا کہ تین سو مسلمانوں کے ساتھ ایک ہزار فرشتے مل کر تیرہ سو جنگ کرنے والے ہو گئے ہوں۔ ہاں تین سو کا ہزار پر غالب آنا یقینی شہادت ہے کہ مسلمانوں کو امداد غیبی پہنچی۔

ع۱۲۱۰ نعاس۔ تھوڑی نیند یا اونگھ کو کہتے ہیں مگر راغب نے یہاں نُعاس کے معنی سکون بھی قبول کیے ہیں۔ کیونکہ نیند خود بھی سکون ہے۔

جنگ بدر کے ابتدائی مراحل کو بیان کر کے اب میدان جنگ کی کسی قدر کیفیت بیان کی اور اس میں سب سے پہلے یہ بتایا کہ ہم نے تم پر نعاس وارد کر دی۔ نعاس کے عام معنی اُونگھ یا نیند کی مقاربت ہیں مگر کسی حدیث صحیح سے یہ ثابت نہیں کہ بدر کے دن لڑائی کے وقت مسلمانوں پر نیند وارد ہوئی تھی۔ البتہ اُحد کے دن خاتمۂ جنگ پر نیند کا وارد ہونا ایک مشہور واقعہ ہے۔ ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے کہ رات کے وقت نیند کا آنا مراد لیا جائے۔ کیونکہ جنگ اگلے دن صبح شروع ہوئی۔ پس یہاں یا تو یہ مراد ہے کہ رات کو میدان جنگ میں تمہیں نیند آ گئی اور یہ امن کی نشانی تھی یعنی مسلمانوں کے دلوں میں جو دشمن کا خوف تھا وہ جاتا رہا اور مجاہد سے مروی ہے کہ بارش نعاس سے پہلے آئی تھی (رش) اور یہ اس معنی کا موید ہے مگر رات کی نیند کے لیے نوم کا لفظ زیادہ موزوں تھا اور یا نعاس سے مراد یہاں سکون ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ وہ جو حالت خوف تھی کہ بعض سمجھتے تھے کہ ہم موت کے مُنہ میں جا رہے ہیں۔ میدان جنگ میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کو بدل کر دلوں میں سکون وارد کر دیا اور شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نبی کریم صلعم بہت دعا کرتے کرتے آخر عریش سے باہر تشریف لائے تو آپ کی زبان مبارک پر

عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ؕ ﴿۱۱﴾

قوت دے اور قدموں کو اس کے ساتھ مضبوط کرے ع۱۲۱۱

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ
فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ
الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ
الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ؕ ﴿۱۲﴾

جب تیرا رب فرشتوں کو وحی کرتا تھا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں سو جو ایمان لائے ان کو ثابت قدم رکھو۔ میں ان کے دلوں میں جو کافر ہوئے رعب ڈال دونگا۔ سو گردنوں کے اوپر مارو اور ان کے پوروں کو کاٹ ڈالو ع۱۲۱۲

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ
يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾

یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ (بدی کی) سخت سزا دینے والا ہے ع۱۲۱۳

ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

اس (عذاب) کا مزہ چکھ لو اور (جان لو) کہ کافروں کے لیے آگ کا عذاب ہے ع۱۲۱۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۚ ﴿۱۵﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم ان سے جو کافر ہیں، جنگ کی حالت میں ملو تو اُن سے پیٹھ نہ پھیرو ع۱۲۱۵

یہ لفظ تھے سیہزم الجمع ویولون الدبر یعنی کافروں کی جمعیت بھاگ جائے گی اور پیٹھ پھیر دیں گے جو ایک قرآنی پیشگوئی جنگ بدر کے لیے تھی۔

ع۱۲۱۱ یربط علی قلوبکم۔ رَبْط کے معنی باندھنا ہیں اور دلوں پر ربط سے مراد وہی ہے جو سکینت کے نازل کرنے اور روح القدس سے تائید کرنے سے (رغ)

دوسری نعمت مسلمانوں پر یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مینہ برسا دیا اور اس مینہ سے کئی ایک فواید حاصل ہوئے۔ اوّل یہ کہ جہاں مسلمان اُترے تھے وہاں پانی کافی نہ تھا، دوسرے مسلمانوں کے اُترنے کی جگہ نشیب میں تھی اور ریتلی زمین تھی جس میں پاؤں دھنستا تھا پس بارش سے ایک تو پانی استعمال کے لیے یعنی وضو غسل کے لیے بافراط ہو گیا اور دوسرے زمین سخت ہو گئی اور اس پر قدم جمنے لگا اور تطہیر سے مراد یا تو وضو غسل وغیرہ ہی ہیں اور یا دلوں سے کمزور خیالات کا دور کرنا۔ شیطان کی ناپاکی دور کرنے سے یا تو ان وساوس کا دور کرنا مراد ہے جو شیطان بعض دلوں میں ڈالتا تھا کہ ایک تو تم پہلے ہی کمزور تھے دوسرے جگہ بھی اچھی نہیں ملی اور یا پیاس کا دور کرنا مراد ہے کیونکہ پیاس کو شیطان الفلا کہا جاتا ہے۔ اور دلوں کی قوت اور قدموں کی مضبوطی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ قدموں کی مضبوطی صرف یہی نہیں کہ ریتلی زمین پر بارش کی وجہ سے پاؤں جمنے لگا بلکہ یہ کہ دشمن کے مقابلہ پر قدم مضبوط ہو گئے۔

ع۱۲۱۲ یہ میدان جنگ کا دوسرا نظارہ ہے پہلا نظارہ وہ ہے جس کا ذکر پہلی آیت میں ہے اور یہاں عین حالت جنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ ملائکہ کا جو کام تھا اس کی تصریح یہاں خود قرآن کریم نے فرما دی ہے۔ اس لیے اختلاف روایات کے اندر صحیح راہ قرآن کریم کے الفاظ کو مدنظر رکھنا ہے۔ ملائکہ کو حکم تھا کہ مسلمانوں کو ثابت قدم رکھیں اور ملائکہ کا تعلق چونکہ قلوب سے ہوتا ہے اس لیے ان کا ثابت قدم رکھنا اسی طرح پر تھا۔ جیسا کہ زجاج نے بھی لکھا ہے کہ ان کے دلوں میں ایسا القا کریں جس سے ان کا عزم پختہ ہو اور ان کی کوشش مضبوط ہو سالقی فی قلوب والا فقرہ الگ ہے۔ جس میں مسلمانوں کو خطاب ہے کہ تم کفار کو مارو یہ ملائکہ کی وحی میں داخل نہیں فوق الاعناق سے مراد بعض نے سر لیے ہیں کہ ان کے سر کاٹ دو۔ اور بعض نے فوق بمعنی علےٰ لیا ہے یعنی ان کی گردنوں پر تلواریں مارو۔

بنان - بنانۃ کی جمع ہے۔ انگلیوں کی پوروں کو کہتے ہیں کیونکہ انہی سے ہاتھ کام دیتا ہے اور اسی میں انسان کی ساری قوت مخفی ہے پس مراد یہ ہے کہ جن ہاتھوں سے تم پر تلواریں اُٹھاتے ہیں ان ہاتھوں کو کاٹ ڈالو۔

ع۱۲۱۳ شاقوا - شق کے معنی شگاف ہیں ثم شققنا الارض شقا (عبس ۸۰ - ۲۶) اور شِقّ کے معنی مشقت ہیں الابشق الانفس (النحل ۱۶ - ۷) اور شُقّۃ وہ جانب ہے جن تک پہنچنے میں مشقت ہو لبعدت علیہم الشقۃ (التوبۃ ۹ - ۴۲) اور شقاق مخالفت ہے وان خفتم شقاق بینہما (النساء ۴ - ۳۵) ومن یشاقق الرسول (النسا - ۱۱۵) (رغ)

ع۱۲۱۴ یہاں صاف طور پر اس عذاب دنیا کو عذاب آخرت کے لیے پیش خیمہ بتایا ہے۔ یہ اس لیے کہ دونوں قسم کے عذاب کا ان سے وعدہ کیا تھا ولنذیقنہم من العذاب الادنیٰ دون العذاب الاکبر (السجدۃ ۳۲ - ۲۱) سو اس پہلے عذاب کا آجانا ثبوت تھا کہ دوسرا وعدہ بھی سچا ہے۔

ع۱۲۱۵ زحف - اصل میں پاؤں گھسیٹ کر چلنا ہے جس طرح بچہ چلتا ہے اور لشکر کے کوچ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اس لیے کہ کثرت سامان وغیرہ کی وجہ سے

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑯

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ⑰

ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ⑱

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ⑲ ع

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

اور جو کوئی اس دن ان سے اپنی پیٹھ پھیرے سوائے اس کے کہ جنگ کے لیے ایک طرف پھر جائے یا کسی جماعت کے ساتھ پناہ لے تو وہ اللہ کی ناراضگی لے پھرا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُری جگہ ہے ۱۲۱۶

سو تم نے ان کو نہیں مارا بلکہ اللہ نے ان کو مارا۔ اور جب تو نے پھینکا تو تُو نے نہیں پھینکا، بلکہ اللہ نے پھینکا۔ اور تا کہ وہ مومنوں کو اپنی طرف سے اچھا انعام دے۔ اللہ سُننے والا جاننے والا ہے ۱۲۱۷

یہ (تو ہو چکا) اور جان لو کہ اللہ کافروں کی جنگ کو کمزور کرنے والا ہے ۱۲۱۸

اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو فیصلہ تمہارے پاس آ گیا ۱۲۱۹ اور اگر تم رک جاؤ تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم پھر (جنگ) کرو گے ہم بھی پھر (سزا) دینگے اور تمہارا جتھا تمہارے کچھ کام نہ آئے گا، اگرچہ بہت ہو اور (جان لو) کہ اللہ مومنوں کے ساتھ ہے ۱۲۲۰

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور

وہ آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہے (غ) اس لیے زحف کے معنی جنگ میں دشمن سے مٹھ بھیڑ بھی آئے ہیں جیسے حدیث میں ہے وان فرّ من الزحف۔ جنگ کے ذکر میں بتایا ہے کہ مسلمان کا یہ کام نہیں کہ دشمن کو پیٹھ دکھائے استثنا کا ذکر اگلی آیت میں ہے چونکہ مسلمان کے لیے جنگ کے قوانین بھی منجانب اللہ ہیں اس لیے آج تک مسلمان ان احکام پر عامل ہیں۔ ترکوں کے متعلق بالخصوص یہ ایک مشہور امر ہے کہ گولی کا زخم ان کے سینہ پر یا سامنے کی طرف ہوتا ہے پیٹھ پر نہیں۔

ع ۱۲۱۶ متحرفا۔ حرف سے ہے جس کے معنی کنارہ یا طرف ہیں پس تحرّف کنارہ کشی ہے۔

متحیزا۔ حوز اس کا اصل ہے ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ جمع ہونا پس متحیزا کے معنی ہیں صائرا الی حَیّزٍ (غ)

جنگ میں دشمن کے سامنے دو حال میں بھاگنا جائز ہے۔ اول اغراض جنگ کے لیے، دوسرا بڑے حصّہ لشکر سے کٹ جائے تو اس کے ساتھ ملنے کے لیے۔

ع ۱۲۱۷ یہاں دو باتوں کا ذکر ہے۔ ایک مسلمانوں کا کفار کو قتل کرنا، دوسرے نبی کریم صلعم کا رمی یعنی پھینکنا۔ حنین کے دن نبی کریم صلعم کی رمی مسلّم ہے مگر بدر کے دن بھی بعض احادیث میں رمی کا ذکر ہے۔ گو طیبی نے اس کے صحیح احادیث میں ہونے سے انکار کیا ہے اور وہ رمی یہ تھی کہ آنحضرت صلعم نے ایک مٹھی کنکروں کی دشمن کے لشکر کی طرف پھینکی جو اس کی ہزیمت کا موجب ہو گئی۔ ان دونوں باتوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے اس سبب سے کہ دونوں میں ایک اعجازی رنگ ہے۔ تین سو مسلمان ہزار کے ساتھ مقابلہ کر کے ان کو کس طرح قتل کر سکتے تھے ایک مٹھی کنکروں کی دشمن کو کس طرح بھگا سکتی تھی۔ دونوں میں اللہ تعالیٰ نے اعجازی رنگ پیدا کر دیا۔ اللہ کے قتل اور رمی سے مراد یہی ہے کہ ان میں اعجازی طاقت پیدا کر دی۔

ع ۱۲۱۸ ذٰلك میں اشارہ موجودہ جنگ کے نتائج کی طرف ہے وان اللہ موھن کید الکافرین میں یہ بتایا کہ اب ان کی جنگ جاری تو رہے گی لیکن اللہ تعالیٰ اس کو کمزور کر دے گا۔ یعنی آہستہ آہستہ یہ خود رک جائیں گے۔

ع ۱۲۱۹ کفار جب مکہ سے چلنے تو استار کعبہ کو پکڑ کر یہ دعا کی اللّٰھم انصر اعلی الجندین واھدی الفئتین واکرم الحزبین اے اللہ دونوں لشکروں میں سے اعلیٰ لشکر کو اور دونوں جماعتوں میں سے زیادہ ہدایت والی جماعت کو اور دونوں گروہوں میں سے زیادہ معزز گروہ کو مدد دے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ابوجہل نے میدانِ جنگ میں یہ دعا کی تھی کہ جو ہم دونوں فریق میں سے فساد اور قطع رحمی کا مرتکب ہے اس کو ہلاک کر دے۔ انہی دعاؤں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ہے کہ تمہاری اپنی دعا کے مطابق اللہ تعالیٰ نے فیصلہ دیدیا۔ اب اس فیصلہ کو تو قبول کر لو۔

ع ۱۲۲۰ کفار کو نصیحت ہے کہ جنگ سے رُک جاؤ تو اسی میں تمہارا فائدہ ہے اور پھر جنگ کرو گے تو اس کا نتیجہ یہی ہے کہ اور سزا بھگتو گے۔ اور یہ بھی پیشگوئی کھلے الفاظ میں کر دی کہ کتنے بڑے بڑے لشکر لیکر آؤ کامیاب نہ ہو گے۔ ان حالات میں جب مسلمانوں کی جمعیت ابھی تین چار سو ہے۔ کل عرب کو مخاطب کر کے

وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝۲۰

اس سے مت پھرو درانحالیکہ تم سنتے ہو۔ ۱۲۲۱

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا
وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝۲۱

اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنھوں نے کہا ہم سنتے ہیں، اور وہ قبول نہیں کرتے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ
الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۲۲

اللہ کے نزدیک سب جانداروں سے بدتر وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۱۲۲۲

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ
وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۲۳

اور اگر اللہ ان میں بھلائی جانتا تو ان کو سناتا اور اگر ان کو سنائے تو وہ پھر جائیں اور وہ منہ پھیرنے والے ہوں ۱۲۲۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ
اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ
اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۴

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور رسول کا حکم مانو، جب وہ تم کو اس کام کے لیے بلاتا ہے جو تمھیں زندگی دیتا ہے ۱۲۲۴ اور جان لو کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل رہتا ہے اور کہ تم اس کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے ۱۲۲۵

یہ کتنا الٰہی طاقت کا جلوہ ہے۔ ان الفاظ کی صداقت روز روشن کی طرح چمکی جس سے کوئی دشمن بھی انکار نہیں کرسکتا۔

ع ۱۲۲۱ پچھلے رکوع کے آخر میں کفار کو صاف کہہ کر کہ تمہارے بڑے بڑے جتھے اسلام کو نیست و نابود نہ کرسکیں گے بلکہ جنگوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کو سزا ملے گی اور مسلمانوں کو بتا کر کہ اللہ ان کے ساتھ ہے یعنی وہ کامیاب اور غالب ہونگے اس رکوع میں خود مسلمانوں کو تنبیہ کرتا ہے اور ان کو بتاتا ہے کہ یہ مت سمجھ لینا کہ بس حکومت اور بادشاہت کا مل جانا اور دشمنوں کا ناکام ہو جانا ہی فلاح ہے بلکہ تمہاری حقیقی فلاح اللہ اور رسول کے احکام کی پابندی میں ہے۔ ہماری موجودہ حالت کے لیے ہدایت ہے۔

لا تولوا عنه۔ یہاں ضمیر اس امر کی طرف ہے جس پر فعل اطاعت دلالت کرتا ہے یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت سے روگردانی نہ کرو۔ درحقیقت ظاہر میں تو صرف رسول کی ہی اطاعت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پیغام بھی وہی پہنچاتا ہے اس لیے اگر ضمیر صرف رسول کی طرف ہو تو بھی حرج نہیں یا چونکہ دوسرے رنگ میں رسول کی اطاعت بھی آخر اللہ کی اطاعت ہی ہے اس لیے اللہ کی طرف ضمیر لے لی جائے تو بھی حرج نہیں۔

ع ۱۲۲۲ عقل اور مذہب: یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن شریف کی اصطلاح میں بہرے اور گونگے وہ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ بعض پیشوایان دین علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ عقل کو مذہب میں کیا دخل ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو انسان ہو کر عقل سے کام نہ لے وہ چارپایوں بلکہ کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر ہے۔ اور یہ ظاہر بھی ہے کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل نہیں دی ہے، اس لیے انسان جس کو وہ نعمت ملی ہے جب اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو ان سے بدتر ہوا۔

ع ۱۲۲۳ حالت عناد: وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے وہ خیر سے خالی ہیں۔ سننے سے فائدہ تب ہوتا ہے جب انسان اس پر غور کرے یعنی عقل سے کام لے۔ مگر وہ چونکہ غور نہیں کرتے اس لیے ان کا سننا نہ سننا برابر ہے۔ یہ ان کی حالت واقعی کا اظہار ہے۔ اس کے بعد ان کی حالت عناد کا ذکر کیا کہ انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو خیر و خوبی سے ہی محروم کر دیا ہے بلکہ حق کی عداوت میں یہاں تک ترقی کر گئے ہیں کہ اگر کلمہ حق ان کے کان میں ڈالا بھی جائے تو بوجہ عناد کے منہ پھیر لینگے۔ غور کرنا تو ایک طرف رہا وہ اعراض کرتے ہیں یعنی کچھ کی کچھ باتیں بناتے ہیں۔

ع ۱۲۲۴ اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کا نتیجہ بتایا ہے کہ وہ تمہاری زندگی کا موجب ہے۔ آج مسلمان قوم جس موت کے نیچے ہے اسی کا علاج یہاں بتایا ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تو کوئی حکم نہیں ملا جس کی انہوں نے فرمانبرداری نہ کی ہو اور اسی لیے وہ ایک زندہ قوم تھے۔ مگر آج اسلام کا دعویٰ کرنے والے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ انہی کو یہ زندگی کا پیغام دیا ہے کیا مسلمان اس پر توجہ کریں گے؟ ان کی زندگی حکومت و بادشاہت سے نہیں بلکہ اللہ اور رسول کی فرمانبرداری سے ہے۔ حکومت و بادشاہت تو محض غلام ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول جو مُردوں کو زندہ کرتا ہے اس سے مراد احیائے روحانی ہی ہوا کرتا ہے پس اگر حضرت عیسیٰ نے مُردے زندہ کیے تو ہمارے نبی کریم صلعم نے اس سے لاکھوں درجہ بڑھ کر مُردے زندہ کیے۔

ع ۱۲۲۵ یحول۔ حَوْل کے معنی ایک چیز کا تغیر اور اس کا دوسرے سے الگ ہو جانا ہیں اور حال کا صلہ جب بَیْن ہو تو مراد اُن دونوں کے درمیان آ جانا ہوتا ہے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۤصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

اور اس عظیم الشان فتنہ سے بچاؤ کرو جو خاص کر اُن لوگوں کو نہ پہنچے گا جو تم میں سے ظالم ہیں اور جان لو کہ اللہ (بدی کی) سزا دینے میں سخت ہے ۱۲۲۶

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے زمین میں کمزور تھے ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو زبردستی پکڑ نہ لے جائیں، سو اس نے تم کو پناہ دی اور اپنی نصرت کے ساتھ تمھاری تائید کی اور تم کو اچھی چیزوں سے رزق دیا تاکہ تم شکر کرو ۱۲۲۷

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو۔ اور (نہ) اپنی امانتوں میں خیانت کرو حالانکہ تم جانتے ہو ۱۲۲۸

اللہ کے انسان اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اس سے سب سے زیادہ قریب ہے، یہاں تک کہ قلب انسان اور انسان جن میں کوئی فرق نہیں ان دونوں کے درمیان میں بھی اللہ تعالیٰ حائل ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا نحن اقرب الیہ من حبل الورید (ق ۵۰ - ۱۶) یعنی ہم انسان کی رگ حیات سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔ حالانکہ رگ حیات سے ہی انسان کی زندگی ہے۔ اور اللہ کے قریب ہونے کی طرف اس لیے توجہ دلائی کہ پھر اس کو چھوڑ کر دوسری طرف کیوں جاتا ہے۔ یا یہ فرمانبرداری میں جلدی کرنے کے لیے ترغیب ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مہلت جو انسان کو دی گئی ہے انسان کے ہاتھ سے نکل جائے اور یہ بھی صحیح ہے کہ قلب انسانی اللہ تعالےٰ کے تصرف میں ہے اس کے عزائم بعض وقت رکھے کے رکھے رہ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی کسی مصلحت سے ان کو فسخ کر دیتا ہے اس لیے انسان کو جب نیکی کا موقعہ ملے اس سے فوراً فائدہ اُٹھائے ایسا نہ ہو کہ نیکی کو ترک کرتے کرتے اس کے قلب کی حالت یہاں تک پہنچ جائے کہ پھر وہ نیک تحریک ہی اس کے اندر نہ ہو۔ اور یا مراد یہ ہے کہ تم اگر فرمانبرداری کرو تو تمہارے ضعف کو اللہ تعالیٰ قوت سے بدل دے گا اور بُزدلی کی جگہ تم میں ہمت پیدا کر دے گا اور خوف کی جگہ امن دے دیگا۔

۱۲۲۶ فتنۃ سے مراد دکھ یا عذاب ہے۔ اور تنوین اس کی عظمت کے لیے ہے جیسا کہ سیاق عبارت سے ظاہر ہے اس میں مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے کہ بعض وقت جب ایک قوم میں کثرت سے لوگ مستحق عذاب ہو جاتے ہیں تو پھر وہ دکھ ساری قوم کو ہی پہنچ کر رہتا ہے یعنی ظالموں کے ساتھ اچھے بھی پھر اس لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ حدیثوں میں مسلمانوں پر آخری زمانہ میں اسی قسم کے فتنوں کے آنے کا ذکر آتا ہے جو ساری مسلمان دنیا میں عام ہو جائیں گے۔ اور کوئی شخص ان کو روک نہ سکے گا اور ایک طرف سے اس کو روکنے کی کوشش کی جائے گی تو دوسری طرف سے نمودار ہو جائے گا۔

۱۲۲۷ یتخطفکم۔ خَطْف اور اختطاف کے معنی ہیں تیزی سے کسی چیز کا لے لینا یکاد البرق یخطف ابصارھم (البقرۃ ۲ - ۲۰) الا من خطف الخطفۃ (الصّٰفّٰت ۳۷ - ۱۰) اور ویتخطف الناس من حولھم (العنکبوت ۲۹ - ۶۷) میں معنی کیے ہیں لوگ قتل کیے جاتے ہیں اور گرفتار کیے جاتے ہیں (غ) یہی معنی یہاں ہیں۔

اٰوی۔ اَوٰی کے معنی ہیں ایک چیز کے ساتھ مل گیا یعنی اس کی پناہ لی اور اٰوٰی کے معنی اسے پناہ دی اور اَوٰی کے معنی رَجَع یعنی لوٹ آیا بھی آتے ہیں۔ اِذ اوی الفتیۃ الی الکھف (الکھف ۱۸ - ۱۰) اٰوی الیہ اخاہ (یوسف ۱۲ - ۶۹) وتؤوی الیک من تشاء (الاحزاب ۳۳ - ۵۱) اور اسی سے مَاْوٰی ہے جو مصدر بھی ہو سکتا ہے جیسے جنۃ الماوٰی (النجم ۵۳ - ۱۵) اور اسم مکان بھی جیسے ماوٰھم جھنم (بنی اسرائیل ۱۷ - ۹۷) (غ)

ساتھ ہی اس فتنہ عظیم میں ایک خوشخبری بھی دی ہے کہ اگر تم اس وقت کمزور ہو گے تو پھر اس وقت کو بھی یاد کرو جب تم تھوڑے بھی تھے اور کمزور بھی یعنی اسلام کی ابتدائی حالت اور اس وقت تو تمہاری حیثیت اسی قدر تھی کہ لوگ اگر زبردستی تم کو پکڑ کر ہلاک کر دیتے تو تمہارے بس کی بات نہ تھی پس اگر اس وقت بھی تم کو اللہ تعالیٰ نے مصائب سے پناہ دی اور اپنی نصرتوں سے تم کو مضبوط کر دیا تو اب ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہو کر تم کیوں مایوس ہوتے ہو؟

۱۲۲۸ اللہ اور رسول کی خیانت یہ ہے کہ ان کی فرمانبرداری کا اقرار کرکے، مسلمان کہلا کر پھر ان کی فرمانبرداری نہ کریں۔ خیانت نقضِ عہد کا نام ہے دیکھو ۲۶ یا یہ کہ وہ کام کریں جس سے دین اسلام کو اور قوم مسلمان کو نقصان پہنچتا ہو کیونکہ دین ایک امانت تھی جو ان کے سپرد کی گئی تھی۔ مسلمانوں میں یہ خیانت ہی آج کل ان کی بڑی تباہی کا موجب ہو رہی ہے قومی اور دینی اغراض کو اپنی ذاتی اغراض پر قربان کر دیتے ہیں۔ چند پیسوں کے لیے قوم کو اور دین کو نقصان پہنچانے کے کام کر لیتے ہیں۔ ایک ادنیٰ خواہش کے سامنے اپنے اعلیٰ فرائض کو برباد کر دیتے ہیں۔ ایمان فروشی اور قوم فروشی ان کا عام شیوہ ہو گیا ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں اسی سے تباہ ہوئیں کہ ایک شخص نے چند پیسے اپنی جیب میں ڈالنے کے لالچ سے اغراض قومی کو دوسری قوموں کے ہاتھ بیچ دیا۔ گویا اس حصّہ آیت میں اغراض قومی اور اغراض دینی کو مقدم کرنے

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ
وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ ع

اور جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد آزمایش ہے اور
یہ کہ اللہ کے ہاں بھاری اجر ہے ۱۲۲۹ء

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ
لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم اللہ کا تقویٰ کرو تو وہ تمھارے
لیے (حق و باطل میں) فرق کردیگا اور تمھاری بُرائیاں تم سے دور کردے گا۔
اور تمھاری حفاظت کرے گا اور اللہ بڑے فضل کا مالک ہے ۱۲۲۹ء-ل

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ
اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ
وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾

اور جب وہ جو کافر ہوئے تیرے متعلق تدبیریں کرتے تھے تاکہ تجھے قید کریں
یا تجھے قتل کریں یا تجھے نکال دیں اور وہ تدبیریں کرتے تھے۔ اور
اللہ بھی تدبیر کرتا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے ۱۲۲۹ء-ب

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا
لَوْ نَشَاۗءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ
اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾

اور جب ان پر ہماری آتیں پڑھی جاتی ہیں کہتے ہیں ہم نے سُن
لیا ۔ اگر ہم چاہیں، تو اس کی مثل کہہ لیں ۔ یہ کچھ
نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ
مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ

اور جب انھوں نے کہا اے اللہ اگر یہ تیری طرف
سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا

کی طرف توجہ دلاتی ہے ۔ یہ قومی ترقی کا راز ہے۔ اپنی امانتوں کی خیانت یہ ہے کہ جو قویٰ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیئے ہیں ان کو اپنے محل اور موقع پر کام میں نہ لائے اور خدا داد طاقتوں کو بیکار کردے ۔ یہ انسانی یعنی افراد قومی کی ترقی کا راز ہے ۔ جب تک مسلمان اندرونی اصلاح سے کام کو شروع نہ کریں گے ان کی سوراج اور حکومت حاصل کرنے کی خواہشات کا حشر بھی ناکامی کے رنگ میں ہوگا۔ اصل بیماری جب تک دور نہ ہو بادشاہت سے کیا ملے گا۔

۱۲۲۹ء مال اور اولاد مسلمانوں کے لیے فتنہ ہو گئے ہیں اس لیے کہ انہوں نے اسی کو غرض زندگی سمجھ لیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا اسی قدر فرض ہے کہ اپنے لیے کچھ مال کمالیں یا جمع کرلیں اور اپنی اولاد کا کچھ فکر کریں۔ اور اغراض قومی اور اغراض دینی کی اہمیت کو کچھ بھی نہیں سمجھا۔ اس لیے سزا بھی اسی مال اور اولاد پر ہی آکر پڑی یعنی قوموں میں مفلس قوم رہ گئے اور اولاد دوسروں کی محکوم ہوگئی ۔ وہ مال جس کو غرض زندگی سمجھا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اور وہ اولاد بھی ذلیل ہوئی جس کو مدنظر رکھ فرائض اعلیٰ کو ترک کردیا تھا۔

۱۲۲۹ء-ل ایک فرقان ظاہری تو وہ تھا جو جنگ بدر کے ذریعہ سے مسلمانوں کو عطا ہوا۔ یہاں اس دوسرے فرقان کا ذکر ہے جو اندرونی طور پر مومن کو عطا ہوتا ہے یعنی اس کے اندر ایک ایسا نور پیدا کردیا جاتا ہے جس سے اسے دوسروں سے ایک امتیاز مل جاتا ہے۔ ظاہری فرقان یا فتوحات تب ہی مفید ہوسکتی ہیں جب اصلی فرقان یعنی اندرونی نور پیدا ہو۔

۱۲۲۹ء-ب یثبتوك ۔ ثبات زوال کی ضد ہے اور ثابت بصر سے بھی ہوتا ہے اور بصیرۃ سے بھی اور بصیرۃ کے لحاظ سے ہی کہا جاتا ہے کہ فلاں امر ثابت ہے اور یثبتوك کے معنی ہیں تجھے قید کردیں اور حیران کردیں (غ)، گویا اَثْبَتَه کے معنی ہیں اسے ایک مکان میں قائم کردیا جس سے وہ علیحدہ نہ ہوسکے اور اس حالت پر بھی اثبت بولا جاتا ہے جب بیماری یا زخم سے ایک شخص حرکت کے قابل نہ رہے (ل) پس یثبتوك کے معنی دونوں طرح ہوسکتے ہیں قید کردیں یا ایسا زخمی کردیں کہ حرکت کے قابل نہ رہے مگر پہلے معنی قابل ترجیح ہیں اس لیے کہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ان میں سے بعض نے کہا اثبتوہ بالوثاق (ل)

اس میں مسلمانوں کی تکلیفوں کا وہ نقشہ کھینچا ہے جب خود رسول اللہ صلعم کو بھی کہیں امن نہ ملتا تھا اور دار الندوہ میں اکٹھے ہو کر کفار نے مختلف تجویزیں آپ کے متعلق کیں ۔ یہ کہ آپ کو قید کردیا جائے یا قتل کردیا جائے یا نکال دیا جائے ۔ باقی تجویزیں ردّ ہو کر آخر اس بات پر اتفاق ہوا تھا کہ آپ کو قتل کیا جائے۔ اس کے بالمقابل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی تمہارے بچانے کے لیے ایک تدبیر کی اور وہی تدبیر کارگر ہوئی ۔ ایک طرف سارے اہل مکّہ کی متفقہ تدبیر دوسری طرف ایک اکیلے انسان کو بغیر سروسامان کے ان کے اندر سے نکال کر اور انہی کے گھر کے پاس رکھ کر بچایا جاتا ہے۔

خیر الماکرین ۔ مکر کے معنی مخفی تدبیر اچھی ہو یا بُری ۴۴۳ء میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں صرف اس قدر ظاہر کردینا ضروری ہے کہ لفظ خیر کا ماکر کے ساتھ آنا خود بتاتا ہے کہ ماکر میں بجائے خود کوئی شر یا بُرائی نہیں کیونکہ بری چیز پر خیر کا لفظ بولا ہی نہیں جاسکتا۔

السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣٢﴾

ہم پر دردناک عذاب بھیج ۱۲۲۹ج

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ؕ
وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿٣٣﴾

اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان کو عذاب دیتا حالانکہ تو ان میں تھا
اور اللہ ان کو عذاب دینے والا نہ تھا حالانکہ وہ استغفار کرتے ہوں ۱۲۲۹د

وَ مَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَ هُمْ يَصُدُّوْنَ
عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ مَا كَانُوْۤا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ
اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٤﴾

اور ان کا کیا عذر ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے۔
اور وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں اور وہ اس کے متولی
نہیں اس کے متولی سوائے متقیوں کے اور کوئی نہیں ہو سکتے
لیکن ان میں سے بہت نہیں جانتے ۱۲۲۹ہ

وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا
مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا
كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿٣٥﴾

اور ان کی نماز خانہ (کعبہ) کے پاس سوائے سیٹیاں بجانے
اور تالیاں پیٹنے کے اور کچھ نہیں۔ سو عذاب چکھو، اس لیے
کہ تم کفر کرتے تھے ۱۲۲۹و

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ
عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ۬ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا
اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿٣٦﴾

وہ جو کافر ہیں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں، تاکہ اللہ کی
راہ سے روکیں، سو ان کو خرچ کرتے رہیں گے پھر وہ ان
کے لیے پچھتاوا ہوں گے۔ پھر وہ مغلوب کیے جائیں گے
اور جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے ۱۲۲۹ز

ع ۱۲۲۹ج جب ان سے پہلوں کا ذکر کیا جاتا جسے وہ کہانیاں قرار دیتے ہیں اور ان کی مخالفت حق کا انجام بتایا جاتا تو پھر یہ کہتے کہ اگر محمد رسول اللہ صلعم حق پر ہیں تو ہم پر ایسا ہی عذاب کیوں نہیں آتا۔ بدر میں بھی ان کا اس قسم کی دعا کرنا ثابت ہے دیکھو ع ۱۲۱۹۔

ع ۱۲۲۹د کفار پر تاخیر عذاب کی وجہ: بتایا ہے کہ عذاب تو تم پر آنا ہی تھا۔ مگر اس وقت کس طرح آتا جب محمد رسول اللہ صلعم ابھی تمہارے درمیان موجود تھے۔ سنت اللہ عذاب کے متعلق یہی ہے کہ جب نبی قوم سے الگ ہو جاتا ہے تب عذاب آتا ہے۔ پس اہل مکہ پر عذاب ضروری تھا کہ ہجرت نبی کریم صلعم کے بعد آتا۔ دوسری وجہ یہ دی ہے کہ ابھی وہ استغفار کرتے تھے یعنی گو بظاہر عناد کی حالت میں عذاب تک مانگ لیتے تھے مگر پھر پچھتاتے تھے اور گھروں میں جا کر استغفار بھی کرتے تھے، لیکن جب آخر مقابلہ پر نکل کھڑے ہوئے اور تلوار ہاتھ میں لے لی کہ مسلمانوں کو بالکل نیست و نابود کر دیں تو وہ حالت استغفار پھر باقی نہ رہی۔ اور یا ھم یستغفرون میں اشارہ مسلمانوں کے استغفار کی طرف ہے کہ جب ان میں ایک قوم استغفار کرنے والی تھی تو عذاب ان پر کس طرح آتا۔

ع ۱۲۲۹ہ یعنی عذاب کا آنا تو اس لیے ضروری ہے کہ وہ حق کی مخالفت کو ترک نہیں کرتے اور مسجد حرام سے مسلمانوں کو روکتے ہیں۔ حالانکہ بوجہ اپنے مشرک ہونے کے وہ ولایۃ مسجد حرام کے مستحق بھی نہیں کیونکہ مسجد تو توحید کا گھر ہے اور وہی لوگ اب اس کے اولیا قرار پائیں گے جو مذہب توحید رکھتے ہیں یعنی اہل اسلام۔ متقیوں سے مراد یہاں شرک سے بچنے والے لوگ ہیں بمقابلہ ان مشرکوں کے جن کا ذکر ہے اور یہی ادنیٰ مرتبہ اتقا بھی ہے۔ اس میں یہ پیشگوئی بھی ہے کہ اہل اسلام ہی آیندہ خانہ کعبہ کے متولی رہیں گے۔

ع ۱۲۲۹و مکاء۔ مکا پرند کی آواز نکالنے پر بولا جاتا ہے (غ) اور سیٹی بجانے پر بھی (ل)
تصدیۃ۔ صَدیٰ وہ آواز ہے جو صاف مکان سے لگ کر واپس آتی ہے یعنی گونج اور تصدیۃ وہ آواز ہے جو اس کے قائم مقام ہو یعنی جس میں کچھ فائدہ نہ ہو (غ)

مشرکین عرب کی عبادت کا رنگ: ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مشرک حج کے وقت ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے اور سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے۔ یا اشارہ اُن کے ان افعال کی طرف ہے جو نبی کریم صلعم کو عبادت سے روکنے کے لیے کرتے تھے۔ گویا ان کی عبادت اب اسی قدر رہ گئی ہے کہ سیٹی اور تالیاں بجا کر دوسروں کی عبادت میں مخل ہوں۔ راغب کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ ان کی نماز یا دعا میں حقیقت کچھ نہیں ایسی ہے جیسے سیٹی یا تالی یعنی بے معنی حرکت یا آواز۔

ع ۱۲۲۹ز یہاں بتایا ہے کہ مسلمانوں سے ان کو عداوت اور کسی وجہ سے نہیں بلکہ محض اس لیے کہ وہ مسلمانوں کے دین کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ جنگ بدر میں بھی اگرچہ

لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ ع ۴ ۱۸

تاکہ اللہ پاک کو ناپاک سے الگ کر دے اور ناپاک کو ایک دوسرے پر رکھتا چلا جائے پھر سب کو ایک ڈھیر بنادے پھر اس کو جہنم میں ڈالدے وہی نقصان اٹھانے والے ہیں ۱۲۲۹ح

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾

ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا، کہہ دو اگر وہ رُک جائیں، تو جو گزر چکا اُن کو معاف کر دیا جائے گا۔ اور اگر وہی کام پھر کریں تو پہلوں کا معاملہ گزر ہی چکا ہے ۱۲۲۹ط

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾

اور ان کے ساتھ جنگ کرو، یہاں تک کہ (دین کے لیے) دکھ دینا نہ رہے اور دین سب کے سب اللہ کے لیے ہوں پھر اگر وہ رک جائیں تو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے جو وہ کرتے ہیں ۱۲۳۰

عام لوگوں کو اس بنا پر اُکسایا گیا تھا کہ ابن حضرمی کو مسلمانوں نے قتل کر دیا ہے مگر اصل کینہ یہی تھا کہ مسلمان ترقی کرتے جارہے ہیں ایسا نہ ہو کہ زور پکڑ جائیں تو پھر ان کا تباہ کرنا مشکل ہو جائے اور ابن حضرمی کا قتل محض ایک بہانہ بنایا گیا تھا۔ ابن حضرمی کے قتل کا واقعہ اتفاقی تھا اور وہ اس طرح پر تھا کہ آنحضرت صلعم نے عبد اللہ بن جحش کی سرداری میں کچھ آدمی قریش کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجے تھے۔ غرض یہ تھی کہ ان کی تیاری جنگ کا حال معلوم رہے اور تحریری پروانہ میں صرف اسی قدر ہدایت تھی کہ نخلہ تک جاؤ اور قریش کی خبر لاؤ۔ ان لوگوں نے غلطی سے ابن حضرمی کو جو اس وقت ایک قافلہ کو لیے ہوئے طائف سے آرہا تھا قتل کر دیا ایسے اتفاقی قتلوں میں عرب میں دستور دیت کا تھا، مگر ابوجہل نے اسے بہانہ بنا کر مدینہ پر چڑھائی کی۔ سات سو اونٹ اور تین سو گھوڑے اس لشکر کے لیے تیار کیے، جس پر بہت سا مال خرچ ہوا،،

جنگ بدر کے بعد اور لڑائیاں اور ان میں کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی: مگر علاوہ اس کے یہاں آیندہ کے لیے بھی پیشگوئی ہے کہ ابھی یعنی جنگ بدر کے بعد اور مال بھی اسلام کی مخالفت پر خرچ کریں گے مگر چونکہ ناکام رہیں گے اس لیے یہ خرچ ان کے لیے موجب حسرت رہے گا اور صرف مسلمانوں پر چڑھائی میں ہی ناکام نہ رہیں گے بلکہ آخر کار مسلمانوں سے مغلوب بھی ہو جائیں گے۔ جنگ بدر کے بعد بھی ایسی صریح پیشگوئی قیاس انسانی سے بالکل بالاتر تھی اس لیے کہ ان کی طاقت ابھی اسی طرح باقی تھی اور مسلمانوں کی تعداد تین چار سو سے زائد نہ تھی جو میدان جنگ میں لائی جاسکتی،،

۱۲۲۹ح الخبیث۔ الطیّب۔ خبیث اور طیب کے معنی کے لیے دیکھو ع۳۴۳ و ع۸۲ اور الخبیث اور الطیّب سے بُرے اور اچھے عمل بھی مراد ہو سکتے ہیں اور بُرے اور اچھے نفوس بھی یا کافر و مومن (غ) اور انسانوں میں طیب وہ ہے جو جہل اور فسق اور بُرے اعمال سے پاک ہو اور علم اور ایمان اور اچھے اعمال کے ذریعہ سے آراستہ ہو (غ)

یرکم۔ رَکم کے معنی ہیں ایک چیز کو دوسرے کے اوپر رکھ کر جمع کرتا چلا گیا سحاب مرکوم (الطور ۵۲-۴۴) اور رُکام وہ ہے جو ایک دوسرے پر رکھ کر جمع کیا جائے ثم یجعلہ رکاما (النور ۲۴-۴۳)

یہاں ان کے مغلوب ہونے کا نتیجہ بتایا یعنی تاکہ پاک اور ناپاک الگ الگ ہو جائیں۔ خبیث اور طیب انسانوں پر بھی بولے جا سکتے ہیں اور مال وغیرہ پر بھی۔ اگر انسان مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ اس مغلوبیت پر کافروں اور مسلمانوں میں ایک کھلا کھلا امتیاز قائم ہو جائے گا اور ائمۃ الکفر یکے بعد دیگرے جہنم میں پہنچ جائیں گے۔ یا ان کے لشکر یکے بعد دیگرے آتے رہیں گے مگر نتیجہ سب کا ناکامی ہوگا یہی ان کا جہنم ہے۔ اور اموال مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ مومنوں اور کافروں کے خرچ کیے ہوئے مال میں تمیز ہو جائے گی ایک کا مال خرچ کیا ہوا کامیابی کا موجب ہوگا، دوسرے کا ناکامی کا موجب۔ آیت کے آخری الفاظ پہلی صورت کو مرجح ٹھہراتے ہیں۔

۱۲۲۹ط۔ اس رکوع میں یہ دکھایا ہے کہ جنگ بدر میں مسلمانوں کا دشمن کے مقابلہ میں نکلنا محض مصلحت الٰہی سے عمل میں آیا، ورنہ اگر کفار کی طاقت کا اندازہ ان کو ہوتا تو وہ جرأت نہ کرتے۔ اور ایسا اس لیے ہوا کہ تا اللہ تعالیٰ ایک کھلا ثبوت حقانیت اسلام کا دے اور حق و باطل میں کھلا کھلا فیصلہ کر دکھائے۔

سنت کے معنی طریق ہیں سنّت الاوّلین سے مراد وہ طریق ہے جو پہلے سرکش لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے برتا، یعنی مراد پہلوں کا قائم کردہ طریق نہیں بلکہ وہ طریق ہے جو اللہ تعالےٰ نے ان کے خلاف قائم کیا یعنی جس طرح ان کو سرکشی کی سزا دی اسی طرح تمھیں بھی دے گا۔

۱۲۳۰ اس پر مفصل بحث ع۲۴۶ میں گزر چکی ہے۔ ہاں یہاں الفاظ الدّین کلّہ قابل غور ہیں جن کے معنی ہیں سب دین جیسے لیظہرہ علی الدّین کلّہ

وَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝۴۰

اور اگر پھر جائیں تو جان لو کہ اللہ تمھارا مولیٰ ہے کیا ہی اچھا مولیٰ اور کیا ہی اچھا مددگار ہے ؎

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴۱

اور جان لو کہ کوئی چیز تم فتح پاکر حاصل کرو، تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے [۱۲۳۱] اگر تم اللہ پر ایمان لاتے ہو اور اس (پر) جو ہم نے اپنے بندہ پر حق و باطل میں فرق کرنیکے دن اتارا، جس دن دو گروہوں میں مٹھ بھیڑ ہوئی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے [۱۲۳۲]

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ۭ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ڏ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰي مَنْ حَيَّ عَنْۢ

جب تم ورلے کنارے پر تھے اور وہ پرلے کنارے پر اور قافلہ تم سے نیچے تھا اور اگر تم (دونوں گروہ) آپس میں قرارداد کرتے تو تم میعاد میں اختلاف کرتے، لیکن (ایسا ہوا) تاکہ اللہ ایک امر کا فیصلہ کردے جو ہو کر رہنا تھا تاکہ جو ہلاک ہوتا ہے وہ کھلی دلیل سے ہلاک ہو اور جو زندہ ہوتا ہے وہ

میں الدین کلہ سے مراد سب دین ہیں۔ سب دینوں کا اللہ کے لیے ہونا یہی ہے کہ جو دین کوئی چاہے اختیار کرے، کسی ایک دین پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ عین اس کے مطابق ہے جہاں دوسری جگہ اسلامی جنگوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ہم ایسی اجازت نہ دیتے تو گرجے اور راہبوں کی کوٹھریاں اور دوسرے مذاہب کے عبادت خانے سب تباہ ہوجاتے۔ گویا وہاں بھی سب مذاہب کی حفاظت اسلامی جنگوں کی غرض بتائی ہے اور یہاں بھی۔

ع۱۲۳۱ غنمتم۔ غنم کے اصل معنی الفوز بالشئ یعنی کسی چیز کا حاصل کرنا۔ راغب نے لکھا ہے کہ غُنم اصل میں غنم یعنی بکریوں کا حاصل کرنا ہے جو بذریعہ فتح ہو۔ پھر ہر ایک چیز پر جو فتح کرکے دشمنوں سے حاصل کی جائے یہ لفظ بولا گیا ہے اس کے معنی لُوٹ صحیح نہیں۔

تقسیم غنیمت: مال غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہو۔ اللہ کے لیے ہونے سے مراد یہی ہے کہ وہ فی سبیل اللہ خرچ ہو یعنی بیت المال میں داخل ہوکر مسلمانوں کی ضروریات عامہ پر خرچ ہو اور باقی سپاہیوں وغیرہ میں تقسیم ہو یا ان کی تنخواہوں وغیرہ کے کام آئے۔ پھر ان ضروریات عامہ کی تفصیل کردی یعنی رسول اور قریبی اور یتیم اور مسکین اور مسافر کہا گیا ہے کہ ان میں برابر پانچ حصوں میں تقسیم ہو مگر یہ صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ امام مالکؒ کا مذہب یہی ہے کہ اس خمس کے برابر پانچ حصے کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ امام اپنی رائے کے مطابق ان اغراض پر جس طرح چاہے صرف کرے خود رسول اللہ صلعم بقدر کفایت لیکر باقی سب ضروریات عامہ مسلمین پر خرچ کردیتے تھے۔ جناب پیغمبر خدا کس قدر لیتے تھے یہ اس سے ظاہر ہے کہ خیبر کو فتح کرکے جب آپ واپس ہوئے اور حضرت صفیہؓ سے نکاح کیا تو آپ کی دعوت ولیمہ پر وہی ستو اور کھجوریں وغیرہ تھیں جو لوگ اپنے اپنے گھروں سے لائے تھے اور اس زمانہ میں جب آپ ملک عرب کے بادشاہ تھے آپ کے گھر کا سامان ایک کھجور کی چٹائی اور ایک پانی کی ٹھلیا تھی۔ اور بیبیوں نے جب کچھ اپنی آسودگی کے لیے مال مانگا تو حکم ہوا اگر مال دنیا چاہتی ہو تو آؤ تمھیں رخصت کردوں اور جب آپکی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ نے خادمہ مانگی کہ چکی پیسنے سے تکلیف ہوتی ہے تو فرمایا کہ نماز کے بعد تینتیس تینتیس مرتبہ سبحان اللہ والحمد للہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ آپکے گھر میں مہینوں اس طرح گزر جاتے تھے کہ آگ نہ جلتی تھی اور صرف کھجوروں پر گزارہ کرتے تھے اور اسی خمس کے متعلق ایک حدیث میں آپ کے یہ لفظ آتے ہیں مالی الا الخمس والخمس مردود فیکم یعنی پانچواں حصہ جو میرے لیے ہے وہ بھی تمھارے اندر ہی واپس کیا گیا ہے۔

ذوی القربیٰ سے مراد نبی کریم صلعم کے ذوی القربیٰ ہی لیے گئے ہیں مگر اس سے مراد بھی یہ نہیں کہ ان کے اغنیاء کو دیا جائے، بلکہ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا وہ حق صرف اس قدر تھا کہ ان میں سے جو غربا ہوں ان کو دیا جائے اور ان کی بیوہ کا نکاح کردیا جائے اور کسی کو جس کے پاس خدمت گار نہ ہو خادم دیدیا جائے اور ان کے خاص ذکر کی وجہ یہ ہے کہ بیت المال میں جو صدقات آتے تھے وہ ان پر حرام کیے گئے تھے اور صرف اسی مال میں سے ان کو دینا جائز تھا بلکہ یہاں ذوی القربیٰ سے مراد قرب نصرت لیا گیا ہے نہ قرب قرابت یعنی ان کو دینا ان کی نصرت کی وجہ سے تھا جو وہ دین کی نصرت کرتے تھے نہ ان کی قرابت کی خاطر۔

ع۱۲۳۲ یوم الفرقان یوم بدر ہی ہے۔ کیونکہ حق و باطل میں فرق کردیا جیسا کہ حضرت مجاہد و دیگر مفسرین سے مروی ہے اور جیسا کہ یوم التقی الجمعٰن سے بھی ظاہر ہے۔ اس دن کیا اُتارا تھا۔ وہ ساری باتیں جو حق و باطل میں فرق کا موجب ہوئیں، یعنی نشانات الٰہی، نصرت الٰہی، فرشتے وغیرہ۔

بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾
اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۭ وَلَوْ
اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ
فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ
عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾
وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ
قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ
ع اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾
وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا
وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ

کھلی دلیل سے زندہ ہو اور اللہ یقیناً سننے والا اور جاننے والا ہے ۱۲۳۳
جب اللہ نے تجھے تیرے خواب میں انھیں تھوڑا دکھایا، اور اگر وہ
تجھے ان کو بہت دکھاتا تو تم ہمت ہار دیتے اور تم معاملہ میں جھگڑنے
لگتے، لیکن اللہ نے بچالیا۔ وہ سینوں کی باتوں کو
جاننے والا ہے ۱۲۳۴
اور جب تم ایک دوسرے کے سامنے آئے تو تمھاری نظروں میں انھیں
تھوڑا کر کے دکھایا اور ان کی آنکھوں میں تم کو تھوڑا کر کے دکھایا تاکہ اللہ
ایک کام کا فیصلہ کر دے جو ہو کر رہنا تھا اور اللہ کی طرف ہی سب کام لوٹائے جاتے ہیں ۱۲۳۵
اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تمھارا کسی جماعت سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم
رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو ۱۲۳۶
اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو
ورنہ تم ہمت ہار دو گے اور تمھاری ہوا جاتی رہے گی اور صبر کرو، اللہ

۱۲۳۳ العدوۃ۔ عدو بمعنی تجاوز سے ہے اور عُدوۃ وادی کے کنارے کو کہتے ہیں۔
دنیا۔ ادنیٰ کی تانیث ہے اور قریب سے مراد مدینہ سے قریب ہے۔
قُصوی۔ اقصی کی تانیث ہے اور قَصِیّ بعید کو کہتے ہیں مکانا قصیا (مریم ۱۹-۲۲) اور المسجد الاقصی (بنی اسرائیل ۱۷-۱) من اقصا المدینۃ (یٰس ۳۶-۲۰، القصص ۲۸-۲۰) اور یہاں مراد مدینہ کی جانب سے دور کا کنارہ ہے۔
الرکب۔ قافلہ جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آرہا تھا۔ راکب کی جمع ہے۔
اسفل۔ نیچے یعنی ساحل سمندر کی طرف۔ کیونکہ وہ زمین نیچی ہے۔
اختلفتم فی المیعاد۔ ضمیر مسلمانوں کی طرف ہے۔ یعنی جنگ اگر کسی وعدہ کا نتیجہ ہوتا تو ضرور تھا کہ مسلمان وعدہ پورا کرنے سے رہ جاتے اس لیے کہ کفار کی طاقت کا پتہ ہوتا اور اپنے آپ کو ان کے مقابل میں کمزور خیال کر کے مقابلہ کے لیے نہ نکلتے۔ مگر یہ سب ایک فوری کارروائی تھی اور مسلمانوں کو کفار کی طاقت اور تعداد کا علم نہ تھا۔
مفعولا کے معنی کیا گیا۔ مراد یہ کہ ارادہ الٰہی میں ایسا ضروری ٹھہر چکا تھا کہ ضرور تھا کہ ہو کر رہتا۔ اس میں ان پیشگوئیوں کی طرف اشارہ ہے جو جنگ بدر کے متعلق مدت پہلے سے قرآن شریف میں بیان ہو چکی تھیں اور جن میں وعدہ تھا کہ مسلمانوں اور کافروں میں مقابلہ ہو کر کفار مغلوب کیے جائیں گے۔
جنگِ بدر کیوں فرقان کہلائی: اس آیت میں اول دونوں فوجوں کی حالت بتائی ہے۔ مسلمان مدینہ کے قریب کے کنارہ کی طرف تھے اور کفار دور والے کنارہ کی طرف اس میں یہ بتایا ہے کہ مسلمان کفار سے پیچھے میدان جنگ میں نکلے۔ اور مقابلہ کی غرض یہ بتائی کہ وہ پیشگوئیاں پوری ہوں جو پہلے سے ہو چکی تھیں اور نتیجہ اس کا یہ بتایا ہے کہ کوئی ایسی مضبوط دلیل صداقت اسلام پر قائم ہو کہ ہلاک ہونے والے اور مخالفت کرنے والے بھی اس کھلی دلیل کو دیکھ لیں اور زندہ ہونے والی قوم یعنی مسلمان بھی اس کھلی دلیل کو دیکھ لیں۔ گویا بدر کی فتح اس لیے فرقان نہ تھی کہ کفار کو شکست اور مسلمانوں کو فتح ہوئی بلکہ اس لیے کہ عین ان پیشگوئیوں کے مطابق یہ سب کچھ وقوع میں آیا جو مدت پہلے سے شائع شدہ تھیں جن کا علم کفار کو بھی تھا اور مسلمانوں کو بھی۔
۱۲۳۴ نبی کریم صلعم کو رویا میں دشمن تھوڑا دکھایا گیا اس لیے کہ وہ مغلوب ہونے والا تھا۔ اور اس میں حکمت یہ تھی کہ تا مسلمانوں کے دلوں کو قوت رہے۔
۱۲۳۵ یہ دوسرا واقعہ ہے یعنی میدان جنگ میں جب ایک دوسرے کے سامنے آئے تو اس وقت بھی مسلمانوں کو کافر تھوڑے نظر آئے۔ صرف اپنے سے دوچند حالانکہ تھے سہ چند دیکھو ۳۸۴ اس سے بھی ان کے حوصلے بڑھے اور مسلمانوں کا کفار کی نظر میں تھوڑا ہونا تو مطابق واقع تھا۔
۱۲۳۶ یہاں پھر مسلمانوں کو فلاح کے اسباب کی طرف متوجہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جنگ اور مقابلہ کے وقت بھی اللہ کو یاد رکھو کیونکہ اصل غرض صرف جنگ میں فتح حاصل کرنا نہیں بلکہ اصل غرض فلاح ہے یعنی زندگی کے مقصود حقیقی تک پہنچنا۔

مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۚ ﴿۴۶﴾

صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۱۲۳۷

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کے دکھاوے کے لیے اپنے گھروں سے نکلے اور وہ اللہ کی راہ سے روکتے تھے۔ اور اللہ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو وہ کرتے ہیں ۱۲۳۸

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ ع ۶

اور جب شیطان نے اُن کو اُن کے عمل خوب صورت بنا کر دکھائے اور کہا آج لوگوں میں سے کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا اور میں تمہارا حامی ہوں۔ پھر جب دونوں گروہ ایک دوسرے کے سامنے آئے اُلٹے پاؤں پھر گیا اور کہا میرا تم سے کچھ واسطہ نہیں، میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے، مَیں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سزا دینے میں سخت ہے ۱۲۳۹

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۹﴾

جب منافق اور وہ جن کے دلوں میں بیماری تھی کہنے لگے اُن لوگوں کو ان کے دین نے دھوکا دیا ہے اور جو شخص اللہ پر بھروسا کرتا ہے تو اللہ غالب حکمت والا ہے ۱۲۴۰

ف ۱۲۳۷ ریحکم۔ ریح کے معنی ہوا ہیں۔ مگر مفردات میں ہے کہ کبھی ریح کا لفظ بطور استعارہ غلبہ پر بولا جاتا ہے اور قتادہ سے روایت ہے کہ ریح سے مراد ریح اللہ یعنی مدد کی ہوا ہے (ج) کیونکہ ہوا بھی نصرت کے خاص سامانوں میں سے ہے۔ چنانچہ جنگ احزاب میں ایک ہوا نے ہی دشمن کے ٹڈی دل لشکر کو پراگندہ کر دیا اور ان کے قدم اکھیڑ دیئے بتایا ہے کہ اتفاق اور مشکلات کے مقابلہ میں ثابت قدمی یہ دو بڑے کامیابی کے راز ہیں۔

ف ۱۲۳۸ بطر بَطَر کے معنی نشاط ہیں یا متکبرانہ روش (ل) اور بَطَر اور طَرَب قریب قریب ہیں اور وہ خفت یعنی ہلکا پن ہے جو خوشی سے پیدا ہوتا ہے (غ) یا وہ کسی چیز سے کراہیت کرنا ہے حالانکہ وہ کراہیت کی مستحق نہ ہو یا نعمت کے وقت حد سے نکل جانا اور سرکشی کا طریق اختیار کرنا بطرت معیشتہا (القصص ۲۸-۵۸) میں اصل ترکیب ہے بطرت فی معیشتہا (ل)

ابوجہل اور اس کے ساتھی ..... مکّہ سے نکلے .... تو بڑے ساز و سامان سے نکلے اور ان کو اپنی قوت پر بڑا فخر تھا۔ اور ان کا منشاء قبائل عرب پر بھی اپنا رعب بٹھانا تھا کہ ہماری طاقت بڑی ہے۔ مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے کہ تم فاتح ہو کر کبھی اس غرض کے لیے جنگ نہ کرنا اور نہ اپنی قوت پر ناز کرنا۔

ف ۱۲۳۹ جار ہمسائے کو کہتے ہیں اور جوار یا مُجَاوَرَة کے معنی دوسرے کی حفاظت میں آنا یا حفاظت میں لینا ہیں اور یہاں اسی معنی میں جار ہے اور جار عن الطریق کے معنی ہیں رستہ سے ہٹ گیا جو بلحاظ معنی قرب ہے اور اسی سے جَوْر بمعنی عدول یا ظلم ہے (غ)

قریش اور بنی کنانہ میں جنگ رہا کرتی تھی اس لیے جب قریش نے مدینہ پر حملہ کیا تو ان کو یہ بھی خیال تھا کہ کہیں بنی کنانہ جنگ پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ بنی کنانہ کا سردار سراقہ بن مالک تھا اس نے ابوجہل کو یقین دلایا کہ تمہاری طاقت بڑی ہے اور ہم تمہارے ساتھ جنگ نہ کریں گے بلکہ ہم تو تمہارے حمایتی ہیں۔ مفسرین کہتے ہیں کہ شیطان سراقہ بن مالک کنانی کی صورت اختیار کر کے آیا تھا لیکن اگر سراقہ ہی آیا ہو اور اسی کو شیطان کہا ہو جیسا کہ کئی جگہ پر سرداران کفار کو شیطان یا شیاطین کہا ہے تو اس میں بھی کوئی ہرج نہیں۔ جب قریش کے پاؤں اکھڑتے دیکھے تو بھاگ گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سب محض شیطان کی وسوسہ اندازی ہو نہ کوئی واقعی گفتگو۔

ف ۱۲۴۰ اس رکوع میں اصل ذکر کفار کی بدعہدی کا اور بار بار عہد شکنی کا ہے اور فرعون کے ساتھ مثال دینے کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ وہ بھی اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے ساتھ بدعہدی کرتا تھا فلمّا کشفنا عنہم الرجز الی اجل ہم بالغوہ اذا ہم ینکثون (الاعراف ۔ ۱۳۵) ایسی بدعہدیاں نبی کریمؐ کے آخری زمانہ میں بھی بہت سی وقوع میں آئیں جیسا کہ سورۂ براۃ کے شروع میں ذکر ہے مگر ابتدا میں بھی حالت ایسی ہی تھی اور آنحضرت صلعم نے کفار قریش کی دستبرد سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے کئی ایک اقوام کے ساتھ جو حالت کفر پر تھیں عہدنامے کر رکھے تھے۔ مگر جب یہ لوگ ذرا مسلمانوں میں کمزوری دیکھتے تو فوراً عہد شکنی کرتے۔ کیونکہ ان کا اصول مہذب یورپ کے اصول کی طرح یہ تھا کہ کمزور قوم کے ساتھ ایفائے عہد کی کوئی ضرورت نہیں۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۵۰﴾

اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، ان کے مونھوں اور پیٹھوں کو مارتے ہیں اور جلنے کا عذاب چکھو۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾

یہ اس کی سزا ہے جو تمھارے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ اور کہ اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾

فرعون کے لوگوں کی طرح اور جو ان سے پہلے ہوئے انھوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا سو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑا اللہ طاقتور سزا دینے میں سخت ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾

یہ اس لیے کہ اللہ کبھی کسی نعمت کو نہیں بدلتا، جو اس نے کسی قوم پر کی ہو، جب تک کہ وہ خود اپنی حالتوں کو نہ بدلیں اور کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔[۱۲۴۱]

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

فرعون کے لوگوں کی طرح اور جو اُن سے پہلے ہوئے انھوں نے اپنے رب کی آیتوں کو جھٹلایا، سو ہم نے اُن کو اُن کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا اور سب ظالم تھے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾

اللہ کے نزدیک بدترین جاندار وہ ہیں جو کافر ہوئے، پھر وہ ایمان لاتے ہی نہیں۔[۱۲۴۲]

اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾

وہ جن سے تو عہد کرتا ہے پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں، اور وہ (خلاف ورزی عہد سے) نہیں بچتے۔[۱۲۴۳]

مسلمانوں کی کمزوری کو دیکھ کر اور بالمقابل چاروں طرف دشمنوں کو دیکھ کر منافق لوگ اور کمزور دل یہ کہتے تھے کہ مسلمان ان وعدوں پر بھروسہ کرکے اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں جو محمد رسول اللہ صلعم نے ان کو دے رکھے ہیں اس کا جواب دیا ہے کہ اللہ پر بھروسہ کرنے والا دھوکا نہیں کھاتا یہی لوگ غالب ہوں گے کیونکہ اللہ غالب ہے۔

۱۲۴۱ قوم سے نعمت کب چھنتی ہے: یعنی اللہ تعالیٰ باوجود ان کے کفر کے بھی ان سے یہ نعمتیں نہ چھینتا اگر یہ اپنی حالتوں کو خراب نہ کر ڈالتے کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎
اے کریمی کہ از خزانۂ غیب ٭ گبر و ترسا وظیفہ خورداری ٭ دوستاں را کجا کنی محروم ٭ تو کہ بر دشمناں نظرداری ٭ ہاں جب قوم سے حکومت کی اہلیت چھین جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو اُٹھا کر دوسری کو اس کی جگہ لے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی دی ہوئی نعمتوں کو نہیں لیتا جب تک کہ انسان خود ہی ان کو نہیں پھینکتا۔ آج مسلمانوں کے ہاتھ سے بھی سلطنت دولت کی نعمتیں تب ہی گئیں جب انہوں نے اپنے حالات کو بدل ڈالا۔ پس مقدم ضرورت اپنی حالت میں اصلاح کرنے کی ہے اور اسی کی طرف سے مسلمان غافل ہیں۔

۱۲۴۲ یعنی ایسے کافر جنہوں نے یہ ٹھان لیا ہے کہ ایمان کسی صورت میں لائینگے ہی نہیں۔ اس لیے وہ حق کی مخالفت پر کمربستہ رہتے ہیں جیسا کہ ان کی عہد شکنی سے ظاہر ہے جیسا کہ اگلی آیت میں ذکر ہے۔

۱۲۴۳ یہ حالت بھی اس وقت عام تھی۔ نبی کریم صلعم چاہتے تھے کہ ان قوموں کے ساتھ جنگ نہ ہو اس لیے آپ نے جہاں تک ہو سکتا تھا معاہدے کر لیے تھے مگر ایفائے

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَذَّکَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

سو اگر تو ان کو جنگ میں پائے تو ان (کی عبرتناک سزا) سے اُن کو منتشر کردے جو اُن کے پیچھے ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔[۱۲۴۴]

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ ﴿۵۸﴾ ع

اور اگر تجھے کسی قوم سے دغا بازی کا خوف ہو تو ان (کا عہد) برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے اللہ دغا بازوں سے محبت نہیں کرتا۔[۱۲۴۵]

وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا یُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور جو کافر ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ وہ آگے نکل گئے وہ عاجز نہیں کر سکتے۔[۱۲۴۶]

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّکُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُوَفَّ اِلَیْکُمْ

اور جو کچھ طاقت اور گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھ رکھنے سے تم سے ہو سکے ان کے لیے تیار رکھو، تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ رکھو اور ان کے سوائے اوروں کو (بھی) جنھیں تم نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے۔ اور جو کوئی چیز تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تم کو پوری واپس دی جائے گی اور

عہد اُن اقوام میں بہت کم تھا۔ حتیٰ کہ یہودی جو اہل کتاب تھے وہ بھی ایفائے عہد کی پروا نہ کرتے تھے اور بالخصوص مسلمانوں کی کمزوری ان کو اور بھی زیادہ عہد شکنی کی طرف مائل کرتی تھی۔ اتقاء سے مراد یہاں خلاف ورزی عہد سے بچنا ہی ہے۔ مفسرین نے اس آیت کے نیچے بنو قریظہ یا بعض اور قبائل یہود کا ذکر لکھا ہے۔ مگر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے شاذ و نادر کے جن اقوام نے آنحضرت صلعم سے معاہدات کیے تھے عموماً عہد شکنی ہی کرتی رہیں۔

۱۲۴۴ شَرِّد۔ شَرَدَ کے معنی ہیں بھاگ گیا (غ) اس لیے طرید۔ شرید اس شخص کو کہتے ہیں جو اکیلا رہ گیا ہو۔ اور تَشْرِید کے معنی نکال دینا یا پراگندہ اور منتشر کردینا ہیں۔ مفردات میں ہے کہ شرّدت بہ کے معنی ہیں اس کے ساتھ ایسا فعل کیا جس نے اس کے غیر کو بھگا دیا یعنی ایسی عبرت ناک سزا جو دوسرے کو ایسا فعل کرنے سے روک دے۔

مراد یہ ہے کہ جو لوگ بار بار بدعہدیاں کرتے اور امن اٹھا دیتے ہیں ان کو اگر واقعی مسلمانوں کے خلاف جنگ میں پائے جائیں تو عبرتناک سزا دینی چاہیئے تاکہ دوسرے لوگ اس قسم کی بدعہدی سے باز آئیں۔

۱۲۴۵ تخافن۔ خوف۔ مکروہ امر کی توقع ہے جو ظنی یا معلوم علامات سے حاصل ہو جس طرح رجاء اور طمع محبوب امر کی توقع ہے جو ظنی یا معلوم علامات سے حاصل ہو۔ اور ان خفتم شقاق بینھما (النساء۔ ۳۵) میں خفتم (یا تم ڈرو) کے معنی کیے گئے ہیں عرفتم تم پہچان لو گویا اصل مطلب یہ ہے کہ حالات کے جاننے کی وجہ سے تمہیں خوف ہو (غ) یہی معنی تخافن کے یہاں ہیں یعنی یہ کہ اگر حالات کی واقفیت کی وجہ سے تمہیں ڈر ہو کہ یہ قوم خیانت کرے گی۔

علیٰ سواء۔ برابری کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ ان کو مشکلات کی حالت میں پاکر چھوڑ دیا جائے یا عہد کو اس صورت میں توڑ دیا جائے کہ وہ سمجھ رہے ہوں کہ عہد باقی ہے۔ فریقین کو مساوی حالت میں رکھ کر ایسی صورت میں معاہدہ سے دست برداری کر لی جائے۔ دوسرے فریق کو نقصان پہنچانا مدنظر نہ ہو۔

یہ اسلام کی تعلیم کا کمال ہے کہ ایک خائن قوم کے ساتھ بھی خیانت کی اجازت نہیں دی بلکہ یہ فرمایا کہ اگر کسی قوم کی خیانت کا علم ہو جائے تو ان کو برابری کا موقع دے کر معاہدہ سے دست برداری کر لی جائے۔

۱۲۴۶ کفر اسلام پر غالب نہیں آسکتا۔ یعجزون کا مفعول ذکر نہیں کیا لیکن اگلی آیت میں مسلمانوں کو خطاب کر کے اور ان کو دشمن کے مقابلہ کے لیے تیار رہنے کا حکم دے کر صاف بتا دیا کہ یہاں بھی مسلمانوں کو عاجز نہ کر سکنا ہی مراد ہے آج جب مسلمان چاروں طرف سے مایوس ہیں اور بظاہر دنیا پر کفر کا غلبہ ہو رہا ہے۔ یہ آیت کس قدر مایوس دلوں میں امید کی روشنی پیدا کر سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو چھوڑ کر اپنے دلوں کو مایوسی کا شکار کر دیا ہے۔ اگر قرآن کریم کے یہ وعدے جو ایک مرتبہ موجودہ حالت سے بڑھ کر مایوس کن حالات کے باوجود پورے ہو چکے ہیں ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے تو زندہ ایمان ان سے ایثار کے وہ کارہائے نمایاں کرا دیتا جو دنوں میں ان کی حالت بدل ڈالتے۔ خدا کی آواز اب بھی وہی یقین ہم کو دلاتی ہے۔ چنانچہ اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو آج سے کوئی چالیس سال پیشتر یہ الہام ہوا "بخرام کہ وقتِ تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں بر منارِ بلند تر محکم افتاد"۔ مایوسی مسلمانوں کیلئے نہیں نہ اسلام کے لیے مغلوبیت ہے۔ بلکہ جہاں اور جب لوگوں نے خیال کیا کہ اسلام مغلوب ہوا وہی اس کے غلبہ کا وقت تھا۔

وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٦٠﴾
وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ
عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦١﴾
وَ اِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ
اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾
وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي
الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٣﴾

تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔[1247]
اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی اس کی طرف جھک جا، اور
اللہ پر بھروسہ رکھ، وہ سننے والا جاننے والا ہے۔[1248]
اور اگر ان کا ارادہ ہو کہ تجھے دھوکا دیں، تو اللہ تجھے بس ہے وہی ہے
جس نے اپنی نصرت کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ تجھے قوت دی۔
اور اس نے ان کے دلوں میں الفت ڈالی اگر تو جو کچھ زمین میں ہے
سب کا سب خرچ کر دیتا تو ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتا
لیکن اللہ نے ان میں اُلفت ڈال دی وہ غالب حکمت والا ہے۔[1249]

ع۱۲۴۷ قوۃ۔ وہ چیز جو موجب تقویت ہو۔ مثلاً جنگ میں طرح طرح کے ہتھیار۔ جیسا کہ ابن عباسؓ نے لکھا ہے۔ اور قلعے۔ جیسا کہ عکرمہ نے کہا ہے اور رمی یعنی تیر (یا بندوق یا توپ) کا چلانا، جو ایک حدیث میں مروی ہے اور رمی کی تعریف احادیث میں آئی ہے اور اس کے سیکھنے کا حکم بھی احادیث میں پایا جاتا ہے۔ رباط الخیل۔ ربط باندھنا اور رِباط اور مُرابطۃ کے معنی ہیں دشمن کی سرحد پر لگے رہنا۔ گویا ہر ایک نے اپنے گھوڑے تیار باندھے ہوئے ہیں اور محض حفاظت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ پر بھی رباط بولا گیا ہے (غ) پس جس طرح جہاد پر قائم رہنے اور تیار رہنے پر رِباط بولا جاتا ہے اسی طرح طہارت اور نماز پر قائم رہنے پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ رِباط کے ساتھ خیل کا لفظ لانے میں مزید مستعدی پر دلالت ہے۔

اٰخرین من دونہم۔ یعنی ان دشمنوں کے سوائے جو اب تمہارے مقابل پر ہیں کچھ اور دشمن بھی ہیں جن کو تم نہیں جانتے کسی نے کہا یہود بنو قریظہ۔ کسی نے منافق۔ کسی نے اہل فارس۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد جن ہیں۔ میرے نزدیک ایک معنی سے یہ آخری قول درست ہے۔ کیونکہ جنّ وہ ہیں جو نظروں سے مخفی ہوں پس اسلام کے وہ دشمن جو ابھی ظاہر نہ ہوئے تھے اور پھر وہ دشمن جن کا حملہ جنّوں کی طرح وسوسہ اندازی سے ہو۔ جیسے آج کل کے عیسائی مشنری کہ ان کا حملہ اسلام پر کھلا نہیں بلکہ جن کی طرح مخفی حملہ ہے اور طرح طرح کے اعتراض کر کے وسوسہ اندازی کرتے ہیں انہی کی طرف یہاں اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

اس آیت میں دشمن کے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کو دو باتوں کا حکم دیا ہے۔ ایک قوت یعنی دشمن کی مدافعت کا سامان مثلاً جنگوں میں آلات اور قلعے اور فنون جنگ سے واقفیت اور گولہ بارود۔ اور جہاد قلمی میں وہ علمی سامان جس سے دشمن کے اعتراضات کا مقابلہ ہو۔ اور دوسرے مستعد رہنا جس کو یہاں رباط الخیل کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دشمن کو اتنا موقعہ نہیں دینا چاہیئے کہ وہ سرحد سے آگے نکل سکے بلکہ اس کا مقابلہ سرحد پر کرنے کے لیے پورا تیار رہنا چاہیئے اگر ظاہری رنگ میں دیکھا جائے تو مسلمانوں کی سلطنتوں کی تباہی کا موجب رباط الخیل سے غفلت ہوئی ہے نہ صرف یہی کہ مسلمان دشمن کے مقابلہ کے لیے سرحد پر تیار نہیں رہے بلکہ انہوں نے دشمنوں کو اپنے ملکوں میں گھس جانے کا موقعہ خود اپنے ہاتھ سے دیا اور دشمنوں نے اندر داخل ہو کر مسلمانوں کی جڑیں کاٹ دیں۔ اب دوسرے پہلو یعنی جہاد قلمی میں مسلمان اسی طرح غافل ہیں۔ دشمن طرح طرح کے سامانوں سے میگزینوں اور رسالوں اور کتابوں اور لکچروں اور تقریروں سے اور مشن قائم کر کے اسلام پر حملہ آور ہو رہا ہے مسلمان خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور دشمن کے مقابلہ کے لیے کوئی سامان نہیں نہ کوئی تیاری ہے۔ تیاری کا فائدہ بتایا کہ دشمن مرعوب رہے گا اور حملہ کرنے کی جرأت نہ کرے گا بلکہ صلح کی طرف مائل ہوگا۔ اسی لیے اگلی آیت میں صلح کا ذکر ہے۔ آج بعض ناواقف لوگ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ یورپ میں تبلیغ اسلام کی ضرورت نہیں، جب خود گھر میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ ایک ہی سامان سے دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں اور یورپ یعنی تثلیث کے مرکز میں توحید کی آواز کا بلند ہونا رباط الخیل ہے جس سے دشمن پر رعب بیٹھتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو اپنا شکار سمجھے بیٹھے ہیں۔ مسلمان اگر ہمت کر کے یہ دکھا دیں کہ ان کے نزدیک خود عیسائی ان کا شکار ہیں تو دشمن کی آدھی سے زیادہ قوت ٹوٹ جاتی ہے۔

ع۱۲۴۸ اسلام صلح کو مقدم کرتا ہے: کیا یہ اس مذہب کی تعلیم ہو سکتی ہے جو بجبر اپنے آپ کو دنیا میں پھیلا چاہتا ہو سخت ترین دشمنوں کا ذکر کر کے انکی غداری کا ذکر کر کے ان کے مقابلہ میں مستعد رہنے کا حکم دیکر پھر بھی فرمایا کہ اصل غرض جنگ نہیں اگر صلح کی طرف دشمن مائل ہو تو تم بھی صلح کر لو بلکہ اس سے اگلی آیت میں فرمایا کہ اگر میلان صلح میں غداری کا ارادہ بھی ان کا پنہاں ہو تو بھی تم صلح کی طرف ہی جھکو، رہی غداری تو اس کے مضرات سے اللہ تم کو بچا دیگا اس زمانہ میں مسلمان بادشاہوں کو یہ زرین اصول اور بھی زیادہ مدنظر رکھنا چاہیئے تھا ایک طرف اپنی طاقت اور قوت کو مضبوط کریں اور اپنی پوری تیاری دکھائیں تو دوسری طرف حتی الوسع جنگ سے بچیں۔

ع۱۲۴۹ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کے بڑے پہلو کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ مسلمانوں میں باہمی الفت پیدا کر دی۔ بلاشبہ کسی قوم کے دلوں میں الفت و محبت کا پیدا ہو جانا اس کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ دلوں میں محبت ہو تو ایک دوسرے پر حسن ظن ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے کام کی قدر ہوتی ہے۔ ذاتی

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٤﴾ ع

اے نبی! اللہ تیرے لیے بس ہے اور (اس کے لیے) جو مومنوں
میں سے تیرا پیرو ہو۔۱۲۵۰

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ
اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا
مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا
اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ
قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾

اے نبی! مومنوں کو جنگ کی رغبت دے۔۱۲۵۱ اگر تم میں سے
بیس صبر کرنے والے ہوں، تو دو سو پر غالب آئیں گے
اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں، تو کافروں میں
سے ایک ہزار پر غالب آئیں گے، یہ اس لیے کہ وہ ایسے
لوگ ہیں جو سمجھ سے کام نہیں لیتے۔۱۲۵۲

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ
ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ
يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ

اس وقت اللہ نے تمھارا بوجھ ہلکا کر دیا اور وہ جانتا
ہے کہ تم میں کمزوری ہے، سو اگر تم میں سے ایک سَو صبر
کرنے والے ہوں، دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں

اغراض درمیان میں نہیں آتیں۔ آج مسلمانوں کا جو کام دیکھو اس کے خلاف نظر آتا ہے۔ ذاتی رنجشیں اور کدورتیں ہیں۔ بدظنی ہے۔ ایک دوسرے کی تحقیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کام میں برکت نہیں۔

لو انفقت میں بتایا کہ وہ ملک جس کی قوم قوم کے خلاف اور قبیلہ قبیلہ کے خلاف شب و روز برسرِ پیکار رہتا تھا، جن کی دشمنی کی آگ قریب تھا کہ انھیں بھسم کر دیتی۔ جیسا کہ فرمایا کنتم علی شفا حفرۃ من النار۔ وہ آگ یہی باہم دشمنی کی آگ تھی۔ اس قسم کی صدیوں کی خطرناک دشمن قوموں کو ملا کر ایک کر دینا ساری دنیا کے خزانے صرف کرنے سے بھی نہ ہو سکتا تھا پس وہ مذہب جس نے ایسی دشمن اقوام میں بھی الفت پیدا کر دی وہ آج بھی دنیا کی سخت ترین دشمن قوموں میں محبت پیدا کر سکتا ہے۔ کاش مسلمان آپس میں محبت کا نمونہ دنیا کی قوموں کو دکھاتے تو دیکھتے کہ قومیں اس طرح اسلام پر فدا ہوتی ہیں جیسے پروانے چراغ پر۔

ع۱۲۵۰ ظاہری سامانوں کی ضرورت بتا کر اور یہاں دشمن کے مقابلہ کی تیاری کو ضروری قرار دے کر فرمایا کہ یہ سب کچھ کر کے ان چیزوں پر بھروسہ نہ کرو۔ سامان سب کرو مگر بھروسہ اللہ کی ذات پر ہی رکھو۔ نبی کو اگر یہ مواحدانہ تعلیم دی تو آپ کے مومن متبعین کو بھی یہی تعلیم دی۔ اور نبی کو اگر ان الفاظ میں بشارت دی کہ دشمن اگر قوی ہے تو نگہبان قوی تر ہے۔ تو یہی بشارت آج ہمارے لیے بھی ہے بشرطیکہ ہم متبع بنیں یہی اسلامی توکّل ہے جسے لوگوں نے غلطی سے یوں سمجھا ہوا ہے کہ وہ کچھ نہ کرنے کا نام ہے حالانکہ یہاں زبردست سامانوں کی تیاری کی تعلیم کے بعد توکّل کے لیے کہا۔

ع۱۲۵۱ حَرَض۔ حَرَض اس کو کہتے ہیں جس میں کچھ بھلائی نہ ہو، جو ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہو۔ حتٰی تکون حرضا (یوسف۱۲-۸۵) اور تحریض کے معنی ہیں کسی چیز کو بہت اچھا کر کے دکھانا اس پر ترغیب دینے کے لیے، گویا تحریض حرض کا ازالہ ہے جیسے تمریض میں مرض کا ازالہ (رغ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ مومنوں کو جنگ کی ترغیب دو۔ اور لفظ حَرِّض جو یہاں استعمال فرمایا ہے وہ اس غرض سے ہے کہ تا معلوم ہو کہ جنگ میں حَرَض یعنی ہلاکت نہیں۔ جیسا کہ ظاہر نظر سے معلوم ہوتا تھا، یعنی جنگ میں ہلاکت نظر آتی تھی اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جنگ کو پسند نہ کرتے تھے دوسرا یہ امر قابل غور ہے کہ القتال سے مراد کیا ساری دنیا کے ساتھ جنگ ہے؟ نہیں بلکہ انہی دشمنوں کے مقابل پر جن کا ذکر اوپر ہو رہا ہے اور اسی قتال پر جس کی اجازت ہو چکی ہے اور وہ قتال کیا ہے قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں صرف ان کے ساتھ جنگ کرو۔ وہ بھی اللہ کی راہ میں نہ انتقام کے لیے نہ بدلہ لینے کے لیے۔ ہاں دین اسلام کی حفاظت کے لیے۔

ع۱۲۵۲ مسلمانوں کی تعداد کفار کے مقابل بہت ہی تھوڑی تھی پس ان کی تسلّی کے لیے فرمایا کہ تم صابر ہو یعنی مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرو تو تم میں سے ایک آدمی دس پر غالب آئے گا۔ اس کی وجہ بتائی کہ تمہارے دشمن ایک ایسی قوم ہیں کہ وہ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ گویا اسلام مسلمانوں کے اندر وہ بہادری پیدا کرنا نہیں چاہتا، جو اندھا دھند کام کرے، بلکہ ایسی بہادری پیدا کرتا ہے جو فقاہت کا نتیجہ ہو یعنی انسان سوچ سمجھ کر کہ اس کی زندگی کی غرض یہ ہے پھر اس اصل غرض پر اپنی زندگی کو لگائے۔ جس نے اپنی زندگی کی غرض کو نہیں سمجھا وہ اگر ایک وقت جوش کے ماتحت اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالتا بھی ہے تو پھر جان بچانے کا خیال اس کی ہمّت کو کمزور بھی کر دیتا ہے۔ یہی رنگ علمی پہلو میں بھی ہے بلکہ شاید لایفقھون اسی کی طرف اشارہ کرنے کو فرمایا۔ دس عیسائی مشنری ایک مسلمان مبلغ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے کہ ان کے عقاید کی بنیاد علم اور فقاہت پر نہیں۔

يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾
مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى
يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ
الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۷﴾

اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں گے اور اللہ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے۔[۱۲۵۳]
ایک نبی کے لیے شایاں نہیں کہ اس کے قبضہ میں قیدی ہوں جب
تک کہ وہ زمین میں جنگ کر کے غالب نہ آئے۔ تم دنیا کا مال چاہتے تھے
اور اللہ تمہارے لیے آخرت کو چاہتا ہے۔ اور اللہ غالب
حکمت والا ہے[۱۲۵۴]

ع۱۲۵۳ اس آیت کو پہلی کی ناسخ سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہاں کوئی حکم ہی نہیں جو منسوخ ہو سکتا ہو۔ بلکہ صرف ایک خبر ہے ہاں ان دونوں خبروں میں کہ پہلی جگہ فرمایا کہ مسلمان دہ چند تعداد پر غالب آئیں گے اور یہاں فرمایا کہ دو چند تعداد پر غالب آئیں گے فرق نظر آتا ہے جس کو الآن کا لفظ ہی حل کرنے کے لیے کافی ہے یعنی ان دونوں آیتوں میں دو مختلف حالات کا ذکر کیا ہے۔ ایک مسلمانوں کی حالت نزول آیت کے وقت جس کو فیکم ضعفا سے تعبیر کیا ہے یعنی مسلمانوں میں اس وقت کمزوری ہے اور یہ زمانہ جنگ بدر کا ہے اس وقت دشمن کے مقابلہ پر مسلمانوں میں کئی قسم کی کمزوری تھی اوّل یہ کہ طاقت کے لحاظ سے وہ سب جنگ کے قابل نہ تھے ان میں بوڑھے اور بچے بھی تھے جن کو میدان جنگ میں جانا پڑتا تھا ان میں کمزور و ناتوان بھی تھے اور تعداد اس قدر تھوڑی تھی کہ بلحاظ جنگی قابلیت کے میدان جنگ میں نکلنا پڑتا تھا۔ دوسرے یہ لوگ فنونِ سپاہگری سے واقف نہ تھے ان کو کسی جنگ کے لیے تیار ہی نہ کیا گیا تھا۔ بلکہ یہ جنگ صرف دشمن کی زبردستی کی وجہ سے وقوع میں آئی۔ تیسرے یہ کہ آلاتِ حرب ان کے پاس کافی نہ تھے کیونکہ جنگ یک بیک سر پر آپڑی۔ چوتھے یہ کہ دیگر ضروریات جنگ مثلاً گھوڑے باربرداری کا سامان بھی موجود نہ تھا اس لیے فرمایا کہ اس وقت تو تم ابھی جنگ کے لیے تیار ہی نہیں تم میں طرح طرح کی کمزوریاں ہیں باوجود ان کمزوریوں کے اگر تم صبر اختیار کرو تو پھر بھی اس قدر نصرت تم کو دی جائے گی کہ تم دو چند تعداد پر غالب آؤ گے اور پہلی آیت میں جہاں دہ چند پر غالب آنے کی خبر دی ہے اس میں اس حالت کا ذکر ہے جب مسلمان ہر طرح سے مسلّح اور تیار ہوں جیسا کہ اس سے پہلے رکوع میں اس کا مفصل ذکر بھی کیا ہے کہ تم کو ہر ایک قسم کے آلاتِ حرب اور سامانِ جنگ تیار کرنا چاہیئے اور فنون جنگ سے واقفیت حاصل کرنا چاہیئے جب تمہارے پاس یہ سب سامان ہوں تو تم دہ چند تعداد پر غالب آؤ گے۔ ہر حالت میں یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صبر کی شرط ساتھ ہے۔ اور اس آیت کے آخر پر بتا بھی دیا کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یعنی نصرت الٰہی صبر کرنے والوں پر نازل ہوتی ہے۔

ع۱۲۵۴ اَسْرٰی۔ اسیر کی جمع ہے۔

یثخن۔ ثَخُنَ کے معنی موٹا یا سخت ہوا۔ اور اَثْخَنَ کے معنی غَلَبَ وَقَہَرَ جیسا کہ ابن الاعرابی کا قول لسان العرب میں منقول ہے یعنی غالب ہوا۔ ہاں اثخان فی القتل کے معنی بہت قتل کرنا ہیں اور عام طور پر کسی شے میں اثخان اس میں مبالغہ اور اکثار کو کہتے ہیں مگر مطلق اثخان کے معنی جیسا کہ دو جگہ یہ لفظ قرآن شریف میں آیا ہے غالب آنا ہی ہیں نہ خونریزی کرنا چنانچہ دوسری جگہ ہے حتّٰی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق (محمد ۴) جہاں اثخان کے بعد فرمایا کہ ان کو قید کر لو۔ اور قید وہی کیے جا سکتے ہیں جن پر غلبہ حاصل ہوا ہو نہ وہ جو قتل کر دیئے گئے ہوں۔

امام احمد اور ترمذی وغیرہما کی روایات سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے یہ رائے دی کہ فدیہ لیکر ان کو چھوڑ دیا جائے اور حضرت عمرؓ نے یہ کہ مسلمان ابھی کمزور ہیں۔ قیدیوں کو قتل کر دیا جائے۔ اور رسول اللہ صلعم نے حضرت ابوبکرؓ کو فرمایا کہ تمہاری مثال حضرت ابراہیمؑ کی مثال ہے کہ انہوں نے کہا تھا ومن عصانی فانک غفور رحیم اگر کوئی میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا مہربان ہے یا حضرت عیسٰیؑ کی کہ انہوں نے کہا وان تغفر لھم فانک انت العزیز الحکیم اور حضرت عمرؓ کو فرمایا کہ تیری مثال نوحؑ کی مثال ہے۔ جنہوں نے کہا لاتذر علی الارض من الکافرین دیارا۔ یا حضرت موسٰیؑ کی جنہوں نے کہا ربنا اطمس علی اموالھم۔ اور عمل آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے پر کیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔ لیکن حضرت ابن عباس سے اس قدر مزید روایت ہے کہ اگلے دن حضرت ابوبکرؓ اور نبی کریم صلعم رو رہے تھے، تو حضرت عمرؓ نے وجہ دریافت کی تو اس آیت کا نزول وجہ بتائی گئی یعنی یہ کہ فدیہ لینا خلاف منشائے حکم الٰہی تھا۔ روایت کے اس حصہ کے غلط ہونے پر چونکہ قرآن کریم صراحت سے گواہ ہے اس لیے یہ کسی طرح قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل کی وجوہات بتاتی ہیں کہ اسیران بدر کو فدیہ پر چھوڑنا عین حکم قرآن کے مطابق تھا۔

اوّل۔ اگلے رکوع کی پہلی آیت یوں ہے یاایھا النبیّ قل لمن فی ایدیکم من الاسرٰی ان یعلم اللہ فی قلوبکم خیرا یؤتکم خیرا مِمّا اخذ منکم اے نبی ان قیدیوں کو جو تمہارے ہاتھوں میں ہیں کہدو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی جانتا ہے تو تم کو اس سے بہتر دیدیگا جو تم سے لیا گیا۔ یعنی جو فدیہ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر اللہ تعالیٰ تم کو دیدیگا۔ اگر قتل کرنا ضروری تھا تو اُن کو یہ تسلّی کسی طرح نہ دی جا سکتی تھی یہاں تو فدیہ کی رقم سے بھی بہتر کا وعدہ دیا جاتا ہے پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ اس آیت کے نزول کے وقت تک قیدی چھوڑے تو گئے نہیں تھے پس اگر رسول اللہ صلعم کو منشائے الٰہی یہ معلوم ہوتا کہ انھیں قتل کرنا ضروری ہے تو اس وقت قتل کرنے میں کون مانع تھا۔

دوم۔ یہ قیدی تو عین اس حکم کے مطابق لیے گئے تھے کہ دشمن پر غالب آ کر قیدی پکڑ سکتے ہو بغیر غالب آنے کے نہیں اور جنگ بدر میں دشمن پر غلبہ مل چکا تھا اور

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ
اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۶۸

اگر اللہ کی طرف سے پہلے سے حکم نہ ہو چکا ہوتا، تو تمکو اس بارے میں جو تم کرنے لگے تھے بھاری عذاب پہنچکر رہتا ۱۲۵۵ع

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا
ع اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۶۹

اس سے جو تم نے فتح پا کر حاصل کیا ہے حلال طیّب کھاؤ اور اللہ کا تقویٰ کرو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۲۵۶ع

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ
الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا
يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ
لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۷۰

اے نبی ان کو جو تیرے ہاتھ میں قیدیوں میں سے ہیں کہہ دے، اگر اللہ تمھارے دلوں میں کوئی بھلائی جانے گا تو تم کو اس سے بہتر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۲۵۷ع

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ

اور اگر وہ تجھ سے دغا کرنا چاہیں تو پہلے اللہ سے دغا کر چکے ہیں

باقاعدہ فوج سے جنگ ہو چکی تھی۔

سوم۔ دوسری جگہ صراحت سے یہ حکم قرآن شریف میں موجود ہے کہ جب دشمن پر غالب آکر قیدی پکڑو تو یا ان کو فدیہ لیکر چھوڑ دو یا بطور احسان۔ قیدیوں کو قتل کرنے کا حکم قرآن شریف میں کہیں نہیں چنانچہ سورۂ محمد ۴ میں فرمایا فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتّٰی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فامّا منّا بعد واما فداءً جب کافروں سے تمہاری جنگ ہو تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب ان پر غالب آجاؤ تو ان کو قید کرلو۔ پھر اس کے بعد یا احسان کے طور پر چھوڑ دو یا فدیہ لیکر۔

چہارم۔ نبی کریم صلعم نے بعض جنگوں میں ہزاروں کی تعداد میں قیدی پکڑے لیکن کبھی ان کو قتل نہیں کیا (یہود کا معاملہ الگ ہے اس لیے کہ ان کے اپنے منتخب کردہ ثالث کا فیصلہ تھا اور ان کی شریعت کے مطابق تھا) بلکہ جنگ بدر میں تو فدیہ لیا باقی جنگوں میں عموماً بطور احسان ہی آزاد کیا جس سے معلوم ہوا کہ یہی عملدرآمد مطابق قرآن کریم تھا یہ کس طرح ممکن ہے کہ قرآن میں تو یہ حکم ہو کہ قیدیوں کو قتل کر دو اور نبی کریم صلعم کا عمل اس کے خلاف ہو۔ مگر یہ محض ایک خیال ہے کہ قرآن میں کوئی ایسا حکم ہے نہ یہاں کوئی ایسا حکم ہے نہ کہیں دوسری جگہ قرآن شریف میں کوئی ایسا حکم ہے بلکہ اس کے خلاف آزاد کرنے کا حکم ہے۔

پنجم۔ فدیہ کے فیصلہ کی تعمیل ہونے میں بہت دن لگے یعنی جب تک مکّہ سے زر فدیہ آئے اس وقت تک قیدی قبضہ میں تھے جب نبی کریم صلعم کو اپنی غلطی کی اطلاع مل گئی تھی تو اس کی اصلاح کیوں نہ کی؟ پھر بعض قیدیوں سے فدیہ بجائے روپے کے یہ لیا گیا کہ وہ کتابت سکھا دیں۔ یہ ایک دن کا کام نہ تھا بلکہ کئی مہینے اس پر لگے ہونگے۔

ششم۔ آیت ۶۹ میں فدیہ کو ممّا غنمتم میں داخل کر کے پھر اس کو صریح طور پر حلال ٹھہرایا ہے۔ غرض یہ بات بالکل خلاف صریح نص قرآن شریف ہے کہ ایسا ہوا ہو۔ اس آیت میں جو ذکر ہے وہ تو صاف ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ چاہتا تھا کہ قافلہ پر حملہ کیا جائے تودّون انّ غیر ذات الشوکۃ تکون لکم (۷) جو شروع سورت میں گزر چکا ہے اس خیال کی نفی یہاں آخر پر اللہ تعالیٰ نے پھر کی ہے کہ قافلہ پر حملہ کرنا نبی کی شان کے شایاں نہ تھا۔ بلکہ ضروری تھا کہ میدان میں جنگ ہو کر پھر قید کیا جاتا۔ یہی اشارہ تریدون عرض الدنیا میں ہے اور یہ صرف اس گروہ کا ذکر ہے جو قافلہ پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے اور نبی کریم صلعم کو اس کے خلاف حکم تھا اور یہاں واللہ یرید الاٰخرۃ اسی کے مطابق ہے جو پیچھے فرمایا تھا ویرید اللہ ان یحق الحق بکلماتہ (۷)

ع۱۲۵۵ فیما اخذ تم۔ اخذ فی کذا کے معنی لسان العرب میں دیئے ہیں بدأ یعنی اس کام کو کرنا شروع کیا تھا یا اس کام کو کرنے لگا تھا اس لیے فیما اخذتم سے مراد فدیہ کا لینا درست نہیں بلکہ اس سے مراد ہے وہ کام جو تم کرنے لگے تھے۔ یعنی قافلہ پر حملہ کرنا۔ یعنی ایسا کرنا چونکہ مومنانہ شان کے خلاف تھا۔ گو عام جنگوں میں جائز ہوتا اس لیے اس کا نتیجہ عذاب ہوتا کتٰب من اللہ سبق میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ یہ پہلے سے فیصلہ ہو چکا تھا کہ یہ جنگ ہو۔ جیسا کہ فرمایا لیقضی اللہ امرا کان مفعولا (۴۴)۔

ع۱۲۵۶ ان الفاظ میں غنمتم کا ذکر کر کے اسی فدیہ کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی فدیہ کا لینا تمہارے لیے جائز ہے کیونکہ دوسرے مال غنیمت کا ذکر پہلے آچکا ہے اور قیدیوں کا فدیہ یقیناً مال غنیمت میں داخل ہے۔

ع۱۲۵۷ قیدیوں کے فدیہ کی مقدار: عام فدیہ بیس اوقیہ فی قیدی تھا (اوقیہ چالیس درہم ہے) اور حضرت عباس کا چالیس اوقیہ۔ بعض ان میں سے جنگ میں خلاف منشا بھی شامل ہوئے تھے۔ جیسے حضرت عباس اور ابو البختری ان کے متعلق رسول اللہ صلعم نے حکم بھی دیدیا تھا کہ ان کو قید نہ کیا جائے۔

مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٧١﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا
مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى
يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ
فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ
بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٧٢﴾
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا
تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿٧٣﴾

سو اُس نے ان پر تم کو قابو دیدیا اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ؏۱۲۵۸
جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور
اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اور
وہ جنھوں نے (ان کو) پناہ دی اور مدد دی یہ ایک دوسرے
کے دوست ہیں اور وہ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت نہیں کی
تم پر ان کی دوستی کا کوئی حق نہیں، یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں
اور اگر تم سے دین کے متعلق مدد چاہیں تو تم پر مدد دینا فرض
ہے سوائے اس کے کہ (یہ مدد) ان لوگوں کے خلاف ہو جنکے اور
تمھارے درمیان عہد ہے اور اللہ جو تم کرتے ہو اسے دیکھتا ہے ؏۱۲۵۹
اور جو کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اگر تم ایسا نہ کروگے
تو ملک میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا ؏۱۲۶۰

؏۱۲۵۸ نبی کریم صلعم کی خیانت سے مراد یہ ہے کہ جو عہد کیا ہے کہ پھر مسلمانوں کے خلاف جنگ نہ کریں گے اس پر قائم نہ رہیں اگر ان کا یہ ارادہ ہو تو بھی تم فکر مت کرو اس لیے کہ وہ اس سے بڑھ کر خدا کی خیانت پہلے کر چکے ہیں یعنی بلا وجہ مسلمانوں پر چڑھ کر آئے تاکہ ان کو تباہ کریں اور خدا کا نام مٹا دیں۔

؏۱۲۵۹ اس آیت میں مسلمانان مدینہ کے ان مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کا ذکر ہے جو کفار کے اندر رہ گئے تھے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی ان کے متعلق فرمایا کہ اُن کی ولایت کا کوئی حق مسلمانوں پر نہیں، یعنی ان مہاجرین اور انصار پر جو مدینہ میں ایک جمعیت بن گئی تھی اور جن کی اپنی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ گو محض مسلمان ہونے کے لحاظ سے وہ ان کے بھائی ہوں مگر ولایت جس میں لین دین تجارت' میراث' عہد نصرت وغیرہ کے تعلقات شامل ہیں وہ ان کے ساتھ نہیں۔ کیونکہ ان کا فر قوموں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم نہیں۔ اور عام حالت ان کافر قوموں کی یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے دشمن تھے اور عموماً ان سے برسرپیکار تھے۔ پس جن کافر قوموں سے مسلمانوں کے تعلقات ولایت ہیں جو مسلمان ان میں ملے رہ گئے ہیں اور وہاں سے ہجرت نہیں کرتے ان کو بھی انہی قوموں کے حکم میں رکھا ہے اور یہی حق بھی تھا اور دینی تعلق کی وجہ سے ایک حالت کو مستثنیٰ کیا ہے یعنی اگر وہ مسلمان دین کے بارہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کو مدد دو اور ظاہر ہے کہ یہ مدد جنگ کی صورت میں ہوگی تاکہ ان کافر قوموں کے ظلم سے انہیں نجات حاصل ہو اس طرح پر ان کی مدد کرنا مسلمانوں کا فرض قرار دیا، لیکن اس سے پھر ایک حالت کو مستثنیٰ کیا یعنی اگر ایک کافر قوم کے ساتھ تمہارا عہد ہو تو پھر دینی رنگ میں ان کی مدد کرنا جائز نہیں، کیونکہ ایسی مدد اس معاہدہ کے خلاف ہوگی جو اس قوم کے ساتھ ہے اور معاہدہ بہرحال مقدم ہے اور ایسا ہی نبی کریم صلعم کا عمل بھی پایا جاتا ہے کہ آپ نے معاہدہ کو مقدم کیا۔ رہا یہ سوال کہ اگر ان مسلمانوں کی جو معاہد قوم میں ہوں دینی رنگ میں مدد کرنا جائز نہیں، تو کیا ان سے تعلقات ولایت بھی ہونگے یا نہیں سو یہ امر ظاہر ہے کہ جب ایک کافر قوم سے مسلمانوں کا معاہدہ ہے تو ایک حد تک تعلقات ولایت تو ان سے قائم ہیں یعنی ان کے ساتھ لین دین تجارت وغیرہ ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات ایسے معاہدات کی رو سے جنگوں میں وہ مسلمانوں کے اور مسلمان ان کے معاون ہو جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جو مسلمان ان میں ہوں ان سے وہ تعلقات نہ ہوں صرف تعلقات وراثت کو ان کی صورت میں بھی جائز قرار نہیں دیا گیا (ج۔ د)

؏۱۲۶۰ الا تفعلوہ میں کس حالت کا ذکر ہے جس کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ زمین میں فتنہ و فساد کبیر ہوگا فتنۃ قرآن کریم کی اصطلاح میں مسلمانوں کو بوجہ اسلام ماننے کے جو دکھ دیا جاتا تھا اس پر بولا گیا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ الا تفعلوہ میں کسی فعل کے نہ کرنے کا ذکر ہے اور اوپر جس فعل کے کرنے کا حکم تھا وہ صرف یہی تھا ان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر یعنی مسلمانوں کو جہاں کفار بوجہ مسلمان ہونے کے اذیت پہنچاتے ہوں وہاں مسلمانوں کی مدد کرنا مسلمانوں کا فرض قرار دیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہ دوسرے مسلمان خاموش بیٹھے دیکھتے رہیں۔ اس لیے اب یہ بتایا اگر ایسا نہ کروگے یعنی وہ اپنے معاملہ میں تمہاری مدد چاہتے ہیں اور تم مدد نہیں کرتے تو پھر زمین میں فتنہ و فساد ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں فرمایا والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض یعنی کفار ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں تو تمہیں بھی ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیئے ہاں تمہاری ایک دوسرے کی مدد دین کے بارہ میں چاہیئے۔ کفار محض اغراض دنیا کو مدنظر رکھ کر بھی ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ یہ گویا اصلاح ہے جو اسلام نے کی۔ اور دوسری اصلاح یہ کی کہ دینی ضروریات کے لیے بھی جنگ کرنی پڑے تو ان لوگوں کے خلاف جنگ نہ کرو جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے گویا عہد کی عزت سکھائی کہ دینی ضروریات کے پیش آنے پر بھی اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾

اور جو ایمان لائے اور (انھوں نے) ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ جنھوں نے پناہ دی اور مدد دی، یہی سچے مومن ہیں، اُن کے لیے حفاظت اور عزّت کا رزق ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ۭ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾ ع ۱۰

اور جو بعد میں ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جہاد کیا تو وہ تم میں سے ہی ہیں اور رشتہ کے تعلقات والے اللہ کے حکم میں آپس میں زیادہ حق دار ہیں، اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے [۱۲۶۱]

۱۲۶۱ جب اخوت ایمانی کے تعلقات کا ذکر کیا تو ساتھ ہی تعلقات رشتہ داری کا بھی ذکر کیا۔ یعنی وہ تعلقات بھی اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ ہی ہیں۔ اس لیے وہ تعلقات جو اخوت ایمانی سے پیدا ہوئے ہیں ان کی غرض یہ نہیں ہو سکتی کہ تعلقات رشتہ داری جن کے لحاظ سے وراثت کے احکام اجرا پاتے ہیں باطل ہو جائیں۔ جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو عموماً بیکسی کی حالت میں تھے۔ آنحضرت صلعم نے ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کے درمیان اخوت قائم کر دی تھی، جس کی ان سچے مومنوں نے یہاں تک عزت کی کہ گھر بار مال اسباب تک نصف نصف دینے کو تیار ہو گئے اور وفات کی صورت میں حصہ میراث بھی۔ سو اس سے رکا اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائی مسلمانوں میں تعلقات اخوت کس قدر مضبوط تھے کہ ان میں افراط کا خطرہ ہو گیا تھا جس کو آیت قرآنی نے روک دیا۔ آج اس کی بجائے منافرت اور تباغض و تحاسد میں کمال حاصل کیا جا رہا ہے۔

(۹) سُوۡرَةُ التَّوۡبَةِ مَدَنِيَّةٌ

اٰیاتُھا ۱۲۹ رکوعاتھا ۱۶

نام - اس سورۃ کا نام التوبۃ یا البراءۃ ہے اور بھی کئی ایک نام اس کے احادیث میں آئے ہیں جیسے المقشقشۃ یعنی شفا دینے والی گویا نفاق سے شفا دیتی ہے اور المنقرۃ - البحوث - المبعثرۃ وغیرہ جن ناموں میں اس کے مضمون کی طرف اشارہ ہے - جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کے ناموں میں ان کے مضمون کی طرف اشارہ ہے اس سورت میں ۱۶ رکوع اور ۱۲۹ آیات ہیں اور اس کا نام البراءۃ اس کی پہلی ہی آیت میں مذکور ہے براءۃ من اللہ ورسولہ جہاں ان کفار سے علیحدگی اور بیزاری کا اعلان ہے جو اپنے معاہدات پر قائم نہ رہتے تھے اور ایسا ہی اس سورت میں منافقین کو بھی بالکل الگ کر دیا جواب تک ملے جُلے آتے تھے۔ پس اس کے نام میں یہ اشارہ ہے کہ شرک اور نفاق سے مسلمان الگ ہوتے ہیں اور کامل بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اس کا دوسرا نام التوبۃ۔ لقد تاب اللہ علی النبی (۱۱۷) سے لیا گیا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے ان فضلوں اور رحمتوں کا ذکر کیا ہے جو اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں پر کیے اس لیے کہ انہوں نے سخت تنگی کے وقت میں نبی کریم صلعم کی آواز پر لبیک کہا۔ یہاں تک کہ تیس ہزار آدمی اپنے سب کاروبار کو چھوڑ کر سخت گرمی کے موسم میں پکی ہوئی فصلوں کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ ہو گئے اور ایک لمبا اور صعوبت والا سفر اختیار کیا۔ اور مسلمانوں میں سے صرف تین آدمی پیچھے رہے ؛

خلاصہ مضمون - جیسا کہ اس سورت کے نام البراءۃ سے ظاہر ہے، پہلے رکوع میں ان کفار سے علیحدگی کا اعلان ہے جنہوں نے بار بار عہد شکنی کر کے مسلمانوں کو سخت تکلیف پہنچا رکھی تھی۔ چونکہ اسلام نے ملک عرب میں جنگوں کا خاتمہ کر کے اپنے اصول کو پھیلانا تھا اس لیے اب وقت آ گیا تھا کہ کفار کی شرارتوں کا سدّباب ہمیشہ کے لیے کیا جاتا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ صرف کفر و شرک اس علیحدگی کی وجہ نہیں۔ چنانچہ حکم دیا کہ جن کفار نے عہد شکنی نہیں کی، ان کے ساتھ تم بھی اپنے عہد کو پورا کرو۔ اور یہ بھی بتایا کہ باوجود مشرکوں کے معاہدات کے اختتام کے اگر ان قوموں میں سے کوئی شخص آ کر تمہاری پناہ مانگے تو اسے پناہ دیدو اور اسے اصول اسلام سمجھاؤ اگر وہ مسلمان نہ ہو تو پھر اسے صحیح سلامت اپنی قوم میں پہنچا دو۔ دوسرے رکوع میں وجوہات قطع تعلق دی ہیں اور کچھ ذکر ان لوگوں کا کیا ہے جن کے ساتھ ابھی جنگ ہونے والی تھی اس لیے کہ انہوں نے اسلام لانے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیا اور اسلام کو نیست و نابود کرنے کا ارادہ کیا۔ تیسرے رکوع میں بتایا کہ اسلام مسلمانوں سے پوری مالی و جانی قربانیاں چاہتا ہے۔ صرف یہ فخر کافی نہیں کہ ہم نے اس قدر مہمان نوازی کر دی یا مسجدوں کی مرمت کر دی یا مسجدیں بنا لیں بلکہ اپنے عزیزوں اپنے اموال اپنی جائدادوں اپنی تجارتوں کو جب تک اسلام کے سامنے قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہوں اس وقت تک مسلمان نہیں۔ چوتھے میں بتایا کہ اپنی کثرت پر فخر نہ کرنا بلکہ وہ چیز جو تمہیں کامیاب کر رہی ہے وہ نصرت الٰہی ہے اور فرمایا کہ مشرکوں کو آیندہ خانہ کعبہ کے پاس نہ آنے دو اور اس بات کا خوف مت کرو کہ اس سے تمہاری تجارتوں کو نقصان پہنچے گا۔ اور اہل کتاب بھی اگر تمہارے ساتھ جنگ کریں تو ان کا بھی مقابلہ کرو اللہ تعالیٰ انہیں بھی مغلوب کریگا پانچویں میں اہل کتاب کی اسلام کے خلاف کوششوں کا ذکر کر کے اسلام کے آخری غلبہ کی پیشگوئی کی۔ چھٹے رکوع میں غزوۂ تبوک کا ذکر کیا جس کی ضرورت عیسائیوں کی ہلچل سے پیش آئی اور منافقوں کے پیچھے رہ جانے کا ذکر کیا۔ ساتویں میں بتایا کہ منافق مصائب کے خوف کی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہیں اور اس لیے بھی کہ وہ اسلام کو تباہ ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ آٹھویں میں منافقوں کی ایذا رسانی کا ذکر کیا۔ نویں میں نفاق کا انجام ناکامی بتایا۔ دسویں میں منافقوں سے جہاد کا اور گیارھویں میں ان سے کامل قطع تعلق کا حکم دیا۔ بارھویں میں اعراب کا ذکر کیا جن میں بہت سے منافق تھے۔ تیرھویں میں منافقوں کے مختلف گروہوں کا ذکر کر کے بتایا کہ ایک گروہ کو تو دو دفعہ عذاب ملیگا یہ دوسرا عذاب ان کی فضیحت تھی اور ایک گروہ کو اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق دیگا اور اسی میں مسجد ضرار کا ذکر کیا۔ چودھویں میں بتایا کہ مومنوں کا خدا کے ساتھ کیا عہد ہے اور وہ انہیں کس طرح پورا کرنا چاہیئے اور کس طرح پورا کر رہے ہیں۔ پندرھویں میں بتایا کہ مومنوں کے حقیقی مجاہدات جن سے وہ مقام قرب حاصل کر سکتے ہیں یہی خدمات دینی ہیں سولھویں میں بتایا کہ رسول اللہ صلعم تو اصل میں دنیا کو گناہ اور ہلاکت سے نکالنے کے لیے آئے ہیں اور اسی پر سورت کا خاتمہ کیا۔

تعلّق : اس سورۃ کا الانفال سے یعنی پچھلی سورت سے ایسا شدید تعلق ہے کہ ان کو ایک ہی سورت کے دو حصّے قرار دیکر درمیان میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی نہیں لکھی گئی۔ اور اسی تعلق شدید کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بسم اللہ کا نزول اس سورت کی ابتدا میں آنحضرت صلعم پر نہیں ہوا۔ سورۂ الانفال میں بالخصوص جنگ بدر کا ذکر تھا اور مخالفین کو سمجھایا تھا کہ یہ جنگ تمہارے لیے ایک نشان ہے اگر تم جنگ سے رک جاؤ تو تمہارے لیے بہتر ہے اگر جنگ کو جاری رکھو تو تمہارا انجام ذلّت اور مغلوبیت ہے سورہ براءت میں اس ذلّت اور مغلوبیت کا نقشہ کھینچا ہے کہ کس طرح آخر کار کفر کا زور ٹوٹا اور اسے اسلام کے سامنے نیچا دیکھنا پڑا۔ پھر سورۃ انفال میں ذکر تھا کہ مخالف بار بار عہد شکنی کرتے ہیں اس عہد شکنی کا آخری علاج اب سورہ براءت میں بتایا۔ غرض غور کیا جائے تو دونوں سورتوں کا مضمون بالکل مسلسل معلوم ہوتا ہے حالانکہ الانفال اور اس کے نزول میں سات سال کے قریب فرق ہے جس میں طرح طرح کے واقعات پیش آئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم الٰہی میں کس طرح پر ان واقعات اور امور میں ایک ربط تھا ؛

زمانۂ نزول : براءۃ من اللہ ورسولہ اور سورت کی ابتدائی آیات کا اعلان ہجرۃ کے نویں سال میں ذیقعدہ میں ہوا پس یہ اسی سال کی نازل شدہ ہیں۔ بقیہ حصّہ سورت میں سے کثیر حصّہ کا تعلق جنگ تبوک سے ہے اور یہ جنگ نویں سال ہجرت میں پیش آئی۔ پس یہ سورت کل کی کل نویں سال ہجرت کی ہے۔ ہاں اگر ایک دو آیات جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے بعد میں نازل ہوئی ہوں تو ہو سکتا ہے مگر اصل سورت کا نزول یقیناً نویں سال ہجرت کا ہی ہے ؛

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱

یہ علیحدگی رکا اعلان) ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مشرکوں میں سے اُن لوگوں کی طرف جنکے ساتھ تم نے معاہدہ کیا تھا ۱۲۶۲

فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝۲

پس چار مہینے ملک میں چلو پھرو اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں اور کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے ۱۲۶۳

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳

اور (یہ) اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو حج اکبر کے دن اطلاع ہے ۔ کہ اللہ اور اس کا رسول ان مشرکوں سے بیزار ہے، پس اگر تم توبہ کرو تو وہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر پھر جاؤ تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں اور جنھوں نے انکار کیا ان کو دردناک عذاب کی خبر دے ۱۲۶۴

۱۲۶۲ براءۃ ۔ بُرء اور بَراء اور تَبرّی کے معنی ہیں اس سے علیحدگی جس سے انسان کو کراہت ہو۔ اسی لیے بیماری سے اچھا ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور جسے ناپسند کیا جائے اس سے علیحدگی پر بھی اور ایسے شخص کو بری اور قوم کو براء کہا جاتا ہے ان اللہ بری من المشرکین ورسولہ (التوبۃ ۹-۳) انتم بریئون مما اعمل وانا بری مما تعملون (یونس ۱۰-۴۱) اذ تبرا الذین اتبعوا (البقرۃ ۲-۱۶۶) انا برءٰؤا منکم (الممتحنۃ ۶۰-۴) (غ)

سورۂ انفال جنگوں کی ابتدا کی خبر دیتی ہے تو یہ سورۃ ان کے خاتمہ کی یا وہ کفار کی پہلی کارروائیوں کا ذکر کرتی ہے تو یہ ان کے انجام کا۔ پس سب سے پہلے رکوع میں ان مشرکین سے قطع تعلق کا ذکر ہے جنھوں نے بار بار عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا مسلمانوں کو ایک بڑی تکلیف جو عرب کی مشرک قوموں سے پہنچتی رہتی تھی یہ تھی کہ ایک دن یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ عہد کر لیتے اور مسلمان ان کی طرف سے مطمئن ہو جاتے لیکن اگلے ہی دن ذرا مخالفین کا دباؤ پڑا تو عہد شکنی کر دیتے۔ اب جبکہ فتح مکہ کے بعد ملک عرب میں جنگوں کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ یہ ضروری ہوا کہ ان عہد شکنیوں کی گنجایش کا خاتمہ کیا جائے اور ملک میں ایک عالمگیر صلح کی بنیاد رکھی جائے۔ چنانچہ نویں سال ہجری میں حج کے موقعہ پر اس سورت کی پہلی چند آیات کا تمام اطراف ملک سے جمع شدہ قبائل میں اعلان کیا گیا۔ اس سال حج کے لیے نبی کریم صلعم خود تشریف نہیں لے گئے، بلکہ حضرت ابوبکرؓ کو حاجیوں پر امیر مقرر کر کے بھیجا اور آپ کی روانگی کے بعد حضرت علیؓ کو روانہ کیا کہ سورۂ توبہ کی پہلی آیات کا اعلان کر دیں۔ جس کے بعد ذیل کے امور کا اعلان کیا گیا: اوّل یہ کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک خانہ کعبہ کے قریب نہ جائے گا۔ دوم یہ کہ کوئی شخص ننگا ہو کر طواف نہ کریگا۔ سوم یہ کہ ہر ایک عہد پورا کیا جا ۔ ئے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ ان آیات میں تمام مشرکین عالم کا ذکر نہیں، بلکہ تمام مشرکین عرب کا بھی ذکر نہیں، جیسا کہ چوتھی آیت سے ظاہر ہے۔ یہ اعلان صرف ان لوگوں کے متعلق تھا جو بار بار عہد کر کے خلاف ورزی کرتے تھے۔ کیونکہ جنھوں نے عہد کر کے خلاف ورزی نہیں کی ان کے ساتھ عہد پورا کرنے کا وہاں صریح حکم موجود ہے اور حضرت علیؓ نے جن باتوں کا اعلان کیا ان میں سے ایک عہدوں کا ایفا تھا۔ پس ان آیات سے مشرکین دنیا سے عام جنگ کا حکم نکالنا ایسی تاویل ہے جو صریح نص قرآنی کے خلاف ہے۔

۱۲۶۳ لکھا ہے کہ اس سال حج بسبب نسئی کے (یعنی اس تاخیر کے جو حج کے مہینوں میں کر لی جاتی تھی) ذلقعدہ میں ہوا۔ ہر حال میں چار مہینے اس وقت سے دئے گئے۔ جب یہ اعلان حج کے دن ہوا۔ یہ خیال کہ فتح مکہ کی وجہ سے چونکہ مسلمانوں کا غلبہ ہو گیا تھا اس لیے ان معاہدات کے ختم ہو جانے کا اعلان کیا گیا۔ صحیح نہیں فتح مکہ کا واقعہ رمضان ۸ھ کا ہے اور یہ چودہ ماہ بعد کا واقعہ ہے باوجود فتح مکہ کے جس کا تعلق صرف قریش سے تھا دوسری اقوام عرب کی طرف سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی رہی تھیں بلکہ یہاں جو لفظ استعمال فرمائے ہیں کہ جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک یہ لوگ اسلام کے خلاف منصوبوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس لیے جیسا کہ اس سے پیشتر سورۂ انفال میں مدّت پہلے حکم ہو چکا تھا واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم علیٰ سواء (الانفال ۸-۵۸) جب بار بار کی عہد شکنی کی وجہ سے ملک میں فتنہ وفساد کا خاتمہ نہ ہوتا تھا تو آنحضرت صلعم نے اس حکم الٰہی کے ماتحت نہایت صفائی سے چار ماہ کی مہلت دیکر ان عہدوں کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ اور یہ بات کہ اصل وجہ اس اعلان کی وہ فتنہ وفساد ہی تھا جو عہد شکنی سے پیدا ہوتا تھا نہ ان لوگوں کا کفر۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ چوتھی آیت میں ان کافر قوموں کو مستثنےٰ کر دیا ہے جنھوں نے عہد کر کے عہد شکنی نہیں کی۔

۱۲۶۴ یوم الحج الاکبر ۔ اس میں اختلاف ہے کہ آیا اس سے مراد قربانیوں کا دن یعنی دسویں ذی الحج ہے یا عرفہ کا دن یعنی میدان عرفات میں اجتماع کا۔ چونکہ

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۴

مگر جن مشرکوں کے ساتھ تم نے عہد کیا، پھر انھوں نے تمھارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کو مدد دی، تو ان کے ساتھ ان کا عہد ان کی مدت تک پورا کر دیں۔ اللہ متقیوں سے محبت رکھتا ہے ۱۲۶۵ع

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۵

پھر جب حرمت والے مہینے نکل جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور ان کو پکڑ لو اور ان کو روک دو، اور ان کے لیے ہر گھات کی جگہ بیٹھو پھر اگر توبہ کریں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا رستہ چھوڑ دو۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۲۶۶ع

تاریخ سے یہی ثابت ہے کہ اعلان یوم النحر یعنی دسویں ذی الحج کو ہُوا اس لیے قول اوّل کو ترجیح ہے اور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بھی اسی کی موید ہے کہ آپ نے یوم النحر کو یوم الحج الاکبر فرمایا۔

ع۱۲۶۵ یہ استثناء صاف بتاتا ہے کہ مشرکین سے قطع تعلق کی وجہ صرف ان کی عہد شکنی ہوئی تھی جہاں عہد شکنی نہیں ہوئی ان کے ساتھ عہد پورا کرنے کو اتقاء قرار دیا ہے۔ گویا اس اعلان کی اصل وجہ شرک یا کفر نہیں بلکہ عہد شکنی ہے۔ مفسرین نے یہاں صرف بنی حمزہ اور بنی مدلج کا ذکر کیا ہے کہ کنانہ کے یہ دو قبیلے ایسے تھے جن کی مدت عہد باقی تھی۔ لیکن خود خزاعہ جن کی خاطر مکہ پر چڑھائی کی گئی مسلمانوں کے معاہد تھے اور یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا عہد مدت معینہ تک تھا شاید اور بھی اس قسم کے عہد ہوں۔

ع۱۲۶۶ الاشہر الحرام سے مراد یہاں وہی چار ماہ ہیں جن کے متعلق اوپر اعلان ہو چکا کہ ان میں جنگ نہ کی جائے گی۔ ان کو حرمت والے مہینے یا تو اسی لیے کہا کہ جنگ ان کے اندر رکی رہیگی اور یا اس لیے کہ ذیقعد اور ذی الحج اور محرّم جو ان چار ماہ میں شامل تھے اور بیشتر حصّہ ان چار ماہ کا تھے۔ حرمت والے مہینے تھے۔

احصروھم۔ حَصْر کے معنی تضییق اور احصروھم کے معنی ہیں ضیقوا علیھم (غ) یعنی ان کو تنگ کر کے روک دو اَحْصَرَہُ العَدُوُّ اذا ضُیِّقَ علیہ فحصر۔ یعنی جب دشمن کسی کو یہاں تک تنگ کردے کہ وہ رک جائے تو احصرہ العدوّ کہا جاتا ہے اور حَصْر اور اِحْصار کے اصل معنی منع یعنی روک دینا ہیں (ل) اور گو حصر کے معنی حبس یعنی قید کرنا بھی ہیں۔ مگر چونکہ یہاں خذوھم پہلے آچکا ہے جس کے معنی ہیں گرفتار کرلو اس لیے حصر سے مراد کسی دوسری طرح پر روک دینا ہیں جیسے للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ (البقرۃ ۲۔ ۲۷۳) میں کسی طرح رک جانا مراد ہے نہ قید سے اور ابن جریر نے واحصروھم کے معنی کیے ہیں وامنعوھم التصرف فی بلاد الاسلام و دخول مکۃ یعنی ان کو بلاد اسلامی میں آنے جانے اور مکّہ میں داخل ہونے سے روک دو۔

مرصد۔ رَصَد کے معنی گھات میں بیٹھنا اور مرصَد گھات کی جگہ ہے رَصَد اور ارصاد کے ایک ہی معنی ہیں وارصادا لمن حارب اللہ ورسولہ (التوبۃ ۹۔ ۱۰۷)

وہ معترضین جو قرآن کریم کو اگر دیکھیں بھی تو بالکل سطحی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں اس آیت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام میں ہر کافر کو قتل کر دینے کا حکم ہے۔ کیونکہ یہاں فاقتلوا المشرکین آگیا ہے۔ تعصّب کی عینک کبھی انسان کی نظر کو صاف نہیں رہنے دیتی۔ یہاں شروع سے ایک خاص ذکر چلا آتا ہے یعنی ان مشرکوں کا ذکر جنھوں نے بار بار عہد کر کے خلاف ورزیاں کیں ینقضون عھدھم فی کل مرۃ (الانفال ۸۔ ۵۶) پہلے بھی ان کے متعلق آچکا ہے۔ یہاں نہ ان مشرکوں کا کوئی ذکر ہے جن سے کوئی عہد ہی نہیں ہُوا نہ ان کا جنھوں نے عہد کر کے خلاف ورزی نہیں کی۔ بلکہ پہلی ہی آیت میں بیزاری کو صرف ان لوگوں تک محدود کر کے جن سے عہد ہوا الذین عاھدتم۔ ان تمام مشرکوں، اور کفار کو اس سورت کے مضمون سے بے تعلق کر دیا جنھوں نے مسلمانوں سے کوئی عہد نہ کیا تھا۔ اور عہد کر کے پورا کرنے والوں کو الگ مستثنے کر دیا تو باقی صرف وہ چند مشرک رہ گئے جنھوں نے عہد کر کے بار بار اس کی خلاف ورزی کی اور سزا جو یہاں تجویز کی گئی ہے وہ محض ان کی بار بار کی عہد شکنی کی وجہ سے تھی۔ اس سزا میں بھی صرف قتل کرنا نہیں بلکہ قتل۔ گرفتار کرلینا۔ روک دینا ہے اور اس سزا کی غرض صاف معلوم ہوتی ہے کہ وہ شرارت کرنے سے رُک جائیں ان کو قتل کرنا مقصود اصلی نہیں بلکہ شرارت کو روکنا مقصود اصلی ہے اس لیے اگر کسی طریق سے رُک جائیں تو وہ طریق کافی ہے ورنہ گرفتار کیے جا سکتے ہیں اور یہ دونوں صورتیں نہ ہوسکیں تو پھر ایسے شریروں کو قتل کرنا حفاظت و امن قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے اور یا یہ سزائیں بلحاظ جرم کے الگ الگ

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ
فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ
مَأْمَنَهُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ ۝٦ ع
كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِندَ اللَّهِ وَ
عِندَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّمْ عِندَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ
فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝٧

اور اگر ان مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے ، تو
اس کو پناہ دو ، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سُن لے پھر اس کو
اسکے امن کی جگہ پہنچا دو یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو جانتے نہیں [۱۲۶۷]
ان مشرکوں کے لیے اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول کے
نزدیک عہد کیوں کر ہو سکتا ہے ، سوائے ان کے جن سے
تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا ، سو جب تک وہ تمھارے لیے
قائم ہیں تم ان کے لیے قائم رہو۔ اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے [۱۲۶۸]

ہیں یعنی جو بہت شریر ہیں ان کو قتل کر دو جو کسی طرح سے باز ہی نہیں آتے جو اس سے کم ہیں انہیں گرفتار کر لو جو بغیر قید کے رکے رہ سکتے ہیں ان کو دوسرے طریقوں سے روک دو اور جو پکڑے نہیں جاتے ان کے لیے گھات میں بیٹھو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اس صورت میں ہے کہ وہ بلاد اسلامی میں آئیں ، جیسا ابن جریر نے واحصر وھم کی تفسیر میں لکھا ہے اور یہ اگلے الفاظ فخلوا سبیلھم سے ظاہر ہے جہاں فرمایا کہ ان کا رستہ کھلا چھوڑ دو اور آیت ۶ سے بھی یہی ظاہر ہے جہاں مشرکوں کی پناہ مانگنے کا ذکر ہے۔

اس سزا کی معافی کی صورتیں : اور اگر یہ کہا جائے کہ یہاں چونکہ ان لوگوں کے چھوڑ دینے کا حکم ہے جو توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اس لیے گویا باقی سب کو قتل کرنے کا حکم ہے تو یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ مجرم تو وہی ہیں جنہوں نے عہد شکنی کی۔ ہاں ان مجرموں کے بعض حالات میں چھوڑ دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو لوگ اس حکم کے ماتحت تھے ہی نہیں وہ بھی اس استثنا کی وجہ سے زیر مواخذہ آ گئے ہیں۔ یعنی سزا دینے کا حکم صرف ان لوگوں کے لیے تھا جو عہد شکنی کریں۔ پھر ان مجرموں میں سے ان کو مستثنےٰ کر دیا جو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ تو اس سے یہ لازم نہ آیا کہ جو مجرم تو کبھی تھے ہی نہیں نہ انھوں نے عہد کیا تھا نہ عہد شکنی کی تھی۔ تو اب وہ محض اس لیے کہ نماز نہیں پڑھتے مجرم بن کر مستحق سزا ہو گئے۔ محض نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے ۔ زکوٰۃ نہ دینے کی وجہ سے اسلام نہ لانے کی وجہ سے قرآن کریم نے کسی شخص کو مستحق سزا قرار نہیں دیا (اس کی سزا عالم آخرت میں ہے) ہاں عہد شکنی کے لیے مستحق سزا قرار دیا اور اس سزا کی جس کے وہ مستحق ہو چکے تھے اس صورت میں معافی کا اعلان کر دیا جب وہ مسلمان ہو جائیں اور یہ صرف ایک صورت ہے کیونکہ اسلام میں داخل ہونے سے ان کی شرارتوں کا کامل طور پر سدّباب ہو جاتا تھا۔ دوسری صورتیں یہ بھی ہیں کہ ان کو گرفتار کر لیا جائے یا ان کو روک دیا جائے مگر چونکہ عرب میں ہر قوم بجائے خود آزاد تھی اس لیے روکنا بغیر اس کے نہ ہو سکتا تھا کہ وہ مغلوب ہو جائیں جس کے لیے قتال کی ضرورت پیش آتی اور اس میں بعض قتل بھی ہو جاتے یہی وجہ ہے کہ صرف قتل کا کہیں حکم نہیں۔ غرض تلوار یا اسلام کا پیش کرنا اسلام پر مخالفین کا محض افترا ہے۔

ع ۱۲۶۷ استجارك تیری مجاورت چاہے یعنی تجھ سے امن چاہے بعد انقضائے مدت معینہ کے۔ یہ لفظ خود بتاتا ہے کہ انہی مجرم عہد شکن مشرکوں کا ذکر ہے جو مجرم نہیں اس کو پناہ مانگنے کی ضرورت ہی نہیں۔
چونکہ پچھلی آیت میں کہا تھا کہ جو مسلمان ہو جائے اسے معاف کر دو۔ لیکن اسلام لانے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں سے ملیں اور دین اسلام کے متعلق دریافت کریں اس لیے فرمایا کہ وہی مشرک جن کا ذکر ان آیات میں ہے کہ وہ مستحق سزا ہیں۔ اگر دین اسلام کے متعلق کچھ باتیں دریافت کرنے کے لیے تم سے امن مانگیں تو ان کو امن دو۔ پھر یہ نہیں کہ وہ سن کر مسلمان نہ ہو تو اسے مار ڈالو بلکہ اس حالت میں اسے امن کے ساتھ اپنی قوم کے مقام سکونت میں واپس پہنچا دو یہی تفسیر ابن جریر سے مروی ہے۔ ثم ابلغه ما منه يقول ثم رده بعد سماعه كلام الله ان هو ابى ان يسلم ولم يتعظ بما تلوته عليه من كلام الله فيؤمن الى مامنه يقول الى حيث يا من منك وممن فى طاعتك حتى يلحق بداره وقومه من المشركين۔ یعنی ابلغه ما منه سے مراد یہ ہے کہ پھر اسے لوٹا دو بعد اس کے کہ وہ اللہ کا کلام سُن لے اگر وہ اسلام لانے سے انکار کرے اور جو کچھ اللہ کا کلام اس پر پڑھا گیا ہے اس سے نصیحت حاصل نہ کرے تو اُسے اُس کی امن کی جگہ پہنچا دیا جائے۔ یعنی ایسے مقام پر جہاں تجھ سے اور ان لوگوں سے جو تیری اطاعت میں ہیں امن میں ہو جائے یہاں تک کہ اپنے گھر پہنچ جائے اور اپنی مشرک قوم کے ساتھ مل جائے۔ کاش ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قرآن کی کہانی بنانے والے کبھی ان الفاظ پر غور کرتے۔ یہ اس مشرک کا ذکر ہے جو مجرم ہو چکا ہے۔ اتفاق سے مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا ہے وہ پناہ مانگتا ہے رسول اللہ صلعم اسے خدا کا کلام سُناتے ہیں وہ اسلام لانے سے انکار کرتا ہے۔ یہاں تو کھلا حکم قتل کا ہونا چاہیئے تھا مگر حکم یہ ہے کہ اسے اپنے گھر حفاظت سے واپس پہنچا دو۔ اور وجہ کیا دی ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ اسلام کی تعلیم کی خوبی سے واقف نہیں اور نہیں جانتے کہ اللہ پر ایمان لانے سے انسان کیا فواید حاصل کرتا ہے۔

ع ۱۲۶۸ اس رکوع میں انہی مشرکوں کا ذکر ہے جن کا ذکر پچھلے رکوع میں تھا یعنی عہد شکنی کرنے والے جیسا کہ خود مضمون بھی شاہد ہے اور ان سے قطع تعلق کی

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨﴾

(عہد) کس طرح ہو حالانکہ اگر وہ تم پر غالب آئیں تو تمھارا کچھ لحاظ نہ کریں نہ ناطے کا اور نہ ہی عہد کا وہ اپنے مونہوں سے تم کو راضی کرتے ہیں اور ان کے دل انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں[1269]

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩﴾

اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی قیمت لے لی یوں اس کی راہ سے روکا، بُرا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ﴿١٠﴾

کسی مومن کا لحاظ نہیں کرتے نہ ناطے کا اور نہ ہی عہد کا۔ اور وہ حد سے بڑھے ہوئے ہیں۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿١١﴾

سو اگر توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، تو دین میں تمھارے بھائی ہیں۔ اور ہم ان لوگوں کے لیے باتیں کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿١٢﴾

اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسموں کو توڑیں اور تمھارے دین میں عیب لگائیں تو کفر کے سرداروں کے ساتھ جنگ کرو، ان کی قسمیں کچھ نہیں تاکہ وہ باز آئیں[1270]

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣﴾

کیوں اُن لوگوں کے ساتھ جنگ نہ کرو جنھوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں اور رسول کے نکال دینے کا قصد کیا اور انھوں نے پہلے تمھارے ساتھ ابتدا کی، کیا تم اُن سے ڈرتے ہو بلکہ اللہ ہی زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

وجوہات بیان کی ہیں الا الذین عاھدتم وہی ہیں جن کا ذکر پیچھے آیت ۴ میں ہو چکا ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ عہد کو قائم کرنا بڑا اتقاء ہے۔ یہ عہد کی عزت ہے جو اسلام نے سکھائی ہے۔ مسلمان کبھی عہد نہیں توڑ سکتا۔ خواہ مفاد قومی کو بھی نقصان پہنچتا ہو۔

[1269] یرقبون۔ رقب اس دیکھنے کو کہتے ہیں جو حفظ و رعایت کے طریق پر ہو۔

اِلّ۔ راغب کے نزدیک ہر حالت ظاہری پر بولا جاتا ہے خواہ قسم کے عہد سے ہو یا قرابت کے۔ مگر یہاں جیسا کہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے قرابت ہی مراد ہے۔

ذِمّة۔ ذمّ کے معنی مذمت کرنا یا دوسرے کو بُرا کہنا ہیں مذ موماً مد حورا (بنی اسرائیل-١٨) اور ذمۃ عہد کے ضائع کرنے پر مذمت کا ہونا ہے (غ)

کفار کا مسلمانوں سے سلوک: یہ حالت عام اہل عرب کی تھی کہ جن کے ساتھ عہد ہو ذرا طاقت پکڑی تو عہد کو توڑ ڈالا جیسا کہ دوسری جگہ قرآن شریف میں مذکور ہے۔ تتخذون ایمانکم دخلا بینکم ان تکون امة ھی اربیٰ من امة (النحل-٩٢) یہی حال ان کا مسلمانوں کے ساتھ تھا اور اس کی وجوہات تو اور بھی قوی تھیں۔ وہ مسلمانوں کے دشمن تھے۔ عہد صرف ظاہری طور پر کر لیتے تھے۔ حالانکہ دلوں میں بغض مخفی ہوتا اس لیے موقع کی تاک میں رہتے۔ جب کسی مسلمان کو نقصان پہنچانے کا موقعہ ملتا نہ قرابت کا لحاظ کرتے نہ عہد کی خلاف ورزی کا۔

[1270] حذیفہ سے یہ روایت ہے کہ اس آیت کے مذکور کفار سے جنگ نہیں ہوئی (ج) اور بعض نے ائمة الکفر سے مراد ابوجہل وغیرہ کو لیا ہے جو کسی صورت میں درست نہیں۔ گو آیت ١٣ کے الفاظ سے خیال اس طرف جاتا ہو اس لیے کہ یہ سورت یقیناً نویں سال کی ہے اور ابوجہل وغیرہ جنگ بدر میں ہلاک ہو چکے تھے لیکن آیت ١٣ و ١۴ و ١۵ کے الفاظ اس بات کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتے جو حذیفہ سے مروی ہے یعنی یہ کہ ان لوگوں سے کبھی جنگ نہیں ہوئی کیونکہ آیت ١۴ میں صاف حکم ہے کہ ان لوگوں سے جنگ کرو اور پیشگوئی موجود ہے کہ اللہ تمھارے ہاتھوں سے ان کو عذاب دیگا۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو مسلمان ہونے

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۴﴾

اُن سے جنگ کرو اللہ ان کو تمھارے ہاتھوں سے عذاب دیگا اور ان کو رسوا کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمھیں مدد دیگا اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا بخشے گا۔

وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۱۵﴾

اور اُن کے دلوں سے غصّہ دور کردے گا اور اللہ جس پر چاہتا ہے رجوع برحمت کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۱۲۷۱

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً ۚ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۶﴾ ع ۸

کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے اور اللہ نے تم میں سے ان کو ابھی الگ نہیں کیا جنھوں نے جہاد کیا اور نہ اللہ کے سوائے اور نہ اس کے رسول اور نہ مومنوں کے رسوائے کسی کو دِلی دوست بنایا ہے اور اللہ اس سے واقف ہے جو تم کرتے ہو ۱۲۷۲

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۚ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ﴿۱۷﴾

مشرکوں کا کام نہیں کہ اپنے اوپر کفر کی گواہی دیتے ہوئے اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں۔ ان کے عمل بے کار ہیں اور وہ آگ کے اندر رہیں گے ۱۲۷۳

کے بعد اپنے عہد وغیرہ کو توڑ دیں جیسا کہ آنحضرت صلعم کے آخری ایام میں مسیلمہ کذاب نے کیا اور آپ کی وفات کے بعد بعض دیگر اقوام عرب نے جن کے خلاف حضرت ابوبکرؓ نے فوج کشی کی ان کا زکوٰۃ دینے سے انکار کرنا بھی نکث ایمان تھا۔ اور طعن فی الدین کرنے والے مسیلمہ اور اسود اور دوسرے لوگ تھے۔ رہی یہ بات کہ ان کے متعلق آیت ۱۳ میں فرمایا وھموا باخراج الرسول سو مسیلمہ وغیرہ کا ایسا کرنا ظاہر ہے کہ وہ یہ قصد کرچکا تھا اور قریش کا آنحضرت صلعم کو نکالنا ان الفاظ میں نہیں آسکتا کیونکہ وہ تو یہ کام کرچکے تھے ان پر ھموا صادق نہیں آسکتا اور یہ الفاظ کہ لیشف صدور قوم مومنین و یذھب غیظ قلوبھم بھی مسیلمہ اور اس کے ساتھیوں پر ہی صادق آتے ہیں کہ ان کی وجہ سے جو مسلمانوں کو سخت رنج پہنچا تھا ان کی ہلاکت سے وہ دور ہوگیا۔ محض طعن فی الدین پر قتل کا فتویٰ ان الفاظ سے نہیں نکل سکتا۔

ع۱۲۷۱ یذھب غیظ قلوبھم۔ قلوبھم میں ضمیر مخالفین کی طرف ہے یعنی ان کے دلوں میں جو غیظ و غضب اسلام کی تباہی کے لیے پیدا ہوگا اللہ اس کو بھی دور کردے گا اور یہ دونوں طرح ہوسکتا ہے۔ کفار کے ذلیل ہوجانے سے بھی اور ان کے مسلمان ہونے سے بھی جس کی طرف ویتوب اللہ علیٰ من یشاء میں اشارہ کیا ہے۔

ع۱۲۷۲ ولیجۃ۔ ولوج تنگی میں داخل ہونے کا نام ہے حتّٰی یلج الجمل فی سم الخیاط (الاعراف۔ ۴۰) تولج اللیل فی النہار (اٰل عمران۳۔ ۲۷) اور ولیجۃ وہ ہے جو انسان کے اہل میں سے تو نہ ہو مگر انسان اسے ایسا دوست بنائے جس پر اعتماد ہو (غ)

یہ کون لوگ ہیں جن کو ممیز کرنے کا یہ ذکر ہے ظاہر ہے کہ اس سے سابقین اولین مراد نہیں، جو جہاد بھی کرچکے اور اپنا اخلاص اللہ اور رسول کے لیے بھی دکھا چکے ہیں۔ بلکہ ان کا ذکر ولا المومنین میں ہے اور حسبتم میں مخاطب وہ لوگ ہیں جو اِدھر اُدھر اقوام میں ملے جلے دین اسلام میں داخل ہوچکے تھے تو فرمایا کہ ابھی ضرورت ہے کہ تمہارا خلوص اللہ کے لیے ترقی کرے۔ اس لیے نئی مشکلات تمہارے رستہ میں آئیں گی۔ یا نئے مسلمان مراد ہیں جو اب دین اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ ان کو بتایا ہے کہ تم کو بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرنا پڑے گا اور اپنے خلوص کا ثبوت دینا ہوگا۔ یہ ان لوگوں کا بھی جواب ہے جو اسلام پر بجبر مسلمان کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ جو مجبور ہوکر مسلمان ہوئے تھے۔ انہوں نے جہاد کیا کرنا تھا اور اخلاص کیا دکھانا تھا۔ صرف منہ سے کچھ کہہ دینے پر تو اسلام راضی نہیں ہوتا۔

ع۱۲۷۳ یعمروا۔ عمارۃ۔ ویران کرنے کی ضد ہے یعنی آباد کرنا۔ اور مسجد کے آباد کرنے میں اس میں رہنا یا اس میں آنا بھی داخل ہے اور اس کا تعاہد مرمت وغیرہ بھی داخل ہے۔

مساجد اللہ۔ مشرک باقی مسجدوں سے تو کچھ تعلق نہ رکھتے تھے البتہ مسجد حرام پر اپنا حق جتاتے تھے کہ ہم اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں تو اسی کو یعنی مسجد حرام کو ہی مساجد اللہ کہا اسلیئے کہ وہ سب مسجدوں کا قبلہ ہے۔ یا ایک خاص دعویٰ کو عام لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔

پچھلے رکوع کے آخر پر ذکر کیا تھا کہ ایک مسلمان کو صرف اتنی بات پر نہیں چھوڑا جاتا کہ منہ سے اپنے آپ کو مسلمان کہدے بلکہ جہاد اور خلوص کا ظاہر ہونا اس سے ضروری ہے اس لیے اب یہاں بتایا کہ اسلام کیسی قربانیاں چاہتا ہے اور چونکہ کفار صرف اسی قدر کو بڑی خدمت سمجھتے تھے کہ خانہ کعبہ کے ہم خدمتگزار ہیں۔ حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں رمت وغیرہ کرتے ہیں اور یوں اس گھر کو آباد رکھتے ہیں تو یہ سمجھانے کے لیے کہ یہ کوئی بڑے مجاہدانہ کام نہیں کہ مسلمان بھی مسجدوں کے متولی ہونے کو اپنا فخر سمجھیں

اِنَّمَا يَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمۡ يَخۡشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰۤـئِكَ اَنۡ يَّكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿١٨﴾

اللہ کی مسجدیں صرف وہی آباد کرتے ہیں، جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور نماز کو قائم کیا اور زکوٰۃ دی، اور اللہ کے سوائے کسی کا خوف نہ کیا، سو امید ہے کہ یہ ہدایت پانے والوں میں سے ہوں۔

اَجَعَلۡتُمۡ سِقَايَةَ الۡحَآجِّ وَعِمَارَةَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ كَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ لَا يَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ‌ ﴿١٩﴾

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کا آباد کرنا اس کی طرح ٹھیرایا ہے جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اللہ کے ہاں وہ برابر نہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا[١٢٧٤]

اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ ۙ اَعۡظَمُ دَرَجَةً عِنۡدَ اللّٰهِ‌ؕ وَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ﴿٢٠﴾

جو ایمان لاتے ہیں اور ہجرت کرتے ہیں اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، اللہ کے ہاں بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں اور وہی بامراد ہونگے۔

يُبَشِّرُهُمۡ رَبُّهُمۡ بِرَحۡمَةٍ مِّنۡهُ وَرِضۡوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمۡ فِيۡهَا نَعِيۡمٌ مُّقِيۡمٌ ۙ ﴿٢١﴾

ان کا رب ان کو اپنی رحمت اور رضا اور باغوں کی خوشخبری دیتا ہے ان کے لیے ان میں ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہونگی[١٢٧٥]

خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿٢٢﴾

انہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰبَآءَكُمۡ وَاِخۡوَانَكُمۡ اَوۡلِيَآءَ اِنِ اسۡتَحَبُّوا الۡكُفۡرَ عَلَى الۡاِيۡمَانِ‌ؕ وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿٢٣﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ، اگر وہ ایمان پر کفر کو دوست رکھیں اور جو کوئی تم میں سے ان کو دوست بنائے گا، تو یہی ظالم ہیں۔

قُلۡ اِنۡ كَانَ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ وَاِخۡوَانُكُمۡ

کہہ دے اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے

بلکہ خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانیاں بکار ہیں۔ شروع یہاں سے کیا کہ مشرک جوان کاموں پر فخر کرتے ہیں اول تو حق ہی کیا رکھتے ہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں۔ کیونکہ مسجد اللہ کی عبادت کے لیے بنائی گئی ہے اور یہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ اپنے آپ پر کفر کی شہادت ہے کیونکہ اس وقت خانہ کعبہ بتوں سے بالکل پاک ہو چکا تھا تو اس لیے اب بت پرستوں کا خانہ کعبہ میں جانا یا اس کی کوئی اور خدمت کرنا خود ان کے اپنے معتقدات کے خلاف تھا اور اس طرح پر شروع کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ آیندہ مشرک خانہ کعبہ کا حج نہ کریں اس کی وجہ بھی بتا دی۔ اور یہ جو فرمایا کہ ان کے عمل بیکار ہیں تو مراد اس سے وہ عمل ہیں جن پر ان کو بوجہ خدمت خانہ کعبہ فخر تھا۔ فرمایا کہ یہ عمل کچھ کام نہیں دے سکتا جب شرک و کفر میں مبتلا ہیں تو خانہ کعبہ کی خدمت یا خانہ کعبہ کا حج کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ خانہ کعبہ کی تولیت کسی مشرک یا کافر قوم کے سپرد نہیں ہوسکتی۔

ع١٢٧٤ یعنی چھوٹے چھوٹے فیاضی کے کام اور جہاد فی سبیل اللہ جیسا عظیم الشان کام جو کہ حق کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے پوری جد و جہد کرنے کا نام ہے یکساں نہیں۔ اس کا شان نزول حضرت عباس کا جنگ بدر میں قید ہو کر آنا اور حضرت علیؓ پر فخر کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اس کا نزول ۹ھ کا ہے۔

ع١٢٧٥ اللہ کی رحمت اور اس کی رضا جنت کی وہ عظیم الشان نعماء ہیں جن کا ذکر دوسری ساری نعماء سے الگ کیا ہے٭

وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا
وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ
اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ
سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ
ع وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارے کنبے اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور مکان جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تمھارے نزدیک اللہ اور اسکے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ع۱۲۷۶

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّ يَوْمَ
حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ
عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا
رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

یقیناً اللہ نے تمھیں بہت سے میدانوں میں مدد دی، اور حنین کے دن جب تمھاری کثرت تمھیں اچھی لگی، پھر وہ تمھارے کچھ بھی کام نہ آئی، اور تم پر زمین باوجود فراخی کے تنگ ہوگئی تب تم پیٹھ دیتے ہوئے پھر گئے ع۱۲۷۷

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى
الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ عَذَّبَ

تب اللہ نے اپنی تسکین اپنے رسول پر اور مومنوں پر نازل کی اور وہ لشکر اتارے، جن کو تم نہیں دیکھتے تھے اور ان کو جو

ع۱۲۷۶ اس آیت میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا ایک اصول بیان کیا ہے جس کو آج مسلمانوں نے یہاں تک بھلا رکھا ہے کہ ایک مترجم قرآن نے اپنے ترجمہ کے حاشیہ پر لکھ دیا ہے کہ یہ حکم ابتدائی زمانہ کے مسلمانوں کے لیے تھا ہمارے لیے نہیں۔ گویا یہاں تک اس حالت سے جو ان کی اصل زندگی کا موجب ہوئی تھی دور پڑ گئے ہیں کہ اب وہ اس اصول کو قابل عمل ہی نہیں سمجھتے اس آیت کی رُو سے مسلمانوں کو اس سے منع نہیں کیا گیا کہ وہ اپنے عزیزوں اور قریبیوں سے تعلق رکھیں یا مال کمائیں یا تجارتیں کریں یا بڑے بڑے مکانات بنائیں بلکہ ان کے سارے تعلقات دنیا کا ذکر کیا۔ ان کی ایسی تجارتوں کا ذکر کیا جن سے ذرا توجہ ادھر اُدھر ہو تو مندی پڑ جائیں۔ ان کے بڑے بڑے محلات و مکانات کا ذکر کیا۔ یہ سب کچھ مسلمان رکھیں، اس کے لیے کوشش کریں مگر اصول یہ رکھیں کہ یہ چیزیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد سے زیادہ پیاری نہ ہوں یعنی اگر خدا کے لیے ان کو قربان کرنے کی ضرورت پڑے تو قربان کر دیں، حق کے قبول کرنے یا پھیلانے میں تعلقات رشتہ داری چھوڑنے پڑتے ہیں تو چھوڑیں، مال برباد ہوتے ہیں تو ہوں، تجارت جاتی ہے تو جائے۔ غرض ان چیزوں کو اسلام پر قربان کرنے کے لیے تیار رہیں اسی آیت قرآنی کا ہی خلاصہ ہے جو اس صدی کے مجدد نے اپنے ساتھیوں سے یہ اقرار لیا ہے "میں دین کو دنیا پر مقدم کروں گا" یہ سب چیزیں وسائل میں داخل ہیں مگر خدا اور اس کا رسول اصل غرض ہیں وسائل کو حصول غرض کے لیے قربان کرنا ضروری ہے۔ آخر پر فرمایا کہ اگر ایسا نہ کرو گے اگر انہیں چیزوں کو تم اصل غرض زندگی بنا لو گے تو پھر تمھارے ساتھ فاسقوں والا معاملہ ہوگا۔

ع۱۲۷۷ مواطن۔ مَوْطِن کی جمع ہے اور وَطْن وہ جگہ ہے جہاں انسان اقامت رکھتا ہے اسے مَوْطِن بھی کہا جاتا ہے اور اس سے مراد لڑائی کا میدان بھی لیا جاتا ہے (ل)

جنگ حنین: حنین۔ مکہ اور طائف کے درمیان وادی ہے۔ مکّہ سے صرف تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ مکّہ کو فتح کرنے کے بعد رسول اللہ صلعم کو خبریں پہنچیں کہ ہوازن اور ثقیف مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس لیے آپ نے مناسب سمجھا کہ قبل اس کے کہ وہ زور پکڑیں اس شورش کو دبا دیا جائے۔ چنانچہ آپ اسی دس ہزار جمعیت کے ساتھ جس کو لیکر مکّہ فتح کیا تھا اور جس میں اب دو ہزار طلقاء مل کر کل تعداد بارہ ہزار ہوگئی تھی باہر نکلے۔ مسلمانوں کو اپنی کثرت پر فخر ہوا، بالمقابل دشمن صرف چار ہزار تھے۔ ہوازن اور ثقیف مشہور تیر انداز تھے اور پہاڑوں کے تنگ رستوں پر قابض تھے۔ پہلے حملہ میں ہی مسلمانوں پر اس قدر زور سے تیروں کی بوچھاڑ ہوئی کہ جو فوج آگے بڑھی تھی اور جس میں اکثر طلقا تھے۔ اس نے پیٹھ پھیر لی اس کا اثر پچھلی فوج پر پڑا اور آن کی آن میں بارہ ہزار کی فوج بھاگ اُٹھی قدرت خداوندی کا نظارہ تھا، مگر نبی کریم صلعم اپنی خچر پر سوار اور حضرت عباس آپکی رکاب پکڑے ہوئے برابر دشمن کی طرف بڑھے جا رہے تھے اور بلند آواز سے یوں پکار رہے تھے انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب میں نبی ہوں کوئی جھوٹ نہیں میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔ یہ ہمّت اور شجاعت کا نظارہ البیانہ تھا کہ بے اثر رہتا۔ تھوڑی ہی دیر میں لوگ آپ کے گرد جمع ہونا شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ ساری فوج کا رُخ پلٹا اور دوبارہ حملہ کر کے دشمن کو شکست دی۔ زمین کے تنگ ہونے سے مراد وہی پسپائی کی حالت ہے جب بھاگنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ یہاں اس گزشتہ واقعہ کا ذکر اس لحاظ سے کیا کہ مسلمان متنبہ رہیں کہ ان کے لیے فتح و ظفر کا موجب نصرت الٰہی ہے نہ ان کی کثرت وہ اپنی کثرت پر کبھی نازاں نہ ہوں۔

الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝۲۶
ثُمَّ يَتُوۡبُ اللّٰهُ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنۡ
يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝۲۷

کافر تھے عذاب دیا اور یہی کافروں کی سزا ہے [ع ۱۲۷۸]
پھر اللہ اس کے بعد جس پر چاہے رجوع برحمت کرے اور
اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡمُشۡرِكُوۡنَ
نَجَسٌ فَلَا يَقۡرَبُوا الۡمَسۡجِدَ الۡحَـرَامَ
بَعۡدَ عَامِهِمۡ هٰذَا ۚ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ عَيۡلَةً
فَسَوۡفَ يُغۡنِيۡكُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖۤ اِنۡ شَآءَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝۲۸

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، مشرک ضرور پلید ہیں۔
سو اپنے اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے پاس نہ آئیں [ع ۱۲۷۹]
اور اگر تم کو مفلسی کا ڈر ہو تو اللہ اگر چاہے گا تم کو اپنے
فضل سے غنی کر دے گا۔
اللہ علم والا حکمت والا ہے [ع ۱۲۸۰]

قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَلَا
بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ
اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَلَا يَدِيۡنُوۡنَ دِيۡنَ الۡحَـقِّ
مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حَتّٰى يُعۡطُوا
الۡجِزۡيَةَ عَنۡ يَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ ۝۲۹ ع ۱۰

ان سے جنگ کرو، جو اللہ پر ایمان نہیں لائے اور نہ
پچھلے دن پر اور نہ ہی ان چیزوں کو حرام ٹھیراتے ہیں، جو اللہ
اور اس کے رسول نے حرام کیں اور نہ سچے دین کو اختیار کرتے ہیں،
ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے
جزیہ دیں اور وہ محکوم ہوں [ع ۱۲۸۱]

ع ۱۲۷۸ جنود لم تروھا۔ ملائکہ کی نصرت ہے۔ اور لم تروھا ان کو تم نے دیکھا نہیں ثابت کرتا ہے کہ ملائکہ کا نزول جو جنگوں میں ہوا وہ ان آنکھوں سے نہیں دیکھا گیا۔ ہاں کسی صحابی نے کشفی نظر سے دیکھ لیا ہو تو الگ بات ہے۔

ع ۱۲۷۹ نجس۔ نجاسۃ پلیدی کو کہتے ہیں وہ بھی جو حاسہ سے معلوم ہو یعنی جسمانی پلیدی اور وہ بھی جو بصیرت سے معلوم ہو یعنی باطنی ناپاکی (غ) اور یہاں مراد روحانی نجاست ہے اور مبالغہ کے لیے اسم کو استعمال کیا ہے۔ گویا عین نجاست ہیں۔ مراد یہ نہیں کہ ان کے جسم پلید ہیں ان سے مسجد حرام پلید ہو جائے گی، بلکہ ان کے عقاید اور شرک ناپاک ہیں اور مسجد حرام کو اللہ تعالیٰ نے توحید کا پاک نشان بنایا ہے۔
مسجد حرام میں مشرکوں کے آنے کو روک دیا۔ اس لیے کوئی غیر مسلم حدود حرم میں داخل نہیں ہو سکتا اور یہ حکم حج سے مخصوص نہیں بلکہ عام ہے یعنی کسی وقت بھی غیر مسلم حدود حرم میں داخل نہ ہو۔ اور مشرک کے لفظ میں ہر غیر مسلم اس لیے داخل ہے کہ توحید کا مذہب سوائے اسلام کے کوئی نہیں رہا یہ حکم ہر ایک مسجد کے لیے نہیں بلکہ خاص مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کے لیے ہے۔ اور اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ تا اسلام کا یہ مرکز غیر مسلموں کے تصرف میں نہ آنے پائے۔ بلکہ یہ امر کمال علم الٰہی پر دلالت کرتا ہے کہ ان حالات کا انکشاف آنحضرت صلعم پر کیا جو تیرہ سو سال بعد دنیا میں پیدا ہونے والے تھے کہ غیر مسلم طاقتیں مسلمانوں کے ملکوں میں تھوڑی تھوڑی آمد و رفت کرتے کرتے پھر تدریجاً کچھ رسوخ حاصل کرتے کرتے آخر ان ممالک پر متصرف ہو جائینگی اس لیے عالم الغیب اور حکیم خدا نے (جیسا کہ آخری الفاظ ان اللّٰہ علیم حکیم میں اشارہ کیا) اپنے کامل علم و حکمت سے حدود حرم کو جو اسلام کا مرکز ہے غیر مسلموں کے دخول سے پاک رکھا۔ ہاں یہ حکم مسلمانوں کو دیا ہے جس میں یہ بھی بتا دیا کہ بادشاہت اس ملک کی تمہارے ہی ہاتھ میں رہے گی اور تم اس امر کے بجا لانے پر قادر ہو گے۔

ع ۱۲۸۰ مکہ کے لیے فقر کی بیخ کنی کی بشارت: عیلۃ کے معنی فقر ہیں اور عال کے معنی فقیر ہو گیا ووجدك عائلا فاغنٰی (الضحیٰ ۹۳-۸) مفلسی کے خوف کا ذکر اس لیے کیا کہ مکہ تو خود وادی غیر ذی زرع میں تھا۔ تجارت سے اس کی ساری رونق تھی۔ بالخصوص موسم حج میں تجارتی مال دور دور سے لوگ ساتھ لاتے تھے اور اہل مکہ کو بیٹھے بٹھائے تجارت سے نفع حاصل ہوتا تھا۔ سو فرمایا کہ یہ خوف مت کرو۔ اللہ تعالیٰ اسکے سامان اپنے فضل سے پیدا کر دے گا۔ وہ فضل کے سامان یہ تھے کہ سارے ملک عرب کو مسلمان کر دیا بلکہ سارے عالم میں اسلام کو پھیلا دیا۔

ع ۱۲۸۱ الجزیۃ یہ لفظ جزا سے نکلا ہے جس کے معنی بدلہ ہیں۔ اس لیے جزیۃ کسی چیز کا بدلہ ہے وتسمیتھا بذلك للاجتزاء بھا فی حقن دمھم (غ) یعنی اس کا نام جزیہ اس لیے رکھا گیا کہ یہ ان کی جانوں کی حفاظت کا بدلہ ہے جن سے لیا جاتا ہے۔ گویا جزیہ ایک ٹیکس ہے جو غیر مسلموں سے اخراجات حفاظت ملک کے بدلہ میں لیا جاتا ہے۔ جس حفاظت کے لیے مسلمان اپنی جان دیتا ہے دوسرے سے صرف ایک قلیل رقم لی جاتی ہے۔ جب مسلمان کسی دوسری قوم پر حکومت کریں گے تو لازماً ان کے جان و مال کی حفاظت وہ کریں گے کیونکہ حفاظت کا کام حکومت کے سپرد ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی دشمن سے

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ
النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ
بِأَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا

اور یہودی کہتے ہیں عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور عیسائی
کہتے ہیں مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں[۱۲۸۲]
یہ ان کی بات کی نقل کرتے ہیں، جو پہلے کافر ہوئے۔

بھی ان کی حفاظت کریں گے۔ اس کے عوض ان سے ایک رقم لے لیجاتی تھی۔ جو اس حفاظت کا معاوضہ ہو جاتی تھی۔ اسی کو جزیہ کہا جاتا ہے اور یہ امر کہ یہ صرف حفاظت کا بدلہ ہے اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب اسلامی فوجیں حمص سے جو شام میں واقع ہے ہٹ آئیں تو حضرت ابو عبیدہ نے وہاں کے یہودیوں اور عیسائیوں کو بلا کر کئی لاکھ کی رقم جزیہ سب واپس کردی کہ اب ہم چونکہ تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے اس لیے یہ رقم ہم نہیں رکھ سکتے اور ایسا ہی اضلاع میں لکھ دیا کہ جہاں سے اسلامی لشکر ہٹ آئے وہاں کی رقم جزیہ واپس کردی جائے۔

عن ید۔ ید کے معنی ہاتھ اور مجازاً قوت کے معنی میں آتا ہے۔ تو مراد ہوئی قوت کی وجہ سے یعنی مسلمانوں کے ان پر غالب ہونے کی وجہ سے اور راغب نے اس کے معنی کیے ہیں عَنْ مقابَلَةِ نِعْمَةٍ علیهم فی مُقَارَّتِهِمْ یعنی اس نعمت کے مقابل پر جو ان کو آرام دیا جانے سے ملی ہے اور بعض نے عن ید کے معنی عن غنی کیے ہیں یعنی غنی ہونے کی حالت میں جزیہ دیں اس لیے کہ فقیر عاجز سے جزیہ نہیں لیا جاتا (رد) یہ معنی اس لیے قابل ترجیح ہیں کہ محکومیت کا مفہوم صاغرون میں آجاتا ہے۔

صاغرون۔ صاغر کے معنی راغب نے لکھے ہیں جو چھوٹے مرتبہ پر راضی ہو۔ پس مراد حالت محکومیت ہے۔

اہل کتاب کے ساتھ جنگ کے احکام: یہ آیت مضمون سابق کے لیے بطور تتمہ کے ہے۔ قرآن کریم میں اور بالخصوص اس سورت میں جس قدر احکام جنگ کے متعلق اب تک آئے ہیں وہ سب مشرکوں کے متعلق ہیں اور یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید سوائے مشرکوں کے مسلمانوں کو دوسروں سے جنگ کی ضرورت ہی کبھی پیش نہ آئیگی اس لیے اہل کتاب کا نام بھی یہاں لے دیا ہے اور منشا صرف اس قدر ہے کہ جن حالات میں مشرکوں سے جنگ کی اجازت یا حکم دیا ہے انہی حالات میں اہل کتاب سے بھی جنگ جائز ہے۔ اور اہل کتاب کا نقشہ جو کھینچا ہے تو اس میں بھی بتایا ہے کہ یہ مذہب حق سے جس پر ان کو قائم کیا گیا تھا بالکل گر گئے ہیں۔ جس کی تفصیل اگلے رکوع میں آئے گی۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہاں قاتلوا کا حکم ہے اور مقاتلہ میں دو فریق ہوتے ہیں اقتلوا کا حکم نہیں کہ انہیں قتل کرنے کا اختیار ہو اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے قتال پر جو حد بندی وارد ہو چکی ہے وہ اہل کتاب کی صورت میں باطل نہیں ہو جاتی اور وہ یہ ہے قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولاتعتدوا یعنی جنگ صرف ان لوگوں کے ساتھ ہو جو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور بے ضرورت جنگ سے نہ بڑھیں۔

کیا نبی کریم صلعم کا عمل اس کے مطابق تھا یا نہیں۔ رومن امپائر عرب کے شمال میں لگتی تھی اور آپ کو خبر پہنچی کہ یہ لوگ عرب پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آپ نے فوراً تیس ہزار کی فوج جمع کی اور عرب کی شمالی حد پر پہنچ گئے۔ یہ غزوۂ تبوک ہے جس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔ مگر وہاں آپ نے مقابلہ کے لیے کوئی لشکر تیار نہ پایا۔ اب اگر اہل کتاب سے جنگ کرنے کا حکم مشروط نہ ہوتا تو ظاہر تھا کہ حکم بھی موجود ہے فوج بھی موجود ہے۔ مقابل میں تیاری نہ ہونے سے کامیابی کی امید بھی بہت زیادہ ہے مگر نبی کریم صلعم نے کیا کیا؟ بغیر جنگ کے واپس آئے۔ کیوں؟ اس لیے کہ الذین یقاتلونکم کی شرط پوری نہ ہوئی تھی۔ پس الفاظ قرآنی اور عمل نبی کریم صلعم دونوں اس پر شاہد ہیں کہ اہل کتاب سے جنگ بھی اسی طرح مشروط ہے جس طرح مشرکوں سے۔

ہاں یہاں یہ فرمایا کہ اہل کتاب یعنی دوسرے مذاہب تو ہمیشہ رہیں گے عرب کی بت پرستی کی طرح نابود نہ ہو جائیں گے۔ اس لیے فرمایا کہ جنگ ان سے کرنی پڑے اور وہ جزیہ قبول کریں تو جنگ مت کرو اور جزیہ کے لینے میں جو حاکم کا کام ہے اور ان کے لیے لفظ صاغر اختیار کرکے یہ بھی بتا دیا کہ اہل کتاب کے ساتھ جنگوں میں مسلمان کامیاب ہونگے اور اہل کتاب مغلوب ہونگے۔

[۱۲۸۲] اہل کتاب کے ساتھ جنگوں کا ذکر کیا تو بتا دیا کہ یہ لوگ بھی اسلام کی کامیابی کو نہیں چاہتے اور اس کے خلاف کوشش کرتے ہیں مگر اسلام آخر کار غالب ہوگا۔ مگر اصل مضمون سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کی غلطیوں کا کچھ ذکر کیا ہے۔

حضرت عزیرؑ: عزیر یا عزرا یہودیوں میں ایک بڑے عظیم الشان نبی گزرے ہیں۔ علمائے طالمود نے ان کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز بیان کیے ہیں۔ یہاں تک کہ یہودی انسکلوپیڈیا میں ہے بعض نے کہا ہے کہ اگر موسیٰ پر شریعت نازل نہ ہوئی ہوتی تو عزیر پر نازل ہوتی۔ ممکن ہے اس زمانہ میں یہودیوں کی قوم اس قسم کے بیانات کی وجہ سے اور عیسائیوں کے مقابل میں آکر سچ مچ عزیر کو ابن اللہ کہنے لگی ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں جس قدر مباحثات یہود کے ساتھ ہیں ان میں ان کو براہ راست یہ الزام نہیں دیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن اللہ ہونے کا عقیدہ اگر فی الواقع ان میں تھا تو ساری قوم کا نہ تھا کسی ایک شاخ کا ہوگا اور یا ممکن ہے کہ یہاں ابن اللہ کا استعمال اسی معنی میں ہوا ہو۔ جیسے دوسری جگہ ہے وقالت الیہود والنصارٰی نحن ابناء اللہ واحباءہ (المائدۃ ۵-۱۸) اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ جہاں ابناء اللہ کا لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے۔ اور مطلب صرف یہی ہے کہ اس کے ایسے پیارے ہیں جیسے باپ کو بیٹا پیارا ہوتا ہے۔ اسی طرح عزیر کو ابن اللہ کہنے سے مراد یہی ہو کہ وہ ان کی عزت ان کے اصل مرتبہ سے بڑھ کر کرتے ہیں

مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٣٠﴾

اللہ ان کو ہلاک کرے کہاں سے اُلٹے پھرے جاتے ہیں [1283]

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٣١﴾

انھوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے سوائے رب بنالیا ہے اور مسیح ابن مریم کو اور ان کو سوائے اس کے کچھ حکم نہ دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک ٹھیراتے ہیں [1284]

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٣٢﴾

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنے مونہوں سے بجھادیں، اور اللہ کو کچھ منظور نہیں مگر یہی کہ اپنے نور کو پورا کرے، گو کافر بُرا ہی مانیں [1285]

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿٣٣﴾

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس کو کل دینوں پر غالب کرے، گو مشرک بُرا ہی مانیں [1286]

۱۲۸۳ یضاھئون۔ ضاھی بغیر ہمزہ کے اور ہمزہ کے ساتھ دونوں طرح آیا ہے اور اس کے معنی ہیں مشابہت اختیار کی (غ)
قاتلھم کے معنی بعض نے کیے ہیں اللہ ان پر لعنت کرے اور بعض نے اللہ ان کو قتل کرے۔ راغب کہتے ہیں درست یہ ہے کہ یہ باب مُفَاعَلَة سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ گویا ایسا شخص اللہ کے ساتھ جنگ کا قصد کرتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ مقابلہ کرے گا وہ مغلوب ہوگا۔

ان الفاظ میں ایک ایسی بات کی خبر دی ہے جس کی اطلاع آج دنیا کو ہوئی ہے یعنی یہ کہ عیسائیوں نے خدا کا بیٹا تجویز کرنے میں پہلی کافر قوموں کی نقل کی ہے آج یونانیوں اور رومیوں کے مذاہب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فی الواقع یہ خدا کا بیٹا بنانے کا عقیدہ ان میں مروج تھا اور وہیں سے پولوس نے اس کو لیا۔ کیونکہ جب اس نے دیکھا کہ یہودی تو حضرت عیسےٰ کو قبول نہیں کرتے تو اس نے حضرت مسیح کے بعض الفاظ کو جو مجاز اور استعارہ کے طور پر تھے حقیقت پر محمول کرکے اور اصل بنائے مذہب قرار دیکر بت پرستی سے ملتا جلتا ایک مذہب بنا دیا جس کی وجہ سے غیر یہودی اقوام کا میلان عیسائیت کی طرف بہت ہوگیا۔ یہی الزام قرآن شریف نے دیا ہے کہ عیسائیوں کا مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینا ان کی ایجاد نہیں، بلکہ پہلی کافر قوموں کی ریس کرکے یہ مذہب بنالیا ہے یوں تو عرب کے لوگ بھی خدا کی طرف بیٹیاں منسوب کرتے تھے مگر من قبل کا لفظ بڑھا کر یہ صاف کر دیا کہ قرآن کریم کی مراد عیسائیت سے پہلی کافر قومیں ہیں ✦

۱۲۸۴ ارباب۔ ربّ کی جمع ہے دیکھو ۲؎۔ جب کسی کی اطاعت میں غلو کیا جائے تو اسے بھی معبود یا رب ہی کہدیا جاتا ہے۔ چنانچہ عدی بن حاتم سے روایت ہے کہ انھوں نے اس آیت کے نزول پر رسول اللہ صلعم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ لوگ احبار و رہبان کی عبادت تو نہ کرتے تھے تو آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں کہ جو اللہ نے حلال کیا ہے اسے وہ حرام کہہ دیتے تو لوگ بھی اسے حرام سمجھ لیتے اور جو اللہ نے حرام کیا ہے اسے حلال کہہ دیتے تو لوگ بھی اسے حلال سمجھ لیتے
مسیح ابن مریم کا نام الگ لینے سے بالخصوص عیسائیوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جن کا ذکر اگلی آیت میں ہے اس معیار پر آج مسلمانوں میں جس قدر گدیاں ہیں اِلّا ماشاء اللہ ان سب کو ان کے مرید اربابا من دون اللہ سے کم نہیں سمجھتے، کیونکہ جو کچھ پیر کہدے اس کے مقابل شریعت کی پروا بھی نہیں کی جاتی ✦

۱۲۸۵ نور اللہ سے مراد نبوت محمدیہ ہے یا دین اسلام۔ بافواھھم سے مراد ان کے اقوال باطلہ ہیں جن کے ساتھ دلیل کوئی نہیں۔
اس آیت میں ایک طرف تو یہ بتایا کہ عیسائیوں کے کیا کیا منصوبے اسلام کے خلاف ہیں اور وہ کس طرح اسلام کے نیست و نابود کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور دوسری طرف نہایت پرزور الفاظ میں یہ خبر ہے کہ دین اسلام کامل ہو کر رہے گا۔

۱۲۸۶ یُظھِر۔ ظَھر کے معنی پیٹھ ہیں اور سواری کو بھی کہتے ہیں اور بطور استعارہ اس پر بھی بولا جاتا ہے جس سے قوت ملے۔ اور ظَھَر علیہ کے معنی ہیں غلبہ یعنی اس پر غالب آگیا۔ اسی سے یظھرہ غالب کرنے کے معنی میں ہے (غ)
یہ دوسری خوشخبری ہے۔ پہلی آیت میں تو یہ بتایا تھا کہ دین اسلام کو یہ نیست و نابود نہیں کرسکیں گے۔ اب فرمایا کہ یہی نہیں بلکہ یہ دین کل ادیان پر غالب کر دیا جائیگا۔ عیسائی اس بات پر خوش ہو رہے ہیں کہ اب اسلام کی حکومت دنیا سے اُٹھ گئی اس لیے اب عیسائیت غالب آجائے گی۔ لیکن اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ اسلام کی حکومت باوجود مسلمانوں کی محکومی کے دنیا پر بڑھ رہی ہے۔ اسلام کی حکومت پہلے بھی دلوں پر تھی اب بھی دلوں پر ہے۔ ہاں مسلمانوں

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ
وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ
بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ
وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ
وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳۴﴾
يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى
بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ
هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو یقیناً بہت سے علماء اور راہب لوگوں کے مال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں، اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے ۱۲۸۷

جس دن اس مال کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائیگا پھر اس کے ساتھ ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائینگی یہ وہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، سو (اس کا مزہ)

کو حکومت دیدی گئی تھی کیونکہ اس وقت بغیر اسلامی حکومت کے اسلام کا پھیلنا ناممکن تھا۔

عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ: اب بغیر مسلمانوں کی حکومت کے بھی اسلام پھیل سکتا ہے اور چونکہ عیسائیوں کا یہ اعتراض اسلام پر تھا کہ مسلمانوں کی حکومت کی وجہ سے ابتدا میں اسلام پھیل گیا اور بزور شمشیر پھیلا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری قوم کے ہاتھ میں حکومت اور تلوار دے کر ان کو اس بات پر بھی آمادہ کر دیا ہے کہ وہ سارا زور اسلام کے خلاف لگا لیں بالآخر حق ہی غالب ہوگا۔ چنانچہ ایک طرف اگر اسلامی حکومتیں گرتی جاتی ہیں تو دوسری طرف اصول اسلام غالب آتے چلے جاتے ہیں۔ توحید اسلامی۔ مساوات نسل انسانی جس کی تعلیم اسلام نے دی اگر ایک طرف روز بروز ترقی کر رہے ہیں تو دوسری طرف تثلیث و کفارہ کے اصول خود بخود گھٹتے چلے جاتے ہیں۔ ساری دنیا پر عیسائیت کی حکومت ظاہری کے باوجود اس کی حکومت باطنی گر گئی اور مسلمانوں کی محکومیت کے باوجود اسلام کی حکومت باطنی مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔

اکثر مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ اظہار دین اس امت میں مسیح موعود کے ظہور کے بعد ہوگا (ج) البتہ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اظہار اسلام سے مراد کل دینوں کا ہلاک ہو جانا ہے۔ بلکہ غلبہ یا اظہار کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ دوسرے دین بھی رہیں گے مگر غالب دین اسلام ہوگا۔ اس زمانہ میں دین عیسوی کے عقاید خود بخود اس طرح دلوں سے نکلتے چلے جاتے ہیں اور خود عیسائی ان سے اس طرح بیزار ہو رہے ہیں اور دوسری طرف عقاید حقہ اسلامیہ کی قبولیت یوں خود بخود بڑھتی جاتی ہے کہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ مسیح کا زمانہ آ چکا ہے۔

۱۲۸۷ اس آیت میں اول علماء و مشائخ کے مال و زر بالباطل کھانے کا ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ اس زمانہ میں علمائے یہود و نصاریٰ عوام کالانعام کو اس طرح دھوکہ دیکر ان کا مال کھاتے تھے کہ ہم کو راضی کر لو گے تو اللہ راضی ہو جائے گا اور رشوتیں لیکر فتویٰ دیتے تھے۔ مگر یہ یہود و نصاریٰ کے علما تک محدود نہیں، بلکہ ان کے ذکر میں مسلمانوں کو سمجھایا ہے۔ چنانچہ ہمارے اس زمانہ میں اکثر علماء مشائخ کی یہی حالت ہے کہ وہ بھی اپنی رضا میں خدا کی رضا بتاتے ہیں۔ یہی لوگ پھر اللہ کی راہ سے روکنے والے بھی ہو جاتے ہیں اس لیے کہ ذاتی اغراض درمیان میں آ جاتی ہیں۔ اور یہ لوگ حق کے دشمن ہو جاتے ہیں اسی وجہ سے یہود و نصاریٰ کے علماء آنحضرت صلعم کے دشمن ہو گئے تھے اور آج بھی علماء و مشائخ نے اس حق کی مخالفت کی جو ایک مجدد کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ نے ظاہر فرمایا تھا اور جس نے سوائے خدمت دین اسلام کے اور کسی طرف نہیں بلایا ؞

سونے اور چاندی کے جمع کرنے سے کیا مراد ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے اس بارہ میں یہاں تک مبالغہ کیا کہ ان کے نزدیک سونے چاندی کا گھر میں رکھنا ہی منع تھا۔ اس بارہ میں ان کا صحابہؓ سے اختلاف بھی سخت تھا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ کعبؓ کے پیچھے ڈنڈا لیکر دوڑے اور انہوں نے حضرت عثمانؓ کے پاس جا کر پناہ لی جس کی وجہ سے آخر کار حضرت عثمانؓ کو حکم دینا پڑا کہ وہ ربذہ میں جا رہیں تاکہ فساد نہ ہو۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ خیال درست نہیں اس لیے کہ پھر زکوٰۃ کس چیز پر ہے اور وراثت کی تقسیم کا کیا مطلب ہے۔ خود نبی کریم صلعم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مال کو پاک کرنے کے لیے زکوٰۃ فرض کی گئی ہے پس مال کی وہی محبّت بری ہے جب انسان اللہ کی راہ میں کچھ صرف نہ کرے۔ یا غربا کا اس میں کچھ حق نہ سمجھے۔ مال کے جمع کرنے کے بارہ میں افراط و تفریط دونوں راہوں سے بچنا چاہیئے آج اگر ایک طرف مال کے چند افراد کے ہاتھ میں جمع ہونے سے یورپ میں مصائب پیش آ رہی ہیں تو ان کے بالمقابل بولشویکوں کا گروہ پیدا ہو گیا ہے جنہوں نے تفریط کی راہ اختیار کی ہے اسلام کی تعلیم اعلیٰ درجہ کے اقتصاد اور میانہ روی کی ہے۔ مال بھی جمع کرو مگر غربا کا حِصّہ دیتے رہو اور ملامت ان لوگوں کو کی ہے جو مال جمع کرتے ہیں پھر اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے صرف جمع کرنے والوں کو ملامت نہیں ؞

مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝۳۵

چکھو جو تم جمع کرتے تھے ۱۲۸۸

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ
شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ
الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڏ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ
اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً
كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَاۗفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۶

مہینوں کی گنتی اللہ (تعالیٰ) کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے حکم میں بارہ مہینے ہے، جس دن آسمان اور زمین پیدا کیے۔ ان میں سے چار حرمت والے ہیں یہ دین مضبوط ہے۔ سو ان میں اپنے اوپر ظلم مت کرو اور مشرکوں سے سب کے سب جنگ کرو، جس طرح وہ تم سے سب کے سب جنگ کرتے ہیں اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے ۱۲۸۹

اِنَّمَا النَّسِيْۗءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ
عَامًا لِّيُوَاطِــــُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا
مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۭ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْۗءُ اَعْمَالِهِمْ ۭ
وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۷ ع

مہینوں کا پیچھے کر دینا کفر کی ایک زیادتی ہے وہ جو کافر ہیں اس سے گمراہ ہوتے ہیں ایک سال اسے حلال قرار دیتے ہیں اور ایک سال اسے حرام قرار دیتے ہیں تاکہ ان (مہینوں) کی گنتی کے مطابق کر لیں جو اللہ نے حرام کیے ہیں اور یوں جو اللہ نے حرام کیا ہے اسے حلال کر لیں اُن کو اُن کے بُرے کام اچھے معلوم ہوتے ہیں اور اللہ کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا ۱۲۹۰

ع ۱۲۸۸ یحمی۔ حُمّی وہ حرارت ہے جو گرم جواہر سے پیدا ہوتی ہے جیسے آگ اور سورج اور وہ بھی جو بدن میں قوت حارہ سے پیدا ہوتی ہے اور قوت غضبیہ جب جوش میں آئے تو اسے حَمِیّۃ کہا جاتا ہے حمیۃ الجاھلیۃ (الفتح ۴۸-۲۶)

تکوی۔ کَوَی جانور کے داغ دینے پر بولا جاتا ہے اور مصدر کیّ ہے۔

جباھھم۔ جَبْهَۃ ماتھے کو کہا جاتا ہے وہ جگہ جو سر میں سے سجدہ میں زمین پر لگتی ہے۔

جنوب۔ جنب کی جمع ہے کروٹ یا پہلو۔

پیشانی وغیرہ کا داغا جانا: آخرت کی سزا کا ذکر عموماً انہی الفاظ میں ہوتا ہے جس قسم کی بدی ہو۔ انسان مال جمع کرکے اس سے دوسروں پر وجاہت قائم کرتا ہے اور دوسروں سے متکبرانہ پیش آتا ہے اور حاجتمندوں پر پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ اس لیے وہ پیشانی جس سے وہ اظہار فخر کرتا ہے اور وہ پہلو جو وہ بوجہ تکبر پھیر لیتا ہے (واذا انعمنا علے الانسان اعرض ونا بجانبه) اور وہ پیٹھ جو وہ حاجتمند پر پھیرتا ہے سب محل سزا ہو جاتے ہیں اور یوں سزا بھی محیط ہو جاتی ہے کہ سامنے پیشانی پر اور کروٹ پر اور پیٹھ پر سب طرف اس کا اثر ہے۔ دولت کا نرا جمع کرتے جانا اور اس کا خدا کی راہ میں خرچ نہ کرنا اس دنیا میں بھی دکھ کا موجب بن جاتا ہے اور وہ سکھ جو انسان اس سے چاہتا ہے حاصل نہیں ہوتا۔

ع ۱۲۸۹ اہل کتاب کا ذکر درمیان میں ضمنی طور پر آ گیا تھا۔ اصل مضمون مشرکین سے جنگ کا تھا۔ اور غزوۂ تبوک اور منافقین کا ذکر شروع کرنے سے پہلے اسی اصل مضمون کی طرف عود کیا ہے۔ تو چونکہ جنگوں کا ذکر تھا اس لیے حرمت کے مہینے جن میں جنگ کرنا منع کیا گیا ہے ان کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مشرک لوگ نسئی کے ذریعہ سے حرمت کے مہینوں کو بدلتے رہتے تھے جس سے امن اُٹھ جاتا تھا چنانچہ خود اسی نویں سال میں حج ذلیقعد میں ہوا تھا۔ اس لحاظ سے بھی کہ مشرکوں کے لیے یہ ایک اعلان تھا۔ یہ اطلاع ضروری تھی کہ آیندہ یہ تغیر و تبدل نہ ہونگے پس فرمایا کہ مہینے تو بارہ ہی ہیں اور پہلے دن سے ہی بارہ ہیں۔ چنانچہ سب قوموں میں سال کے بارہ مہینے ہی پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے چار حرمت کے مہینے ہیں جن کے بارہ میں اپنے آپ پر ظلم مت کرو، یعنی ان کے اندر جنگ مت کرو۔ اور اس کو یعنی حرمت کے تسلیم کرنے کو دین قیم کہا ہے۔ اس لحاظ سے کہ یہ ایک مضبوط اصول ہے جس سے جنگوں کے اندر قوموں کی زندگی وابستہ ہے۔ اور یا دین یہاں بمعنی حساب ہے یعنی یہ حساب مضبوط ہے۔ اس سے شک و شبہ پیدا نہیں ہوتا۔

حرمت کے مہینوں کو قائم کرکے پھر فرمایا کہ مشرکوں کے ساتھ سب کے سب جنگ کرو، جس طرح وہ سب کے سب تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں جس میں یہ اصول سمجھایا ہے کہ دشمن کے مقابل میں سب مسلمانوں کو ایک رہنا چاہیئے جس طرح دشمن مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک ہو جاتے ہیں۔

ع ۱۲۹۰ نسئی۔ نسٔ کے معنی تاخیر کرنا یا پیچھے ڈال دینا ہیں۔ اور نسیئۃ حرمت کے مہینوں کا پیچھے ڈال دینا ہے، جو عرب لوگ کرتے تھے (غ) بعض وقت یہ لوگ یوں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ
انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ
اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ
فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ
اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾
اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ
وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ
شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾
اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ
اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمھیں کیا ہُوا کہ جب تم کو کہا جائے
کہ اللہ کی راہ میں نکلو، تو تم بوجھل ہو کر زمین کی طرف جھک جاتے ہو
کیا تم آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے ہو،
سو دنیا کی زندگی کا سامان آخرت کے مقابلے میں
تھوڑا ہی ہے ع۱۲۹۱
اگر تم نہ نکلو تو وہ تم کو دردناک عذاب دے گا اور
تمھاری جگہ دوسرے لوگ لے آئے گا، اور تم اس کا کچھ
نہ بگاڑ سکو گے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ع۱۲۹۲
اگر تم اس کی مدد نہ کرو تو یقیناً اللہ نے اس کی مدد کی، جب
اس کو اُن لوگوں نے جو کافر تھے نکال دیا (اس حال میں کہ) وہ دو میں کا
دوسرا تھا جب وہ دونوں غار میں تھے جب اس نے اپنے رفیق کو کہا غمگین نہ ہو

کیا کرتے تھے کہ اگر جنگ ہو رہی ہو اور حرمت کا مہینہ آجائے تو اسے پیچھے ڈال دیتے یعنی اس کی بجائے کسی پچھلے مہینہ کو حرمت والا قرار دے لیتے۔ لعض اور اغراض کے لیے بھی ایسا کر لیتے تھے۔ اس سے ناواقفوں کو بڑی تکلیف ہوتی تھی اس لیے نسئی کو ناجائز قرار دیا گیا اور فرمایا کہ خدا کے حکم میں جب چار ماہ کی حرمت قرار دی گئی تو یہ نسئی نہ تھی یہ پیچھے کافروں نے اپنی اغراض کے لیے بنالی۔ اس لیے اب اس کو دور کیا جاتا ہے۔

ع۱۲۹۱ انفروا۔ نَفَر قرار پکڑنے کی ضد ہے (ل)، یا گھبرا کر ایک چیز سے ہٹ جانا یا ایک چیز کی طرف نکل پڑنا ماذا دھم الا نفورا (فاطر ۳۵-۴۲) اور جنگ میں نکلنے کو بھی نفر کہا جاتا ہے اور نَفَر اور نفیر کئی آدمیوں کو کہتے ہیں گویا ان کے لیے باہر نکلنا ممکن ہے (غ)

اثاقلتم۔ ثِقُل۔ خِفَّة کے مقابلہ پر ہے اور اجسام اور معانی دونوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور ثقیل کا استعمال انسان میں اکثر ذم کے مقام پر ہوتا ہے کبھی مدح پر بھی اور چونکہ اجسام میں ثقیل وہ ہیں جن کا میلان نیچے کی طرف ہوتا ہے جیسے پتھر وغیرہ اور خفیف وہ جن کا میلان اوپر کی طرف ہو اس لیے اثاقل میں اشارہ یہاں پستی کی طرف جھک جانے کی طرف ہے (غ) اور اس کا اصل تثاقلتم ہے۔

یہاں سے جنگ تبوک اور اس کے متعلق واقعات کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ یہ مہم رجب ۹ھ میں تیار ہوئی اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ نبی کریم صلعم کو سلطنت روما کے متعلق یہ خبریں متواتر پہنچیں کہ وہ عرب پر حملہ کرنا چاہتے ہیں جنگ کے معاملہ میں آپ کا طریق نہایت احتیاط کا تھا۔ جب کبھی کسی قوم کی تیاری کی خبر آپ کو پہنچی آپ فوراً اس کے انسداد کے لیے مہم روانہ کر دیتے تھے۔ اس موقعہ پر بھی متواتر خبروں کے پہنچنے پر آپ نے تیاری کا حکم دیا۔ اس وقت مسلمانوں کے لیے بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ اوّل تو ایام قحط تھے۔ دوسرے ملک شام کی حدود تک ایک بہت ہی لمبا سفر تھا اور راستہ میں پانی اور رسد وغیرہ کی قلت تھی۔ تیسرے فصل بالکل پختہ کاٹنے کے لیے تیار تھی۔ اور اس حالت میں اس کو چھوڑنا بڑا مشکل تھا۔ چوتھے موسم سخت گرمی کا تھا۔ اور پانچویں مقابلہ عرب کی کسی قوم سے نہ تھا بلکہ ایک منتظم سلطنت کی باقاعدہ فوجوں سے مقابلہ تھا جو ہر قسم کے سامان جنگ سے آراستہ تھیں اور روما اور ایران کی سلطنتوں سے عرب کے لوگ ہمیشہ خائف رہتے تھے کیونکہ ان کی طاقت کے سامنے عربوں کی طاقت ہیچ تھی۔ مگر باوجود ان مشکلات کے مسلمانوں نے نبی کریم صلعم کی آواز پر لبیک کہا اور تیس ہزار آدمی آپ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور کسی نے مشکلات کی پروا نہ کی۔ بلکہ جو لوگ تنگدست تھے اور سواری کا انتظام ان کے لیے نہ ہو سکا وہ روتے ہوئے پیچھے رہے البتہ منافقوں کی تمیز کا یہ آخری موقعہ آ پہنچا تھا۔ اور وہ طرح طرح کے عذر کر کے رہ گئے۔ یہ جنگ عیسائیوں سے تھی اور اس لیے اس کے ذکر سے پہلے اہل کتاب کے ساتھ جنگ کا ذکر بھی آچکا ہے۔ اور نبی کریم صلعم کی جنگوں میں یہ سب سے آخری جنگ تھی۔ شاید یہ اشارہ تھا کہ آخر کار مسلمانوں کا مقابلہ عیسائیوں سے ہی رہ جائے گا۔ اور یہاں جو اثاقلتم الی الارض کہا تو مطلب اس کا یہ نہیں کہ مومن زمین کی طرف جھک گئے تھے بلکہ یہ بطور حث ہے اور خطاب ان لوگوں سے ہے جو نرا مُنہ سے دعوئ ایمان کرتے تھے جیسا کہ آیت ۴۰ میں الا تنصروہ سے ظاہر ہے کیونکہ مومن مدد کرنے والے تھے۔

ع۱۲۹۲ یہ عذاب منافقین کو ہی ملا جس سے معلوم ہوا کہ یہاں خطاب منافقوں سے ہی ہے ولا تضروہ شیئا یعنی جنگ کیلئے تمہارے نہ نکلنے سے اللہ تعالیٰ کا اور اس کے دین کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾

اللہ ہمارے ساتھ ہے، سو اللہ نے اپنی تسکین اس پر اتاری اور اس کو ایسے لشکروں سے قوت دی جن کو تم نہ دیکھتے تھے اور اُن لوگوں کی بات کو جو کافر تھے نیچا دکھایا اور اللہ کی بات ہی بلند ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے ع۱۲۹۳

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

ہلکے اور بوجھل نکل پڑو، اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو ع۱۲۹۴

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

اگر فائدہ جلد ملنے والا اور سفر میانہ ہوتا، تو ضرور تیرے پیچھے ہو لیتے، لیکن مشقت کا سفر انھیں بہت دُور معلوم ہُوا۔ اور اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ ہم میں طاقت ہوتی تو ہم ضرور تمھارے ساتھ نکلتے، اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں اور اللہ جانتا

ع۱۲۹۳ غار۔ غَوْرٌ سے ہے اور غَوْرٌ ہر چیز کی گہرائی کو کہتے ہیں اور اسی سے پہاڑ کی غار ہے اور مَغَار اور مَغَارَۃ بھی غار کی طرح ہے اور او مغارات (التوبۃ ۹: ۵۷) اور پانی کے بہت گہرائی میں چلے جانے پر بھی بولا جاتا ہے اصبح ماؤکم غورا (الملک ۶۷: ۳۰) اور اسی سے غَوْر کسی چیز میں فکر کرنا ہے (ل)

اس آیت میں مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کیسی کیسی مشکلات کے وقت میں اسلام کی نصرت کرتا رہا ہے اور نبی کریم صلعم کی انتہائی بے کسی کا نقشہ کھینچکر دکھایا ہے کہ مخالفین اسلام تو اس وقت بھی اسلام کو نیست و نابود نہ کر سکے تو اب مومنوں کو کیا خوف ہے جب اسلام اس قدر پھیل چکا ہے۔

وہ واقعہ جس کا یہاں ذکر ہے نبی کریم صلعم کی مکّہ سے مدینہ کو ہجرت کا واقعہ ہے جس کی طرف اذ اخرجہ الذین کفروا میں اشارہ ہے یعنی کافروں کی وجہ سے آپ کو نکلنا پڑا۔ آپ کے قتل کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ قاتلوں کا جتھا آپ کے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے کھڑا تھا۔ اس حالت میں آپ ان کے درمیان سے نکلتے ہیں اور سیدھے حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچتے ہیں اور یہ دونوں ساتھی رات کی تاریکی میں نکلتے ہیں۔ نبی کریم صلعم نے سب صحابیوںؓ کو ایک ایک کرکے اپنے سے پہلے رخصت کر دیا تھا۔ سوائے حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے۔ ان میں سے حضرت علیؓ تو آپ کے بستر پر لیٹے رہے اور ان کے پیچھے رہنے کی غرض یہ تھی کہ امانتیں وغیرہ ادا کریں جو نبی کریم صلعم کے ذمہ تھیں اور حضرت ابوبکر کو آپ نے ہجرت میں ساتھی بنانے کے لیے چنا ہوا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ آپ سے بار بار دریافت کرتے رہتے تھے اور آپ فرماتے تھے ابھی ہجرت کی اجازت مجھے نہیں ملی۔ آخر وہ وقت آیا تو آپ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لیکر نکلے جس کی طرف ثانی اثنین میں اشارہ ہے اور جو حضرت ابوبکرؓ کی علو مرتبت پر شاہد ہے تیسرا واقعہ اذھما فی الغار کا بیان کیا ہے یہ غار ثور ہے جو مکّہ سے کوئی تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ رات کے وقت غار میں جا کر چھپنا کس قدر خطرات سے پُر ہے اور غار بھی نہایت بے آباد اور سنسان مقام میں جہاں انسان کا گزر نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اس غار میں پہلے داخل ہوئے اور اس کے سارے سوراخوں وغیرہ کو بند کیا اور ہاتھ پھیر کر اندر سے صاف کیا، تب اس بات کا اطمینان کر کے کہ کوئی موذی جانور اندر نہیں نبی کریم صلعم کو اندر داخل ہونے دیا اور اس تاریک پُرخطر جگہ میں یہ دونوں ساتھی چھپے۔ آخر کار دن چڑھا، کفار کو پتہ لگا ہر طرف تلاش شروع ہوئی سراغ غار کے مُنہ تک پہنچا ادھر حضرت ابوبکرؓ نے اوپر پاؤں کی آہٹ سُنی تو آپ کو نہ اپنے لیے بلکہ اپنے پیارے رفیق کے لیے جس کی خاطر سب کچھ قربان کر رکھا تھا فکر ہوا۔ کہ اب گریز کی کوئی جگہ نہیں۔ دو آدمی غار کے اندر ہیں اور دشمنوں کا جمگھٹا اس کے منہ پر، اس حالت میں وحی الٰہی کی تسکین کام دیتی ہے۔ ہم دو نہیں بلکہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ کیا عجب شان خداوندی ہے کہ ایک مکڑی غار کے منہ پر جالا تن دیتی ہے اور تلاش کرنے والے سراغ رسانی کرتے ہوئے غار کے منہ تک پہنچتے اور وہاں سے جالا دیکھ کر واپس ہو جاتے ہیں۔ مکڑی کا جالا جو اوھن البیوت ہے وہ کام دے جاتا ہے جو ایسے اوقات میں بڑے بڑے مضبوط قلعے نہیں دے سکتے۔ یہ نصرت الٰہی کا نظارہ تھا۔

ایدہ بجنود لم تروھا میں یا تو اشارہ اس وقت نزول ملائکہ کی طرف ہے جنہوں نے آنحضرتؐ اور ابوبکرؓ کو تسکین دی اور یا بعد میں جنگوں میں نزول ملائکہ کی طرف اشارہ ہے کلمۃ الذین کفروا یا کافروں کی بات یہ تھی کہ اسلام کو نیست و نابود کر دیا جائے گا کلمۃ اللہ اسلام کے غلبہ کی پیشگوئیاں تھیں۔

خطاب ثانی اثنین میں ان اللہ معنا میں حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت پر صریح دلیل ہے۔ اہل تشیع کو اس کی بڑی لچر تاویلیں کرنی پڑی ہیں اللہ کی معیت جو آنحضرت صلعم کو حاصل تھی اس میں حضرت ابوبکرؓ بھی شامل ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی نصرت کو اللہ تعالیٰ اپنی نصرت قرار دیتا ہے۔

ع۱۲۹۴ خفافا وثقالا ہلکا ہونا اور بوجھل ہونا کئی طرح سے ہو سکتا ہے اس لیے ان الفاظ کی کئی تاویلات کی گئی ہیں۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ خفافا یا ہلکا ہونے

ع ٦/١٢ إِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٤٢﴾

ہے کہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ع۱۲۹۵

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٤٣﴾

اللہ تجھے معاف کرے تو نے کیوں اُن کو اجازت دی یہاں تک کہ جو سچے تھے وہ تیرے لیے الگ ہو جاتے اور تو جھوٹوں کو بھی جان لیتا۔ع۱۲۹۶

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٤﴾

جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں وہ تجھ سے اجازت نہیں مانگتے کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد نہ کریں اور اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔

اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿٤٥﴾

وہی تجھ سے اجازت چاہتے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان نہیں لاتے، اور ان کے دل شک میں پڑ گئے سو وہ اپنے شک میں متردّد ہیں۔

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿٤٦﴾

اور اگر اُن کا ارادہ نکلنے کا ہوتا تو اس کے لیے سامان مہیا کرتے لیکن اللہ نے اُن کا اُٹھنا پسند نہ کیا، سو اُن کو بوجھل کر دیا اور کہا گیا بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ع۱۲۹۷

میں ہر وہ امر شامل ہے جس کی وجہ سے نکلنا سہل ہو جیسے قوت بدن صحت جسمانی۔ جوانی کی عمر۔ فراخیٔ مال۔ شغل سے فراغت۔ سواری کا ہونا اور اس کے خلاف جو کچھ ہو وہ ثقال میں داخل ہے۔ جیسے ضعف جسمانی، کمزوری۔ بیماری۔ بڑھاپا۔ تنگیٔ مال۔ صورت معاش کا نہ ہونا وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ جب ضرورت آ پڑے تو جس حال میں بھی ہو نکل پڑو۔

ع۱۲۹۵ عَرَض۔ عَرض چوڑائی یا وسعت کو کہتے ہیں اور عَرَض وہ ہے جسے ثبات نہ ہو اس لیے حدیث میں آتا ہے الدنیا عَرَضٌ حاضرٌ پس عرض سے مراد تھوڑی دیر رہنے والا منافع یا مال دنیا ہے تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الاٰخرۃ (الانفال-۶۷) یاخذون عرض ھذا الادنیٰ (الاعراف-۱۶۹) (رغ)

الشقۃ۔ وہ جانب جس کے پہنچنے میں مشقت اٹھانی پڑے اور شق کے معنی مشقت ہیں الابشق الانفس (رغ)

یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو پیچھے رہ گئے یعنی منافقین۔ چنانچہ ایک طرف لاتبعوك صاف بتاتا ہے دوسری طرف ان کا جھوٹی قسمیں کھانا اور پھر اگلے رکوع کا مضمون سب اس پر گواہ ہیں کہ اس رکوع میں منافقوں کا ذکر ہے۔

ع۱۲۹۶ عفا اللہ عنك۔ یہ کلمہ بعض وقت صرف محبت اور تعظیم کے لیے بولا جاتا ہے (ر) ایسا ہی موقعہ یہاں ہے۔ جنگ تبوک کی مشکلات کو دیکھ کر منافقوں نے جو ہمیشہ جنگوں میں پیچھے رہ جاتے تھے عذر پیش کر کر کے نبی کریم صلعم سے اجازت مانگی۔ آپ میں اس قدر حیا تھی کہ آپ نے ان کا پول کھولنا پسند نہ کیا اور ان کو اجازت دے دی۔ یہ اجازت دینا اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف نہ تھا۔ بلکہ محض ایک طبعی حیا کی وجہ سے اور درحقیقت ایک نہایت بلند مقام اخلاق تھا جس کو ظاہر کرنے کے لیے یہ فرمایا۔ گویا آپ میں صفت عفو اس قدر غالب ہے کہ اس پر ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تجھے بھی معاف کرے۔ یعنی جیسا معاملہ تو لوگوں سے کرتا ہے ایسا ہی اللہ تجھ سے کرے۔ اس میں صدور گناہ کا وہم بھی نہیں پایا جاتا۔ ہاں یہ فرمایا کہ اب موقعہ آ چکا تھا کہ یہ منافق الگ ہو جاتے روح المعانی میں علی بن الجہیم کا شعر متوکل کی مدح میں نقل کیا ہے جس میں یہی لفظ آتے ہیں عفا اللہ عنك اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا لقد عجبت من یوسف علیہ السلام وکرمہ وصبرہ واللہ تعالیٰ یغفر لہ حین سئل عن البقرات العجاف والسمان مجھے یوسف علیہ السلام پر اور آپ کے کرم اور صبر پر تعجب ہے اور اللہ ان کو بخشے جب ان سے دبلی اور موٹی گائیوں کے متعلق سوال کیا گیا۔ یہاں ذکر ان کے کرم و صبر کا ہے اور ساتھ دعائے مغفرت ہے۔ مطلب یہی ہے کہ جس طرح اس نے مغفرت سے کام لیا اللہ اس سے مغفرت کرے۔

ع۱۲۹۷ اعدوا۔ عُدّۃ۔ دونوں کا مادہ عد ہے اور چونکہ بہتوں کو بھی گننے کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے کثرت پر بھی اس کا استعمال ہوا ہے (قلت کے استعمال کے لیے دیکھو ع۲۲۴) اور اَعَدَّتُ کے معنی ہیں ایک چیز کو ایسا بنایا کہ دوسرا اس کو شمار میں لائے اور حسب حاجت لے لے۔ اعدت للکافرین (البقرۃ-۲۴)- واعد لہم جنات (التوبۃ-۱۰۰) اعتدنا جہنم للکافرین (الکہف-۱۰۲) جو سب تیار کرنے کے معنی میں ہیں اور عُدّۃ وہ شے کثیر ہے جو گنی جائے مال ہو یا ہتھیار (رغ)

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا
وَّلَا۠اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ
سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾

اگر تم میں (مل کر) نکلتے تو تم میں سوائے فساد کے کچھ نہ بڑھاتے
اور تمھارے اندر تمھارے لیے دُکھ چاہتے ہوئے چُغلیاں پھیلاتے پھرتے
اور تم میں اُن کے جاسوس بھی ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے[۱۲۹۸]

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ
الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ
وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾

یقیناً انھوں نے پہلے بھی دُکھ میں ڈالنا چاہا اور تیرے لیے تدبیریں
کرتے رہے، یہاں تک کہ حق آگیا اور اللہ کا حکم غالب رہا
اور وہ بُرا مانتے ہی رہے[۱۲۹۹]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ
اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ
لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

اور ان میں وہ بھی ہے جو کہتا ہے مجھے اجازت دیجیے، اور
مجھے دُکھ میں نہ ڈالیے، دیکھو دُکھ میں تو یہ پڑ ہی گئے اور دوزخ
یقیناً کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے[۱۳۰۰]

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ
مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ
قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾

اگر تجھے بھلائی پہنچے انھیں بُرا لگتا ہے اور اگر تجھے تکلیف پہنچے
کہتے ہیں ہم نے اپنا کام پہلے ہی سے ٹھیک کر لیا تھا اور وہ
پھر جاتے ہیں اس حال میں کہ خوشیاں منا رہے ہوتے ہیں۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ
مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾

کہہ دے ہم کو ہرگز کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی مگر وہی جو اللہ نے ہمارے
لکھ رکھی ہے وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ پر ہی مومنوں کو بھروسا رکھنا چاہیئے[۱۳۰۱]

ثبط۔ ثَبَّطَ کے معنی ہیں روک دیا یا ایک چیز سے ہٹا دیا۔

مطلب یہ ہے کہ ان کا ارادہ کبھی جنگ کے لیے نکلنے کا ہوا ہی نہیں اور اس پر قرینہ یہ ہے کہ انہوں نے کوئی تیاری ہی نہیں کی ہاں اللہ تعالیٰ کو بھی ان کا نکلنا ناپسند ہی تھا کیونکہ ان سے بوجہ ان کی دلی بیماری کے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا۔ ان کا نہ اُٹھنا اور ان کا رُک رہنا ان کا اپنا فعل ہے مگر اس کو منسوب اللہ تعالیٰ کی طرف کیا ہے کیونکہ ان کے کسی پہلے فعل پر بطور سزا کے اللہ تعالیٰ نے ہی یہ نتیجہ مترتب کیا ہے ان کے نکلنے سے کیا نقصان ہوتا وہ اگلی آیت میں بیان کیا ہے۔

ع[۱۲۹۸] اوضعوا خلالکم۔ وَضَعَ کے معنی رکھنا اور جانور کے تیز چلنے پر بولا جاتا ہے (غ) اوضع اس کو تیز چلایا اور تیز چلنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ خلال۔ خَلَل کی جمع ہے دو چیزوں کے درمیان خالی جگہ (غ) اوضعوا کا مفعول نمائم مقدر ہے یعنی چغلیاں یا اوضعوا بالنمائم ترکیب ہے اور معنی ہیں سعوا وَسَطَکُمْ بالنمائم۔

سماعون لہم۔ یعنی ان کی خاطر سننے والے یا اس غرض کے لیے بات سننے والے کہ ان کو پہنچائیں۔ جاسوس۔
چونکہ فی الواقع یہ لوگ مسلمانوں کی تباہی چاہتے تھے۔ اس لیے اگر وہ نکلتے تو فساد پھیلانے کی ہی کوشش کرتے۔ پس ان کا نہ نکلنا بہتری کا موجب ہی تھا۔ گو اُن کا یہ فعل مستحسن نہیں۔

ع[۱۲۹۹] قلبوا لك الامور۔ تقلیب الامور یعنی امور کے ہیر پھیر کے معنی محاورہ میں تدبیریں ہیں (غ) کیونکہ تدبیر میں معاملات کے سب پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے۔ مراد ان کی منصوبہ بازیاں اور سازشیں ہیں جو نبی کریم صلعم کے خلاف کرتے رہتے تھے۔
امر اللہ جو اللہ نے پہلے فرما دیا تھا۔ اللہ کا حکم۔ وہی آخر کار غالب رہا۔

ع[۱۳۰۰] روایت ہے کہ بعض منافقوں نے یہ عذر بنا لیا کہ عیسائیوں کی عورتیں خوبصورت ہیں ہم ان کے ساتھ جنگ کرنے جائیں گے تو ان کی وجہ سے فتنہ میں پڑیں گے لیکن یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ آپ کے ساتھ نکلنے سے مال و عیال ہلاک ہو جائے گا ہمیں اس تکلیف میں نہ ڈالیے۔ جواب میں فرمایا دکھوں میں تو اپنے افعال سے پڑ چکے ہیں یعنی اس دنیا میں بھی دکھوں میں مبتلا ہونگے اور پھر جہنم آیندہ زندگی میں ہے۔

ع[۱۳۰۱] یعنی تم ہم کو مصیبت پہنچانے پر قادر نہیں مگر چونکہ بعض مصائب انسان کی ترقی کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ ایسی مصائب جو اللہ نے ہمارے لیے مقدر کر رکھی ہیں ان کو ہم خوشی سے اُٹھانے کو تیار ہیں کیونکہ وہ ہماری بہتری کا موجب ہیں ھو مولٰنا میں اسی طرف اشارہ ہے۔

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۖ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

کہہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ہی ایک کا انتظار کرتے ہو اور ہم تمھارے حق میں انتظار کرتے ہیں کہ اللہ تم پر کوئی عذاب (دیا) اپنی طرف سے لائے یا ہمارے ہاتھوں سے۔ سو انتظار کرو ہم بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں ع۱۳۰۲

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۖ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾

کہہ دے خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے ہرگز قبول نہ کیا جائیگا کیونکہ تم نافرمان قوم ہو ع۱۳۰۳

وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور کوئی چیز اُن کے حق میں مانع نہیں ہوئی کہ اُن کے خرچ اُن سے قبول کیے جائیں، سوائے اس کے کہ وہ اللہ کا اور اس کے رسول کا انکار کرتے ہیں اور نماز کو نہیں آتے مگر اس حال میں کہ وہ کاہل ہوں اور خرچ نہیں کرتے مگر اس حال میں کہ وہ ناخوش ہوں ع۱۳۰۴

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۖ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾

سو اُن کے مال تجھے تعجب میں نہ ڈالیں اور نہ ان کی اولاد ہی۔ اللہ یہی چاہتا ہے کہ ان کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں ان کو عذاب دے اور ان کی جانیں نکلیں جب وہ کافر ہوں ع۱۳۰۵

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ۖ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تمھیں میں سے ہیں اور وہ تم میں سے نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو ڈر رہے ہیں ع۱۳۰۶

ع۱۳۰۲ احدی الحسنیین۔ دو بھلائیوں میں سے ایک۔ منافق کبھی تو خیال کرتے تھے کہ مسلمان اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے مارے جائیں گے کبھی نصرتوں کو دیکھ کر سمجھتے تھے کہ کامیاب ہو جائیں گے ان دونوں باتوں کو مسلمانوں کے حق میں بھلائی فرمایا اس لیے کہ اگر کفار کے ہاتھ سے مارے جائیں تو بہرحال مقصد زندگی تو حاصل کر لیا کہ حق کی خاطر اپنی جانیں دیدیں۔ نتیجہ تو پھر بھی اچھا ہوا۔ اور یا نصرت الٰہی کے ساتھ حق پھیل گیا اور کامیاب ہو گئے تو یہ بھی بھلائی ہے۔ دنیا کے مال کی خاطر دنیا کی عزت کی خاطر، دنیا کی حکومت کی خاطر وہ جنگ نہ کرتے تھے جو ان کا مارا جانا حصول مقصد زندگی کے منافی ہوتا۔ لیکن بالمقابل منافقوں کے لیے عذاب ہی تھا، کیونکہ اگر مسلمان مارے بھی جائیں تو بھی منافقوں کو اس سے فائدہ نہ تھا بلکہ ضرور تھا کہ وہ اپنے اعمالِ بد کی سزا پاتے یہ عذاب من عندہ ہے اور اگر مسلمان کامیاب ہوں تو پھر جو کچھ منصوبے مسلمانوں کی تباہی کے منافقوں نے کیے ضرور تھا کہ ان کی پاداش میں سزا پاتے۔ اس کی طرف بایدینا میں اشارہ ہے۔

ع۱۳۰۳ منافق کھلی مخالفت تو کر نہ سکتے تھے اس لیے کچھ نہ کچھ مال بھی ان کو خرچ کرنا پڑتا تھا اور بعض وقت جنگوں میں بھی نکلنا پڑتا تھا۔ مگر چونکہ اخلاص نہ تھا اللہ کے ہاں ان اعمال کی کوئی قدر نہ تھی۔

ع۱۳۰۴ نہ اللہ سے کوئی تعلق۔ کیونکہ نماز بھی مجبوری کی پڑھتے ہیں۔ نہ مسلمانوں سے حقیقی تعلق کیونکہ خرچ اخلاص سے نہیں کرتے بلکہ محض بحالت مجبوری کہ اپنے آپ کو ظاہر مسلمان کرتے ہیں۔ یہی بات ان کے نفقات کے نہ قبول ہونے کا موجب ہو گئی۔ کیونکہ قبول اخلاص ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں سستی یعنی ایسی حالت کہ انسان بوجھ سمجھ کر نماز پڑھے علامت نفاق ہے۔

ع۱۳۰۵ اللہ تعالیٰ کا مال اور اولاد کے ذریعہ ان منافقوں کو عذاب دینا یوں تھا کہ ان کو مال جنگوں وغیرہ میں خرچ کرنا پڑتا تھا اور زکوٰۃ بھی دینی پڑتی تھی۔ لیکن چونکہ دل سے یہ نہ چاہتے تھے اس لیے یہ خرچ ان کے لیے عذاب کا موجب ہو رہا تھا۔ اور ان کی اولاد کی وجہ سے یوں عذاب تھا کہ وہ لوگ دین اسلام کے خادم تھے اور اپنی جانیں خدا کی راہ میں دیتے تھے جس اسلام کو وہ خود نیست و نابود کرنے کے منصوبے کرتے تھے اسی کی خاطر ان کی اولاد اپنی جانیں قربان کر رہی تھی۔ عبداللہ بن ابی کا لڑکا عبداللہ مخلص مومن تھا۔

ع۱۳۰۶ یفرقون۔ فرق کے معنی الگ ہونا ہیں۔ اسی سے امن سے حالت مفارقت یعنی خوف بھی فرق کے معنی آتے ہیں۔ راغب کہتے ہیں فرق خوف کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ دل کی حالت خوف سے پراگندگی کی ہوتی ہے یعنی ان کا قسمیں کھانا کہ ہم مسلمان ہیں محض خوف کی وجہ سے ہے ورنہ دلوں میں کفر بھرا ہوا ہے مسلمانوں کے

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا
لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ۞۵۷

اگر کوئی پناہ کی جگہ یا غاریں یا گھسنے کی جگہ پائیں تو اس کی طرف
پھر جائیں اور وہ بے تحاشا بھاگ رہے ہوں ۱۳۰۷

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ
اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ
اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۞۵۸

اور اُن میں سے وہ بھی ہیں جو زکوٰۃ (کے بانٹنے) میں تجھے طعنہ دیتے ہیں
سو اگر ان میں سے ان کو دیدیا جائے تو راضی ہو جاتے ہیں اور اگر ان
میں سے ان کو نہ دیا جائے تو ناخوش ہو جاتے ہیں ۱۳۰۸

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ
وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ
ع ۷ / ۱۳ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۞۵۹ ع

اور (کیا اچھا ہوتا) اگر وہ اس پر راضی ہو جاتے جو اللہ اور اس
کے رسول نے اُن کو دیا تھا اور کہتے اللہ ہمارے لیے بس ہے اللہ اپنے
فضل سے اور اس کا رسول (اور بھی) ہمکو دیگا ہم تو اللہ کی طرف ہی رغبت رکھنے والے ہیں ۱۳۰۹

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ
وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ
وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۞۶۰

زکوٰۃ صرف ناداروں کے لیے ہے اور مسکینوں اور اس کے
کارکنوں (کے لیے) اور جن کے دل مائل کرنا ہے اور غلاموں کے
آزاد کرنے اور قرضداروں (کے لیے) اور اللہ کی راہ میں اور مسافر
(کے لیے) یہ اللہ کی طرف سے ضروری ٹھیرایا گیا ہے۔ اور
اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۱۳۱۰

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ

اور ان میں سے وہ لوگ ہیں جو نبی کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے

مقابلہ کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے اظہار مخالفت نہیں کرتے۔

ع ۱۳۰۷ ملجأ۔ لجأ کے معنی کسی چیز کی پناہ لینا یا اس سے ٹیک لگانا (ل) اسی سے التجا ہے۔

مُدّخلا۔ ادَّخَلَ کے معنی ہیں اِجْتَهَدَ فی دخوله داخل ہونے میں زور لگایا۔ اسی سے مُدّخل ہے (غ)۔

یجمحون۔ جمح کا اصل استعمال گھوڑے پر ہے جب وہ چلنے میں نشاط کی وجہ سے سوار پر غالب آجائے یعنی اس کے قابو سے نکل جائے (غ)

ع ۱۳۰۸ یلمز۔ لمز کے معنی پیٹھ کے پیچھے بات کا کہنا اور معائب کے پیچھے لگنا ولا تلمزوا انفسکم (الحجرات ۴۹-۱۱) اور لُمَزَة وہ ہے جو کثرت سے دوسروں کی عیب شماری کرے ویل لکل همزة لمزة (الهمزة ۱۰۴-۱)

یسخطون۔ سَخَط اور سُخْط غضب شدید کو کہتے ہیں جس کا اقتضاء عقوبت ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف انزال عقوبت ہے کمن باء بسخط من اللّٰه (آل عمران ۳-۱۶۲)

ع ۱۳۰۹ مطلب یہ ہے کہ اسلام کی اصل غرض کوئی مال لوگوں کو دینا تو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنا اور اس کی رضا کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ پس ان کو چاہیئے تھا کہ اصل غرض کو مقدم رکھتے۔ ہاں اسلام نے دنیوی زندگی کے لیے بھی اعلیٰ درجہ کے اصول قائم کر دیئے ہیں منجملہ ان کے غربا کی خبرگیری ہے سو وہ بھی ہوتی رہتی ہے مگر جس شخص نے مال کو ہی زندگی کا مقصد قرار دے لیا وہ اصل راہ کو چھوڑ کر دور نکل گیا۔

ع ۱۳۱۰ صدقات۔ صَدَقَة وہ ہے جو انسان اپنے مال سے قرب حاصل کرنے کے لیے خرچ کرے اور اصل میں صدقة اسے کہا جاتا ہے جو بطور تطوع دیا جائے یعنی اپنی خوشی سے یا نفل کے طور پر اور جس کا دینا واجب ہے اسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے لیکن بعض وقت بلحاظ اصل معنی کے زکوٰۃ کو بھی صدقة کہا جاتا ہے جب اس کا دینے والا صدق کا طالب ہو جیسے خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها (۹-۱۰۳) یہاں بھی زکوٰۃ ہی مراد ہے (غ) کیونکہ جو نفل صدقات ہوں وہ ہر انسان جس طرح چاہے دے سکتا ہے معین تقسیم اسی کی ہو سکتی ہے جو بیت المال میں داخل ہو اور یہ زکوٰۃ ہی ہے۔

خرچ زکوٰۃ کی مدات: منافقوں کی ایذا رسانی کا ذکر کرتے ہوئے پچھلے رکوع کے آخر پر فرمایا تھا کہ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو مال زکوٰۃ کی تقسیم میں آنحضرت صلعم پر طعن کرتے ہیں کہ فلاں کو دیا فلاں کو نہ دیا اسلیئے یہاں بتایا ہے کہ زکوٰۃ (صدقات) سے یہاں خاص مال زکوٰۃ ہی مراد ہے۔ کیونکہ یہی صدقات بیت المال میں جمع ہوتے

هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلۡ اُذُنُ خَيۡرٍ لَّكُمۡ يُؤۡمِنُ
بِاللّٰهِ وَ يُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَ رَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ ؕ وَ الَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ رَسُوۡلَ

ہیں یہ کان (کا کچّا) ہے کہہ دے تمھاری بھلائی کے لیے ہی کان (دھرتا)
ہے اللہ پر ایمان لاتا ہے اور مومنوں کی بات کو مانتا ہے اور ان لوگوں
کے لیے رحمت ہے جو تم میں سے ایمان لائے اور جو لوگ اللہ کے

تھے اور انہی کی تقسیم پر طعن ہو سکتا تھا) کی تقسیم کس طرح ہو۔ اس خرچ کی یہاں آٹھ مدات بیان کی ہیں۔ پہلے فقراء یعنی نادار لوگ۔ دوسرے مسکین جو گو بالکل نادار تو نہ ہوں مگر بغیر امداد اپنی روزی کمانے کے قابل نہ ہو سکیں۔ مثلاً اہل حرفہ کے لیے خاص ہتھیار۔ طالبعلموں کے لیے ذرائع حصول علم کا مہیا کرنا وغیرہ۔ امام شافعی نے فقیر اور مسکین میں اسی کے قریب قریب فرق بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں فقیر وہ ہے جس کے پاس نہ مال ہو نہ اس کے ہاتھ میں کوئی کسب ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس مال یا کسب تو ہو مگر اس کی ضروریات کے لیے مکتفی نہ ہو اس پر انہوں نے قرآن کریم کی آیت اما السفینۃ فکانت لمساکین (الکھف ۱۸: ۷۹) کو پیش کیا ہے کیونکہ جن کے پاس کشتی تھی وہ نادار نہ تھے۔ تیسرے وہ لوگ جو صدقات کے انتظام پر متعین ہوں جیسے مال زکوٰۃ جمع کرنے والے اس کے تقسیم کرنے والے۔ چوتھے مؤلفۃ القلوب یعنی ایسے لوگ جن کے دلوں سے تنفر دور کرنا مقصود ہو اور ان کے دلوں کو حق کی طرف مائل کرنا ہو۔ روح المعانی میں ہے کہ اس میں تین گروہ آتے ہیں۔ اوّل ایسے لوگ جو اسلام نہیں لائے اور ان کو اسلام کے قریب لانے کی ضرورت ہے ان کو مال دینے کی غرض یہ نہیں کہ پیسوں سے ان کا ایمان خریدا جائے ایسے ایمان کو اسلام ایک لحہ کے لیے نہیں چاہتا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ حصول تعلیم اسلام کے لیے یا اسلام سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ان کو مدد دینے کی ضرورت ہے تو دی جائے۔ دوم وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں مگر ان کا ایمان ابھی کمزور ہے یعنی نومسلموں کی امداد اور ان کو تعلیم اسلام میں مضبوط کرنا۔ سوم وہ لوگ جن کے شر سے اسلام کو بچانا مقصود ہو۔ پانچویں فی الرقاب جس کے معنی گردنوں کو آزاد کرنا ہیں۔ اور یہ تین طرح پر ہو سکتا تھا اول یہ کہ حکومت کی طرف سے ان لوگوں کی امداد کی جائے جو غلامی کی حالت سے نکلنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اسلام نے غلام کو یہ حق دیا تھا کہ وہ اپنے مالک سے مکاتبہ کر لے لیکن اس کی آزادی مشروط ہو اس بات پر کہ ایک خاص رقم مالک کو جمع کر کے دے تو اس میں امداد دینا یا اس رقم کا مہیا کر دینا حکومت کا فرض ٹھہرایا کہ وہ بیت المال سے ان لوگوں کی امداد کرے۔ دوم یہ کہ حکومت خود مالکوں سے غلام خرید کر ان کو آزاد کرے۔ سوم یہ کہ اس سے اسیران جنگ کا فدیہ ادا کیا جائے۔ وہ اسیران جنگ ظاہر ہے کہ دشمن قوم میں سے اور پھر غیر مسلم ہونگے یہ تعلیم اسلامی کی وسعت ہے۔ چھٹے قرضداروں کا قرضہ ادا کرنے کے لیے یا جن پر جرمانہ ہو گیا ہو ان کا جرمانہ ادا کرنے کے لیے۔ ساتویں فی سبیل اللہ یعنی جہاد کے لیے خواہ وہ جہاد قلمی ہو یا سیفی۔ کفار کے حملوں سے اپنے مذہب کو محفوظ کرنے کے لیے اور اصول حقہ کو کافروں میں پھیلانے کے لیے۔ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کو مال زکوٰۃ لینا جائز ہے گو وہ غنی ہو کیونکہ اس کی غرض اس مال کو دشمنوں کے مقابلہ میں خرچ کرنا ہے۔ آٹھویں مسافر کے لیے۔ کیونکہ اپنے گھر سے باہر وہ بھی مفلس کے حکم میں ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ مراد اس سے ایسا مسافر ہے جو محتاج امداد ہو۔

فریضہ زکوٰۃ سے مسلمانوں کی غفلت: فریضۂ زکوٰۃ ایک ایسا فریضہ تھا جو مسلمانوں کی ساری قومی ضروریات کا متکفل ہو سکتا تھا مگر آج اس کی یہ حالت ہے کہ اوّل تو مسلمان مال زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور جو کرتے ہیں تو اس کے ایک جگہ جمع ہو کر ضروریات قومی پر خرچ ہونے کا کوئی انتظام نہیں بلکہ عموماً اپنے اپنے طور پر اور اکثر اوقات غیر مستحق لوگوں میں وہ مال تقسیم ہو کر اصل غرض اس فریضہ کی ضائع ہو جاتی ہے۔ فریضۂ زکوٰۃ ایک ایسا اعلیٰ درجہ کا انتظام تقسیم دولت ہے کہ جس کے نہ ہونے کی وجہ سے یورپ کو طرح طرح کی مصائب کا سامنا درپیش ہے جن مصائب کا علاج سوائے زکوٰۃ کے اور کچھ نہیں۔ اور سوشلزم اور بولشوزم محض دھوکہ دینے والے خیالات ہیں جو عملی رنگ میں کبھی قائم نہیں ہو سکتے۔ تقسیم دولت کے مسئلہ میں یورپ کو جو سب سے بڑی مشکل پیش آئی ہے وہ یہ ہے کہ دولت کا رجحان یہ ہے کہ چند ہاتھوں میں زیادہ مقدار میں جمع ہوتی چلی جائے اور بیشتر حصّہ نسل انسانی میں غربت یا مسکنت کی حالت میں رہے یا ایسی حالت کہ بمشکل وہ اپنی گزر کرنے کے قابل ہوں۔ اس کا علاج اسلام نے طرح طرح کے رنگوں میں کیا ہے انہی علاجوں میں سے ایک علاج زکوٰۃ ہے کہ اغنیا کی دولت میں سے ہر سال چالیسواں حصّہ نکل کر غربا میں تقسیم ہوتا رہے۔ دوسرے دو علاج ایک تقسیم وراثت ہے اور دوسرا ممانعت سود۔

بیت المال کی ضرورت: مسلمانوں کے کل قومی کام آج صرف ایک فریضۂ زکوٰۃ کے قیام پر ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اس کے جمع کرنے کا کوئی انتظام ہو۔ قرآن کریم نے تو زکوٰۃ کو ایک جگہ جمع کرنے کی ضرورت یہاں تک مقدم کی ہے کہ اخراجات زکوٰۃ میں ایک مد خصوصیت سے کارکنان زکوٰۃ کی قائم کر دی ہے جس پر خرچ کرنا ضروری ٹھہرایا ہے۔ گویا قرآن کریم کوئی حالت زکوٰۃ ایسی فرض نہیں کرتا کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ آپ ادا کرے بلکہ اس کا قومی بیت المال میں جمع ہونا اور پھر وہاں سے تقسیم ہونا ضروری ہے۔ کاش مسلمان اس طرف توجہ کریں۔

اشاعت اسلام اور تعلیم پر زکوٰۃ کا خرچ کرنا: پھر مسلمانوں کی سب سے بڑی دو قومی ضرورتیں اس وقت ہیں ایک اشاعت اسلام دوسرے تعلیم ہر قسم کی۔ سو یہ دونوں کام زکوٰۃ کے مصارف میں داخل ہیں اور آج اگر زکوٰۃ کا روپیہ ایک جگہ جمع ہو تو مسلمانوں کے یہ دونوں کام عمدہ طور پر سرانجام پا سکتے ہیں۔ اشاعت اسلام پر تو آج زکوٰۃ کا روپیہ بالکل صرف نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا کوئی قومی انتظام ہی مسلمانوں نے نہیں رکھا، حالانکہ فی سبیل اللہ کا لفظ خصوصیت سے اشاعت اسلام کے لیے موجود ہے اور تعلیم پر شاید علماء کا فتویٰ نہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر اغنیا سے تعلیم کی فیس لی جائے اور تعلیم کا خرچ کل زکوٰۃ سے ادا کیا جائے تو اس طرح زکوٰۃ کا مصرف صرف غیر اغنیا کے لیے رہ گیا اس میں کونسا محذور لازم آتا ہے اصول تقسیم زکوٰۃ کہ اس کا خرچ عموماً غیر اغنیا کیلئے ہو قائم رہ گیا اور ظاہر ہے کہ بیشتر حصہ مسلمان

اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۱﴾ — رسول کو دُکھ دیتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے ع۱۳۱۱

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ — تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو خوش رکھیں اور اللہ اور اس کا رسول زیادہ حقدار ہیں کہ اس کو راضی کریں اگر وہ مومن ہیں ع۱۳۱۲

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾ — کیا ان کو معلوم نہیں ہوا کہ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے اسی میں رہے گا یہ بڑی رسوائی ہے ع۱۳۱۳

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾ — منافق ڈرتے ہیں کہ ان پر کوئی سورۃ (نہ) اتاری جائے، جو اُن کو ان باتوں کی خبر دیدے جو اُن کے دلوں میں ہیں کہہ دے ہنسی کیے جاؤ، اللہ اس کو کھولنے والا ہے جس کا تم کو ڈر ہے ع۱۳۱۴

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾ — اور اگر تو ان سے سوال کرے تو کہیں گے ہم تو یوں ہی باتیں اور دل لگی کرتے تھے کہہ، کیا اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھے؟ ع۱۳۱۵

آبادی کا بلحاظ ضرورت تعلیم مساکین میں داخل ہے۔
یتامٰی اور زکوٰۃ: بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ یتامٰی پر زکوٰۃ کا روپیہ خرچ نہیں ہوسکتا۔ یہ انہوں نے اس سے قیاس کیا ہے کہ یتامٰی کی مد مصارفِ زکوٰۃ میں نظر نہیں آتی، حالانکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یتامٰی غنی بھی ہوتے ہیں اور فقیر بھی۔ اس لیے یتامٰی کی مد قائم کرنا درست نہ تھا۔ ہاں جو یتیم فقرا یا مساکین یا اور کسی مد میں آتے ہوں وہ اس مد کی ذیل میں زکوٰۃ کے مستحق ہیں۔

ع۱۳۱۱ اُذُن کے اصل معنی تو کان ہی ہیں مگر بطور استعارہ اس کا استعمال اس شخص پر بھی ہوتا ہے جو بات کو سن کر اسے فوراً قبول کرلے (غ)
منافقوں کی مراد آنحضرت صلعم کو اُذُن کہنے سے یہی تھی کہ جب ہم آپ کے سامنے جا کر قسم کھا لیتے ہیں تو ہماری بات کا اعتبار کر لیتے ہیں اس لیے آپ کی غیبت میں ہم جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں کریں جب سامنے جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہمارا منشا یہ تھا تو آپ اس بات کو مان لیں گے۔ درحقیقت یہ امر نبی کریمؐ کے خُلقِ عظیم میں سے تھا کہ آپ ان لوگوں کی طرح نہ تھے کہ کوئی بات کرے تو فوراً کہہ دیتے ہیں کہ تو جھوٹ کہتا ہے حسنِ ظن اور حیا آپ کی طبیعت میں غالب امور تھے۔ چنانچہ اسی کے مطابق ان کی اسبات کا جواب دیا ہے کہ اگر آپ بات کو سن کر مان لیتے ہیں تو یہ تو تمہاری ہی بھلائی کے لیے ہے ایسا خُلق دیکھ کر تو چاہیئے تھا کہ تم آپ پر ایمان لاتے نہ یہ کہ اور ایذا دیتے اور آپ کا مان لینا محض بلحاظ رحمت کے ہے کیونکہ وہ مومنوں کے لیے رحمت ہے یعنی محض تم پر شفقت جبلی کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ حق و باطل میں تمیز ہی نہیں کرسکتے۔ جیسا کہ بعض کان کے کچے لوگ ہوتے ہیں کہ جو بات سُنی اس کو لے دوڑے۔ تحقیق اور تمیز کے متعلق دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا (الحجرات ۴۹-۶) اگر ایک فاسق کوئی خبر تمہارے پاس لائے تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ تحقیق کرنا اور امر ہے اور دوسرے کو جھوٹا کہہ دینا اور امر۔

ع۱۳۱۲ یرضوہ پیچھے اللہ اور رسول دونوں کا ذکر ہے مگر یہاں ضمیر واحد ہے اس لیے کہ اصل رضا اللہ تعالیٰ کی ہی مطلوب ہے۔ بشر کی ناراضگی بلاوجہ بھی ہوسکتی ہے۔ گو وہ رسول ہی ہو کیونکہ اسے غلطی لگ سکتی ہے اور دوسرے رسول کی اطاعت فی الحقیقت اللہ کی اطاعت میں داخل ہے۔

ع۱۳۱۳ یحادد۔ حد سے ہے جس کے ایک معنی جہت کے ہیں پس محادّۃ ایک دوسرے سے عداوت اور مخالفت کی جانب میں ہو جانا ہے۔ اسی طرح یشاقق کا لفظ ہے ایک شق میں ہو جانا (ل) اسی طرح معاداۃ ہے کہ عدوۃ بھی ایک کنارہ کو کہتے ہیں۔ راغب نے اس معنی کی وجہ ممانعت یا استعمال حدید دی ہے اور ممانعت کے معنی حد میں شامل ہیں۔

ع۱۳۱۴ ینزل علیھم میں ضمیر مومنوں کی طرف بھی ہوسکتی ہے اور منافق بھی مراد ہوسکتے ہیں کیونکہ جو کچھ نازل ہوتا تھا وہ ان پر بھی نازل ہوتا تھا۔ اسی طرح تنبئھم میں ضمیر دونوں طرف ہوسکتی ہے۔ منافقوں کا یہ حذر بھی بطور استہزاء تھا جیسا کہ قل استھزؤا سے ظاہر ہے۔

ع۱۳۱۵ خوض اصل میں ایسی چیز میں داخل ہونے کو کہتے ہیں جیسے پانی یا کیچڑ۔ اس لیے کسی ایسے امر میں داخل ہونے پر بولا جاتا ہے جو انسان کو ملوث کرے۔

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ
اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ
طَآئِفَةً ۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝۶۶ ع
اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ
يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ
وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ
اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۶۷
وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ
نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ
وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝۶۸
كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ
قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا
بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا
اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ
وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ

بہانے نہ بناؤ تم نے یقیناً اپنے ایمان کے بعد کفر کیا۔ اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف کریں گے تو ایک گروہ کو عذاب دیں گے۔ اس لیے کہ وہ مجرم تھے ۱۳۱۶

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک سے ہی ہیں۔ وہ بُرے کام کرنے کو کہتے ہیں اور اچھے کاموں سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں انھوں نے اللہ کو چھوڑ دیا، سو اللہ نے ان کو چھوڑ دیا، منافق ہی نافرمان ہیں ۱۳۱۷

اللہ نے منافق مَردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے دوزخ کی آگ کا وعدہ کیا ہے، اسی میں رہیں گے وہ ان کو کافی ہے، اور اللہ نے اُن پر لعنت کی اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔

(تم منافق بھی) اُن کی طرح ہو جو تم سے پہلے ہو چکے، وہ تم سے طاقت میں زیادہ اور مالوں اور اولاد میں بڑھ کر تھے، سو انھوں نے اپنے حصّے سے تھوڑا فائدہ اٹھایا پس تم بھی اپنے حصّے سے تھوڑا سا فائدہ اُٹھا رہے ہو جیسے ان لوگوں نے جو تم سے پہلے تھے اپنے حصّے سے تھوڑا سا فائدہ اٹھایا اور تم بیہودہ باتوں میں لگے رہے ۱۳۱۸ جیسے وہ لگے رہے ان کے عمل دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے۔ اور یہی

اکثر استعمال اس کا قرآن شریف میں ذم کے موقعہ پر ہی ہوا ہے۔ یہاں بتایا ہے کہ بعض منافق یہی عذر کر دیتے ہیں۔ آج بعض مسلمان امور دینی میں ہنسی کرتے ہیں اور ان کا ذکر ایک مشغلہ کے طور پر کرتے ہیں۔ وہ غور کریں کہ جو کچھ منافقوں کے متعلق قرآن شریف نے فرمایا تھا اس کے مصداق وہ ہو رہے ہیں۔

ع۱۳۱۶ تعتذروا۔ عُذْر اس چیز کا قصد کرنا ہے جس سے گناہ مٹ جائے اور اعتذر کے معنی عذر پیش کیا اور عَذَرَ کے معنی اس کا عذر قبول کیا۔ اور اَعْذَرَ کے معنی ایسی بات پیش کی جس سے معذور ہو گیا اور راغب نے ایک قول نقل کیا ہے کہ عُذْر کا لفظ عَذِرَة سے ماخوذ ہے جو نجس شے کو کہا جاتا ہے۔ اور عَذَرْتُ فلانا کے معنی ہیں اس کے گناہ کی نجاست کو عفو سے دور کیا (غ)

منافقوں کی آخری علیحدگی: یہ ایک پیشگوئی تھی جو پوری ہوئی منافقوں کا اکثر حصّہ اسلام میں شامل ہو گیا کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے اس حالت نفاق کو ترک نہ کیا۔ ان کو بالآخر مسلمانوں سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس طرح پر کہ نبی کریم صلعم نے خطبہ میں اُن کے نام لیکر ظاہر کر دیا اور ان کو مسجد سے نکال دیا گیا اور ان سے زکوٰۃ نہ لی جاتی تھی یہی وہ عذاب تھا، جو اُن کو دیا گیا۔

ع۱۳۱۷ بعضہم من بعض لفظی معنی ہیں بعض ان کے بعض میں سے ہیں۔ مگر مراد اُن کا تشابہ ہے جس طرح ایک ہی چیز کے مختلف اجزا میں تشابہ ہوتا ہے۔ گویا وہ سب ایک ہی ہیں کیا مرد اور کیا عورتیں۔

یقبضون ایدیہم۔ قَبْض کے معنی ہیں کسی چیز کا پورے کف سے لے لینا اور کسی شے پر قَبْضُ الْيَدِ سے مراد اس کا جمع رکھنا ہے اس کے لے لینے کے بعد اور یقبضون ایدیہم کے معنی ہیں خرچ کرنے سے رُکتے ہیں (غ)

نسوا اللہ فنسیہم میں بتا دیا کہ جس طرح کا فعل انسان کرتا ہے اسی طرح کی سزا اللہ کی طرف سے ملتی ہے یہاں نسی بمعنی ترک ہے دیکھو ع۶۷۔

ع۱۳۱۸ کالذی خاضوا کی ترکیب دو طرح ہو سکتی ہے کالخوض الذی خاضوہ یا الذی کی اصل الذین ہے اور نون تخفیف کے لیے گرا دیا گیا ہے اور مراد

هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٩﴾

نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

اَلَمْ یَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ
نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۙ۬ وَقَوْمِ اِبْرٰهِیْمَ
وَاَصْحٰبِ مَدْیَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ
اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ
اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ
یَظْلِمُوْنَ ﴿٧٠﴾

کیا ان کے پاس ان کی خبر نہیں آئی، جو اُن سے پہلے تھے، نوحؑ کی قوم اور عادؑ کی اور ثمودؑ کی اور ابراہیمؑ کی قوم کی اور مدین کے رہنے والوں کی اور تباہ شدہ بستیوں کی — ان کے رسول ان کے پاس دلائل لے کر آئے سو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے ع[1319]

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ
بَعْضٍ ۘ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَیُطِیْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَیَرْحَمُهُمُ
اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿٧١﴾

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان پر اللہ رحم کرے گا۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ
تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا
وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ
مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿٧٢﴾ ع

اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں انھیں میں رہیں گے اور ہمیشگی کے باغوں میں پاکیزہ رہنے کی جگہ کا۔ اور اللہ کی رضا سب سے بڑھ کر (نعمت) ہے یہی بڑی بھاری کامیابی ہے ع[1320]

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ
وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ

اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان کے مقابلہ میں شدّت اختیار کر، اور اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے

ہے کالذین خاضوا۔

ع۱۳۱۹ المؤتفکات۔ مؤتفکۃ کی جمع ہے اور ائتفاک کے معنی (جو افک سے ہے) انقلاب ہیں اور مراد اس سے ہے سب لوگ جو ہلاک ہوئے۔ اور نضر بن انس نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا اے بیٹے بصرہ میں نہ اُترنا فانها احدی المؤتفکات اور بعض نے اسے صرف لوط کی بستیوں سے خاص کیا ہے (ل) اور مفردات میں ہے کہ مؤتفکۃ وہ ہوائیں ہیں جو اپنے چلنے سے پھر جائیں۔

ع۱۳۲۰ عَدْن۔ عَدَنَ بمکان کے معنی ہیں استقر یعنی مکان میں استقرار پکڑا۔ پس جنات عدن وہ باغ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے یعنی ان سے کبھی نکالے نہ جائیں گے اسی سے مَعْدِن ہے (غ)

رضوان من اللہ اکبر۔ اللہ کی رضا کو یہاں جنت کی سب سے بڑی نعمت فرمایا ہے۔ ابوسعید خدری کی حدیث جو بخاری اور مسلم میں ہے اسی کی موید ہے۔ یہ ایک فیصلہ کن دلیل ہے کہ مسلمانوں کا بہشت کیسی چیز ہے جس کی سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔ پھر یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اللہ کی رضا مومن کو اس دنیا میں بھی مل جاتی ہے اور صحابہؓ کے متعلق تو نص صریح ہے رضی اللہ عنهم۔ پس مومن کی جنت اسی دنیا سے شروع ہوتی ہے اور وہ جنت وہی چیز ہے جس میں مومن اور غیر مومن کا اشتراک نہیں۔ دنیا کی لذات فانی میں تو نہ صرف اشتراک موجود ہے بلکہ بعض وقت کفار اس سے زیادہ حظ اُٹھا لیتے ہیں۔ مومنوں کا ذکر ان دو آیات میں کفار کے مقابلہ کے لیے کیا۔ جن کا ذکر منافقین کی تنبیہ کے لیے آگیا تھا کہ تمہارا انجام بھی اسی طرح بُرا ہوگا جس طرح تم سے پہلے کفار کا انجام بُرا ہُوا۔

وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٧٣﴾
يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوا ؕ وَلَقَدْ قَالُوا
كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ
وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا ۚ وَمَا نَقَمُوا إِلَّا
أَنْ أَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ
فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَإِنْ يَتَوَلَّوْا
يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا أَلِيمًا ۙ فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ

اور وہ بری جگہ ہے [۱۳۲۱]
اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے نہیں کہا اور یقیناً انھوں
نے کلمۂ کفر کہا اور اپنے (اظہارِ) اسلام کے بعد کافر ہو گئے اور
ایسی چیز کا قصد کیا جس کو نہیں پا سکے [۱۳۲۲] اور وہ بُرا نہیں کہتے مگر
اس لیے کہ اللہ نے اپنے فضل سے اور اس کے رسول نے اُن کو غنی کر دیا [۱۳۲۳]
سو اگر توبہ کریں تو ان کے لیے بہتر ہوگا اور اگر پھرے رہیں تو اللہ
ان کو دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور زمین
میں ان کا کوئی دوست نہ ہوگا اور نہ کوئی

ع ۱۳۲۱ جاھد۔ جُھد سے ہے جس کے معنی زور لگانا، کوشش کرنا ہیں اور جہاد اور مجاہدہ دشمن کی مدافعت میں اپنی طاقت کا خرچ کرنا ہے۔ راغب کہتے ہیں جہاد تین طرح پر ہے۔ دشمن ظاہری سے مجاہدہ اور شیطان سے مجاہدہ اور اپنے نفس سے مجاہدہ۔ اور جاھدوا فی اللہ حق جہادہ اور جاھدوا باموالکم وانفسکم وغیرہ میں تینوں قسم کا جہاد شامل ہے۔ اور پھر نبی صلعم کی حدیث نقل کی ہے جاھدوا اھواءکم کما تجاھدون اعداءکم اپنی خواہشات سے اسی طرح جہاد کرو جس طرح اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو اور پھر کہتے ہیں کہ مجاہدہ کبھی ہاتھ سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے جیسا کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا جاھدوا الکفار بایدیکم والسنتکم کافروں کے ساتھ جہاد کرو اپنے ہاتھوں سے اور اپنی زبانوں سے۔ پس جہاد لسانی بھی ہو سکتا ہے اور سیفی بھی۔

اغلظ علیھم۔ غِلَظ اصل میں رقت کی ضد ہے اور اس کا استعمال قوت اور مضبوطی پر بھی ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں آتا ہے میثاقا غلیظا (النساء ۴: ۲۱) جس سے مراد مضبوط یا موکد عہد ہے۔ ایسا ہی فاٰزرہ فاستغلظ (الفتح ۴۸: ۲۹) مراد مضبوط ہونا، یا موٹا ہونا ہے اور غُلظ اس زمین کو کہتے ہیں جو نرم نہ ہو بلکہ سخت ہو جس میں کوئی چیز آسانی سے داخل نہ ہو سکے (ل)۔ واغلظ علیھم کے کیا معنی ہیں؟ دوسری جگہ آتا ہے ولیجدوا فیکم غلظۃ (التوبۃ ۹: ۱۲۳) چاہیئے کہ کافر تم میں شدت پائیں۔ پس یہاں بھی معنی وہی لیے جائیں گے یعنی ان کے مقابلہ میں شدت اختیار کرو۔

منافقوں کے ساتھ ایک مدت تک نبی کریم صلعم نرمی برتتے رہے ان کی شرارتوں پر چشم پوشی سے کام لیتے رہے ان کے جنگوں میں نہ نکلنے پر کبھی سخت گیری نہیں کی بلکہ ان کے عذروں کو قبول کر لیتے جیسا کہ اس جنگ میں بھی ہوا۔ مگر اب چونکہ وہ موقعہ پہنچ چکا تھا کہ منافقوں اور مومنوں کو الگ الگ کر دیا جائے اور زیادہ ان کے مسلمانوں میں ملا رہنے سے مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس لیے اب حکم ہوتا ہے کہ کافروں اور منافقوں دونوں کے خلاف جہاد کرو۔ ظاہر ہے کہ یہاں جہاد سے مراد جہاد سیفی نہیں۔ کیونکہ منافقوں کے ساتھ کبھی جہاد سیفی نبی کریم صلعم نے نہیں کیا۔ پس اس سے مراد دوسرا جہاد ہے جس کے معنی محض کوشش اور زور لگانے کے ہیں یعنی اب ان کو اپنے میں سے نہ سمجھو اور ان کے خلاف پورا زور لگاؤ۔ اور دوسری بات فرمائی واغلظ علیھم نبی کریم صلعم کے غلیظ القلب ہونے کی تو قرآن کریم نے نفی کی ہے لوکنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک (اٰل عمران ۳: ۱۵۹) اگر تو سخت گو سخت دل ہوتا تو تیرے پاس سے بھاگ جاتے معلوم ہوا نبی کریم صلعم نہ سخت کلامی کرنے والے تھے نہ سخت دل تھے۔ پس جب قرآن شریف خود آپ کی یہ صفت بیان فرماتا ہے تو واغلظ علیھم نہ آپ کے لیے سخت گوئی کرنے کا حکم ہو سکتا ہے نہ سخت دلی اختیار کرنے کا۔ بلکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ تم جو اس قدر نرمی ان کے مقابلہ میں برتتے رہے ہو اگر یہ نرمی سے درست ہونے والے ہوتے تو ہو جاتے اس لیے اب وہ چشم پوشیاں اور عفو اور درگزر جو اُن کے قصوروں اور شرارتوں پر آپ کرتے رہے ہیں ان کو ترک کر کے ان کے مناسب حال شدت کا طریق اختیار کریں۔ کیونکہ دشمن کے مقابلہ میں نرمی اور درگزر سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے۔ جب وہ طریق عداوت کو نہیں چھوڑتے تو نرمی کا طریق اب اُن کے مقابلہ میں کام نہیں دے سکتا۔

ع ۱۳۲۲ منافقت کا نتیجہ ناکامی اور شیعوں پر اتمام حجّت: ھموا بما لم ینالوا۔ منافقوں نے اسلام کو تباہ کرنے کا قصد کیا مگر اس مقصد کو حاصل نہ کر سکے۔ شیعہ جو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو منافق کہتے ہیں قرآن کریم کے اس نص صریح کے خلاف کرتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ منافقوں کو ان کے ارادہ میں کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ مگر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو وہ کامیابیاں اللہ تعالیٰ نے دیں اور ایسی ایسی نصرتیں ان کے ذریعہ سے اسلام کو عطا فرمائیں کہ بہت سے انبیاء کو بھی وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

ع ۱۳۲۳ مانقموا الا ان اغنٰھم اللہ ایسا ہی ہے جیسا کوئی کہے مالی عندک ذنب الا انی احسنت الیک میں نے تیرا کوئی گناہ نہیں کیا سوائے اس کے کہ تیرے ساتھ احسان کیا۔ اللہ نے تو ان کو اپنے فضل سے غنی کر دیا۔ کیونکہ جو وسعت و غنا فتوحات کے بڑھنے کے ساتھ مسلمانوں کو ملے اس میں یہ منافق بھی شریک تھے۔ مگر نتیجہ اُلٹ ہوا کہ بجائے اس کے کہ نفاق کو چھوڑتے اور بُرا کہنا شروع کیا۔

وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٧٤﴾
وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ
فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٧٥﴾
فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا
وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٧٦﴾
فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ
يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ
وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿٧٧﴾
اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ
نَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿٧٨﴾ ج
اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا
جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ط سَخِرَ اللّٰهُ

مدد گار رہو گا) ۱۳۲۴
اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر وہ ہم کو اپنے فضل سے دیدے
تو ہم ضرور صدقہ دیتے اور ہم ضرور نیکو کاروں میں سے ہوں گے۔
پھر جب اس نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخل کیا اور
پھر گئے اور وہ منہ پھیرنے والے ہیں ۱۳۲۵
سو اس نے انھیں بدلہ دیا (کہ) ان کے دلوں میں نفاق (پیدا کر دیا)
اس دن تک کہ وہ اس سے ملیں اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے اس
کے خلاف کیا جو اس سے وعدہ کیا تھا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے ۱۳۲۶
کیا اُن کو معلوم نہیں کہ اللہ ان کے بھیدوں کو اور ان کے خفیہ
مشوروں کو جانتا ہے اور کہ اللہ غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔
جو ان مومنوں پر طعن کرتے ہیں جو دل کھول کر صدقہ دیتے ہیں
اور جو سوائے اپنی سخت مشقت کے کچھ نہیں پاتے تو ان پر ہنسی
کرتے ہیں اللہ اُن کو ہنسی کی سزا دے گا ۱۳۲۷ اور ان کے لیے

ع۱۳۲۴ دنیا کا عذاب الیم کوئی سزا ہے جو ان کو اس دنیا میں دی جائے۔ اس صورت میں صرف مسلمانوں سے ان کی تمیز کر دینا ہی ان کے لیے عذاب الیم تھا اور جب یہ سزا ان کو ملی تو ان کا کوئی دوست و مدد گار نہ بنا جو اس سزا کو ٹال دیتا۔

ع۱۳۲۵ ثعلبہ بن حاطب اور منافقوں سے زکوٰۃ کا نہ لیا جانا: ثعلبہ بن حاطب ایک غریب آدمی تھا جس نے رسول صلعم سے دعا کرائی کہ اس کے پاس مال بہت ہو تو وہ سب حقوق دیگا۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کی زندگی میں ہی اس کا مال بڑھ گیا یہاں تک کہ اس نے نماز وغیرہ بھی ترک کر دی اور منافقانہ رویّہ اختیار کیا اور جب نبی کریم صلعم کے عامل اس کے پاس زکوٰۃ وصول کرنے گئے تو انکار کر دیا۔ پھر جب منافقین کو مسلمانوں کی جماعت سے الگ کر دیا گیا تو یہ شخص رسول اللہ صلعم کے پاس آیا کہ اس کے مال میں سے زکوٰۃ لی جائے آپ نے فرمایا اب نہیں لی جاسکتی۔ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد یہی ثعلبہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس حاضر ہوا کہ اسکے مال میں سے زکوٰۃ لی جائے آپ نے بھی انکار کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات پر حضرت عمرؓ کی خدمت میں یہی درخواست لیکر حاضر ہوا انہوں نے بھی انکار کر دیا۔ پھر اسی طرح حضرت عثمانؓ نے بھی۔ یہ واقعہ اس آیت کے شان نزول میں بیان کیا گیا ہے مگر مراد اسی قدر ہے کہ اس پر اس آیت کا مضمون صادق آیا اور ہزاروں اور انسانوں پر بھی آتا ہے بہتیرے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے دعائیں کر کر کے لیتے ہیں پھر حقوق مال ادا نہیں کرتے اور مال کو اپنا معبود بنا لیتے ہیں۔ ان لوگوں کی سزا قرآن کریم نے یہ بیان کی ہے کہ ان کے دلوں میں نفاق پیدا ہو جاتا ہے ہاں اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منافقوں کے ساتھ کیسا جہاد تھا کہ ان میں سے ایک شخص حضرت عثمانؓ کی خلافت تک زندہ رہتا ہے وہ مدینہ میں یا اس کے پاس موجود ہے مگر اس کی سزا سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اس سے زکوٰۃ نہیں لی جاتی۔

ع۱۳۲۶ اس سے معلوم ہوا کہ نفاق کا ان کے دلوں میں پیدا ہونا خود ان کے پہلے اعمال کی سزا تھی کہ اللہ تعالیٰ سے عہد کر کے خلاف ورزی کرتے رہے ہر ایک خدائی مُہر بطور سزا ہی لگتی ہے۔ اسی کے مطابق ہی جو منافق کی علامات میں لکھا ہے کہ اذا وعد اخلف جب وہ وعدہ کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے واذا حدث کذب اور جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے جھوٹ بولنا اور وعدہ خلافی منافقت میں داخل ہیں۔

ع۱۳۲۷ مطوع اصل میں مُتَطَوِّع ہے ایسا شخص جو بطور تطوّع یا تبرع یعنی رضا و رغبت سے یا دل کھول کر دیتا ہے (ن) ان پر منافق طعن کرتے۔ کہ دکھاوے کے لیے بڑی بڑی رقوم دیتے ہیں۔
لا یجدون الا جہدھم جَہْد اور جُہد کے معنی مشقت ہیں (غ) مراد غریب لوگ ہیں جو سخت محنتیں کرتے مزدوری کرتے اور جو کماتے اس میں سے جو چند پیسے بچتے وہ لا کر خدا کی راہ میں حاضر کر دیتے۔ منافق ان پر ہنسی کرتے کہ بھلا اُن کے مٹھی بھر دانوں کا بھی خدا محتاج ہے۔
سخر اللہ منھم کے معنی ہیں جازاھم علی سخریتھم ان کی ہنسی کا ان کو بدلہ دے۔ جیسے اللہ یستھزی بھم میں دیکھو ع۲۷

مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٩﴾

دردناک عذاب ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ
تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ
اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ
ع رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٨٠﴾

اُن کے لیے بخشش مانگ یا ان کے لیے بخشش نہ مانگ۔ اگر تو ان کے لیے ستّر مرتبہ بھی بخشش مانگے تو اللہ ان کو نہیں بخشے گا یہ اس لیے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرتے ہیں اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ ع۱۳۲۸

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ
اللّٰهِ وَكَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ
وَاَنْفُسِهِمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا
تَنْفِرُوْا فِى الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ
حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨١﴾

جو پیچھے چھوڑے گئے وہ اللہ کے رسول کے خلاف بیٹھ کر خوش ہو نگے اور ناپسند کیا کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ اور کہا گرمی میں مت نکلو۔ کہہ دوزخ کی آگ گرمی میں بہت بڑھ کر ہے، کاش یہ سمجھتے۔ ع۱۳۲۹

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ
بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾

سو تھوڑا ہنسیں اور بہت روئیں۔ اس کی سزا جو وہ کماتے تھے۔ ع۱۳۳۰

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ
فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا
مَعِىَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِىَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ
رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا

پس اگر اللہ تجھے ان میں سے کسی گروہ کی طرف لوٹا کر لائے اور وہ نکلنے کے لیے تجھ سے اجازت مانگیں تو کہدے میرے ساتھ کبھی نہ نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے جنگ کرو گے تم پہلی مرتبہ بیٹھنے پر راضی ہو گئے، سو اب پیچھے رہنے

ع۱۳۲۸ اس آیت کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ منافقوں کی حالت ایسی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی صورت میں نہیں بخشے گا خواہ نبی ان کے لیے استغفار کرے یا نہ کرے۔ لیکن اس سے ممانعت استغفار نہیں نکلتی۔ اسلیۓ وہ حدیث صحیح اس آیت کے خلاف نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلعم نے عبداللہ بن ابیّ راس رئیس المنافقین کا جنازہ پڑھا۔ بلکہ حضرت عمرؓ کو جنھوں نے اس آیت کے مضمون کی طرف توجہ دلا کر روکنا چاہا۔ آپ نے فرمایا اخّرعنی یا عمر لوا علم انی لوزدت علی السبعین یغفر له لزدت علیھا اے عمر ہٹ جا اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ اگر میں ستّر سے زیادہ مرتبہ استغفار کروں تو اسے بخش دیا جائے گا تو میں ضرور ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کرتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ستر کا لفظ نبی کریم صلعم نے بھی عدد کامل کے معنی میں ہی لیا اور اس سے یہ مراد نہیں لی کہ ستر سے زیادہ بار استغفار ہو تو اللہ تعالیٰ بخشدے گا بلکہ یہ تو آپ جانتے تھے کہ اللہ تعالےٰ نے ایسا فرمایا ہے کہ استغفار کرو یا نہ کرو اللہ انہیں نہیں بخشے گا۔ اور اس سے پہلے سورۂ منافقون میں نازل ہو چکا تھا استغفر لہم اولا تستغفر لہم لن یغفر اللہ لہم جہاں سبعین مرۃ مذکور نہیں۔ پس یہ آپ کا استغفار اسی غلبۂ رحمت و شفقت سے تھا جس کی وجہ سے آپ رحمۃ للعالمین کہلائے کہ ایسی آیت کے ہوتے ہوئے راس الرئیس منافقین کی نماز جنازہ پڑھی۔ ہاں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کا یہ بھی ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مواعید کو بھی ٹال دیتا ہے۔ اسی بنا پر آپ نے یہ دعا کی۔ لیکن جب لا تصل (۸۴) کا حکم صریح آگیا تب آپ رک گئے۔ اگلا رکوع منافقوں سے قطع تعلق پر ہے۔

ع۱۳۲۹ المخلّفون۔ خَلَّفْتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اسے پیچھے چھوڑا پس مخلفون وہ ہیں جو پیچھے چھوڑے گئے اس لیے کہ انہوں نے جھوٹے عذر بنا کر اجازت حاصل کر لی تھی۔

خِلٰف۔ خَالَفَ سے مصدر ہے اور اس کے معنی مخالفت ہیں (غ۔ ج) یعنی رسول اللہ صلعم کی مخالفت میں یا مخالفت کی خاطر خوش ہوئے اور بعض نے خلف کے معنی بعد بھی کیے ہیں مگر پہلے معنی قابل ترجیح ہیں۔

ع۱۳۳۰ مطلب یہ ہے کہ یہ تو رسول اللہ صلعم کی اس مخالفت سے خوش ہو رہے ہیں۔ حالانکہ ان کو چاہیئے کہ اپنی اس حالت پر بہت روئیں اور تھوڑا ہنسیں۔ یعنی ان کی ایسی حالت کہ بُرے کام پر خوش ہو رہے ہیں رونے کے قابل ہے خوشی کا مقام نہیں۔ اور ضحک اور بکاء سے خوشی اور غم مراد ہیں۔ یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ خوش تو

مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿٨٣﴾

والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔١٣٣١

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨٤﴾

اور تُو ان میں سے کسی پر جو مرجائے نماز (جنازہ) کبھی نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑا ہونا، کیونکہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور وہ مر گئے اِس حالت میں کہ وہ نافرمان تھے۔١٣٣٢

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿٨٥﴾

اور ان کے مال اور ان کی اولاد تجھے تعجب میں نہ ڈالیں۔ اللہ یہی ارادہ کرتا ہے کہ ان کی وجہ سے ان کو دنیا میں عذاب دے اور ان کی جانیں نکل جائیں اور وہ کافر ہوں۔

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿٨٦﴾

اور جب کوئی سورت اُتاری جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کرو تو ان میں سے فراخی والے تجھ سے اجازت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں چھوڑ ہم بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ رہ جائیں۔

رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨٧﴾

وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی، سو وہ سمجھتے نہیں۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ؗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٨٨﴾

لیکن رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں اور انہی کے لیے (سب) بھلائیاں ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٨٩﴾ ع

اللہ نے اُن کے لیے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، انہی میں رہیں گے یہ بڑی بھاری کامیابی ہے۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ

اور دیہاتیوں میں سے بہانے کرنیوالے آئے کہ انھیں اجازت دی

ہو رہے ہیں مگر یہ ان کی خوشی بہت تھوڑے دن ہے اور آخر کار رونا یا غم ہی ہوگا۔

ع١٣٣١ فان رجعك الله ۔ کیونکہ یہ وحی اس حالت میں ہوئی، جب آپ سفر تبوک پر تھے۔

خالفین ۔ خالف کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں پیچھے رہنے والا النقصان یا قصور کی وجہ سے جیسے متخلف اور خالفۃ خیمہ کے پچھلے ستون کو کہتے ہیں اور کنایۃً عورت کو اس لیے کہ وہ کوچ کرنے والوں سے پیچھے رہ جاتی ہے اور اس کی جمع خوالف ہے (غ) جس کا استعمال (٨٧) میں ہوا ہے۔

یہ ان منافقین سے جو توبہ نہ کریں اور دین اسلام میں سچے دل سے داخل نہ ہوں تعلقات ظاہری کا انقطاع ہے کہ آیندہ ان کو کسی جنگ میں نکلنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔

ع١٣٣٢ یہ انقطاع تعلقات روحانی ہے کہ آپ کو ان کے جنازہ سے بھی روک دیا گیا۔ کیونکہ ان کی عداوت اب حد سے بڑھ گئی تھی اور اخفا کی حالت سے نکل چکی تھی۔ لاتقم علی قبرہ سے مراد قبر پر دعا کے لیے کھڑے ہونا ہے۔ اس آیت کا نزول عبداللہ بن ابی کے جنازہ کے واقعہ کے بعد کا ہے اور یہ متعدد احادیث سے جو بخاری اور دیگر صحاح میں ہیں ثابت ہے۔ چونکہ حضرت عمرؓ عبداللہ بن ابی کا جنازہ پڑھنے کو پسند نہ کرتے تھے اس لیے یہ ان مواقع میں سے ایک موقع ہے جن پر حضرت عمرؓ کی رائے کا وحی الٰہی سے توافق ہوا، یہاں سے ہی یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وحی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے خیالات کا نتیجہ نہ تھی۔ کیونکہ آپ کی شفقت تو جبلی تھی استغفر لھم اولا تستغفر لھم لن یغفر لھم کے ارشاد نے بھی آپ کو دعائے مغفرت کرنے سے نہ روکا کہ اللہ تعالیٰ بخشے یا نہ بخشے یہ اس کا اختیار رہا۔ آپ نے اپنی شفقت جبلی سے اور رحمت وسیع سے دعائے مغفرت بھی کی اور اپنی قمیص بطور تبرک عطا کر دی۔ اب اس کے خلاف وحی ہونا صاف بتاتا ہے کہ یہ آپ کی رائے اور خیالات سے الگ کوئی امر تھا۔

لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِينَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ ۚ سَيُصِيبُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۹۰﴾

جائے اور جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا وہ بیٹھے رہے[۱]۔ جو اُن میں سے کفر پر رہے انھیں دردناک دکھ پہنچے گا[۱۳۳۳]

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنْفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلّٰهِ وَرَسُولِهٖ ۚ مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ ۚ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۹۱﴾

نہ کمزوروں پر کوئی گناہ ہے اور نہ بیماروں پر اور نہ اُن پر جو خرچ کرنے کو کچھ نہیں پاتے جب وہ اللہ اور اس کے رسول سے اخلاص رکھیں نیکی کرنے والوں پر الزام کی، کوئی راہ نہیں، اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے[۱۳۳۴]

وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ ﴿۹۲﴾

اور نہ ان پر (الزام ہے) کہ جب وہ تیرے پاس آئے کہ تو انھیں سواری دے تو نے کہا مجھے کچھ نہیں ملتا جس پر تمھیں سوار کروں وہ واپس چلے گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اس غم سے کہ وہ (مال) نہیں پاتے جسے خرچ کریں[۱۳۳۵]

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ ۚ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۹۳﴾

الزام صرف ان پر ہے، جو تجھ سے اجازت مانگتے ہیں۔ حالانکہ وہ دولت مند ہیں۔ راضی ہو گئے کہ عورتوں کے ساتھ رہیں اور اللہ نے اُن کے دلوں پر مُہر لگادی سو وہ نہیں جانتے۔

ع[۱۳۳۳] معذرون۔ لسان العرب میں ہے کہ مُعْتَذِر سچا بھی ہوتا ہے اور جھوٹا بھی، یعنی محض عذر کرنے والا خواہ وہ عذر درست ہو یا غلط اور عَذَّر کے معنی قَصَّر ہیں یعنی کوتاہی کی اور مُعَذِّر وہ ہے جو عذر پیش کرے اور اس کا عذر درست نہ ہو یعنی جھوٹا عذر بنانے والا یا بہانہ کرنے والا۔

الاعراب۔ اصل میں عَرَب کی جمع ہے مگر یہ ان لوگوں کے لیے خاص ہو گیا ہے جو بادیہ کے رہنے والے ہوں (غ) ہمارے ہاں اس کے مقابل پر دیہاتی کا لفظ ہے یعنی گاؤں کے رہنے والے لوگ۔

اس رکوع میں بالخصوص ان لوگوں کا ذکر ہے جو بادیہ کے رہنے والے تھے اور جن میں ایسے بھی لوگ تھے جو منافقانہ طور پر اسلام کا دعویٰ کرتے تھے اور ایسے بھی تھے جو سچے دل سے مسلمان تھے جیسا کہ آیت ۹۹ سے ظاہر ہے۔ مجاہد کہتے ہیں یہاں جن کا ذکر ہے وہ بنی غفار کا ایک گروہ تھا وقعد الذین میں اسی گروہ کا ذکر ہے۔ اور کذبوا اللہ و رسولہ میں ان کے جھوٹے عذروں کا ذکر ہے۔ یعنی یہ لوگ جھوٹے عذر کر کے جنگ سے پیچھے رہ گئے۔

ع[۱۳۳۴] نصحوا۔ نَصَحَ الشئُ کے معنی ہیں خَلَصَ یعنی خالص ہوئی اور نُصْح غِشّ یعنی کھوٹ کی ضد ہے (ل) اور حدیث میں ہے الدِّيْنُ النَّصِيحَةُ لله و لرسوله ولكتابه ولائمة المسلمين وعامّتهم یعنی دین نصیحت ہے اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور اس کی کتاب کے لیے اور مسلمانوں کے ائمہ کے لیے اور ان کے عام لوگوں کے لیے۔ جس کی شرح ابن اثیر نے یوں کی ہے کہ نصیحۃ سے مراد ارادۂ خیر ہے اس کے لیے جو منصوح ہے یعنی جس پر وہ فعل نصیحت واقع ہوتا ہے۔ پس اللہ کے لیے نصیحت اس کی وحدانیت کا اعتقاد اور اس کی عبادت میں اخلاص اور رسول کے لیے نصیحت اس کی نبوت اور رسالت کی تصدیق اور جو امر یا نہی وہ دے اس کی فرمانبرداری ہے اور کتاب اللہ کے لیے نصیحت کتاب پر عمل اور آئمہ کے لیے نصیحت ان کی اطاعت فی المعروف اور عوام کے لیے نصیحت ان کو اچھی باتوں کی طرف ہدایت کرنا ہے اور توبۃ نصوحا (التحریم ۶۶-۸) کے معنی ہیں خالص توبہ جس کے بعد اس بات کی طرف لوٹ کر نہ جائے جس سے توبہ کی ہے (ل)

جب پچھلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر کیا جنھوں نے رسول اللہ صلعم سے جھوٹے عذر کر کے اجازت لے لی تھی کہ وہ جنگ میں نہ جائیں تو اب اس آیت اور اس سے اگلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر کیا جو فی الحقیقت معذور تھے۔ اس میں تین گروہوں کا ذکر کیا [۱] کمزور جیسے بچے بوڑھے۔ [۲] بیمار۔ [۳] وہ لوگ جن کے پاس خرچ کرنے کو موجود نہیں۔ ایسے لوگ جہادِ سیف میں معذور ہیں۔

ع[۱۳۳۵] لتحملهم۔ حَمَل کا لفظ اٹھانے کے معنی میں بہت سے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ گناہ کے اُٹھانے پر بھی استعمال ہوا

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَ سَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾

وہ تمھارے پاس بہانے لائیں گے جب تم لوٹ کر ان کی طرف جاؤ گے کہہ، بہانے مت بناؤ ہم تمھاری بات ہرگز نہ مانیں گے، اللہ نے تمھارے حالات کی خبر ہمیں دیدی ہے اور اللہ اور اس کا رسول تمھارے عمل کو دیکھے گا، پھر تم غائب اور حاضر کے جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو وہ تمھیں خبر دے گا جو تم کرتے تھے[1336]

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ؗ وَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾

وہ تمھارے پاس اللہ کی قسمیں کھائیں گے جب تم اُن کی طرف واپس جاؤ گے تاکہ تم اُن سے درگزر کرو، سو اُن سے درگزر کرو وہ ناپاک ہیں اور اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے، اس کا بدلہ جو وہ کرتے تھے[1337]

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ

وہ تمھارے پاس قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، سو اگر تم اُن سے راضی ہو جاؤ تو اللہ نافرمان لوگوں

ہے۔ مگر یہاں جس خاص موقع پر استعمال ہوا ہے اس کی تشریح میں لسان العرب میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنے سفر کو جاری نہ رکھ سکے تو وہ دوسرے کے پاس جاتا اور کہتا ہے اِحْمِلْنِیْ تو مراد ہوتی ہے کہ مجھے سواری کا جانور دو۔

تفیض من الدمع۔ فاض پانی کے بہنے پر بولا جاتا ہے جب وہ گر رہا ہو اسی معنی میں یہاں تفیض ہے اور دوسری جگہ ہے افیضوا علینا من الماء (الاعراف۔ ۵۰) اور اسی سے فیّاض سخی کو کہا جاتا ہے اور اسی سے افاضوا فی الحدیث استعارۃً بات میں لگ جانے کے معنی میں ہے لمسّکم فیما افضتم فیہ (النور ۲۴۔ ۱۴)

یہ ان لوگوں میں سے جو اس جنگ میں جانے میں فی الواقع معذور تھے چوتھا گروہ ہے۔ کسی نے کہا یہ بنو مقرن تھے جو مزینہ میں سے تھے کسی نے کہا عرباض بن ساریہ کا ذکر ہے کسی نے کہا مختلف قبیلوں کے سات آدمی تھے (ج) کسی نے ابو موسیٰ اشعری اور بعض اہل یمن کو اس کا مصداق ٹھہرایا (ر) ممکن ہے یہ سب ہی ہوں تخصیص کی ضرورت نہیں۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ ہر موقع پر اس کے مناسب حال انتظام نہ ہونے سے انسان معذور ہوتا ہے۔ چونکہ یہ لمبا سفر تھا بغیر سواری کے نہ پہنچا جا سکتا تھا اس لیے سواری کا نہ ملنا بھی صحیح عذر تھا۔

لیکن جو نقشہ یہاں ان معذورین کا کھینچا ہے وہ صحابہؓ کے قلب کی کیفیت کا ایک عجیب نقشہ ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جن کے پاس خرچ کرنے کو ہے وہ خوشی سے اللہ کی راہ میں دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب خرچ کرنے کو نہیں پایا اور رسول اللہ صلعم بھی سواری مہیا نہ فرما سکے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جذبہ محبت جو رسول اللہ صلعم کی فرمانبرداری کراتا تھا کس قدر زبردست تھا۔ آج مسلمانوں کی انفاق مال میں یہ حالت ہے کہ اوّل تو اسلام کی حالتِ زار دیکھ کر اسے چاروں طرف سے مصیبتوں میں مبتلا پاکر بھی ان کے دل دینے کے لیے نہیں پگھلتے اور اس قدر دل سخت کر لیتے ہیں کہ ایک پیسہ تک جیب سے نہیں نکلتا اور جو کچھ دیتے ہیں تو وہ بھی ایک گونہ جبر و اکراہ سے۔ دل نہیں چاہتا مگر لحاظ سے یا اور وجوہ سے کچھ دینا پڑتا ہے اسلام اس مقام کو چاہتا ہے کہ جو دے اس کا دل خوشی سے بھرا ہوا ہو کہ اس نے کچھ خدمت کی اور جو نہ دے سکے اس لیے کہ اس کے پاس نہیں اس کا دل غم سے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ہوں۔

ع ۱۳۳۶ چونکہ ان آیات کا نزول سفر تبوک میں ہوا، اس لیے پہلے باطل عذروں کے ساتھ جو اجازت کے لیے ان لوگوں نے کیے تھے جن کا ذکر جاء المعذرون (۹۰) میں ہے یہاں ان عذروں کا ذکر کیا ہے جو جنگ سے واپسی کے بعد پھر یہ لوگ کرینگے پہلی دفعہ یہ عذر قبول کر لیے گئے اب فرمایا کہ کہدو کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی سے تمہارے معاملہ پر روشنی ڈالی ہے اور تمہارا فیصلہ کر دیا ہے اس لیے اب عذر بے سود ہے۔

ع ۱۳۳۷ منافقوں سے اعراض: ان کی قسمیں کھانے کی غرض یہ بتائی کہ مسلمان ان سے اعراض کریں یعنی ان کو ان کی کمزوریوں پر ملامت نہ کریں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم ان سے اعراض ہی کرو یعنی کسی قسم کا تعلق نہ رکھو اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ وہ ناپاک ہیں یعنی ان کے خیالات ناپاک ہیں وسوسہ اندازی ان کا کام ہے

الْفٰسِقِيْنَ ﴿٩٦﴾

سے راضی نہیں ہوتا۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٩٧﴾

دیہاتی کفر اور نفاق میں بڑے سخت ہیں اور اسی کے زیادہ لائق ہیں کہ اس کی حدوں کو نہ جانیں جو اللہ نے اپنے رسول پر اتارا ہے اور اللہ علم والا حکمت والا ہے ۱۳۳۸

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٩٨﴾

اور بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اُسے چٹی سمجھتے ہیں اور تم پر زمانہ کی گردشوں کی تاک میں رہتے ہیں بُری گردش انھیں پر پڑے گی اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۱۳۳۹

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩٩﴾ ع

اور بعض گاؤں والے ایسے بھی ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں قرب اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ ٹھیراتے ہیں، سنو وہ ان کے لیے قرب کا ذریعہ ہے اللہ انھیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۳۴۰

ع۱۳۳۸ اجدر۔ جدیر ایک چیز کا منتہی ہے یعنی جس کی طرف ایک امر کا انتہا ہو جس طرح جدار یعنی دیوار کی طرف ایک امر کا انتہا ہو جاتا ہے اور جدار دیوار کو بلحاظ اس کی بلندی کے کہا جاتا ہے اور حائط احاطہ کرنے کے لحاظ سے جدارا یرید ان ینقض (الکھف ۱۸-۷۷) جمع جدر ہے او من وراء جدر (الحشر ۵۹-۱۴) اور اس لیے جدیر کے معنی ہیں گویا وہ اسی چیز کے لیے بنائے گئے ہیں۔

یہ قرآن شریف کا کمال تھا کہ ایسے سخت لوگوں کو بھی جو علم سے اس قدر دور تھے کہ حدود اللہ کا علم حاصل کرنے کیلئے گویا پیدا ہی نہیں ہوئے ان کو بھی حدود اللہ پر قائم کر دکھایا۔ اعراب کے اس نقشہ میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ دنیا کی کوئی قوم نہیں جس کی اصلاح قرآن شریف نہیں کر سکتا۔

ع۱۳۳۹ مغرمًا۔ غرم وہ ہے جو انسان کو اس کے مال میں نقصان پہنچے حالانکہ اس کا اپنا کوئی ایسا فعل نہیں نہ خیانت ہے یہاں اور انا لمغرمون (الواقعۃ ۵۶-۶۶) میں چٹی مراد ہے اور قرضدار کو غارم یا غریم کہا جاتا ہے والغارمین (التوبۃ ۹-۶۰) اور غرام اس شدت اور مصیبت کو کہا جاتا ہے جو انسان پر آپڑے گویا وہ اس سے ایسا چمٹ جاتا ہے جیسے غریم۔ ان عذابها کان غراما (الفرقان ۲۵-۶۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین کو ظاہرداری کے لیے کچھ مال بھی خرچ کرنا پڑتا تھا اسے وہ چٹی سمجھتے تھے۔ بہتیرے مسلمان جو آج کچھ دینی کاموں میں خرچ کرتے ہیں اسے چٹی سمجھتے ہیں۔ قرآن نہیں پڑھتے کہ ان کو معلوم ہو کہ وہ صحابہؓ کے نقش قدم پر نہیں چلتے اور منافقین کا خرچ کیے ہوئے مال کو چٹی سمجھنا اس وجہ سے تھا، جیسا کہ خود بتایا کہ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان ہلاک ہو جائیں گے۔ یہ نویں سال ہجرت کی آیت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک بھی مخالفین کو یہ امید لگی ہوئی تھی کہ مسلمان تباہ ہو جائیں گے اس لیے اسلام میں داخل ہونا کسی لالچ کی بنا پر نہ ہو سکتا تھا۔

ع۱۳۴۰ قربات۔ قُرْبَۃ کی جمع ہے۔ ہر ایک قدم جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرتا ہے قُرْبَۃ ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب بندہ پر فیض اور افضال سے ہے، نہ مکان سے اور قُرب اصل میں یہ ہے کہ بہت سی وہ صفات جو اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں ان سے بندہ مخصوص ہو گو اس حد تک وہ صفات اس میں نہ پائی جائیں، جس حد تک اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں جیسے حکمت اور علم اور حلم اور رحمت اور غنا اور یہ تب ہوتا ہے جب پہلے انسان جہل اور طیش اور غضب وغیرہ بُری صفات سے پاک ہو (غ)

صلوٰت۔ صلوٰۃ کی جمع ہے جس کے اصل معنے دعا ہیں۔ دیکھو ع۱۲ یہی معنی یہاں مراد ہیں۔

قرآن کریم کا پیدا کردہ انقلاب: یہاں نہ صرف ایک حق بات کو ظاہر کیا کہ اعراب ہیں یا دیہاتیوں میں اگر سخت لوگ ہیں تو اچھے بھی ہیں بلکہ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ کس طرح قرآن کریم کی بدولت ایک قوم ایک ایسے ذلیل مقام سے جس پر عرب کے دیہاتی تھے بلند مقام پر ترقی کر گئی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا حاصل کرنا ان لوگوں کی غرض ہو گئی گویا کوئی دنیوی غرض نہیں کہ اس طرح مال خرچ کرنے سے حکومت اور سلطنت مل جائے گی بلکہ محض قرب الٰہی کا حصول غرض ہے ــــ یہ فی الواقع بڑا ہی بلند مقام ہے آج کتنے مسلمان ہیں جو قرب الٰہی کے حصول کے لیے اپنے مالوں کو خرچ کرنے کے لیے تیار ہوں ہاں حکومت اور سلطنت کے حصول کے لیے

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

اور پہلے سبقت لے جانے والے مہاجرین اور انصار میں سے اور وہ جنھوں نے نیکی میں ان کی پیروی کی اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے، اور اس نے ان کے لیے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ انھیں میں ہمیشہ رہیں گے یہ بڑی کامیابی ہے [۱۳۴۱]

بہتیرے اپنے مال دینے کو تیار ہیں کاش مسلمانوں کے ایڈر اس بات پر غور کر کے قوم کو صحیح راہ پر ڈالیں۔ صلوٰت الرسول کا لفظ یہاں لا کر یہ بتایا ہے کہ گناہوں کے پاک کرنے میں رسول اللہ صلعم کی دعاؤں نے بھی ایک عظیم الشان کام کیا ہے اور قرب الٰہی آپ کی دعا کے بغیر میسّر نہیں آ سکتا۔ آپ کی یہ قوتِ قدسی اور یہ دعا اور توجہ اب بھی کام کرتی ہے۔ جو لوگ پیروں کے پیچھے پڑ کر ان کو ارباب من دون اللہ بنا رہے ہیں اور اپنے اموال کو ان کی نذروں نیازوں میں تباہ کرتے ہیں۔ اگر یہی اموال دین اسلام کی ترقی کے لیے خرچ کرتے تو رسول اللہ صلعم کی دعا ان کو بھی اللہ تعالیٰ کے قرب کے مقام پر پہنچا دیتی مگر یہ افسوس کا مقام ہے کہ ایک طرف یہ لوگ اپنے اموال کو برباد کرتے ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ سے بھی روز بروز دُور پڑتے چلے جاتے ہیں۔ رسول کے دین کی ترقی میں جو شخص کوشاں ہوگا وہ یقیناً قرب الٰہی کے حصول میں ترقی کرے گا۔ یہی وہ طریق ہے جس پر رسول اللہ صلعم نے اپنے صحابہؓ کو چلایا اور یہی ہم کو صحابہؓ کی زندگیوں میں کام کرتا نظر آتا ہے۔ ایک بھی مثال ایسی نہیں کہ صحابہؓ میں کوئی پیر بن کر لوگوں کا مال نذر و نیاز کے رنگ میں کھاتا ہو۔

۱۳۴۱ سابقون۔ سَبْق کے اصل معنی چلنے میں آگے بڑھنا ہیں۔ اور اِسْتِبَاق ایک دوسرے سے آگے بڑھنا انّا ذھبنا نستبق (یوسف ۱۲۔ ۱۷) واستبقا الباب (یوسف ۱۲۔ ۲۵) اور پھر ہر قسم کے تقدم پر بولا جاتا ہے ماسبقونا الیہ (الاحقاف ۴۶۔ ۱۱) اور کلمۃ سبقت من ربّک (یونس ۱۰۔ ۱۹) میں مراد فوز یا پہلے ہو چکنا ہے اور فضیلت اور بزرگی کے حاصل کرنے پر بولا جاتا ہے السابقون السابقون (الواقعۃ ۵۶۔ ۱۰) سے مراد اعمال صالحہ سے ثواب اور جنّت کی طرف پہلے جانیوالے ہیں گویا یہ یسارعون فی الخیرات کے قائم مقام ہے وھم لھا سٰبقون (المؤمنون ۲۳۔ ۶۱) میں یہی مراد ہے اور ما نحن بمسبوقین (الواقعۃ ۵۶۔ ۶۰) میں مراد ہے کہ وہ ہمارے ہاتھ سے نکل نہیں سکتے۔ ایسا ہی ولا تحسبن الّذین کفروا سبقوا (الانفال ۸۔ ۵۹)

اولون۔ اَوّل۔ اَوْل سے ہے جس کے معنی ہیں اصل کی طرف رجوع کرنا۔ اور اوّل وہ ہے جس پر اس کا غیر مترتب ہو۔ اور اوّل ہونا کئی لحاظ سے ہو سکتا ہے جیسے زمانہ کے لحاظ سے جو عام ہے یا ریاست اور مرتبہ کے لحاظ سے جیسے اول امیر ہے پیچھے وزیر وغیرہ اور انا اوّل المسلمین (الانعام ۶۔ ۱۶۴) انا اوّل المؤمنین (الاعراف ۷۔ ۱۴۳) میں مراد یہ ہے کہ اسلام اور ایمان میں دوسروں کو میرا اقتدا کرنا چاہیئے اور لاتکونوا اوّل کافر بہٖ (البقرۃ ۲۔ ۴۱) میں بھی یہی مراد ہے کہ ایسے کافر مت بنو کہ دوسرے تمہارا اقتدا کریں۔

مہاجرین۔ مہاجر کے لیے دیکھو ع ۲۸۰ مہاجرین اصطلاح اسلام میں وہ لوگ ہیں جن کو رسول اللہ صلعم کے اتباع کی وجہ سے اپنے وطن چھوڑنے پڑے، یہاں تک کہ فتح مکّہ کے بعد عموماً ترک وطن کی ضرورت نہ رہی۔

انصار نصیر کے معنی ناصر یا مدد کرنے والا اور اس کی جمع انصار ہے مگر اصحاب نبی صلعم کے ایک گروہ کے لیے یہ خاص نام ہو گیا ہے جیسے ایک قبیلہ کا نام ہوتا ہے (ل) اور یہ اہل مدینہ کا وہ گروہ ہے جن کی وجہ سے دین اسلام کو وہ عظیم الشان نصرت ملی کہ سب مسلمان ہجرت کر کے وہاں چلے گئے۔

رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ اللہ کی رضا بندہ سے یہ ہے کہ وہ اسے اپنے اوامر کی تعمیل کرتا ہوا اور اپنی نہیوں سے رکتا ہُوا پائے اور بندہ کی رضا اللہ سے یہ ہے کہ جو کچھ اس کی قضا و قدر سے اس پر وارد ہو اسے ناپسند نہ کرے (غ)

اصل ذکر تو اس رکوع میں انہی لوگوں کا ہے جن سے کوئی کمزوریاں سرزد ہوئیں یا جو منافق تھے لیکن چونکہ پچھلے رکوع کے آخر میں اعراب کے اس گروہ کا ذکر آیا تھا جو اللہ تعالیٰ کا قرب چاہنے کے لیے اپنے مال خرچ کرتے تھے۔ اس لیے یہاں ان کامل مومنین کے گروہ کا ذکر بھی کیا جو دوسرے مسلمانوں کے لیے بطور مقتدا ٹھہرے اور یہ گروہ مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین کا ہے۔ سابقون اوّلون سے کیا مراد ہے، بعض نے کہا وہ جنھوں نے دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی۔ بعض نے کہا اہلِ بدر، بعض نے اہل بیعت رضوان۔ بعض نے کہا جو ہجرت سے پہلے ایمان لائے اور انصار میں سے سابق اوّل اہل بیعت عقبہ اولیٰ و ثانیہ کو کہا ہے، لیکن اکثر اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد کل مہاجرین اور انصار ہیں اور سابق اوّل ہونا بلحاظ دوسرے مسلمانوں کے ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ سابق اور اوّل ہونے میں گو زمانہ کو بھی خاص دخل حاصل ہے اس لیے کہ جس قدر زیادہ مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اسی قدر زیادہ کمال ایمان بھی ان لوگوں کو حاصل ہوا اور جو لوگ پہلے ایمان لائے ان میں سے اکثر نے بہت بڑی بڑی ترقیاں کیں مگر سابق اور اوّل سے اصل مراد جیسا کہ ان الفاظ کی تشریح میں دکھایا گیا ہے اعمال صالحہ کے لحاظ سے سابق ہونا اور دوسروں کے لیے مقتدا ہونے کے لحاظ سے اوّل ہونا ہے۔ یوں بلحاظ زمانہ عبید اللہ مہاجرین اوّلین میں سے تھا مگر نصرانی ہو گیا۔ اس لیے حقیقتاً سابقون اولون بلحاظ زمانہ نہیں، بلحاظ اعمال ہیں۔ اسی لیے جب ان کے اتباع کا ذکر کیا تو باحسان کا لفظ بڑھایا۔ یا نیکیوں میں ان کی اتباع کرنے والے گویا ان کا تقدم اور ان کی سبقت نیکیوں کے

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛؔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۟ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۚ﴿۱۰۱﴾	اور بعض تمھارے اردگرد کے دیہاتیوں میں سے منافق ہیں اور بعض مدینے کے رہنے والے بھی نفاق پر اڑے بیٹھے ہیں - تو ان کو نہیں جانتا ، ہم انھیں جانتے ہیں ہم ان کو دو بار عذاب دیں گے پھر وہ بھاری عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے ۱۳۴۲ؔ
وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾	اور کچھ اور ہیں جنھوں نے اپنے قصور مان لیے ایک نیک کام اور دوسرا بُرا ملایا ، قریب ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرے اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۳۴۳ؔ

لیے میں تھی - یہ سابقین مقربین بارگاہ الٰہی ہیں والسابقون السابقون اولئك المقربون (الواقعة ۵۶ - ۱۰و۱۱) اور جنھوں نے احسان میں ان کی پیروی کی ان کو بھی ان کے ساتھ یہ مرتبہ ملا کہ اللہ ان سے راضی ہُوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور یہ بلند ترین مقام ہے جس پر انسان پہنچ سکتا ہے - اور فی الحقیقت جو کمال صحابہؓ نے اللہ کے اوامر و نواہی کی تعمیل میں دکھایا اس کی نظیر دنیا دکھانے سے عاجز ہے - قرآن کریم میں کوئی حکم نازل نہیں ہُوا جس کی تعمیل انہوں نے لفظاً نہیں کر دکھائی اور پھر اللہ تعالیٰ کے قضا و قدر پر ایسے راضی ہوئے کہ سر دیکر، جان دیکر، مال دیکر، اولاد دیکر خوش ہوتے تھے ۔

ع۱۳۴۲ مردوا - مارِد اور مَرِید کے معنی راغب نے کیے ہیں خیرات سے خالی اور اسی سے اَمْرَد وہ ہے جس کی ڈاڑھی کے بال ابھی نہ نکلے ہوں اور حدیث میں جو ہے اهل الجنة مُرْدٌ تو اس کے ایک معنی یہ کیے گئے ہیں کہ وہ برائیوں اور عیبوں سے خالی ہوں گے اور مردوا علی النفاق کے معنی کیے ہیں اِرْتَكَسُوا عن الخيرِ وهم علي النفاق یعنی نیکی سے محروم رہ گئے درانحالیکہ وہ نفاق پر تھے (رغ) اور مَرَدَ کے معنی مَرَنَ بھی ہیں یعنی عادی ہو گیا اور مَرَدَ علی الشرِّ کے معنی ہیں عنا و طغی یعنی سرکشی کی اور حد سے بڑھ گیا (ل)

منافقین کی سزا : چونکہ اصل ذکر اعراب یعنی بادیہ نشین منافقین کا چل رہا تھا - اس لیے اسی مضمون کی طرف رجوع کیا ہے اور فرمایا کہ ان میں سے تو منافق ہیں مگر اہل مدینہ میں سے جو شہری لوگ ہیں وہ نفاق پر سخت اڑے بیٹھے ہیں ان کا نفاق اس وقت سے شروع ہوا جب نبی کریم صلعم مدینہ میں تشریف لائے اور اب نویں سال تک انہوں نے اپنی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تھی اور گو ان کے عمل سے ان کی حالت ظاہر تھی مگر تاہم یہ لوگ اس قدر چالاک تھے کہ مسلمانوں کے سامنے قسمیں کھا کھا کر اپنا مومن ہونا ظاہر کرتے تھے - (اتخذ وا ایمانهم جنة (المنافقون ۶۳ - ۲) اس لیے فرمایا کہ تم انہیں نہیں جانتے ہم جانتے ہیں - اور ہم جانتے ہیں میں یہ اشارہ ہے کہ ہم اب تمہیں ان کے نام بتاتے ہیں یہی وہ لوگ تھے جنہیں مسجد سے نکال دیا گیا - اور ان کی سزا بتائی کہ دو دفعہ ان کو عذاب دیں گے پھر عذاب عظیم کی طرف لوٹائے جائیں گے - عذاب عظیم آخرت کا عذاب ہے اس لیے دو دفعہ کا عذاب اس دنیا میں ہونا چاہیئے اکثر مفسرین نے اس دو دفعہ میں عذاب قبر کو شامل کیا ہے حالانکہ عذاب قبر عذاب آخرت میں شامل ہے اور وہ منافقوں سے خاص نہیں - اور ایک عذاب پر حضرت ابن عباسؓ سے روایت موجود ہے کہ آنحضرت صلعم نے خطبۂ جمعہ میں ان منافقوں کے نام لیکر ان کو مسجد سے نکال دیا یہ ان کی رسوائی ان کے لیے واقعی سخت عذاب کا موجب تھی اس لیے کہ اب تک وہ اپنی منافقت کو جھوٹی قسمیں کھا کر چھپاتے تھے - اب وہ سب پردہ فاش ہو گیا اور دوسرے عذاب پر قرآن کریم اپنی نص صریح سے شاہد ہے ولا تعجبك اموالهم واولادهم انما يريد الله ان يعذبهم بها في الدنيا (۸۵) ان منافقوں کے مال اور اولاد تجھے تعجب میں نہ ڈالیں اللہ چاہتا ہے کہ ان کے ساتھ انہیں دنیا میں عذاب دے اور یہ یوں عذاب کا موجب تھا کہ ان کی اولاد اُن کی آنکھوں کے سامنے مسلمان بنی اور اسلام کی تائید اور نصرت میں جانوں تک دیتے تھے اور ان کو مال بھی ظاہرداری کے لیے اسلام کی تائید میں خرچ کرنے پڑتے تھے جیسا کہ آیت ۹۸ سے ظاہر ہے جہاں فرمایا کہ وہ اس خرچ کو چٹی سمجھتے ہیں - دل سے تو اسلام کے دشمن تھے اور اسلام کی تباہی چاہتے تھے اور ان کے مال اور اولاد اسلام کی تائید میں خرچ ہو رہے تھے اس سے بڑھ کر عذاب کیا ہو سکتا تھا پس یہی دو عذاب دنیا تھے ۔

ع۱۳۴۳ اعترفوا - عَرَفَ کے معنی پہچانا یا جان لیا - اور اِعْتَرَفَ کے معنی اقرار کیا اور اصل اس کا گناہ کی معرفت کا اظہار ہے جو جحود کی ضد ہے (رغ) اور اعترف بمعنی عَرَفَ بھی آتا ہے (ل) اور اعتراف ذنب کے لازمًا یہ معنی نہیں کہ گناہ کر کے دوسروں پر ظاہر کرتا پھرے بلکہ رسول اللہ صلعم کے سامنے ایک شخص نے آکر اپنے کسی گناہ کو ظاہر کیا تھا تو آپ نے منہ پھیر لیا اور دو دفعہ اسی طرح کیا گویا اس کو پسند نہ کیا اور حضرت عمرؓ کا قول منقول ہے اَطْرُدُوا الْمُعْتَرِفِينَ یعنی جو لوگ ان باتوں کو جن میں حد اور تعزیر واجب ہے خود ظاہر کرتے ہیں ہم ان کو شہر سے نکال دیں گے گویا اسے ناپسند کیا (ل) اصل اعتراف ذنب یہ ہے کہ انسان کا اپنا نفس یہ محسوس کرے کہ اس سے ایک بُرا فعل سرزد ہوا ہے اور اس کے ازالہ کی کوشش کرے یہی اقرار ہے ۔

منافقوں کی توبہ : مفسرین نے یہاں ابولبابہ اور بعض دوسرے لوگوں کا ذکر کیا ہے ، مگر یہ سب بطور مثال ہے قرآن کریم نے منافقوں کے ذکر کو یہاں ہر پہلو سے پورا کر دیا ہے - چونکہ یہاں

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ
وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَ صَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ
سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

ان کے مالوں سے زکوٰۃ لے لے تاکہ اس سے تو انھیں پاک اور صاف کرے، اور ان کے لیے دعا کر، کیونکہ تیری دعا اُن کے لیے تسکین ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے[۱۳۴۴]

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ
عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰهَ
هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور زکوٰۃ لے لیتا ہے اور کہ اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے[۱۳۴۵]

وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ
وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى
عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

اور کہہ عمل کرو اللہ تمھارے عمل کو دیکھے گا اور اس کا رسول اور مومن بھی۔ اور تم غائب اور حاضر کے جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے، سو وہ تمھیں خبر دے گا جو تم عمل کرتے تھے[۱۳۴۶]

وَ اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ
وَ اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

اور کچھ اور اللہ کے حکم کے لیے پیچھے رکھے گئے ہیں یا انھیں عذاب دے اور یا ان کی توبہ قبول کرے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے[۱۳۴۷]

منافقوں کی سزا کا ذکر تھا اور اوپر اُن منافقوں کا ذکر ہوا جو نفاق پر اڑ گئے اور ان کی فضیحت کا ذکر تھا تو اب ایک اور گروہ کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا اور ان کی اصلاح کی کوشش کی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخت دشمن اسلام نہ تھے یا کمزوری کی وجہ سے منافقین سے ملے ہوئے تھے اور سوائے ان تھوڑوں کے جنکے نام لیکر انہیں مسجد سے نکالا گیا بڑا حصہ منافقوں کا ایسا ہی تھا جو سچے دل سے مسلمان ہو گئے اور عسی اللہ ان یتوب علیھم میں جو امید دلائی ہے وہ ان کے حق میں پوری ہوئی۔

ع۱۳۴۴ تطھرھم وتزکیھم۔ تطہیر اور تزکیۃ میں فرق یہ ہے کہ طُہر نجاست کا نقیض ہے اور تطہیر کے معنی نجاست سے پاک کرنا ہیں اور تزکیۃ کا اصل زکا ہے جو نمو پر بولا جاتا ہے اور اس لیے تزکیۃ کے معنی ہیں خیرات اور برکات سے نفس کو ترقی دینا۔ پس تطہیر صرف برائیوں سے پاک کرنا ہے اور تزکیہ نیکیوں میں ترقی کرنا۔

صل علیھم میں یہاں صرف دعا مراد ہے یعنی ان کے لیے استغفار کرو، نماز جنازہ مراد نہیں۔

توبہ کرنے والے منافقوں سے زکوٰۃ کا لینا اور مسلمانوں کے لیے سبق: یہاں رسول اللہ صلعم کو یہ حکم دیکر کہ ان کے مالوں سے زکوٰۃ لیلو یہ بھی بتا دیا ہے کہ آیت ۱۰۱ کے منافقوں سے جنہیں مسجد سے نکال دیا گیا زکوٰۃ نہیں لینی چاہیئے جو مسلمان زکوٰۃ ادا نہیں کرتے وہ غور کریں کہ ان کا حشر کس گروہ میں ہوگا۔ نام کا مسلمان کہلانا کوئی فائدہ نہ دیگا جس طرح منافقوں کو فائدہ نہ دیا۔ پھر اس زکوٰۃ لینے کا فائدہ یہ بتایا کہ اس سے ان کی تطہیر اور ان کا تزکیہ ہوگا یعنی جو گناہ کر چکے ہیں ان سے پاک ہونگے اور آیندہ نیکیوں میں ترقی کریں گے اور نبی کریم صلعم کو ان کے لیے دعا کا حکم دیا۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلعم کے پاس جب زکوٰۃ کا مال آتا تو آپ دینے والے کے لیے دعا کرتے اور اسی طرح جو امام ہو اس پر واجب ہے دعا کو دوسروں کے لیے موجب تسکین فرمایا ہے۔

ع۱۳۴۵ یاخذ الصدقات۔ اَخذ کے معنی لے لینا ہیں لیکن یہاں اللہ تعالیٰ کا صدقات کو لینا استعارۃً بمعنی قبولیت ہے۔

ع۱۳۴۶ اللہ تعالیٰ تو اعمال کو دیکھتا ہی ہے مطلب یہ ہے کہ تمہیں آیندہ اپنے صدق اور اخلاص کا ثبوت دینا ہوگا دوسری جگہ فرمایا قل للمخلفین من الاعراب ستدعون الی قوم اولی باس شدید تقاتلونھم او یسلمون (الفتح ۴۸-۱۶) اور چونکہ یہاں بھی پیچھے فرمایا تھا کہ آیندہ یہ منافق جنگ میں ساتھ نہ نکلیں (۸۳) اس لیے جنھوں نے توبہ کی ان کو پھر موقعہ ملتا ہے کہ اسلام کے لیے اپنے صدق اور اخلاص کو دشمن کے مقابلہ میں نکل کر دکھائیں۔ اس لیے اللہ کے ساتھ رسول اور مومنوں کا لفظ بڑھایا ہے یعنی وہ اس قسم کے عمل ہونگے جن کو رسول اور مومن بھی دیکھ سکتے ہیں اور وہ جنگوں میں نکلنا ہے۔ آج بھی مسلمان اپنے اخلاص کا ثبوت اسی طرح دے سکتے ہیں کہ خدا کی راہ میں اور اس کے دین کی ترقی کے لیے اپنے مالوں کو بے دریغ خرچ کریں اور اپنی جانیں دیدیں۔

ع۱۳۴۷۔ مرجون۔ اَرجأ الامر کے معنی ہیں اَخرہٗ یعنی اسے پیچھے ڈال دیا اور ہمزہ ترک بھی کر دیا جاتا ہے (ل)

منافقین سے تشابہ: یہ کون تھے؟ ابن عباس مجاہد عکرمہ وغیرہ اسی طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد وہی تین شخص ہیں جن کا ذکر آیت ۱۱۸ میں ہے مگر اس رکوع میں منافقین کا ذکر ہے اور ان تین کا ذکر آگے چل کر مومنوں کی ذیل میں بھی کیا ہے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان تینوں نے غزوۂ تبوک میں شمولیت پر اپنے آرام کو مقدم کیا اور یوں منافقوں کے ساتھ خود تشبیہ پیدا کر لی۔ اس لحاظ سے ان کا ذکر یہاں کیا اور ان کی توبہ کا ذکر مومنوں کی ذیل میں کیا تاکہ یہ معلوم ہو کہ وہ فی الواقع منافقین میں شامل نہ تھے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿١٠٧﴾

اور کچھ وہ ہیں جنھوں نے ضرر اور کفر اور مومنوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے مسجد بنائی اور اس شخص کے لیے گھات جس نے پہلے سے اللہ اور اسکے رسول کے ساتھ لڑائی کی اور وہ یقیناً قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا ارادہ سوائے بھلائی کے کچھ نہ تھا۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں ۱۳۴۸ؑ

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿١٠٨﴾

اس میں کبھی کھڑا نہ ہو یقیناً وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقوے پر رکھی گئی ہے زیادہ لائق ہے کہ تو اس میں کھڑا ہو اس میں ایسے لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ پاک رہیں اور اللہ پاک رہنے والوں سے محبت کرتا ہے ۱۳۴۹ؑ

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾

تو کیا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے تقوے اور رضا پر رکھی اچھا ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک کھوکھلے گرتے ہوئے کنارے پر رکھی سو وہ اس کو جہنم کی آگ میں لے گرا اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۱۳۵۰ؑ

ع۱۳۴۸ اس آیت میں منافقوں کے اس گروہ کا ذکر ہے جنہوں نے وہ مسجد بنائی جو مسجد ضرار کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بارہ آدمی تھے جنہوں نے ابوعامر راہب کی سازش سے ایک مسجد قبا کے پاس بنائی۔ ابوعامر خزرج میں سے ایک شخص تھا جو زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہوگیا۔ اور بوجہ اس کی عبادت کے خزرج اس کی عزت کرتے تھے۔ جب بدر میں رسول اللہ صلعم کو فتح ہوئی تو ابوعامر بھاگ کر قریش سے جا ملا اور ان کو رسول اللہ صلعم کی جنگ کے لیے اُکسایا اور اُحد میں خود بھی آیا۔ اور انصار کو ورغلانا چاہا مگر نامراد رہا۔ آخر جب رسول اللہ صلعم کے امر کو غالب ہوتے دیکھا تو ملک شام میں چلا گیا تاکہ ہرقل سے رسول اللہ صلعم کے خلاف مدد لے اور وہاں سے کچھ وعدہ پاکر اس نے اپنی قوم کے بعض آدمیوں کو خط لکھا کہ وہاں ایک علیحدہ مسجد بنائیں جہاں منصوبہ بازی کا کام آسانی سے ہوسکے۔ اسی بنا پر یہ مسجد بننی شروع ہوئی۔ رسول اللہ صلعم تبوک کے لیے تیار تھے جب یہ لوگ رسول اللہ صلعم کے پاس آئے کہ آپ اس میں نماز پڑھیں، آپ نے فرمایا سفر سے واپسی پر دیکھا جائے گا۔ واپسی پر مدینہ سے تھوڑے سے فاصلہ پر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وحی کے ذریعہ سے اصل حقیقت سے آپ کو اطلاع دی اور آپ نے اس مسجد کو گروا دیا۔ اس کے بنانے کی اوّل غرض ضرارا فرمائی، یعنی مسلمانوں کو ایذا پہنچانا۔ سو ظاہر ہے دوسری غرض کفر کا پھیلانا وہ بھی ظاہر ہے۔ تیسری تفریقاً بین المومنین جس سے مراد یہ ہے کہ الگ مسجد بنانے کی غرض مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا تھا تاکہ بعض لوگوں کو دھوکہ دیکر اپنے ساتھ ملالیں اور ارصادا لمن حارب اللہ ورسولہ سے مراد ابوعامر کے لیے گھات ہے۔ کیونکہ غرض یہ تھی کہ ابوعامر اس مسجد کے ذریعہ سے رسول اللہ صلعم کے حالات سے آگاہی وغیرہ حاصل کرتا رہے، جس سے آپ کے خلاف سازش میں اسے مدد ملے۔

ع۱۳۴۹ اسس۔ اُس اور اساس بنیاد کو کہتے ہیں جس پر عمارت بنائی جائے اور جہاں سے کسی چیز کی ابتدا ہو اسے بھی کہتے ہیں اور انسان کا اُسّ اس کا قلب ہے (ل) تقوٰی پر بنیاد ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے بنانے میں تقوٰی مدنظر تھا۔

اس مسجد سے مراد مسجد قبا ہے۔ گو بعض روایات میں مسجد نبوی کا ذکر بھی ہے مگر قول اوّل کو ترجیح ہے اور یہ جو فرمایا کہ اس میں لوگ ہیں جو پاک ہونا چاہتے ہیں تو مراد ظاہری طہارت نہیں گو چند روایات اس کی تائید میں ہیں۔ کیونکہ قرآن شریف نے اس تطہیر کا ذکر پہلی شرارتوں کے مقابل پر کیا ہے۔ ظاہری طور پر پاکیزہ کپڑوں سے تو مسجد ضرار میں بھی جا سکتے تھے۔ مراد قلوب کی پاکیزگی ہے یعنی ہر قسم کی شرارت سے پاک ہونا جیسے تقوٰی پر بنیاد رکھنے سے مراد یہ نہیں کہ تقوٰی کوئی جسمانی شئے تھی جس پر بنیاد رکھی گئی۔

ع۱۳۵۰ بنیان۔ بنٰی سے جس کے معنی ہیں عمارت بنائی اور بنیان دیوار کو بھی کہتے ہیں کانّہم بنیان مرصوص (الصفّ ۶۱-۴) اور ہر چیز کو جو بنائی جائے۔ چنانچہ دوسری جگہ آیا ہے فاتی اللہ بنیانہم من القواعد (النحل ۱۶-۲۶) جہاں مراد ان کی تدابیر کی عمارت ہے۔ چنانچہ بناء کا لفظ جسم انسانی پر بھی بولا گیا ہے من ھدم بناء ربہ اور

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ
قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ
ع ۱۳ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ ع

اُن کی عمارت جو انھوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں کی بےچینی
کا موجب رہے گی، یہاں تک کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو
جائیں اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۱۳۵۱ؔ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ
وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا
عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَ
الْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ
فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ
وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں
(اس کے) بدلہ میں کہ اُن کے لیے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے
ہیں، سو مارتے ہیں اور مرتے ہیں - یہ وعدہ اس کے
ذمے سچا ہے، توریت اور انجیل اور قرآن میں،
اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو کون پورا کرنے والا ہے
سو اپنے سودے پر جو تم نے اس سے کیا ہے خوش ہو جاؤ،
اور یہی بڑی کامیابی ہے ۱۳۵۲ؔ

بِنْيَة فطرت کو کہا گیا ہے (ل)
شفا - شَفا کنوئیں وغیرہ کے کنارے کو کہتے ہیں اور ہلاکت سے قرب میں مثال کے طور پر بولا جاتا ہے جیسے یہاں اور شِفاء بیماری سے بھی ہوتی ہے جو گویا سلامتی کے کنارہ کو پالینا ہے (غ)
جرف - جَرْف کسی چیز کا بہت سا یا سارے کا سارا لے لینا ہے اور جرف وادی اور نہر کی جانب کا نچلا حِصّہ ہے جسے سیل بہا لیجاتا ہے اور اس کا اوپر کا حِصّہ آگے بڑھا ہوا رہ جاتا ہے پھر جب وہ اوپر کا حِصّہ پھٹ جائے تو اسے ھار کہا جاتا ہے - حدیث میں جو طاعون جارِف کا ذکر ہے اسی مادہ سے ہے (ل)
ھار - انھارَ ھارَ البناءُ دیوار گر گئی - انھار اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو بلند جگہ سے نیچے گر جائے -
یہاں مراد سچ مچ عمارتوں کا بنانا نہیں، بلکہ مومن اور منافق کی حالت کو تشبیہ دی ہے - ایمان کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے اور نفاق کی بنیاد نہایت کمزور ہے
۱۳۵۱ؔ ریبۃ - ریب سے اسم ہے اور بنوا ریبۃ فی قلوبھم کی تفسیر میں ہے تَدُلُّ علی دغلٍ وقِلَّةِ یقینٍ یعنی یہ کھوٹ اور قلت یقین پر دلالت کرتا ہے (غ)
تقطع قلوبھم - قَطْع کے معنی ہیں کسی چیز کا علیحدہ کر دینا جسم سے ہو یا معنًا جیسے ویقطعون ما امر اللہ بہٖ ان یوصل (البقرۃ ۲ - ۲۷) اور دلوں کے کٹنے سے مراد یہ ہے کہ مر جائیں یا یہ کہ ایسی توبہ کریں جس سے ان کے دل ندامت کے مارے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں (غ)
یہاں خود ان کی اس عمارت کو ریبۃ کہا ہے یعنی شک اور قلق اور اضطراب جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مراد ان کا دین ہے -
۱۳۵۲ؔ مسلمانوں کا عہد: جب منافقوں کا ذکر ہو چکا تو اب بتایا کہ وہ لوگ جو فی الواقع مومن ہیں ان کا کیا طریق ہے - جان اور مال دو ہی چیزیں انسان کو بہت پیاری ہیں سو سب سے پہلے یہ فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں اللہ کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں اور اس کا معاوضہ جنت قبول کر چکے ہیں - گویا اللہ پر ایمان کی حقیقت یہ بتائی کہ انسان اپنی محبوب ترین چیزوں کو اپنا نہ سمجھے بلکہ اللہ تعالیٰ کا مال سمجھے - یہ گویا اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں کے ساتھ عہد ہے جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں گے اس وقت تک اللہ تعالیٰ سے جنت کے مستحق ہونگے اور وعدۂ جنت میں اس دنیا کی کامیابی کا وعدہ بھی شامل ہے - جیسا کہ متعدد مقامات سے ظاہر ہے، لیکن اگر مسلمان اپنے عہد پر قائم نہ رہیں تو معاوضہ کے بھی وہ مستحق نہ ہونگے پس ہر ایک شخص کو جو مسلم کہلاتا ہے یا ایمان کا دعویٰ کرتا ہے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنی جان اور اپنا مال دونوں بیچ چکا ہے اور ان پر اس کا کوئی حق نہیں اور اب وہ بطور ایک امین کے ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کو لگائے -
صحابہؓ نے اس عہد کو کس طرح پورا کیا: اس وعدہ کے بعد اُن کے کاموں کا ذکر کیا اور چونکہ پچھلے رکوعوں میں منافقوں کی سب سے بڑی علامت یہ بتائی کہ وہ لڑائی کے لیے نہیں نکلتے اس لیے مقابلہ کے طور پر یہاں مومنوں کے جنگ کرنے کا ذکر کیا - منافق نماز میں بھی شامل ہو جاتے تھے - زکوٰۃ بھی دیدیتے تھے اور احکام ظاہری نکاح وغیرہ کے معاملات میں بھی شریعت قرآنی پر عمل کر لیتے تھے مگر جنگوں کے پیش آنے پر اُن میں اور مومنوں میں مابہ الامتیاز یہ ہو گیا کہ وہ جنگوں میں نہ نکلتے تھے - اس لیے یہاں مومنوں کے ساتھ وعدہ کا ذکر کر کے عمل کے رنگ میں اس چیز کو پیش کیا جو منافقوں اور مومنوں میں مابہ الامتیاز تھا - یعنی جنگ کرنا - علاوہ ازیں یہ بھی ظاہر ہے کہ جان اور مال کو دینے کا پورا امتحان جنگ میں ہی ہوتا ہے اس لیے وعدہ کے ذکر کے ساتھ اس چیز کا ذکر کیا جو ایفائے وعدہ کے لیے ایک محک کے طور پر کام دے سکتی تھی لیکن یقاتلون سے یہ مراد لینا کہ خواہ مخواہ لوگوں کو مارتے پھرتے ہیں پرلے درجہ کی حماقت ہے - جنگ کی ضرورت جو پیش آئی وہ خود کھول کر قرآن شریف بیان فرما چکا ہے وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (البقرۃ ۲ - ۱۹۰) انہی جنگوں میں نہ شامل ہونے پر منافقوں کو الزام دیا انہی میں شمولیت اختیار کرنے کو مومن کے وعدہ کا ایفا قرار دیا -

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾

توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، خدا کی راہ میں سفر کرنیوالے، رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے بھلائی کا حکم دینے والے اور بُرائی سے روکنے والے اور اللہ کی حدّں کی حفاظت کرنے والے اور مومنوں کو خوش خبری دے ع۱۳۵۳

مَا كَانَ لِلنَّبِیِّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِیْنَ وَ لَوْ كَانُوْۤا اُولِیْ قُرْبٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿۱۱۳﴾

نبی کے لیے شایاں نہیں اور (نہ) ان کے لیے جو ایمان لائے کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش مانگیں، گو وہ قریبی ہوں۔ اس کے بعد کہ اُن پر کھل گیا کہ وہ دوزخ والے ہیں ع۱۳۵۴

تیسری بات جو یہاں بیان فرمائی وہ یہ ہے کہ یہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ کا مومنوں کے ساتھ ہے یہ توریت اور انجیل اور قرآن سب میں پایا جاتا ہے گویا سب انبیاء یہی وعدہ لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس وعدہ کا اوپر ذکر ہے وہ یہی ہے کہ جنت کے عوض اپنی جانوں اور مال کو بیچ دیا ہے بالفاظ دیگر وعدہ یہ ہے کہ مومن جان اور مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیگا اور اللہ تعالیٰ اُسے جنت دے گا۔ عیسائی جو قرآن کریم کے بیانات کو توڑ مروڑ کر محل اعتراض بنانے کے عادی ہیں کہتے ہیں یہ قرآن کریم نے جھوٹ کہا ہے ایسا کوئی وعدہ توریت اور انجیل میں نہیں۔ غالباً یہ لفظ قلم سے نکالتے وقت پادری صاحبان کا خیال یقا تلون کی طرف تھا کیونکہ اسلام میں قتال کی اجازت انہیں سب سے بڑا عیب نظر آتا ہے حالانکہ جس مصیبت کی حالت میں پہنچ کر مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی کوئی عقلمند ایک لمحہ کے لیے بھی ان حالات میں جنگ کرنے پر اعتراض نہیں کرسکتا اور موسوی شریعت میں تو ایسی کوئی شرائط جنگ کے لیے قطعاً نہیں اور خود عیسائی قومیں جب اپنے آپ کو طاقتور پاتی ہیں تو ادنےٰ ادنےٰ بہانوں پر جنگ کے لیے آمادہ ہو جاتی ہیں مگر بہرحال یقاتلون میں کسی وعدہ کا ذکر نہیں۔ ایفائے وعدہ کا ذکر ہے اور وعدہ کا ذکر اشتریٰ من المؤمنین میں ہے اور یہ سچ ہے کہ یہی وعدہ توریت اور انجیل میں موجود ہے۔ جب ایک دولتمند حضرت مسیح کے پاس آیا اور پوچھا کہ اے نیک استاد میں کونسا نیک کام کروں کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں، تو حضرت عیسٰی نے جواب دیا "اگر تو کامل ہوا چاہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا تب آ کے میرے پیچھے ہولے" (متی ۱۹: ۲۱) اور حضرت موسیٰ کی بھی یہی تعلیم تھی "تو اپنے سارے دل اور اپنے سارے جی اور اپنے سارے زور سے خداوند اپنے خدا کو دوست رکھ"۔ جنت یا آسمان کی بادشاہت دنیا پر لات مارنے کے بغیر نہیں ملتی ۔

ع۱۳۵۳ السّائحون۔ سَاحَۃ فراخ مکان کو کہتے ہیں اور ساحۃ الدار گھر کے صحن کو کہتے ہیں فاذا نزل بساحتہم (الصّٰفّٰت ۳۷-۱۷۷) اور ساح فی الارض کے معنی ہیں زمین میں گزرا یا سیاحت کی فسیحوا فی الارض اربعۃ اشہر (التوبۃ ۹-۲) اور سائح اس پانی کو کہتے ہیں جو دائم طور پر جاری ہو۔ اور سیّاح اور سائح سیاحت کرنے والے کو کہتے ہیں (غ) اور سائحون جو یہاں آیا ہے اور سائحات (التحریم ۶۶-۵) کے معنی روزہ رکھنے والے صحابہ اور تابعین سے مروی ہیں۔ بلکہ ایک حدیث میں یہی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ سائحون کے معنی صائمون ہیں اور ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلعم سے سیاحت کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا کہ میری امت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے (ث) مگر عموماً روزہ رکھنے والے معنی ہی قبول کیے گئے ہیں اور مفردات میں بھی ہے السائحون ای الصائمون اور السائحات ای الصائمات پھر اس کے بعد لکھا ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ روزہ دو طرح پر ہے ایک حقیقی یعنی کھانے پینے کا ترک کرنا اور دوسرا حکمی یعنی جوارح کا معاصی سے محفوظ رکھنا۔ اور سائح اسی روزہ کا رکھنے والا ہے۔

پہلی آیت میں مومنوں کے عہد کا ذکر کیا اور اس میں ان کی صفات بیان کیں۔ سب سے پہلے تائب یعنی سب قسم کے گناہوں سے توبہ کرنے والے پھر عابد یعنی قوےٰ کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگانے والے۔ پھر حامد یعنی اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والے اور جس کی حمد کی جائے اس کی صفات کو انسان اپنے اندر لیتا ہے پس حامدون اخلاق الٰہی کے رنگ میں رنگین ہونیوالے ہیں۔ پھر سائحون یعنی روزہ رکھنے والے یا اپنے جوارح کی پوری حفاظت کرنے والے، پھر اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی کی حالت اختیار کرنے والے۔ پھر دوسروں کو نیکی کی راہ پر ڈالنے والے اور بُرائی سے روکنے والے اور سب سے آخر حدود اللہ کی حفاظت کے لیے کھڑے ہو جانے والے یہ وہ مومن ہیں جن کے لیے خوش خبری ہے۔

ع۱۳۵۴ اس آیت کی رو سے ان مشرکوں کے لیے استغفار منع کیا گیا ہے جن کے متعلق یہ کھلے طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ اصحاب جحیم ہیں صحیح بخاری اور دیگر صحاح میں اس کا شان نزول ابوطالب کی وفات کو بیان کیا گیا ہے جو ہجرت سے پیشتر کا واقعہ ہے اور اس سورت کا نزول ۹ سنہ ہجری کا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم برابر اس کے لیے استغفار کرتے رہے جب تک کہ کفار سے قطع تعلق کی وجہ سے اس سورت کے نزول کے وقت آپ کو روکا نہیں گیا اور بعض احادیث میں اس کا شان نزول آپ کا اپنی والدہ کے لیے استغفار کرنا بتایا گیا ہے۔ ابوطالب نے آنحضرت صلعم کا زمانہ پایا۔ مگر آپ کی والدہ جو آپ کی بعثت سے چونتیس سال پیشتر وفات پا چکی تھیں ان کے متعلق ایسا خیال جائے تعجب ہے۔ فرعون نے جب حضرت موسیٰ سے دریافت کیا فما بال القرون الاولیٰ (طٰہٰ ۲۰-۵۱) تمہارے آنے سے پیشتر جو نسلیں گزر چکیں ان کا کیا حال ہے تو اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے دیا علمہا عند ربی (طٰہٰ ۲۰-۵۲) بعثت نبی سے پیشتر جو لوگ ہوتے ہیں یا جن کو تبلیغ نہیں پہنچی ان پر

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

اور ابراہیمؑ کا اپنے بزرگ کے لیے بخشش مانگنا صرف ایک وعدے کی وجہ سے تھا جو اس نے اُس سے کیا تھا پھر جب اس پر کُھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے وہ اس سے الگ ہو گیا، یقیناً ابراہیمؑ بہت نرم دل اور بُردبار تھا۔[۱۳۵۵]

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور اللہ کی شان نہیں کہ ایک قوم کو گمراہ قرار دے جب انھیں ہدایت دے چکا جب تک کہ ان کے لیے بیان نہ کر دے جس سے انھیں بچنا چاہیئے۔ اللہ سب باتوں کا جاننے والا ہے۔[۱۳۵۶]

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ کی ہی ہے۔ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ کے سوائے تمھارا کوئی حمایتی نہیں

مواخذہ بھی صرف اس روشنی کے مطابق ہوتا ہے جو عقل اور فطرت کے ذریعہ سے ان کو دی گئی ہے نبی کے انکار کا لفظ ان پر نہیں آتا اور آنحضرت صلعم کی والدہ کا صحیح فطری مذہب پر قائم ہونا خود وتقلبك فی الساجدین (الشعراء ۲۶ - ۲۱۹) کی اس تفسیر سے ظاہر ہے جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ مراد اس سے آپ کا انتقال ایسے آباء اور امہات میں ہوتے رہنا ہے جو ساجدین میں داخل تھے۔

استغفار کی ممانعت کو اس بات کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ ان کا دوزخی ہونا صراحت سے معلوم ہو جائے۔ مفسرین نے صرف دو ہی صورتیں ایسی تبین کی ٹھہرائی ہیں ایک یہ کہ ایک شخص حالت کفر پر مرجائے دوسرا یہ کہ وحی سے معلوم ہو جائے کہ ایک شخص ناقابل اصلاح ہے اور قرآن کریم نے خود جو تصریح فرمائی ہے وہ اگلی آیت میں مذکور ہے جہاں حضرت ابراہیم کا استغفار سے اس وقت رکنا بیان کیا گیا ہے جب یہ واضح ہو گیا کہ وہ شخص خدا کا دشمن تھا۔ پس اصل بات تو یہی ہے کہ استغفار سے روکنے کی غرض صرف یہی ہے کہ جو شخص کھلے طور پر حق اور صداقت کا جو اللہ تعالیٰ نے بھیجی ہے دشمن ہو اس کے لیے طلب حفاظت الٰہی یا طلب معافی بے معنی ہے خدا کے دشمنوں سے ایسا تعلق مومن کو شایاں نہیں اور کسی شخص کی ایسی دشمنی پر قطعی یقین تو وحی الٰہی سے ہی پیدا ہوتا ہے گو بعض وقت واقعات بھی بتا دیتے ہیں مگر اس نہی میں عام مشرک یا کافر شامل نہیں ہاں جو لوگ حالت شرک یا کفر پر مرجائیں ان کی نماز جنازہ کے نہ پڑھنے کا استدلال بھی اس سے کیا جا سکتا ہے اور اصل تو یہ ہے کہ نماز جنازہ صرف مسلمان کا حق مسلمان پر ہے انسانی ہمدردی کا حق اور ہے اور اسلامی ہمدردی عامہ انسانی ہمدردی کے حق کے علاوہ ہے نماز جنازہ بغیر تعلق اخوت اسلامی جائز نہیں ہاں اللہ تعالیٰ اپنی وسیع رحمت سے جس طرح چاہے ان سے معاملہ کرے۔ مگر نماز جنازہ انہی لوگوں کی ہو سکتی ہے جو ظاہر طور پر اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔

ع۱۳۵۵ وہ جو کثرت سے تَاَوُّہ کرے یا اَوّہ کہے اور تَاَوُّہ ہر وہ کلام ہے جو حزن پر دلالت کرے اور مراد اس سے ایسا شخص لیا جاتا ہے جو بہت خشیۃ اللہ کو ظاہر کرے (غ) نرم دل اس لیے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے کہ کثرت خشیۃ اللہ سے نرم دلی پیدا ہوتی ہے۔ ابن جریر میں جو اقوال اس کے معنی میں نقل کیے گئے ہیں ان میں الرحیم کو ترجیح ہے یعنی اس سے مراد رحم کرنے والا ہے۔

ابراہیمؑ اور آزر: حضرت ابراہیم کا اپنے اب یا بزرگ کے لیے استغفار سے روکا جانا یہاں سے صراحت سے ثابت ہے حالانکہ والدین کے لیے استغفار آخر عمر تک کرتے رہے ربنا اغفر لی ولوالدی (ابراھیم ۱۴ - ۴۱)

اب کے لیے دیکھو ع۹۶۷ باوجود اس کے کہ وہ حضرت ابراہیم...... کا بزرگ تھا جب اس کی حالت معمولی کفر کی حالت سے نکل کر یہاں تک پہنچ گئی کہ کھلے طور پر اللہ تعالیٰ کا دشمن ہو گیا تو پھر اس کی بخشش کی دعا کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اس ناحق اور باطل کو جو حق اور صداقت کو کچلنا چاہتا ہے دنیا میں سبز کرے ہاں جب تک ایسا نہ ہو اس وقت تک غیروں کے لیے بھلائی مانگنا بھی مقام مدح پر ہے۔ وعدہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے اس کی تصریح دوسری جگہ ہے۔ دیکھو مریم ۱۹ - ۴۷۔ جہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ باوجود آزر کے حضرت ابراہیم کو سنگسار کرنے کی دھمکی دینے اور ان سے علیحدگی اختیار کر لینے کے حضرت ابراہیمؑ نے استغفار کا وعدہ کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک استغفار کو نہیں چھوڑا جب تک کہ آزر کی دشمنی اور استیصال حق کی کوشش انتہا کو نہیں پہنچ گئی۔

ع۱۳۵۶ ان الفاظ سے یہ مراد لی گئی ہے کہ مسلمانوں کے مشرکوں کے لیے استغفار کرنے کو اللہ تعالیٰ نے ضلالت قرار نہیں دیا۔ یہاں تک کہ اس حکم کو کھول کر قرآن کریم میں بیان کر دیا۔ ہاں حکم کے آ جانے کے بعد جو شخص ایسا کرے وہ ضلالت میں ہو گا اور یضل کے معنی گمراہ قرار دینا ہی لیے گئے ہیں۔

مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١١٦﴾

اور نہ کوئی مددگار ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ
وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ
الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ
فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ
رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٧﴾

اللہ نبی پر اور اُن مہاجرین اور انصار پر مہربان ہُوا
جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں اس کا ساتھ دیا، اس کے
بعد کہ قریب تھا کہ اُن میں سے ایک گروہ کے دِل پھر
جاتے، پھر اُن پر مہربان ہُوا، وہ ان پر مہربان
رحم کرنے والا ہے ع۱۳۵۷

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا
ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ
وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا
مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ
لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١١٨﴾ ع

اور اُن تین پر جو پیچھے رکھے گئے تھے، یہاں تک کہ
زمین باوجود فراخی کے اُن پر تنگ ہوگئی اور وہ اپنی
جانوں سے تنگ آ گئے اور یقین کر لیا کہ اللہ (کی سزا) سے
سوائے اس کے کوئی پناہ نہیں، تب وہ ان پر مہربان ہوا تاکہ
وہ پھر آئیں اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے ع۱۳۵۸

ع۱۳۵۷ تاب لفظ تاب کے معنی پر یہ آیت کھلی شہادت ہے کہ اس سے مراد صرف گناہ پر رجوع ہی نہیں بندہ کی طرف سے ہو یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلکہ جیساکہ ع۵۷ میں بیان کیا گیا ہے ایک اچھی حالت سے اس سے زیادہ اچھی حالت کی طرف رجوع کرنا بھی تاب میں داخل ہے۔ یہاں نبی اور مومنین کا قطعاً کوئی گناہ نہیں بلکہ الذین اتبعوہ فی ساعۃ العسرۃ میں ان کی تعریف ہی کی گئی ہے تاہم فرمایا تاب اللّٰہ علی النبی۔ اور مراد صرف اس قدر ہے کہ بڑے بڑے فضل کیے۔ اور یہ اس کے مطابق ہے جو لغت میں تاب کے معنی دیئے ہیں کہ اصل معنی عاد الی اللّٰہ ورجع واناب ہیں۔ یعنی اللہ کی طرف عود کیا اور لوٹ آیا اور جُھک گیا (ل)

ساعۃ العسرۃ۔ عُسر۔ یُسر کی ضد ہے اور یہاں ساعۃ العسرۃ سے مراد غزوۂ تبوک لیا گیا ہے۔ جس میں صحابہؓ کو تکالیف شاقہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ بعض وقت ایک کھجور کو دو آدمیوں نے بانٹ کر اس پر پانی پی کر گزارہ کیا اور دو دو تین تین آدمی ایک اونٹ پر سوار ہوتے یہ ان کے کمال صداقت اور اخلاص کا ثبوت تھا اس لیے خصوصیت سے اس کا ذکر کیا۔

مسلمانوں کی جاں نثاری کا کمال: اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اس سخت مصیبت اور مقابلہ کے وقت مسلمانوں نے خوش دلی سے آنحضرتؐ کی آواز پر لبیک کہا، صرف ایک گروہ کے متعلق ذکر کیا کہ ان کے دلوں میں کچھ کمزوری کا خیال آیا تھا مگر اس پر بھی کاد کا لفظ بول کر بتا دیا کہ فی الواقع کوئی زیغ ان کے دلوں میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ آنحضرت صلعم کی قوت قدسی کا اثر تھا کہ صحابہؓ کو اس مقام اتباع تک پہنچایا کہ وہ سب کے سب ہی ایک رنگ میں رنگین تھے۔

ع۱۳۵۸ خلّفوا۔ خلّفتہٗ کے معنی ہیں میں نے اسے اپنے پیچھے چھوڑا مگر مخلّفون سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ میں پیچھے رہ گئے اور یہی مراد خلّفوا سے ہوسکتی ہے یعنی جو پیچھے رہ گئے۔ مگر عموماً مراد اس سے لی گئی ہے کہ ان کا حکم پیچھے رکھا گیا یعنی وہ جن کے متعلق فرمایا تھا اٰخرون مرجون لامر اللّٰہ (۱۰۶) خود کعب نے جو ان میں سے ایک تھے یہی معنی خلّفوا کے لیے ہیں۔

ضاقت۔ ضِیق وسعت کی ضد ہے اور اس کا استعمال فقر اور بخل اور غم وغیرہ پر ہوتا ہے وضائق بہ صدرک (ھود۱۱۔ ۱۲) یضیق صدری (الشعراء۲۶۔ ۱۳) ولا تک فی ضیق مما یمکرون (النحل۱۶۔ ۱۲۷) میں اور یہاں مراد حزن ہے (غ)

رحبت۔ رُحب مکان کی وسعت کو کہتے ہیں اور اس کا استعمال ضیق کی طرح بطور استعارہ بھی ہوجاتا ہے جیسے یہاں اور اسی سے مَرحبا ہے (غ)

یہ تین شخص جن کا یہاں خصوصیت سے علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ کعب بن مالک۔ مرارۃ بن الربیع اور ہلال بن اُمیہ تھے۔ ان کا ذکر صحیح احادیث میں ہے اور ایک طویل حدیث میں خود کعب نے یہ ذکر کیا ہے۔ غزوۂ تبوک میں تیاری کو ایک سے دوسرے دن پر ملتوی کرتے کرتے یہ لوگ پیچھے رہ گئے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلعم بہت دور نکل گئے۔ تب انہوں نے ارادہ ترک کردیا۔ واپسی پر جب بہت سے منافقین نے جھوٹے عذر پیش کیے تو کعب اور ان کے دونوں ساتھیوں نے رسول اللہ صلعم سے سچ سچ کہدیا کہ ہمارا عذر کوئی نہ تھا رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم ان کے بارہ میں نازل نہ ہو مسلمان ان سے قطع تعلق کرلیں۔ پچاس دن تک ان تینوں کی یہ حالت رہی کہ کوئی شخص ان سے کلام تک نہ کرتا تھا۔ کعب کہتے ہیں کہ میں مسجد میں رسول اللہ صلعم کیساتھ نماز بھی پڑھنے آتا مگر کوئی شخص

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا
مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کا تقویٰ کرو اور
سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔[۱۳۵۹]

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ
مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ
اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ
وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ
مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ
عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ۭ

مدینہ کے رہنے والوں اور ان کے اردگرد کے دیہاتیوں کو
نہ چاہیے کہ اللہ کے رسول کے پیچھے رہ جائیں اور نہ (یہ کہ)
اپنی جانوں کو اس کی جان سے زیادہ چاہیں، یہ اس لیے
کہ انھیں اللہ کی راہ میں نہ پیاس پہنچتی ہے اور نہ تکان اور
نہ بھوک اور نہ وہ کسی ایسی جگہ چلتے ہیں جس سے کافروں کو
غصہ آتا ہے اور نہ دشمن سے کچھ چیز حاصل کرتے ہیں
مگر اس کے لیے اُن کا نیک عمل لکھا جاتا ہے۔ اللہ نیکی

مجھ سے کلام نہ کرتا۔ انہی ایام میں جب ایک دن میں بازار میں پریشان پھر رہا تھا ملک غسان کے ایک قاصد نے میرا پتہ دریافت کیا اور مجھے بادشاہ کا ایک رقعہ دیا جس میں لکھا تھا کہ ہم نے سُنا ہے تمہارے ساتھ سختی ہوئی ہے اور ذلت کا برتاؤ کیا جاتا ہے تم ہمارے پاس چلے آؤ تو ہم تم سے ہمدردی کریں گے۔ کعب کہتے ہیں میں نے سمجھا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہے اور اس رقعہ کو لیکر تنور کا رُخ کیا اور اسے جلا دیا۔ پچاس دن کے بعد اس آیت کے نزول پر رسول اللہ صلعم نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو یاد فرمایا اور بشارت دی۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے صحابہؓ کو سچائی سے کس قدر محبت تھی کہ اس کی خاطر خود رسول اللہ صلعم کی ناراضگی کی بھی پروا نہیں کی۔ ایک طرف اگر یہ صحابہ کا گروہ جان نثاری میں اور مال و جان کے قربان کرنے میں اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتا۔ تو دوسری طرف اخلاق فاضلہ میں بھی تاریخ عالم دوسرا کوئی ایسا گروہ پیش کرنے سے عاجز ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان تینوں میں سے کعب علاوہ تبوک کے صرف بدر میں غیر حاضر تھے اور دوسرے دونوں اصحاب بدر میں بھی شامل تھے۔ بایں غزوہ تبوک میں نہ جانے کی وجہ سے ان پر ایسی سختی ہوئی۔ وہ مسلمان غور کریں جو آج خدمتِ اسلام کو ایک بے معنی چیز ٹھہرا کر صرف اپنے نفسوں کے فکر کو کافی سمجھے ہوئے ہیں یا زیادہ سے زیادہ کسی نے نماز پڑھ لی اور سمجھ لیا کہ ہم جنت کے وارث ہو گئے۔

منجملہ اور امور کے جو ان تین شخصوں کے ذکر میں مقصود ہیں ایک یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جان نثاری اور اطاعت کس حد تک پہنچ چکی تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ مقام بلند عطا فرمایا جو کسی قوم کی قوم کو دنیا میں نہیں ملا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ایک طرف اس جنگ کی مشکلات کو رکھو۔ خطرناک گرمی، عرب کا ملک، فصلیں پکی ہوئیں، لمبا سفر، سواریوں کا پورا انتظام نہیں، نہ سامان رسد کا۔ عظیم الشان شہنشاہ کی فوج سے مقابلہ ہے۔ سب لوگ اپنی تجارتیں کرکے اور کاروبار کرکے معاش پیدا کرنے والے ہیں کوئی فوج باقاعدہ نہیں مگر تیس ہزار تو ساتھ ہوتے ہیں اور صرف تین پیچھے رہ جاتے ہیں کیا ایسی اطاعت اور ایسی جان نثاری کی کوئی مثال دنیا میں مل سکتی ہے (منافقوں کو الگ رکھو کیونکہ وہ دل سے ہی دشمن اسلام تھے) گویا دس ہزار میں سے صرف ایک کمزوری دکھاتا ہے اور وہ کمزوری بھی خود عظیم الشان مدح کا پہلو ساتھ لیے ہوئے ہے کہ اس میں ان کی صداقت کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔

ع۱۳۵۹ معیت صادقین کا حکم: یہ آیت قرآن کریم کی ترتیب ابلغ اور محکم پر گواہ ہے۔ پچھلی آیت میں ان تین شخصوں کا ذکر تھا جو ہمیشہ غزوات میں شامل ہوتے ہوتے غزوہ تبوک سے رہ گئے تو ان پر اس قدر عتاب اللہ تعالیٰ کا ہوا کہ پچاس دن تک کسی مسلمان کو ان سے بولنے کی اجازت نہ تھی، حالانکہ وہ نمازیں پڑھتے اور سب مسلمانوں والے کام کرتے اور مسلمانوں کی جماعت میں سے تھے۔ تو سمجھایا کہ ضروریات دینی میں جو مسلمان ان ضروریات کو محسوس کرکے ان کے پورا کرنے کا تہیہ نہ کریں۔ وہ اس بات کے اہل نہیں کہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوں۔

صادقین سے مراد راستباز خادمانِ دین ہیں جیسے مجدد: اب نبوت کا سلسلہ تو منقطع ہونا تھا مگر ضروریات دینی ختم ہونے والی نہ تھیں۔ اس لیے اس کے فوراً بعد مسلمانوں کو نصیحت کرتا ہے کہ جو صادق راستباز تمہارے اندر پیدا ہوں اور ضروریات دینی کی طرف قوم کی رہنمائی کریں تو قوم کا ان کے ساتھ ہو جانا اس وقت کا سب سے اہم فرض ہوتا ہے اور صادقین سے مراد یہاں ایسے ہی لوگ ہیں جو خدمت دین میں صدق دکھاتے ہیں نہ صرف سچ بولنے والے صادق کے اس معنی کے لیے دیکھو ع۳۸۸ اور قرآن شریف نے خود فرمایا ہے انما المؤمنون الذین اٰمنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ اولٰئک ھم الصّٰدقون (الحجرات[۴۹] - ۱۵) اور یہاں بھی اگلی آیت میں مصائب اٹھانے کے ذکر میں یہی اشارہ ہے کہ صادق کہلانے کا وہی مستحق ہے جو خدا کی راہ میں دُکھ اٹھاتا اور کام کرتا ہے۔ آج مسلمان قرآن شریف سے اس قدر دور پڑے ہوئے ہیں کہ کثرت سے یہی کہتے اور جواب دیتے ہیں کہ فلاں شخص مجدد زمانہ ہے تو ہو ہم نمازیں پڑھتے ہیں۔ کاش کبھی قرآن پر تھوڑا سا بھی غور کرتے تو معلوم ہوتا کہ صادقوں کے ساتھ ہونے کے حکم کو یہاں لاکر قرآن شریف نے اسے کس قدر اہمیت دی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٢٠﴾
وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً
وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ
اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢١﴾
وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۭ فَلَوْلَا
نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا
فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا
ع ١٥ اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿١٢٢﴾ ع

کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ١٣٦٠
اور نہ وہ کچھ خرچ کرتے ہیں تھوڑا یا بہت اور نہ کسی میدان
سے گزرتے ہیں مگر وہ ان کے لیے لکھا جاتا ہے تاکہ اللہ انھیں
اس کا بہترین بدلہ دے جو وہ کرتے تھے ١٣٦١
اور مومنوں کو یہ بھی مناسب نہیں کہ سب کے سب نکل پڑیں تو کیوں نہ
ان کی ہر ایک جماعت میں سے ایک گروہ نکلے، تاکہ وہ دین میں
سمجھ حاصل کریں اور اپنی قوم کو ڈرائیں جب وہ ان کی طرف
واپس جائیں تاکہ وہ بھی بچیں ١٣٦٢

ع ١٣٦٠ یرغبوا۔ رغب کے معنی کیلئے دیکھو ع ١٦٥ کسی چیز کے ساتھ رغبت ہونا اس کے لیے حرص اور اس میں طمع ہے حدیث میں ہے کیف انتم اذا مَرِج الدینُ وظَہرتِ الرغبۃ۔ تمہاری کیا حالت ہوگی جب دین ابتری کی حالت میں ہوگا اور رغبت ظاہر ہو گی جس سے مراد مال کے جمع کرنے کی حرص ہے (ل) یہاں بھی اپنی زندگی پر حرص مراد ہے۔

ظمأ۔ ظِمْءُ۔ وہ وقفہ ہے جو دو دفعہ پانی پینے کے درمیان ہو اس لیے ظَمأ پیاس ہے اور ظمآن پیاسا۔ لا تظمؤا فیہا (طٰہٰ ٢٠۔ ١١٩) یحسبہ الظمآن ماء (النور ٢٤۔ ٣٩) (غ)

نصب۔ نَصْب کے اصل معنی گاڑ دینا ہیں اور نُصُب ... اور نَصَب تکان کو کہتے ہیں مسنی الشیطان بنصب (صٓ ٣٨۔ ٤١) (غ) لا یمسہم فیہا نصب (الحجر ١٥۔ ٤٨)

مخمصۃ۔ خَمْص البطن پیٹ کی لاغری کو کہتے ہیں اس لیے مخمصۃ بھوک ہے جس سے پیٹ کی لاغری پیدا ہوتی ہے (غ)

یطؤن۔ موطئا۔ وَطِئَ کے معنی پامال کیا اس لیے زمین کو پامال کرنا یا زمین پر چلنا۔ جیسے یہاں اور مَوْطِئ کے معنی موضع یعنی جگہ (ل) اور اللّٰھم اشْدُد وَطْأَتَکَ علیٰ مُضَر میں مراد ہے اس کو ذلیل کر دے یا فرمانبردار کر دے اور مُواطاۃ کے معنی مطابقت ہیں۔ گویا جہاں ایک پاؤں رکھتا ہے وہیں دوسرا رکھتا ہے اسی معنی میں ہے لیواطؤا عدۃ ما حرم اللہ (التوبۃ ٩۔ ٣٧) ایسی جگہ چلتے ہیں جس سے کافروں کو غضب آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ دشمن اس سے مرعوب ہوتا ہے۔

ینالون۔ نیلا۔ نَیْل وہ ہے جسے انسان اپنے ہاتھ سے لیتا ہے اور نَوْل (نَالَ ینال) اور تَنَاوُل کے معنی لینا یا حاصل کرنا ہیں (غ) دشمن سے کچھ لیتے ہیں یعنی فتح یا کوئی اور فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ دشمنان دین کے مقابلہ پر جو کام کیے جائیں وہ سب عبادت میں داخل ہیں اور انسان کے لیے اعمال صالحہ کا کام دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں اس سے بڑھ کر کونسا کام ہو سکتا ہے جس سے دین اسلام کو زندگی ملے۔ عمل صالح درحقیقت وہی عمل ہے جو انسان کے لیے موجب بقا ہے مگر انسان کی زندگی سے بڑھ کر حق اور صداقت کا زندہ رہنا ہے اس لیے حق اور صداقت کو زندہ رکھنے کے لیے جو کام کیے جاتے ہیں وہ انسان کے بہترین اعمال صالحہ میں ہیں۔ کیونکہ ان سے انسان کا اپنا بھی بقا ہے۔ کس قدر لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ صرف اندر بیٹھ کر خدا کا نام لے لینے کو عمل صالح سمجھتے ہیں اور طرح طرح کے مجاہدات اختیار کیے جاتے ہیں حالانکہ دشمنان دین کا مقابلہ کرنا وہ مجاہدہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو چلایا اور یوں بتا دیا کہ یہ بہترین مجاہدہ ہے۔ ہاں دشمنان دین کا مقابلہ جب وہ تلوار اٹھائیں تو تلوار سے ہے۔ لیکن آج سب سے بڑا مقابلہ علم اور دلائل کے رنگ میں ہے اور جس طرح پر ایک مجاہد بالسیف کا بھوک پیاس کو برداشت کرنا، دکھ اٹھانا، دشمن کو زک دینا، رستے طے کرنا عمل صالح ہے اسی طرح ایک مجاہد بالقلم یا باللسان کا انہی باتوں کو برداشت کرنا یا ان کو کر دکھانا عمل صالح ہے جس سے نہ صرف انسان کو خود قلب کی صفائی میسر آتی ہے بلکہ وہ حق اور صداقت کے بقا میں بھی معاون ہوتا ہے اور یوں تمام مجاہدات سے افضل یہ مجاہدہ ہے۔ یہاں لفظ ایسے اختیار کیے ہیں جن میں مجاہدات سیف اور مجاہدات علمی دونوں آ جاتے ہیں بلکہ یہاں اصل مقصود علمی مجاہدات کا ذکر ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کہ رکوع کی آخری آیت میں صاف بتا دیا ہے جہاں جہاد سیف کیلئے نکلنے کا ذکر حذف کر کے جہاد علمی کے لیے نکلنے کا ذکر کیا ہے۔

ع ١٣٦١ یقطعون وادیا۔ قطع کسی چیز کا الگ کر دینا ہے اور قطع الطریق سے مراد سیر یعنی چلنا بھی ہوتا ہے۔ جیسے یہاں قطع وادی کے معنی وادی میں سے گزرنا ہیں اور رستے چلنے والوں سے مال چھیننا بھی مراد ہوتا ہے جیسے وتقطعون السبیل (العنکبوت ٢٩۔ ٢٩) (غ)

پچھلی آیت میں خود تکلیف بھوک پیاس وغیرہ کے اٹھانے یا دشمن پر کسی قسم کا غلبہ حاصل کرنے کا ذکر تھا اس میں بتایا کہ خواہ کوئی ایسی تکلیف نہ پہنچے اور خواہ اس سے کوئی غلبہ حاصل نہ ہو محض خدا کی راہ میں خرچ کرنا اور خدا کی راہ میں نکلنا بجائے خود ہی ایک عمل صالح ہے۔

ع ١٣٦٢ یتفقھوا۔ فِقْہ علم شاہد سے علم غائب کی طرف پہنچنا ہے علم عام ہے اور یہ خاص ہے لا یکادون یفقھون حدیثا (النساء ٤۔ ٧٨) اور احکام شریعت کے علم پر بالخصوص بولا جاتا ہے اور تَفَقُّہ کے معنی ہیں اس علم کو طلب کیا پھر اس میں خصوصیت پیدا کی (غ)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اُن کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے قریب ہیں اور چاہیئے کہ وہ تم میں شدت پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے ۱۳۶۳

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور جب کوئی سورت اُترتی ہے تو ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھایا ہے ۔ سو جو ایمان لائے ان کا ایمان بڑھایا اور وہ خوش ہوتے ہیں۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

اور جن کے دلوں میں بیماری ہے تو ان کی پلیدی پر پلیدی کو زیادہ کیا اور وہ مرگئے اور وہ کافر ہی رہے ۱۳۶۴

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

اور کیا دیکھتے نہیں کہ وہ ہر سال میں ایک بار یا دوبار آزمائے جاتے ہیں۔ پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں ۱۳۶۵

یہ عجیب بات ہے کہ اس سورت کے نزول کے ساتھ جس میں جنگوں کا مضمون اس قدر بھرا ہوا ہے فی الحقیقت جنگوں کا خاتمہ ہوا۔ اور اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مختلف اقوام عرب کے وفد آنے شروع ہوئے وہ قومیں جو اب تک اسلام کی تباہی پر تلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بھی جب دیکھا کہ اسلام کی قوت کو وہ توڑ نہیں سکتے تو ٹھنڈے دل سے اسلام کی صداقتوں پر غور کرنے لگے۔ ان کے سامنے یہ نظارہ تھا کہ کس طرح محمد رسول اللہ صلعم ایک اکیلے شخص تھے سارا عرب آپ کا مخالف ہی نہیں خطرناک دشمن تھا جان لینے کے درپے تھا۔ منصوبے کیے کوشش کی لڑائیاں کیں مگر اسلام کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور اب غزوۂ تبوک کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان قیصر روم کا بھی مقابلہ کر سکتے ہیں تو انہوں نے مقابلہ کو چھوڑ دیا اور دل ان کے پہلے سے اندر سے کھائے ہوئے تھے پس قوم پر قوم آنے لگی اور اسلام کے اصول معلوم کر کے دین اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ ان مختلف اقوام کی تعلیم کا ایک انتظام تو یہ ہو سکتا تھا کہ جو مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ کر تعلیم حاصل کر چکے تھے وہ باہر نکل جائیں مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ سب کے سب ہی باہر نکل جاتے اس لیے فرمایا کہ بہتر یہ ہے کہ ہر ایک قوم میں سے کچھ آدمی مدینہ میں آکر تعلیم حاصل کریں اور پھر یہی لوگ جا کر اپنی قوم کو تعلیم دیں جو ان میں سے مسلمان ہو گئے تھے ان کو اسلام کی تعلیم دیں جو مسلمان نہیں ہوئے تھے ان کو اسلام کی طرف بلائیں ولینذروا قومھم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی قوموں کا بڑا حصہ کفر پر تھا گو ان میں سے تھوڑے لوگ مسلمان ہو گئے تھے علاوہ ازیں دین اور علم کے تمام اقوام میں پھیلانے کا یہی بہترین ذریعہ تھا اگر اہل مدینہ ہی اس کام کے لیے مخصوص رہتے تو دوسری قومیں سمجھتیں کہ علم انہی کا خاص ورثہ ہے مگر دین اور علم کی اشاعت میں اسلام کی تعلیم جمہوریت کے لیے یہ خلاف تھا اس لیے حکم دیا کہ سب قومیں تعلیم حاصل کریں اور اس کا طریق یہ ہے کہ ہر قوم میں سے کچھ آدمی آکر علم سیکھ جائیں اور پھر اپنی قوم کو جا سکھائیں۔ یوں جنگوں کا خاتمہ اور صلح اور امن کی بنیاد رکھا جانا اسلام کی فتوحات حقیقی کی ابتدا تھی۔ اور جنگوں کے خاتمہ پر اس آیت کو لا کر اسلام کی اصل غرض بھی بتادی۔ آج بھی اسلام کو ضرورت ایسے لوگوں کی ہے جو دین میں تفقہ حاصل کر کے دنیا کی مختلف قوموں کی طرف نکل جائیں اور جب ان قوموں سے کچھ لوگ اسلام لے آئیں تو پھر وہی لوگ دین اسلام کو سیکھ کر اپنی اپنی قوم کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ جب تک مسلمانوں کی طرف سے پہلا قدم نہ اُٹھے گا اسلام بھی دنیا میں نہیں پھیل سکتا۔

ع۱۳۶۳ قریب کے کفار سے جنگ: قاتلوا الذین یلونکم من الکفار۔ عام حکم نہیں جس سے پہلے احکام قتال کے متعلق منسوخ ہو جاتے ہوں۔ مثلاً جن کفار کے ساتھ معاہدات تھے ان کے متعلق خود حکم دے چکا ہے کہ ان عہدوں کو پورا کرو یہی تقویٰ ہے۔ پھر یہودی خیبر میں رہے حالانکہ کافر تھے آنحضرت صلعم نے ان سے جنگ نہیں کی اور ایک یہود پر کیا انحصار ہے۔ بہترے قبیلے اور قومیں تھیں جن کے خلاف آپ نے جنگ نہیں کی پس یہ حکم بھی قتال کے اس پہلے حکم کے ماتحت ہے، جو درحقیقت تمام احکام قتال پر حاوی ہے یعنی ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ پھر الذین یلونکم کہنے کی ضرورت کیا تھی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو دکھ اور تکلیفیں انہی لوگوں سے پہنچتی تھیں جو قریب تھے دور والوں نے دکھ کیا دینا تھا۔ اسی طرف الذین یلونکم میں اشارہ کیا ہے اور غلظۃ پر دیکھو ع۱۳۲۱ مراد یہ ہے کہ محض قرب کے لحاظ سے قوم کی مصیبت کو نہ بھول جاؤ۔

ع۱۳۶۴ رجس یا پلیدی ان کا نفاق ہے جیسا کہ فی قلوبھم مرض سے ظاہر ہے اور پہلی آیت میں مومنوں کے ایمان کے بڑھنے کا ذکر ہے اس کے مقابلہ پر یہاں ان کے نفاق کے بڑھنے کا ذکر ہے۔ قرآن کریم کے نزول سے بالخصوص ان سورتوں کے نزول سے جن میں جنگ اور دشمن کے مقابلہ کا یا منافقوں کے نفاق کا ذکر ہوتا جس طرح مومنوں کا ایمان ترقی کرتا اسی طرح منافقوں کا نفاق ترقی کرتا۔

ع۱۳۶۵ منافقوں کو نصیحت کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں: کسی قسم کا فتنہ یعنی آزمائش یا دکھ مراد ہے۔ بعض نے کہا قحط اور بیماریاں، بعض نے کہا غزوات اور

وَ إِذَا مَآ أُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ ۭ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ أَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿١٢٧﴾

اور جب کبھی کوئی سورۃ اترتی ہے وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں، کیا تمھیں کوئی دیکھتا ہے؛ پھر پھر جاتے ہیں اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ سے کام نہیں لیتے ١٣٦٦

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٢٨﴾

یقیناً تمھارے پاس تمھیں میں سے ایک رسول آیا ہے۔ تمھارا تکلیف پانا اس پر شاق گزرتا ہے، وہ تمھارے لیے (بھلائی کا) خواہشمند ہے مومنوں پر مہربان رحم کرنے والا ہے ١٣٦٧

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۣ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿١٢٩﴾ ع ١٦/٧/٥

سو اگر پھر جائیں تو کہہ اللہ میرے لیے کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میں نے بھروسا کیا، اور وہ عرش عظیم والا رب ہے ١٣٦٨

جہاد۔ یفتنون کا لفظ زیادہ تر پہلے پر صادق آتا ہے۔ کیونکہ بھوک بیماری وغیرہ سے جو انسان کو تکلیف پہنچتی ہے۔ فطرت کا تقاضا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو انسان گناہ سے توبہ کرے مگر ان منافقوں کی حالت ایسی تھی کہ اس سے بھی فائدہ نہ اٹھاتے تھے اور غزوات اور جہاد کے ذریعہ سے بھی آزمائش تھی۔ اس لیے کہ یہ لوگ اس انتظار میں رہتے تھے کہ ان جنگوں میں مسلمان مارے جائیں گے، مگر ہر جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کی کامیابی اور دشمن کی نامرادی ہوتی تھی اور یفتنون میں جس دُکھ کا ذکر ہے وہ جنگوں کی صورت میں یہ تھا کہ کچھ اموال ان منافقوں کے بھی خرچ ہوتے تھے اور کچھ لوگ بھی ان میں سے شریک جنگ ہو کر مارے جاتے تھے۔

١٣٦٦ سورت کے نزول سے مراد یہاں ایسی سورت کا نزول معلوم ہوتا ہے جس میں منافقوں کا ذکر ہو اور ان کا ایک دوسرے کی طرف دیکھنا یا تو اس غرض سے ہے کہ اب یہاں سے چلنا چاہیئے اور یا بطور تمسخر آنکھوں سے اشارہ کرنا مراد ہے۔ اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا کیونکہ وہ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔

١٣٦٧ عزیز علیہ۔ عَزَّ کے معنی ہیں غَلَبَ یعنی غالب ہوا۔ اور عَزَّ علیہ کذا کے معنی ہیں صَعُبَ وہ چیز اس پر شاق گزری (غ)

ما عنتم یعنی عَنَتُکُمْ عنت کے معنی کے لیے دیکھو ٢٨٣ مشقت فساد ہلاکت گناہ غلطی سب پر بولا جاتا ہے (ل)

قلب رسول کی اصلی کیفیت: یہاں سورت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس میں کچھ جنگوں کا ذکر ہے کچھ منافقوں کا ذکر ہے۔ اس لیے آخر پر بتایا کہ یہ کوئی رسول کے آنے کی غرض نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ رسول کی حالت تو یہ ہے کہ جو کچھ تم پر تکلیفیں اور مصیبتیں آتی ہیں وہ اس پر بھی شاق گزرتی ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ تم ان مصائب سے باہر نکل جاؤ اور وہ تم پر حریص ہے یعنی تمہاری بہتری کو چاہتا ہے۔ یہاں تک لفظ عام ہیں یعنی جو کچھ دنیا میں گناہ اور غلطیاں ہیں اور جو کچھ ان کی وجہ سے دنیا اپنے آپ کو مشقت اور ہلاکت میں ڈال رہی ہے اس سے رسول اللہ صلعم کا دل پگھلتا ہے جنگ میں انسانوں کا خون بہتا ہے اس سے اسے خوشی نہیں ہوتی اگر لوگ کفر اور نفاق اختیار کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں تو اس سے اسے راحت نہیں ہوتی بلکہ ان چیزوں کو دور کرنے کی تڑپ اس کے دل میں ہے۔ اس آخری پیغام میں رسول کے قلب کی پہلی حالت کا ذکر کیا جو دنیا میں گناہ اور ہلاکت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا اور خدا سے مدد چاہی اور بالمؤمنین رؤف رحیم میں بتایا کہ اگر تم مومن بن جاؤ تو پھر وہ رسول تو تمہارے لیے مجسم راحت و رحمت ہی ہے صرف جب لوگ شرارت میں حد سے بڑھے تو ضرورت وقتی کے لحاظ سے حق کو تباہی سے بچانے کے لیے اسے تلوار اٹھانی پڑی۔ رؤف اور رأفۃ کے لیے دیکھو ١٨٠ اور رأفۃ کو رحمۃ پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ رافۃ میں دفع مضرت ہے اور رحمۃ میں جلب نفع (ل)

ان لوگوں کو جن سے جنگ تھی یا جن کا ذکر اس سورت میں ہے یعنی کافر اور منافق یہ بتایا ہے کہ اصل وہ کونسی تڑپ ہے جو رسول اللہ صلعم کے قلب مبارک میں ہے۔

١٣٦٨ رب العرش العظیم۔ عرش کے لیے دیکھو ١٠٩٥ یہ ترکیب ایسی ہی ہے جیسے رب العزۃ میں یعنی یہ اضافت اختصاص کی ہے۔

جب یہ بتایا کہ رسول صرف تمہاری خیر خواہی چاہتا ہے تو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دی کہ اگر باوجود اس کے کہ تم صرف ان کو دکھوں اور ہلاکت سے نکالنا چاہتے ہو اور ان کی بھلائی چاہتے ہو پھر بھی یہ تمہیں قبول نہ کریں اور تمہاری مخالفت پر اڑے رہیں تو تم کوئی پروا مت کرو۔ فقل حسبی اللہ۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کافی ہے۔ ایک اللہ پر ہی اپنا بھروسہ رکھو۔

بعض روایات میں ہے کہ سورۂ توبہ کی آخری دو آیتیں سب سے آخر نازل ہوئیں۔ مگر بخاری نے واتقوا یوماً ترجعون فیہ (البقرۃ۔ ٢٨١) کو آخر ما انزلت حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ ہاں سورۂ توبہ آخری سورتوں میں سے ہے اور روایت کا مطلب شاید یہی ہو کہ سورۂ توبہ میں سب سے آخر ان کا نزول ہوا۔

اٰیاتھا ۱۰۹ (۱۰) سُوْرَۃُ یُوْنُسَ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتھا ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ① میں اللہ دیکھتا ہوں [1369] یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں [1370]

نام: اس سورت کا نام یونس ہے اور اس میں گیارہ رکوع اور ۱۰۹ آیات ہیں۔ اس کا نام یونس اس بات کی طرف توجہ دلانے کیلئے ہے کہ جس طرح حضرت یونسؑ کی قوم آخر ایمان لا کر ہلاکت سے بچ گئی تھی ویسا ہی معاملہ آنحضرت صلعم کی قوم سے ہوگا یعنی یہ قوم تباہ نہ کی جائے گی بلکہ آخر راہِ راست پر آجائے گی۔

خلاصہ مضمون: اس سورت میں زیادہ تر توجہ اللہ تعالیٰ کے رحم کی طرف دلائی ہے کہ وہ کس طرح مصائب میں انسان پر رحم فرماتا ہے اور کفار کو اللہ تعالیٰ کے بے انتہا رحم سے فائدہ اُٹھانے کی نصیحت کی ہے۔ پہلے رکوع میں وحی الٰہی کا ذکر کیا اور بتایا کہ صرف اس دنیا کی زندگی پر خوش نہ ہو جانا چاہیئے اور اسی کو غرض و غایت نہ سمجھ لینا چاہیئے بلکہ اصل زندگی انسان کی دوسری ہے اور اسی کی طرف وحی الٰہی ہدایت کرتی ہے دوسرے رکوع میں وحی الٰہی کی تکذیب اور اس پر عذاب کے آنے کا ذکر ہے۔ تیسرے رکوع میں بتایا کہ تم پر چھوٹے چھوٹے دُکھ اور تکلیفیں آتی ہیں اور تکلیف کے وقت فطرت انسانی اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتی ہے پس تم بھی ان مصائب سے یہ فائدہ اٹھاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرو اور جب آرام ملے تو خدا کو بھول نہ جاؤ۔ چوتھے میں ہستی باری اور توحید پر دلائل دیئے ہیں۔ پانچویں میں پھر تکذیب پر عذاب کا ذکر کیا ہے چھٹے میں بتایا کہ قرآن شریف تو تمہیں بلند مقامات کی طرف لے جاتا ہے تم اس کی تکذیب کرنے کی بجائے ان مقامات عالیہ کی طرف رخ کیوں نہیں کرتے۔ ساتویں میں مومنوں کے مقامات عالیہ کا ذکر کیا۔ آٹھویں میں حضرت نوحؑ اور موسیٰؑ کی مثالیں پیش کیں نویں میں فرعون کی تباہی کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس قدر سخت انسان بھی جب آخر ہلاکت کا نشان اس پر آیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا، مگر وہ جھکنا بعد از وقت تھا تم قبل از وقت اس مثال سے فائدہ اٹھاؤ اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ اس کی لاش کو ہم نے نشان کے طور پر رکھنے کے لیے سمندر سے باہر نکال پھینکا اور یہ خبر قرآن کے منجانب اللہ ہونے پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس وقت کسی کو اس بات کی خبر نہ تھی اور آج واقعات نے ثابت کر دیا کہ واقعی وہ لاش محفوظ ہے۔ دسویں میں بتایا کہ اگر تم اب بھی تکذیب سے رک جاؤ تو عذاب ٹل سکتا ہے اور گیارھویں میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کا ذکر کر کے سورت کو ختم کیا۔

تعلق اور ترتیب: اس سورت کا تعلق پچھلی سورت سے یہ ہے کہ اس کا خاتمہ اس بات پر کیا تھا کہ یہ رسول جو تمہارے پاس آیا تو تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو اسے رنج ہوتا ہے۔ اس لیے اس سورت میں بتایا کہ گو وحی الٰہی کی تکذیب اور ساری ہمت اس دنیا پر صرف کر دینے پر عذاب کا آنا لازمی ہے تاہم اللہ تعالیٰ کا رحم بھی بے انتہا ہے اگر انسان ذرا بھی اس کی طرف متوجہ ہو تو وہ بھی اس پر رحمت سے متوجہ ہوتا ہے پچھلی سورت میں زیادہ تر کفار کی سزا کا ذکر تھا تو اس سورت میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کا رحم غالب ہے بشرطیکہ کوئی فائدہ اٹھانے والا ہو۔ عام ترتیب قرآن شریف میں یہ سات سورتیں یعنی یہاں سے لیکر النحل تک قریباً ایک ہی مضمون کی ہیں اور ان میں اثبات نبوت ہے گویا جب سورۂ الاعراف میں جو اثبات نبوت پر ہے انبیاء کی تکذیب کا ذکر کیا تو اس کے بعد الانفال اور البراۃ میں آنحضرت صلعم کے مخالفین کی سزا کا کچھ ذکر کر کے پھر اسی اصل مضمون اثبات نبوت کی طرف توجہ کی اور سلسلہ مضمون کو جاری رکھا بلحاظ نزول یہ ساتوں سورتیں یعنی یونس سے لیکر النحل تک ایک ہی زمانہ کی ہیں اور یہ آنحضرت صلعم کی مکی زندگی کا پچھلا زمانہ ہے جب کفار کی مخالفت حد سے زیادہ بڑھ گئی اور ان میں پیشگوئیوں کے رنگ میں آنحضرت صلعم اور مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ آخر حق غالب آئے گا اور باطل ہلاک ہو جائے گا۔

۱۳۶۹ الٓرٰ۔ مقطعات کے لیے دیکھو ع۸۔ یہ مجموعہ حروف اس سورت کے علاوہ چار اور سورتوں کی ابتدا میں آتا ہے یعنی ہود[11]، یوسف[12]، ابراہیم[14]، الحجر[15] اور ان چاروں کے درمیان سورۂ الرعد[13] ہے جو المرٓ سے شروع ہوتی ہے۔ ان چھ سورتوں کا مضمون بھی ملتا جلتا ہے اور زمانہ نزول بھی قریباً ایک ہی ہے۔ یہ حروف انا اللہ اریٰ کے قائم مقام ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباس سے روایت ہے (رج)۔ اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کی صفت لانے کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے اور اس کے مطابق جزا دے گا۔

ع۱۳۷۰ الحکیم۔ یہاں کتاب کی صفت ہے حکمۃ اور الحکیم کے معنی کے لیے دیکھو ع۵۰ و ع۱۶۴ و ع۳۲۱ قرآن کریم کو حکیم اس لیے کہا کہ اس میں حکمت ہے اور بعض نے حکیم سے مراد محکم لیا ہے اور دونوں باتیں درست ہیں کیونکہ وہ محکم بھی ہے اور حکم کے لیے فائدہ دینے والا ہے اور حُکم حکمۃ سے وسیع ہے ہر ایک حکمت حُکم ہے مگر ہر حکم حکمت نہیں کیونکہ حکم صرف یہ فیصلہ کرنے کا نام ہے کہ یہ چیز یوں ہے یوں نہیں۔ اور حکمت یہ ہے کہ علم اور عقل سے حق کو یعنی صحیح بات کو پالے (رغ)

یہاں قرآن کریم کو الکتاب الحکیم فرمایا، دوسری جگہ بھی ہے والقراٰن الحکیم (یٰس[36]۔۲) اور ایک جگہ آتا ہے حکمۃ بالغۃ (القمر[54]۔۵) اور کئی جگہ پر کتاب کے مقابل پر حکمت کا ذکر کیا ہے جیسے یعلمھم الکتاب والحکمۃ (الجمعۃ[62]۔۲) واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من اٰیٰت اللہ والحکمۃ (الاحزاب[33]۔۳۴) تو یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ یہ ساری کتاب حکمت سے ہی بھری ہوئی ہے۔ اس کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں یعنی اس میں جو کچھ ہے وہ حق ہے اور علم اور عقل کے مطابق ہے اور پھر اس کی بعض باریک حکمت کی باتوں کو فہم رسول نے الگ کر کے کھول دیا تو وہ بھی حکمت ہے اور قرآن کو حکیم کہنے میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ مذہب کی بنا اصل میں حکمت پر ہے اور یہ ایک سائنس ہے جس کے قوانین اور قواعد عقل و علم کے مطابق ہیں۔ چند بے جوڑ باتوں کا نام مذہب نہیں جیسا پہلے لوگوں نے خیال کر رکھا تھا۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ②

کیا لوگوں کو تعجب ہے کہ ہم نے اُن میں سے ایک مرد کی طرف وحی کی کہ لوگوں کو ڈرا ، اور انھیں خوشخبری دے جو ایمان لائے کہ ان کے لیے اُن کے رب کے ہاں راستی کا قدم ہے ۔ کافروں نے کہا ، یہ تو صریح جادوگر ہے[1371]

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ③

تمھارا رب اللہ ہے ، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ وقتوں میں پیدا کیا ، پھر وہ عرش پر غالب ہے ہر کام کی تدبیر کرتا ہے ، کوئی سفارش کرنے والا نہیں مگر اس کے حکم کے بعد ۔ یہ اللہ تمھارا رب ہے ، سو اس کی عبادت کرو تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے[1372]

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ④

اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے ۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے وہی مخلوق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ بنائے گا تاکہ انھیں جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں انصاف کے ساتھ بدلہ دے اور جو کافر ہیں ان کے لیے کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب ہے ، اس لیے کہ وہ کفر کرتے تھے[1373]

ع[1371] قدم صدق ۔ قَدَم پاؤں کو کہتے ہیں اور اس سے مراد تقدم و تاخر لیا جاتا ہے جو باعتبار زمانہ بھی ہوتا ہے اور باعتبار شرف بھی (غ) یعنی قدم سے مراد یہاں مجازاً سبقت ہے اور وہ سبقت بلحاظ شرف و فضیلت ہے اور صدق کا استعمال قول پر عام ہے مگر کذب کی طرح افعال جوارح میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور ہر ایک فضیلت والے فعل کو ظاہری ہو یا باطنی صدق کہا جاتا ہے فی مقعد صدق عند ملیك مقتدر (القمر ۵۴ ۔ ۵۵) رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق (بنی اسرائیل ۱۷ ۔ ۸۰) واجعل لی لسان صدق فی الآخرین (الشعراء ۲۶ ۔ ۸۴) اور اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے صالح بنائے "تاکہ جو لوگ بعد میں اس کی ثنا کریں وہ ثنا سچ ہو جھوٹ نہ ہو (غ) اور قدم صدق سے مراد فضیلت میں قدم آگے بڑھانا ہے (غ) اور اللہ تعالیٰ کی صفت میں جو قدیم کا لفظ متکلمین میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے تو امام راغب کہتے ہیں کہ قرآن اور آثار صحیح میں اس کا کچھ اثر نہیں پایا جاتا ۔

اس بات کے بیان کو کہ بدی کا انجام بد ہے اور نیکی کرنے والے ترقی کریں گے ۔ منکر سحر قرار دیتے ہیں اور آنحضرت صلعم کو ساحر کہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سحر اور ساحر کا استعمال قرآن مجید میں کس رنگ میں ہوا ہے ۔ مخالفین انبیاء کو ان کے معجزات کی وجہ سے ساحر نہیں کہتے بلکہ ان کے حسن بیان کی وجہ سے ساحر کہتے ہیں ۔ بات تو صاف تھی دلوں پر اثر کرتی تھی ۔ مگر اس سے بچنے کے لیے کہتے تھے ساحر ہے اس کی باتوں کا اعتبار نہ کرو ۔

ع[1372] ستۃ ایام اور عرش اور تدبیر امر پر دیکھو ع۱۰۹۴ ۔ ع۱۰۹۵ پہلی آیت میں وحی الٰہی کا ذکر تھا جو بدی اور نیکی کی جزا کو ضروری قرار دیتی ہے اور اس کے لیے ایک دوسری زندگی کا وعدہ دیتی ہے اس پر کفار کو تعجب ہوتا ہے تو عظمت الٰہی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ، کیا وہ دوسری خلق پر قادر نہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا افعیینا بالخلق الاول بل ھم فی لبس من خلق جدید (قٓ ۵۰ ۔ ۱۵) انسان کی عقل اور اس کا علم تو اس موجودہ مخلوق کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے تو اور خلق کے انکار کے کیا معنی ۔ اور چھ وقتوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ خلق بھی تبدریج ہوئی وہ دوسری خلق بھی تبدریج ہو گی ۔ اور شفیع کا ذکر اس لحاظ سے کیا کہ پیدا کرنے والا وہ ایک ہے کوئی اس کے ساتھ شامل نہیں کیونکہ شفع وتر کے مقابل پر ہے ۔ پس اور کوئی مستحق عبادت بھی نہیں الا من بعد اذنہ میں دوسری شفاعت کی طرف بھی اشارہ ہے جو گنہگاروں کے لیے ہو گی اور اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ جو اوراس کے شفیع سمجھے جاتے ہیں وہ سب اس کی مخلوق ہے ۔ یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے خالق ہونے کی طرف توجہ دلانے میں اصل غرض دوسری زندگی کی طرف توجہ دلانا ہے ۔ اگلی آیت سے ظاہر ہے ۔

ع[1373] یہاں پچھلی آیت کے اشارہ کو واضح کر دیا ہے اور وعد اللہ اس وعدہ کے لیے بطور مصدر موکد ہے جو الیہ مرجعکم جمیعا میں پایا جاتا ہے اور حقا

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝۵

وہی ہے، جس نے سورج کو چمکتا ہُوا اور چاند کو روشن بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب جان لو، اللہ نے یہ حق کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے وہ ان لوگوں کے لیے کھول کر باتیں بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں ع۱۳۷۴

اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ۝۶

رات اور دن کے ادل بدل میں اور (اس میں) جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے، ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو تقوٰے سے کام لیتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝۷ لا

جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی ہیں اور اسی پر مطمئن ہو گئے ہیں۔ اور وہ جو ہماری آیتوں سے بے خبر ہیں۔

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۝۸

ان کا ٹھکانا آگ ہے، اس کا بدلہ جو وہ کماتے تھے ع۱۳۷۵

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۝۹

جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں، ان کا رب اُن کے ایمان کی وجہ سے انھیں راہ دکھائے گا، نعمتوں والے باغوں میں ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں ع۱۳۷۶

وعداللہ کی تاکید کیلئے ہے۔ اور الیہ مرجعکم سے مراد موت کے بعد لعث کے ذریعہ لوٹ کر جانا ہے اور یہی وعدہ حق ہے ورنہ موت کو تو سب جانتے ہیں اور آگے پہلی پیدائش کا ذکر کیا۔ اور اس دوبارہ پیدائش کی غرض یہ بتائی کہ نیک اور بد عمل کرنے والے اس کے مطابق پھل پائیں۔

ع۱۳۷۴ ضیاء۔ ضَوْءٌ وہ ہے جو روشنی کرنے والے اجسام سے پھیل جاتی ہے آگ کی روشنی پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے (غ) اور بعض نے ضوء اور نُور کو مترادف کہا ہے اور بعض کے نزدیک ضوء وہ ہے جو بالذات ہو جیسے سورج اور آگ اور نور وہ ہے جو بالعرض ہو اور دوسرے سے حاصل کیا گیا ہو (ت) جیسے چاند کی روشنی۔ قرآن کریم نے یہاں یہی فرق رکھا ہے اور دوسری جگہ آگ کے متعلق ہے فلما اضاءت ما حوله (البقرہ ۲۔ ۱۷) اور یکاد زیتها یضئ ولو لم تمسسه نار (النور ۲۴۔ ۳۵) کے معنی بعض نے یوں کیے ہیں کہ یہ آنحضرت صلعم کے لیے بطور مثال ہے یکاد مَنظرہٗ یَدُلُّ علٰی نبوتہٖ ولو لم یتل قرانا (ت) یعنی آپ کا منظر ہی آپ کی نبوت پر دلالت کرتا تھا گو آپ قرآن نہ پڑھتے اور حدیث میں جو آتا ہے لاتستضیئوا بنار اھل الشرك جسکے لفظی معنی ہیں مشرکوں کی آگ سے آگ روشن نہ کرو تو مراد اس سے صرف یہ ہے کہ اپنے معاملات میں مشرکوں کو مشیر نہ بناؤ اور ان کی رائیں نہ لو (ت) نور کے لیے دیکھو ع۵۸۰۔

منازل۔ مَنزِل یا منزلة جائے نزول کو کہا جاتا ہے اور مرتبہ اور درجہ کو بھی کہا جاتا ہے (ل) قدرہ منازل کے معنی ہونگے اس کا اندازہ کیا کئی منزلیں یعنی اسے منزلوں والا بنایا اور منزلوں سے مراد اس کا بڑھنا گھٹنا ہے۔

اس ظاہری نظام کو جس پر انسان کی زندگی کا انحصار ہے بیان کرنا اس غرض سے ہے کہ عالم جسمانی سے عالم روحانی کے نظام کی طرف توجہ دلائی جائے جیسا اگلی آیت سے ظاہر ہے اور بتایا جائے کہ وہ خدا جس نے انسان کی حیوانی زندگی کیلئے یہ سامان پیدا کئے ہیں اسی نے روحانی زندگی کے سامان بھی پیدا کیے ہیں۔

ع۱۳۷۵ دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ اسی حیوانی زندگی کو ہی اصل زندگی قرار دیا جائے اور کھانے پینے اور آسائش جسمانی کو ہی مقصد زندگی سمجھ لیا جائے ایسے لوگ حقیقی راحت کو کبھی نہیں پاتے جب اس دنیا میں بھی نہیں پاتے تو آخرت میں کہاں پائیں گے۔

ع۱۳۷۶ ہدایت کے معنی کے لیے دیکھو ع۵۔ بایمانهم یعنی وہ ایمان ہی ان کے لیے اس منزل مقصود تک پہنچنے کا موجب ہو جاتا ہے۔ گویا بغیر ایمان کے انسان منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔ یہی ایمان انسان کے لیے نور بن جاتا ہے اس دنیا میں بھی جیسا کہ فرمایا یخرجهم من الظلمات الی النور (البقرہ ۲۔ ۲۵۷) اور آخرت میں بھی یوم تری المومنین والمومنات یسعٰی نورھم بین ایدیهم (الحدید ۵۷۔ ۱۲) مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عمل صالح کوئی چیز نہیں بلکہ عمل صالح کی توفیق ایمان سے ملتی ہے۔ ایمان ایک روشنی ہے صرف روشنی فائدہ نہیں دیتی جب تک انسان اس میں چلے نہیں۔

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠﴾ ع

اُن میں اُن کی دعا ہے اے اللہ تو پاک ہے اور ان میں اُن کی آپس کی دعا سلام ہے اور ان کی آخری دعا ہے کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے[١٣٧٧]

وَ لَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١١﴾

اور اگر اللہ لوگوں پر مصیبت جلد بھیجے جیسے وہ بھلائی کو جلد چاہتے ہیں تو ان کی ہلاکت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ۔ سو جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، ہم ان کو اُن کی سرکشی میں بھٹکتے چھوڑ دیتے ہیں[١٣٧٨]

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢﴾

اور جب انسان کو دُکھ پہنچتا ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے اپنی کروٹ پر یا بیٹھا یا کھڑا ۔ پھر جب ہم اس کا دُکھ دور کر دیتے ہیں تو اس طرح گزر جاتا ہے گویا کہ ہمیں کسی دُکھ کے لیے جو اسے پہنچا ہو پکارا ہی نہ تھا ۔ اسی طرح خطا کاروں کو بھلا معلوم ہوتا ہے جو وہ کرتے ہیں[١٣٧٩]

وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٣﴾

اور یقیناً ہم نے تم سے پہلے کئی نسلوں کو ہلاک کر دیا، جب انھوں نے ظلم کیا اور ان کے رسول اُن کے پاس کھلی دلائل لے کر آئے اور نہ تھے کہ ایمان لاتے، اسی طرح ہم مجرم لوگوں کو سزا دیتے ہیں ۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ

پھر ہم نے اُن کے بعد تمھیں زمین میں جانشین بنایا تاکہ

ع١٣٧٧ مومن کے مُنہ سے تو اس زندگی میں بھی یہی کلمات نکلتے ہیں سبحانك اللھم ۔ الحمد للہ رب العلمین پانچ وقت کی نماز میں یہی بار بار کہتا ہے مسلمان مسلمان سے ملتا ہے تو اسے سلامتی کی دعا دیتا ہے اور عملاً بھی اس کی سلامتی کا خواہاں ہوتا ہے المسلم من سلّم المسلمون من لسانه ویدہ مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں ۔ پس مومن کا بہشت اسی دنیا کی زندگی سے شروع ہوتا ہے اور جنّات نعیم کا نقشہ یہاں کیا لطیف کھینچا ہے اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد اور ایک دوسرے پر سلامتی ۔

ع١٣٧٨ اجل ۔ اصل میں تو کسی چیز کے لیے مدت معینہ کو کہا جاتا ہے اور اس سے مراد موت بھی لی جاتی ہے کیونکہ اس سے دنیا میں بقا کی مدت پوری ہو جاتی ہے (غ) اور یہاں چونکہ قوم کا ذکر ہے اس لیے مراد قوم کی ہلاکت ہے ۔

بُرائی مانگنے کی ممانعت: جب کفار کو اُن کی بدکرداریوں کے انجام سے ڈرایا جاتا تھا تو کہتے تھے وہ عذاب آتا کیوں نہیں اسی کی طرف اس سوال میں اشارہ ہے جو بار بار کرتے تھے متی ھذا الوعد ۔ متی ھذا الفتح اور ایک جگہ ہے اللّٰھم ان کان ھذا ھو الحق من عندك فامطر علینا حجارۃ من السماء او ائتنا بعذاب الیم (الانفال ۔ ٣٢) اسی طرح وہ عذاب بار بار مانگتے تھے ۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دکھ اور تکلیف کو جلد نہیں بھیجتا گو انسان اپنی بیوقوفی سے اس کے لیے جلدی کرتا ہے جس طرح بھلائی کے لیے جلدی کرتا ہے ۔ کفار تو عذاب کے لیے جلدی کرتے تھے مگر آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ذرا ذرا باتوں پر اپنے ہی عزیزوں کے لیے عذاب مانگتے ہیں یا کوئی اپنے بچے پر خفا ہوتا ہے تو اس کے لیے موت مانگتا ہے ۔ کسی کو اپنے بھائی سے ذرا اختلاف ہوتا ہے تو اس کے لیے بد دعاؤں پر اُتر آتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی رحمت کو چاہیں اپنے لیے دکھ اور تکلیف نہ چاہیں ۔

ع١٣٧٩ اس آیت میں بتایا کہ دکھ تو مانگتے ہیں لیکن دکھ پہنچتا ہے تو پھر خدا کو پکارتے ہیں ۔ اور یہ بھی بتایا کہ دکھ ہم اس لیے بھیجتے ہیں تاکہ انسان اپنی اصلاح کرے مگر

بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٤﴾
وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ
الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ
غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ
اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ
اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ
رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٥﴾
قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ
اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۡ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا
مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٦﴾
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ

ہم دیکھیں تم کیا کرتے ہو۔
اور جب اُن پر ہماری کھلی آیات پڑھی جاتی ہیں، تو جو
ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں اس کے سوا
کوئی اور قرآن لا، یا اسے بدل دے کہہ، میرا کام
نہیں کہ اپنی طرف سے اسے بدل دوں۔ میں تو کسی چیز کی
پیروی نہیں کرتا سوائے اس کے جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے
اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں[1380]۔
کہہ، اگر اللہ چاہتا تو میں اسے تم پر نہ پڑھتا اور نہ وہ تمہیں اس
کا علم دیتا۔ میں تو تم میں اس سے پہلے ایک عمر رہا ہوں،
تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے[1381]
تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ

انسان جلد بھول کر پھر خطاکاری کی طرف چلا جاتا ہے۔

ع۱۳۸۰ نشأۃ ثانیۃ یعنی دوسری زندگی جو ہر عمل کی جزا و سزا کو ضروری ٹھہراتی ہے اور جس کو مدنظر رکھتے ہوئے انسان کو اپنے ہر عمل کے نتیجہ پر پہلے غور کرنا چاہیئے۔ دنیا پرست لوگوں کے لیے جو خواہشات حیوانی سے اوپر اٹھنا نہیں چاہتے ناقابل قبول چیز ہے اس لیے کہتے ہیں کہ یہ قرآن جو ایک دوسری زندگی پر اس قدر زور دیتا ہے اسے ہم قبول نہیں کر سکتے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح ان کے کاہن ان کے حسب منشا باتیں عالم بالا کی بیان کر دیتے ہیں اسی طرح رسول اللہ صلعم کریں اور ان کے کھانے پینے شہوات محبت دنیا وغیرہ امور میں کوئی دخل نہ دیں، نہ ان کی بت پرستی کو برا کہیں۔ جواب کیا لطیف دیا ہے۔ میں تو خود صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں۔ اگر یہ میری بنائی ہوئی بات ہوتی تو میں خود اس پر کیوں عمل کرتا۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم تمام احکام قرآنی کی تعمیل کرتے تھے۔ اور سوائے وحی کے اور کسی چیز کی پیروی نہ کرتے تھے۔ اس لیے تفصیلات شریعت کے دینے میں بھی آپ نے اتباع وحی الٰہی ہی کیا۔

ع۱۳۸۱ ادرٰىكم۔ دَرَیْتُ کے معنی ہیں میں نے اس چیز کی معرفت حاصل کی اور اَدْرَیْتُہ کے معنی ہیں دوسرے کو اس کا علم دیا اَدْرَاہُ بِہٖ اَعْلَمَہٗ (ل) لا تدری لعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امرا (الطلاق ۶۵-۱) وان ادری لعلہ فتنۃ لکم (الانبیاء ۲۱-۱۱۱) وما ادرٰىك (المرسلٰت ۷۷-۱۴) وما یدریك (الاحزاب ۳۳-۶۳) اسی مادہ سے مداراۃ ہے جس کے معنی حسن خلق اور نرمی ہیں۔

آنحضرت کی صداقت و امانت کا اعتراف: مطلب یہ ہے کہ وہ تو اس کے ذریعے سے تمہیں گمراہی سے نکال کر دین اور دنیا میں شرف دینا چاہتا ہے اسی لیے اس نے اسے اتارا۔ اور یہ جو فرمایا کہ میں نے تمہارے اندر ایک عمر بسر کی ہے تم کیوں عقل سے کام نہیں لیتے تو یہ ان کی اس بات کا جواب ہے کہ کوئی اور قرآن بنا لو یا اسے بدل دو مطلب یہ ہے کہ جھوٹ بنانا میرا کام نہیں میں نے تمہارے اندر چالیس سال کاٹے ہیں۔ کیا تم نے کبھی میری صداقت اور دیانت و امانت پر حرف رکھا جس شخص نے چالیس سال تک ایسی صداقت اور راستبازی کا نمونہ دکھایا کہ ملک عرب نے اسے الامین کے نام سے پکارا، جس شخص نے اتنی مدت انسان پر جھوٹ نہیں بولا، کیا اب ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اتنا بڑا افترا کرے کہ شب و روز جھوٹ باتیں اس کی طرف منسوب کرے اور ایک دن نہیں دو دن نہیں بلکہ برابر سالہا سال تک جھوٹ پر جھوٹ بناتا چلا جائے۔ یہ دلیل ان عربوں کے لیے جو آپ کی چالیس سالہ اخلاق و عادات سے واقف تھے دلوں کو کھا جانے والی تھی صحیح بخاری میں ہے جب ابوسفیان سے ہرقل نے آنحضرت صلعم کے حالات دریافت کیے اور اس وقت ابوسفیان رسول اللہ صلعم کے سخت ترین دشمن تھے اور ان پر یہ سوال ہوا ھل کنتم تتھمونہ بالکذب قبل ان یقول ما قال یعنی کیا اس دعوٰی سے پہلے تم ان پر جھوٹ کی تہمت لگاتے تھے، تو ابوسفیان نے اقرار کیا کہ ایسا نہ تھا۔ اور ہرقل نے اس سے استدلال کیا کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص البیارا ستباز ہو کبھی لوگوں پر جھوٹ نہ بولے۔ پھر اللہ پر جھوٹ بولے۔ ایسا ہی نجاشی کے سامنے حضرت جعفرؓ نے کفار قریش کے سامنے یہ شہادت دی جس کا وہ انکار نہیں کر سکے نعرف صدقہ ونسبہ وامانتہ۔ ہم آپ کے صدق اور عالی نسبی اور امانت کو پہچانتے ہیں بعض سعید فطرت لوگ آتے اور آپ کی وجہ مبارک کو دیکھ کر پکار اٹھتے، لیس بوجہ رجل کذاب یہ کذاب کا منہ نہیں۔ اس مضمون کو اگلی آیت میں صاف کر دیا ہے جہاں فرمایا فمن اظلم ممن افترٰی علی اللہ کذبا اللہ پر جھوٹ بنانا سب سے بڑا ظلم ہے، جو انسان پر جھوٹ نہیں بناتا وہ اللہ پر جھوٹ بنانے کا مرتکب کیونکر ہو سکتا ہے یہاں قرآن کریم کے

كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا
يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾

باندھا یا اس کی آیات کو جھٹلایا ۔ مجرم کامیاب
نہیں ہوتے ع۱۳۸۲

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ
وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا
عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ
فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ
وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾

اور اللہ کو چھوڑ کر اس کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں
نقصان پہنچاتا ہے اور نہ انھیں نفع دیتا ہے اور کہتے ہیں یہ
اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں ۔ کہہ کیا تم اللہ کو ایسی بات بتاتے
ہو جو نہ آسمانوں میں اس کے علم میں ہے اور نہ زمین میں ، وہ پاک
ہے اور اس سے بلند ہے جو وہ شرک کرتے ہیں ع۱۳۸۳

وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً
فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ
رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں ، سو وہ اختلاف
کرتے ہیں ۔ اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے پہلے نہ ہو چکی ہوتی
تو ان میں ان باتوں کا فیصلہ کر دیا جاتا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں ع۱۳۸۴

وَ يَقُوْلُوْنَ لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ
رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ

اور کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے نشان کیوں نہ اتارا
گیا ۔ کہہ ، غیب صرف اللہ کے لیے ہے ، سو انتظار کرو میں

اعجاز کا ذکر نہیں ؞

ع۱۳۸۲ پیشگوئی کہ مفتری اور مکذّب فلاح نہیں پا سکتے اور اس کا پورا ہونا : مکّی زمانہ ہے آنحضرت صلعم سخت مصائب میں ہیں ۔ بات کوئی مانتا نہیں ۔ چند ماننے والے یا تکلیفیں اُٹھا رہے ہیں یا تتر بتر ہو چکے ہیں مگر اپنی صداقت اور راستبازی پر اور اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ پر کتنا بڑا ایمان ہے کہ اس وقت فرماتے ہیں کہ ان دونوں گروہوں میں سے یعنی ایک طرف آپ اور ایک طرف آپ کو جھوٹا کہنے والے ایک گروہ نہایت ہی ظالم ہے اور مجرم ہے اور مجرم کو کبھی فلاح نہیں مل سکتی ۔ اگر میں نے اللہ پر جھوٹ بنایا ہے تو مجھ سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں اگر تم خدا کی باتوں کو جھوٹ قرار دیتے ہو تو تم سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ۔ پھر اس بیکسی کے وقت کے لفظ جب مخالفت کا پورا زور صرف ہو جانے کے بعد اس قدر سچے ثابت ہوئے اور کوئی دنیوی طاقت حق اور صداقت کی رَد کو نہ روک سکی بلکہ اس کی ہر ایک طاقت اس کے سامنے خود بہ گئی ۔ اللہ تعالیٰ نے انہی عربوں کو ایک دوسرا نقشہ بھی دکھا دیا کہ جب آپ کی کامیابیوں کو دیکھ کر مسیلمہ اور اسود نے نبوت کے دعوے کیے تو افترا کرنے والوں کا انجام بد بھی اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا ۔

ع۱۳۸۳ عرب کے بت پرست بتوں کو اپنا شفیع سمجھتے تھے یعنی کہتے تھے ہم خدا تک نہیں پہنچ سکتے یہ ہمیں اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کا واسطہ ہیں ۔ بعینہٖ جس طرح آج کثرت سے مسلمان پیروں کو اپنا شفیع سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ اس قابل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو سکیں یا اس سے کوئی دعا کر سکیں ۔ ان کے پیران کے شفیع ہیں ۔ ہندوؤں کا عامی عقیدہ تو نہایت سطحی ہے مگر ان کا فلسفیانہ عقیدہ اسی کے قریب قریب ہے وہ بتوں میں اللہ تعالیٰ کا حلول مان کر ان پر اپنی توجہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں اصل غرض ان کی عبادت نہیں خدا کی عبادت ہے ۔ مگر چونکہ ایک غیر جسم غیر مرئی چیز پر ہم اپنی توجہ نہیں لگا سکتے اس لیے ان کو توجہ کے لیے سامنے رکھتے ہیں ۔ یہ بعینہٖ اس کی مثال ہے جو عرب کے بت پرست کہتے تھے ما نعبدهم الا ليقربونا الى الله زلفىٰ (الزمر ۳۹-۳) اللہ کو مان کر ایسی باتوں کو پیش کرنے پر فرمایا کہ تم سمجھتے ہو کہ تم کو بعض ایسی باتیں بھی معلوم ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ کو نہیں اس نے یہ تعلیم آج تک کسی نبی کی معرفت نہیں دی کہ کسی اور کو شفیع بنا کر اس کی عبادت کیا کریں ۔ بلکہ وحی الٰہی یہی راہ بتاتی ہے کہ ہر انسان خود ان راہوں پر چل کر جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں قرب الٰہی کا مقام حاصل کر سکتا ہے اور لا یضرهم ولا ینفعهم میں بتایا کہ جب دنیا میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے تو اللہ تعالیٰ کے حضور کیا نفع دیں گے ۔ عیسائیوں نے بھی حضرت مسیح کو بعینہٖ ایسا ہی شفیع مانا ہوا ہے ۔

ع۱۳۸۴ مخالفت کا قانون مستمرہ : ما كان الناس الا امة واحدة پر دیکھو ع۲۷۲ مراد یہ ہے کہ جیسے پہلے لوگ تھے ویسے ہی یہ تمہارے مخالف ہیں انہوں نے بھی حق کی مخالفت کی یہ بھی حق کی مخالفت کرتے ہیں اختلاف کے اس معنی کیلئے دیکھو ع۲۱۴ کلمة سبقت من ربك سے مراد یہ ہے کہ ان کی سزا کا ایک وقت مقرر ہو چکا ہے وہ جلدی چاہتے ہیں مگر وہ اپنے وقت پر آئے گی ۔ یہی مضمون اس رکوع کا ہے اور یوں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب سے آگے ہے سبقت رحمتی غضبی ؞

ع اِنِّیۡ مَعَکُمۡ مِّنَ الۡمُنۡتَظِرِیۡنَ ﴿۲۰﴾

بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ع۱۳۸۵

وَ اِذَاۤ اَذَقۡنَا النَّاسَ رَحۡمَۃً مِّنۡۢ بَعۡدِ ضَرَّآءَ
مَسَّتۡہُمۡ اِذَا لَہُمۡ مَّکۡرٌ فِیۡۤ اٰیَاتِنَا ؕ قُلِ
اللّٰہُ اَسۡرَعُ مَکۡرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا
یَکۡتُبُوۡنَ مَا تَمۡکُرُوۡنَ ﴿۲۱﴾

اور جب ہم لوگوں کو تکلیف کے بعد جو انھیں پہنچتی ہے رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو وہ ہماری آیتوں کے حق میں تدبیریں کرنے لگتے ہیں، کہہ، اللہ سب سے جلد تدبیر کر سکتا ہے ہمارے بھیجے ہوئے لکھتے جاتے ہیں جو تم تدبیریں کرتے ہو ع۱۳۸۶

ہُوَ الَّذِیۡ یُسَیِّرُکُمۡ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ ؕ حَتّٰۤی
اِذَا کُنۡتُمۡ فِی الۡفُلۡکِ ۚ وَ جَرَیۡنَ بِہِمۡ بِرِیۡحٍ
طَیِّبَۃٍ وَّ فَرِحُوۡا بِہَا جَآءَتۡہَا رِیۡحٌ عَاصِفٌ
وَّ جَآءَہُمُ الۡمَوۡجُ مِنۡ کُلِّ مَکَانٍ وَّ ظَنُّوۡۤا
اَنَّہُمۡ اُحِیۡطَ بِہِمۡ ۙ دَعَوُا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ
لَہُ الدِّیۡنَ ۚ لَئِنۡ اَنۡجَیۡتَنَا مِنۡ ہٰذِہٖ
لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیۡنَ ﴿۲۲﴾

وہی ہے جو تمھیں خشکی اور تری میں چلاتا ہے ۔ یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ انھیں اچھی ہوا کی مدد سے لیکر چلتی ہیں اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں انھیں تند ہوا آلیتی ہے اور ہر طرف سے ان پر لہریں چڑھ آتی ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ ہلاکت میں گھر گئے ۔ اللہ کو اُسی کی خالص فرمانبرداری کرتے ہوئے پکارتے ہیں. اگر تو ہمیں اس سے نجات بخشے، تو یقیناً ہم شکرگزاروں میں سے ہوں گے ع۱۳۸۷

فَلَمَّاۤ اَنۡجٰہُمۡ اِذَا ہُمۡ یَبۡغُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ
بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغۡیُکُمۡ

پھر جب انھیں نجات دیتا ہے تو وہ زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں ۔ اے لوگو! تمھاری سرکشی تمھاری اپنی ہی جانوں پر ہے

ع۱۳۸۵ اٰیۃ میں اشارہ اسی نشان ہلاکت کی طرف ہے ۔ اور تنکیر عظمت کے لیے ہے اسی لیے جواب دیا ہے کہ وہ نشان تو آکر رہے گا میں بھی انتظار کرتا ہوں تم بھی کرو ۔ ہاں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سا دن اور کونسا وقت ہوگا کیونکہ غیب کی ساری تفصیلات کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے ۔

ع۱۳۸۶ رحمت سے مراد وسعت آسائش صحت وغیرہ ہیں ۔ رحمت کے چکھانے کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور دُکھ کے متعلق کہا جو انہیں پہنچ جاتا ہے ۔ دوسری جگہ ہے واذا مرضت فھو یشفین (الشعراء ۲۶ - ۸۰) اللہ تعالیٰ انسان کے لیے رحمت ہی رحمت چاہتا ہے ۔ تکلیف میں بھی راحت پنہاں ہے ۔ مگر بجائے اس کے کہ فراخی اور آسائش کی قدر کریں شکرگزار ہوں ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ مکر کے لیے دیکھو ع۴۴۳ ۔

ع۱۳۸۷ عاصف ۔ نباتات کے تنہ پر جو پتے ہیں اور جو خشک ہوکر چُورا چورا ہو جاتے ہیں انہیں عَصف کہتے ہیں اور والحب ذو العصف (الرحمٰن ۵۵ - ۱۲) میں عصف سے مراد وہ چھلکا ہے جو کھانے میں نہیں آتا کعصف ماکول (الفیل ۱۰۵ - ۵) (ل) اور ریح عاصف یا عاصِفۃ وہ تند ہوا ہے جو چیزوں کو توڑ کر چورا کر دیتی ہے (غ)
احیط بہم ۔ حاط کے معنی ہیں حفاظت کی (ل) اسی سے احتیاط ہے اور اسی سے حائط ہے جس کے معنی دیوار ہیں کیونکہ وہ ایک چیز کو گھیر کر اندر لے لیتی ہے اور احاطۃ کے لیے دیکھو ع۱۳۲۹ ل الا انہٗ بکل شیٔ محیط (حٰم السجدۃ ۴۱ - ۵۴) یعنی سب جہات سے ہر چیز کی حفاظت کرتا ہے اور منع کے معنی میں بھی آتا ہے الا ان یحاط بکم (یوسف ۱۲ - ۶۶) اور احاطت بہ خطیئتہ (البقرۃ ۲ - ۸۱) بلیغ استعارہ ہے ۔ کیونکہ انسان جب گناہ کرتا ہے اور بار بار کرتا ہے تو یہ اسے اس سے بڑے گناہ کی طرف کھینچ لے جاتا ہے ۔ اور اس طرح گناہ سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے اور احیط بہم میں اور واخری لم تقدروا علیھا قد احاط اللہ بھا (الفتح ۴۸ - ۲۱) میں اور عذاب یوم محیط (ھود ۱۱ - ۸۴) میں احاط بالقدرۃ مراد ہے یعنی اپنی قدرت سے اس کا احاطہ کرلیا ہے (غ) اور جب ایک شخص کی ہلاکت قریب آگئی ہو تو کہا جاتا ہے احیط بفلانٍ جیسے احیط بثمرہ (الکھف ۱۸ - ۴۲) ای اصابہ ما اھلکہ یعنی اسے ہلاکت نے آلیا، (ل) اور یہی مراد یہاں ہے یعنی مراد ہے ہلاکت میں گھر گئے ۔

جو کچھ اوپر بیان فرمایا تھا اس کی ایک مثال دی ہے کہ کس طرح مصیبت کے وقت انسان خدا کو پکارتا ہے گویا بتایا ہے کہ فطرت انسانی میں یہ بات مرکوز ہے کہ اللہ تعالیٰ کا سہارا تلاش کرے مگر مصیبت سے نکل کر آسائش کی زندگی پھر دل پر غفلت کا پردہ ڈال دیتی ہے ۔ اور ابتدا تو خطاب سے کی ہے کنتم مگر جرین میں غائب کی طرف التفات کلام کردیا ہے غرض ان کے بُعد کی طرف توجہ دلاتا ہے جو آسائش کے وقت انسان کو ہو جاتا ہے اور یا چونکہ مثال میں دکھ تو بعض کا ہے اور مثال کی غرض سب کو سمجھانا ہے اس لیے مخاطب سے غائب کی طرف التفات کیا ۔

عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ ثُمَّ
اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾
اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ
مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ
مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَ الْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓى
اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّيَّنَتْ
وَ ظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ
اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا
كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ
الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾
وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَ يَهْدِيْ
مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾

دنیا کی زندگی کا سامان (لے لو) پھر تمھیں ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے ، پھر ہم تمھیں بتائیں گے جو کچھ تم کرتے تھے۔

دنیا کی زندگی کی مثال صرف پانی کی طرح ہے جسے ہم بادل سے اتارتے ہیں، پھر اس سے زمین کا سبزہ مل نکلا۔ جسے لوگ اور چارپائے کھاتے ہیں ، یہاں تک کہ جب زمین اپنا سنگار کر لیتی ہے اور خوب صورت بن جاتی ہے اور اس کے مالک سمجھتے ہیں کہ وہ اس پر پوری طاقت رکھتے ہیں۔ ہمارا حکم رات یا دن کو اس پر آتا ہے تو ہم اسے کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیتے ہیں گویا کل وہ تھی ہی نہیں اسی طرح ہم باتوں کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں [ع۱۳۸۸]

اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھاتا ہے [ع۱۳۸۹]

ع۱۳۸۸ اختلط۔ خَلْط دو یا زیادہ چیزوں کے اجزا کا جمع کرنا ہے خواہ وہ دونوں سیال ہوں یا دونوں جامد یا ایک سیال اور ایک جامد اور خلیط شریک ہمسایہ یا دوست کو کہتے ہیں وان کثیراً من الخلطاء (صٓ ۳۸ - ۲۴) اور اسی سے اختلاط ہے (غ) مگر ابن عباس نے یہاں مختلف سبزیوں کا اُگنا مراد لیا ہے گویا وہ ایک دوسرے سے مل جل گئیں (ج) اور ایک ہی چیز کا بہت بڑھ جانا بھی مراد ہو سکتا ہے گویا اس کے اجزا ایک دوسرے سے مختلط ہو گئے (د) اس صورت میں با سبب کے لیے ہو گی۔ یعنی بارش کے سبب سے سبزیوں میں بہت نشو و نما ہوا۔ اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ زمین کی نبات اس پانی کے ساتھ مل گئی کیونکہ روئیدگی اسی سے پیدا ہوتی ہے کہ پانی کے اجزا سبزیوں کے اجزا سے مل جل جاتے ہیں۔

زخرف۔ زُخْرُف۔ زینت کو اور کسی چیز کے حسن کے کمال کو کہتے ہیں اور یہاں مراد زمین کی زینت ہے جو نبات سے اسے ملتی ہے یا اس زینت کا تمام کمال کو پہنچ جانا۔ اور زخرف سونے کو بھی کہتے ہیں اور زخرف القول (الانعام ۶ - ۱۱۲) ایسی باتیں جو خوب سجائی گئی ہوں۔ (ل)

حصید۔ حَصد کھیتی کے کاٹنے پر بولا جاتا ہے اور یہی معنی حصاد کے ہیں واٰتوا حقه یوم حصادہ (الانعام ۶ - ۱۴۱) اور یہاں حصید سے مراد کٹی ہوئی کھیتی ہے جو گویا تباہ کر دی گئی۔ اسی معنی میں ہے منها قائم وحصید (ھود ۱۱ - ۱۰۰) اور حب الحصید (قٓ ۵۰ - ۹) میں مراد وہ دانا ہے جو کاٹا جاتا ہے (غ)

تغن۔ غنی کے معنی تو عدم حاجت ہیں اور غنی فی مکان کذا سے مراد ہے اس مکان میں مدت تک رہا گویا اپنے غیر سے مستغنی تھا (ل) کان لم یغنوا فیها (الاعراف ۷ - ۹۲) (غ) اور یہاں لم تغن سے مراد ہے گویا کل اس کی نبات تھی ہی نہیں۔

اس مثال میں بھی وہی بات سمجھائی ہے جو پہلی مثال میں تھی۔ زمین کی زینت کے سامان اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہی کرتا ہے مگر جب لوگ اس آسایش کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طاقت و قدرت سے غافل ہو کر اپنے آپ کو ہی قادر سمجھ لیتے ہیں (انہم قادرون علیها۔ تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا دوسرا نظارہ بھی دکھا دیتا ہے تاکہ انسان سمجھ لے کہ اس کی طاقت سب طاقتوں سے اوپر نہیں بلکہ یہ کوئی اور عظیم الشان طاقت ہے جس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔

ع۱۳۸۹ دار السلام۔ سَلْم اور سَلامَة کے معنی آفات ظاہری اور باطنی سے پاک ہونا ہیں اور دار السلام سے مراد دار السلامة ہے (اس لیے وہاں کا قول بھی سلاماً سلاماً ہے) لهم دار السلام عند ربهم (الانعام ۶ - ۱۲۷) اور السلام اللہ تعالیٰ کا بھی اسم ہے السلام المؤمن المهیمن (الحشر ۵۹ - ۲۳) کیونکہ وہ ہر قسم کے عیوب اور نقائص سے پاک ہے (غ)

دنیا کی نعمتوں کے مقابل جن میں دکھ اور تکلیفیں ملی ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ ایسے گھر کی طرف بلاتا ہے جو دکھوں اور تکالیف سے پاک ہے۔ انسان اگر

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ ؕ وَ لَا
يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾

جو نیکی کرتے ہیں ان کے لیے نیک بدلہ ہے اور بڑھ کر، اور اُن کے منہ کو نہ سیاہی ڈھانکے گی اور نہ ذلت - یہی جنت والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے ع۱۳۹۰

وَ الَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ
بِمِثْلِهَا ۙ وَ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ
اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ
قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور جو بدیاں کماتے ہیں (تو) بدی کا بدلہ اسی کی مثل ہے اور ان پر ذلت چھا جائے گی کوئی انھیں اللہ سے بچانے والا نہ ہوگا گویا کہ اُن کے مونہوں پر رات کا سیاہ ٹکڑا اوڑھا دیا گیا ہے - یہی آگ والے ہیں، وہ اسی میں رہیں گے -

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ
لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ ۚ
فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا
كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے پھر انھیں جنھوں نے شرک کیا تھا کہیں گے تم اور تمھارے شریک اپنی جگہ ٹھیرے رہو پھر ہم اُن میں جدائی ڈال دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہ کرتے تھے ع۱۳۹۱

سکھ کو چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی سکھ کی طرف بلاتا ہے مگر انسان عارضی سکھ کو مدنظر رکھ کر خود اپنے لیے دکھ کا سامان کر لیتا ہے -

ع۱۳۹۰ الحسنی - حُسن (دیکھو ع۱۰۶) اور حسنی میں فرق یہ ہے کہ حسن کا استعمال عام ہے اور حسنی کا حرف احداث پر (غ) حسن اور حسنی دونوں مصدر ہیں اور گو حسنی کے معنی زیادہ تر جنت یا المنزلۃ الحسنی لیے گئے ہیں - مگر لسان العرب میں ہے کہ اس سے اصل مراد المجازاۃ الحسنی ہے اچھا بدلہ اور ابن جریر میں بھی اس کے مطابق اقوال موجود ہیں -

زیادۃ - تو اصل میں ایک چیز پر کچھ بڑھانے کا نام ہے مگر یہاں چونکہ نعمائے جنت میں اس کا ذکر ہے اس لیے مراد نظر الی وجہ اللہ لی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا دیکھنا جو بہشت کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے - راغب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رویت کو زیادہ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ ایسی چیز ہے جس کا تصور بھی دنیا میں ممکن نہیں - ابن جریر میں کچھ اور اقوال بھی منقول ہیں - مثلاً بڑھا ہوا اجر یا دس گنا اجر - یا اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رضوان - یا اس دنیا میں نعمتیں ؞

یرھق - رَھِق کے معنی کسی امر نے غالب آکر اس کو ڈھانک لیا ہیں سارھقہ صعودا (المدثر ۷۴ - ۱۷) (غ)

قتر - قَتَرۃ اس غبار کو کہتے ہیں جس پر سیاہی غالب ہو جیسے دھواں (ل) نیز دیکھو ع۳۰۵ ؞

احسان یعنی اپنے نفس میں نیکی کرنے یا دوسروں سے نیکی کرنے کا انجام یہ ہے کہ بدلہ نیک ملتا ہے کچھ اور بھی ملتا ہے اور چہرہ پر سیاہی چھا جانا جو ناکامی اور نامرادی کا لازمی نتیجہ ہے وہ پیدا نہیں ہوتی نہ انسان کو ذلیل ہونا پڑتا ہے ابن جریر نے ان الفاظ کی یوں تفسیر کی ہے لا یغشی وجوھھم کابۃ ولا کسوف حتی تصیر من الحزن کانما علاھا قتر یعنی ان کے مونہوں کو رنج و ملال اور تاریکی نہیں ڈھانکے گی یہاں تک کہ غم کے مارے وہ ایسے ہو جائیں کہ گویا ان پر دھواں چھا گیا ہے - اس کے مقابل پر بدی کے انجام بد کا اگلی آیت میں ذکر کیا ہے -

ع۱۳۹۱ مکانکم - فعل محذوف ہے الزموا مکانکم یعنی اپنی جگہ ٹھہرے رہو ؞

زیلنا - زال کے معنی ایک چیز اپنے طریق سے ہٹتی ہوئی علیحدہ ہو گئی - اس سے زوال وغیرہ ہیں - اور تزیلوا (الفتح ۴۸ - ۲۵) کے معنی تفرقوا الگ الگ ہو گئے - باب تفعیل یہاں تکثیر کے لیے ہے (غ) پس زیلنا کے معنی ہیں فرقنا ؞

تین قسم کے معبود: شرکاءکم اور شرکاءھم سے مراد وہ ہیں جنھیں وہ اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہراتے تھے حضرت مسیح فرماتے ہیں ما قلت لھم الا ما امرتنی بہ ان اعبدوا اللہ ربی وربکم (المائدۃ ۵ - ۱۱۷) اور ملائکہ کے متعلق ہے اھؤلاء ایاکم کانوا یعبدون (السبا ۳۴ - ۴۰) یہاں فرمایا کہ وہ ان کے شرکاء کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہ کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان دونوں یعنی عابد اور معبود کو الگ الگ کر دے گا اور دوسری جگہ ہے انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم (الانبیاء ۲۱ - ۹۸) لو کان ھؤلاء اٰلھۃ ما وردوھا (الانبیاء ۲۱ - ۹۹) تو معلوم ہوا کہ ان دونوں مقامات پر الگ الگ قسم کے معبودین کا ذکر ہے ایک تو اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں یا ملائکہ کو معبود بنا لیا گیا ہے - یہ آیات ان کے متعلق ہیں اور جہاں معبودین کے دوزخ میں

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ
كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۲۹﴾

سو ہمارے اور تمھارے درمیان اللہ گواہ بس ہے کہ ہم تمھاری
عبادت سے بالکل بے خبر تھے۔

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ
وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ
ع ۳ ۸ النصف عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع

وہاں ہر شخص اس کی خبر پالے گا جو آگے بھیجا تھا اور وہ
اللہ اپنے سچّے مولیٰ کی طرف لوٹائے جائیں گے اور جو وہ
افترا کرتے تھے اُن سے جاتا رہے گا ع۱۳۹۲

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ
اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ
يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ
مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ
اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾

کہہ کون تمھیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے، یا کس
کے اختیار میں کان اور آنکھیں ہیں اور کون زندہ مُردے
سے نکالتا ہے اور مُردہ زندہ سے نکالتا ہے اور کون کاروبار
عالم کی تدبیر کرتا ہے، تو کہیں گے اللہ۔ پس کہہ پھر کیا تم
تقوےٰ اختیار نہیں کرتے ع۱۳۹۳

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ
الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

تو یہی اللہ تمھارا سچا رب ہے اور حق کے بعد کیا ہے
مگر گمراہی۔ پھر تم کہاں سے پھرے جاتے ہو۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ
فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

اسی طرح تیرے رب کی بات ان پر صادق آئی جنھوں نے نافرمانی
کی کہ وہ ایمان نہیں لاتے ع۱۳۹۴

پڑنے کا ذکر ہے تو مراد وہ لوگ ہیں جو خود اپنے آپکو بڑا بنا کر دوسروں سے اپنے آپ کو خدا کی طرح منواتے ہیں اور پتھروں اور درختوں اور ہواؤں وغیرہ کو معبود بنا لیتے ہیں تو ان کا ذکر ان دونوں میں نہیں کیونکہ حشر صرف انسانوں کا ہوگا نہ جمادات اور نباتات کا۔

ع۱۳۹۲ الحق۔ اسمائے الٰہی میں سے ہے دیکھو ع۶۵ تبلو بلی سے خبر پا لینے کے معنی میں ہے دیکھو ع۱۵۵

جب اعمال کی سزا کے بھگتنے کا وقت آتا ہے تو غلط سہارے سب گر جاتے ہیں اور اصل حقیقت انسان کے سامنے منکشف ہو جاتی ہے۔ یہ تجربہ ہر انسان یہاں بھی کر سکتا ہے۔ ہر ایک غلط کار کو اپنی غلطیوں کی سزا آخر خود بھگتنی پڑتی ہے اور جو اس کو ان غلطیوں میں ڈالتے ہیں نتیجہ بھگتنے کے وقت وہ الگ ہو جاتے ہیں۔ رکوع کے پہلے حصّہ میں بتایا تھا کہ مصیبتوں کے وقت فطرت انسانی صرف اللہ تعالیٰ کے آگے جھکتی ہے اور معبودان باطل کو اس وقت انسان بھول جاتا ہے ان چھوٹی چھوٹی مصیبتوں کے مقابلہ میں آخری آیات میں اس مصیبت عظمیٰ کی طرف توجہ دلائی ہے جو بدکرداروں کے لیے نتائج اعمال کے رنگ میں ظہور پذیر ہوگی اس وقت انکشاف کامل ہوگا کہ غیر اللہ معبود کسی کام نہیں آ سکتے بلکہ وہ معبود بھی انکار کریں گے کہ ان کی عبادت کی جاتی تھی۔

ع۱۳۹۳ یملك السمع والبصر سے مراد ہے کہ کون ان قوتوں کو وجود میں لانے والا اور کون ان کی حفاظت کا متولی ہے (غ)

مشرکین کا اقرار توحید: پچھلے رکوع میں یہ بتایا تھا کہ مصیبت کے وقت فطرت انسانی اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتی ہے اور معبودان باطل کو بھول جاتی ہے اسی سے اس ہولناک وقت کی طرف توجہ دلائی تھی جو نتائج اعمال کے بھگتنے کا وقت ہوگا کہ خود وہ معبود بھی انکار کریں گے۔ اسی مضمون کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ایک بُت پرست کی فطرت بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت دے اٹھتی ہے اور بعض باتوں میں تو مجبوراً اسے بھی ماننا پڑتا ہے کہ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ چنانچہ آسمان اور زمین سے رزق کا دینا۔ آسمانی رزق سے مراد یا تو وحی کا نزول ہے اور زمینی رزق سے مراد جسمانی سامانوں کا عطا کرنا۔ اور یا آسمان کا رزق پانی ہے جو اوپر سے برستا ہے اور زمین کا رزق اس پانی سے روئیدگی کا نکلنا ہے ایسا ہی سمع اور بصر پر اختیار یعنی قوائے انسانی پر کیونکہ سمع اور بصر دو اعلیٰ ترین قوائے انسانی ہیں۔ پھر مردوں سے زندوں کو اور زندوں سے مردوں کو نکالنا جسمانی رنگ میں ہو یا قوموں کی احیا و اماتت ہو اور خلاصہ ان سب امور کا تدبیر امر میں آجاتا ہے۔ جس سے مراد نظام عالم کا چلانا ہے۔ مسیح کی پرستش کرنے والا یا شجر یا حجر کی پرستش کرنے والا مانتا ہے کہ یہ سب کام اللہ تعالیٰ کے ہی ہیں اس لیے فرمایا پھر مستحق پرستش دوسرے کس طرح ہو گئے جیسا کہ اگلی آیت میں واضح کر دیا۔

ع۱۳۹۴ فسق۔ یہاں عام معنی میں ہے یعنی عہد فطرت کی خلاف ورزی مراد ہے کیونکہ اوپر عہد فطرت کی طرف اشارہ ہے جو اس عہد کی نافرمانی کرتے ہیں

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

کہہ کیا تمھارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو پہلے پیدا کرتا ہے ، پھر اسے دوہراتا ہے ۔ کہہ اللہ ہی پہلے پیدا کرتا ہے ، پھر اسے دوہراتا ہے پھر تم کہاں سے الٹ جاتے ہو ۱۳۹۵

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾

کہہ کیا تمھارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو صحیح راہ بتاتا ہے ، کہہ ، اللہ ہی صحیح راہ بتاتا ہے ، تو کیا وہ جو صحیح راہ بتاتا ہے زیادہ حق دار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا ، سوائے اس کے کہ اُسے راہ دکھائی جائے تمھیں کیا ہو گیا تم کیسا فیصلہ کرتے ہو ۱۳۹۶

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور ان میں اکثر اٹکل پر ہی چلتے ہیں ، حق کے مقابلے میں اٹکل کچھ کام نہیں دیتی

اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں ۱۳۹۷

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۟ ﴿۳۷﴾

اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا اوروں کا افترا ہو ، بلکہ یہ اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے ، اور کتاب کی تفصیل ہے جس میں کچھ شک نہیں ، جہانوں کے رب کی طرف سے ہے ۱۳۹۸

وہ اس دوسرے عہد یعنی شریعت یا وحی کو بھی قبول نہیں کرتے ۔

ع۱۳۹۵ بدء الخلق اور عود : خلق کے لوٹانے سے مراد بعد موت زندگی بھی ہو سکتی ہے تو گو وہ اس کے قائل نہ تھے مگر مراد یہ ہو سکتی ہے کہ جب وہ پہلی بار بھی خلق نہیں کر سکتے تو دوسری زندگی جو اللہ تعالیٰ کے اور بھی عجائبات قدرت سے ہے اور ایک حقیقت ہے اس پر وہ کیونکر قادر ہو سکتے ہیں اور یا پہلی خلق سے مراد بار اول اشیاء کو وجود میں لانا اور اعادہ سے مراد ایک قانون کے ماتحت ان کو بار بار پیدا کرتے رہنا ہے جیسے انسان اول کو پیدا کیا یہ بدء ہے پھر اس سے آگے ایک قانون کے ماتحت نسل چلائی یہ اعادہ ہے اس صورت میں معنی ظاہر ہیں ۔

ع۱۳۹۶ یَهِدِّی ۔ اصل میں یَهْتَدِی ہے اور اهتداء کے معنی ہدایت پانا ہیں ۔ اور هَدٰی لے جانا بھی ہیں جیسے هَدَیْتُهٗ الی الطریق یا للطریق ۔ یا هدیت العروس الی زوجها اور یہاں هدی اور اِهتدی کے معنی محض انتقال مکان کے کیے گئے ہیں لا یقدر ان ینتقل عن مکانه الّا ان ینقلوه (ل) یعنی اس بات پر قادر نہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ خود جا سکے سوائے اس کے کہ دوسرے اُسے لے جائیں اور قرآن شریف میں ہے اوا جد علی النار هدی (طٰهٰ [20] ۔ ۱۰) جہاں هدٰی سے مراد صرف رستہ ہے (ل) اور دوسری جگہ ہے فاهدوهم الی صراط الجحیم (الصّٰفّٰت [37] ۔ ۲۳) اور ایک ہدایت اعطٰی کل شیٔ خلقه ثم هدٰی (طٰهٰ [20] ۔ ۵۰) والی ہے جس سے مراد اپنے دائرہ استعداد میں ترقی ہے دیکھو ع[5] ۔

معبودان غیر اللہ کا عجز : تیسری بات جس کی طرف توجہ دلائی (پہلی تدبیر امر ہے آیت ۳۱ ۔ دوسری خلق آیت ۳۴) وہ ہدایت کا دینا ہے یہ بھی کوئی بت یا کوئی معبود باطل نہیں دیتا صرف اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے اور معبودان باطل کے متعلق جو فرمایا کہ لا یهدی الّا ان یهدی تو یا عباد امثالکم (الاعراف [7] ۔ ۱۹۴) مراد ہیں کہ وہ خود محتاج ہدایت ہیں اور یا هدی سے مراد ان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا ہے یعنی وہ خود چلنے کے قابل بھی نہیں اور یا وہ ہدایت عامہ مراد ہے جو جاندار اور بیجان اور ذی عقل اور غیر ذی عقل سب کو دی جاتی ہے کہ اس کا دینے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے ۔

ع۱۳۹۷ غیر اللہ کی پرستش اس لحاظ سے ظنی ہے کہ ان کے پرستار کو یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سے کوئی نفع پہنچے یا کسی نقصان سے بچ جائے اس کے مقابل حق یعنی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے معلوم ہوا قرآن شریف ظنی باتوں کے اتباع سے روکتا ہے اور ان باتوں کی طرف بلاتا ہے جو ثابت شدہ حقایق ہیں ۔

ع۱۳۹۸ یہاں دو باتیں بالخصوص بتائیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قرآن افترا نہیں ۔ ایک پہلی کتابوں کا مصدق ہونا یعنی ان پیشگوئیوں کو پورا کرنے والا

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾

کیا کہتے ہیں کہ اسے از خود جھوٹ بنا لیا ہے کہہ ایک سورۃ اس جیسی لے آؤ اور اللہ تعالیٰ کے سوا جسے بلا سکو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾

بلکہ اُسے جھٹلاتے ہیں جس کے علم کا وہ احاطہ نہیں کر سکتے اور ابھی اس کی حقیقت ان تک نہیں آئی اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے، تو دیکھ لو ظالموں کا انجام کیسا ہوا ۱۳۹۹

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾ ع

اور کچھ ان میں سے وہ ہیں جو اس پر ایمان لائیں گے اور کچھ وہ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائینگے اور تیرا رب فساد کرنیوالوں کو خوب جانتا ہے۔

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

اور اگر تجھے جھٹلائیں تو کہہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل، تم اُس سے بری ہو جو میں کرتا ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم کرتے ہو ۱۴۰۰

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور اُن میں سے بعض وہ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں تو کیا تو بہروں کو سنائے گا گو وہ عقل سے کام نہ لیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ

اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو تیری طرف نظر اُٹھاتے ہیں تو کیا

ہے جو اس کے آنے سے ہزارہا برس پہلے موجود ہیں ان پیشگویوں کو محمد رسول اللہ نے نہیں بنایا۔ اور دوسرا یہ تفصیل کتاب ہے یعنی وہ باتیں جو پہلی کتابوں میں مجمل اور مبہم رہ گئی ہیں ان کی تفصیل یہ قرآن شریف فرماتا ہے جیسے مسئلہ معاد یا مسئلہ صفات الٰہی کہ پہلی کتابیں اس بارہ میں بہت ہی اجمالی تعلیم دیتی ہیں ایسا ہی ان کتابوں میں دلائل کا نام ونشان نہیں۔ اگلی آیت میں اس دعوے کو اور مضبوط کیا کہ اگر تم پھر بھی اسے افترا سمجھتے ہو تو اس جیسی ایک ہی سورت لے آؤ۔ اس کے لیے دیکھو ع۳۷ اور قرآن کا ذکر یہاں اس لحاظ سے کیا کہ اس میں دلائل توحید الٰہی ہیں۔

ع۱۳۹۹ یحیطوا بعلمہ۔ کسی چیز کا احاطہ از روئے علم کامل طور پر صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے دیکھو ع۳۲۹ لیکن انسان بھی اس میں سے جس قدر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے حاصل کرتے رہتے ہیں ولا یحیطون بشئ من علمہ الا بما شاء (البقرۃ ۲ - ۲۵۵) یہاں ان کے احاطہ بالعلم نہ کرنے سے مراد اُن کا تدبّر نہ کرنا ہے کیونکہ انسان کو جو علم ملتا ہے تدبّر سے ملتا ہے۔

تاویل کے معنی کے لیے دیکھو ع۳۷۶ اصل حقیقت یا انجام دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ یہاں انجام مراد ہے۔

علوم قرآنی اور تکذیب کرنے والوں کا غور نہ کرنا: مثل لانے کی تحدّی کے بعد اس کتاب کے علوم کی طرف توجہ دلائی ہے جھوٹ تو کہہ دیا مگر اس کے علوم کی خبر تک نہیں۔ اس کے مضامین عالیہ پر کبھی غور نہیں کیا اگر غور کرتے تو خود وہ باتیں ہی ان کے دلوں کو کھینچ لیتیں تو یہ کس قدر جرات ہے کہ بغیر ایک چیز کا علم حاصل کرنے کے اس کی تکذیب شروع کر دی چونکہ حقیقت معنی کا ذکر احاطہ بالعلم میں آچکا ہے اس لیے تاویل سے مراد تاویل فعلی یا انجام ہے اور اسی انجام تکذیب کی طرف آیت کے آخری الفاظ میں توجہ دلائی کیف کان عاقبۃ الظالمین۔ پس مطلب یہ ہوا کہ قرآن کے علوم پر غور کرتے تو اس کی تکذیب نہ کرتے اور جو تکذیب کی ہے تو اب اس کا انجام وہی ہوگا جو اُن کو پہلے سے بتا دیا گیا ہے۔

ع۱۴۰۰ پچھلے رکوع کے آخر پر توحید کے ذکر میں قرآن کریم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ تکذیب میں انہوں نے جلدی کی ہے اس کا انجام آکر رہے گا۔ اس رکوع میں اسی عذاب کا ذکر ہے جو تکذیب پر آتا ہے اور پہلے بطور تمہید بیان فرمایا کہ ہر ایک کی ذمہ داری اپنے اپنے اعمال کی ہے اس لیے جو حق کی مخالفت کرتا ہے اور اس کا استیصال چاہتا ہے وہ لازماً سزا پاتا ہے۔

تَهۡدِی الۡعُمۡیَ وَلَوۡ کَانُوۡا لَا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۴۳﴾
تو اندھوں کو راہ دکھائے گا گو وہ سوجھ نہ رکھتے ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظۡلِمُ النَّاسَ شَیۡـًٔا وَّلٰـکِنَّ النَّاسَ اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۴۴﴾
اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا، لیکن لوگ آپ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں ع۱۴۰۱

وَیَوۡمَ یَحۡشُرُهُمۡ کَاَنۡ لَّمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ یَتَعَارَفُوۡنَ بَیۡنَهُمۡ ؕ قَدۡ خَسِرَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا کَانُوۡا مُهۡتَدِیۡنَ ﴿۴۵﴾
اور جس دن اُن کو اکٹھا کرے گا گویا نہ رہے تھے مگر دن کی ایک گھڑی، ایک دوسرے کو پہچانیں گے اور وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور وہ ہدایت پانے والے نہ ہوئے ع۱۴۰۲

وَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیۡنَا مَرۡجِعُهُمۡ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِیۡدٌ عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۴۶﴾
اور اگر ہم ان وعدوں میں سے جو انھیں دیتے ہیں کچھ تجھے دکھادیں یا تجھے وفات دیں تو ہماری طرف ہی انھیں لوٹ کر آنا ہے پھر اللہ اس پر گواہ ہے جو وہ کرتے ہیں ع۱۴۰۳

وَلِکُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوۡلُهُمۡ قُضِیَ بَیۡنَهُمۡ بِالۡقِسۡطِ وَهُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۴۷﴾
اور ہر ایک قوم کے لیے ایک رسول ہے، سو جب ان کا رسول آجاتا ہے ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا ع۱۴۰۴

وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۴۸﴾
اور کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو۔

قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِکُ لِنَفۡسِیۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِکُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا
کہہ میں اپنے لیے نہ بُرے کا مالک ہوں نہ بھلے کا، سوائے اس کے جو اللہ چاہے۔ ہر ایک قوم کا ایک وقت ہے جب ان کا

ع۱۴۰۱ جب اعمال کی ذمہ داری کا ذکر کیا تو بتایا کہ بعض لوگ بظاہر کان تو لگاتے ہیں یعنی آواز تو ان کے کان میں پڑتی ہے مگر عقل سے کام نہیں لیتے اس لیے سن کر فائدہ نہیں اُٹھاتے اور آنکھوں سے دیکھتے تو معلوم ہوتے ہیں مگر چونکہ بصیرت سے کام نہیں لیتے اس لیے ان کا دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہے اور یہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سزا بطور ظلم نہیں دیتا۔

ع۱۴۰۲ آرام اور مصیبت کا مقابلہ: دنیا میں جو مدّت رہے ہیں وہ ایک گھڑی بھر سے بھی کم معلوم ہوگی انسان کتنی بھی عمر آسایش اور آرام میں گزارے جب مصیبت آتی ہے تو وہ سب ایک گھڑی ہی معلوم ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو پہچاننے سے بھی یہی مطلب ہے کہ گویا علیحدہ ہوئے کوئی عرصہ نہیں گزرا۔

ع۱۴۰۳ آنحضرتؐ کے مخالفین پر قیامت تک سزا کا آتا رہنا: مطلب یہ ہے کہ سزا کے سارے وعدوں کا آپ کی زندگی میں پورا ہونا ضروری نہیں اور حق تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا دامن جب قیامت تک ممتد ہے اور قرآن کریم میں سب ہی مکذبین اور مخالفین کا ذکر ہے تو ان کی سزائیں سب کی سب آنحضرتؐ کی زندگی میں کس طرح وارد ہوسکتی تھیں اور بعض کا آپ کو دکھایا جانا تاریخ سے ثابت ہے اور یہ جو فرمایا کہ اللہ اس پر گواہ ہے جو وہ کرتے ہیں تو مطلب یہ ہے کہ ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جس جس کو وہ جس سزا کے لائق سمجھے گا دیتا رہے گا۔

ع۱۴۰۴ ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے یہ وہ عظیم الشان صداقت ہے جو اسلام سے پہلے کسی نے نہیں سکھائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چونکہ کل دنیا کی طرف ہوئی اس لیے سب عالم ایک ہی اُمت کے حکم میں ہوگیا۔ رسول کا اب کسی قوم کے پاس آنا ان کو تبلیغ ہونا ہے۔ جس قوم پر آپ کی تعلیم کی تبلیغ ہوگئی۔ اسی کے متعلق اس آیت کا مضمون صادق آگیا اور بینہم سے مراد رسول اور اس کے مخالف ہیں کہ ان کے درمیان فیصلہ ہوجاتا ہے یعنی مخالفین پر سزا وارد ہوتی ہے اسی کے متعلق اگلی آیت میں سوال ہے کہ وہ سزا کب آئے گی اور قرآن کریم میں متی ھٰذا الوعد۔ متی ھٰذا الفتح اکثر دنیوی عذاب کے متعلق ہی ہے۔

جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً
وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾
قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا
اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾
اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ
كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾
ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ
الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾
وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ
ع اِنَّهٗ لَحَقٌّ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾
وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِى الْاَرْضِ
لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا
رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ
وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾

وقت آجاتا ہے تو ایک گھڑی پیچھے نہیں رہ سکتے اور نہ آگے بڑھتے ہیں[1405]
کہہ بتاؤ اگر اس کا عذاب رات یا دن کو تم پر آجائے تو اس میں سے وہ کیا ہے جس کے لیے مجرم جلدی کر رہے ہیں[1406]۔
(اور) کیا پھر جب وہ آہی جائے گا اس پر ایمان لاؤ گے اب (ایمان لاتے ہو) اور (پہلے) اس کے لیے جلدی مچاتے تھے۔
پھر انھیں جنھوں نے ظلم کیا تھا کہا جائے گا دیرپا عذاب چکھو نہیں بدلہ نہیں دیا جاتا مگر وہی جو تم کماتے تھے۔
اور تجھ سے دریافت کرتے ہیں کیا یہ سچ ہے، کہہ ہاں! میرے رب کی قسم یہ یقیناً حق ہے اور تم (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے[1407]
اور اگر ہر شخص کے لیے جس نے ظلم کیا وہ (سب کچھ) ہو جو زمین میں ہے تو اس کے ساتھ فدیہ دینا چاہیگا اور (جب عذاب کو دیکھیں گے تو ندامت کو چھپائیں گے اور ان میں انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا[1408]

ع۱۴۰۵ جب یہ سوال ہوا کہ وہ سزا ہم پر کب آئے گی تو فرمایا کہ جواب میں کہہ دو کہ تمہیں سزا پہنچانے کا اختیار مجھے کہاں ہے میں تو اپنی جان کے لیے بھی کسی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ اس قسم کے الفاظ جو قرآن کریم میں بار بار آئے ہیں نہ صرف آپ کے پیروؤں کو غلو سے روکتے ہیں بلکہ دوسری طرف یہ بھی بتاتے ہیں کہ حق کے قبول کرنے میں کسی نفع نقصان کا لالچ نہ دیں بلکہ حق کی خاطر حق کو قبول کرنے کے لیے بلائیں۔
اور یہ جو فرمایا کہ ہر قوم کے لیے ایک میعاد مقرر ہے تو اس میں یہ تعلیم دی ہے کہ جس طرح انسان پیدا ہوتے اور مرتے ہیں اسی طرح قومیں بھی پیدا ہوتی اور مرتی ہیں اور ہر ایک قوم کے لیے علم الٰہی میں ایک وقت مقرر ہوتا ہے جب وہ صف لپیٹ لی جاتی ہے۔ پس کسی قوم کو اپنی طاقت پر فخر نہیں کرنا چاہیئے جس طرح کسی انسان کو اپنی قوت پر فخر نہیں کرنا چاہیئے۔

ع۱۴۰۶ تعیش اور غفلت سے عذاب آتا ہے: رات کے وقت غافل لوگ عیش و عشرت میں مصروف ہوتے ہیں اور خدا کو بھول جاتے ہیں۔ دن کے وقت اپنے کاروبار کی مصروفیت میں خدا سے دور پڑ جاتے ہیں۔ یہی اشارہ دن اور رات کے وقت عذاب کے آنے میں ہے۔ فرمایا جب عذاب خود ہی آنے والا ہے تو پھر جلدی مانگنے سے کیا حاصل ہے۔

ع۱۴۰۷ اِیْ۔ حرف جواب اور تصدیق ہے جس کے معنی نَعَم ہیں یعنی ہاں اور اس کا استعمال اس طرح پر قسم کے ساتھ خاص ہے پھر اسی عذاب کے متعلق سوال ہے کہ کیا ایسا سچ مچ ہوگا۔ جب ایک قوم طاقت کے نشہ میں ہوتی ہے تو اسے کبھی خیال نہیں آتا کہ اس کے لیے بھی کوئی وقت آنے والا ہے جب اس کی طاقت نابود کر دی جائے گی۔ یہ بار بار کے سوال اسی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔

ع۱۴۰۸ اَسَرُّوْا۔ سِرّ اور اسرار خلاف اعلان ہے سرا وعلانیۃ (البقرۃ ۲-۲۷۴) اور سِرّ وہ بات ہے جو دل کے اندر چھپائی ہوئی ہو اور اَسَرُّوْا کے معنی انہوں نے چھپایا۔ مگر بعض کے نزدیک اس کے معنی ہیں ظاہر کیا۔ کیونکہ دوسری جگہ ان کا قول منقول ہے یٰلیتنا نرد ولا نکذب بایات ربنا (الانعام ۶-۲۷) مگر وہ ندامت صرف اسی قدر نہیں جس کا یہاں اشارۃً ذکر ہے۔ ہاں اسرار جب دوسرے کی طرف ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے اس پر ظاہر کرنا اور اس کے غیر سے چھپانا واذ اسر النبیّ الی بعض ازواجہ حدیثا (التحریم ۶۶-۳) واسررت لھم اسرارا (نوح ۷۱-۹) گویا ایک رنگ میں اظہار اور ایک رنگ میں اخفا (غ) اور بعض اہل لغت نے اسرار کو اضداد میں سے قرار دیا ہے یعنی اس کے معنی ظاہر کرنا بھی ہیں اور چھپانا بھی (ت)
ندامت کو چھپانے سے مراد یہ ہے کہ بڑے لوگ اپنے متبعین سے ندامت کو چھپائیں گے۔ تکذیب پر جس عذاب کا وعدہ تھا اسی کا یہاں ذکر ہے۔ وہ

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۵۵

سنو اللہ کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سنو اللہ کا وعدہ سچا ہے، لیکن اُن میں سے اکثر نہیں جانتے۔

هُوَ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۵۶

وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ۬ وَ هُدًی وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝۵۷

اے لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے اور اس کے لیے شفا جو سینوں میں ہے۔ اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ع۱۴۰۹

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۝۵۸

کہہ، اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر ہاں اسی پر چاہیئے کہ خوش ہوں، وہ اس (دولت) سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں ع۱۴۱۰

قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَی اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝۵۹

کہہ، کیا دیکھتے ہو جو اللہ نے تمھارے لیے رزق اتارا ہے، پھر تم اس سے حرام اور حلال ٹھیراتے ہو۔ کہہ، کیا اللہ نے تمھیں اس کا حکم دیا ہے؟ یا تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو ع۱۴۱۱

وَ مَا ظَنُّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ

اور جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں قیامت کے دن کی نسبت اُن کا کیا

دنیا میں بھی ظاہر ہو جاتا ہے گو کامل طور پر قیامت میں ظہور پذیر ہوگا۔

ع۱۴۰۹ صدور۔ صدر سینہ کو کہتے ہیں اور راغب نے بعض حکماء کا قول نقل کیا ہے کہ جہاں قلب کا ذکر ہے تو اشارہ عقل اور علم کی طرف ہے جیسے ان فی ذٰلک لذکری لمن کان لہ قلب (ق۔ ۳۷) اور جہاں صدر کا ذکر ہے تو اس کی طرف اور تمام قویٰ مثلاً شہوت، ہوا، غضب وغیرہ کی طرف ہے (غ) پس شفاء لما فی الصدور سے مراد ہوئی کہ سب قویٰ کی اصلاح ہے۔

تکذیب کے انجام بد سے ڈرا کر اور پچھلی آیات میں یہ بتا کر کہ واقعی طاقت اور قدرت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور جو بر سر طاقت ہیں وہ خوب یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہی زندہ کرتا اور مارتا ہے اب اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تم تکذیب میں کیوں جلدی کرتے ہو۔ قرآن تو تمہارے رب کی طرف سے ایک وعظ ہے اور وعظ روکنا ہے اس طرح کہ بدی کے بد انجام سے ڈرایا جائے۔ دوسری بات فرمائی کہ انسان کو جو کچھ قویٰ دیئے گئے ہیں ان کے لیے یہ دوا ہے یعنی ان کی اصلاح کرتا ہے تیسری بات ہدایت ہے کہ ان کو صحیح راہ پر لگاتا ہے۔ اور چوتھی رحمت کہ اس سے اچھے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی اخلاق فاضلہ کی بلند ترین منازل پر یہ پہنچاتا ہے جو دنیا کے لیے موجب رحمت ہے۔

ع۱۴۱۰ اخلاق اور مال: یہاں اسی بات کو واضح کر کے بیان کیا ہے کہ اللہ کی طرف سے یہ فضل اور رحمت ہے جو تم کو بلند مقامات پر پہنچاتا ہے اور اس مال و دولت سے جس کے جمع کرنے کی فکر میں تم اس کی تکذیب کرتے ہو وہ بہت بہتر ہے۔ گویا سمجھایا ہے کہ اخلاق فاضلہ دولت سے اچھی چیز ہے قرآن کریم تم میں وہ اخلاق فاضلہ پیدا کرتا ہے۔ تم دولت کے جمع کرنے کے لیے بڑی کوشش کرتے ہو، لیکن ان اخلاق کے لینے کے لیے کیوں متوجہ نہیں ہوتے دولت سے انسان عزت اور راحت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر دولت سے یہ چیزیں کبھی نہیں ملتیں اور جو عزت اور راحت ہمیشہ کے لیے اخلاق فاضلہ سے ملتی ہے وہ دولت سے عارضی طور پر بھی نہیں مل سکتی۔

ع۱۴۱۱ رزق۔ عطائے جاری کو کہتے ہیں دنیوی ہو یا اخروی۔ اور مال اور جاہ اور علم سب رزق میں داخل ہیں (غ)

ایک معنی تو ظاہر ہیں کہ مشرک بعض قسم کی چیزوں کو حرام قرار دے لیتے تھے ھٰذہ انعام وحرث حجر (الانعام۶۔ ۱۳۸) مگر سیاق و سباق کے لحاظ سے یہ مراد معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اخلاق سے بھی رزق دیا ہے اور قیام جسم کے لیے بھی پھر تم اس رزق سے جو اخلاق سے تعلق رکھتا ہے اپنے آپ کو بکلی محروم رکھ کر اسے گویا حرام ٹھہرا رہے ہو۔ ھو خیر مما یجمعون سے یہی معلوم ہوتا ہے اگلی آیت بھی اس معنی کی موید ہے کیونکہ فرمایا کہ یہاں تو اس رزق سے تم دن کاٹ لو گے مگر قیامت کے دن کی نسبت جہاں یہ رزق ساتھ نہیں ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے یعنی اس کے لیے کیوں کچھ بھی تیاری نہیں کرتے۔

یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَهُمۡ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۶۰﴾ ع

خیال ہے ؟ یقیناً اللہ لوگوں پر فضل کرتا ہے لیکن اُن میں سے اکثر شکر نہیں کرتے۔

وَ مَا تَکُوۡنُ فِیۡ شَاۡنٍ وَّ مَا تَتۡلُوۡا مِنۡهُ مِنۡ قُرۡاٰنٍ وَّ لَا تَعۡمَلُوۡنَ مِنۡ عَمَلٍ اِلَّا کُنَّا عَلَیۡکُمۡ شُهُوۡدًا اِذۡ تُفِیۡضُوۡنَ فِیۡهِ ؕ وَ مَا یَعۡزُبُ عَنۡ رَّبِّکَ مِنۡ مِّثۡقَالِ ذَرَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ وَ لَاۤ اَصۡغَرَ مِنۡ ذٰلِکَ وَ لَاۤ اَکۡبَرَ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۶۱﴾

اور تو کسی حال میں نہیں ہوتا اور نہ اس میں کچھ قرآن پڑھتا ہے اور نہ تم کچھ کام کرتے ہو، مگر ہم تم پر موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور تیرے رب سے ذرّہ کے وزن کے برابر بھی کوئی چیز نہ زمین میں چھپی رہتی ہے اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی، مگر وہ ایک کھلی کتاب میں ہے ع۱۴۱۲

اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾

سنو اللہ کے دوستوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ع۱۴۱۳

الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿۶۳﴾ ؕ

جو ایمان لائے اور تقوےٰ کرتے تھے۔

ع۱۴۱۲ شان۔ حال اور معاملہ کو کہتے ہیں۔ جو واقع ہو اور جو سنوار والا ہو۔ اور یہ لفظ صرف بڑے اہم احوال اور امور پر بولا جاتا ہے (غ)

تفیضون۔ افاض فی الحدیث کے معنی ہیں بات کو پھیلایا یا اس میں کثرت سے لگ گئے (ل) دیکھو ع۱۳۳۵ اور یہ خوض کے ہم معنی بھی ہے (غ) جس کا اکثر استعمال مذمت کے مقام پر ہے۔

یعزب۔ عازب وہ شخص ہے جو چارہ کی تلاش میں اپنے اہل سے دُور نکل جائے (غ) اس لیے عزب بمعنی غاب یا بَعُد ہے۔ یعنی غائب ہُوا یا دُور ہُوا۔

کتاب۔ کتاب سے مراد ہمیشہ لکھے ہوئے اوراق نہیں ہوتے بلکہ بعض وقت اس سے مراد ہوتی ہے وہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اندازہ کیا ہے اور بعض وقت مراد اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کا ایجاب اور اس کا حکم ہوتا ہے (غ) اور یہاں کتاب مبین سے مراد علم الٰہی ہے اور مبین اس کو اس لحاظ سے کہا کہ نتائج اعمال ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

جب کفار کو یہ توجہ دلائی کہ وہ بجائے تکذیب کے قرآن کریم سے فائدہ اٹھائیں کیونکہ اس میں شفا اور ہدایت ہے تو اب یہ بتایا کہ یہ قرآن اپنی پیروی کرنے والوں کو کن مقاماتِ عالیہ پر پہنچاتا ہے۔ اور اس پہلی آیت میں تلاوت قرآن کا ذکر کیا خواہ خطاب خاص نبی صلعم سے لیا جائے یا عام۔ اور آپ کے یا آپ کے سچے متبعین کی ساری شانیں ہی اچھی ہیں۔ مگر تلاوت قرآن کا بالخصوص ذکر کیا۔ منہ میں ضمیر اسی شان کی طرف ہے اور یا اللہ کی طرف یعنی اللہ کی طرف سے نازل شدہ قرآن کی تلاوت کرتے ہو یا قبل الذکر ضمیر قرآن کی طرف ہے اور خطاب واحد کے بعد خطاب کو جمع کر کے بتا دیا کہ اصل خطاب سب سے ہی ہے اور ما تعملون من عمل میں سب مومن مراد ہیں جو کسی کام میں لگے ہوں تو ان کو خوش خبری دی ہے کہ تمہارا کوئی نیک عمل ضائع نہیں ہوتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھتا ہے اور افاضۃ کے اصل معنی چونکہ کثرت یا زور سے کسی بات یا کام میں لگنا ہیں اس لیے یہ معنی بھی درست ہیں اور بعض نے اذ تفیضون فیہ میں مراد مخالفین کو لیا ہے کہ قرآن کے بارے میں جھوٹ کو شائع کرتے ہو مگر پہلے معنی ہی قابل ترجیح ہیں (ج) اور اگلی آیت میں صفائی سے اولیاء اللہ کا ذکر کر کے بتا بھی دیا کہ یہاں مراد وہی لوگ ہیں جو نبی صلعم کے اتباع میں اعمال صالح میں لگے رہتے ہیں۔

ع۱۴۱۳ اولیاء اللہ۔ ولی کے معنی کے لیے دیکھو ع۳۳۲ اولیاء اللہ کہنے سے یہ منشا ہے کہ وہ اللہ کے دین کی نصرت کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ ان کا ناصر ہوتا ہے۔

قرآن کس مقام بلند پر پہنچاتا ہے: تکذیب کرنے والوں کے مقابلہ پر یہاں انصار اللہ کا ذکر کیا جن کو یہاں اولیاء اللہ کے نام سے پکارا ہے اور اگلی آیت میں بتا دیا کہ وہ کون لوگ ہیں جو ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں پس اس کے بعد جو نصرتِ دین کرتے ہیں وہی اولیاء اللہ ہیں۔ ان کا اس مقام بلند پر پہنچ جانا یقینی بیان کیا ہے جو نجات کامل کا مفہوم ہے کہ نہ ان پر خوف ہے نہ وہ غمگین ہونگے اور یہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر انسان اس دنیا میں پہنچ سکتا ہے اور حقیقی راحت انسان

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۶۴

ان کے لیے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں خوشخبری ہے ۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں ، یہ بڑی بھاری کامیابی ہے ۱۴۱۴

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۶۵ وقف لازم

اور اُن کی بات تجھے غمگین نہ کرے ، عزت سب اللہ کے لیے ہے ، وہ سننے والا جاننے والا ہے ۱۴۱۵

کو اسی وقت میسّر آتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جس پر پہنچ کر انسان یہیں جنت کو پا لیتا ہے۔

۱۴۱۴ البشرٰی ۔ بشارۃ اور لبشرٰی ۔ اس خبر کو کہا جاتا ہے جو خوش کرنے والی ہو ۔ ولما جاءت رسلنا ابراھیم بالبشرٰی (العنکبوت ۲۹ ۔ ۳۱) یٰبشرٰی ھٰذا غلام (یوسف ۱۲ ۔ ۱۹) اور لبشیر وہ ہے جو ایسی خبر دیتا ہے فلما ان جاء البشیر (یوسف ۱۲ ۔ ۹۶) اور ہواؤں کو بھی مبشر کہا ہے یرسل الریاح مبشرات (الروم ۳۰ ۔ ۴۶) اور آنحضرت صلعم نے فرمایا انقطع الوحی ولم یَبْقَ الا المبشرات اور وہ رویائے صالحہ ہیں جو مومن دیکھتا ہے یا جو اس کے لیے دکھائی جاتی ہیں (غ)

اولیاء اللہ کو اگر ایک طرف یہ خوش خبری دی تھی کہ ان کے لیے خوف وحزن باقی نہ رہے گا تو اب دوسری طرف یہ بھی بتا یا کہ صرف یہی نہیں بلکہ ان کو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بشارتیں ہوں گی اور یہی وہ بلند ترین مقام ہے جس کو قرآن کریم نے فوز عظیم کے نام سے موسوم کیا ہے ۔ حدیث صحیح میں اس کی تصریح موجود ہے جہاں فرمایا لم یبق من النبوۃ الا المبشرات یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان جو سفارت کا کام انبیاء کرتے تھے اس میں سے اب صرف مبشرات باقی رہ گئی ہیں جو مومنوں کو ملتی رہیں گی ۔ نبوۃ یا سفارۃ تو کئی ایک چیزوں کے مجموعہ کا نام تھا ۔ مثلاً مبشرات کے علاوہ کتاب کا ملنا جیسا کہ وانزل معھم الکتاب (البقرۃ ۲ ۔ ۲۱۳) سے ظاہر ہے یا کسی نمونہ کا ظاہر کرنا وغیرہ ۔ اس سفارت میں ایک حصّہ یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی تائیدات اور نصرتوں کی خوشخبری اسکے بندوں کو پہنچائی جائے سو وہ حصّہ باقی رہ گیا یعنی کل میں سے ایک جزو اور بلحاظ اس اصل پیغام کے جو اللہ تعالیٰ کی راہوں کا بتانا اس کے اوامر ونواہی کا پہنچانا وغیرہ ہے ۔

مبشرات چالیسواں جزو نبوت ہیں : ا سے نبوت کا صرف چالیسواں اور چھیالیسواں یا ساٹھواں حصّہ قرار دیا ہے اور مبشرات کی تشریح حدیث میں رویائے صالحہ سے کی ہے اور اس میں الہام بھی داخل ہے ۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کے اس کلام کو جو بذریعہ رویا یا کشف یا الہام انسان تک پہنچایا جاتا ہے من وراء حجاب میں داخل کیا ہے ۔ اور حدیث نے بلحاظ کثرت کے جو رویا کو حاصل ہے اسی کو اصل قرار دیا ہے پس یہ آیت بھی جس کی تفسیر یہ حدیث کرتی ہے ختم نبوت پر دلیل ہے کیونکہ اس کی رو سے صرف مبشرات باقی رہ گئی ہیں اور متعدد حدیثوں میں ہے کہ رسول اللہ صلعم سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد رویائے صالحہ ہے دیکھو ابن جریر اور ابن کثیر ۔

انقطاع نبوت سے انقطاع مقامات عالیہ نہیں ہوا : یہاں آیت کے آخر پر یہ لفظ لا کر ذٰلک ھوالفوزالعظیم یہی بڑی بھاری کامیابی ہے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر انسان پہنچ سکتا ہے اس سے اوپر کوئی مقام نہیں اور یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ اب نبوت نہیں تو کچھ بھی نہیں یا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا دروازہ بند ہو گیا ۔ حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم صلعم نے فرمایا ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت ولا رسول بعدی ولا نبی قال فشق ذٰلک علی الناس فقال وٰلکن المبشرات ۔ یعنی رسالت اور نبوت منقطع ہو گئی اور میرے بعد کوئی رسول نہیں اور نہ کوئی نبی ہے تو یہ بات لوگوں پر شاق گزری تو آپ نے فرمایا لیکن مبشرات باقی ہیں جس میں یہی ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اللہ تعالیٰ کا مکالمہ ومخاطبہ جو اصل نعمت ہے وہ باقی ہے ، کیونکہ وہ معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے اور اسی کی طرف اشارہ ہے رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء میں ، ہاں نبوت کی اصل غرض چونکہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں کا ظاہر کرنا تھا اور تکمیل دین کے بعد اس کی ضرورت نہ رہی اس لیے اب نبوت نہیں مگر مقامات عالیہ تک پہنچنے کی سب راہیں موجود ہیں بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر چنانچہ احمد اور ابن ابی حاتم اور بیہقی نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ان اللہ تعالیٰ عباداً لیسوا بانبیاء ولا شھداء یغبطھم النبیون والشھداء علی مجالسھم وقربھم من اللہ (د) یعنی اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں جو نبی اور شہید نہیں لیکن نبی اور شہید ان کے مرتبہ اور ان کے اللہ تعالیٰ کے قرب پر رشک کریں گے اور ابو ہریرہ سے اسی کی مثل روایت ہے ان من عباد اللہ عباداً یغبطھم الانبیاء والشھداء اور جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ کون ہیں تو آپ نے ان کے متعلق کچھ باتیں بیان کر کے یہی آیت پڑھی الاان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون (یونس ۱۰ ۔ ۶۲) (ج) اور ایسی ہی روایت ابو داؤد میں ہے (ث) اور ان روایات کا ماحصل یہی ہے کہ قرب الٰہی کے مراتب اسی طرح لوگوں کو ملتے رہیں گے اور انقطاع نبوت سے مقامات عالیہ سے محروم نہیں کیے جائیں گے ۔

۱۴۱۵ مومنین کے ان مدارج عالیہ کو کفار کیا سمجھ سکتے تھے جن کی نظریں دنیا تک محدود تھیں اور جنہیں مال و دولت دنیوی اور حکومت ظاہری پر ناز تھا اس لیے تسلی کے طور پر فرمایا کہ ان باتوں سے غمگین مت ہو ۔ عزت وذلت بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے ۔ مومن اگر اس وقت دنیوی طور پر بیکسی کی حالت میں ہیں تو یہ بھی کوئی غم کی بات نہیں اصل عزت سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے وہ ان کو بھی دے دیگا سمیع علیم میں ان کے اعمال حسنہ کے نتائج کی

أَلَآ إِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ۚ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿٦٦﴾

سنو اللہ کے لیے ہی ہے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور جو اللہ کے سوا (اوروں کو) پکارتے ہیں وہ (ان) شریکوں کی پیروی نہیں کرتے وہ صرف (اپنے) خیال کی پیروی کرتے ہیں اور صرف اٹکلیں دوڑاتے ہیں ع۱۴۱۶

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿٦٧﴾

وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن روشنی دینے والا (بنایا) یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو سنتے ہیں ع۱۴۱۷

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۖ هُوَ الْغَنِيُّ ۖ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ۚ أَتَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾

کہتے ہیں اللہ نے بیٹا بنایا وہ (اس سے) پاک ہے، وہ بے نیاز ہے، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں، کیا تم اللہ پر (جھوٹ) کہتے ہو جو تم نہیں جانتے ع۱۴۱۸

قُلْ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾

کہہ، وہ جو اللہ پر جھوٹ بناتے ہیں، کامیاب نہیں ہوتے۔

مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٧٠﴾ ع

دنیا کا سامان ہے پھر ہماری طرف انھیں لوٹ کر آنا ہے پھر ہم انھیں سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے اس لیے کہ وہ کفر کرتے تھے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ ۘ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِي وَتَذْكِيرِي بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوٓا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ

اور ان پر نوحؑ کی خبر پڑھ، جب اس نے اپنی قوم کو کہا اے میری قوم! اگر میرا کھڑا ہونا اور میرا اللہ کی آیات سے نصیحت کرنا تم پر بھاری ہے، تو میرا بھروسا اللہ پر ہے سو اپنا کام درست کر لو اور اپنے شریک جمع کر لو، پھر تم کو

طرف اشارہ کیا۔

ع۱۴۱۶ پہلی آیت کے مضمون کو اور واضح کیا ہے کہ حکومت اور بادشاہت سب اللہ کی ہے اور کسی کو خدا کا شریک سمجھ کر پکارنا اس خیال سے کہ اس سے کچھ نفع پہنچے گا بے سود ہے اس لیے کہ یہ صرف جھوٹ اور وہم کی پیروی ہے حقیقت میں وہ کوئی شے ہی نہیں جس کی وہ پیروی کرتے ہیں ما یتبع الذین یعنی ای شئی یتبع یہ کس چیز کی پیروی کرتے ہیں گویا وہ کچھ بھی نہیں خوص کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۰۳۰۔

ع۱۴۱۷ رات کا آرام انسان کو کام کے قابل بناتا ہے اور دن کی روشنی میں وہ کام کرتا ہے یہ دن اور رات اللہ تعالیٰ نے ہی بنائے ہیں پس نفع نقصان کا مالک وہی ہے جو سامانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ یا یہ اشارہ ہے کہ جس طرح رات جسمانی سکون کا موجب ہے اسی طرح روحانی سکون کا موجب بھی ہے کیونکہ رات کی عبادت سے خصوصیت سے تسکین قلب حاصل ہوتی ہے اور ایسا ہی دن جس طرح جسمانی طور پر روشنی دیتا ہے ایسا ہی روحانی طور پر بھی۔

ع۱۴۱۸ شرک اتخاذ ولد: جب شرک کا ذکر کیا تو اس سب سے بڑے شرک کا بھی ذکر کیا جو دنیا میں پھیل جانے والا تھا اور یہ بھی بتایا کہ اس شرک کی بھی کوئی دلیل ان کے ہاتھ میں نہیں اور آیت ۷۰ میں ان کی ظاہری حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا کی زندگی کے سامان اگر انہیں بہتات سے ملیں تو یہ عارضی اور چند روزہ بات ہے۔ حقیقی راحت کے سامانوں سے وہ محروم ہیں اس لیے انجام دکھ ہی دکھ ہے۔

اَمۡرُکُمۡ عَلَیۡکُمۡ غُمَّۃً ثُمَّ اقۡضُوۡۤا اِلَیَّ وَ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۷۱﴾

اپنے کام میں شبہ نہ رہے، پھر میرے ساتھ (وہ) کرگزرو اور مجھے مہلت نہ دو ع۱۴۱۹

فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَمَا سَاَلۡتُکُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ ؕ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ۙ وَ اُمِرۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۷۲﴾

پھر اگر تم پھر جاؤ تو میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر صرف اللہ پر ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے، کہ میں فرماں برداروں میں سے رہوں۔

فَکَذَّبُوۡہُ فَنَجَّیۡنٰہُ وَ مَنۡ مَّعَہٗ فِی الۡفُلۡکِ وَ جَعَلۡنٰہُمۡ خَلٰٓئِفَ وَ اَغۡرَقۡنَا الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ ﴿۷۳﴾

پر انھوں نے اسے جھٹلایا سو ہم نے اسے اور انھیں جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے بچایا اور انھیں جانشین بنایا اور انھیں غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا تو دیکھ لے جو ڈرائے گئے تھے ان کا انجام کیسا ہوا۔

ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ رُسُلًا اِلٰی قَوۡمِہِمۡ فَجَآءُوۡہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَمَا کَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡا بِمَا کَذَّبُوۡا بِہٖ مِنۡ قَبۡلُ ؕ کَذٰلِکَ نَطۡبَعُ عَلٰی قُلُوۡبِ الۡمُعۡتَدِیۡنَ ﴿۷۴﴾

پھر ہم نے اس کے بعد اپنی (اپنی) قوم کی طرف رسول بھیجے اور وہ اُن کے پاس کھلی دلائل لائے مگر وہ ایسے نہ تھے کہ اس پر ایمان لاتے جسے پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم حد سے گزر جانے والوں کے دلوں پر مُہر لگا دیتے ہیں ع۱۴۲۰

ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ مُّوۡسٰی وَ ہٰرُوۡنَ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۠ئِہٖ بِاٰیٰتِنَا فَاسۡتَکۡبَرُوۡا

پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰؑ اور ہارونؑ کو اپنی آیتوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا، پر

ع۱۴۱۹ مقام مصدر بھی ہوسکتا ہے اور قیام سے اسم مکان اور اسم زمان بھی اور یہاں مصدر بھی ہوسکتا ہے یعنی مراد یہ ہو کہ میرا تمہارے درمیان ٹھہرنا تمہیں بُرا معلوم ہوتا ہے اور یا اسم مکان لیکر اس سے ایماء اپنے نفس کی طرف ہوسکتا ہے۔

اجمعوا امرکم۔ اَجمعۡتُ کذا اکثر اس موقعہ پر بولا جاتا ہے جہاں جمع سے کسی امر کی طرف اجتماع فکر سے پہنچنا مراد ہو۔ فاجمعوا کیدکم (طٰہٰ[20] -۶۴) اور اجمع المسلمون علی کذا سے مراد ہے کہ مسلمانوں کی رائیں اس امر پر مجتمع ہوگئیں۔ اور ان الناس قد جمعوا لکم (ال عمرٰن[3] -۱۷۳) میں رائوں کا اجتماع بھی مراد ہوسکتا ہے اور لشکروں کا بھی۔ اور اَمۡرٌ جَامِعٌ اس عظیم الشان امر کو کہتے ہیں جس کے لیے لوگ اکٹھے ہو جائیں واذا کانوا معہ علی امر جامع (النور[24] -۶۲) (غ) اور جَمَعَ امرہٗ اور اَجۡمَعَہٗ کے معنی ہیں عَزَمَ علیہ یعنی اس پر عزم کرلیا اور اجمعوا امرکم وشرکاءکم میں و بمعنی مع ہے یعنی اجمعوا امرکم مع شرکاءکم اور بعض نے وادعوا شرکاءکم مراد لیا ہے۔

غُمّۃ۔ غَمّ۔ کے اصل معنی ڈھانکنا ہیں اور اَمۡرٌ غُمَّۃٌ اس امر کو کہتے ہیں جو مبہم اور مشکوک ہو (ل)

اقضوا الی۔ قضاء۔ کسی امر کا فیصلہ کر دینا ہے قول سے ہو یا فعل سے اور یہاں قضاء فعل سے ہے یعنی اس اپنے فیصلہ کو میرے متعلق عمل میں لے آؤ فاذا قضیتم مناسککم (البقرۃ[2] - ۲۰۰) اور ایّما الاجلین قضیت (القصص[28] -۲۸) میں بھی قضائے فعلی ہی ہے۔

اعدائے رسول کو چیلنج: رسول اللہ صلعم کی تکذیب کا ذکر تھا۔ اسی میں قرآن کریم کے مومنوں کو مقامات عالیہ پر پہنچانے کا ذکر آیا۔ اب پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا ہے اور مثال کے رنگ میں پہلے انبیاء کی تکذیب اور اس کے نتائج کو پیش کیا ہے مگر اصل ذکر آنحضرتؐ کا مقصود ہے اور آپ کے ہی مخالفوں کو ان الفاظ میں خطاب ہے کہ تم جو کچھ طاقت رکھتے ہو میرے خلاف کرگزرو۔ میری ہلاکت کا عزم کرلو۔ کوئی اشتباہ باقی نہ رہے، مہلت بھی نہ دو اور جو کرنا چاہتے ہو فوراً کرگزرو۔ اس شدید مخالفت کے اندر اور کفار کے اس جوش کے اندر جو ان میں پہلے ہی پھیلا ہوا تھا۔ ان الفاظ میں دشمنوں کو یہ کہنا کہ تم سے جو کچھ ہوسکتا ہے میری مخالفت پر زور لگالو اور میری تباہی کے سامان کرلو انسان کا کام نہ ہوسکتا تھا۔ چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں۔ چند بے بس دوست ہیں۔ وہ گھروں سے نکل چکے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت پر کس قدر ایمان ہے کہ یہ پیغام پورے زور کے ساتھ دشمنوں کو پہنچاتے ہیں۔

ع۱۴۲۰ الی قومھم میں بتایا کہ ہر ایک رسول کو ایک خاص قوم کی طرف بھیجا گیا۔ ان رسولوں کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ حضرت نوحؑ کی بعثت بھی عام نہ تھی جیسا کہ انا ارسلنا نوحًا الی قومہ (نوح[71] -۱) سے ظاہر ہے اور اس کا سارا خطاب اپنی قوم سے ہی پایا جاتا ہے۔ اور جو فرمایا کہ جس بات کو پہلے جھٹلایا اس پر ایمان نہ

وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿٧٥﴾

انھوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٦﴾

سو جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا انھوں نے کہا یہ کھلا جادو ہے۔

قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ۭ اَسِحْرٌ هٰذَا ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿٧٧﴾

موسیٰؑ نے کہا، کیا تم حق کو (یہ) کہتے ہو کہ جب وہ تمھارے پاس آیا، کیا یہ جادو ہے؟ اور جادوگر کامیاب نہیں ہوتے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٨﴾

انھوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس (راہ) سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا اور تم دونوں کے لیے ملک میں بڑائی ہو اور ہم تم دونوں پر ایمان لانے والے نہیں ع۱۴۲۱

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿٧٩﴾

فرعون نے کہا ہر ایک علم والے جادوگر کو میرے پاس لے آؤ۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿٨٠﴾

سو جب جادوگر آ گئے، موسیٰؑ نے انھیں کہا، ڈالو جو تم ڈالتے ہو۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٨١﴾

تو جب ڈال چکے موسیٰؑ نے انھیں کہا، جو تم لائے ہو یہ دھوکا ہے اللہ اس کو ابھی باطل کر دکھائے گا کیونکہ اللہ فساد کرنے والوں کے کام کو نہیں سنوارتا۔

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٨٢﴾ ع

اور اللہ اپنے کلمات سے حق کو سچا کر دکھائے گا، گو مجرم برا منائیں ع۱۴۲۲

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰي خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٨٣﴾

پھر موسیٰ پر کوئی ایمان نہ لایا مگر اس کی قوم کے کچھ لوگ فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتے ہوئے کہ انھیں دُکھ دے گا اور فرعون یقیناً ملک میں سرکش تھا اور وہ حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا ع۱۴۲۳

لائے تو مطلب یہ ہے کہ ہر رسول کے ساتھ اس کی قوم نے یکساں سلوک کیا یعنی پہلے ہی بغیر سوچے سمجھے جھٹلا دیا پھر مخالفت اور تکذیب پر اڑ گئے، کیونکہ دلوں میں نفرت اور بغض بیٹھ گیا۔

ع۱۴۲۱ تلفت۔ لَفَتَ کے معنی صَرَفَ ہیں یعنی پھیر دیا۔ اسی سے التفات ہے ایک طرف سے ہٹکر دوسری طرف متوجہ ہونا۔

ان آیات میں سحر اور ساحر دھوکہ اور دھوکہ باز کے معنی میں ہی ہے ۔

ع۱۴۲۲ موسیٰؑ کا غلبہ بذریعہ کلمات: یہ آخری الفاظ بتاتے ہیں کہ احقاق حق بذریعہ ان کلمات کے ہوا، جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو سکھائے تھے اور یہی بات حضرت موسیٰ کے آخری غلبہ کا موجب ہوئی۔

ع۱۴۲۳ ذریة۔ دیکھو ع۱۵۶ اور اس میں باپ بیٹے اولاد عورتیں سب شامل ہیں انا حملنا ذریتہم فی الفلك المشحون (یٰس ۳۶-۴۱) (ل) اور حدیث میں ہے کہ آنحضرتؐ نے کسی جنگ میں ایک عورت کو قتل ہوا ہوا دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ اس کے ساتھ جنگ کرنا نہ چاہیئے تھا۔ اور پھر آپ نے خالد کے پاس آدمی بھیجا اور حکم دیا لا تقتل ذرية ولا عسيفا۔ جہاں ذریة کی تشریح میں ابن اثیر لکھتے ہیں۔ یجمع نسل الانسان من ذکر و انثی (ن) یعنی ذریة سے مراد نسل انسان ہے مرد اور عورتیں دونوں

وَ قَالَ مُوْسٰی یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ
بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ ﴿۸۴﴾
فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا
فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۵﴾
وَ نَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۸۶﴾
وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰی وَ اَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ
لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ
قِبْلَةً وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۷﴾
وَ قَالَ مُوْسٰی رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ
وَ مَلَاَهٗ زِیْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ

اور موسیٰؑ نے کہا اے میری قوم اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو
اسی پر بھروسہ کرو ، اگر تم فرمانبردار ہو۔
تو انھوں نے کہا اللہ ہی پر ہم بھروسا کرتے ہیں اے ہمارے رب
ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا ح۱۴۲۴
اور اپنی رحمت سے ہمیں کافر لوگوں سے چھڑا۔
اور ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم
کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو مسجدیں بناؤ
اور نماز قائم کرو اور مومنوں کو خوشخبری دے ح۱۴۲۵
اور موسیٰؑ نے کہا اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کے
سرداروں کو دنیا کی زندگی میں آسایش کا سامان اور بہت سا

اس میں شامل ہیں۔

ذریۃ من قومہ میں مراد بعض نے قوم بنی اسرائیل اور بعض نے قوم فرعون لی ہے، مگر ترجیح قول اول کو ہے (ج) سیاق عبارت یہی چاہتا ہے۔ کیونکہ آگے ذکر موسیٰ کی قوم کا ہی چلتا ہے اور ذریۃ سے مراد یہاں ابن عباس کے نزدیک قلیل ہے یعنی تھوڑے لوگ اور بعض نے اولاد مراد لی ہے یعنی ان کے باپ مدت گزر جانے سے مرچکے تھے اور ملائہم میں ضمیر ذریۃ کی طرف بلحاظ معنی جاتی ہے یا قوم کی طرف یا تو فرعون کی قوم کے سرداروں کو بنی اسرائیل کے سردار کہا ہے اس لیے کہ بنی اسرائیل محکوم تھے اور یا ملائہم سے مراد واقعی بنی اسرائیل کے بڑے لوگ ہیں کیونکہ فرعون انہی لوگوں کے ذریعہ سے بنی اسرائیل پر ظلم کرتا تھا جیسا کہ دوسری جگہ قارون کا ذکر صاف الفاظ میں ہے اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ خود غرض لوگ اپنے ذاتی رسوخ اور مالی فائدہ کے لیے اپنی ہی قوم کی جڑیں کاٹنے کے لیے مستعد رہتے ہیں، جیسے آج کل بھی بہتیرے مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ کوئی عہدہ ان کو حکومت میں ملتا ہے یا کسی عزت کی خواہش ہوتی ہے تو اپنی ہی قوم کی بیخکنی کو اس کا ذریعہ بناتے ہیں، پس مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سے بھی بہت سے لوگ فرعون اور اپنے نمبرداروں کے خوف سے حضرت موسیٰ پر ایمان نہ لائے اور یہ ابتدا کا ذکر ہے اور یہاں قوم فرعون کا ذکر نہیں۔ گو ان میں سے بھی چند ایک لوگ جیسے خود ساحر اور رجل مومن مذکورہ سورت المومن حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے تھے۔

ح۱۴۲۴ فتنۃ کے اصل معنی دکھ اور عذاب ہیں اور یہاں مراد فتنہ کا محل ہے۔ گویا اس عذاب اور تکلیف سے نجات مانگی ہے جو فرعون کی طرف سے ان کو پہنچتا تھا۔

ح۱۴۲۵ قبلۃ سے مراد یہاں مجازاً نماز کی جگہ یا مسجد ہے جیسے دوسری جگہ مصلّٰی یا نماز کی جگہ سے مراد قبلہ ہے دیکھو ح۱۵۸۔

بنی اسرائیل کی نجات کا سامان: بنی اسرائیل مصر میں تو رہتے ہی تھے اس لیے حضرت موسیٰ کو یہ وحی کرنے کا کیا مطلب ہے۔ حضرت موسیٰ کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنی قوم کو فرعون کے پنجہ سے چھڑا لاؤ، چنانچہ حضرت موسیٰ کا پہلا مطالبہ فرعون سے یہی تھا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو فارسل معی بنی اسرائیل (الاعراف ۷۔ ۱۰۵) لیکن فرعون نے اس کی اجازت نہ دی اور اپنے تشدد اور مظالم کو بنی اسرائیل پر اور سخت کیا اور چونکہ خود بنی اسرائیل بھی عرصہ دراز تک محکومیت کی حالت میں رہنے سے ان اخلاق فاضلہ سے عاری ہو چکے تھے جن سے قوم کو بادشاہت مل سکتی ہے اس لیے حکم ہوا کہ ابھی کچھ مدت ملک مصر میں رہنا ہوگا مگر یہ تمہارا رہنا بیکار نہ ہو، بلکہ انہی گھروں کو مسجدیں بناؤ اور اللہ تعالیٰ سے دعا میں لگ جاؤ اور نماز کو قائم کرو تاکہ تمہارے اندر اخلاق فاضلہ پیدا ہوں جیسا کہ دوسری جگہ بھی فرمایا استعینوا باللہ (الاعراف ۷۔ ۱۲۸) یہی ان کی مشکلات کا علاج تھا۔ قوموں کے اندر جب ان کی حالت گر چکی ہو اخلاق فاضلہ کا پیدا کرنا آسان امر نہیں ہوتا ایک عرصہ دراز کو چاہتا ہے۔ آج مسلمان اس صریح تعلیم قرآن کی پروا تک نہیں کرتے اور حکومت اور بادشاہت کو اپنا پہلا اور آخری نصب العین بنا کر راہِ صواب سے اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں اور اپنی قوم کی اصلاح اس طریق سے کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جس طریق سے ایسے ہی حالات کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اپنی قوم کی اصلاح کا حکم دیا تھا۔

ہارونؑ کو وحی: یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی وحی حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں کو ہوتی تھی۔ اور یہاں ذکر بھی دو باتوں کا ہے۔ ایک مصر میں اقامت کرنے کا دوسرا نماز کا اور نماز کی امامت کا کام حضرت ہارونؑ کے سپرد تھا۔

رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ
عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾

مال دے رکھا ہے اے ہمارے رب اس لیے کہ وہ تیرے رستہ سے بہکائیں اے ہمارے رب ان کے مالوں کو برباد کردے اور ان کے دلوں کو سخت کردے سو وہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھیں ع۱۴۲۶

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا
تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

فرمایا تم دونوں کی دعا قبول ہوئی سو تم دونوں ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے رستہ کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ
فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓى اِذَآ
اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا الَّذِىْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا
مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا پار کردیا، پھر فرعون اور اس کے لشکروں نے شرارت اور زیادتی سے اُن کا پیچھا کیا یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا کہا، میں مانتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے، اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں ع۱۴۲۷

آٰلْــٴٰـنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ
مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾

کیا اب (ایمان لاتا ہے) اور پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ
خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ
عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾ ع ۱۴

سو آج ہم تیرے بدن کو بچا دیں گے۔ تاکہ تو اُن کے لیے جو تیرے پیچھے ہیں نشان ہو اور یقیناً بہت سے لوگ ہمارے نشانوں سے بے خبر ہیں ع۱۴۲۸

ع۱۴۲۶ لیضلّوا میں لام عاقبت کا ہے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مال اس لیے دیا تھا کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں۔ بلکہ مال دینے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ انہوں نے لوگوں کو گمراہ کیا۔
اشدد ۔ شَدّ کے معنی مضبوط باندھنا ہیں وشددنا اسرھم (الدھر ۷۶-۲۸) فشدّوا الوثاق (محمّد ۴۷-۴) (غ) اور شدّ علیہ کے معنی ہیں حَمَل علیہ اس پر حملہ کیا (ن)
حضرت موسیٰ کی دعا فرعون کی تباہی کے لیے: حضرت موسیٰ کی یہ دعا اس وقت کی ہے جب فرعون کے سامنے ہر قسم کے نشان اور دلائل دیئے جا چکے ہیں۔ اور بار بار نشان دیکھ کر اور ایمان لانے کا وعدہ کرکے وہ اس سے انحراف کرچکا ہے اور بنی اسرائیل پر سختی کو اور بڑھا دیا ہے لئن کشفت عنّا الرجز لنؤمننّ لك (الاعراف ۷-۱۳۴) جب چھوٹی چھوٹی تکالیف سے انسان اپنی اصلاح نہیں کرتا تو پھر بڑی تکالیف اس پر آتی ہیں۔ اسی کی طرف آیت کے آخری الفاظ میں اشارہ ہے۔ فرعون کو جس چیز نے حق سے روکا وہ مال ہے اس لیے اس کی تباہی کی دعا کی۔ گویا جس مال نے حق سے روکا تھا وہ بھی باقی نہ رہے اشدد علی قلوبھم کے معنی عموماً مفسرین نے یوں کیے ہیں کہ ان کے دلوں پر مہر کردے یا ان کے دلوں کو سخت کردے مگر شدّ کا صلہ علی ہو تو اس کے معنی حملہ کرنے کے لغت میں آئے ہیں۔ اور دلوں پر حملہ کرنے سے مراد دلوں کی محبوب چیزوں کو الگ کردینا ہے گویا وہ چیزیں جن کی محبت نے انہیں حق سے پھیرا ہے ان سے چھین لی جائیں اور اگر دلوں کو سخت کرنے کے معنی ہی لیے جائیں تو یہ دعا چونکہ ان کی سزا کے لیے ہے اس لیے ایسے اعدائے حق کے لیے ایسی دعا بھی قابل اعتراض نہیں، گو اس میں سختی کا پہلو غالب ہے۔

ع۱۴۲۷ فرعون کی توبہ یا مرتے وقت ایمان لانے کا ذکر بائبل میں نہیں مگر قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے اور اس کو ایک دوسرے امر کے ساتھ وابستہ کیا ہے یعنی اس کی لاش کے باہر پھینکنے سے، دیکھو اگلی سے اگلی آیت اس کا ذکر بھی کسی تاریخ میں نہیں، مگر آج واقعات نے اس کو صحیح ثابت کرکے اس دوسرے امر کی صداقت پر بھی مہر لگا دی اور یوں بتا دیا کہ قرآن کریم بائبل سے نہیں لیتا اور عجیب بات یہ ہے کہ گو بائبل میں یہ ذکر نہیں مگر طالمود میں خروج ۹: ۱۶ کی تفسیر کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ فرعون نے توبہ کی تھی۔

ع۱۴۲۸ فرعون کی لاش اور قرآن کریم کا معجزہ: ننجیك ببدنك۔ نجات کے ساتھ بدن کے لفظ کو اس لیے بڑھایا تاکہ معلوم ہو کہ یہ لاش بلا روح تھی (ج)

وَ لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ
وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا
حَتّٰی جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ
بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾
فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ
فَسْـَٔلِ الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ
لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ
مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۹۴﴾

اور بلاشبہ ہم نے بنی اسرائیل کو صدق کے مقام میں ٹھیرایا اور
ان کو ستھری چیزوں سے رزق دیا تو انھوں نے اختلاف نہیں
کیا یہاں تک کہ ان کے پاس علم آیا تیرا رب قیامت کے دن ان میں
فیصلہ کرے گا جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے تھے[۱۴۲۹]
(اے سننے والے) اگر تجھے اس میں شک ہے جو ہم نے تیری طرف
اتارا تو ان لوگوں سے پوچھ جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں یقیناً
تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے حق آیا ہے پس تو جھگڑا
کرنے والوں میں سے نہ ہو[۱۴۳۰]

قرآن کریم کی صداقت کے عظیم الشان نشانوں میں سے یہ ایک نشان ہے کہ اس بات کا پتہ دیا جس کا اس زمانہ میں کسی کو علم تک بھی نہ تھا، لیکن آج واقعات اسے صحیح ثابت کرتے ہیں بلکہ اس کی صحت کا ایسا پختہ ثبوت ملتا ہے کہ جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ نہ بائبل میں نہ اور کسی کتاب میں فرعون کی لاش کو باہر پھینکنے کا ذکر ہے۔ مگر قرآن کریم نے یہ ذکر ایسے کھلے الفاظ میں کیا ہے کہ ان الفاظ کے یہی معنی تمام مفسرین کرتے آئے ہیں کہ فرعون کی لاش کو اللہ تعالیٰ نے سمندر سے باہر نکال پھینکا تھا۔ حضرت موسیٰ کے مقابل میں جو فرعون تھا اس کا نام تاریخ سے رعمیس ثانی ثابت ہے اور انسکلوپیڈیا برٹینیکا میں مضمون ممّی کے نیچے لکھا ہے کہ رعمیس ثانی کی لاش آج تک ان لاشوں میں محفوظ ہے جو مسالہ وغیرہ کے ذریعہ سے رکھی جاتی ہیں۔ آج ان الفاظ لتکون لمن خلفک اٰیۃ کی شوکت کے سامنے دنیا کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے کہ یہ کلام صرف خدائے عالم الغیب کا ہو سکتا تھا۔ آج سے تیرہ سو سال پیشتر ایک عرب کے اُمّی کی زبان سے ایک بات کا اظہار کرایا جاتا ہے جس سے دنیا بے خبر تھی اور آج واقعات اسے صحیح ثابت کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے آیات اللہ سے بے خبر ہونے میں بھی اسی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ تک بے خبر رہنے کے بعد دنیا کو یہ پتہ ملے گا۔ دنیا کی کوئی مذہبی کتاب اس قسم کا بیّن ثبوت خدائے عالم الغیب کی طرف سے ہونے کا پیش نہیں کر سکتی۔

ع[۱۴۲۹] مبوّا صدق۔ مبوّا۔ بواء سے مکان کے معنی میں ہے اور صدق کے مقام سے مراد اچھا مقام ہے دیکھو ع[۱۳۷۱] اور خلیل کا قول ہے کہ ہر کامل چیز کو صدق کہا جاتا ہے اور مبوا صدق کے معنی کیے ہیں منزل صالح (ت) یعنی ایسا مقام جو ہر طرح کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بنی اسرائیل پر نعمت اور ان کی مخالفت رسول: آیت کے پہلے حصّہ میں یہ ذکر ہے کہ فرعون کے ہاتھ سے نجات دلانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مقام صدق عطا فرمایا اور مقام یا جگہ کا کمال یہ ہے کہ اس میں رہنے والوں کو ہر طرح کے فوائد حاصل ہوں اور وہ اچھی سے اچھی جگہ اور اعلےٰ مقام ہو اور یہاں اشارہ ارض مقدس کی طرف ہے جہاں نہ صرف وہ دوسری قوم کی غلامی سے آزاد تھے بلکہ ان کو عمدہ سے عمدہ چیزیں بھی وہاں میسّر تھیں اور طیّبات کے رزق میں بادشاہت بھی شامل ہے اور علوم بھی جو بذریعہ انبیاء ان کو دیئے گئے اور دوسری جگہ اس کی تصریح یوں فرمائی ہے اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا واٰتکم مالم یؤت احدا من العٰلمین (المائدۃ ۵-۲۰) کیونکہ رزق کا لفظ وسیع ہے۔ یہ تو ان پر اللہ تعالیٰ کا انعام تھا دوسرے حصّہ آیت میں ان کی موجودہ حالت کا ذکر کیا جب باوجود علم کے انہوں نے اختلاف کیا اور اختلاف سے مراد رسول اللہ صلعم کے معاملہ میں اختلاف یا آپ کی مخالفت ہے دیکھو ع[۲۱۴] ل

ع[۱۴۳۰] شک۔ کسی شخص کے نزدیک دو امور کا جو ایک دوسرے کے نقیض ہیں یکساں اور مساوی ہونا شک ہے اور یہ یا اسلیئے ہوتا ہے کہ اس شخص کے نزدیک دونوں میں یکساں نشانات پائے جاتے ہیں یا دونوں میں یکساں نشان نہیں پائے جاتے اور شک کبھی تو کسی شے کے متعلق ہوتا ہے کہ وہ موجود ہے یا نہیں اور کبھی اس کی جنس کے متعلق ہوتا ہے کہ یہ کس جنس میں سے ہے اور کبھی اس کی بعض صفات میں ہوتا ہے اور کبھی اس غرض میں ہوتا ہے جس کے لیے وہ چیز وجود میں لائی گئی ہو اور شک ایک قسم کی جہالت ہے مگر جہالت عام ہے اور یہ خاص اور ہر ایک شک جہالت ہے گو ہر جہالت شک نہیں (غ)

آنحضرت صلعم کو قرآن کریم کے متعلق کبھی شک نہ تھا نہ ہو سکتا تھا: یہاں خطاب کس سے ہے؟ یہ ایک ایسا بیّن امر ہے کہ جس پر چنداں بحث کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم میں بسا اوقات خطاب عام ہوتا ہے گو مخاطب واحد ہو اور ہر مخاطب واحد نبی صلعم نہیں۔ بلکہ بعض جگہ نبی کے نام سے بھی خطاب ہو تو مراد عام ہوتی ہے یا یٰایھا النبی اذا طلقتم النساء (الطلاق ۶۵-۱) یہاں ایسے مخاطب کا ذکر ہے جس کو قرآن کے بارے میں شک ہے اور شک کے معنی اوپر بیان ہو چکے کہ دو نقیض باتوں میں مساوات اور اعتدال مثلاً شک اس شخص کو ہو گا جو فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے ہے یا افترا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ نبی صلعم کو ایسا خیال ہونا قطعی طور پر ناممکن ہے یہاں تک کہ بڑے بڑے مخالفین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم اپنے آپ کو سچائی پر یقین کرتے تھے اور مکّی زمانہ کے متعلق جبکہ یہ سورت ہے بالخصوص یہ اعتراف اکثر عیسائیوں کو ہے۔ پھر قرآن کے بارہ میں آپ کو شک ہونا بالکل بے معنی بات ہے۔ اگر نعوذ باللہ من

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۹۵﴾

اور تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں ورنہ تو نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۹۶﴾

وہ لوگ جن پر تیرے رب کی بات پوری ہو گئی، ایمان نہیں لائیں گے۔

وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿۹۷﴾

اور گو اُن کے پاس سب نشان آجائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھیں ۱۴۳۱

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿۹۸﴾

تو کیوں کوئی بستی ایسی نہ ہوئی کہ ایمان لاتی تو اس کا ایمان اسے نفع دیتا، مگر یونسؑ کی قوم، جب وہ ایمان لائے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ان سے ذلّت کا عذاب دور کر دیا اور ایک وقت تک ان کو سامان دیا ۱۴۳۲

ذلک آپ افترا کر رہے تھے تو بھی آپ کو علم تھا کہ میں افترا کر رہا ہوں۔ اور اگر افترا نہیں کر رہے تھے تو بھی علم تھا کہ میں افترا نہیں کر رہا ہوں۔ قرآن کے متعلق کسی دوسرے کو شک ہو سکتا ہے خود رسول اللہ صلعم کو دونوں صورتوں میں شک نہیں ہو سکتا یعنی خواہ دشمن سچے ہوں یا جھوٹے آپ کو شک کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ شک جہالت کا نام ہے اور آپ کو علم ہے کہ یہ کیا ہے شک کا لفظ انہی لوگوں کے متعلق ہو سکتا ہے جو ایک درمیانی اور تذبذب کی حالت میں ہیں۔ نہیں جانتے کہ اسے سچا کہیں نہ یہ کہ اسے جھوٹا کہیں کبھی ایک بات کہتے ہیں کبھی دوسری پھر جس شخص کے اندر اس قدر قوت یقین بھری ہوئی ہو کہ سینکڑوں دلوں کے اندر ایسا یقین پیدا کر دے کہ وہ موت کے مُنہ میں جانا قبول کر لیں مگر قرآن کو نہ چھوڑیں کیا اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس کو شک ہو اور اس سے اگلی آیت نے یہ بالکل واضح کر دیا کیونکہ وہاں فرمایا کہ تو جھٹلانے والوں میں سے نہ ہو۔ یہاں بھی خطاب واحد ہے اگر شک کرنے والے نعوذ باللہ نبی صلعم ہیں تو جھٹلانے والے بھی وہی ہونگے جو ایک ایسی بدیہی باطل بات ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل بکار نہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ صفائی سے آیت ۱۰۴ میں فرمایا یایہا النّاس ان کنتم فی شك من دینی اے لوگو اگر تمہیں میرے دین کے متعلق کچھ شک ہے جس سے معلوم ہوا کہ وہی لوگ جن کو یہاں بصیغہ واحد خطاب کیا ہے وہاں بصیغہ جمع خطاب کر کے بات کو صاف کر دیا ہے کہ شک کرنے والے دوسرے لوگ تھے اور اسی آیت کے آخر پر ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں سے ہوں۔ پس آپ ہی شک کرنے والے کس طرح ہو سکتے ہیں اور مما انزلنا الیك اس کے خلاف نہیں کیونکہ قرآن شریف میں بار بار قرآن کریم کے سب کی طرف نزول کا ذکر ہے یایہا النّاس قد جاءکم برہان من ربکم وانزلنا الیکم نوراً مبینا (النساءؑ ۔۱۷۴) اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں۔

بعض مفسرین نے غلطی سے فسئل الذین یقرءون الکتاب من قبلك میں عبد اللہ بن سلام کا ذکر کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ مدینہ میں ایمان لائے اور یہ سورت مکی ہے اور وہ رسول اللہ صلعم کی صداقت پر ایمان لائے تھے نہ کہ رسول اللہ صلعم ان سے دریافت کر کے اپنی صداقت پر ایمان لائے تھے اور یہ غلطی خود اس سے ظاہر ہے کہ ابن جریر میں کئی روایتیں موجود ہیں کہ نبی کریم صلعم نے نہ کبھی شک کیا اور نہ سوال کیا بلکہ بعض روایتوں میں یہ لفظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا اشك ولا اسئل نہ میں شک کرتا ہوں اور نہ سوال کرتا ہوں۔ جس میں صاف طور پر یہ سمجھا دیا کہ میرے متعلق یہ آیت نہیں بلکہ اس میں خطاب دوسرے لوگوں سے ہے اور یہ امر واقعات تاریخی میں سے ہے کہ نبی کریم صلعم نے کبھی کسی اہل کتاب سے کسی امر کے متعلق اس غرض سے سوال نہیں کیا کہ وہ کسی حقیقت کو آپ پر منکشف کر دے۔

ع۱۴۳۱ اللہ تعالیٰ کا وہ کونسا کلام تھا جو ایسے لوگوں کے حق میں پورا ہوا۔ ظاہر ہے کہ وہ وہی سزائے تکذیب ہے جس کا ذکر چل رہا ہے اور پچھلی آیت میں اس تکذیب کا ذکر پھر بھی کر دیا ہے۔

ع۱۴۳۲ یونس۔ بائبل میں یہ نام یوناہ ہے اور ان کی ایک مختصر سی کتاب بائبل کے مجموعہ کتب انبیاء میں موجود ہے۔ ان کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح ہے۔ قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کا ذکر علاوہ اس مقام کے الانعام۶ ۔۸۷؛ الانبیاء۲۱ ۔۸۷؛ الصّٰفّٰت۳۷ ۔۱۳۹ تا ۱۴۸؛ القلم۶۸ ۔۴۸ تا ۵۰ میں ہے ان کا پیغام اہل نینوہ کی طرف تھا اور نینوہ اس زمانہ میں ایک ایسی عظیم الشان سلطنت کا دار الخلافہ تھا جو دنیا کے بڑے حصّہ پر محیط تھی۔

اہل نینوی اور عذاب: جہاں انبیاء کے مکذبین کی ہلاکت اور تباہی کا ذکر کیا ایک ایسے نبی کا بھی ذکر کر دیا جس کے مخالفین باوجود نہ ماننے کے آخر توبہ کر کے عذاب الٰہی سے بچ گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی طرف حضرت یونسؑ کو بھیجا گیا۔ ابن کثیر میں ہے کہ حضرت یونسؑ نے اہل نینوی کو عذاب سے ڈرایا مگر انہوں نے نہ مانا تب یونسؑ ان کے درمیان

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾

اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین میں جس قدر لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے، تو کیا تُو لوگوں کو مجبور کرے گا یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں ؏۱۴۳۳

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

اور کسی شخص کے لیے نہیں کہ سوائے اللہ کے اذن کے ایمان ؏۱۴۳۴ لائے اور وہ پلیدی کو انہی پر ڈالتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

کہہ دیکھو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور نشان اور ڈرانے والے ان لوگوں کے کچھ کام نہیں آتے جو ایمان نہیں لاتے۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

یہ تو صرف ایسے ہی دنوں کا انتظار کرتے ہیں جیسے اُن پر آئے جو اُن سے پہلے گزر چکے کہہ انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ؏۱۴۳۵

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ۱۵

پھر ہم اپنے رسولوں کو اور انہیں جو ایمان لائے بچاتے ہیں، اسی طرح ہمارا ذمہ ہے ہم مومنوں کو بچائیں گے ؏۱۴۳۶

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ

کہہ اے لوگو! اگر تمہیں میرے دین میں شک ہے تو میں اُن کی

سے چلے گئے تا کہ عذاب کے مقام سے الگ ہو جائیں (تب ان لوگوں نے..... اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور اللہ تعالیٰ نے وہ عذاب دور کر دیا۔ پھر دو گروہ ہیں ایک کہتے ہیں کہ ان سے صرف عذاب دنیا دُور کیا گیا اور عذاب اُخروی نہیں (گویا وہ فی الواقع ایمان نہ لائے تھے صرف عذاب کے خوف سے کچھ رجوع کیا) اور دوسرے کہتے ہیں کہ عذاب اُخروی بھی ان سے دور کیا گیا اور وہ ایمان لے آئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انذاری پیشگوئیاں ٹل بھی جاتی ہیں۔ حالانکہ ایک نبی کی زبان سے وہ ظاہر بھی کر دی گئی ہوں اور گو رجوع کامل ہو جس میں ایمان صحیح ہو یا ناقص ہو کہ صرف عذاب کے خوف سے رجوع کیا جائے۔

حضرت یونسؑ کے اس ذکر میں جو خصوصیت سے مکذبین کے انجام میں لایا گیا ہے یہ اشارہ ہے کہ آپ کے مخالفین بھی آخر رجوع کریں گے اور وہ تباہ نہ کیے جائیں گے اسی مخالفین پر رحم کیا جانے کی طرف ہی اشارہ اس حدیث میں معلوم ہوتا ہے جو نبی کریمؐ نے فرمایا لا تفضّلو نی علی یونس مجھے یونس پر فضیلت مت دو۔

؏۱۴۳۳ یہ تو مکّی زمانہ ہے اس لیے یہ شک پیدا نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ صلعم تلوار سے لوگوں کو مسلمان کرنا چاہتے تھے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ ایمان کا معاملہ تو خوشی کا ہے اس لیے جو ایمان لاتے ہیں لائیں۔

؏۱۴۳۴ اذن سے کیا مراد ہے دیکھو ؏۱۲۳ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے اذن سے ہی ہوتا ہے وما کان لنفس ان تموت الّا باذن اللہ (آل عمران)۔ ۱۴۵) مگر فرمایا کہ کفر کی پلیدی اور ناپاکی انہی لوگوں پر اللہ تعالیٰ باقی رکھتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ سو جب ایک انسان عقل سے کام نہ لے گا، تو اللہ کا اذن بھی اس کے متعلق نہ ہوگا۔

؏۱۴۳۵ ایام کے لیے دیکھو ؏۵۲۴ مراد واقعات ہیں جو پہلوں پر گزرے یعنی جیسے مصائب ان پر آئے یہاں فرمایا کہ یہ ایام بھی آئیں گے انتظار کرو۔ اگلی آیت میں رسول اور مومنوں کے نجات پا جانے کو پھر بطور پیشگوئی واضح الفاظ میں بیان فرمایا۔

؏۱۴۳۶ اعدائے دین کے ظلم سے نجات، جب پچھلی آیت میں عذاب کے انتظار کے لیے کہا تو اب بتایا کہ جب عذاب آتا ہے تو رسول اور اس کے ساتھ مومن نجات پا جاتے ہیں یعنی دشمنوں کے ظلم سے رہائی حاصل کر لیتے ہیں تو اس میں رسول اللہ صلعم اور آپ کے ساتھیوں کو تسلّی دی اور دوبارہ فرمایا اسی طرح ہم مومنوں کو نجات دینگے یعنی اعدائے دین کے ظلم سے چھڑانا صرف رسول سے مخصوص نہیں بلکہ جب کبھی مومنوں پر مصائب آئیں گی تو اسی طرح ہم ان کو بھی نجات دیتے رہیں گے بلکہ درمیان میں حقا علینا لا کر اسے اور بھی موکد کیا ہے۔ اس قدر تاکید کے باوجود آج کس طرح مسلمان ملکوں کے ملک اور قوموں کی قومیں مصائب میں گرفتار ہیں۔ مگر کیوں؟ اس لیے کہ مومن نہیں بنتے۔ اگر مسلمان سچے دل سے مومن بن جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مصائب کو خود دور فرما دے۔

مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ
يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٤﴾
وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا
تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٥﴾

عبادت نہیں کرتا جن کو تم اللہ کے سوائے پوجتے ہو۔ لیکن
مَیں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہیں وفات دیتا ہے،
اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مَیں مومنوں میں سے ہوں ١٤٣٧
اور یہ کہ یکسو ہو کر اپنے تئیں دین پر قائم رکھ ، اور
مشرکوں میں سے مت ہو ١٤٣٨

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ
وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا
مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٦﴾

اور اللہ کے سوا اُسے نہ پکار، جو نہ تجھے نفع دیتا ہے
اور نہ تجھے نقصان دیتا ہے اور اگر (ایسا) کیا تو تُو بھی اس
وقت ظالموں میں سے ہوگا۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ
لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا
رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ
مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٧﴾

اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اس کے دور
کرنے والا کوئی نہیں اور اگر وہ کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے
فضل کو رد کرنے والا کوئی نہیں وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے
اسے پہنچاتا ہے اور وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ
مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا
يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ
عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ؕ ﴿١٠٨﴾

کہہ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق
آچکا سو جو کوئی راہ پر چلتا ہے وہ اپنے بھلے کو ہی راہ پر چلتا ہے
اور جو کوئی گمراہ ہوتا ہے اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے،
اور مَیں تم پر مختار نہیں۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى
ع ١٦ يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ ع

اور اس کی پیروی کر جو تیری طرف وحی کی جاتی ہے اور صبر کر یہاں تک
کہ اللہ فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ١٤٣٩

ع١٤٣٧ اللہ تعالیٰ کی توحید کے مضمون کو قرآن شریف نے بار بار دہرایا ہے اس صراحت کے ہوتے ہوئے کسی کو آپ کے دین میں کیا شک ہو سکتا تھا۔ بایں پھر وضاحت کر دی جن کی تم عبادت کرتے ہو اس کی میں عبادت نہیں کرتا بلکہ میں اس کی عبادت کرتا ہوں جو تمہیں وفات دیتا ہے اس خاص صفت کے اختیار کرنے میں ایک تو یہ اشارہ ہے کہ جن انسانوں کو تم نے خدا یا خدا کی طرح سمجھا ہُوا ہے وہ بھی آخر مرتے ہیں اور دوسرا یہ کہ تمہارا کوئی معبود تمہیں موت سے نہیں بچا سکتا۔

ع١٤٣٨ اس آیت میں خطاب پھر بدل گیا ہے اوپر کی آیت میں تھا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں سے ہوں اور یہاں ہے کہ تو اپنی توجہ کو دین کے لیے مضبوط رکھ اور مشرکوں میں سے نہ ہو جس سے صاف ظاہر ہے کہ دوسرا مخاطب مراد ہے اگلی آیت اور بھی اس کی وضاحت کرتی ہے۔ ١٠٧ آیت تک یہی عام خطاب ہے اسی لیے آیت ١٠٨ میں پھر دوبارہ فرمایا قل ۔

ع١٤٣٩ اس رکوع میں مومنوں اور کافروں کو الگ کر کے آخر پر فرمایا کہ تم صرف اللہ تعالیٰ کی وحی کی پیروی کیے جاؤ۔ مشکلات سے اللہ تعالیٰ خود باہر نکالے گا اور دونوں گروہوں میں فیصلہ کر کے دکھا دے گا کہ حق پر کون ہے۔ ایسی صریح آیات کا جن میں حق کی آخری کامیابی کو روز روشن کی طرح ظاہر کیا گیا ہے یہ اثر تھا کہ جب کفار کی مخالفت فتح مکہ کے ساتھ ٹوٹ گئی تو گروہوں کے گروہ اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے۔

(۱۱) سُوْرَۃُ ھُوْدٍ مَّکِّیَّۃٌ

اٰیَاتُہَا ۱۲۳ — رُکُوْعَاتُہَا ۱۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
الٓرٰ قف کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ
مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۙ﴿۱﴾
اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْہُ
نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ ۙ﴿۲﴾
وَّ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ
یُمَتِّعْکُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی
وَّ یُؤْتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَہٗ ؕ وَ اِنْ
تَوَلَّوْا فَاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ کَبِیْرٍ ﴿۳﴾
اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ ۚ وَ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴﴾

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
میں اللہ دیکھتا ہوں، یہ کتاب جس کی آیتیں پُر حکمت بنائی گئی ہیں
پھر کھول کر بیان کی گئی ہیں حکمت والے خبردار (خدا) کی طرف سے ہے[۱۴۴۰]
کہ اللہ کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو میں اس کی طرف سے تمہارے
لیے ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔
اور کہ اپنے رب سے بخشش مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو،
وہ تمھیں ایک وقت مقرر تک اچھے سامان سے فائدہ پہنچائے
گا اور ہر ایک بزرگی والے پر اپنا فضل کرے گا — اور اگر تم پھر
جاؤ تو میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں[۱۴۴۱]
اللہ کی طرف ہی تم سب کو لوٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس سورۃ کا نام ھود ہے اور اس میں دس رکوع اور ایک سو تئیس آیتیں ہیں گو اس میں حضرت نوحؑ اور دیگر انبیاء کا بھی ذکر ہے مگر اس کا نام ہود اس خصوصیت کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے کہ حضرت ہود پہلے نبی ہیں جو عرب میں ہوئے۔

خلاصہ مضمون یہ سورت پچھلی سورت سے ملتی جلتی ہے اور یہ دونوں ایک ہی مضمون کی تکمیل کرتی ہیں مگر یہاں زیادہ تر مثالوں سے مطلب کو واضح کیا ہے۔ پہلے رکوع میں حق اور اس کے مخالفین کا ذکر ہے۔ دوسرے میں بتایا کہ بعض لوگ صرف دنیا کی طلب میں لگ جاتے ہیں اور اس کے مقابل پر طالبان حق کا ذکر کیا۔ تیسرے اور چوتھے رکوع میں حضرت نوحؑ کا ذکر ہے، پانچویں میں حضرت ہودؑ کا، چھٹے میں حضرت صالحؑ کا، ساتویں میں حضرت ابراہیمؑ اور لوطؑ کا، آٹھویں میں حضرت شعیبؑ کا، نویں میں شقی اور سعید دونوں گروہوں کا الگ الگ ذکر کیا اور ان کا انجام بتایا اور دسویں میں نبی کریمؐ اور آپ کے ساتھیوں کو عظیم الشان مصائب میں تسلی دی۔

تعلق: یہ سات سورتیں یعنی یونس سے لے کر النحل تک قریباً ایک ہی مضمون پر ہیں یعنی صداقت وحی پر۔ پچھلی سورت میں زیادہ تر علمی بحث تھی اس میں گزشتہ انبیاء اور ان کے مخالفین کی مثالیں دے کر سمجھایا ہے۔

زمانہ نزول اس سورت کا وہی ہے جو سورت یونس کا ہے۔ اس بات سے کہ یہاں دس سورتوں کے مقابل میں لانے کی تحدی ہے اور سورۂ یونس میں ایک سورت کی۔ جو اس میں ترقی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ ہود بلحاظ نزول سورۂ یونس سے پہلے کی ہے۔

۱۴۴۰ احکمت۔ اَحْکَمَ۔ اور حَکَمَ کے ایک معنی آتے ہیں مَنَعَہٗ عن الفَسَادِ یعنی اسے بگڑنے سے محفوظ کیا۔ اور اس لیے یہاں ایک معنی کیے گئے ہیں باطل سے اسے محفوظ کیا اور اَحْکَمَ الامر کے معنی ہیں اَتْقَنَہٗ یعنی اسے مضبوط کیا اور اَحْکَمَتْہُ التجارِب کے معنی ہیں تجربوں نے اسے حکیم یعنی صاحب حکمت بنا دیا (ل)، اسی آخری معنی میں لفظ اُحْکِمَ کا استعمال یہاں معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ احکمت اٰیاتہٗ کے مقابلہ پر اللہ تعالیٰ کا اسم حکیم اور فصلت کے مقابلہ پر خبیر لایا گیا ہے۔

قرآن میں اصول و فروع کا ضروری علم: پچھلی سورت میں صرف الکتاب الحکیم فرمایا تھا، یہاں تفصیل آیات شاید اس اشارہ کے لیے بڑھایا ہو کہ اس سورۃ میں اسی مضمون کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور احکام سے اصل مطلب یہ ہے کہ قرآن شریف سارا پُر حکمت کلام ہے اور اس کی بنیاد علم پر ہے اور دوسری طرف اس میں تمام تفصیلات ضروری موجود ہیں۔ ضروریات انسانی کا کوئی پہلو نہیں جس پر اس میں بحث نہ ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا تبیانا لکل شیءٍ (النحل[۱۶]۔۸۹) گویا اس کے اصول بھی کامل ہیں اور فروع بھی۔

۱۴۴۱ پہلے حصّہ میں بیان فرمایا کہ اگر تم گناہوں سے استغفار کرو اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی طرف رجوع کرو، تو اس سے تمہاری دنیا بگڑ نہیں جاتی، بلکہ اس زندگی میں بھی اچھا سامان ملتا ہے اور دوسرے حصّہ میں ذی فضل سے مراد عمل صالح میں زیادتی والا ہے اور فضلہ میں ضمیر یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل عظیم سے اسے دیتا ہے اور یا ضمیر اسی ذی فضل کی طرف ہے اور مراد اس کے فضل یعنی عمل صالح کی جزا ہے۔

اَلَاۤ اِنَّھُمۡ یَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَھُمۡ لِیَسۡتَخۡفُوۡا مِنۡہُ ؕ اَلَا حِیۡنَ یَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِیَابَھُمۡ ۙ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَ مَا یُعۡلِنُوۡنَ ۚ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝۵

سنو یہ اپنے سینوں کو دوہرا کرتے ہیں تاکہ اس سے چھپے رہیں، سنو جب یہ اپنے کپڑے لپیٹ لیتے ہیں، وہ جانتا ہے جو یہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے ۱۴۴۲ء

وَ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُھَا وَ یَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّھَا وَ مُسۡتَوۡدَعَھَا ؕ کُلٌّ فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ۝۶

اور زمین میں کوئی جاندار نہیں، مگر اللہ کے ذمہ ہی اس کا رزق ہے اور وہ اُس کے ٹھیرنے کی جگہ اور اُس کے سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے، سب کچھ ایک کھلی کتاب میں ہے ۱۴۴۳ء

وَ ھُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ وَّ کَانَ عَرۡشُہٗ عَلَی الۡمَآءِ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ لَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّکُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡمَوۡتِ لَیَقُوۡلَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ ھٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ۝۷

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ وقتوں میں پیدا کیا، اور اس کا عرش پانی پر ہے تاکہ تمھیں آزمائے کون تم میں سے اچھے عمل کرنے والا ہے، اور اگر تو کہے کہ تم موت کے بعد اُٹھائے جاؤ گے تو جو کافر ہیں، کہیں گے یہ تو صریح جادو ہے ۱۴۴۴ء

۱۴۴۲ء یثنون۔ ثنی الشیٔ کے معنی ہیں اس کے ایک حصّہ کو دوسرے پر لوٹایا یا تہہ کیا۔ اور مروڑا بھی اس کے معنی آتے ہیں۔ اور یثنون صدورھم کے معنی ہیں کہ محبت ظاہر کرتے ہیں اور سینوں میں بغض چھپاتے ہیں۔ (ل) اور مجاہد نے مراد شک اور امترا لیا ہے (ج) اور یا اس سے مراد حق سے اعراض ہے کیونکہ جو شخص ایک چیز کو لیتا ہے اس کا سینہ اس کے سامنے ہوتا ہے اور جو اعراض کرتا ہے وہ اس سے پیٹھ پھیر لیتا ہے (ر)

لیستخفوا منه میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اپنی اس عداوت کو جو حق سے رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ سے چھپانا چاہتے ہیں۔

یستغشون ثیابھم کے معنی ہیں کپڑوں کو لپیٹتے ہیں اور مراد اس سے یا تو یہ ہے کہ اپنے کانوں پر لپیٹ لیتے ہیں۔ گویا سننے سے اعراض کرتے ہیں اور یا یہ دوڑ جانے سے کنایہ ہے جس طرح شَمَّرَ ذَیلًا اور القیٰ ثَوۡبَہٗ دوڑنے سے کنایہ ہے (غ) وانی کلّما دعوتہم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اٰذانھم واستغشوا ثیابھم (نوح ۱۱-۷) میں یہی دو معنی مراد ہو سکتے ہیں اور یہ جو اس سے مراد لی گئی ہے کہ سونے کے وقت کپڑے اوڑھ لیتے ہیں (ر) تو یہ معنی اس موقعہ پر چسپاں نہیں اور یا مراد صرف چھپنا ہے۔

۱۴۴۳ء دابۃ کے معنی کے لیے دیکھو ۲۰۲ء اور مستقر اور مستودع کے لیے ۹۸۹ء

تمام جانداروں کا رزق اللہ کے ذمہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رزق کے سب سامان پیدا کر رکھے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ انسان کو معاش یا رزق کی فکر نہیں کرنی چاہیئے بلکہ آیت ۳ کے مضمون کی طرح اس کا مضمون ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے سے انسان سے دنیا کے سامان چھن نہیں جاتے بلکہ رزق تو ہر حال میں پہنچ سکتا ہے نیکی کے اختیار کرنے سے رزق نہیں رک جاتا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کفار طرح طرح کی اذیتیں مسلمانوں کو پہنچاتے تھے اور اس سے قبل شعب ابی طالب میں محصور کر کے سامان خوراک وغیرہ بھی ان تک پہنچنا بند کر دیا تھا۔ پس جب پچھلی آیت میں کفار کی عداوت کا ذکر کیا تو یہاں مسلمانوں کو تسلی دی کہ وہ رزق کے سامانوں کو تم سے نہیں چھین سکتے۔ اس کے یہ معنی لینا کہ گھر بیٹھے رہو وہیں رزق پہنچ جائے گا درست نہیں۔ ہر ایک جانور اپنے رزق کی تلاش میں نکلتا ہے۔ چڑیا اور چیونٹی بھی رزق کی تلاش میں نکلتی ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے سامان ان کے لیے بھی پیدا کر رکھے ہیں انسان کے لیے بھی اور یہاں پر دابۃ یعنی جاندار کا ذکر ہے اور جاندار اور بیجان میں جیسے نباتات وغیرہ امتیاز یہ ہے کہ جانداروں کو اپنا رزق اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے سامانوں سے تلاش کرنا پڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قابل بنایا ہے کہ وہ چلیں اور پھریں اور نباتات وغیرہ اپنا رزق اسی حالت میں پا لیتی ہیں جس حالت میں وہ ہوتی ہیں اور یہ جو فرمایا کہ اس کا مستقر اور مستودع جانتا ہے تو اس میں دونوں زندگیوں کی طرف اشارہ ہے جس کی تصریح اگلی آیت میں فرمائی۔

۱۴۴۴ء چھ یوم میں آسمان اور زمین کی پیدائش کے لیے دیکھو ۱۰۹۴ء ابن جریر نے ضحاک اور کعب سے روایت کی ہے کہ یہ یوم ہزار سال کا تھا۔ مگر اصل حقیقت وہی ہے جو وہاں بیان ہوئی ہے کہ مراد چھ ایام سے چھ حالتیں ہیں اور یہ علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے کہ ہر حالت میں کتنا وقت لگا۔

کان عرشه علی الماء۔ عرش کے لیے دیکھو ۱۰۹۵ء مفسرین نے یہ مراد لی ہے کہ خلق سے پہلے اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔ اور مسلم میں ہے کان

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۸ ع

اور اگر ہم اُن سے عذاب کو ایک مقررو وقت تک پیچھے ڈال دیں تو کہیں گے اسے کس چیز نے روک رکھا ہے، سنو جس دن ان پر آئیگا پھر ان سے ٹلے گا نہیں اور وہ چیز اُن کو گھیر لے گی، جس پر یہ ہنسی کرتے تھے ع۱۴۴۵

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۹

اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت چکھائیں پھر اُسے اس سے لے لیں تو وہ نا اُمید ناشکر گزار ہو جاتا ہے۔

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۱۰

اور اگر دُکھ کے بعد جو اُسے پہنچا ہو ہم اسے سُکھ چکھائیں تو کہتا ہے سب تکلیفیں مجھ سے جاتی رہیں یقیناً وہ اترانے والا شیخی کرنے والا ہے ع۱۴۴۶

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۱۱

مگر جو صبر کرتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں یہی ہیں جن کے لیے حفاظت اور بڑا اجر ہے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ

تو کیا تو اس کا کچھ حصّہ جو تیری طرف وحی کیا جاتا ہے،

اللہ تعالیٰ ولم یکن معہ شیٔ وکان عرشہ علی الماء جس کی تشریح میں ابن الکمال لکھتے ہیں کہ اس کے عرش سے مراد اس کی قیومیت ہے اور ماء میں اشارہ صفت حیات کی طرف ہے (د) جہاں تک عرش کا سوال ہے ع۱۰۹۵ میں دلائل قطعیہ سے دکھایا جا چکا ہے کہ جس طرح کرسی سے مراد علم ہے، عرش سے مراد قدرت ہے۔ پس عرش کے یا نفاذ قدرت کے پانی پر ہونے سے کیا مراد ہے؟ دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے جعلنا من الماء کل شیٔ حیّ (الانبیاء ۲۱-۳۰) ہر ایک زندہ چیز کو پانی سے بنایا اور یہاں اس سے پہلی آیت میں دابۃ یعنی جانداروں کا ذکر ہے پس قرینہ چاہتا ہے کہ جب آسمانوں اور زمین کی پیدائش کا ذکر کیا تو جانداروں کی پیدائش کا بھی ذکر کیا اور اس سے انسان کی زندگی کی طرف اشارہ کرکے آگے فرمایا لیبلوکم ایکم احسن عملا جس کی تقدیر بعض مفسرین نے بھی یوں نکالی ہے وخلقکم لیبلوکم یعنی تمہارے پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ اس بات کو انجام کار ظاہر کرے کہ اچھے عمل کون کرتا ہے۔ پس عرشہ علے الماء میں انسان کی زندگی کی ابتدا کی طرف اشارہ ہے اور یہ حقیقت آج تمام سائنس دانوں کے نزدیک مسلم ہے کہ زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی۔ اور اصل غرض یہ بتانا ہے کہ جو پہلی زندگی کو اس قدر باریک راہوں سے وجود میں لایا اس کے اس ارشاد پر کہ موت کے بعد بعث ہوگا اور ایک دوسری زندگی ہوگی کیوں اس قدر تعجب کرتے ہو کہ اسے سحر مبین کہتے ہو۔ اور یہاں سحر مبین کسی معجزہ کو نہیں کہا۔ بلکہ اس بیان کو کہ موت کے بعد بعث ہوگا سحر مبین کہا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ یہ محض دھوکہ ہے ایسا کہاں ہو سکتا ہے۔

ع۱۴۴۵ اُمّۃ کے لیے دیکھو ع۱۶۳ مگر علاوہ اس معنی کے اور بھی بہت سے معنوں میں یہ لفظ آتا ہے اس کے ایک معنی وقت بھی ہیں (ل) گویا وہ ایک اُمّت یا جماعت کے رہنے کا زمانہ ہے (ج) یہی معنی یہاں ہیں اور بعض نے امۃ معدودۃ سے مراد لوگوں کی جماعت ہی لی ہے یعنی اس جماعت سے پیچھے ہٹا کر دوسری جماعت تک اسے ملتوی کر دیں مگر معاندین کو چھوڑ کر دوسروں پر لانا یہ سنت اللہ نہیں۔

عذاب سے یہاں صریحًا عذاب دنیا ہی مراد ہے۔ بعض نے اسے جنگ بدر کا عذاب کہا ہے مگر آخر تک جو کچھ کفار کی حالت ہوئی وہ سب ہی مراد ہے۔

ع۱۴۴۶ فرح - فَرَح وہ خوشی ہے جو لذت عاجلہ کی وجہ سے ہو یعنی جلد آنے جانے والی سے اس لیے اس کا اکثر استعمال لذات بدنی میں ہے ولا تفرحوا بما اٰتاکم (الحدید ۵۷-۲۳) وفرحوا بالحیٰوۃ الدنیا (الرعد ۱۳-۲۶) فرحوا بما عندھم من العلم (المومن ۴۰-۸۳) اور فرح کے معنی اس طرح خوش ہونے والا۔ اور صرف دو جگہ پر فرح کی رخصت دی گئی ہے فبذٰلک فلیفرحوا (یونس ۱۰-۵۸) ویومئذٍ یفرح المؤمنون (الروم ۳۰-۴) (غ) اور فرح بمعنی بَطِر یعنی حد سے زیادہ خوش ہوا اور تکبر کیا یا اَشِر یعنی ڈینگ ماری بھی آتا ہے (ل) فخور کے لیے دیکھو ع۶۵۶۔

جسمانی دُکھ اور سُکھ: دنیا طلب انسان کی تھڑ دلی کا ذکر کیا ہے پہلی آیت میں یہ کہ ذرا سکھ کے بعد دکھ آتا ہے تو پھر چاروں طرف سے نا اُمید ہو بیٹھتا ہے اور پہلی نعمت کی بھی ناشکری کرتا ہے اور اس میں یہ کہ دکھ کے بعد سکھ ملتا ہے تو خوشی میں پھولا نہیں سماتا اور اس پر اتراتا ہے اور دوسروں پر فخر کرتا ہے اور یہ سمجھایا ہے کہ دنیا کے دکھوں اور تکلیفوں کے آنے پر نہ تو خدا کے فضل اور رحمت سے نا امید ہونا چاہیئے اور نہ ان کے چلے جانے پر اترانا چاہیئے گویا دنیا کے مال اور آرام کو عارضی چیزیں سمجھے۔ یہ زندگی کی غرض نہیں اگلی آیت میں بتایا کہ اخلاق انسانی میں اصل چیز صبر ہے اور زندگی کی غرض اعمال صالحہ سے پوری ہوتی ہے اور دنیا طلب کے مقابلہ پر اعمال صالحہ کرنے والوں کا ذکر کیا۔

وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدۡرُكَ اَنۡ يَّقُوۡلُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ‌ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ نَذِيۡرٌ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ وَّكِيۡلٌ ؕ ﴿۱۲﴾

چھوڑ دے اور تیرا سینہ اس پر تنگ ہوگا کہ وہ کہتے ہیں اس پر خزانہ کیوں نہیں اُترا یا اس کے ساتھ فرشتہ (کیوں نہیں) آیا تو تو ڈرانے والا ہے اور اللہ ہر چیز کا کارساز ہے ع۱۴۴۷

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ‌ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَيٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۳﴾

یا یہ کہتے ہیں کہ اس نے جھوٹ بنایا ہے؟ کہہ پھر اس جیسی دس سورتیں بنائی ہوئی لے آؤ اور اللہ (تعالیٰ) کے سوائے جسے بُلا سکتے ہو، بلا لو، اگر تم سچے ہو ع۱۴۴۸

فَاِلَّمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَـكُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ بِعِلۡمِ اللّٰهِ وَاَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۴﴾

پھر اگر وہ تمھاری بات قبول نہ کریں، تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سو کیا تم فرماں بردار ہوتے ہو؟ ع۱۴۴۹

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَ زِيۡنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيۡهِمۡ اَعۡمَالَهُمۡ فِيۡهَا وَهُمۡ فِيۡهَا لَا يُبۡخَسُوۡنَ ﴿۱۵﴾

جو دنیا کی زندگی اور اس کی زینت ہی چاہتا ہے ہم انھیں ان کے عمل اسی (زندگی) میں پورے دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔

اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ لَيۡسَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ‌ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوۡا فِيۡهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے آگ کے کچھ نہیں اور جو کچھ انھوں نے اس (زندگی) میں کیا تھا کسی کام نہ آئیگا اور جو کچھ وہ کرتے تھے باطل ہے ع۱۴۵۰

ع۱۴۴۷ لعلك تارك۔ لعلّ یہاں ترقی کے لیے نہیں بلکہ تبعید کے لیے ہے یعنی یہ امر بعید ہے کہ تو ایسا کرے بالفاظ دیگر تو ایسا نہیں کر سکتا اور یا استفہام انکاری ہے اور بعض نے ترجّی مراد لیکر یعنی شاید معنی لیکر یہ کہا ہے کہ یہ ترجّی دوسرے لوگوں کی طرف سے ہے جو مخاطب ہیں یعنی کافر چاہتے ہیں یا ایسی آرزو رکھتے ہیں کہ آنحضرت صلعم تبلیغ کا کچھ حصّہ چھوڑ دیں (ر)

ضائق به صدرك دیکھو ع۱۳۵۸ مراد یہاں مغموم ہونا ہے کیونکہ غم سے بھی سینہ میں تنگی پیدا ہوتی ہے۔

کنز۔ مال کو جوڑتے چلے جانا اور اس کی حفاظت کرنا کنز ہے والذین یکنزون الذهب والفضّة (التوبة ۹-۳۴) اور اسم کے معنی مال عظیم یا خزانہ ہیں (غ) دنیاداروں کے خیالات دنیوی زندگی تک ہی محدود ہوتے ہیں اس لیے کہتے ہیں نبی یا مصلح اخلاق آئے تو وہ بھی خزانہ ساتھ لائے۔ حالانکہ اس کے آنے کی غرض یہ ہے کہ مال دنیا کو اپنا محبوب نہ بنائیں پس مال دنیا کی محبت کو وہ کم کرنے آتا ہے مسلمان بھی آج ایسا ہی مصلح چاہتے ہیں جو ان کو بہت سا دنیا کا مال دیدے۔ دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ فرشتہ ساتھ ہو گویا روحانیات کو بھی مادی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ فرشتے تو نبی کریم صلعم پر نازل ہوتے تھے، مگر ان کے دیکھنے کے لیے دوسری آنکھیں چاہئیں۔ ایسے ایسے اعتراض سنکر نبی کریم صلعم کے دل پر کیا کیا غم نہ گزرتا ہوگا تو فرمایا کہ ان باتوں پر غم مت کرو کوئی ان باتوں کی وجہ سے تم نے وحی کو تو ترک کرنا ہی نہیں۔

ع۱۴۴۸ قرآن افترائے انسان نہیں: یہاں دس سورتوں کے مقابلہ میں لانے کی تحدی ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورت سورۂ یونس سے پہلے کی نازل شدہ ہے۔ کیونکہ سورۂ یونس میں ایک سورت کے لانے کا مطالبہ ہے اس سے بھی پہلے کل قرآن کی مثل لانے کا مطالبہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

ع۱۴۴۹ یعنی اگر وہ لوگ جنہیں تم مدد کے لیے بلاؤ وہ تمہاری بات کو قبول نہ کریں یا اس کا جواب نہ دیں یعنی دس سورتیں قرآن شریف کی مثل نہ لا سکیں تو سمجھ لو کہ یہ بشر کی طاقت سے بالاتر بات ہے انزل بعلم اللہ میں صاف بتا دیا کہ اس کے اندر مضامین ایسے کامل اور ایسی علم کی باتیں ہیں جو بشر کے علم میں نہیں آسکتیں تو اصل مطالبہ محض فصاحت لفظی کا نہیں، بلکہ یہ کہ ایسی سورتیں لاؤ جن میں ایسا علم ہو۔

ع۱۴۵۰ اللہ تعالیٰ کا قانون ایسا ہے کہ جو شخص جس راہ پر اپنے آپ کو ڈالتا ہے۔ اسی میں کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتا ہے۔ اس لیے جو لوگ دنیا کی زندگی کو غرض بنا لیتے ہیں،

اَفَمَنۡ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ وَ یَتۡلُوۡہُ شَاہِدٌ مِّنۡہُ وَ مِنۡ قَبۡلِہٖ کِتٰبُ مُوۡسٰۤی اِمَامًا وَّ رَحۡمَۃً ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ ؕ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِہٖ مِنَ الۡاَحۡزَابِ فَالنَّارُ مَوۡعِدُہٗ ۚ فَلَا تَکُ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡہُ ٭ اِنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۷﴾

تو کیا وہ شخص جو اپنے رب سے کھلی دلیل رکھتا ہے اور اس کی طرف سے ایک گواہ اس پر عمل کرتا ہے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی - یہی اس پر ایمان لاتے ہیں - اور جو کوئی فرقوں میں سے اس کا انکار کرتا ہے تو اس کا ٹھکانا آگ ہے ، سو تو اس میں کسی شک میں نہ رہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے ، لیکن اکثر لوگ نہیں مانتے ع۱۴۵۱

وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا ؕ اُولٰٓئِکَ یُعۡرَضُوۡنَ عَلٰی رَبِّہِمۡ وَ یَقُوۡلُ الۡاَشۡہَادُ ہٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ کَذَبُوۡا عَلٰی رَبِّہِمۡ ۚ اَلَا لَعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۸﴾

اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے - وہ اپنے رب کے سامنے لائے جائیں گے اور گواہ کہیں گے یہی ہیں جنھوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا - سنو ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے ع۱۴۵۲

انھیں دنیا کی زندگی میں بہتیرا کچھ مل جاتا ہے مگر آخرت میں اور انجام کار یہ باتیں کچھ فائدہ نہیں دیتیں - حرص دنیا کو بڑھانے کا انجام آگ ہے - یہاں کے عمل وہاں حبط ہیں یعنی بے نتیجہ اس سے حبط اعمال کے مفہوم کا بھی پتہ لگتا ہے - اس حیوانی زندگی میں آسایش کے لیے جو کچھ کیا تھا وہ وہاں کچھ کام نہیں دے گا یہ ان اعمال کا حبط ہے -

ع۱۴۵۱ یتلوہ - تلی کے معنی پیروی کی یا عمل کیا دیکھو ع۶۷ وع۱۵۳ یہاں یہی معنی مراد ہیں یَقْتَدی به ویعمَلُ (غ) اس کی پیروی کرتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے اور یتلوہ میں ضمیر بلحاظ معنی بینة کی طرف جاتی ہے کیونکہ بینة سے مراد قرآن شریف ہے -

احزاب - حِزْب کی جمع ہے اور وہ اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں شدّت ہو (غ) حزب الشیطان (المجادلة ۵۸ - ۱۹) حزب اللہ (المجادلة ۵۸ - ۲۲) ای الحزبین احصیٰ لما لبثوا امدا (الکھف ۱۸ - ۱۲) لما را المؤمنون الاحزاب (الاحزاب ۳۳ - ۲۲) ٭

بینة قرآن ہے : دنیا اور اس کی زینت کے طالب کے مقابل پر یہاں ایک دوسرے فریق کا ذکر کیا ہے جن کا مقصد زندگی بہت بلند ہے - افمن کان علی بینة من ربه عام ہے جس سے مراد مومن ہے اور بینة من ربه قرآن کریم ہے جس کو دوسری جگہ بیّنات من الهدیٰ فرمایا ہے (البقرة ۲ - ۱۸۵) اور ایک جگہ بینة کہا ہے حتّٰی تاتیھم البینة (البینة ۹۸ - ۱) جس سے مراد رسول اللہ صلعم بھی ہو سکتے ہیں اور قرآن کریم بھی اور ہر نبی کے حق میں اس کی وحی بینة ہے جیسا کہ آگے حضرت نوح صالح وغیرہ کے ذکر میں آتا ہے اور شاھد منه یا اللہ کی طرف سے گواہ رسول اللہ صلعم ہیں جو اس قرآن کو پڑھتے ہیں اور اس پر عمل کر کے دکھاتے ہیں اور شاھد اور شہید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نبی ہی ہوتے ہیں اور یتلوہ کے معنی دونوں طرح پر ہو سکتے ہیں اس قرآن کو پڑھتا ہے یا اس قرآن پر عمل کرتا ہے - اور دوسرے معنی قابل ترجیح ہیں کیونکہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ مومن کے ہاتھ میں صرف ایک بینة یعنی کتاب یا روشنی ہی نہیں بلکہ اس کے لیے ایک کامل نمونہ بھی موجود ہے جو اس بینة پر عمل کر کے اس کے رستہ کو بالکل صاف کر دیتا اور اس میں بھی اس کتاب پر عمل کرنے کی طاقت پیدا کر دیتا ہے - تو کہاں وہ دنیا طلب انسان جس کی ہمّت کی غایت دنیا کا مال اور اس کی زینت ہے اور کہاں یہ حق پرست انسان اسی مقابلہ کو ظاہر کرنے کے لیے رکوع کی آخری آیت میں فرمایا مثل الفریقین کالاعمی والاصم والبصیر والسمیع -

اور یہ جو فرمایا ومن قبله کتاب موسیٰ اماما ورحمة یعنی اس سے پہلے حضرت موسیٰ کی کتاب کی پیروی کی جاتی تھی اور وہ رحمت تھی تو اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اسی طرح پر کتابوں کو نازل کرنا اور انبیاء کو ان کتابوں کی تعلیم عملی کا نمونہ بنانا یہ اللہ تعالیٰ کی قدیم سے سنت رہی ہے تا کہ لوگ دنیا کو اپنی زندگی کی غرض و غایت نہ بنائیں یہی وجہ ہے کہ آگے جن انبیاء کا ذکر آتا ہے وہ سب اپنی امتوں سے یہی خطاب کرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف سے ایک بینة پر ہیں اور رحمت کے پرتو ہیں - کیونکہ ہر نبی کی وحی اس کے حق میں بینة ہی ہے - مگر اس میں ایک دوسری غرض یہ بھی ہے کہ یہ بینة (یعنی قرآن) ایسی صاف ہے کہ اس کی شہادت حضرت موسیٰ کی کتاب اور پہلی کتابوں میں بھی ہے -

ع۱۴۵۲ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ پر جھوٹ افترا کرنے والے اعدائے حق ہوتے ہیں اشھاد سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا فکیف اذا جئنا من کل اُمة بشھید (النساء ۴ - ۴۱) اور ان کا افترا دو طرح پر ہے ایک افترا کر کے لوگوں کو راہ حق سے روکتے ہیں دوسرے دین حق میں کجی پیدا کرنا چاہتے

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

جو اللہ (تعالےٰ) کی راہ سے روکتے اور اس کے لیے کجی چاہتے ہیں اور وہ آخرت سے بھی منکر ہیں۔

اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾

وہ زمین میں (خدا کو) عاجز کرنے والے نہیں اور نہ اُن کے لیے سوائے اللہ کے کوئی مددگار ہونگے اُن کے لیے دوگنا عذاب ہے وہ نہ سُن سکتے تھے اور نہ دیکھتے تھے ۱۴۵۳ؑ

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾

یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں رکھا اور ان سے گم ہو گیا جو وہ جھوٹ بناتے تھے۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾

ضرور ہے کہ وہ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانیوالے ہوں

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾

جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں اور اپنے رب کے آگے عاجزی کرتے ہیں، وہی جنت والے ہیں وہ اُسی میں رہیں گے ۱۴۵۴ؑ

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِيْرِ وَ السَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ ع

ان دونوں گروہوں کی مثال ایسی ہے جیسے اندھا اور بہرا اور دیکھنے والا اور سننے والا، کیا دونوں کی حالت یکساں ہے؟ تو کیا پھر تم نصیحت قبول نہیں کرتے ۱۴۵۵ؑ

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۫ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾

اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ میں تمھیں کھلا ڈرانے والا ہوں۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾

کہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کرو میں تم پر ایک دکھ دینے والے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

ہیں جیسا کہ اگلی آیت میں صراحت کر دی۔

۱۴۵۳ؑ ما کانوا یستطیعون السمع۔ حضرت ابن عباس سے اس کے یہ معنی مروی ہیں کہ وہ حق کو نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھ سکتے تھے ایسے طریق پر جس سے ان کو فائدہ ہوتا اور ہدایت پاتے اس لیے کہ وہ کفر میں مشغول رہتے تھے (ج) اور ظاہر ہے کہ جب ایک شخص دن رات ایک بات کی مخالفت میں لگا رہے تو اس میں حق بات کے سننے کی بھی تاب باقی نہیں رہتی اور یہی یہاں مراد ہے۔

۱۴۵۴ؑ اخبتوا۔ خَبْت پست زمین کو کہتے ہیں اس لیے اِخْبات کے معنی نرمی اور تواضع اختیار کرنا ہیں۔ اور مُخْبِت نرمی اختیار کرنے والا یا جھک جانے والا ہے وبشر المخبتین (الحج ۲۲-۳۴) (غ)

۱۴۵۵ؑ دنیا طلب اور حق طلب کا مقابلہ: یہاں دنیا طلب دنیوی زندگی کو اپنی غرض بنا لینے والے اور اس شخص کا جو زندگی کی اصل غرض و غایت کو سمجھ چکا ہے کھلے لفظوں میں مقابلہ کیا ہے۔ ایک کی مثال اندھے اور بہرے کی ہے کیونکہ وہ اصل غرض زندگی سے اندھا ہے اور دوسرے کی مثال بصیر و سمیع کی ہے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ
اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ
هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ
عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿٢٧﴾
قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ
مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ
فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ
لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿٢٨﴾

تو اس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا کہ ہم تجھے اپنے ہی جیسا انسان دیکھتے ہیں اور ہم نہیں دیکھتے کہ تیری پیروی کی ہو مگر ان لوگوں نے جو ہم میں سے نیچ ہیں (اور وہ بھی) سرسری نظر سے اور ہم تم میں اپنے اوپر کوئی بڑائی نہیں دیکھتے، بلکہ تمھیں جھوٹا خیال کرتے ہیں[ع1456]

کہا، اے میری قوم بتاؤ اگر میں اپنے رب سے ایک کھلی دلیل پر ہوں اور اس نے اپنے پاس سے مجھے رحمت عطا فرمائی ہو، پھر وہ تم پر مشتبہ رہ گئی (کیا ہم اسے تمھیں لگا دیں، حالانکہ تم اسے ناپسند کرنے والے ہو[ع1457]

ع1456 اراذل۔ اَرْذَل کی جمع ہے اور رَذْل اور رَذِیل اور ارذل کمینہ اور خسیس شخص کو کہتے ہیں اور ہر چیز میں سے جو ردّی ہو اس پر بھی بولا جاتا ہے (ل) ومنکم من یرد الی ارذل العمر (النحل ١٦-٧٠) واتّبعك الارذلون (الشعراء ٢٦-١١١)

بادی الرای۔ بَدَا کے معنی ظاہر ہُوا اور بَدَءَ کے معنی شروع کیا اور بادی دونوں سے ہو سکتا ہے کیونکہ ہمزہ یا سے بدل جاتا ہے۔ صورت اوّل میں بادی الرای کے معنی ہونگے سرسری نظر سے۔ صورت ثانی میں پہلی نظر میں۔ ماحصل ایک ہے مطلب یہ ہے کہ تیرا اتباع جن لوگوں نے کیا ہے انہوں نے غور و فکر سے کام نہیں لیا۔

سب سے پہلا اعتراض انبیاء پر یہی ہوتا ہے کہ یہ ہماری طرح بشر ہیں۔ کھانے پینے اور حوائج بشری کے محتاج ہیں۔ حالانکہ بشر ہی بشر کے لیے رہنما اور ہادی کا کام دے سکتا ہے۔ جو شخص حوائج بشری کا محتاج نہیں وہ بشر کے لیے نمونہ کا کام کیونکر دے سکتا ہے۔ اگر خالی تعلیم انسانوں کی رہنمائی کے لیے کافی ہوتی اور کسی نمونہ کی ضرورت نہ ہوتی تو بلا شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ تعلیم بذریعہ ملک یا کسی اور ذریعہ سے بغیر وسیلہ بشر کے انسانوں کو پہنچا دی جاتی۔ مگر چونکہ جس طرح تعلیم کی ضرورت ہے اسی طرح نمونہ کی ضرورت ہے اور بغیر نمونہ کے تعلیم عبث ہے اور نمونہ بشر کے لیے بشر ہی ہو سکتا ہے اس لیے یہ اعتراض کم فہمی سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ نبی کے پیرو شروع میں غریب لوگ ہوتے ہیں۔ امراء جو نشۂ دولت اور حکومت میں مست ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف کہاں رجوع کرتے ہیں انہی کو یہاں اراذل کہا ہے گویا دولت و مرتبہ دنیوی کو وہ لوگ شرف اور بزرگی کا معیار قرار دیتے ہیں اور مزدوری کر کے کمانے اور کھانے والے ان کو رذیل نظر آتے ہیں۔ حجام ہو یا دھوبی یا مزدور۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مزدوری اور محنت ہی شرف انسانیت ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ یہ لوگ جو حضرت نوحؑ کے ساتھ تھے حجام اور موچی تھے۔ حضرت مسیحؑ خود بلحاظ پیشہ بڑھئی تھے آپ کے حواری ماہی گیر اور دھوبی تھے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ چھوٹوں کو نبی کی تعلیم سے بلند مقامات پر پہنچاتا ہے اور سرکشوں متکبروں کو جو حق کی مخالفت کرتے ہیں نیچا دکھاتا ہے۔

آنحضرتؐ اور محنت: دنیا نے محنت اور مزدوری کی قدر کو نہیں سمجھا۔ قرآن کریم نے اس پر بہت زور دیا ہے اور نبی کریم صلعم نے قرآن کریم کی اس تعلیم کا عملی نمونہ یوں بن کر دکھایا کہ ہر قسم کے کام یہاں تک کہ ٹوکری اٹھا لینا، جھاڑو چلا لینا۔ بکریوں کو دوہ لینا۔ اپنے کپڑے جوتی وغیرہ کی مرمت کر لینا سب کام اپنے ہاتھ سے کیے تا دنیا کو یہ معلوم ہو کہ ہر قسم کی محنت و مزدوری قابل عزت شے ہے۔ جن لوگوں نے اس پاک اصول سے روگردانی کی ہے ان کے لیے بولشوزم کی صورت میں سزا پیدا کر دی گئی ہے۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ تم کو یعنی نبی اور اس کے متبعین کو ہم پر کوئی فضیلت نہیں۔ اس سے بھی مراد دنیوی طور پر فضیلت اور مرتبہ ہے۔ حالانکہ اصل فضیلت وہ ہے جو اخلاق اور روحانیت سے پیدا ہوتی ہے جس کے سامنے دنیا کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ وہ تہذیب کے مدعی جو آج ایشیا کے باشندوں کو اراذل کی طرح سمجھتے ہیں اپنی گردنیں ایک ایشیائی (بلحاظ پیشہ) نجار کے سامنے جھکاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسے خدا بناتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ اصل حکومت دنیا میں اخلاق اور روحانیت کی ہے۔

ع1457 عمیت۔ عمیٰ بصر یعنی آنکھ اور بصیرت یعنی رائے کی روشنی کا جاتے رہنا ہے اور دونوں معنی میں قرآن شریف میں بکثرت اس کے مشتقات کا استعمال ہُوا ہے جآءہ الاعمیٰ (عبس ٨٠-٢) پہلے معنی میں ہے صم بکم عمی (البقرۃ ٢-١٨) فعموا وصمّوا (المائدۃ ٥-٧١) دوسرے معنی میں ہے اور دونوں معنوں کو لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب (الحج ٢٢-٤٦) میں اکٹھا کر دیا ہے اور عَمِیَ علیہ کے معنی ہیں اس پر وہ بات مشتبہ ہو گئی گویا اس کی نسبت وہ اعمیٰ کے حکم میں ہے اسی معنی میں یہاں ہے اور عماء بادل اور جہالت کو بھی کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا عماء میں ہونا: اور حدیث میں جو آتا ہے کہ آپ سے پوچھا گیا کہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے پہلے ہمارا رب کہاں تھا تو آپ نے فرمایا فی عماءٍ تحتہٗ عماءٌ وفوقہٗ عماءٌ تو یہ اشارہ ہے ایسی حالت کی طرف جو انسان کی سمجھ سے باہر ہے اور وہ اس پر واقف نہیں ہو سکتا (غ)

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ
اِلَّا عَلَي اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ
اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝۲۹

اور اے میری قوم مَیں اس کے بدلے تم سے مال نہیں مانگتا، میرا اجر صرف اللہ پر ہے اور میں انھیں نکال نہیں سکتا جو ایمان لائے ہیں وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں لیکن مَیں تمھیں ایسی قوم دیکھتا ہوں جو جاہل ہو۱۴۵۸

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ
طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳۰

اور اے میری قوم کون اللہ کے مقابلہ میں میری مدد کر سکتا ہے اگر میں انھیں نکال دوں تو کیا تم نصیحت قبول نہیں کرتے۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ
وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ
وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ
لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا
فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۱

اور مَیں تمھیں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں کہتا ہوں کہ مَیں فرشتہ ہوں اور نہ میں کہتا ہوں کہ جنھیں تمھاری نظریں حقیر دیکھتی ہیں اللہ ان کو بھلائی نہیں دیگا۔ اللہ جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے۔ (ایسا کروں) تو بیشک میں ظالموں میں سے ہونگا۱۴۵۹

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ
جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۳۲

انھوں نے کہا اے نوحؑ! تو ہم سے جھگڑا اور ہم سے بہتیر اجھگڑ چکا تو جس کا وعدہ دیتا ہے وہ لے آ، اگر تو سچوں میں سے ہے۔

نلزم۔ لُزُوم۔ کسی چیز کا بہت لمبے زمانہ تک ٹھہرنا ہے (گویا وہ دوسری چیز سے لگ گئی) فسوف یکون لزاما (الفرقان ۲۵ - ۷۷) یعنی لازم ہو جائے گا یا ساتھ لگ جائے گا۔ والزمہم کلمۃ التقوی (الفتح ۴۸ - ۲۶) (غ)

شروع سورت میں طالب دنیا اور طالب حق کا مقابلہ جس رنگ میں دکھایا تھا کہ ایک دنیا کی زندگی اور اس کے سامان کو ہی اپنا مقصد بنا لیتا ہے۔ اور دوسرا اپنے رب سے بینہ پر ہوتا ہے اسی کی مثال اب سب انبیاء میں دی ہے اور بتایا ہے کہ وہی بات جو نبی اور اس کے پیروؤں کے لیے روشن دلیل ہے ان کے منکرین کو تاریک اور مشتبہ معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ ان کے دلوں پر طرح طرح کے پردے مال دنیا کی محبت کے پڑے ہوئے ہوتے ہیں، وہ دلوں پر زنگ کی وجہ سے اس روشنی کو نہیں دیکھ سکتے جو ایک صاف دل انسان کو نظر آتی ہے ان کی فطرت کے آئینہ پر زنگ لگ چکا ہوتا ہے اور مومن کی فطرت کا آئینہ صاف ہوتا ہے۔

ع ۱۴۵۸ تمام انبیائے عالم کی ایک ہی شان نظر آتی ہے کہ دنیا کے مال کی ان کے دلوں میں کچھ عظمت نہیں ہوتی اور نہ ہی جو محنت اور خدمت قوم کی یا نسل انسانی کی وہ کرتے ہیں اس کا کوئی معاوضہ لیتے ہیں۔ ایک نمایاں شان ان کی یہ ہوتی کہ وہ ایثار اور بے نفسی کا کامل ترین نمونہ انسانوں کے لیے ہوتے ہیں جو کچھ مال ان کے ہاتھ میں ہو وہ بھی مخلوق خدا کی خدمت میں صرف کر دیتے ہیں اور مال کمانے کی ان کو قطعاً کوئی فکر نہیں ہوتی۔ یہ نمونہ بھی اپنے کمال میں محمد رسول اللہ صلعم کی زندگی میں ہی نظر آتا ہے اور درحقیقت تمام انبیاء کے تذکرہ میں اصل غرض محمد رسول اللہ صلعم کے مقام بلند کی طرف توجہ دلانا ہے جس سے مخاطب روشنی حاصل کر سکتے تھے ہاں سبھی انبیاءؑ کا نمونہ یہی ہوتا ہے کہ وہ مال نہیں چاہتے اور نہ دنیا داروں اور صاحبان مال و دولت سے انھیں کچھ اُنس ہوتا ہے بلکہ ان کے تعلقات انہی لوگوں سے ہوتے ہیں جو اخلاق اور روحانیت کو مدنظر رکھتے ہوں۔ اس لیے فرمایا کہ جو لوگ اپنے رب سے ملنے والے ہیں یعنی مال دنیا کی جگہ اللہ تعالیٰ کے لقا کو اپنی زندگیوں کا مقصد اور منتہا ٹھہراتے ہیں وہی اس بات کے اہل ہیں کہ نبی کے پاس رہیں دنیا داروں کی خاطر ان لوگوں کو نبی کس طرح جواب دے سکتا ہے۔

ع ۱۴۵۹ تزدری۔ اس کا اصل زری ہے اور زَرَیْتُ علیہ کے معنی ہیں میں نے اس پر عیب لگایا۔ اور اِزْدِرَاء اس سے باب افتعال ہے جس کی تا دال سے بدل گئی ہے۔ اور تزدری اعینکم کے معنی ہیں تمھاری آنکھیں ان پر عیب لگاتی یا انہیں حقیر قرار دیتی ہیں۔ یا وہ تمہیں حقیر معلوم ہوتے ہیں۔

دعوت انبیاءؑ کا دنیوی مال و جاہ کے لالچ سے برتر ہونا: یہ باتیں اس لیے کہی جاتی ہیں کہ کسی قسم کے دنیوی لالچ کو مدنظر رکھ کر کوئی شخص الٰہی تعلیم کو قبول نہ کرے رسول کے قبضے میں مال و خزانے نہیں ہوتے کہ اپنے متبعین کو مالا مال کر دے نہ وہ غیب دانی کا دعویٰ کرتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کو غیب دانی سے تکلیف سے بچا لے نہ وہ خود ملک ہونے کا دعویٰ کرتا ہے کہ آپ ہی حوائج بشری سے پاک ہو۔ ہاں جنھیں دنیا کے لوگ حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں اس لیے کہ ان کے پاس بہت مال نہیں یا وہ بڑے مرتبہ پر نہیں ان کے متعلق وہ بھلائی کا امیدوار ہوتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو دیکھ کر اس کے مطابق ان کو اجر دیتا ہے۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۳۳

اس نے کہا اس کو اللہ ہی لے آئے گا جب وہ چاہے گا اور تم (اسے) عاجز نہیں کر سکتے۔

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۟ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ؕ۝۳۴

اور تمھیں میری نصیحت نفع نہیں دے سکتی اگر میں چاہوں کہ تمھاری خیر خواہی کروں اگر اللہ کا ارادہ ہو چکا ہو کہ وہ تمھیں ہلاک کرے وہ تمھارا رب ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ع۱۴۶۰

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝۳۵ ع ۳

کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ بنا لیا ہے کہہ، اگر میں نے یہ جھوٹ بنایا ہے تو میرا گناہ مجھ پر ہے اور میں اس سے بری ہوں جو تم گناہ کرتے ہو ع۱۴۶۱

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۚ۝۳۶

اور نوحؑ کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم سے کوئی ایمان نہیں لائے گا، مگر وہی جو ایمان لا چکا، سو تو اس پر غم نہ کر، جو وہ کرتے ہیں ع۱۴۶۲

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝۳۷

اور ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا اور ان کے بارے میں مجھے کچھ نہ کہہ جو ظالم ہیں وہ غرق کیے جائیں گے ع۱۴۶۳

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۟ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا

اور وہ کشتی بنانے لگا اور جب اس قوم کے سردار اس پر گزرتے ہیں اس پر ہنستے ہیں، کہا اگر تم ہم پر ہنستے ہو، تو ہم بھی تم پر

ع۱۴۶۰ یغویکم اس کے لیے دیکھو ع۱۰۵۸ انسان کی خیر خواہی دوسرے کے کام نہیں آ سکتی جب وہ خود غلط راہ پر قدم مارتا ہوا اتنی دور نکل جائے کہ اللہ تعالیٰ اس پر گمراہ ہونے کا یا ہلاکت کا حکم لگا دے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسا حکم اسی وقت لگاتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ایک شخص اپنی اصلاح کسی صورت میں نہیں کرتا۔

ع۱۴۶۱ اجرام۔ جَرْم کے معنی قَطْع یعنی کاٹ دینا ہیں درخت کے کاٹنے پر بولا جاتا ہے اور شجرۃ جریمۃ کٹے ہوئے درخت کو کہتے ہیں اور اَجْرَمَ کے معنی ہیں حانَ جراَمُہ یعنی اس کے کاٹنے کا وقت آ گیا۔ اور جُرْم گناہ کو کہتے ہیں (ل) اور مادہ کے معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جرم وہ گناہ ہے جو قطع کر دیتا ہے یعنی ایسا سخت گناہ جو اللہ تعالیٰ سے قطع تعلق کر دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں اجرام اور مجرم سخت گناہوں پر بولا گیا ہے۔ اس جگہ اجرامی سے مراد اللہ تعالیٰ پر افترا کرنے کا گناہ اور تجرمون سے مراد مخالفین حق کے وہ گناہ ہیں جو وہ حق کو نیست و نابود کرنے کے لیے کرتے ہیں۔

اس آیت میں خطاب کو بدل دیا ہے اور ذکر آنحضرت صلعم کے مخالفین کا ہے۔

ع۱۴۶۲ تبتئس۔ اس کا اصل بُؤس یا بأس ہے جس کے معنی شدّت و مکروہ ہیں اور اس کے معنی ہیں لَا تَلْتَزِمُ البؤس ولا تحزن بؤس کہ لازم نہ کر اور غم نہ کر (غ)

حضرت نوح کو قوم کی سخت دلی دیکھ کر سخت غم ہوتا تھا اور سبھی انبیاء کو ہوتا ہے، آنحضرت صلعم کے متعلق ہے لعلک باخع نفسک الّا یکونوا مومنین۔ (الشعراء [۲۶]۔۳) ان حالات میں اطلاع دی ہے کہ یہ قوم اب ہلاکت کے قابل ہی ہے۔ حضرت نوحؑ کی دعا ربّ لا تذر علی الارض من الکافرین دیّارا (نوح [۷۱]۔۲۶) اس وحی کے بعد ہی معلوم ہوتی ہے۔

ع۱۴۶۳ باعیننا۔ عَیْن آنکھ ہے، لیکن جو شخص کسی کی حفاظت کرے اسے بھی عین کہہ دیا جاتا ہے اور فلانٌ بِعَیْنِیْ کے معنی ہیں میں اس کی حفاظت اور نگہداشت کرتا ہوں اور عین اللہ علیک کے معنی ہیں تم اللہ کی حفاظت اور اس کی حمایت میں رہو۔ اسی سے یہ محاورہ ہے۔ دوسری جگہ ہے تجری باعیننا (القمر [۵۴]۔ ۱۴) یعنی کشتی ہماری حفاظت میں چلتی تھی اور حضرت موسیٰ کے متعلق ہے ولتصنع علیٰ عینی (طٰہٰ [۲۰]۔ ۳۹) یعنی میری حفاظت میں پرورش پائے (غ)

تخاطبنی۔ خَطْب اور مُخَاطَبَۃ بات کا ایک دوسرے کی طرف لوٹانا ہے (غ) اور اللہ تعالیٰ سے مخاطبت یہ ہے کہ اس کا حکم سن لینے کے بعد کہ ایک قوم ہلاک کی جائے گی پھر اس کی سفارش کی جائے۔

چونکہ اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے سیلاب سے تباہ کرنا تھا اس لیے حضرت نوح کو پہلے سے کشتی بنانے کا حکم دیا۔ پس یہ کشتی وحی الٰہی کے مطابق بنی اور اپنی حفاظت

مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝۳۸	ہنستے ہو ۱۴۶۴ (ہم پر) ہنستے ہیں جیسے تم (ہم پر)
فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ	سو تم جان لوگے کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رُسوا کرے
يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝۳۹	اور کس پر قائم رہنے والا عذاب اُترتا ہے۔
حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ	یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آیا اور وادی نے جوش مارا۔
قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ	ہم نے کہا اس میں ہر (ضرورت کی) شے کے نر و مادہ دو دو لے لو
وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ	اور اپنے اہل کو مگر جس کے متعلق پہلے حکم ہو چکا اور ان کو بھی جو ایمان
وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝۴۰	لائے اور اس کے ساتھ تھوڑے ہی ایمان لائے تھے ۱۴۶۵
وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا	اور اس نے کہا اس میں سوار ہو جاؤ اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور

قرء حفص بفتح الميم والباقون بضمها ۱۲

کا ذکر اس لیے فرمایا کہ دشمن بہت تھے پس تسلّی دی کہ وہ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے ؎

ع۱۴۶۴ نسخر منکم۔ حضرت نوح یا مومنوں کا واقعی ہنسی کرنا مراد نہیں اس لیے کہ استہزا مومن کی شان نہیں۔ یہ محض ان کے فعل کے مقابل پر ذکر ہے جیسے جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا ہیں اور کشاف نے اس کے معنی استجہال لیے ہیں کیونکہ استہزا کا اصل سبب جہالت ہے تو سخریۃ سے مراد اس کا سبب لیا ہے گویا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنی جہالت کی وجہ سے ہم پر ہنستے ہو مگر ہم تمہیں جاہل سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اصل حقیقت کی تمہیں خبر نہیں ؎

ع۱۴۶۵ فار کے معنی ہیں جاش یعنی جوش میں آیا۔ ہانڈی کے اُبال پر۔ آدمی کے غضب میں آنے پر۔ مشک کے پھیل جانے پر فار بولا جاتا ہے اور پانی جب پھوٹ کر چشمہ سے نکلے تو اس پر بھی فار بولا جاتا ہے فار الماء من العین اور فوارۃ وہ جگہ ہے جہاں سے پانی پھوٹ کر نکلے منبع الماء اور پانی کے حوض کو بھی فوّارۃ کہا جاتا ہے (ت)

تنور۔ کو بعض نے فارسی سے معرب کہا ہے اور بعض نے اس کا مادہ نور یا نار قرار دیا ہے۔ اور تنور کے ایک معنی تو مشہور ہیں جس میں ہماری زبان میں بھی یہ استعمال ہوتا ہے یعنی جہاں روٹی پکائی جاتی ہے۔ اس کے دوسرے معنی جو تاج العروس میں دیئے ہیں وجہ الارض یعنی سطح زمین ہیں اور یہ معنی حضرت علی اور ابن عباس سے مروی ہیں) اور پھر لکھا ہے کلُّ مَفْجَرِ ماءٍ تَنُّوْرٌ یعنی ہر ایک پانی پھوٹ نکلنے کی جگہ کو تنور کہا جاتا ہے محفل ماء الوادی یعنی وادی کے پانی کے اکٹھا ہونے کی جگہ کو بھی تنور کہتے ہیں اور قتادہ سے ہے کہ ملند اور اشرف زمین کو تنور کہا جاتا ہے اور حضرت علیؓ سے ایک معنی بھی مروی ہیں کہ فار التنور سے مراد یہاں صبح کا پھوٹ نکلنا ہے اور ہردی کا قول نقل کیا ہے کہ یہ ایک پانی کا مشہور چشمہ ہے (ت)

یہاں اس سیلاب کے آنے کا ذکر ہے جو طوفان نوح کے نام سے مشہور ہے۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ اس کی ابتدا یوں ہوئی تھی کہ ایک تنور سے پانی پھوٹ نکلا تھا۔ لیکن قرآن شریف نے خود دوسری جگہ یوں فرمایا ففتحنا ابواب السماء بماء منھمر (القمر ۵۴-۱۱) یعنی اوپر سے بہت پانی برسایا اور خود یہاں جب طوفان کو ٹھہرانے کا وقت آتا ہے تو حکم ہوتا ہے یا سماء اقلعی (۴۴) اے بادل تھم جا جس سے معلوم ہوا کہ بادلوں سے پانی برسنا شروع ہوا تھا اور یہ جو زمین کے اسی آیت میں پانی جذب کر لینے کا حکم ہے تو ظاہر ہے کہ پانی زمین میں ہی جذب ہو کر اوپر سے خشک ہوتا ہے۔

فار التنور سے مراد: تنور کے لفظ سے یہ غلط استدلال کیا گیا ہے کہ پہلے تنور سے پانی پھوٹ کر نکلا۔ تنور کے معنی بروئے لغت اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ ابن جریر نے جو اقوال بیان کیے ہیں ان میں اوّل حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ تنور کے معنی وجہ الارض ہیں۔ اور حضرت نوحؑ کو حکم ہوا تھا اذا رایت الماء علی وجہ الارض فارکب اور ابن عباسؓ کہتے ہیں العرب تسمی وجہ الارض تنور الارض دوسرا قول حضرت علیؓ کا منقول ہے کہ اس سے مراد تنویر الصبح یعنی صبح کی روشنی ہے تیسرا قول قتادہ کا منقول ہے کہ اس سے مراد بلند اور اشرف زمین ہے اور چوتھا قول روٹی کے تنور سے پانی نکلنے کا ہے ابن کثیر کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم آیا تو پے درپے بارش شروع ہوئی نہ آسمان کھلتا تھا نہ بارش بند ہوتی تھی۔ اور اس کی تائید میں انہوں نے آیت ففتحنا ابواب السماء بماء منھمر نقل کی ہے اور پھر فار التنور کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کر کے لکھا ہے ای صارت الارض عیونا تفور حتی فار الماء من التنانیر یعنی ساری زمین پر پانی ہی پانی بہ نکلا یہاں تک کہ تنوروں سے بھی پانی بہ نکلا۔ پس قرآن کریم سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ کثرت بارش سے اتنا بڑا سیلاب آیا جس میں قوم نوح کی ساری بستیاں بہ گئیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان بستیوں کے اوپر پہاڑ بھی تھے جیسا کہ ساٰوی الی جبل سے ظاہر ہے اور پہاڑوں کی بارش سے وادی میں پانی کا زور اور بھی زیادہ ہو گیا۔

حضرت نوح نے کشتی میں کیا کیا لیا: اور یہ جو فرمایا کہ ہر شے کے زوجین لے لو تو ہر شے سے مراد یہ نہیں کہ تمام روئے زمین پر پھر کر جانوروں کو اکٹھا کرو۔ ایسا کام ایک نبی کے سپرد کرنا بے معنی بات ہے کہ وہ ساری زمین پر پھر کر ہر قسم کے جانداروں کے نر و مادہ لیتا پھرے اور پھر اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر انسان حاوی کہاں

وَ مُرْسٰهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۴۱﴾
وَ هِیَ تَجْرِیْ بِهِمْ فِیْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۟ قف
وَ نَادٰی نُوْحُ ﰳابْنَهٗ وَ كَانَ فِیْ مَعْزِلٍ یّٰبُنَیَّ
ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۴۲﴾
قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ
الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ
اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَیْنَهُمَا
الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ﴿۴۳﴾
وَ قِیْلَ یٰۤاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَ یٰسَمَآءُ
اَقْلِعِیْ وَ غِیْضَ الْمَآءُ وَ قُضِیَ الْاَمْرُ
وَ اسْتَوَتْ عَلَی الْجُوْدِیِّ وَ قِیْلَ بُعْدًا

اس کا لنگر ڈالنا ہے یقیناً میرا رب بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ع۱۴۶۶
اور انھیں پہاڑ جیسی لہروں میں لیے چلی جا رہی تھی ، اور
نوحؑ نے اپنے بیٹے کو پکارا اور وہ الگ ہو رہا تھا اے میرے بیٹے
ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ مت ہو ع۱۴۶۷
اس نے کہا میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لونگا جو مجھے پانی سے بچالے ۔
کہا آج کی سزا سے کوئی بچانے والا نہیں ، مگر وہی (بچے گا)
جس پر وہ رحم کرے ، اور ایک لہر اُن کے درمیان حائل
ہوئی اور وہ ڈوبنے والوں میں سے ہو گیا۔
اور کہا گیا اے زمین اپنا پانی جذب کرلے اور اے بادل تھم جا
اور پانی خشک ہو گیا اور کام کا فیصلہ ہو گیا اور (کشتی) جودی
پر ٹھیر گئی ، اور کہا گیا ظالم قوم کے لیے

ہو سکتا ہے ۔ اور یہ فرض کرلینا کہ ایک ایک جوڑے کو خود اللہ تعالیٰ نے وحی کردی کہ وہ زمین کے تمام گوشوں سے بھاگ کر حضرت نوح کے پاس جمع ہو گئے اور باقی اسی نوع کے جانوروں کو وحی نہ کی تو طوفان کے آنے سے پہلے اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر کہ درند چرند پرند درخت سب حضرت نوحؑ کے پاس جمع ہوئے تھے لوگ کیوں ایمان نہ لے آئے یہ تمام بے ضرورت اور بے سند باتیں ہیں جو غلطی سے تراشی ہوئی ہیں ۔ کل سے مراد یہاں ہر اپنی ضرورت کی شے ہے جیسا جب توریت کو تفصیل کل شیٔ (یوسف[۱۲] - ۱۱۱) کہا تو مراد اس سے اس وقت کی ضرورت ہے یا ایک ملکہ کے متعلق کہا اوتیت من کل شیٔ (النمل[۲۷] - ۲۳) تو مراد تمام عالم کی اشیاء نہیں بلکہ اس کی اپنی ضرورت کی اشیاء ہیں اسی طرح یہاں ہے اور زوج چونکہ جوڑے کے ہر فرد کو کہا جاتا ہے اس لیے زوجین سے مراد ایک نر اور ایک مادہ ہے اور اثنین میں اسی کی تفصیل ہے ۔ اور بعض نے لفظ کل کو وسیع کرکے اور پھر اس خیال کے نیچے کہ یہ طوفان کل روئے زمین پر محیط تھا ، نہ صرف درند و پرند کا ساتھ لینا بیان کیا ہے بلکہ درختوں کے مختلف اقسام کا ساتھ لینا بھی فرض کرلیا ہے اور پھر اس پر عجیب عجیب قسم کی کہانیاں بنائی ہیں مثلاً یہ کہ چوہوں نے جب کشتی کے رسوں کو کاٹنا شروع کیا تو حضرت نوحؑ نے دعا کی تو شیر کی چھینک سے بلّیاں پیدا ہو گئیں ۔ اور ایسا ہی جب غلاظت بڑھ گئی ، تو ہاتھی کے چھینکنے سے سؤر پیدا ہو گئے ۔ اور شیر سے بچاؤ کے لیے اللہ تعالیٰ نے شیر کو تپ چڑھا دیا ۔ ایسے ہی اور بہت سے فضول قصّے جمع کر دیئے گئے ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں مثلاً یہ کہ شیطان بھی گدھے کی دم پکڑ کر چڑھ گیا تھا ۔ قرآن و حدیث ان تمام لغویات سے پاک ہیں۔

طوفان نوح کل روئے زمین پر نہ تھا : یہ ساری مصیبتیں اس لیے پیش آئیں کہ بائبل کے بیان کو صحیح سمجھ کر یہ فرض کرلیا گیا کہ طوفان کل روئے زمین پر آیا تھا ۔ حالانکہ قرآن شریف صاف الفاظ میں فرماتا ہے کہ قوم نوح کے لیے آیا تھا ۔ قرآن شریف نے کہیں نہیں فرمایا کہ حضرت نوحؑ کو کل دنیا کی طرف بھیجا گیا تھا ۔ بلکہ بار بار یہی کہا کہ ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا اور پھر یہی فرمایا کہ مکذبوں کو غرق کیا گیا اور ابھی اوپر آچکا ہے انه لن یؤمن من قومك الا من قد اٰمن یہاں صرف حضرت نوحؑ کی قوم کا ذکر ہے نہ کل عالم کا اور الارض کا لفظ عام ہے کسی حصّہ ارض پر یا کسی ملک پر بھی بولا جاتا ہے حضرت نوح کی قوم کل دنیا پر آباد نہ تھی بلکہ خاص قطعہ زمین میں تھی نہ ایک اکیلا آدمی کل روئے زمین پر پھر سکتا تھا ۔ ہمارے نبی کریم صلعم کو جب اللہ تعالیٰ نے کل عالم کی طرف مبعوث کیا تو آپ کی تبلیغ بھی بذریعہ آپ کے متبعین کے آہستہ آہستہ دنیا میں پہنچنی مقدر ہوئی اگر یہ ممکن ہوتا کہ کل روئے زمین پر ایک ہی شخص ایک دفعہ پھر نکلے اور اس کی تکذیب پر فوراً ساری دنیا ہلاک ہو جائے تو یہ آنحضرت صلعم کے لیے ہونا چاہیئے تھا ، نہ حضرت نوحؑ کے لیے جو صرف ایک قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے ۔ یہ بھی ان مقامات میں سے ایک ہے جہاں قرآن کریم نے بائبل کی غلطی کی اصلاح کی ہے۔

ع۱۴۶۶ مجریٰ ۔ یہاں یا مجہول کی آواز سے پڑھا جاتا ہے یعنی مجرے ۔ اور اس کا اصل جَرْی ہے جس کے معنی ہیں تیزی سے گزرنا جیسے پانی ۔ جنات تجری من تحتها الانهار ۔ فیها عین جاریة (الغاشیة[۸۸] - ۱۲) اور کشتی کے چلنے پر بھی بولا جاتا ہے (غ) کشتی کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ کے نام سے ہے یعنی اس کی اعانت یا اس کی قدرت یا اس کے امر اور اذن سے۔

ع۱۴۶۷ معزل ۔ عَزْل کے معنی علیحدہ ہونا ۔ اور کان فی معزل سے مراد یہ ہے کہ حضرت نوح سے علیحدہ تھا یعنی مومنوں میں سے نہ تھا ۔ حضرت نوحؑ نے چاہا کہ اب بھی ایمان لے آئے ۔ یا مراد یہ ہے کہ کشتی سے دور تھا۔

لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

دُوری ہے [۱۴۶۸]

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِىْ مِنْ اَهْلِىْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾

اور نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور کہا اے میرے رب، میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّىْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾

کہا، اے نوحؑ! وہ تیرے اہل سے نہیں ہے، کیونکہ وہ بدعمل ہے، سو مجھ سے ایسا سوال نہ کر، جس کا تجھے علم نہیں، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو ناواقفوں میں سے نہ ہو [۱۴۶۹]

قَالَ رَبِّ اِنِّىْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِىْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِىْ وَتَرْحَمْنِىْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۴۷﴾

کہا، اے میرے رب! میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے ایسا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں اور اگر تو میری حفاظت نہ کرے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں نقصان اٹھانیوالوں میں سے ہونگا۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ

کہا گیا اے نوحؑ ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اُتر (جو) تجھ پر اور (کئی) جماعتوں پر (ہونگی) جو تیرے ساتھ والوں سے ہوں اور ایسی امتیں بھی

ع۱۴۶۸ ابلعی۔ بلع کے معنی ہیں جرع یعنی گھونٹ گھونٹ کرکے یا تھوڑا تھوڑا کرکے نگل لیا (ل) اور یہاں اس لفظ کو اس لیے استعمال کیا کہ زمین بھی پانی کو آہستہ آہستہ جذب کرتی چلی جاتی ہے۔

اقلعی۔ قلع کے معنی ہیں جڑ سے اکھیڑ پھینکا اور اَقلَعَ کے معنی کسی چیز سے رک گیا اور اَقلَعَ السحاب کے معنی ہیں بادل برسنے سے رک گیا (ل)

غیض۔ غاض کے معنی ہیں نقص ایک چیز کم ہوگئی یا دوسرے نے اسے کم کردیا۔ ماتغیض الارحام (الرعد ۱۳: ۸) یعنی رحم اسے خراب کردیتے ہیں یا ان کی حالت ایسی کردیتے ہیں جیسے زمین پانی کو نگل جاتی ہے۔

جودی۔ قیل ھو اسم جبلٍ بین الموصل والجزیرۃ و ھو فی الاصل منسوب الی الجود (غ) یعنی کہا گیا ہے کہ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو موصل اور جزیرہ کے درمیان ہے اور وہ اصل میں جود یعنی بخشش کی طرف منسوب ہے۔

جب وہ بستیاں ہلاک ہوچکیں تو مینہ تھم گیا اور زمین نے پانی کو جذب کرلیا اور کشتی جودی پر ٹھہر گئی۔ ابن جریر میں بعض روایات ہیں ہے شمخت الجبال وتواضع جس کے معنی یہ سمجھے گئے ہیں کہ دوسرے پہاڑوں نے تکبر کیا اور جودی نے تواضع اختیار کی مگر شمخ کے اصل معنی بلند ہونا ہیں اور وضع کے معنی پست ہونا اور مراد صاف یہ معلوم ہوتی ہے کہ دوسرے پہاڑ بلند تھے جو غرق نہیں ہوئے اور جودی پست تھا یعنی کوئی چھوٹا سا ٹیلا تھا جس پر کشتی آ لگی۔

ع۱۴۶۹ انہ عمل غیر صالح۔ یہ ضمیر سوال کی طرف نہیں بلکہ اس بیٹے کی طرف ہے اور مراد ہے ذو عمل یعنی وہ غیر صالح یا بُرے کام کرنے والا ہے جیسا ولکن البر من اٰمن میں مراد راستبازی نہیں بلکہ راستباز ہے۔ دیکھو ع۲۱۵۔

نوح کے بیٹے کا اہل میں سے نہ ہونا: ان آیات میں ظاہر الفاظ کے لحاظ سے بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ حضرت نوح کا بیٹا نہ تھا۔ بلکہ حضرت نوح کی بیوی کا کسی پہلے خاوند سے بیٹا تھا۔ یہ فی الواقع صحیح ہو یا نہ ہو۔ یہاں یہ مراد نہیں بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح کے اہل کو جو بچانے کا وعدہ تھا تو حضرت نوح نے ظاہر الفاظ کو مدّنظر رکھتے ہوئے عرض کیا کہ اہل میں تو وہ داخل تھا یعنی بلحاظ نسب اس لیے وہ کیوں مطابق وعدہ نہ بچایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صالحین کے اہل صرف بلحاظ نسب نہیں ہوتے بلکہ بلحاظ عمل بھی۔ چونکہ وہ بدعمل ہے' بُرے کام کرتا ہے اس لیے وہ تمہارے اہل میں داخل نہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ ایسا سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں۔ تو مطلب یہ ہے کہ دعا ایسے امور کے لیے کرنی چاہیئے جن کے متعلق یہ علم ہو کہ ان کا حصول درست اور حکمت الٰہی کے مطابق ہے۔ ایک عورت یہ دعا کرے کہ میں مرد بن جاؤں تو یہ عبث ہے۔ کفار کے ایمان کے بارہ میں یا ان کی مغفرت کیلئے دعا اس وقت تک کی جاسکتی ہے جب تک کہ ان کے ایمان لانے کا موقع باقی ہے۔ جب وہ شخص حالت کفر میں غرق ہوگیا تو اس کے متعلق دعا بے سود تھی اس لیے اس سے روک دیا۔

سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٤٨﴾

ہونگی جنھیں ہم کچھ سامان دینگے پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔ [۱۴۷۰]

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا
كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ
هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٩﴾ ع

یہ غیب کی خبروں سے ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں، تو انھیں اس سے پہلے نہ جانتا تھا اور نہ تیری قوم، سو صبر کر انجام متقیوں کے لیے ہے [۱۴۷۱]

معانقة ٩ الوقف على فاصبر احسن والبقي

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ
اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ
اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿٥٠﴾

اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہودؑ کو (بھیجا) اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمھارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، تم صرف جھوٹ بنانے والے ہو۔

يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ
اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٥١﴾

اے میری قوم میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا میرا اجر صرف اس پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ
يُرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ
قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿٥٢﴾

اور اے میری قوم اپنے رب کی بخشش مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو، وہ تم پر زور سے برستا ہوا بادل بھیجے گا اور تمھاری طاقت کو بڑھا کر زیادہ طاقتور کریگا اور مجرم ہو کر پھر نہ جاؤ۔ [۱۴۷۲]

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ
بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ
لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٣﴾

انھوں نے کہا اے ہودؑ تو ہمارے پاس کوئی کھلی دلیل نہیں لایا اور ہم تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہم تجھ کو ماننے والے ہیں۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا
بِسُوْۗءٍ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا
اَنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿٥٤﴾

ہم تو یہی کہیں گے کہ ہمارے کسی معبود نے تجھے آسیب پہنچایا ہے، اس نے کہا، میں اللہ کو گواہ ٹھیراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں اس سے بیزار ہوں جسے تم اس کے سوائے شریک کرتے ہو [۱۴۷۳]

مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿٥٥﴾

تو تم سب میرے لیے تدبیر کرو، پھر مجھے مہلت نہ دو۔

ع ۱۴۷۰ امم ممن معك یعنی ایسی امتیں جو تیرے ساتھیوں میں سے بن جائیں گی جس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ حضرت نوح کے ساتھ تھے ان میں سے بھی آگے قومیں بنیں۔ اور امم سنمتعھم میں بظاہر دوسری قوموں کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت دنیا میں موجود تھیں یا انہی کی نسل میں سے پیچھے آنے والی امتیں مراد ہیں۔

ع ۱۴۷۱ پچھلے رکوع کے آخر پر بھی انتقال مضمون آنحضرت صلعم کے اعدا کی طرف کیا تھا یہاں بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ نوح اور اس کے مخالفوں کا قصہ رسول اللہ صلعم اور آپ کے مخالفوں کے لیے بطور پیشگوئی ہے اور یہی انباء الغیب ہیں جن کا یہاں ذکر ہے جیسا کہ آخری الفاظ فاصبر ان العاقبة للمتقین سے ظاہر ہے

ع ۱۴۷۲ مینہ برسانے سے مراد اللہ تعالیٰ کے افضال ہیں اگر ایک قوم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور ظلم اور زیادتی سے رک جائے تو اللہ تعالیٰ کے افضال اس پر اور بھی زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی قوت بجائے گھٹنے کے بڑھتی ہے۔

ع ۱۴۷۳ اعتری۔ عری کے معنی ننگا ہوا۔ اور عریان ننگے کو کہتے ہیں الّا تجوع فیھا ولا تعری (طٰہٰ ۲۰ - ۱۱۸) اور عراء میدان ہے یعنی جس کو کسی پردہ وغیرہ نے نہ ڈھانکا ہوا ہو لنبذ بالعرآء (القلم ۶۸ - ۴۹) اور عراہ اور اعتراہ کے معنی ہیں قصد عراہ (غ) اس کی جانب کا قصد کیا یا اس سے کچھ لینے کا قصد کیا اور یہاں مراد مصیبت کا وارد کرنا ہے مطلب ان کا یہ تھا کہ ہمارے کسی معبود نے تم کو مجنون بنا دیا ہے۔

إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ ۚ مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۵۶﴾

میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب اور تمھارا رب ہے۔ کوئی جاندار نہیں مگر وہ اس کی چوٹی کو پکڑے ہوئے ہے، میرا رب سیدھے رستہ پر ہے ع۱۴۷۴

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ۚ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ﴿۵۷﴾

سو اگر تم پھر جاؤ تو میں نے تمھیں پہنچا دیا ہے جو مجھے دیکر تمھاری طرف بھیجا گیا ہے اور میرا رب تمھارا جانشین دوسرے لوگوں کو بنا دے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے، میرا رب تمام چیزوں پر نگہبان ہے ع۱۴۷۵

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَنَجَّيْنَاهُمْ مِنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴿۵۸﴾

اور جب ہمارا حکم آگیا ہم نے ہودؑ کو اور انھیں جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا اور ہم نے انھیں سخت عذاب سے بچایا۔

وَتِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿۵۹﴾

اور وہ عاد ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر سرکش دشمن (حق) کے حکم کی پیروی کی ع۱۴۷۶

وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ أَلَا إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ
ع أَلَا بُعْدًا لِعَادٍ قَوْمِ هُودٍ ﴿۶۰﴾

اور اس دنیا میں لعنت ان کے پیچھے لگی اور قیامت میں بھی سنو! عاد نے اپنے رب کا انکار کیا، سنو! ہودؑ کی قوم عاد پر پھٹکار رہے ع۱۴۷۷

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ

اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو (بھیجا) اُس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو، تمھارے لیے اس کے

ع۱۴۷۴ آخذ بنا صیتہا۔ نا صیۃ پیشانی کے بالوں کو کہتے ہیں۔ اور عرب اخذ نا صیۃ کا استعمال انتہائے ذلت اور عاجزی کے موقعہ پر کرتے تھے ان کا مطلب اس سے ہوتا تھا کہ دوسرا شخص اسے جس طرح چاہتا ہے چلاتا ہے اور یہ بھی ان میں دستور تھا کہ ایک قیدی کو جب چھوڑنا ہوتا تو نشان کے طور پر اس کی پیشانی کے بال کاٹ دیتے تھے مطلب یہ ہے کہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے کامل تصرف میں ہیں اور رب کے صراط مستقیم پر ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ سب سے عدل و انصاف کا معاملہ کرتا ہے اچھے سے اچھا، بُرے سے بُرا۔

ع۱۴۷۵ تولوا اصل میں تتولوا ہے یہاں بعض نے خطاب کا انتقال کفار قریش کی طرف سمجھا ہے اور یہی درست بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہود کے ذکر میں سمجھانا تو انہی لوگوں کو اصل مقصود تھا۔

ع۱۴۷۶ عنید۔ عَنَدَ کے معنی حد اور اندازہ سے نکل گیا اور عَنَدَ عن الحق حق سے پھر گیا اور معاندۃ اور عِناد یہ ہے کہ ایک چیز کو پہچاننے پر پھر اس کا انکار کر دے۔ پس عنید وہ حق سے پھرنے والا باغی ہے جو باوجود علم کے حق کو رد کرتا ہے (ل)

تلک میں اشارہ یا تو ذہنی ہے اور اشارہ بعید تحقیر کے لیے یا ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہے یا ان کی ویران شدہ سرزمین کی طرف اشارہ ہے۔

ع۱۴۷۷ بُعد۔ بُعد۔ قرب کی ضد ہے۔ اور محسوس اور معقول میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور بَعِد کے معنی ہیں مر گیا اس لیے اس کا استعمال ہلاکت میں ہوتا ہے بعدت ثمود (ہود۱۱۔ ۹۵) اور بُعد اور بَعَد ہلاکت کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور دوری کے لیے بھی فبعدا للقوم الظالمین (المؤمنون ۲۳۔ ۴۱) (غ) اور یہاں چونکہ قوم ہلاک تو ہو چکی ہے اس لیے مراد رحمت الٰہی سے دوری ہے یا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عاد ہلاک ہوئے ایسی اور قومیں بھی ہلاک ہونگی۔ جو وہی راہ اختیار کریں۔

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿٦١﴾

سوا اور کوئی معبود نہیں، اس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور اس میں تمھیں آباد کیا سو اس کی بخشش مانگو اور اس کی طرف رجوع کرو میرا رب نزدیک (اور) قبول کرنے والا ہے۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿٦٢﴾

انھوں نے کہا اے صالح اس سے پہلے تجھ پر ہمیں امید تھی، کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ اس کی عبادت کریں جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے اور یقیناً ہمیں اس کے متعلق شک ہے جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے۔[۱۴۷۸]

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۣ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿٦٣﴾

اس نے کہا اے میری قوم بتاؤ اگر میں اپنے رب سے کھلی دلیل پر قائم ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائی تو کون اللہ کے خلاف میری مدد کریگا اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم سوائے گھاٹے کے میرا کچھ نہیں بڑھاتے۔

وَ يٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿٦٤﴾

اور اے میری قوم یہ تمھارے لیے اللہ کی اونٹنی ہے (یہ) ایک نشان (ہے) سو اسے چھوڑ دو، اللہ کی زمین میں چرے اور اُسے کوئی دُکھ نہ پہنچاؤ، ورنہ تمھیں نزدیک کا عذاب آ پکڑے گا۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿٦٥﴾

مگر انھوں نے اسے مار ڈالا تو اس نے کہا اپنے گھر میں تین دن فائدہ اُٹھالو، یہ وعدہ ہے جو کبھی جھوٹ نہ ہوگا۔

فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْيِ يَوْمِىِٕذٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿٦٦﴾

سو جب ہماری سزا آگئی تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور ان کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے (اس سے) بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے تیرا رب طاقتور غالب ہے۔

وَ اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا

اور جو ظالم تھے انھیں ہولناک آواز نے آ پکڑا سو وہ اپنے گھروں

ع۱۴۷۸ مرجو ۔ رجاء ایسا ظن ہے جس کا اقتضا خوش کرنے والی بات کا حصول ہو یعنی کسی بہتری کی امید (غ) پس مرجو وہ شخص ہے جس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہوں۔

مریب ۔ راب اور اراب کے معنی ہیں ریب میں ڈالا ۔ اور ریب یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق کسی امر کا وہم کیا جائے ۔ پھر وہ چیز اس وہم سے صاف ہو جائے (غ)

مخلوق خدا کی خدمت فطرتِ انبیاء ہے: حضرت صالح کے متعلق ان کی قوم کا یہ اعتراف کہ آپ سے اس سے پہلے ہماری بہت امیدیں وابستہ تھیں بتاتا ہے، کہ انبیاء علیہم السلام شروع سے ہی قوموں کی امیدگاہ ہوتے ہیں۔ ان کا دل اور دماغ اور ان کی قوت عملی ایسی زبردست ہوتی ہے کہ قوم میں وہ اس دعوے سے پہلے ایک نمایاں امتیاز حاصل کر لیتے ہیں تاریخی رنگ میں اس کا بہترین نظارہ ہمارے نبی صلعم کی زندگی میں نظر آتا ہے کہ ہر قسم کے باطل سے متنفر کھیل کود سے الگ ہر وقت خدمت قومی میں لگے ہوئے ہیں۔ بعثت سے پہلے ثمال الیتامی عصمۃ الارامل ہیں غریبوں اور بیکسوں کے ملجا اور ماوی ہیں۔ دن رات مخلوق خدا کی فکر ہے نیکی اور راستبازی ایسی مسلّم کہ کوئی شخص آخر تک حرف نہیں رکھ سکا۔ درحقیقت قرآن کریم نے جو مختلف نقشے انبیاء کے کھینچے ہیں وہ آنحضرت صلعم کے متعلق ہی توجہ دلانے کے لیے ہیں۔ مگر جب یہ لوگ ان ساری باتوں کے باوجود قوم کے اندر سے بدی کی جڑ کاٹنا چاہتے ہیں تو شیاطین کا گروہ ان کا دشمن ہو جاتا ہے۔

فِیْ دِیَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۶۷﴾ | میں اوندھے پڑے رہ گئے ۱۴۷۹
کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْھَا ؕ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ کَفَرُوْا | گویا کہ ان میں بسے ہی نہ تھے، سنو ثمود نے اپنے رب کا انکار
رَبَّھُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾ ع ۶ | کیا، سنو ثمود پر پھٹکار ہے۔
وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰھِیْمَ بِالْبُشْرٰی | اور یقیناً ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیمؑ کے پاس خوش خبری لیکر
قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ | آئے۔ کہا سلامتی ہو، اس نے کہا سلامتی اور دیر نہ کی کہ تلا
جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ ﴿۶۹﴾ | ہُوا بچھڑا لے آیا ۱۴۸۰

ع ۱۴۷۹ صیحۃ آواز بلند کرنے کا نام ہے (رغ) جس کو یہاں صیحۃ کہا۔ اسی کو (الاعراف ۔ ۷۸) میں رجفۃ یا زلزلہ کہا، جس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی عذاب کی مختلف حالتوں کے یہ نام ہیں۔ زلزلہ سے پہلے بھی خطرناک آواز آتی ہے یہاں قریباً قریباً انہی الفاظ میں اونٹنی اور اس کے مارا جانے اور عذاب آنے کا ذکر ہے جیسے سورۂ اعراف میں۔ دیکھو الاعراف۔ رکوع ۱۰۔

ع ۱۴۸۰ حنیذ۔ دو دگرم) پتھروں کے درمیان رکھ کر کباب کیا ہوا اور یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس سے رطوبت نکل جائے (رغ)

حضرت ابراہیمؑ کا ذکر یہاں اصل مقصود نہیں بلکہ مقصود حضرت لوط کا ذکر ہے لیکن چونکہ جو رسول لوط کی قوم پر عذاب کی خبر لائے تھے۔ وہی حضرت ابراہیم کے لیے بھی بشارت لائے تھے۔ اس لیے قرآن کریم نے یہاں اور کئی اور موقعوں پر جہاں قوم لوط کے عذاب کا ذکر کیا ہے اسے حضرت ابراہیم کے ہاں فرزند کی بشارت سے شروع کیا ہے اس اکٹھے ذکر میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی تباہی نہیں چاہتا بلکہ ان پر بڑے بڑے انعام کرتا رہتا ہے۔ ہاں جب ایک قوم بدی میں حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو نسل انسانی کو بچانے کے لیے اس کی تباہی ضروری ہو جاتی ہے اور حضرت ابراہیم کو قوم لوط کے عذاب سے پہلے اپنی ایک عظیم الشان رحمت کی خبر دی اور بتایا کہ اگر ایک قوم تباہ ہوتی ہے تو تمہاری ہی نسل سے ایک دوسری قوم کھڑی کی جاتی ہے۔

یہ رسول فرشتے تھے یا انسان: یہ رسول کون تھے؟ ان کے آنے کی غرض تباتی انا ارسلنا الی قوم لوط (۷۰)، کون تھے روایات میں ہے کہ وہ فرشتے تھے اور ان کی تعداد بارہ سے لیکر تین تک بیان کی جاتی ہے اور بعض روایات میں ہے کہ وہ جبرائیل، میکائیل اور عزرائیل تھے بائبل میں پیدائش ۱۸ باب میں بھی یہی ذکر ہے اور وہاں بھی ان کو آدمیوں کی شکل میں فرشتے ہی قرار دیا ہے اور ان کی تعداد بھی تین ہی لکھی ہے۔ مگر تمام واقعات جن کا ذکر ہے انہیں انسان ٹھہراتے ہیں مثلاً ابراہیمؑ کا ان کی مہمانی کرنا اور ان کا کھانا کھانا پھر حضرت ابراہیم کا ان کے ساتھ چلنا وغیرہ اور وہیں حضرت ابراہیم کو ان کا بیٹے کی بشارت دینا اور پھر سدوم یعنی حضرت لوط کی بستی کی طرف جانا مذکور ہے۔ قرآن کریم میں صراحت سے یہ ذکر کہیں نہیں کہ یہ فرشتے تھے البتہ یہ ذکر ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ ان کے سامنے کھانا لائے تو انہوں نے کھایا نہیں۔ مگر ان کے دوسرے سارے حالات انسانوں سے ملتے ہیں اور کھانا نہ کھانے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، ممکن ہے اس وقت انہیں بھوک ہی نہ ہو یا روزہ سے ہوں اور آنحضرت صلعم کی کوئی حدیث ایسی نہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ فرشتے تھے۔ رہا یہ کہ انہوں نے حضرت ابراہیم کو بیٹے کی بشارت دی تو یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ اس زمانہ میں کوئی ایسے صالح لوگ ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ خوش خبری دی ہو اور انہوں نے اس کا ذکر حضرت ابراہیم سے کیا حالانکہ حضرت ابراہیم کو اس سے پہلے خود بھی اولاد کی خوشخبری دی تھی مگر چونکہ حضرت اسمٰعیل کی پیدایش سے وہ پیشگوئی پوری بھی ہو چکی تھی اس لیے ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم کا خیال یہ ہو کہ اب اور اولاد ان کے ہاں نہ ہوگی تب اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے ذریعہ سے ان کو یہ خبر پہنچائی کہ سارہ کے بطن سے بھی ان کے ہاں اولاد ہوگی۔ اور اصل میں یہ حضرت لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے تھے جو ایک بدکار قوم تھی اور خلاف وضع فطرت انسانی افعال شنیعہ کا ارتکاب کرتی تھی اور ان کو وہاں بھیجنے کا منشا اس قوم پر اتمام حجت کے رنگ میں معلوم ہوتا ہے یعنی آپس میں تو ایسے افعال کرتے تھے مگر جب مہمانوں پر دست درازی کریں جو نہ صرف ان افعال بد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ جن کی تکریم لازم تھی تو اللہ تعالیٰ کا غضب ان پر بھڑک اٹھے۔ اگر یہ فرشتے ہوتے جن کی وساطت سے اللہ تعالیٰ اپنا کلام انسانوں کو پہنچاتا ہے تو پھر اس کی صورت وہی ہونی چاہیئے تھی جو اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمائی ہے او یرسل رسولا فیوحی باذنہ ما یشآء (الشوریٰ ۴۲ ۔ ۵۱) یعنی ملک رسول کو بھیجتا ہے تو وحی کرتا ہے اور کلام وحی اور اس ملک کا آنا اس رنگ میں نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک دوسرے عالم میں آتا ہے یہاں تک کہ رسول اللہ صلعم پر جب جبرئیل وحی لیکر آتا تو کوئی دوسرا شخص اسے نہ دیکھ سکتا نہ اس کے کلام کو سن سکتا۔ حالانکہ سب سے زیادہ پرزور اور پرشوکت وحی رسول اللہ صلعم کو ہی ہوئی پس حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کو وحی اس رنگ میں ہی ہو سکتی تھی جس طرح ہمارے نبی کریم صلعم کو ہوئی اور ان واقعات میں چونکہ وہ رنگ نہیں اس لیے ماننا پڑے گا کہ یہ کوئی صالح انسان تھے۔ جن کو بطور ایک نشان کے قوم لوط کی طرف بھیجا گیا اور اسی لحاظ سے ان کو رسول کہا گیا جیسا کہ ایک جگہ حضرت صالح کی اونٹنی کے متعلق بھی فرمایا کہ ہم نے اس اونٹنی کو بھیجا انا مرسلوا الناقۃ فتنۃ لھم (القمر ۵۴ ۔ ۲۷)

حضرت ابراہیمؑ کا فوراً بھنا ہُوا بچھڑا لے آنا بتاتا ہے کہ کس قسم کی مہمان نوازی اخلاق انسانی کو کمال تک پہنچانے کے لیے بکار ہے حضرت ابراہیمؑ ان سے

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیۡدِیَهُمۡ لَا تَصِلُ اِلَیۡهِ نَکِرَهُمۡ وَ اَوۡجَسَ مِنۡهُمۡ خِیۡفَةً ؕ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمِ لُوۡطٍ ؕ ﴿۷۰﴾

مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں اُٹھتے، اُس نے انھیں اجنبی سمجھا اور اُن سے دل میں ڈرا، انھوں نے کہا، نہ ڈر ہم لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں [۱۴۸۱]

وَ امۡرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِکَتۡ فَبَشَّرۡنٰهَا بِاِسۡحٰقَ ۙ وَ مِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ یَعۡقُوۡبَ ﴿۷۱﴾

اور اس کی عورت کھڑی تھی سو وہ خوش ہوئی تو ہم نے اسے اسحاقؑ کی اور اسحاق کے پیچھے (ایک پوتے) یعقوبؑ کی خوش خبری دی [۱۴۸۲]

قَالَتۡ یٰوَیۡلَتٰۤی ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوۡزٌ وَّ هٰذَا بَعۡلِیۡ شَیۡخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَیۡءٌ عَجِیۡبٌ ﴿۷۲﴾

اس نے کہا مجھ پر تعجب ! میں جنوں گی حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرا خاوند بھی بوڑھا ہے یہ تو بڑی عجیب بات ہے [۱۴۸۳]

قَالُوۡۤا اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ رَحۡمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَکٰتُهٗ عَلَیۡکُمۡ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِیۡدٌ مَّجِیۡدٌ ﴿۷۳﴾

انھوں نے کہا، کیا تو اللہ کے حکم سے تعجب کرتی ہے؟ اے اہل بیت اللہ کی رحمت اور برکتیں تم پر ہیں، وہ تعریف کیا گیا بزرگ ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنۡ اِبۡرٰهِیۡمَ الرَّوۡعُ وَ

سو جب ابراہیمؑ سے ڈر جاتا رہا اور اسے خوش خبری پہنچی

سوال نہیں کرتے کہ تم کھانا کھاؤ گے یا نہیں بلکہ فوراً بہتر سے بہتر غذا جو اُن کی مقدرت میں ہے لا حاضر کرتے ہیں گویا اس میں یہ تعلیم دی ہے کہ مہمان سے دریافت کرنا بھی مہماں نوازی میں ایک قسم کا نقص ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اس قدر تکلیف کرتے ہیں حالانکہ وہ مہمان کھانا کھانے بھی نہیں۔ اور اس واقعہ کا ذکر اس غرض کے لیے کیا ہے کہ ہر نبی کی زندگی میں جس خاص خلق کا ذکر کیا ہے وہ بدرجہ اتم ہمارے نبی کریم صلعم میں موجود تھا اور خاص خاص اخلاق کی طرف توجہ دلانے کی غرض یہی ہے۔

سلام کا لفظ اختیار کر کے بتایا ہے کہ صلحا کا سلام ایک دوسرے کو ہمیشہ یہی رہا ہے یہاں تک کہ وہ قوم جس کو آج سوائے گڈ مارننگ اور گڈ ایوننگ کے اور کچھ آتا ہی نہیں ان کی کتاب مقدس میں خود حضرت مسیحؑ کا سلام جو انھوں نے حواریوں کو کیا یہی لکھا ہے" یسوع انہیں ملا اور کہا سلام" (متی ۲۸ : ۹)

۱۴۸۱ نکر۔ اَنۡکَرۡتُ اور نَکِرۡتُ ایک معنی میں ہیں اور انکار عرفان یعنی پہچاننے کی ضد ہے اور نَکِرَھُم اسی معنی میں ہے (غ) اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ان کے ہاں مہمان آتا اور وہ کھانا نہ کھاتا تو سمجھتے تھے کہ یہ کسی بد ارادہ سے آیا ہے (ج)

اَوۡجَسَ۔ وَجۡس صوت خفی یعنی ایسی آواز کو کہتے ہیں جو سنی نہ جائے اور ایجاس ایسی آواز کا اندر پانا ہے (غ)

حضرت ابراہیمؑ نے ان کے نہ کھانے کو دستور ملک کے مطابق اس بات پر محمول کیا کہ ان کا ارادہ اچھا نہیں۔ اس لیے آپ نے دل میں ان سے خوف محسوس کیا۔ جس کا جواب انہوں نے دیا کہ تمہارے لیے تو خوشخبری ہے۔ ہاں اگر ہم بُرائی کی خبر لائے ہیں تو وہ قوم لوط کے لیے ہے۔

۱۴۸۲ ضحکت ۔ ضِحۡك۔ چہرہ کا انبساط ہے اور دانتوں کا ظاہر ہونا ہے جو دل میں خوشی پیدا ہونے سے ہو اور استعارۃً استہزا یا تمسخر پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے وکنتم منہم تضحکون (المؤمنون ۲۳-۱۱۰) اور اذا ھم منہا یضحکون (الزخرف ۴۳-۴۷) اور صرف خوش ہونے پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے مسفرۃ ضاحکۃ (عبس ۸۰-۳۸ و ۳۹) فلیضحکوا قلیلا (التوبۃ ۹-۸۲) اور مجرد تعجب پر بھی اس کا استعمال ہے (غ)

وراء۔ اس کا مادہ وری ہے اور اس کے معنی دونوں طرح آتے ہیں۔ پیچھے اور آگے گویا وہ وہ چیز ہے جو تم سے چھپی ہوئی ہو آگے ہو یا پیچھے (ت) پس من وراء اسحاق کے معنی ہوئے اسحاق سے آگے یعنی اگلی نسل میں یا اسحاق کی اولاد گویا صرف بیٹے کی خوشخبری نہیں بلکہ ایک قوم کے پیدا ہونے کی خوش خبری ہے اس لیے بتایا کہ اس بیٹے کے بھی بیٹا ہوگا اور تاج العروس میں ہی ہے الوراء ایضاً ولد الولد یعنی بیٹے کے بیٹے کو بھی وراء کہا جاتا ہے۔ یہی معنی حضرت ابن عباس سے مروی ہیں (ج)

امراتہ قائمۃ میں بتایا کہ حضرت ابراہیمؑ کی بی بی بھی مہمانوں کی خدمت میں مشغول تھیں اور ان کے ضحك سے مراد اگر ہنسنا یا خوش ہونا لیا جائے تو اس لیے ہو سکتا ہے کہ ان کو اطمینان ہوگیا کہ یہ لوگ ہمارے متعلق کوئی بُری خبر نہیں لائے، بلکہ قوم لوط کے لیے لائے ہیں اور اسحاق کی خبر پر یہ خوشی نہیں کیونکہ وہ خبر ابھی بعد میں ملتی ہے اور یا ضحك بمعنی تعجب ہے اور تعجب انہیں اس بات پر ہوا کہ حالانکہ دونوں میاں بی بی ان کی خدمت میں مشغول رہے مگر انہوں نے کھانا نہ کھایا۔

۱۴۸۳ یویلتی ۔ وَیۡل کے اصل معنی برائی ہیں۔ مگر یہ کلمہ یا ویلتا اہل عرب تعجب کے وقت بھی بولتے ہیں (ج)

جَآءَتۡهُ الۡبُشۡرٰی یُجَادِلُنَا فِیۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ ﴿۷۴﴾

لوط کی قوم کی نسبت ہم سے جھگڑنے لگا ؏۱۴۸۴

اِنَّ اِبۡرٰهِیۡمَ لَحَلِیۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیۡبٌ ﴿۷۵﴾

یقیناً ابراہیمؑ بُردبار، نرم دل (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا تھا ؏۱۴۸۵

یٰۤاِبۡرٰهِیۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمۡ اٰتِیۡهِمۡ عَذَابٌ غَیۡرُ مَرۡدُوۡدٍ ﴿۷۶﴾

اے ابراہیمؑ یہ خیال چھوڑ دے، کیونکہ تیرے رب کا حکم آچکا ہے اور اُن پر وہ عذاب آنے والا ہے جو ردّ نہیں ہو سکتا۔

وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِیۡٓءَ بِهِمۡ وَضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا وَّقَالَ هٰذَا یَوۡمٌ عَصِیۡبٌ ﴿۷۷﴾

اور جب ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے وہ ان کی وجہ سے مغموم ہُوا اور ان کے معاملے میں ہاتھ کو تنگ پایا اور کہا یہ دن بڑا سخت ہے ؏۱۴۸۶

وَجَآءَهٗ قَوۡمُهٗ یُهۡرَعُوۡنَ اِلَیۡهِ ؕ وَمِنۡ قَبۡلُ كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیۡ هُنَّ اَطۡهَرُ لَكُمۡ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ فِیۡ ضَیۡفِیۡ ؕ اَلَیۡسَ مِنۡكُمۡ رَجُلٌ رَّشِیۡدٌ ﴿۷۸﴾

اور اس کے پاس اس کی قوم دوڑتی آئی اور وہ پہلے سے بُرے کام کرتے تھے۔ اس نے کہا اے میری قوم یہ میری بیٹیاں ہیں یہ تمھارے لیے سب سے بڑھ کر پاک ہیں سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ؟ ؏۱۴۸۷

؏۱۴۸۴ روع۔ رُوع دل کو کہتے ہیں حدیث میں ہے اِنَّ رُوحَ الۡقُدُسِ نَفَثَ فِیۡ رُوۡعِی روح القدس نے میرے دل میں ڈالا۔ اور رَوۡع وہ چیز ہے جو دل کو پہنچے اور خوف کو جو دل میں ڈالا جائے رَوۡع کہا جاتا ہے (غ) اور حدیث میں ہے اللّٰھم امن رَوۡعاتی اور رَوۡعات رَوۡعۃ کی جمع ہے یعنی ایک مرتبہ خوف (ل)

یجادلنا فی قوم لوط یعنی لوط کی قوم پر جو عذاب کی خبر اُنہیں ملی تو اس کے ٹل جانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اسے مجادلہ اس لیے کہا کہ ارادۂ الٰہی ظاہر ہو چکا تھا۔

؏۱۴۸۵ منیب۔ نَوۡب کے معنی ایک چیز کا بار بار لوٹ کر آنا اور نائبۃ حادثہ کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ لوٹ لوٹ کر آتا ہے اور انابۃ یہ ہے کہ توبہ اور اخلاص عمل سے بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے خرّ راکعاً واناب (ص ۳۸۔ ۲۴) وانیبوا الی ربکم (الزمر ۳۹۔ ۵۴) منیبین الیہ (الروم ۳۰۔ ۳۱)

؏۱۴۸۶ سئی بہم۔ سُوۡء وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں ڈالے (غ) اس لیے سئی بہم کے معنی ہیں ان کی وجہ سے مغموم ہُوا۔

ضاق بہم ذرعًا ذِراع ہاتھ ہے یعنی کہنی سے لیکر درمیانی انگلی کے آخر تک ہے ذرعہا سبعون ذراعا (الحاقۃ ۶۹۔ ۳۲) اور ذَرۡع کے معنی طاقت بھی آتے ہیں جس طرح ید کے معنی طاقت ہیں اور ضاقَ بِالۡاَمۡرِ ذَرۡعُہٗ کے معنی ہیں اس کی طاقت اس معاملہ میں کمزور ہوئی (ل)

عصیب۔ عَصَب پٹھے کو کہتے ہیں اور عَصۡب کا استعمال ہر سختی اور مضبوطی پر ہے اور عصیب کے معنی سخت ہیں (غ)

جب اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے حضرت لوط کے پاس آتے ہیں تو ان کو اپنی قوم کی بدکاری کی وجہ سے یا اس لیے کہ ان کی قوم اس بات کو پسند نہ کرتی تھی کہ اجنبی لوگ ان کے پاس آکر ٹھہریں جیسا کہ اولم ننہک عن العالمین (الحجر ۱۵۔ ۷۰) سے ظاہر ہے۔ ان کی حفاظت کی فکر ہوئی اور ان کو خوف ہوا کہ وہ ان مہمانوں کی حفاظت نہ کرسکیں گے اس لیے وہ مغموم ہوئے۔

؏۱۴۸۷ یھرعون۔ ھَرَعَ اور اَھۡرَعَ کے معنی ہیں اس کو سختی سے اور ڈرا کر خوب چلایا (غ) اور ابن جریر نے یھرعون کے معنی میں یہ شعر نقل کیا ہے فجاؤا یھرعون وھم اساری ؞ نقودھم علی رغم الانوف جس سے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ قیدیوں کو سختی کے ساتھ اور ڈرا کر چلایا جاتا ہے اور وہیں ہے کہ جب انسان سردی یا غضب یا بخار سے کانپتا ہو تو اس پر بھی اُھۡرِعَ کا استعمال ہوتا ہے اور یہاں ان کے تیز چلنے کو طلب فاحشہ سے منسوب کیا گیا ہے (ج)

ضیف۔ ضَیۡف کے اصل معنی مَیۡل یعنی مائل ہونا ہیں پس ضَیۡف وہ ہے جو تمہارے پاس ٹھہرتا ہوا تمہاری طرف مائل ہو یعنی مہمان اور چونکہ اس کا اصل مصدر ہے اس لیے واحد جمع میں یکساں استعمال ہوتا ہے اور اسی سے ضِیافۃ ہے اور اضافۃ کا استعمال جو نحو میں ہوتا ہے وہ بھی اسی سے ہے (غ)

حضرت لوطؑ کی قوم کے متعلق یھرعون کا لفظ بتاتا ہے کہ وہ کسی خوف کے مارے دوڑے آئے اور ممکن ہے کہ وہ اسی خوف سے آئے ہوں کہ حضرت

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾

انھوں نے کہا تو جانتا ہے ہمارا تیری بیٹیوں پر کوئی حق نہیں اور تو خوب جانتا ہے جو ہم چاہتے ہیں ؏۱۴۸۸

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾

اس نے کہا کاش مجھ میں تمھارے (مقابلہ) کے لیے طاقت ہوتی بلکہ میں ایک مضبوط سہارے کی پناہ لیتا ہوں ؏۱۴۸۹

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾

انھوں نے کہا اے لوطؑ ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں وہ تجھ تک نہ پہنچ سکیں گے تو کچھ رات سے اپنے اہل کو لے نکل سوائے تیری عورت کے اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اس پر وہی مصیبت آنے والی ہے جو ان پر آ رہی ہے ان کا مقرر وقت صبح ہے۔ کیا صبح قریب نہیں ؟ ؏۱۴۹۰

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا

سو جب ہمارا حکم آگیا ہم نے اُسے تہ و بالا کر دیا۔

لوط اجنبیوں کو اپنے پاس جمع کر رہے ہیں گو اگلے الفاظ اس معنی کی تائید نہیں کرتے جہاں ان کی پہلی بدکاریوں کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی وہ اسی ارادہ سے آئے تھے۔ اور اس قوم کی بیحیائی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ علی الاعلان اور مہمانوں کے ساتھ بھی بیحیائی کے ارتکاب کی خواہش سے اندھے ہو گئے اور کسی قسم کا لحاظ ان کو باقی نہ رہا۔

حضرت لوطؑ کی بیٹیاں: ھٰؤلاء بناتی ھن اطھر لکم اس کے ایک معنی تو یہ کیے گئے ہیں کہ حضرت لوط نے اپنے مہمانوں کو بچانے کے لیے فرمایا کہ یہ میری بیٹیاں ہیں تم ان سے نکاح کر لو۔ کیونکہ وہ لوگ پہلے حضرت لوط سے ان کی بیٹیاں نکاح میں مانگتے تھے تو آپ انکار کرتے تھے۔ اپنے مہمانوں کی حفاظت کے لیے آپ نے اس بات کو بھی قبول کیا کہ وہ اپنی لڑکیاں ان کو نکاح میں دے دیں اور بعض کہتے ہیں کہ ان الفاظ سے صرف ان کو شرم دلانا مقصود تھا حقیقت میں نکاح میں دینا مقصود نہ تھا اور مجاہد اور قتادہ ابن جریج وغیرہم سے روایت ہے کہ ھٰؤلاء بناتی میں اشارہ عورتوں کی طرف تھا کہ قضائے شہوت کے لیے تمہاری بیویاں موجود ہیں اور وہ تمہارے لیے پاکیزہ ہیں پس تمام حرام اور فاحش طریقوں کو چھوڑ دو اور عام عورتوں کو بناتی اس لحاظ سے کہا کہ نبی اپنی امت کے لیے باپ کے حکم میں ہوتا ہے (ج) یہ آخری تاویل کسی قدر کمزور ہے اس لیے کہ نبی کا باپ ہونا مومنوں کے حق میں ہوتا ہے نہ کفار کے، مگر پھر بھی مجازاً بناتی سے مراد عام عورتیں لی جا سکتی ہیں اور یہی معنی قابل ترجیح ہیں کہ آپ نے مرد اور عورت کے قدرتی اور پاکیزہ تعلق کی طرف توجہ دلائی۔ بائبل میں ایک نہایت فحش قصہ حضرت لوط کی بیٹیوں کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کو شراب پلا کر اس سے زنا کیا۔ انبیاء کے متعلق ایسے ناپاک قصے بیان کر کے بھی یہ کتاب مقدس کہلاتی ہے اور عیسائی اسے فخر سے دنیا میں پھیلا رہے ہیں کچھ تھوڑی سی حیا ہوتی تو اس قسم کے فحش قصوں کو ہی اس کتاب سے نکال دیتے۔

؏۱۴۸۸ اس جواب میں کہ تمہاری بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ تم دوسری قوم سے ہو اس لیے ہم تمہاری بیٹیوں سے نکاح نہیں کر سکتے یا یہ کہ تم ان کے متعلق پہلے انکار کر چکے ہو۔

؏۱۴۸۹ رُکن۔ ایک چیز کا رُکن اس کی وہ جانب ہے جس سے وہ سکون پکڑتی ہے اس لیے استعارۃً اس کے معنی قوت ہیں یعنی سہارا اور اسی سے رَکَنَ کے معنی ہیں ایک جانب مائل ہوا لا ترکنوا الی الذین ظلموا (ھود۔۱۱۳) اور عبادت کے ارکان وہ باتیں ہیں جن پر اس کی بنا ہے اور جن کے ترک کرنے سے وہ باطل ہو جاتی ہے (غ)

رکن شدید سے مراد: پہلے اپنی کمزوری کا اعتراف ہے کاش مجھ میں یہ طاقت ہوتی کہ میں تمہارا مقابلہ کر کے اپنے مہمانوں کو تم سے بچا سکتا لیکن چونکہ مجھ میں یہ طاقت نہیں اس لیے پھر فرمایا اٰوی الی رکن شدید بلکہ میں ایک مضبوط سہارے کی پناہ لیتا ہوں اور گو اس مضبوط سہارے سے بعض مفسرین نے مراد کنبہ لیا ہے مگر حدیث نبوی سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا سہارا ہے۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ ہیں رَحِمَ اللّٰہُ لوطاً فَاِنَّہٗ کان یأوی الی رکن شدید (ج) اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط پر رحم کیا کیونکہ وہ ایک مضبوط سہارے کی پناہ لیتا تھا یعنی اللہ تعالیٰ کی۔

؏۱۴۹۰ اسر۔ سَرٰی اور اَسْرٰی کے معنی ہیں رات کے وقت چلا قطع من اللیل رات کا کچھ حصہ ہے۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ۙ ﴿۸۲﴾	اور ہم نے اس پر سخت پتھر پے در پے برسائے ۱۴۹۱
مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾ ع	تیرے رب کے ہاں سے نشان لگائے ہوئے اور وہ ظالموں سے دور نہیں ۱۴۹۲
وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ	اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو (بھیجا) اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمھارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں اور ماپ اور تول میں کمی نہ کیا کرو، میں تمھیں اچھی حالت میں دیکھتا

یلتفت۔ التفات کے لیے دیکھو ع۱۴۲۱ حضرت ابن عباس سے یہاں لا یتخلّف معنی مروی ہیں یعنی پیچھے نہ رہے (ر) اور بعض نے پھر کر دیکھنا مراد لیا ہے۔

وہ لوگ اس وقت کس طرح اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے اس کی تفصیل قرآن کریم نے نہیں دی بعض آثار میں ہے کہ وہ اندھے کر دیئے گئے۔

ع۱۴۹۱ عالی۔ سافل۔ سُفل۔ عُلوّ کی ضد ہے اور اَسفل اَعلیٰ کی (غ) والرکب اسفل منکم (الانفال ۸۔ ۴۲) میں مراد ایسی طرف ہے جو بوجہ ساحل سمندر کے قریب ہونے کے مدینہ سے نیچی تھی یعنی سطح سمندر سے اس کی بلندی کم تھی اذ جاؤکم من فوقکم ومن اسفل منکم (الاحزاب ۳۳۔ ۱۰) میں بھی پست زمین مراد ہے وجعل کلمۃ الذین کفروا السفلٰی (التوبۃ ۹۔ ۴۰) میں مغلوبیت مراد ہے ثمّ رددناہ اسفل سافلین (التین ۹۵۔ ۵) میں ذلیل حالت مراد ہے۔

سجّیل۔ کو سنگِ گِل (یعنی مٹی کا پتھر) سے معرب خیال کیا گیا ہے لیکن اس لفظ کا مادہ سجل زبان عربی میں موجود ہے اور اس کے مشتقات بکثرت عربی زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے سجّیل کو معرب خیال کرنا صریح غلطی ہے۔ سَجْل بڑے ڈول کو کہتے ہیں جو پانی سے بھرا ہوا ہو اور حدیث میں ہے الحرب بیننا سجالٌ یعنی کبھی ایک طرف کو غلبہ ہوتا ہے کبھی دوسری طرف کو اور ایک حدیث میں سورت کی قرأت کے متعلق ہے فَسَجَلَھا یعنی اس کو ملی ہوئی قرأت کے ساتھ پڑھا۔ کیونکہ سجل کے معنی صَبّ یعنی گرانا بھی آتے ہیں اور اَسْجَلَ کے معنی اَرْسَلَ یا اَطْلَقَ آتے ہیں یعنی بھیجا اور چھوڑ دیا یا آزاد کیا۔ اور سجّل کتاب عہد کو کہتے ہیں اور ابو عبیدہ کہتے ہیں من سجیل کے معنی ہیں کثیرۃ شدیدۃ یعنی بہت اور سخت اور بعض کے نزدیک سجیل اُسْجِلَ بمعنی اَرْسَلَ سے ہے یعنی چھوڑ دیا گویا وہ پتھر ان پر بھیجے گئے یا چھوڑے گئے اور یا سجیل سے مراد سِجّل ہے یعنی لکھے ہوئے گویا وہ ان کے لیے مقدر ہو چکے تھے اور سجّیل اور سجّین کے ایک ہی معنی ہیں اور سجّین بمعنی کتاب مرقوم قرآن شریف میں ہے وما ادرٰک ما سجّین کتاب مرقوم (التطفیف ۸۳۔ ۸ و ۹) (ل) اور ابن جریر نے بعض اہل علم کا قول نقل کیا ہے کہ سجّیل سے مراد سخت ہے۔

منضود۔ نَضَد سامان کے ایک دوسرے کے اوپر رکھنے پر بولا جاتا ہے (غ) اور منضود کے معنی ہیں یَتْبع بعضُہ بعضاً (ج) ایک دوسرے کے پیچھے آنے تھے بالفاظ دیگر پے در پے برس رہے تھے۔ اور قرآن کریم میں ہے طلح منضود (الواقعۃ ۵۶۔ ۲۹) اور ایسا ہی طلع نضید (ق ۵۰۔ ۱۰) یعنی تہ بتہ۔

لوط کی بستیاں کس طرح تباہ ہوئیں: فجعلنا عالیھا سافلھا کی تفسیر میں مفسرین نے بعض آثار کی بنیاد پر لکھا ہے کہ حضرت جبرئیل نے زمین کے اس ٹکڑے کو اٹھا کر اتنا اونچا کیا کہ آسمان والوں نے مرغوں کی آواز اور کتّوں کا بھونکنا سنا اور پھر اسے وہاں سے پھینکا، مگر کسی حدیث میں یہ نہیں اور اگر اس سے یہ مراد ہوتی تو پھر ساتھ پتھر برسانے کا ذکر بے معنی ہے کیونکہ جب زمین کے نیچے کا حصّہ اوپر آگیا اور اوپر والا نیچے چلا گیا تو پتھر کہاں برسے گویا قرآن کریم نے پتھر برسانے کا ذکر کر کے خود بتا دیا کہ عالی کو سافل بنانے سے مراد تہ وبالا کرنا ہے اور دوسری جگہ اس قوم کے عذاب کو کہیں صرف امطرنا علیھم مطرا (النمل ۲۷۔ ۵۸) کہا ہے اور کہیں انا ارسلنا علیھم حاصبا (القمر ۵۴۔ ۳۴) گویا صرف پتھروں کی بارش کا ذکر کیا ہے۔ پس یہی اصل عذاب تھا اور اسی کے ذریعہ سے وہ زمین تہ وبالا کر دی گئی۔ اور ظاہر ہے کہ پتھروں کی بارش آتش فشاں پہاڑوں سے ہوتی ہے اور پے در پے بھیجنے سے بھی یہی منشا ہے۔

ع۱۴۹۲ پتھروں کو مسومۃ یا نشان لگائے ہوئے اس لیے کہا کہ گویا وہ ان کے لیے مقدر ہو چکے تھے۔ اور ماھی من الظالمین ببعید میں یہ بتایا کہ وہ جگہ ان ظالموں سے جو اس وقت حق کی مخالفت کر رہے ہیں دور نہیں یعنی اسے دیکھتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ہے کہ اس پر تم گزرتے ہو اور یا مراد یہ ہے کہ ایسا ہی عذاب ان ظالموں کے لیے تیار ہے۔

عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿٨٤﴾

ہوں اور میں تم پر گھیر لینے والے دن کے عذاب کے آنے سے ڈرتا ہوں [۱۴۹۳]۔

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٨٥﴾

اور اے میری قوم! ماپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور فساد پھیلاتے ہوئے زمین میں حد سے نہ بڑھو۔

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿٨٦﴾

جو اللہ کے پاس باقی رہتا ہے وہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو، اور میں تم پر نگہبان نہیں ہوں [۱۴۹۴]۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿٨٧﴾

انھوں نے کہا اے شعیبؑ کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا اپنے مالوں میں جس طرح چاہیں (نہ) کریں بیشک تو بڑا بردبار سیدھی راہ پر چلنے والا ہے [۱۴۹۵]۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰي مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿٨٨﴾

اس نے کہا اے میری قوم بتاؤ اگر میں اپنے رب سے ایک کھلی دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے اچھی روزی دی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تمھاری مخالفت کر کے وہ کام کروں جس سے میں تمھیں روکتا ہوں میں سوائے اصلاح کے کچھ نہیں چاہتا جہاں تک میری طاقت ہے اور مجھے توفیق ملنا اللہ کی مدد سے ہی ہے اسی پر میں بھروسا رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں [۱۴۹۶]۔

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿٨٩﴾

اور اے میری قوم میری دشمنی تم سے ایسا نہ کرائے کہ تم پر ایسی ہی مصیبت آ پڑے جیسی نوحؑ کی قوم، یا ہودؑ کی قوم، یا صالحؑ کی قوم پر پڑی اور لوطؑ کی قوم بھی تم سے دور نہیں [۱۴۹۶الف]۔

ع۱۴۹۳ خیر۔ وہ چیز ہے جس میں سب رغبت کریں۔ اور اس کی ضد شر ہے اور ایک چیز کو دوسری کے مقابلہ میں بھی خیر کہا جاتا ہے جیسے مال کثیر کو خیر کہا جاتا ہے اور یہاں مراد دنیوی نعمتیں یا آسایش کی حالت ہے باقی کے لیے دیکھو ع۱۱۲۰۔

ع۱۴۹۴ بقیۃ اللہ۔ بقاء کسی چیز کا پہلی حالت پر ثابت رہنا ہے۔ اور اپنے نفس میں باقی رہنے والی صرف ذات باری ہے۔ باقی سب کا بقا اسی کی ذات سے ہے ایسا ہی بقا اہل جنت کا ہے اور الباقیات الصالحات (الکھف۱۸۔ ۴۶) وہ اعمال ہیں جن کا ثواب انسان کے لیے باقی رہتا ہے اور بقیۃ اللہ سے مراد بھی یہی ہے اور اس کی اضافت اللہ کی طرف ہے (غ) اور اس کے معنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا اللہ تعالیٰ کا رزق بھی کیے ہیں (ج)

ع۱۴۹۵ بظاہر ان کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نماز پڑھتے ہو تو پڑھو ہماری باتوں میں دخل کیوں دیتے ہو۔ ہم اپنے پرانے طریق پر عبادت کرتے ہیں جس طرح ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ رہے مال سو وہ ہماری چیز ہے جس طرح پر چاہیں کریں کم دیں یا زیادہ دیں اور یہ جو کہا کہ تم حلیم رشید ہو تو بعض نے اسے بطور تہکم مراد لیا ہے یعنی تم اپنے زعم میں حلیم و رشید ہو۔ مگر قرین قیاس یہ ہے کہ وہ حضرت شعیبؑ کی حلیمی اور رشد کے قائل تھے۔

ع۱۴۹۶ رزق حسن سے مراد یہاں نبوت و حکمت ہے (ر) کیونکہ یہی وہ رزق ہے جو انبیاء کو خصوصیت سے ملتا ہے اور ان کی اس بات کا کہ ہماری باتوں میں دخل نہ دو یہ جواب دیا ہے کہ میں تمھاری اصلاح چاہتا ہوں اور یہ کہ میں خود اسے اچھا سمجھتا ہوں اس سے ظاہر ہے کہ میں خود بھی اس پر عامل ہوں۔

ع۱۴۹۶الف یہاں کیسی صفائی سے بتا دیا کہ جس طرح ہودؑ اور صالحؑ اور لوطؑ کی قوم پر عذاب آیا اسی طرح حضرت نوحؑ کی بھی قوم پر عذاب آیا جس سے معلوم ہوا

وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ ﴿٩٠﴾

اور اپنے رب کی بخشش مانگو، پھر اس کی طرف پھر آؤ، میرا رب رحم کرنے والا محبت کرنے والا ہے ع۱۴۹۷

قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا ۖ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ﴿٩١﴾

انھوں نے کہا اے شعیبؑ ہمیں بہت سی وہ باتیں سمجھ نہیں آتیں جو تو کہتا ہے اور ہم تجھے اپنے اندر کمزور دیکھتے ہیں اور اگر تیرے بھائی بند نہ ہوتے تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے اور تو ہم پر غالب نہیں ع۱۴۹۸

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٩٢﴾

اس نے کہا اے میری قوم کیا میرے بھائی بندوں کا دباؤ تم پر اللہ سے زیادہ ہے اور تم نے اسے پیٹھ کے پیچھے ڈال رکھا ہے میرا رب اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو تم کرتے ہو ع۱۴۹۹

وَيَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ سَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ ﴿٩٣﴾

اور اے میری قوم اپنی طاقت کے مطابق عمل کرو، میں بھی عمل کرنے والا ہوں، تم جان لوگے کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے اور کون جھوٹا ہے اور دیکھتے رہو میں بھی تمھارے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَأَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿٩٤﴾

اور جب ہمارا حکم آگیا ہم نے شعیبؑ کو اور انھیں جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت کے ساتھ بچا لیا اور جنہوں نے ظلم کیا اُن کو سخت آواز نے آپکڑا سو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہی رہ گئے۔

كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ

گویا کہ اُن میں بسے ہی نہ تھے سنو مدین پر پھٹکار ہے جیسے

کہ طوفان نوح کا عذاب صرف قوم نوح کے لیے تھا نہ کل عالم کے لیے، سارے قرآن شریف میں جہاں جہاں حضرت نوحؑ کا ذکر آتا ہے ان کی قوم کا اسی طرح ذکر ہے جس طرح دوسرے انبیاءؑ کی قوموں کا۔

ع۱۴۹۷ ودود۔ وُدّ کے لیے دیکھو ع۱۱۳۷ اس میں محبت سے بڑھ کر ایک چیز کے ہونے کی تمنی بھی ہے اور ودود وہ ہے جو بندوں سے مودّت رکھتا ہے یعنی بندوں کے لیے مراعاۃ یا ان کی حفاظت بھی اس میں شامل ہے۔ اور یا ودود کے معنی میں یہ داخل ہے کہ اللہ ایک ایسی قوم کو لاتا رہتا ہے جو اس سے محبّت کرے اور جن سے وہ محبت کرے (غ)

ع۱۴۹۸ رھط کسی شخص کا رَھْط اس کی قوم یا قبیلہ ہے۔ اور تین یا سات سے دس تک کے عدد کو ظاہر کرتا ہے (ل)

شعیبؑ کی نابینائی کی روایت: انبیاء کی تعلیم ایسی سادہ ہوتی ہے کہ عام انسان اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ ہم سمجھتے نہیں گویا اس بات کے قائمقام ہے کہ ہم پروا نہیں کرتے۔ کیوں کہ تم ہم میں کوئی طاقتور آدمی نہیں ہو کہ تمھاری بات کی ہم پروا کریں۔ ضعیف سے یہی مراد ہے اور یہ جو حضرت ابن عباسؓ سے ضعیف کے معنی اندھا مروی ہیں تو یہ درست نہیں اس لیے کہ انبیاء ایسے عیوب سے پاک ہوتے ہیں اور یہاں لفظ ہیں کہ ہم تم کو اپنے اندر ضعیف پاتے ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ ہمارے مقابلہ میں تم کمزور ہو اور اگر ضعیف سے اندھا مراد لیا جائے جس پر لغت کی بھی شہادت نہیں تو معنی کچھ نہیں بنتے۔ کیونکہ اپنے اندر اندھا پانا بے معنی ہے۔

ع۱۴۹۹ ظِھْرِی۔ ظَھْر کے معنی پیٹھ ہیں اور ظِھْرِیّ اسے بھی کہتے ہیں جسے سواری کے لیے تیار کیا جائے اور اسے بھی جسے پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا جائے (غ) یہی دوسرے معنی یہاں ہیں۔

ع ۸ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ ﴿٩٥﴾

ثمود پر پھٹکار ہوئی۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ﴿٩٦﴾

اور ہم نے موسیٰؑ کو اپنے نشانوں اور کھلی سند کے ساتھ بھیجا۔

إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاتَّبَعُوا أَمْرَ فِرْعَوْنَ ۖ وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ ﴿٩٧﴾

فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، مگر انھوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی اور فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۖ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ ﴿٩٨﴾

وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا سو ان کو آگ پر پہنچا دیگا اور کیا ہی بُری گھاٹ ہے جس پر پہنچے ع۱۵۰۰

وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ ﴿٩٩﴾

اور اس دنیا میں بھی لعنت اُن کے پیچھے لگی رہی اور قیامت کے دن بھی بُرا انعام ہے جو دیا جائے گا ع۱۵۰۱

ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْقُرَىٰ نَقُصُّهُ عَلَيْكَ ۖ مِنْهَا قَائِمٌ وَحَصِيدٌ ﴿١٠٠﴾

یہ بستیوں کے کچھ حالات ہیں جو ہم تجھ پر بیان کرتے ہیں ان میں سے کچھ آباد اور (کچھ) اجڑی ہوئی ہیں۔

وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ۖ فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مِن شَيْءٍ لَّمَّا جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَمَا زَادُوهُمْ غَيْرَ تَتْبِيبٍ ﴿١٠١﴾

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا سو جب تیرے رب کا حکم آگیا تو ان کے وہ معبود ان کے کچھ کام نہ آئے جنھیں وہ اللہ کے سوائے پکارتے تھے اور اُن کے حق میں ہلاکت ہی بڑھائی ع۱۵۰۲

وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۚ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ﴿١٠٢﴾

اور اسی طرح تیرے رب کی پکڑ ہوتی ہے جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے درانحالیکہ وہ ظالم ہوں ہاں اس کی پکڑ دردناک سخت ہوتی ہے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ ﴿١٠٣﴾

یقیناً اس میں اس کے لیے نشان ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے، یہ وہ دن ہے جس میں سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے اور یہ حاضری کا دن ہے ع۱۵۰۳

ع۱۵۰۰ اورد۔ وُرُود پانی کا قصد کرنا ہے پھر اس کے غیر میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں اور دوسرے مقامات پر آگ پر استعمال ہوا ہے گویا پانی کی جگہ آگ پائیں گے (غ)، اور وَرَدَ کا استعمال صرف پہنچنے پر ہے جب ابھی اس میں داخل نہ ہوا ہو جیسے ولمّا ورد مآء مدین (القصص ۲۸۔۲۳) اور جب ایک شخص کسی شہر تک پہنچ جائے مگر اس میں ابھی داخل نہ ہوا ہو تو کہا جاتا ہے وَرَدَ بَلَدَ کذا اور بعض کے نزدیک داخل ہو جائے یا نہ ہو دونوں حالتوں میں وَرَد کا استعمال ہوتا ہے۔ اور جوہری کا قول ہے کہ ورود بالاجماع پہنچنے پر استعمال ہوتا ہے جب اس میں داخل نہ ہوا ہو (ل) اور وِرْد وہ لوگ ہیں جو پانی پر پہنچتے ہیں یا اونٹ وغیرہ اور پانی کی جگہ کو بھی وِرْد کہا جاتا ہے اور وِرْد قرآن کریم کے اس حصّہ کو بھی کہا جاتا ہے جو مقرر طور پر پڑھا جائے (ل) اور وَارِد کے معنی ہیں آگے چلنے والا جو پانی لاتا ہے۔ فارسلوا واردھم (یوسف ۱۲۔۱۹) (غ)

ع۱۵۰۱ رفد۔ رِفْد عطیہ کو کہتے ہیں اور رفد عطیہ دیا (غ)

ع۱۵۰۲ تتبیب۔ تَبّ اور تباب خسران یعنی گھاٹے میں پڑے رہنا ہے تبّت یدا ابی لھب (اللھب ۱۱۱۔۱) وما کید فرعون الّا فی تباب (المؤمن ۴۰۔۳۷)

ع۱۵۰۳ مشہود۔ شہود کے معنی حاضر ہونا اور مشہود یہاں بمعنی شاھد ہے یعنی جس کا مشاہدہ ضرور ہوگا مطلب یہ کہ آکر رہے گا (غ)

وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعۡدُوۡدٍ ﴿۱۰۴﴾
يَوۡمَ يَاۡتِ لَا تَكَلَّمُ نَفۡسٌ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ۚ
فَمِنۡهُمۡ شَقِىٌّ وَّسَعِيۡدٌ ﴿۱۰۵﴾
فَاَمَّا الَّذِيۡنَ شَقُوۡا فَفِى النَّارِ لَهُمۡ فِيۡهَا
زَفِيۡرٌ وَّشَهِيۡقٌ ﴿۱۰۶﴾
خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ
الۡاَرۡضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيۡدُ ﴿۱۰۷﴾
وَاَمَّا الَّذِيۡنَ سُعِدُوۡا فَفِى الۡجَـنَّةِ خٰلِدِيۡنَ
فِيۡهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اِلَّا
مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيۡرَ مَجۡذُوۡذٍ ﴿۱۰۸﴾
فَلَا تَكُ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّمَّا يَعۡبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ
مَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا كَمَا يَعۡبُدُ اٰبَآؤُهُمۡ

اور ہم اِسے ایک مقرر وقت کے لیے ہی پیچھے ڈال رہے ہیں۔
جس دن وہ آجائے گا کوئی شخص سوائے اس کے حکم کے بات نہیں کریگا، پھر ان میں سے بدقسمت اور خوش قسمت ہوں گے ۱۵۰۴ع
سو جو بدقسمت ہیں وہ آگ میں ہوں گے اُن کے لیے اس میں چیخنا اور چلّانا ہوگا ۱۵۰۵ع
اسی میں رہیں گے، جب تک آسمان اور زمین ہیں مگر جو تیرا رب چاہے، کیوں کہ تیرا رب جو چاہے کر گزرے۔
اور وہ جو خوش قسمت ہیں وہ جنت میں ہوں گے، اُسی میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے یہ بخشش ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی ۱۵۰۶ع
سو اُن کے متعلق کچھ بھی شک نہ کر جن کی یہ عبادت کرتے ہیں وہ اسی طرح عبادت کرتے ہیں جیسے پہلے ان کے باپ دادا عبادت

۱۵۰۴ع شقی۔سعید۔شَقَاوَۃ۔ سعادۃ کی ضد ہے اور سَعۡد اور سَعَادۃ انسان کے لیے بھلائی کے پانے پر امورِ الٰہیہ کی اعانت ہے اور شقاوۃ اور سَعَادۃ دنیوی بھی ہے اور اُخروی بھی اور سب سے بڑی سعادت جنت ہے (غ) یا سَعۡد۔ یُمۡن یعنی برکت ہے۔
یہاں شقی اور سعید کی تقسیم اس لحاظ سے ہے کہ جو لوگ جنت میں داخل ہونگے وہ سعید ہوئے اور جو آگ میں وہ شقی ہونگے۔

۱۵۰۵ع زفیر۔شہیق زفیر سانس کا اندر کو کھینچنا یہاں تک کہ پسلیاں اس سے پھول جائیں اور شہیق..... سانس کا لوٹانا اور زفیر اس کا مد یا اندر کھینچنا ہے اور جَبَلٌ شَاھِقٌ بڑے بلند پہاڑ کو کہتے ہیں اور اسی سے شہیق ہے (غ) دوزخ کے متعلق دونوں لفظ آتے ہیں سمعوا لھا شھیقا (الملک۶۷-۷) سمعوا لھا تغیظا و زفیرا (الفرقان۲۵-۱۲) اور لسان العرب میں ہے کہ گدھے کی آواز کا پہلا حصّہ زفیر ہے پچھلا شہیق۔کیونکہ زفیر سانس کا اندر لیجانا ہے اور شہیق اس کا باہر نکالنا۔اور اسی میں ہے کہ زفیر یہ ہے کہ انسان کا سینہ غم سے بھرا ہوا ہو پھر وہ اسے نکالے۔

۱۵۰۶ع مجذوذ۔جَذّ کے معنی ہیں کسی چیز کا توڑنا اور اس کا فنا کر دینا فجعلھم جذٰذا (الانبیاء۲۱-۵۸) اور غیر مجذوذ کے معنی ہیں غیر مَقۡطُوۡعٍ عنھم یعنی جو ان سے کبھی قطع نہ کی جائے گی (غ)

یہاں جنت اور دوزخ کے ذکر میں کہ ان کے اندر ہمیشہ کے لیے رہنا ہوگا ایک بیّن فرق نظر آتا ہے یعنی دونوں میں اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ فرما کر دوزخ کی صورت میں پیچھے یہ لفظ لائے گئے ہیں کہ تیرا رب جو چاہے کر گزرے یعنی چاہے تو انہیں دوزخ سے نکال دے اور بہشت کی صورت میں یہ کہ یہ عطا کبھی منقطع نہ ہوگی یعنی بہشت سے کبھی کوئی شخص باہر نہ نکالا جائے گا یہ کھلا فرق جو صاف بتا رہا ہے کہ دوزخ کے لیے وہ ہمیشگی نہیں جو جنت کے لیے ہے ہماری توجہ کو اس طرف پھیرتا ہے کہ آیا کبھی دوزخی دوزخ سے باہر بھی نکالے جائیں گے۔ ابن جریر نے چار مختلف توجیہات پہلی آیت کی تفسیر میں روایت کی ہیں۔اوّل یہ کہ الا ما شاء ربك میں جو استثنا ہے وہ اہل توحید کے لیے ہے یعنی سب دوزخی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے سوائے اہل توحید کے کہ جو ایسے لوگ گنہگار ہوں گے ان کے لیے ہمیشگی نہیں ہوگی دوم یہ کہ الّا ما شاء ربك میں جو استثنا ہے وہ گنہگار اہل توحید کے دخول کے متعلق ہے یعنی سب گنہگار داخل نار ہونگے مگر اہل توحید نہیں۔تیسرا یہ کہ یہ سب لوگوں کے متعلق ہے یعنی سب دوزخیوں کو آخر کار دوزخ سے نکال دیا جائے گا۔چوتھا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہل نار کے متعلق اپنی مشیت کی خبر نہیں دی، چاہے اللہ تعالےٰ ان کی سزا میں زیادتی کر دے اور چاہے کمی کر دے ان چاروں توجیہات میں سے دوسری صریحًا غلط ہے اس لیے کہ فساق اہل ایمان کا نار میں جانا صریح آیات قرآنی اور احادیث سے ثابت ہے اور چوتھی میں جو یہ حصّہ ہے کہ استثنا سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ چاہے تو دوزخ والوں کا عذاب بڑھا دے یہ بھی بالبداہت باطل ہے کیونکہ استثنا خلود سے ہے اس میں گھٹانے بڑھانے کا سوال نہیں خلود کا استثنا یہی ہوسکتا ہے کہ انہیں باہر نکال دے اس لیے پہلی اور تیسری توجیہ

مِّنۡ قَبۡلُ ؕ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوۡہُمۡ نَصِیۡبَہُمۡ غَیۡرَ مَنۡقُوۡصٍ ﴿۱۰۹﴾ کرتے تھے اور ہم ان کو ان کا حصّہ بغیر کم کیے پورا پورا دینے والے ہیں۔

باقی رہ جاتی ہے۔ اول ہم پہلی توجیہہ کو لیتے ہیں۔
عصاۃ مومنین اور کفار کے خلود عذاب میں قرآن کریم نے کوئی فرق نہیں رکھا: جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اہل ایمان میں سے نافرمان لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے مگر معتزلہ اس کے قائل نہیں ان کے نزدیک جو دوزخ میں پڑیں گے وہ ہمیشہ دوزخ میں ہی رہیں گے اور خوارج بھی اس کے قائل نہیں۔ جمہور کے مذہب کی بنا ان احادیث پر ہے جن میں شفاعت کا ذکر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا قرآن شریف نے نافرمانوں اور کافروں کی سزا میں کوئی ایسا امتیاز رکھا ہے اس کے لیے کسی شہادت کی ضرورت نہیں ہر شخص جس نے قرآن شریف کو پڑھا ہے وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ قرآن کریم نے ایسا کوئی فرق نہیں رکھا بلکہ دونوں کے لیے یکساں خلود رکھا ہے اور نہ صرف ہر ایک بدکار کے لیے دوزخ جگہ بتائی ہے بغیر اس امتیاز کو ظاہر کرنے کے کہ وہ ایمان کا دعویٰ کرکے بدکاری کرتا ہے یا علی الاعلان کافر ہ کر۔ بلکہ صاف طور پر صرف حکم الٰہی کے نافرمانوں کا ذکر کرکے جن سے مراد صریحًا اسلام کا دعویٰ کرنے والے ہیں ان کے خلود فی النار کا ذکر کرتا ہے مثال کے طور پر اس آیت کو لو جو احکام وراثت کے بعد آتی ہے اور جس میں صریحًا مسلمانوں کا ذکر ہے جو ان احکام وراثت کی نافرمانی کرتے ہیں اور اس میں یہ لفظ ہیں ومن یعص اللہ ورسولہ ویتعد حدودہ یدخلہ نارا خالدا فیہا ولہ عذاب مہین (النساء ۴-۱۴) اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اس کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کرے اسے آگ میں داخل کرے گا اسی میں وہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ اور جگہ پر بھی اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کی سزا ایسے ہی الفاظ میں بیان فرمائی ہے بلکہ ابد اکا لفظ بھی ساتھ بڑھایا ہے ومن یعص اللہ ورسولہ فان لہ نار جہنم خالدین فیہا ابدا (الجن ۷۲-۲۳) اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے ابد تک اسی میں رہے گا۔ ان نافرمانی کرنے والوں میں سے مسلمان کہلا کر نافرمانی کرنے والوں کو باہر رکھنا صریح الفاظ قرآنی کے خلاف ہے۔ پس جہاں تک خلود اور ابد کا سوال ہے وہ فساق اہل توحید اور کفار پر یکساں حاوی ہے پس اگر ایک کے لیے کوئی استثنا ہے تو دوسرے کے لیے بھی استثنا ہے۔ اگر کوئی صحیح حدیث نبی کریم صلعم کی ہوتی جس میں آپ نے فرمایا ہوتا کہ الا ما شاء ربك میں جو استثنا ہے وہ صرف اہل توحید کے لیے ہے تو بیشک وہ حجت تھی مگر کسی تابعی یا تبع تابعی کا یہ خیال اسے حجت نہیں بنا سکتا۔ بلکہ قرآن کریم نے دوسری جگہ صرف کفار کا ذکر کرکے جو اسلام کو قبول نہیں کرتے یوں فرمایا قال النار مثواکم خالدین فیہا الا ما شاء اللہ (الانعام ۶-۱۲۸) یہاں بھی استثنا صرف کفار کے لیے موجود ہے۔ یعنی خلود سے نکل بھی سکتے ہیں۔ ہاں احادیث شفاعت، سو ان پر آگے بحث آتی ہے۔
جہنم پر فنا آنے کی شہادت: پس اب صرف ایک ہی توجیہہ باقی رہ جاتی ہے اور اس کی تائید میں نہ صرف صحابہؓ کے اقوال موجود ہیں بلکہ احادیث شفاعت بھی اسی کی موید ہیں۔ اقوال صحابہؓ میں سے حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اہل نار کو آگ کھا جائے گی اور ابن مسعودؓ کا قول ہے لیاتین علی جہنم زمان تخفق ابوابہا لیس فیہا احد وذلك بعد ما یلبثون فیہا احقابا۔ یعنی دوزخ پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ اس کے دروازے کھٹکھٹائیں گے اس میں کوئی نہیں ہوگا اور یہ اس کے بعد ہوگا جو اس میں احقاب تک رہ چکے ہونگے۔ یہ دونوں قول ابن جریر میں منقول ہیں اور وہیں شعبی کا قول ہے جہنم اسرع الدارین عمرانا واسرعہما خرابا۔ یعنی دوزخ دونوں گھروں میں بننے میں بھی جلدی بنتا ہے اور ویران ہونے میں بھی سب سے جلدی ویران ہوگا۔ اور تفسیر فتح البیان میں اسی آیت کی تفسیر میں منادی الکبیر کی عبارت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کفار کا عذاب جہنم میں ہمیشہ کے لیے ہوگا اور اس کے سوائے جس قدر اقوال ہیں ان کی تاویل واجب ہے۔ مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی کا قول کہ دوزخیوں کو ایک وقت تک عذاب ہوگا۔ پھر ان کی طبیعت ہی اس کے موافق ہو جائے گی اور اس وجہ سے وہ اس سے بھی لذت حاصل کریں گے اور کہ وعدہ کو سچا کرنا قابل تعریف امر ہے نہ وعید یعنی سزا کے وعدہ کو بلکہ اس سے تجاوز کرنا قابل تعریف امر ہے اور آگے لکھا ہے کہ ایک جماعت اس بات کی قابل ہے کہ دوزخ فنا کر دیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک وقت رکھا ہے جس پر پہنچکر وہ ختم ہو جائے گا اور پھر لکھا ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کے اقوال نقل کیے ہیں کہ دوزخ فنا ہو جائے گا اور ابن قیم نے اس کی تائید کی ہے۔ مگر یہ مذہب متروک ہے اور جمہور نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ عصاۃ مومنین ہی دوزخ سے نکالے جائیں گے نہ کفار۔ اس کلام کو نقل کرکے فتح البیان میں ان اقوال کو لکھا ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ کا قول لو لبث اہل النار فی النار کقدر رمل عالج لکان لہم علی ذلك یوم یخرجون فیہ یعنی اگر اہل دوزخ دوزخ میں اتنی مدت بھی رہیں جیسے ریت کے انبار پر انبار تو بھی ایک دن ان پر آئے گا جس میں وہ نکالے جائیں گے اور اس روایت کے رجال کو ثقات قرار دیا ہے۔ اور ایک قول حضرت ابو ہریرہؓ کا ہے سیاتی علی جہنم زمان لا یبقی فیہا احد جہنم پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس میں کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔ اور ابن مسعود کا قول جو اوپر نقل ہو چکا اور ابن عمرو ابن العاص کا قول لیاتین علی جہنم یوم تصفق فیہا ابوابہا لیس فیہا احد جہنم پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس کے دروازے بند ہو جائیں گے اس میں کوئی نہیں رہے گا۔ اور پھر لکھا ہے کہ جس طرح کے اقوال حضرت عمرؓ اور ابو ہریرہؓ اور ابن مسعودؓ کے بیان ہوئے ہیں اس قسم کے اور اقوال سلف نے صحابہؓ سے روایت کیے ہیں مثلاً ابن عباسؓ ابن عمرؓ جابرؓ ابی سعید سے اور ایسے ہی اقوال تابعین کے بھی ہیں اور پھر لکھا ہے کہ اس سے اس کی صحت ثابت ہوتی ہے جو ابن تیمیہ اور ابن قیم نے کہا ہے

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۗ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۗ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾

اور ہم نے ہی موسیٰؑ کو کتاب دی پھر اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے نہ ہو چکی ہوتی، تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور وہ اس کے بارے میں سخت شک میں ہیں ع۱۵۰۷

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۗ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

اور یقیناً تیرا رب سب کے سب کو ان کے عمل پورے پورے دیگا، کیونکہ یہ جو کچھ کرتے ہیں وہ اس سے خبردار ہے ع۱۵۰۸

اور ابن حجر اور مناوی نے جو کچھ اس پر کہا ہے اس کا بودا پن ثابت ہوتا ہے۔ اور یہی حق بھی ہے اس لیے کہ ان صریح اقوال کی یہ تاویل کہ عصاۃ مومن نکلیں گے اور کفار دوزخ میں ہی بھرے رہیں گے کسی طرح بھی درست نہیں جہنم کے دروازے بند ہو جانا۔ اس میں کسی کا نہ رہنا سب کا ایک دن نکل آنا یہ صاف بتاتا ہے کہ جہنم سے آخر کار سب نکال دیئے جائیں گے۔

اور حدیث شفاعت بھی اسی کی مؤید ہے۔ صحیح حدیث میں ہے شَفَعَتِ الملائکۃُ وشَفَعَ النبیّون وشفع المومنون ولم یَبْقَ اِلَّا ارحم الراحمین فیَقْبِضُ قبضۃً من النّار فیُخرج منها قوماً لم یعملوا خیراً قطُّ یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ فرشتے بھی شفاعت کر چکے اور نبی بھی شفاعت کر چکے اور مومن بھی شفاعت کر چکے اور اب سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا باقی رہ گیا پس ایک مٹھی دوزخ سے بھرے گا اور اس سے ان لوگوں کو باہر نکال دے گا جنھوں نے کبھی کوئی بھلائی نہ کی تھی۔ اب اس حدیث سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ پہلے تین قسم کی شفاعت ہے مومنوں کی نبیوں کی فرشتوں کی۔ ظاہر ہے کہ مومنوں کی شفاعت بہت محدود ہے صرف اپنے سے تعلق رکھنے والوں کے لیے، اس سے بڑھ کر انبیاء کی شفاعت ہے اور وہ اپنی امتوں کے لیے۔ اس کے بعد فرشتوں کی شفاعت ہے اس کا دائرہ اس سے بھی وسیع ہے کیونکہ وہ تمام نیکی کرنے والوں کے لیے ہے اور ارحم الراحمین ایک ایسی قوم کو نکالے گا جس کا تعلق نہ کسی مومن سے تھا، نہ کسی نبی سے نہ نیکی کے محرک فرشتوں سے اور اس لیے انہوں نے کبھی کوئی نیکی نہ کی تھی اور خدا کی مٹھی سے باہر کون رہ جائیگا والارض جمیعاً قبضتہ یوم القیامۃ والسمٰوٰت مطویّٰت بیمینہ (الزمر ۳۹۔ ۶۷)

اور اس کے بالمقابل خلود اور ابد کی بحث بے سود ہے اس لیے کہ جو خلود اور ابد عصاۃ مسلمین کے لیے ہے وہی کفار کے لیے ہے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں جو بات ایک کو مستثنیٰ کر سکتی ہے وہی دوسرے کو۔ اور اصل بات یہ ہے کہ خلود کے لیے دیکھو ع۳۹ ہمیشگی لازم نہیں بلکہ یہ بقائے طویل کا نام ہے۔ رہا لفظ ابد۔ سو مفردات میں تابّد الشیئُ کے معنی میں لکھا ہے ویُعَبَّرُ بہٖ عَمَّا یَبْقٰی مُدَّۃً طَوِیْلَۃً یعنی اس سے مراد وہ چیز لی جاتی ہے جو مدت طویل تک باقی رہے اور پھر ابد کی جمع آباد زبان عربی میں آتی ہے حالانکہ اگر اس کے معنی ہمیشگی ہوتے تو جمع نہ ہو سکتی تھی اور اسی طرح اس کی تاکید بھی آتی ہے اَبَدٌ اَبِدٌ وابیدٌ حالانکہ اگر غیر محدود زمانہ اور ہمیشگی لازماً اس کے معنی میں ہوتی تو تاکید بھی نہ آ سکتی تھی اور امام راغب لکھتے ہیں کہ حق یہ تھا کہ ابد کی جمع کوئی نہ آتی کیونکہ یہ تصور نہیں آ سکتا کہ ایک ابد کے ساتھ دوسرا ابد ملایا جا سکے لیکن آباد کہا جاتا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اس کو اس کے ایک حصّہ کے لیے خاص کر لیا گیا ہے جو اس میں شامل ہے جیسا کہ اسم جنس کو اس کے بعض سے خاص کر لیا جاتا ہے گو غیر محدود زمانہ کا حصّہ کوئی نہیں کہلا سکتا تاہم اس توجیہ کا بھی صاف مطلب یہ ہے کہ ابد کے لفظ کا استعمال محدود لمبے زمانہ پر بھی ہو سکتا ہے اور غیر محدود زمانہ پر بھی۔ اگر غیر محدود زمانہ بھی اس سے مراد لیا جائے تو بھی الّا ماشاء ربک کے استثناء نے دوزخیوں کو اس سے باہر نکال دیا ورنہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن شریف نے دوسری جگہ لابثین فیہا احقابا (النبأ ۷۸۔ ۲۳) کہہ کر یہ صاف بتا دیا کہ دوزخ کا ابد بھی ایک محدود زمانہ ہے برخلاف بہشت کے ابد کے کہ اس کے لیے کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں فرمایا جو محدود زمانہ پر ہی بولا جا سکتا ہو جیسا کہ احقاب ہے جو حقبۃ کی جمع ہے۔ اور دوسرے بہشت کی ابدیت کو عطاء غیر مجذوذ قرار دے کر بھی واضح کر دیا کہ یہ نعما ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہیں۔

ع۱۵۰۷ حضرت موسیٰؑ کا ذکر پچھلی سورت میں ہو چکا ہے اس لیے یہاں صرف اسی پر اکتفا کیا ہے غرض وہی ہے جو دوسرے انبیاء کے ذکر میں ہے یعنی آنحضرت صلعم کو تسلی دینا۔ اختلاف فی الکتاب کے لیے دیکھو ع۲۱۴ اور وہ بات جو پہلے ہو چکی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی سزا میں بوجہ اپنے رحم عظیم کے تاخیر کرتا رہتا ہے جیسا کہ آیت ۱۱۹ میں وضاحت کر دی ہے۔

ع۱۵۰۸ کلا میں تنوین مضاف الیہ کے قائم مقام ہے یعنی سب اختلاف کرنے والے یا سب کے سب، مومن ہوں یا کافر۔

لَمّا کا استعمال کلام عرب میں کئی طرح پر ہے حین یعنی وقت کے معنی میں ولما ورد ماء مدین (القصص ۲۸۔ ۲۳) فلمّا بلغ معہ السعی (الصّٰفّٰت ۳۷۔ ۱۰۲) یعنی جب ایسا ہوا۔ اور لَمْ جازمہ کے معنی میں یعنی صرف نفی کے لیے جیسے بل لما یذوقوا عذاب (ص ۳۸۔ ۸) ولما یعلم اللہ الذین جاہدوا منکم (التوبۃ ۹۔ ۱۶) اور اِلّا کے معنی میں ان کل نفس لما علیہا حافظ (الطارق ۸۶۔ ۴) جس کے معنی ہیں کوئی نفس نہیں مگر اس پر حافظ ہے یا وان کلٌّ لمّا

فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ
وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٢﴾
وَلَا تَرْكَنُوٓا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ
النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللّٰهِ مِنْ
أَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ﴿١١٣﴾

سو سیدھی راہ پر چلتا رہ جیسا تجھے حکم دیا گیا ہے اور وہ بھی جو توبہ کرکے
تیرے ساتھ ہوا اور حد سے نہ بڑھو جو کچھ تم کرتے ہو وہ اُسے دیکھ رہا ہے ع۱۵۰۹
اور ان کی طرف نہ جھکو جو ظالم ہیں، ورنہ تمھیں آگ چھو جائے گی اور
اللہ کے سوائے تمھارے کوئی حمایتی نہ ہوں گے، پھر تمھیں مدد
بھی نہیں ملے گی ع۱۵۱۰

جمیع لدینا محضرون (یٰس ٣٦-٣٢) یعنی ما کل الا جمیع کوئی نہیں مگر سب کے سب ہمارے حضور حاضر کیے جائیں گے گویا یہ لمْ اور مَا سے مرکب ہے جیسے اِلّا اِن اور لا سے یا دو نفیوں کا اجتماع ہے جو دونوں مل کر اور ایک لفظ ہو کر نفی کی حد سے نکل گئے۔ اور اس کے معنی اِلّا ہونے پر بطور شہادت یہ آیت قرآنی بھی پیش کی گئی ہے ان کل الا کذب الرسل (صٓ ٣٨-١٤) اور کبھی کسی چیز کے انتظار کے لیے آتا ہے جس کے ہونے کی توقع کی جاتی ہے (ل)

یہاں اگر اِن کلا ہوتا جونا فیہ ہے تو لمّا کے معنی الّا لیکر ترکیب درست ہو جاتی مگر یہاں اِنَّ کُلًّا ہے۔ تو بعض نے اس صورت میں بھی معنی اِلّا ہی لیے ہیں اور بعض نے لَمَنْ مَا اس کا اصل قرار دیا ہے یعنی کوئی بھی ہو جس میں نون کو میم سے تبدیل کرکے تین میموں کے جمع ہو جانے کی وجہ سے ایک حذف کیا گیا اور باقی دو میں سے ایک دوسرے میں مدغم ہو گیا (ل) اور بعض نے یوں توجیہ کی ہے کہ لمّا یہاں بغیر تنوین وہی معنی رکھتا ہے جو لمّا تنوین کے ساتھ یعنی تنوین صرف قرأت میں حذف ہو گئی ہے اور مراد لمًّا ہے اور لمًّا کے معنی ہیں جمع کرکے جیسے وتا کلون التراث اکلاً لمّا (الفجر ٨٩-١٩) جس کا مادہ لمّ ہے جس کے معنی ہیں الجمع الکثیرُ الشّدِیدُ یعنی کثرت اور شدت سے جمع کرنا (ل)، تو یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ سب کو جمع کرکے ان کے اعمال کا اجر انہیں پورا پورا دیا جائے گا اور یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ سب کے سب یہ مضبوط بات اور حق ہے کہ ان کے اعمال کا بدلہ پورا پورا انہیں ملے گا۔

ع۱۵۰۹ استقم۔ انسان کی اِستقامۃ یہ ہے کہ مستقیم یعنی سیدھی راہ پر لگا رہے (غ) یعنی کسی حال میں اس سے اِدھر اُدھر نہ ہو۔

صحابہؓ کی استقامت: اِس آیت میں نہ صرف نبی کریم صلعم کو حکم ہے کہ آپ کسی صورت میں صراط مستقیم سے اِدھر اُدھر نہ ہوں بلکہ یہ بھی ساتھ ہی حکم ہے کہ آپ کے ساتھی بھی جادۂ مستقیم سے ذرہ بھر انحراف نہ کریں۔ بغیر اس استقامت کے وہ کامیابیاں جن کا وعدہ دیا گیا ہے میسر نہیں آسکتیں؟ نبی اپنی ذات میں تو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرکے دکھاتا ہے بلکہ کتاب کی تعلیم عمل کے رنگ میں لاکر دکھاتا ہے لیکن ساتھیوں کا بھی اس استقامت کی راہ پر چلنا بہت ہی دشوار امر ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شَیَّبَتْنِیْ ھود یعنی سورۂ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ ساتھیوں کو اس راہ پر قائم کرنا یہ ایک نہایت ہی دشوار امر تھا۔ کتنے انبیاء ہیں کہ ان کے ساتھیوں نے ان کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا حضرت موسیٰؑ کے ساتھی کہتے ہیں فاذھب انت وربك فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون (المائدۃ ٥-٢٤) حضرت عیسیٰؑ نے جب اپنے حواریوں کو کہا کہ آج کی رات میرے ساتھ مل کر دعا ہی کرو تو وہ اس سے بھی عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ مگر یہ فخر سرور دو عالمؐ کے حصّہ میں ہی آیا کہ آپ کے صحابہ نے صراط مستقیم پر ایسا دوام اختیار کیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی وہ اپنے ہر عمل میں صرف قرآن شریف کو ہی اپنا ہادی بناتے تھے اور اس کی تعلیم سے ایک بال بھر انحراف کو بھی آگ میں گرنے کے برابر سمجھتے تھے۔ علاء بن عبداللہ کا قول ہے کہ لا تطغوا میں جو خطاب ہے اس سے مراد اصحاب نبی صلعم نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو ان کے بعد آنے والے تھے (فتح البیان)

ومن تاب معك۔ یہاں جس بات میں معیت کا ذکر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری یا اس کے اوامر اور نواہی پر استقامت ہے اور تاب سے مراد ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور یوں رجوع کرکے رسول اللہ صلعم کی معیت اختیار کی اور اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کو قبول کیا جس طرح خود مامور یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قبول کیا تھا پس یہاں نہ صرف رسول اللہ صلعم کی معیت ہے بلکہ وہ معیت بھی اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی پر استقامت میں ہے یا اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہے اس سے صحابہ کے مقام بلند پر شہادت ملتی ہے کہ طاعۃ اللہ میں وہ رسول اللہ صلعم کی معیت میں تھے۔ جو نادان نبیوں کی معیت (النساء ٤-٦٩) سے مراد نبی ہونا لیتے ہیں وہ ان الفاظ پر غور کریں کہ یہاں خود سرور دو عالم کی معیت آپ کے برگزیدہ صحابہ کو حاصل ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ سب خاتم النبیین بن گئے تھے۔

ع۱۵۱۰ الذین ظلموا سے مراد مشرک اور رکن یا میلان سے مراد ان سے محبّت قلبی یا ان کے افعال پر راضی ہو جانا خیال کیا گیا ہے یہ کہنا چاہیئے کہ یہ باتیں بھی اس کے اندر آجاتی ہیں اور الفاظ قرآنی میں عمومیت اور وسعت ہے۔ جب پہلی آیت میں طاعۃ اللہ پر استقامت کا حکم دیا اور ہر قسم کے ظلم یا طغیان سے روکا تو یہاں اور بھی ترقی کی یعنی نہ صرف انسان ہر قسم کے ظلم سے بچے بلکہ ظالم کی طرف میلان سے بھی بچے۔

ما سوی اللہ کا سہارا: چونکہ ان سورتوں کے نزول کا زمانہ اسلام اور مسلمانوں پر سخت ترین مصائب کا زمانہ تھا اور مصائب میں انسان ہر قسم کا سہارا تلاش کرتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ ان تکالیف میں تم کفار کی طرف جھک کر ان مصائب سے نکلنے کا خیال کرو پھر اللہ تعالیٰ کی ولایت تمہارے لیے نہ ہو گی آج بھی مسلمانوں کو اس ہدایت کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ وہ بجائے طاعۃ اللہ پر استقامت کے دوسرے لوگوں کے سہارے تلاش کرتے ہیں اور یہ سہارے

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

اور دن کی دونوں طرفوں میں اور پہلی رات نماز کو قائم رکھ ۔ کیوں کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں ۔ یہ نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے ۱۵۱۱

وَ اصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

اور صبر کر کیونکہ اللہ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ۔

فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَاۤ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

پھر کیوں تم سے پہلی نسلوں میں اچھے عملوں والے لوگ نہ ہوئے جو ملک میں فساد سے روکتے ، ہاں تھوڑے سے اُن میں سے جنھیں ہم نے بچا یا (ایسے تھے) اور جو ظالم تھے وہ ان آسائشوں کے پیچھے پڑے رہے جو انھیں دی گئی تھیں اور وہ مجرم تھے ۱۵۱۲

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

اور تیرا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کر دے اور ان کے رہنے والے نیکو کار ہوں ۱۵۱۳

ایک ایک کر کے گرتے چلے جاتے ہیں اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنا سہارا نہیں بناتے اس لیے ناکامی پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے ۔

ع ۱۵۱۱ اوقاتِ نماز: طرفی النہار ۔ طرف ایک جانب کو کہتے ہیں وقت کے لحاظ سے ہو یا جسم کے یا اور رنگ میں (غ) ، اور نہار عرف شریعت میں طلوع فجر یعنی پو پھٹنے سے لیکر غروب آفتاب تک کا وقت ہے (غ) پس اس کی طرفیں یا دو طرفیں طلوع آفتاب سے پہلے اور زوال آفتاب کے بعد کے اوقات ہوئے جیسا کہ خود اس کی تشریح دوسری جگہ فرمادی ہے اقم الصلوٰۃ لدلوك الشمس الی غسق الیل وقرآن الفجر (بنی اسرائیل ۱۷ ۔ ۷۸) یعنی فجر کو ایک جانب اور آفتاب کے ڈھلنے کو دوسری جانب قرار دیا ہے پس طرفی النہار میں نماز فجر ، ظہر اور عصر آئینگی ۔

زلفا ۔ زلف اور زُلفی اور زُلفۃ کے معنی قریب ہونا اور مرتبہ ہیں وما اموالکم ولا اولادکم بالتی تقربکم عندنا زلفی (السبا ۳۴ ۔ ۳۷) وازلفت الجنۃ للمتقین (الشعراء ۲۶ ۔ ۹۰) وازلفنا ثم الاخرین (الشعراء ۲۶ ۔ ۶۴) فلما راوہ زلفۃ (الملک ۶۷ ۔ ۲۷) اور مزدلفۃ جو مکہ معظمہ میں ایک مقام کا نام ہے وہ بھی قرب کے معنی کے لحاظ سے ہی ہے کیونکہ عرفات سے نکلنے کے بعد اس مقام پر پہنچ کر منیٰ سے حاجی قریب ہو جاتے ہیں اور زُلَفْ زُلفۃ کی جمع ہے ، اور رات کی پہلی گھڑیوں پر جو دن سے قریب ہیں یہ لفظ بولا جاتا ہے اور زلفا من الیل (ھود ۱۱ ۔ ۱۱۴) مغرب اور عشا کی نمازوں کے اوقات ہیں (ل)

جب ظالموں کی طرف جھکنے سے روکا تو ساتھ ہی بتایا کہ اللہ کی طرف جھکو اور نماز اس کا ذریعہ ہے ۔ اسی لیے قرآن کریم نے مصائب میں نماز سے استعانت کا بار بار ذکر کیا ہے بظاہر خیال ہو سکتا ہے کہ نماز کو مصائب سے نجات سے کیا تعلق ہے مگر اس کی حقیقت کو ایک موحد ہی سمجھ سکتا ہے کہ کس طرح جب انسان تمام سہاروں کو چھوڑ کر ایک اللہ تعالیٰ کو اپنا سہارا بناتا اور اس کے آگے گرتا ہے ، تو وہ جو تمام طاقتوروں سے بڑھ کر طاقتور ہے اس کا ہو جاتا ہے ۔ اگلی آیت میں صبر کا حکم اسی حقیقت کی مزید وضاحت کرتا ہے ۔ یہاں پانچوں نمازوں کا بھی ذکر کر دیا ہے ان الحسنات یذھبن السیئات کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بھلائی کے اختیار کرنے سے انسان دکھوں اور تکلیفوں سے نجات پا جاتا ہے اور نماز حسنات کا رستہ کھولتی ہے اور ان الفاظ میں ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا قانون بھی بیان فرمایا ہے کہ بدی کا کفارہ نیکی ہے جب انسان نیکی کو اختیار کرتا ہے تو اس کی بدیاں دور ہو جاتی ہیں ۔ بدی کو دبانے والی نیکی کی طاقت ہے اس لیے کہ نیکی اور بدی ایک ہی قویٰ کے اچھے اور بُرے استعمال کا نام ہے جب انسان ان قویٰ کو صحیح موقعہ پر لگانا سیکھ لے گا تو بدی خود ہی دور ہو جائے گی یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نیکی کی قوت اس قدر زبردست ہے کہ بدی کی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔

ع ۱۵۱۲ اترفوا ۔ ترف کے معنی تنعم یا آسودگی ہیں اور مُترف وہ ہے جسے فراخی اور آسودگی متکبر کر دے (ل) وارجعوا الی ما اترفتم فیہ (الانبیاء ۲۱ ۔ ۱۳) اخذنا مترفیھم بالعذاب (المؤمنون ۲۳ ۔ ۶۴) امرنا مترفیھا (بنی اسرائیل ۱۷ ۔ ۱۶)

گویا اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ ایسے عقلمند ان میں کیوں نہ ہوئے کہ وہ لوگوں کو فساد سے روکتے جس سے معلوم ہوا کہ تباہی زمین میں فساد پھیلانے کی وجہ سے آتی ہے ظالم لوگ آسائش دنیوی کے پیچھے پڑ کر ظلم میں یہاں تک ترقی کرتے ہیں کہ آخر مجرم کی سزا کی نوبت آجاتی ہے ۔

ع ۱۵۱۳ اس کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو محض ان کے شرک کی وجہ سے ہلاک نہیں کرتا ۔ اگر وہ ملک میں فساد پھیلانے والے نہ ہوں ۔ گویا

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی گروہ کر دیتا اور وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہتے ہیں۔

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

مگر جس پر تیرا رب رحم کرے اور اسی کے لیے اُس نے انھیں پیدا کیا ہے اور تیرے رب کی بات پوری ہوگئی، میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا ۱۵۱۴ء

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور سب جو ہم رسولوں کے حالات سے تجھ پر بیان کرتے ہیں اس سے ہم تیرے دل کو مضبوط کرتے ہیں اور اس میں تیرے پاس حق آگیا اور (وہ) مومنوں کے لیے وعظ اور نصیحت رہے) ۱۵۱۵ء

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

اور جو ایمان نہیں لاتے انھیں کہہ دے اپنی جگہ کام کیے جاؤ ہم بھی کام کرتے ہیں ۱۵۱۶ء

وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

اور انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ ع ۱۰

اور آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ کے لیے ہی ہے اور اسی کی طرف ہی سب کام لوٹائے جاتے ہیں سو اس کی عبادت کرو اور اس پر بھروسا کرو اور تیرا رب اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔

کسی قوم کو ہلاک اس وقت کیا جاتا ہے۔ جب وہ زمین میں شرارت اور فساد اور ظلم میں حد سے تجاوز کر جاتی ہے محض عقاید باطلہ کی وجہ سے نہیں۔

۱۵۱۴ء پیدا کرنے کی غرض رحم کرنا ہے: اس سے پہلی آیت میں بیان فرمایا تھا کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی گروہ بنا دیتا یعنی ان میں کوئی اختلافات نہ ہوتے مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت نے انسان کو کچھ قویٰ دے کر ان کے استعمال کا اسے اختیار دیا ہے اس لیے وہ اختلاف کرتے ہی رہیں گے یعنی احکام الٰہی کے بارہ میں اختلاف کریں گے جس سے مراد ان کی مخالفت ہے۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ وہ لوگ مخالفت نہیں کرتے جن پر تیرے رب نے رحم کیا یعنی مومن یا اہل حق اور اس سے آگے جو لفظ آتے ہیں ولذٰلك خلقهم اسی لیے انہیں پیدا کیا تو گو ابن جریر نے دونوں قسم کی روایتیں جمع کی ہیں یعنی بعض اقوال کی رو سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اختلاف کے لیے پیدا کیا اور بعض کی رو سے یہ کہ انہیں رحم کے لیے پیدا کیا مگر پہلے معنی کی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے نہیں ہوتی یعنی یہ کہ اللہ تعالےٰ کے انسانوں کو پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ وہ اختلاف کرتے رہیں دوسری جگہ فرمایا وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون (الذٰریٰت ۵۱ - ۵۶) تو غرض حقیقی تو یہی ہے کہ وہ عبادت کریں۔ اور یہ اس کے ہم معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کے ان کو پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ وہ اس کی نافرمانی کریں۔ اور پھر صاف الفاظ میں فرمایا ورحمتی وسعت کل شیٔ (الاعراف ۷ - ۱۵۶) پس جب رحمت ہر چیز پر ہے تو معلوم ہوا اسی کیلئے پیدا کیا ہے۔ ابن کثیر میں حضرت ابن عباس کا قول منقول ہے للرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ ولم يَخْلُقهم لِلعذاب یعنی رحمت کے لیے پیدا کیا ہے۔ عذاب کے لیے پیدا نہیں کیا۔ اور حدیث میں ہے میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی پس جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو رحم کے لیے ہی پیدا کیا ہے تو آخر کار سب پر رحم ہی ہوگا اور یہ اس کے مطابق ہے جو ۱۵۰۶ء میں دکھایا گیا کہ دوزخ پر آخر فنا آئے گی۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوزخ بھی اللہ تعالےٰ کے رحم کا ایک رنگ اپنے اندر رکھتا ہے جس طرح یہاں مصائب میں پڑ کر انسان آرام پاتا ہے اسی طرح وہ لوگ جو یہاں آسایش جسمانی کے درپے رہتے ہیں ان کے لیے ایک اور قسم کے دکھوں میں سے گزر کر اللہ تعالیٰ کا رحم حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک پھوڑے کا چیرنا پھاڑنا بیمار کو عذاب کے رنگ میں نظر آتا ہے مگر طبیب جانتا ہے کہ ایسی حالت میں یہی رحم ہے یہی حالت عذاب نار کی ہے اسی لیے یہ فرما کر کہ اللہ تعالیٰ نے رحم کے لیے انسانوں کو پیدا کیا ہے اس کے بعد فرمایا کہ دوزخ کو بھی جنوں اور انسانوں سے بھرا جائے گا تو اس کی غرض بھی وہی ہے۔

۱۵۱۵ء یہاں سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے قصص کی غرض نبی کریم صلعم کو تسلی دینا ہے گویا ان انبیاء کے حالات میں اور ان کے مخالفین کی ہلاکت میں نبی کریمؐ کے حالات اور آپ کے مخالفین کی ہلاکت کو بطور پیشگوئی بیان کیا گیا ہے۔ فی ھٰذہ سے مراد یہ سورت ہے یا ان حالات کا بیان۔

۱۵۱۶ء نرے عقاید نرے لفظ نرے دعاوی سے کچھ نہیں ہوتا اعملوا علی مکانتکم انا عاملون اسی میں کامیابی اور ناکامی کا راز ہے عمل سے ہی انسان بنتا ہے عمل سے ہی قوم زندہ ہوتی ہے۔ آج عمل کو چھوڑ کے ہی مسلمان موت کی حالت تک پہنچ گئے ہیں اگر زندہ ہونگے تو پھر عمل سے ہی زندہ ہونگے ؛

(۱۲) سُورَۃُ یُوسُفَ مَکِّیَّۃٌ

آیاتھا ۱۱۱ رکوعاتھا ۱۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۟﴿۱﴾ میں اللہ دیکھتا ہوں، یہ کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۲﴾ ہم نے یہ قرآن عربی میں اتارا ہے تاکہ تم سمجھو ۱۵۱۶ا۔

نام: اس سورت کا نام یوسفؑ ہے اور اس میں بارہ رکوع اور ایک سو گیارہ آیتیں ہیں اس کا نام حضرت یوسفؑ کے تذکرہ سے لیا گیا ہے جو اس کا واحد مضمون ہے۔

خلاصہ مضمون: اس سورت کا مضمون ایک ہی ہے یعنی حضرت یوسفؑ کا ذکر سوائے اس کے کہ ابتدا میں یہ بتا دیا ہے اس ذکر کی اصل غرض کیا ہے اور آخر میں بالوضاحت آنحضرت صلعم کے مخالفین کو توجہ دلائی ہے۔ پہلے رکوع میں حضرت یوسفؑ کے رویا کا ذکر ہے کہ اسے ایک عظیم الشان انسان بنایا جائیگا اور اس میں گویا آنحضرت صلعم کی ظاہری اور باطنی عظمت کی طرف اشارہ ہے دوسرے رکوع میں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے یوسف سے سلوک کا ذکر ہے اس سے بہت بڑھ کر بُرا سلوک اور بہت زیادہ خطرناک منصوبے آنحضرتؐ کے خلاف ہوئے تیسرے میں ذکر ہے کہ کس طرح طرح طرح کی ترغیبات کے اندر حضرت یوسفؑ نے استقامت دکھائی اور اس میں آنحضرت صلعم کی استقامت کا ذکر ہے کیونکہ اسی قسم کی ترغیبات آنحضرتؐ کے سامنے بھی پیش کی گئی تھیں۔ چوتھے رکوع میں حضرت یوسفؑ کے قید میں پڑنے کا ذکر ہے اور گو آنحضرت صلعم کو اللہ تعالیٰ نے اس سے محفوظ رکھا مگر شعب ابی طالب میں یہ مشابہت بھی پوری ہوگئی۔ پانچویں رکوع میں ذکر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے حالت قید میں بھی جب موقعہ ملا تو وعظ و نصیحت کو نہیں چھوڑا۔ آنحضرت صلعم نے شعب میں محصور ہونے کے زمانہ میں بنو ہاشم میں اپنے سلسلہ وعظ و نصیحت کو جاری رکھا اور انہی ایام میں ان لوگوں میں سے بہتوں کے دلوں میں اسلام گھر کر گیا۔ چھٹے رکوع میں شاہ مصر کی خواب کا ذکر ہے اور اس کی تفسیر میں خود بخاری میں اس سات سال کے قحط کا حوالہ دیا گیا ہے جو مکہ میں ہوا۔ ساتواں رکوع حضرت یوسفؑ کی بریت اور عزت کو ظاہر کرتا ہے اسی طرح نبی کریم صلعم کی بریت ہوئی اور مدینہ میں سب قوموں نے آپ کو اپنا حکم قرار دیا۔ آٹھویں اور نویں رکوع میں حضرت یوسفؑ اور آپ کے بھائیوں کے باہمی معاملات کا ذکر ہے۔ عرب میں قحط کے وقت جب ابوسفیان نے آنحضرت صلعم سے کہا کہ آپ کے بھائی بند ہلاک ہو رہے ہیں تو آپ نے بھی دعا کی اور آپ کی دعا سے قحط دور ہوا۔ دسویں رکوع میں بھائیوں کا اعتراف اور حضرت یوسفؑ کی معافی کا ذکر ہے اور نبی کریم صلعم نے فتح مکہ کے وقت وہی لفظ لاتثریب علیکم الیوم دوہرا کر بتایا کہ حضرت یوسفؑ کے ذکر میں آپ کا ہی نقشہ کھینچا گیا تھا۔ گیارھویں رکوع میں یہ ذکر ہے کہ کس طرح وہی بھائی آخر مصر میں آکر حضرت یوسفؑ کی حکومت میں شریک ہوئے اور یہ اشارہ تھا کہ عرب کے لوگ بھی آخر اس عظیم الشان حکومت کے وارث ہونگے جو نبی کریم صلعم کی طفیل ان کو ملے گی۔ بارھویں رکوع میں مضمون کو عام کر کے آپؐ کے مخالفین کو توجہ دلائی۔

تعلق: الرا کے مجموعہ میں یہ تیسری سورت ہے جب پچھلی دو سورتوں میں پہلے علمی بحث سے اور پھر انبیائے سابق کے مخالفین کے انجام کا ذکر کر کے آنحضرت صلعم کے مخالفین کو سمجھایا تو اب یہاں بالخصوص ایک ایسے نبی کا ذکر کیا جس کے حالات کے ساتھ آنحضرت صلعم اور آپؐ کے مخالفین کے حالات کی کھلی کھلی مشابہت پیش آنے والی تھی اور پچھلی سورت کے آخر میں بتایا تھا کہ ذکر انبیاءؑ میں آنحضرتؐ کا ہی ذکر ہے۔

زمانہ نزول: سورت کی آخری سے پہلی آیت بالصراحت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس سورت کا نزول اس زمانہ کا ہے جب قریش کی مخالفت انتہا کو پہنچ گئی اور لوگوں نے آپؐ کے وعظ و نصیحت کی طرف بالکل توجہ چھوڑ دی جس کے بعد نصرت الٰہی کا اس رنگ میں ظہور ہوا کہ آپؐ کے لیے مدینہ میں ایک مضبوط جماعت کھڑی ہوگئی۔

۱۵۱۶ا۔ عربیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کو عَرَب کہا جاتا ہے اور عَرَبِیّ کے معنی مُفْصِح یعنی فصاحت سے بیان کرنے والا ہیں اور اِعْراب کے معنی بیان ہیں اور حدیث میں ہے اَلثَّیِّبُ تُعْرِبُ عَنْ نَفْسِھَا یعنی بیوہ خود بات کو کھول کر بیان کردے یعنی رضامندی نکاح کے معاملہ میں۔ اور عَرَبِیّ فصیح واضح کلام کو کہا جاتا ہے جیسے یہاں۔ یا بلسان عربی مبین (الشعراء ۲۶- ۱۹۵) یا حکما عربیا (الرعد ۱۳- ۳۷) جہاں معنی کیے گئے ہیں فصاحت سے بیان کرنے والا جو حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائے اور بعض نے اس کے معنی شریف کریم کیے ہیں جیسے دوسری جگہ کتاب کریم (النمل ۲۷- ۲۹) فرمایا اور یا عَرَبِیّ کے معنی ہیں نبی عربیؐ کی طرف منسوب (رغ) اور عَرَب عَجَم کے خلاف ہے اور اَعْجَم وہ شخص ہے جس کی زبان میں عُجْمَۃ یعنی ابہام ہو خواہ وہ عربی ہو یا غیر عربی اسی معنی میں ہے ولو جعلناہ قرانا اعجمیا (حٰم السجدۃ ۴۱- ۴۴) (رغ)

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا حضرت آدم علیہ السلام کی زبان جنت میں عربی تھی (ر) اس صورت میں عربی ام الالسنۃ یعنی سب زبانوں

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۳﴾

ہم اس قرآن کی تیری طرف وحی کرنے سے تجھے نہایت اچھا بیان سناتے ہیں ، گو تو اس سے پہلے بے خبروں میں سے تھا ۱۵۱۶ب

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيْهِ يٰٓأَبَتِ إِنِّيْ رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ﴿۴﴾

جب یُوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا اے میرے باپ! میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا، میں نے دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کرتے ہیں ۱۵۱۶ج

کی ماں قرار پائے گی اور اسی کے موافق بعض کا مذہب ہے کہ عربی سب سے پہلی لغات ہے اور دوسری سب زبانیں اس کے بعد پیدا ہوئیں (ر) اور ایک حدیث میں ہے کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی۔ پس اگر قرآن عربی سے مراد عرب کی زبان میں نازل ہونا لیا جائے تو لعلکم تعقلون میں یہ اشارہ ہے کہ یہ زبان جوام الالسنۃ ہے اسی میں اللہ تعالیٰ کا آخری کلام نازل ہوا اور یہ عجیب بات ہے کہ کم ازکم گزشتہ تیرہ چودہ سو سال کی زبان عربی جو علمی رنگ میں استعمال ہوتی تھی اس میں آج تک کچھ بھی فرق نہیں آیا اور آج تیرہ سو سال بعد وہی زبان علمی ہے جو اس وقت عرب میں تھی۔ حالانکہ دوسری زبانیں اس سے نصف وقت میں بھی اس طرح تغیر سے پاک نہیں رہیں جس سے اس بات پر شہادت ملتی ہے کہ یہ زبان ابتدا سے اسی حالت میں رہی ہے۔ عربی کے ام الالسنۃ ہونے پر مفصل بحث کے لیے دیکھو کتاب ام الالسنۃ جو خواجہ کمال الدین صاحب کی تصنیف ہے اور اس کی طرف اس زمانہ میں توجہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے دلائی ہے۔

زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہاں قرآن عربی سے مراد وہ کتاب ہے جو اپنے مضامین کو کھول کر اور فصاحت سے بیان کرتی ہے تا کہ لوگ اسے اچھی طرح سمجھ لیں۔ جو کوئی شخص چاہے قرآن کریم کا متقابلہ دوسری مذہبی کتابوں سے کر کے دیکھ لے کہ جس طرح کھول کر یعنی مدلل طور پر اور باایں فصاحت سے قرآن کریم نے مضامین کو بیان کیا ہے اس سے دوسری کتابوں کو نسبت ہی نہیں۔

ع۱۵۱۶ب قصص کے لیے دیکھو ع۴۵۴ قَصَصَ کے معنی بیان ہیں۔ یا وہ خبر جو بیان کی جائے اور قِصّۃ کی جمع قِصَص ہے اور احسن القصص کے معنی احسن البیان ہیں یعنی نہایت اچھا بیان (ل)

الغافلین غَفْلَۃ بھول جانا ہے جو یادداشت یا احتیاط کی کمی سے انسان کے لازم حال ہوتا ہے (غ) یا اس چیز کا احساس نہ ہونا جس کا احساس ہونا چاہیے یا کسی چیز سے ذہول (ت)

اس ذکر کو جو اس سورت میں ہے نہایت عمدہ بیان کہا ہے۔ اس لیے کہ گو یہ محض ایک انسان کی زندگی کے تھوڑے سے حالات کا بیان ہے مگر اوّل سے لیکر آخر تک اعلیٰ درجہ کے اخلاقی سبقوں سے بھرا پڑا ہے۔ اور علاوہ ازیں یہ گویا نبی کریم صلعم اور آپؐ کی قوم کے تعلقات کا مرقع ہے اور اسی کی طرف و ان کنت من قبلہ لمن الغافلین میں اشارہ ہے گو یہ الفاظ ظاہر معنی میں بھی درست ہیں کہ آنحضرت صلعم نے نہ ان ذکروں کو کہیں سے سنا تھا اور نہ ان کتابوں کو پڑھا تھا اور صرف وحی کے ذریعہ سے آپؐ پر ان حالات کا انکشاف ہوا مگر قرآن کے لیے ظہر و بطن دونوں ہیں اور اس ظاہری معنی کے ساتھ اس حقیقت کی طرف بیان اشارہ کیا ہے کہ ابھی تمہیں معلوم نہیں کہ تمہاری قوم تمہارے ساتھ کیا کیا سلوک کرے گی اور اس طرح تم کو گھر سے نکالا جائے گا اور کسی دوسرے مقام پر پہنچ کر تمہیں وہ عزت کا مقام ملیگا جس کے سامنے تمہاری قوم کو آخر اسی طرح سر جھکانا پڑے گا جس طرح یوسفؑ کے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے جھکایا۔ ان حالات کا آنحضرت صلعم کے حالات سے مطابق ہونا اور آپؐ کی زندگی کا نقشہ اس سورت میں کھینچا جانا خود نبی کریم صلعم کے ان الفاظ سے ظاہر ہے جو آپؐ نے اپنی قوم کے آخرکار اظہار عاجزی پر فرمائے لا تثریب علیکم الیوم جو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو کہے تھے۔ اور اس آیت کے اندر جو الفاظ بظاہر زائد معلوم ہوتے ہیں بما اوحینا الیک ھذا القراٰن یعنی اس قرآن کی وحی کے ذریعہ سے تو ان کی غرض یہ ہے کہ یہ قصہ نہیں کیونکہ قرآن شریف قصوں سے پاک ہے بلکہ اس کی غرض اخلاق کی تعلیم ہے اور جس رنگ میں یہ تذکرہ بائبل میں مذکور ہے اگر اس کے ساتھ ہی اس کا متقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم میں اول سے آخر تک اس تذکرہ سے ایسے اخلاق سکھائے گئے ہیں جو بائبل میں نہیں پائے جاتے اور اسی لیے بائبل کے ساتھ کہیں کہیں اختلاف بھی ہے۔ گویا بتا دیا ہے کہ اگر یہ وحی الٰہی کے ذریعہ سے نہ سکھایا گیا ہو تو محض بائبل کی نقل ہوتی۔

ع۱۵۱۶ج ابت۔ اصل میں ابی ہے میرے باپ اور یا کو تائے تانیث سے بدلا گیا ہے۔

رایت کے معنی یہاں ہیں خواب میں دیکھا۔ ماضی دونوں معنی میں آتی ہے خواب میں دیکھنا معنی ہوں تو مصدر رُؤیا آتا ہے ویسے دیکھنے کے معنی میں رُؤْیۃ مصدر ہے۔

کوکب۔ نَجْم یعنی ستارہ کو کہتے ہیں اور نور کو اس کے ساتھ تشبیہ کی وجہ سے بھی کَوْکَب کہہ دیا جاتا ہے اور سردار قوم کو بھی کوکب کہا جاتا ہے۔

حضرت یوسفؑ کے رویا سے آپ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلعم کو بھی قبل از نبوت سچے خواب آتے تھے اور آپکے خواب فلق

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۵﴾	اس نے کہا اے میرے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا ورنہ وہ تیرے لیے کوئی مخفی تدبیر کریں گے کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔
وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶﴾ ع ۱	اور اسی طرح تیرا رب تجھے چُن لے گا اور تجھے باتوں کی حقیقت سکھائے گا اور اپنی نعمت تجھ پر اور یعقوبؑ کی اولاد پر پوری کرے گا، جیسے اس نے پہلے تیرے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر اسے پورا کیا، تیرا رب جاننے والا حکمت والا ہے ۱۵۱۶د

الصبح کی طرح سچے ہوتے تھے۔ گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کا سجدہ کرنا کسی تمثّل کے رنگ میں ہوگا۔ کیونکہ سجدہ کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ ماتھا زمین پر رکھا جائے سو یہ چیزیں اپنی اصل ہیئت میں ایک انسان کی رویت میں اس مفہوم کو پورا نہیں کرسکتیں۔ پس یا تو ان چیزوں نے انسان کا تمثّل اختیار کرکے حضرت یوسف کو سجدہ کیا اور یا یہ سجدہ کسی رنگ کا اظہار فرمانبرداری تھا جس کی کوئی تصریح یہاں موجود نہیں۔ اس خواب کی تعبیر کیا تھی اس کا ذکر اگلی آیت میں اور پھر سورت کے آخر میں آتا ہے اور گیارہ ستاروں کے نام جو ایک حدیث میں دیئے ہیں تو ابن جوزی نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔

ع ۱۵۱۶د احادیث۔ حدیث حدث سے ہے اور حُدُوث کے معنی ہیں کسی چیز کا ہونا بعد اس کے کہ وہ نہ تھی۔ اور حدیث ہر ایک کلام کو کہتے ہیں جو سماعت سے یا وحی سے انسان کو پہنچے بیداری کی حالت میں ہو یا خواب میں۔ اسی لیے خود قرآن کریم کو بھی حدیث کہا ہے افمن هذا الحدیث تعجبون (النجم ۵۳-۵۹) ومن اصدق من اللہ حدیثا (النساء ۴-۸۷) (رغ)

بائبل اور قرآن میں فرق: بائبل میں ہے کہ یوسفؑ نے یہ خواب حضرت یعقوب کے سامنے بیان کیا تو "اس کے باپ نے اُسے ڈانٹا اور اس سے کہا کہ یہ کیا خواب ہے جو تو نے دیکھا ہے کیا میں اور تیری ماں اور تیرے بھائی سچ مچ تیرے آگے زمین پر جھک کے تجھے سجدہ کریں گے" (پیدائش ۳۷ : ۱۰) یہ کلام ایک نبی کی شان کے مطابق نہیں، کیونکہ وہ گویا اس خواب کو بے معنی یا جھوٹا قرار دیتا ہے قرآن کریم میں اس کے خلاف اس کو سچّا قرار دیا ہے۔ اور اس کی تعبیر یہ کی ہے کہ یوسفؑ ایک عظیم الشان انسان ہوگا اور یہ ان واقعات کے بھی مطابق ہے جو کتاب پیدائش میں موجود ہیں۔

سورج اور چاند اور گیارہ ستاروں کے سجدہ کرنے سے کیا مراد ہے؟ روح المعانی میں ہے کہ سورج کی تعبیر بادشاہ اور سونا اور زوجہ جمیلہ ہے اور قمر کی تعبیر امیر اور کواکب کی رؤسا۔ تو اس صورت میں سورج اور چاند اور ستاروں کے سجدہ سے مراد کسی بادشاہ اور امیر اور رؤسا کا آپ کی اطاعت کرنا ہوگا اور مصر میں آپ واقعی ایسے بلند مرتبہ پر پہنچے کہ شاہ مصر اور اس کے رؤسا سب آپ کے سامنے جھک گئے اور سب پر آپ کو فوقیت ملی اور کواکب کی تعداد یا تو اس لحاظ سے ہوگی کہ وہاں کے بڑے بڑے رؤسا یا وزراء کی تعداد گیارہ ہو اور یا محض ایک عدد کامل کے طور پر مگر مفسرین زیادہ تر اس طرف گئے ہیں کہ گیارہ ستاروں سے مراد ان کے گیارہ بھائی اور شمس اور قمر سے مراد والد اور والدہ ہیں۔ مگر محض بھائیوں یا ماں باپ پر کسی شخص کی فوقیت اس قدر بلند مرتبہ کا پتہ نہیں دیتی جیسا بادشاہ یا وزراء پر فوقیت کا حاصل ہونا۔ بلکہ حضرت یعقوب نے جو تعبیر کی ہے وہ دین و دنیا میں بلند مراتب پر پہنچنا ہے جیسا کہ آگے آتا ہے۔

حضرت یعقوب کی تعبیر: حضرت یعقوب نے تین باتوں کی خبر دی ہے اول اجتباء جس کے معنی کے لیے دیکھو ع ۸۷۵ مفسرین میں سے بعض نے کہا نبوت کے لیے چن لینا مراد ہے۔ بعض نے کہا سجود کے لیے بعض نے اور توجیہات کی ہیں (ر) مگر اجتباء کے اصل معنی کے لحاظ سے مراد اچھی صفات کا آپ میں جمع کردینا ہے اور اللہ تعالیٰ کا اجتباء نبیوں اور صدیقوں اور شہداء کے لیے ہوتا ہے دوسری بات تاویل احادیث کا علم دینا ہے اور اس سے مراد بعض نے تعبیر رویا کو لیا ہے اور بعض نے عواقب امور کو اور بعض نے احادیث انبیاء اور کتب سابقہ کو۔ مگر جس طرح احادیث کا لفظ وسیع ہے اور اس میں رؤیا اور وحی آجاتے ہیں اسی طرح یہاں بھی معنی میں توسیع مراد ہے یعنی ہر ایک بات کی تہ تک پہنچنا اور اعلیٰ درجہ کے فہم کا ملنا۔ اسی اعلیٰ درجہ کے علم میں تعبیر رویا بھی شامل ہے جو محض اس کا ایک حصّہ ہے اور تیسری بات اتمام نعمت ہے اور اس سے مراد دنیا اور آخرت کی نعمت کا مل جانا یا اکٹھا ہوجانا ہے جیسے نبوت کے ساتھ بادشاہت یا دوسروں کی غلامی سے آزادی روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی نعمتیں مل جانا یہی اتمام نعمت ہے۔ حضرت یعقوب نے یہ سب کچھ بظاہر اس خواب سے ہی سمجھا ہے اور ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بذریعہ وحی بھی اطلاع دی ہو کہ یوسفؑ ان بلند مراتب پر پہنچنے والا ہے مگر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سورج چونکہ اصل سرچشمہ نور ہے اس لیے اس کے سجدہ سے مراد کمال دینی ہے کیونکہ انسان کے اصل فضائل دینی ہیں اور قمر چونکہ سورج سے نور مستعار لیتا ہے اس لیے مراد کمال دنیوی ہے اور یہ حضرت یوسف کو کمال دینی کی طفیل حاصل ہوتا ہے اور آپ کی راستبازی اور علم ہی آپ کو حکومت تک پہنچاتے ہیں اور کواکب سے چونکہ علم حاصل کیا جاتا ہے وبالنجم

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِۦٓ ءَايَٰتٌ لِّلسَّآئِلِينَ ⑦

بیشک یوسفؑ اور اس کے بھائیوں (کے ذکر) میں پوچھنے والوں کے لیے نشان ہیں ؏۱۵۱۷

إِذْ قَالُوا۟ لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰٓ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ⑧

جب انھوں نے کہا کہ یوسفؑ اور اس کا بھائی تو ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم قوی جماعت ہیں، یقیناً ہمارا باپ صریح غلطی پر ہے ؏۱۵۱۸

ٱقْتُلُوا۟ يُوسُفَ أَوِ ٱطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا۟ مِنۢ بَعْدِهِۦ قَوْمًا صَٰلِحِينَ ⑨

یوسفؑ کو مار ڈالو یا اُسے کسی اور ملک میں نکال دو تاکہ تمھارے باپ کی توجہ صرف تمھاری طرف ہی ہو جائے اور اس کے بعد تم نیک لوگ بن جاؤ ؏۱۵۱۹

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا۟ يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِى غَيَٰبَتِ ٱلْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ ٱلسَّيَّارَةِ إِن كُنتُمْ فَٰعِلِينَ ⑩

ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا، یوسفؑ کو قتل نہ کرو اور اسے کنوئیں کی گہرائی میں ڈال دو تا کوئی قافلہ اسے نکال لے جائے اگر تم کچھ کرتے ہو (تو یہ کرو) ؏۱۵۲۰

هم يهتدون (النحل ۱۶ - ۱۶) اس لیے کواکب کے سجدہ سے مراد علم کا حاصل ہونا ہے۔

؏۱۵۱۷ پوچھنے والوں سے مراد یہاں نبی کریم صلعم کے حالات کو دریافت کرنے والے لوگ ہیں۔ ان کے لیے یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کے معاملہ میں نشان ہیں یعنی جو معاملہ یوسفؑ کے ساتھ ہوا وہی آنحضرت صلعم کے ساتھ ہوگا۔ آپ کو قتل کرنے یا ملک سے نکالنے کی تجویز ہوگی اور بالآخر جس طرح یوسفؑ کے بھائی عاجز حالت میں یوسفؑ کے سامنے حاضر ہوئے اسی طرح آپ کے مخالف بھی عاجز اور مغلوب ہو کر آپ سے معافی مانگیں گے۔

؏۱۵۱۸ عصبة۔ عَصَب پٹھوں کو کہتے ہیں اور عَصْب کے معنی باندھنا ہیں اور عُصْبَةٌ اور عِصابةٌ جماعت کو کہا جاتا ہے دس سے چالیس تک جس کا واحد کوئی نہیں۔ مفردات میں ہے جماعة مُتَعَصِّبَة مُتَعاضِدَة یعنی ایسی جماعت جو ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوں اور عَصَبَة ایک شخص کے بیٹوں اور باپ کی طرف سے قریبیوں کو کہا جاتا ہے اور اسی مادہ سے مشہور لفظ تَعَصُّب ہے جس کے اصل معنی جمع ہو جانے کے ہیں۔ پھر کسی دوسرے فریق کے خلاف جمع ہو جانا ظالم یا مظلوم ہو کر اور عَصَبِيَّة یہ ہے کہ ایک شخص کو عَصَبَة کی مدد کے لیے بلائے اور حدیث میں ہے لَيْسَ مِنَّا من دعا الى عَصَبِيَّة او قاتل عَصَبِيَّة جو شخص عصبیت کی طرف ملاتا ہے یا عصبیت کے لیے جنگ کرتا ہے (یعنی محض اپنے قریبیوں کی حمایت کے لیے اور یہ نہیں دیکھتا کہ حق کس طرف ہے) وہ ہم میں سے نہیں۔

ضلال کے معنی یہاں خطا فی الرائے ہیں (ر) یعنی غلطی ؛

یوسفؑ کے بھائی سے مراد یہاں ان کا حقیقی بھائی ہے جس کا نام بن یامین تھا یہ دونوں ایک والدہ سے تھے محض اس لیے کہ باپ کو ایک بیٹے سے زیادہ پیار ہے ان کے سینوں میں حسد کی آگ جلی انہیں یہ شکایت نہیں کہ ہمارا باپ ہم سے محبت نہیں کرتا بلکہ یہ ہے کہ یوسفؑ سے زیادہ محبت کرتا ہے، یہ کوشش نہیں کرتے کہ باپ کی محبت ان سے کس طرح بڑھے، یہ کوشش کرتے ہیں کہ یوسفؑ کی محبت درمیان سے اُٹھ جائے۔ یہی حسد ہے جس کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔

؏۱۵۱۹ اطرحوا۔ طَرْح۔ کسی چیز کا پھینکنا اور اس کا دور کر دینا ہے (غ)

تکونوا من بعدہ قومًا صالحین سے مراد یہ ہے کہ اس گناہ سے توبہ کر کے پھر تم صالح بن سکتے ہو اور یا مطلب یہ ہے کہ یوسف کے درمیان سے نکل جانے سے تم اپنے امور دنیا میں سنوار والے ہو جاؤ گے کیونکہ باپ کی توجہ صرف تمھاری طرف ہو گی۔

؏۱۵۲۰ غیٰبت۔ اس کا اصل غَیب سے ہے اور غَیَابَة زمین کی پستی یا گہرائی کو کہتے ہیں (غ)

جُبّ۔ جَبّ کے معنی کسی چیز کا جڑ سے کاٹ دینا ہیں اور جُبّ اس کنوئیں کو کہتے ہیں جس کی اینٹوں سے منڈیر نہ بنائی گئی ہو (غ) جس کی دیوار بنائی گئی ہو وہ بِئر ہے اور بعض کے نزدیک جُبّ ایسا کنواں ہے جس کی گہرائی بہت زیادہ ہو (ل)

یلتقط۔ لَقْط۔ اور اِلْتِقاط کسی چیز کا زمین سے لے لینا ہے یعنی زمین پر پڑی ہوئی چیز کا اُٹھا لینا اور لُقَطَة گری ہوئی چیز کو اور لَقِیط پھینکے ہوئے بچے کو کہتے ہیں جسے کوئی شخص پالے (ل)

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾

انھوں نے کہا اے ہمارے باپ کیا وجہ ہے کہ تو یوسفؑ کے معاملہ میں ہمارا اعتبار نہیں کرتا حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں۔

اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾

کل اسے ہمارے ساتھ بھیجئے کہ وہ کھائے (پیئے) اور کھیلے (کودے) اور ہم اس کے نگہبان ہیں ع۱۵۲۱

قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾

اس نے کہا مجھے اس بات سے غم ہوتا ہے کہ تم اسے لے جاؤ اور مَیں ڈرتا ہوں کہ اسے بھیڑیا کھا جائے اور تم اس کی طرف سے بے خبر رہو ع۱۵۲۲

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

انھوں نے کہا اگر اسے بھیڑیا کھا جائے حالانکہ ہم ایک قوی جماعت ہیں تو اس صورت میں بیشک ہم گھاٹے میں رہنے والے ہونگے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

سو جب اسے لے گئے اور اتفاق کر لیا کہ اسے کنوئیں کی گہرائی میں ڈال دیں اور ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تو انھیں ان کے کام کی خبر دیگا اور وہ نہیں جانتے ہونگے ع۱۵۲۳

وَ جَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ ؕ

اور رات کو اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے۔

سَیّارۃ۔ سَیر کے معنی چلنا اور سَیّارَۃ چلنے والی جماعت کو کہتے ہیں (غ)

پیدایش ۳۷: ۲۲ میں ہے کہ ایسا کہنے والا رُوبن تھا ؞

ع۱۵۲۱ یرتع۔ رَتع کا استعمال اصل میں حیوانات پر ہے یعنی چرنا۔ استعارۃً انسان پر بولا جاتا ہے (غ) یا بافراغت کھانا پینا (ل)

ع۱۵۲۲ اس کے یجانے سے غم ہوتا ہے گویا ان کا دل اندر سے بول رہا تھا کہ وہ محض شرارت کے لیے یوسُفؑ کو لے جا رہے ہیں ؞

ع۱۵۲۳ بائبل میں حضرت یوسُفؑ کی طرف اس وحی کا ذکر نہیں اور اتنی بات سے دونوں تذکروں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے بائبل میں یہ محض ایک کہانی کا رنگ رکھتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب کا بیٹا گم ہو گیا اور پھر مل گیا۔ قرآن کریم میں یہ طرح طرح کے روحانی اور اخلاقی سبقوں سے بھرا ہوا ہے۔ مثلاً یہی واقعہ کہ عین اس وقت جب بھائی اپنی طرف سے یوسُفؑ کا کام تمام کر چکے تھے اور کوئی امید کی جھلک باقی نہ رہی تھی اور زندگی کا خاتمہ سامنے نظر آتا تھا ایک خارجی آواز آتی ہے کہ تم پر وہ زمانہ آئے گا کہ تم انہی بھائیوں کو ان کی اس حرکت کی خبر دو گے اور تمہارا مقام اس قدر بلند ہوگا کہ ان کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا کہ تم اس مقام پر پہنچے ہوئے ہو۔ یہ آواز نہ صرف یوسُفؑ کے اندر اللہ تعالےٰ کی ہستی پر ایمان کامل پیدا کرتی ہے اور اس کو آیندہ زندگی میں مصائب کی برداشت کے قابل بناتی ہے اور بڑے بڑے ابتلاؤں میں نیکی پر قائم رہنے کی قوت دیتی ہے بلکہ اس ذکر کے پڑھنے والے کے اندر بھی یہی تمام باتیں پیدا کرتی ہے ایک اتنے ذکر کو چھوڑ دینے سے بائبل میں یہ ذکر محض ایک قِصّہ رہ جاتا ہے اور قرآن کریم میں یہ ایک اعلیٰ درجہ کا اخلاقی سبق بن جاتا ہے۔

وحی قبل از نبوت: اس وحی کے ہونے سے یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ حضرت یوسف اس وقت نبی بھی ہو گئے تھے۔ آیت ۲۲ میں بتایا ہے کہ حکم اور علم روحانی بلوغ کو پہنچنے پر ملا تھا اور وہ اس واقعہ کے بہت بعد تھا۔ وحی غیر نبی کو بھی ہو جاتی ہے۔ حضرت موسیٰ کی ماں اور حواریوں کو وحی ہونے کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے پس حضرت یوسُفؑ کی یہ وحی بھی قبل از نبوت ہے جس طرح ان کا رویا قبل از نبوت تھا اور اس میں محض ایک آیندہ کی خبر ہے اور آیندہ کی اخبار غیر نبی پر بھی ظاہر کی جاتی ہیں جیسے کہ اس امت میں محدثین پر جن کے متعلق احادیث میں آتا ہے رجال یکلمون من غیران یکونوا انبیاء یہ خیال کر کے کہ وحی سوائے نبی کے نہیں ہو سکتی بعض نے اوحینا الیہ میں مراد حضرت یعقوب کو لیا ہے کیونکہ حضرت یوسف کی عمر اس وقت ۷ اسال کی تھی مگر اس سے بھی اس ذکر کی اصل عظمت مفقود ہو جاتی ہے وھم لا یشعرون سے مراد یہ ہے کہ ایسی حالت میں تم ان کو یہ خبر دو گے کہ تمہارے اس مقام کی وجہ سے یہ نہ جانتے ہونگے اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ تم کو ہم نے یہ خوشخبری دی ہے تو تمہارے بھائیوں کو اس بات کی کچھ بھی خبر نہیں ؞

قَالُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾
وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾
وَ جَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَ اَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ

کہا، اے ہمارے باپ ہم ایک دوسرے سے آگے نکلتے ہوئے چلے گئے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑا تو بھیڑیا اسے کھا گیا اور تو ہماری بات ماننے کا نہیں اگرچہ ہم سچے ہوں [۱۵۲۴]
اور اس کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے، اس نے کہا بلکہ تمہارے دلوں نے تمہارے لیے ایک (بری) بات کو اچھا کر دکھایا تو نیک صبر ہی ہے اور اس پر اللہ کی ہی مدد طلب کی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو [۱۵۲۵]
اور ایک قافلہ آیا تو انھوں نے اپنا پانی بھرنے والا بھیجا اور اس نے اپنا ڈول ڈالا، کہا، خوش خبری ہو یہ لڑکا ہے اور اُسے مالِ تجارت قرار دے کر چھپا رکھا، اور اللہ جانتا ہے

ع۱۵۲۴ ولوکنا صادقین سے مراد یہ ہے کہ اگر ہم آپ کے نزدیک صادق القول بھی ہوتے تو بھی اس معاملہ میں آپ ہماری بات کا یقین نہ کرتے اور جب آپ پہلے بھی ہمارے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تو ہماری بات کو آپ مانیں گے تو نہیں۔

ع۱۵۲۵ سوّلت۔ تسویل کے معنی ہیں جس چیز کی خواہش ہو اسے نفس کا اچھا کر دکھانا اور اس کے برے پہلو کو بھی اچھے رنگ میں دکھانا۔ الشیطان سوّل لھم (محمد۔ ۲۵) اور سُوْل اُمنِیّة کے قریب قریب ہے فرق یہ ہے کہ امنیة یا آرزو وہ ہے جس کا انسان اپنے نفس میں اندازہ کرتا ہے اور سُوْل وہ ہے جس کو وہ طلب کرتا ہے گویا یہ امنیة کے بعد کا مرتبہ ہے اور اس کا اصل سُؤل ہے قد اوتیت سُؤلك یا موسٰی (طٰہٰ۔ ۳۶) اور سُؤل وہ حاجت نفس ہے جس کا پورا ہونا انسان چاہتا ہے (رغ)

یہاں پھر بائبل کے ذکر میں اور قرآن شریف میں ایک بین فرق نظر آتا ہے۔ بائبل میں ہے کہ جب یہ خبر حضرت یعقوب کے پاس پہنچی تو انہوں نے اس کو باور کرلیا اور کہا۔"یوسف بیشک پھاڑا گیا تب یعقوب نے اپنے کپڑے پھاڑے اور ٹاٹ اپنے کولے پر ڈالا اور بہت دن تک اپنے بیٹے کے لیے غم کیا" (پیدائش ۳۷ : ۳۳ و ۳۴) یہ بات شان نبوت سے بعید ہے۔ قرآن کریم نے اس کے بجائے کیسے پاک لفظ فرمائے ہیں فصبر جمیل اتنے بڑے عظیم الشان صدمے پر بھی نہ صرف صبر کیا بلکہ صبر کو جمیل فرمایا یعنی خوبی کی بات یہی ہے۔ اس میں دوسروں کے لیے بھی سبق ہے کہ وہ سخت سے سخت مصائب کے وقت واویلا اور جزع فزع سے بچیں اور صبر کا طریق اختیار کریں اور اللہ تعالیٰ کے قضا و قدر پر راضی ہوں صحیح حدیث میں ہے کہ جب حضرت عائشہؓ پر بہتان باندھا گیا تو اس صدمہ عظیم میں انہوں نے یہی فرمایا کہ میں وہی کہتی ہوں جو یعقوب نے کہا فصبر جمیل واللہ المستعان علی ما تصفون ایک اور بڑا فرق جو قرآن شریف اور بائبل میں ہے یہ ہے کہ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب کو یقین تھا کہ حضرت یوسؑف مارے نہیں گئے بلکہ زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ آخر ان باتوں کو پورا کرے گا جو رویا میں ان کو دکھائی گئیں جس طرح بائبل کے اس بیان کی بجائے کہ حضرت یعقوب نے یوسؑف کا رؤیا سنکر اسے ڈانٹا، قرآن کریم نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس خواب کی تعبیر بتائی کہ یوسؑف کو دینی اور دنیوی عظمت ملے گی۔ اسی طرح اس پر پورا ایمان رکھتے ہوئے اپنے بیٹوں کو صاف کہہ دیا کہ جو کچھ تم کہتے ہو یہ سب غلط ہے اور واللہ المستعان میں بتایا کہ اللہ تعالےٰ ان باتوں کو پورا کرے گا جو اس نے دکھائی ہیں۔

حضرت یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی یہ لوگ لگا لائے تھے۔ بائبل میں ہے کہ یہ ایک "بوقلمون قبا" تھی جو حضرت یعقوب نے یوسؑف کو بنوا کر دی تھی، لیکن جیسی بھی ہو اُن کی غرض تو اپنی بات کی تائید تھی کہ بھیڑیا یوسؑف کو کھا گیا اور اس کی قمیص باقی رہ گئی اور اس پر خون کے نشان بھی ہیں۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت یوسف کے ذکر میں تین مرتبہ قمیص کا ذکر آتا ہے۔ جس قمیص کو یوسف کے بھائیوں نے بطور شہادت پیش کیا اسی سے حضرت یعقوب معلوم کرتے ہیں کہ جھوٹ موٹ کے نشان ہیں گویا یوسف کے زندہ ہونے کی وہ شہادت بنی، دوسرے موقعہ پر ایک قمیص سے ہی یوسؑف کی بریت کی شہادت ملی، اور تیسرے موقعہ پر اپنی قمیص کو ہی حضرت یوسؑف نے اپنے باپ کے پاس بھیجا۔ گویا وہ یوسؑف کی شان وشوکت کی شہادت بنی۔ بالفاظ دیگر یوسؑف کی زندگی، یوسف کی عصمت اور یوسف کی شان وشوکت کی گواہی قمیص سے ہی ملتی ہے اور رویا میں قمیص کی تعبیر علم ہے جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ پر میں نے لمبی قمیص دیکھی اور اس کی تعبیر علم کی اور یہاں اس سورت میں بھی جس طرح قمیص کا ذکر تین دفعہ آتا ہے تین ہی دفعہ حضرت یوسف کے تاویل احادیث کے علم کا ذکر بالخصوص آتا ہے یعنی آیت ۶ میں اور ۲۱ میں اور ۱۰۱ میں ؛

بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

جو یہ کرتے ہیں ع۱۵۲۶

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ ع ۱۲

اور اسے تھوڑی سی قیمت چند درہموں پر بیچ ڈالا اور وہ اس کے بارے میں بے رغبت تھے ع۱۵۲۷

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ۭ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۭ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓي اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور جس نے اسے مصر میں خریدا تھا، اس نے اپنی عورت سے کہا، اسے عزّت کی جگہ دے، شاید یہ ہمیں نفع دے، یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔ اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو ملک میں جگہ دی، تاکہ ہم اسے باتوں کی حقیقت سکھائیں۔ اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ع۱۵۲۸

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

اور جب وہ اپنی بلوغت کو پہنچا، ہم نے اُسے حکم اور علم دیا اور اسی طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں ع۱۵۲۹

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۭ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ اِنَّهٗ

اور جس کے گھر میں تھا، اس نے اسے اپنے ارادہ سے پھیرنا چاہا اور دروازے بند کرلیے اور کہا ادھر آؤ، اس نے کہا اللہ کی پناہ (مانگتا ہوں)، میرے رب نے میرے مقام کو بہت

ع۱۵۲۶ بضاعۃ۔ مال کا وافر حصّہ جو تجارت کے لیے رکھا جائے ھذہ بضاعتنا ردت الینا (۶۵) اور اس کا اصل بَضْع سے ہے جس کے معنی ہیں گوشت کا ٹکڑا جو کاٹا جائے اور حدیث میں ہے فاطمۃ بَضْعَۃٌ مِنّی یعنی فاطمہؓ گویا میرے جسم کا ٹکڑا ہے اور بِضْع وہ ہے جو دس سے کاٹا جائے یعنی تین سے ۹ تک پر بولا جاتا ہے (غ)

ع۱۵۲۷ زاھدین۔ زھید بہت تھوڑی سی چیز کو کہتے ہیں اور الزاھِدُ فی الشَّیٔ کے معنی ہیں اس کی طرف سے بے رغبتی دکھانے والا، گویا اس کی طرف سے نہایت تھوڑی چیز پر راضی ہوجاتا ہے (غ) یہی معنی یہاں ہیں اور زُھد دین سے خاص ہے جو دنیا کی رغبت اور حرص کی ضد ہے (ل) بائبل میں ہے کہ پہلے یوسف کے بھائیوں نے یوسف کو مدیانیوں (قافلہ والوں) کے ہاتھ بیچا پھر مدیانیوں نے اسے مصر میں جابیچا۔ قرآن شریف سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ والے اسے چھپا کرلے گئے اور مصر میں جا بیچا اور ان لوگوں کو اس کے بارہ میں کچھ زیادہ رغبت نہ تھی۔

ع۱۵۲۸ مکنا۔ تمکین کے معنی ہیں مضبوطی اور قوت دینا اور اسباب تصرف دینا دیکھو ع۹۰۶ مگر مکانۃ منزلۃ اور مرتبہ کو کہتے ہیں (ت) علاوہ ازیں اسباب تصرف دینے سے مراد بھی معزز بنانا ہی ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ خریداری وہ نہیں جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہے۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب پچھلی آیت میں فروخت کنندہ حضرت یوسف کے بھائی سمجھے جائیں یہاں حضرت یوسف کو ایک معزز عہدیدار کے ہاں مقام عزت ملتا ہے اور یہ ان کے استحکام اور علم کی زیادتی کا موجب بن جاتا ہے۔ اللہ کا اپنے امر پر غالب آنا یہ ہے کہ وہ جس طرح پر چاہے ہوتا ہے کوئی اس کے امر کو روک نہیں سکتا اور یہ اشارہ ہے یوسف کو مقام عزت ملنے کی طرف کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حالت غلامی میں بھی عزت کے مقام پر رکھا۔

ع۱۵۲۹ بلوغ سے مراد: اَشُدّ جسمانی مضبوطی اور روحانی مضبوطی دونوں پر بولا جاتا ہے مگر چونکہ سترہ سال کی عمر کے حضرت یوسف اس وقت تھے جب کنعان سے نکلے اس لیے جسمانی مضبوطی وہ اسی وقت حاصل کرچکے تھے اور یہاں جس اشد کا ذکر ہے وہ روحانی مضبوطی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ اب انہیں حکم اور علم عطا ہوتا ہے اور یہ دونوں باتیں روحانی بلوغ سے تعلق رکھتی ہیں اور آگے ذکر بھی ہے کہ اسی طرح احسان کرنے والوں کو ہم بدلہ دیتے ہیں۔ حکم سے مراد یہاں بعض نے نبوت کو لیا ہے مگر یہ درست نہیں کیونکہ اس وقت تک انہیں تبلیغ کا ہی کوئی موقعہ نہ ملا تھا۔

لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٣﴾
وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ
بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ
وَ الْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٢٤﴾
وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ وَ قَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ
دُبُرٍ وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ
مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّاۤ

اچھا بنایا۔ ظالم کامیاب نہیں ہوتے [1530]
اور اس عورت نے اس کا قصد کیا اور وہ بھی اس کا قصد کرتا،
اگر وہ اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل نہ دیکھ چکا ہوتا، یوں ہُوا تاکہ ہم
اس سے بدی اور بےحیائی کو پھیر دیں وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھا [1531]
اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے اور اس عورت نے اس کی قمیص
پیچھے سے پھاڑ دی اور دونوں نے اس کے خاوند کو دروازے پر پایا،
بولی اس کی کیا سزا ہے جو تیری عورت سے بُرا ارادہ کرے سوائے

ع۱۵۳۰ راودتہ۔ رَوْد کے معنی ہیں کسی چیز کی طلب میں نرمی سے تردد کرنا اور اِرَادَۃ اصل میں وہ قوت ہے جو شہوت اور حاجت اور اہل سے مرکب ہو یعنی جس میں خواہش اور حاجت اور امید یا آرزو پائی جائے اور ارادہ کی ابتدا نفس کا کسی چیز کی طرف کھچنا ہے اور اس کی انتہا یہ ہے کہ حکم لگایا جائے کہ ایسا ہو یا ایسا نہ ہو اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق ارادہ کا لفظ بولا جائے تو مراد اس سے منتہا ہوتا ہے یعنی ایک بات میں حکم لگانا جیسے ان اراد بکم سوٓء او اراد بکم رحمۃ (الاحزاب [33] - ۱۷) یا اذا اراد اللہ بقوم سوء فلا مردّ لہ (الرعد [13] - ۱۱) اور انسان میں ارادۃ عموماً نفس کا کسی چیز کی طرف کھچنا ہے اور کبھی اس سے مراد قصد یا طلب کرنا ہوتا ہے جیسے لا یریدون علوّا فی الارض (القصص [28] - ۸۳) اور ارادۃ جس طرح قوت اختیاری سے ہوتا ہے کبھی قوت تسخیری اور حسی سے ہوتا ہے یعنی بے جان چیزوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے جدارا یرید ان ینقضّ (الکہف [18] - ۷۷) اور حیوانات پر بھی بولا جاتا ہے اور مُرَاوَدَۃ (جس سے یہاں فعل ماضی آیا ہے) یہ ہے کہ تم اپنے غیر سے ارادہ میں جھگڑا کرو اور جو وہ ارادہ کرتا ہے اس کے خلاف ارادہ کرو یا جس چیز کو وہ طلب کرتا ہے اس کے خلاف طلب کرو اور راودتہ عن نفسہ کے معنی ہیں تَصْرِفہ عن رَأْیِہ یعنی اس کو اپنی رائے سے یا ارادہ سے پھیرنا چاہا (غ)

غلّقت۔ غَلْق کے معنی بند کرنا اور اِغلاق یا تَغْلِیْق (جس سے یہاں فعل ہے) کثرت سے بند کرنا یعنی بہت دروازوں کا بند کرنا یا بار بار بند کرنا (غ)

ھیت اور ھَلُمَّ کے معنی قریب قریب ہیں یعنی آؤ (غ) ھَیْتَ لَکَ۔ اَقْبِل یعنی آگے آؤ (ل) بعض نے اسے عبرانی سریانی وغیرہ کہا ہے مگر مجاہد کہتے ہیں کہ یہ عربی ہے (د)

عصمت یوسفؑ: قرآن کریم نے جو لفظ اختیار کئے ہیں ان سے حضرت یوسفؑ کے ارادہ عصمت کی مضبوطی پر کافی شہادت ملتی ہے کیونکہ راودت میں بتایا کہ اس عورت کا ارادہ یوسفؑ کے ارادہ کے خلاف تھا اور عن نفسہ میں اور بھی اس کو موکد کیا ہے حضرت یوسفؑ نے اس عورت کی تمام کارروائیوں اور ارادوں کا ایک ہی جواب دیا ہے معاذ اللہ۔ معلوم ہوا کہ آپ کے ارادہ عصمت میں ادنیٰ جنبش بھی نہیں آئی انہ ربّی سے مراد بعض نے اس عورت کا خاوند لیا ہے مگر ایک متقی آدمی کے مُنہ میں ربی سے مراد اللہ تعالیٰ ہی لینا بہتر ہے۔ اور اچھی جگہ دینا بھی حضرت یوسفؑ عزیز کی طرف منسوب نہیں کر سکتے کیونکہ وہ محض ایک واسطہ ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں جو حقیقی سبب ہے کیونکہ عزیز کے دل کو اللہ تعالیٰ نے ہی یوسفؑ کی عزت کی طرف پھیرا کس قدر کامل ایمان ہے کہ فرماتے ہیں اگر میں ایسا کام کروں تو یہ ظلم ہے اور ظالم کامیاب نہیں ہوتا۔ ایسے موقعہ پر جہاں تنہائی ہو، ایک عورت جو مالکہ ہے اپنے غلام کو اپنی طرف بلائے، دروازے بند ہیں۔ حضرت یوسفؑ کا عصمت کے بلند مقام پر کھڑا ہونا اس ذکر کے پڑھنے والوں کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا روحانی سبق ہے اور حقیقت میں اگر عزیز مصر کی عورت نے حضرت یوسفؑ کو مقام عصمت سے پھیرنے کی کوشش کی تو قریش مکّہ نے بھی آنحضرت صلعم کو جن کو وہ امین جانتے اور کہتے تھے۔ مقام عصمت سے ہٹانے کے لیے خوبصورت سے خوبصورت عورت دینے کا لالچ دیا جس کا جواب آپ نے یہ دیا کہ دنیا کی حکومت اور دولت اور خوبصورتی کیا حقیقت رکھتی ہیں اگر سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ میں رکھ دیں تو بھی میں اپنے مقام کو نہ چھوڑوں۔

ع۱۵۳۱ وھمّ بہا لولا ان راٰ برھان ربہ۔ لسان العرب میں ابو عبیدہ کا قول منقول ہے کہ یہ تقدیم و تاخیر ہے یعنی مطلب یہ ہے لولا ان راٰ برھان ربہ لھمّ بہا اگر یوسفؑ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ چکا ہوتا تو اس کا قصد کرتا۔

یوسفؑ کے دل میں بدی کا خیال بھی نہیں گزرا: بعض مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ حضرت یوسفؑ معصیت کا خیال دل میں لائے تھے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی کچھ ایسے اقوال منقول ہیں۔ مگر یہ درست نہیں۔ اس لیے کہ قرآن کریم کی پہلی آیت اس کے خلاف ہے اور جو کچھ وہاں فرمایا ہے، اسی کی مزید تشریح یہاں ہے، وہاں مراودۃ کا ذکر تھا یعنی اس عورت کا یوسفؑ کو اپنے ارادہ اور رائے سے پھیرنے کی کوشش کرنا اسی کوشش کا ذکر ولقد ھمت بہ میں ہے مگر اس مراودۃ یا اس عورت کی کوشش کا نتیجہ وہاں بتایا تھا قال معاذ اللہ انہ ربی احسن مثوای انہ لا یفلح الظالمون یہاں فرمایا وھمّ بہا لولا ان راٰ برھان ربہ اگر حضرت یوسفؑ کے دل میں کوئی خیال معصیت کا آتا تو قرآن کریم آپ کی طرف الفاظ معاذ اللہ منسوب نہ کرتا۔ اور پھر دوسری جگہ خود اس عورت کی شہادت حضرت یوسفؑ کی

اَنۡ یُّسۡجَنَ اَوۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۲۵﴾ | اس کے کہ اسے قید کیا جائے یا دردناک سزا ہو۔

قَالَ ہِیَ رَاوَدَتۡنِیۡ عَنۡ نَّفۡسِیۡ وَ شَہِدَ شَاہِدٌ مِّنۡ اَہۡلِہَا ۚ اِنۡ کَانَ قَمِیۡصُہٗ قُدَّ مِنۡ قُبُلٍ فَصَدَقَتۡ وَ ہُوَ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۲۶﴾ | (یوسفؑ نے) کہا اس نے مجھے میرے ارادہ سے پھیرنا چاہا اور اس کے لوگوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر اس کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہو تو وہ سچی ہے اور وہ جھوٹوں میں سے ہے ۱۵۳۲

وَ اِنۡ کَانَ قَمِیۡصُہٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ فَکَذَبَتۡ وَ ہُوَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۲۷﴾ | اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہو تو وہ جھوٹی ہے اور وہ سچوں میں سے ہے

فَلَمَّا رَاٰ قَمِیۡصَہٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ قَالَ اِنَّہٗ مِنۡ کَیۡدِکُنَّ ؕ اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ ﴿۲۸﴾ | سو جب اس نے اس کی قمیص کو پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا تو کہا یہ تم عورتوں کی چال ہے بلاشبہ تمہاری چال بڑی بھاری ہے۔

عصمت پر موجود ہے ولقد راودتہ عن نفسہ فاستعصم (۳۲) میں نے اس کو اس کے ارادہ سے پھیرنا چاہا مگر وہ مضبوط رہا اور عصمت اختیار کی یہاں صرف مراودتہ اور اس کے محفوظ رہنے کا ذکر ہے اگر کوئی اور واقعہ بھی ہوا ہوتا جیسا کہ ان مفسرین نے خیال کر لیا ہے جنہوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جلس منہا مجلس الرجل من امرأتہ تو وہ عورت یوسفؑ کے معصوم ہونے کی شہادت نہ دیتی، جہاں کہیں اس واقعہ کا ذکر ہے دو ہی باتوں کا بیان ہے عورت کی کوشش اور یوسفؑ کا بچا رہنا۔ جب دوسری عورتوں نے یوں شہادت دی حاش للہ ما علمنا علیہ من سوٓء تو اس عورت نے بھی یہی کہا الئٰن حصحص الحق انا راودتہ عن نفسہ وانہ لمن الصادقین (۵۱) نہ دوسری عورتیں یوسفؑ میں کسی ادنٰے بدی کے خیال کے شہادت دیتی ہیں نہ عزیز کی عورت۔ وہی صدق جو پہلے قرائن سے ظاہر ہو چکا اب خود عزیز کی عورت اس کا کھلا اعتراف کرتی ہے غرض یہ خیال کہ حضرت یوسفؑ نے اس عورت سے ارادۂ بد کیا تھا بالکل باطل اور قرآن کریم کے مخالف ہے حل سراویل تک نوبت پہنچنے سے پہلے بہت سے مبادی ہوتے ہیں جو انسان ان میں مبتلا ہو جائے وہ معصوم نہیں کہلا سکتا۔ نہ ہی جب وہ اپنی بریت کا اظہار کرے تو اسے صادق کہا جا سکتا ہے اور خود اس آیت میں ہے کذٰلک لنصرف عنہ السوء والفحشاء جہاں ظاہر ہے کہ فحشاء بیحیائی کے فعل کا ارتکاب ہے خواہ وہ زنا ہو یا مبادی زنا اور سوء بیحیائی کا خیال دل میں لانا ہے پس اللہ تعالیٰ حضرت یوسفؑ سے نہ صرف زنا اور ہر قسم کے مبادی زنا کی نفی کرتا ہے بلکہ ان گندے خیالات کے آپ کے پاک دل میں آنے کی بھی نفی کرتا ہے۔ اور ھم بہا لولا ان راٰ برہان ربہ کی جس طرح ترکیب ہے ایسے ہی دوسری جگہ ہے ان کادت لتبدی بہ لولا ان ربطنا علٰی قلبہا (القصص ۱۰) یعنی حضرت موسٰیؑ کی والدہ اس بات کو ظاہر کر دیتی اگر ہم نے اس کا دل مضبوط نہ کر دیا ہوتا اور روح المعانی میں ہے کہ جواب کا شرط پر مقدم ہونا ممتنع نہیں تاہم اس کی ترکیب ایسی ہے جیسے عرب کہتے ہیں انت ظالم ان فعلت کذا جہاں ظلم کا اثبات نہیں بلکہ نفی ہے اسی طرح یہاں حضرت یوسفؑ کے ھمّ کی نفی ہے اور تفسیر بحر المحیط میں ہے کہ بعض لوگوں نے یوسفؑ کی طرف وہ بات منسوب کی ہے جو ایک فاسق کی طرف بھی منسوب نہیں کی جا سکتی حالانکہ حضرت یوسفؑ سے ھم کے واقع ہونے کا نہیں بلکہ اس کی نفی کا ذکر ہے۔

برھان ربہ کو کسی نے حضرت یعقوبؑ کا بطور تمثل نظر آنا اور نصیحت کرنا کہا ہے بعض نے کہا ہے کہ اس عورت نے اپنے بت پر پردہ ڈالا تو حضرت یوسف نے کہا کہ اگر تجھے اس پتھر سے شرم آتی ہے جو نہ سنتا ہے نہ عقل رکھتا ہے تو میں اپنے خدا سے شرم نہ کروں جو ہر وقت اور ہر حال میں دیکھتا ہے اور بعض نے کہا کوئی تحریر سامنے آگئی یا جبرئیل نے آکر روک دیا مگر قرآن شریف نے خود اس دلیل کا ذکر پہلی آیت میں کیا ہے انہ ربی احسن مثوای انہ لا یفلح الظالمون اور یہی وہ برہان رب تھی جس نے حضرت یوسفؑ کو بچا لیا یعنی ان کا کامل ایمان اللہ تعالیٰ پر اور اس کی ربوبیت پر اور اس بات پر کہ ظالم کو فلاح نہیں ملتی۔

۱۵۳۲ شاہد کون تھا: یہ شاہد بعض کے نزدیک ایک چھوٹا بچہ تھا اور بعض کے نزدیک دانا عمر رسیدہ آدمی دونوں قسم کے اقوال ابن کثیر میں اور ابن جریر میں موجود ہیں اس کی گواہی اسی قدر تھی کہ اس نے ایک مضبوط قرینہ کی طرف توجہ دلائی یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرائن کی شہادت بھی مقدمات کے فیصلہ کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم نے بڑی وضاحت سے حضرت یوسفؑ کی بریت یہاں بھی کی ہے اور آگے چل کر بھی، مگر بائبل میں صرف اس قدر ذکر کر کے کہ جب عزیز کی عورت نے اُسے بُلایا تو وہ اپنا پیراہن اس کے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگا" (پیدائش ۲۹: ۱۳) بریت کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ اسی جرم کی بنا پر اسے قید کیا جاتا ہے اور پیراہن چھوڑ کر بھاگنے کا واقعہ اس جرم میں تائیدی شہادت بن جاتا ہے اور اس الزام سے حضرت یوسف کی قطعاً کوئی صفائی نہیں ہوتی۔ یہ کتاب کیونکر اخلاق کی تعلیم سکھا سکتی ہے جس میں ایک پاک انسان پر تہمت کا ذکر کر کے اسے اس تہمت سے بری نہیں کیا جاتا اور اس سے پہلے باب میں اسی کتاب پیدائش میں حضرت یوسف کے ایک بھائی یہوداہ کے متعلق ایک نہایت گندے اور فحش قصے کا ذکر کیا ہے جو اگر کسی ناول میں بھی ہوتا تو اسے پڑھنے کے ناقابل قرار دیا جاتا مگر بائبل باوجود ان گندے قصوں کے کتاب مقدس کہلاتی ہے اور قرآن کریم کو باوجود اس کی اعلیٰ اخلاقی تعلیم کے رد کیا جاتا ہے۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۟ وَاسْتَغْفِرِيْ
لِذَنْۢبِكِ ۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾ ع ۳ ۱۲
وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ
تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ
اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾
فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ
وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ
وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ
عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ
اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا
بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾

یوسفؑ ! اس سے درگزر کر اور (اے عورت !) اپنے قصور کی معافی
مانگ کیونکہ تو خطا کاروں میں سے ہے۔
اور شہر میں عورتوں نے کہنا شروع کیا کہ عزیز کی عورت اپنے غلام کو
اس کے ارادہ سے پھیرنا چاہتی ہے اس کی محبت اس کے دل میں
بیٹھ گئی ہے ہم اسے صریح غلطی میں پاتی ہیں ع۱۵۳۳
جب اُس نے اُن کی چال سُنی ان کو بلوا بھیجا اور ان کے لیے
کھانا تیار کیا اور اُن میں سے ہر ایک کو ایک (ایک)
چھری دی اور (یوسف کو) کہا ان کے سامنے نکل۔
سو جب انھوں نے اسے دیکھا، اسے بہت بڑا سمجھا اور
اپنے ہاتھ کاٹے ۔ اور بول اٹھیں اللہ پاک ہے یہ انسان
نہیں ، یہ تو ایک بزرگ فرشتہ ہے ع۱۵۳۴

ع۱۵۳۳ مدینۃ ۔ مَدَنَ بالمکان کے معنی ہیں مکان میں ٹھہرا اور اسی سے مَدِینۃ ہے جس کے معنی شہر ہیں اور مدینۃ اس قلعہ کو بھی کہتے ہیں جو کسی زمین کے وسط میں بنایا جائے اور اس زمین کو بھی جس میں ایسا قلعہ بنایا جائے اور بالخصوص یہ لفظ نبی کریم صلعم کے شہر پر بولا جاتا ہے اور جب اسکی طرف کسی چیز کو منسوب کیا جائے تو مَدَنِی کہا جاتا ہے اور عام معنی میں مدینۃ کی طرف منسوب ہو تو مَدِینی۔

العزیز۔ عزیز۔ غالب کو کہتے ہیں اور بادشاہ کو اور مصر کے بادشاہوں کا یہ خطاب تھا (ت) مگر یہاں بادشاہ مراد نہیں۔ اس لیے کہ اس کا ذکر لفظ مَلِك میں الگ آتا ہے بلکہ اس کے عظیم الشان امرا میں سے ایک مراد ہے جس کے سپرد کل کاروبار سلطنت کا انصرام معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب یہی حیثیت حضرت یوسف کو ملتی ہے تو پھر اسے اسی خطاب العزیز سے پکارا جاتا ہے۔ بائبل میں اس کا نام فُوطیفار لکھا ہے جو فرعون کا ایک امیر اور لشکر کا رئیس تھا۔

شغف۔ شَغَاف۔ غلافُ القَلْب یا دل کے پردے کا نام ہے اور شغفہا حبا کے معنی ہیں کہ اس کی محبت اس کے دل کے پردے کے نیچے داخل ہو گئی یا اس کے دل پر غالب آگئی (ل)

ع۱۵۳۴ بمکرھنّ۔ مَکْر باریک تدبیر کو کہتے ہیں عورتوں کی گفتگو کو جو انہوں نے عزیز کی عورت کے متعلق کی مکر اس لیے کہا کہ انہوں نے اسے یوسفؑ کے دیکھنے کا حیلہ بنایا اور یا ان کی غیبت اور بُری باتوں کے ذکر کو مکر اس لیے کہا کہ اخفا میں وہ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور ہو سکتا ہے کہ مکر سے مراد یہ ہو کہ انہوں نے کہلا بھیجا ہو کہ ہم ایک تجویز کرتے ہیں جس سے یوسفؑ کو قابو میں لایا جا سکتا ہے اور اسی غرض کے لیے انہیں بلایا گیا ہو۔ اس صورت میں پچھلی آیت کے آخر پر ضلال مبین یا صریح غلطی سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس نے ٹھیک طریق اس غرض کے حصول کا اختیار نہیں کیا۔ مثلاً یہ کہ اسے چاہیئے تھا کہ پہلے یوسفؑ کو کسی اور کی معرفت اس بات پر راضی کر لیتی۔

متکأ۔ تَوَکَّأَ اور اِتَّکَأَ (مادہ وکا ہے) کے معنی ہیں ٹیک لگائی ھی عصای اتوکّؤا علیھا (طٰہٰ ۲۰-۱۸) علی الآرائک متکؤن (یٰس ۳۶-۵۶) اور متکأ تکیہ وغیرہ کو بھی کہتے ہیں اور طعام یا کھانے کو بھی کہتے ہیں اس لیے کہ کھانے کے لیے ٹیک لگائی جاتی تھی اور اس امت کو ٹیک لگا کر کھانے سے منع کیا گیا ہے اور بعض نے متکأ کے معنی مجلس بھی کیے ہیں (ل) اور ترنج بھی اس کے معنی ہیں (غ) اور ان سب کے مطابق ابن جریر میں روایات بھی موجود ہیں۔

سکین۔ سکن سے ہے چھری کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ اس چیز کو جسے اس سے ذبح کیا جائے حالت سکون میں کر دیتی ہے (ل)

اکبرن۔ اَکْبَرتُ الشیءَ کے معنی ہیں رَأَیْتُہٗ کَبِیْرًا اسے بڑا دیکھا (غ)

حاش للہ کے معنی بُعْدًا منہ اور تنزیہ کے طور پر اس کا استعمال ہوتا ہے (غ) یعنی ہر ایک عیب اللہ سے دور ہے۔

عورتوں کا یوسفؑ کو یکایک دیکھ کر جب وہ کھانے میں مصروف تھیں اور اس غرض کے لیے ان کے ہاتھوں میں چھریاں تھیں حیرت زدہ ہو جانا اور اپنے ہاتھوں کو کاٹ لینا کوئی ایسا تعجب انگیز واقعہ نہیں جس کا انکار کیا جائے۔ ہاں ہاتھوں کے کاٹنے سے مراد یہاں یہ نہیں کہ ہاتھ کٹ کر الگ ہو گئے

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

(عزیز کی عورت نے) کہا یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں اور میں نے اسے اس کے ارادے سے پھیرنا چاہا مگر یہ بچا رہا اور اگر جو میں حکم دوں اس نے نہ کیا تو اسے ضرور قید کر دیا جائے گا اور وہ ذلیل لوگوں میں سے ہوگا ۱۵۳۵

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾

(یوسفؑ نے) کہا اے میرے رب! مجھے قید اس سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ مجھے بلاتی ہے اور اگر تو ان کی چال کو مجھ سے نہ پھیرے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤنگا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤنگا ۱۵۳۶

تھے بلکہ چھری سے ان پر زخم ہو جانا مراد ہے اور گو یہ مجاز ہے مگر مفسرین نے بھی عموماً اسی معنی کو ترجیح دی ہے یہاں تک کہ عکرمہ سے ایک معنی مروی ہیں کہ ہاتھوں کو نہیں بلکہ آستینوں کو کاٹ لیا تھا۔ اور مجاز کے رنگ میں ہی یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ حیرت سے اپنے ہاتھوں کو کاٹ لیا جیسا غضب کے وقت انگلیوں کے کاٹنے کا محاورہ ہے عضّوا علیکم الانامل من الغیظ (آل عمران ۳ - ۱۱۹) اور ان کا یہ کہنا کہ یہ بشر نہیں بلکہ فرشتہ ہے صرف حُسنِ صورت کے لحاظ سے نہیں بلکہ عصمت پر مضبوطی کے لحاظ سے یہ لفظ زیادہ موزوں ہیں اور قرینِ قیاس ہے کہ حضرت یوسف نے اس حسن و زینت کے مجمع کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا جس پر انہیں اور بھی زیادہ تعجب ہوا۔ ایک دوسری توجیہ ان الفاظ کی وہ بھی ہو سکتی ہے جس کی طرف لفظ مکر کی تشریح میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی عزیز کی عورت نے ان کو ایک چال کرنے کے لیے بلایا تھا اور وہ تجویز انھوں نے اسے پہلے بتا دی ہوگی اس لیے دعوت کا سامان تیار کر کے چھریاں وغیرہ ان کے ہاتھ میں دیدیں اور یوسفؑ کے نکلنے پر ان سب نے یا بعض نے چھریوں کو عمداً ہاتھوں پر لگا لیا اور پھر یوسفؑ پر زور ڈالا کہ یہ واقعہ تمہارے خلاف بطور شہادت ہو جائے گا ورنہ تم عزیز کی عورت کی بات مان لو۔ اور پھر بھی جب حضرت یوسف نے انکار ہی کیا تو وہ بول اُٹھیں کہ یہ بشر نہیں جو کسی بات کی پروا ہی نہیں کرتا بلکہ فرشتہ ہے اس صورت میں اگلی آیت میں لمتننی فیہ سے مراد ہو گی کہ تم مجھے ملامت کرتی تھیں کہ میں اسے راضی نہیں کر سکی اب تم نے بھی زور لگا کر دیکھ لیا مزید تشریح کے لیے دیکھو ۱۵۳۶ع

ان واقعات کا ذکر بھی بائبل میں نہیں مگر جس مقام عصمت کو حضرت یوسف کے بیان میں ظاہر کرنا مقصود ہے اس کی اصل غرض حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ یہ نہ دکھایا جائے کہ ایک ہی عورت نہیں بلکہ کل شہر کے اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں کی حسین عورتیں حضرت یوسف کو اپنے مقام عصمت سے ایک بال برابر ادھر ادھر نہیں کر سکیں۔ اسی بلند مقام پر ہر مسلم کو پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ سبق بائبل کے قصہ سے نہیں ملتا۔

ع۱۵۳۵ استعصم۔ یعنی اس چیز کو طلب کیا جو اسے بچائے رکھے (غ)، یا حالت عصمت میں رکھے۔

عزیز کی عورت نے حضرت یوسف کو ان سب کے سامنے دھمکی دی کہ اگر وہ اس کی ناجائز خواہش کو پورا نہ کرے گا تو ذلیل کر دیا جائے گا اور قید کر دیا جائیگا اور یہ کہہ کر اس کے بارہ میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں ان کی ہمدردی کو اپنی طرف مائل کیا ہے۔

ع۱۵۳۶ اصب صَبَاءٌ کے معنی ہیں نَزَعَ وَ اشْتَاقَ وَ فَعَلَ فِعْلَ الصِّبْیَانِ یعنی ایک چیز کی طرف کھچا چلا گیا اور مشتاق ہوا اور لڑکوں کا سا کام کیا کیونکہ صَبِیٌّ لڑکے کو کہا جاتا ہے۔

عورتوں کا یوسف پر دباؤ ڈالنا: یہاں ان عورتوں کے سارے مشوروں کا ذکر نہیں جو اس وقت انہوں نے کیے یا جو کچھ حضرت یوسف کو کہا مگر مما یدعوننی الیہ اور کیدھن سے صاف ظاہر ہے کہ ان عورتوں نے حضرت یوسف کو کسی بات کے لیے کہا ہے اور کوئی چال چلی ہے جس سے حضرت یوسف کو سخت فکر ہوا ہے اب بلانے والی ایک نہیں اور نہ چال چلنے والی اکیلی عزیز کی عورت ہے بلکہ یہ عورتیں بھی اس چال میں شامل ہو گئی ہیں اور وہ بھی کسی رنگ میں حضرت یوسف کو اسی بات کی طرف بلاتی ہیں جس کی طرف عزیز کی عورت نے بلایا تھا۔ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ عورتیں عزیز کی عورت کے منشا کو پورا کرنے میں معاون ہو گئیں اور انہوں نے ہاتھوں کے کاٹنے کو اس بات کی طرف منسوب کیا ہے کہ حضرت یوسف نے ان کی عفت پر حملہ کیا ہے اور ان کے ہاتھوں وغیرہ پر اس وجہ سے زخم آ گئے ہیں۔ اس لیے باوجود اس بات کے کہ عزیز اپنی بیوی کے معاملہ میں مطمئن ہو چکا تھا کہ قصور عورت کا ہے حضرت یوسف کو قید کیا جاتا ہے دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف کو جب قید خانہ سے رہائی کا حکم جاتا ہے تو وہ اپنی بریت سے پیشتر اس سے نکلنا پسند نہیں کرتے اور اس بریت کے لیے عزیز کی عورت کی طرف سے بریت نہیں چاہتے بلکہ یوں کہتے ہیں ما بال النسوۃ التی قطعن ایدیھنّ ان ربّی بکیدھنّ علیم (۵۰) ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے میرا رب ان کی چال سے خوب واقف ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ ہاتھ کاٹنے کا واقعہ یا تو فی الواقع کوئی چال تھی۔ یا اسے بطور ایک چال کے استعمال کیا گیا۔ اور ان عورتوں کا جواب ما علمنا علیہ من سوء (۵۱) ہم نے یوسفؑ میں کوئی بُرائی نہیں

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٤﴾

سو اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور ان کی چال کو اس سے پھیر دیا وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿٣٥﴾ ع ٤

پھر اس کے بعد کہ نشانیاں دیکھ چکے تھے، انھیں یہ سُوجھا کہ اسے ایک وقت تک قید کر دیں ١٥٣٧

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٣٦﴾

اور اس کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان اور داخل ہوئے ان میں سے ایک نے کہا میں نے اپنے آپ کو شراب نچوڑتے ہوئے دیکھا اور دوسرے نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اُٹھائے ہوئے ہوں جن میں سے پرند کھا رہے ہیں۔ ہمیں اس کی تعبیر بتا، کیونکہ ہم تجھے نیکو کاروں میں سے دیکھتے ہیں ١٥٣٨

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿٣٧﴾

اس نے کہا جو کھانا تمھیں دیا جاتا ہے تمھارے پاس آنا نہیں پائیگا کہ میں اس کی تعبیر تمھیں بتا دوں گا قبل اس کے کہ وہ (کھانا) تمھارے پاس آئے یہ وہ علم ہے جو میرے ربّ نے مجھے سکھایا کیونکہ میں نے اس قوم کے مذہب کو چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت کے منکر ہیں ١٥٣٩

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ

اور میں اپنے بزرگوں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور

پائی۔ یوسُف کی بریت کرتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان کی طرف سے کسی بُرائی کا الزام پہلے دیا گیا تھا۔ قرآن کریم کی یہ صراحت صاف بتاتی ہے کہ اس موقعہ پر ان عورتوں نے یا تو عمداً ہاتھ کاٹے تھے اور یا اگر استعجاب میں ہاتھ کٹ گئے تھے تو اسی واقعہ کو یوسُف کے خلاف ایک نئے الزام کی صورت میں کھڑا کیا گیا۔

معصیت پر قید کو ترجیح: اور اس موقع پر حضرت یوسف کو بتایا گیا کہ عزیز کی عورت کی خواہش کو پُورا کر دو، ورنہ جیلخانہ میں جانا ہوگا۔ اسی پر آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ربّ السّجن احبّ الی ممّا یدعوننی الیہ یعنی قید خانہ کو اختیار کرنا آسان ہے اور معصیّت میں پڑنا مشکل ہے اسی ایمان پر اللہ تعالیٰ ہر مسلم کو قائم کرنا چاہتا ہے کہ معصیت اسے قید سے اور ہلاکت سے بڑی مصیبت معلوم ہو۔

ع ١٥٣٧ آیات یا نشانوں سے مراد حضرت یوسف کی بریت کے نشان ہیں۔ باوجود اس کے کہ قرآن کی شہادت سب حضرت یوسف کے حق میں تھی مگر چونکہ معاملہ قومی تھا اس لیے حضرت یوسف کو قید کر دیا۔

ع ١٥٣٨ دونوں قیدی جب حضرت یوسف کے پاس رہ کر نیکی کو دیکھتے ہیں تو اپنی خوابیں آپ کے پاس بیان کرتے ہیں۔

ع ١٥٣٩ چونکہ انہوں نے خود کہا تھا کہ ہم آپ کو احسان کرنے والوں میں سے دیکھتے ہیں اس لیے حضرت یوسف نے اوّل ان کو نصیحت شروع کی کہ شاید وہ بھی اصلاح کی راہ پر آ جائیں۔ بائبل میں یہ حصّہ پھر مفقود ہے اور صرف خوابوں اور خوابوں کی تعبیر کا ذکر ہے ایک ایک قدم پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے کس طرح حضرت یوسف کے ذکر کو مفید نصائح سے بھر دیا ہے حالانکہ بائبل میں یہ ایک خشک کہانی ہے اور یوں بتا دیا ہے کہ زنداں کے پتھر کی دیواریں بھی انسان کو نیکی سے نہیں روک سکتیں جو اس کی زندگی کی اصل غرض ہے اور یہ جو شروع میں کھانے کا ذکر کیا ہے تو مراد یہ نہیں کہ کھانے کی کیفیت بتا دوں گا بلکہ تاویلہ سے مراد خواب کی تعبیر ہی ہے جو انہوں نے دریافت کی ہے۔ مگر چونکہ آپ ان کو کچھ وعظ کرنا چاہتے تھے اور دنیادار وعظ سے جلد اُکتا جاتے ہیں اس لیے فرمایا کہ تمہارا بڑا کام تو اب کھانے سے پیٹ بھرنا ہے۔ سو اس سے پہلے پہلے میں تمہیں تعبیر بھی بتا دوں گا اور نصیحت کو بھی ختم کر دوں گا۔

وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَآ أَن نُّشْرِكَ بِاللَّهِ
مِن شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِن فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا
وَعَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٨﴾

یعقوبؑ کے مذہب کا پیرو ہوں، ہمارا کام نہیں کہ کسی چیز کو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائیں۔ یہ ہم پر اور لوگوں پر اللہ کا فضل ہے، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ؏۱۵۴۰

يَٰصَٰحِبَيِ السِّجْنِ ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ
خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾

اے میرے قید خانہ کے دو ساتھیو! کیا الگ الگ خداوند اچھے ہیں یا اللہ (جو) اکیلا سب پر غالب (ہے) ؏۱۵۴۱

مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِۦٓ إِلَّآ أَسْمَآءً
سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُم مَّآ أَنزَلَ اللَّهُ
بِهَا مِن سُلْطَٰنٍ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ
أَلَّا تَعْبُدُوٓا۟ إِلَّآ إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ
وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٠﴾

اسے چھوڑ کر تم صرف ناموں کی پوجا کرتے ہو، جو تم نے اور تمھارے بزرگوں نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ حکم اللہ کے سوا اور کسی کا نہیں، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو یہ سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ؏۱۵۴۲

يَٰصَٰحِبَيِ السِّجْنِ أَمَّآ أَحَدُكُمَا فَيَسْقِى
رَبَّهُۥ خَمْرًا ۖ وَأَمَّا الْءَاخَرُ فَيُصْلَبُ
فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِن رَّأْسِهِۦ ۚ قُضِىَ
الْأَمْرُ الَّذِى فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ ﴿٤١﴾

اے میرے قید خانہ کے دو ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور دوسرا صلیب دیا جائے گا، تو پرند اس کے سر سے (نوچ کر) کھائیں گے اس بات کا فیصلہ ہو چکا جس کے متعلق تم دریافت کرتے ہو۔

وَقَالَ لِلَّذِى ظَنَّ أَنَّهُۥ نَاجٍ مِّنْهُمَا
اذْكُرْنِى عِندَ رَبِّكَ فَأَنسَىٰهُ الشَّيْطَٰنُ
ع ۵ ۱۵ ذِكْرَ رَبِّهِۦ فَلَبِثَ فِى السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ ﴿٤٢﴾

اور اُسے جس کے متعلق اسے خیال تھا کہ وہ ان دونوں میں رہائی پا جائیگا کہا میرا ذکر اپنے آقا کے پاس کرنا، مگر شیطان نے اسے اپنے آقا کے پاس ذکر کرنا بھلا دیا سو (یوسفؑ) کئی سال قید خانہ میں پڑا رہا ؏۱۵۴۳

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّىٓ أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَٰتٍ

اور بادشاہ نے کہا میں نے سات موٹی گائیں دیکھی ہیں، انھیں

؏۱۵۴۰ یہاں صرف اصل اصول مذہب کا ذکر ہے یعنی توحید باری جو سب مذاہب میں یکساں ہے پس مراد یہ ہے کہ جو اصول ان کے مذہب کے ہیں وہی میرے مذہب کے اصول ہیں۔

؏۱۵۴۱ گویا شرک کرنے والا مختلف آقاؤں کی غلامی اختیار کرتا ہے اور مختلف آقاؤں کا غلام کبھی خوشحال نہیں ہو سکتا اللہ سب پر غالب ہے پس جو اس کی غلامی اختیار کرتا ہے اسکو اور کسی کی احتیاج نہیں رہتی۔

؏۱۵۴۲ اسماء سے مراد یہاں صرف الفاظ ہیں جن کے نیچے حقیقت کوئی نہیں ان الحکم الا للہ میں بتایا کہ وہی حکم درست ہے جو اللہ دے اور اللہ نے آج تک اپنے کسی نبی کے ذریعہ سے یہ حکم نہیں دیا کہ خدا تعالےٰ کے سوائے اوروں کی بھی پرستش کرو۔ بلکہ وہ ہمیشہ ہی حکم دیتا رہا ہے کہ اللہ کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو۔

؏۱۵۴۳ ذکر ربہ میں اضافت ادنیٰ ملابست ہے اور مراد ہے ذکر یوسف عند ربہ یہ درخواست استعانت غیر اللہ میں داخل نہیں بلکہ چونکہ انہوں نے آپ کی نیکی کو دیکھ کر خود اعتراف کیا تھا اس لیے آپ نے یہی چاہا کہ یہی شہادت حقہ وہ بادشاہ کے دربار میں بھی ادا کر دے تا اسے معلوم ہو جائے

سِمَانٍ يَّأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾

سات دُبلی (گائیں) کھا گئی ہیں - اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی ، اے درباریو! میرے خواب کی تعبیر بتاؤ ، اگر تم خواب کی تعبیر کر سکتے ہو ؟ ۱۵۴۴

قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

انھوں نے کہا پریشان خواب ہیں - اور ہمیں (ایسے) خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں ۱۵۴۵

وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

اور جو ان دونوں (قیدیوں) میں سے رہا ہوا تھا اس نے کہا اور ایک مدت کے بعد اُسے یاد آیا میں تمھیں اس کی تعبیر بتاؤنگا مجھے بھیجو۔ ۱۵۴۶

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

یوسفؑ ! اے صدیق ! ہمیں سات موٹی گائیوں کی تعبیر بتاؤ ، جنھیں سات دبلی (گائیں) کھا گئی ہیں - اور سات ہری بالیں اور دوسری سوکھی - تاکہ میں لوگوں کے پاس واپس جاؤں تاکہ وہ جان لیں -

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا

(یوسفؑ نے) کہا تم حسب معمول سات سال کھیتی کرو گے ، تو جو کچھ کاٹو اسے اپنے خوشہ میں ہی رہنے دو ، سوائے تھوڑے

کہ یوسف پر ناحق الزام لگایا گیا ہے۔

۱۵۴۴ سمان سَمِین کی جمع ہے اور سِمَن ھُزال کی ضد ہے یعنی فربہی اور لاغری - اور اَسْمَنَ کے معنی اسے موٹا کر دیا لایسمن ولا یغنی من جوع - (الغاشیۃ ۸۸-۷) اور سَمْن گھی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ موٹا کرتا ہے (غ)

عجاف - اعجف اور عجفاء کی جمع ہے ، جو ہُزال سے بہت پتلا ہو گیا ہو۔

خضر - اَخْضَر کی جمع ہے - سبز - یابس - یَبُس سے ہے جس کی رطوبت جاتی رہی ہو (غ)

تعبرون - عَبْر کے معنی ہیں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف تجاوز - پھر پانی پر سے گزرنے سے عُبُور مخصوص ہے اور تَعْبِیْر رویا سے خاص ہے (اور رویا کے لیے تاویل کا لفظ بھی بولا جاتا ہے مگر یہ عام لفظ ہے دوسری جگہ بھی بولا جاتا ہے) گویا رویا کے ظاہر سے باطن کی طرف گزرنا ہے عبرۃ وغیرہ کے لیے دیکھو ع ۳۸۴

۱۵۴۵ اضغاث - ضِغْث کی جمع ہے - اور ضَغْث ایک چیز کے ایک حصّہ کو دوسرے حصّہ سے ملا دینا ہے اور ضغث الحدیث کے معنی ہیں بات کو خلط ملط کر دیا - اس لیے ایسی خوابیں جو بوجہ پریشانی کے ایک دوسرے سے مل گئی ہوں ان کو اضغاث کہا جاتا ہے - جن کی اختلاط کی وجہ سے تعبیر نہیں ہو سکتی (ل)

احلام - حِلْم کے معنی ہیں غضب کے ہیجان سے نفس اور طبیعت کا ضبط میں رکھنا اور اس کی جمع بھی اَحْلام آتی ہے امتا مرھم احلامھم بھذا (الطور ۵۲-۳۲) جہاں مراد عقل ہے گو حِلْم کے اصل معنی عقل نہیں اور حُلْم اور حُلُم کی جمع بھی اَحلام ہے جس کے معنی خواب ہیں اور حُلُم بلوغت کو بھی کہتے ہیں واذا بلغ الاطفال منکم الحلم (النور ۲۴-۵۹) اور حُلم بمعنی خواب اور رؤیا میں فرق یہ ہے کہ ابتداً زبان عرب میں دونوں خواب پر بولے جاتے تھے مگر شارع علیہ السلام نے رویا کو اچھے خواب سے اور حلم کو بُرے خواب سے مخصوص فرما دیا جیسا کہ فرمایا الرُّؤیا من اللہ والحلم من الشیطان رویا اللہ کی طرف سے ہے اور حلم شیطان کی طرف سے ہے اور اسی سے احتلام ہے (ل) یہی فرق قرآن کریم نے بھی رکھا ہے کیونکہ بادشاہ اپنے خواب کو رویا کہتا ہے اور اہل دربار اسے احلام قرار دیتے ہیں۔

۱۵۴۶ ادّکر - اصل میں اِذْتکر ہے یعنی ذِکْر سے باب افتعال - تا دال سے بدلگئی اور ذال اس میں مدغم ہو گئی۔

مِّمَّا تَأْكُلُونَ ﴿٤٧﴾
کے جس سے تم کھاؤ[۱۵۴۷]

ثُمَّ يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ
يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا
مِّمَّا تُحْصِنُونَ ﴿٤٨﴾

پھر اس کے بعد سات سخت (سال) آئیں گے وہ سب کچھ کھا جائیں گے جو تم نے ان کے لیے پہلے جمع کیا ہے، مگر تھوڑا، جو تم بچا لو گے[۱۵۴۸]

ثُمَّ يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ
يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿٤٩﴾ ع

پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا، جس میں لوگوں پر مینہ برسایا جائے گا اور اس میں وہ (انگور) نچوڑیں گے[۱۵۴۹]

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ
الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ
مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ
إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ﴿٥٠﴾

اور بادشاہ نے کہا اُسے میرے پاس لے آؤ، سو جب ایلچی اس کے پاس آیا تو اس نے کہا اپنے آقا کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، میرا پروردگار ان کی چال سے خوب واقف ہے[۱۵۵۰]

ع۱۵۴۷ دأبا دیکھو ع۳۸۱ مفردات میں ہے کہ دَأَب کے معنی اِدَامَۃُ السَّیْرِ ہیں یعنی ہمیشہ چلتے رہنا۔ وسخر لکم الشمس والقمر دائبین (ابراھیم ۱۴۔ ۳۳) پس دَأَب سے مراد عادت مستمرہ ہے (رغ)

حضرت یوسف تعبیر کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ اس لیے جب سات موٹی گائیوں اور سات سبز خوشوں کی تعبیر ان الفاظ سے کی کہ سات سال حسب معمول کھیتی کرو گے یعنی فصلیں اچھی لگیں گی تو ساتھ ہی بتا دیا کہ جتنا کھانے کی ضرورت ہو اسے نکال کر باقی کو خوشوں میں چھوڑ دو اس کی غرض یہ تھی کہ تا کیڑے سے محفوظ رہے اور خراب نہ ہو جائے۔

ع۱۵۴۸ یہ سات دُبلی گائیوں کی تعبیر ہے جو موٹی گائیوں کو کھا گئیں اور سات خشک خوشوں کی۔ اور قلیل جو محفوظ رکھا ہے وہ بیج وغیرہ کے لیے ہے۔

بخاری میں سورۂ یوسف کی تفسیر میں اس موقعہ پر وہ حدیث لکھی ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ نبی کریم صلعم کی دعا سے قریش پر سات سال قحط کے آئے قال اللّٰھم اکْفِنِیْھِم بِسَبْعٍ کَسَبْعِ یوسف یعنی نبی کریم صلعم نے دعا کی کہ اے اللّٰہ ان پر سات سال کا قحط بھیجکر جیسے یوسُف کے وقت میں سات سال کا قحط پڑا تھا مجھے ان کی شرارتوں سے بچا۔ چنانچہ اس دعا کا اثر یہ لکھا ہے فاصابتھم سَنَۃٌ حَصَّتْ کُلَّ شَیْءٍ حَتّٰی اَکَلُوا الْعِظَام حتی جَعَل الرجل یَنْظُرُ الی السماءِ فیری بَیْنَہٗ وبَیْنَھا مِثْلَ الدُّخان۔ یعنی ان پر ایسا قحط پڑا جس نے سب چیزوں کو برباد کر دیا یہاں تک کہ لوگوں نے ہڈیاں کھا کر گزارہ کیا اور ایک شخص آسمان کی طرف دیکھتا تو اپنے اور اس کے درمیان دھواں سا دیکھتا۔ چنانچہ یہ پیشگوئی قرآن شریف میں دوسری جگہ موجود ہے فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین (الدخان ۴۴۔ ۱۰) اس حدیث کو سورۂ یوسف کی تفسیر میں لانے کا صاف منشاء یہ ہے کہ سورۂ یوسف میں بھی آنحضرت صلعم کا ہی ذکر ہے اور یہی منشا ان الفاظ کا ہے آیات للسائلین جو شروع سورت میں ہیں۔

ع۱۵۴۹ عام کے معنی سال ہیں جس طرح سَنَۃ کے معنی سال ہیں لیکن سَنَۃ کا استعمال زیادہ تر ایسے سال پر ہے جس میں خشکی اور شدت ہو اور عام کا اس پر جس میں بارش اور ارزانی ہو۔

یغاث۔ دیکھو ع۱۲۰۸ غَوْث مدد ہے اور غَیْث بارش اور مدد دینے پر اَغاث کہا جاتا ہے اور بارش برسانے پر غَاثَ (رغ)

یہ محض خوشخبری کے طور پر ہے کہ قحط کے سات سال ختم ہو کر پھر بارش ہو گی اور حدیث میں ہے کہ جب سات سال قحط کے قریش پر گزرے تو ابو سفیان آنحضرت صلعم کے پاس آیا اور کہا کہ آپ کی قوم کے لوگ بھوک سے مر رہے ہیں تب نبی کریم صلعم نے دعا کی اور بارش ہوئی اسی کی طرف اشارہ کرنے کو یہاں آخر پر بارش کے سال کا ذکر کیا۔

ع۱۵۵۰ بال۔ شان یا وہ حال ہے جس کی پروا کی جائے حدیث میں کل امر ذی بال اہم امور یا معاملات کو کہا گیا ہے۔ اس لفظ کو اختیار کرنے میں یہ توجہ دلانا مقصود ہے کہ یہ معاملہ ایسا تھا کہ جس کے صاف کرنے کو حضرت یوسف اہمیت دیتے تھے۔

بائبل حضرت یوسف کو الزام سے پاک نہیں کرتی: بائبل میں یہ ذکر بھی موجود نہیں۔ بلکہ صرف اس قدر ہے کہ جب فرعون نے یوسُف کو خواب کی تعبیر کے لیے بلوایا تو حضرت یوسف فوراً حاضر ہوئے اور بادشاہی دربار میں آ گئے۔ برخلاف اس کے قرآن شریف اس حصّہ کا ذکر کر کے یہ بتاتا ہے کہ خدا پرست کی نگاہ میں دنیوی وجاہت کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ حضرت یوسف جانتے تھے کہ ان کے خواب کی تعبیر کی وجہ سے بادشاہ ان کی عزت کرے گا مگر وہ قید خانہ

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾

(بادشاہ نے) کہا، کیا معاملہ تھا جب تم نے یوسفؑ کو اپنے ارادے سے پھیرنا چاہا انھوں نے کہا اللہ پاک ہے ہم نے اس میں کوئی بدی معلوم نہیں کی، عزیز کی عورت نے کہا اب حق کھل گیا، میں نے ہی اسے اس کے ارادے سے پھیرنا چاہا اور یقیناً وہ سچوں میں سے ہے ع۱۵۵۱

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾

(یوسفؑ نے) کہا یہ اس لیے ہے کہ وہ جان لے کہ میں نے پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی اور کہ اللہ خیانت کرنیوالوں کی چال کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتا ع۱۵۵۲

سے نکلنا بھی پسند نہیں کرتے جب تک کہ اس الزام سے تمام لوگوں کی نظر میں پاک نہ ہو جائیں جو الزام لگا کر انہیں قید خانہ میں ڈالا گیا تھا۔ حضرت یوسف کا ان عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کے معاملہ کو اس قدر وقعت دینا بتاتا ہے کہ یہی ان کے خلاف بڑی بھاری گواہی تھی۔

بخاری میں اس موقعہ پر تفسیر میں ہے ولو لَبِثْتُ فی السِّجْنِ ما لَبِثَ یُوسُفُ لاَجَبْتُ الداعی یعنی اگر میں قید خانہ میں اسی طرح رہتا جس طرح یوسفؑ رہا تو میں بلانے والے کی بات کو مان لیتا۔ اس کا مطلب صرف حضرت یوسف کے اس فعل کی عزت ہے کہ کس قدر اپنی عفت کے معاملہ کو انہوں نے صاف کرنا چاہا اور قید خانہ کو الزام سے ملوث رہنے پر ترجیح دی۔ رہا یہ کہ آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ میں ہوتا تو قید خانہ میں نہ رہتا۔ تو وہ دوسرے نقطۂ خیال سے ہے اس لیے کہ آپ کا کام حضرت یوسف کے کام کے مقابل میں اتنا بڑا تھا کہ آپ کو ان باتوں کی پروا نہ تھی کہ لوگ کیا کہتے ہیں آپ کے مدنظر صرف دوسروں کی اصلاح کا عظیم الشان کام تھا۔ اگر اتنا بڑا کام حضرت یوسف کے سپرد ہوتا تو وہ بھی الزام کی پروا نہ کرتے۔ ہاں یہ مرتبہ اس سے بھی بلند تر ہے۔ رہا تہمت سے بچنے کا معاملہ سو آنحضرت صلعم کی یہی تعلیم ہے کہ تہمت کے موقعوں سے بچو اور خود آپ جب اپنی بی بی کے ساتھ کسی موقعہ پر کھڑے تھے اور پاس سے ایک صحابی کا گزر ہوا تو آپ نے اسے بلایا اور فرمایا کہ یہ میری بیوی ہے اور فرمایا کہ شیطان انسان کے دل میں طرح طرح کے وساوس ڈالتا رہتا ہے۔

ع۱۵۵۱ خطب دیکھو ع۱۴۶۳ اور خَطْب امر عظیم کو کہتے ہیں جس میں ایک دوسرے سے بہت خطاب ہو (غ)۔ حَصْحَصَ۔ حَصّ کے معنی ہیں قطع کرنا چنانچہ حِصّہ وہ ہے جو کل سے کاٹ دیا جائے اور حَصّ اور حَصْحَصَ کے معنی ہیں ایک امر بالکل کھل گیا اور جس چیز نے اسے مغلوب کیا ہوا تھا وہ دور ہو گئی (غ)

ہاتھوں کا کاٹنا یوسفؑ کے خلاف سازش تھی: بادشاہ نے ان عورتوں سے یہ یوں خطاب کیوں کیا کہ کیا بات تھی جب تم نے یوسفؑ کو ورغلانا چاہا۔ اس کی وجہ دو معلوم ہوتی ہیں، اوّل حضرت یوسف کی راستبازی کا اثر جو ان پر اپنے مصاحب کے بیان سے ہوا اور خود اس خواب کی تعبیر میں جس علم کا اظہار ہوا اس نے بھی سب لوگوں کی گردنیں یوسفؑ کے سامنے جھکا دیں۔ دوسرے حضرت یوسف نے قید خانہ سے بادشاہ کو جو کچھ کہلا بھیجا اس میں یہ بھی لفظ تھے کہ ان عورتوں کا ہاتھ کاٹنا ان کا کید یا چال تھی جو میرے خلاف انہوں نے کی اور گو لوگوں کی نظروں سے وہ مخفی رہی مگر اللہ تعالیٰ تو اسے خوب جانتا تھا۔ یوسفؑ کے یوں کہلا بھیجنے سے بھی بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ یہ سب یوسفؑ کے خلاف ایک سازش کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ عورتوں نے اس بات کو محسوس کر کے کہ یوسفؑ کی راستبازی اب کھل چکی ہے اور یہ بھید بھی چھپا نہیں رہ سکتا صاف اقرار کیا کہ یوسفؑ نے ہرگز ان کے متعلق کسی قسم کا برا ارادہ نہیں کیا۔ تب عزیز کی عورت بھی بول اٹھی کہ سچائی پر جتنے پردے ڈالے گئے تھے وہ اب دور ہو گئے جس سے معلوم ہوا کہ قطع ید کے ذریعہ سے یوسفؑ کی سچائی پر پردہ ڈالا گیا تھا۔

ع۱۵۵۲ بظاہر یہ کلام عزیز کی عورت کے کلام کے سلسلہ میں ہے۔ اور اس سے اگلی آیت کا مضمون بھی۔ مگر اس پر یہ صادق نہیں آتا۔ اور مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ کلام حضرت یوسف کا ہے اور عموماً مفسرین اسی طرف گئے ہیں عزیز کی عورت یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ میں نے پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی۔ خیانت کر کے تو اس نے اسے قید خانہ میں ڈلوایا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحقیقات میں تو آخر ایک وقت لگتا تھا۔ تو لوگوں نے حضرت یوسف کو کہا ہو گا کہ تم خواہ مخواہ کیوں قید خانہ میں پڑے ہوئے ہو، جس پر انہوں نے یہ فرمایا کہ تا بادشاہ کو علم ہو جائے کہ میں نے اس کی یعنی عزیز کی خیانت نہیں کی۔ اور یا اخنہ میں ضمیر بادشاہ کی طرف ہی لی جائے تو بادشاہ کی خیانت سے بھی مراد عزیز کی خیانت ہی ہو گی کیونکہ اتنے بڑے عہدیدار شاہی کی خیانت بادشاہ کی ہی خیانت تھی۔ اور ہدایت سے مراد یہاں منزل مقصود پر پہنچانا ہے دیکھو ع۵۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۵۳﴾

اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں ٹھیراتا، کیونکہ نفس تو یقیناً بدی کا حکم دیتا رہتا ہے، مگر جس پر میرا رب رحم کرے، میرا رب حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے[۱۵۵۳]

وَقَالَ الۡمَلِکُ ائۡتُوۡنِیۡ بِہٖۤ اَسۡتَخۡلِصۡہُ لِنَفۡسِیۡ ۚ فَلَمَّا کَلَّمَہٗ قَالَ اِنَّکَ الۡیَوۡمَ لَدَیۡنَا مَکِیۡنٌ اَمِیۡنٌ ﴿۵۴﴾

اور بادشاہ نے کہا اُسے میرے پاس لے آؤ، میں اسے اپنے لیے خاص کرلوں، پس جب اس سے گفتگو کی، کہا آج تو ہمارے ہاں صاحب مرتبہ امین ہے[۱۵۵۴]

قَالَ اجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ ۚ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ ﴿۵۵﴾

(یوسفؑ نے) کہا مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کردو، میں نگہبان خبردار ہوں[۱۵۵۵]

وَکَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنۡہَا حَیۡثُ یَشَآءُ ؕ نُصِیۡبُ بِرَحۡمَتِنَا مَنۡ نَّشَآءُ وَلَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۵۶﴾

اور یوں ہم نے یوسفؑ کو ملک میں طاقتور بنایا، وہ اس میں جہاں چاہتا اختیار رکھتا تھا، ہم اپنی رحمت سے جسے چاہتے ہیں پہنچاتے ہیں اور ہم احسان کرنیوالوں کا اجر ضائع نہیں کرتے

وَلَاَجۡرُ الۡاٰخِرَۃِ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَکَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿۵۷﴾ ع

اور بلاشبہ آخرت کا اجر اُن کے لیے بہتر ہے جو ایمان لاتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

وَجَآءَ اِخۡوَۃُ یُوۡسُفَ فَدَخَلُوۡا عَلَیۡہِ فَعَرَفَہُمۡ وَہُمۡ لَہٗ مُنۡکِرُوۡنَ ﴿۵۸﴾

اور یوسفؑ کے بھائی آئے، پھر اس کے پاس گئے، تو اُس نے اُن کو پہچان لیا، اور وہ اُسے نہ پہچان سکے[۱۵۵۶]

۱۵۵۳ راستبازوں کا طریق: یہ آیت بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ یہ عزیز کی عورت کا کلام نہیں۔ حضرت یوسف نے جب اس قدر اپنی بریت پر زور دیا تو یہ خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ آپ اپنی بریت کو اس طرح قائم کرنے میں گویا اپنے لیے اس مرتبہ کا دعویٰ کرتے ہیں جو کبھی کسی راستباز نے نہیں کیا کہ میرا نفس ایسا پاک ہے کہ اس سے نافرمانی ہوسکتی ہی نہیں۔ اس لیے آپ نے ساتھ ہی اس طرف توجہ دلائی کہ یہ محض اللہ کے فضل سے ہے کہ اس نے مجھے اس قدر بدی سے دور رہنے کی توفیق دی یہ کوئی میرے نفس کی خوبی نہیں۔ کیونکہ نفس انسانی تو سب انسانوں کا یکساں ہی ہے اور اس کی پہلی حالت یہی ہوتی ہے کہ وہ بدی کا حکم کرتا رہتا ہے۔ ہاں جن پر اللہ کا رحم ہوتا ہے ان کا نفس یا پہلے سے ہی سدھرا ہوا ہوتا ہے جیسے انبیاء کی حالت ہیں کہ وہ معصوم ہوتے ہیں اور بعض اولیاء کی حالت ہیں کہ وہ محفوظ ہوتے ہیں اور یا بعد میں اصلاح پر آجاتا ہے انسان کی پہلی یعنی حیوانی حالت کا نام یہاں نفس امّارہ رکھا ہے گویا ابھی حیوانیت اس پر غالب ہے۔ دوسری حالت کا نام نفس لوّامہ ہے یعنی اس حالت میں اگر کبھی ارتکاب معصیت کا ہو جائے تو نفس ملامت کرتا ہے اور معصیت پر راضی نہیں ہوتا اور تیسری کا نام نفس مطمئنہ اور یہ کامل اصلاح کی حالت ہے جب انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں پر چلتا ہے۔

۱۵۵۴ استخلص۔ اِسۡتَخۡلَصَ اور اَخۡلَصَ ایک معنی میں آتے ہیں۔ اَخۡلَصَہٗ اِخۡتَارَہٗ یعنی اسے اختیار کرلیا یا چن لیا (ل) اور خلصوا نجیّا (۸۰) میں خَلَصُوا کے معنی ہیں انفردوا خالِصِینَ عن غیرِھم (غ) یعنی الگ ہوگئے ایسی حالت میں کہ دوسرا کوئی ان سے ملا ہوا نہ تھا۔

مکین کے معنی ہیں بَیِّنُ الۡمَکَانَۃِ یعنی جس کا مرتبہ اور عزت واضح ہو (ل) اور ذی قوۃ عند ذی العرش مکین (التکویر۔ ۲۰) میں مکین کے معنی کیے ہیں مُتَمَکِّنٌ ذی قَدۡرٍ و مَنۡزِلَۃٍ (غ) یعنی قدر و مرتبہ والا۔

۱۵۵۵ حضرت یوسف کا مصر پر مالی تصرّف: حضرت یوسف کی جب بادشاہ نے خود عزت افزائی کی تو انہوں نے ملک کے خزانوں یعنی مالی حالت کا انتظام اپنے لیے طلب کیا اس لیے کہ آنے والے قحط کے مقابلہ پر اس کی ضرورت تھی کہ مالی انتظام امین اور سمجھ دار ہاتھوں میں ہوتا اسی کی طرف حفیظ اور علیم میں توجہ دلائی ہے دینداری اور راستبازی اس کا نام نہیں کہ تسبیح لیکر دنیا سے الگ ہو کر بیٹھ رہے بلکہ دنیا کے کاروبار کو اور خدمات ملکی کو امانت کے ساتھ سرانجام دینا بھی اعلیٰ درجہ کی راستبازی ہے۔ بائبل میں اس موقعہ پر ہے کہ بادشاہ نے حضرت یوسف کو کل اختیارات حکومت دیدیئے تھے قرآن شریف نے اجعلنی علٰی خزائن الارض فرمایا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مالی تصرف ہی اصل حکومت ہے آج یورپ کی طاقتیں جب کسی سلطنت کو دبانا چاہتی ہیں تو پہلے اس کے مالی معاملات میں دخل دینا شروع کرتی ہیں جس کی ابتدا قرضہ دینے سے ہوتی ہے۔

۱۵۵۶ بہت سے درمیانی واقعات کو چھوڑ دیا ہے فراخی کے سات سال گزر جاتے ہیں اور قحط شروع ہوتا ہے غلہ کی تلاش میں یوسفؑ کے بھائی بھی مصر میں آتے

وَ لَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ
بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ
اُوْفِي الْكَيْلَ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝٥٩

اور جب انھیں ان کے سامان سے تیار کر دیا، کہا اپنے اس بھائی کو
بھی میرے پاس لاؤ جو تمھارے باپ کی طرف سے ہے کیا تم نہیں دیکھتے
کہ میں ماپ بھی پورا دیتا ہوں اور اچھی طرح اتارتا ہوں ع١٥٥٧

فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ
عِنْدِيْ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ ۝٦٠

لیکن اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو تمھیں میرے پاس سے
(غلّہ کا) ماپ نہ ملے گا اور میرے پاس نہ آؤ۔

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ۝٦١

انھوں نے کہا ہم اس کے باپ کے ارادے کو پھیرینگے اور ہم (یہ) کر کے ہی رہیں گے۔

وَ قَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ
لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝٦٢

اور اس نے اپنے نوکروں سے کہا ان کا سرمایہ ان کی بوریوں میں رکھ دو
کہ جب وہ اپنے گھر والوں کی طرف واپس جائیں تو اسے پہچان لیں
تاکہ پھر واپس آئیں ع١٥٥٨

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا
الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا
لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝٦٣

پس جب وہ اپنے باپ کے پاس واپس گئے کہا اے ہمارے باپ!
غلّہ ہم سے روک دیا گیا اس لیے ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج
کہ ہم غلہ لائیں اور ہم اس کے نگہبان ہیں ع١٥٥٩

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى
اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ
اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝٦٤

کہا، کیا میں اس کے لیے تمھارا اعتبار کروں مگر اسی طرح جیسے پہلے اس کے
بھائی کے بارے میں تمھارا اعتبار کیا تھا سو اللہ ہی بہتر نگہبان ہے اور
وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے ع١٥٦٠

وَ لَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ

اور جب انھوں نے اپنا اسباب کھولا اپنے سرمایہ کو اپنی طرف لوٹایا ہوا پایا

ہیں اور حضرت یوسف کے سامنے لائے جاتے ہیں مگر چونکہ آپ محض بچے تھے جب ان سے جدا ہوئے اور حالات میں بہت تغیر آچکا تھا اسلئے وہ آپکو نہ پہچان سکے۔

ع١٥٥٧ جھز۔ جھاز۔ جَھاز۔ وہ سامان وغیرہ ہے جو تیار کیا جائے اور تَجْھِیز اس کا اٹھانا یا بھیجنا ہے۔
کَیل۔ غلہ کے ماپ سے مخصوص ہے دیکھو ع١١٢٠ اس لیے غلہ کے لیے بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔
منزل۔ نُزول کے معنی حلول یا اترنا ہیں اور نَزِیل مہمان۔ نُزل ضیافت یا مہمانی کا سامان ہے اسی لحاظ سے اِنزال مہمان نوازی کرنا ہے اور مُنزِل جو مہمان نوازی کرتا ہے۔

حضرت یوسف نے بات چیت کر کے سب حالات ان سے دریافت کر لیے اس لیے بھائی کو ساتھ لانے کا حکم دیا اور ماپ پورا دینا اور مہمان نوازی کا ذکر بطور احسان جتانے کے نہیں بلکہ اظہار واقعات کے لیے ہے تاکہ وہ دوبارہ آئیں۔ مہمان نوازی عرب کی خاص صفت رہی ہے اس لیے مصر میں حضرت یوسف کی مہمان نوازی کی برابری کوئی نہ کر سکتا تھا۔

ع١٥٥٨ رحال۔ رَحل کی جمع ہے۔ وہ چیز جو سواری کے لیے اونٹ پر رکھی جائے اور کبھی اس سے اونٹ بھی مراد لیا جاتا ہے۔ اور کبھی وہ چیز جس پر منزل میں بیٹھا جائے اور رِحلَة کے معنی ارتحال یا کوچ کرنا ہے رحلة الشتآء والصیف (القریش ١٠٦: ٢)
غلہ کی قیمت واپس کرنے کی غرض یہ تھی کہ وہ لوٹ کر آئیں یہ مراد ہو سکتی ہے کہ اتنے بڑے احسان کو دیکھ کر وہ پھر غلّہ کے لیے اسی طرف رُخ کریں گے اور یہ بھی کہ شاید اس روپے کو واپس کرنے کے لیے آئیں۔

ع١٥٥٩ نَکتَل۔ اصل نکتیل ہے یعنی باب افتعال ہے یا الف سے بدل گئی جو بوجہ التقائے ساکنین گرا دیا گیا۔

ع١٥٦٠ مطلب یہ کہ تم پر اعتبار کروں تو ویسا ہی اعتبار ہو گا جیسا یوسفؑ کے معاملہ میں کیا تھا۔ حفاظت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے یہی راستبازوں کا طریق ہے یوں ان سے سخت اقرار بھی لیا مگر پھر بھی بھروسہ ان پر نہیں بلکہ اللہ پر ہے اسباب سے بھی کام لیتے ہیں مگر ان اسباب کو کامیابی کا مدار نہیں سمجھتے۔ حل کے لیے دیکھو ع٢٦٩

رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ
بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ
اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾

کہا اے ہمارے باپ ہم (اور) کیا چاہتے ہیں یہ ہمارا سرمایہ ہمیں واپس کیا گیا ہے اور ہم اپنے اہل کے لیے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کرینگے اور ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ لائینگے یہ غلہ (جو ہم لائے ہیں) تھوڑا ہے[۱۵۶۱]۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا
مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ
فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا
نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾

اس نے کہا میں اسے ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجونگا جب تک مجھے خدا کا عہد نہ دو کہ تم اسے ضرور میرے پاس لے آؤ گے، سوائے اس کے کہ تم سب ہی گھیر لیے جاؤ۔ پس جب انھوں نے اپنا عہد اسے دیدیا اس نے کہا جو ہم کہتے ہیں اللہ ہی اس کا ذمہ دار ہے[۱۵۶۲]

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ
وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ
اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ
اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾

اور اس نے کہا اے میرے بیٹو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا، اور الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا اور اللہ کے مقابل پر میں تمہارے کچھ بھی کام نہیں آسکتا۔ حکم صرف اللہ کا ہے اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی پر چاہیے کہ سب بھروسا کرنے والے بھروسا کریں[۱۵۶۳]

ع۱۵۶۱ نمیر۔ مِیرۃ طعام کو کہتے ہیں اور مَارَ یَمِیرُ غلہ لایا۔
یسیر۔ یُسْر ضد عُسْر ہے اور یسیر سہل کو کہتے ہیں مگر تھوڑی چیز کو بھی یسیر کہا جاتا ہے (غ) یہاں یہی مراد ہے کہ جو غلہ ہم پہلے لائے ہیں وہ تھوڑا ہے یا قحط کے ایام کے لیے وہ مکتفی نہیں ہوسکتا۔

ع۱۵۶۲ باوجود عہد موکد لے لینے کے آخر پر پھر معاملہ کو سپرد خدا ہی کیا ہے۔ وکیل اصل میں تو وہ ہے جس کے سپرد کوئی معاملہ کیا جائے اور چونکہ جس کے سپرد کوئی معاملہ کیا جاتا ہے وہ اس پر نگہبان بھی ہوتا ہے اس لیے نگہبان معنی کیے گئے ہیں یوں بھی ترجمہ ہوسکتا ہے کہ اللہ ہی ہے جس کے سپرد یہ معاملہ کیا جاتا ہے یحاط بکم سے مراد گھیرے جانا بھی ہوسکتا ہے اور ہلاک ہونا بھی کیونکہ جسے دشمن گھیر لے وہ ہلاک بھی ہو جاتا ہے۔

ع۱۵۶۳ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونے کی نصیحت کی غرض: مفسرین کا زیادہ رجحان اسی طرف ہے کہ حضرت یعقوب نے ان کو نظر لگنے کے خوف سے یہ کہا تھا بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ جب وہ گئے تو یوسف نے ان سے سختی کی اور کہا تھا کہ تم جاسوس ہو (پیدائش ۴۲: ۹) حضرت یعقوب نے خیال کیا ہو کہ اکٹھے داخل ہوں تو پھر حکومت مصر کو شبہات نہ گزریں اور ایسا نہ ہو کہ بادشاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ اس شبہ میں گرفتار ہو جائیں اور یوں بادشاہ کی مہربانی بھی کچھ کام نہ آئے اس لیے انہوں نے داخلہ کے وقت احتیاط کا پہلو اختیار کرنے کی تاکید کی اور اس کی تائید دو اور باتوں سے ہوتی ہے اول یہ کہ جب ان سے اقرار لیا تو وہاں بھی ایک استثنا کیا تھا یعنی فرمایا تھا الّا ان یحاط بکم سوائے اس کے کہ تم سب گرفتار ہو جاؤ۔ اور دوسرے اس سے کہ ساتھ ہی فرمایا ما اغنی عنکم من اللہ من شیٔ اگر اللہ کی طرف سے ضرور کوئی مصیبت تم پر آنے والی ہے تو اس کا علاج تو میں نہیں کرسکتا۔ اور اگلی آیت میں اسی بات کا ذکر کر کے فرمایا انّہ لذو علم لما علّمناہ یعنی اسے کچھ علم بھی تھا جو ہم نے دیا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب کو کسی وحی یا رویا کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ ان پر اس دفعہ کچھ مصیبت آنے والی ہے، لیکن چونکہ پیشگوئی میں تفصیلات سے اطلاع نہیں دی جاتی عموماً اجمالی رنگ میں ایک واقعہ دکھایا جاتا ہے۔ اس لیے آپ کا خیال اس طرف گیا کہ پہلی مرتبہ جو ان پر جاسوسی کا شک ہوا شاید اسی وجہ سے بلا میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ مگر چونکہ یہ خیال محض اجتہاد پر مبنی تھا اس لیے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ اللہ کی طرف سے جو مصیبت آنے والی ہے اسے تو میں دور نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اگلی آیت میں پھر جب ان کے داخلہ کا ذکر کیا کہ وہ عافیت سے شہر میں تو داخل ہو گئے تو ساتھ ہی پھر بڑھایا کہ جو مصیبت آنے والی تھی وہ اس طرح پر دور نہ ہوسکی۔ کیونکہ وہ مصیبت جیسا آگے ذکر آتا ہے اور راہ سے آنے والی تھی۔ حضرت یوسف کے معاملہ میں بھی مصیبت کا کچھ نقشہ حضرت یعقوبؑ کو دکھا دیا گیا تھا اس لیے انہوں نے فرمایا تھا واخاف ان یاکلہ الذئب (۱۳) پیشگوئیوں میں عموماً تعین واقعات کا نہیں ہوتا۔
رہا نظر کا لگنا، سو خوبصورتی کی وجہ سے جیسے نظر ایک کو لگ سکتی ہے ویسے ہی بہتوں کو بھی لگ سکتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر نظر کی احتیاط کی وجہ سے ہوتا تو پہلی مرتبہ کیوں ایسی ہدایت نہ کرتے۔ دس اور گیارہ میں تو ایسا فرق نہیں ہو جاتا واقعات اسی کے موید ہیں، کہ پہلی مرتبہ انہیں ان پر کسی تکلیف کا آنا

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ ۗ
مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا
حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۚ وَإِنَّهُ
لَذُو عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾ ع

اور جب وہ داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے حکم دیا تھا وہ اللہ کے مقابل پر ان کے کچھ بھی کام نہ آسکتا تھا، ہاں یعقوبؑ کے دل میں ایک حاجت تھی جسے اس نے پورا کیا اور بلاشبہ وہ علم والا تھا اس لیے کہ ہم نے اسے علم دیا تھا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ ۖ
قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا
كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٩﴾

اور جب وہ یوسفؑ کے پاس آئے اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی کہا میں تیرا بھائی ہوں، سو اس پر افسوس نہ کر جو یہ کرتے رہے ہیں [۱۵۶۴]

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ
فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا
الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿٧٠﴾

پھر جب اُن کا سامان دے کر تیار کر دیا (ایک نے) پانی پینے کا کٹورا اس کے بھائی کی بوری میں رکھ دیا پھر ایک پکارنے والے نے پکارا، اے قافلے والو! تم تو چور ہو [۱۵۶۵]

نہیں دکھایا گیا۔ دوسری مرتبہ دکھایا گیا اس لیے جو کچھ ان کی سمجھ میں آیا اس کے مطابق نصیحت کر دی مگر پھر بھی صادق راستبازوں کی طرح اس احتیاط پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ بھروسہ تو اللہ پر ہی ہے' اس سے بھی معلوم ہوا کہ صلحا توکل کے یہ معنی نہیں سمجھتے کہ اسباب سے کام نہ لیا جائے۔ یہ بھی یہاں بڑھا دینا ضروری ہے کہ نظر کے لگنے کا ذکر احادیث میں ہے اور نظر لگنا حق ہے بلکہ آج تو جن لوگوں نے مسمریزم کے ادنیٰ کرشموں کو دیکھا ہے وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ نظر بھی کیا کیا عجائبات دکھا سکتی ہے اور کس طرح پر نظر کے ذریعہ سے معمول پر اس قدر اثر ڈالا جا سکتا ہے کہ وہ عامل کے ہاتھ میں مردہ کی طرح ہو جاتا ہے یہ رسول اللہ صلعم کی صداقت پر دلیل ہے کہ کس طرح ہر قسم کے توہمات کو دور کرتے ہوئے ایک بات کو جس کی اصل انسان میں موجود تھی بلا خوف لومۃ لائم بیان کر دیا۔

۱۵۶۴ یعنی اپنے بھائی کو خصوصیت سے اپنے پاس جگہ دی اور اسے علیحدگی میں بتا دیا کہ میں تمہارا بھائی ہوں اس لیے جو کچھ انہوں نے کیا اس پر غم نہ کر۔ یعنی جو معاملہ میرے ساتھ کیا۔ اس پر اب کوئی افسوس نہ کر۔

۱۵۶۵ سقایۃ۔ سَقْی اور اَسْقٰی کے معنی ہیں پینے کو دیا اور اسقاء۔ سَقْی سے زیادہ بلیغ ہے یعنی اسقاء یہ ہے کہ اس کے لیے پینے کی چیز ٹھہرا دے یہاں تک کہ وہ اسے خود لیکر جس طرح چاہے پیئے۔ سقاھم ربھم شرابا طھورا (الدھر [۷۶]۔ ۲۱) واسقیناکم ماء فراتا (المرسلات [۷۷]۔ ۲۷) نسقیکم مما فی بطونھا (المؤمنون [۲۳]۔ ۲۱) اور سِقَایَۃ وہ ہے جس میں پینے کی چیز ڈالی جائے یعنی گلاس یا پیالہ جس میں پانی پیا جائے اور آگے اسی کو صُواع کہا ہے اور صاع ماپنے کا پیمانہ ہوتا ہے پس اسی کو صواع اس لحاظ سے کہا ہے کہ وہی ماپ کا بھی پیمانہ تھا (غ)

عِیر اس جماعت کو کہا جاتا ہے جن کے ساتھ غلہ کے بوجھ ہوں یعنی آدمیوں پر اور اونٹوں پر جن پر بوجھ لدے ہوئے ہوں۔ یہ لفظ بولا جاتا ہے گو اس کا استعمال الگ الگ دونوں پر بھی ہوتا ہے۔

بن یامین کی بوری میں پیالہ رکھنے والے حضرت یوسف نہ تھے: جَعَلَ السقایۃ میں ضمیر کس طرف جاتی ہے؟ مفسرین کا خیال یوسُفؑ کی طرف ہے۔ گویا حضرت یوسف نے خود بوری کے اندر پیالہ رکھا۔ مگر اس پر قرآن شریف کے الفاظ کئی قسم کی مشکلات وارد کرتے ہیں۔ خود ایسی کارروائی کر کے پھر سب لوگوں میں یہ اعلان کرانا کہ یہ قافلہ والے چور ہیں ایتھا العیر انکم لسارقون ایک نبی کے کس طرح شایانِ شان ہو سکتا ہے یہ تو ایک معمولی آدمی بھی کرے تو قابلِ گرفت ہے قرآن شریف میں ہے و من یکسب خطیئۃ او اثما ثم یرم بہ بریئا فقد احتمل بھتانا و اثما مبینا (النساء [۴]۔ ۱۱۲) ایک شخص خود ایک گناہ کرے پھر اس کا الزام دوسرے پر لگائے تو وہ ارتکاب بہتان کرتا ہے۔ مفسرین اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ان کو سارق اس لحاظ سے کہا کہ انہوں نے خود یوسُفؑ کو اپنے باپ سے چرایا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو الزام اہل مصر کے سامنے اعلان ہوا وہ تو یہ تھا کہ تم نے پیالہ چرایا ہے اور اس کے وہ مرتکب نہ تھے۔ اور آخر کار انہی میں سے ایک کی بوری سے اُسے نکال کر اہل مصر کی نظر میں انہیں چور ٹھہرا بھی دیا۔ پس قرآن کریم کا منشا ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت یوسف نے خود وہ پیالہ بوری میں رکھا یا رکھوایا۔ اس سے پہلے جب روپیہ ان کو واپس کیا گیا تو یہ لفظ ہیں کہ اپنے نوکروں کو کہا کہ ان کا روپیہ اُن کی بوریوں میں رکھ دو۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ بوریوں کا بھرنا بھرانا حضرت یوسف کا اپنا کام نہ تھا اور نہ وہ کام آپ کے سامنے ہونا تھا اس لیے اگر پیالہ حضرت

قَالُوْا وَ اَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾
قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ
بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾
قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ
فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾
قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾
قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ
جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾
فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ
اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا

انھوں نے کہا اور وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے تم کیا نہیں پاتے [۱۵۶۶]
انھوں نے کہا ہم بادشاہ کا پیالہ نہیں پاتے اور جو شخص اسے لائے
اس کے لیے ایک اونٹ کا بوجھ (انعام) ہوگا اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ [۱۵۶۷]
انھوں نے کہا اللہ کی قسم تم جانتے ہو ہم اس لیے نہیں آئے کہ ملک
میں فساد کریں اور ہم چور نہیں ہیں [۱۵۶۸]
انھوں نے کہا پھر اس کی کیا سزا ہے اگر تم جھوٹے نکلے۔
انھوں نے کہا اس کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کی بوری میں وہ نکلے وہی
اس کا بدلہ ہوگا، ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں [۱۵۶۹]
تب اس نے ان کے بھائی کے شلیتے سے پہلے ان کے شلیتوں سے
شروع کیا تب اسکے بھائی کے شلیتے سے اسے نکالا اسی طرح ہم نے

یوسف نے رکھوانا ہوتا تو اسی طرح اپنے نوکروں کو حکم دیتے جس طرح روپیہ رکھنے کے لیے دیا تھا اس لیے اس کا رکھنے والا کوئی اور تھا۔ قرآن شریف سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت یوسف کے ساتھ ان کے بھائیوں نے ایک بھاری شرارت کی تھی اسی طرح بن یامین کے ساتھ بھی کی چنانچہ جب حضرت یوسف اپنے آپ کو ان پر ظاہر کرتے ہیں تو یوں فرماتے ہیں هل علمتم ما فعلتم بیوسف و اخیہ (۸۹) اب ظاہر ہے کہ اور کوئی واقعہ بن یامین کے ساتھ ایسا نہیں ہوا جس میں ان کے ساتھ قریبًا قریبًا ویسا ہی سلوک ہوا ہو جیسا یوسف کے ساتھ ہوا تھا۔ صرف یہی ایک واقعہ ہے اور ان کی شرارت کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ انہوں نے چوری کا جھوٹا الزام یوسف پر بھی لگایا قالوا ان یسرق فقد سرق اخ لہ من قبل (۷۷) اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے بھائی یوسف نے بھی چوری کی تھی۔ حالانکہ یہ دونوں جھوٹ تھے گویا بجائے صفائی کی شہادت پیش کرنے کے اور چوری کے الزام کی تائید کا مطلب یہ کہ یہ دونوں بھائی چور ہیں اور حضرت یعقوب سے جب انہوں نے جا کر یہ ذکر کیا کہ تیرے بیٹے نے چوری کی ہے تو انہوں نے اس کا الزام انہی پر دیا بل سوّلت لکم انفسکم امرا (۸۳) جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ تمہاری ہی کوئی شرارت ہے پس اصل واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان بھائیوں میں سے کسی نے محض شرارت کے طور پر پیالہ اٹھا کر بن یامین کی بوری میں رکھ دیا تاکہ یوسف کی طرح وہ بھی حضرت یعقوب کی نظروں سے دور ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ بائبل میں یہی ذکر ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے نوکروں کو پیالہ رکھنے کا حکم دیا تھا مگر بائبل نے قبیح ترین افعال انبیاء کی طرف منسوب کیے ہیں۔ حضرت لوط کی طرف زنا وہ بھی بیٹیوں کے ساتھ، حضرت ہارون کی طرف بت پرستی حضرت سلیمان کی طرف شرک۔ حضرت داؤد کی طرف زنا۔ اور قرآن کریم نے ایسے تمام ناپاک الزامات سے انبیاء علیہم السّلام کی بریت کی ہے اور عصمت انبیاء کا اصول سکھایا ہے اس لیے حضرت یوسف کی طرف ایسا فعل اگر بائبل منسوب کردے تو اس کی معمولی تحریفات میں سے ایک ہے مگر قرآن کریم ایسا نہیں کرسکتا۔

۱۵۶۶ اقبلوا۔ اقبال کے معنی متوجہ ہونا ہیں۔ فاقبل بعضہم علی بعض (الصّٰفّٰت ۳۷: ۵۰)

۱۵۶۷ زعیم۔ زعم کے لیے دیکھو ۶۷۹ ضمانت جو قول سے ہو اور ریاست کو زَعَامَۃ کہا جاتا ہے اور ضامن اور رئیس کو زعیم کہا جاتا ہے اس لیے کہ ان دونوں کے قول میں جھوٹ کا ظن ہوتا ہے (رغ)

صواع الملك کا لفظ خود ظاہر کرتا ہے کہ جو چیز گم ہوئی وہ یوسف کا پیالہ نہ تھا بلکہ شاہی پیالہ تھا۔ اس لیے بھی اس کا تعلق حضرت یوسف سے نہیں، قرین قیاس ہے کہ یہ سونے کا ہو، اس لیے اس پر اتنی تحقیقات بھی ہوئی۔

۱۵۶۸ تاللہ۔ تا کلمہ کے شروع میں قسم کے لیے آتی ہے (رغ) اور اکثر نحویوں کے نزدیک یہ واؤ کا بدل ہے۔ مگر سوائے اللہ کے لفظ کے دوسرے پر نہیں آتی (ر)

۱۵۶۹ جزاؤہ میں ضمیر فعل کی طرف ہے جیسا پچھلی آیت میں یعنی چوری کی سزا یہ ہے فہو جزاؤہ یعنی وہ خود اس کے عوض گرفتار کیا جائے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ پہلے یہ دریافت کرتے ہیں کہ تمہارا گم کیا ہوا ہے تو جب یہ علم ہو جاتا ہے کہ یہ پیالہ کے لیے ہی آئے ہیں تب سزا یہ بتاتے ہیں کہ جس کی بوری میں ہو وہ پکڑا جائے کیونکہ جانتے تھے کہ بن یامین کی بوری میں ہے

لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾

یوسفؑ کے لیے ارادہ کیا وہ اپنے بھائی کو شاہی قانون کے مطابق لے نہ سکتا تھا، سوائے اس کے جو اللہ چاہے ہم جس کے چاہتے ہیں درجے بلند کرتے ہیں اور ہر ایک علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے ۱۵۷۰

قَالُوْۤا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾

انھوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے تو پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی، سو یوسفؑ نے اُسے اپنے دل میں چھپایا اور اسے اُن پر ظاہر نہ کیا۔ کہا تم بُری حالت کے لوگ ہو اور اللہ بہتر جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو ۱۵۷۱

قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

انھوں نے کہا اے عزیز اس کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے تو ہم میں سے ایک کو اس کی جگہ رکھ لے ہم تجھے نیکو کاروں میں سے دیکھتے ہیں

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا

اس نے کہا اللہ کی پناہ کہ ہم کسی اور کو پکڑیں مگر جس کے پاس

ع۱۵۷۰ اوعیۃ ۔ وِعَاء کی جمع ہے ۔ اور وَعیٰ کے معنی ہیں کسی بات کا یاد رکھنا وتعیھا اذنٌ واعیۃ (الحاقۃ ۶۹ - ۱۲) اور اِیْعاء کے معنی ہیں سامان کا وِعَاء میں محفوظ کر لینا جمع فاوعیٰ (المعارج - ۱۸) (غ) اور وِعَاء وہ برتن ہے جس میں کوئی چیز محفوظ کی جائے۔

کِدنا ۔ کاد بمعنی اراد کے لیے دیکھو ع۹۷ یہاں یہی معنی ہیں۔

دین ۔ کے معنی شریعت دیکھو ع۳ اسی لحاظ سے یہاں قانون کے معنی میں استعمال ہوا ہے قتادہ سے حکم اور قضا معنی مروی ہیں۔

بن یامین کا حضرت یوسف کے پاس رہ جانا: جن واقعات کا ذکر ہے ان سے یہ نہیں پایا جاتا کہ یہ سب کچھ حضرت یوسفؑ کی موجودگی میں ہو رہا ہے بلکہ بظاہر وہی شخص جو تحقیقات کے لیے آیا ہے سب کچھ یہ خود ہی کر رہا ہے اور بن یامین کی بوری کو پیچھے رکھنا اگر عمداً تھا، تو شاید اس لیے ہو کہ بن یامین کی خصوصیت سے یوسفؑ کے ہاں عزّت ہوئی تھی ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہمارا ارادہ یوسف کے لیے ایسا ہی ہوا کہ ان کا بھائی ان کے پاس رہ جائے کدنا بمعنی اردنا ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ آگے آتا ہے اِلّا ان یشاء اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت سے ایسا ہوا ۔ اور اگر کدنا بمعنی تدبیر بھی لیا جائے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تدبیر ہم نے یوسف کے لیے کی یہ نہیں فرمایا کہ یوسف نے یہ تدبیر کی اور اس صورت میں کدنا کے لفظ میں یہ اشارہ ہوگا کہ ان کے بھائیوں کی تدبیر تو یہ تھی کہ بن یامین کسی طرح واپس حضرت یعقوب کے پاس نہ جائے اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو یوسف کے حق میں کر دیا کہ بھائی بھائی کے پاس رہ گیا ۔ وہ خود بغیر افشائے راز کے اسے رکھ نہ سکتے تھے اور اس حقیقت کو وہ بھی ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے مشیت الٰہی سے یہ ایک سامان پیدا ہو گیا کہ بن یامین حضرت یوسف کے پاس رہ گئے ۔ گو وہ ذی علم تھے مگر یہ سامان اس خدا کی طرف سے ہو گیا جو اُن سے بڑھ کر علیم تھا ۔ اگر یوسف نے خود یہ کام کیا ہوتا تو یہاں نرفع درجات من نشاء کا کوئی موقعہ نہ تھا ۔ کیونکہ بہرحال یہ ایک چالبازی تھی اور چالبازی کے موقعہ پر رفع درجات موزوں نہیں ہاں خود بخود اس سامان کا پیدا ہو جانا رفع درجات پر گواہ ہے یعنی جب انسان اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے فائدہ کے سامان خود بخود پیدا کر دیتا ہے۔

دوسرے دین کے بادشاہ کے قانون پر عمل : اس آیت سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے مذہب کے بادشاہ کے ماتحت ہے تو اسی کے قانون پر عمل بھی کرنا پڑتا ہے ۔ حضرت یوسف ایک ایسے بادشاہ کے ماتحت تھے جو ان کے دین پر نہ تھا بایں اس کے قانون پر ہی عمل کرتے تھے اس چھوٹے سے واقعہ کے اظہار سے ایک عظیم الشان اصول قائم کر دیا ہے۔

ع۱۵۷۱ حضرت یوسف پر جو چوری کا الزام انہوں نے لگایا ہے تو مفسرین اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یا تو بائبل کے بعض بیانات میں ادل بدل کرتے ہیں یا خود کوئی کہانی تجویز کر لیتے ہیں ۔ لیکن یہ الزام دینے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک بے گناہ کی جان تک لینے سے دریغ نہ کیا اور پھر حضرت یعقوب کے سامنے جا کر جھوٹ بولا ۔ اس لیے اگر اس دوسرے موقعہ پر بھی انہوں نے جھوٹ سے کام لیا تو یہ کونسا امر مستبعد ہے بات تو صاف ہے وہ اپنے آپ کو تو الگ کرتے ہیں اور یوسف کے بھائی پر چوری کا الزام ثابت کرنے کے لیے تائیدی شہادت یہ دیتے ہیں کہ اس کا بھائی بھی چور تھا کیونکہ ان کی غرض تو یہی تھی کہ کسی طرح بن یامین بھی حضرت یعقوب کی آنکھوں سے دور ہو جائے گویا ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو نیک لوگ ہیں یوسف اور اس کا بھائی دونوں چور ہیں ۔ یوسف نے اپنے دل میں کس بات کو چھپایا ؟ اس تہمت کے جواب کو ان پر ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے ورنہ یوں جواب دیتے کہ تم میرے منہ پر جھوٹا الزام لگاتے ہو۔

مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ۷۹

ہم نے اپنا سامان پایا تو ہم ظالم ہوں گے ۱۵۷۲

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۸۰

جب اس سے مایوس ہو گئے تو مشورہ کرنے کے لیے الگ ہو گئے سب سے بڑے نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ تمھارے باپ نے تم سے اللہ کا عہد لیا تھا اور پہلے جو یوسفؑ کے معاملہ میں تم قصور کر چکے ہو، سو میں ہرگز اس ملک کو نہیں چھوڑونگا جب تک کہ میرا باپ مجھے اجازت نہ دے، یا اللہ میرے لیے فیصلہ نہ کرے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ۱۵۷۳

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ۸۱

اپنے باپ کی طرف واپس جاؤ ــ اور کہو اے ہمارے باپ تیرے بیٹے نے چوری کی اور ہم وہی گواہی دیتے ہیں جو ہمیں معلوم ہے اور ہم غیب کے نگہبان نہ تھے ۱۵۷۴

وَ سْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَ الْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۸۲

اور اس بستی سے دریافت کر جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے جس میں ہم آئے ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۸۳

اس نے کہا بلکہ تمھارے دلوں نے ایک (بُری) بات کو اچھا کر دکھایا سو نیک صبر ہی ہے، امید ہے کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے، وہ علم والا حکمت والا ہے ۱۵۷۵

۱۵۷۲ ان بھائیوں میں بعض اچھے دل کے بھی تھے ان میں سے ہی وہ بھی تھا جس نے پہلے موقعہ پر کہا تھا لا تقتلوا یوسف اب بھی ان میں سے کوئی حضرت یوسف کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ بن یامین کی جگہ کسی دوسرے کو قید کر لیا جائے جس کو حضرت یوسف ردّ کرتے ہیں۔

۱۵۷۳ اسنا یئسوا۔ اِسْتَایْئَس اور یَئِسَ کے ایک ہی معنی ہیں امید منقطع ہوگئی (غ) یعنی حضرت یوسف نے انکار کر دیا۔

نجیا۔ نجوٰی کے لیے دیکھو ۷۳۱ نجیّ کے معنی ہیں۔ مُناجی یعنی خفیہ مشورہ کرنے والا اور واحد اور جمع دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔ وقرّبناہ نجیا (مریم ۱۹-۵۲)

ابرح۔ بَرِحَ کے معنی زَالَ آتے ہیں لن نبرح علیہ عاکفین (طٰہٰ ۲۰-۹۱) لا ابرح حتی ابلغ مجمع البحرین (الکہف ۱۸-۶۰) اور بَرِحَ الارض کے معنی ہیں اس زمین سے الگ ہو گیا۔ (ل)

یہ مشورہ کرنے کے لیے الگ ہوئے کہ اب حضرت یعقوبؑ سے جا کر کیا کہیں۔ اس مشورہ کی ضرورت بھی نہ ہوتی اگر ان کے دل صاف ہوتے اب چاہتے تھے کہ کوئی بات بنائیں جس پر حضرت یعقوب کو اطمینان ہو جائے ان میں سب سے بڑا بوجہ اس عہد کے جو حضرت یعقوب سے کیا تھا جانے سے ہی انکار کرتا ہے، جب تک کہ باپ کی طرف سے اجازت نہ ملے یا اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے یعنی کوئی ایسے اسباب پیدا ہو جائیں کہ عہد کی ذمہ واری اس پر نہ رہے۔

۱۵۷۴ یہ کلام اسی بڑے بھائی کا سمجھا گیا ہے مگر بعض نے کہا کہ یہ یوسف کا کلام ہے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ ان کے مشورے کا آخری نتیجہ ہے یعنی آخر کار سب اس رائے پر پہنچے کہ یوں ہی کہا جائے کہ بن یامین نے چوری کی۔ اور غیب کے حافظ نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ جو کام ہماری آنکھوں کے اوجھل ہوا یعنی بن یامین کا چوری کرنا اس کی ہم حفاظت کیونکر کر سکتے تھے۔ یا مراد یہ ہے کہ جب عہد کیا تھا تو اس وقت اس غیب کی بات کا ہمیں علم نہ تھا کہ یہ چوری کریگا۔

۱۵۷۵ بن یامین پر چوری کا الزام بھائیوں کا منصوبہ تھا: درمیانی واقعات کو چھوڑ کر اب بتایا ہے کہ جب اسی کے مطابق انہوں نے حضرت یعقوب سے کہا تو انہوں نے جواب میں وہی لفظ کہے جو حضرت یوسف کے ماجرا کے وقت کہے تھے بل سوّلت لکم انفسکم امرا فصبر جمیل جس سے معلوم ہُوا کہ حضرت یعقوب نے اس بات کو ان کی طرف منسوب کیا ہے کہ یہ بھی تم نے ایک منصوبہ بنایا ہے جس طرح یوسف کے معاملہ میں بنایا تھا اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب سوّلت لکم انفسکم کہہ کر کہ تم نے اب بھی کوئی بُرا کام کیا ہے جو تمہیں اچھا معلوم ہوا کوئی جھوٹا الزام ان پر نہ دے سکتے تھے بلکہ یہ بات ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف

وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾

اور ان سے منہ پھیر لیا اور کہا ہائے افسوس یوسفؑ کی وجہ سے اور اس کی آنکھیں غم سے ڈبڈبا آئیں۔ پس وہ (غم کو) دبائے تھے [1576]

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

انھوں نے کہا اللہ کی قسم تو یوسفؑ کا ذکر کرتا ہی رہے گا یہاں تک کہ تو مرنے کے قریب ہو جائے یا ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائے [1577]

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ

کہا میں اپنی پریشانی اور غم کی شکایت اللہ سے ہی کرتا ہوں اور

سے معلوم ہو گئی تھی جس طرح یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ دونوں واپس مل بھی جائیں گے۔

1576 ابیضت۔ بَیاض کے معنی سفیدی ہیں اور اَبْیَض سفید بَیَّضَ الشیْئَ فابْیَضَّ یعنی بَیَّضَ کے معنی سفید کر دیا اور ابیضّ کے معنی وہ سفید ہو گئی اور بَیَّضْتُ السقاءَ کے معنی ہیں مشکیزہ کو پانی سے بھر دیا (ل) اسی لحاظ سے ابْیَضَّ کے معنی ہوں گے وہ پانی سے بھر گیا اور پانی اور دودھ کو یا پانی اور روٹی کو یا پانی اور گیہوں کو اَبْیضان کہا جاتا ہے یعنی دو سفید چیزیں۔

حضرت یعقوب کا غم میں رو رو کر اندھا ہو جانا خلاف قرآن ہے: ابیضت عیناہ من الحزن کے معنی مفسرین نے عموماً یوں کیے ہیں کہ غم کی وجہ سے حضرت یعقوب روتے رہتے تھے اور روتے رہنے سے ان کی آنکھیں جاتی رہیں یعنی وہ اندھے ہو گئے گویا ابیضاض اندھا ہو جانے سے کنایہ ہے۔ لیکن یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک خدا کا نبی بیٹے کے جاتے رہنے سے تبلیغ و اصلاح کے کام کو چھوڑ کر جو اس کی بعثت کی اصل غرض ہے رونے لگ جائے اور یہاں تک روئے کہ روایات میں ہے کہ اسیؔ سال تک آپ یوسف سے جدا رہے اور اس سارے عرصہ میں ایک لمحہ ایسا نہیں گزرا کہ آپ کے دل میں غم نہ ہوا اور رخساروں پر آنسو نہ ہوں اور اسی حالت میں آپ روتے روتے اندھے ہو گئے، مخلوق کی اصلاح تو ایک طرف رہی ایسا شخص تو خدا تعالے کی بھی عبادت نہیں کر سکتا۔ اگر ایک عامی آدمی اپنے کسی عزیز کی وفات پر ایک ماہ بھی اس طرح روئے تو وہ ملامت کے قابل ہو گا، چہ جائیکہ خدا کا نبی اسیؔ سال تک اس حال میں رہے پھر ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ رہا ہو فصبر جمیل پھر اللہ تعالی نے اُسے یقین بھی دلا دیا ہو کہ وہ بیٹا زندہ ہے۔ یہ بات کسی طرح قابل تسلیم نہیں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آنحضرت صلعم بھی اپنے بیٹے ابراہیم کی وفات پر روئے تھے اور فرمایا تھا القلب یحزن والعین تدمع دل میں غم ہے اور آنکھوں میں آنسو ہیں۔ مگر یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ آنحضرت صلعم ایک دو سال روتے رہے تھے یا ایک دو ماہ ہی روتے رہے تھے۔ بلاشبہ عزیزوں کی جدائی پر آنکھوں میں آنسو بھر آنا تقاضائے فطرت ہے اور اگر حضرت یعقوب میں اسی حد تک مانا جائے تو یہ بتقاضائے محبّت پدری ہے لیکن اسیؔ سال تک دن رات روتے چلے جانا یہاں تک کہ انسان اندھا ہو جائے اس کے برابر اہل دنیا کی بھی کوئی جزع فزع نہیں اور اس سے بڑھ کر بے صبری کوئی نہیں اور نبوت کا کام تو پھر گویا یوسف کی پرستش ہوئی نعوذ باللہ من ذٰلك۔ ابیضا عین کے معنی لغت میں اندھا ہونا کہیں نہیں لکھے ہاں یہ مراد سمجھی گئی ہے مگر اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ آنکھوں میں آنسو بھر کر آنکھیں سفید ہو گئیں جس کو ہماری زبان میں ڈبڈبانا کہتے ہیں اور یہ وہ امر ہے جو ایک نبی کی شان کے لائق ہے کہ جب آپ کو یہ خبر پہنچتی ہے کہ بن یامین پکڑے گئے تو حضرت یوسف کا صدمہ تازہ ہو کر آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں مگر با ایں وہ اپنے رنج اور غم کو دباتے ہیں جیسا کہ لفظ کظیم لا کر ظاہر کیا گیا ہے جس کے معنی غصّہ یا غم وغیرہ دبانے کے ہیں کہ وہ ظاہر نہ ہونے پائے دیکھو 518 جس کی آنکھوں سے اسیّ سال تک آنسو خشک نہ ہوں اسے کظیم کس زبان سے کہا جائے گا؟

یہ معنی حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہیں۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے انہ لما قال یا اسفی علی یوسف غلبہ البکاء وعند غلبة البکاء یکثر الماء فی العین فتصیر العین کانہا ابیضت من بیاض ذٰلك الماء...... فلو حملنا الابیضاض علی غلبة البکاء کان ھذا التعلیل حسنا ولو حملناہ علی العمی لم یحسن ھذا التعلیل فکان ما ذکرناہ اولی وھذا التفسیر مع الدلیل رواہ الواحدی فی البسیط عن ابن عباسؓ یعنی جب آپ نے یوسف پر اس وجہ سے افسوس کیا تو بکاء (رونا) آپ پر غالب آ گیا اور رونے کے غلبہ کے وقت آنکھ میں پانی بہت ہو جاتا ہے گویا اس پانی کی سفیدی سے وہ سفید ہو جاتی ہے.... پس اگر ہم سفید ہو جانے کو غلبۂ بکاء پر حمل کریں تو یہ وجہ اچھی ہے اور اگر اسے اندھا پن پر حمل کریں تو یہ وجہ اچھی نہیں۔ اس لیے جو ہم نے بیان کیا ہے وہ اولیٰ ہے اور یہ تفسیر مع دلیل کے واحدی نے بسیط میں ابن عباس سے روایت کی ہے۔

1577 تفتؤا۔ لا تفتؤا مراد ہے اور ما فَتِئْتُ کے معنی وہی ہیں جو ما زلت کے معنی ہیں اور لا کے محذوف ہونے پر یہ دلیل ہے کہ قسم کا جواب اگر مثبت ہو تو اس پر علامت اثبات ضرور داخل ہوتی ہے اور علامت اثبات ل اور نون تاکید ہے۔

یوسفؑ کی اس یاد کو بھائیوں نے بُرا منایا کیونکہ اُن کے دل اُنہیں ملزم کرتے تھے اس لیے وہ پسند نہ کرتے تھے کہ حضرت یعقوبؑ اس کا نام بھی لیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب آپ بوڑھے ہو کر موت کے قریب ہو گئے ہیں تاہم یوسف کے ذکر کو نہیں چھوڑتے۔ اس سے قطعاً یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت یعقوبؑ ہر وقت یوسفؑ کا ذکر کرتے رہتے تھے، بلکہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مدّت بعد یہ ذکر کیا جس کی وجہ سے بھائیوں کو یہ بات کہنے کی ضرورت پیش آئی۔

وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾
يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ
وَلَا تَايْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْــَٔسُ
مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾
فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ
مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ
مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ
عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾

اللہ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ع۱۵۷۸
اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسفؑ اور اس کے بھائی کا
پتہ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو، کیونکہ اللہ کی
رحمت سے سوائے کافر لوگوں کے اور کوئی مایوس نہیں ہوتا ع۱۵۷۹
پھر جب اس کے پاس آئے کہا اے عزیز ہمیں اور ہمارے گھر
والوں کو تکلیف پہنچی ہے اور ہم تھوڑا سا سرمایہ لیکر آئے ہیں سو ہمیں
(غلہ کا) پورا ماپ دے اور ہمیں خیرات دے اللہ خیرات دینے والوں
کو (اچھا) بدلہ دیتا ہے ع۱۵۸۰

ع۱۵۷۸ اس سے معلوم ہوا کہ اپنے رنج و مصائب کو دوسروں پر ظاہر کرنے سے حتی الوسع بچنا چاہیئے اور صرف اپنے مولےٰ کے سامنے ظاہر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہی غم و رنج کو دور بھی کر سکتا ہے۔ حدیث میں ہے مِن کُنُوزِ البِرِّ اخفاء الصدقة وکِتمانُ المصائبِ صدقہ کا اخفا اور مصائب کا چھپانا نیکی کے خزانے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کا روتے رہنا اس آیت کے بھی خلاف ہے۔

ع۱۵۷۹ تحسّسو احسّ سے باب تفعل ہے حاسہ سے کسی چیز کا پالینا اور مراد اس سے اس کے احوال کا دریافت کرنا ہے۔
رَوح وسعت پر بولا جاتا ہے اور یہاں مراد اس سے کشایش اور رحمت ہے (غ) اسی مادہ سے ریح اور رُوح ہیں۔
حضرت یوسف کی تاریخ کا یہ حصّہ کہ بھائی دوبارہ حضرت یعقوب کے پاس گئے اور بن یامین کی گرفتاری کا قصّہ سنایا بائبل میں مذکور نہیں بلکہ حضرت یوسف اپنے آپ کو اسی وقت ظاہر کر دیتے ہیں جب بن یامین کو پکڑا جاتا ہے اور بھائی حیران ہیں کہ اب کیا کریں۔ قرآن کریم نے اس حصّہ کو بیان کر کے اور بائبل سے اس موقعہ پر اختلاف کر کے یہ دکھایا ہے کہ باوجود اسباب مایوسی کے انتہا کو پہنچ جانے کے، باوجود ایک صدمہ کے ساتھ دوسرا صدمہ اور مل جانے کے مایوسی حضرت یعقوبؑ کے قریب بھی نہیں آئی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ان تکالیف کے دور کرنے پر آپ کا ایمان بڑھتا ہی چلا گیا اور یہ وہ عظیم الشان سبق ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نیک لوگوں کی زندگیاں بیان کر کے سکھانا چاہتا ہے کہ وہ کس طرح پر مایوسی کے اسباب کے کمال کو پہنچ جانے کے باوجود ایک لمحہ کے لیے بھی مایوسی کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔ بلکہ جس قدر تاریکی بڑھتی ہے اسی قدر ان کا ایمان بڑھتا ہے کہ روشنی ضرور نمودار ہو گی۔ چنانچہ اس مضمون کو خود قرآن شریف نے سورت کی آخری آیات میں کھول دیا ہے دیکھو آیت ۱۱۰۔ افسوس ہے کہ بائبل میں نہ تو اسباب مایوسی انتہا کو پہنچتے ہیں اور نہ ہی حضرت یعقوبؑ کی زندگی میں وہ دلوں کو ابھارنے والا نظارہ نظر آتا ہے جو یہاں ان الفاظ میں قرآن کریم نے دکھایا ہے لا تایئسوا من روح اللّٰہ انہ لا یایئس من روح اللّٰہ الا القوم الکافرون۔ یہ وہ ایک اور عظیم الشان سبق ہے جو اس سورت سے ہمیں ملتا ہے مگر بائبل کے قصہ سے نہیں ملتا۔ بائبل میں یہ ایک کہانی ہے مگر قرآن کریم میں قدم قدم پر اس کے اندر وہ اخلاقی سبق بھر دیئے ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھائے تو اس کی زندگی اس دنیا میں جنت کی زندگی بن جاتی ہے۔
مسلمانوں کے مایوس دلوں کے لیے مرہم۔ اور ایک مسلمان کے دل میں اس ذکر کو پڑھ کر یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر چاروں طرف مغلوبیت حق کا نظارہ ہی نظر آتا ہو اور کفر اپنی ترقی کی انتہا کو پہنچ گیا ہو اور نیکوں کو پاؤں تلے روندا جاتا ہو اور مکار اور فریبی دنیا میں مالک نظر آتے ہوں اور سب چیزیں ان کے قبضۂ قدرت میں معلوم ہوتی ہوں تو بھی وہ مایوس نہیں ہوتے اور اللہ کی رحمت کے آفتاب کے طلوع پر یقین رکھتے ہیں اس لیے کہ حق کا غلبہ یقینی ہے۔ تعجب ان مسلمانوں پر ہے جو قرآن کریم میں ایسی آیات کے ہوتے ہوئے پھر کفار کی نقل کرتے اور ذرا ذرا مشکلات پیش آنے پر گھبرا ہی نہیں اُٹھتے بلکہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ آج جب اسلام ہر طرف مغلوب نظر آتا ہے اس ایمان کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جب مسلمانوں میں یہ ایمان پیدا ہو جائے گا تو وہی اسلام کی شان و شوکت بھی وہ دوبارہ دیکھ لیں گے جس کی تڑپ ان کے دلوں میں ہے۔

ع۱۵۸۰ مزجٰىة۔ تَزْجِيَةٌ (زجا) کسی چیز کا دھکیلنا ہے تاکہ وہ آگے چلے جیسے ہوا کا بادل کو چلانا یزجی سحابا (النور ۲۴-۴۳) یزجی لکم الفلك (بنی اسرائیل ۱۷-۶۶) پس جو چیز قلیل ہو گویا کسی شمار میں نہیں اور رد کی جائے اسے مزجاة کہا جاتا ہے (غ)
اس دفعہ بموجب ارشاد حضرت یعقوب وہ یوسفؑ کی تلاش میں آئے ہیں اور اپنی مفلسی اور غربت کی طرف توجہ دلانا اس لیے تھا کہ اگر یہی یوسفؑ ہیں تو ان کا دل پگھلے اور وہ اصلیت کا اظہار کر دیں چنانچہ یہی اثر اس کا ہوا۔

قَالَ هَلۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا فَعَلۡتُمۡ بِيُوۡسُفَ وَاَخِيۡهِ اِذۡ اَنۡتُمۡ جٰهِلُوۡنَ ﴿۸۹﴾

اس نے کہا، کیا تم جانتے ہو تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی سے کیا کیا، جب تم جاہل تھے ۱۵۸۱ع

قَالُوۡۤا ءَاِنَّكَ لَاَنۡتَ يُوۡسُفُ‌ ؕ قَالَ اَنَا يُوۡسُفُ وَهٰذَاۤ اَخِىۡ‌ قَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡنَا ‌ؕ اِنَّهٗ مَنۡ يَّتَّقِ وَيَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۹۰﴾

انھوں نے کہا، کیا تُو ہی یوسفؑ ہے؟ اس نے کہا، میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے اللہ نے ہم پر احسان کیا ہے، ہاں جو کوئی تقوٰے اور صبر کرتا ہے، تو اللہ بھی نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا ۱۵۸۲ع

قَالُوۡا تَاللّٰهِ لَقَدۡ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيۡنَا وَاِنۡ كُنَّا لَخٰطِـئِيۡنَ ﴿۹۱﴾

انھوں نے کہا اللہ کی قسم اللہ نے تجھے ہم پر فوقیت دی ہے، اور یقیناً ہم خطا کار تھے ۱۵۸۳ع

قَالَ لَا تَثۡرِيۡبَ عَلَيۡكُمُ الۡيَوۡمَ‌ ؕ يَغۡفِرُ اللّٰهُ لَـكُمۡ‌ وَهُوَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِيۡنَ ﴿۹۲﴾

کہا، آج تم پر کچھ الزام نہیں، اللہ تمھیں معاف کرے اور وہ سب رحم کرنیوالوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے ۱۵۸۴ع

ع۱۵۸۱ بن یامین سے بھائیوں کی شرارت: یہی ایک موقعہ ہے جس پر حضرت یوسف نے ان بھائیوں کا سلوک یاد دلایا ہے وہ بھی ملامت کے لیے نہیں بلکہ اس بات کے ظاہر کرنے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ گو تم نے میرے ساتھ ایسا سلوک کر کے پھر میرے بھائی سے بھی اس قسم کا سلوک کیا تاہم آج تم پر ان باتوں کے لیے کوئی ملامت نہیں لاتثریب علیکم الیوم (۹۲) یہی وجہ ہے کہ یہ نہیں بتایا کہ وہ معاملہ کیا تھا صرف اتنا کہہ کر چھوڑ دیا کہ تم نے کچھ معاملہ ہم دونوں سے کیا اسے تم جانتے ہو۔ اس سے یہ یقینی طور پر معلوم ہوا کہ بن یامین کے ساتھ کوئی شرارت اسی رنگ کی ان بھائیوں کی طرف سے ہوئی تھی جیسے یوسُف کے ساتھ اور قرآن کریم میں ایک ہی ایسے واقعہ کا ذکر ہے یعنی پیالہ کی چوری بائبل میں بھی اور کوئی واقعہ مذکور نہیں جس سے معلوم ہو کہ بن یامین کے ساتھ کوئی اس قسم کا سلوک ہوا تھا جس کا الزام یہاں ان پر دیا گیا ہے۔

ع۱۵۸۲ اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا قد من اللّٰه علینا یعنی ان تمام واقعات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب پر احسان کیا اور دکھ سے راحت پیدا کر دی۔ اس بات سے بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس کے فضل کی طرف کہ بظاہر انسان پر دُکھ بھی آتے ہیں تو کس طرح وہ اپنے فضل سے انہیں راحت میں تبدیل کر دیتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہر ایک راحت دکھ سے ہی پیدا ہوتی ہے جب تک انسان تکلیفوں میں مبتلا نہ ہو کبھی حقیقی راحت کو نہیں پا سکتا اس لیے مصائب کو خوش دلی سے برداشت کرنا چاہیئے اس لیے کہ ان میں بھی انسان کی بہتری ہے اسی لیے اس کے بعد فرمایا جو کوئی بھی تقویٰ اور صبر کرے تو اللہ تعالیٰ محسنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا یعنی مصائب میں رعایت حقوق کو اور صبر کو ہاتھ سے نہ دے اور ان الفاظ میں عام قانون کو بیان کرنے کا یہی منشا ہے کہ یہ یوسُف سے خاص معاملہ نہیں بلکہ جو انسان مصائب کی کٹھالی میں پڑتا اور صبر کرتا ہے اور تقویٰ کو ہاتھ سے نہیں دیتا وہی سونا بنا کر نکالا جاتا ہے۔

ع۱۵۸۳ اٰثر۔ اَثَر کسی چیز کا اس بات کا حصول ہے جو اس کے وجود پر دلالت کرے اور اس کی جمع اٰثار ہے ثم قفّینا علیٰ اٰثارھم برسلنا (الحدید ۵۷-۲۷) وَاٰثاراً فی الارض (المؤمن ۴۰-۲۱) فانظر الی اٰثار رحمة اللّٰه (الروم ۳۰-۵۰) اور اس لیے اٰثار پہلے لوگوں کے نقشِ قدم کو بھی کہتے ہیں یعنی ایسا راستہ جو اُن لوگوں کی طرف لیجاتا ہے جو پہلے گزر چکے فہم علیٰ اٰثارھم یہرعون (الصّٰفّٰت ۳۷-۷۰) ھم اولاء علیٰ اثری (طٰہٰ ۲۰-۸۴) اور اَثَرْتُ الْعِلْم کے معنی ہیں میں نے علم کی روایت کی اٰثارة من علم (الاحقاف ۴۶-۴) گویا یہ وہ چیز ہے جو لکھی جائے یا روایت کی جائے تو اس کا اثر باقی رہ جائے اور استعارةً اُثر کے معنی بزرگی لیے جاتے ہیں اور اسی سے اِیثار ہے جس کے معنی فضیلت دینا ہیں جیسے یہاں اور یؤثرون علی انفسہم (الحشر ۵۹-۹) بل تؤثرون الحیٰوة الدنیا (الاعلیٰ ۸۷-۱۶) (غ) یعنی ترجیح دیتے ہو۔

ع۱۵۸۴ تثریب۔ ثَرَّبَ علیہ کے معنی ہیں اسے ملامت کی اور اس کے قصور پر اسے عیب لگایا اور اسے وہ یاد دلایا۔ اور یَثْرِب مدینہ طیّبہ کا پہلا نام ہے اور نبی کریم صلعم نے یثرب کی بجائے اس کا نام طَیّبَة رکھا، کیونکہ ثَرْب کلام عرب میں فساد کو کہتے ہیں (ل) قرآن شریف میں ایک موقعہ پر صرف دوسروں کا قول نقل کرتے ہوئے اسے یثرب کے نام سے پکارا ہے یا اھل یثرب لا مقام لکم (الاحزاب ۳۳-۱۳)

عفوِ یوسُف اور عفوِ خاتم النّبیّین: کتنا بڑا دل ہے اور کتنا بڑا عفو ہے کہ وہ لوگ جو جان لینے کے درپے تھے انہیں یہ کہا کہ آج تم پر اس کی وجہ سے کوئی ملامت بھی نہیں، مگر اس مقام سے کس قدر بلند وہ مقام ہے جس کی طرف یوسف علیہ السلام کے ذکر میں اشارہ ہے یعنی آنحضرت صلعم کا مقام جن کی جان

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۹۳ ع

یہ میری قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے سامنے ڈال دو، تا وہ یقین کر کے آجائے اور اپنا سب کنبہ میرے پاس لے آؤ ۱۵۸۵

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ۹۴

اور جب قافلہ (مصر سے) چلا، ان کے باپ نے کہا، یوسفؑ کی خوشبو پاتا ہوں اگر مجھے بہکا ہوا نہ سمجھو ۱۵۸۶

ع قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ۹۵

انھوں نے کہا اللہ کی قسم تو اپنی پرانی غلطی میں ہے۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ

پھر جب خوش خبری دینے والا آپہنچا (اور) اسے اس کے سامنے

لینے کی ایک دفعہ نہیں متعدد مرتبہ کوشش کی گئی۔ اور آپ کو تیرہ سال کے عرصہ میں مکہ میں بڑے بڑے دکھ پہنچائے گئے اور نہ صرف آپ کو بلکہ ہر اس شخص کو جو آپ کا دم بھرتا حد درجے کے دکھ دیئے جاتے بعض کو جان سے مارا گیا۔ اور یہ دکھ اس قدر شدّت میں بڑھے کہ ان لوگوں نے اپنے وطن مالوف کو چھوڑ کر خود جلاوطنی اختیار کی پھر یہ تیرہ سال کے مسلسل دکھ بھی مکّہ کو چھوڑنے پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ اب تلوار لیکر مدینہ پر چڑھائی کی جاتی ہے اور مٹھی بھر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ باایں ان سب جرموں کے مرتکب جب مغلوب ہو کر آپ کے سامنے آتے ہیں تو یہی لفظ آپ کی زبان مبارک سے نکلتے ہیں لاتثریب علیکم الیوم اور سید البشرؐ کے عفوِ عظیم کا یہ نمونہ دنیا میں ہمیشہ کے لیے اپنی نظیر آپ ہی رہتا ہے۔ اخلاقِ یوسفی میں اگر لاتثریب ایک عظیم الشان مقام ہے جس کا اثر دس بھائیوں تک محدود تھا، تو اخلاق محمّدی کے علوِ شان کو کون پہنچ سکتا ہے جو ایک مجرم قوم کی قوم کو جن کے جرم انتہا کو پہنچ چکے تھے اسی لاتثریب کے ماتحت ایسا بخشتا ہے کہ ایک حرف ملامت زبان پر نہیں لاتا۔

۱۵۸۵ بصیر۔ بَصَر قوت مدرکہ اور دیکھنے کی قوت دونوں کو کہا جاتا ہے ع۱۲۱ اور رَجُلٌ بَصِيْرٌ کے معنی ہیں مُبْصِر اور بعض نے کہا اس سے مراد آنکھوں سے دیکھنے والا ہے (ل) اور راغب یہ کہہ کر کہ ضَرِیر یعنی اندھے کو عکس کے طور پر بصیر کہا جاتا ہے لکھتے ہیں کہ قابل ترجیح یہ ہے کہ یہ اُسے کہا جائے جس کے لیے بصیرت قلب کی قوت ہو (غ) بہرحال بصیر کا لفظ اپنے اصل معنی کے لحاظ سے دونوں معنی دیتا ہے آنکھ سے دیکھنے والا۔ اور دل کی قوت مدرکہ سے ایک بات کو پا لینے والا۔

یہاں اس سورت میں قمیص کا ذکر تیسری دفعہ آیا ہے دیکھو ع۱۵۲۵ پہلی دفعہ قمیص حضرت یوسف کی زندگی کا نشان ٹھہری، دوسری مرتبہ آپ کی پاکدامنی کا نشان ہوئی اور یہ قمیص آپ کی حکومت کا نشان ہوئی۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے حضرت عثمانؓ کو فرمایا اِنَّ اللّٰهَ سَيُقَمِّصُكَ قَمِيْصًا وَ اِنَّكَ لَتُلَاصُ عَلٰى خَلْعِهٖ فَاِيَّاكَ وَخَلْعَهٗ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائے گا اور تمہیں اس قمیص کے اتارنے کو کہا جائے گا مگر خبردار اس قمیص کو نہ اتارنا۔ ابن اثیر کہتے ہیں کہ اس سے مراد خلافت ہے۔ پس ہو سکتا ہے کہ وہ قمیص اصلی تھی اور صرف بطور نشان حکومت بھیجی گئی تھی جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف کو عطا فرمائی تھی۔ یعنی تاکہ حضرت یعقوب کو یقین آجائے کہ جو کچھ ان کے بھائیوں نے حضرت یوسف کی حکومت اور اختیارات کے متعلق کہا ہے وہ سچ ہے اور ہو سکتا ہے کہ قمیص سے مراد یہاں واقعی حکومت ہی ہو اور قمیص کو لے جانے کے معنی یہ ہوں کہ یہ خبر لے جاؤ کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے حکومت عطا فرمائی ہے۔ بائبل میں یہ ذکر نہیں کہ قمیص بھیجی گئی تھی صرف اسی قدر ذکر ہے کہ ان کو کہا تھا "میرے باپ کو خبر سنا دو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہاں حکومت دی ہے" اور وہاں یہ بھی ذکر ہے کہ جب بھائیوں نے یہ باتیں حضرت یعقوب کو سنائیں "تو یعقوب کا دل سنسنا گیا کیونکہ اس نے اُن کا یقین نہ کیا"۔ شاید اسی کے ازالہ کے لیے یات بصیرا اور فارتد بصیرا (۹۶) فرمایا یعنی اسے یقین ہو گیا۔ مفسرین نے ایک توجیہ یہ قبول کی ہے کہ جب حضرت یعقوب کو یہ خبر پہنچے گی تو اس سے اس کے دل کو قوت ملے گی اور قویٰ میں جو ضعف آگیا ہے وہ دور ہو جائے گا۔ اور بصارت کی کمی بھی دور ہو جائے گی (د) گویا اس صورت میں بھی انہوں نے اندھا پن سے اچھا ہونا مراد نہیں لیا اور نہ یعقوبؑ کو اندھا مانا ہے بلکہ غم سے بصارت میں کچھ کمی مراد لی ہے جو اس خبر سے دور ہو جائے گی اور یقین کے معنی اس لیے بھی درست ہیں کہ گو یا وحی الٰہی کے اشارات سے حضرت یعقوب کو یہ علم تھا کہ یوسفؑ زندہ ہیں اور واقعات کی شہادت سے وہ بات اب یقین کامل کی حد تک پہنچ گئی۔

۱۵۸۶ ریح کے مشہور معنی ہوا ہیں اور خوشبو اور بدبو کو بھی ریح یا رائحۃ کہا جاتا ہے وقد یکون الرِّيْحُ بمعنى الغلبةِ والقوة (غ) یعنی رِیح کے معنی غلبہ اور قوت بھی آتے ہیں۔

تفنّدون۔ فَنَد رائے کی کمزوری ہے اور تفنید دوسرے کی طرف اس کا منسوب کرنا (غ)

یوسف کی ریح سے مراد یا تو یہ ہے کہ مجھے خوشبو آرہی ہے کہ یوسفؑ زندہ ہے اور یا مراد یہ ہے کہ اس کی قوت و شوکت کی خوشبو آرہی ہے۔ ادھر حضرت یوسف اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں ادھر بفحوائے مفہوم دل را بدل رہ است حضرت یعقوب کو علم ہو جاتا ہے۔

فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٩٦﴾

پیش کیا تو وہ یقین کرنے والا ہوا۔ کہا کیا میں تمھیں نہیں کہتا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ ﴿٩٧﴾

انھوں نے کہا اے ہمارے باپ! ہمارے لیے ہمارے قصوروں کی معافی مانگ، ہم قصوروار ہیں۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿٩٨﴾

کہا، میں اپنے رب سے تمھارے لیے بخشش مانگوں گا وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿٩٩﴾ ؕ

پھر جب وہ یوسفؑ کے پاس آئے، اس نے اپنے والدین کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں خدا چاہے تو امن سے داخل ہو جاؤ۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ؗ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿١٠٠﴾

اور اس نے اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا اور وہ اس کی خاطر سجدہ میں گر گئے اور اس نے کہا اے میرے باپ! یہ میرے پہلے کے خواب کی تعبیر ہے، میرے رب نے اسے سچ کر دیا۔ اور اس نے مجھ پر احسان کیا، جب مجھے قید خانہ سے نکالا اور تمھیں بادیہ سے لے آیا اس کے بعد کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوا دیا تھا، میرا رب جو بات چاہے اسے باریک تدبیر سے کرتا ہے۔ وہ علم والا حکمت والا ہے[1587]

١٥٨٧ العرش۔ بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ کو بوجہ اس کے علوّ کے عرش کہا جاتا ہے جیسے یہاں ایکم یاتینی لعرشہا (النمل[27]۔ ٣٨)

خروا له سجدا۔ خرّ کے معنی ہیں اس طرح گرا کہ اس سے خریر سنی گئی اور خریر پانی یا ہوا وغیرہ کی اس آواز کو کہا جاتا ہے جو اوپر سے نیچے گرے فکانما خرّ من السماء (الحج[22]۔ ٣١) فخرّ علیہم السقف (النحل[16]۔ ٢٦) دوسری جگہ ہے خرّوا سجّدا وسبّحوا بحمد ربہم (السجدۃ[32]۔ ١٥) امام راغب کہتے ہیں کہ خرّ کا استعمال دو باتوں پر دلالت کرتا ہے ایک گرنا اور دوسرے تسبیح کی آواز اور آگے سبحوا بحمد ربہم اس لیے بڑھایا کہ معلوم ہو کہ خریر تسبیح کی آواز کو کہا ہے نہ کسی اور شے کو (غ) یہاں بھی یہی لفظ خروا له سجدا اختیار کر کے یہ توجہ دلائی ہے کہ سجدہ میں تسبیح وتحمید الٰہی کی آواز نکلتی تھی۔ پس معلوم ہوا یہ سجدہ یوسفؑ کو نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے لیے تھا جس کی تسبیح اور تحمید وہ کر رہے تھے اور له کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ یوسفؑ کی اس عزت ومرتبت کی وجہ سے جس میں اب وہ سب شریک ہو گئے تھے سب نے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کیا۔

بدو۔ بَدَءَ کے معنی ظاہر ہوا، اور بَدْو۔ حضر یعنی شہر کے خلاف ہے کیونکہ اس میں ہر چیز جو درمیان میں آئے ظاہر ہو جاتی ہے۔ پس بَدْو بادیہ ہے اور بادیہ میں رہنے والے کو باد کہا جاتا ہے۔ سواءن العاکف فیه والباد (الحج[22]۔ ٢٥) لو انہم بادون فی الاعراب (الاحزاب[33]۔ ٢٠)

سجدہ یوسفؑ کو نہ تھا: باپ اور ماں یا باپ اور خالہ کو تخت پر بٹھانا امتیاز کے لیے تھا۔ اس پر سب سجدہ میں گرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح وحمد کرتے ہیں جیسا کہ خروا کے استعمال سے ظاہر ہے یہ سراسر غلط خیال ہے کہ یہ سجدہ یوسفؑ کو تھا تو پھر حمد وتسبیح کس کی تھی؟ اور ظاہر ہے کہ جس کی حمد وتسبیح تھی اسی کو سجدہ تھا۔ اور یہ کہنا کہ پہلی شرائع میں غیر اللہ کو سجدہ جائز تھا ایسا ہی ہے جیسا کوئی کہہ دے کہ پہلی شرائع میں شرک جائز تھا۔ شرک یا غیر اللہ کو سجدہ سب شرائع میں ناجائز تھا اور اصول دین ہمیشہ سے ایک ہی رہے ہیں۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿١٠١﴾

میرے رب تو نے مجھے حکومت سے حصّہ دیا اور مجھے باتوں کی حقیقت سکھائی ، اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا ولی ہے ، مجھے فرمانبرداری کی حالت میں وفات دے اور مجھے نیکوں کے ساتھ ملا ع۱۵۸۸

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۤءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿١٠٢﴾

یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو ان کے پاس نہیں تھا جب انھوں نے اپنے معاملہ پر اتفاق کر لیا اور وہ باریک تدبیر کر رہے ہیں ع۵۸۹

وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾

اور اکثر لوگ گو تم کتنا ہی چاہو ایمان نہیں لاتے ۔

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾ ع

اور تو ان سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا وہ صرف تمام قوموں کے لیے نصیحت ہے ۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اور آسمانوں اور زمین میں کتنے نشان ہیں جن پر لوگ گزرتے

اور حضرت یوسف کا یہ فرمانا کہ یہ میرے رویا کی تعبیر ہے تو اس سے سجدہ مراد لینا دوسری غلطی ہے ۔ بلکہ لفظ ھذا میں اسی یوسفؑ کی عظمت وشوکت کی طرف اشارہ ہے جس کی وجہ سے سب نے سجدۂ شکر کیا ۔ اور خود حضرت یوسف اگلی آیت میں اس کی تصریح کرتے ہیں کہ تو نے مجھے حکومت اور علم دیئے ہیں یہی مراد سورج اور چاند اور ستاروں کے سجدہ کرنے سے تھی ورنہ یہ کونسی بڑی بات ہے کہ کسی شخص کو اپنے بھائیوں میں اس قدر عظمت حاصل ہو جائے کہ وہ اس کی عظمت کا اعتراف کریں ع۱۵۱۶ میں اس رویا کی تعبیر کے متعلق مفصل لکھا جا چکا ہے اور حضرت یوسف نے کیسے لطیف پیرائے میں بھائیوں کا ذکر کیا ہے یہ نہیں کہا کہ میرے بھائیوں نے شیطان کے ورغلانے سے مجھ سے بُرا سلوک کیا بلکہ یہ کہا کہ شیطان نے مجھ میں اور ان میں فساد ڈلوایا گویا ان کا خاص قصور نہ تھا ۔

ع۱۵۸۸ راستبازوں کی خواہش کیا پاک ہوتی ہے ۔ حکومت بھی ملی علم بھی ملا اور علم بھی علم دین ۔ مگر دل میں ایک ہی تڑپ ہے اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری میں جئیں اور مریں اور صلحا کے زمرہ میں ہوں ۔ یہی زندگی کا اصل مقصد ہے ۔ مسلمانوں کو سبق دیا تھا مگر کون آج قرآن کی طرف توجہ کرتا ہے راستبازی کا پھل حکومت بھی ہے مگر جو حکومت کو پہلے چاہتے ہیں اور کہتے ہیں راستباز بعد میں بنیں گے ۔ وہ قرآن کی بتائی راہ پر نہیں چلتے ۔ وہاں اس میں محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے ساتھیوں کو یہ بھی وعدہ ہے کہ جس طرح یوسفؑ آخر کار بادشاہ بنے اور بھائیوں کو ان کے سامنے اعتراف عجز کرنا پڑا ۔ اسی طرح آنحضرت صلعم کی مخالفت کرنے والے بھی آخر کار مغلوب ہونگے اور مسلمانوں کو بادشاہت ملے گی ۔ اور چونکہ یہاں بھائیوں کے قائم مقام عرب کے لوگ نہیں اس لیے جس بادشاہت کا وعدہ دیا جاتا ہے ، وہ صرف عرب کی بادشاہت نہیں بلکہ اتنی بڑی بادشاہت ہے کہ جس سے عرب کے لوگ بھی فائدہ اٹھائیں جس طرح یوسفؑ کی بادشاہت سے بھائیوں نے فائدہ اُٹھایا ۔ پس اس میں صاف اشارہ عرب سے باہر کسی عظیم الشان بادشاہت کا ہے ۔ چنانچہ صحیح حدیث میں جو مسلم ترمذی ابوداؤد میں ہے ذیل کے لفظ آتے ہیں اِنَّ رَبِّیْ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَاُرِیْتُ مَشَارِقَہَا وَمَغَارِبَہَا وَاِنَّ مُلْکَ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مَا زُوِیَ لِیْ مِنْہَا ۔ میرے رب نے زمین کو میرے لیے سکیڑ دیا یعنی اس کا نقشہ میرے سامنے پیش کیا اور مجھے اس کے مشرقی اور مغربی ممالک دکھائے گئے اور میری اُمت کی بادشاہت وہاں تک پہنچے گی جو مجھے نقشہ میں دکھایا گیا ۔

ع۱۵۸۹ آنحضرت کی مخالفت اور اس کا انجام : حضرت یوسف کے تذکرہ کو توفنی مسلما والحقنی بالصالحین پر ختم کر کے انتقال مضمون آنحضرت صلعم اور آپ کے خلاف تدابیر کرنے والوں کی طرف کیا ہے چنانچہ اس آیت میں الفاظ وھم یمکرون وہ باریک تدابیر کر رہے ہیں صاف اس پر شاہد ہیں اور اگلی آیات کا مضمون بھی صاف یہی ظاہر کرتا ہے پس انباء الغیب سے مراد بھی وہ خبریں ہیں جو بطور پیشگوئی حضرت یوسف کے تذکرہ میں ہیں یعنی مخالفین کی سازشیں اور کوششیں اور سات سال کا قحط اور بالآخر ان کی ناکامی اور مغلوب ہو کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں آنا اور آنحضرت صلعم کا ان کو معاف کرنا اور آپ کو وسیع حکومت کا ملنا اور ان کا اس میں حصّہ دار ہونا ۔ اور اگر حضرت یوسف کے تذکرہ کی طرف بھی ذٰلک من انباء الغیب میں اشارہ لیا جائے تو اس معنی سے بالکل بجا ہے کہ کتنی وہ باتیں قرآن شریف نے بیان کی ہیں جن سے اعلےٰ درجہ کے اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں حالانکہ بائبل میں وہ باتیں موجود نہیں اور وہاں یہ قصّہ اس سے بڑھ کر وقعت نہیں رکھتا جو کسی نے کہا ہے پیرے بود لپسرے داشت گم کرد باز یافت ۔

يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

ہیں اور وہ ان سے منہ پھیرے ہوئے ہیں ع۱۵۹۰

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر وہ شرک (بھی) کرتے ہیں ع۱۵۹۱

اَفَاَمِنُوْۤا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

تو کیا وہ اِس بات سے نڈر ہوگئے ہیں کہ اُن پر اللہ کے عذاب کی بھاری مصیبت آپڑے یا ناگہاں وہ گھڑی ان پر آجائے اور انھیں خبر بھی نہ ہو۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

کہہ دے یہ میرا رستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر میں اور جو میری پیروی کرتے ہیں اور اللہ سب نقصوں سے پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں ع۱۵۹۲

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ

اور ہم نے تجھ سے پہلے بھی بستیوں کے رہنے والوں میں سے مردوں کو ہی بھیجا تھا جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے تو کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے

ع۱۵۹۰ کایّن۔ ایّ حرف استفہام ہے۔ ایہم یکفل مریم (آل عمران ۳۔۴۴) ایہم اشد علی الرحمٰن عتیا (مریم ۱۹۔ ۶۹) ایسا ہی ایا ما تدعوا (بنی اسرائیل ۱۷۔۱۱۰) اور ندا میں جب منادی پر ال داخل ہو تو مذکر اور مونث میں اَیُّھَا اور مونث میں اَیَّتُھَا یا کے ساتھ بڑھایا جاتا ہے۔ جیسے یاَیُّھا الناس، یاَیُّھا الذین اٰمنوا۔ یا الناس یا یا الرجل نہیں کہا جائیگا ایتھا العیر (۷۰) اور کایّن میں ك حرف تشبیہ ہے اور ایّ حرف استفہام اور ن تنوین کی جگہ ہے۔ اور یہ سب بمنزلہ ایک لفظ کے ہے جس کے معنی ہیں رُبَّ یعنی بہت (ل)

چونکہ اس رکوع میں عبرت دلانا مقصود ہے اس لیے بطور تمہید عام لوگوں کی حالت غفلت اور لاپروائی کا ذکر کرتا ہے کہ کتنے نشانوں پر گزر جاتے ہیں مگر ان پر غور نہیں کرتے بلکہ آنکھیں بند کرکے گزر جاتے ہیں۔ ایک ہی چیز کو دو آدمی دیکھتے ہیں ایک کے نزدیک اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی، دوسرا اس سے بڑے بڑے قیمتی سبق حاصل کرلیتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ اپنی عادت ایسی بناؤ کہ ہر نشان سے عبرت حاصل کرو، ہر تذکرہ سے فائدہ اٹھاؤ۔

ع۱۵۹۱ ایک حالت تو کفار کی ہے کہ اللہ پر ایمان بھی لاتے ہیں اور پھر شریک بھی ساتھ ٹھہراتے ہیں۔ کوئی مشرک قوم نہیں مگر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا بھی ساتھ ساتھ اقرار کرتی ہے۔ عرب کے لوگ باوجود پتھروں اور درختوں اور بتوں کی پرستش کے، ہندو باوجود اپنے کروڑ ہا دیوتاؤں اور دیویوں اور بتوں کے خدا کو ایک مانتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر عیسائی ہیں کہ تین خدا کہتے ہوئے خدا کو ایک بھی کہتے ہیں اور تین ایک اور ایک تین کے عقدۂ لاینحل کو قبول کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر فطرت انسانی کی شہادت ہے اور کوئی قوم اس فطری گواہی کا انکار نہیں کرسکتی گو اس فطرت کی شہادت کے ساتھ خواہشات نفسانی کو ملا کر اور بھی ہزار ہا رب بنا لیے ہیں۔ مگر سب سے بڑھ کر قابل افسوس مسلمانوں کی حالت ہے کہ جنہیں ہر قسم کے شرک سے پاک کرکے ایک توحید پر کھڑا کیا گیا تھا۔ انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کو مانتے ہوئے ہزار ہا قسم کے شرک ساتھ ملا لیے ہیں من اتخذ الٰھہ ھوٰلہ کا شرک تو خفی ہے مگر موٹے شرک جیسے قبر پرستی، پیر پرستی انہوں نے مسلمان قوم کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اس موقعہ پر شرک کا ذکر اس لیے کیا کہ جو لوگ شرک میں مبتلا ہوجاتے ہیں وہ اپنی آنکھوں سے اور اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اوپر ذکر آیات اللہ کی طرف توجہ نہ کرنے کا ہی تھا۔ مسلمان بھی پیر پرستی میں پڑ کر اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ چکے ہیں اس لیے ان مصائب سے بھی فائدہ نہیں اُٹھاتے اور عبرت حاصل نہیں کرتے، جو خود اُن پر وارد ہو رہی ہیں۔

ع۱۵۹۲ جب یہ ذکر کیا کہ یہ تمام لوگ توحید کے ساتھ شرک کو ملا رہے ہیں تو اپنے رستہ کا بھی ذکر کیا کہ وہ توحید خالص ہے جو ہر قسم کے شرک سے پاک ہے سب سے زبردست بات جو یہاں بیان فرمائی یہ ہے کہ میں جس بات پر قائم ہوں علی بصیرت ہوں میں ہی نہیں میرے پیرو بھی گویا اچھی طرح اس راہ کے حق ہونے کو دیکھ رہے ہیں اور یقین کامل سے اس پر قائم ہیں پس محمد رسول اللہ صلعم کی پیروی انسان کو علی بصیرت ایمان پر قائم کرنے والی چیز ہے افسوس کہ کتنے مسلمان ہیں جو آج آپ کی پیروی کی برکت سے اس علی بصیرت مقام پر ہونے کا دعوٰی کرسکتے ہیں۔ انہیں اپنے دین کی صداقت کی دلائل کا کچھ بھی علم نہیں رہا۔ اس سے زیادہ دوسرے لوگوں کو علم ہے حالانکہ ہر ایک مسلمان پر یہ حق تھا کہ وہ اپنے دین کی صداقت کے دلائل سے پورا واقف ہوتا تاکہ علی بصیرت اپنے مذہب پر ہوکر دوسروں کو بھی دعوت دے سکتا۔

مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ
اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

اور آخرت کا گھر ان کے لیے بہتر ہے جو تقوےٰ اختیار کرتے ہیں تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ
قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ
نَّشَآءُ ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

یہاں تک کہ جب رسول (لوگوں کی طرف سے) نا امید ہو گئے اور لوگوں نے سمجھ لیا کہ ان کے ساتھ جھوٹ بولا گیا ہماری مدد انکے پاس آ پہنچی سو جسے ہم نے چاہا بچ گیا اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے پھیرا نہیں جاتا ع۱۵۹۳

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ
مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ
الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ
شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ع ۱۲/۷

ان کے ذکر میں عقل والوں کے لیے عبرت ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں جو بنائی گئی ہو لیکن اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ہدایت ہے اور ان لوگوں کے لیے رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں ع۱۵۹۴

ع۱۵۹۳ یہاں بہت لوگوں کو ضمیروں کی غلط فہمی ہوئی ہے ظنوا میں مراد وہ لوگ ہیں جن کی طرف رسول بھیجے گئے۔ یعنی ان کو اس قدر مہلت دی جاتی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ رسولوں نے جو عذاب کے وعدے ہمارے ساتھ کیے تھے وہ سب انہوں نے جھوٹ ہی کہا تھا۔ چنانچہ مفردات میں ہے ظنّ المُرسَلُ الیہم ان المُرسَلَ قد کذبوھم فیما اخبروھم بہ انّھم ان لم یؤمنوا بہم نزل بھم العذاب وانّما ظنّوا ذٰلک من امہال اللہ تعالیٰ ایّاھم و املائہٖ لہم یعنی وہ لوگ جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے انہوں نے ظن کیا کہ رسولوں نے ان سے جھوٹ بولا تھا، جو یہ خبر دی تھی کہ اگر تم ہم پر ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب اُترے گا۔ اور یہ ظن انہوں نے اس لیے کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مہلت دی اور لمبا وقفہ دیا اور رسولوں کے مایوس ہونے سے مراد صرف یہ ہے کہ جب ان کی تبلیغ کی طرف لوگوں نے توجہ ہی چھوڑ دی تو انہوں نے سمجھا کہ اب یہ قطعاً ایمان نہ لائیں گے تو ایسے اوقات میں نصرت الٰہی آتی ہے اور فی الواقع نصرت الٰہی اسی کا نام رکھا جاتا ہے جب اسباب کوئی باقی نہ رہیں اور چاروں طرف سے مایوسی ہی مایوسی نظر آتی ہو۔

ع۱۵۹۴ قرآن تفصیل کلّ شئی ہے سے مراد: ما کان یعنی ما کان القرآن یہ قرآن کوئی افترا کی بات نہیں۔ کیونکہ ایک تو یہ پہلی وحی کی مصدق ہے۔ دوسرے ان تمام اصول دین کی اس نے تفصیل کر دی ہے جو پہلی کتابوں نے مجمل چھوڑ دیئے تھے جیسے مسئلہ توحید نبوت معاد جنت و نار تقدیر وغیرہ۔ کیونکہ جس قدر قرآن کریم نے ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور کسی کتاب نے نہیں ڈالی بلکہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں ڈالی اور قرآن کریم نے نہ صرف ان تمام باتوں کو بالتفصیل بیان کر دیا جو پہلے بیان نہ کی گئی تھیں بلکہ اس تفصیل میں دلائل بھی شامل ہیں۔ یعنی جو دعویٰ کیا اس کے دلائل بھی دیئے۔ پھر اصول باطلہ کی تردید بھی کی، رہیں فروع سو ان کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے نبی کریم صلعم نے بھی بہت کچھ انہیں بیان کر دیا اور آئندہ وقتاً فوقتاً بھی ضرورتیں پیش آتی رہیں گی۔ تیسری بات یہ فرمائی کہ یہ لوگوں کو راہ دکھاتی ہے اور سب ہی کو دکھاتی ہے اور چوتھی یہ کہ جو اسے مان لیتے ہیں ان کے لیے رحمت ہو جاتی ہے ؛

آیاتہا ۴۳ (۱۳) سُوْرَةُ الرَّعْدِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ①

میں اللہ خوب جانتا اور دیکھتا ہوں ۔ یہ کتاب کی آیتیں ہیں اور وہ جو تیرے رب سے تیری طرف اتارا گیا ہے، حق ہے لیکن اکثر لوگ نہیں مانتے ١٥٩٥

نام: اس سورت کا نام الرعد ہے اور اس میں چھ رکوع اور تینتالیس آیتیں ہیں۔ یہ نام اس لحاظ سے رکھا گیا ہے کہ وحی الٰہی کو قرآن شریف نے بار بار بارش سے تشبیہ دی ہے اور اس سورت میں بالخصوص یہ ذکر ہے کہ وحی الٰہی سے ہی مُردہ دل زندہ ہوتے ہیں جس طرح بارش سے مردہ زمین میں جان پڑ جاتی ہے اور بارش میں کڑک کو ان حملوں سے بھی تشبیہ دی ہے جو دشمن حق کے نیست و نابود کرنے کے لیے کرتے تھے اور اس سے مراد وہ مصائب بھی ہیں جو مخالفین حق پر آتی ہیں اور درحقیقت یہ مصائب اس تصادم کا نتیجہ ہوتی ہیں جو حق اور باطل کے درمیان ہوتا ہے جس طرح کڑک بھی بادل میں ایک تصادم کا نتیجہ ہے اس لیے دونوں پر اس کا اطلاق ہے تو اس سورت میں جہاں اسلام کی آخری کامیابی اور غلبہ کا ذکر ہے وہاں ان چھوٹی چھوٹی مصائب کا آنا اس آخری کامیابی کے لیے بطور نشان قرار دیا ہے اور اسی مناسبت سے اس کا نام الرعد رکھا ہے۔

خلاصہ مضمون: سب سے پہلے اس سورت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ وحی الٰہی سے انسان کیونکر فائدہ اٹھاتا ہے اور مثالیں دیکر سمجھایا ہے کہ زمین اور آسمانوں میں تمام نظم کا انحصار زوجیت پر ہے یعنی ایک چیز اثر ڈالنے والی موجود ہے تو دوسری اس کے بالمقابل اثر قبول کرنے والی چیز ہے۔ اسی طرح قلب انسانی کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اور بدوں اس تعلق کے جو انسان اور خدا کے درمیان وحی الٰہی سے پیدا ہوتا ہے قلب انسانی اپنے کمال کو حاصل نہیں کر سکتا۔ پہلے رکوع میں یہ بیان کرکے دوسرے میں بتایا کہ تعلق باللہ کے نتائج اور درحقیقت تمام اعمال کے نتائج عورت کے حمل سے مشابہت رکھتے ہیں یعنی اس عالم میں ظاہر کوئی نتیجہ کھلے طور پر نظر نہیں آتا مگر اندر ہی اندر وہ نتائج تیار ہوتے رہتے ہیں اور یہ بھی بتایا کہ ان نتائج کو قبول کرنے والے دل مراتب میں فرق رکھتے ہیں اور ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق فائدہ اٹھاتا ہے۔ تیسرے رکوع میں ان لوگوں کے جو وحی الٰہی کو قبول کرتے ہیں اور ان کے جو اسے رد کر دیتے ہیں انجام کا مقابلہ کیا۔ چوتھے میں بتایا کہ قرآن کریم ایک طرف قلوب انسانی کے اندر اور دوسری طرف ظاہر میں بھی ایک انقلاب عظیم پیدا کرکے دکھائے گا۔ پانچویں رکوع میں بتایا کہ پیروان حق اور مخالفین حق میں ایک کھلا فیصلہ کر دیں گے اور چھٹے میں ان نشانوں کی طرف توجہ دلائی جو حق کی آخری کامیابی پر اس وقت بھی نظر آ رہے تھے جب بظاہر اسلام چاروں طرف سے مشکلات میں گھرا ہوا تھا اور بتایا کہ دشمنوں کے دلوں کو فتح کرتے چلے جانا اس کی آخری کامیابی کا بین نشان ہے۔

تعلق: الرا کے مجموعہ میں یہ چوتھی سورت ہے۔ اس سے پہلی سورت میں جب حضرت یوسفؑ کے ذکر میں سمجھایا کہ آخرکار محمد رسول اللہ صلعم کے سامنے آپ کے دشمن اور آپ کے خلاف منصوبے کرنے والے کس طرح مغلوب ہونگے تو اس میں اسی حق کی آخری کامیابی اور اس کی وجوہات کو کھول کر بیان فرمایا اور یہ بھی بتایا کہ اس آخری غلبہ کے نشان کس طرح اب بھی ظاہر ہو رہے ہیں

زمانہ نزول وہی ہے جو باقی اس مجموعہ کی سورتوں کا ہے۔ اس سورت میں جو دشمنوں کے مکر یعنی آنحضرت صلعم کے خلاف منصوبوں کا ذکر ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ سورت ہجرت سے کچھ پہلے کی ہے۔ جب آپ کے خلاف منصوبے ترقی پر تھے۔ اور زمین کے گھٹانے کا ذکر جو آیت ۴۱ میں ہے بتاتا ہے کہ اسلام کی کامیابی اب دور دور ہونے لگی تھی۔ اور غالباً مدینہ میں اسلام کے پھیل جانے کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے۔ جس سے اس مجموعہ سور کے زمانہ نزول پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ یہ گیارھویں بارھویں سال بعثت سے تعلق رکھتی ہیں۔

١٥٩٥ الٓمّٓرٰ کے معنی حضرت ابن عباس سے مروی ہیں انا اللہ اعلم و اریٰ (د) گویا الٓمّٓ میں جو ان سورتوں کے شروع میں آتا ہے م بڑھا دیا ہے جو اعلم کا قائم مقام ہے اور اس میں حق کو تباہ کرنے والوں کی سزا کے ساتھ علمی رنگ میں ان کی آخری ناکامی اور نامرادی کے دلائل دیئے ہیں۔ اس لیے یہاں علم اور رویت دونوں صفات کو جمع کیا ہے۔

حقانیت قرآن: ایات الکتاب۔ عموماً جہاں اس طرح کی ترکیب آئی ہے کہیں فرمایا تلك ایات الکتاب الحکیم جیسے سورۂ یونس کے شروع میں، کہیں تلك ایات الکتاب المبین جیسے سورۂ یوسف کے شروع میں۔ دونوں جگہ وصف نے بتا دیا کہ قرآن شریف مراد ہے یہاں لفظ کو عام رکھا ہے جس سے معلوم ہوا کہ جنس کتاب مراد ہے یعنی یہ وحی الٰہی کی آیات ہیں اس لیے ساتھ ہی فرمایا کہ یہ جو تیری طرف نازل ہوا ہے حق ہے۔ اور اسی کی حقانیت پر اس سورت میں دلائل علمی بھی دیئے ہیں۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ
تَرَوۡنَہَا ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ وَ سَخَّرَ
الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ
مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ یُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ
لَعَلَّکُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّکُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ ﴿۲﴾
وَ ہُوَ الَّذِیۡ مَدَّ الۡاَرۡضَ وَ جَعَلَ فِیۡہَا
رَوَاسِیَ وَ اَنۡہٰرًا ؕ وَ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ
جَعَلَ فِیۡہَا زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ یُغۡشِی الَّیۡلَ
النَّہَارَ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے بلند کیا جنھیں تم دیکھتے ہو، پھر عرش پر قرار پکڑا اور سورج اور چاند کو کام پر لگایا ہر ایک ایک مقرر وقت تک چل رہا ہے۔ وہ کاروبار کی تدبیر کرتا ہے، باتیں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔1596

اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے، اور ہر قسم کے پھلوں سے اس میں دو دو (یعنی) جوڑے بنائے، وہ دن پر رات کا پردہ ڈالتا ہے اور اس میں اُن لوگوں کے لیے یقینی نشان ہیں جو فکر کرتے

ع1596 عمد ۔ عَمْد کے معنی ہیں کسی چیز کا تصد کرنا اور اس سے سہارا لینا۔ پس عَمْد اور تَعَمُّد خلاف سہو ہے یعنی ارادۃً ایک کام کرنا و من یقتل مومنا متعمداً (النسآء-۹۳) ولکن ما تعمدت قلوبکم (الاحزاب ۳۳-۵) اور عَمُود خیمہ کی چوب کو کہتے ہیں جس پر خیمہ کا سہارا ہوتا ہے اور ہر چیز جس پر انسان سہارا لے لوہے کی ہو یا لکڑی کی یا ستون اس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اس کی جمع عُمُد اور عَمَد آتی ہے فی عَمَدٍ ممدّدۃ (الھمزۃ ۱۰۴-۹) (غ)

آسمانوں کے غیر مرئی ستون: رفع السمٰوات بغیر عمدٍ ترونھا۔ ابن عباس اور مجاہد سے یہ معنی مروی ہیں اور الفاظ بھی خود اسی معنی کو چاہتے ہیں کہ آسمانوں کو بلند رکھا ہُوا ہے بغیر ایسے ستونوں کے جنہیں تم دیکھتے ہو گویا آسمانوں اور زمین کے درمیان کوئی ایسے ستون ہیں جنہیں ہم نہیں دیکھتے یعنی ان کا باہم کوئی تعلق تو ہے مگر وہ ان آنکھوں سے نظر آنے کے قابل نہیں۔ اور چونکہ یہاں ساری بحث ہی بعض تعلقات پر ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے، جیسے سورج اور چاند کا تعلق یا جیسے زمین اور آسمان کا تعلق۔ یا جیسے پہاڑوں اور دریاؤں کا تعلق رات اور دن کا تعلق وغیرہ اس لیے یہی معنی درست ہیں اور آج سائنس بھی اس بات پر شہادت دیتی ہے کہ ہر ایک نظام کے اندر وہ تعلقات موجود ہیں جو اس کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ بغیر ان تعلقات کے جیسے کشش ثقل وغیرہ یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا سو یہی وہ ستون ہیں جنہیں ہم نہیں دیکھتے۔

نظام سماوی میں تعلقات اور اثرات: قرآن کریم کے حق ہونے کے دعویٰ کے بعد فوراً یہ مضمون شروع ہو جاتا ہے کہ آسمان ایسے بنائے اور سورج اور چاند سے یہ کام لیا اور اس کا نتیجہ بھی بتایا کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔ ان باتوں کا باہم کیا تعلق ہے۔ قرآن شریف نے بڑی کثرت سے ظاہری امور کو امور باطنی کے لیے بطور شہادت پیش کیا ہے اور صحیفۂ قدرت کے نظاروں سے عالم روحانیت کے نظاروں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ لقاء اللہ یا اللہ کی ملاقات یہ چاہتی ہے کہ انسان اور اس کے رب کے درمیان کوئی تعلق ہو جسے حاصل کیے بغیر نہ صرف انسان کمال کو ہی نہیں پہنچ سکتا، بلکہ وہ سارا نظم ہی تباہ ہو جاتا ہے۔ اور مذہب کی اصل غرض اسی تعلق کی طرف توجہ دلانا ہے اس لیے فرمایا کہ مخلوق پر غور کرو وہاں تم بڑے سے بڑے اجرام میں بھی ایک تعلق کو موجود پاؤ گے جس تعلق سے ہی وہ اپنے وجود کی غرض کو پورا کر رہے ہیں اور جس کے قیام بغیر نظام عالم تباہ ہو جائے۔ مثلاً یہی نظام شمسی لے لو جو ہماری زمین کے لیے بمنزلہ ایک سماء کے ہے۔ یہ سب نظام کواکب اور سورج کے ایک دوسرے سے تعلقات پر مبنی ہے اسی طرح پر اس نظام کا تعلق کسی اور نظام سے ہے جیسا کہ موجودہ تحقیقات نے ثابت کیا ہے پھر سورج اور چاند کے لفظ لا کر توجہ دلائی کہ کس طرح سورج کے نور کا اثر چاند قبول کرتا ہے حالانکہ چاند بالذات روشن نہیں اور یدبر الامر کہہ کر توجہ دلائی کہ اس عالم کا سارا نظام کاروبار کی کل تدبیر اسی ایک اصول پر ہے کہ ایک چیز اثر ڈالتی ہے اور دوسری اثر قبول کرتی ہے یفصل الایات یوں ہم کھول کر باتیں بیان کرتے ہیں تاکہ تم کو یقین آ جائے کہ لقاء اللہ بھی ایک حقیقت ہے یعنی اسی طرح انسان کا بھی ذات باری سے ایک تعلق ہے جو گو آنکھوں سے نظر نہیں آتا مگر ان لوگوں کی زندگیوں میں نظر آتا ہے جو اس تعلق کو کمال کو پہنچاتے ہیں کہ کس طرح وہ عام انسانوں سے ممیز ہو جاتے ہیں اسی مضمون کو اگلی آیت میں اور واضح کیا ہے اور دوسری جگہ صراحت سے بیان فرمایا ہے والسماء بنینھا باید و انّا لموسعون و الارض فرشنٰھا فنعم الماھدون و من کل شئ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون ففروا الی اللہ (الذٰریٰت ۵۱-۴۷-۴۸-۴۹ و ۵۰) اے انسان غور کر کہ آسمان کو ہم نے کس طرح وسعت دی ہے اور زمین کو کیا اچھا بچھایا ہے (یا ان دونوں میں کیسا تعلق رکھا ہے کہ ایک میں اثر ڈالنے کا مادہ ہے تو دوسرے میں اثر قبول کرنے کا اگر ایک بھی ان دونوں میں سے اپنا کام چھوڑ دے تو کس طرح یہ نظام بگڑ جاتا ہے۔ پھر ان دو پر کیا انحصار ہے) ہم نے ہر چیز کے ہی جوڑے جوڑے پیدا کیے ہیں (ساری مخلوق میں غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ایک چیز کے اثر ڈالنے اور دوسری کے اثر قبول کرنے سے ہی سلسلہ نظام عالم چلتا ہے) پس اے انسان تو بھی اللہ کی طرف بھاگ آ کیونکہ اس کے بغیر وہ نظام روحانی قائم نہیں رہ سکتا جو انسان کی زندگی کی علت غائی ہے۔

یَتَفَکَّرُوْنَ ﴿۳﴾
وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ
مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ
وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ قف
وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ ط
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۴﴾
وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا کُنَّا
تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ
الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ج وَاُولٰٓئِكَ
الْاَغْلٰلُ فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ ج وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ج هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۵﴾

ہیں[1597]
اور زمین میں پاس پاس ٹکڑے ہوتے ہیں اور انگوروں کے باغ اور کھیتی اور کھجوریں ایک ہی جڑ سے کئی کئی نکلی ہوئیں اور الگ الگ جڑوں سے نکلی ہوئیں سب کو ایک ہی پانی دیا جاتا ہے اور ہم ان میں سے بعض کو بعض پر پھل میں فضیلت دیتے ہیں اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں[1598]
اور اگر تو تعجب کرے تو ان کا یہ کہنا عجیب تعجب ہے کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو پھر ایک نئی پیدائش میں آئیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کا انکار کرتے ہیں اور یہی ہیں جن کی گردنوں میں زنجیریں ہیں اور یہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے[1599]

ع۱۵۹۷ ہر چیز کے ازواج: رفع سماوات کے مقابل یہاں مدالارض سے شروع کیا۔ اور یوں آسمان اور زمین کے تعلق زوجیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ پھر جس طرح وہاں سورج اور چاند ہیں۔ یہاں پہاڑوں اور دریاؤں کا کیا عجیب تعلق ہے کہ پہاڑ بادلوں کو کھینچتے ہیں اور یہاں پانی برستا ہے تو اس سے دریا بنتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ غور کرو تو معلوم ہو گا کہ تمام قسم کے پھلوں میں بھی جوڑے ہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے جس کا آج ہی دنیا کو علم ہوا، زمانۂ نزول قرآن کے وقت دنیا اس سے بیخبر تھی۔ پھر اور ترقی کر کے فرمایا رات کی تاریکی کا پردہ دن پر ڈالتا ہے گویا رات اور دن میں بھی ایک تعلق زوجیت ہے۔ ورنہ رات دن کو ثمرات سے کیا تعلق۔ فرمایا نشان تو اس میں ہیں مگر فکر کرے بغیر ان کا علم نہیں ہوتا۔

ع۱۵۹۸ قطع۔ قِطَع قِطْعَۃ کی جمع ہے ایک ٹکڑا قطعاً مِّنَ الیّل (یونس ۱۰-۲۷) اور قِطْع اور قِطْعَۃ کے ایک ہی معنی ہیں فاسر باھلك بقطع من الیل (ھود ۱۱-۸۱)

متجاورات۔ جار کے معنی ہیں ہمسایہ اور پھر محض قریب پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ اور جَاوَرَ۔ تَجَاوَرَ کے معنی ہیں ایک دوسرے کے پاس ہوئے لا یجاورونك فیھا الا قلیلا (الاحزاب ۳۳-۶۰) (غ) اور مُتَجَاوِر ایک دوسرے کے پاس۔

صنوان۔ صِنو شاخ جو درخت کی جڑ سے نکلے اور صِنْوَانِ اس کا تثنیہ اور صِنْوَانٌ جمع ہے (غ)

جب یہ بیان کیا کہ انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے تو اب باوجود اس تعلق کے اختلاف مراتب کی وجہ بیان فرمائی کہ یہ اختلاف خود اس استعداد سے بھی پیدا ہوتا ہے جو قبولیت کے لیے چیزوں میں ہے چنانچہ زمین تو ایک ہی ہے مگر اس کے مختلف قطعات کو دیکھو کہ پاس پاس قطعات ہوتے ہیں پھر ان میں سے بعض ایک قسم کے پھل کو اچھا اگاتے ہیں بعض دوسری قسم کے، پھر باوجود اس کے کہ ایک ہی پھل ہو اور ایک ہی پانی ملتا ہو اُن کے ذائقوں میں اختلاف ہوتا ہے اسی لحاظ سے یہاں لفظ اُکُل اختیار کیا ہے کہ پھل اور ذائقہ دونوں پر آسکے اس کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۰۲۴ اس میں مسئلہ تناسخ کی بھی تردید کر دی ہے کہ اگر انسانوں میں اختلاف مراتب ہے تو یہ اختلاف تقاضائے قدرت سے ہے بدون اس اختلاف کے دنیا رہ ہی نہیں سکتی یہاں تک کہ زمین کے مختلف قطعات میں بھی اختلاف ہے پس جن لوگوں نے محض اختلاف مراتب و استعداد انسانی کو دیکھ کر یہ خیال کر لیا ہے کہ یہ کسی پہلی زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہے انہوں نے عقل سے کام نہیں لیا ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ اختلاف تمام عالم میں موجود ہے اور موجودات اس اختلاف کے بغیر رہ ہی نہ سکتی تھی اختلاف مخلوق کا خاصہ ہے۔ ہاں اس اختلاف میں جو وحدت نظر آتی ہے وہ اسبات کی شہادت ہے کہ ایک ہی خالق کے ہاتھ سے یہ نکلی ہوئی چیزیں ہیں۔

ع۱۵۹۹ اغلال۔ غَلَل کے معنی درمیان میں ہونا ہیں اور غُلّ وہ چیز ہے جس سے انسان قید کیا جائے یعنی اس کے اعضا اکٹھے باندھ کر درمیان میں کر دیئے جائیں اس کی جمع اَغلال ہے اور انا جعلنا فی اعناقھم اغلالا (یٰسٓ ۳۶-۸) سے مراد ہے مَنَعْنٰھُمْ فِعْلَ الْخَیْرِ یعنی انہیں نیکی کے کاموں سے روک دیا۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسا دلوں پر مہر وغیرہ کا لگانا (غ) اور والاغلال التی کانت علیھم میں زجاج کا قول ہے کہ اس سے مراد ان کی وہ رسوم ہیں جن میں جکڑے ہوئے تھے یا ایسی باتیں جو ان میں روک کے طور پر تھیں جیسا مثال کے طور پر کہتے ہیں ھٰذا طوق فی عنقك حالانکہ

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۶

اور بھلائی سے پہلے تجھ سے دکھ کی جلدی کر رہے ہیں اور ان سے پہلے عبرت ناک مثالیں گزر چکی ہیں اور تیرا رب لوگوں کو باوجود ان کے ظلم کے معاف کرتا رہتا ہے اور تیرا رب بدی کی سزا دینے میں سخت (بھی) ہے ع۱۶۰۰

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۷ ع

اور جو کافر ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس پر اپنے رب کی طرف سے نشان کیوں نہیں اتارا جاتا تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کے لیے راہ دکھانے والا ہے ع۱۶۰۱

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰی وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ ؕ وَ كُلُّ

اللہ جانتا ہے جو ہر ایک مادہ حمل میں لیتی ہے اور جسے رحم گھٹاتے ہیں اور جسے وہ بڑھاتے ہیں اور ہر ایک چیز اس کے ہاں

طوق فی الحقیقت مراد نہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ تم پر لازم کر دیا گیا ہے اور اذا الاغلال فی اعناقھم (المؤمن-۷۱) میں مراد ایسے اعمال ہیں جن میں وہ جکڑے ہوئے ہیں (ل) اور تفاسیر میں بھی یہاں یہ معنی جائز قرار دیئے ہیں کہ مراد ایمان سے روکنا وغیرہ ہے (ر) یا ان کے بُرے رسوم و رواج جو زنجیروں کی طرح ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں (ح)

بعث بعد الموت اور اس کا انکار: تعلق باللہ کا کمال چونکہ زندگی بعد الموت میں حاصل ہوتا ہے اس لیے اب مضمون کا انتقال اس طرف کیا ہے اور اس زندگی بعد الموت کو خلق جدید یا ایک نئی پیدائش قرار دیا ہے وہ یہ زندگی نہیں اور دوسری جگہ صفائی سے فرمایا وننشئکم فی ما لاتعلمون (الواقعۃ ۵۶-۶۱) یعنی ایسی زندگی تمہیں دینگے جس کو تم نہیں جانتے۔ اس خلق جدید کے انکار کو انکار رب قرار دیا ہے۔ اولئك الذين كفروا بربھم اس لیے کہ گو ایسے لوگ خدا کو مانتے ہوں مگر اس کی صفت ربوبیت کا وہ انکار کرتے ہیں کیونکہ اس کی صفت ربوبیت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان کو اس کے کمال روحانی تک پہنچائے۔ اور وہ کمال زندگی بعد الموت میں حاصل ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ ان کی گردنوں میں طوق ہیں یعنی جو لوگ لقاء اللہ کے منکر ہوتے ہیں ان کے قوائے روحانی نشوونما پانے سے رک جاتے ہیں جس طرح وہ شخص جس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے جائیں کاروبار سے رک جاتا ہے اور یہ سچ ہے کہ لقاء اللہ سے انکار کر کے قوائے روحانی کا نشوونما رک جاتا ہے اور اس طرح رک جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اصحاب النار ہیں گویا قوائے روحانی کی نشوونما سے جنت پیدا ہوتی ہے اور ان کے نشوونما کے رک جانے سے آگ پیدا ہوتی ہے اور یہی انسان کا دوزخ ہے ومن کان فی ھذہٖ اعمٰی فھو فی الاخرۃ اعمٰی (بنی اسرائیل- ۷۲)

ع۱۶۰۰ مثلت مُثْلَۃ کی جمع ہے اور وہ وہ سزا ہے جو انسان پر آئے تو اس کو ایک مثال بنا دے جس سے دوسرا رک جائے (غ)۔ بخاری میں ہے کہ یہ مَثُلَۃ کی جمع ہے جس کے معنی اشباہ و امثال ہیں۔

دُکھ کو بھلائی سے پہلے چاہتے ہیں اور اس کے لیے جلدی کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر حق کو قبول کریں اس پر عمل کریں تو ان کے لیے بھلائی ہے اگر اسے رد کریں تو ان کے لیے دُکھ ہے۔ پس رد کرنے میں جلدی کرنا گویا دکھ کے لیے جلدی کرنا ہے اپنے فائدہ کی بات کو چھوڑ کر دکھ کو قبول کرتے ہیں اور یہ بھی غور نہیں کرتے کہ پہلے لوگوں نے یہی راہ اختیار کر کے کیسی سزا پائی۔

ع۱۶۰۱ اٰیۃ سے مراد یہاں وہی نشان ہلاکت ہے جس کی طرف پچھلی آیت میں بھی اشارہ ہے یستعجلونك بالسیئۃ یعنی حق کی مخالفت کرتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ اپنی مغفرت کی وجہ سے پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا تو کہتے ہیں وہ نشان ہلاکت کیوں نہیں آتا، جس سے ڈرایا گیا تھا۔ اس کا جواب دیا ہے کہ نبی صرف منذر ہے یعنی بدی کے بد انجام سے ڈرا دینا اس کا کام ہے اس انجام کو لانا اس کے اختیار میں نہیں یہ نشان کا انکار نہیں بلکہ بتایا ہے کہ جب ڈرایا جاتا ہے تو وہ عذاب بھی آ کر ہی رہے گا۔ اور یہ جو بڑھایا ولکل قوم ھاد تو مطلب یہ ہے کہ چونکہ آپ کو ہر قوم کا ہادی بنا کر بھیجا گیا ہے اس لیے وہ باتیں جن سے آپ ڈراتے ہیں وہ بھی ہر قوم کے لیے ہیں پس جو کوئی قوم بھی آپ کی مخالفت کرے گی اسی کے لیے یہ انذار بھی ہے۔ یہ آیت علاوہ اس کے کہ آنحضرت صلعم کی بعثت عامہ کا ذکر کرتی ہے۔ ختم نبوت پر بھی دلیل ہے اس لیے کہ کل اقوام عالم کی ہدایت اور انذار ہمیشہ کے لیے آپ کے سپرد کیا گیا۔ عذاب انذار کا نتیجہ ہے جب انذار آپ کی طرف سے ہوا تو عذاب بھی جو آئے گا وہ آپ کے انکار کی وجہ سے آئے گا اور یہ انذار اگر آپ کے پیرو کریں تو بھی آپ کی طرف سے ہی ہوگا کیونکہ اس حق کے بعد جو نبی صلعم لائے دوسرا کوئی حق آنے والا نہیں۔ بعض نے ولکل قوم ھاد کے معنی یوں بھی کیے ہیں کہ ہر قوم میں ایک ہادی ہو گزرا مگر یہ معنی یہاں موزوں نہیں۔

شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ ﴿۸﴾
عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ الۡکَبِیۡرُ الۡمُتَعَالِ ﴿۹﴾
سَوَآءٌ مِّنۡکُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ وَ مَنۡ
جَہَرَ بِہٖ وَ مَنۡ ہُوَ مُسۡتَخۡفٍۭ بِالَّیۡلِ
وَ سَارِبٌۢ بِالنَّہَارِ ﴿۱۰﴾
لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ مِنۡ
خَلۡفِہٖ یَحۡفَظُوۡنَہٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ
اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا
بِاَنۡفُسِہِمۡ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوۡمٍ سُوۡٓءًا

اندازہ سے ہے ع۱۶۰۲
وہ غائب اور حاضر کا جاننے والا بہت بڑا بلند ہے ع۱۶۰۳
برابر ہے تم میں جو چھپ کر بات کرے اور جو اُسے پکار کر کہے اور جو رات کو چھپ رہا ہو اور جو دِن کو چل رہا ہو ع۱۶۰۴
اس کے لیے اس کے آگے اور پیچھے (اعمال کا) پیچھا کرنے والے ہیں جو اسے اللہ کے حکم سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو نہ بدلیں) اور جب اللہ کسی قوم کے لیئے تکلیف کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کسی طرح رد نہیں ہو سکتی

ع۱۶۰۲ تحمل۔ حِمل ظاہری بوجھ پر اور حَمل باطنی بوجھ پر بولا جاتا ہے جیسے پیٹ میں بچہ اور بادل میں پانی اور درخت میں پھل وان تدع مثقلۃ الی حملہا (فاطر ۳۵-۱۸) اور اِحتَمَلَ اور حَمَلَ کے ایک ہی معنی ہیں (رغ)

پیچھے بھی اعمال کی جزا و سزا کا ذکر ہے اور آگے بھی اور درمیان میں یہ ایک آیت ہے پس اس سے مراد صرف اس قدر لینا کہ اللہ کو یہ علم ہے کہ عورت کے پیٹ میں لڑکا یا لڑکی ہے اور مدّت حمل آٹھ یا نو یا دس مہینے ہے درست نہیں۔ بلکہ جس طرح پچھلے رکوع میں آسمان اور زمین کی اور پھر ہر شے میں ایک اثر ڈالنے والے اور ایک اثر قبول کرنے والے کی مثالیں دی تھیں، اسی طرح یہاں عورت کے حمل کو بطور ایک مثال کے بیان کیا ہے۔ گویا عمل کرنے والا بمنزلہ ایک مادہ کے ہے اور جو عمل وہ کرتا ہے وہ بطور حمل کے ہے جس طرح عورت کے پیٹ میں وہ چیز نظروں سے مخفی ہوتی ہے جو اندر ہی اندر تیار ہو رہی ہے اسی طرح اعمال کے نتائج نظروں سے مخفی ہوتے ہیں لیکن ایک صورت وہ اندر ہی اندر تیار کرتے جاتے ہیں۔ گویا وحی الٰہی اثر ڈالنے والی چیز ہے انسان اثر قبول کرنے والا ہے۔ اعمال جو اس اثر سے پیدا ہوتے ہیں وہ بمنزلہ حمل کے ہیں اور یہ جو فرمایا کہ بعض کو رحم تکمیل تک نہیں پہنچاتے اور بعض کو بڑھاتے ہیں تو یہی حالت اعمال میں ہے بعض وقت ایک انسان اچھے عمل کرتا ہے جن سے اچھے نتائج کی توقع ہونی چاہیئے مگر ایک مرتبہ کوئی ایسی آفت آ جاتی ہے کہ وہ نتیجہ تکمیل پذیر ہونے سے رہ جاتا ہے جس طرح حمل بعض وقت پوری پرورش نہ پانے کی وجہ سے ساقط ہو جاتے ہیں اور بعض پوری قوت پا کر کمال کو پہنچ جاتے ہیں اور آخر پر کل شئی عندہ بمقدار کہہ کر انہی نتائجِ اعمال کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی ہر چیز کا (اور یہاں ذکر بالخصوص اعمال کا ہے) اسی پر قیاس کر لو۔ چنانچہ اگلا سارا مضمون اس معنی کی تائید کرتا ہے۔ یہاں تک کہ آیت ۱۱ میں صاف فرمایا کہ ہر عمل کو اللہ تعالیٰ کے محفوظ کرنے والے فرشتے محفوظ کرتے رہتے ہیں گویا وہ ایک نتیجہ پیدا کرتا رہتا ہے۔

ع۱۶۰۳ الکبیر۔ کِبر کے لیے دیکھو ع۵۳ اور کِبر کے معنی رفعت اور شرف بھی ہیں یا شرف میں رفعت اور الکبیر اور المُتکَبِّر اللہ تعالیٰ کے اسماء میں اسی معنی میں ہیں یعنی عظمت و کبریاء والا اور کِبریاء کمال ذات اور کمال وجوب پر دلالت کرتا ہے اور سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کے وصف میں نہیں آتا (ت) اور چونکہ کبیر اور صغیر نسبتی اسماء ہیں اور کبیر کا اطلاق بمعنی رئیس وغیرہ بھی ہو جاتا ہے جیسے انہ لکبیرکم الذی علّمکم السحر (طٰہٰ ۲۰-۱۷) اس لیے اللہ اکبر میں یہ بتانا مراد ہے کہ وہ سب سے بڑا ہے۔ جیسے الاعلیٰ میں دوسروں پر اس کا علو مراد ہے۔

المتعال۔ عُلوّ پستی کی ضد ہے اور علا یعلوا سے مصدر عُلُو اور عَلِیَ یَعلیٰ سے علاً ہے اور ان میں سے پہلا اچھے اور بُرے دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے اور دوسرا صرف اچھے معنی میں اور پہلے کی مثالیں قرآن شریف میں بہت ہیں۔ ان فرعون علا فی الارض (القصص ۲۸-۴) وکانوا قوماً عالین (المؤمنون ۲۳-۴۶) لا یریدون علوّا فی الارض (القصص ۲۸-۸۳) ولتعلنّ علوّا کبیرا (بنی اسرائیل ۱۷-۴) اور دوسرے یعنی عَلِیَ سے عَلِیٌّ ہے جس کے معنی رفیع القدر ہیں اور مراد یہ ہے کہ وہ اس سے بلند ہے کہ وصف کرنے والوں کا وصف یا عارفوں کا علم اس کا احاطہ کر سکے اور تعالیٰ سے بھی یہی مراد ہے اور باب تفاعُل اس صورت میں مبالغہ کے لیے ہے (رغ) اسی سے متعال ہے۔

ع۱۶۰۴ مستخف۔ خَفِیَ کے معنی چھپ گیا اور اِخفاء چھپانا، اِستخفاء طلب اخفاء یعنی چھپانے کی کوشش کرنا لیستخفوا منہ (ھود ۱۱-۵) (غ) اسی سے مُستخفی اسم فاعل ہے۔

سارب۔ سَرَب کے معنی نشیب کی طرف جانا ہیں فاتخذ سبیلہ فی البحر سربا (الکھف ۱۸-۶۱) اور سارب مطلق چلنے والے کو کہتے ہیں (غ) ہو سکتا ہے کہ یہاں ان خفیہ منصوبوں اور کھلی شرارتوں کیطرف بھی اشارہ ہو جو نبی کریم صلعم کے خلاف کی جاتی تھیں۔

فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ⑪
هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا
وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۚ ⑫
وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ
بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ
وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ۭ ⑬

اور ان کے لیے اس کے سوائے کوئی حمایتی نہیں ع۱۶۰۵
وہی ہے جو تمھیں ڈرانے اور امید دلانے کو (بجلی کی) چمک دکھاتا
ہے اور بھاری بادل اٹھاتا ہے ع۱۶۰۶
اور گرج اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور فرشتے اس کے
خوف سے اور وہ بجلیاں بھیجتا ہے پھر جس پر چاہتا ہے انھیں
گراتا ہے اور وہ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور
وہ بڑی قوت والا ہے ع۱۶۰۷

ع۱۶۰۵ معقبات۔ عَقِب سے ہے اور تعقیب کے معنی ایک چیز کو دوسری کے پیچھے لانا ہیں۔ لا معقّب لحکمہٖ (الرعد ۱۳۔ ۴۱) یعنی جب اس کا حکم آجائے تو پھر اس کے پیچھے کوئی دوسرا حکم لانیوالا نہیں مطلب یہ کہ آخری حکم اسی کا ہے اس کا رد کرنے والا کوئی نہیں۔ اور معقبات کے معنی کیے گئے ہیں وہ فرشتے جو انسان کی حفاظت کرتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں (غ) اور جو شخص ایک کام کرے پھر اس کی طرف عود کرے تو یہ تعقیب ہے اسی لیے اس شخص کو مُعَقِّب کہا جاتا ہے جو نماز کے بعد نماز پڑھتا ہے یا غزوہ کے بعد غزوہ کرتا ہے (ل) اور یا ملائکہ کو معقبات اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ وہ انسان کے اقوال اور افعال کا پیچھا کرتے ہیں یعنی اسے لکھ کر محفوظ کرتے چلے جاتے ہیں (ر) اور معقبۃ میں تا مبالغہ کے لیے ہے۔ یا معقبۃ معقب کی جمع ہے اور معقبات جمع الجمع ہے۔

معقبات سے مراد کراماً کاتبین ہیں: معقبات کون ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مصائب وغیرہ کے پہنچنے سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں مگر یہ معنی نہ تو لفظ معقبات کے لحاظ سے چسپاں ہیں اور نہ ہی سیاق وسباق کے لحاظ سے۔ معقبات کے ایک معنی کے لحاظ سے یہ وہ فرشتے ہیں جو ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور یہ فرشتے وہی ہیں جو انسان کی حسنات اور سیئات کو لکھنے والے ہیں اور یہی ملائکۃ اللیل اور ملائکۃ النہار کہلاتے ہیں اور دوسرے معنی کے لحاظ سے تو بالکل صاف ہیں انہم یعقبون اقوال الشخص وافعالہ ای یتبعونہا ویحفظونہا بالکتابۃ پس یہ وہی ملائکہ ہیں جن کو دوسری جگہ کراماً کاتبین کہا ہے اور سیاق اور سباق کے لحاظ سے بھی ظاہر ہے کہ یہاں ذکر انسان کی بلاؤں سے حفاظت کا نہیں ہے بلکہ اس کے اعمال کی حفاظت کا ہے جیسا کہ اس سے پچھلی آیت سے اور اگلے الفاظ لا یغیر ما بقوم سے ظاہر ہے اور خود قرآن کریم کی شہادت بھی بالصراحت موجود ہے کہ انہیں ملائکہ کو حافظ اور نگہبان کہا گیا ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا ما یلفظ من قول الّا لدیہ رقیب عتید (قٓ ۵۰۔ ۱۸) کوئی بات منہ سے نہیں نکلتی مگر اس کے پاس ایک حفاظت کرنے والا تیار رہتا ہے۔ اور دوسری جگہ ہے وانّ علیکم لحافظین کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون (الانفطار ۸۲۔ ۱۰۔ ۱۱) تم پر حفاظت کرنے والے ہیں کراماً کاتبین وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ اور یہی مراد یحفظونہ من امر اللہ سے ظاہر ہے اور یحفظونہ میں ضمیر یا اس عمل کی طرف ہے جو انسان کرتا ہے اور یا خود کرنے والے انسان کی طرف ہے کہ اس کی حفاظت سے مراد اس کے اعمال کی ہی حفاظت ہے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو حفاظت کے قابل ہے اور اس کتاب کے متعلق ہی دوسری جگہ فرمایا وعندنا کتاب حفیظ (قٓ ۵۰۔ ۴)

اعمال کی ذمہ داری کے احساس میں ہی شرف انسانیت ہے جس قدر انسان ترقی کرتا چلا جاتا ہے اسی قدر اس میں اپنے اعمال کی ذمہ داری کا احساس زیادہ سے زیادہ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے اور اس احساس ذمہ داری کو مذہب نے اور بالخصوص اسلام نے کمال تک پہنچا دیا، جب یہ قانون بنا دیا کہ کسی حال میں ہو ہر ایک عمل لکھ لیا جاتا ہے یعنی محفوظ کر لیا جاتا ہے اس لیے کوئی عمل بھی انسان کا بلا نتیجہ نہیں رہتا اس اصول کے تسلیم کرنے میں نسل انسانی کی حقیقی بہتری ہے اس لیے اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ اگر کوئی قوم اپنی بہتری چاہتی ہے تو اس کے افراد اپنی حالت کو تبدیل کریں، بدون اس کے قوم کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی۔ آج مسلمان اس اصول کو فراموش کر کے ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں اور اپنے نفسوں کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے تو وہ ٹلتا نہیں تو مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ تو انسان کے اعمال پر ہے۔ جب ایک قوم کے اعمال کا یہ تقاضا ہو جاتا ہے کہ اس پر مصیبت آئے تو پھر واویلا سے وہ دور نہیں ہوتا ہاں پھر بھی اصلاح کریں تو اللہ تعالیٰ اسے دور کر دیتا ہے۔

ع۱۶۰۶ برق۔ وہ چمک اور رَعْد وہ گرج ہے جو بادل سے پیدا ہوتی ہے۔

السحاب الثقال۔ ثقال۔ ثقیلۃ کی جمع ہے بھاری۔ سحاب چونکہ اسم جنس ہے اس لیے اس کی صفت جمع لائی گئی۔

ع۱۶۰۷ مِحال۔ کا اصل مَحَلَ سے ہے اور اس کے معنی عقوبت کا وارد کرنا ہیں اور بعض کے نزدیک مِحَال کا اصل حَوْل بمعنی قوت سے ہے (غ)

چونکہ اس رکوع کا مضمون بھی صداقت وحی ہے اور قرآن کریم میں وحی کی مثال بارش سے دی ہے او کصیب من السماء فیہ ظلمت ورعد

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا
كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا
هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿١٤﴾
وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ
طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ۩ ﴿١٥﴾ سجدة
قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ

اسی کا حق ہے کہ اُسے پکارا جائے اور وہ جنھیں وہ اس کے سوائے
پکارتے ہیں وہ ان کی دعا کو قبول نہیں کرتے۔ مگر اس شخص کی طرح
جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلاتا ہے تاکہ وہ اس کے
منہ تک آپہنچے اور وہ اس تک پہنچنے والا نہیں اور کافروں کی دعا ضائع ہی ہوتی ہے [١٦٠٨]
اور جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں چار و ناچار اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں،
اور اُن کے سائے بھی صبح اور شام (سجدہ کرتے ہیں) [١٦٠٩]
کہہ کون آسمانوں اور زمین کا رب ہے؟ کہہ دے اللہ!، کہہ

وبرق (البقرۃ ٢ - ١٩) اسی مناسبت سے یہاں بارش اور بادل اور رعد اور برق کا ذکر کیا ہے اور آگے آیت ١٧ میں اس کی اور وضاحت کر دی ہے، وحی الٰہی کو نزول باران سے یہ مشابہت ہے کہ جس طرح بارش سے زمین کی مخفی طاقتیں کام کرنے لگ جاتی ہیں وحی الٰہی سے بھی انسانوں کی مخفی طاقتیں کام کرنے لگ جاتی ہیں اور ایک مردہ قوم میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی کچھ مشکلات بھی ہوتی ہیں اور صاعقہ کے بھیجنے سے مراد یہ ہے کہ کچھ لوگ بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس باران رحمت سے فائدہ اٹھائیں اُلٹا جھگڑا کر کے اس کے تباہ کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان پر کچھ عذاب بھی آتا ہے مگر آخری نتیجہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد ہے دکھ اور تکلیف کی بھی یہی غرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح ہو۔

ع١٦٠٨ لہ دعوۃ الحق۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے جو دعا کی جاتی ہے وہ برمحل ہے اور قبول ہوتی ہے یا اس کا فائدہ پہنچتا ہے اور اس دعوت یا دعا سے مراد یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ہے مضمون یہاں بھی وہی ہے جو پیچھے چلا آتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کر کے انسان فائدہ اٹھاتا ہے مگر یہاں اسے توحید کی طرف منتقل کر کے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے جو اور بتوں وغیرہ سے تعلق پیدا کیا جاتا ہے تو اس کا نتیجہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی مثال یہ دی ہے کہ ایک پیاسا آدمی ہاتھ پھیلا کر پانی سے آرزو کرتا رہے کہ وہ خود چل کر اس کے مُنہ تک پہنچ جائے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ قوتیں دی ہیں کہ وہ ان سب چیزوں کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے اور وہ اس کی خادم ہیں۔ مگر غلط کار انسان انہیں اپنا مخدوم بنا لیتا ہے اور اپنی پیدائش اور ان چیزوں کی پیدائش کی علّت غائی کو بھی باطل کرتا ہے دعاء الکافرین سے مراد یہاں وہی دعا ہے جو وہ اپنے بتوں وغیرہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور کافر جو بعض وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے جیسا کہ مشرکوں کے ذکر میں آتا ہے کہ وہ مصیبت کے وقت اللہ تعالےٰ کو پکارتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو بھی سن لیتا ہے دعوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین لئن انجیتنا من ھٰذہ لنکونن من الشاکرین۔ فلمّا انجٰھم (یونس ١٠ - ٢٢ و ٢٣)

ع١٦٠٩ طوعًا و کرھًا۔ طَوع انقیاد یعنی فرمانبرداری ہے اور کَرْہ اس کی ضد ہے اور طوعًا و کرہًا سے مراد ہے کہ بہرحال اس کی فرمانبرداری کرتے ہیں جو برضا و رغبت فرمانبرداری نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا نہیں کرتے وہ اس کا نتیجہ کسی اور رنگ میں بھگتتے ہیں اور اسی کو کرھا فرمانبرداری کہا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے قانون میں جکڑے ہوئے ہیں اگر قانون کو نہ مانیں اور اس کو توڑ دیں تو پھر آخر اس کی سزا اُٹھانی پڑتی ہے۔ یہ بھی آخر کار سجدہ ہی ہے گو نقصان کے رنگ میں۔ اور من فی السمٰوات والارض سے مراد یا ملائکہ اور جن و انس ہیں اور یا سب مخلوق اس میں شامل ہے۔

ظلال یا سائیوں کے سجدہ سے کیا مراد ہے۔ اس کی تصریح خود قرآن شریف نے دوسری جگہ کر دی ہے اولم یروا الی ما خلق اللّٰہ من شئ یتفیّئوا ظلالہ عن الیمین والشمائل سجدًا للّٰہ وھم داخرون (النحل ١٦ - ٤٨) مطلب یہ ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے قانون کے ماتحت چلتے ہیں تو انسان اس قانون سے باہر کیونکر نکل سکتا ہے جب اس کا سایہ تک بھی قانون میں جکڑا ہوا ہے مگر آیا ظل یا سایہ سے مراد صرف انسان کا وہ سایہ ہے جو سورج کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ظلّ عربی زبان میں بہت وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی پردہ اور سواد اور کسی چیز کا اپنا وجود بھی مراد لے لیا جاتا ہے حضرت ابن عباس کی حدیث میں آتا ہے ان الکافر یَسْجُدُ لغیر اللّٰہ وظِلُّہ یسجد لِلّٰہ جہاں ظِلّ کے معنی اس کا جسم لیے گئے ہیں جس سے سایہ پیدا ہوتا ہے (ن) اور ظلال البحر سے مراد اس کی موجیں لی گئی ہیں (ل) اور ظِلّ کے معنی خیال بھی آئے ہیں (ل) اور ظل کے معنی حالت بھی ہیں انتقلت عن ظلّی یعنی میں اپنی حالت سے الگ ہو گیا (ت)

اور ظِلّ کا لفظ دو حدیثوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے ایک میں ہے سَبْعَۃٌ یُظِلُّھُمُ اللّٰہ فی ظِلِّہٖ جہاں اللہ کے ظلّ سے مراد اس کی رحمت لی گئی ہے اور السلطان ظِلُّ اللّٰہِ فی الارض جہاں ظل اللّٰہ کے معنی ستر اللّٰہ یا خاصۃ اللّٰہ لیے گئے ہیں (ن۔ت) اور دونوں حدیثوں سے ظاہر ہے کہ ظلّ سے مراد اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا ظہور لیا گیا ہے جس طرح سایہ کسی شخص کا ظہور ہوتا ہے۔ پس ظلال کے ظاہر معنی لیتے ہوئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسان خود تو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری چار و ناچار اختیار کرتا ہی ہے مگر اس کی صفات کا جو ظہور اعمال کے رنگ میں ہوتا ہے جسے انسان

قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ⑯

تو کیا تم اس کے سوائے حمایتی بناتے ہو، جو اپنے بھلے بُرے کے مالک نہیں، کہہ کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہیں، یا کیا اندھیرا اور روشنی برابر ہیں یا کیا انھوں نے اللہ کے کوئی ایسے شریک بنائے ہیں جنھوں نے (کچھ) پیدا کیا ہو، جیسے اللہ پیدا کرتا ہے پھر پیدائش ان کی نظر میں مل جل گئی، کہدے اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ اکیلا ہے سب پر غالب ؏۱۶۱

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ

وہ بادل سے پانی اتارتا ہے پھر نالے اپنے اپنے اندازے کے موافق بہ نکلتے ہیں، پس سیلاب جھاگ کو اوپر اٹھا دیتا ہے، اور اس میں جسے آگ میں تپاتے ہیں، زیور یا اور سامان بنانے کے لیے اسی طرح جھاگ ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال دیتا ہے۔ سو جھاگ تو رائیگاں جاتا ہے اور وہ (پانی) جو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے، زمین میں ٹھیرا رہتا ہے۔ اسی طرح

کا ظل کہنا چاہیئے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے قوانین کے ماتحت اور اس کا فرمانبردار ہے۔ یعنی انسان جیسا بھی چاہے عمل کرے وہ گو اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرے مگر جو وہ عمل کرتا ہے چونکہ اس پر نتیجہ پھر اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق مترتب ہوتا ہے اس لیے وہ اس کا ظل یا عمل یا اس کی صفات کا ظہور اللہ تعالیٰ کو ہی سجدہ کرتا ہے اور ظلّ بمعنی حالت اوپر بیان ہو چکا یہ معنی اس کے مطابق ہیں اور میرے نزدیک حضرت ابن عباس کی اس حدیث کے جو اوپر نقل ہو چکی الکافر یسجد لغیر اللہ فظله یسجد للہ کے یہی معنی ہیں اور یہی معنی ظلال کے الجنة تحت ظلال السّیوف میں ہیں یعنی تلوار سے جو جہاد فی سبیل اللہ کیا جاتا ہے اس سے جنت حاصل ہوتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ صوفی جسے ظلی نبوت کہتے ہیں وہ فی الواقع نبوت نہیں بلکہ نبوت کی بعض صفات کی جھلک ہے، جو ایک سچے پیروی کرنے والے میں پیدا ہو جاتی ہے جس طرح ظل اللہ اللہ نہیں اسی طرح ظل نبی نبی نہیں اور نہ ظلی نبوت نبوت ہے اللہ اور نبی کے ظل ایسے ہی ہیں جیسے صاف پانی یا آئینہ میں آفتاب کا عکس کہ وہ آفتاب کی شکل پر نظر آتا ہے مگر فی الحقیقۃ آفتاب نہیں۔

ع ۱۶۱۰ غیر اللہ سے تعلق بیسود ہے: توحید کے مضمون کو جاری رکھا ہے تاکہ لوگ صرف ایک اللہ سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کریں جس سے انسان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے ایک انسان کو خدا سمجھ کر یا خدائی کا مرتبہ دیکر یا کسی اور چیز کو اپنا معبود بنا کر اور اس سے تعلق پیدا کر کے انسان کو حقیقتاً کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اس لیے کہ یہ چیزیں تو خود اپنی ذات کے لیے بھی نفع نقصان کی مالک نہیں اعمیٰ وہ جاہل ہے جو غیر اللہ سے تعلق پیدا کرتا ہے اور بصیر مومن ہے ظلمات سے مراد کفر اور ضلالت ہیں اور نور سے ایمان۔ آیت کے آخری حصّہ میں خلق کو دلیل عبادت قرار دیکر جیسا کہ بارہا پہلے بھی بیان ہو چکا ہے یایّھا النّاس اعبدوا ربّکم الّذی خلقکم والذین من قبلکم (البقرۃ ۲ - ۲۱) فرمایا کہ جن کو معبود بناتے ہو کیا ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ اس نے کچھ پیدا کیا ہو خلقوا کخلقه کی شرط اس لیے لگائی کہ انسان بھی تو دن رات چیزیں بناتے رہتے ہیں اور خلق بمعنی اندازہ بھی کرتے رہتے ہیں مگر کیا اللہ تعالیٰ کی مخلوق جیسی بھی وہ کوئی چیز پیدا کر سکتے ہیں۔ ایک چیونٹی کیا ایک چیونٹی کا پاؤں بھی نہیں بنا سکتے۔ مسیح کو بھی اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا گیا ہے، جو مسلمان یہ مانتا ہے کہ آپ نے چمگادڑ بنائے تھے جو خدا کی مخلوق جیسی مخلوق ہے یا کوئی اور پرند بنائے تھے جو خدا کی مخلوق سے مل جل گئے ہیں وہ عیسائیوں کے ہاتھ میں مسیح کی خدائی کی ایک دلیل دیتا ہے۔

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿۱۷﴾
لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؕ
وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ
مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ
لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ
ع ۸ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾
اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ
الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ
اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾
الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا
يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾
وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ
يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ
سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ
السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾

اللہ مثالیں بیان کرتا ہے ع۱۶۱۱

جنھوں نے اپنے رب کی بات مانی ان کے لیے بھلائی ہے اور جو اس کی بات نہیں مانتے اگر ان کے لیے وہ سب کچھ بھی ہو جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور بھی، تو وہ سب اپنے چھڑانے کو دے دیں ان کے لیے بُرا حساب ہے، اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُری جگہ ہے ع۱۶۱۲

بھلا کیا وہ جو جانتا ہے کہ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تیری طرف اتارا گیا ہے سچ ہے۔ اس جیسا ہے جو اندھا ہے عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں ع۱۶۱۳

جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اقرار کو نہیں توڑتے۔

اور جو اُسے جوڑتے ہیں، جو اللہ نے حکم دیا ہے کہ جوڑا جائے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور بُرے حساب کا خوف رکھتے ہیں۔

اور جو اپنے رب کی رضا چاہتے ہوئے صبر کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور اس میں سے جو ہم نے دیا ہے، چُھپ کر اور ظاہر خرچ کرتے ہیں اور بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں انھی کے لیے (اس) گھر کا انجام اچھا ہے ع۱۶۱۴

ع۱۶۱۱ زبدا رابیا۔ زَبَد کے معنی جھاگ ہیں۔ رابیا۔ رَبَا سے ہے جس کے معنی ہیں بڑھا اور اوپر آگیا اور یہاں زبدا رابیا سے مراد ہے جھاگ جو اوپر آجاتی ہے اور اخذۃ رابیۃ (الحاقۃ ۶۹-۱۰) کے معنی ہیں شدت میں بڑھی ہوئی گرفت۔
حلیۃ۔ زیور ومن ینشؤا فی الحلیۃ (الزخرف ۴۳-۱۸) جمع حُلِیٌّ ہے۔ من حلیّھم عجلا (الاعراف-۱۴۸)
جفاء۔ اَجْفَأَتِ الْقِدْرُ کے معنی ہیں ہانڈی نے (جھاگ کو) باہر پھینک دیا اور جُفاء وہ چیز ہے جو وادی باہر پھینک دیتی ہے یعنی ردّی چیز (غ)
اس مثال کو اللہ تعالیٰ نے خود ہی واضح کر دیا کہ یہ حق اور باطل کی مثال ہے۔ باطل ایک وقت اوپر نظر آتا ہے مگر وہ جھاگ کی طرح ہوتا ہے اور حق اس پانی کی طرح ہے جو لوگوں کو نفع دیتا ہے بقدرھا میں یہ بتا دیا کہ جس طرح وادی اپنے قدر کے مطابق بارش کے پانی کو لیتی ہے اسی طرح ہر انسان اپنی استعداد کے مطابق وحی الٰہی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ آج بھی باطل جھاگ کی طرح اوپر آیا ہوا ہے یہ جھاگ جاتا رہے گا اور حق رہ جائے گا۔
ع۱۶۱۲ آخری آیت میں پھر تعلق باللہ کی طرف توجہ دلائی کہ اس کا نتیجہ بہتری ہے اور وہ بہتری جو اس ذریعہ سے حاصل ہوسکتی ہے وہ دنیا کے سارے مال و دولت سے حاصل نہیں ہوسکتی دنیا کا سارا مال بھی اکٹھا کیا جائے تو اخلاق فاضلہ کو پیدا نہیں کرسکتا۔
ع۱۶۱۳ جب پہلے دو رکوعوں میں یہ بیان کر دیا کہ وحی الٰہی انسان کے اخلاق پر اور اس کی روحانیت پر کیا اثر پیدا کرتی ہے تو اب مومن اور کافر کا اور ان کے انجام کا مقابلہ کیا ہے۔
ع۱۶۱۴ عقبی الدار۔ عُقُوبۃ۔ اور مُعَاقَبَۃ اور عِقَاب تینوں لفظ عذاب یا سزا سے مختص ہیں گو اصل تینوں کے معنی میں انجام یا پیچھے لانا ہے

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ
مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ
وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾
وَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ
مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ
اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ
اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾
اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ
وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ
ع الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾
وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ
عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ

ہمیشگی کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے اور (وہ بھی) جو
ان کے ماں باپ سے اور ان کی بیویوں اور اولاد میں سے
نیک ہوں اور فرشتے اُن پر ہر دروازے سے داخل ہوں گے ع۱۶۱۵
تم پر سلامتی ہو اس لیے کہ تم نے صبر کیا سو کیا ہی اچھا اس (گھر کا انجام ہے ع۱۶۱۶
اور وہ جو اللہ کے عہد کو اس کے پکا کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور اسے
کاٹتے ہیں جو اللہ نے حکم دیا ہے کہ جوڑا جائے ، اور زمین
میں فساد کرتے ہیں یہی ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور
جن کے لیے (اس) گھر کا بُرا (انجام) ہے ع۱۶۱۷
اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور
(جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے اور لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہو جاتے
ہیں حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں صرف عارضی سامان ہے ع۱۶۱۸
اور جنھوں نے کفر کیا کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے نشان
کیوں نہیں اتار دیا جاتا۔ کہہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑتا ہے

اور عُقُب اور عُقْبیٰ اور عَاقِبَۃ یہ تینوں لفظ ثواب سے خاص ہیں یعنی جہاں اچھا بدلہ یا اچھا انجام بتانا مراد ہو وہاں ان لفظوں کا استعمال ہوتا ہے۔ خیر ثوابا وخیر عقبا (الکھف ۱۸-۴۴) والعاقبۃ للمتقین (القصص ۲۸-۸۳) (رغ) پس عُقبیٰ سے مراد ثواب یا اچھا انجام ہے اور تلک عقبی الذین اتقوا وعقبی الکافرین النار (۳۵) میں کافروں کے لیے عقبیٰ کا لفظ صرف مقابلہ کے طور پر اختیار کیا ہے اور شاید اس لیے بھی کہ پھر آگ سے ہی ان کی اصلاح ہوگی اور الدار سے مراد یہ دار دنیا ہے یعنی جو دنیا میں رہ کر یہ کام کرتے ہیں ان کے لیے اس گھر کا انجام بھی اچھا ہوتا ہے اس کی تصریح اگلی آیت میں ہے اس گھر کے انجام کو جنات عدن کہنے میں اشارہ ہے کہ وہ اس دنیا میں ہی جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔

ان تین آیتوں میں مومنوں کے اوصاف بیان کیے سب سے آخر میں فرمایا کہ وہ بُرائی کو بھلائی سے دور کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو بُرائی کرتا ہے ضرور اس سے بھلائی کرتے ہیں کیونکہ بعض وقت بُرائی کی سزا دینی پڑتی ہے اور برائی کرنے والے کو تکلیف پہنچانی ضروری ہوتی ہے۔ یہ ناقص تعلیم انجیل کی مشہور پہاڑی وعظ میں ہے جو ایک وقتی تعلیم تھی۔ مگر جس پر دنیا ہمیشہ کے لیے کبھی بھی عامل نہیں ہو سکتی۔ ہر طمانچہ مارنے والا ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے آگے دوسری گال کر دی جائے۔ اس لیے اس کامل تعلیم میں یہ ہدایت فرمائی کہ بدی کو دور کرنا اصل غرض ہونی چاہیے۔ ہاں اسے بھلائی سے دور کرو۔ اس میں یہ بات بھی آگئی کہ تم سے کوئی بُرائی کرے تو تم اس سے نیکی کرو اور یہ بھی کہ بدی کا دور کرنا اصل غرض سمجھو پس جہاں نیکی کرنے سے بُرائی دور نہیں ہوتی تو اچھے طریق سے اسے دور کرو۔ اور یہ بھی اس میں آجاتا ہے کہ اپنی طاقتوں کو نیکی پر لگا کر اپنی برائیوں کو دور کر دیتے ہیں۔

ع۱۶۱۵ عزیزوں کا جنت میں انسان کے ساتھ ہونا: ماں باپ اور بیبیوں اور اولاد کا ذکر اس لیے کیا کہ ان سے ہی انسان کی راحت کمال کو پہنچتی ہے اور گو وہ اس کمال کو نہ پہنچے ہوں مگر انہی جنات میں وہ بھی ہونگے۔ یعنی ان کے ساتھ ہوں گے ہاں من صلح کی شرط لگا دی ہے کہ صلاحیت ان میں ہو اور اس لیے بھی یہ ذکر کیا ہے کہ جو لوگ ان اوصاف والے ہوتے ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ان کا نیک اثر ان کے ماں باپ بی بی اولاد پر بھی پڑتا ہے اور فرشتوں کا ہر دروازہ سے داخل ہونا یہ ہے کہ جتنے اسباب نیکی کے ہوتے ہیں وہ ان سب سے بہرہ ور ہوتے ہیں دیکھو ع۲۴۰ اس لیے ملائکہ بھی ہر باب جنت سے ان پر داخل ہوتے ہیں۔

ع۱۶۱۶ ابن جریر میں ہے کہ آنحضرت صلعم اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ شہداء کی قبور پر جاتے تو یہ لفظ دہراتے تھے۔

ع۱۶۱۷ یعنی اس دنیا کی زندگی میں رہ کر انہوں نے اپنے لیے بُری کمائی کی اس لیے اس گھر کا انجام بھی ان کے لیے بُرا ہو۔

ع۱۶۱۸ یہاں بتایا کہ رزق کی فراخی اور تنگی پر نہ جانا چاہیئے یہ دنیا کے عارضی سامان ہیں۔ دونوں حالتوں میں رہ کر اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے۔

يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ
اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ ؕ
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى
لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾
كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ
قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ
اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ
قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ
تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾
وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ
اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ
الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ

اور اسے اپنی طرف رستہ دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ [ع۱۶۱۹]
جو ایمان لاتے ہیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں
سُن رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے [ع۱۶۲۰]
جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں ان کے لیے انجام کار
خوشحالی اور اچھا ٹھکانا ہے [ع۱۶۲۱]
اسی طرح ہم نے تجھے ایک امّت میں بھیجا ہے جس
سے پہلے امتیں گزر چکی ہیں تاکہ تو ان پر وہ پڑھے، جو ہم
نے تیری طرف وحی کی اور وہ رحمٰن کا انکار کرتے ہیں۔
کہہ وہ میرا رب ہے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، اسی پر
میں نے بھروسا کیا اور اس کی طرف میرا رجوع ہے [ع۱۶۲۲]
اور اگر قرآن ایسا ہوتا جس سے پہاڑ دور کردیئے جائیں یا اس سے
زمین کاٹ دی جائے یا اس کے ذریعہ سے مُردوں سے باتیں
کی جائیں۔ بلکہ سب باتیں اللہ کے اختیار میں ہیں [ع۱۶۲۳]۔ تو کیا جو ایمان

ع۱۶۱۹ اسی نشان ہلاکت کا مطالبہ پھر ہے جس کا مطالبہ آیت ۷ میں تھا۔ انہیں مثالیں دیکر سمجھایا جاتا ہے کہ وحی الٰہی سے وہ اسی طرح فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جس طرح زمین بارش سے فائدہ اٹھاتی ہے مگر ان کا مطالبہ وہی ہے اس کا جواب اسی رکوع کی آخری آیت میں ہے کہ پہلے ان پر چھوٹی چھوٹی مصائب آتی رہیں گی یہاں تک کہ وہ نشان ہلاکت آجائے۔

آیت کے پچھلے حِصّہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اسے وہ ضرور اپنی طرف رستہ دکھاتا ہے اور جو رجوع نہیں کرتا خود قدم نہیں اُٹھاتا اللہ تعالیٰ اسے پکڑ کر نہیں لاتا بلکہ جس طرح وہ خود گمراہی میں رہنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اسے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔

ع۱۶۲۰ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اطمینان قلبی میسر آتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے تمام پاک لوگوں کی زندگیاں روشن کرتی ہیں کہ کس طرح مصائب کے اندر مشکلات کے اندر' ناکامیوں کے اندر قید میں پڑ کر ان کے دلوں میں راحت ہوتی ہے' اور اللہ کے ذکر کے سوائے اطمینان قلبی میسر نہیں آتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے جسے تمام طالبان دنیا کی زندگیاں اظہر من الشمس کرتی ہیں کہ کس طرح جب ملک پر ملک فتح ہوتا چلا جاتا ہے تو دل میں اور آگ بھڑکتی ہے اور جب خزانہ پر خزانہ حاصل ہوتا جاتا ہے تو ہوس دنیا کی آگ اور تیز ہوتی جاتی ہے۔ نہ فتوحات نے اور نہ مال دنیا نے کسی شخص کے دل میں کبھی اطمینان پیدا کیا ہے۔ اور چونکہ قلب انسانی کو جب تک اطمینان میسر نہیں آتا اس وقت تک وہ ترقی کے قابل بھی نہیں ہوتا اور نہ اس کے وہ جوہر نشوونما پاتے ہیں جن کے لیے یہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ بتا کر کہ صرف اللہ کے ذکر سے ہی اطمینان قلب میسر آتا ہے توجہ دلاتی ہے کہ قلب انسانی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کر کے ایک انقلاب عظیم پیدا ہوتا ہے۔

ع۱۶۲۱ طوبیٰ۔ طاب سے مصدر ہے اور اس کے معنی میں مختلف روایات ہیں۔ خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک۔ خیر کثیر کرامت وغیرہ (د) مفردات میں ہے کہ طوبی کہا گیا ہے کہ جنت میں ایک درخت کا نام ہے۔ اور ترجیح اس کو دی ہے کہ وہ جنت کی ہر ایک نعمت ہے جیسے بقا، جس کے ساتھ فنا نہیں۔ عزّت جس میں زوال نہیں۔ غنا جس میں فقر نہیں۔

ع۱۶۲۲ متاب۔ اصل میں متابی ہے۔ میرا متاب اور متاب کے معنی کامل توبہ ہیں۔ یعنی ہر ایک قبیح بات کا ترک کرنا اور ہر ایک جمیل کا اختیار کرنا (غ)

ان دونوں باتوں کا کہ ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی جس طرح پہلے بھیجتے رہے اور یہ لوگ رحمان کا انکار کرتے ہیں یہ تعلق ہے کہ نزول وحی اللہ تعالےٰ کی صفت رحمانیت سے ہے جس طرح اس نے انسانوں کے لیے دوسرے سامان اپنی قدرت کاملہ سے مہیّا کیے ہیں اسی طرح ابدی زندگی کے حصول کے لیے وحی کا سامان رکھا ہے الرّحمٰن۔ علّم القراٰن (الرحمٰن ۵۵- ۱ و ۲) جو لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں وہ اس ابدی زندگی کو حاصل کرلیں گے۔

ع۱۶۲۳ جبال۔ جَبَل کی جمع ہے یعنی پہاڑ، مگر یہ لفظ عظیم الشان انسانوں پر بھی بولا جاتا ہے بعض وقت ثبات کے معنی کے لحاظ سے جو اس میں پایا جائے

يَايْـَٔسِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ
لَهَدَى النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيۡنَ
كَفَرُوۡا تُصِيۡبُهُمۡ بِمَا صَنَعُوۡا قَارِعَةٌ اَوۡ
تَحُلُّ قَرِيۡبًا مِّنۡ دَارِهِمۡ حَتّٰى يَاۡتِىَ
ع ٤/١٠ وَعۡدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ ﴿٣١﴾

لاتے ہیں انھوں نے جان نہیں لیا کہ اگر اللہ چاہتا ، توسب ہی لوگوں کو ہدایت دیتا [ح ١٦٢٤] اور جنھوں نے کفر کیا انھیں اس کی وجہ سے جو وہ کرتے ہیں کوئی نہ کوئی مصیبت پہنچتی رہے گی ، یا اُن کے گھر کے قریب اُترے گی ، یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آجائے اللہ وعدے کا خلاف نہیں کرتا [ح ١٦٢٥]

وَلَقَدِ اسۡتُهۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ
فَاَمۡلَيۡتُ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ثُمَّ اَخَذۡتُهُمۡ ۟ فَ
فَكَيۡفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾

اور تجھ سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ ہنسی کی جاتی رہی ۔ سو میں نے کافروں کو مہلت دی ، پھر انھیں پکڑا ۔ سو میری سزا کیسی تھی [ح ١٦٢٦]

اَفَمَنۡ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفۡسٍۢ بِمَا
كَسَبَتۡ ۚ وَجَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلۡ سَمُّوۡهُمۡ ؕ

پھر کیا وہ جو ہر شخص پر اس کا کیا لیے کھڑا ہے (انھیں سزا نہ دے گا) اور انھوں نے اللہ کے شریک بنا رکھے ہیں ،

(غ) اور فراء کا قول ہے اَلْجَبَلُ سَیِّدُ القوم و عالِمُهم (ل) یعنی قوم کے سردار اور ان کے عالم کو جَبَل کہا جاتا ہے اور طاقتور آدمی کے لیے کہا جاتا ہے فُلان جَبَلٌ من الجبال (ل) وہ شخص پہاڑوں میں سے پہاڑ ہے ۔

قرآن کے کمالات : لَوْ کی جزا محذوف ہے ایسی صورتوں میں جواب اس لیے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے اگر کوئی قرآن ایسا ہو سکتا ہے تو یہی ہے لکان هذا القراٰن (ر) اور دوسری جگہ صفائی سے فرمایا لو انزلنا هذا القراٰن علی جبل لرایته خاشعا متصدعا من خشیة الله (الحشر ٥٩ - ٢١) بلکہ لله الامر جمیعًا کہہ کر صاف بھی کر دیا کہ یہ سب باتیں اسی قرآن سے ہو جائیں گی ۔ پہاڑوں کے دور کر دینے یا اپنی جگہ سے ہٹا دینے سے مراد ان عظیم الشان آدمیوں کا دور کر دینا ہے جو اس کی راہ میں روک ہو رہے تھے ۔ جیسا کہ لفظ جبل کی لغوی تشریح سے ظاہر ہے ۔ زمین کے کاٹنے سے مراد اس میں نہروں اور چشموں کا چلانا ہے (ر ۔ ج) اور مجازاً مراد علوم روحانی کی نہریں اور چشمے ہیں جیسا کہ اسی سورت میں وادیوں کے بقدر استعداد پانی کے لینے سے یہی مراد ہے ح ١٦١١ اور مُردوں کے کلام سے مراد روحانی مُردوں کا زندہ ہونا ہے جیسا کہ خود دوسری جگہ قرآن شریف نے فرمایا او من کان میتا فاحییناه (الانعام ٦ - ١٢٢) اور اذا دعاکم لما یحییکم اور بل کا یہاں لانا اسی لیے ہے کہ اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ ایسا کہاں ہو سکتا ہے تو یاد رکھو کہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں اور ہو کر رہیں گی ۔ گویا پہلے آیت ٢٨ میں یہ بتایا کہ اس قرآن کے ذریعہ سے قلوب انسانی میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگا تو اس کے بعد اب بتایا کہ یہ انقلاب دلوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ ظاہر میں بھی اور کھلے رنگ میں یہ ایک انقلاب عظیم پیدا کر کے دکھائے گا ۔

ح ١٦٢٤ یائس کے معنی یہاں یَعْلَم کیے گئے ہیں بعض نے کہا یہ معنی لغت ہوازن میں ہیں (ر) اور بعض کے نزدیک یہ مجاز ہے کیونکہ مایوس ہونے والے کو یہ علم ہوتا ہے کہ یہ بات نہیں ہوگی (ر) اور مفردات میں ہے کہ مومنوں کی اس سے یاس اس بات کی مقتضی تھی کہ اس کے نہ ہونے کے علم کے بعد حاصل ہو ۔ اس لیے ان کی یاس کا قائم ہونا ان کے حصول علم کے قیام کا مقتضی ہوا ۔

یہاں بھی اسی کے مطابق خوشخبری ہے جو پہلے حصہ آیت میں تھی کہ یہ سب رکاوٹیں دور ہو کر مردے بولنے لگیں گے کیونکہ یہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ چاہے توسب لوگوں کو ہدایت دیدے ۔

ح ١٦٢٥ قارعة ۔ قَرْعٌ کے معنی ایک چیز کا دوسری پر مارنا ہیں اور قارِعَة مصیبت کو کہا جاتا ہے یا سخت مصیبت کو اور یہاں قارِعة کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ صلعم کا کوئی سریّہ ہے (ل) اور قیامت کو بھی القارعة کہا ہے ۔

یہ کفار کے مطالبہ نشان کا جواب ہے جو دو دفعہ آچکا ہے اور اس لیے اس کی تفسیر میں یہی قول صحیح ہے کہ یہاں کفار سے مراد قریش اور عرب ہیں ۔ اور قارعة سے مراد جنگیں ہیں اور وعد الله سے مراد اسلام کا آخری غلبہ اور اس کی حکومت ہے جو فتح مکّہ سے قائم ہوئی اور قریبًا من دارهم میں یہ اشارہ ہے کہ وہ مصائب خواہ خود ان مخالفین اسلام پر نازل ہوتی رہیں یا ان کے آس پاس نازل ہو کر ان کی تنبیہ کا موجب ہوتی رہیں اور تحل میں خطاب رسول اللہ صلعم کی طرف بھی ہو سکتا ہے یعنی تو ان کے گھر کے قریب نازل ہو جیسے حدیبیہ میں ہُوا ۔

ح ١٦٢٦ یہاں کافروں کے استہزا کا ذکر اس لیے کیا کہ جب انہیں عذاب کا وعدہ دیا جاتا تھا تو وہ ہنسی کرتے تھے کہ یہ شخص جو کوئی طاقت نہیں رکھتا کوئی اس کی بات نہیں سنتا اس کے سامنے ہم ذلیل اور مغلوب ہوں گے ۔

اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ
اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ
مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾
لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ
الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾
مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ
وَّظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ
وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

کہہ اُن کے نام لو آیا تم اللہ کو جتاتے ہو جو زمین میں ہے وہ
نہیں جانتا، یا سرسری بات کر دیتے ہو جس کی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ جو
کافر ہیں انھیں اپنی چال اچھی معلوم ہوتی ہے اور وہ رستے سے رُک گئے
اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں ع۱۶۲۷
ان کے لیے دنیا کی زندگی میں عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی
سخت ہے اور کوئی انھیں اللہ (کی سزا) سے بچانے والا نہیں۔
جنت کی مثال جس کا وعدہ متقیوں کو دیا گیا ہے (یہ ہے) اس کے
نیچے نہریں بہتی ہیں اس کے پھل ہمیشہ رہیں گے اور اس کی آسائش (بھی)
یہ ان کا اچھا انجام ہے جو تقوٰے اختیار کرتے ہیں۔ اور کافروں کا
انجام آگ ہے ع۱۶۲۸

ع۱۶۲۷ من ھو قائم۔ قائم کے معنی یہاں حافظ ہیں کیونکہ قیام بمعنی مراعاۃ بھی آتا ہے (غ) مراد ایسا شاہد یا دیکھنے والا ہے جو اس عمل کو محفوظ بھی رکھتا ہو یعنی اس پر جزا و سزا مترتب کرتا ہو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کو جو کچھ وہ کرتا ہے اس کی جزا یا سزا دیتا ہے کوئی عمل ضائع نہیں ہونے دیتا۔ یہ تو اللہ کی شان ہے اور انہوں نے اس کے شریک بنا رکھے ہیں۔

شرک کا ابطال: بتانا یہ مقصود ہے کہ غور کرو کیا وہ شریک بھی کچھ لوگوں کے اعمال کی جزا و سزا دیتے ہیں کیا ان کو بھی تھوڑی بہت قدرت ہے کہ لوگوں کے اعمال کو دیکھیں پھر ان پر جزا و سزا مترتب کریں۔ مفسرین نے اسے مبتدا قرار دے کر کمن لیس کذٰلک کو محذوف قرار دیا ہے یعنی کیا وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو ایسا نہیں اور قائم علیٰ کل نفس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ تم جو تدبیریں ہمارے رسول کے خلاف کر رہے ہو ہم انہیں بھی محفوظ کر رہے ہیں اسی کی وضاحت آیت کے آخر میں مکرھم میں موجود ہے۔

سموھم۔ سماہٗ کے معنی ہیں اس کے لیے اسم یا عَلم قرار دیا (ت) سمیتھا مریم (آل عمران ۳-۳۶) میں مریم عَلم ہے اور اسم وہ ہے جس سے مسمی کا ذکر بلند ہوتا ہے اور وہ اس سے پہچانا جاتا ہے اس لیے ایک چیز کے وصف پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے لیسمّون الملائکۃ تسمیۃ الانثٰی (النجم ۵۳-۲۷) میں مراد یہ نہیں کہ ملائکہ کے لیے کوئی عَلم تجویز کرتے ہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں یعنی ان کی صفت عورت ہونا بیان کرتے ہیں۔ ھل تعلم لہ سمیّا (مریم ۱۹-۶۵) میں سمی یا ہمنام سے مراد اس کی نظیر ہے یعنی ایسا موصوف جس پر اس کی صفات صادق آسکیں اور ان صفات کا وہ مستحق ہو اور محض نام مراد نہیں کیونکہ نام تو اوروں کے بھی اللہ کے ناموں پر رکھ لیے جاتے تھے۔ ایسا ہی سموھم میں یہ مراد نہیں کہ ان کے نام کیا ہیں وہ بتاؤ مثلاً لات یا عزیٰ۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ جن کو تم خدا کہتے ہو ان کے متعلق حق امر کو ظاہر کرو اور بتاؤ کہ ان اسماء کے معانی بھی ان میں پائے جاتے ہیں (غ) اور بعض نے یوں معنی کیے ہیں کہ وہ تو ذکر کے قابل ہی چیزیں نہیں ہیں (ر)

معبودانِ باطل: ام تنبئونہ بما لا یعلم فی الارض ام بظاھر من القول۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ایسے کوئی شرکاء نہیں تو تم شریک قرار دیکر اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جو اس کے علم میں نہیں اور ایسی چیز فی الحقیقت موجود نہیں ہو سکتی۔ اور ظاھر من القول سے مراد باطل لیا گیا ہے گویا ایسی بات جس کے نیچے حقیقت کوئی نہیں اور ایک معنی اس کے یہ بھی لیے گئے ہیں کہ کوئی کتاب اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہو جس میں کھلے طور پر ان چیزوں کا نام خدا رکھا ہو (ر) اور بلحاظ سیاق یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو خود ہر عمل پر قائم یعنی اس کا شاہد ہے تو تم اس کے ساتھ شریک ٹھہرا کر کیا اسے کچھ ایسی باتوں کی ان شریکوں کے ذریعہ سے خبر پہنچاتے ہو جن کو وہ نہیں جانتا یا کسی ظاہر بات کی خبر پہنچاتے ہو یعنی تمہارا یہ خیال ہے کہ کچھ ایسے مخفی امور ہیں جن کا علم اللہ کو نہیں ان شریکوں کے ذریعہ سے وہ علم اسے حاصل ہو جاتا ہے۔ یا یہ خیال ہے کہ ظاہر اور کھلی کھلی باتوں کی اللہ تعالیٰ کو خبر نہیں ہوتی یہ باتیں ان شریکوں کے ذریعہ سے اس تک پہنچائی جاتی ہیں۔

ع۱۶۲۸ مثل۔ مَثل اور مِثل سے مراد بعض کے نزدیک کسی چیز کا وصف بھی ہوتا ہے اور یہ اس کی مثال دی ہے (غ) اور اکثر مفسرین نے یہاں مراد الصفۃ الغریبۃ لی ہے یعنی نادر صفت مگر جب خود قرآن کریم اور حدیث صحیح نے بیان کر دیا کہ جنت کی نعماء ایسی چیزیں ہیں جنھیں آنکھوں نے نہیں دیکھا اور کانوں نے نہیں سنا اور دل میں نہیں گزریں تو لازماً ان کا ذکر اس دنیا کی چیزوں کے رنگ میں بطور مثال سمجھانے کے لیے ہے اور اسی لیے قرآن شریف نے ان کے لیے یہاں اور سورۂ

وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾

اور وہ جنھیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور کچھ فرقے اس کی بعض (باتوں) کا انکار کرتے ہیں ۔ کہہ مجھے صرف یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ شریک نہ کروں اسی کی طرف میں بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میرا ٹھکانا ہے۔ ۱۶۲۹

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾ ع

اور اسی طرح ہم نے اسے اتارا فیصلہ عربی میں ۔ اور اگر تو ان کی خواہشوں کی پیروی کرے اس کے بعد جو تیرے پاس علم آگیا، تو تیرے لیے اللہ کے مقابلہ پر کوئی حمایتی نہ ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا۔ ۱۶۳۰

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ؕ وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

اور ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے اور انھیں بیویاں اور اولاد بھی دی اور کسی رسول کے لیے نہ تھا کہ سوائے اللہ کے حکم کے نشان لاتا ۔ ہر میعاد کے لیے ایک حکم معین ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚۖ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے ۱۶۳۱

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ

اور اگر ہم تجھے وہ بعض باتیں دکھا دیں جو اُن سے وعدہ کرتے ہیں

محمد۴۷ - ۱۵ میں مَثَل کا لفظ استعمال کیا ہے جو اپنے اصل معنی پر ہے اور اس لفظ کے اختیار کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ یہ لازمی بات ہے کہ یہ نعماء کسی نہ کسی رنگ میں اس عالم میں بھی ان لوگوں کو ملیں جنھوں نے حق کو قبول کیا ہے مگر وہ نتائج عملی رنگ اختیار نہیں کرتے جب تک کہ قبولیت حق عمل میں نہ آئے ظل کے معنی آسائش اس لحاظ سے کیے گئے ہیں کہ جنت کی شان ہے لایرون فیہا شمسًا (الدھر۷۶ - ۱۳) ظل کے اس معنی کے لیے دیکھو ع۶۷۶ ۔

ع۱۶۲۹ الذین اٰتینٰھم الکتٰب سے مراد اصحاب نبی یا مومن ہیں اور احزاب سے مراد یہود و نصارٰی (ج) اور یہی سیاق چاہتا ہے۔

ع۱۶۳۰ عربی سے مراد یہاں واضح لیا گیا ہے جس کے لیے دیکھو ع۱۵۱۶ و

ع۱۶۳۱ کتاب ۔ راغب کہتے ہیں کہ کتاب سے مراد کبھی وجود میں لانا اور فنا کرنا بھی ہوتا ہے اور یہی اس کی مثال دی ہے ۔ اور لکل اجل کتاب کے معنی کیے ہیں کہ ہر وقت کے لیے اقتضائے حکمت سے کوئی چیز وجود میں لائی جاتی ہے اور کوئی فنا کی جاتی ہے اور یہی مطلب عندہٗ ام الکتاب کا ہے۔ اور یہ اس کے مطابق ہے جو فرمایا کل یوم ھو فی شان (الرحمٰن۵۵ - ۲۹) (غ)

پہلے کفار کے استہزا کا جواب دیا ہے کہ بیوی بچے ہونا خلاف رسالت کوئی امر نہیں ۔ پہلے بھی رسولوں کی بیبیاں اور اولاد تھی اس کے بعد اس نشان کا ذکر کیا ہے جس کا وہ بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ پہلے رسول بھی اپنے اختیار سے اپنے مخالفوں کو ہلاک نہ کر دیتے تھے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار کی بات ہے جب چاہے اور جس طرح چاہے کرے ۔ اور پھر اپنا عام قانون بیان کیا کہ ایک قوم کی جو اجل ہوتی ہے اس کے لیے بھی ایک مقرر وقت ہوتا ہے کہ کب اسے مٹایا جائے اور کب اس کی جگہ دوسری قوم کو کھڑا کیا جائے اور ام الکتاب سے مراد لوح محفوظ کو بھی لیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا علم جس میں سب احکام اصل میں موجود ہوتے ہیں اور روح المعانی میں ایک روایت کی ذیل میں بیان کیا ہے کہ ام الکتاب سے مراد اصولی احکام ہیں جن میں کبھی نسخ نہیں ہوتا اور قرآن کریم میں دوسری جگہ یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے اٰیات محکمات ھن ام الکتاب (اٰل عمران۳ - ۷)

یمحوا اللہ مایشاء ویثبت سے اسبات پر بھی شہادت ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنی قضا و قدر کو بھی ٹال دے اور یہی حق ہے واللہ غالب علٰی امرہ (یوسف۱۲ - ۲۱) میں اس طرف اشارہ ہے چنانچہ اگلی آیت میں صاف فرما بھی دیا کہ بعض عذاب جن کا وعدہ دیا جاتا ہے ہم چاہیں تو دور بھی کر دیں اور عذاب کا وعدہ کر کے اس کا نہ لانا اللہ تعالیٰ کے وسیع عفو و کرم کا نتیجہ ہے جو انسان کے حیطۂ خیال سے باہر ہے وہ کسی حالت میں بھی انسان کو مایوس نہیں ہونے دیتا۔

نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَيۡنَا الۡحِسَابُ ﴿۴۰﴾

یا تجھے وفات دے دیں تو تجھ پر صرف پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔

اَوَ لَمۡ يَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِى الۡاَرۡضَ نَـنۡقُصُهَا مِنۡ اَطۡرَافِهَا‌ ؕ وَاللّٰهُ يَحۡكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكۡمِهٖ‌ ؕ وَهُوَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۴۱﴾

اور کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں اور اللہ فیصلہ کرتا ہے کوئی اس کے فیصلہ کو رد کرنیوالا نہیں اور وہ جلد حساب لینے والا ہے ۱۶۳۲ء

وَقَدۡ مَكَرَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلِلّٰهِ الۡمَكۡرُ جَمِيۡعًا‌ ؕ يَعۡلَمُ مَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ‌ ؕ وَسَيَعۡلَمُ الۡكُفّٰرُ لِمَنۡ عُقۡبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾

اور ان لوگوں نے بھی (حق کے خلاف) تدبیریں کیں جو ان سے پہلے تھے مگر سب تدبیر اللہ کے اختیار میں ہے وہ جانتا ہے جو ہر شخص کماتا ہے۔ اور کافر جان لیں گے کہ اس گھر کا اچھا انجام کس کے لیے ہے ۱۶۳۳ء

وَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَسۡتَ مُرۡسَلًا‌ ؕ قُلۡ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًاۢ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكُمۡ ۙ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ ﴿۴۳﴾ ع ۱۲

اور کافر کہتے ہیں تو بھیجا ہُوا نہیں کہہ میرے اور تمھارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے، اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے ۱۶۳۴ء

۱۶۳۲ء اطراف۔ طرف کی جمع ہے جس کے لیے دیکھو ۵۱۳ء اور طَرَفُ الۡقَوۡم کے معنی ہیں ان کا رئیس اور اطراف کے معنی رؤسا اس لیے یہاں اطراف کے گھٹانے سے مراد علماء کی موت یا اس کے اہل کی موت اور پھلوں کی کمی لی گئی ہے اور اَطۡرافُ الرِّجال سے مراد اشراف بھی ہیں (ل) اور مجاہد نے یہاں یہی معنی زمین کی اطراف کے گھٹانے کے لیے ہیں (ج)

حق کے آخری غلبہ کا کھلا نشان اس کی قبولیت ہے: جب نشان ہلاکت کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس کا لانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور پھر اس سے پچھلی آیت میں فرمایا کہ اگر محمد رسول اللہ صلعم وفات بھی پا جائیں تو بھی حساب لینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے تو اب انہیں یوں توجہ دلاتا ہے کہ وہ اگر غور کریں تو ان کی آخری مغلوبیت کے نشان تو ابھی سے ظاہر ہو رہے ہیں کہ ہم زمین کے کناروں کو گھٹاتے چلے آتے ہیں یعنی ان کے بڑے بڑے آدمیوں کو کم کرتے چلے آتے ہیں اور دور دور اطراف عرب میں اسلام کا چرچا شروع ہو گیا ہے اور یہ کم کرنا صرف ان کی موت سے نہ تھا بلکہ ان کے مسلمان ہو جانے سے چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور حمزہؓ جیسے انسان اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور بعض مخالف مرتے بھی جاتے تھے مگر عظیم ترین کامیابی اسلام کی جو اس زمانہ سے خاص تعلق رکھتی ہے مدینہ میں اسلام کا پھیل جانا اور بعض اور جوانب میں اس کی قبولیت کے آثار کا ظاہر ہونا ہے اور یہی ظاہر طور پر زمین کی اطراف کا گھٹتا چلا آنا تھا اور یہ اسلام کا اعجاز تھا کہ جس قدر اس کی مخالفت بڑھتی چلی جا رہی تھی اسی قدر دلوں پر اس کا اثر زیادہ ہوتا چلا جاتا تھا اور اسی قدر وہ اسباب پیدا ہوتے چلے جاتے تھے جن سے اس کا چرچا دور دور پھیلتا چلا جاتا تھا اور اگر مکہ میں اس کی ترقی رکتی معلوم ہوتی تھی تو عرب کے اور اطراف میں اس کا قدم آگے بڑھ رہا تھا اور دوسری جگہ فرمایا افلا یرون انّا نأتی الارض ننقصها من اطرافها افهم الغالبون (الانبیاء ۲۱-۴۴) یعنی یہ زمین میں اسلام کی قبولیت کا پھیلتے جانا کفر کے غلبہ کا نشان نہیں بلکہ اس کی مغلوبیت کا نشان ہے جس سے صاف معلوم ہوا کہ یہاں بھی کفر کی آخری مغلوبیت کی طرف ہی توجہ دلائی ہے تو سمجھایا کہ تمہیں آخری مغلوبیت تو اسی سے نظر آ جانی چاہیئے کہ تمہارے بڑے بڑے آدمیوں کے دلوں پر اسلام تسلّط کرتا چلا جا رہا ہے۔ درحقیقت حق کے آخری غلبہ کی اس سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ دشمنوں کے دلوں پر وہ اثر پیدا کر دیتا ہے۔ کاش آج بھی مسلمان دیکھتے کہ کس طرح اسلام اور محمد رسول اللہ صلعم کی صداقت یورپ کے دلوں کو کھاتی جا رہی ہے اور اس نشان سے سبق حاصل کر کے اپنا زور ان لوگوں کو مسلمان بنانے پر لگاتے اور مایوسی کو اپنے پاس نہ آنے دیتے۔ آخری الفاظ میں توجہ دلائی ہے کہ مخالف کی ناکامی کا فیصلہ اللہ کے ہاں سے ہو چکا ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے یعنی ان کی بدکاریوں اور شرارتوں کا اسی دنیا میں حساب لے لیگا۔

۱۶۳۳ء اس آیت میں کیسی صفائی سے بتایا کہ ان کی تدابیر اور منصوبے جو اسلام اور رسول اللہ صلعم کے خلاف کر رہے ہیں ناکام ہوں گے۔ للّٰہ المکر جمیعا یعنی ان کی تدابیر کا کارگر یا ناکام ہونا اللہ کے اختیار میں ہے مگر یعلم ماتکسب کل نفس میں اپنا قانون بتایا کہ ایک کی ہلاکت اور دوسری قوم کا قیام ان کے اعمال کی وجہ سے ہے کافر جان لیں گے کہ کامیاب کون ہوتا ہے۔ اس قسم کے الفاظ کو پڑھتے ہوئے ان حالات کو مدّنظر رکھنا چاہیئے جن میں یہ کہے گئے وہ وقت آنحضرت صلعم اور مسلمانوں پر سخت ترین مصائب کا تھا اور ہر طرف سے ناکامی ان کو گھیرے ہوئے معلوم ہوتی تھی۔ مکر کے لفظ میں یہ صاف اشارہ ہے کہ اس وقت آپ کے خلاف دشمنوں کے منصوبے ترقی پر تھے اور یہ ہجرت سے پہلے کا زمانہ ہے۔

۱۶۳۴ء اہل عرب نے کیوں بالآخر اسلام کو قبول کیا: اللہ کی گواہی عملی رنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہی پیشگوئیاں جو اس قدر صفائی سے ان کو سنائی جاتی تھیں جب اپنے وقت پر آ کر پوری ہوئیں تو سب عرب کی گردنیں اسلام کے سامنے جھک گئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شہادت آنحضرت صلعم کی سچائی پر تھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی شہادت انہی پیشگوئیوں میں مذکور تھی اس لیے ساتھ ان لوگوں کا نام بھی بڑھا دیا جن کے پاس کتاب یعنی قرآن کریم اور اس کی ان پیشگوئیوں کا علم تھا۔ من عندہ علم الکتاب سے یہی مراد ہے ای علم القرآن (ر) اور بعض نے پہلی کتابوں اور ان کی پیشگوئیوں کا علم بھی مراد لیا ہے۔

سُوْرَۃُ اِبْرٰھِیْمَ مَکِّیَّۃٌ (۱۴)

آیاتھا ۵۲ — رکوعاتھا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ
النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ۬
بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ ①

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔
مَیں اللہ دیکھنے والا ہوں۔ (یہ) کتاب (ہے) جو ہم نے تیری طرف اتاری تاکہ تو
لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لیجائے۔
اس کے رستہ کی طرف جو غالب تعریف کیا گیا ہے ۱۶۳۵

نام: اس سورت کا نام ابراہیم ہے اور اس میں سات رکوع اور ۵۲ آیات ہیں۔ اس سورت میں اعدائے رسل کے رسولوں کو دُکھ دینے اور گھروں سے نکالنے اور رسولوں کی آخری کامیابی کا عام ذکر ہے مگر اس کے چھٹے رکوع میں حضرت ابراہیم کی اس دعا کا ذکر ہے جو آپ نے مکّہ اور اہل مکّہ کے لیے کی تھی۔ اور جس دعا میں یہ ذکر ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کو ایک خاص غرض کے لیے خانہ کعبہ کے قریب ایک وادی غیر ذی زرع میں چھوڑا گیا اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ان کا اس طرح چھوڑا جانا سلسلہ نبوت میں ایک پرحکمت فعل تھا۔ کیونکہ آخر اسی دور افتادہ شاخ سے اور اسی بے آب وگیاہ میدان سے توحید کا وہ چشمہ پھوٹنا تھا جس نے ساری دنیا کو سیراب کرنا تھا اس لحاظ سے اس سورت کا نام ابراہیم رکھا گیا اور اس دعائے ابراہیمی کا یہ اثر تھا کہ آنحضرت صلعم کے اعدا کو ہلاک نہیں کیا گیا۔

خلاصۂ مضمون: اس سورت میں سب سے پہلے یہ بیان فرمایا ہے کہ آنحضرت صلعم کی بعثت تمام دنیا کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کے لیے ہے اور پہلے ہی رکوع میں حضرت موسٰیؑ کے ساتھ مماثلت کا اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ حضرت موسٰی کا پیغام صرف اپنی قوم تک محدود تھا۔ رسول عربیؐ کا پیغام محدود نہیں۔ دوسرے رکوع میں مخالفین رسل کا ذکر ہے کہ وہ کس طرح رسولوں کے پیغام کو نہ صرف پس پشت ڈالتے ہیں بلکہ اس کی مخالفت پر سارا زور لگاتے ہیں۔ تیسرے میں بتایا ہے کہ جب ان کی مخالفت حد کو پہنچ جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اس سرزمین سے بھی رسولوں کو نکال دیتے یا نکال دینے کا عزم کر لیتے ہیں تو آخر خدائی فیصلہ ہوتا ہے اور حق کامیاب اور باطل ناکام ہوتا ہے۔ چوتھے رکوع میں حق و باطل کا مقابلہ کر کے دکھایا ہے اور سمجھایا ہے کہ حق اس لیے کامیاب ہوتا ہے کہ اس کی جڑ مضبوط ہوتی ہے اور اس کے اصول و فروع ایک علم کی طرح ہوتے ہیں اسے کوئی چیز نابود نہیں کر سکتی۔ پانچویں رکوع میں بتایا کہ یہ حق جو وحی الٰہی کی صورت میں آسمان سے آتا ہے اس سے فائدہ نہ اٹھانا خود اپنے آپ کو ایک عظیم الشان نعمت الٰہی سے محروم کرنا ہے۔ چھٹے رکوع میں دعائے ابراہیم ہے اور بتایا ہے کہ حضرت ابراہیم کا حضرت اسماعیل کو مکّہ میں چھوڑنا خاص ارادۂ الٰہی کے ماتحت تھا۔ تاکہ سلسلہ نبوت اپنے کمال کو پہنچے۔ اور ساتویں رکوع میں رسول اللہ صلعم کے مخالفین کی آخری مغلوبیت کا نقشہ کھینچا ہے۔

تعلق: الرا کے مجموعہ میں یہ پانچویں سورت ہے اور اس میں ایک عمومیت کے رنگ میں رسولوں اور ان کے اعدا کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے سمجھایا ہے کہ حق ایک ایسی چیز ہے کہ وہ نابود ہو سکتی ہی نہیں وہ ایک درخت ہے جس کی جڑ زمین میں مضبوط ہوتی ہے اور جس کی شاخیں آسمان میں پھیل کر چاروں طرف سے اپنی خوراک حاصل کرتی ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے تباہ نہیں کر سکتی اور باطل کی چونکہ جڑ کوئی نہیں ہوتی اس لیے دنیا کی کوئی طاقت اسے قائم نہیں رکھ سکتی اس لیے رسول جو حق کو ساتھ لاتے ہیں انجام کار غالب ہی ہوتے ہیں۔

زمانہ نزول: اس سورت میں بھی کئی ایک صریح اشارات موجود ہیں کہ یہ مجموعہ مکّہ کے آخری زمانہ کا ہے یہاں نہایت صفائی سے لنخرجنکم من ارضنا میں بتا دیا کہ کفار اب اپنی آخری تدبیر پر عزم کر رہے تھے اور ان کی اس عظیم الشان تدبیر کا ذکر یہاں ان الفاظ میں ہے وقد مکروا مکرھم وعند اللہ مکرھم وان کان مکرھم لتزول منہ الجبال یہ وہی ان کی آخری چال تھی جس میں رسول اللہ صلعم کا کام تمام کرنے کا فیصلہ وہ کرنے والے تھے۔

۱۶۳۵ ظلمات۔ ظُلمۃ اور ظُلمات کے لیے دیکھو ۳۰ اور اس سے مراد جہالت شرک فسق کو لیا جاتا ہے جیسا کہ نور سے مراد انہی باتوں کی ضد ہوتی ہے (غ) پس ظلمات سے نور کی طرف لے جانے سے مراد ہے کہ ہر قسم کی جہالت توہمات اور فاسد اعتقادات سے نکال کر صحیح علم اور صحیح خیالات کی طرف لے جائے۔ یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ مذہب فی الحقیقت ایک علم ہے اور محض چند باتوں کے فرض کر لینے کا نام نہیں۔

قرآن شریف کے نازل کرنے کی غرض لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لانا ہے بالفاظ دیگر توہم پرستی اور جہالت کو دور کر کے علم صحیح اور خیالات صحیح کا دنیا میں پھیلانا اور یہاں الناس کا لفظ لا کر اور آیت ۵ میں حضرت موسٰی کی وحی کی یہی غرض قرار دیکر مگر قومک لفظ لا کر دونوں نبیوں کی مماثلت کو ظاہر کرتے ہوئے فرق بھی بتا دیا ہے کہ ایک کی غرض صرف اپنی قوم تک محدود تھی اور دوسرے کا پیغام تمام لوگوں کے لیے ہے اور یہاں اس راہ کو عزیز وحمید کی راہ قرار دیکر بتا دیا کہ یہی صفات اس کے بندوں میں بھی پیدا ہو جائیں گی۔

اللّٰهِ الَّذِیۡ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ وَیۡلٌ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡ عَذَابٍ شَدِیۡدِۣ ۙ﴿۲﴾
الَّذِیۡنَ یَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا عَلَی الۡاٰخِرَۃِ وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَ یَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۳﴾

اللہ کی طرف جس کے لیے سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور کافروں پر سخت عذاب کی وجہ سے افسوس ہے۔
جو دنیا کی زندگی آخرت پر پسند کرتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ اور اس میں ٹیڑھا پن ڈھونڈتے ہیں۔ یہی پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں ع۱۶۳۶

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمۡ ؕ فَیُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۴﴾

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان میں تاکہ انھیں کھول کر بتا دے، پھر اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ ہنے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے وہ غالب حکمت والا ہے ع۱۶۳۷

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اَنۡ اَخۡرِجۡ قَوۡمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۬ۙ وَ ذَکِّرۡهُمۡ بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ ﴿۵﴾

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیتوں کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکال لا۔ اور ان کو اللہ (کی نعمتوں) کے دن یاد دلا، یقیناً اس میں ہر ایک صبر کرنے والے شکر کرنے والے کے لیے نشان ہیں۔

وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِهِ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰهِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ اَنۡجٰىکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ وَ یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ وَ فِیۡ

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کو کہا اللہ کی نعمت کو یاد کرو (جو) تم پر ہوئی ہے) جب اس نے تمھیں فرعون کی قوم سے چھڑایا جو تمھیں سخت عذاب دیتے تھے اور تمھارے بیٹوں کو مار ڈالتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں

ع۱۶۳۶ یستحبون۔ حُبّ کے لیے دیکھو ع۲۰۳ اِسْتِحباب یہ ہے کہ انسان کسی چیز کا قصد کرے کہ اس سے محبت کرے اور اس کا صلہ علیٰ لانے سے اس میں ایثار کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں (رغ) یعنی ایک چیز کو دوسری پر ترجیح دینا یا ایک سے بڑھ کر دوسری سے محبت کرنا اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا یا اس سے آخرت سے بڑھ کر محبت رکھنا کافروں کا کام ہے اور اس کا نتیجہ وہ سب کچھ ہوتا ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ آج مسلمانوں کی سب سے بڑی بیماری یہی دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا ہے۔ یعنی فواید دنیوی کی فوائد دینی سے بڑھ کر پروا کرنا اور فوائد دنیوی کی خاطر فوائد دینی کو قربان کر دینا۔ اسلام کی تعلیم یہ تھی کہ فوائد دینی کی خاطر فوائد دنیوی کو قربان کر دیا جاتا مگر آج سب قومیں قومی فوائد کے لیے ایثار کرتی ہیں اور مسلمان سب سے پیچھے ہیں اس لیے نفع بھی دوسری قومیں ہی اُٹھاتی ہیں۔ جب تک مسلمانوں میں قربانی کی روح پیدا نہیں کی جائیں گی اُس وقت تک ان میں زندگی کے آثار کبھی پیدا نہیں ہو سکتے۔

ع۱۶۳۷ آنحضرت کی بعثت عامہ پر ایک اعتراض اور اس کا جواب: عیسائی معترضین کہتے ہیں کہ یہاں جو اصول بیان کیا گیا ہے اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلعم صرف عرب کی طرف مبعوث ہوئے تھے کیونکہ آپ کی زبان عربی تھی اور اسے قطعی نتیجہ کہا جاتا ہے یہاں یہ فرمایا ہے کہ ہر ایک نبی اپنی قوم کی زبان میں ہی بھیجا جاتا ہے یہ نہیں فرمایا کہ ہر ایک نبی صرف اپنی ہی قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے اور یہ دو بالکل جدا باتیں ہیں آنحضرت صلعم کی قوم عرب تھی مگر آپ کی بعثت عرب اور عجم دونوں کی طرف تھی جیسا کہ قرآن کریم نے بار بار فرمایا ہے کہ آپ کو کافۃ للناس...... بھیجا گیا اور جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آپ کی بعثت اسود اور احمر سب کی طرف تھی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ پہلے تمام انبیاء ایک ایک قوم کی طرف ہی بھیجے گئے جیسا کہ ہر نبی کا ذکر کر کے فرمایا کہ وہ الی قومہ بھیجا گیا یعنی اپنی قوم کی طرف یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق فرمایا و رسولا الی بنی اسرائیل مگر آنحضرت صلعم کی نسبت کہیں نہیں فرمایا کہ آپ کو عرب کی طرف یا صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا بلکہ سب سے پہلی آیت میں ہی یہ فرق ظاہر کر دیا ہے دیکھو ع۱۶۳۵ اور یہ بھی صحیح ہے کہ نبی صلعم نے اپنی قوم کو تیار کیا کہ وہ آپ کا پیغام تمام دنیا میں پہنچائے۔

ع ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ٦
وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ
وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ٧
وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي
الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ٨
اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ
مع قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۬ۛ
وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا
اللّٰهُ ۭ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا
اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا
بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا
تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ٩
قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ
لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ
مُّسَمًّى ۭ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۭ
تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ

تمھارے رب کی طرف سے بڑی بھاری آزمایش تھی۔
اور جب تمھارے رب نے بتا دیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمھیں زیادہ دونگا
اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بھی سخت ہے ۱۶۳۸ع
اور موسٰیؑ نے کہا اگر تم اور جو زمین میں ہیں سب کے سب انکار
کرو تو اللہ یقیناً بے نیاز تعریف کیا گیا ہے ۱۶۳۹ع
کیا تمھارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی، جو
تم سے پہلے تھے (یعنی) نوحؑ کی قوم اور عادؔ اور ثمودؔ کی۔
اور ان کی جو اُن کے پیچھے ہوئے، انھیں اللہ کے سوائے
کوئی نہیں جانتا، ان کے رسول کھلی دلائل لے کر آئے تو انھوں
نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں ڈالے اور کہا ہم اس کا انکار کرتے
ہیں جو تمھیں دیکر بھیجا گیا ہے اور یقیناً ہمیں اس کے بارے میں سخت
شک ہے جس کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو ۱۶۴۰ع
ان کے رسولوں نے کہا کیا اللہ میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین
کا پیدا کرنے والا ہے وہ تمھیں بلاتا ہے تاکہ تمھارے قصور تمھیں
بخش دے اور تمھیں ایک مقرر وقت تک مہلت دے۔
انھوں نے کہا تم بھی ہمارے جیسے انسان ہو۔ تم چاہتے ہو کہ
ہمیں اس سے روک دو جس کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے

ع۱۶۳۸ یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک عام قانون بیان فرمایا ہے کہ جب نعمت کے لیے انسان شکر کرتا ہے تو وہ اور زیادہ ملتی ہے۔ اور ناشکری کا نتیجہ دکھ ہے شکر کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۷۵ اور شکر نعمت عملی رنگ میں یہ ہے کہ حصول نعمت کے لیے جو اسباب اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں ان سے فائدہ اٹھائے یہ قانون جسمانی اور روحانی دونوں نعمتوں پر یکساں حادی ہے۔ زمین میں اللہ تعالیٰ نے طاقت رکھی ہے کہ وہ بیج کو نشوونما دے اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ زمین میں بیج ڈالا جائے قلب انسانی میں طاقت رکھی ہے کہ وحی الٰہی کے اثر سے اس کی مخفی قوتیں بڑھیں اس نعمت کا شکر اس وحی کی قبولیت ہے جو اس طرح پر قدر کرتا ہے وہ فائدہ اٹھاتا ہے جو نہیں کرتا اس کا انجام محرومی اور دکھ ہے۔

ع۱۶۳۹ مطلب یہ ہے کہ کفر (انکار یا ناشکری) سے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ کسی کے شکر کرنے سے یا ایمان لانے سے اللہ تعالیٰ کو فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ ناشکری یا کفر سے اس کا کچھ بگڑتا ہے اس لیے کہ وہ غنی ہے یعنی اسے کسی کی احتیاج نہیں۔ اور اس کی حمد میں بھی اس سے فرق نہیں آتا۔

ع۱۶۴۰ ردوا ایدیہم فی افواھم اس کے معنی تین طرح پر ہو سکتے ہیں منکروں نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں ڈالے گویا غیظ و غضب سے اپنے ہاتھ کاٹے جیسا کہ دوسری جگہ ہے عضوا علیکم الانامل من الغیظ (آل عمران ۳۔ ۱۱۹) یا اپنے ہاتھ اپنے مونہوں پر رکھے گویا خاموشی کی طرف اشارہ ہے یا اپنے ہاتھ نبیوں کے مونہوں میں ڈالے گویا انہیں خاموش کرا دیا۔ اور ردّ کا استعمال یہ ظاہر کرنے کو ہے کہ وہ بار بار ایسا کرتے رہے (غ)
یہاں بیان کو حضرت موسٰی کے ذکر سے لوٹا کر عام کر دیا ہے اور پھر فرمایا کہ اتنی قومیں ہوئی ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا گویا ان کی تاریخ بھی محفوظ نہیں رہی۔ انہیں الفاظ کی بنا پر حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ نساب یعنی وہ لوگ جو سلسلہ نسب حضرت آدم تک پہنچا کر بس کرتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں مگر ہمارے تاریخ نویسوں نے بعض حالات میں نسابوں کے بھی کان کتر دیئے ہیں۔

اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾

تھے تو ہمارے سامنے کوئی کھلی سند لاؤ۔ ۱۶۴۱ؑ

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾

ان کے رسولوں نے انھیں کہا کہ ہم تمھارے جیسے ہی انسان ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے اور یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم تمھارے پاس سوائے اللہ کے حکم کے کوئی سند لائیں ۔ اور چاہیئے کہ مومن اللہ ہی پر بھروسا کریں۔

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ
ع وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور کیوں کر ہوسکتا ہے کہ ہم اللہ پر بھروسا نہ کریں اور اسی نے ہمیں ہمارے رستوں کی ہدایت کی ہے اور ضرور ہم اس پر صبر کریں گے جو تم ہمیں ایذا دیتے ہو اور چاہیئے کہ بھروسا کرنیوالے اللہ پر ہی بھروسا کریں۔ ۱۶۴۲ؑ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾

اور جو کافر تھے انھوں نے اپنے رسولوں سے کہا ہم تمھیں اپنے ملک سے نکال دیں گے یا تمھیں ہمارے مذہب میں آجانا ہوگا۔ سو ان کے رب نے ان کی طرف وحی کی کہ ہم یقیناً ظالموں کو ہلاک کر دیں گے۔

وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾

اور یقیناً ہم ان کے بعد تمھیں زمین میں آباد کریں گے۔ یہ اس کے لیے ہی جو میرے سامنے کھڑا ہونے سے اور میرے (عذاب کے) وعدے سے ڈرتا ہے ۱۶۴۳ؑ

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۱۵﴾

اور انھوں نے فیصلہ چاہا اور ہر ایک سرکش باغی نامراد ہوا ۱۶۴۴ؑ

۱۶۴۱ؑ سُلطان کے معنی کے لیے دیکھو ۵۳۷ؑ پہلی آیت میں رسولوں کا بینات یعنی کھلی دلائل کے ساتھ آنا بیان کیا تھا۔ یہاں وہ سلطان کا مطالبہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حق کے غالب ہوجانے کا مطالبہ کرتے ہیں جیسا کہ انہیں کہا جاتا تھا۔

۱۶۴۲ؑ جو کچھ یہاں عام رسولوں کے متعلق بیان کیا گیا ہے اس سب میں ذکر آنحضرت صلعم کا ہی اصل مقصود ہے۔

۱۶۴۳ؑ مقامی ۔ میرا مقام ۔ اور مَقام مصدر بمعنی قیام بھی ہوسکتا ہے اور اسم مکان یا زمان بھی یعنی کھڑا ہونے کی جگہ یا وقت (غ) پس یہاں مقامی کے معنی میرا قیام یعنی میرا حفظ اعمال کے ساتھ قائم ہونا بھی ہوسکتے ہیں یا میرا عدل و انصاف پر قائم ہونا۔ اور اس کے معنی میرا موقف یعنی میرے حضور سب انسانوں کے کھڑا ہونے کی جگہ بھی ہوسکتے ہیں ؛

اخراج رسل اور ان کی آخری کامیابی : سب رسولوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قانون ایک ہی رہا ہے۔ آخری کامیابی سب کو ملتی ہے۔ مگر اس زمانہ میں سے بھی سب کو گزرنا پڑتا ہے جب باطل کی فوجیں پورے زور پر ہوتی ہیں اس وقت رسولوں کو وعدہ دیا جاتا ہے کہ حق کو مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے مگر وہ ضرور غالب آئیگا اور باطل کو نیست و نابود کردیا جائے گا آیت ۱۳ میں ارضنا سے مراد خاص وہ ملک ہے جہاں مخالفین کا غلبہ ہے مگر آیت ۱۴ میں الارض وسیع ہے حق کو قائم کردیا جائے گا خواہ کہیں ہو اسی جگہ پر واپس لانے کا وعدہ رسول اللہ صلعم سے خاص تھا لرآدّك الی معاد (القصص ۲۸ - ۸۵) اور لتعودن فی ملتنا کے لیے دیکھو ۱۱۲۲ؑ ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کا نزول اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جب آنحضرت صلعم کے اخراج کی تجویزیں ہو رہی تھیں ؛

۱۶۴۴ؑ استفتحوا ۔ اِسْتِفْتاح فَتْح سے ہے جس کے معنی زنجیروں بیڑیوں کا دور کرنا ہیں یعنی کھولنا اور یہ جسمانیات پر بھی بولا جاتا ہے یعنی جو چیزیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور علوم وغیرہ پر بھی یعنی جو بصیرت سے تعلق رکھتی ہیں اور فتح القضیّة فتاحًا کے معنی ہیں مقدمہ کا فیصلہ کردیا گویا اس کی زنجیریں یا مشکلات وغیرہ کو دور کردیا (ربنا افتح بیننا وبین قومنا بالحق وانت خیر الفاتحین (الاعراف ۷ - ۸۹) اور فَتْح بمعنی ظفر و نصرت بھی آتا ہے اور اِسْتِفْتاح کے معنی طَلَبُ الفتح بھی ہوسکتے ہیں ۔ اور طَلَبُ الفتاح بھی یعنی فتح چاہنا یا فیصلہ چاہنا (غ)

استفتاح انبیاء بھی کرتے ہیں جیسے ربنا افتح بیننا وبین قومنا بالحق (الاعراف ۷ - ۸۹) سے ظاہر ہے اور ان کے مخالف بھی جیسے ربنا عجل لنا

مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾

اس کے سامنے دوزخ ہے اور اُسے کھولتا ہُوا پانی پلایا جائے گا ع۱۶۴۵

يَّتَجَرَّعُهٗ وَ لَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَ مِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾

وہ اسے گھونٹ گھونٹ پیئے گا اور اُسے گلے سے نہیں اتار سکے گا اور ہر طرف سے اُسے موت آرہی ہوگی اور وہ مرے گا نہیں اور اس کے سامنے سخت عذاب ہوگا ع۱۶۴۶

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِ۟اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾

ان لوگوں کی مثال جو اپنے رب کا انکار کرتے ہیں یہ ہے کہ اُن کے عمل راکھ کی طرح ہیں، جس پر آندھی کے دن ہُوا زور سے چلے جو کچھ انھوں نے کمایا تھا، اس میں سے کوئی چیز ان کے ہاتھ نہ آئے گی ۔ یہ پرلے درجہ کی گمراہی ہے ع۱۶۴۷

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾

کیا تو غور نہیں کرتا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے ع۱۶۴۸

وَّ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾

اور یہ اللہ پر کچھ بھی مشکل نہیں۔

وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ

اور سب اللہ کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے، تب کمزور اُنھیں جو متکبر تھے، کہیں گے ہم تمھارے پیرو تھے، تو کیا

قطنا (صٓ ۳۸ ۔ ۱۶) فاتنا بما تعدنا (الاعراف ۷ ۔ ۷۰) اور جنگ بدر کیلئے جب قریش نکلے ہیں تو اس وقت ابوجہل نے بھی دعا کی تھی دیکھو ع۱۲۱۹۔

ع۱۶۴۵ صدید ۔ صَدّ اور صُدُود کسی چیز سے روکنا یا رُکنا ہے اور صَدِید پیپ وغیرہ کو کہا جاتا ہے جو چمڑے اور گوشت کے درمیان حائل ہو اور یہ دوزخیوں کے طعام کے لیے بطور مثال بیان کیا گیا ہے (غ) اور صدید اس گرم پانی کو بھی کہا جاتا ہے جو ابالا گیا ہو۔ یہاں تک کہ گاڑھا ہو جائے اور تلچھٹ کو بھی (ل)

ع۱۶۴۶ یتجرع ۔ جَرِعَ اور تَجَرَّعَ پانی کے نکلنے پر بولا جاتا ہے اور جُرْعَۃ اور جَرْعَۃ ایک گھونٹ اور ایک مرتبہ پینے کو کہتے ہیں (ل) اور نہایہ میں ہے کہ تَجَرُّع کے معنی ہیں جلدی سے پانی پی جانا اور بعض کے نزدیک گھونٹ گھونٹ پینا معنے ہیں۔

یسیغ ۔ سَاغَ ۔ کھانے یا پانی پر بولا جاتا ہے جو گلے سے آسانی سے اُتر جائے سائغا للشاربین (النحل ۱۶ ۔ ۶۶)

جب استفتاح کا نتیجہ یہ فرمایا کہ حق کو نابود کرنے کی کوشش کرنے والے نامراد ہو جائیں گے تو اس عذاب دنیا کے بعد عذاب جہنم کا ذکر کیا۔ موت کے معنی کے لیے دیکھو ع۷۹ اور یہاں مراد وہ دُکھ اور مصائب ہیں جو موت تک پہنچا دیتے ہیں مگر چونکہ موت وہاں نہیں ہے اس لیے وہ مرتا نہیں لایموت فیہا ولا یحییٰ (طٰہٰ ۲۰ ۔ ۷۴)

من ورائہ کے معنی آگے اور پیچھے دونوں ہو سکتے ہیں اس لیے من ورائہ عذاب غلیظ میں عذاب دنیا کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔

ع۱۶۴۷ یوم عاصف ۔ عاصف اصل میں ہوا کی صفت ہے دیکھو ع۱۳۸۷ یوم کی طرف اس کا اسناد بطور مجاز ہے۔

کافروں کے اعمال کو راکھ سے مثال دی ہے جو ایک تیز ہوا کے سامنے اڑ جاتی ہے اس لیے کہ ان کی ساری دوڑ خواہشات حیوانی تک تھی، اس کے خاتمہ کے ساتھ ہی وہ عمل بھی برباد ہو گئے اور آخرت میں کچھ کام نہ دیں گے۔

ع۱۶۴۸ آیت کے دونوں حصوں میں کیا تعلق ہے؟ حق کے ساتھ زمین و آسمان کو پیدا کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہر فعل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے اس لیے انسانوں کے افعال بھی بلا نتیجہ نہیں رہ سکتے اور ایک قوم کے اعمال و افعال ہی اس کے زوال کا موجب ہوتے ہیں۔

اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا مِنۡ عَذَابِ اللّٰهِ مِنۡ
شَیۡءٍؕ قَالُوۡا لَوۡ هَدٰٮنَا اللّٰهُ لَهَدَیۡنٰكُمۡؕ
سَوَآءٌ عَلَیۡنَاۤ اَجَزِعۡنَاۤ اَمۡ صَبَرۡنَا مَا
ع ٣ ١٥ لَنَا مِنۡ مَّحِیۡصٍ ﴿٢١﴾

آج تم کچھ اللہ کا عذاب ہم سے دور کر سکتے ہو؟ وہ کہیں گے اگر اللہ ہمیں راہ دکھاتا تو ہم تمھیں راہ دکھاتے ہمارے لیے برابر ہے کہ ہم واویلا کریں یا صبر کریں، ہمارے لیے کوئی گریز کی جگہ نہیں ١٦٤٩

وَقَالَ الشَّیۡطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الۡاَمۡرُ اِنَّ اللّٰهَ
وَعَدَكُمۡ وَعۡدَ الۡحَقِّ وَوَعَدۡتُّكُمۡ فَاَخۡلَفۡتُكُمۡؕ
وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیۡكُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ اَنۡ
دَعَوۡتُكُمۡ فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِیۡۚ فَلَا تَلُوۡمُوۡنِیۡ
وَلُوۡمُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡؕ مَاۤ اَنَا بِمُصۡرِخِكُمۡ
وَمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُصۡرِخِیَّؕ اِنِّیۡ كَفَرۡتُ بِمَاۤ
اَشۡرَكۡتُمُوۡنِ مِنۡ قَبۡلُؕ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ
لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿٢٢﴾

اور جب بات کا فیصلہ ہو جائے تو شیطان کہے گا اللہ نے تمھیں سچا وعدہ دیا تھا اور میں نے تمھارے ساتھ وعدہ کیا تو تم سے وعدہ خلافی کی اور میرا تم پر کوئی غلبہ نہ تھا۔ مگر میں نے تمھیں بلایا تو تم نے میری بات مان لی، سو مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو، نہ میں تمھاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو، میں اس کا انکار کرتا ہوں جو تم نے پہلے مجھے شریک بنایا۔ ظالموں کے لیے دردناک دکھ ہے ١٦٥٠

وَاُدۡخِلَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ
فِیۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡؕ تَحِیَّتُهُمۡ فِیۡهَا سَلٰمٌ ﴿٢٣﴾

اور جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اپنے رب کے حکم سے انھیں میں ہمیشہ رہیں گے ان میں ان کی دعائے ملاقات سلام ہوگی۔

اَلَمۡ تَرَ كَیۡفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً
طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ

کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے اچھی بات کی مثال کس طرح بیان کی ہے جیسا ایک پاکیزہ درخت اس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی شاخیں

١٦٤٩ تبعا۔ تابع کی جمع ہے۔

لو ھدٰنا اللہ لھدینٰکم۔ یہاں راہ دکھانے سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ راہ حق دکھاتے مگر سیاق یہ چاہتا ہے کہ اس سے مراد عذاب سے مخلصی کی راہ ہے۔ کیونکہ ان کا سوال یہ ہے کہ کیا تم کچھ عذاب ہم سے دور کر سکتے ہو؟

جزعنا۔ جَزۡع کے اصل معنی رسہ کا درمیان سے کاٹ دینا ہیں اور جَزۡع اس حزن یا غم کو کہتے ہیں جو انسان کو اپنے سامنے کی چیز سے پھیر دے اور اسے اس سے کاٹ دے (غ) اور یہ صبر کے مقابل پر ہے حُزن اور صبر جمع ہو سکتے ہیں۔ مگر جَزۡع اور صبر جمع نہیں ہو سکتے۔

محیص۔ حَیص کے معنی ہیں ایک چیز سے الگ ہو جانا اور مَحِیص مَهۡرَب یعنی بھاگنے کی جگہ (ل) اور حَیۡصَ بَیۡصَ کے معنی شدت ہیں۔

١٦٥٠ مصرخ۔ صَرۡخَة۔ اس زور کی آواز کو کہتے ہیں جو مصیبت کے وقت دوسرے کو مدد کو بلانے کے لیے بلند کی جاتی ہے۔ اور صَارِخ فریاد کرنے والا اور مُصۡرِخ وہ جو فریاد سنکر مدد کو آئے اور صَرِیۡخ دونوں پر بولا جاتا ہے فَلَا صَرِیۡخَ لَهُمۡ (یٰسٓ ٣٦۔ ٤٣)

شیطان کا انکار شرک: انی کفرت بما اشرکتمون من قبل کے ایک معنی تو وہ ہیں جو ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ خدا کا شریک ہونے کا میں پہلے ہی منکر تھا یا میں نے کبھی یہ دعوٰی نہیں کیا کہ میں خدا کا شریک ہوں یا تم مجھے خدائی طاقتوں میں اس کا شریک مانو اور یہ معنی بالکل سیاق کے مطابق ہیں کیونکہ اوپر وہ صاف کہتا ہے کہ اللہ کے وعدے تو سچے ہوتے تھے اور میرے وعدے جھوٹے۔ پس اسی سے تم سمجھ سکتے تھے کہ اگر مجھ میں بھی کوئی خدائی طاقت ہو تو میں بھی اپنے وعدوں کو پورا کروں۔ اور اب جو تم مجھ سے مدد مانگتے ہو تو میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ کیونکہ میں کوئی خدا کا شریک تو ہوں نہیں۔

وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾	آسمان میں پھیلی ہوئی) ہیں ع۱۶۵۱
تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَ	وہ اپنے رب کے حکم سے اپنا پھل ہر موسم میں دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ
يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾	لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔
وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِۨ اجْتُثَّتْ	اور ناپاک بات کی مثال گندے درخت کی طرح ہے جو زمین کے

چھوٹوں کی غلطی سے بڑے گمراہ ہوتے ہیں: دوسرے معنی یوں ہوسکتے ہیں کہ میں نے جو خدا کا انکار کیا تو اس کی وجہ خود تمہارا شرک ہے اگر تم مجھے خدا کا شریک نہ بناتے تو میں بھی اس کا کافر نہ ہوتا اور اس صورت میں شیطان سے مراد وہی سردار ہوگا جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہے انا کنا لکم تبعًا ۔گویا جب کمزوروں نے بڑوں سے درخواست کی کہ ہم تمہاری بات مان کر تمہارے پیچھے چلا کرتے تھے تو وہ بڑے یہ جواب دیتے ہیں کہ تمہارے پیچھے چلنے نے ہی تو ہمیں کافر بنایا اور یہ بالکل سچ ہے کہ اکثر لوگ دنیا میں جو اپنے لیے خدا کی برابری کا دعویٰ کرتے ہیں اور جو چاہتے ہیں اپنے پیروؤں سے منواتے ہیں تو اس کی وجہ عوام الناس کی حماقت ہوتی ہے جب لوگ ایک شخص کو بڑا بنانا شروع کریں تو وہ کیوں بڑا نہ بنے گویا جب عوام نے یہ کہا کہ ہم تمہاری پیروی کی وجہ سے ہلاک ہوئے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ہی بڑا بنانے سے کافر ہوئے اور کفر میں بڑھتے گئے گویا تم ہماری ہلاکت کا موجب ہوئے اور ایک معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ میں اس بات کا انکار کرتا ہوں کہ تم نے مجھے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں شریک بنایا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو اچھے کاموں کا حکم دیتا تھا اور میں بُرے کاموں کی طرف بلاتا تھا۔

اس آیت میں یہ دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے سچے ہوتے تھے اور شیطان کے وعدے جھوٹے اور اس کا نظارہ ہم اس دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ نیکی پر خوشی کا وعدہ جو اللہ تعالیٰ دیتا ہے ہمیشہ سچا ثابت ہوتا ہے اور بدی پر خوشی کا وعدہ جو شیطان دیتا ہے ہمیشہ جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ اور جو لوگ بد صحبت میں بیٹھ کر تباہ ہوتے ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ جس جس شیطان نے جو جو کہہ کر ان کو بدی کی طرف مائل کیا تھا وہ آخر کار سب جھوٹ نکلا۔ دوسری بات یہ ہے کہ شیطان کا نیکوں پر تو کیا بدوں پر بھی کوئی تسلّط نہیں۔ وہ صرف ایک تحریک ہوتی ہے جو انسان اپنی بدبختی سے جھٹ پٹ قبول کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان پر شیطان کو مسلّط نہیں کیا بلکہ لوگ خود اس کا اتباع اختیار کرتے ہیں ؏

ع۱۶۵۱ اصل۔ کسی چیز کا اَصْل اس کا سب سے نیچے کا حصہ ہے (ل) یا وہ چیز جو اس کے لیے بطور بنیاد ہے کہ اگر اس کو اٹھایا جائے تو ساری شے ساتھ اُٹھ جائے (غ)

فَرْع کے معنی شاخ ہیں اور اس کی جمع فُرُوع ہے اور یہ دو لحاظ سے ہے ایک طول یعنی بلندی کے لحاظ سے کیونکہ فَرَعَ کے معنی طَالَ ہیں اور دوسرا بلحاظ عرض جیسے تَفَرَّعَ کے معنی پھیل گیا۔

اس آیت میں کلمہ طیّبہ اور آیت ۲۶ میں کلمہ خبیثہ کی مثال دی ہے جس سے مراد حق اور باطل ہیں کلمہ طیّبہ سے کسی نے لا الٰہ اِلّا اللّٰہ کسی نے قرآن، کسی نے دعوت الی الاسلام مراد لی ہے۔ مگر کلمہ حق میں یہ سب کچھ داخل ہے ایسا ہی کلمہ خبیثہ سے مراد کفر، کذب وغیرہ لیا گیا ہے جو سب کچھ باطل میں داخل ہے۔ یہاں بتایا ہے کہ حق بات کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑ زمین میں مضبوط لگی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہوں، یعنی بلند بھی ہوں اور ویسے بھی دور دور تک پھیلی ہوئی ہوں۔ یہ مثال صرف سمجھانے کے لیے ہے آیا مراد اس سے کھجور کا درخت ہے؟ صحیح حدیث میں مسلم کی مثال کھجور کے درخت سے دی ہے کیونکہ اس کی کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ مگر یہاں مسلم کی مثال نہیں بلکہ حق بات کی مثال ہے اور اس میں سمجھایا ہے کہ جس طرح ایک درخت جس کی جڑ زمین میں لگی ہوئی ہو اس کی شاخیں آسمان میں پھیل جاتی ہیں اسی طرح کلمہ حق ہوتا ہے کہ اس کا اصل مضبوط ہوتا ہے اور اس کی فروع سب اس اصل سے تعلق رکھتی ہیں گو کتنی بھی دور دور تک پھیلی ہوئی ہوں۔ پس وہ فروع سب ایک اصل کے ماتحت ہوتی ہیں اور اصل اور فروع کا تعلق اسی طرح دلائل عقلی سے روشن ہوتا ہے جس طرح درخت کی جڑ اور شاخوں کا تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس مثال میں یہ بھی سمجھایا ہے کہ جس طرح درخت کی جڑ پانی کے ذریعہ سے غذا حاصل کرتی ہے اور اس کی آسمان میں پھیلی ہوئی شاخیں ہوں اور دھوپ وغیرہ سے بھی ساتھ ساتھ اپنی غذا حاصل کرتی چلی جاتی ہیں اسی طرح حق کے اصل اصول تو وحی الٰہی سے قائم ہوتے ہیں جو بمنزلہ پانی کے ہے مگر اس کی فروع کو علاوہ اس غذا کے حالات پیش آمدہ سے بھی جو ان کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہوتے ہیں غذا ملتی رہتی ہے یہ اجتہاد کے ذریعہ سے ان فروع کا نشوونما پاتا ہے۔

اشجار بہشت اعمال انسانی سے پیدا ہوتے ہیں: یہاں بہشت کے ذکر کے بعد فوراً اس مثال کو بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مثال کا تعلق بہشت سے بھی ہے۔ بہشت کا نقشہ عموماً ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور یہاں کلمہ حق کو درخت سے مثال دیکر بتا دیا کہ بہشت کے درخت اور ثمرات اسی کلمہ حق کا ہی نتیجہ ہیں جس کو قبول کرکے انسان اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ گویا ہر کلمہ حق بمنزلہ ایک بیج کے ہے جس سے ایک ایسا درخت بن جاتا ہے جو ہمیشہ اپنا پھل دیتا رہتا ہے (آیت ۲۵) یعنی دنیا کے درختوں کی طرح نہیں کہ سال میں ایک آدھ دفعہ پھل دے دیا بلکہ اس کا پھل ہر وقت موجود رہتا ہے یہی انسان کے اعمال ہی آخر کار باغوں اور پھلوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ہاں اس عالم میں وہ زیادہ تر نظروں سے مخفی رہتے ہیں عالم آخرت میں کھلے کھلے نظر آجاتے ہیں۔ گویا ہر شخص کے اعمال کے مطابق ہی اس کے لیے بہشت تیار ہوتا ہے۔

مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾
يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ
فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِى الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ
ع اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ
كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾
جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ؕ وَ بِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾
وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ
قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾
قُلْ لِّعِبَادِىَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
وَ يُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً
مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِىَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ
وَ لَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾
اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ

اوپر سے ہی اُکھاڑ پھینکا جائے اس کو کچھ بھی قرار نہیں ع۱۶۵۲
اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں یقینی بات کے ساتھ مضبوط کرتا
ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور اللہ ظالموں کو ہلاک
کرتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ع۱۶۵۳
کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری
سے بدلا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں اتارا ع۱۶۵۴
(یعنی) دوزخ میں اس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔
اور اللہ کے شریک بناتے ہیں تاکہ اس کے رستہ سے گمراہ کریں، کہہ
(دنیا میں) فائدہ اُٹھا لو آخر کار تھیں دوزخ کی طرف ہی جانا ہے۔
میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں کہدے کہ وہ نماز کو قائم کریں
اور اس سے جو ہم نے ان کو دیا ہے چھپے اور کھلے خرچ کریں اس سے
پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ لین دین ہوگا اور نہ دوستی
کام آئے گی ع۱۶۵۵
اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے

ع۱۶۵۲ اجتثت۔ کسی چیز کا جُثّۃ اس کا وہ وجود ہے جو نظر آرہا ہو۔ اور اِجتِثَات اس کے جُثّہ کا نکال پھینکنا ہے۔
جس طرح حق بات کی مثال ایک مضبوط جڑ والے درخت سے دی ہے باطل کی مثال اس درخت سے دی ہے جس کی جڑ زمین کے اندر مضبوط نہیں بلکہ ذرا سے مقابلہ پر وہ سارے کا سارا اکھڑ جاتا ہے اور یہی باطل کا قاعدہ ہے کہ اسے قیام کچھ نہیں ہوتا۔ ایک دلیل سے پاش پاش ہو جاتا ہے ان دو مثالوں کو لاکر یہ بتایا کہ قرآن کی حقانیت ایسی زبردست ہے کہ کوئی دلائل اسے توڑ نہیں سکتیں بلکہ جوں جوں عقلی دلائل ترقی کریں گی توں توں اس کی مضبوطی اور اس کی شاخوں کی بلندی ظاہر ہوتی جائے گی اور باطل کو کبھی بھی قرار نہیں ہوگا۔ یہی حال تمام ان عقاید کا ہے جو اسلام کے خلاف ہیں کہ وہ کسی اصل کے ماتحت نہیں اس لیے فوراً گر جاتے ہیں۔

ع۱۶۵۳ اس آخری آیت میں بتا دیا کہ اصول حقہ کا یہ اثر مومن کی زندگی میں بھی نظر آتا ہے یہاں بھی اور آخرت میں۔ پس جس شخص کو ایسی مضبوطی حاصل نہیں اس کا ایمان بھی ناقص ہے۔
یضل اللہ الظالمین میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام سے تو لوگوں کو مضبوط ہی کرتا ہے مگر جو لوگ خود ظلم کا طریق اختیار کرتے ہیں انہیں انکی گمراہی کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے جس کا نتیجہ ہلاکت ہوتا ہے۔

ع۱۶۵۴ بوار۔ کَسَاد یا سرد بازاری کا بہت ہو جانا ہے اس لیے اس کے معنی ہلاکت ہو گئے ہیں بَارَ یَبُوْرُ۔ تجارۃ لن تبور (فاطر ۳۵-۲۹) ومکر اولٰئک ھو یبور (فاطر ۳۵-۱۰) وکنتم قوما بورا (الفتح ۴۸-۱۲)
نعمت سے مراد وحی الٰہی یا قرآن ہے اور اس کے تبدیل کرنے سے مراد اس کا قبول نہ کرنا اور اس کی جگہ کفر کا لینا ہے گویا اس نعمت کو دیکر کفر لیا۔ یہ اہل مکہ کی طرف اشارہ ہے جو اب نعمت الٰہی کی قبولیت کی جگہ رسول اللہ صلعم کو جو اس نعمت کے لانے والے تھے گھر سے نکال رہے تھے جس کا نتیجہ ان کی قوم پر ہلاکت کا آنا ہُوا۔

ع۱۶۵۵ نماز کا قائم کرنا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ان مشکلات کا علاج بتایا جو کفار کی طرف سے اس وقت پیش آرہی تھیں۔ بیع اور خلّت کے نہ ہونے پر دیکھو ع۳۲۸۔

وَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ ۚ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الۡفُلۡکَ لِتَجۡرِیَ فِی الۡبَحۡرِ بِاَمۡرِہٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الۡاَنۡہٰرَ ﴿۳۲﴾

پانی اتارا پھر اس کے ساتھ تمھارے لیے پھلوں سے رزق نکالا اور کشتیوں کو تمھارے کام میں لگایا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں اور دریاؤں کو تمھارے کام میں لگایا۔

وَ سَخَّرَ لَکُمُ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ دَآئِبَیۡنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ ﴿ۚ۳۳﴾

اور سورج اور چاند کو جو ایک قانون پر چل رہے ہیں تمھارے کام میں لگایا اور رات اور دن کو بھی تمھارے کام میں لگایا۔

وَ اٰتٰىکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مَا سَاَلۡتُمُوۡہُ ؕ وَ اِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡہَا ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ کَفَّارٌ ﴿۳۴﴾ ع

اور جو کچھ تم مانگو اس میں سے تمھیں دیتا ہے اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انھیں گن نہ سکو گے۔ یقیناً انسان بڑا ہی ظالم بڑا ناشکر گزار ہے ۱۶۵۶

وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہِیۡمُ رَبِّ اجۡعَلۡ ہٰذَا الۡبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجۡنُبۡنِیۡ وَ بَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ ﴿ؕ۳۵﴾

اور جب ابراہیمؑ نے کہا، میرے رب! اس شہر کو امن والا بنا، اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی پرستش کریں ۱۶۵۷

۱۶۵۶ تحصوا۔ حَصٰی کنکری کو کہتے ہیں اور چونکہ پہلے کنکریوں سے گنتی کی جاتی تھی (یا چونکہ کنکریوں سے گنتی سکھائی جاتی ہے) اس لیے اِحْصَاء کے معنی گنتی کے ذریعہ سے کسی چیز کا حاصل کر لینا یا اس کا احاطہ کر لینا ہیں واحصٰی کل شیٔ عددا (الجن ۷۲-۲۸) علم ان لن تحصوہ (المزمل ۷۳-۲۰)

ظَلُوم اور کَفَّار۔ ظالِم اور کافر سے مبالغہ کے صیغے ہیں بڑا ظالم بڑا ناشکر گزار۔

سورج چاند وغیرہ کی تسخیر: اوپر کی دونوں آیتوں میں جب یہ ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کشتیوں اور دریاؤں کو۔ سورج اور چاند کو۔ رات اور دن کو انسان کے لیے مسخر کر رکھا ہے اور اس کے کام میں لگا دیا ہے تو یہاں اس کو عام کر کے بیان فرمایا کہ یہ کیا ہر چیز کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور تم اس سے فائدہ اُٹھاتے ہو۔ ہاں ان چیزوں سے پھر تم اس قدر فائدہ اُٹھاتے ہو جس قدر مانگو اور وہ مانگنا اپنے عمل سے ہے۔ ہوائیں بادل بجلیاں آگ پانی یہ سب چیزیں انسان کی خدمت میں لگائی ہیں۔ کیونکہ انسان ان سے منفعت حاصل کرتا ہے مگر پھر جس قدر زیادہ ان سے وہ خود کام لے لے اسی قدر زیادہ نفع اُٹھائے گا۔ پس جس طرح دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ کی روحانی نعمتوں سے فائدہ اُٹھاؤ ان کو کیوں ظلم اور ناشکری سے پھینکتے ہو۔ وحی الٰہی اسی طرح تمہیں روحانی طور پر فائدہ پہنچانے والی چیز ہے جس طرح جسمانی رنگ میں یہ نعمتیں اس لیے جب تم اسے رد کرتے ہو تو اس کے فائدے سے محروم ہو کر اسی طرح دُکھ اٹھاتے ہو جس طرح جسمانی نعمتوں سے محروم ہو کر بھی نتیجہ دکھ ہوتا ہے اور دوسری طرف اس میں یہ بھی سمجھایا ہے کہ جن چیزوں کو تم اپنا معبود بناتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہاری خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔

۱۶۵۷ سلسلۂ نبوت کا نظم: اس سارے رکوع میں صرف اس دعا کا ذکر ہے جو حضرت ابراہیم نے مکّہ کے لیے اور اہل مکّہ کے لیے اور اپنی اولاد کے لیے کی۔ اور اس سے پہلے اور پیچھے دونوں طرف مخالفت حق اور اس کے انجام کا ذکر ہے یہ مضمون بے تعلق نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مذہب اور وحی الٰہی کا سلسلہ سب ایک نظم میں منسلک ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفٰے صلعم کو اپنے اسی ارادہ کے مطابق دنیا میں مبعوث فرمایا ہے جو وہ مدتوں پیشتر انبیاء پر ظاہر فرما چکا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم گویا ایک جڑ کی طرح ہیں کیونکہ وہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل کے لیے بطور جد کے ہیں اور یوں گویا یہ بھی ایک تشریح ہے اس اصول کی جو آیت ۲۴ میں بیان فرمایا کہ حق ایک درخت کی طرح ہے جسکی جڑ زمین میں قائم ہے اور شاخیں چاروں طرف آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں اور حضرت ابراہیم کے مذہب کا اصل الاصول بھی وہی توحید الٰہی تھا جو سب مذاہب کے لیے بطور ایک جڑ کے ہے۔ کوئی مذہب نہیں جس نے ایک خدا کے ساتھ تعلق قائم کرنے کو بطور اصل اور جڑ نہ ٹھہرایا ہو۔ اسی لیے حضرت ابراہیم کی دعا میں بھی سب سے پہلے ذکر توحید الٰہی کا کیا ہاں اس توحید کے ذکر کے ساتھ یہ بھی دعا ہے کہ مکّہ امن والا شہر ہو سو اسلیے کہ اس میں خانہ کعبہ تھا، جو وہ بھی توحید کے لیے بطور نشان ابتدائے عالم سے قائم کیا گیا اور ایک خدا کی پرستش کا سب سے پہلا معبد دنیا میں یہی ہوا۔

حضرت ابراہیم کی یہ دعا عصمت انبیاء کے خلاف نہیں۔ اس لیے کہ وہ عصمت حاصل ہی اس سے ہوتی ہے کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتے اور اس سے مدد طلب کرتے رہتے ہیں اسی لیے حفاظت الٰہی ان کے شامل حال رہتی ہے عصمت انبیاء کا اگر یہ مطلب ہوتا کہ وہ کوئی علیحدہ قویٰ کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں تو انبیاء

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضۡلَلۡنَ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ‌ۚ فَمَنۡ تَبِعَنِىۡ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡ‌ۚ وَمَنۡ عَصَانِىۡ فَاِنَّكَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳۶﴾

میرے رب! انھوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے، سو جو میری پیروی کرے تو وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۶۵۸ع

رَبَّنَاۤ اِنِّىۡۤ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ بِوَادٍ غَيۡرِ ذِىۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِۙ رَبَّنَا لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ وَارۡزُقۡهُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُوۡنَ ﴿۳۷﴾

ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے عزّت والے گھر کے پاس اس وادی میں بسایا ہے جہاں کھیتی نہیں ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں سو تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کردے اور ان کو پھلوں سے رزق دے، تاکہ وہ شکر کریں ۱۶۵۹ع

کی عصمت ہمارے لیے کچھ مفید نہ ہوسکتی تھی۔ ان کی عصمت کا راز ہی یہ ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر حال میں حفاظت الٰہی طلب کرتے رہتے ہیں اور اپنے نفس پر بھروسہ نہیں کرتے اور ان کی عصمت کے اس راز کو سمجھ کر ہی ہم بھی گناہوں سے بچ سکتے ہیں کہ ان کی طرح اپنے نفسوں پر بھروسہ نہ کریں بلکہ ہر حال میں حفاظت الٰہی کے طالب ہوں لاتکلنی الی نفسی طرفۃ عین نبی کریم صلعم کی دعا ہمارے لیے کیسی اچھی تعلیم ہے۔

ع۱۶۵۸ آیت کے پہلے حصّہ میں بتوں کو لوگوں کے گمراہ کرنے والے ٹھہرایا ہے اور یہ اسناد بطور مجاز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بُت پرستی سے لوگ گمراہ ہوگئے ورنہ بُت تو بے جان ہیں وہ گمراہ نہیں کرتے پچھلے حصّہ میں انبیاء کی وسعت قلبی اور رحمدلی کا نقشہ ہے۔ وہ نافرمانوں کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی صفت غفر اور رحم کا ہی ذکر کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کی اس دعا میں آپ کے اس فرزند کی حالت قلبی کا بھی نقشہ کھینچا ہے جو رحمۃ للعالمین کرکے بھیجا گیا۔ اس لیے اس کے دشمن یوں تباہ نہ ہوئے جیسے انبیائے سابق کے مخالفوں کی ہلاکت کا نقشہ قرآن شریف نے کھینچا ہے بلکہ زیادہ حصّہ اللہ تعالیٰ کے غفر اور رحم کی صفات کے نیچے آکر ہدایت پر آگیا۔ اور چونکہ جو نقشہ حق کے مخالفین کی ہلاکت کا اس سورت میں کھینچا ہے اس میں خاص مقصود تو نبی کریم صلعم کے ہی دشمن ہیں اس لیے حضرت ابراہیم کی اس دعا میں یہ بتایا ہے کہ کچھ ہلاک ہوکر بہت غفر اور رحم کے نیچے آجائیں گے۔

۱۶۵۹ع تھوی۔ ھَوٰی کے ایک معنی ع۹۶۴ میں بیان ہوچکے ہیں۔ اور گو یہ لفظ مطلق عموماً مذموم ہوتا ہے یعنی ادنیٰ یا گری ہوئی خواہشات پر بولا جاتا ہے مگر اچھے معنی میں بھی اس کا استعمال ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے متعلق تقرّب الی اللہ بھواہُ اپنی ہوای یعنی محبّت سے اللہ کا قرب حاصل کیا۔ اور اچھے کاموں کی محبّت کے متعلق ہی اس کا استعمال رسول اللہ صلعم کے لیے بھی ہوا ہے۔ جیسے حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث میں یسارع لک ربک فی ھواک یعنی جن اچھی باتوں کی طرف آپ کا میلان ہے ان میں آپ کا رب آپ کو بہت جلد عطا فرماتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ھوی کے معنی کسی چیز کی محبّت اور اس کا دل پر غالب آجانا ہیں (ل) حدیث میں ہے یاخُذُ کلُّ واحدٍ مِنَ البَیعِ ماھَوٰی جس کے معنی ہیں ما اَحَبَّ یعنی جس چیز سے محبّت کرتا ہے (ن) اور ھَوٰی یَھْوِی ھَوِیًّا اور ھُوِیًّا دونوں طرح آتا ہے اور ھَوِیّ کے معنی نیچے کی طرف آنا ہیں اور ھُوِیّ کے معنی اوپر کی طرف جانا یا اس کے خلاف اور ھَوٰی یَھْوِی کے معنی چلنے میں تیزی بھی ہیں اور تھوی الیھم میں معنی ان کی طرف مائل ہونے کے بھی کیے گئے ہیں اور بلند ہونے کے بھی اور ان کا ارادہ کرنے کے بھی اور ان کی طرف جلدی کرنے کے بھی (ل) اور ھَوَاء وہ ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان ہے اور آیت ۴۳ میں افئدتھم ھواء اسی لحاظ سے ہے یعنی جیسے خلا میں ہوا ہوتی ہے (غ) گویا وہ خالی ہیں یعنی عقل سے خالی یا خوف کی وجہ سے کسی چیز کو محفوظ نہ رکھ سکیں گے (ل)

یہ حضرت اسمٰعیل کے خانہ کعبہ کے پاس چھوڑنے کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں لفظ اَسْکَنْتُ لاکر بتا دیا ہے کہ یہ چھوڑنا محض اخراج کے طور پر نہ تھا بلکہ مصلحت الٰہی کا تقاضا تھا کہ حضرت ابراہیم کی اولاد کا ایک حصّہ یہاں آباد ہو اور حدیث میں بھی ہے کہ یہ چھوڑنا حکم الٰہی سے تھا۔ اور وادٍ غیر ذی زرع اسے کہا اس لیے کہ وہ پتھریلی زمین ہے جہاں سبزی وغیرہ نہیں ہوتی اور بارش بھی بہت کم ہوتی ہے اس لیے وہ زراعت کے لیے موزوں نہ تھی۔ اس لفظ کے لانے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ انہیں محض رضائے الٰہی کے ماتحت یہاں چھوڑا ہے کسی غرض دنیوی کے لیے نہیں اسی کی تائید کے لیے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا لیقیموا الصلوٰۃ یعنی غرض یہ ہے کہ قیام صلوٰۃ ہو جس میں حصول رضائے الٰہی مدنظر ہے نہ کوئی دنیوی غرض۔ اور عند بیتک المحرم کے لفظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیت الحرام یعنی خانہ کعبہ وہاں موجود تھا۔ حالانکہ حضرت ابراہیم کے بنانے کا جو ذکر ہے، اس میں حضرت اسمٰعیل کی شمولیت موجود ہے واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل (البقرۃ ۲ - ۱۲۷) لیکن جب اسمٰعیل کو وہاں چھوڑا تو ان کی عمر چھوٹی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں مکہ کے رہنے والوں کے لیے محبّت کا پیدا کرنا خود خانہ کعبہ کی محبّت کے قائمقام ہے یہ دعا بھی کیا عجیب ہے اس مقام کے لیے جذب اور کشش پیدا ہونے کی دعا ہے جہاں کوئی بھی ظاہری سامان کشش کا نہیں، یہاں تک کہ وہ جگہ زراعت سے بھی خالی ہے۔ یہ اس لیے ہوا کہ تا ایک اللہ کے نام کے سوائے یہاں کوئی دوسری کشش نہ ہو اور صرف دینی

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ؕ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾

ہمارے رب تو جانتا ہے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور اللہ پر کوئی چیز بھی چھپی نہیں رہتی (نہ) زمین میں اور نہ آسمان میں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسمٰعیل اور اسحٰق دیئے، یقیناً میرا رب دعا کا سننے والا ہے۔

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾

میرے رب مجھے نماز کا قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے (بھی) ہمارے رب اور میری دعا کو قبول فرما۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾ ع ۶ / ۱۸

ہمارے رب! میری حفاظت فرما اور میرے باپ کی اور مومنوں کی بھی جس دن حساب قائم ہو۔ع۱۶۶۰

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾

اور اللہ کو اس سے بے خبر نہ سمجھ جو ظالم کرتے ہیں، وہ صرف ان (کے معاملہ) کو اس دن تک پیچھے ڈال رہا ہے جب آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ع۱۶۶۱

مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ؕ ﴿۴۳﴾

بھاگے جا رہے ہونگے اپنے سر اٹھائے ہوئے ان کی نگاہ ان کی طرف نہ پھرے گی اور ان کے دل خالی ہوں گے۔ع۱۶۶۲

فوائد کے لیے ہی یہ جگہ مخصوص رہے ہاں یہ بھی دعا ہے کہ کھانے کو بھی اُنہیں ملتا رہے گو وہ اشیائے خوردنی وہاں باہر سے ہی جائیں۔ اگلی آیت میں یہ بتایا ہے کہ نیت اور ارادہ کا جاننے والا اللہ تعالیٰ ہے ہماری نیتوں میں کوئی دنیا کی ملونی نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو ایسا بابرکت کیا کہ ساری دنیا کے دل اس کی طرف کھچے چلے جاتے ہیں۔

ع۱۶۶۰ یہ ضروری نہیں کہ یہ ساری دعا ایک ہی موقعہ کی ہو۔ اس کا آخری حصّہ جو آیت ۳۹ سے شروع ہوتا ہے بڑھاپے کے زمانے کا ہے جب حضرت اسمٰعیل اور اسحٰق دونوں پیدا ہو چکے ہیں۔ اور اس وقت ماں اور باپ کے لیے دعائے استغفار کرنا صاف بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے جس اَبْ کا ذکر دوسری جگہ ہے وہ کوئی اور بزرگ تھے۔ کیونکہ ان سے بعد میں بیزاری کا اظہار بھی کیا تھا۔ فلمّا تبیّن له انّه عدو للّٰه تبرّا منه (التوبة ۹-۱۱۴)

ع۱۶۶۱ یوخر۔ تاخیر ضد تقدیم ہے یعنی کسی معاملہ کا پیچھے لانا۔

تشخص۔ شَخْص انسان کا سواد ہے جو دور سے نظر آتا ہے۔ اور ہر جسم جس کے لیے ارتفاع اور ظہور ہو۔ اس لیے شَخَصَ کے معنی اِرْتَفَعَ آتے ہیں یعنی ایک چیز بلند ہوگئی اور شَخَصَ البَصَرُ کے معنی ہیں آنکھ کھل گئی اس طرح کہ پھر جھپکی نہ جائے اور حدیث میں میت کے ذکر میں ہے شَخَصَ بَصَرُہٗ جس سے مراد ہے پلکیں اوپر اٹھ گئیں اور نظر محدود ہوگئی (ل) فاذا ھی شاخصة ابصار الذین کفروا (الانبیاء ۲۱-۹۷)

عذاب کے وقت کا نقشہ: ظالم جو حق کو مٹانا چاہتے ہیں کامیاب ہوتے چلے جاتے ہیں جب اپنے ارادوں میں تو اکثر دلوں میں یہ خلش پیدا ہوتی ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ دیکھتا نہیں پھر انہیں پکڑتا کیوں نہیں جس کا جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ ان کے معاملہ میں تاخیر کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دن آپہنچتا ہے جب آنکھیں پھٹی رہ جاتی ہیں اور وہ موت کا وقت ہے۔ مراد اس سے یا تو واقعی مجرم کی موت ہو سکتی ہے اور یا عذاب کا دن جب اکثر دلوں پر وہ کیفیت وارد ہوتی ہے جس کا نظارہ موت کے وقت دیکھا جاتا ہے اور اگلی آیت سے ظاہر ہے کہ یہ عذاب کا دن ہے جب عذاب کی سختی سے مجرموں کی کیفیت اس شخص کی سی ہو جاتی ہے جو حالت نزع میں ہو۔

ع۱۶۶۲ مھطعین۔ ھَطَعَ اور اَھْطَعَ کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف آیا اپنی آنکھ اس پر ٹکائے ہوئے اور اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ خوف سے دوڑتا ہوا اور یہ صرف خوف کی حالت پر بولا جاتا ہے اور ایک قول میں مُھْطِع وہ ہے جو عاجزی اور ذلت کی حالت میں دیکھے اور مُقْنِع وہ جو سر اٹھائے ہوئے ذلت کی حالت میں دیکھے مھطعین الی الداع (القمر ۵۴-۸)

وَ اَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ
فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ
اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ
الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ
قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾

اور اس دن سے لوگوں کو ڈرا جب اُن پر عذاب آجائے گا جو ظالم ہیں کہیں گے ہمارے رب! ہمیں ایک قریب وقت تک تاخیر دے، ہم تیری دعوت کو مانیں اور رسولوں کی پیروی کریں اور کیا تم پہلے قسمیں نہ کھایا کرتے تھے کہ تم پر زوال نہیں آئے گا ۱۶۶۳ع

وَّ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا
اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ
وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾

اور تم اِن لوگوں کی جگہوں میں آباد ہوئے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور تمھارے لیے کھل چکا ہے کہ ہم نے ان سے کیا کیا اور ہم نے تمھارے لیے مثالیں بیان کیں ۱۶۶۴ع

وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ
مَكْرُهُمْ ؕ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ
لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

اور انھوں نے اپنی چال چلی اور ان کی چال اللہ کے اختیار میں ہے اور گو اُن کی چال ایسی ہی ہو کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں ۱۶۶۵ع

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ
رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾

سو یہ گمان نہ کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے اپنے وعدے کا خلاف کرے گا، اللہ غالب سزا دینے والا ہے ۱۶۶۶ع

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ
وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾

جس دِن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی اور (لوگ) اللہ اکیلے سب پر غالب کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے ۱۶۶۷ع

مقنعی۔ قناعۃ تھوڑی چیز پر راضی ہوجانا ہے اور قنوع سوال کرنا ہے جس سے قانع ہے و اطعموا القانع والمعتر (الحج ۲۲-۳۶) جس سے مراد سائل ہے یا ایسا سائل جو تھوڑے پر راضی ہوجائے اور الحاح نہ کرے اور اَقْنَعَ رَاسَہٗ کے معنی ہیں اپنا سر اٹھایا۔ کیونکہ قِنَاع وہ ہے جس سے سر ڈھانکا جاتا ہے (غ)

یہاں وہ نقشہ کھینچا ہے جب بڑے بڑے مغرور اور متکبر انسان آخر کار مغلوب ہوتے ہیں اور انہی لوگوں کے سامنے جن پر انہوں نے ظلم کیا تھا ذلت کی حالت میں آتے ہیں شرمندگی کے مارے سر نیچا بھی ہے اور دہشت کی وجہ سے اُٹھا ہوا بھی ہے۔

ع۱۶۶۳ زوال۔ زال کے معنی ہیں ایک چیز اپنی حالت یا طریق سے الگ ہوگئی لتزول منه الجبال (۴۶) ان تزولا (فاطر ۳۵-۴۱) ولئن زالتا (فاطر ۳۵-۴۱) اور زوال صرف اس چیز کے متعلق کہا جاتا ہے جو پہلے ثابت یعنی مضبوط ہو اور پھر وہ حالت اس کی بدل جائے اور زوال آفتاب بھی اسی لحاظ سے ہے کہ دوپہر کے وقت وہ ثابت معلوم ہوتا ہے (غ)

یہاں صاف اشارہ ہے کہ مخالفین کے اقتدار اور قوت کے ٹوٹنے کا وقت آجائے گا اس لیے ان کو وہ وقت یاد دلایا ہے جب اپنی طاقت کے نشہ میں سرشار وہ کہا کرتے تھے کہ ہماری قوت اور سلطنت کبھی زوال نہ دیکھے گی۔

ع۱۶۶۴ اس سے مراد وہ قومیں ہیں جو پہلے عرب میں یا اس کے اردگرد حکمران تھیں جن کے تذکرے اور انجام قرآن شریف میں مذکور ہیں۔

ع۱۶۶۵ قریش کی تدابیر: اس میں قریش کا ذکر ہے اور یہ ان کی چال وہی ہے جس کا ذکر دوسری جگہ فرمایا اذ یمکربك الذین کفروا لیثبتوك او یقتلوك او یخرجوك (الانفال ۸-۳۰) اور یہ ان کی چال تو اس قدر مضبوط تھی کہ پہاڑوں کو بھی اڑا دیتے مگر اللہ جو سب سے طاقتور ہے اس کے اختیار میں ہی ہر بات ہے اس لیے وہ ان کی چال کو سرسبز نہ ہونے دے گا۔ یہی معنی ہیں عند اللہ مکرھم کے۔

ع۱۶۶۶ اس پر اس قدر زور اس لیے دیا کہ ابھی بڑی بڑی مشکلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آنے والی تھیں۔ جہاں بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ دین اسلام کا خاتمہ ہوگیا اس لیے فرمایا کہ یہ کبھی ہو نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہو کر رہے گا۔

ع۱۶۶۷ وعدۂ عذاب دنیا کے لیے بھی ہے: قرآن کریم میں جس قدر وعدے عذاب کے کفار کے ساتھ ہیں وہ آخرت پر بھی چسپاں ہوسکتے ہیں اور دنیا پر بھی۔ یہی

وَ تَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾

اور تُو اُس دن مجرموں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھے گا ۱۶۶۸ع

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّ تَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾

اُن کے کُرتے رال کے ہونگے اور ان کے مونہوں کو آگ ڈھانک لے گی ۱۶۶۹ع

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾

تاکہ اللہ ہر نفس کو وہ بدلہ دے، جو اس نے کمایا بیشک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَ لِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ لِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾ ع ۱۱ / ۱۹

یہ لوگوں کو کھولکر پہنچا دینا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ سے ڈرائے جائیں اور تاکہ وہ جان لیں کہ وہ صرف ایک ہی معبود ہی اور تاکہ خالص عقل والے نصیحت حاصل کریں ۱۶۷۰ع

زمین وآسمان کا بدل جانا قیامت میں بھی درست ہے اور ایک معنی میں جب عرب اسلام کے سامنے جھک گئے اور چاروں طرف بت پرستی کی جگہ توحید کا نقارہ بج گیا۔ بتوں کا نام ونشان باقی نہ رہا۔ شراب خوری اور زنا مٹ گئے۔ جہالت کی جگہ علوم کی نہریں بہنے لگیں تو یہ بھی واقعی زمین وآسمان کے بدل جانے کا ہی نظارہ تھا اور اگلی آیت میں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہونے کا نظارہ بھی جنگوں میں دیکھ لیا گیا۔

ع۱۶۶۸ مقرنین۔ قرن یا اقتران دو یا زیادہ چیزوں کے اجتماع کا نام ہے اور قرَّنَ میں تکثیر پائی جاتی ہے قرین ہمنشین۔ قرن نسل اسی معنی کے لحاظ سے ہیں او جاء معه الملائكة مقترنين (الزخرف ۴۳۔ ۵۳)

اصفاد۔ صَفَد کی جمع ہے جس کے معنی زنجیر ہیں۔

ع۱۶۶۹ سرابیل۔ سِربال کی جمع ہے۔ کرتہ کسی چیز کا بھی ہو۔ سرابيل تقيكم الحرّ وسرابيل تقيكم بأسكم (النحل ۱۶۔ ۸۱)

قطران۔ قُطر کے معنی جانب ہیں جس کی جمع اقطار ہے اَنْ تنفذوا من اقطار السموٰت والارض (الرحمٰن ۵۵۔ ۳۳) ولو دخلت عليهم من اقطارها (الاحزاب ۳۳۔ ۱۴) اور قطرَ اور تقطّرَ کے معنی ہیں اپنی جانب پر گرا جس سے مراد بارش کا گرنا ہے اور قطران وہ چیز ہے جو ھِنَاء یعنی رال سے گرتی ہے اور اٰتونی افرغ عليه قطرا (الكهف ۱۸۔ ۹۶) ہیں قِطر پگھلا ہوا تانبا ہے (غ)

ع۱۶۷۰ نتیجۂ تبلیغ: نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کی توحید کو شناخت کرلیں۔ سو ایسا ہی ہوا کہ کل عرب نے توحید الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا اور جو نظارہ عرب میں پیش آیا اس کو دنیا بھی عنقریب کسی نہ کسی رنگ میں دیکھ لے گی۔

(۱۵) سُوْرَۃُ الْحِجْرِ مَکِّیَّۃٌ

ایاتھا ۹۹ رکوعاتھا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ① میں اللہ دیکھنے والا ہوں۔ یہ کتاب کی آیتیں ہیں اور قرآن کی جو کھول کر بیان کرنیوالا ہے ۱۶۷۱

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ② بسا اوقات کافر چاہیں گے کہ کاش! وہ مسلمان ہوتے ۱۶۷۲

نام: اس سورت کا نام الحجر ہے اور اس میں چھ رکوع اور ننانوے آیات ہیں۔ حجر کے معنی پتھر ہیں۔ اور الحجر اس وادی کا نام ہے جس میں حضرت صالحؑ کی قوم یعنی ثمود رہتے تھے۔ اس قوم کا مسکن نہ صرف اہلِ مکّہ کے بالکل قریب تھا بلکہ اس رستہ پر تھا جو مکّہ سے شام کو جاتا تھا اور جس پر ان کے قافلے آتے جاتے تھے۔ اور سخت دلی میں بھی معلوم ہوتا ہے یہ قوم اپنی نظیر آپ ہی تھی۔ جو کچھ انہوں نے حضرت صالحؑ کے خلاف منصوبے اور سازشیں کیں وہ بعینہٖ ایسے تھے جیسے قریش نے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کیے۔ اسی مناسبت سے اس سورت کا نام الحجر ہے اور اس کے ساتھ ہی اس سورت میں دو اور قوموں کا ذکر ہے یعنی حضرت شعیب کی قوم اور حضرت لوط کی جن کے مسکن اسی راستہ پر تھے جس پر ثمود کا مسکن تھا اور یہ تینوں قومیں ایک ہی عذاب یعنی زلزلہ سے تباہ ہوئیں۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں قرآن کریم کی حفاظت ابدی کا ذکر ہے یعنی نہ صرف یہ حق جو قرآن لایا ہے دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہے گا بلکہ تحریف وغیرہ سے بھی یہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگا، دوسرے رکوع میں بتایا کہ شیاطین اس حق کو نابود نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود اس سے نابود ہو جائیں گے اور کہانت نجوم وغیرہ اس کی بدولت مٹ جائیں گے۔ تیسرے میں بتایا کہ شیطان کے پیچھے لگ کر انسان حصول مقصد زندگی میں ناکام رہتا ہے اور چوتھے میں اس کے متعلق متقی کی کامیابی کا ذکر کیا۔ پانچویں میں لوطؑ اور شعیبؑ کی قوموں کی تباہی کا اور چھٹے کے شروع میں قوم ثمود کی بربادی کا ذکر کرکے اعدائے اسلام کو انذار کیا۔

تعلّق: الٓرٰ مجموعہ کی یہ چھٹی سورت ہے۔ اس کے بعد جو ساتویں سورت اس مجموعہ میں آتی ہے الٓرٰ سے شروع نہیں ہوتی۔ جب پچھلی سورت میں مثال سے سمجھایا کہ حق کو کوئی طاقت نابود نہیں کر سکتی، تو اب یہاں نہایت صفائی سے قرآن کریم کی حفاظت ابدی کا ذکر کیا اور بتایا کہ باطل حق کو نابود نہیں کرے گا، بلکہ خود حق کے سامنے نابود ہو جائے گا۔ اور حق کا مقابلہ کرنے والوں میں سے وہ تین مثالیں پیش کیں جو اہلِ مکّہ کی نظر کے سامنے شب و روز آتی تھیں۔ باقی تو عموماً تذکرے تھے جو وہ سنتے تھے مگر ان قوموں کا انجام اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے تھے۔

زمانۂ نزول: اس سورت میں بھی کئی اشارات موجود ہیں کہ یہ مکہ کے آخری زمانہ کی نازل شدہ سورت ہے۔ بالخصوص مقتسمین کے ذکر میں ان کا قسمیں کھا کر آپ کے خلاف آخری تدابیر اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

۱۶۷۱ یہاں قرآن مبین کا عطف الکتاب پر ہے۔ الکتاب سے مراد بھی قرآن شریف ہی ہے مگر چونکہ یہ لفظ جنس کتاب پر بھی بولا گیا ہے اور اس کے لانے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح پہلے انبیاءؑ پر کتابیں نازل ہوتی رہیں اسی طرح یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وحی ہے اس لیے قرآن کا لفظ ساتھ لا کر بتا دیا کہ آیندہ یہی کتاب دنیا میں پڑھی جائے گی اور ساتھ اس کی صفت بھی بیان کر دی کہ یہ ان تمام باتوں کو کھول کر بیان کرنے والی ہے، جو پہلی کتابوں میں اجمال کے طور پر بیان ہوئی ہیں اور قرآن کی تنکیر بمقابلہ الکتاب کے یہاں اس کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔

۱۶۷۲ رُبما۔ ربّ کے معنی تربیت ہیں اور اسی سے اَرَبَّتِ السَّحَابُ کے معنی ہو گئے ہیں بادل ہمیشہ رہا گویا بلحاظ اس کی تربیت یعنی سبزیوں کو نشو و نما دینا رہنے کے اس میں اقامت کے معنی آگئے اس لیے ربّ میں استقلال کے معنی ہیں اور رُبَّ اور رُبَمَا اس چیز پر بولا جاتا ہے جو بار بار ہوتی رہے (غ)

کافروں کی مسلمان ہونے کی آرزو: کب ایسی آرزو کریں گے؟ قیامت کے دن تو ایسا کرنا ظاہر ہی ہے جب انکشاف حقیقت پورے طور پر ہو جائے گا اور ضحاک کا قول ہے کہ یہ موت کے وقت دنیا میں ہوگا۔ اور حضرت ابن مسعود کا قول ہے کہ یہ آیت کفار قریش کے بارہ میں ہے اور یہ ان کا آرزو کرنا بدر کے دن تھا، جب اہل اسلام کا غلبہ دیکھا (ر) ظاہر ہے کہ یہ پیشگوئی کا رنگ ہے اور رُبَمَا لا کر بتایا کہ یہ اکثر اوقات میں ہوگا پس یہ ان کی آرزو ہر غلبہ کے وقت میں ہوگی جو اسلام کو حاصل ہوگا۔ یہاں تک کہ اس کے کامل غلبہ کا وقت آجائے گا اور سیاق عبارت اسی کو چاہتا ہے کیونکہ ابھی پچھلی سورت کے آخری رکوع میں کفار کی مغلوبیت کا نقشہ کھینچا جا چکا ہے اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے کہ جب یہ اپنی مغلوبیت کے نظارہ کو دیکھیں گے تو پھر یہ بھی آرزو کریں گے کہ ہم مسلمان ہی ہوتے۔ یہی مضمون اگلی آیت کا بھی ہے جہاں صاف فرمایا کہ ایک غلط آرزو نے انہیں حق کی طرف سے غافل کر رکھا ہے اور اس سے بعد کی آیتیں جہاں ملائکہ کے آنے کا ذکر ہے

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝۳

انھیں چھوڑ دو کھائیں اور فائدہ اُٹھائیں اور آرزوئے (دنیا) انھیں غافل کیے رکھے عنقریب جان لیں گے۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝۴

اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا، مگر اس کے لیے ایک میعاد مقرر تھی۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝۵

کوئی جماعت اپنے وقت سے پہلے نہیں جا سکتی اور نہ وہ پیچھے رہ سکتے ہیں۔

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝۶

اور کہتے ہیں اے شخص جس پر نصیحت اتاری گئی ہے، یقیناً تو پاگل ہے۔

لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷

تو فرشتوں کو ہمارے پاس کیوں نہیں لے آتا، اگر تو سچوں میں سے ہے۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝۸

ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر جب حکمت چاہتی ہو اور اس وقت اُن کو مہلت بھی نہ دی جائے گی ۱۶۷۳ء

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹

ہم نے خود یہ نصیحت اتاری ہے اور ہم خود ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں ۱۶۷۴ء

جو جنگوں میں ہوا، سب اسی طرف اشارہ کر رہی ہیں کیونکہ اسلام میں اُن کو بُرائی تو کوئی نظر نہ آتی تھی، ہاں ان کے دلوں میں یہ تکبر بھرا ہوا تھا جس طرح آج مخالفین اسلام کے دلوں میں بھرا ہوا ہے کہ ہم اسلام کو تباہ کر کے رہیں گے سو ہر مغلوبیت کا نظارہ ان کے دلوں میں یہ آرزو پیدا کرنیوالا تھا کہ کاش ہم مسلمان ہی ہو گئے ہوتے یہاں تک کہ کامل غلبۂ اسلام کے وقت جو فتح مکّہ میں ہوا وہ آخر مسلمان ہو بھی گئے اس وقت بھی ان کو افسوس ہوتا ہی ہوگا کہ ہم نے کیوں خواہ مخواہ ایسی صداقت کی مخالفت کی اور اتنی مدّت تک اس سے اپنے آپ کو محروم رکھا۔

۱۶۷۳ء بالحق یا اقتضائے حکمت سے (دیکھو ع۶۵) فرشتوں کے اتارنے سے مراد یہ ہے کہ وہ تو تمہاری سزا کے لیے نازل ہونگے اس لیے آگے فرمایا کہ جب فرشتے آجائیں گے تو پھر سزا بھی ساتھ ہی آجائے گی۔ فرشتوں اور سزا کا آنا دو الگ الگ باتیں نہیں ان سب آیات میں ان کی مغلوبیت کی طرف اشارہ ہے۔ اور وہ جو مجنون کہتے ہیں (آیت ۶) تو مراد یہ ہے کہ یہ پاگلوں کی سی باتیں ہیں کہ ہم بھی کبھی مغلوب ہو جائیں گے۔

۱۶۷۴ء الذکر قرآن شریف کے ناموں میں سے ایک نام ہے دیکھو ع۱۹۱ و ع۱۴۵۱ اور یہاں یہی مراد ہے۔ جیسا کہ آیت ۶ میں نزّل علیہ الذّکر کہہ کر صاف کر دیا ہے اور خود سیاق عبارت بھی چاہتا ہے کہ یہاں ذکر حفاظت قرآن کا ہے اس لیے کہ کفار کو اپنے ظاہری غلبہ پر فخر تھا اور پچھلی سورت میں ان کی تدابیر کا ذکر ہو چکا کہ وہ حق کو کس طرح ملیامیٹ کرنا چاہتے ہیں تو اب صفائی سے بتا دیا کہ کفار کا کتنا بھی غلبہ ہو وہ اس حق کو جو قرآن شریف میں نازل ہوا اب دنیا سے مٹا نہیں سکتے۔ نہ صرف یہ کہ وہ مٹا نہیں سکتے بلکہ اس میں کسی قسم کی تحریف کمی بیشی بھی نہ ہوگی کیونکہ اس کی حفاظت کو ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ برخلاف دیگر کتب سماوی کے جن کی حفاظت ان کے پیروؤں کے سپرد کی گئی تھی جیسا کہ بما استحفظوا من کتاب اللہ (المائدہ ۵-۴۴) سے ظاہر ہے۔

حفاظت قرآن سے مراد یہ ہے کہ اس میں کوئی کمی بیشی تغیر تبدل نہ ہو۔ یہ ایک دعویٰ ہے جس کی صداقت آج دشمنوں تک کو مسلم ہے۔ میور کہتا ہے "جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو"۔ پھر وان ہیمر کا قول نقل کرتا ہے "ہم ایسے ہی یقین سے قرآن کو بعینہٖ محمد (صلعم) کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سمجھتے ہیں جیسے مسلمان اسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں"۔ اور واقعات خود بھی بتاتے ہیں اس لیے کہ وہ کتاب جس کے پہلے دن سے لکھے جا کر بکثرت نسخے ہر قوم اور ہر ملک میں شائع ہوئے اور آخر مشرق سے مغرب تک پھیل گئے ان ہزار در ہزار قدیم ترین نسخوں میں ایک بھی ایسا نسخہ نہیں ملتا جس میں ایک حرف کا یا ایک زیر و زبر کا فرق ہو۔ اہل تشیع میں سے محقق اس کی حفاظت کے ہی قائل ہیں اور اگر نہ ہوں تو اس الزام کے نیچے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنی خلافت میں قرآن کو کیوں مکمل نہ کیا۔ یہ ایک وسیع مضمون ہے جس پر پوری تحقیقات میں نے

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۰﴾

اور ہم تجھ سے پہلے اگلی اُمتوں میں رسول بھیج چکے ہیں ۔

وَ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور کوئی رسول اُن کے پاس نہیں آتا رہا مگر اس سے وہ ہنسی کرتے تھے ۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۲﴾

اسی طرح ہم اسے مجرموں کے دلوں میں داخل کرتے ہیں۔ ۱۶۷۵

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ قَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾

وہ اس پر ایمان نہیں لاتے اور پہلوں کا بھی یہی طریق رہا ۱۶۷۶

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں پھر وہ اس میں چڑھنے لگیں ۱۶۷۷

لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾ ع

تو کہیں گے ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے ، بلکہ ہم وہ لوگ ہیں جن پر جادو کر دیا گیا ہے ۱۶۷۸

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۶﴾

اور یقیناً ہم نے آسمان میں ستارے بنائے اور اسے دیکھنے والوں کے لیے سجایا۔

وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾

اور اُسے ہر شیطان مردود سے محفوظ کیا ۔

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ

ہاں جو چھُپ کر کچھ سُن لے تو اُسے روشن کرنے والا انگارا

اپنی کتاب جمع قرآن میں شائع کی ہے ۔ اور یہاں اس کو دوہرانے کی گنجائش نہیں ۔

۱۶۷۵ نسلك ۔ سُلُوك کے معنی ہیں النَّفَاذُ فی الطریق ایک رستہ پر چلنا ۔ فا سلکی سبل ربك (النحل ۱۶ - ۶۹) ۔ لتسلکوا منها سبلا فجاجا (نوح ۷۱ - ۲۰) اور دوسرے کو کسی رستہ پر چلانے پر بھی بولا جاتا ہے جیسے ما سلککم فی سقر (المدثر ۷۴ - ۴۲) اور جیسے یہاں (غ)

پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ وہ ہر رسول سے استہزا کرتے ہیں یہاں کذلك سے شروع کرکے بتایا کہ جس طرح وہ وحی الٰہی کے متعلق طریق استہزا اختیار کرتے ہیں اسی طرح ہم بھی ان کو اسی رستہ پر چلاتے ہیں کہ وہ ایمان نہیں لاتے ۔ گویا اللہ تعالیٰ کا انہیں ایک راہ پر چلانا ان کے اپنے فعل کا نتیجہ ہے اللہ تعالےٰ صرف انہی لوگوں کو ایمان نہ لانے کی راہ پر چلاتا ہے جو استہزا کرتے ہیں اس لیے کہ استہزا کرنے والا کبھی غور کرتا ہی نہیں اور بغیر غور کرنے کے انسان صحیح نتیجہ پر پہنچ نہیں سکتا ۔

۱۶۷۶ سنة الاوّلین سے مراد اللہ تعالیٰ کی سنت اولین میں ہے یعنی جن لوگوں نے استہزا کو اپنا طریق رکھا وہ ہمیشہ حق سے محروم ہی رہے ۔

۱۶۷۷ یعرجون میں عموماً مراد خود کفار کو لیا گیا ہے کہ وہ آسمان پر چڑھنے لگیں ۔ مگر قتادہؓ اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ مراد ملائکہ ہیں (د) اور سیاق عبارت بھی یہی چاہتا ہے کیونکہ فرشتوں کے متعلق ہی ان کا اقتراح تھا تو فرمایا کہ اگر آسمان کا دروازہ کھول دیں اور فرشتے نازل ہوں اور ان کو سزا دے کر پھر چڑھنے بھی لگیں تو پھر بھی یہ مانیں گے نہیں اور صورت اول میں آسمان پر چڑھنے سے مراد سچ مچ اوپر چڑھنا نہیں بلکہ استعارہ کے رنگ میں یہ مراد ہوگی کہ بعض سماوی باتیں ان کو سمجھ بھی آنے لگیں ۔ پھر بھی ان کو یہ کہہ کر رد کر دیں گے کہ ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے اور یہ ذکر شدید ترین مخالفوں کا ہے ۔

۱۶۷۸ سُكِّرَت ۔ سَكْر کے معنی حَبْس الماءِ یعنی پانی کا روک دینا بھی ہیں اور حالت سکر وہ حالت ہے جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان پردہ حائل کر دیتی ہے (غ)، اس لیے سُكِّرَ بَصَرُهٗ کے معنی ہیں اس پر پردہ ڈال دیا گیا اور یہاں یہ معنی بھی کیے گئے ہیں کہ انہیں دیکھنے سے روک دیا گیا (ل)

مسحور ۔ سِحْر کے لیے دیکھو ۱۲۹ مسحورون سے مراد ہے کہ ہمیں صحیح طور پر شناخت کرنے سے سحر کے ساتھ روک دیا گیا ہے (غ)

اس آیت میں اور اس سے پہلی آیت میں بتایا ہے کہ جب انسان لہو و لعب دنیا کو اور اس حیوانی زندگی کو ہی اپنا مقصد بنا لیتا ہے تو کتنے کھلے نشان اس کے سامنے ظاہر ہوں پروا نہیں کرتا ۔

شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ۞۱۸ آلیتا ہے ع۱۶۷۹

ع۱۶۷۹ بروج ۔ بُرج کی جمع ہے اور مراد ستارے ہیں دیکھو ع۶۹۶ قرآن کریم نے خود اس معنی کو واضح کر دیا ہے جب دوسری جگہ بجائے بروج کے لفظ کواکب اختیار فرمایا اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنيا بِزِينَةِ ن الكواكب وحفظاً من كلّ شيطان مّارد (الصّٰفّٰت ۳۷ ۔ ۶ و ۷) تیسری جگہ انہی کواکب کو مصابیح کہا ہے ولقد زينا السماء الدنيا بمصابيح وجعلنٰها رجوماً للشياطين (الملك ۶۷ ۔ ۵)

رجیم دیکھو ع۱۴ لسان العرب میں رَجْم کے معنی حسب ذیل دیئے ہیں ۔ قتل ۔ پتھر مارنا ۔ طَرد یعنی دور کرنا ۔ ظن ۔ سب و شتم اور رجیم کے یہ معنی لینا کہ اسے سچ مچ پتھر مارے جاتے ہیں یا شہاب اس پر پھینکے جاتے ہیں اس لیے اسے رجیم کہا جاتا ہے درست نہیں ۔ بلکہ رجیم بمعنی ملعون ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کیا گیا ہے اور یہ معنی لسان العرب میں قبول کیے ہیں اور قرآن کریم نے خود اسے صاف کیا ہے جہاں آیت ۳۴ میں شیطان کو بوجہ ایک اچھی حالت سے دور کیا جانے کے رجیم کہا ہے نہ اس لیے کہ اسے کسی نے پتھر مارے تھے اور یہ بھی قبول کیا ہے کہ رجوماً للشياطين (الملك ۶۷ ۔ ۵) میں (اور ایسا ہی یہاں) شیاطین سے مراد انسان شیطان ہیں یعنی کاہن وغیرہ جو اٹکل پچو باتیں اخبار غیبی کے متعلق کرتے رہتے ہیں ۔ اور یہ معنی ابن اثیر سے لیے ہیں ۔

استرق ۔ سَرِقَة کسی چیز کا چھپکر لینا ہے جو لینے والے کی نہیں اور اِسْتَرَقَ السَّمْعَ چھپ کر بات سننے کو کہتے ہیں (غ)

شہاب روشن شعلہ کو کہتے ہیں جو جلتی ہوئی آگ سے لے لیا جائے یا جو فضا میں نظر آتا ہے (غ) اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ (طٰه ۲۰ ۔ ۱۰)

شیاطین کا ملائکہ کی باتوں کو سننا : آیت ۱۶ میں یہ بیان فرمایا کہ آسمان میں بروج بنائے اور آیت ۱۷ میں یہ کہ ان ستاروں کو ہر شیطان مردود سے محفوظ رکھا ہے بعینہٖ یہی مضمون سورۂ الصّٰفّٰت میں ہے جہاں بروج کی بجائے کواکب کا لفظ رکھ کر بتا دیا کہ بروج سے مراد کواکب یا ستارے ہی ہیں ۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آسمان یا ستاروں کو شیاطین سے حفاظت میں رکھنے سے کیا مراد ہے اور دوسرا یہ کہ استراق سمع کیا ہے یا چھپکر کس چیز کو شیاطین سنتے ہیں اور تیسرا یہ کہ شہاب ثاقب کے پیچھے آنے سے کیا مراد ہے ۔ وہ بات جسے مفسرین نے عام طور پر قبول کیا ہے اس کی بنیاد بخاری کی ذیل کی حدیث پر ہے جو اسی آیت کی تفسیر میں ہے ملخصاً اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے (اور اس حدیث کی دوسری روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ وحی بھیجنے کے لیے کلام کرتا ہے) تو فرشتے اظہار عاجزی کرتے ہیں اور ایسی آواز سنتے ہیں جیسے پتھر پر زنجیر مارنے کی آواز ہوتی ہے جب ان کا ڈر جاتا رہتا ہے تو دوسرے فرشتے ان سے دریافت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا تو وہ کہتے ہیں حق فرمایا اور وہ علی و کبیر ہے تو چھپ کر سننے والے بھی اس میں سے کچھ سُن لیتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے اوپر تہ بتہ ہوتے ہیں پھر شہاب یعنی انگارا کبھی تو اس سننے والے کو ہلاک کر دیتا ہے اور کبھی وہ انگارے سے ہلاک ہونے سے پیشتر اپنی بات دوسرے کو پہنچا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین تک اس بات کو پہنچا دیتے ہیں اور وہ ساحر (یا کاہن) کے منہ میں ڈالی جاتی ہے جو اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا کر اسے بیان کرتا ہے اور جب وہ ایک بات سچی نکل آتی ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو اس نے سچ بولا تھا ۔ اور طبرانی کی روایت میں یوں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ وحی بھیجنے کے لیے کلام کرتا ہے تو آسمان کانپ اٹھتا ہے اور آسمان والے کلام سنتے ہی بیہوش ہو جاتے ہیں اور سجدہ میں گر پڑتے ہیں ۔ سب سے پہلے جبرئیلؑ سر اُٹھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے ان سے فرماتا ہے تب فرشتے ان سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا تو وہ فرماتے ہیں الحق وهو العلی الكبير ان احادیث سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ جب جبرائیلؑ سے یا ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا تو جواب صرف اسی قدر ہوتا ہے الحق وهو العلی الكبير اور دوسری طرف یہ کہ شیاطین اس کلام کو سُن لیتے ہیں حالانکہ خود قرآن کریم صراحت سے اس عظیم الشان وحی کے متعلق جو قرآن کریم میں ہے فرماتا ہے کہ شیاطین اسے قطعاً نہیں سُن سکتے وما تنزّلت به الشياطين وما ينبغي لهم وما يستطيعون انهم عن السمع لمعزولون (الشعراء ۲۶ ۔ ۲۱۰ تا ۲۱۲) جہاں آخری الفاظ میں فرمایا کہ وہ سننے سے الگ کیے گئے ہیں اور انہیں اس بات کی طاقت ہی نہیں ۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ قرآنی وحی کے متعلق نہیں بلکہ دوسرے امور کے متعلق ہے تو اس کی بھی قرآن کریم تردید فرماتا ہے ام لهم سلّم يستمعون فيه فليأت مستمعهم بسلطان مبين (الطور ۵۲ ۔ ۳۸) یعنی ان کے قبضہ میں کوئی ایسے ذرائع ہیں جن سے وہ غیب کی باتیں سن لیتے ہیں تو ان کے سننے والے کوئی کھلی کھلی دلیل لائیں جس سے معلوم ہوا کہ کوئی ذریعہ اخبار غیبی کے اس طرح پر سننے کا نہیں ہے اس لیے قرآن کریم کی صراحت کے مقابل پر حدیث کو قبول نہیں کیا جا سکتا ۔ اور مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ پہلے شیاطین کو آسمانوں میں جانے کی کوئی رکاوٹ نہ تھی جب حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تو انہیں تین آسمانوں سے روک دیا گیا اور پھر آنحضرت صلعم کی ولادت پر سارے آسمانوں سے روک دیا گیا اور یہ بات حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے مگر اس کی سند قرآن و حدیث میں قطعاً کوئی نہیں ۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس قسم کی ساری آیات میں شیاطین سے مراد کاہن اور منجم ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ نجوم یعنی ستاروں سے کچھ علم حاصل کر کے آیندہ کی خبریں بتا سکتے ہیں ۔ چنانچہ رجوماً للشياطين میں ابن اثیر نے بھی اسی معنی کو قبول کیا ہے کہ رجوماً سے مراد ظنون اور شیاطین سے مراد منجم اور کاہن ہیں جیسا کہ لسان العرب کے حوالہ سے اوپر دکھایا جا چکا ہے اور خود الفاظ قرآنی پر غور کیا جائے تو یہی حق ثابت ہوتا ہے اس لیے کہ وہاں یعنی سورۂ ملک میں مصابیح یعنی ستاروں کو رجوماً للشياطين کہا ہے پس اگر مطلب یہ ہوتا کہ ان ستاروں کو شیاطین پر پھینکا جاتا ہے تو آج تک یہ آسمان کے ستارے ختم ہو گئے ہوتے یا ان میں معتد بہ کمی نظر آتی اور واقعات بھی اس کو غلط ٹھہراتے ہیں یہاں تک کہ مفسرین کو خود یہ کہنا پڑا ہے کہ مراد خود ستاروں کا پھینکنا نہیں بلکہ ستاروں میں سے شعلہ لیکر پھینکنا ہے ۔ اس تاویل بعید کی نسبت یہ سیدھی تاویل کیوں قبول نہ کی جائے کہ رجوماً للشياطين سے مراد منجموں کے ظنون فاسدہ لیے جائیں جیسا کہ رجماً بالغيب (الكهف ۱۸ ۔ ۲۲) میں رجم کا لفظ اور واذا خلوا الى شياطينهم (البقرة ۲ ۔ ۱۴) میں شیاطین

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ⁽¹⁹⁾ اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور ہم نے اس میں پہاڑ بنائے اور اس میں ہم نے ہر ایک چیز اندازہ کی ہوئی اگائی۔

کا لفظ انہی معنوں میں آئے ہیں۔ تو گویا ایک طرف یہ فرما کر کہ ہم نے ستاروں کو شیاطین سے محفوظ کیا ہے یہ بتایا کہ فی الواقع ان منجموں اور کاہنوں کو علم غیب میں کچھ دسترس نہیں جیسا کہ ام لهم سلم یستمعون فیه (الطور ۵۲-۳۸) سے اور ام عندهم الغیب فهم یکتبون (الطور ۵۲-۴۱) سے بھی ظاہر ہے اور دوسری طرف رجوماً للشیاطین کہہ کر یہ بتایا کہ یہ محض ظنون اور اٹکلیں ہیں جو وہ دوڑاتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ستاروں سے یہ علم حاصل کرتے ہیں حالانکہ یہ علم کوئی نہیں اور نہ ستاروں تک وہ پہنچ سکتے ہیں بلکہ محض اٹکل پچو باتیں ہیں ÷

دوسرا سوال یہ ہے کہ استراق سمع سے کیا مراد ہے۔ اور تیسرا یہ کہ شہاب کے پیچھے آنے سے کیا مراد ہے یہ دونوں سوال باہم ملے ہوئے ہیں۔ اگر استراق سمع سے یہ مراد لی جائے کہ واقعی شیاطین جن کچھ اللہ تعالیٰ کے رازوں کو بھی چھپ کر سن لیتے ہیں تو اللہ کی قدرت کاملہ پر اعتراض ہوتا ہے کہ شیاطین بھی چھپ کر اس کے بھیدوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ گویا وہ اپنے بھیدوں کی اس قدر بھی حفاظت نہیں کر سکتا جس قدر ایک انسان کر سکتا ہے۔ دنیا کی حکومتیں تک تو اپنے اسرار پر دوسروں کو آگاہ نہیں ہونے دیتیں تو کیا اللہ تعالیٰ میں اتنی قدرت بھی نہیں۔ پھر خدا کے خبر دینے میں اور شیاطین کے اس طرح خبر حاصل کر لینے میں بھی مابہ الامتیاز اُٹھ جاتا ہے کیونکہ یہ تو پھر محض شیاطین کا اختیار رہا کہ ایک سچی بات کے ساتھ سو جھوٹی باتیں نہ ملائیں۔ علاوہ ازیں باوجود شہاب ثاقب کے پیچھے آنے کے بھی وہ خبر کے پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں گویا اول تو اللہ تعالیٰ اپنے رازوں کو شیطانوں سے نہیں بچا سکتا۔ پھر جب پتہ لگ بھی جاتا ہے اور راز کو بچانے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ کوشش بھی ناکام ہوتی ہے ان باتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا اس کی صفات کاملہ میں نقص قبول کرنا ہے۔ اور یہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور راستبازوں کو بھی ان کے دشمنوں کے ہاتھ سے دکھ پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ عین اس کی صفات کا تقاضا ہے کہ بشر رسول سارے ان حالات کے ماتحت ہو جو دوسرے انسانوں کو پیش آتے ہیں۔ اور اس کی قدرت کاملہ کا اظہار یہی ہے کہ باوجود دشمنوں کے ہاتھ میں پڑ جانے کے بھی وہ آخر کار اس کو بچا لیتا ہے مگر وہ راز جن کا علم اللہ تعالیٰ سوائے اپنے رسولوں یا برگزیدوں کے دوسروں کو نہیں دینا چاہتا شیاطین بھی اس علم کو حاصل کر لیں تو یہ اس کی صفات کاملہ میں نقص ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی درست نہیں کہ یہ سلسلہ شہاب کا حضرت عیسیٰؑ کے وقت سے شروع ہوا جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے۔ کہ اس سے پہلے شیاطین ان رازوں سے اچھی طرح واقف ہو جایا کرتے تھے اور کوئی روک نہ تھی حضرت عیسیٰؑ کے وقت میں تین آسمانوں سے اور آنحضرت صلعم کے وقت میں سب آسمانوں سے انہیں روک دیا گیا کیونکہ شہب کا سلسلہ اس وقت سے ہے جب سے دنیا ہے۔ اور یہ بے معنی بات ہے کہ پہلے یہ سلسلہ شہب یوں ہی تھا حضرت عیسیٰؑ کے وقت سے شیاطین کی سزا کے لیے ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کے قانون اس طرح تبدیل نہیں ہو جاتے سلسلہ شہب جس غرض کے لیے ہے وہ ہمیشہ سے ایک ہی ہونی چاہیئے۔ اور اس بحث میں عجیب تر وہ آیت قرآنی ہے جس میں فرمایا وانا کنا نقعد منها مقاعد للسمع فمن یستمع الاٰن یجد له شهابا رصدا (الجن ۷۲-۹) جس سے معلوم ہوا کہ پہلے وہ گھات میں بیٹھ کر باتیں سن لیا کرتے تھے صرف رسول اللہ صلعم کے ظہور پر شہاب کا آنا شروع ہوا (یہ جن بھی انسان ہی ہیں جیسا کہ اپنے موقعہ پر دکھایا جائے گا) اس مشکل کو قرآن شریف دو لفظوں میں حل کر دیتا ہے جہاں یلقون السمع (الشعراء ۲۶-۲۲۳) میں القائے سمع شیاطین کی طرف ہے۔ یعنی یہ منجم یا کاہن شیاطین سے کچھ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جس طرح القائے سمع سے مراد فرشتوں کی باتیں سننا نہیں اسی طرح استراق سمع سے مراد چھپ کر فرشتوں کی باتیں سننا نہیں اور جسے ایک جگہ استراق سمع کہا ہے اسے دوسری جگہ یوں ادا کیا ہے الا من خطف الخطفة (الصّٰفّٰت ۳۷-۱۰) اور یہ ایک دفعہ اچک لے جانا درحقیقت ایک آدھ بات میں کامیاب ہو جانا ہے۔ جب انسان اٹکل پچو باتیں کرتا ہے اور قیاس سے کام لے کر کچھ آئندہ کی خبریں دیتا ہے تو بیس باتوں میں سے دو چار سچی بھی نکل آتی ہیں۔ چونکہ جس طرح رسول کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے کاہنوں اور منجموں کا تعلق شیاطین سے ہوتا ہے اور یہ کاہن اور منجم ان باتوں کو مخفی طور پر حاصل کرنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اس لیے ان باتوں کو القائے سمع اور استراق سمع فرمایا ٭

شہاب کا شیطان کے پیچھے آنا: اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ شهاب مبین یا شهاب ثاقب (الصّٰفّٰت ۳۷-۱۰) سے کیا مراد ہے۔ شہاب کا لفظ بروئے لغت ہر شعلہ پر بھی صادق آتا ہے اور اس شعلہ پر بھی جو فضائے آسمان میں بعض وقت دکھائی دیتا ہے۔ شہاب کا گرنا یا جس کو ہم ستارے کا ٹوٹنا کہتے ہیں اصل میں کیا چیز ہے۔ وہ بعض پتھر ہیں جو فضائے آسمان میں چکر لگاتے ہیں جس طرح بڑے بڑے سیارے چکر لگاتے ہیں جب ان میں سے کوئی ہمارے کرہ ہوائیہ میں داخل ہوتا ہے تو ہوا کی رگڑ سے بوجہ اپنی تیزی حرکت کے جل اُٹھتا ہے اور شعلہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے پھر بعض وقت اس کا کچھ حصہ زمین پر بھی گر پڑتا ہے اگر ان پتھروں سے اللہ تعالیٰ کوئی اور کام بھی لیتا ہے تو اس کے رازہائے سربستہ سے کون آگاہ ہو سکتا ہے اگر شیاطین کی ہلاکت بھی ان کی ایک غرض ہو تو یہ کوئی بعید بات نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کے ظہور پر یہ شہب کثرت سے گرے اور ایسا ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں، شاید اسی سے مفسرین نے یہ استدلال کیا ہو کہ حضرت عیسیٰؑ کے وقت میں شیاطین تین آسمانوں سے اور آنحضرت صلعم کے وقت میں سارے آسمانوں سے روک دیئے گئے (یہ بھی ایک لطیفہ ہے کہ جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کے جسم کے ساتھ آسمان پر چڑھ جانے کے قائل ہیں وہ انہیں چوتھے آسمان پر جگہ دیتے ہیں اور یہ آسمان بموجب اس خیال کے ابھی ایسا تھا جہاں شیاطین کا دخل تھا) سوال صرف یہ ہے کہ آیا یہاں شہاب سے مراد یہی ظاہری شہاب ہے اس پر آیت وانا کنا نقعد منها مقاعد للسمع فمن یستمع الاٰن یجد له شهابا رصدا (الجن ۷۲-۹) سے کھلی روشنی پڑتی ہے۔ یہ

وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور تمہارے لیے اس میں روزی کا سامان بنایا اور اس کے لیے (بھی) جسے تم رزق نہیں دیتے ۱۶۸۰ع

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ٘ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

اور کوئی چیز نہیں مگر اس کے خزانے ہمارے ہی پاس ہیں اور ہم اسے ایک مناسب اندازے سے اتارتے رہتے ہیں ۱۶۸۱ع

وَ اَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

اور ہم (پانی سے) بھری ہوئی ہواؤں کو بھیجتے ہیں۔ تب ہم بادل سے پانی اتارتے ہیں، پھر ہم وہ تمھیں پلاتے ہیں اور تم اس کا خزانہ نہیں رکھنے ۱۶۸۲ع

وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور یقیناً ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں ۱۶۸۳ع

شہاب ظاہری پہلے بھی تھے مگر آیت کہتی ہے کہ پہلے ایسے نجومی آزادی سے اپنا کام کرتے تھے اب ان سے کچھ اور سلوک ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں شہاب سے مراد یہ شہاب ظاہری نہیں۔ بلکہ اس شہاب سے استعارۃً کوئی ایسی روشنی مراد ہے جو ان کاہنوں کے استراق سمع کے اثر کو زائل کر دیتی ہے یعنی کچھ ان کی اٹکل پچو باتیں جو سچی نکل آتی ہیں تو اس سے لوگوں پر ایک اثر ہوتا ہے پہلے اس اثر کو دور کرنے والی کوئی چیز نہ تھی اور اس لیے لوگ کہانت اور نجوم کے اثر کے قائل تھے لیکن اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسی روشنی آگئی ہے جو اس کے اثر کو دور کر دیتی ہے۔ یہ شہاب پیغمبر کے آنے سے خاص ہے۔ شہاب ظاہری پیغمبر کے آنے سے خاص نہیں۔ پس اس شہاب سے مراد پیغمبر کی وہ کھلی پیشگوئیاں ہیں جو نجومیوں کی دھندلی پیشگوئیوں کے اثر کو باطل کر دیتی ہیں۔ یہی چیز ہے جو پیغمبر سے خاص ہے سوائے اس کے اس آیت کے کوئی معنے نہیں ہو سکتے اور شہاب کے لفظ کا یہ استعمال کچھ بھی بعید نہیں جب خود رسول اللہ صلعم کو بھی النجم الثاقب فرما دیا ہے بلکہ والنّجم اذا ھوٰی (النجم ۵۳-۱) اور فلا اقسم بمواقع النّجوم (الواقعۃ ۵۶-۷۵) میں خود مفسرین کو یہ امر مسلم ہے کہ نجم سے مراد قرآن کریم کا ایک ٹکڑہ ہے پس یہی مراد شہاب سے بھی لی جائے گی جب ظاہری معنی کو واقعات غلط ٹھہراتے ہیں۔

سیاق مضمون خود اسی معنی کو چاہتا ہے اس لیے کہ پچھلے رکوع میں حفاظت قرآن شریف کا ذکر تھا اور چونکہ اس کے اعدا میں اگر ایک طرف سیاسی طاقت تھی تو دوسری طرف نجومیوں اور کاہنوں کی طاقت تھی جو لوگوں کو اپنے اثر باطل سے مرعوب کر رہے تھے۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ بتایا جاتا کہ ان کا اثر بھی دور کیا جائیگا۔ چنانچہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ نجوم اور کہانت جو ملک عرب میں بت پرستی کی طرح مروج تھے نبی کریم صلعم کے ظہور سے بالکل نابود ہو گئے اور وہ سرزمین اس نجاست سے بھی پاک ہو گئی۔

۱۶۸۰ع من لستم له برازقین سے مراد مجاہد کے نزدیک چار پائے وغیرہ ہیں۔ مطلب یہ کہ انسانوں کے لیے بھی اس میں سامان بنایا اور دوسری مخلوق کے لیے بھی جو گو تمہارے ماتحت ہے مگر رزق اسے تم نہیں دیتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے۔

۱۶۸۱ع اس سے معلوم ہوا کہ تمام وہ چیزیں جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے ان کے اصل خزانے اللہ کے پاس ہیں۔ یعنی ان کا وجود میں لانا اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ ایک معین اندازہ سے یعنی اپنے قانون کے مطابق وہ چیزیں انسانوں کو پہنچاتا ہے۔ انزال اور تنزیل کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ ایک چیز کے اسباب مہیا کر دیئے جائیں یا اس کی طرف ہدایت کر دی جائے (غ) گو وہ چیز زمین پر ہی موجود ہو۔

۱۶۸۲ع لواقح۔ لِقَاح ماء الفحل کو کہتے ہیں اور لَقِحَت اصل میں اونٹنی کے حاملہ ہونے پر استعمال ہوتا ہے پھر عورت کے اور لواقح لاقح کی جمع ہے اور مراد اس سے حمل والی ہیں بلحاظ اس پانی کے جسے وہ اُٹھائے ہوئے ہوتی ہیں، کیونکہ اس پانی سے زندگی ملتی ہے اور اس کے مقابل پر الریح العقیم (الذٰریٰت ۵۱-۴۱) یا بانجھ ہوا وہ ہے جس میں پانی نہیں یا جس سے فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ وہ عذاب کے رنگ میں ہے (ل)

خازنین۔ خَزَن کے معنی ہیں ذخیرہ کے طور پر کسی چیز کی حفاظت کرنا، پھر عام طور پر حفاظت کرنا اس کے معنی ہو گئے ہیں اور اس سے پچھلی آیت میں جو عندنا خزآئنه آیا ہے تو وہاں خزائن کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ وہ اپنی قدرت سے جس چیز کو چاہتا ہے وجود میں لاتا ہے اور لا اقول لکم عندی خزائن اللہ (الانعام-۵۰) میں خزائن سے مراد اس کی مقدورات ہیں یا اس کی جود اور اس کی قدرت اور یہاں خازن کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں یعنی شکر کے ساتھ اس کی حفاظت کرنے والے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اسے بادلوں میں محفوظ کرتا ہے جیسا دوسری جگہ ہے افرءیتم المآء الذی تشربون ءانتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون (الواقعۃ ۵۶-۶۸ و ۶۹) (غ)

۱۶۸۳ع جس طرح پانی والی ہوائیں زندگی بخشتی ہیں اسی طرح وحی الٰہی بھی مردہ زمین کو زندہ کر دے گی اور جس طرح شہاب کی روشنی تاریکی کو دور کر دیتی

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ
وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿٢٤﴾

اور ہم تم میں سے آگے بڑھنے والوں کو خوب جانتے ہیں اور ہم پیچھے رہنے والوں کو بھی جانتے ہیں ١٦٨٤

وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ
حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٥﴾ ع

اور تیرا رب انھیں اکٹھا کرے گا ، وہ حکمت والا علم والا ہے ۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ
مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٢٦﴾ ج

اور ہم نے اِنسان کو سُوکھی ہوئی مٹی سے سیاہ کیچڑ سے جو متغیر ہو چکا ہو پیدا کیا ١٦٨٥

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ

اور جِنّوں کو ہم نے (اس سے) پہلے تیز آگ سے

ہے اسی طرح کہانت اور نجوم کی تاریکی قرآن شریف سے دور ہو جائے گی۔ اسی احیا اور اسی امانت کی طرف یہاں اشارہ ہے۔

١٦٨٤ المستقدمین ـ المستاخرین سے پہلے گزرے ہوئے لوگ اور پیچھے آنے والے لوگ بھی مراد لیے گئے ہیں اور نیکی میں قدم آگے رکھنے والے یا معصیت کر کے پیچھے رہنے والے بھی (ج) اور سیاق عبارت پچھلے معنی کو صحیح ٹھہراتا ہے کیونکہ یہاں ذکر انہی لوگوں کا ہے جو خدا کی وحی سے زندگی حاصل کر کے قدم آگے رکھتے ہیں یا ظلمتوں اور تاریکیوں کی موت میں رہ کر زندگی کی اصل غرض کے حاصل کرنے میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

١٦٨٥ صلصال ـ اصل میں آواز کے تردد کو کہتے ہیں جو خشک چیز سے پیدا ہو یعنی کھنکھنانا اور سوکھی ہوئی مٹی کو صلصال کہا جاتا ہے اور سڑی ہوئی مٹی کو بھی صلصال کہتے ہیں کیونکہ صَلَّ اللَّحْم کے معنی ہیں گوشت سڑ گیا یعنی بدبودار ہو گیا (غ) اور مجاہد کہتے ہیں کہ صلصال سے مراد حمإ مسنون ہے یعنی سڑی ہوئی مٹی (ل)، مگر قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے صلصالٍ کالفخّار (الرحمٰن ٥٥: ١٤) اس لیے پہلے معنی ہی درست ہیں کیونکہ فخار اُسے کہتے ہیں جو آگ میں پکائی گئی ہو۔

حمإ ـ حَمْأَة اور حمأ سیاہ سڑی ہوئی مٹی کو کہا جاتا ہے۔ جیسے کنوئیں کا سیاہ کیچڑ اور عین حمئة (الکھف ١٨: ٨٦) سے مراد ذاتِ حَمأ یعنی سیاہ کیچڑ والا ہے اور حَمَأ حَمْأَة کی جمع بھی ہے (غ)

مسنون ـ سِنّ دانت کو کہتے ہیں السن بالسن (المائدۃ ٥: ٤٥) اور سَنّ کے معنی صاف کیا اور صیقل کیا اور اسی سے سُنّة مُنہ کو اس کی صفائی کی وجہ سے کہا جاتا ہے اور سَنّ کے معنی ایک چیز کو شکل و صورت دینا ہیں اور مَسْنُون کے معنی مُصَوَّر یعنی تصویر بنایا گیا ہیں اور یہاں مَسْنُوْن کے معنی مُصَوَّر۔ صورت دیا گیا۔ اور مُنْتِن بدبودار اور مُتَغَیِّر تبدیل شدہ کیے گئے ہیں (ل) اور مفردات میں صرف متغیر اس کے معنی دیئے ہیں اور لسان العرب میں اخفش کا قول منقول ہے کہ یہ تغیر اس وقت واقع ہوتا ہے جب پانی جاری نہ ہو یعنی چلتے پانی میں تغیر واقع نہیں ہوتا ٹھہرے ہوئے پانی میں ہوتا ہے۔

ابتدائے پیدائش: اس رکوع میں اصل مضمون تو شیطان کی انسان سے دشمنی ہے جو اسے ایک غلط راہ کی طرف لے جاتا ہے اور اس کے اعلٰے قویٰ کی تکمیل میں روک ہوتا ہے اور اسے حصول مقصد زندگی میں ناکام رکھتا ہے مگر ابتدا ہر دو کی پیدائش سے کی ہے۔ اور سب سے پہلے انسان کے اصل کی طرف توجہ دلائی ہے یا زندگی کی ابتدا کی طرف۔ کوئی سے بھی مدارج ہوں جن میں سے ہو کر انسان بنا اور کتنی بھی مدت اس کے بننے میں یا بننے پر گزر گئی ہو زندگی کی ابتدا کا جو کچھ پتہ آج سائنس سے ملتا ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر یہاں دو تین لفظوں میں قرآن شریف نے کر دیا ہے یعنی سب سے پہلی حالت زمین کی جو انسانی زندگی کی معاون ہوئی وہ صلصال تھی یا سوکھی ہوئی مٹی اور دوسری جگہ اسے صلصال کالفخار (الرحمٰن ٥٥: ١٤) کہہ کر بتا دیا کہ گویا وہ آگ سے پک کر نکلی ہے اس میں یہ توجہ دلانا مقصود ہے کہ زمین کی موجودہ سطح گویا آگ سے پک کر تیار ہوئی ہے اور اسی کی شہادت آج سائنس سے ملتی ہے کہ ابتدا میں یہ زمین ایک آگ کا ٹکڑا تھا۔ تدریجاً ٹھنڈا ہوتے ہوتے اس کی اوپر کی سطح سخت ہو گئی۔ قرآن کریم نے اسے صلصالٍ کالفخار کہہ کر اس کی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے اور اگلی آیت میں اس کی ناری حالت کا ذکر بھی ان الفاظ میں کیا ہے کہ جنوں کو اس سے پہلے نار سے پیدا کیا گویا اس سے پہلے پہلی حالت زمین کی نار کی تھی اور ناری صفت کے مطابق جو ہستیاں پیدا ہوئیں وہ جن ہیں اور یہاں من صلصال کہہ کر پھر جو فرمایا من حمإ مسنون۔ تو بتایا کہ صلصال کی حالت سے تبدیل ہو کر پھر حماء کی حالت ہوئی یعنی اس مٹی کے ساتھ پانی ملا ـ اور پھر اس میں تغیر آیا اور ابن عباس سے حمإ مسنون کے معنی طین رطب یعنی گیلی مٹی مروی ہیں (ج) اور ابتدائے زندگی کی تاریخ پر جو روشنی سائنس نے ڈالی ہے وہ یہی ہے کہ زندگی کی ابتدا ایسی مٹی سے ہوتی ہے جس میں پانی مل کر اس میں ایک تغیر واقع ہو جائے۔ ایک اُمّی کے مُنہ سے آج سے تیرہ سو سال پیشتر یہ الفاظ کہلوا کر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس علم کامل کا ثبوت دیا ہے جس کے مقابل پر انسانی علوم ہیچ ہیں۔ اور صلصال میں چونکہ آواز کا خیال پایا جاتا ہے اور مسنون میں شکل و صورت دینے کا اس لیے ان الفاظ کے اختیار کرنے میں ساتھ ہی انسان کی ان دو صفات کی طرف بھی اشارہ ہے جو اسے دوسرے حیوانات سے متمیز کرتی ہیں یعنی ایک گویائی اور دوسرے خاص قسم کی شکل و صورت۔

نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ — پیدا کیا [ع۱۶۸۶]

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں انسان کو سوکھی ہوئی مٹی سیاہ کیچڑ سے جو متغیر ہو چکا ہو پیدا کرنے والا ہوں۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

سو جب میں اسے تکمیل کو پہنچاؤں اور اپنی روح اس میں پھونکوں تو تم اس کے لیے فرمانبرداری کرتے ہوئے گر پڑنا [ع۱۶۸۷]

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾

پس کل فرشتوں سب کے سب نے فرمانبرداری کی،

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾

مگر ابلیس (نے نہ کی) اس نے انکار کیا کہ فرمانبرداری کرنے والوں کے ساتھ ہو

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾

فرمایا اے ابلیس کیا وجہ ہے کہ تو فرماں برداری کرنیوالوں کے ساتھ نہیں ہوتا؟

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

اس نے کہا مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں ایک انسان کی فرمانبرداری کروں جسے تو نے سوکھی ہوئی مٹی سے متغیر شدہ کیچڑ سے پیدا کیا ہے۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾

کہا، تو اس (حالت) سے نکل جا کیونکہ تو دور کیا گیا ہے۔

وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾

اور تجھ پر قیامت کے دن تک لعنت ہے۔

ع۱۶۸۶ جان۔ جنّ کے لیے دیکھو ع۱۰۱۵ اور جانّ کو بعض نے جنّوں کا باپ کہا ہے جیسے آدم انسانوں کا باپ ہے اور بعض کے نزدیک جانّ جنّ ہی ہیں اور یہ اسم جمع ہے اور بعض نے جان کو جنوں کی ایک نوع قرار دیا ہے لم یطمثهنّ انس قبلهم ولا جانّ (الرحمٰن ۵۵-۵۶) اور جانّ سانپ کی بھی ایک قسم ہے جو پتلا ہلکا سا ہوتا ہے۔ کانّها جانّ (النمل ۲۷-۱۰؛ القصص ۲۸-۳۱) اور جان شیطان کو بھی کہتے ہیں (ل)

سموم۔ سَمّ اور سُمّ ہر ایک تنگ سوراخ کو کہتے ہیں جیسے سوئی کا ناکہ حتّٰی یلج الجمل فی سمّ الخیاط (الاعراف ۷-۴۰) اور اسی سے سَمّ کے معنی داخل ہونا آتے ہیں۔ اور سَمّ زہر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی باریک تاثیر سے جسم میں داخل ہو جاتی ہے اور سَمُوم گرم ہوا کو کہتے ہیں کہ وہ بھی زہر کی طرح جسم پر اثر کرتی ہے فی سموم وحمیم (الواقعة ۵۶-۴۲) و وقٰنا عذاب السّموم (الطور ۵۲-۲۷) (غ) اور سموم کے معنی ایسی گرم ہوا بھی کیے گئے ہیں جو قتل کر دے اور بعض نے اس کے معنی آگ کا شعلہ کیے ہیں اور یا اس کے معنی سخت تیز آگ کے ہیں (ج)

اس میں زمین کی ابتدائی حالت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے یعنی نسل انسانی کی آبادی کے قابل ہونے سے پہلے اس میں ایسی مخلوق تھی جو آگ سے پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ کوئی بعید بات نہیں کہ جس قسم کے حالات ہوں اسی قسم کی مخلوق ہو۔ انسان کا خود خاص حالات میں پیدا ہونا بتاتا ہے کہ مختلف حالات کے لحاظ سے مختلف قسم کی مخلوق ہو سکتی ہے۔ محض یہ بات کہ ہمیں وہ ناری ہستیاں نظر نہیں آتیں ان کے وجود کے خلاف کوئی دلیل نہیں۔

ع۱۶۸۷ سویت۔ سَوَّيْتُهٗ فاستوی اور اِسْتَوٰی کے معنی ہیں ایک چیز اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ پس سَوّٰی کے معنی ہیں اس کو کمال کو پہنچایا۔ ثمّ سوّٰك رجلا (الكهف ۱۸-۳۷) الّذی خلق فسوّٰی (الاعلیٰ ۸۷-۲) اور یہاں مراد جسمانی تسویہ ہے نیز دیکھو ع۴۴

روحی۔ ابن الانباری کا قول ہے کہ روح اور نفس ایک ہی ہیں سوائے اس کے کہ روح مذکّر ہے اور نفس مؤنث (ت) اور نفس کے لیے دیکھو ع۵۹۸ جہاں ایک معنی قوت ممیزہ بھی اس کے دیئے گئے ہیں اور روح کے معنی جان بھی آتے ہیں اور نفس بھی (یعنی نفس ناطقہ) اور وحی اور قرآن وغیرہ (ل)۔

اللہ کی روح کا انسان میں نفخ: روحی کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف بر سبیل تشریف ہے جیسے بَیْتِی میں (غ) اور یہاں روح سے مراد نفس ناطقہ یا وہ چیز ہے جس سے انسان تمیز کرتا ہے یہاں روح جان کے معنی میں اس لیے نہیں ہو سکتی کہ یہ روح انسان اور دوسرے حیوانات میں اشتراک رکھتی ہے اور سجدہ کا حکم کسی خصوصیت کی وجہ سے ہے اگر جان کے ڈالا جانے کی وجہ سے یہ حکم ہوتا تو دوسرے جاندار بھی اس میں شامل ہوتے اور سورۂ بقرہ میں اوّل انسان کو علم دیا جاتا ہے تب ملائکہ کو سجدہ کا حکم ہوتا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ یہاں نفخ روح سے مراد اس قوت ممیزہ کا نفخ ہے جس سے انسان علم حاصل کرتا ہے اور روح سے مراد وحی بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ یہ وہ روح ہے جو تمام انسانوں میں نفخ ہوتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ثمّ جعل نسله من سللة من مّآء مّهین ثمّ سوّٰه ونفخ فیه من رّوحه (السجدة ۳۲-۸ و ۹)

قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۳۶﴾	کہا میرے رب تو مجھے اس دن تک مہلت دے جس دن وہ اٹھائے جائیں
قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ ﴿۳۷﴾	کہا تو اُن میں سے ہے جنھیں مہلت دی گئی۔
اِلٰی یَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ ﴿۳۸﴾	ایک معلوم وقت کے دن تک ع۱۶۸۸
قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ لَاُزَیِّنَنَّ لَہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَاُغۡوِیَنَّہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۳۹﴾	کہا میرے رب جیسا تو نے مجھے گمراہ ٹھہرایا میں انھیں زمین میں (نافرمانی کو) خوبصورت بنا کر دکھاؤنگا اور ان سب کو (حصول مقصد میں) ناکام رکھونگا ۱۶۸۹
اِلَّا عِبَادَکَ مِنۡہُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴿۴۰﴾	سوائے تیرے بندوں کے جو اُن میں سے خالص کیے گئے ہیں۔
قَالَ ہٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسۡتَقِیۡمٌ ﴿۴۱﴾	فرمایا یہ سیدھا رستہ میری طرف ہے ع۱۶۹۰
اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡغٰوِیۡنَ ﴿۴۲﴾	کہ میرے بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں مگر جو جاہلوں میں سے تیرے پیچھے چلے ع۱۶۹۱
وَ اِنَّ جَہَنَّمَ لَمَوۡعِدُہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۴۳﴾	اور یقیناً ان سب کے وعدہ کی جگہ دوزخ ہے۔
لَہَا سَبۡعَۃُ اَبۡوَابٍ ؕ لِکُلِّ بَابٍ مِّنۡہُمۡ جُزۡءٌ مَّقۡسُوۡمٌ ﴿۴۴﴾ ع ۳	اس کے سات دروازے ہیں، ہر ایک دروازے کے لیے ان میں سے ایک حصہ الگ کر دیا گیا ہے ع۱۶۹۲

ع۱۶۸۸ جب تک اس دنیا پر انسان ہے اس وقت تک شیطان کا رہنا بھی ضروری ہے مگر اس کی بھی ذریت ہے اور ہر انسان کے لیے ایک علیحدہ شیطان کا ہونا حدیث سے بھی ثابت ہے کان شیطان آدم کافرا و شیطانی مسلما۔ دیکھو سورۂ اعراف کا دوسرا رکوع۔

ع۱۶۸۹ دنیوی زندگی کو مقصد ٹھہرانا اصل حصول مقصد میں ناکامی ہے: فی الارض میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا کی زندگی انہیں اچھی کرکے دکھاؤں گا یہانتک کہ وہ اس دنیوی زندگی کو ہی اپنا اصل مقصد بنالیں۔ اس لیے آخر پر لاغوینہم کا لفظ استعمال کیا ہے اور غیّ کے معنی وہ جہالت ہیں جو اعتقاد فاسد سے پیدا ہو اور غوی کے معنی خاب یعنی ناکام ہوا اور اِغواء کے معنی ناکام رکھنا ہیں دیکھو ع۱۰۵۸ یعنی اصل مقصد زندگی کی طرف ان کی توجہ نہ ہونے دونگا اور یوں انہیں اس مقصد کے حصول میں ناکام رکھوں گا۔

ع۱۶۹۰ یہاں عَلَیّ بمعنی اِلَیّ ہے (ج) یعنی مجھ تک پہنچانے والا یہ صراط مستقیم ہے اور یا عَلَیّ کے معنی ہیں میں اسے ضرور ملحوظ رکھوں گا۔

ع۱۶۹۱ عباد یا عبد کے لیے دیکھو ع۲۸۴ عبادی سے مراد یہاں عموماً وہی عبادك منہم المخلصین لیے گئے ہیں جن کا ذکر آیت ۴۰ میں ہے مگر قرینہ یہ چاہتا ہے کہ یہاں لفظ عام ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عباد مخلصین سے تو شیطان خود ہی مایوس ہے کیونکہ ان کو اللہ تعالےٰ نے پہلے سے ہی شیطان کی غلامی سے آزاد کر رکھا ہے اس لیے وہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں انھیں چھوڑ کر باقی سب کو ناکام کر دونگا یعنی دنیا ہی اُن کا مقصد ہو جائے گی اور وہ اصل مقصد زندگی کے حاصل کرنے میں ناکام رہیں گے تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہارا تسلّط اور غلبہ تو کسی بندہ پر بھی نہ ہوگا، ہاں جو خود بخود اپنے فاسد اعتقاد کی وجہ سے جاہل رہ کر تیری پیروی کرے تو کرے۔ یہ آیت اس بات پر قطعی شہادت ہے کہ شیطان کا بندوں پر تسلط کوئی نہیں، وہ خود اس کے پیچھے لگتے ہیں۔

ع۱۶۹۲ ابواب۔ باب کی جمع ہے۔ کسی چیز میں داخل ہونے کا راستہ۔ اور اصل میں مکانوں میں داخل ہونے کا رستہ ہے اور ایک علم کو دوسرے علم کا باب کہا جاتا ہے یعنی اس کے ذریعہ سے اس دوسرے علم تک پہنچا جاتا ہے۔
علیؓ باب علم ہیں؟: اَنَا مَدِیۡنَۃُ الۡعِلۡمِ وَ عَلِیٌّ بَابُہَا (میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے) پس باب سے مراد یہی ہے کہ اس کے ذریعہ سے مجھ تک پہنچ سکتے ہو۔ اور یہ کوئی خصوصیت نہیں .... بلکہ جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے اصحابی کالنّجوم فبایّہم اقتدیتم اہتدیتم۔ میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں جس کی پیروی کروگے ہدایت پالوگے۔ مراد صرف یہ ہے کہ صحابہؓ مثل دروازوں کے ہیں اور حقیقی علم صرف رسول اللہ صلعم ہی ہیں اسی لیے صحابی کا قول حجت شرعی نہیں۔ اور فتحنا علیہم ابواب کل شیٔ (الانعام-۴۴) میں بھی ذرائع ہی مراد ہیں۔ اور ابوابُ الجنّۃ اور ابوابُ جہنّم سے مراد وہ باتیں ہیں جن کے ذریعہ سے ان تک پہنچا جاتا ہے، (رغ) اور حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ابواب جہنم

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾	متقی باغوں اور چشموں میں رہیں گے۔
اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۴۶﴾	ان میں سلامتی سے امن کی حالت میں داخل ہو جاؤ۔
وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ	اور جو ان کے دلوں میں کچھ کدورت ہو گی ہم اسے نکال دینگے
اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۷﴾	وہ بھائی بھائی تختوں پر آمنے سامنے ہونگے ۱۶۹۳
لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۴۸﴾	انھیں ان میں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے
نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾	میرے بندوں کو خبر دے دے کہ میں بخشنے والا رحم کرنے والا ہوں۔
وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾	اور کہ میرا عذاب دردناک عذاب ہے ۱۶۹۴
وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾	اور انھیں ابراہیمؑ کے مہمانوں کی خبر دے دو۔
اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾	جب وہ اس کے پاس آئے تو کہا سلامتی ہو، اس نے کہا ہم تم سے ڈرتے ہیں۔
قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾	انھوں نے کہا ڈر نہیں ہم تجھے ایک صاحب علم لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں

سے مراد طبقات جہنم ہیں نہ دروازے (ج) اور ان سات طبقوں کے نام جَهَنَّمَ۔ لَظٰی۔ حُطَمَة۔ سَعِيْر۔ سَقَر۔ جَحِيْم۔ هَاوِيَة لیے گئے ہیں (ج) اور قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساتوں دوزخ کے مختلف نام ہیں اور ہر ایک ان میں سے کسی وصف کے لحاظ سے دوزخ کا نام ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سات کا استعمال ایسی حالت میں عدد کامل کے طور پر ہو۔ یعنی بہت سے دروازے ہیں۔ سَبْعَة کے لیے دیکھو ع۴۴ اور قتادہ کہتے ہیں کہ یہ سات دروازے ان کے اعمال کے مطابق سات منزلیں ہیں (ج) اور یہی اصل حقیقت ہے کہ ہر ایک شخص کا دوزخ اس کے اعمال کے مطابق ہے۔ کسی موٹی تقسیم کے لحاظ سے ان کی سات قسمیں بھی ہو سکتی ہیں۔

ع۱۶۹۳ سُرُر۔ سریر کی جمع ہے اور مادہ اس کا سِرّ ہے جس کے معنی بھید یا چھپی ہوئی چیز ہیں اور سُرُور خوشی کو کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہ وہ چھپی ہوتی ہے اور سریر تخت کو کہتے ہیں اس لیے کہ اس پر سرور کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور یہ صرف اہل نعمت کے لیے ہے اور جس پر میت کو رکھا جائے اسے بھی سریر کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس میں خوشی کا تفاؤل ہے جو موت کے بعد ملیگی اور دنیا کے غموں سے نجات ہے۔ (رغ)
چونکہ پچھلے رکوع میں شیطان کا ذکر تھا اور ان لوگوں کے انجام کا جو اس کی اتباع کرتے ہیں، اس لیے یہاں تقابل کے طور پر ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو شیطان کے اتباع سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔ یعنی متقی متبعین شیطان یا حیوانی زندگی کو مقصد بنا لینے والے کیلئے اگر آخرکار آگ ہے تو متقی کے لیے جنت ہے۔ اس جنت کا نقشہ یہاں جن الفاظ میں کھینچا ہے اس کی طرف کم لوگ توجہ کرتے ہیں۔ انسان کے اپنے نفس کے لیے وہاں ہر قسم کے عیوب سے سلامتی ہے اور ہر قسم کے خطرات سے امن ہے پھر دوسروں سے بھی تعلقات ہیں اور وہ تعلقات اس اعلیٰ درجہ کی محبت کے ہیں جو اخوت کے نام سے موسوم ہے مگر اخوت بھی ایسی جس میں رنج و حسد کوئی نہیں جس سے دنیا کی محبتیں اور اخوتیں عموماً آلودہ رہتی ہیں۔ پھر سب سے بڑھکر یہ کہ ان نعمتوں کا دوام ہے۔ یعنی ان سے کبھی کوئی نکالا نہیں جائیگا جو بلا یہاں دنیا کی نعمتوں سے لگی ہوئی ہے کہ آج ایک شخص کو ملتی ہیں تو کل ان سے محروم ہو جاتا ہے مگر ایک چیز کی مداومت سے انسان تھک جاتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ یہ مداومت ایسی نہ ہوگی جس میں تکان ہو یہ کمال راحت کا نقشہ ہے جس سے بڑھ کر راحت کے لیے اور الفاظ تجویز نہیں ہو سکتے اور متقی کو جو اس دنیا میں جنت ملتی ہے اس میں بھی یہ سب کیفیات ایک نہ ایک رنگ میں موجود ہوتی ہیں فی جنات و عیون یعنی باغوں اور چشموں میں ہونگے اور دوسری جگہ فرمایا فی جنّات ونهر (القمر ۵۴-۵۴) باغوں اور نہروں میں ہوں گے جس سے معلوم ہوا کہ یہ چشمے اور نہریں ایسی ہیں کہ ان میں انسان رہ بھی سکتا ہے۔

۱۶۹۴ جب دونوں راہیں بتا دیں تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی ان دو صفات کی طرف بھی اشارہ کیا یعنی ایک طرف غفر و رحم اور دوسری طرف سزا دینے کی صفت۔ کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ان دونوں باتوں پر اس کا ایمان نہ ہو اسی رجاء و خوف کے درمیان ایمان ہے کہ اس کی رحمت بھی بہت وسیع ہے مگر اس کی سزا بھی سخت ہے اور آگے حضرت ابراہیمؑ اور لوطؑ کے ذکر میں یہی دو نقشے پیش کیے ہیں۔

قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِیْ عَلٰۤی اَنْ مَّسَّنِیَ الْکِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾	اس نے کہا کیا تم مجھے خوشخبری دیتے ہو حالانکہ مجھے بڑھاپے نے آلیا ہے تو تم کا ہے کی خوش خبری دیتے ہو۔
قَالُوْا بَشَّرْنٰکَ بِالْحَقِّ فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْقٰنِطِیْنَ ﴿۵۵﴾	انھوں نے کہا ہم حق کے ساتھ تجھے خوشخبری دیتے ہیں، پس تو نا امیدوں میں سے نہ ہو[۱۶۹۵]
قَالَ وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَۃِ رَبِّہٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾	اس نے کہا اور سوائے گمراہوں کے اپنے رب کی رحمت سے کون مایوس ہوسکتا ہے۔
قَالَ فَمَا خَطْبُکُمْ اَیُّہَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾	کہا، تو اے رسولو! تمھارا کام کیا ہے؟
قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰی قَوْمٍ مُّجْرِمِیْنَ ﴿۵۸﴾	انھوں نے کہا، ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔
اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْہُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۵۹﴾	سوائے لُوطؑ کے پیروؤں کے ہم ان سب کو ضرور بچالیں گے
ع اِلَّا امْرَاَتَہٗ قَدَّرْنَاۤ ۙ اِنَّہَا لَمِنَ الْغٰبِرِیْنَ ﴿۶۰﴾	مگر اس کی عورت ہم مقدر کر چکے ہیں کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہو[۱۶۹۶]
فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾	سو جب رسول لوطؑ کی آل کے پاس آئے۔
قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ ﴿۶۲﴾	اس نے کہا تم اجنبی لوگ ہو۔
قَالُوْا بَلْ جِئْنٰکَ بِمَا کَانُوْا فِیْہِ یَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾	انھوں نے کہا بلکہ ہم وہ بات تیرے پاس لائے ہیں جس میں یہ جھگڑتے تھے
وَاَتَیْنٰکَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾	اور ہم حق کے ساتھ تیرے پاس آئے ہیں اور یقیناً ہم سچے ہیں[۱۶۹۷]

ع۱۶۹۵ یقنط۔ قنوط کے معنی بھلائی سے مایوس ہوجانا ہیں اور قانط (۵۵) اور قنوط رحٰم السجدۃ ۴۱-۴۹) مایوس ہونیوالا ہے (رغ)
یہاں انہی واقعات کا ذکر ہے جو سورۂ ہود میں ۶۹-۷۳ میں بیان ہوچکے ہیں۔ یہاں ان آنیوالوں کو مہمان کہا ہے اس سے بھی یہ پتہ لگتا ہے کہ یہ انسان تھے اور حضرت ابراہیم کا یہ کہنا کہ تم کس ذریعہ سے مجھے خوشخبری دیتے ہو صاف بتاتا ہے کہ وہ انھیں ملائکہ نہ سمجھتے تھے اور یہ ناممکن ہے کہ فرشتہ نبی پر نازل ہو تو وہ اسے شناخت نہ کرے کہ یہ فرشتہ ہے اور ان کا جواب کہ ہم تجھے حق کے ساتھ خوشخبری دیتے ہیں اسی بات کا موید ہے گویا وہ بتاتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی سے آگاہ کیا ہے جو امر حق ہے۔

ع۱۶۹۶ الّا اٰل لوط میں الّا استثنائے منقطع ہے اور مطلب صرف اس قدر ہے کہ اٰل لوط اس مجرم قوم میں داخل نہیں اور اگلے رکوع کی پہلی آیت میں صاف فرمایا کہ رسول آل لوط کے پاس آئے۔ حضرت ابراہیمؑ اور لوطؑ کے اس واقعہ کو اکٹھا بیان کرنے پر دیکھو ع۱۴۸۰۔ قدرنا میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے کیونکہ قضاء وقدر نہ ملائکہ کے اختیار میں ہے نہ انسانوں کے بلکہ صرف اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے اور اس میں بُعد کوئی نہیں کہ ان مرسلوں کے کلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کلام شروع ہوگیا ہو۔ دوسری جگہ انہی مرسلوں کا کلام یوں نقل کیا ہے قالوا انا ارسلنا الی قوم مجرمین۔ لنرسل علیہم حجارۃ من طین۔ مسوّمۃ عند ربك للمسرفین فاخرجنا من کان فیہا من المومنین فما وجدنا فیہا غیر بیت من المسلمین وترکنا فیہا اٰیۃ للذین یخافون العذاب الالیم (الذٰریٰت ۵۱-۳۲ تا ۳۷) جس میں لازماً کہیں نہ کہیں ضمیر کو بدل کر اللہ تعالیٰ کی طرف لانا پڑتا ہے کیونکہ آخری الفاظ ترکنا کسی طرح ان ملائکہ کی طرف منسوب نہیں ہوسکتے اور اس موقعہ پر تفاسیر میں فاخرجنا سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایتاً قول مانا گیا ہے۔ اسی طرح یہاں انا لمنجوھم سے کلام حکایتاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

ع۱۶۹۷ حضرت لوطؑ نے بھی ان مرسلوں کو انسان ہی سمجھا: جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے ان آنے والوں کو ملائکہ نہیں سمجھا حضرت لوطؑ نے بھی نہیں سمجھا۔ کیونکہ نبی ملائکہ کو منکر یا اجنبی لوگ نہیں کہہ سکتا اور ان کا حضرت لوط کو یقین دلانا کہ ہم سچے ہیں صاف بتاتا ہے کہ یہ انسان تھے فرشتوں کو ایسا یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اَتینٰك بالحق کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ایک حق بات ہم آپ کے پاس لائے ہیں یعنی عذاب الٰہی جس کا آنا حق ہے مگر یہ خطاب حضرت لوطؑ کے لیے موزون نہیں ان کی قوم کے لیے موزون ہوسکتا ہے اس لیے میں نے دوسرے معنی اختیار کیے ہیں کہ ہم اقتضائے حکمت کے مطابق آپ کے پاس آئے ہیں تاکہ اس قوم پر اتمام حجت ہوجائے اور یہ اپنی شرارت کو اس انتہا تک پہنچا دیں جس کے بعد قوم کو مہلت نہیں دی جاتی۔ یہاں جن واقعات

فَاَسۡرِ بِاَہۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ وَاتَّبِعۡ اَدۡبَارَہُمۡ وَلَا یَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ وَّامۡضُوۡا حَیۡثُ تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۵﴾

سو اپنے اہل کو کچھ رات رہے لیکر چلا جا اور خود ان کے پیچھے چل اور تم میں سے کوئی شخص پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اور چلے جاؤ جہاں تمھیں حکم دیا گیا ہے ۱۶۹۸

وَقَضَیۡنَاۤ اِلَیۡہِ ذٰلِكَ الۡاَمۡرَ اَنَّ دَابِرَ ہٰۤؤُلَآءِ مَقۡطُوۡعٌ مُّصۡبِحِیۡنَ ﴿۶۶﴾

اور ہم نے اس کے ساتھ اس بات کا فیصلہ کر دیا کہ ان کی جڑ صبح ہونے ہی کاٹ دی جائے گی ۱۶۹۹

وَجَآءَ اَہۡلُ الۡمَدِیۡنَۃِ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ﴿۶۷﴾

اور شہر کے لوگ خوش خوش آئے۔

قَالَ اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ ضَیۡفِیۡ فَلَا تَفۡضَحُوۡنِ ﴿۶۸﴾

(لوطؑ نے) کہا یہ میرے مہمان ہیں تو تم مجھے رسوا نہ کرو ۱۷۰۰

وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ ﴿۶۹﴾

اور اللہ کا تقویٰ کرو اور مجھے ذلیل نہ کرو۔

قَالُوۡۤا اَوَلَمۡ نَنۡہَكَ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۷۰﴾

انھوں نے کہا کیا ہم نے تمھیں جہان (کے لوگوں) سے روکا نہیں ۱۷۰۱

قَالَ ہٰۤؤُلَآءِ بَنٰتِیۡۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِیۡنَ ﴿۷۱﴾

کہا یہ میری بیٹیاں ہیں اگر تم (ان سے نکاح) کرنا چاہتے ہو۔

لَعَمۡرُكَ اِنَّہُمۡ لَفِیۡ سَكۡرَتِہِمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ﴿۷۲﴾

تیری زندگی کی قسم وہ اپنی بدمستی میں اندھے ہو رہے تھے ۱۷۰۲

کا ذکر ہے وہی سورۂ ہُود کے ساتویں رکوع میں بیان ہو چکے ہیں دیکھو ع۱۴۸۶ سے ع۱۴۹۱ تک۔

ع۱۶۹۸ خود ان کے پیچھے چلو۔ یہی انبیاء کی طرز ہے سب سے بڑھ کر خطرے کے مقام میں خود رہتے ہیں نبی کریم صلعم نے بھی سب صحابہؓ کو مکّہ سے رخصت کر کے سب سے آخر خود ہجرت کی تاکہ کمزور ناتوان وغیرہ پیچھے نہ رہ جائیں پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے کی تاکید اس لیے کی کہ وہ ایک خطرناک مقام تھا۔ ایسا نہ ہو کہ نکل کر اس انتظار میں ٹھہر جائیں کہ اس قوم پر کیا سزا آتی ہے۔ اور جہاں حکم دیا جاتا ہے وہاں چلے جاؤ۔ یہ حکم الٰہی حضرت لوطؑ کو علیحدہ دیا گیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ سارا کلام فاسر باھلك سے لیکر حضرت لوطؑ کی طرف وحی ہے جیسا کہ اسی آیت میں اس وحی کا صاف ذکر بھی ہے۔

ع۱۶۹۹ قضینآ۔ قضا کے معنی فصل امر یعنی ایک بات کا قطعی فیصلہ کر دینا ہیں اور جہاں وحی الٰہی سے ایک امر کا قطعی فیصلہ کر دیا جائے اس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے یہاں اور وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب (بنی اسرائیل ۱۷۔ ۴) میں بھی قضاء بالاعلام مراد ہے یعنی ایک بات کا قطعی خبر سے علم دے دینا (غ)

اس سے معلوم ہُوا کہ ان رسولوں کا آنا اور وحی الٰہی دو الگ الگ امر ہیں۔ اگر یہ رسول فرشتے ہوتے تو علیحدہ وحی الٰہی کی ضرورت نہ تھی بلکہ فرشتوں کا آنا ہی کافی تھا۔ مگر چونکہ رسول اپنی وحی پر ہی عمل کرتے ہیں اس لیے حضرت لوطؑ کی طرف وحی بھی ہوئی۔

ع۱۷۰۰ تفضحون فضح کے معنی (جس سے فضیحت ہے) کسی بُرائی کی تشہیر ہے۔

ع۱۷۰۱ پیدائش ۱۹ : ۹ میں ہے "یہ ایک مرد یہاں گزران کرنے آیا" مطلب یہ ہے کہ ہماری قوم میں سے نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اسی وجہ سے انہوں نے حضرت لوطؑ کو اس بات سے روک دیا تھا کہ آپ کے پاس کوئی مہمان آ کر رہے یعنی کوئی غیر قوم کا آدمی آ کر ٹھہرے۔ یہی مطلب ان الفاظ کا ہے۔

ع۱۷۰۲ لعمرك۔ عَمۡر اور عُمُر کے ایک ہی معنی ہیں دیکھو ع۱۲۱ قسم میں عَمۡر کا لفظ آتا ہے۔ یہاں قسم کھانے والا کون ہے اور کس چیز کی قسم ہے اکثر اس طرف گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلعم کی زندگی کی قسم کھائی ہے اور بعض کے نزدیک حضرت لوطؑ کے مہمانوں نے لوطؑ کی زندگی کی قسم کھائی ہے اور گو اس میں قالوا محذوف ماننا پڑے گا مگر قرینہ اسی کو چاہتا ہے اور اس طرح پر حذف قرآن شریف میں کئی جگہ آتا ہے اور یہاں ذکر قوم لوط کا ہی ہے پہلی صورت میں آنحضرت صلعم کی زندگی کی قسم کھانے سے کیا منشاء ہے۔ انسان جب خدا کی قسم کھاتا ہے تو اس کا منشا عموماً یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اسبات پر گواہ ٹھہراتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی قسم میں مراد صرف اس قدر ہوگی کہ کسی چیز کو بطور گواہ پیش کیا جاتا ہے۔ تو اس صورت میں نبی کریم صلعم کی زندگی کو بطور گواہ پیش کیا ہے اور یہ سچ ہے کہ ایک راستباز، ہاں تمام راستبازوں کے سردار کی زندگی ان لوگوں کے اندھا اور بدمست ہونے پر گواہ ہے جو بدی میں منہمک ہو جاتے ہیں اور لسان العرب میں ابن عباس کے اس قول کو نقل کر کے کہ اللہ تعالےٰ نے یہاں نبی کریم صلعم کی زندگی کی قسم کھائی ہے اور آپ کے سوائے اور کسی کی زندگی کی قسم نہیں کھائی اس کا انکار بھی نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ دوسروں نے اس کے معنی کیے ہیں لَدِیۡنُكَ الَّذِیۡ تَعۡمُرُ یعنی تیرے اس دین کی قسم جسے تو مروج کرتا ہے (ل)

فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّیۡحَۃُ مُشۡرِقِیۡنَ ﴿۷۳﴾	سو ایک خطرناک آواز نے انھیں سورج نکلتے ہی آپکڑا ۱۷۰۳
فَجَعَلۡنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡهِمۡ حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ﴿۷۴﴾	پس ہم نے اُسے تہ و بالا کر دیا ، اور ہم نے اُن پر سخت پتّھر برسائے ۔
اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ ﴿۷۵﴾	یقیناً اس میں فراست والوں کے لیے نشان ہیں ۱۷۰۴
وَ اِنَّهَا لَبِسَبِیۡلٍ مُّقِیۡمٍ ﴿۷۶﴾	اور وہ (شہر) ایک دائمی رستے پر ہے ۱۷۰۵
اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۷۷﴾	یقیناً اِس میں مومنوں کے لیے نشان ہیں ۔
وَ اِنۡ کَانَ اَصۡحٰبُ الۡاَیۡکَۃِ لَظٰلِمِیۡنَ ﴿۷۸﴾	اور بَن کے رہنے والے بھی ظالم تھے ۱۷۰۶
فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ ۘ وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۷۹﴾ ع	سو ہم نے انھیں سزا دی اور یہ دونوں (شہر) کھلے رستے پر ہیں ۱۷۰۷
وَ لَقَدۡ کَذَّبَ اَصۡحٰبُ الۡحِجۡرِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۸۰﴾	اور حجر کے رہنے والوں نے رسولوں کو جھٹلایا ۱۷۰۸

ع ۱۷۰۳ مشرقین ۔ شَرَقَت الشّمسُ کے معنی ہیں سورج طلوع ہوا ۔ اور اَشۡرَقَ کے معنی روشن کر دیا بالعشیّ والاشراق (صٓ ۳۸ - ۱۸) اور مَشۡرِق جدھر سے سورج طلوع ہوتا ہے مکاناً شرقیاً (مریم ۱۹ - ۱۶)

ع ۱۷۰۴ متوسّمین ۔ وَسۡم کے معنی نشان کرنا ہیں اور سِمَۃ نشان ہے ۔ یہی معنی سِیۡما کے ہیں سیماهم فی وجوههم (الفتح ۴۸ - ۲۹) تعرفهم بسیماهم (البقرۃ ۲ - ۲۷۳) (اور یہاں فا کی جگہ عین نے لے لی ہے) اور وَسَم یسم کے معنی ہیں کسی نشان لگانے والی چیز کے ساتھ نشان لگا یا سنسمه علی الخرطوم (القلم ۶۸ - ۱۶) اور تَوَسَّمَ کے معنی فراست یا فطنت ہیں اور مُتَوَسِّم وہ ہے جو عبرت حاصل کرے یا فراست سے کام لے (غ)

ع ۱۷۰۵ مقیم ۔ اِقَامَۃ کے معنی دوام بھی آتے ہیں یعنی ہمیشہ رہنا جیسے عذاب مُّقیم (المائدہ ۵ - ۳۷) (غ) یہاں مراد دائمی رستہ ہے ۔

مراد یہ ہے کہ لوط کی یہ بستیاں ایک ایسے رستہ پر ہیں جو ہمیشہ چلتا ہے اس لیے یہ تباہ شدہ بستیاں بھی نظروں کے سامنے آتی رہتی ہیں آج بھی یہ رستہ اسی طرح جاری ہے ۔

ع ۱۷۰۶ ایکۃ ۔ بہت سے درختوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے سے پھنسے ہوئے ہوں اور ایسی جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں اس طرح درخت ہوں یعنی بَن کو (ل) اور اصحاب الایکۃ یا تو بَن کے رہنے والے ہیں اور یا ایکۃ شہر کا نام ہے ۔

اصحاب الایکۃ کون تھے ؟ ان کا ذکر یہاں اور صٓ ۳۸ - ۱۳ میں اور قٓ ۵۰ - ۱۴ میں قوم لوط کے ساتھ ملا ہوا مجملاً آیا ہے ۔ اور الشعراء ۲۶ ع - ۱۷۶ تا ۱۹۱ میں قوم لوطؑ کے بعد ان کا ذکر مفصل آیا ہے جہاں یہ ذکر ہے کہ ان کے رسول حضرت شعیبؑ تھے اور حضرت شعیبؑ کا اہل مدین کی طرف مبعوث ہونا دوسری جگہ سے ظاہر ہے والی مدین اخاهم شعیبا (الاعراف ۷ - ۸۵) پس سوال یہ ہے کہ آیا یہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں یا دو الگ الگ قومیں ہیں اہل مدین کے عذاب کو ہود ۱۱ - ۹۴ میں صیحۃ کہا ہے اور اصحاب الایکۃ کے عذاب کو الشعراء ۲۶ ع - ۱۸۹ میں عذاب یوم الظُّلّۃ کہا ہے اس سے اور ایک حدیث سے جو ابن عساکر میں مذکور ہے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ یہ دو الگ الگ قومیں تھیں ۔ مگر علاوہ اس بات کے جس کا ذکر اوپر ہوا کہ دونوں قوموں کی بیماری ایک ہے قرآن شریف میں جہاں اہل مدین کا ذکر ہے وہاں اصحاب الایکہ کا نہیں اور جہاں اصحاب الایکہ کا ہے وہاں اہل مدین کا نہیں جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی قوم ہے اور عذاب کے دو نام آنے سے یہ قیاس کرنا کہ الگ الگ عذاب تھے بالکل غلط ہے صیحۃ زلزلہ کو کہا ہے اور زلزلہ جس میں آتش فشاں کی سنگباری ہو عذاب یوم الظلۃ کہلا سکتا ہے پس یا یہ ایک ہی قوم ہے اور یا ایک ہی قوم کے دو ٹکڑے ہیں ۔

ع ۱۷۰۷ امام کے معنی کے لیے دیکھو ع ۱۵۵ چونکہ رستہ پر چلا جاتا ہے اس لیے اسے بھی امام کہدیا ہے ۔

دونوں سے مراد لوط اور شعیب کی بستیاں ہیں ۔ کیونکہ یہ دونوں ایک ہی رستہ پر واقع ہیں ۔

ع ۱۷۰۸ الحجر قوم ثمود کے مسکن کا نام ہے (غ) اور یہ قطعہ مدینہ کے شمال میں ملک عرب کی حدود کے اندر واقع ہے ۔

یہاں قوم ثمود کا ذکر ہے اس سے پہلے قوم لوط اور پھر قوم شعیب کا ذکر کیا تھا ۔ ان تین کو یہاں ذکر سے کیوں مخصوص کیا ۔ اور پھر یہ ترتیب کیسی ہے کہ لوط کی قوم ثمود کے بعد ہوئی اور شعیب کا زمانہ لوط سے بعد ہے لیکن یہاں ذکر اوّل لوط کا پھر قوم شعیب کا پھر قوم ثمود کا ہے ۔ بات یہ ہے کہ ان تینوں قوموں کے مسکن اس رستہ پر ہیں ، جہاں سے اہل مکہ اپنی شام کی تجارت میں بار بار گزرتے تھے ۔ اس لیے انہی تین کو یہاں ذکر سے مخصوص کیا ۔ اور ترتیب اس لحاظ سے ہے کہ سب سے اوپر لوط کی بستیاں ہیں اس سے نیچے قوم شعیب کی اور اس کے نیچے وادی حجر ہے یعنی قوم ثمود کا مسکن ۔ ان کا ذکر اعدائے اسلام کی عبرت کے لیے کیا ۔ نبی کریم صلعم نے مسلمانوں کو فرمایا کہ ان تباہ شدہ مقاموں پر جائیں تو روتے ہوئے جائیں مطلب یہ ہے کہ عبرت

وَ اٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾ — اور ہم نے انھیں اپنی آیتیں دیں تو وہ اُن سے منہ پھیر لینے والے ہوئے۔

وَ كَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾ — اور وہ امن میں پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ — سو صبح ہوتے ہی انھیں سخت آواز نے آلیا۔

فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾ — پس جو کچھ وہ کماتے تھے ان کے کسی کام نہ آیا۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾ — اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے حق کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے اور یقیناً (موعود) گھڑی آنے والی ہے سو خوبی سے درگزر کرتے رہو۱۷۰۹

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾ — تیرا رب سب کا پیدا کرنے والا جاننے والا ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ — اور ہم نے ہی تجھے سات بار بار دہرائی گئی (آیتیں) اور عظمت والا قرآن دیا ہے ۱۷۱۰

حاصل کریں (بخاری) خود مدت بعد تبوک کو جاتے ہوئے صحابہ کو اسی طرح نصیحت فرمائی۔ معلوم ہوتا ہے یہ قوم قبول حق میں بہت ہی سخت تھی شاید اسی موزونیت سے سورۃ کا نام الحجر ہے۔

۱۷۰۹ اجمیل۔ جمال حُسن کثیر کو کہتے ہیں اور یہ دو قسم ہے ایک وہ جو انسان سے مخصوص ہے اس کے نفس میں ہو یا بدن میں یا فعل میں۔ اور دوسرا وہ جو اس سے اس کے غیر کی طرف پہنچتا ہے۔ اور یہی معنی ہیں اس حدیث کے اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ اللہ جمیل ہے جمال سے محبت کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام خیرات یعنی بھلائیاں اس سے نکلتی ہیں پس وہ ایسے شخص سے محبت کرتا ہے جو دوسروں سے نیکی کرے اور پھر اس سے کثرت معنی ہو گئے ہیں اس لیے جُمْلَۃ کے معنی کل ہیں لولا نزّل علیہ القراٰن جملۃ واحدۃ (الفرقان ۲۵-۳۲) اور جس چیز کی تفصیل نہ ہو اسے مُجْمَل کہا جاتا ہے۔ اور جَمَل اونٹ کو کہتے ہیں جب اس کے سب دانت نکل آئیں حتّٰی یلج الجمل فی سمّ الخیاط (الاعراف ۷-۴۰) اور اس کی جمع جِمال اور جِمَالَۃ آتی ہے کانّہٗ جمالۃ صفر (المرسلٰت ۷۷-۳۳)

ان تین قوموں کے ذکر میں یہ سمجھایا کہ اعمال کی جزا حق ہے۔ اس لیے اب عام کر کے سمجھایا کہ آسمان اور زمین میں جہاں تک بھی دیکھتے جاؤ یہی معلوم ہوگا کہ کوئی فعل بے نتیجہ نہیں۔ پس اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ قوم جو اعمال بد میں بڑھتی چلی جاتی ہے آخر اس کی صف لپیٹ دی جائے اور الساعۃ سے مراد یہاں وہی قوم کی تباہی کا وقت ہے جسے الساعۃ الوسطیٰ کہا جاتا ہے دیکھو ۱۰۸؎ اسی لیے اس کے بعد درگزر کا حکم دیا کیونکہ ان کی ساعۃ ان کی مغلوبیت تھی جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ادفع بالّتی ھی احسن فاذا الّذی بینک وبینہ عداوۃ کانّہ ولی حمیم (حٰم السجدۃ ۴۱-۳۴) یا فرمایا عسی اللہ ان یجعل بینکم وبین الذین عادیتم منھم مّودّۃ (الممتحنۃ ۶۰-۷)

۱۷۱۰ مثانی۔ اس کا اصل ثنی ہے اور ثِنی اور اثنان گنتی کے اعتبار سے بھی بولا جاتا ہے اور دوبارہ لانے کے اعتبار سے بھی اور دونوں کے اعتبار سے بھی۔ اور ثَنَاء حمد کو کہتے ہیں اس لیے کہ اس کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے اور مَثَانی (مثناۃ کی جمع) قرآن کریم کی سورتوں کو کہا گیا ہے اس لیے کہ وہ بار بار دوہرائی جاتی ہیں یعنی ہمیشہ پڑھی جاتی ہیں اور دوسری جگہ قرآن کریم کو مثانی کہا ہے اللہ نزّل احسن الحدیث کتا با متشابھا مثانی (الزمر ۳۹-۲۳) اور یہ بھی درست ہے کہ قرآن شریف کو مثانی اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے فوائد بار بار اور از سرِ نو تازہ ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ حدیث میں اس کی صفت میں ہے کہ لَا یَعْوَجُّ فَیُقَوَّمُ وَلَا یَزِیْغُ فَیُسْتَعْتَبُ وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ یعنی جب کبھی اس میں کجی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ اسے دور کر کے اسے قائم کرنے کا سامان کر دیگا اور جب اس میں زیغ پیدا کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے دور کر دیگا۔ اور اس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہونگے اور اس لحاظ سے بھی مثانی کا لفظ اس پر صادق آتا ہے کہ اس میں سے ایسی باتیں ہمیشہ ظاہر ہوتی رہیں گی جن کی وجہ سے اس کی ثنا ہوتی رہے گی۔ اور اس کی بھی جو اسے پڑھے اور سیکھے اور اس پر عمل کرے اور اسی معنی میں قرآن شریف کو کریم بھی کہا ہے۔ انّہ لقراٰن کریم (الواقعۃ ۵۶-۷۷) اور مجید بھی بل ھو قراٰن مجید (البروج ۸۵-۲۱) (غ)

سبعا من المثانی سے کیا مراد ہے بخاری میں ابو ہریرہؓ اور ایک دوسرے صحابی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ یہ سورۃ فاتحہ ہے اور دونوں روایتوں میں اسی کو قرآن عظیم بھی فرمایا ہے۔ یا ابن عباسؓ سے اور مجاہد وغیرہما سے روایت ہے کہ اس سے مراد سات لمبی سورتیں ہیں یعنی پہلی ساتوں سورتیں (ج) لیکن یہ سورت مکی ہے اور سات لمبی سورتوں میں سے پانچ مدنی ہیں اس لیے بھی یہ معنی قابل قبول نہیں۔ اور یہ یقینی امر ہے کہ اس سے

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَٱخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٨٨﴾ — تو اپنی آنکھوں کو اس طرف نہ لگا جو ہم نے ان میں سے کئی قسم کے لوگوں کو چند روزہ سامان دیا ہے اور ان کے لیے غم نہ کھا اور مومنوں کے لیے اپنے بازوؤں کو جھکا ۱۷۱۱

وَقُلْ إِنِّىٓ أَنَا ٱلنَّذِيرُ ٱلْمُبِينُ ﴿٨٩﴾ — اور کہہ میں کھلے طور پر ڈرانے والا ہوں۔

كَمَآ أَنزَلْنَا عَلَى ٱلْمُقْتَسِمِينَ ﴿٩٠﴾ — جس طرح ہم نے قسمیں کھانے والوں پر اتارا ۱۷۱۲

مراد سورۂ فاتحہ ہی ہے جو اس وقت نازل ہو چکی تھی اور نمازوں میں دہرائی جاتی تھی اور وہ اس لحاظ سے بھی مثانی بالخصوص کہلائے گی کہ نماز میں یہی حصّہ ہے جو بار بار دہرایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کوئی سورت یا حصّہ اور پڑھا جاتا ہے اور ہر رکعت میں دوہرائی صرف یہی سورت جاتی ہے اور اس کی سات آیات بھی ہیں۔ اور قرآن عظیم اس کو اس معنی سے کہا جیسے ام الکتاب اس لیے کہ اس میں ساری تعلیم قرآنی کا نچوڑ موجود ہے اور اس کا ذکر اس لیے کیا کہ اگر لوگوں کے پاس مال و دولت ہے دیکھو اگلی آیت جس کے بھروسہ پر وہ تمہاری مخالفت کرتے ہیں تو تمہارے پاس وہ حق موجود ہے جس کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہیں سکتی اور وہی غالب آ کر رہے گا۔

ع ۱۷۱۱ تمدان۔ مَدّ کے معنی کھینچنا ہیں اور مُدّۃ وقت ممتد یعنی لمبے وقت کو کہتے ہیں اور حرف کی مَدّ اس کا لمبا کرنا اور کسی چیز کی طرف مد بصر یا مد عین سے مراد ہوتی ہے اس کی حرص کرنا یا اس کا خواہش مند ہونا (غ)

ازواجا۔ اَزْواج۔ زَوْج کی جمع ہے دیکھو ع ۱۳۹ و ع ۱۰۲۶ اور چونکہ ہر ایک قرین یا ہمنشین پر یہ لفظ بولا جاتا ہے اس لیے ازواج کے معنی یہاں اشباہ اور اقران ہیں (غ) یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ اور اَصناف بھی اس کے معنی کیے ہیں یعنی قسم قسم کے لوگ اور بعض نے تکلف کر کے رجالا مع نسائہم بھی کہا ہے یعنی مرد اور ان کی عورتیں (ر)

اخفض جناحك۔ خَفْض۔ رفع کی ضد ہے خافضۃ رافعۃ (الواقعۃ ۵۶ - ۳) اور جناح جانب کو کہتے ہیں اور مراد خفض الجناح یا پہلو کے نیچا یا نرم کرنے سے نرمی کا اختیار کرنا ہے۔ جب اس عظیم الشان حق کا ذکر کیا جو نبی کریم صلعم کو دیا گیا، تو اس کے بالمقابل جن چیزوں پر لوگ فخر کرتے ہیں ان کا ذکر بھی کیا، یعنی دنیا کا مال اور اس کی نعمتیں اور آسائشیں۔ بعض نے یہاں مراد اُمّت کو لیا ہے کیونکہ نبی کریم صلعم ابتدائے زندگی سے ہی کبھی مال دنیا کی پروانہ کرتے تھے لیکن دیکھو ع ۱۴۲ و ع ۴۲۷ ہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آئندہ زمانہ کی طرف اشارہ ہے جب سامان دنیوی کی افراط اس قدر دنیا میں ہونے والی تھی تو یہ سمجھایا ہے کہ دنیا کے مال و متاع کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو کیونکہ تمہارے پاس اس سے بہت بڑھ کر دولت ہے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا جس شخص کو قرآن دیا گیا پھر اس نے یہ خیال کیا کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر بھی کوئی چیز کسی کو دی گئی ہے تو اس نے ایک عظیم الشان چیز کو حقیر جانا اور ایک حقیر چیز کو بڑا سمجھا۔ ولا تحزن علیہم دوسری جگہ عیسائیوں کے ذکر میں ہے فلعلك باخع نفسك علیٰ آثارهم ان لم یومنوا بهذا الحدیث اسفا (الکھف ۱۸ - ۶) اور یا اس وجہ سے کہ وہ اپنے اموال کو حق کی مخالفت پر خرچ کرتے تھے تو مراد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا استیصال ضروری ہے۔

ع ۱۷۱۲ مقتسمین قَسَمَ کے معنی تقسیم کیا اور تقاسما المالَ اور اِقْتَسَماہُ کے معنی ہیں ان دونوں نے باہم مال تقسیم کیا۔ اور اسی سے قِسْمَۃ ہے واذا حضر القسمۃ (النساء ۴ - ۸) اور قسم امرہ اور اِقْتَسَمَ کے معنی یوں بھی آتے ہیں کہ اس معاملہ میں سوچتا رہا کہ اسے کرے یا نہ کرے اور اَقْسَمَ کے معنی ہیں قسم کھائی اور تقاسم القومُ سب لوگوں نے ایک دوسرے سے عہد کے طور پر قسم کھائی تقاسموا باللہ (النمل ۲۷ - ۴۹) (ل) یہاں مقتسمین سے مراد راغب نے وہ لوگ لیے ہیں، جنہوں نے مکّہ کی گھاٹیوں میں باہم قسمیں کھائی تھیں کہ جو لوگ رسول اللہ صلعم کے پاس آئیں انھیں روک دیں گے یا نبی کریم صلعم کے خلاف تدابیر کرنے پر باہم قسمیں کھائی تھیں اور بخاری نے بھی اس کے معنی الذین حلفوا ہی کیے ہیں یعنی وہ لوگ جنھوں نے قسمیں کھائی تھیں اور بعض نے اقتسام سے مراد قرآن شریف کی تقسیم لی ہے یعنی ایسے لوگ جنھوں نے ایک حصّہ کو حق کہا اور دوسرے کو باطل۔ جیسا کہ اہل کتاب کرتے تھے یہی مضمون اگلی آیت میں بیان ہوا ہے۔

آئندہ زمانہ کے عذاب کی پیشگوئی: کما کو ولقد آتیناك کے متعلق سمجھا گیا ہے مگر یہاں انزال وحی کا ذکر نہیں بلکہ انزال عذاب کا ذکر ہے جس کی طرف انا النذیر المبین میں اشارہ ہے۔ جب عذاب سے ڈرایا تو فرمایا کہ ہم اسی طرح عذاب نازل کریں گے جس طرح قسمیں کھانے والوں پر اُتارا جنھوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اب ظاہر ہے کہ یہ سورت مکّی ہے اور ابھی نہ اہل کتاب پر عذاب اُترا تھا نہ اہل مکّہ پر۔ اس لیے بعض نے خیال کیا کہ مقتسمین سے مراد پہلے انبیاء کے مخالف ہیں اور اگلی آیت میں القرآن سے بھی پہلی کتب منزلہ کو مراد لے لیا ہے مگر یہ بالبداہت غلط ہے۔ القرآن کا لفظ ان پر صادق نہیں آ سکتا پس مراد اس سے کسی آئندہ زمانہ کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ ع ۱۷۱۱ میں دکھایا گیا جب دنیا کے سامان بہت ترقی کر جائیں تو فرمایا کہ ان پر بھی ہم اسی طرح پر عذاب نازل کریں گے جس طرح ان سے پہلے لوگوں پر کیا جنھوں نے رسول اللہ صلعم کی مخالفت پر قسمیں کھائیں اور اس صورت میں انزلنا کا استعمال بہ سبب تحقق وقوع درست ہے اس لیے کہ انہیں بار بار اس کی پیشگوئیاں سنا دی گئی تھیں۔

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ اصحاب الحجر ہی (جن کے نام پر سورت ہے) وہ لوگ تھے جن کے متعلق اپنے پیغمبر کے خلاف قسمیں کھانے کا ذکر ہے

الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾	جنھوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ۱۴۱۳
فَوَرَبِّكَ لَنَسْــَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾	سو تیرے رب کی قسم ہم ضرور ان سب سے پوچھیں گے ۔
عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾	جو وہ عمل کرتے تھے ۔
فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾	سو کھول کر کہہ دے جو تجھے حکم دیا جاتا ہے اور مشرکوں کا خیال نہ کر ۱۴۱۴
اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾	ہم تیری طرف سے ہنسی کرنے والوں (کی سزا) کے لیے کافی ہیں ۔
الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾	جو اللہ کے ساتھ دوسرا معبود قرار دیتے ہیں سو عنقریب جان لیں گے ۔
وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾	اور ہم جانتے ہیں کہ تیرا دل اس سے تنگ پڑتا ہے جو یہ کہتے ہیں ۔
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾	سو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتا رہ اور سجدہ کرنیوالوں میں رہ ۔
وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾	اور اپنے رب کی عبادت کرتا رہ یہاں تک کہ تجھ پر موت آ جائے ۱۴۱۵

قالوا تقاسموا باللہ لنبیّتنّہ واھلہ ثمّ لنقولنّ لولیّہ ماشھدنا مھلک اھلہ وانّا لصادقون (النمل ۲۷ - ۴۹) اور بعینہٖ یہی معاملہ ہمارے نبی کریم صلعم کے خلاف ہوا ۔

ع ۱۴۱۳ اعضین ۔ عِضُوْن ۔ عِضَۃ کی جمع ہے اور اس کی اصل عِضْوَۃ ہے جس کے معنی جزو ہیں اسی سے عُضْو اور عِضْو ہے کیونکہ عضو بھی جسم کا ایک جزو ہے اور تَعْضِیَۃ کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کرنا آتے ہیں (ل) اور قرآن کو عضین بنانے سے یہ منشا ہے کہ کسی حصّہ پر ایمان لاتے ہیں اور کسی کا انکار کرتے ہیں اور یا یہ کہ کبھی اسے سحر کہتے ہیں کبھی کہانت کبھی شعر وغیرہ بخاری میں ابن عباس سے پہلے معنی مروی ہیں اور یہود ونصاریٰ مراد لیے گئے ہیں ۔

ع ۱۴۱۴ اصدع ۔ صَدْع ۔ سخت اجسام میں شق کرنے کو کہتے ہیں اور صَدَعَ الْاَمْرَ کے معنی ہیں اس کو کھول دیا اور صُداع سخت سر درد کو کہتے ہیں گویا درد سے سر پھٹ رہا ہو اسی لحاظ سے ہے لایصدّعون عنھا (الواقعۃ ۵۶ - ۱۹) اور تصدّع القوم کے معنی ہیں تفرقوا پراگندہ ہو گئے ۔ یومئذ یصدعون (الروم ۳۰ - ۴۳)

بار بار انذار کی ضرورت : مشرکوں سے اعراض کے یہ معنی ہیں کہ ان کی مخالفت اور عداوت اور منصوبوں کی کچھ پروا نہ کرو اور کھول کھول کر بیان کرتے چلے جاؤ ۔ یہ سورت مکّہ کے آخری زمانہ کی ہے اور نبی کریم صلعم اس سے پہلے بھی کھول کر ہی بیان فرماتے تھے مگر اب چونکہ آپ کو مٹانے کے لیے کفار کی طرف سے سخت ترین منصوبے ہو رہے تھے اس لیے فرمایا کہ پروا نہ کرو ۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ اسلام کی اصل کامیابی اسی میں ہے کہ قرآن شریف کو کھول کھول کر بیان کر دیا جائے جس طرح سخت چیز میں شق کرنے کے لیے بار بار ضرب لگانے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ان سخت دلوں پر جو دنیا کی آلائشوں میں ملوث ہیں صداقت تب ہی اثر کرتی ہے جب اسے بار بار پیش کیا جائے ۔

ع ۱۴۱۵ الیقین ۔ یقین کے معنی یہاں موت ہیں دیکھو بخاری کیونکہ اس کا آنا یقینی ہے اور بعض نے مراد نصرت لی ہے جو کفار کے خلاف آپ کو ملنے کا وعدہ تھا ۔

عبادت کب تک ہے : الحاد پسند طبائع نے ان الفاظ کی تاویل یوں کر لی ہے کہ اسی وقت تک عبادت کرنے کا حکم ہے جب تک یقین آ جائے اور وہ کہتے ہیں کہ چونکہ ہمیں وہ یقین کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے اسلئے اب ہمیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ضرورت نہیں رہی ۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ مراد اس سے ہوتی تو کیا نبی کریم صلعم کو ساری عمر یقین نہ آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں آپکے قدم تک سوج جاتے تھے یقین کے معنی یہاں موت ہیں ۔ لیکن اگر عام معنی بھی یہاں مراد لیے جائیں تو یہ مطلب نہیں کہ یقین آئے تو عبادت چھوڑ دو ، بلکہ مطلب یہ ہے کہ عبادت الٰہی سے یقین پیدا ہوتا ہے ۔ سو عبادت کرو تاکہ وہ یقین کا مرتبہ حاصل ہو اور جب یقین کا مرتبہ حاصل ہو جائے گا پھر تو عبادت میں خود ایسی لذت پیدا ہو جائے گی کہ انسان عبادت کو نہ چھوڑ سکے گا ۔

(۱۶) سُوْرَۃُ النَّحْلِ مَکِّیَّۃٌ

اٰیاتُھا ۱۲۸ — رکوعاتُھا ۱۶

نام: اس سورت کا نام النحل ہے اور اس میں سولہ رکوع اور ۱۲۸ آیات ہیں۔ نحل کے معنی شہد کی مکھی ہیں اور اس سورت میں جہاں یہ دکھایا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت حیوانات تک میں کام کرتی ہوئی انسان کے لیے اچھی سے اچھی چیزیں پیدا کر دیتی ہے شہد کی مکھی کی نسبت لفظ وحی استعمال کر کے اشارہ کر دیا ہے کہ ان مثالوں میں جہاں دُودھ اور شہد کے حیوانات کے ذریعہ سے پیدا کرنے کا ذکر ہے اصل غرض وحی الٰہی کی طرف توجہ دلانا ہے۔ شہد کی نسبت بالخصوص لفظ بھی ایسے ہی استعمال فرمائے ہیں یعنی فیہ شفاء للناس جیسے خود قرآن شریف کے متعلق، گو ایک میں جسمانی بیماریوں کے لیے شفا ہے تو دوسرے میں روحانی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔ یوں تو حیوانات میں جس قدر ہدایت فطرتاً ملتی ہے وہ سب ان کے لیے وحی کا ہی حکم رکھتی ہے مگر شہد کی مکھی کا انتخاب، بالخصوص وحی کے ذکر کے لیے اس لیے کیا کہ جس طرح شہد کی مکھی مختلف پھولوں پر بیٹھ کر ان کی مٹھاس کو چوس کر ایک اعلیٰ درجہ کی شیریں اور شفا دینے والی چیز پیدا کر دیتی ہے اسی طرح وحی الٰہی جو قرآن میں ہے اس نے تمام بہترین ہدایات عالم کو جو کبھی دی گئی ہوں اس پاک کتاب کے اندر جمع کر دیا ہے جس طرح پھولوں سے مٹھاس کو انسان لیکر شہد کی صورت نہیں دے سکتا اسی طرح کسی انسان کا یہ کام نہ تھا کہ ان تمام بہترین ہدایات کو ایک جگہ جمع کر سکتا اور پھر ان کو ایسا رنگ دے سکتا کہ وہ روحانی بیماریوں کے لیے شفاء کا کام دیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں شہد کی مکھی کی وحی کا ذکر ہے اس سے تین آیتیں پہلے قرآن کریم کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ یہ کتاب تمام اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لیے نازل کی گئی ہے۔ اور تمام اختلافات مذاہب کا فیصلہ ہو نہ سکتا تھا جب تک کہ تمام کی بہترین ہدایات جو باقی رکھنے کے قابل تھیں ایک نئی اور بہترین شکل میں محفوظ نہ کر دی جاتیں۔ پھول آج پیدا ہوتا ہے اور کل اپنی مٹھاس سمیت ختم ہو جاتا ہے مگر شہد جو اس سے ایک حیوان کی وحی فطرت نے پیدا کیا وہ کبھی نہیں بگڑتا۔

خلاصہ مضمون: سورت کی ابتدا ان الفاظ سے کی ہے جو اس کا تعلق پچھلی سورت سے کھلے طور پر قائم کرتے ہیں کیونکہ اس کا خاتمہ اعدائے اسلام کے انذار پر کیا تھا اور اس کے پہلے لفظ ہی یہ ہیں اتٰی امر اللہ فلا تستعجلوہ وہ اللہ کا امر آ ہی گیا سمجھو جو اللہ کی بھیجی ہوئی صداقت کی تکذیب پر آیا کرتا ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی وحی جس پر چاہتا ہے بھیجتا ہے اور رکوع کی آخری آیت میں فرمایا کہ قصد السبیل سوائے اللہ تعالیٰ کی وحی کے نہیں مل سکتا۔ اور درمیان میں آسمانوں اور زمین اور انسان اور حیوانات کی ظاہری پیدائش کی طرف توجہ دلائی کہ جو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے یہ چیزیں پیدا کرتا ہے اس کے ہدایت انسان کے لیے وحی بھیجنے پر تعجب کیوں کرتے ہو۔ دوسرے رکوع میں توحید الٰہی پر صحیفۂ قدرت کی شہادت بیان فرمائی۔ کیونکہ وحی الٰہی کا سب سے بڑا کام دنیا میں توحید الٰہی کا قائم کرنا ہے اور خلق کو توحید پر بطور دلیل پیش کیا جو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ تیسرے رکوع میں بتایا کہ توحید کی طرف تو کم و بیش صحیفۂ قدرت بھی رہنمائی کر دیتا ہے مگر بعد الموت زندگی جس کی طرف صرف وحی الٰہی رہنمائی کرتی ہے۔ اس پر ایمان کے بغیر توحید الٰہی پر ایمان بھی ناقص ہی ہوتا ہے اور آخرت کا منکر عملاً توحید کا بھی منکر ہے۔ چوتھے رکوع میں اس حق کے خلاف جو وحی الٰہی لاتی ہے تدابیر کے انجام کا ذکر کیا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے اور اعلیٰ صفات سے محروم رہ جاتے ہیں۔ پانچویں رکوع میں مشرکین کے باطل عذروں کا ذکر ہے جو انھیں آخرکار کچھ کام نہ دیں گے۔ چھٹے میں اعدائے حق کی سزا کا ذکر ہے اور یہاں صاف الفاظ میں بتا دیا ہے کہ کس کس قسم کے عذاب ان پر آئیں گے۔ ساتویں میں بتایا ہے کہ خود فطرت انسانی شرک کو قبول نہیں کرتی۔ آٹھویں میں بتایا ہے کہ وحی الٰہی کی ضرورت دنیا سے ظلم کو دور کرنے کے لیے اور اختلافات مذاہب کو دور کرنے کے لیے تھی۔ نویں میں وحی الٰہی کی ضرورت کو تمثیلات کے رنگ میں بیان کیا۔ دسویں میں مہبط وحی صلعم کی فضیلت کا ذکر کیا گیارھویں میں مہبط وحی کے انکار کا اور بارھویں میں اس انکار کی سزا کا ذکر ہے تیرھویں میں قرآن کریم کی تعلیم کامل کا ایک نمونہ بتایا اور اس پر قیام کی ضرورت کو واضح کیا۔ چودھویں میں وجوہات دیں کہ یہ وحی افترا نہیں۔ پندرھویں میں بالخصوص مکہ والوں کو انذار کیا کہ ان کی حالت امن و اطمینان تبدیل کر دی جائے گی اور سولھویں میں حضرت ابراہیم کی مثال کا ذکر کر کے مومنوں کو نصیحت پر سورت کا خاتمہ کیا۔

تعلق: یہ سورت الرا کے مجموعہ کی ہی آخری سورت سمجھنی چاہیئے گو یہ الرا سے شروع نہیں ہوتی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تمام سورتوں میں عموماً گزشتہ واقعات کی طرف توجہ دلا کر مخالفین کی ناکامی کا ذکر کیا ہے اور اس میں ایسا کوئی ذکر نہیں بلکہ صحیفۂ قدرت اور فطرت کی شہادت کو وحی الٰہی کی صداقت پر پیش کیا ہے۔ اور ضمناً اس صداقت کو رد کرنے والوں کا ذکر بھی آ گیا ہے اور یوں یہ سورت انہی پہلی چھ سورتوں کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے۔

زمانہ نزول: اس سورت کا نزول بھی نبی کریم صلعم کے مکی زمانہ کے آخری ایام کا ہے اس لیے کہ اس میں صاف طور پر ہجرت کا ذکر ہے جو مدینہ کی طرف شروع ہو چکی تھی۔ اور اس ہجرت کے ذکر سے جن لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ایسی آیات مدنی ہیں انہوں نے غلطی کھائی ہے کیونکہ نبی کریم صلعم کے مدینہ جانے سے بہت دن پیشتر صحابہؓ کی ہجرت شروع ہو چکی تھی۔ یوں بلحاظ زمانہ نزول بھی یہ سورت اسی الرا کے مجموعہ کی سورتوں میں شامل ہے اور بلحاظ مضمون بھی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ①
اللہ کا حکم آگیا سو اس کے لیے جلدی مت کرو، وہ پاک ہے اور اس سے بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں ع۱۴۱۶

یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ ②
وہ فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے کہ بتا دو کہ میرے سوائے کوئی معبود نہیں سو میرا تقویٰ اختیار کرو ع۱۴۱۷

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ③
اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، وہ اس سے بلند ہے، جو وہ شریک بناتے ہیں۔

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ فَاِذَا ہُوَ خَصِیۡمٌ مُّبِیۡنٌ ④
انسان کو نطفہ سے پیدا کیا، پھر دیکھو وہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا ہے ع۱۴۱۸

وَ الۡاَنۡعَامَ خَلَقَہَا ۚ لَکُمۡ فِیۡہَا دِفۡءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ ۪ ⑤
اور چارپایوں کو اسی نے پیدا کیا۔ تمھارے لیے ان میں گرمی کا سامان اور کئی فائدے ہیں اور ان میں سے تم کھاتے ہو ع۱۴۱۹

ع۱۴۱۶ امر اللہ یا اللہ کے حکم کے آنے سے کیا مراد ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں وہ عذاب جس کا کفار کو وعدہ دیا جاتا تھا۔ اور سیاق بھی اسی معنی کو چاہتا ہے، پچھلی سورت کے آخر پر بھی یہی ذکر تھا۔ مگر اس عذاب کو یا مخالفت کے استیصال کو امر اللہ صرف اس لیے نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے متعلق حکم ہو چکا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے ساتھ "خدا کی بادشاہت" جس کی خوشخبری بار بار حضرت مسیح نے دی تھی زمین پر آنے والی تھی اور نبوت کے ساتھ اسلام کی بادشاہت قائم ہونے والی تھی۔ اور فلا تستعجلوہ اس لیے فرمایا کہ کفار اس عذاب کے لیے جلدی کرتے تھے ولیستعجلونك بالعذاب (العنکبوت ۲۹: ۵۴) اور اس امر اللہ کے ساتھ شرک کی نفی میں یہ اشارہ ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توحید قائم ہو گی۔

ع۱۴۱۷ روح کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۱۱ اور یہاں روح سے مراد وحی الٰہی ہی ہے کیونکہ یہاں ذکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے روح نازل کرتا ہے اور روح جو حیات ہے یا جو نفس ناطقہ ہے وہ تو سب کو ملتی ہے۔ اور اسی روح کے نازل کرنے کا نتیجہ بھی انذار ہے پس یہ یقیناً وحی الٰہی ہے اور یہاں اشارہ قرآن کریم کے نزول کی طرف ہے۔ اور پہلی آیت سے تعلق یہ ہے کہ یہ غالب آکر رہے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بیہودہ کام نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی ساری خلق ہی بالحق ہے جیسا کہ اگلی آیت میں بیان فرمایا تو حق کا نازل کرنا جس غرض کے لیے ہے ضرور ہے کہ وہ بھی پوری ہو کر رہے۔

ع۱۴۱۸ نطفۃ۔ اصل میں اَلۡمَاءُ الصَّافِی یعنی مصفّٰی پانی کو کہتے ہیں (غ۔ ت۔ ل) خواہ قلیل ہو یا کثیر دونوں کی مثال حدیث میں موجود ہے ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ سے پوچھا کہ کیا وضو کے لیے پانی ہے فجاء رجلٌ بنطفۃ فی اداوۃ تو ایک شخص لوٹے میں تھوڑا سا پانی لایا جہاں تھوڑے پانی کے لیے نطفۃ کا لفظ استعمال فرمایا۔ اور دوسری حدیث میں ہے قال لایزالُ الۡاِسۡلامُ یَزِیۡدُ واھلہ وینقص الشرك واھلہ حتّٰی یَسِیۡرَ الراکب بین النطفتین لایَخۡشٰی اِلَّا جَوۡرًا یعنی اسلام اور اس کے اہل بڑھتے رہیں گے اور شرک اور اس کے اہل گھٹتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ ایک سوار دونوں سمندروں کے درمیان چلا جائے گا اسے کوئی خوف نہ ہوگا، سوائے اس کے کہ رستہ بھول جائے۔ جہاں دو نطفوں سے مراد عرب کے دونوں طرف کے سمندر یا مغرب میں سمندر اور مشرق میں دریائے فرات ہیں جو عرب کی حدود ہیں (ل) اور نطفۃ ماء الرجل کو بھی کہا جاتا ہے جو اس کے مشہور معنی ہیں، لسان العرب میں ہے کہ یہ نام اس کی قلت کی وجہ سے ہے۔ مگر چونکہ قلت وکثرت کے دونوں مفہوم لفظ میں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ زیادہ صحیح ہوگا کہ اس کے مصفّٰی پن کی وجہ سے ہے گویا یہ ایک مصفّٰی جوہر ہے کیونکہ زمین کا خلاصہ پھلوں سبزیوں اناج میں آتا ہے جس سے انسان کی غذا بنتی ہے غذا سے مصفّٰی جوہر خون پیدا ہوتا ہے اور خون کا مصفّٰی جوہر وہ پانی ہے جس سے انسان بنتا ہے۔
آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بعد انسان کا ذکر کیا اور اس کی ابتدا کی طرف اشارہ کر کے اپنی قدرت کاملہ کا ذکر کیا کہ کس طرح پر مصفّٰی خلاصہ در خلاصہ نکلتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ انسان بنتا ہے۔ بایں انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت میں جھگڑا کرتا ہے اور اسے اس موت کے بعد زندگی جس کے لیے وحی الٰہی انسان کو تیار کرتی ہے ایک بعید بات معلوم ہوتی ہے۔

ع۱۴۱۹ دِفۡءٌ۔ بَرۡد یعنی سردی (غ) یا حِدَّۃُ الۡبَرۡدِ یعنی سردی کی تیزی (ل) کی نقیض ہے۔

وَ لَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ﴿۶﴾

اور تمہارے لیے ان میں خوبصورتی کا سامان ہے جب تم شام کو (انھیں) واپس لاتے ہو اور جب چرانے لے جاتے ہو ۱۷۲۰۔

وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷﴾

اور وہ تمہارے بوجھ ایسے مقامات کی طرف اٹھالے جاتے ہیں جہاں تم سوائے جانوں کو مشقت میں ڈالنے کے نہیں پہنچ سکتے تھے یقیناً تمھارا رب مہربان رحم کرنے والا ہے۔

وَّ الْخَيْلَ وَ الْبِغَالَ وَ الْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِيْنَةً ؕ وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾

اور گھوڑے اور خچریں اور گدھے (پیدا کیے) تاکہ تم ان پر سوار ہو اور زینت کا سامان ہوں اور وہ کچھ پیدا کرتا رہتا ہے جو تم نہیں جانتے ۱۷۲۱۔

وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹﴾ ع

اور اللہ پر ہی سیدھی راہ پر چلانا ہے اور بعض راہیں ٹیڑھی ہیں اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت کرتا ۱۷۲۲۔

هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ﴿۱۰﴾

وہی ہے جو تمھارے لیے بادل سے پانی اتارتا ہے اس سے پینے کے کام آتا ہے اور اس سے درخت (پرورش پاتے) ہیں جن میں تم چراتے ہو۔

يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّيْتُوْنَ

اسی سے وہ تمھارے لیے کھیتی اگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور

انسان سے نیچے اُتر کر چارپایوں کا ذکر کیا جو جاندار ہونے میں انسان کے شریک ہیں۔ اور یہ بتا کر کہ ان میں انسانوں کے لیے فوائد ہیں یہ ظاہر کیا کہ انسان کی زندگی کی کوئی اور بلند غرض ہے۔

۱۷۲۰ تریحون اصل اس کا روح ہے اور رَواح زوال آفتاب کے بعد کا وقت ہے گویا کہ وہ راحت کا وقت ہے اور رَاحَ کے معنی زوال آفتاب کے بعد گیا جیسا کہ جمعہ کے لیے جانے پر بولا گیا ہے اور اَرَاحَ یُرِیحُ کی مصدر اِراحۃ کے معنی ہیں اونٹ بکری کو چرانے کے بعد اس کے رات کو آرام کرنے کی جگہ واپس لانا (ل)

تسرحون۔ سَرح ایک خاص درخت ہے اور اونٹ وغیرہ کو اس درخت کے چرانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور پھر عام طور پر چرانے کے لیے لے جانے پر بولا گیا ہے (غ) تریحون کو تسرحون سے پہلے رکھنے کی وجہ لفظ جمال کا استعمال ہے کیونکہ جانور جب چر کر آئے تو زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔

۱۷۲۱ خیل کے لیے دیکھو ۳۸۵۔ بغال۔ بَغل کی جمع ہے خچر۔ حمیر حمار کی جمع ہے گدھا۔ ان کا الگ ذکر کیا اس لیے کہ یہ سواری کا کام دیتے ہیں اور اونٹ گائے بکری وغیرہ سے دوسری قسم کے فوائد زیادہ ہیں اور جب ان پر سواری کا ذکر کیا تو ساتھ ہی بڑھایا کہ اللہ تعالیٰ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے اور کرے گا جنھیں تم جانتے نہیں اور اس میں بالخصوص سواری کی ان چیزوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو ابھی ظاہر ہونے والی تھیں اور دوسری جگہ فلک یعنی کشتی کا ذکر کر کے جس سے سواری کا کام لیا جاتا ہے فرمایا وخلقنا لھم من مثلہ ما یرکبون (یٰسٓ ۳۶-۴۲) یعنی کشتی کی مثل سواری کی اور چیزیں بھی ہم پیدا کریں گے۔ اور عام بھی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ایسی ایسی مخلوق ہے جس کا انسان کو علم بھی نہیں ۞

۱۷۲۲ قصد۔ دیکھو ۸۵۴ قَصْد کے معنی رستہ کی استقامت یا سیدھا ہونا ہیں اور یہاں مصدر بمعنی فاعل ہے یعنی استقامت والا رستہ یا سیدھا رستہ ۞

جائر اس کی اصل جوار بمعنی قرب سے ہے اس لیے جارعن الطریق اصل میں بلحاظ قرب ہی بولا جاتا ہے پھر ہر ایک حق سے پھرنے کا نام ہو گیا جس سے جَوْر بمعنی ظلم ہے اور جائر کے معنے سیدھے رستہ سے پھرنے والا ہیں (غ)

جسمانی سامانوں کے مقابلہ پر روحانی سامان: جب انسان پر اپنی جسمانی نعمتوں کا ذکر کیا کہ ہم نے کیا کیا سامان اس کے لیے بنا رکھے ہیں تو اب اس طرف توجہ دلائی کہ کیا ضروری نہ تھا کہ جس نے اس قدر سامان جسمانی آسایش کے لیے بنائے ہیں وہ اخلاق اور روحانیت کے لیے بھی کوئی رستہ دکھاتا۔ اس لیے فرمایا کہ سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا ہی کام تھا اور اسی غرض کے لیے وہ وحی بھیجتا ہے۔ ہاں لوگ خود بھی رستہ تراش لیتے ہیں مگر یہ سیدھی راہیں نہیں بلکہ طریق مستقیم سے ایک طرف پھیر دینے والی ہیں ۞

وَ النَّخِيلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۱۱

انگور اور ہر قسم کے پھل یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہے جو فکر کرتے ہیں۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ۙ وَ الشَّمْسَ
وَ الْقَمَرَ ؕ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ
فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۱۲

اور اس نے تمھارے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

وَ مَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ۱۳

اور جو کچھ اس نے تمھارے لیے زمین میں پیدا کیا ہے اس کے مختلف رنگ ہیں یقیناً اس میں اُن لوگوں کے لیے نشان ہے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ ۱۷۲۳

وَ هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ
لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً
تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَی الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ
وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۱۴

اور وہی ہے جس نے سمندر کو کام میں لگا رکھا ہے تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے (موتیوں کے) زیور نکالو جنھیں تم پہنتے ہو، اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے اُسے پھاڑتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اس کا فضل طلب کرو اور تاکہ تم شکر کرو ۱۷۲۴

وَ اَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ
بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۱۵

اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈالے تاکہ وہ تمھیں کھانے کا سامان دیں اور دریا اور راستے (بنائے) تاکہ تم ہدایت پاؤ ۱۷۲۵

۱۷۲۳ الوان۔ لَون کے معنی رنگ ہیں لیکن اَلوان سے بعض وقت اجناس اور انواع بھی مراد لیجاتی ہیں مثلاً اَتی بِالْاَلوانِ من الاحادیث کے معنی ہیں طرح طرح کی باتیں کیں (رغ) یہاں بھی نعمتوں کے مختلف انواع مراد ہیں۔ رنگوں کے اختلاف کی طرف دوسری جگہ توجہ دلائی ہے اختلاف السنتکم و اَلوانکم۔

ان تمام نعمائے الٰہی کے ذکر میں ان کے پیدا کرنے والے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کس طرح زمین کے پھل اور آسمان کے ستارے یکساں انسان کے لیے فائدے کا موجب ہو رہے ہیں۔ یہ کام نہ عیسٰی مسیح کا ہے جسے عیسائیوں نے خدا بنایا، نہ رامچندر اور کرشن جی کا جن کو ہندوؤں نے خدائی کا مرتبہ دیا نہ کسی بُت کا جسے بت پرست پوجتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ اس سورج اور چاند کو بھی کسی نے کام میں لگا رکھا اور قید میں جکڑ رکھا ہے۔ ان تمام چیزوں کی حدبندیاں بتاتی ہیں کہ کوئی حدبندی کرنے والا بھی ہے اور یہ سارا نظم ظاہر کرتا ہے کہ کوئی اس نظام کو وجود میں لانے والا بھی ہے۔

۱۷۲۴ طری۔ تازہ۔ اسی سے طراوت ہے اور لحم طری سے مراد مچھلی کا گوشت ہے۔

حلیۃ تلبسونہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف عورتوں اور مردوں کو یکساں مخاطب کرتا ہے زیورات تو عورتیں ہی پہنتی ہیں او من ینشؤا فی الحلیۃ (الزخرف ۴۳۔ ۱۸) اور یہاں حلیۃ سے مراد موتی وغیرہ ہیں۔

مواخر۔ ماخِرۃ کی جمع ہے اور مَخَرت السَّفِینۃ کشتی کے پانی کو چیرنے پر بولا جاتا ہے۔

سمندر کا مسخر ہونا یہ ہے کہ کشتیوں کے ذریعہ سے انسان اس پر حکمرانی کرتا ہے اور طرح طرح کے فوائد حاصل کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے تو چیزوں کو کام میں لگا رکھا ہے مگر انسان جد وجہد کے بغیر ان سے منافع حاصل نہیں کرسکتا۔

۱۷۲۵ تمید۔ مَادَ یَمِیْدُ کے لیے دیکھو ۸۹۰ اور مَیْد کے معنی اِضْطِرَابُ الشئ العظیم بھی ہیں یعنی عظیم الشان چیز کا اضطراب جیسے زمین کا اضطراب (رغ) اور مَادَ کے معنی یہ بھی ہیں کہ ایک چیز ایک طرف مائل ہوگئی۔ اور یہ بھی کہ کچھ دوسرے کو دیا۔ اور ان تمید بکم کے معنی دونوں طرح ہوسکتے ہیں یعنی یہ کہ وہ تمھیں کھانے کا سامان دے اور یہ بھی کہ وہ اضطراب سے رک جائے اور پہلے معنی ترجمہ میں اَنھٰرا کی مناسبت سے اختیار کیے گئے ہیں کیونکہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو دریا بھی نہ ہوتے اور انسان کی روزی کے سامان کا انحصار پہاڑوں اور دریاؤں پر ہی ہے اور یہ امر کہ پہاڑ اور دریا دونوں یہاں ان تمید بکم کے حکم میں ہیں اس سے ظاہر ہے کہ انہار کو سُبُل کے ساتھ نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ دریا رستوں کا کام نہیں دیتے اور حدیث میں جو آیا ہے کہ لَمّا خلق اللہ الارض جعلت تمید فَاَرْسٰھا بالجبال یعنی جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو اس میں بہت اضطراب تھا۔

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجۡمِ هُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۶﴾

اور بڑے بڑے نشان اور ستاروں سے وہ راہ پاتے ہیں۔

اَفَمَنۡ يَّخۡلُقُ كَمَنۡ لَّا يَخۡلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۱۷﴾

تو کیا جو پیدا کرتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو پیدا نہیں کرتا، سو کیوں تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ۱۷۲۶

وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۸﴾

اور اگر اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انھیں گن نہ سکو گے یقیناً اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۷۲۷

وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ﴿۱۹﴾

اور اللہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔

وَالَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَا يَخۡلُقُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّهُمۡ يُخۡلَقُوۡنَ ؕ ﴿۲۰﴾

اور وہ جنھیں یہ اللہ کے سوائے پکارتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے گئے ہیں۔

اَمۡوَاتٌ غَيۡرُ اَحۡيَآءٍ ۚ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ۙ اَيَّانَ يُبۡعَثُوۡنَ ﴿۲۱﴾ ع

مُردے ہیں نہ زندے اور وہ نہیں جانتے کہ کب اُٹھائے جائیں گے ۱۷۲۸

اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ قُلُوۡبُهُمۡ مُّنۡكِرَةٌ وَّهُمۡ مُّسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۲۲﴾

تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، سو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل انکاری ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں ۱۷۲۹

تب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ قائم کیے سو یہ بالکل درست ہے اور سائنس بھی اس پر شاہد ہے کہ پہاڑوں کے بن جانے سے زمین کا اضطراب زلزلوں کے رنگ میں کم ہو گیا۔

۱۷۲۶ انسان کے لیے ان بیشمار نعمتوں کے خلق کا ذکر کر کے اب فرماتا ہے کہ یہ سب نعمتیں پیدا کرنے والا اور وہ جو پیدا نہیں کرتا کیا یہ دونوں یکساں ہیں من یخلق صرف ذات باری ہے له الخلق خالق کل شئ اور لا یخلق کل معبودان باطل ہیں۔ اور چونکہ دلیل عبادت خلق ہے پس جنھوں نے پیدا نہیں کیا وہ معبود بھی نہیں ہو سکتے اور یہ بھی سمجھایا کہ جو چیزیں تمہارے ہی فائدہ کے لیے پیدا کی گئی ہیں ان سے بجائے کام لینے کے انہیں اپنا معبود بناتے ہو۔

۱۷۲۷ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ذکر کے بعد غفور اور رحیم کی صفات کا اس لیے ذکر کیا کہ انسان بہتیری نعمتوں کی ناشکر گزاری بھی کرتا ہے اور ان کی پروا نہیں کرتا اس پر اللہ تعالیٰ اپنے غفر سے کام لیتا ہے اور جس نعمت سے فائدہ اُٹھاتا ہے اس پر صفت رحیمیت نتیجہ مترتب فرماتی رہتی ہے۔ اگلی آیت میں ما تسرون وہی نعمتیں ہیں جن سے انسان فائدہ نہ اٹھا کر انہیں گویا چھپاتا ہے اور ما تعلنون وہ جن کا وہ اپنے عمل سے اظہار کرتا ہے۔

۱۷۲۸ یہ دونوں آیتیں بتاتی ہیں کہ وہ انسان جن کو لوگ خدا کر کے پکارتے تھے وہ مر چکے تھے کوئی ان میں سے زندہ نہ تھا اور نہ ان کو یہ علم تھا کہ وہ خود کب اُٹھائے جائیں گے ان باتوں کا ذکر کیوں فرمایا؟ اس لیے کہ اوپر فرمایا تھا کہ وہ جو پیدا کرتا ہے اس کی طرح نہیں ہو سکتا جو پیدا نہیں کر سکتا اور چونکہ وہ انسان جنہیں خدا بنایا گیا ان کے متعلق بھی خود ان کے پرستاروں کو یہ اعتراف ہے کہ انھوں نے پیدا کچھ نہیں کیا۔ اس لیے یوں اتمام حجت کر کے اب بتایا کہ انھوں نے نہ صرف کچھ پیدا ہی نہیں کیا بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور مخلوق کی جو حالت ہوتی ہے وہ ان پر آئی یعنی وہ مر گئے اور بعثت چونکہ دوسری پیدائش کا نام ہے اس لیے فرمایا کہ جب انھیں پہلی خلق میں کچھ حصہ نہیں تو دوسری میں بھی نہیں، ان آیات سے یہ یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کو انسانوں کے ایک بڑے حصہ نے خدا بنایا ہے وہ بھی اس آیت کے نزول کے وقت مردوں میں داخل تھے۔ اموات کے بعد غیر احیاء تاکید کے طور پر لایا گیا ہے کیونکہ اموات سے یہ مراد بھی ہو سکتی تھی کہ آئندہ کبھی ان پر موت آ جائے اس لیے فرمایا کہ نہیں وہ اس وقت بھی زندہ نہیں۔ عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ روح القدس جو جبرائیلؑ کا نام ہے وہ اموات غیر احیاء میں داخل نہیں اس لیے غلط ہے کہ اوّل عیسائیوں کے نزدیک روح القدس جبرائیلؑ کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک فرضی اقنوم ہے اور دوسرے یہاں انسانوں کا ذکر ہے جنہیں خدا بنایا گیا کیونکہ یہاں بعثت کا ذکر ہے اور بعثت صرف انسانوں کے لیے ہے اور تیسرے روح القدس سے عیسائی دعائیں نہیں مانگتے جس طرح مسیح سے مانگتے ہیں۔

۱۷۲۹ منکرة۔ انکار جو ضد عرفان ہے اصل اس کی یہ ہے کہ دل پر کوئی بات وارد ہو جسے وہ تصور میں نہیں لا سکتا اور یہ ایک قسم کی جہالت ہے (غ) یہاں مراد ہے منکرة للوحدانیۃ (د)

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَمَا
يُعۡلِنُوۡنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الۡمُسۡتَكۡبِرِيۡنَ ﴿٢٣﴾

حق یہی ہے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو
ظاہر کرتے ہیں، وہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ١٤٣٠ء

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ مَّاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّكُمۡ ۙ
قَالُوۡۤا اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿٢٤﴾

اور جب انھیں کہا جاتا ہے تمھارے رب نے کیا اتارا ہے
کہتے ہیں پہلوں کی کہانیاں۔

لِيَحۡمِلُوۡۤا اَوۡزَارَهُمۡ كَامِلَةً يَّوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ۙ
وَمِنۡ اَوۡزَارِ الَّذِيۡنَ يُضِلُّوۡنَهُمۡ بِغَيۡرِ
عِلۡمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوۡنَ ﴿٢٥﴾ ع

کہ اپنے بوجھ قیامت کے دن پورے اٹھائیں اور ان کے
بوجھوں سے بھی جنھیں علم کے بغیر گمراہ کرتے ہیں۔ سنو برا بوجھ
ہے جو وہ اٹھاتے ہیں ١٤٣١ء

قَدۡ مَكَرَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَاَتَى اللّٰهُ
بُنۡيَانَهُمۡ مِّنَ الۡقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيۡهِمُ
السَّقۡفُ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ وَاَتٰٮهُمُ الۡعَذَابُ
مِنۡ حَيۡثُ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿٢٦﴾

انھوں نے بھی (حق کے خلاف) تدبیریں کیں جو ان سے پہلے تھے
سو اللہ نے ان کی عمارت کو بنیادوں سے گرایا، سو چھت ان کے
اوپر سے اُن پر آ گری اور عذاب اُن پر آ پہنچا، جہاں
سے انھیں خیال نہ تھا ١٤٣٢ء

ثُمَّ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُخۡزِيۡهِمۡ وَيَقُوۡلُ
اَيۡنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِيۡنَ كُنۡتُمۡ تُشَآقُّوۡنَ
فِيۡهِمۡ ؕ قَالَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ اِنَّ
الۡخِزۡىَ الۡيَوۡمَ وَالسُّوۡۤءَ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿٢٧﴾ ۙ

پھر قیامت کے دن انھیں رسوا کرے گا اور کہے گا میرے
شریک کہاں ہیں جن میں تم (حق کی) مخالفت کرتے تھے،
جنھیں علم دیا گیا ہے، کہیں گے آج کی رسوائی اور خرابی
کافروں پر ہے ١٤٣٣ء

الَّذِيۡنَ تَتَوَفّٰٮهُمُ الۡمَلٰۤٮِٕكَةُ ظَالِمِىۡۤ
اَنۡفُسِهِمۡ ۖ فَاَلۡقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعۡمَلُ

جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں (دراں حالیکہ) وہ
اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں، تب وہ فرمانبرداری

پہلے رکوع میں صحیفۂ قدرت سے وحی الٰہی پر اور دوسرے میں توحید پر دلائل دیئے تھے۔ اب دونوں باتوں کو ملا کر فرماتا ہے کہ جو لوگ زندگی بعد الموت کو نہیں مانتے ان کے دل درحقیقت توحید الٰہی سے بھی انکاری ہیں۔ گویا وہ توحید الٰہی کی حقیقت کو بھی نہیں پہچانتے یوں برائے نام اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرتے ہیں اور متکبر انکو اس لحاظ سے کہا کہ وہ اعمال کی ذمہ داری نہیں سمجھتے۔

١٤٣٠ء لا جرم جَرَم کے معنی ہیں گناہ کمایا۔ اور لاجَرَم محاورہ کے طور پر اسی طرح استعمال ہوتا ہے جیسے لابُدَّ۔ لا محالۃ۔ اور اس کے معنی ہیں کہ حق یوں ہی ہے (ل)

١٤٣١ء لیحملوا میں لام عاقبت کا ہے۔ یعنی ان کے ایسی باتیں کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ خود بھی گمراہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں وحی الٰہی کو جو انسان کے اعمال کی ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتی ہے اور بتاتی ہے کہ کوئی عمل بے نتیجہ نہیں رہیگا کہانیاں کہنے کا یہ نتیجہ ہے کہ اصلیت پر غور نہیں کرتے گمراہی میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور کاملۃً اس بوجھ کو اسی لحاظ سے کہا کہ جس حد تک یہ بڑھ سکتا تھا انہوں نے اسے بڑھایا۔

١٤٣٢ء خلاف حق تدابیر کا انجام: جب یہ بتایا کہ توحید الٰہی کا علم درحقیقت وحی الٰہی سے ہی آتا ہے تو اب ان لوگوں کا ذکر کیا جو اس عظیم الشان امر حق کی مخالفت میں تدبیریں کر کے اسے نیست و نابود کرنا چاہتے تھے اور اس آیت میں سمجھایا ہے کہ ان کی تمام تدابیر بمنزلہ ایک بڑی عمارت کے ہیں جس کی بنیادوں کو اللہ تعالیٰ کھوکھلا کر دیگا اور بجائے اس کے کہ اس عمارت سے حق کو نقصان پہنچے یہ خود ہی ان تدابیر سے نقصان اٹھائیں گے بنیان سے مراد یہاں ان کی تدابیر کی عمارت ہے دیکھو ١٣٥٠ء۔

١٤٣٣ء الذین اوتوا العلم۔ اول انبیاء علیہم السلام پھر ان کے حقیقی متبع ہیں وہ قیامت کو بھی ایسا کہیں گے اس دنیا میں بھی کہتے ہیں۔

مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓی اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

ظاہر کریں گے (کہیں گے) ہم کوئی بدی نہیں کرتے تھے، ہاں اللہ خوب جانتا ہے جو تم کرتے تھے ؏۱۲۳۴

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِیْنَ ﴿۲۹﴾

سو دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اسی میں رہو گے یقیناً متکبروں کا ٹھکانا بہت بُرا ہے۔

وَقِیْلَ لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَیْرًا ؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۳۰﴾

اور جو تقوےٰ کرتے ہیں انھیں کہا جاتا ہے تمھارے رب نے کیا اتارا؟ کہتے ہیں بھلائی جو لوگ نیکی کرتے ہیں ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر یقیناً بہتر ہے اور متقیوں کا گھر کیا ہی اچھا ہے ؏۱۲۳۵

جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِیْهَا مَا یَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ یَجْزِی اللّٰهُ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۳۱﴾

ہمیشگی کے باغ جن میں داخل ہوں گے، اُن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان کے لیے اُن میں ہے جو کچھ وہ چاہیں۔ اسی طرح اللہ متقیوں کو جزا دیتا ہے۔

الَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ ۙ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں (درآنحالیکہ) وہ پاک ہیں کہتے ہیں تم پر سلامتی ہو جنت میں داخل ہو جاؤ، اس کا بدلہ جو تم کرتے تھے۔

هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ یَاْتِیَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾

وہ سوائے اس کے اور کچھ انتظار نہیں کرتے کہ اُن پر فرشتے آجائیں یا تیرے رب کا حکم آجائے اسی طرح انھوں نے کیا جو ان سے پہلے تھے اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ اپنی جانوں پر آپ ہی ظلم کرتے تھے ؏۱۲۳۶

فَاَصَابَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾ ع

سو جو وہ عمل کرتے تھے اسی کی بُرائیاں اُن پر آئیں اور اسی نے انھیں آلیا جس پر وہ ہنسی کرتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا

اور جو شرک کرتے ہیں وہ کہتے ہیں اگر اللہ چاہتا تو ہم اس

؏۱۲۳۴ سَلَم کے معنی استسلام یا فرمانبرداری یا اطاعت ہیں گویا اس دن کہیں گے کہ ہم تو فرمانبرداری ہی کرتے تھے اور کوئی بُرا کام نہیں کرتے تھے۔ گویا جھوٹ عذر پیش کریں گے جیسا دوسری جگہ ہے واللہ ربنا ما کنا مشرکین (الانعام ۶-۲۳)

؏۱۲۳۵ ان دونوں رکوعوں کا مضمون ایک ہونا اس سے ظاہر ہے کہ پچھلے رکوع میں یہی سوال کفار پر ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں یوں ہی قصے ہیں ماننے کے قابل باتیں نہیں (۲۴) یہاں وہی سوال مومنوں سے ہے۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ وحی الٰہی انسانوں کی بھلائی کے سامان اپنے اندر رکھتی ہے سو اللہ تعالیٰ ان کو دنیا کی بھی اور آخرت کی بھی بھلائی عطا فرماتا ہے۔ طیب کے معنی پر دیکھو ؏۵۷۴

؏۱۲۳۶ اس کے معنی پر بحث ؏۲۶۹ میں گزر چکی۔ یہاں آخر پر فرمایا کہ ایسے حالات میں عذاب ان پر آئے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظلم نہیں بلکہ ان کا اپنا ظلم اپنی جانوں پر ہے۔

عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ
وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ
مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ
الْمُبِيْنُ ﴿٣٥﴾

کے سوائے کسی چیز کی عبادت نہ کرتے (نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے (حکم کے) سوائے کوئی چیز حرام ٹھیراتے اسی طرح انھوں نے کیا جو اُن سے پہلے تھے۔ سو رسولوں پر سوائے کھول کر پہنچا دینے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ
اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ
مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ
الضَّلٰلَةُ ۭ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٦﴾

اور یقیناً ہم نے ہر ایک قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو، سو اُن میں سے کوئی ایسا تھا جسے اللہ نے ہدایت دی اور کوئی ان میں سے ایسا تھا جس پر گمراہی ثابت ہوئی، سو زمین میں چلو پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا ع۱۴۳۷

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰي هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا
يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٣٧﴾

اگر تو ان کی ہدایت کی آرزو کرتا ہے تو اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا جس پر وہ گمراہی کا فتویٰ لگا دیتا ہے ع۱۴۳۸ اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہونگے

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا
يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ۭ بَلٰى وَعْدًا
عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ

اور اللہ (تعالیٰ) کی قسم کھاتے ہیں سخت ترین قسم، کہ جو مر جاتا ہے اللہ (تعالیٰ) اُسے نہیں اُٹھائے گا ہاں، یہ وعدہ ہے سچا، جو اس کے ذمہ ہے،

ع۱۴۳۷ ان دو آیتوں میں باطل پرستوں کے اس عذر باطل کا فیصلہ کیا ہے کہ اللہ چاہتا تو ہم ایسا نہ کرتے۔ گویا اللہ ہی یہ چاہتا ہے کہ لوگ شرک کریں اگر وہ یہ چاہتا کہ شرک نہ کریں تو انہیں روک دیتا۔ اس کا جواب دیا ہے کہ اللہ تو رسولوں کو اسی لیے بھیجتا ہے کہ لوگ شرک سے بچیں فهل على الرسل الا البلٰغ المبین۔ لیکن رسولوں کا کام صرف پیغام کو پہنچا دینا ہے وہ جبراً نہیں روکتے۔ اگر اس کا ہی منشا یہ ہوتا کہ لوگ شرک کریں تو پھر وہ رسولوں کو شرک کے خلاف تعلیم دے کر کیوں بھیجتا۔ پھر آیت ۳۶ میں اس کو اور تقویت دی کہ ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجے کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے یعنی غیر اللہ کی پرستش سے بچو۔ پھر اس تعلیم کے آنے پر دو گروہ ہو جاتے ہیں ایک وہ جنھیں اللہ ہدایت دے دیتا ہے یعنی وہ ہدایت کو قبول کر لیتے ہیں اور دوسرے وہ جن پر ضلالت یعنی گمراہی ثابت ہو جاتی ہے۔ اب اس دوسرے فریق کے متعلق فرمایا کہ ان پر گمراہی ثابت ہو جاتی ہے یعنی ان کی تکذیب اور مخالفت حق اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ان افعال کی وجہ سے ان پر گمراہ ہونے کا فتویٰ لگا دیتا ہے۔ چنانچہ آیت کے آخر پر مکذبین کا ذکر کر کے اسے صاف کر دیا کہ وہ خود تکذیب حق میں یہاں تک بڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر بطور سزا یہ حکم لگ جاتا ہے۔ اور یہ وہ حالت ہوتی ہے جب انسان کو اپنے ان بُرے افعال سے آہستہ آہستہ اس قدر پیار ہو جاتا ہے کہ وہ گویا اس کی طبیعت کا جزو ہو جاتے ہیں دیکھو ع۴۱ اسی لیے اگلی آیت میں یہ لفظ اختیار فرمائے ہیں فان الله لا يهدی من يضل یعنی جب یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے تو پھر وہ ہدایت سے بہت دور جا پڑتا ہے۔ اس لیے اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا۔ اور جو بعض جگہ ایسے لفظ آ جاتے ہیں جیسے ولو شاء الله ما اشركوا (الانعام ۶۔۱۰۷) یا فلو شآء لهدٰكم اجمعين (الانعام ۶۔۱۵۰) تو ان کا مفہوم بھی اسی کے مطابق ہے کیونکہ مطلب یہاں بھی یہی ہے کہ ہم نے انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ ایک راہ اختیار کرے یا دوسری یعنی اس کی مشیت یہی ہے کہ انسان مجبور محض نہ ہو۔ نہ وہ شرک پر مجبور ہے نہ اللہ تعالیٰ اسے ہدایت پر مجبور کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور ہی کرنا ہوتا تو وہ ہدایت پر مجبور کرتا جیسے دوسری مخلوق کو کیا ہے شرک پر کسی صورت میں مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ پس ماحصل دونوں کے الفاظ کا ایک ہے۔

ع۱۴۳۸ من یضل کے ایک معنی وہ ہیں جو ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں اور جن کی تشریح اوپر گزر چکی اور دوسرے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا جو دوسروں کو گمراہ کرتا ہے اور مآل ایک ہے۔ اس لیے کہ ایک شخص کی جب گمراہی سے محبت ترقی کر کے اس کی طبیعت کا جزو ہو جاتی

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾

تاکہ اُن پر وہ باتیں کھول دے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور تاکہ جو کافر ہیں وہ جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾ ع

ہمارا فرمان کسی چیز کے لیے جب ہم اس کا ارادہ کریں صرف یہی ہوتا ہے کہ ہم اسے کہدیں ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے۔ ۱۷۳۹ء

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

اور جن لوگوں نے اس کے بعد جو اُن پر ظلم کیا گیا، اللہ کے لیے ہجرت کی ہم ضرور انھیں دنیا میں اچھی جگہ دیں گے اور آخرت کا بدلہ تو بڑا ہے کاش وہ جانتے۔ ۱۷۴۰ء

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾

جنھوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب پر ہی بھروسا کرتے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور ہم نے تجھ سے پہلے مرد ہی بھیجے تھے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ تو اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔ ۱۷۴۱ء

بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۗ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ

کھلی دلائل اور کتابوں کے ساتھ (انھیں بھیجا) اور ہم نے

ہے تو پھر وہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنا شروع کرتا ہے۔

۱۷۳۹ء ان کے عذر باطل کا فیصلہ کرکے اب ان کی اصل بیماری کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ انہیں آخرت پر ایمان نہیں اور اللہ تعالیٰ کو وہ اس بات پر قادر نہیں جانتے کہ موت کے بعد وہ انھیں پھر زندہ کرے اس لیے آخر پر فرمایا کہ اس کے حکم سے پہلے بھی خلق ہوئی ہے اسی کے حکم سے دوبارہ بھی ہوجائے گی۔

۱۷۴۰ء دکھوں کے وقت کامیابی کی بشارت: اس آیت میں جو ہجرت کا ذکر ہے تو اس سے دونوں ہجرتوں کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے یعنی پہلی ہجرت جو ملک حبش کی طرف ہوئی اور دوسری ہجرت جو مدینہ کی طرف ہوئی۔ کیونکہ مدینہ کی ہجرت بھی نبی کریم صلعم کی مکہ میں موجودگی میں ہی شروع ہوگئی تھی اور آپؐ نے سب سے آخر ہجرت کی۔ ان لوگوں کو جو اس بے سروسامانی میں اپنے گھروں سے نکلے اور جن کی کوئی بڑی تعداد بھی نہ تھی اتنی بڑی بشارت کہ ہم انھیں دنیا میں بھی اچھی جگہ دیں گے قرآن کریم کی ان بےنظیر پیشگوئیوں میں سے ایک ہے جن کے سامنے سخت سے سخت معاند کو بھی سر جھکانا پڑتا ہے۔ یہ مکی سورت ہے مکہ میں اس کا اعلان ہوتا ہے اور ان لوگوں کے متعلق جو کس مپرسی کی حالت میں کفار کے ہاتھ دُکھ اُٹھا کر بھاگے جا رہے ہیں یہ بآواز بلند ان کے مخالفین کو سنایا جاتا ہے کہ ان کا استیصال نہیں ہوگا جیسا کہ تم نے گمان کرلیا ہے بلکہ ان کو دنیا میں ہی مقامات بلند عطا ہونگے۔ سارا ملک چند نفوس کے استیصال کے درپے ہو یہ کسی کے وہم میں بھی نہ آسکتا تھا کہ یہی چند نفوس اس دنیا میں بھی اعلیٰ مقامات پر پہنچیں گے اس قسم کی پیشگوئیوں کے پورا ہونے نے ہی ملک عرب کو آخر آنحضرت صلعم کے سامنے جھکا دیا۔

۱۷۴۱ء ذکر کے لیے دیکھو ۱۹۱ء و ۱۰۴۷ء وغیرہ الذکر قرآن کریم کا نام خصوصیت سے ہے اور ہر ایک وحی کو بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس لیے اھل الذکر سے مراد یہاں اہل کتاب بھی ہوسکتے ہیں کیونکہ سوال صرف اس قدر ہے کہ انسان ہی ہمیشہ رسول ہوکر آتے رہے یا نہیں اور مسلمان بھی مراد ہوسکتے ہیں کیونکہ اصل غرض صرف ان پر اتمام حجت ہے۔ یعنی تم ان باتوں کو جانتے تو ہو لیکن اگر نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو۔ اور اگلی آیت میں قرآن شریف کا ہی نام الذکر لے کر اسی دوسرے معنی کی تائید کی ہے۔

عورت کی نبوت: رجال کا لفظ یہاں آنے پر یہ بحث ہوئی ہے کہ اس آیت کی تصریح کے بموجب عورت رسول تو نہیں ہوسکتی مگر آیا وہ نبی بھی ہوسکتی ہے یا نہیں۔ روح المعانی میں ہے کہ عورتوں کی نبوت کے صحیح ہونے کی ایک جماعت قائل ہے۔ سو اصل یہ ہے کہ اس نبوت سے مراد محض اللہ تعالیٰ کی ہمکلامی ہے یعنی نبوت اپنے لغوی معنی میں جس کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے جاری ہے، لیکن اصطلاح شرعی میں نبوت چونکہ ماموریت کو چاہتی ہے اس لیے وہ رسالت سے الگ نہیں ہوسکتی اور اس لیے اصطلاح شریعت میں نبوت عورتوں کو نہیں ملتی۔

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٤٤﴾

تیری طرف ذکر بھیجا ہے تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دے جو اُن کی طرف اتارا گیا ہے اور تاکہ وہ فکر سے کام لیں۔

أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٤٥﴾

تو کیا وہ جو بُرائی کی تدبیریں کرتے ہیں اس بات سے نڈر ہو گئے ہیں کہ اللہ ان کو ملک میں ذلیل کر دے یا ان پر ایسی طرف سے عذاب آجائے جس کا انھیں خیال بھی نہیں ع۱۴۴۲

أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿٤٦﴾

یا وہ انھیں اُن کے آنے جانے میں پکڑ لے تو وہ اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتے۔

أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿٤٧﴾

یا وُہ انھیں تھوڑا تھوڑا گھٹا کر پکڑ لے سو تمھارا رب مہربان رحم کرنے والا ہے ع۱۴۴۳

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ ﴿٤٨﴾

کیا وہ ہر اس چیز کو نہیں دیکھتے جو اللہ نے پیدا کی ہے اس کے سائے بھی دائیں اور بائیں سے ڈھلتے ہیں اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں ع۱۴۴۴

ع۱۴۴۲ یخسف۔ خُسُوف چاند کی اور کسُوف سورج کی روشنی کے جاتے رہنے کا نام ہے اور عَیْنٌ خَاسِفَةٌ وہ چشمہ ہے جو غائب ہو جائے اور خَسف کا استعمال استعارۃً ذلت پر بھی ہوتا ہے۔ (غ) اور خَسف کے معنی ہذال اور ذلت اور اذلال یعنی کسی کو ذلیل کرنا بھی آتے ہیں اور خسف بہ الارض کے معنی ہیں اسے زمین میں غائب کر دیا (ل)۔

اس آیت میں آنحضرت صلعم کے مخالفین کے عذاب کا ذکر ہے۔ اور سب سے پہلے ان کے خسف کا ذکر کیا۔ اگر خسف سے مراد زمین میں دھنسانا لیا جائے تو یہ عذاب عام طور پر آپؐ کے مخالفین پر نہیں آیا۔ ایک آدھ واقعہ جیسے سراقہ کا الگ امر ہے لیکن خسف کے دوسرے معنی یعنی ذلیل کرنا آپؐ کے مخالفین پر اپنی عمومیت میں صادق آئے ہیں اس لیے وہی معنی یہاں لیے جائیں گے۔

ع۱۴۴۳ تخوف۔ خَوف کے معنی کسی مکروہ امر کی توقع ہیں جو ظنی یا یقینی علامات سے ہو اور تخویف کے معنی ایسے امور سے بچنے کی تحریص ہیں ذٰلک یخوف اللہ بہ عبادہ (الزمر ۳۹-۱۶) انما ذٰلکم الشیطان یخوف اولیآءہ (آل عمران ۳-۱۷۵) اور تخوفناھم کے معنی ہیں ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے یعنی تدریجاً کم کیا جس کا اقتضا خوف ہو اور تخوف کے معنی تنقص ہیں (ل) اور ابن جریر میں اس کے معنی دیئے ہیں کہ ان کو اطراف و نواحی سے تھوڑا تھوڑا کر کے کم کرتا جائے، یہاں تک کہ سب کو ہلاک کر دے۔

ان تین آیات میں عذاب کے تین رنگ بیان کیے ہیں ایک ان پر ذلّت وارد کرنا، دوسرے ان کے آنے جانے یا سفروں میں ان کو پکڑنا اور تیسرے تدریجاً انہیں کم کرتے چلے جانا۔ یہاں بڑی صراحت اور صفائی سے اس عذاب کا ذکر ہے جو آپ کے مخالفین پر آنے والا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ عام طور پر ان کی مغلوبیت کا ذکر بہت دفعہ کیا ہے مگر یہاں اس مغلوبیت کی صورتیں بھی بتا دی ہیں اور انہی رنگوں میں سے ایک نہ ایک رنگ میں اہل مکہ پر یہ عذاب آیا۔ ان کے آنے جانے کے ذکر میں ان کے تجارتی سفروں کی طرف اشارہ ہے جو وہ شام کی طرف کرتے تھے انہی سفروں پر ان کی تجارت اور خوشحالی کا دار و مدار تھا اور مسلمانوں کی مدینہ میں موجودگی اسی رنگ میں سب سے بڑھ کر ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔

ع۱۴۴۴ یتفیّؤا۔ فیٔ کے معنی اچھی حالت کی طرف لوٹ آنا ہیں۔ اور فاء اور فیٔ اس سایہ پر بولا جاتا ہے جو لوٹ کر آتا ہے یعنی زوال کے بعد (غ) اور تفیّؤا اس سے باب تفعّل ہے۔

داخرون۔ دَخَرَ کے معنی ہیں ذلیل و حقیر ہوا۔ دَاخِر ذلیل ہونے والا۔

سایوں کے سجدہ کرنے کی تشریح ع۱۶۰۹ میں گزر چکی۔ یہاں سایوں کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے اگلی آیت میں خود ہر چیز کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے۔ یہاں کفار کی ذلت کا ذکر کر کے پھر یہ ذکر کیا ہے کہ ہر چیز کے سائے بھی ذلیل ہو کر سجدہ کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اور اس کے اصل قوانین کے سامنے ہر چیز کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے یہ کافر اس قانون سے باہر نہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور اللہ کی ہی فرمانبرداری کرتے ہیں جو کوئی جاندار آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے ہیں۔ ۱۴۴۵

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ السجدۃ ۳ ع

وہ اپنے رب سے جو اُن پر غالب ہے ڈرتے ہیں اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے کرتے ہیں۔ ۱۴۴۶

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾

اور اللہ نے کہا ہے کہ دو معبود مت بناؤ، وہ صرف اکیلا ہی معبود ہے سو مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔ ۱۴۴۷

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور فرمانبرداری اسی کی لازم ہے تو کیا اللہ کے سوائے کسی اور کا تقویٰ کرو گے؟ ۱۴۴۸

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْــَٔــرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جو کوئی نعمت تمہارے پاس ہے سو اللہ کی طرف سے ہے، پھر جب تمہیں دکھ پہنچتا ہے تو اسی کی طرف تم فریاد لے جاتے ہو۔ ۱۴۴۹

ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾

پھر جب وہ تم سے دُکھ دور کر دیتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ شریک بناتے ہیں۔

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

تاکہ اس کی ناشکری کریں جو ہم نے انھیں دیا ہے۔ سو چند روزہ فائدہ اٹھا لو آخر جان لو گے۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا

اور وہ ان کے لیے جو (کچھ) نہیں جانتے اس کا ایک حصہ مقرر

ع۱۴۴۵ ملائکۃ کا عطف دابۃ پر بتاتا ہے کہ فرشتے الگ قسم کی مخلوق ہیں اور معمولی جانداروں میں شمار نہیں ہوتے دابۃ وہ ہیں جنہیں حرکت جسمانی ہے کیونکہ اس کا اصل دَبّ سے ہے جس کے معنے ہلکا چلنا ہیں۔

ع۱۴۴۶ من فوقھم اللہ تعالٰے کے ان کے اوپر ہونے سے مراد اس کا قہر اور اس کا غلبہ ہے کیونکہ فوقیت مکانی کی نسبت اس کی طرف نہیں ہو سکتی (ر) اور اس میں بظاہر ملائکہ کی طرف ضمیر جاتی ہے اور یخافون ربھم میں رب کے خوف سے مراد اس کے حکم کی خلاف ورزی کا خوف ہے۔

ع۱۴۴۷ دو خداؤں اور تین خداؤں کا عقیدہ لوگوں نے علی الاعلان اختیار کیا ہے اور دونوں عقیدوں کی تردید قرآن کریم نے کھلے الفاظ میں کی ہے۔ گو جعل الظلمٰت والنور میں بھی اس کی تردید ہو چکی ہے دیکھو ع۹۰۱ مگر یہاں اثنین کا لفظ لا کر یہ صاف کر دیا کہ ثنویہ کا عقیدہ غلط ہے اس کی دلیل لہ ما فی السمٰوات والارض اگلی آیت میں ہے خود فطرت انسانی دو خداؤں کے عقیدہ کو قبول نہیں کر سکتی۔ دو خدا جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں ان دونوں سے ایک انسان کس طرح ڈر سکتا ہے۔

ع۱۴۴۸ لہ الدین واصبا۔ دین کے معنی جزا بھی ہیں اور طاعت بھی۔ اور واصب وَصَب سے ہے جس کے معنی سقم لازم ہیں۔ اگر دین کے معنی جزا لیے جائیں تو یہ ذکر بطور وعید کے ہے کہ جو شخص دو خدا بناتا ہے اس کی سزا عذاب لازم ہے اور اگر دین بمعنی اطاعت لیا جائے اور یہی قرینہ چاہتا ہے تو واصب کے معنی دائم لیے جائیں گے اور مطلب یہ ہو گا کہ انسان پر یہ لازم ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے (غ) یہ بھی فطرت کی شہادت ہے کیونکہ دو آقاؤں کی فرمانبرداری نہیں ہو سکتی۔

ع۱۴۴۹ تجئرون۔ جَأَرَ کے معنی ہیں دعا میں مبالغہ اور تضرّع کیا یعنی بہت فریاد اور زاری کی اور جُؤَار اصل میں وحشی کے چیخنے کو کہا جاتا ہے (غ) یہ تیسری شہادت فطرت انسانی کی ہے کہ دکھ کے وقت وہ صرف ایک خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔

رَزَقْنٰهُمْ ؕ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾

کرتے ہیں جو ہم نے انھیں دیا ہے اللہ کی قسم ضرور تم سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا جو تم افترا کرتے تھے [۱۷۵۰]

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھیراتے ہیں، وہ پاک ہے اور اُن کے لیے ہے جو وہ چاہتے ہیں۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ ۚ

اور جب ان میں سے ایک کو لڑکی کی خبر دی جاتی ہے اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصہ سے بھرا ہوتا ہے [۱۷۵۱]

يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

وہ اس خبر کی بُرائی سے جو اسے دی جاتی ہے، لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کیا اسے ذلت کے ساتھ رہنے دے یا اسے مٹی میں گاڑ دے سنو بہت بُرا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں [۱۷۵۲]

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾ ع ۷ ۱۴

جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اُن کی بُری مثال ہے اور اللہ کی صفت نہایت بلند ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے [۱۷۵۳]

ع۱۷۵۰ لما لا یعلمون میں ضمیر الھۃ کی طرف ہے جن کے بنانے کا ذکر یجعلون میں ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے یعنی کچھ علم نہیں رکھتے اور خود کفار کی طرف بھی ہو سکتی ہے یعنی وہ کفار ان معبودوں کی اصل حقیقت سے کچھ بھی واقف نہیں ؃

تاللہ ۔ ت عموماً افعال کی ابتدا یا آخر میں آتی ہے جیسے تضرب ۔ ضربت لیکن اسماء کی ابتدا اور آخر میں بھی آتی ہے اور ابتدا میں اسم اللہ کے ساتھ مخصوص ہے اور تعجب کے لیے آتی ہے اور اس کے معنی قسم ہوتے ہیں اور ب اور و سے جو قسم آتی ہے اس سے بڑھ کر اس میں تعجب کے معنی ہوتے ہیں (مغنی)

ع۱۷۵۱ ظَلّ ۔ ظلّ کے معنی بیان ہو چکے ہیں ۔ ظَلّ (ظَلْتُ ایک لام کے حذف سے اور ظللت) اس کام پر بولا جاتا ہے جو دن کے وقت کیا جائے اور پھر اس کے معنی صار کی طرح ہو گئے ہیں (غ)

وجھہ مسودا ۔ چہرہ کی سیاہی سے مراد غم فکر نفرت وغیرہ کا پیدا ہونا ہے (ر) سچ مچ سیاہ ہونا مراد نہیں ؃

توجہ دلائی ہے کہ کس قدر انسان اپنے فعل سے خود الزام کے نیچے ہے اپنے خدا کی طرف بیٹیاں منسوب کرنے والے لوگ اپنے ہاں بیٹی کی خبر کو کس قدر بُرا مناتے ہیں ۔ گویا خود فطرت انہیں ملزم کر رہی ہے ۔

ع۱۷۵۲ یتوارٰی ۔ وری سے ہے دیکھو ع۸۱۶ اور اس کے معنی ہیں اپنے آپ کو چھپاتا ہے ۔

یدس ۔ دَسّ ایک چیز کا دوسری میں جبر کے ساتھ داخل کرنا ہے (غ) اور دَسَسْتُ الشئی فی التُّراب کے معنی ہیں ایک چیز کو مٹی میں چھپا دیا اور یہاں مراد زندہ دفن کرنا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا واذا الموءدۃ سئلت (التکویر ۸۱ ـ ۸) اور یدسہ میں ضمیر مذکر ہے (ایسا ہی یمسکہ میں) اس لیے کہ بلحاظ لفظ ضمیر ما بشر بہ کی طرف جاتی ہے اور قد خاب من دسّٰھا (الشمس ۹۱ ـ ۱۰) میں یہی مادہ ہے (ل) اس لیے کہ وہاں بھی بمقابلہ تزکیہ کے جس میں نشوونما کا خیال پایا جاتا ہے ۔ قوائے یا نعمائے خدا داد کا اخفا مراد ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی توحید کے ذکر میں ہی یہ ایک عظیم الشان اصلاح بھی قرآن کریم نے کی ہے یعنی لڑکیوں کو مار دینا جس کا رواج ملک عرب میں، بالخصوص اعلیٰ طبقہ میں بہت پایا جاتا تھا ۔ بعض باتیں اصلاح کی ایسی ہیں کہ پہلے دن سے ہی قرآن کریم نے ان کی طرف توجہ دلائی ہے حالانکہ کوئی تفصیلات شریعت ابھی نازل نہ ہوئی تھیں جیسے یتامیٰ اور مساکین کی خبرگیری انہیں میں لڑکیوں کو مارنے یا زندہ گاڑنے کا رواج ہے جس کی اصلاح قرآن کریم نے ابتدا سے مدنظر رکھی ۔ چنانچہ اس سے بہت پہلے کی وحی میں ہے واذا الموءدۃ سئلت (التکویر ۸۱ ـ ۸) عرب میں لڑکی کو جب وہ پانچ چھ سال کی عمر کو پہنچ جاتی تو یا گڑھا کھود کر اس میں زندہ دھکیل کر اوپر سے مٹی ڈال دیتے یا پہاڑ سے نیچے گرا دیتے اس سنگدلی پر رحمۃ للعالمین کا دل پگھلا اور آپؐ کی آواز نے وہ اثر پیدا کیا جو نہ کوئی قانون اور نہ کوئی عبرتناک سزا پیدا کر سکتی ہے اسلام کے بعد اس بیرحمی کے اعادہ کی ایک اکیلی نظیر بھی پیش نہیں کی جا سکتی ۔ بدی کو دور کرنے کی جو طاقت آپؐ کو دی گئی ہے اس کی نظیر کوئی اور طاقت دنیا میں نظر نہیں آتی ؃

ع۱۷۵۳ للہ المثل الاعلٰے ۔ چونکہ دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے لیس کمثلہ شئی (الشوریٰ ۴۲ ـ ۱۱) اس لیے یہاں مَثَل کے معنی وصف مراد ہیں ۔ اور راغب نے اس آیت میں دونوں جگہ مثل کے معنی وصف ہی کئے ہیں لھُمُ الصِفاتُ الذَّمِیْمَۃُ و لہ الصِفاتُ العُلیٰ یعنی آخرت پر ایمان نہ

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ
عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى
اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا
يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٦١﴾
وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ
اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ؕ
لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿٦٢﴾
تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ
فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ
وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦٣﴾
وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ
لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى
وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٦٤﴾

اور اگر اللہ لوگوں کو اُن کے ظلم پر پکڑتا تو اس پر کوئی جاندار
نہ چھوڑتا ، لیکن وہ انھیں ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا ہے
پس جب ان کا وقت آ جائے گا وہ ایک گھڑی بھی پیچھے
نہیں رہ سکتے اور نہ آگے جا سکتے ہیں ۱۷۵۴
اور اللہ کے لیے وہ ٹھیراتے ہیں جسے خود ناپسند کرتے ہیں
اور ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں کہ ان کے لیے بھلائی ہے
حق یہی ہے کہ ان کے لیے آگ ہے اور یہ کہ وہ آگے بھیجے جائینگے ۱۷۵۵
اللہ کی قسم ہم نے تجھ سے پہلے قوموں کی طرف رسول بھیجے ،
پھر شیطان نے انھیں اُن کے (بُرے) عمل اچھے کر کے دکھائے
سو وہ آج ان کا دوست ہے اور ان کے لیے دردناک دُکھ ہے ۱۷۵۶
اور ہم نے تجھ پر کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے کہ تو ان
کے لیے وہ باتیں کھول کر بیان کرے جن میں وہ اختلاف کرتے
ہیں اور وہ ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں ۱۷۵۷

لانے والوں کی صفات نہایت بری ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات بلند ہیں اور پہلے حصہ میں معنی مثال بھی ہو سکتے ہیں اور اصل غرض تو یہ توجہ دلانا ہے کہ ان لوگوں کی حالت کیسی بری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف وہ بات منسوب کرتے ہیں جو اپنے لیے بھی پسند نہیں کرتے۔ لیکن ساتھ ہی سمجھا دیا کہ اگر یہ اپنے لیے بیٹوں کو پسند کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی بیٹا تجویز کر سکتے ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف بہت بلند ہیں اور اس کی ذات ان تمام باتوں سے پاک ہے۔ جو گو انسانوں کے لیے محبوب ہوں مگر وہ ایک رنگ کا نقص ہے جو مخلوق میں پایا جاتا ہے اور خالق کی ذات اس سے برتر ہے۔

۱۷۵۴ دابۃ سے مراد بعض کے نزدیک سب جاندار ہیں اور بعض کے نزدیک صرف وہی ظالم لوگ ہیں جو ظلم کرتے ہیں اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ دابۃ سے مراد یہاں مشرک ہیں (ر) اور گو یہ سچ ہے کہ اگر کل انسان تباہ ہو جائیں تو دوسرے جانداروں کی جو انسان کی خاطر ہی پیدا کیے گئے ہیں کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن ظلم کا ذکر صاف بتاتا ہے کہ مراد وہی مخلوق ہے جو ظلم کر سکتی ہے یعنی انسان۔ اور اس آیت میں آنحضرت صلعم کے زمانہ میں جو حالت دنیا کی تھی اس کی تصویر کھینچی ہے۔ یعنی ظلم اس حد تک دنیا میں پھیل گیا ہے کہ زمین اس قابل نہ رہی تھی کہ اس پر انسان باقی رہے کیونکہ انسان نے اپنے خدا کو بالکل بھلا دیا اور ساری دنیا خطرناک شرک اور معصیت میں گرفتار ہو گئی۔ گو یا روحانی طور پر دنیا پر موت وارد ہو گئی اس لیے یہ اس قابل تھی کہ اسے ویسے بھی مٹا دیا جاتا، مگر اس موت سے اس آسمانی بارش نے اسے بچایا جس کا ذکر صاف الفاظ میں رکوع کے آخر میں ہے۔

۱۷۵۵ مفرطون۔ فَرَط کے معنی ۹۳۱ میں بیان ہو چکے ہیں اور اِفراط کے معنی آگے بڑھنے میں حد سے تجاوز کرنا ہیں اور اُفراط کے معنی اِعجال یعنی جلدی کرنا بھی ہیں اور اس کے معنی ترک کرنا اور بھلانا بھی آتے ہیں ما اَفرَطتُ من القوم احدا ای ما ترکتُ اَفرَط الشئَ نَسِیَہٗ (ل) پس مُفرَط کے معنی آگے بھیجا ہوا، جلدی بھیجا ہوا، یا عذاب میں چھوڑا ہوا ہو سکتے ہیں۔ فراء نے یہی آخری معنی لیے ہیں (ل)

ان کے اعتقادات فاسد کی تصویر یہاں کھینچی ہے کہ خدا کی طرف وہ باتیں منسوب کرتے ہیں جو اپنے لیے بھی پسند نہیں کرتے۔ اسی کا اثر اعمال پر بھی ہوتا ہے یہاں تک کہ نیک اور بزرگ لوگوں کی طرف بدیاں منسوب کرنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدی آہستہ آہستہ دل کو اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ بدترین حالت ہے جس پر قوم پہنچ جاتی ہے۔

۱۷۵۶ یہاں بتایا کہ پہلے بھی ہم رسول بھیجتے رہے جس طرح اب رسول بھیجا ہے لیکن ان کے متبعین بھی گمراہ ہو گئے اور شیطان نے بُرے عملوں کو ان کے لیے ایسا خوبصورت کر دکھایا کہ وہ اس کے پیچھے لگ گئے یہاں تک کہ آج یعنی رسول اللہ صلعم کی بعثت کے وقت وہ اس طرح شیطان کے تصرف میں آ گئے کہ وہی ان کا ولی اور رفیق ہے۔

۱۷۵۷ جب پہلے رسولوں کا ذکر کیا تو اب ساتھ ہی بتایا کہ باوجود پہلی قوموں میں رسولوں کے آنے کے اب ایک اور رسول کی ضرورت تھی تاکہ ان میں جو

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۵﴾ ع

اور اللہ ہی بادل سے پانی اتارتا ہے پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے یقیناً اس میں لوگوں کے لیے نشان ہے جو سنتے ہیں۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۶۶﴾

اور تمہارے لیے چارپایوں میں عبرت ہے ہم تمہیں اس چیز سے جو ان کے پیٹوں میں ہے گوبر اور لہو کے درمیان سے خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے ع۱۷۵۸

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

اور کھجوروں اور انگوروں کے میووں میں سے تم اس سے شراب اور اچھا رزق بناتے ہو۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہے جو عقل سے کام لیتے ہیں ع۱۷۵۹

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾

اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں میں اور اس میں جو وہ بناتے ہیں۔

ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ

پھر تمام پھلوں سے کھا اور اپنے رب کے رستوں پر فرمانبرداری سے چلی جا، ان کے پیٹوں سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہیں اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے

اختلافات پیدا ہوگئے ہیں وہ اپنی وحی یعنی قرآن سے ان کا فیصلہ کردے تمام دنیا کے اختلافات مذہبی کا فیصلہ سوائے اللہ تعالیٰ کی وحی کے نہ ہوسکتا تھا۔ اور چونکہ قرآن سب اختلافات کا فیصلہ کرتا ہے اس لیے خود مسلمانوں میں کوئی اس قسم کا اختلاف نہیں ہوسکتا جیسے پہلے مذاہب میں اختلافات ہوئے یعنی اصولی اختلاف نہیں اگلی آیت میں آسمانی پانی وحی الٰہی ہے جو مردہ دلوں کو زندہ کرتی ہے۔

ع۱۷۵۸ چارپایوں میں انسان کے لیے عبرت: پچھلے رکوع میں وحی الٰہی کا ذکر تھا کہ رفع ظلم و اختلاف کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ انسان اپنی عقل سے ہی سب کچھ کرسکتا ہے۔ تو سمجھایا کہ دیکھو اگر تمہیں دودھ کی ضرورت ہے تو تم یہ نہیں کرسکتے کہ چارہ اور گھاس کو لیکر اس کا جوہر دودھ کی صورت میں نکال لو بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنی قدرت سے حیوانوں کے اندر ایک کل پیدا کی ہے وہ اس چارہ کو بدل کر تین چیزوں کی صورت میں بناتی ہے ایک فضلہ جو گوبر کی صورت میں نکل جاتا ہے، دوسرا خون جو حیوان کے بقا کا موجب ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک تیسری چیز دودھ بن جاتی ہے جو انسان کے پینے کے لیے ایک نہایت ہی خوشگوار چیز ہے۔ پس اگر ایک اپنی زندگی کی ضرورت دودھ کے لیے انسان قدرت کی کل کا محتاج ہے اور خود اسے نہیں بناسکتا تو روحانی بقا کے لیے بھی اس کی اپنی کوشش کارگر نہیں ہوسکتی۔

ع۱۷۵۹ سکر۔ سُکر کے لیے دیکھو ع۶۶۳ اور سَکَر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے سُکر یعنی نشہ پیدا ہو (غ) اور مراد اس سے خمر ہے (ج)

دوسری مخلوق میں عبرت: اس آیت میں پچھلی آیت کے مضمون کو وسیع کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے بقا کے لیے ہر قسم کے پھل اللہ تعالیٰ نے ہی انسان کے لیے پیدا کر رکھے ہیں۔ پس ضرور تھا کہ بقائے روحانی کے سامان بھی وہ خود پیدا کرتا اور انہیں انسان پر نہ چھوڑتا کیونکہ کسی چیز کا پیدا کرنا اس کی طاقت سے باہر ہے ہاں پیدا شدہ چیز کو وہ استعمال کرسکتا ہے اور یہاں اس کے استعمال میں بُرے اور اچھے استعمال کی طرف توجہ دلائی ہے کہ خدا کے پیدا کیے ہوئے پھلوں سے انسان شراب بھی بنالیتا ہے جو ان کا بُرا استعمال ہے کیونکہ اس سے نقصان پیدا ہوتا ہے اور رزق حسن بھی لے لیتا ہے رزق حسن کے مقابل پر سکر کو لانے سے صاف اس کی بُرائی کی طرف اشارہ کیا ہے اور حالانکہ ابھی تک شراب کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا کیونکہ یہ سورت مکّی ہے مگر یہاں جس رنگ میں سُکر کا ذکر کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی ساری تعلیم ایک ہی اصول پر ہے۔

لِّلنَّاسِ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾	یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہے جو فکر کرتے ہیں ع۱۷۶۰
وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰىكُمْ ۣۙ وَ مِنْكُمْ مَّنْ	اور اللہ نے تمھیں پیدا کیا پھر وہ تمھیں مارتا ہے اور تم میں سے
یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ	کوئی وہ ہے جو نہایت خراب عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے تاکہ
ع ۹ ۱۵ عِلْمٍ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ﴿۷۰﴾	جاننے کے بعد کچھ نہ جانے اللہ جاننے والا قدرت والا ہے ۱۷۶۱
وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۚ	اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں فضیلت دی
فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰى	ہے تو جنھیں فضیلت دی گئی ہے وہ اپنی روزی انھیں نہیں
مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ ؕ	دیدیتے جو ان کے ماتحت ہیں کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں۔
اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾	تو کیا اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں ع۱۷۶۲
وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا	اور اللہ نے تمھارے لیے تم سے ہی عورتیں بنائیں اور تمھارے
وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِیْنَ وَ حَفَدَةً	لیے تمھاری عورتوں سے بیٹے اور پوتے بنائے اور تمھیں

ع۱۷۶۰ **شہد کی مکھی سے سبق**: یہ تیسری مثال اسی اصول کی وضاحت کے لیے ہے اور یہاں وحی کا ذکر صفائی سے کیا ہے۔ گویہ وحی اور رنگ کی ہے شہد کی مکھی علم حاصل نہیں کرتی بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس کی فطرت میں رکھ دیا ہے اس کے مطابق چلکر مختلف پھولوں سے شیرینی حاصل کرکے اسے ایسے رنگ میں جمع کرتی ہے جو انسانوں کے لیے موجب شفا ہے۔ انسان اپنے سارے علوم کو خرچ کرکے وہ چیز پیدا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح جب انسان کی ہدایت کے لیے اس کی شفائے روحانی کے لیے ایک شہد کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ مقصد بھی انسان کے علوم مکتب سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کے لیے ایک وحی کی ضرورت ہے۔ ہاں چونکہ اللہ تعالیٰ کا تعلق جو اپنی ایسی مخلوق سے ہے جیسے شہد کی مکھی اس سے بہت بڑھ کر تعلق اسے انسان سے ہے اور یہ غرض بھی اعلیٰ اور ارفع ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی یہ وحی بھی اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اور یہ وحی الٰہی کا ہی کام تھا کہ تمام مذاہب کے اختلافات کا فیصلہ کرتی، کوئی انسان اپنی کوشش سے یہ نہ کرسکتا تھا اس پر زیادہ تفصیل کے لیے دیکھو نوٹ جو تمہید سورت میں اس سورت کے نام پر دیا گیا ہے۔

ع۱۷۶۱ انسان کے حالات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت نمائی ہے کس طرح پیدا ہوتا ہے پھر بڑھتا ہے پھر گھٹتا ہے یہاں تک کہ وفات پاتا ہے اور ارذل عمر وہ ہے جس میں عجز اور ذلت کی حالت انسان پر وارد ہو جاتی ہے۔ علم کے بعد نہ جاننے سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ جو کچھ علم سیکھا تھا وہ بھول جاتا ہے اور یہ بھی کہ جتنا علم حاصل کیا پھر اس کے بعد اور علم حاصل نہیں کرسکتا اور انسان کے حالات میں قوموں کے لیے سبق ہے کہ ان پر بھی ایک ارذل حالت آتی ہے اور اس کی طرف بھی یہاں اشارہ ہے۔ اور یہ بھی اشارہ ہے کہ انسان کے علم کی ایک انتہا ہے اللہ تعالیٰ کے علم کی کوئی انتہا نہیں۔

ع۱۷۶۲ **انسانوں کے مراتب میں اختلاف اور نزول وحی**: ما ملکت ایمانہم سیاق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے ماتحت ہیں یا جن سے دوسرے کام لیکر بہت دولت کے مالک بن جاتے ہیں۔ شاید اسی مناسبت سے رآدّی (رادّین یعنی لوٹانے والے) کا لفظ استعمال فرمایا اس رکوع میں چند ایک تمثیلات بیان فرمائی ہیں جن میں یہ توجہ دلائی ہے کہ مہبط وحی صلعم کو دوسرے عام انسانوں پر اللہ تعالیٰ نے ہی فضیلت دی ہے اس سب سے پہلی مثال میں یہ سمجھایا ہے کہ ظاہری سامان معیشت میں بھی جو سب کے لیے یکساں کھلے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہی بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ایک کام لینے والے ہیں ایک کام دینے والے۔ اسی طرح پر روحانیت میں الگ الگ استعدادیں ہیں جس کی طرف آیت کے آخر میں نعمۃ اللہ کا لفظ لاکر توجہ دلائی ہے خصوصیت سے نعمۃ اللہ کا اطلاق وحی الٰہی پر ہی ہوسکتا ہے کیونکہ وہ فی الحقیقت سب سے بڑی نعمت الٰہی انسانوں پر ہے۔ اور بعض مفسرین نے بھی اس سے یہی مراد لی ہے۔ اور فما الذین فضلوا جملہ معترضہ کے طور پر ہے جس کے معنی بعض نے یوں بھی لیے ہیں کہ اپنے مملوکوں کو تمہیں اپنے برابر رکھنا چاہیئے۔ جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ انہیں وہ کھانا دو جو خود کھاتے ہو اور وہ لباس پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔ اور یوں بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ نظام عالم اس طرح کی مساوات پر چل نہیں سکتا کہ سب میں مال و دولت برابر تقسیم ہو اس لیے فرق مراتب رکھا ہے اور استعداد روحانیت میں اس فرق کا ذکر یہاں اس لیے کیا کہ پچھلے رکوع میں شہد کی مکھی کی طرف وحی کا ذکر کرکے سمجھایا تھا کہ وحی الٰہی جو سامان انسان کے لیے مہیا کرسکتی ہے وہ انسان اپنی کوشش سے نہیں کرسکتا تو اس پر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ پھر ہر شخص کو خود وحی کیوں نہیں ہو جاتی۔ اور کفار کا یہ اعتراض قرآن شریف میں منقول بھی ہے حتّٰی نؤتٰی مثل ما اوتی رسل اللہ (الانعام ۔ ۱۲۴) مفسرین نے اس مثال کو شرک پر لگایا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو بتوں کی طرف منسوب کرتے ہو۔

وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾

ستھری چیزوں سے رزق دیا تو کیا جھوٹ کو مانتے ہیں، اور اللہ کی نعمت کا وہ انکار کرتے ہیں ع۱۶۶۳

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾ ج

اور اللہ کے سوائے ان کی عبادت کرتے ہیں جو انھیں آسمانوں اور زمین سے رزق دینے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے اور نہ ہی کچھ طاقت رکھتے ہیں۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾

پس اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ع۱۶۶۴

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

اللہ ایک غلام کی مثال بیان کرتا ہے جو (دوسرے کے) اختیار میں ہے کسی چیز کی طاقت نہیں رکھتا اور ایک وہ ہے جسے ہم نے اپنے ہاں سے اچھا رزق دیا ہے، سو وہ اس سے چھپا کر اور ظاہر خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ سب تعریف اللہ کے لیے ہے بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے ع۱۶۶۵۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ

اور اللہ دو آدمیوں کی مثال بیان کرتا ہے ایک اُن میں سے گونگا ہے، کوئی کام نہیں کرسکتا اور وہ اپنے مالک پر بوجھ ہے، جدھر اُسے بھیجتا ہے کوئی اچھا کام کرکے نہیں

ع۱۶۶۳ انفسکم سے مراد من جنسکم و نوعکم ہے (ر) یعنی تمہاری جنس اور نوع سے یہاں سے وخلق منہا زوجہا کے معنی پر روشنی پڑتی ہے۔ حفدۃ حافد کی جمع ہے اور حفد کے معنی خدمت اور کام میں سرعت ہیں چنانچہ دعائے قنوت میں آتا ہے والیک نسعٰی ونحفد یعنی عمل اور خدمت میں جلدی کرتے ہیں جس سے مراد فرمانبرداری ہے اور حفدۃ کے معنی مددگار اور خدمتگذار ہیں اور بیٹیوں کو بھی حفدۃ کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک اولاد کی اولاد ہے یعنی پوتے اور بعض کے نزدیک اصہار یعنی بی بی کے قرابتی یا داماد (ل) اور ابن جریر نے مختلف اقوال نقل کرکے کہا ہے کہ اصل اس کی یہی ہے کہ مراد اس سے خدمت کرنے والے ہیں اور یہ سب لوگ اس کے اندر شامل ہیں اور خود ازواج اور بیٹے بھی ایک رنگ میں حفدۃ ہیں۔

اس آیت میں بھی اختلاف مراتب کی طرف ہی توجہ دلائی ہے حالانکہ سب انسان ایک ہی ہیں مگر ان میں کوئی مرد ہے کوئی عورت کوئی باپ ہے کوئی بیٹا، کوئی خسر ہے کوئی داماد۔ گویا اختلاف مراتب پر نظام عالم کا دار و مدار ہے اور آخر پر نعمت اللہ یعنی وحی الٰہی کے انکار کے مقابل پر ان کے باطل پر ایمان یعنی بت پرستی کا ذکر کیا اور اسی لیے اگلی آیت میں کھول کر ان کی بت پرستی کا ذکر کیا۔

ع۱۶۶۴ امثال۔ مِثْل کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور اس صورت میں امثال سے مراد ہوگی کہ اس کے شریک مت بناؤ اور تضربوا کے معنی تجعلوا ہونگے فلا تجعلوا للّٰہ اندادا (البقرۃ ۲-۲۲) اور یہ معنی ابن عباسؓ سے مروی ہیں اور عموماً اسے مَثَل کی جمع مانا گیا ہے۔ اور اس صورت میں مراد یہ ہوگی کہ کسی دوسرے کو اس جیسا نہ کہا جائے نہ اسے دوسرے جیسا۔ یا یہ کہ اس کی صفات میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔

ع۱۶۶۵ یہ کافر اور مومن کی مثال ہے (ج) اور غرض وہی ہے جس کا ذکر پہلے ہوا جب کافر اور مومن میں بھی یہ فرق بیّن ہے تو اوّل المومنین کے ساتھ ان کفار کو کیا نسبت ہوسکتی ہے اور یا رزق حسن سے مراد وحی الٰہی ہے اور وہ جسے رزق حسن دیا ہے وہ مہبط وحی صلعم ہے اگلی آیت کے آخری الفاظ اسی کے مؤید ہیں اور سرّاً خرچ کرنا اپنے قویٰ کو مخلوق کی خدمت میں لگانا ہے اور جہراً اپنے مال کو۔ اور کافر یا مشرک عبد مملوک ہے اس لیے کہ جن چیزوں پر اسے حکومت کرنے کے لیے بنایا گیا تھا وہ اپنے آپ کو ان کا محکوم اور انہیں اپنا معبود اور مسجود بناتا ہے۔ اور لا یقدر علیٰ شئ اس لیے کہ جس غرض کے لیے اس کے اندر اعلیٰ درجہ کے قویٰ رکھے گئے تھے۔ وہ اسے پورا نہیں کرتا اس لیے اسے نتیجہ بھی کچھ نہیں ملتا لا یقدرون مما کسبوا علی شئ (ابراھیم ۱۴-۱۸)

هَلْ يَسْتَوِىْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۞۷۶ ع ۱۱

آتا ۔ کیا وہ اور ایسا شخص برابر ہیں جو انصاف کا حکم دیتا ہے اور وہ سیدھے رستہ پر ہے ۱۷۶۶

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۞۷۷

اور آسمانوں اور زمین کا (علم) غیب اللہ کو ہی ہے اور قیامت کا معاملہ آنکھ کے جھپکنے کی طرح ہے بلکہ اس سے بھی قریب۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۱۷۶۷

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۞۷۸

اور اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کیا، تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور تمھیں کان اور آنکھیں اور دل دیئے تاکہ تم شکر کرو ۱۷۶۸

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِىْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۞۷۹

کیا یہ پرندوں کو نہیں دیکھتے جو آسمان کی فضا میں رام کیے ہوئے ہیں اللہ کے سوائے انھیں کوئی نہیں تھامتا۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو ایمان لاتے ہیں ۱۷۶۹

۱۷۶۶ کَلّ ۔ کُلّ وہ ہے جو سارے اجزا کو جمع کرلے اور کَلّ یَکِلّ کَلاًّ کے معنی ہیں تھک گیا۔ اور یہاں مراد وہ ہے جو دوسرے پر بوجھ ہو یا دوسرے کے لیے بمنزلہ عیال کے ہو کہ اس کا بوجھ اسے اٹھانا پڑے (ل)

یہ مثال بھی ویسی ہی ہے جیسی اس سے پہلی۔ مگر یہاں من یامر بالعدل وھو علی صراط مستقیم سے زیادہ وضاحت کردی ہے بعض نے ان الفاظ کی وجہ سے یہ خیال کیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور ابکم سے مراد بُت ہیں اور پھر پہلی مثال کو بھی اسی پر قیاس کیا ہے مگر اللہ کی مثال کسی چیز سے نہیں دی جاسکتی جیسا کہ ابھی خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا فلا تضربوا للہ الامثال۔ اس لیے من یا مر بالعدل سے مراد رسول اللہ صلعم ہی ہیں اور آپ ہی صراط مستقیم پر ہیں اور اس مثال میں اسی مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا ذکر اس رکوع میں ہے اینما یُوَجِّھْهُّ لَایَاْتِ بِخَیْرٍ میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ کافر اپنے کسی مقصد میں کامیاب نہ ہونگے۔

۱۷۶۷ لمح ۔ لَمْحَ اور اَلْمَح کے معنی ہیں آنکھ چھپا کر دیکھا اور لَمْحَۃ عُجلت کے دیکھنے کو کہتے ہیں اور لَمْحَ الْبَرْقُ بجلی کی چمکار پر بھی بولا جاتا ہے (ل) کیونکہ وہ بھی عجلت سے ہوتی ہے۔ کلمح البصر سے مراد اس کا عجلت سے آجانا ہے اور او ھو اقرب میں اَوْ بمعنی بَلْ ہے یعنی آنکھ جھپکنا گو ایک بہت قلیل وقفہ کو چاہتا ہے مگر وہ ساعت جب آئے گی تو اس سے بھی جلدی آجائے گی۔ یہ ایک بات تھی جو ان کے وہم میں بھی نہ آسکتی تھی اس لیے فرمایا کہ اس سے بھی جلدی آجائے گی جو تمہارے وہم میں آسکے۔

عذاب دنیا اور الساعۃ: قرآن کریم کا تسلسل مضمون اس سے ظاہر ہے کہ کس طرح یہاں پھر اس ساعت کا ذکر کیا ہے جو اس سورت کا اصل نشاء ہے جس کی طرف سب سے پہلی آیت میں ان الفاظ میں توجہ دلائی تھی۔ اتیٰ امر اللہ فلا تستعجلوہ۔ پھر چوتھے رکوع کے شروع میں آیت ۲۶ میں ان کے مکروں کا ذکر کرکے فرمایا تھا اتٰھم العذاب من حیث لایشعرون پھر اسی رکوع کے آخر میں آیت ۳۳ میں فرمایا ھل ینظرون الاان تاتیھم الملائکۃ اویاتی امر ربك پھر چھٹے رکوع میں آیت ۴۵۔۴۶۔۴۷ میں مختلف قسم کے عذابوں کا ذکر کیا جو ان پر آنے والے تھے اور اب پھر اس ساعت کا ذکر کرتا ہے جو ساعت کبریٰ یعنی قیامت کے لیے بطور ایک نمونہ کے ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس رکوع کی آخری آیات میں صاف طور پر کافروں کے پھر جانے اور رسول اللہ صلعم کے انکار کا ذکر ہے۔

۱۷۶۸ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنے عظیم الشان احسان کا ذکر کیا ہے کہ اس نے اس کے اندر سننے اور دیکھنے اور سوچنے کی وہ طاقتیں رکھ دی ہیں جن سے وہ بڑے بڑے کام لیتا ہے چنانچہ آیت ۸۰ و ۸۱ میں جن نعمتوں کے دینے کا ذکر ہے کہ تمہارے لیے گھر بنائے اور تمہارے لیے لباس بنائے وہ انسان سب اپنے علم سے اور اپنی جد وجہد سے ہی حاصل کرتا ہے مگر اسی لیے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا کہ اگر وہ طاقتیں اس نے انسان کے اندر نہ رکھی ہوتیں تو انسان یہ کام نہ کرسکتا تھا اور لا تعلمون شیئًا سے اس لیے ابتدا کی کہ وحی الٰہی بھی انسان کو ایک علم دیتی ہے تو جب علم ظاہری کے لیے بعض قوائے خدا داد کی ضرورت ہے تو علم باطنی کے لیے بھی ایسی ہی ضرورت ہے۔

۱۷۶۹ جوّ کے معنی ہوا ہیں (غ) یا آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے۔

وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡۢ بُیُوۡتِکُمۡ سَکَنًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ بُیُوۡتًا تَسۡتَخِفُّوۡنَہَا یَوۡمَ ظَعۡنِکُمۡ وَ یَوۡمَ اِقَامَتِکُمۡ ۙ وَ مِنۡ اَصۡوَافِہَا وَ اَوۡبَارِہَا وَ اَشۡعَارِہَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۸۰﴾

وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنَ الۡجِبَالِ اَکۡنَانًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ سَرَابِیۡلَ تَقِیۡکُمُ الۡحَرَّ وَ سَرَابِیۡلَ تَقِیۡکُمۡ بَاۡسَکُمۡ ؕ کَذٰلِکَ یُتِمُّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکُمۡ

اور اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھروں کو رہنے کی جگہ بنایا اور تمھارے لیے چارپایوں کی کھالوں سے گھر بنائے جنھیں تم اپنے کوچ کے وقت اور گھر میں ٹھیرنے کے وقت ہلکا پھلکا پاتے ہو اور ان کی اُون اور ان کی پشم اور ان کے بالوں سے تمھارے لیے اسباب اور ایک وقت مقرر تک سامان (بنایا) ؏۱۷۷۰

اور اللہ نے تمھارے لیے اس سے جو پیدا کیا سائے بنائے اور تمھارے لیے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں بنائیں۔ اور تمھارے لیے کپڑے بنائے جو تمھیں گرمی سے بچاتے ہیں اور (ایسے) کپڑے جو تمھیں تمھاری جنگ میں بچاتے ہیں۔ اسی طرح وہ تم پر اپنی

پرندوں کا تعلق ذکر عذاب سے: پرندوں کے ہوا میں روکنے کا ذکر دو جگہ قرآن شریف میں ہے ایک یہاں اور ایک سورۂ ملک میں اولم یروا الی الطیر فوقہم صٰفّٰت ویقبضنؕ ما یمسکھن الا الرحمٰن (الملک ۶۷ - ۱۹) یہاں بھی اعدا پر عذاب آنے کا ذکر ہے اور وہاں اس سے بھی زیادہ صاف الفاظ میں ہے۔ کیونکہ پہلی آیت میں ہے ولقد کذب الذین من قبلہم فکیف کان نکیر (الملک ۶۷ - ۱۸) اور بعد کی آیت میں ہے امّن ھذا الذی ھو جند لکم ینصرکم من دون الرحمٰن (الملک ۶۷ - ۲۰) اور کوئی تعلق اس آیت کا یہاں نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اس مشکل کو خود ہی حل فرمایا جہاں تیسری جگہ پرندوں کے ذریعہ سے عذاب بھیجنے کا ذکر کیا ہے وارسل علیہم طیراً ابابیل ترمیہم بحجارۃ من سجیل (الفیل ۱۰۵ : ۳ و ۴) اور خود شر کو بھی طائر کہا ہے الا انّما طائرہم عند اللہ (الاعراف ۷ - ۱۳۱) اور جب ہم محاورہ عرب کی طرف توجہ کرتے ہیں تو وہاں بھی یہی عجیب بات پاتے ہیں کہ عذاب یا ذلت یا شکست کے متعلق پرندوں کا ذکر کیا جاتا ہے چنانچہ میدانی نے مجمع الامثال میں یہ مثال دی ہے تَبَدَّدَ بِلَحْمِكَ الطیر جو بد دعا ہے یعنی تو ہلاک ہو جائے اور ایسی طرح ہلاک ہو کہ دفن ہونا بھی میسر نہ آئے اور پرندے تیرے گوشت کو کھائیں اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھیلائیں اور نابغہ کا شعر ہے اذا ما غدا بالجیش حلّق فوقہٗ ؛ عَصَائِبُ طیرٍ تَہْتَدی لعصائب۔ یعنی جب وہ لشکر کے ساتھ نکلتا ہے تو اس کے اوپر پرندوں کے جھنڈ حلقہ باندھ لیتے ہیں اور جدھر لشکر چلتے ہیں ان کے ساتھ ہی وہ بھی چلتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک فاتح فوج کے ساتھ پرندے ہوتے ہیں گویا ان کو علم ہو جاتا ہے کہ دشمن اس فوج کے ہاتھ سے مارا جائیگا اور ایسا ہی ابو الطیب کا شعر ہے اذا لَقُوا جیشاً تَیَقَّنَ انہ ؛ لمن بطن طیر تَنُوفَۃ مُحْشُور۔ یعنی جب ان کا مقابلہ کسی فوج سے ہوتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ قیامت کے دن وہ تنوفہ کے پرندوں کے پیٹ سے اٹھائے جائیں گے۔ اور بائبل میں یاجوج کی ہلاکت کے لیے ایسے ہی الفاظ میں پیشگوئی کی ہے "تو اسرائیل کے پہاڑوں پر گر جائے گا تو اور تیرا سارا لشکر اس گروہ سمیت جو تیرے ساتھ ہے اور میں تجھے ہر قسم کے شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو خوراک کے لیے دونگا" (حزقی ایل ۳۹ : ۴) پس ان تمام شہادتوں سے ظاہر ہے کہ پرندوں کے روکنے میں اشارہ عذاب اور شر کے روکنے کی طرف ہے جو ان پر آنے والی تھی اور یوں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نظاروں میں سے بھی ہے کہ کس طرح پرند ہوا میں معلق رہتے ہیں۔

؏۱۷۷۰ تستخفّون۔ خَفِیف۔ ثقیل کے مقابلہ پر ہے اور یہ کبھی باعتبار وزن ہوتا ہے اور کبھی جس چیز کو آسان سمجھا جائے اسے خفیف کہہ دیا جاتا ہے اور مشکل کو ثقیل اسی معنی میں ہے الْئٰن خفّف اللہ عنکم (الانفال ۸ - ۶۶) یرید اللہ ان یخفف عنکم (النساء ۴ - ۲۸) فلا یخفف عنہم (البقرۃ ۲ - ۸۶) اور کبھی ثقیل بلحاظ وقار کہا جاتا ہے اور خفیف اس کے مقابلہ پر اور اس حالت میں خفیف مذمت کا موقعہ ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے اِسْتِخْفَاف کے معنی میں اختلاف ہوگا چنانچہ فاستخفہ قومہ فاطاعوہ (الزخرف ۴۳ - ۵۴) میں اور ولا یستخفّنّك (الروم ۳۰ - ۶۰) میں مذمت کا موقعہ ہے اور خَفُّوا عن مَنَازِلِہِمْ سے مراد ہوتی ہے ہلکے پھلکے اپنے گھروں سے چلے اور یہاں استخفاف اسی معنی میں ہے اور خُفّ موزہ کو کہتے ہیں (غ)

اصواف۔ صُوف کی جمع ہے دُنبہ یا بھیڑ کی اُون۔ اوبار۔ وَبَر کی جمع ہے اونٹ کی پشم۔ اور اشعار۔ شَعَر کی جمع ہے بکریوں کے بال۔

اثاث۔ اَثَّ کے معنی ہیں بہت ہوا۔ اور گھر کے سامان کو جب بہت ہو اثاث کہا جاتا ہے اور مال کو بھی جب بہت ہو اثاث کہا جاتا ہے اور اس کا واحد کوئی نہیں (غ)

اللہ تعالیٰ نے اپنی ظاہری نعمتوں کا ان دو آیات میں ذکر کیا ہے اور غرض اس طرف توجہ دلانا ہے کہ وہ تمہیں روحانی نعمتوں سے کس طرح محروم کر سکتا تھا۔

لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ نعمت کو پورا کرتا ہے تاکہ تم فرمانبرداری کرو۔ع۱۷۷۱

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾ پھر اگر وہ پھر جائیں تو تجھ پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾ ع ۱۷ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر ناشکر ہیں۔ع۱۷۷۲

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾ اور جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کرینگے پھر جنھوں نے کفر کیا انھیں (بولنے کی) اجازت نہ دیجائیگی اور نہ انھیں عتاب دور کرنیکا موقع دیا جائیگا۔ع۱۷۷۳

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾ اور جنھوں نے ظلم کیا جب عذاب کو دیکھیں گے تو نہ وہ ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی۔

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۸۶﴾ اور جب شرک کرنے والے اپنے شریکوں کو دیکھیں گے کہیں گے اے ہمارے رب یہ ہمارے شریک ہیں جنھیں ہم تیرے سوائے پکارتے تھے تو وہ بات کو ان (کے منہ) پر ماریں گے کہ تم یقیناً جھوٹے ہو۔ع۱۷۷۴

وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ۣ السَّلَمَ وَضَلَّ اور اس دن اللہ کے سامنے فرمانبرداری پیش کریں گے اور

ع۱۷۷۱ سرابیل۔ سِربال کی جمع ہے قمیص کسی قسم کی ہو (غ)

نعمائے ظاہری سے ضرورت وحی پر دلیل: ان دونوں آیتوں میں ایسی نعمتوں کا ذکر ہے جن سے انسان کو دکھوں اور تکلیفوں سے آرام ملتا ہے چنانچہ پہلی آیت میں گھر اور خیمے اور اس آیت میں سائے اور غاریں اور کرتے مذکور ہیں اور تقیکم الحر کہہ کر حر اور برد یعنی گرمی اور سردی دونوں مراد لے لیے ہیں۔ اور اس آیت کے آخر میں اپنی روحانی نعمتوں کی طرف صاف توجہ دلائی جہاں اتمام نعمت کا ذکر کیا۔ کیونکہ اتمام نعمت اس کے بغیر نہ ہوتا تھا کہ جسمانی طور پر تو اس قدر آرام کی چیزیں ہوں اور روحانی طور پر دکھوں اور تکلیفوں سے بچانے والی کوئی چیز نہ ہوتی اسی مناسبت سے آیت کا خاتمہ تسلمون پر کیا یعنی تم اسلام میں یا سلامتی میں داخل ہو جاؤ، جس سے مراد روحانی سلامتی ہے اور اگلی آیت میں فان تولوا کہہ کر بالکل ہی مضمون کو صاف کر دیا۔

ع۱۷۷۲ نعمت اللہ وہی وحی الٰہی ہے جس کا ذکر پچھلی آیت میں بھی ہے اور اس کے معنی محمد صلعم سدی سے مروی ہیں (ج)

ع۱۷۷۳ یستعتبون۔ عَتَبة دہلیز کو کہتے ہیں جو پاؤں سے روندی جاتی ہے (ل) اور عَتب عتاب یا ناراضگی ہے جو انسان اپنے دل میں دوسرے کے لیے پاتا ہے اور اعتاب کے معنی اظہار عتاب بھی ہیں اور عتاب کا دور کرنا بھی فما ھم من المعتبین (حٰم السجدۃ ۴۱-۲۴) میں یہی دوسرے معنی ہیں۔ اور استعتاب یہ ہے کہ دوسرے سے یہ چاہا جائے۔ یا اسے یہ موقعہ دیا جائے کہ وہ عتاب کو دور کرے (غ)

نبی کس معنی میں گواہ ہے: گواہ سے مراد ہر قوم کا نبی ہے اور رکوع کی آخری آیت میں اس کو صاف کر دیا ہے اور نبی کا گواہ ہونا اپنے پیروؤں کے لیے بھی ہے اور مخالفوں کے لیے بھی۔ اول کے لیے اس لحاظ سے کہ قیامت کے دن ان کے ایمان اور طاعت کی گواہی دے گا اور اس دنیا میں ان کے لیے وہ نمونہ بنتا ہے جیسا کہ فرمایا وکذٰلک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھدآء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (البقرۃ ۲-۱۴۳) یا حضرت عیسٰیؑ کا قول کنت علیھم شھیدا مادمت فیھم (المائدۃ ۵-۱۱۷) اور مخالفین کے لیے اس کی گواہی ان کے کفر اور عصیان پر ہوگی فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علٰی ھٰؤلاء شھیدا یومئذ یود الذین کفروا وعصوا الرسول لو تسوّٰی بھم الارض (النساء ۴-۴۱-۴۲)۔ اور اذن نہ دینے سے مراد عذر پیش کرنے کی اجازت ہے جیسا کہ فرمایا ولا یؤذن لھم فیعتذرون (المرسلٰت ۷۷-۳۶) اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان پر جو عتاب ہوگا اسے بھی دور کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی اس لیے کہ عذر اور عتاب کا دور کرنا اس وقت کوئی فائدہ نہ دیگا۔

ع۱۷۷۴ دوسری جگہ ہے ما کنتم ایانا تعبدون (یونس ۱۰-۲۸) اور ایک جگہ ہے۔ بل کانوا یعبدون الجن (السبا ۳۴-۴۱) اپنے ہی توہمات کی پرستش کرتے ہیں کیونکہ ان چیزوں کے نیچے کوئی حقیقت نہیں جن کی پرستش بظاہر کرتے ہیں۔

عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾

جو افترا وہ کرتے تھے ان سے جاتا رہے گا۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا
يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾

وہ جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا، ہم انھیں عذاب پر عذاب بڑھا کر دیں گے، اس لیے کہ وہ فساد کرتے تھے ۱۴۷۵

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى
هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا
لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى
ع ۱۲/۱۸ لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور جس دن ہم ہر امت میں سے ان کے اندر سے ایک گواہ کھڑا کر دیں گے اور تجھے ان پر گواہ لائیں گے۔ اور ہم نے تجھ پر کتاب اتاری ہے (جو) ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی اور فرمانبرداروں کے لیے ہدایت اور رحمت اور خوش خبری (ہے) ۱۴۷۶

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ
وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ
الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾

اللہ تمھیں عدل اور احسان اور قریبیوں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور بُرائی اور زیادتی سے روکتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو ۱۴۷۷

ع۱۴۷۵ ان کا جرم صرف خود کفر کرنا نہیں بلکہ دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکنا بھی ہے اس لئے عذاب پر عذاب بڑھایا:

ع۱۴۷۶ اس آخری آیت میں وہی ذکر کر کے جو پہلی آیت میں کیا تھا قرآن کریم کا ذکر کیا جس وحی الٰہی کا انکار ہو رہا تھا۔ اور یوں اگلے رکوع کے مضمون سے تعلق قائم کیا۔ اور قرآن کریم کا تبیانا لکل شئی ہونا اس لحاظ سے ہے کہ تمام اصول مذہب کو اس میں کھول کر بیان کیا اور تمام ضروری تعلیم اپنے کمال کو پہنچائی اور تمام اصول باطلہ کی کھول کر تردید کی:

ع۱۴۷۷ خیر و شر کی جامع تعلیم: پچھلی آیت میں جب قرآن کریم کو تبیانا لکل شئی کہا تو اب اس کی جامع تعلیم کا ایک نمونہ پیش کیا ہے اور اس آیت میں خیر اور شر کو پورے طور پر جمع کیا ہے خیر کی اقسام میں عدل اور احسان اور ایتاء ذی القربیٰ کو بیان کیا ہے اور شر میں فحشاء اور منکر اور بغی اور یہ تینوں باتیں ایک ترتیب میں ہیں۔ عدل ادنیٰ درجہ کی نیکی ہے جو مساوات کے رنگ میں ہے یعنی جو کوئی تمہارے ساتھ نیکی کرے اس کے ساتھ نیکی کرنا یا احسان کے عوض احسان دیکھو ۷۹۶ احسان وہ نیکی ہے جو بطور ابتدا بغیر کسی معاوضہ کے یا معاوضہ کے خیال کے کی جائے اور ایتاء ذی القربیٰ سے مراد صرف قریبیوں کو دینا نہیں گو صلہ رحمی بجائے خود ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی نیکی ہے جس سے سب نیکیاں پیدا ہوتی ہیں بلکہ ایسا ایتاء مراد ہے جیسے ذی القربیٰ کا ہوتا ہے۔ قریبیوں کو انسان کسی احسان کے خیال سے نہیں دیتا۔ یہ بھی نہیں سمجھتا کہ میں کوئی نیکی کر رہا ہوں بلکہ یہ ایک فطری خواہش کے ماتحت ہوتا ہے۔ پس یہ تیسرا مرتبہ یہ چاہتا ہے کہ نیکی انسان میں فطری خواہش کی طرح بن جائے ایک کام کو جب انسان بار بار کرتا ہے تو آخر ہوتے ہوتے وہ اس کی طبیعت کا جزو بن جاتا ہے۔ پس انسان اس قدر احسان کی عادت کرے اور اس قدر بار بار اس کا اعادہ کرے کہ آخر ہوتے ہوتے احسان کرنا اس کی فطری خواہش کی طرح ہو جائے۔ اور اقسام شر میں سب سے پہلے فحشاء کا ذکر کیا یعنی ہر ایک امر جو بذات خود قبیح ہے گو اس کا اثر دوسروں پر ہو یا نہ ہو اور دوسری قسم منکر ہے جیسے دوسرے بُرا منائیں اور اس کا انکار کیا جائے گویا اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے۔ اور تیسری قسم بغی ہے۔ جس میں انسان حد سے نکلنا چاہتا ہے وہ گویا ایسا تجاوز ہے جس کا اثر بہت ہی وسیع ہے۔ ایک دوسرے رنگ میں فحشاء قوت شہویہ سے پیدا ہوتا ہے۔ منکر قوت غضبیہ سے بغی قوت وہمیہ سے شہوت کا اثر بد دوسرے انسانوں پر بہت کم پڑتا ہے اور عموماً اس میں ظلم کا رنگ بہت کم ہوتا ہے غضب کے اثر بد کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے اور عموماً اس سے دوسرے انسانوں کو تکلیف پہنچتی ہے مگر سب سے بڑے مظالم دنیا میں قوائے وہمیہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے قوموں کی قومیں اور ملکوں کے ملک صرف ایک وہم کے اتحت تباہ کر دیئے جاتے ہیں اور یہ تینوں قوتیں اگر حالت اعتدال پر آ جائیں تو انسان بدی کی تمام راہوں سے بچ سکتا ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس آیت کو خطبہ جمعہ کے آخر میں داخل کیا:

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾

اور اللہ (تعالیٰ) کے عہد کو پورا کرو، جب تم عہد کر لو اور قسموں کو ان کے پکّا کرنے کے بعد مت توڑو اور تم اللہ (تعالیٰ) کو اپنا ضامن کر چکے ہو، اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۱۷۷۸

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ، جس نے محنت کرکے کاتا ہُوا سوت ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا موجب بنا لیتے ہو اس لیے کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے بڑھ کر ہو۔ اللہ اس طرح صرف تمھیں آزماتا ہے اور وہ ضرور تمھارے لیے قیامت کے دن وہ باتیں کھول کر بیان کرے گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۱۷۷۹

ع۱۷۷۸ تنقضوا نقض: ابرام کی ضد ہے اور اس کے معنی ہیں ایک چیز کے اجزا کا الگ کر دینا اور بکھیر دینا۔ اور استعارہ عہد شکنی پر بولا جاتا ہے الذین ینقضون عهد الله (البقرۃ ۲-۲۷) ینقضون عهدهم (الانفال ۸-۵۶)۔ اور نقیض ایک چیز کی وہ ہے کہ وہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہو سکتیں اور انقض ظهرك (الانشراح ۹۴-۳) میں انقض کے معنی ہیں توڑ دیا یہاں تک کہ اس کی نقیض ہو گئی (رغ)۔

توکید۔ وَکَدَ اور اَکَدَ قول اور فعل دونوں کے لیے آتا ہے جس کے معنی ہیں اسے مضبوط کیا۔

اللہ کا عہد اس کی شریعت ہے یا اس کی وحی اور اذا عاهدتم سے ان کا منہ سے قبول کرنا مراد ہے۔ اور محمد رسول اللہ صلعم پر جو اللہ کے رسول ہیں ایمان لا کر اور آپ کے ہاتھ پر اقرار کرکے گویا اللہ کو ضامن بنایا گیا۔ کہ ہم اس عہد کو پورا کریں گے۔ پس جب قرآن کریم کی ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم بتائی اور یہ بتایا کہ وحی الٰہی تمہیں ہر نیکی کی طرف اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی نیکی کی طرف بلاتی ہے اور ہر بدی سے روکتی ہے تو اب یہ بھی سمجھایا کہ نرا مُنہ سے اقرار کر لینا کافی نہیں بلکہ جب تم نے پختہ عہد کیا ہے تو اسے پورا بھی کر کے دکھاؤ۔

ع۱۷۷۹ غزل۔ غَزْل عورت کا سوت کاتنا ہے اور مغزل یعنی کاتتے ہوئے سوت کو بھی غَزْل کہتے ہیں اور غَازَل عورتوں کے ساتھ کھیل وغیرہ شغل میں مصروف ہونا ہے (رغ)

انکاث۔ نِکْث کی جمع ہے اور نَکْث سوت کا توڑنا یا کپڑے کا اُدھیڑنا ہے۔ اور نقض کے قریب قریب ہے اور نقضِ عہد پر بھی بولا جاتا ہے و ان نکثوا ایمانهم (التوبۃ ۹-۱۲) اذا هم ینکثون (الاعراف ۷-۱۳۵) (رغ)

دَخَل۔ دُخُول کے معنی داخل ہونا یا اندر آنا ہیں اور مکان اور زمانہ اور اعمال میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور دَخَل فساد اور عداوت سے کنایہ ہے جیسے دَغَل (رغ)

اربیٰ۔ رَبَا سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز بڑھ گئی اور ترقی کی۔ اور اربیٰ سے مراد یہاں ہے گنتی میں زیادہ یا مال میں زیادہ۔

تفرقہ پر ایک مثال: بخاری میں اور تفاسیر میں ایک عورت کا ذکر ہے جو مکہ میں تھی جو دن بھر کات کات کر شام کو توڑ دیا کرتی تھی اور یہ اس کا جنون تھا مگر سیاق بتاتا ہے اور ایسی ہی روایت مجاہد وغیرہ سے ہے کہ یہ ایک مثال کے طور پر ہے خاص عورت کا ذکر مقصود نہیں (ج) گویا پچھلی آیت میں جو فرمایا تھا کہ جب اللہ سے عہد کیا ہے یعنی ایمان لائے ہو تو اسے پورا کرو تو یہاں بتایا کہ اسے پورا نہ کرنا گویا اس عورت کی مثال ہے جو کات کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دے بظاہر یہ ایک مجنون کا فعل ہے مگر دنیا میں کتنے عقلمند کہلانے والے ہیں جو اسی فعل کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے ایک عمارت کو کھڑا کرتے ہیں پھر خود اس کی جڑ بنیاد کو اکھیڑتے ہیں مسلمانوں کو جس بات سے بچنے کی نصیحت کی تھی انہوں نے اس کا ارتکاب کیا اور اپنے ہی افعال سے اپنے کیے کرائے کام کو بگاڑا۔ اور سب سے زیادہ نقصان جو پہنچا وہ اسی بات سے پہنچا جس کا ذکر یہاں کیا ہے یعنی باہم اختلاف اور ان معاہدات کو مد نظر نہ رکھنا جو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ اس وجہ سے کہ ایک جماعت اپنے آپ کو دوسری جماعت سے زبردست دیکھتی ہے یا اس لئے کہ وہ زبردست ہو جائے یہی مسلمانوں کی بیماری ہے جس نے انہیں موجودہ حالت تک پہنچایا جن کی دنیا پر پھیلی ہوئی حکومت اس مجنون عورت کے سوت کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

اہل جاہلیت اور معاہدات اور یورپ کی حالت: مگر اب بھی اس کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں تتخذون ایمانکم یہاں جملہ معترضہ کے طور پر ہے۔ جہاں اہل جاہلیت کا ذکر

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں ایک ہی گروہ بنا دیتا ، لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور ضرور تم سے پوچھا جائے گا جو تم کرتے تھے ۔

وَلَا تَتَّخِذُوْۤا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾

اور اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا موجب نہ بناؤ ، ایسا نہ ہو کہ قدم جمے پیچھے پھسل جائے اور تم تکلیف کا مزہ چکھو ۔ اس لیے کہ تم نے اللہ کی راہ سے روکا اور تمھیں بڑا عذاب ہو ع۱۷۸۰

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾

اور اللہ کے عہد کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو ، جو اللہ کے پاس ہے تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو ۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْۤا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

جو تمھارے پاس ہے وہ جاتا رہے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے اور جنھوں نے صبر کیا ان کے بہترین اعمال کے لیے جو انھوں نے کیے ہم ضرور انھیں اجر دینگے ع۱۷۸۱ ۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

جو کوئی اچھا عمل کرتا ہے مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہے ہم یقیناً اسے ایک پاک زندگی میں زندہ رکھیں گے اور ہم انھیں بہترین اعمال کا جو وہ کرتے تھے اجر دیں گے ع۱۷۸۲

ہے یا عام طور پر دنیا کی روش کا ذکر ہے ۔ مسلمانوں کو خاص حکم اس بارہ میں آیت ۹۴ میں موجود ہے ۔ اہل جاہلیت میں یہ رواج عام تھا کہ معاہدے موجود ہوتے مگر ایک قوم ذرا اپنے آپ کو دوسری سے طاقتور پاتی تو سب معاہدات کو بالائے طاق رکھ دیتی ۔ بعینہ جیسے آج یورپ کی حالت ہے ۔ کہ جس قوم کو کمزور دیکھا ، اس کے ساتھ معاہدہ ردّی کاغذ کا ٹکڑا بن جاتا ہے ۔

ع۱۷۸۰ فتزل قدم بعد ثبوتہا صاف بتاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کا ذکر ہے کہ ان کا قدم جم کر پھر باہمی فسادات سے پھسل جائیگا اور یوں وہ اللہ کی راہ سے روکنے والے ہو جائیں گے ۔ اور عذاب بھی ان پر آئے گا کیا آج اسی حکم کی خلاف ورزی کی سزا تو ہم پر نہیں !

ع۱۷۸۱ ینفد ۔ نَفَاد کے معنی فناء ہیں ان ھذا لرزقنا مالہ من نفاد (صٓ ۳۸ ۔ ۵۴) لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی (الکہف ۱۸ ۔ ۱۰۹) (غ) مال دنیا ختم ہو جاتا ہے مگر اعمال حسنہ کے نتائج ختم نہیں ہوتے ؛

ع۱۷۸۲ اس آیت میں جیسا کہ اور بھی کئی موقعوں پر قرآن شریف نے نہایت صفائی سے بتا دیا ہے کہ اعمال حسنہ کی جزا میں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں باوجود ان صراحتوں کے عیسائی کہتے ہیں کہ قرآن شریف کی رو سے عورت میں روح کوئی نہیں ۔ جو اصل میں ان کا اپنا خیال تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ یہاں حیات کا ہی ذکر ہے ۔ حیات طیبہ دینے سے کیا مراد ہے ۔ بعض نے کہا اس دنیا کی زندگی جو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہو وہ مومن کو ہی میسر آتی ہے اور یہ درست ہے بعض نے کہا اس سے مراد برزخ میں پاک زندگی کا عطا فرمانا ہے اور بعض نے کہا آخرت میں جنت کی زندگی ۔ اور حق یہ ہے کہ یہ تینوں زندگیاں ایک ہی تسلسل میں ہیں بہشتی زندگی اسی دنیا سے شروع ہوتی ہے اور یقیناً وہ قبر میں بھی رہتی ہے اور پھر قیامت کو اپنی پوری چمکار کے ساتھ ظاہر ہوگی مراتب ضرور ہیں مگر چیز ایک ہی ہے ۔ اور اسی پاک زندگی کا یہاں ذکر ہے جو یہاں سے شروع ہو کر ترقی کرتی چلی جائے گی اور ختم کبھی نہ ہوگی ۔ قیامت کے ظہور کے بعد پھر اس کے اور کمالات ظاہر ہوں گے ۔ وما عند اللہ باق ۔

فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ﴿۹۸﴾

سو جب تو قرآن پڑھنے لگے تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ ۱۷۸۳

اِنَّہٗ لَیۡسَ لَہٗ سُلۡطٰنٌ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ﴿۹۹﴾

کیوں کہ اس کا کوئی غلبہ اُن لوگوں پر نہیں جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں۔

اِنَّمَا سُلۡطٰنُہٗ عَلَی الَّذِیۡنَ یَتَوَلَّوۡنَہٗ

ع ۱۳ ۱۹ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ بِہٖ مُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

اس کا غلبہ صرف اُنہی لوگوں پر ہے جو اُسے دوست بناتے ہیں اور وہ جو اس کے ساتھ شریک بنانے والے ہیں ۱۷۸۴

وَ اِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ ۙ وَّ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾

اور جب ہم ایک پیغام کی جگہ دُوسرا پیغام بھیجتے ہیں اور اللہ بہتر جانتا ہے جو وہ اُتارتا ہے، کہتے ہیں تُو تو افترا کرنے والا ہے بلکہ اُن میں سے اکثر نہیں جانتے ۱۷۸۵

ع۱۷۸۳ تلاوت قرآن اور استعاذہ: فاذا قرأت القراٰن سے مراد ہے جب قرآن شریف پڑھنے لگو تو اس وقت استعاذہ کر لیا کرو۔ اور سب سے مشہور استعاذہ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ہے جو اسی آیت کے حکم کی تعمیل ہے اور بعض روایتوں میں اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم بھی آیا ہے۔ اور تعامل سے بھی یہی ثابت ہے کہ اعوذ قرآن شریف کے شروع کرتے وقت پڑھا جاتا ہے۔ اور ختم کر کے پڑھنا مراد نہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ استعاذہ کی ضرورت ہر وقت ہے اور خاتمہ پر بھی ہے اور قرآن کریم کا خاتمہ بھی معوذتین پر ہی ہے اور ظاہر حکم کی تعمیل تو لفظوں میں ہوتی ہے مگر مراد یہی ہے کہ انسان ہر اس راہ سے جو شیطان کی طرف لے جاتی ہے بچنے کی کوشش کرے اور اللہ تعالیٰ کی پناہ تلاش کرے اور قرآن شریف تو خود اللہ تعالیٰ کی راہ ہے پس اس کے پڑھنے سے پہلے شیطان سے بچنے کی درخواست بارگاہ الٰہی میں کرنا عین مناسب موقعہ ہے۔ پھر اس کی تعلیم پر قیام بھی سوائے اس کے میسر نہیں آسکتا۔

ع۱۷۸۴ شیطان کا تسلط کس پر ہے: ان دو آیات میں نہ صرف یہ بتا دیا کہ مومنوں پر شیطان کا کوئی تسلط نہیں بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ ان کا تسلط انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو خود اس کی ولایت میں جاتے ہیں اور اسے اپنا دوست بناتے ہیں۔ ورنہ کسی شخص پر بھی شیطان کا تسلط نہیں۔ انّ عبادی لیس لك علیھم سلطان (الحجر ۱۵-۴۲)

ھم بہٖ مشرکون کے ایک تو وہ معنی ہیں جو ترجمہ میں اختیار کئے گئے ہیں یعنی اس کی وجہ سے یا اس کے اغوا سے شرک اختیار کرتے ہیں اور بہٖ میں ضمیر ربھم کی طرف بھی جا سکتی ہے یعنی وہ اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں اور ایک معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ شیطان کو اپنے اعمال میں شریک کرتے ہیں۔

ع۱۷۸۵ قرآن میں نسخ نہیں: تمام مفسرین نے اس آیت کے یہ معنی کئے ہیں کہ ہم ایک آیت قرآنی کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسری لاتے ہیں حالانکہ ادنیٰ تدبر سے بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ آیت قرآنی کے منسوخ ہونے کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ اول یہ کہ یہ کفار کا قول ہے اور ان کو اس سے کیا واسطہ تھا کہ آج کون سا حکم قرآنی منسوخ ہوا ہے اور کونسا قائم ہے۔ وہ تو اصول کے ہی مخالف تھے۔ اور یہ تو ہوا نہیں کہ پہلے قرآن نے کبھی شرک کو جائز رکھا ہو پھر منسوخ کر دیا ہو کہ کفار ایسا کہتے۔ دوم یہ کہ سیاق عبارت ناسخ و منسوخ کی بحث کو نہیں چاہتا اصل مضمون کفار کے مقابلہ پر وحی الٰہی کی صداقت کو ثابت کرنا ہے اور آگے آیت ۱۰۳ میں صاف ان کا قول مذکور ہے کہ ایک بشر آپ کو سکھاتا ہے۔ سوم یہ کہ یہ سورت مکی ہے اور جن آیات کو ناسخ کہا جاتا ہے وہ سب مدینہ کی نازل شدہ ہیں جب مکہ میں تفصیلات شریعت ہی نازل نہیں ہوئیں تو منسوخ کیا چیز کی گئی اور یہ قطعی دلیل ہے کہ اس آیت میں ناسخ و منسوخ قرآنی کا کوئی ذکر نہیں۔ چہارم یہاں تبدیل آیت کا ذکر ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہاں ان آیات کا ذکر ہے جو قرآن کریم کے اندر نہیں اس لیے بین الدفتین کے ناسخ و منسوخ کا یہاں کوئی ذکر نہیں اور ایسی کسی آیت کا ہمیں علم نہیں جو منسوخ التلاوۃ اور منسوخ الحکم ہو۔ پنجم اگلی آیت میں اس کے نازل کرنے کی غرض یہ بتائی کہ مومنوں کو مضبوط کیا جائے اور مسلموں کیلئے ہدایت اور بشارت ہو۔ بعض آیتوں کے بعض کو منسوخ کرنے سے مومن کس طرح مضبوط ہو سکتے تھے۔ اور کسی آیت قرآنی کے منسوخ ہونے میں ان کے لیے ہدایت اور بشارت کیا تھی یہ تو سارے قرآن کے نزول کی شان ہے جیسا کہ فرمایا لنثبت بہٖ فؤادك (الفرقان ۲۵-۳۲) ششم جب کفار تک کو یہ علم تھا اور مکہ میں ہی علم تھا کہ رسول اللہ صلعم نے فلاں فلاں آیتوں کو جو پہلے قرآن میں تھیں منسوخ کر دیا ہے تو تعجب ہے کہ ایک بھی صحابیؓ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ کبھی آنحضرت صلعم نے کسی آیت کو منسوخ فرمایا ہو۔ قرآن میں عدم تنسیخ پر اور دلائل کے لیے دیکھو ع۱۳۸۔

یہاں بھی آیت کے بدلنے سے نئی رسالت یا نئے پیغام الٰہی کا آنا مراد ہے دیکھو ع۱۳۸ اور اس پر قرینہ یہ ہے کہ پچھلے سے پچھلے رکوع میں دوسرے

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ
بِالْحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هُدًی
وَّ بُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۰۲﴾

کہہ اسے رُوح القدس نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اُتارا ہے تاکہ اُنھیں مضبوط کرے جو ایمان لائے اور وہ فرمانبرداروں کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے۔

وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ
بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ
اَعْجَمِیٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۰۳﴾

اور ہم جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اسے تو ایک انسان سکھاتا ہے اس کی زبان جس کی طرف یہ رسکھانے کی نسبت کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ کھلی عربی زبان ہے ۱۷۸۶

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا
یَهْدِیْهِمُ اللّٰهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾

جو لوگ اللہ کی باتوں پر ایمان نہیں لاتے اللہ انھیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اِنَّمَا یَفْتَرِی الْكَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ
بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

جھوٹ تو صرف وہ لوگ بناتے ہیں جو اللہ کی باتوں پر ایمان نہیں لاتے اور وہی جھوٹے ہیں ۱۷۸۷

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ
اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ وَ لٰكِنْ

جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ کا انکار کرتا ہے مگر وہ نہیں جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔

انبیاء کا جو اپنی اپنی قوموں میں آئے ذکر کیا تھا۔ دیکھو آیت ۸۴ و آیت ۸۹ اور پچھلے رکوع میں صرف یہ بتایا کہ قرآن کریم کی تعلیم نیکی سکھانے والی اور بدی سے روکنے والی ہے تو اب کفار کے اس اعتراض کا ذکر کیا کہ جب پہلے بھی رسول آئے تھے تو نئے رسولوں کی کیا ضرورت ہے اور کیوں اس نے سابق شرائع کو منسوخ کیا اس لیے وہ کہتے ہیں کہ یہ تو بہرحال افترا ہے۔ اس کا جواب دیا ہے کہ روح القدس نے اسے نازل کیا ہے اور روح القدس کے نازل کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا گناہ کی ظلمت میں مبتلا تھی اس کے دور کرنے کے لیے اس وحی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے ایک عالم کو گناہ سے پاک کر کے دکھا بھی دیا اور اس ظلمت کا ذکر رسول اللہ صلعم کے ظہور کے متعلق پیچھے ہو چکا ہے اور بالحق کہنے میں یہ اشارہ ہے کہ باوجود پہلی رسالتوں کے ایک نئی رسالت کی ضرورت تھی جس پر قرآن کریم میں بار بار دلائل گزر چکی ہیں۔

۱۷۸۶ یلحدون الیہ۔ الحاد کے اصل معنی مَیل اور عُدول ہیں یعنی ایک طرف مائل ہونا یا جھک جانا۔ اور لَحَدَ الیہ بلسانہ کے معنی ہیں مَالَ یعنی مائل ہوا یہاں اُلحِدَ ہے اور فراء کا قول ہے کہ یلحدون کے معنی یعترضون ہیں یعنی اعتراض کرتے ہیں اور من یرد فیہ بالحاد بظلم (الحج ۲۲ - ۳۵) میں اِلحاد کے معنی اعتراض ہیں اور زجاج نے الحاد کے معنی اللہ کے بارہ میں شک کرنا دیئے ہیں اور ظلم بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں (ل)

مخالفین کا اعتراض کہ کوئی انسان آپ کو سکھاتا ہے: کفار مکہ بھی ایسے اعتراض کرتے تھے اور مخالفت حق میں ان کے پیرو عیسائی بھی یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کفار قریش جن لوگوں کے نام لیتے تھے وہ سب اہل کتاب عموماً عیسائی نومسلم تھے جو عجمی لوگ تھے کسی روایت میں جبر کا نام ہے اور کسی میں عایش یا یعیش کا اور ایک میں یسار کا (جو کہا جاتا ہے کہ یہودی تھا) اور ایک میں ہے کہ عبداللہ بن مسلم الحضرمی نے کہا کہ ہمارے دو نصرانی غلام تھے یسار اور جبر جو مکہ میں تلواریں بنایا کرتے تھے اور وہ انجیل پڑھا کرتے تھے۔ نبی کریم صلعم وہاں سے کبھی گزرتے تو ٹھہر جاتے تو مشرک کہتے کہ آپ ان سے سیکھتے ہیں۔ جتنے لوگوں کے نام لیے گئے ہیں وہ سب عجمی تھے اور نومسلم غلام تھے۔ ان میں سے امر اول کو تو صفائی سے بیان کیا ہے قرآن کریم کی زبان ہمیشہ کے لیے عربی زبان کی فصاحت کا معیار ہو گئی اسے کوئی عجمی کب سکھا سکتا تھا؟ اور امر دوم کی طرف اگلی آیات میں اشارہ کیا ہے جہاں یہ ذکر ہے کہ اسلام کی خاطر کیا کیا تکلیفیں لوگوں کو اٹھانی پڑیں۔ اول تو ایسے لوگ جو خود سکھاتے ہوں مسلمان ہی کس طرح ہو سکتے تھے پھر ان ایذاؤں اور تکلیفوں کو برداشت وہ کیوں کرتے جب جانتے تھے کہ یہ نرا جھوٹ ہے جو ہم خود سکھا رہے ہیں جن دکھوں اور تکلیفوں میں سے مسلمان گزرے انہوں نے ان کے اخلاص پر تو ضرور مہر لگا دی اور جو کوئی چاہے کہے افترا کرنے والے یا افترا میں حصہ لینے والے انہیں کوئی نہیں کہہ سکتا۔

۱۷۸۷ ان دونوں آیتوں میں بتایا کہ یہ لوگ یعنی رسول اللہ صلعم اور آپ کے ساتھی مفتری نہیں ہو سکتے کیونکہ جو اللہ پر افترا کرتا ہے وہ آیات اللہ پر ایمان نہیں لا سکتا اور جو آیات اللہ پر ایمان نہیں لاتا وہ اس ہدایت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ خطرناک دکھوں اور تکلیفوں کا مقابلہ افترا کرنے والے نہیں کر سکتے۔ اگلی

مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٦﴾

بلکہ وہ جس کا سینہ کفر پر کھل جائے تو ان پر اللہ کی طرف سے غضب ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے ١٧٨٨

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٠٧﴾

یہ اس لیے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی آخرت پر عزیز رکھی اور کہ اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو منزلِ مقصود پر نہیں پہنچاتا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿١٠٨﴾

یہی وہ ہیں جن کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی اور وہی غافل ہیں ١٧٨٩

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٠٩﴾

کچھ شک نہیں کہ وہی آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٠﴾ ع

پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اس کے بعد کہ انھیں دکھ دیا گیا ہجرت کی پھر جہاد کیا اور صبر کیا یقیناً تیرا رب اس کے بعد حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ١٧٩٠

يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَ

جس دن ہر شخص اپنی ہی ذات کے لیے جھگڑا کرتا آئے گا اور ہر شخص کو

آیت میں اس مضمون کو اور کھولا ہے۔

١٧٨٨ع حالت مجبوری میں کلمہ کفر: اصل غرض تو اسی بات کا بیان کرنا ہے کہ کس ہمت اور کس قوت ایمانی سے مسلمانوں نے مصائب کا مقابلہ کیا اسی ضمن میں ان لوگوں کا ذکر بھی کر دیا ہے جو بعض وقت تبقاضائے بشریت کافروں کے ظلم کے نیچے منہ سے کوئی ایسی بات کہہ دیتے ہیں جن سے ان کی جان بچ جائے بشرطیکہ قلب میں ایمان ہو۔ لیکن جو کفر کے دباؤ کے نیچے آکر کفر پر راضی ہو جائیں تو ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ وہ غضب الٰہی کے نیچے ہیں۔ رہے وہ جو ایک وقت قلب میں تو کچھ انکار نہیں پاتے لیکن زبان سے انکار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو یہ کوئی اعلیٰ مقام نہیں ہاں چونکہ جان بچانے کی مجبوری کے لیے وہ ایسا کرتے ہیں۔ اس لیے ایک حد تک انہیں قابل معافی سمجھا ہے چنانچہ ان دو شخصوں کے معاملہ میں جن میں سے ایک نے جان بچانے کے لیے مسیلمہ کذاب کے سامنے کلمہ انکار کہہ دیا اور دوسرا لوجہ اپنی ثابت قدمی کے شہید کیا گیا نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ ایک نے رخصت سے فائدہ اٹھایا مگر دوسرے نے حق کو نہ چھپایا سو اس کے لیے مبارک ہے اور اصل میں ایمان کامل یہی ہے کہ جان کی بھی پروا اس کے مقابلہ میں انسان نہ کرے اور یہی اکثر مسلمانوں نے کیا۔ ایسے لوگوں کی مثالیں جنھوں نے کافروں کے ظلم کے نیچے کلمہ کفر کہہ دیا ہو شاذ و نادر ملیں گی مگر ان لوگوں کی مثالیں جنھوں نے خوش دلی سے نہ صرف تکلیفیں اٹھائیں بلکہ گردنیں بھی کٹوائیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ مسلمانوں کا ایمان اور اخلاص ؏ ولست ابالی حین اقتل مسلماً۔ علی ای شق کان للہ مصرعی۔

١٧٨٩ع اللہ کن کے دلوں پر مہر لگاتا ہے؟ جو دنیا کی زندگی میں غرق ہو کر آخرت کی پروا نہیں کرتے اور وہ مہر کیا ہے ان کی وہ حالت قلبی ہے جس کا نقشہ یہ ہے اولٰئك هم الغافلون۔

١٧٩٠ع ہجرت حبش اور ہجرت مدینہ: آخر میں ان لوگوں کا ذکر کیا جو نہ صرف خوش دلی سے اللہ کی راہ میں ہر قسم کی مصائب برداشت کرتے ہیں بلکہ آخر کار گھر بار کو وطن کو عزیز و اقارب کو بدی سے بچنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ بلکہ پھر اللہ کی راہ میں جہاد بھی کرتے ہیں یعنی اپنا سارا زور بھی لگاتے ہیں اور پورے استقلال سے کھڑے ہو جاتے ہیں ایسے کامل الایمان لوگوں کے لیے اللہ کا غفور ہونا یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ انھیں اپنی حفاظت میں لیکر گناہوں سے پاک کر دیتا ہے۔ اس سورت میں دوبارہ ہجرت کا ذکر ہے اور اس سے مراد مدینہ کی ہجرت ہی ہے جس سے اس کے زمانۂ نزول کا پتہ بھی لگتا ہے کیونکہ اگر ہجرت حبشہ کا ذکر ہوتا تو پہلی بہت سی سورتوں میں بھی اس کا ذکر ہوتا، جو درمیانی زمانہ کی نازل شدہ ہیں اس ہجرت کا ذکر قرآن کریم نے اس لیے نہیں کیا کہ وہ ہجرت جس سے علم الٰہی میں مسلمانوں کی کامیابیاں وابستہ تھیں مدینہ کی ہجرت ہی تھی۔ مکی سورتوں میں جہاد کا ذکر جب ابھی قتال کی اجازت نازل نہیں ہوئی صاف بتاتا ہے کہ یہ جہاد اعلائے کلمۃ اللہ ہے جو ہر مسلمان کا سب سے پہلا فرض ہے۔

تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١١١﴾

جو اُس نے کیا پورا دیا جائیگا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ع١٧٩١

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿١١٢﴾

اور اللہ ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے، جو امن اور اطمینان کی حالت میں تھی، اس کی روزی ہر جگہ سے اس کے پاس بافراغت آتی تھی پھر اس نے اللہ کی نعمتوں کا انکار کیا تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے لباس کا مزہ چکھایا، اس کا بدلہ جو وہ کرتے تھے۔ ع١٧٩٢

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿١١٣﴾

اور ان کے پاس ایک رسول انہی میں سے آیا تو انھوں نے اُسے جھٹلایا سو عذاب نے انھیں آلیا اور وہ ظالم تھے۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿١١٤﴾

سو اس سے جو تمھیں اللہ نے دیا ہے حلال اچھی چیزیں کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر کرو، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٥﴾

اس نے تم پر صرف مُردار اور خون اور سؤر کا گوشت حرام کیا ہے اور وہ جس پر اللہ کے سوائے کسی دوسرے کا نام پکارا جائے پھر جو شخص ناچار ہو جائے نہ خواہش کرنے والا اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ع١٧٩٣

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى

اور اسے جو تمھاری زبانیں جھوٹ بیان کر دیتی ہیں نہ کہا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ اللہ پر جھوٹ بناؤ

ع١٧٩١ تجادل۔ جَدَلْتُ الحَبْلَ کے معنی ہیں میں نے رسّہ کو مضبوط بٹا اور عمارت کے مضبوط بنانے پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے اور جدال یہ ہے کہ گویا ہر شخص دوسرے کو اپنی رائے سے ہٹانا چاہتا ہے (غ) یعنی دلائل کے ساتھ جھگڑنا وجادلھم بالتی ھی احسن (١٢٥) الذین یجادلون فی ایات اللہ۔ (المومن۴۰۔ ٣٥) قد جادلتنا فاکثرت جدالنا (ھود١١۔ ٣٢) یجادلنا فی قوم لوط (ھود١١۔ ٧٤) اور یہاں مراد جھگڑا کرنے سے اپنی خلاصی کا جھگڑا یا کوشش یا اس کے لیے عذروں کا پیش کرنا ہے۔

ع١٧٩٢ لباس الجوع والخوف۔ لباس وہ چیز ہے جو پہنی جاتی ہے یا جسم کو ڈھانک لیتی ہے اور خوف اور جوع کو لباس کہا گویا اس نے جسم اختیار کر کے لباس کی صورت اختیار کر لی۔ (غ) اور چاروں طرف سے انسان کو ڈھانک لیا۔

اہل مکہ کی سزا: یہ قریہ یا بستی جس کی مثال دی ہے مکہ ہے (ج) امن اور اطمینان کی وہ حالت جو دنیا میں کسی بستی کو میسر نہیں آئی اور باوجود وادی غیر ذی زرع ہونے کے ہر قسم کے پھل اور غلہ وہاں پہنچتا۔ سارے عرب کی چیزیں گھر بیٹھے ان کے پاس پہنچ جاتیں۔ اللہ کی نعمتوں کی ناشکری یہ کہ جب سب سے بڑی روحانی نعمت ملی تو اسے قبول نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے بھوک اور خوف کے رنگ میں عذاب آیا بھوک تو یہ کہ سات سال کا قحط پڑا جس کی پیشگوئی پہلے سے ہو چکی تھی فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین (الدخان۴۴۔ ١٠) اور خوف ایک اس لحاظ سے کہ اسلام کی قوت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ دوسرے مدینہ میں مسلمانوں کی ہجرت کی وجہ سے تجارت کے رک جانے کا خوف تیسرے آیندہ جنگوں کی وجہ سے خوف۔ امن و اطمینان کی جگہ بھوک اور خوف کفران نعمت یعنی انکار رسول کی سزا تھی جیسا کہ اگلی آیت میں صاف ذکر ہے الفاظ قرآنی کے عجائبات ختم نہیں ہوتے اور آج بھی یہ لفظ کسی بستی پر صادق آتے ہیں۔

ع١٧٩٣ اہل مکہ جو قرآن کو افترا کہتے تھے انہیں بتایا ہے کہ جو حق ہے اسے تم افترا کہتے ہو اور خود افترا کرتے ہو۔ چنانچہ غذاؤں کی حلت و حرمت کے متعلق وہ اللہ تعالیٰ پر یہ افترا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یوں حکم دیا ہے اگلی آیت میں اسے اور صاف کیا ہے۔

اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى
اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ؕ ﴿۱۱۶﴾

جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ کامیاب نہیں ہوتے۔

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۙ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

تھوڑا سا سامان ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا
عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ
كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اور ان پر جو یہودی ہیں ہم نے وہی حرام کیا تھا جو تجھ پر پہلے بیان کر چکے ہیں اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن وہ اپنی جانوں پر خود ہی ظلم کرتے تھے[۱۷۹۴]

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ
ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْۤا اِنَّ
ع ۱۶ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾

پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے جو نادانی سے بدی کر بیٹھتے ہیں پھر اس کے بعد توبہ کرتے ہیں اور اصلاح کر لیتے ہیں یقیناً تیرا رب اس کے بعد حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔[۱۷۹۵]

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ
وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ ﴿۱۲۰﴾

ابراہیمؑ ایک امام اللہ کا فرماں بردار راست رَو تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا[۱۷۹۶]

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَ هَدٰىهُ اِلٰى
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾

اس کی نعمتوں کا شکر کرنے والا اس نے اُسے چُن لیا اور اسے سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کی۔

وَ اٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَ اِنَّهٗ فِى
الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ؕ ﴿۱۲۲﴾

اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی اور وہ آخرت میں یقیناً نیکوں میں سے ہے۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ
حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ ابراہیمؑ راست رَو کے دین پر چل اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا[۱۷۹۷]

ع۱۷۹۴ یہ سورۂ الانعام ۶-۱۴۷ میں بیان ہو چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورہ انعام اس سورت سے پہلے نازل ہوئی تھی؛

ع۱۷۹۵ سزا اور عذاب کے ذکر کے ساتھ یہ بشارت بھی ہے کہ یہ تم جہالت سے بُرے کام کر رہے ہو۔ اگر توبہ کرو اور اصلاح کرو تو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ گناہ بخش دے گا بلکہ تم پر رحم بھی کرے گا؛

ع۱۷۹۶ امۃ اُمّۃ جماعت کو کہتے ہیں اور امام راغب نے یہاں معنی کئے ہیں کہ اللہ کی عبادت میں ایک جماعت کے قائم مقام تھے (غ) لیکن اس کے اور معنی بھی آئے ہیں چنانچہ ہر شخص کو جو دین حق پر ہو کر سب ادیان کا مخالف ہو اُمّۃ کہا جاتا ہے۔ اور ایسا ہی وہ شخص جو اپنی نظیر نہیں رکھتا اور ابو عبیدہ نے اس کے معنی امام کئے ہیں اور معلّم خیر بھی اس کے معنی کئے گئے ہیں (ل)
حضرت ابراہیمؑ کا ذکر اس آخری رکوع میں دو وجہ سے کیا۔ ایک کفار کو توجہ دلانے کے لیے کہ حضرت ابراہیمؑ جن کی وہ پیروی کا دعوے کرتے ہیں مشرک نہ تھے دوسرے مسلمانوں کو بتانے کے لیے کہ وہ اس شخص کا طریق اختیار کریں جو دنیا میں راست بازوں کا سردار ہوا۔ اور پھر اپنے زمانہ میں بے نظیر انسان تھا جس نے حق کی پیروی میں کسی کی پروا نہیں کی اور ابراہیمؑ کو امت کہنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ نیکی کے معلم دنیا میں ہمیشہ سردار بن جاتے ہیں پس اگر مسلمان بھی دنیا میں نیکی کے معلم بنیں تو وہ بھی دنیا کے پیشوا بنا دیئے جائیں گے۔ چنانچہ وان عاقبتم (۱۲۶) میں اور ان اللّٰہ مع الذین اتقوا (۱۲۸) میں مسلمانوں کی آئندہ شوکت کی طرف صاف اشارہ ہے؛

ع۱۷۹۷ ملت ابراہیمی پر چلنے کا ارشاد: یعنی وہی کام کرو جو ابراہیم نے کیا مطلب یہ ہے کہ تم بھی شرک کی بیخکنی کرو جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے کی کیوں کہ ملت ابراہیمی کا اصل الاصول تو یہی بیان کیا کہ وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ شرک سے دنیا کو صاف کرنا حضرت ابراہیمؑ کا بھی مقصد تھا یہی مقصد محمد رسول اللہ صلعم کی بعثت کا تھا نیز دیکھو ع۲۷۰ و ع۹۸۰ ؛

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا
فِيْهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾
اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ
الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ
رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ
وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۲۵﴾
وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ
بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾
وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ
عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

سبت (کا وبال) صرف ان لوگوں پر ڈالا گیا جنھوں نے اس میں اختلاف کیا اور تیرا رب قیامت کے دن ضرور ان میں ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے ؁۱۷۹۸

اپنے رب کے رستے کی طرف۔ حکمت اور اچھے وعظ سے بُلا اور ان کے ساتھ اس طریق پر بحث کر جو نہایت عمدہ ہو۔ تیرا رب اسے خوب جانتا ہے جو اس کے رستے سے گمراہ ہوا اور وہ سیدھی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے ؁۱۷۹۹

اور اگر تم (انھیں) بدلہ دو تو اتنا دو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی۔ اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہت اچھا ہے۔

اور صبر کر اور تیرا صبر اللہ کی مدد سے ہی ہے اور ان پر افسوس نہ کر اور اس کی وجہ سے تنگ نہ ہو جو وہ تدبیریں کرتے ہیں۔

؁۱۷۹۸ السبت۔ سَبْت کے اصل معنی قطع عمل ہیں دیکھو ؁۹۴ اور یہاں راغب نے مراد لیا ہے ترك العمل فیہ یعنی اس دن کام کا ترک کرنا اور سَبْت کے معنی مدت زمانہ بھی ہیں تھوڑی ہو یا بہت:

یہودیوں اور عیسائیوں کا سبت: اس آیت کے ماتحت مفسرین نے بخاری اور مسلم کی ایک حدیث نقل کی ہے۔ بخاری کے لفظ یہ ہیں نحن الاٰخرون السابقون یوم القیامۃ بید انهم اوتوا الکتاب من قبلنا ثم هذا یومهم الذی فرض الله علیهم فاختلفوا فیه فهدانا الله له فالناس لنا فیه تبع الیهود غدا والنصاری بعد غد۔ ہم پیچھے آنے والے قیامت کے دن سب سے پہلے ہوں گے سوائے اس کے کہ انہیں ہم سے پہلے کتاب دی گئی پھر ان کا دن تھا جو اللہ نے ان پر فرض کیا۔ مگر انہوں نے اس میں اختلاف کیا پس اللہ نے ہمیں اس کی طرف ہدایت دی سو لوگ ہمارے پیرو ہیں یہود کل اور عیسائی کل کے بعد۔ اور مسلم میں کچھ لفظوں کا اختلاف ہے اور اس کے ابتدائی الفاظ یوں ہیں اضل الله عن الجمعة من قبلنا فکان للیهود یوم السبت وکان للنصاریٰ یوم الاحد فجاء الله بنا فهدانا الله لیوم الجمعة اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو ہم سے پہلے تھے۔ جمعہ سے محروم رکھا سو یہودیوں کے لیے ہفتہ کا دن تھا اور عیسائیوں کیلئے اتوار کا پھر اللہ ہمیں لایا اور ہمیں جمعہ کے دن کیلئے رہنمائی فرمائی مفسرین نے آیت اور ان احادیث کا مطلب یہ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی قوموں کیلئے جمعہ کا دن ہی عبادت کا دن قرار دیا تھا۔ مگر انہوں نے خود ہفتہ اور اتوار کا دن اختیار کیا۔ اب آیت میں تو یہ ذکر قطعاً نہیں اور بخاری کی حدیث کا اگر یہ مطلب لیا بھی جائے جہاں دن کا نام بھی نہیں تو مسلم کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی یوم جمعہ سے ان لوگوں کو محروم رکھا اور ہفتہ اور اتوار کا دن ان کیلئے مقرر کیا اور یہودیوں نے باہم تو کوئی اختلاف سبت کے بارہ میں نہیں کیا نہ عیسائیوں نے بلکہ ان کے سبت متفقہ طور ہفتہ اور اتوار ہی رہے اور اتنے بڑے تعامل قومی میں اس قدر اختلاف کا ہونا بھی مشکل ہے۔ پھر یہود کے اندر نبی پر نبی آتے رہے اگر کسی وقت انہوں نے اس کو بدل دیا تھا تو اس کی اصلاح انبیاءؑ کر دیتے اور بخاری کی حدیث کا مطلب کچھ اور ہونا چاہیئے۔

سبت میں اختلاف سے مراد: ممکن ہے یہی مراد ہو کہ اس امر پر یعنی نبی کریم صلعم پر پہلے عرب لوگ ایمان لائے بعد میں یہود و نصاریٰ لائیں گے۔ اور آیت کا مطلب سبت کے معنی عبادت کا دن لیکر یوں بھی ہو سکتے ہیں جعل وبال ترك تعظیم السبت یعنی سبت کی تعظیم کو ترک کرنے کا وبال ان لوگوں پر آیا جنہوں نے سبت میں اختلاف کیا یعنی سبت کی تعظیم کو قائم نہ رکھا۔ اور یہ معنی بعض مفسرین نے کئے ہیں اور یا سبت کے اصل معنی قطع عمل لے کر یہ مراد ہو گی کہ جن لوگوں نے قرآن شریف کے متعلق اختلاف کیا یا اسے نہ مانا ان کے عمل قطع ہو گئے۔ کیونکہ قرآن کریم اعمال صالحہ کی طرف توجہ دلاتا ہے اور بلحاظ سیاق یہ معنی سب سے زیادہ موزوں ہیں:

؁۱۷۹۹ چونکہ اس سورت میں وحی الٰہی کی صداقت کا مسئلہ ہر قسم کی دلائل سے قائم کیا ہے اس لیے اس کے خاتمہ پر دحی کی اصل غرض دعوت الی الحق کا ذکر کیا اور اس کا طریق بتایا۔ حکمت مضبوط بات با فہم ہے یا مضبوط دلیل اور وعظ تنبیہ کیلئے ہے۔ دعوت الی الحق میں یہی دو چیزیں ضروری ہیں۔ نہ دلائل محکمہ کے بغیر دعوت کا کام ہو سکتا ہے۔ نہ وعظ کے بغیر اس کے بعد جدال کا ذکر ہے۔ یعنی بحث کا اس لئے کہ دعوت میں بحث کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے پس اگر بحث کی ضرورت پیش آئے تو عمدہ طریق پر بحث کی جائے جس سے دلوں میں تنفر اور باطل پر اصرار پیدا نہ ہو بلکہ حق بات کے فہم میں مدد ملے:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿١٢٨﴾ ع ١٦ ١٧

اللہ اُن کے ساتھ ہے جو تقوےٰ اختیار کرتے ہیں اور وہ جو احسان کرنے والے ہیں ۱۸۰۰

ع۱۸۰۰ عقاب فعل بد کے پیچھے اس کی سزا لانا ہے اور مطلق سزا یا دُکھ پہنچانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

دعوت الی الحق میں صبر کی ضرورت اور غلبہ کی پیشگوئی: پس مراد یہ ہے کہ تمہیں جو دُکھ اور تکلیفیں دی جاتی ہیں۔ ان کی سزا دینے کا موقعہ ملے تو اس سے زیادہ سزا نہ دو جس قدر تکلیف تمہیں پہنچائی گئی ہے بلکہ بہتر یہی ہے کہ تم صبر سے ہی کام لو اور بدلہ نہ لو۔ دعوت الی الحق میں اس کا ذکر اس لیے کیا کہ دعوت الی الحق کرنے والے لوگوں کو تکلیفیں بھی اٹھانی پڑتی ہیں۔ اگر وہ دنیا کے لوگوں کی طرح غلبہ کے وقت انتقام لیں تو دل ان سے متنفر ہو جائیں اس لیے فرمایا کہ تمہارا کام یہی ہے کہ دُکھ برداشت کرو اور کام کرتے جاؤ ہاں اگر کبھی ضرورت سزا دینے کی ہو تو اسی قدر سزا ہو جس قدر تکلیف تمہیں پہنچائی گئی تھی۔ سزا دینے کا ذکر کر کے صاف بتا دیا کہ تمہیں دنیا میں اس قدر غلبہ دیا جائے گا کہ تم اپنے مخالفین کو سزا دینے پر قادر ہو گے۔ اس آیت کا تعلق نہ سمجھنے کی وجہ سے اسے مدنی بھی کہدیا گیا ہے مگر اعتراض تو پھر بھی باقی رہے گا کہ اسے یہاں کیوں رکھا اور حق یہی ہے کہ یہ مکی ہے اگلی آیت میں پھر صبر کی تاکید کی ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہی اصل چیز ہے جس پر تعلیم قرآنی زور دیتی ہے دشمنوں کی ایذا پر صبر کے بغیر دعوت الی الحق کا کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا اور سب سے آخری آیت میں یہ عظیم الشان خوشخبری تسلی کے طور پر دی کہ اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں اور احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اٰیَاتُھَا ۱۱۱ (۱۷) سُوۡرَۃُ بَنِیۡٓ اِسۡرَآءِیۡلَ مَکِّیَّۃٌ رُکُوۡعَاتُھَا ۱۲

نام: اس سورت کا نام بنی اسرائیل ہے اور اسرا بھی اس کا نام آیا ہے اور اس میں بارہ رکوع اور ایک سو گیارہ آیتیں ہیں۔ بنی اسرائیل کے ذکر سے ہی یہ سورت شروع ہوتی ہے اور انہی کے ذکر پر ختم ہوتی ہے اور اس کی پہلی ہی آیت میں یہ اشارہ کر دیا گیا ہے کہ وہ سب برکات جو بنی اسرائیل کو دی گئیں ان کا وارث بھی اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جاتا ہے اور سورت کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں پندرہ آیتوں میں توریت کی ساری تعلیم سے بڑھ کر مکمل اور بلند تر اخلاق کی تعلیم اکٹھی کر دی گئی ہے اور سورت کے آخری رکوع میں پھر شریعت موسوی کا ذکر کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خاص طور پر بنی اسرائیل یعنی یہود کو خطاب ہے۔ اس لحاظ سے اس سورت کا نام بنی اسرائیل ہے۔ اور اس کے نام اسرا میں اشارہ کمالاتِ محمدیہ کی طرف ہے جن پر آپؐ کا معراج جس کا ذکر سورت کی ابتدا اور پھر درمیان میں موجود ہے' دلالت کرتا ہے۔

خلاصۂ مضمون: سورت کی ابتدا نبی کریم صلعم کے معراج سے کی ہے مگر معراج کا ذکر ایسے رنگ میں کیا ہے جس میں مسجد اقصٰی کا ذکر لا کر بتا دیا ہے کہ وہ برکات جو مسجد اقصٰی یعنی بیت المقدس سے تعلق رکھتی تھیں اور جن کے ساتھ بنی اسرائیل کو مخصوص کیا گیا تھا ان کا وارث اب نبی کریم صلعم اور آپؐ کی امت کو کیا جاتا ہے اور معراج نبوی میں گویا عروج اسلام کا ذکر کر کے مضمون کا انتقال فوراً بنی اسرائیل کے دو مرتبہ فساد عظیم کرنے اور ان پر دو مرتبہ سزا آنے کا ذکر پہلے رکوع میں کیا ہے۔ اور اس میں اگر ایک طرف بنی اسرائیل کو سمجھانا مقصود ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کو بھی تنبیہ کرنا مقصود ہے اس لیے رکوع کے آخر میں قرآن کا ذکر کر کے بتایا کہ یہ پاک کتاب تمہیں نہایت ہی مضبوط راہ پر چلاتی ہے۔ دوسرے رکوع میں بتایا کہ اعلیٰ اغراض زندگی کو چھوڑنے اور صرف دنیا پر گر جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی قوموں پر بربادی اور تباہی آجاتی ہے اور اسی ضمن میں بتایا کہ انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے اور نتائج یہاں انسان کی نظر سے مخفی رہتے ہیں اور قیامت میں یہ کھل کر سامنے آجاتے ہیں ہاں دنیا میں بھی جب کوئی قوم حد سے تجاوز کرتی ہے تو یہ نتائج کھلا رنگ اختیار کر کے سامنے آجاتے ہیں۔ تیسرے اور چوتھے رکوع میں اخلاق فاضلہ کی تعلیم دی ہے اور یوں بتایا ہے کہ یہی اعلیٰ اغراض زندگی ہیں جن کی طرف انسان کو متوجہ ہونا چاہیئے اور اسی تعلیم میں توریت کی بھی ساری تعلیم آگئی ہے اور نہایت عجیب تقسیم کر کے تیسرے رکوع میں دوسروں سے نیکی کی تعلیم ہے اور چوتھے میں دوسروں سے بدی کرنے سے روکا ہے۔ پانچویں رکوع میں توحید کے مضمون کی طرف رجوع کر کے جس سے اخلاق فاضلہ کا مضمون شروع کیا تھا ایمان بالآخرۃ کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ بغیر اس کے اخلاق فاضلہ حاصل نہیں ہو سکتے کہ اعمال کی جزا و سزا پر پورا پورا یقین ہو۔ چھٹے رکوع میں اسی قانون جزا و سزا کے ذکر کو جاری رکھتے ہوئے عذاب الٰہی کے آنے کا قانون بیان کیا اور ساتویں میں مخالفین نبی کریم صلعم پر عذاب کا ذکر کیا۔ آٹھویں میں ان کوششوں کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلعم کے خلاف کی جاتی تھیں دکھوں اور تکلیفوں کے بعد آپؐ کو بادشاہت اور دولت کا لالچ دینا اور بالآخر آپؐ کے قتل کا منصوبہ اور نویں میں حق کی کامیابی کی عظیم الشان بشارت دی اور بتایا کہ باطل یعنی بت پرستی اس ملک عرب سے ایسی دور ہوگی کہ پھر دوبارہ نہ آئے گی اور ضمناً سمجھا دیا کہ دنیا میں روز بروز توحید کا غلبہ ہوتا چلا جائے گا۔ دسویں میں قرآن کریم کے اعجاز عظیم کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ ظاہر پرست مخالفین ظاہری کامیابی اور مال و دولت کو ہی معیار صداقت ٹھہرانے میں غلطی پر ہیں گیارھویں میں انکار رسول اور اس کی سزا کا ذکر کر کے بارھویں میں پھر شریعت موسوی اور اس کی صداقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے شریعت محمدیہ اور اس کی حقانیت کا ذکر کیا اور آخر میں سلسلہ بنی اسرائیل کے آخری نبی یعنی مسیحؑ کے متعلق جو غلط فہمی عقیدۂ ابنیت مسیح سے پیدا ہوئی۔ اس کی طرف توجہ دلا کر مضمون کا انتقال عیسائیت کی طرف کیا جن کا ذکر اگلی سورت میں ہے۔

تعلق: خلاصہ مضمون سے ظاہر ہے کہ اس سورت کا مضمون پچھلی سورتوں سے الگ رنگ کا ہے کیونکہ یہاں بالخصوص خطاب بنی اسرائیل کو ہے لیکن باایں ہمہ پچھلی سورت کے ساتھ اس کا تعلق نہایت واضح ہے۔ اول تو اس طرح پر کہ پچھلی سورت کا خاتمہ اس بات پر کیا تھا کہ مسلمان ایک بڑی قوم بنیں گے، تو اس سورت کی ابتدا نبی کریم صلعم کے معراج سے کر کے اسی عروج اسلام کی طرف توجہ دلائی اور دوسرے اس طرح پر کہ سورت نحل کے آخر پر فرمایا تھا کہ اہل کتاب کو حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ حق کی طرف بلاؤ تو اب یہاں اہل کتاب کے پہلے گروہ یعنی یہود کو خطاب کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح ان کا دنیا پر جھک جانا انکی تباہی کا موجب ہوا اسلیے اب بھی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور حق کو قبول کریں اور اسی طرح سورۂ کہف میں عیسائیوں کو خطاب کیا ہے۔

زمانۂ نزول: اس سورت کے زمانۂ نزول کے متعلق حضرت ابن مسعودؓ سے صریح روایت ہے کہ پہلے زمانہ کی نازل شدہ ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل۔ الکہف مریم۔ طٰہٰ۔ الانبیاء کے متعلق آپ نے فرمایا اِنَّهُنَّ مِنَ الْعِتَاقِ الْاُوَلِ وَهُنَّ مِنْ تِلَادِیْ یعنی یہ وہ سورتیں ہیں جو ابتدا میں مکہ میں نازل ہوئیں اور یہ ان میں سے ہیں جو انھوں نے پہلے پہلے قرآن کریم سے سیکھا پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ابتدائی زمانہ مکہ کی سورتیں ہیں اور اس کی تائید دو اور باتوں سے ہوتی ہے۔ اول یہ کہ اس سورت میں یقیناً معراج کا ذکر ہے اور سورت النجم میں بھی یہ ذکر ہے اور سورت النجم بالاتفاق ابتدائی زمانہ کی ہے اس لیے یہ سورت جس میں معراج کا ذکر ہے اسی زمانہ کی ہونی چاہیئے اور دوسرے یہ کہ سورت مریم جسے اس سورت کے ساتھ حضرت ابن مسعودؓ نے ایک ہی زمانہ کی قرار دیا ہے وہ حصہ قرآن کریم کا ہے جسے حبش کی پہلی ہجرت کے وقت حضرت جعفرؓ طیار نے نجاشی کے سامنے پڑھا اور وہ پانچواں سال ہجرت کا تھا اور ایسا ہی حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے وقت سورت طٰہٰ نازل شدہ تھی اور اسی سے حضرت عمرؓ پر بھی اثر ہوا تھا۔ پس اگر ہم مکی زمانہ کی تقسیم یوں کریں کہ ابتدائی زمانہ پہلے سے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ①

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

وہ ذات پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے (محمد) کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا۔ بابرکت بنایا، تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ وہ سُننے والا دیکھنے والا ہے ۱۸۰۱

پانچویں سال لبعثت تک اور درمیانی زمانہ چھٹے سے دسویں سال لبعثت تک اور آخری زمانہ ہجرت تک قرار دیں تو یہ بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سورت کے نزول کی ابتدا ابتدائی مکّی زمانہ سے تعلق رکھتی ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ لبعض آیات کا نزول پیچھے ہوا ہو اور یہ جو لبعض لوگوں نے دو یا چار یا پانچ یا آٹھ آیتوں کو مدنی کہا ہے تو یہ درست نہیں مثلاً آیت وان کادوا لیفتنونك (۷۳) وان کادوا لیستفزونك (۷۶) قریبًا قریبًا چھٹے سال لبعثت کے واقعات میں سے ہیں اور انہیں مدنی کہنا غلطی ہے اور آیت وقل رب ادخلنی مدخل صدق بطور پیشگوئی کے ہے یا ممکن ہے ہجرت کے بالکل قریب کی ہو۔ لیکن مدنی یہ نہیں۔

۱۸۰۱ المسجد الاقصا۔ اَقْصٰی قَصَا بمعنی بُعد لیعنی دوری سے ہے دیکھو ۱۲۳۳ اور المسجد الاقصی کے لفظی معنی ہوئے دور کی مسجد اور مسجد اقصیٰ بیت المقدس کو کہا ہے بوجہ اس فاصلہ کے جو نبی کریم صلعم کی جائے قیام لیعنی حجاز اور بیت المقدس میں تھا (غ) اور لبعض نے بُعد سے پلیدیوں اور ناپاکیوں سے دور ہونا مراد لیا ہے (ر) اور ہر دو معنی کے لحاظ سے مسجد نبوی کو جو مدینہ میں ہے مسجد اقصٰی کہا جا سکتا ہے مگر احادیث میں مسجد اقصٰی کا لفظ بیت المقدس پر ہی بولا گیا ہے۔

بٰرکنا۔ بارك کے معنی اسے برکت دی اور بَرَکَۃ کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کا رکھا جانا ہے کیونکہ بِرْکَۃ حوض کو کہتے ہیں جس میں پانی ٹھہرتا ہے گویا اس چیز میں الہٰی خیر اسی طرح ٹھہر گئی جس طرح پانی حوض میں ٹھہر جاتا ہے (غ) اور یہاں بارکنا سے مراد دینی اور دنیوی بھلائیوں کا جمع کر دینا ہے۔ کیونکہ وہ سرزمین بوجہ اپنی انہار واشجار کے دنیوی طور پر بھی بھلائیوں کی جگہ ہے جس طرح بوجہ انبیاء کا مقام ہونے کے دینی طور پر بھلائیوں کی جگہ ہے۔

حول۔ اصل معنی کسی چیز کا تغیر ہیں دیکھو ۲۰۷ اور سال کو کہتے ہیں اس لیے کہ اس میں ایک دورہ بلحاظ نظام شمسی پورا ہوتا ہے حولین کاملین (البقرۃ ۲-۲۳۳) اور کسی چیز کے اردگرد کو بھی حول کہا جاتا ہے گویا یہ اس کی وہ جانب ہے جس کی طرف اسے پھیرا جا سکتا ہے (غ) اور یہاں یہی مراد ہے۔

آیت اسرا اور احادیث معراج: اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے نبی کریم صلعم کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصٰی کو لے جانے کا ذکر ہے اور مفسرین نے اس سے مراد معراج لیا ہے۔ کیونکہ حدیث معراج میں نبی کریم صلعم کو پہلے بیت المقدس میں لے جانے کا ذکر ہے۔ احادیث اس بارہ میں بہت ہیں۔ اور ان میں سے صحیح بھی ہیں حسن بھی اور ضعیف بھی۔ اور ان میں بہت سے اختلافات بھی ہیں یہاں تک کہ انہی اختلافات کی وجہ سے لبعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ معراج کئی بار ہوا ہے ایک بار نہیں۔ مگر کثیر صحابہؓ سے اس روایت کا پایا جانا اور سب میں ایک ہی معراج کا ذکر پایا جانا صاف بتاتا ہے کہ واقعہ تو صحیح ہے اور ہے بھی ایک لیکن بوجہ نوعیت قصہ کے اس میں راویوں سے بہت اختلاف ہو گیا ہے۔ خلاصہ احادیث معراج کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے بیت المقدس میں تشریف لے گئے اور پھر سب آسمانوں کی سیر آپؐ کو کرائی گئی۔ یہاں تک کہ آپؐ ان تمام مقامات سے اوپر نکل گئے جہاں تک دوسرے انبیاء علیہم السلام پہنچے تھے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پانچ نمازوں کا فرض ہونا بھی واقعہ معراج سے ہی متعلق ہے۔ اس بارہ میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آیا معراج جسد عنصری کے ساتھ تھا یا نہیں۔ اور اس بارہ میں اُمت میں دو گروہ ہوئے ہیں کثیر گروہ اسے جسم عنصری کے ساتھ مانتا ہے اور قلیل گروہ جن میں حضرت عائشہؓ صدیقہ اور معاویہؓ اور حسنؒ ہیں اسے رویا مانتا ہے۔ ابن کثیر نے اس پر بحث کرتے ہوئے ابن اسحاق کے الفاظ نقل کیے ہیں واللہ اعلم ای ذالك کان قد جاءہ وعاین من اللہ فیہ ما عاین علی ای حالاتہ کان نائما او یقظانا کل ذٰلك حق وصدق لیعنی اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ معراج جسم عنصری سے تھا یا لبغیر اس کے ہاں آپؐ اللہ تعالیٰ کے حضور گئے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دیکھنا تھا دیکھا، خواہ وہ کسی حالت میں ہوں لیعنی سوتے یا جاگتے یہ سب حق وصدق ہے اور یہی بات اقرب الی الصواب ہے مگر آج اس بات پر تعجب ہے کہ صرف اس بات کے کہنے کی وجہ سے کہ معراج روحانی تھا تکفیر تک نوبت پہنچائی جاتی ہے۔

جن لوگوں نے معراج کو جسمانی مانا ہے ان کی دلائل حسب ذیل ہیں اول یہ کہ اسے ایک عظیم الشان واقعہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی ابتدا سبحان الذی سے ہوتی ہے دوم یہ کہ اگر جسمانی نہ ہوتا تو کفار قریش تکذیب کیوں کرتے۔ سوم یہ کہ لبعض مسلمان اس بات کو سن کر مرتد بھی ہو گئے

وَ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى اور ہم نے موسٰی کو کتاب دی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت

تھے چہارم یہ کہ لفظ عبد مجموعہ جسم و روح سے عبارت ہے۔

ان میں سے پہلی بات تو چنداں قابلِ توجہ نہیں معراج روحانی بھی ہو تو اس کی عظمت کم نہیں ہو جاتی عظمت تو اس لحاظ سے ہے کہ آنحضرت صلعم کو تمام انبیاءؑ سے بلند تر مقام پر پہنچایا گیا۔ دوسری بات کہ کفار تکذیب نہ کرتے۔ یہ بھی کوئی مضبوط دلیل نہیں اس لیے کہ کفار تو آنحضرت صلعم پر وحی آنے کی بھی تکذیب کرتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ کا جواب بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جب آپ کے سامنے ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا انی اصدقہ علی البعد من ذلك اصدقہ علی خبر السماء غدوۃ او روحۃ۔ میں تو اس سے بھی زیادہ بعید از قیاس بات پر آپ کی تصدیق کرتا ہوں میں تو آپ کو اس میں بھی سچا مانتا ہوں کہ صبح شام آپ پر آسمان کی خبر آتی ہے۔ تیسری بات کہ بعض مسلمان مرتد ہو گئے تھے صحیح معلوم نہیں ہوتی کوئی خاص نام کسی حدیث میں میری نظر سے نہیں گزرا کہ معراج کے واقعہ پر وہ مرتد ہو گیا ہو صرف یہی عام الفاظ بعض روایات میں ہیں کہ بعض لوگ مرتد ہو گئے تھے مگر ابوسفیان والی حدیث اس کی تردید کرتی ہے جہاں قیصر کے اس سوال کے جواب میں کہ کوئی مسلمان مرتد ہوتا ہے ابوسفیان نے یہ جواب دیا حالانکہ وہ اس وقت مسلمان بھی نہ تھا کہ دین سے ناراض ہو کر کوئی مرتد نہیں ہوتا۔ اور چوتھی بات بہت ہی کمزور ہے کیونکہ رویا میں جو کچھ انسان دیکھتا ہے وہ گو اس جسد عنصری سے نہ ہو مگر روح کو ایک اور جسم مل جاتا ہے اور حالت کشفی میں بھی جو رویا سے زیادہ صفائی کی حالت ہے۔ ایک اور نورانی جسم عطا ہوتا ہے جس کے ساتھ انسان کسی دوسرے عالم کی اشیاء کو دیکھتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کہتے ہیں اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ یہ دیکھنے والا بھی تو روح مع الجسد ہی ہے مگر وہ جسم جو رویا اور کشف میں ملتا ہے یہ جسم عنصری نہیں ہوتا یہ جہاں ہو وہیں رہتا ہے اور انسان کہیں کا کہیں ہو آتا ہے لوگ چونکہ انبیاء علیہم السلام کے رویا کو بھی اپنے خوابوں کی طرح سمجھتے ہیں اس لیے خیال کرتے ہیں کہ رویا کے نیچے حقیقت ہی کیا ہے۔

معراج کے جسد عنصری کے ساتھ نہ ہونے کی دلائل: غور کیا جائے تو خود قرآن شریف سے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح مذہب وہی ہے جس کی طرف قلّت گئی ہے یعنی یہ کہ معراج نبوی اس جسد عنصری سے نہیں بلکہ دوسرے نورانی جسم کے ساتھ تھا جو اللہ تعالیٰ حالت کشف میں اپنے برگزیدوں کو عالمِ روحانی کی سیر کے لیے عطا فرماتا ہے قرآن کریم میں پہلی دلیل تو خود یہ موجود ہے کہ اسی سورت میں معراج کا ذکر کر کے فرمایا وما جعلنا الرؤیا التی اریناك (۶۰) جہاں صاف الفاظ میں اسے رویا کہا ہے اور رویا کا لفظ عالم خواب سے مخصوص ہے جس میں جسد عنصری حرکت نہیں کرتا۔ والرویا مایری فی المنام (غ) رؤیا وہ ہے جو خواب میں دیکھا جاتا ہے۔ دوم جب کفار نے جسد عنصری کے ساتھ اوپر جانے کا مطالبہ کیا او ترقی فی السماء (۹۳) تو اس کا جواب دیا قل سبحان ربّی ھل کنت اِلّا بشرًا رّسولًا گویا یہ تقاضائے بشریت کے خلاف ہے کہ انسان اس جسد عنصری کے ساتھ اس زمین کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ پر چلا جائے جیسا کہ دوسری جگہ ہے الم نجعل الارض کفاتا احیاء و امواتا (المرسلٰت۔ ۲۵، ۲۶) سوم حدیث بخاری میں صاف یہ لفظ ہیں فیما یری قلبہ وتنام عینہ ولاینام قلبہ یعنی اس حالت میں معراج ہوا جب آپؐ کا قلب دیکھتا تھا اور آپؐ کی آنکھ سوتی تھی مگر دل نہیں سوتا تھا اور اسی حدیث کے آخر میں یہ لفظ ہیں واستیقظ وھو فی المسجد الحرام پھر آپؐ جاگ اٹھے اور آپؐ مسجد حرام میں تھے جس سے صاف ثابت ہوا کہ یہ سب کچھ آپؐ پر حالت خواب میں وارد ہوا۔ اور دوسری روایت میں جو وہ بھی بخاری کی ہے معراج کی حالت کو بین النائم و الیقظان یعنی سوتے اور جاگتے کے درمیان یا حالت مکاشفہ قرار دیا ہے اور مطلب دونوں کا ایک ہے۔ چہارم جو کچھ آنحضرت صلعم نے معراج میں دیکھا اس کا اسی زمین پر حالت کشف یا رویا میں دیکھنا ثابت ہے اول بیت المقدس۔ حدیث میں ہے کہ جب کفار نے آپؐ کی بات کو نہ مانا اور بیت المقدس کے حالات دریافت کیے تو اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو آپؐ کے سامنے کر دیا یعنی کشفی حالات میں اور آپؐ نے ان کو سب کچھ بتا دیا قمت فی الحجر فجلی اللہ لی بیت المقدس فطفقت اخبرھم عن اٰیاتہ و انا انظر الیہ میں حجر میں کھڑا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس میرے سامنے کر دیا تو میں انہیں اس کی نشانیوں سے خبر دینے لگا درانحالیکہ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دوسرا جنت و نار۔ حدیث کسوف میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس جگہ سب کچھ دکھا دیا گیا یہاں تک کہ بہشت اور دوزخ بھی اور یہ اس وقت کا ذکر ہے جب آپؐ نماز کسوف پڑھا رہے تھے۔ چنانچہ بخاری ابواب الکسوف میں حدیث اسماء بنت ابی بکر میں یہ لفظ ہیں قال ما من شئ کنتُ لم اَرَہ الاوقد رئیتُہ فی مقامی ھذا حتی الجنۃ والنار یعنی کوئی چیز نہیں جسے میں نے نہیں دیکھا تھا مگر وہ مجھے اس مقام پر یعنی نماز پڑھتے پڑھتے دکھا دی گئی۔ یہاں تک کہ بہشت اور دوزخ بھی دکھا دیئے گئے تیسرا اللہ تعالیٰ کا۔ جس طرح معراج میں دنا فتدلی کا نظارہ ہوا اسی طرح احمد اور ترمذی کی روایت میں ہے جسے حدیث صحیح کہا گیا ہے جو معاذ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا میں نے اپنے رب کو احسن صورت میں دیکھا اور یہ اسی زمین کا ذکر ہے انی قمت من اللیل فصلیت.... فاذا انا بربی فی احسن صورۃ..... فرایت وضع کفہ بین کتفی حتی وجدت بردانا ملہ بین صدری یعنی میں رات کے وقت اٹھا اور نماز پڑھی ..... تب ناگہاں میں نے اپنے رب کو احسن صورت میں دیکھا ..... تب میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے کندھوں کے درمیان رکھا یہاں تک کہ میں نے اس کی انگلیوں کی ٹھنڈک اپنے سینہ میں پائی تو جب اللہ تعالیٰ کو جنت و نار کو بیت المقدس کو مکہ یا مدینہ میں دیکھ لیا تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ یہ نظارے اسی زمین پر دکھا دیا کرتا ہے۔ اور ان کیلئے نقل مکانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں اللہ تعالیٰ کو یہ بھی قدرت ہے کہ وہ ایک انسان کو اٹھا کر

لِّبَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡلَ اَلَّا تَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِیۡ وَکِیۡلًا ۲ؕ
ٹھیرایا کہ میرے سوائے کسی کو کارساز نہ بناؤ ع۱۸۰۲

ذُرِّیَّۃَ مَنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ ؕ اِنَّہٗ کَانَ عَبۡدًا شَکُوۡرًا ۳
(تم) ان کی نسل (ہو) جنھیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ سوار کیا تھا۔ وہ شکر گزار بندہ تھا ع۱۸۰۳

وَ قَضَیۡنَاۤ اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ فِی الۡکِتٰبِ لَتُفۡسِدُنَّ فِی الۡاَرۡضِ مَرَّتَیۡنِ وَ لَتَعۡلُنَّ عُلُوًّا کَبِیۡرًا ۴
اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یقینی خبر دے دی تھی۔ کہ ضرور تم ملک میں دو دفعہ فساد کرو گے اور بڑی سرکشی اختیار کرو گے ع۱۸۰۴

لے جائے یہاں تک کہ جنت دکھا دے اور یہ بھی کہ جنت کو اٹھا کر لائے یہاں تک کہ ایک انسان کو دکھا دے دونوں صورتوں میں قدرت میں کوئی فرق نہیں۔ اور نہ اس سے قدرت میں کچھ فرق آتا ہے کہ ایک چیز اپنی جگہ پر بھی ہو اور اللہ تعالیٰ اس کا تمثل دوسری جگہ بھی دکھا دے۔

یہاں معراج کی ایک غرض بھی بتائی ہے لنریہ من ایاتنا یعنی آنحضرت صلعم کا معراج اس غرض کے لیے تھا کہ آپ کو کچھ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دکھائی جائیں گویا جو باتیں آپ کو معراج میں دکھائی گئیں وہ کسی دوسری حقیقت کے لیے بطور نشان بھی تھیں اور درحقیقت معراج میں آنحضرت صلعم کے کمالات غیر متناہی کا نقشہ کھینچا ہے اور یہ بتایا ہے کہ آپ اس بلند ترین مقام پر پہنچے ہوئے ہیں جہاں کوئی دوسرا انسان یا فرشتہ نہیں پہنچا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس اسرا میں اشارہ نبی کریم صلعم کی ہجرت کی طرف ہو خواہ اقصیٰ سے مراد مدینہ کو لے لیا جائے اور اس مسجد کو جو اس میں بننے والی تھی جہاں سے برکات اسلام دنیا میں پھیلنی تھیں اور خواہ مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہو مگر الیٰ غایت کے لیے نہ ہو اور حدیث معراج کی بعض روایتوں میں یہ آتا ہے کہ آپ نے پہلی منزل پر نماز مدینہ میں پڑھی اور دوسری منزل پر بیت المقدس میں۔

واقعہ اسرا میں یعنی آنحضرت صلعم کے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لیجائے جانے میں یہ اشارہ ہے کہ بیت المقدس جو انبیائے بنی اسرائیل کا مقام تھا آنحضرت صلعم کے متبعین کو دے دیا جائے گا۔ کیونکہ یہود یا عیسائیوں میں وہ لوگ نہ رہے تھے جو اس پاک سرزمین کے وارث قرار دئے جاتے اور بموجب وعدہ خداوندی بھی ضروری تھا کہ ابراہیمؑ کی اولاد کی دوسری شاخ اب اس پاک سرزمین کی مالک ہوتی۔ پس اصل اشارہ اس طرف ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل کی برکات کا وارث بھی اب حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کو کیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ معراج میں کل انبیاءؑ کا آپؐ کے اقتدا میں بیت المقدس میں نماز پڑھنا دکھایا گیا اور قرآن شریف میں معراج کا ذکر صرف اسی قدر ہے جو یہاں ہوا یعنی بیت المقدس کو لیجانے کا ذکر آسمانوں پر لیجانے کا ذکر نہیں جس سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں بیت المقدس کے آنحضرت صلعم کو دیا جانے اور انبیائے سابق کی تمام برکات کا وارث کیا جانے کی طرف ہی خاص اشارہ ہے اور اسی کی تائید آیت کے آخری الفاظ سے ہوتی ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات سمع و بصر کا خاص ذکر کیا گیا ہے گویا بتایا ہے کہ وہ خدا جو مخلوق کی باتوں کو سننا اور ان کے اعمال کو دیکھتا ہے اسی کا یہ کام ہے کہ اب ان تمام برکات کا وارث ایک دوسری قوم کو بناتا ہے اور اسی کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ آگے ذکر حضرت موسیٰؑ کا اور اس کے بعد بنی اسرائیل کے فساد فی الارض کا ہے اور ھو السمیع البصیر میں بعض نے ضمیر آنحضرت صلعم کی طرف لی ہے۔ مگر اس صورت میں مراد صرف اس قدر ہو گی کہ آپ سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے کلام کو سننے والے اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے والے ہیں۔ مگر چونکہ السمیع اور البصیر اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں اس لیے ھو کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لینی چاہیئے۔

معراج کب ہوا: عام خیال یہ ہے کہ معراج دسویں یا گیارہویں سال بعثت کا واقعہ ہے مگر میرے نزدیک یہ غلط ہے اس سورت کے زمانہ نزول کی بحث میں مَیں نے دکھایا ہے کہ یہ چوتھے یا پانچویں سال کی سورت ہے اور حضرت ابن مسعودؓ کی شہادت اس پر صریح ہے اور اس میں معراج کا ذکر آنا خود بتاتا ہے کہ معراج اس سے پہلے کا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ شہادت موجود ہے کہ سورت النجم میں بھی معراج کا ذکر ہے اور وہ اس سے بھی پہلے کی ہے۔

ع۱۸۰۲ تعلیم توحید کی غرض: اس سورت میں یہود کی حالت کی طرف بالخصوص توجہ دلائی ہے اور یہ سب سے پہلے اور آخری رکوع کے مضمون سے صاف ظاہر ہے جس طرح اس سے اگلی سورت میں عیسائیت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور پہلی آیت میں اسرا کے ذکر میں بھی اسی طرف اشارہ تھا جیسا کہ اوپر کے نوٹ سے ظاہر ہے۔ پس سب سے پہلے بتایا کہ ان کی ہدایت کے لیے توریت کو ہم نے بھیجا تھا اور اس کی تعلیم کا اصل الاصول یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے اور کسی پر بھروسہ مت کرو وکیل بمعنی موکول الیہ ہے یعنی جس کے سپرد کام کیے جائیں۔ میرے سوائے کسی کو وکیل نہ بناؤ گویا عملی رنگ میں توحید ہے اور زبان سے اقرار فائدہ نہیں دیتا، جب تک عمل میں یہ رنگ پیدا نہ ہو کہ ایک خدا کے سوائے اور کسی پر انسان کا بھروسہ نہ ہو۔

ع۱۸۰۳ ذریۃ پر نصب اختصاص کی وجہ سے ہے یا ندا ہے بنی اسرائیل حضرت نوحؑ کی اولاد میں سے تھے اور انہیں یہ واقعہ یاد دلایا ہے کہ جب بندے شکرگزاری اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ خود ان کے لیے مصائب سے نکلنے کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔

ع۱۸۰۴ بنی اسرائیل کا دو بار فساد کرنا اور دو بار ان پر تباہی آنا: قضینا کے معنی پر دیکھو ع۱۶۹۹ دو مرتبہ بنی اسرائیل کے فساد کرنے کی خبر دی ہے۔

فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰىهُمَا بَعَثۡنَا عَلَيۡكُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّيَارِ‌ؕ وَكَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا ۞ ۵

سو جب دونوں میں سے پہلا وعدہ آ پہنچا ہم نے تم پر اپنے سخت لڑنے والے بندے اُٹھا کھڑے کیے پس وہ شہروں کے اندر گھس گئے اور وعدہ پورا ہونا ہی تھا [۱۸۰۵]

ثُمَّ رَدَدۡنَا لَـكُمُ الۡـكَرَّةَ عَلَيۡهِمۡ وَاَمۡدَدۡنٰكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ وَجَعَلۡنٰكُمۡ اَكۡثَرَ نَفِيۡرًا ۞ ۶

پھر ہم نے لوٹا کر تمھیں اُن پر غلبہ دیا اور مال اور بیٹوں سے تمھاری مدد کی اور تمھیں بڑا جتھا بنایا [۱۸۰۶]

اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ‌ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا‌ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ لِيَسُــوْٓءٗا وُجُوۡهَكُمۡ وَلِيَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا تَتۡبِيۡرًا ۞ ۷

اگر تم نے نیکی کی تو اپنا ہی بھلا کیا، اور اگر تم نے بُرائی کی تو اپنے لیے، پھر جب پچھلی بار کا وعدہ آیا، (اور بندے اٹھا کھڑے کیے) تاکہ وہ تمھارا بُرا حال کریں اور تاکہ وہ مسجد میں داخل ہوں جس طرح پہلی بار داخل ہوئے اور تاکہ جس چیز پر وہ غالب آئیں ویران کرتے ہوئے برباد کریں [۱۸۰۷]

مفسرین میں اختلاف ہے کہ کون کون سے واقعات ہیں مگر قرآن کریم نے خود تصریح فرما دی ہے لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان داؤد وعیسٰی ابن مریم (المائدہ ۵-۷۸) پس یہ دو خبریں وہ ہیں جو ایک دفعہ حضرت داؤدؑ کی زبان سے دی گئی اور دوسری دفعہ حضرت عیسٰیؑ کی زبان سے۔ گو یروشلم پر اور بھی کئی حملے ہوئے اور کم و بیش بربادی وہاں ہوئی مگر یہ تباہی کمال کو دو ہی دفعہ پہنچی ہے اور یہی قوم یہود کی تباہی تھی جیسا کہ لیدخلوا المسجد کما دخلوہ اوّل مرۃ میں صاف بتا دیا۔ پہلی مرتبہ حضرت داؤدؑ سے کوئی چار سو سال بعد یعنی حضرت مسیحؑ سے چھ سو سال پیشتر بابلیوں نے بخت النصر کے ماتحت یروشلم کو فتح کر کے آخر کار ہیکل کو جلا دیا۔ اور دوسری دفعہ حضرت مسیحؑ سے ستر سال بعد طیطوس رومی نے اسے برباد کیا۔ انہی دونوں تباہیوں کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے اور انہیں بنی اسرائیل کے فساد اور سرکشی کا ہی نتیجہ بتایا ہے حضرت داؤدؑ اور عیسٰیؑ کو خاص اس لیے کیا گیا کہ حضرت داؤدؑ کے ذریعہ سے بنی اسرائیل پر جسمانی نعمتیں کمال کو پہنچیں اور حضرت عیسٰیؑ کے ذریعہ سے روحانی اور دونوں مرتبہ بنی اسرائیل نے سخت ناشکری اور سرکشی اختیار کی اس لیے سخت مواخذہ کے نیچے آئے حضرت عیسٰیؑ کے الفاظ نقل کرنے کے قابل ہیں: "پھر جب تم یروشلم کو فوجوں سے گھرا ہوا دیکھو تو جان لینا کہ اس کا اُجڑ جانا نزدیک ہے...... ملک میں بڑی مصیبت اور اس قوم پر غضب ہوگا اور وہ تلوار کا لقمہ ہو جائیں گے اور اسیر ہو کر سب قوموں میں پہنچائے جائیں گے اور جب تک غیر قوموں کی میعاد پوری نہ ہو یروشلم غیر قوموں سے پامال ہوتی رہے گی" (لوقا ۲۱: ۲۰-۲۴) اور متی ۲۳: ۳۸ اور ۲۴: ۲ میں ہیکل کی تباہی کی پیشگوئی صاف الفاظ میں ہے۔

ع[۱۸۰۵] جاسوا۔ مصدر جَوس ہے جس کے معنی تردّد یعنی بار بار آنا جانا ہیں اور کسی چیز کا پورے طور پر طلب کرنا بھی اس کے معنی ہیں (ل) یعنی وہ لوگ شہروں کے اندر تمھاری تلاش کے لیے گھس گئے تاکہ کوئی باقی نہ رہ جائے۔

الدیار۔ دار کی جمع ہے جس کے معنی منزل یعنی رہنے کی جگہ بھی ہیں اور شہر پر بھی بولا جاتا ہے اور اس کا اصل دَور سے ہے جس کے معنی گھیر لینا ہیں۔ کیونکہ گھر کا بھی دیوار احاطہ کیے ہوئے ہوتی ہے (غ)

بابلیوں کی بعثت سے مراد: اللہ تعالیٰ کا بابلیوں کو جنہوں نے بنی اسرائیل کو تباہ کیا عبادا لنا کہنا اور ایسا ہی ان کے لیے بعثنا کا لفظ استعمال کرنا (دیکھو ع[۲۱۵]) صرف اس لحاظ سے ہے کہ اسی نے ان کو ان کی تباہی پر مسلط کیا اور یہ تباہی ان کے لیے سزا کے طور پر تھی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بابلیوں کو کھڑا کر دیا۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی تھی یا وہ اللہ تعالیٰ کے راستباز بندے تھے۔

ع[۱۸۰۶] کرّۃ۔ کرّ کے اصل معنی ہیں کسی چیز پر پھر کر آنا بالذات ہو یا بالفعل (غ) اسی سے تکرار اور مکرر ہیں فلوان لنا کرّۃ فنکون من المؤمنین (الشعراء ۲۶-۱۰۲) میں کرّۃ سے مراد ہے دنیا میں دوبارہ آنا۔ اور یہاں کرّۃ سے مراد غلبہ ہے کیونکہ ان کی باری ان کے دشمنوں پر ان کا غالب آنا تھا۔

یہ کرّۃ یا غلبہ جس کا یہاں ذکر ہے خورس شاہ ایران کے ذریعہ سے وقوع میں آیا جس نے دوبارہ یہودیوں کو یروشلم میں آباد ہونے اور ہیکل کے بنانے کی اجازت دی اور یہ ۵۳۶ قبل مسیح میں ہوا۔ نفیر کے معنی جتھا ہیں دیکھو ع[۱۲۹۱]۔

ع[۱۸۰۷] لیسوء ا وجوھکم۔ وجہ کے لیے دیکھو ع[۱۴۴] یہاں منہ بھی مراد ہو سکتا ہے کیونکہ مصیبت اور غم کے آثار چہرہ پر ظاہر ہوتے ہیں اور ذات بھی مراد ہو سکتی ہے کیونکہ سوء سے یہاں مراد قتل و غارت اور قید کر لینا ہے اور یہ چیزیں انسان کی ذات پر وارد ہوتی ہیں۔ اور لیسوءا محذوف سے متعلق ہے اور وہ محذوف وہی ہے جس کا ذکر آیت ۵ میں ایسے ہی موقعہ پر ہے یعنی بعثنا علیکم عبادا لنا۔

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۸	قریب ہے کہ تمھارا رب تم پر رحم کرے اور اگر تم پھر وہی رکام کرو گے ہم پھر وہی (سزا) دینگے اور ہمنے دوزخ کو کافروں کیلئے قید خانہ بنایا ہے ۱۸۰۸
اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۹	یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو زیادہ مضبوط ہے اور ان مومنوں کو جو اچھے کام کرتے ہیں خوش خبری دیتا ہے کہ اُن کے لیے بڑا اجر ہے ۱۸۰۹
وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۱۰	اور کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم نے اُن کے لیے دردناک دکھ تیار کر رکھا ہے۔
وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۱۱	اور انسان بھلائی مانگنے کی جگہ بُرائی مانگتا ہے، اور انسان جلد باز ہے ۱۸۱۰

اس آیت میں پہلے اللہ تعالیٰ کا عام قانون بیان کیا کہ جو قوم نیکی کی طرف قدم اٹھاتی ہے اس میں اس کا اپنا ہی بھلا ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد بنی اسرائیل کی دوسری تباہی کا ذکر کیا جس سے معلوم ہُوا کہ باردوم پھر ان کی بدعملی ہی ان پر وہ سزا لائی جس کا ذکر یہاں ہے۔ اور یہاں ہیکل کی تباہی کا ذکر صاف الفاظ میں کرکے اور کما دخلوہ اول مرۃ بڑھا کر بتادیا کہ دونوں مرتبہ ہیکل یعنی بیت المقدس کو تباہ کیا گیا۔
مسلمانوں میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا دوہرایا جانا: بنی اسرائیل کے ذکر میں اگر ایک طرف مسلمانوں کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ وہ ایسی ناشکری سے بچیں تو دوسری طرف مسلمانوں کی تاریخ بھی اس میں آجاتی ہے اور حدیث صحیح لتتبعن سنن من قبلکم نے اسی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو حالات بنی اسرائیل پر گزرے وہ تم پر بھی گزریں گے۔ چنانچہ اسی کے مطابق دو دفعہ مسلمانوں پر بھی تباہی آئی ہاں چونکہ مکہ معظمہ کو اللہ تعالیٰ نے خاص شرف عطا فرمایا ہے اور اس کے لیے یہ وعدہ ہے کہ وہ دشمن کے ہاتھ سے کبھی برباد نہ ہوگا اس لیے اس تباہی سے خانہ کعبہ کو نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن خلافت اسلامی دونوں مرتبہ تباہ کی گئی یعنی بار اول جب بغداد خلافت عباسیہ کے ساتھ تباہ ہوا اور دوسری مرتبہ اب جب یورپ نے سلطنت ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے خلافت اسلامیہ کو تباہ کیا۔ مگر جیسے پہلی مرتبہ خلافت کی تباہی شوکت اسلامی میں تبدیل ہوئی ایسا ہی پھر ہوگا۔
۱۸۰۸ حصیرا۔ حصر کے معنی روک لینا ہیں پس حصیر سے مراد روک لینے والا یا قید خانہ ہے اور اس کے معنی سجن اور فراش دونوں مروی ہیں (ج)
دونوں عذابوں کا ذکر کرکے پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ذکر میں بعثت رحمۃ للعالمین کا ذکر ہے یعنی اب بھی اگر یہ قوم آنحضرت صلعم کو قبول کرلے تو اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرکے انہیں ذلت اور محکومیت کی حالت سے نکال دیگا۔ اور عدتم سے مراد ان کا فساد کی طرف لوٹنا ہے اور عدنا سے اللہ تعالیٰ کا پھر سزا دینا۔
۱۸۰۹ توریت کے مقابل قرآن کریم کے امتیازات: آیت ۲ میں حضرت موسیٰ کی کتاب کا ذکر کیا تھا کہ اسے ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا۔ اس آیت میں اس کے مقابل پر قرآن شریف کا ذکر کیا ہے اور اس میں دو باتیں قابل توجہ ہیں ایک تو یہدی کا مفعول کسی خاص قوم کو نہیں بنایا جیسے وہاں ھدی لبنی اسرائیل تھا پس یہدی سے مراد ہے کل لوگوں کو راہ دکھاتا ہے اور دوسرے اس راہ کو اقوم کہا ہے یعنی بمقابلہ اس پہلی راہ کے زیادہ مضبوط ہے۔ توریت کی تعلیم بھی مضبوط تھی مگر وہ وقتی تھی اور ایک قوم کے لیے تھی۔ قرآن شریف کی تعلیم ہمیشہ کے لیے ہے اور تمام قوموں کے لیے ہے اور تمام قوائے انسانی کی تکمیل کرتی ہے اس لیے یہ اس سے زیادہ مضبوط ہے اور بہت زیادہ عرصہ تک قایم رہنے والی ہے اور بنی اسرائیل کی دو مصائب کے ذکر کے بعد تعلیم قرآنی کو اقوم کہنے میں یہ بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ گو جس طرح بنی اسرائیل پر مصائب آئیں مسلمانوں پر بھی آئیں گی۔ مگر یہ تعلیم چونکہ زیادہ مضبوط ہے اور تاقیامت باقی رہے گی اس لیے مسلمان اس حالت کو نہ پہنچینگے جس حالت کو بنی اسرائیل پہنچے اور عظیم الشان مصیبت کے بعد پھر اللہ تعالیٰ ان کی دستگیری فرمائیگا۔
۱۸۱۰ عجول۔ عَجَلَة کسی چیز کا اس کے وقت سے پہلے طلب کرنا اور قصد کرنا ہے اور چونکہ یہ اقتضائے شہوت سے ہوتا ہے اس لیے قرآن کریم کی عام اصطلاح میں اس کا استعمال محل ذم پر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اَلْعَجَلَةُ مِنَ الشَّیْطَانِ یعنی جلد بازی شیطانی فعل ہے (غ) اور عَاجِلَة دنیا کو کہتے ہیں (ل) اور یہاں عجول کے معنی یا تو یہ ہیں کہ وہ شر اور عذاب کو جلد مانگتا ہے اور یا یہ کہ وہ طلب منفعت اور دفع مضرت میں جلد باز ہے یعنی جس چیز کا نفع جلد ہو اسے فوراً اپنے لیے چاہتا ہے اور انجام امور پر نظر نہیں کرتا کہ کون سی چیز اس کے حقیقی فائدہ کی ہے اور کون سی حقیقی نقصان کی۔

وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰيَةَ الَّيْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ وَ كُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿۱۲﴾

اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے پھر ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی نشانی کو روشن بنا لیا تاکہ تم اپنے رب کا فضل طلب کرو — اور تاکہ سالوں کی گنتی اور حساب کو جانو اور ہر چیز کو ہم نے پوری تفصیل سے بیان کر دیا ہے ۱۸۱۱

طلب شر میں انسان کی عجلت سے مراد: یہاں عموماً مراد یہ سمجھی گئی ہے کہ انسان اپنی جلد بازی سے اپنی اولاد یا اپنے دوستوں وغیرہ پر بد دعا کر دیتا ہے مگر سیاق مضمون وسعت معنی کو چاہتا ہے۔ پیچھے قرآن کریم کا ذکر تھا جو انسان کی بھلائی کی راہیں بتاتا ہے اور آگے نتائج اعمال کا ذکر ہے پس یہاں بتایا ہے کہ انسان چونکہ جلد باز ہے اس لیے نفع عاجل یعنی دنیوی نفع کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی حقیقی بھلائی کی راہوں کو ترک کر دیتا ہے، یعنی اعمال صالحہ کی پروا نہیں کرتا کیونکہ اس کا نفع دیر سے ملتا ہے اور یوں جہاں اسے بھلائی کا طالب ہونا چاہیئے تھا۔ وہ درحقیقت اپنے لیے شر کا طالب ہو جاتا ہے۔ اور جلد آنے والے نفع کی خاطر اپنے حقیقی نفع کو ترک کر دیتا ہے اسی کے مطابق دوسری جگہ حضرت صالح کا قول نقل فرمایا ہے لم تستعجلون بالسیئۃ قبل الحسنۃ لولا تستغفرون اللہ لعلکم ترحمون (النمل ۲۷-۴۶) اور اہل و اولاد وغیرہ پر بد دعا اس میں آجاتی ہے کیونکہ اس سے بھی انسان اپنی فوری خواہش انتقام کو پورا کرنا چاہتا ہے اور نہیں سوچتا کہ وہ بات فی الحقیقت اس کے نقصان کا موجب ہے۔ احادیث میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے اپنی اولاد وغیرہ پر بد دعا کرنے سے منع کیا۔ بعض لوگ بے سوچے سمجھے بد دعا کے کلمات بول دیتے ہیں اور بعض پیار میں بھی بد دعا کے کلمات منہ سے نکال دیتے ہیں۔ ایسا ہی بعض لوگ بیماری کی حالت میں یا شدت درد میں اپنے لیے موت وغیرہ کی دعا کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ سب منع ہے۔

آنحضرتؐ کی رحمت: ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اے اللہ میں بھی بشر ہوں بشر کی طرح راضی ہو جاتا ہوں اور بشر کی طرح ناراض ہو جاتا ہوں پس اگر میں کسی مومن کے حق میں بد دعا کروں تو اسے اس کے لیے پاکیزگی کا موجب بنائیو۔ تعلق اس آیت کا پچھلے رکوع سے یوں ہے کہ وہاں بنی اسرائیل پر سزا آنے کا ذکر تھا یہاں بتایا کہ انسان خود ہی نفع عاجل کے پیچھے پڑ کر انجام کار اپنے لیے دکھ لانے کا موجب ہو جاتا ہے۔

۱۸۱۱ محونا۔ مَحْوٌ کے معنی نشان کا دور کر دینا یا مٹا دینا ہیں اور آنحضرت صلعم کے اسمائے مبارک میں اَلْمَاحِی ہے جس کے معنی حدیث میں ہی یوں مروی ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ سے کفر کو مٹا دیگا۔

مبصرۃ۔ اَبْصَرَ کے معنی ہیں دیکھا اور کفر سے نکل کر بصیرت ایمانی کی طرف آیا فمن ابصر فلنفسہ (الانعام ۶-۱۰۴) میں یہی دوسرے معنی مراد ہیں اور مُبْصِرَۃ کے معنی فلما جاءتہم اٰیٰتنا مبصرۃ (النمل ۲۷-۱۳) میں واضحۃ ہیں یعنی صاف صاف اور کھلی کھلی نشانیاں اور اٰتینا ثمود الناقۃ مبصرۃ (بنی اسرائیل ۱۷-۵۹) میں بَیِّنَۃ یعنی واضح معنی کیے گئے ہیں یا مُضِیئَۃ یعنی روشن کرنے والی (نشانی) اور یہی آخری معنی یہاں ہیں (ل)

رات کی نشانی کے محو کرنے سے مراد: رات اور دن کے اختلاف سے سالوں کی گنتی اور حساب کا معلوم ہونا تو ایک امر ظاہر ہے اور الحساب سے مراد یہاں وہی حساب ہے جو سالوں کے متعلق ہے یعنی مہینوں دنوں وغیرہ کا حساب لیکن یہاں فرمایا کہ ہم نے انہیں دو نشان بنایا ہے اس سے کیا مراد ہے بعض نے کہا ہے کہ مضاف محذوف ہے اور مراد ہے نیّری الیل والنہار یعنی رات اور دن کے نیر یعنی چاند اور سورج کو نشان بنایا ہے اور پھر محو سے مراد لیا ہے کہ اس کی یعنی چاند کی شعاع نہیں رکھی یا اس کے نور اصلی کو محو کر دیا (ر) علمی رنگ میں یہ درست ہے کہ چاند آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو کر اس حالت کو پہنچا ہے اور آثار میں بھی ابن عباس سے ایسا ہی مروی ہے کہ پہلے چاند بھی سورج کی طرح روشن تھا پھر اس کی وہ اصلی روشنی محو ہو گئی (ج) اور ایک روایت میں یہی لفظ نبی کریم صلعم کی طرف منسوب کیے گئے ہیں (ر) لیکن اس ظاہر حقیقت کے یہاں لانے میں کیا اشارہ ہے جہاں پہلی آیت میں بھی اعمال انسانی کی جزا کا ذکر ہے اور اس سے اگلی آیت میں بھی اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ رات کی تاریکی اور ظلمت کو مصائب سے تشبیہ دی جاتی ہے پس جب پہلی آیت میں یہ ذکر کیا کہ انسان اپنی جلد بازی سے اپنے اوپر مصیبت کھینچ لاتا ہے تو اس آیت میں یہ اشارہ کیا کہ مصیبت آخر گزر جاتی ہے اور اس کی جگہ دن کی روشنی لے لیتی ہے۔ اور ایک طرف اگر ہر فرد بشر کے لیے اس میں خوشخبری ہے کہ مصیبت کے وقت گھبرائے نہیں تو بنی اسرائیل کے ذکر کے بعد مسلمان قوم کے لیے بالخصوص خوشخبری ہے کہ اگر وہ خیر قرآنی کو چھوڑ کر اپنے اوپر مصائب لے آئیں۔ تو پھر بھی رات کی ظلمت کو مٹا کر ان پر دن چڑھا دیا جائے گا۔ اس لیے یہاں لیل کے لیے لفظ محو یا اس کا مٹا دینا اختیار کیا گیا ہے اور دن کے لیے مبصرۃ لا کر بصیرت ایمانی کی طرف اشارہ کیا ہے آخری الفاظ کہ ہر ایک چیز کو ہم نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے کیسی صداقت اپنے اندر رکھتے ہیں ایک ظاہری قانون کو علمی رنگ میں بیان کر دیا اور ساتھ ہی باطنی قانون بھی کھول کر بتا دیا۔

وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿ؕ۱۴﴾ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾

اور ہر انسان کے عملوں کو ہم نے اُس کی گردن میں ڈالا اور ہم اس کے لیے قیامت کے دن ایک کتاب نکالیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا ع۱۸۱۲ اپنی کتاب پڑھ، آج تو خود ہی اپنا حساب لینے کے لیے کافی ہے ع۱۸۱۳ جو شخص سیدھی راہ پر چلا، وہ اپنے ہی لیے سیدھی راہ پر چلا اور جو گمراہ رہا تو اپنے اوپر وبال کے لیے گمراہ رہا اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور ہم عذاب دینے والے نہ تھے یہاں تک کہ ایک رسول کو اٹھا کھڑا کرتے ع۱۸۱۴

ع۱۸۱۲ طائر کے لیے دیکھو ع۱۴۳۱ انسان کا وہ اچھا اور بُرا عمل جو اس سے اُڑ جاتا ہے اسے بھی طائر کہا جاتا ہے جیسے یہاں اور طائرکم معکم (یٰسٓ ۳۶-۱۹) اور طائرکم عند اللہ (النمل ۲۷-۴۷) میں مراد ان کی شومئی اعمال ہے یعنی وہ برا نتیجہ جو انہیں اپنی بدعملیوں کی وجہ سے ملا (غ) اور طائر کے معنی عمل حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہیں (ج)

اس آیت میں اعمال خیر و شر اور ان کے نتائج کا ایک نہایت پرحکمت فلسفہ بیان کیا ہے اول تو عمل کے لیے لفظ طائر استعمال کیا ہے جو گو لغت کے مطابق ہے مگر اس میں اشارہ اس عمل کے اڑ جانے کی طرف ہے یعنی جو کچھ انسان کرتا ہے وہ اس کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے پھر اس کا اس پر اختیار کوئی نہیں رہتا۔ لیکن ایک طرف اگر وہ عمل ہاتھ سے نکل گیا تو دوسری طرف اس کا نتیجہ انسان کی گردن میں باندھ دیا جاتا ہے یعنی اس کے گلے کا ہار بنا دیا جاتا ہے جو اس سے الگ نہیں ہوسکتا۔ عمل کا اڑ جانا اور اس کے نتیجہ کا انسان کے لازم حال ہو جانا یہ دونوں حقیقتیں ہیں جن سے اکثر لوگ بے خبر ہیں وہ عمل کرتے وقت اس قدر لاپرائی برتتے ہیں کہ گویا سب کچھ ان کے قبضہ قدرت میں ہے بہتیرے ہیں جو کہتے ہیں یہ کام کرلیں پھر توبہ کرلیں گے۔ وہ نہیں جانتے کہ جو عمل ہوگیا وہ پھر ہاتھ نہیں آتا۔ اور بہتیرے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ عمل کا نتیجہ کوئی شے نہیں اس لیے کہ انہیں کھلا کھلا نتیجہ ہر عمل کا نظر نہیں آتا۔ اس لیے یہ کہہ کر کہ ہر عمل کے نتیجہ کو ہم نے انسان کے لازم حال کر دیا ہے۔ فرمایا کہ وہ نتیجہ کھلا کھلا بے شک یہاں نظر نہیں آتا۔ مگر قیامت کے دن وہ ایک کھلی کتاب کی صورت میں ہوگا یعنی وہ پردے جو اب انسان کو اسے دیکھنے نہیں دیتے اس وقت اُٹھ جائیں گے۔ دوسری جگہ ہے لقد کنت فی غفلۃ من ھذا فکشفنا عنك غطاءك فبصرك الیوم حدید (قٓ ۵۰-۲۲) اور یہاں اسے کتاب منشور کہا ہے یعنی کھلا کھلا اس کے سامنے آموجود ہوگا اور بعض نے کتاب منشور کی تفسیر یوں کی ہے کہ اعمال کے آثار نفس پر منقش ہونگے کیونکہ ہر فعل کا اثر روح پر ساتھ ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن حواس موجودہ میں وہ اثر خفا کا رنگ رکھتا ہے اور جب ان حواس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے تب وہ اثر بھی ظاہر ہو جاتا ہے (ر) اس پر اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اس صورت میں قیامت سے مراد قیامت صغریٰ یا ایک شخص کی موت ہوگی۔ اور کہ یہ ظاہر کے خلاف ہے مگر یہ تو بہرحال ماننا پڑیگا کہ کتاب سے مراد اس قسم کے کاغذ نہیں جو ہماری ان قلموں اور سیاہی سے لکھے گئے ہوں کراماً کاتبین ان قلموں اور دواتوں سے اور اس کاغذ پر نہیں لکھتے۔ اور کتاب کے معنی میں لغت میں وسعت ہے دیکھو ع۱۴۱۲ وغیرہ اور پھر اسے کتاب منشور کہا ہے جس سے یہ مراد نہیں ہوسکتی کہ وہ کسی ایک جگہ سے کھول کر رکھی ہوئی ہے کیونکہ اس صورت میں اس کے باقی سارے حصے بند ہوئے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ ہر جگہ سے کھلی ہے اور سب کا سب جو اس میں لکھا ہے ایک نظر میں نظر آجاتا ہے اگر یہ مراد نہ ہوتی تو اسے منشور کہنا بے فائدہ تھا۔ پس وہ کتاب اس لحاظ سے ہے کہ اس میں اعمال محفوظ ہیں اور منشور اس لحاظ سے ہے کہ ان اعمال کے نتائج صاف صاف نظر آتے ہیں۔

ع۱۸۱۳ یہاں بتایا کہ انسان کے محاسبہ کے لیے اس کا اپنا نفس ہی قیامت کے دن کافی ہوگا۔ اس میں صاف اس حقیقت کو آشکارا کر دیا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا کہ نفس کی حالت ہی خود سب کچھ ظاہر کر دے گی۔ پس اقرأ کتابك میں جو پڑھنے کا ارشاد ہے وہ بھی دوسرے رنگ کا پڑھنا ہے۔ کیونکہ کہیں تو یہ ذکر ہے کہ میزان قائم کی جائے گی گویا اعمال ناموں کا وزن ہوگا اور کہیں یہ ذکر ہے جیسے یہاں کہ انسان کا اپنا نفس ہی حساب کرلے گا اور کہیں اسی اعمالنامہ کے پڑھنے کیلئے دوسروں کو بلایا جاتا ہے ھاؤم اقرءوا کتابیہ (الحاقۃ ۶۹-۱۹) حقیقت یہی ہے کہ جو چیزیں اس دوسرے عالم سے تعلق رکھتی ہیں ان کو اس عالم پر قیاس کرنا غلطی ہے۔ ہاں سمجھایا انہی الفاظ میں جا سکتا تھا جو یہاں کی چیزوں پر بولے جاتے ہیں۔ وہ سب حق ہے جس کا ذکر قرآن و حدیث میں ہے کس رنگ میں وہ واقع ہوگا اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔

ع۱۸۱۴ پہلی آیات کا مضمون اس آیت میں جاری رکھا گیا ہے اور اس کی تکمیل کی گئی ہے جب اعمال کی جزا و سزا کا قانون بتایا اور یہ بھی بتایا کہ قیامت

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَ اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو اس کے

کے دن یہ جزا و سزا کھلی کھلی نظر آ جائے گی تو اب بتایا کہ ہدایت اختیار کرنے والا اپنے اعمال کا اچھا نتیجہ اپنے آپ میں دیکھ لے گا۔ اور گمراہ اپنی گمراہی کا بُرا نتیجہ اپنے اندر دیکھ لیگا۔ گویا ہر ایک کو وہ کھلا نتیجہ جس کا ذکر اوپر تھا وہ کتاب منشورا اپنے نفس میں ہی اسے نظر آجائے گی۔ اور پھر بتایا کہ اس نتیجہ کا تعلق نفس انسانی سے ایسا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی دوسرا انسان اسے اپنے ذمہ لیکر عمل کرنے والے کو چھڑا دے اور جب اس قانون جزا و سزا کی یوں تکمیل کر دی تو پھر ایک اور پہلو سے بھی اس کی تکمیل فرمائی یعنی یہ فرمایا کہ اعمال کی یہ سزا انسان کو بے خبری کی حالت میں نہیں دی جاتی بلکہ پہلے ہم نے اپنے رسول بھیج کر لوگوں کو اس بات کی خبر پہنچا دی کہ اعمال کی جزا و سزا یوں ظاہر ہوتی ہے اور قرآن کریم کی متعدد آیات سے یہ ظاہر ہے کہ جب تک رسول بھیج کر نیکی اور بدی کا صحیح احساس پیدا نہ کیا جائے گا اس وقت تک عذاب نہ دیا جائے گا وسیق الذین کفروا الی جھنم زمرا حتّٰی اذا جاؤھا فتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا الم یاتکم رسل منکم یتلون علیکم اٰیات ربکم (الزمر ۳۹ - ۷۱) اولم نعمّرکم مایتذکر فیہ من تذکر و جاءکم النذیر (فاطر ۳۵ - ۳۷) کلما القی فیھا فوج سألھم خزنتھا الم یاتکم نذیر قالوا بلٰی قد جاءنا نذیر (الملک ۶۷ - ۸ و ۹) ان تصریحات قرآنی کے ہوتے ہوئے ماکنا معذبین حتّٰی نبعث رسولا کے اور کوئی معنی کرنا سخت غلطی ہے اصل بات یہ ہے کہ گو اللہ تعالٰی کی ہستی بلکہ اس کی توحید کا علم بھی کچھ نہ کچھ قدرت کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے اور فطرت انسانی کے اندر بھی وہ مرکوز ہے، مگر زندگی بعد الموت کا علم یا جزا و سزا کا وہ قانون جس کا ذکر اوپر ہوا اس کا علم صرف انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے دنیا میں آیا کیونکہ انسان کی اپنی عقل کی روشنی اس قدر دور کے نتائج دیکھ نہ سکتی تھی پس اسی بات کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اللہ تعالٰی کی یہ شان کہاں ہو سکتی تھی کہ لوگوں کو ایسے قانون کے ماتحت سزا دیدے جس کا انہیں علم ہی نہیں دیا گیا اور عذاب دینے کا ذکر اس لیے کیا کہ نیک اعمال کے نتائج تو وہ بہر حال ہی دیگا کیونکہ یہ اس کی رحمت کا تقاضا ہے اور اسی رحمت کا یہ تقاضا ہے کہ عذاب نہ دے جب تک کہ پہلے بتا نہ دے کہ یہ امر سزا کے لائق ہے تا کہ انسان متنبہ ہو جائے۔

بچہ جزا و سزائے اعمال کے قانون سے باہر ہے: یہی وجہ ہے کہ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ایک بچّہ جس میں ابھی نیکی بدی کا احساس ہی پیدا نہیں ہوا یا وہ لوگ جنہیں انبیاء کی تعلیم ہی نہیں پہنچی وہ کسی مواخذہ کے نیچے نہیں۔ اور غور کیا جائے تو یہ بات ایک پر حکمت فلسفہ پر مبنی ہے۔ ایک خشک منطقی کہہ سکتا ہے کہ بچہ ہو یا بے خبر انسان خدا تعالٰی کا قانون تو اپنا کام کر کے رہیگا ایک بچہ بھی آگ میں ہاتھ ڈالے گا تو اس کا ہاتھ جل جائے گا اس کے بچہ ہونے کی وجہ سے یا بے خبر ہونے کی وجہ سے وہ جلنے سے نہیں بچے گا۔ یہ سچ ہے لیکن ہر بات میں ظاہری قوانین پر اخلاقی قوانین کا قیاس نہیں کیا جا سکتا اخلاق کا تعلق احساس سے ہے وہ ایک باطنی چیز ہے بسا اوقات بچہ ایک بات خلاف واقعہ کہہ دیتا ہے یا ایک چیز کو چھپا لیتا ہے مگر ان باتوں کا کوئی اثر اس کی زندگی پر نہیں پڑتا لیکن وہی فعل ایک ایسا آدمی کرے جس میں نیکی بدی کا احساس پیدا ہو چکا ہے تو اس کا اثر یقیناً اس کی طبیعت پر پڑے گا۔ پس اللہ تعالٰے کے قوانین اخلاق کا تعلق احساس سے ہے اور یہی احساس انبیاء پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے بچہ تو کوئی بھی مواخذہ کے نیچے نہیں خواہ وہ ایک کافر کا بچّہ ہو۔ اور نبی کریم صلعم کا صاف ارشاد ہے ما من مولود یولد الا علی الفطرۃ ہر ایک بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم سے جب کفار کے بچوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اہل جنت کے خادم ہوں گے (ش) شاید غلمان میں اسی طرف اشارہ ہو اور جن لوگوں نے کفار کے بچوں کو قابل مواخذہ سمجھا ہے اور یہ خیال کیا ہے کہ کفار کے بچے جو بلوغت سے پہلے فوت ہو جائیں وہ اپنے آباء کی وجہ سے دوزخ میں جائیں گے انہوں نے غلطی کی ہے اور یہی حکم فاتر العقل لوگوں کے بارہ میں ہے اور مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن چار قسم کے لوگ عذر پیش کرینگے یعنی بہرا۔ فاتر العقل اور بہت بوڑھا اور جو شخص زمانہ فترت میں مر گیا ہے تو اللہ تعالٰی انہیں حکم دے گا کہ آگ میں داخل ہو جاؤ سو اگر وہ داخل ہو جائیں تو آگ ان پر ٹھنڈی ہو جائے گی اس میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اللہ بھی درحقیقت ایک قسم کی آگ میں ہی انسان کو داخل ہونے کا حکم دیتے ہیں اور وہ عشق الٰہی کی آگ ہے جو دنیا کی محبت کو ٹھنڈا کر دیتی ہے اور جو اس آگ میں داخل ہو جاتا ہے وہ دیکھ لیتا ہے کہ یہی انسان کی حقیقی راحت ہے اور اسی حکم میں وہ لوگ ہیں جو تعلیم انبیاء سے بے خبر ہیں اور بعض نے یہاں رسول میں عقل کو بھی شامل کیا ہے یعنی جن کو عقل دی گئی ہے وہی ان کے لیے رسول کا حکم رکھتی ہے بلکہ بعض نے تو کہا ہے کہ نبعث رسولا سے مراد ہی رسول عقل ہے کیونکہ اصلی رسول وہی ہے (ر) مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو اللہ تعالٰی نے انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی سلسلۂ نبوت شروع کر دیا اور دوسری طرف یہ بھی فرمایا کہ ان من امۃ الا خلا فیھا نذیر تو گویا رسولوں کی بعثت سب اقوام کی طرف ہو گئی ہاں اگر کوئی قوم ابھی وحشت کی حالت سے باہر نہیں نکلی تو اس کی حالت ایک بچہ سے مشابہ ہو گی جس میں ابھی احساس اخلاق پیدا ہی نہیں ہوا اور جب ہم متمدن دنیا کی حالت دیکھتے ہیں اور امم انسانی کی حالت پر غور کرتے ہیں تو ہر ایک قوم کے اندر کوئی نہ کوئی معلم ایسا پاتے ہیں جس کے ذریعہ سے انہیں نیک و بد کی جزا و سزا کا علم دیا گیا بلکہ مذاہب میں گو اللہ تعالٰی کی ذات اور صفات کے متعلق بڑے بڑے اختلافات ہیں۔ لیکن اعمال کی جزا و سزا میں سب متفق ہیں حتّٰی کہ عیسائی بھی جو کفارہ کو ہی بظاہر کافی سمجھتے ہیں پس جملہ اقوام کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے یہ علم ہو چکا ہے کہ اعمال انسانی کی جزا و سزا بھی ہے۔

دنیوی عذاب اور بعثت رسل: سیاق و سباق کے لحاظ سے ان الفاظ کے معنی اور نہیں ہو سکتے، لیکن اگر یہاں مراد عذاب دنیوی لیا جائے تو بھی مفہوم یہی ہوگا

فِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيرًا ﴿۱۶﴾
وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِنْ بَعْدِ نُوحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهٖ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿۱۷﴾

آسودہ حال لوگوں کو حکم بھیجتے ہیں پھر وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں تب (سزا کا) حکم اس پر ثابت ہوجاتا ہے سو ہم اُسے ہلاک کر دیتے ہیں جیسا ہلاک کرنا چاہیئے ۱۸۱۵
اور کتنی نسلیں ہم نے نوحؑ کے بعد ہلاک کر دیں، اور تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے خبردار دیکھنے والا بس ہے۔

کہ دنیا کی قوموں پر جو ہم بعض وقت ان کے سخت ظلموں کی وجہ سے عذاب دنیوی بھیجتے ہیں تو وہ بھی انہیں اعمال کی جزا و سزا کے قانون سے واقف کرنے کے بعد بھیجتے ہیں اور یہ خبر بذریعہ انبیاء علیہم السلام جو کل قوموں میں مبعوث ہو چکے ہم نے ان کو پہنچا دی ہے دنیا کی جاہل سے جاہل قومیں بھی اعمال کی جزا و سزا کا علم اور احساس رکھتی ہیں کیونکہ سب میں رسول مبعوث ہو چکے۔ لیکن جو لوگ ان الفاظ سے یہ مراد لیتے ہیں کہ دنیا میں کبھی کوئی عذاب نہیں آتا جب تک کہ پہلے ایک رسول اس وقت مبعوث نہ کیا جائے وہ غلطی کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین کل دنیا کو بتا دیئے ہیں جو عذاب آئے گا وہ ان قوانین کو توڑنے کی وجہ سے آئے گا۔ پس نئے رسول کی ضرورت نہیں اور جو مجدّد اس رسول اور اس کی کتاب کی طرف بلاتا ہے وہ محض ظل ہے نہ اصل پھر اگر رسول کی ضرورت ہے تو عین اس مقام پر ہے جہاں عذاب آئے۔ مثلاً جنگ کا عذاب یورپ میں آئے یا کوئی بھاری زلزلہ اٹلی میں آئے اور اس سے دلیل یہ لی جائے کہ ضرور ہے کہ اس وقت کوئی رسول مبعوث ہوگیا ہو تو پھر ایسے رسول کا ہندوستان میں مبعوث ہونا خدائے حکیم کا فعل نہیں ہوسکتا جس میں حکمت کچھ بھی نہیں۔ وہ رسول یورپ یا اٹلی میں آنا چاہیئے تھا۔ پھر دوسری دقّت یہ ہے کہ ہر رسول کے لیے ایک وقت مقرر کرنا پڑے گا کہ اگر اس کے بعد اتنے عرصہ تک عذاب آئے تو وہ اس کی بعثت کی وجہ سے ہوگا اور اگر اس میعاد کے بعد آئے تو نیا رسول چاہیئے۔ اور اب جو عذاب آ رہے ہیں اگر ان کے لیے کوئی نیا رسول پیدا ہونا ضروری ہو چکا ہے تو اب آیندہ رسول کی کب ضرورت ہو گی؟ یا یہ قانون تیرہ سو سال کا بن جائے گا؟ ایسی باتیں کرنا گویا لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ مذہب علم نہیں بلکہ کھیل ہے۔

<u>۱۸۱۵</u> نہلك - هَلَاك کئی طرح پر ہے۔ ایک چیز ہم سے گم ہو جاتی ہے اور دوسرے کے پاس موجود ہوتی ہے جیسے هلك عنّی سلطانیهْ (الحاقّة ۶۹-۲۹) اور ایک هلاك استحالہ اور فساد سے ہے یعنی بگڑ جانے سے جیسے یهلك الحرث والنسل (البقرة ۲-۲۰۵) اور ایک هلاك موت ہے جس کی مثالیں بہت ہیں اور ایک چیز کا عالم سے باطل ہو جانا اور اس کا اصلاً نابود ہو جانا بھی ہلاک ہے كل شئ هالك الا وجهه (القصص ۲۸-۸۸) اور عذاب اور خوف اور فقر کو بھی هلاك کہا جاتا ہے وان یهلكون الّا انفسهم (الانعام ۶-۲۶) كم اهلكنا من قبلهم من قرن (الانعام ۶-۶) وكم من قرية اهلكنٰها (الاعراف ۷-۴) اور فهل یهلك الا القوم الفٰسقون (الاحقاف ۴۶-۳۵) میں ہلاک اکبر مراد ہے جس کی طرف آنحضرت صلعم کے اس قول میں اشارہ ہے لاشرَّ کشرٍّ بعده النار یعنی کوئی شر اس شر کے برابر نہیں جس کے بعد آگ ہے (غ)

امرنا - اَمر کے معنی حکم دینا مشہور ہیں اور جس چیز کا حکم دیا وہ محذوف ہے جو طاعۃ اللہ ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے (ج) اور اس کے معنی اَکثرنا بھی مروی ہیں (ج) یعنی ان کی کثرت کر دی اور لغت میں اَمِرَ القوم کے معنی کَثُروا ہیں گویا بوجہ اپنی کثرت کے ایسے ہو گئے کہ ان کے لیے امیر کا ہونا ضروری ہو گیا اور اسی لحاظ سے یہاں کَثّرنا معنی درست تسلیم کیے گئے ہیں اور ابو عبیدہ نے ان معنوں کو صحیح تسلیم کیا ہے (غ)

دمرنا - تدمیر کے معنی ہیں کسی چیز پر ہلاکت کا داخل کرنا (غ)

عذاب ہلاکت کا وقت اور غرض: اصل ذکر تو آخرت کے عذاب کا ہی چلتا ہے اور آیت ۱۸ میں صاف کہہ بھی دیا ہے کہ طالب دنیا کو ہم دنیا کے فوائد بھی دیدیتے ہیں پھر آخرت میں وہ جہنم میں جاتا ہے لیکن یہاں اسی عذاب آخرت کے لیے بطور دلیل اس بات کو بیان کیا ہے کہ جب بدی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور ایک قوم کی قوم اس میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی کھلا کھلا ہلاکت کا عذاب بھیج دیتا ہے تاکہ عذاب آخرت محض ایک قصّہ کہانی نہ رہ جائے۔ چنانچہ فرمایا کہ کسی بستی کے رہنے والوں کو جب فسق و فجور کی کثرت ہو جائے تو ہلاک بھی کر دیتے ہیں امرنا مترفیها کے دونوں معنی اوپر دیدیئے گئے ہیں حکم کے معنی لیکر بھی یہ ضروری نہیں کہ اس وقت کوئی نیا رسول بھیجکر نیا حکم دیا جائے بلکہ احکام تو رسولوں کے ذریعہ سے فسق و فجور سے بچنے کے لیے ہر قوم کو اللہ تعالیٰ دے ہی چکا ہے بلکہ انسان کو عقل دیکر بھی اسے اپنے احکام پہنچا دیئے ہیں یہ معنی کرنا کہ فسق و فجور کا حکم انہیں دید یتے ہیں خلاف قرآن ہیں ان الله لا یامر بالفحشاء (الاعراف ۷-۲۸) اور یہ سچ ہے کہ جب تک قوم میں فساق کی کثرت نہ ہو جائے وہ ہلاک نہیں ہوتی اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہلاکت سے مراد لازماً اس قوم کا موت کے گھاٹ اتارنا ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی قوت و طاقت کو برباد کر دینا بھی اس کی ہلاکت ہی ہے جیسا کہ لفظ ہلاک کی تشریح میں بھی بتا دیا گیا ہے اگلی آیت میں بتایا ہے کہ اس قانون کے مطابق حضرت نوحؑ کے بعد بھی بہتیری قوموں کو ہلاک کیا۔ ہاں قوم کے ذنوب اس قدر ہو جانا کہ ان پر اسی دنیا میں ہلاکت آجائے اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے کوئی انسان اس میں دخل نہیں دے سکتا کہ فلاں قوم فلاں وقت ہلاک کیوں نہیں ہوئی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾

جو کوئی جلد آنے والا نفع چاہتا ہے ہم اسے اسی (دنیا) میں جو کچھ ہم چاہتے ہیں جس کے لیے ارادہ کریں جلد دیدیتے ہیں پھر ہم نے اس کے لیے دوزخ ٹھیرائی ہے وہ اس میں بُرے حال میں دھتکارا ہوا داخل ہوگا ۱۸۱۶ع

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾

اور جو آخرت کو چاہتا ہے اور اس کے لیے کوشش کرتا ہے جو اس کی کوشش کا حق ہے اور وہ مومن ہے تو یہی ہیں جن کی کوشش کی قدر کی جاتی ہے ۱۸۱۷ع

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾

ہم سب کو مدد دیتے ہیں اُن کو بھی اور ان کو بھی، تیرے رب کی عطا سے اور تیرے رب کی عطا کبھی رکتی نہیں ۱۸۱۸ع

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

دیکھ ہم کس طرح بعض کو بعض پر فضیلت دیتے ہیں اور یقیناً آخرت درجات میں بڑھ کر اور فضیلت میں برتر ہے ۱۸۱۹ع

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾ ع

اللہ کے ساتھ دوسرا معبود نہ بنانا ورنہ تو بُرے حال میں بیکس ہو کر بیٹھ جائے گا ۱۸۲۰ع

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾

اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوائے (کسی کی) عبادت نہ کرو اور ماں باپ سے نیکی کرو، اگر تیرے سامنے دونوں میں سے ایک یا دونوں ہی بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف (تک) نہ کہہ اور نہ ان کو ڈانٹ اور ان دونوں سے ادب سے بات کر ۱۸۲۱ع

ع۱۸۱۶ یہاں پھر رکوع کی پہلی آیت کے مضمون کی طرف رجوع کیا ہے العاجلۃ سے مراد دنیا ہے دیکھو ع۱۸۱ کیونکہ اس کا نفع جلد ملتا ہے۔ یہاں اس شخص کا ذکر ہے جو اس زندگی کے نفع عاجل کو اپنی زندگی کی اصل غرض بنا لیتا ہے۔ فرمایا کہ اسے ہم جس قدر چاہتے ہیں دنیا بھی دیدیتے ہیں ما نشاء اس لیے کہا کہ دنیا کی ہوس ساری کبھی پوری نہیں ہوتی۔ دوسری جگہ ہے من کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منہا (الشوریٰ ۴۲-۲۰) مگر نتیجہ اس کا جہنم ہے یعنی انجام کار ایسا شخص جس کی نظر اس دنیا سے اوپر نہیں اُٹھتی دکھ اُٹھاتا ہے۔

ع۱۸۱۷ سعی سَعْی کے معنی تیز چلنا ہیں اور اس کا استعمال کسی معاملہ میں کوشش کرنے پر بھی ہوتا ہے اچھا ہو یا برا وسعٰی فی خرابہا (البقرۃ ۲-۱۱۴) وان لیس للانسان الا ما سعٰی (النجم ۵۳-۳۹) اور اس کا اکثر استعمال افعال محمودہ میں ہے (غ) اور سعٰی لہا سعیہا کے معنی ہوئے ایسی کوشش کرے جو حقِ کوشش ہے۔

مشکورا۔ شکر کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۷۵ اور اللہ تعالیٰ کا شکر اپنے بندوں پر انعام اور ان کو جزا دینا ہے (غ) اور اسی لحاظ سے یہاں مشکور کہا گیا ہے۔

یہاں فرمایا کہ جو آخرت کو اپنا مقصد بناتا ہے تو اس کی کوشش پر ضرور انعام ملتا ہے بشرطیکہ کوشش کا حق ادا ہو۔ گویا وہ لازماً کامیاب ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ہے الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (العنکبوت ۲۹-۶۹)

ع۱۸۱۸ محظورا۔ حَظر کے معنی روکنا ہیں اور محظور کے معنی ہوئے روکی گئی چیز (ل)

ع۱۸۱۹ یعنی دنیا میں انسان کوشش کرکے ایک دوسرے سے بڑھ جاتے ہیں تو آخرت کے لیے بھی جو کوشش کرے گا وہ بڑھ جائے گا۔ بلکہ وہ مراتب تو بہت بڑھ کر ہیں۔

ع۱۸۲۰ یعنی اللہ کے ساتھ اور کسی کو اپنا محبوب اور مطلوب اور مقصود نہ بناؤ اور تقعد (بیٹھ جائیگا) سے مراد یا مطلق ٹھہرنا ہے یا عجز۔

ع۱۸۲۱ اُفّ۔ کان یا ناخن کی میل یا ناخن کی تراشش یا اور ایسی چیزوں کو کہا جاتا ہے جن کو سمجھا جائے اور قلیل چیز پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے (ل) اُف لکم ولما تعبدون من دون اللہ (الانبیاء ۲۱-۶۷)

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ

اور ان دونوں کے آگے رحم کے ساتھ عاجزی کا بازو جھکا اور کہہ اے میرے رب تو ان پر رحم کر جس طرح انھوں نے مجھے چھوٹے ہوتے پالا[۱۸۲۲] تمھارا رب خوب جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے اگر تم نیک ہو تو وہ رجوع کرنے والوں کو بخشتا ہے۔ اور قریبی کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو (بھی) اور بیجا

تنھر۔ نَھَر مشہور ہے اور اس کے معنی شدّت کے ساتھ روکنا یا ڈانٹنا بھی آتے ہیں الزَّجر بمغالظۃٍ، اما السآئل فلا تنھر (الضحٰی ۹۳-۱۰) پس اُف میں تحقیر ہے اور نہر میں سختی۔

اخلاق فاضلہ کی جڑ کیا ہے: پچھلے رکوع میں یہ بیان کر کے کہ پست اغراض کو سامنے رکھنے سے انسان آخر کار نقصان اٹھاتا ہے اس اور اگلے رکوع میں کچھ اخلاق فاضلہ کی تعلیم دی ہے اور توریت کی گویا ساری تعلیم جو دس احکام پر مشتمل ہے اس رکوع اور اگلے رکوع میں آجاتی ہے مگر اس سے بہت زیادہ بسط اور بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ اور اکمل رنگ میں اور یہ تعلیم اخلاق فاضلہ کی اس یعنی تیئسویں آیت سے لیکر سینتیسویں آیت تک ہے جو کل پندرہ آیتیں ہیں اور ابن جریر میں حضرت ابن عباس کا قول منقول ہے التوراۃ کلھا فی خمس عشرۃ اٰیۃ من سورۃ بنی اسرائیل یعنی ساری توریت سورت بنی اسرائیل کی پندرہ آیتوں میں ہے اور یہاں اس تعلیم کو شروع بھی توحید الٰہی سے کیا ہے اور توریت کے دس احکام کی ابتدا بھی توحید سے ہی ہوتی ہے اور اس کی ابتدا اس سے کی ہے کہ اللہ کے سوائے کسی کی عبادت نہ ہو۔ گویا یہ اخلاق فاضلہ کی جڑ ہے اور یہی سچ ہے کہ جو شخص ایک خدا کے آگے سر نہیں جھکاتا نہ وہ اخلاق کے بلند ترین مقام پر پہنچ سکتا ہے اور نہ وہ جو ہر چیز کے سامنے سر جھکاتا پھرتا ہے اور تذلل اختیار کرتا ہے۔ انسان سے بالاتر سوائے خدا کے کوئی طاقت نہیں یہی ایک چیز ہے جس کا اعتراف انسان کو انسان بناتا اور اخلاق فاضلہ پر قائم کرتا ہے۔

والدین سے سلوک: اس کے بعد انسانوں سے حسن سلوک کا حکم دیا اور اس میں سب سے پہلے والدین کے حقوق کی طرف توجہ دلائی کیونکہ وہ انسان کی تربیت جسمانی کرنے میں سب سے بڑھ کر ہیں اور احسان کی تاکید کے ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ ان کو کوئی تحقیر کا کلمہ نہ کہا جائے اور نہ ان کو سختی سے کسی کام سے روکا جائے۔ بلکہ قول کریم یعنی ایسے قول کے ساتھ جس میں ان کا اکرام ہو انہیں مخاطب کیا جائے۔ اور بڑھاپے کا ذکر اس لیے کیا کہ بڑھاپے میں انسان کی طبیعت کمزور ہو جاتی ہے اور اس وقت والدین اولاد پر کچھ زیادتی بھی کر لیتے ہیں وہی وقت ہوتا ہے جب اولاد کو والدین کے ساتھ اخلاق سے پیش آنے اور احسان کرنے کا موقعہ ہوتا ہے اور یہ زمانہ بچپن کے زمانہ سے زیادہ مشابہ ہوتا ہے اور یہاں خطاب عام ہے۔

۱۸۲۲ جناح الذل۔ جناح کے اصل معنی پرند کا بازو ہیں اور انسان کے جناح سے مراد اس کا ہاتھ ہوتا ہے اور ذُل فرمانبرداری ہے جو دوسرے کے غلبہ کی وجہ سے ہو اور راغب کہتے ہیں کہ جناح الذل استعارہ ہے کیونکہ فرمانبرداری یا اطاعت دو طرح پر ہے ایک وہ جو انسان کو پستی کی طرف لے جاتی ہے اور دوسری وہ جو اس کا رفع کرتی ہے یعنی اس کا مقام بلند کرتی ہے اور چونکہ یہاں وہ فرمانبرداری مراد ہے جو اس کا مرتبہ بلند کرتی ہے اس لیے لفظ جناح استعارۃً لایا گیا گویا یوں فرمایا گیا کہ وہ فرمانبرداری اختیار کرو جو تمہارے اکتساب رحمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حضور تمہارا مرتبہ بلند کرتی ہے (غ) اور یا من الرحمۃ سے مراد ہے فرط رحمت سے بھر کر (ر)

یہاں پچھلی آیت کے مضمون کی تکمیل کی ہے اور بتایا ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک محبّت سے ہونا چاہیئے یعنی انسان کا دل ان کی محبت سے بھرا ہوا ہو جس طرح ان کا دل اولاد کی محبّت سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے لیے دعائیں بھی کرے اور کما ربّیانی میں یہ بتایا کہ وہ رحمت ایسی ہو جس رحمت کے ساتھ انہوں نے اولاد کی پرورش بچہ ہونے کی حالت میں کی تھی کیونکہ وہ کمال درجہ کی رحمت تھی اور دوسرا اس تشبیہ کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ رحمت کے ساتھ تربیت ملی ہوئی ہو یعنی ان کی خبر گیری کی جائے اور اپنا مال اور آرام ان کے لیے قربان کیا جائے قرآن کریم میں فطرت انسانی کا کس قدر گہرا علم پایا جاتا ہے کہ اولاد کو یہ تاکید کی ہے کہ ان کے دلوں میں ماں باپ کے لیے رحم اور محبت ہو والدین کو یہ نہیں کہا، اس لیے کہ وہ فطرت میں موجود ہے اور بغیر کسی حکم کے اپنا کام کر رہی ہے۔ ایسا ہی بڑھاپے میں ماں باپ سے نرمی سے پیش آنے میں ہی فطرت کا گہرا علم نظر آتا ہے۔

احادیث میں ماں باپ کے ساتھ نیکی پر اس قدر ترغیب دلائی ہے کہ جنت کو ماؤں کے قدموں کے نیچے قرار دیا ہے گویا وہ ماں کی خدمت سے حاصل ہوتا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ والدین کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور ان کی ناراضگی اس کی ناراضگی اور ماں باپ کی خدمت کو جہاد کی طرح قرار دیا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ ان کی موت کے بعد بھی ان سے نیکی کرے اور اس کی تفصیل یوں بیان فرمائی ہے کہ ان کے لیے دعا اور استغفار کرے اور ان کے بعد ان کے عہد کا ایفا کرے اور صلہ رحمی کرے اور ان کے دوست کا اکرام کرے۔

السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾
إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا إِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ
وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾
وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ
رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾
وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ
وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ
مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾
إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ
يَقْدِرُ ۭ إِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾ ع

خرچ کرکے (مال کو) نہ اُڑا ع۱۸۲۳
مال اُڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے
رب کا ناشکر گزار ہے ع۱۸۲۴
اور اگر تو اپنے رب کی رحمت کو چاہتا ہُوا جس کی تجھے امید
ہے اُن سے منہ پھیرلے تو ان سے نرمی کی بات کہہ دے ع۱۸۲۵
اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے بندھا ہُوا نہ رکھ اور نہ
اسے حد سے زیادہ کھول ورنہ تو ملامت کیا ہُوا اور ماندہ
ہو کر بیٹھ رہے گا ع۱۸۲۶
تیرا رب جسے چاہتا ہے رزق کی فراخی دیتا ہے اور وہی تنگ کرتا
ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں سے خبردار (انھیں) دیکھنے والا ہے۔

ع۱۸۲۳ تبذیر۔ بَذْر وہ دانہ ہے جو بیج کے لیے محفوظ رکھا جائے اور راغب کہتے ہیں کہ تبذیر مال کو ضائع کرنا ہے کیونکہ بیج کا ڈالنا بھی بظاہر اس شخص کو مال ضائع کرنے کی طرح معلوم ہوتا ہے جو اس کے مآل سے ناواقف ہے (یا اس لیے کہ اس کا بیجا پھینکنا اس کا ضائع کرنا ہے)۔

ماں باپ کے حقوق کے بعد قریبیوں پھر مساکین پھر مسافروں کے حقوق کی طرف توجہ دلائی اور حقہ کہہ کر یہ تبایا کہ ہر انسان کے مال میں اس کے قریبیوں اور مساکین اور مسافروں کا بھی کچھ حق ہے اور اس کی تبذیر یعنی بیجا مال خرچ کرنے سے روک کر یہ سمجھایا کہ مال کو جب تم صحیح موقعہ پر خرچ کرتے ہو تو وہ ایک بیج کی طرح ہے جو زمین میں پڑتا اور پھل لاتا ہے لیکن جو بیج بے موقعہ پھینکا جائے گا وہ ضائع ہو گیا اس میں مال کی حفاظت کس قدر سکھائی ہے مگر اس کی محبت کی تعلیم قرآن شریف نہیں دیتا اور یہی اس کا کمال ہے اس رکوع کی تعلیم خلاصۃً سورۃ الانعام کے رکوع ۱۹ میں آچکی ہے وہاں سارے رکوع کا خلاصہ صرف دو جملوں میں ہے الّا تشرکوا بہ شیئًا و بالوالدین احسانا (الانعام۶۔ ۱۵) یہاں والدین کے ساتھ احسان کو پہلے تفصیل سے بیان کیا پھر قریبیوں مسکینوں وغیرہ سے احسان کی تعلیم دی گویا تبایا کہ ماں باپ سے جب انسان نیکی کرتا ہے پھر دوسروں سے بھی نیکی کی توفیق ملتی ہے گویا وہ پہلی نیکی ہے جس سے اور نیکیوں کی طرف قدم اٹھتا ہے۔

ع۱۸۲۴ اخوان الشیاطین۔ اَخ دین یا معاملہ یا محبت کے شریک پر بھی بولا جاتا ہے ع۲۸۳ یہاں مراد بری صفات میں ان کے مماثل یا ان کے دوست ہیں کفور کا لفظ لاکر تبایا کہ نعمت کو بیجا طور پر خرچ کرنا بھی کفران نعمت ہے اسی طرح اس کو برمحل خرچ کرنا اس کا شکر ہے اور برمحل خرچ نہ کرنا کفران ہے ناشکری کو شیطان کی صفت قرار دیکر ہر ناشکر گزار کو شیطان صفت قرار دیا۔

ع۱۸۲۵ میسور۔ یسر سے ہے ع۱۵۶۱ اور میسور کے معنی سہل ہیں اور یہ اسم مفعول ہے یُسِر الامر سے اور یا مصدر ہے اور مبالغہ کیلئے بطور صفت استعمال ہوا ہے۔ اعراض یا مُنہ پھیر لینے سے مراد ہے کہ مسکین وغیرہ کو کچھ دینے کی استطاعت نہ ہو تو ایسی صورت میں سختی سے انہیں رد نہ کرے، نرمی سے کلام کرنا بھی ایک صدقہ ہے اور ابتغاء رحمۃ من ربك اس لیے بڑھایا کہ نیت انسان کی بہرحال یہی ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے ذرا وسعت دے تو وہ دوسروں کو بھی دے گا۔

ع۱۸۲۶ ملومًا۔ لَوْم ملامت کرنا اور لائم ملامت کرنے والا، لا یخافون لومة لآئم (المائدۃ۵۔ ۵۴) اور مَلُوم ملامت کیا گیا اور اَلام کے معنی ہیں وہ ملامت کا مستحق ہوا جس سے مُلیم ہے فالتقمه الحوت وهو مليم (الصّٰفّٰت۳۷۔ ۱۴۲)

خرچ میں میانہ روی: ہاتھ کے بندھا ہوا ہونے یا گردن سے بندھا ہوا ہونے سے مراد بخل کرنا ہے دیکھو مغلولة الید ع۸۵۰ اور اس کے کھولنے سے مراد اسراف ہے۔ جب انفاق کی نصیحت کی اور اس کے بعد تنگ دستی کی حالت کا ذکر کیا تو اب خرچ کرنے کا ایک عام اصول بھی تبا دیا کہ مال کے خرچ کرنے میں نہ تو انسان بخیل ہو کیونکہ بخیل خدا کی راہ میں بھی نہیں دے سکتا اور نہ فضول خرچ ہو کیونکہ فضول خرچ کے پاس خدا کی راہ میں دینے کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اور حدیث میں ہے ما عال من اقتصد جو شخص خرچ میں میانہ روی اختیار کرے وہ تنگدست نہیں ہوتا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پس انداز کرنا یا کچھ بچاتے رہنا اسلام کی تعلیم کے خلاف نہیں بلکہ اس کا عین منشا ہے اور بخل کا نتیجہ ملامت ہے اور اسراف کا درماندگی اور خدا کی راہ میں سارا مال دے دینا بھی اسراف نہیں اس لیے کہ وہ بیجا خرچ نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر کوئی ضروری خرچ نہیں اور اگلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فراخی اور تنگدستی دونوں حالتوں میں میانہ روی کو نہ چھوڑنا چاہیئے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے نہ مار ڈالو، ہم ہی انھیں رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی، اُن کا مار ڈالنا بڑی غلطی ہے ع۱۸۲۷

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾

اور زنا کے قریب مت جاؤ، کیونکہ وہ بے حیائی کی بات ہے اور بُری راہ ہے ع۱۸۲۸

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّى الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھیرایا ہے مگر حق کے ساتھ اور جو ظلم سے قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو اختیار دیا ہے مگر وہ قتل میں زیادتی نہ کرے اس لیے کہ اسے مدد دی گئی ہے ع۱۸۲۹

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾

اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ مگر اس (طریق) سے جو نہایت عمدہ ہے یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور عہد کو پورا کرو کیونکہ (ہر) عہد کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ

اور جب تم ماپو تو ماپ کو پورا کرو اور سیدھی ترازو سے تولو،

ع۱۸۲۷ پچھلے اور اس رکوع کی تعلیم سورۃ الانعام کے رکوع ۱۹ کی تعلیم ہے۔ سوائے اس کے کہ یہاں بسط ہے۔ وہاں بھی توحید کے مضمون کے ساتھ یہ اخلاقی نصائح بیان کی ہیں اور یہاں بھی۔ وہاں شرک سے روک کر پھر والدین سے احسان کی تاکید کی۔ اور یہ مضمون پچھلے رکوع میں آچکا ہے۔ اب یہاں تفصیل سے اخلاقی تعلیم کا ذکر کیا ہے۔ پہلے رکوع میں دوسروں سے نیکی کی تعلیم ہے اور یہاں دوسروں سے بدی کرنے سے روکا ہے گویا ایک میں دوسروں سے نیکی کرنے کا ذکر ہے دوسرے میں ان کی حق تلفی سے روکا ہے اور یہ دونوں باتیں معاملات میں اخلاق کی تکمیل کرتی ہیں۔ موٹی موٹی باتیں جن کا یہاں ذکر ہے قتل اولاد۔ فواحش یا زنا۔ قتل نفس۔ یتیم کا مال کھانے سے روکنا۔ ماپ اور تول اور عہد کا پورا کرنا ہیں۔ وہاں قتل اولاد کے ذکر میں من املاق آتا ہے یہاں خشیۃ املاق جس کے لیے دیکھو ع۱۰۳۳ اسی لحاظ سے وہاں نرزقکم وایاھم فرمایا یہاں نرزقھم وایاکم۔ کیونکہ وہاں والدین واقعی مفلس ہیں اور یہاں افلاس کا خوف ہے اور خِطْأ اور خَطاء کے ایک ہی معنی ہیں ع۱۰۵ اور قتل اولاد سے مراد یہاں لڑکیوں کا زندہ گاڑنا نہیں کیونکہ وہ امرا اور بڑے لوگ جھوٹی غیرت سے کرتے تھے۔ بلکہ ان کو علم سے محروم رکھنا اور صحیح طور پر تربیت نہ کرنا ہے دیکھو ع۱۰۳۳

ع۱۸۲۸ زنا کے قریب مت جاؤ یعنی اس کے مبادی سے بھی بچو اور یہی اسلام کا کمال ہے کہ صرف بدی سے روکتا نہیں بلکہ بدی سے بچنے کا طریق بھی بتاتا ہے اور پھر اس کے بدنتائج سے بھی آگاہ کرتا ہے اور بدنتائج میں اس کا فاحشہ ہونا بیان کیا یعنی اس سے بیحیائی بڑھتی ہے اور اخلاق فاضلہ کا ستیاناس ہوتا ہے۔ اور دوسرے اس میں اور بھی برائیاں ہیں۔ مثلاً نسب کا ضائع ہونا فتنوں اور جنگ و جدل کا پیدا ہونا۔

ع۱۸۲۹ سزائے قتل میں اسراف: یہاں نفس یا جان سے مراد کوئی خاص نفس نہیں بلکہ ہر ایک انسان کی جان کو اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے اور ولی سے مراد وارث لیا گیا ہے جب وارث نہ ہو تو سلطان اور وارث کا اسراف فی القتل یہ ہے کہ خود بخود ایک شخص کو قتل کر دے اور اس کی وجہ بتائی کہ وہ منصور ہے یعنی حکومت وقت اس کی مدد کرے گی اور وہی تحقیقات کرنے اور فیصلہ دینے کی مجاز ہے اور حکومت وقت کو بھی سزا کے طور پر قتل میں اسراف سے روکا ہے یعنی یہ کہ ایک کی جگہ کئی کو قتل کر دے جیسے بعض ظالم حکام اپنے یا اپنے متعلقین میں سے کسی کے قتل پر شہروں کے شہر اُڑا دیتے ہیں اور گنہگاروں کے ساتھ بیگناہوں کو بھی نہ تیغ کر دیتے ہیں اور جب سزائے قتل میں بھی گنہگار سے تجاوز کرنا جائز نہیں تو دوسری سزاؤں میں کہاں جائز ہو سکتا ہے پس ضمناً سمجھایا ہے کہ سزاؤں کے وارد کرنے میں یہ مدنظر رکھا جائے کہ ملزم کو حد سے زیادہ سزا نہ دی جائے نہ بیگناہوں کو گنہگاروں کے ساتھ ملایا جائے جیسا کہ آج کل انتظام قائم رکھنے کی آڑ کے ماتحت مہذب گورنمنٹیں بھی کر گزرتی ہیں اور حق یہ ہے کہ جن اخلاق کی تعلیم قرآن شریف نے دی ہے انہیں آج تک کوئی مہذب سے مہذب گورنمنٹ نہیں پہنچ سکی۔

الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۳۵
یہ بہتر اور انجام کار بہت خوبی کی بات ہے ۱۸۳۰

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْــــُٔـوْلًا ۝۳۶
اور اس کے پیچھے نہ لگ جس کا تجھے علم نہیں، کان اور آنکھ اور دل ان سب سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا ۱۸۳۱

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝۳۷
اور زمین میں اکڑتا ہوا نہ چل، کیونکہ نہ تو تو زمین کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ لمبائی میں پہاڑوں کو پہنچے گا ۱۸۳۲

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝۳۸
ان سب کی برائی تیرے رب کے ہاں ناپسندیدہ ہے۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝۳۹
یہ اُن حکمت کی باتوں میں سے ہیں جو تیرے رب نے تیری طرف وحی کیں اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ ٹھیرا ورنہ تو ملامت کیا گیا دھتکارا ہوا ہو کر جہنم میں ڈالا جائے گا ۱۸۳۳

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ
تو کیا تمہارے رب نے تمہیں بیٹوں کے لیے چن لیا اور خود فرشتوں

ع۱۸۳۰ قسطاس۔ قسط کے لیے دیکھو ع۳۸۹ اور قسطاس میزان یعنی ترازو کو کہتے ہیں اور میزان کی طرح اس سے عدل کرنا یا انصاف کرنا مراد لیا جاتا ہے۔ اور وزنوا بالقسطاس المستقیم کے معنی کیے ہیں کہ یہ اشارہ ہے کہ انسان اپنے تمام اقوال و افعال میں جن کا وہ قصد کرتا ہے عدل و انصاف کی رعایت رکھے (غ) امام راغب نے اسے مادہ قسط کے نیچے بیان کیا ہے لیکن اکثر کا خیال یہ ہے کہ یہ رومی سے معرب ہے۔

اس رکوع میں سب نواہی کا ذکر ہے لیکن ایفائے عہد اور ماپ اور وزن کا پورا کرنا اوامر ہیں اور غرض دونوں کی ایک ہے یعنی دوسروں کی حق تلفی سے روکنا۔ ایفائے عہد نہ کرنا بھی دوسروں کی حق تلفی ہے اور ماپ تول کو پورا نہ کرنا بھی۔ اور جیسا کہ لفظ کی تشریح میں گزرا ماپ تول کے پورا کرنے سے مراد صرف ترازو وغیرہ نہیں بلکہ تمام معاملات میں عدل و انصاف کا برتاؤ ہے۔ یورپ کی موجودہ تہذیب نے عیسائیت میں اپنے معراج پر پہنچ کر دو میزانیں رکھی ہیں مسلمانوں اور ایشیائی اقوام کے لیے اصول انصاف اور ہیں یورپ کی دحشی سے وحشی قوم کے لیے اور۔ پھر ایک قوم سے معاملہ میں لینے کے بٹے اور ہیں دینے کے اور۔

ع۱۸۳۱ تقف۔ قَفَا گردن کے پچھلے حصّہ کو کہتے ہیں اور قَفَوْتُہٗ کے معنی ہیں اس کے قفا کو پہنچا اور اِقتفاء قفا کا اتباع ہے اور اس سے کنایۃً کسی کے پیچھے اس کی بدگوئی کرنا اور عیب جوئی مراد لی جاتی ہے اور لاتقف میں معنی ہیں قیافہ اور ظن سے کام نہ لو اور قیافۃ اقتفاء سے مقلوب ہے (غ)

جب دوسروں کی ہر قسم کی حق تلفی سے روکا تو اب ایک اور بات سے بھی روکا جس سے بڑی بڑی بداخلاقیاں پیدا ہوتی ہیں یعنی دوسروں کی بدگوئی یا عیب جوئی یا بغیر سننے اور دیکھنے کے ایک بات کا دیکھا اور سنا ہوا بیان کرنا۔ یہی اکثر ان بداخلاقیوں کی جڑ ہے جو اکثر مجلسوں میں رواج پا جاتی ہیں۔

ع۱۸۳۲ مرحا۔ مَرَح شدت فرح کا نام ہے جو اندازہ سے گزر جائے اور اکڑبازی اور متکبرانہ روش کو بھی کہتے ہیں ذٰلکم بما کنتم تفرحون فی الارض بغیر الحق وبما کنتم تمرحون (المؤمن۔ ۷۵) (ل)

جب ہر ایک قسم کی دوسروں کی حق تلفی اور عیب گیری سے روکا تو آخر پر یہ بھی بتایا کہ بعض افعال ایسے ہوتے ہیں کہ گو ان میں دوسروں کی حق تلفی نہ ہو مگر ان کے کرنے سے انسان خود اخلاق فاضلہ سے محروم رہ جاتا ہے اور یہ انسان کی متکبرانہ روش ہے اور مشی یا چلنے سے مراد صرف چلنا نہیں بلکہ ہر قسم کی روش ہے کہ اس میں انسان تکبر اختیار نہ کرے گو اس کی سب سے موٹی مثال اکڑ کر چلنا ہے اس سے انسان کو حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ اور محروم بہت چیزوں سے ہو جاتا ہے اور اگلی آیت میں ربکَ کا لفظ لا کر بتا دیا کہ ان تمام باتوں سے انسان کی اپنی تربیت میں نقصان ہوتا ہے۔

ع۱۸۳۳ اوحی الیک فرمایا حالانکہ خطاب عام ہے کیونکہ وحی فی الحقیقت ہر ایک کی طرف ہے گو وہ اسے رسول کی وساطت سے پاتا ہے اور اسے حکمت کہا اس لیے کہ اعلیٰ درجہ کی مضبوط اور دانائی کی باتیں ہیں۔

عٔ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿٤٠﴾
وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ
وَ مَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿٤١﴾
قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ
اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿٤٢﴾
سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿٤٣﴾
تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ
وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ
بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ
اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿٤٤﴾
وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا

کو بیٹیاں بنایا، یقیناً تم بڑا بول بولتے ہو[۱۸۳۴]
اور یقیناً ہم نے اس قرآن میں طرح طرح کے پیرائے اختیار کیے
تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور یہ بات (بھی) ان کی نفرت ہی بڑھاتی ہے[۱۸۳۵]
کہہ اگر اس کے ساتھ (اور) معبود ہوتے جیسا یہ کہتے ہیں تو یہ ضرور
عرش کے مالک کی طرف رستہ ڈھونڈ نکالتے[۱۸۳۶]
وہ پاک ہے اور جو کچھ یہ کہتے ہیں اس سے بہت ہی بلند ہے۔
ساتوں آسمان اس کی تسبیح کرتے ہیں اور زمین، اور جو کوئی ان کے
اندر ہیں (وہ بھی) اور کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے
ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ وہ
تحمل والا بخشنے والا ہے[۱۸۳۷]
اور جب تُو قرآن کو پڑھتا ہے تو ہم تیرے اور ان لوگوں کے
درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ایک چھپا ہوا

ع۱۸۳۴ سب اخلاق فاضلہ کی تعلیم کے بعد پھر اصل الاصول یعنی توحید کی طرف توجہ دلائی جیسا کہ پچھلی آیت کے آخری حصہ سے ظاہر ہے اور اس آیت میں عرب کے ایک موٹے قسم کے شرک کا ذکر کیا کہ یہاں تک ان کا شرک ترقی کر گیا ہے کہ اس بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں جسے خود اپنے لیے بھی ناپسند کرتے ہیں یعنی یہ کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور یہ مضمون تفصیل کے ساتھ النحل ۱۶: ۵۷ تا ۶۲ میں بیان ہو چکا ہے دیکھو ع۱۷۵۳۔

ع۱۸۳۵ اخلاق فاضلہ کے مضمون کی ابتدا بھی توحید الٰہی سے کی تھی اور اس کے خاتمہ پر بھی اسی کا ذکر کیا اور اب اس رکوع میں ایمان بالآخرۃ کے ذکر میں پھر اسی سے ابتدا کی اور بار بار اور طرح طرح کے پیرایوں میں اس مضمون کے بیان کرنے کی غرض بھی خود ہی بتا دی کہ کسی طرح سے لوگ سمجھ لیں ایک شخص ایک پیرایہ بیان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسرا دوسرے سے اس لیے قرآن کریم نے اہم مضامین کو رنگا رنگ کے پیرایوں میں بیان کیا ہے مگر جو شخص دشمنی کی ہی ٹھان لیتا ہے وہ اور بھی دور بھاگتا ہے۔

ع۱۸۳۶ مشرک مقرب بارگاہِ الٰہی نہیں ہو سکتا: مشرک قوموں کا بڑا عذر یہ ہوتا ہے اور یہی عرب کے بُت پرستوں کا تھا کہ ہم بتوں کی یا اوروں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اس ذریعہ سے حاصل کریں۔ فرمایا کہ اگر یہ درست ہوتا تو پھر ان کو خدائے برتر کا قرب حاصل ہو جانا چاہیئے تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں پر اطلاع پا لیتے تو اس صورت میں وحی الٰہی کے پانے والے نبوت اور رسالت کے مقام پر کھڑے ہونے والے بھی مشرک ہوتے نہ کہ موحد۔ حالانکہ جتنے اس قسم کے انسان تاریخ میں نظر آتے ہیں جو نبوت اور رسالت کے مقام پر کھڑے کیے گئے ہوں وہ سب موحد ہی ہوئے ہیں اور یا مراد یہ ہے کہ اگر یہ خدا تعالیٰ کے مقرب ہوتے تو پھر اسلام کی مخالفت میں کامیاب ہو جاتے اور بعض نے سبیل سے مراد سبیل مغالبۃ اور ممانعت لیا ہے یعنی وہ معبود کوشش کر کے خدا پر غالب آ جاتے جیسا دوسری جگہ ہے لو کان فیھما اٰلھۃ الا اللہ لفسدتا (الانبیاء ۲۱: ۲۲)

ع۱۸۳۷ کل مخلوق کی تسبیح سے مراد: یہ تسبیح جس کا یہاں ذکر ہے زبانِ حال سے ہے (ر) اور یہ خود لا تفقھون تسبیحھم سے ظاہر ہے کیونکہ زبان کی تسبیح کو وہ بھی سمجھتے تھے اور مطلب یہ ہے کہ ہر ایک مخلوق اپنے خالق کے وجود پر گواہی دیتی ہے اس لیے کہ ہر مخلوق ایک قید اور ایک دائرہ اور ایک حد بست کے اندر ہے اور معرض زوال میں ہے لیکن خالق یا معبود مقید یا محدود اور زوال پذیر نہیں کیونکہ مقید اور محدود ہونا یا معرض زوال میں ہونا ایک عیب ہے پس عملی رنگ میں تمام چیزیں مقید اور محدود اور معرض زوال میں ہو کر ایک خالق کے وجود پر شہادت دیتی ہیں جو دوسری چیزوں کو اندازوں اور حد بست کے اندر رکھنے والا اور خود لازوال ہے اور یہی تسبیح ہے کہ وہ ان تمام عیوب سے پاک ہے جو مخلوق کے لاحق حال ہیں اور شرک کی تردید اس سے ہوتی ہے اس لیے کہ جن کو خدا کے شریک بنایا جاتا ہے وہ سب مخلوقیت کی مہر اپنے اوپر رکھتے ہیں۔ حلم و غفر کی صفات آخر میں لا کر یہ بتایا کہ جو لوگ اس کو چھوڑتے ہیں، ان پر فوراً عذاب نازل نہیں کرتا۔ چنانچہ انہی لوگوں کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔

مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ پردہ حائل کر دیتے ہیں ۱۸۳۸

وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾

اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ اسے نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ (ڈال دیا ہے) اور جب تو قرآن میں اپنے اکیلے رب کا ذکر کرتا ہے اپنی پیٹھیں پھیرتے ہوئے بدک کر چل دیتے ہیں

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾

ہم خوب جانتے ہیں جیسا وہ سنتے ہیں جب تیری طرف کان لگاتے ہیں اور جب یہ خفیہ مشورہ کرتے ہیں، جب ظالم کہتے ہیں کہ تم صرف ایک جادو کیے ہوئے مرد کی پیروی کرتے ہو ۱۸۳۹

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾ ع

دیکھ کس طرح تیرے لیے مثالیں بیان کرتے ہیں سو یہ گمراہ ہو گئے اور راستہ نہیں پا سکتے ۱۸۴۰

ع۱۸۳۸ حجابا۔ حَجْب اور حجاب کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف پہنچنے سے روک دینا۔ اور ایسی روک بھی۔ اور اہل جنت اور اہل نار کے درمیان جس حجاب کا ذکر ہے و بینهما حجاب (الاعراف۷۔ ۴۶) تو وہ ایسا پردہ نہیں جو نظر کو روکتا ہے بلکہ ایسا پردہ ہے جو اہل جنت کی لذات کو اہل نار کو پہنچنے سے اور اہل نار کی اذیت اہل جنت کو پہنچنے سے روکتا ہے (غ) اور یہاں تو خود ہی اس حجاب کو مستور بھی کہہ دیا ہے یعنی وہ ایسا پردہ ہے جو آنکھ سے نظر نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ دلوں پر کیوں پردہ ڈالتا ہے: اس آیت میں حجاب کے حائل کرنے اور اگلی میں دلوں پر پردے ڈالنے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے جس کے متعلق مفصل بحث گزر چکی ہے ع۱۸ یہ پردے اس لیے ڈال دیئے جاتے ہیں کہ وہ خود سننا اور سمجھنا نہیں چاہتے چنانچہ یہاں بھی آیت ۴۱ میں بتایا کہ ہم تو طرح طرح کے پیرایوں میں باتوں کو بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں مگر ان کی نفرت اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور آیت ۴۶ میں نفرت کو صاف الفاظ میں ان کی طرف منسوب کیا کہ جب ایک خدا کا ذکر ہوتا ہے تو وہ اس کے سننے کی برداشت ہی نہیں کر سکتے واذا ذکرت ربك فی القراٰن وحدہ ولوا علیٰ ادبارھم نفورا اور اسی کے مطابق دوسری جگہ اور بھی صفائی سے فرمایا واذا ذکر اللّٰہ وحدہ اشمأزت قلوب الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ واذا ذکر الذین من دونہ اذا ھم یستبشرون (الزمر۳۹۔ ۴۵) پس توحید الٰہی کا ذکر سنتے ہی ان کے دل گھٹ جاتے پھر سمجھنا کیا تھا یہی وہ پردے ہیں جو حائل ہو جاتے تھے۔ اور آیت ۴۷ میں اور بھی اسی بات کو واضح کیا ہے کہ وہ کچھ سنتے بھی ہیں تو صرف اس نیت سے کہ ان باتوں پر ہنسی اڑائیں اور حق تو یہ ہے کہ قرآن کریم اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے وقالوا قلوبنا فی اکنۃ مما تدعونا الیہ و فی اٰذاننا وقر و من بیننا و بینك حجاب (حٰم۴۱۔ ۵) وہ خود کہتے تھے کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے اور ہمارے اور تمہارے درمیان حجاب ہے اسی بات کو یہاں اس دوسرے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس آیت میں آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کا ذکر کر کے بتایا کہ وہ توحید حقیقی سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔ گویا ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ ایک دوسرے سے ایسے وابستہ ہیں کہ ایک کا انکار دوسرے کا بھی انکار ہے۔

ع۱۸۳۹ مسحور۔ سَحَر غذا یا طعام کو کہتے ہیں اور سِحْر دھوکہ یا وہ چیزیں جن کا ماخذ دقیق و لطیف ہو اور مُسَحَّر اور مَسْحُور کے دونوں طرح معنی ہو سکتے ہیں یعنی سَحَر دیا گیا یا محتاج غذا یا کھاتا پیتا آدمی اور وہ جس کے لیے سِحْر کیا گیا ہو یعنی جس کی باریکی سے وہ اس امر کی طرف پہنچتا ہے جس کا وہ دعویٰ کرتا ہے (غ) گویا مراد اس سے ساحر ہی ہوا اور پہلے معنی ابن جریر نے بھی نقل کیے ہیں اور ان کی صحت پر اشعار عرب سے سند دی ہے (ج) اور بعض نے مسحور بمعنی ساحر بھی لکھا ہے (ر) گویا آپ کو چالباز دھوکہ دینے والا کہا نجویٰ کے لیے دیکھو ع۷۳۱۔

یستمعون بہ میں یا تو مراد ہے جس چیز کو ساتھ لیے ہوئے سنتے ہیں یعنی استخفاف ہنسی وغیرہ اور یا لاجلہ مراد ہے یعنی جس نیت استہزا وغیرہ سے سنتے ہیں۔ اور پھر یہی نہیں بلکہ آنحضرت صلعم کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔

ع۱۸۴۰ آنحضرت صلعم کے متعلق مختلف رائیں: ضربوا لك الامثال یا مثالیں بیان کرنے سے مراد ہے کہ کن کن سے تمہیں تشبیہ دیتے ہیں یعنی کبھی ساحر کہتے ہیں کبھی استہزا کرتے اور مجنون کہتے ہیں۔ کبھی مفتری قرار دیکر منصوبے کرتے ہیں اور گمراہ ہونے اور راستہ نہ پانے سے اسلامی صداقتوں کا انکار بھی مراد ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہ آنحضرت صلعم کے معاملہ میں یہ بھٹک رہے ہیں اور کوئی مخرج نہیں ملتا کہ کیا ایک رائے قائم کریں اس لیے کوئی کچھ کہتا تھا کوئی

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾

اور کہتے ہیں کیا جب ہم ہڈیاں اور چُورا ہو جائیں گے تو کیا نئی پیدائش کے لیے اٹھائے جائیں گے ۱۸۴۱

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾

کہہ پتھر ہو جاؤ یا لوہا۔

اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾

یا کوئی اور مخلوق جو تمھارے دلوں میں بڑی سخت معلوم ہوتی ہے پس کہیں گے ہمیں کون لوٹائے گا۔ کہہ جس نے تمھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ تب وہ تیرے سامنے اپنے سر ہلائیں گے اور کہیں گے یہ کب ہوگا؟ کہہ شاید قریب ہی ہو۔ ۱۸۴۲

يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾ ع

جس دن وہ تمھیں بلائے گا تب تم اس کی حمد کرتے ہوئے فرمانبرداری کروگے اور جان لوگے کہ تم تھوڑا ہی رہے۔

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۵۳﴾

اور میرے بندوں کو کہہ دے وہ (بات) کہیں جو بہت اچھی ہے شیطان ان میں فساد ڈلوا تا رہتا ہے شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے ۱۸۴۳

کچھ اور ایک دوسرے کو خود ہی جھٹلا دیتے تھے۔ یہی حالت مخالفین اسلام کی آج بھی ہے اور یا مثالیں بیان کرنے سے مراد انکار بعث وغیرہ کی باتیں ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

ع۱۸۴۱ رفاتا۔ رَفْت کے معنے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہیں اور رفات وہ چیز ہے جو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پراگندہ کر دی جائے (غ)

ع۱۸۴۲ ینغضون۔ اِنْغاض دوسرے کی طرف سر کا ہلانا ہے گویا کہ اس کی بات پر تعجب کرتا ہے (غ) اور نیز اوپر نیچے ہلانا ہوتا ہے یا انکار کے طور پر ہلانا (ل)

بعث بعد الموت مادہ پرستوں کے لیے ہمیشہ ہی تعجب کا مقام رہا ہے انکار کے رنگ میں کہتے ہیں کہ ہم مرجائیں گے اور گوشت گل سڑ کر بڑیاں رہ جائیں گی اور آخر وہ ہڈیاں بھی چورا ہو جائیں گی تو کیا پھر ہم از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے اس کے جواب میں فرمایا کہ چورا اور مٹی تو آسانی سے زندگی قبول کر لیتی ہے اگر تم ایسی چیز بھی بن جاؤ کہ جو زندگی قبول ہی نہیں کرسکتی جیسے پتھر یا لوہا یا اس سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز جو تمہارے خیال میں آسکتی ہو تب بھی موت کے بعد تم زندہ ہوگے اور آگے چل کر فرمایا کہ تم چورا چورا ہو جاؤ گے تو وہ تمہاری مثل پیدا کر دیگا (دیکھو ۹۹) کیونکہ وہ زندگی اعمال انسانی سے پیدا ہوتی ہے اور اس پیرایہ کے اختیار کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اگر تمہارے دل پتھر اور لوہے کی طرح بھی سخت ہو جائیں تو بھی اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی تمہیں ایمان کی توفیق دیدیگا اور شاید قریباً میں اسی طرف اشارہ ہو اور اگلی آیت میں حمد کے ساتھ فرمانبرداری کرنا اسی کا مؤید ہے گویا اس بعثت کبریٰ سے پیشتر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا نظارہ ایک بعثت صغریٰ میں بھی دکھا دیگا۔

ع۱۸۴۳ عین اس وقت جب کفار کی طرف سے سخت تکلیفیں پہنچ رہی تھیں آنحضرت صلعم پر استہزا ہوتا آپ کو ساحر، کاہن، مفتری، شاعر کہا جاتا تھا مسلمانوں کو آیات بالا میں یہ خوشخبری سنا کر یہ بھی ایک وقت اسلام قبول کریں گے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ سب کچھ سُن کر بھی اپنے مخالفین سے احسن طریق پر بات کریں اور ان سے خشونت نہ کریں کیونکہ شیطان کی کوشش ہے کہ فساد بڑھائے نزغ کے لیے دیکھو ع۱۱۹۵ اور سخت کلامی سے فساد اور بڑھے گا۔ کیا آج مسلمانوں کے لیے اس میں کوئی سبق نہیں آج سے کم اُس وقت مخالفین اسلام کی تباہی کے درپے نہ تھے۔ مگر حق اور صداقت دنیا میں صرف نرمی سے پھیل سکتے ہیں بغیر درشتی برتنے کے بھی ہم بعض افعال سے اظہار نفرت کرسکتے ہیں جن کا ارتکاب آج عیسائی اقوام طاقت کے نشہ میں کر رہی ہیں اگلی آیت میں یرحمکم میں یہی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اسلام میں داخل کر دے۔

رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ ۖ إِن يَشَأْ يَرْحَمْكُمْ أَوْ إِن يَشَأْ يُعَذِّبْكُمْ ۚ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿٥٤﴾

تمھارا رب تمھیں خوب جانتا ہے اگر وہ چاہے تم پر رحم کرے اور اگر چاہے تمھیں عذاب دے اور ہم نے تجھے ان کا ذمہ دار (بناکر) نہیں بھیجا۔

وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ ۖ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ﴿٥٥﴾

اور تیرا رب انھیں خوب جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور یقیناً ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی اور داؤدؑ کو ہم نے زبور دی ۱۸۴۴

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ﴿٥٦﴾

کہہ انھیں پکارو جنھیں تم اس کے سوائے (معبود) خیال کرتے ہو تو وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ بدل دینے کا۔ ۱۸۴۵

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴿٥٧﴾

وہ جنھیں یہ پکارتے ہیں ان میں سے وہ جو زیادہ قرب رکھتے ہیں خود اپنے رب تک پہنچنے کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں تیرے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے ۱۸۴۶

ع۱۸۴۴ زبور کی خصوصیت: بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دینے میں اشارہ آنحضرت صلعم کی فضیلت کی طرف ہے دیکھو ع۳۲۴ اور یہاں سورت کی ابتدا ہی اس ذکر سے ہوتی ہے جس میں یہ بتایا گیا کہ آپ کل انبیاء کے فضائل کو اپنے اندر جمع رکھتے ہیں اور کامیابی اور تقرب الٰہی کے بلند سے بلند مرتبہ پر جو انسان کے لیے ممکن ہے پہنچے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہاں اس فضیلت کی طرف اشارہ کرکے اس رکوع کے آخر پر پھر اسی رویائے معراج نبوی کا ذکر کیا۔ اور آیت ۵۸ میں آپ کی بعثت عامہ کا ذکر اسی کی طرف اشارہ ہے اور حضرت داؤدؑ کو زبور دینے کا یہاں بالخصوص ذکر اس لیے کیا کہ ایک تو زبور میں شدت بہت ہے اس کے مقابل قرآن کریم نے اسی جگہ اعدائے اسلام تک کے لیے یقولوا التی ھی احسن کی تعلیم دی ہے اور دوسرے جن کامیابیوں کی طرف اس سورت میں توجہ دلائی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسجد اقصٰی یعنی بیت المقدس بھی مسلمانوں کو دیا جائیگا اور یہ پیشگوئی خاص طور پر حضرت داؤد کی زبور میں ہی ہے ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (الانبیاء ۲۱-۱۰۵) پس حضرت داؤدؑ اور زبور کا ذکر یہاں بے ربط نہیں بلکہ صاف بتاتا ہے کہ کس لطیف طریق پر سلسلہ مضمون کو قرآن کریم چلاتا ہے اور رکوعوں کے رکوع درمیان میں آجانے کے بعد بھی کس طرح سورت کے اصل مضمون کو قائم رکھا ہے۔

ع۱۸۴۵ تحویلا۔ حال سے ہے ع۴۲۰ اور ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف منتقل ہونا تحوّل اور منتقل کرنا تحویل ہے اور مراد یہ ہے کہ وہ دکھ کو ان سے ہٹا کر دوسرے پر نہیں ڈال سکتے اور حِوَل اور تحوّل کے ایک ہی معنی ہیں لایبغون عنھا حولا (الکھف ۱۸-۱۰۸) (رغ)

ع۱۸۴۶ وسیلۃ کے لیے دیکھو ع۸۲۰۔ ابن جریر میں اس کی تفسیر میں ہے کہ اس کے معنی قرب ہی ہیں اور یہ معنی ابن عباس سے مروی ہیں۔

ایھم۔ میں یا ایّ موصولہ ہے اور یہ ضمیر یبتغون سے بدل بعض ہے یعنی جو ان میں سے مقرب ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے ساتھ اور بھی اس کے قرب کو چاہتے ہیں اور یا ایّ استفہامیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ کون ان میں سے زیادہ قرب حاصل کرے۔

حصول قرب الٰہی کا ذریعہ: یہاں کن معبودوں کا ذکر ہے۔ بعض کے نزدیک جنّ مراد ہیں اور بعض کے ملائکہ اور بعض کے عیسٰےؑ اور مریم اور عزیر (ج) اور آخری بات ہی درست ہے اس لیے کہ یہاں بذریعہ اعمال و طاعات کے قرب حاصل کرنے کا ذکر ہے کیونکہ جنوں کے مقرب بارگاہ الٰہی ہونے کا قرآن شریف میں کہیں ذکر نہیں۔ اور ملائکہ مقرب تو ہیں مگر وہ طاعات اور اعمال سے قرب حاصل نہیں کرتے نہ ان کے مدارج قرب میں کوئی ترقی ہوتی ہے۔ پس مراد ایسے راستباز انسان ہی ہیں جیسے حضرت عیسٰیؑ۔ اور سب سے بڑا شرک انہی کے متعلق ہونے والا تھا۔ اب بھی انجیل کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی خود عبادات اور دعائیں کرتے تاکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں خدا کو خدا کا قرب حاصل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور اس کے عذاب سے ڈرنا اس کے قانون کو توڑنے سے ڈرنا ہے انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم (الانعام ۶-۱۵) خیر البشر کی زبان سے کہلوایا۔ پس قرب الٰہی کو حاصل کرنے کا وہی راستہ ہے جس پر چل کر ان راستبازوں نے قرب الٰہی حاصل کیا یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری کی جائے نہ یہ کہ انکی عبادت کی جائے۔ جو شخص کسی بزرگ

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾

اور کوئی بستی نہیں مگر ہم اسے قیامت کے دن سے پہلے ہلاک کردیں گے یا اسے سخت عذاب دیں گے ۔ یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے ۱۸۴۷

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾

اور ہمیں کسی چیز نے نہیں روکا کہ نشان بھیجتے رہیں مگر یہ (ہوا) کہ پہلے انھیں جھٹلاتے رہے اور ہم نے ثمود کو اونٹنی روشن (نشان کے طور پر) دی، سو انھوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم نشان صرف ڈرانے کو بھیجتے ہیں ۱۸۴۸

کو مقرب بارگاہ الٰہی سمجھتا ہے اسے چاہیئے کہ خود اسی راستہ پر چلے جس پر چل کر وہ بزرگ مقرب بنا یہی سیدھی راہ ہے۔

ع۱۸۴۷ جب اوپر کی آیت میں بتایا کہ مقربین بارگاہ الٰہی بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں تو اب بتایا کہ ان کو خدا بنانے والے کس طرح عذاب سے بچ سکتے ہیں کیونکہ وہ راستباز تو طاعات کی طرف قدم بڑھاتے تھے اور یہ ان کو خدا بنا کر معاصی پر دلیر ہوتے چلے جاتے ہیں اور ان کے غلط راہ پر ہونے کا یہ نشان ہے کہ ان پر عذاب آتے رہیں گے اسی کے مطابق دوسری جگہ ہے وقالت الیھود والنصٰری نحن ابنٰؤا اللہ واحباؤہ قل فلم یعذبکم بذنوبکم (المائدۃ ۵ - ۱۸) اور یہاں حصر کیا ہے کہ قیامت سے پہلے ہر ایک بستی کو یا ہم ہلاک کردیں گے یا سخت عذاب دیں گے۔ اور اس کے کتاب میں لکھا ہونے سے یہ مراد ہے کہ علم الٰہی میں یہ بات ہے جس کو اب قرآن شریف میں ظاہر کیا گیا۔ ان الفاظ سے خود قیامت کا آنا مراد نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ پھر ہلاکت اور سخت عذاب کو علیحدہ علیحدہ بیان نہ کیا جاتا۔ قیامت کے آنے پر تو ہلاکت ہی ہلاکت ہوگی اور خود زمین ہی پاش پاش کردی جائے گی۔ پس اس آیت میں ان امور کا ذکر ہے جو قیامت سے پیشتر آنحضرت صلعم کے زمانہ نبوت میں وقوع میں آنے والے ہیں اور ہلاکت سے مراد یہ ہے کہ بعض بستیاں بالکل تباہ کردی جائیں گی اور عذاب شدید سے مراد یہ ہے کہ ان پر طرح طرح کے مصائب بھیجے جائیں گے اور جیسا کہ دوسرے مقامات سے ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کا عذاب لوگوں کی اصلاح کے لیے آیا کرتا ہے اخذنا اھلھا بالبأساء والضرآء لعلھم یضرعون (الاعراف ۷ - ۹۴) اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت لے گئی ہے اس لیے ہلاکت کا عذاب کم ہی آتا ہے باایں تاریخ اسبات پر گواہ ہے کہ بستیوں کی بستیاں دنیا سے بالکل نابود ہوگئیں اور یہ بھی سچ ہے کہ انسانوں کی ہر بستی کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ مزا طرح طرح کی بلاؤں کا چکھتی ہی رہتی ہے اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ لوگ ظلم میں حد سے تجاوز کرجاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی سزا محض انکی تنبیہ کیلئے اور ان کے معاصی کی وجہ سے ہوتی ہے جیساکہ دوسری جگہ فرمایا فذاقت وبال امرھا وکان عاقبۃ امرھا خسرا (الطلاق ۶۵ - ۹) وکاین من قریۃ عتت عن امر ربھا ورسلہ فحاسبنٰھا حسابا شدیدا وعذبنٰھا عذابا نکرا (الطلاق ۶۵ - ۸)

ع۱۸۴۸ قرآن معجزات کا انکار نہیں کرتا: اس آیت کے معنی میں بسااوقات یہ غلطی کی جاتی ہے کہ اس میں معجزات یا خاص قسم کے معجزات کا انکار مانا جاتا ہے گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب ہم نشان نہیں بھیجتے اس لیے کہ پہلے لوگوں نے ان کی تکذیب کردی۔ اگر واقعی کسی کا تکذیب کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے روک ہوسکتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ سلسلہ رسل وانبیاء کو ہی بند کردیتا کیونکہ کونسا رسول آیا جس کی تکذیب نہیں ہوئی فان کذبوک فقد کذب رسل من قبلک (آل عمران ۳ - ۱۸۴) یحسرۃ علی العباد ما یاتیھم من رسول الّا کانوا بہ یستھزءون (یٰسٓ ۳۶ - ۳۰) اور یوں بھی یہ تو اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے کہ اسے پہلے علم نہ تھا کہ لوگ تکذیب کردیں گے جب لوگوں کے نشانات کی تکذیب کرنے سے یہ سمجھ آگیا کہ نشانات کا بھیجنا بے سود ہے تو پھر اس نے ان کا بھیجنا بند کردیا۔ بعض روایات جو اس آیت کی تفسیر میں ابن کثیر اور ابن جریر نے بیان کی ہیں۔ ان میں یوں آیا ہے کہ کفار نے کہا تھا کہ صفا پہاڑ سونا ہوجائے تو ہم مان لینگے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ایسا کردوں گا لیکن اگر یہ پھر بھی نہ مانیں گے تو بالکل تباہ کردیئے جائیں گے جیسے پہلی امتیں ہلاک کردی گئیں تو آنحضرت صلعم نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ میں ان کے معاملہ میں نرمی کی درخواست کرتا ہوں تب یہ آیت نازل ہوئی اس صورت میں گویا الاٰیات سے مراد وہ خاص نشان لیا جائے گا جو قریش نے مانگا اور کذب بھا میں ضمیر ان نشانوں کی طرف نہیں بلکہ ان کی جنس کی طرف ہوگی۔ مگر اس توجیہ کو آیت کے آخری الفاظ وما نرسل بالاٰیات الّا تخویفا صحیح نہیں ٹھہراتے کیونکہ صفا کا سونا بنانا تخویف کے لیے نہ تھا۔ اور علاوہ ازیں اگلی آیت میں نخوفھم لاکر بتا دیا کہ جس طرح پہلے آیات تخویف کے لیے بھیجتے رہے ہیں اب بھی بھیج رہے ہیں اور یہ دونوں باتیں صاف بتاتی ہیں کہ اس آیت میں کسی قسم کے معجزات کا بھی انکار نہیں۔ اور سیاق مضمون بھی صاف یہی بتاتا ہے کہ یہاں انکار آیات نہیں کیونکہ اس سے پچھلی آیت میں صراحت کے ساتھ بیان فرمایا تھا کہ ہم عذاب ہلاکت یا دوسرے عذاب دنیا میں بھیجتے رہیں گے اور اگلی آیت میں بھی عذاب بھیجنے کا ذکر ہے پس الّا کو استثنائے منقطع لیکر آیت کے معنی یوں ہونگے کہ کسی چیز نے بھی ہمیں نشانوں کے بھیجنے سے نہیں روکا ہاں دوسری طرف یہ بھی ہوتا رہا کہ جن کے لیے یہ نشان بھیجے گئے تھے کہ وہ ان سے سبق حاصل کریں انہوں نے نشانات

وَ اِذۡ قُلۡنَا لَکَ اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَ مَا جَعَلۡنَا الرُّءۡیَا الَّتِیۡۤ اَرَیۡنٰکَ اِلَّا فِتۡنَۃً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَۃَ الۡمَلۡعُوۡنَۃَ فِی الۡقُرۡاٰنِ ؕ وَ نُخَوِّفُہُمۡ ۙ فَمَا یَزِیۡدُہُمۡ اِلَّا طُغۡیَانًا کَبِیۡرًا ﴿۶۰﴾ ع

اور جب ہم نے تجھے کہا کہ تیرے رب نے لوگوں کو گھیر لیا ہے اور ہم نے اس رؤیا کو جو تجھے دکھایا صرف لوگوں کے لیے فتنہ بنایا اور اس درخت کو بھی جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے اور ہم انھیں خوف دلاتے ہیں تو اس سے ان کی خطرناک سرکشی اور بڑھتی ہے ۔ ۱۸۴۹

وَ اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ قَالَ ءَاَسۡجُدُ لِمَنۡ خَلَقۡتَ طِیۡنًا ﴿ۚ۶۱﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو تو انھوں نے فرماں برداری کی مگر ابلیس (نے نہ کی) کہا کیا میں اس کی فرمانبرداری کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے ۔

قَالَ اَرَءَیۡتَکَ ہٰذَا الَّذِیۡ کَرَّمۡتَ عَلَیَّ ۫ لَئِنۡ اَخَّرۡتَنِ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَاَحۡتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَہٗۤ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۶۲﴾

کہا ، بتا جسے تو نے مجھ پر بزرگی دی ہے اگر تو مجھ کو قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں ضرور سوائے تھوڑوں کے اس کی نسل کو قابو میں کر لوں گا ۔ ۱۸۵۰

کی تکذیب کی ۔ اور آیات تخویف کے لیے بھیجی جاتی ہیں یعنی ہلاکت سے کمتر عذاب اس لیے بھیجے جاتے ہیں کہ لوگ ڈر کر رجوع کریں ۔
اور درمیان میں ثمود کو ناقہ دینے کا ذکر بطور جملہ معترضہ کیا ہے اور یہ گویا ان آیات کی ایک مثال ہے ۔ یعنی اس اونٹنی کو بھی بطور ایک نشان کے انھیں دیا گیا تھا سو اس پر انھوں نے ظلم کیا ۔ اس اونٹنی کا خصوصیت سے ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے ؟ تباہ شدہ قوموں میں اہل حجاز سے قریب ترین قوم ثمود ہی تھی جو الحجر میں مدینہ کے شمال میں آباد تھی اور جو کچھ منصوبہ حضرت صالح کے اعدا نے صالح کے خلاف کیا بعینہٖ وہی منصوبہ نبی کریم صلعم کے اعدا نے آپ کے خلاف کیا قالوا تقاسموا باللہ لنبیّتنّہٗ و اھلہ ثمّ لنقولنّ لولیّہٖ ما شھدنا مھلک اھلہ و انا لصٰدقون (النمل ۲۷ - ۴۹) اور بعینہٖ ایسا ہی منصوبہ نبی کریم صلعم کے خلاف ہوا تھا حالانکہ وہ سورت اس منصوبہ سے بہت پہلے کی ہے اور ثمود کا اونٹنی کو مارنا حضرت صالح کے قتل کا پیش خیمہ تھا ۔ اور شاید یہ بھی اس میں مدنظر ہو کہ وہ بھاگ نہ سکیں ۔

ع ۱۸۴۹ احاط بالناس ۔ احاطۃ کے لیے دیکھو ع ۱۳۸۷ یہاں مراد قدرت کے ساتھ احاطہ کرنا ہے اور احیط بفلان سے مراد ہوتی ہے اس کی ہلاکت قریب آگئی ۔

الرؤیا خواب کے ساتھ مخصوص ہے ع ۱۵۱۶ اور اس رؤیا سے مراد معراج ہے جیسا کہ بخاری اور دیگر کتب حدیث سے ثابت ہے لیکن یہاں جو مفسرین نے اسے رؤیا عین کہا ہے تو یہ صریحاً لغت کے خلاف ہے اور اس لیے قبول نہیں کیا جا سکتا مفصل ع ۱۸۰۱ میں گزر چکا ۔

الشجرۃ الملعونۃ سے مراد زقوم کا درخت لیا گیا ہے اور یہ معنی ابن عباس سے مروی ہیں اور ملعونۃ اسے اس لیے کہا کہ اس کے کھانے والے ملعون ہوں گے لیکن دیکھو ع ۵۵ اباء و استکبار کی وجہ سے جسے قرآن شریف میں ایک شجرۃ ہی قرار دیا گیا ہے شیطان ملعون ہوا اور خود بدی کو شجرۃ خبیثۃ کہا ہے (ابراہیم ۱۴ - ۲۶)

رویائے معراج : رکوع کی آخری آیت میں صاف طور پر سورت کے اصل مضمون کی طرف پھر متوجہ کیا اور اس رویا کا ذکر کیا ہے جس سے سورت کی ابتدا کی تھی اور پہلے بلحاظ سیاق مضمون بتایا کہ جو مخالف اپنے آپ کو بڑا طاقتور سمجھتے ہیں وہ سب اللہ کی گرفت میں ہیں اور ہلاک کر دیئے جائیں گے اور بعض مفسرین نے یہاں اشارہ بالخصوص بدر کی طرف مانا ہے اور پھر رویائے معراج کا ذکر کیا ہے جس میں نبی کریم صلعم کی آیندہ کامیابیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور پھر ملعون درخت کا یعنی زقوم کا درخت جو دوزخیوں کا طعام ہو گا اور اس میں اشارہ مخالفوں کی سزا دہی کی طرف ہے اور یا بدی کا درخت یا اباء و استکبار کا درخت کہ اسی سے ڈرانا مقصود ہے اور ان دونوں کو فتنۃ للناس فرمایا ہے رویا کا فتنہ ہونا تو اس لحاظ سے کہ لوگوں کے لیے ابتلا اور امتحان کا موجب ہو گئی اور ملعون درخت سے اگر زقوم مراد لیا جائے تو اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ یہ سنکر کہ قرآن شریف نے دوزخیوں کی خوراک زقوم بتائی ہے ابوجہل نے کھجوریں اور مکھن منگوا کر اسے ملایا اور کہا ہم تو اسی کو زقوم کہتے ہیں اور اگر اباء و استکبار مراد لیا جائے تو وہ اس لحاظ سے فتنہ ہے کہ اس کو اختیار کر کے لوگ دکھ اور تکلیفوں میں پڑتے ہیں ۔

۱۸۵۰ اکرمت ۔ کرم کے لیے دیکھو ع ۶۴۷ اور اِکرام اور تکریم ایسا نفع پہنچانا ہے جس میں کوئی خواری یا نقصان نہ ہو (غ) بل عباد مکرمون (الانبیاء ۲۱

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ
جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿٦٣﴾

فرمایا چلا جا جو کوئی ان میں سے تیری پیروی کرے گا تو دوزخ
تمھاری سزا ہے (اور) پوری سزا ہے ۱۸۵۱ء

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ
وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ
فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا
يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿٦٤﴾

اور ان میں سے جس کو تو کر سکے اپنی آواز سے خفیف کر دے اور
ان پر اپنے سواروں اور اپنے پیادوں کو اکٹھا کر لا اور ان کے
مالوں اور اولاد میں شریک ہوتا رہ اور ان سے وعدے کرتا رہ
اور شیطان جو اُن سے وعدے کرتا ہے سو دھوکا ہے ۱۸۵۲ء

اِنَّ عِبَادِىْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ
وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿٦٥﴾

میرے بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں۔ اور تیرا رب
کافی کارساز ہے ۱۸۵۳ء

---

۲۶۰) هل اتٰك حديث ضيف ابراهيم المكرمين (الذّٰريٰت ۵۱-۲۴)

احتنكن۔ حَنَكُ انسان اور جانور کے منہ میں اس حصّہ کو جو ٹھوڑی کے نیچے اندر کی طرف ہے کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک تالو کو بھی اور اِحْتِنَاكٌ جس سے یہاں اِحْتَنِكَ فعل آیا ہے جانور کے متعلق کہا جاتا ہے جب اس کے نچلے جبڑے میں رسہ ڈال کر اسے چلایا جائے اور ٹڈی جب زمین کی روئیدگی کو کھا کر بالکل صاف کر دے تو اس پر بھی اِحْتَنَكَ بولا جاتا ہے۔ پس اَحْتَنِكَ کے معنی ہونگے انھیں قابو میں کرکے ان کا استیصال کردوں گا (ل)

پچھلے رکوع میں اعدائے حق اور ان کے عذاب کا ذکر تھا۔ اب بتایا ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلعم کے پیغام کو پھیلانے سے روکتے ہیں وہ عذاب سے بچ نہیں سکتے لیکن اس سے پہلے اپنا ایک عام قانون بیان فرمایا ہے کہ شیطان ہمیشہ سے ہی انسان کا دشمن چلا آیا ہے اور وہ راستی اور نیکی کے پھیلانے میں کاوٹ پیدا کرتا ہے مگر یہاں فرمانبرداری کے انکار کے بعد شیطان کی تعلیوں کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ اپنے بڑے بڑے دعوں میں کہ میں یوں کردوں گا جھوٹا ہے اور اپنے اولیاء سے جو وعدے وہ کرتا ہے وہ بھی سب دھوکہ۔ ان تعلّیوں میں اعدائے حق کی تعلّیوں بلکہ تمام بدی کی طرف بلانے والوں کی تعلیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ مٹی سے پیداشدہ پر فخر کرنے کی وجہ کے لیے دیکھو ۱۰۵۴ء۔

۱۸۵۱ء موفور۔ وَفَرْتُ کے معنی ہیں ایک چیز کو تمام اور کامل کیا۔ اسی سے موفور بمعنی کامل ہے (غ)

۱۸۵۲ء استفزز۔ فَزَّ کے معنی ہیں گھبراہٹ میں ڈال دیا اور اِسْتَفَزَّ کے بھی یہی معنی ہیں اور نکال دیا یا اسے ہلاکت میں ڈال دیا یا ڈرا دیا یا خفیف بنا دیا۔ وان کادوا ليستفزّونك من الارض (٧٦) (ل) ان يستفزّهم من الارض (١٠٣)

صوت۔ صَوْتٌ مطلق آواز کو کہتے ہیں خواہ اس کے معنی ہوں یا نہ ہوں اور ہر آواز کو جو دو جسموں کے کھٹکھٹانے سے پیدا ہو صوت کہا جاتا ہے۔ اور اِنْصات کے معنی ہیں باتوں کو ترک کر کے ایک کلام کو سننا و اذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا (الاعراف ۷-۲۰۴) (غ) اور یہاں شیطان کے وسوسہ کو یا اس کے بلانے یا اس کی تحریک کو تحقیر کے رنگ میں صوت سے تعبیر کیا ہے گویا کہ وہ ایک بے معنی بات ہے (د)

اجلب۔ جلب ایک جگہ سے ہانک کر دوسری جگہ لے جانا اور اَجْلَبْتُ علیہ کے معنی ہیں اس پر زور سے چیخ ماری (غ) اور اَجْلب علیہ کے معنی یہ بھی آتے ہیں کہ اس پر جماعتوں کو اکٹھا کر لایا اور اسے شر سے ڈرایا (ل)

بخيلك ورجلك۔ خیل سوار ۳۸۵ء رَجِل پیادہ بمعنی راجل ۳۰۸ء اور یہاں راجل کی جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ شیطان کے سواروں اور پیادوں سے مراد بعض نے وہ سوار اور پیادے لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی معصیت میں جنگ کرتے ہیں اور بعض کے نزدیک مراد صرف اس کے اعوان اور اتباع ہیں یعنی اس کے مددگار۔

شارکھم فی الاموال والاولاد۔ شیطان کی مالوں اور اولاد میں شرکت سے مراد بعض کے نزدیک ان کا اللہ تعالیٰ کی معصیت میں صرف کرنا اور ناجائز طریق پر کمانا ہے اور بعض نے اولاد میں شیطان کی شرکت سے مراد زنا لی ہے اور بعض نے ان کا ادیان باطلہ میں داخل کرنا مراد لیا ہے (ج) اور درحقیقت یہ لفظ ان سب باتوں پر حاوی ہیں۔

یہاں بتایا ہے کہ شیطان جس رستہ سے بھی چاہے انسان کو بہکائے اور اپنی جمعیت سے اور اپنے اعوان و انصار سے ڈرائے یہ سب دھوکہ ہے فی الحقیقت وہ انسان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

۱۸۵۳ء اوپر کی سب باتوں کا جواب ایک ہی دیا گیا ہے کہ میرے بندوں پر شیطان کا کوئی تسلط یا غلبہ حاصل نہیں۔ عبادی سے مراد سب بندے بھی ہو سکتے ہیں اور عباد اللہ المخلصین بھی۔ اور یہ سچ ہے کہ شیطان کو فی الواقع کسی انسان پر بھی غلبہ نہیں دیا گیا یعنی وہ اسے زبردستی پکڑ کر معصیت نہیں کرا سکتا۔

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۶۶﴾

تمھارا رب وہ ہے جو تمھارے لیے دریا میں کشتیاں چلاتا ہے تاکہ تم اس کے فضل کو طلب کرو وہ تم پر رحم کرنے والا ہے ؏۱۸۵۴

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾

اور جب تمھیں دریا میں مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کھوئے جاتے ہیں جنھیں تم پکارتے ہو سوائے اس کے پھر جب وہ تمھیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تم منہ پھیر لیتے ہو اور انسان ناشکر گزار ہے۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿۶۸﴾

تو کیا تم (اس سے) نڈر ہو کہ وہ تم کو خشکی کے قطعہ پر ہی نابود کر دے یا تم پر کنکر برسانے والی آندھی بھیجدے ــــ پھر تم اپنے لیے کوئی کارساز نہ پاؤ ؏۱۸۵۵

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿۶۹﴾

یا تم (اس سے) نڈر ہو کہ ایک دفعہ پھر تم کو اسی (دریا) میں لے جائے پھر تم پر کشتی توڑ دینے والی ہوا چلائے اور تم کو غرق کر دے اس لیے کہ تم نے ناشکری کی پھر تم اپنے لیے ہمارے خلاف اس کی کوئی پیروی کرنے والا نہ پاؤ ؏۱۸۵۶

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْۤ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي

اور یقیناً ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں

جیسا کہ دوسری جگہ شیطان کا اپنا اعتراف موجود ہے ان اللہ وعدکم وعد الحق ووعدتکم فاخلفتکم وما کان لِیَ علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی (ابراہیم ۱۴ - ۲۲) (یعنی اللہ وعدہ دیتا تھا تو وہ وعدہ سچا ہونا تھا اور میرا وعدہ جھوٹا نکلنا تھا اور مجھے تم پر کوئی غلبہ بھی حاصل نہ تھا) اور یہاں مخاطب خود اس کے پیچھے لگنے والے ہیں) میں صرف تمہیں بلاتا تھا تو تم فوراً میری بات مان لیتے تھے۔ البتہ جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے ہیں ان کو وہ بلا بھی نہیں سکتا اور ان کی مخالفت کے رنگ میں اس کی کوشش آخر کار ناکام ہوتی ہے۔

؏۱۸۵۴ یہاں خطاب ان مشرکین سے ہے جو شیطان کے پیچھے لگ کر خدا کو چھوڑتے تھے اور شرک کرتے تھے۔ تو اپنی نعمتوں کو یاد دلایا ہے کہ ان سامانوں کا پیدا کرنیوالا جن سے تم فائدہ اٹھاتے ہو اللہ تعالیٰ ہی ہے نہ تمہارے معبودان باطل پھر بھی خدا کو چھوڑ کر ان کی طرف جھکتے ہو۔

؏۱۸۵۵ حاصب۔ حَصْبَۃ کنکری کو کہتے ہیں اور حاصِب اس ہوا کو کہتے ہیں جو بوجہ اپنی شدت کے مٹی اور کنکر اڑا دیتی ہے اور اس بادل کو بھی جس سے اولے برسنے ہیں اور عذاب کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے حضرت علیؓ نے خوارج کو فرمایا اصابکم حاصِبٌ یعنی تم پر عذاب آیا (ل)

خسف اور ہوا کا عذاب: یہ نقشہ قرآن کریم نے بار بار کھینچا ہے کہ کس طرح مشرک جب اس انتہائی بیکسی کی حالت کو پہنچتے ہیں جو طوفان کے وقت سمندر میں پیش آتی ہے تو شریکوں کو چھوڑ کر خدا کو پکارتے ہیں لیکن مصائب سے نکل کر پھر اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں تو فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو خشکی میں بھی یعنی اس جگہ جسے تم مقام امن سمجھتے ہو تمہیں نابود یا ذلیل کر سکتا ہے جیسا بدر میں ہوا۔ خسف کے معنی کے لیے دیکھو ؏۱۶۴۲ یا سخت ہوا چلا کر تمہاری قوت کو توڑ سکتا ہے جیسا کہ غزوہ احزاب میں ہوا۔

؏۱۸۵۶ قاصف۔ وہ ہوا ہے جو جس چیز پر چلے درخت ہو یا عمارت اسے توڑ دے اور خطرناک گرج کو رَعْد قاصِفٌ کہتے ہیں (رغ)

تبیع۔ تَبِعَ کے معنی ہیں پیروی کی اور تبیع کئی معنی میں آتا ہے حدیث زکوٰۃ میں اس سے مراد گائے کا نر بچہ ہے جب ایک سال کا ہو جائے اس لیے کہ وہ ماں کے پیچھے چلتا ہے اور حدیث حدیبیہ میں تبیع بمعنی خادم ہے اور تبیع وہ بھی ہے جو کسی حق کے لیے جس کا وہ مطالبہ کرتا ہے دوسرے کا پیچھا کرے (یعنی ناصر یا بدلہ لینے والا) اور یہاں یہی معنی ہیں اور بعض نے تبیع کے معنی یہاں کیے ہیں۔ ایسا پیچھا کرنے والا جو اس عذاب کا جو تم پر نازل ہوا انکار کرے یا اسے تم سے پھیر سکے۔ (ل) شاید کشتیوں پر فخر کرنے والی قوم کو سمجھایا ہے کہ ایک دفعہ کشتی بچ نکلے تو دوسری دفعہ غرق ہو سکتی ہے اور یا عمومیت ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر ایک وقت شدائد و مصائب سے جن کو ظلمات بحر سے تشبیہ دی جاتی ہے نجات دیدے تو انسان کو نڈر نہ ہو جانا چاہیئے اور یہاں خطاب اس قوم کو کیا ہے جو مخالفت حق پر کمربستہ ہو رہی ہے۔

الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ
وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿۷۰﴾ ع
يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ
اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ
كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۱﴾

سواری دی اور ان کو اچھی چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے اُن
کو بہتوں پر جنھیں ہم نے پیدا کیا ہے بڑی فضیلت دی ہے ۱۸۵۷ع
جس دن ہم سب لوگوں کو اُن کے سرداروں کے ساتھ بلائیں گے
تو جسے اس کی کتاب اس کے داہنے ہاتھ میں دی جائے گی وہ اپنی
کتاب کو پڑھیں گے اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہ ہوگا ۱۸۵۸ع

۱۸۵۷ع یہاں سب بنی آدم کو عزت اور بزرگی دینے کا ذکر ہے اور یہ بحیثیت مخلوق کے بمقابلہ دوسری مخلوق کے ہے۔ اور کثیر سے مراد یہ نہیں کہ بہت سی قسم کی مخلوق پر تو بنی آدم کو فضیلت دی ہے اور بعض پر نہیں بھی دی یعنی کثیر کسی کے مقابلہ پر نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ نہیں ایک دو قسم کی مخلوق پر فضیلت نہیں دی بلکہ بہت قسموں کی مخلوق پر فضیلت دی ہے کیونکہ دوسری جگہ صاف فرمایا وھو فضلکم علی العالمین (اعراف ۔ ۱۴۰) اور علاوہ ازیں یہاں اس تکریم کا ذکر بمقابلہ شیطان کے انکار تکریم کے ہے ھذا الذی کرمت علیّ کیونکہ انسان کی فرمانبرداری کا اسے حکم تھا اور انسان کی فرمانبرداری کا ملائکہ کو بھی حکم تھا۔ پس جس دلیل سے انسان کی تکرمت شیطان پر ثابت ہے اسی دلیل سے ملائکہ پر بھی اس کا شرف ثابت ہے اور یہ شرف اس لحاظ سے ہے کہ اس کی ترقیات غیر متناہیہ ہیں اور یہاں بنی آدم کی بزرگی کے ذکر میں یہ اشارہ ہے کہ ہم نے تو تم کو سب مخلوق پر فضیلت دی ہے تم کیوں اس کمال نفس کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اپنی کرتوتوں سے اسے ذلیل کرتے ہو۔

۱۸۵۸ع یمین کے مختلف معانی کے لیے دیکھو ع۶۰۵ قرآن کریم میں اس لفظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے جہاں ہوا ہے وہ بطور استعارہ اور مجاز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تشبیہ اور جسم سے پاک ہے (ل) اور حدیث میں آتا ہے وکلتا یدیہ یمین اس کے دونوں ہاتھ یمین ہیں یعنی صفت کمال سے متصف ہیں اور ایک دوسرے میں کچھ کمی نہیں کیونکہ بایاں ہاتھ بہ نسبت داہنے کے ناقص ہوتا ہے (ل) اور انسان کے متعلق بھی اس کا استعمال سوائے داہنے ہاتھ کے اور معنی میں ہوتا ہے ھو عندنا بالیمین کے معنی ہیں وہ ہمارے ہاں بمنزلہ حسنہ یا اچھا مقام رکھتا ہے اور انکم کنتم تاتوننا عن الیمین (الصّٰفّٰت ۳۷ - ۲۸) میں زجاج نے معنی کیے ہیں باقوی الاسباب یعنی نہایت قوی ذرائع کے ساتھ اور ایسا ہی فراغ علیھم ضربًا بالیمین (الصّٰفّٰت ۳۷ - ۹۳) میں ایک معنی قوت لئے گئے ہیں (ل)۔

یظلمون۔ ظلم کے لیے دیکھو ع۵۵ غ سے مجاوزت کمی سے ہو یا زیادتی سے ظلم ہے۔ اور اس لیے اس کے معنی صرف کم کرنے کے بھی آتے ہیں جیسے وما ظلمونا ولٰکن کانوا انفسھم یظلمون (البقرۃ ۲ - ۵۷) یعنی ہمارا کچھ کم نہیں کیا کلتا الجنتین اٰتت اکلھا ولم تظلم منہ شیئًا (الکھف ۱۸ - ۳۳) یعنی اس میں سے کچھ کم نہیں کیا (ل) یہی معنی یہاں ہیں یعنی ان کے اعمال حسنہ میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔

پچھلے رکوع میں مخالفین کو سمجھایا تھا کہ عذاب الٰہی سے نڈر نہ ہوں اس میں مخالفین کی ان کوششوں کا ذکر کیا ہے جو وہ رسول اللہ صلعم کے خلاف کر رہے تھے۔ اور پہلی دو آیتوں میں پچھلے رکوع کی آخری آیت کے سلسلہ میں کہ بنی آدم کو ہم نے کتنا بڑا شرف عطا فرمایا ہے یہ بتایا ہے کہ جو کوئی اس کمال کے حاصل کرنے سے محروم رہتا ہے اسی لیے محروم رہتا ہے کہ اس کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر رکھتا ہے۔ امام سے مراد یہاں روحانی سردار یعنی انبیاء ہی ہیں جن کی پیروی کا لوگ دعوی کرتے تھے اسی لیے دوسری جگہ انہیں شہید کہا ہے فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علیٰ ھٰؤلاء شھیدا (النساء ۴ - ۴۱) اور امام کے ساتھ بلانے سے مراد یہ ہے کہ ان کے امام نے تو انہیں کمال انسانی کی طرف دعوت دی تھی پھر ایک گروہ نے اس کی پیروی کی اور اس کمال کو پالیا اور دوسرے نے اس سے آنکھیں بند کر لیں اور محروم رہ گئے۔ اور بعض نے امام سے مراد ان کے اعمال اور بعض نے وہ کتاب مراد لی ہے جو ان پر نازل کی گئی (ج) اور نبی یا کتاب کا معنی کے لحاظ سے مفہوم ایک ہی ہے امام کے لیے دیکھو ع۱۵۵۔

کتاب کے داہنے ہاتھ میں دیا جانے سے کیا مراد ہے: قرآن کریم میں جہاں بعض لوگوں کے یمین میں کتاب دینے کا ذکر ہے تو دوسروں کے لیے مختلف پیرائے اختیار کیے ہیں کہیں تو اس کے مقابل پر فرمایا واما من اوتی کتٰبہ بشمالہ (الحاقۃ ۶۹ - ۲۵) اور کہیں فرمایا واما من اوتی کتٰبہ وراء ظھرہ (الانشقاق ۸۴ - ۱۰) اور یہاں کتاب کو یمین میں دینے کے مقابل پر فرمایا ومن کان فی ھٰذہ اعمٰی فھو فی الاٰخرۃ اعمٰی تو پس یمین میں کتاب ہونے کے مقابل پر شمال میں کتاب ہونا بھی ہے اور پیٹھ پیچھے کتاب ہونا بھی اور اندھا ہونا بھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ قیامت کے دن کتابوں کا دیا جانا جزاء وفاقا کے رنگ میں ہے یعنی ایک لوگ وہ ہیں جو اس کتاب کو جو انہیں ان کے نبی کی معرفت ملتی ہے اس دنیا میں یمین میں لیتے ہیں یعنی قوت وقدرت سے اس پر عمل کرتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو شمال میں لیتے ہیں یعنی ناقص طور پر اسے لیتے ہیں یا وراء ظھرہ یعنی اسے پیٹھ پیچھے پھینک دیتے ہیں۔ جیسا دوسری جگہ ہے فنبذوہ وراء ظھورھم (اٰل عمران ۳ - ۱۸۷) یا وہ جو بالکل ہی اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اندھے رہتے ہیں تو اسی کے مطابق قیامت میں ان سے معاملہ ہوگا۔ جس نے یہاں کتاب کو یمین میں لیا اسے وہاں بھی یمین میں دی جائے گی اور جس نے یہاں شمال میں لیا اسے وہاں بھی شمال میں ملے گی اور جس نے

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾

اور جو کوئی اس (دنیا) میں اندھا رہا تو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور راہ سے بہت دور پڑا ہوا ۱۸۵۹ء

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾

اور وہ تجھے اس سے ہٹانے ہی لگے تھے جو ہم نے تیری طرف وحی کی تا کہ تو اس کے سوائے ہم پر جھوٹ بنا لے اور تب یہ تجھے ضرور دوست بنا لیتے ۱۸۶۰ء

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿۷۴﴾

اور اگر ہم نے تجھے ثابت قدم نہ بنایا ہوتا تو تُو تھوڑا سا ضرور ان کی طرف جھک جاتا ۱۸۶۱ء

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

تب البتہ ہم تجھے دُگنا (عذاب) زندگی میں اور دُگنا مرنے پر چکھاتے پھر تو ہمارے خلاف کوئی مددگار نہ پاتا ۱۸۶۲ء

یہاں کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینکا اس کو وہاں بھی پیٹھ پیچھے ملے گی اور جو یہاں اندھا رہا وہ وہاں بھی اندھا ہوگا۔ رہا یہ کہ یمین یا شمال یا وراء ظہرہ دنیا کس رنگ میں ہوگا سو ان کیفیات کو ہم اس دنیا میں نہیں سمجھ سکتے آخرت کے جتنے معاملات ہیں ما لا عین رأت کے مصداق ہیں۔ دوزخی اندھے بھی ہونگے اور دیکھیں گے بھی ان کو کلام کی اجازت بھی نہیں ہو گی اور بولیں گے بھی وہ جنت سے دور بھی ہونگے اور جنتیوں سے پانی وغیرہ بھی مانگیں گے اور انہی یمین میں کتابوں والوں کو جو اصحاب الیمین اور شمال میں کتابوں والوں کو اصحاب الشمال کہا ہے تو اصحاب الیمین کے معنی امام راغب کرتے ہیں اصحاب السعادات والمیامن یعنی سعادتوں اور برکتوں والے اور ایک حدیث میں جو ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کی ہے یوں آتا ہے کہ کتاب یمین میں ملتے ہی اس شخص کا چہرہ روشن ہو جائے گا۔

نامۂ اعمال کا پڑھنا: اولٰئك یقرءون کتابھم سے کیا مراد ہے بظاہر یقرءون کتابھم کے مقابل پر اگلی آیت اعمی لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے نہیں پڑھیں گے مگر اس سورت میں گزر چکا کہ سب کو حکم ہوگا اقرء کتابك (۱۴) اپنی اپنی کتابیں پڑھو ۱۸۱۳ء۔

پس یہ پڑھنا ایسا ہے جیسے اندھا بھی پڑھ سکتا ہے اور چونکہ پڑھنے سے انسان کو علم حاصل ہو جاتا ہے اس لیے اصل منشا یہی ہے کہ انھیں ان اچھے اور بُرے اعمال کا علم ہو جائے گا مگر نہ صرف واقعات کے رنگ میں بلکہ نتائج کے رنگ میں کیونکہ بار بار اس کا ذکر یوں بھی آتا ہے ذوقوا ما کنتم تعملون (العنکبوت ۲۹ - ۵۵) اور چکھنے سے مراد نتائج کا بھگتنا ہوتا ہے۔

۱۸۵۹ء آخرت میں اندھا ہونا: اعمٰی کے لیے دیکھو ۱۴۵۷ء پہلے اعمٰی سے مراد مجازاً اندھا لیا گیا ہے اور دوسرے سے حقیقی طور پر اندھا لیکن دوسری جگہ فرمایا فکشفنا عنك غطاءك فبصرك الیوم حدید (قٓ ۵۰ - ۲۲) یعنی اس دن نظر تیز ہو جائے گی اور دوسری آیات سے بھی ان کا دیکھنا ثابت ہے۔ پس دوسرے اعمٰی سے مراد بھی ایسا اندھا نہیں ہو سکتا کہ جس کی بصارت نہ ہو اور اضل سبیلا سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور اضل اسے اس لیے کہا کہ جو شخص غلط راستہ کو اختیار کر لیتا ہے وہ روز بروز حق سے دور ہی ہوتا چلا جاتا ہے اس آیت میں دوزخ کی کیفیات کو دوسرے رنگ میں بیان کیا ہے اور عذاب نار کے پہلو بہ پہلو یہ نقشہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور اعمٰی سے مراد یہاں یہی ہو سکتی ہے کہ اپنے رب کے لقاء سے محروم رہے گا اور وہ نور اسے نہ ملے گا، جو مومنوں کو ملے گا بلکہ وہ تاریکیوں میں رہے گا۔

۱۸۶۰ء لیفتنونك۔ یفتنون۔ فَتْن سے ہے اس کے ایک معنی کے لیے دیکھو ۳۷۶ء اور راغب نے یوں معنی کیے ہیں کہ تجھے بلا اور مصیبت میں ڈال دیں (غ)

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے بعض مدنی واقعات کا ذکر کر دیا ہے حالانکہ سورت اور اس کی یہ آیت مکّی ہے اور اس میں اشارہ قریش کے اس وفد کی طرف ہے جس کا ذکر ابن ہشام میں ہے یعنی جب آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچا کر قریش آپ کے دعوت الی الاسلام کے کام کو روکنے میں ناکامیاب ہوئے تو انہوں نے لالچ دے کر آپؐ کو اس کام سے روکنا چاہا اور آپؐ کی خدمت میں ایک وفد پہنچا کہ قرآن شریف میں آپ من دون اللہ معبودان کا ذکر چھوڑ دیں تو جو چیز آپ چاہیں دولت حسن حکومت وہ سب حاضر کرنے کو تیار ہیں مگر آپؐ نے اس لالچ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔

۱۸۶۱ء اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رسول اللہ صلعم نے یہ ارادہ کیا تھا کہ قریش کی بات مان لیں اور نہ الفاظ سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے بلکہ یہاں تو صاف فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ثابت قدم نہ کیا ہوتا تو جھک جاتا یعنی لالچ اس قدر زبردست تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی خاص حفاظت آپ کے شامل حال نہ ہوتی تو آپ جھک جاتے یا کوئی آدمی کتنا بھی بڑا ہوتا جھک جاتا اگلی آیت بھی یہی بتاتی ہے کہ آپ نے کبھی ایسا ارادہ نہیں کیا کیونکہ عذاب نہیں آیا۔

۱۸۶۲ء ضعف الحیٰوۃ سے مراد دو چند عذاب دینا ہے اور ضعف الممات سے مراد دو چند عذاب آخرت اور قتادہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾

اور وہ تجھے اس سرزمین میں خفیف بنانے لگے تھے تاکہ تجھے اس سے نکال دیں اور اس صورت میں یہ بھی تیرے پیچھے نہ ٹھہرتے مگر تھوڑی مدت ۱۸۶۳

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾ ع۸

یہی (ہمارا) طریق ان رسولوں سے رہا جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے بھیجا اور تو ہمارے طریق میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا ۱۸۶۴

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾

سورج کے ڈھلنے سے (شروع کر کے) رات کے اندھیرے تک نماز کو قائم رکھ اور صبح کے قرآن کو (بھی) صبح کے قرآن میں حضور ہوتا ہے ۱۸۶۵

ہوئی تو رسول اللہ صلعم نے یہ دعا پڑھی اللّٰھم لا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین اے اللہ مجھے اپنے نفس کے سپرد ایک لمحہ کے لیے بھی نہ کیجیو جس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کس قدر حفاظت الٰہی پر بھروسہ رکھتے تھے۔

۱۸۶۳ اس آیت میں قریش کے اس ارادہ کا ذکر ہے کہ آپ کو ہلکا اور خفیف بنا کر نکال دیں اور یہ قریش کی آخری تدبیر کی طرف اشارہ نہیں، جو دارالندوہ میں ہوئی تھی جس کا ذکر دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے واذ یمکربك الذین کفروا لیثبتوك اویقتلوك اویخرجوك (الانفال ۸-۳۰) یہاں صرف استفزاز کا ذکر ہے اور یہ اشارہ آپ کے شعب ابی طالب میں قید کر دینے کی طرف ہے اور اصل غرض یہ تھی کہ رسول اللہ صلعم گھبرا کر اس سرزمین کو چھوڑ دیں اور چونکہ آخر نبی صلعم کو ہجرت کرنی پڑی تو اس لحاظ سے فرمایا کہ گو یہ اس میں کامیاب تو نہ ہوئے لیکن جب تم حکم الٰہی کے ماتحت مکہ سے نکل جاؤ گے تو پھر یہ بھی تمہارے بعد تھوڑے ہی دن یہاں ٹھہریں گے۔ چنانچہ یہ پیشگوئی پوری ہوئی اور آپ کی ہجرت کے ڈیڑھ سال بعد ہی قریش کو بدر میں ایسی سخت شکست اٹھانی پڑی کہ ان کی قوت ٹوٹ گئی اور آخر آٹھ ہی سال میں فتح مکہ میں ان کا دورِ حکومت و تکلیف دہی ختم ہو گیا اور یہ جو بعض مفسرین نے یہاں یہود کے مطالبہ کا کہ انبیاء کی سرزمین شام ہے آپ وہاں جائیں اور اس کے ساتھ آپ کے تبوک جانے کا ذکر کیا ہے تو واقعات تاریخی کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور تبوک کا غزوہ آخری ایام مدینہ کا ہے۔

۱۸۶۴ یعنی جب رسولوں کی تکالیف اس انتہا کو پہنچ جاتی ہیں کہ انہیں وہ سرزمین چھوڑنی پڑتی ہے تو پھر مخالفین خود بھی جلد ہی ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہی سنت اللہ دربارہ رسل ہے جس کا یہاں ذکر کیا ہے۔

۱۸۶۵ دلوك۔ دلك کے معنی ملنا ہیں جیسے جسم کو نہاتے وقت یا کپڑے کو دھوتے وقت (ل) اور حدیث میں دلوك الشمس کئی جگہ پر آیا ہے اور اس سے مراد دوپہر کے بعد اس کا ڈھلنا بھی ہے اور اس کا غروب بھی اور اصل معنی دلوك کے مائل ہونا ہیں (ن) کلام عرب میں دُلُوك کے معنی زوال ہی تھے، اس لیے سورج کو جب دوپہر کے بعد ڈھلے دَالِكَۃ کہا جاتا تھا اور غروب ہونے کی حالت پر بھی یہی لفظ بولا جاتا تھا کیونکہ دونوں حالتوں میں اس کا زوال ہے (ل) راغب نے اس کے معنی کیے ہیں مَیلُھا لِلغُرُوب اس کا مائل ہونا غروب کے لیے (غ) اور یہی معنی زجاج نے کیے ہیں اور ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ اور حضرت عمرؓ سے یہی معنی مروی ہیں۔ گویا دلوك کی ابتدا ڈھلنے سے ہے اور اس کی انتہا غروب ہونا ہے اس لیے دونوں حالتوں پر بولا گیا ہے۔

غسق۔ غَسَق رات کی شدت تاریکی کو کہتے ہیں اور غاسِق تاریک رات کو کہتے ہیں اور من شر غاسق (الفلق ۱۱۳-۳) میں مراد اس سے رات کو آنے والی مصیبت لی گئی ہے۔

نماز فجر کے مشہود ہونے سے مراد: مشہود۔ یعنی ایسا کرنے والے کے پاس شفا اور رحمت اور توفیق اور سکینت وغیرہ جن کا ذکر ننزل من القرآن ما ھو شفاء ورحمۃ للمؤمنین (۸۲) میں ہے آ موجود ہوتی ہیں (غ) کیونکہ شھد کے معنی ہیں موجود ہوا یا گواہ ہوا اور ایک حدیث میں ہے کہ رات اور دن کے ملائکہ اس وقت حاضر ہوتے ہیں (د) اور سکینت اور توفیق اور شفا اور رحمت بھی ملائکہ کے ذریعہ سے ہی انسان کو ملتے ہیں اور رات چونکہ سکون کے لیے ہے اور دن جد و جہد اور سعی کے لیے، اس لیے بھی رات اور دن کے ملائکہ کے جمع ہونے سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت انسان کو پورا حضور قلب میسر ہوتا ہے۔

پچھلے رکوع میں جب کفار کے فتنوں اور مخالفت کی کوششوں کا ذکر کر کے ہجرت نبویؐ کا ذکر بطور پیشگوئی کیا تو اسی مضمون کو جاری رکھتے ہوئے مصائب میں قیام صلوٰۃ پر مداومت کی طرف توجہ دلائی جیسا کہ (استعینوا بالصبر والصلوٰۃ (البقرۃ ۲-۱۵۳) کا منشاء ہے جس قدر مصائب بڑھیں اسی

وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ۝٧٩

وَقُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِىۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِىۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّىۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِيۡرًا ۝٨٠

اور رات کے کچھ حصے میں اس (قرآن) کے ساتھ جاگتا رہ یہ تیرے لیے نفل کے طور پر ہے امید ہے کہ تیرا رب تجھے بڑی تعریف کے مقام پر کھڑا کرے ع۱۸۶۶

اور کہہ اے میرے رب مجھے سچائی کے داخلہ سے داخل کیجیو اور سچائی کا نکلنا نکالیو اور مجھے اپنے پاس سے مدد دینے والی قوت دے ع۱۸۶۷

قدر زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہاں ان مصائب کی طرف اور مصائب سے نکلنے کی طرف دلوک الشمس اور غسق الیل اور قرآن الفجر میں صاف اشارہ بھی ہے گویا زوال آفتاب مصیبت کی ابتدا ہے (اور نبی کریم صلعم کا آفتاب اقبال تو واقعی نصف النہار کے آفتاب کی طرح روشن تھا جب آپ نے دعویٰ کیا کیونکہ سب لوگ آپ کی امانت صداقت راستبازی کے قائل تھے) اور اس کے مقابل پر نماز ظہر ہے۔ پھر آفتاب جوں جوں ڈھلتا ہے وہ مصیبت کی زیادتی ہے یہاں تک کہ عصر کے ساتھ اس کی دھوپ پھیکی پڑ جاتی ہے اور اس کے مقابل نماز عصر ہے اور آخر وہ غروب ہوتا ہے اور اس کے مقابل نماز مغرب ہے اور تاریکی کا زمانہ شروع ہو کر شدت ظلمت میں انسان مبتلا ہوتا ہے گویا مصیبت اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے اور اس کے مقابل نماز عشا ہے۔ لیکن اس کے بعد فجر کی روشنی بھی نمودار ہو جاتی ہے اسی لیے قرآن الفجر کو باقی نمازوں سے الگ کر کے بیان کیا ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ اگر مصائب بڑھتے بڑھتے تمام طرف تاریکی ہی تاریکی پھیل جائے تو بھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف رجوع کرنے والے بندوں کو ضائع نہیں کرتا بلکہ مصائب کی تاریکی کو دور کر کے روشنی نمودار کرتا ہے۔

پانچ نمازیں: یہاں پہلی نماز نماز ظہر کو قرار دیا ہے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرائیلؑ نے جب آنحضرت صلعم کو نماز سکھائی تو نماز ظہر سے ہی ابتدا کی۔ اور دلوک الشمس میں دونوں نمازیں ظہر اور عصر کی آجاتی ہیں اور غسق الیل مغرب اور عشا کیونکہ رات کی تاریکی مغرب سے شروع ہو کر عشا کے وقت کمال کو پہنچ جاتی ہے اور پانچویں نماز فجر کا علیحدہ ذکر کیا ہے اور قرآن الفجر سے مراد نماز فجر ہی ہے اور اس نام میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں قرأت لمبی ہوتی ہے اور دو دو نمازوں کے اکٹھا ذکر کرنے سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ بوقت ضرورت ظہر اور عصر کی اور مغرب اور عشا کی نمازیں جمع کی جاسکتی ہیں۔ اور رسول اللہ صلعم سے ان نمازوں کا سفر میں جمع کرنا ثابت ہے اور بغیر سفر مدینہ میں جمع کرنا بھی۔ اور بارش یا بیماری میں بھی جمع ہوسکتی ہیں اور کسی اور ضرورت کے وقت بھی مگر نہ یوں کہ بلا وجہ اس کی عادت کرلی جائے اور حضرت ابن عباسؓ کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے ایک دن عصر کے بعد وعظ شروع کیا یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا اور ستارے نکل آئے اور لوگوں نے نماز نماز پکارنا شروع کیا اور جب ایک شخص نے بہت زور سے اس طرح چلانا شروع کیا تو آپ نے اسے ڈانٹا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو ظہر اور عصر میں اور مغرب اور عشا میں جمع کرتے دیکھا۔ اور جمع تاخیر بہتر ہے یعنی ظہر کو پیچھے کر کے عصر کے قریب کرلینا اور مغرب میں تاخیر کر کے عشا کے قریب کرلینا اور جمع تقدیم بھی جائز ہے۔

ع۱۸۶۶ تہجد۔ ھجود کے معنی نیند ہیں اور ھَجَّدتہ کے معنی ہیں اس کی نیند کو دور کر دیا اور اسی معنی میں تہجد ہے اور فتہجد بہ سے مراد ہے کہ قرآن کے ساتھ جاگتا رہ اور یہ رات کی نماز پر ترغیب ہے (غ) اور تہجد بہ میں ضمیر قرآن کی طرف ہے یعنی نماز میں تلاوت قرآن کے ساتھ جاگتا رہ اور بعض لیل کی طرف بھی ہوسکتی ہے جو من سے مفہوم ہے یعنی رات کے ایک حصہ میں تہجد پڑھ اور اصطلاح شریعت میں تہجد وہ نماز ہے جو رات کے وقت سو کر اٹھنے کے بعد پڑھی جائے یعنی اس میں پہلے سونا لازمی ہے۔

نافلۃ۔ نفل وہ ہے جو واجب سے زیادہ ہو دیکھو ع۱۲۰۲ اور نافلۃ وہ ہے جو انسان کرتا ہے اور وہ اس پر واجب نہیں اور عبادات پر آتا ہے اور چونکہ بیٹے کا بیٹا اصل پر زیادت ہے اس لیے پوتے کو بھی نافلۃ کہتے ہیں ویعقوب نافلۃ (الانبیاء ۲۱- ۷۲) (ل)

پانچ فرض نمازوں کے بعد نماز تہجد کا ذکر کیا ہے جو پچھلی رات پڑھی جاتی ہے اور نفل کے طور پر ہے اور یہ گیارہ یا تیرہ رکعت ہوتی ہیں جو دو دو کر کے پڑھی جاتی ہیں۔ اور آخر میں ایک۔ یا صبح ہو جانے کی صورت میں اس سے کم جس قدر ہو سکے نماز تہجد کو رسول اللہ صلعم کے ساتھ خاص کہا گیا ہے مگر دوسری جگہ صاف فرمایا وطائفۃ من الذین معک (المزمل ۷۳- ۲۰) ہر ایک مسلمان کو پچھلی رات اٹھنے اور نماز تہجد کی عادت ڈالنی چاہیے اور مقام محمود سے مراد مقام شفاعت عظمیٰ ہے جیسا احادیث میں وارد ہے اور بخاری کی حدیث کے آخر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر کھڑا کریگا جس کی تشریح یوں کی ہے یحمدہ اھل الجمع کلھم سب لوگ جو جمع ہوں گے آپ کی حمد کریں گے اور بعض احادیث میں مقام محمود سے مراد شفاعت ہی لی گئی ہے (ر)۔

ع۱۸۶۷ ہجرت میں کامیابی کی پیشگوئی: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ آیت ہجرت کے بارہ میں نازل ہوئی (ج) یعنی دخول سے مراد دخول مدینہ ہے اور خروج سے مراد مکہ سے نکلنا۔ دخول کو خروج پر مقدم اس لیے کیا کہ وہ اہم ہے اور غرض یہ ہے کہ آپؐ کو ضائع نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اگر آپؐ مکہ سے نکلیں گے تو آپؐ کے داخل ہونے کی جگہ اس سے پیشتر مقرر ہو چکی ہے اور سیاق مضمون سے بھی صاف اشارہ ہجرت کی طرف ہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ پچھلے رکوع میں صفائی سے

وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

اور کہہ حق آگیا اور باطل بھاگ گیا۔ باطل بھاگنے والا ہی تھا ۱۸۶۸

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

اور ہم قرآن سے وہ کچھ اتارتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کو یہ صرف نقصان میں بڑھاتا ہے ۱۸۶۹

وَ اِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾

اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو وہ مُنہ پھیر لیتا ہے اور پہلو تہی کرتا ہے اور جب اُسے برائی پہنچتی ہے تو نا امید ہو جاتا ہے ۱۸۷۰

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾ ؏ ۹ ۷

کہہ ہر ایک اپنے طریق پر عمل کرتا ہے سو تمہارا رب اسے خوب جانتا ہے جو سب سے بڑھ کر سیدھی راہ پر ہے ۱۸۷۱

بیان ہو چکا اور سلطٰنا نصیرا سے مراد غلبہ ہے جس سے آپ کو نصرت ملے اور بعض نے اسے فتح مکّہ کہا ہے۔ اور اس پر اگلی آیت شاہد ہے کیونکہ یہی الفاظ نبی کریم صلعم نے فتح مکّہ پر پڑھے۔ اور بعض نے سلطان سے مراد بادشاہ لیا ہے۔ یعنی ہر زمانہ میں کوئی دین کا ناصر بادشاہ پیدا ہوتا رہے (ر) اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں آپؐ کو بار بار بتا دیا تھا کہ آپؐ کو ہجرت کرنی پڑے گی۔ اور اسی سے آپؐ کی کامیابی کی ابتدا ہوگی اور ہجرت فی الواقع تمام کامیابیوں کی جڑ ہے بشرطیکہ انہی شرائط کے ساتھ ہو۔

ع ۱۸۶۸ زھق۔ زَھَقَتْ نفسُہ کے معنی ہیں کسی چیز پر افسوس کرتے ہوئے اس کی جان نکل گئی تزھق انفسھم (التوبۃ ۹ - ۵۵) (غ)........ اور زَھَقَ الشَّیْءُ کے معنی ہیں وہ چیز باطل ہو گئی ہلاک ہو گئی اور نابود ہو گئی فاذا ھو زاھق (الانبیاء ۲۱ - ۱۸) (ل)

خانہ کعبہ سے بتوں کے دور کیا جانے اور پھر بت پرستی کے کبھی نہ آنے کی دوہری پیشگوئی: بخاری میں ہے کہ نبی کریم صلعم جب فتح مکّہ کے بعد مکّہ میں داخل ہوئے تو اس وقت کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے آنحضرت صلعم ایک چھڑی سے جو آپ کے ہاتھ میں تھی ایک ایک بت کو مارتے اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے اور اس کے ساتھ ہی یہ آیت بھی وما یبدئ الباطل وما یعید (السبا ۳۴ - ۴۹) کس قدر عظیم الشان پیشگوئی اس وقت پوری ہوئی جو بیکسی کی حالت میں مکّہ میں بیان کی گئی تھی اور کس قدر عظمت اس پیشگوئی کو حاصل ہے جس کا نظارہ ہم آج بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس خانہ کعبہ میں پھر وہ بت نہیں جا سکے اور الحق کا آپؐ کی تشریف آوری ہی تھی اسی لیے حضرت عیسیٰؑ کی پیشگوئی میں آپؐ کو روح حق کہا گیا ہے۔

ع ۱۸۶۹ قرآن شریف روحانی بیماریوں کی شفا کے لیے نازل ہوا اور یہی شفا یہاں مراد ہے۔ جیسا کہ خود فرمایا وشفاء لّما فی الصدور (یونس ۱۰ - ۵۷) اور جس طرح یہاں مومنوں کے لیے شفا اور رحمت قرار دیکر امراض روحانی سے شفا کی طرف اشارہ کیا اسی طرح دوسری جگہ ایمان والوں کے لیے اسے ہدایت اور شفا فرمایا ھو للذین اٰمنوا ھدی وشفاء (حٰمٓ ۴۱ - ۴۴) اور حدیث میں ہے من لم یستشف بالقراٰن فلا شفاہ اللہ جو شخص قرآن سے شفا نہیں چاہتا اللہ تعالیٰ اسے شفا نہ دے اور یہاں بھی یہی شفا مراد ہے نہ کہ امراض جسمانی سے شفا۔ اور تعویذ کے طور پر قرآن شریف کی آیا دوسری عبارتیں لکھ کر بیماروں کو پلانا کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ اور حسن اور مجاہد اور نخعی نے لوگوں کو اس سے روکا (د) اور تبرک کے طور پر قرآن شریف کا کوئی حصّہ لکھ کر بڑے یا چھوٹے کا اپنے پاس رکھنا ایک علیحدہ امر ہے مگر قرآن شریف کو امراض جسمانی کے لیے استعمال کرنا اس غرض کے منافی ہے جس کے لیے یہ پاک کلام نازل ہوا۔ اور افسوس یہ ہے کہ قوم تباہ ہو رہی ہے اور اس موت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے تو قرآن کریم کو استعمال نہیں کیا جاتا اور لغو موقعوں پر اس کا استعمال کیا جاتا ہے کوئی چور دریافت کرنے کے لیے یٰسین پڑھ کر لوٹا گھماتا ہے کوئی تعویذ لکھ کر بیماروں کو پلاتا ہے اگر ان باتوں میں حق و حکمت ہوتی تو نبی صلعم کو ان پر اطلاع دی جاتی اور احادیث میں ان کا ذکر ہوتا۔ اصل غرض یہ ہے کہ ہر ایک مسلمان مرد ہو یا عورت اسے پڑھے اور اس پر عمل کرے اس پر عمل امراض جسمانی سے بھی بچاتا ہے اور آخر پر فرمایا کہ یہی قرآن جھٹلانے والوں کے لیے اور زیادہ ہلاکت کا موجب ہوتا ہے اس لیے کہ ہر نیکی کے مقابل پر جو اس کے اندر سکھائی جاتی ہے وہ مخالفت کی وجہ سے اور زیادہ بدیوں کا ارتکاب کرتے ہیں یا اس کی مخالفت میں قدم بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

ع ۱۸۷۰ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح انعام کے وقت اعراض فعل مذموم ہے اسی طرح تکلیف کے وقت مایوسی بھی مذموم فعل ہے۔ رحمت الٰہی سے کبھی مایوس نہ ہو خواہ کیسی بھی مصائب پیش آئیں۔

ع ۱۸۷۱ شاکلۃ۔ شکل کے معنی شبہ یا مثل ہیں واٰخر من شکلہٖ ازواج (صٓ ۳۸ - ۵۸) اور انسان کی شاکلۃ اس کی شکل اور اس کی جانب اور اس کا

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾

اور تجھ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمھیں تھوڑا سا ہی علم دیا گیا ہے ۱۸۷۲

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿۸۶﴾

اور اگر ہم چاہتے تو اسے لے جاتے جو ہم نے تیری طرف وحی ۱۸۷۳ کی پھر تو اپنے واسطے اس کے (لا دینے کے) لیے ہمارے اوپر کوئی ذمہ لینے والا آپاتا۔

طرائق ہے (ل)، اور مفردات میں ہے کہ شکال چونکہ اسے کہا جاتا ہے جس کے ساتھ جانور کو قید کیا جاتا ہے اس لیے شاکلۃ انسان کی وہ خصلت ہے جو اسے قید کیے ہوئے ہے (غ) اور مفسرین نے طریق۔ طبیعت اور دین اس سے مراد لیے ہیں۔

جب اوپر دو گروہوں کا ذکر کیا ایک وہ جن کے لیے قرآن شفا ہو گیا دوسرا وہ جو گھاٹے میں بڑھ رہا ہے تو اب بتایا کہ ہر ایک اپنے طریق یا طبیعت پر عمل کرتا ہے نتیجہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہدایت پر کون ہے۔ ان الفاظ کا مطلب نکالنا کہ بعض انسان طبیعت کی رو سے ہی بدی کرنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ قرآن کریم کی ساری تعلیم کو باطل کرتا ہے۔

۱۸۷۲ روح۔ دیکھو ۱۱۱ و ۵۹۸ و ۱۷۷ روح تین طرح پر ہے: روح کو حکما نے دو طرح پر قرار دیا ہے روح حیوانی اور روح انسانی یعنی نفس ناطقہ اور قرآن کریم میں جو آدم میں نفخ روح کا ذکر ہے فاذا سوّیتہٗ ونفخت فیہ من روحی (الحجر ۱۵ - ۲۹) تو وہ بھی روح انسانی ہی ہے جو حیوان سے انسان کو ممتاز کرتی ہے کیوں کہ حیوان آدم سے پیشتر بن چکے تھے اور ہر انسان میں جو نفخ روح کا ذکر ہے وہ بھی اسی معنی سے ہے ثم جعل نسلہ من سللۃ من ماء مھین، ثم سوّٰہ ونفخ فیہ من روحہ وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ (السجدۃ ۳۲ - ۸ و ۹) اور تیسری قسم کی روح وحی الٰہی ہے ینزّل الملٰئکۃ بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ (النحل ۱۶ - ۲) کیوں کہ یہ خاص خاص بندوں پر نازل ہوتی ہے اور اسی لحاظ سے قرآن کریم کو بھی روح کہا ہے وکذٰلک اوحینا الیک روحا من امرنا (الشوریٰ ۴۲ - ۵۲) اور آخرالذکر دونوں مقامات پر جہاں وحی مراد ہے۔ من امرہ اور من امرنا کے الفاظ بھی ساتھ بڑھائے ہیں جیسے یہاں فرمایا قل الروح من امر ربی۔

یہاں سوال کس روح کے متعلق ہے؟ مفسرین نے پانچ اقوال لکھے ہیں: یعنی ارواح بنی آدم۔ جبرئیلؑ (جن کو دوسری جگہ الروح الامین کے نام سے پکارا ہے) ایک عظیم الشان فرشتہ۔ فرشتے جو بنی آدم کی صورتوں پر ہیں۔ وہ فرشتے جنہیں فرشتے بھی نہیں دیکھتے گو وہ انہیں دیکھتے ہیں گو وہ بلحاظ دیگر ملائکہ کے ایسے ہیں جیسے ملائکہ بلحاظ انسان کے (ث) میرے نزدیک سوال عام ہے اور روح سے مراد روح حیوانی بھی ہے۔ اور روح انسانی یا نفس ناطقہ بھی اور حیات اخروی والی روح یعنی وحی الٰہی بھی اور تینوں کے متعلق فرمایا کہ وہ من امر ربی ہے یعنی وہ جو ربوبیت کرنے والا ہے اس کے امر خاص سے ہے اور تینوں پر اس لیے حاوی ہے کہ ربوبیت تینوں سے ہوتی ہے۔ اور چونکہ انسان کی اصل ربوبیت جو اسے اس کے حقیقی کمال تک پہنچاتی ہے وحی الٰہی سے ہے اس لیے اسی کے متعلق ذکر کو جاری رکھا ہے جیسے اگلی آیت میں الذی اوحینا کے ذکر سے یا آیت ۸۸ میں قرآن کے ذکر سے اور باقی دو اس کے اندر شامل ہیں۔ اور ان تینوں کی حقیقت یا کنہ کو انسان نہیں پہنچ سکتا اور بخاری کی حدیث یا دیگر احادیث میں جو ذکر ہے تو وہ بھی ہر سہ کے متعلق ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ یہود میں بھی لفظ روح کلام الٰہی پر بولا جاتا تھا البتہ یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی کیونکہ سورت مکی ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول مکہ میں ہی ہوا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یہود نے مدینہ میں سوال کیا ہو اور آنحضرت صلعم نے یہ جواب ان کو دیا ہو جو پہلے کا نزول شدہ تھا اور اسی وقت وحی ہونا محض راوی کا ظن ہے۔ جیسا کہ ظننت کے استعمال سے ظاہر ہے۔ اور ما اوتیتم من العلم الا قلیلا میں بتایا کہ انسان کا علم بمقابلہ علم الٰہی کچھ بھی نہیں۔ انسان صرف چند اوپر اوپر کی باتوں کا علم حاصل کر سکتا ہے ان کی کنہ تک پہنچنا اس کا کام نہیں ؂

روح جسم کے ساتھ پیدا ہوتی ہے: یہاں اس قدر اور بڑھا دینا ضروری ہے کہ یہ خیال کہ روحیں اللہ تعالیٰ نے پہلے سے پیدا کر کے رکھ چھوڑی ہیں صحیح نہیں اور یہ حدیث کہ روحیں دو ہزار سال پیشتر پیدا ہوئیں اس کی اسناد صحیح نہیں جیسا کہ ابن قیم نے لکھا ہے (د) کیونکہ دوسری حدیث میں ہے کہ انسان جب نطفہ پھر علقہ پھر مضغہ بنتا ہے تب اللہ تعالیٰ فرشتہ بھیجتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے اور روح المعانی میں یہ قول نقل کیا ہے کہ روحوں کا جسموں سے پہلے پیدا ہونا قول فاسد اور خطائے صریح ہے اور عقل اور شرع کے مطابق یہی امر ہے کہ روح جسم کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور یہی مذہب اہل تحقیق کا ہے جیسا کہ امام غزالی نے بھی لکھا ہے ؂

۱۸۷۳ حضرت موسیٰ کے ذکر سے تو سورت ہی شروع ہوئی تھی اور دیگر انبیاء کا اور ان کے متعلق سنت اللہ کا بھی ذکر آیا تھا اور ظاہر ہے کہ ہر نبی کے بعد دوسرا نبی آتا رہا اور پہلی کتابیں پچھلی کتاب کے آنے سے منسوخ ہوتی رہیں اور قرآن شریف کے آنے سے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ

اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝۸۷
مگر یہ تیرے رب کی طرف سے رحمت ہے۔ اس کا فضل تجھ پر بہت بڑا ہے۔

قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝۸۸
کہہ اگر انسان اور جن اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اس قرآن کی مانند بنا لائیں تو اس کی مانند نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں ع۱۸۷۴

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝۸۹
اور یقیناً ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی نادر باتیں بار بار بیان کر دی ہیں، مگر اکثر لوگوں کو سوائے انکار کے کچھ منظور نہیں ع۱۸۷۵

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝۹۰ۙ
اور کہتے ہیں ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ تو ہمارے لیے اس زمین سے چشمہ بہا دے ع۱۸۷۶

اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝۹۱ۙ
یا تیرا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو۔ پھر تو اس کے اندر خوب نہریں بہا نکالے۔

اَوْ تُسْقِطَ السَّمَاۗءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا
یا تو آسمان کو جیسا کہا کرتا ہے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے

کی وحی کی ضرورت باقی نہ رہی اور یوں بھی پہلی تمام کتابوں میں تحریف ہوتی رہی اس لیے فرمایا کہ یہ وحی جس کے ذریعہ سے اب ہم مخلوق کو حیات جاودانی دیتے ہیں۔ اسے بھی اگر اللہ چاہتا تو پہلی وحیوں کی طرح لے جاتا پھر کوئی چیز اسے دنیا میں واپس نہ لا سکتی۔ لیکن مشیت آلہی ایسی نہ تھی بلکہ اس مشیت کا تقاضا یہی تھا کہ یہ آخری وحی ہمیشہ کے لیے دنیا میں رہے اور آپ کے بعد کوئی کتاب نہ آئے نہ کوئی نبی مبعوث ہو اور تمام لوگ اسی ایک نور سے روشنی حاصل کریں اسی کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے ان فضله كان عليك كبيرا۔

ع۱۸۷۴ قرآن کی عظمت: جب قرآن کے دنیا میں ہمیشہ باقی رہنے کا اور آخری کتاب ہونے کا ذکر کیا تو اب اس کی عظمت کی طرف بھی توجہ دلائی تمام دنیا کے انسان اس کی مثل نہیں لا سکتے نہ پہلی کتابوں میں سے نہ نئی بنا کر پس جس کی نظیر دنیا نہیں بنا سکتی اس کو اللہ تعالیٰ بھی ضائع نہیں کرے گا۔ دیکھو ع۳۷ مگر جہاں سورۂ بقرہ میں وادعوا شهداءكم (البقرة ۲-۲۳) فرمایا یہاں فرمایا کہ انسان اور جنّ اکٹھے ہوں اور ایک دوسرے کی مدد کریں جس سے معلوم ہوا کہ وہی ان کے شہداء یا بیشتر وہی ہیں جنہیں اس مکی سورۃ میں جنّ کے نام سے پکارا ہے۔

ع۱۸۷۵ مَثَل کے معنی حجة یعنی دلیل اور حدیث یعنی بات اور صفت آئے ہیں (ت) اور روح المعانی میں مثل کے معنی یہاں دیئے ہیں ہر ایک معنی جو حسن میں اور نادر ہونے میں اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لینے میں بدیع یعنی بے مثال ہو۔

قرآن کی عظمت کی اور اس کے ہمیشہ تک رہنے کی یہاں دلیل دی کہ اس میں ہر قسم کی باتیں بار بار اور کھول کھول کر بیان کر دی گئی ہیں مذہب کے معاملہ میں کوئی ایسی بات نہیں جو یہاں نہ ہو اور دوسری جگہ ہو۔

ع۱۸۷۶ ينبوع ۔ نَبَعَ چشمہ سے پانی کا نکلنا ہے اور ينبوع (جمع ينابيع) چشمہ کو کہتے ہیں فسلكه ينابيع (الزمر ۳۹-۲۱) (غ)

روحانی انعامات کو جسمانی رنگ میں دیکھنے کی درخواست: باوجود قرآن شریف کی اس عظمت کے اسکے ہدایت میں بےمثل ہونے اور اسکی تعلیم کے کمال کے اسکا تو انکار کیا جاتا ہے اور مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ مکّہ کی زمین سے ایک چشمہ پھوٹ نکلے چونکہ راستبازوں کے لیے جنات و انہار کے وعدے تھے اور مخالفین پر عذاب کے آنے کے اس لیے مطالبات بھی قریباً اسی رنگ کے ہیں۔ چشمے اور نہریں اور باغ ہوں جن میں رسول اللہ صلعم رہیں یا مخالفوں پر آسمان ٹوٹ پڑے وہ نعماء جن کا روحانی طور پر وعدہ دیا گیا تھا انہیں جسمانی رنگ میں اس دنیا میں دیکھنا چاہتے ہیں یہی حالت آج بھی ہے اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان فتوحات میں جو مسلمانوں کو عطا فرمائیں ایک رنگ ظاہری بھی ان نعمائے روحانی کا دکھا دیا مکّہ معظمہ میں پانی کا چشمہ بھی نکلا یعنی وہ نہر جو اب وہاں بہتی ہے۔ رسول اللہ صلعم باغوں اور نہروں کے مالک بھی ہوئے مخالفوں پر آسمان بھی ٹوٹا مگر نہ اس رنگ میں جیسے وہ چاہتے تھے جس کی وجہ رکوع کی آخری آیت میں بتائی ہے۔

أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ﴿٩٢﴾
أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ
فِي السَّمَاءِ ۚ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ
عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي
ع هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا ﴿٩٣﴾
وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ
الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا ﴿٩٤﴾
قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ
مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ
مَلَكًا رَسُولًا ﴿٩٥﴾

یا تو اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئے ۱۸۷۷ع
یا تیرا سونے کا گھر ہو، یا تو آسمان میں چڑھ جائے
اور ہم تیرے چڑھنے کو بھی نہیں مانیں گے، جب تک کہ تو
ہم پر کتاب نہ اتارے جسے ہم پڑھ لیں، کہہ میرا رب پاک
ہے میں صرف ایک بشر رسول ہوں ۱۸۷۸ع
اور لوگوں کو کوئی چیز ایمان لانے سے مانع نہیں ہوتی جب ان
کے پاس ہدایت آئی مگر یہ کہ انھوں نے کہا کیا اللہ نے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے
کہہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے
تو ضرور ہم ان پر آسمان سے فرشتہ رسول
بنا کر بھیجتے ۱۸۷۹ع

۱۸۷۷ع کسفا۔ کِسْفَۃ کی جمع کِسَف ہے اور کِسْفَۃ بادل کے ٹکڑے کو کہتے ہیں یا روئی کے اور اجسام کے جن کے اجزا ایک دوسرے سے مضبوط طور پر پیوستہ نہ ہوں اور ان میں ردوبدل ہوتا ہے ویجعلہ کسفا (الروم[30]-۴۸) فاسقط علینا کسفا من السماء (الشعرآء[26]-۱۸۷) (رغ)
قبیل۔ قبیلۃ کی جمع ہے جس کے معنی جماعت ہیں پس یہاں مراد ہے جماعت جماعت کرکے یا قبیلا کے معنی کے مقابلۃ یعنی آنکھوں کے سامنے (رغ)
عذاب کا ذکر استعارہ کے رنگ میں: یہ وہی عذاب ہیں جن کے ان کو وعدے دیئے جاتے تھے مگر جیسا کہ لفظ کِسف کا استعمال بتاتا ہے مراد یہ نہ تھی کہ آسمان کوئی ٹھوس چیز ہے جس کا ایک بڑا سا ٹکڑا ان پر گر کر انہیں تباہ کر دے گا جیسا انہوں نے سمجھا۔ بلکہ اس سے مراد اوپر سے کسی عذاب کا آنا تھا۔ ہوا کے رنگ میں ہو یا بادل کے۔ اللہ اور فرشتوں کا آنا بھی حق تھا مگر نہ اس رنگ میں جیسا انہوں نے خیال کیا یعنی ظاہر طور پر نہیں دیکھو ۲۶۹ع مادہ پرستوں کی نظریں بھی لفظوں کے قشر تک محدود رہتی ہیں اور وہ اصل حقیقت پر غور نہیں کرتے۔

۱۸۷۸ع ترقی۔ رَقِیَ ماضی ہے اور رُقِیّ مصدر اور اس کے معنی سیڑھی یا زینہ پر یعنی اوپر چڑھنا ہیں اور اسی سے ارتقاء ہے فلیرتقوا فی الاسباب (صٓ[38]-۱۰)
کفار کے مطالبات میں لفظ پرستی: سونے کا گھر ہو، یعنی زمین پر ہی عام انسانوں سے کوئی امتیاز ہو یا خدا سے باتیں کرنے کا دعویٰ ہے تو آسمان پر چڑھ کر دکھاؤ اور چڑھنا بھی دیکھ لیں تو بھی نہیں مانیں گے جب تک اوپر سے خدا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب لا کر نہ دکھاؤ ان تمام مطالبات میں وہی ایک ہی رنگ نظر آتا ہے یعنی لفظ پرستی اور اصل حقیقت کی طرف توجہ نہ کرنا۔ قرآن شریف میں دوسری جگہ فرمایا ہے کہ ہمارے ہاں سونے اور چاندی کی کچھ بھی وقعت نہیں اور اگر لوگوں کے فتنہ میں پڑ جانے کا احتمال نہ ہوتا تو کافروں کے چاندی سونے کے گھر بنا دیتے لجعلنا لمن یکفر بالرحمٰن لبیوتھم سقفا من فضۃ ومعارج علیہا یظھرون...... وزخرفا (الزخرف[43]-۳۳ تا ۳۵) تو لفظ پرست کہتے ہیں کہ تمہارے رب کے ہاں اتنی بہتات سونے کی ہے تو پہلے تمہارا گھر ہی سونے کا بن لے۔ اور اسی سورت میں آپ کے معراج کا یعنی آسمانوں کے عجائبات کے دیکھنے کا ذکر ہے تو اس لیے کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ کر دکھاؤ اور یہ جو تم کہتے ہو کہ وہاں سے احکام الٰہی لایا ہوں تو اوپر سے ہی تمہارے ساتھ کوئی کتاب بھی آئے جس میں وہ احکام لکھے ہوئے ہوں۔ غرض باتیں تو وہی ہیں جو قرآن شریف نے فرمائیں لیکن ایک لفظ پرست قوم نے بجائے حقیقت کی طرف توجہ کرنے کے لفظوں پر اعتراض شروع کر دیئے۔ ان سب کا جواب ایک ہی دیا ہے کہ میں بشر رسول ہوں اور اللہ تعالیٰ کی ذات عیب سے پاک ہے یعنی وہ خدا جسم نہیں کہ آسمان پر چڑھ کر اس تک پہنچ سکیں اور اس کا کلام بھی یوں سنایا دکھا نہیں جاتا بلکہ اس کے لیے دوسرے غیر مادی اور روحانی حواس بکار ہیں جو ان حواس کے نقصوں سے خالی ہوں اور اس کی تمام باتیں پوری ہوئیں اور ہونگی مگر نہ اس طرح پر جسطرح کہ تم چاہتے ہو۔ اسی سورت میں معراج کا ذکر ہونے کے باوجود کفار کے اس مطالبہ کا ذکر کہ تم آسمان پر چڑھ جاؤ صاف بتاتا ہے کہ آنحضرت صلعم کا معراج روحانی تھا۔ اور جسمانی طور پر آسمان پر چڑھنا بشریت کے منافی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے سبحان ہونے کے بھی منافی ہے کیونکہ اس صورت میں ماننا پڑیگا کہ خدا بھی ایک جسم ہے اور یہ اس میں عیب کا ماننا ہے۔

۱۸۷۹ع مطمئنین اطمینان کے معنی ہیں خوف کے بعد سکون (رغ) اور یہاں ظاہری قرار یا سکونت اختیار کرنا مراد ہے۔
بشریت رسول کا مضمون جاری رکھ کر فرمایا ہے کہ انسان کے لیے انسان ہی رسول ہو سکتا تھا اور جو انسان ہوگا اس کے ساتھ لوازم بشریت بھی ہونگے یہ روحانی امور کو جسمانی رنگ میں دیکھنے کے خواہاں ہیں اس لیے کہتے ہیں کہ فرشتے ان کو نظر آئیں۔ مگر فرشتے انسانوں کی طرف رسول بن کر نہیں آ سکتے کیونکہ

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۞۹۶ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ۞۹۷ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۞۹۸ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

کہہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان کافی گواہ ہے۔ کیونکہ وہ اپنے بندوں سے خبردار (انھیں) دیکھنے والا ہے۔[۱۸۸۰] اور جسے اللہ ہدایت دے تو وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے وہ گمراہ ٹھیرائے تو تُو ان کے لیے اس کے سوائے اور کوئی حمایتی نہ پائے گا اور ہم انھیں قیامت کے دن تک ان کے مونہوں کے بل (گرتے ہوئے) اکٹھا کرینگے اندھے اور گونگے اور بہرے، ان کا ٹھکانا دوزخ ہے جب کبھی وہ آگ بجھنے لگے گی ہم اُن پر اور زیادہ بھڑکا دینگے۔[۱۸۸۱] یہ ان کی سزا ہے اس لیے کہ وہ ہماری باتوں کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کیا جب ہم ہڈیاں اور چُورا ہو جائیں گے تو نئی پیدائش میں اٹھائے جائیں گے۔ کیا وہ غور نہیں کرتے کہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو

رسول کا کام تو ہے ہی نمونہ دکھانا اور نمونہ جنس ہی جنس کے لیے ہوسکتی ہے نہ غیر جنس انسانوں کی جگہ فرشتے زمین پر آباد ہوتے تو فرشتے ہی ان کی طرف رسول بن کر آتے۔ اور خود پیغمبر پر فرشتہ کا آنا اس کے منافی نہیں کیونکہ پیغمبر فرشتہ کو ان حواس جسمانی سے نہیں بلکہ حواس روحانی سے دیکھتا ہے انہی حواس سے جن حواس سے وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کے یہ حواس جسمانی فرشتوں کو نہیں دیکھ سکتے بلکہ وہ روحانی حواس کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں کیونکہ اس بات کو بشریت کے منافی قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلعم جو ملائکہ کو دیکھتے تھے اور حضرت جبرائیلؑ شب و روز آپ کے پاس آتے تھے تو وہ وہی حواس انبیاء سے دیکھنا تھا اور حضرت جبرائیل کو دحیہ کلبی یا کسی اعرابی کی شکل میں صحابہ کا دیکھنا اس آیت کے خلاف نہیں ہوسکتا اور وہ بھی ایک کشفی نظارہ ہی ہوسکتا ہے۔ جس میں دوسرے صحابہؓ بھی بہ سبب زبردست قوت کشفی نبویؐ کے شامل ہو گئے۔ جس طرح پر حضرت ابوبکرؓ کا بعض وقت وحی کی آواز کی بھنبھناہٹ کو سن لینا روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح فرشتہ انسانوں کی طرف رسول نہیں ہوسکتا، اسی طرح انسان فرشتوں کی طرف رسول نہیں ہوسکتا نہ جنوں کی طرف جو انسان کی جنس سے نہیں بلکہ دوسری جنس کی غیر مرئی ہستیاں ہیں جس جنس کو اپنی تکمیل کے لیے رسول کی ضرورت ہے اس رسول کا اسی جنس میں سے ہونا ضروری ہے اور رسول اللہ صلعم کے پاس جنوں کے آنے سے اور قرآن کو سننے اور اس پر ایمان لانے سے کیا مراد ہے اس پر آیندہ اپنے موقعہ پر بحث ہوگی۔

ع۱۸۸۰ اللہ تعالیٰ کی شہادت سے مراد اپنے فعل سے حق کے حق اور باطل کے باطل ہونے پر گواہی دینا ہے یعنی حق دنیا میں قائم ہوتا چلا جاتا اور باطل جو اس کو نابود کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ خود باطل ہوتا چلا جاتا ہے اسی لیے خبیر اور بصیر کی صفات آخر میں لائی گئی ہیں۔

ع۱۸۸۱ فهو المهتد۔ مراد یہ ہے کہ وہی شخص ایسے راستہ پر چلتا ہے جو اسے منزل مقصود تک پہنچا دے۔ اس کے مقابل پر وہ ہے جو گمراہی میں اس قدر دور نکل گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر گمراہ ہونے کا فرد جرم لگا دیا اب اس کی سزا سے اللہ کے مقابلہ پر اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔

علیٰ وجوههم۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا گیا کہ لوگوں کا حشر اُن کے مونہوں کے بل کس طرح ہوگا تو آپ نے فرمایا جو انہیں پاؤں پر چلانے پر قادر ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اُنہیں مونہوں پر چلائے۔ اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ لوگوں کا حشر تین گروہوں میں ہوگا۔ ایک وہ جو سوار ہونگے اور ایک وہ جو چلتے اور دوڑتے ہونگے اور ایک وہ جنہیں فرشتے ان کے مونہوں کے بل گھسیٹتے ہونگے، اور قرآن کریم میں ہے یوم يسحبون في النار على وجوههم (القمر ۵۴ - ۴۸) اور قرآن کریم میں ایک جگہ یوں بھی ہے افمن يمشي مكبا على وجهه اهدى امن يمشي سويا على صراط مستقيم (الملک ۶۷ - ۲۲) یہاں مراد یہ ہے کہ جو شخص قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا اور مُنہ کے بل گرتا ہے کیا وہ اس راہ پر ہے جو اسے منزل مقصود تک پہنچا دے گی اور چونکہ قرآن کریم میں سزا کو جزاء وفاقا (النبأ ۷۸ - ۲۶) قرار دیا ہے اس لیے جو لوگ یہاں سیدھی راہ اختیار نہیں کرتے بلکہ غلط راہ اختیار کر کے منہ کے بل گرتے ہیں ان کی سزا بھی ویسی ہی ہے جس طرح یہاں اندھے رہنے کی وجہ سے قیامت میں اندھے ہونگے اور یہاں حق کی طرف سے بہرہ ہونے کی وجہ سے

وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾

پیدا کیا اس بات پر قادر ہے کہ ان جیسے پیدا کرے اور اس نے ان کے لیے ایک میعاد ٹھیرائی ہے جس میں کوئی شک نہیں مگر ظالموں کو سوائے انکار کے کچھ منظور نہیں ۱۸۸۲ء

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَاۗىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ ع

کہہ اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو تب تم اُن کے خرچ ہو جانے کے ڈر سے (انھیں) روک رکھتے اور انسان تنگ دل ہے ۱۸۸۳ء

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔــلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِذْ جَاۗءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾

اور یقیناً ہم نے موسیٰؑ کو نو کھلے نشان دیے۔ سو بنی اسرائیل سے پوچھ، جب وہ ان کے پاس آیا۔ تو فرعون نے اسے کہا، اے موسیٰؑ میں سمجھتا ہوں کہ تجھ پر جادو کیا گیا ہے ۱۸۸۴ء

وہاں بہرے ہونگے حالانکہ یہی اندھے وہاں دیکھیں گے بھی اور یہی بہرے وہاں سنیں گے بھی اور یہی گونگے وہاں بولیں گے بھی گویا سزا کا ذکر انہی الفاظ میں کیا ہے جو الفاظ انکی غلط کاریوں کے لیے استعمال کیے ہیں اور حدیث جو اوپر دی گئی ہے اس سے خود ظاہر ہے کہ جس طرح سوار ہونا چلنا بطور استعارہ ہے گھوڑوں یا ریلوں پر سوار ہونا مراد نہیں اسی طرح مونہوں کے بل گرنا بھی بطور استعارہ ہے جس طرح انہوں نے انسان کی زندگی کے اشرف اور بلند تر مقصد کو اپنے پاؤں کے نیچے رکھا اسی طرح ان کا اشرف حصّہ وہاں ان کے پاؤں بنے گا۔

خبت۔ خبو سے ہے اور خِباء اصل میں پردہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز پر ڈال دیا جائے اس لیے جلتی آگ پر جب خاکستر کا پردہ آکر اس کے شعلہ کو ساکن کر دیتا ہے تو اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ)

آگ کا بجھنا اور پھر اس کا بھڑکایا جانا اسی کی مثال ہے جیسے فرمایا کلما نضجت جلودھم بدّلنٰھم جلودا غیرھا (النسآء - ۵۶) اور مطلب یہ ہے کہ وہ عذاب قائم رہے گا وہ ایسی آگ نہیں کہ ایک دفعہ جلادی تو خود بخود اس پر خاکستر کا پردہ آکر بجھ جائے گی بلکہ اس کا اثر برابر قائم رہے گا۔ جس طرح وہ مخالفت کی آگ بار بار بھڑکاتے تھے اسی طرح ان سے معاملہ ہوگا۔

۱۸۸۲ء حیات بعد الموت میں یہی جسم نہ ہوگا بلکہ اس کی مثل ہوگا: یہاں حیات بعد الموت کو قیامت میں اُٹھایا جانے کو مثلھم قرار دیا ہے یعنی انہی انسانوں کی مثل جس سے معلوم ہوا کہ وہ بالکل یہی جسم نہیں اور یہ جسم تو ہر آن بدلتا بھی رہتا ہے۔ بلکہ اس کی مثل ہے اور مثل کا لفظ اس لئے بھی موزوں ہے کہ جزا اور سزا مطابق اعمال ہے اور اجل کا ذکر اس لحاظ سے کیا کہ یہ جسم ایک وقت مقرر کے بعد فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن اعمال فنا نہیں ہوتے۔

۱۸۸۳ء انفاق سے مراد یہاں مال کا جاتے رہنا یا ختم ہو جانا ہے ع۱۳ اس آیت کا تعلق ماقبل سے کیا ہے بعض نے اسے ان کے ان سوالات کے متعلق قرار دیا ہے کہ تمہارے لیے باغ اور نہریں اور سونے کا گھر ہو۔ تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ چیزیں بھی اللہ تعالیٰ دیدیگا وہ بُروں کو دیدیتا ہے تو اچھوں کو کیوں نہ دیگا۔ انسان کی طرح وہ بخیل نہیں۔ مگر زیادہ تر قرین قیاس یہ ہے کہ رحمت ربی میں اشارہ اس رحمت کی طرف ہے جو بذریعہ وحی انسانوں پر نازل ہوتی ہے اور مراد یہ ظاہر کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں سے بڑھ کر دوسری نعمتیں ہیں اور وہ یہ بھی دیتا جاتا ہے وہ بھی اسے ختم ہو جانے کا خوف نہیں کیونکہ اس کے خزانے بے انتہا ہیں اور یہ اشارہ رسول اللہ صلعم کی کامیابیوں کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے آپ کو بڑے بڑے سامان اور بادشاہتیں دے دیگا کیونکہ مالک وہ ہے تم نہیں ہو۔

۱۸۸۴ء تسع آیات سے مراد: ایک حدیث میں ہے کہ دو یہودیوں نے آنحضرت صلعم سے تسع آیات کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے نو احکام بیان فرمائے یعنی شرک نہ کرو چوری نہ کرو۔ زنا نہ کرو وغیرہ جو شریعت موسوی کی بنیاد کے طور پر ہیں۔ مگر کئی وجوہ سے یہ حدیث قابل قبول نہیں گو ترمذی ابن ماجہ اور امام احمد نے اسے لیا ہے اسلئے کہ اول تو یہ احکام دس تھے دوسرے یہ احکام بنی اسرائیل کو بعد میں دیئے گئے جب مصر سے وہ ارض مقدس کی طرف چلے گئے اور یہاں ان کے متعلق صاف فرعون کا ذکر ہے تیسرے اگلی آیت میں صاف طور پر انہیں بصائر یعنی دلائل صداقت حضرت موسیٰ قرار دیا ہے۔ اور دلائل صداقت تعلیم نہیں بلکہ معجزات ہو سکتے ہیں اس لیے تسع آیات سے مراد وہی نو نشان ہیں جن کا ذکر سورۃ الاعراف میں ہے دیکھو ع۱۱۴۳ مسحور کے لیے دیکھو ع۱۸۳۹ اور اس کے معنی مجنون بھی ہو سکتے ہیں اور دوسری جگہ ہے انّ رسولکم الذی ارسل الیکم لمجنون (الشعراء ۲۶ - ۲۷)

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾

اس نے کہا تو خوب جانتا ہے کہ یہ آسمانوں اور زمین کے رب کے سوائے اور کسی نے نہیں اتارے روشن دلائل کے طور پر اور میں اے فرعون تجھے ہلاک شدہ خیال کرتا ہوں ۱۸۸۵ء

فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ﴿۱۰۳﴾

سو اس نے چاہا کہ انھیں اس زمین میں خفیف کردے، سو ہم نے اسے غرق کر دیا اور ان سب کو بھی جو اس کے ساتھ تھے۔

وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ﴿۱۰۴﴾

اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا وعدے کی زمین میں آباد ہو جاؤ، پھر جب پچھلا وعدہ آئے گا ہم تمھیں اکٹھا کر لائیں گے ۱۸۸۶ء

وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ﴿۱۰۵﴾

اور ہم نے اسے حق کے ساتھ اتارا اور وہ حق کے ساتھ اترا اور ہم نے تجھے صرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا ﴿۱۰۶﴾

اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کر دیا ہے تاکہ تو اسے ٹھیر ٹھیر کر لوگوں پر پڑھے اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے ۱۸۸۷ء

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾

کہہ اسے مانو یا نہ مانو، جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے، جب یہ ان پر پڑھا جاتا ہے وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے کرتے ہوئے گر پڑتے ہیں۔

۱۸۸۵ء مثبور۔ ثَبْر کے معنی حبس یعنی روکنا ہیں (ل) اور ثبور کے معنی ہلاک اور فساد کے ہیں جو لازم حال ہو جائے دعوا ھنالك ثبورا (الفرقان ۲۵-۱۳) اور ثبور ہلاک شدہ ہے ابن عباس سے ہے کہ اس کے معنی ناقص العقل ہیں کیونکہ یہی سب سے بڑی ہلاکت ہے (غ)

۱۸۸۶ء لفیف۔ لَفَف ران پر گوشت کی کثرت کو کہتے ہیں اور لفیف کے معنی ہیں جمع عظیم جو طرح طرح کے لوگوں سے مل کر بنی ہوئی ہو جن میں شریف اور کمینے اور فرمانبردار اور عاصی اور قوی اور ضعیف ہوں (ل) اور ابن عباسؓ نے اس کے معنی جمیعًا کئے ہیں (ج) اور جنّٰت الفافا (النبا ۷۸-۱۶) میں الفاف سے مراد درختوں کی کثرت ہے (ل)۔

یہاں مراد وعد الاخرۃ سے قیامت کا آنا لیا گیا ہے گویا مطلب یہ ہے کہ تم سب ہمارے حضور ملے جلے آؤ گے تو ہم تم میں فیصلہ کریں گے، لیکن اس کے بعد فوراً آتا ہے وبالحق انزلناہ وبالحق نزل جس میں ذکر آنحضرت صلعم کی تشریف آوری کا ہے اس لیے وعد الاخرۃ سے مراد نبی کریم صلعم کا آنا بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ یہ خاص وعدہ تھا جو حضرت موسیٰ سے کیا گیا تھا اور اس کی تائید نہ صرف اگلی آیت سے ہوتی ہے بلکہ آگے چل کر پھر اسی وعدے کا ذکر کیا ہے ان کان وعد ربنا لمفعولا (۱۰۸) اور اس کے کہنے والے اوتوا العلم ہیں اور اس صورت میں اکٹھا کر لانے سے مراد یہ ہے کہ تم کو اس پاک سرزمین سے یعنی ارض مقدس سے بیدخل کر دیا جائے گا یا سلسلہ بنی اسرائیل ختم ہو جائیگا اور ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائیگا۔

۱۸۸۷ء فرقنا۔ فرق کے اصل معنی دو چیزوں کا الگ الگ کرنا ہیں پس یہاں دو طرح پر معنی ہو سکتے ہیں کھول کھول کر بیان کیا یعنی اس کے احکام کو تفصیل کے ساتھ الگ الگ کر دیا۔ یا تھوڑا تھوڑا کر کے یعنی الگ الگ ٹکڑوں میں نازل کیا (غ)

مکث۔ مُکث کے معنی ہیں ثبات مع انتظار یعنی انتظار کرتے ہوئے ٹھہرے رہنا قال لاھلہ امکثوا (القصص ۲۸-۲۹) فمکث غیر بعید (النمل ۲۷-۲۲) (غ) تنزیل دیکھو ۱۲۳ء۔

قرآن کریم کا بتدریج نزول: قرآن کریم تھوڑا تھوڑا کر کے ۲۳ سال کے عرصہ میں نازل ہوا۔ یہاں اس کا ذکر بلحاظ اس کی عظمت کے ہے۔ کیونکہ اس میں ہر قسم کی تعلیم تھی تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنے میں حفظ اور فہم دونوں میں مدد ملتی تھی۔ اور تنزیلا میں اشارہ ہے کہ مصالح کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا

وَّ يَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾

اور کہتے ہیں، ہمارا رب پاک ہے، یقیناً ہمارے رب کا وعدہ پورا ہونا تھا۔

وَ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَ يَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾ السجدۃ

اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں، روتے ہیں اور یہ ان کی عاجزی بڑھاتا ہے ع۱۸۸۸

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾

کہہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو پکارو، جس نام سے پکارو، اس کے سب نام اچھے ہیں اور پکار پکار کر دعا نہ کر اور نہ چپکا ہی رہ اور اس کے بیچ بیچ ایک طریق اختیار کر۔ ع۱۸۸۹

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا

اور کہہ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے بیٹا نہیں

وردوسری جگہ تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کرنے کی حکمت کو یوں بیان فرمایا لنثبت بہ فوادک (الفرقان ۲۵-۳۲)

ع۱۸۸۸ اذقان۔ ذقن کی جمع ہے ٹھوڑی (غ) (خرّ کے لیئے دیکھو ع۱۵۸۷) اور یہاں جزو سے کل مراد لیکر منہ مراد لیا گیا ہے (د)

حضرت موسیٰ کی پیشگوئی: کوئی ایمان لائے یا نہ لائے مگر جو شخص اوتوا العلم کا مصداق ہے اور علم کی بات کے سامنے نفس کی ہوا وہوس کو چھوڑ دیتا ہے وہ انکار نہیں کرسکتا کہ بیشک وہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی زبان سے کیا تھا استثناء ۱۸: ۱۵-۱۸ وہ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کی ذات بابرکات میں ہی پورا ہوا اور اگر آپ نہ آتے تو وہ وعدہ بھی پورا نہ ہوتا۔ دوبار گرنے میں نماز کے دوسجدوں کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے اور اصل مراد یہ ہے کہ جب وعدہ الٰہی کے پورا ہونے پر وہ سجدۂ شکر بجالاتے ہیں تو پھر ایک ایسا سرور قرآن کے ساتھ ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے کہ اس سے بھر کر پھر دوبارہ خدا کے حضور گرجاتے ہیں گویا ان کا علم ویقین اور ترقی کرجاتا ہے۔

ع۱۸۸۹ تخافت۔ خفت اور خفات بھوک سے جو کمزوری پیدا ہو یا آواز کی کمزوری کو کہتے ہیں اور جب موت کے ساتھ انسان کا کلام منقطع ہوجاتا ہے اور وہ خاموش ہوجاتا ہے تو اسے خافت کہتے ہیں اور بات کے چھپانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے یتخافتون بینہم (طٰہٰ ۲۰-۱۰۳) (ل)۔

اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت میں تمام مذاہب باطلہ نے ٹھوکر کھائی ہے۔ عرب کے بت پرست بھی عیسائی قوم کی طرح صفت رحمانیت یعنی رحم بلا بدل کو نہ مانتے تھے۔ اور گو سورت میں ذکر بنی اسرائیل کا تھا مگر چونکہ ان سے پھیر کر اب عیسائیت کی طرف ذکر کو لاتا ہے۔ جس پر سلسلہ موسوی ختم ہوتا ہے اس لیے اس آیت میں اور اگلی آیت میں صاف طور عیسائی عقیدہ کا ذکر کیا ہے۔ اور تفاسیر میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ مکہ میں آنحضرت صلعم اللہ تعالیٰ سے یا اللہ یا رحمٰن کہہ کر دعا کرتے تھے تو مشرکوں نے کہا کہ ہمیں دو خدا پکارنے سے روکتے ہیں اور آپ دو خداؤں کو پکارتے ہیں جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ یہ ایک ہی ذات واحد کے اسماء ہیں یعنی اس کی مختلف صفات کے لحاظ سے اس کے نام ہیں۔ اور اصل میں یہاں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور خضوع وخشوع سے اور اپنے آپ کو اس کے اسمائے حسنیٰ کے ماتحت لانے سے انسان اپنے کمال کو حاصل کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی سب صفات ہی خوبصورت ہیں جس صفت کو انسان اپنے اندر لینے کی کوشش کرے اسی سے اس کے اندر حسن پیدا ہوگا۔

اور صلوٰت کا لفظ جو یہاں آیا ہے تو اس کے معنی دعا ہیں دیکھو ع۱۲ گو بخاری میں دونوں قسم کی احادیث ہیں یعنی حضرت ابن عباسؓ کی روایت کہ اس آیت کا نزول قرأت کے بارہ میں ہے یعنی نماز کی قرأت کے اور حضرت عائشہؓ کی روایت کہ یہ عام دعا کے بارہ میں ہے اور دوسری روایات میں مجاہد اور ابن عباس سے بھی تفسیر مروی ہے (د) اور سیاق مضمون اس کے دعا کے بارہ میں ہونے کو ہی صحیح ٹھہراتا ہے کیونکہ اوپر صاف ذکر دعا کا ہے۔ یعنی جب یہ ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے اسمائے حسنیٰ سے پکارو تو اب یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے میں میانہ روی اختیار کرو نہ تو اس قدر چیخ کر پکارو کہ گویا خدا بلند آواز کو ہی سنتا ہے۔ اور نہ ہی یہ سمجھ کر کہ اللہ تعالیٰ تو دل کی باتوں کو جانتا ہے منہ سے کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بالکل خاموشی اختیار کرو۔ دعا کے معاملہ میں بھی لوگوں نے افراط وتفریط سے کام لیا ہے دعا میں زیادہ چلانا ادب کے خلاف ہے اور بغیر الفاظ کے دعا کا اثر قلب پر نہیں پڑتا اور نہ اس میں وہ گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی ہے جو اسے قبولیت کے مقام پر پہنچائے اور صلوٰۃ کے معنی نماز لیکر قرأت ہی مراد لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ نہ تو ساری قرأت بالجہر ہو اور نہ ساری آہستہ ہو بلکہ ان کے درمیان چلو یعنی کچھ حصہ بالجہر ہو تاکہ اس حالت میں سب کے سب ایک ہی طرح پر خدا کی عظمت کے آگے سر جھکائے ہوئے ہوں اور ایک حصہ آہستگی سے ہو تاکہ ہر شخص اپنے رنگ میں خدا کے خیال میں محو ہو۔

وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾ ع ۱۲ ۱۲

بنایا اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ وہ عاجز ہے کہ اس کا کوئی مددگار ہو اور اس کی بڑائی بیان کر جو حق بڑائی بیان کرنے کا ہے۔ ؀۱۸۹۰

؀۱۸۹۰ توحید الٰہی: سورت کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرنے پر کیا ہے جیسا کہ ابتدا اس کی سبوحیت سے کی نفی نہ اس کا کوئی بیٹا ہے نہ کوئی شریک ہے نہ کوئی ولی مددگار ہے۔ بیٹا اس کو بکار ہے جس نے مرجانا ہو۔ شریک اسے بکار ہے جو خود سارا کام نہ کرسکے اور مددگار اسے بکار ہے جو اپنی طاقت سے ایک کام کو نہیں کرسکتا بلکہ دوسرے کا محتاج ہے اور عقیدہ ولد کا ذکر کرکے مضمون کا انتقال عیسائی مذہب کی طرف کیا جس پر اگلی سورت میں بحث ہے۔ نتیجہ سب کا ایک ہے کہ دلوں پر عظمت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنا ہی رسولوں کی بعثت کی اصل غرض ہے۔ عیسائیت کے ذکر سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا ذکر بھی خاص معنی رکھتا ہے۔

آیاتھا ۱۱۰ (۱۸) سُوْرَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتھا ۱۲

نام: اس سورت کا نام الکہف ہے اور اس میں بارہ رکوع اور ایک سو دس آیتیں ہیں اور کہف کے معنی غار بھی ہیں اور جائے پناہ بھی۔ اور اس سورت کا نام کہف اس وجہ سے ہے کہ اس میں اصحاب الکہف کا ذکر ہے یعنی چند لوگوں کا جنہوں نے شرک سے بچنے کے لیے اور توحید کو پھیلانے کے لیے ایک غار میں پناہ لی تھی۔ اور یہ لوگ عیسائی مذہب کے تھے اور عیسائی مذہب کی پرورش اس رنگ میں بھی کہف میں ہوئی کہ ایک عرصہ دراز تک اس کی حالت مظلومیت کی رہی اور آزادانہ اس کی تبلیغ نہ ہو سکتی تھی۔ اور اس رنگ میں بھی کہ اس میں جو اچھے لوگ ہوئے ہیں وہ زیادہ تر رہبانیت کی طرف جھکے رہے ہیں یعنی دنیا و مافیہا سے الگ ہو کر پہاڑوں اور غاروں میں خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور چونکہ اس سورت میں صرف ایک ہی ذکر ہے یعنی عیسائی مذہب کا، اس لیے اس کا نام کہف اسی مذہب کی تاریخ کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے۔

خلاصہ مضمون: اس سورت کے ربط مضامین میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہے اور بظاہر اس میں تین موٹے موٹے ذکر الگ الگ نظر آتے ہیں یعنی ذکر اصحاب کہف۔ ذکر خضر و موسیٰ۔ ذکر ذوالقرنین جن کا بظاہر ایک دوسرے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ مفسرین نے آسان توجیہ یوں کر دی ہے کہ چونکہ یہود نے تین سوال اکٹھے کیے تھے یعنی روح کے متعلق اصحاب کہف کے متعلق اور ذوالقرنین کے متعلق اس لیے ایک کا جواب پچھلی سورت میں دیدیا اور دو کا یہاں مگر اول تو جب دو سورتوں میں الگ الگ جواب کر دیئے تو اس بنا پر ان کا اکٹھا ایک سورت میں لانا بے معنی ہے علاوہ بریں خضر و موسیٰ کا ذکر دونوں کے درمیان میں کیوں رکھا۔ اصل بات یہ ہے کہ جو مفہوم ان تینوں کے نیچے ہے وہ ایک ہے اور باوجود تین الگ الگ زمانوں کے الگ الگ ملکوں کے الگ الگ اشخاص کے واقعات ہونے کے تینوں کا تعلق ایک نہ ایک رنگ میں عیسائی مذہب سے اور نبی کریم صلعم کی تبلیغ حقہ سے ہے۔ سورت کی ابتدا قرآن کے کتاب قیم ہونے اور ان لوگوں کے انذار سے کی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹا منسوب کرتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کی زمینی آرائشوں کی طرف اشارہ کیا ہے یہی وہ فتنۂ دجالی ہے جس کا ذکر احادیث نبوی میں ہے اس لیے کہ انہی فتنوں کے علاج کے طور پر ان آیات کے پڑھنے کا حکم ہے اور اس فتنۂ دجالی کے ساتھ جو بالآخر عیسائی مذہب کی تعلیم اور عیسائی اقوام کی دنیوی حالت سے پیدا ہونا تھا۔ عیسائی مذہب کی ابتدا کا ذکر اصحاب کہف کے تذکرہ میں کیا ہے۔ یوں پہلے رکوع میں فتنۂ دجالی کے ذکر کو اصحاب کہف کے ذکر کے ساتھ ملایا ہے۔ دوسرے رکوع میں اصحاب کہف کی حقیقت کو بیان کیا ہے اور تیسرے میں ان کے خاتمہ کا ذکر کیا ہے اور چونکہ عیسائی اقوام اسلام کے پیغام حق کے قبول کرنے میں تمام دنیا کی اقوام سے پیچھے رہ گئی ہیں اس لیے چوتھے رکوع میں دعوت الی الحق اور اس کی مشکلات کا ذکر کیا۔ پانچویں میں عیسائیت اور اسلام کا ایک تمثیل کے رنگ میں ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ عیسائیت کو اپنے مال و دولت اور حکومت پر فخر ہوگا اور اسلام کو خدائے واحد کی پرستش کی تعلیم دینے پر فخر ہے۔ اسی بنا پر چھٹے رکوع میں بتایا کہ دنیا کا مال و دولت محاسبۂ اعمال میں ہیچ اشیاء ہیں۔ ساتویں میں شیطان کی دوستی کا انجام بتایا اور سمجھایا کہ جن تعلقات کی خاطر انسان حق کو چھوڑتا ہے یہ بھی آخر کار کسی کام نہیں آتے بلکہ انسان کی ہلاکت کا موجب ہوتے ہیں۔ آٹھویں میں اس دنیا کی مالک قوموں کو سمجھایا کہ کوئی قوم نہیں جو ہمیشہ علو کے مقام پر رہی ہو بلکہ ہر ایک کے لیے ایک ہلاکت کا وقت ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کے لیے بھی ہو گا یعنی ان کی یہ قوت جس کی بنا پر پیغام حق کے قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ بالآخر توڑ دی جائے گی نویں اور دسویں رکوع میں حضرت موسیٰ اور خضر کے واقعات کو بیان کرکے سمجھایا کہ خدا کا پیغام بنی اسرائیل تک محدود نہ تھا بلکہ سلسلہ اسرائیل کا عظیم الشان بانی یعنی حضرت موسیٰ بھی صرف ایک ہی قوم کے لیے ہدایت لے کر آئے تھے اور انہی کے زمانہ میں ان کے سامنے ایسے لوگ موجود تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے دوسری اقوام کے لئے پیغامبر بنایا تھا۔ اور جو علم خضر رکھتے تھے وہ موسیٰ کو نہ تھا اور جو موسیٰ کو علم دیا گیا تھا وہ خضر کو نہ تھا ان واقعات میں یہ سمجھانا مقصود ہے کہ سلسلہ اسرائیل جو خود مختص

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿۱﴾ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب آتاری اور اس کے لیے کوئی کجی نہ رہنے دی ۱۸۹۱

القوم تھا اس میں کل دنیا کا نجات دہندہ کس طرح آسکتا تھا - اور دوسری طرف یہ بھی اشارہ کے رنگ میں بتایا کہ خود تمہاری کتابوں میں وہ پیشگوئیاں موجود ہیں جن سے محمد رسول اللہ صلعم کی صداقت ظاہر ہوتی ہے - گیارھویں رکوع میں ایک ایرانی نبی یا مصلح کا ذکر کیا جس کا نام ذوالقرنین ہے - اور اس میں بھی یہی سمجھانا مقصود ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ ہر قوم کو الگ الگ نمونے دیتا رہا - اور ساتھ ہی اس ذوالقرنین کو یاجوج ماجوج سے مقابلہ پیش آیا جن کی روک تھام کے لیے اس نے ایک عظیم الشان دیوار بنائی اور یاجوج ماجوج کا ہی فساد بالآخر دوبارہ ظاہر ہونے والا تھا جب اسلام کو ظاہری طور پر یعنی ملکی رنگ میں بہت مغلوبیت کا پہلو دیکھنا پڑے گا مگر آخر کار اسلام ہی غالب آئے گا - اور یاجوج ماجوج جو زبردست عیسائی اقوام کے لیے ہی دوسرا نام ہے بالآخر اسلام کے سامنے گردن جھکائیں گے اس کے بعد آخری رکوع میں عیسائی اقوام کی آخری حالت کا نقشہ کھینچا عقیدتاً انسان کو خدا بنانے والے عملاً دنیا اور اس کی صنعتوں میں منہمک معلوم کرلینگے کہ نجات بغیر اسلام کے نہیں - اور کہ مسیح خدا کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے اور کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نسل انسانی کو اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات کی طرف بلاتے ہیں ؎

تعلق : اس سورت کا تعلق سورۂ بنی اسرائیل کے ساتھ نہایت صاف ہے پچھلی سورت کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا تھا - وقل الحمد للہ الذی لم یتخذ ولدا اور اس کی ابتدا الحمد للہ الذی انزل علیٰ عبدہ الکتاب سے کرکے شروع میں ہی وینذر الذین قالوا اتخذ اللہ ولدا کا ارشاد فرمایا اور بلحاظ مضمون سورت دیکھا جائے تو بھی تعلق نہایت صاف ہے پچھلی سورت میں حضرت موسیٰؑ کے بعد کی تاریخ بنی اسرائیل کا کچھ ذکر تھا اور اس میں حضرت عیسیٰ کے بعد کی تاریخ کا کچھ ذکر ہے یعنی عیسائی مذہب کی تاریخ کا - کیونکہ حضرت عیسیٰؑ حضرت موسیٰؑ کے آخری خلیفہ ہیں لیکن اگر یہود کے ذکر کو نہایت مختصر کیا تھا لتفسدنّ فی الارض مرّتین تو عیسائیت کی تاریخ کو کہف کی حالت سے شروع کرکے یحسنون صنعا تک بیان کیا یعنی ایک طرف ان کی رہبانیت اور ترک دنیا اور دوسری طرف حد درجہ کی دنیا پرستی اور خدا کا نام تک ترک کر دینا - اور عالم الغیب خدا کے کلام میں ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہود اس قوت و اقتدار کو حاصل نہیں کریں گے جسے عیسائی حاصل کریں گے - ایک لطیف تعلق یہ بھی ہے کہ سورہ بنی اسرائیل میں اسریٰ کے ذکر میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی طرف اشارہ تھا اور یہاں اس ہجرت میں کہف یعنی جائے امن ملنے کی خوشخبری دی۔

زمانہ نزول ۔ اس سورت کا وہی ہے جو سورۂ بنی اسرائیل کا یعنی قریباً پانچواں سال بعثت کا یا اس سے بھی پیشتر اور یہ ان سورتوں میں سے ایک سورت ہے جو جملۃً واحدۃً نازل ہوئی ہیں یعنی ساری سورت ایک ہی وقت میں نازل ہوئی اور اس کی بنا ایک حدیث ہے (د) اور یہ ساری مکّی سورت ہے۔

۱۸۹۱ ولم یجعل لہ عوجاً - ابن عباسؓ نے اس جملہ کو معترضہ قرار دیا ہے تو گویا ترکیب یوں ہوئی انزل علیٰ عبدہ الکتاب قیما (ج) اور لم یجعل لہ عوجاً کے معنی کیے گئے ہیں کہ اس میں کوئی میل عن الحق یا التباس نہیں (ج) یا اس میں کوئی اختلال لفظی یا تناقض معنی نہیں (د) مگر دوسری جگہ ہے یا اھل الکتاب لم تصدون عن سبیل اللہ من اٰمن تبغونہا عوجا (اٰل عمرانؔ - ۹۹) اور الذین یصدّون عن سبیل اللہ یبغونہا عوجا (الاعرافؔ - ۴۵) یعنی حق کے دشمن لوگوں کو اس سے روک کر سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہاں اسی طرف اشارہ ہو کہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کامل بندہ محمد صلعم پر قیم ہونے کی حالت میں اتارا ہے اس لیے جو لوگ اس سے روک کر یا وساوس ڈال کر اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوسکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی کجیوں کو دور کر دیا ہے اور باقی نہیں رہنے دیا - اور چونکہ اس سورت میں خطاب عیسائیوں سے ہے جو تبغونہا عوجا کے اصل مصداق بھی ہیں اس لیے یہ معنی زیادہ موزوں ہیں اور اسی صورت میں اس کا جملہ معترضہ ہونا بھی موزوں ٹھہرتا ہے - کیونکہ کتاب کا اتارنا ہی بے معنی ہوتا اگر مخالف اس سے روک کر اس میں عوج پیدا کرسکتے اور عوج پیدا کرنا یہی ہے کہ اس غرض کو جس کے لیے کتاب اتاری گئی ہے پورا نہ ہونے دیا جائے۔

اس سورت کو حمد کے ساتھ شروع کیا ہے اور حمد ربوبیت سے ہے الحمد للہ رب العالمین پس مراد یہ ہے کہ کتاب کا اتارنا انسانوں کی ربوبیت کے لیے ہے اور اس میں بالخصوص ربوبیت روحانی کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ قیّم سے بھی ظاہر ہے کیونکہ اسی سے کمال انسانی حاصل ہوتا ہے اور اس سورت کی ابتدا ربوبیت روحانی کے ذکر سے اسلیئے کی کہ اس میں اس قوم کا ذکر ہے جو بالکل دنیا کی زندگی پر گر گئی الذین ضلّ سعیہم فی الحیٰوۃ الدنیا (۱۰۴) یعنی عیسائی قوم ؎

فتنۂ دجال سے مراد فتنہ عیسائیت ہے : حدیث صحیح میں ہے جسے مسلم ابوداؤد ترمذی اور امام احمد نے روایت کیا ہے عن النبی صلعم قال من حفظ عشر اٰیات من اول سورۃ الکہف عصم من الدجال یعنی نبی صلعم نے فرمایا کہ جو شخص سورت کہف کی ابتدائی دس آیتیں یاد رکھے گا وہ دجال سے محفوظ رہے گا اور دوسری حدیث میں جو اسے بھی مسلم اور نسائی اور احمد نے روایت کیا ہے یہ لفظ ہیں قال من قرأ العشر الاواخر من سورۃ الکہف عصم من فتنۃ الدجال یعنی جو شخص سورۂ کہف کی پچھلی دس آیات پڑھے گا وہ فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا - اور احمد کی ایک روایت میں ان دونوں

قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ — قائم رکھنے والی — تاکہ اس کی طرف سے سخت عذاب سے ڈرائے
وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ — اور ان مومنوں کو خوش خبری دے جو اچھے عمل کرتے ہیں کہ
الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝۲ — ان کے لیے اچھا اجر ہے ۱۸۹۲ء
مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝۳ — وہ اس میں ہمیشہ ٹھیرنے والے ہیں۔
وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝۴ — اور انھیں ڈرائے، جو کہتے ہیں اللہ نے بیٹا بنا لیا ۱۸۹۳ء

کو یوں جمع کیا ہے کہ جو شخص سورۂ کہف کی پہلی اور پچھلی آیتوں کو پڑھے گا اس کے سر سے قدم تک نور ہو جائے گا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ قرآن شریف ایک پر حکمت علمی کتاب ہے اور تعویذوں منتروں کی طرح اپنے آپ کو پیش نہیں کرتا کہ فلاں لفظ کے پڑھ لینے سے فلاں مشکل حل ہو جاتی ہے پس یہ غور طلب ہے کہ ان پہلی اور پچھلی دس آیتوں میں کیا خاص بات ہے جو فتنۂ دجال سے بچا سکتی ہے ایک سرسری نظر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں جگہ عیسائیت کا ذکر ہے پہلی دس آیات میں قالوا اتخذ اللہ ولدا میں بلحاظ عقیدہ کہ وہ خدا کا بیٹا بناتے ہیں اور انا جعلنا ما علی الارض زینۃ میں بلحاظ عمل یعنی زمین کو زینت دیں گے اور پچھلی دس میں ان یتخذ وا عبادی من دونی اولیاء میں بلحاظ عقیدہ اور الذین ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا میں بلحاظ عمل کہ ان کی ساری کوشش دنیا پر اور صنعتوں پر صرف ہوگی تو جب ان کے عقاید اور اعمال کی طرف توجہ دلادی اور یہ بھی بتا دیا کہ ان کی دنیوی ترقیوں کی ظاہری دلفریبیوں پر نہ جانا تو ان کے فتنہ سے بچنے کی راہ بتا دی اور ایک مسلمان پر جو قرآن کے خدا کا کلام ہونے پر ایمان لاتا ہے آج تیرہ سو برس بعد ان نظاروں کو دیکھ کر جو قرآن شریف میں پہلے سے بتائے ہوئے موجود ہیں خدا کے کلام پر اور ایمان بڑھتا ہے اور یوں وہ عیسائیوں کے عظیم الشان فتنہ سے بچتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دجال کا فتنہ ہی عیسائیت کا فتنہ ہے اور قرآن شریف اپنی راحت سے اس پر شاہد ہے حدیثوں میں تو دجال کی تعیین میں بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں یہاں تک کہ بعض حدیثوں میں ابن صیاد پر جزم معلوم ہوتا ہے حالانکہ وہ مسلمان ہو کر مرا مگر قرآن شریف میں ایسی پکی بات ہے جس پر کسی کو اعتراض کی گنجایش ہی نہیں۔

احادیث میں لفظ دجال اختیار کرنے کی وجہ اور لفظ کی لغوی تشریح: اس جگہ لفظ دجّال کی لغت دیدینا بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا تا معلوم ہو کہ کیوں احادیث میں عیسائیت کی جگہ مسیح الدجّال کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ دجل الشئ کے اصل معنی ہیں غطّاہ یعنی اسے ڈھانک دیا اور دجّال کے مختلف معنی اس لحاظ سے ہیں کہ ڈھانکنا کیسا ہے چنانچہ اس کے پہلے معنی کذاب ہیں اس لیے کہ جھوٹ سے بھی ایک پردہ ڈال دیا جاتا ہے اور ابن سیدہ کہتے ہیں دجال کا نام دجال اس لیے رکھا گیا کہ وہ حق کو باطل کے ساتھ ڈھانک دیگا اور کہا گیا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی جماعتوں کی کثرت سے زمین کو ڈھانک لے گا اور بعض نے کہا اس لیے کہ وہ لوگوں پر اپنے کفر کا پردہ ڈال دیگا اور حدیث میں ہے یکون فی اٰخر الزمان دجالون یعنی آخری زمانہ میں دجال ظاہر ہوں گے اور ایک میں ہے کہ قیامت سے پہلے دجال ہونگے اور ازہری نے کہا کہ ہر کذاب دجال ہے اور دجال کے ایک معنی ہیں بڑا گروہ جو اپنی کثرت کی وجہ سے ساری زمین پر پھیل جائے اور بعض کے نزدیک ایسا گروہ جو اپنا سامان تجارت کے لیے اٹھائے پھرے اور یہ بھی لکھا ہے کہ دجال کو دجال اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ جو کچھ دل میں رکھتا ہے اس کے خلاف ظاہر کرتا ہے (ل)۔ اب اس تمام تشریح سے جو لسان العرب سے نقل کی گئی ہے کس قدر صفائی سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے جو عیسائیت کے فتنہ کو فتنۂ دجال قرار دیا ہے تو یہ بالکل صحیح ہے اور آج واقعات نے کس دل کو اس بات کا قائل نہیں کر دیا کہ اس کے سوا دوسرے دجال کا تلاش کرنا صریح غلطی ہے حدیث کے استعارات کو حقیقت پر محمول کرنے سے یہ غلطی پیدا ہوئی ہے۔ اور مسیح الدجال کا لفظ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ مسیح کی اصل تعلیم کے بالکل خلاف وہ تعلیم ہے جو عیسائیت اس وقت دنیا میں پھیلا رہی ہے۔

۱۸۹۲ء قیّمًا۔ قیام کے معنی کسی چیز کی نگہداشت اور حفاظت کرنا ہیں اور یہاں کتاب کو قیم کہا ہے (جو مبالغہ کا صیغہ ہے) اور دوسری جگہ دین کو قیّم کہا ہے ذٰلک الدّین القیّم (التوبۃ ۹-۳۶) اور ایک جگہ ہے ذٰلک دین القیّمۃ (البیّنۃ ۹۸-۵) اور دین کے قیم ہونے سے مراد ہے مضبوط اور معاش اور معاد کے امور کو قائم رکھنے والا اور فیھا کتب قیّمۃ (البیّنۃ ۹۸-۳) میں اشارہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں کے معانی کی طرف ہے جو قرآن میں موجود ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی پہلی ساری کتابوں کے ثمرات قرآن میں جمع ہیں اور اللہ تعالیٰ کو قیوم کہا ہے یعنی سب چیزوں کی حفاظت کرنے والا اور ان کے قیام کے سامان عطا کرنے والا (غ) اور فراء کا قول ہے کہ وہ ساری کتب سماوی پر قیم ہے یعنی ان کی حفاظت کرنے والی اور ابو مسلم کہتے ہیں مصالح عباد کو قائم کرنے والی اور ان کی متکفل اور بعض نے کہا اپنی ذات میں کامل دوسرے کو کامل کرنے والی (ر) اور حقیقت میں وہ دونوں رنگ میں قیم ہے یعنی کتب سماوی کی صحیح تعلیم کی حفاظت بھی اس نے کی جیسا کہ دوسری جگہ اسے مھیمنا علیہ (المائدۃ ۵-۴۸) کہا ہے اور وہ انسان کو اپنے کمال کو پہنچانے والی بھی ہے اور تعلیم کو بھی۔ اور اس کی تعلیم کے کمال سے اس کا پیرو بھی اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔

دو باتیں بیان کی ہیں ایک سخت عذاب کا انذار یہ ان کے لیے ہے جو یبغونھا عوجا کے مصداق ہیں اور دوسرا اجر حسن اور یہ ان کے لیے

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ
انھیں اس کے متعلق کچھ بھی علم نہیں اور نہ ان کے بڑوں کو تھا
كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ
بڑی بات ہے جو اُن کے مونہوں سے نکلتی ہے وہ جھوٹ
اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۵
ہی کہتے ہیں ۱۸۹۴
فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ
تو کیا تو اپنی جان کو ان کے پیچھے غم سے ہلاک کر دے گا اگر وہ
اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۶
اس بات پر ایمان نہ لائیں ۱۸۹۵
اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا
جو کچھ زمین پر ہے ہم نے اسے اس کے لیے زینت بنایا ہے تاکہ
لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۷
انھیں آزمائیں کہ کون ان میں سے بہترین عمل کرنے والا ہے۔
وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ؕ ۸
اور ہم یقیناً اسے جو اس پر ہے خالی زمین چٹیل میدان بنا دیں گے۔ ۱۸۹۶

ہے جو اس کے پیچھے چل کر اپنے کمال کو حاصل کرتے ہیں اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوتیں تو اس کے کمال میں نقص ہوتا۔

ع ۱۸۹۳ عیسائی اقوام کی مخالفت اسلام: حالانکہ پہلے بھی انذار کا ذکر کیا ہے مگر یہاں پھر دوہرایا اور یہاں انذار کو اس قوم سے خاص کیا جو اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹا بنانا منسوب کرتے ہیں یعنی عیسائی اور یہ گویا عطف خاص علی العام ہے یعنی پہلے تو تمام ان مخالفین کا ذکر تھا جو بیغونہا عوجا کے مصداق ہیں اور اب ایک خاص قوم کا ذکر کیا جو سب سے بڑھ کر قرآن شریف کے پھیلنے میں روک ہونے والی تھی اور اس خاص ذکر میں یہی اشارہ ہے کہ سب مخالفتوں سے بڑھ کر ان کی طرف سے اسلام کی مخالفت ہو گی۔ یہ خیال کہ اس سے مراد مشرکین عرب ہیں بالکل غلط ہے اس لیے کہ آگے صاف ذکر اصحاب کہف کا ہے جو عیسائی تھے۔

ع ۱۸۹۴ کبرت کلمۃ۔ نصب علی التمیز ہے گویا فرمایا کہ جو بات یہ کہتے ہیں وہ کتنی بڑی بات ہے۔

عیسائیت کے اصل الاصول پر کوئی علمی یا عقلی دلائل نہیں: عیسائی عقیدہ ابنیت والوہیت مسیح پر اس سے بڑھکر کوئی زد نہیں ہو سکتی تھی جو قرآن شریف نے یہاں فرمایا یعنی اس عقیدہ اتخاذ ولد کا نہ انہیں علم حاصل ہے یعنی نہ ان کے پاس کوئی علمی دلائل ہیں نہ ان کے باپ دادوں کے پاس تھیں جس چیز کے لیے کوئی علمی اور عقلی دلائل پیش کی جائیں اس کی تردید دلائل سے کی جا سکتی ہے مگر عیسائیت نے اپنے عقیدہ کو خود بھی اس قدر عقل اور علم سے دور سمجھا ہے کہ اس مذہب کے مشنری سے جب ابنیت کفارہ وغیرہ کی عقلی دلائل پوچھو تو یہ جواب ملے گا کہ اسے مان لوگے پھر اس کی صداقت معلوم ہو جائے گی اور یہ صاف الفاظ میں اس بات کا اعتراف ہے کہ اس کے لیے کوئی علمی یا عقلی دلائل موجود نہیں اور نہ صرف ان کے پاس نہیں بلکہ جب سے یہ عقیدہ ایجاد ہوا کبھی اس پر کوئی علمی دلائل پیش نہیں کی گئیں۔

ع ۱۸۹۵ باخع۔ بخع کے معنے ہیں غم کے ساتھ اپنے آپ کو ہلاک کر دینا (غ) لعلّک باخع نّفسک الا یکونوا مؤمنین (الشعراء ۲۶ – ۳)

علی اٰثارھم کے لفظی معنی ہونگے ان کے پیچھے۔ اور مراد ہے ان کے ایمان سے پھر جانے کے بعد۔

جب خدا کا بیٹا ماننے والی قوم کا ذکر کیا تو ساتھ ہی ان کے اس کفر پر اصرار کا بھی ذکر کیا۔ آج تیرہ سو سال سے اسلام ان کے سامنے ہے مگر سوائے تھوڑوں کے انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ نہ صرف اس آیت سے بلکہ اس سے اگلی آیات سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کو ان کی دنیوی زیب وزینت کا اور اسلام سے اعراض کا نقشہ دکھایا گیا اور اس کا ثبوت احادیث صحیحہ سے بھی ملتا ہے جہاں نزول عیسیٰ کی ضرورت یہ بتائی کہ وہ کسر صلیب کریگا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلیبی غلبہ آپ کو دکھایا گیا تھا۔ اور آپ کے قلب کو اس سے اتنا رنج پہنچا تھا کہ فرمایا تو اس رنج میں اپنے آپ کو ہلاک کر دے گا۔ نبی کریم صلعم کے سینہ میں جو درد نسل انسانی کے لیے تھا اس کی تہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی فکر میں گزرتا تھا کہ کس طرح انسان اپنے مولیٰ کے حضور سر جھکائے۔ پس جس طرح اس قوم کی وجہ سے جو آپ کے سامنے کفر پر اصرار کر رہی تھی آپ کو رنج وغم تھا اسی طرح ان قوموں کے لیے بھی تھا جو بعد میں آنے والی تھیں اور آپ نسل انسانی کے لیے اسی غم میں گھل رہے تھے۔ مگر جس طرح اس غم نے پہلے اپنا اثر دکھایا اور وہ قوم مسلمان ہو گئی اسی طرح ضرور ہے کہ آنحضرت صلعم کا یہ درد اب بھی اپنا رنگ لائے۔

ع ۱۸۹۶ جُرُز۔ جَرْز کے معنی ہیں جلدی سے کھا جانا اور جَرُوز بہت کھانے والے کو کہتے ہیں جو دسترخوان پر کچھ باقی نہ چھوڑے اور ارضٌ جُرُزٌ سے مراد وہ زمین ہے جس میں سبزی نہ اُگے گویا کہ وہ نبات کو کھا گئی انّا نسوق الماء الی الارض الجرز (السجدۃ ۳۲ – ۲۷) (ل)

عیسائی اقوام کی زمینی ترقی اور ایک پیشگوئی: اس سے پہلی آیت میں بتایا تھا کہ زمین پر جو سامان ہیں وہ موجب زینت بنا دئے جائیں گے اور عیسائی اقوام نے اس میں فی الواقع کمال حاصل کیا ہے کہ جہاں ان کا تصرف ہوتا ہے وہاں وہ دنیوی زیب وزینت کے سامانوں کو کمال تک پہنچا دیتے ہیں،

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَٰبَ ٱلْكَهْفِ وَٱلرَّقِيمِ كَانُوا۟ مِنْ ءَايَٰتِنَا عَجَبًا ﴿٩﴾

کیا تو سمجھتا ہے کہ غار اور کتبہ والے ہماری عجیب نشانیوں میں سے تھے ۱۸۹؎

گویا اشارۃً بتایا کہ حق سے اعراض کی وجہ یہی ہے کہ دنیا کی زیب و زینت میں منہمک ہو جائیں گے گو چاہیئے یوں تھا کہ زمینی آرائش کے ساتھ اخلاق کی آرائش کی طرف توجہ کرتے اور سمجھتے کہ انسان کی اصل زینت دنیوی سامانوں سے نہیں بلکہ اخلاق سے ہے ایہم احسن عملا میں یہی اشارہ ہے اس کے بعد فرمایا کہ اسی خوبصورت اور آراستہ زمین کو ہم ایسی مٹی بنا دیں گے جس پر کوئی سبزی نہیں اُگتی۔ یعنی یہ ان کے دنیا کی زیب و زینت کے سامان برباد کر دیئے جائیں گے اور مراد یہ ہے کہ ان کی دنیوی ترقی جس پر ان کو فخر ہے اور جس کی وجہ سے وہ اسلام سے رُکے ہوئے ہیں ان کے کام نہ آئے گی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر یہ قوم حق کی طرف رجوع کرے گی۔ اور عام طور پر یہ بھی صحیح ہے کہ جب کبھی کوئی قوم عروج دنیوی کی انتہا پر پہنچی ہے تو اس کے بعد زوال بھی دیکھا ہے اور قوموں کے بارہ میں یہ اللہ تعالیٰ کا عام قانون ہے جس سے دنیا کی کوئی قوم نہ پہلے مستثنےٰ ہوئی نہ آیندہ ہوگی موجودہ تہذیب اور اس کے تعیش کے سامانوں کا بھی آخر وہی حشر ہوگا جو پہلے ہوتا رہا۔

۱۸۹؎ اصحاب الکھف والرقیم۔ کہف غار کو کہتے ہیں اور فلانٌ کہفٌ فلانٍ کے معنی ہیں وہ اس کی جائے پناہ ہے (ل)

رقیم۔ رَقْم سے ہے جس کے معنی ہیں موٹا لکھنا یا واضح طور پر لکھنا (غ)، اور رقیم لکھی ہوئی چیز ہے فعیل بمعنی مفعول اور اس میں اختلاف ہے کہ رقیم سے یہاں کیا مراد ہے۔ ایک قول ہے کہ وہ اس جگہ کا نام ہے اور دوسرا یہ کہ وہ کتبہ ہے جس میں ان کے نام لکھے ہوئے تھے اور ابن عباس سے ایک قول منقول ہے کہ میں نہیں جانتا الرقیم کیا ہے (ل)، اور ایک حدیث میں ہے کان یزید فی الرقم جہاں رَقْم سے مراد کپڑوں پر قیمتوں کا لکھنا ہے (ل) اور ابن جریر مختلف اقوال کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ صحیح تر قول یہ ہے کہ رقیم سے مراد تختی یا پتھر یا کوئی چیز ہے جس پر کچھ لکھا ہوا ہو (ج)

عیسائیوں کے انکار صداقت اسلامی اور ان کے دنیوی زینتوں کے سامانوں میں فوراً اصحاب کہف کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور یہ تعلق ہی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ مضمون عیسائیت سے تعلق رکھتا ہے اصحاب کہف کا مشہور قصّہ خود اسی بنا پر ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسٰی کے مذہب پر تھے اور شہنشاہ ڈیسیئس یا دقیانوس کے زمانہ کے چند نوجوان تھے۔ جنہوں نے اس بادشاہ کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر ایک غار میں پناہ لی جہاں اطلاع ملنے پر بادشاہ نے غار کے سامنے دیوار بنوا دی اور اختلاف روایات پر کوئی دو سو سال سے لیکر پونے چار سو سال تک یہ لوگ اس غار میں سوتے رہے تب وہ جاگے اور اس وقت رومن امپائر میں عیسائی مذہب کا دور دورہ تھا اس لیے ان کی اطلاع ملنے پر اس وقت کا بادشاہ خود انہیں دیکھنے گیا اور بعض روایات کے مطابق اس نے انہیں دیکھا اور بعض کے مطابق ان کا پتہ نہ ملا۔

اصحاب کہف کے ذکر سے قرآن کریم کی اصل غرض: فی الواقع کوئی ایسے لوگ تھے یا نہیں۔ بظاہر اس قصّہ کی عام شہرت بتاتی ہے کہ ان روایات میں گو کچھ غلط ملط ہو گیا ہو مگر کچھ نہ کچھ اصل اس کی ضرور تھی لیکن قرآن شریف کے ظاہر الفاظ بتاتے ہیں کہ غار کا منہ بند ہو جانے پر ان لوگوں کا اندر سویا رہنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ آیت ۱۸ کے مضمون سے ظاہر ہے پس جس رنگ میں یہ مشہور ہے اس رنگ میں قرآن شریف نے اسے قبول نہیں کیا اور ابتدا میں ہی انہیں بجائے اصحاب کہف کے اصحاب الکھف والرقیم کے نام سے یاد کیا ہے اصحاب الکھف تو وہ لوگ ہونگے جو غار میں رہے مگر اصحاب الرقیم سے کیا مراد ہے اس میں مفسرین کا بھی بہت کچھ باہم اختلاف ہے۔ رقیم کے معنی جو اوپر بیان ہوئے ہیں اُن سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا امتیازی نشان جس طرح پر غار ہے اسی طرح ایسی تختیاں بھی ان کا امتیازی نشان ہے جن پر کچھ لکھا ہوا ہو۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک تختی پر ان کا قصّہ یا ان کے نام لکھے ہوئے تھے اسی لحاظ سے انہیں اصحاب الرقیم کہا گیا ہے لیکن ایسی کوئی تختی آج موجود نہیں ہے علاوہ ازیں قرآن کریم میں جو قصص مذکور ہیں تو ان کی غرض صرف اسی قدر نہیں ہوتی کہ ایک پرانے قصّے کو دہرایا جائے بلکہ آیندہ واقعات پر بھی کچھ روشنی ڈالنا مقصود ہوتا ہے اسی لحاظ سے دیکھا جائے تو اصحاب الکھف والرقیم کے قصّہ میں عیسائیت کی تاریخ بتائی گئی ہے۔ اصحاب کہف کون تھے اور ان سے کیا معاملہ ہوا اس کے جاننے کی ہمیں اتنی ضرورت نہیں جتنی اس بات کے جاننے کی ضرورت ہے کہ وہ مذہب جس کا مقابلہ سب سے بڑھ کر اسلام سے ہونے والا تھا اس کے متعلق قرآن شریف نے کیا فرمایا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نے صرف اصحاب الکہف کا نام اختیار کرنے کی بجائے اصحاب الکھف والرقیم فرمایا ہے کیونکہ عیسائیت کی تاریخ کا خلاصہ انہی دو الفاظ میں آجاتا ہے یعنی کہف اور رقیم میں عیسائیت کی ابتدائی تاریخ غار سے وابستہ ہے اور اس کی آخری حالت رقیم سے عیسائیت کی پرورش غاروں میں ہوئی نہ صرف اس لیے کہ ابتدا میں اس مذہب کے قبول کرنے والوں کو مظالم سے تنگ آ کر غاروں میں پناہ لینی پڑی بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ عیسائیت کا پہلا رجحان رہبانیت کی طرف تھا اور اس لیے عیسائیوں میں جو بڑے بڑے لوگ ہوئے انہوں نے رہبانیت اختیار کر کے غاروں میں ہی اپنے کمال کو حاصل کیا اور دنیا کو بکلی ترک کر کے گوشہ گزینی اختیار کی جس کی طرف لفظ کہف میں اشارہ ہے اور اس مذہب کی آخری حالت رقیم سے وابستہ ہے یعنی لکھی ہوئی تختیوں سے جو اس قوم کا نمایاں امتیاز ہے کہ نہ صرف ہر زندہ شخص کے نام کی تختی لکھی ہوتی ہے نہ صرف مردہ کی قبر پر لکھی ہوئی تختی ہوتی ہے بلکہ ان کی تمام تجارتی اشیاء پر بھی ایک لکھی ہوئی تختی ہوتی ہے اور لفظ رقیم کے اختیار کرنے میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ رقم کے معنی کپڑوں پر قیمتوں کا لکھنا بھی ہیں اور تجارتی اشیا پر قیمتوں کے لکھنے میں اشارہ ان کی وسعت تجارت کی طرف معلوم ہوتا ہے یا ان

إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَآ آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ﴿۱۰﴾

جب ان نوجوانوں نے غار میں پناہ لی تو کہا اے ہمارے رب ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما اور ہمارے کام میں ہمارے لیے بھلائی مہیا کر دے ۱۸۹۸ع

فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ﴿۱۱﴾

سو ہم نے غار میں اُن کے کانوں پر گنتی کے سال (پردہ) ڈال رکھا ۱۸۹۹ع

ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا لَبِثُوٓا أَمَدًا ﴿۱۲﴾ ع ۱۳

پھر ہم نے انھیں بھیجا تاکہ ہم ظاہر کریں کہ دونوں گروہوں میں سے کون اس مدت کی بہتر حفاظت کرنے والا ہے جو ٹھیرے رہے ۱۹۰۰ع

نَّحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ ۚ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾

ہم ان کی خبر تجھ پر حق کے ساتھ بیان کرتے ہیں وہ (کئی) جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے انھیں ہدایت میں بڑھایا ۱۹۰۱ع

کے تجارت اور دنیا میں انہماک کی طرف گویا رقیم۔ کہف کے متابل پر ہے اور جس طرح کہف رہبانیت کو ظاہر کرتی ہے یعنی دین کی خاطر دنیا کو بکلی ترک کر دینا۔ اسی طرح رقیم تجارت کو ظاہر کرتی ہے یعنی دنیا کی خاطر دین کو بکلی ترک کر دینا اور تجارتی اغراض کے سامنے تمام قسم کی اغراض کو قربان کر دینا۔ سورت کے آخر پر الفاظ الذین ضلّ سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون انّھم یحسنون صنعا (۱۰۴) بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جن کی ابتدا رہبانیت تھی اس افراط کے مقام پر بھی پہنچیں گے کہ صرف دنیا کے طالب رہ جائیں۔

یہاں اصحاب الکھف والرقیم کے ذکر میں فرمایا کہ تم انہیں ہماری عجیب نشانیوں میں سے سمجھتے ہو اس میں بھی یہی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصحاب کہف اس قدر عجیب نشان نہ تھے جس قدر عجیب وہ اصل بات ہے جس کی طرف اس ذکر سے رہنمائی کرنا مقصود ہے اسی سورت میں یاجوج ماجوج کا ذکر بھی جن کا خروج آخری زمانہ سے تعلق رکھتا ہے یہی بتاتا ہے کہ اصحاب کہف کے ذکر میں خود عیسائیت کا ذکر مقصود اصلی ہے۔

۱۸۹۸ع فتیۃ۔ فتی کی جمع ہے دیکھو ۶۳۹ع اور فتیان بھی جمع آتی ہے وقال لفتیانہ (یوسف ۱۲۔ ۶۲)۔

اصحاب کہف کے غار میں پناہ لینے کی اصل غرض: مختصر طور پر اصحاب کہف کا ذکر اس (۱۰ اس سے) اگلی دو آیات میں کی ہے اور اصل حقیقت صرف اسی قدر ہے کہ وہ چند جوان تھے جنہوں نے دین کی خاطر غار میں پناہ لی اور اس غار میں کئی سالوں تک وہ باہر کی خبروں سے بے خبر رہے اور ان کی غرض وہاں جانے میں صرف اس قدر نہ تھی کہ وہ کسی ظالم کے مظالم سے بچ جائیں بلکہ ان کے دلوں میں اعلائے کلمۃ اللہ کا جوش تھا اسی لیے جب وہ غار کی طرف جاتے ہیں تو دعا کرتے ہیں کہ اے مولیٰ تو اپنی جناب سے ہمیں رحمت عطا فرما اور ہمارے معاملہ میں رُشد یعنی بھلائی یا کامیابی کی راہ پیدا کر دے اور دوسری جگہ فرمایا ویھیّیٔ لکم من امرکم مرفقا (۱۶) یعنی کوئی نفع یا فائدہ کی بات مہیا کر دے اور تم زندگی کی اصل غرض کو پالو۔ فتنہ یا ظلم کے خوف سے محض کسی غار میں چھپ کر بیٹھ رہنا کوئی رُشد نہیں بلکہ حقیقی بھلائی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا نام پھیلانے کی توفیق دے اور یہی رشد نبی کریم صلعم کو ملنے کا بھی ذکر ہے ان یھدین ربی لاقرب من ھذا رشدا دیکھو ۱۹۰۹ع

۱۸۹۹ع ضربنا علی اٰذانھم مفعول محذوف ہے۔ ضربنا علی اٰذانھم حجابا یعنی اُن کے کانوں پر پردہ ڈال دیا (ر) مفسرین نے عموماً اس سے مراد نیند یعنی سلا دینا لیا ہے۔ مگر اصل مفہوم ان الفاظ کا صرف اس قدر ہے کہ اس عرصہ میں وہ دنیا کے واقعات سے بے خبر رہے۔

سنین عددا سے مراد سنین معدودۃ ہی ہے یعنی گنتی کے سال (ج) اور راغب کہتے ہیں کہ عدد سے مراد کبھی قلت کا ظاہر کرنا ہوتا ہے اور کبھی کثرت کا اور یہاں دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ یعنی چند سال یا بہت سے سال مگر قرآن کریم نے لن تمسنا النار الّا ایّاما معدودۃ (البقرۃ ۲۔ ۸۰) میں اس کا استعمال تھوڑے پر ہی کیا ہے۔

۱۹۰۰ع احصیٰ۔ احصاء کے معنی ہیں گننا۔ احاطہ کرنا ۱۶۵۶ع مگر علم ان لّن تحصوہ (المزمل ۷۳۔ ۲۰) میں دو طرح پر معنی کئے گئے ہیں۔ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے یا تم ان اوقات کی حفاظت نہیں کر سکتے (اور حفاظت سے مراد ان اوقات میں قیام ہے جیسا کہ وہاں سیاق سے ظاہر ہے یا اعمال صالحہ سے حفاظت) اور حدیث میں آتا ہے اِنّ لِلّٰہِ تسعۃ وتسعین اسما من احصاھا دخل الجنۃ تو اس سے مراد اسمائے الٰہی کا گننا نہیں بلکہ ان کا علم حاصل کرنا ان پر ایمان لانا اور یقین رکھنا ہے اور بعض کے نزدیک ان کے مقتضیٰ کے مطابق عمل کرنا (ل)

دو فریق کون ہیں اور لبث اور زمانہ لبث کے احصاء سے کیا مراد ہے؟ دو فریق کے متعلق ذیل کے اقوال ہیں۔ (۱) قوم اصحاب کہف کے دو گروہ اور وہ دونوں کافر تھے یا ایک کافر اور ایک مسلم گروہ تھا (ج) (۲) خود اصحاب کہف اور وہ لوگ جن کے وقت میں وہ اُٹھے (۳) یہود اور نصاریٰ (۴) خالق اور مخلوق جیسے ءانتم اعلم ام اللہ۔ لبث سے مراد نیند سے جاگنا اور احصائے مدت سے مراد سالوں کی گنتی رکھنا سمجھا گیا ہے۔ لیکن سالوں کی گنتی کا حساب

وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا — اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کیا جب وہ اُٹھ کھڑے ہوئے

رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ — اور کہا ہمارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم اس کے سوائے

مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ — کسی اور معبود کو نہ پکاریں گے کیونکہ اس صورت میں ہم (ایسی) بات کہیں گے جو حق سے دور ہے ۱۹۰۲

هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ — ان ہمارے لوگوں نے اس کے سوائے اور معبود بنا لیے ہیں کیونکہ ان پر کوئی

لَوْ لَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ — کھلی سند نہیں لاتے، پس اس سے زیادہ کون ظالم ہے

اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾ — جو اللہ پر جھوٹ افترا کرتا ہے۔

وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ — اور جب تم اُن سے علیحدہ ہو گئے ہو اور اس سے جس کی وہ اللہ کے سوائے

کوئی ایسا واقعہ نہیں جس پر اللہ تعالیٰ لنعلم کا لفظ فرماتا۔ پیچھے کئی موقعوں پر دکھایا جا چکا ہے کہ ایسے موقعہ پر علم الٰہی سے مراد ایک امر کے واقعہ ہو جانے کا علم ہوتا ہے جو پہلے غیب میں ہوتا ہے بالفاظ دیگر اس علم کا دوسروں پر ظاہر کرنا جیسے مثلاً ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم (آل عمران ۱۴۲) میں مراد اصلی یہ ہے کہ ایسے واقعات ظاہر ہو جائیں جن سے لوگوں کو یہ علم ہو جائے کہ مجاہد کون ہے کیونکہ یہ علم پہلے غیب میں تھا کہ مجاہد کون ہے جب جہاد کا موقعہ آگیا تو اللہ تعالیٰ کا علم وقوع میں آگیا یعنی دوسروں پر ظاہر ہو گیا گویا علم الٰہی دو طرح پر ہے ایک وہ جو پردہ غیب میں ہے جس کا لوگوں کو کوئی علم نہیں ہوتا اور دوسرا وہ جو واقع ہو جاتا ہے تو اس کا علم دوسروں کو بھی ہو جاتا ہے اور ایسے موقعوں پر یہ دوسری قسم کا علم ہی مراد ہوتا ہے۔ اب سالوں کی گنتی کوئی ایسا واقعہ نہیں بلکہ اس قسم کا علم ہمیشہ انسانوں کے اعمال سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ وہی علم ہے جو پہلے پردہ غیب میں ہوتا ہے اور پھر وقوع میں آتا ہے اس لیے احصیٰ کے معنی بھی اسی کے مطابق لیے جائیں گے یعنی اس وقت کی حفاظت کرنا یا جس غرض کے لیے انسان کو زندگی دی گئی ہے اس کے مطابق عمل کرنا یا ان اوقات کی اعمال صالحہ سے حفاظت کرنا اور لبعث سے (دیکھو ع ۳۱۵) مراد ان کا کہف سے نکل کر دنیا میں جانا ہے یعنی جب انھوں نے اپنی تنہائی اور خلوت غار کی مدت کو بہترین طریق پر صرف کیا تو ہم نے انہیں دوسرے لوگوں کی طرف بھیجا تاکہ وہ اوروں کے لیے نیکی کا نمونہ بنیں اور دکھادیں کہ عبادت الٰہی سے انسان کس بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے اور ان کا غار میں جانا اسی غرض کے لیے تھا کہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے دنیا میں نکلیں جیسا کہ ع ۱۸۹۵ میں دکھایا جا چکا ہے نہ اس لیے کہ وہ غار میں پڑے سوئے رہیں انسان کی زندگی کی غرض سو رہنا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اصحاب کہف کے سو رہنے کے قصہ کو ہمارے لیے اپنی ہدایت کے طور پر ذکر کرتا بلکہ وہ غرض اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ اصحاب کہف کا غار میں رہنا محض ایک وقفہ تھا جس کے اندر ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے سہولت کی راہ پیدا کر دی اور دو فریق جن کا یہاں ذکر ہے ایک تو خود اصحاب کہف ہیں جن کو غار میں پناہ لینی پڑی مگر انھوں نے حق کو نہ چھوڑا اور دوسرا وہ دنیا داروں کا گروہ ہے جن کے ظلم سے انھیں پناہ لینی پڑی اور جن کی نظر دنیا سے اوپر نہ اُٹھ سکی اور وہ انسانیت کے مقام بلند کو نہ دیکھ سکے۔

تاریخ عیسائیت پر ان بیانات سے جو روشنی پڑتی ہے اس کا ذکر آگے آئیگا۔ لیکن نبی کریم صلعم کی زندگی کے واقعات کی طرف بھی اس قصہ میں اشارہ ہے اور اس کو خود قرآن کریم نے آیت ۲۴ میں ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے وقل عسیٰ ان یھدین ربی لاقرب من ھذا رشدا۔ یعنی جس قدر عرصہ اصحاب کہف کو غار میں رہنا پڑا اللہ تعالیٰ اس سے بہت قریب آنحضرت صلعم کے لیے سامان پیدا کر دے گا۔ یہ سورت ہجرت سے بہت پیشتر زمانہ کی ہے اور ایسا ہی واقعہ ہوا کہ آپ کو بھی کفار کے ہاتھ سے ایک غار میں پناہ لینی پڑی مگر آپ کو سنین عددا یعنی کئی سال کی جگہ صرف تین دن رہنا پڑا اور اس کے بعد اعلائے کلمۃ اللہ کے کام کے لیے مدینہ میں پہنچ کر رستے کھل گئے اور دوسری طرف تاریخ عیسائیت اور تاریخ اسلام میں بھی یہی اقرب رشدا نظر آتا ہے یعنی عیسائیت تین سو سال تک مغلوبیت کی حالت میں رہی اور اسلام تین سو سال کے اندر اندر ساری روئے زمین پر پھیل گیا اور ساری دنیا پر اس کی حکومت قائم ہو گئی۔

ع ۱۹۰۱ اس رکوع میں آیت ۱۰ کے مضمون کو ہی بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اصحاب کون تھے کہاں کے رہنے والے تھے ان کے نام کیا تھے یہ نہیں بتایا کیونکہ ناموں کے جاننے سے کوئی خاص فائدہ بھی نہیں، جو مطلب کی بات تھی وہ بتا دی وہ مومن تھے اور معمولی طور پر ایمان لانے والے نہ تھے بلکہ ہدایت کے ایک اعلیٰ مرتبہ پر تھے، اور اعلیٰ مرتبہ ہدایت پر وہی لوگ کہلاتے ہیں جو تمام اغراض دنیا کو چھوڑ کر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ بالحق کا لفظ لا کر بتا دیا کہ جو قصے مشہور تھے وہ صحیح نہ تھے اور انہی میں سے یہ سوئے رہنے کا قصہ ہے۔

ع ۱۹۰۲ ربطنا علیٰ قلوبہم۔ دیکھو ع ۱۲۱۱ اور ربط اللہ علیٰ قلبہ بالصبر سے مراد ہے کہ اللہ نے اس کے دل میں صبر ڈال دیا اور اسے مضبوط اور قوی کر دیا دل)

شطط۔ الافراط فی البُعد یعنی بہت دوری۔ اور شطط کہنے سے مراد ایسا قول ہے جو حق سے بہت دور ہو (غ)

یہی پہلے عیسائیوں کا مذہب تھا یعنی ایک خدا کے سوا دوسرے کو پکارنا خواہ اس کا نام بیٹا رکھا جائے یا کچھ اور حق سے بہت دُور بات ہے۔

آج مسیحیت کی تعلیم مسیح کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے اور اسی لحاظ سے یہ تعلیم مسیح الدجال کی تعلیم ہے۔

فَأْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ
رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾
وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ
كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ
تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ
مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ
اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ
لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾ ع

عبادت کرتے ہیں تو غار میں پناہ لو تاکہ تمہارا رب تمہارے لیے اپنی رحمت (کے سامان)
پھیلا دے اور تمہارے کام میں سہولت مہیا کردے ۱۹۰۳
اور تو سورج کو دیکھیگا کہ جب وہ نکلتا ہے تو ان کے غار سے
دائیں طرف کو جھک جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو اُن سے
بائیں طرف کترا جاتا ہے اور وہ اس کے ایک کھلے میدان میں ہیں
یہ اللہ کے نشانوں میں سے ہے جسے اللہ ہدایت دے تو وہی ہدایت
پانے والا ہے اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے تو تو اس کے
لیے کوئی دوست راہ بتانے والا نہ پائے گا ۱۹۰۴

ع۱۹۰۳ ینشر۔ نَشر کے معنی پھیلانا ہیں کپڑا ہو یا کاغذ یا نعمت یا بات۔ اور نشور مُردہ کا جی اٹھنا واذا الصّحف نشرت (التکویر۸۱-۱۰) والناشرات نشرا (المرسلٰت۷۷-۳) والیہ النشور (الملک۶۷-۱۵) (غ)

یھیئ۔ ھَیْئَۃ وہ حالت ہے جس پر کوئی چیز محسوس ہو یا معقول کھیئۃ الطیر (المائدۃ۵-۱۱۰) (غ) اور تھیئۃ کسی ہیئت کا بنا دینا ہے پھر کسی چیز کے لاموجود کرنے یا اس کے سہل کر دینے پر بھی بولا جاتا ہے (ل) مرفق کے لیے دیکھو ع۷۹۳۔

یہاں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ غار میں صرف ایک وقت کے لیے پناہ لیتے ہیں اور ان کی دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی اور رستہ کھول دے جو ان کے لیے نفع کا موجب ہو جیسا کہ لفظ مرفق لا کر بتا دیا غرض لفظ لفظ سے یہ شہادت ملتی ہے کہ اصحاب کہف کے مدنظر کوئی عظیم الشان کام تھا۔

ع۱۹۰۴ تزاور۔ زَارَہ کے معنی ہیں اس سے ملاقات کی اور زَوَد میلان کو کہتے ہیں اور تزاور اصل میں تتزاور ہے اور اس کے معنی ہیں تمیل یعنی مائل ہونا۔ اور زُور جھوٹ کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی اصل جہت سے ایک طرف جھک جاتا ہے ظلماً وزورا (الفرقان۲۵-۴) قول الزّور (الحج۲۲-۳۰) (غ)

تقرض۔ قَرض کے معنی قطع یا کاٹنا ہیں اور کسی جگہ سے کترا کر یعنی ایک طرف ہو کر نکل جانے پر بھی بولا جاتا ہے (غ)

فجوۃ اس کا اصل فجا ہے اور دو چیزوں کے درمیان جو کھلی اور وسیع جگہ ہو اسے فجوۃ کہا جاتا ہے (غ)

کہف سے سورج کے پھر جانے سے مراد: حاصل مطلب آیت کے پہلے حصّہ کا تو صرف اس قدر ہے کہ یہ لوگ ایسی جگہ پر تھے جہاں انھیں غار کی تنگی اور سورج کی دھوپ ایذا نہیں دیتی تھی پھر بعض کے نزدیک یہ اس لیے تھا کہ کہف کا دروازہ بنات نعش کے مقابل پر تھا اور بعض کے نزدیک اللہ تعالےٰ خرق عادت کے طور پر سورج کو ان کی غار سے پھیر دیا کرتا تھا اور گروہ ثانی کے نزدیک ذٰلک من اٰیات اللہ اس کی دلیل ہے (ر) اور ابن کثیر کہتے ہیں کہ ان الفاظ سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ کہف کا دروازہ شمال کی طرف تھا کیونکہ اگر مشرق مغرب یا جنوب کی طرف ہوتا تو یہ بات اس پر صادق نہ آتی اور من اٰیات اللہ اسے اس لیے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی غار کی طرف ہدایت دیدی (ت)

کہف اور اس کا محل وقوع: اور جو کچھ ابن کثیر نے کہا ہے وہ بالکل درست ہے کیونکہ خط استوا سے شمال کی طرف شمال رُخ مکانات میں دھوپ کم داخل ہوتی ہے اور خط استوا سے جس قدر زیادہ شمال کی طرف جگہ ہوگی اسی قدر زیادہ اس پر یہ الفاظ صادق آئیں گے اور مفسرین کے اقوال مختلف ہیں بعض کے نزدیک یہ جگہ ایلہ کے قریب تھی اور بعض کے نزدیک نینویٰ کے قریب اور بعض نے اسے بلاد روم میں اور بعض نے بلاد بلقاء میں قرار دیا ہے۔ لیکن جس طرح یہ الفاظ ایسی غار پر صادق آتے ہیں اس سے بڑھ کر صحت کے ساتھ کسی شمالی ملک پر صادق آتے ہیں۔ کیونکہ شمالی ممالک میں سورج سر پر نہیں آتا بلکہ نیچے کی طرف مائل رہتا ہے یعنی طلوع سے لیکر دوپہر تک دائیں طرف جھکا رہتا ہے اور دوپہر سے لیکر غروب تک بائیں طرف کو جھکا رہتا ہے اور ایسے ممالک میں سورج کی تیزی بہت کم ہو جاتی ہے جیسے ممالک یورپ ہیں کہ ان سب پر یہ بیان نہایت صفائی سے صادق آتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ عیسائیت کا پہلا رخ شمال کی طرف ہی ہوا ہے اور بعض روایات سے جن کا ذکر انسکلو پیڈیا برٹینیکا میں ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف آرمینیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دولتمند شاگردوں میں سے تھا مع کچھ اور رفقا کے انگلستان میں آیا۔ چنانچہ مضمون یوسف آرمینیا کے نیچے لکھا ہے کہ سینٹ فلپ نے یوسف آرمیتیا کو انگلستان میں بھیجا اور وہ سومرسٹ شائر (انگلستان) میں ایک چھوٹے سے جزیرہ میں آکر رہا اسی انسکلو پیڈیا کے دسویں ایڈیشن میں ہے کہ یوسف آرمیتیا ۶۳ء میں پھرتا پھرتا برطانیہ میں آیا اور بھی بہت سی روایات ہیں جن کو جب اس تاریخی امر کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے کہ یوسف ارمیتیا کا نام حواریوں کی ان سرگرمیوں میں جو حضرت عیسیٰؑ کے بعد اس ملک میں جاری رہیں نظر نہیں آتا تو یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ یوسف ارمینیا کسی دوسری جگہ چلا گیا۔ اور مظالم تو ابتدائی عیسائیوں پر ہوتے ہی تھے۔ اور غالباً اور بھی کوئی شاگرد یا مسیحی مذہب کے پیرو اس کے ساتھ آئے ہوں گے۔ پس ہو سکتا ہے

وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ۖۗ وَّ
نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ ۖۗ
وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ
لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا
وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾

اور تُو انھیں جاگتے ہوئے سمجھتا ہے اور وہ سوئے ہوئے ہیں اور ہم انھیں دائیں بائیں پھیرتے ہیں، اور اُن کا کتّا چوکھٹ پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے اگر تو ان پر جھانکے تو بھاگتا ہوا ان سے پیٹھ پھیر لے، اور تجھ پر اُن سے دہشت چھا جائے ؏۱۹۰۵

وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ
قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا
اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ
فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ

اور اسی طرح ہم نے انھیں اُٹھا کھڑا کیا تاکہ ایک دوسرے سے سوال کریں اُن میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ تم کتنی مدت ٹھیرے رہے (بعض نے) کہا ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھیرے رہے (اوروں نے) کہا تمھارا رب خوب جانتا ہے تم کتنا ٹھیرے رہے۔ اب اپنے میں سے ایک کو اپنے اس روپے کیساتھ شہر کی طرف بھیجو

کہ کہف سے مراد یہی ملک انگلستان ہی ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ دوسرے یورپ کے ممالک بھی ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کہف کوئی غار ہو جو کسی اور جگہ شمال رُخ واقع ہو۔

؏۱۹۰۵ ایقاظ۔ یَقَظَۃ نیند کی ضد ہے اور فعل اِسْتَیْقَظَ ہے اور یَقْظان صفت ہے جس کی جمع اَیْقَاظ ہے اور یہ یَقِظ اور یَقُظ کی بھی جمع ہے جس کے معنی ہیں چوکس۔ یعنی جس شخص میں معرفت اور ذہانت ہو (ل)

رقود۔ رُقاد۔ اچھی تھوڑی نیند کو کہتے ہیں اور رُقُود مصدر بھی ہے اور رَاقد کی جمع بھی (غ) اور رَقَدَ الحرُّ کے معنی ہیں گرمی ساکن ہوگئی اور اَرْقَدَ بالمکان کے معنی ہیں مکان میں قیام کیا (ل)

وصید۔ گھر اور کوٹھری کے صحن کو کہتے ہیں اور وَصِیدَۃ اس گھر کو کہا جاتا ہے جو پہاڑوں کے اندر پتھروں سے مال کے لیے بنایا جائے (ل) اوصَدْتُ الباب کے معنی ہیں اسے بند کر دیا اور مضبوط کر دیا اور یہی معنی اَصَدَ کے ہیں اور مؤصَدَۃ اسی سے ہے اِنَّھا علیھم مُؤصدۃ (الھمزۃ ۱۰۴ - ۸) یعنی ہر طرف سے ان پر بند کیا گیا (ل) اور بعض نے وصید کے معنی چوکھٹ یا دروازہ بھی کیے ہیں (ج)۔

اطلعت۔ طَلَعَ سورج کے نکلنے پر بولا جاتا ہے اور اسی سے طَلَعَ اور اِطَّلَعَ (مصدر اِطِّلاع) کے معنی ہیں ایک چیز کو دیکھ کر اس کی حالت کی خبر پائی (غ) ھل انتم مُطَّلِعون (الصّٰفّٰت ۳۷ - ۵۴) اطّلع الی الٰہ موسٰی (القصص ۲۸ - ۳۸)

اصحاب کہف کا سونا: اگر یہاں انہی لوگوں کا ذکر ہے جو غار میں چلے گئے تھے تو ظاہر ہے کہ یہ صدیوں یا سالوں کی نیند نہیں کیونکہ لفظ رقود کی تشریح جو امام راغب نے کی ہے اس کے لحاظ سے یہ لفظ تھوڑی نیند پر بولا جا سکتا ہے نہ اتنی لمبی اور گہری نیند پر۔ لیکن یہاں پر کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ اس سے کیا مطلب ہے کہ وہ سو رہے تھے اور دیکھنے والا انہیں جاگتا ہوا سمجھتا۔ بعض نے کہا ان کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں بعض نے کہا شدت حفاظت اور قلت تغیر حوان پر تھا اس کے لحاظ سے بعض نے کہا کروٹ لینے کی وجہ سے ان ساری توجیہات میں کوئی تسلی بخش جواب نہیں اور لکھا ہے کہ کروٹ سال میں ایک دفعہ یا چھ ماہ میں ایک دفعہ لیتے تھے اور آنکھیں کھلی رکھنے کا کیا مطلب تھا اور پھر اس سارے قصّے کو دہرانے کا کیا منشا ہے۔ دوم کتّے کا ذکر یہاں ساتھ شروع کیا آیا وہ بھی بطور اعجاز سویا رہا یا نہیں بعض کہتے ہیں سویا رہا۔ بعض کہتے ہیں سویا نہیں پہرہ دیتا تھا اور اسے غذا اپنے ہاتھ چاٹنے سے پہنچ جاتی تھی۔ اس پہرہ کا کیا منشا تھا کیا جس طرح سانپ اور بچھو سے ان کی حفاظت کی گئی اسی طرح جنگلی درندوں وغیرہ سے ان کی حفاظت نہ ہو سکتی تھی۔ سوم کروٹیں بدلاتے رہنے میں کس حکمت کا اظہار ہے۔ اگر بطور اعجاز تین سو سال تک سوئے رہے تو یہ اعجاز کیا خدا تعالیٰ کی قدرت سے باہر تھا کہ بغیر کروٹ بدلنے کے وہ پڑے رہتے اور اگر کروٹیں لیتے بھی تھے تو اس ذکر کا یہاں کیا مطلب ہے۔

اقوام یورپ کی دنیوی ہشیاری اور دینی غفلت: میرے نزدیک اس آیت میں ذکر ان لوگوں کا ہے جن کی طرف پچھلے رکوع کی آخری آیت میں من یضلل کہہ کر اشارہ کیا ہے یعنی انہی اصحاب کہف کے جانشین جو دنیا میں غرق ہو کر اصحاب الرقیم بنے۔ اپنی دنیوی جدوجہد کے لحاظ سے وہ ایقاظ ہیں نہ صرف جاگتے ہیں بلکہ کمال درجہ کی مستعدی اور ذہانت دکھا رہے ہیں لیکن حقیقت سے بے خبر ہونے کے لحاظ سے وہ سوئے ہوئے ہیں اور دنیا میں دائیں بائیں یعنی ہر جانب میں پھر بھی رہے ہیں اور کوئی جگہ نہیں جسے انہوں نے چھوڑا ہو۔ اور حدیث میں جو دجال کا ذکر آتا ہے کہ اس کی دائیں آنکھ ماری ہوئی ہوگی تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کی دینی آنکھ اندھی ہوگی اور یوں یہ حدیث اسی آیت کے مضمون کو دہراتی ہے اور کتے کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ بھی ان کی خصوصیت

فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿١٩﴾

سو وہ دیکھے کہ کونسا اُن میں زیادہ ستھرا کھانا ہے پس تمہارے پاس اس میں سے کھانا لائے اور چاہیئے کہ وہ نرمی کرے اور تمہارا پتہ کسی کو نہ لگنے دے ۱۹۰۶

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿٢٠﴾

کیونکہ اگر وہ تم پر غالب آ جائیں تو تمھیں سنگسار کریں گے یا اپنے مذہب میں لوٹا دیں گے اور اس وقت تم کبھی کامیاب نہ ہوگے۔

نصف القرآن باعتبار اعداد الحروف بان التاء بعد الباء من النصف الاول و اللام الثانية من النصف الاخير ۱۲

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ

اور اسی طرح ہم نے (لوگوں کو) ان پر مطلع کر دیا، تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور کہ قیامت میں کچھ بھی شک نہیں

ہے جس قدر محبت اس قوم نے کتے سے کی ہے اور کسی نے نہیں کی ان کی عورتیں کتوں کو گودیوں میں لیکر بچوں سے زیادہ محبت کرتی ہیں کتوں کا منہ چاٹتے اور چومتے بلکہ ان کی زبانوں تک چوستے ہیں اور قریباً ہر شخص کتا بھی ضرور اپنے ساتھ رکھتا ہے شاید کوئی مناسبت روحانی بھی ہے کیونکہ کتا حرص میں ضرب المثل ہے اور ان قوموں کی مال دنیا کی حرص بھی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور یا کتے سے مراد انہیں قوموں میں سے کوئی قوم ہے جو بسبب اپنی وسیع طاقت کے گویا ہر وقت چوکھٹ پر موجود ہے اور ان کے لیے محافظ کا کام دیتی ہے اس کے لیے دیکھو ع۱۹۰۸ اور آخر میں ان کی ظاہری شان و شوکت کا ذکر کیا جو اس قدر ہے کہ ان ظاہری سامانوں کو دیکھ کر جوان میں سے قریباً ہر شخص کو میسر ہیں دیکھنے والا مرعوب ہو جاتا ہے۔

ع۱۹۰۶ ورق۔ ورق درخت کے پتوں کو کہتے ہیں واحد وَرَقَۃ ہے اور جمع اَوْرَاق۔ وما تسقط من ورقۃ (الانعام۔ ۵۹) (اور کتاب کے ورقوں کو بھی) اور مال کثیر کو بھی کہتے ہیں گویا وہ اپنی کثرت میں درخت کے پتوں کی طرح ہے اسی لحاظ سے مال کو تری یا تُراب یا بَسِل بھی کہا جاتا ہے اور وَرِق اور ورق کے معنی دراہم یا روپے ہیں (غ)

یتلطف۔ لطیف اسمائے الٰہی میں سے ہے جس کے لیے دیکھو ع۹۹۴ اور لطیف وہ ہے جو حاجت نرمی سے پہنچا دے اور ابن اثیر کہتے ہیں لطیف وہ ہے جس میں یہ چیزیں جمع ہوں یعنی فعل میں نرمی اور باریک مصالح کا علم اور اس کی طرف پہنچانا جس کے لیے اس کا اندازہ کیا ہے اور لُطف دوسرے سے نرمی کرنا ہے اور کسی امر میں تَلَطُّف اس کے لیے تَرَفُّق یا نرمی ہے۔

اس آیت میں پھر اصحاب کہف کا ذکر ہے آیت ۱۶ میں فرمایا تھا کہ جب غار میں گئے تو انہوں نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی مفید راہ پیدا کر دے تو اللہ تعالیٰ نے آخر انھیں اس غرض کے لیے اٹھا کھڑا کیا۔ رہا یہ سوال کہ کتنی مدّت رہے سو آیت ۱۱ میں اسے سنین عددا کہا ہے۔ یعنی کئی سال اور یہی انسانی زندگی کے لحاظ سے صحیح مدت ہے۔ آیت ۲۵ کے تین سو سال پر اس آیت کے نیچے بحث ہوگی اور ان میں سے بعض کا یہ کہنا کہ ہم دن یا دن کا کچھ حصّہ رہے اس لحاظ سے ہے کہ یوم کا لفظ وسیع معنی میں ہے اور چوبیس گھنٹے کا دن نہیں۔ اور شاید ان کا منشا یہی ہو کہ ہم نے تو گویا اپنی عمر یہی یہاں گزار دی یا عمر کا بڑا حصّہ گزار دیا۔ اور ربکم اعلم بما لبثتم میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہی منشائے الٰہی تھا یعنی یہ وقت بھی ضائع نہیں ہوا بلکہ اس میں کام کے لیے ایک تیاری ہوگئی اور عبادت الٰہی سے بعض اخلاق تکمیل کو پہنچ گئے جن کی تکمیل کی ضرورت دعوت الی اللہ کے کام کے لیے تھی۔ اس کے بعد وہ کام کرنے کی تجویز سوچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ایک آدمی کو روپے دیکر شہر میں بھیجو کہ وہ اچھا کھانا لائے اور یوں کچھ تعلقات اہل شہر کے ساتھ قائم ہوں اور گفتگو اور تبلیغ میں نرمی کا پیرایہ اختیار کرے تاکہ آہستہ آہستہ لوگوں کا رجوع حق کی طرف ہو اور کسی کو پتہ نہ لگنے دے کہ اصل کیا منشا ہے یہاں اگر یہ خیال گزرے کہ اس سے پہلے یہ لوگ کھانا نہیں کھاتے ہونگے تو یہ صحیح نہیں اس لیے کہ جو لوگ غاروں میں تنہا رہتے ہیں وہ کھانے پینے کا سامان بھی کر لیتے ہیں یا زیادہ تر ایسی چیزوں پر گزارہ کر لیتے ہیں جو جنگلوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ مدینہ یا شہر میں بھیجنے سے مراد یہی ہے کہ آہستہ آہستہ لوگوں کے ساتھ تعلقات پیدا کیے جائیں۔ یہ نقشہ اگرچہ اصحاب کہف کا ہے تو عیسائیت کی ابتدائی تاریخ بھی اسی کے مطابق ہے۔ کیونکہ عیسائیت قریباً تین سو سال محکومیت کی حالت میں رہی اور اس وقت اس کی تبلیغ نہایت نرمی کے طریق سے کی جاتی تھی اور چھپ کر کی جاتی تھی۔ علانیہ تبلیغ نہ ہو سکتی تھی۔ جیسا کہ اگلی آیت میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ آج یورپ کی عیسائی اقوام اپنے سیاسی مقاصد کے حاصل کرنے میں بھی اسی طریق کا تتبع کرتی ہیں۔ یعنی جس ملک میں یہ لوگ قدم رکھتے ہیں پہلے تجارت کے بہانہ سے جاتے ہیں اور نرمی کا طریق اختیار کر کے آہستہ آہستہ ملک کے اندر تصرف تام حاصل کر لیتے ہیں اور اس تصرف کے حاصل کرنے میں ان کے بڑے معاون دراہم ہیں یعنی روپے دیکر اپنا کام نکال لیتے ہیں اور اپنے اصل ارادہ پر کسی کو مطلع نہیں ہونے دیتے پس اصحاب کہف کے قصہ میں یہاں بھی تاریخ عیسائیت ہی لکھی ہے۔

فِيهَا ۚ إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ
فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُنْيَانًا ۖ رَّبُّهُمْ
أَعْلَمُ بِهِمْ ۚ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ
أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا ﴿٢١﴾
سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَ
يَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا
بِالْغَيْبِ ۖ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ
كَلْبُهُمْ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا
يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۗ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ

جب وہ ان کے معاملہ میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے تو انھوں نے کہا ان پر ایک عمارت بنا دو۔ ان کا رب ان کو خوب جانتا ہے جو لوگ اپنے امر پر غالب ہوئے۔ انھوں نے کہا ہم ضرور ان پر مسجد بنائیں گے ۱۹۰۷

کہیں گے وہ تین ہیں، ان کا چوتھا اُن کا کتّا۔ اور کہیں گے پانچ ہیں ان کا چھٹا اُن کا کتّا ہے۔ اٹکل پچّو باتیں کرتے ہیں۔ اور کہیں گے سات ہیں اور ان کا آٹھواں ان کا کتّا ہے۔ کہدے میرا رب ان کی گنتی بہتر جانتا ہے سوائے تھوڑوں کے انھیں کوئی نہیں جانتا۔ سو ان کے بارے میں جھگڑا نہ کر،

۱۹۰۷ اصحاب کہف کی اصل منشا پر اطلاع پانا: کذلک اعثرنا علیھم میں عموماً یہ مراد لیگئی ہے اور اسی طرح پر یہ قصّہ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ درہم کی وجہ سے جو تین سو سال کا پرانا سکہ تھا لوگوں کو ان کی خبر مل گئی۔ اور انھوں نے آکر انہیں دیکھا اور بعض روایتوں میں ہے کہ انہیں دیکھا نہیں بلکہ جب کبھی کوئی شخص جرأت کر کے دیکھنے کے لیے آگے بڑھتا دہشت زدہ ہو کر واپس ہو جاتا) کہ یہ تین سو سال کے لوگ ہیں اس لیے ان کو یہ بھی یقین آگیا کہ قیامت حق ہے یعنی مُردوں کو پھر زندہ کیا جائے گا لیکن یہاں پر مفسرین کو خود شبہ پیدا ہوا ہے کہ اگر ایک طویل زمانہ تک اصحاب کہف کا سونا اور اس پر یقین کرنا مان بھی لیا جائے تو بھی اس سے یہ علم پیدا نہیں ہوتا کہ مر جانے کے بعد انسان زندہ ہوگا اور اس کا جواب صرف یہ دیا گیا ہے کہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔ یعنی جو خدا اتنی مدت تک جسموں کو محفوظ رکھ سکا وہ دوبارہ زندہ بھی کر سکتا ہے مگر سوال تو پھر وہی باقی رہتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ایک قدرت کے مشاہدہ سے دوسری قدرت کا علم حاصل ہو جاتا ہے تو پھر اس قدرت کے ہزارہا نظارے تو انسانی آنکھوں کے سامنے ہر دم رہتے ہیں وہی کافی ہیں ایک جسم کے لمبی مدّت تک محفوظ رہ جانے سے یہ علم پیدا نہیں ہوتا کہ موت کے بعد جب اجزائے جسم متفرق ہو جائیں گے پھر انسان کو زندہ کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں یہ بھی قابل تسلیم نہیں کہ ایک شخص کے بیان پر اعتبار کر کے لوگوں کو اس قدر یقین حاصل ہو گیا ہو۔ میرے نزدیک اعثرنا علیھم میں ان کے اصل مقصد پر مطلع کر دینا ہے۔ یعنی یوں ہی وہ نرمی کے پیرایہ میں لوگوں کو سمجھاتے رہے یہاں تک کہ لوگوں کو اسباب کا علم ہو گیا کہ جس بات کی طرف یہ بلاتے ہیں وہ سچ ہے اور بعث بعد الموت بھی بلاشبہ صحیح ہے۔ قیامت پر یقین لوگوں کو انبیاء کی تعلیم سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے جب نیکی اور اخلاق کی تعلیم آہستہ آہستہ ان کے اندر پھیلا دی تو ان کے حق پر ہونے کا یقین بھی ان کو آگیا۔

اقوام یورپ کے اصل منشا پر لوگوں کا اطلاع پا لینا: اور اگر عیسائیت کی تاریخ میں موجودہ ارادوں کے متعلق اسے لیا جائے تو بھی درست ہے کیونکہ آخرکار دنیا ان اقوام کے ارادوں پر مطلع ہو گئی۔ اور اس صورت میں لیعلموا کی ضمیر خود ان لوگوں کی طرف جائے گی یعنی دنیا کے ان کے ارادوں پر اطلاع پا جانے سے جب انہیں دنیا میں ناکامی ہو گی تو پھر حق کی طرف توجہ ہو گی اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہی زندگی ہی سب کچھ نہیں جس پر انھوں نے اپنا سارا زور لگا دیا بلکہ اس کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے۔

آیت کے پچھلے حصّہ میں انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کے پیغام کو انھوں نے قبول کیا یعنی یا تو یہ حالت تھی کہ ان کی بات کوئی نہ سنتا تھا اور یا اب ان کی نیکی کی وجہ سے ان کی یادگاریں بنانے کی تجویزیں ہونے لگیں اور اس کے بھی بعد ایک اور مرحلہ آیا کہ وہ لوگ جنہیں پوری حکومت اور غلبہ ملا یعنی جب عیسائیت غالب ہو گئی (غلبوا علی امرھم سے مراد غلبہ ہی ہے جیسے واللہ غالب علیٰ امرہ میں یعنی امرھم کی ضمیر انہی غالب آنے والوں کی طرف ہے انھم اذا ارادوا امرا لم یتعسر علیھم (ر)) تو اب انھوں نے انہی صلحاء کو اور نیک لوگوں کو اپنا معبود بنا لیا۔ اور عیسائیت میں مسیح کی خدائی کا عقیدہ بھی قسطنطین کے تبدیل مذہب کے ساتھ پختہ ہوا۔ بخاری میں ہے لعن اللہ الیھود والنصارٰی اتخذوا قبور انبیاء ھم مساجد یہود اور نصارٰی پر اللہ کی لعنت ہو اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا اور ایک اور حدیث میں ہے اذا کان فیھم الرجل الصالح فمات بنوا علی قبرہ مسجدا وصوروا فیہ تلک الصور۔ یعنی جب ان میں کوئی صالح آدمی مر جاتا تو اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے اور اس میں یہ صورتیں بنا لیتے یعنی نیک لوگوں کی تصویریں بنا کر ان کی عبادت کرتے۔ اسی کی طرف یہاں اشارہ معلوم ہوتا ہے اور یہ ان کے غلو کا ذکر ہے اس سے قبروں پر مسجدیں بنانے کا جواز نکالنا عجیب ترین قول ہے جب حدیث صحیح اس کو غلط ٹھہراتی ہے اور یہ شرک کی بنیاد ہے۔

اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ
ع ٣ ١٥ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿٢٢﴾
وَلَا تَقُولَنَّ لِشَاْىءٍ اِنِّي فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾
اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ
وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ
مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿٢٤﴾

سوائے (اس کے کہ) ظاہر جھگڑا (ہو) اور ان کے بارے میں
ان میں سے کسی سے نہ پوچھ ١٩٠٨
اور کسی چیز کی نسبت (یوں) نہ کہہ کہ میں اسے کل کرنے والا ہوں۔
مگر جو اللہ چاہے اور جب تو بھول جائے تو اپنے رب کو یاد
کر اور کہہ امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے قریب تر
بھلائی کا رستہ دکھائے گا ١٩٠٩

ع ١٩٠٨ سیقولون۔ س مضارع سے خاص ہے یعنی مضارع پر داخل ہوتا ہے اور اس کو استقبال کے لیے خالص کر دیتا ہے اور سوف بھی یہی کام دیتا ہے مگر بعض کے نزدیک اس کے استقبال میں وسعت زیادہ ہے (مغنی)

تمار۔ مراء و ممارا ۃ اور امتراء کے ایک ہی معنی ہیں یعنی اس چیز میں جھگڑا کرنا جس میں تردد ہو (غ) اور مراء اصل میں جدال ہے یعنی یہ کہ ایک شخص دوسرے سے بات نکلوائے اور مَرَیتُ الشاۃ کے معنی ہیں میں نے بکری کا دودھ نکالا۔ اور اسی لحاظ سے شک اور تردد کے معنی آتے ہیں (ل)

ظاہر۔ ظَہَرَ الشئُ کی اصل یہ ہے کہ ایک چیز زمین کی پیٹھ پر یعنی زمین کے اوپر آگئی (ظَہر پیٹھ کو کہتے ہیں) پس مخفی نہ رہی اور بَطَنَ جب وہ زمین کے پیٹ میں داخل ہوگئی اور چھپ گئی۔ ما ظہر منہا و ما بطن (الاعراف۔ ٣٣) پس ہر ایک چیز کو جو کھلی ہو اور آنکھ سے یا دلیل سے معلوم ہو جائے ظاہر کہا جاتا ہے (غ) اور یہاں بعض نے معنی غیر متعمق کئے ہیں اور بعض نے مراد لیا ہے۔ ایسا جھگڑا جس کی دلیل کھلی ہو اور ایک قول میں وہ ایسے عالم کا جدال ہے جسے حقیقت خبر کا یقین ہو اور ایک قول ہے جسے لوگ دیکھ لیں اور ایک اور قول ہے جو خصم کی دلیل کو باطل کر دے۔

اس آیت میں آیندہ کا ذکر ہے کہ لوگ ایسا کہیں گے یہ ذکر نہیں کہ پہلے کہتے ہیں۔ مفسرین نے اس کی یوں توجیہ کی ہے کہ قرآن شریف میں جو کچھ ان کا مذکور ہوا اسے سُن کر کہیں گے کہ وہ تعداد میں اتنے تھے مگر پھر بھی وہی بات رہتی ہے جب تک پہلے ان میں ایسے اقوال موجود نہ ہوں کہ وہ تین تھے یا پانچ تھے وہ یہ کہہ نہیں سکتے۔ اور جب پہلے ایسے اقوال موجود تھے تو اللہ تعالیٰ نے سیقولون کیوں فرمایا دوسری دقت یہ ہے کہ اگر قرآن شریف پہلے خود کوئی گنتی ان کی بیان کرتا تو یہ الفاظ موزون ہوتے کہ اسے سن کر وہ یوں کہیں گے مگر نہ صرف پہلے ہی کوئی گنتی ان کی نہیں بتائی بلکہ بعد میں بھی یہی فرمایا ربی اعلم بعدتہم ان کی گنتی کو میرا رب ہی بہتر جانتا ہے اور آگے جو فرمایا ما یعلمہم الا قلیل تو وہاں عدت کا لفظ چھوڑ دیا ہے اور صرف یہی فرمایا ہے کہ انہیں سوائے تھوڑوں کے کوئی نہیں جانتا اور اس سے بھی مراد وہ لوگ نہیں ہو سکتے جنہیں ان کا قصہ یا ان کی گنتی معلوم ہو۔ کیوں کہ اس لحاظ سے وہ ایسے قابل تعریف نہیں ٹھہر جاتے کہ اس بات کا ذکر قرآن شریف میں کیا جاتا بلکہ یہ قلیل علماء ہی ہیں جو ان لوگوں کی گنتی نہیں بلکہ ان کے حالات کو جانتے ہیں اور لا تستفت فیہم منہم احدا میں منہم میں ضمیر اہل کتاب کی طرف لی گئی ہے من اھل الکتاب (ج) جن کا ذکر یہاں سوائے اس کے کوئی نہیں کہ خود اس قصہ میں اہل کتاب کا ذکر ہی اصل مقصود سمجھا جائے یعنی عیسائیت کا۔

عام قول اہل کتاب میں اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق سات ہی ہے دوسرے اقوال تین یا پانچ کے اگر ہوئے بھی ہوں تو اُن کے بیان کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ اور بھی بہتیری غلط باتیں اس قصہ میں مل گئی تھیں (اور ہر ایک ایسے قصّہ میں مل جاتی ہیں) جن کا ذکر قرآن شریف نے نہیں کیا۔ میرے نزدیک یہاں زیادہ مدنظر عیسائیت کی تاریخ ہی ہے۔ اور غلبوا علی امرھم میں اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے کہ وہ حالت محکومیت سے نکل کر آخر غالب بھی آگئے اور اسی لیے ثلثۃ۔ خمسۃ۔ سبعۃ مطلق آیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد تین آدمی وغیرہ ہوں یا تین اقوام وغیرہ ہوں یا تین حکومتیں وغیرہ ہوں اور لا تستفت فیہم منہم میں اشارہ ہے کہ یہ قصہ کے آدمیوں کی گنتی کا ذکر نہیں کیوں کہ یہ ذکر تو ان میں مشہور تھا اور وہ سات ہی انہیں سمجھتے تھے اور پچھلی دو صورتوں میں کلبہم سے مراد کوئی ایسی قوم یا حکومت ہوگی جو ان کے لیے کلب کا کام دے یعنی پہریدار کا یا ان کی حفاظت کرنے والے کا اور کلبہم کی جگہ ایک قرأت کالبہم بھی آئی ہے یعنی صاحب کلبہم (د) اور یوں سب کو ایک ذیل میں شامل کیا ہے۔ یعنی کلب کوئی علیحدہ جنس نہ تھی یا ایں ہمہ میں اس آیت کے حل کو مشکلات میں سے سمجھتا ہوں شاید اللہ تعالیٰ آیندہ کبھی کسی پر کھول دے۔ ہاں ایک ممکن توجیہ ان الفاظ کی یہ ہے کہ بڑی عیسائی طاقتیں دنیا میں آٹھ رہی ہیں جس عدد کو قرآن شریف نے علیحدہ کر کے بیان کیا ہے یعنی امریکہ۔ برطانیہ۔ فرانس۔ ہسپانیہ۔ آسٹریا۔ جرمنی۔ اٹلی۔ روس اور کبھی چار کو ہی سب طاقت کا مالک سمجھا جاتا ہے یعنی۔ امریکہ۔ برطانیہ فرانس روس کو اور کبھی جرمنی اور اٹلی ساتھ مل کر چھ بن جاتی ہیں۔ اور بلا شبہ ان میں سے ایک باقی سب کی حفاظت کا کام بھی دیتی ہے اور ربی اعلم بعدتہم میں بتایا کہ اصل میں زیادہ ہیں ان کی گنتی کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

ع ١٩٠٩ غدا۔ غدا اصل میں غَدْ وٌ ہے اور اس کے معنی کل ہیں اور حدیث عبد المطلب میں ہے لا یَغلِبَنَّ صَلِیبُہُم۔ و مِحالُہُم غَدْ واً

وَلَبِثُوْا فِیْ کَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾
اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور نو (اور) بڑھائے۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَیْبُ
کہہ، اللہ خوب جانتا ہے جتنا رہے ۱۹۱۱ آسمانوں اور زمین

مِمالک جہاں غَدٌ سے مراد کل کا دن نہیں بلکہ قریب کا زمانہ ہے اور کبھی اس سے مراد اخیر زمانہ ہوتا ہے جیسے سیعلمون غداً من الکذّاب الاشر (القمر ۵۴: ۲۶) جہاں مراد قیامت کا دن یا فیصلہ کا دن ہے (ل) نیز دیکھو ۵۰۸ ؛

رشد - رَشَدْ اور رُشْد کے ایک ہی معنی ہیں ۶۰۹ اور بعض کے نزدیک رشد صرف اخروی بھلائی پر بولا جاتا ہے اور رُشْد دنیوی اور اخروی دونوں پر (غ) ؛

ان آیات کے شان نزول میں جو قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ قریش نے یہود مدینہ سے آنحضرت صلعم کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ سے اصحاب کہف اور روح اور ذوالقرنین کے متعلق دریافت کرو اگر وہ جواب نہ دے سکے تو جھوٹا ہے اور دریافت کرنے پر آپ نے کل بتانے کا وعدہ کیا اور پھر پندرہ دن تک وحی نازل نہ ہوئی یہ ابن عباس سے ایک مشکوک سی روایت ہے اور یہود کا تعلق اصحاب کہف سے کچھ تھا بھی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب اصحاب کہف اور اُن کی مشکلات کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کس طرح پیغام حق پہنچانے میں انہیں ایک مدت غار میں رہنا پڑا اور آخر ان کو وہ راہ ملی کہ وہ پیغام حق پہنچانے کے قابل ہوئے یا ضمناً عیسائیت کا ذکر کیا کہ کس طرح تین سو سال کا عرصہ دراز وہ کھلے طور پر اپنے پیغام کو نہ پہنچا سکی تو بالمقابل اسلام کا ذکر کیا جیسا کہ لاقرب من ھذا رشدا سے ظاہر ہے یعنی جو بھلائی کا رستہ ان کو دکھایا گیا اس سے قریب تر کوئی بھلائی کا رستہ اللہ تعالیٰ امت محمدیہ کو دکھائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی توحید کو دنیا میں پھیلانا تو ایسا کام ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اسے چاہتا ہے بایں فرمایا کہ ایسے کام کی نسبت بھی یہ مت کہو کہ ہم کل یا قریب زمانہ میں ایسا کر لینگے اور یہاں خطاب عام ہے مگر اصل خطاب انہی لوگوں کو ہے جو داعی الی الحق ہیں کیوں کہ اوپر ذکر دعوت الی الحق کا ہی تھا اور یہ جو فرمایا کہ سوائے اس کے کہ اللہ چاہے تو ایک معنی اس کے یوں کئے گئے ہیں کہ ایسا مت کہو سوائے اس کے کہ ساتھ انشاء اللہ بھی کہو یا لفاظ دیگر یہ بھی اللہ کی مشیت سے ہی ہوتا ہے انسان اپنے زور اور سعی سے کچھ نہیں کر سکتا اور طریق ادب یہی ہے کہ انسان ہر ایک معاملہ کو خود کوشش کرتا ہوا اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے اور ایک معنی یوں کئے گئے ہیں کہ تم مت کہو سوائے اس کے کہ اللہ چاہے اور اللہ کی مشیت اس کی وحی کا نزول ہے تو مطلب یہ ہوا کہ تم اپنی طرف سے مت کہو کہ ہم دنیا میں یوں خدا کا نام پھیلا لیں گے ہاں جو کچھ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کے مطابق کہدو اور واذکر ربك اذا نسیت میں ہر ایک داعی الی الحق کو نصیحت کی ہے کہ اپنے رب کو بہت یاد کرے اور اپنے آپ کو غفلت کی حالت سے باہر نکالنے کی کوشش کرتا رہے اور ربك کی خصوصیت اس لیے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت روحانی چاہتی ہے کہ اس کا نام دنیا میں پھیلے۔ اور عسٰی ان یهدین ربی لاقرب من ھذا رشدا میں بتایا کہ اسلام کے لیے دعوت الی الحق کے کام میں اس قدر مشکلات نہ ہونگی جیسے عیسائیت کے رستہ میں تھیں چنانچہ ابتدائی تاریخ اسلام اور ابتدائی تاریخ عیسائیت میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ عیسائیت تین سو سال تک ایک سلطنت روما کے اندر بھی بمشکل آٹھواں حصہ ساتھ ملا سکی۔ مگر اسلام تین سو سال کے عرصہ میں کل روئے زمین پر پھیل گیا۔ اور نبی کریم صلعم کے غار میں ٹھہرنے کی طرف بھی یہاں اشارہ ہو سکتا ہے کہ آپ صرف تین دن غار میں رہے حالانکہ اصحاب کہف کو کئی سال تک اس حالت میں رہنا پڑا۔ ایسا ہی اس زمانہ میں بھی اگر کوئی شخص غور کرے تو کیسا اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نظارہ نظر آتا ہے کہ ایک مذہب کروڑ در کروڑ روپیہ خرچ کر کے اور ہزارہا مبلغ بھیجکر اس قدر کامیاب نہیں ہو سکتا جس قدر دوسرا مذہب اپنی کس مپرسی کی حالت میں ترقی کر رہا ہے ایک افریقہ کو دیکھو کہ عیسائیت اور اسلام کے مقابلہ ترقی میں وہاں کیسا لاقرب من ھذا رشدا کا نظارہ نظر آرہا ہے۔ پھر آج کسی عیسائی ملک میں ایک مشن اسلامی چلا جائے تو اس کی فتوحات ایک طرف اور کسی اسلامی ملک میں سو مسیحی مشن چلے جائیں تو ان کے نتائج کو دوسری طرف رکھ کر مقابلہ کر لو۔ گو افسوس یہ ہے کہ باوجود اس قدر اسلام کے لیے سہولت کے مسلمان اسی کام میں سب سے بڑھ کر غفلت دکھا رہے ہیں چنانچہ اس مقابلہ کے بعد فوراً عیسائیت کے اس زمانہ کی طرف توجہ دلائی ہے جب وہ غاروں میں چھپ چھپ کر گزارہ کرتے تھے اور اسی مقابلہ عیسائیت واسلام کی پچھلی حالت کا ذکر چوتھے رکوع میں ہے ؛

۱۹۱۰ عیسائیت کا تین سو سال غربت کی حالت میں رہنا: بظاہر یہ دونوں بیان۔ ایک یہ کہ وہ اپنی غار میں تین سو نو سال رہے اور دوسرا یہ کہ اللہ بہتر جانتا ہے کتنا رہے متضاد معلوم ہوتے ہیں یہاں تک کہ بعض رکیک تاویلیں بھی مفسرین نے کی ہیں مثلاً یہ کہ چونکہ تسع یعنی نو کے ساتھ سال کا لفظ نہیں اور ممکن ہے نو مہینے یا نو دن یا نو گھڑیاں مراد ہوں اس لیے فرمایا کہ اللہ اعلم بما لبثوا۔ اور بڑی مشہور تاویل اس کی یہ ہے کہ ولبثوا فی کهفهم عطف ہے سیقولون پر اور مراد یہ ہے کہ یہ بھی دوسرے لوگوں کا قول ہے اور یہ حضرت ابن عباس کی طرف منسوب ہے اور اس میں یہ دقت ہے کہ کوئی روایت ایسی نہیں ملتی جس میں تین سو یا تین سو نو سال اصحاب کہف کا غار میں رہنا بیان کیا گیا ہو۔ اور دوسرے اس طرح قالوا محذوف ماننے سے الفاظ سے امن اٹھ جاتا ہے اور بعض نے یوں کہا ہے کہ اللہ اعلم بما لبثوا میں مراد وہ زمانہ ہے جو ان کی حالت پر اطلاع پانے سے لیکر رسول اللہ صلعم کے زمانہ تک گزرا (د) اور حق یہ ہے کہ تضاد کوئی نہیں

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ؗ وَّ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

کے بھید اسی کو معلوم ہیں کیا خوب دیکھنے والا اور کیا خوب سننے والا ہے اس کے سوائے کوئی ان کا حمایتی نہیں، اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا ۱۹۱۱

وَ اتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾

اور پڑھ جو تیرے رب کی کتاب سے تیری طرف وحی کی گئی ہے۔ کوئی اس کی باتوں کو بدلنے والا نہیں، اور اس کے سوائے تو کہیں پناہ نہیں پائے گا ۱۹۱۲

قرآن کریم کا لفظ لفظ حکمت پر مبنی ہے۔ پہلی آیت میں فرمایا کہ وہ تین سو نو سال اپنی کہف میں رہے۔ دوسری میں فی کھفہم کا لفظ نہیں بلکہ صرف لبثوا ہے اور اس کے ساتھ لہ غیب السمٰوات والارض بڑھا کر بتا دیا کہ یہ آیندہ کے زمانہ کی خبر ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ یہاں ان اصحاب کہف کا ذکر نہیں بلکہ خود عیسائیت کا ذکر ہے اور اس کی دو حالتوں کے متعلق فرمایا کہ ایک ان کی کہف کی حالت تھی اور ایک غلبہ کی حالت جب عیسائیت شاہی مذہب ہو کر اصل حقیقت سے بھی دور جا پڑی۔ ان کی پہلی حالت تین سو نو سال تک رہی اور دوسری حالت کے متعلق فرمایا کہ جتنی مدت وہ رہیں گے اللہ ہی اس کو خوب جانتا ہے کیونکہ یہ غیب کی بات ہے اور غیب کا جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلا رہنا غیب کی حالت نہیں کہلا سکتا۔ اور پھر دوسرے رہنے کے ساتھ یہ بڑھا کر کہ اللہ کے سوائے ان کا کوئی ولی نہیں اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا یہ بھی بتا دیا ہے کہ آخر کار ان کے غلبہ کی صف بھی لپیٹ دی جائے گی۔

تین سو نو سال اور قرآن کریم کا اعجاز اظہار علم غیب: تین سو نو سال کے متعلق غور کیا جاتا ہے تو یہ بھی قرآن کریم کے عجیب اعجازات میں سے نظر آتا ہے ہمارے نبی کریم صلعم تو اُمّی تھے اور تاریخ عیسائیت کی عرب کو کیا خبر تھی جب خود عیسائیوں کو بھی ان باریک تفصیلات کا علم نہ تھا۔ قرآن کریم نے چند لوگوں کے کہف میں جانے کی غرض یہ بیان کی ہے کہ وہ خدا کے سوائے کسی دوسرے کو معبود نہ مان سکتے تھے پس عیسائیت کے کہف میں رہنے کی وہ حالت ہے جب ابھی اس میں تین خداؤں کا عقیدہ جو شرک ہے مروج نہیں ہوا۔ اب تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قسطنطین کے عیسائی مذہب علی الاعلان اختیار کرنے کے بعد ۳۲۵ء میں مذہب تثلیث کو اصل عیسائیت اور شاہی مذہب قرار دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اگر ایک طرف عیسائیت مظلومیت کی حالت سے نکل کر غالب مذہب بن گئی تو دوسری طرف اصل توحید سے دور جا پڑی۔ لیکن ابھی یہ سوال باقی ہے کہ قرآن شریف نے بجائے ۳۲۵ سال کے تین سو نو سال کیوں فرمائے۔ یہیں پر قرآن کریم کے علم غیب کے سامنے انسان کو سر جھکانا پڑتا ہے۔ عیسائیت کی تاریخ میں خود چھ سال کی غلطی چلی آتی ہے۔ یعنی حضرت مسیح کی پیدائش جس سے سنہ عیسوی شروع ہوتا ہے مشہور سنہ عیسوی سے چھ سال پہلے ہوئی۔ اس لیے جسے ۳۲۵ء کہا جاتا ہے وہ مسیح کی پیدائش سے فی الواقع تین سو تیس یا اکتیس سال ہیں اور حضرت مسیح کا دعویٰ تاریخ عیسائیت کے مطابق تیس سال کی عمر میں ہوا اس لیے دعوے سے لیکر تثلیث کے سرکاری طور پر عیسائی مذہب قرار پانے تک پورے تین سو سال ہوئے اور نو سال کے بڑھانے کا جو علیحدہ ذکر قرآن شریف نے کیا ہے تو اسے مفسرین نے بھی قمری حساب کا اضافہ بیان کیا ہے یعنی ہر صدی میں قمری حساب سے تین سال بڑھ جاتے ہیں۔ پس پوری تین صدیاں جو عیسائیت کی حالت کہف تھی اس پر قمری حساب سے نو سال اور بڑھ گئے اور قرآن شریف نے تین سو سال کو نو سال سے الگ کر کے بتا دیا کہ عیسائیت کی اصل حالت کہف تو تین سو سال ہی رہی، مگر قمری حساب سے اس میں نو سال اور بڑھ جائیں گے۔ آج دنیا میں تاریخی واقعات کے اظہار سے قرآن شریف کا حرف حرف اس طرح صحیح ثابت ہونا صاف بتاتا ہے کہ یہ خدائے عالم الغیب کا کلام ہے نہ کسی انسان کی بناوٹ۔

ع ۱۹۱۱ ابصر بہ واسمع۔ بہ میں ضمیر اللہ کی طرف ہے اور یہ مدح میں مبالغہ ہے جیسے کہا جائے ما ابصرہ واسمعہ یعنی اللہ تعالیٰ کیسا عجیب دیکھنے والا اور کیسا عجیب سننے والا ہے کہ کوئی چیز اس پر مخفی نہیں رہتی (ج)

ما لھم من دونہ من ولی یہاں ضمیر انہی عیسائیوں کی طرف جاتی ہے جن کا ذکر ابھی ہو چکا اور مطلب یہ ہے کہ جب وہ اپنے غلبہ کے وقت حد سے تجاوز کرنے لگیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ اللہ کے سوائے ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اور اللہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا یعنی جو حکومت اور بادشاہت کسی قوم کو دی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حکومت میں شرک کے طور پر نہیں کہ وہ اپنی قوت سے اسے قایم رکھ سکیں بلکہ مصالح الٰہی کے ماتحت وہ حکومت دی جاتی ہے اور اصل حکم اللہ کا ہی ہے اس لیے جب وہ چاہتا ہے حکومت لے بھی لیتا ہے۔ اور اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ کسی کو حکومت دیتا ہی نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ حکومت میں اس کے شریک نہیں بلکہ اس کے ماتحت ہیں۔

ع ۱۹۱۲ ملتحد الحد وہ گڑھا ہے جو وسط سے ایک جانب مائل ہو الحاد کے لیے دیکھو ۱۱۸۱ و ۱۴۸۶ اور التحد کے معنی ہیں ایک چیز کی طرف مائل ہوا۔ پس ملتحد سے مراد پناہ یا جائے پناہ ہے (غ)

وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ
وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ
زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لَا تُطِعْ مَنْ
اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ
وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روک رکھ جو صبح اور شام
اپنے رب کو پکارتے ہیں (اور) اسی کی رضا کو چاہتے ہیں۔
اور اپنی نگاہیں اُن سے ہٹا کر (اور طرف) نہ دوڑا (کہ) تو دنیا کی
زندگی کی آرایش کا ارادہ کرے اور اس کی بات نہ مان جس کا دل ہم نے
اپنے ذکر سے غافل رکھا ہے اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتا
ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے ۱۹۱۳

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ
فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ
اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ
سُرَادِقُهَا وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ
كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ
وَ سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾

اور کہہ حق تمھارے رب کی طرف سے ہے، سو جو کوئی چاہے
ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کرے۔ ہم نے ظالموں
کے لیے آگ تیار کی ہے، جس کی قناتیں ان کو گھیر لیں
گی۔ اور اگر پانی مانگیں گے تو انھیں تلچھٹ جیسا پانی دیا
جائے گا جو ان کے مونہوں کو جلا دے گا، کیا ہی بُرا پانی ہو گا
اور جائے آرام بھی بُری ہو گی ۱۹۱۴

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

جو لوگ ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں (تو) ہم اس کا

یہاں تلاوت کتاب کا حکم دے کر صاف بتا دیا کہ تم لوگوں کو حق کی طرف بلاؤ کیوں کہ یہ کتاب تیرے رب کی طرف سے یعنی لوگوں کی ربوبیت روحانی کے لیے نازل ہوئی ہے اور لا مبدل لکلماتہ میں بتایا کہ حق کی آخری کامیابی کی پیشگوئی ٹل نہیں سکتی اور سب پناہیں جو عارضی طور پر انسان اپنے لیے تلاش کرتے رہیں گے آخر دور ہو کر صرف ایک۔ اللہ کی پناہ ہی رہ جائے گی ؎

۱۹۱۳ وجہ کے لیے دیکھو ۱۴۴ و ۱۸۱ وغیرہ وجہ کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہو تو اس سے مراد مجازاً اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے کیوں کہ جو شخص کسی پر راضی ہو وہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے (ر)

تعد۔ عدد کے اصل معنی تجاوز ہیں (غ) اور عَدَاہُ عن الامر کے معنی صرفتہ عنہ ہیں یعنی اسے اس امر سے پھیر دیا (ل) ؎

فرط۔ فرط کے لیے دیکھو ۹۳۱ اور فُرُط سے مراد ہے اسراف اور تضییع یعنی ضائع کر دینا (غ) اسی معنی کی تائید ابن جریر نے کی ہے یہاں بھی عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ کیا ہے ایک طرف وہ لوگ ہیں جو صبح و شام یعنی اپنے تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور صرف اللہ کی رضا کو چاہتے ہیں اور دوسری طرف وہ ہیں جو دنیا کی آرائشوں کے پیچھے اس قدر پڑے ہیں کہ اللہ کے ذکر سے ان کے دل بالکل غافل ہو گئے ہیں اور اپنی حرص و ہوا کی پیروی میں لگے ہوئے ہیں تو رسول کو یا ہر داعی الی الحق کو حکم ہوتا ہے کہ اللہ کی رضا ہی وہ چیز ہے جس کی طرف تمہاری نظر اٹھنی چاہیئے اور زیب و زینت دنیوی تمہاری نظر کو نہ کھینچ لے ؎

۱۹۱۴ سرادق قنات کو کہتے ہیں جو خیمہ کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے یا دیوار جو کسی چیز کو گھیرے اس کی جمع سرادقات آتی ہے (ل) ؎

مہل۔ مَهْل آہستگی یا ٹھہر جانا ہے یعنی مہلت فمھل الکٰفرین امھلھم رویدا (الطارق۔۱۷) اور مُہل تلچھٹ کو بھی کہتے ہیں (غ) ؎
اور یہ معنی حدیث مرفوع میں نبی کریم صلعم سے مروی ہیں (د) اور پگھلے ہوئے تانبے وغیرہ کو بھی کہتے ہیں جس کی گرمی انتہا کو پہنچ گئی ہو (ج) ؎
یشوی۔ شَوَی اللحم کے معنی ہیں بھونا گوشت۔ اور شَوَی اطراف کو کہتے ہیں جیسے ہاتھ اور پیر نزّاعۃ للشّوٰی (المعارج۔ ۱۶) (غ)
مرتفق۔ رِفق اور مِرفق کے لیے دیکھو ۷۹۳ اور ارتفق کے معنی ہیں کہنی پر ٹیک لگائی (ل) اس لیے مراد آرام یا استراحت ہے اور یہاں اس کا استعمال اس لحاظ سے ہے کہ آرام اور استراحت کی جگہ بھی ان کے لیے آگ ہے۔

اس آیت میں صاف بتا دیا کہ یہ وہ حق ہے جو ان لوگوں کو پیش کیا جاتا ہے الحق من ربکم۔ ایمان لانا یا انکار کرنا ہر شخص کا اپنا اختیار ہے اللہ تعالیٰ نہ ایمان پر مجبور کرتا ہے نہ انکار پر۔ پھر جیسے ان کے اعمال ہیں ویسی سزا ہے جس طرح حرص دنیا نے یہاں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا وہی آگ بن کر وہاں گھیر لے گی اور جس طرح دنیا کی محبت کی پیاس یہاں نہیں بجھتی تھی۔ وہاں بھی اس کے بجھنے کا سامان کوئی نہ ہو گا۔

اِنَّا لَا نُضِيعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۚ ﴿۳۰﴾	اجر ضائع نہیں کرتے جو اچھا عمل کرتا ہے۔
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ يَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۧ ﴿۳۱﴾	ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی ان میں انھیں سونے کے کڑے پہنائے جائیں گے اور وہ باریک اور موٹے ریشم کے سبز کپڑے پہنیں گے، ان کے اندر تختوں پر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے، کیا ہی اچھا بدلہ ہے اور جائے آرام بھی اچھی ہوگی ۱۹۱۵
وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ؕ ﴿۳۲﴾	اور ان کے لیے دو شخصوں کی مثال بیان کر، جن میں سے ایک کے لیے ہم نے انگوروں کے دو باغ بنائے اور ان کے گرد اگرد کھجوریں لگائیں ۱۹۱۶ اور ان دونوں کے درمیان کھیتی لگائی
كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۙ ﴿۳۳﴾	یہ دونوں باغ اپنے پھل دیتے تھے اور اس میں کوئی کمی نہ کرتے تھے اور ان دونوں کے درمیان ہم نے نہر بہائی تھی۔

۱۹۱۵ء اساور، اور اَسْوِرَۃ سوار کی جمع ہے اسورۃ من ذھب (الزخرف ۴۳-۵۳) دیکھو ۳۷
سندس۔ باریک ریشم کو کہتے ہیں اور استبرق موٹے ریشم کو (ل)
ارائک۔ اَرِیکۃ کی جمع ہے اَرَکَ کے معنی ایک مکان میں ٹھہرا اور اَرَاكٌ خاص درخت ہے اور اَرِیکۃ کے معنی ہیں حَجَلَۃٌ علی سریر یعنی تخت یا پلنگ جس پر چھپرکھٹ لگی ہوئی ہو (غ)

سونے کے کڑوں ریشمی لباس تختوں سے مراد: نعمائے جنت کے متعلق یہ تو بارہا بیان ہو چکا کہ وہ مالاعین رأت کی مصداق ہیں اور یہ جو نام لیے جاتے ہیں تو یہ مراد نہیں کہ یہ اس دنیا کی چیزیں وہاں ہونگی۔ کیونکہ اس دنیا کی سندس اور استبرق اور سونے کے کڑے وہ چیزیں ہیں جو آنکھیں دیکھتی ہیں یا کان سنتے ہیں مگر جنت کی چیزیں بروئے حدیث صحیح ایسی ہیں کہ دل میں بھی ان کا خیال نہیں گزرا اور اس سے یہ خیال کر لینا کہ اس طرح ان چیزوں کے وجود کا ہی انکار ہو گیا کم فہمی ہے اصل میں ان اسماء سے اس بات کو ظاہر کرنا مقصود ہے جو ان چیزوں سے یہاں مقصود ہوتی ہے۔ سونے کے کڑے۔ تختوں پر بیٹھنا۔ فاخرہ لباس یہ سب زینت کی چیزیں اور سرداری کے نشان ہیں اور چونکہ یہاں عیسائی اقوام کے بالمقابل مومنین کے لیے نعماء کا ذکر تھا اس لیے خاص ان نعماء کا ذکر کیا ہے جس کی مالک اس دنیا میں یہ قومیں اپنے آپ کو سمجھتی ہیں اور مراد یہ ہے کہ حقیقی سرداری انہی لوگوں کی ہے جو رضائے الٰہی کے طالب ہیں اور اس دنیا کی سرداری جلد ختم ہو جاتی ہے اور ان کے لباس کو سبز کہا ہے اس لیے کہ سبز رنگ سے دیکھنے والوں کی آنکھوں کو راحت پہنچتی ہے۔ اسی لیے شہداء کی ارواح کے ذکر میں ہے کہ وہ جنت میں فی حواصل طیور خضر یا فی صور طیر خضر یعنی سبز پرندوں کے جینہ دان میں یا سبز پرندوں کی صورت میں ہیں (مسلم) تو دونوں صورتوں میں ایک ہی حقیقت کا انکشاف ہے۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ ان نعمائے جنت کے ذکر میں فتوحات دنیوی کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ ہے اور اس کا پتہ ہمیں خود نبی کریم صلعم کی زبان سے لگتا ہے۔ جب آپؐ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ کی طرف جا رہے تھے اور صرف حضرت ابوبکرؓ آپؐ کے ساتھ تھے تو ایک شخص سراقہ نامی نے آپ کا تعاقب کیا۔ مگر آخر اس پر بعض نشانات سے آپ کی سچائی کا اثر ہوا تو مخلصانہ حاضر خدمت ہوا اور معافی کا خواستگار ہوا اس وقت نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ اے سراقہ میں تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے سونے کے کنگن دیکھتا ہوں۔ چنانچہ یہ خبر جو اس قدر بے سروسامانی کی حالت میں دی گئی تھی کہ ایران کے خزانے مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں گے جب خود اپنی جان بھی سخت خطرہ کی حالت میں تھی چوبیس سال بعد پوری ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے ان وعدوں میں فتوحات دنیوی کی طرف بھی لطیف اشارہ موجود ہے ٭

۱۹۱۶ء حففنا حَفَّ بالشئ کے معنی ہیں ایک چیز کے گرد کرد گھوما یا اس کا احاطہ کیا وتری الملائکۃ حافین من حول العرش (الزمر ۳۹-۷۵) (ل) یہاں اللہ تعالیٰ نے کافروں اور مومنوں کی ایک مثال بیان فرمائی ہے وضرب المثل لایقتضی وجودہا (ر) اور جس چیز کی مثال دی جائے اس کا وجود ضروری نہیں ہوتا۔ یعنی یہ مطلب نہیں کہ فی الحقیقت کوئی ایسے دو آدمی تھے۔ مگر بعض مفسرین نے یہاں بھی نام لے کر قصہ بنانے کی کوشش کی ہے،

وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ
يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ۝۳۴
وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ
مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۝۳۵
وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ
اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝۳۶
قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ
بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ
ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۝۳۷
لٰكِنَّاۡ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ۝۳۸

اور اسکے پاس طرح طرح کا مال تھا تو اس نے اپنے ساتھی کو کہا اور وہ اس سے باتیں
کر رہا تھا میں مال میں تجھ سے بڑھکر ہوں اور جتھے کے لحاظ سے غالب ہوں ۱۹۱۷
اور وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اور وہ اپنے آپ پر ظلم کرنے والا
تھا کہنے لگا میں یقین نہیں کرتا کہ یہ کبھی برباد ہو گا ۱۹۱۸
اور میں یقین نہیں کرتا کہ قیامت آئے اور اگر میں اپنے رب کی
طرف لوٹایا بھی جاؤں تو یقیناً لوٹنے کی جگہ اس سے بہتر پاؤں گا۔
اس کے ساتھی نے اسے کہا اور وہ اس سے باتیں کر رہا تھا کیا تو
اس کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے (پہلے) مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے
پھر تجھے پورا انسان بنایا۔
لیکن میں (جانتا ہوں کہ) وہی اللہ میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا ۱۹۱۹

حالانکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ عیسائیوں کو جو مال و دولت ہم نے دیا ہے تو اس کی مثال یوں ہے اور باغوں سے مثال اس لیے دی کہ دنیا میں یہ راحت کا بڑا بھاری سامان ہے ان باغوں میں بہترین پھل انگور کا ذکر کیا اور گرداگرد کھجور کا لگانا اس کی خوبصورتی کے لحاظ سے ہے کہ وہ بوجہ اپنی لنبائی اور سیدھا ہونے کے اعلیٰ درجہ کی زینت کا سامان ہے اور پھر صرف پھلدار درخت ہی نہیں بلکہ درمیان میں غلہ کے لہلہاتے کھیت ہیں اور اگلی آیت میں ہے کہ نہریں اس میں بہتی ہیں اور ظاہری طور پر بھی ان قوموں نے جنگلوں کو باغ بنا دیا ہے۔ کفار کی زینت کے سامانوں کی نسبت اللہ کی طرف: اور اللہ تعالیٰ نے باغ کے دینے، کھجوریں لگانے نہریں بہانے سب باتوں کو اپنی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ کفار نے انہیں اپنے لیے بنایا ہے اس لیے کہ سامان تو اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیے ہیں۔

۱۹۱۷ ثمر۔ اصل میں تو درختوں کے پھل کو کہا جاتا ہے واحد ثمرۃ ہے اور جمع ثمرات اور اثمار۔ فاخرج بہ من الثمرات رزقا لکم (البقرۃ ۲-۲۲) کلوا من ثمرہ اذا اثمر (انعام ۶-۱۴۱) اور پھر ہر چیز سے جو نفع حاصل ہو اس کو اس کا ثمرۃ کہا جاتا ہے جیسے ثمرۃ العلم۔ ثمرۃ العمل اور ثمر سے مراد مال بھی لیا جاتا ہے جس سے فائدہ اٹھایا جا سکے اور یہی معنی یہاں کیے گئے ہیں (غ) اور انواع المال یعنی قسم قسم کے مال (قاموس) اور سونا اور چاندی (ج) بھی یہاں معنی لیے گئے ہیں ؛

حالانکہ اوپر صرف باغ کا ذکر تھا۔ مگر یہ سمجھانے کو کہ محض بطور مثال بیان کیا ہے یہاں اس باغ والے کے منہ سے جو لفظ کہلوائے ہیں یہ ہیں کہ میرا مال اور میرا جتھا تم سے بڑھکر ہے اور اس جتھے کی وجہ سے اپنے غلبہ کو بھی ظاہر کیا ہے۔ مال اور جتھے پر ہی عیسائیت کو فخر ہے۔

۱۹۱۸ تبید۔ بادَ (یبید) کے معنی ہیں ایک چیز پراگندہ ہو گئی اور بَیْداء بیابان کو کہتے ہیں (غ)

عیسائی اقوام کی روحانیت سے محرومی: جنت میں داخل ہونے سے مراد ایک خاص وقت میں داخل ہونا نہیں بلکہ مراد اپنے مال و متاع سے فائدہ اٹھانا ہے وھو ظالم میں بتایا کہ ان سامانوں میں ایسے منہمک ہوئے کہ اپنے آپ پر ہی ظلم کرنے لگے کیوں کہ اخلاق اور روحانیت کی طرف سے لاپروائی اختیار کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا اور اصل غرض زندگی مال و دولت کو سمجھ لیا اور اس کے لیے اتنا زور لگایا کہ یہ یقین ہو گیا کہ اب دنیوی جاہ و حشم ہمارے ہاتھوں سے نہیں جا سکتا یہی حالت آج عیسائیت کی ہے اور اگلی آیت میں بتایا کہ آخرت پر انکا یقین بالکل نہیں رہے گا سو یہ بھی سچ ہے کہ آج عیسائی اقوام کو نہ آخرت پر یقین ہے نہ آخرت کا کچھ فکر ہے ہاں چونکہ انجیل میں قیامت کا ذکر ہے اس لیے یہ فرض کر رکھا ہے کہ آخرت کی نعمتوں کے بھی ہم ہی مستحق ہیں ؛

۱۹۱۹ لکنا۔ اصل میں لکن انا ہے اور مطلب ہے لکن انا اقول لیکن میں یہ کہتا ہوں یا مانتا ہوں ؛

یہاں مومن کی حالت کو بیان کیا ہے یا یوں کہنا چاہئیے کہ عیسائیت کے بالمقابل اسلام کی حالت کو ولا اشرک بربی احدا توحید کامل صرف اسلام میں ہی ہے۔ اور اس سے پہلی آیت میں جو اللہ تعالیٰ کے کفر کا ذکر ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ عملاً عیسائی اقوام خدا کا انکار ہی کر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ کسی معاملہ میں خدا کا نام تک لینا معیوب سمجھتی ہیں اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس قدرت کا انکار کرتے ہیں کہ وہ جس نے انسان کو ایسا ظاہری کمال عطا فرمایا ہے وہ اس کو کمال روحانی کے لیے بھی اٹھائیگا۔ اسی آیت میں انسان کی پیدائش کے ذکر میں فرمایا کہ تجھے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے تو مطلب یہ نہیں کہ تمہارے باپ آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور تمہیں نطفہ سے بلکہ یہ مطلب ہے کہ مٹی سے نباتات اور غلے پیدا ہوتے ہیں جن سے انسان کو غذا ملتی اور

وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿٣٩﴾

اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا کیوں نہ تو نے کہا جو اللہ چاہتا ہے رو ہی ہوتا ہے) اللہ کے سوائے کوئی بھی قوت نہیں۔ اگر تو مال اور اولاد میں مجھے اپنے سے کمتر سمجھتا ہے ع۱۹۲۰

فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿٤٠﴾

سو امید ہے کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا فرمائے اور اس پر آسمان سے بلا بھیجے، تو وہ خالی زمین چٹیل میدان رہ جائے ع۱۹۲۱

اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿٤١﴾

یا اس کا پانی اُتر جائے، پھر تو اُسے نکال نہ سکے۔

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿٤٢﴾

اور اس کا مال و دولت تباہ کر دیا گیا تو اس پر اپنے ہاتھ ملنے لگا جو اس پر خرچ کیا تھا اور وہ ویران تھا اپنی چھتوں پر گرا ہوا اور کہنے لگا اے کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ع۱۹۲۲

اس کا خلاصہ نطفہ بنتا ہے۔ تو یوں ہر ایک انسان مٹی سے ہی پیدا ہوتا ہے اور پھر مٹی سے نطفہ کی صورت میں آتا ہے گویا اجزائے انسانی مٹی میں ہی ہوتے ہیں وہاں سے خلاصہ ہو کر نطفہ کی صورت میں آتے ہیں۔

دوسری زندگی کے مدارج اس زندگی کی طرح ہیں: اسی طرح پر نشأۃ الاخرۃ یا دوسری زندگی ہے کہ انسان کے اعمال متفرق اور پراگندہ ہوتے ہیں ان کے نتائج کے ساتھ ساتھ ظہور پذیر ہونے سے ایک خلاصہ انسان کی دوسری زندگی کا بنتا جاتا ہے جس کو نطفہ سے مشابہت ہے یعنی زندگی تو وہ یہاں بھی موجود ہے لیکن نطفہ کے طور پر ایک نامعلوم صورت میں ہے پھر عالم برزخ گویا اس حالت سے مشابہ ہے جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اور قیامت اس کی پیدائش کا وقت ہے ۔

ع۱۹۲۰ ماشاءاللہ۔ یعنی الامر ماشاء اللہ یا ماشاء اللہ کائن کیوں کہ اگر اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو ہی پیدا نہ کرتا جن سے انسان فائدہ اُٹھاتا ہے۔ تو یہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ انسان تب ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جب پہلے اللہ تعالیٰ اسے پہنچانا چاہتا ہے اور وہ فائدہ پہنچانا سامانوں کی پیدائش سے ہے لاقوۃ الا باللہ میں عجز انسانی کا اعتراف ہے اور حدیث میں اس قول کو جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ فرمایا ہے ۔

ان ترن۔ ترن اصل میں ترنی ہے اور انا فصل کے لیے ہے اول مفعول ثانی ہے اور جواب شرط محذوف ہے۔ جس کے قائم مقام اگلی آیت ہے ۔

ع۱۹۲۱ حسبان کے اصل معنی حساب ہی ہیں اور یہاں مراد آسمان سے آگ یا عذاب ہے اور وہ حقیقت میں وہ ہے جس پر حساب لیا جائے پس اس کے مطابق جزا دی جائے (غ) ۔

زلق۔ اور زلَلَ ایک ہی ہیں اور زلَق وہ زمین ہے جس پر پاؤں نہ جمے یعنی پھسلنی زمین۔ اس لیے زلق سے مراد یہاں ایسی زمین ہے جس میں سبزی نہ ہو اور دوسری جگہ ہے لیزلقونك بابصارھم (القلم ۶۸ : ۵۱) یعنی اپنی نظروں سے (یا گھور گھور کر) تجھے اپنے مقام سے جس پر اللہ تعالیٰ نے تجھے کھڑا کیا ہے ہٹا دیں (ل) ۔

بہتر باغ سے مراد وہی جنت آخرت ہے جس کا مومنوں کے لیے وعدہ ہے جو کبھی فنا نہیں ہوگی۔ اس دنیا کے مال پر فنا بھی آ جاتی ہے طاقت و حشمت دولت سب کچھ جاتا رہتا ہے جس کے لیے کوئی آسمانی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں من السماء یا زمینی جیسا اگلی آیت میں ہے کہ پانی خشک ہو جائے ۔

ع۱۹۲۲ یقلب کفیہ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ ہاتھوں کو اُلٹا سیدھا کرتا یا ایک ہاتھ کی ہتھیلی دوسرے کی پشت پر رکھتا پھر اس کے برعکس مطلب اظہار ندامت ہے جیسے ہماری زبان میں ہاتھ ملنا کہتے ہیں ۔

مال دنیا تو ہاتھ سے نکلتا ہی رہتا ہے تب ہی انسان کو سمجھ آتی ہے کہ خدا سے تعلق ہی وہ چیز ہے جو ہر حال میں انسان کے کام آتا ہے فی الحقیقت یہی وہ جنت ہے جس سے انسان کبھی نکالا نہیں جاتا ۔

وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾

اور اس کے لیے کوئی جتھا نہ تھا جو اللہ کے سوائے اس کی مدد کرتا اور نہ ہی وہ خود اپنی مدد کر سکا ۱۹۲۳

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾ ع ۶ ۱۷

وہاں اختیار اللہ کے لیے ہے جو حق ہے، وہی بدلا دینے میں اچھا اور اچھا انجام لانے میں بہتر ہے ۱۹۲۴

وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾

اور ان کے لیے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کر اس کی مثال پانی کی طرح ہے جو ہم بادل سے برساتے ہیں تو اس کے ساتھ زمین کی روئیدگی (بڑھ کر) مل جل جاتی ہے پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے جسے ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے ۱۹۲۵

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہے اور باقی رہنے والے اچھے عمل تیرے رب کے نزدیک بدلے میں بہتر ہیں۔ اور امید کے لحاظ سے (بھی) بہت اچھے ہیں ۱۹۲۶

وَ يَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّ حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۚ ﴿۴۷﴾

اور جس دن ہم پہاڑوں کو دور کر دیں گے اور تو زمین کو کھلا میدان دیکھے گا اور ہم انھیں اکٹھا کریں گے سو اُن میں سے کسی کو پیچھے نہیں چھوڑیں گے ۱۹۲۷

۱۹۲۳ منتصر - اِنتصار - اور اِستِنصار کے معنی ہیں مدد طلب کرنا (غ)

۱۹۲۴ ولایۃ کے لیے دیکھو ۳۳۲ مگر ابن جریر کہتے ہیں کہ ولایۃ کے معنی موالات ہیں اور وِلایۃ کے حکومت اور غلبہ - اور عُقبٌ اچھا انجام ہے دیکھو ۱۶۱۴ مطلب یہ ہے کہ اسی مقام پر آکر معلوم ہوتا ہے کہ نصرت اللہ کی طرف سے ہی ملتی ہے کیوں کہ دنیادار طاقتور آخر اپنی طاقت کو ہلاکت سے نہیں بچا سکتے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ سے ہی ولایت یا دوستی کا تعلق کام آتا ہے ؎

۱۹۲۵ ھشیم - ھَشمٌ نرم چیز جیسے نبات کے (غ) یا ایسی چیز کے توڑنے پر بولا جاتا ہے جو اندر سے خالی اور خشک ہو (ل) اس لیے ہڈیوں وغیرہ کے توڑنے پر بھی بولا جاتا ہے اور ھشیم پتے وغیرہ ہیں جو خشک ہو کر ٹوٹ جائیں اور چورا چورا ہو جائیں فکانوا کھشیم المحتظر (القمر ۵۴-۳۱)

تذروہ - ذَرْوٌ ہوا کے مٹی وغیرہ اڑا کرلے جانے پر بولا جاتا ہے والذٰریٰت ذروا (الذٰریٰت ۵۱-۱) (ل)

مقتدر کے معنی وہی ہیں جو قدیر کے ہیں لیکن یہ ابلغ ہے (ل) مقتدر بشر پر بھی بولا جاتا ہے اور مراد ہوتی ہے اکتساب سے قدرت حاصل کرنے والا (غ) دنیوی زیب و زینت چلی جانے والی چیز ہے؛ کیسا پر حکمت کلام ہے - چونکہ عیسائی اقوام کو حیات دنیا کی زیب و زینت پر ہی سارا فخر ہے اس لیے یہاں اس کی حقیقت بھی بتا دی اور فرمایا کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیز ہے مگر یہ سبزی کی طرح ہے ایک وقت کیسی خوشنما ہوتی اور لہلہاتی ہے دوسرا وقت ہوتا ہے خشک ہو کر چورا چورا ہو جاتی ہے یہی حالت قوموں کی زندگی کی ہے کہ ایک وقت ایک قوم زیب و زینت دینوی کے لحاظ سے کمال کو پہنچی ہوئی ہوتی ہے دوسرا وقت آتا ہے اس کا نام نشان بھی نہیں ملتا علی کل شی مقتدرا میں اسی طرف اشارہ ہے ؎

۱۹۲۶ اَمَل اور اَمِل کے معنی ہیں آخری امید اور جمع اٰمال ہے (ل)

اعمال حسنہ کا بقا: دنیوی زیب و زینت کے مقابل پر اس اصلی سامان زینت کا ذکر کیا جو کبھی برباد نہیں ہوتا اور اسی لیے اس کو باقیات کہا جس کے لیے دیکھو ۳۱۷ وہ اعمال جن کا مقصد حصول رضائے الٰہی ہو یہی ایک چیز ہے جو ہمیشہ کے لیے باقی رہتی ہے کیونکہ جزا اسی پر ملتی ہے وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزی الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ ولسوف یرضیٰ (الیل ۹۲- ۱۹ تا ۲۱) اور حدیثوں میں جو الباقیات الصالحات کی تفسیر میں بعض کلمات آئے ہیں جیسے سبحان اللہ - الحمد للہ - اللہ اکبر - لا الہ الا اللہ تو مراد یہی ہے کہ وہ بھی الباقیات الصالحات میں داخل ہیں۔

۱۹۲۷ نسیر - سار کے معنی ہیں چلا اور سَیَّرَہٗ مِنْ بَلَدِہٖ کے معنی ہیں اسے اس کے شہر سے نکال دیا اور جلاوطن کر دیا اور سَیَّرْتُ الجُلَّ عن ظھر

وَعُرِضُوْا عَلٰی رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا
كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ ۡ بَلْ زَعَمْتُمْ
اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾

اور وہ تیرے رب کے سامنے صف باندھ کر پیش کیے جائیں گے یقیناً تم ہمارے پاس آجاؤ گے جس طرح ہم نے تمھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا بلکہ تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمھارے لیے وعدے کے پورا ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں کیا۔[۱۹۲۸]

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ
مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا
مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا
كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا
ع ۱۸ حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

اور کتاب رکھی جائے گی تو تُو مجرموں کو اس سے جو اس میں ہے، ڈرتے ہوئے دیکھے گا اور وہ کہیں گے اے ہم پر افسوس! یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو پیچھے چھوڑتی ہے اور نہ بڑی کو مگر اسے محفوظ کر لیا ہے اور جو کچھ انھوں نے کیا تھا موجود پائینگے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔[۱۹۲۹]

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا
اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ
اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ
مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ

اور جب ہم نے فرشتوں کو کہا آدم کی فرماں برداری کرو تو انھوں نے فرمانبرداری کی مگر ابلیس نے (نہ کی) وہ جنّوں میں سے تھا سو اپنے رب کے حکم سے باہر نکل گیا تو کیا تم مجھے چھوڑ کر اُسے اور اس کی نسل کو دوست بناتے ہو۔ اور وہ تمھارے دشمن ہیں ظالموں کے لیے کیا ہی

الدابّة میں نے چارپائے کی پیٹھ سے جھول کو دور کردیا (ل) اور سَیّرۃ میں کثرت پائی جاتی ہے اور تسییر میں بعض وقت چلنے والے کا ارادہ اور اختیار ہوتا ہے ھو الذی یسیّرکم (یونس ۱۰-۲۲) اور بعض وقت قہر اور غلبہ سے چلانا ہوتا ہے جیسے یہاں (غ)۔

بارزۃ۔ بَرَز کے لیے دیکھو ع۲۰۳ اور بارزۃ کو یا زمین خود کھلا میدان بن جائے گی جس میں کوئی روک باقی نہ رہے گی اور چونکہ برز بعض وقت چھپی ہوئی حالت کے ظاہر ہونے پر بھی بولا جاتا ہے اس لیے بارزۃ سے مراد بھی اسی کے مطابق ہو سکتی ہے جیسے فرمایا یوم تبدل الارض غیر الارض۔

نغادر۔ غَدَر کے معنی کسی چیز کا چھوڑ دینا اور ترک کر دینا ہیں اس لیے ترک عہد پر بھی بولا جاتا ہے اور غدیر وہ پانی ہے جسے سیلاب ایسی جگہ میں چھوڑ دے جہاں پانی جمع ہو جاتا ہے اور غادر کے معنی بھی چھوڑ دیا ہیں۔

اس آیت میں اور اس سے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر فرمایا ہے جہاں یہ دنیا کا مال کچھ کام نہیں دے گا مگر قیامت کے متعلق جس قدر الفاظ استعمال کئے ہیں وہ عموماً مجازی رنگ میں قیامت وسطیٰ یعنی ایک قوم کی تباہی پر بھی صادق آتے ہیں۔

ع۱۹۲۸ عرضوا۔ عَرَضْتُ علیہ کے معنی ہیں اس کے لیے ظاہر کیا (ل) صفا۔ صَفّ کے معنی ہیں چیزوں کو ایک خط مستقیم پر رکھنا۔ اپنے ربّ کے سامنے صف باندھ کر پیش کیا جانے سے کیا مراد ہے؟ حدیث میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اولین اور آخرین کو ایک ہی مقام پر صفیں باندھ کر کھڑا کرے گا۔ مراد اس سے ایک ہی صف میں سب کا کھڑا کرنا بھی ہو سکتا ہے یعنی سب کا یکساں حالت میں اللہ تعالےٰ کے حضور پیش ہونا اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ الگ الگ امتیں الگ الگ صفوں میں کھڑی کی جائیں گی اور بعض نے کہا کہ یہ کلام استعارہ کے رنگ میں ہے اور مشہور معنی میں پیش ہونا یا صفیں باندھنا مراد نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کا ان کے بارہ میں حکم صادر کرنا ہے (ر)۔

لقد جئتمونا یا قول کے طور پر ہے یعنی ہم کہیں گے یا انہیں کہا جائے گا اور یا ماضی کا استعمال استقبال کے لیے تحقق وقوع فعل کے لیے ہے۔ یعنی ضرور تمہاری دوسری پیدائش اسی طرح حق ہے جس طرح یہ پہلی پیدائش حق ہے میرے نزدیک اسی کو ترجیح ہے۔ اور موعد جو وعد سے اسم زمان ہے اس میں اشارہ اس وعدہ کی طرف ہے جو دوسری پیدائش سے تعلق رکھتا ہے اور مصدر میمی بمعنی وعدہ بھی ہے۔

ع۱۹۲۹ وُضع الکتاب۔ وَضع کے معنی رکھنا ہیں اور وضع الکتٰب سے مراد ہے بندوں کے اعمال کا ظاہر کرنا۔ جس طرح فرمایا ونخرج لہ یوم القیامۃ کتٰبا یلقٰہ منشورا دیکھو ع۱۸۱۴ (غ)

صغیرۃ۔ دیکھو کبیرۃ کی بحث ع۶۲۶ اور فرمایا وکل صغیر وکبیر مستطر (القمر ۵۴-۵۳) اور فرمایا ولا اصغر من ذٰلک ولا اکبر (یونس ۱۰-۶۱) تو یہ سب خیر اور شر کا بلحاظ قدر و منزلت کے بڑا یا چھوٹا ہونا ہے ایک دوسرے کی نسبت سے (غ) پس یہاں ہر قسم کے اعمال مراد ہیں۔

لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۵۰ برا بدل ہے ۱۹۳۰

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۵۱

میں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرتے وقت انھیں گواہ نہ بنایا تھا اور نہ خود انھیں پیدا کرتے وقت۔ اور میں ایسا نہ تھا کہ گمراہ کرنے والوں کو (اپنا قوت بازو) بناتا ۱۹۳۱

وَ يَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ۵۲

اور جس دن کہے گا (انھیں) پکارو جنھیں تم میرا شریک قرار دیتے تھے، پس وہ انھیں پکاریں گے مگر وہ انھیں جواب نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان ہلاکت کو حائل کریں گے ۱۹۳۲

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ۵۳ ع ۷ ۱۹

اور مجرم آگ کو دیکھیں گے تو یقین کر لیں گے کہ وہ اس میں پڑنے والے ہیں اور وہ اس سے ہٹ کر جانے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے۔

۱۹۳۰ء جب پچھلے رکوع میں محبت دنیا اور محاسبہ اعمال کا ذکر کیا تو یہاں بتایا کہ انسان شیطان کے پیچھے لگ کر اس غلط راہ پر پڑتا ہے جس کا انجام ہلاکت ہے۔ شیطان کی نافرمانی وغیرہ کے لیے دیکھو ۵۲ء وغیرہ یہاں کھول کر بتایا کہ شیطان ملائکہ میں سے نہیں بلکہ جنوں میں سے ہے۔ بایں صراحت عجیب عجیب کہانیاں ابلیس کو ملائکہ میں سے قرار دینے کے لیے بنائی گئی ہیں کوئی جنوں کو ملائکہ کا قبیلہ قرار دیتا ہے۔ حالانکہ جنّ کے متعلق صراحت سے مذکور ہے کہ اسے نار سے پیدا کیا گیا اور ملائکہ کا نور سے پیدا ہونا حدیث سے ثابت ہے کوئی اسے اشراف ملائکہ میں سے قرار دیتا ہے کوئی کہتا ہے کہ جنوں اور فرشتوں کی جنگ ہوا کرتی تھی ابلیس چھوٹا ہوتا قید ہو کر ملائکہ میں آگیا اور ملائکہ کی طرح عبادت کرنے لگا اس لیے ملائکہ میں سے سمجھا جانے لگا۔ یہ سب بے اصل باتیں ہیں حسن کا قول ہے قاتل اللہ اقواما زعموا ان ابلیس من الملائکۃ واللہ تعالیٰ یقول کان من الجن (ر)

ایک اور بات قابل توجہ یہ ہے کہ یہاں شیطان یا ابلیس کی ذریت بھی قرار دی گئی ہے۔ قتادہ سے روایت ہے ہم یتوالدون کما تتوالد بنو آدم یعنی ان کا سلسلہ نسل اسی طرح چلتا ہے جس طرح بنی آدم کا اور اس سے بھی زیادہ صاف ابن زید کا قول ہے قال اللہ لابلیس انی لا اذرأ لآدم ذریۃ الا ذرأت لک مثلھا (ج) یعنی اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو کہا کہ میں آدم کی نسل میں کوئی شخص پیدا نہیں کروں گا مگر تیرے لیے اس کی مثل پیدا کروں گا۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہر انسان کے لیے الگ شیطان ہوتا ہے اور اس سے صفائی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کا شیطان الگ ہے اور فی الحقیقت ہر انسان کے بیرونی قوی سے جس ہستی کا تعلق ہے وہی اس کا شیطان ہے مگر ان روایات کا یہ مطلب لینا کہ جنوں میں اسی طرح نکاح اور سلسلہ توالد و تناسل ہوتا ہے جس طرح انسانوں میں صحیح نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ذریت وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہی کام کرتی ہے جو وہ کرتا ہے۔ چنانچہ بعض نے ذریت سے مراد اس کے اتباع لیے ہیں۔

۱۹۳۱ء عَضُد اصل میں وہ حصہ ہے جو کہنی اور کندھے کے درمیان ہے یعنی بازو اور استعارۃً مددگار کو بھی کہتے ہیں (غ)

خلق میں عدم شرکت: ما اشھدتھم خلق السمٰوٰت۔ شاہد نہ بنانے سے کیا مراد ہے شاھد یا شھید کے اصل معنی صرف گواہ کے ہیں تو بعض نے اس سے مراد لیا ہے کہ ان سے مشورہ نہیں کیا اور بعض نے یہ کہ وہ اپنی مشیت کے مطابق پیدا نہیں ہوئے یعنی کامل پیدا نہیں ہوئے (ر) لیکن کسی کو کسی اہم کام کے وقت بلانے سے منشا یہ ہوتا ہے کہ اس سے مدد لی جائے اسی بنا پر وادعوا شھداءکم من دون اللہ (البقرۃ۔ ۲۳) میں شہداء سے مراد مددگار لیے گئے ہیں اور ابن جریر نے یہی مراد لی ہے ما احضرتھم ذٰلک فاستعین بھم۔ اور خود آیت کے خاتمہ کے الفاظ اسی معنی پر دلالت کرتے ہیں جہاں فرمایا کہ میں مضلین کو اپنا مددگار نہ بنا سکتا تھا۔ پس مراد یہ ہے کہ پیدائش میں یہ خدا کے شریک یا معاون نہیں کہ ان کی فرمانبرداری کی جائے کیونکہ حق عبادت خلق سے پیدا ہوتا ہے ما اشھدتھم میں کون مراد ہیں بعض نے شیاطین مراد لیے ہیں اور بعض نے کفار بعض نے ملائکہ، مگر مراد یہاں وہ ہیں جنھیں شیاطین کے پیچھے لگ کر خدا کے شریک بنایا جاتا ہے اور اگلی آیت میں اسے صاف بھی کر دیا ہے نادوا شرکاءی پس یہاں وہی شرکاء مراد ہیں اور انہیں کو مضلین کہا ہے کیونکہ ان کی وجہ سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں ربّ انھن اضللن کثیرا (ابراھیم۔ ۳۶)

۱۹۳۲ء بینھم۔ بین درمیان کے معنی میں بھی آتا ہے اور اس کے معنی وَصل یعنی ملاپ یا تعلق بھی ہیں۔ دوسری جگہ ہے لقد تقطع بینکم (الانعام۔ ۹۴) جہاں وصل ہی مراد ہے (غ) اور یہاں بھی یہی مراد ہے۔

موبق۔ وَبَق ایک امر سے باز رہا پس ہلاک ہو گیا۔ او یوبقھن (الشوریٰ۔ ۳۴) پس موبق ہلاکت ہے (غ)

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

اور بلا شبہ ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثالیں بار بار بیان کی ہیں اور انسان بہت ہی جھگڑالو ہے ۱۹۳۳

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾

اور کسی چیز نے لوگوں کو جب ہدایت ان کے پاس آگئی اس بات سے نہیں روکا کہ وہ ایمان لائیں اور اپنے رب سے استغفار کریں مگر یہ کہ پہلوں کا طریق اُن سے برتا جائے یا عذاب ان کے سامنے آموجود ہو۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾

اور ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے۔ اور جو کافر ہیں وہ باطل پر جھگڑا کرتے ہیں۔ تاکہ اس کے ساتھ حق کو زائل کردیں اور میری آیتوں کو اور اسے جو انھیں ڈرایا جاتا ہے ہنسی سمجھتے ہیں ۱۹۳۴

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ ان سے منہ پھیر لیتا ہے اور اسے بھول جاتا ہے جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے (پس) ہم نے انکے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں تاکہ اسے نہ سمجھیں اور انکے کانوں میں بوجھ (ڈال دیا) ہے اور اگر تو انھیں ہدایت کی طرف بلائے تو وہ کبھی بھی ہدایت پر نہ آئیں گے ۱۹۳۵

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾

اور تیرا رب بخشنے والا رحمت کا مالک ہے اگر وہ انھیں اس پر پکڑے جو وہ کماتے ہیں، تو فوراً اُن پر عذاب بھیج دے۔ بلکہ اُن کے لیے ایک وعدے کا وقت ہے جس کے مقابل پر وہ کوئی پناہ نہ پائیں گے ۱۹۳۶

۱۹۳۳ء اکثر شئ جدلا سے یہ مراد نہیں کہ دوسری چیزوں کی نسبت انسان زیادہ جھگڑتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ حالانکہ حق کو طرح طرح کے پیرایوں میں بار بار بیان کیا جاتا ہے مگر باایں ہمہ انسان سے جھگڑا ہی زیادہ سرزد ہوتا ہے اور وہ اسے قبول کرنے کی بجائے کج حجتی کرتا چلا جاتا ہے اصل غرض اس رکوع کی ان اعدائے حق کے لیے وعدہ ہلاکت ہے جن کے ذکر سے یہ سورت مخصوص ہے وینذر الذین قالوا اتخذ اللّٰہ ولدا (۴) مگر ابتداء اس وعدہ کی یوں کی کہ باوجود حق کی مختلف پیرایوں میں وضاحت کے بجائے اسے اختیار کرنے کے جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں ؂

۱۹۳۴ء یدحضوا۔ دَحض کے معنی ہیں پھسلنا اور اِدحاض پھسلانا (ل) اور دلیل کے دَاحِض ہونے سے مراد اسکا باطل اور زائل ہونا ہے حجتہم داحضۃ عند ربہم (الشوریٰ ۴۲:۱۶)

۱۹۳۵ء دیکھو ۹۲۶ء یہاں بھی صاف ظاہر ہے کہ دلوں پر پردے ابتداءً نہیں بلکہ بطور سزا ڈالے جاتے ہیں ایک شخص آیات سے روگردانی کرتا ہے اور بدکاریوں میں بھی مبتلا ہے جیسا کہ نسی ما قدمت یداہ سے ظاہر ہے اس لیے اس کے دل کا شیشہ سیاہ ہو جاتا ہے اور حق اس میں منعکس نہیں ہوتا ؂

۱۹۳۶ء موئل۔ وَأَلَ الیہ کے معنی ہیں اس کی پناہ میں گیا۔ اور مَوْئِل کے معنی ملجا یا پناہ ہیں (ل)

وَ تِلْكَ الْقُرٰۤى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَ جَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ۵۹ ع ۸/۲۰

اور ان بستیوں نے جب ظلم کیا ہم نے انھیں ہلاک کر دیا اور ان کی ہلاکت کے لیے (بھی) ہم نے ایک وعدے کا وقت مقرر کر دیا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا ۶۰

اور جب موسیٰؑ نے اپنے نوجوان (ساتھی) کو کہا میں (چلنا) نہیں چھوڑونگا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے اکٹھا ہونے کی جگہ پہنچ جاؤں یا برسوں چلتا رہوں۔ ع۱۹۳۷

وعدہ ہلاکت: مطلب یہ ہے کہ ظالموں کے کام تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر فوراً عذاب آجائے مگر اللہ تعالیٰ کا غفر اور رحم بہت بڑا ہے اس لیے بڑی مہلت دے کر عذاب بھیجتا ہے اور پھر جب وہ عذاب آتا ہے تو اس سے پناہ بھی کوئی نہیں ملتی۔ یہاں صاف طور پر یہ بتا دیا کہ ان اعدائے حق کے لیے بھی جن کا ذکر ہو رہا ہے ایک وقت وعدہ عذاب کا ہے مگر وہ خدا کے علم میں ہے جلد نہیں آتا۔ اگلی آیت میں پہلوں کی ہلاکت کا ذکر کر کے صاف فرما دیا کہ ان کی ہلاکت بھی ایسی ہی یقینی ہے۔ مگر ہلاکت سے مراد محض ان کی قوت کا توڑنا ہوتا ہے جو حق کے مقابل پر ہوتی ہے ؀

ع۱۹۳۷ برح۔ لاابرح۔ براح فراخ کھلے مکان کو کہتے ہیں جس میں کوئی روک نہ ہو اور برِح کے معنی ہیں براح میں قایم ہو گیا اور مراد اس سے زائل کی طرح نفی ہوتی ہے اس لیے لاابرح اثبات کے معنی میں آتا ہے۔ کیونکہ دو نفیوں کا اجتماع اثبات ہوتا ہے۔ لن نبرح علیہ عاکفین (طٰہٰ ۲۰-۹۱) (غ)

مجمع البحرین۔ دو دریاؤں یا دو سمندروں کے ملنے کی جگہ ہے۔ مجاہد۔ قتادہ وغیرہ سے مروی ہے کہ بحر فارس اور بحر روم کے ملنے کی جگہ مراد ہے (ج) مگر یہ دونوں سمندر باہم ملتے ہی نہیں اور بعض نے کہا کہ وہ آرمینیا میں دو دریا ہیں۔ مگر وہاں حضرت موسیٰ کبھی گئے ہی نہیں۔ اور اُبیؓ سے مروی ہے کہ وہ افریقہ میں ہے (د) اور یہی صحیح ہے اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بعثت سے پیشتر بھی اور بعثت سے بعد بھی مدت تک مصر میں رہے اور مجمع البحرین بحر ابیض اور بحر اسود یعنی دریائے نیل کی دونوں بڑی شاخوں کے ملنے کی جگہ ہے اور یہ خرطوم پر ملتے ہیں اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد بحر ملح اور بحر عذب یعنی نمکین اور میٹھے سمندر کا ملنا ہے (ر) جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے (الفرقان ۲۵-۵۳۔ الفاطر ۳۵-۱۲) مگر یہ خاص دو سمندروں کے نام نہیں اور بعض نے کہا کہ یہ موسیٰؑ اور خضر کے ملنے سے مجاز ہے کیونکہ وہ علم کے دو دریا تھے (ر) مگر اس صورت میں خود حضرت موسیٰ کا فرمانا کہ میں مجمع البحرین میں پہنچوں صحیح نہیں ٹھہرتا ہاں مجازی معنی لے کر یوں کہہ سکتے ہیں کہ دو بحر دنیا اور دین ہیں یا علوم دنیا اور علوم روحانی اور اسی کی طرف فی الحقیقت بحر ملح اور بحر عذب میں بھی اشارہ ہے تو اس صورت میں مجازاً مراد دین و دنیا کا ملنا یا علوم دینی اور علوم دنیوی کا اجتماع ہے۔ جو نہ حضرت موسیٰ کی اُمت کو میسر آیا اور نہ حضرت عیسیٰ کو بلکہ اُمت محمدیہ کے لیے یہ مقدر تھا۔ پس ظاہر طور پر مجمع البحرین سے مراد بحر ابیض اور بحر اسود کے ملنے کی جگہ ہے اور اس میں اشارہ سلسلہ محمدیہ (صلعم) کی طرف ہے جیسا کہ آگے چل کر وضاحت سے دکھایا جائے گا ؀

حقب۔ حِقبَۃ زمانہ کی مدت ہے جس کا وقت مقرر نہیں اور سال کو بھی کہتے ہیں اور حُقُب اور حُقب اسی ۸۰ سال کو کہتے ہیں اور حُقُب کی جمع حِقاب اور اَحْقاب آتی ہے اور یا حُقُب زمانہ ہے اور احقاب زمانے اور ثعلب سے حُقُب کے معنی ایک سال یا کئی سال مروی ہیں (ل) ؀

موسیٰ اور خضر کے قصے پر اختلاف روایات:۔ یہاں سے وہ ذکر شروع ہوتا ہے جو حضرت خضر کے قصّہ کے نام سے مشہور ہے۔ خضر کون تھے اور ان کا قصّہ کیا ہے۔ حضرت موسیٰ ان سے کیا سیکھنے گئے تھے۔ اور اس قصہ کو یہاں لانے کی کیا غرض ہے۔ جہاں پہلے بھی عیسائیت کا ذکر ہو رہا ہے اور ابھی ان اقوام کی ہلاکت کا ذکر کیا تھا اور بعد میں بھی یاجوج ماجوج کا ذکر ہے جو انہی اقوام سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دو سوال ہیں جن کا جواب اشکال سے خالی نہیں۔ دوسرے سوال یعنی تعلق کی ایک ہی توجیہ مفسرین میں ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اصحاب کہف کا ذکر یہود کے سوال پر کیا گیا تو اس قصّہ کو لا کر یہ بتایا گیا کہ ضروری نہیں کہ نبی کو سب باتوں کا علم دیا جائے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ یہود نے یہ کہا تھا کہ اگر آپ اصحاب کہف کا قصہ بتا دیں تو آپ نبی ہیں ورنہ نہیں۔ مگر میں دکھا چکا ہوں کہ یہ روایت ہی قابل قبول نہیں۔ اور تعلق کی یہ وجہ بھی کافی نہیں ؀

حضرت موسیٰ کے تلاش خضر میں نکلنے کی وجہ:۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ ضروری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ احادیث قصص گو وہ صحیح بخاری یا دیگر صحاح میں ہوں اس قابل نہیں ہوتیں کہ ان کے ایک ایک لفظ کو نبی کریم صلعم کی طرف وثوق کے ساتھ منسوب کیا جا سکے اور اس فرق کو جو احادیث مسائل اور احادیث قصص میں ہے محدثین نے خود تسلیم کیا ہے اس لیے جہاں تک ممکن ہو قرآن شریف کے الفاظ پر قصص میں بہت سی تفصیلات کو بڑھانا نہیں چاہئے۔ قرآن شریف میں یہ ذکر نہیں کہ حضرت موسیٰ کو کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ احادیث میں اختلاف ہے۔ بعض احادیث میں تو یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے ایک موثر وعظ پر ایک شخص نے آپ سے سوال کیا کہ کیا آپ سے زیادہ علم والا کوئی شخص بھی دنیا میں موجود ہے تو آپ نے فرمایا نہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو عتاب کیا اور فرمایا کہ ہمارا بندہ خضر ہے۔ اور بعض احادیث میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ اگر کوئی مجھ سے زیادہ علم والا شخص ہو تو اس کا نشان مجھے بتائیے۔ تو اللہ تعالیٰ نے بتایا اور اس کے ملنے کی اجازت بھی دی یہ دوسری حدیث ایک نبی کی شان کے زیادہ شایاں ہے اس لیے دوسری کو ہم قبول کرتے ہیں اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے کئی سوال کئے تھے کون بندہ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے کون سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے کون سب سے زیادہ علم والا ہے تو اس آخری سوال کے جواب

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾

پس جب وہ ان دونوں (دریاؤں) کے اکٹھا ہونے کی جگہ پہنچے وہ اپنی مچھلی بھول گئے تو اس نے چلتے چلتے اپنا رستہ دریا میں لے لیا۱۹۳۸

ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ علم والا وہ ہے جو دوسرے لوگوں کے علم کو طلب کرتا ہے کہ اس طرح سے اپنا علم بڑھائے۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے سوال کیا کہ مجھے اس شخص کا پتہ بتایا جائے جو مجھ سے زیادہ علم والا ہے تاکہ میں اس کے پاس جاؤں تب اللہ تعالیٰ نے آپ کو خضر کا پتہ بتایا پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے یہ سفر اس لیے کرایا کہ تا انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کا علم صرف ایک قوم کے لیے ہے۔ ایسا ہی علم اللہ تعالیٰ نے اور لوگوں کو بھی دیا ہے اور قرآن کریم سے اس کی تائید ان الفاظ سے ہوتی ہے ان تعلّمن مما علّمت رشدا (۶۶) اور اس قصّہ کے یہاں لانے کی غرض یہ ہے کہ ایک طرف عیسائیوں کے ان اعتراضات کا جواب دیا جائے جو وہ آنحضرت صلعم پر کرتے ہیں اکثر عیسائی مورخین اس بات کے قایل ہیں کہ مکّہ میں آپؐ کی زندگی بالکل بے لوث تھی مگر مدینہ میں آکر بادشاہ بن کر لوگوں کو ناحق قتل کیا گیا۔ اس کا جواب یہاں دیا ہے کیونکہ سب سے بڑی بات جو حالات خضر میں نظر آتی ہے وہ ایک ایسے شخص کا قتل ہے جس پر الزام قتل کوئی نہ تھا اور باقی دو معاملات میں بھی آنحضرت صلعم کی صداقت کی طرف ہی اشارہ ہے جس کے لیے دیکھو ۱۹۵۲ء دوسری طرف یہ بھی اس قصّہ کے لانے کی غرض معلوم ہوتی ہے کہ یہ بتایا جائے کہ سلسلہ موسوی ایک محدود سلسلہ تھا جس کا پیغام کل دنیا کی طرف ہونا تو ایک طرف رہا وہ قومیں جو بنی اسرائیل سے بالکل قریب رہتی تھیں ان کے حالات سے بھی ان کو واقفیت نہ تھی اور نہ وہ سلسلہ دوسری قوموں کی ہدایت کے لیے تھا بلکہ ان قوموں کو علیحدہ ہدایتیں دی گئی تھیں اور وہ ایسی ہدایتیں تھیں جن سے خود حضرت موسیٰؑ بھی ناواقف تھے۔ عیسائیوں نے یہ سخت غلطی کھائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی کو چند انبیائے بنی اسرائیل تک محدود کیا ہے۔ تیسرے یہ بھی ظاہر کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی پیشگوئیاں خود یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اور اس سورت میں چونکہ عیسائیت کے حالات سے بحث تھی اس لیے اس قصّہ کو یہاں لایا گیا ہے تا وہ اسلام کی طرف رجوع کریں۔

حضرت موسیٰ کا سفر خرطوم: سب سے پہلے اس تذکرہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا فی الواقع بھی حضرت موسیٰ نے کوئی ایسا سفر کیا۔ جو واقعات آپ کے بائبل میں موجود ہیں ان میں کوئی ایسا ذکر نہیں۔ نہ علمائے یہود کی روایات میں ایسا ذکر ہے۔ لیکن تورات میں یہ ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ کی ایک بی بی اس علاقہ کی تھیں" اور مریم اور ہارون نے موسیٰ کا شکوہ اس کوشی عورت کی بابت کہ اس نے لی تھی کیا کیونکہ اس نے ایک کوشی عورت لی تھی" (گنتی ۱۲: ۱) اور علمائے یہود کی روایات میں جو ذکر حضرت موسیٰ کا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ ایتھیوپیا گئے تھے جو مصر کے جنوب میں ایک بادشاہت تھی جس کی جنوبی حد خرطوم ہے بلکہ یہ بھی ذکر ہے کہ اس ملک کے بادشاہ کی بیوہ کے ساتھ انہوں نے شادی بھی کی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ انہی کی تدبیر اور بہادری سے اس کو ایک بڑے قوی دشمن سے نجات ملی تھی پس ان حالات کے ہوتے ہوئے حضرت موسیٰ کا ایسا سفر کرنا بالکل قرین قیاس ہے اور چونکہ مدین سے واپس آکر آپ کو بہت وقت مصر میں رہنا پڑا اس لیے اغلب یہی ہے کہ یہ سفر اس وقت پیش آیا۔

حضرت موسیٰ کا فتی یا نوجوان ساتھی یا خادم جس کا یہاں ذکر ہے اس کا نام معلوم کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ مگر اکثر روایات میں اس کا نام یوشع دیا گیا۔ یہ وہی یوشع ہیں جو حضرت موسیٰ کے جانشین بھی ہوئے۔

۱۹۳۸ء مچھلی کا بھولنا اور اس کا دریا میں چلا جانا: اس آیت میں دو باتوں کا ذکر ہے۔ ایک یہ کہ مجمع البحرین کے موقعہ پر پہنچکر وہ مچھلی کو بھول گئے اور دوسرا یہ کہ وہ مچھلی دریا میں چلی گئی اگر صرف الفاظ قرآنی کی تشریح مطلوب ہو تو اس میں چنداں دقت معلوم نہیں ہوتی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ دریا کے کنارہ پر چل رہے تھے۔ سفر میں جب ٹھہر جاتے ہونگے تو مچھلی پکڑ لیتے ہونگے تاکہ بھوک کے وقت غذا کا کام دے اور سہل ترین غذا یہی تھی جو اس حالت میں میسر آسکتی تھی۔ اور اگلی آیت اور اس سے اگلی آیت صاف بتاتی ہیں کہ جب حضرت موسیٰ نے غذا مانگی تو آپ کے ساتھی نے کہا کہ مچھلی تو میں بھول گیا۔ یعنی ساتھ نہیں لایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی غذا کے لیے ساتھ رکھتے تھے اور مچھلی کا دریا میں چلا جانا بھی معمولی بات ہے اور سَرَب کے معنی کے لیے دیکھو ۱۶۰۴ء صرف الذھاب فی حدور یعنی نیچے کی طرف چلا جانا ہیں اور راغب نے یہی معنی دے کر اس آیت کو نقل کیا ہے۔ اور سارب کے معنی چلنے والا وہیں آچکے ہیں پس سربا بلحاظ معنی فاتخذ سبیلہ کے لیے مصدر موکد کے طور پر ہے اور تفسیر ابن جریر میں ہے کہ سرب سے مراد مسلک اور رستہ ہے یعنی دریا میں رستہ بنا کر چلی گئی اور بخاری میں بھی سرب کے معنی مذہب یعنی رستہ ہی ہیں۔

مچھلی کا بطور نشان دیا جانا: لیکن بخاری کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ میں اس شخص تک کس طرح پہنچوں تو آپ کو بذریعہ وحی اطلاع دی گئی قَالَ تَاْخُذُ معك حُوْتًا فَتَجْعَلُهٗ فِی مِکْتَلٍ فحیثما فَقَدْتَ الحُوتَ فَهُوَ ثَمَّ یعنی ایک مچھلی ساتھ لے لو اور اسے ایک زنبیل میں رکھ لو پھر جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے وہیں وہ ہوگا اور ایک اور روایت میں ہے فاوحی الیہ ان ائت البحر فانك تجد علی شط البحر حوتا فخذہ فادفعه الی فتاك ثم الزم شاطئ البحر فاذا نسیت الحوت وھلك منك فثمّ تجد العبد الصالح الذی تطلب (ت) یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ دریا پر چلے جاؤ تو دریا کے کنارے ایک مچھلی تمہیں ملے گی اس کو لیلو اور اسے اپنے ساتھی کو دے دو۔ پھر دریا کے کنارے کنارے چلتے جاؤ پس جہاں تم مچھلی بھول جاؤ اور وہ گم ہو جائے وہیں تم اس عبد صالح کو پاؤ گے جس کی تلاش کرتے ہو۔ پھر کسی روایت میں اسے مری ہوئی مچھلی کہا گیا

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾

سو جب وہ دونوں آگے نکل گئے (موسیٰ نے) اپنے نوجوان (ساتھی) سے کہا ہمارا صبح کا ناشتہ لے آ ہمیں اس (آج کے) سفر سے تکان ہوگئی ہے ۱۹۳۹۔ کہا دیکھیئے، جب ہم نے چٹان پر پناہ لی تھی تو میں مچھلی بھول گیا اور شیطان نے یہ مجھے بھلا دیا کہ اس کا ذکر کروں اور اس نے سمندر میں اپنا رستہ لے لیا، تعجب ہے ۱۹۴۰

ہے اور کسی میں نمکین اور کسی میں بھنی ہوئی۔

مچھلی کا بھنا ہوا ہونا قابل قبول نہیں:- اب روایات کو قبول کرتے وقت یا ان روایتوں کو قبول کرنا پڑے گا جو قرآن شریف کے بیان کے مطابق ہیں کہ معمولی مچھلی تھی اور دریا کے کنارے سے لے لی تھی اور یا ان کو جن میں اس کے بھنے ہوئے اور نمکین ہونے کا ذکر ہے اقرب الی الصواب یہی ہے کہ ان زوائد کو کہ وہ نمکین تھی یا کباب تھا قبول نہ کیا جائے۔ علاوہ ازیں جو الفاظ اس قسم کے ہیں کہ جہاں چٹان کے پاس مچھلی رکھی تھی وہاں آب حیات کا چشمہ تھا اور یوشع کے وضو کے قطرے مچھلی پر پڑے تو وہ مچھلی زندہ ہوگئی یہ بھی ساتھ ہی رد کرنے کے قابل ہیں اور سب پر جو اور حاشیے چڑھائے گئے ہیں کہ جہاں سے مچھلی گزرتی تھی پانی جمتا چلا جاتا تھا یا پتھر کی طرح ہوتا جاتا تھا یا واقعی پتھر ہوتا جاتا تھا اور ایک روایت میں تو کمال کر دیا ہے کہ دریا میں آگے آگے مچھلی بھاگی جاتی تھی پیچھے پیچھے حضرت موسیٰ اپنے عصا کی مدد سے پانی کو چیرتے ہوئے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ ایک جزیرہ پر پہنچ گئے جہاں خضر کو ملے اور مچھلی کے چھونے سے پانی پتھر کی طرح ہوتا جاتا تھا ان تمام باتوں کی قرآن شریف میں کوئی اصلیت نہیں اور روایات قصص اس قدر قابل اعتماد نہیں کہ ان کے ایسے بعید از عقل قصے بھی قبول کئے جائیں۔

حصول علم کے لیے سفر اور صعوبت کا اٹھانا:- ہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ معمولی طور پر اگر کھانے کی مچھلی اسے سمجھا جائے تو قرآن شریف نے اس کا ذکر کیوں کیا سو بات یہ ہے کہ بتانا یہ تھا کہ علم کے حاصل کرنے کے لیے انبیاء نے کیا کیا صعوبتیں اُٹھائی ہیں اور علم سے کس قدر محبت رکھتے تھے کہ اتنا بڑا سفر اختیار کیا جس میں سواری کا بھی کوئی انتظام نہیں۔ اور پھر غذا کے ساتھ لینے کا بھی کوئی اہتمام نہیں کیا بلکہ مچھلی پر ہی صبر کیا جو وہیں دریا کے کنارے سے مل جاتی تھی۔ باقی یہ ہو سکتا ہے کہ حدیث کے الفاظ میں رواۃ سے اس قدر تصرف ہوگیا ہو کہ روزمرہ غذا کی مچھلی کو نشان سمجھنے کی بجائے انہوں نے ایک ہی خاص مچھلی کو نشان سمجھ لیا ہو ممکن ہے یہی نشان قرار دیا گیا ہو کہ روزمرہ غذا کی مچھلی جہاں بھول جاؤ وہیں وہ ہوگا۔

۱۹۳۹ انبیاء کی فطرت ایسی سلیم ہوتی ہے کہ اتنے لمبے سفر میں حضرت موسیٰ نے کوئی تکان محسوس نہیں کی جب تک کہ حد مقررہ سے آگے نہیں نکل گئے۔

۱۹۴۰ صخرۃ۔ الصخرۃ العظیم الصُّلب (ل) یعنی بہت بڑے اور سخت پتھر کو صخرۃ کہا جاتا ہے فتکن فی صخرۃ (لقمٰن ۳۱-۱۶) جمع صخر ہے جابوا الصخر بالواد (الفجر ۸۹-۹)۔

عجبا۔ عجب اور تعجّب وہ حالت ہے جو انسان کو کسی چیز کے سبب سے ناواقفیت کی وجہ سے پیش آتی ہے اور بعض حکما کا قول ہے کہ عجب وہ ہے جس کا سبب سمجھ نہ آئے۔ کانوا من اٰیٰتنا عجبا میں یہ بتانا ہے کہ یہ کوئی بڑے تعجب کی بات نہیں بلکہ ہمارے امور میں اس سے بھی بڑی اور عجیب تر باتیں ہیں۔ اور یہاں عجبا فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کی تقدیر یوں ہے اعجب عجبا (ر) یعنی میں اسباب پر تعجب کرتا ہوں کہ یہ آپ سے ذکر کرنا مجھے کیوں یاد نہ رہا یہی وجہ ہے کہ تحریر میں فی البحر کے بعد وقف لا کر پھر عجبا آتا ہے گویا اسے علیحدہ کیا ہے۔

مچھلی بھول جانے کا سبب: اوی کے لفظ سے جس میں پناہ لینے کا مفہوم پایا جاتا ہے دیکھو ۱۲۲۷ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے چٹان پر پناہ لی اور چونکہ ان کا سفر دریا کے کنارے کنارے تھا۔ اس لیے پناہ سیلاب سے ہی لی ہوگی جو یکایک آگیا اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسا وقت تھا جب آپ آرام کر رہے تھے تو گھبراہٹ میں اٹھنا پڑا۔ مچھلی کو بھول جانے کی بھی یہی وجہ ہے خواہ یہ خاص مچھلی ہو جو بطور نشان ساتھ لی گئی تھی یا محض کھانے کے لیے کوئی مچھلی دریا سے پکڑ کر ساتھ رکھی ہو۔ ناشتہ کے مانگنے پر آپ کے ساتھی کا یہ کہنا بتاتا ہے کہ پہلی صورت تھی۔ لیکن حدیث میں اسے خاص مچھلی قرار دیا ہے۔ جو بطور نشان ساتھ لی تھی۔ تو اس صورت میں غذا کے ذکر کی وجہ سے مچھلی کا خیال یوشع کو آگیا کیونکہ گو وہ مچھلی بطور نشان تھی مگر مچھلی کھائی بھی جاتی تھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مچھلی آپ کھاتے بھی تھے۔ کیونکہ اگر وہی نشان والی مچھلی ہی کھاتے ہوتے تو اتنے لمبے سفر میں وہ کفایت کیونکر کر سکتی تھی یہاں کہا انی نسیت الحوت اور پہلی آیت میں ہے نسیا حوتھما یعنی دونوں بھول گئے یہ دونوں تعبیر درست ہیں اس لیے کہ دونوں میں سے کسی کو مچھلی کا ساتھ لینا یاد نہ رہا اور اکیلے ساتھی کی طرف اس لیے منسوب ہے کہ اس کے سپرد یہ کام خصوصیت سے تھا۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى
اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾
فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً
مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

کہا، یہی تو ہے جو ہم تلاش کرتے تھے، سو وہ دونوں اپنے
(پاؤں کے) نشانوں کا پیچھا کرتے ہوئے واپس لوٹے 1941
پس انھوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنے
پاس سے رحمت عطا فرمائی تھی اور اپنے پاس سے اسے علم سکھایا تھا۔ 1942

1941ء حضرت موسیٰ کے لیے نشان بروے روایات صخرۃ بھی تھا اور مچھلی بھول جانا بھی: پچھلی آیت میں حضرت موسیٰ کے رفیق نے دو باتوں کا ذکر کیا ہے ایک چٹان پر پناہ لینے کا دوسرا مچھلی بھول جانے کا تو حضرت موسیٰ نے جو فرمایا ذلک ماکنا نبغ یہی ہم تلاش کرتے تھے تو ممکن ہے ان کی مراد صخرۃ ہو۔ یعنی صخرۃ ہی تو ہماری مقررہ جگہ تھی اور ممکن ہے مراد یہ ہو کہ مچھلی کا بھول جانا ہی نشان تھا۔ اکثر روایات میں تو نشان مچھلی کا بھول جانا ہی قرار دیا ہے اور ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے پتہ دریافت کیا تو آپ کو بتایا گیا عند الصخرۃ التی عندھا العین اس چٹان کے پاس جس کے قریب چشمہ یا دریا ہے۔ ممکن ہے وہاں کوئی چشمہ بہتا ہو اور ممکن ہے عین سے مراد دریا ہی ہو۔ غرض صخرۃ کے ذکر پر یا مچھلی بھول جانے کے ذکر پر حضرت موسیٰ واپس ہوئے اس میں یہ بتایا ہے کہ انبیاء سے بھی غلطی یا فروگزاشت ایسے معاملات میں ہو جاتی ہے جو شریعت سے تعلق نہیں رکھتے مگر اللہ تعالیٰ ان کو غلطی پر قائم نہیں رکھتا بلکہ جلد ہی اس کے دور کرنے کے سامان پیدا کر دیتا ہے خواہ بذریعہ اپنی وحی کے ایسا کرے خواہ اور واقعات پیدا کر کے۔

1942ء خضر کون تھے: یہ بندہ کون تھا؟ احادیث میں ان کا نام خضر آیا ہے مگر ان کے بارہ میں اختلاف اقوال کی کوئی حد نہیں۔ بعض ان کو ولی۔ بعض نبی غیر مرسل بعض نبی رسول کہتے ہیں بعض انہیں ایک فرشتہ قرار دیتے ہیں۔ پھر کوئی کہتا ہے وہ آدم کی پیٹھ سے ان کے فرزند تھے۔ بعض انہیں قابیل کا فرزند کہتے ہیں کوئی انہیں ارمیاہ اور کوئی الیسع قرار دیتا ہے کوئی فرعون کا بیٹا اور کوئی فرعون کی بیٹی کا بیٹا قرار دیتا ہے پھر کوئی کہتا ہے وہ اب تک زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے یہاں تک کہ دجال کی تکذیب کریں اہل علم کہتے ہیں وہ مر گئے۔ صوفی کہتے ہیں وہ اب بھی موجود ہیں اور لوگ ان سے ملاقات بھی کرتے ہیں بعض ان سے علم سیکھنے کا بھی دعوےٰ کرتے ہیں۔ اس میں تو کچھ شک نہیں کہ اگر وہ انسان تھے تو اپنے وقت پر فوت ہو چکے روح المعانی ابن کثیر فتح البیان میں اسی کو صحیح ٹھہرایا ہے کیونکہ اگر وہ زندہ ہوتے تو آنحضرت صلعم کی اتباع ان کے لیے لازمی تھی اسی موقعہ پر ابن کثیر نے آنحضرت صلعم کی اس حدیث کو نقل کیا ہے لوکان موسیٰ و عیسیٰ حیّین لما وسعھما الا اتباعی۔ اگر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اتباع کرنا پڑتا جس سے نہ صرف خضر کا وفات یافتہ ہونا ثابت ہوتا ہے بلکہ حضرت عیسیٰؑ کا بھی وفات یافتہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ جو بڑی کثرت سے صوفیاء کی شہادت ملتی ہے کہ وہ خضر کو ملے تو یہ ملنا بطور مکاشفہ ہے جیسا کہ اور انبیاء اور صلحاء کی بھی ملاقات رویا یا کشف میں ہو جاتی ہے۔

خضر کی نبوت: دوسری بات جو وثوق سے کہی جا سکتی ہے یہ ہے کہ اگرچہ جمہور نے خضر کو ولی یا نبی غیر مرسل مانا ہے لیکن ان کے جن حالات کا ذکر قرآن شریف میں ہے ان سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کی طرف رسول تھے گو بلحاظ ضروریات قومی ان کی نبوت کا رنگ علیحدہ ہو ان کے نبی ہونے کا یہ قطعی ثبوت ہے کہ قرآن شریف سے ان کی وحی حجت ثابت ہوتی ہے ولی کا الہام حجت شرعی نہیں ہوتا جب تک کہ شریعت اس کی تصدیق نہ کرے صرف نبی کی وحی حجت ہوتی ہے میں اس جگہ ایک چھوٹا سا واقعہ لکھتا ہوں جو ولی کے الہام اور شریعت کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو ایک دفعہ اُنتیس روزوں کے گذر جانے پر الہام ہوا کہ عید تو آج ہے چاہو کرو یا نہ کرو۔ مگر اُنتیس کے دن قادیان اور اس کے گرد و نواح میں چاند نہ دیکھا گیا۔ صبح کو جب آپ نے یہ الہام سنایا تو بعض لوگوں نے دریافت کیا کہ جب الہام آپ کو ہو گیا ہے تو کیا ہم روزے نہ کھول دیں اور عید نہ کر لیں۔ آپ نے فرمایا نہیں یہ شریعت کا مسئلہ ہے کہ اُنتیس کو اگر چاند نظر آئے تو عید کی جائے اس لیے روزہ ہی رکھنا چاہیے۔ بعد میں دوسرے مقامات سے تاریں آ گئیں کہ چاند پہلی شب یعنی اُنتیس کا دیکھا گیا۔ یوں الہام کی بھی تصدیق ہو گئی۔ مگر عمل شریعت پر ہی ہوا اور یہی امّت کا مسلّمہ مذہب ہے، پس خضر کے اپنی وحی کو حجتِ قطعی ٹھہرانے سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ رسول اور نبی تھے۔

مقامی نبوتیں اور مقامی ضروریات: ہاں یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ باوجود نبی ہونے کے ان کو جو احکام دیئے گئے ان کا رنگ کچھ اور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ کو کہا یا موسیٰ انی علی علم من علم اللہ علّمنیہ لا تعلمہ انت وانت علی علم من علم اللہ علّمک اللہ لا اعلمہٗ۔ اے موسیٰ میں اللہ کے علم میں سے ایک علم پر ہوں جو اس نے مجھے سکھایا ہے جسے تو نہیں جانتا اور تو اللہ کے علم میں سے ایک علم پر ہے جو اللہ نے تجھے سکھایا ہے۔ اسے میں نہیں جانتا مطلب یہ کہ تم ایک قوم کے لیے مبعوث ہوئے ہو تمہیں ایک علم دیا گیا ہے جو اسکی ضروریات کے مطابق ہے میں ایک دوسری قوم کیلئے مبعوث ہوا ہوں مجھے وہ علم دیا گیا ہے جو اس قوم کے حالات کے مطابق ہے نہ تمہارا علم مجھے فائدہ دے سکتا ہے نہ میرا تمہیں ضروریات قومی کا اقتضاء یہی تھا کہ ہر قوم کے نبی کو اس قوم کے حالات کے مطابق علم دیا جاتا کامل علم ہر قسم کی انسانی ضروریات کا صرف ایک ہی انسان کے لیے مقدر تھا یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی لیے آپ کو ایک قوم کی طرف مبعوث نہیں کیا گیا بلکہ کافۃ للناس مبعوث کیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کا دائرہ

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ
تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾
موسیٰؑ نے اسے کہا میں تیرے ساتھ چلوں اس (شرط) پر کہ تو مجھے اس میں سے سکھائے جو بھلائی تجھے سکھائی گئی ہے [۱۹۴۳]

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾
اس نے کہا تو میرے ساتھ صبر نہیں کر سکے گا۔

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾
اور تو کس طرح اس پر صبر کرے گا جس کی تجھے پوری پوری خبر نہیں [۱۹۴۴]۔

قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ
اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾
(موسیٰؑ نے) کہا تو مجھے انشاء اللہ صابر پائے گا اور میں کسی معاملہ میں تیری نافرمانی نہیں کرونگا۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ
ع ۹ ۲۱ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾ ع
کہا اگر تو میرے ساتھ چلے تو مجھ سے کسی بات کا سوال نہ کرنا یہاں تک کہ میں خود تجھ سے اس کا ذکر کروں [۱۹۴۵]

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ
خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ
لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ﴿۷۱﴾
پس وہ دونوں چلے۔ یہاں تک کہ کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے کشتی کو پھاڑ دیا، (موسیٰؑ نے) کہا کیا تو نے اسے پھاڑ دیا تاکہ اس کے سواروں کو غرق کر دے، یقیناً تو نے ایک خطرناک بات کی ہے [۱۹۴۶]

ہمت اسباب کا مقتضی نہ تھا کہ انہیں سوائے بنی اسرائیل کے اور قوموں کی طرف بھی مبعوث کیا جاتا اور اگر خضر کو ایک فرشتہ مانا جائے جیسا کہ ایک قول میں ہے تو پھر جن واقعات کا آگے ذکر آتا ہے وہ سب خود حضرت موسیٰ کو بطور کشف پیش آئے اور اس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ بطور کشف واقعات کے لیے سفر کی کیا ضرورت تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مصالح ہیں حضرت موسیٰ طور پر جاتے ہیں تو وحی ہوتی ہے حالانکہ خدا کی وحی تو ہر جگہ ہو سکتی ہے پھر وہیں طور پر جا کر ہی شریعت ملتی ہے۔ پس ایسا سفر کرانا بھی اللہ تعالیٰ کے مصالح میں سے تھا۔ اور در حقیقت وحی اور مکاشفات کے لیے بہت بڑی محنت شاقہ بکار ہوتی ہے اللہ تعالےٰ جس رنگ میں چاہے وہ کرائے۔ مگر میرے نزدیک ترجیح اسبات کو ہے جس پر اکثر ہیں کہ حضرت خضر انسان تھے۔

۱۹۴۳ء اتبعك اس سے مراد وہ اتباع نہیں جو ایک نبی کا پیرو نبی کا اتباع کرتا ہے۔ یعنی عبادات معاملات وغیرہ میں نقش قدم پر چلنا بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جہاں تم جاؤ وہاں میں بھی جاؤں یعنی ساتھ رہنا مراد ہے۔ تاکہ جو واقعات خضر کو پیش آئیں آپ بھی انہیں دیکھ سکیں کیونکہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ خضر کی اتباع کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ ان کے واقعات کا کچھ علم حاصل کرنے آئے تھے۔

موسیٰ اور خضر کا علم: یہاں سے معلوم ہوا کہ جو علم خضر کو دیا گیا وہ اور تھا۔ کیونکہ علم تو حضرت موسیٰ کو بھی دیا گیا تھا جیسا کہ فرمایا اٰتینا ہ حکما و علما (القصص ۲۸-۱۴) اور چونکہ دونوں علم علم دین ہیں اس لیے دین کا ایک علم حضرت موسیٰ کو دیا گیا جو ان کی قوم کی ضروریات کے مطابق تھا۔ اور دین کا ہی ایک علم حضرت خضر کو دیا گیا جو ان کی قوم کی ضروریات کے مطابق تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ اپنی اپنی اُمت کے متعلق اللہ تعالیٰ بعض وقت اپنے انبیاءؑ کو خاص واقعات کا علم دیدیتا ہے جہاں تک ظاہر نظریں نہیں پہنچ سکتیں اور وہ ایک ایسا فعل اس علم کی بناپر کر لیتے ہیں جو ظاہر نظروں میں قابل اعتراض بھی ہوتا ہے، لیکن اگر حقیقت پر غور کیا جائے اور ان کے سارے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو وہ اعتراض نہیں رہتا۔

۱۹۴۴ء خبر۔ خبر اشیائے معلومہ کا علم ہے جو خبر دینے سے ملے اور بعض نے خُبر اور خُبرۃ میں یہ فرق کیا ہے کہ خبر کے معنی ایک امر باطن کی معرفت ہیں۔

موسیٰ کے صبر نہ کر سکنے کی وجہ: نبی بھی ایک بشر ہے جب ایک صفت اس میں غالب ہو تو اس کا اظہار ہونے سے نہیں رہتا۔ حضرت موسیٰ باوجود اپنے مشہور حلم اور بردباری کے حق کی غیرت اس قدر رکھتے تھے کہ جب انہوں نے ایک موقعہ پر حضرت ہارون کو قوم کی غلطی میں شریک سمجھا تو ان سے بھی یہاں تک سختی سے پیش آئے کہ جس پر حضرت ہارون کو یہ کہنا پڑا لا تاخذ بلحیتی ولا براسی (طٰہٰ ۲۰-۹۴) حضرت خضر کو معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے یہ خبر بھی دیدی تھی کہ حضرت موسیٰ اور قسم کی صفات الٰہی کے مظہر ہیں اور حضرت خضر اور کے اس لیے انہوں نے کہا کہ آپ کا میرے ساتھ صبر کرنا مشکل ہوگا اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر اور قسم کے کمالات رکھے ہیں مجھے اور قسم کے کمالات سے حصہ دیا ہے۔

۱۹۴۵ء اس شرط کے لگانے کی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر اوپر کے نوٹ میں ہوا۔ بتانا یہی مقصود تھا کہ تمہارے کمالات اسبات کے متحمل نہیں ہو سکتے جو مجھ میں ہے۔ تمام قسم کے کمالات کا صرف ایک ہی انسان میں جمع ہونا مقدر تھا۔ اور وہ ذات پاک نبوی ہے۔

۱۹۴۶ء سفینۃ۔ سفن لکڑی وغیرہ کسی چیز کے بیرونی حصّہ کا تراشنا ہے اسی لحاظ سے کشتی کو سفینۃ کہا جاتا ہے (رغ)

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٢﴾

کہا، کیا میں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ صبر نہیں کر سکے گا۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿٧٣﴾

(موسیٰؑ نے) کہا، آپ گرفت نہ کیجیئے جو میں بھول گیا اور میرے معاملہ میں مجھ پر تنگی نہ ڈالیے۔

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿٧٤﴾

پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ جب ایک جوان سے ملے تو اس نے اسے قتل کر دیا (موسیٰؑ نے) کہا کیا تو نے ایک بے گناہ جان کو بغیر جان کے (بدلہ کے) مار ڈالا یقیناً تو نے بہت بُری بات کی ۱۹۴۷ء

امرا۔ اَمِرَ الاَمْرُ کے معنی ہیں کَبُرَ وَکَثُرَ بڑا ہوا اور بہت ہوا۔ اس لیے اِمْر کے معنی منکر ہیں یعنی بُرا (غ) یا بڑی مصیبت والی منکر بات اور بعض کے نزدیک یہ نُکر سے بڑھ کر ہے جو آگے غلام کے قتل پر آیا ہے اس لیے کہ کشتی کے ٹوٹنے سے بہت آدمیوں کے غرق ہونے کا خطرہ تھا (ل) خرق کے لیے دیکھو ۹۹۱ء۔

اس رکوع میں ان تین واقعات کا ذکر ہے جو حضرت موسیٰؑ اور خضر کو پیش آئے، پہلا واقعہ کشتی کا توڑنا ہے اس میں جو لتغرق اھلہا ہے تو یہ مطلب نہیں کہ کشتی کو اس غرض کے لیے توڑا ہے بلکہ لام عاقبت کا ہے یعنی کشتی کو توڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کشتی والے غرق ہو جائیں۔ خضر کے اس طرح کشتی توڑنے سے اور آگے غلام کو قتل کرنے سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ خضر ایک ایسا انسان تھا جسے عام آنکھیں نہیں دیکھتی تھیں، صرف حضرت موسیٰؑ دیکھتے تھے ورنہ لوگ اسے کشتی توڑنے یا قتل کرنے سے روک دیتے تو یہ صورت مکاشفہ کی ہوگی یعنی وہ صورت جب خضر کوئی انسان نہیں بلکہ فرشتہ سمجھا جائے اور نووی نے تہذیب الاسماء میں لکھا ہے کہ خضر بادشاہت کے خاندان سے تھے۔ اور ممکن ہے کہ انہیں خود بھی اس علاقہ میں کوئی ریاست یا بادشاہی حاصل ہو جس وجہ سے انہیں روکا نہیں گیا یا ان لوگوں کو ان پر اس قدر اعتقاد ہو کہ ان کے فعل کو وہ ناپسندیدہ نگاہ سے نہ دیکھتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ خرقہا سے مراد صرف اسی قدر ہو کہ اس کے توڑنے کا حکم دیدیا کیونکہ اگر فی الواقع توڑ دی ہوتی تو لوگ غرق بھی ہو جاتے۔ اور ایسا ہی غلام کے قتل کرنے میں بھی ممکن ہے مراد صرف اس کے قتل کا حکم ہو ایسے موقعہ پر اس قسم کے الفاظ کا بول دینا عام محاورہ ہے۔ اور یہاں بہرحال کشتی کو صرف عیب دار کر دیا ہے بالکل نہیں توڑا جیسا کہ آیت ۷۹ سے ظاہر ہے۔

۱۹۴۷ء غلام کے لیے دیکھو ۴۱۶ء پیدا ہونے سے لیکر جوانی تک غلام کہا جاتا ہے اور کہل کو بھی غلام کہہ دیتے ہیں اور یہاں بعض نے نابالغ قرار دیا ہے بعض نے بالغ (ر د)۔

زکیۃ۔ زکاء کے اصل معنی ہیں بڑھا اور ارضٌ زکیّۃٌ اچھی زمین کو کہتے ہیں اور آگے آتا ہے خیرا منہ زکوٰۃ (۸۱) جہاں زکوٰۃ کے معنی صلاح ہیں اور یہی معنی حنانا من لدنا وزکوٰۃ (مریم ۱۹-۱۳) میں ہیں۔ اور آیت ۸۱ میں زکوٰۃ کے معنی عمل صالح بھی کیے گئے ہیں جیسے للزکوٰۃ فاعلون (المؤمنون ۲۳-۴) (ل) پس زکیۃ کے معنی ہونگے اچھا بھلا اور مفسرین نے اس کے معنی تائبۃ یعنی توبہ کرنے والا اور مسلمۃ یعنی فرمانبردار کیے ہیں (ج)۔

نکر۔ نکر کے لیے دیکھو ۱۲۸۱ء وغیرہ اور نُکر بڑے سخت امر کو کہتے ہیں جو پہچانا نہیں جاتا (غ)

خضر کا ایک شخص کو قتل کر دینا: یہ دوسرا واقعہ ہے اور گو مفسرین نے عموماً اسے بچہ قرار دیا ہے اس وجہ پر کہ اسے زکیۃ کہا گیا ہے لیکن اگر زکیۃ کے معنی بے گناہ بھی لیے جائیں تو مراد صرف اس قدر ہوگی کہ اس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا تھا جس کی وجہ سے اسے قتل کیا جاتا۔ چنانچہ بغیر نفس اسی لیے بڑھایا ہے کہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا اور یہ نابالغ بچہ نہ تھا بلکہ جوان تھا کیونکہ سزائے قتل بلوغت پر ہی وارد کی جاتی ہے جب سے دنیا پیدا ہوئی کسی شخص نے خواہ نبی ہو یا رسول بچوں کو اس لیے قتل نہیں کیا کہ یہ بڑے ہو کر گنہگار ہو جائیں گے اگر یہ بھی کوئی قانون ہوتا تو پھر چاہیئے یوں تھا کہ جتنے گنہگار ہونے والے ہوتے اللہ تعالےٰ انہیں بچپن میں ہی خود مار دیا کرتا یا کم سے کم کسی نبی کے وقت میں اسے ہی اطلاع دیدیا کرتا کہ فلاں بچہ گنہگار ہوگا اسے قتل کر دو۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٥﴾	کہا، کیا مَیں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ تُو میرے ساتھ صبر نہ کرسکے گا۔
قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴿٧٦﴾	(موسیٰؑ نے) کہا اگر مَیں تجھ سے اس کے بعد کسی بات کے متعلق سوال کروں تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا، تُو میری طرف سے عذر (کی حد) کو پہنچ چکا ع١٩٤٨
فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿٧٧﴾	پھر دونوں چلے۔ یہاں تک کہ جب ایک گاؤں والوں کے پاس آئے جہاں کے لوگوں سے کھانا طلب کیا تو انھوں نے انکار کیا کہ ان کی مہمانی کریں۔ پس انھوں نے اُس میں ایک دیوار پائی جو گرا چاہتی تھی، تو (خضر نے) اسے کھڑا کر دیا (موسیٰؑ نے) کہا اگر تو چاہتا تو اس کی مزدوری لے لیتا ع١٩٤٩
قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٧٨﴾	کہا، یہ مجھ میں اور تجھ میں جدائی ہے، اب مَیں تجھے اس کی اصل حقیقت سے خبر دیتا ہوں، جس پر تو صبر نہیں کرسکا۔
اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿٧٩﴾	جو کشتی تھی وہ تو مسکین لوگوں کی تھی، جو دریا میں مزدوری کرتے تھے، تو مَیں نے چاہا کہ اسے عیب دار کردوں اور اُن سے پرے ایک بادشاہ تھا جو ہر ایک کشتی کو زبردستی پکڑ لیتا تھا ع١٩٥٠

ع١٩٤٨ پہلے موقعہ پر حضرت موسیٰؑ نے بھول جانے کا عذر کیا تھا۔ اس دوسرے موقعہ پر یہ عذر نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمجھ گئے ہیں کہ واقعی میری طبیعت ہی ان باتوں کو برداشت نہیں کرسکتی، لیکن وہ کہتے ہیں کہ ایک موقعہ مجھے اور دیدیا جائے اگر تیسری مرتبہ بھی میں برداشت نہ کرسکا تو معلوم ہوگا کہ اس علم کا حاصل کرنا میرے لیے موزوں یا مقدر ہی نہیں۔

ع١٩٤٩ یرید ان ینقض۔ مجاز کے طور پر ہے گرنے کے قریب ہونے کو یوں ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ ارادہ کر رہی تھی کہ گر پڑے نیز دیکھو ع١٥٣۔
دیوار کا واقعہ: یہ تیسرا واقعہ ہے پہلے دونوں میں بظاہر کوئی نقصان تھا مگر یہاں فائدہ پہنچایا گیا۔ تاہم یہاں اس لحاظ سے سوال پیدا ہوا کہ جو لوگ ادنیٰ احسان بھی مہمانوں کے ساتھ نہ کرسکے ان کے ساتھ کیوں بغیر معاوضہ لیے کوئی نیکی کی جائے۔

ع١٩٥٠ غصب۔ غَصب کسی چیز کے ظلم سے لینے کا نام ہے (ل) جدار کے لیے دیکھو ع١٣٣٨۔
کشتی توڑنے کی وجہ: اس سے معلوم ہوا کہ کشتی کو صرف عیب دار کر دیا گیا تاکہ اپنے عیب کی وجہ سے ظلماً لیا جانے سے بچ رہے تو یہ ایک پُر حکمت فعل تھا اور اس میں حضرت خضر کو جو اطلاع تھی تو بوجہ حالات سے واقف ہونے کے تھی۔ وحی کے ذریعہ سے یہ اطلاع دی گئی کہ کشتی کو پھاڑ کر بچاویں اسی کی طرف ما فعلته عن امری میں اشارہ ہے اور حضرت موسیٰ کو مقامی حالات کا علم نہ ہونے کی وجہ سے اس کی اطلاع نہ تھی اس لیے ان کے دل میں اعتراض پیدا ہوا۔
اس سے قومی نبوت کی ضرورت پر استدلال: اس میں یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ جب قومیں الگ الگ پڑی ہوئی تھیں اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر نہ تھی تو نبوتیں بھی مقامی ہوسکتی تھیں ایک قوم کا نبی دوسری قوم کے لیے ہدایت کا موجب نہ ہوسکتا تھا اس لیے کہ وہ ان کے حالات پر اطلاع پانے کے ذرائع نہ رکھتا تھا اور شاید یہی حضرت موسیٰ کو سمجھایا گیا کہ کیوں ان کی نبوت بنی اسرائیل تک محدود ہے اور کیوں انہیں وہ علم نہیں دیا گیا جو اور قوموں کے لیے بھی موجب ہدایت

وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ﴿٨٠﴾

اور جو جوان تھا تو اس کے ماں باپ مومن تھے تو ہم ڈرے کہ وہ انھیں سرکشی اور کفر میں مبتلا کر دے گا۔

فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾

تو ہم نے چاہا کہ اُن کا رب اُنھیں صلاحیت میں اس سے بہتر اور رحم سے قریب تر (چیز) بدلہ میں دے ع۱۹۵۱

وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ

اور جو دیوار تھی، تو وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی، اور اس کے نیچے اُن دونوں کا خزانہ تھا اور اُن کا باپ نیک تھا، سو تیرے رب نے چاہا کہ وہ اپنی قوت کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ (یہ) تیرے رب کی طرف سے رحمت (ہوئی) اور مَیں نے اپنے اختیار سے یہ نہیں کیا۔ یہ اس

ہوسکتا تھا۔ اور قرآن کریم کے الفاظ تو بہت صاف ہیں کہ خضر کو کچھ بھلائی کی باتیں سکھائی گئی تھیں جو حضرت موسیٰ کو نہیں سکھائی گئیں اور احادیث میں جو خضر کے لیے لفظ اعلم آیا ہے تو اس سے مراد یہ نہیں کہ انہیں وہ علم بھی حاصل تھا جو حضرت موسیٰ کو تھا اور اس سے بڑھ کر بھی کچھ علم حاصل تھا بلکہ مراد صرف اس قدر ہے کہ جو علم خضر کو تھا وہ موسیٰ کو نہ تھا اور جو موسیٰ کو تھا وہ خضر کو نہ تھا جیسا کہ خود حدیث کے الفاظ نے بھی واضح کر دیا وانت علی علم من علم اللّٰہ علمك اللّٰہ لا اعلمه ؎

ع۱۹۵۱ خشینا۔ خشیۃ کے لیے دیکھو ع۷۸۶ اور اس کے معنی میں بھی خوف کی طرح (دیکھو ع۶۵۲) علم کا مفہوم پایا جاتا ہے اور خضر کا صیغہ جمع استعمال کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کو حکومت حاصل تھی کیونکہ جمع کا صیغہ واحد کے لیے عموماً ایسے ہی موقعہ پر استعمال ہوتا ہے۔

رُحما۔ رُحم - رَحِمَ سے مصدر ہے اور رَحْمَۃ اور مَرْحَمَۃ بھی اسی طرح مصدر ہیں وتواصوا بالمرحمۃ (البلد ۹ - ۱۷) (ل) ؎

خضر کے جوان کو قتل کرنے کی وجہ اس کا فساد اور ڈاکہ زنی تھی: اس کی توجیہ مفسرین نے عموماً یہ کی ہے کہ حضرت خضر نے ایک معصوم بچہ کو اس لیے مار ڈالا کہ بڑا ہوکر یہ اپنے والدین کے لیے بھی موجب کفر ہو جائیگا اس کی تردید میں اوپر ع۱۹۴۷ میں کر چکا ہوں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خضر کو اللّٰہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم دیدیا گیا تھا کہ بڑا ہوکر یہ لڑکا کافر ہوگا یا والدین کو بھی اپنی محبّت کی وجہ سے کافر بنا دے گا مگر اس بنا پر بھی جب سے اللّٰہ تعالیٰ کا قانون دنیا میں نافذ ہوا کبھی کسی شخص کو قتل نہیں کیا گیا اور نہ کسی شریعت میں ایسے قتل کا جواز ہُوا۔ اور یہ کہنا کہ یہ شریعت کی رُو سے تو جائز نہیں مگر حقیقت کی رُو سے جائز ہے خود شریعت کی ہتک ہے۔ حقیقت زیادہ سے زیادہ اس بات کو کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو ایک علم حاصل ہو جو دوسرے کو نہ ہُوا اور بس۔ اگر خضر کو یہ علم ہو گیا تھا کہ یہ شخص قاتل یا ڈاکو یا مفسد ہے اور پھر انہوں نے اسے قتل کیا تو شریعت کے ماتحت یہ فعل ان کا آ جاتا ہے، لیکن اگر ان کو صرف یہ علم تھا کہ یہ بڑا ہوکر کافر یا مفسد بن جائے گا تو اس بنا پر کوئی شریعت، کوئی خدا کا قانون، کوئی انسان کا قانون اسے جائز نہیں ٹھہراتا اور تعجب یہ ہے کہ آثار میں ایسی باتوں کے وجود ہوتے ہوئے جو امر اوّل کو ظاہر کرتی ہیں اور حضرت خضر کے اس فعل کو بروئے شریعت جائز ٹھہراتی ہیں مفسرین عموماً امر دوم کی طرف ہی چلے گئے ہیں۔ آثار میں ہے کہ یہ جوان فساد برپا کرتا تھا اور ایک روایت میں ہے کہ ڈاکے مارتا تھا اور پھر اپنے ماں باپ کے سامنے قسم کھا دیا کرتا تھا کہ میں نے ایسا فعل کوئی نہیں کیا تو وہ اس سے قصاص نہ لینے دیتے تھے اور اس کی حمایت کرتے تھے (ر) خود قرآن شریف میں اوّل لفظ رھق موجود ہے اور اَرْھَقَ کے معنی ہیں غَشِیَہٗ بِقَھْرٍ (غ) ع۱۳۹۰ یعنی زبردستی یا غلبہ سے ڈھانک لینا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین پر بھی وہ کچھ جبر کرتا تھا۔ دوسرے لفظ طغیان موجود ہے جس کے معنی ہیں حد سے گزر جانا۔ تو یہاں کفر میں حد سے گزرنے کا ذکر نہیں کیونکہ کفر کا لفظ الگ بعد میں لایا گیا ہے بلکہ فساد اور قانون کی نافرمانی میں حد سے گزرنا ہے اور ان معنوں میں یہ لفظ قرآن شریف میں بکثرت آیا ہے جیسے فی طغیانهم یعمهون (البقرہ ۲ - ۱۵) جہاں پہلے ان کے فساد فی الارض کا ذکر ہے اور دوسرے کو طغیان میں وہی مبتلا کر سکتا ہے جو پہلے خود اس کا ارتکاب کرتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ واقعی یہ شخص مفسد تھا تیسرے خیرمنه زکوٰۃ بھی بتاتا ہے کہ اس میں صلاحیت نہ تھی اور چہارم اقرب رحما سے ظاہر ہے کہ اس میں رحم نہ تھا تو ان الفاظ قرآنی سے اور آثار سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جوان کوئی مفسد تھا جو بوجہ اپنے والدین کی عزت اور مرتبت کے یا ان کی حمایت کے قانون کی گرفت سے بچا ہوا تھا اور اس کا فساد ظاہر رنگ میں اتنا عیاں نہ تھا اس لیے حضرت موسیٰ کو اعتراض ہوا مگر حضرت خضر کو بوجہ علم حالات اصل حقیقت سے آگہی بھی تھی اور اللّٰہ تعالیٰ کا حکم بھی آ گیا کہ بغیر اس کے قتل کے اس کا فساد رفع نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقعی اس کے جرم کی شہادت ظاہر طور پر نہ ملتی ہو اور حضرت خضر کو اللّٰہ تعالیٰ نے اطلاع دی ہو مگر الفاظ قرآنی سے یہ لازماً نتیجہ نہیں نکلتا۔ رہی یہ بات کہ اس کا کیا مطلب ہوا کہ اللّٰہ تعالیٰ والدین کو اس سے بہتر صلاحیت اور قریب تر رحم والا بدلہ

ع ذٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾ ع — کی اصل حقیقت ہے جس پر تو صبر نہ کر سکا ۱۹۵۲

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ۗ قُلْ — اور تجھ سے ذوالقرنین کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ میں اس

سَاَتْلُوا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿۸۳﴾ — کا کچھ ذکر تم پر پڑھوں گا ۱۹۵۳

ہیں دے تو اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب وہ ایک مفسد کی حمایت کو چھوڑ دیں گے تو یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اور اولاد نہیں دیگا بلکہ یہی ان کا فعل اللہ تعالیٰ کو ایسا پسند آئے گا کہ اس سے بہتر اولاد ان کو دیدیگا اور یا زکوٰۃ کے معنی صرف پاکیزگی لیکر اچھے نتیجہ کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے یہاں بھی حضرت خضر کو خاص حالات قومی کا علم ہے جو حضرت موسیٰ کو نہیں ۔

۱۹۵۲ تسطع۔ اصل میں تستطع ہے تائے افتعال کو تخفیف کے لیے ساقط کر دیا گیا ہے اور یہاں بعض نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ آخر میں تخفیف کی وجہ یہ ہے کہ اس بیان کے سبب سے حضرت موسیٰ کے دل پر وہ بوجھ نہ رہا تھا جو پہلے تھا۔

دیوار بلا اُجرت بنا دینے کی وجہ یہ بتائی کہ گو انھوں نے خود تو ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا مگر ان کا والد نیک آدمی تھا۔ اس کی نیکی کی وجہ سے اُن نااہل لوگوں کے ساتھ بھی نیکی کرنا ضروری تھا اور اسی معاملہ کو رحمۃ من ربك کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ میں نے اپنے اختیار سے ایسا نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ایسا کیا ہے اور جعفر صادق نے کہا ہے کہ یہ ساتویں پشت میں ان کا جدامجد تھا جس کا ذکر یہاں ہے اور بعض نے کہا دسویں پشت میں (ر) یہاں بھی حضرت خضر کا خاص حالات قومی کا علم نظر آتا ہے گو تینوں جگہ حضرت خضر کے فعل کی وجہ امر الٰہی ہے اور ما فعلته عن امری تینوں واقعات کے متعلق ہے۔

ذکر کنز میں آنحضرتؐ کی پیشگوئی: حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضر کے بیان کے شروع میں میں نے کہا تھا کہ اس میں آنحضرت صلعم کی صداقت کی طرف خاص اشارہ ہے اور یہ صرف میرا قیاس نہیں بلکہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ اور دیگر سلف کے اقوال سے بھی مستنبط ہوتا ہے۔ اس آیت میں جو لفظ کنز آیا ہے اس کی ایک توجیہ مال و دولت تو ظاہر ہے، لیکن حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ سونا چاندی نہ تھا بلکہ علم کے صحیفے تھے۔ اور یہی حضرت علیؓ اور ابن جبیرؓ اور ابوذرؓ سے مروی ہے اور ابن عباسؓ کی ایک روایت میں یہ صاف لفظ ہیں کہ یہ ایک سونے کی تختی تھی جس پر چند نصائح کے بعد آخری لفظ یہ تھے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (ر) تو اس صورت میں حضرت نبی کریم صلعم کا ذکر بتاتا ہے کہ موسیٰؑ اور خضر کے بیان کی اصل غرض بھی یہی ہے کہ وہ رسول جو ہر قسم کے علوم کا جامع ہوگا اور جو ہر قوم کے لیے ہدایت لائے گا اور جسے رشد کی ساری راہیں بتائی جائیں گی وہ موسیٰؑ نہیں ہو سکتے بلکہ محمد رسول اللہ صلعم ہیں۔ اور رحمۃ من ربك میں اسی طرف اشارہ ہے ؛

موسیٰؑ اور خضر کے واقعات میں آنحضرتؐ کی صداقت کا اظہار: اب خواہ خضر کو فرشتہ قرار دے کر ان واقعات کو حضرت موسیٰؑ کا ایک کشف مانا جائے اور خواہ انہیں ایک نبی مان کر یہ ظاہری واقعات ہوں دونوں صورتوں میں ان باتوں کے بیان کرنے کی اصل غرض کچھ اور ہے اور وہ رسول اللہ صلعم کا ذکر ہے اور اس کی طرف یہ آخری آیت صاف اشارہ کرتی ہے پہلا واقعہ یہ ہے کہ ایک کشتی کو عیب دار بنایا گیا تھا تاکہ ایک ظالم بادشاہ اس پر قبضہ نہ کرلے اس میں ملک عرب کی حالت کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جہاں سے آفتاب نبوت طلوع ہونا تھا اور کشتی کے ساتھ اسے مشابہت دینے کی یہ غرض ہے کہ جس طرح کشتی طوفان سے نجات دیتی ہے اسی طرح انبیاء کا پیغام بھی نجات عالم کا موجب ہوتا ہے۔ ملک عرب کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ پیغام اس لیے مخصوص کیا تا ایک ریگستانی ملک فاتحین دنیا کے لیے کسی کشش کا موجب نہ ہو اور وہاں ایک آزاد قوم پرورش پاکر دنیا میں خدا کے پیغام کی حامل بنے یہودیوں اور عیسائیوں کا پہلا اعتراض اسلام پر یہی تھا کہ یہ نبی ملک عرب میں کیوں ہوا ؛

واقعہ قتل اور آنحضرتؐ پر بیگناہوں کے قتل کا جھوٹا الزام: اور قتل غلام میں اس سب سے بڑے اعتراض کا جواب دیا جو یہودیوں اور عیسائیوں کو اسلام پر ہے کہ نبی صلعم نے یہود کی ایک قوم کے بڑے بڑے آدمیوں کو قتل کروا ڈالا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ مفسد تھے۔ اگر ان مفسدوں سے مدینہ کو پاک نہ کیا جاتا تو حق زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ اور تیسرے واقعہ کو لاکر یہ بتایا ہے کہ وہ شخص جو بلا کسی اُجرت کے لینے کے دن رات ان لوگوں کی اصلاح میں لگا رہتا ہے جو اس سے طرح طرح کی بدسلوکی کرتے ہیں وہ کسی کے خون کا پیاسا کب ہو سکتا ہے وہ شخص جسے بادشاہت ملتی ہے تو وہ ایک فقیر کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ شخص جس کا دل انسانوں کے مصائب پر غم سے پگھلتا ہے بادشاہت کا خواہاں نہیں ہو سکتا نہ کسی انسان کی دشمنی کا خیال اس کے دل میں آ سکتا ہے اور دو یتیم غلاموں میں جن کا ایک خزانہ دیوار کے نیچے ہے۔ اشارہ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے جن کے جد صالح حضرت ابراہیمؑ یا خود حضرت موسیٰؑ ہیں اور ان کی دیوار کو سیدھا کر دینے سے مراد توریت و انجیل کا منجانب اللہ تسلیم کر لینا ہے اور اس دیوار کے نیچے کنز وہی پیشگوئیاں ہیں جن میں محمد رسول اللہ صلعم کا ذکر ہے تاکہ یہ لوگ جب اپنے قوائے روحانی سے پورا کام لیں تو انہیں سمجھ آجائے کہ واقعی توریت اور انجیل نے انہیں اسی طرف ہدایت کی تھی۔ آثار نے اس آخری بات کی طرف ہدایت کرکے سارے معاملہ پر صفائی سے روشنی ڈال دی ہے ؛

ما فعلته عن امری۔ خضر کی نبوت اور رسالت پر صریح دلیل ہے۔

۱۹۵۳ ذوالقرنین۔ قرن کے معنی نسل بھی ہیں دیکھو ع ۹۰۶ اور قرن سینگ کو بھی کہتے ہیں ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ میں بہت سی روایات ہیں ابن جریر کہتے ہیں کہ

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِی الْاَرْضِ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنْ
كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾
فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾
حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا
تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا
قَوْمًا ؕ قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّاۤ
اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ
حُسْنًا ﴿۸۶﴾
قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ

ہم نے اُسے زمین میں طاقت دی تھی اور ہر قسم کا سامان اُسے دیا تھا ۱۹۵۴
سو وہ ایک راہ پر چلا۔
یہاں تک کہ جب وہ (ادھر) پہنچا، جدھر سورج ڈوبتا تھا، اسے ایک سیاہ کیچڑ والے پانی میں غائب ہوتا ہوا پایا اور اس کے پاس ایک قوم کو (بھی) پایا۔ ہم نے کہا، اے ذوالقرنین! چاہو تو سزا دو اور چاہو تو ان سے بھلائی کا معاملہ کرو ۱۹۵۵
اس نے کہا جو ظلم کرے ہم اُسے سزا دیں گے، پھر وہ اپنے رب

اہل کتاب کا اس میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں وہ دو بادشاہتوں کا مالک تھا یعنی روم اور فارس کا بعض کہتے ہیں اس کے سر میں دو سینگوں سے مشابہ کوئی چیز تھی بعض کہتے ہیں اس کے سر کی دونوں طرفیں تانبے کی تھیں۔ وہ کون تھا مفسرین میں سے بعض نے اسے فرشتہ بھی کہہ دیا ہے۔ اکثر کا یہ قول ہے کہ وہ ایک عبد صالح تھا جسے اللہ تعالیٰ نے حکومت بھی دی تھی اور اسے علم و حکمت اور ہیبت دی تھی اور بعض اس کی نبوت کے بھی قائل ہیں۔ مگر اس کی تعیین کسی نے نہیں کی کہ کون تھا۔ اس عقدہ کا حل بائبل سے ہوتا ہے جہاں دانیال کی رویا میں دو سینگ کے مینڈھے کا ذکر ہے اور اس کی تعبیر بھی وہیں موجود ہے "وہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اس کے دو سینگ ہیں سو ماوہ اور فارس کے بادشاہ ہیں" (دانیال ۸ : ۲۰) ماوہ اور فارس کے بادشاہوں میں سے دارائے اول (۵۲۱ء تا ۴۸۵ء قبل مسیح) وہ شخص ہے جس پر قرآن شریف کا بیان جو یہاں ذوالقرنین کے متعلق ہے صادق آتا ہے۔ چنانچہ جیوش انسکلوپیڈیا (دائرۃ المعارف یہود) میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ دارا ایران کی شہنشاہت کی تنظیم کرنے والا تھا۔ اس کی فتوحات نے اس کی سلطنت کی حدود کو آرمینیا اور کوہ قاف اور ہندوستان اور تورانی پہاڑوں اور وسط ایشیا کے مرتفع میدانوں میں درست کر دیا" اور انسکلوپیڈیا برٹینیکا میں ہے "دارا اپنے کتبوں کی رو سے زردشت کے سچے مذہب کا پکا پیرو معلوم ہوتا ہے مگر وہ بڑا مدبر اور بڑا منتظم بھی تھا۔ فتوحات کا وقت انجام کو پہنچ گیا تھا اور دارا نے جو لڑائیاں اختیار کیں ان سے یہ فائدہ ہوا کہ سلطنت کے لیے مضبوط قدرتی حدود مل گئیں اور اس کی حدود پر جو وحشی اقوام تھیں ان کی طرف سے امن ہو گیا۔ چنانچہ دارا نے پانٹک اور آرمینیا کے پہاڑوں کی وحشی اقوام کو مسخر کیا اور سلطنت ایران کی حدود کو کوہ قاف تک وسیع کیا۔ اسی وجہ سے اس نے ساسی اور دوسری تورانی قوموں سے بھی لڑائی کی"۔ ان باتوں کا جو یہاں بیان ہوئی ہیں اگر قرآن کریم سے مقابلہ کیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ قرآن کریم نے ذوالقرنین کے نام سے جو دانیال کی رویا کی بنا پر اس کا نام تھا۔ دارائے اوّل کا ہی ذکر کیا ہے اور اس میں بھی قرآن کریم کے کمال علم پر دلالت ہے۔

ذوالقرنین کے یہاں ذکر کی وجہ: اور اسکے یہاں ذکر کی وجہ ایک تو یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ بھی ایک قوم کا نبی تھا اور یوں یہود اور نصاریٰ کو یہ بتایا ہے کہ نبوت ان کی قوم سے مخصوص نہیں، دوسری قوموں کے انبیاء کا ذکر کرنے میں شاید یہ بھی سمجھانا مقصود ہو کہ یہود اور نصاریٰ جو نبی آخر زمان کے عرب میں سے ہونے پر معترض تھے انہیں بتایا جائے کہ نبوت خدا کی ایسی نعمت نہیں جسے اس نے بنی اسرائیل سے مخصوص کیا ہو۔ اور دوسرے چونکہ ذوالقرنین کا ذکر یاجوج ماجوج کے ذکر پر ختم ہوتا ہے اور ساتھ ہی یاجوج ماجوج کے آخری زمانہ میں خروج کا بھی ذکر ہے اور یاجوج ماجوج عیسائی اقوام ہیں اس لیے اس ذکر کو اس سورت کے ساتھ خاص مناسبت ہے۔

۱۹۵۴ سبب۔ ہر ذریعہ کو کہتے ہیں جس سے دوسری چیز کی طرف پہنچا جائے دیکھو ۲۰۴ اور یہاں راغب نے مراد ہر چیز کی معرفت اور اس کا ذریعہ لیے ہیں اور ابن جریر نے علم معنی لیے ہیں اور اگلی آیت میں سبب کے معنی یا تو ذریعہ یا سامان ہی ہیں اور مراد ہے سامان سفر اور یا اس کے معنی منزل اور طریق یعنی رستہ ہیں (ج) کیونکہ رستہ بھی کسی جگہ تک پہنچانے کا ذریعہ ہے اور ہر چیز سے مراد اس کی ضرورت کی ہر شے ہے یعنی جس چیز کی اسے اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کے لیے ضرورت تھی اور مکنا لہ کے لیے دیکھو ۹۰۶ ۞

۱۹۵۵ مغرب الشمس کے معنی کیے گئے ہیں منتھی الارض من جھۃ المغرب یعنی مغرب کی طرف الارض کا انتہائی مقام مگر الارض سے مراد یہاں روئے زمین لینا غلطی ہے اس سے مراد اس کا اپنا ملک ہے اور خاص ملک کے معنی میں یہ لفظ کثرت سے آتا ہے، خود قرآن شریف میں بھی کئی جگہ ہے جیسے ان الارض یرثھا عبادی الصٰلحون (الانبیاء ۲۱ - ۱۰۵) اور مغرب الشمس سے مراد اس کے ملک کی مغربی حد ہے نہ کچھ اور، وہیں تک وہ جا بھی سکتا تھا۔

ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِۦ فَيُعَذِّبُهُۥ عَذَابًا نُّكْرًا ۝٨٧

پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ اسے بہت بڑا عذاب دے گا۔

وَأَمَّا مَنْ ءَامَنَ وَعَمِلَ صَٰلِحًا فَلَهُۥ جَزَآءً ٱلْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُۥ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ۝٨٨

اور جو کوئی ایمان لاتا ہے اور اچھے عمل کرتا ہے، تو اس کے لیے بہت اچھا بدلہ ہے اور ہم اسے اپنے معاملہ میں سہل بات کہیں گے ع۱۹۵۶

ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ۝٨٩

پھر وہ ایک (اور) راہ پر چلا۔

حَتَّىٰٓ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ ٱلشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا ۝٩٠

یہاں تک کہ جب وہ (ادھر) پہنچا جدھر سورج نکلتا تھا تو اسے ایک ایسی قوم پر نکلتے ہوئے پایا جن کے لیے ہم نے اس سے بچنے کے لیے کوئی اوٹ نہیں بنائی تھی ع۱۹۵۷

عین حمئۃ۔ عَین پانی کی افراط ہے یا وہ جگہ جہاں پانی جمع ہوتا رہتا ہے (ت) اور حمئۃ سیاہ کیچڑ ہے دیکھو ع۱۶۸۵ اور عین حمئۃ یا سیاہ کیچڑ والا پانی بحیرہ اسود ہے جس کا نام بسبب اس کے پانی کی سیاہی کے اسود ہے اور اس کی سیاہی کی وجہ اس کی مٹی کا سیاہ ہونا ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ دارائے اول کی حکومت مغرب میں بحیرہ اسود تک پہنچی ہوئی تھی۔

ذوالقرنین کا سفر مغرب: سب سے پہلے قرآن کریم نے دارا کے مغربی سفر کا ذکر کیا ہے جو بحیرہ اسود پر جا کر ختم ہو گیا، اس کے بعد سفر مشرق کا ذکر آتا ہے اور اس کے بعد شمال کے سفر کا جو کوہ قاف کی طرف تھا۔ قرآن کریم نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ واقعی سورج سیاہ پانی میں غروب ہوتا تھا بلکہ ذوالقرنین نے ایسا پایا کیونکہ جب وہ خشکی کی سرحد پر پہنچ گیا تو آگے پانی ہی پانی تھا اور اسی میں اُسے سورج ڈوبتا ہُوا معلوم ہُوا، جس طرح آگے ہے وجدھا تطلع علی قوم اسے ایک قوم پر چڑھتے ہوئے پایا، یہ مراد نہیں کہ واقعی اس قوم میں سے سورج طلوع ہوتا تھا۔ اسی طرح یہاں یہ مراد نہیں کہ واقعی سورج سیاہ پانی میں ڈوبتا تھا۔ اور غَرَب یا مَغرِب کے معنی ڈوبنا نہیں بلکہ غائب ہو جانا یعنی نظر سے اوجھل ہو جانا اور دور نکل جانا ہیں دیکھو ع۸۱۶ پس یہ خیال سرے سے ہی غلط ہے کہ پانی میں سورج ڈوب جاتا تھا۔

آیت کے پچھلے حصّہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین نبی بھی تھے کیونکہ ایک تو یہاں اللہ تعالیٰ کا ان سے خطاب ہے جس میں عذاب و ثواب کا اختیار دیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں وحی ہوتی تھی اور یہ ان کی نبوت پر ایک دلیل ہے دوسرے ایک قوم کے ان سے مقابلہ کا ذکر ہے۔ اور اپنی مخالفت پردہ کہتے ہیں کہ جو شخص ظلم کرے گا اسے یہاں بھی سزا ملے گی اور آخرت میں بھی اسے عذاب ملیگا اور یہ بات صرف ایک نبی ہی کہہ سکتا ہے اور یہ جو اختیار دیا ہے، کہ چاہو تو سزا دو اور چاہو تو اچھا معاملہ کرو، تو مراد یہ ہے کہ اس قوم میں سے جس سے چاہو وہ سلوک کرو، جس سے چاہو یہ۔ اس کی وجہ اگلی آیت میں مذکور ہے اور حسنا سے مراد امراً ذا حُسْنٍ یعنی خوبی کا معاملہ ہے۔ اور یہاں مراد اُن سے احسان کرکے ان کو معاف کر دینا ہے۔

۱۹۵۶ یہاں ایسے ہی دو گروہوں کا ذکر ہے جو انبیاء کے معاملہ میں ہو جاتے ہیں یعنی ایک گروہ تو وہ جو ایمان لاتا اور عمل صالح کرتا ہے اور دوسرا گروہ محض منکروں کا نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو حق کی مخالفت کرتے اور اہل حق پر ظلم کرتے ہیں جس کو یہاں من ظلم کہا ہے اور اس سے مراد محض ارتکاب شرک نہیں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ایسی قوم تھی جس کی طرف سے پہلے کسی قسم کی زیادتی ہو چکی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں بھی پہلے اما ان تعذب ہی رکھا ہے اور ذوالقرنین نے بھی پہلے سزا کا اور ظالموں کا ہی ذکر کیا ہے اور یہ مہم اسی قوم کی سزا کے لیے تھی، لیکن چونکہ انبیاء صرف سزا کے لیے نہیں ہوتے اس لیے پھر بھی اس قوم کو موقعہ دیا ہے کہ جو ان میں سے ایمان لائے ان پر کوئی سختی نہ کی جائے گی سنقول لہ من امرنا یسرا۔ لیکن جو پھر بھی ظلم اور مخالفت کو نہیں چھوڑتا تو اس کو اس دنیا میں بھی سزا دی جائے گی مفسرین نے فسوف نعذبہ میں صرف سزائے قتل کو لیا ہے حالانکہ قرآن شریف نے قتل کا ذکر نہیں کیا اس لیے مراد کوئی سزا ہے جو اُن لوگوں کے لائق حال ہو۔ اور یسرا سے مراد ذا یسر یعنی سہولت کی بات ہے۔ اور جن لوگوں نے آیت ۸۶ میں حُسن کے معاملہ سے مراد قید کرنا لیا ہے گویا وہ قتل کے مقابل پر اچھا معاملہ ہے تو نہ صرف وہ الفاظ ہی ان کے اس خیال کو باطل کرتے ہیں کیونکہ احسان کا تقاضا معافی ہے بلکہ یہاں جزاء الحسنیٰ کے لفظ بھی اس کی تردید کرتے ہیں۔ جو لوگ قید ہونے کے قابل ہوں ان کو آخرت میں جزاء حسنیٰ ملنا بے معنی ہے۔

۱۹۵۷ مطلع الشمس۔ طلع کے لیے دیکھو ع۹۹۰ مطلع الشمس کے معنی کیے ہیں غایۃ الارض المعمورۃ من جھۃ المشرق (ر) یعنی مشرق کی جانب آخری آبادی۔ مگر یہاں بھی آخری آبادی سے مراد اس کی اپنی مملکت کی آخری آبادی ہے نہ روئے زمین کی آخری آبادی۔

ستر۔ سِتْر کے معنی کسی چیز کا ڈھانک دینا ہیں اور یہاں ستر نہ ہونے سے مراد عمارتوں کا نہ ہونا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے.... لم یبن

جا بناء قط (ر)

كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾
ایسا ہی تھا اور جو اس کے پاس تھا ہمیں اس کا پورا علم تھا ۱۹۵۸

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾
پھر ایک (اور) راہ پر چلا ۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾
یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو اُن سے ورے ایک قوم کو پایا جو قریب نہ تھا کہ بات سمجھیں ۱۹۵۹

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ
انھوں نے کہا ، اے ذوالقرنین ! یاجوج اور ماجوج ۱۹۶۰ اس ملک میں فساد کرنے والے ہیں ، تو کیا

یہ ذوالقرنین کا شرقی سفر ہے جو حدود کی مضبوطی کے لیے کیا۔ اور اس طرف اس کی مملکت کی انتہا اس قوم پر تباتی ہے جو عمارتیں بنا کر نہ رہتے تھے یعنی خانہ بدوش اقوام تھیں۔

۱۹۵۸ یعنی جو کچھ لشکر یا سامان حرب وغیرہ اس کے پاس تھا اس کا ہمیں علم تھا۔ مطلب یہ کہ ان مہمات کے لیے اس کے پاس ہر قسم کا کافی سامان تھا۔

۱۹۵۹ سدّین ۔ سدّ کے لیے دیکھو ۶۱۴ ہر ایک مانع سد ہے (غ) وجعلنا من بین ایدیھم سدّا و من خلفھم سدّا (یٰسٓ ۳۶ - ۹) اور دیوار کو اور پہاڑ کو بھی سد کہتے ہیں (ل) اور یہاں سدین سے مراد جیسا کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ آرمینیا اور آذر بائیجان کے دو پہاڑ ہیں۔

لا یکادون یفقھون قولا سے مراد ہے کہ وہ زبان نہ سمجھتے تھے یعنی ان کی زبان اور تھی۔ یہ ذوالقرنین کا شمالی سفر ہے اور سب سے زیادہ خطرہ اسی طرف سے تھا انسکلوپیڈیا برٹینیکا میں ہے کہ "میڈیا کے شمال میں جو اقوام تھیں وہ ایرانی یا انڈو یوروپین نہ تھیں بلکہ آرمینیا کے پہلے باشندوں کی طرح وہاں کی اصلی قومیں تھیں جو شاید کوہ قاف کی بیشمار قوموں سے تھیں "

۱۹۶۰ یاجوج وماجوج کی وجہ تسمیہ: یاجوج وماجوج ۔ اَجّ سے یفعُول اور مفعُول کے وزن ہیں اور اجیج آگ کے شعلہ مارنے یا بھڑکنے کو کہتے ہیں اور اجّ کے معنی اَسْرَعَ بھی ہیں یعنی تیز چلا ۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی پیدائش میں سے دو قبیلے ہیں اور ماء اُجاج کھارے پانی کو کہتے ہیں یا اس کو جس کا کھاراپن بہت سخت ہو (ل) ھٰذا ملح اجاج (فاطر ۳۵ - ۱۲) اور یاجوج اور ماجوج کو ان کے کثرت اضطراب کی وجہ سے شعلے مارنے والی آگ سے اور موجیں مارنے والے پانیوں سے تشبیہ دی گئی ہے (غ) اور اَجّ سے مشتق ہونے میں شاید یہ اشارہ ہو کہ یہ قومیں آگ سے بہت کام لیں گی اور یاجوج ماجوج آدم کی نسل سے ہیں جیسا کہ صحیحین سے ثابت ہے (ث) اور بعض کے نزدیک وہ یافث بن نوح کی اولاد سے دو قبیلے ہیں اور تُرک بھی اُنہیں میں سے ہیں جو دیوار سے ادھر چھوڑا جانے کی وجہ سے ترک کہلائے اور کعب احبار سے روایت ہے کہ یاجوج ماجوج آدم کی اولاد میں سے ہیں مگر حوّا سے نہیں (ر) پس یاجوج ماجوج نسل انسانی میں سے ہیں اور ان کے متعلق جو بعض الفاظ احادیث میں آتے ہیں جن سے بعض کو یہ خیال گزرتا ہے کہ وہ ہماری طرح کے آدمی نہیں تو لازماً وہ استعارہ کے رنگ کے ہیں اور اس بارہ میں سب روایات قابل قبول بھی نہیں مثلاً یہ قول جو حضرت ابن عبّاسؓ کی طرف منسوب ہے کہ ان کے قد ایک بالشت اور دو بالشت یا زیادہ سے زیادہ تین بالشت ہیں ۔ یا یہ کہ ان میں سے ایک مرتا ہے تو ایک ہزار ذریت چھوڑتا ہے جس کو مرفوع بھی بتایا جاتا ہے مگر منکر قرار دیا گیا ہے یہودی انسکلوپیڈیا میں ہے کہ جوزیفس ان کو وہی قوم بتاتا ہے جو سیتھیئن کہلاتی ہے اور جیرومی کہتا ہے کہ میگاگ (یاجوج) کوہ قاف سے پرے بحیرہ خضر کے قریب تھا ۔ انسکلوپیڈیا برٹینیکا بھی اسی رائے کا مؤید ہے یعنی انہیں سیتھیئن قومیں قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ شمال کی بہت سی اقوام میں سے کسی ایک یا سب پر اس لفظ کا استعمال ہو سکتا ہے ۔

بائبل کی شہادت کہ یاجوج ماجوج اقوام یورپ ہیں : بائبل میں ہے "خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدمزاد تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبال کا سردار ہے اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر اور کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے پھرا دونگا اور تیرے جبڑوں میں بنسیاں ماروں گا" (حزقی ایل ۳۸ : ۱-۴) یہاں تین نام یاجوج ماجوج کے ذکر میں آئے ہیں ۔ روش ، مسک اور توبال ۔ مفسرین بائبل ایسے صریح الفاظ سے گھبرا کر ان ناموں کو ایشیائے کوچک میں تلاش کرتے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں روش سے مراد روس نہیں ؟ کیوں اس لیے کہ اس صورت میں پیشگوئی اپنے ہی گھر کے خلاف ثابت ہوتی ہے مگر واقعات ایسے زبردست ہیں کہ ان کے سامنے یہ انکار قائم نہیں رہ سکتا یاجوج ماجوج کا کوہ قاف کے شمال میں ہونا ایک امر مسلم ہے جسے یہودی انسکلوپیڈیا اور انسکلوپیڈیا برٹینیکا دونوں میں صحیح تسلیم کیا گیا ہے ۔ اب ایشیائے کوچک میں ان ناموں کو تلاش کرنا عبث کوشش ہے ۔ کوہ قاف کے شمال میں روس بھی ہے اور مسک اور توبال بھی موجود ہیں ۔ مؤخر الذکر دونوں ناموں کے دو دریا (مسکوا اور توبال) کوہ قاف کے شمال میں ملک روس میں بہ رہے ہیں اور ان میں سے اول پر ماسکو کا قدیم شہر آباد ہے اور موخر الذکر پر توبالسک ۔ اور یہ یقینی امر ہے کہ جوج یا یاجوج جس کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد روس ہی ہے

لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿٩٤﴾

ہم تیرے لیے کچھ خرچ مہیا کر دیں، تاکہ تو ہمارے اور اُن کے درمیان ایک روک بنا دے [۱۹۶۱]

قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾

اس نے کہا جو میرے رب نے مجھے طاقت دی ہے وہ بہتر ہے سو تم مجھے (اپنی) قوت سے مدد دو، مَیں تمہارے اور اُن کے درمیان ایک دیوار بنا دوں گا [۱۹۶۲]

نہ کچھ اور رِیس یا جوج ماجوج ہیں سے ایک روس ہے۔ یا سلانی قوموں کا مسکن آیا ماجوج ٹیوٹن قوموں کا مسکن ہے یا نہیں۔ گو اس کی تائید میں کوئی دلائل پیش نہیں کر سکتا مگر اقوام یورپ کے ایک حصّہ پر اس صراحت سے یاجوج کا نام صادق آنا جو خود بائبل اور انسکلوپیڈیا سے ثابت ہے کوئی شک باقی نہیں رہنے دیتا کہ ماجوج سے مراد بھی انہی قوموں کا کوئی دوسرا بڑا عظیم الشان حصّہ ہے۔ اور لندن کے گلڈ ہال کے سامنے یاجوج اور ماجوج کے بتوں کا نصب ہونا جن کی اصلیت بھی بہت پرانے زمانے کی بتائی جاتی ہے یعنی اس قسم کے بت ہنری فامس کے زمانہ میں بھی موجود تھے۔ بتاتا ہے کہ جس نتیجہ پر ہم پہنچے ہیں وہی درست ہے اور ممکن ہے کہ ابتدا میں ان قوموں کے باہم تعلقات بھی ہوں یا یہ ایک ہی قوم کی دو شاخیں ہوں۔

۱۹۶۱ خرج۔ خَرْج اور خَرَاج وہ چیز ہے جو لوگ سال میں ایک دفعہ معلوم اندازہ سے اپنے مال سے نکالتے ہیں یا خراج جو لوگوں کے مال سے لیا جاتا ہے (ل) ام تسئلھم خرجًا فخراج ربّك خير (المؤمنون ۲۳-۷۲) اور خرج میں خراج کی نسبت وسعت ہے اور آمد کے مقابل یعنی خرچ کو بھی خرج کہا جاتا ہے (غ)۔

یاجوج وماجوج کے فساد سے کیا مطلب ہے ابن کثیر میں ہے یخرج منھا یاجوج وماجوج علی بلاد الترك فيبعثون فيھا فسادا ويھلكون الحرث والنسل یعنی اس جگہ سے یاجوج وماجوج ترکوں کے ملک پر حملہ آور ہونگے اور وہاں فساد برپا کرینگے اور کھیتی اور نسل کو تباہ کر دیں گے۔ احادیث میں یاجوج ماجوج کے ایک خروج کا آخری زمانہ میں ذکر ہے جس کی طرف آگے آیت ۹۸ و ۹۹ میں اشارہ ہے اور یہ دونوں خروج ترکوں پر حملہ سے ہی مخصوص معلوم ہوتے ہیں۔ خروج اول میں جو قوم ہے وہ بھی جیسا کہ اوپر ذکر ہوا تُرک ہی معلوم ہوتے ہیں وہ گو ان میں سے ہوں یا نہ ہوں لیکن اس میں کچھ شک معلوم نہیں ہوتا کہ دیوار جس کے بنانے کا یہاں ذکر ہے اس کے جنوب کی طرف جو قوم رہ گئی وہ ترک ہی تھے اور شمال کی طرف جو اقوام رہ گئیں وہ یاجوج ماجوج تھیں اور ایسا ہی مقدر تھا کہ بار اول بھی یہ شمالی اقوام ترکوں پر ہی حملہ آور ہوں اور آخری زمانہ میں بھی ترک ہی ان کے حملہ کا خاص نشانہ ہوں۔ اور یہ جو یہاں یاجوج ماجوج کے فساد کا ذکر ہے تاریخ بھی اس پر شاہد ہے۔ وہ قومیں جو آرمینیا اور آذربائیجان کے پہاڑوں کے درمیان رہتی تھیں وہ اپنے شمالی ہمسائیوں یعنی یاجوج ماجوج سے ہمیشہ تکلیف اٹھاتی تھیں اور ان کے ان پر حملے ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ انسکلوپیڈیا بریٹینیکا میں ہے کہ وہی سینتھیئن قومیں جنہیں ماجوج قرار دیا گیا ہے ماوہ پر ۲۸ سال کے لیے حکمران رہیں اور ۵۱۲ قبل مسیح کے قریب دارا نے ان پر فوج کشی کی اور کہ اس جنگ کی غرض صرف یہی تھی کہ تورانی قوموں پر عقب کی طرف سے حملہ آور ہو کر سلطنت کی شمالی سرحد پر امن قائم کیا جائے اس سے قرآن کریم کے اس بیان کی "تائید ہوتی ہے جو ذوالقرنین کے سفر شمال کے متعلق ہے اور نیز اس کی کہ کوہ قاف سے شمال کی طرف رہنے والی قوموں کی طرف سے ایران کی شمالی سرحد کی قوموں پر حملے ہوتے رہتے تھے۔

۱۹۶۲ رَدْم۔ کسی رخنہ کا پتھروں سے روکنا ہے (غ) اور یہ سدّ سے بڑھکر ہے کیونکہ اس میں ایک چیز دوسری کے اوپر رکھی جاتی ہے (ل)

اعینونی بقوۃ۔ مراد یہ ہے کہ روپے کی مجھے ضرورت نہیں البتہ مزدوری وغیرہ کا تم انتظام کرو۔

ذوالقرنین کی دیوار: یہ دیوار جس کا یہاں ذکر ہے وہ مشہور دیوار ہے جو دربند پر جو بحیرۂ خضر کے کنارے واقع ہے بنی ہوئی ہے مسلمان جغرافیہ نویسوں نے بھی اس دیوار کا ذکر کیا ہے چنانچہ مراصد الاطلاع میں بھی یہ ذکر ہے اور ابن النعقیہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے انسکلوپیڈیا بریٹینیکا میں اس دیوار کا حسب ذیل ذکر ہے: "دربند ایران کا ایک شہر ہے جو علاقہ قاف میں داغستان کے صوبہ میں ہے اور بحیرۂ خضر کے مغربی کنارہ پر ہے...... یہ سمندر کے ساتھ ہی ایک تنگ قطعہ زمین پر واقع ہے جہاں سے یہ ڈھلوان بلندیوں پر خشکی کے اندر کو اونچا چلا گیا ہے ...... اور جنوب کی طرف دیوار قاف کا سمندر کی طرف کا سرا واقعہ ہے جو پچاس میل لمبی ہے اور جسے سدِّ سکندر کہتے ہیں جس کی وجہ سے باب حدید یا باب خضر کا تنگ درہ رکھا گیا ہے یہ دیوار جب سالم تھی تو ۲۹ فٹ اونچی تھی اور موٹائی میں تقریباً دس فٹ تھی اور اپنے لوہے کے دروازوں اور بیشمار حفاظت کے برجوں کے ساتھ سرحد ایران کا نہایت قیمتی استحکام تھی۔" اس دیوار کا شمالی سرحد پر ایران کی حفاظت کا ذریعہ ہونا جسے یہاں تسلیم کیا گیا ہے بالکل قرآن شریف کے بیان کے مطابق ہے اور اسے جو سدِّ سکندر کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ مسلمان تاریخ نویسوں کی یہ غلطی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ذوالقرنین سے مراد سکندر لیتے ہیں (یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ذوالقرنین دارائے اول ہے وہ دارا نہیں جس کا مقابلہ سکندر سے ہوا تھا) یہ بیان کچھ شبہ باقی نہیں رہنے دیتا کہ جس دیوار کا ذکر قرآن شریف میں ہے یہی دربند کی دیوار ہے جو قاف کی شمالی قوموں کو ایران پر حملہ آور ہونے سے روکنے کے لیے بنائی گئی تھی جنہیں نہ صرف قرآن شریف یاجوج ماجوج قرار دیتا ہے بلکہ خود مورخین بھی انہی کو یاجوج ماجوج قرار دیتے ہیں۔

اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ؕ ﴿۹۶﴾

میرے پاس لوہے کے (بڑے بڑے) ٹکڑے لے آؤ، پھر جب اس نے پہاڑ کی دونوں طرفوں کے درمیان (دیوار کو) برابر کر دیا، کہا دھونکو یہانتک کہ جب اُسے آگ (کی طرح) کر دیا کہا مجھے پگھلا ہُوا تانبا لا دو تاکہ اس کے اوپر ڈالوں ۱۹۶۳ع

فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾

سو نہ تو وہ اس قابل تھے کہ اس پر چڑھ سکیں اور نہ اس میں سوراخ کر سکتے تھے ۱۹۶۴ع

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ؕ ﴿۹۸﴾

کہا یہ میرے رب کی رحمت ہے، پس جب میرے رب کا وعدہ آ جائے گا تو اسے ہموار (زمین) کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے ۱۹۶۵ع

وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ وَّ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۙ ﴿۹۹﴾

اور ہم انھیں اس دن ایک دوسرے پر موجیں مارتے ہوئے چھوڑ دیں گے اور صور پھونکا جائے گا پس ہم اُن کو اکٹھا کر دیں گے ۱۹۶۶ع

۱۹۶۳ع صدفین۔ صدف کا تثنیہ ہے اور صَدَف پہاڑ کی جانب کو کہتے ہیں اور صَدَف عنہ کے معنی ہیں اس سے سخت اعراض کیا وصدف عنہا (الانعام ۶ ۔ ۱۵۷) (غ)

قطر۔ قُطر جانب کو کہتے ہیں۔ جمع اقطار ہے ان تنفذوا من اقطار السموات (الرحمٰن ۵۵ ۔ ۳۳) ولو دخلت علیہم من اقطارھا (الاحزاب ۳۳ ۔ ۱۴) اور قِطر پگھلائے ہوئے تانبے کو کہتے ہیں اور قَطِران رال کو کہتے ہیں۔ سرابیلھم من قطران (ابراھیم ۱۴ ۔ ۵۰) قِطار بھی اسی سے ہے (غ)

یہ دیوار لوہے کی بنی ہوئی نہ تھی بلکہ پتھروں کی تھی جس پر خود لفظ رَدْم شاہد ہے دیکھو ۱۹۶۲ع پھر لوہے کے ٹکڑے کس لیے منگوائے یہی باتیں ہیں جو قرآن کریم کے کمال علم پر دلالت کرتی ہیں رسول اللہ صلعم تو اس دیوار کو دیکھنے نہ گئے تھے اور مسلمان آج تک اس کی تعیین نہ کر سکے یہاں تک کہ ہمارے اس زمانہ میں سرسیّد نے دیوار چین کو یہ دیوار قرار دیا ہے مگر اب اس کی صحیح طور پر تعیین ہو جانے پر کس قدر تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ فی الواقع دیوار تو پتھروں کی بنی ہوئی ہے جیسے قرآن کریم نے رَدْم کہہ کر بتا دیا مگر اس میں دروازے لوہے کے تھے اور انہی کے لیے لوہے کے ٹکڑے منگوائے گئے تھے اس لیے لوہے کے استعمال کا ذکر اس وقت آتا ہے جب دیوار بن چکی اور پہاڑ کی دونوں جانبوں میں برابر ہو چکی تو پھر لوہے کو گرم کیا گیا اور اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈالا گیا تاکہ اس کی مزید مضبوطی کا موجب ہو۔ پگھلا ہوا تانبا دیوار پر نہیں ڈالا گیا بلکہ لوہے کے تختوں پر جن کے پھاٹک بنے۔

۱۹۶۴ع یعنی یہ دیوار ان شمالی قوموں کے لیے روک ہو گئی۔ نہ وہ اس کے اوپر چڑھ سکتے تھے نہ نقب لگا سکتے تھے۔ اس لیے کہ جا بجا اس میں برج تھے جن میں فوج رہتی تھی۔

۱۹۶۵ع دَکّاء۔ دَکّ پہاڑ، دیوار یا اور کسی ایسی چیز کے گرانے کو کہتے ہیں (ل) فلما تجلّٰی ربہ للجبل جعلہ دکا (الاعراف ۷ ۔ ۱۴۳) وحملت الارض والجبال فدکتا دکّۃ واحدۃ (الحاقّۃ ۶۹ ۔ ۱۴) اور ایک قول یہ بھی ہے کہ دَکّ سے مراد زلزلہ ہے (ل) اور دَکّاء مٹی کے پشتہ کو کہتے ہیں جو بہت بڑا نہ ہو (ل) اَرْضٌ دَکّاء ہموار زمین ہے (غ) اور یہاں جعلہ دکاء میں مراد ارضا دکاء ہی ہے۔

دیوار کی تباہی: مطلب یہ کہ یہ روک آخر کار تباہ ہو جائے گی اور پھر یاجوج ماجوج کا خروج ہو گا مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ خروج اسی دیوار کی جگہ سے ہو نہ یہ ضروری ہے کہ وہی قوم نکلے بلکہ اسی قوم کی نسل یا اسی قسم کی اور قومیں مراد ہو سکتی ہیں۔ اور ایک حدیث میں جو یہ لفظ آتے ہیں کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ آپ کی بعثت کے وقت اس دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر لیا گیا ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان قوموں کے خروج اور دنیا پر غالب آنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔

۱۹۶۶ع یموج۔ مَوْج سمندر کی لہر کو کہتے ہیں فی موج کالجبال (ھود ۱۱ ۔ ۴۲) اور ماج (یموج) کے معنی ہیں اس میں لہر کی طرح اضطراب آیا (غ)

یاجوج ماجوج کا آخری خروج اور ان کا انجام: یہ انہی اقوام کی حالت ہے جن کے خروج کی طرف آیت ماقبل میں اشارہ ہے خود قرآن کریم میں دوسری جگہ صاف الفاظ میں ہے حتّٰی اذا فتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون (الانبیاء ۲۱ ۔ ۹۶) یعنی جب یاجوج ماجوج کا خروج ہو گا تو وہ ہر ایک بلندی سے نکل پڑیں گے جس سے مراد یہ ہے کہ کل دنیا پر غالب ہو جائیں گے۔ چنانچہ حدیث مسلم میں جہاں خروج یاجوج وماجوج کا ذکر

وَّ عَرَضۡنَا جَهَنَّمَ يَوۡمَئِذٍ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ عَرۡضَا ۙ﴿۱۰۰﴾ اور اس دن ہم دوزخ کو کافروں کے سامنے لے آئیں گے۔

الَّذِيۡنَ كَانَتۡ اَعۡيُنُهُمۡ فِىۡ غِطَآءٍ عَنۡ ذِكۡرِىۡ وَكَانُوۡا لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ سَمۡعًا ﴿۱۰۱﴾ وہ جن کی آنکھیں میرے ذکر سے پردے میں تھیں اور وہ سن بھی نہ سکتے تھے۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنۡ يَّتَّخِذُوۡا عِبَادِىۡ مِنۡ دُوۡنِىۡۤ اَوۡلِيَآءَ ؕ اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾ تو کیا جو کافر ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ میرے مقابل میں میرے بندوں کو کارساز بنائیں، ہم نے دوزخ کو کافروں کے لیے مہمانی کے طور پر تیار کیا ہے ١٩٦٧

قُلۡ هَلۡ نُنَبِّئُكُمۡ بِالۡاَخۡسَرِيۡنَ اَعۡمَالًا ؕ﴿۱۰۳﴾ کہہ کیا ہم تمھیں عملوں میں بہت بڑھ کر گھاٹے میں رہنے والوں کی خبر دیں

اَلَّذِيۡنَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ يُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ﴿۱۰۴﴾ وہ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں برباد ہوگئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ صنعت کے بہت اچھے کام بنا رہے ہیں ١٩٦٨

ہے وہاں صاف الفاظ ہیں لایدان لاحد بقتالھم ان کے ساتھ جنگ کرنے کی کسی کو طاقت نہ ہو گی۔ قرآن و حدیث کی یہ متفقہ شہادت ایک ذرہ بھر بھی شبہ باقی نہیں چھوڑتی کہ یاجوج ماجوج کونسی قومیں ہیں اور کہ ان کا خروج ہو چکا ہے وہ یہی یورپین اقوام ہیں سلافی ہوں یا ٹیوٹن جنہوں نے دنیا پر ایسا غلبہ حاصل کیا ہے کہ کوئی بلندی ان کے تصرف سے باہر نہیں رہ گئی اور یہ دنیا کی تاریخ میں ایک بےنظیر امر ہے اور اس آیت میں ان کی اپنی حالت کا ذکر ہے کہ ہم انہیں ایسی حالت میں چھوڑ دینگے جب وہ ایک دوسرے پر موجیں مارتے ہونگے یعنی ساری دنیا پر غالب آکر پھر آپس میں لگ جائینگے خواہ وہ جنگ کے ذریعہ سے ہو جیسا کہ گزشتہ جنگ یورپ میں ہوا یا اور کسی ذریعہ سے اور لفظ یموج میں ان کے اضطراب اور حیرت کا ذکر ہے کہ باوجود ساری دنیا کو مسخر کر لینے کے انہیں کوئی اطمینان قلب میسّر نہیں ہوگا۔ یہ تموج بہرحال شروع تو ہو چکا ہے آئندہ کس کس رنگ میں اس کا ظہور ہوگا۔ یہ علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اور ایسا ہی بگل بجانے پر ان کا جمع ہونا صرف قیامت کبریٰ تک محدود نہیں بلکہ یہاں ان کی قومی قیامت کا ذکر معلوم ہوتا ہے اور کم از کم شامل ضرور ہے۔ اور ان کے جمع ہونے میں اشارہ شاید دین حق پر یعنی اسلام پر جمع ہو جانا ہو یعنی اکثر حصہ ان کا اسلام قبول کرلے گا اور اسی کے بالمقابل اگلی آیت میں کافروں کا ذکر ہو سکتا ہے۔ اور لیظہرہ علی الدین کلہ صاف بتاتا ہے کہ آخرکار اسلام کو کثرت سے لوگ قبول کرلیں گے۔

١٩٦٧ عبادی سے مراد مسیح اور ملائکہ لیے گئے ہیں (ج) مگر جیسا کہ اگلی آیات ظاہر کریں گی یہاں بالخصوص حضرت عیسیٰؑ ہی مراد ہیں اور یہ کافر عیسائی ہیں۔

سورت کا خاتمہ عیسائی اقوام کی آخری حالت پر کیا ہے اور یہاں بتایا ہے کہ مسیح کی عبادت کرنے والے یہ خیال نہ کریں کہ مسیح کی عبادت انہیں حق کے انکار کی سزا سے بچا سکے گی یا مسیح کی عبادت کرکے وہ فلاح پا جائیں گے۔ نزل پہلی چیز ہوتی ہے جو مہمان کے لیے تیار کی جاتی ہے اس لیے جہنم کے لفظ میں اشارہ اس دنیا کی سزا کی طرف بھی ہے کیونکہ انسان کی ہوس بالآخر اس دنیا کو بھی اس کے لیے دوزخ بنا دیتی ہے۔

١٩٦٨ صُنع۔ صَنعَۃ ہاتھ کے عمل کو کہتے ہیں ویصنع الفلک (ہود ١١-٣٨) واصنع الفلک (ہود ١١-٣٧) وعلّمنٰہ صنعۃ لبوس لکم (الانبیاء ٢١-٨٠) (ل) اور صُنع کے معنی اِجَادَۃ الفِعل ہیں یعنی ایک کام کا جید بنانا۔ فِعل عام ہے اور حیوانات وغیرہ کی طرف منسوب ہو جاتا ہے مگر یہ نہیں (غ) صنع اللہ الذی اتقن کل شیءٍ (النحل ٢٧-٨٨)

عیسائی اقوام کی صنعت: ابن عباس، سعد بن ابی وقاص اور مجاہد سے مروی ہے کہ جن لوگوں کا یہاں ذکر ہے وہ یہود و نصاریٰ ہیں (ر) اور حق یہ ہے کہ جس قدر یہ الفاظ آج نصاریٰ قوموں کی حالت پر صادق آتے ہیں ایسا کسی قوم پر صادق نہیں آئے۔ یہی اقوام ہیں جن کی ساری کوشش دنیا کی زندگی کے لیے ہے یہاں تک کہ ان کے پادریوں کے مدّنظر بھی دنیوی طور پر دوسری قوموں پر غالب آنا ہے۔ اور بلحاظ اکثریت کہا جاسکتا ہے کہ یورپ و امریکہ کی نصاریٰ اقوام دنیا میں بکلی منہمک ہیں شب و روز یہی فکر ہے کہ دنیا میں کس طرح ترقی کریں، مال و دولت کن کن ذرائع سے آسکتا ہے ضل سعیہم فی الحیٰوۃ الدنیا اور ان کی کوشش کا برباد ہونا اس لیے کہا کہ ان چیزوں کو اخلاق انسانی سے کچھ تعلق نہیں اور جو چیز باقی رہتی ہے وہ اخلاق سے ہی تعلق رکھتی ہے آسایش جسمانی کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ اور صُنع کے لفظ میں اگر ایک طرف ان کے ہاتھ کی کاریگری کے کاموں کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں یہ اقوام کل دنیا پر سبقت لے گئی ہیں تو دوسری طرف یہ بھی بتایا ہے کہ یہ ان کا گمان باطل ہے کہ یہ کوئی بڑے جید اور اعلیٰ درجہ کے کام ہیں۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ
فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾
ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا
وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ﴿١٠٦﴾
إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ
لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾
خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٠٨﴾
قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي
لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي
وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ﴿١٠٩﴾
قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ
أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَمَنْ كَانَ يَرْجُو
لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا
يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ﴿١١٠﴾ ع

یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی باتوں اور اس کی ملاقات کا انکار کیا ، سو اُن کے عمل اُن کے کام نہ آئے اس لیے ہم قیامت کے دن ان کے لیے وزن قائم نہیں کریں گے۔

یہ اُن کی سزا ہے (یعنی) دوزخ۔ اس لیے کہ انھوں نے کفر کیا اور میری باتوں اور میرے رسولوں کو ہنسی بنایا۔

جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں ان کے لیے فردوس کے باغ مہمانی ہیں ع۱۹۷۰

انہی میں رہیں گے وہاں سے جگہ بدلنا نہیں چاہیں گے۔

کہہ اگر سمندر میرے رب کے کلمات کے لیے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائیگا قبل اس کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں گو ہم اسی جیسا (اور اس کی) مدد کو لائیں ع۱۹۷۱

کہہ میں صرف تمھاری طرح بشر ہوں (لیکن) میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے — پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہے تو چاہیئے کہ وہ اچھے عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے ع۱۹۷۲

ع۱۹۶۹ قیامت کے دن ان کے لیے وزن قائم نہیں ہوگا اس لیے کہ وزن تو ان افعال کا ہے جو ابتغاء لمرضات اللہ کیے جاتے ہیں۔

ع۱۹۷۰ فردوس کو بعض نے معرب کہا ہے اور بعض نے اسے عربی قرار دیا ہے کَرْمٌ مُفَرْدَسٌ کے معنی ہیں مُعَرَّشٌ یعنی ٹٹی پر چڑھائے ہوئے۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی محض باغ ہیں یا سرسبز وادی یا وہ ایسا باغ ہے جس میں وہ تمام اشیاء جمع ہوں جو باغوں میں ہوتی ہیں (ل) اور حدیث نبوی میں جو بخاری و مسلم میں ہے اسے وَسَطُ الجَنَّة اور اَعْلَى الجنّة کہا ہے یعنی جنت کا بہترین اور سب سے بلند مقام (ر)

ع۱۹۷۱ مداد۔ مَدّ کے معنی کھینچنا یا لمبا کرنا ہیں دیکھو ع۱۱۷۱ اور مِداد سیاہی کو کہتے ہیں جس سے لکھا جاتا ہے اور مَدَّ الدَّواة اور اَمَدَّ ھا دونوں کے معنی ہیں دوات میں سیاہی ڈالی یا اور زیادہ کی۔ اور بعض نے کہا کہ مِداد سیاہی کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کاتب کو مدد دیتی ہے (ل)
اللہ تعالیٰ کے لا انتہا کلمات میں سے مسیح ایک کلمہ ہے: اصل مضمون تو یہ تھا کہ جو لوگ مسیح کو خدا بناتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ اور انہی کے مقابل پر ایمان والوں کا ذکر کیا تھا تو اس مضمون کا کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات لا انتہا ہیں یہاں کیا تعلق ہے۔ روح المعانی میں ہے کہ کلمات اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے معلومات ہیں مگر معلومات کے لیے بولنا ضروری نہیں اور کلمۃ کے معنی کلام یا بات ہیں دیکھو ع۵۰ دوسری طرف قرآن کریم میں ہے انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق اس کے کلمہ سے پیدا ہوتی ہے اور حضرت مسیح کو جو کلمۃ کہا ہے تو اس سے بھی اصل مراد یہی ہے کہ وہ اس کی مخلوق ہے نہ خدا یا خالق۔ اور عیسائیوں نے چونکہ مسیح کے کلمہ ہونے پر بڑی ٹھوکر کھائی ہے اور وہ کلمۃ کو خدا کا مترادف ہی قرار دیتے ہیں "اور کلام خدا تھا" (یوحنا ۱:۱) تو اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا ہے کہ ساری مخلوق ہی اس کے کلمے ہیں ایک مسیح ہی کلمہ نہیں۔ اور وہ مخلوق اتنی بڑی ہے کہ یہ اس زمین کا جو سمندر ہے اگر وہ سیاہی بن جائے تو خدا کی مخلوق لکھ کر ختم نہیں ہوتی۔ پس ان الفاظ میں بھی عیسائی مذہب کی غلطی کو ہی واضح کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں رسول اللہ صلعم کی بشریت کا ذکر کیا۔

ع۱۹۷۲ عیسائیت کی تردید اور نسل انسانی کے لیے خوشخبری: سورت کا خاتمہ ایک ایسی آیت پر کیا ہے جو نہ صرف عیسائی مذہب کی بنیاد ہی کو گرا دیتی ہے بلکہ انسان کے سامنے ترقیات کا ایک نہایت کھلا میدان لا کر اسے اعلیٰ سے اعلیٰ منازل روحانی پر پہنچنے کی خوشخبری سناتی اور ان منازل کو حاصل کرنے کے لیے اس کی ہمت بندھاتی ہے۔ میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں پس تم میری پیروی تو کر سکتے ہو لیکن جو تمہارے اعتقاد میں کہ تم جیسا بشر نہ تھا اس کی پیروی تم کیونکر کر سکتے ہو اس کا آنا نہ آنا تمہارے لیے برابر ہے کیوں کہ انسان انسان کے قدم بقدم تو چل سکتا ہے مگر خدا کے قدم بقدم نہیں چل سکتا۔ دوسری طرف بشر مثلکم کہکر ہمیں یہ خوشخبری سنائی کہ وہ مقامات عالیہ جن پر محمد رسول اللہ صلعم پہنچے انہی کو اپنی اپنی استعداد کے مطابق تم بھی حاصل کر سکتے ہو اس لیے کہ جیسے وہ بشر تھے تم بھی بشر ہو۔ اور بشر بشر کے نقش قدم پر چل سکتا ہے ہاں ہر شخص اپنی استعداد اور اپنے حالات کے مطابق ان مقامات عالیہ پر پہنچ سکتا ہے لیکن جو کچھ موہبت سے ملتا ہے جیسے نبوت اس میں انسان کی کوشش کا کوئی دخل نہیں۔

آیاتہا ۹۸ (۱۹) سُورَةُ مَرْيَمَ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

كٓهٰيٰعٓصٓ ۟ۚ ⑴ کافی، ہادی، برکت والا، عالم، صادق (خدا) ع۱۹۷۳

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۚ ⑵ (یہ) تیرے رب کی رحمت کا ذکر اپنے بندے زکریاؑ پر ہے۔

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ⑶ جب اس نے اپنے رب کو چپکے سے پکارا ع۱۹۷۴

نام: اس سورت کا نام مریم ہے اور یہ نام خود نبی کریم صلعم سے مروی ہے اور اس میں چھ رکوع اور اٹھانوے آیات ہیں اور مریمؑ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی والدہ کا نام ہے اور چونکہ اس سورت میں حضرت عیسٰیؑ کا ذکر کرکے عیسائیت پر اتمام حجت کیا ہے اس لیے اس سورت کا نام حضرت عیسٰیؑ کی والدہ کے نام پر رکھا ہے اس سورت کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں تمام انبیاءؑ کی بیگناہی یا عصمت پر زور دیا گیا ہے۔ اور یوں حضرت عیسٰیؑ کا جو خاص امتیاز عیسائی قائم کرتے ہیں اسے باطل کیا گیا ہے یہ خاص امتیاز حضرت عیسٰیؑ کی عصمت ہے جو عیسائیوں کے نزدیک دوسرے کسی نبی کو حاصل نہیں ہوئی اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اس کے مقابل پر کہیں حضرت یحیٰیؑ کو پاکیزہ اور بیگناہ فرمایا کہیں حضرت ابراہیمؑ کو صدیق قرار دے کر تمام گناہوں سے پاک ثابت کیا ہے کہیں حضرت موسٰیؑ کو ہر قسم کے کھوٹ سے پاک قرار دیا ہے کہیں حضرت اسمٰعیلؑ کی عصمت بیان فرمائی ہے اور پھر ان تمام باتوں کے ساتھ سورت کا نام مریم رکھکر یہ توجہ دلائی ہے کہ عیسائیوں کے عقیدہ کے بموجب گناہ دنیا میں عورت کی وجہ سے آیا پس اگر وہ گناہ ورثہ میں ملتا ہے جس کی وجہ سے تمام انبیاءؑ کو گنہگار قرار دیا جاتا ہے تو حضرت عیسٰیؑ بھی اس سے خالی نہیں جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے اور خود ان کی اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "وہ جو عورت سے پیدا ہوا ہے کیوں کر پاک ٹھہرے" (ایوب ۲۵: ۴)؂

خلاصہ مضمون: اس سورت کی ابتدا حضرت زکریاؑ کے ذکر سے کی ہے جس کے لیے دیکھو ع۱۹۷۴ اور پہلے رکوع میں حضرت یحیٰیؑ کا ذکر ہے جو حضرت عیسٰیؑ کے ساتھ نبی تھے۔ اور اس ذکر میں نہ صرف حضرت یحیٰیؑ کی بیگناہی پر زور دیا ہے بلکہ یہ بھی سمجھایا ہے کہ اس زمانہ میں صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے بھی اکیلے حضرت عیسٰیؑ کافی نہ تھے اس لیے آپ کے ساتھ ایک دوسرے نبی کے کھڑا کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ دوسرے رکوع میں حضرت مریمؑ کے حضرت عیسٰیؑ کو حمل میں لینے اور جننے اور حضرت عیسٰیؑ کی نبوت کا ذکر ہے۔ اور ان تمام باتوں میں یہ دکھایا ہے کہ وہ انسان سے بڑھکر کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ یہودیوں کے اعتراضا کا جواب دیتے ہوئے بھی مسیحؑ کے خدائی کے عقیدہ کا بطلان کیا ہے۔ تیسرے رکوع میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کیا ہے جو بوجہ اپنی مقبولیت عامہ کے حضرت مسیح سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ اور ان پر جو ایک ہی الزام تھا کہ انہوں نے جھوٹ بولا اس کی تردید کی ہے چوتھے رکوع میں حضرت موسٰیؑ حضرت اسمٰعیلؑ اور بعض دیگر انبیاءؑ کا ذکر کرکے اور ان کی معصومیت ثابت کرکے یہ بتایا ہے کہ سلسلہ نبوت ابتدائے آفرینش سے چلتا ہے۔ پانچویں رکوع میں بتایا ہے کہ عیسائیت کو جن سامانوں پر اور جس مال و دولت پر فخر ہے یہ سامان آخر اس سے چھن جائیں گے اور چھٹے میں بتایا ہے کہ عقیدۂ ابنیت مسیح دنیا میں باقی نہیں رہ سکتا اور تمام صالحین کے سردار حضرت محمد مصطفٰے صلعم کی محبت آخر دنیا میں پھیل جائے گی؂

تعلق: اس سورت کا تعلق پچھلی سورت سے ظاہر ہے اس میں تاریخ عیسائیت بیان کی ہے اور اس میں عقیدتاً عیسائیت پر اتمام حجت کیا ہے اور عقیدۂ ابنیت مسیح کا جو عیسائیت کا بنیادی پتھر ہے ابطال کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ عقیدہ دنیا میں باقی نہیں رہ سکتا۔ گویا یہ سمجھنا چاہئیے کہ دونوں سورتوں کا ایک ہی مضمون ہے۔ اور یہ دونوں سورتیں پوری کی پوری عیسائیت پر ہیں؂

زمانہ نزول: اس سورت کے زمانہ نزول کے لیے دیکھو سورۂ بنی اسرائیل کے زمانۂ نزول پر نوٹ۔ اور خاص اس سورت کے متعلق یہ امر تاریخی طور پر ثابت ہے کہ ہجرت حبش کے وقت جو پانچویں سال بعثت نبوی میں ہوئی یہ سورت نجاشی کے سامنے پڑھی گئی۔ اور چونکہ یہ واقعہ ابتدائے ہجرت کا ہی ہے کیونکہ کفار قریش نے اسی وقت مہاجرین کے پیچھے اپنا وفد نجاشی کے پاس بھیجا تھا اور اسی وفد کی شکایت پر نجاشی نے حضرت عیسٰیؑ کے متعلق مسلمانوں کا عقیدہ دریافت کیا تھا اس لیے یہ امر قریباً ثابت شدہ ہے کہ یہ سورت چوتھے سال بعثت نبوی کی یا پانچویں سال کے آغاز کی ہے اور یہ کُل کی کُل مکّی ہے۔

ع۱۹۷۳ كٓهٰيٰعٓصٓ ۔ اُم ہانی نے رسول اللہ صلعم سے ان حروف کے معانی میں روایت کی ہے کہ اس سے مراد اسمائے الٰہی کاف ہاد عالم صادق ہیں اس صورت میں یا بطور حرف ندا ہوگی اور ابن اثیر میں سعید بن جبیر کی تفسیر میں (لفظ یمن کے نیچے) مذکور ہے کاف ھاد یمین عزیز صادق جہاں یا کو یمین کے قائم مقام ٹھہرایا ہے اور یا من اور یمین کے معنی برکت والا دیئے ہیں جیسے قادر اور قدیر کے معنی قدرت والا ہیں۔

ع۱۹۷۴ خفیا ۔ خفیّ وہ ہے جو دوسروں پر ظاہر نہ ہو اور ندا کے خفی ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کی آواز لوگوں سے مخفی تھی؂

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَ اشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّ لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِیًّا ④	کہا، میرے رب میری ہڈیاں کمزور ہوگئیں اور سر بالوں کی سفیدی سے شعلے مار رہا ہے اور میرے رب تجھ سے دعا کرکے میں محروم نہیں رہا ۱۹۷۵
وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَ كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ⑤	اور میں اپنے بھائی بندوں سے اپنے پیچھے ڈرتا ہوں اور میری عورت بانجھ ہے سو اپنے پاس سے مجھے کوئی وارث عطا فرما
یَّرِثُنِیْ وَ یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۖۗ وَ اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ⑥	جو میرا ورثہ لے اور آلِ یعقوب کا ورثہ لے اور اے میرے رب اسے پسندیدہ بنائیو ۱۹۷۶

اس سورت کی ابتدا حضرت زکریا کے ذکر سے کرنے میں یہ بتایا ہے کہ خود حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں ان سے پہلے ایسے پاک اور نیک لوگ تھے جن کے متعلق خود انجیل میں موجود ہے کہ وہ اور اس کی بیوی "دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانونوں پر بے عیب چلنے والے تھے" (لوقا ۱: ۶) چونکہ اصل غرض اس سورت کی عیسائیت پر اتمام حجت ہے اور بہ اتمام حجت حضرت عیسٰی کی خاص بیگناہی کو جس پر عیسائی زور دیتے ہیں مٹا کر کیا ہے اور تمام انبیاء کو بیگناہ ثابت کیا ہے اس لیے سورت کی ابتدا اس شخص کے ذکر سے کی ہے جس کے متعلق خود عیسائیوں کی کتابوں میں یہ اعتراف موجود ہے کہ وہ خدا کے حضور راستباز اور بے عیب تھا نہ صرف وہی بلکہ اس کی بی بی بھی باوجود عورت ہونے کے بیگناہ تھی ؞

دعا میں اخفا اور تضرع: دعا کے متعلق اصول دوسری جگہ بیان فرمایا ادعوا ربکم تضرّعا وخفیة (الاعراف - ۵۵) اور تضرع گڑگڑانا ہے پس چھپکر دعا کرنا تضرع کی حالت کے خلاف نہیں بلکہ زیادہ تر تضرع اسی دعا میں پیدا ہوتا ہے جو لوگوں سے چھپ کر کی جائے، ہمارے نبی کریم صلعم علاوہ اُن دعاؤں کے جو نماز میں مخلوق خدا کے لیے کرتے رہے زیادہ تر دعا رات کی نمازیں یعنی تہجد میں کرتے تھے جو وقت ہی ایسا تھا کہ کسی دوسرے کو اطلاع نہ ہوتی اور یہ حکم صرف کثرت پر ہے، ہر دعا کے لیے مخفی ہونا ضروری نہیں، بعض دعائیں جماعت میں بھی کی جاتی ہیں اور دعائے جماعت بھی ایک خاص کیفیتِ تضرع پیدا کرتی ہے مگر بیشتر حصّہ دعا کا وہی ہونا چاہیئے جو دوسروں سے الگ ہوکر کی جائے۔

ع۱۹۷۵ عظم - جمع عِظام ہڈی کو کہتے ہیں فکسونا العظام لحما (المومنون ۲۳ - ۱۴) اور عَظُمَ کے اصل معنی ہیں ایک چیز کی ہڈی بڑی ہوگئی، پھر ہر ایک طرح بڑا ہوجانے پر بولا گیا ہے معقول ہو یا محسوس اسی سے عظیم ہے اور یہاں مفرد کا استعمال جنس پر دلالت کرنے کے لیے ہے ؞

اشتعل - شُعل آگ کے شعلہ مارنے پر بولا جاتا ہے اور اِشتعال کا لفظ غضب میں آنے پر بولا جاتا ہے۔ اور رنگ کی تشبیہ کے لحاظ سے سفیدی کے چھاجانے پر بولا جاتا ہے جیسے یہاں۔

شیب۔ بالوں کی سفیدی کو کہتے ہیں (رغ - ل)

قبولیت زکریا اور اس کی وجہ: بدعائك کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ تجھ سے دُعا کرکے یا تیرے مجھے اپنی طاعت کی طرف بلانے سے۔ تو صورت اوّل میں مراد یہ ہوئی کہ تجھ سے دعا کرکے میں بھلائی سے محروم نہیں رہا، یہ شاید اس لیے کہا کہ اس زمانہ میں لوگ ظاہر طور پر دعائیں بھی کرتے تھے اور پھر خدا سے دور بھی پڑے ہوئے تھے، تو بتایا ہے کہ اخلاص کی دعا کو تو ضائع نہیں کرتا۔ اور دوسری صورت میں یہ مطلب ہے کہ تیری طاعت کو قبول کرکے میں کسی بھلائی سے محروم نہیں رہا، مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہے یعنی خدا کا ہوکر انسان نقصان نہیں اُٹھاتا گو عام طور پر یہی معنی کیے گئے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کی سب دعائیں قبول ہوتی رہی ہیں، مگر میرے نزدیک اس بات کو پیش کرنے کا یہ موقعہ نہیں یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ میری پہلی دعائیں قبول ہوتی رہی ہیں تو یہ بھی قبول فرما بلکہ اس وقت کی حالت عامہ کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ لوگ تیرے بندے نہیں بنتے، تجھ سے اخلاص سے دعا نہیں کرتے، تیری طاعت نہیں کرتے، اس لیے بھلائیوں سے محروم ہیں، میں نے تیری عبادت اور طاعت کی اور سب کچھ پایا اور بڑھاپے کا ذکر اس لیے کیا کہ اب انہیں نظر آرہا ہے کہ ان کی موت کا وقت قریب ہے بعد میں اس قوم کی حالت کیسی ہوگی، جیسا اگلی آیت میں صاف کردیا ہے وانی خفت الموالی من ورائی یعنی جو میرے بھائی بند نظر آتے ہیں اپنی موت کے بعد (من ورائی کے یہی معنی ہیں) میں ڈرتا ہوں کہ ان شریر لوگوں سے قوم کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچے ؞

ع۱۹۷۶ رضی - کے معنی دونوں طرح ہوسکتے ہیں مرضی۔ یعنی وہ جس سے خدا راضی ہو۔ یا راضی جو خدا سے راضی ہو راضیة مرضیة (الفجر ۸۹ - ۲۸) رضا کے لیے دیکھو ع۳۸۶ ؞

زکریا کے ورثہ سے مراد: حضرت زکریاؑ کو کیا فکر تھی؟ یہ کہ ان کے پیچھے قوم کو کوئی نیک رستہ پر ڈالنے والا نظر نہیں آتا۔ یا یہ کہ کوئی جائداد انہوں نے بڑی محنت سے پیدا کی ہے ان کے پیچھے اسے کوئی سنبھالنے والا نظر نہیں آتا کیا انبیاء اور صلحاء کو اپنی جائداد کی فکر ہوا کرتی ہے یا اپنی قوم کی؟ اہل تشیع نے

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ⑦

اے زکریاؑ ہم تجھے ایک لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں اس کا نام یحیٰیؑ ہے ہم نے اس کا کوئی نظیر پہلے نہیں بنایا ۱۹۷۷۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ⑧

کہا، میرے رب میرے لڑکا کیسے ہوگا اور میری عورت بانجھ ہے۔ اور مَیں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ گیا ہوں ۱۹۷۸۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ⑨

کہا ایسا ہی ہوگا، تیرے رب نے فرمایا ہے۔ یہ مجھ پر آسان ہے اور پہلے میں نے تجھے پیدا کیا اور تو کچھ چیز نہ تھا۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ⑩

کہا میرے رب میرے لیے کوئی نشان مقرر کر دے کہا تیرے لیے نشان یہ ہے کہ تو تین راتیں صحیح وسالم رہ کر لوگوں سے بات نہ کرے ۱۹۷۹۔

اور ان کے تتبع میں آج کل ایک غلطی خوردہ فرقہ نے یہ خیال کیا ہے کہ یہاں یرثنی سے مراد یہ ہے کہ میری جائداد کا وارث ہو، مگر اس سے بڑھکر ایک راستباز کی کوئی ہتک نہیں ہو سکتی کہ اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ بڑھاپے کو پہنچ کر اور موت کا نظارہ سامنے دیکھ کر اسے یہ فکر ہو کہ میری جائداد کو چچا کے بیٹے سنبھال لیں گے اس لیے وہ دعا کرتا ہے کہ مجھے ایک بیٹا ملے جو اس جائداد کو سنبھال لے۔ میں کہتا ہوں یہ الفاظ قرآنی کی تحقیر ہے اور پھر اس کے ساتھ یرث من اٰل یعقوب کے لفظ بڑھائے ہیں وہ ان باطل خیالات کا قلع قمع کرنے کے لیے کافی ہیں، کیا اٰل یعقوب کی بھی کوئی جدی جائداد چلی آتی تھی جو زکریاؑ کو بھی نہ ملی تھی اور وہ اب چاہتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ کی کچھ زمینیں اور املاک چلی آتی ہیں ان کا وارث بھی یہی لڑکا ہو؟ یہ سب بودے خیالات ہیں راستبازوں کی وراثت علم اور ہدایت کی ہوتی ہے سلسلہ اسرائیل یعنی آل یعقوب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص روحانی نعمت ہدایت تو رکھی تھی بس وہی مراد ہے۔ اور اپنے ورثہ سے مراد ان علوم کا وارث ہونا ہے جو آپ کو دیئے گئے تھے۔

۱۹۷۷ مسمّی کے لیے دیکھو ۱۶۲۷ ہمنام اور نظیر اس کے معنی ہیں اور یہاں شبیہہ یا نظیر مجاہد اور عطاء وغیرہ سے مروی ہیں (د)

یحیٰی کی بےنظیری سے مراد: یحیٰی نام پر دیکھو ۴۱۴۔ انجیل میں ہے "آٹھویں دن ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کا ختنہ کرنے آئے اور اس کے باپ کے نام پر زکریا رکھنے لگے مگر اس کی ماں نے کہا نہیں بلکہ اس کا نام یوحنا رکھا جائے انہوں نے اس سے کہا کہ تیرے کنبے میں کسی کا یہ نام نہیں" (لوقا ۱: ۵۹-۶۱) پس اگر سمی کے معنی ہمنام لیے جائیں تو مراد یہی ہوگی کہ اس خاص گھرانے میں پہلے اس نام کا کوئی آدمی نہیں ہوا اگر فی الواقع اس نام کا آدمی پہلے کوئی نہ ہوا ہو تو یہ کوئی خوبی کی بات نہیں جس کا ذکر قرآن شریف میں کیا جاتا۔ اس لیے مراد یہی ہے کہ اس کا نظیر کوئی نہیں ہوا۔

یحیٰی کی بیگناہی: اب سوال یہ ہے کہ کس معنی میں نظیر نہیں ہوا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں اس لیے کہ حضرت یحیٰی نے نہ اللہ تعالیٰ کی معصیت کی اور نہ کبھی معصیت کا خیال ان کے دل میں آیا اور ایک حدیث بھی ہے ما من احد من ولد اٰدم الا وقد اخطأ اوھم بخطیئۃ الا یحیٰی بن زکریا علیہما السلام لم یہم بخطیئۃ ولم یعملھا آدم کے فرزندوں میں سے کوئی نہیں مگر اس نے خطا کی یا خطا کا ارادہ کیا سوائے یحیٰی بن زکریا کے کہ نہ اس نے خطا کا ارادہ کیا اور نہ خطا کی۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ انجیل میں بھی اسی قسم کا اعتراف موجود ہے "مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورت سے پیدا ہوئے ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی بڑا نہیں ہوا" (متی ۱۱: ۱۱) مگر اصل بات یہ ہے کہ یہ امر اسی نسل کے متعلق ہے کیونکہ جیسا کہ یحیٰی کی وجہ تسمیہ میں لکھا گیا ہے دیکھو ۴۱۴ خود یحیٰی نام میں یہی اشارہ تھا کہ وہ گنہگار نہیں ہوگا جیسی وہ نسل عام طور پر تھی اور خود زکریا کی دعا یہی بتاتی ہے اور سارا ذکر اسی نسل کا ہے ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الفاظ قرآنی میں یہ بھی اشارہ ہو کہ جن خصوصیات کو یحیٰی لیکر آتا ہے وہ سلسلہ اسرائیلی میں اور کسی کو نہیں دی گئیں اور یہ ان کی نبوت کی طرف اشارہ ہوگا کیونکہ سلسلہ اسرائیلی میں ہر ایک نبی خاص صفات کا مظہر ہو کر آتا تھا جن کا مظہر دوسرا نبی نہ ہوا ہوتا تھا۔

۱۹۷۸ عتیا۔ عَتَا (مصدر عُتُوّ اور عِتِیّ) کے معنی ہیں تکبّر کیا اور حد سے نکل گیا وعتو عتوًّا کبیرا (الفرقان ۲۵-۲۱) عتت عن امر ربّھا (الطلاق ۶۵-۸) اور یہاں عِتِیّ سے مراد وہ حالت ہے جس کی اصلاح کا رستہ باقی نہیں رہا (غ)، یا انتہا کو پہنچ جانا (ل) ایسے ہی الفاظ سورۂ آل عمران میں گزر چکے ہیں۔ دیکھو ۴۱۶۔

۱۹۷۹ سویا۔ سَوِیّ وہ ہے جو اندازہ اور کیفیت میں افراط و تفریط سے محفوظ ہو۔ من اصحاب الصراط السوی (طٰہٰ ۲۰-۱۳۵) اور رجل سوی وہ ہے جو اخلاق میں اور خلقت میں افراط و تفریط سے محفوظ ہو (غ) جمہور نے سوی کے معنی یہی لیے ہیں یعنی صحیح سالم ہونے کی حالت میں جس میں کوئی گونگاپن وغیرہ نہیں (د) باقی تشریح کے لیے دیکھو ۴۱۷۔

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَةً وَّ عَشِیًّا ﴿۱۱﴾

سو وہ عبادت گاہ سے اپنی قوم پر نکلا تو انھیں اشارہ سے کہا کہ صبح اور شام تسبیح کرو۔

یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَ اٰتَیْنٰهُ الْحُکْمَ صَبِیًّا ﴿۱۲﴾

اے یحییٰؑ کتاب کو مضبوطی سے پکڑ، اور ہم نے اسے لڑکپن کی حالت میں فہم دیا ع۱۹۸۰

وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَکٰوةً ؕ وَ کَانَ تَقِیًّا ﴿۱۳﴾

اور اپنے پاس سے رحمدلی اور پاکیزگی (دی تھی) اور وہ (گناہ سے) بچنے والا تھا ع۱۹۸۱

وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَیْهِ وَ لَمْ یَکُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا ﴿۱۴﴾

اور اپنے ماں باپ سے نیکی کرنیوالا تھا اور سرکش نافرمان نہیں تھا۔

وَ سَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ وَ یَوْمَ یَمُوْتُ وَ یَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا ﴿۱۵﴾

اور اس پر سلامتی ہے جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ مرے اور جس دن وہ زندہ اٹھایا جائے گا ع۱۹۸۲

وَ اذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ مَرْیَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَکَانًا شَرْقِیًّا ﴿۱۶﴾

اور کتاب میں مریم کا ذکر کر، کہ جب وہ اپنے لوگوں سے الگ ہوکر ایک مشرقی مکان میں چلی گئی ع۱۹۸۳

ع۱۹۸۰ حکم۔ دیکھو ع۱۳۷۰ یہاں مراد حکمت ہے یا کتاب اللہ کا فہم (ج)

یہاں کتاب سے مراد عموماً مفسرین نے توریت کو لیا ہے اگر توریت ہی مراد ہو تو ہرج نہیں اس لیے کہ کل انبیائے بنی اسرائیل توریت پر عمل کرتے اور کراتے تھے یہاں تک کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تعلیم میں بھی توریت پر عمل کو ضروری قرار دیا ہے۔ مگر اغلب یہ ہے کہ کتاب سے یہاں مراد حضرت یحییٰ کی اپنی کتاب ہے اور یہ ان کے زمانۂ نبوت کا ذکر ہے اور آگے جو آتا ہے واٰتینٰہ الحکم صبیا تو یہ پہلے زمانہ کا ذکر ہے یعنی وہ باتیں جن کی ضرورت نبوت کے لیے ہوتی ہے وہ شروع سے دی جاتی ہیں جیسے فہم یا حکمت، رحمدلی، پاکیزگی، بدیوں سے بچنا اور یوں عصمت انبیاء کے اصول کو ساتھ ہی قائم کیا ہے اور میرے نزدیک ترجیح کتاب کے اس دوسرے معنی کو ہے۔ کیونکہ یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ بطور وحی ہے۔

ع۱۹۸۱ حنان۔ حَنِین وہ شوق ہے جس میں شفقت پائی جائے اور حنان سے مراد رحمت ہے (غ) اور حنّان اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے یعنی بہت رحم والا (دل) اور حنانا من لدنا کے معنی دو طرح پر ہوسکتے ہیں یعنی اس پر اپنی جناب سے رحمت کی یا یہ کہ اس کے قلب میں اپنی جناب سے رحمت رکھی۔ اور مَیں نے یہی دوسرے معنی ترجمہ میں لیے ہیں کیونکہ یہاں تین چیزوں کا ذکر ہے جو انبیاء کو شروع سے دی جاتی ہیں جن میں سے پہلی چیز شفقت علی خلق اللہ ہے جو رحمدلی سے پیدا ہوتی ہے اور دوسری بات زکوٰۃ ہے اور تیسری اتقاء ۔

زکوٰۃ کے اصل معنی نمو ہیں جو اللہ تعالیٰ کی برکت سے حاصل ہوتا ہے اور اسی سے زکوٰۃ ہے جو مال میں سے دی جاتی ہے اور یہاں اور غلاماً زکیاً (۱۹) میں مراد تزکیہ بطور اجتباء ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو عالم اور طاہر الخلق بناتا ہے نہ اس طرح کہ وہ ان باتوں کو سیکھ کر حاصل کریں بلکہ توفیق الٰہی سے (غ) اور یہاں چونکہ تقویٰ یا بدی سے بچنے کا ذکر الگ ہے اس لیے مراد اصل معنی یعنی وہ نمو ہیں جو اللہ تعالیٰ کی برکت سے حاصل ہوتا ہے گویا بمقابلہ بدیوں سے بچنے کے یہ نیکیوں میں ترقی ہے۔

ع۱۹۸۲ یہاں تین موقعوں پر سلامتی کا ذکر ہے۔ ولادت کے وقت، موت کے وقت، بعثت کے وقت۔ یوں تین زمانوں پر اس سلامتی کا دائرہ وسیع کیا ہے ولادت کے وقت سلامتی وہ ہے جو اس دنیا کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے، موت کے وقت کی سلامتی حالت قبر یا عالم برزخ کے متعلق ہے اور بعثت کے وقت کی سلامتی وہ جو قیامت سے تعلق رکھتی ہے گویا ہر نبی دنیا میں سلامتی کی حالت میں آتا ہے یعنی شیطان کے حملہ سے محفوظ ہوتا ہے اور موت کے بعد بھی اسے سلامتی ہوتی ہے یعنی عذاب قبر سے محفوظ ہوتا ہے اور قیامت کو سلامت ہے یعنی عذاب جہنم سے محفوظ ہے ۔

ع۱۹۸۳ انتبذت۔ نبذ کے لیے دیکھو ع۱۲۶ اسی سے اِنْتَبَذَ کے معنی ہیں الگ ہوگیا۔ اس شخص کا الگ ہونا جو لوگوں کے اندر اپنے نفس کو بہت کم قابل توجہ سمجھتا ہے (غ)

حضرت عیسٰیؑ اور یحییٰؑ کے اکٹھے ذکر میں حکمت: یہی مضمون یعنی حضرت مریمؑ اور حضرت عیسٰیؑ کا ذکر زکریاؑ اور یحییٰؑ کے ذکر کے ساتھ سورۂ آل عمران میں گذر چکا ہے۔ یہاں کچھ مزید تفصیلات ہیں جو وہاں موجود نہیں۔ ان دونوں موقعوں پر حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسٰیؑ کا اکٹھا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے۔ اس کی وجہ مفسرین نے عموماً یہ دی ہے کہ حضرت یحییٰؑ کی پیدائش میں بھی ایک اعجاز تھا۔ اور اس سے بڑھکر اعجاز حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش میں تھا۔ لیکن اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ جیسا اعجاز حضرت یحییٰؑ کی پیدائش میں ہے ویسا حضرت اسحاقؑ

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۗ فَأَرْسَلْنَآ إِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾ قَالَتْ إِنِّيْٓ أَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾

پس اس نے اُن سے پردہ کر لیا سو ہم نے اپنے کلام کو اس کی طرف بھیجا تو وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں آیا ۱۹۸۴
کہا، مَیں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں، اگر تو متقی ہے ۱۹۸۵

کی پیدائش میں ہے ان کا ذکر دونوں موقعوں پر کیوں نہ کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کو حضرت یحییٰؑ کے ساتھ اکٹھا کرنے میں عیسائیت پر اتمام حجّت ہے۔ عیسائی حضرت مسیح کی بن باپ پیدائش کو اس کی خدائی کی دلیل ٹھہراتے ہیں۔ تو اس کے مقابل حضرت یحییٰ کی پیدائش کا ذکر کیا کہ وہ کم اعجاز نہیں۔ پھر عیسائی حضرت مسیحؑ کی بے گناہی کو اس کی خدائی کی دلیل ٹھہراتے ہیں تو اس کے مقابل حضرت یحییٰؑ کی بے گناہی کو کس قدر پُرزور الفاظ میں بیان فرماتا ہے پھر اگر مسیحؑ کے لیے پیشگوئی تھی تو یحییٰ کے لیے بھی پیشگوئی تھی۔ دیکھو ۴۱۴ پھر سب سے بڑھ کر اتمام حجّت دونوں کے اکٹھے ذکر میں یوں کیا ہے کہ وہ نبی جو اکیلا ایک قوم بنی اسرائیل کی اصلاح کیلئے کافی نہ تھا وہ اصلاح عالم کا بیڑا کیونکر اُٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ باوجود اپنی ساری عظمت کے حضرت عیسٰیؑ صرف ایک شاخ اخلاقِ انسانی کی پرورش کے لیے آئے تھے اسی لیے ان کے ساتھ حضرت یحییٰؑ کی ضرورت پیش آئی۔ جس طرح حضرت موسٰیؑ جب اکیلے بوجھ کو نہ اٹھا سکے تو ان کے ساتھ حضرت ہارُونؑ کو کھڑا کیا گیا۔ پس اِس سارے ذکر کو اس نگاہ سے پڑھنا چاہیے کہ یہ دراصل عیسائیت پر اتمام حجّت ہے اور سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم دونوں سورتیں عیسائیت پر اتمام حجّت کے طور پر ہیں۔

مریم کا شرقی مکان میں جانا: مکان شرقی سے مراد مفسرین بیت المقدس کے مشرق کی طرف لیتے ہیں۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ عیسائیوں کے بیت المقدس کی بجائے اپنی عبادت گاہوں کا مشرق کی طرف منہ کرنے کی وجہ یہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں مریم کے پہلے حالات جو بچپن کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں بیان نہیں ہوئے وہ سورہ آل عمران میں ہیں کہ کس طرح حضرت مریم ہیکل میں (یروشلم میں) رہتی تھیں کیونکہ ان کی ماں نے انہیں ہیکل کی خدمت کے لیے نذر مانا تھا۔ یہاں حضرت مریم کے بلوغ کو پہنچ جانے کے بعد کے حالات ہیں۔ جیسا کہ اگلی آیت میں لفظ حجاب لاکر بتا بھی دیا ہے پس مکان شرقی میں چلے جانے سے مراد یہی ہے کہ جب آپ بلوغت کو پہنچیں اور حیض کے ایام آئے تو اب مسجد میں نہ رہ سکتی تھیں اس لیے کسی شرقی مکان میں چلی گئیں اور غالباً یہ مشرقی مکان ناصرہ تھا۔ یہاں کا رہنے والا یوسف نجار تھا اور حضرت مریم کی اصل رہائش بھی وہیں کی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یوسف آپ کے چچا کا بیٹا بھی تھا اور ناصرہ بیت المقدس سے شمال مشرق کی طرف ہے مگر قرآن کریم نے عموماً شمال جنوب کا ذکر چھوڑ کر مشرق مغرب کا ہی ذکر کیا ہے۔ اِسی لیے اسے مکان شرقی کہہ دیا ہے یا ممکن ہے کہ کوئی اور مکان شرقی ہو۔ لیکن انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کی خوشخبری ملنے کے وقت حضرت مریم ناصرہ میں تھیں (لوقا ۱:۲۶) بہرحال جیسا کہ اگلی آیت سے معلوم ہوگا یہ جانا اس لیے تھا کہ آپ بوجہ حیض آجانے کے مسجد میں نہ رہ سکتی تھیں اور اس لیے یہاں لفظ انتبذت بھی اختیار کیا ہے کیونکہ تکمیل روحانی کے اعلیٰ مقام سے الگ ہو کر جو مسجد میں رہنے سے حاصل تھا اب ایک رنگ کی معمولی گھریلو زندگی اختیار کرنی پڑی جس میں گھر کے دھندے، زوجیت کے تعلقات۔ اولاد کی پرورش وغیرہ امور شامل ہیں۔

۱۹۸۴ تمثّلَ۔ مثل سے ہے ۳۰ اور تَمَثَّلَ کے معنی ہیں ایک چیز کی شبیہ یا مثال بنائی اور تَمَثَّلَ فلانٌ کے معنی ضرب مثلاً بھی آتے ہیں یعنی مثال بیان کی (ل) اور ایک چیز کی مثال ہو گیا (منتہی الارب)

حضرت مریم کے پردہ میں ہو جانے سے کیا مطلب ہے؟ مفسرین نے مختلف توجیہات کی ہیں بعض کہتے ہیں غسل حیض کے لیے پردہ کیا اور بعض کہتے ہیں ایام حیض میں مسجد سے الگ ہو جانا مراد ہے اور بعض کہتے ہیں عبادت کیلئے مگر عبادت کیلئے تو مسجد موجود تھی اور وہیں حضرت مریم صغر سنی میں رہتی بھی تھیں کلما دخل علیہا زکریا المحراب (آل عمرانؑ ۔ ۳۷) اس لیے اصل بات یہ ہے کہ جب آپ بلوغت کو پہنچیں تو اسلئے چونکہ مسجد کا رہنا آئندہ کے لیے موزوں نہ تھا کسی اور مکان میں جانا پڑا۔ بہرحال یہ تبدیلی بلوغت سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی لیے حجاب کا بھی ذکر ہے کیونکہ حجاب سن بلوغت کو پہنچنے پر ضروری ہوتا ہے۔

روح سے مراد اکثر نے یہاں جبرائیل لیا ہے اور ابو مسلم نے خود حضرت عیسیٰ کو مگر دیکھو ۱۸۷۲ روح کے معنی کلام الٰہی بھی ہیں اور دوسری جگہ اذ قالت الملئکۃ (آل عمرانؑ ۔ ۴۵) اسی کا مؤید ہے اور وحی جبرائیل انبیاء سے مخصوص بھی ہے پس مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام یا الہام اس کی طرف بھیجا اور تَمَثَّلَ لھا میں ضمیر اپنے اوپر ہوگی یعنی اس کلام الٰہی کے آنے کی تفصیل یہ ہے کہ ایک متمثل ہونے والا البشر کی صورت پر متمثل ہوا یعنی ایک کشفی نگاہ میں اسے ایک بشر نظر آیا۔

۱۹۸۵ کشف یا رویا میں بُرے کام کا ارتکاب: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کے خیالات نیک ہوں وہ رویا یا کشف کی حالت میں بھی بُرے کام کا ارتکاب

قَالَ إِنَّمَآ أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلَٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾

اس نے کہا، مَیں صرف تیرے رب کا بھیجا ہُوا ہوں تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا بخشوں ۱۹۸۶

قَالَتْ أَنَّىٰ يَكُونُ لِى غُلَٰمٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِى بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾

کہا، میرے لڑکا کس طرح ہوگا حالانکہ مجھے کسی انسان نے (نکاح کرکے) چھوا نہیں اور نہ میں بدکار ہوں ۱۹۸۷

قَالَ كَذَٰلِكِ ۖ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ ۖ وَلِنَجْعَلَهُۥٓ ءَايَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾

اس نے کہا ایسا ہی ہوگا، تیرا رب کہتا ہے یہ مجھ پر آسان ہے اور تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے نشان اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں اور یہ امر فیصلہ شدہ ہے ۱۹۸۸

فَحَمَلَتْهُ فَٱنتَبَذَتْ بِهِۦ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾

پھر (مریم نے) اسے حمل میں لیا اور اس کے ساتھ الگ ہو کر دور چلی گئی ۱۹۸۹

نہیں کرتا، یہ حضرت مریم کے خیالات کے کمال عصمت پر دلیل ہے۔ ان کنت تقیا اس لیے بڑھایا کہ متقی ہی ان کی اس بات کی پروا کرسکتا تھا ایک شریر کیا پروا کرتا۔

۱۹۸۶ء لاھب میں فاعل وہ انسان کی صورت نہیں جس کی وساطت سے کلام ہو رہا ہے بلکہ خود اللہ تعالیٰ ہے چنانچہ دوسری قرأت اس کی لیھب ہے جو اس معنی کی صحت کی مؤید ہے اور اس ترکیب کے اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب اس متمثل نے یہ کہا کہ میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تو اب اس پیغام کو بھی ظاہر کیا جو وہ لیکر آیا تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کے یہ الفاظ تھے کہ میں تجھے ایک لڑکا دوں گا۔ اور یہ اس کے مطابق ہے جو فرمایا ان اللہ یبشرك (آل عمران ۳-۴۵)

۱۹۸۷ء لغیا۔ بَغی کے لیے دیکھو ۱۱۵ء وغیرہ۔ اور بَغَتِ الامۃُ کے معنی ہیں لونڈی نے زنا کیا۔ اور اسی سے بَغِیّ ہے یعنی زنا کرنے والی لونڈی اور اسی سے بغاء ہے جو لونڈیوں کی زنا کاری پر قرآن شریف میں آیا ہے ولا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء (النور ۲۴-۳۳) اور بعض نے کہا ہے کہ بغیّ صرف لونڈی ہے بدکار ہو یا نہ ہو۔ اور بعض نے کہا بَغِیّ ہر ایک بدکار عورت ہے لونڈی ہو یا آزاد۔ اور بَغِیّ لونڈی کو کہدیا جاتا ہے گو اس میں ذم مراد نہ ہو (ل)

لم یمسسنی بشر پر دیکھو ۴۲۷ء اور لم اك بغیا نکاح کے مقابل پر بڑھایا کیونکہ مس بشر کنایہ ہے اس سے کہ نکاح ہوا ہو۔

حضرت مریم کی منگنی: البتہ انجیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کی منگنی ہو چکی تھی "چھٹے مہینے جبرائیل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نام سے ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا (لوقا ۱: ۲۶ و ۲۷) حضرت مریم کا یہ کہنا کہ مجھے ابھی بشر نے نہیں چھوا خود یہی ظاہر کرتا ہے کہ نکاح کا معاملہ طے ہو چکا تھا تو جب بیٹے کی خوشخبری ملتی ہے تو وہ متعجب ہو کر کہتی ہیں کہ ابھی تو نکاح نہیں ہوا اور بشر نے مجھے چھوا نہیں اور یہ بھی نہیں کہ نکاح کے بغیر میرا تعلق کسی مرد سے ہو گیا ہو، کیونکہ میں بدکار عورت نہیں۔ ھو علی ھین میں بظاہر یہی مراد ہے کہ اس روک کا دور ہونا کیا مشکل ہے۔

۱۹۸۸ء حضرت عیسیٰ کے آیت ہونے سے مراد: اٰیۃ للناس۔ اٰیۃ کے معنی کے لیے دیکھو ۶۰ء ہر چیز جو بطور ایک دلیل یا نشان کے ہو اٰیۃ کہلاتی ہے وجعلنا الیل والنہار اٰیتین (بنی اسرائیل ۱۷-۱۲) حالانکہ دن رات معمولی طور پر آتے جاتے ہیں۔ ہر خدا کی طرف بلانے والے کا وجود ایک آیت ہے حق کی مخالفت کرنے والوں کی ہلاکت بھی ایک آیت ہے یوسف اور اس کے بھائیوں کا معاملہ بھی ایک آیت ہے لقد کان فی یوسف واخوتہ اٰیات للسائلین (یوسف ۱۲-۷) بلکہ کئی آیات ہیں اس لیے کہ اس ذکر سے بہت سے سبق ملتے ہیں اور حدیث میں سورج گرہن کو اٰیۃ کہا ہے اور در حقیقت اللہ تعالیٰ کی سب مخلوق ہی نشان ہے وکاین من اٰیۃ فی السمٰوات والارض (یوسف ۱۲-۱۰۵) حضرت مسیح کس معنی میں آیت تھے یہاں آپ کو اٰیۃ للناس کہا ہے اگر صرف اعجازی ولادت میں نشان مراد ہو تو صرف مومنوں کے لیے نشان ہوتے نہ عام طور پر لوگوں کے لیے۔ ہو سکتا ہے کہ اٰیۃ میں یہاں ان کی رسالت کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نبی بلکہ اس کے صالح بندے بھی اس کے وجود پر ایک آیت بن جاتے ہیں۔ باخصوصیت سے مراد یہ ہو کہ ان کے بعد نبوت بنی اسرائیل سے منقطع ہو گئی مگر پہلے معنی کی رحمۃ منا سے تائید ہوتی ہے۔

۱۹۸۹ء حضرت مریم کا حاملہ ہونا الوہیت مسیح کے خلاف دلیل ہے: اس آیت میں مریم صدیقہ کے عیسیٰ کو حمل میں لینے کا ذکر کیا۔ اس ذکر کی ضرورت سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تا یہ بھی عیسائیت کے عقیدۂ الوہیت مسیح کے خلاف دلیل ہو اور ایسی ہی دلیل کے طور پر خود نبی کریم صلعم نے وفد نجران کے سامنے اسے استعمال کیا۔ کیونکہ وہ چیز جسے عورت حمل میں لیتی ہے وہ خدا نہیں ہو سکتا اور شاید اس لیے بھی حمل کا ذکر ہو کہ تا معلوم ہو کہ جس طرح پر عورتوں کو حمل ہوتا ہے اسی طرح حضرت مریم کو بھی ہوا اور نبی کریم صلعم نے وفد نجران کے مقابل پر ایسا ہی فرمایا الستم تعلمون ان عیسیٰ حملتہ امہ کما تحمل المراۃ کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰ کو اس کی ماں نے حمل میں لیا جس طرح عورتیں حمل میں لیا کرتی ہیں۔ کما تحمل المراۃ کے لفظ فیصلہ کن ہیں کہ یہ حمل اسی طریق پر ہوا جس

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ

پھر درد زہ اُسے کھجور کے تنے کی طرف لے آیا، کہنے لگی اے کاش! میں اس سے پہلے مرجاتی اور بھولی بسری ہوتی ع۱۹۹۰ تو اس کے نیچے سے اُسے ایک ندا آئی کہ غم نہ کر تیرے رب نے

طرح عورتوں کو ہوا کرتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اسے مریم کے کشف اور فرشتہ کے کلام سے بالکل الگ کر کے بیان کیا ہے اور یہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ خود مفسرین نے ایسے اقوال نقل کیے ہیں جیسے وہب کا قول ان مریم لما حملت کان معھا ابن عم لھا یسمی یوسف النجار (یعنی جب مریم کو حمل ہوا تو ان کے ساتھ ان کے چچا کا بیٹا یوسف نجار تھا) (د) اور یہ یوسف نجار وہی ہیں جو بروئے اناجیل و تاریخ حضرت مریم کے شوہر تھے اور جن کے ساتھ مریم کا تعلق زوجیت یعنی میاں بی بی کا تعلق ہونا خود عیسائیوں کو مسلّم ہے جو حضرت عیسیٰ کو خدا بناتے ہیں۔ مگر مسلمان بعض یہاں تک کہ گئے ہیں کہ کہتے ہیں حضرت مریم کو حیض بھی نہیں آتا تھا۔ اور کبھی کہہ دیتے ہیں کہ مریم کا حمل صرف ایک گھڑی کے لیے تھا یعنی فوراً حمل ہوا فوراً آپ وہاں سے چل پڑیں اور فوراً حضرت عیسیٰ پیدا ہو گئے (اور اس کے آگے ایک مرحلہ اور ترقی کر کے یہ بھی کہ وہ فوراً نبی بھی بن گئے) حالانکہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ حضرت مریم کو نو ماہ حمل رہا جس طرح تمام عورتوں کو حمل رہتا ہے (د)

مکانا قصیا سے مراد اور حضرت مریم کا سفر بیت لحم: فانتبذت به مکانا قصیا سے یہ مراد نہیں کہ حمل ہوتے ہی وہ کسی دور کے مکان میں چلی گئی بلکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ حالت حمل میں اسے کہیں دور جانا پڑا۔ اور بہ کا لفظ ساتھ بڑھانے کا منشا سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ وقت ایسا تھا کہ حمل کا اچھا بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ وضع حمل کا وقت قریب تھا اور یہ سفر مردم شماری کی غرض کے لیے یوسف نے مریم کے ساتھ اختیار کیا تھا "یہ پہلی اسم نویسی سوریہ کے حاکم کورنیس کے عہد میں ہوئی اور سب لوگ نام لکھوانے کے لیے اپنے اپنے شہر کو گئے۔ پس یوسف بھی گلیل کے شہر ناصرہ سے داؤد کے شہر بیت لحم کو گیا جو یہودیہ میں ہے اس لیے کہ وہ داؤد کے گھرانے اور اولاد سے تھا کہ اپنی مریم منگیتر کے ساتھ جو حاملہ تھی نام لکھوائے جب وہ وہاں تھے تو ایسا ہوا کہ اس کے جننے کا وقت آ پہنچا" (لوقا ۲: ۲-۶)

ع۱۹۹۰ اجاء جاء (یجیئ) کے معنی وہی ہیں جو اَتی کے یعنی آیا۔ لیکن اِتیان سہولت سے آنا اور اتیان یا اَتی قصد کے اعتبار سے کہا جاتا ہے گو وہ مقصد حاصل نہ ہوا ہو اور مجیئ یا جاء حصول کے اعتبار سے اور اعیان اور معانی دونوں میں مستعمل ہوتا ہے جاء من اقصا المدینة رجل (یٰس ۳۶-۲۰) فاذا جاء الخوف (الاحزاب ۳۳-۱۹) فاذا جاء اجلھم (الاعراف ۷-۳۴) اور فقد جاء و ظلما و زورا (الفرقان ۲۵-۴) میں مراد ہے کہ ظلم اور جھوٹ کا قصد کیا اور اسے کر گزرے اور جاء ربک والملک صفا صفا (الفجر ۸۹-۲۲) میں بالذات آنا مراد نہیں بلکہ اپنے امر کے ساتھ آنا مراد ہے اور یہ ابن عباس کا قول ہے اور اَجاء جاء سے متعدی کیا گیا ہے اور اس کے معنی اَلجأ ہیں یعنی اسے ایک بات کے لیے مضطر کر دیا اور جاء بکذا کے معنی ہیں اسے حاضر کیا لولا جاءو علیه باربعة شھداء (النور ۲۴-۱۳) (غ)

مخاض۔ اس کا اصل مَخض ہے اور مخاض دردِ زہ کو کہتے ہیں یعنی حاملہ کو جننے کے وقت جو درد ہوتا ہے (ل)

جذع۔ جِذع کھجور کے تنہ کو بھی کہتے ہیں اور شاخ کو بھی (ل) جمع جُذوع ہے فی جذوع النخل (طٰہٰ ۲۰-۷۱)

حضرت مریم کا دردِ زہ دلیل ابطال الوہیت مسیح ہے: حضرت مریم کے حمل کے ذکر کے بعد اب دردِ زہ کا ذکر کیا ہے اور جس طرح ذکر حمل عیسائیت پر اتمام حجت کے لیے ہے اسی طرح درد زہ کا ذکر بھی ہے کیونکہ عیسائی کہتے ہیں کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے عورت کو یہ سزا ملی تھی کہ "درد سے تو لڑکے جنے گی" (پیدائش ۳: ۱۶) اور جسے عیسائی اپنا خدا سمجھتے ہیں جس نے آدم کے گناہ کا ازالہ کرنا تھا جب وہ جنا جاتا ہے تو اس کی ماں بھی درد زہ سے جنتی ہے اور یہاں تک شدت دردِ زہ کی ہوتی ہے کہ وہ چلا اٹھتی ہے یٰلیتنی مت قبل ھذا۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت مریم کی طرف اس بات کو منسوب کرنا کہ انہوں نے درد زہ کی شدت سے ایسا کہا ہو ان کی شان کے لائق نہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ بڑی سے بڑی عورت کی شان بھی اسے اس تکلیف سے نہیں بچا سکتی اور اگر کسی رسوائی کے خیال سے حضرت مریم یہ بات کہہ سکتی ہیں تو درد زہ کی شدت سے کیوں نہیں کہہ سکتیں۔ پھر یہ پلوٹھی کا بچہ تھا اور پہلے وضع حمل میں عورت کو ہمیشہ بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں مشکلات تھیں کہ گھر میں نہ تھیں، حالت سفر میں تھیں، بے سروسامانی حد درجہ کی، یہاں تک کہ باہر کھلے میدان میں یہ واقعہ پیش آیا جس پر قرآن کریم و انجیل دونوں شاہد ہیں، دائی تک پاس نہیں ایسی حالت میں شدت درد زہ سے ان الفاظ کا ان کے منہ پر آ جانا بالکل قرین قیاس ہے۔

کھجور کے تنے سے سہارے کے لیے مضطر ہو جانا بھی انجیل کے بیان سے ملتا جلتا ہے "اور وہ پہلوٹا بیٹا جنی اور اس کو کپڑے میں لپیٹ کر چرنی میں رکھا کیونکہ ان کے واسطے سرائے میں جگہ نہ تھی" (لوقا ۲: ۷) اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ سرائے کے باہر کسی کھجور کے درخت سے سہارا لیا ہے اور اس کا ذکر قرآن شریف نے اس لیے کیا کہ جسے عیسائی خدا خدا کر کے پکارتے ہیں وہ کیسی بیکسی کی حالت میں پیدا ہوا اور جسے خدا کی ماں کہہ دیا جاتا ہے اس نے کس مصیبت کی حالت میں اسے جنا۔

جَعَلَ رَبُّكِ تَحۡتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾
تیرے نیچے ایک چشمہ (بہا) رکھا ہے ۱۹۹۱

وَهُزِّيٓ إِلَيۡكِ بِجِذۡعِ ٱلنَّخۡلَةِ تُسَٰقِطۡ عَلَيۡكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾
اور کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا، تجھ پر تازہ پکی کھجوریں جھڑ پڑیں گی ۱۹۹۲

فَكُلِي وَٱشۡرَبِي وَقَرِّي عَيۡنًاۖ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ ٱلۡبَشَرِ أَحَدًا فَقُولِيٓ إِنِّي نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمَٰنِ صَوۡمًا فَلَنۡ أُكَلِّمَ ٱلۡيَوۡمَ إِنسِيًّا ﴿۲۶﴾
سو کھا اور پی اور آنکھیں ٹھنڈی کر پھر اگر تو کسی انسان کو دیکھے تو کہنا، مَیں نے رحمٰن کے لیے (اپنے اوپر) روزہ واجب کیا ہے، اس لیے آج میں کسی انسان سے کلام نہیں کرونگی ۱۹۹۳

فَأَتَتۡ بِهِۦ قَوۡمَهَا تَحۡمِلُهُۥۖ قَالُواْ يَٰمَرۡيَمُ لَقَدۡ جِئۡتِ شَيۡـٔٗا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾
پھر اسے سوار کیے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی، انھوں نے کہا اے مریم تو ایک عجیب چیز لائی ہے ۱۹۹۴

۱۹۹۱ سری۔ سَرِیّ رات کو چلا اور یہ سَرَاۃ سے ہے جو فراخ زمین کو کہتے ہیں اور سَرِیّ نہر ہے جو چلتی ہے (غ)
نادٰیھا کا فاعل نہیں بتایا ظاہر ہے کہ خدا کا فرشتہ ہے اور یہ الہامی آواز ہے۔ مگر بعض مفسرین کو حضرت عیسیٰ کے جلد بلانے کا شوق یہاں تک ہے کہ کہتے ہیں کہ یہ آواز حضرت عیسیٰ نے پیدا ہوتے ہی دی تھی حضرت عیسیٰ کے متعلق عجوبہ پرستی کسی زمانہ میں لوگوں کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی تھی۔
۱۹۹۲ ھزی۔ ھَزّ زور سے ہلانا ہے اسی سے اِھۡتَزَّ ہے فلما راٰھا تھتزّ (النّحل ۲۷-۱۰) اور سبزی کا اپنی تروتازگی سے حرکت کرنا بھی اھتزاز ہے فاذا انزلنا علیھا الماء اھتزت (الحج ۲۲-۵)
رطب۔ رَطۡب تازہ یابس (یعنی خشک) کے خلاف اور رُطَب تازہ کھجور سے مخصوص ہے (غ)
جنی۔ جَنَیٰ پھل کے چُننے پر بولا جاتا ہے اور جَنِیّ وہ ہے جو چنا گیا مگر اس کا استعمال تازہ پھل پر ہے اور جَنیٰ پھل ہے وجنا الجنّتین دان۔ (الرحمٰن ۵۵-۵۴) اور استعارۃً جِنَایۃ کا استعمال گناہ پر ہوتا ہے (غ)
کھانے اور پینے دونوں کا سامان موجود تھا۔ کھجور موجود تھی اس کے ہلانے سے تازہ کھجوریں مل جائیں گی اور پانی کا چشمہ نیچے بہ رہا تھا اس کا پتہ بتا دیا اگر ایک طرف بیکسی کا اظہار کیا تو دوسری طرف یہ بھی بتا دیا کس طرح جنگل میں بھی اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں مہیا فرما دیتا ہے۔
۱۹۹۳ قری عینا دیکھو ۹۶ قَرَّتۡ عَیۡنُہٗ کے معنی ہیں سُرَّت یعنی آنکھ کو راحت پہنچی اور یا یہ قُرّ بمعنی سردی سے ہے یعنی آنکھ ٹھنڈی ہوئی اور یا یہ قرار سے ہے یعنی آنکھ کو اس سے سکون ملا پس وہ دوسری چیز کی طرف نہ اُٹھی۔ قرۃ عین (القصص ۲۸-۹) قرۃ اعین (الفرقان ۲۵-۷۴) کی تقرّ عینھا (طٰہٰ ۲۰-۴۰) (غ)

مریم کے کسی سے کلام نہ کرنے کی غرض: کھانے پینے کا سامان سفر میں بہم پہنچایا آنکھوں کی راحت کے لیے بیٹا عطا فرمایا اس لیے ساتھ ہی اپنی نعمت کی شکرگزاری کے لیے لوگوں سے بات چیت بند کرکے اللہ کے ذکر کی طرف توجہ دلائی۔ جس طرح زکریا کو فرمایا تھا الا تکلم الناس ثلٰثۃ ایام الا رمزا واذکر ربک کثیرا وسبح بالعشی والابکار (آل عمران ۳-۴۰) یعنی تین یوم کی خاموشی سے فائدہ یہ اٹھاؤ کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور تسبیح بہت کرو جو ایک نعمت پر شکرگزاری کے طور پر ہے۔ حالانکہ دوسرے موقع پر جب اس سورت میں تین دن کی خاموشی کا ذکر کیا تو وہاں کوئی ایسے لفظ نہیں مگر مراد وہی ہے اسی طرح حضرت مریم کے ذکر میں خاموشی کی ہدایت فرما کر اس ذکر کی ضرورت نہ تھی کہ اس اثنا میں ذکر خدا کرو۔ مگر مطلب یہی ہے اور یہ کہنا کہ اس سے مطلب یہ تھا کہ لوگ تم پر الزام لگائیں گے تو تم جواب نہ دے سکو گی اس لیے خاموش رہو۔ درست نہیں اس لیے کہ یہ تو حالت سفر تھی سرائے کے باہر پڑے تھے اندر بھی جگہ نہ ملی تھی۔ وہاں کون جانتا تھا کہ یہ مریم کون ہے اور اس نے بچہ بِن باپ کے جنا ہے۔ قرآن کریم کے پُرحکمت الفاظ پر بھی غور نہیں کیا۔ من البشر احدا صاف بتاتا ہے کہ کسی انسان سے بھی کلام نہیں کرنا یہاں تک کہ یوسف سے بھی نہیں کیونکہ وہ بھی بشر میں داخل ہے۔

خاموشی کا روزہ شریعت اسلام نے منسوخ کر دیا: یہ خاموشی کا روزہ صرف ذکر الٰہی کے لیے تھا۔ اور یہودی ایسا کرتے تھے کہ ذکر الٰہی کے لیے خاموشی کا روزہ رکھتے تھے اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی اور نبی کریم صلعم نے اسے منع کر دیا (د) اور حضرت ابوبکر ایک عورت پر داخل ہوئے جس نے نذر مانی تھی کہ کلام نہ کرے گی تو آپ نے فرمایا کہ اسلام نے اسے منسوخ کر دیا ہے (د) ہاں اس قصہ سے اس قدر سبق ہر مسلمان کو اب بھی ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر کس طرح شکرگزاری کرے۔
۱۹۹۴ تحملہ سے مراد گود میں اُٹھانا ہی نہیں بلکہ سواری دینا بھی ہے دیکھو ۱۳۳۵ یا سوار کرنا۔

يَا أُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۚ ۲۸
فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۖ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ

اے ہارون کی بہن! تیرا باپ بُرا آدمی نہیں تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی ۱۹۹۵
تو اس نے اُس کی طرف اشارہ کیا، انھوں نے کہا ہم کس طرح

فریّا - فریٰ کے معنی ہیں قطع کیا ۳۹۵ع اور فریّ کے معنی عظیم۔ عجیب اور بناوٹی ہیں (رغ)

حضرت عیسٰی کے زمانہ نبوت کے حالات: مفسرین کا خیال تو یہ ہے کہ حضرت مریم حاملہ ہوجانے پر اپنے رشتہ داروں سے بھاگ گئی تھیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ بچہ جنتے ہی پھر اسے گود میں لیے قوم کے پاس پہنچیں یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے خلاف ہیں اگر وہ اس خوف سے بھاگیں کہ لوگ مجھ پر الزام لگائیں گے تو پھر بچّہ کو اُٹھائے ہوئے آنے کے کیا معنی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ پھر انہیں یقین ہوگیا کہ یہ بچّہ خود الزام کا جواب دے لیگا یہ تو اس تفسیر کے مطابق پہلے سے علم تھا و یکلم الناس فی المھد اس لیے یہ قصہ بنانا پڑا کہ شیطان نے یہودیوں کو خبر دیدی تھی کہ مریم کے ہاں لڑکا ہوا ہے اس لیے انہوں نے اسے بلا بھیجا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ واقعہ بالکل الگ ہے اور حضرت عیسٰی کی ولادت کے ساتھ اس ذکر کو چھوڑ دیا ہے یہاں تک کہ حضرت عیسٰی کی نبوت کا زمانہ آجاتا ہے اور یہ بالکل اس کے مطابق ہے جو پچھلے رکوع میں حضرت یحییٰ کے ذکر میں طرز اختیار فرمائی تھی۔ یعنی بشارت دیکر اور اس پر تسبیح کا ارشاد کرکے فوراً فرمایا یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ۔ حالانکہ یحییٰ کے پیدا ہونے کا بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ یہاں ولادت کے ذکر کے بعد حضرت مریم کو ذکر و تسبیح کا ارشاد کرکے اسی طرح حضرت عیسٰی کے زمانہ نبوت کا ذکر کیا ہے اور پچھلی آیت کا تعلق اس مضمون سے کوئی نہیں۔ اور اس پر قطعی دلیل یہ ہے کہ اس موقع پر جو کچھ حضرت مریم کو کہا گیا اور اس کا جو جواب حضرت عیسٰی نے دیا وہ یقیناً اور قطعاً زمانہ نبوت سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ حضرت عیسٰی کہتے ہیں جعلنی نبیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے نبی بنایا ہے اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ اٰتانی الکتاب مجھے کتاب دی ہے۔ اور یہ کہنا کہ یہ باتیں لامحالہ واقع ہونے والے ہونگی وجہ سے ماضی کے صیغہ میں بیان کی گئی ہیں اور مراد استقبال ہے تو اوصٰنی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ ما دمت حیا کے کس طرح معنی کیے جائیں گے اور وہ مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیگا جب تک میں زندہ رہوں گو یا جب کلام کر رہے ہیں اس وقت ما دمت حیا میں داخل نہ تھے اور لم یجعلنی کے معنی کس طرح کریں گے یہ سب ماضی کے صیغے ہیں یا تو ان سب کے معنی مستقبل کے ہونگے اور وہ ہو نہیں سکتے۔ کیونکہ پھر لازم آتا ہے کہ کلام کرنے کے وقت حضرت عیسٰی زندہ نہ ہوں اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ بعض مستقبل کے صیغے مانیں جائیں اور بعض ماضی کے کیونکہ اس صورت میں ایک دن یا چالیس دن کے بچّے کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم ملنا بے معنی ہے پھر کیا حضرت عیسٰی ایک ماہ کی عمر میں ماشاء اللہ نمازی اور تہجد خواں بھی تھے اور کسی مال کے مالک بھی تھے؟ اور یا ماننا پڑے گا کہ اس کلام کے کرنے کے وقت حضرت مسیح نبی بن چکے تھے۔ انجیل ان پر نازل ہو رہی تھی، نماز اور زکوٰۃ کا حکم مل چکا تھا اور ان پر یہ الزام تھے کہ یہ خدائی کا دعویٰ کرتا ہے جس کا جواب انی عبد اللہ میں ہے اور یہ کہ ماں سے بھی اچھا سلوک نہیں کرتا (اور یہ واقعہ اناجیل میں بھی موجود ہے) جس کا جواب براً بوالدتی میں ہے اور یہ کہ یہ ایک سرکش آدمی ہے جو علماء اور گدی نشینوں کو بُرا کہتا ہے جس کا جواب لم یجعلنی جبارا شقیا میں ہے اور اس کے سوائے چارہ نہیں۔ پس فاتت بہٖ قومھا تحملہ لازماً حضرت عیسٰی کے زمانہ نبوت سے تعلق رکھتا ہے اور حضرت عیسٰی اس وقت حضرت مریم کی گود میں نہ تھے بلکہ سوار ہوکر یروشلم میں داخل ہوئے تھے۔ اور سوار ہوکر داخل ہونا کسی خاص غرض سے تھا۔ جیسا کہ انجیل میں ہے دیکھو متی ۲۱ باب جس میں حضرت مسیح کے یروشلم پہنچنے کا اور گدھی یا گدھی کے بچے یا دونوں پر سوار ہونے کا ذکر ہے "اور گدھی اور بچے کو لاکر اپنے کپڑے ان پر ڈالے اور وہ ان پر بیٹھ گیا" (متی ۲۱: ۷) اور یہ اس لیے ہوا کہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو" (متی ۲۱: ۴) اور حضرت مریم کا ساتھ ہونا اس لیے بیان کیا کہ اناجیل کے بعض بیانات سے پایا جاتا ہے کہ حضرت عیسٰی کی والدہ اور ان کے بھائی گویا ان پر ایمان نہ لاتے تھے تو والدہ کے ساتھ ہونے کو اس کی تردید کے لیے بیان کیا ہے کیونکہ اگر فی الواقع یہ سچ ہو کہ حضرت مریم بھی حضرت عیسٰی کو جھوٹا مانتی تھیں تو پھر آپ کی نبوت پر اور خود حضرت مریم کے صدیقہ ہونے پر سخت شبہات وارد ہوتے ہیں اور اناجیل کے ہی کئی موقعوں سے ظاہر ہے کہ حضرت مریم حضرت عیسٰی کے ساتھ رہتی تھیں۔

شیئا فریا سے مراد: اور فقیہوں وغیرہ کا یہ کہنا کہ اے مریم تو ایک بناوٹ بنالائی ہے یا تو ایک عجیب چیز لائی ہے اسی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ ایک طرف ان کے نزدیک خدائی کا دعویٰ ہے دوسری طرف حضرت مسیح نے اپنے وعظوں میں اپنی قوم کے علماء کے ساتھ سختی بھی کی تھی اور ایسے ایسے الفاظ میں انھیں خطاب کیا تھا "اے سانپ کے بچّو! تم بُرے ہوکر کیونکر اچھی باتیں کہہ سکتے ہو" (متی ۱۲: ۳۴) "اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو، جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بیدینی سے بھرے ہوئے ہو" (متی ۲۳: ۲۷ و ۲۸) "اے سانپو اے افعی کے بچو" (متی ۲۳: ۳۳) حضرت مسیح کی عمر اس وقت تیس تینتیس سال کی بتائی جاتی ہے اس لیے انہوں نے ان کو نوعمری کی وجہ سے قابل خطاب بھی نہیں سمجھا جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے اور ماں سے خطاب کیا۔

۱۹۹۵ع اخت ھارون۔ حضرت مریم کو ان الفاظ میں خطاب کیا ہے دیکھو ۴۰۷ع تعجب ہے کہ عیسائی اعتراض کرتے ہیں جن کی اپنی انجیل میں موجود ہے۔ اے یوسف ابن داؤد۔ اور جہاں بار بار مسیح کو ابن داؤد کہا گیا ہے اور اس خطاب میں ایک گونہ حضرت مریم کی بزرگی کا اعتراف بھی ہے۔ کیونکہ حضرت ہارون کی طرف آپ کو نسبت دی گئی۔

مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝٢٩
قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۗ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝٣٠
وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝٣١
وَّبَرًّا ۢ بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝٣٢

اس سے کلام کریں جو ابھی کل جھولے میں لڑکا تھا[۱۹۹۶]
(عیسیٰؑ نے) کہا میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا۔
اور مجھے برکت والا بنایا جہاں کہیں میں رہوں اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک میں زندہ رہوں۔
اور اپنی ماں سے نیکی کرنے والا (رہوں) اور اس نے مجھے سرکش بدبخت نہیں بنایا[۱۹۹۷]

یہودیوں کا اعتراض حضرت عیسیٰ پر تھا یا مریم پر: اور ان کا یہ کہنا کہ تیرا باپ بُرا نہ تھا اور تیری ماں بدکار نہ تھی یا لونڈی نہ تھی (دیکھو ع۱۹۸۷) میں بھی اشارہ حضرت مسیح کی طرف ہی ہے کہ یہ ہمیں گالیاں دیتا ہے اور تمہارا خاندان تو اچھا خاندان تھا یہ ایسا کہاں سے پیدا ہو گیا اور اگر یہ کہا جائے کہ یہودیوں نے مریم پر زنا کا بہتان تو باندھا ہے تو کیوں وہی مراد نہ سمجھا جائے تو وہ باندھنے والے پچھلے لوگ ہیں وقولھم علی مریم بھتانا عظیما وقولھم انا قتلنا المسیح (النساء۴ - ۱۵۶ و ۱۵۷) پیچھے جب مخالفت حد کو پہنچ گئی تو اس مخالفت کے جوش میں سب کچھ کہہ دیا۔ اور اگر مریم پر جھوٹا الزام بھی دیا ہو تو کیا شادی شدہ عورتوں پر بہتان نہیں باندھے جاتے مگر سیاق سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں ذکر زمانہ نبوت حضرت عیسیٰ کا ان کے مزعومہ خدائی کے دعویٰ کا اور ان کی مزعومہ سختی کا ہے جو وہ بزرگان قوم پر کرتے تھے بلکہ خود ماں سے بھی کرتے تھے۔

ع۱۹۹۶ اشارت۔ اَشَارَ لِیْشِیْرُ کا مادہ شور ہے (ع۳۰۲) اور اسی سے شوریٰ ہے حضرت مریم نے بجائے خود جواب دینے کے حضرت مسیح کی طرف اشارہ کیا یہ خاموشی کے روزہ کی وجہ سے نہ تھا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا اور یہ خود اس سے بھی ظاہر ہے کہ خاموشی کے روزہ پر یہ حکم تھا فقولی انی نذرت للرحمٰن صوما فلن اکلم الیوم انسیا۔ یعنی اگر کوئی پوچھے تو اسے بتا دو کہ میں نے خاموشی کا روزہ رکھا ہوا ہے مگر یہاں انہوں نے بتایا کچھ نہیں اور بات بھی یہی معقول تھی، اعتراض تو حضرت مسیح پر تھا آپ اس کا کیا جواب دیتیں آپ نے ان کی طرف اشارہ کر دیا کہ خود انہی سے دریافت کرو مجھے کیا کہتے ہو، تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ہم کل کے بچہ سے کیا بات کریں۔ حضرت عیسیٰ تیس سال کے نوجوان تھے پُرانے بزرگوں کے سامنے وہ بچہ ہی تھے اس لیے انہوں نے کہا کہ جو ہمارے سامنے کا بچہ ہے ہم اس سے کیا خطاب کریں۔ اس کے سوائے من کان فی المھد صبیا کے کچھ معنی نہیں بنتے مفسرین نے خود اس مشکل کو محسوس کیا ہے واستشکلت الاٰیۃ بانّ کل مَنْ یکلّمہ الناسُ کان فی المھد صبیا قبل زمان تکلیمہٖ (ر) یعنی اس آیت میں اشکال واقع ہوا ہے اس لیے کہ ہر شخص جس سے لوگ بات کرتے ہیں وہ گفتگو کے زمانہ سے پہلے جھولے میں بچہ رہ چکا ہے اور یہ کس قدر ظاہر بات ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ اس کلام کے وقت بھی بچہ ہوتے تو انہیں کہنا چاہیئے تھا کیف نکلم من ھو فی المھد صبی۔ کان کا استعمال خود بتاتا ہے کہ کلام کرنے والا اس حالت سے نکل چکا ہے رہا یہ کہ زمانہ قریب میں نکل چکا ہے یا بعید میں اس سے بحث نہیں۔ لیکن قرآن کریم کے الفاظ کی صراحت بتاتی ہے کہ اس کلام کے وقت حضرت عیسیٰ مہد میں نہ تھے اور بچپن کی حالت سے نکل چکے تھے رہا یکلم الناس فی المھد سو دیکھو ع۴۲۶ اور ایک یا دو دن کا بچہ تو اس وقت بھی فی المھد نہیں کہلا سکتا۔ مہد کا وقت بھی کچھ بعد ہی آتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر فی الواقع ایسا ہی ہوا کہ حضرت عیسیٰ نے ایک یا دو دن کی عمر میں لوگوں کو یہ بتا دیا ہو کہ میں خدا کا نبی ہوں۔ تو جوانی کو پہنچنے پر کون یہودی کتنا بھی سخت دل ہوتا اس کا انکار کرتا۔ وہ جانتے تھے کہ مریم نے کل بچہ جنا ہے وہ جانتے تھے کہ ایک دن کا بچہ سوائے رونے کے کچھ نہیں جانتا پھر جب وہ اس قدر باتیں اس سے سُن چکے ہوتے اور اس نے اپنی نبوت کی خبر پیدا ہوتے ہی دیدی ہوتی تو کس یہودی کا سر پھرا تھا کہ وہ کہتا یہ افترا کرتا ہے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر انکار حضرت عیسیٰ کا ہوا انبیائے بنی اسرائیل میں سے اور کسی کا انکار اس قدر نہیں ہوا۔ پس یہ تمام باتیں ایک ہی امر کو قطعی اور یقینی ٹھہراتی ہیں کہ یہ زمانہ نبوت کا کلام ہے نہ پیدائش کے فوراً بعد کا۔

ع۱۹۹۷ حضرت عیسیٰ پر اعتراضات اور انکا جواب اور عیسائیوں پر اتمام حجت: اس جواب میں جو آیت ۳۰ و ۳۱ و ۳۲ میں حضرت عیسیٰ نے دیا ہے ذیل کی باتیں کہی ہیں۔ میں[۱] اللہ کا بندہ ہوں۔ مجھے[۲] کتاب ملی ہے۔ میں[۳] نبی بنایا گیا ہوں۔ میں[۴] بابرکت ہوں یہاں رہوں یا دوسری جگہ جاؤں۔ مجھے[۵] جب تک زندہ ہوں نماز اور زکوٰۃ کا تاکیدی حکم ملا ہے۔ میں[۶] اپنی ماں سے حسن سلوک کرتا ہوں ان کی گستاخی نہیں کرتا۔ میں[۷] جبار شقی نہیں کہ بزرگوں اور نیکوں کو بُرا کہوں۔ اب جیسا کہ میں نے کہا یہ زمانہ نبوت کا کلام ہے۔ اس صورت میں ہر ایک جواب اعلیٰ درجہ کی حکمت پر مبنی ہے۔ اپنی عبودیت کا اعتراف اس لیے کیا کہ لوگ آپ کی طرف خدائی کا دعویٰ منسوب کرتے تھے۔ اس کی قطعی تردید کی۔ اناجیل سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح پر جو سب سے بڑا الزام یہودیوں نے لگایا تھا وہ یہی تھا کہ یہ خدا بنتا ہے اس لیے سب سے پہلے اسی کا جواب دیا۔ جب خدا نہیں تو پھر کیا ہے۔ اسے کتاب ملی ہے کتاب ملنے سے

وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوۡمَ وُلِدۡتُّ وَ یَوۡمَ اور مجھ پر سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں

تورات کا جاننا مراد نہیں تھا بلکہ بحیثیت نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب کا ملنا اس لیے ساتھ ہی اپنے نبی ہونے کا ذکر کیا گویا بتایا کہ جس طرح پہلے تم میں نبی ہوتے رہے ہیں میں بھی نبی ہوں اور آیت ۳۰ کی یہ تینوں باتیں گویا ایک خدائی کے دعوے کے اعتراض کا جواب ہیں اور پھر آیت ۳۱ میں اپنی نبوت پر دلیل دی کہ میں بابرکت ہوں یعنی میرا پیغام مقبول ہے یہاں بھی مقبول ہو رہا ہے کیونکہ باوجود علماء کی مخالفت کے لوگ ان کے ساتھ ملتے بھی تھے بلکہ ان کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو گئے تھے اور اینما کنت میں پیشگوئی ہے کہ میں کسی دوسری جگہ جاؤں گا اور وہاں بھی میرا پیغام مقبول ہوگا دوسری دلیل یہ ہے کہ میں نیکی پر عمل پیرا ہوں اور اسی کا حکم دیتا ہوں اس لیے نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کیا کہ یہی دو باتیں تمام نیکیوں کا اصل الاصول ہیں اور نیکی پر عامل ہونا اور اس کی تعلیم دینا یہی انبیاء کا کام ہوتا ہے۔ یہ دلیل انجیل میں بھی دی ہے کہ تم میری تعلیم کو شیطان کی طرف منسوب کرتے ہو شیطان نیکی کی تعلیم کس طرح دے سکتا ہے۔ اس کے بعد آیت ۳۲ میں ان اعتراضات کا جواب دیا جو سخت کلامی کے متعلق تھے اوّل ماں کے متعلق کہ میں ہرگز ان کی گستاخی نہیں کرتا، بلکہ ان سے نیکی کرتا ہوں، دوسرا اوروں کے متعلق کہ میں جبار شقی نہیں کہ خواہ مخواہ دوسروں کو بُرا کہوں اور ان پر زبا دتی کروں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ان تمام باتوں میں اگر یہودیوں کے اعتراضات کا جواب ہے تو ساتھ ہی عیسائیت پر بھی اتمام حجت ہے۔

حضرت مسیح کے ماں سے نیکی کا ذکر بالخصوص کیوں کیا: برا بوالدتی۔ بالخصوص قابل توجہ ہے اس لیے کہ کہا جاتا ہے کہ اس سے یہ دلیل پیدا ہوتی ہے کہ آپ کا باپ کوئی نہ تھا۔ یہ دلیل صحیح نہیں کیا ممکن نہیں کہ باپ مر چکا ہو۔ اور اصل بات یہ ہے کہ حضرت عیسٰی پر اعتراض تو یہ تھا کہ یہ اپنی والدہ سے سختی کرتے ہیں اور اناجیل میں بھی لکھا ہے کہ آپ کو "اے عورت" کہہ کر خطاب کیا کرتے۔ اور ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ آپ کی والدہ نے اندر آنے کی اجازت چاہی تھی تو آپ نے اجازت نہ دی تھی" کسی نے اس سے کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے باتیں کرنی چاہتے ہیں اس نے خبر دینے والے کے جواب میں کہا کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی؟ اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وہی میرا بھائی اور بہن اور ماں ہے" (متی ۱۲: ۴۷-۵۰) اب اس واقعہ کی اصلیت کچھ ہی ہو اور اس میں شک نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت مسیح کے بھائی آپ پر صرف ایمان نہ لاتے تھے بلکہ شاید مجنون سمجھتے تھے۔ لیکن ماں جو ایک راستباز عورت تھی وہ ایک نبی کی منکر نہ ہو سکتی تھی اور غالباً اصل واقعہ میں یا کچھ ملاوٹ ہو گئی ہے اور یا ممکن ہے کہ ماں بھائیوں کو سفارش کے طور پر لائی ہو اس لیے اس کا نام بھی ساتھ آگیا۔ بہر حال جن باتوں کا اس سے استدلال ہوتا ہے کہ ماں سے حضرت مسیح سختی کرتے تھے اور کہ حضرت مریم آپ پر ایمان نہ لائی تھیں ان دونوں کی تردید قرآن کریم نے کی ہے۔ سختی کا جواب تو یہ دیا کہ برا بوالدتی۔ ماں سے میں نیکی کا سلوک کرتا ہوں ان کی گستاخی نہیں کر سکتا اور ماں کے ایمان کے متعلق دوسری جگہ فرمایا اُمہ صدیقۃ (المائدۃ ۵-۷۵) اور یہی وجہ ہے کہ ان دو باتوں کے ذکر کی ضرورت ہوئی یعنی حضرت عیسٰی کے والدہ سے نیکی کرنے کی اور ان کی والدہ کے راستباز اور مومن عورت ہونے کی۔ یہ ہے وہ پر حکمت طریق جس سے قرآن کریم نے حضرت مسیح اور ان کی والدہ سے ہر قسم کے الزامات کو دور کیا ہے۔

انی عبد اللہ والا کلام زمانہ طفولیت کا نہیں ہو سکتا: یوں زمانہ نبوت کا کلام قرار دیکر یہ کلام کیسا پر حکمت ٹھہرتا ہے کہ جس کے ایک ایک لفظ میں نہ صرف تمام اعتراضات کا جو آپ پر کیے جاتے تھے اور جن کو عیسائیوں نے بھی مسیح کو خدا ماننے کے لیے قبول کر لیا ہے جواب آگیا ہے بلکہ ساتھ ہی اپنے دعوٰی کو بھی صاف کر دیا ہے لیکن اگر اسے بچپن کا کلام سمجھا جائے تو اس سے کیا غرض پوری ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت مریم پر جو اعتراض تھا کہ بن باپ بچہ کیونکر ہو گیا یہ اس کا جواب ہے۔ میں کہتا ہوں اگر اس کا جواب ہوتا تو حضرت عیسٰی کو صاف کہنا چاہیئے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ایسا کر دیا اور میرا اس وقت کلام کرنا اور یہ شہادت ادا کرنا اس پر کافی دلیل ہے بجائے اس کے کہ وہ ذکر یہ شروع کر دیتے ہیں کہ میں خدا نہیں خدا کا بندہ ہوں، نبی ہوں، صاحب کتاب ہوں، نماز پڑھتا ہوں، زکوٰۃ دیتا ہوں، ماں سے اچھا سلوک کرتا ہوں، جبار شقی نہیں ہوں۔ تو کیا جو شخص ایسا ہو وہ بن باپ پیدا ہوا کرتا ہے اس قسم کے تو بہت لوگ بنی اسرائیل میں ہو چکے تھے۔ ابھی یحییٰ کا ذکر گزر چکا ہے جو اس سے کم نہیں بڑھ کر ہی ہے تو کیا وہ بن باپ ہوئے تھے اس لیے ان میں یہ صفات تھیں یہ سچ ہے کہ اس سے اس قدر استدلال تو ہو سکتا ہے کہ ایک ایسے راستباز انسان کی ماں زانیہ نہیں ہو سکتی گو عیسائیوں نے تو اس کے خلاف بھی کہا ہے لیکن اصل اعتراض کا جواب کچھ نہ آیا اور پھر یہ ساری باتیں بے ضرورت تھیں ایک بچہ کا اتنا کہہ دینا ہی کافی تھا کہ یہ بڑی راستباز ہے اور میں نبی بنوں گا مگر وہ اپنے متعلق سب کچھ کہتے ہیں لیکن والدہ کے متعلق ایک حرف بھی زبان پر نہیں لاتے جس سے ان کے جواب کا کوئی تعلق حضرت مریم پر الزام کے ساتھ سمجھا جائے۔

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم مسیح کے آسمان پر ہونے کو غلط ٹھہراتا ہے: علاوہ ازیں یہ بچہ کا کلام ہو کر کچھ معنی نہیں بنتے اور بالخصوص اوصٰنی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادمت حیا اس ساری توجیہہ کو قطعی طور پر غلط ٹھہراتا ہے۔ مادمت حیا اس صورت میں اس کے ساتھ مل سکتا ہے جب حکم نماز مل چکا ہوا اور بچہ کو حکم نماز بے معنی ہے پھر زکوٰۃ کا حکم اور بھی بے معنی ہے۔ مفسرین نے اس مشکل کو یوں دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ صلوٰۃ سے مراد محض دعا ہے اور زکوٰۃ سے مراد تطہیر نفس ہے اور اس ذریعہ سے شاید آسمان پر بٹھانے کی مشکل کو بھی حل کرنا چاہا ہے مگر وہی مادمت حیا کی شرط یہاں بھی کچھ نہیں بننے

اَمُوْتُ وَ يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿٣٣﴾ — مروں اور جس دن میں زندہ اٹھایا جاؤں [1998]

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٣٤﴾ — یہ مریم کا بیٹا عیسیٰؑ ہے، یہ سچائی کی بات ہے جس میں وہ جھگڑتے ہیں۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٣٥﴾ — اللہ کو شایاں نہیں کہ وہ کوئی بیٹا بنائے وہ پاک ہے جب کسی امر کا فیصلہ کر دیتا ہے تو اسے کہتا ہے ہوجا سو وہ ہوجاتا ہے [1999]

وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٣٦﴾ — اور اللہ میرا رب اور تمھارا رب ہے سو اس کی عبادت کرو یہ سیدھا رستہ ہے۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿٣٧﴾ — پھر فرقوں نے باہم اختلاف کیا سو ان پر افسوس ہے جنھوں نے کفر کیا کہ (انھیں) ایک سخت دن میں حاضر ہونا ہوگا [2000]

اَسْمِعْ بِهِمْ وَ اَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٨﴾ — وہ کیسے سننے والے اور کیسے دیکھنے والے ہونگے جس دن ہمارے سامنے آئیں گے، لیکن ظالم آج کھلی گمراہی میں ہیں۔

وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّ هُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٣٩﴾ وقف لازم — اور انھیں حسرت کے دن سے ڈرا جب معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ غفلت میں ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے [2001]

اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا — ہم ہی زمین کے وارث ہیں اور (ان کے بھی) جو اس پر ہیں اور

دینی وفات کے بعد دعا اور تزکیہ کا سلسلہ ختم نہیں ہوجاتا۔ پس یہاں وہی صلوٰۃ اور زکوٰۃ مراد ہے جو اس دنیا کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے اور یہ الفاظ نہ صرف اسی بات کو غلط ٹھہراتے ہیں کہ یہ بچپن کا کلام ہے بلکہ ساتھ ہی حضرت مسیح کے آسمان پر ہونے کو غلط ٹھہراتے ہیں کیونکہ اس خاص صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا تعلق اس زمین سے ہے۔

1998ء یہ وہی لفظ ہیں جو حضرت یحییٰ کے حق میں ہیں پس وہی تین زندگیاں حضرت مسیح کے لیے ہیں جو اوروں کے لیے ہیں، یعنی ایک ولادت سے لیکر وفات تک اس زمین پر زندگی، ایک وفات سے لیکر قیامت تک یعنی برزخ کی زندگی، ایک بعد قیامت۔ اگر آسمان پر جانا اور وہاں سے اُترنا بھی کوئی حقیقت رکھتا تو اس قدر اہم واقعہ کا ذکر بھی یہاں ہونا چاہئے تھا۔

1999ء ان دو آیتوں میں کھول کر بتا دیا کہ اصل غرض اس بحث کی عیسائیت پر اتمام حجّت ہے جو مسیح کو خدا بناتی ہے اور فیه یمترون میں مراد نصاریٰ کا جھگڑا رسول اللہ صلعم سے ہے کیونکہ آگے ان یتخذ من ولد میں اسی کی تردید ہے۔

2000ء احزاب یا فرقوں (ح1451) سے مراد عیسائیت کے مختلف فرقے ہیں (ج) ان کے باہمی اختلافات حضرت عیسیٰ کے بارہ میں بہت ہیں اور ہر ایک عقیدہ باطلہ کا یہی حال ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے فرقوں اور عیسائیوں کے فرقوں میں کتنا فرق ہے کہ وہ سب فرقے حتیٰ کہ سنّی اور شیعہ بھی رسول اللہ صلعم کے متعلق کوئی اختلاف ایسا نہیں رکھتے کہ آپ کا مرتبہ کیا تھا اور ان میں اصولی اختلاف کوئی نہیں، مگر عیسائیوں کے تمام فرقوں میں ایک دوسرے سے اصولی اختلاف ہے اور کوئی دو فرقے اس پر اتفاق نہیں کرتے کہ حضرت عیسیٰ کو کیا کہیں، اور ان لچر بحثوں سے دفتروں کے دفتر سیاہ ہوئے ہیں۔ انہی سے اسکندریہ کا کتب خانہ بھرا ہوا تھا، جسکے جلانے کا غلط الزام حضرت عمرؓ پر عیسائی دیتے ہیں۔ گبن اس الزام کی تردید کرکے لکھتا ہے کہ اگر ان فضول بحثوں سے بھری ہوئی کتابوں کو واقعی عمر نے جلا کر چھ ماہ تک اسکندریہ کے حمام گرم رکھے تو اس سے بہتر مصرف ان کتابوں کا اور نہ ہوسکتا تھا۔

2001ء یوم الحسرۃ سے مراد قیامت ہے اس لیے کہ اس دن عمل کے ہاتھ سے جاتے رہنے سے شدّتِ غم ہوگی۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی ایک لمبے زمانہ تک حالتِ غفلت میں رہیں گے اور ایمان نہ لائیں گے اور اس سے اگلی آیت میں بتایا کہ انہیں حکومت اور ملک ملیگا مگر آخر یہ چیزیں

ع وَ اِلَيۡنَا يُرۡجَعُوۡنَ ﴿٤٠﴾
وہ ہماری طرف لوٹائے جائیں گے۔

وَ اذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ اِبۡرٰهِيۡمَ ۬ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا ﴿٤١﴾
اور کتاب میں ابراہیم کا ذکر کر، وہ صدیق نبی تھا ۲۰۰۲ؔ

اِذۡ قَالَ لِاَبِيۡهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا يَسۡمَعُ وَ لَا يُبۡصِرُ وَ لَا يُغۡنِىۡ عَنۡكَ شَيۡـًٔا ﴿٤٢﴾
جب اس نے اپنے بزرگ سے کہا اے میرے بزرگ تو کیوں اس کی عبادت کرتا ہے جو نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے اور نہ کچھ تیرے کام آسکتا ہے۔

يٰۤاَبَتِ اِنِّىۡ قَدۡ جَآءَنِىۡ مِنَ الۡعِلۡمِ مَا لَمۡ يَاۡتِكَ فَاتَّبِعۡنِىۡۤ اَهۡدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿٤٣﴾
اے میرے بزرگ مجھے وہ علم ملا ہے جو تجھے نہیں ملا، سو تو میری پیروی کر، میں تجھے سیدھا رستہ دکھاؤں گا۔

يٰۤاَبَتِ لَا تَعۡبُدِ الشَّيۡطٰنَ‌ؕ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ كَانَ لِلرَّحۡمٰنِ عَصِيًّا ﴿٤٤﴾
اے میرے بزرگ! شیطان کی عبادت نہ کر، کیونکہ شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے ۲۰۰۳ؔ

يٰۤاَبَتِ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اَنۡ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ فَتَكُوۡنَ لِلشَّيۡطٰنِ وَلِيًّا ﴿٤٥﴾
اے میرے بزرگ! میں ڈرتا ہوں کہ تجھے رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب آپہنچے تو تو شیطان کا دوست بن جائے ۲۰۰۴ؔ

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنۡتَ عَنۡ اٰلِهَتِىۡ يٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ‌ۚ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّكَ‌ وَاهۡجُرۡنِىۡ مَلِيًّا ﴿٤٦﴾
اس نے کہا اے ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے منہ موڑتا ہے اگر تو باز نہ آئے میں تجھے سنگسار کرونگا اور تو ایک مدت مجھ سے الگ ہو جا۔ ۲۰۰۵ؔ

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيۡكَ‌ۚ سَاَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّىۡ‌ؕ
کہا تجھ پر سلامتی ہو، میں اپنے رب سے تیرے لیے استغفار کرونگا

ہماری ہی طرف واپس آئیں گی۔

ع ۲۰۰۲ اس سورت کا اصل مضمون عیسائیت پر اتمام حجت ہے اور حضرت ابراہیمؑ کا ذکر اس لیے کیا کہ آپ ان تمام انبیاء کے مورث اعلیٰ ہیں جو سلسلۂ بنی اسرائیل میں ہوئے جن میں سے ایک حضرت عیسیٰ بھی ہیں اور بلحاظ قبولیت آپ کا مرتبہ بہت ہی بلند ہے اس لیے کہ یہودی اور عیسائی اور مشرکین عرب اور مسلمان سب ان کی راستبازی کے قائل تھے۔ اور توجہ اس عظیم الشان سلسلۂ نبوت کی طرف دلائی ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوتا ہے اور حضرت عیسیٰ پر ختم ہوتا ہے۔

صدیق کے لیے دیکھو ع۶۸۶ اور نبی کے متبع بھی مرتبہ صدیقیت کو پاتے ہیں اور وہ خود بھی صدیق ہوتا ہے یعنی ایمان کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچا ہُوا اور صدیق کا کم سے کم مرتبہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سچ بولے اس سے کبھی جھوٹ سرزد نہ ہو۔ اس لیے حضرت ابراہیم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا لم یکذب قط (ر) پس وہ حدیث غلط ہے جس میں تین دفعہ جھوٹ بولنا حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یوں حضرت ابراہیم کے متعلق جو ایک ہی بات ان کی عصمت کے خلاف بیان کی جاتی ہے اس کی تردید کر کے حضرت ابراہیمؑ کی عصمت کو قائم کیا ہے۔

ع ۲۰۰۳ شیطان کو معبود بنانے مراد: شیطان کو کوئی معبود نہیں کہتا مگر چونکہ عبادۃ غایۃ تذلل کا نام ہے اس لیے جو لوگ شیطان کے آگے غایت درجہ کا تذلل اختیار کرتے ہوئے اس کی ہر آواز کی پیروی کرتے چلے جاتے ہیں وہ گویا اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ بعض نے شیطان کی عبادت سے مراد بتوں کی عبادت لی ہے اس لیے کہ شیطان ہی اس کی تحریک کرتا ہے (ر) ابراہیم کے اس اب کے متعلق دیکھو ع۹۶۷۔

ع ۲۰۰۴ شیطان کا ولی بننے سے مراد: رحمان کی طرف عذاب کی نسبت اس لیے کی کہ اس کا رحم تو اتنا بڑا ہے کہ بلا بدل بھی رحم کرتا ہے پس اس کا عذاب سوائے اس کے نہیں آتا کہ انسان حد سے نکل جائے یا شاید اس لیے کہ ایک رنگ میں بت پرست رحمانیت کا منکر ہے اور اس عذاب کا نتیجہ یہ بتایا کہ تو شیطان کا ولی بن جائے یعنی دوسروں کے بہکانے میں شیطان کا مددگار ہو جائے۔ پس اس عذاب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے، گو اس میں کوئی ظاہری دکھ نہ ہو۔ یعنی خود شیطان کا اتباع کرتے کرتے تو اللہ سے اس قدر دور جا پڑے تو پھر خود دوسروں کو غلط راہ پر ڈالنے لگے۔ اسی دوری کو یہاں عذاب کہا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بُعد اور دُوری سب سے بڑا عذاب ہے۔

ع ۲۰۰۵ رجم کے معنی بُرا کہنا دھتکارنا بھی آتے ہیں ع۴۱۰ یہاں یہی معنی مروی ہیں (ج) ملیّ کے لیے دیکھو ع۵۷۳۔

اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا ﴿۴۷﴾
وہ مجھ پر بہت مہربان ہے ع۲۰۰۶

وَ اَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ اَدْعُوْا رَبِّیْ ۖ٘ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِیًّا ﴿۴۸﴾
اور مَیں تم سے اور ان سے جنھیں تم اللہ کے سوائے پکارتے ہو الگ ہوتا ہوں اور مَیں اپنے رب سے دعا کروں گا، امید ہے میں اپنے رب سے دعا کر کے محروم نہیں رہوں گا۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَ مَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا نَبِیًّا ﴿۴۹﴾
سو جب ان سے الگ ہو گیا اور ان سے جن کی وہ اللہ کے سوائے عبادت کرتے تھے ہم نے اسے اسحاقؑ اور یعقوبؑ دیئے اور ہر ایک کو ہم نے نبی بنایا ع۲۰۰۷

وَ وَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِیًّا ﴿۵۰﴾ ع
اور ہم نے انھیں اپنی رحمت سے حصّہ دیا اور ہم نے ان کے لیے سچا ذکر بلند کیا ع۲۰۰۸

وَ اذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ مُوْسٰۤى ۫ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا ﴿۵۱﴾
اور کتاب میں موسیٰؑ کا ذکر کر، وہ ہر کھوٹ سے پاک تھا اور رسول نبی تھا ع۲۰۰۹

وَ نَادَیْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَیْمَنِ
اور ہم نے اسے پہاڑ کی بابرکت طرف سے پکارا اور اپنے راز

ع۲۰۰۶ حفی۔ حَفی۔ احفاء کے لیے دیکھو ع۱۱۸۶ اور حفارت قدم اور پیر کے ننگا ہونے کو کہتے ہیں اور حَفی بالرجل کے معنی ہیں اس کے اکرام میں غایت درجہ کو پہنچا۔ اس لیے حَفی وہ مہربانی کرنے والا ہے جو اکرام میں غایت درجہ کو پہنچے (ل) اور کسی چیز کا علم رکھنے والے کو بھی کہتے ہیں (غ)
یہاں بدی کے مقابل نیکی کا طریق سکھایا ہے وہ بُرا کہتا ہے حضرت ابراہیم سلام علیک فرماتے ہیں اور استغفار کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ دشمن سے یہ پیار کا عملی ثبوت ہے۔ عیسائیوں کا فخر کہ یہ تعلیم حضرت عیسیٰ نے دی بیجا ہے ہر نبی کی یہی تعلیم تھی اور یہی بتانا مقصود ہے استغفار ابراہیم کے لیے دیکھو ع۱۳۵۵

ع۲۰۰۷ یہاں اسحاق اور یعقوب دینے کا ذکر ہے۔ اشارہ یہ ہے کہ جب اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنے بزرگ اور اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کی تو ہم نے اسے ایک ایسی نسل دی جس میں ایک مدت تک سلسلۂ نبوت چلا اسی لیے اسحاق کے ساتھ اس کے بیٹے یعقوب کا بھی ذکر کیا۔ یہاں حضرت اسمٰعیل کا ذکر اسی لیے نہیں کیا اور اس لیے بھی کہ اسماعیل کا ذکر آگے علیحدہ آتا ہے کیونکہ اس سے ایک علیحدہ نسل چلی جس میں ہمارے نبی کریم صلعم پیدا ہوئے۔

ع۲۰۰۸ لسان۔ زبان یعنی عضو کو بھی کہتے ہیں اور اس کی قوت کو بھی (غ) اور لسان صدق کے لیے دیکھو ع۱۳۷۱ اور واحلل عقدۃ من لسانی (طٰہٰ ۲۰-۲۷) میں مراد قوت لسان ہی ہے نہ خود لسان اس لیے کہ عقدہ قوت لسان یعنی نطق میں تھا نہ زبان میں (غ)

ع۲۰۰۹ مخلص۔ اَخْلَصَهٗ اَمْحَضَهٗ (ل) یعنی اُخْلِصَ کے معنی ہیں ایک چیز کو ہر قسم کی آمیزش سے پاک کیا یا رکھا۔ اس لیے مخلص وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی میل یا کھوٹ سے پاک رکھا ہوا اور مُخْلِص وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید کو ہر آمیزش سے پاک رکھے اسی لیے قل ھو اللہ احد کا نام سورۃ الاخلاص ہے کیونکہ اس میں توحید کو ہر آمیزش سے پاک کیا گیا ہے (ل)
چونکہ سورت کا اصل مضمون عیسائیت پر اتمام حجت ہے اس لیے حضرت ابراہیمؑ کے بعد سلسلہ اسرائیلی کے اس عظیم الشان نبی کا ذکر کیا جو اس سلسلہ کا بانی ہے اور باقی تمام انبیاء کے ذکر کو چھوڑ دیا۔ لیکن ہارون کا ذکر ساتھ کر دیا اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کو جو ع۱۹۵۳ میں بیان ہوئی اور چونکہ عیسائی حضرت عیسیٰ کے بیگناہ ہونے پر بڑا زور دیتے ہیں اس لیے حضرت موسیٰ کو مُخْلَص فرمایا یعنی جو ہر قسم کی میل اور کھوٹ سے پاک تھا اس سے بڑھ کر بیگناہی متصور نہیں ہو سکتی اور یہاں حضرت موسیٰ کو رسول نبی کہا ہے۔ اصطلاح شرعی میں ہر ایک رسول نبی ہے اور ہر نبی رسول ہے اس لیے جس کو ایک جگہ نبی کہا ہے اُسے دوسری جگہ رسول کہا ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کے متعلق اوپر فرمایا وجعلنی نبیا اور آل عمران میں فرمایا تھا ورسولاً الی بنی اسرائیل اور دونوں ناموں کو اکٹھا کرنے میں دونوں کے لغوی معنوں کی طرف اشارہ ہے۔ رسول کے لیے دیکھو ع۱۱۰ وہ ہے جسے پیغام دیکر بھیجا جاتا ہے اور نبی وہ ہے دیکھو ع۹۱ جسے اللہ تعالیٰ اپنی توحید کی خبر دیتا ہے اور اسے غیب کی باتیں بتاتا ہے۔ اور چونکہ رسول سوائے پیغام الٰہی کے کسی اور چیز کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے اس لیے بعد میں لفظ نبی لایا گیا۔

وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿٥٢﴾ — بتانے کو اسے مقرب بنایا ع۲۰۱۰

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿٥٣﴾ — اور ہم نے اسے اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارُونؑ نبی عطا فرمایا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿٥٤﴾ — اور کتاب میں اسمٰعیلؑ کا ذکر کر وہ وعدے کا سچّا تھا، اور رسول نبی تھا ع۲۰۱۱

وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿٥٥﴾ — اور اپنے ساتھیوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا ع۲۰۱۲

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٥٦﴾ — اور کتاب میں ادریسؑ کا ذکر کر، وہ صدّیق نبی تھا۔

وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿٥٧﴾ — اور ہم نے اسے بلند مقام پر اٹھایا ع۲۰۱۳

ع۲۰۱۰ ایمن۔ یُمن کے معنی برکت ہیں اور اَیمَن برکت والا (ل) اور اس کے معنی دایاں بھی ہیں مگر پہاڑ کا دایاں یا بایاں موزوں معنی نہیں اور با برکت پہاڑ کو ان برکات کی وجہ سے کہا جو وہاں حضرت موسٰیؑ پر نازل ہوئیں۔ اور یہاں ایمن جانب کی صفت بھی ہو سکتا ہے اور طور کی بھی۔

نجیّ۔ نجاۃ کے لیے دیکھو ع۲۷ اور ناجیتُہٗ کے معنی ہیں سارَرْتُہٗ یعنی اسے اپنا رازدار بنایا اور اس کا اصل نجاۃ سے ہے یعنی تم اس کی ایسی بات میں مدد کرو جس میں اس کی نجات ہے (غ) اور نجیّ مُناجی ہے (غ) یعنی جسے اپنے راز پر اطلاع دی جائے۔

ع۲۰۱۱ حضرت اسمٰعیلؑ کی رسالت: حضرت موسٰیؑ کے بعد حضرت اسمٰعیلؑ کا ذکر کیا ہے اس لیے کہ سلسلہ موسوی کے ختم ہونے کے بعد حضرت اسمٰعیلؑ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور نبوت سلسلہ موسوی سے سلسلہ محمدی میں منتقل ہوتی ہے۔ اور حضرت اسمٰعیل کے صادق الوعد ہونے کے ذکر میں بائبل کے اس بیان کی تردید ہے کہ اسمٰعیلؑ ایک وحشی آدمی تھا (پیدائش ۱۶: ۱۲) اور ہمارے نبی کریم صلعم میں بھی یہ وصف کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ اور اُمت محمدیہ میں بھی وعدہ کی سچائی کی صفت خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے بمقابلہ دوسری اقوام کے جن میں وعدہ توڑنا ایک معمولی بات ہے۔ حضرت اسمٰعیل قبیلہ جرہم کی طرف مبعوث ہوئے تھے (د) کیونکہ اس وقت مکہ میں کوئی آبادی نہ تھی بائبل میں ان کی رسالت کا ذکر نہیں۔

ع۲۰۱۲ حضرت اسماعیل کی عصمت: صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی تعلیم سب انبیاء میں مشترک تھی یہ دو اصل دین کے ہمیشہ سے چلے آئے ہیں حضرت عیسٰیؑ کو بھی یہی حکم دیا تھا۔ حضرت اسمٰعیلؑ بھی اپنے پیروؤں کو اسی راہ پر چلاتے تھے اور آپ کے مَرضیّ یا رضائے الٰہی کا محل ہونے میں یہ بتایا کہ ان سے کوئی فعل اللہ کی رضا کے خلاف سرزد نہیں ہوا اور یہی مقام عصمت ہے۔

ع۲۰۱۳ حضرت ادریسؑ کا رفع: حضرت ادریسؑ وہی ہیں جن کا ذکر بائبل میں حنوک کے نام سے ہے اور یہ حضرت نوحؑ سے پہلے کے ہیں بعض کے نزدیک ان میں اور نوحؑ میں ایک ہزار سال کا فرق ہے جس طرح نوحؑ اور ابراہیمؑ میں ایک ہزار سال کا فرق ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حضرت آدمؑ کے بعد پہلے رسول ہیں۔ اور بائبل میں ہے کہ "حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور غائب ہو گیا اس لیے کہ خدا نے اسے لے لیا" (پیدائش ۵: ۲۴) اور پولوس کہتا ہے "ایمان ہی سے حنوک اٹھا لیا گیا تاکہ موت کو نہ دیکھے" (عبرانیوں ۱۱: ۵) اسی وجہ سے ہمارے بعض مفسرین نے بھی لکھ دیا ہے کہ حضرت ادریسؑ زندہ آسمان پر اُٹھائے گئے اور وہ چوتھے یا چھٹے آسمان پر ہیں اور بعض نے کہا کہ چوتھے آسمان پر ان کی روح قبض کر لی گئی۔ ان باتوں کی کوئی اصلیت نہ قرآن شریف میں ہے نہ حدیث صحیح میں اور کعب احبار سے جو روایت ہے کہ ایک فرشتہ حضرت ادریس کا دوست انہیں چوتھے آسمان پر لے گیا تھا اور وہاں ملک الموت نے اس کی روح قبض کر لی تو اس کو نقل کر کے ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ کعب کی اسرائیلیات ہیں اور ان میں بعض باتیں ناقابل قبول ہیں۔ اور رفعناہ مکانا علیا کی تفسیر حسن سے مروی ہے ھو شرف النبوۃ والزلفی عند اللہ تعالٰی (د) یعنی اس سے مراد شرف نبوۃ اور قرب الٰہی ہے اور پھر روایات کو نقل کر کے بتایا ہے کہ بلند مکان سے مراد علو شان اور بلند مرتبہ ہو تو یہ تعریف کی بات ہے ورنہ صرف اونچے مکان پر لے جانا کوئی حقیقت نہیں رکھتا (د) اور حضرت ادریسؑ کے رفع کا ذکر کر کے یہ بھی بتا دیا کہ رفع بھی حضرت عیسٰی کی خصوصیت نہیں بلکہ سب انبیاء کا ہوا۔

انبیاء کی غیر تاریخی ترتیب میں حکمت: اس سورت میں جو ترتیب انبیاء ہے وہ تاریخی نہیں مگر اس کی وجوہات خاص ہیں۔ پہلے یحیٰیؑ کا ذکر کیا جو حضرت عیسٰیؑ کے ذکر کے لیے بطور تمہید تھا۔ پھر حضرت عیسٰیؑ کا جو اصل مقصود ہے پھر حضرت ابراہیمؑ جہاں سے ایک عظیم الشان سلسلہ نبوت چلتا ہے اس میں اوّل ایک شاخ کے

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ
النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ق وَمِمَّنْ
حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ز وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ
وَاِسْرَآءِيْلَ ز وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ط
اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا
سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا ۵۸ السجدة

یہ نبیوں میں سے وہ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا آدم کی نسل سے اور اُن سے جنھیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ سوار کیا، اور ابراہیمؑ اور اسرائیل کی نسل سے اور ان میں سے جنھیں ہم نے ہدایت دی اور چن لیا جب ان پر رحمٰن کی آیتیں پڑھی جائیں وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر پڑتے ہیں ۲۰۱۴

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا
الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ
يَلْقَوْنَ غَيًّا ۵۹

پھر ان کے بعد ناخلف جانشین ہوئے، جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کی سو وہ ہلاکت کو پالیں گے ۲۰۱۵

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا
فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا
يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ۶۰

مگر جنھوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور اچھے عمل کیے تو یہ جنت میں داخل ہوں گے اور اُن پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔

جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ
بِالْغَيْبِ ط اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ۶۱

ہمیشگی کے باغوں میں جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے بن دیکھے وعدہ کیا ہے اس کا وعدہ آکر رہے گا ۲۰۱۶

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ط وَلَهُمْ
رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۶۲

اس میں کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے، ہاں سلام (سنیں گے) اور ان کا رزق اس میں صبح اور شام انھیں ملے گا ۲۰۱۷

ذکر کو اسحاقؑ و یعقوبؑ سے شروع کرکے جو ابتدا میں ہیں موسیٰ اور ہارون پر جو سلسلہ موسوی کی بنیاد رکھنے والے ہیں ختم کر دیا اور دوسری شاخ میں صرف حضرت اسمٰعیلؑ کا ذکر کیا کیونکہ اس کے اوّل اسمٰعیلؑ اور آخر حضرت محمد مصطفٰے احمد مجتبٰی صلعم ہیں پھر ادریسؑ کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ سلسلہ نبوت کی بنیاد ابراہیمؑ سے نہیں رکھی گئی بلکہ جب سے انسان ہوا اسی وقت سے انبیاء بھی ہوتے چلے آئے ہیں۔ اور یہ ترتیب اسی سورت سے خاص ہے۔ کیونکہ اس میں عیسائی مذہب پر اتمام حجت ہے۔

۲۰۱۴ آدم کی ذریت سے تو سب ہیں مگر یہاں قریب ترین جد کا ذکر کیا ہے۔ یعنی ادریسؑ آدم کی ذریت سے۔ ابراہیمؑ نوحؑ کی ذریت سے، اسحاقؑ اور اسماعیلؑ ابراہیمؑ کی ذریت سے، موسیٰؑ ہارونؑ عیسیٰؑ یحییٰؑ اسرائیل کی ذریت سے۔ حضرت عیسیٰؑ کے یوں ذریت میں شامل کرنے پر مفسرین کو یہ کہنا پڑا ہے کہ نسب لڑکی کی طرف سے بھی ہوتی ہے اور ان تمام انبیاء کے ایک جا ہدایت اور اجتبا کا ذکر کر کے حضرت عیسیٰؑ کی فرضی خصوصیات کو توڑا ہے۔

۲۰۱۵ غیّ کے معنی یہاں راغب نے عذاب لیے ہیں مگر دیکھو ۱۰۵۸ اغوینتی اھلکتنی (ج) شاہد ہے کہ غیّ کے معنی ہلاکت بھی ہیں اضاعت صلوٰۃ یا نماز کا ضائع کرنا اس کا ترک کر دینا بھی ہے یا ظاہر صورت کو قائم رکھ کر حقیقت سے بے خبر ہونا یا اس کے اوقات کو ترک کر دینا۔ اور گو لفظ عام ہیں مگر بالخصوص عیسائیوں نے عبادات کو کفارہ کے خلاف سمجھ کر بالکل ترک کر دیا ہے اور شہوات کے پیچھے بھی جس قدر یہ قوم لگی ہے دوسری کوئی نہیں لگی۔ آج مسلمان بھی نماز کو ضائع کر رہے ہیں۔

۲۰۱۶ بالغیب میں با ملابست کے لیے ہے یعنی اس نے جنت کا وعدہ کیا ہے اور وہ ان سے غیب کا حکم رکھتی ہے (ر) کیونکہ وہ ان آنکھوں سے نہیں دیکھی جاتی بلکہ اس کا علم دوسرے حواس سے ہوتا ہے۔
ماتیا۔ اتیان (اتی) سہولت سے آنے پر بولا جاتا ہے اور یہاں ماتی بمعنی اٰتی ہے یعنی مفعول بمعنی فاعل اور مراد ہے کہ ضرور آکر رہے گا۔

۲۰۱۷ بہشت میں رات نہیں کہ وہاں صبح اور شام ہوں۔ آنحضرت صلعم سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اوقات مراد ہیں جن میں یہاں نماز

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾

یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اسے بناتے ہیں جو متقی ہوں۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾

اور ہم تیرے رب کے حکم کے سوائے نازل نہیں ہوتے۔ اسی کا ہے جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو اس کے درمیان ہے اور تیرا رب بھولنے والا نہیں ع۲۰۱۸

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾ ع

آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سو اس کی عبادت کر اور اسی کی عبادت پر مضبوط رہ، کیا تو اس جیسا کوئی اور جانتا ہے ع۲۰۱۹

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾

اور انسان کہتا ہے کیا جب میں مرجاؤں گا تو (پھر) زندہ کرکے نکالا جاؤں گا ع۲۰۲۰

اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴿۶۷﴾

کیا انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اسے پہلے پیدا کیا اور وہ کچھ بھی نہ تھا۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۸﴾

سو تیرے رب کی قسم ہم ضرور انھیں اور (ان کے) شیطانوں کو اکٹھا کرینگے پھر ہم ضرور انھیں دوزانو بیٹھے ہوئے دوزخ کے گرد لا حاضر کرینگے ع۲۰۲۱

پڑھتے تھے (ر) گویا ان کا رزق وہی نماز کا پھل ہے اور صبح وشام سے دوام بھی مراد ہوتا ہے یعنی ہر حالت میں اور تمام اوقات میں اور سلام وہاں ہونے سے مراد تمام آفات سے سلامتی کا ہونا ہے اور سلام سننے سے مراد ایک تو ان کا باہمی سلام ہے تحیتھم فیھا سلام (ابراھیم ۱۴-۲۳) اور دوسرا ملائکہ کا ان پر سلام کہنا۔ سلام علیکم طبتم (الزمر ۳۹-۷۳)

ع۲۰۱۸ اسی ایک روایت کی بنا پر جو اصحاب کہف کے سوال کے متعلق ہے یہاں یہ سمجھا گیا ہے کہ حضرت جبرئیل کا قول ہے جس میں گویا یہ بتایا ہے کہ وحی کیوں رک گئی تھی اور بخاری میں ابن عباسؓ کی روایت صرف اس قدر ہے کہ آنحضرت صلعم نے جبرائیل کو کہا تھا کہ آپ اس سے زیادہ نزول کیوں نہیں کرتے تو انہوں نے یہ جواب دیا۔ لیکن آیت کے الفاظ سے جو مفہوم اقرب الی الذہن معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں خود انبیاء علیہم السلام کے نزول کا ذکر ہے اور اگر فرشتوں کا آنا بھی مراد ہو تو پھر بھی مراد نزول قرآن ہی ہوگی۔ کیونکہ لیلۃ القدر جس میں قرآن نازل ہوا اس میں ملائکہ بھی نازل ہوتے ہیں تو پس یا تو عام طور پر انبیاء کا آنا مراد ہے کہ نبی تبھی آتا ہے جب امر رب ہو اور یا بالخصوص نزول قرآن کریم کا ہی ذکر ہے کہ اب جو یہ وحی نازل ہوئی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی ہے ما بین اید ینا سے مراد مستقبل اور ما خلفنا سے مراد ماضی اور ما بین ذٰلك حال ہے اور ما کان ربك نسیا میں یا تو یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں کو بھول نہیں سکتا تھا جو اس نے ایک آخری رسول بھیجنے کے متعلق سب انبیاء سے کیے تھے اور یا یہ کہ وہ لوگوں کو اس طرح ضلالت کی حالت میں چھوڑ نہیں سکتا تھا اور بعض نے مراد یہ لی ہے کہ اپنے نبیوں کو نہیں چھوڑ سکتا یعنی ان کی نصرت کرے گا۔

ع۲۰۱۹ اصطبر۔ اصطبار۔ صبر سے باب افتعال ہے اور اصطبر کے معنی ہیں تحمّل الصبر بجھدك (رغ) اپنی کوشش سے صبر کو قائم رکھ سمیّ کے لیے دیکھو ع۱۶۲۷ اس جیسا کوئی نہیں اس میں ابنیت کی بھی تردید ہے۔

ع۲۰۲۰ یہاں کسی خاص انسان کا ذکر نہیں بلکہ ہر اس انسان کا ہے جو منکر بعث ہے۔

ع۲۰۲۱ جثی۔ جثی کے معنی گھٹنوں پر بیٹھ گیا اور جاث گھٹنوں پر بیٹھنے والا وتری کل امۃ جاثیۃ (الجاثیۃ ۴۵-۲۸) اور اس کی جمع جثیّ ہے اور جثیّ بھی ہے (ل)

شیاطین سے مراد یہاں وہ شیطان بھی ہو سکتے ہیں جو ہر انسان کے قرین ہیں مگر شیاطین الانس زیادہ قرین قیاس ہیں +

ثُمَّ لَنَنۡزِعَنَّ مِنۡ كُلِّ شِيۡعَةٍ اَيُّهُمۡ اَشَدُّ عَلَى الرَّحۡمٰنِ عِتِيًّا ﴿۶۹﴾
پھر ہر گروہ میں سے ہم ضرور انھیں الگ نکال لیں گے جو رحمٰن کے خلاف سرکشی میں سخت تر تھے۔

ثُمَّ لَنَحۡنُ اَعۡلَمُ بِالَّذِيۡنَ هُمۡ اَوۡلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿۷۰﴾
پھر یقیناً ہم انھیں خوب جانتے ہیں جو اس میں داخل ہونے کے زیادہ اہل ہیں ع٢٠٢٢

وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا‌ ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتۡمًا مَّقۡضِيًّا ﴿۷۱﴾
اور تم میں سے کوئی نہیں مگر اس پر سے گزرے گا یہ تیرے رب پر لازم ہے جس کا فیصلہ ہو چکا رہے۔ ع٢٠٢٣

ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيۡنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيۡنَ فِيۡهَا جِثِيًّا ﴿۷۲﴾
پھر ہم انھیں بچالیں گے جنھوں نے تقوےٰ اختیار کیا اور ہم ظالموں کو اس میں گھٹنوں پر گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔

وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا ۙ اَىُّ الۡفَرِيۡقَيۡنِ خَيۡرٌ مَّقَامًا وَّاَحۡسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾
اور جب ہماری کھلی کھلی آیات ان پر پڑھی جاتی ہیں تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں، دونوں فریق میں سے کس کا مقام اچھا ہے اور کس کی مجلس زیادہ خوبصورت ہے ع٢٠٢٤

ع٢٠٢٢ صلی صالٍ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں آگ میں داخل ہونے والا (غ) دیکھو ع١١٢ الا من ھو صال الجحیم (الصّٰفّٰت ٣٧-١٦٣)
بدکاروں کے لیے جہنم ضروری ہے: اولیٰ لانے سے یہ مطلب نہیں کہ بعض زیادہ اہل ہیں بعض کم گو یہ بھی معنی کیے گئے ہیں اور ہو سکتے ہیں کہ جو لوگ کفر میں زیادہ سخت تھے جیسا اوپر کی آیت میں ہے وہی آگ میں بھی پہلے داخل ہونگے۔ اور ان کا عذاب بھی سخت تر ہوگا۔ مگر یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جن کا آگ میں داخل ہونا بہ نسبت ان کے باہر رہنے کے زیادہ مفید ہے اس لیے وہ آگ میں داخل ہونے کی بہ نسبت نہ داخل ہونے کے زیادہ اہل ہیں اس میں یہ بتایا ہے کہ ان کا آگ میں داخل ہونا ہی ان کا علاج ہے

ع٢٠٢٣ وارد۔ وُرود کے لیے دیکھو ع١٥٠٠ اس کے اصل معنی ہیں پانی یا آگ پر پہنچنا بغیر اس میں داخل ہونے کے گو بعض نے توسیع کرکے داخل ہونا بھی اس میں شامل کر لیا ہے۔
حتم۔ حَتۡم ایک امر کا احکام یعنی مضبوط کرنا ہے یا ایک بات کا واجب کرنا یا قضاء (ل)
مومن دوزخ میں داخل نہ ہونگے: ورود کے معنی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت کے معنی میں قطعاً کوئی دِقّت نہیں رہتی گو ان منکم میں تمام انسان یعنی مومن و کافر شامل ہوں کیونکہ یہ دوزخ کے اوپر پہنچنا ہے نہ دوزخ میں داخل ہونا اور ایک حدیث میں ہے جسے غریب کہا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ نیک اور بد دونوں اس میں داخل ہونگے مگر نیکوں پر وہ آگ ٹھنڈک اور سلامتی ہوگی اور ایک اثر میں ہے کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہونگے تو وہ دریافت کرینگے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا ان منکم الا واردھا تو کہا جائیگا تم اس کے اوپر سے گزر آئے ہو اور اس کی آگ بجھی ہوئی تھی تو ان تینوں سے ایک ہی بات ثابت ہوتی ہے یعنی یہ کہ حقیقتاً نیک لوگ دوزخ میں داخل نہ ہونگے۔ اور یہی قرآن کریم کی تعلیم ہے کیونکہ فرمایا لا یسمعون حسیسھا (الانبیاء ٢١-١٠٢) وہ اس کی آواز تک کو نہ سنینگے اور اولئک عنھا مبعدون (الانبیاء ٢١-١٠١) وہ اس سے دور رکھے جائیں گے پس اگر یہاں ورود میں نیک و بد دونوں شامل بھی سمجھے جائیں تو یہ وہ ورود ہے جس کے ساتھ دخول نہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں منکم میں خطاب صرف کفار کو ہے۔ اور شروع رکوع سے ہی ذکر کفار کا ہے۔ مثلاً آیت ٦٦ میں الانسان کا لفظ عام ہے مگر مراد صرف وہی انسان ہے جو منکر بعث ہے پھر آیت ٦٨ میں انہی منکران بعث اور شیاطین کے حشر کا ذکر ہے پس منکم میں یہی لوگ داخل ہیں اور یہ حضرت ابن عباس سے منقول ہے (ج) اور بعض نے کہا کہ مومن کا ورود بھی گو شامل ہے مگر اس سے مراد وہ مصائب و تکالیف ہیں جو اس دنیا میں مومن پر آتی ہیں اور یہ مجاہد کی طرف منسوب ہے (ج) اور اس کے آگے جو آتا ہے ثم ننجی الذین اتقوا تو یہاں ثم ترتیب کے لیے نہیں دیکھو ع٢٢ بلکہ یہ ایک الگ واقعہ کا ذکر ہے کہ متقی نجات پا جائیں گے یعنی عذاب سے بچ جائیں گے اور ظالم دوزخ میں رہیں گے اور یہ جو بعض آثار میں صحابہ کے ایسے اقوال پائے جاتے ہیں کہ وہ اس آیت سے بہت خائف رہتے تھے۔ تو ان سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ ایک نہ ایک رنگ میں ہر انسان کو مصائب برداشت کرنی پڑتی ہیں اور مقامات عالیہ بغیر تکالیف شاقہ میں پڑنے کے میسر ہی نہیں آسکتے تو گویا یہ تکالیف بھی بظاہر ایک رنگ دوزخ کا ہی رکھتی ہیں لیکن مومن کے لیے وہ بَرد و سلام بن جاتی ہیں ٭

ع٢٠٢٤ ندیّ۔ نداء آواز دینا ہے اسی سے نَدِیّ اور نادی مجلس کو کہتے ہیں اور نادِی ہم نشین کو بھی کہتے ہیں فلیدع نادیہ (العلق ٩٦-١٧) وتاتون فی نادیکم

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِءْيًا ﴿۷۴﴾

اور کتنی نسلیں ہم نے اُن سے پہلے ہلاک کیں جو سامان اور حُسنِ منظر میں ان سے اچھی تھیں ۲۰۲۵

قُلْ مَن كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمَٰنُ مَدًّا ۚ حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضْعَفُ جُندًا ﴿۷۵﴾

کہہ جو کوئی گمراہی میں رہتا ہے تو رحمٰن اس کے لیے مہلت بڑھاتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے، جس کا انھیں وعدہ دیا جاتا ہے، خواہ وہ عذاب اور خواہ وہ (موعود) گھڑی، تو جان لیں گے کس کی حالت بُری ہے اور کس کا لشکر کمزور ہے ۲۰۲۶

وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ۗ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

اور اللہ انھیں ہدایت میں بڑھاتا ہے جو سیدھے رستہ پر چلتے ہیں اور باقی رہنے والے اچھے عمل تیرے رب کے نزدیک ثواب میں بہتر ہیں اور انجام میں خوب تر ہیں ۲۰۲۷

أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتَيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا ﴿۷۷﴾

تو کیا تو نے اسے دیکھا جو ہماری آیتوں کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے مجھے (ہمیشہ) مال اور اولاد ملتے رہیں گے ۲۰۲۸

أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾

کیا اسے غیب کی اطلاع ہے یا اس نے رحمٰن سے کوئی اقرار لے لیا ہے۔

المنکر (العنکبوت ۲۹۔ ۲۹) اور اسی سے مکّہ کا دارالندوہ ہے جہاں لوگ بڑے بڑے مشوروں کے لیے اکٹھے ہوتے تھے (غ)۔
مجلس کی خوبصورتی پر جس قدر فخر عیسائی اقوام کو ہوا ہے اور کسی قوم کو نہیں ہوا اس لیے کہ ان کی عورتیں آرائش کے سامان سے مزین ہو کر ان کی مجالس کی زینت بنتی ہیں۔

۲۰۲۵ رِئیا۔ الذی یُرمق من الحُسن بہ (غ) وہ جس کی طرف اس کے حسن کی وجہ سے نظر اُٹھے۔
یہاں انہی اعدائے حق کے اثاث اور حسن منظر کا ذکر ہے اثاث کے لیئے دیکھو ۱۵۷ گھر کا سامان بھی ہو سکتا ہے اور مال بھی اور گھر کے سامان میں سب فرنیچر اور لباس آجاتا ہے۔ کون قوم اس کی مصداق ہے یہ محتاج بیان نہیں جو سامان اور لباس بادشاہوں اور امراء کو میسر نہ آتے تھے وہ اس قوم کے معمولی آدمیوں کے پاس موجود ہیں۔

۲۰۲۶ فلیمد د لہ الرحمن۔ میں بتایا کہ عادت اللہ یہ ہے کہ ضال قوم کو مہلت زیادہ دیتا ہے اور اما العذاب واما الساعۃ میں چھوٹے عذاب اور ساعت وسطے یعنی قوم کی تباہی کا وقت مراد ہیں کیونکہ آگے لشکر کی کمزوری کا ذکر ہے۔ اور تباہی سے مراد ان کے ساز و سامان کا چھن جانا ہے دیکھو ۲۰۳۰ اس سورت میں لفظ رحمان کو بڑی کثرت سے دوہرایا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ سورت عیسائیت پر اتمام حجت کے طور پر ہے اور عیسائیت نے صفت رحمانیت کا مطلق انکار کیا اور رحم بلا بدل کو اللہ تعالیٰ کی صفات کے خلاف قرار دیکر بیٹے کی قربانی کو گنہگاروں کی بخشش کا بدل ٹھہرایا ہے گویا اللہ تعالیٰ کوئی گناہ بخش نہیں سکتا جب تک اس کا بدلہ نہ لے اور یہ اس کی صفت رحمانیت کے خلاف ہے دیکھو صفحہ ۲ فاتحہ میں عقاید باطلہ کی تردید۔

۲۰۲۷ مردّ مردّ کی طرح مصدر ہے اور اس کے اصل معنی صرف یا پھیرنا ہیں فلا مردّ لہ (الرعد ۱۳۔ ۱۱) اور یہاں مراد مرجع اور عاقبت ہے (ر)
انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی بنایا ہے کہ جب وہ غلطی کی طرف قدم اُٹھاتا ہے تو ادھر ہی اس کا قدم اٹھتا چلا جاتا ہے جب نیکی اور ہدایت کی طرف قدم اُٹھاتا ہے اسی میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے اسی سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت میں بڑھاتا ہے۔

۲۰۲۸ لاوتین مالا و ولدا کہنے والا پہلے ہی صاحب مال و ولد ہے پس یہاں مراد ایتائے مستمر ہے یعنی یہ چیزیں ہمیشہ ہی مجھے ملتی رہیں گی گویا یہ ایک انسان کا کہنا نہیں بلکہ ایک قوم کا کہنا ہے جو اپنے مال و ولد پر فخر کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے دنیا کے اموال اور بڑے جتھے کی مالک ہو گئی ہے۔

كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾	ہرگز نہیں ہم لکھ لیں گے جو وہ کہتا ہے اور اس کے لیے عذاب کو بڑھاتے چلے جائیں گے ۲۰۲۹
وَّنَرِثُهُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾	اور ہم اس چیز کے وارث ہوں گے جو وہ کہتا ہے اور وہ اکیلا ہمارے پاس آئیگا ۲۰۳۰
وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾	اور وہ اللہ کے سوائے اور معبود بناتے ہیں تا کہ ان کے لیے قوت کا موجب ہوں۔
كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾ ع	ایسا نہ ہوگا، وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور اُن کے مخالف ہوں گے ۲۰۳۱
أَلَمْ تَرَ أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ﴿۸۳﴾	کیا تو نے غور نہیں کیا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے جو اُنھیں اکساتے رہتے ہیں ۲۰۳۲

۲۰۲۹ سنکتب۔ یعنی جو کچھ وہ کہتا رہتا ہے ہم اسے لکھتے رہیں گے اسی لیے س بڑھایا۔ یہاں بھی پچھلی آیت کی طرح استمرار ہے ؎

۲۰۳۰ مایقول سے مراد وہی مال و ولد ہے جس پر وہ فخر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس کے وارث ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ مال اس سے لے لیا جائے گا موت کے وقت تو ہوتا ہی ہے مگر یہاں قومی حالت کا ذکر ہے مال اور جتھے کی مالک دنیا میں کبھی ایک قوم ہوتی ہے کبھی دوسری اور جس قوم کو اپنے مال اور جتھے پر فخر ہو اس کا اس سے چھن جانا اس پر سخت ترین عذاب بلکہ اس کی ہلاکت ہے ؎

۲۰۳۱ ضد۔ ضِدّ ایک چیز کی وہ ہے کہ ایک آئے تو دوسری چلی جائے جیسے رات اور دن اور جو چیز دوسری کے خلاف ہو اسے بھی اس کی ضد کہا جاتا ہے اور عکرمہ سے یہاں ضد کے معنی اعدا مروی ہیں (ل) ؎

پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ یہ دوسرے معبود اس لیے بناتے ہیں کہ ان کے لیے قوت کا موجب ہو اور اس آیت میں پہلے فرمایا کہ ایسا نہیں ہوگا اور پھر فرمایا کہ وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے یعنی جنہیں معبود بنایا تھا وہ نہ صرف ان کی قوت کا موجب نہ ہوں گے بلکہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے جیسا کہ فرمایا ما کانوا ایانا یعبدون (القصص ۲۸-۶۳) اور پھر اس سے بڑھ کر یہ فرمایا کہ وہ ان کے خلاف ہوں گے۔ یعنی ان کے خلاف شہادت ادا کریں گے۔ اور یہ لوگ ہیں جنہیں معبود بنایا گیا بالخصوص حضرت مسیح جن کی قوم کا یہاں خاص ذکر ہے۔ یہاں پرستاروں کے انکار کا ذکر نہیں، بلکہ معبودین کے انکار کا ذکر ہے ؎

۲۰۳۲ ارسلنا۔ اِرْسال (بھیجنا) انسان کے لیے بھی ہوتا ہے اور پسندیدہ یا ناپسندیدہ چیزوں کے لیے بھی کبھی تسخیر سے جیسے وارسلنا السماء علیھم مدرارا (الانعام ۶-۶) اور کبھی اس شخص کے بھیجنے سے ہوتا ہے جس کے لیے اختیار ہو ویرسل علیکم حفظۃ (الانعام ۶-۶۱) فارسل فرعون فی المدائن حاشرین (الشعراء ۲۶-۵۳) اور کبھی تخلیۃ اور ترک منع سے یعنی ایک چیز کو اس کی حالت پر چھوڑ دینا اور اسے نہ روکنا جیسے یہاں (یعنی یہاں ارسلنا الشیاطین سے مراد ہے کہ ہم نے ان شیطانوں کو منع نہیں کیا اور وہ اپنا کام کرتے ہیں) اور ارسال اِمساک یعنی روک رکھنے کے مقابل پر ہے۔ ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسك لہا وما یمسك فلا مرسل لہ من بعدہ (فاطر ۳۵-۲)

تؤز۔ اَزّ ہانڈی کے اُبال پر بولا جاتا ہے جب وہ جوش میں ہو اور یہ ھَزّ یعنی ہلانے سے بڑھ کر ہے (غ) اور اَزّ کے معنی اختلاط یعنی ملا دینا اور تہییج یعنی اُبھارنا اور اِغرا یعنی اُکسانا بھی آتے ہیں اور حرکت شدید بھی اس کے معنی ہیں (ل)

یہاں شیاطین سے مراد بھی سردار ہیں جن کا ذکر ایہم اشدّ علی الرحمٰن عتیا میں ابھی ہو چکا ہے۔ گویا ان کے بڑے بڑے سردار کفار کو انگیخت کرتے اور اُکساتے رہتے ہیں تا کہ وہ حق کی مخالفت میں لگے رہیں اسی لیے اگلی آیت میں فرمایا کہ ان کے لیے عذاب کی جلدی مت کر، کیونکہ ان کے گنتی کے دن تو پورے ہونے ہی ہیں گویا ان کا جرم کسی قدر ہلکا کیا ہے اسی لیے پیچھے آیا تھا فلیمدد لہ الرحمٰن مدا کسی قدر مہلت ان کی لمبی کی جاتی ہے۔ اس عام ذکر میں خاص اشارہ اس قوم کی طرف ہے جس کا ذکر ابھی آتا ہے وقالوا اتخذ الرحمٰن ولدا جو اس سورت میں بالخصوص مخاطب رہی ہے اور اگر وہ شیاطین مراد لیے جائیں جو قرین انسان ہیں تو گناہوں پر اُبھارنا مراد ہے اس صورت میں بھی شیطان کا کام صرف تحریک کرنا ہی بتایا ہے ہاں اسے زور کی تحریک کہا ہے اور ارسلنا کی تشریح اوپر ہو چکی، شیطان کا کام بدی کی تحریک ہے سو اللہ تعالیٰ اسے ایسا کرنے سے منع نہیں کرتا مگر شیطان کا تسلّط انسان پر کوئی نہیں ؎

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾
سو تو ان پر (عذاب کے لیے) جلدی نہ کر، ہم صرف ان (کے دنوں) کی گنتی اُن کے لیے پوری کر رہے ہیں۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾
جس دن ہم متقیوں کو رحمٰن کی طرف ایک عزت والے گروہ کے طور پر اکٹھا کریں گے ٢٠٣٣

وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾
اور مجرموں کو ہم جہنم کی طرف (پیاسے جانوروں کی طرح) ہانک لے جائیں گے۔ ٢٠٣٤

لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ﴿٨٧﴾
وہ شفاعت کے مالک نہ ہونگے، مگر جس نے رحمٰن سے عہد باندھا ہے ٢٠٣٥

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾
اور کہتے ہیں رحمٰن نے بیٹا بنایا

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ﴿٨٩﴾
یقیناً تم ایک خطرناک بات کر گزرے ٢٠٣٦

تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾
قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں ٢٠٣٧

٢٠٣٣ وفد۔ وَفْد اصل میں وہ لوگ ہیں جو بادشاہوں کے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ حوائج کو پیش کریں (غ) یا معزز سوار (ل)

٢٠٣٤ ورد۔ وِرْد۔ وُرُود کے معنی میں بھی آتا ہے یعنی لوگوں کا پانی پر جانا اور اس پانی کو بھی کہتے ہیں جس پر جائیں اور اُن اونٹوں کو بھی جو جائیں اور پیاس کو بھی (ل) بئس الورد المورود (ھود۔ ٩٨) یہاں لفظ وِرد میں لطیف اشارہ ہے کہ پیاسا تو پانی پر پیاس بجھانے کے لیے جاتا ہے مگر ان کی پیاس بجھانے کا سامان بھی آگ ہی ہو گی بالفاظ دیگر وہ روحانی پیاس جو انھوں نے اپنے افعال سے پیدا کی ہے پانی سے نہیں بلکہ آگ سے بجھ سکتی ہے۔

٢٠٣٥ مومنوں کا شفاعت کرنا: من اتخذ عند الرحمٰن عهدا سے مراد یہاں شفیع بھی ہو سکتا ہے اور مشفوع بھی شفیع کی صورت میں مراد کامل الایمان لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد کو مضبوط پکڑا یعنی اس کے احکام پر عمل کیا اور مقامات عالیہ حاصل کیے پس کامل الایمان مومن دوسرے مومنوں کے لیے شفیع ہو جائیں گے اور مشفوع کی صورت میں مراد یہ ہے کہ شفاعت ان کے حق میں ہو گی جنہوں نے رحمٰن سے عہد باندھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی شرائع کو انہوں نے قبول کیا مگر کسی وجہ سے کچھ نقص ان کے عمل میں رہ گیا، بہرحال یہ ضروری ہے کہ شفیع کے ساتھ تعلق قائم کیا ہو اور یہ شفاعت صلحاء اور انبیاء کی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام شفاعتوں کے بعد بھی لوگوں کو جہنم سے باہر نکال دیگا۔ اور بعض نے عہد سے مراد یہاں امر اور اذن لیا ہے۔

٢٠٣٦ اِدّ۔ وہ امر ہے جس کی بُرائی حد سے گزری ہوئی ہو اور وہ بڑی بھاری بات ہو یا بڑی مصیبت کی بات (ل)
یہاں صاف طور پر بتا دیا کہ وہ کونسی قوم ہے جس کا خاص ذکر اس سورت میں چلا آتا ہے اور جس کے سامانوں اور آرائشوں اور حسنِ منظر کا ذکر تھا یہ وہ قوم ہے جنھوں نے عقیدۂ ابنیت کو دنیا میں پھیلایا ہے۔ گو مفسرین نے یہاں عیسائیوں کے ساتھ عزیر کو ابن اللہ کہنے والوں کو اور ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہنے والوں کو بھی شامل کیا ہے۔ لیکن ان دونوں گروہوں کا وجود بھی دنیا میں باقی نہیں رہا۔ اور اتخذ الرحمٰن ولدا کہنے والی ایک ہی قوم رہ گئی جنھوں نے عقیدۂ ابنیت کو دنیا میں پھیلا کر اپنے آپ کو ان آیات کا مصداق بنایا ہے۔ اور اس آیت سے اور اس سے اگلی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ دنیا میں اس قدر زور پکڑنے والا تھا کہ قرآن کو اس قدر پُرہیبت الفاظ میں اس کی تردید کرنی پڑی۔ بُت پرستی عناصر پرستی اور دیگر قسم کے شرک کے متعلق ایسے الفاظ نہیں فرمائے اور جئتم سے مراد یہی ہے دیکھو ح ١٩٩٠ کہ ایک بات کا قصد کیا اور اسے کر گزرے اور یہ عقیدۂ ابنیت کے دنیا میں پھیلا دینے کی طرف اشارہ ہے۔

٢٠٣٧ یتفطرن۔ فَطْر کے اصل معنی طول میں شق یعنی پھاڑ دینا ہیں۔ اور تَفَطَّر کے معنی تَشَقَّق یعنی پھٹ گیا ہیں۔
ھدّ۔ سخت گرنے اور ٹوٹ جانے کو کہتے ہیں جیسے ایک چیز یکبر تبہ گر کر منہدم ہو جائے (ل)

عقیدۂ ابنیت نظام عالم کو باطل کرتا ہے: ان ہیبتناک الفاظ میں صرف اس عقیدہ کی بُرائی کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ فی الواقع دنیا میں کوئی قانون باقی نہیں رہتا اور نہ خود اس عالم کا وجود باقی رہتا ہے بلکہ عالمِ بالا کا بھی وجود باقی نہیں رہتا اگر اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانا جائے، کیونکہ بیٹا ماننا ہی اس بنا پر جانا

أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ — کہ وہ رحمٰن کے لیے بیٹے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔

وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ — اور رحمٰن کو توشایاں نہیں کہ وہ بیٹا بنائے۔

إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ — آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں سوائے اس کے نہیں کہ وہ رحمٰن کے پاس غلام بن کر آئیں گی ۲۰۳۸ع

لَقَدْ أَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾ — اُس نے اُن کا احاطہ کر لیا ہے اور اُنھیں پُورا پُورا گن رکھا ہے۔

وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾ — اور وہ سب کے سب قیامت کے دن اس کے پاس اکیلے اکیلے آئیں گے ۲۰۳۹ع

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ — وہ جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں، رحمٰن ان کے لیے محبّت پیدا کر دے گا ۲۰۴۰ع

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنْذِرَ بِهِ قَوْمًا لُدًّا ﴿۹۷﴾ — سو ہم نے اسے تیری زبان میں آسان کیا ہے تاکہ تو متقیوں کو اس کے ذریعہ سے خوشخبری دے اور ایک جھگڑالو قوم کو اس کے ساتھ ڈرائے ۲۰۴۱ع۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾ ع — اور ان سے پہلے ہم نے کتنی نسلیں ہلاک کر دیں، کیا تو اُن میں سے کسی کو دیکھتا ہے، یا اُن کی بھنک بھی سُنتا ہے ۲۰۴۲ع

النصف

ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں رحم بلا بدل نہیں - اگر اللہ تعالیٰ رحم بلا بدل بھی کر سکتا ہو تو اسے کسی بیٹے کی ضرورت نہیں جو انسانوں کے گناہوں کے لیے معاوضہ بنے اور عیسائیت نے ابنیت اور کفارہ کی بنیاد ہی اسی بنیاد پر رکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب تک کوئی بدلہ نہ لے اس وقت تک وہ گناہوں کو معاف نہیں کر سکتا۔ اور انسان کی نجات ناممکن ہو جاتی ہے تو اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر رحم بلا بدل اللہ تعالےٰ کی صفات میں سے ایک آن کے لیے بھی نکل جائے تو نہ آسمان باقی رہیں نہ زمین، نہ پہاڑ۔ خلق عالم اور نظام عالم کی بنیاد ہی رحم بلا بدل پر ہے۔ اسی سے معلوم ہوا کہ یہ عقیدہ دنیا میں نہیں رہ سکتا۔ مایَنبغی للرحمٰن ان یتخذ ولدا میں اس کو صاف بیان بھی کر دیا ہے کہ اگر رحمانیت مانی جائے تو عقیدۂ ابنیت باقی نہیں رہ سکتا۔

۲۰۳۸ع یعنی مخلوق کا کمال ہی عبد ہونے میں ہے اسی لیے محمداً عبدہٗ ورسولہ میں اصل عبدیت کو ہی رکھا ہے۔

۲۰۳۹ع یعنی عابد اور معبود سب خدا کے حضور اپنی اپنی ذمہ داری کو لیکر آئیں گے۔

۲۰۴۰ع یعنی پاک لوگوں کی محبّت خود بخود دنیا میں پیدا ہوتی چلی جاتی ہے جیسا کہ بخاری اور مسلم میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبّت کرتا ہے تو پہلے ملائکہ میں اس کی محبّت پیدا ہوتی ہے پھر وہ محبّت زمین میں پھیل جاتی ہے اور یہ قانون بالکل صحیح ہے جتنے اللہ تعالےٰ کے نیک بندے ہوئے ہیں ابتدا میں ان کی مخالفت بھی سخت ہوئی ہے مگر آہستہ آہستہ ان کی محبّت دنیا میں بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور یہاں شاید رسول اللہ صلعم کی قبولیت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ آپ کی محبّت دنیا میں یوماً فیوماً ترقی کرتی جائیگی۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہی عیسائی جنہوں نے کسی زمانہ میں آنحضرت صلعم کے متعلق ہر قسم کی بدزبانی کی اور غلطیوں کو پھیلایا اب انہی میں سے بہت سے دلوں میں آپ کی محبّت پیدا ہوتی جا رہی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار یہ قوم بھی آپ کو قبول کرلے گی اور عیسائیت پر اتمام حجت کے ذکر میں اس کو لانے سے اسی طرف اشارہ کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے۔

۲۰۴۱ع جن الفاظ سے سورۂ کہف کو شروع کیا تھا یعنی مومنوں کو بشارت اور ولد بنانے والوں کو انذار انہی پر سورۂ مریم کا خاتمہ کیا ہے سوائے اس کے کہ یہاں اتخاذ ولد کی بجائے ان کا قوم لُدّ ہونا بیان کیا ہے اس لیے کہ جس قدر جھگڑا اس قوم نے حق کے ساتھ کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا۔

۲۰۴۲ع رِکز۔ صوت خفی یعنی ہلکی آواز کو کہتے ہیں (رغ)

قوموں کی ہلاکت کا اٹل قانون: اللہ تعالیٰ نے اپنے اس اٹل قانون کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کس طرح قومیں دنیا میں بڑھتی اور ترقی کرتی ہیں۔ پھر اُن پر وہ وقت آتا ہے کہ ان کی صف لپیٹ لی جائے یہاں تک کہ ان کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ ہاں حق ہی ایک چیز ہے جو دنیا میں رہ جاتی ہے اور اسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔

اٰيَاتُهَا ١٣٥ (٢٠) سُوۡرَةُ طٰهٰ مَكِّيَّةٌ رُكُوۡعَاتُهَا ٨

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

طٰهٰ ۚ ① — اے مرد کامل ۲۰۴۳

مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ۙ ② — ہم نے تجھ پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ تو ناکام رہے ۲۰۴۴

اِلَّا تَذۡكِرَةً لِّمَنۡ يَّخۡشٰى ۙ ③ — بلکہ یہ اس کے لیے نصیحت ہے جو ڈرتا ہے۔

تَنۡزِيۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَالسَّمٰوٰتِ — اس کی طرف سے اتارا گیا ہے جس نے زمین اور بلند آسمانوں

نام: اس سورت کا نام طٰہٰ ہے اور اس میں آٹھ رکوع اور ۱۳۵ آیات ہیں اس کا نام اس کے پہلے حروف سے لیا گیا ہے جن سے یہ سورت شروع ہوتی ہے اور جن میں آنحضرت صلعم کو مرد کامل کے نام سے خطاب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ نور محمدی اپنے کمال کو پہنچ کر رہے گا گو ابتدا میں وہ ایک ہلال کی طرح نظر آئے اور اسی کمال کا ذکر ہی اس سورت میں ہے۔ پس اس کا نام اس کے مضمون کو ظاہر کرتا ہے۔

خلاصہ مضمون: اس سورت کی ابتدا ہی کامیابی کی بشارت سے کی ہے نہ صرف طٰہٰ کے لفظ میں آنحضرت صلعم کے کمال کی طرف اشارہ کر کے بلکہ اس کے ساتھ ہی صریح الفاظ میں یہ بتا کر کہ قرآن جیسی کتاب نازل کر کے یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کا مہبط دنیا میں ناکام رہے وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ پھر اس کے ساتھ حضرت موسیٰ کی بعثت کا ذکر کیا جس کی غرض بھی یہی بتانا ہے کہ باوجود ساری مشکلات کے جس طرح نور موسوی کمال کو پہنچا اسی طرح نور محمدی بھی ضرور ہے کہ اپنے کمال کو پہنچ کر رہے۔ حضرت موسیٰ کے ذکر کو جاری رکھتے ہوئے دوسرے رکوع میں ان کے اور حضرت ہارون کے فرعون کی طرف جانے کا تیسرے میں ان کے ساحروں سے مقابلہ کا اور چوتھے میں فرعون کی ہلاکت کا ذکر کیا اور اس کامیابی کے بعد بتایا کہ بنی اسرائیل اپنے مقام بلند سے گر کر عجل پرستی میں پڑ گئے۔ اور پانچویں رکوع میں عجل پرستی کے انجام کا ذکر کیا اور یوں مسلمانوں کو بتایا کہ اگر وہ بھی بنی اسرائیل کی طرح زینت دنیوی کے ظاہری سامانوں پر گر گئے تو یہ بات ان کے حصول مقصد میں روک ہو جائے گی۔ چھٹے رکوع میں ذکر قیامت میں بتایا کہ بڑی بڑی روکیں آخر دور ہو جائیں گی اور وہ انسان اور قومیں جو پہاڑوں کی طرح نظر آتی ہیں وہ بھی آخر رجوع الی الحق کریں گی۔ ساتویں رکوع میں بتایا کہ حق و باطل کا مقابلہ ہمیشہ سے رہا ہے اور حق ہی آخر کار غالب آیا کرتا ہے اور اس کو آدم اور شیطان کے قصہ سے واضح کیا۔ آٹھویں رکوع میں بتایا کہ حق کی آخری کامیابی اور مجرموں کی سزا دونوں امور یقینی ہیں یہ ہو کر رہیں گے اور یہ بھی بتایا کہ اس عذاب کی جو نبی کریم صلعم کے مخالفین پر آئے گا نوعیت کیا ہوگی۔

تعلق: پچھلی سورت میں عیسائیت کے عقاید باطلہ کی تردید کی تھی اور بتایا تھا کہ یہ عقیدہ ابنیت مسیح جس سے اسلام کو مقابلہ پڑے گا دنیا میں باقی نہیں رہ سکتا اور سورت کے آخری رکوع میں اشارہ کیا تھا کہ رسول اللہ کی محبت آخر کار دنیا میں پھیل جائے گی۔ اس سورت میں اسی مضمون کی زیادہ توضیح کی ہے اور بتایا ہے کہ قرآن کا لانے والا دنیا میں کبھی ناکام نہیں رہ سکتا۔ اور نہ اس کے مخالف اس عذاب ہلاکت سے بچ سکتے ہیں جو پہلے مکذبین پر آتا رہا۔ ہاں یہاں اس کی نوعیت بھی بتا دی ٭

زمانہ نزول: یہ سورت مکی ہے اور اس کا نزول بھی ابتدائی زمانہ سے ہی تعلق رکھتا ہے دیکھو بنی اسرائیل کے زمانہ نزول پر نوٹ۔ اور حضرت عمرؓ کے اسلام کی تاریخ میں صاف آتا ہے کہ یہی وہ سورت تھی جس کو سنکر حضرت عمرؓ کانپ اٹھے اور قاتلانہ ارادہ کو چھوڑ کر غلامی کی حیثیت میں دربار نبوی میں جا حاضر ہوئے۔ یہ بھی اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت اس وقت لکھی ہوئی موجود تھی۔ پس اس کا نزول بھی پانچویں سال بعثت کے قریب قریب کا ہے ٭

۲۰۴۳ طٰہٰ۔ بعض لغتوں میں یا رجل کی جگہ بولا جاتا ہے یعنی اے مرد (ج) اور اس کے نکرہ رکھنے میں عظمت اور کمال کی طرف اشارہ ہے اور روح المعانی میں باب الاشارہ میں ہے کہ طٰہٰ کے عدد چودہ ہیں اور یہ مرتبہ بدریہ کی طرف اشارہ ہے (د) یا یہ کہ نور محمدی جس کا انکار کیا جائے گا چودھویں کے چاند کی طرح اپنے کمال کو پہنچے گا اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ حق جو شروع میں ایک ہلال کی طرح تھا ٹھیک اپنے چودھویں سال میں یوں کمال کو پہنچا کہ اس کی قبولیت کو استحکام حاصل ہوا اور اس کے مخالفوں کی قوت و شوکت ٹوٹ گئی کیا عجب ہے کہ چودھویں صدی میں پھر ایک دفعہ یہ نور محمدی جس کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے از سر نو بدر ہو کر چمکے۔ والقمر قدرناہ منازل حتّٰی عاد کالعرجون القدیم (یٰس ۳۶-۳۹)٭

۲۰۴۴ شقاوۃ سعادت کی ضد ہے دیکھو ۱۵۰۴ اور اس کے معنی ہیں بھلائی کے پانے سے یا اعانت الٰہی سے محرومی۔ پس مراد یہ ہے کہ اتنی بڑی عظیم الشان اور کامل کتاب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر نازل کی ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ پیغمبر اس غرض کے حصول میں ناکام رہے جس کے لیے وہ کتاب نازل کی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر کتاب اس لیے نازل کی ہے کہ تم مخلوق الٰہی کو ہدایت پر لا سکو اس لیے یہ لازمی ہے کہ تم کامیاب بھی ہو۔ چونکہ پچھلی سورت کے آخر پر

الْعُلٰى ﴿٤﴾
کو پیدا کیا ۲۰۴۴ؑ

الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴿٥﴾
وہ رحمٰن (رہے جو) عرش پر قائم ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ﴿٦﴾
اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو ان دونوں کے درمیان ہے اور جو گیلی مٹی کے نیچے ہے ۲۰۴۵ؑ

وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ﴿٧﴾
اور اگر تو پکار کر بات کہے تو وہ بھید کو اور اس سے مخفی بات کو بھی جانتا ہے ۲۰۴۶ؑ

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ﴿٨﴾
اللہ، اس کے سوائے کوئی معبود نہیں اچھے نام اسی کے ہیں۔

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿٩﴾
اور کیا تجھے موسیٰؑ کی خبر پہنچی ہے؟ ۲۰۴۷ؑ

اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّىْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ﴿١٠﴾
جب اسے آگ دکھائی دی تو اپنے گھر والوں سے کہا ٹھیرو میں نے آگ دیکھی ہے، شاید میں تمھارے پاس اس میں سے (ایک) شعلہ لے آؤں یا (اسی) آگ پر رستہ پاؤں ۲۰۴۸ؑ

ایک سخت جھگڑالو قوم کا ذکر کیا تھا اس لیے اب تشفی دیتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ سے آخر دنیا ہدایت کو قبول کرے گی۔

۲۰۴۴ؑ عُلٰے۔ عُلیا کی جمع ہے اور عُلیا اعلےٰ کی تانیث ہے اور یہاں مراد ہے کہ اس عالم کی نسبت وہ اشرف اور افضل ہیں (غ)

۲۰۴۵ؑ ثریٰ۔ اصل میں گیلی مٹی کو کہتے ہیں حدیث میں ہے فاذا کلب یاکل الثری من العطش ایک کتا پیاس کی وجہ سے گیلی مٹی چاٹ رہا تھا (ل) اور اسی مادہ سے ثروت ہے جو کثرت کو کہتے ہیں اور ثُریّا کواکب میں سے ہے (ل) پس تحت الثریٰ سے مراد ہے زمین کے اندر اور مفسرین نے کہیں ساتویں زمین اور کہیں صخرۃ مراد لیا ہے۔

۲۰۴۶ؑ اخفٰی یعنی جو سِرّ یا بھید سے بھی زیادہ مخفی ہے مثلاً وہ خیال جو دل میں گزرے یا اس سے بھی مخفی جو ابھی انسان کے دل میں بھی نہیں آیا۔

۲۰۴۷ؑ جب حضرت موسیٰ اپنے محدود پیغام کے ساتھ بھی ناکام نہیں رہے تو محمّد رسول اللہ صلعم کس طرح ناکام رہ سکتے ہیں یہ اصل غرض معلوم ہوتی ہے جس کے لیے حضرت موسیٰ کا ذکر یہاں شروع کیا ہے۔ اس سورت میں حضرت موسیٰ کے ذکر کو وحی کی ابتدا سے شروع کرکے ساری شریعت کے ان پر نازل ہونے تک پانچ رکوعوں میں بڑے بسط سے بیان کیا ہے۔ اور غالباً بلحاظ نزول یہ سب سے پہلی سورت ہے جس میں اس قدر بسط کے ساتھ حضرت موسےٰ کا ذکر ہے۔

۲۰۴۸ؑ قبس۔ وہ ہے جو شعلہ سے یعنی جلتی ہوئی آگ میں سے لے لیا جائے قَبَس اور اِقتباس اس کا طلب کرنا ہے پھر علم اور ہدایت کے طلب کرنے پر استعارۃً بولا جاتا ہے انظرونا نقتبس من نورکم (الحدید ۵۷- ۱۳) (غ)

یہاں حضرت موسیٰ پر نزول وحی کی ابتدا کا ذکر کیا ہے۔ اور جو کچھ یہاں فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت موسیٰ سفر میں تھے اور آپ کے اہل آپ کے ساتھ تھے اور یہ سفر مدین سے مصر کی طرف واپسی کا تھا جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا فلبثت فی اھل مدین ثم جئت علٰی قدر یا موسیٰ (۴۰) - اور طور کی جانب میں یہ واقعہ پیش آیا فلما قضٰی موسی الاجل وسار باھلہ اٰنس من جانب الطور نارا (القصص ۲۸ - ۲۹) انہوں نے آگ دیکھی۔ یہ آگ کیسی تھی؟ یہ تو اگلی آیات سے ثابت ہے کہ یہ وہ آگ نہ تھی جو جلانے کا کام دیتی ہے۔ روح المعانی میں ہے کہ آگ کو لوگوں نے چار قسم کہا ہے۔ ایک وہ جس میں نور ہے اور وہ جلاتی بھی ہے جیسے اس دنیا کی آگ۔ اور ایک وہ جس میں نہ نور ہے نہ وہ جلاتی ہے جیسے درختوں کی آگ۔ اور ایک وہ جس میں نور نہیں مگر وہ جلاتی ہے جیسے جہنم کی آگ اور ایک وہ جس میں نور ہے اور وہ جلاتی نہیں جیسے وہ آگ جو حضرت موسیٰ نے دیکھی۔

حضرت موسیٰ کا کشف: اور غرائب القرآن میں ہے کہ اس بات میں اختلاف ہوا ہے کہ وہ چیز جو حضرت موسیٰ نے دیکھی تھی آگ تھی یا نہیں اور پھر اس قول کو بیان کرکے کہ وہ آگ ہی تھی ورنہ موسیٰ اپنی خبر میں صادق نہیں ٹھہرتے لکھا ہے کہ اگر وہ آگ سے مشابہ ہو تو بھی کذب لازم نہیں آتا مگر میرے نزدیک یہاں رأٰ کا مفہوم وہ نہیں جو خیال کیا گیا ہے جب حضرت یوسف نے کہا تھا انّی رأیت احد عشر کوکبا والشمس والقمر رأیتھم لی ساجدین تو وہ کوکب اور سورج اور چاند تو اپنی جگہ پر ہی رہے تھے پھر انبیاء علیہم السلام کی ایک رویت حالت منام میں ہے اور ایک رویت حالت کشف میں اور ایک حالت وحی میں اور ایک رویت عام واقعات کی جیسے عام انسانوں میں اب یہ رویت عام واقعات کی تو نہ تھی کیونکہ وہ آگ ایسی نہ تھی جس میں سے حضرت موسیٰ جلتی

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۱﴾	سو جب اس کے پاس آیا آواز آئی اے موسیٰ!
اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۲﴾	میں تیرا رب ہوں، سو تو اپنی جوتیاں اتار دے تو پاک وادی طوےٰ میں ہے [2049]
وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴿۱۳﴾	اور میں نے تجھے چن لیا سو اسے سن جو وحی کی جاتی ہے [2050]
اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾	میں اللہ ہوں میرے سوائے کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کر۔ اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کر۔

ہوئی لکڑی اٹھالائے۔ اور یہ حالت خواب بھی نہیں اور وحی کا نزول بھی ابھی آپ پر نہیں ہوا۔ پس یہ کشف کی حالت ہے اور کشف میں انسان حالتِ بیداری میں ایک واقعہ کو دیکھتا ہے مگر وہ واقعہ دوسرے عالم کا ہوتا ہے اسی حالت کشف میں حضرت موسیٰ نے آگ کو دیکھا اور یہ کہنا کہ اگر سچ مچ وہاں آگ نہ ہو تو خبر میں کذب لازم آتا ہے۔ صحیح نہیں اس لیے خبر تو اس بات کی دی ہے کہ اس نے آگ دیکھی سو اس کا دیکھنا بالکل حق تھا۔

اجد علی النار ھدی کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہاں کوئی رستہ بتانے والا مل جائے اور یہ بھی کہ وہاں ہدایت دینی ملے اسی دوسرے معنی کے قریب قریب معنے مجاہد اور قتادہ سے مروی ہیں (ر) یہ دوسرے معنی ہی یہاں موزوں ہیں۔ گویا حضرت موسیٰ کو خود بھی ظن غالب یہ تھا کہ یہ کشفی نظارہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ہدایت دینی ملنے والی ہے اور میرے نزدیک (القصص ۲۸-۲۹) میں خبر سے مراد بھی یہی ہے۔

2049 اخلع نعليك۔ خَلع کے معنے ہیں اتار دینا اور نعل کے معنی ہیں جوتی اور رجلٌ ناعلٌ اور مُنْعَلٌ غنی کو کہتے ہیں جیسے حافر (ننگے پاؤں والا) فقیر کو کہتے ہیں (غ) اور اخلع نعليك کے معنے دو طرح پر کیے گئے ہیں یعنی ظاہر پر اس لحاظ سے کہ وہ مردہ گدھے کے چمڑے کی تھیں۔ اور بعض صوفیوں کا قول ہے کہ یہ ایک مثال ہے اور یہ امر ہے اقامت اور مضبوط ہو جانے کے لیے جیسا کہ تم اس شخص کو جسے کہنا ہو کہ مضبوط ہو جاؤ کہتے ہو اپنے کپڑے اور موزے اتار لو (غ) اور نعل سے وہ چیز بھی مراد لی جاتی ہے جو آرام کا موجب ہو اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں۔ اہل اور مال سے اپنے دل کو خالی کر دے (ر)؛

طوی۔ طَوٰی (مصدر طَیّ) کے معنی ہیں لپیٹنا۔ یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب (الانبیاء ۲۱-۱۰۴) اور یہاں طُوًی اس وادی کا نام بھی ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ اس حالت کی طرف اشارہ ہے جو حضرت موسیٰ کو طریق اجتباء پر حاصل ہوئی گویا کہ اس پر مسافت لپیٹ لی گئی اگر اجتہاد سے اس تک پہنچنا ہوتا تو وہ اس سے دور رہتے (غ) اور بعض کے نزدیک طُوًی اور طِوًی کے ایک ہی معنی ہیں اور وہ وہ چیز ہے جو دوہرائی گئی ہو اور طُوًی کے معنی کئے گئے ہیں۔ طِوَی مرتین یعنی دو بار پاک کی گئی۔ اور حسن کا قول ہے کہ اس میں برکت اور تقدیس دوچند کی گئی (ل) اور بعض نے یہاں معنی لیے ہیں کہ اس کے رب نے اسے دوبار بلایا اور مجاہد نے دو بار پاک کی گئی اور برکت دی گئی معنی لیے ہیں (ج) اور دو بار برکت سے مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ پہلے بھی ارض مقدس یا مبارک سرزمین میں ہے اور پھر حضرت موسیٰ کو وہاں وحی ملنے سے اس کی برکت دوچند ہو گئی؛

ظاہر ہے کہ جس کا ذکر پہلی آیت اور اس آیت میں ہے وحی الٰہی ہے اذ ناده ربه بالواد المقدس طوی (النزعٰت ۷۹-۱۶) اور پکارنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے وہ آواز کسی درخت کی نہیں اور انی انا ربك سے بھی یہی ظاہر ہے اور وحی جس طرح پر انبیاء کو ہوتی ہے اسی طرح حضرت موسیٰ کو ہوئی۔ اور بعض لوگوں نے جو یہاں پر بحث کی ہے کہ لفظ کوئی نہ تھے تو یہ صحیح نہیں وحی متلو میں ہمیشہ لفظ ہوتے ہیں اور یہ سب سے اعلیٰ مرتبہ وحی کا ہے البتہ وحی خفی میں ایک بات دل میں ڈالی جاتی ہے اس میں الفاظ نہیں ہوتے۔ اور جوتیاں اتارنے سے کیا مراد ہے۔ آیا ظاہر طور پر بلحاظ جگہ کی تقدیس کے ہے۔ اکثر مفسرین کا یہی خیال ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جوتی میں رہ کر بھی اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی ہو سکتی ہے جیسا کہ خود حضرت موسیٰ کو ہوئی۔ اور پاک جوتی ہو تو پاک جگہ پر اس کے جانے میں بھی کوئی ہرج نہیں جیسا کہ پاک جوتی کے ساتھ مسجد میں بھی جانا جائز ہے۔ اور در حقیقت اگر جوتی میں ہو کر اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کا مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے تو کسی پاک مقام پر پاک جوتی کا جانا منع نہیں ہو سکتا اس لحاظ سے دوسرے معنی جو اوپر دیئے گئے ہیں۔ زیادہ موزوں ہیں یعنی یا تو یہ حضرت موسیٰ کو حکم ہے کہ وہ مضبوط ہو کر اس کام کو اختیار کریں اور یا یہ مطلب ہے، کہ اب دنیا کے فکروں کو چھوڑ کر تبلیغ کو اختیار کریں۔ ورنہ وحی ہوتے ہوتے درمیان میں جوتیاں اتارنے کی بظاہر کوئی ضرورت نظر نہیں آتی۔ جیسا نبی کریم صلعم کو حکم ہوا۔ وثیابك فطهر (المدثر ۷۴-۴) تو مراد اس سے عمل صالح کا کرنا یا تطہیر نفس ہے؛

2050 اخترتك۔ اختیار سے ہے (مادہ خیر ہے) اور اختیار کے معنی ہیں اس کا طلب کرنا جو خیر ہے اور اس کا کرنا اور کبھی اس پر بولا جاتا ہے جسے انسان خیر سمجھے گو وہ خیر نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کو اختیار کرنے میں جیسے یہاں اور اخترنهم على علم على العالمين (الدخان ۴۴-۳۲) میں یہ بھی صحیح ہے کہ اشارہ ان کے نیک پیدا کرنے کی طرف ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اشارہ یہ ہو کہ انہیں دوسروں پر مقدم کیا ہے (غ) اور عرف متکلمین میں مختار اس فعل

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ⑮

وہ گھڑی ضرور آنے والی ہے میں اسے مخفی ہی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر نفس کو اس کے مطابق بدلہ دیا جائے جو وہ کوشش کرتا ہے ۲۰۵۱۔

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ⑯

تجھے اس سے وہ شخص نہ روکے جو اس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے سو تو ہلاک ہو جائے ۲۰۵۲۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ⑰

اور اے موسیٰ یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟

قَالَ هِىَ عَصَاىَۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِىْ وَلِىَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ⑱

اس نے کہا یہ میرا عصا ہے میں اس پر سہارا لگاتا ہوں اور اس سے میں اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے لیے اور بھی فائدے ہیں ۲۰۵۳۔

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ⑲

کہا اے موسیٰ اسے ڈال دے۔

فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِىَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ⑳

سو اُسے ڈال دیا تو کیا دیکھا کہ وہ سانپ ہے (جو) دوڑ رہا ہے ۲۰۵۴۔

کو کہا جاتا جیسے انسان مجبوری سے نہیں کرتا اسی سے کہا جاتا ہے فلاں شخص اسباب میں مختار ہے (غ)۔

۲۰۵۱ قیامت کا مخفی رکھنا:۔ اخفی۔ خفی (یخفی) کے معنی دونوں طرح پر آتے ہیں اور یہ اضداد میں سے ہے یعنی چھپایا اور ظاہر کیا۔ لیکن اَخفی (یُخفِی) مصدر اِخفاء کے معنی صرف چھپانا ہیں (ل) لیکن اکاد یہاں بمعنی ارید ہے بعض نے یہاں قرأت اَخفیہا لی ہے جس کے معنی اظھرھا ہوں گے مگر ابو علی نے اخفیہا کے معنی بھی اظھرھا لیے ہیں (د) اکاد اخفیہا جملہ معترضہ کے طور پر ہے۔ یعنی وہ قیامت کبریٰ جو انسان کے اعمال کی جزا و سزا سے قائم ہو گی۔ اس کو اللہ تعالیٰ انسان کی نظروں سے مخفی ہی رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اعمال کی جزا و سزا خود ایک مخفی چیز ہے جس کا ظہور صرف قیامت میں ہو گا۔

۲۰۵۲ عنہا میں اور بہا میں ضمیریں یا دونوں ساعت کی طرف جاتی ہیں یا دونوں صلوٰۃ کی طرف یا پہلی صلوٰۃ کی طرف اور دوسری ساعت کی طرف (د) یعنی تجھے ساعت سے نہ روکے یا نماز سے نہ روکے وہ شخص جو ساعت پر ایمان نہیں لاتا یا وہ شخص جو نماز پر ایمان نہیں لاتا۔ اور ہو سکتا ہے کہ ضمیر عنہا میں فعل مفہوم کی طرف جاتی ہو یعنی تبلیغ امرحق سے نہ روکے اور اس پر دلیل یہ ہے۔ کہ اس کے ساتھ ہی آیات دی ہیں۔ جو تبلیغ سے روکنے والوں کے مقابلہ پر ہیں۔

۲۰۵۳ اھش۔ ھَشّ۔ ھشّ کے قریب قریب ہے۔ یعنی اس کے معنی تحریک ہیں اور لاٹھی سے پتے جھاڑنے پر بولا جاتا ہے (غ)۔

مآرب۔ مَاْرُبَۃ کی جمع ہے اور یہ اَرِبَ سے مصدر ہے اور اَرَب سخت حاجت کو کہتے ہیں جس کے لیے حیلہ کرنا پڑے (غ) اور اولی الاربۃ من الرجال (النور ۲۴-۳۱) میں اِربۃ سے مراد نکاح کی حاجت ہے۔

وحی کی حالت میں بندے کی طرف سے سوال اور پھر بذریعہ وحی اس کا جواب بھی ہو سکتا ہے یہاں وحی کے درمیان حضرت موسیٰ کا جواب ایسا ہی ہے۔ جیسے آنحضرت صلعم کو جب وحی ہوئی تو اسی حالت وحی میں آپ نے تین بار فرمایا ما انا بقاریٔ۔

۲۰۵۴ حضرت موسیٰ کے عصا کا ابتدائے نزول وحی میں باریک سانپ بننا اور فرعون کے سامنے اژدہا بننا اور اس کا مفہوم: حیۃ سانپ کو کہتے ہیں اور یہ حیاۃ بمعنی زندگی سے مشتق ہے بوجہ اپنی زندگی کے طول کے (ل) اور چھوٹے بڑے دونوں پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں تین جگہ یہ ذکر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو وحی کی اور عصا ڈالنے کو کہا تو وہ سانپ بن گیا۔ ایک یہاں اور اسے حیّۃ کہا ہے دوسرا (النمل ۲۷-۱۰) میں اور تیسرا (القصص ۲۸-۳۱) جہاں دونوں جگہ اسے جانّ کہا ہے اور جانّ باریک سانپ کو کہتے ہیں اور دو جگہ یہ ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کے سامنے عصا ڈالا تو وہاں دونوں جگہ ثعبان کا لفظ ہے یعنی اژدہا (الاعراف-۱۰۷) اور (الشعراء ۲۶-۳۲) اور ساحروں کے مقابلہ پر جہاں ڈالنے کا حکم ہے تو وہاں ان دونوں میں سے کوئی لفظ اختیار نہیں فرمایا صرف یہ فرمایا ہے کہ جو کچھ ساحروں نے بنایا تھا۔ عصا اسے نگل گیا (الاعراف-۱۱۷) (طٰہٰ ۲۰-۶۹) (الشعراء ۲۶-۴۵) یہ فرق بلاوجہ نہیں ہو سکتا ظاہر ہے کہ جب حضرت موسیٰ کو اکیلے عصا کا سانپ بننا دکھایا گیا ہے تو یہ معجزہ نہیں کیونکہ معجزہ کی ضرورت منکر کے لیے ہوتی ہے اور حضرت موسیٰ منکر نہ تھے نہ یہ بتانے کو ہے کہ اس عصا میں یہ خاصیت ہے کہ جب ڈالا جائے گا تو سانپ بن جائے گا۔ کیونکہ نہ صرف اس کے حضرت موسیٰ کی ساری زندگی میں سوائے فرعون کے مقابلہ پر سانپ بننے کا ذکر نہیں کیا بلکہ خود ساحروں کے مقابل پر بھی حضرت موسیٰ نے عصا نہیں ڈالا۔ جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نہیں ہوئی پس ہر جگہ پر عصا ڈالنے اور اس کے سانپ بننے کی الگ غرض ہے۔ اور حضرت موسیٰ کو اپنے طور پر اس کیفیت کے دکھانے کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی قوم کو اللہ تعالیٰ زندہ کریگا۔ اور فرعون کے مقابل پر اژدہا بنانے کا یہ منشا ہے کہ آپ کی جماعت اسے اور اس کی افواج کو کھا جائے گی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عصا سانپ یا اژدہا نہیں بنا تھا بلکہ یہ مطلب ہے کہ سانپ یا اژدہا بننے کے نیچے یہ مفہوم تھا۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ ﴿٢١﴾
کہا اسے پکڑ لے اور ڈر نہیں، ہم اسے اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے ع۲۰۵۵

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ ﴿٢٢﴾
اور اپنا ہاتھ اپنے پہلو سے لگا، وہ سفید نکل آئے گا، بغیر اس کے کہ اس میں کوئی بُرائی ہو (یہ) دوسرا نشان (ہے)

لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى ﴿٢٣﴾
تاکہ ہم تجھے اپنے بہت بڑے نشانوں میں سے دکھائیں ع۲۰۵۶

اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ﴿٢٤﴾ ع
فرعون کی طرف جا کہ وہ حد سے نکل گیا ہے۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿٢٥﴾
(موسیٰ نے) کہا میرے رب میرا سینہ کھول دے۔

وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ﴿٢٦﴾
اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے۔

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي ﴿٢٧﴾
اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔

يَفْقَهُوا قَوْلِي ﴿٢٨﴾
تاکہ میری بات کو سمجھ لیں ع۲۰۵۷

وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا مِنْ أَهْلِي ﴿٢٩﴾
اور میرے ساتھیوں میں سے ایک میرا بوجھ بٹانیوالا بنا دے۔

هَارُونَ أَخِي ﴿٣٠﴾
ہارون میرا بھائی ع۲۰۵۸

ع۲۰۵۵ سیرت۔ سیر چلنے کا نام ہے اور سیرت وہ حالت ہے جس پر انسان ہو قدرتی ہو یا اکتساب سے حاصل ہوئی ہو جیسے کہا جاتا ہے اس کی سیرت اچھی ہے اس کی سیرت بری ہے۔ اور یہاں مراد ہے اس کی پہلی یعنی لکڑی ہونے کی حالت (غ)۔
اس سے معلوم ہوا کہ عصا کے سانپ ہونے کی حالت محض ایک وقتی حالت تھی۔

ع۲۰۵۶ لنریك من اٰیاتنا الکبری کے معنی یوں بھی کر لیے گئے ہیں کہ یہی بڑی نشانیاں ہیں جو ہم تمہیں دکھانا چاہتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک مطلب یہ ہے کہ یہ نشان جو ہم نے دکھائے ہیں اس لیے دکھائے ہیں تاکہ اس سے بھی بڑے نشان تمہیں دکھائیں اور اس سے بڑے نشانوں سے مراد وہی غلبہ ہے جس کی طرف ان نشانات میں اشارہ تھا۔

ع۲۰۵۷ شرح صدر کے لیے دیکھو ع۱۰۱۴ مراد دلائل کا ملنا ہے اور یسر میں مشکلات کے دور ہونے کی دعا ہے اور عقدہ لسان کے کھلنے سے مراد جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے۔ قوت بیانی میں جو نقص ہے اس کا دور کیا جانا ہے دیکھو ع۲۰۰۸ اور قرآن شریف نے خود بھی یہی فرمایا ہے کیونکہ ایک جگہ فرعون کا اعتراض ہے ولا یکاد یبین (الزخرف ۴۳-۵۲) یعنی موسیٰ میں قوت بیانی نہیں۔ اور حضرت موسیٰ خود ہارون کا ذکر کر کے فرماتے ہیں ھو افصح منی لسانا (القصص ۲۸-۳۴) اور خود اپنے متعلق فرماتے ہیں ویضیق صدری ولا ینطلق لسانی (الشعراء ۲۶-۱۳) پس یہ خیال کہ حضرت موسیٰ کی زبان (جارحہ) میں کوئی گرہ تھی صحیح نہیں اور یہاں عصا اور ید بیضا کا نشان مل جانے کے بعد حضرت موسیٰ تین باتوں کے لیے دعا کرتے ہیں۔ اوّل شرح صدر یعنی اعلیٰ درجہ کی دلائل میسر آجائیں۔ دوسرے ان دلائل کے پیش کرنے میں جو مشکلات اور رکاوٹیں ہیں وہ دور ہو جائیں۔ تیسرے فصاحت لسانی ملے اور ان سب کا نتیجہ یہ کہ آپ کے مخاطب اصل بات کو اچھی طرح سمجھ لیں جس سے صاف معلوم ہوا کہ تبلیغ حق کے لیے ان باتوں کی ضرورت حضرت موسیٰ کو تھی جیسے آج ہر مبلغ کو ہے۔

ع۲۰۵۸ وزیر۔ بمعنی مُوازِر ہے اور بادشاہ کے وزیر کو وزیر اس لیے کہا جاتا ہے کہ تدبیر مملکت کا جو بوجھ بادشاہ پر ہے۔ وہ اسے اٹھاتا ہے (ل) اور موازرۃ بمعنی معاونت ہے (غ)۔

حضرت موسیٰ کی درخواست ہارون کو نبی بنانے کی نہیں اپنا معاون بنانے کی ہے؛ حضرت موسیٰ کی یہ دوسری درخواست جناب باری میں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے قبضہ سے نکالنے کے لیے اور اس کی سارے پہلوؤں میں اصلاح کے لیے حضرت موسیٰ نے اپنے آپ کو کافی نہیں سمجھا اور ایک مددگار ساتھ چاہا ہے۔ اور اس مددگار کو نام سے مخصوص کیا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت موسیٰ نے دعا کی تھی کہ ہارون کو نبی بنا دیا جائے ایسی کسی دعا کا قرآن شریف میں کوئی ذکر نہیں اور فارسل الی ھٰرون (الشعراء ۲۶-۱۳) اور فارسلہ معی (القصص ۲۸-۳۴) سے بھی یہ مراد نہیں کہ اسے رسول بنا دے بلکہ اپنے ساتھ فرعون کی طرف بھیجا جانے کی درخواست ہے اور حضرت موسیٰ کی اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یہ علم تھا کہ ان کے بھائی ہارون کو نبوت مل

اشۡدُدۡ بِهٖۤ اَزۡرِیۡ ﴿۳۱﴾

میری قوت کو اس کے ساتھ مضبوط کر ۲۰۵۹

وَ اَشۡرِکۡهُ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ﴿۳۲﴾

اور میرے کام میں اسے شریک کر ۲۰۶۰

کَیۡ نُسَبِّحَكَ کَثِیۡرًا ﴿۳۳﴾

تاکہ ہم تیری بہت تسبیح کریں۔

وَّ نَذۡکُرَكَ کَثِیۡرًا ﴿۳۴﴾

اور تجھے بہت یاد کریں۔

اِنَّكَ کُنۡتَ بِنَا بَصِیۡرًا ﴿۳۵﴾

تو ہمیں ہر حال میں دیکھتا ہے۔

قَالَ قَدۡ اُوۡتِیۡتَ سُؤۡلَكَ یٰمُوۡسٰی ﴿۳۶﴾

کہا اے موسیٰ تیری درخواست منظور ہوئی ۲۰۶۱

وَ لَقَدۡ مَنَنَّا عَلَیۡكَ مَرَّةً اُخۡرٰۤی ﴿۳۷﴾

اور یقیناً ہم نے تجھ پر ایک بار اور احسان کیا۔

اِذۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّكَ مَا یُوۡحٰۤی ﴿۳۸﴾

جب ہم نے تیری ماں کی طرف وحی کی جو (اب) وحی کی جاتی ہے:

اَنِ اقۡذِفِیۡهِ فِی التَّابُوۡتِ فَاقۡذِفِیۡهِ فِی الۡیَمِّ فَلۡیُلۡقِهِ الۡیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاۡخُذۡهُ عَدُوٌّ لِّیۡ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَ اَلۡقَیۡتُ عَلَیۡكَ مَحَبَّةً مِّنِّیۡ ۬ۚ وَ لِتُصۡنَعَ عَلٰی عَیۡنِیۡ ﴿۳۹﴾

کہ اسے صندوق میں ڈال دے، پھر اس (صندوق) کو دریا میں ڈال دے تو دریا اسے کنارے پر ڈال دے گا۔ تاکہ میرا ایک دشمن اور اس کا دشمن اسے لے لے اور میں نے تجھ پر اپنی طرف سے محبت ڈالی۔ اور تاکہ میرے سامنے تیری تربیت کی جائے ۲۰۶۲

چکی ہے (اور یہ حضرت موسیٰ سے بڑے تھے) پس ان کی درخواست یہ ہے کہ کام مشترک طور پر دونوں کے سپرد ہو تاکہ ایک دوسرے کی قوت کا موجب ہوں۔ جیسا کہ اشدد بہ ازری واشرکہ فی امری سے ظاہر ہے۔ سلسلہ کی ابتدا اور انتہا کو چونکہ زیادہ وقعت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے سلسلہ اسرائیلی کی ابتدا میں بھی دو نبی پائے جاتے ہیں۔ یعنی موسیٰ اور ہارون اور انتہا میں بھی دو ہیں یعنی عیسیٰ اور یحییٰ ؏

۲۰۵۹ ازر۔ اس کی اصل اِزار سے ہے جو لباس ہے۔ اور اَزْر قوت شدید کو کہتے ہیں۔ اور اٰزرہ اسے مدد دی اور مضبوط کیا اخرج شطاہ فاٰزرہ (الفتح ۴۸-۲۹) (غ)

۲۰۶۰ امر سے مراد یہاں امر تبلیغ و دعوت الی الحق ہے۔ نہ نبوت ؏

۲۰۶۱ سؤل۔ فُعل بمعنی مفعول ہے یعنی مسئول۔ اور سوال کے لیے دیکھو ۲۱۵ ؏

۲۰۶۲ اقذفی۔ قذف کے معنی دور پھینکنا ہیں اور یہاں معنی طرح یعنی ڈال دینا ہیں وقذف فی قلوبہم الرعب (الاحزاب ۳۳-۲۶) بل نقذف بالحق علی الباطل (الانبیاء ۲۱-۱۸) ویقذفون من کل جانب (الصّٰفّٰت ۳۷-۸) اور استعارۃً شتم اور عیب بھی اس کے معنی آتے ہیں (غ) ؏

یم - یَمّ کے معنی دریا یا سمندر ہیں اور اس کے معنی قصد کرنا بھی آتے ہیں جس سے تیمم ہے (غ) ؏

تصنع - صُنع کے معنی ہیں اجادۃ الفعل یعنی کام کا اچھا بنانا۔ اور اِصطناع کسی چیز کی اصلاح میں کمال کر دینا ہے اور واصطنعتك لنفسی اور ولتصنع علی عینی میں اشارہ اسباب کی طرف ہے جیسا کہ بعض حکما نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کے لیے تعاہد کرتا ہے جس طرح دوست دوست کے لیے تعاہد کرتا ہے (غ) اور صَنَعَ الفرس سے مراد ہے گھوڑے کی نگہداشت نہایت خوبی سے کی اور صنع جاریۃ کے معنی ہیں لونڈی کی تربیت کی اور لتصنع علی عینی کے معنی ہیں تاکہ میرے سامنے تیری تربیت کی جائے (ل) اور صَنَعَ کے معنی احسان بھی کئے گئے ہیں یعنی مراد یہ ہے کہ تا تیری پرورش مہربانی اور شفقت سے ہو (د) علی عینی سے مراد ہے میرے سامنے گویا میں دیکھ رہا ہوں اور کوئی امر میرے خلاف منشا تم میں نہیں ہو سکتا ؏

یہاں اللہ تعالیٰ نے اس وحی کا ذکر کیا ہے جو حضرت موسیٰ کی والدہ کو ہوئی۔ کہ اپنے بچہ کو صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دے اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت کے سامان پیدا کر دیگا۔ اور ایسا ہی انہوں نے کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وحی الٰہی غیر نبی کو بھی (کیونکہ حضرت موسیٰ کی والدہ نبیہ نہ تھیں) ایسی ہی یقینی ہو سکتی ہے جیسے نبی کو لیکن ہمیں جو امور ظاہر کئے جاتے ہیں وہ اور رنگ کے ہوتے ہیں اگر حضرت موسیٰ کی والدہ کو اس وحی کے منجانب اللہ ہونے کا یقین کامل نہ ہوتا تو وہ اپنے بچہ کو اس کی بنا پر دریا میں نہ ڈال سکتی تھیں۔ فرعون کو یہاں اللہ تعالیٰ کا دشمن کہا ہے اس لیے کہ وہ حق کا دشمن تھا۔ اور حضرت موسیٰ کا بھی دشمن کہا ہے یا تو اس لحاظ سے کہ وہ آگے چل کر دشمن ثابت ہوا اور یا اس لیے کہ وہ بنی اسرائیل کے سب بچوں کا دشمن تھا ؏

إِذْ تَمْشِيٓ أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَن يَكْفُلُهُۥ ۖ فَرَجَعْنَٰكَ إِلَىٰٓ أُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَٰكَ مِنَ ٱلْغَمِّ وَفَتَنَّٰكَ فُتُونًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِيٓ أَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَٰمُوسَىٰ ﴿٤٠﴾

جب تیری بہن گئی اور کہا کیا میں تمھیں بتاؤں جو اس کی پرورش کو اپنے ذمہ لے، سو ہم نے تجھے تیری ماں کی طرف لوٹایا تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ غم نہ کرے اور تو نے ایک شخص کو مار ڈالا، سو ہم نے تجھے غم سے نجات دی اور ہم نے تجھے طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا کیا، پھر تو مدین کے لوگوں میں کئی سال رہا، پھر تو اے موسیٰ ایک اندازے پر آگیا ٢٠٦٣

وَٱصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِى ﴿٤١﴾

اور میں نے تجھے اپنے لیے کمال خوبی میں بنایا ٢٠٦٤

ٱذْهَبْ أَنتَ وَأَخُوكَ بِـَٔايَٰتِى وَلَا تَنِيَا فِى ذِكْرِى ﴿٤٢﴾

تُو اور تیرا بھائی میری آیتوں کے ساتھ جاؤ اور میرے ذکر میں سستی نہ کرنا ٢٠٦٥

ٱذْهَبَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُۥ طَغَىٰ ﴿٤٣﴾

دونوں فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ حد سے نکل گیا ہے۔

فَقُولَا لَهُۥ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُۥ يَتَذَكَّرُ

سو اُسے نرم بات کہو، شاید وہ نصیحت پکڑے یا

اللہ تعالیٰ کے حضرت موسیٰ پر محبت ڈالنے میں یہ بتایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی محبت قلوب میں پہلے سے ہوتی ہے یہ حضرت موسیٰ کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ اس قسم کے الفاظ سب ہی انبیاء پر صادق آتے ہیں خود ہمارے نبی کریم صلعم پر اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبت ڈالی گئی تھی اور کوئی دل نہ تھا جو آپ کی محبت سے خالی ہوتا۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ میرے سامنے تو اچھا بنایا جائے ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کے لیے پرورش کے سامان بھی ایسے مہیا فرما دیتا ہے کہ ان کی تربیت اچھی ہو اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اس لیے کہا کہ اللہ تعالیٰ ان میں کوئی ایسی بات پیدا ہونے نہیں دیتا جو ان کے آیندہ منصب کے خلاف ہو وہ گویا اللہ تعالیٰ کے حضور پر پرورش پاتے ہیں گو ظاہری ذرائع کیسے ہی ہوں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ دشمنوں کے ہاتھ سے ابھی ان کی پرورش اسی اعلیٰ درجہ کے معیار پر کرا لیتا ہے۔ یہ بھی انبیاء کی عصمت پر دلیل ہے۔

٢٠٦٣ فتونا۔ یا مصدر ہے (فعول کے وزن پر) یا فتن کی جمع ہے یعنی طرح طرح کے ابتلا یا فتنۃ کی جمع ہے یعنی طرح طرح کی تکالیف میں ڈالا۔ اور راغب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتن یا دکھوں میں ڈالنا حکمت کے طریق پر ہوتا ہے جس طرح سونے کو آگ میں ڈالا جاتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو طرح طرح کی تکالیف میں ڈالا تاکہ آپ اس منصب پر کھڑا ہونے کے اہل ہو جائیں جس پر آپ کا کھڑا ہونا مقدر تھا۔ اور کوئی نبی نہیں جسے تکالیف میں نہ ڈالا گیا ہو۔

علیٰ قدر۔ قدر (قضائے موفق کو کہا جاتا ہے جب ایک چیز دوسری کے موافق ہو (ل) پس علیٰ قدر سے مراد ہے کہ حضرت موسیٰ کا آنا یعنی سفر مصر اختیار کرنا اس اندازہ پر تھا کہ وہی وقت آپ پر نزول وحی کا بھی آپہنچا تھا اور بعض نے قدر کو بمعنی قدْر لیکر مقدار معنی لیے ہیں یعنی اس زمانہ کو پہنچ گیا جس میں انبیاء پر وحی نازل ہوتی ہے۔

حضرت موسیٰ کو واپس ماں کے پاس پہنچا دینے کا ذکر اس لیے کیا تا معلوم ہو کہ وحی الٰہی اس راستہ پر کبھی نہیں ڈالتی جس کا نتیجہ ہلاکت ہو۔ بلکہ ظاہر ہلاکت کے سامان بھی معلوم ہوتے ہیں تو انجام اچھا ہوتا ہے۔

٢٠٦٤ اصطناع کے لیے دیکھو ٢٠٦٢۔ لنفسی اپنی ذات کے لیے۔ اس لیے کہ انبیاء اللہ تعالیٰ کا نام ہی دنیا میں پھیلاتے ہیں اور نیکی اور پاکیزگی کی تعلیم دیتے ہیں چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے اس کے معنی مروی ہیں اپنی وحی اور رسالت کے لیے (د) پس معلوم ہوا کہ انبیاء کی زندگی محض خدا کے لیے ہوتی ہے۔ اور وہ تمام اغراض نفسانی سے پاک ہوتے ہیں۔

٢٠٦٥ تنیا، ونی سے ہے جس کے معنی ضعف۔ فتور، عاجز آجانا تھک جانا ہیں۔ (ل)

حالانکہ اوپر ذکر صرف حضرت موسیٰ کا تھا مگر یہاں دونوں کو خطاب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ درمیانی واقعات بہت سے چھوڑ دیئے ہیں یا حضرت ہارون کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مطلع فرمایا۔

اَوۡ یَخۡشٰی ﴿۴۴﴾ ڈرے ۲۰۶۶ء

قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنۡ یَّفۡرُطَ عَلَیۡنَاۤ اَوۡ اَنۡ یَّطۡغٰی ﴿۴۵﴾

دونوں نے کہا، ہمارے رب ہم ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا حد سے نکل جائے ۲۰۶۷ء

قَالَ لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِیۡ مَعَکُمَاۤ اَسۡمَعُ وَ اَرٰی ﴿۴۶﴾

کہا مت ڈرو میں تمہارے ساتھ ہوں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں

فَاۡتِیٰهُ فَقُوۡلَاۤ اِنَّا رَسُوۡلَا رَبِّکَ فَاَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۬ۙ وَ لَا تُعَذِّبۡهُمۡ ؕ قَدۡ جِئۡنٰکَ بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکَ ؕ وَ السَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الۡهُدٰی ﴿۴۷﴾

سو اُس کے پاس جاؤ اور کہو ہم تیرے رب کے دو رسول ہیں سو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیجدے۔ اور انھیں دُکھ نہ دے ہم تیرے رب کی طرف سے تیرے پاس ایک نشان لائے ہیں اور اس پر سلامتی ہے جو ہدایت کی پیروی کرتا ہے ۲۰۶۸ء

اِنَّا قَدۡ اُوۡحِیَ اِلَیۡنَاۤ اَنَّ الۡعَذَابَ عَلٰی مَنۡ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ﴿۴۸﴾

ہماری طرف یہ وحی ہوئی ہے کہ عذاب اس پر ہے، جو جھٹلاتا ہے اور پھر جاتا ہے۔

قَالَ فَمَنۡ رَّبُّکُمَا یٰمُوۡسٰی ﴿۴۹﴾

(فرعون نے) کہا اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ ۲۰۶۹ء

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ﴿۵۰﴾

کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی پیدائش عطا کی پھر اسے (اپنے کمال کی) راہ دکھائی ۲۰۷۰ء

قَالَ فَمَا بَالُ الۡقُرُوۡنِ الۡاُوۡلٰی ﴿۵۱﴾

اس نے کہا تو پھر پہلی نسلوں کا کیا حال ہے۔

قَالَ عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّیۡ فِیۡ کِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ

کہا اُن کا علم میرے رب کے پاس کتاب میں ہے، میرا رب

۲۰۶۶ء دعوت الی الحق کا صحیح طریق: لیّن - لیّن سے ہے دیکھو ۵۱ ۵ نرم بات - خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فرعون حد سے گزر گیا ہے - وہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرتا تھا نہایت ذلیل کام ان سے لیتا تھا - بایں کلمہ حق پہنچانے کے لیے اپنے نبیوں کو بھی ارشاد ہوتا ہے کہ اس سے نرمی سے بات کرنا اور پھر ساتھ ہی اُمید دلاتا ہے کہ شاید وہ نصیحت پکڑے یہ ہے تبلیغ حق کا طریق جس کی پیروی آج مسلمانوں کو کرنی چاہئے - اگر وہ اس وقت اسی حالت میں ہیں جس حالت میں بنی اسرائیل فرعون کے ماتحت تھے اگر ان پر حکمران قوم حد سے نکل چکی ہے - اگر ان کے بیٹے ذبح کئے جاتے ہیں اگر ان کو ذلیل سمجھا جاتا ہے اور ذلیل حالت میں رکھا جاتا ہے تو بھی اس قوم سے مایوس نہ ہونا چاہیے - لعله یتذکر او یخشٰی جب ایک شقی ازلی کے متعلق بھی ہے تو آج کیوں قول لین سے دعوت الی الحق دے کر ان کے مسلمان ہونے کی اُمید نہ رکھی جائے - فرعون کا تذکرہ مسلمانوں کی ہدایت کے لیے ہے مگر وہ فائدہ نہیں اُٹھاتے ؛

۲۰۶۷ء یفرط - فرط کے معنی ہیں تقدّم یعنی پیش دستی کی اور فرط علیه کے معنی ہیں اسرف وتقدم یعنی زیادتی کی اور پیشدستی کی (ل) ؛
اور یہاں مراد ہے کہ قبل اس کے کہ ہمارے پیغام کو سُنے ہمارے اوپر کوئی حکم سزا صادر کرے اور یطغیٰ سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں طغیان کرے ؛

۲۰۶۸ء یہاں جو یہ فرمایا کہ ہم ایک آیت تیرے پاس لائے ہیں - تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد رسالت یا پیغام ہی ہے دیکھو آیت کے معنی کے لیے ع۶۰ کیونکہ اگر اس سے مراد معجزہ ہوتا تو معجزے دو تھے ایک نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ ساتھ ہی فرمایا من اتبع الهدی گو یا وہ آیت ہدایت آلٰہی یا پیغام آلٰہی ہی ہے نہ کچھ اور ؛

۲۰۶۹ء یہاں پھر بہت سے درمیانی واقعات کو چھوڑ دیا ہے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ اور ہارون دونوں فرعون کے پاس پہنچ کر اپنا پیغام ادا کرتے ہیں

۲۰۷۰ء سوال رب کے متعلق تھا اس لیے فرمایا کہ وہ صرف خالق ہی نہیں اور اس نے مخلوق کو پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کی ربوبیت کا یہ اقتضا ہے کہ اسے ہدایت بھی دی یعنی منزل مقصود تک پہنچنے کی راہ دکھائی ایسی فطری ہدایت سے ہر چیز اپنے دائرہ میں کمال کو حاصل کرتی ہے اور اس میں وحی آلٰہی کی ضرورت پر بھی دلیل ہے اور بتایا ہے کہ انسان کو اس کے کمال تک پہنچنے کے لیے وحی کی ضرورت ہے کیونکہ روحانی کمال کے لیے روحانی سامانوں کی ہی ضرورت ہے ؛

رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی ﴿۵۲﴾	غلطی نہیں کرتا، نہ بھولتا ہے ع۲۰۷۱
الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ	وہ جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا اور تمہارے لیے
لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً	اس میں رستے چلائے اور بادل سے پانی اتارا، پھر ہم اس کے
فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴿۵۳﴾	ساتھ مختلف سبزیوں کے جوڑے پیدا کرتے ہیں ع۲۰۷۲
كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ	کھاؤ اور اپنے چارپایوں کو چراؤ یقیناً اس میں عقل والوں
ع لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ﴿۵۴﴾	کے لیے نشان ہیں ع۲۰۷۳
مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَمِنْهَا	اسی (زمین) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے
نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰی ﴿۵۵﴾	اور اسی سے ہم تمہیں دوسری دفعہ نکالیں گے ع۲۰۷۴
وَلَقَدْ اَرَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰی ﴿۵۶﴾	اور ہم نے اسے اپنے سب کے سب نشان دکھائے مگر اس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔ ع۲۰۷۵
قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا	کہا اے موسیٰ کیا تو ہمارے پاس آیا ہے کہ اپنے جادو سے ہمیں اپنے
بِسِحْرِكَ یٰمُوْسٰی ﴿۵۷﴾	ملک سے نکال دے۔
فَلَنَاْتِیَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَیْنَنَا	سو ہم بھی ضرور تیرے پاس اسی طرح کا جادو لائیں گے سو ہمارے اور اپنے

ع۲۰۷۱ سوال کا مطلب یہ تھا کہ پہلی قومیں جنہیں یہ ہدایت نہیں ملی ان کا کیا حال ہے تو اس کا جواب دیا ہے کہ وہ میرا کام نہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے مناسب حال جو سامان چاہا کر دیا کیونکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے وہ نہ کسی کے متعلق غلطی کرتا ہے نہ کسی کو بھولتا ہے لا ینسیٰ میں یہ اشارہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کتاب کا محتاج نہیں جس طرح انسان بوجہ نسیان کے محتاج ہوتا ہے۔ گویا اس کی کتاب بھی اس کا علم ہے جس سے کوئی چیز باہر نہیں ٭

ع۲۰۷۲ اس میں اسی پہلی دلیل کو اور بسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح اوپر سے پانی برستا ہے تو زمین کی روئیدگیاں نکل آتی ہیں اسی طرح وحی الٰہی قلب انسانی کو زندگی بخشتی ہے اور اس میں طرح طرح کی قوتیں نشوونما پاتی ہیں۔ ازواج کے لفظ میں یہی اشارہ ہے کہ ہر چیز اپنا ایک زوج رکھتی ہے۔ جس سے اثر قبول کرکے وہ بقائے حیات میں معاون ہوتی ہے۔ قلب انسانی بغیر ہدایت وحی کے ترقی نہیں کرسکتا۔

ع۲۰۷۳ نُهٰی۔ نُہْیَۃ کی جمع ہے جس کے معنی عقل ہیں اس لیے کہ وہ بری باتوں سے روکتی ہے نَهْی کے لیے دیکھو ع۹۵۲ ٭

ع۲۰۷۴ تارۃ۔ تور سے ہے (اور تَور ایک برتن ہے) اور اس کے معنی مَرّۃ یا دفعہ ہیں اور تارۃ اُخریٰ کے معنی کئے ہیں مرۃً بعد مرۃٍ (ل)

انسان کی پہلی اور دوسری پیدائش کا اسی زمین سے ہونا: سب انسان زمین سے ہی پیدا ہوتے ہیں اور زمین میں ہی لوٹ کر جاتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے اور دوسری مرتبہ زمین سے پیدا کیا جانا اس لحاظ سے ہے کہ انسان کے وہ اعمال جن سے اس کی دوسری زندگی پیدا ہوتی ہے اسی زمین پر ہی ہوتے ہیں نہ اس سے باہر اور سچ تو یہ ہے کہ پہلی مرتبہ زمین سے پیدا کیا جانا بھی کئی مراحل سے وقوع میں آتا ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ ایک مٹی کا بت بنا کر کھڑا کر دیا جائے بلکہ اس مٹی سے نباتات و غلے پیدا ہوتے ہیں جنہیں حیوانات کھاتے ہیں۔ اور انسان بھی پھر ان غذاؤں کا خلاصہ در خلاصہ وہ چیز ہے جس سے ہر انسان کی پیدائش کی ابتدا ہوتی ہے دوسری زندگی کن مراحل سے گزر کر آئے گی اور کن طریقوں پر یا کیسی ہوگی۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ یہ دوسرے عالم کے متعلق ہے ٭

ع۲۰۷۵ نشان تو صرف دو ہی تھے یعنی عصا اور ید بیضا کیونکہ باقی نشان اس واقعہ کے بہت بعد دکھائے گئے ہیں۔ پس یہاں نشانوں یا آیات میں علاوہ معجزات کے دلائل و بینات بھی داخل ہیں جو حضرت موسیٰ نے بیان کئے جیسا کہ اوپر انہی آیات کا ذکر ہے۔ یعنی جو دلائل حضرت موسیٰ نے توحید باری تعالیٰ پر دیئے ہیں۔ اور یہ قابل غور ہے کہ یہاں فرعون اور حضرت موسیٰ کی صرف گفتگو کا ذکر ہے اور حضرت موسیٰ کی دلائل کا جو ہستی باری اور ضرورت وحی پر دیے ہیں اور فرعون کے سامنے عصا ڈالنے یا سفید ہاتھ نکالنے کا یہاں مطلق ذکر نہیں اور انہیں دلائل کو یہاں آیات کہا ہے اور اسی کا نام فرعون نے سحر رکھا ہے جیسا کہ اگلی آیت میں ہے لتخرجنا من ارضنا بسحرك گویا یہ دلائل بھی سحر ہیں اور دلائل اور بیان کا سحر ہونا ان من البیان لسحرا سے ظاہر ہے۔ دیکھو ع۱۲۹ ٭

وَ بَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَ لَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾

درمیان ایک وعدہ ٹھیرالے جس کی نہ ہم خلاف ورزی کریں اور نہ تو، برابر مکان میں رہوں) ۲۰۷۶

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَ اَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾

کہا تمھارا وعدے کا وقت جشن کا دن ہے اور یہ کہ لوگ چاشت کے وقت جمع کیے جائیں ۲۰۷۷

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾

سو فرعون پھر گیا اور اپنی تدبیروں کو جمع کیا پھر آیا ۲۰۷۸

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَ قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۱﴾

موسیٰؑ نے انھیں کہا، تم پر افسوس! اللہ پر جھوٹ نہ بناؤ ورنہ وہ تمھیں عذاب سے فنا کردے گا اور جو جھوٹ بناتا ہے وہ نامراد رہتا ہے۔

فَتَنَازَعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾

تب انھوں نے اپنے معاملہ میں باہم جھگڑا کیا اور مشورے کو مخفی رکھا ۲۰۷۹

قَالُوْۤا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ يَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾

انھوں نے کہا یہ دو جادوگر ہیں (جو) چاہتے ہیں کہ اپنے جادو سے تمھیں تمھارے ملک سے نکال دیں، اور تمھارے عمدہ طریقہ کو مٹا دیں ۲۰۸۰

۲۰۷۶ فرعون کا تحقیق مذہبی میں برابری اختیار کرنا: مکانا سوی کے ایک معنی کئے گئے ہیں کہ ہم سے اور تم سے برابر مسافت ہو اور ایک یہ کہ ہموار ہو مگر امر اول تو ایک بہت کمزور سی بات ہے اور دوسری بات کوئی ذکر کے قابل شے نہیں تیسرے معنی یوں کئے گئے ہیں کہ ایسی جگہ ہو جہاں ہم اور تم برابر ہوں یعنی حاکم اور رعیت کا جو فرق ہے وہ اس میدان میں نہ ہو (ر) کیونکہ اس اجتماع کی غرض تحقیق حق تھی۔ اور یہی معنی یہاں موزون ہیں۔ یہ حضرت موسیٰ کی نرم گفتگو کا نتیجہ تھا کہ فرعون تحقیق حق پر اس طرح راضی ہوگیا اور گو وہ خود محروم رہا مگر اس کی قوم میں سے کئی لوگ ایمان لے آئے۔

۲۰۷۷ یوم الزینة سے مراد وہ دن ہے جس میں لوگ زینت کرتے ہیں اور یہ نوروز یا کوئی میلہ یا کوئی اور جشن کا دن ہوسکتا ہے۔

ضحی ضُحٰی دھوپ کا پھیل جانا اور دن کا امتداد ہے اور اس وقت کو بھی جب دھوپ پھیل جائے ضحی کہتے ہیں یعنی چاشت کا وقت۔ اور ضَحِیَ یَضْحٰی کے معنی ہیں دھوپ کے سامنے ہونا وانك لا تظمؤ فيها ولا تضحى (۱۱۹) سویرے کا وقت مقرر کرنا بتاتا ہے کہ یہ مجمع بہت دیر تک رہنا تھا اس لیے سویرے سے لوگوں کو جمع کیا گیا۔

۲۰۷۸ فرعون کی تدابیر مختلفہ: جمع کیدہ۔ جَمْع ایک چیز کا بعض کو بعض سے قریب کرکے ملا دینا ہے اور جَمَعَ امرہ اور اَجْمَعَ کے لیے دیکھو ۱۴۱۹ اور یہاں جمع کیدہ ہے اور آگے آتا ہے فاجمعوا کیدکم تو اس کے معنی احکام و عزیمت کئے گئے ہیں یعنی ایک امر کو پختہ اور مضبوط کرنا اور جَمَعَ کیدہ کے معنی بھی اسی طرح ہوں گے یعنی اپنی تدبیروں میں سے کسی بات کو باقی نہ چھوڑا اور بعض نے جمع اور اجماع میں یہ فرق کیا ہے کہ جمع ایک چیز کا دوسری کے ساتھ ملانا ہے اور اجماع ایک پراگندہ چیز کے اجزا کو اکٹھا کرنا (ل) تو اس لحاظ سے جمع کیدہ کے معنی یہ ہوئے کہ جتنی تدبیریں کرسکتا تھا وہ سب کیں۔ اور اجمعوا کیدکم میں مراد یہ ہوئی کہ اس بات کو پختہ اور مضبوط کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہاں ایک سے زیادہ رنگوں میں مقابلہ ہوا ہو یعنی کچھ ہاتھ کے کرتب کے علاوہ تقریریں وغیرہ بھی ہوئی ہوں۔

۲۰۷۹ حضرت موسیٰ کی تقریر کا اثر: اس سے پہلی آیت میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے ان کو سمجھایا کہ افترا نہ کریں اسی کا اثر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں باہم کچھ اختلاف ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے یقیناً وہاں کوئی تقریر کی ہے اور یہی اصل بات ہے جو کبھی فرعون کے سرداروں کے اور کبھی ساحروں کے دلوں کو کھائے چلی جاتی ہے اور یہ ہونا بھی ضروری تھا اس لیے کہ اشرح لی صدری اور احلل عقدة من لسانی کی دعا بیکار تھی اگر اصل مقابلہ دلائل میں نہ تھا اور قبل اس کے کہ ساحر اپنے ہاتھ کے کرتب دکھائیں ان کے دل حضرت موسیٰ کی دلائل حقہ سے کھائے گئے تھے۔ چنانچہ آخر پر وہ کہتے بھی ہیں ما اکرھتنا علیه من السحر (۷۳) جس سے معلوم ہوا کہ فرعون نے مجبور کرکے ان سے وہ شعبدہ بازی کرائی جس کا ذکر آگے آتا ہے وہ خود اس پر رضامند نہ تھے۔

۲۰۸۰ یذھبا۔ ذَھَبٌ سونا ہے اور ذَھَبَ کے معنی چلا گیا اور ذھب بالشیٔ اور اَذْھَبَ کے معنی ہیں اسے لے گیا، اسے دور کردیا اور اس کا استعمال اشیاء اور معانی دونوں میں ہوتا ہے جیسے انی ذاھب الی ربی (الصّٰفّٰت ۳۷ - ۹۹) فلما ذھب عن ابراھیم الروع (ھود ۱۱ - ۷۴) اذھب عنا الحزن (فاطر ۳۵ - ۳۴) لیذھب

فَاَجۡمِعُوۡا كَيۡدَكُمۡ ثُمَّ ائۡتُوۡا صَفًّا‌ ۚ وَقَدۡ اَفۡلَحَ الۡيَوۡمَ مَنِ اسۡتَعۡلٰى ﴿۶۴﴾

اس لیے اپنی تدبیر کو پختہ کرو، پھر صف باندھ کر آؤ، اور آج وہی کامیاب ہے جو غالب ہوا ۲۰۸۱

قَالُوۡا يٰمُوۡسٰٓى اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِىَ وَاِمَّاۤ اَنۡ نَّكُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَلۡقٰى ﴿۶۵﴾

انھوں نے کہا، اے موسیٰؑ! کیا تُو ڈالے گا یا ہم پہلے ڈالنے والے ہوں۔

قَالَ بَلۡ اَلۡقُوۡا‌ ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمۡ وَعِصِيُّهُمۡ يُخَيَّلُ اِلَيۡهِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰى ﴿۶۶﴾

کہا، بلکہ تم ڈالو، تو اُن کی رسّیاں اور اُن کی لاٹھیاں اُن کے جادو سے اُسے ایسا خیال ہوا کہ گویا وہ دوڑ رہی ہیں ۲۰۸۲

فَاَوۡجَسَ فِىۡ نَفۡسِهٖ خِيۡفَةً مُّوۡسٰى ﴿۶۷﴾

پس موسیٰؑ نے اپنے دل میں خوف معلوم کیا ۲۰۸۳

قُلۡنَا لَا تَخَفۡ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡاَعۡلٰى ﴿۶۸﴾

ہم نے کہا ڈر نہیں، تو ہی غالب ہے۔

وَاَلۡقِ مَا فِىۡ يَمِيۡنِكَ تَلۡقَفۡ مَا صَنَعُوۡا‌ ؕ اِنَّمَا صَنَعُوۡا كَيۡدُ سٰحِرٍ‌ ؕ وَلَا يُفۡلِحُ السّٰحِرُ حَيۡثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾

اور جو تیرے دائیں ہاتھ میں ہے ڈال دے، کہ جو انھوں نے بنایا اُسے نگل جائے، جو انھوں نے بنایا ہے جادوگر کی چال ہے اور جادوگر کامیاب نہیں ہوتا خواہ کہیں سے آئے۔

فَاُلۡقِىَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ

پس جادوگر سجدے میں گر گئے، کہنے لگے ہم ہارونؑ اور موسیٰؑ کے

عنکم الرجس (الاحزاب ۳۳-۳۳) ذھب اللہ بنورھم (البقرۃ ۲-۱۷) (غ)

طریقۃ - طَرَقَ - اصل میں ضرب کی طرح ہے مگر صرف ایک چیز کے دوسری پر مارنے کو کہا جاتا ہے اور اسی سے طریق رستہ کو کہتے ہیں کیونکہ اسے پیروں سے روندا جاتا ہے اور پھر ہر ایک مسلک پر بولا جاتا ہے جس کو انسان اختیار کرے اچھا ہو یا بُرا اور یہاں طریقۃ سے مراد ایسا ہی مسلک یعنی مذہب ہے۔

مثلیٰ - مثل کے لیے دیکھو غ۳۰ و ع۲۷۳ اور اَمۡثل کے معنی ہیں وہ چیز جو افضل اور اقرب الی الخیر چیزوں سے زیادہ مشابہ ہو اور اَماثِلُ القوم بہترین لوگوں کو کہا جاتا ہے اذ یقول امثلہم طریقۃ (۱۰۴) اور مُثلیٰ اسی سے تانیث ہے طریقۃ مثلیٰ سے مراد اُن کا مذہب اور ان کے رسوم ورواج ہیں جنھیں وہ حضرت موسیٰ کے مذہب سے افضل قرار دیتے ہیں۔

ع۲۰۸۱ استعلاء - اِسۡتَعۡلاء کے معنی طلب علو ہیں یعنی دوسروں سے اونچا یا بلند رہنے کی خواہش اور یہ علو مذموم بھی ہو سکتا ہے اور طلب رفعت یا بلندی مرتبہ بھی اس سے مراد ہو سکتی ہے اور یہاں دونوں باتیں مراد ہو سکتی ہیں (غ) اور بعض نے علا مراد لیا ہے یعنی غالب رہا (ر)

ع۲۰۸۲ یخیل - خَیال - صورت مجرّدہ کو کہتے ہیں (یعنی صرف ایک صورت کو) جیسے وہ صورتیں جو خواب میں نظر آتی ہیں یا شیشہ میں یا کسی چیز کے غائب ہونے کے باوجود دل میں آجاتی ہیں پھر ہر ایک صورت پر بولا جاتا ہے جس کا تصوّر کیا جائے اور تخیل کسی چیز کے خیال کی صورت کا دل میں آنا ہے (غ)
ساحروں کی رسّیاں سانپ نہیں بنی بلکہ یہ شعبدہ بازی تھی: الاعراف ۱۱۶ میں صرف یہ ذکر ہے کہ لوگوں کو مرعوب کر دیا اور ان کی آنکھوں کو دھوکا دیا۔ یہاں حضرت موسیٰ کا ذکر ہے کہ آپ کو وہ رسیاں وغیرہ دوڑتی ہوئی خیال میں گزریں۔ یہ نہیں فرمایا کہ ساحروں نے رسیوں کی قلب ماہیت کر دی تھی اور وہ فی الواقع دوڑنے لگیں بلکہ صرف ان کی چالاکی سے اور دھوکا دہی سے حضرت موسیٰ کو بھی یہ خیال گزرا کہ یہ دوڑ رہی ہیں۔ پس یہ محض چالاکی اور دھوکہ دہی تھی جس طرح آجکل بھی شعبدہ باز کر لیتے ہیں۔ ساحروں کی رسیوں اور لاٹھیوں کا فی الواقع سانپ بننا قرآن شریف میں مذکور نہیں۔ مفسرین نے اس شعبدہ بازی کی کچھ تفصیلات بیان کی ہیں کسی نے کہا ہے اُن میں پارہ بھر دیا تھا، کسی نے کہا نیچے آگ جلا دی تھی۔ یہ سب بے ضرورت باتیں ہیں جس تفصیل کو اللہ تعالےٰ نے چھوڑ دیا ہے اس کی ہمیں ضرورت نہیں اور اس قسم کی شعبدہ بازیاں ایسی عام ہیں کہ کسی شخص کو یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں، مداری ہر جگہ ایسی شعبدہ بازیاں دکھاتے رہتے ہیں اور حضرت موسیٰ کا خیال ایسا ہی ہے جیسے آج بھی کوئی اس قسم کی شعبدہ بازی دیکھ کر خیال کرے گا یہ نہیں کہا کہ حضرت موسیٰ کو یقین ہو گیا تھا۔

ع۲۰۸۳ حضرت موسیٰ کا خوف: یہ خوف اس لیے تھا کہ لوگ دھوکا نہ کھا جائیں اور اللہ تعالیٰ نے تسلّی دی اور بتایا انت الاعلےٰ یعنی تمہارا غلبہ کھلا ہو گا اور کسی قسم کا دھوکا باقی نہ رہے گا۔

هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ﴿٧٠﴾

رب پر ایمان لائے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ﴿٧١﴾

(فرعون نے) کہا تم اس پر ایمان لائے اس سے پہلے کہ میں تمھیں اجازت دوں یقیناً وہ تمھارا بڑا ہے جس نے تمھیں جادو سکھایا ہے۔ سو میں ضرور تمھارے ہاتھ اور تمھارے پاؤں مخالف اطراف سے کاٹ دونگا اور تمھیں کھجوروں کے تنوں میں صلیب دونگا اور تم جان لوگے ہم میں سے کون زیادہ سخت اور دیرپا عذاب دے سکتا ہے۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٧٢﴾

انھوں نے کہا ہم تجھے اس پر ترجیح نہ دیں گے، جو نشان ہمارے پاس آچکے، اور نہ اس پر جس نے ہمیں پیدا کیا۔ سو کر گزر جو تو کرنے والا ہے تو صرف اس دنیا کی زندگی کے متعلق ہی حکم چلا سکتا ہے۔

اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿٧٣﴾

ہم اپنے رب پر ایمان لائے تاکہ وہ ہماری خطائیں ہمیں بخش دے۔ اور وہ جادو (بھی) جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا اور اللہ ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى ﴿٧٤﴾

بات یہ ہے کہ جو اپنے رب کے حضور مجرم بن کر آئے گا تو اس کے لیے دوزخ ہے وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ زندہ رہے گا[2084]

وَ مَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿٧٥﴾

اور جو کوئی اس کے حضور مومن بن کر آئے گا کہ اس نے اچھے عمل کیے ہیں تو یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے اونچے درجے ہیں۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿٧٦﴾

ہمیشگی کے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، انہی میں رہیں گے اور یہ اس کا بدلہ ہے جو پاک ہوا۔

وَ لَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّ لَا تَخْشٰى ﴿٧٧﴾

اور ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی بھیجی۔ کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے جا، پھر انھیں سمندر میں خشک رستہ پر جلد لے جا نہ تجھے پکڑا جانے کا خوف ہے اور نہ تو (غرق ہونے سے) ڈرے[2085]

ع۲۰۸۴ جہنم میں نہ موت ہے نہ زندگی: جہنم میں موت نہیں کیونکہ مر کر انسان دکھ سے چھوٹ جاتا ہے اور وہاں حیات یعنی زندگی بھی نہیں اس لیے کہ اصل زندگی تو لقاء اللہ ہے اذا دعاکم لما یحییکم اور وہ اہل نار کو میسر نہیں اور یا اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعماء سے محروم ہونگے اور زندگی ان نعماء سے فائدہ اٹھانا ہے جیسا کہ بل احیاء عند ربھم میں نعماء سے لذت حاصل کرنا مراد لیا گیا ہے اہل نار کی حیات صرف ان کی قوت حاسہ کے لحاظ سے ہے کہ وہ عذاب کو محسوس کریں گے۔

ع۲۰۸۵ اضرب لھم طریقا۔ بعض مفسرین نے ضرب مارنے کے معنی میں لیکر یوں معنی کیے ہیں اضرب البحر لعصاك ليصير لهم طريقا سمندر کو اپنے عصا سے مار تاکہ وہ ان کے لیے رستہ بنا دے۔ مگر یہ الفاظ سے بہت دور نکل جانا ہے بعض نے ضرب کو یہاں بمعنی اتخذ لیکر لھم اور طریق کو دو مفعول مانا ہے (ر) اور ضرب کے معنی اسراع فی السیر چلنے میں جلدی کرنا لغت میں موجود ہیں (ل) اور ضرب یعسوب الدین بذنبہ میں یہی معنی کیے گئے ہیں یعنی فتنوں سے بھاگتا ہوا جلدی چلا گیا (ل) پس ضرب کے معنی میں یہی اشارہ ہے۔

فَاَتۡبَعَهُمۡ فِرۡعَوۡنُ بِجُنُوۡدِهٖ فَغَشِيَهُمۡ مِّنَ الۡيَمِّ مَا غَشِيَهُمۡ ؕ ﴿۷۸﴾
تب فرعون نے اپنے لشکروں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا، سو دریا نے انھیں جیسے ڈھانکنا تھا ڈھانک لیا۔

وَ اَضَلَّ فِرۡعَوۡنُ قَوۡمَهٗ وَ مَا هَدٰى ﴿۷۹﴾
اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور سیدھا رستہ نہ دکھایا۔

يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ قَدۡ اَنۡجَيۡنٰكُمۡ مِّنۡ عَدُوِّكُمۡ وَ وٰعَدۡنٰكُمۡ جَانِبَ الطُّوۡرِ الۡاَيۡمَنَ وَ نَزَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡمَنَّ وَ السَّلۡوٰى ﴿۸۰﴾
اے بنی اسرائیل ہم نے تمھیں تمھارے دشمن سے نجات دی اور طور کی بابرکت جانب کا تمھارے ساتھ عہد کیا اور تم پر منّ اور سلویٰ اتارا ع۲۰۸۶

كُلُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَ لَا تَطۡغَوۡا فِيۡهِ فَيَحِلَّ عَلَيۡكُمۡ غَضَبِىۡ ۚ وَ مَنۡ يَّحۡلِلۡ عَلَيۡهِ غَضَبِىۡ فَقَدۡ هَوٰى ﴿۸۱﴾
ستھری چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں دی ہیں اور اس میں حد سے نہ بڑھو، ورنہ میرا غضب تم پر اُترے گا اور جس پر میرا غضب اُترا وہ پستی میں گر گیا ع۲۰۸۷

وَ اِنِّىۡ لَغَفَّارٌ لِّمَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهۡتَدٰى ﴿۸۲﴾
اور یقیناً میں اس کو بخشنے والا ہوں جو توبہ کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور اچھا عمل کرتا ہے، پھر ہدایت پر قائم رہتا ہے ع۲۰۸۸

وَ مَاۤ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى ﴿۸۳﴾
اور اے موسیٰ کیا چیز تجھے اپنی قوم سے (آگے) جلدی لے آئی۔

قَالَ هُمۡ اُولَاۤءِ عَلٰٓى اَثَرِىۡ وَ عَجِلۡتُ
کہا وہ بھی میرے نقش قدم پر ہیں ۔ اور اے میرے رب

یبساً۔ یبْس کے لیے دیکھو ع۱۵۴۴ اور یَبَس اس مکان کو کہتے ہیں جس میں پانی ہو پھر جاتا رہے (غ)

حضرت موسیٰ کا سمندر میں خشک رستہ پر چلنا: ان الفاظ سے اوّل تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ رستہ جس پر حضرت موسیٰ کو بنی اسرائیل کو لیجانے کا حکم ہوا تھا ایک ہی رستہ تھا نہ بارہ رستے جیسا کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے۔ پھر اسے طریق یا رستہ کہا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اور لوگ بھی وہاں سے چلتے تھے، کیونکہ طریق اسی کو کہا جاتا ہے جس پر لوگ چلیں ع۲۰۸۰ اور یہی وجہ ہے کہ فرعون بھی اس رستہ پر چل پڑا اگر وہ سمندر کی دیواریں بنکر غیر معمولی خشک جگہیں ہوتیں تو نہ اُن پر طریق کا لفظ بولا جاتا نہ فرعون کبھی ان پر چلنے کی جرأت کرتا۔ پھر حضرت موسیٰ کو مصر سے چلنے سے پیشتر وحی ہو جاتی ہے کہ سمندر میں خشک رستہ مل جائیگا اور یبس کے جو معنی امام راغب نے دیئے ہیں اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سے پانی ہٹ گیا تھا خواہ جوار بھاٹے سے ہو یا اور غیر معمولی اسباب سے۔

ع۲۰۸۶ ایمن کے لیے دیکھو ع۲۰۱۰ یہاں یہ جانب کی صفت ہے اور واعدنا سے مراد وہی حضرت موسیٰ کو توریت کا عطا کرنا ہے۔ واذ واعدنا موسیٰ اربعین لیلۃ (البقرۃ ۲-۵۱) اور یہاں واعدناکم اس لیے فرمایا کہ حضرت موسیٰ کی وساطت سے توریت بنی اسرائیل کو ہی ملی تھی جو کچھ نبی کو دیا جاتا ہے وہ اس کی امت کو ہی اس کے واسطہ سے دیا جاتا ہے۔

ع۲۰۸۷ تطغوا فیہ۔ فیہ کی ضمیر مارزقنکم کی طرف ہے۔ اور ھوٰی کے معنی بلندی سے پستی کی طرف گرنا ہیں دیکھو ع۱۵۲ پس مطلب یہ ہے کہ وہ اس بلند مقام سے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا تھا یعنی رضائے الٰہی کا مقام ایک نہایت پست مقام کی طرف گر گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فی الحقیقت رضائے الٰہی کا حصول سب سے بلند مقام ہے جس پر انسان پہنچ سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہی اسفل سافلین میں گرجانا ہے اور ھوی کے معنی ہلاک ہو گیا بھی کیے گئے ہیں اس لیے کہ بلندی سے پستی میں گرنا موجب ہلاکت ہے۔

ع۲۰۸۸ اھتدیٰ۔ اِھتداء (جو ھدی سے ہے) اس سے مخصوص ہے جس کا انسان اختیار کے طریق پر قصد کرتا ہے امور دنیوی میں ہو یا اُخروی میں جعل لکم النجوم لتھتدوا بھا (الانعام ۶-۹۸) لایستطیعون حیلۃ ولا یھتدون سبیلا (النساء ۴-۹۸) اور کبھی طلب ہدایت پر بولا جاتا ہے واذ اٰتینا موسی الکتاب والفرقان لعلکم تھتدون (البقرۃ ۲-۵۳) ولاُتمّ نعمتی علیکم ولعلکم تھتدون (البقرۃ ۲-۱۵۰) اور اھتداء کسی صاحب ہدایت کا اقتدا کرنا بھی ہے اولو کان اٰباؤھم لا یعقلون شیئا ولا یھتدون (البقرۃ ۲-۱۷۰) یعنی کسی عالم (یا ہدایت) کی پیروی نہ کرتے تھے اور فمن اھتدی فانما یھتدی لنفسہ (یونس ۱۰-۱۰۸) میں اھتداء میں کئی وجوہ داخل ہیں یعنی طلب ہدایت اور اقتدائے ہدایت اور قصد ہدایت اور یہاں اھتدیٰ کے معنی ہیں ہدایت کی طلب میں مداومت اختیار کرتا ہے یعنی اس میں لگا رہتا ہے اور اس کا قصد کرنے میں سستی نہیں کرتا اور نافرمانی کی طرف نہیں لوٹتا (غ)

اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿٨٤﴾

میں نے تیری طرف جلدی کی تاکہ تو راضی ہو ۲۰۸۹

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ
بَعْدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾

کہا تو ہم نے تیری قوم کو تیرے پیچھے فتنہ میں ڈالا، اور سامری نے انھیں گمراہ کیا ۲۰۹۰

فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ
قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ
وَعْدًا حَسَنًا ۭ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ
الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ
عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ
مَّوْعِدِيْ ﴿٨٦﴾

سو موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف ناراض افسوس کرتا ہُوا لوٹا، کہا، اے میری قوم! کیا تمھارے رب نے تم سے اچھا وعدہ نہ کیا تھا، تو کیا وہ وعدہ تمھیں لمبا معلوم ہُوا، بلکہ تم نے یہ ارادہ کر لیا کہ تم پر تمھارے رب کا غضب اُترے، سو تم نے میرے (ساتھ) وعدہ کا خلاف کیا ۲۰۹۱

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا
وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ
فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿٨٧﴾

انھوں نے کہا ہم نے تیرے (ساتھ) وعدہ کا خلاف اپنے اختیار سے نہیں کیا بلکہ ہم پر قوم کی زینت سے بوجھ ڈالا گیا سو ہم نے اُسے پھینک دیا اور ایسا ہی سامری نے (خیال) ڈالا ۲۰۹۲

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ
فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۵

پس ان کے لیے ایک بچھڑا نکال کھڑا کیا (محض) ایک جسم جس سے بچھڑے کی آواز نکلتی تھی، تو انھوں نے کہا یہ تمھارا معبود ہے اور

۲۰۸۹ یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کے آدمیوں کو جو ساتھ لائے تھے پہاڑ کے نیچے چھوڑ کر خود اوپر چلے آئے تھے واختار موسیٰ قومه سبعين رجلا لميقاتنا (الاعراف - ۱۵۵) اور اس سوال میں کوئی تنبیہ کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ انبیاء کے سب کام رضائے الٰہی کے لیے ہوتے ہیں اور بعض کے نزدیک هم اولاء على اثری سے مراد یہ ہے کہ وہ میرے قریب ہی ہیں اور مراد ساری قوم ہے یعنی میری قوم بھی مجھ سے کچھ دور نہیں اور بعض کے نزدیک علی اثری سے مراد علی دینی ہے یعنی وہ میرے ہی دین پر ہیں (ر)

۲۰۹۰ السامری۔ سُمرۃ اس رنگ کو کہتے ہیں جو سفیدی اور سیاہی کے درمیان ہو (یعنی گندم گوں) اور سَمَر رات کی تاریکی کو کہتے ہیں اور رات کو کہانی بیان کرنے کو بھی اور سامر ایسی کہانیوں کا بیان کرنے والا ہے اور سامری ایک شخص کی طرف منسوب ہے (غ) اور سامرۃ بنی اسرائیل کے قبیلوں میں سے ایک قبیلہ ہے جو بعض امور دینی میں یہود سے اختلاف رکھتے تھے اور سامری انہی کی طرف منسوب ہے (ل)، اور بعض مفسرین نے سامری کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک قبطی تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلا تھا اور وہ ایک منافق آدمی تھا (د) اور یہ حضرت ابن عباس کی طرف منسوب ہے۔

۲۰۹۱ وعدا حسنا سے مراد بعض نے تورات کا دینا لیا ہے اور بعض نے وہ وعدے جو اہل طاعت کے ساتھ کیے جاتے ہیں اور یہی درست معلوم ہوتا ہے وطال علیکم العهد سے مراد وہ وعدہ کا زمانہ لیا گیا ہے جو حضرت موسیٰ ان سے الگ ہوئے تھے مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ تو اتنا لمبا نہیں تھا کہ تم بھول جاتے پس تم نے عمداً خلاف ورزی کی۔

۲۰۹۲ مَلک اور مِلک کے ایک ہی معنی ہیں (ع) یعنی اختیار یعنی اپنی مرضی سے ایسا نہیں کیا بلکہ کسی کے ورغلانے سے۔

القٰی۔ اِلقاء کے معنی کسی چیز کا وہاں پھینکنا ہیں جہاں وہ تمھارے سامنے ہو (کیونکہ اس کا مادہ لقی ہے) اور پھر عام ہو گیا ہے یعنی ہر طرح کا پھینکنا۔ اما ان تلقی واما ان نکون اول من القی (۶۵) اور پھر کلام۔ قول۔ سلام۔ دوستی کے پیش کرنے پر بھی یہی لفظ آجاتا ہے فالقوا الیهم القول (النحل[16]۔ ۸۶) والقوا الی الله یومئذ السلم (النحل[16]۔ ۸۷) او القی السمع (ق[50]۔ ۳۷) (غ) اور چونکہ یہاں مفعول مذکور نہیں اور زیورات کے ڈالنے پر قذف استعمال کیا ہے (۲۰۶۲) اور یہاں اس کے مقابل پر القی ہے اس لیے مراد یہاں یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ بات سامری نے ہمارے سامنے پیش کی اور اس کے مطابق تفاسیر میں ایک قول بھی ہے فمثل ذلك الذی ذکرنا ه لك القی السامری الینا وقرره علینا (ر)

فَنَسِيَ ؕ ۸۸

موسیٰ کا معبود ہے مگر (موسیٰ) بھول گیا۔ ۲۰۹۲ الف

اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ
وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۸۹ ع

کیا وہ غور نہ کرتے تھے کہ وہ ان کی بات کا جواب نہیں دیتا اور نہ ان کے لیے کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہے اور نہ نفع کا۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ
يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ
الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۹۰

اور ہارونؑ نے ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا اے میری قوم تم اس سے صرف آزمائش میں ڈالے گئے ہو اور تمہارا رب بہت رحم کرنیوالا ہے سو میری پیروی کرو اور میرے حکم کی فرمانبرداری کرو ۲۰۹۳

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى
يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۹۱

انھوں نے کہا ہم اس کی عبادت میں لگے رہیں گے جب تک کہ موسیٰؑ ہماری طرف لوٹ کر آئے۔

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۹۲
اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۹۳

(موسیٰؑ نے) کہا اے ہارون کس چیز نے تجھے روکا جب تو نے انہیں دیکھا تھا کہ گمراہ ہو گئے کہ تو نے میری اتباع نہ کی تو کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی ہے ۲۰۹۴

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا
بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ

کہا اے میری ماں کے بیٹے میری ڈاڑھی اور میرا سر نہ پکڑ میں ڈر گیا کہ تو کہے گا تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور

اوزارا من زینۃ القوم سے وہی مراد ہے جو دوسری جگہ من حلیہم سے مراد ہے (الاعراف - ۱۴۸) یعنی زیورات اور زینۃ القوم کے لفظ سے مفسرین نے عام طور پر یہ مراد لیا ہے کہ یہ وہ زیورات تھے جو بنی اسرائیل قبطیوں سے عاریتاً لے آئے تھے جیسا کہ خروج ۱۲ : ۳۵ میں ذکر ہے مگر قرآن شریف کے الفاظ جہاں ان زیورات کو الاعراف - ۱۴۸ میں حلیہم یعنی بنی اسرائیل کے زیورات قرار دیا ہے اس توجیہ کو صحیح نہیں ٹھہراتے اور بعض نے اسے مالِ غنیمت قرار دیکر پھر خود ہی اعتراض کیا ہے کہ مالِ غنیمت کا لینا ان کے لیے جائز نہ تھا اور مالِ غنیمت اسے یوں بنایا ہے کہ جب فرعون اور اس کے ساتھی سمندر میں غرق ہو گئے تو ان کے زیورات سمندر نے ساحل پر پھینک دیئے اور وہ بنی اسرائیل نے لے لیے مگر یہ سب دور از قیاس باتیں ہیں اور صحیح بات صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ فرعونیوں کی نقل کر کے بنی اسرائیل کے خیالات بھی زینت کے ظاہری سامانوں یعنی زیورات وغیرہ کی طرف بہت جھک گئے تھے۔ اس لیے یہ تجویز کہ زیورات کو اتار دیا جائے سب کو اچھی بھی معلوم ہوئی۔ پس زینۃ القوم سے مراد اہلِ مصر کی ظاہری آرائش کے سامان ہیں اور حملنا میں یہ اشارہ ہے کہ بنی اسرائیل بھی ان کی نقل کر کے اسی مرض میں مبتلا ہو گئے اور زیورات وغیرہ کا شوق بہت بڑھ گیا اسی لیے دوسری جگہ حلیہم فرمایا پھر یا تو ان زیورات سے بچھڑا بنایا گیا اور یا کوئی بت بچھڑے کا بنا کر ان زیورات سے اسے آراستہ کیا گیا اور بتوں کو زیورات پہنانے کا دستور بھی بت پرست قوموں میں پایا جاتا ہے۔

ع ۲۰۹۲ الف مسلمان اور عجلِ یورپ: زیورات سے بنے ہوئے یا زیورات سے آراستہ بچھڑے کی پرستش میں کیا اشارہ ہے؟ کیونکہ بنی اسرائیل کے واقعات کا ذکر تو مسلمانوں کی ہدایت کے لیے کیا اس کی تصریح قرآن کریم نے خود اس سورت میں کر دی ہے جہاں فرمایا لا تمدن عینیك الی ما متعنا بہ ازواجاً منہم زہرۃ الحیوۃ الدنیا (۱۳۱) یعنی جس طرح بنی اسرائیل فرعون اور اس کے ساتھیوں کی نقل کر کے دنیوی آرائش کے سامانوں پر گر گئے تھے مسلمان ایسا نہ کریں مگر آج یہی حالت مسلمانوں کی ہے کہ وہ فی الحقیقت عجلِ یورپ کی پرستش کر رہے ہیں اور ہر بات میں ان کی نقل اتارتے ہیں۔ فی الواقعہ یورپ کی ظاہری ٹیپ ٹاپ ایک عجل ہے اور اس کی پرستش یہی ہے کہ مسلمان بھی اپنے تمام کاروبار میں دنیا اور اس کے مال اور اس کی آرائشوں کو اپنی زندگی کی غرض و غایت سمجھتے ہیں۔

ع ۲۰۹۳ حضرت ہارون کی عصمت اور بائبل کے بیان کی تردید: یہاں قرآن کریم نے نہایت صفائی سے بائبل کے اس قصہ کی تردید کی ہے کہ حضرت ہارونؑ بچھڑے کے بنانے اور عبادت میں شریک تھے یوں نہ صرف ان کی عدمِ شرکت کا ذکر کیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ حضرت ہارونؑ نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی سے روکا بھی تھا ایسے ایسے مقامات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم بائبل کے قصوں کو نقل نہیں کرتا بلکہ اس کلام پاک کا سرچشمہ کوئی اور ہے اور وہ بائبل کی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے اور یہاں حضرت ہارون کی عصمت کو ثابت کیا ہے۔

ع ۲۰۹۴ اتباع نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایسے حالات میں تم نے وہ کچھ کیوں نہ کیا جو میں کرتا اور بعض کے نزدیک یہ مراد ہے کہ تو ان لوگوں کو ساتھ لیکر جو شرک سے بچے رہے تھے میرے پیچھے کیوں نہ آ گیا۔ مگر پہلے معنی زیادہ صاف ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں سے تعلق منقطع کر دینا یا ایسا فساد ڈالنے والے کو قرار واقعی سزا دینا یا سختی سے روک دینا۔

بَيْنَ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾	میری بات کا پاس نہ کیا ۲۰۹۵
قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾	(موسیٰؑ نے) کہا اے سامری تیرا کیا معاملہ ہے۔
قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾	اس نے کہا میں نے وہ کچھ جانا جو انھوں نے نہیں جانا۔ پس میں نے رسول کے نقش قدم سے کچھ حاصل کیا پھر اسے پھینک دیا اور ایسا ہی میرے دل نے مجھے (یہ کام) اچھا کر دکھایا ۲۰۹۶
قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۠ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾	کہا تو چلا جا تیرے لیے زندگی میں یہ (سزا) ہے کہ تو کہتا رہے، چھونا نہیں ۲۰۹۷ اور تیرے لیے ایک (اور) وعدہ ہے جس کے خلاف تجھ سے نہ ہوگا اور اپنے اس معبود کو دیکھ جس کی عبادت میں تو لگا ہوا تھا ہم اسے جلا دیں گے، پھر اسے دریا میں اچھی طرح بکھیر دیں گے ۲۰۹۸

۲۰۹۵ دیکھو ع۱۱۵۹ حضرت ہارون کو یہ خیال تھا کہ اگر انہوں نے سختی کی تو قوم میں فساد پڑ جائے گا کیونکہ دوسرا گروہ اور ان کے سرغنے بہت زبردست تھے جیسا کہ اعراف میں ہے کادوا یقتلوننی۔

۲۰۹۶ بَصُرْتُ۔ بَصَر کے لیے دیکھو ع۱۲۱ جب ظاہری آنکھ سے دیکھنا مراد ہو تو کہتے ہیں اَبْصَرْتُ اور جب قلب کی قوت مدرکہ کا ذکر ہو تو کہتے ہیں اَبْصَرْتُهٗ اور بَصُرْتُ بہ اور بَصُرْتُ حاسہ میں یعنی آنکھ سے دیکھنے کے لیے بہت ہی کم استعمال ہوتا ہے جب تک کہ اس کے ساتھ رؤیت قلب بھی نہ ہو لم تعبد مالا یسمع ولا یبصر (مریم ۱۹-۴۲) اَبْصرنا وسمعنا (السجدۃ ۳۲- ۱۲) (غ) اور اسی کے مطابق زجاج کا قول ہے یعنی بَصُر بالشئ کے معنی ہیں علمہ اسے جانا اور اَبْصَرَ کے معنی ہیں دیکھا۔

قبضت۔ قَبْض کے لیے دیکھو ع۳۱۴ مگر محض کسی چیز کے حاصل کرنے پر بھی بولا جاتا ہے گو اس میں ہاتھ سے لینا نہ ہو (غ) اور قبضۃ ایک مرتبہ حاصل کرنا ہے۔

سامری کا بچھڑا بنانا اور حضرت جبرئیل کی گھوڑی کا بے بنیاد قصہ: یہاں بہت سے زوائد داخل کر کے یوں معنی کیے گئے ہیں کہ میں نے رسول یعنی جبرائیل کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے کی مٹی لے لی اور اسے آگ میں ڈالا تو بچھڑا بن گیا معلوم نہیں اس عجیب کہانی کا ماخذ کیا ہے اوّل تو یہاں جبرئیل کا ذکر نہیں پھر جبرئیل کا گھوڑا درمیان میں زبردستی داخل کیا جاتا ہے۔ پھر مٹی کا کوئی ذکر نہیں۔ اثر کے معنی مٹی نہیں بلکہ نقش ہیں خواہ وہ نقش ظاہری ہو یا معناً۔ پھر آگ میں ڈالنے کا کوئی ذکر نہیں۔ پھر بچھڑا بننے کا کوئی ذکر نہیں۔ پھر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ سامری کو منافق بھی کہا جاتا ہے اور ساتھ ہی اس کے اس کو ایسی قوت کا مالک بھی سمجھا جاتا ہے کہ جبرائیل اور اس کا گھوڑا جو مخلص مومنوں کو نظر نہ آئے وہ منافق سامری کو نظر آ گیا۔ پھر یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ جبرئیل کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے کی مٹی سے زیورات کا بت بن جایا کرتا ہے اور اس میں سے عجیب و غریب آوازیں آنے لگتی ہیں۔ یا کیا اسے سامری کا معجزہ کہا جائیگا۔ غرض یہ کہانی کسی طرح پر قابل قبول نہیں۔ رسول خود حضرت موسیٰ ہیں اور ان کے اثر سے کچھ لینا صاف بتاتا ہے کہ ان کی تعلیم کو اس نے پورے طور سے قبول نہیں کیا بلکہ اس کو بہت تھوڑا قبول کیا اور بَصُر کے معنی قلب کی قوت مدرکہ سے لینا ہیں۔ پس وہ اپنی بڑائی ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ جو بلا سوچے سمجھے تمہاری تعلیم کی پیروی کرتے چلے جاتے ہیں میں ان میں سے نہیں بلکہ صاحب علم ہوں کچھ اپنے مطلب کی بات لے لی۔ پھر اسے بھی پس پشت پھینک دیا فنبذوہ وراء ظھورھم۔ اور یہ سب کچھ اس کے نفس کی تزیین تھی۔ یعنی میرے دل نے مجھے یہ کام اچھا کر کے دکھایا اس لیے میں نے ایسا کیا یہی قول ابومسلم کا ہے اور یا مراد یہ ہے کہ زیورات کا بنی اسرائیل سے لینا تو رسول کی تعلیم کا کچھ اثر تھا مگر پھر اسے پھینک دیا اور انہی زیورات کے ذریعہ سے قوم کو مشرک بنا دیا۔

۲۰۹۷ سامری کا لوگوں سے میل جول روکا جانا: لامساس۔ مَسّ دیکھو ع۳۰۵ اور مِساس ایک دوسرے کو چھونا اور لامساس کے معنی ہیں تم کسی سے مخالطت نہ کرو، یعنی میل جول نہ رکھو۔ سامری کا میل جول دوسرے لوگوں سے بطور سزا روک دیا گیا (ل) پس معلوم ہوا کہ سامری کو یہ سزا دی گئی تھی کہ لوگوں سے اس کا میل جول روک دیا گیا اور لامساس کہنے سے مراد بظاہر یہی ہے کہ وہ کسی سے ملے نہیں اور قول اس معنی میں آسکتا ہے دیکھو ع۴۵ اور اگر منہ سے کہنا ہی مراد ہے تو بھی غرض یہی ہے کہ اگر کوئی اس سے کلام کرنا بھی چاہے تو بھی وہ کہہ دے کہ اسے یہ حکم نہیں۔

۲۰۹۸ ظلت۔ اصل میں ظَلَلْتَ ہے۔ ایک لام حذف ہو گیا ہے دیکھو ع۱۷۵۱۔

اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

تمھارا معبود صرف اللہ ہے، جس کے سوائے کوئی معبود نہیں، اس کا علم ہر چیز پر پھیلا ہوا ہے۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَیْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَیْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿ۚۖ۹۹﴾

اسی طرح ہم تجھ پر اس کی خبر بیان کرتے ہیں، جو پہلے گزر چکا، اور ہم نے تجھے اپنے پاس سے ذکر دیا ہے۔

مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ یَحْمِلُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ۙ

جو کوئی اس سے منہ پھیرے گا تو وہ قیامت کے دن بوجھ اٹھائے گا۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ۙ

اسی میں رہے گا اور قیامت کے دن اُن کا بوجھ بُرا ہوگا۔

یَّوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿ۚۖ۱۰۲﴾

جس دن صور پھونکا جائے گا اور ہم اس دن مجرموں کو اکٹھا کریں گے ان کی آنکھیں نیلی ہونگی ٢٠٩٩

یَّتَخَافَتُوْنَ بَیْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾

آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کریں گے کہ تم صرف دس (دن) ہی ٹھیرے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ اِذْ یَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِیْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا یَوْمًا ﴿۱۰۴﴾ ع ۱۴

ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہیں گے۔ جب ان میں سے اچھے طریق والا کہے گا تم صرف ایک ہی دن ٹھیرے نمبر ٢١٠٠

نحرقن ۔ حَرَق آگ یا آگ کا شعلہ ہے اور اَحْرَقَہٗ کے معنی ہیں جلایا اور حَرَّقَہٗ کثرت کے لیے ہے اور اِحْتَرَقَتْ حدیث میں آیا ہے جہاں اس کے معنی ہیں ھَلَکَتْ یعنی ہلاک ہوگئی اور دوسری حدیث میں ہے اُوحِیَ اِلَیَّ ان اُحْرِقَ قریشا جہاں اُحْرِقَ کے معنی ہیں اُھْلِكَ یعنی انہیں ہلاک کردوں اور حَرَقَ نابَہٗ (یَحْرُقُ) کے معنی ہیں دانت پیسے یہاں تک کہ اس کی آواز سنی گئی اور حَرَقَ الْحَدِیْدَ بالْمِبْرَدِ یَحْرُقُه اور حَرَّقَہٗ کے معنی ہیں لوہے کو سوہان سے کوٹا اور اس کے بعض کو بعض سے رگڑا اور یہاں نُحَرِّقَنَّہٗ کی جگہ لَنَحْرُقَنَّہٗ بھی قرأت پڑھی گئی ہے اور دونوں کے معنی ایک ہیں (ل)

ننسفن ۔ نَسَفَ ہوا کا ایک چیز کو اُکھیڑ دینا اور اس کا دور کر دینا ہے۔ ینسفها ربی نسفا (۱۰۵) اور لننسفنه فی الیم نسفا کے معنی ہیں ہم اسے دریا میں اس طرح ڈال دیں گے جس طرح مٹی کا غبار ہوتا ہے۔

بچھڑے کی خاک بائبل سے اختلاف: چونکہ نحرقنه کے معنی دو طرح ہو سکتے ہیں یعنی جلانا اور پیس ڈالنا ممکن ہے جلانے سے وہ خاکستر کی طرح ہوگیا ہو اور ممکن ہے بوجہ سونے چاندی وغیرہ سے بنا ہونے کے اس کو پیس کر ریت کی طرح کیا گیا ہو۔ دونوں صورتوں میں اسے دریا میں ڈال دیا گیا تاکہ اس کی خاکستر سے بھی کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے یہاں بھی قرآن کریم نے بائبل کے اس قصہ کی تردید کی ہے کہ بچھڑے کی خاکستر گھول کر بنی اسرائیل کو پلائی گئی (خروج: ۳۲-۲۰) بعض مفسرین نے یہاں بھی یہ قصہ بڑھا دیا ہے کہ اس بچھڑے میں گوشت اور خون پیدا ہو گیا تھا گویا وہ سچ مچ کا زندہ بچھڑا بن گیا تھا اس لیے اسے جلانے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ بھی بالکل بے بنیاد بات ہے۔

ع۲۰۹۹ زرق ۔ زُرْقَة سیاہی اور سفیدی کے درمیان ایک رنگ ہے یعنی نیلا اور کہا جاتا ہے زَرِقَت عینُه یعنی اس کی آنکھ نیلی ہے۔ اور یہاں معنی عمیا یعنی اندھے کیے گئے ہیں (غ) مگر ظاہر معنی زیادہ موزون ہیں۔ حضرت ابن عباس سے دریافت کیا گیا کہ ایک آیت میں عمی یعنی حشر میں اندھے ہونے کا ذکر ہے اور یہاں زرقاً یعنی نیلی آنکھوں والے۔ تو آپ نے فرمایا کہ قیامت کے مختلف حالات ہیں۔ (ر) اور ہوسکتا ہے کہ اس زرق کے لفظ سے بعض ایسی قوموں کی طرف اشارہ ہو، جن کی آنکھیں نیلی ہیں اور حشر کے معنی میں ان کے دنیوی حشر کی طرف اشارہ ہو۔

ع۲۱۰۰ دس دن اور ایک دن رہنے سے مراد: پہلی آیت میں ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کہیں گے کہ تم دس دن رہے اور یہاں ان میں سے اعلیٰ درجہ کے انسان

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۝١٠٥	اور تجھ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں تو کہہ دے کہ میرا رب انہیں اڑا کر بکھیر دے گا ۲۱۰۱
فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝١٠٦	پھر ان کو صاف ہموار میدان کر چھوڑے گا۔
لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ۝١٠٧	نہ تو ان میں ٹیڑھا پن دیکھے گا اور نہ اونچ نیچ ۲۱۰۲
يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ	اس دن بلانے والے کی پیروی کریں گے جس میں کوئی کجی نہیں۔
وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا	اور رحمٰن کے سامنے آوازیں پست ہو جائیں گی، پس تو سوائے ہلکی

کا قول بیان کیا ہے کہ تم ایک ہی دن رہے۔ اگر یہ قیامت کا قول ہے تو عشرا اور یوم کا الگ الگ بیان کرنا کوئی خاص معنی نہیں رکھتا دونوں قلت میعاد پر دلالت کرتے ہیں۔ اگر کسی قوم کی حیات دنیا کی طرف اشارہ لیا جائے تو پھر عشرا سے مراد دس صدیاں ہوں گی اور افضل انسان کا قول کہ یہ دس صدیاں نہیں ایک یوم ہے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک یوم ہزار سال کی طرح ہے وان یوما عند ربك كالف سنة مما تعدون (الحج ۲۲-۴۷) اور دوسری جگہ امر اسلام کا ایک ہزار سال رکا رہنا مذکور ہے ثم يعرج اليه في يوم كان مقداره الف سنة مما تعدون (السجدۃ ۳۲-۵) اس لیے اگر یہاں مراد ایسی قوم لی جائے جو اسلام کی ترقی میں مانع ہو اور اس کے خلاف زور لگائے تو واقعات کے لحاظ سے اقوام یورپ پر یہ الفاظ صادق آتے ہیں کہ ان کی آنکھیں بھی نیلی ہیں اور ایک ہزار سال تک انہوں نے اسلام کی ترقی کو بھی روکا ہے ؏

ع ۲۱۰۱ جبال اور ان کے اڑانے کے متعلق دیکھو ع ۱۶۲۳ جیسا کہ میں بار ہا کہہ چکا ہوں قرآن کریم نے جو الفاظ قیامت کبرٰے کے متعلق استعمال کئے ہیں۔ وہ ایک رنگ میں قیامت وسطیٰ پر بھی صادق آتے ہیں۔ اور وہ وعید جن کا ذکر آیت ۱۱۳ میں ہے جس طرح قیامت سے تعلق رکھتے ہیں اس دنیا کی زندگی سے بھی تعلق رکھتے ہیں مثلاً اسی سورت میں فرعون کی ہلاکت اور سامری کی سزا کا ذکر ہے اور یہ دونوں باتیں اس دنیا سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ قرآن شریف ایک قوم کی اس دنیا میں تباہی کو بطور نظیر بیان کر کے پھر مخالفین نبی کریم صلعم کو صرف عذاب قیامت سے ڈرائے کیونکہ عذاب قیامت سے تو یوں بھی ڈرایا جا سکتا تھا اس کے لیے کسی قوم کی دنیوی سزا کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ اور خود الفاظ آیت پر غور کیا جائے تو یہاں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ قیامت کے آنے یا مردوں کے زندہ ہونے کے لیے جبال یعنی پہاڑوں کا وجود کوئی رکاوٹ نہیں کہ وہ لوگ اس کے متعلق سوال کرتے نہ ایسا سوال کبھی کسی نے فی الواقع کیا کہ پہاڑ موجود ہیں تو قیامت کیونکر آئے گی اور مفسرین نے جو اس دقت کو یوں دور کرنا چاہا ہے کہ یہ سوال بطور استہزا تھا تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس میں استہزا کیا ہے اور اگر بطور استہزا ہی ذکر تھا تو سمندروں کے متعلق سوال کیوں نہ کیا یا درختوں کے متعلق کیوں نہ کیا اصل بات یہی ہے کہ وہ لوگ جبال کا لفظ عظیم الشان انسانوں پر بولتے تھے۔ اور جب انہیں طرح طرح کے پیرایوں میں بتایا جاتا تھا کہ آخر ان کی بھی وہی حالت ہو گی جو پہلے حق کا مقابلہ کرنے والوں کی ہوئی جیسا کہ آیت ۱۱۳ میں ذکر ہے تو انہیں یہ امر مستبعد معلوم ہوتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اتنے اتنے عظیم الشان انسان جو حق کی مخالفت کے درپے ہیں یہ کہاں جائیں گے اور اس کے جواب میں ایسا پیرایہ اختیار فرمایا ہے۔ کہ ان الفاظ میں قیامت کبرٰے اور قیامت وسطیٰ دونوں کا ذکر آ گیا ہے اور ولو ان قرانا سيرت به الجبال (الرعد ۱۳-۳۱) اس پر شاہد ہے کہ اس قرآن کے مقابل پر کتنے بھی عظیم الشان لوگ آئیں اللہ تعالیٰ ان سب کو دور کر دے گا ؏

ع ۲۱۰۲ قاع ۔ قاع اور قیع ہموار زمین کو کہتے ہیں جس کی جمع قیعان ہے (غ) یا فراخ نرم پست زمین جس میں کوئی اونچ نیچ نہ ہو اور نہ اس میں سبزی وغیرہ ہو اور قیعة بعض کے نزدیک واحد اور بعض کے نزدیک قاع کی جمع ہے (ل) کسراب بقيعة (النور ۲۴-۳۹)

صفصف ۔ ہموار زمین کو کہتے ہیں گویا کہ وہ ایک صف میں ہے (غ) ؏

اَمت کے اصل معنی قدر یا اندازہ ہیں اور اَمت چھوٹے ٹیلے کو کہتے ہیں اور اس زمین کو بھی جس میں نشیب فراز ہو اور حدیث میں عیب اور شک کے معنی میں بھی آیا ہے (ل)

ان آیات میں ھا کی ضمیر جبال کی طرف ہی ہے گویا پہاڑ جو روک کا کام دیتے ہیں وہ نہ رہیں گے اور وہی ہموار پست زمین بن جائیں گے گویا ایک انقلاب عظیم کا آنا مراد ہے وہ انقلاب عظیم اس دنیا میں یوں آیا کہ مقابلہ کرنے والے سب نابود یا مطیع ہو گئے اور سب روکیں جو حق کے پھیلنے میں نظر آتی تھیں دور کر دی گئیں اور ان میں عِوَج اور اَمت نہ رہنے کا ذکر کیا حالانکہ عِوَج اس ٹیڑھا پن کو کہا جاتا ہے جس کا ادراک فکر اور بصیرت سے ہو اگر آنکھ سے دکھا جانے والا ٹیڑھا پن مراد ہوتا تو عَوَج چاہیئے تھا دیکھو ع ۴۸۶ اور پہلے یہ لوگ وتبغونها عوجا (الاعراف ۷-۸۶) کے مصداق تھے آخر یہ عوج نہ رہے گا۔ اور اسی طرح امت کے دوسرے معنی کے لحاظ سے پہلے وہ شک میں تھے وہ بھی جاتا رہیگا اور قیامت میں پہاڑوں کو دور کر کے زمین کے ہموار کر دینے سے جو مراد ہے اس کی اصل حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے کہ اس کی کیا صورت اور کیا غرض ہے۔

تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿١٠٨﴾

آواز کے کچھ نہ سنے گا ع٢١٠٣

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾

اس دن سفارش کسی کو نفع نہ دے گی سوائے اس کے جس کے لیے رحمٰن اجازت دے اور اس کے لیے بات کو پسند کرے ع٢١٠٤

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿١١٠﴾

وہ جانتا ہے جو اُن کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَ قَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿١١١﴾

اور زندہ قائم (خدا) کے سامنے بڑے بڑے لوگ ذلیل ہو جائیں گے اور وہ نامراد ہُوا جس نے ظلم (کا بوجھ) اٹھایا ع٢١٠٥

وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا ﴿١١٢﴾

اور جو اچھے عمل کرے اور وہ مومن ہے تو اسے نہ ظلم کا خوف ہوگا اور نہ حق تلفی کا ع٢١٠٦

ع٢١٠٣ داعی۔ دعاء کے لیے دیکھو ع٢٠٨ اور داعی دعا کرنے والا یا پکارنے والا ہے اور داعی ایک لحاظ سے اللہ تعالیٰ کو پکارنے والا ہے اُجیب دعوۃ الداع (البقرۃ ٢-١٨٦) اور ایک لحاظ سے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اطاعت کی طرف بلانیوالا۔ اسی لحاظ سے نبی کریم صلعم کو داعی کہا ہے۔ وداعیًا الی اللہ باذنہ وسراجا منیرا (الاحزاب ٣٣-٤٦) اور قرآن کریم میں آنحضرت صلعم کو داعی اللہ بھی کہا ہے اجیبوا داعی اللہ (الاحقاف ٤٦-٣١) اور داعی اللہ مؤذن کو بھی کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ بھی توحید اور طاعت کی طرف بلاتا ہے (ل)

ھمس۔ صوت خفی کو کہتے ہیں (غ) یعنی ایسی آواز جو مخفی ہو یا بہت ہی ہلکی ہو۔

داعی کون ہے، قرآن کریم میں تو یہ لفظ بالخصوص رسول اللہ صلعم پر ہی بولا گیا ہے اور آپ کا نام خاص طور پر داعی الی اللہ یا داعی اللہ رکھا گیا ہے۔ مگر مفسرین یہاں داعی الی المحشر مراد لیتے ہیں یعنی اسرافیل۔ مگر اسرافیل کی اتباع لوگ کس طرح کریں گے اور پھر لاعوج لہ سے کیا مراد ہے۔ اگر داعی رسول اللہ صلعم ہوں تو لاعوج لہ آپ کی صفت ہے انزل علی عبدہ الکتاب ولم یجعل لہ عوجا (الکھف ١٨-١) مگر اسرافیل مراد لے کر یوں تاویل کرنی پڑتی ہے کہ وہ ظلم نہیں کرے گا اور یا یوں کہ وہ بعض لوگوں سے ہٹ کر بعض کی طرف مائل نہ ہوگا یعنی اپنی آواز سب کو سنائے گا اور یہ دونوں تاویلیں بعید ہیں۔ اور بعض مفسرین نے داعی سے مراد یہاں رسول اللہ صلعم کو ہی لیا ہے (ر) اور رسول اللہ صلعم کو داعی مراد لے کر یہ امر دنیا میں بھی صحیح ثابت ہوا اور آخرت میں بھی ہوگا کہ وہی لوگ جو پہلے آپ کے حد درجہ کے مخالف تھے وہ سب بڑے بڑے لوگ آپ کے متبع ہوئے اور آوازوں کا رحمان کے سامنے پست ہونا بھی دنیا میں صحیح ہوا کہ سرکشی کی بجائے اللہ تعالیٰ کے حضور فروتنی اختیار کی ؎

ع٢١٠٤ شفاعت میں شافع اور مشفوع دونوں کے لیئے اذن کی ضرورت اور اس سے مراد: ان الفاظ کے معنی دونوں طرح پر ہو سکتے ہیں اول یہ کہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کسی کو نفع نہ دے گی مگر صرف اسی کو جس کی شفاعت کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت دے اور جس کی خاطر قول شفاعت کو پسند کرے یا جس کی بات کو پسند کرے یعنی جو ایمان اور طاعت پر قائم ہو۔ اور دوسرے یہ کہ کوئی شفاعت نفع نہ دیگی سوائے اس شخص کی شفاعت کے جسے رحمٰن اجازت دے اور جس کی بات کو پسند کرے اور قرآن شریف سے ثابت ہے کہ شفاعت میں اذن شفاعت کرنے والے کے لیے بھی ہے اور جس کے لیے شفاعت کی جائے اس کے لیے بھی من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ (البقرۃ ٢-٢٥٥) لایشفعون الا لمن ارتضی (الانبیاء ٢١-٢٨)۔ اور اذن سے مراد یہ ہے کہ شفاعت کرنے والے بھی خاص لوگ ہوں گے جو قرب کے مرتبہ پر ہیں اور مشفوع بھی خاص لوگ ہوں گے جنہوں نے کوشش کی مگر ایسی وجوہات سے جو ان کی طاقت سے باہر ہیں کمال کے کرنے سے رہ گئے ؎

ع٢١٠٥ عنت کے لیے دیکھو ع٢٨٣ اور وجوہ وجہ کی جمع ہے جس کے لیے دیکھو ع١٤٤ و ع٦٦٧ اور مراد مونہوں سے خود وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں اور اشراف الناس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے (ر) پس مطلب یہ ہے کہ بڑے بڑے لوگ حی قیوم خدا کے سامنے ذلیل ہو جائیں گے۔ اور حی قیوم کا لفظ لانے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ ان کو حقیقی زندگی عطا فرمائے گا یعنی وہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور عرب کے کل کے کل بڑے بڑے لوگ آخر مسلمان ہوئے ؎

ع٢١٠٦ ھضم ھضم کے معنی ہیں اس چیز کا توڑنا جس میں نرمی ہو اور طلعھا ھضیم (الشعراء ٢٦-١٤٨) میں مراد ہے کہ اس کا بعض بعض میں داخل ہے گویا کہ اسے توڑا گیا ہے (غ) اور اسی سے کھانے کا ہضم ہونا ہے اور ھضمہٗ حقّہٗ کے معنی ہیں اس کا حق اسے ناقص کر کے دیا اور ھضیم اسے کہتے ہیں جو اپنے گابھ کے اندر ہو اور خوشگوار اور تازہ بھی اس کے معنی ہیں (ل) ؎

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّ	اور اسی طرح ہم نے اسے قرآن عربی اتارا اور اس میں طرح
صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ	طرح سے ڈرانے کی باتوں کو بیان کیا ہے تاکہ وہ (بُری راہوں سے)
يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿١١٣﴾	بچیں بلکہ یہ ان کے لیے بڑائی پیدا کرے گا ۲۱۰۷
فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ	سو اللہ کی بلند شان ہے جو سچا بادشاہ ہے اور تو قرآن کے لینے
بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ	میں جلدی نہ کر قبل اس کے کہ اس کی وحی تیری طرف پوری کی جائے
وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿١١٤﴾	اور کہہ میرے رب مجھے علم میں بڑھا ۲۱۰۸
وَلَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ	اور یقیناً ہم نے آدم کو پہلے حکم دیا تھا مگر وہ بھول گیا ، اور
ع ٦/١٥ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿١١٥﴾	ہم نے اس کا عزم نہ پایا ۲۱۰۹
وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ	اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو ، تو
فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿١١٦﴾	انھوں نے فرمانبرداری کی مگر ابلیس نے (نہ کی) اس نے انکار کیا۔
فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ	تو ہم نے کہا اے آدم یہ تیرا اور تیرے جوڑے کا دشمن ہے سو یہ تم دونوں کو

مومنوں کے حق میں ظلم و ہضم کی نفی: ایسے مومن کو جو اعمال صالحہ کرے ظلم اور ہضم کا خوف نہیں ہوگا ظلم تو یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک کام نہیں کیا اور اسے سزا دی جائے یا جتنا برا کام کیا ہے اس سے بڑھکر سزا دی جائے اور ہضم یہ کہ جو اس نے اچھا کام کیا ہے اس کے بارہ میں اس کی حق تلفی ہو یعنی اس کے ذمہ خواہ مخواہ کوئی بدی نہ لگائی جائے گی نہ اس کے نیک کام بلا اجر رہیں گے اس کا مطلب یہ نہیں کہ برائی کرنے والوں کے حق میں ظلم اور ہضم ہوگا مگر چونکہ وہ سزا پائیں گے اور ان کے نیک عمل ایسے نہ ہوں گے جو ان کو سزا سے بچا سکیں اس لئے یہ ترکیب اختیار کی ہے اور اس سے پہلی آیت میں ہے من حمل ظلما تو گویا ظلم اللہ تعالےٰ انسان پر نہیں کرتا بلکہ برا انسان خود اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے پس جس نے خود اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا اسے کسی ظلم کا خوف نہیں اور جس نے اپنے نفس کے حقوق کو تلف نہیں کیا اس کی حق تلفی کوئی نہ ہوگی اس لیے اس کے معنی یوں بھی کئے گئے ہیں کہ وہ ظلم اور ہضم کی سزا سے بے خوف ہوگا ؛

ع ۲۱۰۷ یحدث - حدوث کے لیے دیکھو ع ۱۵۱۶ اور احداث وجود میں لانا ہے حتیٰ احدث لك منه ذکرا (الکھف ۱۸ - ۷۰) لعل اللہ یحدث بعد ذٰلك امرا (الطلاق ۶۵ - ۱)

اور ذکر سے مراد یہاں شرف و عظمت ہے دیکھو ع ۱۹۱ اور قرانا عربیا سے مراد ہے کھول کر بیان کرنے والا دیکھو ع ۱۵۱۶ اور اَوْ بمعنی بَلْ ہے یعنی نہ صرف وہ بدیوں سے بچ جائیں گے بلکہ یہ قرآن ان کے لیے ایک عظمت اور شرف کا مقام پیدا کر دے گا ؛

ع ۲۱۰۸ الحق کے لیے دیکھو ع ۶۵ قرآن کے متعلق جلدی کرنے سے مراد یہ لی گئی ہے کہ جیسا حدیث میں ذکر ہے پہلے نبی کریم صلعم اس خوف سے کہ کچھ رہ نہ جائے ملک سے وحی لینے میں جلدی کیا کرتے تھے مگر یہاں وعید کا ذکر ہے اس لیے یہ مراد نہیں ہو سکتی اصل یہ ہے کہ ابتدائی سورتوں میں وعد اور وعید کا ذکر زیادہ تر مجاز اور استعارہ کے رنگ میں ہے۔ جیساکہ اوپر بھی وعید کا ذکر اسی رنگ میں ہوا اور رسول اللہ صلعم یہ چاہتے تھے کہ ان کو ان کی بدکرداریوں اور مخالفت حق کا انجام صاف لفظوں میں جلد بتا دیا جائے۔ اسلئے فرمایا کہ اس معاملہ میں جلدی نہ کرو بلکہ کہو رب زدنی علما یعنی اور زیادہ علم دیا جائے اور آنحضرت صلعم کی دعا مذکور ہے اللّٰھم انفعنی بما علّمتنی وعلّمنی ما ینفعنی وزدنی علما اے اللہ مجھے اس سے نفع پہنچا جو تونے مجھے علم دیا ہے اور مجھے وہ علم دے جو مجھے نفع دے اور میرا علم بڑھا ؛

ع ۲۱۰۹ آدم کی عصمت: عـزم - کے لیے دیکھو ع ۲۹۰ کسی امر کے کر گزرنے کے لیے دل کو پختہ کر لینا اور یہاں نسیان کا قرینہ بتاتا ہے کہ جو امر آدم سے سرزد ہوا وہ نسیان کا نتیجہ تھا۔ عزم یعنی عمداً اور ارادہ سے نہ تھا۔ بالفاظ دیگر ذنب پر عزم نہ تھا یہ معنی ابن زید وغیرہ سے مروی ہیں (ر) اور راغب نے یوں معنی کیے ہیں کہ یہاں مراد اس امر کی محافظت، یعنے جو کچھ حکم دیا گیا تھا اس کی حفاظت نہ کر سکے اور قیام پر ہم نے ان میں عزم نہ پایا (غ) دونوں صورتوں میں نسیان کا لفظ آدم کی عصمت پر بیّن دلیل ہے۔

وحی سے فطری کمزوری کا علاج: یہاں چونکہ اوپر ایک معاملہ میں جلدی کرنے سے روکا تھا تو اس لحاظ سے حضرت آدم کا ذکر کیا کہ انہوں نے بھی جلد ایک نتیجہ کو حاصل کرنے کے خیال سے غلطی کھائی اور یا اس لحاظ سے ذکر ہے کہ انسان وحی الٰہی کے بغیر خود بخود اپنی فطری طاقت سے بدی کا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ حضرت آدم بھی جب فطری عہد کو قائم نہ رکھ سکے تو اس کمزوری کا علاج وحی الٰہی سے کیا گیا۔

فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾
جنت سے نہ نکلوا دے پس تو تکلیف میں پڑے ۲۱۱۰

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾
تیرے لیے یہ ہے کہ تو اس میں نہ بھوکا رہے اور نہ ننگا رہے۔

وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾
اور یہ کہ تو اس میں نہ پیاسا رہے اور نہ دھوپ میں رہے ۲۱۱۱

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰاٰدَمُ هَلْ
پس شیطان نے اس کو وسوسہ ڈالا کہا اے آدم کیا میں تجھے ہمیشگی

اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾
کے درخت کا پتہ دوں اور ایسی بادشاہت کا جو پرانی نہ ہو ۲۱۱۲

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ
سو دونوں نے اس سے کھایا تو اُن کے عیب اُن کے لیے ظاہر ہو گئے

طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ
اور وہ جنت کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنے لگے اور آدم نے

وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾
اپنے رب کی نافرمانی کی پس ناکام ہُوا ۲۱۱۳

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى ﴿۱۲۲﴾
پھر اس کے رب نے اسے چن لیا پس اس پر رحمت سے متوجہ ہوا اور راستہ دکھایا ۲۱۱۴

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًۢا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ
فرمایا تم سب اس سے نکل جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ سو اگر

عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ۵
میری طرف سے تمھارے پاس ہدایت آئے، سو جو کوئی میری

۲۱۱۰ تشقٰی۔ شقا اور شقاوۃ کے لیے دیکھو ۱۵۰۴ کسی قسم کی خیر سے محرومی اور شقاء شدّت اور عُسرت (سختی اور تنگی) کو بھی کہتے ہیں (ل) جنت سے نکلنے کا نتیجہ شقاوت ہے پس یہ شقاوت شدت و عسرت ہی ہے۔

۲۱۱۱ تجوع جُوع وہ تکلیف ہے جو انسان کو معدہ کے کھانے سے خالی ہونے کی وجہ سے پہنچتی ہے (رغ) اور عِلم کے لیے استجاعۃ یعنی طلب جوع یہ ہے کہ اس سے انسان سیر نہ ہو اور جاع الی لقائہٖ کے معنی ہیں اس کی ملاقات کی خواہش کی (ل) یعنی معانی میں بھی اس کا استعمال ہے۔

تعریٰ۔ عَرِیَ کے معنے ہیں ننگا ہوا اور عَرُوٌّ من الذنب کے معنی ہیں ذنب سے عاری (رغ) اور حدیث میں آنحضرت صلعم کی صفت میں ہے انا النَّذِیرُ الْعُرْیَانُ یعنی کھول کر بیان کرنے والا نذیر (ل)

تظمؤا۔ ظَمَاء کے معنی پیاس ہیں۔ اور ظَمْاٰن پیاسا یحسبہ الظمان ماء (النور ۲۴۔ ۳۹)

تضحٰی۔ ضَحِیَ (یَضْحٰی) تَعَرَّضَ للشمس یعنی اپنے آپ کو سورج کے سامنے رکھا اور لا تضحٰی کے معنی ہوئے کہ سورج کی گرمی سے محفوظ کر لیتا ہے (رغ)

ان دو آیات میں اسباب راحت کو جمع کر دیا ہے بھوک کی تکلیف سے بچا رہے ننگا نہ ہو پیاس اور دھوپ سے محفوظ رہے کھانا پینا پہننا مکان یہی انسان کی ضرورت کی چار چیزیں ہیں اور ان کا مہیّا ہو جانا گویا انسان کی آسائش کے اسباب کا اجتماع ہے۔ اور دوسری جگہ اسی خیال کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے وکلا منہا رغدا حیث شئتما (البقرۃ ۲۔ ۳۵) گویا دونوں جگہ ہر قسم کی فراغت کا ہی ذکر ہے۔ مگر کیا اس سے مراد جسمانی طور پر فارغ البال ہونا ہے اور انسان کی جنت یہی ہے کہ اسے کھانے پینے کو بہت ملے؟ تو پھر اس جنت کو بہت سے بدکار بھی اس دنیا میں حاصل کر لیتے ہیں آیت ۱۲۴ اس کو حل کرتی ہے جو شخص میرے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اس کے لیے تنگی کی روزی ہے ظاہر ہے کہ اس تنگی کی معیشت سے یہ مراد نہیں کہ اسے جسم کو قائم رکھنے کے لیے سامان معیشت کم ملیگا یا نہ ملے گا بلکہ وہ ایسی تنگی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن وہ اندھا اُٹھایا جائیگا۔ اسی مضمون پر دیکھو ۱۰۶۱ و ۱۰۶۴ پس گو لفظ بھوک اور پیاس وغیرہ کے استعمال ہوئے ہیں مگر مراد یہی ہے کہ روحانی طور پر تنگی نہیں بلکہ آسایش حاصل ہے اور یا مطلب یہ ہے کہ جب انسان اپنی زندگی کی اصل غرض ذکر اللہ یا لقاء اللہ کو سمجھے تو کھانے پینے وغیرہ سامانوں کے متعلق اسے آسائش حاصل ہوتی ہے اس لیے کہ وہ ان کے پیچھے نہیں پڑتا اور کھانے پینے کو اللہ تعالیٰ دے ہی دیتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھو ۲۱۱۶ نیز دیکھو ۵۴۔

۲۱۱۲ دوسری جگہ ہے اِلّا ان تکونا ملکین او تکونا من الخالدین (الاعراف ۷۔ ۲۰) پس شجرۃ الخلد سے مراد ہمیشہ کی زندگی ہے دیکھو ۱۰۶۲۔

۲۱۱۳ غوٰی۔ کے معنی یہاں جہل کیے گئے ہیں یعنی جاہل ہوا یا خاب یعنی ناکام رہا۔ یا فسد عَیْشُہٗ یعنی اس کی زندگی میں فساد واقع ہوا۔ ان الفاظ کی تفسیر ۱۰۶۴ میں گزر چکی ہے۔

۲۱۱۴ اجتبٰی کے لفظ میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں بھلائی کی باتوں کو جمع کیا تھا دیکھو ۵۷۵ اور ھدیٰ میں اس ہدایت کی طرف اشارہ کیا جو بذریعہ وحی الٰہی ملتی ہے فتلقّٰی اٰدم من ربہ کلمات فتاب علیہ (البقرۃ ۲۔ ۳۷) یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے ذریعہ سے ان غلطیوں سے بچایا جن کے دفع کرنے پر فطرت انسانی اکیلی قادر نہیں۔

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

ہدایت کی پیروی کریگا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا ع۲۱۱۵

اور جو کوئی میرے ذکر سے منہ پھیرے گا تو اس کے لیے تنگی کی زندگی ہوگی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے ع۲۱۱۶

کہے گا اے میرے رب تو نے مجھے اندھا کیوں اُٹھایا اور میں دیکھنے والا تھا ع۲۱۱۷

کہا ایسا ہی تیرے پاس میری آیات آئیں تو تُو نے ان کی پروا نہ کی اسی طرح آج تیری بھی پروا نہ کی جائے گی۔

اور اسی طرح ہم اسے بدلہ دیتے ہیں جو حد سے بڑھے اور اپنے رب کی باتوں پر ایمان نہ لائے اور آخرت کا عذاب یقیناً زیادہ سخت اور زیادہ دیر پا ہے ع۲۱۱۸

ع۲۱۱۵ ھبط کے لیے اور بعضکم لبعض عدو کے لیے دیکھو ع۵۶ ذکر تو دونوں کا ہے مگر کل نسل انسانی کو خطاب کر لیا ہے اس لیے کہ یہ دونوں ساری نسل کے لیے بمنزلہ اصل کے ہیں اور بتایا یہ ہے کہ جو قانون ان دو پر حاوی ہے وہی سب نسل انسانی پر حاوی ہوگا۔

ع۲۱۱۶ ضنک کے معنی ضیّق یعنی تنگ ہیں۔

تنگی کی زندگی سے کیا مراد ہے۔ بعض مفسرین نے اسے عذاب قبر قرار دیا ہے بعض نے عذاب جہنم۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ اس دنیا کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ اس کے بعد آتا ہے ونحشرہ یوم القیامۃ اعمٰی پس لازماً وہ کوئی اور بات ہے اب یہاں اللہ سے اعراض کا ذکر ہے اور دوسری جگہ فرمایا الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب (الرعد ۱۳-۲۸) یعنی اطمینانِ قلب انسان کو اس دنیا کی زندگی میں صرف ذکر اللہ سے ملتا ہے اور جو ذکر اللہ سے اعراض کریگا ظاہر ہے کہ وہ اطمینان قلب کو کبھی حاصل نہیں کر سکتا اور فی الحقیقت زندگی میں وسعت اور تنگی کثرت وقلت سامان پر منحصر نہیں بلکہ حالت قلب پر اس کا انحصار ہے جسے اطمینان قلب میسّر آجاتا ہے تو اسے تھوڑے سامان بھی بہت ہیں اور جسے اطمینان قلب نہیں ملتا اس کے لیے ساری دنیا بھی ہو تو بھی اور زیادہ جلن کا موجب ہی ہوتی ہے اور حضرت ابن عباس سے معیشۃ ضنکا کے معنی شقاء مروی ہیں (ج) یعنی خیرات اور نیکیوں سے محرومی اور بعض کے نزدیک رزق حرام اور کسب خبیث مراد ہے کیونکہ وہ باوجود فراخی کے تنگی ہے (ج) پس دنیا دار کی زندگی فی الواقع ایک تنگی کی زندگی ہے اور وہ خود اس تنگی کو محسوس کرتا ہے اور ایک اور لحاظ سے بھی یہ تنگی کی زندگی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختلف قسم کے قویٰ دیئے ہیں اور ان سب قویٰ سے کام لینے سے ہی انسان کی زندگی میں حقیقی کشائش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ اخلاقی اور روحانی پہلو کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف دنیا کی زندگی پر ہی گرے رہتے ہیں وہ خود اپنی زندگی کو ایک تنگ دائرہ میں محدود کر دیتے ہیں۔ حشر میں اندھا ہونے سے مراد: اور ان کا زندگی کے حقیقی پہلو سے آنکھیں بند رکھنا ہی اس بات کا موجب ہے کہ وہ قیامت کے دن اندھے اُٹھیں گے کیونکہ وہ یہاں اندھے رہے من کان فی ھذہ اعمٰی فھو فی الاخرۃ اعمٰی (بنی اسرائیل ۱۷-۷۲) اس سے بھی معلوم ہوا کہ انسان کو جنت یا سکون یا اطمینان قلب اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنے سے ملتا ہے اور وہ جنت جو انسان اس دنیا میں حاصل کر سکتا ہے اور جس میں پہلے آدم کو رکھا گیا تھا یہی اطمینانِ قلب کی جنت تھی دیکھو ع۵۴۔

اعمٰی یا اندھا اٹھانے سے کیا مراد ہے؟ دوسری جگہ ہے ونحشرھم یوم القیامۃ علیٰ وجوھھم عمیا وبکما وصما (بنی اسرائیل ۱۷-۹۷) یعنی اندھے بہرے گونگے اٹھائے جائیں گے عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ ان کی آنکھیں نہیں ہونگی مگر وہ آگ کو دیکھیں گے ورا المجرمون النار (الکھف ۱۸-۵۳) اور اپنا نامۂ اعمال بھی پڑھیں گے اقرأ کتابک (بنی اسرائیل ۱۷-۱۴) پس یہ ایسا اندھا پن ہے کہ سزا کے سامانوں کو دیکھیں گے اور نعماء کو نہ دیکھ سکیں گے اور ان نعماء کو وہی دیکھ سکتا ہے۔ جو خود اپنے اندر ایسی آنکھیں پیدا کرتا ہے جن سے وہ نعماء دیکھی جا سکتی ہیں۔ ایک راستباز انسان جس راحت اور جنت کو اس دنیا کی زندگی میں محسوس کرتا ہے اسے ایک طالب دنیا نہیں دیکھ سکتا۔ پس نعمائے جنت کو کس طرح دیکھے اور آیت ۱۲۶ میں بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ترک کیا جانا یا لقاء اللہ سے محرومی یہی نابینائی ہے۔

ع۲۱۱۷ اس کا یہ کہنا کہ میں بصیر تھا تو مراد اس سے دنیوی معاملات میں بصیرت ہے اگلی آیت میں جواب سے یہ ظاہر ہے جہاں فرمایا کہ ہماری آیات آئیں تو ان کی پروا نہ کی یعنی ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس لیے دنیا کے معاملات میں بصیرت وہاں فائدہ نہیں دے سکتی اور جو آنکھ یہاں بند رہی وہ وہاں بھی بند ہوگی۔

ع۲۱۱۸ اسراف کسی فعل میں حد سے گزر جانے کا نام ہے اور یہاں شہوات میں انہماک مراد ہے اور عذاب آخرت کو جو اشد وابقٰی کہا تو مراد ہے کہ

اَفَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ؑ (١٢٨)	تو کیا ان کو اس سے ہدایت نہیں ہوئی کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی نسلوں کو ہلاک کیا، جن کے رہنے کی جگہوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں، اِس میں عقل والوں کے لیے نشان ہیں ٢١١٩
وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ؕ (١٢٩)	اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے نہ ہو چکی ہوتی، اور ایک وقت مقرر (نہ ہوتا) تو یقیناً (عذاب) آ ہی لگا ہوتا ٢١٢٠
فَاصْبِرْ عَلٰى مَا یَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَ مِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى (١٣٠)	سو اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں اور سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور رات کے وقتوں میں بھی تسبیح کر اور دن کی طرفوں میں بھی، تاکہ تو راضی ہو جائے ٢١٢١
وَ لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ۬ لِنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ ؕ وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰى (١٣١)	اور اپنی نگاہیں اس کے پیچھے لمبی نہ کر جو ہم نے ان میں سے قسم قسم کے لوگوں کو دنیا کی زندگی کی آرائش کے لیے سامان دیا ہے تاکہ ہم ان کو اس کے ذریعہ سے آزمائیں اور تیرے رب کا رزق بہتر اور زیادہ دیرپا ہے ٢١٢٢

دنیا کے عذاب سے وہ زیادہ سخت اور دیرپا ہے اور دنیا کا عذاب وہ ہے جس کا ذکر فان لہ معیشۃ ضنکا میں ہے گویا وہی تنگی سخت تر صورت میں ظاہر ہو جائے گی۔

٢١١٩ع یھد۔ ھدایۃ کے معنی کیلئے دیکھو ع۵ اور ھَدٰی بمعنی بَیَّنَ بھی آتا ہے جیسے محمد بن کعب کی حدیث میں فما ھدی مِمّا رَجَعَ جس کے معنی ہیں کہ اس نے جو جواب دیا اس میں نہ بات کو واضح کیا نہ کوئی دلیل دی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لغت اہل غور میں ھَدَیت لَکَ کے معنی ہیں بَیَّنْتُ لَکَ یعنی بات کو کھول کر بیان کیا اور یہی معنی یہاں ہیں (ل)

٢١٢٠ع ترکیب میں یوں ہے ولولا کلمۃ سبقت من ربک واجل مسمی لکان لزامًا مگر لکان لزاما کو مقدم اس لیے کیا کہ فی الحقیقت یہ مستحق تو اسی بات کے تھے کہ عذاب فوراً ان کے لازم حال ہو جاتا اور کلمۃ جو پہلے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو چکا ہے وہ اس کی رحمت کی سبقت غضب پر ہے جس کی وجہ سے وہ جلد گرفت نہیں کرتا۔ اور اجل مسمی یہ تھی کہ مخالف اپنی تمام تدابیر کو کمال تک پہنچا کر آخر اسلام کو تلوار سے نیست و نابود کرنے کے لیے نکل پڑیں سیھزم الجمع ویولون الدبر (القمر ۵۴-۴۵) اس لیے اجل مسمی سے مراد بعض نے یوم بدر لیا ہے اور اس پر یہ اعتراض درست نہیں کہ یہاں ذکر عذاب استیصال کا ہے اور بدر میں استیصال نہیں ہوا اس لیے کہ وہ اس کی ابتدا ہے اور فتح مکہ کے ساتھ وہ عذاب استیصال کمال کو پہنچ گیا۔

٢١٢١ع اوقات نماز: مصائب پر صبر کے ساتھ ہمیشہ نماز کا ذکر ہوتا ہے کیونکہ اس میں رجوع الی اللہ ہے واستعینوا بالصبر والصّلوٰۃ اور یہاں بھی پانچ اوقات نماز کا ذکر ہے صبح اور عصر کا ذکر تو صراحت سے ہے قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا اور باقی نمازوں کا ذکر اناء الیل واطراف النہار میں ہے۔ دن کی طرفیں یوں بھی ہو سکتی ہیں کہ طلوع آفتاب سے پہلے اور زوال آفتاب کے بعد اور یہی مراد طرفی النہار (ھود ۱۱-۱۱۴) میں ہے اور یوں بھی ہو سکتا ہے کہ زوال آفتاب کے بعد اور غروب آفتاب کے بعد اور یہی مراد یہاں ہے یعنی ظہر اور مغرب اور ترضی میں یہ اشارہ ہے کہ کامیابی کو حاصل کرے کیونکہ کامیابی پر ہی انسان راضی ہوتا ہے۔

٢١٢٢ع زھرۃ۔ زَھْرۃ سبزی کی کلی کو کہتے ہیں اور بعض نے اسے سفید سے مخصوص کیا ہے اور زھرۃ الدنیا اس کی تر و تازگی اور حسن اور خوشنمائی کو کہا جاتا ہے اور زُھْرۃ حسن اور سفیدی کو کہا جاتا ہے اور رَجُلٌ اَزْھَر اس مرد کو کہا جاتا ہے جس کا رنگ سفید ہو اور جس کا منہ روشن ہو کیوں کہ اَزْھَر چاند کو اور اَزْھَران سورج اور چاند کو کہتے ہیں) اور عورت کو زَھْراء کہا جاتا ہے اور نبی کریم صلعم کی صفت میں ہے اَزْھَرُ اللَّوْنِ یعنی آپ کا رنگ سفید چمکدار تھا اور حضرت فاطمہؓ الزھراء کہلاتی ہیں۔

آرائش ظاہری کے سامان: ان آیات میں خطاب عام ہے اور اگر رسول اللہ صلعم کو بھی خطاب سمجھا جائے تو اصل مقصود امت سے خطاب ہے جس کے

وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿١٣٢﴾

اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور خود اس پر قائم رہ۔ ہم تجھ سے رزق نہیں مانگتے ہم تجھے رزق دیتے ہیں اور اچھا انجام تقویٰ کے لیے ہے ٢١٢٣

وَ قَالُوْا لَوْ لَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَ لَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿١٣٣﴾

اور کہتے ہیں ہم پر ایک نشان اپنے رب کی طرف سے کیوں نہیں لے آتا کیا ان کے پاس اس کی کھلی دلیل نہیں آچکی جو پہلے صحیفوں میں ہے ٢١٢٤

وَ لَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى ﴿١٣٤﴾

اور اگر ہم انھیں اس سے پہلے عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیتے تو کہتے اے ہمارے رب کیوں تو نے ہماری طرف رسول نہ بھیجا تو ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے قبل اس کے کہ ہم ذلیل اور رسوا ہوتے ٢١٢٥

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَ مَنِ اهْتَدٰى ﴿١٣٥﴾ ع ١٧

کہہ سب ہی انتظار کرنے والے ہیں سو تم بھی انتظار کرو پھر تم جان لوگے کہ کون سیدھے رستے پر چلنے والے ہیں اور کون ہدایت پر قائم ہیں۔

سامنے یہ زھرۃ الحیٰوۃ الدنیا کے سامان آنے والے تھے۔ نبی کریم صلعم کے سامنے ایسی قومیں نہ تھیں جنھوں نے دنیوی زندگی کی آرائش کو کمال تک پہنچایا ہو۔ یہ نقشہ آج یورپ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور اسی زمانہ کے مسلمان بالخصوص مخاطب ہیں کہ دوسری قوموں کے سامان زینت و آرائش و حسن کو دیکھ کر دنیا کے سامانوں کی طرف نہ جھک جائیں اور فی الحقیقت ایسا ہی ہوا ہے کہ آرائش ظاہری کی بیماری اور دنیا طلبی مسلمانوں میں بھی سرایت کر گئی ہے یہاں تک کہ خدا کے آگے جھکنے کے لیے انہیں وقت بھی نہیں ملتا اس کے بالمقابل رزق رب کا ذکر کیا جس سے مراد نبوت و ہدایت لی گئی ہے مگر فی الحقیقت تمام وہ امور اس میں داخل ہیں جو روحانیت سے تعلق رکھتے ہیں۔

٢١٢٣ اَھْل دیکھو ١٣٧ لـ یہ لفظ عام ہے اور صرف بیبیاں مراد نہیں، اگر خطاب رسول اللہ صلعم سے لیا جائے تو آپ کے کل متبعین اس میں شامل ہیں اور اگر عام ہے تو ہر شخص کے ساتھ اتحاد کا رنگ رکھنے والے لوگ اس میں داخل ہیں اور یہ جو نماز کے ذکر کے ساتھ فرمایا کہ ہم تجھ سے رزق نہیں مانگتے تو مطلب یہ ہے کہ نماز سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اس کی بڑائی اور عظمت زیادہ نہیں ہوتی، کیونکہ وہ کسی کا محتاج نہیں بلکہ نحن نرزقك میں بتایا کہ یہ نماز انسان کے رزق روحانی کا موجب ہے اور نماز کی ہدایت کر کے اللہ تعالیٰ انسان کو اس کا اصل رزق دیتا ہے اور یہی وہ رزق ہے جو انجام کار کام آنے والا ہے اسی کی طرف والعاقبة للتقوىٰ میں اشارہ ہے، اور اس طرف بھی کہ متقی کا انجام لازماً اچھا ہوگا۔

٢١٢٤ مطالبۂ عذاب ہلاکت کا لطیف جواب: قرآن کریم کی طرز تبلیغ اعلیٰ درجہ کی حکمت پر مبنی ہے جب ان کے سامنے قوموں کی ہلاکتوں کا ذکر ہوتا تو کہتے کہ اس قدر قوموں کی ہلاکت کا جو ذکر ہمیں سنایا جاتا ہے ایسا ہی ایک نشان ہلاکت ہم پر کیوں نہیں لے آتا۔ اٰية من ربه میں تنکیر نہ صرف نشان مطلوب کی عظمت کے لیے ہے بلکہ نکرہ لانے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جیسا نشانوں کا ذکر سنایا جاتا ہے ویسا کوئی ایک نشان استیصال ہم پر بھی لے آئے اس کا جواب نہایت لطیف دیا ہے ان کے پاس پہلے صحیفوں کا بیّنہ یعنی رسول رحمۃ للعالمین آچکا ہے یہ اس سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے جیسا کہ دوسری جگہ وقالوا لولا انزل عليه اٰيات من ربه (العنکبوت ٢٩ - ٥١) کا جواب دیا ہے اولم يكفهم انا انزلنا عليك الكتاب يتلى عليهم ان فى ذٰلك لرحمة وذكرىٰ لقوم يومنون (العنکبوت ٢٩ - ٥١) یعنی کتاب میں ان کے لیے رحمت موجود ہے وہ اس سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے ایسا ہی یہاں ہے کہ پہلے صحیفوں میں رسول کریم کا ذکر موجود ہے اور وہ کھلی دلیل اب ان کے پاس آچکی ہے کیونکہ پہلے صحیفوں کا بھی مصدق ہے اور بینة رسول کریم صلعم کو دوسری جگہ صفائی سے فرمایا لم يكن الذين كفروا من اهل الكتاب والمشركين منفكين حتىٰ تاتيهم البينة رسول من الله يتلوا صحفا مطهرة (البیّنۃ ٩٨ - ١و٢) اور دوسرے یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ جب پہلے صحیفوں کے مکذبوں پر عذاب آیا تو قرآن کریم کے جھٹلانے والے کیونکر اس سے بچ سکتے ہیں۔

٢١٢٥ عذاب اور رسول کا تعلق: یہاں دو باتیں بیان فرمائی ہیں اوّل یہ کہ مکذبین کا فساد اور شرارت تو پہلے ہی اس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ انہیں ہلاک کر دیا جاتا مگر اتمام حجت کے لیے ضروری تھا کہ رسول ان کے پاس آجاتا اس سے بھی معلوم ہوا کہ پہلی آیت میں بینة سے مراد رسول ہی ہے اور دوسرے عذاب جو مکذبین نبی کریمؐ پر آنے والا تھا اس کی نوعیت بھی بیان فرمادی ان نذل ونخزى یہ عذاب ذلت و رسوائی کا تھا۔ اسی میں ان کا استیصال اور یہی ان کی ہلاکت تھی کہ آخر کار اسی کے سامنے ذلیل اور مغلوب ہو کر آئے جس کو مٹانے کے درپے تھے آخری آیت میں صاف کہہ دیا کہ الٰہی فیصلے کا انتظار کریں وہ آکر رہے گا۔

آیاتہا ۱۱۲ (۲۱) سُوْرَۃُ الْاَنْبِیَآءِ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتہا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

۱ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ① لوگوں کے لیے اُن کا وقت حساب قریب آگیا ہے اور وہ غفلت میں مُنہ پھیرے ہوئے ہیں ۲۱۲۶

مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ کوئی نئی نصیحت اُن کے رب کی طرف سے اُن کے پاس نہیں آتی، مگر

نام: اس سورت کا نام الانبیاء ہے اور اس میں سات رکوع اور ۱۱۲ آیتیں ہیں، لفظ انبیاء اس سورت میں نہیں آتا مگر اس کا مضمون انبیاء علیہم السلام کے متعلق ہی ہے ان پر اعتراضات، ان کا مقام بلند، ان کے مخالفین کی ہلاکت اُن کے دشمنوں کے ہاتھ سے ان کی نجات، ان کا اور ان کے متبعین کا وارث زمین ہونا، انہیں باتوں کا اس میں ذکر ہے اور بالخصوص اس میں عصمت انبیاء کا مضمون نہایت صفائی سے بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے قول اور فعل دونوں میں کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں پر چلتے ہیں اس لحاظ سے اس کا نام الانبیاء ہے۔

خلاصہ مضمون: اس سورت کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ اعمال کی جزا و سزا کی لوگ پروا نہیں کرتے بلکہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جگانے والا آتا ہے تو اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ کبھی اس کی تعلیم کو پریشان خوابیں کہتے ہیں کبھی افترا قرار دیتے ہیں کبھی اسے شاعر بتاتے ہیں ان کا جواب دیا کہ رسول ہمیشہ بشر ہی ہوتے رہے۔ دوسرے رکوع میں انبیاء کے مقام عظیم کا ذکر کیا کہ گو وہ انسان ہیں انسانوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں۔ مگر ان کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنا اس سے ظاہر ہے کہ ان کے مخالف اور بدخواہ جب انہیں یا ان کی تعلیم کو نیست و نابود کرنے کے درپے ہوجاتے ہیں تو آخر خود ہلاک ہوجاتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ کا طاقتور ہاتھ ان کی تائید میں نہ ہوتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ ایک اکیلا انسان ساری طاقتوں کا مقابلہ کرکے غالب آجاتا۔ اسی رکوع کے دوسرے حصّہ میں صاف الفاظ میں بتایا کہ انبیاء کا تعلق اللہ تعالیٰ سے اس قدر ہے کہ ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود وہ لذت جو انہیں اس میں حاصل ہوتی ہے وہ ترقی پر ہوتی ہے۔ پھر بتایا کہ یہی لوگ خدا کی توحید کو دنیا میں پھیلاتے ہیں۔ پھر بتایا کہ وہ خدا کے ایسے کامل فرمانبردار ہوتے ہیں کہ نہ قول میں اور نہ فعل میں ان سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوتی ہے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہو۔ تیسرے رکوع میں اول بتایا کہ جس طرح بارش سے زمین کی روئیدگی قوت پکڑتی ہے اسی طرح سے وحی سے قلوب انسانی میں نشوونما پیدا ہوتا ہے اور جو لوگ اس آسمانی بارش سے اپنے آپ کو محروم کردیتے ہیں وہ ضرور آخر کار نقصان اٹھائیں گے۔ چوتھے میں بتایا کہ حق کس طرح دلوں پر تسلط کرتا چلا جاتا ہے اور یہ اس کی آخری کامیابی کا کھلا نشان ہے۔ پانچویں میں بتایا کہ حضرت ابراہیم نے جب تعلیم توحید دی تو کس طرح لوگ ان کے دشمن ہوگئے اور کس طرح انھیں ہلاک کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچایا اور آپ کے ذریعہ حق کو دنیا میں پھیلایا۔ چھٹے رکوع میں کئی ایک دوسرے انبیاء کا ذکر کرکے اسبات کو واضح کیا کہ کس طرح بڑے مصائب میں وہ مبتلا ہوکر آخر بچے اور کامیاب ہوئے ساتویں میں حضرت خاتم النبیین کا ذکر کیا اور بتایا کہ اب بھی اسی طرح حق کامیاب ہوگا اور آخرکار راستباز زمین کے وارث ہونگے۔

تعلّق: اس سورت کا تعلق پچھلی سورت سے ظاہر ہے اس میں مضمون کا خاتمہ اس بات پر کیا کہ آنحضرت صلعم دنیا میں ناکام نہیں ہوسکتے اور آخر آپ کی قبولیت پھیلے گی۔ اس میں اسی کو اور واضح کیا اور بتایا کہ انبیاء اور راستباز ہمیشہ ہی کامیاب ہوتے رہے ہیں اور جو دشمن انہیں تباہ کرنا چاہتے ہیں ان سے انہیں بچا کر آخرکار حق کو غالب کیا جاتا ہے اور انہیں زمین کا وارث بنایا جاتا ہے۔

زمانہ نزول: اس سورت کا زمانہ نزول بھی آنحضرت صلعم کی مکّی زندگی کا پہلا حصّہ ہے یعنی ہجرت حبش سے پہلے کا زمانہ دیکھو بنی اسرائیل پر نوٹ۔ بنی اسرائیل سے لے کر اس سورت تک اوائل زمانہ کی سورتیں ہیں جیسا کہ حضرت ابن مسعودؓ کی کھلی شہادت وہاں نقل ہوچکی ہے۔

ع ۲۱۲۶ حساب کا یا حساب کے وقت کا قریب ہونا کئی طرح پر ہے ایک یہ کہ انسان کا ہر عمل ساتھ ساتھ ہی نتیجہ پیدا کرتا جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ موت پر بھی ایک حساب انسان کے سامنے آجاتا ہے اور موت کا وقت بھی ہر انسان سے قریب ہے تیسرا یہ کہ اس قوم یا ان لوگوں کے لیے جن میں رسول اللہ صلعم مبعوث ہوئے تھے ان کا وقت حساب قریب آگیا تھا۔ کیونکہ ان کے اعمال اس قابل ہوگئے تھے کہ اس دنیا میں ان کو سزا دی جائے اور رسول کا آنا اتمام حجت کے لیے تھا۔ چوتھا یہ کہ سب لوگوں کا حساب قریب ہے، یعنی قیامت کبریٰ بھی جلدی آنے والی ہے انا والساعۃ کھاتین اور بعض نے تحقق وقوع کے لحاظ سے قرب مراد لیا ہے کیونکہ جو چیز لامحالہ آنے والی ہے وہ قریب ہی ہے (د) اس سورت کی ابتدا اس مضمون سے کہ اعمال کی جزا و سزا یقینی ہے نہایت موزوں ہے اس لیے کہ اس میں بحث ہی نبوت پر ہے اور ایک بات جس پر انبیاء خاص زور دیتے ہیں وہ اعمال کی جزا و سزا ہے ؛

اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَ هُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٢﴾	وہ اس کو سنتے ہیں حالانکہ وہ کھیل رہے ہوتے ہیں ٢١٢٧
لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ	اُن کے دل غافل ہوتے ہیں ، اور جو ظالم ہیں وہ چھپ کر مشورہ کرتے
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ	ہیں کہ وہ کچھ نہیں مگر تمہاری طرح ایک انسان ہے تو کیا تم جادو کو
اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿٣﴾	قبول کرتے ہو، حالانکہ تم دیکھتے ہو ٢١٢٨
قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ	کہا میرا رب (ہر ایک) بات کو جانتا ہے (جو) آسمانوں اور زمین
وَ الْاَرْضِ ۫ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٤﴾	میں (کہی جاتی) ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے ۔
بَلْ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ	بلکہ کہتے ہیں (یہ) پریشان خوابیں ہیں بلکہ (یہ کہ) اس نے افترا کیا
افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۖ فَلْيَاْتِنَا	بلکہ (یہ کہ) وہ شاعر ہے ، سو ہمارے پاس کوئی نشان لائے جس
بِاٰيَةٍ كَمَاۤ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿٥﴾	طرح (کے نشانوں کے ساتھ) پہلوں کو بھیجا گیا ٢١٢٩
مَاۤ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ	ان سے پہلے کوئی بستی ایمان نہیں لائی ، جسے ہم نے ہلاک کیا
اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٦﴾	تو کیا یہ ایمان لائیں گے ۔
وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ	اور تجھ سے پہلے ہم نے کسی کو نہیں بھیجا سوائے مردوں کے
اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ	جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے ، پس اہلِ علم سے پوچھ لو
اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٧﴾	اگر تم نہیں جانتے ٢١٣٠

٢١٢٧ محدث ۔حُدوث کے لیے دیکھو ١٥١٦ اور احداث کے معنی وجود میں لانا ہیں اور مُحْدَث وہ چیز جو وجود میں لائی جائے بعد اس کے کہ وہ کچھ نہیں تھی۔ اور یہ بعض وقت اس کی اپنی ذات میں ہوتا ہے اور بعض وقت ان لوگوں کے لیے جنہیں یہ حاصل ہوتی ہے (رغ) ؛

مُحَدَّث کے لغوی معنی: مُحَدَّث جو حضرت عمرؓ کے لیے حدیث میں آیا ہے اور جس قسم کے لوگوں کا اس امت میں ہونے کا وعدہ دیا گیا ہے اس کے معنی ہیں وہ شخص جس کے دل میں ملاءِ اعلیٰ کی طرف سے ایک بات ڈالی جائے (رغ) اور صادق الظن شخص کو محدّث کہتے ہیں ؛

اصطلاح شریعت میں محدث: اور احادیث میں اس کی تفسیر مُلْہَم سے کی گئی ہے اور اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جن کے دل میں ایک بات ڈالی جائے تو وہ دور اندیشی اور فراست سے اس کی خبر دیں گویا ان کے ساتھ ایک بات کی گئی ہے جسے وہ کہہ دیتے ہیں (ل) اور ایک حدیث میں حضرت عمرؓ کے ذکر میں مُحَدَّث کا لفظ آتا ہے اور دوسری حدیث متفق علیہ میں اسی حدیث میں محدثون کی جگہ الفاظ رجال یُکَلَّمُوْن من غیران یکونوا انبیاء آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوا کہ مُحَدَّث اصطلاح شریعت میں وہ لوگ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کلام کرتا ہے مگر وہ نبی نہیں ہوتے ؛

٢١٢٨ مخالفین کا قرآن کریم کو سحر قرار دینا: ابتدائی زمانہ کی سورت ہے بڑے بڑے معجزات ابھی ظاہر نہیں ہوئے اور قرآن کریم اندر ہی اندر دلوں کو کھینچ رہا ہے یہاں تک کہ سخت ترین تکلیفیں اُٹھا کر بھی لوگ اسے قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں یہ اثر ہی تھا۔ جس کی وجہ سے اسے سحر کہتے تھے ؛

٢١٢٩ پہلی بات جو قرآن کریم کے متعلق کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ پریشان خواب ہیں پھر جب اس پر خود بھی مطمئن نہیں ہوتے اور اس کے نظم کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں افترا ہے یہ اس نے خود بات بنا کر کہدی ہے تیسرا قول یہ ہے کہ یہ محض شاعر ہے یعنی اس کے الفاظ حقیقت سے خالی ہیں قرآن کریم کے مخالف آج بھی ایک بات پر متفق نہیں ایک کچھ کہتا ہے تو دوسرا کچھ۔ پریشان خوابوں میں تعلق کوئی نہیں ہوتا وہ کاہنوں کی طرح چند بے معنی فقرے چاہتے ہیں۔ مگر قرآن کریم میں ایک غرض اور مقصد صاف نظر آتا ہے اس لیے بول اٹھتے ہیں کہ یہ بناوٹ ہے پھر محض بناوٹ نہیں کیونکہ بناوٹ میں اتنا اثر نہیں اس لیے پھر یہ خیال گزرتا ہے کہ یہ شاعرانہ کلام ہے کیونکہ شاعر تخیل کے زور سے کلام میں اثر پیدا کرتا ہے ؛

٢١٣٠ یہ بشر مثلکم (٣) کا جواب ہے۔ یعنی پہلے بھی انسان آتے رہے اور رسول بشر ہی ہو سکتا ہے تاکہ وہ ان کے لیے نمونہ بنے ۔ اگر رسول کسی اور جنس سے ہوتا تو وہ انسانوں کے لیے نمونہ کا کام نہ دے سکتا تھا ؛

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝٨

اور ان کے ہم نے ایسے جسم نہ بنائے تھے کہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ غیر متغیر تھے ۲۱۳۱ء

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝٩

پھر ہم نے (اپنا) وعدہ انھیں سچ کر دکھایا، سو انھیں ہم نے نجات دی اور جسے چاہا، اور زیادتی کرنے والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا ۲۱۳۲ء

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝١٠ ع

ہم نے تمھاری طرف کتاب اتاری ہے جس میں تمھاری بڑائی ہے۔ تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ۲۱۳۳ء

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝١١

اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں جو ظالم تھیں اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوم کو اٹھا کھڑا کیا ۲۱۳۴ء

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝١٢

پھر جب انھوں نے ہمارے عذاب کی آہٹ پائی، تو اس سے بھاگنے لگے ۲۱۳۵ء

لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ۝١٣

بھاگو نہیں اور اس کی طرف لوٹ جاؤ جس میں تم عیش کرتے تھے اور اپنے مکانوں کی طرف تاکہ تم سے سوال کیا جائے ۲۱۳۶ء

۲۱۳۱ء وفات مسیح پر فیصلہ کن دلیل: خلود اور خالد کے لیے دیکھو ۳۹ء اس کے اصل معنی فساد واقع ہونے سے بری ہونا ہیں اور کھانے کا محتاج ہے۔ وہ خالد نہیں ہو سکتا یعنی اس کا جسم تغیر سے پاک نہیں ہو سکتا کیونکہ کھانا بدل ماتحلل ہے اور انسان کو کھانے کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ اس کے جسم خاکی سے کچھ اجزا ہر وقت نکلتے رہتے ہیں ان کی جگہ دوسرے اجزا لیتے رہتے ہیں اس لیے وہ کھانے کا محتاج ہوتا ہے اور کچھ اجزا کا نکلنا اور دوسروں کا ان کی جگہ لینا فانی ہونے کی دلیل ہے اور یہاں بتایا ہے کہ رسولوں کا جسم خاکی بھی دوسرے انسانوں کی طرح ہوتا ہے یعنی تغیر اس میں بھی ہوتا رہتا ہے یہ دلیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس جسم خاکی کے ساتھ آسمان پر زندہ ہونے کو جیسا کہ بہت مسلمانوں کا خیال ہے صریحًا باطل ٹھہراتی ہے ؛

۲۱۳۲ء یہ ان کے اقوال آیت ۵ کا جواب ہے اللہ تعالیٰ کا وعدہ جو مومنوں کی نجات اور مکذبوں کی ہلاکت کے متعلق ہے پورا ہو کر اس خیال کو باطل ٹھہراتا ہے کہ یہ پریشان خوابوں کا نتیجہ سالہا سال کے بعد کیونکر وہی نکل سکتا ہے جو قبل از وقت بتایا جاتا ہے ایسا ہی ان وعدوں کے پورا ہونے سے افترا یا بناوٹ ہونے کا خیال بھی باطل ہوتا ہے کیونکہ ایک مفتری آیندہ کے متعلق کوئی پر زور دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بالخصوص جب وہ خود سخت بے سرو سامانی کی حالت میں ہو اور چاروں طرف مخالفت کا زور ہو رہا ہو شاعر سو وہ موزون کلام بنا سکتا ہے مگر وہ بھی یہ نہیں کر سکتا کہ بڑی بڑی قوموں کا تنہا مقابلہ کر سکے۔

۲۱۳۳ء قرآن کے ذریعہ سے قومیں عظمت حاصل کریں گی: ذکر کے معنی کے لیے دیکھو ۱۹۱ء اور یہاں معنی شرف یا بزرگی مراد لیے گئے ہیں (ج) اور ابن عباس سے یہی معنی مروی ہیں (ر) مطلب یہ ہے کہ نہ صرف ایمان لانے والوں کے لیے نجات اور مکذبین کے لیے ہلاکت کی خبر ہے۔ بلکہ فی الحقیقت اس کے اندر وہ اعلیٰ درجہ کے جوہر موجود ہیں کہ ان کو عمل میں لا کر ایک قوم دنیا میں عظیم الشان مرتبہ پر پہنچ سکتی ہے اور مومن دنیا میں ایک عظیم الشان قوم بن جائیں گے ؛

۲۱۳۴ء انبیاء کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کا نشان: قصمنا۔ قَصْم کسی چیز کا کوٹنا۔ سخت چیز کا توڑنا۔ ہلاک کرنا ہے (ل) ان چند آیات میں بتایا ہے کہ رسول بیشک عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا تعلق اس سے ظاہر ہے کہ بڑی بڑی بستیاں اور قومیں جب اس کی مخالفت میں کھڑی ہو جاتی ہیں تو بجائے اس کے کہ اس کا کچھ بگاڑ سکیں خود تباہ ہو جاتی ہیں اگر اس شخص کا تعلق اس مقتدر ہستی سے نہ ہو جس کے قبضۂ قدرت میں زمین و آسمان کی سب طاقتیں ہیں تو کس طرح ممکن ہے کہ ایک اکیلے آدمی کے مقابلہ پر اتنی زبردست قومیں ہلاک ہو جائیں۔ رکوع کے پچھلے حصّہ میں انبیاء علیہم السلام کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کا ذکر ہے۔

۲۱۳۵ء یرکضون۔ رَکْض کے معنی پیر کے ساتھ مارنا ہیں سوار کی طرف منسوب ہو تو سواری کے دوڑانے پر آتا ہے اور چلنے والے کی طرف ہو تو چلنا مراد ہوتا ہے ارکض برجلك (صٓ ۳۸-۴۲) اور یہاں مراد انہزام یعنی بھاگنا ہے (غ)

۲۱۳۶ء اپنی آسودہ حالی اور فراخی کی طرف لوٹ جاؤ تاکہ تم سے سوال کیا جائے کہ تم پر کیا ماجرا گزرا یا اعمال سے سوال مراد ہے۔

قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ ۝۱۴
انھوں نے کہا ہم پر افسوس! ہم ظالم تھے۔

فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِیْدًا خٰمِدِیْنَ ۝۱۵
سو یہی ان کی پکار رہی یہاں تک کہ ہم نے انھیں کٹے ہوئے کھیت اور بجھے ہوئے شعلے کی طرح کر دیا ۲۱۳۷

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ۝۱۶
اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا ۲۱۳۸

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِیْنَ ۝۱۷
اگر ہم ارادہ کرتے کہ کھیل بنائیں تو اپنے پاس سے اسے بناتے ہم ایسا کرنے والے نہ تھے ۲۱۳۹

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَكُمُ الْوَیْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ۝۱۸
بلکہ ہم حق کو باطل پر ڈالتے ہیں سو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے پس ناگہاں وہ نابود ہو جاتا ہے اور تمھارے لیے اس کی وجہ سے افسوس ہے جو تم بیان کرتے ہو ۲۱۴۰

وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ ۝۱۹
اور اسی کے لیے ہے جو کوئی آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبّر نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں

یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ ۝۲۰
رات اور دن تسبیح کرتے ہیں سست نہیں ہوتے ۲۱۴۱

ع۲۱۳۷ خامدین۔ خَمَدت النّار کے معنی ہیں آگ کا شعلہ بجھ گیا اور اس کا کوئلہ نہیں بجھا۔ اور ھَمَدت کے معنی ہیں اس کا کوئلہ بجھ گیا (ل) وترى الارض هامدة (الحج ۲۲-۵) حصید ع۱۳۸۸۔

قوموں کی تباہی سے مراد: یہاں ان کی اس آخری حالت کو دو باتوں سے تشبیہ دی ہے ایک کھیتی سے جو ان کی پہلی سرسبزی کی طرف اشارہ ہے مگر وہ کھیتی کاٹ لی گئی دوسرے آگ سے جس کا شعلہ بجھ گیا ہو گویا وہ ان کا غیظ و غضب فرو ہو گیا پس یہ بھی قوموں کی تباہی ہی ہے کہ ان کے اقبال میں کمی آ جائے اور حق کے مقابل ان کا غیظ ٹھنڈا پڑ جائے جو بسا اوقات اس لیے ہوتا ہے کہ وہ مخالفت ترک کر کے حق کو قبول کر لیتی ہیں۔

ع۲۱۳۸ جزا و سزا کا انکار خدا کے کاموں کو بے حقیقت قرار دیتا ہے: لَعِب (ع۸۴۵) ایسا فعل ہے جس سے کوئی مقصد صحیح مدنظر نہ ہو پس بتایا کہ زمین میں کوئی مخلوق ہو یا آسمان میں ہر ایک کی پیدائش میں ایک مقصد صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں جو شخص اعمال کی جزا و سزا کا منکر ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کی خلق کو محض ایک لعب سمجھتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کے اعمالِ بد پر اُسے کوئی سزا نہیں ملے گی۔

ع۲۱۳۹ یہاں لہو کے معنی بہت سے مفسرین سے زوجۃ اور ولد مروی ہیں (ج) لیکن پہلی آیت میں لعب کا قرینہ بتاتا ہے کہ اسی مضمون کو جاری رکھا ہے۔ لہو و لعب میں فرق کے لیے دیکھو ع۹۳۲ اور مطلب یہ ہے کہ ہمارا ارادہ ہی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی چیز بے حقیقت ہو اور ان کنّا فاعلین میں اِنْ نافیہ ہے مطلب یہ ہے کہ ہماری شان ہی یہ نہیں کہ ہم ایسا کرتے۔

ع۲۱۴۰ یدمغ۔ دَمْغ کے معنی دماغ کا توڑ دینا ہیں (غ)

پہلی دو آیتوں میں جو کچھ فرمایا تھا اس کا نتیجہ یہاں بتایا کہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز کو مقصد صحیح سے پیدا کرتا ہے اس لیے حق جب آ جاتا ہے تو باطل کا باوجود اس کی ساری طاقت کے سر کچل دیتا ہے اسی طرح توحید سے شرک کی تعلیم دنیا میں مٹ جائے گی اور باطل حق کے سامنے بھاگ جائے گا۔

ع۲۱۴۱ حسر کے لیے دیکھو ع۲۰۵ اور استحسار اس سے ابلغ ہے اور فتور کے لیے دیکھو ع۸۰۴ اور لیفترون کے معنی کیے ہیں لایسکنون عن نشاطهم فی العبادة (غ) یعنی عبادت میں ان کو اس قدر خوشی حاصل ہوتی ہے کہ وہ ٹھہرتے نہیں۔ یہاں من عندہ سے فرشتے مراد لیے گئے ہیں۔ مگر یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کے پاک بندوں پر بھی صادق آتے ہیں کیونکہ دن اور رات تسبیح وہ بھی کرتے رہتے ہیں یعنی تسبیح پر مداومت کرتے ہیں قول اور فعل سے۔ اور وہ خدا کی عبادت سے تھکتے نہیں اور انھیں اس میں نشاط بھی حاصل ہوتی ہے اس لیے اس میں سست نہیں ہوتے۔ یا جس طرح ملائکہ کو رسالت تسبیح سے نہیں روکتی اسی طرح نیک لوگوں کو بھی نہیں

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۝۲۱	کیا انھوں نے زمین سے معبود بنا لیے ہیں ، جو پیدا کرتے ہیں ۲۱۴۲
لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۲۲	اگر ان دونوں میں اللہ کے سوائے (کوئی اور) معبود ہوتا تو دونوں بگڑ جاتے سو اللہ عرش کا رب اس سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں ۲۱۴۳
لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ۝۲۳	اس سے پوچھا نہیں جاتا جو وہ کرتا ہے اور اُن سے پوچھا جاتا ہے
اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۲۴	کیا اس کے سوائے (اور) معبود بنا لیے ہیں ۔ کہہ اپنی روشن دلیل لاؤ یہ اس کا ذکر ہے جو میرے ساتھ ہے اور اس کا ذکر جو مجھ سے پہلے ہے ، بلکہ ان میں سے اکثر حق کو نہیں جانتے اس لیے وہ منہ پھیرے ہوئے ہیں ۲۱۴۴
وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝۲۵	اور تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم یہی وحی کرتے تھے کہ میرے سوائے کوئی معبود نہیں ، سو میری ہی عبادت کرو ۲۱۴۵

روکتی اور یہاں ذکر انبیاء کا ہے ۔ کیونکہ انہیں کے متعلق یہ اثبات کرنا ہے کہ ان کا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہے تو پہلے یہ تعلق اس رنگ میں ظاہر کیا کہ ان کے مقابلہ پر بڑی بڑی قومیں بھی گر جاتی ہیں اور اب اسی تعلق کو صاف الفاظ میں بیان فرمایا اور ان کے مقام بلند کا ذکر کیا جو اللہ تعالیٰ کے حضور ان کو حاصل ہے اور بتایا کہ یہی کیسا کھلا نشان ان کے تعلق باللہ کا ہے کہ انہیں ذکر الٰہی میں کمال درجہ کا سرور حاصل ہوتا ہے اور وہ اس کی عبادت اور اس کی مخلوق کی خدمت کرتے ہوئے تھکتے نہیں بلکہ باوجود مخالفت کے اس میں خوشی سے لگے چلے جاتے ہیں۔

۲۱۴۲ ینشرون ۔ نشور اور نشر کے لیے دیکھو ۱۹۰۳ اور نَشَرَ الْمَيِّتُ کے معنی ہیں مردہ جی اٹھا اور انشرہ اللہ کے معنی ہیں اللہ نے مردہ کو زندہ کیا اور نشرہ اللہ کے بھی یہی معنی ہیں اور حدیث میں ہے لا رضاع الاما انشر اللحم و انبت العظم ۔ جہاں انشر اللحم کے معنی ہیں گوشت کو مضبوط کیا اور قوت دی انشار سے جس کے معنی احیاء ہیں (ل) اس لیے یہاں بعض مفسرین نے معنی مردہ زندہ کرنا کیے ہیں ۔ اور بعض نے صرف یخلقون یا پیدا کرتے ہیں معنی کیے ہیں اور یہ دوسرے معنی زیادہ موزون ہیں اس لیے کہ ان معبودان باطل کے متعلق قرآن کریم میں بار بار یہ مطالبہ کیا ہے کہ انہوں نے کیا پیدا کیا ہے خلقوا کخلقه فتشابه الخلق علیهم (الرعد ۱۳-۱۶) امهم الخالقون (الطور ۵۲-۳۵)

۲۱۴۳ یہ توحید باری پر دلیل ہے اور اس مضمون کے یہاں لانے کی وجہ آیت ۲۵ میں صاف بیان فرمادی ہے کہ تمام رسول توحید کی تعلیم لے کر آئے اور انہی کی تعلیم سے اللہ تعالیٰ کی توحید دنیا میں پھیلی ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو نظام عالم قائم نہ رہ سکتا کیونکہ ایک ایک طرح پر اسے چلاتا تو دوسرا اپنے حسب منشا دوسری طرح پر چلاتا نظام عالم کا قیام ہی اس بات پر ہے کہ ایک قانون کے ماتحت یہ چل رہا ہے مختلف خدا ہوں تو مختلف قانون ہوں اور نظام عالم تباہ ہو جائے اگلی آیت میں لا یسئل عما یفعل اسی قانون کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ قانون کے ماتحت سب کو چلنا پڑتا ہے ۔ سوال تو وہ شخص کرے جو اس قانون سے باہر ہو مگر کل مخلوق ایک قانون میں جکڑی ہوئی ہے ۔ اور بندوں پر نوادنی خلاف ورزی قانون کریں تو مواخذہ ہوتا ہے ۔ دونوں صورتوں میں سوال فعل کے رنگ میں ہے ۔

۲۱۴۴ توحید باری پر دوسری دلیل : ذکر من معی سے مراد ہے اس امت کا ذکر اور ذکر من قبلی سے پہلی امتوں کا ذکر ۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی توحید ہی میرے ساتھیوں کا ذکر ہے اور یہی پہلوں کا ذکر تھا یعنی وہ بھی توحید پر قائم تھے جیسا کہ اگلی آیت میں فرمایا کہ پہلے رسولوں کی طرف بھی یہی وحی ہوتی تھی کہ اللہ ایک ہے پس ایک طرف توحید الٰہی ہے جس پر نہ صرف محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے ساتھیوں کی شہادت ہے بلکہ جس قدر راستبازنیکی کے معلم پہلے گزرے ان کی بھی یہی شہادت ہے ۔ اس کے مقابل شرک پر اپنی برہان پیش کرو ۔ اور یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ہر قوم کا شرک دوسری قوم سے علیحدہ رنگ کا ہے اور ایک قوم کے شرک کی دوسری تائید نہیں کرتی ۔ پرستاران مسیح اہرمن کو اور ہندوستان کے تینتیس کروڑ دیوتاؤں کو نہیں مانتے اور اہرمن کے ماننے والے اور ہندو مسیح کو خدا نہیں مانتے لیکن ان شرکوں کو چھوڑ کر ایک خالق کو ماننے میں سب ایک ہیں ۔

۲۱۴۵ یہ تیسری دلیل توحید الٰہی پر ہے کہ جس قدر انبیاء دنیا میں ہوئے کسی کو سوائے توحید کے اور کوئی تعلیم نہیں دی گئی ۔ یہ بھی ایک زبردست دلیل توحید الٰہی پر ہے

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور کہتے ہیں رحمٰن نے بیٹا بنا لیا، وہ پاک ہے بلکہ وہ معزز بندے ہیں۔

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾

وہ بات میں اس سے آگے نہیں بڑھتے اور اس کے حکم کے مطابق وہ عمل کرتے ہیں ۲۱۴۶

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَ هُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾

وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو اُن کے پیچھے ہے اور وہ شفاعت نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے اور وہ اس کی ہیبت سے ڈرتے ہیں ۲۱۴۷

وَ مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ ع ۲

اور جو کوئی ان میں سے کہے کہ مَیں اس کے سوائے معبود ہوں تو اسے ہم دوزخ کی سزا دینگے۔ اسی طرح ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔

اَوَ لَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۰﴾

کیا جو کافر ہیں وہ غور نہیں کرتے کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے تو ہم نے انھیں کھولا۔ اور ہر زندہ چیز کو ہم نے پانی سے بنایا، تو کیا یہ نہیں مانتے ۲۱۴۸

یہاں تک کہ ان انبیاء کی تعلیم پر بڑے بڑے تغیرات آجانے کے باوجود بھی ان کی تعلیم توحید اب تک قائم ہے اگر ایک خدا کے سوائے کوئی اور بھی خدا ہوتا تو کسی نبی کی تعلیم میں بھی یہ لفظ موجود ہوتے مگر ایسا نہیں۔

۲۱۴۶ آیت ۲۶ سے لیکر ۲۹ تک کا مصداق ملائکہ کو سمجھا گیا ہے۔ لیکن کئی ایک قرائن صاف بتاتے ہیں کہ ان میں مراد انبیاء علیہم السلام ہی ہیں اور ولدیت کا عقیدہ بھی انبیاء کے متعلق ہی بنا۔ اوّل اتخذ الرحمٰن ولداً سبحانہ میں عموماً عیسائیوں کے عقیدۂ ولدیت مسیح کی تردید ہی کی گئی ہے گو اور بھی اس میں شامل ہو جائیں اور عباد کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ مسیح کے سوائے اور لوگوں کو بھی خدا کا بیٹا بنایا گیا ہے جیسے عزیر جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے اور اور بھی اس قسم کے عقاید مروج ہیں۔ دوم اوپر جو ذکر تھا وہ یہی تھا کہ کسی رسول کو یہ تعلیم نہیں دی گئی کہ خدا کے سوائے کوئی اور بھی لائق عبادت ہے۔ پس یہ بھی رسولوں کا ہی ذکر ہے سوم اُنتیسویں آیت میں ہے ومن یقل منہم انی الٰہ جو کوئی ان میں سے کہے میں معبود ہوں۔ ظاہر ہے کہ فرشتے انسانوں کو اس طرح کہنے نہیں آتے بلکہ انسانوں کو انسان ہی کہہ سکتا ہے اور دوسرے انسان تو ایسا کہنے والے ہوئے ہیں یعنی جنہوں نے اپنے آپ کو خدا تو کہا، مگر فرشتہ کوئی ایسا نہیں ہوسکتا اور نہ ہوا۔ مفسرین نے اس دِقّت کو یوں حل کیا ہے کہ ابلیس نے ایسا کہا مگر اوّل تو ابلیس نے ایسا کہا نہیں دوسرے ابلیس ملائکہ میں سے نہیں۔ پس منہم کی ضمیر انسانوں کی طرف ہی جاسکتی ہے۔ چہارم ما کان لبشر ان یؤتیہ اللّٰہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون اللّٰہ (آل عمران ۳-۷۹) میں صاف یہی ذکر موجود ہے دو یہ دونوں مقامات ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔ پنجم آخری آیت کے آخری الفاظ کذٰلک نجزی الظالمین صاف بتاتے ہیں کہ انسانوں کا ذکر ہے کیونکہ فرشتہ پر لفظ ظالم آہی نہیں سکتا۔

پس اس آیت میں انبیاء علیہم السلام کے مقام بلند کا ذکر ہے اور ان کی عصمت پر دلیل ہے۔ وہ نہ تو قول میں اللّٰہ تعالیٰ پر سبقت کرتے ہیں نہ عمل میں یعنی سی تعلیم لوگوں کو دیتے ہیں جو اللّٰہ تعالیٰ انہیں فرماتا ہے اور ان کے اعمال بھی اللّٰہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوتے ہیں۔ پس نہ قولاً اور نہ عملاً وہ خدا تعالیٰ کے حکم سے ایک ذرّہ بھی انحراف کرسکتے ہیں اور یہی مقام عصمت ہے۔ اور یہ آیت انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر قطعی دلیل ہے۔

۲۱۴۷ من ارتضٰی کی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے منقول ہے شہادۃ ان لا الٰہ الا اللّٰہ۔ اور ان کی شفاعت استغفار ہے جو دنیا و آخرت میں ہے (ر) درحقیقت انبیاء علیہم السلام کی شفاعت بھی اپنی امتوں کے لیے استغفار ہی ہے یعنی ان کی دعا سے اللّٰہ تعالیٰ اُمتوں کی بعض کمزوریوں کی پردہ پوشی کر دیتا ہے۔

۲۱۴۸ رتقاً۔ ففتقنا۔ رَتْق فتق کے خلاف ہے اور فتق کے معنی شق یعنی پھاڑنا ہیں اور فتق تھوڑی بارش کو بھی کہتے ہیں اور صبح کے پھٹنے کو بھی۔ اور

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ ۖ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿٣١﴾

اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے تاکہ وہ انھیں لے کر کانپے نہیں، اور ہم نے اس میں کھلے رستے بنائے، تاکہ وہ راہ پائیں ۲۱۴۹ع

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا ۖ وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ ﴿٣٢﴾

اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا اور وہ اس کے نشانوں سے منہ پھیر رہے ہیں ۲۱۵۰ع

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ فِي

اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب (اپنے اپنے) فلک میں تیزی

رَتْق مِل جانا ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آسمان کا رتق یہ ہے کہ اس سے بارش نہ برسے اور زمین کا رتق یہ کہ اس میں سبزی نہ اُگے اور فتق اس کے مقابل پر آسمان سے پانی کا برسنا اور زمین میں سبزی کا نکلنا ہے اور یہی زجاج کا قول ہے اور رتق سے مراد یہاں ذوی رتق ہے یعنی رتق والے تھے اور رَتْق کے معنی ظلمت بھی ہیں (ل)

قرآن کریم کی علمی صداقتیں جن کا اس کے نزول کے وقت دنیا کو علم نہ تھا: آسمان اور زمین کے بند ہونے اور ان کے کھولا جانے سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ سب چیزیں ایک غیر ممیز صورت میں باہم ملی جلی تھیں پھر اللہ تعالیٰ نے تمام اجرام کو الگ الگ کر کے ایک دوسرے سے ممیز کر دیا اور اس کی طرف آگے کل فی فلك یسبحون (۳۳) میں اشارہ بھی ہے کہ اب وہ سب اپنے اپنے افلاک میں چکر لگا رہے ہیں اور اس معنی سے ملتے جلتے معنی مفسرین نے کیے ہیں اور سائنس بھی یہی کہتا ہے کہ یہ سب نظام ایک ابتری کی حالت میں سے نکل کر اس موجودہ نظام پر آیا اور دوسرے معنی جو اوپر نقل کیے گئے ہیں حضرت ابن عباس سے مروی ہیں یعنی آسمان سے پانی کا برسنا اور زمین سے روئیدگی کا نکلنا اور اس صورت میں یہ یا تو قانون عام ہے کہ جب آسمان سے پانی نہیں برستا زمین سے بھی روئیدگی نہیں نکلتی اور یہ بھی ابتدائے آفرینش کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے پانی کو الگ کر دیا تو اس کے ذریعہ سے زمین میں روئیدگی ہوئی اور اس کی صداقت کا بھی سائنس گواہ ہے اور جعلنا من الماء کل شئ حی میں اس دوسرے معنی کی طرف اشارہ ہے۔

پانی سے ہر زندہ چیز کا ہونا یہ بھی ایک عظیم الشان صداقت ہے جس کا اعتراف سائنس نے آج کیا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اس صداقت کا علم ایک عرب کے اُمّی کے مُنہ سے آج سے تیرہ سو سال پیشتر دنیا کو دیا۔ یوں اس ایک آیت میں تین ایسی عظیم الشان علمی صداقتیں اکٹھی کر دی ہیں جن کا علم دنیا کو آج ہوا ہے اور پھر کیسے پر حکمت طریق سے ایمان کے لیے اسے بطور گواہ ٹھہرایا یعنی جس طرح وہاں آسمان سے پانی آتا ہے تو زندگی نمودار ہوتی ہے اسی طرح قلب انسانی وحی الٰہی کے لیے بمنزلہ زمین کے ہے جب وحی کی بارش کا اس پر نزول ہوتا ہے تو اس قلب کی مردہ قوتیں زندہ ہو جاتی ہیں اگر انبیاء نہ آئیں تو یہ زمین قلوب انسانی بالکل مُردہ ہو جائے اس لحاظ سے پچھلے حصّہ میں مکذبین کی ہلاکت کا ذکر کیا۔ کیونکہ جو لوگ اس بارش سے اپنے آپ کو محروم کرتے ہیں، ضرور ہے کہ انجام کار وہ نقصان اُٹھائیں۔

ع۲۱۴۹ فجاج۔ فج کی جمع ہے اور وہ اصل میں وہ شگاف ہے جس کا احاطہ دو پہاڑوں نے کیا ہوا ہے (غ) یا دو پہاڑوں کے درمیان کھلی جگہ اور پھر ہر کشادہ رستہ پر اس کا استعمال ہوا ہے (غ) من کل فج عمیق (الحج ۲۲-۲۷)

اس مضمون پر دیکھو ع۱۷۲۵ اور یھتدون میں گو ظاہر طور پر رستہ پانا ہی مراد ہے مگر اس میں اشارہ یہ ہے کہ ان جسمانی انتظامات سے روحانی انتظامات کی طرف بھی ہدایت ملتی ہے۔

ع۲۱۵۰ سَقْف چھت کو کہتے ہیں اور اس کی جمع سُقُف ہے لبیوتھم سُقُفا من فضة (الزخرف ۴۳-۳۳) اور سَقِیفہ ہر مکان کو کہتے ہیں جس کی چھت ہو (غ) اور اسی سے سقیفۃ بنی ساعدہ ہے جہاں آنحضرت صلعم کی وفات پر مہاجرین و انصار (انتخاب خلیفہ کے لیے جمع ہوئے تھے۔

محفوظ حِفظ کا لفظ ہر قسم کے تعہد اور نگہداشت پر بولا جاتا ہے (غ) مثلاً انا لہ لحافظون (الحجر ۱۵-۹) میں مراد ہے کہ اسے تحریف یا فساد سے بچایا جائے گا والحافظین فروجھم والحفظٰت (الاحزاب ۳۳-۳۵) میں مراد عفت کی رو سے حفاظت ہے اسی طرح حافظوا علی الصلوٰت (البقرۃ ۲-۲۳۸) وماجعلنٰك علیھم حفیظا (الانعام ۶-۱۰۷) وغیرہ میں تعہد اور نگہداشت کے مختلف پہلو ہیں۔

یہاں آسمان کو سقف کہا ہے اور محفوظ بھی اور دوسری جگہ سماء کو بناء یعنی عمارت کہا ہے ان الفاظ کے استعمال میں بتایا ہے کہ یہ تمام نظام عالم بمنزلہ ایک گھر کے ہے جس کا ایک مالک ہے اور اسے محفوظ کہا ہے یعنی وہ نظام فساد سے محفوظ ہے یعنی اتنا بڑا نظام بگڑتا نہیں اگر اس کی پیدا کرنے والی ایک مدبر بالارادہ ہستی نہ ہو تو اتنا بڑا نظام جس میں لاکھوں اجرام شب و روز گشت لگا رہے ہیں کس طرح قائم رہ سکتا ہے یہی وہ آیات ہیں جن سے کفار اعراض کرتے ہیں اور ان موٹی موٹی باتوں پر غور نہیں کرتے۔

فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾
سے چل رہے ہیں ٢١٥١

وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَا۟ئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾
اور تجھ سے پہلے ہم نے کسی انسان کے لیے ہمیشگی نہیں رکھی، تو کیا اگر تو مرجائے تو یہ رہ جائیں گے ٢١٥٢

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾
ہر شخص موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور کھرا کھوٹا الگ کرنے کے لیے ہم تمھیں دکھ اور سکھ سے آزماتے ہیں اور تم ہماری طرف ہی لوٹائے جاؤ گے ٢١٥٣

وَ اِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾
اور جب کافر تجھے دیکھتے ہیں تیری ہنسی اڑاتے ہیں۔ کیا یہی وہ ہے جو تمھارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے اور وہ خود رحمٰن کے ذکر کا انکار کرنے والے ہیں۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾
انسان جلدی کا پتلا بنایا گیا ہے میں تمھیں اپنے نشان دکھاؤں گا سو تم مجھ سے جلدی نہ کرو ٢١٥٤

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾
اور کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ
کاش جو کافر ہیں، اس وقت کو جانیں جب وہ اپنے مونہوں

٢١٥١ فلك - مجری الکواکب یعنی سیاروں کے چلنے کی جگہ ہے (غ) یا مدار النجوم (ل) جس میں ستارے گھومتے ہیں (ل) اور سمندر کی موج کو بھی فلک کہا جاتا ہے جو آتی اور جاتی ہے اور زجاج نے کل فی فلك یسبحون میں کہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک فلك ہے (ل) اور سبح کے لیے دیکھو ٤٧ ہوا یا پانی میں تیز گزرنے پر بولا جاتا ہے۔

اجرام سماوی کا اپنے افلاک میں تیر چلنا: یسبحون کا استعمال بتاتا ہے کہ وہ سیارے خود فلک میں تیز دوڑ رہے ہیں نہ یہ کہ فلک ان کو لیے ہوئے گھوم رہا ہے۔ پس فلك وہ رستہ ہے جس میں یہ اجرام مختلف چلتے ہیں اور وہ فلک ہر جرم کے لیے الگ ہے جیسا کہ زجاج کا قول ہے اور فی فلك میں واحد کا استعمال جنس کے لیے ہے جس سے مراد جمع ہوتی ہے جیسے کساھم حُلّۃً میں مراد ایک حلّہ نہیں بلکہ ہر ایک کے لیے الگ حلّہ ہے (د) اور کلٌّ میں ضمیر بعض نے شمس و قمر کے لیے لی ہے مگر مراد سب کواکب ہیں کیونکہ سورج اور چاند سب سے روشن اجرام ہیں اور بعض کے نزدیک ضمیر نجوم کی طرف ہے گو ان کا ذکر موجود نہ ہو اس لیے کہ جو بیان ہو رہا ہے اس سے ان کے ذکر پر دلالت ملتی ہے (د) اجرام سماوی کا اپنے اپنے فلکوں میں گھومنا ایک اور علمی حقیقت ہے جس کو قرآن کریم نے ظاہر کیا ہے۔

٢١٥٢ خلد سے خضر اور عیسیٰ کے زندہ نہ ہونے پر دلیل: خلد سے مراد خلود ہے (د) جس کے لیے دیکھو ١٧١٥ اور یہاں مکث طویل یعنی دیر تک زندہ رہنا معنی لیکر اس سے خضر علیہ السلام کے زندہ نہ ہونے پر دلیل لی گئی ہے (د) پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس استدلال سے کیونکر باہر رہ سکتے ہیں۔

٢١٥٣ یہاں فتنۃ اپنے اصل معنی میں ہے ادخالُ الذَّھَبِ النارَ لِتَظْھَرَ جَوْدَتُہٗ من رِداءَتِہٖ اور شر اور خیر سے مراد یہاں شِدَّۃ اور رخاء یعنی سختی اور نرمی یا دکھ اور سکھ ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے (د)

٢١٥٤ انسان کے عجلت سے پیدا ہونے سے مراد: خلق الانسان من عجل کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عجلت میں پیدا کیا یا ایسے وقت پیدا ہوا جب دن تھوڑا رہ گیا تھا۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ عجلت انسان میں اس قدر ہے کہ گویا اسی سے پیدا ہوا ہے جیسے اللہ الذی خلقکم من ضعف (الروم ٣٠-٥٤) اور لسان العرب میں ہے کہ جب انسان میں ایک چیز بہت پائی جائے تو اہل عرب یوں کہتے ہیں خُلِقْتَ منہُ یعنی تو اس سے پیدا ہوا ہے مثلاً خُلِقْتَ مِنْ لَعِبٍ اسے کہیں گے جو بہت کھیلتا ہو اور سیاق خود بتاتا ہے کہ یہی معنی ہیں اس لیے کہ ساتھ ہی جلد بازی سے روکا ہے۔

عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾

سے آگ کو نہ روک سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھوں سے اور نہ انھیں مدد دی جائے گی۔

بَلْ تَأْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۴۰﴾

بلکہ وہ (گھڑی) ان پر اچانک آجائے گی پس وہ ان کے ہوش کھو دے گی تو وہ اُسے ہٹا نہ سکیں گے اور نہ انھیں مہلت ملے گی۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۱﴾ ع

اور یقیناً تجھ سے پہلے رسولوں سے ہنسی کی گئی، تو انھیں جو ان میں سے ہنسی کرتے تھے، اسی نے آلیا جس کی وہ ہنسی کرتے تھے ع۲۱۵۵

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾

کہہ، کون رات کو اور دن کو رحمٰن سے تمھاری حفاظت کرتا ہے۔ بلکہ وہ اپنے رب کے ذکر سے منہ پھیر رہے ہیں ع۲۱۵۶

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾

کیا اُن کے معبود ہیں جو ہمارے مقابلے میں انھیں بچا لیں گے وہ آپ اپنی مدد کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ ہماری طرف سے ان کی حفاظت ہوگی ع۲۱۵۷

بَلْ مَتَّعْنَا هٰۤؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ

بلکہ ہم نے انھیں اور ان کے باپ دادوں کو سامان دیا۔ یہاں تک کہ اُن کی عمر لمبی ہوگئی، تو پھر کیا غور نہیں کرتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے

ع۲۱۵۵ اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ وہ عذاب جس کے متعلق وہ سوال کرتے ہیں اس دنیا کا عذاب ہے کیونکہ اس چیز کا آلینا جس سے وہ ہنسی کرتے تھے ان کی ہلاکت ہی ہے نہ کچھ اور، اور درحقیقت یہ ساوریکم اٰیاتی اور فلا تستعجلون سے صاف ظاہر ہے کیونکہ وہ جس نشان کو جلدی مانگتے ہیں وہ نشان ہلاکت ہے نہ قیامت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ایسے ہی نشان دکھانے کا وعدہ ہے قیامت نشان نہیں کہلا سکتی۔ پس آیت ۳۹ میں جو آگ کو مونہوں اور پیٹھوں سے نہ ہٹا سکنے کا ذکر ہے تو اس سے مراد مجازاً جنگ ہی ہے اور مونہوں اور پیٹھوں کا ذکر اس لیے کیا کہ جب وہ حملہ کرکے آئینگے تب بھی دکھ اٹھائیں گے اور جب پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے تب بھی دُکھ اٹھائیں گے اور آیت ۴۰ سے بھی یہی ظاہر ہے اس لیے کہ مبہوت ہونا اسی زندگی کے لیے ہے جب انسان دلائل میں مقابلہ سے عاجز آجائے۔

ع۲۱۵۶ یکلؤ۔ کِلَاءَۃ کسی چیز کی حفاظت کرنا اور اس کا باقی رکھنا ہے (رغ)

من الرحمٰن سے مراد رحمان کی سزا سے مطلب یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کی رحمانیت نہ ہوتی تو اپنے اعمال بد کی سزا میں کفار فوراً پکڑے جاتے۔ بایں بھی سب رحمان کی طرف رجوع نہیں کرتے۔

ع۲۱۵۷ یصحبون صَحِبَہٗ کے معنی ہیں عاشرہٗ یعنی اس کے ساتھ رہا اور اَصْحَبَ الرجل کے معنی ہیں اس کی حفاظت کی اور یہاں یہی معنی ہیں یُصْحَبُوْنَ بالاِجارۃِ اور قتادہ کا قول ہے لا یصحبون من اللہ بخیر اور اَصْحَبْتُ الرَّجُلَ کے معنی ہیں منعتہٗ اس کی حفاظت کی اور صَحِبَکَ اللہ کے معنی بھی حفظک اللہ آتے ہیں یعنی اللہ تیری حفاظت کرے (ل) اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ہماری طرف سے وہ چیز نہیں ہوگی جو ان کا ساتھ دے یعنی سکینت اور کشائش اور نرمی وغیرہ جو اولیاء اللہ کو ملتی ہے۔

یعنی جو ان کے معبودان باطل ہیں وہ تو اپنے آپ کو دوسروں کے مقابل پر نہیں بچا سکتے جیسا کہ اگلے رکوع میں حضرت ابراہیم کے ذکر سے واضح کر دیا ہے اور جب سزا کا وقت آجائے گا تو پھر وہ رحمٰن کی حفاظت بھی نہیں رہے گی اس لیے اس وقت ان کے بچنے کا کوئی سامان بھی نہ رہے گا۔

أَطْرَافِهَا ۚ أَفَهُمُ الْغٰلِبُونَ ﴿٤٤﴾	آتے ہیں، تو کیا وہ غالب ہیں ع۲۱۵۸
قُلْ إِنَّمَا أُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۚ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاءَ إِذَا مَا يُنْذَرُونَ ﴿٤٥﴾	کہہ، مَیں تمھیں صرف وحی کے ساتھ ڈراتا ہوں اور بہرے پکار کو نہیں سنتے، جب انھیں ڈرایا جائے ع۲۱۵۹
وَلَئِنْ مَسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ يٰوَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظٰلِمِينَ ﴿٤٦﴾	اور اگر انھیں تیرے رب کے عذاب کی ہوا بھی لگ جائے، تو کہیں گے اے افسوس ہم پر، ہم ہی ظالم تھے ع۲۱۶۰
وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۖ وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِينَ ﴿٤٧﴾	اور ہم قیامت کے دن کے لیے انصاف کی میزانوں کو قائم کرتے ہیں۔ پس کسی شخص پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا اور اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی (عمل) ہوگا ہم اسے لے آئیں گے اور ہم حساب کرنے کو کافی ہیں ع۲۱۶۱
وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسٰى وَهٰرُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِلْمُتَّقِينَ ﴿٤٨﴾	اور ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرقان اور روشنی اور نصیحت متقیوں کے لیے دی ع۲۱۶۲
الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ ﴿٤٩﴾	جو غیب میں اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور (اس) گھڑی کا اُن کو خوف ہے ع۲۱۶۳
وَهٰذَا ذِكْرٌ مُبَارَكٌ أَنْزَلْنٰهُ ۚ أَفَأَنْتُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ ﴿٥٠﴾ ع	اور یہ (قرآن) بابرکت ذکر ہے جسے ہم نے اتارا ہے تو کیا تم اس کا انکار کرتے ہو۔
وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرٰهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ	اور ہم نے ہی ابراہیمؑ کو پہلے سے اس کے (لائق حال)

ع۲۱۵۸ ایک قوم پر جب ایک لمبے زمانہ تک اللہ تعالیٰ گرفت نہیں کرتا تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا میں ہمیشہ رہیں گے جو چاہیں کریں اور غور کی عادت بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ عمر سے مراد یہاں ایک قوم کی عمر ہے۔ اطراف کے گھٹانے سے مراد کفار کے دلوں پر اسلام کا اثر ہونا ہے دیکھو ع۱۶۳۲ اس لیے فرمایا کہ اب اسلام کے غالب آنے کے نشان تو واضح ہیں۔

ع۲۱۵۹ وحی کے ساتھ ڈراتا ہوں یعنی یہ میں قیاس سے نہیں کہتا بلکہ اس خبر کا سرچشمہ یقینی ہے۔

ع۲۱۶۰ نفحۃ۔ نفح الریح ہوا چلی اور نفح الطیبُ مشک نے خوشبو دی اور نفحۃ ہوا کا جھونکا ہے اچھا ہو یا بُرا (ل) ؁

ع۲۱۶۱ خردل واحد خردلۃ ہے۔ رائی۔ میزان پر دیکھو ع۱۰۵۰ اور قسط موازین کی صفت ہے چونکہ مصدر ہے اس لیے واحد لایا گیا اور یا ذوات القسط مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا وزن قایم ہے کہ اس سے ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی عمل باہر نہیں رہتا ؁

ع۲۱۶۲ فرقان۔ ضیاء۔ ذکر سب توریت کے نام بھی ہو سکتے ہیں۔ فرقان حق و باطل میں فرق کرنے کے لحاظ سے ضیاء اس لحاظ سے کہ ہر قسم کی ظلمت کو دور کر کے اس کی جگہ روشنی کر دی اور ذکر اس لحاظ سے کہ اپنے پیروؤں کو کمال تک پہنچایا اور یا فرقان وہ معجزات ہیں جنھوں نے حق و باطل میں فرق کر دیا۔ ضیاء دلائل ہیں جن سے تعلیم روشن ہوئی اور ذکر خود وہ تعلیم ہے تینوں چیزیں موسیٰ اور ہارون دونوں کو دی گئیں ؁

ع۲۱۶۳ بالغیب یا تو مفعول سے حال ہے یعنی اللہ سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ وہ غیب میں ہے اور یا فاعل سے حال ہے یعنی اس حال میں ڈرتے ہیں کہ لوگوں کی نظروں سے غائب ہوتے ہیں۔ اگلی آیت میں توریت کے مقابل پر قرآن کو مبارک کہا ہے جس کے لیے دیکھو ع۹۸۲ ؁

قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

ہدایت دی اور ہم اس کو خوب جانتے تھے ۲۱۶۳؀

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾

جب اس نے اپنے بزرگ اور اپنی قوم سے کہا یہ مورتیں کیا ہیں جن کی تعظیم میں تم لگے ہوئے ہو ۲۱۶۴؀

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

انھوں نے کہا ہم نے اپنے بڑوں کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا۔

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾

کہا، تم اور تمھارے بڑے کھلی گمراہی میں تھے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾

انھوں نے کہا، کیا تو ہمارے پاس حق لایا ہے یا تو کھیل کرنے والوں میں سے ہے۔

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾

کہا بلکہ تمھارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ جس نے انھیں پیدا کیا اور میں اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾

اور اللہ کی قسم میں تمھارے بتوں کو تکلیف پہنچاؤں گا، اس کے بعد کہ تم پیٹھ پھیرتے ہوئے واپس چلے جاؤ گے ۲۱۶۵؀

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾

سو ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، مگر ان کے بڑے کو رہنے دیا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں ۲۱۶۶؀

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ

کہنے لگے ہمارے معبودوں سے کس نے یہ کام کیا ہے،

۲۱۶۳؀ عصمت انبیاء: رشد کے لیے دیکھو ۶۰۹؀ و ۱۹۰۹؀ اور چونکہ یہ غیّ اور ضلال کا نقیض ہے اس لیے رشد کے دینے میں ضلالۃ اور غی کی نفی پائی جاتی ہے اور رشدہ اس لیے کہا کہ یہ معمولی رشد نہیں نہ صرف دنیا کے کاموں میں رشد تھا بلکہ ایسا رشد جو اس کے لائق حال تھا یعنی رشد کامل جو رسولوں اور نبیوں کو دیا جاتا ہے من قبل میں اشارہ حضرت موسیٰ کی طرف یا خود آنحضرت صلعم کی طرف ہے اور بعض نے مراد من قبل البلوغ لیا ہے یعنی بچپن سے ہی وہ ہدایت پر تھے (ج) اور اس کو جاننے میں اشارہ ان کے کمالات کی طرف ہے ؛

۲۱۶۴؀ تماثیل۔ تمثال کی جمع ہے اور تمثال صورت کو کہتے ہیں (ل) معلوم ہوتا ہے یہ بت انسانوں وغیرہ کی صورت پر بناتے تھے۔ اور ما یہاں سوال کیلئے نہیں بلکہ تحقیر کے لیے ہے ؛

۲۱۶۵؀ کید کے لیے دیکھو ۵۰۷؀ اور کاد کے معنی اراد بسوء آتے ہیں اور یہاں معنی لاُرِیْدَنّ بہا سُوْءً ہی ہیں (غ) ؛

۲۱۶۶؀ ابراہیم کے بڑے بت کو نہ توڑنے کی وجہ: جذاذا۔ جَذّ کے معنی توڑنا اور ریزہ ریزہ کر دینا ہیں جُذاذ توڑے ہوئے اور ٹکڑے ٹکڑے کیے ہوئے کو کہتے ہیں (ل) ؛

کبیر لھم میں ضمیر عبادت کرنے والوں کی طرف ہے اور مراد ہے ان کفار کا بڑا بت۔ اور الیہ یرجعون میں جمہور نے ضمیر کو ابراہیم کی طرف لیا ہے یعنی اس سے دریافت کریں۔ اور بعض نے اللہ کی طرف یعنی بتوں کو ٹوٹا ہوا پا کر اللہ کی طرف رجوع کریں اور بعض نے بڑے بت کی طرف اور میرے نزدیک یہ آخری توجیہ صحیح ہے۔ کیونکہ ابراہیم یا خدا کی طرف رجوع کرنے کے لیے تو چاہیے تھا کہ سارے توڑ دیئے جاتے۔ اس غرض کے لیے ایک کو باقی رکھ لینا بے معنی ہے اور مطلب یہ ہے کہ حل مشکلات کیلئے اسکی طرف رجوع کریں یعنی ایک طرف تو اپنے بتوں کو ٹوٹا ہوا پا کر یہ سمجھیں کہ اگر یہ نفع نقصان کے مالک ہوتے تو خود کیوں ٹوٹ جاتے اور دوسری طرف بڑے بت کو سالم پا کر اس کی طرف رجوع کرتے اور دیکھ لیتے کہ وہ جو سب سے بڑا تھا باوجود صحیح سالم ہونے کے ان کی کچھ مدد نہیں کر سکتا اور نہ ان کی مشکلات کو حل کر سکتا ہے ؛

لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾

یقیناً وہ ظالموں میں سے ہے

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾

(لوگوں نے) کہا ہم نے ایک نوجوان کو اُن کا ذِکر کرتے سُنا تھا جسے ابراہیمؑ کہا جاتا ہے۔

قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

کہنے لگے، اسے لوگوں کے سامنے لاؤ، تاکہ وہ گواہی دیں۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾

کہا، اے ابراہیمؑ کیا تو نے ہمارے معبودوں سے یہ کام کیا ہے؟

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾

اس نے کہا بلکہ یہ کیا (جس نے کیا) ان کا بڑا یہ ہے، سو ان سے پوچھو اگر وہ بولتے ہیں ۲۱۶۷

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

سو انھوں نے اپنے آپ کی طرف رجوع کیا اور کہنے لگے تم خود ہی ظالم ہو ۲۱۶۸

۲۱۶۷ حضرت ابراہیم نے بتوں کا توڑنا بڑے بت کی طرف منسوب نہیں کیا نہ جھوٹ بولا۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ بل فعلہ پر وقف ہے اور اسی کو مدنظر نہ رکھنے سے حضرت ابراہیم کی طرف یہ جھوٹ منسوب کرنا پڑتا ہے کہ آپ نے خود بت توڑنے سے انکار کیا اور جواب یہ دیا کہ بڑے بت نے چھوٹے بتوں کو توڑ دیا ہے۔ یہ کہنا کہ اس طرح ان پر الزام دینا مقصود تھا۔ صحیح نہیں اس لیے کہ اس قسم کا الزام تو بغیر اس جھوٹ کے بھی دیا جا سکتا تھا اور اس معنی کے خلاف اور قرائن بھی ہیں اول حضرت ابراہیم نے علی الاعلان انہیں کہہ دیا تھا لاکیدن اصنامکم بعد ان تولوا مدبرین مفسرین نے اس صریح خطاب کو جو قوم سے حضرت ابراہیم نے کیا مخفی طور پر کہنا قرار دیا ہے اگر مخفی تھا تو بعد ان تولوا کے کیا معنی ہوئے وہ تو کچھ لوگوں کو خطاب کر کے کہہ رہے ہیں کہ تم پھر جاؤ گے تو میں انہیں نقصان پہنچاؤں گا۔ اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم کو ڈرایا ہوگا کہ اگر تم بتوں کے خلاف کوئی بات منہ سے نکالو گے تو وہ تمہیں نقصان پہنچائیں گے حضرت ابراہیم نے کہا انہوں نے مجھے کیا نقصان پہنچانا ہے میں انہیں نقصان پہنچاؤں گا اور طرز عبارت صاف بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیم نے یہ بات میدان مقابلہ میں کہی ہے اور بہت لوگوں نے اسے سنا ہے اسی لیے جب بت ٹوٹے ہوئے پائے گئے اور تحقیقات شروع ہوئی تو بہت سے لوگ بول اُٹھے کہ ہم نے ابراہیم کو یوں کہتے سنا تھا۔ اسی لیے ابراہیم کو بلایا گیا تاکہ سب کے سامنے یہ گواہی دی جائے۔ یہ دوسرا قرینہ اسبات پر ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے فعل کا اخفا نہیں کیا اور اخفا کرنے سے ان کی اصل غرض ہی پوری نہ ہوتی تھی۔ تیسرا اور نہایت قوی قرینہ یہ ہے کہ بڑے بت سے پوچھنے کے لیے نہ حضرت ابراہیم کہتے ہیں اور نہ پجاری بڑے بت کے متعلق نہ بولنے کا عذر کرتے ہیں بلکہ حضرت ابراہیم بھی کہتے ہیں فسئلوھم ان کانوا ینطقون۔ اور وہ بھی جواب میں کہتے ہیں ماھؤلاء ینطقون اگر بڑے بت کو اس لیے چھوڑا گیا تھا کہ فعل کو اس کی طرف منسوب کیا جائے تو فسئلوہ کہنا چاہیے تھا نہ فسئلوھم اور وہ بھی جواب میں کہتے کہ یہ بولتا نہیں پس وہ صورت الزام بھی نہ رہی جو اس جھوٹ کی غرض بنائی جاتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کسی مصلحت اور غرض کے لیے کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ ان کی سب اغراض اور ان کے سب مصالح سچائی سے پورے ہو جاتے ہیں بل فعلہ پر وقف ہے اور کسائی جیسے نحوی نے ان الفاظ کی توجیہ یوں کی ہے فعلہ من فعلہ کیا جس نے کیا یعنی فاعل محذوف ہے۔ تو حضرت ابراہیم نے جواب یوں دیا ہے کہ میں نے کیا یا کسی اور نے کیا۔ تم اس تحقیقات کے کیوں درپے ہو۔ اور اس سے کیا حاصل۔ اگر تمہارے یہ بت کچھ کر سکتے ہیں کوئی نفع نقصان پہنچانے پر قادر ہیں تو ابھی سب سے بڑا بت موجود ہے یہ کیوں کچھ نہیں کر لیتا اگر یہ مجھے نقصان پہنچانے پر قادر ہیں تو یہ بڑا موجود ہے رہا یہ کہ کس نے کیا تو خود ان سے کیوں نہیں پوچھتے جس شخص کو مار پڑے وہ خود بتا دیا کرتا ہے کہ مجھے فلاں نے مارا ہے یہ کیوں نہیں بتاتے پس اگر یہ نفع نقصان پہنچانے پر قادر نہیں اور نہ بول سکتے ہیں تو ان کی عبادت کے کیا معنی اور بل جو حرف اضراب ہے تو کبھی پہلے جملہ کے خیال کے ابطال کے لیے ہوتا ہے وقالوا اتخذ الرحمٰن ولدا سبحانہ بل عباد مکرمون اور کبھی ایک غرض سے دوسری غرض کی طرف انتقال کے لیے آتا ہے جیسے قد افلح من تزکی و ذکر اسم ربہ فصلّی بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا (مغنی)۔

۲۱۶۸ اپنے آپ کی طرف رجوع کرنے سے مراد تفکر و تدبر ہے یعنی اپنے دلوں میں سوچا۔

ثُمَّ نُكِسُوا عَلٰى رُءُوسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾

پھر اپنے سر ڈال کر اوندھے گر گئے (اور بولے) تو جانتا ہے کہ یہ بات نہیں کرتے ۲۱۶۹۔

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ ط

کہا تو کیا اللہ کو چھوڑ کر تم اس کی عبادت کرتے ہو، جو تمھیں کچھ نفع نہیں دیتا اور نہ تمھیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

تف ہے تم پر اور اس پر جس کی تم اللہ کے سوائے عبادت کرتے ہو، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۶۸﴾

کہنے لگے اسے جلا دو اور اپنے دیوتاؤں کی مدد کرو، اگر تم (کچھ) کرنے والے ہو۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾

ہم نے کہا، اے آگ! ابراہیمؑ پر ٹھنڈک اور سلامتی ہو جا ۲۱۷۰۔

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۰﴾ ج

اور انھوں نے اس سے بُرائی کرنی چاہی تو ہم نے انہی کو نقصان اُٹھانے والے کر دیا۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ

اور ہم نے اُسے اور لوطؑ کو اس سرزمین کی طرف بچا نکالا جس

۲۱۶۹۔ نکسوا ۔ نکس، کے معنی ہیں کسی چیز کا سر کے بل اُلٹا کر دینا اور نکس رأسہٗ کے معنی اماله آتے ہیں یعنی اسے جھکایا اسی سے ہے ناکسوا رؤسھم عند ربھم (السجدة ۳۲ - ۱۲) اور بیماری میں نکس یہ ہے کہ افاقہ کے بعد مبتلائے مرض ہو جائے اور یہاں معنی لیے گئے رجعوا عما عرفوا من الحجة لا ابراھیم یعنی ابراہیم کی جس دلیل کا اعتراف کیا تھا اس سے رجوع کیا اور ننکسه فی الخلق (یٰس ۳۶ - ۶۸) میں معنی ہیں کہ قوت کی جگہ ضعف بدل دیا - اور جوانی کی جگہ بڑھاپا (ر ل) ؏

۲۱۷۰۔ حضرت ابراہیم کا آگ سے بچایا جانا: حضرت ابراہیم کے آگ میں ڈالا جانے اور رہنے کے قصوں کو بعض مفسرین نے عجیب عجیب پیرایوں میں بیان کیا ہے چالیس دن تک لکڑیوں کا جمع کیا جانا پھر ایک عظیم الشان آگ کا جلنا پھر کفار کو سمجھ نہ آنا کہ کس طرح حضرت ابراہیم کو اس آگ میں ڈالیں اور شیطان کا آکر انہیں گوپیا بنانا سکھانا پھر حضرت ابراہیم کا اس آگ میں چالیس یا پچاس دن رہنا اور ایسے ایسے قصوں کو نقل کر کے روح المعانی میں لکھا ہے کہ "اس قصہ کی بہت سی روایتیں ہیں لیکن بحر المحیط میں ہے کہ لوگوں نے حضرت ابراہیم کے ماجرا کو بیان کرنے میں بہت سی باتیں بنائی ہیں اور صحیح وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ آپ کو آگ میں ڈالا گیا - تو اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو ٹھنڈا کر دیا" اور یہی صحیح ہے - اب قرآن کریم میں کفار کے ارادہ کا ذکر یہاں تو صرف اس قدر ہے کہ انہوں نے کہا حرقوہ اور دوسری جگہ ہے اقتلوہ او حرقوہ (العنکبوت ۲۹ - ۲۴) اسے قتل کر دو یا جلا دو اور تحریق پر دیکھو ۲۰۹۸ اور تیسری جگہ ہے ابنوا له بنیانا فالقوه فی الجحیم اس کے لیے عمارت بناؤ اور اسے جحیم یعنی دوزخ میں ڈال دو - (الصّٰفّٰت ۳۷ - ۹۷) اور کیا ہوا اس کے متعلق یہاں فرمایا قلنا یا نار کونی بردًا وسلامًا علی ابراھیم اور دوسری جگہ کہا ہے فانجٰه الله من النار (العنکبوت ۲۹ - ۲۴) اور تیسری جگہ ہے :- فارادوا به کیدا اجعلنٰھم الاسفلین (الصّٰفّٰت ۳۷ - ۹۸) اور یہاں بھی بردا و سلاما کے بعد یہی لفظ آتے ہیں اس لیے اگر ہم قرآن کریم کے بیان سے آگے نہ نکلیں تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیا فی الواقع حضرت ابراہیم کو اس آگ میں ڈالا گیا یا جیسا کہ انجٰه الله من النار سے ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال حکمت سے حضرت ابراہیم کو آگ میں پڑنے سے پہلے نجات دے دی اور کسی دوسری طرف نکال دیا جیسا کہ آیت ۷۱ سے ظاہر ہے اور حضرت ابراہیم کا وہاں سے ہجرت کر جانا تو صاف معلوم ہوتا ہے جس خدا نے حضرت نوح کو طوفان سے حضرت موسیٰ کو سمندر سے ۔ حضرت عیسیٰ کو صلیب سے اور حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کو قتل سے بچا لیا حالانکہ آپ کے گھر کا محاصرہ ہو چکا تھا وہ اسباب پر بھی قادر تھا کہ حضرت ابراہیم کو آگ سے بچا دے خواہ آگ میں پڑ کر آپ بچائے گئے ہوں اور خواہ اس سے بھی پیشتر اس آگ کو ابراہیم کے حق میں (علی ابراھیم) ٹھنڈا کر دیا ہو - اور آیت ۷۱ سے اور ایسا ہی (الصّٰفّٰت ۳۷ - ۹۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ابھی ارادہ ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں وہاں سے نجات دے دی ؏

بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾
وَ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ؕ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ
وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾
وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا
وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ
الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾
وَ لُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ نَجَّيْنٰهُ
مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ؕ
اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾
وَ اَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ
الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ ع ۵
وَ نُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا
لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾
وَ نَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ
فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۷۷﴾
وَ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي
الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ
وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾

میں ہم نے قوموں کے لیے برکت رکھی تھی ع ۲۱۷۱

اور ہم نے اسے اسحٰقؑ دیا اور یعقوبؑ پوتا اور سب کو ہم نے نیک بنایا۔

اور ہم نے انھیں امام بنایا، وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کی طرف نیکیوں کے کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ ہماری عبادت کرنے والے تھے۔

اور لوطؑ کو بھی ہم نے فہم اور علم دیا اور اسے اس بستی سے نجات دی جو ناپاک کام کرتی تھی، وہ بُرے لوگ (اور) نافرمان تھے۔

اور ہم نے اُسے اپنی رحمت میں داخل کیا وہ نیکوں میں سے تھا۔

اور نوحؑ کو جب (اس سے بھی) پہلے اس نے پکارا تو ہم نے اس کی (دُعا) قبول کی سو اسے اور اس کے گھر والوں کو بڑی مصیبت سے نجات دی۔

اور اسے اس قوم کے مقابل پر مدد دی جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے، وہ بُرے لوگ تھے۔ سو ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

اور داؤدؑ اور سلیمانؑ کو جب وہ کھیتی کے معاملہ میں فیصلہ کرنے لگے جب اس میں لوگوں کی بکریاں رات کو چر گئیں اور ہم ان کے فیصلے کے گواہ تھے ع ۲۱۷۲

ع ۲۱۷۱ برکت والی زمین سے مراد ارض شام ہے جدھر حضرت ابراہیم اور حضرت لوط ہجرت کر کے چلے گئے۔

ع ۲۱۷۲ نفشت۔ نَفَش اون کا کوٹنا ہے یہاں تک کہ اس کے اجزا ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں یعنی اس کا دھننا۔ کالعھن المنفوش (القارعۃ ۱۰۱ - ۵) اور نُفُش اونٹوں بکریوں کا چرواہے کے علم کے بغیر پھیل جانا اور چرنا ہے (ل)۔

بکریوں کے کھیتی چر جانے کے واقعہ کی اہمیت کی وجہ: اس واقعہ کا ذکر خصوصیت سے کیا حالانکہ حضرت داؤد اور سلیمان بادشاہت کی حیثیت میں بڑے بڑے اہم امور ملکی طے کرتے تھے اور یہ ایک نہایت خفیف سا معاملہ ہے کہ کسی کی بکریاں رات کو کھیت چر گئیں اس میں یہ توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے بادشاہ بھی ہو جائیں تو وہ اپنی رعایا میں سے معمولی لوگوں کی شکایات کی طرف اسی طرح توجہ کرتے ہیں جس طرح اہم امور ملکی کی طرف اس کی مثالیں ہمارے خلفائے راشدین اور بعض دیگر اسلامی بادشاہوں میں ملتی ہیں کہ کس طرح رعایا کے غریب سے غریب لوگوں کی خاطر وہ خود تکلیف اور مشقت اٹھانے کے عادی تھے یہی بادشاہت کا وہ رنگ ہے جسے اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے کہ بڑے سے بڑے آدمی تک چھوٹے سے چھوٹے آدمی کی آواز پہنچ سکے آج کل کی جمہوریت میں دفاتر کی پابندیوں کی روک بڑے سے بڑے مطلق العنان بادشاہوں کے استبداد سے بڑھ کر ہے اور وہ سادگی جو انسانیت کا اصل فخر ہے بالکل مفقود نظر آتی ہے۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۫ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿٧٩﴾ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ

سو ہم نے وہ (فیصلہ) سلیمانؑ کو سمجھا دیا اور سب کو ہم نے فہم اور علم دیا تھا اور ہم نے پہاڑوں کو جو تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو داؤد کے ساتھ کام میں لگا دیا، اور ہم ہی کرنے والے تھے ۲۱۷۳

اور ہم نے اسے تمہارے لیے زرہ بنانی سکھائی، تاکہ تمہاری لڑائی میں تمہاری حفاظت کرے، تو کیا

ع۲۱۷۳ سلیمان کو فیصلہ سمجھا دیا۔ حالانکہ حضرت داؤدؑ کی موجودگی میں سلیمانؑ نبی نہ تھے پس فہم معاملات میں بعض وقت ایک غیر نبی نبی سے بڑھ سکتا ہے۔

پہاڑوں کی تسبیح: پہاڑ حضرت داؤد کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ بعض کے نزدیک یہ معجزہ تھا جس طرح کنکریوں کا نبی صلعم کے ہاتھ میں تسبیح پڑھنا جسے دوسرے لوگوں نے سنا۔ مگر یہاں اس کا ذکر بطور معجزہ نہیں جو ایک دفعہ کا واقعہ ہوتا ہے بلکہ عادت کے طور پر ہے اور اکثر لوگوں کا قول یہ ہے کہ ان کی تسبیح کو صرف حضرت داؤد سنتے تھے۔ اور بعض نے کہا کہ یہ تسبیح زبان حال سے تھی۔ اور حالانکہ قرآن کریم کے ظاہر الفاظ طیر کو تسبیح میں ساتھ شامل نہیں کرتے مگر بعض نے یہ مانا ہے کہ پرندے بھی آپ کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔

حضرت داؤد کے لیے پہاڑوں اور پرندوں کا مسخر کیا جانا: قابل غور بات یہ ہے کہ یہاں اور سورۂ سبا میں بھی تین باتوں کا اکٹھا ذکر ہے (۱) پہاڑوں کی تسخیر یعنی ان کا حضرت داؤد کے کام میں لگایا جانا اور تسبیح کرنا (۲) پرندوں کا ان کے کام میں لگایا جانا۔ (۳) حضرت داؤد کا زرہیں بنانا چنانچہ دوسری جگہ ہے یٰجبال اوّبی معه والطیر ج والنّالہ الحدید۔ ان اعمل سٰبغٰت وقدر فی السرد (السبا ۳۴-۱۰ و ۱۱) دونوں جگہ ان تینوں باتوں کا اکٹھا ذکر کرنا بتاتا ہے کہ ان میں باہم کوئی تعلق ہے۔ اب ان تینوں میں سے جہاں تک زرہیں بنانے کا سوال ہے۔ اس کی غرض ظاہر ہے تاکہ وہ جنگوں میں کام دیں اور خود بھی قرآن کریم نے یہ وضاحت کر دی ہے لتحصنکم من باسکم اور یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت داؤد کے وقت میں بڑی بڑی فتوحات حاصل ہوئیں جن سے سلطنت اسرائیلی نہایت درجہ مستحکم ہوگئی اور جب زرہیں بنانے کا تعلق صاف طور پر ان فتوحات سے ہے تو لازماً دوسری باتوں کا تعلق بھی فتوحات سے ہی ہونا چاہیے ورنہ تینوں باتوں کا اکٹھا ذکر نہ ہوتا، پرندوں کا تعلق جنگوں اور فتوحات سے دو طرح پر ہوسکتا ہے ایک یہ کہ پرند جنگوں میں خبر رسانی کا کام دیتے تھے اور اسی لیے حضرت سلیمان کے ذکر میں بھی پرندوں کا ذکر آتا ہے۔ اور میرے نزدیک پرندوں کے حضرت داؤد کے ساتھ مسخر ہونے یا کام میں لگایا جانے سے منشا یہی ہے مگر ایک اور رنگ میں بھی پرندوں کا ذکر فتوحات میں اشعار عرب میں آتا ہے جیسا کہ نابغہ کے شعر میں ہے اذا ماغدا بالجیش حلّق فوقهٗ عصائبُ طیرٍ تھتدی بعصائب۔ یعنی جب وہ لشکر کے ساتھ نکلتا ہے تو اس کے اوپر پرندوں کے جھنڈ حلقہ باندھ لیتے ہیں، جو ان لشکروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور بائبل میں بھی پرندوں کے مفتوح فوج کو کھانے کا ذکر ہے۔ "تو اسرائیل کے پہاڑوں پر گر جائے گا تو اور تیرا سارا لشکر اس گروہ سمیت جو تیرے ساتھ ہے اور میں تجھے ہر قسم کے شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو خوراک کے لیے دونگا" (حزقی ایل ۳۹: ۴) تیسری بات پہاڑوں کی تسخیر اور ان کی تسبیح ہے اب ایک رنگ میں تو زمین و آسمان کی سب چیزیں انسانوں کے لیے مسخر ہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ کشتی کی اور دریاؤں کی اور چاند اور سورج کی تسخیر کا ذکر آتا ہے بلکہ یوں بھی وسخر لکم ما فی السمٰوات وما فی الارض جمیعا منه (الجاثیة ۴۵-۱۳) اور تسبیح بھی ہر چیز کرتی ہے وان من شیئ الا یسبّح بحمده (بنی اسرائیل ۱۷-۴۴) اس لیے یہاں کوئی خصوصیت ہونی چاہیئے۔ میرے نزدیک زرہوں اور پرندوں کے تعلق کو مدنظر رکھتے ہوئے پہاڑوں کا مسخر ہونا اور تسبیح کرنا اس معنی میں ہے کہ وہاں پر حضرت داؤد کی حکومت قائم ہوگئی اور ان کی تسبیح سے مراد ان پہاڑی قوموں کا تسبیح کرنا ہے جو ظاہری اور باطنی دونوں رنگوں میں حضرت داؤد کے ساتھ ہوگئیں اور یہ تو ظاہر ہے کہ جس معنی میں کل مخلوق کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے اسی معنی میں پہاڑ اور پرند حضرت داؤد کے لیے مسخر کیے۔ کل مخلوق انسان کے لیے اسی معنی میں مسخر ہے کہ وہ اس کے کاموں میں معاون ہے پھر جس قدر انسان اس پر زیادہ تصرف حاصل کرے اسی قدر زیادہ مسخر ہو جاتی ہے مثلاً ہوا سب انسانوں کے لیے بھی مسخر ہے یعنی ان کے کام میں لگی ہوئی ہے پھر جو انسان اس سے دوسروں سے بڑھ کر فائدہ اٹھاتا ہے اس کے لیے خصوصیت سے مسخر ہوگئی پس پہاڑوں اور پرندوں کے مسخر ہونے کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتے کہ پہاڑ اور پرند ان کے کام میں دوسروں کی نسبت زیادہ آئے اور ان کے لیے نصرت کا موجب ہوگئے اور اسی کی طرف وکنا فاعلین میں اشارہ ہے۔ ایسا ہی تسبیح جس رنگ میں کوئی چیز کرتی ہے اسی رنگ میں کریگی۔ پہاڑ بھی خدا کی تسبیح کرتے ہیں مگر اسی طرح جس طرح ہر چیز تسبیح کرتی ہے ولکن لا تفقهون تسبیحهم (بنی اسرائیل ۱۷-۴۴) ہاں اگر جبال سے مراد اہل جبال یعنی پہاڑی قومیں لی جائیں جیسے بعض وقت قریہ سے مراد اہل قریہ یعنی بستی کے رہنے والے لیے جاتے ہیں یا بڑے بڑے انسان مراد لیے جائیں۔ دیکھو ع۱۶۲۳ تو ان کی تسبیح بلاشبہ حضرت داؤد کی طرح ہی ہو گی۔

اَنۡتُمۡ شٰكِرُوۡنَ ۸۰
وَلِسُلَيۡمٰنَ الرِّيۡحَ عَاصِفَةً تَجۡرِىۡ
بِاَمۡرِهٖۤ اِلَى الۡاَرۡضِ الَّتِىۡ بٰرَكۡنَا فِيۡهَا ؕ
وَكُنَّا بِكُلِّ شَىۡءٍ عٰلِمِيۡنَ ۸۱
وَمِنَ الشَّيٰطِيۡنِ مَنۡ يَّغُوۡصُوۡنَ لَهٗ وَ
يَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا
لَهُمۡ حٰفِظِيۡنَ ۙ ۸۲
وَاَيُّوۡبَ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىۡ مَسَّنِىَ

تم شکر گزار ہو ؟ ۲۱۷۴
اور ہم نے سلیمانؑ کے لیے تیز چلنے والی ہوا کو (کام میں لگادیا)
وہ اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے
برکت رکھی تھی اور ہم ہر چیز کو جاننے والے ہیں ۲۱۷۵
اور کئی سرکش جو اس کے لیے غوطہ زنی کرتے اور اس کے
سوائے اور کام بھی کرتے تھے اور ہم ان کی حفاظت
کرنے والے تھے ۲۱۷۶
اور ایوبؑ کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے تکلیف پہنچی ہے

۲۱۷۴ لبوس۔ لَبِسۡتُ کے معنی ہیں میں نے پہنا اور لَبَسۡتُ کے معنی ہیں میں نے مشتبہ کر دیا اور لباس اور لَبُوۡس اوّل سے ہے مایُلۡبَسُ یعنی جو چیز پہنی جائے اور لبوس کے معنی کپڑے بھی ہیں اور ہتھیار بھی اور اس صورت میں مذکر ہوتا ہے اور جب اس سے مراد زرہ ہو تو مونث لایا جاتا ہے (ل)

حضرت داؤدؑ کو زرہ بنانی سکھائی۔ سب علم اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے یہ بھی ضروری نہیں کہ اس سے پہلے زرہ کا استعمال بالکل نہ ہوتا ہو بلکہ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس میں انہوں نے ترقی کی اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ کثرت سے ان کا استعمال کیا اور مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت داؤد پہلے بیت المال سے گزارہ لیتے تھے پھر زرہ بنا کر اس کی اُجرت سے اپنا گزارہ کرتے تھے۔

۲۱۷۵ و لسلیمن الریح میں سخرنا مقدر ہے یعنی سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ سلیمان کے لیے شیاطین نے ایک فرسخ لمبا اور ایک فرسخ چوڑا فرش بنایا تھا جس پر سلیمان مع اپنے درباریوں اور دیگر لوگوں کے بیٹھ جاتے اور پرندے اکٹھے ہو کر سر پر سایہ کیے ہوئے ہوتے اور پھر ہوا اسے اُٹھا کر لے جاتی اور بعض نے ایک عجیب قسم کا مرکب تنایا ہے جس میں ہزارہا مکان تھے اور جسے شیاطین اُٹھاتے اور پھر ہوا اسے چلاتی۔ مگر قرآن کریم ان قصّوں سے پاک ہے اور ہوا کا حضرت سلیمان کے لیے مسخر ہونا یہی ہے کہ آپ کے کام میں معاون تھی جس طرح پر ہوا سے مدد ملا کرتی ہے اور غالباً تجری بامرہ میں اس ہوا کے کشتیاں چلانے کی طرف اشارہ ہے یا خود کشتیوں کا چلنا ہی مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہوائے موافق یا بادبانوں وغیرہ کے استعمال سے جہاز دور دور کا سامان لیکر ملک شام میں جو ارض مبارک ہے آتے تھے۔ چنانچہ یہودی انسکلوپیڈیا میں ہے کہ خلیج فارس اور خلیج عقبہ کے درمیان حضرت سلیمان کے جہاز چلتے تھے اور اس تجارت سے ملک میں سونا اور دولت بہت بڑھ گئی تھی اور یہی وجہ حضرت سلیمان کی شان و شوکت کی تھی اور قرآن شریف میں دوسری جگہ آتا ہے وسخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہ (ابراھیم ۱۴-۳۲) اور ہو سکتا ہے کہ یہاں بھی بامرہ میں اشارہ امر الٰہی کی طرف ہی ہو اور یہاں ریح کو عاصفۃ کہا ہے اور دوسری جگہ ہے تجری بامرہ رخاء (ص ۳۸-۳۶) تو مطلب یہ ہے کہ وہ ریح عاصفہ ایسی نہ تھی کہ نقصان پہنچاتی، بلکہ باوجود تیز ہوا ہونے کے اس میں نرمی پائی جاتی تھی ؎

۲۱۷۶ شیاطین۔ شیطان ہر سرکش کو کہتے ہیں جنّ ہو یا انسان ۲۶ء ۱ اور یہاں سرکش انسان ہی مراد ہیں جیسا کہ ان کے غوطہ زنی کرنے اور دوسرے کام کرنے سے صاف ظاہر ہے۔

یغوصون۔ غوص کے معنی ہیں پانی کے نیچے داخل ہونا اور اس سے کسی چیز کا نکال لانا اور پھر جو کوئی کسی پوشیدہ چیز پر اچانک آئے اور اسے نکال لے تو اسے غائص کہا جاتا ہے خواہ وہ کوئی چیز ہو یا علم ہو اور غوّاص وہ ہے جو کثرت سے ایسا کرے اور یغوصون سے یہاں یہی مراد ہے کہ اس کے لیے نادر کام اور افعال بدیعہ کرتے تھے اور فقط موتیوں کا نکالنا مراد نہیں (غ)، مگر دوسرے اعمال کا ذکر یعملون عملا دون ذٰلک میں موجود ہے اور اس کی تفصیل دوسری جگہ موجود ہے یعملون له مایشاء من محاریب وتماثیل وجفان کالجواب وقدور راسیٰت (السبا ۳۴-۱۳)

شیاطین غوطہ زن اور معمار انسان تھے: حالانکہ لغت میں صاف طور پر موجود ہے کہ شیطان سرکش انسان کو بھی کہا جاتا ہے اور قرآن کریم میں شیاطین الانس بالتصریح مذکور ہیں اور کئی جگہ پر خود مفسرین نے بالاتفاق شیاطین سے مراد صرف سردار یعنی انسان لیے ہیں جیسے واذا خلوا الی شیاطینهم (البقرۃ ۲-۱۴) اور حالانکہ یہاں غوطہ زنی کا صاف ذکر ہے جو کام ہمیشہ سے انسان کرتے چلے آئے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں لیکن مفسرین کو یہ اصرار ہے کہ یہ سچ مچ کے شیطان ہی تھے جو غوطہ زنی کرتے تھے اور پھر کنا لهم حافظین میں یہ قصّہ بنایا گیا ہے کہ ان شیطانوں پر ایک گروہ ملائکہ کا اور مومن جنّوں کا حفاظت کے لیے مقرر تھا۔ اور پھر وہ شیطان سچ مچ معماروں کا کام بھی کرتے تھے والشیاطین کل بناء وغواص (ص ۳۸-۳۷) گویا وہ زمانہ ایسا تھا کہ جتنے کام آج کل انسان کرتے ہیں اس وقت وہ شیاطین کیا

الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۚۖ ﴿۸۳﴾

اور تُو سب رحم کرنیوالوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے ع۲۱۷۷

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾

تو ہم نے اس کی (دعا) قبول کی اور جو اسے تکلیف تھی وہ دور کردی۔ اور ہم نے اُسے اس کے اہل دے دیئے اور ان کی مثل ان کے ساتھ اور بھی دیئے (یہ ہماری طرف سے رحمت تھی اور عبادت کرنیوالوں کے لیے یاد دلانے کو ہے ع۲۱۷۸

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۚۖ ﴿۸۵﴾

اور اسمٰعیلؑ اور ادریسؑ اور ذوالکفلؑ کو۔ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے ع۲۱۷۹

وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾

اور ہم نے انھیں اپنی رحمت میں داخل کیا۔ وہ نیکو کاروں میں سے تھے۔

وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖۗ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۚۖ ﴿۸۷﴾

اور ذوالنونؑ کو جب وہ (قوم پر) ناراض ہوکر چلا گیا، اس نے گمان کیا کہ ہم اس پر تنگی نہیں کریں گے، پس اس نے مشکلات میں پکارا کہ تیرے سوائے کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، میں اپنے (اوپر) ظلم کرنے والوں میں سے ہوں ع۲۱۸۰

کرتے تھے اور شیاطین اس وقت بدی کے محرک نہ تھے اور یہ قانون اللہ تعالیٰ کا پیچھے بنا کہ ان الشیطان یجری من ابن اٰدم مجری الدم صاف اور سادہ الفاظ کو عجوبہ بنانے سے اور قرآن کریم کے سادہ بیانات میں عجیب و غریب قصّے داخل کرنے سے قرآن کریم کی عظمت بڑھتی نہیں بلکہ اس سے اسے نقصان پہنچتا ہے اور ان کاریگروں کو شیاطین اس لیے کہا کہ وہ سرکش قوموں میں سے تھے جنہیں سلیمان نے فتح کرکے مغلوب کیا تھا اور بعض کو ان میں سے قید کرکے کام لیا جاتا تھا، جیسا کہ اٰخرین مقرنین فی الاصفاد (صٓ - ۳۸) سے ظاہر ہے اسی لیے کنا لھم حافظین بھی فرمایا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت نہ ہوتی تو ان سے کام لینا آسان نہ تھا۔

ع۲۱۷۷ حضرت ایوبؑ کی تکلیف: قرآن کریم نے اس ضرّ یا تکلیف کی کوئی تشریح نہیں فرمائی۔ مفسرین نے کچھ بائبل سے اخذ کرکے اور کچھ اس پر بڑھا کر خطرناک پیرایہ جسمانی تکالیف کا بنایا ہے گو یہ بھی ممکن ہے مگر اصل یہ ہے کہ انبیاء کی تکالیف اور رنگ کی ہوتی ہیں اور بیماریوں سے بڑھ کر ان میں صبر دکھانا پڑتا ہے۔ ہاں یہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے اور دوسری جگہ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت ایوب اپنے اہل وعیال سے الگ ہوگئے تھے۔

ع۲۱۷۸ حضرت ایوبؑ کو ان کے اہل اور اس کی مثل دیا جانے سے مراد: کہا گیا ہے کہ حضرت ایوبؑ کی سب اولاد مرگئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کردیا اور اٰتیناہ اھلہ سے یہی مراد لی گئی ہے لیکن قرآن شریف میں نہ ان کے مرنے کا ذکر ہے نہ دوبارہ زندہ ہونے کا۔ اور دینے سے مطلب صرف یہی ہے کہ وہ دوبارہ اسے مل گئے اور نہ صرف وہی مل گئے بلکہ اور بھی اللہ تعالیٰ نے اسے بہت سی اولاد دی۔ اور ابن عساکر وغیرہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلعم سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا رد اللّٰہ تعالیٰ امراتہٗ الیہ وزاد فی شبابھا حتی ولدت لہٗ ستۃً وعشرین ذکرا (ر د) یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی بی بی اس کی طرف لوٹا دی اور اس کی شباب کو بڑھایا یہاں تک کہ چھبیس ۲۶ لڑکے اس کے لیے جنی اور ذکرٰی للعبدین یہ بتانے کے لیے ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اللہ تعالیٰ اسے دنیوی نعمتوں سے بھی محروم نہیں رکھتا۔

ع۲۱۷۹ ذاالکفل۔ ذوالکفل کون تھے اس میں اختلاف ہوا ہے۔ کئی اور ناموں کے علاوہ زکریا، الیاس، یوشع بن نون کا نام بھی لیا گیا ہے۔ راڈول نے ایک سیاح کی سند پر لکھا ہے کہ عرب کے لوگ حزقیل کو کفل کہتے ہیں اور مفسرین لکھتے ہیں کہ یہود کہتے ہیں کہ ذوالکفل سے مراد حزقیل ہیں۔ پس ان دونوں شہادتوں کی بنا پر یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ذوالکفل حضرت حزقیل کا نام ہے۔

جب حضرت ایوبؑ کا ذکر کیا جو صبر میں ایک نمونہ ہیں تو اپنے اپنے وقتوں کے اور ایسے انبیاء کا بھی ذکر کیا جنہوں نے صبر میں کمال دکھایا، ان سب کے سرتاج حضرت اسماعیلؑ ہیں جنھوں نے بلوغت سے بھی پیشتر اپنی گردن چھری کے آگے رکھ دی اور حزقیلؑ نبی بھی صبر میں نمونہ ہیں اس لیے کہ وہ اس وقت مبعوث ہوئے جب یہودی قید اور یروشلم تباہ ہوگیا تھا اور بنی اسرائیل پر یہ سخت ترین مصائب کا زمانہ تھا۔

ع۲۱۸۰ ذوالنون۔ نُون بڑی مچھلی کو کہتے ہیں اور حضرت یونس کو ذوالنون مچھلی کی وجہ سے کہا گیا ہے جس نے آپ کو منہ میں لیا تھا (غ)

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۸۸

سو ہم نے اس کی (دعا) قبول کی اور اسے غم سے نجات دی اور اسی طرح ہم مومنوں کو نجات دیتے ہیں۔

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۸۹

اور زکریا کو، جب اس نے اپنے رب کو پکارا، میرے رب مجھے اکیلا نہ چھوڑیو اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۹۰

سو ہم نے اس کی (دعا) قبول کی اور اسے یحییٰ دیا اور اس کی عورت کو اس کے لیے اچھا کر دیا ۲۱۸۱ وہ نیکیوں میں جلدی کرتے تھے اور ہمیں امید اور خوف سے پکارتے تھے اور ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے ۲۱۸۱

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۹۱

اور وہ جس نے اپنی عصمت کو محفوظ کیا، سو ہم نے اپنا کلام اس میں پھونکا اور اُسے اور اس کے بیٹے کو قوموں کے لیے نشان بنایا ۲۱۸۲

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ڮ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۹۲

یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے۔ اور میں تمہارا رب ہوں سو میری عبادت کرو ۲۱۸۳

نقدر علیہ ۔ قَدْر کے معنی اندازہ ہیں اور قَدَرْتُ عَلَيْهِ الشَّيْءَ کے معنی ہیں ضَيَّقْتُهٗ اسے تنگ کر دیا گویا یہ اندازہ ہے اس وسعت کے خلاف جو بغیر حساب ہیں پائی جاتی ہے ومن قدر علیہ رزقہ (الطلاق [65]۔ ۷) یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر (الرعد [13]۔ ۲۶) اور یہاں بھی لن نقدر علیہ کے معنی ہیں اس پر تنگی نہیں کریں گے (غ)

حضرت یونس کی قوم پر ناراضگی اور بلا اذن ہجرت، حضرت یونس ناراض ہو کر۔ کس سے ناراض ہو کر؟ قریبًا تمام بڑے بڑے مفسرین نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے یعنی ان لوگوں سے جن کی طرف انہیں بھیجا گیا تھا کیونکہ انہوں نے آپ کو قبول نہ کیا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ سے ناراض ہو کر چلے گئے تھے کہ اس نے عذاب کیوں ٹال دیا کسی صورت میں صحیح نہیں ہو سکتا اس لیے کہ نبی تو ایک طرف رہا یہ ایک معمولی مومن کی بھی شان کے خلاف ہے۔ اور یہ آپ کا قوم سے ناراض ہو کر جانا بطور ہجرت تھا لیکن ہجرت کا حکم ان کو نہیں ہوا تھا (د) اور انہیں یہ یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ان پر گرفت نہیں کرے گا۔ مگر ہجرت کے لیے انہیں حکم الٰہی کا انتظار کرنا چاہیئے تھا اسی لیے فرمایا فاصبر لحکم ربك ولا تكن كصاحب الحوت (القلم [68]۔ ۴۸) نتیجہ یہ ہوا کہ ظلمات یعنی مشکلات میں پڑ گئے ظلمات بمعنی شدائد کے لیے دیکھو ۹۵۷ اور انی کنت من الظالمین اس لیے کہ نبی کی ادنٰے غلطی بھی گو وہ کسی حکم الٰہی کی خلاف ورزی نہ ہو اور گناہ نہ ہو ظلم میں داخل ہے کیونکہ ظلم کا لفظ بہت وسیع ہے اور ہجرت جیسا اچھا فعل بھی محض اس لیے ظلم میں داخل ہو گیا کہ بغیر اجازت الٰہی اسے اختیار کیا گیا دیکھو ۵۵ مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے متعلق دوسری جگہ بحث آئے گی اور حضرت یونس کی دعا لا الٰہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین کے متعلق حدیث میں ہے کہ جو مومن مشکلات میں یہ دعا مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ضرور قبول فرماتا ہے اسی کی طرف اگلی آیت کے الفاظ وکذلك ننجی المؤمنین میں اشارہ ہے ؛

۲۱۸۱ بی بی کی اصلاح یا اچھا کرنے سے مراد بعض مفسرین نے یہ کی ہے کہ اس کے اخلاق اچھے کر دیئے مگر قرآن کریم نے جو نقص خود دوسری جگہ بیان فرمایا ہے وہ اس کا عقیم ہونا ہے اسی نقص کے دور کرنے کو یہاں اصلاح بیان فرمایا ہے ؛

۲۱۸۲ نفخ روح سے کیا مراد ہے۔ حضرت آدم کے متعلق آتا ہے نفخت فیہ من روحی (صٓ [38]۔ ۷۲) پس اگر نفخ روح سے مراد جان ڈالنا لیا جائے تو یہ جان حضرت مریم میں پھونکی گئی حالانکہ وہ زندہ تھیں اس مشکل کو دور کرنے کے لیے بعض مفسرین نے یہ توجیہ اختیار کی ہے کہ یہاں مضاف حذف ہے یعنی مراد ہے فنفخنا فی ابنہا من روحنا مگر یہ تاویل بعید ہے اصل بات یہ ہے کہ یہاں روح سے مراد کلام الٰہی ہے دیکھو ۱۱۱ یعنی اس میں اپنا کلام پھونکا یا اسے وحی کی اور مریم اور ان کے بیٹے کے نشان ہونے پر دیکھو ۲۲۷۱ ؛

۲۱۸۳ امۃ کے معنی جماعت بھی ہیں اور دین بھی جیسے انا وجدنا اباءنا علی امۃ (الزخرف [43]۔ ۲۲) (غ) اور یہاں دونوں طرح پر معنی ہو سکتے ہیں یعنی انبیاء

وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾ | اور انھوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا سب ہماری طرف لوٹ کر آنے والے ہیں۔
فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾ | تو جو کوئی کچھ اچھے کام کرے اور وہ مومن ہو، تو اس کی کوشش کی ناقدری نہ ہوگی۔ اور ہم اس کے لیے لکھ لیتے ہیں ۲۱۸۴
وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ | اور اس بستی پر جسے ہم ہلاک کر دیں، لازم ہے کہ وہ لوٹ کر نہ آئیں ۲۱۸۵
حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ | یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے تیزی سے پھیل جائیں گے ۲۱۸۶

اور راستبازوں کی ایک ہی جماعت ہے جس طرح ایک کو اپنے اعدا سے نجات دی دوسرے کو بھی دی اور اس کی عبادت کرنے والوں کو وہ اب بھی نجات دے گا اور دین معنی لے کر مراد یہ ہوگی کہ ملت توحید اور اسلام ہی سب کا اصل مذہب ہے ؏

ع ۲۱۸۴ کفران نعمت کا کُفر اور کُفران اس کے ادائے شکر کو ترک کر کے اس کا چھپانا ہے اور یہاں یہی معنی ہیں اور کُفران کا اکثر استعمال انکار نعمت ظاہری ہیں اور کُفر کا اکثر استعمال دین میں ہے اور کفور کا استعمال دونوں میں ہے فابی الظلمون الاکفورا (بنی اسرائیل۔ ۹۹) اما شاکرا و اما کفورا (الدھر۔ ۳)

مومنوں کو خوش خبری: جب گروہ انبیاء کا اور ان کو مصائب سے نجات دینے کا ذکر کیا اور اس میں رسول اللہ صلعم کو خوش خبری دی تو اب ساتھ ہی مومنوں کا بھی ذکر کیا تاکہ وہ بھی مصائب کے وقت ان الفاظ سے تسلی حاصل کریں کہ وہ بھی اگر انبیاء کے نقش قدم پر چلیں تو ان کے ساتھ بھی ویسا ہی معاملہ ہوگا۔ خدا کی راہ میں کوشش کرنے والا کوئی ہو اس کی کوشش کی اللہ تعالیٰ قدردانی فرماتا ہے اور یہاں مراد ایسی ہی کوشش ہے جو حق کے پھیلانے سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اس کے بالمقابل اگلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کو مخالفت حق کی وجہ سے ہلاک کر دیا جاتا ہے ؏

ع ۲۱۸۵ حرام کے معنی ممنوع ع ۱۸۱ میں بیان ہو چکے ہیں اگر یہی معنی لیے جائیں تو لا یرجعون بطور تاکید ہوگا گویا ترکیب عبارت یوں ہے کہ جس بستی کو ہم ہلاک کر دیں اس کے لیے پھر حق کی مخالفت ممنوع ہے اس لیے کہ وہ لوٹ کر نہیں آتے اور حرام بمعنی واجب بھی اشعار جاہلیت میں آیا ہے فَاِنَّ حرامًا لا اری الدھر باکیا۔ علی شجوہ اِلَّا بکیتُ علی عمرو یعنی مجھ پر واجب ہے کہ میں کسی کو اس کے غم پر روتا ہوا نہ دیکھوں مگر کہ عمرو پر روؤں۔ اور دوسری قرأت حِرْم اس کے معنی کی موید ہے مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے ؏

مردے اس دنیا میں واپس نہیں آسکتے: حضرت ابن عباس سے ایک قول میں صراحت سے منقول ہے کہ مراد اس کے یہ ہے کہ جو لوگ ہلاک کر دیئے جائیں گے وہ قیامت سے پہلے پھر دوبارہ نہ آئیں گے یعنی اس دنیا میں لوٹ کر نہ آئیں گے اور دوسرے اقوال میں منقول ہے کہ جن پر ہلاکت کا حکم ہو چکا وہ توبہ نہیں کریں گے اور پہلا قول زیادہ واضح ہے (ث) اگر سیاق مضمون کو مدنظر رکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ یہاں ذکر یہی ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ ہلاک کر دے وہ اس دنیا میں لوٹ کر نہیں آتے کیونکہ ذکر انبیاء اور ان کے مخالفین کا ہے جب انبیاء اور راستبازوں کی اعدا اور مصائب سے نجات کا ذکر کیا تو ساتھ ہی بتا دیا کہ جو قوم بوجہ مخالفت حق ہلاک کر دی جاتی ہے وہ لوٹ کر اس دنیا میں نہیں آتی کہ دوبارہ مخالفت کرے لیکن اس خاص موقعہ پر ایک عام قانون بیان کر دیا کہ جو مر جائے وہ اس دنیا میں لوٹ کر نہیں آیا کرتا جس طرح پچھلی آیت میں بھی ایک خاص موقعہ پر عام قانون بیان کر دیا۔ اور اسی پر نسائی اور ابن ماجہ کی حدیث بھی گواہ ہے جو پہلے نقل ہو چکی ہے دیکھو ع ۴۳۴ جس میں مذکور ہے کہ جابر بن عبداللہ کے باپ کو جو شہید ہو گئے تھے جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ مانگتے ہو مانگو اور انہوں نے دوبارہ دنیا میں جانے کی خواہش ظاہر کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا قد سبق منی انھم لا یرجعون یہ میں پہلے سے کہہ چکا ہوں کہ مُردے لوٹ کر دنیا میں نہ جائیں گے۔

ع ۲۱۸۶ حدب۔ حَدَب پیٹھ کا باہر کو نکل آنا اور پیٹ کا اندر ہو جانا یعنی کبڑا ہو جانا اور اسی سے حَدَب بلند زمین کو کہتے ہیں حدب الماء پانی کی موج کی بلندی کو کہا جاتا ہے (ل)

خروج یاجوج ماجوج اور مسلمان: یاجوج ماجوج پر دیکھو ع ۱۹۶۰ وغیرہ ان کے کھولے جانے سے مراد انکا خروج ہے جس کا ذکر احادیث میں آتا ہے اور

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۹۷﴾

اور سچا وعدہ قریب آجائے گا تو ناگاہ ان کی آنکھیں جو کافر ہیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، ہم پر افسوس ہم اس سے غفلت میں رہے، بلکہ ہم ظالم تھے ۲۱۸۷

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾

تم اور وہ چیزیں جن کی تم اللہ کے سوائے عبادت کرتے ہو دوزخ کا ایندھن ہو تم اس میں داخل ہو گے ۲۱۸۸

یہ آخری زمانہ کے متعلق ہے اور کئی حدیثوں میں خروج دجال اور خروج یاجوج ماجوج کا اکٹھا ذکر ہے اور خروج یاجوج ماجوج سے مسلمانوں پر خاص طور پر بلاؤں اور مشکلات کا آنا مذکور ہے۔ یہاں تک کہ لکھا ہے کہ مسلمان اپنے شہروں اور گھروں میں گھس جائیں گے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اور سلطنت ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی اور یہ جو بعض احادیث میں ہے کہ وہ دریاؤں کا سب پانی پی جائیں گے تو شاید اس لحاظ سے ہے کہ پانی ہی زندگی کا موجب ہے تو مطلب یہ ہے کہ دوسری قوموں کی اور بالخصوص مسلمانوں کی زندگی کے سامانوں کو وہ چٹ کر جائیں گے۔ اور ہر بلندی سے تیزی سے نکل پڑنے کے معنی صاف ہیں کہ ہر بلندی پر تھوڑے عرصہ میں قابض ہو جائیں گے یعنی خشکی اور تری کے تمام مقامات پر ان کا قبضہ یا ان کا تصرف ہو جائے گا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ وہ ساری زمین کو ڈھانک لیں گے اور نسل کے لیے دیکھو ع ۲۶۴ اور ان الفاظ کی یہ مراد حدیث سے بھی ظاہر ہے جہاں آتا ہے لا یدان لاحد بقتالہم ان کے ساتھ جنگ کرنے کی طاقت دنیا میں کسی قوم کو نہیں ہوگی اور ان کی آخری حالت کا ذکر یوں فرمایا وترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض (الکہف ۱۸-۹۹) یعنی وہ ایک دوسرے سے ہی الجھ پڑیں گے اور یہی ان کی ہلاکت کا موجب ہوگا اور یہاں یاجوج ماجوج کا ذکر اس لیے کیا کہ حق کے مخالفین اور ان کی ہلاکت اور ہلاکت کے بعد دنیا میں لوٹ کر نہ آنے کا ذکر بتانا سے ئے فرمایا کہ اتنی بڑی زبردست اقوام بھی جو دنیا کی ہر بلندی پر قابض ہوں گی، اور جن کے ساتھ جنگ کی طاقت کسی کو نہ ہوگی وہ بھی اسی قانون کے ماتحت ہیں مگر وہ بھی آخر ہلاک ہونگی اور ہلاکت کے بعد لوٹ کر نہ آئیں گی۔

ع ۲۱۸۷ شاخصۃ۔ شخص کھڑے ہوئے ہوئے انسان کا وجود ہے جو دور سے نظر آئے (غ) اور شَخَصَ بَصَرُ فلانٍ کہا جاتا ہے جب آنکھ کھولے اور جھپکے نہیں۔ اور حدیث میں ذکر میّت میں ہے اذا شَخَصَ بَصَرُہٗ یعنی پلکوں کا اوپر کو اٹھ جانا اور نظر کی تحدید اور اس کا جگہ سے اکھڑ جانا اور جب ایک قلق میں ڈالنے والا امر کسی پر پڑے تو کہا جاتا ہے شخص بہ (ل) تشخص فیہ الابصار (ابراھیم ۱۴-۴۲)

وعدہ حق سے مراد مفسرین نے قیامت لی ہے مگر اس سے موت بھی مراد ہو سکتی ہے اور ہلاک یا زوال طاقت کا وقت بھی ہو سکتا ہے بلکہ چونکہ ذکر یہاں ان کی ہلاکت کا ہی چلتا ہے اس لیے زیادہ قرین قیاس یہی ہے اور اس وقت وہ کہیں گے کہ یہ امر حق تھا جس کی طرف سے ہم غافل رہے بلکہ غافل ہی نہیں ظلم کر کے اس کی مخالفت کرتے رہے اس میں بھی ان کے قبول حق کی طرف ہی اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

ع ۲۱۸۸ حصب۔ حَصَب اور حَصْبَۃ پتھروں یا کنکریوں کو کہتے ہیں اور حَصْب کنکریاں پھینکنے کو اور حَصَب ہر اس چیز کو کہتے ہیں یعنی لکڑی وغیرہ جو آگ میں ڈالی جائے اور یہاں یہی مراد ہے اور بعض کے نزدیک اہل یمن کی لغت میں حَصَب اور حَطَب کے ایک ہی معنی ہیں (ل) اور بعض نے حصب کے معنی صرف مایُرمیٰ بہٖ لیے ہیں یعنی پھینکی گئی چیز۔

کفار یا مخالفین حق کا جہنم کا ایندھن ہونا تو ایک ظاہر امر ہے۔ لیکن ما تعبدون سے کیا مراد ہے؟ بعض نے کہا صرف بُت مراد ہیں کیونکہ ما غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے۔ اور بعض احادیث ایسی ہیں جن میں ہر قسم کے معبود یہاں مراد لیکر نیکوں کو ان الذین سبقت لہم منا الحسنیٰ میں مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ مگر دیکھو ع ۱۳۹۱ جہاں دکھایا گیا ہے کہ اس موقعہ پر مراد صرف وہ معبودان باطل ہیں جو اپنے آپ کو معبود کے رنگ میں پیش کرتے تھے یعنی صرف ان کے بڑے بڑے پیشوا جو حکم خدا کے خلاف انہیں اپنی مرضی پر چلاتے تھے اور ان سے حق کی مخالفت کراتے تھے اس لیے کہ ما تعبدون من دون اللہ میں یوں تو سورج، چاند، ستارے، ہوائیں، بادل، دریا، درخت، پتھر، کتے، بلیاں اور دوسرے بہت سے جانور آجاتے ہیں اس لیے کہ دنیا کی قوموں نے ان چیزوں کی عبادت کی ہے لیکن ان چیزوں کا حشر نہیں ہوگا کہ وہ خاص خاص چیزیں جن کی عبادت کی گئی ہے از سر نو بنا کر دوزخ میں ڈالی جائیں اور نہ ان کے دوزخ میں ڈالنے سے کچھ حاصل ہے۔

پس یہاں مراد ان کے کبراء اور سادات ہیں جن کے دوزخ میں ہونے کا بار بار ذکر بھی آتا ہے چونکہ انہوں نے اپنی عبادت کرائی یا ایسی تعظیم کرائی جو عبادت کے قائمقام تھی اس لیے وہ مستحق دوزخ ہیں اور لو کان ھٰؤلاء اٰلھۃ میں یہی بتایا ہے کہ جیسا کہ یہ اپنے آپ کو پیش کرتے تھے اگر سچ مچ ویسے ہوتے تو دوزخ میں کیوں داخل ہوتے۔

لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٩٩
اگر یہ معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے اور سب اسی میں رہیں گے۔

لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ۝١٠٠
ان کے لیے اس میں چلّانا ہوگا اور وہ اس میں کچھ نہ سنیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝١٠١
جن کے لیے ہماری طرف سے پہلے سے بھلائی آ چکی ہے وہ اس سے دور رکھے جائیں گے ۲۱۸۹

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ۝١٠٢
وہ اس کی آہٹ (بھی) نہ سنیں گے اور وہ اس میں جو اُن کے دل چاہیں رہیں گے ۲۱۹۰

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝١٠٣
سب سے بھاری گھبراہٹ انھیں غمگین نہ کرے گی اور فرشتے اُن سے ملیں گے۔ یہ وہ تمھارا دن ہے، جس کا تمھیں وعدہ دیا جاتا تھا ۲۱۹۱

يَوْمَ نَطْوِى السَّمَآءَ كَطَىِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝١٠٤
جس دن ہم آسمان کو لپیٹ لیں گے جس طرح تحریروں کا طومار لپیٹ لیا جاتا ہے جس طرح ہم نے پہلی پیدائش شروع کی اُسے پھر بنائیں گے یہ ہم پر وعدہ ہے ضرور ہم (یہ) کرنے والے ہیں ۲۱۹۲

۲۱۸۹ سبقت۔ سَبق کے معنی اصل میں چلنے میں آگے بڑھنا ہیں۔ پھر کسی چیز کے نفوذ یا ہو جانے پر یا تقدم یعنی پہلے سے ہو چکا ہونے پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے لولا کلمۃ سبقت من ربک (طٰہٰ ۲۰۔ ۱۲۹) (غ)

یہ لوگ وہی ہیں جو دنیا میں ہی جنت میں پہنچ چکے ہیں یعنی نفوس مطمئنہ۔ اس لیے فرمایا کہ انہیں حسنیٰ پہلے سے پہنچ چکی ہے۔

۲۱۹۰ حسیس۔ حِسّ کے لیے دیکھو ۴۴۰ و ۵۳۸ اور حَسیس اور حِسّ سے مراد حرکت بھی لی جاتی ہے (غ)

اشتہت۔ شہی الشئ اور اِشتہاہُ کے معنی ہیں ایک چیز سے محبت کی اور اس کی طرف مائل ہوا (ل)

مومنوں کی محبت اور ان کا میلان کس چیز کی طرف ہوتا ہے؟ دنیا میں وہ معمولی سے معمولی چیزوں پر گزارہ کر لیتے ہیں۔ اور ان کی اصل تڑپ اور خواہش حصول رضائے الٰہی کے لیے ہوتی ہے اسی لیے جنت کی سب سے بڑی نعمت بھی وہی ہے ورضوان من اللہ اکبر (التوبۃ ۹۔ ۷۲)

۲۱۹۱ فزع۔ فَزَع اس انقباض اور گھبراہٹ کو کہتے ہیں جو ڈرانے والی چیز سے پہنچے اور وہ جَزَع کی جنس سے ہے (جزع اس غم کو کہتے ہیں جو انسان کو اس کے مقصد سے روک دے) اللہ تعالیٰ کے متعلق خوف کا لفظ آ سکتا ہے فزع کا نہیں۔ ففزع من فی السمٰوٰت ومن فی الارض (النمل ۲۷۔ ۸۷) وھم من فزع یومئذٍ اٰمنون (النمل ۲۷۔ ۸۹) اور فَزِعَ الیہ کے معنی ہیں فزع کے وقت اس سے مدد چاہی اور تفزیع فزع کا دور کرنا ہے حتّٰی اذا فُزِّعَ عن قلوبھم (السبا ۳۴۔ ۲۳) اور فزع الاکبر سے مراد آگ میں داخل ہونے کی گھبراہٹ ہے۔

۲۱۹۲ نطوی۔ طوی (مصدر طَیّ) کے معنی ہیں لپیٹنا۔ اور طَیّ کے معنی عمر گزر جانا بھی آتے ہیں جیسے طَوَتکَ خُطُوبُ دَھرِکَ بَعدَ نَشرٍ ہیں اور والسمٰوٰت مطویات بیمینہ (الزمر ۳۹۔ ۶۷) میں پہلے معنی بھی ہو سکتے ہیں اور دوسرے بھی یعنی مراد صرف یہ ہے کہ وہ فنا کر دیئے جائیں گے (غ) اور طوی البلاد کے معنی ہیں شہر سے شہر کو گیا (ل)

سجل۔ سِجِلّ کے لیے دیکھو ۱۴۹۱ اور سجلّ کتاب عہد وغیرہ کو کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک اس سے مراد کاتب ہے اور سِجِلّ صحیفہ کو بھی کہتے ہیں جس میں کتاب ہو (ل) یعنی کچھ لکھا جائے۔

آسمان کو لپیٹنا یا فنا کرنا۔ دونوں سے مراد ایک انقلاب عظیم معلوم ہوتا ہے اور کما بدانا اوّل خلق نعیدہ سے بظاہر مراد قیامت ہے لیکن اس انقلاب عظیم کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے جب کفر کی صف لپیٹ کر اس کی جگہ حق کو قائم کیا جائے جیسا کہ یہ نظارہ ہمارے نبی کریم صلعم کی زندگی میں ملک عرب میں دیکھا گیا اور اس اشارہ کو کھول کر اگلی آیت میں بیان کیا ہے جہاں یہ ذکر ہے کہ زمین کے وارث اس کے صالح بندے ہوں گے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُونَ ﴿١٠٥﴾

اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا، کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے ٢١٩٣

إِنَّ فِي هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِينَ ﴿١٠٦﴾

یقیناً اس میں عبادت کرنے والے لوگوں کے لیے پیغام ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ ﴿١٠٧﴾

اور ہم نے تجھے تمام قوموں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے ٢١٩٤

قُلْ إِنَّمَا يُوحٰى إِلَيَّ أَنَّمَا إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُونَ ﴿١٠٨﴾

کہہ میری طرف یہی وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو کیا تم (اللہ کے) فرماں بردار بنتے ہو۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ وَإِنْ أَدْرِيٓ أَقَرِيبٌ أَمْ بَعِيدٌ مَّا

پھر اگر پھر جائیں تو کہہ دے میں نے تمہیں انصاف کی بات کہہ کر خبردار کر دیا ہے اور میں نہیں جانتا کہ وہ قریب ہے یا دور

٢١٩٣ راستباز زمین کے وارث ہونگے، زبور ۳۷: ۲۹ میں ہے "صادق زمین کے وارث ہوں گے"۔ اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے۔ اور الارض سے مراد ارض مقدس بھی ہو سکتی ہے دیکھو ١٥٦ جہاں دکھایا گیا ہے کہ اس زمین کا وعدہ حضرت ابراہیم کی اولاد سے تھا۔ اور اب اس نسل ابراہیمی کے قائم مقام مسلمان ہیں اور اس کا دو دفعہ ان کے ہاتھ سے عارضی طور پر نکل جانا پیشگوئیوں کے مطابق ہے اور الارض سے مراد عام زمین بھی ہو سکتی ہے اور اس صورت میں اشارہ مسلمانوں کی حکومت اور بادشاہت کی طرف ہوگا جیسا کہ احادیث نبوی میں صاف آتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا اِنَّ رَبِّی زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَاُرِیْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَاِنَّ مُلْكَ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مَا زُوِیَ لِیْ مِنْهَا وَاُعْطِیْتُ الْکَنْزَیْنِ الْاَحْمَرَ وَالْاَبْیَضَ یعنی میرے رب نے زمین کو میرے لیے سکیڑ دیا اور اس کی مشرقی اور مغربی زمینیں مجھے دکھائی گئیں اور میری اُمت کی بادشاہت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک زمین سکیڑ کر مجھے دکھائی گئی اور مجھے دو خزانے دیئے گئے ہیں ایک سُرخ اور ایک سفید۔ یہ حدیث مسلم ابوداؤد ترمذی میں ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے ملک عرب سے باہر اپنی امت کی بادشاہت کی کھلی پیشگوئی کی تھی۔ اور موجودہ غلبہ کفر اس کو غلط نہیں کرتا اس لیے کہ اسی حدیث میں یہ پیشگوئی بھی موجود ہے کہ مجھے دو خزانے دیئے گئے ایک سُرخ اور ایک سفید خزانہ۔ سُرخ خزانہ مشرقی اقوام کا اسلام میں داخل ہونا ہے اور سفید خزانہ مغربی اقوام کا جو سفید رنگ کی ہیں اور اس میں صاف بشارت ہے کہ جس طرح مشرق میں اسلام پھیلا مغرب میں بھی پھیلے گا اور یوں بھی مسلمان زمین کے وارث ہونگے اس لیے اگلی آیت میں توجہ دلائی کہ عابد بن جاؤ تو بادشاہت بھی تمہیں مل جائے گی۔

٢١٩٤ آنحضرت صلعم کو دنیا کی تمام قوموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ یہ ایک عظیم الشان حقیقت ہے اس میں نہ صرف یہ بات بتائی گئی ہے کہ آپ کل دنیا کی طرف مبعوث ہوئے بلکہ یہ بھی کہ آپ رحمت کے رنگ میں مبعوث ہوئے اور دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے نہیں آئے جیسا کہ زبور دشمنوں کی تباہی اور ویرانی کی دعاؤں سے بھری ہوئی ہے بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی نہ صرف آپ نے ہی رحم کا سلوک کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ رحم ہی کیا اور ان کی ہلاکت محض ان کی قوت توڑ دینے تک محدود کی نہ قوم کی تباہی اور بربادی پر۔ چنانچہ یہ تشریح ان الفاظ کی خود حدیث نبوی میں موجود ہے کہ جب آپ سے کہا گیا کہ یارسول اللہ مشرکوں پر بددعا کیجیئے تو آپ نے فرمایا اِنِّیْ لَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا وَّاِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً میں لعنت کرنے کے لیے مبعوث نہیں کیا گیا بلکہ رحمت بنا کر مبعوث کیا گیا ہوں۔ پس آپ کے اعداء سے اللہ تعالیٰ نے بھی رحم کا ہی سلوک کیا ہے اور اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں اس کا ذکر کیا۔ کیونکہ یہاں ذکر تو یہی تھا کہ راستباز زمین کے وارث ہونگے اور یہ وراثت چاہتی تھی کہ دشمن برباد ہوں اور تباہ ہو جائیں تاکہ ان کی جگہ راستباز لیں تو فرمایا کہ ایسا نہیں ہوگا اس لیے کہ ہم نے رسول کو رحمت بنا کر بھیجا ہے پس مسلمانوں کو زمین کی وراثت تو ملے گی مگر نہ پہلی قوموں کو برباد کر کے بلکہ ان پر رحم کے ذریعہ سے چنانچہ اسلام کی تاریخ میں ایسا ہی نظر آتا ہے کہ کسی قوم کو برباد نہیں کیا گیا۔

غیر مسلموں کے لیے رحمت: ان الفاظ میں یہ بھی بتایا ہے کہ رسول اللہ صلعم کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ صرف دوست ہی اس سے فائدہ نہیں اُٹھائیں گے بلکہ دشمن بھی اور یہ صرف مسلموں کے لیے ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی ہے چنانچہ قرآن کریم کی تعلیم سے بہت سی ان قوموں نے فائدہ اٹھایا ہے اور یہ ان کے حق میں رحمت ثابت ہوا جنھوں نے بظاہر اسلام کو قبول نہیں کیا خود یورپ کی قومیں اسی رحمۃ للعالمین سے فائدہ اٹھا رہی ہیں گو اس کی دشمن بھی ہیں وہ اصول سعی پر عمل پیرا ہیں جو انجیل کی نہیں بلکہ قرآن کریم کی تعلیم ہے وہ ہر بات میں ایک نظام رکھتی ہیں یہ بھی اسلام کی تعلیم ہے جس نے نماز اور خیرات تک میں اعلیٰ درجہ کا نظام قائم کیا ہے وہ وقت کی قدر کرتی ہیں جو اسلام کی کھلی تعلیم ہے ان کا رستوں تک کا صاف رکھنا اسلام کی تعلیم اماطة الاذی عن الطریق پر عمل ہے اور آج بیسیوں خوبی کی باتیں جو ان میں ہم دیکھتے ہیں ایک ایک کر کے اسلامی تعلیم کا نتیجہ دکھائی جا سکتی ہیں۔

تُوعَدُونَ ﴿۱۰۹﴾ ہے جس کا تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے ع۲۱۹۵

اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ مِنَ الۡقَوۡلِ وَ يَعۡلَمُ مَا تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾ وہ پکار کر کہی ہوئی بات کو جانتا ہے اور اُسے بھی جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو۔

وَاِنۡ اَدۡرِىۡ لَعَلَّهٗ فِتۡنَةٌ لَّكُمۡ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۱۱۱﴾ اور میں نہیں جانتا شاید وہ تمھارے لیے آزمائش ہے اور ایک وقت تک فائدہ اُٹھانا۔

قٰلَ رَبِّ احۡكُمۡ بِالۡحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا الرَّحۡمٰنُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ ع ۱۹ (رسول نے) کہا، میرے رب حق کے ساتھ فیصلہ فرما۔ اور ہمارا رب رحمٰن ہے جس سے ان باتوں پر مدد مانگی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو ع۲۱۹۶

ع۲۱۹۵ اٰذنت ۔ اٰذنتہ بکذا اور اٰذنتہ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی ایک بات کا علم دیدینا (غ) دیکھو ع۱۲۳ و ع۳۵۶ علٰی سواء کے لیے دیکھو ع۴۵۵ اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ایک خدا کو مان لیں۔ دوسری جگہ ہے تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم (آل عمران ع۔ ۶۴)

ع۲۱۹۶ مصائب اور مشکلات کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف ہی رجوع کرنا چاہیئے اور اسی سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ حق کے ساتھ فیصلہ کرے اور حق کو دنیا میں پھیلائے۔

سُوۡرَةُ الۡحَجِّ مَدَنِيَّةٌ (۲۲) اٰیاتھا ۷۸ رکوعاتھا ۱۰

نام: اس سورت کا نام الحج ہے اور اس میں دس رکوع اور ۷۸ آیتیں ہیں اور اس کا نام الحج اس حکم سے لیا گیا ہے جو حج کے متعلق اس سورت میں دیا گیا ہے حج ارکانِ اسلام میں سے چوتھا رکن ہے اور محبتِ الٰہی میں عاشقانہ رنگ پیدا کر کے اسے اس کی ترقی کے کمال تک پہنچاتا ہے اور محبت الٰہی جب کمال کو پہنچتی ہے تو انسان اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے قربان کر دیتا ہے یہاں تک کہ جان بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیدیتا ہے اور یہی ضرورت اس وقت پیش آئی تھی اس لیے کہ کفار نے مسلمانوں کو تلوار کے ساتھ نیست و نابود کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اسی مناسبت سے اس سورت کا نام الحج رکھا ہے۔

خلاصہ مضمون: اس سورت کی ابتدا زلزلۃ السّاعۃ کے ذکر سے ہوتی ہے جس میں حق کی مخالفت کرنے والی قوم کی تباہی کا بھی ذکر ہے اور پھر بتایا ہے کہ محاسبۂ اعمال ضروری ہے۔ دوسرے رکوع میں بتایا کہ حق کی نصرت یقینی ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس نصرت کو روک نہیں سکتی۔ تیسرے رکوع میں اہلِ حق کے نیک انجام کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ انہیں خانہ کعبہ سے روکا گیا ہے اور مقامِ حرمت میں ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ چوتھے میں خانہ کعبہ کی ابتدا کا ذکر کر کے فرضیت حج کا ذکر کیا ہے پانچویں میں قربانی کی اصل غرض بتائی اس لیے کہ حج میں قربانی کرنی ضروری ہے۔ چھٹے میں مضمون کا انتقال ضرورت جنگ کی طرف کیا جس کے لیے اعلیٰ درجہ کی قربانیوں کی ضرورت تھی اور جس کا موقعہ اب آچکا تھا ساتویں میں اعدائے حق اور ان کے انجام کا ذکر کیا۔ آٹھویں میں بتایا کہ مومن کامیاب ہوں گے نویں میں بتایا کہ توحید ایک مضبوط اصول ہے جس کی دنیا کی سب قوموں کو تعلیم دی گئی اور اب یہ دین توحید کی طرف ہی بلاتا ہے اور آخری رکوع میں شرک کی کمزوری اور بے بنیادی کا ذکر کر کے مسلمانوں کو بشارت دی اور ساتھ ہی سمجھایا کہ کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ پر پورا زور لگاؤ۔

تعلق: پچھلی سورت سے اس کا تعلق یوں ہے کہ اس میں انبیاء کی کامیابی اور ان کے اعدا کی ہلاکت کا عام ذکر تھا یہاں اس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ تمہیں بھی اپنے اعدا سے نجات دی جائے گی۔ مگر اس کے لیے جنگوں کی ضرورت پیش آئے گی۔

زمانہ نزول: بعض لوگوں نے اس سورت کو مدنی قرار دیا ہے اور بعض نے اُسے بکلی مکی قرار دیا ہے اور ابن عباس سے ایک روایت میں ہے کہ سوائے ھٰذان خصمان والی چار آیات کے یعنی آیت ۱۹ سے ۲۲ تک کے یہ سورت مکی ہے اور ان چار کو مدنی کہنا بھی اس وجہ سے ہے کہ وہ خصمان سے مراد جنگ بدر میں بالمقابل دو فریقوں کو لیتے ہیں۔ مگر اس کے لیے کوئی سند نہیں۔ البتہ اس سورت میں جنگ کی اجازت سے اور ہجرت کے ذکر سے یہ یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ کے آخری ایام کی ہے اور ممکن ہے کہ بعض آیات کا نزول بعد ہجرت ہوا ہو۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ ۚ اِنَّ زَلۡزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیۡءٌ عَظِیۡمٌ ①

اے لوگو! اپنے رب کا تقوٰی اختیار کرو، اس گھڑی کا زلزلہ ایک بڑی چیز ہے ع٢١٩٧

یَوۡمَ تَرَوۡنَہَا تَذۡہَلُ کُلُّ مُرۡضِعَۃٍ عَمَّاۤ اَرۡضَعَتۡ وَ تَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمۡلٍ حَمۡلَہَا وَ تَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَ مَا ہُمۡ بِسُکٰرٰی وَ لٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰہِ شَدِیۡدٌ ②

جس دن تم اسے دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی (بدحواس ہوکر) اسے چھوڑ دے گی جسے دودھ پلاتی تھی اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دے گی اور تو لوگوں کو متوالے دیکھے گا، حالانکہ وہ متوالے نہیں ہوں گے۔ لیکن اللہ کا عذاب سخت ہے ع٢١٩٨

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیۡرِ

اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو علم کے بغیر اللہ کے

ع٢١٩٧ زلزلۃ الساعۃ کیا چیز ہے مفسرین نے اختلاف کیا ہے کہ قیامت سے پہلے ہے یا قیامت یعنی مُردوں کے جی اُٹھنے کے بعد، روایات دونوں قسم کی ہیں اور بعض نے اسے قبل قیامت قرار دے کر اشراط الساعۃ میں سے لکھا ہے اور روح المعانی میں ہے کہ قیامت سے پیشتر ایک زلزلۂ عظیم کی خبر بہت سے آثار میں پائی جاتی ہے اور اسے زلزلۃ الساعۃ اس لیے کہا کہ اس کے قرب میں اور اس کے نشانوں میں سے ہوگا۔ اور بعض احادیث کی رو سے اس کا وقوع مُردوں کے جی اُٹھنے کے بعد ہے۔ اور ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے مگر مردوں کے جی اُٹھنے کے بعد حمل والی عورتیں اور دودھ پلانے والی عورتیں کہاں ہونگی دوسری آیات قرآنی پر جن میں زلزلہ کا ذکر ہے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ زلزلہ وہ ہے جس سے زمین تباہ ہو جائے گی مثلاً وحملت الارض والجبال فدکتا دکۃ واحدۃ (الحاقۃ [69] - ١۴) اور اذا رجت الارض رجا (الواقعۃ [56] - ۴) کے بعد وکنتم ازواجا ثلٰثۃ آتا ہے اور وہ تین قسم قیامت میں ہونگے مگر اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ قیام قیامت کے بعد زلزلہ ہوگا بلکہ پہلے زلزلۂ عظیم آکر یہ نظام تباہ ہو جائے گا پھر قیامت قائم ہوکر لوگ تین گروہ ہو جائیں گے اور اذا زلزلت الارض زلزالھا سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ زلزلہ کے ذکر کے بعد آتا ہے یومئذٍ یّصدر النّاس اشتاتا لیروا اعمالھم (الزلزال [99] - ٦) تو گویا اس سب کو ایک یوم قرار دیکر یوں فرمایا کہ پہلے زلزلہ سے اس نسل انسانی کا خاتمہ ہو جائے گا پھر مُردے اُٹھیں گے تاکہ اپنے اعمال کے نتائج دیکھیں پس زلزلۃ الساعۃ قبل قیامت ہی ہے مگر اس طرح پر کہ وہی قیامت کا لانے والا ہے۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ساعتیں تین ہیں دیکھو ع١٠٨ اور لفظ ساعۃ کی تشریح کے لیے ع٩٣١ یعنی صغریٰ، وسطیٰ، کبریٰ۔ صغریٰ جو ہر انسان کی موت سے تعلق رکھتی ہے اس کا ذکر تو یہاں نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں خطاب سب لوگوں کو ہے۔ اور وسطیٰ اور کبریٰ دونوں قیامتوں پر یہ الفاظ صادق آتے ہیں اور ساعت وسطیٰ کی صورت میں لفظ زلزلہ سے مراد زمین کا کانپنا نہیں بلکہ اھوال وشدائد اور جنگیں وغیرہ ہیں دیکھو ع٢٧٣ اور زلزلہ سے یہاں مراد مجازاً اھوال وشدائد کا آنا مفسرین نے بھی قبول کیا ہے والزلزال ھو ما یحصل للنفوس من الرعب والفزع کما قال اللہ تعالیٰ ھنالك ابتلی المؤمنون وزلزلوا زلزالاً شدیدا یعنی زلزلہ سے مراد دلوں میں رعب اور گھبراہٹ کا پیدا ہونا ہے اور یہاں اس ساعت وسطیٰ کی طرف یقیناً اشارہ ہے اس لیے کہ پچھلی سورت کا خاتمہ اس ساعت وسطیٰ یعنی نشان ہلاکت کے ذکر پر ہوا تھا۔ تو اب کھول کر اس کے اھوال سے ڈرایا ہے اور ساعت وسطی، ساعت کبریٰ کے لیے بطور ایک گواہ کے ہے اس لیے اس کے قیام سے تقوی اللہ کی طرف دل مائل بھی ہوتے ہیں اور اس سورت میں آگے چل کر جنگ کی اجازت بھی دی ہے۔ پس یہ تمام قرائن بتاتے ہیں کہ یہاں خصوصیت سے اشارہ ایک قوم کی ساعت وسطیٰ کی طرف ہے۔

ع٢١٩٨ تذھل۔ ذَھل ایک چیز کا چھوڑ دینا ہے خواہ ارادتاً چھوڑی جائے یا کوئی دوسرا شغل اس سے روک دے (ل)، یا ایسی بات جس سے حزن اور نسیان پیدا ہو (غ)

مرضعۃ۔ رَضَع کے لیے دیکھو ع٣٠٢ مُرضِع اور مُرضِعۃ میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ مرضع بلحاظ صفت دودھ پلانے والی ہے اور مُرضِعۃ وہ ہے جو فی الواقع دودھ پلا رہی ہو یعنی جس کی چھاتیاں بچہ اس وقت چوس رہا ہو (ل)

گھبراہٹ کی شدت کی یہ تصویر کھینچی ہے کیونکہ ماں کا دودھ پیتے ہوئے بچہ کو چھوڑنا یا حمل والی کا حمل گر جانا سخت ترین غم سے ہی ہو سکتا ہے اور سکارٰی سے مراد یہاں شراب سے بدمست ہے یعنی بدحواس ایسے ہونگے اور عقل پر اس قدر پردہ پڑا ہوا ہوگا کہ گویا شراب سے بدمست ہیں حالانکہ وہ بدحواسی شراب سے نہ ہوگی بلکہ شدت عذاب سے ہوگی۔

عِلْمٍ وَّ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ﴿۳﴾
كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ
يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۴﴾
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ
الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ
مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ
مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ
لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا
نَشَاۗءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ
طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ
مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ
الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ

بارے میں جھگڑتا ہے اور ہر سرکش شیطان کے پیچھے چلتا ہے۔
اس کی نسبت لکھا جا چکا ہے کہ جو کوئی اسے دوست بناتا ہے وہ اسے گمراہ کر
دیتا ہے اور اسے جلتی ہوئی آگ کے عذاب کی طرف لے جاتا ہے ع۲۱۹۹
اے لوگو! اگر تمھیں جی اُٹھنے میں شک ہے، تو
(غور کرو کہ) ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ
سے، پھر لوتھڑے سے، پھر گوشت کے ٹکڑے سے
جو (کبھی) پورا بن جاتا ہے اور (کبھی) ادھورا رہتا ہے تاکہ تمھارے
لیے کھول کر بیان کردیں ع۲۲۰ اور ہم جو چاہتے ہیں رحموں میں ایک مقررہ
وقت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تمھیں بچہ بنا کر نکالتے ہیں پھر
(تمھیں بڑھاتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے
کوئی ایسا ہے جو وفات پا جاتا ہے اور کوئی تم میں سے وہ ہے جو
نکمّی عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے تاکہ علم حاصل کرنیکے بعد اسے کچھ علم نہ رہے ع۲۲۰۱

ع۲۱۹۹ ہر دو آیات عام ہیں نضر ابن الحرث ہو یا ابوجہل یا اور کوئی ان کا مثیل۔ بلکہ ابوجہل اور اس کے مثیلوں کا ذکر شیطان مرید کے لفظ میں ہے اور اتباع کرنے والے عام لوگ ہیں اور شیطان مرید سے رؤسائے کفار مراد ہونا مفسرین نے بھی مانا ہے (د) اور اتباع کا لفظ انہی کے لیے زیادہ موزون ہے علیہ میں ضمیر اسی شیطان مرید کی طرف ہے کہ اس کی دوستی سے انجام کار قلب کو راحت نہیں ملتی بلکہ جلن ہی پیدا ہوتی ہے۔

ع۲۲۰۰ علقة۔ علق کے اصل معنی کسی چیز کو مضبوط پکڑ لینا یا تعلق پیدا کرلینا ہیں اور عَلَقَة وہ خاص حالت ہے جس سے بچہ بنتا ہے (غ) اور اس کے معنی عموماً خون کا لوتھڑا کیے جاتے ہیں۔

مضغة گوشت کے ٹکڑے کو کہتے ہیں اس اندازہ سے جو چبایا جاسکے اور جنین کی اس حالت کا نام ہے جو علقہ کے بعد ہوتی ہے

مخلّقة۔ خلق کیلئے دیکھو ع۳۳ و ع۴۳۱ اور مُخَلَّقَة سے مراد تامّة الخلق ہے یعنی جس کی پیدائش کمال کو پہنچ گئی اور ایک قول ہے کہ مخلقة وہ ہے جس کی خلق ظاہر ہوگئی اور غیر مخلقة وہ ہے جس کی تصویر نہیں بنی اور قِدْحٌ مخلّق اس تیر کو کہتے ہیں جو برابر اور نرم کیا گیا ہو (ل)

پیدائش جسمانی کے مختلف مراتب: جو لوگ موت کے بعد جی اُٹھنے کو امر مستبعد خیال کرتے ہیں اور اس بنا پر اس میں شک کرتے ہیں کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے ان کو بتایا ہے کہ انسان کی پہلی پیدائش پر غور کریں پہلی اس کی حالت مٹی کی ہوتی ہے گویا ہر انسان کی پیدائش مٹی سے شروع ہوتی ہے اس مٹی سے نطفہ بنتا ہے۔ کیونکہ مٹی سے غذائیں غذاؤں سے خون صالح، خون صالح سے منی بنتی ہے۔ یہ انسان کی دوسری حالت ہے۔ پھر یہ نطفہ رحم مادر سے تعلق پیدا کرتا ہے اور اس کی حالت علقہ کی ہوجاتی ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ علقہ اس حالت کا نام اسی لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں ایک نیا تعلق پیدا ہوتا ہے جو نطفہ رحم مادر سے تعلق پیدا نہیں کرتا وہ بچہ نہیں بنتا۔ پس علقہ ماں کے پیٹ میں بچہ کی ابتدائی حالت ہے۔ پھر یہ نشوونما پاتا ہوا ایک گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے اور مخلقة اور غیر مخلقة سے صحیح مراد وہی ہے جو مجاہد نے کہا ہے یعنی مخلقة وہ ہے جس کی مدّت حمل پوری ہوجاتی ہے اور غیر مخلقة وہ ہے جو ادھورا رہ کر نا تمام گر جاتا ہے (د) اور یہ مراتب اسلیے بیان کیے کہ تا انسان پر واضح ہوجائے کہ اگر ایسے حالات میں سے ایک خوبصورت انسان بن سکتا ہے تو اعمال سے اس کو ایک اور زندگی ملنا کونسا مستبعد امر ہے۔ اور دوسری طرف یہ خلق جسمانی کے مراتب خلق روحانی کے مراتب کے مقابل پر ہیں یعنی اعمال انسانی پہلے اسی طرح پراگندہ سے ہوتے ہیں جس طرح انسان کے اجزا مٹی میں پھر نطفہ کی حالت میں آکر ان اعمال میں ایک غیر محسوس طریق پر زندگی پیدا ہوتی ہے مگر یہ زندگی نطفہ کی طرح قابل نشوونما نہیں ہوتی جب تک کہ ان اعمال کا تعلق اللہ تعالیٰ سے نہ ہو پھر وہ تعلق کبھی ناقص ہوتا ہے کبھی کامل۔

ع۲۲۰۱ طفل۔ بچّہ کو کہتے ہیں جب تک وہ نرم و نازک ہو۔ اطفال جمع ہے (و اذا بلغ الاطفال (النور ۲۴-۵۹)

اس حصّہ میں بتایا کہ بچہ ہونے سے انسان کس طرح ترقی کرکے اپنے جسمانی کمال کو پاتا ہے پھر اپنے روحانی کمال کو حاصل کرتا ہے اور کمال جسمانی کے بعد پھر اس

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ﴿٥﴾

اور تُو زمین کو بے حس پڑی دیکھتا ہے۔ پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلہاتی ہے اور ابھرتی ہے اور ہر قسم کی خوشنما روئیدگی اگاتی ہے ؁۲۲۰۲

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٦﴾

یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور کہ وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے ؁۲۲۰۳

وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ ﴿٧﴾

اور کہ وہ گھڑی آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور یہ کہ اللہ انھیں اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ﴿٨﴾

اور لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو اللہ کے بارے میں جھگڑتا ہے حالانکہ نہ علم رکھتا ہے اور نہ ہدایت اور نہ روشنی دینے والی کتاب۔

ثَانِيَ عِطْفِهِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۖ لَهُ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖ وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٩﴾

اپنی کروٹ موڑ کر تاکہ اللہ کی راہ سے بہکا دے اس کے لیے دنیا میں رُسوائی ہے اور ہم اسے قیامت کے دن جلنے کا عذاب چکھائیں گے ؁۲۲۰۴

ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿١٠﴾ ع ٨

یہ اس کی وجہ سے ہے جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْبُدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ ۖ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ ۖ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ﴿١١﴾

اور لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے سو اگر اسے کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو اس پر مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اُسے تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے منہ پر الٹا پھر جاتا ہے۔ دنیا اور آخرت میں گھاٹے میں رہا۔ یہی کھلا گھاٹا ہے ؁۲۲۰۵

میں زوال بھی آنے لگتا ہے جو اس کے مخلوق ہونے پر دلالت ہے اور یہ تنزل کی حالت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ انسان پھر ایک بچہ کی طرح ہو جاتا ہے اور سب کچھ حاصل کیا ہوا پھر بھول جاتا ہے۔

؁۲۲۰۲ ھامدۃ۔ ھَمَدَتِ النارُ کے معنی ہیں آگ بجھ گئی اور ارض ھامدۃ اس زمین کو کہتے ہیں جس میں سبزی کوئی نہ ہو (غ)

بھیج۔ بَھْجَۃ رنگ کی خوبصورتی اور خوشی کے ظاہر ہونے کو کہا جاتا ہے حدائق ذات بھجۃ (النمل ۲۷-۶۰) (غ)

اس روحانی زندگی کے ذکر کو جو پہلے حصّہ میں بطور اشارہ چلا آیا ہے یہاں مردہ زمین اور پانی کا ذکر کر کے زیادہ واضح کیا ہے۔

؁۲۲۰۳ گویا اللہ تعالیٰ کے ان قوانین سے معلوم ہوا کہ اللہ حق ہے اور جس طرح وہ مردہ زمین کو بارش سے زندہ کرتا ہے اسی طرح مردہ دلوں کو روحانی بارش یعنی وحی الٰہی سے زندہ کرتا ہے یحی الموتیٰ سے یہاں یہی مراد ہے۔ قیامت میں مُردوں کے اُٹھانے کا ذکر اگلی آیت میں الگ ہے۔ یعنی ساعت کا آنا اور جو قبروں میں ہیں ان کا اُٹھا کھڑا کیا جانا۔

؁۲۲۰۴ ثانی عطفہ۔ ثنی کے لیے دیکھو ؁۱۴۴۲ عَطْف کسی چیز کے متعلق کہا جاتا ہے جب اس کی ایک طرف دوسری پر دوہرا دی جائے اور عِطفُ انسان کی جانب اس کے سر سے لیکر ران تک ہے اور ثَنَیٰ عِطْفَہ کے معنی ہیں اعراض کیا الگ ہو گیا جیسے نأ بجانبہ (بنی اسرائیل ۱۷-۸۳) (غ)

؁۲۲۰۵ علی حرف۔ حَرْف کے معنی کنارہ یا طرف بیان ہو چکے ہیں ؁۱۰۰۱ اور کہا جاتا ہے فلان علیٰ حرفٍ من امرہ یعنی اپنے معاملہ میں وہ ایک کنارہ

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَ مَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾

اللہ کو چھوڑ کر اسے پکارتا ہے جو نہ اسے نقصان دے سکتا ہے اور نہ اسے نفع پہنچا سکتا ہے ، یہ پرلے درجے کی گمراہی ہے۔

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَ لَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾

اُسے پکارتا ہے جس کا نقصان اس کے نفع سے قریب تر ہے۔ کیا ہی بُرا دوست اور کیا ہی بُرا رفیق ہے ۲۲۰۶

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾

اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں باغوں میں داخل کرے گا ، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اللہ جو ارادہ کرتا ہے کر گزرتا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾

جسے یہ خیال ہے کہ اللہ اس (رسول) کی دنیا اور آخرت میں مدد نہیں کرے گا ، تو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو کسی ذریعہ سے آسمان پر لے جائے پھر اسے کاٹ دے پھر دیکھے کہ کیا اس کی تدبیر اس چیز کو دور کر دیتی ہے جو اسے غصّہ میں لاتی ہے ۲۲۰۷

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ

اور اسی طرح ہم نے اسے آتارا (کہ) کھلی آتیں (ہیں) اور اللہ جسے

پر کھڑا ہے گویا انتظار کر رہا ہے کہ اگر آرام اور سُکھ ملتا رہے تو خیر اور ذرا تکلیف پہنچی تو فوراً دوسری طرف مائل ہو گیا اور زجاج نے علیٰ حرف کے معنی علیٰ شكٍّ کیے ہیں یعنی شک کی حالت میں رہ کر (ل)

علیٰ وجھہ سے مراد ہے کہ وہ دائیں بائیں التفات کیے بغیر اُلٹا پھر جائیگا اور بعض نے اسے بھاگ جانے سے کنایہ سمجھا ہے (ر)

یہ ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو دین کو دین کی خاطر قبول نہیں کرتے بلکہ دنیوی فوائد کے لیے قبول کرتے ہیں اس لیے جب تک کچھ فائدہ پہنچتا رہا خوش رہے لیکن دین کی خاطر بڑی بڑی تکلیفیں بھی اٹھانی پڑتی ہیں۔ بخاری میں ہے کہ ایک شخص مدینہ میں آتا پھر اس کی عورت لڑکا جنتی اور اس کی گھوڑیاں بچے جنتیں تو کہتا یہ اچھا دین ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو کہتا یہ بڑا بُرا دین ہے ایسے لوگ اعراب میں سے تھے جنہیں دین کی خاطر کوئی دکھ اُٹھانا نہیں پڑا ورنہ ابتدائی مسلمانوں کا بیشتر حصّہ وہ تھا جنھوں نے دین کی خاطر سر بھی دیدیئے اور یہاں یہ سمجھایا ہے کہ حق کو حق کی خاطر قبول کرنا چاہیئے نہ اس لیے کہ اس سے کوئی دنیوی فائدہ پہنچتا یا نقصان دور ہوتا ہے۔

۲۲۰۶ پہلی آیت میں ذکر ہے کہ وہ اسے بلاتا ہے جو نہ اسے نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان اور دوسری میں ہے کہ اسے بلاتا ہے جس کا نقصان اس کے نفع سے قریب تر ہے اور ان دونوں باتوں میں تناقض سمجھا گیا ہے حالانکہ تناقض فی الحقیقت کوئی نہیں، معبود باطل فی الحقیقت نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان یعنی نہ وہ کسی کا کچھ بنا سکتا ہے نہ کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ مگر اس کی عبادت عبادت کرنے والے کو یقیناً نقصان پہنچاتی ہے اور عبادت کرنے والا اس میں نفع سمجھتا ہے تو یہ نقصان اس کے فرضی نفع سے قریب تر ہے یعنی نفع کی امید تو اسے آئندہ کے لیے ہے اور نقصان اس کے اخلاق کو جب وہ اپنے آپ کو ایک مخلوق کے سامنے گراتا ہے فوراً پہنچ جاتا ہے۔

۲۲۰۷ یقطع۔ قَطْع کے معنی کسی چیز کا علیحدہ کر دینا ہیں خواہ وہ مادی چیز ہو جو آنکھ سے دیکھی جا سکے اور خواہ بصیرت سے معلوم کی جاتی ہو (غ) اور یہاں حَبْل یعنی رسہ کا قطع کرنا بھی مراد لیا گیا اور اجل یعنی زندگی کا قطع کرنا بھی (غ)

حق کی نصرت کو کوئی نہیں روک سکتا: من ینصرہ میں ضمیرہ کی رسول اللہ صلعم کے لیے ہے اور یہ ابن عباس اور مفسرین سے مروی ہے (ر) اور خود قرینہ بھی یہی چاہتا ہے اس لیے کہ ذکر رسول اللہ صلعم سے جھگڑنے والوں کا ہے فلیمدد بسبب الی السماء ثم لیقطع کے ایک معنی (سبب کے معنی رسّہ اور سماء کے معنی سقف بیت یعنی گھر کی چھت لیکر اور لیقطع کے معنی یختنق یعنی گلا گھونٹ لے کر) یہ کیے گئے ہیں کہ چھت سے رسّہ لٹکا کر پھانسی لیلے یعنی نصرت تو بہر حال آئے گی مگر چونکہ سبب کے معنی کوئی ذریعہ ہیں جس سے کسی چیز تک پہنچا جائے ۲۰۴۷ اس لیے یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ نصرت الٰہی تو رسول کے لیے آئے گی جو شخص اسے روکنا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ کسی ذریعہ سے آسمان پر پہنچ کر یعنی اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کر کے اس نصرت کو قطع کر دے مگر کسی کی کوشش کچھ نہیں کر سکتی۔ اور رسول کے لیے نصرت کا آنا یقینی ہے۔ کسی کے غیظ و غضب سے یہ سلسلہ قطع نہیں ہو سکتا۔

يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ⑯

چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ⑰

جو ایمان لائے اور وہ جو یہودی ہیں اور صابی اور نصاریٰ اور مجوس اور جو مشرک ہیں، اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ اللہ ہر چیز پر گواہ ہے ۲۲۰۸

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۩ ⑱ السجدة

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ کی ہی فرمانبرداری کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جاندار اور بہت سے لوگ (بھی)، اور بہت (ایسے ہیں کہ) عذاب ان پر لازم ہو گیا۔ اور جسے اللہ ذلیل کرے تو کوئی اسے عزت دینے والا نہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ۲۲۰۹

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ⑲

یہ دو جھگڑنے والے ہیں جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا، سو جو کافر ہیں اُن کے لیے آگ کے کپڑے قطع کیے گئے ہیں ان کے سروں کے اوپر کھولتا ہُوا پانی ڈالا جائے گا ۲۲۱۰

۲۲۰۸ مجوس۔ وہ لوگ جو خالقِ نور اور خالقِ ظلمت الگ الگ مانتے ہیں اور آتش پرست ہیں حدیث میں یُمَجِّسانہ آیا ہے یعنی اسے مجوسیوں کے دین کی تعلیم دیتے ہیں (ل)
اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اختلاف عقاید اس دنیا میں رہے گا اور اس کا فیصلہ قیامت میں ہی ہوگا یہ نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان ادیان کو بکلی مٹا دے

۲۲۰۹ سجدہ کے لیے دیکھو ۵۲ بعض مخلوق صرف سجدہ تسخیری کرتی ہے اور بعض یعنی انسان دوسری مخلوق کے ساتھ سجدہ تسخیری میں شامل ہے اور سجدہ اختیاری اس کا امتیاز ہے اس لیے پہلے من فی الارض میں انسان بھی شامل ہے اور سجدہ تسخیری میں اس کا بھی ذکر ہے اور اس کے بعد جو سورج چاند درختوں وغیرہ کا ذکر کیا تو یہ صرف یہ بتانے کے لیے ہے کہ یہ چیزیں جن کی بعض لوگ عبادت کرتے ہیں یہ خود اللہ تعالیٰ کے قانون میں جکڑی ہوئی اور اس کے احکام کے پابند ہیں جتنی چیزوں کا یہاں نام لیا ہے ان سب کی عبادت کی گئی ہے یہاں تک کہ درختوں اور چارپایوں کی بھی لوگوں نے عبادت کی ہے۔ اور کثیر من الناس میں سجدہ اختیاری کا ذکر ہے مگر اس سے بھی لازماً مراد صرف زمین پر ماتھے کا رکھنا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری ہے اور ان لوگوں کا ذکر جو احکام الٰہی کی فرمانبرداری نہیں کرتے کثیر حق علیہ العذاب میں کیا۔ یعنی انہوں نے سجدہ اختیاری سے انکار کر کے اپنے آپ کو سزا کا مستوجب بنا لیا۔ اور آخر پھر بھی اللہ تعالیٰ کے قانون سے باہر نہ نکل سکے۔ ہاں من دون اللہ کی فرمانبرداری اور عبادت انسان کو ذلیل کرنے والی شے ہے اور اللہ کی فرمانبرداری اسے عزت دینے والی ہے۔

۲۲۱۰ یصب۔ صَبّ پانی کا اوپر سے گرانا ہے۔ انا صببنا الماء صبًّا (عبس ۸۰ - ۲۵) فصب علیهم ربك سوط عذاب (الفجر ۸۹-۱۳) (غ)
هٰذان خصمان کے متعلق قیس کی روایت ابوذر سے بخاری میں ہے کہ بدر کے دن حضرت علی اور آپ کے دو ساتھیوں اور عتبہ اور اس کے دو ساتھیوں کے حق میں یہ نازل ہوئی مگر یہ سورت مکی ہے اور صحیح یہی ہے کہ دو جھگڑنے والوں سے مراد مومنوں اور کافروں کے فریق ہیں (ر) جن میں سے ایک فریق حق کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے اور دوسرا فریق اللہ تعالیٰ کی توحید اور نیکی کو دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کی وضاحت آیت ۲۵ میں کر دی ہے اور آگ کے کپڑے قطع کرنا

یُصْهَرُ بِهٖ مَا فِیْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ ۝۲۰
اس سے جو کچھ اُن کے پیٹوں میں ہے اور کھالیں گل جائیں گی ۲۲۱۱

وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ ۝۲۱
اور ان کے لیے لوہے کے گرز ہوں گے ۲۲۱۲

كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ
غَمٍّ اُعِیْدُوْا فِیْهَا ۗ وَ ذُوْقُوْا
ع عَذَابَ الْحَرِیْقِ ۝۲۲
جب کبھی ارادہ کریں گے کہ اس سے غم کے مارے نکل جائیں ، اس میں لوٹائے جائیں گے اور (کہا جائے گا) جلنے کا عذاب چکھو ۲۲۱۳

اِنَّ اللّٰهَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ
اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ؕ وَ لِبَاسُهُمْ
فِیْهَا حَرِیْرٌ ۝۲۳
اللہ اُن لوگوں کو جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں ، باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں - ان میں انھیں سونے کے کڑے اور موتی پہنائے جائیں گے اور اُن کا لباس اُن میں ریشم ہوگا -

وَ هُدُوْٓا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚۖ وَ
هُدُوْٓا اِلٰی صِرَاطِ الْحَمِیْدِ ۝۲۴
اور اُن کو پاک بات کی طرف ہدایت کی گئی اور انھیں اس راہ کی ہدایت کی گئی ہے جس کی تعریف کی جاتی ہے ۲۲۱۴

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ
اللّٰهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰهُ
لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۟ اِۨلْعَاكِفُ فِیْهِ وَ الْبَادِ ؕ
وَ مَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ
جو لوگ کفر کرتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور مسجد حرام سے جسے ہم نے سب لوگوں کے لیے یکساں بنایا ہے (خواہ) اس میں رہنے والا (ہو) اور (خواہ) باہر سے آنیوالا ، اور جو کوئی اس میں ظلم کے ساتھ ناانصافی کا ارادہ کرے ہم اسے

بطور مجاز ہے کیونکہ کپڑے تو انسان کی پردہ پوشی اور زینت کے لیے ہوتے ہیں ان کی پردہ پوشی اور زینت کا کام آگ دیگی - ایسا ہی سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی ڈالنا اس وجہ سے ہے کہ وہ سر کو اللہ تعالیٰ کے آگے نیچا نہ کرتے تھے -

ع۲۲۱۱ یصهر - صَهْر - چربی کا پگھلانا ہے - اور صِهْر بیٹی اور بہن کے خاوند کو کہتے ہیں اور عورت کے اہل بیت اصہار کہلاتے ہیں فجعله نسبا وصهرا (الفرقان ۲۵ - ۵۴) (غ)
عذاب کی غرض : وہ آلائشیں جو ان کے اندر جمع ہوگئی ہیں وہ بھی نکال دی جائیں گی اور جلود یعنی باہر کا حصّہ بھی صاف کردیا جائے گا -

ع۲۲۱۲ مقامع - مَقْمَع کی جمع ہے جس سے مار کر مطیع کیا جاتا ہے مایُضْرَبُ به ویُذَلَّلُ اور قَمَعْتُهٗ فانقمع کے معنی ہیں میں نے اسے روکا سو وہ رُک گیا (غ) اور قَمْع کے اصل معنی ہی مغلوب اور مطیع کرنا ہیں اور مقمع گُرز یا کوڑے کو کہا جاتا ہے (ل)
معلوم ہوا اس کی اصل غرض بھی ان کی سرکشی کے مادہ کو دور کرنا اور ان میں اطاعت اور فرمانبرداری کی روح پیدا کرنا ہے -

ع۲۲۱۳ عذاب کی نوعیت : من غم کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں یا یہ منہا سے بدل ہے یعنی اس غم سے باہر نکل جانا جو ان کے لاحق حال ہے گویا بتایا ہے کہ اصل عذاب ان کا وہ غم ہے جو اُن کے دلوں کو کھا رہا ہے اور وہی آگ بن کر ان کے جسموں پر محیط ہو جائے گا اور یا من غم علت خروج ہے یعنی اس غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں گے جو انہیں ہوگا - اور بعض نے غم سے مراد یہاں ڈھانک دینے والا عذاب لیا ہے ؛

ع۲۲۱۴ اس ہدایت سے مراد اس دنیا کی زندگی میں ہدایت ہے اور طیب من القول اقرار توحید ہے یا سب اچھی باتوں کا اقرار اور صراط الحمید میں اضافت بیانیہ ہے یعنی ایسا رستہ جو محمود ہے اور مراد اس سے ہر قسم کے اچھے فعل ہیں کیونکہ رستہ پر چلنا بذریعہ افعال کے ہے اور بتایا ہے کہ جنت انسان کی پاک باتوں اور اچھے فعلوں سے ہی پیدا ہوتی ہے اور صراط الحمید میں بعض نے الحمید سے مراد اللہ تعالیٰ کا اسم لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صراط سے مراد اس کا بتایا ہوا رستہ یعنی اسلام ہوگا -

ع۳ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۵﴾
وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ
اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ
لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْقَآئِمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾
وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا
وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ
فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿۲۷﴾

دردناک عذاب کا مزا چکھائیں گے ۲۲۱۵
اور جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے خانہ (کعبہ) کی جگہ مقرر کر دی
کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کر اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں
اور قیام کرنے والوں اور رکوع (اور) سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کر ۲۲۱۶ اور
لوگوں میں حج کے لیے پکار دے، وہ تیری طرف آئیں گے (کچھ)
پیدل اور (کچھ) ہر طرح کی دُبلی (سواریوں) پر، جو ہر دُور کے
رستے سے آتی ہوں گی ۲۲۱۷

ع ۲۲۱۵ اس آیت میں یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو شرارت کی راہ سے لوگوں کو حق کے قبول کرنے سے روکتے تھے اور مسجد حرام سے بھی روکتے تھے اور یہ کفار مکہ تھے جن کی اذیت مسلمانوں کے حق میں اس وقت کمال کو پہنچ چکی تھی جس کی وجہ سے مسلمان مکہ کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔

مکانات مکہ کی بیع اور کرایہ: مسجد حرام کی حرمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مکہ کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنیوالے سب اس میں برابر ہیں تو اس سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا کہ اس میں مکانوں کا کرایہ حاجیوں سے لینا جائز نہیں اور بعض نے اسی بنا پر وہاں کے مکانات کی بیع کو بھی جائز نہیں رکھا مگر امام شافعی کے نزدیک یہ جائز ہے اور درست بھی یہی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ یہاں ذکر یہ ہے کہ کفار مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں اس کے مقابل پر عاکف اور باد کا برابر ہونا اسی لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ اس میں عبادت کرنے سے کسی کو نہ روکا جائے اور مکانات کا بیع ہونا روایات سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے دار السجن کو خرید اس میں شک نہیں کہ دوسری طرف بھی بعض روایات ہیں مثلاً ایک شخص نے اپنے گھر کو دروازہ لگایا تو حضرت عمر نے ناپسند فرمایا اور کہا کہ تم حاجیوں کو گھر میں جگہ دینے سے روکتے ہو تو اس نے کہا کہ میں نے ان کے اسباب کی حفاظت کے لیے دروازہ لگایا ہے مگر اس سے صرف اسی قدر اخذ ہو سکتا ہے کہ جس کے پاس جگہ ہو اس کا فرض ہے کہ حاجیوں کو آرام دے البتہ حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جو شخص مکہ کے گھروں کا کرایہ کھاتا ہے وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتا ہے۔ لیکن جس مکان کی بیع جائز ہے اس کے کرایہ کا ناجائز ہونا خلاف اصول ہے۔

من یرد فیہ بالحاد بظلم سے کیا مراد ہے۔ الحاد کے لیے دیکھو ع۱۴۸۶ اور اَلْحَدَ فلان کے معنی ہیں مال عن الحق (غ) حق سے مائل ہو گیا یعنی حق بات کو ترک کر دیا اور خانہ کعبہ کے متعلق الحاد یہ ہے کہ جو اس کی غرض ہے اسے پورا نہ ہونے دیا جائے یعنی اللہ تعالیٰ نے تو اسے اپنی عبادت کا گھر اور لوگوں کا مرجع بنایا تو جو شخص اللہ کے نام لینے والوں کو اس سے روکتا ہے وہ اس میں الحاد چاہتا ہے اور بظلم ساتھ بڑھایا ان مظالم کی طرف اشارہ کرنے کے لیے جو مسلمانوں پر ہو رہے تھے اور یہ جو الحاد میں شرک اور احتکار غلہ وغیرہ کو داخل کیا ہے تو یہ چیزیں من وجہٍ الحاد میں داخل ہو سکتی ہیں مگر اصل غرض یہ نہیں۔

ع ۲۲۱۶ بوّأ کے لیے دیکھو ع۵۰۸ و ع۹۱ چونکہ باء بمعنی رجع بھی آتا ہے اس لیے بوّانا کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں ہم نے اس کے لیے مرجع بنایا اور ہم نے اس کو جگہ دی اور زجاج نے معنی کیے ہیں ہم نے اسے خانہ کعبہ کی جگہ بتا دی۔

تطہیر خانہ کعبہ: اور طھر بیتی سے مراد ہے شرک سے پاک کر اور یہ مجاہد سے مروی ہے (ج) اور شرک کے ذکر کے بعد طھر کا لانا بتاتا ہے کہ اسی سے پاک کرنا مراد ہے اور پھر طواف قیام رکوع سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کرنا بھی یہی ہو سکتا ہے یہی مضمون البقرۃ ۲-۱۲۵ میں بھی آچکا ہے۔ دیکھو ع۱۵۹۔

حضرت ابراہیم کے خانہ کعبہ سے تعلق پر بحث ع۱۵۷ میں گزر چکی ہے اور ع۱۶۲ میں بتایا گیا ہے کہ خانہ کعبہ کو کب کب اور کس کس نے بنایا۔ خانہ کعبہ کا موجودہ طول وعرض وغیرہ حسب ذیل ہے بلندی ۲۷ ہاتھ، طول ۲۵ ہاتھ، عرض ۲۰ ہاتھ۔

ع ۲۲۱۷ ضامر۔ ضُمر اور ضُمُر ھزال یعنی دُبلاپن کو کہتے ہیں اور اَضمر کے معنی ہیں ایک چیز کو مخفی کیا دل) اور اسی سے ضمیر ہے اس لیے کہ اس پر اطلاع پانا کچھ مشکل ہوتا ہے یعنی وہ چیز صاف طور پر بیان نہیں ہوتی اور ضامر تھوڑے گوشت والے گھوڑے وغیرہ کو کہا جاتا ہے جس کی گوشت کی کمی اس کے زیادہ کام کرنے کا نتیجہ ہو نہ ھزال سے (غ) اور ضامر کے لفظ میں اشارہ ہے کہ لوگ بڑی بڑی مشقتیں اُٹھا کر خانہ کعبہ کی زیارت کو آئیں گے۔

عمیق۔ عُمق اس بعد کو کہتے ہیں جو نیچے ہونے کے لحاظ سے ہو اور یہاں عمیق مطلق بعید کے معنی میں ہے (غ)

اَذِّن میں خطاب عموماً حضرت ابراہیم سے مانا گیا ہے گویا ارکان حج حضرت ابراہیم کے قائم کردہ ہیں اور خانہ کعبہ کا حج ان کے ذریعہ ہی مقرر ہوا اور اذّن میں اسی قسم کا اعلان ہے جیسا اذان من اللہ ورسولہ میں اور یہ خیالات کہ حضرت ابراہیم کی آواز دنیا میں پہنچانے کے لیے پہاڑ نیچے کیے گئے اور بستیاں بلند کی گئیں یا اصلاب اور ارحام میں آواز پہنچائی گئی محض خیالات ہی ہیں جس طرح انبیاء کی تبلیغ دنیا میں پہنچتی ہے اسی طرح حضرت ابراہیم

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۸﴾

تاکہ اپنے فائدہ کی جگہوں پر حاضر ہوں — اور مقرر دنوں میں اللہ کے نام کا ذکر اس پر کریں، جو اس نے انھیں چارپائے جانور دیئے ہیں۔ سو اُن سے کھاؤ اور تکلیف والے محتاج کو کھلاؤ ۲۲۱۸

ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾

پھر چاہیے کہ اپنی میل کچیل اتاریں اور اپنی منتوں کو پورا کریں اور قدیم گھر کا طواف کریں ۲۲۱۹

کی آواز بھی پہنچی۔ اور بعض کے نزدیک یہ خطاب آنحضرت صلعم سے ہے جس کا حکم آپ کو حجۃ الوداع میں دیا گیا لیکن یہ سورت مکّی ہے اور حجۃ الوداع میں اس آیت کا نزول صحیح نہیں بلکہ خطاب آنحضرت صلعم سے ہے اور اس میں حج کی فرضیت کا ذکر ہے۔

۲۲۱۸ بائس وہ ہے جسے بُؤس پہنچا ہو دیکھو ۲۱۵ اور بؤس اس شدت کو کہتے ہیں جو فقر کی وجہ سے ہو (غ)

حج کے منافع: منافع سے مراد دنیوی اور اُخروی دونوں قسم کے فوائد لیے گئے ہیں مگر اصل غرض منافع اُخروی ہیں اور منافع کی تنکیر اُن کی عظمت اور کثرت کے لیے ہے اور اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا سب سے بڑا نفع ہے مگر لفظ کا جمع لانا خود بتاتا ہے کہ اس میں مختلف قسم کے فوائد شامل ہیں اور حج میں روحانی فوائد بہت کثرت سے ہیں انہی میں سے ایک مساوات کا وہ منظر ہے جو سوائے حج کے اور دنیا میں کہیں نظر نہیں آتا۔ ایسا ہی سب مسلمانوں کا مل کر دعا کرنا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت کا دل پر اثر مسلمانانِ عالم میں اتحاد۔ اسلام اور مسلمانوں کی بہتری کی تجاویز کو عمل میں لانا وغیرہ۔

اعمال حج کی اصل غرض: ایام معلومات سے مراد عموماً ایام نحر لیے گئے ہیں یعنی عید کا دن اور دو دن اس کے بعد کیونکہ یہاں قربانیوں کا خاص طور پر ذکر ہے اور فی الحقیقت ایام حج بھی اس میں شامل ہیں۔ اس لیے کہ قربانی حج کی آخری منزل ہے اور امام ابوحنیفہ نے ذوالحج کے دس دن ہی مراد لیے ہیں۔ پس مراد صرف جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا نہیں بلکہ عبادت مراد ہے یہاں تک کہ قربانی کا دن آ جائے اور ان الفاظ میں یہ ذکر اس لیے کیا کہ تا قربانی کی اصل غرض کی طرف توجہ دلائی جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ اعمال حج کل کے کل صرف اللہ کے ذکر کے لیے ہیں اور اس بات کو کہ قربانی کی غرض ذکر اللہ کس طرح پر ہے اور کھول کر آیت ۳۷ میں بیان کیا ہے اور آخر پر ہدایت فرمائی کہ قربانیوں کے گوشت سے خود بھی کھاؤ جس میں دوستوں عزیزوں کو کھلانا بھی آ جاتا ہے اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانیوں کا گوشت ضائع نہیں ہونا چاہیئے اور اس میں سے ایک حصہ محتاجوں کو بھی کھلانا چاہیئے۔

۲۲۱۹ تفث۔ اصل میں ناخن کی میل کو کہا جاتا ہے اور ایسی چیز کو جسے بدن سے دور کرنا چاہیئے اور قضاء کے معنی چونکہ قطع کرنا آتے ہیں اس لیے یہاں مراد اس کا ازالہ ہے (غ)

عتیق۔ متقدم کو کہتے ہیں یعنی جو دوسروں سے آگے بڑھا ہوا ہو خواہ زمانہ کے لحاظ سے ہو یا مکان کے یا رتبہ کے اس لیے قدیم کو بھی عتیق کہا جاتا ہے اور کریم کو بھی اور جو غلامی سے آزاد ہوا سے بھی اور خانہ کعبہ کو عتیق اس لیے کہا کہ وہ اس سے ہمیشہ آزاد رہا ہے کہ جبابرہ اس کو ذلت پہنچا سکیں (غ) اور عِتق خلاف رِقّ ہے اس کے معنی حریت ہیں اور عتیق حضرت ابوبکر صدیق کا نام ہے کیونکہ آنحضرت صلعم نے فرمایا اَنْتَ عَتِیْقُ اللّٰہِ مِنَ النَّارِ یعنی آگ سے آزاد کیا گیا۔ اور حدیث ابن زبیر میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام اس لیے بیت عتیق رکھا ہے کہ اسے ظالم حملہ آوروں سے آزاد کیا اور کبھی کوئی ظالم حملہ آور اس پر غالب نہیں آیا اور بیت عتیق اس کے قدیم ہونے کے لحاظ سے بھی اس کا نام ہے کیونکہ وہ اوّل بیت وضع للناس ہے (ل)، پس عتیق کے معنی قدیم بھی ہیں اور آزاد یا اعلیٰ درجہ کا بھی۔ اور روح المعانی میں ہے تُبّع نے اس کا قصد کیا تو اسے فالج ہو گیا اور ابرہ نے قصد کیا تو اسکا قصّہ اصحاب فیل کے واقعہ کے نام سے مشہور ہے اور حجاج کا منشا کعبہ کی اہانت نہ تھا بلکہ ابن زبیر کا اخراج اور قرامطہ کا حجرِ اسود لے جانا شاید اسی قبیل سے تھا۔

ظاہری صفائی کی تاکید: یہاں مطلب تو صرف اس قدر تھا کہ قربانی سے فارغ ہو کر بال وغیرہ کٹوالیں یا حالت احرام سے نکل جائیں مگر اس کو ادا ان الفاظ میں کیا ہے کہ اپنی میل کچیل کو دور کریں اور میل کے لیے بھی ناخن کی میل کا لفظ استعمال کیا ہے جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ ایّام حج میں بعض افعال کا نہ کرنا جیسے بال یا ناخن کتروانا وغیرہ ایک خاص مقصد کے لیے ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں کرتا کہ ایک مسلمان کا ناخن بھی ایسا ہو کہ اس میں میل ہو اس میں اعلیٰ درجہ کی جسمانی صفائی کی تعلیم دی ہے اور نبی کریم صلعم کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جسم کی ظاہری صفائی کے تمام مراتب کو بدرجہ غایت ملحوظ رکھتے تھے۔

طواف افاضہ طواف صدر: نذروں کے پورا کرنے سے مراد اعمال حج کا پورا کرنا بھی ہو سکتا ہے اور ابن عباس نے اس کی تخصیص قربانیوں سے کی ہے اور ایسے نیک عمل بھی مراد ہو سکتے ہیں جو اپنے اوپر واجب کر لیے ہوں اور یہاں طواف کے خاص حکم سے مراد طواف افاضہ ہے جو قربانی کے دن ہوتا ہے اور بعض نے طواف

ذٰلِكَ ۗ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿۳۰﴾

یہ (یوں ہو) اور جو شخص اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے رب کے نزدیک اس کے لیے بہتر ہے اور تمھارے لیے چارپائے حلال ہیں سوائے اس کے جو تم پر پڑھا جاتا ہے پس بتوں کی ناپاکی سے بچو اور جھوٹ بات سے بچو ۲۲۲۰

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾

ایک اللہ کے ہو کر اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے ہوئے اور جو کوئی اللہ کے ساتھ (اور کو) شریک بنائے تو گویا وہ بلندی سے گر پڑا، پھر اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا اسے اڑا کر دور کے مکان میں پھینک دے گی ۲۲۲۱

ذٰلِكَ ۗ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾

یہ (اسی طرح ہے) اور جو کوئی اللہ کے نشانوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقوے سے ہے ۲۲۲۲

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾ ع ۸/۱۱

تمھارے لیے ان میں ایک مقررہ وقت تک فائدے ہیں، پھر اُن کی آخری منزل قدیم گھر کی طرف ہے ۲۲۲۳

الصدر بھی مراد لیا ہے یعنی روانگی کے وقت کا طواف ؞

۲۲۲۰ ذالك ۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے اسمائے اشارہ دو کلاموں کے درمیان فصل کے لیے رکھے جاتے ہیں اور مراد ہے الامر ذٰلك (ر)

حرمات ۔ حُرمۃ کی جمع ہے وہ چیزیں جن کا احترام واجب ہے اور وہ تمام مناسک حج ہیں اور ابن زید کہتے ہیں پانچ چیزیں ہیں مشعر حرام ۔ مسجد حرام ۔ بیت حرام ۔ شہر حرام ۔ اور مُحرِم ؞

اوثان ۔ وَثَن جو اپنی جگہ پر ٹھہرا ہوا ہو اور حرکت نہ کرے اور وُثن صنم یعنی بت کو کہتے ہیں یا چھوٹے بُت کو اور ابن اثیر نے وَثن اور صنم میں یہ فرق کیا ہے کہ وثن وہ ہے جس کے لیے جثہ ہو خواہ وہ زمین کے جواہر سے بنایا گیا ہو یا لکڑی اور پتھر سے مثلاً آدمی کی صورت پر جو بنایا جائے اور قائم کیا جائے اور اس کی عبادت کی جائے اور صَنَم صورت بلا جثہ ہے اور بعض نے دونوں میں کچھ فرق نہیں کیا (ل)

جب ظاہری میل کچیل کا ذکر کیا تو وہ اندرونی ناپاکیوں کا بھی ذکر کیا یعنی ایک بتوں کی ناپاکی اور دوسرے جھوٹ کی ناپاکی اس لیے کہ خانہ کعبہ توحید کا نشان ہے اور صدق توحید کی طرح تمام نیکیوں کی جڑ ہے گویا بتایا کہ حج کرتے ہو تو ہر قسم کی اندرونی ناپاکیوں سے بھی بچو ۔ اور انعام کا ذکر چونکہ حج میں آنا تھا اس لیے ان کا بھی یہاں ذکر کیا ہے اور اس لیے بھی کہ چارپایوں کے ساتھ بہت سی مشرکانہ رسوم کو وابستہ کیا گیا تھا ؞

۲۲۲۱ سحیق ۔ سَحق ۔ کسی چیز کا باریک پیسنا ہے اور سُحق کے معنی بُعد یعنی دوری ہیں فسحقا لاصحب السعیر (الملک ۶۷ - ۱۱) اور سحیق کے معنی بعید ہیں (ل)

شرک میں ذلّت : اس میں شرک کا انجام بتایا گویا توحید سے انسان کا مقام بلند ہوتا ہے اور شرک کر کے وہ اپنے آپ کو نیچے گراتا ہے اور مشرک فی الواقع اپنے آپ کو اس قدر ذلیل کرتا ہے کہ اس سے بڑھ کر انسان کی ذلّت نہیں ہو سکتی ۔ اور خرمن السماء اس لیے فرمایا کہ فطرتاً تو انسان کو بلند مقام پر کھڑا کیا گیا ہے پس شرک کو اختیار کرنا اس مقام بلند سے گرنا ہے اور پرندوں کے اُچک لیجانے کی تشبیہ خواہشات سفلی کے افکار کو پریشان کرنے سے ہے کیونکہ ایسے شخص کو اطمینان قلب حاصل نہیں ہوتا اور ہوا کے دُور پھینک دینے سے مراد ضلالت میں اس قدر دور نکل جانا ہے کہ جس کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے کچھ نہیں ؞

۲۲۲۲ افعال حج کا مقصد : گو ہر عبادت کے ظاہری ارکان ہیں جیسے حج کے مگر ان تمام افعال کا مقصد بھی دل کی حالت کا بدلنا ہے اور دل میں تقویٰ پیدا کرنا، اس لیے فرمایا کہ شعائر اللہ کی تعظیم سے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کی عزّت پیدا کرو ۔ شعائر اللہ کے لیے دیکھو ۱۸۷ اس سے مراد تمام وہ امور ہیں جن میں انسان شرعاً مکلف کیا گیا ہے یعنی سب حدود و فرائض اور خصوصیت سے مراد اعمال حج بھی ہو سکتے ہیں اور قربانیاں بھی ۔

۲۲۲۳ مَحِلّ مصدر میمی ہے اور مَحِلُّ الدَّین کے معنی ہیں قرضہ کی اجل یعنی اس کا مقرر وقت (ل) اور یا وقت نحر مراد ہے (ر) اور فیہا میں قربانیوں کی طرف ہی اشارہ ہے جیسا کہ اگلے رکوع کے مضمون سے ظاہر ہے اور بعض نے کل اعمال حج مراد لیکر محلہا کے معنی لوگوں کا حالت احرام سے نکلنا لیا ہے اور کل حدود و فرائض کو مراد لیکر یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ تمام احکام دینی کی آخری منزل حج ہے کیونکہ حج میں اللہ تعالیٰ سے عاشقانہ تعلق کا اظہار ہوتا ہے اور دیگر عبادات میں

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا
اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ
الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ
اَسْلِمُوْا ؕ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾
الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ
وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي
الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾
وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ
لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ
عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا
فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ؕ

اور ہر قوم کے لیے ہم نے قربانی مقرر کی ہے تاکہ اللہ کا نام
اس پر یاد کریں جو اس نے انھیں چارپائے جانوروں سے دیئے
ہیں۔ پس تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے سو اسی کے فرماں بردار
ہو جاؤ اور عاجزی اختیار کرنے والوں کو خوشخبری دے ۲۲۲۴
وہ کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل خوف محسوس کرتے
ہیں اور اس پر صبر کرنے والے جو انھیں (تکلیف) پہنچتی ہے اور نماز کے
قائم کرنے والے اور وہ اس سے جو ہم نے انھیں دیا ہے خرچ کرتے ہیں ۲۲۲۵
اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے اللہ کے نشانوں سے
ٹھیرایا ہے تمھارے لیے ان میں بھلائی ہے تو اللہ کا نام اُن پر یاد کرو جب (وہ)
قطار باندھے ہوئے (ہوں) پھر جب وہ پہلو کے بل پر گر پڑیں، تو اُن
سے کھاؤ اور سوال کرنے والے اور سوال نہ کرنے والے کو کھلاؤ۔ اسی

محض عبودیت کا رنگ ہے اور بیت عتیق کا لفظ شاید اسی طرف اشارہ کرنے کے لیے اختیار کیا کہ تمام تعلقات سے آزاد ہو کر انسان صرف اللہ تعالیٰ کا ہو جائے اور چونکہ حج ہی اس رکوع کا مضمون ہے اور شعائر اللہ کے لفظ کو قربانیوں پر محدود کرنے کے لیے کوئی وجہ نہیں اس لیے یہ آخری معنی ہی اصل منشائے قرآنی معلوم ہوتا ہے اور اگر کیا بھی جائے تو بھی قربانیوں کے کرنے میں انسان کے اپنے حصۂ حیوانیت کو قربان کرنے کی طرف اشارہ ہے دیکھو اگلا نوٹ۔

۲۲۲۴ منسك۔ دیکھو ۱۶۳ اصل اس کی یہی ہے کہ کل عبادات اور طاعات پر بولا جاتا ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہاں اس کے معنی نحر یعنی قربانی ہیں۔ مگر آیت ۶۷ میں جہاں یہی الفاظ ہیں لکل امة جعلنا منسکا ھم ناسکوہ۔ سب عبادات اور طاعات ہی مراد ہیں اور یہاں بھی لفظ عام ہی ہے۔ اور لیذکروا میں نتیجہ ان عبادات کا بتایا ہے۔

قربانی کا اصل مقصود: اس رکوع میں قربانی کا مضمون بیان کیا ہے اور اس کی ابتداء یوں کی ہے کہ ہر قوم کے لیے ہم نے عبادات مقرر کیں۔ اور ان عبادات کی اصل غرض یہ ہے کہ وہ اللہ کا نام چارپایوں پر یاد کریں بالفاظ دیگر قربانی کریں ایک جانور کی قربانی عبادت کی غرض کیونکر ہو سکتی ہے وہ خود اگلے الفاظ میں بتا دیا کہ ایک خدا کی ہی فرمانبرداری کرو۔ گویا اصل غرض یہ ہے کہ کل خواہشات حیوانی وسفلی کو اس معبود حقیقی کی فرمانبرداری کے سامنے قربان کر دیا جائے۔ پس قربانی فی الحقیقت انہی خواہشاتِ حیوانی کو قربان کرنے کا نام ہے اور اسی معنی میں یہ عبادت کی غرض ہے اور بہیمۃ الانعام کی قربانی بھی اسی حقیقی قربانی کا ظاہری نشان ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان دو مختلف قسم کی خواہشات سے بنا ہوا ہے۔ ایک اس کی حیوانی خواہشات ہیں جو اس سفلی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک ملکی خواہشات ہیں جو ان خواہشاتِ حیوانی سے الگ اور ان سے بالاتر ہیں۔ مثلاً اپنا آرام چاہنا یہ ایک ایسی خواہش ہے جو حیوانی زندگی سے تعلق رکھتی ہے انسان کا جسم آرام کا محتاج ہے اور اپنی حقیقی ترقی کے لیے یا دوسروں کی بھلائی کے لیے اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا یہ ایک ملکی خواہش ہے ایسا ہی ہر چیز کو اپنے قبضہ میں لانا یہ ایک حیوانی خواہش ہے اور دوسروں کے حقوق کی عزت کرنا یہ ایک ملکی خواہش ہے انسان کو جس قدر عبادات سکھائی گئی ہیں ان کی اصل غرض یہی ہے کہ حیوانی خواہشات کو ملکی خواہشات کے ماتحت کر دیا جائے بالفاظ دیگر ان کے سامنے قربان کر دیا جائے یعنی انسان میں جو حصّہ حیوانیت کا ہے اسے ملکی حصّہ کے سامنے قربان کر دیا جائے یہی اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری ہے اور یہی وہ سبق ہے جو چارپایوں کی قربانی ہمیں سکھاتی ہے گویا حیوان کے ذبح کرنے میں مقصود یہ ہے کہ حصّہ حیوانیت کو قربان کر دیا جائے اور اس کے لیے یہ ظاہری نشان ہے۔ اسی اصول کو قرآن کریم نے یہاں کھول کر بیان کیا ہے اور جس طرح حیوانات میں ایک اجل مسمی تک فوائد ہیں اسی طرح انسان کی حیوانی زندگی میں بھی ایک اجل مسمیٰ تک فوائد ہیں جس کی طرف پچھلی آیت میں اشارہ بھی ہے اگلی آیات میں اور خود یہاں لفظ مخبت میں اسی مضمون کی مزید تشریح ہے۔

۲۲۲۵ اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کی ہی مزید وضاحت ہے دل میں خوف الٰہی کا احساس ہونا، مصائب پر صبر کرنا، نماز کے ذریعے اپنے نفس کی اصلاح کرنا اپنے مال اور اپنے قویٰ کو جو اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں مخلوق خدا کی بھلائی میں لگا دینا یہی چیزیں ہیں جو انسان میں قربانی کی وہ روح پیدا کرتی ہیں جس سے اس کی خواہشات سفلی بکلی حالت اعتدال پر آجاتی ہیں۔

كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾
لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا
وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ
سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا
هَدٰىكُمْ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾
اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ
ع اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾
اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ

طرح ہم نے انھیں تمھارے کام میں لگا دیا ہے تاکہ تم شکر کرو۔ ۲۲۲۶
نہ اُن کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں اور نہ ان کے خون،
لیکن اسے تمھاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے ۔ اسی طرح
اس نے انھیں تمھارے کام میں لگا دیا تاکہ تم اس پر اللہ کی بڑائی
کرو جو اس نے تمھیں ہدایت دی اور احسان کرنیوالوں کو خوشخبری دو۔ ۲۲۲۷
اللہ مومنوں سے دشمنوں کو ہٹاتا رہتا ہے ۔ اللہ کسی دغاباز،
ناشکرگذار کو پسند نہیں کرتا ۲۲۲۸
ان لوگوں کو اجازت دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اس لیے کہ

ع۲۲۲۶ بدن ۔ بَدَن جسم کو کہتے ہیں اور یہ نام جثہ کی بڑائی کے لحاظ سے ہے جس طرح جَسَد اس کے رنگ کے لحاظ سے ہے فالیوم ننجیك ببدنك (یونس ۱۰ ۔ ۹۲) اور بَدَنَ کے معنی موٹا ہوگیا اور بَدَنَۃٌ (جس کی جمع بُدْن ہے) قربانی کو اس کی موٹائی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے (غ) اور اونٹ اور گائے کی قربانی پر ہی یہ لفظ بولا جاتا ہے یا صرف اونٹ پر (ر)

صواف ۔ صافّۃ کی جمع ہے یعنی صف میں کھڑے ہوئے اور بعض نے اس کے معنی صافن کیے ہیں یعنی ایسی حالت میں کھڑے ہوئے کہ اُن کی ٹانگ بندھی ہوئی ہو۔

وجبت ۔ وُجوب کے معنی ثبوت یا ٹھہر جانا ہیں اور وجبت الشمس کے معنی ہیں غربت یعنی سورج غروب ہوگیا اسی معنی میں یہاں ہے یعنی گرجانے سے اس کا پہلو زمین سے لگ جائے ۔

قانع ۔ قَنَاعَۃ تھوڑی ان چیزوں پر راضی ہوجانا ہے جن کا انسان محتاج ہو اور یہ قَنِعَ یَقْنَعُ سے ہے اور قَنَعَ (مصدر قُنُوع) کے معنی ہیں سوال کیا اور بعض کے نزدیک قانع وہ سوالی ہے جو الحاح نہیں کرتا اور جو مل جائے اس پر راضی ہوجاتا ہے اور بعض کے نزدیک قانع قِناع سے ہے جس کے ساتھ سر ڈھانکا جاتا ہے گویا وہ ایسا محتاج ہے جو اپنی محتاجی کے اخفا کے لیے سر ڈھانک لیتا ہے (غ)

معتر وہ ہے جو سوال کے لیے آگے آنے والا ہو اور عَرّ اور عُرّ خارش کو کہتے ہیں جو بدن میں عارض ہوجاتی ہے اور اسی سے تشبیہ کے لحاظ سے مَعَرَّۃ نصرت کو کہا جاتا ہے فتصیبکم منہم معرۃ بغیر علم (الفتح ۴۸ ۔ ۲۵) (غ) بعض کے نزدیک قانع اور معتر میں فرق یہ ہے کہ قانع سوال کرنے والا ہے اور معتر وہ جو تمہارے پاس اپنی حاجت کے لیے آتا ہے خواہ سوال کرے یا نہ کرے (ل) اور بعض کے نزدیک قانع وہ ہے جو اس پر راضی ہو جو اس کے پاس ہے اور معتر وہ جو سوال کے لیے آگے آتا ہے (ر) اور ابن جبیر کا قول ہے کہ قانع اہل مکہ ہیں اور معتر سب لوگ (ر)

اس آیت میں اونٹوں کی قربانیوں کو من شعائر اللہ کہہ کر صاف بتا دیا کہ وہ بطور نشان کے ہیں اور اصل مقصد ان کی قربانی میں کچھ اور ہے جو اگلی آیت میں اور بھی صراحت سے مذکور ہے اور اونٹ کو ذبح کرنے کا طریق بھی اس میں بتا دیا۔

ع۲۲۲۷ ینال ۔ یَنَل وہ چیز ہے جو انسان اپنے ہاتھ سے لیتا ہے لن تنالوا البر (آل عمران ۳ ۔ ۹۲) ولا ینالون من عدو نیلا (التوبۃ ۹ ۔ ۱۲۰) (غ) اور اللہ کا ہاتھ اس کی قدرت اور طاقت ہے۔

غرض قربانی تقوٰی کا پیدا کرنا ہے : یہاں صفائی سے بیان کردیا کہ قربانی کی غرض اس کا گوشت نہیں جو کھایا جاتا ہے نہ اس کا خون ہے جو گرایا جاتا ہے نہ تو خون کے گرانے کا نام قربانی ہے اور نہ گوشت غربا کو کھلانے کا نام بلکہ قربانی حقیقت میں وہ تقوٰی ہے جو انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے اور لحوم اور دماء کا ذکر اس لیے کیا کہ خون چھڑکنے اور گوشت پھیلانے کی رسم اہل جاہلیت میں بھی پائی جاتی تھی ۔ اور اور اقوام میں بھی پائی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کا تعلق قلوب سے ہے نہ اجسام سے۔

ع۲۲۲۸ قربانی اور جنگ : یدافع دیکھو ع۳۲۲ اس آیت میں صاف جنگ کا مضمون شروع کردیا ہے جو اگلے رکوع کا مضمون ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اصل مضمون کی طرف رجوع کیا ہے ان الذین کفروا ویصدون عن سبیل اللہ والمسجد الحرام جس کے آخر پر ہے ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم (۲۵) گویا وہ عذاب الیم آنحضرت صلعم کے دشمنوں پر جنگوں کے رنگ میں آنے والا تھا اور قربانی اور جنگ میں یوں تعلق بھی بتا دیا گویا اگر تم میں قربانی کی روح پیدا ہوگئی ہو تو پھر تم اس قابل بھی ہو کہ حق کی خاطر جنگ کرو اور یہاں گو اللہ تعالیٰ نے مدافعت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے مگر مطلب یہ نہیں کہ تم خاموش ہو کر بیٹھے رہو بلکہ بتایا یہ ہے کہ اب تمہیں جنگ کے لیے تیار ہو جانا چاہیئے ۔ اللہ تعالیٰ کس طرح دشمن کو دور کرتا ہے یہ بھی خود ہی آگے بتا دیا ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض (۴۰)

وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُۨ ﴿۳۹﴾

ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے ع۲۲۲۹

الَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ بِغَیۡرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ وَ لَوۡ لَا دَفۡعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعۡضَہُمۡ بِبَعۡضٍ لَّہُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذۡکَرُ فِیۡہَا اسۡمُ اللّٰہِ کَثِیۡرًا ؕ وَ لَیَنۡصُرَنَّ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۴۰﴾

اور وہ اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے، صرف اس بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے نہ ہٹاتا رہتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھریاں اور گرجے اور عبادتگاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے گرادی جاتیں۔ اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرتا ہے یقیناً اللہ طاقتور غالب ہے ع۲۲۳۰

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ ﴿۴۱﴾

وہ جنہیں اگر ہم زمین میں طاقت دیں تو وہ نماز کو قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھی باتوں کا حکم کریں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔ اور سب کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہی ہے ع۲۲۳۱

ع۲۲۲۹ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ یہ پہلی آیت ہے جو قتال کے بارہ میں نازل ہوئی (ث) بعض روایات میں ہے کہ جب نبی کریم صلعم کو کفار نے مکہ سے نکال دیا تو آپ نے فرمایا کہ اب یہ ہلاک ہوجائیں گے تب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ضرور لڑائی ہوگی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ہجرت کے بعد یہ آیت نازل ہوئی یا ہجرت میں یا اس سے کچھ پہلے کیونکہ گو نبی کریم صلعم دیر سے نکلے مگر صحابہ سب پہلے ہجرت کرچکے تھے۔ اور یہ جو فرمایا کہ انّ اللہ علیٰ نصرھم لقدیر تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سوائے جنگ کے دوسری طرح پر بھی مدد کرسکتا تھا بلکہ یہ مطلب ہے کہ باوجود اس قدر قلیل تعداد میں ہونے کے انہیں جنگ کی اجازت دیجاتی ہے تو یہ ہلاک نہیں ہونگے اس لیے کہ ان کا مددگار اللہ ہے۔

ع۲۲۳۰ ھدّمت۔ ھَدْم عمارت کا گرانا ہے اور تَھْدِیم میں کثرت پائی جاتی ہے (غ)

صوامع۔ صَوْمَعَۃ کی جمع ہے اور وہ ایسی کوٹھری ہے جو اوپر سے تنگ ہو کیونکہ اَصْمَع اس شخص کو کہتے ہیں جس کے کان چھوٹے ہونے کی وجہ سے سر سے ملے ہوئے ہوں (غ) اور صَوْمَعَۃ راہب کی کوٹھری کو کہتے ہیں (ل)

بیع۔ بِیْعَہ کی جمع ہے جو نصاریٰ کے عبادتگاہ پر بولا جاتا ہے اور بعض نے اسے یہود کی عبادتگاہ کہا ہے (ل)

صلوات۔ صلوٰۃ کی جمع ہے مسجد پر بھی بولا گیا ہے اور یہود کی عبادتگاہ کو بھی کہتے ہیں دیکھو ع۶۶۳ اور اس کے اصل معنی عام عبادتگاہ ہی ہیں خواہ کسی مذہب کی ہو۔ کیونکہ جب نصاریٰ کے راہبوں کی کوٹھڑیوں تک کا اور ان کے گرجاؤں کا ذکر کردیا اور یہی آنحضرتؐ سے پہلے آخری مذہب تھا تو اب علیحدہ علیحدہ مذاہب کا نام لینے کی بجائے ایسا لفظ بول دیا جو ہر عبادت گاہ پر صادق آتا ہے۔

اسلامی جنگوں کی غرض: یہاں نہایت صفائی سے اسلامی جنگ کی غرض صرف مساجد کو بچانا نہیں بلکہ ہر قوم کی عبادتگاہوں کو بچانا بتائی ہے یہاں تک کہ عبادتگاہوں کو چھوڑ کر عبادت کرنے والوں کی کوٹھڑیوں کو بھی حفاظت میں شامل کیا اور صحابہ کی جنگوں میں بھی اس بات کو مدنظر رکھا جاتا تھا کہ کسی راہب کی کوٹھڑی کو اور کسی عبادتگاہ کو نقصان نہ پہنچے بلکہ بعض معاہدات کی رو سے گرجا گھروں کی حفاظت اور مرمت کا انتظام بھی بیت المال کے ذمے تھا۔ پس اسلام کی جنگ مذہبی آزادی کے لیے تھی نہ صرف مسلمانوں کی آزادی کے لیے۔ یہ اسلام کا کمال ہے کہ نہ صرف سب مذاہب کی اصلیت کو خدا کی طرف سے مانا اور تمام انبیاء پر ایمان لانا اصول ایمان میں داخل کردیا بلکہ دوسرے مذاہب کی عبادتگاہوں کی حفاظت کو مسلمانوں کے فرائض میں داخل کردیا اور پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ کس قدر پُر زور الفاظ میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ چند متفرق مسلمان جو نزول آیت کے وقت اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگ گئے تھے اور جن کی جمعیت کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا ان کی تائید میں خدا کا ہاتھ ہوگا اور وہ غالب آئیں گے اور اس قابل ہونگے۔

ع۲۲۳۱ مکہ کے آخری ایام کی یہ سورت ہے مسلمان کچھ حبش میں ہیں کچھ مدینہ میں آنحضرت صلعم کو خود مکہ چھوڑنا پڑا ہے۔ کافر اپنی کامیابی پر خوش ہیں۔ اور ادھر حکومت اور بادشاہت کی خبر ہی نہیں دی جاتی بلکہ اتنی وسیع حکومت کی خبر دی جاتی ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی مسلمانوں کے ماتحت

وَ اِنۡ يُّكَذِّبُوۡكَ فَقَدۡ كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ
قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوۡدُ ﴿۴۲﴾

اگر تجھے جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے نوحؑ کی قوم اور عاد
اور ثمود نے جھٹلایا۔

وَ قَوۡمُ اِبۡرٰهِيۡمَ وَ قَوۡمُ لُوۡطٍ ﴿۴۳﴾

اور ابراہیمؑ کی قوم اور لوطؑ کی قوم نے۔

وَّ اَصۡحٰبُ مَدۡيَنَ ۚ وَ كُذِّبَ مُوۡسٰى
فَاَمۡلَيۡتُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ثُمَّ اَخَذۡتُهُمۡ ۚ
فَكَيۡفَ كَانَ نَكِيۡرِ ﴿۴۴﴾

اور مدین کے رہنے والوں نے اور موسیٰؑ (بھی) جھٹلایا گیا
سو میں نے کافروں کو مہلت دی پھر انھیں پکڑا۔ پس میرا
انکار (ان پر) کیسا ہوا ۲۲۳۲

فَكَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَا وَ هِىَ
ظَالِمَةٌ فَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوۡشِهَا
وَ بِئۡرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصۡرٍ مَّشِيۡدٍ ﴿۴۵﴾

سو کتنی بستیاں ہیں جنھیں ہم نے ہلاک کر دیا اور وہ ظالم
تھیں۔ سو وہ خالی ہیں اپنی چھتوں پر اور کتنے بیکار
کنوئیں اور پکے محل (ویران ہیں) ۲۲۳۳

اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَتَكُوۡنَ
لَهُمۡ قُلُوۡبٌ يَّعۡقِلُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ
يَّسۡمَعُوۡنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَى الۡاَبۡصَارُ
وَلٰـكِنۡ تَعۡمَى الۡقُلُوۡبُ الَّتِىۡ فِى الصُّدُوۡرِ ﴿۴۶﴾

تو کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں۔ پس ان کے دل ہوتے
جن سے وہ سمجھتے، یا کان ہوتے جن سے وہ سنتے۔
کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ دل اندھے ہو جاتے
ہیں جو سینوں میں ہیں ۲۲۳۴

وَ يَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالۡعَذَابِ وَلَنۡ يُّخۡلِفَ
اللّٰهُ وَعۡدَهٗ ؕ وَاِنَّ يَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّكَ
كَاَلۡفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴿۴۷﴾

اور تجھ سے عذاب جلد مانگتے ہیں اور اللہ اپنے وعدہ
کا خلاف ہرگز نہیں کرے گا اور ایک دن تمھارے رب کے
نزدیک ایک ہزار سال کے برابر ہے جو تم گنتے ہو ۲۲۳۵

آجائیں گے اور پھر ساتھ ہی یہ پیشگوئی بھی کی جاتی ہے کہ حاکم اور بادشاہ ہو کر یہ لوگ کیا نمونہ دکھائیں گے۔ یہ تمام باتیں اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتیں جس طرح یہ بات بھی اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتی کہ کسی قوم نے سوائے مسلمانوں کے حکومت پا کر نیکی کا دنیا میں پھیلانا اپنی زندگی کی اصل غرض سمجھا ہو یا فی الواقع فتوحات کے نشہ میں اور انتظام ملکی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پروا کی ہو۔

۲۲۳۲ نکیر۔ نکیر اور انکار کے ایک ہی معنی ہیں یعنی ضد عرفان ہے دیکھو ۱۴۸۱ اور نَكِرۡتُ علی فلانٍ اور اَنۡكَرۡتُ کے معنی ہیں اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جو اسے روک دے (رغ) اور نکیر اس انکار کا نام ہے جس کے معنی تغیر ہیں یعنی خوشی کی حالت سے ایسی حالت کی طرف تبدیل کر دینا جو تمہیں ناپسند ہو (ل) اور مُنۡكَر وہ فعل ہے جسے عقل صحیح قبیح ٹھہرائے یا اگر عقل صحیح اس کے قبح یا حُسن کا حکم نہ لگا سکے تو شریعت اس کے قبح کا حکم لگائے اور تنکیر کے معنی ہیں ایسا کر دینا کہ پہچانا نہ جا سکے نکروالها عرشها (النمل ۲۷-۴۱) (رغ)

یہاں جن اقوام کی تکذیب کا ذکر ہے وہ تاریخی ترتیب سے ہے اور بتایا ہے کہ جب انہوں نے حق کو قبول نہ کیا اور دنیوی زندگی پر ہی گر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس آرام کی حالت کو دکھ کی حالت میں تبدیل کر دیا۔

۲۲۳۳ بئر معطلۃ۔ بِئۡر کے معنی کنواں ہیں اور مُعَطَّلَة عَطَل سے ہے جس کے معنی ہیں زینت اور شغل کا جاتے رہنا اور تعطیل زینت اور عمل سے فارغ کر دینا ہے (رغ) بئر اور قصر۔ قریۃ پر عطف ہیں۔

۲۲۳۴ یعنی زمین میں چلنے پھرنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ غور کرتے کہ کس طرح پہلی قومیں ہلاک ہوئیں اور آخر میں بتا دیا کہ آنکھوں سے تو انسان بہتر اچھ دیکھتا ہے مگر غور نہ کرنے سے ہی نقصان اٹھاتا ہے یعنی جب اس کی ہلاکت آتی ہے تو اس کی وجہ آنکھوں کا اندھا ہونا نہیں ہوتی بلکہ دل اندھا ہو جاتا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صم بکم عمی ہیں یا من کان فی ھذہ اعمٰی وغیرہ میں آنکھوں کا اندھا پن مراد نہیں بلکہ دل کا اندھا پن مراد ہے۔

۲۲۳۵ اللہ کے نزدیک ایک دن کے ہزار سال کے برابر ہونے کا ذکر صرف اس لیے نہیں کیا کہ جسے تم بہت وقت سمجھتے ہو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تھوڑا

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿٤٨﴾

اور کتنی بستیاں ہیں جنھیں میں نے مہلت دی اور وہ ظالم تھیں پھر میں نے انھیں پکڑا اور میری طرف ہی انجام کار آنا ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٤٩﴾

کہہ اے لوگو میں صرف تمھارے لیے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٥٠﴾

پس جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں ان کے لیے بخشش اور عزت کی روزی ہے۔

وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿٥١﴾

اور جو ہماری آیتوں کو ہرانے کی کوشش کرتے ہیں، وہی دوزخ والے ہیں[٢٢٣٦]

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٥٢﴾

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا اور نہ نبی مگر جب اس نے آرزو کی شیطان نے اس کی آرزو کے بارے میں وسوسہ اندازی کی۔ پس اللہ اسے مٹا دیتا ہے جو شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیتوں کو مضبوط کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے[٢٢٣٧]

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿٥٣﴾

تاکہ وہ اسے جو شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے ان لوگوں کے لیے آزمایش کا موجب بنائے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں اور بلاشبہ ظالم پرلے درجے کی مخالفت میں ہیں۔

وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٥٤﴾

اور تاکہ وہ جنھیں علم دیا گیا ہے جان لیں کہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے پس وہ اس پر ایمان لائیں پس ان کے دل اس کے لیے نرم ہو جائیں اور یقیناً اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرنے والا ہے۔

سا ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بعض قوموں کو ایک ایک ہزار سال تک کی مہلت بھی دیدیتا ہے اور دوسری جگہ صاف طور پر اسلام کی ترقی کے ایک ہزار سال تک رُکا رہنے کا ذکر ہے ثم يعرج اليه في يوم كان مقدارهٗ الف سنة مما تعدون (السجدة ٣٢-٥)

٢٢٣٦ معاجزین۔ عَجْز کے لیے دیکھو ١٠١٨ اور اَعْجَزْتُ عَجَّزْتُ عَاجَزْتُ سب کے ایک ہی معنی ہیں اسے عاجز کیا۔ مگر معاجزین کے معنی یہاں لیے گئے ہیں ظانّین و مُقَدِّرین انہم يعجزوننا یعنی یہ خیال کرتے ہوئے اور سمجھتے ہوئے کہ ہمیں عاجز کر دیں گے (رغ)

٢٢٣٧ تمنی۔ تَمَنّی کے معنی کسی چیز کا نفس میں اندازہ کرنا اور اس کی صورت بنانا ہیں ع١٠٢ اور یہ کبھی محض تخمینہ اور اندازہ سے ہوتا ہے اور کبھی اس کی بنا اصلیت پر ہوتی ہے (رغ)

قصہ غرانیق اور اس کی بے بنیادی: اس آیت کی تفسیر میں بہت سے مفسرین نے ایک جھوٹا قصہ لکھ دیا ہے جس کی کوئی صحیح سند نہیں ابن کثیر کہتے ہیں قد ذكر كثير من المفسرين ههنا قصة الغرانيق ..... ولكنها من طرق كلها مرسلة ولم ارها مسندة من وجه صحيح یعنی بہت سے مفسرین نے یہاں غرانیق کا قصہ لکھ دیا ہے ...... لیکن یہ سب روایات مرسل ہیں اور میں نے کسی وجہ صحیح سے اس کی سند کو رسول اللہ صلعم تک نہیں پایا اور غرانیق کا قصہ یہ ہے کہ آنحضرت

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً

اور جو کافر ہیں وہ اس کے بارے میں شک میں ہی رہیں گے یہاں تک کہ وہ گھڑی ان پر اچانک آجائے یا ان پر تباہ کرنے

صلعم سورۂ نجم پڑھتے وقت جب یہاں پہنچے افرایتم اللات والعزی ومناۃ الثالثۃ الاخری تو بجائے ءلکم الذکر ولہ الانثی تلك اذا قسمۃ ضیزی کے جو الفاظ قرآنی ہیں یوں پڑھ دیا تلك الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجی یعنی یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی اُمید رکھی جاتی ہے نعوذ باللہ من ذلك۔
اس قصہ پر بحث تو سورۂ نجم میں ہی ہوگی یہاں اس قدر ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس قصہ کو سورۂ حج کی اس آیت سے ملانا واقعات تاریخی کی پوری لاعلمی کا ثبوت دینا ہے سورۂ نجم ابتدائی زمانہ کی سورت ہے۔ اور ہجرت حبش کے ابتدائی ایام کی ہے یعنی پانچویں سال بعثت کی۔ اور سورۂ حج اس قدر پچھلے زمانہ کی ہے کہ بہت سے لوگوں نے اسے مدنی قرار دیا ہے اور اصل یہ ہے کہ یہ مکّہ کے آخری آیام کی ہے جس پر کافی اندرونی شہادت موجود ہے اب ان دونوں سورتوں میں آٹھ سال کا فرق بنتا ہے کہ یا تو وہ تلك الغرانیق العلی آٹھ سال تک پڑھا جاتا رہا جس کی غلط روایات خود ہی تردید کرتی ہیں اور پھر کفار کی ایذا رسانی اور شعب میں محصور کرنا وغیرہ سب فرضی قصّے ہونے چاہئیں اور یا اس آیت کا کوئی تعلق سورۂ نجم کی اُس آیت سے نہیں اور یہی لازماً ماننا پڑے گا؛

نبی کی وحی میں شیطان القا نہیں کرتا: اگر سیاق وسباق پر غور کیا جائے تو خود معلوم ہو جائے گا کہ جو معنی اس آیت کے عام طور پر سمجھے گئے ہیں وہ ہرگز مراد نہیں ان آیات سے پہلے بھی مخالفت حق کرنے والوں اور ان کی سزا کا ذکر ہے وکاین من قریۃ املیت لھا وھی ظالمۃ ثم اخذ تھا (۴۸) اور پیچھے بھی یہی ذکر ہے حتی تاتیھم الساعۃ بغتۃ او یاتیھم عذاب یوم عقیم (۵۵) اور اس مسلسل مضمون کے درمیان ایک بالکل غیر متعلق واقعہ کا آجانا جس کا اس مضمون سے ادنیٰ تعلق بھی نہیں دکھایا جا سکتا کسی صورت میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا یہاں ذکر نبی کی مخالفت کا ہے اور یہی ذکر پہلے اور پیچھے ہے؛

خود الفاظ آیت کو لو تو بھی صاف یہی نتیجہ نکلتا ہے اصل غلطی صرف لفظ تمنی کے استعمال سے لگتی ہے۔ جو اس میں شک نہیں کہ اکثر جھوٹی آرزوؤں کے لیے بولا گیا ہے مگر جیسا کہ امام راغبؒ نے صفائی سے لکھا ہے اس کا استعمال ایسی خواہش اور ایسے اندازہ پر بھی ہوتا ہے جس کی بنا اصلیت پر ہو پس نیک آرزو اور نیک خواہش بھی امنیہ ہے اور یہاں وہی مراد ہے اور غلط آرزو ہرگز مراد نہیں اور الفاظ فی امنیتہ خود اس قصہ کی غلطی کو ظاہر کرتے ہیں اس لیے کہ قصہ تو یہ ہے کہ شیطان نے وحی میں دخل دیکر وحی کو بدل دیا۔ اور الفاظ قرآنی میں یہ نہیں کہ القی الشیطن فی وحیہ بلکہ فی امنیتہ ہے اور اس کے معنی صرف اسی قدر ہیں کہ نبی کی نیک آرزو کے بارہ میں شیطان لوگوں کے دلوں میں وساوس ڈالتا رہتا ہے نہ یہ کہ وہ نبی کی وحی میں کچھ ڈالتا رہتا ہے پھر الفاظ کے حصر کو دیکھو کوئی نبی اور رسول ایسا نہیں بھیجا کہ اس کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہوا ہو۔ تو کیا حضرت عیسٰیؑ کی وحی میں بھی شیطان نے القا کر دیا تھا؟ غالباً اس سوال کا جواب رسول کریم سے بڑھ کر حضرت عیسٰیؑ سے محبت رکھنے والے مسلمان کبھی اثبات میں نہ دینگے۔ پھر سب کو چھوڑ دو ایک بھی نبی کا ذکر قرآن شریف میں نہیں جس کی وحی میں القائے شیطان کا ذکر آیا ہو حالانکہ دوسرے معاملات میں جہاں ایسا حصر کیا ہے اس کی مثالیں بھی دی ہیں مثلاً جب یہ فرمایا کہ سب نبیوں سے استہزا ہوا سب نبیوں کی تکذیب ہوئی تو ایک ایک نبی کا ذکر کر کے اس کی تکذیب کا ذکر بھی کر دیا۔ پھر کیا یہ جائے تعجب نہیں کہ حصر تو یہ کیا جائے کہ کوئی نبی اور رسول ایسا ہوا ہی نہیں جس کی وحی میں شیطان نے القاء نہ کیا ہو اور ایک نبی کی مثال پیش نہ کی جائے کہ اس کی وحی میں شیطان نے یوں القاء کر دیا تھا پھر نتیجہ اس کا بتایا ولیعلم الذین اوتوا العلم انہ الحق تو کیا صاحب علم لوگوں کو اس کے حق ہونے کا علم نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ شیطان وحی میں القا نہ کرے یہ کیسی بدیہی البطلان بات ہے؛

شیطان کا القاء شیاطین کی طرف ہی ہوتا ہے: آیت کے معنی صاف ہیں اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا والذین سعوا فی ایٰتنا معاجزین یعنی ہماری آیتوں کے ابطال کی کوشش کرتے ہیں یہ خیال کرتے ہوئے کہ خدا کو عاجز کر دینگے تو اب فرمایا کہ یہ مخالفت کچھ تمہارے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ سب انبیاء و رسل کے ساتھ ایسا ہی ہوا یعنی جب کسی نے خدا کے نام کو دنیا میں پھیلانا چاہا اور نیکی کے پھیلانے کی آرزو کی تو شیطان نے لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی شروع کی کہ اسکی مخالفت کرو یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ وحی نبی میں شیطان کا القاء ایک ایسا امر ہے جس کی تردید قرآن شریف کا لفظ لفظ کر رہا ہے اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے فانہ یسلك من بین یدیہ ومن خلفہ رصدًا لیعلم ان قد ابلغوا رسالٰت ربھم (الجن۔ ۲۷و۲۸) یعنی وحی کے آگے پیچھے اللہ تعالیٰ پہرہ لگا دیتا ہے تاکہ جان لے کہ ان کے رب کا صحیح صحیح پیغام پہنچا دیا گیا ہے اور ہمارے مفسرین قصّہ گھڑتے ہیں کہ خدائی پہرہ پر شیطان غالب آجاتا ہے پھر وہ فرماتا ہے کہ شیطان کا میرے بندوں پر کچھ تسلط نہیں اور اس لغو قصّہ سے یہ اصول تسلیم کیا جاتا ہے کہ انبیاء پر بھی شیطان کا تسلط ہو جاتا ہے۔ یہاں تو ذکر نہیں کہ شیطان کس کی طرف القاء کرتا ہے مگر قرآن کریم نے دوسری جگہ خود بتا دیا کہ شیطانوں کا القا شیطانوں یا ان کے متبعین کی طرف ہی ہوتا ہے ان الشیاطین لیوحون الی اولیاءھم لیجادلوکم (انعام ۔ ۱۲۱) اور درحقیقت اس آیت کی تفسیر اس دوسری آیت سے ہوتی ہے وکذٰلك جعلنا لکل نبی عدوا شیٰطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا (الانعام۔ ۱۱۲) ہر نبی کے لیے ہم نے شیطان انسان اور جنّ دشمن بنائے ہیں جو ایک دوسرے کے دل میں باتیں دھوکا دینے کے لیے ڈالتے رہتے ہیں۔ پس یہی مراد یہاں ہے نبی کی آرزو کو باطل کرنے کے لیے شیطان اپنے اولیاء کے دلوں میں طرح طرح کی باتیں مخالفت کی ڈالتا رہتا ہے مگر اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں کو منسوخ کر دیتا ہے اور اپنی آیات کو مضبوط کر دیتا ہے یعنی حق کو قائم کر دیتا ہے ہاں یہ شیطان کی مخالفت کمزور دلوں اور سخت دلوں کے لیے موجب فتنہ ہو جاتی ہے کیونکہ مخالفت کی وجہ سے مومنوں کو زور لگانا پڑتا ہے اور کمزور دل چاہتے ہیں کہ سکھ ہی سکھ ہو۔ ایسا ہی سخت دل لوگ بھی چونکہ حق کی آخری کامیابی پر ایمان لا ہی نہیں سکتے اس لیے ان کے لیے بھی یہ مخالفت موجب فتنہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں صاف

أَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ ﴿۵۵﴾

والے دن کا عذاب آجائے ۲۲۳۸

الْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿۵۶﴾

بادشاہت اس دن اللہ کے لیے ہی ہوگی، وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا، پس جو لوگ ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں۔ وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۵۷﴾ ع ۱۴

اور جو کافر ہیں اور ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں تو ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ قُتِلُوا أَوْ مَاتُوا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللَّهُ رِزْقًا حَسَنًا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿۵۸﴾

اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر قتل ہو گئے یا مر گئے، اللہ انھیں اچھا رزق دے گا۔ اور اللہ یقیناً بہترین رزق دینے والا ہے ۲۲۳۹

لَيُدْخِلَنَّهُم مُّدْخَلًا يَرْضَوْنَهُ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَعَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿۵۹﴾

وہ ضرور انھیں ایسی جگہ میں داخل کرے گا جسے وہ پسند کریں گے اور اللہ یقیناً جاننے والا بُردبار ہے۔

ذَٰلِكَ ۖ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهِ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنصُرَنَّهُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ ﴿۶۰﴾

یہ (اسی طرح ہوگا) اور جو اس کی مثل سزا دے جو اسے ایذا دی گئی اور اس پر زیادتی ہوئی ہو، اللہ ضرور اس کی مدد کریگا۔ یقیناً اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے ۲۲۴۰

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ

یہ اس لیے ہے کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور

فرمایا اور اہل علم کے لیے یہی مخالفت ازدیاد ایمان کا موجب ہوجاتی ہے جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے اور اسی کے مطابق دوسری جگہ ہے ولمّا را المؤمنون الاحزاب قالوا ھٰذا ما وعدنا اللہ ورسولہ (الاحزاب ۳۳ - ۲۲)

۲۲۳۸ عقیم۔ عُقم وہ یُبس ہے جو اثر قبول نہ کرنے دے چنانچہ داءٌ عُقامٌ وہ بیماری ہے جو علاج قبول نہ کرے اور وہ عورت عقیم کہلاتی ہے جو نطفہ کو قبول نہ کرے عجوز عقیم (الذٰریٰت ۵۱ - ۲۹) اور الریح العقیم (الذٰریٰت ۵۱ - ۴۱) دو طرح پر ہو سکتی ہے یعنی فاعل کے معنی میں جو بادل کو اور درخت کو باردار نہیں کرتی یا بمعنی مفعول جو خود اچھا اثر قبول نہیں کرتی اور یوم عقیم وہ دن ہے جس میں خوشی کوئی نہ ہو (غ) اور بعض نے یوم عقیم سے مراد جنگ کا دن لیا ہے۔ اس لیے کہ اس دن ان کی اولاد قتل ہوجائے گی (ر) ؏

یہاں ساعۃ اور عذاب کو الگ الگ کر کے صاف بتا دیا کہ دونوں سے مراد اس دنیا کا عذاب ہے۔ ساعۃ سے مراد ان کی ہلاکت کی گھڑی ہے اور عذاب اس سے کمتر ؏

۲۲۳۹ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت شروع ہو چکی تھی اور رزق حسن سے مراد یہاں وہ رزق ہے جو انہیں حیات ابدی کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ تسلی دی کہ ہجرت کر کے قتل بھی ہوجائے یا مر بھی جائے تاہم عند اللہ وہ ثواب کا مستحق ہے ؏

۲۲۴۰ عاقب یا عقاب کا اصل مفہوم تو بدی کے پیچھے اس کی سزا کا لانا ہی ہے مگر یہاں عوقب ابتدائی ایذارسانی پر بولا گیا ہے اور یہ بتانے کو کہ اس کی تکلیف کسی اس کے قصور کا نتیجہ نہ تھی ثم بغی علیہ بڑھا دیا ہے یعنی اس پر زیادتی ہوئی۔ اور ثم یہاں ترتیب کے لیے نہیں بلکہ ایک اور امر کے اظہار کے لیے ہے دیکھو ۴۴ ومن عاقب میں جہاں صاف طور پر کفار کو سزا دینے کا ذکر ہے یہ بتا دیا کہ مسلمانوں کو حکومت اور غلبہ ملے گا اور وہ اپنے دکھ دینے والوں کو سزا دینے پر قادر ہوں گے اور اللہ ان کی تائید کرے گا اور مسلمانوں کے غلبہ اور حکومت کی طرف ہی اگلی آیت میں بھی رات اور دن کے ایک دوسرے میں داخل کرنے میں اشارہ ہے جیسا کہ دوسری جگہ تؤتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممّن تشاء کے مقابل پر بھی تولج الیل فی النھار وتولج النھار فی الیل (آل عمرٰن ۳ - ۲۷) فرمایا ہے اور آیت کے آخر پر اللہ تعالیٰ کی صفات عفو و غفر لانے سے یہ منشا ہے کہ اگر اتنی سزا بھی نہ دو تو اور بھی بہتر ہے کیونکہ اللہ جو تمہارا رب ہے وہ عفو و غفر کرنے والا ہے اور یہی سچ ہے کہ نبی کریم صلعم نے ہرگز اتنی سزا نہیں دی جتنا دکھ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو دیا گیا تھا ؏

وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۶۱﴾

دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور کہ اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۶۲﴾

یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور کہ جو کچھ اس کے سوائے پکارتے ہیں وہ باطل ہے اور کہ اللہ بلند شان والا بڑا ہے ع۲۲۴۱

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۫ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۶۳﴾

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ بادل سے پانی اتارتا ہے تو زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔ اللہ باریک باتوں کا جاننے والا خبردار ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۶۴﴾

اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بلاشبہ اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۵﴾

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ نے جو کچھ زمین میں ہے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور کشتی کو (بھی) جو اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے اور وہ مینہ کو روکتا ہے کہ سوائے اس کی اجازت کے زمین پر پڑے۔ یقیناً اللہ لوگوں پر مہربان رحم کرنے والا ہے ع۲۲۴۲

ع۲۲۴۱ پس اللہ کا نام لینے والے بھی ضرور دنیا میں کامیاب ہونگے اس لیے کہ حق قائم رہتا ہے اور باطل نابود ہو جاتا ہے۔

ع۲۲۴۲ تقع۔ وقوع کسی چیز کا ٹھہرے رہنا اور اس کا گرنا ہے اور واقِعَہ صرف سختی اور ناپسندیدگی کے موقعہ پر بولا جاتا ہے اور قرآن شریف میں وَقَع کا لفظ اکثر عذاب اور سختیوں کے موقعہ پر ہی آیا ہے اذا وقعت الواقعۃ لیس لوقعتھا کاذبۃ (الواقعۃ[56] ۱و۲) فیومئذ وقعت الواقعۃ (الحاقۃ[69] - ۱۵) اور قول کا وُقُوع یہ ہے کہ جس بات پر وہ شامل ہے وہ حاصل ہو جائے ووقع القول علیھم بما ظلموا (النمل[27] - ۸۵) کے معنی ہیں کہ عذاب جس کا انہیں وعدہ دیا گیا تھا وہ واجب ہو گیا۔ اذا وقع القول علیھم (النمل[27] - ۸۲) اور فقد وقع اجرہ علی اللہ (النساء[4] - ۱۰۰) میں بھی مراد اس کا واجب ہونا ہے اور وَقَع المطرُ سَقَطَ کی طرح ہے یعنی بارش پڑی (رغ) اور امساک کے لیے دیکھو ع۲۹۵ اور سماء کے لیے دیکھو ع۳۱ ؂

سماء کے معنی آسمان بلندی بارش بادل ہیں دیکھو ع۳۱ پس سماء کے گرنے سے مراد آسمان کا گرنا ہو سکتا ہے یا مینہ کا پڑنا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی آسمان کو زمین پر گرنے سے روکا ہوا ہے رفع السمٰوٰت بغیر عمد ترونھا (الرعد[13] - ۲) اور ان اللہ یمسک السمٰوٰت والارض ان تزولا (فاطر[35] - ۴۱) مگر یہاں منشا یہ معلوم نہیں ہوتا اور اس پر الا باذنہ بڑا بھاری قرینہ ہے۔ جو بتاتا ہے کہ جب اللہ کا اذن ہوتا ہے تو وہ سماء گرتا بھی رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ آسمان کبھی زمین پر نہیں گرا اور یہ خیال کہ اس میں اشارہ قیامت کی طرف ہے اس لیے درست نہیں کہ قیامت میں آسمانوں کے انفطار انشقاق وغیرہ کا ذکر تو ہے مگر آسمان کے زمین پر گرنے کا کہیں ذکر نہیں جیسا کہ روح المعانی میں بھی تسلیم کیا ہے پس یہاں سماء سے مراد مینہ ہے اور جیسا کہ امام راغبؒ نے قول نقل کیا ہے سماء کا لفظ بارش پر بالخصوص اس وقت تک بولا جاتا ہے مالم یَقَعْ علی الارضِ جب تک وہ زمین پر نہ گرے اور اللہ تعالیٰ کا مینہ کو روکنا کہ سوائے اس کی اجازت کے زمین پر نہ پڑے درحقیقت عظیم الشان اسباب رحمت الٰہی سے ہے نہ صرف اس لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے نہ روکے اور اندازہ سے نہ اتارے تو وہی مینہ بجائے رحمت کے تباہی کا موجب ہو جاتا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے روکنے سے ہی وہ مختلف قطعات زمین پر پہنچتا ہے ورنہ سمندر سے اٹھکر سمندر پر برس جائے یہ اللہ تعالیٰ کی لوگوں پر مہربانی اور رحمت ہے کہ کہاں سے اٹھا کر کہاں لا کر اسے برسنے کی اجازت دیتا ہے سیاق مضمون بھی اسی معنی کو چاہتا ہے اور یہاں ان باتوں کا ذکر اس لیے کیا کہ توحید پر یہ بھی دلائل ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے نہ دوسرے معبودوں نے ؂

وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۝۶۶

اور وہی ہے جس نے تمھیں زندہ کیا پھر تمھیں مارے گا پھر تمھیں زندہ کرے گا۔ یقیناً انسان ناشکر گزار ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَ ادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ۝۶۷

ہر ایک قوم کے لیے ہم نے عبادت کا طریق مقرر کیا جس پر وہ چلیں پس تجھ سے اس امر میں جھگڑا نہ کریں اور تو اپنے رب کی طرف بلا، یقیناً تو سیدھے رستہ پر ہے ۲۲۴۳

وَ اِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۶۸

اور اگر تجھ سے جھگڑا کریں تو کہدے اللہ خوب جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۶۹

اللہ تمھارے درمیان قیامت کے دن ان باتوں کا فیصلہ کریگا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۷۰

کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے یہ (سب کچھ) کتاب میں ہے۔ یہ اللہ پر آسان ہے۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ مَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝۷۱

اور اللہ کے سوائے اس کی عبادت کرتے ہیں جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور جس کا انھیں کوئی علم نہیں اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ۲۲۴۴

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ

اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو تُو ان کے چہروں میں جو کافر ہیں انکار دیکھے گا قریب ہے کہ ان پر حملہ کریں جو اُن پر ہماری آیتیں پڑھتے ہیں۔ کہہ کیا میں تمھیں اس سے بدتر (چیز) کی خبر دوں (وہ) آگ (ہے) اللہ نے اس کا وعدہ ان سے کیا ہے جو کافر ہیں

۲۲۴۳ حقانیت توحید پر دلیل: منسک کے معنی عبادت یا عبادت کا طریق ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کو اپنی نعمائے جسمانی سے بہرہ ور کیا ہے اسی طرح اپنی عبادت کا طریق بھی سب قوموں کو بتایا جس طرح زمین سب کے لیے ہے بارش بھی سب کے لیے ہے اسی طرح طریق عبادت آلہی بھی سب قوموں کو بتایا اور یہ مذہب توحید کی حقانیت پر کھلی دلیل ہے کیونکہ مختلف قوموں اور مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا طریق سکھانے والے لوگ پیدا ہوتے ہیں اس لیے الامر یعنی دین کے معاملہ میں جھگڑا کیسا۔ اور مطلب یہ ہے کہ تم ان کے جھگڑے کی پروا نہ کرو اور دعوت الی اللہ میں لگے رہو؛

۲۲۴۴ شرک پر کوئی دلیل نہیں: یعنی توحید آلہی پر تو ساری دنیا گواہ ہے یا یں ایک خدا کو چھوڑ کر کوئی مسیحؑ کو خدا بناتا ہے کوئی اہرمن کو کوئی بتوں کو حالانکہ ان میں سے کسی کے لیے اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی کیونکہ کسی نبی پر یہ تعلیم نہیں اُتری پھر ان کے پاس اس کی کوئی علمی دلیل بھی نہیں اور آخری بات یہ ہے من دون اللہ کی مدد جس پر انہیں بھروسہ ہے وہ بھی انہیں نہیں ملے گی۔ یعنی عملی طور پر بھی کوئی ثبوت اس کا نہیں؛

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٧٢﴾

اور بُرا ٹھکانا ہے ۲۲۴۵

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿٧٣﴾

اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے سو اُسے سُن رکھو، وہ جنھیں تم اللہ کے سوائے پکارتے ہو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، گو وہ سب اس کے لیے اکٹھے ہو جائیں۔ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو اُسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ طالب اور مطلوب (دونوں) کمزور ہیں ۲۲۴۶

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِيْزٌ ﴿٧٤﴾

انھوں نے اللہ کو نہیں پہچانا (جس طرح) اس کے پہچاننے کا حق (تھا) یقیناً اللہ طاقتور غالب ہے۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰۤئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿٧٥﴾

اللہ فرشتوں میں سے رسول چنتا ہے، اور انسانوں میں سے۔ اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے ۲۲۴۷

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿٧٦﴾

وہ جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور جو اُن کے پیچھے ہے اور اللہ کی طرف ہی سب کام لوٹائے جاتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور نیک کام کرو،

۲۲۴۵ یسطون۔ سَطْوَۃ ہاتھ اٹھا کر پکڑنا ہے اور سَطَابہ کے معنی ہیں اسے اس طرح پکڑا اور اصل میں سَطَا گھوڑے کی اگلی ٹانگیں اُٹھا کر کھڑا ہو جانے کو کہا جاتا ہے (غ)

شر من ذلکم یا اس سے بدتر میں اشارہ ان کے غیظ و غضب کی طرف ہے جس کی وجہ سے وہ داعی حق پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں تو فرمایا کہ تمہارے غیظ و غضب سے بدتر چیز وہ آگ ہے جو فی الحقیقت غیظ و غضب کا ہی نتیجہ ہے اور یہ ان کا غیظ و غضب بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے ہاتھ میں دلیل کوئی نہیں۔

۲۲۴۶ یسلب۔ سَلْب غالب ہو کر کسی چیز کا دوسرے سے لے لینا ہے اور سَلَب وہ چیز ہے جو اس طرح لے لی جائے (غ)

طالب۔ مطلوب۔ طَلَب کسی چیز کے پانے کا اور اس کے لے لینے کا قصد کرنا ہے اور طَلَبَ بمعنی رَغِبَ بھی آتا ہے یعنی اس کی طرف مائل ہوا (ل) اور یہاں طالب سے مراد معبود باطل اور مطلوب سے مراد مکھی بھی لی گئی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ طالب سے مراد عبادت کرنے والا اور مطلوب سے مراد معبود ہے جیسا کہ سدی ضحاک وغیرہ سے مروی ہے (د) اور طلب ایک چیز کی بھی ہوتی ہے اور معنی کے لحاظ سے بھی فلن تستطیع له طلبا (الکھف ۱۸ - ۴۱) (غ)

اس میں معبودان باطل کی کمال درجہ کی کمزوری دکھائی ہے کہ تمام دنیا میں جس قدر انسانوں یا دوسری چیزوں کو معبود مانا گیا ہے وہ سب کے سب مل کر بھی ایک مکھی نہیں بنا سکتے بلکہ ان کی عاجزی کی یہ انتہا ہے کہ مکھی کوئی چیز ان سے چھین لے جائے تو وہ اسے اس سے واپس نہیں لے سکتے۔ جب معبود کی کمزوری کی یہ حالت ہے تو عابد کی کمزوری کو خود سمجھ لو۔ اسی لیے فرمایا کہ طالب و مطلوب دونوں کمزور ہیں اور یہاں بت مراد معلوم نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جنہیں خدا بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ آیت ۷۵ میں بتایا ہے اس کمزوری کے ذکر میں یہ بھی سمجھا دیا کہ نہ پرستاران باطل اور نہ خود باطل حق کا مقابلہ کر سکتے ہیں

۲۲۴۷ یہاں فرشتوں اور انسانوں کے رسول بنانے کا ذکر مضمون توحید کے لحاظ سے ہی کیا ہے کیونکہ انسانوں کو خدا بنایا گیا ہے تو اس لیے فرمایا کہ انسان کی برگزیدگی کا بلند سے بلند مرتبہ رسالت کا ہے اس سے اوپر کچھ نہیں اور اس کی مخلوق تو فرشتے بھی ہیں۔ انہیں بھی وہ رسالت کا مرتبہ ہی دیتا ہے خدائی کے حصہ دار وہ بھی نہیں ہوتے۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۩ ﴿٧٧﴾ السجدة
وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ
اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ
مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ
هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ
هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ
وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ
فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ
وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ
الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿٧٨﴾ ع ۱۰ ۱۷

تاکہ تم کامیاب ہو۔
اور اللہ کی راہ میں کوشش کرو، جو اس کی (راہ میں) کوشش کا حق ہے، اس نے تمھیں چُن لیا اور دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی، تمھارے باپ ابراہیمؑ کا مذہب، اس نے تمھارا نام پہلے سے اور اس (قرآن) میں بھی مُسلم رکھا ــــ تاکہ رسولؐ تمھارا پیش رَو ہو اور تم لوگوں کے پیش رَو بنو، سو نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ اور اللہ کو مضبوط پکڑو وہ تمھارا آقا ہے، سو کیا ہی اچھا آقا ہے، اور کیا ہی اچھا مددگار ہے ع۲۲۴۸

ع۲۲۴۸ مسلمانوں کو اعلائے کلمۃ اللہ پر پورا زور لگانے کی نصیحت: شرک کی تردید کرکے اب مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ وہ توحید پھیلانے کے لیے زور لگائیں آیت ۷۷ میں تکمیل نفس کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ کا نام پھیلانے میں وہی قوم کامیاب ہوسکتی ہے جو پہلے اصلاح نفس کرے اس لیے اس آیت میں اصلاحِ نفس کا حکم دیکر اب فرمایا کہ اللہ کی راہ میں وہ کوشش کرو جو کوشش کا حق ہے ادھوری اور نا تمام کوششیں کسی معمولی دنیوی امر میں بھی انسان کو کامیاب نہیں کرسکتیں دین میں کس طرح کامیاب کریں اور ھو اجتبٰکم میں بتایا کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پھیلانے کے لیے چن لیا اور رسولوں کے اصطفا مذکورہ آیت ۷۵ کے مقابل اُمت مسلمہ کا اجتباء صاف بتاتا ہے کہ جو کام رسول کرتے تھے وہ اب اسی اُمت مسلمہ کے سپرد کیا گیا ہے اور اس بات میں کہ اس نے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کا نام مسلم رکھا پہلے بھی یعنی پہلی کتابوں میں بھی اور فی ھٰذا یعنی اس قرآن میں بھی اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کامل فرمانبرداری ان کا شیوہ ہونا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام مسلم رکھا ہے اور اس کی وجہ بھی خود ہی بتا دی کہ تم لوگوں کے پیشرو یعنی معلم توحید بنو جس طرح رسول تمھارا معلم توحید ہے اس پر دیکھو ع۱۷۸ ؎

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَكِّيَّةٌ (۲۳)

اٰيَاتُهَا ۱۱۸ رُكُوْعَاتُهَا ۶

نام: اس سورت کا نام المؤمنون ہے اور اس میں چھ رکوع اور ۱۱۸ آیتیں ہیں اس کا نام المؤمنون پہلی ہی آیت میں آتا ہے جہاں یہ بتایا کہ مومنوں کی کامیابی کا انحصار کن باتوں پر ہے۔ اور اسی لحاظ سے یعنی یہ بتانے کو کہ مومن اپنی کامیابی صرف دنیوی ترقی کو نہ سمجھیں اس سورت کا یہ نام رکھا ہے ؎

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں بتایا ہے کہ مومنوں کی فلاح کن امور میں ہے اور سمجھایا ہے کہ فلاح یا کامیابی کی بنیاد اخلاق فاضلہ پر رکھنی چاہیئے۔ رہا یہ کہ اپنے دشمنوں سے نجات ملے اور ایک قوم دنیوی رنگ میں بھی کامیاب ہو تو حضرت نوحؑ کا دوسرے رکوع میں اور آپ کے بعد کے انبیاء کا تیسرے رکوع میں ذکر کرکے بتایا کہ یہ بھی ان لوگوں کو میسر آجاتا ہے جو اپنی فلاح کا مدار اخلاق پر رکھتے ہیں چوتھے رکوع میں پھر صفائی سے بتایا کہ فلاح حصول مال و دولت سے نہیں بلکہ اخلاق فاضلہ اور تعلق باللہ سے ہے اس لحاظ سے پانچویں رکوع میں اثبات توحید اور ابطال باطل کیا اور چھٹے میں بتایا کہ اعدائے حق کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے اس لیے کہ وہ غلط راہ پر چلتے ہیں ؎

تعلق: پچھلی سورت میں بتایا تھا کہ آنحضرت صلعم بھی دیگر انبیاء کی طرح کامیاب ہوں گے مگر اس کے لیے جنگیں کرنی پڑینگی جن میں وہ فاتح ہونگے۔ مگر اس لیے کہ فتوحات اور بادشاہت اور مال و دولت کو کامیابی نہ سمجھ لیں یہاں یہ بتایا کہ مومنوں کی فلاح کن باتوں میں ہے ؎

زمانہ نزول: یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ اور مضمون کے لحاظ سے مکہ کے آخری زمانہ میں رکھی جا سکتی ہے ؎

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ — مومن یقیناً کامیاب ہیں ۲۲۴۸؎

الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ — جو اپنی نمازمیں عاجزی کرنے والے ہیں ۲۲۴۹؎

وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ — اور جو لغو سے منہ پھیرنے والے ہیں ۲۲۵۰؎

وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ ۙ﴿۴﴾ — اور جو پاکیزگی کے لیے کام کرنے والے ہیں ۲۲۵۱؎

ع۲۲۴۸ ترقی کی بنیاد اخلاق پر ہے: اس رکوع میں مومنوں کی فلاح یا کامیابی کا ذکر ہے (فلاح میں کیا کیا امور شامل ہیں دیکھو ع۱۶) اور اس فلاح کے لیے مومنوں میں چند صفات کا موجود ہونا ضروری ٹھہرا دیا گیا ہے۔ اور وہ صفات کیا ہیں صلوٰۃ یعنی رجوع الی اللہ۔ ان باتوں اور کاموں سے اجتناب جن کا اثر انسان کی ترقی اور بہتری پر اچھا نہیں۔ ہر ایک فعل میں پاکیزگی یا قوائے انسانی کے نشوونما کو مدنظر رکھنا۔ قوائے شہوانی پر پورا غلبہ حاصل کرنا۔ امانتوں اور عہد کی پابندی نمازوں پر محافظت۔ پس فلاح قومی کو اللہ کا کلام اخلاقی ترقی سے وابستہ کرتا ہے۔ مومنوں کو بلاشبہ وہ سب مشکلات پیش آنے والی ہیں جو دنیا میں قوموں کو پیش آتی ہیں لوگ ان کے مخالف اور دشمن ہوں گے ان کو ظلم سے کچلنا چاہیں گے ان کو لڑائیاں کرنی پڑیں گی۔ ان کو مختلف قوموں اور مذاہب سے واسطہ پڑے گا انہیں دنیوی رنگ میں اپنی تجارتوں وغیرہ کا فکر کرنا ہوگا۔ مگر ان کی قومی ترقی کی جڑ ان کی فلاح کا رنگ بنیاد اخلاق میں بلند مرتبگی کو قرار دیا گیا اگر وہ اخلاق فاضلہ پر قایم ہوں گے تو باقی صفات جن سے دنیا میں قومیں ترقی کرتی ہیں خود بخود ان میں پیدا ہو جائیں گی۔ گو دشمن انہیں کچلنا چاہے گا مگر انہیں ان تجاویز کے سوچنے کی ابھی ضرورت نہیں جن سے دشمن کو زک پہنچ سکے گو انہیں جنگ کرنی پڑے گی مگر انہیں فن جنگ سیکھنے اور سامان حرب اکٹھا کرنے کی ابھی ضرورت نہیں۔ ان کی پہلی ضرورت اخلاق میں ترقی رجوع الی اللہ لغو سے بچنا۔ شہوات پر حکمرانی امانت اور عہد کا پورا کرنا ہے دنیا کی کسی کتاب نے قومی ترقی کا یہ راز نہیں بتایا جو قرآن شریف نے بتایا اور تاریخ شاہد ہے کہ اس بنیاد پر جو عمارت بنی وہ کیسی مضبوط بنی قرآن کریم کا ایک طرف مسلمانوں کی فلاح کے لیے ان صفات کو ضروری ٹھہرانا اور دوسری طرف آنحضرت صلعم کے ساتھیوں کی فلاح کی بار بار پیشگوئیاں کرنا صاف بتاتا ہے کہ یہ سب صفات نبی کریم صلعم کے صحابہؓ میں پائی جاتی تھیں اور یہ وہ انقلاب تھا جو آپ کی قوت قدسی سے ملک عرب کے رہنے والوں میں پیدا ہوا جن کی پہلی حالت ان سب باتوں کے خلاف تھی اور قد افلح المؤمنون کے آگے جو مومنوں کی تصویر کھینچی ہے وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کا ہی نقشہ ہے اسی سے محمدؐ رسول اللہ کی زندگی کے حالات کا اندازہ کر لو ؎

ع۲۲۴۹ خشوع۔ سکون اور فرمانبرداری عاجزی کی حالت کا نام ہے۔ نماز میں خشوع سے مراد کیا ہے۔ خائف اور سکون کی حالت میں ہونا۔ آنکھ کا نیچا رکھنا۔ سر کا جھکا ہوا ہونا وغیرہ مختلف معنی لیے گئے ہیں مگر درحقیقت یہ سب باتیں اس میں شامل ہیں اور نماز میں سکون یہی ہے کہ نماز کے سوائے اور کسی چیز کی طرف توجہ نہ ہو جب یہ حالت ہو گی تو قلب میں بوجہ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے کے احساس کے اس مقام کی پوری عظمت ہو گی اور جوارح خود ہی سب سکون کی حالت میں ہوں گے نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا یا کپڑوں یا اپنے جسم کے کسی حصہ سے لغو حرکتیں کرنا یا اسے جلدی جلدی بیگار کی طرح ادا کرنا سب نماز میں خشوع کے خلاف ہیں اور مومن کے لیے نماز میں خشوع اس کی روحانی ترقی کا پہلا قدم ہے اسلام نے صلوٰۃ یا رجوع الی اللہ کو تمام اخلاق فاضلہ کی جڑ قرار دیا ہے اس لیے کہ خلوص جو تمام اخلاق فاضلہ کی جڑ ہے وہ کبھی کسی قوم میں یا کسی انسان میں سوائے خدا سے تعلق کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک تمام اخلاق اور معاملات میں خلوص نہ ہو اس وقت تک اخلاق فاضلہ کا نام بھی ان کو نہیں دیا جا سکتا اور اسی لیے یہاں محض نماز پڑھنا نہیں رکھا۔ بلکہ نماز میں خشوع رکھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت کا اثر جب تک دل پر پیدا نہ ہو کچھ فائدہ نہیں ؎

ع۲۲۵۰ لغو۔ دیکھو ع۲۸۸ ایسا کلام جو غور و فکر سے نہیں کیا جاتا اور لَغَا چڑیا اور پرندوں کی آواز کو کہتے ہیں اور قبیح بات کو بھی لغو کہدیا جاتا ہے۔ لا یسمعون فیھا لغوا ولا تاثیما (الواقعۃ ۵۶-۲۵) واذا مروا باللغو مروا کراما (الفرقان ۲۵-۷۲) اور لاغیۃ بھی لغو کے معنی میں ہی ہے لا تسمع فیھا لاغیۃ (الغاشیۃ ۸۸-۱۱) اور اسی سے لُغَۃ ہے (غ) اور لغو میں بے حقیقت اقوال اور افعال دونوں شامل ہیں (ر)

اخلاقی اور روحانی ترقی میں لغو سے اعراض کو دوسرا مرتبہ قرار دیا ہے اور اس سے مراد نہ صرف لغو باتیں ہیں بلکہ لغو کام بھی جن میں اکثر لوگ مبتلا رہتے ہیں اور اس زمانہ کی تہذیب کے خاص اشغال میں سے ہیں سلمان کی حدیث میں ہے اِیَّاکُم وَمَلْغَاۃَ اَوَّلِ اللَّیلِ یعنی اوّل شب میں لغو باتوں سے بچو (ل) اگر دیکھا جائے تو آجکل مسلمانوں نے دوسروں کی نقل کر کے اوّل شب کی لغو باتوں کو دنیا جہان کی ضروریات میں سب سے مقدم کیا ہوا ہے ہنسی اور ٹھٹھے اور عیب چینی اور غیبت کی مجلس جمتی ہے تو آدھی آدھی رات گزر جاتی ہے ایسی حالت میں شب بیداری تو ایک طرف رہی نماز فجر کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ ایسا ہی تاش وغیرہ کے اشغال ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کو چارپایوں کی زندگی سے بڑھ کر بلا مقصد بنا دیا ہے اور قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ کوئی ایسا فعل یا کلام نہ کیا جائے جس میں انسان یا نسل انسانی کی بہتری مدنظر نہ ہو پس کہاں تعلیم قرآن اور کہاں موجودہ مسلمانوں کا عمل۔

ع۲۲۵۱ زکوٰۃ بمعنی تزکیہ: زکوٰۃ کیلئے دیکھو ع۱۹۴۷ و ع۱۹۸۱ یہاں مراد تزکیہ ہے للزکوٰۃ میں لام علت کا ہے یعنی جو وہ کرتے ہیں اس غرض سے کرتے ہیں کہ ان کے نفس کا تزکیہ ہو (غ) اور اگر ادائیگی زکوٰۃ مراد ہوتی تو فاعلون کا لفظ یہاں نہ لایا جاتا اس لیے کہ فعلت الزکوٰۃ نہیں کہتے اور یہاں زکوٰۃ کے معنی مصدری یعنی

وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۶ مگر اپنی بیویوں سے یا اُن سے جن کے اُن کے داہنے ہاتھ مالک ہوئے تو وہ ملامت کیے گئے نہیں ۲۲۵۲

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۷ لیکن جو اس سے آگے نکلنا چاہیں وہ حد سے بڑھنے والے ہیں۔

وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں ۲۲۵۲ا

وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹ اور جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں ۲۲۵۳

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ یہی وارث ہیں۔

تزکیہ ہی ہیں (ر) اور سیاق بھی اسی معنی کو چاہتا ہے اس لیے کہ یہ تیسرا مرتبہ انسانی ترقی میں ہے۔ پہلا مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنا اور اس سے تعلق پیدا کرنا ہے، دوسرا یہ کہ انسان اپنے اوقات کو لغو باتوں اور لغو کاموں سے بچائے اور لغو سے وقت کو بچانا خود چاہتا ہے کہ اسے کسی بہتر مصرف پر لگایا جائے۔ پس اب وہ مصرف بتایا کہ تزکیہ کو اپنے ہر ایک فعل کی غرض رکھے اور تزکیہ سے مراد صرف پاکیزگی اپنے تمام معنوں میں نہیں بلکہ اس کے معنی ہی نفس کو خیرات و برکات سے ترقی دینا ہیں دیکھو ع ۱۶۴ وغیرہ پس کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے اوقات کو ایسے مصرف میں لگایا جائے جس میں انسان کی اپنی یا اس کی قومی بہتری مدنظر ہو۔

ع ۲۲۵۲ فروج۔ فَرْج کی جمع ہے اور وہ اصل میں دو چیزوں کے درمیان شگاف کو کہتے ہیں اور مراد اس سے وہ ہے جو دونوں پاؤں کے درمیان ہے اور شرمگاہ کے لیے اس کا استعمال بوجہ کثرت صریح کے طور پر ہوگیا ہے اور ہر ایک موضع مخافت کو یعنی جہاں سے کوئی خوف ہو فَرْج کہا جاتا ہے (غ)

حفظِ فروج سے مراد: حفظ فروج تو فی الحقیقت وسیع معنی میں ہے یعنی ہر ایک موضع مخافت کا یعنی ایسے مقام کا جہاں سے شیطان حملہ آور ہو سکتا ہے محفوظ رکھنا مگر یہاں ازواج کا استثناء بتاتا ہے کہ مراد ایسے مواضع مخافت ہیں جو قوت شہوانیہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن مراد صرف زنا سے بچنا نہیں، بلکہ شہوات کے تمام موقعوں سے اپنی حفاظت کرنا ہے یہاں تک کہ بدنظری سے بچنا بھی اس میں داخل ہے۔ اس لیے جس طرح مردوں کو حفاظت فروج کا حکم ہے عورتوں کو بھی ہے والحافظین فروجھم والحافظات (الاحزاب ۳۳-۳۵) لیکن یہاں استثنا میں الّا ما ملکت ایمانھم سے ایک دقت پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ کہ زوج سے مراد تو مرد کی صورت میں اس کی بی بی اور عورت کی صورت میں اس کا خاوند ہیں اور او ما ملکت ایمانھم میں غلام اور لونڈی دونوں داخل ہیں سوائے اس کے کہ قرینہ اسے غلاموں سے مخصوص کر دے یا لونڈیوں سے اب یہاں بظاہر کوئی ایسا قرینہ نہیں لیکن اجماع نے مرد مملوک سے آزاد عورت کا تعلق بغیر نکاح ناجائز ٹھہرایا ہے اور زن مملوکہ سے آزاد مرد کا تعلق جائز رکھا ہے۔ اس لیے او ما ملکت ایمانھم سے یہاں صرف لونڈیاں مراد لی ہیں۔ مگر یہ سوال الگ ہے کہ لونڈی کے ساتھ تعلق بذریعہ نکاح ہو سکتا ہے یا بغیر نکاح، سو اس پر ع ۶۰۵ و ع ۶۳۹ میں مفصل بحث گزر چکی ہے۔

انسانی ترقی کا یہ چوتھا مرتبہ ہے جو قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے اور اس کا منشا یہ ہے کہ انسان کے قوائے شہوانی جو اسے قدرت نے دیئے ہیں ان پر اس کو پوری حکومت حاصل ہو۔ یہ وہ بات ہے جس کی طرف سے اکثر قوموں نے غفلت کی ہے اور یہی آخر کار ان کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ قوائے شہوانی کو جب تک حد اعتدال کے اندر نہ رکھا جائے یہ تمام دوسری قوتوں کو دبا لیتے ہیں اور ان کا ہیجان آہستہ آہستہ انسانوں کو اور قوموں کو بڑے بڑے اخلاق فاضلہ سے عاری کر دیتا ہے آج بھی کس قدر قومیں ہیں جو اپنے آپ کو مہذب اور ترقی یافتہ سمجھتی ہیں مگر قوائے شہوانی کی غلامی کی طرف ان کا قدم اُٹھ رہا ہے اور وہ نہیں جانتیں کہ وہ ہلاکت کے گڑھے کے قریب ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

ع ۲۲۵۲ا یہ ترقی کا پانچواں مرتبہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی مدعی تہذیب قوموں کی حالت کو مدنظر رکھکر ہی یہ علاج بتائے گئے ہیں جب ایک قوم دنیوی ترقی کے معراج پر پہنچتی ہے تو پھر اسے امانت اور عہد کی کوئی پروا نہیں رہتی اس لیے کہ وہ زبردست ہے اور جو چاہے کر سکتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ امانت اور عہد کے عدم ایفا سے قوموں کا اعتماد اٹھ جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساتھ ہی انکا رعب جاتا رہتا ہے اور رعب کے بغیر کوئی مادی قوت کچھ کام نہیں دیتی۔

ع ۲۲۵۳ چھٹے اور آخری مرتبہ پر نمازوں کی محافظت رکھی ہے اور اسی طرح سورۂ المعارج میں بھی آخری مرتبہ نمازوں کی محافظت کو ہی رکھا ہے اور اس سے مراد جیسا کہ ع ۳۰۷ میں دکھایا گیا ہے صرف اوقات وارکان کی حفاظت ہی نہیں بلکہ ہر ایک فحشاء اور منکر سے بچنا بھی ہے اور نماز یا خدا کی طرف رجوع ایسے انسان کے لیے بطور ایک غذا کے بن جاتا ہے جس کے بغیر اسے چین نہیں پڑتا اور یہی وجہ ہے کہ نماز کو مومن کا معراج کہا ہے کیونکہ اس کی ترقی کا آخری

الَّذِيۡنَ يَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝۱۱
جو فردوس کو ورثہ میں لیتے ہیں، وہ اسی میں رہیں گے۔

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ ۝۱۲
اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا ع۲۲۵۴

ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ ۝۱۳
پھر ہم نے اسے ایک مضبوط ٹھیرنے کی جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا۔

ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ ؕ ۝۱۴
پھر ہم نے نطفہ کو لوتھڑا بنایا اور لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا بنایا۔ اور گوشت کے ٹکڑے میں ہڈیاں بنائیں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اسے ایک اور پیدایش دیکر اٹھا کھڑا کیا پس اللہ بابرکت ہے (جو) سب بنانے والوں سے بہتر (ہے) ع۲۲۵۵

ثُمَّ اِنَّكُمۡ بَعۡدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوۡنَ ؕ ۝۱۵
پھر تم اس کے بعد یقیناً مرنے والے ہو۔

ثُمَّ اِنَّكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ تُبۡعَثُوۡنَ ۝۱۶
پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا فَوۡقَكُمۡ سَبۡعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الۡخَلۡقِ غٰفِلِيۡنَ ۝۱۷
اور ہم نے تمہارے اوپر سات رستے بنائے اور ہم مخلوق سے بے خبر نہیں ع۲۲۵۶

مرتبہ بھی یہی ہے جب انسان اس مرتبہ کو حاصل کرتا ہے تو اس کا تعلق اللہ تعالےٰ کے ساتھ کمال کو پہنچ جاتا ہے اور بلند سے بلند اخلاق والے لوگ دنیا میں مادی ترقی کے لیڈر نہیں بلکہ وہ روحانی پیشوا ہوئے ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ کامل ہوا ہے اور تمام دنیا کی اقوام انہی لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کا دعویٰ کرتی ہیں ؞

ع۲۲۵۴ سلالۃ۔ سَلّ ایک چیز کا دوسری سے کھینچکر نکال لینا ہے اور سلالۃ وہ صاف جوہر ہے جو زمین سے کھینچ کر نکال لیا جاتا ہے (رغ)
انسان مٹی سے کس طرح بنتا ہے: قرآن کریم میں کئی جگہ انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کا ذکر ہے جہاں اس کی تصریح فرمادی اور بتادیا کہ مٹی کا بت نہیں بنایا جاتا بلکہ اس کا خلاصہ نکالا جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے کہ ایسے کثیف جوہر سے جیسے مٹی ہے وہ نہایت لطیف جوہر پیدا کرتا ہے جس سے انسان کی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے اور جسے کوئی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ پس جب مٹی جیسی کثیف چیز سے اللہ تعالیٰ زندگی کے جوہر کو نکالتا رہتا ہے اور یہ نظارہ دن رات ہماری آنکھوں کے سامنے ہے تو اعمال سے اس سے بھی لطیف تر ایک جوہر کیوں نہیں بن سکتا جو انسان کی دوسری زندگی کے لیے بطور ایک بنیاد کے ٹھہرے۔

ع۲۲۵۵ جسمانی زندگی کے مدارج کو روحانی زندگی کے مدارج پر بطور شہادت کے پیش کیا ہے اور یہاں بھی چھ ہی مدارج بیان فرمائے ہیں اور انشاناہ خلقا اٰخرین میں نفس ناطقہ یا عقل انسانی کے دینے کی طرف اشارہ ہے یعنی بتایا ہے کہ انسان کی زندگی کی ترقیات کو ہم نے محض حیوان کی زندگی کی ترقیات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے کوئی چیز زاید بھی دی ہے جو اس کے اعمال کے محاسبہ کو اور بعثت کو ضروری ٹھہراتی ہے۔ اسی لیے اس کے بعد اس کی موت کے ساتھ اس کی بعثت کا ذکر کیا۔

ع۲۲۵۶ سات رستے اور نظام شمسی: سات رستوں کی توجیہ مفسرین نے یوں کی ہے کہ وہ سات آسمان ہیں اور رستے انہیں اس لیے کہا ہے کہ فرشتوں کی آمدورفت ان میں ہے یا کواکب ان میں چلتے ہیں۔ مگر طریقۃ اس چیز کو نہیں کہتے جس میں کوئی رستہ بھی ہو یوں تو زمین بھی طریقہ ہوئی کیونکہ اس میں سبلا فجاجا ہیں۔ بلکہ طریقہ خود رستہ کو کہتے ہیں۔ اور یہاں صرف طریقوں کا ذکر ہے۔ دوسرے قرآن کریم نے خود بتادیا ہے کہ وہ چلنے والے کون ہیں والسّمآء والطارق وما ادرٰلك ما الطارق النجم الثاقب اور نجم ثاقب زہرہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جن کے یہ رستے ہیں ان میں سے ایک چلنے والا زہرہ ہے اور باقی بھی اسی کے ساتھ کے دوسرے کواکب ہیں جو زمین کے علاوہ نظام شمسی میں سات ہیں پس انہی سات کے رستوں کو سبع طرائق کہا ہے نہ آسمانوں کو۔ ہاں سبع سماوات کا لفظ خود ان سات سیاروں

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ
فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ ۖ وَ اِنَّا عَلٰى
ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۚ ﴿۱۸﴾

اور ہم نے بادل سے ایک اندازہ سے پانی اتارا۔ پھر اسے زمین میں ٹھیرایا، اور ہم اُسے اٹھالے جانے پر بھی قادر ہیں ۲۲۵۷

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ
وَّ اَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ
وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۙ ﴿۱۹﴾

پھر ہم نے اس کے ساتھ تمھارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اُگائے، ان میں تمھارے لیے بہت پھل ہیں، اور ان سے تم کھاتے ہو۔

وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ
بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور ایک درخت جو سینا پہاڑ سے نکلتا ہے وہ روغن اور کھانیوالوں کے لیے سالن لیے ہوئے نکلتا ہے ۲۲۵۸

وَ اِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ
مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهَا وَ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ
كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۙ ﴿۲۱﴾

اور تمھارے لیے چار پایوں میں بھی عبرت ہے۔ ہم تمھیں اس سے پلاتے ہیں جو اُن کے پیٹوں میں ہے اور ان میں تمھارے لیے بہت سے فائدے ہیں اور ان سے تم کھاتے ہو۔

ع وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور ان پر اور ان کشتیوں پر تم سوار ہوتے ہو۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ
يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ
غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، سو اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمھارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں تو کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ
مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ
يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ

تو ان لوگوں کے سرداروں نے جو اس کی قوم میں سے کافر ہوئے کہا یہ صرف تم ہی جیسا ایک بشر ہے چاہتا ہے کہ تم پر بڑائی حاصل کرے اور اگر اللہ چاہتا تو فرشتے اتار

پر اس لحاظ سے صادق آتا ہے کہ وہ اوپر ہیں۔ اور ماکنا عن الخلق غافلین اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم سے بیان فرما رہا ہے اور ان اجرام فلکی کی طرف اُس لیے توجہ دلائی کہ انسان کی پیدائش کیا حقیقت رکھتی ہے اللہ تعالیٰ نے اتنے اتنے بڑے اجرام بھی پیدا کئے ہیں اور ممکن ہے کہ ماکنا عن الخلق غافلین میں یہ اشارہ ہو کہ ان اجرام میں جو مخلوق ہے ہم اس کی بھی خبر گیری کرتے ہیں۔

ع۲۲۵۷ پانی کے لے جانے سے مراد اس کا زمین میں کم کر دینا بھی ہو سکتا ہے اور اس کا اوپر بخارات کی صورت میں اُٹھا کر لے جانا بھی۔ سیاق کی رو سے دوسرے معنی کو ترجیح ہے کیونکہ یہاں صرف نعمتیں دینے کا ذکر ہے۔

ع۲۲۵۸ سینا۔ سِینا اور سینین شام میں ایک مشہور پہاڑ ہے (ل) اور بعض نے اس کے معنی مبارک کیے ہیں اور بعض نے درختوں والا (ج) اور اس کا وہ پہاڑ ہونا جس پر سے موسیٰ علیہ السلام پکارے گئے مشہور ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ پہاڑ ہے جس پر سے آنحضرت صلعم پکارے گئے (ج)۔

دُھن۔ روغن کو کہتے ہیں اور صبغ سالن کو اس لحاظ سے کہ کھانا کھانے والا روٹی کو سالن میں ڈبو کر کھاتا ہے ع۱۷۳۔

یہ درخت زیتون ہے (ج) اور اس کے الگ ذکر میں حالانکہ اوپر بارش کے ساتھ باغ وغیرہ لگانے کا ذکر ہے اشارہ اس طرف معلوم ہوتا ہے۔ یوقد من شجرۃ مبٰرکۃ زیتونۃ لا شرقیۃ ولا غربیۃ (النور ۲۴-۳۵) جہاں اسلام کو درخت زیتون سے تشبیہ دی ہے اور بعض احادیث میں زیتون کی تعریف بھی بہت آئی ہے۔

مَلٰٓئِكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۚ ﴿۲۴﴾

دیتا ۔ ہم نے یہ پہلے اپنے باپ دادوں میں نہیں سُنا ۔2259

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾

وہ صرف ایک ایسا شخص ہے جسے جنون ہے تو ایک وقت تک اس کے بارے میں انتظار کرو۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾

(نوحؑ نے) کہا میرے رب مجھے مدد دے اس لیے کہ انھوں نے مجھے جھٹلایا۔2260

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾

پس ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی سے کشتی بنا ۔ پھر جب ہمارا حکم آئے اور زمین (پر پانی) جوش مارے تو اس میں ہر (ضرورت کی) شے کے نر و مادہ دو دو لیلے ۔ اور اپنے اہل کو بھی سوائے اس کے جس کے متعلق اُن میں سے پہلے حکم ہو چکا اور ان کے متعلق مجھ سے خطاب کرنا جو ظالم ہیں وہ غرق کیے جائیں گے ۔

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾

پس جب تو اور جو تیرے ساتھ ہیں کشتی پر بیٹھ جاؤ ، تو کہہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے ، جس نے ہمیں ظالم قوم سے نجات دی ۔2261

وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾

اور کہہ اے میرے رب مجھے برکت والا اُتارنا اُتاریو اور تو سب اتارنے والوں سے بہتر ہے ۔2262

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿۳۰﴾

یقیناً اس میں نشان ہیں اور ہم آزمایش کرتے رہتے ہیں ۔2263

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۚ ﴿۳۱﴾

پھر ہم نے ان کے بعد ایک اور نسل پیدا کی ۔

فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ

پس ان میں انھی میں سے رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو

2259ء تیفضل ۔ تَفَضُّل یہ ہے کہ اپنے ہمسروں پر فضیلت کا دعوے کرے یعنی وہ چاہتا ہے کہ رسول بن کر عام لوگوں سے اس کی قدر و منزلت زیادہ ہو (ل)

2260ء بما کذبون میں با سبب کے لیے ہے یا بدل کے لیے اور آلہ کے لیے لے کر ایک یوں معنی بھی ہو سکتے ہیں اس چیز کے ساتھ میری مدد کر جس میں انھوں نے مجھے جھٹلایا ہے یعنی اس عذاب کو بھیج کر جس کا تو نے وعدہ کیا ہے ۔

2261ء حالانکہ قوم غرق ہو گئی تھی مگر ان کے غرق ہونے پر الحمد نہیں کہا بلکہ اپنی نجات پر اور نجات بھی ان لوگوں کے ہاتھ سے جنھوں نے ظلم کر کے چند خدا کے بندوں کو ہلاک کرنے کی ٹھان لی تھی ۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ کسی کی مصیبت پر خوش نہ ہونا چاہیئے ۔

2262ء مُنزل مصدر بھی ہو سکتا ہے بمعنی انزال اور اُترنے کی جگہ بھی مراد ہو سکتی ہے ۔ یہ دعا اس بنا پر کہ اذا استویت انت کے بعد آتی ہے کشتی میں داخل ہونے کے متعلق سمجھی گئی ہے مگر مجاہد اور ایک جماعت سے روایت ہے کہ یہ وہ دعا ہے جو حضرت نوح کو کشتی سے اُترنے کے وقت کرنے کا حکم تھا اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے ۔

2263ء اِن بمعنی اِنَّ ہے ۔ اور مراد قوم نوح کی آزمایش بھی ہو سکتی ہے مگر نشان کے ذکر کے لحاظ سے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے بندوں کی آزمائش مراد لی جائے یہ الفاظ ایک قانون کے رنگ میں ہیں یعنی ہمارا قانون یہ ہے کہ ہم بندوں کی آزمایش کرتے رہتے ہیں ۔ یعنی ان کی جودت اور رداءت کو ظاہر

اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ ع ۲

تمھارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، تو کیا تم تقوے اختیار نہیں کرتے ۲۲۶۴

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور اس کی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے تھے اور ہم نے انھیں دنیا کی زندگی میں آسودگی دی تھی کہنے لگے یہ کچھ نہیں مگر تم جیسا ایک انسان ہے اسی سے کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور اسی سے پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔

وَ لَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور اگر تم اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت کرو گے تو اس حال میں تم یقیناً نقصان اٹھانے والے ہو گے۔

اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَ كُنْتُمْ تُرَابًا وَّ عِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾

کیا وہ تمھیں ڈراتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو تم (پھر) نکالے جاؤ گے۔

هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾

بہت ہی دور (از عقل) بات ہے جس کا تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے ۲۲۶۵

اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾

یہ کچھ نہیں مگر صرف ہماری دنیا کی زندگی ہے ہم مرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں اور ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے ۲۲۶۶

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ِۨ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّ مَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾

وہ کچھ نہیں مگر صرف ایک شخص ہے جس نے اللہ پر جھوٹ افترا کیا ہے اور ہم اس پر ایمان لانے والے نہیں۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾

(رسول نے) کہا میرے رب میری مدد کر اس لیے کہ انھوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔

قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴿۴۰﴾

فرمایا تھوڑی ہی دیر میں یقیناً پشیمان ہوں گے ۲۲۶۷

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

تو ایک ہولناک آواز نے انھیں حق کے ساتھ آپکڑا سو ہم نے انھیں کوڑا کرکٹ کر دیا پس ظالم لوگوں کے لیے دوری ہے ۲۲۶۸

کرتے رہتے ہیں۔

ع۲۲۶۴ قوم نوح کے بعد جس قوم کا ذکر قرآن شریف نے کیا ہے وہ عاد ہی ہے واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح (الاعراف۔ ۶۹) اور ان کے رسول حضرت ہود علیہ السلام تھے۔

ع۲۲۶۵ ھیہات ایک کلمہ ہے جو کسی چیز کے دور کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے (غ) اور جو اسم اس کے ساتھ ہوتا ہے اس پر عرب لام داخل بھی کرتے ہیں جیسے یہاں اور نہیں بھی کرتے (ج)

ع۲۲۶۶ نموت و نحیا۔ ہم مرتے ہیں اور ہم زندہ ہوتے ہیں یعنی پچھلے مرتے چلے جاتے ہیں نئے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور بعض نے اس سے تناسخ کا عقیدہ نکالا ہے یعنی ان کا منشا یہ ہے کہ ہم جب مر جاتے ہیں تو کسی نئی صورت میں زندہ ہو کر آ جاتے ہیں اور بعثت یا نئی زندگی کوئی شے نہیں۔

ع۲۲۶۷ عما قلیل کی ترکیب ہے عن زمان قلیل اور ما جار و مجرور کے درمیان صلہ ہے جو قلت کے معنی کی تاکید کے لیے ہے۔

ع۲۲۶۸ غثاء۔ سیلاب اور ہانڈی کا غثاء وہ چیز ہے جو ایک چیز بھر کر متفرق ہو جائے۔ جیسے خشک شدہ نبات یا ہانڈی کی جھاگ اور اس کے ساتھ

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِیْنَ ﴿۴۲﴾

پھر ان کے بعد ہم نے اور نسلیں پیدا کیں۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا یَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾

کوئی قوم نہ اپنے وقت مقرر سے آگے جا سکتی ہے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾

پھر ہم نے اپنے رسول پے در پے بھیجے جب کبھی کسی قوم کے پاس اس کا رسول آیا انھوں نے اسے جھٹلایا تو ہم بھی ایک کے پیچھے دوسرے کو (ہلاکت میں) پہنچاتے رہے اور ہم نے انھیں کہانیاں بنا دیا پس ان لوگوں کے لیے دوری ہے جو ایمان نہیں لاتے ع۲۲۶۹

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ اَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۴۵﴾

پھر ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی آیتوں اور کھلی سند کے ساتھ بھیجا۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَ ﴿۴۶﴾

فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، مگر انھوں نے تکبر کیا اور وہ سرکش لوگ تھے۔

فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾

تو انھوں نے کہا کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لائیں اور ان کی قوم (کے لوگ) ہمارے خدمتگار ہیں ع۲۲۷۰

فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِیْنَ ﴿۴۸﴾

سو انھوں نے ان دونوں کو جھٹلایا تو ہلاک شدہ (قوموں) میں سے ہو گئے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی، تاکہ وہ ہدایت پائیں۔

وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْیَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰیَةً وَّ اٰوَیْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیْنٍ ﴿۵۰﴾ ع

اور ہم نے ابن مریم اور اس کی ماں کو ایک نشان بنایا ہے اور ان دونوں کو ایک بلند جگہ پر پناہ دی جو ہموار اور چشموں والی تھی ع۲۲۷۱

اس چیز کی مثال دی جاتی ہے جو ضائع ہو جائے اور اس کی کچھ قدر و قیمت نہ سمجھی جائے۔ بُعد کے لیے دیکھو ع۱۴۷۷۔

ع۲۲۶۹ تترٰی۔ مُواتَرَہ سے فَعْلیٰ ہے جس کا مادہ وَتر ہے اور مواترہ کے معنی ہیں وتر، وتر یعنی ایک ایک کر کے ایک کو دوسرے کے پیچھے لانا اور اس کی اصل واؤ ہے جو تا سے بدل گئی ہے (غ)

احادیث۔ دیکھو ع۱۵۱۶ د اور یہاں مراد ہے کہ ان کا ذکر صرف خبروں کے طور پر رہ گیا جن کے ساتھ مثال دی جائے (غ)

ع۲۲۷۰ عابدون۔ عَابِد کے معنی خادم مطیع بھی ہیں اور عبادت کرنے والے بھی۔ مگر یہاں خادم ہی مراد ہیں اس لیے کہ دوسری جگہ ہے وتلك نعمة تمنها علیّ ان عبّدت بنی اسرائیل (الشعراء ۲۶-۲۲) اور عَبَّدَ کے معنی ہیں اسے عبد یا غلام بنا لیا۔

ع۲۲۷۱ ربوۃ۔ کُلُّ ما ارتفع من الارض یعنی جو زمین بلند ہو اسے ربوہ کہا جاتا ہے (ل) اور وہ ایسی بلند زمین ہے جہاں پہاڑ نہ ہو (د) یعنی سطح مرتفع مکان مرتفع من الارض علی ما حوله (ج)

قرار کے معنی ٹھہرنا ہیں اور ذات قرار کے معنی ہیں ایسی زمین جس میں پانی ٹھہرے (ل) یا سطح مستوی یعنی ہموار جگہ (ج) یا پھلوں والی (ج)

معین۔ ماء معین اور ماء مَعْیُون کے ایک معنی ہیں ظاہر یعنی جسے آنکھ زمین پر چلتا دیکھے (ل) کیونکہ عین آنکھ کو کہتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ اور آپ کی والدہ کا نشان ہونا: ابن مریم اور اس کی ماں کو ایک نشان بنایا کس لحاظ سے ہے؟ مفسرین اکثر بن باپ پیدائش کی طرف ہی گئے ہیں مگر یہاں ذکر نیک لوگوں کی فلاح اور ان کے ظالموں کے ہاتھ سے نجات پانے کا ہے اور اسی کو بار بار نشان کہا گیا ہے ان فی ذٰلك لاٰیة اور قوم نوح کو

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝﴿۵۱﴾

اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور اچھے عمل کرو۔ میں اسے جو تم کرتے ہو جانتا ہوں ۲۲۷۲

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝﴿۵۲﴾

اور کہ یہ تمھاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمھارا رب ہوں سو میرا تقویٰ کرو۔

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝﴿۵۳﴾

پھر انھوں نے اپنے دین کو آپس میں قطع کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا سب گروہ اس پر جو ان کے پاس ہے خوش ہیں ۲۲۷۳

غرق کرنے کے بعد فرمایا وجعلنٰهم للنّاس اٰیۃ (الفرقان ۲۵-۳۷) پس قوم نوح اگر ہلاک کیا جانے کے لحاظ سے نشان ہے تو ابن مریم اور ان کی والدہ بچائے جانے کے لحاظ سے نشان ہیں۔ پس مراد ان کا نشان ہونا اسی لحاظ سے ہے کہ انہیں ظالم قوم کے ہاتھ سے نجات دی گئی اور قرآن کریم نے خود اس آیت کا بیان اگلے الفاظ میں کر دیا ہے۔

حضرت عیسٰی کو پناہ کہاں ملی: یہ جگہ کونسی تھی جہاں ابن مریم اور ان کی والدہ کو پناہ ملی۔ مفسرین کا اس میں بہت اختلاف ہے کوئی اسے فلسطین قرار دیتا ہے کوئی بیت المقدس کوئی دمشق اور کوئی مصر۔ مگر سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ قرآن شریف کے لفظ ربوۃ۔ ذات قرار۔ ذات معین ان میں سے کسی پر بھی صادق نہیں آتے۔ ربوۃ چاہتا ہے کہ بلند زمین ہو۔ ذات قرار چاہتا ہے کہ ہموار ہو۔ پہاڑ نہ ہو یا بہت پھلوں والی ہو۔ ذات معین چاہتا ہے کہ اس میں سطح زمین پر چشمے اور نہریں بہ رہی ہوں۔ ان تمام صفات میں اگر کوئی یکتا قطعہ زمین ہے تو وہ کشمیر ہے۔ اور فلسطین اور بیت المقدس اور مصر تو بہر حال نہیں کشمیر کی بلندی چار ہزار فٹ یا اس سے اوپر ہے۔ پھر یہ ذات قرار ہموار میدان ہونے کے لحاظ سے بھی ہے اور پھلوں والی جگہ ہونے کے لحاظ سے بھی، پھر چشمے بھی اس میں کثرت سے بہتے ہیں کہ ان کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہاں ایواء یا پناہ دینے کا ذکر ہے اور انبیاء کا جس قدر ذکر قرآن شریف میں ہے وہ بعد تبلیغ ظالم مخالفوں کے ہاتھ سے نجات دینے پر ہی ہے۔ پس حضرت عیسٰی کو جو یہ پناہ ملی ہے یہ بھی اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے ملی اور جیسا کہ ۷۶۲ میں دکھایا گیا ہے حضرت عیسٰی صلیب سے زندہ اتر آئے اور یہاں قرآن کریم نے اس عقدہ کو حل بھی کر دیا کہ صلیب سے زندہ اُتر کر پھر کیا ہُوا۔ اور یہاں بتا دیا کہ انہیں اور ان کی والدہ کو ایک اور ملک میں پناہ ملی اور اس کا نقشہ ایسا بتا دیا کہ دنیا کے کسی دوسرے حصہ ملک پر وہ صادق نہیں آسکتا۔ گویا فلسطین سے انہوں نے ہجرت کی۔

یوز آسف نبی کی قبر حضرت عیسٰی کی قبر ہے: کشمیر میں حضرت عیسٰی کا آنا تاریخ سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ محلہ خان یار شہر سرینگر میں ایک قبر ہے جو یوز آسف کی قبر کے نام سے موسوم ہے اور جسے نبی صاحب کی قبر بھی کہا جاتا ہے اور یہ نہ صرف زبانی روایتوں سے ہی معلوم ہوتا ہے بلکہ تاریخ اعظمی کشمیر جسے لکھے ہوئے ڈیڑھ سو سال گزر چکا ہے اس میں صفحہ ۸۲ پر اس قبر کا ذکر بدیں الفاظ ہے کہ یہ قبر عام طور پر ایک نبی کی قبر مشہور ہے اور کہ وہ ایک شہزادہ تھا جو کشمیر میں کسی دوسرے ملک سے آیا اور کہ اس کا نام یوز آسف تھا۔ اب یہ امر غور طلب ہے کہ آنحضرت صلعم کے بعد تو کوئی نبی ہوا نہیں اور نہ کسی ولی کی قبر نبی کی قبر کہلا سکتی تھی۔ اور نبی کا لفظ عربی اور عبرانی زبانوں کا ہے پس لازماً یہ کوئی عبرانی نبی ہیں عرصہ جو روایتاً بیان کیا جاتا ہے وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانہ سے ملتا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ نام یوز یا یوس (کیونکہ س۔ ز سے بدل جاتا ہے) اور یسوع باہم ملتے ہیں یہ دلائل ایک زبردست قرینہ ہیں کہ وہ قبر جو محلہ خانیار میں ہے وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی قبر ہی ہے اور کسی نبی کی قبر نہیں۔

افغانوں اور کشمیریوں کا بنی اسرائیل سے ہونا: علاوہ ازیں اور بھی وجوہات ہیں کہ حضرت عیسٰی مشرق کی طرف آئے۔ افغان اب تک اپنے آپ کو بنی اسرائیل بتاتے ہیں اور ان کی روایات سے رسم و رواج سے ان کے نقشوں سے ان کا بنی اسرائیل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہی بات اہل کشمیر کے متعلق معلوم ہوتی ہے اور کشمیر کے بہت سے شہروں کے نام فلسطین کے شہروں پر ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کچھ حصہ بنی اسرائیل کا ایام جلاوطنی میں افغانستان اور کشمیر میں آباد ہوا اور حضرت عیسٰی کو جب یہود فلسطین کی ایذا دہی سے ہجرت کرنی پڑی تو آپ نے ان اقوام بنی اسرائیل کی طرف رُخ کیا جو اپنے وطن سے الگ ہو چکی تھیں اور حدیث میں جو آتا ہے انّ عیسٰی عاش مائۃ وعشرین سنۃ یعنی حضرت عیسٰی ایک سو بیس سال زندہ رہے اس کی رو سے بھی ضروری ٹھہرتا ہے کہ بقیہ عمر آپ نے کہیں اور گزاری ہو۔

۲۲۷۲ یہ خطاب حضرت عیسٰی علیہ السلام کو ہے اور ایک شخص کے لیے بعض وقت جمع کا صیغہ استعمال ہو جاتا ہے (ج) اور مراد یہ ہے کہ ہم نے جب عیسٰی اور ان کی والدہ کو اچھی جگہ پر پناہ دی تو ساتھ ہی ان کو یہ بھی کہہ دیا کہ طیّبات سے کھاؤ (ر) جس سے معلوم ہوا کہ وہ خطۂ زمین پھلوں والا بھی تھا جیسا کہ ذات قرار کے معنی میں بیان ہوا ہے۔ اور یا یہ حکایت کے طور پر ہے کہ ہر رسول سے اس کے زمانہ میں یوں ہی خطاب ہوا تھا اور اب گویا نبی کریم صلعم کو انہی الفاظ میں خطاب ہوتا ہے اور امام راغب کہتے ہیں کہ رسل کے لفظ میں نبی کریم صلعم کے ساتھ آپ کے برگزیدہ اصحاب شامل ہیں۔

۲۲۷۳ مذاہب مختلفہ کا باہمی فساد اور کل دنیا کی طرف ایک رسول کا آنا: مختلف رسولوں کا ذکر کرنے سے منشا یہ ہے کہ سب خدا کی طرف سے آئے اور اصلاح

فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۴﴾
سو انھیں اپنی جہالت میں ایک وقت تک پڑا رہنے دے۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۵۵﴾
کیا یہ خیال کرتے ہیں یہ جو ہم ان کو مال اور بیٹوں سے مدد دے رہے ہیں

نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾
تو ہم ان کو بھلائی پہنچانے میں جلدی کر رہے ہیں بلکہ وہ محسوس نہیں کرتے ۲۲۷۴

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾
جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں ۲۲۷۵

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾
اور وہ جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾
اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ (کسی کو) شریک نہیں کرتے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾
اور وہ جو دیتے ہیں جو کچھ کہ وہ دیتے ہیں حالانکہ ان کے دل خوف سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ ۲۲۷۶

اُولٰۗىِٕكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾
یہ لوگ نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں اور وہ ان کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں ۲۲۷۷

خلق ان کے مدنظر تھی سب کے حالات ان کا دشمنوں کے ہاتھ سے نجات پانا اور اللہ تعالیٰ کی توحید کو دنیا میں قائم کرنا یکساں تھا۔ اسی لیے پہلے یاایھا الرسل میں سب کو ایک ہی لفظ سے خطاب کیا پھر ان کی بعثت کا مقصد ایک ہونے کا ذکر اور بھی صراحت سے ان الفاظ میں کیا ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ یعنی رسولوں کی جماعت ایک ہی جماعت ہے اور ان کی بعثت کی غرض دنیا میں اس بات کا قائم کرنا ہے کہ سب کا رب اللہ ہے اس کا تقویٰ اختیار کیا جائے لیکن ان کے پیروؤں نے اس واحد مقصد کو ملیا میٹ کر دیا اور امر دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ہر گروہ صرف جو اس کے اپنے پاس تھا اس پر خوش ہو گیا۔ اور دوسرے رسولوں کی رسالت کا انکار کر دیا اور نسل انسانی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ یہ اس آیت کا مضمون ہے اور اس کے بیان کرنے کی غرض صاف ہے کہ اس حالت میں ضروری تھا کہ سب کو ایک دین پر جمع کرنے کے لیے اور اس حقیقت کو دنیا میں آشکارا کرنے کے لیے کہ سب مذاہب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں ایک رسول مبعوث ہوتا۔ جیسا کہ آگے چل کر تبارک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہ لیکون للعالمین نذیرا (الفرقان ۲۵-۱) میں بیان فرمایا۔

۲۲۷۴ دنیا کا مال اور جتھہ کامیابی نہیں: یہاں بتایا ہے کہ لوگ دنیا کے مال اور جتھے کو یعنی دنیوی طاقت کو ہی کامیابی سمجھ لیتے ہیں حالانکہ وہ فلاح سے اتنے دور پڑے ہوئے ہیں کہ ان کو یہ احساس بھی نہیں کہ فلاح کسے کہتے ہیں اور حقیقی کامیابی بلند اخلاق سے ہے نہ مال و دولت سے۔ اسی کو غمرۃ یعنی ان کی جہالت کہا ہے جس میں وہ ڈوبے ہوئے ہیں اور اسی لیے اس کے بالمقابل اگلی آیات میں پھر اللہ تعالیٰ سے تعلق کا ذکر کیا ہے جو اخلاق فاضلہ کی بنیاد ہے۔

۲۲۷۵ مشفقون۔ شَفَق دن کی روشنی کا رات کی سیاہی سے مل جل جانا ہے۔ جو غروب آفتاب کے وقت ہوتا ہے فلا اقسم بالشفق (الانشقاق ۸۴-۱۶) اور اِشفاق فکر ہے جو خوف کے ساتھ ملا ہوا ہو وھم من الساعۃ مشفقون (الانبیاء ۲۱-۴۹) اور جب اس کا صلہ مِن ہو تو خوف کے معنی اس میں غالب ہوتے ہیں اور فی صلہ ہو تو فکر کے معنی غالب ہوتے ہیں انا کنا قبل فی اھلنا مشفقین (الطور ۵۲-۲۶) مشفقین مما کسبوا (الشوریٰ ۴۲-۲۲) ءاشفقتم ان تقدموا (المجادلۃ ۵۸-۱۳) (غ) اور شفقۃ اسی سے اسم ہے چنانچہ کہتے ہیں اَشْفَقْتُ علیہ وانا مُشْفِق وشفیق (ل)۔

۲۲۷۶ یؤتون ما اٰتوا۔ ایتا کے معنی اعطاء یا دینا ہیں اور صدقات کے دینے پر بالخصوص بولا گیا ہے تو مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور ان کا خوف اس لیے ہوتا ہے کہ ان کا دینا اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہوگا یا نہیں یا اس لیے کہ کافی طور پر اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہے یا نہیں اور ان آیات میں دو ہی باتوں کا ذکر کیا ایک اللہ تعالیٰ کا خوف اور عظمت دل میں ہونا اور اس کی توحید پر قائم ہونا اور دوسرے اپنے مال کو مخلوق خدا کی خدمت میں لگا دینا

۲۲۷۷ اوپر کہا تھا کہ مال اور جتھہ خیرات نہیں یعنی ایسی بھلائیاں جو انسان کی فلاح کا موجب ہوتی ہیں تو اب اللہ تعالیٰ سے تعلق اور مخلوق خدا کی خدمت کا ذکر کر کے بتایا کہ خیرات یہ ہیں یعنی انسان کی فلاح کا تعلق ان چیزوں سے ہے اور جو لوگ بجائے دنیا کے مال پر جھکنے کے ان کے لینے کے لیے جلدی کرتے ہیں وہ ان خیرات کی وجہ سے سابق بن جاتے ہیں یعنی دوسرے لوگوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتَٰبٌ يَنطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٦٢﴾

اور ہم کسی شخص پر کچھ بوجھ نہیں ڈالتے مگر اس کی طاقت کے مطابق اور ہمارے پاس کتاب ہے جو سچ سچ بتا دیتی ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ۲۲۷۸

بَلْ قُلُوبُهُمْ فِي غَمْرَةٍ مِّنْ هَٰذَا وَلَهُمْ أَعْمَٰلٌ مِّن دُونِ ذَٰلِكَ هُمْ لَهَا عَٰمِلُونَ ﴿٦٣﴾

بلکہ ان کے دل اس سے غفلت میں ہیں، اور اس کے سوائے ان کے اور عمل بھی ہیں جو وہ کرتے رہتے ہیں ۲۲۷۹

حَتَّىٰٓ إِذَآ أَخَذْنَا مُتْرَفِيهِم بِالْعَذَابِ إِذَا هُمْ يَجْـَٔرُونَ ﴿٦٤﴾

یہاں تک کہ جب ہم ان کے آسودہ حال لوگوں کو عذاب میں پکڑیں گے تو اس وقت وہ چلانے لگیں گے ۲۲۸۰

لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ إِنَّكُم مِّنَّا لَا تُنصَرُونَ ﴿٦٥﴾

آج مت چلّاؤ، تمھیں ہماری طرف سے کوئی مدد نہیں دی جائے گی۔

قَدْ كَانَتْ ءَايَٰتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُمْ عَلَىٰٓ أَعْقَٰبِكُمْ تَنكِصُونَ ﴿٦٦﴾

میری آیتیں تمھارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم اپنی ایڑیوں پر اُلٹے پھر جاتے تھے ۲۲۸۱

مُسْتَكْبِرِينَ بِهِۦ سَٰمِرًا تَهْجُرُونَ ﴿٦٧﴾

اکڑتے ہوئے اسے مشغلہ بناتے ہوئے بکواس کرتے تھے ۲۲۸۲

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَآءَهُم مَّا

تو کیا انھوں نے (اس) بات پر غور نہیں کیا بلکہ ان کے پاس وہ بات

۲۲۷۸ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام انسان کی فلاح کے لیے دیئے ہیں یا جو راہیں ترقی کی اسے بتائی ہیں تو یہ کوئی ایسے امور نہیں جو عام انسانوں کی وسعت سے باہر ہوں۔ اور کتاب ینطق بالحق میں اپنا قانون بیان فرمایا کہ اعمال کے نتائج پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ جو کچھ انسان کرتا ہے اسی کے مطابق نتیجہ پاتا چلا جاتا ہے ؁

۲۲۷۹ ان کے دل جہالت میں ہیں یعنی اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ترقی کی راہیں انسان کے اخلاق میں مضمر ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ پھر طرح طرح کی بدعملیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں؁

۲۲۸۰ اہل مکہ پر عذاب قحط گو ان الفاظ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جب انہیں عذاب میں پکڑیں گے تو وہ چلائیں گے لیکن آیت ۷۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی کوئی عذاب ان پر آیا تھا اور چونکہ یہ سورت مکّی ہے اس لیے غالباً یہ عذاب قحط تھا جس کے لیے نبی کریم صلعم نے دعا بھی کی تھی اور جس کا ذکر قرآن کریم میں پیشگوئی کے طور پر سورۃ الدخان میں آتا ہے (الدخان ۴۴ - ۱۰ تا ۱۲) اور احادیث میں ہے کہ یہ قحط اس قدر شدید ہوا کہ انہوں نے مردار اور چمڑے اور ہڈیاں کھائیں اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبل از ہجرت تھا اور بعض سے یہ کہ یہ بعد از ہجرت تھا اور چونکہ یہ سات سال کا قحط تھا اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ ہجرت سے قبل شروع ہو کر بعد تک رہا۔

۲۲۸۱ تنکصون۔ نکص کے معنی ہیں ایک امر سے پھر گیا یا بھلائی کی جس حالت پر تھا اس سے لوٹ گیا اور یہ خصوصیت سے بھلائی سے لوٹ جانے پر بولا جاتا ہے (ل)

۲۲۸۲ سامرا۔ سُمرۃ گندم گوں رنگ کو کہتے ہیں اور سَمر رات کی سیاہی کو اور رات کے وقت باتیں کرنے کو بھی کہا جاتا ہے اور یہاں سامر جمع کے مقام پر استعمال ہوا ہے (غ)

تہجرون۔ ھجر کے اصل معنی دوسرے سے الگ ہو جانا ہیں اور ھُجر وہ کلام ہے جس کی برائی کی وجہ سے اسے ترک کر دیا گیا ہو اس لیے اَھجَر کے معنی ہیں قصداً ایسا کلام کیا اور ھجَرَ المریضُ کے معنی ہیں بلا قصد ایسا کلام کیا (غ)

مستکبرین بہ میں جمہور مفسرین نے مراد لیا ہے خانہ کعبہ کی وجہ سے متکبر بنے ہوئے تھے مگر ضمیر کا قرآن شریف کی طرف پھیرنا جس کا ذکر آیاتی میں ہے اولیٰ ہے اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کو سنکر متکبرانہ روش سے چھوڑ جاتے تھے اور سامرا میں ان کا خانہ کعبہ میں بیٹھ کر رات کے وقت قرآن شریف کے متعلق طرح طرح کی باتیں بنانا ہے گویا قرآن شریف کا ذکر ایک مشغلہ کے طور پر کرتے تھے ؁

لَمْ يَأْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾
اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ
مُنْكِرُوْنَ ﴿۶۹﴾

آئی ہے جوان کے پہلے باپ دادوں کے پاس نہ آئی تھی ۲۲۸۳ع
کیا انھوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا اس لیے وہ اس سے منکر ہیں ۲۲۸۴ع

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ
بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾

کیا کہتے ہیں اسے جنون ہے بلکہ وہ ان کے پاس حق لایا ہے، اور ان میں سے اکثر حق کو ناپسند کرتے ہیں ۲۲۸۵ع

وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ
السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ
بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ
ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾

اور اگر حق ان کی خواہش کے مطابق ہوتا تو آسمان اور زمین اور جو کوئی ان کے اندر ہیں بگڑ جاتے بلکہ ہم ان کے پاس ان کی بڑائی (کا سامان) لائے ہیں سو وہ اپنی بڑائی سے منہ پھیرنے والے ہیں ۲۲۸۶ع

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖۗ
وَّ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۷۲﴾

کیا تو ان سے کچھ صلہ مانگتا ہے تو تیرے رب کا صلہ بہتر ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔

وَ اِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۳﴾

اور یقیناً تو انھیں سیدھے رستہ کی طرف بلاتا ہے۔

وَ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۴﴾

اور وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے، رستہ سے ہٹ رہے ہیں ۲۲۸۷ع

وَ لَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ
ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۵﴾

اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور جو انھیں تکلیف ہے اسے دُور کردیں تو وہ اپنی سرکشی میں حیران پھرتے ہوئے اصرار کریں ۲۲۸۸ع

۲۲۸۳ع اَم کا استعمال کئی وجہ پر ہے۔ کبھی وہ متصلہ ہوتا ہے اور اس سے پہلے ہمزۂ تسویہ آتا ہے جیسے سواء علیھم استغفرت لھم ام لم تستغفر لھم (المنٰفقون ۶۳-۶) سواء علینا اجزعنا ام صبرنا (ابراھیم ۱۴-۲۱) اور یا اس سے پہلے ہمزہ طلب آتا ہے جیسے ءانتم اشد خلقا ام السماء (النّٰزعٰت ۷۹-۲۷) اور دوسرا یہ کہ وہ منقطعہ ہوتا ہے اور اس صورت میں یا اس سے پہلے محض ایک خبر ہوتی ہے تنزیل الکتاب لاریب فیہ من رب العالمین ام یقولون افترٰہ (السجدۃ ۳۲-۲ و ۳) یا اس سے پہلے ہمزہ ہوتا ہے جو استفہام کے لیے نہ ہو جیسے اَلھم ارجل یمشون بھا ام لھم اید یبطشون بھا (الاعراف ۷-۱۹۵) جہاں ہمزہ انکار کے لیے ہے یا اس سے پہلے استفہام بغیر ہمزہ ہوتا ہے جیسے ھل یستوی الاعمٰی والبصیر ام ھل تستوی الظلمٰت والنور ام جعلوا للّٰہ شرکاء (الرعد ۱۳-۱۶) جہاں مراد ان کے شرک کی خبر دینا ہے اس صورت میں یہ بمعنی بَل یعنی بلکہ ہوتا ہے (مغنی) اور یہاں اَم بمعنی بَل ہے اور مراد ذکر یا قرآن کا آنا ہے اور یا مراد آرام اور آسایش ہے کہ ان کو اتنی آسودگی ملی ہے جو ان کے باپ دادوں کو نہیں ملی تھی۔ اس لیے قرآن پر غور نہیں کرتے۔

۲۲۸۴ع مطلب یہ ہے کہ رسول کو تو یہ پہچانتے ہیں اس کے کوئی حالات ان سے مخفی نہیں۔ وہ آپ کی نیکی کے اس حد تک معترف تھے کہ آپ کو الامین کے نام سے پکارتے تھے۔ پس ایسے (استبعاد) انسان کا جسے بچپن سے جانتے تھے انکار جائے تعجب تھا۔

۲۲۸۵ع یعنی رسول کو تو پہچانتے ہیں کہ وہ صادق اور امین ہے مگر وہ حق جو وہ اللّٰہ تعالیٰ کی طرف سے لایا ہے وہ پسند نہیں۔

۲۲۸۶ع آسمان و زمین کا نظام تو پابندیٔ قانون پر ہے مگر وہ اپنی خواہشات کی پیروی میں کسی قانون کا پابند ہونا نہیں چاہتے اگر حق بھی ایسا ہی ہوتا تو نظام عالم قائم نہ رہتا۔ اس قانون کی اتباع میں ان کے لیے عزو شرف ہے جس سے وہ منہ پھیر رہے ہیں۔

۲۲۸۷ع ناکبون۔ نَکَبَ عَنْ کَذَا کے معنی ہیں اس چیز سے دوسری طرف مائل ہو گیا۔

۲۲۸۸ع لجوا۔ لَجاج سرکشی اور عناد کو کہتے ہیں جو ایسے فعل کے کرنے میں دکھائے جائیں جس سے روکا گیا ہو۔ اور لُجَّۃُ البحر اس کی امواج کا پھر پھر کر

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۷۶﴾
اور ہم نے انھیں عذاب میں پکڑا، مگر وہ اپنے رب کے آگے نہ گرے اور یہ عاجزی کرتے ہی نہیں ۲۲۸۹

حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۷﴾ ع
یہاں تک کہ جب ہم ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے پھر ناگہاں وہ اس میں مایوس ہو جائیں گے۔

وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾
اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے بہت ہی کم تم شکر کرتے ہو۔

وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۹﴾
اور وہی ہے جو تمھیں زمین کے اندر وجود میں لاتا ہے اور اسی کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے ۲۲۹۰

وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۸۰﴾
اور وہی ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے اور رات اور دن کا اختلاف اسی (کے اختیار) کا ہے تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾
بلکہ اسی کی طرح کہتے ہیں جو پہلوں نے کہا۔

قَالُوْۤا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾
کہتے ہیں کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔

لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾
ہمیں اور ہمارے باپ دادوں کو پہلے سے یہی وعدہ دیا جاتا رہا ہے یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾
کہہ زمین اور جو اس میں ہیں وہ کس کے لیے ہیں اگر تم جانتے ہو۔

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾
کہیں گے اللہ کے لیے کہہ تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾
کہہ ساتوں آسمانوں کا رب اور بڑے عرش کا رب کون ہے۔

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾
کہیں گے اللہ کے لیے ہی ہے کہہ تو کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ
کہہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے

آتا ہے اسی سے ہے بحر لجیّ (النور ۲۴-۴۰) (غ) وحسبتہ لجۃ (النمل ۲۷-۴۴)

۲۲۸۹ استکانۃ اور تضرع دونوں اظہار عاجزی کے لیے ہیں مگر استکانۃ میں اظہار عاجزی فرمانبرداری کے اختیار کرنے سے ہے دیکھو ۵۳۲ اور تضرّع میں اس کا تعلق دل سے ہے اسی لیے دعا میں تضرع ہوتا ہے ۹۵۷ یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ عذاب کی اصل غرض صرف انسان کو خدا کی طرف جھکانا ہے اور اگلی آیت میں بتایا کہ سخت عذاب آنے پر رحمت الٰہی سے بھی مایوس ہو جاتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ رحم کرنے کے لیے تیار ہے۔

۲۲۹۰ ذرا۔ ذرْأ۔ اللہ تعالیٰ کا اس کو ظاہر کرنا ہے جس کی اس نے ابتدا کی اور ذَرَأَ اللہُ الْخَلْقَ کے معنی ہیں مخلوق کے اشخاص کو وجود میں لایا (غ) اور یذرؤکم فیہ (الشوریٰ ۴۲-۱۱) میں معنی یکثرکم فیہ کیے گئے ہیں (ل) یعنی تمہیں بڑھاتا اور پھیلاتا ہے۔

وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابل پناہ نہیں ملتی اگر تم جانتے ہو۔

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾

کہیں گے اللہ کے لیے ہی ہے کہہ پھر تمھیں کہاں سے دھوکا لگتا ہے

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾

بلکہ ہم اُن کے پاس حق لائے ہیں اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں ع۲۲۹۱

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾

اللہ نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا معبود ہے اس صورت میں ہر ایک معبود اسے لیجاتا جو اس نے پیدا کیا ہوتا اور ان میں سے ایک دوسرے پر بڑائی حاصل کرنے میں لگا رہتا، اللہ اس سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں ع۲۲۹۲

عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾ ع ۱۵

غیب اور حاضر کا جاننے والا، سو وہ اس سے بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾

کہہ میرے رب اگر تو مجھے وہ دکھائے جس کا انھیں وعدہ دیا جاتا ہے۔

رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾

میرے رب تو مجھے ظالم لوگوں میں نہ رکھیو ع۲۲۹۳

وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾

اور ہم اس پر کہ تجھے وہ دکھائیں جس کا انھیں وعدہ دیتے ہیں قادر ہیں۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾

بدی کو اس (بات) کے ساتھ دور کر جو بہت اچھی ہے ۔ ہم خوب جانتے ہیں جو وہ بیان کرتے ہیں ع۲۲۹۴

ع۲۲۹۱ یہ حق توحید ہے۔ اوپر کی آیات میں تین باتوں کا اثبات کیا ہے۔ آیت ۸۴ و ۸۵ میں خلق کا اثبات صرف اللہ کے لیے ہے اور آیت ۸۶ و ۸۷ میں ربوبیت کا اور آیت ۸۸ و ۸۹ میں حکومت کا اور ان باتوں کا اقرار کفار کے منہ سے کرایا ہے۔ کیونکہ ان باتوں کا اقرار مشرکوں کو بھی ہے کہ خلق اور ربوبیت اور حکومت اللہ تعالیٰ کا ہی کام ہے نہ مسیح کا نہ بتوں کا اور آخر پر فرمایا کہ دوسرے معبود بنانے میں خواہ وہ مسیح کی طرح خدا کا بیٹا کہلائے یا کوئی بت وغیرہ ہو مشرک جھوٹے ہیں۔

ع۲۲۹۲ شرک کے خلاف ایک دلیل: جب دو بادشاہ ایک ملک میں نہیں ہو سکتے تو اتنی بڑی مخلوق کا انتظام کس طرح قائم رہ سکتا ہے اگر خدا کے ساتھ کوئی اور بھی شریک ہو۔ کیسی سیدھی اور قطعی دلیل ہے۔

ع۲۲۹۳ مخالفین کا استیصال آپ کی زندگی میں: اس دعا کا منشا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نزول عذاب اس حالت میں نہ ہو کہ آپ ان ظالم لوگوں کے اندر ہوں کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ (الانفال - ۲۵) کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ اگلی آیت میں بتا دیا کہ ان لوگوں کی قوت کا استیصال جنھوں نے حق کا استیصال کرنا چاہا آپ کی زندگی میں ہو جائے گا۔

ع۲۲۹۴ بدی کے مقابل پر نیکی کی تعلیم احسن پیرایہ میں: جو تمہارے ساتھ بدی کرتا ہے تم اس کے ساتھ نیکی کرو یہ تمام راستبازوں کی تعلیم ہے اور حضرت مسیح کے ساتھ اسے کوئی خصوصیت حاصل نہیں۔ لیکن یہ تعلیم باوجود ایک بلند پایہ تعلیم ہونے کے ہر حالت میں عمل میں نہیں آ سکتی۔ قرآن کریم چونکہ ایک کامل کتاب تھی اس لیے اس بلند پایہ تعلیم میں جو نقص تھا اسے دور کر کے پیش کیا ہے اور اس نقص کو دور کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا لفظ ادفع اختیار فرمایا ہے یعنی بدی کو دفع کرنا اصل غرض ہو اگر ایک بدی بالمقابل نیکی کرنے سے دور نہیں ہو سکتی تو اس وقت نیکی کرنے کا حکم قرآن شریف نے نہیں دیا بلکہ پھر جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا بھی ہے بہرحال مقدم امر بدی کا دفع کرنا ہے اور اس کے دفع کرنے میں بہترین طریق اختیار کرنے کا حکم ہے اور یہ بہترین طریق بعض وقت بالمقابل نیکی کا اختیار کرنا ہے بعض وقت صرف بدی سے درگزر کرنا۔ بعض وقت اس پر ملامت کرنا۔ بعض وقت اس کی سزا دینا۔

وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ ﴿۹۷﴾
اور کہہ میرے رب مَیں شیطانوں کی عیب جوئی سے تیری پناہ مانگتا ہوں ۲۲۹۵ع

وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾
اور میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے سامنے آئیں۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾
تو جب ان میں سے ایک کو موت آتی ہے کہتا ہے میرے رب مجھے لوٹاؤ ۲۲۹۶ع

لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآىِٕلُهَا ؕ وَ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾
تاکہ مَیں اس میں جسے چھوڑ آیا ہوں اچھا عمل کروں۔ ہرگز نہیں وہ ایک بات ہے جسے وہ کہے گا اور ان کے سامنے ایک روک ہے اس دن تک کہ وہ اٹھائے جائیں ۲۲۹۷ع

ع۲۲۹۵ ھمزات ھمزۃ کی جمع ہے ھمز کے معنی غمز ہیں یعنی اشارہ کیا اور جانور کو چلنے کا اشارہ کرنے پر بھی بولا جاتا ہے اسی سے مِھْماز ہے جس سے جانور کو چلایا جاتا ہے اور ھمز کے معنی عیب ہیں۔ اور ھُمَزَۃ اور ھماز عیب لگانے والے کو کہا جاتا ہے جو پیٹھ پیچھے عیب لگائے اور لمزۃ وہ ہے جو سامنے عیب لگائے اور ھمزات الشیطٰن شیطان کے وساوس یا خطرات کو کہا جاتا ہے اور حدیث میں دعائے افتتاح صلوٰۃ آتی ہے اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ من الشیطانِ الرجیم من ھمزہٖ ونفثہٖ ونفخہٖ تو دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ اس کا ھمز اور نفث اور نفخ کیا ہے تو فرمایا اس کا ھمز جنون ہے اور اس کا نفث شعر ہے اور اس کا نفخ کبر ہے (ل) اور ھمز کے معنی غضر یا دبانا بھی ہیں اور انسان کا ھمز اس کی پیٹھ پیچھے اس کے عیب بیان کرنا ہے (غ)۔

یحضرون۔ حضر اصل میں بدو کے خلاف ہے یعنی جنگل یا گاؤں میں رہنے کے۔ پھر کسی مکان میں جانے یا کسی انسان کے پاس جانے یا اور کسی قسم کی موجودگی پر یہ لفظ بولا گیا ہے اور مُحْضَر وہ چیز ہے جو سامنے لائی جائے ماعملت من خیر محضرا (آل عمران ۳-۳۰) جمیع لدینا محضرون (یٰسٓ ۳۶-۳۱) (غ)

آنحضرت کا وساوس شیطانی سے محفوظ ہونا: عام طور پر یہاں ھمزات الشیاطین سے مراد وساوس شیطانی لیے گئے ہیں اور آنحضرت کو یہ حکم ہونا کہ وساوس شیطانی سے اللہ کی پناہ مانگو بتاتا ہے کہ آپؐ وساوس شیطانی سے محفوظ تھے کیونکہ جو اللہ کی پناہ میں آتا ہے وہ شیطان سے محفوظ ہو جاتا ہے اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا میرا شیطان میرا فرمانبردار ہو گیا ہے اور وہ سوائے بھلائی کے مجھے کسی چیز کا حکم نہیں کرتا اور قرآن کریم میں کہیں ذکر نہیں کہ کبھی شیطان نے کوئی وسوسہ آنحضرت صلعم کے دل میں ڈالا ہاں انجیل میں یہ ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شیطان نے بعض باتیں کہی تھیں جس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ وساوس آپ کے دل میں ڈالے تھے چنانچہ اس کا ذکر متی ۴: ۱ تا ۱۰ میں ہے گو حضرت عیسیٰؑ نے ان وساوس کو رد کر دیا اور انہیں قبول نہیں کیا مگر آنحضرتؐ کا مقام بہت بلند ہے لیکن اگر سیاق پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہاں شیاطین سے مراد رؤسائے کفار ہیں اور ان کے ہم ذات سے مراد ان کی عیب جوئی اور بدگوئی ہے جو وہ رسول اللہ صلعم کی کرتے تھے چنانچہ اوپر کی آیت میں نحن اعلم بما یصفون میں صاف ان کی ان بدگوئیوں کا ذکر ہے اور انہی کے مقابل پر ادفع بالتی ھی احسن بھی فرمایا تھا اور بعد کی آیت میں صاف فرمایا حتی اذا جاء احدھم الموت یعنی انہیں شیطانوں میں سے ایک کو موت آتی ہے تو وہ یوں کہتا ہے جس سے صاف معلوم ہوا کہ اوپر ذکر رؤسائے کفر کا تھا اور جنہوں نے وساوس شیطانی مراد لیے ہیں وہ کوئی تعلق اس مضمون کا نہ اگلے مضمون سے بتا سکتے ہیں نہ پچھلے سے۔

ع۲۲۹۶ جمع کے خطاب سے مراد تکرار فعل بھی ہوتا ہے: ارجعون اصل میں ارجعونی ہے اور ارجعوا جمع کا صیغہ ہے جو بعض کے نزدیک بلحاظ تعظیم کے ہے۔ بعض کے نزدیک خطاب ملائکہ کو ہے اور اصل یہ ہے۔ کہ تثنیہ یا جمع کی ضمیر بعض وقت تکرار کے لیے آجاتی ہے جیسا دوسری جگہ آتا ہے القیا فی جہنم جہاں مطلب ہے الق الق اور یہاں مراد ہے ارجعنی ارجعنی ارجعنی۔

ع۲۲۹۷ کلا بعض کے نزدیک ک تشبیہ اور لا نافیہ سے مرکب ہے اور بعض کے نزدیک بسیط ہے وہ کلمہ زجر ہے یعنی ایک چیز سے روکنے کے لیے آتا ہے (مغنی)
برزخ۔ دو چیزوں کے درمیان روک اور حد کو کہتے ہیں بینھما برزخ لایبغیٰن (الرحمٰن ۵۵-۲۰) اور برزخ وہ حالت ہے جو انسان کی موت سے لے کر قیامت تک ہے (غ)
فیما ترکت میں اشارہ ایمان کی طرف ہے جسے پہلے چھوڑ دیا اور یہ خواہش کفار سے خاص نہیں بلکہ ابن عباس کہتے ہیں زکوٰۃ اور حج کو چھوڑنے والے بھی یہی خواہش کریں گے اور حدیث میں ہے کہ ہر چیز جو انسان کو قبول حق میں مانع ہوتی ہے موت کے وقت اس کے سامنے آجاتی ہے اور وہ خواہش کرتا ہے کہ اسے واپس بھیجا جائے من ورائھم برزخ الی یوم یبعثون میں بتا دیا کہ موت کے بعد حالت برزخ ہے اور انسان کی دوبارہ زندگی پھر یوم البعث میں ہی ہو گی اور اس سے پیشتر وہ کبھی زندگی کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔

عالم برزخ: قرآن کریم اور احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد عذاب اور ثواب کا ایک رنگ شروع ہو جاتا ہے گو اس کا کامل ظہور قیامت کے دن

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَلَاۤ اَنۡسَابَ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾

سوجب صور میں پھونکا جائے گا تو اس دن ان میں رشتہ داریاں نہ رہیں گی اور نہ ایک دوسرے سے (حال) دریافت کریں گے[۲۲۹۸]

فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾

پس جس کے اچھے عمل بھاری ہوں گے تو وہی کامیاب ہوں گے۔

وَمَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ فِیۡ جَہَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾

اور جس کے اچھے عمل ہلکے ہوں گے پس وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں رکھا، جہنم میں رہیں گے۔

تَلۡفَحُ وُجُوۡہَہُمُ النَّارُ وَہُمۡ فِیۡہَا کٰلِحُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾

آگ ان کے مونہوں کو جھلس دیگی اور وہ اس میں بُرے منہ بنائے ہوئے ہونگے[۲۲۹۹]۔

اَلَمۡ تَکُنۡ اٰیٰتِیۡ تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ فَکُنۡتُمۡ بِہَا تُکَذِّبُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾

کیا میری آیتیں تم پر نہ پڑھی جاتی تھیں، تو تم انھیں جھٹلاتے تھے۔

قَالُوۡا رَبَّنَا غَلَبَتۡ عَلَیۡنَا شِقۡوَتُنَا وَکُنَّا قَوۡمًا ضَآلِّیۡنَ ﴿۱۰۶﴾

کہیں گے اے ہمارے رب ہماری بدبختی ہم پر غالب آگئی اور ہم گمراہ قوم تھے۔

رَبَّنَاۤ اَخۡرِجۡنَا مِنۡہَا فَاِنۡ عُدۡنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۰۷﴾

اے ہمارے رب ہمیں اس سے نکال دے پھر اگر ہم دوبارہ یہ کام کریں تو ہم ظالم ہوں گے۔

قَالَ اخۡسَئُوۡا فِیۡہَا وَلَا تُکَلِّمُوۡنِ ﴿۱۰۸﴾

کہیگا اسی میں ذلیل ہو کر پیچھے ہٹ جاؤ اور میرے ساتھ بات نہ کرو۔

اِنَّہٗ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡ عِبَادِیۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا وَارۡحَمۡنَا وَاَنۡتَ خَیۡرُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿۱۰۹﴾

میرے بندوں میں سے ایک گروہ تھا وہ کہتے تھے ہمارے رب ہم ایمان لائے سو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے بہتر ہے۔

ہی ہوگا۔ مثلاً لوگ جو نیکی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات پر پہنچ گئے ہیں جیسے شہداء ان کو رزق کا ملنا یا مومن کی قبر میں جنت کی کھڑکی کا کھولا جانا جس کا ذکر احادیث میں ہے ایسا ہی فرعون صفت لوگوں کا عذاب میں مبتلا ہونا معلوم ہوتا ہے البتہ یہ حالت کامل انکشاف کی نہیں اور انسان کی زندگی کی اس حالت کے مشابہ ہے جو ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے جس پر ایک پردہ اخفا کا رہتا ہے۔ اور حالت برزخ میں بعض لوگوں کا عرصہ دراز اور بعض کا کم عرصہ رہنا قابلِ اعتراض نہیں اس لیے کہ وقت کا احساس وہاں نہیں ہوگا اور یہ باتیں کہ روحیں عالم برزخ سے اس دنیا میں آتی رہتی ہیں اور وہ اپنے مکانوں وغیرہ میں جاتی ہیں محض قصے ہیں ہاں رویا یا کشف میں ان کی ملاقات ایک علیحدہ رنگ رکھتی ہے۔

[۲۲۹۸] انساب۔ نسب کی جمع ہے اور نَسَب اور نِسْبَۃ اشتراک ہے جو ماں یا باپ کی طرف سے ہو اور نسبۃ کا استعمال دو مقداروں میں ہوتا ہے جن میں کسی قسم کا تجانس ہو (غ)

فلا انساب بینہم سے مراد ہے کہ کوئی نسب فائدہ نہ دے گی یعنی صرف اعمال ہی فائدہ دیں گے۔ اور یہ جو حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ہر سبب اور نسب منقطع ہوگا سوائے میرے سبب اور نسب کے۔ تو اس سے یہ مراد نہیں کہ آنحضرت صلعم کے نسب سے ہونا نجات کے لیے کافی ہے اور اگر کوئی سید عیسائی ہو جائے تو بھی وہ نجات یافتہ ہوگا اور آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اگر فاطمہ بنت محمدؐ چوری کرے تو اس کے ہاتھ بھی کاٹے جائیں پس جب نسب اس دنیا کی سزا سے نہیں بچا سکتی تو قیامت کی سزا سے کس طرح بچا سکتی ہے بلکہ یہاں نسب اپنے وسیع معنی میں ہے یعنی آنحضرت صلعم کے ساتھ تعلق روحانی مراد ہے اور ایک دوسرے سے دریافت نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ حال دریافت نہیں کریں گے لکل امرئ منہم یومئذ شان یغنیہ (عبس۔ ۳۷)

[۲۲۹۹] تلفح۔ لفح آگ یا سموم کے جھلس دینے پر بولا جاتا ہے۔ کالحون۔ کُلُوح سخت ترش روئی ہے۔

فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰۤى اَنْسَوْكُمْ
ذِكْرِىْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

تو تم نے اُن سے تمسخر کیا یہاں تک کہ (گویا) انھوں نے تمھیں میرا ذکر بھلا دیا اور تم اُن پر ہنسی اڑاتے تھے ع۲۳۰۰

اِنِّىْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْۤا ۙ
اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآٮِٕزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

آج میں نے اُنھیں اُن کے صبر کرنے کا بدلہ دیا، کہ وہی بامراد ہیں۔

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِى الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

کہے گا تم کتنے برس زمین میں رہے؟

قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ
فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾

کہیں گے ہم ایک دن یا دن کا کوئی حصّہ رہے۔ سو گنتی کرنے والوں سے پوچھیئے۔

قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

کہے گا تم رہے تو تھوڑا ہی، کاش! تم جانتے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ
اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمھیں بیکار پیدا کیا ہے اور کہ تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟ ع۲۳۰۱

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ
رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾

سو اللہ بلند ہے بادشاہ ہے حق ہے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں وہ معزز عرش کا رب ہے۔

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا
بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ
رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

اور جو کوئی اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو پکارے گا، جس کی اس کے پاس کوئی روشن دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے ہاں ہے۔ کافر ہی کامیاب نہیں ہوں گے۔

وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ
خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ ع

اور کہہ میرے رب حفاظت فرما اور رحم کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے بہتر ہے۔

ع۲۳۰۰ سخر یا سُخْرِيّة اور سِخْرِيّة تمسخر کرنے والے کا فعل ہے (غ)۔
انسوکم ذکری ذکر کے بھلا دینے کو مومنوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ تمہارا ان سے استہزا اس قدر بڑھا کہ تم اللہ کے ذکر کو بالکل بھول گئے گویا وہ ترکِ ذکر کا سبب بن گئے۔

ع۲۳۰۱ عبثا عَبَث یہ ہے کہ اپنے عمل کیساتھ کھیل ملائے اتبنون بکل ریع اٰیة تعبثون (الشعراء ۲۶:۱۲۸) اور جس کی کوئی صحیح غرض نہ ہو اسے عبث کہا جاتا ہے (غ)

سُوْرَۃُ النُّوْرِ مَدَنِيَّۃٌ (٢٤)

اٰيَاتُهَا ٦٤ رُكُوْعَاتُهَا ٩

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَ فَرَضْنٰهَا وَ اَنْزَلْنَا	(یہ) ایک سورت ہے جسے ہم نے اتارا ہے اور اس (کے احکام) کو ضروری ٹھہرایا
فِيْهَاۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ①	اور اس میں کھلے کھلے حکم اتارے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ٢٣٠٢
اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ	زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنیوالے مرد (کے لیے حکم یہ ہے)
وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّ لَا	کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو سَو کوڑے لگاؤ، اور ان
تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ	پر مہربانی تمھیں اللہ کے حکم کی تعمیل سے نہ روکے، اگر تم

نام: اس سورت کا نام النور ہے اور اس میں نو رکوع اور چونسٹھ آیات ہیں۔ اس کے پانچویں رکوع میں رسول اللہ صلعم کے ظہور کو ایک اعلیٰ درجہ کے مصفّی دائمی اور کل عالم پر محیط نور سے تشبیہ دی ہے اور اسی لحاظ سے اس کا نام النّور ہے۔

خلاصہ مضمون: چونکہ اس سورت میں آنحضرت صلعم کے ظہور کو کامل نور سے مشابہت دے کر یہ بتایا ہے کہ یہ نور دنیا پر غالب ہوگا اور اس لیے نہ صرف آنحضرت صلعم کے لیے بادشاہت کی پیشگوئی کی ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ یہ بادشاہت دائمی طور پر آپ کے بعد بھی رہے گی اور چونکہ جب قوموں کو دنیا میں عروج اور حکومت ملتی ہے تو فسق و فجور ان کی تباہی کا موجب ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس سورت کی ابتدا سزائے زنا و قذف محصنات سے کی ہے، اور اسی پہلے رکوع میں بتایا ہے کہ زانیوں کو اپنی قوم میں نہ ملنے دو تاکہ تم خود اس سے بچے رہو۔ دوسرے رکوع میں واقعہ افک کا ذکر کرکے حضرت عائشہؓ کی بریت کی ہے۔ تیسرے میں بُری باتوں کی تشہیر سے روکا ہے، چوتھے میں وہ علاج بتایا ہے جس سے قوم فسق و فجور سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ گھروں میں اجازت سے داخل ہونا، رستوں میں اور کاروبار کے اوقات میں مردوں اور عورتوں کا نظریں نیچی رکھنا۔ عورتوں کا اپنی زینت کے مقامات کو چھپانا، مجردوں کے نکاح کر دینا یہ چند تدابیر بتائی ہیں اور اگر کوئی قوم ان باتوں کو اختیار کرے اور ان کے اختیار کرنے میں دشواری بھی کوئی نہیں تو وہ زنا کے اس میں رواج پانے سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ پانچویں رکوع میں بتایا کہ رسول اللہ صلعم کا ظہور کامل ترین نور الٰہی کا ظہور ہے اور وہ دائمی اور کل عالم پر محیط نور ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ صحابہ کے گھروں میں یہ نور پھیل گیا ہے اور اس کے منکر اپنے آپ کو ظلمت میں رکھتے ہیں۔ چھٹے رکوع میں نظارۂ قدرت کی کچھ مثالیں دیکر بتایا ہے کہ حق آخرکار کامیاب ہوگا مگر اس کے لیے ضرورت ہے کہ سچے دل سے اتباع نبوی کیا جائے۔ ساتویں میں اطاعت رسول کے مضمون کو جاری رکھتے ہوئے بتایا ہے کہ اس نور کے قیام کے لیے بادشاہت بھی دی جائے گی اور وہ بادشاہت صرف آنحضرت صلعم کی ذات تک محدود نہ ہوگی بلکہ آپ کے بعد بھی قائم رہے گی اور خلافت کے مضمون میں خلافت جسمانی اور خلافت روحانی دونوں کا ذکر کیا ہے۔ آٹھویں رکوع میں مضمون کو پھر اس طرف لوٹایا ہے کہ چھوٹے چھوٹے خانگی امور کو لاپروائی کی نظر سے نہ دیکھا جائے، بلکہ ان میں صحیح راہ پر چلنے پر بھی انسان کی راحت کا بہت کچھ دارومدار ہے۔ گویا یہ رکوع چوتھے رکوع کے مضمون کی تکمیل کرتا ہے۔ اور نویں رکوع میں یہ اصولی بات بتائی کہ دینی اور قومی معاملات پر ذاتی معاملات کو ترجیح دینی ضروری ہے اور رسول اللہ صلعم نے جس امر کی طرف دعوت دی ہے اسے معمولی امر نہ خیال کیا جائے بلکہ اسی میں فلاح ہے اور اسے چھوڑ کر نتیجہ اس دنیا میں بھی دکھ ہوگا۔

تعلق: اس سورت کا تعلق پچھلی سورت سے ظاہر ہے وہاں مومنوں کی فلاح کی اصل باتوں کو بیان کیا تھا تو یہاں یہ بتایا ہے کہ کونسی باتیں ہیں جو ایک کامیاب قوم کی تباہی کا موجب ہو جاتی ہیں۔ اصل علاج انہی کا بتایا ہے اسی اثنا میں نہایت صفائی سے یہ بھی ذکر کر دیا ہے کہ رسول اللہ صلعم کا نور کل عالم پر محیط ہو جائے گا اور آپ کے بعد آپ کے جانشینوں کو حکومت بھی دی جائے گی۔

تاریخ نزول: یہ سورت بالاتفاق مدنی ہے اور حضرت عائشہؓ کے افک کا واقعہ جس کا اس میں ذکر ہے پانچویں سال ہجرت کا ہے اس لیے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ بیشتر حصہ اس سورت کا پانچویں سال ہجرت کا ہے۔

٢٣٠٢ سبھی سورتیں اللہ تعالیٰ نے اتاریں اور سبھی کے احکام کو فرض بھی کیا اور ان کو عمل میں لانا ضروری ٹھہرایا۔ خاص طور پر اس سورت کے متعلق یہ الفاظ اس لیے فرمائے کہ ان کی طرف زیادہ توجہ ہو، کیونکہ ان احکام کے مدنظر رکھنے سے مومن کا گھر اس کے لیے جنت بن جاتا ہے اور ان کی خلاف ورزی سے سب آرام اور امن تباہ ہو جاتا ہے۔ مگر یہ افسوس کا مقام ہے کہ اسی سورت کے احکام کو مسلمانوں نے سب سے زیادہ چھوڑ رکھا ہے حالانکہ ان کی تعمیل میں کوئی بڑی مشکلات بھی نہیں۔

إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ② | اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہو اور چاہیئے کہ ان کی سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہو۔[2303]

۲۳۰۳ زانیۃ۔ زانی۔ زنا بغیر عقد شرعی کے عورت کے ساتھ ہمبستری کا نام ہے (غ)

سزا میں کس قسم کا کوڑا استعمال ہو: اجلدوا۔ جلدۃ۔ جِلد چمڑے کو کہتے ہیں جس کی جمع جُلُود ہے جلود الذین یخشون ربہم (الزمر۔ ۲۳)[39] اور جَلَدَہٗ کے معنی ہیں ضَرَبَ جِلْدَہٗ اس کی جلد پر مارا اور ضَرَبَہٗ بالجِلد اسے چمڑے کے ساتھ مارا (غ) اور یہاں پہلے معنی مراد ہیں (ر) اور جَلد مصدر ہے کسی چیز کے ساتھ مارنا اور جَلَدَہٗ کے معنی ہیں اصاب جِلدَہٗ اس کی جِلد یعنی چمڑے کو پہنچا (ل) اور روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ زانیہ اور زانی کو ایسے کوڑے کے ساتھ مارا جاتا تھا جس پر گانٹھ کوئی نہ ہوتی تھی اور نہ اس کی کوئی شاخ ہوتی تھی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس قسم کے کوڑے کے ساتھ مارنا بھی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اجماع صحابہ سے شروع ہوا اور اس سے پہلے کبھی ہاتھ سے مارا جاتا تھا اور کبھی جوتی سے اور کبھی تازہ شاخ سے (ر) پھر یہ مارنا کپڑے اُتار کر اور ننگا کر کے نہیں، بلکہ شافعی اور احمد کا قول ہے کہ اس پر ایک یا دو قمیصیں چھوڑ دی جائیں اور حضرت علیؓ کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے ایک شخص کو حد لگائی اور اس پر قسطلاتی کپڑا تھا اور ابن مسعودؓ سے ہے کہ اس امت میں تجرید یعنی ننگا کرنا اور مدّ یعنی کھینچنا یا کسی چیز سے باندھنا جائز نہیں البتہ پوستین یا روئی دار کپڑا اوپر سے پہنا ہُوا ہو تو وہ اُتروا دینا چاہیئے کیونکہ ایسی صورت میں مار کا اثر چمڑے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور مناسب ہے کہ سختی سے نہ مارا جائے اور بعض کے نزدیک صرف پیٹھ پر مارنا چاہیئے اور بعض کے نزدیک سوائے سَر اور مُنہ اور ایسی جگہ کے جس پر مارنے سے ہلاکت کا خطرہ ہو تمام اعضا پر تقسیم کر کے مارنا چاہیئے۔

اسلامی سزائے جلد اور آج کل کا کوڑا: جلد کی اس کیفیت سے معلوم ہوگا کہ جو آج کل کوڑے یا دُرّے کا مفہوم ہے وہ جلد کا مفہوم ہرگز نہیں، بلکہ اس سے مراد صرف اس قدر ہے کہ کوئی ایسی چوٹ مارنی چاہیئے جس کی تکلیف انسان کی جلد کو پہنچے، ننگے کر کے مارنا بالکل ناجائز ہے اور شدید مار مارنا بھی درست نہیں۔ اور کھڑے ہوئے انسان کو بغیر باندھنے کے مارنا صاف بتاتا ہے کہ کوڑے اور دُرّے کی مار سے اس جلد کو کوئی نسبت ہی نہیں۔ اور اصل غرض زیادہ تر رُسوائی ہے اور اسی لیے یہ بھی ضروری ٹھہرایا ہے کہ ایک جماعت اس وقت موجود ہو، تا ایسا بدفعل کرنے والے کی تشہیر ہو۔ وہ وحشیانہ سزا جو ایک مہذب قوم کی سزاؤں میں کوڑے مارنے کے رنگ میں تعزیرات ہند میں موجود ہے وہ تعلیم اسلامی کی روح کے سراسر منافی ہے۔ اسلام نے جلد کی سزا صرف چند خاص جرائم میں رکھی ہے یعنی زنا یا قذف یا شراب خوری۔ اور یہ جلد محض رسوائی کے طور پر ہے اور اس کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ ایک شخص کو مار مار کر ادھمؤا کر دیا جائے اور ایسی سزا دی جائے جس کے داغ ساری عمر اس کی پیٹھ پر رہیں اور اس کا گوشت اڑا کر ہڈیوں کی چربی تک صاف کر دی جائے۔

کیا رجم اسلام میں سزائے زنا ہے: یہاں ایک نہایت ضروری سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا رجم یعنی سنگسار کرنا بھی زنا کی سزا ہے یا نہیں۔ جہاں تک تعلیم قرآنی کا تعلق ہے سوائے اس ایک آیت کے اور کہیں زنا کی سزا کا ذکر نہیں رسوائے اس کے کہ یہ ذکر ہے کہ لونڈی اگر زنا کرے تو اس کی سزا آزاد عورت سے نصف ہے) اور اس ایک آیت میں اس قدر واضح الفاظ میں زانی اور زانیہ کی سزا بتا دی ہے کہ ادنےٰ شبہ کی گنجائش نہیں اور زنا کا لفظ بھی زبان عربی میں وسیع ہے یعنی ہر ناجائز ہمبستری پر بولا جاتا ہے خواہ ایسے لوگوں میں ہو جن کے زوج یا زوجہ موجود ہوں اور خواہ ایسے لوگوں میں ہو جن کے ابھی نکاح نہ ہوئے ہوں، لغت ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتی لیکن تعامل اور احادیث دونوں میں بیاہے ہوؤں کے لیے سزا رجم ہے اور بن بیاہوں کے لیے سو جلد۔ اور پھر بعض نے کہا کہ بیاہے ہوؤں کے لیے جلد اور رجم دونوں ہیں اور بعض نے صرف رجم کہا ہے اور ایسا ہی بن بیاہوں کے لیے بعض نے صرف جلد سزا قرار دی ہے اور بعض نے کسی حدیث کی بنا پر جلد کے علاوہ ایک سال کی جلا وطنی بھی بتائی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن شریف کے صریح الفاظ کے بالمقابل کونسی سند ہے جس کی بنا پر سنگساری کی سزا دیجا سکتی ہے۔

آیت رجم کے متعلق حضرت عمر کا قول: اوّل وہ روایات ہیں جن میں حضرت عمرؓ کا قول منقول ہے کہ قرآن شریف میں کوئی آیت رجم کے متعلق تھی۔ ایک روایت میں جو صحیحین میں ہے یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا فکان فیما انزل علیہ ایۃ الرجم فقرأناھا ووعیناھا ورجم رسول اللّٰہ صلعم ورجمنا بعدہ فاخشی ان لیطول بالناس زمان ان یقول قائل لا نجد ایۃ الرجم فی کتاب اللّٰہ فیضلوا بترک فریضۃ قد انزلھا اللّٰہ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اپنے رسول پر اتارا اس میں آیت رجم بھی تھی سو ہم نے اسے پڑھا اور اسے یاد کیا اور رسول اللہ صلعم نے رجم کیا اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ سو میں ڈرتا ہوں کہ لوگوں پر لمبا زمانہ گزر جائے تو کوئی کہنے والا کہے کہ ہم آیت رجم کتاب اللہ میں نہیں پاتے پس ایک فریضہ کے ترک کی وجہ سے گمراہ ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اور امام احمد کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں رجم کا حکم کتاب اللہ میں نہیں اس میں جلد ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہنے والا نہ ہوتا کہ عمرؓ نے کتاب اللہ میں وہ بات بڑھا دی جو اس میں سے نہیں ہے تو میں اسے لکھ دیتا جس طرح اس کا نزول ہوا اور امام احمد کی ایک اور روایت میں ہے کہ اگر کہنے والے یہ نہ کہتے کہ عمرؓ نے کتاب اللہ میں ایسی بات بڑھا دی ہے جو اس میں نہیں ہے تو میں قرآن شریف کے ایک کونہ میں یہ لکھ دیتا۔ یہ ایک ایسی کچّی بات ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی قبول نہیں کی جا سکتی اور

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِکَةً ۡ وَّ الزَّانِیَةُ لَا یَنْکِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ ۚ

بدکار مرد سوائے بدکار یا مشرک عورت کے کسی سے تعلق پیدا نہیں کرتا اور بدکار عورت کے ساتھ سوائے بدکار مرد یا مشرک

نہ حضرت عمر کی طرف منسوب ہو سکتی ہے۔ قرآن شریف میں ایک آیت اُترتی ہے اُسے لوگ پڑھتے ہیں یاد بھی رکھتے ہیں پھر حضرت عمر کہتے ہیں میں اسے قرآن میں نہیں لکھ سکتا، کیونکہ لوگ کہیں گے عمر نے کتاب اللہ میں بڑھا دیا، بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے اس خوف سے اسے نہیں لکھا کہ لوگ ایسا کہیں گے مگر حضرت عمر جیسا جری القلب انسان لوگوں سے ڈر کر کس طرح ایک حق بات کو ترک کر سکتا تھا اور پھر یہ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ سوائے حضرت عمر کے اور کسی کو اس آیت کا علم بھی نہ ہوتا۔

آیت رجم کی تلاوت کی منسوخی اور بقائے حکم کا خیال: اور یہ جو ان بے معنی الفاظ کی توجیہ کی گئی ہے کہ اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی تھی اور حکم باقی رہ گیا تھا تو یہ اصل قول سے بھی بڑھ کر بے معنی ہے۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے کہ ایک حکم تو باقی ہے مگر اس کے لفظ باقی نہیں یا کم از کم پڑھے نہیں جا سکتے یا قرآن کریم کا حصّہ نہیں رہے، جو حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا رہا ہے جب سے دنیا ہوئی الفاظ میں ہی آتا رہا ہے۔ اب ایک حکم الفاظ میں اُترتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ حکم تو باقی ہے مگر لفظ نہیں رہے۔ پہلے ہی بغیر لفظوں کے اتر آتا تو بھی کچھ بات ہوتی لیکن یہ گورکھ دھندا کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ حکم لفظوں میں اُترا کیونکہ بغیر لفظوں کے اتر نہ سکتا تھا۔ پھر لفظ منسوخ ہو گئے اور حکم رہ گیا۔ کیا وہ حکم صحیح تھا اور لفظ غلط تھے؟ آخر بات وہ کہنی چاہیئے جو عقل انسانی میں آسکے اور منسوخ التلاوۃ کے بارے میں جن کا حکم منسوخ نہ ہو، اتقان میں یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ایسی روایات سب خبر اُحاد ہیں اور خبر احاد سے نہ نزول قرآن ثابت ہوتا ہے اور نہ اس کا نسخ اور یہی مذہب معقول ہے۔

نہ صرف عقل ہی بالبداہت اس بات کو غلط ٹھہراتی ہے بلکہ صحابہ میں سے حضرت علی جیسے انسان کی شہادت اس کے خلاف ہے کیونکہ انہوں نے جب ایک شادی شدہ عورت شراحہ پر حد لگائی تو جلد اور رجم دونوں کا حکم دیا اور فرمایا کتاب اللہ کے ساتھ میں نے اسے جلد کیا اور سنت رسول اللہ کے ساتھ رجم کیا۔ اگر کتاب اللہ کی آیت کا حکم باقی ہوتا تو حضرت علی کس طرح اس سے بے خبر رہ سکتے تھے۔ پس اب دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا رجم واقعی سنت رسول اللہ ہے اور اس نے کتاب اللہ کے حکم کو در بارہ محصن کے منسوخ کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن کریم نے بعض احکام کی تفصیلات بیان نہیں کیں تو سنت رسول اللہ نے ان تفصیلات پر ہم کو آگاہ کر دیا مثلاً اقیموا الصلوٰۃ حکم قرآن ہے سنت نے بتا دیا کہ کون کونسی نمازیں کن کن اوقات میں ہیں اور کتنی کتنی رکعات ہیں۔ لیکن یہاں تو تفصیلات کا کوئی سوال نہیں۔ ایک حکم موجود ہے اور صاف الفاظ میں موجود ہے زانی مرد اور زانی عورت کو سو دفعہ جلد کرو یا سو کوڑے لگاؤ۔ تو یہاں تفصیل کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ سزا بتانا مقصود ہے اور وہ بتا دی ہے، ہاں اگر یوں ہوتا کہ زانیوں کو کچھ سزا دو اور سنت تشریح کر دیتی تو ٹھیک تھا یا یوں ہوتا کہ زنا کی سزا جلد اور رجم ہے اور سنت میں تفصیل ہو جاتی کہ جلد فلاں کے لیے ہے اور رجم فلاں کے لیے تو بھی ہو سکتا تھا یا اگر یہاں زنا کی سزا کے ذکر کے علاوہ کہیں اور بھی زنا کی سزا کا ذکر ہوتا اور وہ صراحت سے رجم نہ ہوتا اور سنت اسے رجم قرار دیتی تو بھی ماننے کے قابل بات تھی۔ لیکن سنت قرآن کو منسوخ کر دے یہ نا قابل تسلیم بات ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں ایک حکم نازل کرتا ہے رسول اللہ صلعم اس کے خلاف حکم دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ احادیث میں رجم کی سزا کا ذکر ہے مگر بہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک خاص رجم کا واقعہ اس آیت کے نزول کے بعد کا ہے اور جب تک یہ ثابت نہ ہو اس وقت تک یہ دعویٰ ثابت نہیں کہ سنت نے قرآن کو منسوخ کر دیا۔ اتنا عظیم الشان دعویٰ کہ نبی کریمؐ کا عمل قرآن کو منسوخ کر دے حالانکہ قرآن میں صاف لکھا ہو ان اتبع الّا مایوحیٰ الیّ۔ ایسی فرضی باتوں سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ ہمیں علم نہیں کہ رجم کا حکم نبی کریم صلعم نے اس آیت کے نزول کے بعد دیا۔ اس لیے ہم یونہی تسلیم کریں گے کہ جب قرآن شریف میں زنا کے لیے جلد کا حکم آگیا تو پھر نبی کریم صلعم نے اس کے خلاف عمل نہیں کیا، ہاں اس کے نزول سے پہلے شریعت سابقہ کے مطابق اگر رجم کیا ہو تو یہ امر دیگر ہے الگ الگ احادیث پر بحث کی یہاں گنجائش نہیں۔

اجماع سے قرآن منسوخ نہیں ہو سکتا، رجم پر اجماع امت نہیں: تیسری بات جو اس بارہ میں کہی جاتی ہے وہ اجماع ہے۔ اجماع اصل میں کوئی دلیل نہیں اور کم از کم اس پر تو اتفاق ہے کہ اجماع ناسخ نہیں اور یہاں بغیر نسخ کے کام نہیں بنتا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ رجم پر اجماع کیونکر کہا جا سکتا ہے جب صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کے زمانہ میں بھی بعض لوگ ایسا کہتے تھے کہ رجم کا حکم کتاب اللہ میں نہیں اس لیے سزائے رجم نہیں دی جا سکتی۔ ان اناسا یقولون ما الرجم فی کتاب اللہ وانما فیہ الجلد یہ روایت احمد کے الفاظ ہیں۔ مردوں کے سامنے بھی کوئی ایسا ہی ذکر ہوا پھر عمر بن عبد العزیز کے سامنے بھی یہی قصہ پیش آیا۔ پھر خوارج سارے کے سارے رجم کے منکر ہیں تو اسے اجماع کہنا صحیح نہیں۔ اصل پرکھ یہی ہے کہ ایک بات کتاب میں ہے یا نہیں۔ اگر کتاب اللہ میں صراحت سے ہے تو کوئی حدیث اس کے خلاف قبول نہیں کی جا سکتی۔ اگر کتاب اللہ میں اجمال ہے یا مسئلہ نہیں تو حدیث سے لیں گے۔ اس کے بعد قیاس ہے اور بس۔ سو یہ بات کہ رجم زنا کی سزا ہے پہلے معیار پر ہی غلط ٹھہرتی ہے اس لیے یہاں نہ حدیث کی ضرورت ہے نہ قیاس کی۔ اور خلاف نص صریح قرآن کریم جو حدیث یا قیاس ہو وہ قبول نہیں کیا جا سکتا اور اجماع محض ایک وقتی حادثہ کا فیصلہ ہوتا ہے۔

لونڈیوں کو سزائے زنا نصف دینے سے استدلال کہ رجم سزائے زنا نہیں ہو سکتا: قرآن کریم کے دوسرے مقام سے اسی نتیجہ کی تائید ہوتی ہے۔ سورۂ نساء میں جہاں لونڈیوں کے نکاح کے احکام ہیں وہاں یہ بھی ذکر ہے کہ اگر لونڈیاں نکاح کے بعد ارتکاب زنا کریں تو ان کے لیے اس کی نصف سزا ہے جو محصنات کے لیے ہے فاذا

وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ③ کے کوئی تعلق پیدا نہیں کرتا اور یہ مومنوں پر حرام کیا گیا ہے ۲۳۰۴ع

احصن فان اتین بفاحشۃ فعلیھن نصف ما علی المحصنٰت من العذاب (النسآء ۲۵) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف سو جلد ۃ ہی سزا ہے جس کا نصف ہو سکتا ہے۔ اگر رجم بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس شریعت میں سزائے زنا ہوتی تو نصف ما علی المحصنٰت کا لفظ استعمال نہ کیا جاتا۔ پس قرآن کریم کی یہ دوسری آیت بھی صاف بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک رجم زنا کی سزا نہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہو تو اس میں اقل تعداد بعض کے نزدیک ایک، بعض کے نزدیک دو، بعض کے نزدیک تین اور بعض کے چار ہے۔ طائفۃ کا لفظ چونکہ جماعت کو چاہتا ہے اس لیے تین یا زیادہ پر ہی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

۲۳۰۴ع اس آیت کے معنی میں تین قول ہیں۔ اوّل یہ کہ اس میں یہ حکم ہے کہ اہل قبلہ میں سے ہو کر جو زنا کرے اس کا نکاح سوائے زانیہ یا مشرک عورت کے دوسری سے نہیں ہو سکتا یعنی ایک پاک دامن مومن عورت اس کے نکاح میں نہیں دی جا سکتی اور ایسا ہی زانیہ عورت ایک پاکدامن مرد کے نکاح میں نہیں دی جا سکتی اور اس کا نکاح صرف زانی مرد یا مشرک سے ہو سکتا ہے اور ایک حدیث بھی ہے لاینکح الزانی المجلود الا مثلہ زانی جسے سزائے جلد دی گئی ہے وہ اپنی ہی مثل کسی عورت سے نکاح کر سکتا ہے اور یہ بھی مسلّم ہے کہ زنا ایک ایسا عیب ہے کہ زن وشوہر میں سے ایک فریق اگر زنا کا ارتکاب کرے تو نکاح باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا پھر ارتکاب زنا کیا اور اس پر حد قائم ہوئی تو حضرت علی نے حکماً اس کی بی بی کو الگ کر دیا اور فرمایا لا تتزوج الا مجلودۃ مثلك تو اپنے ہی جیسی کسی زانیہ عورت سے نکاح کر سکتا ہے اور بعض علماء کے نزدیک ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرے پھر اس پر اس کا زانیہ ہونا ثابت ہو جائے تو اسے اختیار رہے کہ اس کے نکاح میں رہے یا طلاق لیلے، لیکن اس میں دقت یہ ہے کہ یہاں زانیہ یا مشرک دونوں سے نکاح کا بظاہر جواز ہوا، حالانکہ مشرک عورت سے مسلمان مرد کا نکاح جائز نہیں۔ نہ ہی مسلمان عورت کا نکاح مشرک مرد سے جائز ہے۔

زانی اور زانیہ کا نکاح: اور بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جو شخص کسی عورت سے زنا کرے پھر اس کا نکاح اس کے ساتھ جائز نہیں گو حضرت عائشہ نے جو حدیث رسول اللہ صلعم سے بیان کی ہے وہ اس کے خلاف ہے یعنی آپ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جو ایک عورت سے زنا کرے اور پھر اسے نکاح میں لانا چاہے تو آپ نے فرمایا حرام حلال کو حرام نہیں کر دیتا۔ اور پھر بعض لوگوں نے اسی معنی کو لیکر یہ کہا ہے کہ یہ آیت وانکحوا الایامی منکم کے حکم سے منسوخ ہے لیکن اس مسئلہ میں صحیح راہ یہ نظر آتی ہے کہ جب ایک زانی یا زانیہ توبہ کرے یہاں تک کہ اس کی نیکی کی وجہ سے وہ نام اس پر باقی نہ رہے تو ایسے شخص کا معاملہ بوجہ توبہ کے ایک سچّے مسلمان کی طرح ہونا چاہیئے اور آیت کا منسوخ ہونا غلط ہے لیکن بہرحال مشرک اور مشرکہ کو زانی اور زانیہ کے حکم میں رکھنے سے جو دقّت پیش آتی ہے وہ باقی رہتی ہے۔

کسبیوں سے نکاح جائز نہیں: دوسرا قول آیت کے معنی میں یہ ہے کہ یہ صرف اُن زانیہ عورتوں کے بارہ میں ہے جو ایام جاہلیت میں زنا کا پیشہ کرتی تھیں تو جب لوگ مسلمان ہوئے اور انہوں نے ان سے قطع تعلّق کر لیا تو بعض کے دل میں یہ خیال آیا کہ ان عورتوں سے نکاح کر لیں تو ایسے نکاح کو اس آیت کی رُو سے منع کیا گیا۔ لیکن آیت کے معنی اس حد تک محدود کرنے میں یہ دقّت ہے کہ اگر زانیہ عورتوں سے مراد صرف پیشہ ور عورتیں ہیں تو زانی مرد کون ہوئے اور مشرکہ کی دقّت جس کا ذکر اوپر ہُوا اسی طرح باقی رہتی ہے۔ ہاں یہ بلاشبہ درست ہے کہ مفہوم اس آیت کا ایسی پیشہ ور عورتوں سے نکاح کو شامل رکھتا ہے یعنی اسے ناجائز قرار دیتا ہے جب تک کہ وہ پیشہ سے توبہ کر کے ایک ایسی نیک زندگی بسر نہ کریں جو زانیہ کے نام کو اُن سے دور کر دے اور اکثر لوگ جو پہلے کسبیوں سے تعلّق پیدا کر لیتے اور پھر جھٹ پٹ ان سے نکاح کر لیتے ہیں اس کے خلاف کرتے ہیں۔

آیت کا صحیح مفہوم: تیسرا قول یہ ہے کہ لفظ نکاح یہاں اپنے وسیع معنی میں ہے یعنی مراد اس سے ایک مرد اور ایک عورت کا جمع ہونا ہے اور عقد شرعی مراد نہیں اور یہ معنی حضرت ابن عباس سے مروی ہیں۔ اور لغت میں لفظ نکاح اس معنی میں آتا ہے دیکھو ع۲۸۴ تو اس صورت میں معنی صاف ہیں کہ زنا کرنے والا مرد کسی پاکدامن مومن عورت سے ناجائز تعلق پیدا نہیں کر سکتا اگر کرے گا تو کسی زانیہ عورت سے ہی کرے گا یا کافر عورت سے اور ایسا ہی حال زنا کرنے والی عورت کا ہے گویا اسلام انسان کا مرتبہ اس قدر بلند کر دیتا ہے کہ وہ ارتکاب زنا سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ ہاں چونکہ ناپاک انسان بھی بیچ میں ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر ایسا کوئی ناپاک خیالات کا مرد ہے تو وہ اپنے جیسی ہی کسی ناپاک خیالات کی عورت کو پھسلا سکتا ہے یا کسی کافر عورت کو اور ایسا ہی کوئی ناپاک خیالات کی عورت کسی ناپاک خیالات کے مرد کو ہی پھسلا سکتی ہے یا کسی مشرک مرد کو۔ اور وحرم ذٰلك علی المؤمنین کے معنی ہونگے کہ زنا مومنوں پر حرام ہے۔ البتہ میرے نزدیک لفظ نکاح دونوں معنوں کو شامل رکھتا ہے۔ یعنی اس سے مراد مرد اور عورت کا جمع ہونا ہے خواہ عقد شرعی سے ہو یا اس کے بغیر اور اس طرح پر جو پہلے دو معنی بیان ہوئے ہیں وہ بھی اس آیت کے حکم میں شامل ہو جاتے ہیں۔

علانیہ زنا کرنے والوں کا برادری سے اخراج: اس آیت نے زنا کو ایک ایسا عیب قرار دیا ہے کہ جو مرد یا عورت اس کا ارتکاب کرے وہ گویا اسلامی برادری سے ایک گونہ خارج ہو جاتا ہے گو اسے کافر یا دائرۂ اسلام سے خارج قرار نہ دیا جائے کیونکہ اس کا نکاح پاک دامن مسلمان سے ناجائز قرار دیا گیا ہے آج اسلامی برادری کس حالت تک گر گئی ہے کہ علانیہ زنا کرنے والے کو برادری میں وہ عزت حاصل ہے جو ایک پاک دامن کا حق ہے کاش مسلمان اس عملی پہلو کے لیے تھوڑی سی کوشش کریں اور جس کا زنا ثابت ہو جائے اسے اپنی برادری سے خارج کر دیں تو یہ برادری پاک دامنی کے اسی بلند مقام پر کھڑی ہو سکتی ہے جہاں آنحضرت صلعم نے اسے کھڑا کیا تھا۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ
يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ
ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ
شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٤﴾

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ نہ لائیں، تو انھیں اَسّی[۸۰] کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو، اور وہی نافرمان ہیں ع۲۳۰۵

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٥﴾

مگر جو بعد میں توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ
لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ
اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ
لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٦﴾

اور جو لوگ اپنی عورتوں پر تہمت لگائیں اور سوائے اپنے ان کا کوئی گواہ نہ ہو تو ان (تہمت لگانے والوں) میں سے ایک کی گواہی یہ ہے کہ اللہ کی قسم کے ساتھ چار بار گواہی دے کہ وہ سچوں میں سے ہے۔

وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ
اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٧﴾

اور پانچویں (بار یہ کہ) اللہ کی لعنت اس پر ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے۔

وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ
اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٨﴾

اور عورت سے یہ بات سزا کو ٹال سکتی ہے کہ وہ اللہ کی قسم کے ساتھ چار بار گواہی دے کہ وہ (مرد) جھوٹوں میں سے ہے۔

وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ
كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٩﴾

اور پانچویں (بار یہ) کہ اللہ کا غضب اس پر ہو اگر وہ سچوں میں سے ہے ع۲۳۰۶

ع۲۳۰۵ یرمون۔ رَمی کا لفظ جو اہر پر بولا جاتا ہے جیسے تیر یا کنکر کا پھینکنا و مارمیت اذ رمیت (الانفال ۸ - ۱۷) اور کسی کے متعلق بات کہنے پر بھی اس کا استعمال ہے جب یہ گالی دینے کے معنی میں ہوتا ہے جیسے تہمت لگانا (غ) اور یہاں مراد زنا کی تہمت ہے۔

زنا کی تہمت: جس طرح سزائے زنا سخت رکھی ہے اسی طرح اس بات کی سزا بھی سخت رکھی ہے کہ خواہ مخواہ دوسروں پر الزام دیا جائے اور گو یہاں صرف محصنات پر تہمت دینے کا ذکر ہے مگر مرد بھی اس میں شامل ہیں صرف عورتوں کا ذکر اس لیے کیا کہ عورتوں کے متعلق بری باتوں کی اشاعت کو زیادہ سختی سے روکنے کی ضرورت ہے اور چار گواہوں کو اس لیے ضروری ٹھہرایا تاکہ اس بات کے سچ ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے۔ ہاں یہ قاضی یا مجسٹریٹ کی رائے پر انحصار ہے کہ قرائن کی شہادت کو بھی شامل کرلے۔ یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اگر ایک شخص ہی دیکھے اور اسے گواہ نہ ملیں تو وہ کیا کرے۔ حکم قرآنی یہ ہے کہ ایسی صورت میں اُسے تشہیر کا کوئی حق نہیں سوائے اس کے کہ وہ اپنی عورت سے ایسے فعل کا ارتکاب دیکھے جس کا علاج آیت ۶ میں تبایا ہے کیونکہ اگر اس طرح اسے تشہیر کا حق دیدیا جائے تو پھر ہر شخص جو چاہے کہتا پھرے اور اس کے مضرات بہت زیادہ ہیں۔ اور ایسے تہمت لگانیوالوں کی سزا علاوہ کوڑوں کے یہ بھی ہے کہ ان کی شہادت کسی معاملہ میں قبول نہ کی جائے سوائے اس کے کہ وہ توبہ کریں اور بعض لوگوں نے یہاں تک کہا ہے کہ توبہ کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے ہے شہادت پھر بھی قبول نہ کی جائے گی مگر یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔

ع۲۳۰۶ ان چار آیتوں میں جو صورت بیان کی گئی ہے وہ لعان کی صورت ہے۔ اور پانچ مرتبہ قسم اٹھانا اس لیے ہے کہ تا دل پر واقعہ کے جھوٹ ہونے کی صورت میں خوف طاری ہو۔ لعان کے ساتھ شوہر اور عورت میں مفارقت لازم ہے اور ان کا نکاح دوبارہ نہیں ہوسکتا۔ سب سے پہلا لعان ہلال بن اُمیہ کا اس کی بی بی سے ہوا اور لکھا ہے کہ یہ آیات اسی کے معاملہ میں نازل ہوئیں۔

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ
ع وَ اَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ
مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ
هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ
مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَ الَّذِيْ تَوَلّٰى
كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱﴾

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی
اور اللہ رجوع برحمت کرنے والا حکمت والا ہے ۲۳۰۷
جو جھوٹ بنا لائے تم ہی میں سے ایک گروہ ہے ۲۳۰۸
اسے اپنے لیے بُرا نہ سمجھو بلکہ وہ تمھارے لیے اچھا ہے
ان میں سے ہر شخص کے لیے وہی ہے جو اس نے
گناہ کمایا اور اُن میں سے جس نے اس کا بڑا بوجھ اپنے اوپر لیا،
اس کے لیے بڑا دکھ ہے ۲۳۰۹

ع ۲۳۰۷ ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ یہاں بھی بغیر جواب کے مذکور ہے اور دوسرے رکوع کے آخر میں بھی بغیر جواب کے مذکور ہے یعنی آیت ۲۰ میں۔ اور تیسرے رکوع کی پہلی آیت میں بھی یہی الفاظ دوہرا کر جواب دیا ہے ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ ما زکی منکم من احد ابدا یعنی اللہ کے فضل اور رحمت سے آنحضرت صلعم مبعوث ہوئے اور تمہیں پاک کیا گیا۔ ورنہ زنا سے ملک عرب کی حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اس پر فخر کیا جاتا تھا۔

ع ۲۳۰۸ واقعہ افک حضرت عائشہؓ: یہ واقعہ جس کی طرف یہاں اشارہ ہے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر وہ بہتان ہے جو منافقوں نے باندھا اور چند مسلمان بھی اس کے دہرانے میں ملوث ہو گئے۔ اس کے جھوٹ اور منافقوں کا بنایا ہوا ہونے کی طرف دو لفظوں میں اشارہ کیا۔ افک۔ عصبۃ۔ افک وہ چیز ہے جو اس حالت سے پھیر لی گئی ہو جس پر اسے ہونا چاہیئے ع ۹۸۶ یا حق سے باطل کی طرف پھیری ہوئی بات یعنی ایک سیدھے سادے واقعہ کو توڑ مروڑ کر اس پر ایک باطل بنا کھڑا کیا۔ اور عصبۃ وہ گروہ ہے جو ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوں۔ پس معلوم ہوا یہ منافقوں کا گروہ تھا جو اسلام کے خلاف ایک دوسرے کے مددگار تھے۔ اور منکم اس لیے کہا کہ منافق بظاہر اسلام کا اقرار کرتے تھے۔

یہ واقعہ جس کی طرف اشارہ ہے پانچویں سال ہجرت کا ہے جب نبی کریم صلعم غزوۂ بنی مصطلق سے واپس آ رہے تھے۔ اور حضرت عائشہ کی زبانی بخاری میں مذکور ہے یہاں باختصار درج کیا جاتا ہے۔ بنی کریم صلعم جب سفر پر نکلا کرتے تو قرعہ اندازی سے ایک بی بی کو ساتھ لیتے، اس غزوہ میں قرعہ میرے نام کا نکلا سو میں رسول اللہ صلعم کے ساتھ نکلی اس کے بعد کہ آیت حجاب نازل ہو چکی تھی (اس سے معلوم ہوا کہ حجاب ضروریات جنگ اور دیگر ضرورتوں کے لیے عورتوں کو باہر نکلنے سے نہیں روکتا) واپسی پر جب ہم مدینہ کے قریب تھے تو رات کے وقت کوچ کا اعلان ہوا۔ میں قضائے حاجت کے لیے لشکر سے باہر نکل گئی، وہاں سے لوٹتے ہوئے میں نے دیکھا کہ میرا ہار گر گیا ہے اور اسے ڈھونڈھنے لگی۔ ادھر قافلہ والوں نے میرا ہودہ اُٹھا کر اونٹ پر رکھ دیا اس خیال سے کہ میں اس کے اندر ہوں اور اس وقت عورتیں بہت ہلکی پھلکی تھیں۔ کیونکہ کھانے کو بہت کم ملتا تھا اور میں تھی بھی نو عمر لڑکی، پس وہ چلے گئے اور میں ہار تلاش کر کے واپس آئی تو کسی کو نہ پایا اور اس خیال سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی کہ جب مجھے ہودہ میں نہ پائیں گے تو واپس آئیں گے اتنے میں میری آنکھ لگ گئی اور صَفوان بن مُعَطّل لشکر کے پیچھے پیچھے رہا کرتا تھا تاکہ کوئی چیز رہ جائے یا گر جائے تو اُسے اُٹھا لیا کرے وہ اس مقام پر پہنچا تو ایک انسان کی شکل دیکھ کر میرے پاس آیا اور مجھے پہچان لیا کیونکہ حجاب سے پہلے وہ مجھے دیکھا کرتا تھا۔ تب اس نے بلند آواز سے انا للہ پڑھا اور میں جاگ اُٹھی۔ تب اس نے اپنی اونٹنی بٹھا دی اور میں چڑھ گئی تو اس کی مہار پکڑ کر چل پڑا یہاں تک کہ دوپہر کے وقت ہم لشکر سے مل گئے۔ اسی بنا پر بعض لوگوں نے طوفان اٹھایا اور سب سے بڑا حصہ اس میں عبداللہ بن اُبیّ بن سلول نے لیا ادھر میں مدینہ پہنچ کر بیمار ہو گئی اور ایک ماہ تک بیمار رہی مگر مجھے کوئی علم نہ تھا یہاں تک کہ مسطح کی ماں سے میں نے یہ قصہ سُنا تب اس کی تصدیق کے لیے رسول اللہ صلعم سے اجازت چاہی کہ والدین کے گھر چلی جاؤں۔ ادھر آنحضرت صلعم نے اسامہ اور حضرت علی سے مشورہ کیا تو اسامہ نے کہا کہ ہم نے سوائے بھلائی کی کوئی بات کبھی نہیں دیکھی اور حضرت علی نے بریرہ (لونڈی) سے دریافت کرنے کو کہا، جس نے کہا کہ سوائے اس کے میں نے عیب کی بات نہیں دیکھی کہ وہ ایک کم سن لڑکی ہیں اور کبھی آٹا گندھا ہوا چھوڑ کر سو جاتی ہیں تو بکری کھا جاتی ہے ادھر مجھے دو راتیں اور ایک دن روتے گزر گئے، تب رسول اللہ صلعم آئے اور مجھ سے دریافت کیا میں نے عرض کیا کہ اگر میں اپنی بریت کا اظہار کروں تو کون مانے گا اور اگر میں جھوٹ اقرار کر لوں تو اللہ تعالی جانتا ہے کہ وہ سچ نہیں پس سوائے اس کے کچھ نہیں کہتی جو حضرت یعقوبؑ نے کہا تھا فصبرٌ جمیل واللہ المستعان علی ما تصفون۔ پھر آپ پر یہ وحی نازل ہوئی اور میری بریت ہوئی اور حضرت عائشہ کی والدہ سے روایت ہے کہ جب حضرت عائشہ نے طوفان کی خبر سنی تو غش کھا کر گر گئیں۔

اس واقعہ پر عیسائی مصنفین نے بھی کچھ بیہودہ گوئی کی ہے، حالانکہ جانتے ہیں کہ اگر عائشہ صدیقہ پر ایسا الزام لگا تو مریم صدیقہ پر بھی تو لگا تھا۔ اور یہاں تو ادنٰے سے ادنٰے وجہ بھی شک کی نہیں۔ بلکہ صرف منافقوں کی شرارت تھی جو ہمیشہ اسلام کو نقصان پہنچانے کے فکر میں لگے رہتے تھے۔

ع ۲۳۰۹ اس واقعہ کو خیر اس لیے کہا کہ نتیجہ میں بھلائی تھی اور اللہ تعالے نے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ان کو آئندہ ایسی باتوں میں شمولیت سے روک دیا۔ اصل تشہیر کرنے والا تو گروہ منافقین ہی تھا۔ چار شخصوں کا نام اس واقعہ میں بالخصوص لیا گیا ہے یعنی عبداللہ بن اُبیّ۔ حمنہ جو ام المومنین زینب

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۲﴾

جب تم نے اُسے سُنا تھا تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے لوگوں پر نیک ظن کیوں نہ کیا اور (کیوں نہ) کہا کہ یہ صریح جھوٹ ہے [۲۳۱۰]

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾

کیوں نہ اس پر چار گواہ لائے، پس جب گواہ نہیں لائے، تو اللہ کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں [۲۳۱۱]

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِىْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۴﴾

اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر دنیا اور آخرت میں نہ ہوتی تو جس بات کا تم نے چرچا کیا تھا، اس کی وجہ سے تمھیں بھاری عذاب پہنچا ہوتا۔

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾

جب تم اپنی زبانوں سے اسے لیتے تھے اور اپنے مونہوں سے وہ بات کہتے تھے جس کا تمھیں کوئی علم نہ تھا [۲۳۱۲] اور تم اسے آسان سمجھتے تھے اور وہ اللہ کے نزدیک بڑی بھاری بات تھی۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾

اور جب تم نے اُسے سنا تو کیوں نہ کہا کہ ہمیں یہ مناسب نہیں کہ اس کے متعلق باتیں کریں (اے اللہ) تیری ذات پاک ہے یہ تو بڑا بہتان ہے۔

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷﴾ ۚ

اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ ایسی بات پھر کبھی (نہ) کرو، اگر تم مومن ہو۔

وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۗ وَاللّٰهُ

اور اللہ تمھارے لیے آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ

بنت حجش کی بہن تھیں۔ مسطح جو حضرت ابوبکر کے عزیزوں میں سے تھے اور حسان بن ثابت اس میں اختلاف ہے کہ ان پر قذف کی حد لگائی گئی یا نہیں۔ اور والذی تولّی کبرہ کا مصداق جیسا کہ بخاری سے ثابت ہے۔ عبداللہ بن اُبّی ہی ہے جس نے اپنے چیلوں کے ذریعہ سے اس جھوٹ کو پہلے خود بنایا پھر خوب شہرت دی مگر بعض لوگوں نے غلطی سے حسان بن ثابت کو سمجھ لیا ہے۔

۲۳۱۰ مومنوں کو آپس میں حُسنِ ظن سے کام لینا چاہیئے اس لیے کہ وہ ایک دوسرے کے اندرونی حالات کا علم رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ایک مومن جو خدا کی رضا کو چاہنے والا ہے، اس قسم کے شنیع فعل کا ارتکاب نہیں کرسکتا اور پھر آٹھ یا دس گھنٹے کی علیحدگی میں بدون کسی پہلے تعلق کے جو ممکن طور پر ہوتا اتنی بلند پایہ عورت سے جیسے کہ صدیقہ تھیں، محمد رسول اللہ صلعم جیسے مزکّی انسان کی بی بی۔ ابوبکر صدیق جیسے پاکباز کی بیٹی سے کس طرح ایسے گندے فعل کا ارتکاب ہوسکتا تھا، جو ایک بدمعاش خبیث انسان کا کام تھا، پھر اس کا بنانے والا عبداللہ بن اُبی جیسا دشمن اسلام۔ ادنیٰ تامّل بھی بتا سکتا تھا کہ یہ ایک بہتان ہے اور یہ کہنا کہ خود نبی کریم صلعم کو بھی شک ہوگیا تھا یہ بھی آپ پر بہتان ہے۔ آپ نے نزول آیت سے پہلے وعظ فرمایا کہ مَیں اپنے اہل کی نسبت بھلائی کا ہی علم رکھتا ہوں۔

۲۳۱۱ ایسے معاملہ کی تشہیر کرنا جس پر ایک بھی شہادت نہیں کاذب کے سوائے اور کس کا کام ہوسکتا ہے اور اللہ کا حکم یہی ہے کہ ایسے آدمی کو کاذب سمجھا جائے جو بغیر شہادت کے پاک دامن عورتوں پر تہمتیں لگاتا اور ان کی تشہیر کرتا ہے۔

۲۳۱۲ تلقونہ اصل میں تتلقونہ ہے دیکھو ۵۷ بہت سے گناہ ہیں کہ انسان اُنہیں چھوٹے سمجھ کر ان کا ارتکاب کرلیتا ہے۔ اور ان کے نتائج بہت بد ہوتے ہیں بُری بات کو کبھی سہل نہ سمجھنا چاہیئے۔

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۸﴾

علم والا حکمت والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾

جو لوگ چاہتے ہیں کہ بے حیائی (کی باتیں) ان لوگوں میں پھیلیں جو ایمان لائے ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۲۳۱۳

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾ ع ۲ ۸

اور اگر اس کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی اور کہ اللہ مہربان رحم کرنے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، اور جو کوئی شیطان کے قدموں کی پیروی کرتا ہے تو (شیطان) بے حیائی اور بُرائی کے لیے ہی کہتا ہے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی، تو کوئی بھی تم میں سے کبھی پاک نہ ہوتا۔ لیکن اللہ جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۲۳۱۴

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۠ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾

اور تم میں سے بزرگی اور وسعت والے لوگ یہ قسم نہ کھائیں کہ وہ قریبیوں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہیں دیں گے اور چاہیئے کہ معاف کریں اور درگزر کریں۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت کرے اور اللہ حفاظت کرنیوالا رحم کرنیوالا ہے ۲۳۱۵

۲۳۱۳ حد جوان پر لگائی جائے وہ دنیا کا عذاب الیم نہیں کہلا سکتی بالخصوص جب کہ اس کے ساتھ ہی آخرت میں عذاب الیم کا ذکر ہو بلکہ کینہ اور حسد وغیرہ مراد ہیں جو انسان کے دل میں آگ کی طرح بھڑکتے ہیں اور اس کے لیے دردناک دکھ کا موجب ہو جاتے ہیں ایسے انسان کو راحت اور آرام میسّر نہیں آتا۔ یا مراد یہ ہے کہ جو جھوٹے الزام دوسروں پر دیتے ہیں خود اُن کا شکار ہوتے ہیں، اگلی آیت میں لولا کا جواب وہی ہے جو آیت ۲۱ میں مذکور ہے۔

۲۳۱۴ع یہ رکوع پہلے دونوں رکوعوں کے لیے بطور تتمہ کے ہے۔ عرب ہر قسم کے افعال شنیعہ کے ارتکاب کی وجہ سے شیطان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مزکی بھیج کر کس طرح ان تمام ناپاکیوں سے اسے صاف کیا۔ تو جس راستباز انسان کی قوت قدسی سے سارا ملک پاک ہو گیا، کیا اس کا گھر اس کی قوت قدسی سے پاک نہ ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کے افک کے ذکر سے پہلے بھی یہ لفظ آئے ہیں دیکھو آیت ۱۰ اور اس ذکر کے خاتمہ پر بھی یہی لفظ آئے ہیں دیکھو آیت ۲۰۔

۲۳۱۵ع یاتل۔ اَلوت کے معنی ہیں ایک بات میں کمی کی اور اَلیت کے معنی ہیں قسم کھائی اور یأتل اَلوت یا اَلیت سے باب افتعال ہے (رغ)

مسطح جو تشہیر افک میں ملوث ہوا حضرت ابوبکر کی خالہ یا ہمشیرہ کا بیٹا تھا۔ بدر میں شامل تھا اور فقراء مہاجرین میں سے تھا اور حضرت ابوبکر اس کی امداد کیا کرتے تھے۔ قصّہ افک میں ملوث ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکر نے اس کی امداد بند کر دی اس پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں حضرت ابوبکر کو فضل والا یعنی بلحاظ دین بزرگی والا اور وسعت والا یعنی مال دنیوی کے لحاظ سے فراخ دست فرمایا ہے اور یہ حکم دیا کہ امداد سے ہاتھ نہ روکو اور حضرت ابوبکرؓ نے امداد جاری رکھی کس قدر فراخدلی کی یہ تعلیم ہے کہ دنیا میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ محمد رسول اللہ صلعم کی بی بی اور حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی اس پر اتنا بڑا اتہام باندھا جاتا ہے اور محمد

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَٰتِ الْغَٰفِلَٰتِ الْمُؤْمِنَٰتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾

جو لوگ پاک دامن بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے ۲۳۱۶

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٢٤﴾

جس دن اُن کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے خلاف اس کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔

يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ﴿٢٥﴾

اس دن اللہ انھیں ان کا ٹھیک بدلہ پورا پورا دے گا اور جان لیں گے کہ اللہ ہی حق (اور) کھولنے والا ہے ۲۳۱۷

الْخَبِيثَٰتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَٰتِ ۖ وَالطَّيِّبَٰتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَٰتِ ۚ أُولَٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ۖ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٢٦﴾ ع

پلید چیزیں پلید لوگوں کے لیے اور پلید لوگ پلید چیزوں کے لیے ہیں۔ اور اچھی چیزیں اچھے لوگوں کے لیے ہیں اور اچھے لوگ اچھی چیزوں کے لیے ہیں،
یہ لوگ ان باتوں سے بری ہیں جو وہ کہتے ہیں، ان کے لیے منفرت اور عزت والا رزق ہے ۲۳۱۸ع

يَٰأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٢٧﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوائے (دوسرے) گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو اور ان کے رہنے والوں پر سلام نہ کرلو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرلو ۲۳۱۹

رسول اللہ پر ہی یہ وحی ابوبکر کی ہدایت کے لیے نازل ہوتی ہے کہ بہتان باندھنے والوں کی امداد سے ہاتھ نہ روکو۔ کس قدر بڑے دل کا انسان یہ رسولؐ ہے جس کی بیوی پر بہتان باندھا جاتا ہے اور اس پر وحی نازل ہوتی ہے کہ بہتان باندھنے والوں کی امداد سے کنارہ کشی نہ کی جائے۔ اور کس قدر وسعت قلب اس کے شاگرد کا ہے کہ بیٹی پر بہتان باندھنے والے کی امداد بھی کرتا ہے آج کسی شخص کے متعلق ادنٰے سی بات کسی کے مُنہ سے نکل جائے تو عمر بھر کینہ کو نہیں چھوڑتا کیا اس وسعت قلبی کی جو آنحضرت صلعم اور ابوبکر صدیقؓ میں نظر آتی ہے دنیا کوئی اور نظیر بھی پیش کرسکتی ہے۔

ع۲۳۱۶ غفلت۔ غفلۃ کے لیے دیکھو ع۱۵۱۶ ب ایک چیز کا احساس نہ ہونے پر بھی بولا جاتا ہے اور یہاں مراد ایسی پاک دامن عورتیں ہیں جن کے دل میں بدی کا وہم بھی نہیں گزرتا اس میں حضرت عائشہ صدیقہ کی کمال بریت کا بھی اظہار فرمایا ہے کہ وہ ایسی پاک تھیں کہ ان کے دل میں بدی کا وہم بھی نہیں گزرا۔

ع۲۳۱۷ المبین۔ ابان لازمی سے ہو تو معنی ہونگے الظاھر جیسا کہ اللہ تعالٰی کی صفت ہے اور اگر ابان متعدی سے ہو جس کے معنی ہیں ایک بات کو واضح کرکے بیان کیا تو مراد ہوگی حق کو واضح کرکے بیان کرنے والا اور الحق اور المبین دونوں اللہ تعالٰی کی صفات ہیں۔

ع۲۳۱۸ خبیثات اور طیّبات سے مراد بُرے اور اچھے اقوال یا اعمال ہیں (رغ) مطلب یہ ہے کہ ناپاک منافقوں کے لیے ایسی ہی ناپاک باتیں رہ گئی ہیں نہ ان کے اپنے دل میں پاک خیالات آتے ہیں نہ وہ دوسروں کی طرف انہیں منسوب کرتے ہیں اور اولٰئك میں اشارہ ان پاک لوگوں کی طرف ہے جن پر اتہام باندھا گیا خصوصاً اہل بیت نبوی۔

ع۲۳۱۹ تستانسوا۔ اُنس کے لیے دیکھو ع۶۰۹ اور اِنس کو انس اس لیے کہتے ہیں کہ وہ دیکھے جاتے ہیں برخلاف جنّ کے کہ وہ نہیں دیکھے جاتے۔ اور تستانسوا کے معنی تَسْتَأْذِنُوا ہیں یعنی اذن لیلو۔ اور یوں بھی معنی کیے گئے ہیں تعلموا اَيُرِيْدُ اهلها ان تدخلوا اَمْ لا یعنی جان لو کہ گھر والے تمہارا اندر آنا چاہتے ہیں یا نہیں (ل) یا تجدوا ایناسا یعنی علم پالو (رغ)

تہمت سے بچنے کا علاج: اس رکوع میں وہ علاج بتائے ہیں جو مسلمانوں کو زنا اور تہمتیں لگانے سے بچا سکتے ہیں انہی میں سے پہلی بات ہے کہ گھروں میں بغیر

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا
حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ
ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۲۸

پھر اگر ان میں کسی کو نہ پاؤ تو اس میں داخل نہ ہو جب تک کہ تمھیں اجازت نہ دی جائے اور اگر تمھیں کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ جاؤ وہ تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اور جو تم کرتے ہو اللہ اُسے جانتا ہے ۲۳۲۰

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا
غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ
يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝۲۹

تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم غیر آباد گھروں میں داخل ہو جاؤ جن میں تمھارا اسباب ہو، اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ
وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۳۰

مومنوں کو کہہ دو اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اللہ اس سے خبردار ہے جو وہ کرتے ہیں ۲۳۲۱

اجازت کے اور السلام علیکم کہنے کے داخل نہ ہوں۔ کیونکہ ناگہاں دوسرے کے گھر میں داخل ہونے سے بدظنی کے موقعے بھی پیدا ہوتے ہیں اور بدی کے بھی اور دوسرے انسان اپنے گھر میں ہر وقت ایسی حالت میں نہیں ہوتا کہ وہ پسند کرتا ہو کہ دوسرا اُسے اس حالت میں دیکھے۔ علیحدگی یا خلوت ہر انسان کا حق ہے جس میں کوئی دوسرا دخل دینے کا مجاز نہیں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اب یہ اصول اجازت حاصل کرنے کا بالکل ترک کر دیا ہے اور یورپ نے اس اصول کو لے لیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو بہت سے اسلامی تعلیم کے اصول سے مسلمان دُور پڑے ہوئے ہیں اور دوسری قومیں ان پر عامل ہیں اسلام کے ذریعہ سے جو فائدہ مسلمانوں کو پہنچ سکتا ہے وہ تو اس کے اصول پر عمل پیرا ہوتے سے پہنچ سکتا ہے نہ برائے نام مسلمان کہلانے سے۔

پس اگر اصول اسلامی کو مسلمان چھوڑ دیں اور دوسری قومیں ان پر عامل ہوں تو فوائد اسلامی سے بھی مسلمان محروم ہونگے اور دوسری قومیں ان سے بہرہ ور ہونگی۔

دوسرے کے گھر جانے کے آداب: اجازت کے متعلق جو آداب نبی کریم صلعم سے مروی ہیں وہ یہ ہے کہ تین دفعہ اجازت طلب کرے ایک دفعہ آپ سعد بن عبادہ کے گھر گئے تو آپ نے السلام علیکم کہا، سعد نے اتنا آہستہ جواب دیا کہ آپ نے نہ سنا اسی طرح دوسری اور تیسری دفعہ ہوا تو آپ واپس چلے گئے تو سعد آپ کے پیچھے نکلے اور عرض کیا یا رسول اللہ میں نے عمداً آہستہ جواب دیا تھا تاکہ آپ بار بار السلام علیکم کہیں (کیونکہ سلام بھی دعا ہے) تو آپ واپس آئے اور ان کے لیے بہت دعا کی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کا عشق آپ سے کس قسم کا تھا۔ محبّت بھی کمال درجہ کی ہے۔ اور اس میں سادگی بھی کمال درجہ کی اور تین دفعہ آواز دینے کا مطلب صرف یہ ہے کہ گھر والوں کو اطلاع مل جائے ایسا نہ ہو کہ ایک آواز دی اور وہ آواز کسی نے سُنی نہیں تو یوں ہی واپس ہو جائے۔ اور گویہ غرض اس طرح بھی پوری ہو سکتی ہے کہ بذریعہ تحریر کے یا ملاقاتی کارڈ کے اطلاع دیدی جائے یا گھر آنے سے پیشتر وقت ملاقات مقرر کر لیا جائے تاہم بلند آواز سے طلب اجازت دل کو بھی پاک رکھنے والی چیز ہے اور مظنات بھی اس سے دور ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ دروازے کے عین سامنے کھڑے نہ ہوتے تھے بلکہ ایک طرف ہٹ کر تا کہ اندر نظر نہ پڑے اور حدیث میں ہے کہ جو شخص بغیر اطلاع کے دوسرے کو جھانکے تو اس کو کنکر مارنے میں بھی ہرج نہیں۔ ایسا ہی اجازت لینے میں نام بتانا چاہیئے اور حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ اپنی ماؤں اور بہنوں کے گھروں میں جاؤ تو بھی اجازت لیکر جاؤ۔

۲۳۲۰ کس قدر پاکیزہ اور سادگی کی تعلیم ہے آج اوّل تو مسلمانوں میں باہم تعلقات محبّت کی جگہ بغض زیادہ پھیلا ہوا ہے پھر اگر کوئی کسی کی ملاقات کو جائے اور وہ اس وقت کسی مصروفیت کی وجہ سے نہ مل سکے تو یہ ہمیشہ کے تعلقات کے منقطع ہونے کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ بعض مہاجرین کا قول نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی ساری عمر اس بات کو چاہا کہ وہ کسی سے ملنے جائیں تو انہیں کہا جائے واپس ہو جاؤ تاکہ اس حکم الٰہی کی بھی تعمیل ہو۔ اور ایسا موقعہ نہیں ملا۔ یہ روح احکام قرآنی کی تعمیل کی ہم میں پیدا ہونی چاہیئے۔

۲۳۲۱ یغضوا۔ غضّ نظر اور آواز میں کمی ہے۔ (واغضض من صوتك (لقمٰن ۳۱-۱۹) (غ) اور غضّ بصرہ کے معنی ہیں اسے روکا اور نیچا کیا۔ اور حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم صلعم خوش ہوتے تھے تو آنکھ نیچی کر لیتے تھے (ل)

زنا سے بچنے کا طریق: قرآن کریم صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتا بلکہ ہر نیکی پر چلنے کی اور ہر بدی سے بچنے کی راہیں بتاتا ہے اور بڑی سے بڑی بدیوں سے بچنے کی آسان سے آسان راہیں بتائی ہیں۔ زنا کتنی بڑی بدی ہے مگر اس کی ابتدا کیسی چھوٹی ہے اور اگر وہاں سے اسے روکا جائے تو آسانی سے رکا سکتا ہے اس کی ابتدا بدنظری سے ہوتی ہے لیکن صرف بدنظری سے بچنے کی ہدایت بھی نامکمل ہوتی اس لیے فرمایا کہ مومن مرد اور اگلی آیت میں یہی حکم مومن

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ

اور مومن عورتوں کو کہہ دے اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو (عادتاً) کھلا رہتا ہے ٢٣٢٢ اور چاہیئے

عورتوں کو ہے) نگاہیں نیچی رکھنے کی عادت ڈالیں۔ بدی کے موقعہ سے اپنے آپ کو بچانا یہ اسلام کی اس بارہ میں تعلیم کا عملی اصل الاصول ہے جو شخص بدی کے موقعہ سے اپنے آپ کو بچاتا ہے اس میں بدی سے بچنے کی ایسی قوت پیدا ہوجاتی ہے کہ پھر اگر بڑی بھاری ترغیب کا بھی موقعہ ہو تو وہ اس کا مقابلہ کرسکتا ہے چنانچہ زنا سے بچنے کے لیے اور اپنے اندر عفت کی قوت پیدا کرنے کے لیے یہ علاج بتایا کہ نظر نیچی رکھنے کی عادت ڈالی جائے جب انسان عموماً اپنی نگاہ نیچی رکھے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شہوت کی نظر سے عورتوں کو دیکھنے سے بچ جائے گا اور یوں اس کے قوائے شہوانی اعتدال کی حالت میں آجائیں گے اور اگر کوئی ترغیب کا موقعہ بھی اس کے سامنے پیش آئے گا تو اس کے اندر پاکیزگی کی اس قدر قوت پیدا ہوچکی ہوگی کہ وہ اس ترغیب پر آسانی سے غالب آسکے گا۔ بدی اور بالخصوص زنا سے بچنے کا یہ فلسفہ قرآن کریم سے مخصوص ہے ویحفظوا فروجہم سے یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ہر وہ اس راہ کی حفاظت کریں جس سے شیطان حملہ آور ہوسکتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ آنکھوں کا بھی زنا ہے اور کانوں کا بھی اور زبان کا بھی اور ہاتھوں کا بھی اور پاؤں کا بھی۔ اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ یہ نگاہوں کے نیچے رکھنے کا گویا نتیجہ ہے کہ وہ زنا سے اپنے آپ کو بچائیں۔ اور اسی غرض کے لیے نبی کریم صلعم نے رستوں پر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا ہے کیونکہ اس طرح بھی انسان خواہ مخواہ ایک بدی کے موقعہ پر اپنے آپ کو ڈالتا ہے اور اتفاقی طور پر کسی عورت پر نظر پڑ جانا قابل گرفت نہیں لیکن اس کے بعد جو عمداً دیکھتا ہے وہ اس حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

٢٣٢٢ زینۃ۔ حقیقی زینت وہی ہے جو انسان کے کسی حال میں عیب کا موجب نہ ہو نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں اور زینت تین طرح پر ہے۔ زینت نفس جیسے علم اور اعتقادات حسنہ۔ زینت بدنی جیسے قوت اور طول قامت اور زینت خارجی جیسے مال اور جاہ اور من حرم زینۃ اللہ (الاعراف۔ ٣٢) میں زینت خارجی بھی مراد لی گئی ہے اور بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ بزرگی ہے جس کا ذکر ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم میں ہے (رغ)

عورتوں کے باہر نکلنے کی ضرورت: اس آیت کے پہلے حصہ میں وہی حکم عورتوں کو دیا ہے جو پہلی آیت میں مردوں کو دیا تھا جس سے معلوم ہوا کہ جس طرح مردوں کو باہر نکلنے کے موقعے پیش آتے ہیں اور انہیں غض بصر کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح عورتوں کو بھی باہر نکلنے کے موقعے ہیں اور وہ باہر نکل سکتی ہیں پس ان الفاظ سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جس طرح عورتوں کی نظر مردوں پر پڑ سکتی ہے جس کے لیے حکم یغضضن من ابصارھن کی ضرورت پیش آتی ہے اسی طرح مردوں کی نظر عورتوں پر پڑ سکتی ہے جس کے لیے حکم یغضوا من ابصارھم کی ضرورت پیش آئی پس دوسری بات جو ان الفاظ سے ثابت ہوتی ہے یہ ہے کہ عورتوں کے لیے کوئی ایسی اوڑھنی تجویز کرنا جس سے ان کو نظر کچھ نہ آئے اور سامنے آنیوالوں پر ان کی نظر نہ پڑ سکے قرآن شریف کا منشا نہیں۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کا کوئی ایسا حصہ کھلا بھی رہتا ہے جس کی وجہ سے مردوں کی نظریں نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور وہ حصہ وجہ ہے جیسا کہ ابھی آگے آتا ہے۔

ماظہر منہا سے مراد: دوسرے حصہ میں پہلا حکم یہ ہے کہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو اس سے عادتاً ظاہر ہوتا ہے ماظہر منہا کے یہی معنی ہیں کہ عام ضروریات انسانی کے لیے بعض مقامات کو کھلا رکھنا پڑتا ہے اس کے سوائے اور زینت کو ظاہر نہ کریں چنانچہ یہی معنی امام رازی نے قفال سے نقل کیے ہیں۔

الا ما یظہرہ الانسان فی العادۃ الجاریۃ یعنی جسے انسان عادتاً ظاہر کرتا ہے اور یہی معنی روح المعانی میں لیے گئے ہیں الا ما جرت العادۃ والجبلۃ علیٰ ظہورہ یعنی جو عادت کے طور پر اور طبعی طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ اور یہی قول کشاف میں ہے۔

ضروریات انسانی کا اقتضا: اب ہم اگر بغیر اسبات کی طرف رجوع کرنے کے کہ سلف نے الا ماظہر منہا سے کیا مراد لیا ہے واقعات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں جو حصہ عادتاً سب انسانوں کو کھلا رکھنا پڑتا ہے وہ منہ اور ہاتھ ہیں عام حالت انسانی میں اس کے بغیر چارہ نہیں۔ چند آسودہ حال لوگوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو کیا مسلمانوں میں اور کیا غیر مسلموں میں بڑی بھاری کثرت انہی لوگوں کی نہیں ہے جن میں مردوں اور عورتوں دونوں کو اشغال زندگی میں جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور شاید بمشکل پانچ فیصدی لوگ ایسے ہونگے جو عورتوں کے معاش کے کاروبار میں حصہ لیے بغیر گزارہ کرسکتے ہوں اور بغیر منہ اور ہاتھ کھلے رکھنے کے یہ کام قطعاً نہیں ہوسکتا۔ پس قرآن کریم کا منشا یہی ہے کہ عام ضروریات انسانی کے مطابق جن حصوں کو عادتاً کھلا چھوڑا جاتا ہے ان کے علاوہ عورتیں دیگر مقامات زینت کو ڈھانک لیا کریں۔

اقوال مفسرین کہ عورتوں کے باہر نکلنے میں منہ اور ہاتھ کھلے رہ سکتے ہیں: اب اقوال مفسرین کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اقوال سلف کے بارہ میں ابن جریر کا مرتبہ سب سے بڑھ کر ہے اور اس میں حسب ذیل اقوال الا ماظہر منہا کے متعلق ہیں اوّل کہ اس سے مراد ظاہری لباس کی زینت ہے اور اس کی تائید میں ابن مسعود۔ عبداللہ اور ابراہیم کے اقوال ہیں۔ دوم کہ اس سے مراد وہ زینت ہے جس کا ظاہر کرنا عورت کے لیے جائز ہے یعنی سُرمہ اور انگوٹھی اور کڑے اور منہ اور اس کی تائید میں ابن عباس۔ سعید بن جبیر۔ ضحاک۔ عطاء۔ قتادہ۔ مسور بن مخرمہ۔ مجاہد۔ عامر۔ ابن زید۔ اوزاعی کے اقوال ہیں۔ سوم کہ اس سے مراد منہ اور کپڑے ہیں۔ اور اس کی تائید میں حسن کا قول ہے اور ان تینوں قسم کے اقوال کو نقل کرکے ابن جریر لکھتے ہیں کہ ان اقوال میں سے صحیح تر قول یہ ہے کہ اس سے

بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ　　کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیں ع۲۳۲۳ اور اپنی زینت

مراد منہ اور ہاتھ ہیں اور اس میں سرمہ اور انگوٹھی اور کڑے اور خضاب داخل ہیں اور ہم اس کو صحیح تر قول اس لیے قرار دیتے ہیں کہ اس بات پر سب کا اجماع ہے کہ ہر نماز پڑھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ نماز میں اپنی عورت یعنی چھپانے کی جگہ کو ڈھانکے رکھے اور عورت کے لیے یہ ضروری ہے کہ نماز میں اپنا منہ اور ہاتھ کھلے رکھے اور اس کے سوائے اپنے سارے بدن کو چھپائے رکھے سوائے اس کے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے اجازت دی کہ عورت اپنا نصف ذراع (یعنی آدھی کلائی) کھلا رکھ سکتی ہے پس جب اس پر اجماع ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے بدن کے اس حصّہ کو کھلا رکھ سکتی ہے جو عورت میں داخل نہیں کیونکہ جو عورت نہیں اس کا ظاہر کرنا بھی حرام نہیں اور جب وہ اسے ظاہر کر سکتی ہے تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے قول الا ما ظھر منھا سے بھی یہی مراد ہے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو اس سے ظاہر رہتی ہے (ج)

اور روح المعانی میں الا ما ظھر منھا کی تفسیر میں ہے یعنی سوائے اس کے جو عادتاً اور طبعاً کھلا رکھا جاتا ہے اور اس کی اصل حالت یہی ہے کہ وہ کھلا رہے جیسے انگوٹھی اور سرمہ اور خضاب پس ان کے اجنبیوں کے سامنے ظاہر کرنے پر کوئی گرفت نہیں اور گرفت اس زینت کے ظاہر کرنے پر ہے جو چھپانی چاہیئے جیسے کڑے اور جھانجر اور بازوبند اور گلوبند اور ہار اور بالیاں اور ذکر زینت کا کیا اور ان مقامات کا ذکر نہیں کیا۔ تا کہ چھپانے کے حکم میں مبالغہ کا اظہار کیا جائے کیونکہ یہ زینت ایسے مقامات پر ہے جن مقامات کی طرف دیکھنا جائز نہیں سوائے انکے جن کا بعد میں استثناء کیا گیا ہے اور وہ کلائی اور پنڈلی اور بازو اور گردن اور سر اور سینہ اور کان ہیں اور آگے چل کر لکھا ہے کہ وہ جو زمخشری نے لکھا ہے۔ وہ امام ابوحنیفہ کے مشہور مذہب پر مبنی ہے یعنی کہ ظاہر یعنی کھلی رہنے والی زینت کے موقعہ منہ اور دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں مطلقاً عورت یعنی چھپانے والے مقامات میں شامل نہیں پس ان کی طرف دیکھنا بھی حرام نہیں ؛

حدیث نبوی کہ منہ اور ہاتھ کھلے رہ سکتے ہیں: اور اس کے بعد ابو داؤد اور ابن مردویہ اور بیہقی کی حدیث ذیل کو نقل کیا ہے جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے ان اسماء بنت ابی بکر دخلت علی النبی وعلیھا ثیاب رقاق فاعرض عنھا وقال یا اسماء ان المرأۃ اذا بلغت المحیض لم یصلح ان یری منھا الا ھذا واشار الی وجھہ وکفہ صلعم یعنی اسماء بنت ابی بکر نبی کریم صلعم کے پاس آئیں اور انہوں نے بہت باریک کپڑے پہنے ہوئے تھے تو نبی صلعم نے اس سے منہ پھیر لیا اور فرمایا اے اسماء جب عورت حیض کی عمر کو پہنچ جائے تو پھر مناسب نہیں کہ اس کے بدن کا کوئی حصّہ سوائے اس کے نظر آئے اور آپ نے اپنے منہ اور ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ نبی صلعم کی یہ حدیث اس بحث میں فیصلہ کن ہے اور اتنی دوسری تائیدات کے ساتھ یہ حدیث قطعی فیصلہ کر دیتی ہے کہ الا ما ظھر منھا میں جو حصّہ مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ منہ اور ہاتھ ہیں۔

یہاں اس حدیث کو لانا بھی ضروری ہے جس سے بعض وقت ایک غلط استدلال بھی کیا گیا ہے یعنی ابن مکتوم کا واقعہ جو نابینا تھے کہ وہ نبی صلعم پر داخل ہوئے درآنحالیکہ آپ کے پاس ام سلمہ اور میمونہ تھیں تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اس سے حجاب کر لو، تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ یہ نابینا ہیں ہمیں نہیں دیکھتے اور نہ پہچانتے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم دونوں نابینا ہو اور اسے نہیں دیکھتی ہو۔ اس حدیث سے یہ تو قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ عورت کے لیے کونسا حصّہ ظاہر کرنا جائز ہے اور کونسا ظاہر کرنا جائز نہیں۔ ہاں اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ عورت کے لیے اجنبی مرد کو دیکھنا خواہ بہ نظر شہوت نہ بھی ہو جائز نہیں۔ چنانچہ ابن کثیر نے یہی استدلال اس سے کر کے اس کے مقابل پر صحیح بخاری کی حدیث کو پیش کیا ہے کہ عورت کا مرد کو بلا نظر شہوت دیکھنا جائز ہے کیونکہ صحیح بخاری میں ہے کہ عید کے دن حبشی مسجد میں اپنے ہتھیاروں کا کھیل دکھا رہے تھے تو حضرت عائشہ صدیقہ نبی کریم صلعم کے پیچھے کھڑی ہو کر انہیں دیکھ رہی تھیں۔ اگر ان دونوں حدیثوں میں تعارض مانا جائے تو صحیح بخاری کی حدیث کو ترجیح ہے لیکن اگر ہم حدیث اوّل کی یہ توجیہ کر لیں کہ ابن ام مکتوم کے لباس میں اس وقت کچھ نقص تھا جس کی طرف نبی صلعم نے دونوں بیبیوں کو توجہ دلائی کہ تم نابینا نہیں ہو اور اسے دیکھ رہی ہو کہ کس حال میں ہے تو تعارض بھی باقی نہیں رہتا۔ البتہ یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ عورت کا اپنا منہ کھلا رکھنا امر دیگر ہے اور دوسرے لوگوں کا اسے دیکھنا امر دیگر۔ اور یہیں سے بعض وقت غلطی لگتی ہے جس طرح مردوں کو حکم ہے کہ عورتوں کو نہ دیکھیں یعنی نظریں نیچی رکھیں اسی طرح عورتوں کو حکم ہے کہ مردوں کو نہ دیکھیں، لیکن ان دونوں حکموں میں سے نہ پہلے حکم سے یہ لازم آتا ہے کہ عورت کا منہ کھلا نہ ہو اور نہ حکم ثانی سے یہ لازم آتا ہے کہ مرد کا منہ کھلا نہ ہو بلکہ ان حکموں کا دینا ہی بتاتا ہے کہ کوئی چیز ہے جو دیکھی جا سکتی ہے اور اسے دیکھنے سے روکا ہے اور حضرت عائشہ کا دیکھنا ایک ضرورت کے لیے تھا یعنی ان کی کھیل دیکھنے کے لیے تھا۔ اور حکم یہی ہے کہ اگر مرد کے سامنے عورت آجائے تو مرد کی آنکھیں نیچی ہو جانی چاہئیں، عورت کے سامنے مرد آجائے تو عورت کی آنکھیں نیچی ہو جانی چاہئیں۔ اور یہی بعض اجلہ پیروان امام شافعی نے لکھا ہے یعنی عورت کے لیے منہ اور ہاتھ کھلے رکھنے جائز ہیں لیکن اجنبیوں کا انہیں دیکھنا جائز نہیں اور اسے بعید قرار دینا جیسا کہ روح المعانی میں ہے تعجب ہے کیونکہ یہ ایک نہایت کھلی بات ہے اور یہ دو الگ الگ فعل ہیں مُنہ اور ہاتھ کھُلے رکھنا۔ یہ عورت کا فعل ہے جو جائز ہے دوسرے لوگوں کا اسے بلا ضرورت دیکھنا یہ مردوں کا فعل ہے جو نا جائز ہے اور بعض شافعیہ کا مذہب ہے کہ عورت کے مُنہ اور ہاتھ کا دیکھنا بھی جائز ہے اور حق بات یہ ہے کہ پہلی نظر تو پڑ جاتی ہے اور یہ انسان کے اختیار سے باہر ہے لیکن عمداً پھر دیکھتے رہنا نا جائز ہے جیسا کہ پہلے نوٹ میں بیان ہو چکا ؛

ع۲۳۲۳ خُمُر۔ خِمار کی جمع ہے اور خمار وہ ہے جس کے ساتھ عورت اپنے سر کو ڈھانکتی ہے (غ) یعنی اوڑھنی کیونکہ خمر کے معنی ڈھانکنا ہیں۔

زِيۡنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اٰبَآئِهِنَّ اَوۡ اٰبَآءِ بُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اَبۡنَآئِهِنَّ اَوۡ اَبۡنَآءِ بُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اِخۡوَانِهِنَّ اَوۡ بَنِيۡۤ اِخۡوَانِهِنَّ اَوۡ بَنِيۡۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوۡ نِسَآئِهِنَّ اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيۡنَ غَيۡرِ اُولِي الۡاِرۡبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفۡلِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يَظۡهَرُوۡا عَلٰى عَوۡرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضۡرِبۡنَ بِاَرۡجُلِهِنَّ لِيُعۡلَمَ مَا يُخۡفِيۡنَ مِنۡ زِيۡنَتِهِنَّ ؕ وَتُوۡبُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيۡعًا اَيُّهَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ

کو (اور کسی کے سامنے) ظاہر نہ کریں سوائے اپنے خاوندوں کے یا اپنے باپوں کے یا اپنے خاوندوں کے باپوں کے یا اپنے بیٹوں کے یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں کے یا اپنے بھائیوں کے یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے یا اپنی عورتوں کے یا ان کے جن کے انکے داہنے ہاتھ مالک ہیں یا مردوں میں سے ایسے خادموں کے جو (عورتوں کی) حاجت نہیں رکھتے یا لڑکوں کے جو عورتوں کے پردے کی باتوں سے واقف نہیں اور اپنے پاؤں کو (اس طرح) زمین پر نہ ماریں کہ اُن کے چھپے ہوئے زیور معلوم ہو جائیں اور اے مومنو سب کے سب

جُیُوب۔ جَیب کی جمع ہے قمیص کا گریبان اور ناصح الجیب میں جیب سے مراد قلب اور سینہ ہے (ل)

عرب کی عورتوں کا اظہار محاسن کرنا اور اسلام کا اس سے روکنا: بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ اگر منہ کھلا رہا تو پھر پردہ بے معنی ہے۔ اس مشکل کو الفاظ ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن صاف کرتے ہیں۔ عرب میں بعینہٖ وہی دستور تھا جو آج یورپین عورتوں میں ہے کہ وہ گردن اور کندھے اور سینہ کا بعض حصّہ اظہارِ حُسن کے لیے کھلا چھوڑتی تھیں۔ تو اسلام نے ان مقامات کو عورت میں داخل کر دیا یعنی چھپانے کے مقامات میں اور بعض وقت کُرتوں کے گریبان اگر نیچے ہوں تو ان میں سے سینہ نظر آسکتا ہے۔ علاوہ ازیں عرب کی عورتیں بعینہٖ یورپ کی طرز پر چھاتیوں کو کپڑے وغیرہ کے ذریعہ سے اُبھار کر رکھتی تھیں اور یوں اپنے ایسے محاسن کا اظہار کرتی تھیں جو مردوں میں تحریک شہوت پیدا کرتے ہیں اور جو بلا ضرورت بھی ہیں اس لیے جب اسلام نے سوائے ظاہر رہنے والے مقامات کے باقی مقامات کو چھپانے کا حکم دیا تو اس کی طرز بھی ساتھ ہی بتا دی۔ اور وہ یہ ہے کہ اپنی اوڑھنیاں گریبانوں پر ڈال لیں۔ اب اوڑھنی اصل میں وہ چیز ہے جو سر کو ڈھانکتی ہے جیسا کہ تشریح لغوی سے ظاہر ہے مگر اوڑھنی ایسے رنگ میں بھی اوڑھی جا سکتی ہے کہ سوائے سر کے باقی محاسن ظاہر رہیں جیسا کہ بعض یورپین عورتیں ایک باریک دوپٹہ سر کے اوپر ڈال لیتی ہیں کہ کندھوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے اس لیے حکم دیا کہ اوڑھنی ایسی صورت میں اوڑھی جائے کہ گریبان کو ڈھانک لے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گردن اور سینہ اور کانوں کے محاسن سب پردہ کے نیچے آجائیں گے اور ایسا ہی کن پٹیاں زلفیں اور وہ بال جو پیشانی کو زینت دیتے ہیں وہ سب ڈھک جائیں گے۔ عرب کی اسلام سے پہلے کی حالت وہی تھی جو آج یورپ کی حالت ہے اور عورتیں اپنے محاسن مردوں کو دکھانے پر فخر کرتی تھیں اسلام نے اسی بات کو روکا ہے کہ عورت اپنے محاسن کی نمائش کر کے باہر نکلے اور لوگوں کے لیے موجب فتنہ ہو۔ کاروبار کی ضروریات کو نہیں روکا جن کے لیے منہ اور ہاتھ کھلے چھوڑنے پڑتے ہیں، ہاں باہر نکلتے وقت لباس زیورات جسم کے محاسن کو حتی الوسع چھپا لے خواہ موٹی اوڑھنی سے یا برقعہ سے یا اوورکوٹ سے جس کے ساتھ سر، کانوں، گردن وغیرہ کے ڈھانکنے کا بھی انتظام ہو اور عورتوں کا رسول اللہ صلعم کے ساتھ جنگوں میں باہر نکلنا اس حکم کے بعد ثابت ہے اور پانچ وقت نمازوں میں بھی مسجدوں میں آتی تھیں اور کھیتی وغیرہ کاروبار میں اپنے خاوندوں کے معاون بھی ہوتی تھیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی عورت اس پردہ کے ساتھ جو آج ہندوستان کے اچھے طبقہ میں مروج ہے جنگ میں باہر نکل سکے اور پھر زخمیوں کو پانی پلانے اور مرہم پٹی کا کام کر سکے اور صحابہ کی جنگوں میں بھی عورتوں کا ساتھ نکلنا بلکہ بعض وقت دشمن کے مقابلہ میں تیار ہونا تاریخی واقعات ہیں۔

من وراء حجاب کا حکم مردوں کو گھروں میں آنے سے روکتا ہے نہ عورتوں کو باہر نکلنے سے: اور یہ جو دوسری جگہ آتا ہے کہ اگر تم نے گھر کے اندر سے کوئی چیز مانگنی ہو تو من وراء حجاب مانگو، یعنی پردہ کے پیچھے سے تو گو یہ رسول اللہ صلعم کی بیویوں کو حکم ہے مگر اس میں بھی مومن عورتیں شامل ہیں اور اس میں عورتوں اور مردوں کے اس خلا ملا کو روکا ہے جو بہت سے بدنتائج کا موجب ہوتا ہے۔ عورت جب گھر سے باہر نکلے گی تو کافی احتیاط سے اپنے محاسن کو چھپا کر نکلے گی، لیکن گھر کے اندر ایسی احتیاط ہر وقت رکھنا مشکل ہے اور اس کے علاوہ بھی جو فتنے غیر مرد کے عورت کے پاس گھر کے اندر آنے سے پیدا ہو سکتے ہیں وہ عورت کے باہر نکلنے سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ پس اجنبی مردوں کو گھر کے اندر عورتوں کے پاس جانے سے روکا ہے کیونکہ ایسے حالات میں ضرورت پس پردہ رہ کر بھی پوری ہو سکتی ہے۔ عورت کا اپنے کاروبار کے لیے گھر سے باہر نکلنا ان فتنوں کا موجب نہیں ہوتا جو مردوں کا غیر محرم عورتوں کے پاس تنہائی میں چلے جانا ہوتا ہے، اس پر مفصل بحث اپنی جگہ پر ہوگی۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۳۱﴾	اللہ کی طرف رجوع کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ۲۳۲۴
وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ	اور جو تم میں سے مجرد ہیں ان کے نکاح کر دو اور اپنے غلاموں
مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا	اور لونڈیوں کے بھی جو صلاحیت رکھتے ہوں اگر وہ محتاج ہونگے
فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ	تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا اور اللہ
وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾	فراخی والا علم والا ہے ۲۳۲۵

۲۳۲۴ تابعین۔ اتباعُ الزَّوج ممن یَخدِمُہٗ مثل الشیخ الفانی والعجوز الکبیرۃ (ل) یعنی خدمت گار مراد ہیں۔

اربۃ۔ اَرَب ایسی سخت حاجت کو کہتے ہیں جس کا اقتضاء یہ ہو کہ اسے دور کرنے کے لیے حیلہ کیا جائے۔ پس ہر ارب حاجت ہے مگر ہر حاجت ارب نہیں اور اَرِبَ الٰی کذا کے معنی ہیں اس کی سخت حاجت محسوس کی اور اِرْبَۃ اور مَأْرَبَۃ اس کے مصدر ہیں ولی فیھا مٰارب اُخریٰ (طٰہٰ ۲۰-۱۸) اور اولی الاربۃ سے مراد ہے نکاح کی حاجت والے۔

لم یظھروا۔ ظھر علی الشیئ کے معنی اطلع علیہ بھی ہو سکتے ہیں یعنی اس بات سے واقف ہوا اور قوی علیہ بھی یعنی اس پر غالب ہُوا (ر)

عورات۔ عَوْرَۃ شرمگاہ کو کہتے ہیں اور یہ کنایہ ہے اور اس کا اصل عار سے ہے گویا اس کے ظاہر کرنے میں انسان کو شرم آتی ہے اور لم یظھروا علی عورات النساء سے مراد ہے کہ بلوغ کو نہیں پہنچے اور عورۃ کے معنی شق ہیں جو کسی چیز میں ہو جیسے کپڑا یا گھر۔ ان بیوتنا عورۃ (الاحزاب ۳۳-۱۳) یعنی ان میں ایسے شگاف ہیں کہ جو کوئی ان میں آنا چاہے آ سکتا ہے اور ثلاث عورات لکم (۵۸) میں عورۃ سے مراد خلل ہے (رغ) یعنی پردہ کا وقت۔

کن مردوں کے سامنے عورت اظہار محاسن کر سکتی ہے: اس حصہ میں بتایا ہے کہ وہ زینت جس کو عام طور پر ظاہر نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ لباس یا زیورات کی زینت ہو اور خواہ جسمانی خوبصورتی جسے عورتیں ظاہر کرنے کی عادی ہیں اس کا اظہار ایک تو چند رشتہ داروں پر ہو سکتا ہے۔ خاوند، باپ، خسر، خاوند کا بیٹا، بھائی، بھتیجا، بھانجا اور دُودھ اور خون کے رشتے یکساں ہیں۔ چچے اور ماموں کا ذکر نہیں کیا اس لیے کہ وہ آباء کے حکم میں ہیں اور اب کا لفظ قرآن کریم میں چچا پر بولا گیا ہے اس کے بعد نساء ھن آتا ہے یعنی اپنی عورتیں۔ اس سے مراد اکثر نے مسلمان عورتیں لی ہیں۔ گویا غیر مذاہب کی عورتوں کے سامنے بھی اظہار محاسن نہیں چاہیئے۔ مگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مذاہب کی عورتیں نبی صلعم کی بیبیوں کے پاس آتی جاتی تھیں (ر) اور اس لیے امام رازی کہتے ہیں سب عورتیں مراد ہیں۔ میرے نزدیک مطلب یہ ہے کہ اپنی طرز کی عورتیں ہوں یا جن سے تعلقات ہوں۔ کیونکہ بعض رذیل عورتیں یا ناواقف فتنہ کا موجب ہو جاتی ہیں۔ پھر ما ملکت ایمانھن ہیں جن سے مراد بعض کے نزدیک لونڈیاں ہیں اور بعض کے نزدیک لونڈیاں اور غلام دونوں، اور یہ دوسرا خیال ہی درست ہے اس لیے کہ لونڈیوں کے ذکر کی ضرورت بھی نہ تھی۔ پھر ایسے خادم مرد ہیں جو حاجت نکاح نہ رکھتے ہوں جیسے شیخ فانی وغیرہ اور پھر نابالغ لڑکے۔ ما ملکت ایمانھم میں ایسے ادنےٰ درجہ کے لوگ آ سکتے ہیں جیسے خاکروب۔ لیکن ملازم یا عام خدمتگاروں کا ذکر تابعین کے لفظ میں ہے ہاں عورتوں کے اس احتیاط کے ساتھ جو باہر نکلنے کے متعلق ہے معمولی نوکروں سے کام لے لینے میں کوئی ہرج نہیں اور ایسا ہی دوسرے عزیز یا رشتہ دار اسی احتیاط کے ساتھ عورتوں کے سامنے آ سکتے ہیں جو ان کے باہر نکلنے کے متعلق ہے۔

پردہ میں افراط و تفریط: اگر ایک طرف مسلمانوں نے افراط کر کے پردہ کو ایسا سخت بنایا ہوا ہے جو قرآن کریم کا منشا نہ تھا تو دوسری طرف ایک بھی گھر نہیں جہاں سوائے ان لوگوں کے جن کا ذکر اس آیت میں ہے اور کوئی عزیز یا رشتہ دار سامنے نہ آتا ہو گویا افراط کے ساتھ تفریط بھی موجود ہے یہ اس لیے کہ قرآن شریف کی اصل تعلیم کو چھوڑ دیا اور اپنے خیالات کا تتبع مقصود ہے۔

۲۳۲۵ ایامی۔ اَیِّم کی جمع ہے اور وہ وہ عورت ہے جس کا خاوند نہ ہو اور اس مرد کو بھی کہہ دیا جاتا ہے جس کی بی بی نہ ہو۔ (رغ)

مجردوں کے نکاح کا حکم: ایم کا لفظ ہر مجرد پر حاوی ہے مرد ہو یا عورت: نکاح کر کے اپنے زوج کو کھو چکا ہو یا ابھی نکاح ہی نہ کیا ہو۔ گو خصوصیت سے رانڈ اور رنڈوے پر بولا جاتا ہے اور یہاں عام ہی ہے اور مراد یہ ہے کہ نکاح ضروری ہے اور مجردوں سے بدکاری پیدا ہوتی ہے اور یہاں چونکہ ان اسباب کا ذکر کیا ہے جن سے بدکاری اور زناکاری رُکے اس لیے یہ بھی بتا دیا کہ حتی الوسع نکاح ہونے چاہئیں، یہاں تک کہ غلاموں اور لونڈیوں کے بھی ہونے چاہئیں۔ جو لوگ بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکتے ہیں وہ اس حکم قرآنی کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور نتیجہ اس کا بہت بُرا نکلتا ہے۔ یورپ کی زناکاری کا علاج بھی اسی حکم کی تعمیل سے ہو سکتا ہے اور یہ لوگ اگر بدی کو بدی سمجھ کر اس اسلامی ہدایت کو قبول نہ کریں گے تو پیدائش کی کمی جو بدکاری کے بڑھ جانے کا لازمی نتیجہ ہے انہیں مجبور کر کے اس طرف لائے گی۔ ان یکونوا فقراء یغنھم اللہ من فضلہ میں سمجھایا کہ نکاح کے ساتھ بھی بعض کشائش کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں کیونکہ اوّل تو عورت بہت سے کاروبار میں مرد کی معاون ہو جاتی ہے۔ دوسرے ذمہ واری کا احساس بھی مرد میں زیادہ ہمت پیدا کر دیتا ہے۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا
حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالَّذِيْنَ
يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ
فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ ق
وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ
وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ
اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ؕ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ
بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۳
وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ

اور جو شادی (کا سامان) نہیں پاتے اپنے تئیں بچائے رکھیں
یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے انھیں غنی کر دے [۲۳۲۶] اور جن کے
تمھارے داہنے ہاتھ مالک ہیں ان میں سے جو آزادی کی
تحریر مانگیں تو انھیں لکھ دو اگر تم ان میں بھلائی جانتے ہو
اور ان کو اللہ کے مال سے دو جو اس نے تمھیں دیا ہے [۲۳۲۷]
اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاکدامن رہنا چاہتی ہیں بدکاری پر
مجبور نہ کرو، تاکہ تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہو اور جو کوئی
انھیں مجبور کرے گا تو اللہ ان کے جبر کے بعد بخشنے والا
رحم کرنے والا ہے [۲۳۲۸]
اور ہم نے تمھاری طرف کھول کر بیان کرنے والی آیتیں

ع۲۳۲۶ لا یجدون نکاحًا سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ رشتہ نہ ملے اور یہ بھی کہ سامان نہ ہو۔ لیکن آج کل جو لوگوں نے رسم و رواج کے تتبع میں نکاح کے لیے سامان ضروری ٹھہرایا ہُوا ہے وہ مراد نہیں اور استعفاف سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو بدکاری سے روکیں۔ یعنی شہوانی خیالات کے خلاف جدوجہد کریں اور حدیث میں روزہ بھی اس کا علاج بتایا گیا ہے۔

ع۲۳۲۷ الکتاب۔ کِتَابَۃ سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی واجب کرنا ہیں اور کَتْب سے بھی جس کے معنی نظم ہیں (غ) اور کتابۃ جس سے مراد غلام کو تحریر کا لکھ دینا ہے کہ وہ اس شرط پر آزاد ہے۔ اسلامی لفظ ہے اہل جاہلیت اسے نہ جانتے تھے (ر)

خیرا۔ خَیر کے معنی ع۱۳۷۱ و ع۲۲۰ وغیرہ میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں بعض نے معنی مال بھی مراد لیے ہیں اور بعض نے معنی نفع لیے ہیں جو انہیں خود اور ان کے آزاد کرنے والوں کو ان کی آزادی سے پہنچے (غ) اور صورت اول میں بھی مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ان کے پاس مال جمع ہو بلکہ یہ معنی ہونگے کہ وہ مال جمع کرنے یا کمانے کی قابلیت رکھتے ہوں اور چونکہ خیر کا لفظ اس مال پر عموماً بولا گیا ہے جو وجہ محمود سے کمایا جائے۔ جیسے وصیت کا حکم دیتے وقت ان ترک خیرا (البقرۃ ۲ - ۱۸۰) فرمایا یا جیسے قل ما انفقتم من خیر (البقرۃ ۲ - ۲۱۵) وما تنفقوا من خیر (البقرۃ ۲ - ۲۷۳) اس لیے مطلب یہ ہوا کہ ان میں یہ قابلیت دیکھو کہ وہ وجہ محمود پر مال کما سکتے ہیں کیونکہ اگر وہ مال کمانے کی اہلیت نہیں رکھتے تو پھر چوری کر کے یا اور ناجائز طریق پر اپنا گزارہ کریں گے اور یوں دونوں صورتوں میں مطلب ایک ہے۔

نکاح کے ذکر میں غلاموں کی کتابت کا ذکر کیا۔ یعنی غلاموں کو آزاد کرنے کا منشا یہ ہے کہ وہ آزاد ہو کر نکاح کو زیادہ پسند کریں گے اور یہاں مکاتبت کی شرط یہ رکھی ہے ان علمتم فیہم خیرا۔ اگر ان میں بھلائی کا علم ہو یعنی یہ دیکھ لو کہ وہ آزاد ہو کر اپنے لیے بھی اور قوم کے لیے بھی مفید ہو سکتے ہیں۔ یہ اس لیے فرمایا کہ غلامی انسان کو بعض وقت نہایت ذلیل حالت تک پہنچا دیتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے بھلے بُرے کو بھی نہیں سوچ سکتا۔ اور پھر ان کو صرف تحریر دیدینے کا حکم ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے کچھ انہیں بھی دو۔ یعنی مالی طور پر بھی ان کی امداد کرو۔ اور یہ حکم سب مسلمانوں کو ہے اسی بنا پر بیت المال سے بھی ان پر صرف کرنے کا حکم تھا اور زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف غلاموں کی آزادی ہے قرآن کریم کے اس حکم سے بڑھ کر کس نے غلاموں کی آزادی کا کچھ کام کر کے دکھایا ہے۔

ع۲۳۲۸ بغاء بِغَاء فجور یعنی زنا ہے کیونکہ یہ ایسی بات کی طرف تجاوز ہے جو نہیں چاہیئے (غ)

لونڈیوں کو زنا پر مجبور کرنا: مسلم اور ابو داؤد میں ہے کہ عبداللہ بن اُبیّ کے پاس دو لونڈیاں تھیں جن سے وہ زنا کراتا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور بعض روایات میں ہے کہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ لونڈیوں سے زنا کراتے اور اس کی اُجرت سے فائدہ اٹھاتے تھے تو اس ناپاک رسم کو مٹایا۔ بڑے بڑے معزز لوگوں کا اس طرح زنا کو علانیہ مروج کرنا بتاتا ہے کہ عرب میں زناکاری کی حالت کہاں تک پہنچ گئی تھی اور ان اردن تحصنا سے یہ مطلب نہیں کہ اگر وہ بچنا چاہیں تو انہیں مجبور نہ کرو اور اگر بچنا نہ چاہیں تو مجبور کرو۔ کیونکہ مجبور اسے ہی کیا جا سکتا ہے جو ایک کام کو نہ چاہے اور ان اردن تحصنا محض صورت حال کا بیان ہے کہ وہ تو اس فعل قبیح سے بچنا چاہتی ہیں اور تم انہیں مجبور کرتے ہو اور غفور رحیم ان کیلئے ہے جنھیں مجبور کیا گیا حالانکہ وہ نہ چاہتی تھیں۔

مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ
ع ٤ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٤﴾
اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ مَثَلُ
نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ
فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ
دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ
زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ ۙ
يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ
نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ
مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ
لِلنَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٣٥﴾

اتاریں اور کچھ ان لوگوں کے حالات جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور متقیوں کے لیے نصیحت ۲۳۲۹ع

اللہ آسمانوں اور زمین کا روشن کرنے والا ہے ۲۳۳۰ع اس کے نور کی مثال (ایسی ہے) جیسے ایک طاق میں ایک چراغ ہے چراغ ایک شیشہ میں ہے ، شیشہ گویا کہ ایک چمکتا ہوا تارہ ہے (چراغ) ایک بابرکت زیتون کے درخت سے روشن ہو رہا ہے ، جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی قریب ہے کہ اس کا تیل روشنی دے ، گو اسے آگ بھی نہ چھوئے ، روشنی پر روشنی ہے اللہ اپنے نور کے لیے جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۲۳۳۱ع

ع۲۳۲۹ رکوع کی اس آخری آیت میں یہ بتا کر کہ یہ احکام جو انسان کے لیے روشنی کا کام دینے والے ہیں اللہ تعالےٰ نے ہی اُتارے ہیں، اگلے رکوع کے مضمون کی طرف اشارہ کیا۔

ع۲۳۳۰ نُور۔ وہ پھیلی ہوئی روشنی ہے جو دیکھنے میں مدد دیتی ہے اور یہ دو قسم ہے دُنیوی اور اُخروی۔ پھر دنیوی دو قسم ہے۔ ایک معاون بصیرت یعنی وہ روشنی جو امور الٰہیہ سے ہے جیسے نورِ عقل۔ نورِ قرآن اور ایک معاون بصارت جیسے سورج چاند ستاروں کی روشنی ذیل کے مقامات پر الٰہی روشنی مراد ہے: قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین (المائدة ۵ - ۱۵) وجعلنا له نورا یمشی به فی الناس (الانعام ۶ - ۱۲۲) ولکن جعلنٰه نورا نهدی به من نشاء من عبادنا (الشوریٰ ۴۲ - ۵۲) فهو علی نور من ربه (الزمر ۳۹ - ۲۲) نور علی نور یهدی اللہ لنوره من یشاء۔ اور محسوس یا معاون بصارت نور کی مثال ہے جعل الشمس ضیاء والقمر نورا (یونس ۱۰ - ۵) اور ضَوء نور سے زیادہ خاص ہے وقمرا منیرا (الفرقان ۲۵ - ۶۱) یعنی نُور والا اور بعض جگہ دونوں پر شامل ہے جیسے وجعل الظلمات والنور (الانعام ۶ - ۱) واشرقت الارض بنور ربها (الزمر ۳۹ - ۶۹) اور نور اُخروی جیسے یسعی نورهم بین ایدیهم (الحدید ۵۷ - ۱۲) اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو نور کہا ہے اس لیے کہ وہ مُنَوِّر ہے یعنی روشن کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کا اپنے آپ کو نور کہنا مبالغہ فعل کے لیے ہے (غ) اور اللہ تعالےٰ کے اسماء میں جو نور ہے تو ابن اثیر کہتے ہیں کہ اس سے مراد ہے وہ جس کے نور کے ساتھ اندھے دیکھتے ہیں اور جس کی ہدایت کے ساتھ گمراہ ہدایت پاتے ہیں اور بعض نے اس کے معنی کیے ہیں ظاہر جس کی وجہ سے ہر شے کا ظہور ہے اور اسے جو اپنے نفس میں ظاہر ہو وہ دوسرے کو ظاہر کرنے والا ہو نور کہا جاتا ہے اور ابو منصور کا قول ہے کہ نور اللہ کی صفات میں سے ہے اور اللہ نور السمٰوات والارض میں نور کے معنی هادی اهل السمٰوات والارض کیے گئے ہیں یعنی آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں کو ہدایت دینے والا (ل) اور بطور مبالغہ اللہ تعالیٰ کو جو منوّر ہے نور اسی طرح کہا جاتا ہے جیسے سخاوت میں مبالغہ کے لیے ایک شخص کو جود کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالےٰ کے نور ہونے سے مراد: پہلے چار رکوعوں میں وہ ہدایات دیکر جن سے انسان پاکیزگی حاصل کرسکتا ہے۔ پچھلے رکوع کی آخری آیت میں فرمایا تھا کہ یہ کھول کر بیان کرنے والی یعنی روشنی دینے والی آیات اللہ تعالیٰ نے ہی اتاری ہیں۔ یہی مضمون اس رکوع کا ہے اور سب سے پہلے بتایا کہ اللہ تعالےٰ نے کتاب ہدایت کے لیے اس لیے اتاری کہ وہ ہی آسمانوں اور زمینوں میں روشنی پھیلانے والا ہے کیونکہ نور سے مراد منوّر ہی ہے اور اگلے الفاظ مثل نورہ خود بتاتے ہیں کہ یہاں مراد منور ہی ہے اور ابن جریر نے نور کے معنی هادی کیے ہیں اور یہ معنی حضرت ابن عباس سے مروی ہیں اور گو یہاں بالخصوص ذکر ہدایت یعنی نورِ الٰہی کا ہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ دونوں طرح پر منوّر ہے یعنی معاون بصارت روشنی دینے والا بھی اور معاون بصیرت روشنی دینے والا بھی جیسا کہ ابن اثیر نے لکھا ہے اور گو نور کے یہ معنی بھی درست ہیں کہ وہ فی نفسہٖ ظاہر دوسروں کو ظاہر کرنے والا ہے مگر سیاق اسی کو چاہتا ہے کہ یہاں مراد ہادی ہی ہے چنانچہ اگلی آیات میں اس کی ہدایت کا ذکر کھلے الفاظ میں ہے۔

ع۲۳۳۱ مشکوٰۃ۔ شَکْو اور شِکَایَۃ اور شَکْوٰی غم کا اظہار ہے انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ (یوسف ۱۲ - ۸۶) وتشتکی الی اللہ (المجادلة ۵۸ - ۱) اور شَکو۔ اصل میں شَکْوَۃ کا کھولنا اور جو کچھ اس میں ہے اس کا ظاہر کرنا ہے اور وہ چھوٹے سے مشکیزہ کو کہتے ہیں جس میں پانی رکھا جاتا ہے اور مشکوٰۃ اس

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ﴿۳۶﴾

یہ نور ان گھروں میں ہے جو اللہ نے حکم دیا ہے کہ بلند کیے جائیں اور ان میں اس کا نام یاد کیا جائے ان میں اس کی تسبیح صبح اور شام کے وقتوں میں کرتے رہتے ہیں ۲۳۳۲

سوراخ کو کہتے ہیں جو دوسری طرف نہ نکل گیا ہو یعنی طاق اور یہ دل کی مثال ہے اور چراغ سے مراد نور الٰہی ہے جو اس میں ہے (غ)، اور بعض نے مشکوٰۃ سے مراد وہ لوہا بھی لیا ہے جس سے قندیل لٹکائی جاتی ہے (ل)

مصباح۔ صُبح اور صباح اوّل النہار ہے یعنی دن کا پہلا حصّہ اور وہ وقت ہے جب افق سورج کی روشنی سے چمک اُٹھتا ہے اور مصباح چراغ کو بھی کہتے ہیں جیسے یہاں اور ستارہ کو بھی وزینا السّماء الدنیا بمصابیح (حٰمٓ السجدۃ ۴۱-۱۲) (غ)

زجاجۃ۔ شفاف پتھر کو کہتے ہیں۔

دُرّی۔ دَرّ۔ دودھ اور آنسو کے بہنے پر بولا جاتا ہے اور دودھ کو بھی دَرّ کہتے ہیں اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ذوات الدّرّ کے ذبح کرنے سے منع کیا، یعنی ان جانوروں کے ذبح سے جو دودھ دے رہے ہوں اور دُرّۃ بڑے موتی کو کہتے ہیں اور دُرّیّ دُرّ کی طرف منسوب ہے، یعنی بہت چمکنے والا (ل)

زیتونۃ اور زیتون شجر اور شجرۃ کی طرح ہے اور زیت زیتون کا تیل ہے (غ)

رسول اللہ صلعم کے قلب صافی اور نور فطری کا نقشہ: اللہ تعالیٰ جو منوّر اور ہادی ہے اس کے نور کی یہاں مثال بیان کی ہے اور اس کے نور سے مراد اس کی ہدایت یا اس کا رسولؐ ہی ہے کیونکہ آنحضرت صلعم کو بھی نور کہا ہے قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین (المائدۃ ۵-۱۵) اور اگلے الفاظ میں جو مثال بیان کی ہے وہ اسلام یا اسلام کے لانے والے محمد رسول اللہ صلعم کی مثال ہی ہے اور اس سے مراد رسول اللہ صلعم کا ہونا کعب سے مروی ہے (ج) اس نور کو پہلے مثال طاق سے دی ہے جس میں چراغ رکھا جاتا ہے اور اس سے اشارہ قلب رسولؐ کی طرف ہے کہ وہ ایک طاق کی مثال ہے پھر اس طاق یعنی قلب میں چراغ موجود ہے اور اس سے مراد فطری نور الٰہی ہے اور وہ فطری نور نہایت صاف ہے کیونکہ وہ شیشہ میں ہے اور شیشہ یا قندیل میں جو چراغ ہو وہ دھواں نہیں دیتا۔ گویا آپ کا فطری نور ایسا ہے کہ اس میں ادنیٰ شائبہ ظلمت کا نہیں ہے اور وہ شیشہ ایسا نہیں کہ اس نور کو کم کر دے، بلکہ ایک چمکتے ہوئے ستارہ کی طرح ہے گویا وہ فطری نور مصفّٰے بھی ہے اور نہایت درجہ کا چمکدار بھی، یعنی کمزور نور نہیں بلکہ جہاں تک چمک نور میں آسکتی ہے وہ اس میں موجود ہے۔ پھر اس چراغ میں جو تیل ہے جس سے وہ چراغ روشن ہے وہ ایک بابرکت درخت سے ہے اور مبارک وہ ہے جس کی خیر منقطع نہ ہو، یعنی نور کبھی بُجھے گا نہیں اور دائمی ہوگا اور وہ زیتون ہے اس لیے کہ زیتون کے تیل میں کمال درجہ کی صفائی ہوتی ہے اور زیتون کا لفظ اختیار کرنے میں خاص اشارہ بھی ہے دیکھو والتّین والزّیتون پر نوٹ اور یہ جو فرمایا لا شرقیۃ ولا غربیۃ تو اس سے مراد ہے جیسا کہ زجاج نے کہا ہے کہ وہ فقط شرقی نہیں نہ فقط غربی ہے یعنی شرقی بھی ہے اور غربی بھی لا شرقیۃ فقط لا غربیۃ فقط لکنّہا شرقیۃ وغربیۃ۔ پس وہ مشرق و مغرب دونوں کی خصوصیات کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے اور اس کا نور بھی مشرق اور مغرب دونوں کے لیے ہے اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ اسی نور کے ذریعہ سے انجام کار مشرق و مغرب دونوں مل جائیں گے اور آپ کی ذات بابرکات جامع شرق و غرب ہے اور آپؐ کا نور کل عالم پر محیط ہے اور اس کے محل وقوع کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ نہ مشرق میں ہے یعنی مشرقی ممالک میں سے اور نہ مغرب میں یعنی مغربی ممالک میں بلکہ مشرق اور مغرب کے درمیان میں ہے اور عرب اسی طرح واقع ہے کہ وہ مشرق اور مغرب کے درمیان ہے بین الشرق والغرب (ر) اور یہ جو فرمایا یکاد زیتہا یضیٔ ولو لم تمسسہ نار تو اس میں یہ اشارہ ہے کہ نور فطری اپنی روشنی تب دیتا ہے جب تعلق باللہ سے جو نار پیدا ہوتی ہے وہ اُسے چھوئے مگر محمد رسول اللہ صلعم کا نور فطری اس قدر زبردست ہے کہ وہ خود ہی روشن ہو جانے کو تیار تھا اور اس میں رسول اللہ صلعم کی بعثت سے پہلے کی زندگی کی طرف اشارہ ہے کہ وہ پہلے سے ہی ایک نہایت درجہ کی پاکیزہ زندگی تھی اور مخلوق خدا کی ہدایت کے سوائے آپ کے دل میں کوئی تڑپ نہ تھی اور اس کا نور کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ تب تعلق باللہ کی نار نے اس فطری نور کو روشن کیا اور اس قلب صافی پر وحی الٰہی کا نزول ہوا اور نور علیٰ نور میں بتایا کہ ایک تو وہ فطری نور اس کمال کو پہنچا تھا، پھر دوسرا نور وحی الٰہی کا اس پر آ پہنچا اس لیے وہ نورٌ علیٰ نور کا مصداق ہوگیا اور یہدی اللہ لنورہ من یشاء میں اسی ہدایت وحی کی طرف اشارہ ہے جو محمد رسول اللہ صلعم کے قلب صافی پر نازل ہوئی یوں اس مثال میں بتایا کہ آنحضرت صلعم کا نور ہر قسم کے شائبہ ظلمت سے خالی۔ اعلےٰ درجہ کا مصفّٰے، دائمی اور تمام عالم کے لیے ہے اور یہ بھی آپ کی ختم نبوت پر دلیل ہے اور مصباح کا لفظ لانے میں یہ اشارہ ہے کہ پہلے نبی بھی چراغ تھے مگر یہ چراغ ایسا ہے جو سب عالم کو روشن کرے گا اور کبھی نہ بجھے گا۔

۲۳۳۲ صحابہ کی شہرت کی پیشگوئی: فی بیوت۔ یسبح لہ کے متعلق بھی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں فیہا اس سے بدل ہوگا مگر بظاہر پچھلے کلام کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ کیونکہ جب یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نور ہدایت کے لیے جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے تو اب یہ بتایا کہ وہ نور ہدایت کہاں ہے۔ فی بیوت یعنی گھروں میں ہے اور ان بیوت سے مراد یا تو مسجدیں ہیں اور یا عام گھر اور دونوں معنی مروی ہیں اور ترفع سے مراد یہاں تعظیم ہے دیکھو

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۙ ﴿۳۷﴾

(ایسے) لوگ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی۔ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں اُلٹ جائیں گی ۲۳۳۳

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

تاکہ اللہ انھیں اس کا بہترین بدلہ دے جو وہ کرتے ہیں اور اپنے فضل سے انھیں زیادہ دے اور اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾

اور جو کافر ہیں ان کے عمل چٹیل میدان میں چمکتی ریت کی طرح ہیں، جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آتا ہے اسے کچھ بھی نہیں پاتا اور اللہ کو اپنے پاس پاتا ہے سو وہ اس کا حساب اُسے پُورا پُورا دے دیتا ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے ۲۳۳۴

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾ ع

یا جیسے گہرے سمندر میں اندھیرے اس کے اوپر ایک لہر چڑھی آرہی ہے اس کے اوپر ایک اور لہر ہے اس کے اوپر بادل ہے، اندھیرے ہیں جو ایک دُوسرے پر چڑھے ہوئے ہیں جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے دیکھ بھی نہیں سکتا اور جسے اللہ روشنی نہ دے اسے (کہیں بھی) روشنی نہیں ملتی ۲۳۳۵

ع۲۳۳۲ یعنی دنیا میں ان کا نام بلند ہو اور عام گھر مراد لیکر یہ لفظ زیادہ مناسب موقع ہے کیونکہ وہ گھر جنہیں دنیا میں کوئی جانتا بھی نہ تھا یعنی مکّہ اور مدینہ کے، بغیر دروازوں کی جھونپڑیاں ان کا نام دنیا کے چاروں کناروں میں روشن ہوا اس لیے کہ وہاں اللہ کے نام کی تسبیح ہوئی اور اللہ تعالیٰ کا ذکر گھروں میں بھی ہوتا تھا اور مسجدوں میں بھی۔ اور یسبح کا فاعل رجال ہے جو اگلی آیت میں ہے۔

ع۲۳۳۳ چونکہ پیچھے ذکر تھا کہ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں تو یہاں بتایا کہ وہ راہبوں کا گروہ نہیں جو دنیا سے الگ ہو کر تسبیح میں لگ گئے ہوں بلکہ وہ تجارت اور بیع بھی کرتے ہیں ہاں یہ مشاغل دنیوی ان کے دلوں کو اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتے اور یہ بیع و تجارت کرنے والا گروہ۔ اور پھر ذکر اللہ سے غافل نہ ہونے والا۔ نماز قائم کرنے والا زکوٰۃ دینے والا گروہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے اور تقلّب قلوب والبصار سے مراد یا تو اضطراب شدید ہے اور یا یہ مراد ہے کہ ان کے دل وہ باتیں سمجھنے لگیں گے جو پہلے نہ سمجھتے تھے اور آنکھیں ان نتائج کو دیکھنے لگیں گی جو پہلے نہ دیکھتی تھیں۔ گویا ان کی حالت بدل جائے گی۔

ع۲۳۳۴ سراب۔ سَرَبَ سے ہے دیکھو ع۱۶۰۴ اور سراب وہ چمکتی ہوئی شے ہے جو بیابان میں پانی کی طرح نظر آتی ہے اور سراب اسے اس لیے کہا جاتا ہے کہ دیکھنے میں چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پس سراب وہ ہے جس کی حقیقت کچھ نہیں وسیرت الجبال فکانت سرابا (النبأ۔ ۲۰)
کافروں کے اعمال کو سراب سے مشابہت دی ہے گویا دور سے کچھ نظر آتا ہے مگر فی الحقیقت کچھ نہیں کیوں کہ ان کے اعمال سارے دنیا کے لیے ہوتے ہیں وجد اللہ عندہ کے معنی دو طرح ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ کو سراب کے پاس پاتا ہے یعنی جو کچھ اس نے اس کے لیے مقدر کیا ہے اسے موجود پاتا ہے اور اپنی بدکاریوں کی سزا پاتا ہے یا اللہ تعالیٰ کو اپنے پاس پاتا ہے یعنی اس کا محاسبہ موجود ہوتا ہے۔

ع۲۳۳۵ یہ دوسری مثال کفار کے اعمال کی ہے پہلی مثال تو اعمال دنیا کی بلحاظ نتائج کے ہے کہ وہ سمجھنے میں ہم بہت کچھ کر رہے ہیں۔ مگر آخر یہ سب کچھ

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۖ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٤١﴾

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ (وہ ہے کہ) اس کی تسبیح کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پر پھیلائے ہوئے پرندبھی، ہر ایک اپنی دعا اور اپنی تسبیح کو جانتا ہے اور اللہ اسے جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں ۲۳۳۶

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ ﴿٤٢﴾

اور اللہ کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور اللہ کی طرف ہی انجام کار پھر کر جانا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهِ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهُ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ۖ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ ﴿٤٣﴾

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ بادل کو چلاتا ہے پھر اسے اکٹھا کرتا ہے پھر اسے تہ بتہ کرتا ہے پھر تو بارش کو اس کے اندر سے نکلتے ہوئے دیکھتا ہے اور وہ بادل سے جو پہاڑوں کی طرح ہیں، اولے برساتا ہے، پھر وہ اُسے پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اُسے ہٹائے رکھتا ہے قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں کو خیرہ کردے ۲۳۳۷

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ﴿٤٤﴾

اللہ دن اور رات کو پھیرتا رہتا ہے اس میں آنکھوں والوں کے لیے عبرت ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ

اور اللہ نے ہر ایک جاندار کو پانی سے پیدا کیا، سو

بے حقیقت ثابت ہوگا۔ اور یہ دوسری مثال اس دنیا کی زندگی کے متعلق ہے اور جس طرح وہاں نور علی نور سے مراد نور فطری اور اس پر وحی الٰہی ہے۔ اور ان دونوں نوروں سے ہر ایک مومن بھی حصّہ لیتا ہے، اسی طرح کافر کے لیے اس دنیوی زندگی میں تاریکی ہی تاریکی ہے ظلمٰت بعضھا فوق بعض۔ بحرلجی گویا جہالت کا سمندر ہے جس میں وہ غرق ہیں۔ اور موج پر موج کا آنا واقعات کے تھپیڑے ہیں جن کی وجہ سے وہ حیرت میں کبھی ایک طرف جھکتا ہے۔ اور یا مصیبت پر مصیبت مراد ہے اور کبھی دوسری طرف اور اس کے اوپر بادل ہے یعنی سماوی روشنی بالکل رُکی ہوئی ہے اس قدر ضلالت اور حیرت میں ہے کہ اپنا ہاتھ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اور یہ مثال سخت تاریکی اور جہالت کی اس کامل نور کے مقابل پر ہے جو محمد رسول اللہ صلعم کے سینہ میں روشن ہے۔

۲۳۳۶ صٰفّٰتٍ صَفَّ خط مستقیم میں ہونا ہے اور صَفَّتِ الطیرُ کے معنی ہیں اپنے پر ایک خط مستقیم میں کر دیئے اور انہیں نہ ہلایا۔ الطیر صافات کے معنی ہیں اس طرح پر پھیلائے ہوئے (ل)

جب پچھلے رکوع میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نور ہدایت دیا ہے اور اپنی تسبیح سکھائی ہے اور یہ اس کے نور کا ظہور ہے تو اب مناظر قدرت کی طرف توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ظہور اس کی مخلوقات میں کس طرح ہوتا ہے اور اس پہلی آیت میں بتایا کہ ہر ایک چیز یہاں تک کہ پر پھیلائے ہوئے پرند بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں گویا یہ بتایا کہ ان کا پر پھیلانا بھی اپنے رنگ کی تسبیح ہی ہے اور ہر ایک چیز اپنی دعا اور تسبیح سے واقف ہے جیسا دوسری جگہ ہے وان من شئ الا یسبح بحمدہ ولٰکن لا تفقھون تسبیحھم (بنی اسرائیل۔ ۴۴) اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ہر ایک کی صلوٰت اور تسبیح کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے مگر یہ واللہ علیم بما یفعلون میں بھی آجاتا ہے۔

۲۳۳۷ یؤلف۔ اِلف۔ اجتماع ہے جس میں اتحاد ہو اسی سے تالیف ہے۔

ودق وہ ہے جو مینہ کے اندر سے نکلتا ہے اور جو غبار کی طرح ہوتا ہے اور کبھی اس سے مینہ بھی مراد لیا جاتا ہے (غ) بھاری ہو یا ہلکا (ل)

بَرَد۔ بَرْد اصل میں ٹھنڈک کو کہتے ہیں، نیند کو بھی بَرْد کہا جاتا ہے یا اس لیے کہ اس سے ظاہر جلد میں ٹھنڈک آتی ہے اور یا اس لیے کہ اس سے سکون حاصل ہوتا ہے لا یذوقون فیھا بردًا ولا شرابا (النبأ۔ ۲۴) یعنی نیند اور راحت پیدا کرنے والی زندگی۔ اور بَرَد اسے کہتے ہیں جو بارش کے قطرے گرتے

فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ
مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ
يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ؕ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾

کوئی اُن میں سے وہ ہے جو اپنے پیٹ پر چلتا ہے اور کوئی ان میں سے وہ ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور کوئی ان میں سے وہ ہے جو چار (پاؤں) پر چلتا ہے اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۲۳۳۸

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ
مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾

ہم نے کھول کر بیان کرنے والی آیتیں اتاری ہیں اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا
ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ
وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

اور کہتے ہیں ہم اللہ پر اور رسول پر ایمان لائے ہیں اور اطاعت کرتے ہیں پھر اس کے بعد ان میں سے ایک فریق پھر جاتا ہے اور یہ لوگ مومن نہیں۔

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ
بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور جب انھیں اللہ اور اسکے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک گروہ مُنہ پھیرنے والا ہوتا ہے

وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا
اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ ؕ

اور اگر حق ان کی جانب ہو تو وہ اس کی طرف فرمانبرداری کرتے ہوئے دوڑے آتے ہیں ۲۳۳۹

ہوئے ہوائیں ٹھنڈے ہو کر سخت ہو جائیں (غ) اور بارد ٹھنڈا ھٰذا مغتسل بارد وشراب (صٓ ۳۸-۴۲)
سنا۔ چمکتی ہوئی روشنی کو کہا جاتا ہے۔

ینزل من السماء من جبال فیہا من برد۔ سماء کے معنی سحاب یعنی بادل ہیں اور من جبال فیہا سے مراد ہے قدر جبال وامثال جبال من برد یعنی پہاڑوں کی مانند اولے (ج) اور مراد جبال سے مجازاً کثرت ہے اور اس معنی میں یہ لفظ اشعار عرب میں استعمال ہوا ہے اور کہا جاتا ہے عندہ جبل من ذھب وجبل من علم (ر) یعنی اس کے پاس سونے کا یا علم کا پہاڑ ہے اور مراد اس سے کثرت ہے اور یا من جبال سے مراد ہے من قطع عظام تشبہ الجبال (ر) یعنی بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے جو پہاڑوں کی مانند ہیں۔ اولے برساتا ہے اور ایک معنی من جبال فیہا کے یوں بھی کیے گئے ہیں۔ کہ جبال سے مراد ماجبلہ اللہ ہے یعنی جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور گو روح المعانی میں اس قول کو یہ کہہ کر رّد کیا گیا ہے کہ لغت اس کی تائید نہیں کرتی، مگر لسان العرب میں ثعلب کا قول منقول ہے کہ جَبْلَۃ جس کے معنی خلقت ہیں اس کی جمع جبال ہے اور عرب کے لوگ کہتے ہیں اَجَنَّ اللّٰہُ جبالہ یعنی اللہ اس کی خلقت کو ڈھانپ دے یا اسے مجنون بنا دے۔

اور یہاں اولوں کے برسانے کا ذکر اور ان سے بعض کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ذکر اس غرض کے لیے ہے کہ بارش جو رحمت الٰہی ہے بعض لوگوں کے لیے ان کے اعمال کی وجہ سے مصیبت بھی بن جاتی ہے اور برق کی چمک سے آنکھوں کے لیجانے میں جس سے مراد اُن کا خیرہ کرنا ہے اشارہ عظیم الشان کامیابیوں کی طرف ہے جو آنکھوں کو خیرہ کردیں گی اور اگلی آیت میں رات اور دن کے ادل بدل میں بھی اشارہ ایک قوم کی کامیابی اور ایک کی ناکامی کی طرف ہے جیساکہ خود بتا دیا کہ اس میں عبرت ہے یعنی ظاہری نظارہ سے گزر کر سبق لینا چاہیئے۔

۲۳۳۸ء یہ بھی ظاہری قدرت کا ایک نظارہ ہے اور اشارہ یہ ہے کہ جس طرح حیوانات میں مختلف اقسام ہیں انسانوں میں بھی ہیں، پیٹ پر چلنے والے تو بالکل زمین کے ساتھ لگے رہتے ہیں اور زمین سے اوپر اُٹھتے ہی نہیں۔ اس کے مقابل دو پاؤں پر چلنے والے ہیں جو زمین پر سیدھے کھڑے رہتے ہیں جیسے انسان اور پھر ایک درمیانی قسم ہے چار پاؤں پر چلنے والے۔ ان کے سر بھی زمین کی طرف ہی جھکے رہتے ہیں گو وہ بالکل زمین سے پیوست نہیں۔

۲۳۳۹ء مذعنین۔ اِذعان کے معنی ہیں الاِسرَاعُ مع الطّاعۃ فرمانبرداری کرتے ہوئے جلدی کرنا یا انقیاد یعنی جھک جانا (ل)
یہ منافقوں کا ذکر ہے (ج) لیکن غور کیا جائے تو آج کل مسلمانوں کا یہی نقشہ ہے اللہ اور رسول پر ایمان کا دعویٰ۔ مگر قرآن کے احکام کی پروا نہ کرنا، اپنی خواہش کے مطابق بات ہو تو قرآن و حدیث کی حکومت کے آگے سر نیچا کرنا۔ اور یہ ظاہر کرنا کہ ہم تو اسی کو مانتے ہیں عملاً یہ آج کل کے مسلمانوں کی حالت ہے۔

اَفِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ اَمِ ارۡتَابُوۡۤا اَمۡ
یَخَافُوۡنَ اَنۡ یَّحِیۡفَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ وَ
ع رَسُوۡلُہٗ ؕ بَلۡ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۵۰﴾

کیاان کے دلوں میں بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا ڈرتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کریں گے - بلکہ وہ خود ہی ظالم ہیں ع۲۳۴۰

اِنَّمَا کَانَ قَوۡلَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذَا دُعُوۡۤا
اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ اَنۡ
یَّقُوۡلُوۡا سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ
ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۵۱﴾

مومنوں کا جواب جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، یہی ہوتا ہے کہ کہیں ہم نے سُن لیا اور ہم فرمانبرداری کرتے ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں ع۲۳۴۱

وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ یَخۡشَ
اللّٰہَ وَ یَتَّقۡہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ﴿۵۲﴾

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرتا ہے اور اس کا تقویٰ اختیار کرتا ہے تو یہی بامراد ہیں۔

وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰہِ جَہۡدَ اَیۡمَانِہِمۡ لَئِنۡ
اَمَرۡتَہُمۡ لَیَخۡرُجُنَّ ؕ قُلۡ لَّا تُقۡسِمُوۡا ۚ طَاعَۃٌ
مَّعۡرُوۡفَۃٌ ؕ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۵۳﴾

اور وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں نہایت زور کی قسمیں کہ اگر تو انہیں حکم دے تو وہ نکل کھڑے ہوں گے کہہ قسمیں نہ کھاؤ دستور کے مطابق فرمانبرداری چاہیئے اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ
تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡہِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَیۡکُمۡ
مَّا حُمِّلۡتُمۡ ؕ وَ اِنۡ تُطِیۡعُوۡہُ تَہۡتَدُوۡا ؕ وَ مَا
عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۵۴﴾

کہہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ پھر جائیں تو اس پر صرف وہ (پہنچادینا) ہے جو اسکے ذمہ ڈالا گیا، اور تم پر وہ واجب ہے جو تمھارے ذمہ ڈالا گیا اور اگر اس کی اطاعت کروگے تو سیدھے رستے پر رہو گے اور رسول کے ذمے سوائے کھولکر پہنچا دینے کے کچھ نہیں ع۲۳۴۲

ع۲۳۴۰ یحیف ۔ حَیف فیصلہ میں رعایت اور ایک فریق کی طرف مائل ہو جانے کو کہتے ہیں (غ)

یعنی خدا اور اس کے رسول کے حکم سے انحراف کی وجہ کیا ہو سکتی ہے سوائے اس کے کہ یا دل میں بیماری ہو یعنی نفاق کی حالت۔ یا اس کے خدا اور رسول کے حکم ہونے میں شک ہو یا یہ خیال ہو کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کے ساتھ ناانصافی کریں گے اور یہ تینوں باتیں شان ایمان سے بعید ہیں۔ پس مومن کہلا کر اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے انحراف کرنا کسی طرح جائز نہیں۔

ع۲۳۴۱ جب پچھلے رکوع میں ان لوگوں کا ذکر کیا جو منہ سے ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اللہ اور اس کے رسول کے فیصلوں کی پروا نہیں کرتے تو یہاں بتایا سچے مومن کون ہیں اور ان دونوں باتوں کے ذکر کی ضرورت یہ ہے کہ اب مومنوں کے لیے حکومت اور بادشاہت کا وعدہ دیا جاتا تھا اور اس وعدہ میں شرط ایمان اور عمل صالح ہیں تو پس بتایا کہ صرف نام کی فرمانبرداری ان وعدوں کا مستحق نہیں ٹھہرا سکتی۔

ع۲۳۴۲ حمل ۔ حَمل ہر ایک قسم کے اُٹھانے پر بولا جاتا ہے بوجھ کا اُٹھانا، بچہ کا پیٹ میں اُٹھانا، پانی کا بادل میں، پھل کا درخت میں، پیغام کا لیجانا، گناہوں کا اُٹھانا، اور حَمَّلۡتُہٗ وَحَمَّلۡتُ علیہ کے ایک ہی معنی ہیں اس پر بوجھ ڈالا جیسے حملوا التوراۃ (الجمعۃ ۶۲ - ۵) یعنی انہیں مکلف کر دیا گیا کہ وہ اس کو اٹھائیں، یعنی اس کا حق ادا کریں۔ اور یہاں علیہ ما حمل یعنی رسول جس بات کا مکلف کیا گیا ہے وہ خود بتادی ہے بلاغ مبین اور لوگ جس بات کے مکلف کیے گئے ہیں وہ اس کا حق ادا کرنا ہے یعنی اس پر عمل کرنا۔

اس آیت میں رسول کی اطاعت سے مراد کسی صورت میں رسالت کی اطاعت نہیں ہو سکتی بلکہ رسول بشر کی اطاعت ہی ہے کیونکہ علیہ ما حمل بتاتا ہے کہ وہی رسول بشر ہے جو کسی بات کا مکلف کیا گیا ہے۔ مکلف انسان ہو سکتا ہے نہ پیغام۔ یہ آیت اہل قرآن پر قطعی حجت ہے جو بشر رسول کی اطاعت کے منکر ہیں اور اس میں خطاب بھی مسلمانوں کو ہے۔ کیونکہ حُمِّلۡتُمۡ کا مصداق مسلمان ہی ہو سکتے ہیں جو اپنے منہ کے اقرار سے ان احکام کے مکلف ہو چکے ہیں۔ یہ آیت بھی وعدۂ خلافت کا پیش خیمہ ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ
وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى
لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ
اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ
شَيْـًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾

اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں خلیفہ بنائیگا، جیسا انھیں خلیفہ بنایا جو اُن سے پہلے تھے اور وہ ان کے لیے ان کے دین کو جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مضبوطی سے قائم کردیگا اور وہ ان کے لیے ان کے خوف کے بعد بدل کر امن (کی حالت) کردیگا وہ میری عبادت کرینگے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو وہی نافرمان ہیں ۲۳۴۳

ع۲۳۴۳ لیستخلفنھم۔ خلف اور خلیفۃ کے لیے دیکھو ع۴۵ اور خلافت دوسرے کی نیابت ہے اور خَلَفَ فلانٌ فلانا کے معنی ہیں قام بالامر عنہ یعنی دوسرے سے لیکر حکومت کا تعاہد کیا، خواہ اس کے ساتھ ہو یا اس کے بعد (غ) اور اِستَخْلَفَ فلان من فلان کے معنی ہیں اسے اس کی جگہ قائم کیا اور اِسْتَخْلَفْتُہٗ میں نے اسے اپنا خلیفہ یعنی جانشین بنایا اور استخلفہٗ اسے خلیفہ بنایا اور خلافۃ امارت یا حکومت کو کہتے ہیں اور زجاج کا قول ہے کہ جائز ہے کہ اولیاء اللہ کو اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کے خلیفے کہا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰداؤد انّا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض (صٓ ۳۸۔ ۲۶) اور اوروں نے کہا، کہ خلیفۃ سلطان المعظم ہے اور ھوالذی جعلکم خلائف فی الارض (فاطر ۳۵۔ ۳۹) میں فراء کا قول ہے کہ امت محمد صلعم کو کل اُمتوں کا جانشین بنایا اور خلائف فی الارض کے یہ معنی بھی کیے گئے ہیں کہ تم ایک دوسرے کے جانشین بننے رہنے ہو اور بیٹے کو جب، وہ اپنے باپ کی جگہ میں ہو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے باپ کا خلیفہ ہوا (ل)

وعدۂ استخلاف اور حکومت اسلامی: اس آیت میں تین وعدے صراحت سے دیئے گئے ہیں: اوّل وعدۂ استخلاف، دوم تمکین دین، سوم خوف کی جگہ امن قائم کردینا۔ وعدۂ استخلاف سے عموماً مراد صرف حکومت اور بادشاہت کا ملنا لیا گیا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ کی زبان سے بنی اسرائیل کو کہا گیا عسٰی ربکم ان یھلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض (الاعراف ۔ ۱۲۹) اور اسی کی طرف کما استخلف الذین من قبلھم میں اشارہ ہے یعنی تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کردیگا اور تمہیں زمین میں بادشاہ بنادیگا۔ چنانچہ ابن جریر میں ہے لیورثنّھم اللہ ارض المشرکین من العرب والعجم فیجعلھم ملوکاً یعنی اللہ تعالیٰ انہیں مشرکین عرب وعجم کی سرزمین کا وارث کردیگا اور انہیں بادشاہ بنادیگا۔ ایسے ہی اقوال سب تفاسیر میں ہیں کہ مراد اس سے یہ ہے کہ انہیں ملک میں ایسا تصرّف دیگا جو بادشاہوں کو دیا جاتا ہے اور کفار کو ہلاک کرکے ان کا جانشین انہیں بنادیگا مگر استخلاف کا لفظ وسیع ہے اور یہاں کفار کے استخلاف کا ذکر نہیں، اور پھر یہاں ذکر اُمت کا ہے جو رسول سے الگ کرکے کیا گیا ہے کیونکہ اس آیت سے پہلے بھی اور بعد بھی اطاعتِ رسول کو فلاح اور فوز کے لیے ضروری قرار دیا ہے تو پس یہاں مراد یہی ہے کہ امت محمدیہ کو آنحضرت صلعم کی خلافت دیجائیگی اور حضرت ابوبکر خلیفہ رسول اللہ ہی کہلائے اور آنحضرت صلعم سے امت کو خلافت ملنا خلافت کے دونوں معنوں کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی امارت یا حکومت بھی اور ولایت بھی جیسا کہ لفظ خلیفہ میں یہ دونوں مفہوم شامل ہیں، کیونکہ نیابت سے مراد ہے کہ جو کچھ رسول اللہ صلعم کو دیا گیا وہ آپ کی اُمت کو بھی دیا جائیگا اور آپ کو بادشاہت بھی دی گئی اور ہدایت اور ارشاد خلق کا کام بھی دیا گیا اور بنی اسرائیل کو جس کی طرف یہاں الفاظ کما استخلف الذین من قبلھم میں اشارہ کیا گیا ہے بادشاہت اور نبوت دونوں دیئے گئے اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا (المائدۃ ۵۔ ۲۰) بلکہ آنحضرت صلعم کی خلافت میں یہ بھی صاف مفہوم موجود ہے کہ وہ سلطنت جو آنحضرت صلعم کو دی گئی اور وہ جسمانی اور روحانی دونوں رنگوں پر مشتمل تھی اسے دوام حاصل ہوگا یعنی بادشاہت اور ولایت مسلمانوں میں ہمیشہ رہے گی۔ کیونکہ اُمت کا وجود قیامت تک باقی ہے اور امت محمدیہ کی جگہ دوسری کوئی امت دنیا میں نہ لیگی۔ البتہ پہلے سلسلہ بنی اسرائیل میں خلافت میں نبوت بھی شامل تھی اس لیے کہ حضرت موسیٰ کی شریعت کامل نہ تھی بلکہ اپنے اپنے اوقات میں انبیائے بنی اسرائیل ہدایت ورشد اپنے اپنے زمانہ کے مطابق لاتے رہے اور ایسا ہی حضرت موسیٰ اپنی اُمت کے لیے کامل نمونہ نہ تھے بلکہ الگ الگ اخلاق کے الگ الگ نمونے ان میں ہوتے رہے چنانچہ صحیح بخاری میں حدیث نبوی ہے کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کُلّما ھلک نبیٌ خَلَفَہٗ نبیٌ وانہ لانبی بعدی وسیکون خلفاء یعنی بنی اسرائیل کی رہنمائی نبی کرتے تھے جب ایک نبی فوت ہو جاتا تو دوسرا اس کا جانشین ہوجاتا اور میرے بعد کوئی نبی نہیں اور خلفاء ہونگے۔ پس وہاں بادشاہت اور نبوت تھی یہاں بادشاہت اور ولایت رہے گی کیونکہ بادشاہت کی ضرورت تو ہمیشہ ہے اور نبوت کو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم میں کامل کرکے اسکی جگہ ولایت کا سلسلہ جاری فرمایا اگر نبوت آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات میں کمال کو نہ پہنچتی تو اس اُمت میں بھی نبی ہوتے مگر جب نبی کی ضرورت باقی نہ رہی کیونکہ نور نبوت آنحضرت صلعم کی ذات میں کمال کو پہنچا ہوا

وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو ، اور رسولؐ کی

ہر وقت موجود ہے تو اس کی نیابت ولایت سے ہی ہو سکتی تھی۔
خلافت راشدہ: اس دوہری خلافت میں بعض وجود تو ایسے ہوئے کہ وہ دونوں امور یعنی سلطنت اور رشد و ہدایت کو جمع رکھتے تھے۔ جیسے خلفائے راشدین مہدیین یعنی خلفائے اربعہ جنھوں نے آنحضرت صلعم کے بعد جسمانی اور روحانی دونوں قسموں کی بادشاہت کو اپنے وجود میں جمع کیا کیونکہ یہ وہ پاک لوگ تھے جنھوں نے آنحضرت صلعم کے رنگ کو بکمال اپنے اندر لے لیا اور اس کے بعد عموماً بادشاہت اور ولایت کا سلسلہ الگ الگ چلا۔ سوائے اس کے کہ کبھی کسی بادشاہ کو اللہ تعالیٰ نے تجدید دین کے لیے بھی کھڑا کر دیا ہو، جیسے حضرت عمر بن عبد العزیز اور یہی معنی اس حدیث کے ہیں الخلافۃ بعدی ثلاثون سنۃ ثم تکون ملکاً عضوضاً یعنی خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی پھر بادشاہت ہوگی، جس میں لوگوں پر ظلم بھی ہوگا۔ اور وہ بادشاہت چونکہ صرف ایک حصہ خلافت کا اپنے اندر رکھتی ہے اور اس میں بعض مکروہ امور بھی شامل ہو جاتے ہیں، اس لیے اسے خلافت سے الگ کر کے ذکر کیا اور اس بادشاہت والی خلافت میں ملک عرب کی بادشاہت تو امر لازم ہے اس لیے کہ وہ بادشاہت نبی کریم صلعم کو ملی، پس ضرور ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں میں رہے اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دائرہ وسیع ہوگا، جیسا کہ حدیث ان ربی زوی لی الارض میں ہے دیکھو ۲۱۹۳ یہی وہ خلافت ہے جس کا مذہبی مسئلہ ہونا آج کئی مسلمانوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا، غیر مسلم تو ایک طرف رہے۔ وہ بادشاہت جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو عطا فرمائی اور وجود دین اسلام کے قیام اور تمکین کے لیے اور اس کے بعض ارکان کی حفاظت کے لیے ضروری تھی غیر مسلموں کے ہاتھ میں نہیں جا سکتی۔ بلکہ ضروری ہے کہ آنحضرت صلعم کی بادشاہت جسمانی کے وارث بھی مسلمان ہی رہیں۔ اور غیر مسلم سلطنتوں کی اس کے خلاف کوشش اور ملک عرب پر تصرف کرنے کی تدابیر اسی غرض کے لیے ہیں کہ وعدۂ الٰہی کو باطل کریں مگر اللہ تعالیٰ کے وعدے غلط نہیں ہو سکتے اور اس وعدۂ الٰہی کے خلاف تمام منصوبے انجام کار نیست و نابود ہوں گے۔ ہاں اس وقت مسلمانوں کا بھی فرض ہے کہ جو ذرائع ان کے اختیار میں ہیں وہ ان ناپاک منصوبوں کے خلاف استعمال کریں مگر افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں نے خود ایمان فروشی کر کے ہی غیر قوموں کو یہ موقعہ دیا۔ اگر وہ ایمان کو ہاتھ سے نہ دیتے، تو کوئی غیر مسلم طاقت وہاں کسی قسم کا تصرف حاصل نہ کر سکتی تھی۔ تو فی الحقیقت ایمانی حالت کی کمزوری نے خلافت جسمانی کو بھی کمزور کیا ہے۔ اور اس کی وجہ مسلمانوں کا خود خلافت روحانی کے پہلو کو ترک کر دینا ہے یہاں تک کہ ان کے نزدیک ملک عضوض ہی سب کچھ ہے۔ اور یہ خیال کہ خلافت جسمانی صرف قریش میں ہونی چاہیئے صحیح نہیں۔ اسلام سب قوموں کے لیے آیا جو قوم اپنے اعمال کے لحاظ سے زیادہ حقدار ہوگی وہی خلافت کی مالک ہوگی اور حدیث الائمۃ من قریش کی اصلیت دوسری حدیث سے معلوم ہوتی ہے جہاں آنحضرت صلعم نے بارہ ائمہ کا ذکر کر کے فرمایا کلھم من قریش یہ بارہ امام قریش میں سے ہوں گے اس سے یہ مراد نہ تھی کہ جب تک دنیا قائم ہے قریش میں سے خلفا ہوتے رہیں گے یہ خلاف واقعات ہے اور قرآن کریم نے صرف ایمان اور عمل صالح کی شرط رکھی ہے قومیت کی شرط نہیں رکھی اور قومیت کی شرط اصول اسلام کے خلاف ہے۔

خلافت روحانی اور بعثت مجددین: خلافت روحانی میں اگرچہ اصل ولایت ہی ہے مگر کسی شخص کے منہاج نبوت پر کھڑا کیا جانے کا ذکر بھی صحیح حدیث میں موجود ہے اور یہ حدیث ابو داؤد نے بیان کی ہے ان اللہ یبعث لھٰذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا۔ یعنی اللہ اس امت کے لیے ہر صدی کے سر پر ایک مجدد مبعوث کرتا رہے گا۔ اور امام سیوطی کہتے ہیں اتفق الحفاظ علی تصحیحہ یعنی حدیث کے حافظ اس کی صحت پر اتفاق رکھتے ہیں۔ ہمارے زمانہ سے قریب حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی اس حدیث کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ مجددین بالخصوص خلافت روحانی کی طرف لوگوں کو توجہ دلانے والے ہوتے ہیں۔ ہمارے اس زمانہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے جس مجدد کو چودھویں صدی کے سر پر کھڑا کیا ہے اس نے اسی امر کی طرف توجہ دلائی ہے اور مسلمانوں کی تمام بیماریوں کی اصل جڑ اسی بات کو قرار دیا ہے کہ وہ دین کی طرف سے غافل ہیں۔ اور تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کو ہی اصل علاج قرار دیا ہے۔

اس کے بعد دو وعدے ہیں ایک تمکین دین یعنی دین کا ایسا مضبوط کر دینا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے برباد نہ کر سکے۔ اور دوسرے خوف کے بعد امن اور ایک خوف تو وہ تھا جو زمانہ نبوی میں تھا یہاں تک کہ صحابہ نے نبی کریم صلعم سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ ہمیں دن رات ہتھیار بند رہنا پڑتا ہے کیا کوئی ایسا وقت بھی آئے گا کہ ہم امن میں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے خوف کی جگہ امن کر دیا۔ مگر یہ وعدہ استمراری ہے یعنی ہر حالت خوف کے بعد امن ہو جائے گا۔ اور اعدائے دین کا خوف مسلمانوں کو ہی رہتے گا۔ یہ آیت اہل تشیع پر قطعی حجت ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر کی خلافت حق ہے اس لیے کہ قرآن کریم نے جو معیار خلافت کا قرار دیا تھا وہ کامل طور پر انہی دو خلافتوں میں پورا ہوا۔ یعنی تمکین دین اور تبدیل خوف با من۔

یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً۔ الذین اٰمنوا سے حال ہے یعنی یہ وعدہ ان کے ساتھ ہے جو میری عبادت کرتے ہیں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور یا استخلاف کی علت ہے یعنی چونکہ یہ لوگ میری عبادت کرتے ہیں اس لیے میں انہیں زمین میں بھی بادشاہ بناؤں گا اور یا اس میں بھی ایک پیشگوئی ہے کہ اس ملک عرب کے اندر میری ہی عبادت ہوگی اور شرک مٹ جائے گا۔

من کفر بعد ذٰلک میں لفظ بمقابلہ ایمان بھی ہو سکتا ہے اور بمقابلہ شکر بھی۔ اوپر چونکہ مسلمانوں پر نعمتوں کا ذکر ہے اس لیے مراد کفران نعمت ہی ہے یعنی اگر پھر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے خروج کریں تو پھر وہ فاسق ہیں اور ایسے عہد شکنوں کے ساتھ خدا کا وعدہ کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔ سو ایسا ہی ہوا اور خلافت کی کمزوری یا اس کی بربادی مسلمانوں کی ناشکری کا ہی نتیجہ ہے گو غیر قوموں کی طرف سے ہی وہ وقوع میں آئی ہو۔

وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۲۳۴۴

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾ ع ۱۳

(یہ) خیال نہ کر کہ جو کافر ہیں وہ زمین میں (ہمیں) ہرا دینے والے ہیں اور ان کا ٹھکانا آگ ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَ مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۫ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَ لَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جن کے تمھارے داہنے ہاتھ مالک ہیں۔ اور وہ جو تم میں سے بلوغ کو نہیں پہنچے چاہیئے کہ تین دفعہ تم سے (اندر آنے کی) اجازت لے لیا کریں۔ نماز فجر سے پہلے اور جب تم (گرمی کی) دوپہر کو اپنے کپڑے اتار دیتے ہو اور نماز عشاء کے بعد تین وقت تمھارے پردے کے ہیں۔ ان کے بعد نہ تم پر اور نہ ان پر کوئی گناہ ہے۔ تم ایک دوسرے کے پاس پھرتے پھراتے ہی رہتے ہو، اسی طرح اللہ تمھارے لیے حکم کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۲۳۴۵

۲۳۴۴ جب مسلمانوں کو اپنی ناشکری اور عہد شکنی سے مصائب آجائیں تو ان کا علاج بتایا ہے۔ نماز۔ زکوٰۃ۔ اطاعت رسول۔ نماز اور زکوٰۃ چونکہ دو بڑے رکن ہیں اس لیے ان کا ذکر بالخصوص کیا ہے اور اصل رسول اللہ صلعم کی اطاعت ہی ہے یعنی اس راہ پر چلنا جس پر آپ نے چلایا تھا جو ان مصائب کو دور کرسکتی ہے دوسری تو مونکی نقل اسلام کی مصائب کو دور نہیں کر سکتی۔ اگلی آیت میں بتایا کہ کفار کا کتنا بھی غلبہ نظر آئے وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

۲۳۴۵ ظہیرۃ۔ ظُہر مشہور ہے اور وہ دن کا نصف ہے اور اس کی وجہ تسمیہ یا تو یہ ہے کہ وہ دیکھنے میں نماز کا ظاہر ترین وقت ہے یعنی ہر شخص کو خود بخود معلوم ہو جاتا ہے اور یا یہ کہ وہ گرمی کے لحاظ سے سب سے زیادہ ظاہر ہے اور بعض کے نزدیک یہ کہ وہ پہلی نماز ہے جو ظاہر ہوئی یعنی پڑھی گئی۔ اور ظہیرہ سخت گرمی کی دوپہر کا وقت ہے اور سردیوں کی دوپہر کو ظہیرۃ نہیں کہا جاتا (ر)

اس رکوع میں بظاہر بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بیان کی ہیں اور مراد اس سے یہ سمجھانا ہے کہ بڑی بڑی بدیاں چھوٹے چھوٹے امور کی طرف توجہ کرنے سے رُک جاتی ہیں۔ اس آیت میں خلوت کی قدر سکھائی ہے، پچھلے رکوع میں بادشاہت کا وعدہ تھا جس کا حصول ہر قوم کا پہلا مقصد ہوتا ہے مگر انسان کو راحت صرف اسی سے نہیں پہنچتی بلکہ اس کے گھر کے اندر چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اس کی راحت میں معاون ہوتی ہیں اور انہی سے اس کے لیے یہ دنیا کی زندگی بہشت یا دوزخ کا نمونہ بنتی ہے اور بالخصوص میاں بی بی کے محبّت آمیز تعلقات میں تسکین قلب ملتی ہے پس جو امور اس میں مخل ہو سکتے ہیں انہیں روکا ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دیگر اوقات میں غلام اور نابالغ لڑکے آجا سکتے ہیں گویا ان سے پردہ نہیں اور نہ انہیں اذن لینے کی ضرورت ہے مگر میاں بی بی میں بے تکلفی کی حالت اور محبّت آمیز امور دوسرے لوگوں کے سامنے نہ ہونے چاہئیں۔

یورپ کی تہذیب نے ان امور کو جو خلوت سے تعلق رکھتے تھے جلوت میں لاکر اخلاق انسانی کا ستیاناس کر دیا ہے اور فسق و فجور کی رُو تمام حد بندیوں سے باہر نکل گئی ہے۔ جوان مرد اور عورتیں کھلے میدانوں میں بیٹھ کر وہ کام کرتے ہیں جنھیں دیکھ کر شرم بھی شرما جاتی ہے۔ جن باتوں کو چھوٹا سمجھا جاتا ہے وہی آج کے فسق و فجور کا اصل علاج ہیں اور یورپ آج عرب سے زیادہ ان ہدایات کا محتاج ہے اور یہ جو فرمایا حین تضعون ثیابکم تو مراد اس سے دن کا لباس اُتار دینا اور سونے کے لباس کا پہن لینا ہوں گے، ننگے ہونا مراد نہیں جیسا کہ آگے بوڑھی عورتوں کے ذکر میں آتا ہے ان یضعن ثیابھن وہ اپنے کپڑے اتار دیں اور مراد خاص ان کپڑوں کا اتارنا ہے جو زینت کے مقاموں کو ڈھانکنے کے لیے لئے جاتے ہیں۔

وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ
فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ
وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾
وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ
نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ
ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ؕ وَ اَنْ
يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾
لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ
حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰٓى
اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ
بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ
بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ
بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ
بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ
مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ
لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا
اَوْ اَشْتَاتًا ؕ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا
عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ

اور جب تم میں سے لڑکے بلوغ کو پہنچ جائیں تو چاہیئے کہ وہ
(اندر آنے کی) اجازت لے لیا کریں، جس طرح وہ اجازت لیتے
رہے جو ان سے پہلے ہیں۔ اسی طرح اللہ اپنے حکم تمھارے لیے
کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۲۳۴۶
اور بڑی عمر کی عورتیں جو نکاح کی امید نہیں رکھتیں ان پر کوئی گناہ
نہیں کہ وہ اپنے (اوپر کے) کپڑے اتار رکھیں، بغیر اس کے
کہ سنگار دکھاتی پھریں اور وہ اپنے آپ کو بچائے رکھیں تو
ان کے لیے بہتر ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۲۳۴۷
اندھے پر کوئی تنگی نہیں اور نہ لنگڑے پر کوئی تنگی
ہے، اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے، اور نہ خود
تم پر کہ تم اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپوں
کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا
اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے
یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے
یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے
یا وہ جس کی چابیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوست کے (گھر سے)
تم پر کوئی گناہ نہیں کہ سب اکٹھے کھاؤ یا الگ الگ
پس جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو
سلام کہا کرو، دعائے خیر اللہ کی طرف سے برکت

ع۲۳۴۶ الذین من قبلہم سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جن کا ذکر قرآن کریم میں پہلے ہوا حتٰی تستانسوا وتسلموا علی اھلہا (۲۷) اور یہ بھی ہے کہ جو اُن سے پہلے بلوغ کو پہنچے ہیں۔

ع۲۳۴۷ قواعد۔ قاعدۃ کی جمع ہے جو عورت حالت حیض اور تزوّج سے رہ گئی ہو (غ)، اور قاعد کی جمع بھی قواعد ہے اور قاعِد عمر رسیدہ عورت کو کہا جاتا ہے (ف)

متبرجات۔ تَبَرَّجَتِ المرأۃ یعنی عورت نے اظہار حسن میں خوبصورت نشانوں والے کپڑے سے مشابہت پیدا کی (غ) پس تبرج حسن کو نمایاں کر کے دکھانا ہے اور تبرّج کی اصل حقیقت یہ ہے کہ تکلّف سے ان محاسن کو ظاہر کرے جن کا چھپانا واجب ہے (ر۔غ ق) اور کہا گیا ہے کہ عورتیں اپنی چال میں تکبر اور تبختر اختیار کیا کرتی تھیں یعنی ناز و انداز سے چلنا اور تبرج ایسا اظہار زینت ہے جس سے مرد کی شہوت کو تحرک میں لایا جائے (ل)، اور عرب میں عورتوں کا بناؤ سنگار کر کے باہر نکلنا اسی طرح مروّج تھا جس طرح یورپ میں مروج ہے۔

اس آیت میں ان عورتوں کو پردہ کے کپڑے اتار دینے کی اجازت دی ہے جو عمر رسیدہ ہو گئی ہوں۔ یوں معمر عورتیں پوری آزادی کے ساتھ باہر نکل سکتی ہیں اور ہر قسم کے کاروبار میں پورا حصہ لے سکتی ہیں۔

مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع

دی گئی پاکیزہ - اسی طرح اللہ تمہارے لیے حکم کھول کر بیان کرتا ہے "تاکہ تم عقل سے کام لو ۲۳۴۸

۲۳۴۸ اعرج - عُرُوج اوپر چڑھنا ہے تعرج الملٰئکۃ والروح (المعارج - ۴) فظلوا فیہ یعرجون (الحجر ۱۵ - ۱۴) اور معارج کے معنی مصاعد ہیں - ذی المعارج (المعارج - ۳) اور لیلۃ المعراج اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں دعائیں اوپر چڑھتی ہیں جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے الیہ یصعد الکلم الطیب (فاطر ۳۵ - ۱۰) اور عَرَج کے معنی ہیں - اس طرح چلا جس طرح اوپر چڑھنے والا چلتا ہے اور عَرِج کے معنی ہیں اس کی بناوٹ ایسی ہو گئی اس لیے اَعْرَج لنگڑا ہے -

صدیق - صَداقۃ کے ایک معنی محبت میں صدق اعتقاد ہیں اور انسان سے خاص ہے (غ) ولا صدیق حمیم (الشعراء ۲۶ - ۱۰۱)

اشتاتا - شتّ - قبیلہ کے پراگندہ ہو جانے کو کہا جاتا ہے اور اشتات کے معنی ایسی حالت ہیں کہ ان کے نظام میں پراگندگی تھی یومئذ یصدر النّاس اشتاتا (الزلزال ۹۹ - ۶) اور نبات شتّٰی (طٰہٰ - ۵۳) میں مراد مختلف انواع کی سبزیاں ہیں اور قلوبھم شتّٰی (الحشر ۵۹ - ۱۴) میں مراد ہے کہ ان میں باہم الفت نہیں ؛

اندھے اور لنگڑے اور بیمار پر حرج نہ ہونے سے کیا مراد ہے، ابن جریر میں ایک قول تو یہ ہے کہ اندھے لنگڑے بیمار کے ساتھ کھانا کھانے میں مضائقہ کرتے تھے اس خیال سے کہ ان کے طعام کا کوئی حصہ نہ کھا جائیں تو یہاں اجازت دی گئی ہے کہ تم اندھوں وغیرہ کے ساتھ بھی کھانا کھا سکتے ہو اور یا اس لیے کہ اہل جاہلیت اندھے وغیرہ کے ساتھ کھانا کھانا پسند نہ کرتے تھے دونوں صورتوں میں اندھے کے ساتھ مل کر کھانا کھانے کی اجازت دی گئی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ آیت کی رو سے ایسے لوگوں کو اپنے ساتھ لیجا کر دوسروں کے گھروں سے کھانا کھلانا جائز ہے جب اپنے گھر میں نہ ہو اور ایک یہ کہ ایسے لوگ چونکہ غزوات میں پیچھے رہ جاتے تھے تو ان کو اجازت دی ہے کہ پیچھے وہ ان کے گھروں سے کھانا کھا سکتے ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ مراد اس سے غزوات میں پیچھے رہ جانے میں حرج کا نہ ہونا ہے میرے نزدیک جس بات میں ہرج نہیں اسے خود بیان فرما دیا ہے ان تاکلوا من بیوتکم او بیوت اٰبائکم یعنی اسباب میں ہرج نہیں کہ ایسے معذور لوگ اپنے قریبی عزیزوں کے گھروں سے کھانا کھالیں - اصل غرض تو اس بات کا بیان کرنا ہے کہ کسی شخص پر تنگی نہیں ڈالی گئی کہ وہ اپنے عزیزوں اور قریبیوں کے گھر سے کھانا نہ کھائے کیونکہ جب اوپر عزیز سے عزیز یہاں تک کہ ماں اور باپ اور بہن کے گھر جانے کے لیے اجازت ضروری ٹھہرائی، تو اس سے یہ خیال گزرنا ممکن تھا کہ ان کے ساتھ معاملہ غیروں کا سا ہے اس لیے کسی قسم کی بے تکلفی بھی جائز نہیں اور اس بے تکلفی میں بڑا حصہ یہ ہے کہ انسان دوسرے کے گھر سے کھانا کھالے - اس لیے فرمایا کہ ان کے گھروں سے کھانا کھانے کی ممانعت نہیں ہے گویا بتایا کہ اجازت لینے کی ضرورت اور وجوہات پر ہے نہ اس وجہ پر کہ ان کو غیر سمجھا گیا ہے اور اس کی ابتدا اس بات سے کی کہ اندھے لنگڑے بیمار پر کوئی تنگی نہیں کہ وہ اپنے عزیزوں کے گھروں سے کھانا کھائیں اس لیے کہ بوجہ معذور ہونے کے اسباب کے مستحق تھے کہ انہیں ایسی اجازت دیجاتی اور ان کے خصوصیت سے ذکر میں یہ اشارہ ہے کہ وہ اس بات کے اہل ہیں کہ انہیں کھانا کھلایا جائے اور یا جس بات میں ہرج نہیں اس کا ذکر لیس علیکم جناح ان تاکلوا جمیعا او اشتاتا میں کیا ہے یعنی ان کے ساتھ مل کر کھانے میں بھی ہرج نہیں اور اگر کوئی صورت کراہت وغیرہ کی ہو تو اس میں بھی ہرج نہیں کہ ایسے معذور لوگوں سے علیحدہ کھانا کھا لیا جائے -

بیوتکم کے معنی اپنے گھر ہیں یعنی جہاں انسان کے بی بی بچے ہوں اور اس کا ذکر اس لیے کیا کہ قریبی رشتہ داروں کے گھر ایسے ہی ہیں جیسے اپنے گھر مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان دوسرے رشتہ داروں پر بوجھ بنکر پڑا رہے بلکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ اگر ان کے گھر جائے اور کھانے کا وقت ہو تو وہاں سے کھانا کھا لینے میں ہرج نہیں - مدعیان تہذیب کی طرح نہیں کہ باپ بیٹے کے گھر جائے اور بیٹا باپ کے تو اس کا بل بھی ادا کرنا پڑے بہت دلوں میں یہ خیال گزرتا ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالٰی نے یہ چھوٹی چھوٹی باتیں کیوں بیان کیں وہ آج یورپ کی حالت کو دیکھیں تو انہیں معلوم ہو کہ قرآن شریف کا ایک ایک لفظ موجودہ تہذیب کی بیماریوں کے علاج کے لیے نازل ہوا ہے علم اور تہذیب کے دعویداروں کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ باپ کے گھر بیٹا یا بیٹے کے گھر باپ یا بھائی کے گھر بہن یا چچا کے گھر بھتیجا مہمان جائے تو وہ اخلاق انسانی کو جواب دیکر کھانے کا بل ان کے سامنے نہ رکھا کریں -

او ما ملکتم مفاتحہ سے مراد ایک قول میں جائداد کا منتظم ہے کہ وہ اس جائداد میں سے اپنی خوراک کے لیے لے سکتا ہے اور بعض کے نزدیک مراد خود اپنی مملوکہ چیزوں سے ہے جن میں غلام بھی داخل ہو جاتے ہیں اور بعض کے نزدیک مراد یہ ہے کہ غزوات میں معذور لوگوں کو پیچھے جائدادوں وغیرہ پر چھوڑا جاتا تھا تو انہیں اجازت دی ہے کہ وہ جائدوں کا انتظام کریں تو بقدر کفایت اس میں سے کھا بھی سکتے ہیں (رج)

جمیعا اکٹھے مل کر کھانا کھانا یعنی ایک دسترخوان اور ایک میز پر خواہ ایک برتن میں سے ہو یا الگ الگ برتنوں سے اور اشتاتا اکیلے اکیلے کھانا کھانا دونوں صورتوں کی اجازت دی ہے اور یہ اجازت عام ہے یعنی اندھے بیمار وغیرہ سے مل کر کھانا یا علیحدہ کھانا - عزیزوں قریبیوں کے ساتھ مل کر کھانا یا الگ کھانا مہمان کے ساتھ مل کر کھانا یا اس سے الگ کھانا - غیروں کے ساتھ مل کر کھانا یا الگ کھانا غنی کا غریب کے ساتھ، بلند مرتبہ انسان کا چھوٹے مرتبہ والے سے مل کر کھانا یا الگ کھانا یہ سب جائز ہے - کیونکہ جیسا کہ ابن جریر میں ہے ان میں سے غنی غریبوں کے ساتھ مل کر نہ کھاتے تھے، جیسا اب بھی یورپ میں رواج ہے کہ بڑا آدمی چھوٹے کے ساتھ ایک میز پر نہیں بیٹھتا اور نہ سپاہی افسر کے ساتھ میز پر بیٹھ سکتا ہے - اور بعض قبائل ایسے تھے کہ ان میں سے کوئی

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ
جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ
الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ
لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ
وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾
لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ
بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ
يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ
يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ
اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں اور جب کسی بات کے لیے جہاں جمع ہونے کی ضرورت ہے اس کے ساتھ جمع ہوتے ہیں، تو جاتے نہیں جب تک کہ اس سے اجازت نہ لے لیں وہ لوگ جو تجھ سے اجازت لے لیتے ہیں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، پس جب وہ اپنے کسی کام کے لیے تجھ سے اجازت مانگیں تو تُو ان میں سے جسے چاہے اجازت دیدے اور انکے لیے اللہ سے استغفار کر اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۲۳۴۹

رسول کے بلانے کو آپس میں ایسا قرار نہ دو جیسا تمہارا ایک دوسرے کو بلانا ہے ۔ اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے چھپ کر نکل جاتے ہیں، پس چاہیئے کہ وہ لوگ ڈریں جو اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں کہ وہ آزمائش میں نہ پڑیں یا انھیں دردناک عذاب نہ پہنچے ۲۳۵۰

شخص اکیلا نہ کھاتا تھا اور یہ بھی تنگی تھی اور بعض ایسے تھے کہ وہ اندھوں وغیرہ کے ساتھ مل کر کھانا پسند نہ کرتے تھے اور بعض ایسے تھے کہ مہمان آجائے تو جائز نہ سمجھتے تھے کہ مہمان سے الگ کھائیں اور گو الگ الگ کھانا کھانا جائز ہے مگر مل کر کھانے کو فضیلت ہے قرآن کریم نے اسے مقدم کیا ہے اور ابن ماجہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کلوا جمیعا ولا تفرقوا فان البرکۃ مع الجماعۃ (ث) مل کر کھاؤ اور الگ الگ نہ کھاؤ، کیونکہ جماعت میں برکت ہے پس ایک گھر کے لوگوں کا بھی ایک دسترخوان پر اکٹھے بیٹھ کر کھانا بہتر ہے اور رسول اللہ صلعم اپنی بیبیوں کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے تھے ؛

ع۲۳۴۹ جامع - امر جامع وہ امر ہے جس کی اتنی اہمیت ہو کہ لوگ اس کے لیے اکٹھے ہو جائیں گویا خود اس امر نے ہی لوگوں کو جمع کیا ہے (غ) جیسے جنگ یا نماز جس کے لیے اجتماع ہو یعنی جمعہ عیدین وغیرہ یا کسی معاملہ میں مشورہ جو پیش آگیا ہو (ج) اور یوم مجموع له الناس (ھود ۱۱-۱۰۳) میں مراد وہ دن ہے جس میں لوگ جمع کیے جائیں (غ)

چونکہ پچھلے رکوع میں خانگی امور کی اہمیت پر زور دیا تھا تو اب بتایا ہے کہ اس میں بھی افراط نہ ہو قومی یا دینی معاملات ذاتی معاملات پر ترجیح رکھتے ہیں پس جب کسی قومی یا دینی معاملہ کے لیے طلب کیا جائے تو نہ صرف حاضر ہوں بلکہ حاضری کے بعد بھی نہ جائیں، جب تک کہ رسول اللہ صلعم سے اجازت نہ لے لیں۔ آج مسلمانوں کی مجالس قومی کی یہ حالت ہے کہ اوّل تو وہاں لوگ آتے نہیں اور جو آتے ہیں تو پابندی کا کوئی خیال نہیں۔ فاذن لمن شئت منھم بتاتا ہے کہ خانگی امور ایسے نہیں کہ ہر ضرورت کے لیے اجازت دی جائے بلکہ کوئی اہم معاملہ ہو یا بہت نقصان ہوتا ہو تو اجازت دینی چاہیئے اور رسول کے بعد امام کی اجازت بکار ہو گی یا کسی مجلس میں اس کے صدر کی ؛

ع۲۳۵۰ یتسللون - سَلّ کسی چیز کا کھینچ لینا اور نرمی سے اس کا نکال لینا ہے اور اِنسلال تنگی یا انبوہ سے نکل جانا اور گزر جانا ہے اور چھپکر نکل جانا بھی اس سے مراد ہوتا ہے اور یتسللون اور ینسلّون کے ایک ہی معنی ہیں (ل)

لواذ - لاوذ (ملاوذ) سے ہے جس کے معنی ہیں کسی دوسری چیز کی آڑ لی یعنی اس کے ذریعہ سے چھپ گیا اور مطلب یہ ہے کہ دوسرے کو آڑ بناتے ہوئے یکے بعد دیگرے نکل جاتے ہیں (غ)

یہاں صاف فرمایا کہ رسول اللہ کا بلانا تمہارے ایک دوسرے کو بلانے کی طرح نہیں، کیونکہ ایک دوسرے کا بلانا ذاتی یا دنیوی ضروریات کے لیے ہوتا ہے اور رسول کا بلانا محض اللہ تعالیٰ کے لیے ہے بعض نے دعاء الرسول سے مراد رسول اللہ کا اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا لیکر آنحضرت صلعم کی استجابت دعا کا یہاں سے استنباط کیا ہے۔ اور بعض نے دعاء الرسول سے مراد لیا ہے لوگوں کا رسول کو بلانا اور اس سے یہ استنباط کیا ہے کہ جس طرح ایک دوسرے کو یا فلاں کہہ کر پکارا جاتا ہے اس طرح آنحضرت صلعم کو نام لیکر نہیں پکارنا چاہیئے بلکہ یا رسول اللہ یا نبی اللہ کہہ کر پکارنا چاہیئے۔ مگر حقیقت میں دعاء الرسول سے مراد

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِؕ قَدْ یَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَیْهِؕ وَ یَوْمَ یُرْجَعُوْنَ اِلَیْهِ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْاؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۠ ﴿۶۴﴾ ع ۱۵	سُن رکھو اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ جانتا ہے جس (حال) پر تم ہو اور جس دن اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو وہ انھیں اس کی خبر دے گا جو وہ کرتے تھے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

رسول کا دین حقہ کی طرف دعوت دینا ہے اور اہم امور دینی کے لیے بلانا اس میں آجاتا ہے اور سیاق اسی معنی کو چاہتا ہے اور رسول اللہ صلعم نے جو دعوت دی تھی تو اس کا منشا یہ تھا کہ دین حق دنیا میں پھیلایا جائے اور لوگوں کو نیکی کی تعلیم دی جائے اور بُری باتوں سے روکا جائے۔ آج مسلمان رسول اللہ صلعم کی اس دعوت کو ایک دوسرے کی دعوت کی طرح بھی قرار نہیں دیتے۔ ایک دوسرے کو جس کام کی طرف بلاتے ہیں اُدھر رُخ کرنا آسان ہو رہا ہے مگر رسول اللہ کی دعوت کی طرف توجہ نہیں کرتے الّا ماشاء اللہ اسی کا نتیجہ فتنہ یا عذاب الیم ہے جس میں اس وقت مسلمان مبتلا ہیں۔

(۲۵) سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ

اٰیاتُھا ۷۷ — رُکُوعَاتُھا ۶

نام: اس سورت کا نام الفرقان ہے اور اس میں چھ رکوع اور ۷۷ آیات ہیں، الفرقان کے نزول کا ذکر اس سورت کی پہلی ہی آیت میں ہے اور اس سورت میں چونکہ یہ دکھایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم کی تشریف آوری سے کیا کھلا کھلا فرق حق و باطل میں ہو گیا ہے اس لیے اس کا نام الفرقان اسی مضمون کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں یہ بتا کر کہ نزول فرقان تمام قوموں کے لیے ہے ان اعتراضوں کا ذکر کیا ہے جو مخالفین رسول اللہ صلعم پر کرتے تھے دوسرے رکوع میں ان اعتراضوں کا جواب دیتے ہوئے بتایا ہے کہ جس رنگ کا فرقان یہ چاہتے ہیں کہ رسول کو دنیا میں حکومت و بادشاہت حاصل ہو وہ بھی قائم کر دیا جائے گا۔ تیسرے رکوع میں مکذبین کے لیے یوم فرقان یعنی جنگ بدر میں قوت ٹوٹ جانے کی پیشگوئی کی اور آخر رکوع میں بتایا کہ قرآن کریم میں سب اعتراضوں کا جواب موجود ہے۔ چوتھے میں کچھ ذکر پہلی قوموں کا کر کے عرب کی اس حالت کا ذکر کیا، جو رسول اللہ صلعم کے آنے سے پیشتر تھی اور بتایا کہ ان لوگوں کی حالت چارپایوں کی طرح ہو چکی تھی۔ پانچویں میں نظارۂ قدرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہ آفتاب کے طلوع سے کس طرح ظلمت آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہے اور بڑی بارش سے پہلے کس طرح ہوائیں بتا دیتی ہیں کہ بارش آ رہی ہے، یہ بتایا کہ انقلاب روحانی کا آغاز ہو چکا ہے اور چھٹے میں اس عظیم الشان انقلاب روحانی کا ذکر کیا کہ کس حالت سے نکال کر کس بلند مقام پر یہ رسول اپنے متبعین کو اس تھوڑے سے عرصہ میں پہنچا چکا ہے۔

تعلق: اس سے پہلے سورۂ نور گذری ہے جو حالانکہ مدنی ہے مگر چونکہ اس میں رسول اللہ صلعم کو ایک اعلےٰ درجہ کے کامل نور سے تشبیہ دی گئی تھی جس کے متعلق یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ وہ نور مشرق و مغرب پر محیط ہو جائے گا اس لیے اس کے بعد اس سورت کو رکھا ہے جو بتاتی ہے کہ وہ کونسی باتیں ہیں جو قرآن کریم اپنے متبعین کے اندر پیدا کرتا ہے اور یوں ظاہر طور پر ایک فرقان یعنی حق و باطل میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔

زمانہ نزول: اس سورت کے نزول کے متعلق جمہور کا قول ہے کہ یہ مکّی ہے اور حضرت ابن عباسؓ نے تین آیتوں کو جو والذین لایدعون مع اللہ الٰہا اٰخر سے شروع ہوتی ہیں مدنی کہا ہے مگر اس کی کوئی وجہ نہیں، تاریخ نزول کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اس میں اس انقلاب روحانی کا ذکر ہے، جو رسول اللہ صلعم کے آنے سے پیدا ہو چکا تھا اس لیے اس کا زمانہ آخری مکّی زمانہ ہے اور غالباً صحابہؓ کی ہجرت مدینہ سے کچھ پیشتر کا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۙ﴿۱﴾

وہ (ذات) بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا، تاکہ وہ تمام جہان کے لیے ڈرانے والا ہو ؏۲۳۵۱

الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَ خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا ﴿۲﴾

وہ وہی ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور اس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ حکومت میں اس کا کوئی شریک ہے اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھیرایا ؏۲۳۵۲

وَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِـہَۃً لَّا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّ ہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ وَ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ ضَرًّا وَّ لَا نَفۡعًا وَّ لَا یَمۡلِکُوۡنَ مَوۡتًا وَّ لَا حَیٰوۃً وَّ لَا نُشُوۡرًا ﴿۳﴾

اور (لوگوں نے) اس کے سوائے معبود بنا لیے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے گئے ہیں اور ان کو اپنے بُرے بھلے کا بھی اختیار نہیں اور نہ موت اور نہ زندگی اور نہ مر کر جی اُٹھنا ان کے اختیار میں ہے۔

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡکُ ۨافۡتَرٰىہُ وَ اَعَانَہٗ عَلَیۡہِ قَوۡمٌ اٰخَرُوۡنَ ۚۛ فَقَدۡ جَآءُوۡ ظُلۡمًا وَّ زُوۡرًا ۚ﴿۴﴾

اور جو کافر ہیں کہتے ہیں یہ تو نرا جھوٹ ہے جو اس نے گھڑ لیا ہے اور اس پر اسے اور لوگوں نے مدد دی ہے۔ یہ ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے ؏۲۳۵۳

؏۲۳۵۱ یہاں قرآن کی بجائے فرقان کا لفظ اختیار کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ حق و باطل میں عملی طور پر فرق کر دکھائے گا اور پچھلی سورت میں لفظ نور کی مناسبت سے جس سے عالم میں تمیز پیدا ہوتی ہے یہاں قرآن کریم کا نام فرقانِ حمید ہی موزوں تھا۔ اور اسی لیے اس سورت میں اوّل کفار کی حالت کا ذکر کر کے آخر پر مومنوں کی حالت بیان فرمائی ہے اور یوں بتایا ہے کہ وہ کتاب جس نے اتنا بڑا انقلاب روحانی پیدا کر دیا، وہ لبشر کا کلام نہ ہو سکتی تھی۔ اور عالمین کے لفظ میں تمام قومیں بلحاظ مکان بھی شامل ہیں خواہ وہ کہیں ہوں اور تمام نسلیں بلحاظ زمان بھی شامل ہیں خواہ وہ کبھی پیدا ہوں۔ ان سب کے لیے نذیر آپؐ ہی ہیں۔

؏۲۳۵۲ تقدیر کے دو ہی مفہوم ہیں۔ ایک قدرت کا عطا کرنا، دوسرا اُن کو اقتضائے حکمت کے مطابق ایک خاص اندازہ اور خاص وجہ پر بنانا ؏۹۸۷ اور اشیاء کی تقدیر انہی دو معنوں میں ہو سکتی ہے کوئی تیسرے معنی اس سے مراد لینا صحیح نہیں۔ دوسرے خود قرآن کریم نے جہاں تقدیر کا ذکر کیا ہے انسان کے لیے علیحدہ ذکر نہیں کیا بلکہ اپنی تمام مخلوق کے لیے تقدیر کا ذکر کیا، جیسے یہاں۔ یا الذی خلق فسوّٰی والذی قدّر فھدٰی (الاعلیٰ ۸۷۔ ۲ و ۳) میں اور جہاں تقدیر کا ذکر خصوصیت سے کیا تو وہ انسان کے لیے نہیں بلکہ یا تو اجرام سماوی کے لیے ہے والشمس والقمر حسبانا ذٰلک تقدیر العزیز العلیم (الانعام ۶۔ ۹۷) والشمس تجری لمستقرّ لہا ذٰلک تقدیر العزیز العلیم (یٰس ۳۶۔ ۳۸) وزیّنا السّمآء الدنیا بمصابیح وحفظا ذٰلک تقدیر العزیز العلیم (حٰم السجدۃ ۴۱۔ ۱۲) اور یا نعمائے بہشت کے متعلق قواریرا من فضّۃ قدّروھا تقدیرا (الدھر ۷۶۔ ۱۶) پس تقدیر محض وہ اندازہ ہے جو ہر چیز کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے جس سے وہ آگے نہیں نکل سکتی اور قرآن کریم میں اس لفظ کا استعمال اعمال انسانی کے متعلق قطعاً نہیں ہوا ہاں شقی یا سعید ہونا یہ اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔ اسے تقدیر نہیں کہا جائے گا اور والذی قدّر فھدٰی میں اسباب کو صاف کر کے بیان کیا گیا ہے کہ ہر چیز کے لیے مادہ ہو یا روح، پتھر ہو یا درخت یا حیوان یا بڑے بڑے اجرام سماوی اللہ تعالیٰ نے ایک اندازہ مقرر کر دیا جس کے اندر وہ شے ترقی کر سکتی ہے اور پھر اسے اس ترقی کی راہیں بھی بتا دی ہیں جس کا ذکر ھدٰی میں ہے اسی طرح انسان کے لیے بھی ایک اندازہ مقرر ہے جس کے اندر وہ ترقی کر سکتا ہے یہ تقدیر ہے اور وہ اچھے کام کرے گا یا بُرے کرے گا یہ اللہ تعالیٰ کے علم کی بات ہے۔

وَ قَالُوْۤا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰى عَلَیْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا ﴿۵﴾

اور کہتے ہیں پہلوں کی کہانیاں ہیں جو اس نے لکھوائی ہیں سو وہ اس پر صبح اور شام پڑھی جاتی ہیں ۲۳۵۴ع

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۶﴾

کہہ، اسے اُس نے اتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھیدوں کو جانتا ہے، ہاں وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ یَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَكٌ فَیَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًا ﴿۷﴾

اور کہتے ہیں یہ کیسا رسول ہے (جو) کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیوں اس کی طرف فرشتہ نہ اتارا گیا تو وہ اس کے ساتھ ہو کر ڈرانے والا ہوتا۔ ۲۳۵۵ع

اَوْ یُلْقٰۤى اِلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ یَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۸﴾

یا اس کی طرف خزانہ بھیجا جاتا یا اس کا باغ ہوتا، جس سے وہ کھاتا۔ اور ظالم کہتے ہیں تم صرف ایک سحر والے آدمی کی پیروی کرتے ہو

اُنْظُرْ كَیْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا ﴿۹﴾ ع ۱۲

دیکھ تیرے لیے کیسی مثالیں بیان کرتے ہیں سو وہ گمراہ ہو گئے ہیں پس رستہ نہیں پا سکتے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْۤ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَیْرًا

وہ (ذات) بابرکت ہے جو اگر چاہے تو تجھے اس سے بہتر

ع۲۳۵۳ قوم اٰخرون سے مراد یہاں وہی لوگ معلوم ہوتے ہیں جن کی طرف کفار اس بات کو منسوب کرتے تھے کہ وہ آپ کو کہانیاں بنا بنا کر دیتے ہیں یعنی بعض نو مسلم غلام جیسے عداس، عایش، یسار، جبر وغیرہ فقد جاء وظلما وزورا میں اس کا جواب ہے اس لیے کہ اگر چند کہانیوں سے یہ انقلاب روحانی پیدا ہو سکتا تھا تو اس کے سُنانے والے ہی کر سکتے تھے، یا خود یہودی اور عیسائی جو صدیوں تک اس کوشش میں لگے رہے کہ عرب کی اصلاح کریں وہ ان کہانیوں کے ذریعہ سے کیوں انقلاب پیدا نہ کر سکے۔ پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا طاقتور ہاتھ محمد رسول اللہ صلعم کی تائید میں کام کر رہا تھا اور جاء اور اتی بمعنی فَعَلَ آتا ہے (ر) اور یا قوم اٰخرون سے مراد صرف یہی ہے کہ چند لوگوں نے مل کر یہ افترا بنایا ہے اور کہانیوں کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔

ع۲۳۵۴ اکتتب۔ اِکْتَتَبَ فلانٌ فلانا کے معنی ہیں اس سے سوال کیا کہ اس کے لیے ایک تحریر لکھ دے جو کسی حاجت کے لیے ہو اور اس کے معنی محض کتب بھی آتے ہیں (ل) اور اگر لکھنا بھی مراد لیا جائے تو یہ اسناد مجاز کے طور پر ہے کیونکہ یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلعم خود نہ لکھ سکتے تھے (ولا تخطہ بیمینک (العنکبوت ۲۹-۴۸) تملی علیہ سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم خود نہ پڑھ سکتے تھے، ورنہ دوسروں کے پڑھ کر سنانے کا ذکر نہ ہوتا، جس اعتراض کا یہاں ذکر ہے۔ اسی کے قریب قریب ایک جرمن ہر شفیلڈ نے اپنی کتاب نیو ریسرچز یعنی نئی تحقیقات میں لکھا ہے اس کا خیال ہے کہ بائبل کے اس قدر مضامین قرآن شریف کے اندر بھرے ہوئے ہیں کہ ضرور ہے کہ نبی کریم صلعم نے اس کتاب کو پڑھ کر ضروری مضامین کے نوٹ اپنے پاس رکھ لیے ہوں اور پھر انہی نوٹوں کو وقتاً فوقتاً قرآن شریف میں داخل کر دیا ہو جو شخص لکھے ہوئے کو پڑھ نہیں سکتا وہ نوٹ کس طرح رکھ سکتا ہے قرآن کریم کے الفاظ تملی علیہ صاف بتاتے ہیں کہ مخالفین نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ یہ خود لکھ لیتا اور پڑھتا رہتا ہے بلکہ دوسروں سے لکھواتا اور پھر دوسروں سے پڑھوا کر سنتا ہے۔ پس جرمن پروفیسر کے خیال کو تاریخ باطل کرتی ہے اور جو اعتراض اس وقت مخالفین نے کیا اس کا جواب یہی کافی ہے کہ جو لوگ کہانیاں اس طرح لکھ کر دیتے اور سناتے تھے وہ آنحضرت صلعم پر ایمان کیونکر لا سکتے تھے اور ایمان بھی تمام دنیا کے مصائب کے مقابلہ میں اس لیے کہ انہی لوگوں کو یعنی بالخصوص غلاموں کو سخت سے سخت مظالم کا تختہ مشق بنایا گیا۔ اور دوسرا جواب اگلی آیت میں دیا ہے کہ اس قرآن میں ایسی اسرار کی باتیں ہیں جنہیں انسان نہیں جان سکتا پس یہ بناوٹی بات کس طرح ہو سکتی ہے۔

ع۲۳۵۵ بازاروں میں چلنے پھرنے سے مراد معاش کے لیے کام کرنا ہے۔

مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ يَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ⑩

باغ دے دے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں اور تجھے محل دے دے ۲۳۵۶ع

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۫ وَ اَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ⑪ۚ

بلکہ وہ مقرر گھڑی کو جھٹلاتے ہیں اور ہم نے اس شخص کے لیے جو مقرر گھڑی کو جھٹلائے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کی ہے ۲۳۵۷ع

اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيْرًا ⑫

جب وہ انھیں دور کے مکان سے دیکھے گی تو وہ اس کے جوش و خروش کو سنیں گے۔

وَ اِذَاۤ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ⑬ؕ

اور جب وہ اس کی تنگ جگہ میں جکڑے ہوئے ڈالے جائیں گے تو وہاں ہلاکت کو پکاریں گے ۲۳۵۸ع

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ⑭

آج ایک ہلاکت کو نہ پکارو اور بہت سی ہلاکتوں کو پکارو ۲۳۵۹ع

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّ مَصِيْرًا ⑮

کہہ کیا یہ بہتر ہے یا ہمیشگی کا باغ جس کا متقیوں کو وعدہ دیا جاتا ہے۔ وہ ان کے لیے بدلہ اور آخری ٹھکانا ہوگا۔

لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ

ان کے لیے جو چاہیں گے اس میں ہوگا (اسی میں) رہیں گے یہ

ع۲۳۵۶ اعتراض یہ تھا کہ رسول ہے تو ہماری طرح کیوں معاش کے لیے چلتا پھرتا اور کام کاج کرتا ہے کیوں اس کے پاس خزانہ خدا کی طرف سے نہیں آجاتا یا وہ آخرت میں جنات کے وعدے دیتا ہے تو اسے یہیں کوئی باغ کیوں نہیں مل جاتا جس کی وجہ سے فکر معاش سے سبکدوش ہو جائے پہلے حصہ کا جواب اس رکوع کی آخری آیت میں دیا اور دوسرے حصہ کا جواب یہاں ہے خیر من ذٰلک سے مراد ہے اس سے بہتر جو ان کے خیال میں ہے اور جنات اور قصور سے مراد اس دنیا کے جنات اور قصور ہیں۔ ان شاء وهب لك فى الدنيا خيرا لك مما اقترحوه وهو ان يجعل لك مثل ما وعد فى الاخرة من الجنات والقصور (ر) اور سوال کرنے والوں کے دل میں تو شاید مکہ یا زیادہ سے زیادہ طائف کے کچھ باغ ہونگے اللہ تعالیٰ نے آپ کو عرب کے باغوں کے ساتھ عراق اور شام اور ایران کے باغوں کا مالک بھی بنا دیا اور شام اور ایران کے محلات اور خزانے سب آپ کے ادنیٰ خادموں کے قدموں میں لاکر ڈال دیئے۔ جنگ خندق میں نبی کریم صلعم کو قیصر اور کسرٰے اور صنعاء کے محل دکھائے گئے اور آپ کو خبر دی گئی کہ ان کے مالک آپ ہوں گے۔ اور خزانوں کی تو یہ حالت تھی کہ ایک ادنیٰ صحابی سُراقہ کے ہاتھ میں کسریٰ کے سونے کے کڑے ایک پیشگوئی کو پورا کرنے کے لیے پہنائے گئے۔ پس بتا دیا کہ جس فرقان کے تم طالب ہو وہ بھی ظاہر کر دیا جائے گا مگر اپنے وقت پر۔

ع۲۳۵۷ الساعۃ سے مراد قیامت بھی ہو سکتی ہے اور ان کی اپنی ساعت بھی۔ دوسری صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ یہ لوگ جو رسول کے انذار کو جھوٹا ٹھہرا کر اس خیال میں بیٹھے ہیں کہ وہ کبھی مغلوب نہ ہونگے ان کے لیے نہ صرف وہ وعدہ مغلوبیت ہی پورا ہو کر رہے گا، بلکہ آخر کار جلتی ہوئی آگ میں بھی داخل ہونگے یعنی وعدہ آخرت بھی پورا ہوگا۔ صورت اول میں مراد یہ ہے کہ جو لوگ جزا و سزا کی تکذیب کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے افعال شنیعہ پر دلیر ہو جاتے ہیں اس لیے آخرت میں ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

ع۲۳۵۸ مقرنین۔ قرن دو چیزوں کو جمع کرنا ہے اور قرّن تکثیر کے لیے ہے (غ) اور دوسری جگہ ہے مقرنین فی الاصفاد (ابراھیم ۱۴-۴۹) پس یہاں بھی مراد زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس دنیا کی خواہشات کی زنجیریں آخرت کی زنجیریں بن جاتی ہیں۔

ع۲۳۵۹ ان کا ہلاکت کو پکارنا اس طرف اشارہ ہے جو دوسری جگہ فرمایا لیقض علینا ربك (الزخرف ۴۳-۷۷) یعنی ان کا کام تمام ہو جائے۔ گویا خود ہلاکت کی خواہش کریں گے اس کے جواب میں فرمایا ایک ہلاکت کیا بیسیوں قسم کی ہلاکتوں کے سامان تم نے کر رکھے ہیں ان سبھی کو بلاؤ۔

عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۶﴾

تیرے رب کے ذمے مانگے جانے کے قابل وعدہ ہے ۲۳۶۰

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰۤؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۱۷﴾

اور جس دن وہ انھیں اکٹھا کرے گا اور ان کو (بھی) جن کی وہ اللہ کے سوائے بندگی کرتے ہیں، پھر کہے گا کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا وہ خود رستہ سے بہک گئے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَ كَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۸﴾

کہیں گے تو پاک ہے ہمارے لیے یہ شایاں نہ تھا کہ تیرے سوائے اور کارساز بناتے لیکن تو نے انھیں اور ان کے باپ دادوں کو سامان دیا یہاں تک وہ ذکر کو بھول گئے اور وہ ہلاک ہونے والی قوم تھے ۲۳۶۱

فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّ لَا نَصْرًا ۚ وَ مَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۱۹﴾

سو انھوں نے تم کو اس میں جھٹلایا جو تم کہتے ہو سو نہ تم (عذاب کو) پھیر سکو گے اور نہ مدد (پا سکو گے) اور جو کوئی تم میں سے ظلم کرے ہم اسے بڑا عذاب چکھائیں گے۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَ كَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾ ع ۲ ۱۱ ۱۷

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجے مگر وہ یقیناً کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔ اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے کیا تم صبر کرو گے اور تیرا رب دیکھنے والا ہے ۲۳۶۲

۲۳۶۰ مسئول سے مراد ہے اس قابل کہ مانگا جائے ابن زید کا قول ہے جسکے متعلق انہوں نے دنیا میں سوال کیا یعنی اسے طلب کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دیا (ج)

۲۳۶۱ بور۔ بوار کساد یعنی سرد بازاری کا بہت ہو جانا ہے اور چونکہ اس کا نتیجہ فساد ہے اس لیے بوار کے معنی ہلاکت ہو گئے ہیں۔ تجارۃ لن تبور (فاطر ۳۵-۲۹) ومکر اولئک ھو یبور (فاطر ۳۵-۱۰) واحلوا قومھم دار البوار (ابراھیم ۱۴-۲۸) اور اکیلے آدمی کو حائر بائر اور قوم کو حور بور کہا جاتا ہے (رغ)

مایعبدون من دون اللہ سے مراد یہاں ایسے لوگ ہیں جن کو خدا بنایا گیا جیسے مسیح وغیرہ ان کا انکار یہ بتانے کیلئے ہے کہ کبھی کسی راستباز نے دنیا میں یہ تعلیم نہیں دی کہ اسے خدا سمجھا جائے۔

۲۳۶۲ اس میں اس اعتراض کا جواب دیا ہے جو پہلے رکوع کے آخر پر تھا کہ یہ رسول کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہی سنت اللہ ہے کہ انسانوں کے لیے انسان ہی رسول ہو کر آئے جہاں کہاں دنیا میں مصلح آئے ایسے ہی آئے۔ بعض کو بعض کے لیے فتنہ بنانے سے مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو تکلیفیں نیکوں کو پہنچائی جاتی ہیں وہ ان کو اعلیٰ مراتب پر پہنچانے کے لیے ہیں کیونکہ فتن سونے کو آگ میں ڈالنا ہے تاکہ ہر قسم کی میل سے پاک ہو جائے اسی لیے اس کے بعد فرمایا کہ تم صبر کرو اللہ تعالیٰ نتیجہ تمہارے حق میں کرے گا۔ کیونکہ وہ بصیر ہے تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ أَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۗ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿٢١﴾

اور جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں کیوں ہم پر فرشتے نہیں اتارے جاتے یا (کیوں) ہم اپنے رب کو (نہیں) دیکھتے، انھوں نے اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھا اور بڑی بھاری سرکشی اختیار کی ع۲۳۶۳

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٢٢﴾

جس دن فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن مجرموں کے لیے کوئی خوشخبری نہیں ہوگی اور کہیں گے کوئی روک حائل ہو جائے ع۲۳۶۴

وَقَدِمْنَآ إِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿٢٣﴾

اور ہم اس کی طرف متوجہ ہوں گے جو انھوں نے عمل کیا ہوگا، سو ہم اُسے اُڑتی ہوئی دھول کر دیں گے ع۲۳۶۵

أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّأَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿٢٤﴾

جنّت والوں کا اس دن اچھا ٹھکانا ہوگا اور بہت خوب استراحت کی جگہ ہوگی ع۲۳۶۶

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿٢٥﴾

اور جس دن آسمان بادل کے ساتھ پھٹ جائے گا اور فرشتے اتارے جائیں گے ع۲۳۶۷

ع۲۳۶۳ فی انفسہم سے مراد فی شان انفسہم ہے۔ یعنی اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھا۔ فرشتے کیوں نہیں اُترتے۔ یا ہم اپنے رب کو کیوں نہیں دیکھتے دیکھو ع۲۶۹ ان کا منشا صرف اتنا اعتراض نہیں کہ فرشتے یا اللہ تعالیٰ ان آنکھوں سے کیوں نظر نہیں آتے بلکہ جیسا کہ اوپر کی آیت میں تصبرون سے ظاہر ہے مسلمانوں کو تکلیفیں پہنچاتے تھے پھر کہتے تھے محمد رسول اللہ کی حمایت کے لیے فرشتے کیوں نہیں آتے یا خود خدا کیوں نہیں آتا اسی کو استکبار اور سرکشی کہا ہے اور بتایا ہے کہ یہ اپنے آپ کو اتنا بڑا خیال کرتے ہیں کہ سمجھتے ہیں ہم پر کبھی سزا ہی نہیں آئے گی خود جواب سے بھی یہی ظاہر ہے جو اگلی آیت میں ہے۔

ع۲۳۶۴ حجرا محجوراً۔ حجر کے معنی منع یا روک ہیں اور محجور روکا گیا۔ مفردات میں ہے کہ جب ایک شخص ایسے آدمی کے سامنے آتا جس سے وہ ڈرتا تو یہ لفظ بولتا۔ اور یہاں مراد یہ ہے کہ کافر فرشتوں کو دیکھ کر ایسا کہیں گے تا کہ وہ اس طرح سزا سے بچ جائیں اور بعض نے اسے فرشتوں کا قول لیکر یوں معنی کیے ہیں کہ اچھی خبر آج تم پر حرام کر دی گئی ہے۔ اور یہی الفاظ حجرا محجورا آگے آیت ۵۵ میں ایسی روک کے متعلق آتے ہیں جو حائل ہو جائے پس پہلے معنی ہی درست اور صحیح ہیں۔ یہاں انکے مطالبہ سزا کا جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ فرشتوں کا نزول تو انکی سزا کے لیے ہوگا اور اسدن وہ چاہیں گے کہ ان میں اور انکی سزا میں کوئی اوٹ حائل ہو جائے مگر اسوقت شوخی کر کے جلدی کر رہے ہیں۔

ع۲۳۶۵ هباء هَبا الغبارُ کے معنی ہیں غبار اُٹھا اور چڑھ گیا۔ اور ھباء باریک مٹی کو کہتے ہیں اور جو ہوا میں ذرات اُڑتے ہیں اور سورج کی روشنی کمرہ میں کسی سوراخ میں سے پڑے تو نظر آتے ہیں۔ فکانت ھباء منبثاً (الواقعۃ ۵۶-۶) (غ)

منثور۔ نثر کے معنی ہیں ایک چیز کو پھیلا دینا اور اسے پراگندہ کر دینا واذا الکواکب انتثرت (الانفطار ۸۲-۲)

یہاں عمل سے مراد جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے ان کا وہ عمل ہے جو مخالفت حق میں انہوں نے کیا۔

ع۲۳۶۶ مقیل۔ قِلتُ قَیلُولۃً کے معنی ہیں دوپہر کے وقت سویا اور مقیل اس سے مصدر بھی ہو سکتا ہے اور قیلولہ کا مکان بھی مراد ہو سکتا ہے (غ) اور قیلولہ یا مقیل اہل عرب کے نزدیک دوپہر کے وقت محض استراحت کا نام ہے گو اس کے ساتھ نیند نہ ہو (ل)

ع۲۳۶۷ تشقق اصل میں تتشقق ہے اور شق الفجرُ اور انشقّ صبح کے طلوع پر بولا جاتا ہے (ل) اور آسمان کے بادل سے پھٹ پڑنے سے مراد بارش کا اُترنا ہی ہو سکتا ہے۔

اس میں جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ بارش کا نازل ہونا اور فرشتوں کا نزول دونوں اس جنگ میں ہوئے اور بدر کو یوم الفرقان بھی کہا ہے۔ یوم الفرقان یوم التقی الجمعٰن (الانفال ۔ ۴۱) اور گو مفسرین اس کو قیامت پر لگاتے ہیں لیکن آگے آیت ۲۷ میں اور اس کے بعد جہاں ظالم کے ہاتھ کاٹنے کا اور کسی کو دوست بنانے وغیرہ کا ذکر ہے وہاں مراد جنگ بدر کا ہی ایک واقعہ لیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات جنگ بدر کے متعلق ہی ہیں جو مکذبوں کے لیے یوم فرقان تھی۔ کیونکہ اس دن ان کی طاقت توڑ دی گئی۔

اَلۡمُلۡكُ يَوۡمَئِذِ ۣ الۡحَقُّ لِلرَّحۡمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوۡمًا عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ عَسِيۡرًا ﴿۲۶﴾

حقیقی بادشاہت اس دن رحمٰن کے لیے ہو گی، اور وہ دن کافروں پر سخت ہو گا ؏۲۳۶۸

وَيَوۡمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيۡهِ يَقُوۡلُ يٰلَيۡتَنِى اتَّخَذۡتُ مَعَ الرَّسُوۡلِ سَبِيۡلًا ﴿۲۷﴾

اور جس دن ظالم اپنے دونوں ہاتھ کاٹے گا، کہے گا اے کاش! میں نے رسول کے ساتھ رستہ اختیار کیا ہوتا ؏۲۳۶۹

يٰوَيۡلَتٰى لَيۡتَنِىۡ لَمۡ اَتَّخِذۡ فُلَانًا خَلِيۡلًا ﴿۲۸﴾

مجھ پر افسوس! کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔

لَقَدۡ اَضَلَّنِىۡ عَنِ الذِّكۡرِ بَعۡدَ اِذۡ جَآءَنِىۡ ؕ وَكَانَ الشَّيۡطٰنُ لِلۡاِنۡسَانِ خَذُوۡلًا ﴿۲۹﴾

اس نے مجھے ذکر سے بہکا دیا، اس کے بعد کہ وہ میرے پاس آگیا تھا اور شیطان (آخر) انسان کو اکیلا چھوڑ دیتا ہے۔

وَقَالَ الرَّسُوۡلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِى اتَّخَذُوۡا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَهۡجُوۡرًا ﴿۳۰﴾

اور رسول نے کہا اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑی ہوئی چیز (کی طرح) قرار دیا ؏۲۳۷۰

وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا مِّنَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيۡرًا ﴿۳۱﴾

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے دشمن بنائے اور تیرا رب ہدایت دینے والا اور مدد دینے والا کافی ہے۔

وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡلَا نُزِّلَ عَلَيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ جُمۡلَةً وَّاحِدَةً ۛۚ كَذٰلِكَ ۛۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلۡنٰهُ تَرۡتِيۡلًا ﴿۳۲﴾

اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں اس پر قرآن (سارے کا) سارا ایک دفعہ ہی کیوں نہ اتارا گیا، اسی طرح (ضروری تھا) تاکہ ہم اس کے ساتھ تیرے دل کو مضبوط کرتے رہیں اور ہم نے اسے اچھی ترتیب سے مرتب کیا ہے ؏۲۳۷۱

؏۲۳۶۸ رحمٰن کی بادشاہت تو ہر وقت ہی ہے وہ مالک الملک ہے جس سے چاہتا ہے ملک لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ پس یہاں مراد رحمٰن کے بندے ہیں عباد الرحمٰن جن کا ذکر آگے آتا ہے اور اس میں اشارہ بدر میں مسلمانوں کے غلبہ کی طرف اور کفار کی ہزیمت کی طرف ہے۔ اس لیے علی الکٰفرین عسیرا بھی اس دن کے متعلق فرمایا۔

؏۲۳۶۹ یعض الظالم علی یدیہ۔ عضّ کے لیے دیکھو ؏۵۰۶ اور ہاتھ کاٹنے سے مراد اظہار ندامت ہے کیونکہ ندامت کے وقت لوگ ایسا کرتے ہیں (غ)۔ ابن جریر میں ہے ندما واسفا۔

مفسرین نے یہاں ظالم سے مراد عقبۃ بن ابی معیط کو لیا ہے اور اگلی آیت میں فلانا سے مراد ابیّ بن خلف ہے (ج۔د) اور یہ واقعہ لکھا ہے کہ عقبہ جو ابیّ بن خلف کے کہنے پر رسول اللہ صلعم کے منہ پر تھوکنے کے لیے تیار ہو گیا تھا بدر کے دن قیدیوں میں پکڑا گیا اور قتل کیا گیا۔ اور یہ ابن عباسؓ سے اور کئی اوروں سے روایت ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیات جنگ بدر کے ہی متعلق ہیں اور آیت ۲۹ میں شیطان سے مراد وہی گمراہ کرنے والا دوست ہے۔

؏۲۳۷۰ یہاں قومی سے مراد کفار قوم ہی ہیں کیونکہ اکثر حصہ قوم کا کفر پر تھا پچھلی آیتوں میں انہی کا ذکر ہے اور آگے بھی مجرموں کا ذکر ہے جو نبی کے اعداء بن جاتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ عملی طور پر مسلمانوں نے قرآن شریف کو یہاں تک چھوڑا ہے کہ وہ الفاظ جو کفار کے لیے تھے آج ان پر صادق آتے ہیں۔

؏۲۳۷۱ رتلنا۔ رَتَل کسی چیز کی ترکیب کا حسن ہے اور رَتَّلَ الکلام کے معنی ہیں اس کی تالیف کو خوب کیا اور اسے واضح کیا اور اس میں آہستگی اختیار کی۔ اور ترتیل فی القرأۃ اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا اور اس میں جلدی نہ کرنا ہے (ل) ورتّل القراٰن ترتیلا (المزمل ۷۳-۴)

قرآن کریم کا یا وحی الٰہی کا بتدریج نازل ہونا اس غرض کے لیے ہے تاکہ اللہ تعالےٰ کے کلام سے جو وقتاً فوقتاً رسول پر طرح طرح کے مصائب اور مشکلات کے اندر نازل ہو رسول کو تسلی ملتی رہے۔ اور اللہ تعالےٰ کے کلام سے بڑھکر تسلی دینے والی کیا چیز ہو سکتی ہے اور ترتیل سے مراد یا تو اللہ تعالیٰ کا بتدریج قرآن کریم کو نازل کرنا ہے اور یا اس سے اس کی ترتیب احسن مراد ہے یعنی گو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل ہوا ہے مگر اسکو ترتیب ایسی دی گئی ہے جس نے اسے ایسا ہی

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ
وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴿۳۳﴾

اور وہ تیرے پاس کوئی اعتراض نہیں لا سکتے مگر ہم حق (جواب) اور عمدہ بیان تیرے پاس لا چکے ہیں ۲۳۷۲ع

الَّذِينَ يُحْشَرُونَ عَلٰى وُجُوهِهِمْ إِلٰى
جَهَنَّمَ ۙ أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ
ع سَبِيلًا ﴿۳۴﴾

جو لوگ اپنے مونہوں کے بل دوزخ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے، وہی بدتر حالت والے اور رستہ سے بہت دور پڑے ہوئے ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا
مَعَهٗٓ أَخَاهُ هٰرُونَ وَزِيرًا ﴿۳۵﴾

اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارونؑ کو مددگار بنایا۔

فَقُلْنَا اذْهَبَآ إِلَى الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا
بِاٰيٰتِنَا ۭ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيرًا ﴿۳۶﴾

سو ہم نے کہا اس قوم کی طرف جاؤ جو ہماری باتوں کو جھٹلاتے ہیں پس ہم نے انھیں جڑ سے اکھیڑ دیا۔

وَقَوْمَ نُوحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنٰهُمْ
وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ۭ وَأَعْتَدْنَا
لِلظّٰلِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۳۷﴾

اور نوحؑ کی قوم نے جب رسولوں کو جھٹلایا، ہم نے انھیں غرق کر دیا اور ہم نے انھیں لوگوں کے لیے نشان بنایا اور ہم نے ظالموں کے لیے دردناک عذاب تیار کیا ہے۔

وَّعَادًا وَّثَمُودَا۟ وَأَصْحٰبَ الرَّسِّ وَ
قُرُونًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيرًا ﴿۳۸﴾

اور عاد اور ثمود اور کنوئیں والوں کو اور اس کے درمیان بہت سی نسلوں کو (ہلاک کیا) ۲۳۷۳ع

وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْأَمْثَالَ ۫ وَكُلًّا
تَبَّرْنَا تَتْبِيرًا ﴿۳۹﴾

اور سبھی کے لیے ہم نے مثالیں بیان کیں اور سبھی کو ہم نے ہلاکت کو پہنچایا۔

وَلَقَدْ أَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيٓ أُمْطِرَتْ
مَطَرَ السَّوْءِ ۭ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ
كَانُوا لَا يَرْجُونَ نُشُورًا ﴿۴۰﴾

اور وہ اس بستی پر گزرتے رہے ہیں جس پر بُرا مینہ برسایا گیا، تو کیا وہ اُسے نہیں دیکھتے رہے، بلکہ وہ دوبارہ جی اُٹھنے کی امید نہیں رکھتے ۲۳۷۴ع

منظم کلام بنادیا ہے جیسا کہ ایک مرتبہ نازل ہونے میں ہوتا، ابن عباس سے اس کے معنی بیناہ بیانا فیہ ترسل مروی ہیں۔ سدی سے فصلناہ تفصیلا۔ مجاہد سے جعلنا بعضہ اثر لبعض (ر)

۲۳۷۲ع مثل۔ ان کے اعتراض کو یہاں مثل کہا ہے گویا وہ بطلان میں مثال ہے (ر)

تفسیر۔ فسر معنی معقول کا اظہار ہے اور تفسیر الفاظ مفرد اور غریب کی تشریح ہے اور تاویل بھی اس سے مراد ہے (غ)

قرآن کریم نے یہاں یہ دعویٰ کیا ہے کہ کوئی اعتراض جو اس پر کیا جائے اس کا جواب اس میں دیدیا گیا ہے اور نہ صرف اعتراض کا جواب ہے بلکہ نہایت عمدہ طور پیرا سے واضح بھی کر دیا گیا ہے۔

۲۳۷۳ع اصحاب الرس۔ رسّ ایک وادی کا نام ہے اور رسّ اصل میں تھوڑا اثر ہے جو کسی چیز میں موجود ہو اور اس سے رُسّ المیّت کے معنی ہیں میّت کو دفن کیا گیا (غ) تفاسیر میں مختلف اقوال ہیں بعض کہتے ہیں ثمود میں سے تھے۔ بعض اسے یمامہ کی ایک بستی بتاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں انہوں نے اپنے نبی کو ایک کنوئیں میں گرا دیا تھا جس کا نام رسّ تھا (ج) ابن جریر آخری قول کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ رسّ کلام عرب میں ہر ایک کھودی ہوئی جگہ یا کنوئیں کو کہا جاتا ہے۔

۲۳۷۴ع یہ بستی سدوم ہے اور جو مینہ ان پر برسایا گیا وہ پتھروں کی بارش تھی جو آتش فشاں پہاڑ سے ہوئی ۱۴۹۱ع

وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ یَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اور جب تجھے دیکھتے ہیں، تو تجھے صرف ہنسی بناتے ہیں،
اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾ کیا یہ وہ ہے جسے اللہ نے رسول بنایا ہے۔
اِنْ كَادَ لَیُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْ لَاۤ قریب تھا کہ وہ ہمیں ہمارے معبودوں سے بہکا دیتا اگر ہم
اَنْ صَبَرْنَا عَلَیْهَا ؕ وَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ان پر ثابت نہ رہتے اور وہ جان لیں گے جب عذاب دیکھیں
حِیْنَ یَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِیْلًا ﴿۴۲﴾ گے کہ کون رستہ سے دُور جا پڑا ہے ۲۳۷۵ع
اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ کیا تو نے اسے دیکھا، جو اپنی خواہش کو اپنا معبود بناتا ہے، تو
اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَیْهِ وَكِیْلًا ﴿۴۳﴾ کیا تُو اس کا ذمہ وار ہو سکتا ہے ۲۳۷۶ع
اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ یَسْمَعُوْنَ یا کیا تو خیال کرتا ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے ہیں، یا
اَوْ یَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ عقل سے کام لیتے ہیں وہ صرف چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ وہ
ع ۴ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا ﴿۴۴﴾ رستہ سے اور بھی دُور بہکے ہوئے ہیں ۲۳۷۷ع
اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ کیا تو نے اپنے رب (کے کام) پر غور نہیں کیا کہ کس طرح سایہ کو لمبا کرتا
وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا ہے اور اگر چاہتا تو اس کو ٹھیرا رکھتا۔ پھر ہم نے سورج
الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا ﴿۴۵﴾ کو اس پر دلیل ٹھیرایا ہے ۲۳۷۸ع

ع۲۳۷۵ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم کے وعظ کا اثر کیسا تھا۔ اس قدر خطرناک بت پرستوں کو بھی متزلزل تو کر دیا مگر ڈھٹائی سے انہوں نے اپنے بتوں کو نہ چھوڑا یہ بھی معلوم ہوا کہ کس قسم کا خطرناک عقیدہ بت پرستی کا ان میں مروج تھا۔

ع۲۳۷۶ بیان تو کفار کا ہے کہ اصل میں انہوں نے اپنی خواہش کو معبود بنایا ہوا ہے ورنہ بتوں کی خدائی تو ٹوٹ چکی ہے لیکن توحید کی تعلیم میں ایک نہایت ہی لطیف اصول بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ شرک یا بت پرستی صرف یہی نہیں کہ پتھروں کو یا ہواؤں کو یا اور چیزوں کو یا بعض انسانوں کو خدا مانا جائے بلکہ یہ بھی شرک ہے کہ انسان اپنی حرص وہوا کے اتباع میں کسی حق بات کی پروا نہ کرے کامل موحد نہیں ہوتا۔ جب تک اس کی حرص وہوا اس کے تابع نہ ہو جو شخص خواہشات کا غلام ہے وہ موحد نہیں ✦

ع۲۳۷۷ چارپایوں کی طرح تو اس لیے کہ جو انسان کو اللہ تعالیٰ نے سمع اور عقل دی تھی ان سے فائدہ نہ اٹھایا اور حیوانوں کی طرح ہو گئے اور اضل یعنی زیادہ گمراہ اس لیے کہا کہ حیوان کو تو عقل ملی نہیں، انہوں نے باوجود عقل کے غلط راہ پر قدم مارا مگر اصل میں عرب کی اس حالت پر توجہ دلائی ہے جو اسلام سے پیشتر تھی کہ وہ لوگ حیوانی زندگی پر گرتے گرتے آخر کار بالکل حیوانوں کی طرح ہی ہو گئے۔ سمع اور عقل سے کام نہ لیتے تھے اور نہ کسی مصلح کی بات کو سنتے یا اس کی کچھ پروا کرتے تھے۔ نہ ان کے اندر انسانی سوسائٹی کو حیوانات سے ممیز کرنے والی صفات رہی تھیں۔ چارپائے کو تو پکڑ کر بھی رستہ پر لایا جا سکتا ہے مگر وہ اس قابل بھی نہ تھے۔ اس ایک فقرہ کالانعام میں بتا دیا کہ عرب کے لوگوں میں نہ اخلاق و روحانیت رہ گئی تھی۔ نہ سیاست نہ تمدن نہ معاشرت کے صحیح اصول باقی رہے تھے اور واقعی ان کی حالت پر غور کیا جاتا ہے تو عامہ حالت ان کی ایسی ہی تھی کہ انسان کا نام بھی ان پر نہ آسکتا تھا۔ دن رات باہم جنگ وجدل۔ عقاید نہایت ذلیل۔ پرلے درجہ کی توہم پرستی۔ حیوانیت کا جوش، شراب خوری اور زناکاری اور قمار بازی کی کثرت۔ علم سے بالکل بے بہرہ۔ یہ وہ چارپایوں سے بدتر قوم تھی جس کی اصلاح کے لیے رسول اللہ صلعم کو کھڑا کیا گیا۔ ان میں ہر قسم کی خوبیاں پیدا کر دینا یہ وہ فرقان تھا جو آپ کے وجود سے ظہور میں آیا۔

ع۲۳۷۸ دلیل۔ دَلالۃ وہ ہے جس سے کسی چیز کی معرفت حاصل کی جائے جیسے لفظوں کی دلالت معنی پر ما دلھم علیٰ موتہٖ (السّبا ۳۴-۱۴) اور دلیل اس سے مبالغہ ہے (رغ)

ظِل کے لیے دیکھو ع۶۷۶ رات کی تاریکی پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور ابن جریر میں جس قدر اقوال ہیں سب میں یہاں ظل سے مراد طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک کی حالت لی گئی ہے تو یہاں سایہ کے لمبا کرنے سے مراد رات کا طول ہے اور اسے ساکن کرنے میں بھی یہی اشارہ ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ

ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾
پھر ہم اسے آہستہ آہستہ سمیٹتے ہوئے اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں ۲۳۷۹

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا
وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾
اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات کو پردہ اور نیند کو (موجب) آرام بنایا اور دن کو اُٹھ کھڑے ہونے کا وقت بنایا ۲۳۸۰

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيْحَ بُشْرًاۢ
بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾
اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری کے طور پر بھیجتا ہے اور ہم اوپر سے پاک کرنے والا پانی اتارتے ہیں ۲۳۸۱

لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا
خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾
تاکہ ہم اس کے ساتھ مردہ شہر کو زندہ کریں اور ان میں سے جو ہم نے پیدا کیے ہیں بہت سے چارپایوں اور لوگوں کو اسے پلائیں ۲۳۸۲ -

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ
فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾
اور ہم نے اسے ان کے درمیان طرح طرح کے پیرایوں میں بیان کیا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں مگر بہت سے لوگوں کو سوائے انکار کے کچھ منظور نہیں ۲۳۸۳ -

---

کی مشیت نہ ہوتی تو رات کی تاریکی ہی ٹھہری رہتی مگر پھر سورج نکلتا ہے اور سایہ آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور سورج کو اس پر دلیل ٹھہرانے کے یہ معنی ہیں کہ سورج سے وہ زائل ہوتا چلا جاتا ہے یا یہ کہ چونکہ ایک چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے اس لیے اگر سورج نہ نکلتا تو سایہ یا تاریکی کا بھی علم نہ ہوتا کہ وہ کیا چیز ہے (ج) اور یوں بھی کہا گیا ہے کہ علی بمعنی مع ہے اور مراد یہ ہے کہ ظل اور سورج کو اپنی وحدانیت پر ہم نے دلیل ٹھہرایا ہے (ر) اوپر کی آیت میں چونکہ عرب کی حالت کا ذکر کیا تھا کہ وہ تمام خوبیوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ اور چارپایوں کی طرح ہیں، تو اب طلوع آفتاب میں یہ اشارہ کیا ہے کہ آفتاب نبوت کے طلوع سے ان کی حالت کس طرح تبدیل ہو کر ظلمت دور ہو جائے گی۔

۲۳۷۹ قبضنا۔ قبض کے لیے دیکھو ع ۳۱۴ یہاں اشارہ اس طرف ہے کہ سورج سے سایہ (یعنی تاریکی) جاتی رہے گی (غ)

یسیرا۔ یسیر قلیل شے کو کہا جاتا ہے (غ) اور بعض نے اس کے معنی سریع کیے ہیں (ج) اور بعض نے قلیلاً قلیلا یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے (ر) اور مراد یہ ہے کہ ظلمت کفر تدریجاً کم ہوتی جائے گی۔

۲۳۸۰ سباتا۔ سبت کے اصل معنی کاٹنا ہیں ع ۹۴ اور سُبات سے مراد ہے قطع عمل (غ)

نشورا۔ نشر کے اصل معنی پھیلانا ہیں اذا الصحف نشرت (التکویر۔۱۰) والناشرات نشرا (المرسلٰت۔۳) اور نشر مُردہ کے جی اُٹھنے کے معنی ہیں۔ نشر الثوب (یعنی کپڑے کے پھیلا دینے) سے ماخوذ ہے اور دن کے نشور بنانے سے مراد ہے کہ اس میں انسانوں کا انتشار اور رزق کی تلاش میں نکلنا مقرر کیا اور لوگوں کا انتشار اپنی حاجات میں لگ جانا ہے ثم اذا انتم بشر تنتشرون (الروم۔۲۰) فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض (الجمعۃ۔۱۰) (غ) اور تفاسیر میں دونوں طرح معنی کیے گئے ہیں یعنی اُٹھنا کیونکہ نشور نیند اور موت دونوں سے اُٹھنے پر بولا جاتا ہے اور معاش کے لیے انتشار یعنی پھیل جانا اور ابن جریر نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس میں روحانی بیداری کی طرف اشارہ ہو جو اصل مضمون ہے۔

۲۳۸۱ طھورا۔ طھارۃ کے لیے دیکھو ع ۱۳۹ وغیرہ اور طَھُور مصدر بھی ہو سکتا ہے اور اس چیز کا نام بھی ہو سکتا ہے جس کے ساتھ دوسری چیز کو پاک کیا جائے اور صفت بھی اور بعض کے نزدیک طھور بمعنی مُطَھِّر ہے اور یہ اس لحاظ سے درست ہے کہ طاہر دو طرح پر ہے ایک جس کی طہارت دوسرے کو نہ پہنچے جیسے کپڑا دوسرا وہ جس کی طہارت دوسرے کو پہنچ سکے، یہاں طھورا اسی معنی میں ہے (غ) وسقٰھم ربھم شرابا طھورا (الدھر۔۲۱)

ہواؤں کے بھیجنے میں یہ اشارہ ہے کہ پہلے اس کا اثر تھوڑا تھوڑا معلوم ہوتا ہے اور پھر زور کی بارش ہوتی ہے تو مُردہ شہر جی اُٹھتا ہے جیسا کہ اگلی آیت میں ہے اور یہاں عرب کے روحانی مردوں کے اُٹھنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور اسی لیے یہاں ماء طھورا فرمایا کہ آسمانی وحی کی بارش سے ہر قسم کی پلیدیاں دور ہو جاتی ہیں، جس طرح پانی ہر قسم کی غلاظتوں کو دور کر دیتا ہے۔

۲۳۸۲ اناسی۔ انسان یا اِنسی کی جمع ہے اور عرب کے مردہ ملک کے زندہ کرنے کے بعد پھر چارپایوں اور انسانوں کے اسے پلانے میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں کو بھی یہ پہنچے گا اس کی وضاحت آیت ۱۵ میں کی ہے۔

۲۳۸۳ صرّفناہ میں ضمیر بارش کی طرف نہیں جیسا کہ خیال کیا گیا ہے بلکہ قرآن کی طرف ہے یا اس مضمون کی طرف جو بیان ہو رہا ہے اور مطلب یہ ہے کہ

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿۵۱﴾

اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے ۲۳۸۴

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾

سو کافروں کی بات نہ مان اور اس (قرآن) کے ساتھ ان سے (وہ) جہاد کر (جو) بڑا جہاد (رہے) ۲۳۸۵

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾

اور وہی ہے جس نے دو دریا ملا رکھے ہیں۔ یہ میٹھا مزیدار ہے اور وہ کھاری کڑوا، اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ اور ایک حائل ہوئی ہوئی روک بنا دی ہے ۲۳۸۶

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿۵۴﴾

اور وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا۔ پھر اسے نسب اور سسرال (والا) بنایا اور تیرا رب قدرت والا ہے ۲۳۸۷

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ؕ وَكَانَ الْكَافِرُ

اور اللہ کو چھوڑ کر اس کی عبادت کرتے ہیں جو انھیں نفع نہیں دیتا اور نہ انھیں نقصان پہنچاتا ہے اور کافر اپنے

کہ اس قرآن کے ذریعہ سے جو انقلاب عظیم آنے والا ہے اسے طرح طرح کے پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ یہاں بھی دو مختلف پیرائے اختیار کیے ہیں۔ پہلے طلوع آفتاب کے رنگ میں پھر بارش کے نزول کے رنگ ہیں۔

۲۳۸۴ء شروع سورت میں فرمایا تھا کہ فرقان اس لیے اُتارا ہے کہ سب قوموں کے لیے آنحضرت صلعم نذیر ہوں اور یہاں فرمایا کہ اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں الگ الگ نذیر اُٹھا کھڑا کرتے تو مطلب یہ ہے کہ ہماری مشیت نہ تھی بلکہ ارادہ الٰہی یہی تھا کہ بالآخر تمام قوموں کے لیے ایک ہی نذیر ہو اور اس کی وجہ ظاہر ہے تا کہ نسل انسانی میں وحدت پھیلے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تسلسل مضمون قرآن شریف میں کس طرح چلتا ہے۔

۲۳۸۵ء یہاں بہ میں ضمیر قرآن کی طرف ہونا ابن عباس سے اور اسلام کی طرف ہونا ابن زید سے مروی ہے (ج) اور اوّل صحیح ہے کیونکہ قرآن شریف کا ہی ذکر اوپر بھی ہے اور قرآن شریف کی طرف ضمیر بغیر اس کا پہلے ذکر ہونے کے بھی بوجہ اس کی عظمت اور شہرت کے آئی ہے جیسے انا انزلناہ فی لیلۃ القدر (القدر ۹۷-۱) یا انّ علینا جمعه وقرانه (القیمۃ ۷۵-۱۷) اور یہاں قرآن کریم کے ذریعہ سے حق پھیلانے کو جہاد کبیر کے نام سے موسوم کیا ہے کیونکہ یہی اصل اور بڑا جہاد ہے اور ہر وقت قائم رہتا ہے اور جہاد سیف کی ضرورت کبھی کبھی پیش آتی ہے۔

۲۳۸۶ء مرج ۔ مَرَج کی اصل خلط ہے یعنی ملا دینا اور اسی سے ہے فی امر مریج (ق ۵۰-۵) (یعنی جس میں التباس اور اختلاط واقع ہو گیا ہے) اور مرجان چھوٹا موتی ہے کانّھنّ الیاقوت والمرجان (الرحمٰن ۵۵-۵۸) اور مارج من نار (الرحمٰن ۵۵-۱۵) میں مارج سے مراد مختلط شعلہ ہے (غ) اور مَرَج الدابّۃ کے معنی ہیں جانور کو چراگاہ میں چھوڑ دیا تا کہ وہ چرے اور مَرْج کے معنی اجراء بھی ہیں یعنی جاری کر دینا اور یہاں دونوں معنی کیے گئے ہیں یعنی ملا دیا اور جاری کیا یا چلایا (ل)

فرات ۔ بہت میٹھے پانی کو کہتے ہیں جس طرح اجاج سخت کھاری کو۔

دریاؤں کا پانی میٹھا ہوتا ہے اور سمندر کا کھاری، پس دو دریا ایک میٹھا اور ایک کھاری جو باہم ملتے بھی ہیں اور ان کے درمیان روک بھی ہے اس طرح پر ہیں کہ دریاؤں کا پانی سمندر میں جا ملتا ہے باایں وہ کھاری ہے اور یہ شیریں اور پھر اسی سمندر سے پانی اُڑ کر خشکی پر برستا ہے اور اس سے دریا بنتے ہیں مگر سمندر کا کھاری پن ان میں نہیں آتا یہ ان کے درمیان برزخ اور حجر ہے اور اشارہ یہاں جسمانی و روحانی زندگی کے سرچشموں کی طرف ہے جو دنیا پر گرجاتا ہے اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسی کھاری پانی پینے والوں کی کہ وہ پیاس کو اور بڑھاتا جاتا ہے اور جو روحانیت کے چشمہ سے اپنے آپ کو سیراب کرتا ہے تو اس کی شیرینی تسکین پیدا کرتی ہے اور اس کو اطمینان قلب میسر آجاتا ہے مگر طالب دنیا کو اطمینان قلب نہیں ملتا۔

۲۳۸۷ء نسبا وصھرا ۔ نَسَب بھی قرابت ہے اور صِھر بھی مگر نسب آباء یعنی مرد کی طرف سے ہے اور صھر عورت کی طرف سے اور یہاں مراد ذو نسب اور ذو صھر ہے یعنی مرد اور عورت اور بجائے ذکر اور اُنثیٰ کے یہ الفاظ اس لیے استعمال فرمائے کہ ان کے پھیلنے کی طرف بھی اشارہ ہو (ر)

عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿٥٥﴾
رب کے خلاف (دوسروں کا) مددگار بنتا ہے ٢٣٨٨

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٥٦﴾
اور ہم نے تجھے صرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانیوالا بنا کر بھیجا ہے۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿٥٧﴾
کہہ میں تم سے اس پر کچھ اجر نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ جو چاہے اپنے رب کی طرف رستہ اختیار کرے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۭ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ﴿٥٨﴾ ۚۙ
اور زندہ (خدا) پر بھروسہ کر جو مرتا نہیں اور اس کی حمد کرتا ہوا تسبیح کر اور وہ اپنے بندوں کے قصوروں سے باخبر رہنے کو کافی ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ڔ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿٥٩﴾
وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ وقتوں میں پیدا کیا پھر وہ عرش پر غالب ہے بے انتہا رحم والا، سو اس سے سوال کر جو اس سے خبردار ہے ٢٣٨٩

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۤ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ۩ ﴿٦٠﴾
اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو، کہتے ہیں اور رحمٰن کیا ہے کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کے لیے تو حکم دیتا ہو اور اس نے انھیں نفرت میں بڑھایا ٢٣٩٠

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾
وہ (ذات) بابرکت ہے جس نے آسمان میں ستارے بنائے اور اس میں سورج اور روشنی دینے والا چاند بنایا ٢٣٩١

٢٣٨٨ ظہیر۔ ظاھرتہ کے معنی ہیں میں نے اُس کی مدد کی اور ظہیر کے معنی مددگار ہیں وظاھروا علٰی اخراجکم (الممتحنۃ ٦٠ - ٩) وان تظاھرا علیہ (التحریم ٦٦ - ٤) فلا تکونن ظہیرا للکافرین (القصص ٢٨ - ٨٦) والملٰئکۃ بعد ذٰلک ظہیر (التحریم ٦٦ - ٤) اور یہاں ظہیر سے مراد ہے شیطان کا مددگار اور بعض نے ظہیر کے معنی مَظْھُوْرٌ بِہٖ کیے ہیں یعنی اپنے رب کے سامنے ذلیل ہے گویا پیٹھ کے پیچھے چھوڑ دیا گیا (غ)

٢٣٨٩ فاسئل بہ خبیرا کے معنی کیے ہیں فاسئل بالرحمٰن خبیرا بخلقہ (ج) یعنی رحمٰن سے سوال کر جو اپنی خلق سے خبردار ہے بہ میں ضمیر خلق کی طرف جاتی ہے۔ اور یا سوال کرنے سے مراد حاجات کا مانگنا ہے اوپر بھی کفار کی ایذارسانی کا ذکر تھا جس کے جواب میں فرمایا وتوکل علی الحی الذی لا یموت۔ اور یہاں بھی یہی بتایا ہے کہ مخلوق کا خیال مت کرو جو کچھ مانگنا ہے خدا سے مانگو۔

٢٣٩٠ ان کا ما الرحمٰن کہنا تجاہل سے ہے جیسے فرعون نے حضرت موسیٰ کو کہا وما رب العالمین (الشعراء ٢٦ - ٢٣) اور یہ جو بعض مفسرین نے لکھ دیا ہے کہ انہوں نے مسیلمہ کذاب کو مراد لیا ہے جو رحمٰن یمامہ کہلاتا تھا تو یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ یہ سورت مکی ہے اور مسیلمہ کا واقعہ بہت بعد کا ہے۔

٢٣٩١ سراجا۔ سراج چراغ کو کہتے ہیں اور پھر ہر روشنی دینے والی چیز پر بولا جاتا ہے وجعل الشمس سراجا (نوح ٧١ - ١٦) (غ) اور سورج دن کا سراج ہے اور حدیث میں ہے عمر سراج اھل الجنۃ یعنی عمر اہل جنت کے سورج ہیں کیونکہ ان کے اسلام میں داخل ہونے سے اخفا اور خوف جاتا رہا اور لوگوں نے اسلام کو ظاہر کیا، گویا آپ نے سورج کا کام دیا۔ اور سراج کے معنی سورج بھی ہیں وجعلنا سراجا وھاجا (النبأ ٧٨ - ١٣) وداعیا الی اللہ باذنہ وسراجا منیرا (الاحزاب ٣٣ - ٤٦) (ل)

قمر۔ چاند کو کہا جاتا ہے جب وہ حالت امتلاء میں ہو اور یہ تیسری رات کے بعد ہوتا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ وہ ستاروں کی روشنی کو ماند کر دیتا ہے (قَمَرْتُ فلانا کے معنی ہیں خدعتہ) (غ) اور حدیث میں ہے کہ نبی صلعم نے دجال کا ذکر کیا اور فرمایا ھِجَانٌ اَقْمَرُ ھجان اقمر کے معنی ہیں نہایت سفید رنگ (ھجان = فربہ) اور چاند کو پہلی دو راتوں میں اور آخری دو راتوں میں ھلال کہا جاتا ہے اور اس کے سوائے باقی میں قمر (ل)

جس خدا نے روشنی دینے والے اجرام اس عالم ظاہری میں بنائے ہیں اسی نے عالم روحانی میں بھی روشنی دینے والے بنائے ہیں اور انہی کی طرف یہاں اشارہ

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾	اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا اس کے لیے جو چاہتا ہے کہ نصیحت حاصل کرے یا شکرگزاری کا ارادہ کرتا ہے ۲۳۹۲ء
وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾	اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر انکساری سے چلتے ہیں اور جب جاہل انھیں خطاب کرتے ہیں، تو کہتے ہیں سلام ۲۳۹۳ء
وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾	اور وہ جو رات گزارتے ہیں اپنے رب کے آگے سجدہ کرتے اور کھڑے ہو کر ۲۳۹۴ء
وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾	اور وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم سے دوزخ کا عذاب ہٹا دے کیونکہ اس کا عذاب بھاری مصیبت ہے۔
اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾	وہ (تھوڑا) ٹھیرنے کے لیے اور (ہمیشہ) رہنے کے لیے بُری جگہ ہے۔

ہے کیونکہ آگے ذکر عباد الرحمٰن کا آتا ہے اور رسول اللہ صلعم کا نام سراج قرآن کریم میں آیا ہے اور اصحاب رسولؐ کو نجوم حدیث میں کہا ہے اصحابی کالنجوم یعنی ستارے اور قمر بھی رسول اللہ صلعم ہی ہیں۔ جیسے کہ اس آیت میں اشارہ ہے والشمس وضحٰھا والقمر اذا تلٰھا۔ اور قمر آپ کو اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ آپ کا نور نورِ خدا سے ہے نہ ذاتی اور شمس اس لحاظ سے کہ آپ کی روشنی دیگر انبیاء سے ممتاز ہو کر کل عالم پر محیط ہو گئی۔ اور یہ آیت اس انقلاب کے لیے بطور تمہید ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

۲۳۹۲ء خِلفۃً اس حالت میں کہا جاتا ہے جب ہر ایک دوسرے کے پیچھے آئے (غ) مراد یہ ہے کہ جو نفل نماز رات کو رہ جائے اسے دن کو پورا کر لے یا یہ کہ دن اللہ تعالیٰ کے صنائع و بدائع میں فکر کے لیے ہے اور رات شکر یعنی عبادت کے لیے۔ بیشتر حصہ عبادت کا رات میں ہی آتا ہے۔

۲۳۹۳ء سلاما۔ سلام بمعنی سلامتی ہے اور فعل محذوف ہے یعنی ہم تم سے سلامتی چاہتے ہیں اور یا سلام صفت ہے اور مطلب ہے سلامتی کا قول یعنی اصلاح کی بات یا اچھی بات۔

اس آیت سے لیکر آخر تک صحابہ رضی اللہ عنہم کا نقشہ کھینچا ہے اور یہ مکہ کا آخری زمانہ ہے اور مدینہ کی تیاریاں ہیں اور ان آیات میں یہ بتایا ہے کہ ان چند سال کے اندر اس ملک کے اندر جس کے انسانوں کی حالت چارپایوں کی سی تھی نبی کریم صلعم کی قوت قدسی نے اور قرآن کریم کی آیات پاک نے کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ ہر ایک نیکی جو یہاں گنی ہے وہ کسی پہلی بدی کے مقابل پر ہے جو عرب میں مروج تھی اور جس پر فخر کیا جاتا تھا اول ان کا انکساری سے چلنا ہے اور یہ ان کی پہلی متکبرانہ روش کے مقابل پر ہے جب ہر ایک کے حقوق کو پامال کرنا ان کا فخر تھا پھر فرمایا کہ جاہل انہیں کچھ بُری بات کہیں تو وہ اس کا جواب بُرائی سے نہیں دیتے، بلکہ جہالت کے مقابل میں سلامت روی اختیار کرتے ہیں۔ حالانکہ پہلے ان کا یہ فخر تھا کہ جہالت کے مقابل پر اور زیادہ جہالت دکھاتے تھے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے الا لا یجھلن احد علینا۔ فنجھل فوق جھل الجاھلینا اور عباد الرحمٰن کا لفظ یہاں اس اشارہ کے لیے استعمال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمانیت سے ایک نبی کو ان کے اندر مبعوث کرکے اور اپنا کلام نازل کرکے انہیں اس مقام پر پہنچایا ورنہ اپنی سعی سے وہ کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔

۲۳۹۴ء اہل عرب راتوں کو شراب خوری ناچ گانے بجانے میں صرف کرتے تھے جس طرح اہل یورپ آج کرتے ہیں یہ قرآن کی تعلیم کا اثر تھا کہ نہ صرف راتوں کی عیاشی کو چھوڑا بلکہ وہی راتیں اب عبادت الٰہی میں صرف ہونے لگیں۔ کتنا بڑا انقلاب ہے کیا آج یورپ میں بال اور سینما اور تھیٹر کو دور کرکے کوئی انہیں تہجد خوان بنانے کا خیال دل میں لا سکتا ہے یہی وہ معجزہ ہے جو رسول اللہ صلعم نے عرب میں کرکے دکھایا۔ اس سے بڑھ کر کسی شخص کے منجانب اللہ ہونے کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ وہ شراب پی کر عیاشی کرتے تھے اور شراب اور عیاشی چھڑا کر محبت الٰہی کی ایسی شراب پلائی (وسقٰھم ربھم شرابًا طھورا) کہ ساری ساری رات عبادت الٰہی میں صرف کرتے تھے کہاں سے کہاں پہنچایا۔

وَ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ یُسۡرِفُوۡا وَ لَمۡ یَقۡتُرُوۡا وَ کَانَ بَیۡنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾

اور وہ جو جب خرچ کرتے ہیں نہ بیجا خرچ کرتے ہیں اور نہ (موقع پر) تنگی کرتے ہیں ۲۳۹۵ اور ان کا خرچ (ان دو حالتوں) کے درمیان اعتدال پر ہے

وَ الَّذِیۡنَ لَا یَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ وَ لَا یَقۡتُلُوۡنَ النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ لَا یَزۡنُوۡنَ ۚ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ یَلۡقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾

اور وہ جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور کسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے قتل نہیں کرتے سوائے اس کے کہ انصاف چاہے اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی ایسا کرے وہ (اپنے) گناہ کی سزا پائے گا ۲۳۹۶

یُّضٰعَفۡ لَہُ الۡعَذَابُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ یَخۡلُدۡ فِیۡہٖ مُہَانًا ﴿٭ۖ۶۹﴾

اس کے لیے قیامت کے دن دوچند عذاب ہوگا اور اس میں ذلیل ہو کر رہے گا۔

اِلَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمۡ حَسَنٰتٍ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۷۰﴾

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے عمل کرتا رہا، تو ایسے لوگوں کی بُری زندگی کو اللہ نیک زندگی سے بدل دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۲۳۹۷

۲۳۹۵ اسراف معاصی میں خرچ کرنا۔ قتر طاعت میں خرچ کرنے سے رکنا قوام وسط و عدل ہے (ر) اسی لیے قوام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت میں خرچ کریں اور اس کے محارم میں خرچ کرنے سے رک جائیں۔ پہلی حالت یہ تھی کہ بیجا رسوم و رواج میں۔ نمود کے لیے۔ عیاشی میں سب کچھ بھی لٹا دیتے تھے۔ بیکسوں، غریبوں پر نیک کاموں میں جہاں نام نہ ہو بخل کرتے تھے۔ آج بھی مسلمانوں کی یہی حالت ہے۔ غریب سے غریب آدمی جو رسم و رواج کے ماتحت اور نمود کے لیے خرچ کرنے لگتا ہے تو مکان اور جائداد بیچ کر سود پر روپیہ لے کر بھی امرا کی طرح خرچ کرتا ہے امیر سے امیر آدمی سے فی سبیل اللہ خرچ کرنے کے لیے کہو جہاں نمود نہ ہو تو ایسا ظاہر کرتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی غریب آدمی نہیں۔ مال تو خرچ ہوتا ہی ہے اس خرچ کو حالت اعتدال میں لانا ہی سب سے مشکل کام ہے آنحضرت صلعم کی قوت قدسی نے اس خوبی کو پیدا کر کے قوم کی طاقت کو برمحل لگا دیا۔

۲۳۹۶ اثام اور اثم کے ایک ہی معنی ہیں ۱۰۸ اور یہاں عذاب کو اثام کہا ہے اس لیے کہ اس کی وجہ سے عذاب آتا ہے اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ان باتوں کا ارتکاب دوسرے گناہوں کے ارتکاب میں مبتلا کر دے گا (غ) اور اثام بمعنی عقوبت یا جزائے اثم بھی آتا ہے (ل)

یہاں ان تین باتوں کا ذکر کیا ہے جن میں عرب سب سے بڑھ کر مبتلا تھے اور جن کی وجہ سے وہ نہایت ذلت کی حالت میں گرے ہوئے تھے یعنی شرک۔ قتل۔ زنا۔ شرک کی حالت تو یہ تھی کہ بن تراشے پتھروں درختوں جانوروں تک کی پرستش کرتے تھے اور بت پرستی کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ ہر قبیلہ اپنا علیحدہ بت رکھتا تھا۔ تین سو ساٹھ بت خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے۔ کوئی کام نہ کرتے تھے جب تک فال نہ لیتے تھے۔ اس کی بجائے کیسی توحید پھیلائی کہ کسی چیز کو خدا کا شریک نہ چھوڑا بلکہ آخری مرتبہ کمال توحید کا (کہ حرص و ہوا کے اتباع سے انسان بچے) بھی طے کرا دیا اور توحید کی آگ اُن کے سینوں میں ایسی مشتعل ہوئی کہ اس کے پھیلانے کے لیے دنیا کے کناروں تک چلے گئے اور کوئی تکلیف خدا کی راہ میں انہیں تکلیف معلوم نہ ہوئی۔ قتل کی یہ حالت تھی کہ انسان کی زندگی کی قدر چڑیا کے برابر بھی نہ تھی۔ ادنٰے ادنٰے باتوں پر ایک دوسرے کو قتل کر دینا معمولی کام تھا۔ ذرا ذرا بات پر قوموں میں باہم جنگ چھڑتی تو سالہا سال تک ختم نہ ہوتی۔ رسول اللہ صلعم کے انفاس قدسی نے اس بلا سے نجات دی۔ زنا کی کثرت کی یہ حالت تھی کہ علانیہ شعروں میں زنا کرنے پر فخر کرتے اور زن و مرد کے ننگے تعلقات کو شعروں میں فخریہ بیان کرتے، جس طرح آج اہل یورپ بجائے شعروں کے تصویروں میں انہیں ظاہر کرتے ہیں اور فخر سے ایسی تصویروں سے اپنے کمرے سجاتے ہیں۔ اسی طرح اہل عرب فحش شعروں سے اپنی مجلسوں کی رونق بڑھاتے تھے۔ اس قوم کو درست کرنا ایسا ہی تھا جیسا آج ایک شخص اہل یورپ سے زنا کاری چھڑا کر اُن میں وہ قوت پیدا کر دے کہ دوسرے کی بی بی کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ یہ وہ کام تھا جو محمد رسول اللہ صلعم کی قوتِ قدسی نے کیا۔

۲۳۹۷ بُرائیوں کو نیکیوں میں بدل دینے سے کیا مراد ہے؟ یہ نہیں کہ اگر ایک شخص پہلے زنا کرتا رہا ہے تو توبہ سے زنا کی جگہ عبادت لکھ لی جاتی ہے، گو بعض لوگوں نے یہ معنی بھی کر لیے ہیں مگر ظاہر ہے کہ یہ کسی صورت میں درست نہیں۔ سیئات سے مراد یہاں بدی کی قوتیں یا ملکہ ہے اور حسنات سے مراد نیکی کی قوتیں

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ﴿٧١﴾	اور جو توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے ، تو وہ اللہ کی طرف اچھا رجوع کر آتا ہے ۔
وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا ﴿٧٢﴾	اور وہ جو جھوٹ گواہی نہیں دیتے اور جب لغو پر گزرتے ہیں بزرگانہ طور پر گزرتے ہیں ۲۳۹۸
وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا ﴿٧٣﴾	اور وہ کہ جب انھیں اُن کے رب کے حکموں سے نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے ۔
وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ﴿٧٤﴾	اور وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں سے اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا ۲۳۹۹
أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ﴿٧٥﴾	انھیں بلند مقام بدلہ میں دیا جائے گا اِس لیے کہ انھوں نے صبر کیا اور اس میں انھیں دعا اور سلامتی ملے گی ۔
خَالِدِينَ فِيهَا ۚ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ﴿٧٦﴾	اسی میں رہیں گے ، اچھی قرارگاہ اور ٹھیرنے کی جگہ ہے ۔
قُلْ مَا يَعْبَأُ بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ ۖ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا ﴿٧٧﴾ ع	کہہ میرا رب تمھاری کچھ پروا نہیں کرتا اگر تمھاری دعا نہ ہو سو تم نے جھٹلایا پس (اس کی سزا) تمھارے لازم حال ہو گی ۲۴۰۰

یا ملکہ ہے (ر) اور مطلب یہ ہے کہ توبہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدی کی جگہ نیکی کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے کہ جس طرح وہ اپنے آپ کو لگائے وہی خیالات اس پر غالب آنے شروع ہو جاتے ہیں ؛

۲۳۹۸ مرّوا باللغو مرّوا کراما کے معنی یوں بھی کیے ہیں کہ قبیح بات کو کنایۃً بیان کرتے ہیں صراحت سے نہیں اور یا یہ کہ جب لوگوں کو لغو میں مشغول پاتے ہیں تو ان کے ساتھ شامل نہیں ہوتے (غ) خاص خاص آدمیوں کو چھوڑ کر عام حالت اہل عرب کی یہی تھی کہ انہیں جھوٹ کی کچھ پروا نہ تھی۔ وقت ضرورت جھوٹے معاہدے بھی کر لیتے تھے۔ منافقوں کا کتنا بڑا گروہ تھا جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے مسلمان ہونے کا یقین دلاتے تھے ان کی جگہ ایسی صداقت کی محبت پیدا کی کہ جو روایت صحیح طور پر صحابی تک پہنچ جائے وہ جھوٹی نہیں اور لغو کہانیوں اور لغو مشغلوں میں مبتلا قوم کو ایسے مفید کاموں میں لگایا کہ نہ صرف نیکی میں ہی دنیا کے رہبر ہوئے بلکہ ہر قسم کے علوم میں بھی کمال حاصل کیا اور فتح کے ساتھ نظم ونسق ملکی کو کمال تک پہنچایا ؛

۲۳۹۹ یہ ان کی خواہش کہ ہمیں متقیوں کے امام بنا ، ان کے کمال روحانی کے معراج کو ظاہر کرتی ہے۔ یہی تڑپ نہیں کہ ہم متقی بنیں ، بلکہ یہ ہے کہ ہم متقیوں کے امام بنیں یعنی جو لوگ ہم سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی ہمارے نمونہ کو دیکھ کر متقی بنیں ؛

۲۴۰۰ یعبؤا۔ ما عَبَأْتُ بِہٖ کے معنی ہیں میں نے اس کی پروا نہ کی اور اس کی اصل عَبْءٌ ہے جس کے معنی ثقل ہیں (غ)
یہاں بتایا کہ انسان جس قدر اپنا تعلق خدا سے پیدا کرتا ہے اسی قدر اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی عزت ہوتی ہے۔ ورنہ مخلوق تو بہائم بھی ہیں۔ اسی تعلق باللہ کی طرف انہیں بلایا گیا ، تو انہوں نے تکذیب کی پس جب وہ عزت کے مقام کی طرف نہیں آتے تو فرقان کا دوسرا پہلو عذاب کا آنا ہے وہ آ کر رہے گا اس لیے کہ فرقان یہی ہے کہ نیکوں کو بلند مقام پر پہنچایا جائے اور بدوں کو بدی کی سزا دی جائے تاکہ دونوں میں کھلا کھلا فرق نظر آ جائے اس لیے ماننے والوں کی حالت کا ذکر کر کے اور یہ بتا کر کہ وہ کس ذلیل حالت سے نکل کر کس بلند مقام پر پہنچ گئے ہیں اب مکذبین کا ذکر کیا کہ ان پر سزا آئے گی ؛

(۲۶) سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ مَكِّيَّةٌ

اٰیاتھا ۲۲۷ — رکوعاتھا ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

منزل ۵ طٰسٓمّٓ ① طور سینا پر موسیٰؑ کی وحی پر غور کرو) ۲۴۰۱

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② یہ کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا شاید تو اپنی جان کو ہلاک کردے گا کہ یہ ایمان

نام: اس سورت کا نام الشعراء ہے اور اس میں گیارہ رکوع اور ۲۲۷ آیتیں ہیں اور اس کا یہ نام اس کے آخری رکوع سے لیا گیا ہے جہاں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے جس طرح پہلے انبیاء کو وحی ہوئی اس بات کی تردید کی ہے کہ یہ کہانت ہے یا شاعری ہے اور بتایا ہے کہ شعراء کی عامہ حالت کیسی ہوتی ہے اسی مناسبت سے اس کا نام الشعراء ہے ؂

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں اس بات کا ذکر کرکے کہ آنحضرت صلعم کو کس قدر غم اس وجہ سے تھا کہ لوگ ایمان نہیں لاتے بتایا ہے کہ اسلام آخر کار کامیاب ہوگا اور لوگ اسلام لے آئیں گے اور چونکہ شروع سورت میں مقطعات میں حضرت موسیٰؑ کی وحی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اس لیے اسلام کی کامیابی کے متعلق آنحضرت صلعم کو تسلی دے کر پھر انبیاء کا ذکر بطور مثال کیا ہے ان میں مقدم حضرت موسیٰؑ کے ذکر کو کیا ہے اور یہ ذکر دوسرے تیسرے اور چوتھے رکوع میں چلتا ہے۔ پانچویں رکوع میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر ہے کیونکہ وہ حضرت موسیٰؑ اور آنحضرت صلعم کے جد امجد ہیں۔ اور ہر دو سلسلے یعنی موسوی اور سلسلہ محمدی انہیں سے چلتے ہیں اس کے بعد تاریخی ترتیب سے چھٹے رکوع میں حضرت نوحؑ کا ساتویں میں حضرت ہودؑ کا۔ آٹھویں میں حضرت صالحؑ کا۔ نویں میں حضرت لوطؑ کا۔ دسویں میں حضرت شعیبؑ کا ذکر ہے اور گیارھویں رکوع میں بتایا ہے کہ قرآن منجانب اللہ وحی ہے اور یہ کاہن یا شاعر کا کلام نہیں ہو سکتا ؂

تعلق: اس سورت اور اس کے بعد کی دو سورتوں کا مضمون قریباً ملتا جلتا ہے تینوں میں زیادہ تر توجہ حضرت موسیٰؑ کے حالات کی طرف یا سلسلہ موسوی کی طرف دلائی ہے۔ اور گو یہ ذکر تینوں سورتوں میں یکساں نہیں۔ مگر تینوں میں حضرت موسیٰؑ کے ذکر کا خاتمہ فرعون کے غرق ہونے پر کیا ہے اور یہ حضرت موسیٰؑ کا فرقان تھا یوں سورۂ فرقان کے بعد فرقانِ موسیٰ کا ذکر کیا ہے اور اس میں بھی اصل مقصود نبی کریم صلعم کی کامیابی کا ذکر ہی ہے کیونکہ حضرت موسیٰؑ سے آپ کو خاص مشابہت تھی جس کا ذکر توریت اور قرآن کریم دونوں میں صاف الفاظ میں ہے۔ چونکہ پچھلی سورت یعنی فرقان میں ان باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی جو قرآن کریم اپنے تبعین کے اندر پیدا کرتا ہے تو ان تینوں سورتوں میں سلسلہ موسوی کا ذکر کرکے یہ بتایا ہے کہ ضرور ہے کہ یہ پیغام حق دنیا میں کامیاب ہو جس طرح حضرت موسیٰؑ کامیاب ہوئے اور مخالفین تباہ ہوں۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کے مخالف تباہ ہوئے بلکہ اس شدید مشابہت کے لحاظ سے جو حضرت موسیٰؑ کو آنحضرت صلعم سے ہے ضرور تھا کہ تاریخ اسرائیل کے واقعات تاریخ اسلام میں دُہرائے جاتے اور ان تینوں سورتوں میں تاریخ اسرائیل کے انہی واقعات کا بالخصوص ذکر کیا ہے۔ جو تاریخ اسلامی میں دُہرائے جانے والے تھے۔ چنانچہ اس سورت میں فرعون کے مقابلہ اور اس کی ہلاکت کو بالتفصیل بیان کیا ہے سورۂ النمل میں اس شان و شوکت کا ذکر کیا ہے۔ جو آخر کار سلسلہ اسرائیل کو ملی۔ سورۂ القصص میں حضرت موسیٰؑ کی ہجرت کا ذکر ہے اور یہ تمام باتیں اسی طرح پر تاریخ اسلام میں دُہرائی گئیں ؂

زمانہ نزول: یہ تینوں سورتیں مکّی ہیں اور غالباً مکّہ کے آخری ایام کی ہیں۔ بالخصوص اس مجموعہ کی آخری سورت میں جو ہجرت کے بعد مکّہ میں واپس لانے کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورتیں اس زمانہ کی ہیں جب ہجرت شروع ہو چکی ہے ؂

۲۴۰۱ طٰسٓمّٓ۔ یہ تین سورتوں کا ایک مجموعہ ہے یعنی سورہ شعراء اور قصص جو طسم سے شروع ہوتی ہیں اور نمل جو طس سے شروع ہوتی ہے۔ محمد بن کعب سے ہے کہ طا سے مراد ذی الطول ہے اور س سے قدوس اور م سے رحمٰن (د) لیکن اگر اسمائے الٰہی کا ان حروف کو قائم مقام سمجھا جائے تو س اور م سے مراد سمیع اور علیم ہو سکتا ہے جو دو اسماء اکثر اکٹھے آتے ہیں۔ لیکن جب ان تینوں سورتوں کے مضمون پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تینوں میں حضرت موسیٰؑ اور ان کے سلسلہ کی طرف خصوصاً توجہ دلائی ہے جس سے نبی کریم صلعم کی صداقت پر روشنی پڑتی ہے یعنی صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ وحی جو طور سینا پر موسیٰؑ پر نازل ہوئی قرآن کریم کے لیے بطور تمہید کے تھی۔ چنانچہ اس مضمون کو کھول کر اس مجموعہ کی آخری سورۃ القصص میں بیان کیا ہے اور اس کے پانچویں رکوع میں نہایت صفائی سے یہ ذکر کیا ہے اس لیے ان حروف میں اشارہ اسی وحی کی طرف معلوم ہوتا ہے جو طور سینا پر حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی اور طا سے مراد طور۔ س سے مراد سینا۔ م سے مراد موسیٰؑ ہے گویا فرمایا ہے کہ اگر اس کتاب کی صداقت معلوم کرنا چاہتے ہو تو اس وحی پر غور کرو جو موسیٰؑ پر طور سینا پر نازل ہوئی ؂

مُؤْمِنِيْنَ ۝٣	نہیں لاتے ع٢٤٠٢
اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ	اگر ہم چاہیں ان پر آسمان سے ایک نشان اتاریں تو
اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۝٤	ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں ع٢٤٠٣
وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ	اور ان کے پاس رحمٰن کی طرف سے کوئی نئی نصیحت نہیں آتی،
مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ۝٥	مگر وہ اس سے منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں۔
فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْبٰٓؤُا مَا	انھوں نے تو جھٹلا دیا پس ان کے پاس اس کی حقیقت آجائے گی
كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝٦	جس سے ہنسی کرتے تھے۔
اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا	کیا انھوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا اس میں ہم نے کتنے
فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝٧	ہر قسم کے عمدہ جوڑے اگائے ہیں ع٢٤٠٤
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ	یقیناً اس میں ایک نشان ہے اور ان میں سے اکثر ایمان
اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝٨	لانے والے نہیں۔
ع وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝٩	اور تیرا رب بیشک وہی غالب رحم کرنے والا ہے ع٢٤٠٥
وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ	اور جب تیرے رب نے موسیٰؑ کو پکارا کہ
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝١٠ ۙ	ظالم قوم کے پاس جا۔

ع٢٤٠٢ مخالفین کی ہلاکت کی خبر سے آنحضرت صلعم کا غم: آپ کو نذیر کر کے بھیجا گیا۔ آپ کا فرض تھا کہ بتاتے کہ بدی کا انجام دکھ ہے۔ قرآن کریم میں بار بار سخت وعید نازل ہوتے تھے۔ آپ ان کو اپنے فرض منصبی کے لحاظ سے پہنچاتے تھے۔ مگر دل غم سے بھرا ہوا تھا اور تڑپ یہ تھی کہ کسی طرح ایمان لائیں اور نیک بنیں تاکہ عذاب ٹل جائے۔ یہی آپ کی تڑپ تھی جس نے آخر اس قوم کا سر اسلام کے سامنے جھکا دیا۔ یہی خوش خبری ہے جو اگلی آیت میں دی گئی ہے۔ وہ آیت مخالفت کی کمر ہمت کا ٹوٹ جانا تھا۔ جس کے بعد عرب کی گردنیں اسلام کے آگے جھک گئیں ؈

ع٢٤٠٣ اعناق عُنُق کی جمع ہے گردن اس کے معنی ہیں الزمناہ طآئرہ فی عنقہ (بنی اسرآئیل ١٧-١٣) فطفق مسحا بالسوق والاعناق (صٓ ٣٨-٣٣) اور اشراف قوم کو بھی اعناق کہتے ہیں اور یہی معنی یہاں ہیں (غ) اور یہ اسی طرح ہے جیسے وجوہ بڑے آدمیوں کو کہہ دیتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے یعنی مراد اس سے اشراف قوم ہیں کہ اعناق کے لیے خاضعین آیا ہے اور اگر اعناق کے عام معنی بھی لیے جائیں تو مراد پھر بھی اصحاب اعناق ہیں کیونکہ جب گردنیں جھکیں تو گردنوں والے ہی جھکے (ل) ابن جریر میں بھی یہ قول موجود ہے کہ اعناق سے مراد سادات اور کبرا ہیں ؈

خاضعین۔ خضع (مصدر خضوع) کے معنی ہیں جُھک گیا۔ فرمانبردار ہوا۔ اور خَضَعَ الرجل کے معنی ہیں عورت سے کلام میں ملائمت کا خاص انداز اختیار کیا (ل) یعنی ایسا انداز جس سے مرد کو عورت کی طرف رغبت پیدا ہو فلا تخضعن بالقول فیطمع الّذی فی قلبہ مرض (الاحزاب ٣٣-٣٢)

ع٢٤٠٤ کریم ہر شے سے اشرف کو کہا جاتا ہے اور مراد یہاں منفعت والی اشیاء ہیں کہ ان سب کے جوڑے جوڑے پیدا کیے ہیں اور اگلی آیت میں جو فرمایا کہ زمین میں ہر قسم کے ازواج پیدا کرنے میں بھی ایک نشان ہے تو وہ نشان صرف یہی نہیں کہ انسان سب سے اشرف ہے وہ اپنے آپ کو کیوں ذلیل کر رہا ہے بلکہ اس کی تصریح دوسری جگہ فرمائی ہے ومن کل شیٔ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون۔ ففرّوا الی اللہ (الذٰریٰت ٥١-٤٩، ٥٠) یعنی جب ہر چیز کے ازواج ہیں یہاں تک کہ سماء اور ارض بھی دو زوج ہیں جیسا کہ وہیں فرمایا ہے تو انسان کے اندر جو قوی دیگر حیوانات سے بڑھ کر رکھے گئے ہیں ان کا نشو و نما صحیح طریق پر بغیر کسی زوج سے تعلق کے کیوں کر ہو سکتا ہے اور اس سورت میں یہ تعلق باللہ ہے جو انسان کے قوائے روحانی کی نشو و نما کرتا ہے۔ یہی وہ نشان ہے جس کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے اور اسی لیے اگلے رکوعوں میں انبیاء کا ذکر کر کے جو تعلق باللہ پیدا کرتے ہیں اور ان کی کامیابی کا ذکر کر کے یہ لفظ ہر بار دُہرائے ہیں ؈

ع٢٤٠٥ ان دو صفات کے انتخاب میں یہ اشارہ ہے کہ مخالفین حق پر اللہ غالب آتا ہے مگر نہ ان کی بیخکنی کے لیے بلکہ ان پر رحم کرنے کے لیے اس میں رسول اللہ صلعم کو تسلی دی ہے کہ آپ ان لوگوں کے لیے زیادہ غم نہ کریں اللہ تعالیٰ غلبہ کے بعد ان سے رحم کا معاملہ کرے گا ؈

قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾

فرعون کی قوم (کے پاس) کیا وہ تقوٰے اختیار نہیں کریں گے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ۭ

اس نے کہا میرے رب میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا دیں۔

وَيَضِيْقُ صَدْرِیْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾

اور میرا سینہ رُکتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی، تو ہارون [ع] کی طرف (میری مدد کے لیے) پیغام بھیج ۲۴۰۶ء

وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾ۚ

اور وہ میرے ذمّے ایک قصور دھرتے ہیں سو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کردیں ۲۴۰۷ء [۲۱]

قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾

کہا ہرگز نہیں، سو دونوں ہمارے نشانوں کے ساتھ جاؤ ہم تمہارے ساتھ سننے والے ہیں۔

فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ۙ

سو فرعون کے پاس دونوں جاؤ اور کہو ہم جہانوں کے رب کے بھیجے ہوئے ہیں ۲۴۰۸ء

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ۭ

کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ۙ

(فرعون نے) کہا، کیا ہم نے تجھے اپنے ہاں بچّہ سا نہیں پالا اور تو ہمارے اندر اپنی عمر کے (کئی) سال رہا۔

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾

اور تو نے اپنا وہ کام کیا جو کیا، اور تو ناشکر گزاروں میں سے ہے۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ۭ

کہا میں نے اسے اس حال میں کیا جبکہ میں ناواقفوں میں سے تھا ۲۴۰۹ء

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِیْ رَبِّیْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾

سو میں تم سے بھاگ گیا جب میں تم سے ڈرا، سو میرے رب نے مجھے فہم عطا فرمایا اور مجھے رسولوں میں سے بنایا۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ۭ

اور یہ وہ نعمت ہے جسے تو مجھ پر جتاتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا ہے ۲۴۱۰ء

ء۲۴۰۶ ینطلق طَلِقُ اللسان فصیح کو کہتے ہیں اور انطلاق کے معنی سرعة الذهاب ہیں یعنی تیز چلنا (ل)۔

ء۲۴۰۷ یہ قصور قبطی کا قتل تھا جس کا مفصل ذکر سورۂ قصص میں ہے اور یہاں بھی آگے کچھ ذکر آتا ہے یہ مطلب نہیں کہ واقعی قصور کیا تھا بلکہ یہ کہ ان کا دعویٰ میرے خلاف ایسا ہے۔

ء۲۴۰۸ دوسری جگہ ہے انا رسولا ربك (طٰہٰ ۲۰-۴۷) یہاں واحد اختیار کیا ہے یعنی ہم میں سے ہر ایک رسول ہے اور رسول کا استعمال واحد جمع میں یکساں بھی ہو جاتا ہے۔

ء۲۴۰۹ پچھلی آیت میں کافر سے مراد کافر نعمت ہے اور یہاں ضال سے مراد جاھل ہے اور عرب جَهِلَ الطریق اور ضَلَّ الطریق ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں (ج)، اور جاھل سے مراد اس فعل کے نتیجہ سے ناواقف ہے کیونکہ آپ کا ارادہ قتل تو نہ تھا بلکہ صرف مکّا مارنا تھا۔ فوکزہ موسٰی (القصص ۲۸-۱۵) اور یہ انہیں کس طرح خبر ہو سکتی تھی کہ ایک مُکّے سے ایک شخص مر جائے گا۔ اور اگلی آیت میں جو خفتکم فرمایا تو مطلب یہ ہے کہ تمہارے ظلم کا خوف تھا اس لیے کہ جو شخص مارا گیا وہ قبطی تھا اور دوسری قوم کی وجہ سے حضرت موسٰی کو کوئی توقع نہ تھی کہ آپ کے ساتھ اس معاملہ میں انصاف ہوگا۔

ء۲۴۱۰ عَبَّدتَّ کے معنی ہیں اسے عبد یعنی غلام بنا لیا (غ) یعنی ایک میرے پالنے کا تم احسان جتاتے ہو اور ساری قوم کو تم نے غلام بنا رکھا ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۲۳

فرعون نے کہا اور جہانوں کا رب کون ہے ؟

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا
بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۲۴

کہا آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۲۵

(فرعون نے) انھیں جو ارد گرد تھے کہا، کیا تم سُنتے نہیں

قَالَ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۲۶

(موسیٰؑ نے) کہا تمھارا رب اور تمھارے پہلے باپ دادوں کا رب۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْۤ اُرْسِلَ
اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۲۷

(فرعون نے) کہا تمھارا رسول جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، یقیناً مجنون ہے ۲۴۱۱ء

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَمَا
بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۲۸

(موسیٰؑ نے) کہا مشرق اور مغرب کا رب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اگر تم عقل سے کام لو۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ
مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۲۹

(فرعون نے) کہا اگر تُو میرے سوا کوئی دوسرا معبود بنائے گا تو میں تجھے قیدیوں میں داخل کردوں گا۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ۳۰

کہا بھلا اگر میں تیرے پاس کوئی کھلی بات لاؤں !

قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۳۱

کہا تو وہ لے آ اگر تو سچا ہے۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۳۲

پس اپنا عصا ڈالا تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ صریح اژدہا ہے۔ ۲۴۱۱ل

وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۳۳

اور اپنا ہاتھ نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید تھا۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۳۴

(فرعون نے) اپنے اِرد گرد کے سرداروں سے کہا یہ علم والا جادوگر ہے۔

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ
بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۳۵

چاہتا ہے کہ اپنے جادو سے تمھیں تمھارے ملک سے نکال دے۔ سو تم کیا مشورہ دیتے ہو۔

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ ابْعَثْ فِي
الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۳۶

انھوں نے کہا اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دے اور شہروں میں نقیب بھیج دے۔

يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ۳۷

وہ ہر ایک علم والے جادوگر کو تیرے پاس لے آئیں۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۳۸

سو جادوگر ایک مقررہ دن کے وعدے پر جمع ہو گئے۔

وَّ قِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۳۹

اور لوگوں کو کہا گیا کیا تم جمع ہو گئے۔

لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا

شاید ہم جادوگروں کی پیروی کریں اگر وہ غالب

۲۴۱۱ء مجنون اس لیے کہا کہ حضرت موسٰے نے اس بات کی پروا نہ کرکے اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا ذکر جاری رکھا۔ اور یوں بھی انبیاء کو بوجہ اس جوش کے جو انہیں حق کے لیے دیا جاتا ہے کہ وہ بالمقابل کسی طاقت کی پروا نہیں کرتے دنیا کے لوگ مجنون سمجھتے ہیں ؛

۲۴۱۱ل ثعبان ثعبَ پانی یا خون جاری کیا اور ثعبان بہت موٹے اور لمبے سانپ کو کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک ہر سانپ کو (ل) ؛

هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾

رہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ
اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾

سو جب جادوگر آ گئے انھوں نے فرعون سے کہا کیا ہمارے لیے کچھ اجر ہے اگر ہم غالب رہیں۔

قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾

کہا ہاں اور تم اس صورت میں مقربوں میں سے ہو گے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾

موسیٰؑ نے اِن سے کہا ڈالو جو تم ڈالنے ہو۔

فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَ عِصِيَّهُمْ وَ قَالُوْا بِعِزَّةِ
فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

سو انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور کہا فرعون کے اقبال سے ہم ہی غالب ہوں گے۔

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ
مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾

تب موسیٰؑ نے اپنا عصا ڈالا، تو جو وہ جھوٹ بناتے تھے وہ اسے نگلنے لگا۔

فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

پس جادوگر سجدے میں گر گئے۔

قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

انھوں نے کہا ہم جہانوں کے رب پر ایمان لائے۔

رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾

موسیٰؑ اور ہارونؑ کے رب (پر)

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ
اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ
فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ لَاُقَطِّعَنَّ
اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ
وَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾

(فرعون نے) کہا تم اس پر ایمان لائے قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دوں یقیناً یہ تمھارا بڑا ہے، جس نے تمھیں جادو سکھایا ہے سو تم جان لو گے۔ مَیں تمھارے ہاتھ اور تمھارے پاؤں مخالف طرفوں سے کاٹ دوں گا، اور مَیں تم سب کو صلیب دے دوں گا۔

قَالُوْا لَا ضَيْرَ ؗ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾

انھوں نے کہا کچھ حرج نہیں[۲۴۱۲] ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَاۤ
اَنْ كُنَّاۤ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾ ع ۴

ہم آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہماری خطائیں ہمیں بخش دے کہ ہم پہلے ایمان لانے والے ہیں۔

وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْۤ
اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے جا کیونکہ تمھارا پیچھا کیا جائے گا۔

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

تو فرعون نے شہروں میں نقیب بھیجے۔

اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾

کہ یہ تھوڑی سی جماعت ہے[۲۴۱۳]

۲۴۱۲ ضیر کے معنی مضرت ہیں (غ)، ان تمام امور پر پہلے مفصل بحث گزر چکی ہے۔

۲۴۱۳ شرذمۃ ایک منقطع ہوئی ہوئی جماعت (غ) یا تھوڑی جماعت اور ثیاب شراذم پرانے پھٹے ہوئے کپڑوں کو کہتے ہیں (ل)، شراذم جمع شرذمۃ ہے) اور کہا گیا ہے کہ شرذمۃ سفلہ یا خسیس لوگوں کو کہتے ہیں (ل) اور چونکہ قلیل کا لفظ موجود ہے۔ اس لیے یہی آخری معنی ٹھیک معلوم ہوتے ہیں اور ثیاب

وَ اِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿٥٥﴾ — اور وہ ہمیں غصے میں لانے والے ہیں ٢٤١٤

وَ اِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿٥٦﴾ — اور ہم ایک محتاط جماعت ہیں ۔

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿٥٧﴾ — سو ہم نے انھیں باغوں اور چشموں سے نکال دیا۔

وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿٥٨﴾ — اور خزانوں اور عزّت والے مقام سے ۔

كَذٰلِكَ ؕ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿٥٩﴾ — ایسا ہی (اب ہوگا) اور ان (چیزوں) کا وارث بنی اسرائیل کو بنایا ٢٤١٥

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿٦٠﴾ — سو انھوں نے سورج نکلتے ان کا پیچھا کیا۔

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿٦١﴾ — پس جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، موسیٰؑ کے ساتھیوں نے کہا ہم تو پکڑے گئے ۔

قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿٦٢﴾ — (موسیٰؑ نے) کہا ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھے رستہ دکھائیگا۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿٦٣﴾ — سو ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ اپنے عصا سے سمندر کو مار۔ پس وہ پھٹ گیا اور ہر ایک فریق ایک بڑے تودہ کی طرح تھا ٢٤١٦

شر ازم کا محاورہ ان کی تائید کرتا ہے ؛

٢٤١٤ جمیع ۔جمع اور جمیع اور جماعة کے ایک ہی معنی ہیں ۔سب کے سب ؛
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو بالکل تباہ کر دینے کی ٹھان لی تھی ۔اسی لیے وہ کہتا ہے کہ ہم محتاط لوگ ہیں یعنی قبل اس کے کہ بنی اسرائیل ہماری برابری کا دعویٰ کریں اور معزز بن جائیں ہمیں ان کا کام تمام کر دینا چاہیئے ۔دوسری جگہ ہے ونری فرعون وھامان وجنودھما منھم ما کانوا یحذرون (القصص ٢٨-٦) غصہ دلانے سے مراد یہ ہے کہ ہم بڑے لوگ ہیں یہ ایک ماتحت اور ذلیل قوم ہو کر جب ہماری برابری کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہمیں غصہ آتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہاں وحی کا ذکر پہلے ہے تو وحی اور چیز ہے اور بنی اسرائیل کا مصر سے نکلنا اور چیز ہے یہ مطلب نہیں کہ بنی اسرائیل مصر سے نکل پڑے تو فرعون نے شہروں میں نقیب بھیجے ۔بلکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بذریعہ وحی پہلے سے اطلاع دیدی تھی کہ اب فرعون ایسا کام کرنے والا ہے کہ سوائے اس کے کہ بنی اسرائیل کو رات کو پوشیدہ طور پر نکال لیا جائے اور چارہ نہیں۔

٢٤١٥ اورثنھا سے مراد ہے کہ باغوں اور خزانوں کا وارث ۔نہ فرعون کے باغوں اور خزانوں کا ۔اس لیے کہ جب وہ غلامی سے نکل کر آزاد ہو گئے، تو باغ اور خزانے اور عزت کا مقام مل گیا ۔اور بعض نے یہ مراد لی ہے کہ حضرت سلیمان کے زمانہ میں مصر پر بنی اسرائیل قابض ہو گئے۔

٢٤١٦ اضرب بعصاك البحر کے معنی کے لیے دیکھو اضرب لعصاك الحجر پر ع٨٨ علاوہ اس معنی کے جو ترجمہ میں ہیں یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اپنے عصا کے ساتھ سمندر میں چل پڑ ۔یا اپنی جماعت کے ساتھ چل پڑ ۔اس کی تائید دوسری آیت سے ہوتی ہے فاضرب لھم طریقا فی البحر یبسا (طٰہٰ ٢٠-٧٧) انفلق کے لیے دیکھو ع٧٣ اور صبح کے نمودار ہونے پر بھی فلق بولا جاتا ہے کیونکہ تاریکی سے روشنی الگ ہو جاتی ہے، سمندر کا پھٹنا یہی ہے کہ پانی ہٹ کر پیچھے ہو گیا ؛

فرق ۔فِرق الگ ہوئے ہوئے ٹکڑے کو کہا جاتا ہے اور فِرقة اس جماعت کو جو باقی لوگوں سے الگ ہو جائے (غ) اور فِرق کے معنی قسم بھی ہیں اور لوگوں کے ایک گروہ کو بھی کہتے ہیں (ل) اور فریق بھی اس جماعت کو کہتے ہیں جو دوسروں سے الگ ہو فریق فی الجنة وفریق فی السعیر (الشوریٰ ٤٢-٧)

طود ۔طود بڑے پہاڑ کو بھی کہتے ہیں اور پشتہ یا تودہ کو بھی اور ایک شعر میں اونٹوں کے کوہانوں کو اطواد کہا گیا ہے (ل) اور طود کا بڑا ہونا طور کے لحاظ سے ہے سب پہاڑوں میں بڑا ہونا مراد نہیں (غ)

بارہ رستوں کا خیال بے بنیاد ہے : سمندر میں حضرت موسیٰ کو رستہ ملنے کے متعلق مفصل ع٧٣ میں بیان ہو چکا ہے ۔یہاں سے مفسرین نے بارہ رستے نکالے ہیں حالانکہ یہاں بارہ کا ذکر نہیں نہ کسی حدیث میں ہے اور کل فرق سے مراد پانی کے قطعات بھی ہو سکتے ہیں اور دونوں فریق یا جماعتیں بھی ہو سکتی ہیں اور اس دوسری صورت میں مراد یہ ہوگی کہ فرعون کے پہنچتے پہنچتے بنی اسرائیل سمندر کو عبور کر گئے اور سمندر کے دونوں کناروں پر یہ دونوں جماعتیں بڑے تودہ کی طرح نظر آنے لگیں اور

وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِیْنَ ﴿۶۴﴾
اور وہیں ہم دوسروں کو قریب لے آئے۔

وَ اَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَ مَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۶۵﴾
اور ہم نے موسٰی کو اور جو اس کے ساتھ تھے اُن سب کو نجات دی۔

ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۶۶﴾
پھر ہم نے دوسروں کو غرق کردیا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ
اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۶۷﴾
اس میں ایک نشان ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے
والے نہیں۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۶۸﴾ ع
اور تیرا رب وہی غالب رحم کرنے والا ہے۔

وَ اتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ﴿۶۹﴾
اور ان پر ابراہیمؑ کی خبر پڑھ ع۲۴۱۷

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾
جب اس نے اپنے بزرگ اور اپنی قوم سے کہا تم کس کو پوجتے ہو۔

قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ ﴿۷۱﴾
انھوں نے کہا ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور انہی کی عبادت میں لگے رہیں گے۔

قَالَ هَلْ یَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾
کہا کیا یہ تمھاری (بات) سنتے ہیں جب تم پکارتے ہو۔

اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾
یا تمھیں فائدہ پہنچاتے ہیں یا نقصان دے سکتے ہیں۔

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ
یَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾
انھوں نے کہا بلکہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایسا ہی
کرتے پایا۔

قَالَ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾
کہا کیا تم دیکھتے ہو کہ جن کی تم عبادت کرتے ہو۔

اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾
تم اور تمھارے پہلے باپ دادا۔

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۷﴾
تو وہ میرے لیے دشمن ہیں مگر جہانوں کا رب ع۲۴۱۸

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿۷۸﴾
جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی مجھے ہدایت دیتا ہے۔

وَ الَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ ﴿۷۹﴾
اور جو مجھے کھلاتا اور مجھے پلاتا ہے۔

وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ﴿۸۰﴾
اور جب میں بیمار ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔

وَ الَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ﴿۸۱﴾
اور جو مجھے مارے گا پھر مجھے زندہ کرے گا۔

ازلفنا ثم الاٰخرین سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر فرعون نے وہی رستہ لیا جس پر بنی اسرائیل چلے تھے۔ نپولین بونا پارٹ کی لائف میں میں نے ایک واقعہ پڑھا ہے بعینہٖ بحیرہ قلزم کے اسی مقام پر جب جوار بھاٹے کی وجہ سے سمندر پیچھے ہٹا ہوا تھا۔ غروب آفتاب کے قریب نپولین اپنے ساتھیوں سمیت داخل ہوا ادھر تاریکی شروع ہوئی اور پانی چڑھنا شروع ہوا یہاں تک کہ رستہ ملنا محال ہوگیا آخر نپولین نے چاروں طرف چند آدمی روانہ کیے اور جدھر جدھر پانی گہرا ہوتا گیا اس طرف سے رُخ ہٹا کر اس جانب کا رُخ کیا جدھر پانی کم ہوتا چلا گیا۔ اگر یہ تجویز نہ سوجھتی تو لشکر سمیت غرق ہوجاتا۔ ہوسکتا ہے کہ جوش تعاقب میں فرعون نے چڑھاؤ کے وقت کا خیال نہ کیا ہو اور ہوسکتا ہے کہ حضرت موسٰی کے لیے اعجازی طور پر سمندر نے رستہ دیدیا اور فرعونی وہاں غرق ہوگئے۔

ع۲۴۱۷ اس سورت میں سب سے پہلے حضرت موسٰی کا ذکر کیا کیونکہ اصل مقصود وہی ہے جیسا کہ طٰسٓمٓ کی تشریح میں دکھایا گیا ہے اس کے بعد حضرت ابراہیم کا ذکر ہے اس لیے کہ حضرت ابراہیم میں حضرت موسٰی اور آنحضرت صلعم ملتے ہیں۔ اس کے بعد چند انبیاء کا ذکر کیا جو عرب کے ارد گرد آئے جن کے دشمنوں کو ہلاک کیا گیا اور وہ ترتیب تاریخی سے ہے یعنی اول نوحؑ پھر ہودؑ۔ پھر صالحؑ۔ پھر لوطؑ۔ پھر شعیبؑ۔

ع۲۴۱۸ حضرت ابراہیم کا بتوں کو دشمن کہنا اس لحاظ سے تھا کہ وہ بُت پرستی کو مٹانے آئے تھے۔

وَ الَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ؕ﴿۸۲﴾
اور جو میں امید رکھتا ہوں کہ میری خطائیں جزا و سزا کے دن معاف کرے گا ۲۴۱۹ء

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۙ﴿۸۳﴾
میرے رب مجھے حکمت عطا فرما اور مجھے صالح لوگوں کے ساتھ ملا۔

وَ اجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۙ﴿۸۴﴾
اور میرے لیے پچھلوں میں ذکر خیر جاری رکھ ۲۴۲۰ء

وَ اجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۙ﴿۸۵﴾
اور مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں بنا۔

وَ اغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۙ﴿۸۶﴾
اور میرے بزرگ کو معاف فرما وہ گمراہوں میں سے ہے۔

وَ لَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۙ﴿۸۷﴾
اور مجھے اس دن رسوا نہ کیجیو جس دن (لوگ) اٹھائے جائیں۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ ۙ﴿۸۸﴾
جس دن نہ مال نفع دے گا اور نہ بیٹے۔

اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ؕ﴿۸۹﴾
مگر جو سلامتی والے دل کے ساتھ اللہ کے حضور آئے ۲۴۲۱ء

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۹۰﴾
اور جنت کو متقیوں کے لیے قریب کیا جائے گا۔

وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ۙ﴿۹۱﴾
اور دوزخ گمراہوں کے لیے ظاہر کیا جائے گا۔

وَ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۙ﴿۹۲﴾
اور انھیں کہا جائیگا وہ کہاں ہیں جن کی تم عبادت کرتے تھے۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ؕ﴿۹۳﴾
اللہ کے سوائے، کیا وہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں یا بدلہ لے سکتے ہیں۔

فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَ الْغَاوٗنَ ۙ﴿۹۴﴾
سو وہ اور گمراہ کرنے والے اس میں اوندھے منہ ڈالے جائیں گے ۲۴۲۲ء

وَ جُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ؕ﴿۹۵﴾
اور ابلیس کے لشکر سب کے سب۔

قَالُوْا وَ هُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ۙ﴿۹۶﴾
کہیں گے اور وہ اس میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہونگے۔

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۹۷﴾
اللہ کی قسم ہم کھلی گمراہی میں تھے۔

ع۲۴۱۹ خطیئۃ کا لفظ وسیع ہے دیکھو ع۱۰۵ بھول کر جو غلطی ہو جائے وہ بھی اس میں داخل ہے حالانکہ وہ گناہ نہیں۔ اس قسم کی غلطی عصمت انبیاء کے منافی نہیں بلکہ تقاضائے بشریت ہے۔ اسی معنی میں حضرت مسیح نے کہا تھا "تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے نیک سوائے خدا کے کوئی نہیں"۔ کیونکہ ہر بشر سے غلطی ہو سکتی ہے۔

ع۲۴۲۰ اٰخرین سے مراد یہاں بعض کے نزدیک آخری امت ہے (د) یعنی خاتم النبیین کی امت جس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ درود شریف میں حضرت ابراہیم کا ذکر اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ع۲۴۲۱ سلیم۔ تمام آفات باطنی سے محفوظ۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے بچاؤ اور نجات کے لیے مال اور اولاد کام نہیں آئیں گے مگر قلب سلیم کام آئے گا۔

ع۲۴۲۲ کبکبوا۔ کَبّ کسی چیز کا منہ کے بل گرانا ہے فکبّت وجوھھم فی النّار (النمل ۲۷۔ ۹۰) اور اِکباب یہ ہے کہ عمل پر کسی شخص کا منہ اوندھا رہے۔ اَفمن یمشی مُکبًّا علٰی وجھہٖ (الملک ۶۷۔ ۲۲) اور کَبْکَبَۃ کسی چیز کا گہرائی میں پھینکنا ہے (غ) اور اس کی حقیقت لغت میں یہ ہے کہ انکباب یعنی اوندھا پھینکنے کو بار بار کیا جائے (ل)

یہاں تین گروہ ہیں۔ ھُم ۔ غاوٗن ۔ جنود ابلیس (جو اگلی آیت میں مذکور ہے) ظاہر ہے کہ آخری لفظ سے شیاطین کا گروہ مراد ہے جو بدی کے محرک ہیں اور غاوی یا گمراہ کرنے والے لوگ سردار ہیں جو دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اور ھم سے مراد ان کے متبعین ہیں۔ جنود ابلیس کے لفظ سے یہ بھی معلوم

إِذْ نُسَوِّيكُم بِرَبِّ الْعَٰلَمِينَ ﴿٩٨﴾
جب ہم تمھیں جہانوں کے رب کے برابر کرتے تھے ۲۴۲۳

وَمَآ أَضَلَّنَآ إِلَّا الْمُجْرِمُونَ ﴿٩٩﴾
اور ہمیں گمراہ نہیں کیا مگر مجرموں نے۔

فَمَا لَنَا مِن شَٰفِعِينَ ﴿١٠٠﴾
پس ہمارے لیے کوئی شفارش کرنے والا نہیں۔

وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ ﴿١٠١﴾
اور نہ کوئی غم کھانے والا دوست ہے۔

فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٢﴾
سو کاش اگر ہمارے لیے لوٹ کر جانا ہو تو ہم مومنوں میں سے ہوں۔

إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٠٣﴾
اس میں ایک نشان ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

ع ۹ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٤﴾
اور تیرا رب وہی غالب رحم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٠٥﴾
نوحؑ کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٠٦﴾
جب ان کے بھائی نوحؑ نے ان سے کہا کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔

إِنِّى لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٠٧﴾
میں تمھارے لیے رسول امین ہوں۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٠٨﴾
سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میری فرمانبرداری کرو۔

وَمَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِىَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَٰلَمِينَ ﴿١٠٩﴾
اور میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر صرف جہانوں کے رب پر ہے۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١١٠﴾
سو اللہ کا تقوےٰ کرو اور میری فرمانبرداری کرو۔

قَالُوٓا أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ ﴿١١١﴾
انھوں نے کہا کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں اور تیرے پیرو ادنیٰ درجے کے لوگ ہیں۔

قَالَ وَمَا عِلْمِى بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١١٢﴾
اس نے کہا اور مجھے کیا علم ہے وہ کیا کرتے ہیں۔

إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّى ۖ لَوْ تَشْعُرُونَ ﴿١١٣﴾
ان کا حساب صرف میرے رب کا کام ہے کاش تم سمجھو۔

وَمَآ أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٤﴾
اور میں مومنوں کو حقیر سمجھ کر نکالنے والا نہیں ہوں ۲۴۲۴

إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿١١٥﴾
میں صرف کھول کر ڈرانے والا ہوں۔

قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَٰنُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ ﴿١١٦﴾
انھوں نے کہا اے نوحؑ اگر تو نہ رکا تو ضرور تجھے سنگسار کیا جائے گا۔

ہوا کہ ہر انسان کے لیے ابلیس کی کوئی الگ ہستی ہے اور یہ حدیث کے مطابق ہے اور یہاں بتوں کے آگ میں ڈالنے کا کوئی ذکر نہیں ؛

۲۴۲۳ اوپر کے نوٹ سے ظاہر ہے کہ یہ جنہیں رب العالمین کے برابر بنانے کا ذکر ہے وہی ان کے گمراہ کنندہ ہیں۔ کیوں کہ ان کے احکام کو وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرح مانتے تھے ؛

۲۴۲۴ طارد۔ طَرْد۔ استخفاف کر کے یعنی حقیر سمجھ کر دھتکار دینا اور دور کر دینا ولا تطرد الذین (الانعام۔ ۵۲) (غ)

قَالَ رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ﴿١١٧﴾
اس نے کہا اے میرے رب میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔

فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَنَجِّنِي وَمَن مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٨﴾
سو میرے اور اُن کے درمیان فیصلہ کر اور مجھے اور اُنھیں جو مومنوں میں سے میرے ساتھ ہیں نجات دے۔

فَأَنجَيْنَاهُ وَمَن مَّعَهُ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ﴿١١٩﴾
سو ہم نے اُسے اور انھیں جو اس کے ساتھ تھے بھری ہوئی کشتی میں نجات دی۔ ٢٤٢٥ع

ثُمَّ أَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبَاقِينَ ﴿١٢٠﴾
پھر اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کر دیا۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٢١﴾
اس میں ایک نشان ہے، اور اُن میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٢﴾
اور تیرا رب وہی غالب رحم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٢٣﴾
عاد نے رسولوں کو جھٹلایا۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٢٤﴾
جب ان کے بھائی ہُودؑ نے اُن سے کہا کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٢٥﴾
میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٢٦﴾
سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میری اطاعت کرو۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٢٧﴾
اور میں تم سے اس پر اجر نہیں مانگتا، میرا اجر صرف جہانوں کے رب پر ہے۔

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ﴿١٢٨﴾
کیا تم ہر اونچی جگہ پر یادگاریں بناتے ہو عبث کام کرتے ہو ٢٤٢٦ع

وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ﴿١٢٩﴾
اور کاریگری کے کام بناتے ہو کہ شاید تم ہمیشہ رہو ٢٤٢٧ع

وَإِذَا بَطَشْتُم بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ﴿١٣٠﴾
اور جب تم (کسی کو) پکڑتے ہو سختی سے پکڑتے ہو ٢٤٢٨ع

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٣١﴾
سو اللہ کا تقوےٰ کرو اور میری اطاعت کرو۔

وَاتَّقُوا الَّذِي أَمَدَّكُم بِمَا تَعْلَمُونَ ﴿١٣٢﴾
اور اس کا تقویٰ کرو جس نے ان چیزوں سے تمھاری مدد کی ہے جو تم جانتے ہو۔

٢٤٢٥ع مشحون۔ شَحن کے معنی ہیں کشتی کا بھرنا اور اس کے سامان کا تیار کرنا (ل) اور شَحنآء اس دشمن کو کہتے ہیں جس سے نفس بھر جائے (غ)

٢٤٢٦ع ریع۔ رِیعَة کی جمع ہے ہر ایک اونچی جگہ جو دور سے نظر آئے (غ) اور رستہ اور وادی بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں (ج) اٰیة یہاں بلند عمارت ہے ع٦٠۔ معلوم ہوتا ہے یہ بلند عمارتیں صرف بڑے بڑے آدمیوں کی یادگاروں کے طور پر بنائی جاتی تھیں اسی لیے ان کو اٰیة یا نشان کہا ہے اور ان کی غرض صرف اپنے نام کی بڑائی اور نمود تھی۔

٢٤٢٧ع مصانع صِنع ع١٩٦٨ مَصانع سے مراد ہے جو وہ بناتے تھے اور اعلےٰ درجہ کے مکانوں کو بھی مصانع کہتے ہیں (غ) اور مَصنَعَة اور صِنع حوض کو کہتے ہیں یا تالاب بند وغیرہ کو جس میں بارش کا پانی جمع کیا جائے اور عمارتوں کو جو لوگ بنائیں اور محلات کو بھی اور مَصانع جمع ہے (ل) اور مفسرین کے بھی اس میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض بڑی بڑی عمارتیں مراد لیتے ہیں۔ بعض قلعے۔ بعض محلات۔ بعض پانی کے تالاب۔ ابن جریر کہتے ہیں یہ لفظ ان سب پر حاوی ہے اور وسیع معنی میں لیا جا سکتا ہے اور اعلیٰ درجہ کی کاریگری کے کام بڑی عمارات ہوں یا قلعے یا پانی کے تالاب کوئی معیوب امر نہیں۔ بلکہ معیوب یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بالکل بھول گئے اور انہی چیزوں کو اپنی طاقت کا اصل موجب سمجھا۔ اس لیے فرمایا کہ یہ چیزیں تم کو باقی نہیں رکھ سکتیں اگر خدا کو منظور نہ ہو۔

٢٤٢٨ع بطشتم۔ بطش حملہ کر کے کسی چیز کا لینا ہے ولقد انذرهم بطشتنا (القمر ٥٤-٣٦) یوم نبطش البطشة الكبرىٰ (الدخان ٤٤-١٦) (غ)

اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿۱۳۳﴾
چارپایوں اور بیٹوں سے تمھاری مدد کی ہے۔

وَ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾
اور باغوں اور چشموں سے۔

اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳۵﴾
میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب (کے آنے) سے ڈرتا ہوں۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَاۤ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾
انھوں نے کہا ہمارے لیے برابر ہے خواہ تو وعظ کرے یا تو وعظ کرنے والوں میں سے نہ ہو۔

اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾
یہ (اور) کچھ نہیں مگر پہلوں کا (بنایا ہوا) جھوٹ ہے ۲۴۲۹

وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾
اور ہم عذاب نہیں دیے جائیں گے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾
سو انھوں نے اسے جھٹلایا پس ہم نے انھیں ہلاک کر دیا اس میں ایک نشان ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانیوالے نہیں۔

ع ۱۸/۱۱ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾
اور تیرا رب وہی غالب رحم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾
ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾
جب ان کے بھائی صالحؑ نے ان سے کہا کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۴۳﴾
میں تمھارے لیے رسول امین ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾
سو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری فرمانبرداری کرو۔

وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾
اور میں تم سے اس پر کچھ اجر نہیں مانگتا، میرا اجر صرف جہانوں کے رب پر ہے۔

اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِيْنَ ﴿۱۴۶﴾
کیا تم (چیزوں) میں جو یہاں ہیں امن میں چھوڑ دیئے جاؤ گے۔

فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾
(یعنی) باغوں اور چشموں میں۔

وَّ زُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿۱۴۸﴾
اور کھیتیوں اور کھجوروں (میں) جن کا گابھا ملائم ہے ۲۴۳۰

وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿۱۴۹﴾
اور تم اتراتے ہوئے پہاڑوں میں گھر تراش لیتے ہو ۲۴۳۱

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾
سو اللہ کا تقوےٰ کرو اور میری فرمانبرداری کرو۔

وَ لَا تُطِيْعُوْۤا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾
اور حد سے بڑھنے والوں کی بات کو نہ مانو۔

۲۴۲۹ع خُلُق۔ خَلق جہاں جہاں کلام کے وصف میں استعمال کیا گیا ہے تو اس سے مراد کذب یعنی جھوٹ ہے۔ اور اسی لیے بہت سے لوگوں نے لفظ خَلق کے قرآن کریم پر اطلاق سے منع کیا ہے اور اسی معنی میں یہاں لفظ خُلق ہے اور اسی معنی میں اختلاق ہے ان ھٰذا الّا اختلاق (صٓ ۳۸-۷) (غ) اور خُلُق اور خُلْق طبیعت یا صورت باطنی کے وصف کو بھی کہتے ہیں لعلٰی خلق عظیم (القلم ۶۸-۴) (ل) اور اس لیے اس کے معنی عادت بھی کیے گئے ہیں (ج)

۲۴۳۰ع ھضیم۔ دیکھو ۲۱۰۶ع اس کے معنی مفسرین نے لطیف اور کثرت پھل سے جھکا ہوا بھی کئے ہیں (ر)

۲۴۳۱ع فارھین۔ فَرِہ کے معنی اَشِر ہیں یعنی اترانے والا اور یہی معنی فارِہ کے ہیں اور حاذق بھی معنی کیے گئے ہیں (غ)

الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿١٥٢﴾
جو زمین میں فساد کرتے ہیں، اور اصلاح نہیں کرتے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿١٥٣﴾
انھوں نے کہا تجھ پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے[۲۴۳۲]

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚۖ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١٥٤﴾
تو کچھ نہیں مگر ہماری طرح ایک انسان ہے، سو کوئی نشان لا اگر تو سچوں میں سے ہے۔

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿١٥٥﴾
کہا یہ اونٹنی ہے اس کے لیے پانی کی باری ہے اور تمھارے لیے ایک معلوم وقت پانی کی باری ہے[۲۴۳۳]

وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٥٦﴾
اور اُسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا، ورنہ تمھیں ایک بڑے دن کا عذاب آ پکڑے گا۔

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿١٥٧﴾
پس انھوں نے اس کے پاؤں کاٹ ڈالے پھر پشیمان ہوئے۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٥٨﴾
سو اُنھیں عذاب نے آ پکڑا، اس میں ایک نشان ہے اور اُن میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

ع ۹ ۱۲ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٥٩﴾
اور تیرا رب وہی غالب رحم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٦٠﴾
لوطؑ کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٦١﴾
جب ان کے بھائی لوطؑ نے اُن سے کہا کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٦٢﴾
میں تمھارے لیے رسول امین ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٦٣﴾
سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میری فرمانبرداری کرو۔

وَمَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٤﴾
اور مَیں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر صرف جہانوں کے رب پر ہے۔

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٥﴾
کیا تم تمام جہان سے مردوں کے پاس جاتے ہو[۲۴۳۴]

۲۴۳۲ء مسحّر کے لیے دیکھو ۱۸۳۹ء عام معنی جادو کیا گیا بھی ہیں مگر یہاں ابن جریر نے ابن عباس سے مخلوق معنی کر کے اسی کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ ہر ایک کھانے والے پر انسان ہو یا چارپایہ مسحر بول دیا جاتا ہے۔

۲۴۳۳ء شرب۔ شِرب پینے کا حِصّہ ہے کل شرب محتضر (القمر ۵۴ - ۲۸) (غ) شرب یوم معلوم سے مراد مقرر وقت پر پانی لینا ہے گو یا وہ معلوم ہے اور یوم سے مراد یہاں عام ہے یعنی وقت۔ یوم معلوم سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ایک دن اونٹنی کے پانی پینے کے لیے مقرر تھا اور ایک دن ساری قوم کے لیے اور اونٹنی اپنی باری میں سارے شہر کا پانی پی جاتی تھی۔ یہ کہیں قرآن شریف میں ذکر نہیں بلکہ کل شرب محتضر (القمر ۵۴ - ۲۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ چشمہ ایک معین وقت پر کھلتا تھا (کیونکہ یہ پہاڑی ملک تھا اور بارش کی کمی سے ایسے مقامات پر پانی کے لیے وقت مقرر کرنا پڑتا ہے) اور مطلب یہ تھا کہ اونٹنی کو پانی پینے سے روکا نہ جائے۔

۲۴۳۴ء اگر من العالمین کو ذکران کے ساتھ پڑھا جائے تو معنی یوں ہونگے کہ عالمین یعنی خدا کی مخلوق میں سے بجائے عورتوں کے پاس جانے کے تم

وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ ۚ بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ﴿١٦٦﴾
اور اسے چھوڑتے ہو جو تمہارے رب نے تمہارے لیے تمہارے جوڑے پیدا کیے، بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔

قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَا لُوطُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ ﴿١٦٧﴾
انھوں نے کہا اے لوطؑ اگر تو باز نہ آیا، تو تجھے نکال دیا جائے گا۔

قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُم مِّنَ الْقَالِينَ ﴿١٦٨﴾
اس نے کہا میں تمہارے عمل سے بیزار ہوں ۲۴۳۵ع

رَبِّ نَجِّنِي وَأَهْلِي مِمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٦٩﴾
میرے رب مجھے اور میرے اہل کو اس سے نجات دے جو یہ کرتے ہیں۔ ۲۴۳۶ع

فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ﴿١٧٠﴾
سو ہم نے اسے نجات دی اور اس کے اہل کو سب کے سب کو۔

إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ﴿١٧١﴾
مگر ایک بڑھیا ــــ (جو) پیچھے رہ جانے والوں میں سے (تھی) ۲۴۳۷ع

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ ﴿١٧٢﴾
پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا۔

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِم مَّطَرًا ۖ فَسَاءَ مَطَرُ الْمُنذَرِينَ ﴿١٧٣﴾
اور ہم نے اُن پر ایک مینہ برسایا، سو کیا بُرا اُن کا مینہ تھا جو ڈرائے گئے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٧٤﴾
اس میں ایک نشان ہے، اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

ع ۹ ۱۲ ۱۳ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٧٥﴾
اور تیرا رب وہی ہے غالب رحم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَ أَصْحَابُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٧٦﴾
بن کے رہنے والوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٧٧﴾
جب شعیبؑ نے ان سے کہا کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٧٨﴾
میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٧٩﴾
سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میری فرمانبرداری کرو۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٨٠﴾
اور میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر صرف جہانوں کے رب پر ہے۔

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ﴿١٨١﴾
ماپ پورا دیا کرو اور کم دینے والوں میں سے نہ ہو۔

وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ﴿١٨٢﴾
اور ٹھیک ترازو سے تولا کرو۔

مردوں کے پاس جاتے ہو۔ اور اگر من العالمین کو تاتون سے متصل لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تم ایک ایسا طریق اختیار کرتے ہو جو کسی قوم نے نہیں کیا یعنی مردوں کے پاس جاتے ہو۔

ع۲۴۳۵ قالین۔ قِلَی شدت بغض کو کہتے ہیں۔ ما ودّعك ربك وما قلیٰ (الضحیٰ ۹۳-۳) (غ) اور قالی بغض رکھنے والا۔

ع۲۴۳۶ یعنی ان کے اعمال کے بد نتائج سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو محفوظ رکھ۔

ع۲۴۳۷ عجوز سے مراد ان کی بی بی ہے دوسری جگہ ہے الّا امرأتہ (الاعراف ۷-۸۳) اور اہل میں ان کے اہل بیت اور پیرو سب شامل ہیں۔

وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۱۸۳﴾
اور لوگوں کو اُن کی چیزیں کم نہ دو ، اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔

وَ اتَّقُوا الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَ الۡجِبِلَّۃَ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۸۴﴾
اور اس کا تقوٰی کرو جس نے تمھیں اور پہلی مخلوق کو پیدا کیا۔ ۲۴۳۸

قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مِنَ الۡمُسَحَّرِیۡنَ ﴿۱۸۵﴾
انھوں نے کہا تجھ پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے۔

وَ مَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا وَ اِنۡ نَّظُنُّکَ لَمِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۱۸۶﴾
اور تو کچھ نہیں مگر ہماری طرح ایک انسان ہے اور ہم تجھے جھوٹوں میں سے ہی سمجھتے ہیں۔

فَاَسۡقِطۡ عَلَیۡنَا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۱۸۷﴾
سو ہم پر کوئی آسمان کا ٹکڑا گرادے ، اگر تو سچّا ہے۔

قَالَ رَبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۸۸﴾
اس نے کہا میرا رب خوب جانتا ہے جو تم کرتے ہو ۲۴۳۹

فَکَذَّبُوۡہُ فَاَخَذَہُمۡ عَذَابُ یَوۡمِ الظُّلَّۃِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۸۹﴾
سو انھوں نے اسے جھٹلایا پس بادل والے دن کے عذاب نے انھیں آپکڑا وہ بڑے دن کا عذاب تھا۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۹۰﴾
اس میں ایک نشان ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

ع ۱۰ ۱۴ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۹۱﴾
اور تیرا رب وہی غالب رحم کرنے والا ہے۔

وَ اِنَّہٗ لَتَنۡزِیۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۹۲﴾
اور یہ جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا ہُوا ہے۔

نَزَلَ بِہِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ ﴿۱۹۳﴾
جبریل امین اسے لے کر اُترا ہے۔

عَلٰی قَلۡبِکَ لِتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾
تیرے دل پر ، تاکہ تو ڈرانے والوں میں سے ہو ۲۴۴۰

بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۹۵﴾
کھول کر بیان کرنے والی عربی زبان میں ۲۴۴۱

ع ۲۴۳۸ جبلۃ ۔ جَبَلَ اللّٰہُ کے معنی ہیں اللہ نے اسے خاص طبیعت پر پیدا کیا اور اسی سے جِبِلّۃ ہے اور ذو جِبِلّۃ بڑے جسم والے کو کہتے ہیں۔ اور جِبِلّ بہت بڑی جماعت کو کہتے ہیں ولقد اضلّ منکم جبلا کثیرا (یٰسٓ ۳۶ - ۶۲) اور بعض نے جِبِلّ کو جبِلّۃ کی جمع کہا ہے (غ) اور راغب الجبلۃ الاولین کے معنی کرتے ہیں وہ لوگ جو اپنے احوال پر جن پر وہ بنائے گئے مجبول تھے اور ان رستوں پر مجبول تھے جن پر وہ چلائے گئے۔

ع ۲۴۳۹ یعنی جب تمہارے عمل اس حد کو پہنچ جائیں گے جس پر سزا کا آنا ضروری ہے تو سزا بھی آجائے گی۔

ع ۲۴۴۰ دیکھو ع ۱۲۳ اور روح الامین سے مراد جبرائیل ہونے پر ع ۱۱۱ مضمون کو رکوع اوّل کے مضمون کی طرف لوٹایا ہے اور بتایا ہے کہ جس قدر ذکر درمیان میں انبیاء کا ہوا وہ سب مثال کے طور پر اور نبی کریم صلعم کی تسلّی کے لیے ہے اور وہی کام جو ان رسولوں کے ایک ایک کرکے سپرد کیا گیا وہ سب کام آپ کے سپرد کیا گیا۔ جب وہ کامیاب ہوئے تو آپ کیوں کامیاب نہ ہونگے۔

ع ۲۴۴۱ کلام الٰہی الفاظ میں نازل ہوا : یہ لفظ بڑھائے ہیں تاکہ اوّل یہ معلوم ہو کہ رسول اللہ صلعم کے قلب پر قرآن کے نازل کرنے سے یہ مراد نہیں کہ اس کے معانی آپ کے قلب پر نازل ہو گئے تھے بلکہ الفاظ اُترے ہیں اور دوسرے اس میں اشارہ حضرت موسیٰ کی اور دیگر ان پیشگوئیوں کی طرف ہے جن میں ایک نبی کے عرب میں آنے کا ذکر تھا اور یوں اس آیت کا تعلق پچھلی آیات سے بھی ہے اور اگلی آیت سے بھی جس میں یہ ذکر ہے کہ قرآن کریم کی پیشگوئیاں سب پہلے صحیفوں میں تھیں۔

وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٩٦﴾
اور وہ پہلوں کے صحیفوں میں (موجود) ہے ۲۴۴۲ء

أَوَلَمْ يَكُن لَّهُمْ آيَةً أَن يَعْلَمَهُ عُلَمَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿١٩٧﴾
کیا اُن کے لیے یہ نشان نہیں کہ بنی اسرائیل کے عالم اُسے جانتے ہیں ۲۴۴۳ء

وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَىٰ بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ ﴿١٩٨﴾
اور اگر ہم اسے عجمیوں میں سے کسی پر اتارتے

فَقَرَأَهُ عَلَيْهِم مَّا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ ﴿١٩٩﴾
اور وہ اسے اُن پر پڑھتا اس پر کبھی ایمان نہ لاتے ۲۴۴۴ء

كَذَٰلِكَ سَلَكْنَاهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ﴿٢٠٠﴾
اسی طرح ہم نے اسے مجرموں کے دلوں میں داخل کیا ہے۔

لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٢٠١﴾
وہ اس پر ایمان نہیں لاتے، یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں ۲۴۴۵ء

فَيَأْتِيَهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٠٢﴾
سو وہ ان پر اچانک آجائے گا اور انھیں خبر نہ ہو گی۔

فَيَقُولُوا هَلْ نَحْنُ مُنظَرُونَ ﴿٢٠٣﴾
تب کہیں گے، کیا ہمیں مہلت دی جائے گی۔

أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿٢٠٤﴾
تو کیا ہمارے عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں۔

أَفَرَأَيْتَ إِن مَّتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ ﴿٢٠٥﴾
تو کیا تو نے دیکھا اگر ہم انھیں سالوں تک فائدہ اٹھانے دیں۔

ثُمَّ جَاءَهُم مَّا كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿٢٠٦﴾
پھر ان کے پاس وہ آجائے جس کا انھیں وعدہ دیا جاتا ہے۔

مَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يُمَتَّعُونَ ﴿٢٠٧﴾
تو جس سامان سے فائدہ اٹھاتے رہے ان کے کسی کام نہ آئے گا۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنذِرُونَ ﴿٢٠٨﴾
اور ہم نے کوئی بستی ہلاک نہیں کی، مگر اس کے لیے ڈرانے والے تھے۔

ذِكْرَىٰ وَمَا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٢٠٩﴾
یاد دلانے کے لیے، اور ہم ظالم نہیں ہیں۔

۲۴۴۲ء پہلے صحیفوں میں آنحضرتؐ کے متعلق پیشگوئیاں: پہلوں کے صحیفوں میں موجود ہونے سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم اور رسول اللہ صلعم کی پیشگوئیاں پہلی کتابوں میں موجود ہیں (ج) اور یہ خیال کہ صرف بعض صحیفوں میں یہ پیشگوئیاں ہیں صحیح نہیں بلکہ آپ کی پیشگوئیاں تو کل انبیاء نے کیں۔ ہاں جس طرح بعض کے صحیفے ہی دنیا سے نابود ہوگئے، بعض میں سے یہ پیشگوئیاں بھی جاتی رہیں مگر اب تک بھی بالخصوص مجموعہ بائبل ان پیشگوئیوں سے بھرا پڑا ہے۔

۲۴۴۳ء علمائے بنی اسرائیل کا بالخصوص ذکر کیا ہے اس لیے کہ جس قدر پیشگوئیاں بائبل میں ہیں اور کسی کتاب میں نہیں۔ علمائے بنی اسرائیل انہیں جانتے تھے اب بھی جانتے ہیں خواہ ایمان لائیں یا نہ لائیں۔ بعض ان میں سے ایمان بھی لائے جیسے ہمارے نبی کریم صلعم کی زندگی میں عبداللہ بن سلام۔

۲۴۴۴ء عربی میں قرآن کا نزول: اس لیے کہ یہ حکمت الٰہی کے خلاف تھا جس حکمت کے مطابق پیشگوئیوں میں بھی اس کا عربی ہونا ظاہر کیا جا چکا تھا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کا آخری کلام چونکہ ہر قسم کی خوبیوں کو کیا ظاہری اور کیا باطنی اپنے اندر جمع کرنے والا تھا اس لیے اس کے لیے زبان بھی عربی ہی ہو سکتی تھی جو ان خوبیوں کو اپنے اندر جمع کر سکے۔ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے کوئی زبان عربی کو نہیں پہنچتی اور جس قدر اس کے الفاظ میں معانی جمع ہو جاتے ہیں دوسری کوئی زبان اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

۲۴۴۵ء مجرم وہ ہے جس نے جناب الٰہی سے قطع تعلق کر لیا۔ اور حق کے مقابلہ پر کھڑا ہو گیا۔ ایسے شخص کو کوئی دلیل کام نہیں دیتی، اس لیے جو شخص مجرم بنتا ہے اس کے لیے یہی قانون الٰہی ہے کہ سوائے عذاب دیکھنے کے ایمان نہیں لاتا۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾
اور شیطان اسے لیکر نہیں اُترے۔

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾
اور یہ اُن کے مناسب حال نہیں اور نہ وہ کر سکتے ہیں۔

اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾
وہ (وحی الٰہی کے) سننے سے دور کر دیئے گئے ہیں ۲۴۴۶

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾
سو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو نہ پکار، ورنہ تو عذاب پانے والوں میں سے ہوگا۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾
اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا ۲۴۴۷

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾
اور اپنے بازو کو اس کے لیے جھکا، جو مومنوں میں سے تیری پیروی کرتا ہے۔

۲۴۴۶ نبی کریم صلعم کو مفتری کہنے والے بہت ہی کم سیاہ باطن تھے کیونکہ وہ آپ کے حالات سے واقف تھے اور آپ کی راستبازی اور نیکی کا ان میں شہرہ تھا۔ آج بھی یہی حال ہے کہ کروڑوں دشمنوں میں سے سینکڑوں بھی نہیں جو آپ کے حالات کا سرسری علم رکھتے ہوئے بھی آپ کو مفتری کہہ سکیں حتیٰ کہ عیسائی پادری بھی اپنا رویہ بدلتے جارہے ہیں۔ اس وقت بھی آپؐ پر دو ہی بڑے اعتراض تھے اور آج بھی وہی دو ہیں۔ ماھو بقول شاعر قلیلاً ما تؤمنون ولا بقول کاھن (الحاقۃ۔ ۶۹: ۴۱ و ۴۲) آج مہذب عیسائیوں کی نئی سے نئی تصانیف کو اُٹھا کر دیکھو تو بڑا زور اس بات پر ہے کہ جیسے عرب میں کاہن تھے اور کہانت کا رواج تھا جس کی جگہ آج سپر یچولیزم نے لی ہوئی ہے ویسے ہی محمد رسول اللہ صلعم تھے۔ اسی کہانت کے الزام کی تردید ہی ان الفاظ میں ہے وما تنزلت بہ الشیاطین۔ یہ تو دعویٰ ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے مضامین ایسے ہیں کہ نہ ہی یہ کاہنوں کے موزون حال ہے اور نہ ان کی طاقت میں ہے۔ موزون حال تو اس لیے نہیں کہ کہانت کو نیکی اور راستبازی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ عموماً ان لوگوں کی زندگیاں ملوث ہوتی ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں سارا زور نیکی اور راستبازی اور تقویٰ پر دیا گیا ہے اور اسی لیے اس سورت میں بالخصوص جملہ انبیاء کی تعلیم کے اس حصہ پر زور دیا گیا ہے کہ لوگ تقویٰ اختیار کریں اور کہ نبی ان سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور یہ دونوں باتیں وہ ہیں جو کاہن میں نہیں پائی جاتیں۔ کاہن اپنے لیے کہانت کو کمائی کا ذریعہ بھی بناتے ہیں اور وہ تقویٰ نیکی اور راستبازی پر کبھی زور نہیں دیتے کیونکہ اگر وہ ایسا کریں تو ان کے پاس کوئی نہ آئے اور تیسری بات جس پر اس سورت میں زور دیا گیا ہے وہ رسول کا امین ہونا ہے یعنی اس کی پہلی زندگی بھی اعلیٰ درجہ کی راستبازی کی ہوتی ہے صرف کاہن نہیں بلکہ شاعر بھی ان باتوں سے خالی ہوتا ہے وہ طالب اجر ہوتا ہے اور کم سے کم واہ واہ کا خواہاں ہوتا ہے اس کی پہلی زندگی ایسی نہیں ہوتی کہ وہ امین کہلا سکے اشعار کا بھی نیکی اور راستبازی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

عن السمع لمعزولون میں بتایا کہ ناپاک لوگ تو اس پاک کلام کو سُن بھی نہیں سکتے ایک ناپاک قلب پر اس کا نزول کیونکر ہو سکتا ہے یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتوں کو سُن نہیں سکتے نہ استراق کے طور پر نہ کھلے طور پر۔

۲۴۴۷ عشیرۃ کے لیے دیکھو ع ۶۳۰ اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اُتری تو آنحضرت صلعم نے پکارا یا صفیۃ بنت عبد المطلب یا فاطمۃ بنت محمد یا بنی عبد المطلب انی لا املك لکم من اللّٰہ شیئاً (ج) صفیہ آپ کی پھوپھی تھیں اور فاطمہ صاحبزادی تو آپ نے انہیں اور بنی عبد المطلب کو خطاب کرکے فرمایا کہ میں اللہ کی طرف سے تمہارے لیے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔ اور بخاری میں ہے کہ جب یہ آیت اتری تو آنحضرت صلعم صفا پر چڑھ گئے اور بلند آواز سے پکارنا شروع کیا اے بنی فہر، اے بنی عدی اور قریش کے مختلف بطنوں کو پکارتے رہے، یہاں تک کہ سب جمع ہو گئے اور جو شخص خود نہ آ سکا اس نے اپنی طرف سے ایک آدمی بھیج دیا تاکہ وہ دیکھے کہ کیا معاملہ ہے۔ ابولہب بھی آیا اور قریش بھی تو آپ نے فرمایا بتاؤ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ وادی میں ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو تم میری بات کو سچ مان لوگے۔ انہوں نے کہا ہاں! ہمارا ہمیشہ کا تجربہ آپ کے متعلق یہی ہے کہ آپ سچ بولتے ہیں۔ فرمایا تو میں تمہیں ایک سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمہارے سامنے ہے تو ابولہب نے کہا تجھ پر ہمیشہ بربادی ہو کیا اس بات کے لیے تو نے ہمیں اکٹھا کیا تھا۔ یہ ابن عباس کی روایت ہے اور ابوہریرہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے بنی عبد مناف اور عباس اور صفیہ اور فاطمہ کو پکار کر کہا کہ میں اللہ کے سامنے تمہارے کچھ کام نہیں آ سکتا اور یہ بھی بخاری میں ہے۔

اس انذار میں بھی ایک حکمت تھی کیونکہ انسان کے قریبی سب سے بڑھ کر اس کے حال کو جانتے ہیں اس لیے ان کو ڈرانا اور ان میں سے بہت سے لوگوں کا آپ کے ساتھ ہو جانا یہاں تک کہ شعب ابی طالب میں کل بنی ہاشم کا آپ کے ساتھ قید کی سختی کو برداشت کرنا بتاتا ہے کہ جو لوگ آپ سے قریب ترین تعلقات رکھتے تھے وہ سب سے بڑھ کر آپ کی صداقت کے معترف تھے۔

فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٢١٦﴾

سو اگر وہ تیری نافرمانی کریں تو کہہ دے، مَیں اس سے بری ہوں جو تم کرتے ہو۔

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ﴿٢١٧﴾

اور غالب رحم کرنے والے پر بھروسہ رکھ ع۲۴۴۸

الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ﴿٢١٨﴾

جو تجھے دیکھتا ہے، جب تو کھڑا ہوتا ہے۔

وَ تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ ﴿٢١٩﴾

اور سجدہ کرنے والوں میں تیرے پھرتے رہنے کو (دیکھتا ہے) ع۲۴۴۹

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿٢٢٠﴾

کیونکہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّیٰطِیْنُ ﴿٢٢١﴾

کیا مَیں تمھیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اُترتے ہیں؟

تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍ ﴿٢٢٢﴾

وہ ہر جھوٹ بنانے والے گنہگار پر اُترتے ہیں ع۲۴۵۰

یُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿٢٢٣﴾

وہ کان لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں ع۲۴۵۱

وَ الشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿٢٢٤﴾

اور (رہے) شاعر، ان کی پیروی گمراہ کرتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ ﴿٢٢٥﴾

کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ ہر وادی میں سرگردان پھرتے ہیں ع۲۴۵۲

وَ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ ﴿٢٢٦﴾

اور کہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔

ع۲۴۴۸ یہاں انہی دو صفات الٰہی کا اعادہ کیا ہے جو ہر نبی کے ذکر کے آخر میں لائے گئے تھے اور عزیز و رحیم پر توکل میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو غالب بھی کرے گا اور اپنے رحم سے لوگوں کو ایمان کی توفیق بھی دیگا۔ اگر خدا کے کلام پر ایمان ہو تو آج یہی بشارت ہمارے لیے بھی ہے۔

ع۲۴۴۹ تقلب کے لیے دیکھو ع۵۹۴ آنحضرت کے تقلب فی الساجدین کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جب آپ نمازیوں میں امامت کراتے ہیں تو آپ کے مختلف حالات رکوع سجود وغیرہ کو اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے (ج) اور مراد یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح اللہ تعالیٰ کے حضور رکوع اور سجدہ اور قیام میں گڑگڑاتے ہیں وہ انہیں اس حالت میں نہیں چھوڑیگا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ ساجدین سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں (ج) اور مراد یہ ہے کہ جس طرح پہلے انبیاء کے مختلف حالات کو جو انہیں تبلیغ میں پیش آتے تھے دیکھتا تھا اسی طرح آپ کے حالات کو بھی دیکھتا ہے اور آپ کو کامیاب کرے گا اور ابن عباس سے ایک معنی مروی ہیں التنقل فی اصلابھم حتی ولدته امه یعنی نیک لوگوں کی پیٹھوں میں آپ کا منتقل ہوتے رہنا یہاں تک کہ آپ کی ماں نے آپ کو جنا یعنی آپ کے آبا و اجداد ساجدین میں سے تھے اور اس سے آپ کے والد اور والدہ کے مومن ہونے پر استدلال کیا گیا ہے (ر)

ع۲۴۵۰ یہاں بتا دیا کہ شیاطین کا تعلق تو انسان کی زندگی سے ظاہر ہو جاتا ہے جن لوگوں کا شیاطین سے تعلق ہو وہ جھوٹ بولتے اور ہر قسم کے گناہوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کی زندگی کا ایک ایک واقعہ بتاتا ہے کہ آپ کا تعلق سرچشمہ قدوسیت سے تھا۔

ع۲۴۵۱ القائے سمع سے مراد: یلقون السمع یعنی شیطانوں کی طرف کان لگاتے ہیں اور کان لگانے سے مراد یہ ہے کہ ان کی طرف ان کا سخت میلان ہوتا ہے اس لیے وہ شیاطین سے مختلف باتیں سیکھتے رہتے ہیں (ر) اور ایسے لوگوں کی ظاہری علامت یہ بتائی کہ وہ صادق القول نہیں ہوتے بلکہ عام معاملات میں بھی جھوٹ بولتے رہتے ہیں اور فرشتوں سے شیاطین کا باتیں سننا اوپر کی آیت کے صریح خلاف ہے۔

ع۲۴۵۲ یھیمون۔ ھائم وہ ہے جو سخت پیاسا ہو اور اس کی جمع ھِیم ہے فشاربون شرب الھیم (الواقعة ۵۶-۵۵) اور ھُیام پیاس کی بیماری ہے جو اونٹ کو لگ جاتی ہے اور اس کے ساتھ اسے مثال دی جاتی ہے جو سخت عشق میں مبتلا ہو جائے اور فی کل واد یھیمون کے معنی ہیں کہ ہر نوع کے کلام میں پھرتے رہتے ہیں کبھی مدح میں غلو کرتے ہیں کبھی مذمت میں اور ھام کے معنی ہیں وہ زمین میں نکل گیا اور اس کا عشق سخت ہوا اور وہ پیاسا ہوا (غ)

شاعر اور نبی میں ما بہ الامتیاز: ان آیات میں اس دوسرے الزام کا جواب دیا ہے کہ یہ شاعر ہے پہلی بات یہ بتائی ہے کہ جو لوگ شاعروں کے متبع ہوتے ہیں

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۭ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾

مگر وہ جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں اور اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں اور اس کے بعد جو ان پر ظلم کیا گیا بدلہ چاہتے ہیں اور جو ظالم ہیں جان لیں گے کہ کس جگہ لوٹ کر جائیں گے۔

وہ حق سے دور پڑے ہوئے ہوتے ہیں ان کو نیکی اور راستبازی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس کے برخلاف نبی کے پیروؤں میں نیکی سے محبت حق کی خاطر دکھ اور تکلیفیں اٹھانا ایسی باتیں ہیں جو شاعر اور نبی میں کھلا کھلا فرق کر دیتی ہیں اور ایک موٹی عقل کا انسان بھی اس بیّن فرق کو دیکھ سکتا ہے۔ عملاً جو نیکی کی تحریک دنیا میں نبی قائم کرتا ہے وہ ایک ایسا موٹا نشان ہے جو اس کے غیر میں نہیں پایا جاتا کسی محض شاعر نے نیکی کی اس قسم کی تحریک دنیا میں پیدا نہیں کی دوسری بات جو بطور مابہ الامتیاز نبی اور شاعر میں بتائی ہے وہ یہ ہے کہ شاعر لوگ ہر وادی میں گشت لگاتے رہتے ہیں کسی کی مدح پر اُترے تو آسمان زمین کے قلابے ملا دیئے کسی کی بدگوئی شروع کی تو دنیا کے سارے عیب اس میں جمع کر دیئے۔ نبی کی تعلیم ان باتوں سے پاک ہوتی ہے اسے کسی کی مدح و ذم سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے سامنے ایک خاص مقصد ہوتا ہے اور اس کی ساری تعلیم اسی مقصد پر زور دینے کے لیے ہوتی ہے اور اس کی ساری جدوجہد اسی کو حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ تیسری بات کا ذکر اگلی آیت میں ہے شاعر یقولون مالا یفعلون کا مصداق ہوتے ہیں کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔ اس میں اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ خدا کی طرف سے جو لوگ آتے ہیں وہ جو کچھ دوسروں کو کرنے کے لیے کہتے ہیں خود بھی کر کے دکھاتے ہیں وہ نیکی کی تعلیم اگر منہ سے دیتے ہیں تو ان کی اپنی زندگی بھی اس نیکی کا مجسم نمونہ ہوتی ہے۔ ان تین موٹے نشانات کے ہوتے ہوئے ہر ایک شخص نبی اور شاعر میں فرق کر سکتا ہے اول تو وہ ہر قسم کی باتیں کہتے رہتے ہیں۔ شاعر کو صرف نیکی سکھانے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر اگر وہ کوئی اچھی بات کہتے بھی ہیں تو خود اس پر عمل نہیں کرتے۔

اگلی آیت میں مومنوں کو مستثنیٰ کیا ہے۔ یعنی مومن اگر شعر بھی کہے تو وہ ان باتوں کا مصداق نہیں ہوتا بلکہ کسی امر حق کا اظہار اشعار میں کرتا ہے۔
وانتصروا من بعد ما ظلموا میں اشارہ یہ ہے کہ جب انہیں بہت بُرا کہا جاتا ہے تو وہ بھی کبھی مدافعت کے طور پر ظالم کے عیوب کا ذکر اشعار میں کر دیتے ہیں۔ اور یہ ضرورت مسلمانوں کو مدینہ میں پیش آئی۔ حالانکہ یہ سورت مکّی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شعر کہنا منع نہیں اور مومن بھی شاعر ہو سکتا ہے مگر اس کی شاعری عام شاعری کی بیہودگیوں سے پاک ہونی چاہیئے۔

آیاتھا ۹۳ (۲۷) سُوْرَةُ النَّمْلِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتھا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝١ — طور سینا کی وحی پر غور کرو، یہ قرآن اور کھول کر بیان کرنیوالی کتاب کی آیتیں ہیں۔

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝٢ — مومنوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝٣ — جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۝٤ — جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، ہم نے ان کے عملوں کو ان کے لیے اچھا کر کے دکھایا ہے مگر وہ حیران پھر رہے ہیں ع۲۴۵۳

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ — یہی ہیں جن کے لیے برا عذاب ہے اور وہ آخرت میں سب سے

نام: اس سورت کا نام النمل ہے اور اس میں سات رکوع اور ۹۳ آیات ہیں اور اس کا نام نمل اس واقعہ سے لیا گیا ہے جو حضرت سلیمانؑ کے متعلق اس میں بیان ہُوا ہے، یعنی حضرت سلیمانؑ کو اس قدر قوت اور رعب کا دیا جانا کہ قومیں ان کی مخالفت کرنے کی بجائے ان کے سامنے سر جھکانے لگیں اور اس سورت کے اس نام میں یہ اشارہ ہے کہ ایسی ہی شوکت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ملے گی۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں بتایا ہے کہ یہ قرآن منجانب اللہ وحی ہے اور حضرت موسیٰ کی وحی کا ذکر کر کے اور اس کے مخالفوں کا انجام بتا کر اشارہ کیا ہے کہ اس کی مخالفت بھی سرسبز نہ ہوگی۔ دوسرے اور تیسرے رکوع میں حضرت سلیمانؑ کا ذکر ہے جن میں بنی اسرائیل کا سلسلہ اپنی دنیوی شوکت کے کمال کو پہنچا۔ اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ شوکت جو بنی اسرائیل کو اس قدر مدت کے بعد ملی وہ آنحضرت صلعم کو بھی دی جائے گی، چوتھے رکوع میں حضرت صالحؑ اور لوطؑ کا ذکر کر کے آنحضرت صلعم کے مخالفین کو سمجھایا ہے کہ ان پیغمبروں کے مخالفین کی تباہ شدہ بستیوں کو تم بارہا شام کو جاتے ہوئے دیکھ چکے ہو اس سے سبق لو، پانچویں رکوع میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے لیے برگزیدہ کیا ہے وہ اپنے مخالفوں کے ہاتھ سے سلامت رہیں گے اور ملک میں بادشاہ بنائے جائیں گے چھٹے رکوع میں مخالفین کے انکار اور ان کی سزا کا ذکر ہے اور ساتویں میں بتایا ہے کہ بڑے بڑے مخالفین کو سزا دے کر ان کی شرارت کو روک دیا جائے گا اور بالآخر لوگ آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

تعلق: چونکہ ان تینوں سورتوں کے یہاں رکھا جانے پر پچھلی سورت کے شروع میں بحث گزر چکی ہے، اس لیے یہاں مزید تفصیل کی ضرورت نہیں اس قدر بڑھا دینا ضروری ہے کہ سورۃ الشعراء میں فرعون کے حضرت موسیٰ سے مقابلہ پر زور دیا تھا اور اس کی آخری ہلاکت کا ذکر کیا تھا۔ اور وہاں اشارۃً یہ کہا تھا کہ سلطنت و شوکت کی وہ نعمتیں جن سے فرعون کو محروم کیا گیا وہ ہم نے آخرکار بنی اسرائیل کو دیں واورثنٰھا بنی اسرائیل (الشعراء ۲۶-۵۹) اور اب اس سورت میں ان نعمتوں کا مفصل ذکر کیا اور بتایا کہ وہ اپنے کمال کو حضرت سلیمانؑ میں جا کر پہنچیں۔ کیونکہ انبیائے بنی اسرائیل ایک دوسرے کے کام کی تکمیل کرتے تھے اس لیے شوکت بھی سلسلہ اسرائیلی کو فوراً حضرت موسیٰؑ کے ساتھ نہیں ملی بلکہ اس کا کمال حضرت سلیمانؑ کے وقت میں ہوا۔ لیکن رسول اللہ صلعم کے متعلق اسی سورت میں فرمایا کہ ہم آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہ کو بھی بادشاہت عطا فرماویں گے۔ پس مضمون کا تقاضا تھا کہ سورۃ النمل کو سورۃ الشعراء کے بعد رکھا جاتا۔

زمانۂ نزول: زمانہ نزول پر بھی پچھلی سورت میں لکھا جا چکا ہے اس سورت کی آیت ۲۷ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نزول قریب زمانہ ہجرت میں ہُوا۔

ع۲۴۵۳ دوسری جگہ صراحت ہے وزین لھم الشیطان ما کانوا یعملون (الانعام ۶-۴۳) یعنی جو بُرے کام وہ کرتے تھے وہ شیطان انہیں اچھے کر کے دکھاتا تھا۔ ایک ہی کام اللہ تعالیٰ اور شیطان کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ پس یہاں جن اعمال کے اچھا کر کے دکھانے کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے وہ وہ اعمال بد نہیں ہو سکتے جو وہ کر رہے ہیں بلکہ وہ اعمال حسنہ ہیں جو انہیں کرنے چاہئیں اور حسن سے روایت ہے کہ انہوں نے یہاں اعمال سے مراد اعمال حسنہ ہی لیے ہیں (ر) اور وہ بھی ان کے اعمال کہلا سکتے ہیں اس لیے کہ انہیں کرنے کو کہا گیا۔

وَ هُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝۵

بڑھ کر نقصان اٹھانے والے ہیں۔

وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ
حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝۶

اور یقیناً تجھے قرآن حکمت والے علم والے کی طرف سے دیا جاتا ہے۔

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّيْۤ اٰنَسْتُ
نَارًا ؕ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ
بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝۷

جب موسیٰؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا، مَیں نے آگ دیکھی ہے، مَیں اس سے تمھارے پاس خبر لاؤں گا یا تمھارے پاس جلتا ہُوا شعلہ لاؤنگا تاکہ تم سینکو [۲۴۵۴]

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ
فِي النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ
اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۸

سو جب اس کے پاس آیا آواز آئی کہ برکت دیا گیا ہے جو آگ میں ہے اور جو اس کے اِرد گرد ہے اور اللہ جہانوں کا ربّ (سب نقصوں سے) پاک ہے [۲۴۵۵]

يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۹

اے موسیٰؑ میں اللہ غالب حکمت والا ہوں۔

وَ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا
جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى
لَا تَخَفْ ۫ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝۱۰

اور اپنا عصا ڈال دے، سو جب اسے ہلتا ہوا دیکھا گویا وہ چھوٹا سانپ ہے پیٹھ پھیر کر اُلٹا بھاگا اور مڑ کر نہ دیکھا، اے موسیٰ ڈر نہیں، میرے ہاں رسولوں کو کوئی خوف نہیں۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ
سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۱

مگر جو ظلم کرتا ہے پھر بدی کے بعد بدل کر نیکی کرتا ہے تو مَیں بخشنے والا رحم کرنے والا ہوں [۲۴۵۶]

وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ

اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال، بغیر

۲۴۵۴ تصطلون۔ اصطلاء۔ کا مادہ صلی ہے۔ اور صلّٰی یَدَہٗ بالنّار کے معنی ہیں اسے گرم کیا اور اِصْطَلَی کے بھی یہی معنی ہیں (غ) آگ کے دیکھنے پر ۲۰۴۸ میں بحث گزر چکی ہے۔

۲۴۵۵ ابن جریر میں من فی النار و من حولھا میں دو قول لکھے ہیں اوّل یہ کہ من فی النار سے مراد خود اللہ تعالیٰ ہے اور یہ نار گویا اسی کا نور تھی اور من حولھا سے مراد ملائکہ ہیں اور دوسرے یہ کہ من فی النار سے مراد خود نار ہے۔ یعنی یہ آگ بابرکت ہے اور من حولھا سے مراد موسیٰ اور فرشتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ اس آگ کے اندر تھا؟ اس کا جواب تو خود یہیں موجود ہے سبحان اللہ رب العالمین اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے کہ وہ کسی مکان میں ہو۔ پس من فی النار سے مراد یا تو اللہ تعالیٰ کا نور ہے۔ یعنی یہ آگ آگ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا نور اس میں ہے گویا یہ حقیقی طور پر آگ نہ تھی بلکہ کشف کے رنگ میں حضرت موسیٰ کو دکھائی گئی تھی اور یا من فی النار سے مراد موضع نار ہے یعنی جہاں آگ ہے وہ بابرکت مقام ہے اور اس کا ارد گرد بھی۔ اور اسکی تائید میں اُبیؓ کی قرأت ہے تبارکت الارض و من حولھا۔ یعنی یہ مقام اور اس کا ارد گرد بابرکت ہے بلکہ خود قرآن کریم میں دوسری جگہ اسے البقعۃ المبارکۃ (القصص ۲۸۔۳۰) کہہ کر بھی واضح کر دیا ہے اور اس صورت میں اس زمین کو بابرکت اس لحاظ سے کہا کہ وہاں بہت سے انبیا ہونے والے تھے۔

۲۴۵۶ اِلَّا استثنائے منقطع ہے (ر) اوپر فرمایا تھا کہ رسولوں کو خوف نہیں۔ اور یہاں اِلّا من ظلم میں فرمایا کہ خوف تو ظالموں کو ہو سکتا ہے (اور رسول جب ظالم نہیں تو انہیں خوف کیسا) اور ظلم کرنے والے کو بھی خوف اسی صورت میں ہے جب وہ اس ظلم سے باز نہ آئے لیکن جو شخص ظلم کر کے پھر نیکی کرتا ہے اسے بھی کوئی خوف نہیں، اور معنی یہ ہیں ہے کہ اِلّا بعض وقت عاطفہ ہوتا ہے یعنی واؤ کی جگہ اور لکھا ہے کہ اخفش اور فراء اور ابو عبیدہ نے اس کا ذکر کیا ہے اور یہ معنی اس کے یہاں لیے گئے ہیں اور لئلا یکون للناس علیکم حجۃ الا الذین ظلموا (البقرۃ ۲۔۱۵۰) ہیں اور اس صورت میں عاطفہ قرار دیکر یہاں کے نیچے آئے گا یعنی مرسلوں کو خوف نہیں اور نہ ان لوگوں کو جو ظلم کر کے پھر نیکی کا طریق اختیار کریں۔

بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۣفِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۱۲﴾

کسی روگ کے سفید نکلے گا۔ فرعون اور اس کی قوم کی طرف نو نشانوں میں سے ہے وہ نافرمان لوگ ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾ۚ

سو جب اُن کے پاس ہماری بصیرت دینے والی نشانیاں آئیں انھوں نے کہا یہ کھلا جادو ہے۔

وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴﴾ ع ١٤

اور ظلم اور تکبر سے ان کا انکار کیا، حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا، پس دیکھ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہُوا۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾

اور ہم نے داود اور سلیمانؑ کو علم دیا۔ اور انھوں نے کہا سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی ہے۔

وَ وَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا

اور سلیمانؑ داوٗدؑ کا وارث ہُوا، اور کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے ۲۴۵۷ اور ہمیں ہر

۲۴۵۷ منطق۔ نُطق۔ نعارف ہیں الگ الگ آوازیں ہیں جو زبان سے نکلتی ہیں اور انہیں کان محفوظ رکھتے ہیں مالکم لا تنطقون (الصّٰفّٰت ۳۷ - ۹۲) اور نطق صرف انسان کے لیے کہا جاتا ہے اور دوسرے کے لیے بطور مجاز بولا جا سکتا ہے اور منطقیوں کے نزدیک نُطق قوت گویائی کو بھی کہتے ہیں۔ اور ناطق اسے بھی کہا جاتا ہے جو کسی چیز پر دلالت کرے اور ما ھٰؤلاء ینطقون (الانبیاء ۲۱ - ۶۵) میں اشارہ ہے کہ وہ ناطق ذوی العقول کی جنس سے نہیں اور انطقنا اللہ الذی انطق کل شیٔ (حٰم السجدۃ ۴۱ - ۲۱) میں مراد اعتبار یعنی دلالت ہی ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ہر ایک شے کا گویا ہونا بلحاظ دلالت ہی ہے اور علمنا منطق الطیر میں پرندوں کی آوازوں کو نطق سلیمان کے لحاظ سے کہا ہے کیونکہ وہ انہیں سمجھتے تھے پس جو کوئی کسی چیز سے کچھ سمجھ لیتا ہے وہ اس کے لحاظ سے ناطق ہو جاتی ہے گو وہ صامت ہو اور جو نہیں سمجھتا اس کے لحاظ سے وہ صامت ہوتی ہے گو وہ ناطق ہو اور ھٰذا کتابنا ینطق علیکم بالحق (الجاثیۃ ۴۵ - ۲۹) میں کہا گیا ہے کہ کتاب ناطق ہو گی لیکن اس کے نطق کو آنکھ پائے گی (یعنی انسان کا اس کو پڑھنا گویا کتاب کا نطق ہے) (غ) اور کِتابٌ ناطقٌ سے مراد واضح کتاب ہے گویا کہ وہ کلام کرتی ہے (ل)

سلیمان کے وارث داؤد ہونے سے مراد بادشاہت اور نبوت میں وارث ہونا ہے اور مال کی وارثت مراد نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو سلیمان کو حضرت داؤد کی ساری اولاد میں سے مخصوص نہ کیا جاتا۔ اور انبیاء کا مال بطور ورثہ نہیں لیا جاتا جیسا کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا ہے نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکناہ صدقۃ ہم انبیاء کے گروہ سے ورثہ نہیں لیا جاتا جو کچھ ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے (ث) اور یہ ظاہر ہے۔

حضرت سلیمان کے علم منطق الطیر سے مراد: یہاں حضرت سلیمان کہتے ہیں علمنا منطق الطیر۔ یعنی ہمیں پرندوں کی منطق یا بولی سکھائی گئی ہے۔ مفسرین نے اس پر زیادتی کر کے بعض نے تمام حیوانات کو اور بعض نے درختوں اور نباتات کو بھی شامل کیا ہے گویا حضرت سلیمان تمام جانوروں کی اور درختوں اور نباتات کی بولیاں بھی سمجھتے تھے جس کے لیے نہ قرآن شریف میں کوئی سند ہے نہ حدیث صحیح میں۔ رہا یہ کہ منطق طیر کے سکھائے جانے سے کیا مراد ہے۔ سو پہلی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ یہاں حضرت سلیمان علمنا کہتے ہیں علمت نہیں کہتے۔ یعنی صرف اپنی ذات کی طرف منسوب نہیں کرتے پس علمنا سے یا تو مراد یہ ہے کہ ساری قوم کو منطق طیر سکھایا گیا اور یا کم سے کم یہ قول بادشاہت کی حیثیت میں کہا ہے یعنی گو کہنے والے حضرت سلیمان ہیں مگر اس میں قوم شامل ہے۔ جس طرح اوتینا من کل شیٔ سے مراد کل قوم ہے۔ پس جس طرح بادشاہت کے سامانوں کے دیئے جانے سے کل قوم کا فائدہ اٹھانا ہے اسی طرح منطق الطیر کے سکھایا جانے سے بھی مراد کل قوم کو سکھانا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ پرندوں کی منطق سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ پرند بھی انسانوں کی طرح سب علوم سے واقف ہیں اور صرف ان کی بولی مختلف ہے جس طرح مثلاً ایک انگریز ایک ہندوستانی کی بولی کو سمجھ سکتا ہے اور ایک ہندوستانی ایک انگریز کی بولی کو۔ اس طرح کی بولی پرندوں کی نہیں بلاشبہ جب ایک مرغی اپنے بچوں کو دانہ دینے کے لیے بُلاتی ہے تو اس کی اور آواز ہوتی ہے اور جب کسی چیز کا خوف ہوتا ہے تو اس کی اور آواز ہوتی ہے

مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۖ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ ﴿١٦﴾

ایک چیز دی گئی ہے، یہ صریح فضل ہے۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿١٧﴾

اور سلیمانؑ کے لیے اس کے لشکر جنوں اور انسانوں اور پرندوں سے اکٹھے کیے گئے اور انھیں روکا جاتا تھا ۲۴۵۸

مگر یہ اختلاف آواز جو پرندوں میں پایا جاتا ہے صرف دو چار باتوں تک محدود ہوتا ہے اور ان آوازوں میں ہر ایک وہ شخص فرق کر سکتا ہے جسے ان پرندوں کو بار بار دیکھنے کا موقعہ ملا ہو، لیکن یہ نہیں ہوتا کہ مرغی بعض وقت اپنے بچوں کو لیکچر دیتی ہو کہ تم اپنی صحت کے تحفظ کے لیے فلاں قسم کی غذا کھاؤ فلاں نہ کھاؤ فلاں قسم کے جانور سے اپنے آپ کو بچاؤ، فلاں سے نہ بچاؤ۔ اور نہ ہی اس خیال کے نیچے کوئی حقیقت ہے کہ جانوروں کو غیب کا علم ہوتا ہے اور انسان کو تو معلوم نہیں کہ کل کیا ہو گا مگر ایک گدھے کو علم ہوتا ہے اس لیے ایک انسان جب گدھے کی بولی سمجھنے لگ جائے تو اس کو پتہ لگ جاتا ہے کہ کل اس کو یہ مصیبت پیش آنے والی ہے اور فلاں بات سے اس کو نفع حاصل ہو سکتا ہے یہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ منطق الطیر کے علم سے اکثر لوگوں کے خیال میں اسی قسم کی باتیں ہیں۔ علم غیب تو اللہ تعالیٰ ہر انسان کو بھی نہیں دیتا جسے اس نے خلیفہ بنایا جسے کل مخلوق پر حکمران کیا فلا یظھر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول۔ پرندوں اور حیوانات کو علم غیب کا ملنا خلاف عقل ہی نہیں بلکہ سارے اصول دین کو باطل کرتا ہے اور خلاف نص قرآنی ہے اور تفسیروں میں جو ایسے اقوال ہیں کہ حضرت سلیمان ایک فاختہ پر گزرے تو آپ نے فرمایا کہ یہ کہہ رہی ہے لیت ذا الخلق لم یخلقوا کاش یہ مخلوق پیدا نہ ہوئی ہوتی۔ اور طاؤس بولا تو کہا یہ کہہ رہا ہے کما تدین تدان جس طرح تو معاملہ کرے گا اسی طرح تجھ سے کیا جائے گا۔ اور ہدہد کہہ رہی تھی استغفروا اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ سے حفاظت چاہو۔ اور کوئی جانور کہہ رہا تھا من سکت سلم وغیرہ تو یہ سب ہی بے بنیاد باتیں ہیں۔ یوں تو جانوروں کی بولیوں سے لوگوں نے سارا قرآن بھی بنا لیا ہے مگر سوال یہ ہے کہ یہ باتیں حضرت سلیمان کو اللہ تعالیٰ نے بتائیں حالانکہ علم بھی دیا فہم بھی دیا، نبوت بھی دی اور جانوروں سے ان حقائق کا پتہ لگا۔ یہ کیسی کچی بات ہے۔ ہاں یہ جانور خدا کی تسبیح کرتے ہیں ولٰکن لا تفقھون تسبیحھم (بنی اسرائیل[17]۔۴۴) ارشاد خداوندی ہے انسان ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتا۔ ہر چیز اپنے رنگ میں تسبیح کرتی ہے اور قرآن کریم کے بیان سے ظاہر ہے کہ منطق الطیر کوئی سلطنت کے سامانوں میں سے ہے، جس کو اوتینا من کل شیئ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے یعنی پہلے فرمایا کہ ہمیں منطق الطیر دیا گیا ہے جو سلطنت کے سامانوں میں سے ایک ہے پھر فرمایا سبھی قسم کے سامان دیئے گئے ہیں یہی مراد اوتینا من کل شیئ سے ہے جیسا کہ آگے ملکہ سبا کے بیان میں اوتیت من کل شیئ (۲۳) ہے بہرحال یہ کوئی عظیم الشان نعمت ہے جس کا یہاں ذکر ہے جیسا کہ ان ھٰذا لھو الفضل المبین سے بھی ظاہر ہے اور اگلی آیت میں پرندوں کو فوجوں کا حصہ قرار دے کر یہ صاف بھی کر دیا گیا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ کبھی چڑیا کی چوں چوں کو سننے بیٹھ جاتے تھے اور کبھی کوّے کی کائیں کائیں کو۔ لفظ منطق کی لغوی تشریح سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد کسی چیز کی حالت سے فہم کا حاصل ہونا بھی ہے جیسے کتاب ناطق سے مراد بولنے والی کتاب نہیں بلکہ بیّن کتاب ہے جس کے پڑھنے سے مطلب واضح ہو جاتا ہے اور یہ بھی دکھایا جا چکا ہے کہ اصل معنی کے لحاظ سے منطق کا لفظ صرف انسان پر بولا جا سکتا ہے اور چونکہ یہاں منطق الطیر کا تعلق سلطنت کے سامانوں سے ہے اور سلطنت کے سامانوں میں بالخصوص قدیم زمانہ میں سب سے بڑا کام جو پرندوں سے لیا جاتا تھا وہ نامہ بری کا کام تھا۔ تو مجازاً وہ نامہ جو پرند ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتا ہے منطق الطیر ہی کہلائے گا اگر نامہ بری مراد نہ ہوتی تو طیر کے نطق کا بالخصوص کیوں ذکر ہوتا دوسرے جانوروں کا ذکر کیوں نہ ہوتا۔ پس سیاق اور لغت دونوں اسی معنی کو چاہتے ہیں فی الواقع پرندوں کی آوازوں کے نیچے کوئی ایسا مفہوم نہیں ہوتا جس طرح انسان ایک بولی بولتا ہے اور بعض خاص قواعد کے لحاظ سے جس کو زبان کی صرف و نحو کہا جاتا ہے اور الفاظ کے خاص مفہوم کے لحاظ سے جسے لغت کہا جاتا ہے وہ آوازیں نکالتے ہیں۔

ع۲۴۵۸ یوزعون۔ وَزْع نفس کو ہوا و حرص سے روکنا ہے۔ پھر مطلق روکنا۔ اور لشکر میں وازع وہ شخص ہوتا ہے جو صفوں میں سے آگے پیچھے ہونے والے کو روکے اور یہاں یوزعون کے معنی ہیں کہ ان کے پہلے ان کے پچھلوں پر روکے جاتے ہیں اور یا یہ کہ انہیں باز رکھا جاتا تھا۔ اور حدیث حسن میں وزعۃ کے معنی ہیں وہ لوگ جو دوسروں کو تعدی اور فساد اور شر سے روکیں اور اُوزِعْ کے معنی ہیں اُلھِمْ اور رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علی (۱۹) میں الھمنی مراد ہے یعنی مجھے ایسا الہام کر دے) وَزَعْتُہ عن کذا میں نے اسے اس چیز سے روک دیا اور یہاں یوزعون میں اشارہ ہے کہ وہ باوجود اپنی کثرت اور تفاوت کے بے ترتیب اور ایک دوسرے سے الگ پڑے ہوئے نہ تھے بلکہ حکم اور ضبط کے ماتحت تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد اس سے پہلوں کا پچھلوں کی خاطر روک دینا ہے اور یوم یحشر اعداء اللہ الی النار فھم یوزعون (حٰم السجدۃ[41] - ۱۹) میں عقوبت کے طور پر روکنا ہے جیسا کہ فرمایا ولھم مقامع من حدید (الحج[22] - ۲۱) اور اوزع اللہ فلانا کے معنی ہیں اسے الہام کیا۔ اور اوزعنی ان اشکر میں اصل مراد یہ ہے کہ مجھے ایسا بنا کہ اپنے نفس کو کفران سے روکوں (غ)

حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾	یہاں تک کہ جب وادی نمل میں آئے ایک نملہ نے کہا، اے نملو اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ، سلیمانؑ اور اس کے لشکر تمھیں کچل نہ ڈالیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو۲۴۵۹

حضرت سلیمان کا افواج کو زیادتی سے روکنا: یہاں لشکروں کا جمع ہونا صاف بتاتا ہے کہ کسی بھاری جنگ کی تیاری ہے اور فھم یوزعون سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ منزل بمنزل چلتے تھے۔ چنانچہ ابن جریر میں ایک قول ہے یساقون اور منزل بمنزل چلنے میں روکنے کے معنی پائے جاتے ہیں اور غالباً یرد اولھم علی اٰخرھم کے یہی معنی ہیں جو اکثر مفسرین نے قبول کیے ہیں۔ لیکن اگلی آیت کے مضمون کے لحاظ سے اور لفظ وزع کے اصل معنی کے لحاظ سے یہ معنی بہتر معلوم ہوتے ہیں کہ ان لشکروں کو فساد یا ناحق لوگوں کا مال لینے سے روکا جاتا تھا۔ اور یہی مراد امام راغب کی ان کے ضبط کے نیچے ہونے سے معلوم ہوتی ہے۔ یعنی ان میں ایسا ضبط تھا کہ وہ لوگوں پر لوٹ مار کرنے نہ جاتے تھے۔ گویا بتایا ہے کہ جنگ کے وقت افواج کو عام لوگوں پر زیادتی کرنے سے روکنا چاہیے۔

حضرت سلیمان کے لشکر میں پرندوں کا کام: سلیمان کے لشکروں کو تین قسم کہا گیا ہے۔ جن۔ انس۔ طیر۔ طیر سے مراد تو وہی معلوم ہوتا ہے جو پچھلے نوٹ میں ذکر ہوا یعنی پرندے سے جو نامہ بری کا کام دیتے تھے ایک بڑے لشکر کی یہ ایسی ہی سخت ضرورت تھی جیسے آج بے تار خبر رسانی کی ورنہ یہ ایک بے معنی بات ہے کہ ساری دنیا کے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ حضرت سلیمان کی فوجوں میں شامل ہوں اور کوے اور چڑیا اور فاختہ اور طوطے سب دنیا سے اکٹھے ہو کر وہاں پہنچ گئے ہوں اس دقت کی وجہ سے مفسرین نے یوں کہا ہے کہ ہر قسم کا ایک ایک پرندہ آگیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی لشکر کا کوئی حصہ نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم نے انہیں لشکر کا ضروری حصہ قرار دیکر صاف بتا دیا ہے کہ مراد اس سے صرف نامہ بر پرند ہوسکتے ہیں۔ مفسرین نے پرندوں کی دو غرضیں بتائی ہیں ایک یہی نامہ بری دوسرے سورج سے سایہ کرنا (ر) یعنی جب دربار لگتا تھا تو ہر ایک قسم کے پرندے اوپر آکر سایہ کرتے تھے یہ دوسری بے معنی بات ہے پرندوں کا سایہ کیا ہوگا کوئی چھوٹا کوئی بڑا۔ اور بارش آتی تھی تو پھر کیا کرتے تھے اور کیا ان کے پاس خیمے نہ تھے وہ تو فرماتے ہیں واوتینا من کل شیء۔

جنوں کے لشکر کا کام: دوسرا سوال یہ ہے کہ جنوں کے لشکر سے کیا مراد ہے۔ اس کو بھی قرآن کریم نے خود صاف کر دیا ہے..... یعملون لہ مایشاء من محاریب وتماثیل وجفان کالجواب وقدور راسیٰت (السبا ۳۴-۱۳) گویا حضرت سلیمان کے بڑے بڑے صناعی کے کام یہ لوگ کرتے تھے۔ اور چونکہ یہ غیر اسرائیل اور پہاڑی اقوام کے لوگ تھے اس لیے انہیں جن کہا ہے اور لشکر میں ایسے کاریگروں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

۲۴۵۹ وادالنمل۔ وادی النمل بین جبرین وعسقلان (رت) وادالنمل جبرین اور عسقلان کے درمیان ہے اور قتادہ اور مقاتل سے مروی ہے کہ وہ ارض شام میں ہے کعب کا قول ہے کہ وہ طائف میں ہے اور بعض کا قول ہے کہ وہ نواح یمن میں ہے اور وہ عرب کے نزدیک ایک مشہور جگہ ہے جس کا ذکر ان کے اشعار میں آتا ہے (ر) اس سے معلوم ہوا کہ وادی النمل کے معنی چیونٹیوں کی وادی نہیں، نہ چیونٹیاں کسی خاص وادی میں رہا کرتی ہیں، بلکہ یہ ایک وادی کا نام ہے اور میرے نزدیک ترجیح اسی قول کو ہے کہ وہ نواح یمن میں ہے کیونکہ بظاہر ملکہ سبا پر حضرت سلیمان کی یہ چڑھائی تھی۔

نملۃ۔ نمل چیونٹیوں کو کہتے ہیں جس کا واحد نملۃ ہے مگر یہ کسی قوم کا نام بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ نہ صرف وادی النمل سے ظاہر ہے جو کسی قوم کے نام پر ہی ہوسکتی ہے بلکہ قاموس میں ہے الابرقۃ من میاہ نملۃ یعنی ابرقہ نملہ کے پانیوں سے ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نملہ قوم کا نام ہے جس کے پانیوں کا یہاں ذکر ہے اور عربی میں اسی طرح پر قوموں کے نام آتے ہیں مثلاً ذر چیونٹی کے انڈوں کو بھی کہتے ہیں اور ایک قوم کا نام بھی ہے۔ اور ابن عساکر نے حسن سے روایت کی ہے کہ اس نملہ کا نام حرس تھا اور وہ قبیلہ بنو الشیصان سے تھی (رت) اور نام اور قبیلے انسانوں کے ہوا کرتے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ اور چیونٹی: جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے، ہوسکتا ہے کہ حضرت سلیمان کا گزر چیونٹیوں پر ہی ہوا ہو۔ اور چیونٹی کا کہنا کہ اے چیونٹیو اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ زبان سے نہیں بلکہ حالت سے ہوگا کیونکہ قول کا لفظ اس طرح آجاتا ہے دیکھو ۴۵ع اور چیونٹیوں کو لغت عربی سے واقفیت نہیں نہ وہ زبان کے قواعد سے واقف ہیں کہ اس طرح پر کلام کریں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان کا فعل تھا کہ وہ انسانوں کی آہٹ پا کر اپنے سوراخوں میں گھس گئیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ ایک جنگل میں رہنے والی چیونٹیاں جنھوں نے سلیمان کو کبھی دیکھا نہیں انہیں یہ علم ہوگیا ہو کہ یہ حضرت سلیمانؑ ہیں۔ انسان کو تو بغیر بتانے کے پتہ نہیں لگ سکتا کہ حضرت سلیمان کون ہیں اور چیونٹی نے جھٹ پہچان لیا اور پھر ایک چیونٹی کو جس کی نظر چند گز سے آگے نہیں جاسکتی حضرت سلیمان کے بیشمار لشکر بھی نظر آگئے یا یہ کہنا پڑے گا کہ اس خاص چیونٹی کو اللہ تعالیٰ نے وحی کر دی، لیکن اللہ تعالیٰ کی ہمکلامی اس رنگ میں بشر سے مخصوص ہے اور دوسرے جانداروں کو جو وحی ہوتی ہے وہ اور رنگ کی ہے جیسے واوحی ربک الی النحل میں۔ اور ایک قول ہے کہ حضرت سلیمان نے کوئی آواز نہیں سنی بلکہ اللہ تعالیٰ نے الہاماً آپ کو اطلاع دی ہے اور ایک قول ہے کہ چیونٹی کا اپنے سوراخ کا رُخ کرنا ہی گویا اپنی حالت سے یہ کہنا تھا (ر) اور یہ خیال بھی کہ یہ منطق الطیر کے علم کی مثال ہے صحیح نہیں اس لیے کہ چیونٹی کو طیر نہیں کہا جاتا۔ گو بعض چیونٹیوں کے پر بھی نکل آتے ہوں پھر یہ کوئی مفید کلام نہیں جس سے حضرت سلیمانؑ کو کچھ علم حاصل ہوا ہو اور سب سے بڑھ کر یہ دقت ہے کہ کیا حضرت سلیمان کے اتنے بیشمار لشکر اتنے لمبے سفر میں بغیر کسی چیونٹی کو پاؤں کے نیچے مسلنے کے چلے جا رہے تھے۔ یہ

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

تو اس کی بات پر خوش ہوتا ہوا مسکرایا اور کہا، اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ تیری نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر انعام کیا اور کہ میں اچھے عمل کروں جن سے تو راضی ہو اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں داخل فرما ۲۴۶۰

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور پرندوں کو طلب کیا تو کہا، کیا بات ہے میں ہُدہُد کو نہیں دیکھتا، کیا وہ غیر حاضر ہے ۲۴۶۱

ناممکن محض ہے۔ پھر ایک چیونٹی کا کلام سُنا اور جو کروڑوں رستہ میں مرگئی ہونگی وہ کیوں نہ بولیں۔ ان مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے معنے زیادہ قرین قیاس ہیں کہ یہ کوئی قوم تھی جن کو علم ہوا کہ حضرت سلیمان اپنی افواج کے ساتھ آرہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ ہم خواہ مخواہ مخالف سمجھ کر مارے جائیں اور گھروں میں داخل ہوجانا اس بات کا نشان ہے کہ ان کا ارادہ مقابلہ کا نہیں بلکہ فرمانبرداری کا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسبات کو سُن کر حضرت سلیمانؑ خوش بھی ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر بھی کیا کہ لوگ آپ کی فرمانبرداری اختیار کررہے ہیں ورنہ چند چیونٹیوں کا اپنے سوراخوں میں گھس جانا کونسا شکر نعمت کا موقعہ تھا جب ہزاروں چیونٹیاں اور لاکھوں کیڑے مکوڑے روزانہ اتنے بڑے لشکر کے پاؤں کے نیچے مسلے جاتے ہونگے۔ ھم لا یشعرون یعنی وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ یہ قوم ہماری دشمن نہیں کیونکہ یہ وادی نواح یمن میں تھی اور ملکۂ سبا پر یہ چڑھائی تھی۔ پس یہ قرین قیاس تھا کہ اردگرد کی قوموں کو بھی دشمن سمجھا جاتا۔ چنانچہ کعب احبار سے روایت ہے کہ حضرت سلیمان یمن کے ارادہ سے بیت المقدس سے روانہ ہوئے اور مدینہ اور مکہ پر سے گزرے اور چلتے گئے یہاں تک کہ آپ وادی النمل میں پہنچے (ر) اور اس میں اشارہ یہ ہے کہ جس طرح حضرت سلیمان کے رُعب کے سامنے قومیں سر جھکاتی تھیں اسی طرح نبی کریمؐ کو بھی رُعب دیا جائے گا بلکہ آپ کا رعب اس سے بدرجہا زیادہ ہوا جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے نصرت بالرعب مسیرۃ شھر میری مدد ایسے رعب سے کی گئی ہے جو ایک مہینہ کی مسافت پر اثر کرتا ہے اور سلسلہ موسوی میں اس قدر زمانہ اس رعب اور حکومت کے ملنے میں لگا کیونکہ وہ سب انبیاء ایک دوسرے کے کام کی تکمیل کرنے والے تھے مگر اسلام کی تاریخ میں وہ شوکت ورعب نبی کریم صلعم سے ہی شروع ہوا اس لیے کہ یہاں آپ کے بعد اور کوئی نبی نہ آنے والا تھا جو آپ کے کام کی تکمیل کرتا جس طرح تکمیل دین آپ کے ساتھ کردی گئی، اسی طرح اتمام نعمت بھی آپ کے ساتھ ہی کردیا گیا اور کوئی حالت منتظرہ اس کے لیے باقی نہ چھوڑی گئی۔

۲۴۶۰ تبسم۔ بَسَمَ اور تَبَسَّم کے معنی ہیں مسکرایا (ل) اور ضاحك سے مراد یہاں خوش ہونیوالا ہے (غ) ۱۴۸۲۔

نمل کی اطاعت پر شکر گزاری: قولہا۔ ضمیر بلحاظ لفظ نملۃ ہے یا مراد وہ قوم ہے حضرت سلیمان کو یہ خبر پہنچی تو وہ خوش ہوئے اور اس نعمت پر شکر الٰہی کیا کہ ان کے ہاتھ سے بے فائدہ خونریزی نہیں ہوئی۔ اور محض ان کی افواج اور سامان کو دیکھ کر قومیں اطاعت اختیار کرتی چلی جاتی ہیں اسی لیے عمل صالح کی توفیق بھی مانگی کہ ایسا نہ ہو توسیع حکومت کے خیال میں کوئی عمل خلاف رضائے الٰہی ہوجائے۔ اس میں یہ بھی دکھایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کا اصل مقصد باوجود حکومت کے خرخشوں اور فوج کشی کی ضروریات کے رضائے الٰہی کا حصول ہی رہتا ہے نہ کچھ اور۔ ان میں ملک گیری کی ہوس کوئی نہیں ہوتی اور اصل غرض تو یہ بتانا ہے کہ ایسے ہی واقعات محمد رسول اللہ صلعم کو بھی پیش آنے والے ہیں اور سوائے سخت ضرورت کے آپ کے ہاتھ سے خونریزی نہ ہوگی۔

۲۴۶۱ تفقد۔ فَقْد۔ وجود کے بعد کسی چیز کا عدم ہے یعنی کسی چیز کا گم ہوجانا۔ پس وہ عدم سے خاص تر ہے ماذا تفقدون قالوا نفقد صواع الملك (یوسف ۱۲۔ ۷۱ و ۷۲) اور تفقد کے معنی تعھّد ہیں لیکن اس کی اصل حقیقت کسی چیز کے گم ہوجانے کو پہچاننا ہے (غ) اور تَفَقُّد اس چیز کا طلب کرنا ہے جو غائب ہو (ل)

حضرت سلیمانؑ اور ہد ہد: مفسرین کہتے ہیں کہ پرند حضرت سلیمان پر سایہ کیا کرتے تھے تو کیا حضرت سلیمان دیکھا کرتے تھے کہ ہر ایک پرند سایہ کرنے کے لیے آگیا ہے اس مشکل کی خاطر یہ کہانی بنائی گئی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو پانی کی ضرورت پیش آئی تو لوگوں نے کہا پانی کا پتہ جنّ بتا سکتے ہیں۔ جنّوں نے کہا پرند بتا سکتے ہیں، پرندوں نے کہا ہدہد بتا سکتا ہے، تب معلوم ہوا کہ ہدہد غائب ہے (ج) اور کہا جاتا ہے کہ ہدہد زمین کے نیچے پانی دیکھ لیا کرتا تھا اور جہاں پانی ہوتا وہاں سے زمین کریدتا، تب پانی وہاں سے نکال لیا جاتا سوال یہ ہے کہ اب کیوں ہدہد کو زمین کے نیچے پانی نظر نہیں آتا اور اگر یہ حضرت سلیمانؑ کا معجزہ تھا تو اتنا بڑا معجزہ دیکر پھر پرند کا محتاج ہی رکھا، اب جب تک ہدہد نہ آئے سب لشکر پیاسا مرے۔ یہ ساری مشکلات اس بات کا نتیجہ ہیں کہ ہدہد سے مراد یہاں پرند ہدہد لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا جو کچھ ذکر یہاں ہے وہ صاف بتاتا ہے کہ وہ انسان تھا، چنانچہ اس کا یہ کہنا کہ میں سبا سے یقینی خبر لایا ہوں اور ان لوگوں پر ایک عورت حاکم ہے اور اس کے پاس سب قسم کے سامان ہیں اور کہ وہ قوم سورج کی پرستار ہے پھر اس کا وعظ کرنا یہ باتیں پرند کی نہیں انسان

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۱﴾ — مَیں اُسے سخت سزا دوں گا یا اُسے قتل کر دوں گا، یا میرے پاس کوئی کھلی دلیل لائے ۲۴۶۲

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾ — سو بہت دیر نہ ٹھیرا (اور آیا) تو کہا مَیں نے ایک ایسی خبر معلوم کی جس کا تجھے علم نہیں اور مَیں سبا سے تیرے پاس یقینی خبر لایا ہوں ۲۴۶۳

اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ — میں نے ایک عورت کو اُن پر بادشاہی کرتے پایا اور اسے ہر چیز دی گئی ہے اور اُس کا ایک بڑا تخت ہے ۲۴۶۴

کے موزون حال ہیں۔ یہ تمام باتیں علم سے تعلق رکھتی ہیں جو انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے نہ پرندوں کے لیے۔ اگر پرندوں میں بھی اس قسم کا شعور ہوتا کہ ایسا علم وہ حاصل کرسکتے تو وہ بھی انسانوں کی طرح مکلف ہوتے اور ان کی طرف بھی نبی مبعوث ہوتے اور اگر کہا جائے کہ یہ حضرت سلیمان کا معجزہ تھا کہ ان کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی حالتوں کو تبدیل کر دیا تھا اور پرندوں کو انسانوں والے حواس اور انسانی والا علم دے دیا تھا۔ تو یہ لاتبدیل لخلق اللہ کے خلاف ہے۔ اور پھر اس قسم کے کلام کرنے کے لیے ان کو زبان بھی انسانوں والی دی گئی ہوگی اور ظاہر ہے کہ انسان زبان کا علم دوسروں سے حاصل کرتے ہیں ان پرندوں کا معلم کون تھا۔ یہ سب کچی باتیں ہیں۔ طیر وہی نامہ بر پرند ہیں ھد ھد کسی شخص کا نام ہے جو اس محکمہ خبر رسانی سے تعلق رکھتا ہے اور جس کی موجودگی جائزہ کے وقت ضروری تھی۔ کیونکہ پرندوں سے خبر رسانی کا ہی کام لیا جاتا تھا تو حضرت سلیمان نے جب پرندوں کو طلب کیا تاکہ سب سامانوں کی حالت سے واقفیت حاصل کریں تو افسر محکمہ کو غائب پایا تو فرمایا ہدہد کہاں ہے اور پرندوں اور جانوروں کے ناموں پر انسانوں کے نام عام طور پر رکھے جاتے ہیں فاکس (لومڑ) اور ولف (بھیڑیا) وغیرہ آج مہذب قومیں بھی اپنے نام رکھتی ہیں اور ہندوؤں میں طوطا رام اور مسلمانوں میں شیر اور باز بلکہ شیر باز عام نام ہیں عرب میں بھی ایسے نام رکھ لیے جاتے تھے جیسے اسد وغیرہ اور بائبل میں اسلاطین بیسویں باب میں ایک شخص بن ہدد کا ذکر ہے اور ہدد ہدہد سے ملتا جلتا نام ہے اور بلقیس کے باپ کا نام ہدہاد لکھا ہے (منتہی الارب) اور لسان العرب میں ہے کہ ھُدھُد کو ھدا ھد بھی لکھا جاتا ہے۔ اور پھر لکھا ہے کہ ھدا ھد اور ھد ہد یمن کے قبیلے کا نام ہے (ل) تو یہ کونسی عجیب بات ہے کہ سلیمان کے کسی افسر کا نام ہدہد ہو۔ اور جئتک من سبا بنبا یقین صاف بتاتا ہے کہ یہ محکمہ خبر رسانی کا افسر تھا جو خود سبا سے یقینی خبر لیکر پہنچ گیا ہے ورنہ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک طرف کہا جائے کہ پرند حضرت سلیمان کے مسخر تھے دوسری طرف یہ مانا جائے کہ ایک پرند حضرت سلیمان کے علم کے بغیر اُڑ بھی گیا۔ بھلا حضرت سلیمان کا یہ فرمانا کہ میں اسے سخت سزا دونگا، پرند کی صورت میں بے معنی نہیں ٹھہرتا، کیونکہ جو بن پوچھے اُڑ گیا ہے وہ واپس کیوں آئے گا اور یہ جو فرمایا میں اسے نہیں دیکھتا یا کیا وہ غیر حاضر ہے تو مراد یہ ہے کہ کہیں میری نظر سے ہی اوجھل ہے یا سچ مچ غیر حاضر ہی ہے۔

۲۴۶۲ مفسرین کہتے ہیں عذاب شدید سے مراد تھا پر نوچ دینا۔ مگر ایک پرند پر ایک عظیم الشان بادشاہ کی اتنی خفگی اور اس کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال کہ اسے سخت سزا دی جائے گی یا اسے قتل کر دیا جائے گا یا وہ کوئی واضح دلیل پیش کرے انسان کی سمجھ سے باہر بات ہے پرند اور واضح دلیل؟ اور دلیل طلب کرنے والے سلیمان بادشاہ اور پھر بیچارہ ہدہدوں میں سے ایک وہی ہدہد حضرت سلیمان کا محکوم تھا یا سارے ہدہد تھے۔ صرف اکیلے کا مسخر ہونا بے معنی ہے اگر سارے ہدہد مسخر تھے تو پانی نکالنے کے لیے ایک ہدہد نہ سہی دوسرے کو بلا لیا ہوتا۔ پھر خفگی کا مطلب ہی کچھ نہ تھا۔

۲۴۶۳ سبأ۔ ایک شہر کا نام ہے جس میں یمن کے قبائل عامہ جمع ہوتے ہیں اور یہ یمن کے اس شہر کا نام ہے جہاں بلقیس تھی جس کو مأرِب کہا جاتا ہے اور یہ صنعاء سے تین رات کے فاصلہ پر ہے (ل)

سبأ سے یقینی خبر لانا اس بات کا موید ہے کہ حضرت سلیمان اسی ملک کی طرف آرہے تھے اس لیے ان کے افسروں کا فرض تھا کہ وہ یقینی خبر لا کر دیتے کہ وہاں کے معاملات کیسے ہیں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے کسی حملہ کی تیاری کی خبر حضرت سلیمان کو پہنچی ہے جس کی وجہ سے وہ تیاری کر کے ان کی سرحد پر پہنچ گئے۔ احطت بما لم تحط به۔ یعنی وہ صحیح خبریں جو میں نے اس ملک میں جا کر جمع کی ہیں وہ ابھی تک آپ کو نہیں پہنچیں احاط کے لیے دیکھو ۱۳۲۹ وغیرہ ایک پرند یہ دعوےٰ نہیں کرسکتا کہ اسے دوسرے انسانوں کے متعلق وہ علم حاصل ہے جو خود انسانوں کو حاصل نہیں۔ مفسرین کہتے ہیں اس ہدہد نے جا کر اس ملک کے کسی ہدہد سے یہ باتیں دریافت کر لی تھیں گویا اس زمانہ میں سب ہدہد ہی انسانوں کی طرح واقعات کا علم حاصل کر لیا کرتے تھے۔

۲۴۶۴ اوتیت من کل شئ سے مراد سلطنت اور حکومت کے سارے سامان ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہدہد کو ان کی فوجوں سامان جنگ وغیرہ کی بھی خبر مل گئی تھی۔

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾

میں نے اُسے اور اُس کی قوم کو اللہ کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے ہوئے پایا اور شیطان نے اُن کے عمل انھیں اچھے کرکے دکھائے اور انھیں رستہ سے روک دیا، سو وہ سیدھی راہ پر نہیں چلتے۔

اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾

کہ وہ اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین کی چھپی چیزوں کو نکالتا ہے اور وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو ۲۴۶۵

اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾ السجدة

اللہ، اس کے سوائے کوئی معبود نہیں بڑے عرش کا رب ہے۔

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾

کہا، ہم دیکھیں گے کہ تو سچ بولتا ہے یا تو جھوٹوں میں سے ہے ۲۴۶۶

اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

یہ میرا خط لے جا، سو یہ اُنھیں دیدے، پھر اُن سے پھر آ اور انتظار کر کہ وہ کیا (جواب) دیتے ہیں۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾

(ملکہ نے) کہا، اے سردارو مجھے ایک معزّز خط ملا ہے۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾

وہ سلیمانؑ کی طرف سے ہے اور وہ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے ہے۔

ع ۱۷ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

کہ میرے خلاف سرکشی نہ کرو اور فرمانبردار ہو کر میرے پاس آجاؤ ۲۴۶۷

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾

(ملکہ نے) کہا اے اہل دربار میرے معاملہ میں مجھے جواب دو۔ میں کسی معاملہ کا فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم میرے پاس موجود (نہ) ہو۔

ع ۲۴۶۵ خب۔ ہر ایک ذخیرہ کی ہوئی چیز کو کہتے ہیں جو نظر سے چھپی ہوئی ہو (غ)

ہدہد کا وعظ: یہ وعظ پرند کا کام نہیں ہو سکتا۔ اسے یہ بھی خبر ہے کہ معبودِ حقیقی تو خدا ہے مگر انسانوں نے کچھ اور معبود بھی بنا لیے ہیں اور وہ سورج کو سجدہ کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ شیطان بھی ہے جو انسانوں کو ورغلاتا ہے اور اعمال بد انہیں اچھے کرکے دکھاتا ہے گویا اسے اعمال حسنہ اور اعمال سیّئہ کا بھی پتہ ہے اور ما تخفون اور ما تعلنون میں تو صاف انسانوں کو خطاب ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح آسمانوں اور زمین کی مخفی قوتوں کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرتا ہے اسی طرح تمہارے اعمال پر بھی وہ نتائج مترتب کرتا ہے۔

ع ۲۴۶۶ صادق اور کاذب کے الفاظ انسانوں پر صادق آ سکتے ہیں نہ پرندوں پر اگر یہ سچ ہو تو پرندوں کی طرف رسول مبعوث ہونے چاہئیں جو انہیں سیدھی راہ بتائیں۔

ع ۲۴۶۷ تعلوا عَلَا فلانٌ فلانًا کے معنی ہیں وہ اس پر غالب آ گیا (ل)، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلقیس کا ارادہ سلیمان پر چڑھائی کرنے کا تھا۔ خط کی یہ صورت انه من سلیمان وانه بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم بتاتی ہے کہ لمبے لمبے القاب سب بیہودہ تکلفات ہیں اور خطوط میں سادگی اختیار کرنی چاہئے۔

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ
وَّ الْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿٣٣﴾

انھوں نے کہا ہم قوت والے اور سخت لڑنے والے ہیں۔ اور حکم کرنا تیرے اختیار میں ہے پس دیکھ لے کہ تو کیا حکم کرتی ہے۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً
اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ
وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٤﴾

اس نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں، اس کو برباد کردیتے ہیں اور اس کے عزت والے لوگوں کو ذلیل کردیتے ہیں اور اسی طرح کریں گے۔

وَ اِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ
بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٣٥﴾

اور میں ان کی طرف تحفہ بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں کہ ایلچی کیا جواب لاتے ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ
بِمَالٍ ۫ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ
بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿٣٦﴾

پس جب (ایلچی) سلیمانؑ کے پاس آیا اس نے کہا کیا تم مجھے مال سے مدد دیتے ہو، سو جو کچھ اللہ نے مجھے دیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو تمھیں دیا ہے بلکہ تم اپنے تحفہ پر اتراتے ہو ۲۴۶۸

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا
قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَ لَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ
اَذِلَّةً وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٣٧﴾

ان کی طرف لوٹ جا سو ہم ان پر ایسے لشکر لائیں گے جن کا وہ مقابلہ نہ کرسکیں گے اور ہم انھیں اس سے ذلیل کرکے نکال دیں گے اور وہ خوار ہوں گے ۲۴۶۹

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ
بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿٣٨﴾

(سلیمانؑ نے) کہا، اے اہل دربار تم میں سے کون میرے پاس اس کا تخت لائیگا اس سے پہلے کہ وہ میرے پاس فرمانبردار ہو کر آئیں ۲۴۷۰

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ
بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ

جنوں میں سے ایک زبردست نے کہا، میں اُسے تیرے پاس لے آؤں گا اس سے پہلے کہ تو اپنی جگہ سے اُٹھے، اور میں اس

۲۴۶۸ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحفہ سے اس نے اپنی بڑائی کا اظہار کیا اور حضرت سلیمان کی کچھ تحقیر بھی کی ہے امراء کے مشورہ کا بھی یہی منشا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں سلیمان کی کیا پرواہ ہے ہم بڑے طاقت والے اور سخت جنگ کرنے والے ہیں جس میں جنگ کی دھمکی موجود تھی۔ تحفہ کیا تھا اس کے مفسرین نے بڑے بڑے عجیب نقشے کھینچے ہیں پانچسو لونڈیاں لڑکوں کے لباس میں اور پانچسو لڑکے لونڈیوں کے لباس میں اور پھر اور عجائبات پھر اسی کے مقابل پر حضرت سلیمان کی تیاری کی عظمت ظاہر کی ہے یہ سب فرضی خیالات ہیں۔ قرآن کریم نے اگلی آیات میں خود بتا دیا ہے کہ وہ ہدیہ کیا تھا یہ ایک بڑا مرصع تخت تھا جس پر کچھ تصاویر وغیرہ بنی ہوئی تھیں۔

۲۴۶۹ قبل۔ قِبَلَ عند کے معنی میں آتا ہے یعنی پاس یا سامنے فمالِ الّذین کفروا قِبَلَكَ مھطعین (المعارج-۳۶) اور لبطور استعارہ مقابلہ کی طاقت پر بھی بولا جاتا ہے اور لاقِبَلَ لِیْ بکذا کے معنی ہیں میرے لیے اس کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں یہی معنی یہاں ہیں (غ)

اگر یہ تحفہ دوستانہ رنگ کا ہوتا اور اس میں اظہار دوستی ہوتا تو حضرت سلیمان یہ جواب نہ دیتے اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے جو پہلے نوٹ میں بیان ہوئی۔

۲۴۷۰ ملکہ کا تخت حضرت سلیمان کے پاس کس طرح آیا: درمیانی واقعات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ حضرت سلیمان کے عزم اور ان کی طاقت کا حال معلوم کرکے ان لوگوں کا ارادۂ جنگ کمزور ہوگیا اور انھوں نے فرمانبرداری اختیار کی اور اپنی فرمانبرداری کے خلوص کا یقین دلانے کے لیے خود حضرت سلیمان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ تب حضرت سلیمان نے اس کا تخت لانے کے لیے کہا، اس کے تخت سے یہ مراد نہیں ہوسکتی کہ وہاں جس تخت پر وہ بیٹھ کر حکومت کرتی ہے اور وہ اس کا مال ہے وہ لایا جائے۔ دوسرے کی چیز کی اس کی اجازت کے بغیر حضرت سلیمان اللہ تعالیٰ کے نبی ہو کر کیوں کر منگوانے کا خیال کرسکتے تھے بلکہ یہ وہی تحفہ ہے جو اس نے بھیجا تھا۔ اسی لیے اسے اس کا تخت کہا ہے۔ اس تحفہ پر آپ ناراض کیوں ہوئے تھے اور اس کو اب منگوانے کی غرض کیا ہے اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

وَ اِنِّیْ عَلَیْهِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ ﴿۳۹﴾
(کے اُٹھانے) کی قوت رکھتا ہوں۔ امین ہوں ۲۴۷۱

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ ؕ
جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا میں تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے اُسے تیرے پاس لے آتا ہوں

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۫ۖ لِیَبْلُوَنِیْۤ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ
پھر جب اُسے اپنے پاس موجود دیکھا، کہا یہ میرے رب کے فضل سے ہے، کہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں

وَ مَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِیْمٌ ﴿۴۰﴾
اور جو کوئی شکر کرتا ہے وہ صرف اپنے (بھلے) کے لیے ہی شکر کرتا ہے اور جو کوئی ناشکری کرتا ہے تو میرا رب بے نیاز بزرگی والا ہے ۲۴۷۲

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِیْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِیْنَ لَا یَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾
(سلیمان نے) کہا اس کے لیے اس کے تخت کی صورت بدل دو، ہم دیکھیں کہ آیا وہ سیدھے رستہ پر چلتی ہے یا اُن لوگوں میں سے ہو جاتی ہے جو سیدھی راہ پر نہیں چلتے ۲۴۷۳

۲۴۷۱ عفریت۔ عَفَر مٹی کو کہتے ہیں اور عافرہٗ کے معنی ہیں اسے مٹی میں لٹایا۔ اور عفریت کے معنی سخت اور خبیث ہیں اور جس طرح شیطان کا لفظ انسان پر بولا جاتا ہے عفریت بھی بولا جاتا ہے (غ) اور زجاج کا قول ہے کہ عفریت مردوں میں سے وہ ہے جو خبث اور شدّت کے ساتھ کسی معاملہ میں گھس جائے اور اسے کمال کو پہنچائے (ل)

۲۴۷۲ یہاں عفریت کے مقابل پر ایک صاحب علم کا ذکر کیا۔ علم من الکتاب سے ممکن ہے علم دین مراد ہو، مگر بظاہر عام علم ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ معاملہ صرف ایک تخت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے کا ہے کوئی دینی مسئلہ نہیں اور قبل ان یرتد الیك طرفك کو بعض نے حقیقت پر محمول کیا ہے اور مراد یہ لی ہے کہ آنکھ کھول کر سامنے دیکھے تو قبل اس کے کہ نظر لوٹ کر آئے اور بعض نے کہا کہ قبل اس کے کہ اتنی دور سے جہاں نظر پہنچے ایک آدمی آ جائے۔ اور مجاہد کا قول قابل ترجیح ہے کہ یہ سرعت میں مبالغہ ہے اور یہاں قوت اور علم کا مقابلہ ہے یعنی پہلی آیت میں عفریت قوت اور جسمانی طاقت کا نمایندہ ہے وہ پھر بھی بہت وقت چاہتا ہے اور صاحب علم شخص گو قوت میں اتنی شدّت نہ رکھتا ہو اس کام کو فوراً کر سکتا ہے، گویا قوت کے مقابل پر علم بڑی چیز ہے اور حضرت سلیمان کا تخت کو دیکھ کر یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ مجھے آزماتا ہے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری اس بات کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر تخت کی صورت بدلنے میں اگلی آیت میں آتا ہے۔

۲۴۷۳ نکروا۔ تنکیر کسی چیز کو ایسا بنا دینا ہے کہ وہ پہچانی نہ جائے۔ اور تعریف اس کا ایسا بنا دینا ہے کہ وہ پہچانی جائے (غ) اس لیے تنکیر کے معنی تغییر ہیں یعنی صورت کا بدل دینا (ج)

حضرت سلیمان نے تخت کی صورت بدلنے کا حکم دیا۔ مفسرین اس کی وجہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ آپ کو کہا گیا تھا کہ بلقیس کا دماغ خراب ہے تو آپ نے امتحان کے لیے ایسا کیا لیکن دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسی کا تخت منگوایا گیا تھا اور اس کو معجزہ دکھانا مقصود تھا۔ اب اگر تخت کی صورت بدل دی جائے تو معجزہ باقی نہیں رہتا کیونکہ اس صورت میں تو صاف خیال گزریگا کہ اس کے تخت کی مانند دوسرا تخت حضرت سلیمان نے تیار کرا لیا ہے۔ پس تخت کی صورت کا بدل دینا معجزہ دکھانے کے خیال کو باطل کرتا ہے اور امتحان عقل کے لیے صورت تخت کو بدل دینا بھی کوئی عقلمندی کا خیال نہیں۔ اس واقعہ پر کافی روشنی ان باتوں سے پڑتی ہے جو خود قرآن کریم نے بیان کی ہیں۔ اوّل حضرت سلیمان پہلے اس تخت کو جو تحفہ کی صورت میں پیش کیا گیا تھا، دیکھکر ناراض ہوئے ہیں۔ دوم جب بلقیس کی آمد پر تخت منگوایا ہے تو اسے دیکھ کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ امتحان ہے کہ میں شکر گزاری اختیار کرتا ہوں یا نہیں۔ سوم تخت کے تبدیل کرنے کی غرض یہ ہے کہ ملکہ خود اس تبدیلی سے راہ راست کی طرف آتی ہے یا نہیں۔ ان تینوں باتوں پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس تخت پر جو ملکہ نے بطور تحفہ بھیجا، کچھ شکلیں بتوں کی یا اور اس قسم کی شکلیں بنی ہوئی تھیں جنہیں ایک موحد انسان پسند نہ کر سکتا تھا اسلیئے حضرت سلیمان نے یہ فرمایا کہ ان شکلوں وغیرہ کو ملیامیٹ کر دو اور اسے شکر گزاری کا امتحان اس لیے کہا کہ وہ شکلیں جواہرات وغیرہ سے بنی ہوئی ہوں گی، جیسا کہ ایک بادشاہ سے دوسرے بادشاہ کی طرف تحفہ ہونے سے ظاہر ہے تو ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ وہ شکلیں دور کر دی جائیں اور خوبصورتی اور آرائش کی محبّت یہ چاہتی تھی کہ وہ اسی طرح بنی رہیں اور ملکہ کا اس سے ہدایت پا نا یوں تھا کہ اس سے معلوم ہو جاتا کہ حضرت سلیمان مال دنیا کی پروا ایمان کے مقابلہ میں کچھ نہیں کرتے اور دوسرے یہ کہ وہ معبود کس طرح ہو سکتا ہے جسے ایک انسان بنائے اور دوسرا فنا کر دے پس جب قرآن کریم خود اس واقعہ پر کافی روشنی ڈالتا ہے اور بات بھی یہی انبیاء کی شان کے لائق ہے کہ وہ توحید کی ہتک کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تو اور قصّے بنانے کی کوئی ضرورت نہیں اور اگلی آیت بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے اھکذا عرشك کیا تیرا تخت ایسا ہی تھا۔ اگر اسی کا تخت منگوایا ہوا ہوتا تو سوال یوں ہوتا اھذا عرشك کیا یہ تیرا تخت ہے۔ ھٰکذا کہہ کر صاف بتا دیا کہ اس کو توجہ دلانا تھا کہ یوں تو تیرا ہی بھیجا ہوا تخت ہے مگر کیا جب تو نے بھیجا تو یہ ایسا ہی تھا تاکہ وہ غور کرے کہ اس میں کیا تبدیلی کر دی گئی ہے اور اس تبدیلی کی طرف اس کی توجہ ہو۔

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾

سو جب وہ آئی کہا گیا، کیا تیرا تخت ایسا ہی تھا، کہنے لگی گویا کہ یہ وہی ہے۔ اور ہمیں اس سے پہلے علم ہو گیا تھا اور ہم فرماں بردار ہو گئے ۲۴۷۴

وَ صَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور اسے اس نے روک رکھا جس کی وہ اللہ کے سوائے عبادت کرتی تھی وہ کافر قوم سے تھی ۲۴۷۵

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ۵ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾ ع ۱۸

اسے کہا گیا محل میں داخل ہو جا، سو جب اُسے دیکھا، اُسے بہت گہرا پانی سمجھا، اور گھبرائی۔ (سلیمانؑ نے) کہا، یہ محل ہے جو شیشوں سے جڑا گیا ہے۔ (اس نے) کہا میرے رب میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور میں سلیمان کے ساتھ اللہ جہانوں کے رب پر ایمان لائی ۲۴۷۶

ع۲۴۷۴ بلقیس کو اس کی ناپسندیدگی کا علم ہو جانا: اھٰکذا عرشک پر دیکھو پچھلا نوٹ۔ اور اس کا جواب گویا کہ ایسا ہی ہے بتانا ہے کہ وہ اپنی اصلیت پر باقی نہیں رہا۔ مگر اوتینا العلم من قبلہا سے کیا مراد ہے؟ ابن جریر نے تو اسے حضرت سلیمان کا قول قرار دیا ہے اور اسی کے مطابق روایات بیان کی ہیں اور بھی کئی مفسرین اس طرف گئے ہیں اور بعض مفسرین نے اسے ملکہ کا قول قرار دے کر جیسا کہ ظاہر ہے یہ مطلب لیا ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا علم اس معجزہ کے دیکھنے سے پہلے ہی تھا جو بالکل غلط ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا علم ہوتا تو بت پرست کیوں رہتے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب اس نے اپنے بتوں وغیرہ کی شکلوں کو اس پر نہ پایا تو اس نے کہا کہ آپ نے ان کو ناپسند کر کے دور کرا دیا ہے اور آپ کی اس ناپسندیدگی کا علم ہمیں پہلے ہی ہو گیا تھا اس لیے کہ ایلچی نے جا کر سب کچھ بتا دیا ہو گا کہ کس طرح حضرت سلیمان نے اس تحفہ کو ناپسند کیا بل انتم بھدیتکم تفرحون میں حضرت سلیمان نے اظہار ناپسندیدگی اس کے سامنے کر دیا تھا۔ قبلہا میں ضمیر اس تبدیلی کی حالت کی طرف ہے۔ اور کنا مسلمین کے معنی دونوں طرح ہو سکتے ہیں یعنی ہم نے بت پرستی کو چھوڑ کر توحید اختیار کر لی ہے یا یہ کہ سرکشی کو چھوڑ کر فرمانبرداری اختیار کر لی ہے اگلی دونوں آیات کے مضمون کو مدنظر رکھتے ہوئے میں دوسرے معنی کو ترجیح دیتا ہوں۔ ابھی اسلمت للّٰہ رب العالمین آگے آتا ہے۔

ع۲۴۷۵ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب تک ایمان نہیں لائی بلکہ عبادت من دون اللہ نے اسے ابھی تک سلیمان پر ایمان لانے سے روک رکھا تھا اور بعض نے یوں معنی کیے ہیں کہ سلیمان نے اسے من دون اللہ کی عبادت سے روک دیا لیکن اگر دل میں ایمان نہ ہو تو زبردستی سے روک دینا اصول مذہب کے خلاف ہے۔

ع۲۴۷۶ صرح۔ صرح اور صریح وہ شے ہے جو ہر چیز سے خالص کی گئی ہو اور صرح بلند مکان ہے جو مزین کیا گیا ہو گویا کہ وہ ہر آلودگی سے پاک ہے (غ) ابن لی صرحا (المومن ۴۰۔ ۳۶)

لجۃ دیکھو ع۲۲۸۸ لُجَّۃُ الْبَحْرِ وہ ہے جس کی گہرائی کا احاطہ نہ ہو سکے اور لُجَّۃُ الماء بہت بڑے پانی کو کہتے ہیں (ل)

کشفت عن ساقیہا۔ ساق وہ ہے جو پاؤں اور گھٹنے کے درمیان ہو یعنی پنڈلی، اس کی جمع سوق ہے۔ فطفق مسحا بالسوق والاعناق (ص ۳۸۔ ۳۳) اور لغت میں ساق امر شدید کو بھی کہتے ہیں۔ اور قرآن کریم میں ہے یوم یکشف عن ساق (القلم ۶۸۔ ۴۲) اور حدیث قیامت میں ہے یکشف عن ساقہ تو یہاں ساق سے مراد امر شدید ہی ہے اور اس کا کشف شدت امر میں مثال ہے جیسا کہ بخیل کو کہا جاتا ہے یدُہ مغلولۃ اور نہ وہاں ہاتھ ہوتا ہے نہ اس کا باندھنا اور یہ شدت بخل میں مثال ہے اسی طرح یہاں نہ پنڈلی ہے اور نہ اس کا کھولنا اور اس کا اصل یہ ہے کہ انسان جب ایک امر شدید میں مبتلا ہو جائے تو کہا جاتا ہے شمَّرَ ساعدہ وکشف عن ساقہ گویا اس امر عظیم کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتا ہے ابن سیدہ نے اللہ تعالیٰ کے قول یوم یکشف عن ساق میں کہا ہے کہ اس سے مراد شدت امر ہے جیسا کہ کہتے ہیں قامتِ الحربُ علی ساقٍ اور اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ساق سے جب شدت مراد ہو تو اسے پنڈلی سے تشبیہ ہوتی ہے کیونکہ پنڈلی سارے جسم کو اُٹھاتی اور اسے چلاتی ہے (ل)

ممرد۔ مرد کے لیے دیکھو ع۶۳۴ اور مُمَرَّد سے مراد ہے صاف اور ہموار کیا ہوا (غ)

قواریر۔ قارُوْرَۃ کی جمع ہے یعنی شیشہ۔ قواریرا من فضۃ (الدھر ۷۶۔ ۱۶) (غ)

بلقیس کی پنڈلیوں پر بالوں کا قصہ: مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان بلقیس سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر انہیں خبر ملی کہ اس کی پنڈلیوں پر بال ہیں

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٤٥﴾

اور ہم نے ہی ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ کہ اللہ کی عبادت کرو، تو وہ دو فریق ہو کر آپس میں جھگڑنے لگے۔ ۲۴۷۷

قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٤٦﴾

راس نے کہا، اے میری قوم کیوں تم بھلائی سے پہلے دکھ کو جلدی مانگتے ہو۔ کیوں تم اللہ سے استغفار نہیں کرتے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۭ قَالَ طٰۗىِٕرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿٤٧﴾

انھوں نے کہا ہمیں تیری وجہ سے اور ان کی وجہ سے جو تیرے ساتھ ہیں مصیبت ہی پہنچی ہے اس نے کہا تمھاری مصیبت اللہ کی طرف سے ہے، بلکہ تم لوگ ہو جو آزمائے جاتے ہو۔

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿٤٨﴾

اور شہر میں نو شخص تھے، جو ملک میں فساد کرتے تھے، اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ

انھوں نے کہا اللہ کی قسم کھاؤ کہ ضرور ہم اس پر اور اس کے اہل پر رات کے وقت حملہ کریں گے پھر ہم اس کے ولی کو کہدینگے

تو انہوں نے اس بات کی تحقیق کے لیے ایک عظیم الشان شیش محل نبایا اور اس کے نیچے پانی چلایا اور بلقیس کو اس میں داخل ہونے کے لیے کہا گیا تو اس نے پانی سمجھ کر اپنی پنڈلیاں کھول دیں۔ ایک نبی ہو کر محض ایک عورت کی پنڈلیاں دیکھنے کے لیے اتنا خرچ اور ایسی تجویزیں کریں یہ سمجھ سے باہر بات ہے اور قرآن کریم کے الفاظ اس کی تردید کرتے ہیں اس لیے کہ قرآن کریم میں صاف ہے حسبتہ لجۃ۔ اسے لجۃ سمجھا اور لجۃ اس پانی کو کہتے ہیں کہ جس کی گہرائی کا احاطہ نہ ہو سکے تو اس میں پنڈلیاں کھول کر گزرنے کا خیال کس طرح آسکتا تھا ہاں یوں ہوتا کہ سارے کپڑے اتار دیئے تو خیال ہو سکتا تھا کہ تیر کر پار ہونے کے لیے ایسا کیا ہوگا مگر اتنے گہرے پانی کے لیے پنڈلیاں کھولنا کسی عقلمند کا کام نہیں ہو سکتا اور پھر اس سے سبق کیا ملتا ہے جس کی وجہ سے قرآن کریم اس بات کو بیان کرتا۔ اصل بات یہ ہے کہ کشف عن الساق کا غلط مفہوم لیکر اس پر اس سارے قصہ کی بنیاد رکھی گئی ہے حالانکہ کشف عن الساق سے جیسا کہ او پر لسان العرب سے دکھایا گیا ہے پنڈلیوں کا کھولنا مراد نہیں بلکہ ایک شدید امر کا پیش آنا ہے جس سے انسان گھبرا جائے۔ اصل یوں معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ملکہ نے حضرت سلیمان کو ایک تخت بھیجکر جس پر مشرکانہ تصاویر وغیرہ بنی ہوئی تھیں گویا شرک کی دعوت دی تھی۔ اسکے مقابل پر حضرت سلیمان نے اسے اس کی عبادت من دون اللہ کی غلطی کی طرف اس طرح پر توجہ دلائی ہے۔ حضرت سلیمان بادشاہ تھے اور ان کے محلات بھی تھے (وہ کامل نمونہ کہ بادشاہ ہو کر گارے اور کھجور کی بنی ہوئی جھونپڑی میں گزارہ کریں، محمد رسول اللہ صلعم کے لیے ہی مقدّر تھا) انہوں نے ایک تصویری رنگ میں ملکہ پر اس کی غلطی کا اظہار کیا یعنی نہایت مصفّا شیشوں کے نیچے پانی چلایا۔ ملکہ نے ان شیشوں کو پانی سمجھ لیا۔ وہ پرستار سورج تھی، سورج کی طاقت بڑی نظر آتی ہے مگر حقیقی طاقت جو اس کے نیچے کام کر رہی ہے وہ الٰہی طاقت ہے نظر غائر سے کام نہ لینے والے خود سورج کو ہی الٰہی طاقت سمجھ لیتے ہیں پس اس تصویری زبان میں کہ شیشہ کو پانی نہ سمجھو، یہ سمجھایا کہ سورج کو خدا نہ سمجھو۔ اللہ تعالیٰ ایک ہے یہ سب چیزیں اس کی طاقت اور قوت کے مظاہر ہیں مظاہر قدرت کو خدا سمجھنا غلطی ہے۔ اس سے ہر انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے اس لیے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا ورنہ کسی عورت کی پنڈلیوں پر بالوں کا ہونا یا نہ ہونا کوئی ایسا واقعہ نہیں جس کے ذکر کی خدا کے کلام میں ضرورت ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تصویری زبان میں کسی حقیقت کا روشن کرنا جائز امر ہے، اس لیے تصاویر کے ساتھ علم کا بڑھانا ممنوع نہیں۔

ف ۲۴۷۷ اس رکوع میں صرف حضرت صالحؑ اور حضرت لوطؑ کا ذکر کیا ہے۔ ان دو پیغمبروں کو یہ خصوصیّت حاصل ہے کہ ان کی قوموں کی بستیاں اُس رستہ پر ہیں جو مکہ سے شام کو جاتا تھا اور عرب کے لوگ جو شام سے تجارت کرتے تھے ان بستیوں میں سے ہو کر گزرتے تھے۔

أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصَٰدِقُونَ ﴿۴۹﴾

ہم اس کے گھر والوں کی ہلاکت پر موجود نہ تھے اور ہم بالکل سچے ہیں ۲۴۷۸ع

وَمَكَرُوا۟ مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۵۰﴾

اور انھوں نے ایک مخفی تدبیر کی اور ہم نے بھی ایک مخفی تدبیر کی اور انھیں خبر نہ تھی۔

فَٱنظُرْ كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَّا دَمَّرْنَٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۵۱﴾

سو دیکھ ان کی تدبیر کا انجام کیسا ہُوا۔ کہ ہم نے اُنھیں اور ان کی قوم سب کو تباہ کر دیا۔

فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوٓا۟ ۗ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۵۲﴾

سو یہ ان کے گھر ویران پڑے ہیں اس لیے کہ انھوں نے ظلم کیا اس میں یقیناً ان لوگوں کے لیے نشان ہے جو جانتے ہیں۔

وَأَنجَيْنَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَكَانُوا۟ يَتَّقُونَ ﴿۵۳﴾

اور ہم نے انھیں نجات دی جو ایمان لائے اور تقوٰے اختیار کرتے تھے۔

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِۦٓ أَتَأْتُونَ ٱلْفَٰحِشَةَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ ﴿۵۴﴾

اور لُوطؑ کو (بھیجا) جب اس نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم بیحیائی کے کام کرتے ہو، حالانکہ تم دیکھتے ہو۔

أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ ٱلرِّجَالَ شَهْوَةً مِّن دُونِ ٱلنِّسَآءِ ۚ بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿۵۵﴾

کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت سے آتے ہو۔ بلکہ تم جاہل قوم ہو۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِۦٓ إِلَّآ أَن قَالُوٓا۟ أَخْرِجُوٓا۟ ءَالَ لُوطٍ مِّن قَرْيَتِكُمْ ۖ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ﴿۵۶﴾

سو اس کی قوم کا جواب کچھ نہ تھا، مگر یہ کہ انھوں نے کہا لوط کے لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا چاہتے ہیں۔

فَأَنجَيْنَٰهُ وَأَهْلَهُۥٓ إِلَّا ٱمْرَأَتَهُۥ قَدَّرْنَٰهَا مِنَ ٱلْغَٰبِرِينَ ﴿۵۷﴾

سو ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو نجات دی مگر اس کی عورت جسے ہم نے پیچھے رہنے والوں میں مقدر کیا تھا۔

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِم مَّطَرًا ۖ فَسَآءَ مَطَرُ ٱلْمُنذَرِينَ ﴿۵۸﴾ ع ۴ ۱۹

اور ہم نے اُن پر ایک مینہ برسایا، تو کیا ہی بُرا ان کا مینہ تھا جو ڈرائے گئے۔

قُلِ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَٰمٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ ٱلَّذِينَ ٱصْطَفَىٰٓ ۗ ءَآللَّهُ خَيْرٌ أَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۵۹﴾

کہہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور اس کے بندوں پر سلامتی ہے جنھیں اس نے چُنا۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جنھیں یہ شریک بناتے ہیں ۲۴۷۹ع

۲۴۷۸ع اس اور اس سے پہلی آیت میں حضرت صالح کے ذکر میں نبی کریم صلعم کے اعدا اور ان کے منصوبوں کا ذکر ہے تسعۃ رھط سے مراد نو بڑے بڑے آدمی ہیں جن کے ساتھ جتھے تھے۔ آنحضرت صلعم کے بھی بڑے دشمن نو ہی تھے جن میں سے آٹھ بدر میں مارے گئے اور نواں ابولہب بدر کی شکست کا حال سُن کر مر گیا۔ یعنی ابوجہل، مطعم بن عدی، شیبہ بن ربیعہ۔ عتبہ بن ربیعہ۔ ولید بن عتبہ، اُمیہ بن خلف، نضر بن الحرث، عقبہ بن ابی معیط، ابولہب۔ اور رات کے وقت حملہ کرنے کا مشورہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا یہاں حضرت صالح کے ذکر میں ہے یعنی نبی کریم صلعم کے متعلق آخری فیصلہ دار الندوہ میں یہی کیا گیا تھا کہ رات کے وقت آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا جائے اور جب رات کو آپ نکلیں جیسا کہ تہجد کے لیے آپ کی نکلنے کی عادت تھی تو اس وقت چند کس یکمرتبہ حملہ کریں تاکہ کسی ایک پر الزام قتل نہ آئے۔

۲۴۷۹ع آللہ۔ اصل میں ءَ اَللّٰہُ ہے اور اَمَّا اصل میں ام ما ہے۔

اَمَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ اَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهۡجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمۡ اَنۡ تُنۡۢبِتُوۡا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلۡ هُمۡ قَوۡمٌ يَّعۡدِلُوۡنَ ﴿۶۰﴾

بھلا کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے بادل سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ خوشنما باغ اُگائے، تمھارے لیے (ممکن) نہ تھا، کہ اُن کے درختوں کو اُگاتے۔ کیا اللہ کے ساتھ (کوئی اور) معبود بھی ہے بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو ایک طرف جھک گئے ہیں ؏۲۴۸۰

اَمَّنۡ جَعَلَ الۡاَرۡضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنۡهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِىَ وَ جَعَلَ بَيۡنَ الۡبَحۡرَيۡنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۱﴾

بھلا کس نے زمین کو قرارگاہ بنایا، اور اس کے اندر دریا بنائے اور اس کے لیے پہاڑ بنائے اور دو دریاؤں کے درمیان روک بنائی، کیا اللہ کے ساتھ (کوئی اور) معبود ہے بلکہ ان میں سے اکثر علم نہیں رکھتے ؏۲۴۸۱

اَمَّنۡ يُّجِيۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكۡشِفُ السُّوۡٓءَ وَ يَجۡعَلُكُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۶۲﴾

بھلا کون بیقرار کی فریاد کو پہنچتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور مصیبت کو دور کرتا ہے اور تمھیں زمین میں حاکم بناتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ (کوئی اور) معبود ہے تم بہت ہی کم نصیحت قبول کرتے ہو ؏۲۴۸۲

اَمَّنۡ يَّهۡدِيۡكُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتِ الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ وَمَنۡ يُّرۡسِلُ الرِّيٰحَ بُشۡرًاۢ بَيۡنَ يَدَىۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ

بھلا کون تمھیں خشکی اور تری کی تاریکیوں میں رستہ دکھاتا ہے، اور کون اپنی رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو خوشخبری دیتے ہوئے بھیجتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ (کوئی اور) معبود ہے، اللہ اس سے

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کے اصطفا کا ذکر فرمایا ہے وہ اصحاب رسول اللہ صلعم ہیں اور ابن عباسؓ سے یہی مروی ہے (ج) اور ظاہر ہے کہ یہاں سلامتی کا وعدہ ہے یعنی دشمن ان کو تباہ نہیں کر سکتے اور ان کے مقابل پر ساتھ ہی مشرکوں کا ذکر بھی یہی بتاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصحاب رسول اللہ صلعم کا اصطفا بھی انبیاء کے رنگ میں تھا اس لیے کہ ان سے کام بھی وہی لیا گیا جو انبیاء سے لیا جاتا تھا۔

؏۲۴۸۰ حدائق۔ حدیقۃ کی جمع ہے اور وہ وہ قطعہ زمین ہے جس میں پانی ہو گویا اسے آنکھ کی تپلی (حَدَقَۃ) سے شکل اور پانی کے موجود ہونے میں تشبیہ ہے (غ)
جب خلق اللہ تعالیٰ کا ہی کام ہے تو دوسرا معبود بھی نہیں ہو سکتا۔

؏۲۴۸۱ یہاں بتایا ہے کہ وہ قوانین جن پر عالم کا دار و مدار ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں نہ کسی اور کے۔ دو سمندروں میں روک پر دیکھو ؏۲۳۸۶

؏۲۴۸۲ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر تین دلائل: سب سے پہلے خلق اشیاء کا ذکر فرمایا، پھر قوانین کے اجرا کا۔ یہ دونوں کام اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے نہ کوئی اور فرضی معبود۔ مگر یہاں تک بس نہیں بلکہ انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا تعلق بھی ہے جو اور کسی شے کا نہیں اور وہ تعلق اس وقت پورے طور پر ظاہر ہوتا ہے جب انسان ماسوائے اللہ کو بکلی چھوڑ کر اپنے آپ کو صرف ایک ذات پاک کا محتاج سمجھتا ہے (اسی کو مضطر فرمایا ہے اضطرار پر دیکھو ؏۲۱۱) تب وہ نہ صرف اس کی حالت اضطرار کی دعا کو قبول کرتا ہے بلکہ دعا کا جواب بھی دیتا ہے کیونکہ کام کا ہونا یا نہ ہونا اتفاقی بھی ہو سکتا ہے اس کی ہستی اور اس کے تعلق کی دلیل اس کا جواب دینا ہی ہے۔ یعنی ایسے بندے کے ساتھ کلام کرنا۔ اور اس کو مصیبت کے وقت تسلی دینا۔ اور گو یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنا عام قانون بیان فرمایا ہے مگر خاص اشارہ انہی اپنے برگزیدہ بندوں کی طرف ہے جن کے ذکر سے رکوع کو شروع کیا تھا اور اسی لیے کشف سوء یا مصیبت کے دور کرنے کے ساتھ انہیں بادشاہ بنانے کا بھی ذکر ہے۔ گویا بتایا ہے کہ داؤد اور سلیمان کے قصے بیان نہیں کیے بلکہ مسلمانوں کو وہ سب کچھ دیا جائے گا جو پہلی قوموں کو دیا گیا۔ آیت ۶۰ میں خلق کے ساتھ یعدلون فرمایا اس لیے کہ دلیل خلق موٹی دلیل ہے اگلی آیت میں اپنے قوانین کا ذکر کر کے یعلمون فرمایا اس کے کہ قوانین کا تعلق علم سے ہے اور یہاں قبولیت دعا کے ذکر میں تذکرون فرمایا اس لیے کہ اس کا تعلق ذکر سے ہے۔

عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ؕ ﴿۶۳﴾

بلند ہے جو وہ (اس کے ساتھ) شریک ٹھہراتے ہیں ع۲۴۸۳

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾

بھلا کون مخلوق کو پہلے پیدا کرتا ہے پھر اسے لوٹاتا رہتا ہے اور کون تمھیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ (کوئی اور) معبود ہے۔ کہہ اپنی روشن دلیل لاؤ، اگر تم سچے ہو ع۲۴۸۴

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۶۵﴾

کہہ جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے اللہ کے کوئی غیب کو نہیں جانتا اور وہ نہیں جانتے کہ کب اُٹھائے جائیں گے۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ ۫ بَلْ هُمْ فِىْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ ع ۸

بلکہ آخرت کے پانے سے ان کا علم پیچھے رہ گیا، بلکہ وہ اس کے متعلق شک میں ہیں، بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں ع۲۴۸۵

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّ اٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾

اور وہ جو انکار کرتے ہیں، کہتے ہیں کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نکالے جائیں گے۔

لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾

یہ وعدہ ہمارے ساتھ اور پہلے ہمارے باپ دادوں سے (بھی) کیا گیا۔ یہ صرف پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۶۹﴾

کہہ زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو مجرموں کا انجام کیسا ہوا۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِىْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

اور ان پر غم نہ کھا، اور اس سے تنگی محسوس نہ کر، جو یہ تدبیریں کرتے ہیں ع۲۴۸۶

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۷۱﴾

اور کہتے ہیں یہ وعدہ کب ہے، اگر تم سچے ہو۔

ع۲۴۸۳ یہاں اس تعلق کو اور بھی کمال کو پہنچایا وہ نہ صرف مصیبت کے وقت انسان کو تسلی دیتا ہے بلکہ انسان کی بہتری کے لیے اپنی ہدایت بھی بھیجتا ہے۔ ظاہری رستوں کے ذکر میں انہی باطنی راہوں کی طرف اشارہ ہے اور رحمت کے آگے ہوائیں بھیجنے میں اشارہ ہے کہ اس کامیابی کے آثار اب بھی نظر آتے ہیں۔

ع۲۴۸۴ خلق کے اعادہ میں یہاں اشارہ اجرائے قانون کی طرف ہے اور آسمانی رزق وحی الٰہی ہے پس انہی تینوں باتوں کا پھر ایک جگہ کرکے اعادہ کیا ہے جو اوپر کی آیات میں الگ الگ کرکے بیان کی ہیں۔

ع۲۴۸۵ ادّٰرك پر دیکھو ع۹۹۴ علم کے انتہا کو پہنچ کر رہ جانے سے مراد ہے کہ وہ جاہل رہ گئے یعنی ان کا علم وہاں تک نہ پہنچ سکا اور پھر فرمایا بل هم فی شك منها۔ یعنی ان کا اپنا علم تو وہاں تک نہ پہنچ سکا لیکن جب ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے یہ علم دیا تو وہ شک میں پڑ گئے اور پھر اس شک میں ترقی کرتے کرتے بالکل اندھے ہو گئے یعنی اس کے قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔

ع۲۴۸۶ آپکا غم اس لیے تھا کہ یہ لوگ بجائے حق کو قبول کرنے کے مخالفت میں بڑھتے جاتے ہیں اور ان کی تدبیروں کے ذکر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی کافر ہیں جو حق کو تباہ کرنے کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں۔

قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِىْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۷۲﴾
کہہ شاید اس کا کچھ حصّہ تم سے نزدیک ہی آ گیا ہو، جسے تم جلد چاہتے ہو۔[۲۴۸۷]

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾
اور تیرا رب یقیناً لوگوں پر فضل کرنے والا ہے، لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۴﴾
اور تیرا رب یقیناً اسے جانتا ہے جو اُن کے سینے چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔

وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِى السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۵﴾
اور کوئی چھپی ہوئی چیز آسمان اور زمین میں نہیں مگر وہ واضح کتاب میں ہے۔[۲۴۸۸]

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۶﴾
یہ قرآن بنی اسرائیل پر بہت سی وہ باتیں بیان کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔[۲۴۸۹]

وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾
اور بیشک وہ مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِىْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾
تیرا رب اُن کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہ غالب علم والا ہے۔[۲۴۹۰]

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۷۹﴾
سو اللہ پر بھروسا رکھ، تو کُھلے حق پر ہے۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۰﴾
ہاں تو مُردوں کو نہیں سُنا سکتا، اور نہ تو بہروں کو سُنا سکتا ہے، جب وہ پیٹھ پھیرتے ہوئے واپس ہو جائیں۔

وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا
اور نہ تو اندھوں کو اُن کی گمراہی سے نکال کر رستہ دکھانے والا ہے، تو صرف اُسے سُناتا ہے جو ہماری آیتوں پر

۲۴۸۷ ردف لکم۔ ردف کے لیے دیکھو ۱۲۰۸ اور ردف لکم کے معنی قرُب لکم یا دنا لکم کیے گئے ہیں یعنی تمہارے قریب آگیا۔ اور ردِفکم اور ردف لکم ایک ہی ہیں جیسے سمعه اور سمع له (ل)۔
یہاں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت رسول اللہ صلعم کی ہجرت کے قریب قریب کی ہے کیونکہ عذاب کا آنا آپ کے چلے جانے کے بعد مقرر تھا ما کان اللّٰہ لیعذّبہم وانت فیہم (الانفال ۸-۳۳) چونکہ آپ اب مکّہ سے جانے والے تھے اس لیے فرمایا کہ عذاب کا بھی ایک حصّہ قریب ہی چکھ لو گے۔ بعض اس لیے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو رحمۃ للعالمین کی بدولت پوری تباہی سے بچا لیا۔

۲۴۸۸ غائبۃ۔ جو چیز حواس سے مخفی ہو یا علم انسان سے مخفی ہو اسے غائب کہا جاتا ہے (غ) اور تا اس میں مبالغہ کے لیے ہے (د) اصل مقصد یہ ہے کہ جس سے آسمان و زمین کی کوئی چیز مخفی نہیں اس سے تمہاری تدابیر کیونکر مخفی رہ سکتی ہیں۔

۲۴۸۹ بنی اسرائیل سے مراد یہاں یہود و نصاریٰ ہیں جیسا کہ قتادہ سے مروی ہے (د) کیونکہ سب سے بڑا اختلاف انہی کا تھا۔ پس مکّہ میں ہی یہ دعویٰ بھی کیا گیا تھا کہ یہود و نصاریٰ کے باہمی اختلافات کا فیصلہ قرآن کریم فرماتا ہے۔

۲۴۹۰ دو گروہ جن کے درمیان فیصلہ کی ضرورت ہے اعدائے دین اور مومن ہیں۔ اسی لیے اگلی آیت میں فرمایا کہ اللہ پر بھروسہ رکھ کر کام میں لگے رہو۔

فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾
وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ
دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ
ع النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۸۲﴾

ایمان لاتا ہے سو وہ فرماں بردار ہیں ۲۴۹۱
اور جب بات اُن پر واضح ہو جائے گی ہم اُن کے لیے زمین
سے ایک جانور نکالیں گے جو اُن سے باتیں کرے گا، اس لیے کہ
لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے ۲۴۹۲

ع۲۴۹۱ پیغمبر کا مردوں کو سنانا: ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر صرف ڈرانے والا ہے۔ جو سننا چاہے اسی کو سنا سکتا ہے اور ان کی کفر پر اصرار کی حالت یہاں تک ترقی کر گئی ہے کہ کسی انسان کی طاقت میں اب یہ نہیں کہ انہیں راہ راست پر لا سکے۔ اذا ولوا مدبرین اصل حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ مُردے ہیں، بہرے ہیں بایں پیغمبر کی آواز پر پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ ایسوں کو پیغمبر نہیں سُنا سکتا۔ اندھے ہیں اور پھر گمراہی میں ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ ایسوں کی ہدایت پیغمبر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ صرف ڈرانے والا ہے اور یہ لوگ ڈرانے کی پروا نہیں کرتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ہمیشہ کے لیے ایمان سے بے بہرہ رہیں گے، کیونکہ دوسری جگہ فرمایا کہ اللہ ان کو بھی سنائے گا ان اللہ یسمع من یشاء (فاطر ۳۵-۲۲) دیکھو ع۲۷۱۹ ہاں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان لاتے ہیں وہ پیغمبر کی ہر بات کو سنتے اور مانتے ہیں اس لیے اعلیٰ مقامات پر پہنچ جاتے ہیں۔ سنانا اچھے اعمال کی طرف بلانا ہے پیغمبر کے بلانے پر اچھے اعمال کی طرف وہی رجوع کرے گا جو پہلے اس کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان لاتا ہے۔ یہی مضمون سورۂ روم ۳۰-۵۲ و ۵۳ میں ہے دیکھو ع۲۶۰۰ جہاں سماع موتیٰ پر بھی بحث ہے اور یہ بات کہ فی الحقیقت یہاں جسمانی مُردے مراد نہیں، روحانی مردے مراد ہیں۔ سورۂ فاطر ۳۵-۱۹ و ۲۳ سے واضح ہے جہاں یہ ذکر ہے کہ اندھے اور دیکھنے والے، اندھیرا اور روشنی۔ سایہ اور دھوپ، زندے اور مردے برابر نہیں اور پھر اس کے ساتھ ہی ہے وما انت بمسمع من فی القبور ان انت الا نذیر۔ تو قبروں والوں کو نہیں سنا سکتا، تو صرف ڈرانے والا ہے۔

ع۲۴۹۲ تکلم۔ کلم سے ہے دیکھو ع۵۷ اور تکلیم کے معنی بات کرنا ہے اور تکلیم بمعنی تجریح بھی آتا ہے یعنی زخمی کرنا اور بعض نے یہاں تَکْلِمُھُم پڑھا ہے جس کے معنی ہیں تجرحہم۔ لیکن اگر تُکَلِّمُھُم پڑھا جائے تو اس کے معنی بھی تُجَرِّحُھُم ہو سکتے ہیں (ل)

دابۃ الارض کا خروج: اس آیت میں ذکر ہے کہ جب لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات پر یقین نہیں رہے گا اور ان پر قول واقع ہو جائے گا یعنی اللہ تعالیٰ کی کوئی بات جو سختی یا عذاب سے تعلق رکھتی ہے ان کے حق میں پوری ہو جائے گی (دیکھو ع۲۲۴۲) تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے ایک دآبۃ زمین سے نکالے گا جو اُن سے باتیں کرے گا یا انہیں زخمی کرے گا۔ ابن کثیر کہتے ہیں یہ دابّہ آخری زمانہ میں لوگوں کے فساد کے وقت نکلے گا جب وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو ترک کر دیں گے اور دین حق کو تبدیل کر دیں گے۔ اور روح المعانی میں ہے کہ یہ جیسا کہ ابوسعید خُدری کی حدیث مرفوع سے اور ابن عمر کی حدیث موقوف سے ثابت ہے اس وقت ہوگا جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کر دیا جائے گا اور دس اشراط الساعۃ میں سے ایک شرط خروج دابہ بھی ہے دیکھو ع۱۰۴۰ اس سے اتنا معلوم ہوا کہ اس آیت کا تعلق مسلمانوں کی حالت کے بگڑ جانے سے ہے۔ اب غور طلب یہ ہے کہ دابۃ الارض سے کیا مراد ہے۔ روایات اس کے متعلق اس قدر ہیں کہ روح المعانی میں چند اس قسم کی روایات دیکر یہ قول نقل کیا ہے کہ روایات میں اسکی ماہیت اور اسکی شکل اور اسکی جائے خروج اور اسکی تعداد خروج اور اسکی مقدار خروج اور اس بارہ میں کہ لوگوں سے اس کا کیا معاملہ ہوگا اور وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے وہ نکلے گا ایسا اختلاف ہے کہ بعض روایات بعض کی معارض ہیں یعنی یہ سب پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں اور اسے قول حق قرار دیا ہے پس جب روایات کی یہ حالت ہے تو ان کی بنا پر یہ کہنا کہ دابۃ الارض کیا چیز ہے مشکل ہے اور اس مشکل کو خود قرآن کریم حل فرماتا ہے اس لیے کہ وہ اسے ایسا دابۃ قرار دیتا ہے جو لوگوں سے باتیں کرے گا اور کلام کرنا انسان سے خاص ہے اور دوسرا کوئی جانور کلام نہیں کرتا۔ اس محکم بات کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جن روایات میں یہ ذکر ہے کہ وہ دابۃ انسان ہے صحیح ہیں اور قرآن کریم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ دوسری جگہ بھی ایک دابۃ الارض کا ذکر ہے جس نے حضرت سلیمان کی سلطنت کو تباہ کر دیا یعنی ان کا ناخلف بیٹا دیکھو السبا ۳۴-۱۴- اور یہاں بھی حضرت سلیمان کا ذکر ہو چکا ہے تو پس دابۃ الارض سے مراد انسان ہی ہے جسے دابۃ الارض اس وجہ سے کہا کہ وہ بالکل اسباب ارضی پر گرا ہوا ہے اور خدا کی طرف اس کی نظر نہیں اٹھتی دیکھو النحل ۱۶-۶۱- اور فاطر ۳۵-۴۵ میں جہاں یہ ذکر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے پکڑے تو زمین پر کسی دابۃ کو باقی نہ چھوڑے۔ اب صاف معلوم ہوتا ہے کہ دابۃ سے مراد وہی لوگ ہیں جو زمین پر اس قدر جھک گئے ہیں کہ ان کی نظر خدا کی طرف اٹھتی ہی نہیں ورنہ انسانوں کے ظلم کی وجہ سے دوسرے جاندار نہیں ہلاک ہو سکتے۔ نہ نیک انسان ہلاک ہو سکتے ہیں دیکھو ع۲۷۲۸ پھر دابۃ الارض کے ایک یا کئی ہونے میں بھی اختلاف ہے قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ جنس پر دلالت کرتے ہیں اور ایک روایت میں بھی ہے کہ ہر شہر سے دابہ نکلے گا پس اسی قول کو ترجیح ہے اور اسی کے مطابق حضرت ابن عباس کا قول بھی ہے لیکن دابۃ الارض کے خروج کے وقت جس طرح اسے اہل مشرق دیکھیں گے، اسی طرح اہل مغرب دیکھیں گے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین پر پھیلی ہوئی قومیں ہیں جو مشرق و مغرب میں یکساں پھیل جائیں گی اور مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو آیات اللہ پر وہ یقین نہ رہے گا جو انسان کے اندر قوت عمل پیدا کرتا ہے اور اس لیے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بھی چھوڑ دیں گے تو ان کے لیے بطور سزا ایک ایسی مخلوق نکل پڑے گی جو بالکل زمین پر جھکی ہوئی ہو جیسے موجودہ عیسائی قومیں ہیں جن کے متعلق خود قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمایا ہے الذین ضل سعیہم

وَ يَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور جس دن ہم ہر امت سے ایک گروہ ان میں سے اکٹھا کریں گے، جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں پھر وہ روکے جائیں گے ۲۴۹۳

حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾

یہاں تک کہ جب وہ آئیں گے کہیگا کیا تم نے میری آیتوں کو جھٹلایا، حالانکہ تم نے اپنے علم سے اُن پر احاطہ نہ کیا تھا، بھلا تم کیا کرتے تھے۔

وَ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾

اور ان پر بات واقع ہو جائے گی اس لیے کہ انھوں نے ظلم کیا تو وہ بات نہ کریں گے۔

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾

کیا وہ غور نہیں کرتے کہ ہم نے رات کو بنایا ہے تاکہ وہ اس میں آرام کریں اور دن کو روشن (بنایا ہے) یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔

وَ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ كُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور جس دن صور میں پھونکا جائے گا پس جو کوئی آسمانوں میں ہیں اور جو کوئی زمین میں ہیں گھبرا جائیں گے سوائے اس کے جو اللہ چاہے اور سب عاجز ہو کر اس کے پاس آئیں گے۔

وَ تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّ هِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے تو انھیں جمے ہوئے سمجھتا ہے۔ اور وہ بادلوں کی طرح چلیں گے۔ اللہ کا کام ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا وہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو ۲۴۹۴

فی الحیٰوۃ الدنیا (الکہف ۱۸-۱۰۴) یعنی ان کی ساری کوشش دنیا کی زندگی تک ہی ختم ہو جائے گی اور اگر تکلمھم کے معنی زخمی کرنا لیا جائیں تو بھی صحیح ہے کہ مسلمانوں کو ان قوموں سے طرح طرح کے نقصانات بھی پہنچے ہیں اور ان کے جسم اور دل ان سے زخمی ہوئے ہیں۔ اور مخالفین کے ذکر میں اس بات کو اس لیے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت مسلمان کریں تو وہ بھی قابل گرفت ہیں اور اگر دابۃ الارض سے مراد انسان نہ لیے جائیں تو پھر مراد وہ تمام اسباب ہوں گے جو زمین سے ہی پیدا ہو کر انسان کی ہلاکت کا موجب ہو جاتے ہیں خواہ وہ طاعون اور وباؤں کے رنگ میں ہوں جن کے کیڑے زمین سے پیدا ہوتے ہیں اور خواہ جنگوں کے رنگ میں ہوں۔

۲۴۹۳ فوج اس جماعت کو کہا جاتا ہے جو گزرنے والی جلدی کرنے والی ہو جمع افواج ہے یدخلون فی دین اللہ افواجا (النصر ۱۱۰-۲) (رغ) یوزعون کے معنی ہیں شرارت اور فساد سے روکے جائیں گے یا آگے پیچھے ہونے سے روکے جائیں گے اور یا پہلوں کا روکنا ہے یہاں تک کہ پچھلے ان سے آملیں۔ میرے نزدیک پہلے معنی کو ترجیح ہے اور اس اکٹھا کرنے کے دن سے مراد اُن کی سزا کا دن ہے اور حتّٰی اذا جاء و اس کی تائید کرتا ہے اس لیے کہ یہ بعد کا ذکر ہے اور ممن یکذب بتاتا ہے کہ تکذیب کرنے والوں میں سے بعض کو سزا دی جائے گی اور یہ ان کے سردار ہیں چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں ابوجہل اور ولید بن مغیرہ اور شعبہ بن ربیعہ کا نام ہے (ر) تو مطلب یہ ہوا کہ سرداروں کو سزا دے کر ان کی شرارت سے روک دیا جائے گا اور باقی لوگ آخر کار ایمان لائیں گے۔ اور اہل تشیع اس آیت سے رجعت پر دلیل لیتے ہیں یعنی امام مہدی کے ظہور کے وقت ان لوگوں کو جنھوں نے ان کے خیال میں آئمہ اہل تشیع کے ساتھ زیادتی کی ہے دوبارہ اس دنیا میں لایا جائے گا اور مومنوں کو بھی تاکہ ان کو سزا ملے تو مومن خوش ہوں۔ اس سے بڑھ کر لغو خیال کچھ نہیں ہو سکتا اللہ تعالیٰ تو مومنوں کے ساتھ فلاح کا وعدہ اس دنیا کی زندگی میں کرتا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ مومن رہتے تو ناکام ہیں البتہ ایک خاص زمانہ میں جب مہدی غار سے نکلے گا تو اس وقت تکلیف پہنچانے والوں کو سزا دے کر مومنوں کا دل خوش کر دیا جائے گا یہ مسئلہ رجعت قرآن شریف کی ان آیات کے صریح خلاف ہے جن میں مُردوں کو اس دنیا میں واپس آنے کو منع کر دیا گیا ہے دیکھو ۲۳۴

۲۴۹۴ جامدۃ۔ جمد پانی کے متعلق کہا جاتا ہے جب وہ جم جائے یعنی برف بن کر ٹھوس ہو جائے اور وہ ذوب یا پگھلنے کا نقیض ہے اور جامد

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ
وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾

جو کوئی نیکی لاتا ہے اس کے لیے اس سے بہتر ہے اور وہ اس دن گھبراہٹ سے امن میں ہوں گے۔

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ
فِي النَّارِ ۭ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۰﴾

اور جو بدی لاتا ہے تو وہ اوندھے منہ آگ میں ڈالے جائیں گے تم کو بدلہ نہیں دیا جاتا مگر اسی کا، جو تم عمل کرتے تھے۔

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ
الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ۡ وَّاُمِرْتُ
اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾

مجھے صرف یہی حکم دیا گیا ہے کہ اس شہر کے رب کی عبادت کروں جس نے اسے حرمت والا بنایا اور ہر چیز اسی کے لیے ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداروں میں سے رہوں ع۲۴۹۵

وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى
فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ
فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۹۲﴾

اور کہ میں قرآن کی پیروی کروں، سو جو کوئی ہدایت اختیار کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے ہدایت اختیار کرتا ہے اور جو کوئی گمراہ ہوتا ہے تو کہدے میں صرف ڈرانے والوں میں سے ہوں۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ
فَتَعْرِفُوْنَهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ
ع ۱۱/۳ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور کہہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے وہ تمھیں اپنے نشان دکھائیگا۔ پھر تم انھیں پہچان لوگے اور تیرا رب اس سے غافل نہیں جو تم کرتے ہو ع۲۴۹۶

اور جلد ہ سخت چیز کو کہتے ہیں (ل)

اتقن۔ مادہ تقن ہے اور اتقان کے معنی احکام یعنی مضبوط کرنا ہیں (ل)

اس آیت میں بظاہر پہاڑوں کی مضبوطی اور ان کے آخر گزر جانے کا ذکر ہے لیکن آیت کا خاتمہ انہ خبیر بما تفعلون پر کیا ہے یعنی افعال انسانی کی جزا و سزا پر اس لیے جامد پہاڑوں کے گزر جانے میں اشارہ ان بڑے بڑے انسانوں کے گزر جانے کی طرف ہے جو حق کی مخالفت کرتے ہیں اور اسی لحاظ سے صنع اللہ الذی اتقن کل شئ بھی درست ہے جس میں یہ اشارہ ہے کہ حق اس قدر مضبوط چیز ہے کہ پہاڑ بھی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے اور بعض نے وھی تمر میں واؤ کو واؤ حالیہ لیا ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تو پہاڑوں کو اپنی جگہ پر جمے ہوئے سمجھتا ہے جو ہلتے نہیں اور وہ بادل کی تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں کیونکہ زمین کے ساتھ وہ چکر کھا رہے ہیں۔

ع۲۴۹۵ یہ شہر مکہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حرمت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور اس شہر کے رب کی عبادت میں اشارہ ہے کہ یہ شہر آپ کو دیا جائے گا۔

ع۲۴۹۶ اللہ تعالیٰ کے نشانوں کو پہچان لینے میں یہ بشارت ہے کہ یہ مخالف آخر کار ایمان لے آئیں گے۔

اٰیاتھا ٨٨ (٢٨) سُوْرَۃُ الْقَصَصِ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتھا ٩

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

طٰسٓمٓ ① — طور سینا پر موسیٰ (کی وحی پر غور کرو)

تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ② — یہ کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

نَتْلُوْا عَلَیْکَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ③ — ہم تجھ پر موسیٰ اور فرعون کی خبر سے کچھ حق کے ساتھ پڑھتے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ ٢٤٩٦-ا

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَۃً مِّنْھُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَھُمْ وَ یَسْتَحْیٖ نِسَآءَھُمْ ؕ — فرعون نے ملک میں سرکشی اختیار کی اور اس کے رہنے والوں کو فرقے بنا رکھا تھا، ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرتا جاتا تھا، ان کے بیٹوں کو مار دیتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا، وہ

نام: اس سورت کا نام القصص ہے اور اس میں نو رکوع اور ٨٨ آیات ہیں اور اس کا نام القصص سورت کے تیسرے رکوع میں آتا ہے۔ جہاں حضرت موسیٰ کے مصر سے ظالموں کے ہاتھ سے بھاگ کر مدین پہنچنے اور وہاں اپنی سرگزشت سنانے کا ذکر ہے۔ سورت کا نام ہی القصص رکھ کر اس واقعہ کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ہے کیونکہ حضرت موسیٰ کی مماثلت میں اسی کا خاص ذکر اس سورت میں مقصود ہے اور اس میں نبی کریم صلعم کی ہجرت مدینہ اور وہاں دس سال کے قیام کی طرف توجہ دلائی ہے، یہی وجہ ہے کہ پانچویں رکوع میں جہاں حضرت موسیٰ سے آنحضرت صلعم کی مماثلت کا ذکر ہے قیام مدین کا پھر خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اور سورت کا خاتمہ اس پیشگوئی پر کیا ہے کہ گو نبی صلعم اب مکہ سے بھاگتے ہیں مگر آپ کا یہاں واپس لایا جانا یقینی ہے گویا ہجرت ہی اس سورت کا خاص مضمون ہے اور اسی لیے حضرت موسیٰ کی ہجرت کی سرگزشت پر اس کا نام رکھا۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں مضمون کی ابتدا اس سے کی ہے کہ فرعون ایک قوم کو تباہ کرنا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ اس قوم کو بڑا بنانا چاہتا تھا اور پھر حضرت موسیٰ کی پیدائش اور دریا میں ڈالا جانا اور فرعون کا اس کی اپنی معرفت پرورش کرنا اسی پہلے رکوع میں مذکور ہے۔ دوسرے رکوع میں یہ ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ کو کس طرح ایک قبطی کے ساتھ کچھ معاملہ پیش آیا جس کا نتیجہ قبطی کی موت ہوا اور اسی کی وجہ سے آپ کو مصر سے بھاگنا پڑا۔ تیسرے رکوع میں آپ کے مدین پہنچنے اور وہاں دس سال ٹھہرنے کا ذکر ہے۔ چوتھے میں حضرت موسیٰ کی بعثت۔ فرعون سے مقابلہ اور فرعون کی ہلاکت کا ذکر ہے پانچویں میں حضرت موسیٰ کی آنحضرت صلعم سے مماثلت کا ذکر ہے جس میں یہ اشارہ کیا ہے کہ ان واقعات کے ذکر میں آپ کی تاریخ کا ہی ذکر ہے چھٹے رکوع میں بتایا ہے کہ گو حضرت موسیٰ کی اور آنحضرت صلعم کی وحی کو آپس میں ایک خاص مماثلت حاصل ہے مگر درحقیقت تمام انبیاء کی وحیوں کو باہم ایک تعلق حاصل ہے اور نہ صرف ان کی تعلیم کے اصل الاصول ایک ہیں بلکہ ایک دوسرے کے لیے پیشگوئیاں بھی موجود ہیں بالخصوص سب کی پیشگوئیاں ہمارے نبی صلعم کے لیے ہیں ساتویں میں بتایا کہ جو لوگ نمبردار بنکر دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ انکا انجام کیسا ہے آٹھویں میں قارون کا ذکر ہے کہ اس نے بھی کثرت مال پر فخر کرکے دوسروں کو گمراہ کیا۔ اور نویں میں آنحضرت صلعم کے ہجرت کے بعد مکہ واپس آنے کی پیشگوئی کا ذکر کیا۔

تعلق: یہ طسم کے مجموعہ کی آخری سورت ہے۔ سب سے پہلی یعنی سورۃ الشعراء میں فرعون کی ہلاکت کا ذکر کرکے بتایا تھا کہ بنی اسرائیل کو طاقت اور حکومت ملے گی۔ دوسری یعنی النمل میں بتایا کہ حضرت موسیٰ کے سلسلہ کو یہ عظمت حضرت سلیمان کے زمانہ میں نصیب ہوئی اب اس تیسری میں بتایا ہے کہ نبی کریم صلعم کی یہ شان وشوکت آپ کی ہجرت سے وابستہ ہے۔ اسلام کی کل ترقیوں کی بنیاد ہجرت ہے اس لیے اس سورت کو اس مجموعہ کے آخر پر رکھا۔

زمانہ نزول: زمانہ نزول کے متعلق جو کچھ سورۃ الشعراء میں لکھا گیا ہے کافی ہے اس سورت کے آخری رکوع کی ایک آیت کا نزول عین ہجرت کے اندر ہوا۔ ممکن ہے ساری سورت ہجرت کے بالکل قریب زمانہ میں نازل ہوئی ہو۔

٢٤٩٦-ا فرعون اور بنی اسرائیل کے قصہ کو مومنوں کے لیے بیان کرنا صاف بتاتا ہے کہ اس میں مسلمانوں اور ان کے اعدا کا ذکر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آنحضرت صلعم کے ساتھ بھی قریش نے وہی سلوک کیا جو فرعون نے حضرت موسیٰ کے ساتھ کیا مگر جیسی صفائی سے فرعون اور موسیٰ کی تاریخ موجودہ زمانہ میں دہرائی گئی ہے وہ ایسی بےنظیر ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ مثال بیان فرمائی تھی۔ آج مہذب حکمرانوں نے مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے عجیب عجیب طریق ایجاد کیے ہیں آج انہیں بہت سے حقوق سے محروم کیا جاتا ہے جو مہذب قوموں کے لیے خاص سمجھے جاتے ہیں اور باایں عیسائیت اپنے سارے

إِنَّهُۥ كَانَ مِنَ ٱلْمُفْسِدِينَ ﴿٤﴾
فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ ۲۴۹۷

وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى ٱلَّذِينَ ٱسْتُضْعِفُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ ٱلْوَٰرِثِينَ ﴿٥﴾
اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو زمین میں کمزور کیے گئے تھے اور اُنھیں امام بنائیں ، اور اُنھیں وارث بنائیں ۲۴۹۸

وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ وَنُرِىَ فِرْعَوْنَ وَهَـٰمَـٰنَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا۟ يَحْذَرُونَ ﴿٦﴾
اور انھیں زمین میں طاقت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو ان سے وہ چیز دکھائیں ، جس سے وہ ڈرتے تھے ۲۴۹۹

وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ أُمِّ مُوسَىٰٓ أَنْ أَرْضِعِيهِ ۖ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِى ٱلْيَمِّ وَلَا تَخَافِى وَلَا تَحْزَنِىٓ ۖ إِنَّا رَآدُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ ٱلْمُرْسَلِينَ ﴿٧﴾
اور موسیٰؑ کی ماں کو ہم نے وحی کی کہ اسے دودھ پلا ، پھر جب اس کے متعلق تجھے خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور نہ ڈرنا اور نہ غم کرنا ، ہم اسے تیری طرف واپس لائیں گے اور اسے مرسلوں میں سے بنائیں گے ۲۵۰۰

سامانوں اور ساری شان وشوکت کے ساتھ اسلام کے نام سے خائف ہے جو چاہے آج موسیٰ کی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ میں پڑھ لے۔

۲۴۹۷ فرعون کے اس ملک کے رہنے والوں کو گروہ گروہ کردینے سے یہ منشا ہے کہ ایک ہی ملک کے رہنے والوں کے مختلف گروہ بنا دیئے ایک گروہ کے حقوق بہت قرار دیئے اور دوسرے کو ذلیل رکھنا چاہا۔ یہ دوسرا گروہ بنی اسرائیل کا تھا جنہیں اس ملک میں رہتے ہوئے عرصہ دراز گزر چکا تھا اب فرعون نے ان کو ملک میں اچھے کاموں اور اعلیٰ عہدوں سے محروم کرکے طرح طرح کی ذلت کے کام ان کے سپرد کیے یسومونکم سوء العذاب یہاں تک کہ اس ساری قوم کو غلامی کی حالت میں رکھنا شروع کیا ان عبدت بنی اسرائیل اور اپنی قوم کو حاکم اور مالک بنایا۔ اسی وجہ سے اسے مفسد کہا ہے۔ فساد صرف یہی نہیں کہ ملک میں بدامنی پھیلائے بلکہ کسی قوم کو انسانیت کے حقوق مساوی سے محروم کرنا بھی فساد ہے۔ یہی وہ فساد ہے جس کا ارتکاب آج دنیا میں مغربی قومیں کررہی ہیں کہ وہ مشرقی قوموں کو کمزور اور بہت سے حقوق سے محروم کررہی ہیں۔

۲۴۹۸ ائمۃ سے مراد دین میں پیشرو ہیں۔ وارثین سے مراد ملک وحکومت کے وارث ہیں یعنی الٰہی ارادہ یہ تھا کہ ان میں دین و دنیا کی دونوں خوبیاں جمع کردے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ دنیا میں کمزوروں کو طاقتور بنا کر اور اپنی طاقت پر فخر کرنے والوں کو نیچا دکھا کر اپنی قدرت کا ہاتھ دکھاتا رہا ہے۔ یہی نظارہ بنی اسرائیل میں دکھایا۔ یہی محمد رسول اللہ صلعم کے اصحاب میں دکھایا جس کی طرف یہاں اشارہ ہے اور یہی وہ اب پھر بھی دکھائے گا۔ کیونکہ اب بھی بعض قومیں دوسری قوموں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کرکے کمزور کرنا چاہتی ہیں۔

۲۴۹۹ ھامان۔ فرعون کا سرلشکر یا کوئی اور بڑا عہدے دار معلوم ہوتا ہے۔ بائبل میں اس کا ذکر نہیں، مگر ایران کے ایک بادشاہ کے مقربین میں سے ایک کا نام ہامان تھا۔ اس لیے پادری صاحبان اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن نے خلط واقعات کردیا ہے۔ بائبل میں تو جو کچھ ہے وہ بھی قابل اعتماد نہیں۔ جن باتوں کا اس میں ذکر نہیں ان کو فرضی قرار دینا انہی عقلمندوں کا کام ہوسکتا ہے جو تین کے ایک کے برابر ہونے کے قائل ہیں۔ یہ کیوں ناممکن ہے کہ فرعون کے کسی سردار کا نام بھی ہامان ہو قرآن کریم نے ایسے ایسے واقعات بیان کرکے جنہیں دنیا میں کوئی نہ جانتا تھا اور جن کی صداقت پر آج واقعات نے مہر لگا دی ہے اپنے بیانات کا ہر قسم کے شبہات سے بالاتر ہونا ثابت کردیا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کو بنی اسرائیل سے کچھ خوف تھا، یعنی یہ کہ یہ قوم کسی دن غالب آجائے گی۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ ان کی تعداد مصریوں کے مقابل میں کچھ بھی نہ تھی۔ بعینہٖ یہی حالت آج مغربی اقوام کی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو خوب پامال کرکے اور ان کی طاقت کو جہاں تک ممکن تھا توڑ کر اور انہیں دنیا بھر میں اپنے غلام بنا کر پھر بھی ان سے ہر وقت ڈرتے ہیں اور پین اسلامزم کا نام یورپ کے لیے ایک ہوّا بنا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آخر جو چیز غالب آنے والی ہوتی ہے اس کا خوف بڑے بڑے طاقتوروں کے دلوں میں ہوتا ہے خواہ وہ کتنی کمزور نظر آئے اسلام کا جو خوف یورپ کے دلوں میں ہے وہی اس بات کی کافی شہادت ہے کہ اسلام غالب آنے والا ہے۔

۲۵۰۰ غیر انبیاء کو وحی یقینی ہونا: حضرت موسیٰ کی ماں نبی نہ تھیں مگر ان کو وحی ہوئی جس سے یہ یقینی نتیجہ نکلتا ہے کہ غیر انبیاء کو وحی ہوتی ہے اور اس لیے گو اس

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ۝۸

پس فرعون کے لوگوں نے اُسے اٹھالیا تاکہ وہ ان کے لیے دشمن اور (موجب) غم ہو۔ فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر بلاشبہ خطاکار تھے ع۲۵۰۱

وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖۗ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹

اور فرعون کی عورت نے کہا میرے لیے اور تیرے لیے آنکھ کی ٹھنڈک ہے اسے قتل نہ کرو، شاید وہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنالیں اور وہ نہیں جانتے تھے۔

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰

اور موسیٰؑ کی ماں کا دل خالی ہوگیا، قریب تھا کہ وہ اسے ظاہر ہی کر دیتی اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ کر دیتے تاکہ وہ مومنوں میں سے ہو ع۲۵۰۲

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ؗ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۱

اور (موسیٰ کی ماں نے) اس کی بہن سے کہا، اس کے پیچھے پیچھے جا، سو وہ اُسے دُور سے دیکھتی رہی اور انھوں نے معلوم نہ کیا۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝۱۲

اور ہم نے اسے پہلے سے (اور) دودھ پینے سے روک دیا، سو اس نے کہا کیا میں تمھیں ایسے گھر والے بتاؤں جو اسے تمھارے لیے پالیں اور اس کے خیر خواہ ہوں۔

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳ ع

سو ہم نے اسے اس کی ماں کی طرف واپس کر دیا تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ غم نہ کرے اور تاکہ وہ جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

امت میں نبوت نہیں مگر وحی کا سلسلہ جاری ہے اور غیر انبیاء کی وحی کا یقینی ہونا خود یہاں سے ظاہر ہے اس لیے کہ حضرت موسیٰ کی ماں کو بذریعہ وحی اطلاع دی گئی کہ جب فرعون کی طرف سے پکڑے جانے کا خوف ہو تو بچہ کو دریا میں ڈال دے دوسری جگہ ہے صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دے ان اقذفیہ فی التابوت فاقذفیہ فی الیم (طٰہٰ ۲۰-۳۹) اگر یقینی وحی نہ ہوتی تو ماں اپنے بچّہ کو ہلاکت میں نہ ڈالتی۔ضائع ہونے کا خوف نہیں اس لیے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کو بچانے کا وعدہ کیا۔ اور مفارقت کا غم نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے واپس لانے کا وعدہ کیا۔ بائبل میں یہ ذکر نہیں کہ حضرت موسیٰ کی ماں کی طرف اللہ تعالےٰ نے وحی کی تھی بلکہ موسیٰ کو دریا میں ڈال دینا محض اس کے اپنے خیال کی طرف منسوب ہے۔قرآن کریم نے اس حقیقت کو ظاہر کر کے اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایک دلیل بنا دیا ہے۔ بائبل میں یہ ایک بھاری نقص ہے کہ اس نے ان تذکروں کو محض قصّوں کا رنگ دیدیا ہے اور وہ چیز جس سے بڑے بڑے روحانی یا اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں وہ اس میں نہیں پائی جاتی یہ کمال قرآن کریم کا ہے کہ بائبل کے ان نقصوں کو دور کر دیا ہے۔

ع۲۵۰۱ التقط۔ لَقْطٌ اور اِلْتِقَاطٌ کے معنی ہیں ایک چیز کا زمین سے اُٹھالینا یا لے لینا اور لُقْطَة وہ چیز ہے جو پڑی ہوئی پائی جائے اور اٹھالی جائے (ل)

لیکون میں لام عاقبت کا ہے یعنی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان کا دشمن اور ان کے لیے موجب غم ہوا۔ یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے اٹھایا اس غرض سے تھا کہ وہ ان کا دشمن اور ان کے لیے موجب غم ہو۔

ع۲۵۰۲ فارغ۔ فراغ دیکھو ع۳۲۰ اور فارغ کے معنی خالی ہیں یہاں مراد بعض نے موسیٰ کے ذکر سے خالی لیا ہے یعنی اس کا ذکر بھول گئی اور اسے تسکین قلب حاصل ہوگئی اور بعض کے نزدیک سوائے اس کے ذکر کے اور چیزوں سے خالی ہونا مراد ہے (غ) لا تخافی ولا تحزنی کی بشارت بتاتی ہے کہ خوف وحزن سے خالی ہونا مراد ہے ان کادت لتبدی بہ۔ یعنی قریب تھا کہ وہ ظاہر کر دیتیں اگر اللہ تعالیٰ نے دل مضبوط نہ کر دیا ہوتا۔ اور بعض نے ظاہر کر دینے سے

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَىٰ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٤﴾

اور جب (موسیٰ) اپنی جوانی کو پہنچا اور کمال حاصل کیا ہم نے اسے فہم اور علم دیا۔ اور اسی طرح ہم احسان کرنے والوں کو بدلے دیتے ہیں ۲۵۰۳

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِن شِيعَتِهِ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ ۖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِن شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ۖ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾

اور وہ شہر میں اس کے باشندوں کی بےخبری کے وقت میں داخل ہوا، تو اس میں دو شخصوں کو لڑتے پایا وہ (ایک) اس کی قوم سے تھا اور وہ (دوسرا) اس کی دشمن (قوم) سے تو اس نے جو اس کی قوم سے تھا اس کے خلاف اس سے مدد مانگی جو اس کی دشمن (قوم) سے تھا، پس موسیٰ نے اُسے ایک مُکّا مارا اور اس کا کام تمام کردیا۔ کہا یہ شیطان کے عمل کی وجہ سے ہے، وہ کھلا گمراہ کرنے والا دشمن ہے ۲۵۰۴

قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿١٦﴾

کہا میرے رب میں نے اپنی جان پر ظلم کیا، سو میری حفاظت فرما۔ سو اللہ نے اس کی حفاظت فرمائی وہ حفاظت کرنیوالا رحم کرنیوالا ہے ۲۵۰۵

مراد لیا ہے کہ بسبب خوشی کے جو حضرت موسیٰ کے بچ جانے سے حاصل ہوئی اس واقعہ کو ظاہر کر دیتی (ر)

۲۵۰۳ یہ حُکم یعنی فہم (دیکھو ۱۹۸۰ع) اور علم نبوت سے قبل ہیں اسی لیے فرمایا کہ ہر ایک نیکی کرنے والے کو ہم فہم اور علم دیتے ہیں نبوت آپ کو بہت بعد میں ملی۔

۲۵۰۴ وکز۔ وَکزٌ بند کیے ہوئے ہاتھ یعنی مکے سے مارنا اور روکنا ہے (غ)

قضی۔ دیکھو ۱۴۹اع وغیرہ۔ مگر قضا سے مراد موت بھی لی جاتی ہے جیسے من قضی نحبہ (الاحزاب ۳۳-۲۳) میں بعض نے معنی نذر کا پورا کرنا اور بعض نے موت مراد لی ہے اور موت کے معنی میں ہے یلیتہا کانت القاضیۃ (الحاقۃ ۶۹-۲۷) لیقض علینا ربك (الزخرف ۴۳-۷۷) (غ) یہاں معنی موت ہی ہیں۔

حضرت موسیٰ کا قبطی کو مارنا آپ کی عصمت کے خلاف اعتراض سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ حضرت موسیٰ نے صرف اسے اسرائیلی پر حملہ کرنے سے روکا ہے اور ایک مکّا مارا ہے یہ تو ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل غلامی کی حالت میں تھے اس لیے قبطی کی زیادتی اسرائیلی پر ہو سکتی تھی نہ اسرائیلی کی قبطی پر پس حضرت موسےٰ کا اسرائیلی کو بچانے کے لیے قبطی کو مکا مارنا بالکل حق بجانب فعل تھا اور بائبل میں یہ ذکر موجود بھی ہے کہ مصری اسرائیلی کو مار رہا تھا (خروج ۲: ۱۱) لیکن مکّا مارنا قتل کرنے کا ذریعہ نہیں اس لیے حضرت موسیٰ کا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہ تھا۔ مگر قبطی مرگیا جس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ پہلے ہی شراب خوری یا کسی اور وجہ سے ایسی حالت کو پہنچا ہوا تھا کہ ایک مُکّے سے مرگیا اور اگر یہ کہا جائے کہ ایسا شخص دوسرے پر زیادتی کیا کر سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حاکم و محکوم کا فرق ہے محکومیت کی حالت میں رہ کر یہ حالت ہو جاتی ہے کہ بڑے بڑے قوی آدمی ایک ذلیل نیم مردہ حاکم سے بھی مار کھا لیتے ہیں اور سامنے بولنے کی جرأت نہیں کرتے ھذا من عمل الشیطان سے حضرت موسیٰ کی مراد یہ نہیں ہو سکتی کہ یہ میرا فعل عمل شیطانی ہے کیونکہ وہ تو بالکل حق بجانب تھا۔ پس ھذا من عمل الشیطان میں یا تو یہ بتایا ہے کہ یہ تمہاری موت تمہاری اس زیادتی اور ظلم کا نتیجہ ہے جو تم نے ایک غریب اسرائیلی پر کیا۔ اور وہ یقیناً شیطانی فعل ہے اور یا مطلب یہ ہے کہ ایک مُکّے سے موت کا واقع ہو جانا اس شخص کے کسی شیطانی فعل شراب خوری یا زنا کاری کا نتیجہ ہے۔

قرآن کی اصلاح بائبل کا ایک اور واقعہ: بائبل میں بجائے مکّا مارنے کے یوں ذکر ہے: "تب اس مصری کو مار ڈالا اور ریت میں چھپا دیا" (خروج ۲: ۱۲) جو صاف طور پر ایک مجرمانہ فعل نظر آتا ہے تعجب ہے ان لوگوں پر جو کہہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم بائبل سے لیتا ہے۔ حالانکہ یہاں قدم قدم پر بائبل کی اصلاح موجود ہے صرف ایک مُکّے کا ذکر کرکے قرآن کریم نے انبیاء کی عصمت کے اصول کو قائم رکھا ہے بائبل میں اس ذکر کے نہ ہونے سے یہ ایک مجرمانہ فعل بن گیا ہے۔

۲۵۰۵ یہاں نفس پر ظلم سے مراد اپنے آپ کو مشکلات میں ڈالنا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ نے اس طرح ظالموں کو اپنے اوپر ظلم کرنے کا ایک موقعہ دیدیا اور غفر سے مراد حفاظت ہے اور اگر اسے کوئی غلطی بھی مانا جائے تو یہ غلطی ارادہ اور عمد سے نہیں نہ گناہ کہلا سکتی ہے بلکہ یہ ایک خطا تھی کہ مکّا مارا تو

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَکُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۷﴾

کہا میرے رب اس لیے کہ تو نے مجھ پر انعام کیا میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ ہوں گا ۲۵۰۶ ؏

فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَةِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ یَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤی اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸﴾

پس شہر میں ڈرتے ہوئے انتظار کرتے ہوئے صبح کی۔ کہ ناگہاں وہی شخص جس نے کل اس سے مدد مانگی تھی اُسے مدد کے لیے پکارنے لگا۔ موسیٰؑ نے اُسے کہا، تو یقیناً کھلا گمراہ ہے ۲۵۰۷ ؏

فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ یٰمُوْسٰۤی اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ کَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِیْدُ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَمَا تُرِیْدُ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾

پس جب اس نے ارادہ کیا کہ اسے پکڑے جو دونوں کا دشمن تھا، اس نے کہا اے موسیٰؑ کیا تو چاہتا ہے کہ مجھے قتل کر دے، جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر دیا، تُو کچھ نہیں چاہتا مگر یہی کہ ملک میں زبردست ہو جائے، اور تو نہیں چاہتا کہ تو اصلاح کرنے والوں میں سے ہو ۲۵۰۸ ؏

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰی ۫ قَالَ یٰمُوْسٰۤی اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۲۰﴾

اور شہر کی پرلی طرف سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا اے موسیٰؑ بڑے بڑے لوگ تیرے متعلق مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیں، سو تو نکل جا۔ میں تیرے خیر خواہوں میں سے ہوں۔

موت واقع ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کا حفاظت فرمانا یہ تھا کہ حضرت موسیٰ کو ایک ظالم حاکم قوم کے ہاتھ سے بچا دیا۔

؏۲۵۰۶ انعام تو حضرت موسیٰ پر قبطی کے قتل سے بہت پہلے سے تھا پس مراد یہی ہے کہ تیرے انعامات کو پا کر میں مجرموں کا مددگار کبھی ہو سکتا ہی نہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ پیچھے جو کیا سو کیا آیندہ مجرموں کا مددگار نہیں ہونگا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کے جرم میں اس کی اعانت کرنا بھی جرم ہے۔

؏۲۵۰۷ امس۔ گزرے ہوئے دن کو کہتے ہیں مگر قریب گذشتہ زمانہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث مغیرہ میں ہے ھل غسلت سوأتك الا امس جہاں اشارہ کسی بیوفائی کی طرف ہے جو مغیرہ نے ایام جاہلیت میں کسی قوم سے کی تھی اس کو یہاں امس کہا ہے یعنی کل تو نے ایسا کیا تھا۔

یستصرخ۔ صرخ کے لیے دیکھو ؏۲۱ اور استصراخ اور استغاثۃ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی مدد چاہنا (ل)۔

یہاں پھر اسی اسرائیلی کا ذکر ہے جس کی مدد پہلے حضرت موسیٰ نے کی تھی اس کا فریاد کرنا بتاتا ہے کہ وہ کسی سے لڑائی کر رہا ہے یہ دوسرا شخص مصری ہے یا اسرائیلی۔ قرآن کریم میں ذکر نہیں مگر بائبل میں ہے کہ اس موقعہ پر دونوں عبرانی تھے جو باہم لڑ رہے تھے اور یہی درست بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہاں زیادتی کرنے والا جسے حضرت موسیٰ گمراہ قرار دیتے ہیں وہی کل والا اسرائیلی ہے اور ایک محکوم اسرائیلی کا حاکم مصری پر زیادتی کرنا بعید از قیاس ہے۔

؏۲۵۰۸ یہاں عدو لھما کون ہے یعنی دو کا دشمن۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی شخص ہے جسے حضرت موسیٰ نے غویٰ کہا ہے یعنی غلطی پر قرار دیا ہے کہ وہ اپنے بھائی پر زیادتی کر رہا تھا۔ پس اوّل تو وہ اس شخص کا دشمن تھا جس پر زیادتی کر رہا تھا اور پھر حضرت موسیٰ کا بھی دشمن ہوا اس لیے کہ وہ ناحق پر تھا۔ حضرت موسیٰ نے ارادہ کیا کہ اس ظالم کو پکڑ کر مظلوم کو چھڑا دے اس نے شور ڈال دیا کہ کل تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا آج مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ اس سے حکام کو خبر پہنچ گئی اور انہوں نے حضرت موسیٰ کی گرفتاری کا فیصلہ کیا مگر کسی خیر خواہ نے گرفتاری سے پہلے حضرت موسیٰ کو خبر پہنچا دی جیسا کہ اگلی آیت میں ذکر ہے اور آپ وہاں سے بھاگ گئے۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِىْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۱﴾ ع ۲ / ۸

سو ڈرتا ہُوا انتظار کرتا ہُوا اس سے نکل پڑا۔ کہا میرے رب مجھے ظالم لوگوں سے نجات دے۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّىْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِىْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾

اور جب (موسیٰؑ نے) مدین کی طرف رُخ کیا، کہا اُمید ہے کہ میرا رب مجھے سیدھے رستہ پر چلائے گا۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۵ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِىْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ۫ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾

اور جب مدین کے پانی پر پہنچا، اس پر لوگوں کے ایک گروہ کو (مویشیوں کو) پانی پلاتے ہوئے پایا، اور ان سے سوائے دو عورتوں کو پایا، جو (اپنی بکریوں کو) روک رہی تھیں۔ کہا تمہارا کیا معاملہ ہے۔ انھوں نے کہا ہم پانی نہیں پلا سکتیں، جب تک کہ چرواہے (اپنے جانوروں کو) نہ لے جائیں اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے ع۲۵۰۹

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾

سو اس نے اُن کے لیے پانی پلا دیا، پھر سایہ کی طرف پھر آیا اور کہا میرے رب جو بھلائی تو میری طرف بھیجے میں اس کا محتاج ہوں۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِىْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۡ قَالَتْ اِنَّ اَبِىْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۭ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾

پس اُن دونوں میں سے ایک حیا سے چلتی ہوئی آئی، کہنے لگی میرا باپ تجھے بلاتا ہے، تاکہ تجھے اس کی اجرت بدلہ میں دے، جو تو نے ہمارے لیے پانی پلایا۔ سو جب اس کے پاس آیا اور سرگزشت اس سے بیان کی، اس نے کہا ڈر نہیں تو ظالم لوگوں سے بچ گیا ع۲۵۱۰

ع۲۵۰۹ تذودان۔ ذود کے معنی چلانا، ہانکنا اور روکنا ہیں۔

یصدر۔ صَدْر سینہ کو کہتے ہیں پھر ہر چیز کے مقدم کو اور صَدَرَہٗ اس کا قصد کیا اور صلہ عَنْ ہو تو اس کے معنی انصراف یعنی پھرنا ہوتے ہیں (غ)

اور اَصْدَر دوسرے کو پھیرا یہاں جانوروں کو واپس لیجانا مراد ہے۔

رعاء۔ اور رُعاۃ۔ راعٍ کی جمع ہیں اور رَعْی اصل میں حیوان کی حفاظت ہے غذا پہنچانے سے ہو یعنی چرانے سے یا دشمن سے اس کے بچانے سے اور مَرْعٰی چرنے کی جگہ ہے وارعوا انعامکم (طٰہٰ ۲۰-۵۴) اخرج منھا ماءھا ومرعٰھا (النّٰزعٰت ۷۹-۳۱) پس راع چرواہا ہے اور رَعْی اور رعاء حفاظت اور سیاست پر بھی آتا ہے جیسے حدیث میں ہے کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ (غ)

یہ شیخ کبیر اکثر مفسرین کے نزدیک حضرت شعیبؑ تھے اور بعض نے کہا ہے شعیب کے بھتیجے اثرون تھے اور شعیب کا نام بائبل میں یثرو ہے اور بائبل میں اس شخص کو مدین کا کاہن رعوائل نام قرار دیا ہے اور یہی نام مفسرین میں سے ابن جریج نے اختیار کیا ہے یہ بھی فطرت انبیاء کا نقشہ ہے کہ وہ کمزوروں اور ضعیفوں کے حامی ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ بالکل نووارد اجنبی ہیں مگر جب دو لڑکیوں کی بیکسی کو دیکھا تو ان کی فطری ہمدردیٔ انسانی نے جوش مارا اور ہمارے نبی کریم صلعم نے تو یتیموں بیواؤں عورتوں غلاموں کے حقوق دلانے میں وہ کام کیا جو دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔

ع۲۵۱۰ اس میں یہ تعلیم دی ہے کہ عورت کی چال میں خصوصیت سے حیا ہونا چاہیئے اپنے کام کاج کے لیے عورتوں کو باہر نکلنا پڑتا ہے اور ان کے باہر نکلنے میں ہرج کوئی نہیں لیکن وہ اگر حیا سے اپنی آنکھ کو نیچا رکھیں اور صرف اپنے کام سے کام رکھیں تو دوسروں پر بھی نیک اثر ڈال سکتی ہیں اور یہ بھی کہ کوئی کچھ کام کرے تو اس کی اُجرت دیدینی چاہیئے۔ اسی لفظ القصص سے جو اس آیت میں آیا ہے اس سورت کا نام لیا گیا ہے کیونکہ اس سورت میں اہمیت اسی واقعہ کو دی۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ز
اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿٢٦﴾
قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى
ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ
حِجَجٍ ج فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ
عِنْدِكَ ج وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ط
سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٢٧﴾
قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ط اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ
قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ط وَاللّٰهُ عَلٰى
ع مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿٢٨﴾
فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ

دونوں (لڑکیوں) میں سے ایک نے کہا اے میرے باپ اسے نوکر رکھ لے
بہترین نوکر جو تو رکھنا چاہے مضبوط امین ہے ع٢٥١١
اس نے کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح
تجھ سے کردوں اس شرط پر کہ تو آٹھ سال میری نوکری کرے
پھر اگر تو دس (سال) پورے کرے تو یہ تیری طرف سے
ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر تکلیف ڈالوں۔ اگر
اللہ چاہے تو تو مجھے نیکوکاروں سے پائے گا ع٢٥١٢
(موسیٰ نے) کہا یہ میرے اور تیرے درمیان وعدہ ہوا، جونسی مدت
میں پوری کردوں مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی، اور اللہ اس پر
جو ہم کہتے ہیں کارساز ہے۔
سو جب موسیٰ نے مدت پوری کرلی اور اپنے گھر والوں کے ساتھ

گئی ہے اور اصل میں اس کو وقعت دیکر اشارہ نبی کریم صلعم کی ہجرت اور ظالموں کے ہاتھ سے نجات پانے وغیرہ کی طرف کیا ہے۔ گویا توجہ دلائی ہے کہ اس سورت میں اہم واقعہ جس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے حضرت موسیٰ کی ہجرت مدین اور وہاں سے بالآخر واپس آنا ہے دیکھو ع٢٥١٢ و ع٢٥٤٢ ۔

ع٢٥١١ استاجر۔ اَجر اور اُجرۃ وہ ہے جو عمل کے بدلے سے لوٹ کر آتا ہے دنیوی ہو یا اُخروی ان اجری الا علی اللہ (یونس ١٠۔ ٧٢) اٰتینٰہ اجرہ فی الدنیا (العنکبوت ٢٩۔ ٢٧) اور اَجر کے معنی ہیں کوئی چیز اسے اُجرت کے بدلہ میں دی ان تاجرنی ثمٰنی حجج (٢٧) یعنی ملازمت اختیار کرنا گویا نفسک یہاں محذوف ہے اور اِستِیجار کسی چیز کا اجرت کے عوض طلب کرنا ہے پھر اجرت پر کسی چیز کا لینا بھی اس سے مراد لیا جاتا ہے اور یہی یہاں مراد ہے (غ)

ع٢٥١٢ حجج۔ حِجّۃ کی جمع ہے جس کے معنی سال ہیں ۔

لڑکی کے نکاح میں دینے کا عوض لینا جائز نہیں: یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بیٹی دینے کے عوض میں خدمت نہیں لی گئی بلکہ اس خدمت کا ذکر نکاح سے پہلے سے ہے ظاہر ہے کہ شیخ کبیر کو ضرورت ہے کہ کوئی اس کا ملازم ہو اور حضرت موسیٰ کو بھی ضرورت ہے کہ کوئی صورت ان کے معاش کی ہو اس لیے خود بیٹیاں یہ تجویز کرتی ہیں کہ حضرت موسیٰ کو ملازم رکھ لیا جائے۔ نکاح کر دینا الگ معاملہ تھا البتہ یہ ضرور تھا کہ لڑکی کے والد نے چاہا کہ کم ازکم کچھ مدت ان کا داماد ان کے پاس رہے اس لیے آٹھ سال کی شرط لگائی۔ اور اس ملازمت کے لیے اجر اور استاجر اختیار کرکے خود بتا دیا کہ مراد اس سے کوئی کام کسی اجرت کے عوض لینا ہے۔ پس کام کی اُجرت الگ ہے جس سے نکاح کو کوئی تعلق نہیں۔ جن لوگوں نے اس سے یہ نکالا ہے کہ بیٹی نکاح میں دیکر داماد سے کچھ وصول کرلینا جائز ہے انہوں نے سخت غلطی کھائی ہے اور یہ رواج جو بعض قوموں میں پایا جاتا ہے اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے فمن عندک سے مراد یہ ہے کہ یہ تمہارے اختیار کی بات ہے میں مجبور نہیں کرتا۔ یہ مطلب نہیں کہ پھر تم جس سے چاہو نکاح کرلو۔

حضرت موسیٰ کی تاریخ میں آنحضرت صلعم اور اسلام کی تاریخ کا ہونا خود قرآن کریم سے ثابت ہے، لیکن بعض پہلو اس تاریخ کے نہایت حیرت انگیز ہیں یہ آٹھ اور دس سال حضرت موسیٰ کے مدین میں رہنے کا واقعہ بائبل میں مذکور نہیں، مگر قرآن کریم نے اسے بیان کیا ہے اور اس کی سچائی پر اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ بعینہٖ یہی واقعہ آنحضرت صلعم کو پیش آتا ہے۔ یہ سورت مکّی ہے ہجرت کے قریب کی ہے اس کی ایک آیت عین ہجرت کے اندر نازل ہوئی جس میں یہ وعدہ ہے کہ اس وقت تو تم مکّہ سے بھاگ رہے ہو لیکن ہم اسی مکّہ میں تمہیں واپس بھی لائیں گے ان الذی فرض علیک القراٰن لرادّک الی معاد (٨٥) تو حضرت موسیٰ کے مدین میں آٹھ اور دس سال کا واقعہ اس لیے بیان کیا کہ جتنی مدت وہ مدین رہے وہی مدت آنحضرت صلعم کی مدینہ میں رہنے کی تھی۔ آٹھ سال بعد آپ مکّہ میں بحیثیت فاتح واپس آجاتے ہیں اور دس سال آپ کی کل مدّتِ اقامت مدینہ ہے جس کے بعد آپ رفیق اعلےٰ سے جا ملتے ہیں کیا اس واقعہ سے صاف معلوم نہیں ہوتا کہ آٹھ اور دس سال کا واقعہ عالم الغیب خدا کی طرف سے ہے بائبل ناقص ہے اور قرآن کریم نے اس کے نقصوں کی اصلاح کی ہے اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ گو آج یہودی انسکلوپیڈیا سے ہمیں اسباب کی شہادت ملتی ہے کہ حضرت موسیٰ مدین میں دس سال رہے مگر آٹھ سال کا ذکر وہاں بھی نہیں کیا۔ یہ عالم الغیب خدا کے سوائے کسی کا کلام ہوسکتا ہے!

اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ
لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ
اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ
النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

چلا، طور کی طرف سے آگ دیکھی، تو اپنے گھروالوں سے کہا، ٹھیرو! مَیں نے آگ دیکھی ہے شاید میں تمھیں اس سے کچھ خبر لا دوں یا آگ کا انگارہ (لا دوں)، تاکہ تم تاپو ۲۵۱۳

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِیِٔ الْوَادِ
الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ
الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰٓی اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ
رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۰﴾

سو جب اس کے پاس آیا، وادی کے دائیں جانب میں درخت والی بابرکت جگہ میں، آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! میں اللہ جہانوں کا رب ہوں ۲۵۱۴

وَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ
كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ ؕ
یٰمُوْسٰٓی اَقْبِلْ وَ لَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ
مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ﴿۳۱﴾

اور کہ اپنا عصا ڈال دے، سو جب اُسے ہلتا ہُوا دیکھا گویا وہ چھوٹا سانپ ہے پیٹھ پھیرتا ہُوا اُلٹا پھر گیا اور پیچھے نہ مڑا، اے موسیٰ آگے آ اور ڈر نہیں تُو امن پانے والوں میں سے ہے۔

اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ
مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ؗ وَّ اضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ
مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ
رَّبِّكَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ
كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۳۲﴾

اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال، وہ بغیر کسی عیب کے سفید ہو کر نکلے گا اور خوف میں اپنا بازو اپنی طرف ملالے یہ دو روشن دلیلیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف ہیں، وہ نافرمان لوگ ہیں ۲۵۱۵

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا
فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾

اس نے کہا، میرے رب مَیں نے اُن میں سے ایک شخص کو قتل کیا تھا سو مَیں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کردیں۔

۲۵۱۳ جذوۃ جو شعلہ کے بعد رہ جاتا ہے یعنی انگارا یا کوئلہ۔

۲۵۱۴ شاطئ جانب یا کنارہ ہے اور شَطْأ اُگنے والی چیز کی سوئی ہے یعنی جو چیز اس سے نکل کر دونوں طرفوں میں پھیل جاتی ہے (غ)
بقعۃ۔ بَقَعٌ اور بُقْعَۃ رنگ کا اختلاف ہے یعنی ایک رنگ میں دوسرے رنگ کا ہونا اور بُقْعَۃ اس قطعہ زمین کو کہتے ہیں جو اپنے پاس والی زمین کی ہیئت سے علیحدہ ہیئت پر ہو (ل)
من شاطئ الواد الایمن۔ ایمن کے معنی اگر دایاں لیا جائے تو شاطئ کی صفت ہو گی یعنی دائیں جانب سے اور اگر ایمن کے معنی بابرکت ہوں تو شاطئ یا وادی دونوں کی صفت ہو سکتی ہے اور فی البقعۃ المبارکۃ شاطئ سے حال ہے یعنی وہ اس مبارک قطعہ میں زمین تھی اور من الشجرۃ بدل اشتمال ہے شاطئ سے یعنی وہ جانب درختوں والی تھی اور معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ موسیٰ کو ادھر سے آواز آتی ہوئی معلوم ہوئی اور یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ موسیٰ کو آواز آئی جب وہ اس جگہ تھا نودی کائنا فی شاطئ الوادی (ر)

۲۵۱۵ اضمم الیك جناحك جناح سے مراد ہاتھ یا بازو ہے دیکھو ۱۸۲۲ اور ضم الجناح کنایہ ہے تجلّد اور ضبط سے اور وہ پرند کے فعل سے ماخوذ ہے کہ خوف کے بعد حالت امن ہو تو وہ ایسا کرتا ہے (ر) مطلب یہ ہوا کہ خوف کے وقت گھبراؤ نہیں۔ اور من الرھب سے مراد من اجل الرھب ہے۔

وَ اَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا
فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ اِنِّیْۤ
اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾

اور میرا بھائی ہارُونؑ وہ مجھ سے فصیح زبان والا ہے۔ سو اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج کہ میری تصدیق کرے۔ مَیں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا دیں ع۲۵۱۶

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَ
نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ
اِلَیْكُمَا ۚۛ بِاٰیٰتِنَاۤ ۚۛ اَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا
الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

کہا، ہم تیرا بازو تیرے بھائی کے ساتھ مضبوط کریں گے اور تمھیں غلبہ دیں گے، سو وہ تم تک نہ پہنچ سکیں گے۔ ہمارے نشانوں کے ساتھ (جاؤ) تم دونوں اور جو تمھاری پیروی کرے غالب رہو گے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ
قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی وَّ مَا
سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْۤ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۶﴾

سو جب موسیٰؑ ہمارے کھلے نشانوں کے ساتھ ان کے پاس آیا، انھوں نے کہا یہ کچھ نہیں مگر بنایا ہُوا جادو ہے۔ اور ہم نے اپنے پہلے باپ دادوں میں یہ نہیں سنا ع۲۵۱۷

وَ قَالَ مُوْسٰی رَبِّیْۤ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ
بِالْهُدٰی مِنْ عِنْدِهٖ وَ مَنْ تَكُوْنُ
لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا
یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور موسیٰؑ نے کہا، میرا رب اسے خوب جانتا ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لایا ہے اور اسے جس کے لیے اس گھر کا اچھا انجام ہے، ظالم کامیاب نہیں ہوتے۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ مَا
عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ ۚ فَاَوْقِدْ
لِیْ یٰهَامٰنُ عَلَی الطِّیْنِ فَاجْعَلْ لِّیْ صَرْحًا
لَّعَلِّیْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤی اِلٰهِ مُوْسٰی ۙ وَ اِنِّیْ
لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۳۸﴾

اور فرعون نے کہا، اے سردارو! مَیں تمھارے لیے اپنے سوائے کوئی معبود نہیں جانتا۔ سو اے ہامان میرے لیے پکّی اینٹیں بنوا، پھر میرے لیے ایک محل بنوا، تاکہ میں موسیٰؑ کے خدا پر اطلاع پاؤں اور میں اسے یقیناً جھوٹا سمجھتا ہوں ع۲۵۱۸

وَ اسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ فِی الْاَرْضِ

اور اُس نے اور اس کے لشکروں نے ملک میں ناحق تکبّر کیا۔

ع۲۵۱۶ رِدأ۔ جو دوسرے کے پیچھے اس کا مددگار ہو کر چلتا ہے اور رِدِیٰ بھی اصل میں اسی کی طرح ہے لیکن اس کا استعمال پیچھے رہ جانے والے مذموم پر ہے اور رَدَی ہلاکت ہے (غ)

اَفْصَح۔ فَصُح کسی چیز کا ملاوٹ سے خالص ہونا ہے فَصُحَ اس کا محاورہ جید ہے اسی سے فصیح ہے (غ)

ع۲۵۱۷ غالباً اس سے مراد توحید نبوت وغیرہ اور ان کی دلائل ہیں۔ ساحروں کا رسیوں کے سانپ وغیرہ بنانا ایسا امر نہیں جس کے متعلق وہ کہہ سکتے کہ اپنے باپ دادوں سے ہم نے یہ نہیں سُنا۔

ع۲۵۱۸ مٹی پر آگ جلوانے سے مراد اینٹ کا پکانا ہے ما علمت لکم من الٰہ غیری سے معلوم ہوتا ہے کہ بت پرست اقوام کی طرح وہ بادشاہ کو بھی خدا کی طرح مانتے تھے اور بمقابلہ دیگر اشیاء جن کی پرستش کی جاتی تھی بادشاہ کی عزت بہت بڑھ کر ہو گی اور فرعون نے موسیٰ کے رب العالمین کے مقابل پر اپنے آپ کو پیش کیا جس سے معلوم ہوا کہ اصل مقابلہ توحید باری تعالیٰ پر ہی تھا اور محل بنوانا بطور استہزا تھا یا وہ سچ مچ خیال کرتا ہوگا کہ اوپر محل کے ذریعہ

بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا
لَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۹﴾

اور انھوں نے سمجھا کہ وہ ہماری طرف نہیں لوٹائے جائیں گے۔

فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ
فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾

سو ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور انھیں سمندر میں ڈال دیا، سو دیکھ ظالموں کا انجام کیسا ہُوا۔

وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ
وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾

اور ہم نے انھیں (ایسے) پیشرو بنایا جو آگ کی طرف بلاتے ہیں اور قیامت کے دن انھیں مدد نہیں دی جائے گی۔

وَ اَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿۴۲﴾ ع

اور ہم نے اُن کے پیچھے اس دنیا میں لعنت لگادی اور قیامت کے دن وہ بُرے حال والوں میں سے ہوں گے ۲۵۱۹

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ
مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ
لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور ہم نے موسٰی کو کتاب دی اس کے بعد کہ ہم نے پہلی نسلوں کو ہلاک کر دیا (جو) لوگوں کے لیے روشن دلیلیں اور ہدایت اور رحمت (تھی) تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ
اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَ مَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾

اور تو مغربی جانب میں نہ تھا، جب ہم نے موسٰی کی طرف حکم بھیجا اور تو حاضر ہونے والوں میں سے نہ تھا۔

وَ لٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ
الْعُمُرُ ۚ وَ مَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ
تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَ لٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۵﴾

لیکن ہم نے (کئی) نسلیں پیدا کیں، پھر اُن پر لمبا زمانہ گزر گیا اور تو اہل مدین میں ٹھیرا ہوا نہ تھا کہ ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا ہو، لیکن ہم ہی رسول بھیجتے رہے ہیں۔

وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا
وَ لٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا
مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾

اور تو طور کے کنارے پر نہ تھا، جب ہم نے آواز دی لیکن یہ تیرے رب کی طرف سے رحمت ہوئی تاکہ تو اس قوم کو ڈرائے جن کے پاس تجھ سے پہلے ڈرانے والا نہیں آیا، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۲۵۲۰

سے آسمان کی حالت کو دیکھا جا سکتا ہے اور کہ حضرت موسٰی کا دعوٰی ہے کہ خدا تعالٰی آسمان پر ہے۔

۲۵۱۹ء مقبوحین۔ قبیح چیزوں میں سے وہ ہے جس سے نظر (نفرت کی وجہ سے) دور ہوتی ہے اور اعمال میں سے وہ جس سے دل دوری اختیار کرتا ہے۔ اور مقبوح وہ ہے جو ایسی حالت منکرہ سے موسوم ہوا اور قَبَحَ اللّٰہُ عن الخیر کے معنی ہیں اسے بھلائی سے ایک طرف یا دور کر دیا (غ) اور مقبوح کے معنی مطرود بھی ہیں یعنی خیر سے دور کیا گیا (ر)

۲۵۲۰ء ان آیات میں جس بات کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ہے وہ حضرت موسٰی کے ساتھ آنحضرت صلعم کی مشابہت ہے اس مشابہت کا واضح الفاظ میں آیت ۴۸ میں ذکر ہے سحران تظاھرا یعنی حضرت موسٰی اور محمد صلے اللہ علیہما وسلم دو جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ یعنی موسٰی آنحضرت صلی اللہ علیہ کی پیشگوئی کر کے آپ کو سچّا ٹھہراتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم موسٰی کی تصدیق کرتے ہیں اور یہاں انہی پیشگوئیوں کی طرف ہی اشارہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضرت موسٰی نے جو پیشگوئیاں آپ کے متعلق کیں اور وہ دو ہزار سال بعد پوری ہوئیں تم کوئی اس وقت موسٰی کے پاس تھے کہ وہ ایسی پیشگوئی کر سکتے اگر اللہ تعالٰی نے انہیں علم نہ دیا ہوتا یا موسٰی کے جو حالات اب قرآن کریم میں بیان کیے جاتے ہیں اور اصولاً

وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ تُصِیۡبَہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ
اَیۡدِیۡہِمۡ فَیَقُوۡلُوۡا رَبَّنَا لَوۡ لَاۤ اَرۡسَلۡتَ
اِلَیۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِکَ وَ نَکُوۡنَ
مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۷﴾

اور اگر ایسا نہ ہوتا کہ انھیں اس کی وجہ سے جو اُن کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے کوئی مصیبت پہنچے پھر وہ کہیں ہمارے رب کیوں تونے ہماری طرف رسول نہ بھیجا، کہ ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے اور مومنوں میں سے ہوتے۔

فَلَمَّا جَآءَہُمُ الۡحَقُّ مِنۡ عِنۡدِنَا قَالُوۡا
لَوۡ لَاۤ اُوۡتِیَ مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی ؕ اَوَ لَمۡ
یَکۡفُرُوۡا بِمَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی مِنۡ قَبۡلُ ۚ
قَالُوۡا سِحۡرٰنِ تَظٰہَرَا ٝ وَ قَالُوۡۤا
اِنَّا بِکُلٍّ کٰفِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

سو جب ہماری طرف سے حق اُن کے پاس آگیا، کہنے لگے اسے کیوں اس کی مثل نہیں دیا گیا جو موسٰی کو دیا گیا۔ کیا انھوں نے اس کا انکار نہیں کیا جو پہلے موسٰیؑ کو دیا گیا۔ کہنے لگے (یہ) دو جادو ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور کہنے لگے ہم سب کے منکر ہیں ۲۵۲۱

قُلۡ فَاۡتُوۡا بِکِتٰبٍ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ہُوَ
اَہۡدٰی مِنۡہُمَاۤ اَتَّبِعۡہُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۴۹﴾

کہہ تو اللہ کی طرف سے کوئی کتاب لاؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو (تاکہ) میں اس کی پیروی کروں اگر تم سچے ہو ۲۵۲۲

ویسی ہی تعلیم ایک عرب کا اُمیؐ دنیا ہے جیسی تعلیم موسٰی نے دی تھی تو یہ باتیں تو ایسی ہیں کہ مشاہدہ کو چاہتی ہیں لیکن تم تو اس وقت موجود نہ تھے۔ پس حضرت موسٰی کا وہ علم غیب اور اب اسی کے مطابق اور ویسی ہی تعلیم دیتے ہوئے دو ہزار سال بعد ملک عرب میں ایک نبی کا آنا اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ دونوں باتیں دونوں وحیاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور یہ جو فرمایا کہ تم مدین میں نہیں رہے تو یہ اس طرف اشارہ ہے کہ موسٰی کا فرعون کے ارادۂ قتل سے بھاگنا اور پھر مدین میں جاکر دس سال ٹھہرنا تمہاری زندگی میں اسی طرح پیش آنیوالا ہے گویا کہ تم مدین میں ہی تھے حالانکہ مدین میں نہ تھے اور انشانا قرونا میں اس عرصہ دراز کا ذکر کیا جو حضرت موسٰی اور آنحضرت صلعم کے درمیان گزرا تھا۔ اور ما اتٰھم من نذیر میں اہل عرب کا ذکر کیا جن کے لیے پیشگوئی موجود ہے۔ کیونکہ ایک طرف بنی اسرائیل ہیں جن میں پے در پے رسول آتے رہے دوسری طرف بنی اسمٰعیل ہیں جن میں ایک بھی رسول نہ آیا۔ اور یہ کہنا کہ حضرت اسمٰعیل ان کی طرف رسول تھے صحیح نہیں اس لیے کہ بنی اسمٰعیل کا ملک عرب میں پھیلنا اور قوم بننا تو حضرت اسماعیل کی موت کے بعد وقوع میں آیا۔

۲۵۲۱ چونکہ اوپر کی آیات میں آنحضرت صلعم کی حضرت موسٰی سے مماثلت اور حضرت موسٰی کی پیشگوئیوں اور ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کا ذکر ہے اور آنحضرت صلعم کی حضرت موسٰی سے مماثلت پر قرآن کریم میں بہت زور بھی دیا گیا ہے، اسی لیے بار بار موسٰی اور فرعون کا قصہ یاد دلایا جاتا تھا۔ اِنّا ارسلنا الیکم رسولاً شاھدا علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولا (المزمّل ۷۳-۱۵) اسی لیے وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ پھر جو حالت فرعون کی موسٰی کے مقابل پر ہوئی تھی وہی ہماری حالت کیوں نہیں ہوتی مثل ما اوتی موسٰی میں یہی اشارہ ہے کہ ایسا ہی نشان ہلاکت ہم پر بھی آئے اگر یہ نبی مثل موسٰی ہے جیسا اس کا دعویٰ ہے تو پھر ہم فرعون کی طرح غرق کیوں نہیں ہوتے اور جب انہیں تعلیم کی مماثلت پیشگوئیوں کے پورا ہونے توریت میں آنحضرت صلعم کا ذکر ہونے وغیرہ امور کی طرف توجہ دلائی جاتی کہ کیا مماثلت کے لیے یہ کافی نہیں تو کہہ دیتے کہ یہ تو جادوگری ہے دو جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔ ساحران تظاھرا سے یہی مراد ہے چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے بخاری نے تاریخ میں یہی معنی روایت کیے ہیں کہ اس سے مراد موسٰی اور آنحضرت صلعم ہیں اور اگلی آیت میں فاتوا بکتاب من عند اللہ ھو اھدیٰ منھما میں صاف بھی کر دیا ہے کہ سحران سے ان کی مراد توریت اور قرآن ہی ہیں۔ پس جو تائید و تصدیق تعلیم اور پیشگوئیوں سے ہوتی تھی اس کی پروا نہ کرتے اور یہی مطالبہ کرتے تھے کہ پھر ہم بھی فرعون کی طرح ہلاک ہو جائیں۔

۲۵۲۲ یہاں توریت اور قرآن کا باہم مقابلہ نہیں بلکہ ان کی اس حیثیت کا ذکر ہے کہ وہ ایک دوسرے کی موید اور مصدق ہیں۔ کفار کے دونوں کے انکار پر فرمایا کہ ان دونوں کی شہادت کو رد کرتے ہو تو بتاؤ ان سے زیادہ ہدایت والی اور کونسی کتاب ہے جس کی پیروی کی جائے اور اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ قرآن کریم کے بعد جو مرتبہ توریت کو حاصل ہے وہ دنیا کی اور کسی کتاب کو نہیں توحید کی تعلیم جس صفائی اور زور کے ساتھ اور بت پرستی سے نفرت کی تعلیم جو توریت میں پائی جاتی ہے وہ نہ ویدوں میں ہے نہ دنیا کی اور کسی کتاب میں اور اصولی اور اصل تعلیم تو توحید الٰہی ہے جس پر صداقت کا دار و مدار ہے اس لیے فرمایا کہ توریت و قرآن جو ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں اور ایک ہی تعلیم اصولی رنگ میں دیتے ہیں باوجودیکہ دونوں میں زمانہ اور ملک اور قوم کا اتنا بڑا فرق ہے اگر ان کی تائیدی شہادت کو قبول نہیں کرتے تو ان سے بہتر کوئی اور کتاب بتاؤ۔ اگلی آیت میں فان لم یستجیبوا لک میں بتا دیا کہ اس مطالبہ کو پورا نہیں کر سکتے پس

فَاِنۡ لَّمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَكَ فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا يَتَّبِعُوۡنَ اَهۡوَآءَهُمۡ ؕ وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيۡرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ۝٥٠ ع

پس اگر وہ تجھے جواب نہ دیں تو جان لو کہ وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ) ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

وَلَقَدۡ وَصَّلۡنَا لَهُمُ الۡقَوۡلَ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ؕ ۝٥١

اور ہم اپنا کلام ایک دوسرے سے ملتا ہُوا انھیں پہنچاتے رہے ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۲۵۲۳ع

اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِهٖ هُمۡ بِهٖ يُؤۡمِنُوۡنَ ۝٥٢

جنھیں ہم نے اس سے پہلے کتاب دی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں ۲۵۲۴ع

وَاِذَا يُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنۡ قَبۡلِهٖ مُسۡلِمِيۡنَ ۝٥٣

اور جب ان پر (قرآن) پڑھا جاتا ہے کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے کہ یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے ہم اس سے پہلے بھی فرماں بردار تھے۔

اُولٰٓئِكَ يُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَهُمۡ مَّرَّتَيۡنِ بِمَا صَبَرُوۡا وَيَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ

یہی ہیں جنھیں اُن کا اجر دوچند دیا جائے گا، اس لیے کہ انھوں نے صبر کیا اور وہ بدی کو نیکی کے ساتھ دُور کرتے ہیں

وہ کسی حق کی پیروی نہیں کرتے اپنی خواہشات کے پیرو ہیں۔

۲۵۲۳ع وصلنا۔ وَصُل اور اِتّصال اشیاء کا ایک دوسرے کے ساتھ ملانا ہے اور اشیاء اور معانی دونوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل (البقرۃ ۲-۲۷) الا الذین یصلون الی قوم بینکم وبینھم میثاق (النساء ۴-۹۰) جہاں یصلون کے معنی ہیں ینسبون یعنی ایسی قوم کی طرف منسوب ہیں کیونکہ جب دو آدمیوں کے درمیان نسبت یا مصاہرت ہو تو کہا جاتا ہے فلانٌ مُتَّصِلٌ بِفلانٍ اور یہاں وصّلنا کے معنی ہیں اکثرنا لھم القول موصولا لبعضہ ببعض یعنی کلام ان کے لیے بہت بھیجا ہے جو بعض بعض سے ملا ہُوا ہے (غ) فَعَّلَ میں چونکہ مبالغہ یا تکثیر پائے جاتے ہیں اس لیے وَصَّلَ کے معنی ہیں بہت ملایا یا بار بار ملایا (ت)

قول اور اس کی توصیل سے کیا مراد ہے؟ پچھلے رکوع میں قرآن کریم اور توریت کے ایک دوسرے کے مصدق اور موید ہونے کا ذکر تھا اب اسی کو عام کیا ہے اور بتایا ہے کہ فی الحقیقت وحی الٰہی کہیں ہوئی ہو اور کبھی ہوئی ہو وہ سب ایک قول کے حکم میں ہے اور اس میں باہم بہت تعلق پایا جاتا ہے گویا توریت و قرآن ہی ایک دوسرے کی مصدق اور موید نہیں بلکہ سب وحی ہی ایک دوسرے کی موید ہے اور اس میں صداقت وحی پر بڑی بھاری دلیل ہے کہ مختلف ملکوں میں، مختلف زمانوں میں، مختلف زبانوں میں جو وحیاں ہوتی ہیں ان سب کی غرض ایک ہی انسان کے اخلاق کو سنوارنا اور اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق پیدا کرنا ان سب کے اصول ایک ہیں انسان کے اوپر ایک اور ہستی کا ہونا اور اعمال کی جزا و سزا کا حق ہونا تمام وحی پانے والے ایک ہی قسم کی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں مخلوق سے کمال درجہ کی ہمدردی رکھتے ہیں بلا کسی اجرا اور مزد کے کام کرتے ہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک کی وحی میں دوسرے کے آنے کا ذکر ہے بالخصوص جملہ انبیاء نے ہمارے نبی کریم صلعم کے آنے کی پیشگوئی کی ہے۔

۲۵۲۴ع دوسرے مذاہب کے لوگ اسلام میں داخل ہوتے رہیں گے: مفسرین دس یہودیوں یا چالیس عیسائیوں وغیرہ کا یہاں ذکر کرتے ہیں مگر اس میں لاکھوں اور کروڑوں وہ انسان داخل ہیں جو ہر مذہب میں سے اسلام میں آئے، آتے ہیں اور آتے رہیں گے۔ کروڑہا ہندو اور بُدھ مذہب کے پیرو کروڑہا کنفیوشس کے پیرو۔ زردشت کے پیرو، حضرت مسیح اور حضرت موسیٰ کے پیرو سب اس میں داخل ہیں۔ کوئی مذہب نہیں جس سے اسلام نے ایک حصہ نہ لیا ہو اور یہی اس کے آخری غلبہ کا نشان ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٥٤﴾

اور اس سے جو ہم نے انھیں دیا ہے خرچ کرتے ہیں ۲۵۲۵ع

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ز سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ز لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿٥٥﴾

اور جب لغویات سنتے ہیں اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہمارے لیے ہمارے عمل ہیں اور تمھارے لیے تمھارے عمل ہیں تمھارے لیے سلامتی ہو ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ج وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿٥٦﴾

تُو اسے ہدایت نہیں دے سکتا جسے تو دوست رکھتا ہو، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے ۲۵۲۶ع

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ط اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٧﴾

اور کہتے ہیں اگر ہم تیرے ساتھ ہو کر ہدایت کی پیروی کریں تو اپنے ملک سے اُچک لیے جائیں، کیا ہم نے انھیں امن والے حرم میں جگہ نہیں دی جس کی طرف ہر قسم کے میوے کھنچے آتے ہیں (یہ) ہماری طرف سے رزق (ہے) لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے ۲۵۲۷ع

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ج فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ط وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٥٨﴾

اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کیں، جو اپنی روزی کے سامان میں اِتراتی تھیں۔ سو یہ ان کے مکانات ہیں جو ان کے بعد آباد نہیں ہوئے، مگر بہت کم۔ اور ہم ہی وارث ہیں ۲۵۲۸ع

۲۵۲۵ع مرتین۔ یعنی دو دفعہ یا دو چند اجر کی وجہ مفسرین یہ دیتے ہیں کہ ایسے لوگ پہلے اپنی کتاب پر ایمان لائے۔ پھر قرآن کریم پر۔ مگر قرآن کریم نے جو خود وجہ بیان فرمائی ہے وہ ان کا صبر ان کا بدی کو نیکی کے ذریعہ دور کرنا اور ان کا اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا ہے۔ اور یہی حق ہے۔ دو چند اجر اُنھیں کا ہے جو صرف آپ ہی نیکی کی راہ اختیار نہیں کرتے بلکہ دنیا میں بھی بدی کو دور کر کے نیکی کو پھیلاتے ہیں۔ اور یا یہ کہ وہ صرف ایمان ہی نہیں لاتے بلکہ ایمان کو بذریعہ اعمال کمال تک پہنچاتے ہیں۔

۲۵۲۶ع اس آیت کے شان نزول میں وفات ابوطالب کا ذکر لکھا ہے یعنی آنحضرت صلعم بوجہ اس محبّت کے جو ابوطالب سے آپ کو تھی اس لیے کہ اس نے آپ کا ساتھ سخت ترین مشکلات میں دیا چاہتے تھے کہ وہ مسلمان ہو جائے مگر انہوں نے ظاہر طور پر اقرار توحید نہیں کیا۔ تو اس پر آنحضرت صلعم کو تسلی دی گئی کہ انسان کے یہ اختیار کی بات نہیں کیونکہ قلب کی حالت کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہوتا ہے اس لیے جسے وہ چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور ہر ایک شخص کو بھی خطاب ہے جو دوسروں کی ہدایت کا کام اختیار کرتا ہے کہ وہ ایک یا دوسرے کے ایمان نہ لانے سے گھبرائے نہیں، اسلام تو آخر کار دنیا میں مقبول ہوگا۔ ہاں یہ ضروری نہیں کہ جسے آج زید یا بکر چاہتا ہے وہ بھی فوراً مسلمان ہو جائے۔

۲۵۲۷ع مکّہ میں بہت لوگ ایسے تھے جو صداقت اسلامی کا دل سے اعتراف کرتے تھے مگر خوف یہ تھا کہ مسلمان ہو کر مارے جائیں گے یا گھروں سے نکالے جائیں گے تو ان کو تسلّی دی ہے کہ جس خدا نے حرم جیسی امن والی جگہ انہیں دی کیا وہ انہیں کفار کے ہاتھ سے بچا نہیں سکتا اور یجبٰی الیہ ثمرات کل شئ میں بتایا ہے کہ مکّہ ایک وادی غیر ذی زرع میں آباد ہے پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کیا تماشہ ہے کہ ہر قسم کے پھل وہاں پہنچتے ہیں۔

۲۵۲۸ع بطرت معیشتھا کے لیے دیکھو ۱۲۳۸ع جن قوموں کو روزی کا سامان کچھ اچھا مل جاتا ہے وہ اترا کر حد سے نکل جاتی ہیں اسی کا نتیجہ ہلاکت ہوتا ہے۔ آج بھی کئی قومیں اسی سامان روزی پر اُترائی ہوئی ہیں کہ انہیں کھانے اور پہننے کو اچھا مل جاتا ہے آیت ۶۰ میں فرمایا کہ یہ صرف حیوانی زندگی کی خوشی ہے انسان کو خوش اس بات پر ہونا چاہیئے جس کا فائدہ اس کے لیے دیرپا ہے نحن الوارثین میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ ہی ایک قوم سے لیکر دوسری قوم کو دیتا ہے۔

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکزی مقام میں رسول (نہ) بھیجتا جو اُن پر ہماری آیتیں پڑھتا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں مگر اس حال میں کہ ان کے رہنے والے ظالم ہوں ۲۵۲۹

وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتُهَا ۚ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

اور جو کوئی چیز تم کو دی گئی ہے تو وہ دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے، تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۶۱﴾

بھلا جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہے پھر وہ اسے پا لینے والا (بھی) ہے اس کی طرح ہے جسے ہم نے دنیا کی زندگی کا سامان فائدہ اٹھانے کو دیا پھر وہ قیامت کے دن (عذاب میں) حاضر کیے گئے لوگوں میں سے ہوگا۔ ۲۵۳۰

وَ يَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور جس دن انھیں پکارے گا اور کہیگا میرے وہ شریک کہاں ہیں، جن کا تم دعوے کرتے تھے۔

قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ز مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴿۶۳﴾

جن کے خلاف بات ثابت ہوئی وہ کہیں گے ہمارے رب یہ وہ ہیں جنھیں ہم نے گمراہ کیا، ہم نے انھیں گمراہ کیا جس طرح ہم خود گمراہ ہوئے ہم تیرے سامنے (ان سے) بے تعلق ہوئے ہیں یہ ہماری عبادت نہ کرتے تھے ۲۵۳۱

وَ قِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَ رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿۶۴﴾

اور کہا جائے گا اپنے شریکوں کو بلاؤ، سو وہ انھیں بلائیں گے مگر وہ انھیں جواب نہ دیں گے اور عذاب کو دیکھ لیں گے کاش وہ ہدایت اختیار کرتے۔

ع۲۵۲۹ یہ ان کے اس مطالبہ کا جواب ہے جو کہتے تھے کہ جس طرح فرعون ہلاک ہوا ہم ہلاک کیوں نہیں ہوتے تو اس کے جواب میں فرمایا کہ بلاشبہ عرب کے ملک کی حالت اس انتہائے فساد کو پہنچ چکی تھی کہ ان پر عذاب بھیجکر انہیں ہلاک کر دیا جاتا یہودیوں نے بھی ان کی اصلاح پر زور لگایا مگر یہ درست نہ ہوئے عیسائیوں نے بھی زور لگایا مگر ان کی اصلاح نہ ہوئی بلکہ اور ظلم اور فساد میں ترقی کرتے گئے مگر چونکہ یہ وہ قوم تھی کہ خود ان کے اندر کوئی رسول نہ آیا تھا آیت ۴۶ اس لیے ضرور تھا کہ پہلے ان میں رسول بھیجا جاتا جو انہیں ڈراتا اور اُمّھا سے مراد یہاں ام القریٰ یعنی مکّہ ہے اور پھر دوبارہ جو فرمایا وما کنا مھلکی القریٰ الا و اھلھا ظلمون تو سمجھایا ہے کہ یہ بھی نہیں ہوتا کہ ادھر رسول مبعوث ہو ادھر مکذبین کو ہلاک کر دیا جائے بلکہ جب تک وہ ظالم ثابت نہ ہوں اور ان کا ظلم کمال کو نہ پہنچے اس وقت تک بھی انہیں ہلاک نہیں کیا جائے گا۔

ع۲۵۳۰ محضرین۔ دیکھو ع۲۲۹۵ یہاں مراد عذاب میں حاضر کیے گئے لوگ ہیں۔ فاولئک فی العذاب محضرون (الروم ۳۰-۱۶) جمیع لدینا محضرون (یٰس ۳۶-۳۲)

ع۲۵۳۱ جنھیں اوپر کی آیت میں شرکاء کہا تھا انہیں یہاں گمراہ کرنیوالے خود گمراہ ہونے والے اور الذین حق علیھم القول کہا ہے جس سے صاف معلوم ہوا کہ وہاں شرکاء سے مراد صرف انکے رؤساء ہیں اور اغوینٰھم کما غوینا سے مراد ہے کہ ہم نے انہیں مجبور کر کے گمراہ نہیں کیا بلکہ جس طرح ہم اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے۔ وہ بھی اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے۔ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی ہوا و حرص کو پوجتے تھے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَآ أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ﴿٦٥﴾

اور جس دن انھیں پکارے گا پھر کہے گا تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا۔

فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُونَ ﴿٦٦﴾

پس اس دن ان کو باتیں نہ سوجھیں گی، سو وہ ایک دوسرے سے بھی سوال نہ کریں گے ع۲۵۳۲

فَأَمَّا مَن تَابَ وَءَامَنَ وَعَمِلَ صَٰلِحًا فَعَسَىٰٓ أَن يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ﴿٦٧﴾

سو جو توبہ کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور نیک کام کرتا ہے تو امید ہے کہ وہ کامیاب ہونے والوں میں سے ہوگا۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحَٰنَ اللَّهِ وَتَعَٰلَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٦٨﴾

اور تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے چُن لیتا ہے چُن لینا اُن کا کام نہیں۔ اللہ اس سے پاک اور بلند ہے جو وہ شرک کرتے ہیں ع۲۵۳۳

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٦٩﴾

اور تیرا رب جانتا ہے جو اُن کے سینے چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔

وَهُوَ اللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْءَاخِرَةِ ۖ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٧٠﴾

اور وہ اللہ ہے، اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، دنیا اور آخرت میں اسی کی تعریف ہے اور اسی کا حکم ہے، اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِن جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَٰمَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِضِيَآءٍ ۖ أَفَلَا تَسْمَعُونَ ﴿٧١﴾

کہہ دیکھو تو سہی، اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لیے قیامت کے دن تک رات ہی رکھے، تو اللہ کے سوائے کون معبود ہے جو تمھیں روشنی لا دے۔ تو کیا تم سنتے نہیں ع۲۵۳۴

ع۲۵۳۲ عمی علیہ کے معنی ہیں مشتبہ ہو گیا ع۱۴۵۷ انباء۔ نبا کی جمع ہے جس کے معنی خبر ہیں اور مراد یہاں وہ مطالبہ ہے جو ان سے کیا گیا یا ہر قسم کی باتیں اور ایک دوسرے سے سوال نہ کرنے سے یہ مطلب ہے کہ سب یکساں تاریکی کی حالت میں ہوں گے۔

ع۲۵۳۳ یختار۔ اختارہٗ کے معنی ہیں اسے چُن لیا رخیر سے باب افتعال ہے) اور اس کے بعد من آتا ہے اور حذف بھی کر دیا جاتا ہے کیونکہ چننے میں بعضیت پائی جاتی ہے واختار موسیٰ قومہ سبعین رجلا لمیقاتنا (الاعراف۔ ۱۵۵) جہاں مراد ہے من قومہ۔ اور اس کا صلہ علیٰ بھی آتا ہے کیونکہ چن لینے میں دوسروں پر فضیلت پائی جاتی ہے اخترنٰھم علی علم علی العالمین (الدخان ۴۴۔ ۳۲) اور خِیْرَۃ اور خِیَرَۃ اس سے اسم ہے حدیث میں ہے محمدٌ صلی اللہ علیہ وسلم خِیَرَۃ اللہ من خلقہ یعنی آں حضرت سب مخلوق سے چنے ہوئے یا سب مخلوق پر فضیلت رکھنے والے ہیں اور خِیَرَۃ بمعنی تخییر یعنی چننے کے معنی میں بھی آتا ہے اور استخارہ کسی چیز میں خیرۃ کا طلب کرنا ہے (ل) اور اختیار کے معنی اس کا طلب کرنا بھی ہیں جو خیر ہو اور اس کا کرنا بھی (رغ) نیز دیکھو ع۲۰۵۰ نیک بنانا بھی اس کے معنی ہیں اور یہاں چن لینے سے مراد رسالت کے منصب کے لیے چن لینا بھی ہو سکتا ہے اور شفاعت کے لیے چن لینا بھی اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو نیک بناتا ہے یا انہیں دوسروں پر فضیلت دیتا ہے۔ اور بعض نے یختار کے معنی یہ بھی کیے ہیں کہ وہ اختیار رکھتا ہے مگر یہ خود یخلق ما یشاء سے ظاہر ہے۔

ع۲۵۳۴ سرمد کے معنی دائم یا ہمیشہ ہیں جس کے لیے انقطاع نہ ہو اور لیل سرمد لمبی رات کو بھی کہتے ہیں (ل) مطلب یہ ہے کہ رات اور دن کے تغیرات جن پر انسان کی بہبودی اور راحت کا مدار ہے یہ بھی سب اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٧٢﴾

کہہ دیکھو توسہی اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لیے قیامت کے دن تک دن ہی رکھے، تو اللہ کے سوائے کون معبود ہے جو تم پر رات لائے جس میں تم آرام کرتے ہو۔ تو کیا تم دیکھتے نہیں۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾

اور اپنی رحمت سے اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے تاکہ تم اس میں آرام کرو اور تاکہ تم اس کا فضل ڈھونڈو اور تاکہ تم شکر کرو۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿٧٤﴾

اور جس دن انھیں پکارے گا پھر کہے گا میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کا تم دعوے کرتے تھے۔

وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٧٥﴾ ع

اور ہم ہر ایک قوم سے ایک گواہ نکال لائیں گے۔ پس کہیں گے اپنی روشن دلیل لاؤ تب جان لیں گے کہ حق اللہ کے لیے ہی ہے اور ان سے جاتا رہیگا جو وہ افترا کرتے تھے ۲۵۳۵

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿٧٦﴾

قارون موسیٰ کی قوم سے تھا اور ان پر زیادتی کرتا تھا اور ہم نے اسے اتنے خزانے دیئے کہ اس کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت کے لیے اٹھانی مشکل تھیں۔ جب اس کی قوم نے اسے کہا اترا نہیں، اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا ۲۵۳۶

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ

اور اس سے جو اللہ (تعالیٰ) نے تجھے دیا ہے آخرت کے گھر کی بہتری تلاش کر اور دنیا سے اپنا حصّہ نہ بھلا۔ اور احسان کر جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے، اور

۲۵۳۵ شہید یا گواہ سے مراد ان کا نبی ہے۔

۲۵۳۶ تنوء۔ ناءِ بِحِملہ ینوءُ۔ بڑی کوشش اور مشقت سے بوجھ کو اٹھا کر لے گیا یا بھاری پا کر پھینک دیا۔

قارون کا ذکر جس کا نام بائبل میں قرح آتا ہے گنتی سولھویں باب میں ہے مگر بائبل نے واقعات کو کچھ ایسا خلط ملط کر دیا ہے کہ اس باب میں قارون کے ساتھ داتن اور ابیرام وغیرہ کی بغاوت کا ذکر اکٹھا کیا ہے پادری ڈملو نے اپنی تفسیر بائبل میں لکھا ہے کہ یہ دو الگ الگ واقعات ملا دیئے گئے ہیں جو الگ الگ زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہمارے مفسرین کہتے ہیں کہ قارون حضرت موسیٰ کے چچے کا بیٹا تھا اور بغی علیہم سے مراد ہے کہ ان پر بڑائی چاہتا تھا اور یہ کہ وہ اس کے ماتحت ہوں۔ یا ان پر ظلم کرتا تھا یا ان کی نعمت کا زوال چاہتا تھا۔ اور بعض نے کہا کہ کپڑا اُن سے لمبا پہنتا تھا مگر یہ کوئی ایسی بات نہیں جو قابلِ ذکر ہوتی۔ اور بعض اقوال میں ہے کہ یہ اس کی زیادتی اس وقت کا واقعہ ہے جب فرعون نے اسے بنی اسرائیل پر حاکم بنایا ہوا تھا۔ اور یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے ورنہ اس قدر دولت

الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٧٧﴾

ملک میں فساد نہ چاہ ۔ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۲۵۳۷

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي ۚ أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِن قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَمْعًا ۚ وَلَا يُسْأَلُ عَن ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ ﴿٧٨﴾

اس نے کہا یہ مجھ کو اپنے علم سے ملا ہے ۔ کیا اسے علم نہ تھا کہ اللہ نے اِس سے پہلے ایسی ایسی نسلوں کو ہلاک کیا جو اس سے طاقت میں بڑھ کر اور جمعیت میں زیادہ تھیں ۔ اور مجرموں سے ان کے گناہوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۲۵۳۸

فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ ۖ قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٧٩﴾

سو وہ اپنی قوم کے سامنے اپنی آرائش میں نکلا، جو لوگ دنیا کی زندگی چاہتے تھے انھوں نے کہا اے کاش! ہمارے لیے بھی اس کی مثل ہوتا جو قارون کو ملا ہے وہ بڑے نصیب والا ہے ۔

وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ ﴿٨٠﴾

اور جنھیں علم دیا گیا تھا انھوں نے کہا تم پر افسوس اللہ کا (دیا ہوا) بدلہ اس کے لیے بہتر ہے جو ایمان لاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے اور یہ سوائے صبر کرنیوالوں کے اور کسی کو نہیں ملتا۔

فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِن فِئَةٍ يَنصُرُونَهُ

سو ہم نے اُسے اور اس کے گھر کو زمین میں نابود کر دیا۲۵۳۹ تو کوئی گروہ اس کے لیے نہ ہُوا جو اللہ کے مقابلہ پر اس

بیابان میں کہاں سے حاصل کرسکتا تھا۔ جابر حاکم محکوم قوموں سے اسی طرح کام لیتے ہیں کہ کسی چالاک آدمی کو لالچ دیکر اسی کو ان پر متعین کر دیتے ہیں۔ اس طرح پر اس شخص نے بھی کچھ فرعون سے انعام کے طور پر اور کچھ بنی اسرائیل سے ظلم کرکے روپیہ اکٹھا کیا۔ رہی یہ بات کہ اس کی ہلاکت بیابان میں ہوئی یا مصر میں کہا نہیں جاسکتا۔ بائبل اسے بیابان میں قرار دیتی ہے مگر جیسا کہ اوپر دکھایا جاچکا ہے بائبل کا بیان خود گڈمڈ ہے ممکن ہے کہ سارا ایام مصر کا ہی واقعہ ہو اور اس سورت میں حضرت موسیٰ کے واقعات مصر کا ہی ذکر ہے اور اس قصّہ کو لاکر اللہ تعالےٰ نے یہ سمجھایا ہے کہ بعض لوگ اپنے مال پر فخر کرکے بھی حق سے منہ موڑ لیتے ہیں گو وہ بظاہر نبی کی پیروی کرنے کا بھی دعویٰ کرتے ہوں۔ اور ان کی کثرت مال اور ان کے ٹھاٹھ کو دیکھ کر لوگ گمراہ ہوتے ہیں۔ چونکہ پچھلے رکوع میں ان گمراہ کنندوں کا ذکر تھا جو تکذیب کرکے حق کی مخالفت پر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس لیے یہاں اس قسم کے گمراہ کرنے والوں کا ذکر کیا جو مومن قوم میں سے کہلا کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔

۲۵۳۷ گویا سمجھایا کہ مال دنیا کا جمع کرنا تو کوئی غرض زندگی نہیں یہ مال کسی اور غرض کے حصول میں معاون ہوسکتا ہے سو آخرت کے گھر کی بہتری چاہو اور نصیبک من الدنیا سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی زندگی تو آخرت کی تیاری کے لیے ہے اسے مت بھلا۔

۲۵۳۸ علم عندی سے مراد بعض مفسرین نے علم کیمیا لیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ کو بھی کیمیا کا علم یعنی سونا بنانا آتا تھا۔ تفسیروں کے انہی بےبنیاد قصّوں نے بہت سے مسلمانوں کو لغو کاموں میں لگا کر تباہ کر دیا ہے جن کی ساری ساری زندگی اسی اُمید میں گزر جاتی ہے کہ ایک آگ کی کسر باقی رہ گئی ہے اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ میں نے اپنے علم سے اسے کمایا ہے۔

مجرموں سے سوال نہ کرنا اس لیے ہے کہ ان کے جرموں کا اثر خود ان پر ظاہر ہوگا سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔

۲۵۳۹ خسف کے لیے دیکھو ۱۴۴۲ ہوسکتا ہے جیسا کہ بائبل میں ہے کہ زلزلہ سے زمین پھٹ کر زمین میں دھنس گیا یا کسی اور طریق سے نابود کر دیا اور اگلی آیت میں خسف سے مراد ذلیل کرنا ہی معلوم ہوتا ہے۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۖ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾

کی مدد کرتے۔ اور نہ وہ خود اپنے تئیں بچا سکا۔

وَ اَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ ۚ لَوْ لَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

اور جو لوگ کل اس کی جگہ کی آرزو کرتے تھے، کہنے لگے ہائے افسوس! اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے اگر اللہ ہم پر احسان نہ کرتا تو ہمیں بھی ذلیل کر دیتا۔ ہائے افسوس کافر کامیاب نہیں ہوتے ۲۵۴۰

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾

یہ آخرت کا گھر ہم اسے ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں، جو زمین میں بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد رچانا چاہتے ہیں اور عاقبت متقیوں کے لیے ہے ۲۵۴۱

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾

جو نیکی لاتا ہے اس کے لیے اس سے بہتر ہے اور جو بدی لاتا ہے تو ان لوگوں کو جو بُرائیاں کرتے ہیں ویسا ہی بدلہ دیا جاتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۵﴾

جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے، وہ یقیناً تجھے لوٹ کر آنے کی جگہ واپس لائے گا۔ کہہ میرا رب اسے خوب جانتا ہے جو ہدایت لایا ہے اور اسے (بھی) جو کھلی گمراہی میں ہے۔ ۲۵۴۲

ع۲۵۴۰ اصبحوا۔ صبح سے ہے ع۲۳۳۱ اور اصباح بھی صبح کو کہتے ہیں فالق الاصباح (الانعام ۶-۹۶) اور اصبح کے معنی صبح کی یا صبح کے وقت میں داخل ہوا اور صرف صار کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے اصبح فلانٌ عالماً یعنی فلاں شخص عالم ہوگیا (ل)۔
ویکانّ۔ وے افسوس اور ندامت اور تعجب کا کلمہ ہے (اور کانّ ساتھ تحقیق کے لیے بڑھایا ہے) اور بعض کے نزدیک ویلک اصل میں ویلک ہے اور لام حذف ہوگیا ہے (غ)

ع۲۵۴۱ فرعون ہو جو کافر کہلاتا تھا یا قارون جو مومن کہلاتا تھا جو کوئی زمین میں تکبر اور ظلم اختیار کرتا ہے وہ دار آخرت سے محروم رہ جاتا ہے۔

ع۲۵۴۲ معاد۔ عَوْد کے لیے دیکھو ع۱۱۲۲ کسی چیز سے پھر جانے کے بعد اس کی طرف رجوع کرنا اور معاد کے معنی لوٹنا بھی ہیں اور لوٹنے کا زمانہ بھی اور لوٹ کر آنے کا مکان بھی اور یہاں معاد کے معنی مکّہ کیے گئے ہیں (غ) اور اس کو معاد کہنے کی وجہ بعض کے نزدیک یہ ہے کہ آپ وہاں پیدا ہوئے یا اس لیے کہ وہ آپ کا وطن تھا (ل)، اور حضرت ابن عباس کہتے ہیں معاد سے مراد یہاں مکّہ ہے (بخاری) اور معاد سے مراد مکّہ ہونا مجاہد اور ضحاک سے بھی مروی ہے اور انسان کا اپنا شہر یا وطن اس لیے معاد کہلاتا ہے کہ سب طرف سے پھر پھرا کر وہ اپنے شہر کی طرف واپس آتا ہے۔ اور مکّہ کا نام معاد اس لیے بھی ہے کہ لوگ ہر سال لوٹ لوٹ کر اس کی طرف آتے ہیں (ر) اور اصل بات یہ ہے کہ خود قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاد مکّہ کا ہی نام ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس (البقرۃ ۲-۱۲۵) اور مثابۃ بھی اسے اسی لیے کہا کہ وہاں لوگ لوٹ لوٹ کر آتے تھے دیکھو ع۱۵۷۔
عین ہجرت میں آنحضرتؐ کو مکہ واپس لانے کی پیشگوئی: روایت ہے کہ نبی کریم صلعم جب ہجرت کر کے مکّہ سے مدینہ کو جا رہے تھے تو جحفہ میں یہ آیت آپ پر نازل ہوئی۔ اس سے بھی اسبات کی تائید ہوتی ہے کہ معاد سے مراد یہاں مکّہ ہے۔ آخرت یا جنت یہاں معنی لینا درست نہیں کیونکہ یہ موقعہ آخرت یا جنت کے وعدے

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

اور تو امید نہیں رکھتا تھا کہ تیری طرف کتاب بھیجی جائے گی مگر تیرے رب کی طرف سے رحمت کے طور پر (ایسا ہوا) سو تو کافروں کا مددگار نہ ہو۲۵۴۳

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور وہ تجھے اللہ کے حکموں سے نہ روک دیں، اس کے بعد جو وہ تیری طرف اتارے گئے اور اپنے رب کی طرف بلا اور مشرکوں میں سے ہرگز نہ ہو۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾ ع ۹ ۱۲

اور اللہ کے ساتھ دوسرا معبود نہ پکار، اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کے جس سے اس کا ارادہ کیا جائے۲۵۴۴، اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے

کا نہ تھا۔ علاوہ ازیں اس سورت میں حضرت موسیٰ کا مدین کو بھاگ کر جانا اور دس سال وہاں رہنا اور پھر مصر کو واپس آنا سب اسی لیے بیان کیا گیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلعم کے حالات میں یہی باتیں پیش آنے والی تھیں۔ اسی لیے جب ابتدائے سورت میں حضرت موسیٰ کے ان واقعات کو بیان کیا تو آخر میں مضمون کو صاف کرنے اور تکمیل کو پہنچانے کے لیے نبی کریم صلعم کو عین ہجرت کے اندر یہ وعدہ دیا کہ آپ بھی مکہ میں واپس آئیں گے اور یہاں سے آپ کا بھاگ کر جانا عارضی ہے۔ عین اس وقت جب آپ کی بیکسی کی حالت انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ یہ وعدہ کہ آپ اسی شہر میں واپس آئیں گے (اور ظاہر ہے کہ بحیثیت فاتح آئیں گے) اللہ تعالیٰ کی زبردست قدرت اور علم کو ظاہر کرنے والا ہے۔

۲۵۴۳ انبیاء کو قبل بعثت اپنے نبی بنایا جانے کا علم نہیں ہوتا: وما کنت ترجوا اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کو بعثت سے پیشتر یہ علم نہیں ہوتا کہ انہیں منصب نبوت پر فائز کیا جائے گا۔ فلا تکونن کو نہی ہے مگر بمعنی خبر ہے جیسے اگلی آیت میں ولا یصدنک بھی بمعنی خبر ہے کیونکہ وہاں بہر حال کفار کو حکم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ پیشگوئی کے طور پر بتایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات اتاری ہیں تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ان آیات کی تبلیغ قطعاً رک جائے۔

۲۵۴۴ کل شیء ھالک الا وجھہ میں بعض نے وجہ کے معنی ذات کیے ہیں۔ مفردات میں ہے کہ عبداللہ بن الرضا کے سامنے یہ معنی بیان کیے گئے تو آپ نے فرمایا سبحان اللہ بہت بڑی بات کہتے ہیں۔ یہاں مراد وہ وجہ ہے جس سے کسی چیز کی طرف آیا جاتا ہے مراد اس سے یہ ہے کہ بندوں کے اعمال سے ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے اور باطل ہے سوائے اس عمل کے جس سے اللہ تعالیٰ کا ارادہ کیا جائے۔ امام راغب نے یہی دوسرے معنی وجھہ کے دیئے ہیں۔ اعمال صالحہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ۔ اور سیاق بھی یہی معنی چاہتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں فرمایا کہ اللہ کے سوائے کسی دوسرے کو مت پکارو اور معبود وہی ایک ہے یعنی حقیقی مقصود اور مطلوب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے پس اور جس چیز کو تم مقصود بناؤ گے وہ ہلاک ہونے والی ہے اور باطل ہے اسی لیے آخر پر پھر بڑھایا اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے اور حضرت ابن عباس سے اس کی تفسیر میں مروی ہے ہر زندہ چیز مرنے والی ہے یعنی باقی سب زندوں پر موت آنے والی ہے ایک اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ایسی ہے کہ اس پر موت نہیں آسکتی اور اس معنی پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔

(۲۹) سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ مَكِّيَّةٌ

اٰيَاتُهَا ۶۹ — رُكُوْعَاتُهَا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔
الٓمّٓ ۚ ①	میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔
اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ②	کیا لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ مصائب میں نہ ڈالے جائیں۔
وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ③	اور یقیناً ہم نے انھیں مصائب میں ڈالا جو اُن سے پہلے تھے پس ضرور اللہ انھیں معلوم کرلے گا جو سچے ہیں اور وہ جھوٹوں کو بھی ضرور معلوم کرلے گا ۲۵۴۵
اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ④	کیا وہ لوگ جو بدیاں کرتے ہیں سمجھتے ہیں کہ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے بُرا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں ۲۵۴۶

نام: اس سورت کا نام العنکبوت ہے اور اس میں سات رکوع اور ۶۹ آیات ہیں۔ آیت ۴۱ میں مشرکانہ عقاید کو اور مخالفین اسلام کی تدابیر کو مکڑی کے جالے سے تشبیہ دے کر بتایا ہے کہ شرک آخرکار دنیا سے مٹ جائے گا اور توحید پھیل جائے گی اور اسلام کے خلاف کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی۔ اس سورت میں مسلمانوں کی تکالیف کا ذکر کرکے انہیں آخری کامیابی کا یقین دلایا ہے اور اسی کی طرف اس نام میں اشارہ ہے۔

خلاصہ مضمون: اس سورت کی ابتدا مسلمانوں کی تکالیف کے ذکر سے کی ہے جن میں وہ اس وقت مبتلا تھے اور انہیں بتایا ہے کہ اگر ان پر تکالیف آرہی ہیں تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت سے ہے گو کفار کی طرف سے ظلم ہی ہو کیونکہ مصائب میں پڑنے کے بغیر انسان کمال کو حاصل نہیں کرسکتا۔ دوسرے تیسرے اور چوتھے رکوع میں حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ، لوطؑ و دیگر انبیاء کا مختصر ذکر کیا ہے کہ انہیں بھی کتنا کتنا عرصہ مخالفوں کے ہاتھ سے تکلیفیں اٹھانی پڑیں مگر آخر اللہ تعالیٰ نے حق کو کامیاب کیا۔ پانچویں رکوع میں بتایا کہ یہ لوگ حق کی مخالفت کرکے پھر کہتے ہیں ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا حالانکہ ہم نے قرآن کو اس لیے نازل کیا ہے کہ تا نفوس انسانی کا تزکیہ ہو اور وہ غرض پوری ہو رہی ہے مگر اصل غرض مذہب کو چھوڑ کر یہ لوگ ایک غلط راہ پر چل رہے ہیں کہ تکذیب کرتے اور عذاب مانگتے ہیں۔ چھٹے رکوع میں بتایا کہ مسلمانوں کو تکالیف کی وجہ سے ہجرت بھی کرنی پڑے گی، اور انہیں یہ فکر نہ ہونا چاہیئے کہ ہجرت کرکے دوسری جگہ جائیں گے تو انہیں کھانے کو کہاں سے ملے گا۔ جہاں جائیں گے اللہ تعالیٰ ان کے لیے سامان معاش بھی پیدا کردے گا۔ ساتویں میں بتایا کہ یہ تکالیف عارضی ہیں اور آخرکار دور ہوجائیں گی اور مومن کامیاب ہوں گے۔

تعلّق: یہ سورت اور اس کے بعد کی تین سورتیں جو الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہیں۔ ان سب کا مضمون قریباً ایک ہی ہے یعنی اسلام کی آخری کامیابی۔ پچھلی تین سورتوں میں اصل مضمون حضرت موسیٰ کی آخری کامیابی پر تھا۔ یہاں اس کے مقابل پر آنحضرت صلعم کی کامیابی کا ذکر کیا ہے اور پچھلی سورت سے خصوصیت سے اس سورت کا یہ تعلق ہے کہ وہاں اول حضرت موسیٰؑ کی ہجرت کا ذکر کیا تھا اور آخری رکوع نبی کریم صلعم کی ہجرت کا۔ تو یہاں بتایا کہ ہجرت کامیابی کے لیے ضروری ہے اور تکالیف میں پڑنا تزکیہ نفس اور حصول کمال کے لیے ضروری ہے جو اصل غرض مذہب ہے۔

زمانۂ نزول: ان چاروں سورتوں کا زمانہ نزول ایک ہی معلوم ہوتا ہے اور اگلی سورت کی ابتدائی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانچواں یا چھٹا سال بعثت نبوی کا تھا۔ پس اس سورت کا زمانہ نزول بھی وہی ہے اور اس میں مسلمانوں کی تکالیف کا خاص ذکر بھی یہی بتاتا ہے اور ہجرت کی ضرورت میں اشارہ ہجرت حبش کی طرف بھی ہوسکتا ہے اور آیندہ پیش آنے والی ہجرت مدینہ کی طرف بھی۔

ع۲۵۴۵ فتن پر دیکھو ع۲۴۳ اصل معنی ایسے دکھوں میں ڈالنا ہیں جو انسان سے کمزوریاں دور کرکے اسے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیں۔ کیونکہ سونے کو آگ میں اسی غرض کے لیے ڈالا جاتا ہے۔ اسی اصول کو یہاں بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو بھیجنے کی غرض یہ نہیں کہ لوگ منہ سے کہہ دیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں بلکہ اصل غرض انسان کو اپنے کمالات تک پہنچانا ہے اور وہ بغیر دکھوں اور مصائب میں پڑنے کے نہیں ہوتا۔ علم کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۶۹ و ع۵۲۴۔

ع۲۵۴۶ یعنی ہمارے قانون جزا و سزا سے بچ نہیں سکتے۔

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۵﴾

جو کوئی اللہ کی ملاقات کی امید رکھتا ہے تو اللہ کا مقرر کردہ وقت ضرور آنے والا ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶﴾

اور جو کوئی جہاد کرتا ہے وہ اپنی ہی جان کی بھلائی کے لیے جہاد کرتا ہے اللہ یقیناً جہانوں سے بے نیاز ہے ۲۵۴۷

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷﴾

اور جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں ہم یقیناً اُن سے ان کی بدیاں دُور کردیں گے اور ہم ضرور انھیں اس کا بہترین بدلہ دینگے جو وہ کرتے ہیں۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ سے نیکی کرنے کا تاکیدی حکم دیا ہے اور اگر وہ تجھ پر زور دیں کہ تو میرے ساتھ (دوسروں کو) شریک کرے جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی بات نہ مان ۲۵۴۸ تمھیں میری طرف لوٹ کر آنا ہے پس میں تمھیں بتاؤنگا جو تم کرتے تھے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ﴿۹﴾

اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں ہم ان کو ضرور نیکوں میں داخل کریں گے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَ لَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَ لَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾

اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے پھر جب اللہ کے لیے دُکھ اُٹھانا پڑتا ہے تو لوگوں کے دُکھ دینے کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھتے ہیں اور اگر تیرے رب کی طرف سے مدد آئے تو وہ ضرور کہیں گے ہم بھی تمھارے ساتھ تھے کیا اللہ اسے خوب نہیں جانتا، جو لوگوں کے سینوں میں ہے ۲۵۴۹

ع۲۵۴۷ یہاں بھی جہادِ سیفی مراد نہیں۔ کیونکہ یہ سورت مکّی ہے بلکہ مراد اللہ تعالیٰ کی راہ میں کوشش کرنا ہے خواہ اپنے تزکیہ کے لیے ہو خواہ دوسرے لوگوں کو حق کی طرف بلانے کے لیے۔ دونوں کا فائدہ انسان کو پہنچتا ہے۔ دعوت الی اللہ تزکیہ نفس کے لیے بہترین جہاد ہے۔

ع۲۵۴۸ وصينا الانسان بوالديه حسنا۔ (لقمان ۳۱-۱۴) میں حسنا کا لفظ ساتھ نہیں بڑھایا اور حُسن سے مراد ایسا فعل ہے جو حُسن والا ہو۔ اور بعض نے ایصاء ذاحسن مراد لیا ہے اور یا حُسن فرطِ حسن کی وجہ سے اس فعل یا ایصاء کو کہہ دیا ہے جیسے قولوا للناس حسنا میں۔

وان جاهداك۔ دوسری جگہ ایسے ہی الفاظ کے ساتھ بڑھایا وصاحبهما فی الدنيا معروفا (لقمان ۳۱-۱۵) یعنی والدین کی نافرمانی صرف اسی خاص بات میں ہے جو شرک سے تعلق رکھتا ہے امورِ دنیا میں پھر بھی ان سے حسن سلوک ہونا چاہیئے۔ والدین کی اطاعت تمام اطاعتوں پر مقدم ہے مگر وہ بھی اللہ تعالیٰ کی معصیت کا حکم دیں تو نہیں ماننا چاہیئے۔ یہ قرآن کریم کی صریح تعلیم ہے حاکم ہو یا عالم یا پیر کسی کا وہ حکم جو خلاف شریعت ہے کسی صورت میں نہ ماننا چاہیئے۔ لاطاعة المخلوق فی معصية الله۔ اور گو یہاں لفظ شرک ہے مگر حکم عام ہے۔ یعنی ہر معصیت کی بات مراد ہے یہ وہ زمانہ تھا جب والدین اولاد کو مجبور کرتے تھے کہ وہ اسلام کو قبول نہ کریں۔

ع۲۵۴۹ فی الله سے مراد لاجل الله یا فی سبیل الله ہے اس سے معلوم ہوا کہ جو اللہ کی راہ میں دکھ اُٹھانے سے گھبراتا ہے اس کی حالت منافقانہ ہے اور آج کتنے مسلمان ہیں جو اللہ کی راہ میں ایک تنکا اُٹھانا بھی بوجھ سمجھتے ہیں۔

وَ لَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَ لَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾

اور اللہ یقیناً انھیں معلوم کرلے گا جو ایمان لائے ہیں اور وہ منافقوں کو بھی ضرور معلوم کرکے رہیگا۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا
اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَ لْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ
وَ مَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ
شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور جو کافر ہیں وہ انھیں جو ایمان لائے ہیں کہتے ہیں ہماری راہ کی پیروی کرو اور ہم ضرور تمھاری خطاؤں کو اٹھالیں گے اور وہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔

وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ
اَثْقَالِهِمْ ز وَ لَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾ ع ۱۳

اور وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ (بھی) اور قیامت کے دن ان سے اس کی بازپرس ہوگی جو وہ افترا کرتے تھے ۲۵۵۰ء

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ
فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ
فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا وہ اُن میں پچاس برس کم ہزار سال رہا، اور اُنھیں طوفان نے آپکڑا اور وہ ظالم تھے ۲۵۵۱ء

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَ جَعَلْنٰهَاۤ
اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾

سو ہم نے اسے اور کشتی والوں کو نجات دی اور ہم نے اسے تمام جہانوں کے لیے نشان بنایا ۲۵۵۲ء

وَ اِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾

اور ابراہیم کو (بھیجا) جب اس نے اپنی قوم سے کہا اللہ کی عبادت کرو اور اس کا تقویٰ کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا

اللہ کے سوائے تم صرف بتوں کو پُوجتے ہو اور

۲۵۵۰ء یہ باتیں جو کفار کہتے تھے آج ان لوگوں کے مُونہوں سے سُنی جاتی ہیں جو اپنے آپ کو دوسروں کا پیرومرشد بتاتے ہیں اثقالھم اپنے بوجھ تو اپنے گناہ ہیں اور دوسرے بوجھ گمراہ کرنے کے بوجھ ہیں۔ دونوں آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ گمراہ کرنے والے گمراہ شدہ پیروؤں کے بوجھ میں تو کچھ کمی نہیں کریں گے یعنی گمراہ شدہ پیرو اپنے گناہوں کے بوجھ آپ اُٹھائیں گے البتہ اپنے پہلے گناہوں کے ساتھ گمراہ کرنے کا مزید بوجھ انہیں اُٹھانا پڑے گا۔

۲۵۵۱ء بائبل میں بھی حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نوسو سال بیان کی گئی ہے۔ چونکہ حضرت نوحؑ کی کوئی تاریخ ہمارے سامنے نہیں اور بائبل نے جو عمر قریباً چھ سات ہزار سال قرار دی ہے وہ قابل اعتماد نہیں۔ اور قرآن کریم میں ہے قوم نوح و عاد و ثمود والذین من بعدھم لا یعلمھم الا اللہ (ابراہیم ۹:۱۴) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت قدیم زمانہ ہے اور کچھ بھی بعید نہیں کہ اس زمانہ میں انسان کی عمر زیادہ ہو اور حضرت نوح کی عمر اپنے زمانہ میں خصوصیت سے لمبی ہو جیسا اس زمانہ میں جو انسان کی اوسط عمر ۶۰-۷۰ سال ہے بعض لوگوں کی عمر دو سو سال تک بھی پہنچ جاتی ہے لیکن ان الفاظ کی ایک اور توجیہ بھی ہوسکتی ہے یعنی یہ کہ حضرت نوح کی شریعت اور برکات ساڑھے نوسو سال رہیں کیونکہ ایک پیغمبر کی مدّت بعثت وہ بھی کہی جاسکتی ہے جو اس کی لائی ہوئی شریعت باقی رہے جیسا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم صلعم قیامت تک زندہ ہیں اور بائبل نے جو تاریخیں دی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش میں نوسو باون سال تھے۔

۲۵۵۲ء کہتے ہیں کہ کشتی ایک مدّت تک جودی پر رہی لیکن اس کا نشان ہونا اس لحاظ سے ہے کہ اس کے ذکر میں لوگوں کے لیے عبرت ہے۔

وَّ تَخۡلُقُوۡنَ اِفۡکًا ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لَکُمۡ رِزۡقًا فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ الرِّزۡقَ وَ اعۡبُدُوۡہُ وَ اشۡکُرُوۡا لَہٗ ؕ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۷﴾

جھوٹ بناتے ہو — وہ جن کی تم اللہ کے سوائے عبادت کرتے ہو ، وہ تمھارے لیے رزق کا اختیار نہیں رکھتے ، سو اللہ سے ہی رزق چاہو اور اس کی عبادت اور اس کا شکر کرو ، تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

وَ اِنۡ تُکَذِّبُوۡا فَقَدۡ کَذَّبَ اُمَمٌ مِّنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ وَ مَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۸﴾

اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلے قوموں نے بھی جھٹلایا اور رسول کے ذمے کھول کر پہنچا دینے کے سوائے اور کچھ نہیں ۲۵۵۳ؔ

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا کَیۡفَ یُبۡدِئُ اللّٰہُ الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ﴿۱۹﴾

کیا وہ غور نہیں کرتے کس طرح اللہ پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر وہی اسے دوبارہ پیدا کرتا ہے یہ اللہ پر آسان ہے۔

قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ ثُمَّ اللّٰہُ یُنۡشِیٴُ النَّشۡاَۃَ الۡاٰخِرَۃَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿ۚ۲۰﴾

کہہ زمین میں چلو پھرو ، پھر دیکھو کس طرح اس نے پہلی بار پیدا کیا - پھر اللہ ہی آخرت کا اٹھانا اٹھائے گا ، اللہ ہر چیز پر قادر ہے -

یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَرۡحَمُ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ اِلَیۡہِ تُقۡلَبُوۡنَ ﴿۲۱﴾

وہ جسے چاہے عذاب دے اور جس پر چاہے رحم کرے اور اسی کی طرف تم واپس پھیرے جاؤ گے ۔

وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ۫ وَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ ﴿ع۲۲﴾ ۲/۱۴

اور تم (اسے) زمین میں عاجز کرنے والے نہیں اور نہ آسمان میں ، اور تمھارے لیے اللہ کے سوائے کوئی دوست نہیں اور نہ کوئی مددگار ہے ۲۵۵۴ؔ

وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ لِقَآئِہٖۤ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوۡا مِنۡ رَّحۡمَتِیۡ وَ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۲۳﴾

اور جو لوگ اللہ کی آیتوں اور اس کی ملاقات کا انکار کرتے ہیں ، وہ میری رحمت سے مایوس ہیں اور اُن کے لیے دردناک دکھ ہے ۲۵۵۵ؔ

فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوۡمِہٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا

سو اس کی قوم کا جواب کچھ نہ تھا سوائے اس کے کہ انھوں

۲۵۵۳ؔ یہ حضرت ابراہیم کے ذکر کا حصہ بھی ہوسکتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اس آیت سے لیکر اگلے رکوع کی پہلی آیت تک کلام کا رُخ آنحضرت صلعم اور آپ کے مخالفین کی طرف لے لیا جائے۔

۲۵۵۴ؔ یعنی نہ زمین کے اندر گھس کر اللہ تعالےٰ کی گرفت سے بھاگ سکتے ہو نہ اوپر بلندی میں چڑھ کر۔

۲۵۵۵ؔ یہ مطلب لیا گیا ہے کہ وہ قیامت کے دن رحمت سے مایوس ہوں گے۔ میرے نزدیک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی ملاقات کا انکار کرنے والا گویا رحمت الٰہی سے مایوس ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی کے مقصد کو نہایت ذلیل کر لیتا ہے۔

اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۲۴

نے کہا کہ اسے قتل کر دو یا اسے جلا دو، سو اللہ نے اسے آگ سے نجات دی - اس میں یقیناً ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۲۵

اور اس نے کہا تم نے اللہ کے سوائے بتوں کو صرف دنیا کی زندگی میں آپس کی محبت کے طور پر معبود بنایا ہے پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے، اور تم ایک دوسرے پر لعنت کرو گے اور تمہارا ٹھکانا آگ ہو اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہو گا ۲۵۵۶

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۲۶

سو لوطؑ اس پر ایمان لایا اور کہا میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں، وہ غالب حکمت والا ہے ۲۵۵۷

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۲۷

اور ہم نے اُسے اسحٰقؑ اور یعقوبؑ عطا کیے اور ہم نے اس کی اولاد میں نبوت اور کتاب جاری رکھی اور ہم نے اُسے دنیا میں اس کا اجر دیا اور وہ آخرت میں یقیناً نیکوں میں سے ہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۲۸

اور لوطؑ کو (بھیجا) جب اس نے اپنی قوم سے کہا تم نے یقیناً ایسی بے حیائی اختیار کی ہے جسے تم سے پہلے اہل عالم میں سے کسی نے نہیں کیا۔

اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ

کیا تم مردوں کے پاس جاتے ہو اور راہ مارتے ہو - اور اپنی مجلس میں بُرے کام کرتے ہو

۲۵۵۶ مودۃ بینکم کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ تمہاری بت پرستی آپس کی محبّت کی وجہ سے ہے یعنی محض ایک دوسرے کی محبت کی وجہ سے اس غلط راہ پر چلے جاتے ہو اور کبھی غور نہیں کرتے - اور دوسرے یہ کہ اس بت پرستی کو آپس کی محبّت کی بنیاد بنا رکھا ہے ویسے تم جانتے ہو کہ یہ بت کچھ چیز نہیں مگر ایک قومی اتحاد بنانے کے لیے ایک مذہب کا ڈھانچہ بنایا ہوا ہے جیسے آج کل عیسائی اقوام نے - حالانکہ بہت ہی کم لوگ ہیں جو توریت و انجیل میں جو کچھ لکھا ہے اسے سچ مانتے ہوں لیکن عیسائیت کے ڈھانچہ کو اتحاد قومی اور اغراض ملکی کے لیے قائم رکھا ہوا ہے۔ تیسرے معنی یوں کیے گئے ہیں کہ بت پرستی کی ابتدا انسانوں کی ایک دوسرے سے محبّت ہے یعنی اول ان لوگوں کے بت بنائے گئے جنہیں لوگ راستباز سمجھ کر ان سے محبت کرتے تھے پھر ان کی موت کے بعد ان کے بُت بنا لیے۔

۲۵۵۷ حضرت ابراہیم کی ہجرت : مہاجر الی ربی سے مراد ہے الجهة التی امرنی ربی بالهجرة اليها (ر) یعنی اس طرف جدھر میرے رب نے مجھے ہجرت کا حکم دیا ہے اور یہ ملک شام تھا۔ اور بعض نے مراد لی ہے کہ اپنے ان لوگوں کو ترک کر کے جو میرے مخالف ہیں اپنے رب کا قرب حاصل کرنے والا ہوں۔ بعض نے اسے لوط کا قول سمجھا ہے اور حضرت لوط بھی ایک دوسری قوم کی طرف گئے تھے مگر ہجرت عموماً ایک جگہ سے دکھ دیا جانے پر ہوتی ہے۔ اور حضرت لوط کے نہیں بلکہ حضرت ابراہیم کے خلاف منصوبہ قتل کرنے یا جلانے کا ہوا تھا۔ اور یہاں ذکر بھی حضرت ابراہیمؑ کا ہی چلتا ہے۔ اور دوسری جگہ ہے انی ذاهب الی ربّی (الصّٰفّٰت ۳ - ۹۹) پس یہ حضرت ابراہیم کا قول ہی ہے۔

الْمُنْكَرَ ۭ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ
اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ
اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۲۹

سو اس کی قوم کا جواب سوائے اس کے کچھ نہ تھا ، انھوں نے کہا ہم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب لے آ اگر تو سچّا ہے ۲۵۵۸

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ
الْمُفْسِدِيْنَ ۝۳۰ ع ۳/۸ ۱۵

اس نے کہا میرے رب ! مجھے فساد کرنے والی قوم کے خلاف مدد دے۔

وَلَمَّا جَاۗءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ
قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ
اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝۳۱

اور جب ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیمؑ کے پاس خوشخبری لے کر آئے انھوں نے کہا ہم اس بستی کے رہنے والوں کو ہلاک کرنے والے ہیں کیونکہ اس کے رہنے والے ظالم ہیں۔

قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ
اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ڡ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ
اِلَّا امْرَاَتَهٗ ڭ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۳۲

اس نے کہا اس میں لوطؑ بھی ہے ، انھوں نے کہا ہم خوب جانتے ہیں اس میں کون ہے ، ہم اسے اور اس کے گھر والوں کو نجات دینگے سوائے اس کی عورت کے وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہو

وَلَمَّآ اَنْ جَاۗءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْۗءَ
بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا
تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۣ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ
اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۳۳

اور جب ہمارے بھیجے ہُوئے لوطؑ کے پاس آئے وہ ان کی وجہ سے غمگین ہُوا اور اُن کے معاملہ میں ہاتھ کو تنگ پایا اور انھوں نے کہا ڈر نہیں اور نہ غم کر ، ہم تجھے اور تیرے گھر والوں کو بچالیں گے ، سوائے تیری عورت کے وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہے۔

اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓي اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ
رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝۳۴

ہم اس بستی کے رہنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے ہیں۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً
لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۳۵

اور یقیناً ہم نے اس کا ایک کُھلا نشان ان لوگوں کے لیے چھوڑا ہے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ
يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ
وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۳۶

اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا، تو اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو ، اور پچھلے دن کی امید رکھو اور زمین میں فساد پھیلاتے ہوئے نہ پھرو۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

تو اُنھوں نے اُسے جُھٹلایا سو اُنھیں زلزلہ نے آپکڑا اور وہ اپنے

۲۵۵۸ قطع طریق یا سبیل کے لیے دیکھو ۱۳۶۱ اور مراد اس سے ڈاکہ زنی ہے اور راغب کہتے ہیں کہ یہ اشارہ ہے یصدون عن سبیل اللّٰہ کی طرف کیونکہ اس طرح پر بھی لوگوں کو رستہ سے روکا جاتا ہے۔ مجلس میں بُرے کام کرنے کا ذکر اس لیے کیا کہ تا معلوم ہو کہ ساری قوم کی حالت خراب ہو چکی تھی اور ایک دوسرے کا لحاظ بھی نہ رہا تھا ، بلکہ ان کاموں پر فخر کرتے تھے ::

فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۳۷﴾

گھروں میں پڑے کے پڑے رہ گئے۔

وَعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۟ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾

اور عاد اور ثمود کو (بھی ہلاک کیا) اور (یہ) تمھارے لیے ان کے مکانوں سے ظاہر ہے۔ اور شیطان نے ان کے عمل انھیں اچھے کرکے دکھائے، سو انھیں (سیدھے) رستہ سے روک دیا، اور وہ بصیرت والے تھے ۲۵۵۹

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۟ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾

اور قارون اور فرعون اور ہامان کو (ہلاک کیا) اور موسٰی ان کے پاس کھلی دلائل لے کر آیا، پر انھوں نے زمین میں تکبّر کیا اور وہ (ہم سے) آگے بڑھنے والے نہ تھے۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾

سو ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ کی وجہ سے پکڑا، سو ان میں سے کسی پر ہم نے پتھر برسائے اور ان میں سے کسی کو سخت آواز نے آپکڑا اور ان میں سے کسی کو ہم نے زمین میں نابود کر دیا۔ اور ان میں سے کسی کو ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے تھے ۲۵۶۰

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

ان لوگوں کی مثال — جو اللہ کے سوائے دوست بناتے ہیں، مکڑی کی مثال کی طرح ہے۔ وہ ایک گھر بناتی ہے اور یقیناً سب گھروں سے کمزور مکڑی کا گھر ہے۔ کاش یہ جانتے ۲۵۶۱

ع۲۵۵۹ مستبصرین۔ جب ایک شخص کے لیے برائی یا بھلائی جو آنے والی ہو واضح ہو جائے تو کہا جاتا ہے اِسْتَبْصَرَ اور بصیرت والا ہو گیا بھی اس کے معنی آتے ہیں۔ اور یہاں معنی یہ ہیں کہ انہوں نے کیا جو کچھ کیا۔ اس حالت میں کہ ان پر واضح ہو گیا تھا کہ ان کے ان افعال کا انجام عذاب ہے (ل)

ع۲۵۶۰ یہاں ذکر تو گزشتہ قوموں کے عذاب کا ہی کیا ہے، مگر اصل منشا یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کے مخالفین پر یہ سب قسم کے عذاب آنے والے ہیں۔

ع۲۵۶۱ عقاید باطلہ کی کمزوری کی مثال۔ عنکبوت: اس میں ایک نہایت زبردست پیشگوئی کی ہے کہ شرک آخر کار دنیا سے اُٹھ جائے گا کیونکہ عنکبوت یعنی مکڑی کے جالے کی طرح ہے جو نہایت کمزور چیز ہے۔ ایک طرف مسلمانوں پر سخت مشکلات اور مصائب کا زمانہ ہے کفر کا زور ہے مسلمان کفار کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے دوسری طرف انہی کفار کو بتایا جاتا ہے کہ ان کے شریک جنہیں وہ اپنے مددگار سمجھتے ہیں ان کی کمزوری مکڑی کے جالے کی طرح ہے جو ایک ہوا کے جھونکے کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس مثال میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے کہ مشرک بلکہ ہر ایک غلط عقیدہ کا پیرو کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا جس طرح مکڑی کا جالا جب ایک اشارہ سے ٹوٹ جاتا ہے تو پھر دوسری دفعہ اسے ایک اور ہی رنگ میں تنتی ہے اسی طرح جب شرک پر یا کسی غلط عقیدہ پر ایک دلیل سے الزام قائم کیا جاتا ہے تو پھر اس کا پیرو دوسرا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور ایک حالت پر اس کا قیام نہیں ہوتا کیونکہ ان چیزوں کی بنیاد کسی علمی دلیل پر نہیں اور دوسری طرف اوپر بھی مخالفین انبیاء کے انجام کا ذکر کرکے یہ بتایا ہے کہ مخالفین اسلام کی تدابیر اسلام کے خلاف ایک مکڑی کے جالے سے بڑھ کر نہیں اور یوں اسلام کی آخری کامیابی کو یقینی ٹھہرایا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ
مِنۡ شَىۡءٍ‌ ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۴۲﴾
وَتِلۡكَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُهَا لِلنَّاسِ‌ ۚ
وَمَا يَعۡقِلُهَاۤ اِلَّا الۡعٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾
خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَـقِّ‌ ؕ
اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّـلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۴۴﴾ ع
اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِىَ اِلَيۡكَ مِنَ الۡكِتٰبِ
وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ‌ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ
الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ‌ ؕ وَلَذِكۡرُ اللّٰهِ اَكۡبَرُ‌ ؕ
وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ ﴿۴۵﴾

الجزء ۲۱ ع ۱۵/۴

اللہ اس کو جانتا ہے جو وہ اس کے سوائے کسی چیز کو پکارتے ہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں سوائے علم والوں کے اور کوئی نہیں سمجھتا۔

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، یقیناً اس میں مومنوں کے لیے نشان ہے۔

(اسے) پڑھتا رہ جو تیری طرف کتاب سے وحی کیا جاتا ہے اور نماز کو قائم رکھ۔ نماز بے حیائی اور بُرائی سے روک دیتی ہے۔ اور اللہ کا یاد کرنا یقیناً سب سے بڑھ کر ہے اور اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو[2562]

۲۵۶۲ نماز کے بدی سے روکنے پر عقلی دلیل: اتل اور اقم کے احکام عام ہیں اور ان دونوں باتوں کو اکٹھا اس لیے کیا کہ اصل غرض تو یہ بتانا ہے کہ قرآن کریم سے تزکیہ نفس انسانی ہوتا ہے اور اسے ایک عظیم الشان نشان ٹھہرایا گیا ہے اور نماز سے بھی تزکیہ ہوتا ہے جیسے فرمایا تنھی عن الفحشاء والمنکر تو یہ دونوں درحقیقت ایک ہی چیز ہیں اس لیے کہ نماز میں بھی تلاوت قرآن کا حصہ ہی بیشتر ہے زائد بات صرف اس قدر ہے کہ عظمت الٰہی کا جو پرتو قرآن کے پڑھنے سے قلب انسانی پر پڑتا ہے اس کے مطابق نماز میں انسان مختلف ہیئتیں اختیار کرتا ہے تاکہ وہ پرتو اپنے کمال کو پہنچے اور یہاں دو باتوں کا ذکر ہے ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ نماز بیحیائی اور بری باتوں سے روک دیتی ہے اس پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں کیا یہ نرا دعویٰ ہے یا فی الواقع نماز میں کوئی ایسی بات پائی جاتی ہے جسے عقل صحیح تسلیم کر سکے کہ اس کی وجہ سے انسان بدیوں سے رک جاتا ہے اور دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر عقلی دلائل پائی بھی جائیں تو کیا یہ امر واقع بھی ہے کہ نماز برائیوں سے روک دیتی رہی ہے۔ جہاں تک دلائل عقلی کا سوال ہے فی الواقع عبادت الٰہی اور پھر عبادت کی وہ طرز جو اسلامی نماز میں پائی جاتی ہے انسان کو بدیوں سے روک کر نیکی کی طرف لانے کا سب سے زبردست ہتھیار ہے۔ عبادت تین باتوں کے جمع ہونے کا نام ہے یعنی معبود کی طرف کامل توجہ اسکی حمد و ستائش۔ اس سے دعا کرنا ان تینوں باتوں میں سے کوئی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ معبود کی عظمت کا احساس دل میں پیدا نہ ہو اور اس کی عظمت کا احساس انسان کے دل میں ایک تبدیلی پیدا کر دیتا ہے جس سے اس کے سارے خیالات متاثر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ قلب انسانی قدرت نے ایسا بنایا ہے کہ جس چیز کی عظمت کا احساس دل میں پیدا ہو جائے اسکے خلاف دل میں خیالات پیدا نہیں ہوتے جن لوگوں کے دلوں پر اپنے پیر کی عظمت کا اثر ہوتا ہے وہ پیر کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرتے، جن پر حکام کی عظمت کا اثر ہو وہ حکام کے خلاف کچھ نہیں کرتے۔ اسلام نے وہ طریق عبادت کا سکھایا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اثر دل پر ہو اسی لیے عبادت میں تمام ارکان ایسے رکھے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اثر دل پر پیدا ہوتا ہے۔ دست بستہ کھڑے ہونا، جھکنا، سجدہ کرنا، مؤدب بیٹھنا۔ پھر ہر ایک حالت میں اس کے مناسب حال اذکار رکھے ہیں، پھر نماز کو دن رات پر تقسیم کر کے ہر روز پانچ بار انسان کے قلب پر اس عظمت الٰہی کے وارد کرنے کی طرز سکھائی ہے کیونکہ جب انسان سوتا ہے یا اپنے کاروبار میں مشغول ہوتا ہے اس کا دل دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے بار بار اس کو دوسرے اشغال سے ہٹا کر ذکر الٰہی کی طرف لانے میں یہ حکمت ہے کہ تا قلب کے بار بار اس طرف متوجہ ہونے سے اس میں وہ قوت پیدا ہو جائے کہ دوسرے اشغال کے اندر بھی اصل حکومت خیالات انسانی پر عظمت الٰہی کی ہو۔ ہاں یہ سچ ہے کہ یہ سب باتیں پہلے دن حاصل نہیں ہوتیں بلکہ جس طرح ہر ایک بلند مقام کو حاصل کرنے کے لیے انسان کو لگاتار ایک مدّت تک محنت کرنی پڑتی ہے اسی طرح نماز کی حالت ہے پہلے پہلے اکثر دلوں میں چونکہ خیالات نفسانی اور شہوات کا غلبہ ہوتا ہے اس لیے انسان کی کوشش کے باوجود بعض وقت اسے ناکامی حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ ذرا سی ناکامی پر ہمت ہار دیتے ہیں وہ اس بلند مرتبہ کے حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں کامیابی کا اصل گُر یہی ہے کہ ہر ناکامی کے بعد از سر نو اور پہلے سے بڑھ کر کوشش کی جائے ایک مدّت کی جد و جہد کے بعد انسان دیکھ لے گا کہ نماز نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا جس کا وعدہ قرآن کریم کرتا ہے یعنی ہر بے حیائی اور بدی سے اس کی طبیعت متنفر ہو جاتی ہے حدیث میں ہے کہ جس شخص کی نماز اسے بدی سے نہیں روکتی اس کی نماز نہیں ہوتی۔ افسوس ہے کہ آج مسلمانوں نے اپنے اعمال سے نماز کو بھی بدنام کر رکھا ہے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ کیا کبھی نماز نے ایسا کر کے دکھایا بھی، سو اس کی نہایت کھلی مثال تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیاں ہیں کہ کس طرح اس نماز نے انہیں

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ
هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ
وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ
اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ
وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿٤٦﴾

اور اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو، مگر ایسے طریق سے جو نہایت اچھا ہو، سوائے اس کے جو ان میں سے ظالم ہیں، اور کہو ہم اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتارا گیا اور تمہاری طرف اُتارا گیا اور ہمارا معبود اور تمہارا معبود ایک ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں ۲۵۶۳

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ
اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ
هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ
بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿٤٧﴾

اور اسی طرح ہم نے تیری طرف کتاب اُتاری، سو وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی اس پر ایمان لاتے ہیں، اور اُن میں سے (بھی) وہ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں — اور ناشکروں کے سوائے ہماری آیتوں کا کوئی انکار نہیں کرتا ۲۵۶۴

گناہ کی غلامی کی ذلیل سے ذلیل حالت سے نکال کر گناہ سے نجات کے ایسے بلند مقام پر کھڑا کر دیا جس کا اعتراف اعدائے اسلام تک کو کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام میں سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں وہ لوگ ہوئے ہیں جن کی زندگیاں اس پاک اصول کی روشن دلیل تھیں۔

دوسری بات جو یہاں بیان کی ہے وہ لذکر اللہ اکبر ہے۔ اس کے معنی سمجھنے میں اکثر لوگوں کو غلطی لگی ہے۔ ابن جریر میں ہے کہ حضرت ابن عباس نے عبداللہ بن ربیعہ سے پوچھا کہ کیا تم ان الفاظ کا مطلب جانتے ہو کہا ہاں اس سے مراد نماز میں تسبیح و تکبیر وغیرہ اور قرأت قرآن ہے۔ آپ نے فرمایا یہ نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اللہ کو یاد کرنے سے بڑھ کر اللہ کا تمہیں یاد کرنا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اذکرونی اذکرکم یعنی جب بندہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتا ہے اور اللہ کا بندہ کا ذکر کرنا اسے شرف و کرامت کا عطا فرمانا ہے۔ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ نماز ایک طرف انسان کو بدی اور بے حیائی سے روکتی ہے تو دوسری طرف انسان کے اللہ کے ذکر کرنے پر اللہ تعالیٰ اسے شرف اور بزرگی عطا فرماتا ہے گویا انسان نہ صرف بیگناہی کے مرتبہ کو حاصل کر لیتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اور بھی اس کے مرتبہ کو بڑھاتا ہے اور اپنی راہ میں بڑے بڑے کام کرنے کی طاقت دیتا ہے۔

<u>۲۵۶۳</u> طریق مجادلہ: جب تزکیہ نفس انسانی اصل غرض قرآن ہے تو ان راہوں سے بچنا ضروری ہوا جن سے اصل غرض کو نقصان پہنچے۔ ایک مذہب کی طرف دعوت دینے میں لوگ اکثر حد سے گزر کر دوسرے مذاہب اور ان کے بزرگوں پر سختی کرنے لگتے ہیں۔ بلکہ نہایت ناپاک اور ناشائستہ الفاظ ان کے متعلق استعمال کرتے ہیں اس کی مثال ہمارے اس مہذب زمانہ میں عیسائیت میں اور اس کے نقش قدم پر چل کر آریہ سماج میں ملتی ہے، جنھوں نے جوش تبلیغ میں وہ طریق مجادلہ کا اختیار کیا ہے جس سے مذہب کی اصل غرض ہی مفقود ہو گئی ہے اس لیے ایک مسلمان کو بتایا کہ اپنے مذہب کی طرف دعوت دیتے وقت اس بات کو مدنظر رکھے کہ اصل غرض یعنی تزکیہ نفس کو نقصان نہ پہنچے اور مجادلہ میں پہلی بات یہ بتائی کہ اہل کتاب یعنی ہر مذہب کے پیروؤں کے ساتھ احسن طریق سے مجادلہ کرو جس میں یہ سکھایا کہ دوسرے مذاہب پر کسی قسم کی زیادتی نہ کرو نہ ان کے بزرگوں کے حق میں کوئی بری بات کہو اور اس کی وجہ بھی ساتھ ہی بتا دی یعنی یہ کہ تم اس پر بھی ایمان لاتے ہو جو اُن پر اُتارا گیا اور جس پر انسان ایمان لاتا ہے اس کی ہتک نہیں کر سکتا اور اس ایک فقرہ امنا بالذی انزل الینا وانزل الیکم میں یہ بھی بتا دیا کہ انہیں نرمی سے سمجھاؤ کہ ہم تمہارے بزرگوں کو بھی مانتے ہیں اس لیے محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لانے سے کسی اچھی بات کو ترک نہیں کرنا پڑتا۔ صرف بعض اچھی باتیں جن سے دوسرے مذاہب محروم ہیں وہ انسان اور اختیار کر لیتا ہے اور الٰھنا والٰھکم واحد میں اصول متقابلہ مذاہب کی طرف توجہ دلائی کہ حقیقی معبود تمہارا اور ہمارا ایک ہے اسلئے کہ ایک خدا کے تم بھی قائل ہو۔ اور یہ جو استثناء کیا الا الذین ظلموا منھم تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عامہ رویہ تو یہ ہونا چاہیئے مگر بعض وقت ظالم مخالف جب حد سے گزر جاتا ہے تو اس کو متنبہ کرنے کے لیے کچھ سختی کا طریق بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ظالم نہ تو دلائل کی پروا کرتا ہے اور نہ نرمی سے کچھ فائدہ اٹھاتا ہے اس لیے اس کو مناسب طریق پر اور حدود کے اندر رہ کر سختی سے سمجھانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ یہاں جنگ اور جزیہ کا خیال بالکل بے معنی ہے مکی سورتوں میں جنگ اور جزیہ کا کیا تعلق! اور نہ ہی الفاظ اس خیال کی برداشت کرتے ہیں۔

<u>۲۵۶۴</u> کذلك انزلنا۔ یعنی سابقہ کتب کی تصدیق کرتے ہوئے ہم نے اس کتاب کو تجھ پر نازل کیا۔ اور من ھٰؤلاء سے مراد اہل عرب ہیں جن کی طرف پہلے کوئی وحی نہ آئی تھی۔ ایسی کتاب کا انکار کافر ہی کر سکتے ہیں جو قوائے انسانی کو نشو و نما دینا نہیں چاہتے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ
وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ
الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور تو اس سے پہلے کوئی کتاب نہ پڑھتا تھا اور نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا ہے اس صورت میں (اس کو) باطل کہنے والے شک کرتے ؏۲۵۶۵

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ
بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

بلکہ وہ ان لوگوں کے سینوں میں کھلی آیتیں ہیں جنھیں علم دیا گیا ہے اور ظالموں کے سوائے ہماری آیتوں کا کوئی انکار نہیں کرتا ؏۲۵۶۶

وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ
رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ
اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾

اور کہتے ہیں اس پر اپنے رب کی طرف سے نشان کیوں نہ اتارے گئے، کہہ نشان صرف اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ
يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ
ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ ؏

کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف کتاب اتاری ہے جو ان پر پڑھی جاتی ہے یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے رحمت اور نصیحت ہے جو ایمان لاتے ہیں ؏۲۵۶۷

؏۲۵۶۵ تخطّ۔ خطّ اسے کہا جاتا ہے جس کے لیے طول ہو اور اس سے مراد کتابت بھی لی جاتی ہے (غ)

رسول اللہ صلعم کے اُمّی ہونے سے قرآن کی حقانیت پر ایک دلیل: قرآن کریم نے ایک اعلیٰ درجہ کا مذہبی اصول قائم کیا ہے۔ یعنی یہ کہ سب مذاہب اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہیں اور سب نے بالآخر ایک معبود حقیقی کو تسلیم کیا ہے یہ ایک ایسا اصول ہے جسے کوئی شخص سوائے اس کے کہ دنیا کے تمام مذاہب سے خود واقفیت حاصل کرے یعنی خود ان کی کتابوں کو پڑھے قائم نہیں کرسکتا۔ آج عیسائیوں کو کس قدر مصیبت کے بعد دنیا کے حالات کو دیکھ کر اور ان کی اصل کتابوں کو پڑھ کر آخر اس کے قریب قریب ماننا پڑا ہے کہ تمام مذاہب میں کچھ نہ کچھ صداقت ہے۔ یہ رسول اللہ صلعم کے تیرہ سو سال بعد ساری دنیا میں پھر کر اور ساری کتابوں کو پڑھ کر ان لوگوں کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑا ہے مگر رسول اللہ صلعم نہ دنیا میں پھرے نہ کوئی کتاب آپ نے پڑھی۔ اس لیے اس اصول کو بیان کرکے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ محمد رسول اللہ صلعم تو پڑھنا نہ جانتے تھے اگر پڑھنا جانتے ہوتے تو کوئی شک کی گنجایش ہو سکتی تھی کہ یہ اصول انہوں نے خود بنا لیا ہے اور لا تخطہ بیمینک اس لیے ساتھ بڑھایا کہ ان اصول عالیہ کے علاوہ جو قرآن کریم نے قائم کیے ہیں اس میں ہر قسم کی تعلیم بھی جو ہمیشہ رہنے کے قابل تھی جمع کر دی ہے اور یہ کام صرف ایسے شخص کا ہو سکتا تھا جو پڑھنے کے علاوہ لکھنا بھی جانتا ہو۔ ورنہ وہ ایک کتاب میں اسے جمع کیونکر کرسکتا تھا، جیسا کہ کہیں اور بھی میں نے لکھا ہے اس بات کا دعویٰ آج ایک جرمن فاضل نے کیا ہے کہ بائبل کے اس قدر حوالجات اور مضامین قرآن کریم میں موجود ہیں کہ سوائے اس کے نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلعم نے بائبل کو پڑھ کر اس کے نوٹ لیے ہوں۔ اور پھر وقتاً فوقتاً مناسب موقعہ پر انہیں قرآن میں داخل کر دیا ہو۔

یہاں ایک بے سود بحث چھیڑی گئی ہے یعنی اس پر تو اتفاق ہے کہ آنحضرت قبل نبوت نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔ سوال یہ ہے کہ آیا بعد نبوت آپ پڑھنا یا لکھنا جانتے تھے یا نہیں اس بحث کے ایک یا دوسری طرف فیصلہ ہونے سے کچھ حاصل نہیں، لیکن یہ کہیں سے معلوم نہیں ہوتا کہ بعد نبوت رسول اللہ صلعم نے لکھنا پڑھنا سیکھا ہو بطور اعجاز اگر آپ کو آ گیا ہو تو الگ امر ہے لیکن کتابت وحی کے بارے میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمیشہ دوسرے کاتب کو بلوا کر لکھوایا کرتے تھے۔ اگر خود لکھنا جانتے ہوتے تو خود ہی لکھ لیا کرتے۔ اور احادیث میں جو لفظ کتب آیا ہے تو اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ نے ایسا لکھوایا۔ ایسا ہی حدیث بخاری کے الفاظ لا یحسن یکتب بھی قطعی دلیل نہیں اس لیے کہ ان سے یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ آپ لکھنا نہ جانتے تھے۔ با ایں اگر بعد میں آپ کا لکھنا پڑھنا مانا جائے تو یہاں جو دلیل دی ہے وہ اسی طرح قائم رہتی ہے۔

؏۲۵۶۶ اکثر مفسرین نے یہاں ھو سے مراد قرآن شریف کو اور اوتوا العلم سے مراد نبی صلعم اور علمائے صحابہ کو لیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اوتوا العلم عام ہو اور مطلب یہ ہو کہ قرآن کریم میں نہ صرف وہ صداقتیں ہیں جو پہلی کتابوں میں پائی جاتی ہیں بلکہ اس میں وہ باتیں بھی ہیں جو کسی کتاب میں نہیں اور صرف اہل علم کے سینوں میں ہیں یا اہل علم آیندہ ان کو دریافت کرسکتے ہیں۔

؏۲۵۶۷ پچھلی آیت میں مطالبہ نشانات تھا۔ اس کے جواب میں اول وہیں فرمایا کہ نشان جن سے ڈرایا جاتا ہے وہ تو آ کر رہیں گے جس کی مزید

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾

کہہ میرے اور تمھارے درمیان اللہ تعالیٰ کافی گواہ ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور جو لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں، وہی نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ لَوْ لَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَ لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور تجھ سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں، اور اگر ایک وقت مقرر نہ ہوتا تو عذاب ان پر آ چکا ہوتا، اور وہ ان پر اچانک آجائیگا اور انھیں خبر (بھی) نہ ہوگی ۲۵۶۸ؑ

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۙ﴿۵۴﴾

تجھ سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں اور یقیناً دوزخ نے کافروں کو گھیرا ہوا ہے ۲۵۶۹ؑ

يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَ يَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

جس دن عذاب انھیں اُن کے اوپر سے اور اُن کے پاؤں کے نیچے سے ڈھانک لے گا اور کہے گا چکھو جو تم عمل کرتے تھے ۲۵۷۰ؑ

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو میری زمین فراخ ہے سو میری ہی عبادت کرو ۲۵۷۱ؑ

تصریح آیت ۵۲ و ۴۵ میں موجود ہے۔ مگر یہاں ایک نہایت لطیف بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کیا یہ نشان کافی نہیں کہ قرآن کو قبول کر کے اور اس پر عامل ہو کر انسانوں کی زندگیاں پاک ہو جاتی ہیں۔ اور مذہب کی جو غرض دنیا میں ہے وہ پوری ہوتی ہے۔ ایک صداقت کے صداقت ہونے کا اصلی نشان تو یہی ہے کہ اس کو قبول کرنے والے اس سے فائدہ اُٹھائیں۔ اس سیدھی راہ کو لوگ اختیار نہیں کرتے۔

ؑ۲۵۶۸ اجل مسمی یا وقت مقرر سے مراد قیامت لینا بالکل غلط ہے۔ وہ عذاب جس کے لیے وہ جلدی کر رہے تھے عذاب قیامت نہ تھا بلکہ وہی نشان ہلاکت تھا جس کے لیے وہ بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ جب ہم تمہاری تکذیب کرتے ہیں تو ہم ہلاک کیوں نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہی تفسیر ابن جریر نے کی ہے اور اس آیت کو نقل کیا ہے اللھم ان کان ھٰذا ھو الحق من عندك فامطر علینا حجارۃ من السماء او ائتنا بعذاب الیم (الانفال۸-۳۲) اور اجل مسمی کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔ ما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم وما کان اللہ معذبھم وھم یستغفرون (الانفال۸-۳۳) اور ایک قول یوم بدر کے متعلق ہے (ر)

ؑ۲۵۶۹ یہاں بھی جس عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں وہی عذاب دنیا ہے مگر جواب میں فرمایا کہ جہنم نے کافروں کا احاطہ کیا ہوا ہے یعنی یہ عذاب دنیا تو کیا ہے اس سے بڑا عذاب بھی ان کے لیے موجود ہے گویا بتایا ہے کہ دنیا کا عذاب تو صرف بطور پیش خیمہ ہے۔ اور یا جہنم سے مراد یہاں ان کے اعمال بد کے نتائج ہیں جو فی الحقیقت تو ان کو گھیرے ہوئے ہیں مگر وہ انہیں دیکھتے نہیں، اگلی آیت سے دوسرے معنی کی تائید ہوتی ہے۔

ؑ۲۵۷۰ مفسرین نے عموماً اس سے عذاب جہنم مراد لیا ہے، مگر خود قرآن کریم میں دوسری جگہ یہی لفظ اسی عذاب دنیا پر آئے ہیں قل ھو القادر علیٰ ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعا ویذیق بعضکم باس بعض (الانعام۶-۶۵) جس کے لیے دیکھو ؑ۹۵۹

ؑ۲۵۷۱ ایک خدا کی عبادت کو وسعت زمین سے کیا تعلق ہے اس میں صاف اشارہ ہجرت کی طرف ہے یعنی اگر ایک جگہ تمہیں دکھ ملتا ہے تو دوسری جگہ چلے جاؤ۔ مجاہد سے ہے فھاجروا وجاھدوا اور ابن زید سے ہے کہ اس سے مراد ہے من کان بمکۃ من المؤمنین (ج) اور یا مراد ہے کہ بدوں کی صحبت سے الگ ہو جاؤ۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾

ہر شخص موت (کا مزہ) چکھنے والا ہے۔ پھر تم ہماری طرف ہی لوٹائے جاؤ گے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۵۸﴾

اور جو لوگ ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں ہم ضرور انھیں جنّت کے بلند مقامات میں جگہ دیں گے جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اسی میں رہیں گے۔ کام کرنے والوں کا اجر کیا ہی اچھا ہے۔

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾

جو صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾

اور کتنے جاندار ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ انھیں رزق دیتا ہے اور تمھیں بھی اور وہ سننے والا جاننے والا ہے ۲۵۷۲ء

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور اگر تو ان سے پوچھے کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کام میں لگایا، تو کہیں گے اللہ نے، پھر کہاں سے اُلٹے پھر جاتے ہیں۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۲﴾

اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور اس کے لیے تنگ کرتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ ع ۶

اور اگر تو ان سے پوچھے کون بادل سے پانی اتارتا ہے پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے تو وہ کہیں گے اللہ، کہہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے بلکہ اُن میں سے بہت عقل سے کام نہیں لیتے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾ وقف لازم

اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف بے حقیقت شغل اور کھیل ہے اور آخرت کا گھر وہی یقیناً (اصل) زندگی ہے)، کاش وہ جانتے ۲۵۷۳ء

۲۵۷۲ء روایت ہے کہ نبی کریم صلعم نے مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا تو لوگوں نے کہا کہ وہاں ہمارے معاش کی کیا سبیل ہو گی جس پر یہ آیت نازل ہوئی (ر) یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ رزق جہاں جاؤ گے مل جائے گا۔ رزق ساتھ اُٹھائے پھرنا ضروری نہیں۔

۲۵۷۳ء حیوان۔ حیاۃ یعنی زندگی کی جائے قرار ہے اور یہ دو طرح پر ہے ایک وہ جس کے لیے حواس ہیں دوسرا وہ جس کے لیے بقائے ابدی ہے اور یہی یہاں مراد ہے۔ اور بعض اہل لغت کے نزدیک حیوان اور حیاۃ ایک ہی ہیں (غ)
دنیا کی زندگی سے مراد کھانا پینا اور حوائج جسمانی کا پورا کرنا ہے۔ اور آخرت کے گھر سے وہ امور ہیں جو اخلاق اور روحانیت سے تعلق رکھتے

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ
مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ
إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ﴿٦٥﴾
لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۙ وَلِيَتَمَتَّعُوا ۖ
فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٦٦﴾
أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ
النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ
وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ﴿٦٧﴾
وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ
كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ ۚ
أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْكَافِرِينَ ﴿٦٨﴾
وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ
ع سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٦٩﴾

سو جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں،
اسی کے لیے فرماں برداری کو خالص کرتے ہوئے۔
پھر جب انھیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو وہ شرک کرنے لگتے ہیں۔
تاکہ اس کی ناشکری کریں جو ہم نے انھیں دیا ہے اور تاکہ وہ
عارضی فائدہ اُٹھائیں سو جان لیں گے۔
کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ ہم نے حرم کو امن والا بنایا ہے،
اور لوگ اُن کے اردگرد سے اُچک لیے جاتے ہیں، تو کیا
باطل پر ایمان لاتے اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں ۲۵۷۴
اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بنائے
یا حق کو جھٹلائے جب وہ اس کے پاس آگیا ہو، کیا کافروں
کا ٹھکانا دوزخ میں نہیں ہے ۲۵۷۵
اور جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انھیں اپنے
رستوں پر چلائیں گے اور اللہ تعالیٰ یقیناً نیکی کرنیوالوں کے ساتھ ہے۔ ۲۵۷۶

ہیں اوّل الذکر موت کے ساتھ منقطع ہو جانے والی چیزیں ہیں اس لیے جو صرف انہیں کو غرضِ زندگی ٹھہرا لیتا ہے وہ گویا لہو و لعب میں مصروف ہوگیا کیونکہ حقیقی غرضِ زندگی سے محروم رہ گیا۔ پس جو حقیقی غرضِ زندگی کو اختیار کرتا ہے وہی کامیاب ہوگا۔

ع ۲۵۷۴ عرب میں عام طور پر بڑی بے امنی تھی اور کسی شخص کی جان محفوظ نہ تھی اسی کی طرف یتخطف الناس من حولھم میں اشارہ ہے ایسے ملک میں جہاں چاروں طرف بے امنی ہو حدودِ حرم کے اندر کسی شخص کا دوسرے پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکنا اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نشان تھا جس کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے۔

ع ۲۵۷۵ گویا دونوں فریقوں میں سے جب ایک اتنا بڑا ظلم اختیار کر رہا ہے تو ضرور ہے کہ اسے سزا ملے اور دوسرا فریق کامیاب ہو۔

ع ۲۵۷۶ پس جس کے ساتھ اللہ ہو وہی کامیاب ہوگا۔

(۳۰) سُوْرَةُ الرُّوْمِ مَكِّيَّةٌ

آیاتھا ۶۰ — رکوعاتھا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اللہ تم بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓ ۚ ①
مَیں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ ②
رومی مغلوب ہو گئے[۲۵۷۷]

فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ ③
قریب سرزمین میں — اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد

فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ ④
چند سال میں غالب آجائیں گے۔ پہلے اور پیچھے، اللہ تعالیٰ کا ہی حکم ہے اور اس دن مومن خوش ہوں گے۔

بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ
اللہ کی مدد سے، وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے،

نام: اس سورت کا نام الروم ہے اور اس میں چھ رکوع اور ساٹھ آیتیں ہیں۔ یہ سورت شروع اس مضمون سے ہوتی ہے کہ روم والے جو اس وقت عیسائی تھے۔ ایرانیوں کے ہاتھ سے مغلوب ہو گئے ہیں لیکن نو سال کے اندر اندر وہ ایران پر غالب آجائیں گے مگر صرف اس خبر کا دنیا مقصود نہیں بلکہ اصل بات جو بتائی ہے وہ یہ ہے کہ جو وقت رومیوں کے ایرانیوں پر غلبہ کا ہے وہی وقت مسلمانوں کے اپنے دشمنوں پر غلبہ کا ہے اور دونوں کو اکٹھا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ پیشگوئی کے وقت یہ دونوں قومیں مغلوب تھیں اور مغلوب بھی ایسی کہ ان کے اُٹھنے اور ایک طاقتور دشمن پر غالب آنے کا خفیف سے خفیف قرینہ بھی نہ تھا۔ اس تعلق کی وجہ سے اس سورت کا نام جس میں غلبہ اسلام کی صریح پیشگوئی ایک معین وقت کے اندر پورا ہونے والی کی ہے الروم رکھا گیا۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں رومیوں کے مغلوب ہونے کے بعد غالب آنے کی پیشگوئی کر کے اور اس کی میعاد نو سال قرار دیکر صراحت سے فرمایا کہ عین وہی وقت مسلمانوں کی کامیابی کا بھی ہوگا۔ دوسرے میں مومن اور کافر کے انجام کا مقابلہ ہے، تیسرے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نشانات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چوتھے میں بتایا ہے کہ اسلام فطرت انسانی کا مذہب ہے اور اس میں بھی یہی اشارہ کیا ہے کہ یہ یقینی بات ہے کہ جو مذہب فطرت انسانی کے مطابق ہے وہ آخر کار دنیا میں مقبول ہو۔ پانچویں رکوع میں بتایا کہ کل عالم میں فساد پھیل چکا تھا اور اب اسلام کے آنے سے ایک عظیم الشان انقلاب روحانی کی بنیاد رکھی گئی ہے جس کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ چھٹے رکوع میں بتایا کہ حق کی مخالفت آخر کار دور کر دی جائے گی۔

تعلق: ان چاروں سورتوں کا مضمون تو ایک ہی ہے لیکن یہاں اسلام کی آخری کامیابی کو دو پہلوؤں سے واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے اول مسلمانوں کے ایک معین میعاد کے اندر اس وقت کے دشمنوں پر غالب آنے کی خبر ہے دوسرے یہ بتا کر کہ اسلام مذہب فطرت ہے اور فطرت انسانی آخر کار اس کے سامنے سر جھکائے گی۔

زمانہ نزول: یہ سورت بالاتفاق کل کی کل مکّی ہے اور اس کا زمانہ نزول یقین کے ساتھ پانچواں یا چھٹا سال بعثت کا کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہی وہ وقت ہے جب رومیوں کی مغلوبیت انتہا کو پہنچ گئی اور اہل فارس نے ان کے تمام صوبجات یکے بعد دیگرے لے لیے۔

ع۲۵۷۷ الروم۔ سلطنت روما کے لوگ اپنے آپ کو رومی کہتے تھے اور یہ عیسائی تھے۔

سلطنت روما کی یہ مغلوبیت جس کا یہاں ذکر ہے ایرانیوں کے ہاتھ سے وقوع میں آئی۔ ان دونوں سلطنتوں کا مقابلہ مدت سے چلا آتا تھا۔ آخر ۶۰۲ء عیسوی میں وہ عظیم الشان جنگ شروع ہوئی جو خسرو ثانی شاہ ایران نے رومیوں کے ساتھ شروع کی "اس کی افواج نے سیریا اور ایشیائے کوچک کو لوٹا۔ اور ۶۰۸ء عیسوی میں کیلسیڈون پر بڑھیں۔ ۶۱۳ء و ۶۱۴ء میں جرنیل شہ براز نے دمشق اور یروشلیم کو فتح کر لیا اور مقدس صلیب کو لے گیا۔ جلد ہی بعد مصر بھی فتح ہو گیا۔ رومی کوئی مقابلہ نہ کر سکے کیونکہ ایک طرف اندرونی جھگڑوں سے اور دوسری طرف سلافیوں کے دباؤ سے وہ بہت ہی کمزور ہو رہے تھے۔" (انسکلوپیڈیا برٹینیکا)

الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝٥ | اور وہ غالب رحم کرنے والا ہے ۲۵۷۸

وَعْدَ اللَّهِ ۖ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝٦ | اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ ۝٧ | وہ دنیا کی زندگی کی ظاہر (باتوں) کو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ بالکل غافل ہیں۔

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِم ۗ مَّا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ وَإِنَّ | کیا انھوں نے اپنے دل میں غور نہیں کیا، اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، حق کے ساتھ اور ایک وقت مقرر تک کے لیے رہنے کو ہی پیدا کیا ہے،

۲۵۷۸ ادنی الارض کے لفظی معنی قریبی سرزمین ہیں اور یہاں ملک عرب سے قریب مراد ہے اور حضرت ابن عباس اور سدی سے مروی ہے کہ مراد اس سے یردن اور فلسطین ہیں اور یہی صحیح ہے اور اس لفظ کے لانے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ ۶۱۴ء عیسوی کا واقعہ ہے جب ایرانی دمشق اور بیت المقدس کو فتح کرکے صلیب بھی لے گئے اور یہ ان کی انتہائی مغلوبیت تھی گو اس کے بعد بھی ایرانی بڑھتے ہی چلے گئے۔

جب مکہ میں ایرانیوں کے غلبہ اور رومیوں کی مغلوبیت کی خبر پہنچی تو بت پرست قریش نے خوشی کا اظہار کیا اس لیے کہ وہ اہل کتاب کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔ اور بالخصوص مسلمانوں کی مخالفت کی وجہ سے اور کچھ عرب پر ایرانیوں کے تسلط کی وجہ سے انہیں ایرانیوں کے غلبہ سے خوشی ہوئی اس پر ان آیات کا نزول ہوا جن میں دو پیشگوئیاں ہیں اول یہ کہ نو سال کے اندر اندر رومی اپنے دشمنوں پر فتح پالیں گے۔ دوسری یہ کہ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد پہنچے گی اور وہ خوش ہوں گے۔ چنانچہ ابن جریر میں ہے یوم یغلب الروم فارس لیفرح المؤمنون باللہ و رسولہ بنصر اللہ ایاھم علے المشرکین جس دن رومی ایران پر غالب آئیں گے اللہ اور رسول پر ایمان لانے والے اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے جو اللہ انہیں مشرکوں کے خلاف دیگا۔ اور ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ یہ بدر کا دن تھا (د) اور اگر غور کیا جائے تو نصر اللہ کا لفظ مومنوں کی کافروں پر فتح پر ہی صادق آسکتا ہے اور یوں یہ پیشگوئی اپنے اندر اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کا عجیب ترین نمونہ ہے اور کوئی پیشگوئی صفائی میں اس سے بڑھ کر نہیں ایک عرصہ دراز کے بعد ایک ایسی لمبی جنگ میں جو ۶۰۲ء سے شروع ہو کر ۶۱۵ء میں ختم ہوتی ہے یعنی تیرہ سال جاری رہتی ہے سلطنت ایران سلطنت روما پر غالب آتی ہے اس کا صوبہ پر صوبہ لیتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ کل صوبجات کو لیکر اس کے دار الخلافہ کے دروازہ پر جا موجود ہوتی ہے ایسے وقت میں یہ پیشگوئی کہ یہ مغلوب سلطنت آخر کار غالب آجائے گی کسی انسان کی طاقت میں نہیں مگر اس پر بضع سنین کی شرط بڑھا دینا یعنی نو سال کے اندر اندر غالب آجائے گی نہ صرف قیاس وقرائن سے باہر بلکہ عین ان کے خلاف ہے اور اسی پر بس نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک ایسی ہی بظاہر ناممکن الوقوع بات اور ملادی ہے یعنی یہ کہ عین اس وقت جب رومی ایران پر نو سال کے اندر اندر غالب آئیں گے مسلمان بھی مشرکین پر غالب آئینگے حالانکہ مسلمانوں کی اس وقت کوئی جماعت بھی نہیں جس کے غالب آنے کا وہم بھی کسی کو ہو سکے۔ لیکن قدرت خداوندی کا کیا عجیب نظارہ ہے کہ ایک ہی سال میں یعنی ۶۲۴ء عیسوی میں ہرقل نہ صرف اپنے علاقے واپس لے لیتا ہے بلکہ ایران کے اندر داخل ہو کر ان کے بڑے آتشکدہ کو تباہ کر دیتا ہے وراسی سال میں ۳۱۳ مسلمان جن کے پاس ہتھیار نہیں، جو جنگ آزمودہ جوان نہیں ایک ہزار قریش کی مسلح جمعیت پر غالب آتے ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ اور اُبی بن خلف کی شرط: اس عظیم الشان پیشگوئی پر عرب خاموش نہ رہ سکتے تھے، اُبی ابن خلف نے بڑی شد و مد سے اس کا انکار کیا اور کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا واقعات اس کے خلاف ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے جن کا ایمان وحی الٰہی پر پہاڑ کی طرح مضبوط تھا اس پر اس سے شرط لگائی کہ اگر تین سال میں اہل روم غالب نہ آگئے تو دس اونٹ میں دونگا اور اگر غالب آگئے تو دس اونٹ تم سے لونگا۔ آنحضرت صلعم کو جب یہ علم ہوا تو آپ نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ بضع کا لفظ تو نو تک آتا ہے۔ اس لیے میعاد اور شرط دونوں کو بڑھا دو۔ اُبی بن خلف نے اس کو منظور کیا اور شرط یہ قرار پائی کہ اگر نو سال کے اندر رومیوں نے ایران کو مغلوب نہ کیا تو ایک سو اونٹ ابو بکرؓ اُبی کو دیں گے ورنہ اس سے ایک سو اونٹ لیں گے۔ چنانچہ روح المعانی میں ذیل کی روایت بیان کی گئی ہے اور ترمذی کے حوالہ سے اسے حسن قرار دیا ہے انہ لما کان یوم بدر ظھرت الروم علی فارس فاخذ ابوبکر رضی اللہ عنہ الخطر من ورثۃ اُبی وجاء بہ الی النبی صلعم فقال علیہ الصلوٰۃ والسلام تصدق بہ (د) یعنی جب بدر کا واقعہ ہوا تو رومی ایران پر غالب آئے پس ابو بکرؓ نے اُبی کے وارثوں سے شرط کا مال لیا اور اسے نبی صلعم کے پاس لائے تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ صدقہ کر دو۔ پس یہ پیشگوئی کفار میں بھی خوب شہرت پا چکی تھی اور پھر اس کا پورا ہونا بھی ان پر اچھی طرح ظاہر ہو گیا تھا۔

كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ⑧

اور بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کا انکار کرنے والے ہیں۔[۲۵۷۹]

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ
كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ
وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَاۗءَتْهُمْ
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ فَمَا كَانَ اللّٰهُ
لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۹ۭ

کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھیں
کہ ان کا انجام کیسا ہُوا، جو اُن سے پہلے تھے۔
وہ ان سے قوت میں بڑھ کر تھے اور انھوں نے زمین
کو کاشت کیا اور اسے آباد کیا، اس سے بڑھ کر جو انھوں
نے آباد کیا اور ان کے پاس ان کے رسول کھلی دلائل کے ساتھ آئے
سو اللہ تو ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا بلکہ وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے تھے۔

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْٓاٰى
اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا
بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑩ ع

پھر ان لوگوں کا انجام جنھوں نے بدی کی بہت بُرا ہُوا،
اس لیے کہ انھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا اور ان
پر ہنسی کرتے تھے۔[۲۵۸۰]

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ
اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ⑪

اللہ ہی پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرتا ہے
پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ⑫

اور جب (موعودہ) گھڑی آئے گی مجرم سخت نا امید ہو جائیں گے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَاۗىِٕهِمْ شُفَعٰۗؤُا
وَكَانُوْا بِشُرَكَاۗىِٕهِمْ كٰفِرِيْنَ ⑬

اور ان کے شریکوں میں سے کوئی ان کے سفارشی نہ ہوں گے
اور وہ اپنے شریکوں کا انکار کرنے والے ہونگے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ⑭

اور جب وہ گھڑی آئے گی اس دن الگ الگ ہو جائیں گے[۲۵۸۱]

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ⑮

پس وہ جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں وہ سرسبز
جگہ میں خوش ہوں گے[۲۵۸۲]

دنیا کا عظیم ترین معجزہ: اس سے بڑھ کر کونسا معجزہ ایک نبی کی صداقت کو ظاہر کرسکتا ہے جن معجزات پر حضرت عیسٰی کی خدائی کی نبیاد رکھی جاتی ہے ان میں سے ایک کا بھی کوئی ثبوت اس وقت موجود نہیں مگر نبی کریم صلعم کا یہ معجزہ آج بھی ایسا ثابت ہے جیسا آپ کی زندگی میں پیشگوئی کے پورا ہونے کے وقت ثابت تھا۔ اپنی صفائی کے لحاظ سے آنحضرت صلعم کا یہ ایک ہی معجزہ قیامت تک آپ کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

ع۲۵۷۹ اس سے معلوم ہوا کہ زمین اور یہ نظام عالم بھی ایک وقت مقرر کے لیے ہے اور اس پر بھی فنا کا ایک وقت آئے گا۔

ع۲۵۸۰ سوای۔ اَسوء کی تانیث ہے یعنی بہت بُرا۔

ع۲۵۸۱ یعنی اچھے اور برے الگ الگ ہو جائیں گے جیسا آگے تفصیل سے ظاہر ہے اس دنیا میں ملے جلے رہتے ہیں۔

ع۲۵۸۲ روضۃ۔ رَوض وہ جگہ ہے جہاں پانی جمع ہو جائے اور سبزی ہو اور یہاں جنت کے روضوں میں سے روضہ مراد ہے اور وہ اس کے خوبصورت اور لذت والے مقام ہیں اور فی روضت الجنات (الشوریٰ ۲۲) میں اس کی طرف اشارہ ہے جو عقبٰی میں ظاہر طور پر ان کے لیے تیار کیا جائے گا اور کہا گیا ہے کہ یہ اشارہ ان علوم و اخلاق کی طرف ہے جن کا انہیں اہل بنایا ہے جن کے ساتھ جو شخص مخصوص ہو اس کا دل خوش اور پاکیزہ ہوتا ہے (غ) اور حقیقت یہی ہے کہ جو لوگ بوجہ اپنے اخلاق اور علوم الٰہی کے یہاں طیب نفس حاصل کر لیتے ہیں وہی ان کے لیے آخرت میں ظاہری روضات کی شکل میں ظاہر ہو جائے گا۔ فی الحقیقت مومن یہاں بھی روضوں میں خوش ہوتے ہیں اور قیامت میں بھی ہونگے ایسا ہی کفار یہاں بھی عذاب میں ہوتے ہیں آخرت میں بھی ہوں گے ہاں یہاں کی خوشیوں اور عذاب کا رنگ مخفی ہے وہاں کھلا ہوگا۔

وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ لِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۝١٦

اور وہ جو کافر ہیں اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے ہیں، وہ عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝١٧

سو اللہ پاک ہے جب تم پر شام ہو اور جب تم پر صبح ہو ع۲۵۸۳

وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ عَشِيًّا وَّ حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝١٨

اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی تعریف ہے اور پچھلے پہر اور جب تم پر دوپہر ہو ع۲۵۸۴

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ وَ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝١٩ ع

وہ زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور مُردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے اور اسی طرح تم نکالے جاؤ گے ع۲۵۸۵

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝٢٠

اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمھیں مٹی سے پیدا کیا پھر دیکھو تم انسان بن کر پھیل جاتے ہو ع۲۵۸۶

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمھارے لیے تمھارے نفسوں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ اور تمھارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے

ع۲۵۸۳ تمسون۔ مَسَاء۔ صباح کی ضد ہے اور اِمساء اِصباح کی (ل) پس تمسون کے معنی ہوئے شام کے وقت میں داخل ہوتے ہو۔

ع۲۵۸۴ عشیّ کے لیے دیکھو ع۴۱۷ زوال آفتاب سے بعد کا وقت ہے اور رات بھی اس میں داخل ہے۔
تظہرون کے معنی ہیں ظہیرۃ کے وقت میں داخل ہوتے ہو ع۲۳۴۵۔

بلاشبہ ان دو آیات میں پانچ نمازوں کا ذکر ہے۔ شام کے وقت میں مغرب اور عشا کی نمازیں داخل ہیں اور صبح کے وقت میں نماز فجر ہے۔ عَشیّ میں نماز عصر اور تظہرون میں نماز ظہر۔ لیکن الفاظ ایسے اختیار فرمائے ہیں کہ جن سے ایک اور غرض بھی حاصل ہوتی ہے یعنی شام میں داخل ہونا روشنی سے تاریکی میں داخل ہونا ہے اور صبح میں داخل ہونا تاریکی سے روشنی کی حالت میں آنا ہے اور انسان پر بلحاظ حالات ظاہری دونوں حالتیں آتی رہتی ہیں ایسا ہی عشیّ یا عصر کا وقت آفتاب کے بہت نیچے ہو جانے کا وقت ہے اور ظہیرۃ اس کے سب سے بلند مقام پر ہونے کا وقت ہے اور یہاں بھی اشارہ ایک انسان کی اس حالت کی طرف ہے جب اس کا آفتاب اقبال ڈھل جاتا ہے اور دوسرا اس حالت کی طرف جب وہ افق پر ہوتا ہے ان تمام حالات میں جو انسان کو پیش آتے رہتے ہیں سبحان اللہ کی تعلیم بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں عیوب اور نقصانوں سے پاک ہے اور ان حالات مختلفہ کا انسان پر آنا انسان کی اپنی اصلاح یا کسی اور مصلحت الٰہی سے ہے یا رات کے آنے میں اشارہ زمانہ جہالت کی طرف ہے اور دن کے آنے میں علم اور دین کے پھیلنے کی طرف۔

ع۲۵۸۵ مُردہ سے زندہ نکالنے سے مراد: اخراج کے لیے دیکھو ع۴۹۷ ایک حالت سے نکالنے پر بھی بولا جاتا ہے اور یہاں اول زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے کا ذکر کیا جس کے لیے دیکھو ع۳۹۸ اور چونکہ موت اور زندگی کے لفظ روحانی موت اور روحانی زندگی پر بھی بولے جاتے ہیں دیکھو ع۷۹ اس لیے مردہ کو زندہ سے اور زندہ کو مردہ سے نکالنے کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ ایک روحانی طور پر مردہ قوم سے زندہ قوم کو پیدا کرتا ہے اور یہی یہاں مراد ہے جیسا کہ مجاہد سے مروی ہے یخرج المؤمن من الکافر ویخرج الکافر من المؤمن (ر) اور یہی حسن کا قول ہے (ج)۔
پس کذٰلك تخرجون سے مراد بھی یہی ہے کہ تمھیں بھی ایک مردہ حالت سے نکال کر زندہ کیا جائے گا۔

ع۲۵۸۶ نشان وہی چیز ہو سکتی ہے جو سامنے موجود ہو۔ پس ہمیں مٹی سے پیدا کرنے کے یہ معنی لینا کہ حضرت آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا تھا صحیح نہیں بلکہ ہر ایک

لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۱﴾
لیے نشان ہیں جو فکر کرتے ہیں ۲۵۸۷ے

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِكُمۡ وَاَلۡوَانِكُمۡ‌ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡعٰلِمِيۡنَ ﴿۲۲﴾
اور اس کے نشانوں میں سے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمھاری زبانوں اور تمھارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں علم والوں کے لیے نشان ہیں ۲۵۸۸ے

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمۡ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَابۡتِغَآؤُكُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ‌ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۳﴾
اور اس کے نشانوں میں سے رات اور دن کو تمھارا سونا اور تمھارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو سنتے ہیں۔

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ يُرِيۡكُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحۡىٖ بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا‌ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۴﴾
اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمھیں خوف اور امید کے لیے بجلی دکھاتا ہے اور بادل سے پانی اتارتا ہے پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ تَقُوۡمَ السَّمَآءُ وَالۡاَرۡضُ بِاَمۡرِهٖ‌ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمۡ دَعۡوَةً ‌ۖ مِّنَ الۡاَرۡضِ ‌ۖ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ تَخۡرُجُوۡنَ ﴿۲۵﴾
اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں پھر جب وہ تمھیں زمین سے ایک آواز دیکر پکارے گا تو تم فوراً نکل پڑو گے ۲۵۸۹ے

وَلَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوۡنَ ﴿۲۶﴾
اور اسی کے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اسی کے فرماں بردار ہیں۔

وَهُوَ الَّذِىۡ يَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ وَهُوَ اَهۡوَنُ عَلَيۡهِ‌ؕ وَلَهُ الۡمَثَلُ الۡاَعۡلٰى فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ۚ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ
اور وہی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرتا ہے اور یہ اس پر بہت آسان ہے اور اس کی شان آسمانوں اور زمین میں بہت بلند ہے۔ اور وہ غالب حکمت والا

انسان مٹی سے پیدا ہوتا ہے اور نشان یہی ہے کہ کس طرح مٹی کے اجزا کا خلاصہ درخلاصہ نکل کر ایک انسان بن جاتا ہے۔ پس وہ خدا جو ہماری آنکھوں کے سامنے مٹی سے انسان بنا کر کھڑا کرتا ہے کیا وہ ہمارے اعمال سے ایک نئی پیدائش نہیں کر سکتا۔ اسی کی طرف رکوع کی آخری آیت میں توجہ دلائی ہے کہ وہ اس پر بہت آسان ہے۔

۲۵۸۷ے یہاں مردوں کے لیے ان کے نفسوں سے بیبیاں پیدا کرنے کا ذکر ہے پس صرف حوّا ہی حضرت آدم کے نفس سے پیدا نہیں ہوئیں۔ بلکہ سب کے لیے ازواج ان کے نفسوں سے پیدا ہوتی ہیں اور مراد اس جنس سے پیدا کرنا ہے تاکہ باہم محبّت اور رحم ہو اور اس میں فکر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی توحید پر نشان ہونے کا ذکر کیا اور آگے کہیں علم والوں کے لیے کہیں سننے والوں کے لیے کہیں عقل سے کام لینے والوں کیلئے ایسے ہی نشانات کا ذکر کیا اور بتا دیا کہ عقل و فکر سے کام لیا جائے تو انسان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر میں صاف اس کی ہستی اور اس کی توحید کی دلائل ملتی ہیں۔

۲۵۸۸ے زبانوں اور رنگوں کے اختلاف کے ذکر سے مطلب تو یہی تھا کہ اس قدر اختلافات کے باوجود تم سب انسان ایک ہی ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے ذکر کے ساتھ اس کو جمع کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں ظاہری اختلاف کے اندر ایک وحدت نظر آتی ہے مگر آج یہ حالت ہے کہ سفید اور سیاہ رنگ میں اس قدر فرق کر دیا گیا ہے کہ سفید رنگ حکومت کے لیے پیدا ہوا ہے اور سیاہ محکومیت کے لیے۔

۲۵۸۹ے اس سے مراد قیامت ہے اس کا پکارنا کس رنگ میں ہوگا اسے وہی بہتر جانتا ہے۔

الْحَكِيْمُ ﴿٢٧﴾ ع

ہے۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٢٨﴾

وہ تمھارے لیے تمھاری اپنی مثال بیان کرتا ہے کیا ان میں سے جن کے تمھارے داہنے ہاتھ مالک ہیں اس رزق میں جو ہم نے تمھیں دیا ہے کوئی تمھارے شریک ہیں کہ تم (سب) اس میں برابر ہو، ان کی تم ایسی پروا کرتے ہو جیسی اپنی پروا کرتے ہو، اسی طرح ہم ان لوگوں کے لیے باتیں کھول کر بیان کرتے ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں ۲۵۹۰

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٩﴾

بلکہ جو ظالم ہیں وہ اپنی خواہشات کی پیروی بغیر علم کے کر رہے ہیں سو اسے کون ہدایت دے جسے اللہ گمراہ ٹھیرائے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٠﴾

سو یکسو ہو کر دین کی طرف اپنا رُخ کر اللہ کی بنائی ہوئی فطرت پر قائم رہ جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی پیدائش کو کوئی بدل نہیں سکتا، یہ قائم رہنے والا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۲۵۹۱

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ

اس کی طرف رجوع کرنے والے (رہو) اور اس کا تقوے کرو

۲۵۹۰ فطرت انسانی کو اپیل کی ہے کہ جب مالک اور مملوک آقا اور نوکر تمھارے نزدیک برابر نہیں حالانکہ ایک ہی جیسے انسان ہیں، تو مخلوق کو خالق کے برابر کس طرح ٹھہراتے ہو۔

۲۵۹۱ فِطْرت۔ فَطْر کے لیے دیکھو ۹۱۳ اور فَطَرَ اللّٰہُ الخلقَ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ ایک چیز کو وجود میں لایا اور ایسی شکل پر بنایا جس سے کوئی فعل مترشح ہوتا تھا پس فِطْرَۃَ اللّٰہِ الّتی فطر الناس علیہا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہے اس کی طرف جو اس نے پیدا کیا یعنی اصل حالت میں بنایا اور لوگوں کے اندر اپنی معرفت کا حصّہ مرکوز کر دیا اور فطرۃ اللہ وہ ہے جو اس میں معرفت ایمان کی قوت مرکوز ہے جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہے ولئن سألتہم من خلقہم لیقولن اللہ (الزخرف ۴۳-۸۷) (غ) اور بخاری میں ہے الفطرۃ الاسلام یعنی فطرۃ اسلام ہے اور فطرت اللہ یہاں فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے الزموا فطرۃ اللہ. یا علیکم فطرت اللہ۔

فطرت کا مذہب اسلام ہے: جب پچھلے رکوع میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور قدرت کے نشان بیان کیے اور یہاں پہلی آیت میں فطرت انسانی کو اپیل کی تو اب اس کا نتیجہ بیان فرمایا کہ اسی دین پر قائم رہو جس کی طرف یہ شواہد لے جاتے ہیں۔ اور حنیف رہو یعنی افراط و تفریط اس میں نہ ہو۔ اور اقم میں خطاب عام ہے، اس لیے آگے سب صیغے جمع کے آتے ہیں۔ اسی کو اگلے الفاظ فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا میں واضح کیا۔ گویا بتایا کہ وہ دین فطرت اللہ ہے اور فطرت اللہ کیا ہے التی فطر الناس علیہا وہ اصل حالت جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُہَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ..... اور پھر آپ نے یہی آیت پڑھی یعنی کوئی بچہ نہیں مگر وہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے (یعنی اصل حالت پر جو اسلام ہے) پھر اس کے والدین اسے یہودی بناتے ہیں یا عیسائی بناتے ہیں یا مجوسی بناتے ہیں۔

پس قرآن و حدیث صراحت کے ساتھ اسلام کو فطرت کا مذہب قرار دیتے ہیں یعنی وہ مذہب جس پر فطرت انسانی اپنی اصل حالت میں شہادت دیتی ہے اور یہاں پہلے اس مذہب فطرت کے اصل الاصول یعنی توحید الٰہی کا ذکر کیا یعنی یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی شریک کا نہ ہونا ہر اس انسان پر ظاہر ہے جو فکر و عقل سے کام لیتا یا علم رکھتا یا سنتا ہے اور آگے پھر توحید کا صاف الفاظ میں ذکر کر کے رکوع کے آخر میں مخلوق خدا کی خدمت کا ذکر کیا جو اس فطری مذہب کا دوسرا اصول ہے فات ذا القربیٰ حقہ۔

لا تبدیل لخلق اللہ سے یہ مراد ہے کہ وہ اصل فطرت بہرحال قائم رہتی ہے اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ چنانچہ اس کی شہادت بھی سب مذاہب میں ملتی ہے کہ باوجود طرح طرح کے مشرکانہ عقاید کے بنا لینے کے توحید کو بھی قائم رکھا ہے عیسیٰ مسیح کو خدا بنا کر ایک عیسائی کی فطرت تبدیل نہیں ہوئی

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۳۱﴾
اور نماز کو قائم کرو اور مشرکوں سے نہ ہو۔۲۵۹۲

مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿۳۲﴾
ان میں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور فرقے فرقے بن گئے سب گروہ اس پر جو ان کے پاس ہے خوش ہو رہے ہیں۔۲۵۹۳

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا أَذَاقَهُمْ مِنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿۳۳﴾
اور جب لوگوں کو دُکھ پہنچتا ہے اپنے رب کو پکارتے ہیں، اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے پھر جب وہ انھیں اپنی طرف سے رحمت چکھاتا ہے تو ان میں سے ایک فریق اپنے رب کے ساتھ شریک بنانے لگتے ہیں۔

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿۳۴﴾
تاکہ اس کی ناشکری کریں جو ہم نے انھیں دیا ہے سو فائدہ اُٹھا لو پھر تم جلد جان لوگے۔

أَمْ أَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ ﴿۳۵﴾
یا ہم نے اُن پر کوئی سند اتاری ہے جو اُن کو (ان کا پتہ) بتاتی ہے جنھیں وہ اس کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔۲۵۹۴

وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا ۖ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ ﴿۳۶﴾
اور جب ہم لوگوں کو رحمت چکھاتے ہیں اس پر خوشی مناتے ہیں اور اگر انھیں اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے مصیبت پہنچتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۳۷﴾
کیا وہ غور نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو فراخ کرتا ہے اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے اس میں یقیناً ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔

فَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لِلَّذِينَ
سو قریبی کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو (بھی) یہ ان لوگوں کے لیے بہتر

پھر بھی اسے خدا ایک ماننا پڑا گو اس کے لیے عقلِ انسانی کے خلاف تین کو ایک بھی کہنا پڑا، مگر فطرت کی روشنی بجھی نہیں گو اس پر طرح طرح کے پردے ڈال دیئے گئے۔

۲۵۹۲ یہاں توحید کے عملی پہلو کو بیان کیا۔ یعنی صرف اللہ کو ایک مان لینا کافی نہیں بلکہ پھر اسی کی طرف رجوع بھی کرنا ضروری ہے اور اس کا تقویٰ کرنا یعنی اس کے قائم کردہ حقوق کو ملحوظ رکھنا اور نماز جو اس کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے اسے قائم رکھنا ضروری ہے۔

۲۵۹۳ پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ مشرکوں میں سے نہ ہو یہاں انہی کے متعلق فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ان کا دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا یہ ہے کہ توحید الٰہی پر جو اصل الاصول تھا قائم نہ رہے بلکہ اس توحید کے ساتھ شرک کو ملا لیا کسی نے کسی کو اور کسی نے کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا اگر دین کے اصل الاصول پر قائم رہتے تو باہم یہ تفرقہ بھی نہ ہوتا لیکن حالت یہ ہوگئی کہ توحید کو جو اصل تھا پیچھے چھوڑا اور جو اس کے ساتھ شرک ملایا تھا اسے ہی مذہب کی اصل بنیاد سمجھ لیا۔ ایک عیسائی سارا زور حضرت مسیح کی خدائی پر لگاتا ہے اور توحید کو تین ایک کہہ کر برائے نام رکھا ہوا ہے۔ ایک ہندو اپنے بتوں کو سب کچھ سمجھتا ہے انہی سے دعا کرتا ہے انہی کی عبادت کرتا ہے اور ایک اللہ کی ہستی برائے نام تسلیم کی ہوئی ہے۔

۲۵۹۴ یتکلم۔ دلیل کا کلام کرنا بطور مجاز ہے مراد اس سے دلالت کرنا ہے (ر) جیسا دوسری جگہ ہے هٰذا كتابنا ينطق عليكم بالحق (الجاثیہ ۴۵-۲۹) مطلب یہ ہے کہ فطرت انسانی کی اس روشنی کو وہ کیوں قبول نہیں کرتے کیا کوئی دلیل اللہ تعالیٰ نے ایسی اتاری ہے جس نے ان کے دلوں پر تسلط کر لیا ہے۔

يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾

ہے جو اللہ (تعالیٰ) کی رضا چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں ع۲۵۹۵

وَ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۠ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

اور جو تم سود پر دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں جاکر بڑھتا رہے ، تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا ۔ اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو (اس کے ساتھ) اللہ کی رضا چاہتے ہو تو یہی بڑھا لینے والے ہیں ع۲۵۹۶

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۰﴾ ع

اللہ وہ ہے جس نے تمھیں پیدا کیا پھر تمھیں رزق دیا ، پھر تمھیں ماریگا ، پھر تمھیں زندہ کرے گا ۔ کیا تمھارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو اس میں سے کچھ بھی کرتا ہے ۔ وہ پاک ہے اور اس سے بلند ہے جو وہ شرک کرتے ہیں ۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾

خشکی اور تری میں فساد ظاہر ہوگیا ، اس سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا تاکہ انھیں اس کا کچھ مزہ چکھائے جو انھوں نے کیا شاید وہ رجوع کریں ع۲۵۹۷

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ﴿۴۲﴾

کہہ زمین میں چلو پھرو ، پھر دیکھو کہ ان کا جو پہلے تھے انجام کیسا ہُوا ۔ ان میں سے اکثر مشرک تھے ۔

ع۲۵۹۵ ایک کے مال میں دوسروں کا حق : حقه سے مراد گو بعض نے حق مان لیا ہے مگر ابن جریر نے اس کی تفسیر حقه عليك من الصلة والبر سے ہی کی ہے اور یہی صراحت الفاظ بھی چاہتی ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہر شخص کے مال میں اس کے قریبیوں کا (جو محتاج ہوں) اور مسافر یا مہمان کا اور عام مساکین کا بھی حق ہے اور اٰت کے حکم کی وجہ سے حضرت امام ابو حنیفہ رح نے ایسے نفقہ کو واجب قرار دیا ہے اور یہاں مراد زکوٰۃ مفروضہ نہیں ہوسکتی اس لیے کہ یہ سورت بالاتفاق مکّی ہے بلکہ مکّہ میں بھی ابتدائی زمانہ کی ہے اور ابو سعید خدری کی روایت کی کہ اس آیت کے نزول پر آنحضرت صلعم نے باغ فدک حضرت فاطمہ رض کو دیدیا تھا کوئی اصلیت کا نہ ہونا اس سے ظاہر ہے کہ مکّہ میں آنحضرت صلعم خود باغ فدک کے مالک نہ تھے ۔

ع۲۵۹۶ رباء دیکھو ع۳۵۱ جو چیز انسان بطور تحفہ یا عطیہ دے یہ چاہتا ہوا کہ اسے اس سے زیادہ ملے تو اسے بھی رباء کہہ دیا جاتا ہے (ل) اور حضرت ابن عباس رض اور مجاہد وغیرہما سے یہاں ایسا ہی عطیہ یا تحفہ معنی مروی ہیں (ج)

اصل مال پر زیادہ دینا یا لینا : کسی عطیہ کا دینا یا مال کا دینا اس خواہش سے کہ اس سے بڑھ کر ملے جائز ہے ہاں یہ لکھا ہے کہ یہ نبی کریم صلعم پر حرام تھا ، یعنی آپ اس خواہش سے کبھی کسی کو نہ دیتے تھے کہ زیادہ ملے اور اس کی وجہ آیت ولا تمنن تستکثر دی ہے اور اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ کسی شخص کا اصل مال پر جو دیا ہے زیادہ لے لینا حرام نہیں اور نہ یہ دینے والے پر گناہ ہے (د) اور یہاں مطلب صرف اس قدر ہے کہ جس نے اس خواہش سے عطیہ کسی کو دیا کہ وہ کسی اجر کا مستحق نہیں کیونکہ اس کی نیت اس ذریعہ سے کچھ مال کمانے کی ہے ۔ ہاں اجر اس پر ملتا ہے جو بطور صدقہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کو مدنظر رکھ کر دیا جائے ۔ اور اگر ربا کے معنی سود بھی کیے جائیں تو یہ آیت نہ اس کی حرمت پر دلیل ہے نہ فرضیت زکوٰۃ کی بلکہ یہاں صرف دو باتوں کا مقابلہ ہے اور اصل میں تحریص زکوٰۃ کی دلائی ہے ۔

ع۲۵۹۷ بحر ۔ دیکھو ع۴۳ اور بَحر کے معنی رِیف بھی ہیں یعنی ایسے مقامات جو پانی اور سبزی والے ہوں یا جو ساحل سمندر پر واقع ہوں ۔ اور مُدن البحر یا سمندر کے شہر بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں اور بَحرۃ زمین اور شہر کو کہتے ہیں اور عرب کے لوگ شہروں اور گاؤں کو بِحار کہتے ہیں اور حدیث میں ہے کتب لهم ببحرهم جہاں معنی ہیں ان کے شہر میں اور ان کی زمین میں ان کے لیے لکھا (ل) اور قتادہ کا قول ہے کہ بَرّ سے مراد جنگل اور قبائل کے مواضع اور

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَىِٕذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴿۴۳﴾

سو اپنی توجہ کو قائم کر دینے والے دین کے لیے سیدھا کر اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس کے لیے اللہ کی طرف سے ٹلنا نہیں اس دن وہ الگ الگ ہو جائیں گے۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿۴۴﴾

جو کفر کرتا ہے تو اس کا روبال، کفر اسی پر ہے اور جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو وہ اپنی ہی جانوں کے لیے سامان کرتے ہیں۔

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۵﴾

تاکہ وہ انھیں جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں اپنے فضل سے بدلہ دے وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيٰحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾

اور اس کے نشانوں سے ہے کہ وہ ہواؤں کو خوش خبری دیتے ہوئے بھیجتا ہے اور تاکہ وہ تمھیں اپنی رحمت چکھائے اور تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تاکہ تم اس کے فضل کو طلب کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

اور ہم نے تجھ سے پہلے رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا، پس وہ ان کے پاس کھلی دلائل لے کر آئے سو ہم نے ان کو سزا دی جو مجرم ہوئے، اور مومنوں کی مدد کرنا ہم پر لازم ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اللہ وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے سو وہ بادل کو اٹھاتی ہیں پھر وہ اسے جس طرح چاہتا ہے آسمان میں پھیلاتا ہے اور اسے تہ بتہ کر دیتا ہے پھر تو مینہ کو دیکھتا ہے کہ اس کے اندر سے نکلتا ہے سو جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے اسے پہنچاتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ

گو وہ اس سے پہلے جو ان پر اتارا جائے اس سے پہلے

صحراؤں اور خیموں کے رہنے والے ہیں اور بحر سے مراد شہر ہیں (ر)

خواہ برّ اور بحر سے مراد خشکی اور تری لیں یا دیہات اور شہر۔ ماحصل ایک ہے یعنی مراد اس سے کل عالم میں فساد کا ظاہر ہونا ہے اور بعض نے جو بحر کے فساد سے مراد جہازوں کشتیوں کا غصب یا فساد لیا ہے تو یہ بھی درست ہے یعنی سمندر کے فساد سے مراد وہ فساد بھی ہو سکتا ہے جس کا ارتکاب سمندروں پر حکومت کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور فساد سے مراد یہاں خشک سالی، موت، آگ لگنا وغیرہ مصائب بھی لیے گئے ہیں اور ابن آدم کا اپنے بھائی کو قتل کرنا بھی۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ان الفاظ کی عظمت کے شایاں نہیں۔ قتادہ سے روایت ہے کہ یہ فساد قبل از بعثت نبوی تھا اور فساد سے مراد اس حالت میں شرک اور ہر ایک قسم کی بدی کا دور دورہ ہے اور تاریخ عالم اس پر شاہد ہے کہ تاریکی اور جہالت اور بدی نبی کریم صلعم کے ظہور سے پہلے اپنے کمال کو

عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمُبۡلِسِيۡنَ ﴿۴۹﴾ — وہ بالکل مایوس تھے۔

فَانۡظُرۡ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحۡمَتِ اللّٰهِ كَيۡفَ يُحۡىِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحۡىِ الۡمَوۡتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۵۰﴾

سو اللہ کی رحمت کے آثار کی طرف دیکھ کس طرح زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے بیشک وہی مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۲۵۹۸ؔ

وَلَئِنۡ اَرۡسَلۡنَا رِيۡحًا فَرَاَوۡهُ مُصۡفَرًّا لَّظَلُّوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ يَكۡفُرُوۡنَ ﴿۵۱﴾

اور اگر ہم ہوا بھیجیں پھر وہ اسے زرد دیکھیں تو اس کے بعد بھی کفر ہی کرتے رہیں گے ۲۵۹۹ؔ

فَاِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى وَلَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِيۡنَ ﴿۵۲﴾

پس تو مُردوں کو نہیں سُنا سکتا اور نہ بہروں کو آواز سُنا سکتا ہے جب وہ پیٹھ پھیر کر واپس ہو جائیں

وَمَاۤ اَنۡتَ بِهٰدِ الۡعُمۡىِ عَنۡ ضَلٰلَتِهِمۡ ؕ اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۵۳﴾ ع

اور نہ تو اندھوں کو ان کی گمراہی سے (روک کر) ہدایت دے سکتا ہے تو صرف انہی کو سُنا سکتا ہے جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں سو وہ فرماں بردار ہیں ۲۶۰۰ؔ

اَللّٰهُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ ضُعۡفٍ ثُمَّ

اللہ تع وہ ہے جس نے تمھیں کمزوری (کی حالت) سے بنایا

پہنچ گئی تھی۔ سر ولیم میور جیسے متعصب عیسائی کو یہ اقرار ہے کہ عیسائیت کی جو دنیا کا اُس وقت کا آخری مذہب تھا اس وقت نہایت ذلیل حالت تھی، چنانچہ اس کے یہ لفظ ہیں "ساتویں صدی کی عیسائیت بہت ہی گری ہوئی اور فساد کی حالت میں تھی"۔ باقی مذاہب کا جن پر اس سے بھی زیادہ زمانہ گزر چکا تھا اسی سے قیاس ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں اس وقت جہالت کا اس قدر زور تھا کہ بڑے بڑے نیک آدمیوں اور دیوتاؤں کی طرف بدترین سیاہ کاریوں کا ارتکاب منسوب کیا جاتا تھا۔ غرض تمام ممالک روشنی سے خالی ہو چکے تھے اور اس فساد عظیم کی طرف یہاں اشارہ ہے۔ اور اس صورت میں لیذیقھم میں لام عاقبت کا ہے اور روح المعانی میں ہے کہ اس آیت کا حکم ہر اس فساد کے لیے عام ہے جو قیامت تک ظاہر ہو اس صورت میں جو فسادات عظیم آج عالم میں بپا ہو رہے ہیں ان کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔

ع۲۵۹۸ رکوع کی ابتدا زمین میں فساد کے ہونے سے کی تھی اور بدکاروں کے انجام کی طرف توجہ دلائی تھی۔ پھر ہواؤں اور بارشوں کا ذکر کر کے نہایت لطیف پیرایہ میں یہاں آکر اصل مطلب کو واضح کر دیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت ظاہر دنیا میں کام کر کے مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے اسی طرح اب یہ روحانی مردے زندہ ہونگے اس سے بھی معلوم ہوا کہ آیت ۴۱ میں فساد سے مراد روحانی مردگی ہی تھی۔

ع۲۵۹۹ راوہ میں ضمیر نبات کی طرف لی گئی ہے جو سیاق کا مفہوم ہے یعنی کوئی ایسی ہوا چلے جو نبات کو زرد کر دے مگر ایک قول ہے کہ ضمیر سحاب کے لیے ہے یعنی بادل کو زرد دیکھیں کیونکہ زرد بادل پانی نہیں برساتا۔ اور ایک اور قول ہے کہ ریح کو مذکر بھی لایا جاتا ہے اور مونث بھی اور یہاں ضمیر ریح کی طرف ہی ہے (ر) اور میرے نزدیک یہ آخری قول ہی صحیح ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار تو یوں نمایاں ہیں لیکن ان کے انکار کی وجہ سے اگر عذاب کی ہوا بھی آئے تو بھی کفر سے باز نہ آئیں۔ اور زرد ہوا سے مراد یہاں عذاب کی ہوا ہی ہے اور یہ ان کے کفر پر اصرار کی حالت کا بیان ہے جیسا کہ اگلی آیات میں واضح کر دیا ہے۔

ع۲۶۰۰ ان دونوں آیتوں میں اسی انکے اصرار کفر کا ہی ذکر ہے دیکھو ع۲۴۹۱ نیز ع۲۱۹ ؛

سماع موتٰی: یہاں ظاہر الفاظ کو نے کر سماع موتٰی پر بھی بحث کی گئی ہے اور اس حدیث سے کہ بدر کے دن اہل قلیب کو پکار کر نبی صلعم نے فرمایا تھا قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقا فھل وجدتم ما وعد کم ربکم حقا۔ اور حضرت عمرؓ کے سوال پر فرمایا کہ تم ان سے بہتر نہیں سنتے۔ اس بات کا استدلال کیا گیا ہے کہ مردے سنتے ہیں۔ حالانکہ ظاہر الفاظ کو لیں تو قرآن کریم صاف فرماتا ہے کہ مردے نہیں سنتے۔ اور اصولاً بھی یہ بات قبول کرنے کے قابل نہیں کہ مر کر انسان کے حواس ایسے ہو جاتے ہیں کہ کہیں کوئی زندہ دنیا میں کچھ بات کرے تو مُردہ اسے سُن لیتا ہے۔ بات صرف اس قدر ہے کہ خاص حالات میں اللہ تعالیٰ کے اذن سے ایک بات مردہ کو زندہ کی طرف سے پہنچا دی جاتی ہے اور یہی مطلب اہل قلیب والی حدیث کا ہے یعنی اس وقت وہ اس بات کو ایسا سُن رہے ہیں جیسا تم سن رہے ہو۔ جیسا کہ قتادہ سے مروی ہے۔ احیاھم اللہ حتی اسمعھم اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا یہاں تک کہ یہ بات اُن کو سنا دی۔

قرء حفص بضم الضاد و فتحها في الثلاثة لكن الضم مختار ۱۲

جَعَلَ مِنۢ بَعۡدِ ضَعۡفٍ قُوَّةً ثُمَّ
جَعَلَ مِنۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ ضَعۡفًا وَّشَيۡبَةً ؕ
يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الۡعَلِيۡمُ الۡقَدِيۡرُ ﴿۵۴﴾

پھر کمزوری کے بعد قوت دی، پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا بنایا۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ جاننے والا قدرت والا ہے ۲۶۰۱

وَيَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ يُقۡسِمُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۙ۵
مَا لَبِثُوۡا غَيۡرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوۡا
يُؤۡفَكُوۡنَ ﴿۵۵﴾

اور جب وہ گھڑی آئے گی مجرم قسمیں کھائیں گے (کہ) وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ٹھیرے، اسی طرح اُلٹے پھر جاتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ وَالۡاِيۡمَانَ
لَقَدۡ لَبِثۡتُمۡ فِىۡ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوۡمِ
الۡبَعۡثِ ۡ فَهٰذَا يَوۡمُ الۡبَعۡثِ وَلٰكِنَّكُمۡ
كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵۶﴾

اور وہ جنھیں علم اور ایمان دیا گیا ہے کہیں گے تم اللہ کے حکم کے مطابق جی اُٹھنے کے دن تک ٹھیرے رہے، سو یہ جی اُٹھنے کا دن ہے لیکن تم نہیں جانتے تھے۔

فَيَوۡمَئِذٍ لَّا يَنۡفَعُ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا
مَعۡذِرَتُهُمۡ وَلَا هُمۡ يُسۡتَعۡتَبُوۡنَ ﴿۵۷﴾

پس اس دن اُنھیں جو ظالم تھے ان کا عذر کوئی نفع نہیں دے گا اور نہ انھیں ناراضگی دور کرنے کا موقع دیا جائیگا۔

وَلَقَدۡ ضَرَبۡنَا لِلنَّاسِ فِىۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ
مِنۡ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنۡ جِئۡتَهُمۡ بِاٰيَةٍ
لَّيَقُوۡلَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ اَنۡتُمۡ
اِلَّا مُبۡطِلُوۡنَ ﴿۵۸﴾

اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں اور اگر تو ان کے پاس نشان لائے تو جو کافر ہیں وہ کہہ دیں گے کہ تم صرف دھوکا دینے والے ہو ۲۶۰۲

كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ
لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵۹﴾

اسی طرح اللہ ان کے دلوں پر مُہر لگا دیتا ہے جو نہیں جانتے۔

فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسۡتَخِفَّنَّكَ
الَّذِيۡنَ لَا يُوۡقِنُوۡنَ ﴿۶۰﴾ ع

سو صبر کر، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور وہ لوگ تجھے خفیف نہ کریں جو یقین نہیں کرتے۔

اسی طرح اہل قبور کو السلام علیکم کہنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ انہیں پہنچا دیتا ہے۔

ع۲۶۰۱ ضعف۔ انسان کی ابتدائی حالت ایسی کمزوری کی ہے کہ اس پر خود لفظ ضعف بولا ہے۔ نطفہ کی حالت میں تو ایسا کمزور ہے کہ وہ نظر بھی نہیں آتا۔ پھر رحم میں پھر بچہ ہونے کی حالت میں بھی کس قدر کمزور ہے۔ اس میں توجہ انسان کی دوسری زندگی کی طرف دلائی ہے اور ساتھ ہی بتایا کہ عرب بھی قوت پکڑیں گے گو اس قوت کے بعد پھر ایک دفعہ کمزوری ہے۔

ع۲۶۰۲ مبطلون سے مراد یہاں مزوّدون یا فریب دینے والے یعنی فریب دیکر حق کو باطل کرنے والے ہیں۔

(۳۱) سُوْرَةُ لُقْمٰنَ مَكِّيَّةٌ

اٰیاتُھا ۳۴ — رکوعاتُھا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ — اللہ تو بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓ ۚ ۝۱ — میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔

تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ ۙ ۝۲ — یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِیْنَ ۙ ۝۳ — احسان کرنے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ؕ ۝۴ — جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔

اُولٰٓىِٕكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵ — وہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ ۖۗ وَّ یَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ۝۶ — اور ایسے لوگ بھی ہیں جو کھیل کی باتوں کے خریدار ہیں تاکہ علم کے بغیر اللہ کی راہ سے گمراہ کریں، اور اُسے ہنسی بنائیں، انہی کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے ۲۶۰۳

نام: اس سورت کا نام لقمان ہے اور اس میں چار رکوع اور چونتیس آیتیں ہیں۔ اس سورت کے دوسرے رکوع میں حضرت لقمان کا ذکر ہے جو حبش کے رہنے والے تھے۔ اور بتانا یہ مقصود ہے کہ اعلےٰ درجہ کی اخلاقی تعلیم جس سے قوموں کو فلاح ملتی ہے کسی ایک قوم سے خاص نہیں بلکہ ہر ملک اور ہر قوم میں وہ تعلیم اللہ نے اپنی خاص وحی سے پہنچائی۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں یہ ذکر ہے کہ مومن جو اللہ تعالیٰ کے آگے جھکتے ہیں اور مخلوق خدا کی ہمدردی میں اپنے قویٰ اور اپنے اموال کو صرف کرتے ہیں کامیاب ہونگے۔ دوسرے رکوع میں حضرت لقمان کی نصائح اپنے بیٹے کو ہیں جن کی غرض یہی بتانا ہے کہ فلاح اخلاق فاضلہ سے ملتی ہے اور ان اخلاق فاضلہ کی تعلیم یہاں لقمان کے منہ سے دلا کر بتایا ہے کہ اصلاح اخلاق اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت ہے جو تمام دنیا کو پہنچائی گئی۔ تیسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ کے نعمائے ظاہری باطنی کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی مخلوق کی وسعت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چوتھے رکوع میں بتایا ہے کہ نعمائے الٰہی کا انکار کرنے والے آخر پکڑے جاتے ہیں۔

تعلق: پچھلی سورت میں مسلمانوں کے غلبہ کی کھلی پیشگوئی کی تھی یہاں بتایا ہے کہ فلاح یا کامیابی کی بنیاد اخلاق فاضلہ ہیں۔

۲۶۰۳ یشتری۔ اشتراء۔ ہر معاملہ پر بولا جاتا ہے جس سے کچھ حاصل ہو ع۲۹ اور یہاں مراد اختیار کرنا ہے (ج)

لھو الحدیث سے مراد ہر وہ بات ہے جو اصل مقصد سے توجہ کو ہٹاتی ہے ع۹۳۲ حسن کہتے ہیں ہر چیز جو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے ذکر سے روکے، جیسے کہانیاں، مخول بازی، خرافات، غنا۔ ابن عباس اور ابن مسعود کے نزدیک غناء یا اس قسم کی چیزیں مراد ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ نضر بن الحرث نے ایک گانے بجانے والی لونڈی رکھی ہوئی تھی اور جس شخص کی نسبت اسے معلوم ہوتا کہ اسلام کی طرف مائل ہے اسے اس کے پاس لے جاتا کہ اسے گانے بجانے میں مشغول رکھو اور بعض روایات میں ہے کہ وہ ایران سے کہانیاں سنکر آتا اور مجلس قریش میں انہیں سنا کر کہتا کہ محمد صلعم تمہیں عاد و ثمود کی کہانیاں سناتے ہیں، میں رستم و اسفندیار کی کہانیاں سناتا ہوں (د) اگر یہ کام اس زمانہ میں کفار کا تھا تو اس وقت مسلمانوں نے اختیار کیا ہوا ہے۔ کتنے مسلمان ہیں جن کی مجلسوں میں ہنسی ٹھٹھے میں گھنٹوں گزر جاتے ہیں مگر خدا کا نام تک نہیں لیا جاتا نماز کے لیے وقت نہیں ملتا۔ قرآن کو کھول کر نہیں دیکھتے۔ آج جن لوگوں کے ہاتھ میں مسلمانوں کی باگ ہے جو لیڈر کہلاتے ہیں ان کے سامنے نماز ہو رہی ہو تو ان کی ہنسی ٹھٹھے اور قہقہوں کی آواز میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا۔ اس میں شامل ہونا تو ایک طرف رہا۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِیْۤ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ⑦

اور جب اس پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تکبّر کرتا ہوُا پھر جاتا ہے گویا کہ انھیں سُنا ہی نہیں، گویا اس کے کانوں میں بوجھ ہے سو اسے دردناک عذاب کی خبر دیدے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ⑧

جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں، اُن کے لیے نعمتوں والے باغ ہیں۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ⑨

انھیں میں رہیں گے اللہ کا وعدہ ہے سچّا (وعدہ) اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ⑩

اس نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے پیدا کیا، جنھیں تم دیکھ سکو اور زمین میں پہاڑ قائم کیے تاکہ وہ تمھیں لیکر کانپے نہیں اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلائے اور ہم بادل سے پانی اتارتے ہیں پھر اس میں ہر قسم کی اعلیٰ درجہ کی چیزیں اگاتے ہیں۔

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ
ع ١٠ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ⑪

یہ اللہ تعہ کی پیدایش ہے، تو مجھے دکھاؤ کہ انھوں نے کیا پیدا کیا ہے جو اس کے سوائے ہیں بلکہ ظالم کھلی گمراہی میں ہیں۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِيْدٌ ⑫

اور ہم نے لقمانؑ کو حکمت عطا کی کہ اللہ تعہ کا شکر کرے اور جو کوئی شکر کرتا ہے وہ اپنی جان کی بھلائی کے لیے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے ۲۶۰۴

غنا کے متعلق بہت بحث ہوئی ہے امام ابو حنیفہ سے اس کی حرمت مروی ہے لیکن کسی شخص کا اکیلے رفع وحشت کے لیے گانا یا عیدوں یا شادیوں میں گانے کے متعلق اختلاف ہوا ہے اور امام مالک سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے غنا اور اسکے سننے سے منع کیا۔ امام شافعی سے بھی منقول ہے کہ غنا لہو مکروہ ہے لیکن اس سے اس قسم کا گانا مستثنےٰ ہے جیسے عورتوں کا بچوں کو لوری دینا یا اعراب کی حدی اونٹوں کو چلانے کے لیے یا جنگ میں کیونکہ اس میں ایک مقصد مدنظر ہے اور بخاری میں حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم آپ پر داخل ہوئے اور آپ کے پاس دو لونڈیاں بعاث کے گیت گا رہی تھیں تو آپ منہ پھیر کر لیٹ گئے اور حضرت ابو بکر آئے تو انہوں نے فرمایا کہ شیطان کی مزار رسول اللہ کے گھر میں۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ یہ عید کا دن تھا اور آپ نے فرمایا اے ابو بکر ان کو چھوڑ دے ہر قوم کے لیے عید کا دن ہوتا ہے۔ تو اس سے سرود کے جائز موقعوں پر جیسے یوم عید یا شادی میں دف کے جواز کی طرح غنا کا جواز نکالا جا سکتا ہے اور ایسے غنا کی حرمت میں تو کوئی شبہ ہی نہیں جس میں فحش ہو یا شراب وغیرہ کی تعریف اور جو بعض مسلمانوں میں قوالی کا طریق مروج ہے اسے بھی اسی میں رکھا ہے کیونکہ اس میں مجنونوں کے سے افعال ہوتے ہیں جیسے ناچنا اور اچھلنا۔ اور روح المعانی میں ہے کہ یہ زندیقوں کے آثار میں سے ہے بلکہ یہ بھی کہ ایسا سماع ممنوع ہے گو اس میں رقص نہ ہو۔

۲۶۰۴ لقمان۔ بظاہر یہ عجمی نام ہے گو اہل لغت نے اس کا اشتقاق لقم سے صحیح تسلیم کیا ہے اور گو بعض لوگوں نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ لقمان کون تھے مگر ترجیح اس قول کو ہے جو مجاہد ابن عباس ابن المسیب وغیرہم سے مروی ہے کہ یہ حبشی تھے اور نوبیہ یا مصر کے رہنے والے تھے (ج) پھر اس بارہ

وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾

اور جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا اور وہ اسے نصیحت کرتا تھا اے میرے بیٹے اللہ کے ساتھ شریک نہ کرنا کہ شرک یقیناً بڑا بھاری ظلم ہے۔

وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیْكَ ؕ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ ﴿۱۴﴾

النصف

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے حق میں تاکیدی حکم دیا ہے اس کی ماں ضعف پر ضعف کی حالت میں اسے اُٹھاتی ہے اور اس کا دُودھ چھڑانا دو سال میں ہوتا ہے کہ میرا شکر کر اور اپنے ماں باپ کا بھی۔ میری طرف انجام کار آنا ہے۔

وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّ اتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾

اور اگر وہ تجھ پر زور دیں کہ تو میرے ساتھ اسے شریک کرے جس کا تجھے علم نہیں، تو ان کی بات نہ مان اور دنیا میں ان کا اچھی طرح ساتھ دے اور اس کے رستہ کی پیروی کر جو میری طرف رجوع کرتا ہے پھر میری طرف تمھارا لوٹ کر آنا ہے سو میں تمھیں بتاؤنگا جو تم عمل کرتے تھے۔

یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۶﴾

اے میرے بیٹے! اگر وہ (عمل) رائی کے دانہ کے برابر بھی ہو پھر وہ کسی پتھر کے اندر ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں اللہ اُسے لائے گا اللہ باریکیوں سے واقف خبردار ہے ع۲۶۰۵

یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اصْبِرْ عَلٰی مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۚ ﴿۱۷﴾

اے میرے بیٹے نماز کو قائم کر اور نیکی کا حکم دے، اور بُرائی سے روک اور جو تکلیف تجھے پہنچے اس پر صبر کر یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۚ ﴿۱۸﴾

اور لوگوں سے بے رُخی نہ کر اور نہ زمین میں اکڑتا ہُوا چل۔ اللہ تعالیٰ کسی خودپسند شیخی خورہ کو پسند نہیں کرتا ع۲۶۰۶

میں اختلاف ہوا ہے کہ وہ نبی تھے یا انہیں صرف علم وحکمت عطا ہوا تھا۔ میرے نزدیک یہ قول صحیح نہیں کہ وہ نبی نہ تھے کیونکہ قرآن کریم کے بیان کی غرض یہی ہے کہ وحی الٰہی ہی اصل سرچشمہ اس علم وحکمت کا ہے جو اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں اور بالخصوص شرک کے خلاف زور دینے والی ایک ہی قوم ہوئی ہے یعنی انبیاء علیہم السلام۔ اور اَنْ قول کی تفسیر ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح احکام دینا انبیاء سے ہی خاص ہے اور یہاں یہ بتایا ہے کہ شکرگزاری سے انسان خود فائدہ اٹھاتا ہے اور ناشکری سے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا اسے ضرورت نہیں کہ کوئی اس کا شکرگزار ہو۔

ع۲۶۰۵ انہا میں ضمیر ھا کنتم تعملون سے جو عمل مفہوم ہوتا ہے اس کی طرف جاتی ہے اور صخرۃ یا پتھر میں ہونا اس لحاظ سے ہے کہ اس میں صلابت یعنی سختی ہے۔ اور آسمان میں ہونا بلندی کے لحاظ سے ہے اور زمین میں ہونا تاریکی کے لحاظ سے ہے۔

ع۲۶۰۶ تصعر۔ صَعَرَ منہ کا ایک طرف جھکانا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ رخسار کے ایک طرف جھکانے سے مخصوص ہے اور بعض کے نزدیک گردن کے

وَاقۡصِدۡ فِیۡ مَشۡیِكَ وَاغۡضُضۡ مِنۡ
صَوۡتِكَ ؕ اِنَّ اَنۡكَرَ الۡاَصۡوَاتِ
ع لَصَوۡتُ الۡحَمِیۡرِ ﴿۱۹﴾

اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو
نیچا رکھ۔ سب آوازوں سے بُری گدھے کی
آواز ہے ۲۶۰۷ۓ

اَلَمۡ تَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا
فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ وَاَسۡبَغَ
عَلَیۡكُمۡ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ
النَّاسِ مَنۡ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ
وَّلَا هُدًی وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِیۡرٍ ﴿۲۰﴾

کیا تم غور نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آسمانوں
میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تمھارے کام میں لگا رکھا
ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو پورا کیا ہے
اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو اللہ کے بارے میں جھگڑتا ہے
(حالانکہ) نہ اس کے پاس علم ہے اور نہ ہدایت اور نہ روشن کرنیوالی کتاب ۲۶۰۸ۓ

وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ
قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡهِ
اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ الشَّیۡطٰنُ یَدۡعُوۡهُمۡ
اِلٰی عَذَابِ السَّعِیۡرِ ﴿۲۱﴾

اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ تعالیٰ نے
اتارا ہے کہتے ہیں بلکہ ہم اس کی پیروی کرتے ہیں جس پر ہم نے باپ
دادوں کو پایا اور کیا اگرچہ شیطان انھیں جلتی ہوئی آگ
کے عذاب کی طرف بلا رہا ہو ۲۶۰۹ۓ

وَمَنۡ یُّسۡلِمۡ وَجۡهَهٗۤ اِلَی اللّٰهِ وَهُوَ
مُحۡسِنٌ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ

اور جو شخص اپنے تئیں اللہ کی فرمانبرداری میں لگا دیتا ہے اور
وہ احسان کرنے والا ہے تو اس نے ایک محکم جائے گرفت کو

میلان پر بولا جاتا ہے اور صَعَر کے معنی تکبّر کے بھی ہیں اور متکبر کو کہا جاتا ہے فیہ صَعَر اور حدیث میں صَعّاد بمعنی متکبر ہے اور لا تصعر خدّك کے معنی ہیں تکبر سے اعراض نہ کر (ل)

خد ۔ خدّ رخسارے کو کہتے ہیں۔ اور خَدّ اور اُخدود زمین میں ایسے شق کو بھی کہتے ہیں جو مستطیل اور گہرا ہو قُتل اصحاب الاخدود (البروج ۸۵-۴) (غ)

ع۲۶۰۷ چلنے میں قصد یا میانہ روی سے یہ مراد نہیں کہ انسان اچھے تیز قدم سے نہ چلے۔ حضرت عائشہ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ لاغری سے موت کے قریب پہنچا ہوا تھا۔ آپ نے پوچھا اسے کیا ہوا ہے۔ لوگوں نے کہا یہ قاریوں میں سے ہے آپ نے فرمایا عمر سید القراء تھے اور جب چلتے تھے تیز چلتے تھے اور نبی کریم صلعم کی صفت میں ہے کہ جب آپ چلتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اوپر سے نیچے کی طرف آرہے ہیں، یعنی تیز چلتے تھے اور مجاہد نے قصد فی المشی سے مراد متواضعانہ چال لی ہے (ر)

نبوت کی نعمت عامہ : عیسائیت کو مسیح کی تعلیم پر فخر ہے لیکن قرآن کریم نے ایک حبشی نبی کے ذکر میں ان اعلیٰ درجہ کے اصول کو بیان کرکے جو مسیح کی تعلیم کا نچوڑ بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر ہیں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم سے بخل نہیں کیا بلکہ سب قوموں کو اعلیٰ درجہ کی اخلاقی تعلیم عطا فرمائی اور جس بات پر یورپ کے سفید منہ والوں کو فخر ہے وہی تعلیم حبش کے ایک سیاہ فام کو بھی اللہ تعالیٰ نے دی۔ پس اختلاف الوان اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

ع۲۶۰۸ اسبغ ۔ شئ سابغ کامل پوری چیز کو کہتے ہیں۔ اور اَسۡبَغَ کے معنی اَوۡسَعَ ہیں وسیع کیا۔ اور اَسۡبَغَ اللّٰہ علیہ النِّعۡمَۃَ کے معنی ہیں اس پر نعمت کو کامل کیا اور تمام کو پہنچایا اور وسیع کیا (ل) ؞

ظاہری نعمتیں وہ ہیں جو انسان کی جسمانی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور باطنی وہ ہیں جو اخلاق اور روحانیت سے تعلق رکھتی ہیں اور ظاہری نعمتوں کا ذکر صراحت سے سخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض میں کرکے توجہ دلائی ہے کہ باطنی نعمتوں کی تکمیل بھی بغیر اس کے نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا سامان ہو اور اسی سامان کا ذکر آگے ہدایت اور کتاب منیر میں ہے۔

ع۲۶۰۹ یعنی ان باتوں میں بھی باپ دادا کا اتباع نہیں چھوڑتے جن کا کھلا نتیجہ دکھ اور تکلیف ہے۔ کتاب منیر کے ذکر کے بعد اس مضمون کے لانے سے یہ منشا ہے کہ نعمائے باطنی میں لوگ دلائل کی پیروی نہیں کرتے جن کی طرف اللہ تعالیٰ کی وحی توجہ دلاتی ہے بلکہ اندھا دھند تقلید میں لگے چلتے ہیں۔

الْوُثْقٰى ۗ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۲۲﴾

مضبوط پکڑ لیا اور (سب) کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ۗ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۳﴾

اور جو کوئی کفر کرتا ہے تو اس کا کفر تجھے غمگین نہ کرے، ہماری طرف انھیں لوٹ کر آنا ہے سو ہم انھیں بتائیں گے جو انھوں نے کیا، اللہ تعالیٰ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۲۴﴾

ہم انھیں تھوڑا سامان دیں گے پھر ہم انھیں سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۗ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۗ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور اگر تو ان سے پوچھے کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تو کہیں گے اللہ تعالیٰ نے، کہہ سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِىُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۶﴾

اللہ کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِى الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۷﴾

اور اگر جو درخت زمین میں ہیں سب قلمیں بن جائیں، اور سمندر سیاہی ہو۔ اس کے بعد سات سمندر اور ہوں تو اللہ تعالیٰ کی باتیں ختم نہ ہوں۔ اللہ (تعالیٰ) غالب حکمت والا ہے [ع۲۶۱۰]

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾

تمھارا پیدا کرنا اور تمھارا دوبارہ اٹھانا ایک ہی جان کی طرح ہے اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِىْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۹﴾

کیا تو غور نہیں کرتا کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو کام پر لگا رکھا ہے، ہر ایک مقرر وقت تک چلتا ہے اور جو تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ

یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے اور کہ جس کو اس کے سوائے پکارتے ہیں وہ باطل ہے اور کہ اللہ بہت بلند بہت

ع۲۶۱۰ اس آیت کا مضمون الکہف ۱۸۔ ۱۰۹ کے مضمون سے مشابہ ہے اور بتایا یہ ہے کہ اللہ کے کلمات یا اس کی مخلوق وہی نہیں جو تم دیکھتے ہو بلکہ اسے اتنی وسعت حاصل ہے کہ کل زمین کے درختوں کی اگر قلمیں بنا دی جائیں اور سمندر سیاہی بن جائیں بلکہ ایسے ہی اور بھی بیشمار سمندر (سبعۃ کا استعمال عدد کامل کے طور پر ہے دیکھو ع۴۴) سیاہی بن جائیں تو وہ مخلوق احاطہ شمار میں نہیں آسکتی۔ اور اس میں توجہ اللہ تعالیٰ کی کمال عظمت کی طرف دلائی ہے۔

اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝٣٠

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ
بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝٣١
وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا
اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا
نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ
وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ۝٣٢
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا
لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۫ وَلَا مَوْلُوْدٌ
هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ وَعْدَ
اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۥ وقفة
وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝٣٣
اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ
الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ
وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ
وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ
تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝٣٤

بڑا ہے۔

کیا تو غور نہیں کرتا کہ کشتیاں سمندر میں اللہ کی نعمت لے کر چلتی ہیں تاکہ وہ تمھیں اپنے نشانوں سے دکھائے اس میں یقیناً ہر ایک صبر کرنیوالے شکر کرنیوالے کے لیے نشان ہیں ۲۶۱۱

اور جب انھیں لہر سائبانوں کی طرح ڈھانک لیتی ہے اللہ کو اسی کی بندگی کو خالص کرتے ہوئے پکارتے ہیں پھر جب انھیں خشکی پر بچا لاتا ہی تو ان میں سے بعض میانہ روی اختیار کرنیوالے ہوتے ہیں اور ہماری آیتوں کا سوائے ہر دغاباز ناشکر گزار کے اور کوئی انکار نہیں کرتا ۲۶۱۲

اے لوگو اپنے رب کا تقویٰ کرو اور اس دن سے ڈرو جس دن باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام نہیں آئے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آسکے گا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے۔ سو دنیا کی زندگی تمھیں دھوکا نہ دے۔ اور نہ بڑا دھوکا دینے والا اللہ کے بارے میں تمھیں کچھ دھوکا دے ۲۶۱۳

اللہ وہ ہے کہ اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہ مینہ برساتا ہے اور جو کچھ رحموں میں ہے اسے جانتا ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کل کیا کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کس زمین میں مرے گا۔ اللہ (تعالیٰ) جاننے والا خبردار ہے ۲۶۱۴

ع۲۶۱۱ نعمۃ سے مراد یہاں احسان ہے اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایسے اسباب پیدا کیے ہیں جن سے کشتیاں چلتی ہیں اور یا مراد یہ ہے کہ کشتیاں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو لیے ہوئے چلتی ہیں۔ اور نشانوں کا صبر کرنے والوں اور شکر کرنے والوں کے لیے ہونا اس لحاظ سے ہے کہ ان ذرائع سے نعمتوں کو وہی حاصل کر سکتے ہیں جو مصائب کو برداشت کرتے ہیں اور پھر وہ نعمتیں انہیں کے پاس رہتی ہیں جو ان پر شکر کرتے ہیں اور یا اشارہ اس طرف ہے کہ ایک قوم جو اس وقت صبر سے کام لے رہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر کرتی ہے اسے ایک دن سمندروں کا مالک بنا دیا جائے گا۔

ع۲۶۱۲ ختار۔ ختر ایسا غدر جس میں زور لگانے کی وجہ سے انسان کمزور ہو جائے (غ) یا فریب دہی یا بہت بُری قسم کی غداری (ل) بعض کی میانہ روی اور بعض کی بدعہدی کے ذکر میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بھی جب ان نعمتوں کی جو انہیں دی جائیں ناشکری کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجائینگے۔

ع۲۶۱۳ غرور۔ غَرَرْت کے لیے دیکھو ع۵۸۲ اور غرور ہر وہ چیز ہے جو انسان کو دھوکا دے مال، مرتبہ، شہوت، شیطان اور شیطان سے اس کی تفسیر کی گئی ہے اس لیے کہ وہ خبیث ترین دھوکہ دینے والا ہے (غ) الناس میں سب لوگ شامل ہیں غیر مسلم ہوں یا مسلم۔

ع۲۶۱۴ پانچ باتوں کا علم کسی کو نہیں: بخاری میں ایک لمبی حدیث میں جس میں ایمان اور اسلام اور احسان کے متعلق سوال ہے یہ بھی ہے کہ آخر پر اس شخص نے آنحضرت صلعم سے پوچھا حتی الساعۃ یعنی وہ گھڑی یا قیامت کب ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اس کے متعلق مسئول کا علم سائل سے زیادہ نہیں اور پھر

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ (۳۲)

آیاتہا ۳۰ — رکوعاتہا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓ ۝۱ — میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲ — اس کتاب کا اُتارنا اس میں کچھ شک نہیں جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝۳ — کیا یہ کہتے ہیں اس نے خود اسے بنا لیا ہے بلکہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے تاکہ تو اس قوم کو ڈرائے جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانیوالا نہیں آیا تاکہ وہ ہدایت پائیں ۲۶۱۵ع

(بقیہ صفحہ سابقہ)

آپؐ نے فرمایا یہ ان پانچ باتوں میں سے ایک ہے جنہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا اور پھر یہ آیت پڑھی۔ اور بخاری میں ہی ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا غیب کے خزانے پانچ ہیں تب یہ آیت پڑھی۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ان پانچ باتوں کا علم نبی صلعم کو نہیں دیا گیا۔ یہ تو صحیح ہے لیکن یہ سوال ہوتا ہے کہ ان پانچ باتوں کو اکٹھا لانے کی کیا وجہ ہے۔ کیونکہ غیب کی اور بھی بے شمار باتیں ہیں جن کا علم آنحضرت صلعم کو دیا گیا نہ اور کسی کو دیا جاتا ہے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک رنگ میں یہ پانچوں باتیں حق کی کامیابی اور مخالفت کی ناکامی سے تعلق رکھتی ہیں۔ الساعۃ سے مراد ساعت وسطے لیکر مخالفین حق کی تباہی کا وقت مراد ہو سکتا ہے۔ بارش کے نازل کرنے میں عرب کی مردہ زمین کے زندہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ بار بار بارش کا ذکر کر کے یہ بتایا بھی گیا ہے کہ جس طرح مُردہ زمین کو زندہ کیا جاتا ہے اسی طرح تمہیں زندہ کیا جائے گا۔ ارحام میں جو ہیں وہ آیندہ نسل ہے جنہیں اللہ تعالیٰ جانتا ہے یعنی انہی کفار کی اولاد کے مسلمان ہو جانے کی طرف اشارہ ہے اور کل کیا کریگا میں یہ اشارہ ہے کہ جو آج حق کی مخالفت کر رہے ہیں وہی کل کو اس کے حامی بن جائیں گے اور کس زمین میں مریگا میں یہ ارشارہ ہے۔ کہ یہ لوگ پیغام حق کو لیکر کہیں کے کہیں نکل جائیں گے۔ اس میں ایک اور لطیف اشارہ بھی ہو سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ سے جب قیامت کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ اس کا علم کسی کو نہیں دیا گیا۔ حتیٰ کہ بیٹے کو بھی نہیں دیکھو ع۳۷۳ پس معلوم ہوا بیٹا بھی انسانوں میں سے ایک انسان ہے نہ خدا۔

نام: اس سورت کا نام السجدۃ ہے اور اس میں تین رکوع اور تیس آیات ہیں۔ اس نام میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کی فلاح اور کامیابی قرآن کریم کی کامل فرمانبرداری سے وابستہ ہے اور یہی اس سورت کا مضمون ہے۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں بتایا ہے کہ اسلام جو دنیا کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اس کے استحکام کے بعد اس پر ایک ہزار سال کا زمانہ ایسا آئے گا جس میں اس کی ترقی میں روک پیدا ہو جائے گی۔ دوسرے رکوع میں مومن اور کافر کا مقابلہ کر کے بتایا کہ ایمان اسی بات کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی فوراً فرمانبرداری کی جائے اور تیسرے میں مومنوں اور کافروں کے درمیان فیصلہ کا ذکر ہے۔

تعلق اور زمانہ نزول: یہ الٓمّٓ کے مکّی مجموعہ کی آخری سورت ہے اور اس میں اسلام کے غلبہ اور استحکام کے ذکر کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ اس وقت اس کی ترقی میں رکاوٹ کا بھی ہوگا مگر وہ ایک محدود زمانہ ہے اس میں گویا اس کی آخری کامیابی کی بشارت بھی ہے اور یہ بھی مکّی سورت اور اسی زمانہ کی ہے، جس زمانہ کی اس مجموعہ کی باقی سورتیں ہیں۔

ع۲۶۱۵ دیکھو القصص ۲۸-۴۶۔ بنی اسمٰعیل میں کوئی نبی نہیں آیا اور یہاں نذیر سے مراد منجانب اللہ ڈرانیوالا ہے اور یوں تو اہل عرب کو یہود و نصاریٰ اپنے اپنے دین کی طرف بلاتے رہے اور زید بن عمرو بن نفیل اور قیس بن ساعدہ گو خود بت پرستی سے مجتنب تھے اور ضرور ہے کہ دوسروں کو بھی توحید کی تعلیم دیتے ہوں، مگر خدا کی طرف سے نبی نہ تھے اور یہی وجہ ہے کہ انہیں کامیابی نہیں ہوئی بلکہ بعثت رسول سے بالکل متصل اس قسم کے آدمیوں کا ظاہر ہونا اور ان کے ذریعہ سے عرب کی حالت میں ادنیٰ تغیر کا پیدا نہ ہونا اور پھر نبی صلعم کی بعثت سے ایک انقلاب عظیم کا وقوع میں آنا صاف بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تائید غیبی آنحضرت صلعم کے لیے کام کر رہی تھی ورنہ انسان کی طاقت قطعاً وہ نہ تھی جو آپ نے کر دکھایا اور خالد بن سنان العبسی اکثر کے نزدیک نبی نہیں اور بعض روایات میں جو لفظ نبی اس کے متعلق آیا ہے تو وہ بطور مجاز ہوگا۔

اَللّٰهُ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا فِىۡ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ‌ؕ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا شَفِيۡعٍ‌ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۴﴾

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ وقتوں میں پیدا کیا پھر وہ عرش پر غالب ہے اس کے سوائے تمھارا کوئی کارساز نہیں اور نہ کوئی شفاعت کرنے والا ہے تو کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے۔

يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الۡاَرۡضِ ثُمَّ يَعۡرُجُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗۤ اَلۡفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴿۵﴾

وہ اس امر کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے، پھر وہ اس کی طرف چڑھ جائے گا ایک دن میں جس کا اندازہ ایک ہزار سال ہے اس سے جو تم گنتے ہو[ع۲۶۱۶]

ذٰلِكَ عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ۙ﴿۶﴾

وہ غیب اور موجود کا جاننے والا ہے، غالب رحم کرنے والا۔

الَّذِىۡۤ اَحۡسَنَ كُلَّ شَىۡءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِيۡنٍ‌ ۚ﴿۷﴾

جس نے ہر چیز کو جو اس نے پیدا کی اچھا بنایا اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا[ع۲۶۱۷]

ع۲۶۱۶ یدبر۔ تدبیر کے اصل معنی ہیں، عواقب امور میں فکر کرنا ع۲۷ اور اللہ تعالیٰ کے حق میں اس سے مجاز مراد ہے یعنی کسی چیز کا مضبوطی کے طور پر اور رعایت حکمت سے ارادہ کرنا اور مراد اس سے انزال ہے (ر)

امر اسلام کے استحکام میں ایک ہزار سال کے لیے روک کا واقع ہونا: اس آیت کے معنی میں کئی ایک اقوال مفسرین نے بیان کیے ہیں ایک یہ کہ آسمان اور زمین میں پانچ سو سال کی مسافت ہے اور یوں آسمان سے ایک امر کے نازل ہونے میں اور پھر چڑھنے میں ایک ہزار سال لگ جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ کی وساطت سے تدبیر امور کرتا ہے پھر ملائکہ کے عروج میں ہزار سال لگتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ایک ہزار سال کے امور کا فیصلہ کر کے ملائکہ کے سپرد کر دیتا ہے (ج)، یہ اقوال قابل قبول نہیں۔ اس لیے کہ ملائکہ کے آنے جانے میں کسی وقت کا لگنا۔ یا ایک ہزار سال کے معاملات کا فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ میں ایک نقص کو لازم ٹھہراتا ہے اللہ کے لیے بُعدِ مسافت یا بُعدِ زمانی کو ماننا اس کے لیے جسم کو قبول کرنا ہے اور وہ اس سے پاک ہے اور بعض نے یہاں الامر سے مراد وحی یا شریعت کا نزول لیا ہے گویا یدبر الامر سے مراد یہ ہے کہ جبرئیل کے ساتھ وحی کو نازل کرتا ہے پھر وہ ایک ہزار سال میں اس کے قبول یا ردّ کو لیکر اوپر چڑھتا ہے (ر) اس کے دوسرے حصّہ میں وہی نقص ہے جو پہلے اقوال میں ہے اس میں شک نہیں کہ الامر سے مراد وحی یا شریعت اسلام یا امر اسلام ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کی تدبیر فرمانا اس کو دنیا میں محکم اور مضبوط کرنا ہے جیسا کہ تدبیر کے معنی سے ظاہر ہے۔ اور اگلی آیت کے الفاظ عالم الغیب والشہادۃ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یعرج الیہ میں کسی علم غیب کا اظہار ہے اور علم غیب کا اظہار عموماً پیشگوئی کے رنگ میں ہوتا ہے پس یہاں امر اسلام کے متعلق کوئی پیشگوئی ہے اور ظاہر ہے کہ تدبیر یعنی اتقان کے مقابل پر اس کا کمزور ہونا یا اس کی ترقی کا رک جانا جیسے یہاں یعرج الیہ سے ظاہر کیا ہے اور حدیث صحیح میں ہے کہ میرے بعد تین قرن اعلیٰ درجہ کے ہیں خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم۔ اور قرن کی سب سے بڑی میعاد ایک سو سال مانی گئی ہے دیکھو نہایہ۔ اور خود نبی کریم صلعم نے اپنے قرن کو ایک سو سال قرار دیا جب فرمایا کہ ایک سو سال میں وہ کل لوگ جو اس وقت زندہ ہیں مرجائیں گے۔ اور ایک حدیث میں یہ ہے کہ آپ نے ایک لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا عِش قرنًا تو وہ ایک سو سال زندہ رہا (ن)، پس وہ تین قرن جنہیں حدیث اسلام کی مضبوطی کا زمانہ قرار دیتی ہے تین سو سال ہیں اور یہی زمانہ یدبر الامر کا ہے اور اسی حدیث میں آتا ہے کہ اس کے بعد کذب وغیرہ ظاہر ہو جائے گا یعنی مسلمان اس اعلیٰ حالت سے گر جائیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کی ترقی رک جائے گی اور ایک ہزار سال کا محدود زمانہ اس روک کے لیے معین فرما کر یہ بتا دیا کہ اس کے بعد پھر امر اسلام ترقی کرے گا اور اگر یہ مراد ہوتی کہ پھر حالت تنزل ہی رہے گی تو ہزار سال کی قید نہ لگائی جاتی۔ اور آیت ۹ میں قلیلا ما تشکرون بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسانوں کی ناشکر گزاری ہی اس روک کا باعث ہے۔ یہ چونکہ اس مجموعہ الم کی جس میں اسلام کی کامیابیوں کا ذکر ہے آخری سورت ہے اس لیے اس میں کامیابی کی خوشخبری کے ساتھ ترقی کی روک کی میعاد کا ذکر بھی کر دیا ہے۔

ع۲۶۱۷ ہر چیز کو خوبصورت بنایا اور اس کا حسن اسی لحاظ سے ہے کہ وہ اقتضائے حکمت کے مطابق بنی ہے اور انسان کو سب سے خوبصورت بنایا لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (التین ۹۵-۴) اور مٹی سے پیدائش ہر انسان کی شروع ہوتی ہے نہ صرف آدم کی، پھر اس مٹی سے سلالہ یعنی خلاصہ بنتا ہے دیکھو ع۲۲۵۴ پھر وہ ماء مہین یعنی نطفہ کی شکل میں آتا ہے۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ ﴿۸﴾

پھر اس کی نسل ایک نچوڑ سے ٹھیرائی (جو) کمزور پانی میں (آ جاتا ہے)

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۹﴾

پھر اسے ٹھیک بنایا اور اپنی روح اس میں پھونکی اور تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، بہت ہی کم تم شکر کرتے ہو۔۲۶۱۸

وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ۬ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۰﴾

اور کہتے ہیں کیا جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے، کیا پھر ہم نئی پیدائش میں (زندہ) ہوں گے، بلکہ وہ اپنے رب کی ملاقات کا انکار کرنے والے ہیں۔

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾ ع ۱۴

کہہ موت کا فرشتہ تمھاری روح قبض کرتا ہے جو تم پر مقرر کیا گیا ہے، پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاتے ہو۔

وَ لَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور اگر تو دیکھے جب مجرم اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہوں گے، ہمارے رب ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا سو ہمیں واپس بھیج ہم اچھے عمل کریں گے (اب) ہمیں یقین آ گیا۔

وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳﴾

اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو اس کی ہدایت دے دیتے لیکن میری طرف سے بات سچی ہوئی، میں ضرور دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔۲۶۱۹

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

سو چکھو اس لیے کہ تم اس دن کی ملاقات کو بھولے رہے۔ ہم نے بھی تمھیں بھلا دیا اور دیرپا عذاب چکھو، اس کے عوض جو تم کرتے تھے۔

ع۲۶۱۸ سوّٰىه یعنی حالت اعتدال پر بنایا اور اس کے بعد اپنی روح نفخ کی۔ یہاں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی روح ہر انسان میں نفخ ہوتی ہے۔ روح حیوانی تو حیوان اور انسان میں مشترک ہے پس وہ مراد نہیں ہو سکتی ورنہ انسان کا ذکر الگ کر کے اس کا ذکر نہ کیا جاتا پس یہ روح وہ چیز ہے جو انسان کو دیگر حیوانات سے ممتاز کرتی ہے یعنی نفس ناطقہ یا تمیز اور شکر کی صفت جس کی طرف آیت کے آخر میں توجہ دلائی ہے اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ دوسری مخلوقات کو نہیں کہا کہ وہ شکر کرتے ہیں یا نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف روحی کی اضافت بلحاظ تشریف کے ہے جیسے بیت اللہ ناقۃ اللہ ہیں۔ عیسائیوں کو فخر ہے کہ حضرت عیسیٰ کو روح من اللہ کہا ہے یہاں ہر انسان میں اللہ کی روح کے نفخ کا ذکر ہے۔

ع۲۶۱۹ جہنم کو بھرنے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قول: وہ قول کیا ہے۔ دوسری جگہ شیطان کہتا ہے لاغوینهم اجمعین الا عبادك منهم المخلصین (الحجر ۱۵۔ ۳۹ و ۴۰) جس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فالحق والحق اقول لاملئنّ جهنم منك و ممن تبعك منهم اجمعین (ص ۳۸۔ ۸۴ و ۸۵) پس اللہ تعالیٰ کا قول جو واقع ہوا وہ یہ تھا کہ شیاطین اور ان کے پیرو جہنم میں جائیں گے اور لو شئنا میں بتایا کہ اگر ہماری مشیت ایسی ہوتی کہ انسان کو پیدا ہی ایسا کرتے کہ وہ ہمارے حکم کی مخالفت نہ کر سکتا اور ایک راہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتا جیسا دوسری مخلوق مجبور ہے تو ہم ایسا بھی کر سکتے تھے۔

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۩ ﴿١٥﴾ السجدة ٩

ہماری آیتوں پر صرف وہی ایمان لاتے ہیں کہ جب انھیں ان سے نصیحت کی جاتی ہے وہ سجدہ کرتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے ٢٦٢٠

تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿١٦﴾

ان کے پہلو بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں، وہ اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے پکارتے ہیں — اور اس سے جو ہم نے انھیں دیا ہے خرچ کرتے ہیں ٢٦٢١

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾

پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے اس کا بدلہ جو وہ کرتے تھے ٢٦٢٢

أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۚ لَا يَسْتَوُونَ ﴿١٨﴾ وقف غفران ٢/١

تو کیا وہ جو مومن ہے اس کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمان ہے وہ برابر نہیں ہو سکتے۔

أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوَىٰ نُزُلًا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾

وہ جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں تو ان کا ٹھکانا باغ ہیں ریہ ان کی مہمانی ہے، اس کا بدلہ جو وہ کرتے تھے۔

وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿٢٠﴾

اور جو نافرمان ہیں تو ان کا ٹھکانا آگ ہے، جب کبھی چاہیں گے کہ اس سے نکل جائیں، اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور انھیں کہا جائے گا آگ کا عذاب چکھو جسے تم جھٹلاتے تھے۔

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ

اور ضرور ہم انھیں نزدیک کا عذاب بڑے عذاب سے

٢٦٢٠ یہاں بتایا کہ منہ سے اپنے آپ کو مومن کہہ دینا کافی نہیں جب تک کہ احکام الٰہی کی کامل فرمانبرداری اور ان احکام کے آگے پورا سر جھکا دینا نہ ہو، آج اسی بات کو مدنظر نہ رکھنے سے مسلمان اپنے مصائب کی صحیح وجہ کو معلوم نہیں کر سکتے۔

٢٦٢١ تتجافی۔ جفا اور تجافی کے معنی ہیں ایک چیز اپنی جگہ پر نہ رہی جیسے زین اور تجافی جَنبُہ عن الفراش اس کا پہلو بستر سے الگ ہو گیا (ل) اور یہ نیند کے ترک کرنے سے کنایہ ہے اور احمد اور ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی صلعم نے صلوٰۃ الرجل فی جوف اللیل یعنی رات کے درمیان میں نماز کا ذکر کر کے یہ آیت پڑھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد نماز تہجد ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تہجد کی نماز میں ہی انسان کو بستر سے الگ ہونا یا نیند کو ترک کرنا پڑتا ہے اور یہ گویا اخفاء میں نماز ہے اسی لیے اسکے اجر کے ذکر میں فرمایا ما اخفی لہم من قرۃ اعین۔

٢٦٢٢ نعمائے جنت کی اصل حقیقت: بخاری میں کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا یقول اللہ تعالیٰ اَعْدَدْتُ لِعِبادیَ الصّٰلحینَ مالا عین رَأَتْ ولا اُذُنٌ سمعت ولا خطرَ علی قلبِ بشرٍ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کیا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سُنا اور نہ کسی انسان کے دل پر گزرا اور تب آپ نے یہ آیت پڑھی فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین اور ابن جریر کی ایک روایت میں ہے مالم یسمعه ملك مقرب یعنی وہ ایسی نعمتیں ہیں کہ کسی مقرب فرشتہ نے بھی انہیں نہیں سنا پس جنت اور اس کی نعماء کے متعلق یہ حدیث اور آیت فیصلہ کن ہیں کہ وہ اور رنگ کی نعمتیں ہیں اور اس دنیا کی نعمتوں ان کا قیاس کرنا صحیح نہیں اس لئے کہ قیاس میں تو وہی چیز آئے گی جو دل میں گزرے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ کسی بشر کے دل پر بھی نہیں گزریں۔

الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٢١﴾

پہلے چکھائیں گے تاکہ وہ رجوع کریں۔ ۲۶۲۳

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ
ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ
مُنْتَقِمُونَ ﴿٢٢﴾ ع

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اپنے رب کی آیتوں کے ساتھ نصیحت کی جائے پھر وہ ان سے منہ پھیر لے، ہم مجرموں کو سزا دینے والے ہیں۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ
فِي مِرْيَةٍ مِنْ لِقَائِهِ ۖ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى
لِبَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿٢٣﴾

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی سو تو اس کے ملنے سے شک میں نہ رہ، اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا۔ ۲۶۲۴

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا
لَمَّا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ﴿٢٤﴾

اور ان میں سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے جب انھوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٢٥﴾

تیرا رب ہی قیامت کے دن ان میں ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ
مِنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ ۚ إِنَّ
فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ ۖ أَفَلَا يَسْمَعُونَ ﴿٢٦﴾

کیا اُن کے لیے یہ واضح نہیں ہوا کہ اس سے پہلے ہم نے کتنی نسلوں کو ہلاک کیا۔ جن کے گھروں میں یہ چلتے پھرتے ہیں یقیناً اس میں نشان ہیں تو کیا وہ سنتے نہیں۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى
الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا
تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ ۖ
أَفَلَا يُبْصِرُونَ ﴿٢٧﴾

اور کیا وہ غور نہیں کرتے کہ ہم پانی کو سبزی سے خالی زمین کی طرف چلاتے ہیں، پھر اس کے ساتھ کھیتی نکالتے ہیں جس سے ان کے چارپائے اور وہ خود کھاتے ہیں۔ تو کیا دیکھتے نہیں۔ ۲۶۲۵

۲۶۲۳ العذاب الادنیٰ سے مراد بعض نے یوم بدر۔ بعض نے قتل وجوع۔ بعض نے مصائب دنیا لی ہیں اور اصل یہی ہے کہ اس سے مراد دنیا میں عذاب کا آنا ہے اور العذاب الاکبر سے مراد اکثر نے عذاب آخرت لیا ہے اور بعض نے قتل و اسیری (د) ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں عذاب دنیوی ہی ہوں ایک چھوٹے عذاب اور ایک وہ عذاب جس نے اُن کی قوت کا استیصال کلی کر دیا مگر عذاب ادنیٰ سے مراد عذاب دنیا اور عذاب اکبر سے مراد عذاب آخرت زیادہ قرین قیاس ہے گویا دو عذابوں کا اکٹھا وعدہ دیا ایک اس دنیا کا عذاب دوسرا آخرت کا۔ دنیا کے عذاب نے ان پر قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ دوسرا وعدہ بھی سچا ہے

۲۶۲۴ لقائہٖ میں ضمیر بعض نے جنس کتاب کی طرف لی ہے یعنی تجھے بھی کتاب مل کر رہے گی اور بعض نے موسیٰ کی طرف اور مراد اس سے لیلۃ المعراج کی ملاقات کو لیا ہے۔ مگر یہ دونوں باتیں کمزور ہیں۔ اصل میں یہاں خطاب عام ہے یعنی ہر مخاطب کو کہا ہے نہ نبی صلعم کو کہ اس کے لقاء میں شک نہ کرو اور لقاء ایک ہی ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں آتا ہے اور اس کا ذکر یہاں بھی پیچھے آچکا ہے بل ھم بلقائی ربھم کفرون۔ یعنی لقاء اللہ۔ پس یہاں بھی حضرت موسیٰ کو کتاب دینے کا ذکر کر کے جملہ معترضہ کے طور پر بیان فرمایا کہ جن باتوں سے تمہیں استبعاد معلوم ہوتا ہے وقالوا ءاذا اضللنا فی الارض ءانا لفی خلق جدید۔ یعنی حیات بعد الموت وہی موسیٰ کی تعلیم بھی تھی پس تم لقاء اللہ میں شک نہ کرو۔

۲۶۲۵ یوں تو یہ اللہ تعالےٰ کا عام قانون ہے مگر یہاں خاص اشارہ عرب کی بنجر زمین کی طرف ہے جو کسی اثر کو قبول نہ کرتی تھی۔ تو فرمایا کہ ہم یہاں بھی کھیتی اگائیں گے یعنی اس زمین میں زندگی پیدا کریں گے اور ان لوگوں کے روحانی قویٰ نشوونما پائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ نہ صرف خود ہی فائدہ اٹھائیں گے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی فائدہ پہنچائیں گے اور انہیں بھی جو ضلالت اور گمراہی میں چارپایوں کی طرح ہیں اس سے پہلی آیت میں اعدائے حق کی ہلاکت کی طرف اشارہ ہے۔ تو یہاں نیکوں اور

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۸﴾

اور کہتے ہیں، یہ فیصلہ کب ہوگا، اگر تم سچے ہو؟

قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾

کہہ فیصلے کے دن انھیں جو کافر ہیں ان کا ایمان نفع نہ دے گا اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی۔

ع ۳/۱۶ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع

سو اُن سے منہ پھیر لے اور انتظار کر وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں ۲۶۲۶

راست بازوں کی جماعت کے قیام کی طرف اشارہ ہے وہ کفار ہیں یہ مومن اس لیے اگلی آیت میں متی ھذا الفتح کا سوال ہے۔ یعنی باطل کی ناکامی اور حق کی اس کامیابی کا فیصلہ کب ہوگا جس کا ذکر یہاں ہے ؎

۲۶۲۶ انتظر سے مراد ہے ان پر نصرت کا انتظار کر یعنی ان کی ہلاکت کا انتظار کر جس طرح وہ تم پر غلبہ یا تمہاری ہلاکت کا انتظار کرتے ہیں ؎

ایاتہا ۷۳ (۳۳) سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ مَدَنِيَّةٌ رکوعاتہا ۹

نام: اس سورت کا نام الاحزاب ہے اور اس میں نو رکوع اور ۷۳ آیتیں ہیں اس کا نام الاحزاب اعدائے اسلام کی اس عظیم الشان جمعیت سے لیا گیا ہے جس میں بہت سی عرب کی قومیں شامل ہوئیں اور ایک جرار لشکر مسلمانوں کو کچلنے کے لیے تیار کیا گیا مسلمان جن کی تعداد ان کے سامنے کچھ بھی نہ تھی۔ مدینہ میں محصور ہو گئے مگر ان کے پائے ثبات میں ذرہ بھی جنبش نہ آئی اور الٰہی نصرت سے یہ لشکر خود ہی بھاگ اٹھا۔ اس سورت کا اصل مضمون یہ ہے کہ نبی کریم صلعم ایک کامل نمونہ ہیں اور مسلمانوں کو آپ کے نقش قدم پر چلنا چاہیے اور جنگ احزاب کا ذکر جس پر اس سورت کا نام ہے اس غرض سے لایا گیا ہے کہ کوئی طاقت اس حق کو مٹا نہیں سکتی ؎

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں بتایا کہ نبی کا تعلق مومنوں سے کیا ہونا چاہیے اور جسمانی تعلقات کی نفی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ آپ کے ساتھ مومنوں کا روحانی تعلق ہے۔ اور آپ کی محبت سب محبتوں پر فائق ہونی چاہیئے۔ دوسرے اور تیسرے رکوع میں جنگ احزاب کا ذکر ہے اور اس میں بھی اصل غرض اس طرف توجہ دلانا ہے کہ مخالفت کی ساری طاقتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہیئے اس لیے تیسرے رکوع کے شروع میں بتایا کہ آنحضرت صلعم مسلمانوں کے لیے ایک کامل نمونہ ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں آپ کا نمونہ کام دیتا ہے۔ چوتھے رکوع میں ازواج مطہرات کا ذکر کیا اور بتایا کہ نبی کی زوجیت میں ان کے آنے کی غرض یہ نہیں کہ ان کی توجہ دوسری عورتوں کی طرح دنیوی زیب و زینت کی طرف ہو بلکہ محض ایک دینی غرض کو تکمیل کو پہنچانے کے لیے ان کا وجود ہے اور انہوں نے بھی دنیا کی عورتوں کے لیے نمونہ بننا ہے۔ پانچویں رکوع میں پھر اصل مضمون کی طرف توجہ دلائی کہ آنحضرت صلعم کی ابوت جسمانی نہیں روحانی ہے اس لیے زید نے جسے لوگ آپ کا بیٹا کہہ دیا کرتے تھے۔ جب اپنی بی بی کو طلاق دیدی جو نبی صلعم کی بہت قریبی رشتہ دار تھیں اور جن کا نکاح نبی کریم صلعم نے خود زید سے کرایا تھا تو نبی کریم صلعم کے لیے اس بی بی سے خود نکاح کرنا ضروری ہوا اور اسی تعلق میں بتایا کہ آنحضرت صلعم رسول ہونے کی حیثیت میں نہ صرف ان لوگوں کے باپ ہیں جو اس وقت آپ پر ایمان لائے ہیں بلکہ چونکہ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں اس لیے قیامت تک جس قدر مسلمان ہونگے آپ سب کے روحانی باپ ہیں۔ چھٹے رکوع میں پھر مضمون کا انتقال آنحضرت صلعم کی ازواج کی طرف کیا اور آپ کی ازواج پر حدبندی کا ذکر کیا۔ ساتویں رکوع میں بتایا کہ منافق وغیرہ کس طرح طرح طرح کی باتیں کر کے آپ کو ایذا دیتے تھے اور ان ایذا دہی کی باتوں کا علاج بھی بتایا اور ایسی باتیں کرنے والوں کو تنبیہ بھی کی۔ آٹھویں رکوع میں بتایا کہ ایسی باتیں کرنے والے منافق اور کافر ہیں اور وہ اس کی سزا پا کر رہیں گے۔ نویں اور آخری رکوع میں بتایا کہ منافق اور کافر اس امانت میں خیانت کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کی ہے اور اس خیانت کا نتیجہ یقیناً دکھ ہے۔

تعلق: مجموعہ الٓمٓ کی چار سورتیں جو پیچھے گزریں ان میں اسلام کی کامیابی کی پیشگوئیاں کی تھیں اس سورت میں ان پیشگوئیوں کو پورا ہونے دکھایا ہے کہ کس طرح کفار اپنا پورا زور خرچ کر کے ناکام رہے۔

زمانہ نزول: اس سورت کا نزول جنگ احزاب کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے پانچویں سال ہجرت میں اس کی ابتدا ہے اور ساتویں سال تک کے واقعات کی طرف اس میں اشارہ موجود ہے بلکہ واقعہ ایلاء اور تخییر جو نویں سال ہجرت کا ہے وہ بھی اس میں مذکور ہے اس لیے اس کا نزول پانچویں سال سے لے کر نویں سال تک ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الۡكٰفِرِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقِيۡنَ ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۙ ①

وَّاتَّبِعۡ مَا يُوۡحٰۤى اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ۙ ②

وَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ‌ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ③

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنۡ قَلۡبَيۡنِ فِىۡ جَوۡفِهٖ‌ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزۡوَاجَكُمُ الّٰٓـئِْ تُظٰهِرُوۡنَ مِنۡهُنَّ اُمَّهٰتِكُمۡ‌ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدۡعِيَآءَكُمۡ اَبۡنَآءَكُمۡ‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ قَوۡلُكُمۡ بِاَفۡوَاهِكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوۡلُ الۡحَـقَّ وَهُوَ يَهۡدِى السَّبِيۡلَ ④

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اے نبی اللہ کے تقوے پر قائم رہ اور کافروں اور منافقوں کی بات نہ مان، اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۲۶۲۷

اور اسی پر چل جو تیرے رب کی طرف سے تیری طرف وحی ہوتی ہے اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

اور اللہ پر بھروسا رکھ، اور اللہ تعالیٰ کارساز بس ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے لیے اس کے اندر دو دل نہیں بنائے ــــ اور نہ تمھاری بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمھاری مائیں بنایا ہے اور نہ تمھارے لئے پالکوں کو تمھارے بیٹے بنایا ہے۔ یہ تمھاری اپنی منہ کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ سچ کہتا ہے اور وہی سیدھا رستہ دکھاتا ہے ۲۶۲۸

۲۶۲۷ بعض مفسرین نے یہ روایت بیان کی ہے کہ اہل مکہ ولید بن مغیرہ وغیرہ نے آنحضرت صلعم سے کہا کہ اپنے قول سے رجوع کریں تو وہ اپنے اموال سے انہیں حصہ دیں گے اور بعض نے یہ کہ ابوسفیان نے صلح حدیبیہ کے زمانہ میں رسول اللہ صلعم سے کہا تھا کہ آپ ہمارے بتوں کا ذکر چھوڑ دیں اور یہ کہہ دیں کہ وہ شفاعت کریں گے تو ہم آپ کی کچھ مزاحمت نہ کریں گے اور اس پر یہ آیات نازل ہوئیں مگر آنحضرت صلعم کے مدینہ تشریف آوری کے بعد اور اس قدر جنگوں کا سلسلہ لمبا ہو جانے کے بعد کفار کا ایسا کہنا بعید از قیاس ہے یہ سب باتیں وہ مکہ میں کہہ چکے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ انتہائی مشکلات کا زمانہ تھا۔ جنگ اُحد میں مسلمان بہت کچھ نقصان اُٹھا چکے تھے۔ ادھر اب جیسا کہ اگلے رکوع سے ظاہر ہے کہ کفار مکہ ایک جرار لشکر کے ساتھ جس کے مقابلہ کی طاقت مسلمانوں میں نہ تھی حملہ آور ہو رہے تھے۔ اندر منافق شب و روز ریشہ دوانیاں کر رہے تھے اور انہی کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ کفار کا یہ حملہ تھا۔ یہ اور اگلی دو آیتیں انہی پریشان کن حالات میں آنحضرت صلعم اور مسلمانوں کی تسلی کے لیے نازل ہوئیں کہ اللہ اُن کا کارساز ہے اور دشمن کتنا بھی طاقتور ہو کچھ نہیں کرسکتا۔ آنحضرت کا تقویٰ اللہ جس پر قائم رہنے کی یہاں تاکید فرمائی ہے یہی تھا کہ اس کام کو جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کھڑا کیا ہے پورا زور لگا کر کرتے جائیں اور کافروں اور منافقوں کی بات نہ مانیں کیونکہ یہ دونوں گروہ یہی چاہتے تھے کہ آپ تبلیغ حق کو چھوڑ دیں اور یا اشارہ ان اعتراضات کی طرف ہے جو کافر اور منافق دن رات کرتے تھے، کھلے مقابلہ سے بڑھ کر بعض وقت اعتراضات سے انسان گھبرا اٹھتا ہے اور دونوں حکم یعنی تقویٰ اللہ کرو اور کفار کی اطاعت نہ کرو اس حالت پر ثبات کے لیے ہیں۔

۲۶۲۸ جوف پست زمین کو کہتے ہیں اور انسان کا جوف اس کا پیٹ یا سارا وہ حصہ ہے جس پر کندھے اور بازو اور پسلیاں اور پہلو منطبق ہوتے ہیں اور ہر چیز کا جوف اس کا اندر ہے (ل)

یظاہرون۔ ظہر بمعنی پیٹھ سے ہے اور ظِہار یہ تھا کہ ایک شخص اپنی عورت کو کہتا کہ تو مجھ پر ایسی ہے جیسی میری ماں کی پیٹھ اور ایسے شخص کے متعلق کہا جاتا ظَاهَرَ مِنْ اِمْرَأَتِہٖ (غ) اور مطلب یہ ہوتا کہ تو مجھ پر حرام ہے اور یہ ان کی طرف سے ایک قسم کی طلاق ہوتی تھی (ر) اس پر مفصل بحث آگے سورۂ تحریم میں آئے گی۔

ادعیاء۔ دَعِیّ کی جمع ہے جو فعیل کے وزن پر ہے اور دَعْوَۃ طعام میں ہے اور دِعْوَۃ نسب میں۔ اور دَعِیّ وہ ہے جسے باپ کے سوائے دوسرے کی طرف منسوب کیا جائے اور متبنیٰ کو بھی دَعِیّ کہا جاتا تھا (ل)

اس آیت میں اول الفاظ ماجعل اللہ الرجل من قلبین فی جوفہٖ ہیں ان کے متعلق بعض مفسرین کا تو خیال ہے کہ منافقین نے آنحضرت صلعم کی نماز میں سہو پر یہ بات کہی تھی کہ آپ کے دو دل ہیں اس کی تردید یہاں ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ایک شخص ابومعمر نام تھا جو اہل مکہ میں ذوالقلبین کے نام سے مشہور تھا اور وہ کہا کرتا تھا کہ میرے دو دل ہیں ان میں سے ایک کے ساتھ میں محمد رسول اللہ صلعم سے زیادہ سمجھتا ہوں مگر آیات قرآنی کے نزول کو ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات پر محدود کر دینے سے ان کے نزول کی اصل غرض ہی مفقود ہو جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ نبی صلعم کو جو اتباع وحی کا حکم دیا ہے تو اس میں ساری اُمت

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ مَوَالِیْكُمْ ؕ وَ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ فِیْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝۵

انھیں ان کے باپوں کے نام سے پکارو یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف ہے پھر اگر تم ان کے باپوں کو نہیں جانتے تو وہ دین میں تمھارے بھائی اور تمھارے دوست ہیں اور تم پر اس بارے میں کچھ گناہ نہیں جو تم سے چُوک ہو جائے لیکن (وہ گناہ ہے) جو تمھارے دل عمداً کریں اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۲۶۲۹ء

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤی اَوْلِیٰٓىِٕكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝۶

نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں — اور رشتہ دار اللہ کے حکم میں مومنوں اور مہاجروں کی نسبت ایک دوسرے پر زیادہ حق رکھتے ہیں مگر یہ (دوسری بات ہے) کہ تم اپنے دوستوں سے کچھ اچھا سلوک کرو - یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے ۲۶۳۰ء

مخاطب ہے اور انہیں سمجھایا ہے کہ انسان کے اندر دو دل نہیں کہ ایک طرف تو دعوئ ایمان کرے اور دوسری طرف اس کے اعمال اس ایمان کے مطابق نہ ہوں یا ایک دل سے اللہ تعالیٰ پر اور اس کے کلام پر ایمان ہو اور دوسرے دل سے رسم و رواج اور حرص و ہوا کی اتباع ہو اور یا یہ منافقوں کی طرف اشارہ ہے جو ایک طرف دعوئ ایمان کرتے اور دوسری طرف کفار کو اکساتے رہتے تھے کہ مسلمانوں کو تباہ کریں۔

رسمِ ظہار : ظہار کے مضمون پر مفصل بحث سورۂ تحریم میں آئے گی یہ آیت اس کے لعد کی نازل شدہ ہے اور اس میں صرف اس قدر فرمایا ہے کہ بی بی ماں نہیں بن سکتی۔ رواجِ جاہلیت یہ تھا کہ بی بی کو ماں کہدیا جاتا لیکن وہ اسی گھر میں رہتی تعلقات زوجیت کے لحاظ سے یہ طلاق تھی۔ مگر عورت گھر کو نہ چھوڑ سکتی تھی نہ دوسری جگہ نکاح کر سکتی تھی قرآن کریم نے اسے ناجائز قرار دیا۔ متبنٰی بنانے کا رواج : اور دوسرا رواج جو اکثر قوموں میں اب بھی پایا جاتا ہے کسی کا دوسرے شخص کو بیٹا کہہ دینا تھا اور پھر وہ حقدار وراثت سمجھا جاتا۔ قرآن کریم نے باوجود مسلمانوں میں کمال درجہ کی اخوت پیدا کرنے کے تعلقات نسبی میں اس اخوت کو حائل ہونے نہیں دیا اور جاہلیت کے پرانے رواج کو کہ جہاں دو شخصوں میں مواخات ہوتی تو ایک دوسرے کی وفات پر حصۂ میراث پاتا منسوخ کر دیا آیت ۶ جس طرح منہ کی اخوت کو بلحاظ وراثت منسوخ کیا اسی طرح منہ کی ابنیت کو بھی منسوخ کیا۔ عورت واقعی ماں نہیں ہو سکتی غیر واقعی بیٹا واقعی بیٹا نہیں ہو سکتا۔ یہ لفظ عام ہیں یعنی ان باتوں کو ہمیشہ کے لیے دور کر دیا اور مفسرین نے جو لکھا ہے کہ یہاں زید بن حارثہ کی طرف خاص اشارہ ہے تو یہ بھی صحیح ہے کیونکہ زید بن حارثہ کو لوگ زید بن محمدؐ کہا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ چونکہ سب مومنوں کا یکساں رشتہ آنحضرت صلعم سے قائم کرنا چاہتا تھا اس لیے اسی آیت کی ذیل میں یہ بھی بتا دیا کہ زید کا آنحضرت صلعم سے وہی تعلق روحانی ہے جو دوسرے مسلمانوں کا ہے جسمانی تعلّق کوئی نہیں۔ اس روحانی تعلق میں جو جس قدر چاہے زیادہ نسبت پیدا کرے۔ آنحضرت صلعم سے کل اُمت کا تعلّق ابنیت بلحاظ روحانیت ہے اور رہے گا اور آپ کا بیٹا وہی کہلا سکیگا۔ جو شدید روحانی تعلق آپ سے پیدا کر کے آپ کی صفات روحانی کو اپنے اندر لے اسی کی طرف آیت ۶ میں اشارہ ہے۔

۲۶۲۹ء بخاری میں ہے کہ لوگ زید بن حارثہ کو زید بن محمدؐ کہا کرتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی یعنی ادعوھم لاٰبآءھم اور فیما اخطأتم بہ اور ما تعمدت قلوبکم کا تعلق صرف اس بات سے نہیں کہ غلطی سے تم کسی کو بیٹا کہدو بلکہ تمام امور سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ غلطی سے ایک کام کے ہو جانے پر جسے کرنے کا انسان کا منشا نہ تھا۔ مواخذہ نہیں کرتا۔ بلکہ جو کام عمد سے کیا جائے اس پر مواخذہ ہوتا ہے۔ پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ انسان کے سینہ میں دو دل نہیں ہوتے کہ ایک دل سے ایمان کا اقرار کرے اور دوسرے دل سے اس کے خلاف کچھ فعل کرے یہاں بتایا کہ چُوک یا خطا ہو جانا امر دیگر ہے یعنی یہ بات ایمان کے منافی نہیں لیکن عمداً کسی فعل کا ارتکاب جو خلاف ایمان ہو نہیں ہونا چاہیئے۔

۲۶۳۰ء اولی - اَوْلیٰ کے معنی اَدنیٰ اور اقرب ہیں یعنی قریب تر۔ اور اَوْلیٰ بکذا کے معنی ہیں اَحَقُّ بہ یعنی اس کا زیادہ حقدار (ل)

اس آیت کے پہلے حصہ میں آنحضرت صلعم اور مومنوں کے باہمی تعلق کو بیان کیا ہے اور اس کے دو حصّے ہیں اوّل یہ کہ نبی مومنوں سے بہ نسبت ان

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۷﴾	اور جب ہم نے نبیوں سے ان کا عہد لیا اور تجھ سے (بھی لیا) اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰ ابن مریم سے ۔ اور ہم نے اُن سے پختہ عہد لیا ۲۶۳۱

کی اپنی جانوں کے اولیٰ ہے ۔ بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا مَا مِن مومنٍ اِلاّ وانا اَولی الناس به فی الدنیا و الاٰخرة اِقرءُ وا ان شئتم النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسهم فاَیّما مومنٍ ترك مالاً فلیرثهٗ عصبتهٗ من کانوا فان ترك دَینًا اَو ضَیاعًا فلیاتنی وانا مولاهٗ کوئی مومن نہیں مگر میں دنیا اور آخرت میں سب لوگوں سے بڑھ کر اس کا حقدار ہوں اگر چاہو تو پڑھو النّبی اَولیٰ بالمؤمنین من انفسهم سو جو کوئی مومن مال چھوڑے تو اس کے رشتہ دار جو کوئی ہوں اس کے وارث ہوں اور اگر وہ قرضہ چھوڑے یا نادار بال بچے چھوڑے تو چاہیئے کہ وہ میرے پاس آئے میں اس کا مولیٰ ہوں ۔ یہ باپ سے بڑھ کر شفقت ہے ۔ اور جب آپ کی مومنوں پر ایسی شفقت ہے تو مومنوں کی محبت بھی آپؐ سے ایسی ہی چاہیئے کہ اس کی نظیر بھی کسی دنیوی رشتہ میں نہ ہو اسی لیے فرمایا لایؤمن احدکم حتی اکون احبّ الیه من والده وولده والناس اجمعین تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں بنتا جب تک کہ میرے ساتھ اس کی محبت باپ اور بیٹے اور تمام لوگوں سے بڑھ کر نہ ہو ۔ اور اس تعلق کا ذکر اس لیے کیا کہ تا مسلمان یہ جان لیں کہ رسول اللہ صلعم جو کچھ حکم دیتے ہیں وہ ان کی بھلائی کے لیے ہے اور اس کی تعمیل میں انہیں جلدی کرنی چاہیئے ۔

دوسری بات جو بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی بیبیاں مومنوں کی مائیں ہیں ، یہاں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابھی تو فرمایا تھا کہ منہ سے کہہ دینے سے کوئی عورت ماں نہیں بن جاتی اور یہاں فرمایا کہ نبی کی بیبیاں مومنوں کی مائیں ہیں تو کیا یہ منہ سے کہدینا نہیں ؟ ایسا خیال کرنا سخت غلطی ہوگی ۔ قرآن کریم نے اگر تعلقات نسبی کی عزت کو قائم کرکے اس بات سے روکا کہ جو ماں نہ ہو اُسے ماں کہو اور جو بیٹا نہیں اسے بیٹا کہو تو اب ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ تعلقات نسبی کی محض جسمانی ہیں اس عزت کے ساتھ تعلقات روحانی کی عزت کو بھی مدّ نظر رکھو ۔ رسول اللہ صلعم سے بیشک مومنوں کے تعلقات نسبی کوئی نہیں لیکن تعلقات نسبی سے بھی شدید تر تعلقات روحانی ہیں اس لیے جب مومنوں پر آپ کی شفقت کا اظہار کیا تو ساتھ ہی بتایا کہ یہ شفقت اس روحانی تعلق کی وجہ سے ہے جو نبی کو تمہارے ساتھ ہے اور یہاں یوں نہیں فرمایا کہ وہ تمہارے باپ ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ اس کی بیبیاں تمہاری مائیں ہیں کیونکہ اس سے دو مقصد حاصل ہوئے ایک تو آپؐ کی ابوت اس سے ایسی ہی ثابت ہوئی جیسے ان صریح الفاظ سے ہوتی هو اَبٌ لهم اور بعض قراتوں میں جو یہاں یہ لفظ آئے ہیں تو ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ کی بیبیوں کو مومنوں کی مائیں کہنا ایسا ہی ہے جیسا آنحضرت صلعم کو مومنوں کے باپ قرار دینا اور دوسرا مقصد ان الفاظ سے یہ حاصل ہوا کہ نہ صرف آپ کی بیبیوں کی تکریم ثابت ہوئی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ثابت ہوا کہ جو شخص مستحق عزّت ہے اس کی بی بی اس کے تعلق سے مستحق عزت ہو جاتی ہے ، بلکہ ان الفاظ میں ایک گہرا راز ہے جس کی طرف آج تک توجہ نہیں ہوئی اور وہ یہ ہے کہ جب ماں بلحاظ نسب وہ ہے جو بچہ کو جسمانی طور پر پرورش کرتی ہے تو ماں بلحاظ روحانی وہ ہے جو بچہ کی روحانی پرورش کرتی ہے آنحضرت صلعم کا اپنی امت کا روحانی باپ ہونا تو ایک امر ظاہر تھا کیونکہ آپ سے ہی نور ایمان ہدایت سب کچھ ملا لیکن ان الفاظ میں یہ بتایا کہ آنحضرتؐ کی بیبیاں بھی محض اس غرض کو پورا نہیں کرتیں جس کا ذکر هن لباس لکم میں یا لتسکنوا الیها میں ہے بلکہ وہ مومنوں کے لیے روحانی ماں کا حکم بھی رکھتی ہیں یعنی مومنوں کی روحانی پرورش بھی ان کے ذریعہ سے ہوتی ہے ۔ اور وہ دین کے اس کثیر حصّہ میں جو انسان کے لیے اس دنیا میں جنت کا حکم رکھتا ہے یعنی معاشرت کے حصّہ میں مومنوں کے لیے اخلاق اور افعال نبوی کو محفوظ رکھ کر اور پھر دنیا کی عورتوں کے لیے نمونہ اور رہنما بن کر مومنوں کی روحانی مائیں بن گئیں ۔

آیت کے پچھلے حصّہ میں بیان کیا ہے کہ میراث وغیرہ تعلقات اخوت دینی کے لحاظ سے نہیں پہنچتیں بلکہ تعلقات رشتہ کے لحاظ سے اور چونکہ مہاجرین کے ساتھ انصار کی اخوت خصوصیت سے قائم ہوئی تھی اس لیے یہاں مہاجرین کا ذکر بالخصوص کیا ہے تفصیل کے لیے دیکھو ۶۴۹

۲۶۳۱ نبیوں کے عہد سے وہی مراد ہے جو میثاق النّبیّین سے آل عمرانؔ ۔ ۸۰ میں دیکھو ۴۷۲ یہ عہد نبی کریم صلعم کے متعلق تھا یعنی یہ کہ سب نبیوں کے آخر پر ایک نبی آئے گا جو سب کا مصدّق ہوگا اور جس پر سب قوموں کو ایمان لانا ہوگا چنانچہ قتادہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالٰی نے نبیوں سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی تصدیق کریں اور رسول اللہ صلعم کے متعلق اعلان کریں اور رسول اللہ صلعم کا اعلان کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا (ر) اور نبیوں کے میثاق کے بعد پھر جو فرمایا ومنك ومن نوح تو اس کی عام توجیہ یہ کی گئی ہے کہ یہ عطف خاص علی العام ہے اور گو پہلے نبیوں میں یہ شامل ہیں مگر بوجہ اُن کی فضیلت کے ان کا ذکر خصوصیت سے کیا ۔ آنحضرت کن معنوں میں اول النبیین ہیں : اور یہاں جو منك میں نبی صلعم کا ذکر سب سے پہلے کیا تو یہ اسبات کی طرف اشارہ ہے جو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کنت اول النبیین فی الخلق واٰخرهم فی البعث یعنی پیدائش میں سب نبیوں سے اول ہوں اور بعثت میں سب سے آخر اور پیدائش میں اول ہونا اس لحاظ سے بھی ہے کہ آپ کے بغیر سلسلہ نبوت کی اصل غرض ہی مفقود ہو جاتی ہے اور منك در حقیقت النبیین کے مقابل پر ہے کیونکہ نبیوں سے عہد رسول اللہ صلعم کے متعلق لیا گیا اور رسول اللہ صلعم سے کل انبیا کے متعلق اور یہ کل انبیائے عالم کی تصدیق تھی ۔ اور من نوح

لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَ
ع ۸ ۱۷ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ⑧
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ
عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۗ وَ
كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۚ ⑨
اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ
مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ
الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ⑩

تاکہ وہ سچوں سے اُن کی سچائی کے متعلق سوال کرے۔
اور اس نے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کیا ہے ۲۶۳۲ع
اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد
کرو جب تم پر لشکر چڑھ آئے، سو ہم نے اُن پر ہوا کو اور
ایسے لشکروں کو بھیجا جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور اللہ تعالیٰ اسے
جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے ۲۶۳۳ع
جب وہ تمھارے اوپر سے اور تمھارے نیچے سے تم پر آگئے
اور جب آنکھوں میں اندھیرا آگیا اور دل دہشت سے گویا
گلوں تک پہنچ گئے اور تم اللہ پر مختلف قسم کے ظن کرنے لگے ۲۶۳۴ع

وابراھیم وموسی وعیسی ابن مریم میں چار نبیوں کا خصوصیت سے ذکر ہے جن میں سے نوح سب سے پہلے نبی ہیں اور ابراہیم ابوالانبیاء ہیں جن میں سلسلۂ موسوی اور سلسلۂ محمدی مجتمع ہوتے ہیں اور موسیٰ اور عیسےٰ سلسلہ موسوی کے اول و آخر ہیں جس سلسلہ کو سلسلہ محمدی سے کمال مشابہت حاصل ہے اور یہ آیت یہاں آپ کی عظمت کے اظہار کے لیے لائی گئی ہے۔

۲۶۳۲ع چونکہ سلسلہ نبوت کی اصل غرض یہی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدق دکھائیں اس لیے اس بات کو بطور نتیجہ بیان کیا۔

۲۶۳۳ع یہاں سے جنگ احزاب کا ذکر شروع ہوتا ہے اور اسی پر سورت کا نام ہے اور اس ذکر کے لانے کی غرض یہ دکھانا ہے کہ مومنوں کا ایمان آنحضرت صلعم پر کس قدر تھا کہ چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں آجانے پر بھی ان کا ایمان آخری کامیابی پر اس قدر مضبوط تھا کہ وہ بول اُٹھے ھٰذا ما وعدنا اللہ ورسولہ۔ جنود سے مراد یہاں احزاب ہی ہیں اور یہ ذیل کی قومیں تھیں۔ قریش (ابوسفیان کے ماتحت) بنو اسد۔ غطفان۔ بنو عامر۔ بنو سلیم۔ بنی نضیر۔ بنی قریظہ۔ اور موخر الذکر رسول اللہ صلعم سے عہد شکنی کرکے ان کے ساتھ شامل ہوگئے اور ان کی تعداد بعض روایات کی رو سے دس ہزار اور بعض کی رو سے پندرہ ہزار تھی۔ رسول اللہ صلعم کو جب ان کی چڑھائی کی خبر ملی تو سلمان فارسی کے مشورہ سے آپ نے مدینہ کے گرد خندق کھدوائی اور چالیس چالیس گز کا ٹکڑا دس دس آدمیوں کے سپرد کیا اور آپ کے ساتھ تین ہزار آدمی تھے یہ واقعہ شوال ۵ھ ہجری کا ہے۔ قریب ایک ماہ کے دونوں فوجیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے پڑی رہیں۔ آنحضرت صلعم کا معجزہ: تب اللہ تعالیٰ کی نصرت ریح یعنی ہوا کی صورت میں آئی اور جنود لم تروھا سے مراد ملائکہ ہیں جنہوں نے دشمن کو باوجود اس کی اتنی کثرت کے کہ پانچ گنا ان کی تعداد تھی ایسا مرعوب کیا کہ وہ راتوں رات بھاگ گئے اور یہ سخت ٹھنڈی ہوا تھی جو ٹھنڈی رات میں چلی اور اس قدر زور کی چلی کہ مٹی اور کنکر ان کے منہ پر پڑتے تھے اور آگ بجھ گئی اور ہانڈیاں گر گئیں اور خیموں کی میخیں اکھڑ گئیں اور رسّیاں ٹوٹ گئیں اور گھبراہٹ میں پندرہ ہزار فوج راتوں رات بھاگ گئی۔ یہ نبی کریم صلعم کا کھلا معجزہ ہے کہ اس قدر کثیر دشمن سے ایک آندھی کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بچا لیا۔ حالانکہ آندھی تو دونوں فریق پر یکساں چلی مگر ایک گروہ کے لیے نجات کا اور دوسرے کے لیے ہلاکت کا موجب ہوگئی یہ معجزہ حضرت موسیٰ کے فلق بحر کے معجزہ سے کم نہیں۔

۲۶۳۴ع زاغت۔ زَیغ کے لیے دیکھو ۳۷۶ع اور زاغت الابصار کے معنی ہیں اپنی جگہ سے مائل ہوگئیں یعنی ایک طرف جھک گئیں جیسا کہ انسان کو حالت خوف میں پیش آتا ہے (ل) اور ہوسکتا ہے کہ یہ اشارہ خوف کی طرف ہو جس کی وجہ سے آنکھوں میں اندھیرا آجاتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ اشارہ اس کی طرف ہو جو فرمایا یرونھم مثلیھم رای العین (غ)

بلغت القلوب الحناجر۔ حَناجِر حَنجَرَة کی جمع ہے جس کے معنی گلا ہیں۔ اور دلوں کے گلوں میں پہنچنے سے مراد ہے کہ دہشت سے گویا وہ اپنی جگہ سے اوپر آگئے (ل) اور عکرمہ سے ہے کہ دل اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتے ورنہ فوراً جان نکل جائے بلکہ یہ صرف گھبراہٹ کا نقشہ ہے اور خوف کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دم رُکتا ہے (ر) یہی معنی اذ القلوب لدی الحناجر کاظمین (المؤمن-۱۸) میں ہیں۔

من فوقکم سے مراد اوپر کی طرف یعنی وادی کی بلند طرف ہے اور یہ مدینہ کا مشرق تھا اور اسفل سے مراد نچلی یعنی سمندر کی طرف ہے جو مدینہ سے غربی جانب ہے۔ گویا مشرق و مغرب دونوں طرف سے حملہ آور ہوئے اور یا مراد اُن کا چاروں طرف سے حملہ آور ہونا ہے اور ظنونا سے مراد مختلف قسم کے ظن ہیں، یعنی مختلف قسم کے آدمیوں کے ظن مختلف قسم کے تھے۔ منافقوں کا یہ خیال تھا کہ اب تباہ ہوئے۔ اور مومنوں کا خیال اللہ تعالیٰ نے خود اگلے رکوع میں بیان کر دیا ہے دیکھو آیت ۲۲ یعنی وہ خوش تھے کہ اللہ تعالےٰ کا وعدہ اب پورا ہوگا یعنی مومنوں کو کامیابی ملے گی اور آنکھوں میں اندھیرا آنا اور دلوں پر دہشت کا چھا جانا بھی منافقوں کے لیے تھا، یہ مطلب نہیں کہ سب پر دہشت چھا گئی تھی تاریخ سے بھی یہی ثابت ہے اور قرآن کریم نے خود دو گروہ بنا کر یہ بتا دیا ہے ہاں مومنوں کی

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝١١

وہاں مومن آزمائے گئے اور سخت مصائب میں ڈالے گئے۔

وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝١٢

اور جب منافق اور وہ جن کے دلوں میں بیماری تھی کہنے لگے اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدہ کیا، نرا دھوکا تھا۔

وَ اِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَ يَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛؕ

ع۲ وَ مَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝١٣

اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا اے یثرب کے رہنے والو تمھارے لیے یہاں ٹھیرنے کی جگہ نہیں سو لوٹ چلو اور ان میں سے ایک فریق نبی سے اجازت مانگتا تھا کہتے تھے ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں اور وہ کھلے نہیں تھے وہ صرف بھاگنا چاہتے تھے ۲۶۳۵ع

وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَ مَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ۝١٤

اور اگر (دشمن) ان پر اس کی اطراف سے داخل ہوتا، پھر ان سے فساد کرنے کو کہا جاتا تو وہ ضرور ایسا کرتے اور بہت ہی کم وہاں ٹھیرتے ۲۶۳۶ع

وَ لَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَ كَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ۝١٥

اور پہلے اللہ تعہ سے عہد کر چکے تھے کہ پیٹھ نہیں پھیریں گے، اور اللہ تعہ کے عہد کی پرسش ہوگی ۲۶۳۷ع

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَ اِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ

کہہ، تمھیں بھاگنا نفع نہیں دے گا، اگر تم موت یا قتل سے بھاگتے ہو اور اس صورت میں تمھیں تھوڑا

آزمایش اور ان پر شدت مصیبت یہ ضرور تھی (زلزال کے لیے دیکھو ع۲۷۳)

ع۲۶۳۵ عورۃ کے لیے دیکھو ع۲۳۲۴ یعنی ان میں شگاف ہیں جو چاہے ان میں آسکتا ہے اور بعض کے نزدیک مراد ہے کہ مردوں سے خالی ہیں یا دیواریں پست ہیں۔ اور مطلب سب صورتوں میں یہ ہے کہ ان میں چوری وغیرہ ہوسکتی ہے۔ یثرب مدینہ کا پہلا نام ہے دیکھو ع۱۵۸۴ اور لا مقام لکم سے مراد ہے کہ مکان اقامت تمھارے لیے نہیں یعنی اس قدر زبردست دشمن ہے کہ تم اس کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتے۔ اور فارجعوا سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مقابلہ سے لوٹ کر اپنے گھروں میں چلے گئے جس طرح منافق چلے گئے اور یہ بھی کہ اسلام سے لوٹ کر شرک میں چلے جاؤ۔

ع۲۶۳۶ تلبثوا۔ لَبِثَ اور تَلَبَّثَ کے ایک ہی معنی ہیں کسی جگہ ٹھہرا۔ اور لَبِثَ توقف کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے فما لبث ان جاء بعجل حنیذ (ھود۔ ۶۹) (ل) اقطارھا سے مراد یہاں شہر کی اطراف ہیں اور مطلب یہ ہے کہ یہی لوگ جواب گھروں کے کھلا ہونے اور ان میں سرقہ ہوجانے کا اندیشہ ظاہر کرتے ہیں اگر حالت یہ ہوتی کہ دشمن شہر میں داخل ہوجاتا پھر انہیں کہا جاتا کہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرو اور انہیں دکھ پہنچاؤ (فتنۃ کے لیے دیکھو ع۲۴۳) تو فوراً اس کام میں لگ جاتے اور پھر گھروں میں نہ ٹھہرتے الا یسیرا اس لیے کہا کہ ہتھیار وغیرہ لینے کے لیے جتنا ٹھہرنا پڑتا اتنا ہی ٹھہرتے اُس صورت میں گھروں کے کھلا رہنے کا عذر نہ ہوتا حالانکہ جیسا کہ اگلی آیت میں ہے عہد ان کا مسلمانوں کے ساتھ تھا کہ اگر دشمن حملہ آور ہو تو ہم تمھارے ساتھ مل کر دشمن سے جنگ کریں گے۔

ع۲۶۳۷ مفسرین کہتے ہیں یہ بنو حارثہ یا بنو سلمہ تھے جو جنگ اُحد میں الگ رہے تھے اور یوم خندق سے پہلے توبہ کی تھی اور عہد کیا تھا (ر) مگر دیکھو ع۵۰۹ بنو حارثہ اور بنو سلمہ جنگ اُحد میں شریک ہوئے تھے اور حضرت ابن عباس اس سے لیلۃ العقبۃ کا عہد مراد لیتے ہیں مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ عہد ہے جو آنحضرت صلعم کی مدینہ تشریف آوری پر یہود اور مسلمانوں میں ہوا تھا جس کی رو سے سب فریق اسبات کے ذمہ وار تھے کہ اگر باہر سے کوئی دشمن مدینہ پر حملہ آور ہو تو اس کا دفاع سب ایک ہو کر کریں گے اور منافق بھی ان میں شامل تھے اور اس معاہدہ میں یہ لفظ تھے وان بینھم النصر علی من دھم یثرب۔

إِلَّا قَلِيلًا ⑯
قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللَّهِ
إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوٓءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ
رَحْمَةً ۚ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ
اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ⑰
قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الْمُعَوِّقِينَ مِنكُمْ
وَالْقَآئِلِينَ لِإِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ إِلَيْنَا ۖ وَ
لَا يَأْتُونَ الْبَأْسَ إِلَّا قَلِيلًا ⑱
أَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۖ فَإِذَا جَآءَ الْخَوْفُ
رَأَيْتَهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ
كَالَّذِي يُغْشَىٰ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَإِذَا
ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوكُم بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ
أَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۚ أُولَٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا
فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ
عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ⑲
يَحْسَبُونَ الْأَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوا ۖ وَ
إِن يَأْتِ الْأَحْزَابُ يَوَدُّوا لَوْ أَنَّهُم
بَادُونَ فِي الْأَعْرَابِ يَسْأَلُونَ عَنْ أَنبَآئِكُمْ ۖ
ع ٢ ١٨ وَلَوْ كَانُوا فِيكُم مَّا قَاتَلُوٓا إِلَّا قَلِيلًا ⑳
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ

ہی سامان ملے گا۔
کہہ، کون ہے جو اللہ تعہ سے تمھیں بچا سکے، اگر وہ
تمھیں تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے یا (تمھیں تکلیف پہنچا سکے
اگر) وہ تم پر رحم کرنے کا ارادہ کرے اور وہ اللہ کے سوائے
اپنے لیے نہ کوئی حمایتی پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔
اللہ تعہ تم میں سے روکنے والوں کو جانتا ہے اور اپنے
بھائی بندوں سے کہنے والوں کو کہ ہماری طرف آجاؤ اور
وہ لڑائی میں کم ہی آتے ہیں ٢٦٣٨
تمھارے ساتھ بخل کی وجہ سے، پھر جب خوف آتا ہے
تو انھیں دیکھتا ہے کہ تیری طرف دیکھتے ہیں ان کی آنکھیں
گھومتی ہیں اس شخص کی طرح جس پر موت کی بے ہوشی آجائے
پس جب خوف جاتا رہتا ہے تو مال کے بخل سے تیز زبانوں
سے تم پر طعن کرتے ہیں، یہ لوگ ایمان نہیں لائے، سو
اللہ نے ان کے عملوں کو برباد کر دیا۔ اور یہ اللہ تعہ
پر آسان ہے ٢٦٣٩
وہ خیال کرتے ہیں کہ (کفار کی) جماعتیں نہیں گئیں اور اگر وہ
جماعتیں (پھر) آجائیں تو آرزو کریں گے کہ وہ دیہاتیوں
میں جا کر صحرانشین ہو جائیں۔ تمھاری خبریں پوچھتے ہیں
اور اگر تمھارے اندر ہوں تو کم ہی جنگ کریں۔
یقیناً تمھارے لیے اللہ تعہ کے رسول میں ایک نیک نمونہ ہے

٢٦٣٨ معوّقین۔ عوق سے ہے اور عائق وہ ہے جو اس سے پھیر دے جو کسی بھلائی کا ارادہ کیا جائے اور معوقین سے مراد بھی وہی لوگ ہیں جو نیکی کے رستے سے روک دیں اور یعوق بُت کا نام ہے (غ)

٢٦٣٩ اشحۃ۔ شحیح کی جمع ہے بخیل اور شُحّ کے لیے دیکھو ع٧٤٢ بخل جس کے ساتھ حرص ہو اور یہاں مراد ہے دشمن کے مقابل پر مال خرچ نہیں کرتے غنیمت پر حریص ہیں۔

سلقوا۔ سَلق آواز کی سختی ہے حدیث میں ہے لیس منّا مَن سَلَقَ جس سے مراد ہے وہ شخص جو موت کے وقت یا مصیبت کے وقت آواز بلند کرتا ہے اور سَلَقَہٗ بلسانہٖ کے معنی ہیں اسے ایسی بات سنائی جو وہ ناپسند کرتا ہے اور سَلَقَہٗ بالکلام سے مراد ہے اسے کلام سے اذیت پہنچائی (ل)

حداد۔ حدید کی جمع ہے دیکھو ع٢٣٧ اور لسانٌ حدیدٌ ایسا ہی ہے جیسا لسان صارم یعنی زبان جو کاٹتی چلی جائے اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کی تاثیر حدید یعنی لوہے کی ہو۔

حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ
الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾
وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا
هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ
اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۫ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ
اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾

اس کے لیے جو اللہ تعالیٰ اور پچھلے دن کی امید رکھتا ہے
اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرتا ہے ۲۶۴۰
اور جب مومنوں نے جماعتوں کو دیکھا انھوں نے کہا یہ وہ
ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے دیا تھا اور
اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا اور اس نے انھیں صرف
ایمان اور فرمانبرداری میں بڑھایا ۲۶۴۱

۲۶۴۰ اسوۃ۔ دیکھو ۸۱۱ اور اُسوۃ۔ قُدْوَۃ یعنی پیشوا کے معنی میں بھی آتا ہے اور کہا جاتا ہے لی فی فلانٍ اُسوۃٌ اور امور میں پیروی کرنا بھی اُسوۃ ہے (ل) رسول اللہ صلعم میں اُسوۂ حسنہ کا ہونا اس موقعہ پر خصوصیت سے کیوں بیان کیا گیا؟ اس لیے کہ مصائب میں استقلال تمام اخلاق کی جان ہے اور یہ موقعہ اس استقلال کے دکھانے کا تھا جب دشمن اس قدر طاقت کے ساتھ کچلنے کے لیے آموجود ہوا کہ مسلمانوں میں اس کے مقابلہ کی کچھ بھی طاقت نہ تھی۔ یہی وہ موقعہ تھا کہ جب ظاہر تک محدود نگاہوں والے پکار اُٹھے یا اھل یثرب لا مقام لکم کہ نبی صلعم نے خندق میں ایک پتھر کو توڑتے ہوئے فرمایا کہ مجھے قیصر اور کسریٰ اور یمن کے محل دکھائے گئے اور جبرئیل نے مجھے خبر دی ہے کہ میری امت ان پر غالب آئے گی۔ ایک اور وجہ اس مضمون کے یہاں لانے کی یہ ہے کہ اصل مضمون تو یہی ہے کہ مومن رسول اللہ صلعم سے کیا تعلق رکھیں اور کیا سیکھیں۔ اسی اثنا میں جنگ احزاب کا ذکر آگیا اور اس ذکر کے اندر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا ہے۔

رسول اللہ صلعم کے اُسوۂ حسنہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ دوسری جگہ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق اسی قسم کے الفاظ ہیں قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معه اذ قالوا لقومھم انا برءٰؤا منکم (الممتحنۃ ۶۰-۴) یعنی حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھی تمہارے لیے اس بارہ میں اسوۂ حسنہ ہیں کہ جب انہوں نے اپنی قوم کو دیکھا کہ وہ عداوت حق میں حد سے بڑھ گئی ہے تو ان سے تعلقات قطع کر لیے تو یہ ایک خاص امر میں اسوۂ حسنہ ہونا ہے۔ لیکن یہاں آنحضرتؐ کا اُسوۂ حسنہ ہونا نہ صرف عام کر کے یہ بتا دیا کہ آپ تمام امور میں اُسوۂ حسنہ ہیں بلکہ اس کے بعد الفاظ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاخر بڑھا کر بتا دیا کہ آپ ہر اس شخص کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں جو اللہ اور یوم آخر کی امید رکھتا ہو۔ گویا تمام قوموں اور تمام زمانوں اور تمام قسم کے آدمیوں کے لیے آپ اُسوۂ حسنہ ہوئے جس طرح قرآن کریم کل مخلوق کے لیے ہدایت ہے اسی طرح آپ ساری نسل انسانی کے لیے اُسوۂ حسنہ ہیں۔ گویا قرآن کریم کی تعلیم الفاظ سے ہے اور محمد رسول اللہ صلعم کا وجود اسی تعلیم کا عملی نقشہ ہے۔ اور آپ سب قسم کے انسانوں کے لیے اُسوۂ حسنہ نہ ہو سکتے تھے جب تک کہ آپ خود جملہ حالات انسانی میں سے نہ گزریں۔ اگر آپ متاہل نہ ہوتے تو آپ ایک نادر کے لیے اُسوۂ حسنہ نہ ہو سکتے تھے۔ بالفاظ دیگر جو بات ہر انسان کو پیش آنے والی تھی اسی میں آپ کا نمونہ نہ ہوتا۔ اگر آپ صاحب اولاد نہ ہوتے تو آپ کسی باپ کے لیے اسوۂ حسنہ نہ ہو سکتے۔ آپ کے والد اور والدہ گو فوت ہو چکے تھے مگر آپ نے اپنے چچا ابو طالب سے وہی سلوک کر کے دکھایا جو بیٹا باپ سے کرتا ہے اور آپ کی رضاعی والدہ جب آپ سے ملنے آئیں تو آپ نے والدہ کی طرح ہی ان کی عزت کی۔ پھر انسان پر جو مختلف حالتیں آتی ہیں وہ یتیمی کی حالت سے لیکر جو انتہائی بیکسی کی حالت ہے بادشاہی تک ہیں جہاں پہنچ کر انسان نخوت و تکبر کا شکار ہوتا اور طاقت کے نشہ میں سب کے حقوق کو پامال کرتا چلا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیمی سے لیکر بادشاہی تک پہنچایا اور ان دونوں حالتوں کے اندر اور جس قدر حالات انسان پر آتے ہیں ان سب میں سے گزارا۔ پھر اگر آپ کو جنگ پیش نہ آتی تو آپ کا اُسوۂ حسنہ ہونا ایک ایسے پہلو میں ناقص رہ جاتا جس کی ضرورت دنیا میں ہر قوم اور ہر زمانہ میں پیش آتی رہتی ہیں۔ اور اس حالت میں آپ کی زندگی میں اگر ایک جرنیل کا نمونہ پایا جاتا ہے تو ایک سپاہی کا نمونہ بھی موجود ہے۔ پھر بادشاہت کی حالت میں آپ خود قانون سازی کرنے والے تھے خود اس قانون کے ماتحت جج اور قاضی کا کام کرنے والے تھے خود انتظامی معاملات کو طے کرنے والے تھے۔ خود معاملات ملکی کو سر انجام دینے والے تھے۔ پس مقنن کیلئے ایک جج کیلئے ایک انتظامی عہدیدار کیلئے، ایک مدبر ملکی کیلئے آپکی زندگی میں نمونہ موجود ہے اور باوجود بادشاہت اور افسری کے آپ نے ادنیٰ سے ادنیٰ کام ٹوکری اُٹھانا، پھاوڑا چلانا، جوتی اور کپڑے کی مرمت کرنا، برتن دھو لینا، دودھ دوہ لینا، بازار سے سودا لے آنا اپنے ہاتھ سے کر دکھائے جس میں ہر قسم کے مزدوری پیشہ آدمی کے لیے آپ نمونہ ہیں۔ پھر دشمنوں کے ہاتھ سے طرح طرح کے دکھ اُٹھا کر آپ صبر و استقلال کا نمونہ بھی بنے اور انہی ظالموں پر فتح پا کر کامل عفو و رحم کا نمونہ بھی بنے۔ حضرت مسیح کی زندگی میں ہم ان میں سے کونسا نمونہ تلاش کریں؛ نہ آپکو ان حالات میں سے گزرنا میسر آیا نہ آپ ان حالات میں سے کسی کے لیے نمونہ کہلا سکتے ہیں۔ یہی حالت دیگر انبیاء کی ہے کہ بعض انبیاء ایک حالت کے لیے نمونہ ہیں اور بعض دوسری کے لیے بعض نے ایک خلق کا کمال دکھایا بعض نے دوسرے کا، لیکن نہ جملہ حالات کسی نبی کی زندگی میں جمع ہوئے نہ جملہ اخلاق فاضلہ میں کوئی نمونہ بنا یہ فخر کل عالم میں صرف ایک کو میسر آیا اور اسی لیے وہ سرور عالم اور فخر بنی نوع انسان اور اُسوۂ حسنہ ہوا۔

۲۶۴۱ ایک بیّن النبوت معجزہ: ھٰذا ما وعدنا اللہ ورسوله صاف کسی پہلی پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ اشارہ ہے

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۙ ﴿۲۳﴾

مومنوں میں سے کچھ مرد ہیں جنھوں نے سچ کر دکھایا جو اللہ سے عہد کیا تھا - سو اُن میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے اپنی نذر کو پورا کر دیا اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو انتظار کرتے ہیں اور اپنی بات نہیں بدلی ۲۶۴۲

لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ ﴿۲۴﴾

(یہ اس لیے ہُوا) تاکہ اللہ تعالیٰ صادقوں کو ان کے صدق کا بدلہ دے اور منافقوں کو اگر چاہے عذاب دے، یا ان پر رجوع برحمت کرے اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۲۶۴۳

وَ رَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۚ ﴿۲۵﴾

اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ان کے غصّے میں لوٹا دیا انھوں نے کوئی بھلائی حاصل نہ کی اور جنگ میں اللہ مومنوں کے لیے بس ہوا اور اللہ تعالیٰ طاقتور غالب ہے ۲۶۴۴

وَ اَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَ تَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۚ ﴿۲۶﴾

اور انھیں جنھوں نے اہل کتاب میں سے ان کی مدد کی تھی ان کے قلعوں سے نکال دیا اور ان کے دلوں میں رُعب ڈال دیا، ایک فریق کو تم قتل کرتے تھے اور ایک فریق کو قید کرتے تھے ۲۶۴۵

سورۂ بقرہ کی اس آیت کی طرف ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم الباساء والضراء وزلزلوا حتّٰی یقول الرسول والذین اٰمنوا معہ متٰی نصر اللہ (البقرۃ ۲-۲۱۴) لیکن اس سے زیادہ صاف یہ مکّی پیشگوئی ہے جند ما ھنالك مھزوم من الاحزاب (صٓ ۳۸-۱۱) جہاں احزاب کا، ان کے لشکروں کا، اور ان کی ہزیمت کا ذکر ہے پس احزاب کا لشکر لے کر آنا مومنوں کے لیے نشان تھا کہ اب یہ بھاگ بھی جائیں گے قرآن کریم کی یہ پیشگوئی جو مکّہ میں بیکسی کی حالت میں کی گئی تھی مدینہ میں اتنے سال بعد اس صفائی سے پوری ہوتی دیکھ کر صحابہ کے ایمان میں کس قدر ترقی ہوئی ہو گی اور پھر اس ترقی ایمانی کا نتیجہ ہی ان کا فرمانبرداری میں اور بڑھ کر قدم اُٹھانا تھا کسی پیغمبر کی زندگی میں دنیا کے کسی مذہب کی تاریخ میں اتنا بڑا معجزہ جو اپنے ساتھ اس قدر بیّن ثبوت رکھتا ہو تلاش کرنا بیسود ہے۔ آج مسلمان بھی اگر ان واقعات پر غور کریں تو ان کے ایمان بڑھ کر ان کا قدم فرمانبرداری میں اُٹھے اور وہ دین و دنیا کی نعمتوں سے مالا مال ہوں۔

۲۶۴۲ نحب ۔ نَحْبٌ اور نَحِیب اصل میں رونے میں آواز کا بلند کرنا ہے اور عظیم الشان معاملہ کو اور نذر کو اور موت کو بھی نحب کہا جاتا ہے (ل) اور نحب وہ نذر ہے جس کے وجوب کا حکم کیا گیا ہو (غ)
اس آیت میں صحابہ کی کمال وفاداری کا ذکر کیا ہے ۔ گویا اپنی جانوں کو اللہ کی راہ میں دے دینا انہوں نے نذر مانی ہوئی تھی ۔ پس جس شخص نے اللہ کی راہ میں جان دیدی اس نے تو گویا اپنی نذر پوری کر دی اور جو ابھی زندہ ہیں وہ بھی موت کے ان نظاروں کو دیکھ کر بدل نہیں گئے بلکہ وہ اس انتظار میں ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی وہ موقعہ دے کہ اپنی جانیں خدا کی راہ میں دیں ۔ ان دونوں میں فی الحقیقت کوئی فرق نہیں اور یہ جو فرمایا من المؤمنین رجال تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ بعض مومن ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے عہد کر کے پورا نہیں کیا کیونکہ صحابہ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس نے عہد کر کے اسے پورا نہ کیا ہو ۔ یہ اس لیے کہا کہ منافق بھی مومنوں میں ملے ہوئے تھے اور اگلی آیت میں ان کو الگ الگ کر کے اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ المومنین میں قیامت تک آنے والے مومن مراد ہیں اور رجال میں خصوصیت سے صحابہ کرام کی طرف اشارہ ہے ۔

۲۶۴۳ منافقوں کے لیے توبہ کی خبر صاف بتاتی ہے کہ آخر ان میں سے بہت سے لوگ راہ راست پر آ جائیں گے اور ایسا ہی ہوا ۔

۲۶۴۴ کفی اللہ المؤمنین القتال میں بتایا کہ مومنوں کو جنگ کی ضرورت پیش نہ آئی اور اللہ تعالیٰ نے دشمن کی ہزیمت کے لیے اور اسباب پیدا کر دیئے ۔

۲۶۴۵ صیاصی ۔ صِیْصَۃ کی جمع ہے اور یہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے اپنے آپ کو محفوظ کیا جائے اس لیے گائے کے سینگ کو بھی صِیصَۃ کہتے ہیں (غ)

وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿٢٧﴾ ع ۳/۱۹

اور تمھیں ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا وارث بنایا اور ایسی زمین کا (بھی) جس پر تم نے (ابھی) قدم نہیں رکھا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۶۴۶

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿٢٨﴾

اے نبیؐ! اپنی بیویوں سے کہدے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کو چاہتی ہو، تو آؤ، میں تمھیں سامان دوں، اور تمھیں اچھی طرح سے رخصت کردوں۔ ۲۶۴۷

قبائل یہود اور مسلمان: اہل کتاب میں سے یہ کفار کی مدد کرنے والے بنو قریظہ تھے۔ مدینہ میں یہودیوں کی تین قومیں آباد تھیں بنو قینقاع۔ بنو نضیر۔ بنو قریظہ۔ ان تینوں نے شروع میں آنحضرت صلعم سے معاہدہ کیا تھا جس میں یہ وعدہ تھا کہ مدینہ پر کوئی دشمن حملہ آور ہو تو وہ اپنی جان و مال سے اس کا مقابلہ کریں گے۔ مگر بعد میں آپ کی ترقی کو دیکھ کر ان کا حسد ترقی کرتا گیا اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی دشمنی ہوگئی۔ بنو قینقاع ان سب میں چھوٹی قوم تھی پہلے انہی کا جھگڑا مسلمانوں کے ساتھ ہوا آخر اعلان جنگ کر کے یہ قلعہ گزین ہوگئے پندرہ دن تک محاصرہ رہا اس کے بعد رسول اللہ صلعم کے فیصلہ پر راضی ہوگئے آپ نے فرمایا کہ مدینہ چھوڑ دیں چنانچہ یہ شام کے علاقہ میں جا آباد ہوئے۔ یہ جنگ بدر سے ایک ماہ بعد کا واقعہ ہے۔ بنو نضیر نے باوجود معاہدہ کے شروع سے قریش کے ساتھ ساز باز رکھی تھی۔ ایک دفعہ انہوں نے نبی کریم صلعم کو قتل بھی کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کی ان کے کھلے دشمنی کے فعل دیکھ کر رسول اللہ صلعم نے تجدید معاہدہ کے لیے انہیں کہا مگر انہوں نے انکار کیا آخر ان کے ساتھ بھی جنگ کی نوبت پہنچی اور وہ محصور ہوئے۔ تصفیہ اس پر ہوا کہ مدینہ چھوڑ جائیں اور جو مال وغیرہ ساتھ لے جا سکتے ہیں لے جائیں ان کا ایک حصہ خیبر میں جا آباد ہوا۔ جنگ احزاب میں قریش اور قبائل عرب کو اکسانے میں ان لوگوں نے بڑا کام کیا۔ بنو قریظہ کو بھی جو اب تک اپنے عہد پر قائم تھے انہوں نے اُکسایا اور حُیّی ان کے سردار کے سمجھانے پر کہ مسلمان اس جرار لشکر سے جو اُن پر آ رہا ہے اب بچ نہیں سکتے بنو قریظہ بھی آخر مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ مل گئے ان کا مدینہ کے اندر ہو کر قریش کو مدد پہنچانا ظاہر ہے صاف ظاہر ہے بلکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی مستورات پر بھی حملہ کرنا چاہا۔ یہ موقعہ مسلمانوں کے لیے نہایت نازک تھا جب کفار کا لشکر پراگندہ ہوگیا تو نبی کریم صلعم نے بنو قریظہ کی سزا کے لیے فوراً ان کا محاصرہ کیا۔ کوئی پچیس دن تک ان کا محاصرہ رہا آخر انہوں نے درخواست کی کہ سعد بن معاذ جو فیصلہ کریں وہ ہمیں منظور ہے۔ سعد اُن کے حلفا میں سے تھے۔ اگر نبی صلعم کے فیصلہ پر یہ لوگ راضی ہو جاتے تو آپ غالباً اُن سے وہی سلوک کرتے جو پہلے بنو قینقاع اور بنو نضیر سے کیا تھا مگر سعد کو ان کی خطرناک غداری پر بہت رنج تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں تک کو تہ تیغ کرنے کا عزم کر لیا تھا اس لیے انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ ان کے مرد جو جنگ کے قابل ہیں وہ قتل کر دیئے جائیں عورتیں اور بچے قید ہوں۔ یہ وہی فیصلہ تھا جو یہود اپنے دشمنوں کے حق میں عاید کرتے تھے۔ چنانچہ توریت میں ہے کہ جب محاصرہ تک نوبت پہنچ جائے اور "خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں کر دیوے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ اپنے لیے لے" (استثناء ۲۰: ۱۳ و ۱۴) اس لیے نبی کریم صلعم نے اسی فیصلہ کو جو نہ صرف ان کے اپنے پیش کردہ منصف کا تھا بلکہ ان کی اپنی آسمانی کتاب کے مطابق بھی تھا ان کے حق میں عاید کیا اور اختلاف روایات پر تین سو سے لیکر آٹھ سو نو آدمی تک قتل ہوئے۔ اس فیصلہ کی بنا پر رسول اللہ صلعم پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا نہ یہ آپ کا فیصلہ تھا نہ آپ کی شریعت کے مطابق تھا۔ بلکہ یہودیوں کے مقرر کردہ ثالث کا اور انہی کی شریعت کے مطابق فیصلہ تھا۔

۲۶۴۶ عرب سے باہر کی زمینوں کی فتح کی پیشگوئی: وہ زمین جس پر تم نہیں چلے کسی نے کہا مکّہ، کسی نے خیبر، کسی نے فارس و روم (ج) اور ظاہر ہے کہ پہلے دونوں خیال درست نہیں اس لیے کہ مکّہ اور خیبر ایسے مقامات نہیں جہاں مسلمان پہلے چلے نہ ہوں مراد اس سے صاف طور پر وہ دور دراز کے ممالک ہیں جن پر اہل عرب عموماً جاتے بھی نہ تھے۔ اس پیشگوئی کا ایک ایسے وقت میں کرنا جب جنگ احزاب میں قریب تھا کہ مسلمانوں کا نام ونشان مٹ جاتا اس کے منجانب اللہ ہونے کا بین ثبوت ہے ایک طرف دشمن اس کثیر تعداد میں حملہ آور ہوتا ہے کہ جس کے حملہ کو روکنے کی مسلمانوں میں کوئی طاقت نہیں اور دوسری طرف پیشگوئی یہ کی جاتی ہے کہ تم ایسے ملکوں کو فتح کرو گے جن پر تمہارا قدم بھی کبھی نہیں گیا۔

۲۶۴۷ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کے متعلق یہ مضمون یہاں بے تعلق شروع ہو گیا ہے لیکن ایسا نہیں۔ ایک تعلق تو اس مضمون کا یہ بھی ہے کہ اس رکوع میں آنحضرت صلعم کی بیبیوں کے آپ سے سامان دنیوی یعنی اچھے کپڑے زیورات وغیرہ طلب کرنے کا ذکر ہے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ مسلمانوں میں فتوحات سے اور مال غنیمت کے آنے سے کچھ آسودگی آگئی تھی اور نبی کریم صلعم کی بیبیوں نے بھی چاہا کہ ان کو بھی اس آسودگی سے حصہ ملے آپ کے گھروں

وَ اِنۡ كُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ وَ الدَّارَ الۡاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلۡمُحۡسِنٰتِ مِنۡكُنَّ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۲۹﴾

اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کو اور آخرت کے گھر کو چاہتی ہو تو اللہ نے تم میں سے نیکی کرنے والیوں کے لیے بڑا اجر تیار کیا ہے ع٢٦٤٨

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنۡ يَّاۡتِ مِنۡكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفۡ لَهَا الۡعَذَابُ ضِعۡفَيۡنِ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا ﴿۳۰﴾

اے نبی کی عورتو! جو کوئی تم میں سے کھلی بے حیائی کرے اسے دوچند سزا دی جائے گی اور یہ اللہ تعالیٰ پر آسان ہے ع٢٦٤٩

نصف ٢٢

وَ مَنۡ يَّقۡنُتۡ مِنۡكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَ

اور جو کوئی تم میں سے اللہ اور اُس کے رسول کی فرمانبردار ہوگی

میں کوئی سامان نہ تھا بیبیوں کے پاس کوئی قیمتی کپڑے یا قیمتی زیورات نہ تھے گزارہ بھی تنگ تھا یہاں تک کہ بعض وقت فاقے بھی برداشت کرنے پڑتے تھے۔ تو اس لحاظ سے بھی یہ مضمون یہاں آیا ہے لیکن اصل تعلق اس مضمون کا اس سے بھی زیادہ گہرا ہے جنگوں کا ذکر درمیان میں بطور جملہ معترضہ آجاتا ہے۔ پچھلے رکوع میں فرمایا تھا کہ نبی کریم صلعم امت کے لیے اُسوہ حسنہ ہیں اور گو آپ سب حالات میں سے گزرے اور ہر حالت میں انسانوں کے لیے اسوۂ حسنہ بنے مگر وہ امور جو خاص عورتوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ آپ پر وارد نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے اس حصہ میں نبی کی بیبیاں بھی امت کی عورتوں کے لیے نمونہ ہیں۔ مثلاً پردہ کے احکام کی تعمیل میں امہات المومنین تمام مسلمان عورتوں کے لیے نمونہ ہیں یا ان احکام کی تعمیل میں جو عورتوں کے مردوں کے ساتھ سلوک کے متعلق ہیں یا اس بات میں کہ باوجود عورت کے فرائض خانہ داری کو ادا کرنے کے عورتیں کس طرح قومی اور دینی ضروریات میں حصہ لے سکتی ہیں اس کے علاوہ اور کئی امور ہیں جو خصوصیت سے عورتوں سے متعلق ہیں یہی وجہ ہے کہ انہیں اُمت کی مائیں بھی قرار دیا ہے یعنی امت کی روحانی تربیت کا ایک حصہ ان کے بھی سپرد تھا جس میں علاوہ اس خاص حصہ کے اور بھی بہت سے امور تھے جو نبی صلعم کو گھر کے اندر پیش آتے تھے اور جن کا تعلق ہر مسلمان مرد اور عورت سے تھا اسلیئے اس رکوع میں ان کو انکا یہ منصب یاد دلایا ہے۔ آسودگی سے زندگی بسر کرنا خلاف شریعت نہیں نہ مردوں کے لیے نہ عورتوں کے لیے، لیکن جس طرح مردوں کے لیے نبی کریم صلعم کا نمونہ سادگی کا تھا اسی طرح ضروری تھا کہ عورتوں کے لیے آپ کی بیبیوں کا نمونہ سادگی کا ہوتا۔ ورنہ سادگی کی جو تعلیم اسلام نے دی تھی اور جس کا نمونہ آنحضرت صلعم نے دکھایا تھا وہ بیکار رہ جاتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بہت سے اخلاق فاضلہ نسل انسانی کے اندر عورتوں سے آتے ہیں وہ لوگ جھوٹے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو عزت نہیں دی اس سے بڑھ کر کیا عزت ہوگی کہ ایک حصہ میں انہیں اخلاق اور روحانیت کا معلّم قرار دیا۔ اس اصول کو ابتدائی مسلمانوں نے خوب سمجھا تھا ورنہ ہزار ہا باتیں وہ عائشہ صدیقہؓ اور دیگر ازواج سے سیکھنے کے لیے کیوں جاتے۔ غرض جب ان پاک بیبیوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کی تکلیفات زندگی کسی قدر کم ہوں اور وہ بھی کسی قدر آسودگی کی زندگی بسر کریں اور دنیا کا کچھ مال ان کے گھروں میں بھی آئے تو حکم ہوا کہ اس سے تمہارے نبی کی بیبیاں ہونے کی اصل غرض ہی مفقود ہوتی ہے اس لیے اگر دنیا کی زینت کے سامان چاہتی ہو تو وہ سامان دیکر تمہیں رخصت کر دیا جائے گا۔ اور اگر تم رسول کے گھر میں رہنا چاہتی ہو اور اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کے گھر کو اصل غرض بنانا چاہتی ہو تو پھر انہیں تکلیفات کے اندر زندگی بسر کرنی ہوگی تاکہ تمہارے نیک نمونہ سے دوسروں کو فائدہ پہنچے اور اس بات کا خصوصیت سے ذکر اس لیے بھی کیا کہ بی بی کا مطالبہ خاوند پر زیورات اور کپڑوں کے لیے سب سے زیادہ گھروں میں تکلیف کا موجب ہوتا ہے اور سب سے بڑا سبق مسلمان بیبیوں کو یہی دینا تھا کہ وہ اپنے خاوندوں سے ایسے مطالبات نہ کریں جو اُن کے لیے تکلیف کا موجب ہوں ہاں اگر کسی کو خود مل جائے تو بیشک اس سے فائدہ اٹھائے انہی مطالبات نے یورپ کے بیشتر مردوں کو شادی سے متنفر کرکے زناکاری کو مروج کر دیا ہے۔

ع٢٦٤٨ بخاری میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں جن میں بیبیوں کو رسول کے گھر میں رہنے یا طلاق لینے کا اختیار دیا گیا تو آپ نے مجھ سے ابتدا کی اور فرمایا کہ میں ایک بات تم سے کہتا ہوں مگر اس کے جواب میں جلدی نہ کرنا بلکہ اپنے ماں باپ سے مشورہ کر لینا۔ تب آپ نے یہ آیتیں پڑھیں تو میں نے کہا میں ماں باپ سے کس بات کا مشورہ کروں میں اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کو چاہتی ہوں۔ تب آپ نے باقی بیبیوں سے بھی اسی طرح دریافت کیا اور سب نے وہی جواب دیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے یہ جواب دیکر آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ میرے اس جواب کی اطلاع دوسری بیبیوں کو نہ دینا۔ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے اس لیے نہیں بھیجا کہ لوگوں کو تکلیف میں ڈالوں بلکہ مجھے معلم اور مبشر بنا کر بھیجا ہے اگر مجھ سے کوئی بی بی دریافت کرے گی تو میں بتا دونگا اور یہ واقعہ تخییر کے واقعہ سے تعلق رکھتا ہے یعنی جب نبی کریم صلعم ایک ماہ کے لیے اپنی بیبیوں سے علیحدہ ہو گئے تھے اور یہ ۹ھ کا واقعہ ہے۔

ع٢٦٤٩ فاحشة مبينة سے یہاں مراد بعض نے نبی صلعم کی نافرمانی لی ہے اور بعض نے وہ امور جو آپ کی تکلیف اور حزن کا موجب ہوں (ر) اور اس سے مراد نشوز اور سوء خُلق بھی ہوتے ہیں دیکھو ع٦٢٩ اور زنا یہاں مراد نہیں کیونکہ نبی کریم صلعم کی عصمت آپ کو اس سے بلند ٹھہراتی ہے کہ آپ کی بیبیوں سے ایسے امر کا ارتکاب ہوا اور بعض نے بطور فرضیت اس کو جائز رکھا ہے اور ایسی حالت میں دوچند عذاب اس لیے کہا کہ وہ تو دوسروں کے لیے نمونہ ہیں۔

تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾ وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾

اور اچھے عمل کرے گی ہم اس کا اجر اُسے دوچند دیں گے اور ہم نے اس کے لیے عزّت والا رزق تیار کیا ہے۔ اے نبیؐ کی عورتو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم تقوٰے اختیار کرو ــــ سو نرم آواز میں بات نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ وہ جس کے دل میں بیماری ہو طمع کرے اور نیکی کی بات کہو ع۲۶۵۰ اور اپنے گھروں میں ٹھیری رہو اور پہلی جاہلیت کی طرح بناؤ سنگار نہ دکھاتی پھرو ع۲۶۵۱ اور نماز کو قائم کرو، اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے اے اہل بیت ناپاکی کو دُور کردے اور تمھیں بالکل پاک صاف کردے ع۲۶۵۲

ع۲۶۵۰ ان اتقیتنّ - نفی مثلیت کے لیے شرط ہے یعنی اگر تقوٰی کرو تو تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں۔ اور تقوٰی سے مراد یہاں ان ذمہ داریوں کا مدنظر رکھنا ہے جو ان کے اس منصب کے لحاظ سے کہ وہ نبی کی بیبیاں ہیں ان پر عاید ہوتی ہیں اور بعض نے اتقیتنّ بمعنی استقبلن لے کر اسے اگلے حصّہ کے متعلق کیا ہے یعنی اگر تمھارے سامنے کوئی شخص آجائے (ر) اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ اگر تم (تہمت وغیرہ سے) بچنا چاہتی ہو تو بات میں بھی ملائمت اختیار نہ کرو۔ اور خضع بالقول کے لیے دیکھو ع۲۴۰۳ اور عورتوں کی طرز کلام میں عموماً نرمی اور ملائمت ہوتی ہے مگر چونکہ ان کا منصب تعلیم دینا تھا اور اس کے لیے ہر قسم کے لوگوں کا ان کے پاس آنا ضروری تھا۔ اس لیے فرمایا کہ طرز کلام ایسی نہ ہو کہ ایسے شخص کے دل میں جو بدخیالات اپنے اندر رکھتا ہے (اور مرض سے یہاں یہی مراد ہے) طمع پیدا ہو اور قلن قولا معروفا میں پھر انہیں ان کے اصل کام کی طرف توجہ دلائی یعنی نیکی کی باتیں لوگوں کو پہنچانا اور یہاں گو حکم نبی صلعم کی بیبیوں کو ہے مگر چونکہ وہ دوسری عورتوں کے لیے نمونہ ہیں اس لیے دوسری عورتوں کو بھی ضمناً حکم ہے کہ جب انہیں غیر محرم مردوں سے کلام کرنا پڑے تو ایسی آواز سے کلام نہ کریں جو دوسروں کے کشش کا موجب ہو بلکہ مردانہ انداز کلام اختیار کریں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کا اجنبی مردوں سے کلام کرنا منع نہیں۔

ع۲۶۵۱ قرن - اصل میں اقررن ہے اور قَرّ کے لیے دیکھو ع۹۶۰۔

تبرج کے لیے دیکھو ع۲۳۴۷ اور بخاری میں ہے التَّبَرُّجُ اَنْ تُخْرِجَ مَحَاسِنَهَا یعنی تبرج کے معنی ہیں اپنا بناؤ سنگار دکھانا۔

الجاھلیۃ الاولیٰ۔ جاھلیۃ کے لیے دیکھو ع۵۴۶ اور مراد اس سے قبل اسلام زمانہ ہے اور اسے اولیٰ اس لیے کہا کہ ہر متقدم اوّل اور اولیٰ ہے۔

جاہلیت میں عورتوں کا بن سنور کر باہر نکلنا عام طور پر مروج تھا اور وہ بہت باریک لباس پہن کر نکلتی تھیں یا بعض حصّے جسم کے کھلے رکھ کر نکلتی تھیں تاکہ مردوں کو اپنی طرف مائل کریں جس طرح آج یورپین عورتیں نکلتی ہیں پس گھروں میں ٹھہرا رہنے اور بناؤ سنگار نہ دکھانے کو ایک جگہ جمع کرنے کا یہی مطلب ہے کہ اس غرض کے لیے باہر نہ نکلو۔ حاجات ضروری کے لیے باہر نکلنے سے منع نہیں کیا گیا، بلکہ حدیث صحیح میں ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی کریم صلعم نے اپنی بیبیوں کو فرمایا اذن لکن ان تخرجن لحاجتکن (ر) یعنی تمہیں اجازت ہے کہ اپنی حاجت کے لیے باہر نکلو اور عورتوں کا جنگوں میں جانا اور اپنی دیگر ضروریات کے لیے باہر نکلنا مسجدوں میں جانا بہت حدیثوں سے ثابت ہے حتیٰ کہ رسول اللہ صلعم خود اپنی بیبیوں کو جنگوں وغیرہ میں ساتھ لے جاتے تھے اور جن لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے واقعہ جمل میں باہر نکلنے پر اعتراض کیا ہے انہوں نے سخت غلطی کھائی ہے آپ ایک عظیم الشان فتنہ کی اصلاح کے لیے باہر نکلیں اور کسی صحیح غرض کے لیے عورت کا باہر نکلنا ممنوع نہیں ہاں اپنا بناؤ سنگار غیر مردوں کو دکھانا ممنوع ہے قرن فی بیوتکن کے یہ معنی لینا کہ عورتیں گھروں کی چار دیواری میں قید رہیں اور کبھی باہر نہ نکلیں نبی کریم اور صحابہ کے عمل کے سراسر خلاف ہے۔

ع۲۶۵۲ اھل البیت۔ اھل کے لیے دیکھو ع۱۳۷۱ اھل البیت وہ ہونگے جن کو ایک گھر جمع کرے اور گھر میاں بی بی اور بچوں کو جمع کرتا ہے پس ایک شخص کے اہل بیت بی بی اور بچے ہیں اور لسان العرب میں ہے کہ اہل بیت نبوی سے مراد آپ کی بیبیاں اور آپ کی بیٹیاں اور آپ کا داماد ہیں اور ایک قول ہے کہ آپ کی بیبیاں مراد ہیں اور تمام وہ لوگ جو آپ کی آل ہیں اور داماد کی شمولیت بظاہر دقّت طلب ہے اس لیے کہ خسر اور داماد ایک گھر کے رہنے والے نہیں ہوتے۔

یہاں اہل بیت سے کیا مراد ہے؟ بعض روایات کی بنا پر یہ سمجھا گیا ہے کہ اہل بیت میں بیبیاں شامل نہیں اور مراد اس سے حضرت فاطمہؓ اور علیؓ اور

وَ اذۡکُرۡنَ مَا یُتۡلٰی فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ مِنۡ	اور اسے یاد رکھو جو تمہارے گھروں میں اللہ کی آیتوں
اٰیٰتِ اللّٰہِ وَ الۡحِکۡمَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ	اور حکمت سے پڑھا جاتا ہے ، اللہ تعالیٰ باریک باتوں کا
لَطِیۡفًا خَبِیۡرًا ﴿۳۴﴾ ع	جاننے والا خبردار ہے ۲۶۵۳
اِنَّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَ الۡمُسۡلِمٰتِ وَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ	مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن
وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَ الۡقٰنِتِیۡنَ وَ الۡقٰنِتٰتِ وَ	مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرماں بردار

حسنؓ اور حسینؓ ہیں کچھ روایات اس کے متعلق حضرت ام سلمہ سے ہیں کہ وہ فرماتی ہیں کہ یہ آیت میرے گھر میں نبی صلعم پر نازل ہوئی اور حضرت فاطمہؓ اور علیؓ اور حسنؓ اور حسینؓ وہاں آئے اور رسول صلعم نے ان کو ایک چادر کے نیچے لیکر دعا کی کہ یہ میرے اہل بیت ہیں انہیں پاک کر اور جب حضرت ام سلمہؓ نے درخواست کی کہ انہیں بھی شامل کیا جائے تو آپ نے فرمایا کہ تم ازواج میں سے ہو۔ اور واثلۃ ابن الاسقع سے روایت ہے کہ یہ آیت حضرت فاطمہؓ کے گھر میں رسول اللہ صلعم پر نازل ہوئی اور وہاں حضرت علیؓ اور حسنؓ اور حسینؓ اور فاطمہؓ کو لیکر دعا کی اور بعض اور بھی روایات ہیں ان کے مقابل حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ یہ آیت خصوصیت سے نبی صلعم کی بیبیوں کے بارہ میں نازل ہوئی اور یہی عکرمہ کا قول ہے (ث) لیکن اگر ہم خود قرآن کریم پر غور کریں تو بات صاف ہو جاتی ہے یہاں ساری وہ ہدایات جو موجب تطہیر ہو سکتی ہیں یعنی زینت دنیوی کا ترک کرنا اللہ اور رسول کی اطاعت ، امر بالمعروف ، گھروں میں ٹھہرنا ، محاسن کی نمائش نہ کرنا ، نماز کا قائم کرنا وغیرہ سب بیبیوں کے لیے ہیں اور اس ٹکڑے سے پہلے بھی انہی کا ذکر ہے اور بعد میں بھی انہی کا واذکرن مایتلی تو یہ سیاق اس خیال کو رد کرتا ہے کہ یہاں مراد بیبیاں نہیں۔ پھر لغت کی رو سے اہل بیت کا لفظ اوّل بی بی پر آئیگا اور ثانیاً اولاد پر، اور قرآن کریم میں خود بی بی پر یہ لفظ بولا گیا ہے دیکھو ھود ۱۱-۷۳۔ رحمت اللہ و برکتہ علیکم اھل البیت جہاں اہل بیت سے مراد حضرت ابراہیمؑ کی بی بی ہیں اور یہ خیال کہ لیذھب عنکم اور لیطہرکم میں ضمیر مذکر ہے اس لیے بیبیاں مراد نہیں۔ نہایت ہی بودا ہے ضمیر بلحاظ لفظ مذکر ہے جیسے حضرت ابراہیم کی بی بی کے لیے فرمایا برکتہ علیکم اھل البیت۔ ہاں وہ احادیث جن میں حضرت فاطمہ اور حسنین اور حضرت علی کا ذکر ہے اس معنی میں صحیح ہو سکتی ہیں کہ آنحضرت صلعم نے اپنی بیٹی اور اس کے ساتھ اس بیٹی کی اولاد اور خاوند کے لیے بھی دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی اس آیت کا مصداق کرے اور انہیں بھی رجس سے پاک کردے اور ایسی وسعت لفظ کے معنی میں بالکل جائز اور صحیح ہے اور بعض روایات میں جو اس قسم کے الفاظ آتے ہیں کہ حضرت ام سلمہؓ کے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا کہ انک الی خیر انت من ازواج النبی تو بھلائی کی طرف ہے کیونکہ تو نبی کی بیبیوں سے ہے تو یہ بھی اسی نتیجہ کی مؤید ہے، یعنی آپ کا مطلب یہ تھا کہ تم تو پہلے ہی اس آیت کی مصداق ہو اور اہل بیت کے لفظ کو اور وسعت دیکر امت کے برگزیدہ لوگ بھی اس میں شامل ہو سکتے ہیں جیسا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ سلمان ہم اہل بیت میں سے ہیں اور جیسا کہ خود واثلہ کی حدیث میں ہے کہ میں نے دریافت کیا یا رسول اللہ کیا میں بھی آپ کے اہل میں سے ہوں تو آپ نے فرمایا انت من اھلی بہرحال اول مصداق اس آیت کی ازواج مطہرات ہیں اور ثانیاً اس میں آنحضرت صلعم نے اپنی صاحبزادی اور ان کے خاوند اور فرزندوں کو بھی داخل کیا اور ثالثاً امّت کے برگزیدہ لوگ اس میں شامل ہیں اور تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات نے اپنے آپ کو اس آیت کریمہ کا مصداق ثابت کیا۔ کیونکہ سب سے بڑی ناپاکی دنیا کے مال کی محبّت ہے اسی سے طرح طرح کی بدیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہی مال کی محبت ہی دل میں خدا کی محبّت کی جگہ لے لیتی ہے اور نبی کریم صلعم کی بیبیوں کے متعلق جس بات کا یہاں ذکر ہے وہ یہی تھی کہ انہوں نے مال کا مطالبہ کیا تھا پس اصل مقصد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ ہے کہ اس رجس اور اس کے ساتھ ہر قسم کی برائیوں سے اہل بیت نبوی کو پاک کرکے انہیں امہات امت صحیح معنی میں بنائے تاکہ وہ بھی رسول کے ساتھ امّت کی روحانی پرورش کرنے والیاں اور امّت کے لیے نمونہ ہوں۔ یہی ارادۂ الٰہی تھا کہ جب بیبیوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ دنیا کا مال لیکر نبی صلعم سے علیحدہ ہو جائیں تو انہوں نے مال دنیا پر لات ماری اور غربت اور فاقہ میں نبی صلعم کی رفاقت اختیار کی اور تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم کی بیبیوں کے دل میں مال دنیا کی ایک تنکے کے برابر بھی وقعت نہ تھی خلفائے وقت جب ان کے پاس کچھ مال بھیجتے تو وہ فوراً اسے اللہ کی راہ میں دیدیتیں اور حضرت عائشہ کے متعلق یہاں تک ثابت ہے کہ بعض وقت رات کے لیے بھی انہوں نے اپنے گھر میں کچھ نہیں رکھا اور سب کا سب اللہ کی راہ میں دیدیا۔ آج مسلمان بیبیاں اگر ازواج مطہرات کے نمونہ پر عامل ہوں تو مسلمانوں کی حالت دنوں میں پلٹ سکتی ہے۔

۲۶۵۳ حکمۃ۔ دیکھو ع۱۶۴ و ع۳۲۱ اور یہاں مراد فہم قرآن ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا یعنی سنت نبوی خواہ حدیث کے رنگ میں آپ کے اقوال میں ظاہر ہوئی ہو یا اخلاق کے رنگ میں یا آپ کے افعال میں اور قتادہ سے اس کے معنی ابن جریر نے سنت ہی روایت کیے ہیں اور خود بھی یہی معنی قبول کیے ہیں ما اوحی الی رسول اللہ صلعم من احکام دین اللہ ولم ینزل بہ القراٰن وذٰلک السنۃ (ج) اور حکمت کے معنی سنت بخاری میں بھی مروی ہیں اس کی تفسیر سنت سے بھی کی گئی ہے اور ان نصائح سے بھی جو رسول اللہ صلعم نے فرمائے (د) اور یتلی کا لفظ اس کے خلاف نہیں اس لیے کہ تلا کے معنی پیروی کے بھی آتے ہیں۔

الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ
وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ
الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِيْنَ
وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ
وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا
وَّ الذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً
وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

عورتیں اور صدق دکھانے والے مرد اور صدق دکھانیوالی عورتیں اور صبر کرنیوالے مرد اور صبر کرنیوالی عورتیں اور فروتنی کرنیوالے مرد اور فروتنی کرنیوالی عورتیں اور خیرات کرنیوالے مرد اور خیرات کرنیوالی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنیوالے مرد اور حفاظت کرنیوالی عورتیں اور اللہ کو بہت یاد کرنیوالے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان کے اللہ نے مغفرت اور بڑا اجر تیار کیا ہے ۲۶۵۴ع

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ
اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ
يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ
وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ
ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ ﴿۳۶﴾

اور نہ یہ کسی مومن مرد نہ کسی مومن عورت کو شایاں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے تو وہ اِس معاملہ میں کچھ (اپنا) اختیار سمجھیں۔ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ کھُلی گمراہی میں دور نکل گیا ۲۶۵۵ع

رکوع کی اس آخری آیت میں کھول کر بتایا کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ وہ اُمہات المومنین ہیں اور معمولی عورتوں کی طرح نہیں کہ ان پر کچھ حقوق خاوند یا اولاد کے ہوں تو یہ غرض کس طرح پوری ہو سکتی ہے۔ اس لیے یہاں انہیں ان کا وہ خاص کام بتایا گیا اور وہ آیات اللہ اور اقوال وافعال نبوی کا محفوظ رکھنا تھا اور محفوظ رکھنے کی یہی غرض تھی کہ اسے لوگوں کو پہنچایا جائے اور وہ لوگوں کے لیے ہدایت اور نور کا موجب ہو، یہ وہ پاک غرض تھی جس کے لیے نبی صلعم کی بیبیاں آپ کے گھر میں تھیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ مدنی زمانہ میں شرائع کی تفاصیل اور مختلف قسم کے امور اس قدر تھے کہ اکیلی بی بی اسے محفوظ نہ رکھ سکتی تھی تعدد ازواج کی اور بھی وجوہات ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

۲۶۵۴ع یہاں ان تمام اعلیٰ صفات میں جو اللہ کے نزدیک مردوں کو بلند مرتبہ پر پہنچاتی ہیں عورتوں کو شریک کر کے یہ بتایا ہے کہ عورتیں اللہ کے ہاں مقامات عالیہ حاصل کرنے میں مردوں سے کسی طرح کم نہیں اسی لیے آخر پر مغفرت اور اجر عظیم کا ذکر کیا ہے اور مغفرت سے مراد یہاں حفاظت الٰہی ہی ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ جس اجر کے مرد مستحق ہیں اسی کی مستحق عورتیں بھی ہیں۔ چونکہ پچھلے رکوع میں ازواج رسول کا ذکر تھا اس لیے ایک تو اس مناسبت سے یہاں عورتوں کا ذکر مردوں کے ساتھ کیا ہے اور دوسرے اس مناسبت سے کہ صرف ازواج رسول کے لیے مقامات عالیہ مخصوص نہیں کیونکہ وہاں فرمایا تھا لستن کاحد من النساء بلکہ سب عورتیں انہی بلند مقامات کو حاصل کر سکتی ہیں تعجب ان لوگوں پر ہے جو باوجود قرآن کریم کی ایسی صریح تعلیم کے جس کی رو سے عورتیں مقامات عالیہ کے حاصل کرنے میں مردوں کی ہمپایہ قرار دی گئی ہیں یہ راگ الاپتے ہیں کہ اسلام نے عورت کی عزت نہیں کی اور اسلام کی تعلیم کی رو سے عورت میں روح ہی نہیں۔

۲۶۵۵ع اس آیت کے بارہ میں حضرت ابن عباس قتادہ مجاہد وغیرہم سے مروی ہے کہ یہ زینب بنت جحش یعنی رسول اللہ صلعم کی پھوپھی امیمہ کی بیٹی اور اس کے بھائی عبداللہ کے معاملہ میں نازل ہوئی رسول اللہ نے زینب کے زید سے نکاح کے لیے درخواست کی تو زینب نے انکار کر دیا اور اپنے خاندانی شرف کو پیش کیا اور ایک آزاد کردہ غلام سے نکاح پر راضی نہ ہوئی اور اس کے بھائی نے اس کی تائید کی (ج۔د) چونکہ اسلام کی غرض ان تفریقات کو مٹانا تھا اور سب مسلمانوں کو خواہ وہ کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں ایک کرنا تھا اس لیے یہ آیت نازل ہوئی۔ یوں ہر ایک مسلمان کو اختیار ہے کہ وہ جہاں چاہے اپنی لڑکی کا نکاح کرے لیکن چونکہ اس انکار سے اسلام میں تفریق پیدا ہوتی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح فرمائی اور اس آیت کے نزول پر زینب اور اس کا بھائی رضامند ہو گئے۔ پس یہ اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ہے کہ مسلمان ایسے تعلقات میں خاندانی اور قومی تفریقات پیدا نہ کریں۔ زید گو آزاد کردہ غلام تھا مگر بلحاظ شرافت اخلاقی کے وہ قریش سے کم نہ تھا اور جب ایک عورت نے خاندانی شرافت کو اخلاقی شرافت پر ترجیح دی تو اسے اللہ تعالیٰ نے ناپسند فرمایا۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے ہر ایک خیال کو قرآن کریم کے سامنے قربان کرتے تھے۔ آج کتنے مسلمان ہیں جو قومی اور خاندانی شرف کے خیال کو قرآن کریم کی تعلیم کے سامنے قربان کرنے والے ہیں اور یہاں لفظ عام اختیار فرمائے ہیں تاکہ تمام حالات پر حاوی ہو سکیں اور صرف ایک واقعہ پر محدود نہ ہوں۔

وَاِذۡ تَقُوۡلُ لِلَّذِیۡۤ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِ اَمۡسِكۡ عَلَیۡكَ زَوۡجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِكَ مَا اللّٰهُ مُبۡدِیۡهِ وَ تَخۡشَی النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰی زَیۡدٌ مِّنۡهَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰکَهَا لِکَیۡ لَا یَکُوۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ حَرَجٌ فِیۡۤ اَزۡوَاجِ اَدۡعِیَآئِهِمۡ اِذَا قَضَوۡا مِنۡهُنَّ وَطَرًا ؕ وَ کَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا ﴿۳۷﴾

اور جب تُو اسے جس پر اللہ نے انعام کیا اور جس پر تو نے انعام کیا، کہتا تھا اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دے اور اللہ کا تقویٰ کر اور تو اپنے دل میں وہ بات چھپاتا ہے جسے اللہ ظاہر کرنے والا ہے اور تُو لوگوں سے ڈرتا ہے اور اللہ تعالیٰ زیادہ حقدار ہے کہ تو اس سے ڈرے۔ پھر جب زیدؓ نے اس سے قطع تعلّق کر لیا تو ہم نے اُسے تیرے نکاح میں دیدیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ رہے جب وہ اُن سے قطع تعلق کر لیں۔ اور اللہ کا حکم ہو کر رہتا ہے۔ ۲۶۵۶

۲۶۵۶ے وطر بڑی حاجت کو کہتے ہیں (غ) پس قضائے وطر کے معنی حاجت کا پورا کر لینا ہوئے اور یہاں مراد اس سے قطع تعلق یا طلاق ہے۔
الذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ سے مراد زید ہیں جیسا کہ آگے خود بتا دیا۔ زید بن حارثہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ قید ہو گئے اور حضرت خدیجہؓ کے ہاتھ بطور غلام فروخت ہوئے جب رسول اللہ صلعم کا نکاح حضرت خدیجہؓ سے ہوا تو انہوں نے یہ غلام آپ کو دیدیا اس اثنا میں زید کو شام کی طرف سفر پیش آیا اور وہاں ان کے چچا نے انہیں پہچان لیا اور سب حالات دریافت کر کے ان کا والد اور چچا اور بھائی رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معاوضہ دیکر اسے لینا چاہا۔ آپ نے فرمایا میں اسے اختیار دیتا ہوں وہ اگر چاہے تو تمہارے ساتھ چلا جائے میں معاوضہ کچھ نہیں لیتا۔ زید کو جب یہ کہا گیا تو اس نے کہا کہ میں آپ پر کسی کو ترجیح نہیں دیتا اور میرے لیے آپ باپ اور چچا سے بڑھ کر ہیں تب آپ نے اسے آزاد کر دیا انعمت علیہ میں اسی کی طرف اشارہ ہے اور انعم اللہ علیہ سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اسلام کے ذریعہ بڑا بلند مرتبہ عطا فرمایا۔ ان کے حضرت زینب سے نکاح کا ذکر پچھلے نوٹ میں ہو چکا ہے یہاں طلاق کا ذکر ہے۔ امسك علیك زوجك سے صاف پایا جاتا ہے کہ زید زینب کو طلاق دینا چاہتے تھے اور نبی کریم صلعم روکتے تھے آیا اس معاملہ میں قصور زینب کا تھا یا زید کا۔ اگر زینب کا قصور ہوتا تو نبی صلعم زید کو طلاق سے نہ روکتے یہی اتق اللہ سے معلوم ہوتا ہے اور الفاظ تخفی فی نفسك ما اللہ مبدیه وتخشی الناس واللہ احق ان تخشٰه میں گو عام طور پر خطاب آنحضرت صلعم کی طرف لیا گیا ہے اگر یہی صحیح ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت صلعم نہ چاہتے تھے کہ جس عورت کا نکاح ایک آیت قرآنی کے نزول پر ہوا ہے اب ناچاقی ہو کر وہاں طلاق واقع ہو جس پر معترض طرح طرح کی باتیں بنائیں اور یہی آپ کا لوگوں سے ڈرنا تھا یعنی آپ فی الحقیقت لوگوں سے نہ ڈرتے تھے بلکہ لوگوں کے ابتلا میں پڑنے سے ڈرتے تھے اور یا ہو سکتا ہے کہ جب آپ نے زید کی غلطی کو محسوس کیا ہو اور دیکھا ہو کہ اسے طلاق دینے سے نہیں روکا جا سکتا تو چونکہ آپ نے نکاح خود زور دے کر کرایا تھا اور زینب اس معاملہ میں بالکل بے قصور تھیں اس لیے آپ نے ان کے رنج کا ازالہ اسی میں سمجھا کہ خود زینب سے نکاح کر لیں اور یہ منشا زینب اور اُن کے بھائی کا پیشتر سے تھا کہ نبی صلعم خود اُن سے شادی کر لیں مگر اس وقت آپ نے پسند نہ کیا اور زید سے اس کا نکاح کرا دیا تو آپ کو یہ خوف ہوا کہ زید کو لوگ آپ کا بیٹا کہتے ہیں اور یہ امر لوگوں کے لیے ابتلا کا موجب ہوگا۔ لیکن انہی الفاظ وتخفی فی نفسك ما اللہ مبدیه وتخشی الناس واللہ احق ان تخشٰه کے متعلق ایک اور قول بھی تفاسیر میں ہے کہ ان میں پہلے الفاظ امسك علیك زوجك واتق اللہ کی طرح خطاب زید کو ہے۔ اور اس قسم کی ترکیب کی صحت کی مثالیں بھی دی گئی ہیں (ر) اور بظاہر کلام میں تسلسل بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گو تخشی الناس کی یہ تاویل درست ہے کہ آپ لوگوں کے ابتلا میں پڑنے سے ڈرتے تھے تاہم آگے رسولوں کے متعلق جو الفاظ آتے ہیں ولا یخشون احدا الا اللہ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ زید کے متعلق ہی ہیں۔ البتہ یہ سوال ہوتا ہے کہ وہ کیا بات تھی جسے زید چھپاتے تھے اور لوگوں سے ان کو کیا خوف تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ زید طلاق دینا چاہتے تھے اور یہ بھی دکھایا جا چکا ہے کہ طلاق دینے میں اگر کوئی قصور تھا تو ان کا تھا نہ حضرت زینب کا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت زینب کو ایک شرف حاصل تھا وہ رسول اللہ صلعم کی پھوپھی کی بیٹی تھیں اور معزز سے معزز گھرانے کی بی بی تھیں زید نہ صرف ایسے معزز خاندان سے نہ تھے بلکہ غلامی کے داغ کے نیچے بھی رہ چکے تھے۔ ان کو زینب کی حرکات و سکنات سے یہ خیال گزرتا ہوگا کہ یہ اپنی بڑائی چاہتی ہیں جب بی بی بڑے خاندان کی ہو اور خاوند کی حیثیت ادنیٰ ہو تو خواہ بی بی کی طرف سے کوئی امر اس کی عزت کے خلاف نہ ہو مگر بی بی کے مرتبہ بلند کی وجہ سے اسے ہمیشہ ایسا خیال رہتا ہے کہ وہ اپنی عزت چاہتی ہے اور اس لیے وہ اس کی مناسب عزت نہیں کرتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ زید اور زینب کے معاملہ نے یہی صورت اختیار کر لی تھی۔ کیونکہ اس کے خلاف صرف یہی فرض کیا جا سکتا ہے کہ زینب واقعی ان سے بدسلوکی کرتی ہوں اور قصور ان کا ہو مگر اس کی تردید قرآن کریم کے صریح الفاظ اتق اللہ سے

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ ۚ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا ﴿٣٨﴾

نبیؐ پر اس کے بارے میں کوئی مضائقہ نہیں جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ان کے بارے میں ہے جو پہلے گزر چکے۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ایک اندازہ ہے جو ٹھیرایا جا چکا ہے ۲۶۵۷

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ

وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے

ہوتی ہے جو قصور زید کا بتاتے ہیں پس جو بات زید دل میں چھپاتے تھے وہ یہی زینب کے مقام بلند اور عظمت کا خیال تھا اور اللہ اسے ظاہر کرنیوالا تھا اس لیے کہ ان کو اس سے بڑھ کر مقام ملنے والا تھا یعنی نبی کریم صلعم کی بیبیوں میں داخل ہونے کا شرف۔ اور تخشی الناس میں بھی یہی اشارہ ہے یعنی زید زینب کی عزت کرنے میں اس بات سے ڈرتے تھے کہ لوگ کہیں گے یہ عورت کی اتنی عزت کرتا ہے واللہ احق ان تخشٰہ حالانکہ حق یہ تھا کہ انہیں لوگوں کی باتوں کی پروا کیے بغیر جو حقوق بی بی کے ان کے ذمّے تھے انہیں مناسب طریق پر ادا کرنا چاہیئے تھا۔

آنحضرتؐ کے زینب سے نکاح کی وجوہات: زید کے طلاق دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلعم کو زینب سے نکاح کا حکم دیا اور یہی وہ بات ہے جسے یہاں زوجنٰکھا کہا ہے ورنہ یہ مطلب نہیں کہ حضرت زینب سے آپ کا نکاح کسی الگ طرز پر ہوا تھا اس نکاح کی ایک غرض تو وہی تھی جسے یہاں بیان کیا ہے کہ منہ بولے بیٹے کی بی بی طلاق یا وفات کے بعد محرمات میں شمار نہ ہو جیسا عرب میں رواج تھا اور جب تک رسول اللہ صلعم خود اس رسم کو اپنے عمل سے دُور نہ کرتے اس کا دور ہونا مشکل تھا بعض باتوں کے خلاف قومی میلان ایسا ہوتا ہے کہ جب تک کسی بڑے آدمی کو اس کے خلاف کام کرتا نہ دیکھا جائے تعصّب دور نہیں ہوتا۔ لیکن دوسری بڑی بات یہ تھی کہ نبی صلعم کی ازواج میں جس قدر بیبیاں تھیں وہ سب سوائے حضرت عائشہؓ کے بیوہ تھیں لیکن چونکہ آپ کی زندگی میں ہر قسم کے نمونے ہونے ضروری تھے اور منجملہ اور باتوں کے طلاق کے واقعات کا پیش آنا لابدی تھا اور مطلقہ عورت کے نام پر عموماً ایک داغ سا لگ جاتا ہے اس لیے آپ کو یہ حکم ہوا کہ ایک مطلقہ عورت سے نکاح کرکے یہ بھی اُمت کے لیے نمونہ قائم کریں کہ طلاق حالات انسانی میں بعض وقت عورت کے قصور کے بغیر ناموافقت حالات سے پیش آجاتی ہے اور مطلقہ عورت سے نکاح کرنا کوئی عیب کی بات نہیں۔ علاوہ ان دو باتوں کے ایک یہ بھی ضرورت تھی کہ زینب کا نکاح آنحضرت صلعم نے خود زید سے کرایا تھا اور اب جو ایسی طلاق سے جس میں وہ بے قصور تھیں انہیں صدمہ پہنچا اس کا ازالہ سوائے اس کے نہ ہو سکتا تھا کہ جیسا کہ ابتدا میں زینب اور ان کے بھائی کا منشا تھا آنحضرت صلعم خود انہیں اپنے نکاح میں لاتے۔

آنحضرت کے زینب سے نکاح کے متعلق جھوٹے قصّے: اور جو ایک لغو قصّہ یہاں پر بعض مفسرین نے حسب عادت بلا تحقیق لکھ دیا ہے کہ زید نے طلاق اس لیے دی تھی کہ آنحضرت صلعم کا ارادہ زینب سے نکاح کا ہو گیا تھا۔ اور بعض نے اس پر اور بھی لغو تفصیلات بڑھائی ہیں کہ نبی کریم صلعم زید کی غیر حاضری میں آئے تھے تو آپ نے زینب کو بیٹھے ہوئے دیکھا اور زید کو خیال ہوا کہ آپ زینب کو چاہتے ہیں تو اس نے طلاق دینے کا ارادہ کیا۔ ان تمام بیہودہ قصّوں کو قرآن کریم کے صریح الفاظ اور واقعات تاریخی باطل کرتے ہیں۔ بھلا اگر نبی صلعم کا منشاء خود نکاح کا ہوتا تو آپ زید کو کیوں روکتے اور اگر یہ کہا جائے کہ لوگوں کے خوف سے روکا تھا تو ساتھ اتق اللہ کی ہدایت کس طرح موزوں تھی نعوذ باللہ من ذالک خلاف تقویٰ کام خود کریں اور زید کو کہیں اتق اللہ۔ کیا ایسے الفاظ قرآن کریم میں دیکھنے کے بعد زید ایک لحظہ کے لیے بھی آپ کی بیعت میں رہ سکتا تھا اور صحابہ جن کے سامنے یہ واقعہ ہوا وہ کب ایسی بات کو دیکھ کر اپنی جانیں آپ پر فدا کر سکتے تھے اس حال میں کہ اسے خدا کا کلام سمجھتے ہوں اور یہ کس قدر بیہودہ بات ہے کہ نبی صلعم نے زینب کو دیکھ لیا تھا۔ زینب آپ کی پھوپھی کی بیٹی تھیں اور ایک دفعہ نہیں ہزاروں دفعہ آپ نے انہیں دیکھا ہوا تھا زینب اور ان کا بھائی خود چاہتے تھے کہ آنحضرت صلعم ان سے نکاح کرلیں اور آنحضرت نے خود انکار کرکے ان کا نکاح زید سے کرایا پھر اس سے بڑھ کر جھوٹ کیا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلعم زینب کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو گئے تھے جسے کنوارپن کی حالت میں قبول نہیں کیا اسے مطلقہ ہونے کی حالت میں اپنے نکاح میں لانا سوائے کسی مجبوری کے نہیں ہو سکتا تھا اور یہ وجوہات اوپر بیان ہو چکی ہیں آنحضرت صلعم کے نفس کی خواہش اگر کوئی تھی تو زینب سے نکاح کے خلاف تھی۔ انہی جھوٹے قصّوں کی تشہیر کرنے والوں کے متعلق سورت کے آخری رکوع میں یہ لفظ آتے ہیں یایھا الذین اٰمنوا لاتکونوا کالذین اٰذوا موسٰی فبرّاہ اللہ مما قالوا (۶۹) یہاں صاف بتا دیا ہے کہ نبی صلعم حضرت موسٰی کی طرح ان تمام باتوں سے بری ہیں اور مسلمانوں کو خطاب کرکے یہ بھی سمجھا دیا کہ غلطی سے ایسی باتیں خود مسلمانوں کے منہ سے نکلیں گی۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت زینب زید کے گھر میں ایک سال یا اس سے اوپر رہی ہیں اور طلاق کے بعد عدت بھی گزاری پس آیت ۳۶ میں جس میں زینب کے نکاح کا ذکر ہے اور اس آیت میں کوئی ڈیڑھ سال کا فرق ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس سورت کا نزول اچھے لمبے زمانہ پر ممتد رہا ہے۔

۲۶۵۷ قدرا مقدورا۔ مقدور۔ قدر کے بعد تاکید کے لیے ہے جیسے ظل ظلیل (ر) یا قدر سے اشارہ اس کی طرف ہے جو اندازہ خلق اشیاء کا ہو چکا اور مقدور سے اشارہ اس کی طرف ہے جو آیندہ مختلف حالات میں اندازہ ہوتا رہتا ہے (غ)

یہاں آنحضرت صلعم کے زینب سے نکاح کو فیما فرض اللہ قرار دیکر اور پھر اسے امر اللہ کہہ کر بتا دیا کہ یہ نکاح اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا۔

وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۳۹﴾
مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ
ع وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾

ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوائے کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ حساب لینے والا بس ہے ۲۶۵۸
محمدؐ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں۔
اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۲۶۵۹

۲۶۵۸ اس آیت میں عام قانون کے رنگ میں صاف بتا دیا کہ نبی کریم صلعم کو کسی انسان کا خوف نہ ہوا نہ ہو سکتا ہے آپ کے سارے معاملات خشیۃ اللہ کو مدنظر رکھ کر ہیں۔

۲۶۵۹ خاتم۔ خَتَمَ کے لیے دیکھو ۱۸ اور اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ کسی چیز کے آخر کو پہنچ گیا اور خاتَم کے معنی مہر بھی ہیں اور آخر بھی اور کسی قوم کے خاتَم اور خاتِم سے مراد ان میں سے آخری ہونا ہے خِتام القوم وخاتَمہم وخاتِمُہم اٰخرہم (ل) اور خاتِم اور خاتَم ہمارے نبی صلعم کے اسماء میں سے ہیں اور خاتَم النّبیّٖن اور خاتِم النّبیّٖن کے معنی ہیں آخری نبی (ل) اور آپ کو خاتم النّبیین کہا اس لیے کہ نبوت کو آپ کے ساتھ ختم کر دیا (غ)

خاتم النبیین کی تفسیر احادیث نبوی سے: خاتم النبیین کے معنی لغت سے اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام ایک قوم ہیں اور کسی قوم کا خاتَم یا خاتِم ہونا صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے یعنی ان میں سے آخری ہونا۔ پس نبیوں کے خاتم کے معنی نبیوں کی مُہر نہیں بلکہ آخری نبی ہیں۔ یہاں ان سب احادیث کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں جن میں خاتم النّبیین کی تشریح کی گئی ہے یا جن میں آنحضرت صلعم کے بعد نبی کا نہ آنا بیان کیا گیا ہے اور یہ احادیث متواترہ ہیں جو صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے مروی ہیں اور اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت صلعم کے بعد نبی نہیں۔ حدیث اول جس میں لفظ خاتم النّبیین کی تفسیر زبان نبوی سے مروی ہے متفق علیہ ہے مثلی ومثل الانبیاء کمثل رجل بنی بیتا فاحسنہ واجملہ الاموضعَ لبنۃٍ من زاویۃٍ فجعل الناس یطوفون بہ ویتعجبون لہ ویقولون ھلّا وضعت ھذہ اللبنۃ قال فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین۔ یعنی میری مثال اور نبیوں کی مثال ایک شخص کی مثال ہے جس نے ایک گھر بنایا اور اسے اچھا اور خوبصورت بنایا سوائے کونے کی اینٹ کے تو لوگ اس کے گرد گھومتے اور تعجب کرتے اور کہتے یہ اینٹ کیوں نہیں لگائی سو میں وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔ اور دوسری حدیث متفق علیہ میں لفظ خاتم النبیین کی تفسیر یوں کی ہے انہ سیکون فی امتی ثلثون کذابا کلھم یزعم انہ نبی وانا خاتم النبیین لانبی بعدی یعنی میری اُمت میں تیس کذاب ہونگے ہر ایک ان میں سے دعویٰ کریگا کہ وہ نبی ہے اور میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تیسری حدیث میں جو مسلم ترمذی نسائی کی ہے یہ ذکر ہے کہ مجھے چھ چیزوں میں دوسرے انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے جن میں چھٹی یہ ہے کہ خُتِمَ بی النبیوّن یعنی میرے ساتھ نبی ختم کیے گئے ہیں وہاں بجائے خاتم النبیین کے یہ لفظ رکھ کر بتا دیا کہ خاتم النبیین سے یہی مراد ہے نہ کچھ اور وہ احادیث جن میں آپ کے آخری نبی ہونے کا ذکر ہے اور وہ بھی درحقیقت خاتم النبیین کی تفسیر ہی ہیں بہت سی ہیں مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ بنی اسرائیل میں نبی کے بعد نبی آتا تھا لیکن میرے بعد نبی نہ آئے گا بلکہ خلفا ہونگے اور ایک حدیث میں ہے کہ میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا اور ایک میں ہے کہ علی کی نسبت میرے ساتھ وہی ہے جو ہارون کی موسیٰ کے ساتھ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں اور ایک میں ہے کہ میرا نام عاقِب ہے اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو انا العاقب والعاقب الذی لیس بعدہ نبی۔ اور ایک میں ہے کہ نبوت میں سے کچھ باقی نہیں رہا مگر مبشرات۔ اور ایک میں ہے کہ نبوت اور رسالت منقطع ہوگئی اور دس حدیثوں میں ہے لانبی بعدی یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں اور ایسی حدیثیں جن میں آپ کو آخری نبی کہا گیا ہے چھ ہیں۔ اس قدر زبردست شہادت کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان کا آنحضرت صلعم کے آخری نبی ہونے سے انکار کرنا بیّنات اور اصول دینی سے انکار ہے۔

لوعاش ابراھیم لکان نبیا پر بحث: اور اس کے خلاف جو کچھ احادیث میں سمجھا گیا ہے وہ ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے لوعاش ابراھیم لکان نبیا۔ مگر اول اس سے امکان نبوت نہیں نکلتا بلکہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے لوکان فیھما اٰلھۃ الا اللّٰہ لفسدتا جس طرح یہاں دو خداؤں کا ہونا اور فساد دونوں ممتنع امر ہیں۔ اسی طرح وہاں ابراہیم کا زندہ رہنا اور اس کا نبی ہونا دونوں ممتنع امر ہیں۔ دوسرے اس حدیث کی سند میں ضعف ہے کیونکہ اس میں ابوشیبہ ابراہیم ہے جسے ضعیف کہا گیا ہے۔ تیسرے اس کی تشریح دوسرے اقوال سے ہوتی ہے مثلاً بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفی کا قول لوقضی بعد محمد صلعم نبی عاش ابنہ ابراھیم ولکن لانبی بعدہ یعنی اگر آنحضرت صلعم کے بعد کوئی نبی مقدر ہوتا تو آپ کا بیٹا ابراہیم زندہ رہتا لیکن آپ کے بعد کوئی نبی نہیں یا انس کا قول ولو بقی لکان نبیا لکن لم یبق لان نبیکم اٰخر الانبیاء یعنی اگر ابراہیم زندہ رہتا تو نبی ہوتا لیکن وہ باقی نہیں رہا کیونکہ تمہارے نبی آخری نبی ہیں۔

اور ایک قول حضرت عائشہ کا پیش کیا جاتا ہے جس کی سند کوئی نہیں قولوا خاتم النبیین ولاتقولوا لانبی بعدہ خاتم النبیین کہو اور یہ نہ کہو کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کے نزدیک خاتم النبیین کے معنی کچھ اور تھے۔ کاش وہ معنی بھی کہیں مذکور ہوتے حضرت عائشہؓ کے اپنے قول میں ہوتے کسی صحابی کے قول میں ہوتے۔ نبی کریم صلعم کی حدیث میں ہوتے۔ مگر وہ معنی در بطن قائل ہیں اور اس قدر حدیثوں کی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿۴۱﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرو۔

وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۴۲﴾

اور صبح اور شام اس کی تسبیح کرو۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿۴۳﴾

وہی ہے جو تم پر درود بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی، تاکہ تمھیں اندھیرے سے روشنی کی طرف نکالے۔ اور وہ مومنوں پر رحم کرنے والا ہے ۲۶۶۰

شہادت جن میں خاتم النبیین کے معنی لا نبی بعدی کیے گئے ہیں ایک بے سند قول پر پس پشت پھینکی جاتی ہیں یہ غرض پرستی ہے خدا پرستی نہیں کہ رسول اللہ صلعم کی تیس حدیثوں کی شہادت ایک بے سند قول کے سامنے رد کی جاتی ہے۔ اگر اس قول کو صحیح مانا جائے تو کیوں اس کے معنی یہ نہ کیے جائیں کہ حضرت عائشہؓ کا مطلب یہ تھا کہ دونوں باتیں اکٹھی کہنے کی ضرورت نہیں خاتم النبیین کافی ہے۔ جیسا کہ مغیرہ بن شعبہ کا قول ہے کہ ایک شخص نے آپ کے سامنے کہا خاتم الانبیاء ولا نبی بعدہٗ تو آپ نے کہا خاتم الانبیاء کہنا تجھے بس ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کا مطلب ہو کہ جب اصل الفاظ خاتم النبیین واضح ہیں تو وہی استعمال کرو یعنی الفاظ قرآنی کو الفاظ حدیث پر ترجیح دو۔ اس سے یہ کہاں نکلا کہ آپ الفاظ حدیث کو صحیح نہ سمجھتی تھیں۔ اور اتنی حدیثوں کے مقابل اگر ایک حدیث ہوتی تو وہ بھی قابل قبول نہ ہوتی چہ جائے کہ صحابی کا قول جو شرعاً حجت نہیں۔

ختم نبوت اور نزول عیسیٰ: اور یہ خیال جو لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نبی اللہ آنحضرت صلعم کے بعد واپس آئیں گے یہ بھی اس نص صریح کے خلاف ہے۔ حضرت عیسیٰ ایک روشن چراغ تھے جنھوں نے ایک ضرورت کے وقت صرف بنی اسرائیل کے ایک گھرانے کو روشن کیا۔ و رسولاً الی بنی اسرائیل محمد رسول اللہ صلعم آفتاب عالمتاب ہیں۔ وسراجاً منیراً۔ آفتاب کے نکل آنے کے بعد چراغ روشن نہیں ہوا کرتے۔ یہ فعل تو انسان بھی نہیں کرتا خدائے حکیم کی طرف کیونکر منسوب ہو سکتا ہے۔ پھر اگر حضرت عیسیٰ آجائیں تو ختم نبوت باطل ہوئی۔ کیونکہ نبی نبوت سے تو معزول نہیں ہو سکتا۔ جب حضرت عیسیٰ آئیں گے نبی ہو کر ہی آئیں گے اور یہ کہنا کہ نبی تو ہونگے مگر کام نبوت کا نہیں کریں گے اور بھی عجیب بات ہے۔ وہ خدا بھی عجیب ہے کہ ایک نبی کو بھیجتا ہے مگر کام نبوت کا اس سے کچھ نہیں لیتا۔ اور پھر عملاً یہ عہدہ نبوت سے معزولی ہے۔ سوال صاف ہے اگر ختم نبوت ایک فرضی شے ہے تو چاہے ہزاروں نبی آئیں اور اگر یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کا کام آنحضرت صلعم کے بعد باقی نہیں رہا اور تکمیل کو پہنچ گیا تو جیسے نیا نبی نہیں آسکتا پرانا بھی نہیں آسکتا۔ اور احادیث میں جو عیسی ابن مریم کے آنے کا ذکر ہے تو اس سے مراد سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ ایک عیسیٰ صفت انسان اس امت میں بھی پیدا ہوگا اور انہی حالات کے ماتحت پیدا ہوگا جن حالات کے ماتحت حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل میں آئے تھے۔

اس آیت کا یہاں کیا تعلق ہے۔ اصل مضمون تو آنحضرت صلعم کا اسوۂ حسنہ ہونا تھا اور یہ کہ مومنوں کا تعلق آپ سے روحانی تعلق ہے اور آپ مومنوں کے لیے روحانی طور پر باپ ہیں۔ اسی مضمون کو یہاں ادا کیا ہے اور بتایا ہے کہ محمد صلعم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن چونکہ اس سے جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی ابوت کی نفی کا اشتباہ پیدا ہوتا تھا اس لیے حرف استدراک لکن سے فی الفور اس کا ازالہ کیا اور فرمایا رسول اللہ وہ اللہ کے رسول ہیں یعنی روحانی طور پر تمہارے باپ ہیں کیونکہ ہر ایک رسول اپنی امت کے حق میں روحانی طور پر باپ کا حکم رکھتا ہے جس طرح جسم کی ابتدا باپ سے ہوتی ہے روحانیت کی ابتدا رسول سے ہوتی ہے۔ پس رسول اللہ کا لفظ لا کر آپ کی ابوت روحانی کو قائم کیا۔ لیکن یہاں پھر ایک وہم پیدا ہوتا تھا کہ جس طرح پہلے رسولوں کے بعد دوسرے رسول آجاتے رہے تو پہلے رسولوں کی ابوت روحانی منقطع ہو جاتی رہی کیا اسی طرح رسول اللہ صلعم کے ساتھ ہوگا تو فرمایا ایسا نہیں ہوگا۔ بلکہ آپ خاتم النبیین بھی ہیں یعنی آخری نبی اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اس لیے آپ کی ابوت روحانی کا سلسلہ بھی تاقیامت منقطع نہ ہوگا بلکہ جو فیض ملے گا وہ صرف محمد رسول اللہ صلعم سے ہی ملیگا اور اسی فیض کے پانے سے ہی آپ کی امت کے لوگ مثیل انبیاء ہوں گے۔

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔ وہ نبی نہ ہونگے پر نبیوں کی طرح ہوں گے وہ نبی نہ ہوں گے پر اللہ تعالیٰ ان سے ہم کلام ہوگا رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام معطل نہیں ہو سکتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے کمال علم کی دلیل ہے کہ تمام دنیا کی ضروریات مذہبی کے متعلق مکمل ہدایات رسول اللہ صلعم پر نازل فرمادیں اسی لیے آیت کا خاتمہ بکل شیء علیما پر کیا ہے ہدایات دینی مکمل ہو گئیں لیکن تعلق باللہ ختم نہیں ہوا بلکہ ان ہدایات کی بدولت پہلے سے بھی بڑھ کر حاصل ہوتا ہے۔

۲۶۶۰ یصلی علیکم اللہ کی صلوٰۃ سے مراد تزکیہ یا گناہوں سے پاک کرنا ہے دیکھو ۱۹۶ع اور ملائکہ کی صلوٰۃ استغفار ہے اور حضرت ابن عباس سے ہے کہ صلوٰۃ اللہ کی طرف سے رحمت ہے اور فرشتوں کی طرف سے استغفار یعنی حفاظت الٰہی کا طلب کرنا اور انسانوں کی طرف سے دعا (د) اور اللہ اور ملائکہ کی صلوٰۃ کا اکٹھا ذکر اس لیے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تزکیہ ملائکہ کی وساطت سے ہوتا ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کو گناہوں کی

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلٰمٌ ۚ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿۴۴﴾

ان کی دعائے ملاقات جس دن وہ اس سے ملیں گے سلامتی ہوگی اور ان کے لیے عزت والا اجر تیار کیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ﴿۴۵﴾

اے نبیؐ ہم نے تجھے گواہ بنا کر بھیجا ہے اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔

وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾

اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنیوالا سورج[۲۶۶۱]

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿۴۷﴾

اور مومنوں کو بشارت دے کہ ان کے لیے اللہ کا بڑا فضل ہے۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۴۸﴾

اور کافروں اور منافقوں کی بات نہ مان اور ان کے ایذا دینے کی پروا نہ کر اور اللہ پر بھروسا کر اور اللہ تعالیٰ کارساز بس ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۴۹﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو پھر تم انھیں طلاق دے دو قبل اس کے کہ تم انھیں چھوؤ تو تمہارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں جسے تم شمار کرو، سو انھیں سامان دو اور انھیں خوبی کے ساتھ رخصت کر دو[۲۶۶۲]

ظلمت سے نکالے تو ملائکہ اس کے دل میں نیکی کی تحریک کرتے ہیں گو اس رکوع میں ذکر آنحضرت صلعم کی ازواج کا ہی ہے مگر اصل مضمون کی طرف ابتدائے رکوع میں پھر توجہ دلائی ہے اور مومنوں کا تزکیہ ہے جو غرض و غایت نبوت ہے۔

۲۶۶۱ یہاں آنحضرت صلعم کے متعلق پانچ باتیں بیان کی ہیں۔ شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ، سراج منیر۔ شاہد نبی کو کن معنوں میں کہا جاتا ہے دیکھو ع۱۴۵۱ وہ اس تعلیم کے عملی گواہ ہوتے ہیں جو وہ دوسروں کے لیے لاتے ہیں اور اسی کے قریب قریب ہے جو کہا گیا ہے شاہد ابان لا الٰہ الا اللہ گویا وہ حق پرست ہے پھر وہ اہل حق کو بشارت دیتا ہے اہل باطل کو بدانجام سے ڈراتا ہے۔ پھر وہ حق کی طرف بلاتا ہے اور یہی نبی کا اصل کام ہے یعنی انسانوں کو اللہ کی طرف بلانا یا انہیں باخدا بنانا۔ پھر وہ سورج کی طرح روشنی بھی دیتا ہے تاکہ دوسرے اس کی روشنی سے فائدہ اٹھائیں اور اندھیرے سے باہر نکلیں۔ آپ کو سراج کہنے میں بھی یہی اشارہ ہے کہ اس آفتاب عالمتاب کے طلوع کے بعد ان روشنیوں کی ضرورت نہیں رہی جو پہلے مختلف قوموں کو اور مختلف ملکوں کو روشن کیا کرتی تھیں۔ نبوت کے چراغ اپنا اپنا کام ایک اندھیری رات میں دے چکے طلوع آفتاب کے بعد اب کسی چراغ کی ضرورت نہیں رہی۔ لو کان موسیٰ و عیسیٰ حیّین لما وسعہما الا اتباعی اگر موسیٰ اور عیسیٰ بھی اس وقت زندہ ہوتے تو انہیں اسی آفتاب سے روشنی حاصل کرنی ہوتی۔ جو کوئی اپنے شیشہ دل کو صاف کرکے اس آفتاب کے سامنے آتا ہے اس کے اندر اس آفتاب کا نور منعکس ہو جاتا ہے یہی ظلی نبوت ہے جسے ولایت کہا جاتا ہے یعنی کامل اتباع پر انوار نبوت کا کسی سینہ میں منعکس ہو جانا۔ اور ازواج مطہرات کے مضمون سے پہلے اس مضمون کا بیان بتاتا ہے کہ اصل غرض نبی کی زندگی کی کیا ہے اور یہ سارے سامان محض اسی غرض کے حصول کے لیے ہیں ٭

۲۶۶۲ اس آیت کو اس مضمون کے اندر بالکل بے تعلق خیال کیا گیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں نبی کریم صلعم کی ازواج کا ذکر تھا اور ان کے مطالبہ کا کہ انہیں بھی مال دنیا سے حصّہ دیا جائے جس پر حکم ہوا تھا کہ اگر دنیا کی زندگی اور اس کا سامان کثیر مدنظر ہے تو تمہیں طلاق دیکر اور سامان دنیا سے حصّہ دیکر رخصت کر دیا جائے گا۔ درمیان میں اور کئی باتوں کا ذکر کر کے اب مضمون کو پھر ازواج مطہرات کے مضمون کی طرف لوٹایا ہے اور یہ آیت اسی تعلق کو قائم کرنے کے لیے ہے۔ ابھی ذکر مومنوں کے اتباع نبوی کا تھا تو چونکہ طلاق کے موقعہ پر نبی کریم صلعم کی ازواج کے لیے متاع دینے اور اچھی طرح رخصت کرنے کا حکم تھا۔ اس لیے اب فرمایا کہ اس میں بھی مومنوں کے لیے نبی کریم صلعم اُسوۂ حسنہ ہیں پس وہ حکم نبی اور اس کی ازواج سے مخصوص نہیں بلکہ جب کسی مومن عورت کو طلاق دی جائے تو

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ
الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ
يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ بَنٰتِ
عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ
وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ
وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا
لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ
خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ قَدْ
عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ
وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ
عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵۰

اے نبیؐ ہم نے تیرے لیے تیری وہ بیویاں جائز کر دی ہیں جنھیں تو نے ان کے مہر دے دیئے ہیں اور جس کا تیرا دایاں ہاتھ مالک ہوا اس سے جو اللہ نے تجھے (کفار سے) دلایا — اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموؤں کی بیٹیاں اور تیری خالاؤں کی بیٹیاں جنھوں نے تیرے ساتھ ہجرت کی — اور مومن عورت اگر وہ اپنے تئیں نبیؐ کو بخش دے اگر نبیؐ چاہے کہ اس سے نکاح کرے یہ خاص تیرے لیے ہے۔ مومنوں کے لیے نہیں — ہم جانتے ہیں جو ہم نے ان کے لیے ان کی بیویوں کے اور ان کے بارے میں جن کے ان کے داہنے ہاتھ مالک ہوئے فرض کیا ہے تاکہ تجھ پر تنگی نہ ہو اور اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۲۶۶۳

اسے اسی طرح متاع دینا اور خوبی کے ساتھ رخصت کرنا ضروری ہے یہاں تک کہ اگر بی بی کو اس کے ساتھ تعلق پیدا ہونے سے پیشتر بھی طلاق دی جائے تو بھی یہی حکم ہے اور عدت کا حکم ضمناً آگیا ہے یہ بتانے کے لیے کہ جب میاں بیوی والا تعلق نہیں ہوا تو عدت بھی کوئی نہیں۔ خلوت صحیحہ سے مساس لازم نہیں آتا اور جب تک مساس نہ ہو عدت نہیں۔

۲۶۶۳ آنحضرت صلعم کو چار ازواج کی حدبندی سے مستثنیٰ کرنا اور اس کی وجہ: اس آیت میں آنحضرت صلعم کی ازواج مطہرات کا ذکر ہے۔ سب سے پہلے فرمایا کہ ہم نے تیری وہ بیبیاں تیرے لیے جائز کی ہیں جن کے مہر تو نے دیئے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ بیبیاں پہلے ہی آنحضرت صلعم کے لیے جائز تھیں تو اس حکم کی ضرورت کیا پیش آئی؟ اس کی وجہ سورۂ النسا کا وہ حکم ہے جس کی رو سے تعدد ازواج کی اجازت کو چار تک محدود کیا گیا۔ اور قد علمنا ما فرضنا علیھم فی ازواجھم میں اس کی طرف اشارہ بھی ہے پس مطلب اس کا یہ ہے کہ جہاں اور لوگوں کو جن کے پاس اس حکم کے نزول کے وقت چار سے زیادہ بیبیاں تھیں چار کو رکھ کر باقی کو رخصت کر دینے کا حکم ہوا۔ نبی صلعم کو اجازت دی گئی کہ جس قدر ازواج آپ کے نکاح میں تھیں خواہ ان کی تعداد چار سے زیادہ ہو وہ سب آپ کے لیے جائز ہیں اس فرق کی وجہ سوائے اس کے کوئی نہیں ہو سکتی کہ آپ کے نکاحوں کی غرض صرف تعلقات زوجیت نہیں بلکہ یہ دینی غرض تھی۔ قرآن کریم کے جس قدر احکام ہیں ان کو دیکھا جائے تو نبی کریم صلعم ان کے سب سے پہلے عامل ہیں بالخصوص وہ باتیں جن کا تعلق ترک آسایش سے ہے ان پر جس حد تک نبی صلعم نے عمل کر کے دکھایا۔ عام مومن اس حد تک نہیں پہنچ سکتے۔ مثلاً اگر اوروں کو مال کی زکوٰۃ دینے کا حکم ہے تو آپ نے اپنے پاس کبھی کوئی مال رکھا ہی نہیں بلکہ جس قدر آیا وہ فوراً دیدیا۔ اور اگر اوروں کو پانچ نمازوں کا حکم ہے تو آپ کو اس کے ساتھ تہجد کی نماز کا بھی حکم ہے اور رات کو بیدار رہنے کا حکم ہے۔ اگر اوروں کو حفاظت دین کے لیے جنگ کا حکم ہے تو یہ حکم سب سے پہلے آپ پر عاید ہوتا ہے بلکہ حقیقی مکلف اس کی آپ کی ذات بابرکات ہی ہے لا تکلف الا نفسك اگر اور مسلمانوں کے گھر میں کچھ نہ کچھ سامان آسایش ہے اور ان کی بیبیوں کے پاس کچھ نہ کچھ زینت و آرایش کا سامان ہے تو آپ کے لیے یہ دونوں باتیں نہیں ہیں پس آپ کے ازواج کی غرض محض زن و شوہر کا تعلق ہوتا تو یقیناً آپ نہ صرف فوراً چار کی حدبندی پر عامل ہوتے بلکہ چار تک کی اجازت کو بھی اپنے لیے غیر ضروری سمجھتے اور جس طرح تریپن۵۳ سال کی عمر تک ایک ہی بی بی پر اکتفا کیا تھا اب بڑھاپے میں بھی ایک ہی پر اکتفا کرتے خصوصاً جبکہ اس ایک یعنی حضرت عائشہ صدیقہ کے ساتھ آپ کی محبت بھی کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ مگر ایسا نہ ہوا اس لیے کہ اس تعلق زوجیت کی غرض دینی تھی۔ پس سب سے پہلی بات یہ فرمائی کہ جس قدر بیبیاں تمہارے نکاح میں اس وقت ہیں جنہیں تم نے ان کے مہر بھی دیئے ہیں وہ سب تمہارے لیے حلال ہیں۔

دوم ان عورتوں کو آپ کے لیے جائز قرار دیا ممّا افاء اللّٰہ علیك۔ فیٔ کے لیے دیکھو ۲۸۹ اچھی حالت کی طرف لوٹ کر آنا اور اس لیے اس مال غنیمت کو جس میں مشقت نہ ہو فیٔ کہا جاتا ہے اور اسی سے افاء ہے (غ) اور غنیمت اور خراج کو بھی فیٔ کہا جاتا ہے اور اس مال کو بھی جو بلا قتال دشمن سے ہاتھ آئے (ل) پس مما افاء اللّٰہ علیك سے مراد وہ بیبیاں ہیں جو دشمن قوم میں سے آئیں اور ما ملکت یمینك ساتھ اس لیے بڑھایا کہ پھر وہ جائز طور پر آپ کے نکاح میں آئیں اس میں نبی کریم صلعم کے نکاحوں کی ایک غرض بتائی ہے کیونکہ دشمن قوم سے کسی بی بی کا نکاح میں لانا اسی غرض کے لیے

تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُـْٔوِيْٓ اِلَيْكَ (تجھے اختیار ہے کہ) ان میں سے جسے چاہے پیچھے رکھے اور جسے
مَنْ تَشَآءُ ؕ وَ مَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ چاہے اپنے پاس جگہ دے اور جسے تو ان میں سے چاہے جن

ہوسکتا ہے کہ دوسری قوم کے ساتھ اتحاد پیدا کیا جائے اور عداوت کی جڑ کاٹی جائے ایسے دو نکاح آپ کے ثابت ہیں ایک حضرت صفیہؓ کے ساتھ جو قوم یہود میں سے تھیں اور جن کے ساتھ آپ نے یہ رابطۂ اتحاد پیدا کر کے ان کی دشمنی کا خاتمہ کرنا چاہا، مگر یہ سخت دل قوم عداوت سے باز نہ آئی۔ دوسرا حضرت جویریہؓ کے ساتھ جو بنی المصطلق میں سے تھیں اور ان کے رئیس حارث کی بیٹی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی المصطلق کے کوئی سو گھرانوں کے قیدی مسلمانوں نے یہ کہہ کر چھوڑ دیئے کہ جس خاندان میں رسول اللہ صلعم نے شادی کی ہے وہ غلام نہیں ہوسکتا۔ اور ایک معمولی قبطی عورت ماریہ کو اپنی ازواج میں داخل کر کے آنحضرت صلعم نے اپنی وسعت قلبی کا ثبوت دیا اور مسلمانوں کو دوسری قوموں کا احترام سکھایا۔

تیسری قسم کی عورتیں جن کا یہاں ذکر کیا ہے آپ کی قریبی تعلقات والی ہیں۔ چچا اور پھوپھی اور ماموں اور خالا کی بیٹیاں جن سے یہاں توسیع کے طور پر دو اوّل الذکر سے قریشی بیبیاں اور دو موخر الذکر سے بنی زہرہ مراد لیے گئے ہیں جن کے ساتھ یہ شرط لگائی ہے کہ وہ ایسی عورتیں ہوں جنھوں نے نبی کریم صلعم کے ساتھ ہجرت بھی کی ہے اور بعض نے ہجرت سے مراد اسلام لانا لیا ہے مگر حق یہی ہے کہ یہ الفاظ اپنی اصلیت پر ہیں۔ اور ان تعلقات تک آپ کے ازدواج کو اس لیے محدود کیا ہے کہ ان کی خبرگیری آپ کے ذمہ تھی۔ اور اسی لیے ہجرت بھی ساتھ شرط رکھی ہے گویا دوسرے رشتہ داروں سے ان کا قطع تعلق ہوچکا ہے اس سے معلوم ہوا کہ بعض صورتوں میں آپ کے نکاح کی غرض ان بیکس بیبیوں کو پناہ میں لینا بھی تھا جنھوں نے آپ کے ساتھ تکلیفیں اٹھائیں اور ان کو ازدواج میں لینا اخلاقی فرض اس لیے بھی ہوگیا تھا کہ جنگوں کی وجہ سے مردوں کی تعداد کم رہ گئی تھی عمّ اور خال کے محدود معنوں میں ایسی کوئی بی بی آپ کی زوجیت میں نہ تھیں، البتہ قرشیات میں سے چھ بیبیاں آپ کے نکاح میں آئی تھیں۔ حضرت خدیجہؓ جو فوت ہوچکی تھیں، عائشہؓ، سودہؓ (جن سے مکّہ میں ہی نکاح ہوچکا تھا) حفصہؓ، ام حبیبہؓ، ام سلمہؓ۔ موخر الذکر چاروں بیوہ تھیں اور ان کا نکاح میں لینا محض ان کی خبرگیری کے لیے تھا۔

چوتھی قسم کی وہ عورتیں ہیں جو خود نبی صلعم سے خواہش نکاح کریں۔ جب نبی کے گھر کو دنیا کے سامانوں اور اس کی زینتوں سے پاک کر دیا گیا اور یہ بتا دیا گیا کہ نبی کی بی بی وہی ہوسکتی ہے جو دنیا پر دار آخرت کو ترجیح دے اور آپ کے اقوال و افعال کو محفوظ رکھ کر دوسروں تک پہنچائے، تو ظاہر ہے کہ یہ اجازت محض اسی لیے تھی کہ اگر کسی بی بی کے دل میں یہ تڑپ ہو تو اس کے لیے یہ دروازہ بند نہ ہو، بشرطیکہ نبی صلعم بھی اُسے اس بات کا اہل سمجھیں ایسی کسی بی بی کے آپ کے نکاح میں ہونے سے بعض لوگوں نے مطلقاً انکار کیا ہے۔ بعض نے کہا میمونہؓ بنت الحارث ان میں سے تھیں بعض نے کہا زینبؓ بنت خزیمہ جو ام المساکین کے نام سے مشہور ہیں۔

ازواج مطہرات کی زوجیت آنحضرت ؐ میں آنے کی تاریخیں: ایک اور سوال یہ ہے کہ یہ آیت کب نازل ہوئی، نبی کریم صلعم کے نکاح میں جس قدر بیبیاں آئیں وہ سب ۷ھ تک آچکی تھیں یعنی حضرت عائشہؓ و سودہؓ مکّہ میں، حضرت حفصہؓ جنگ بدر میں بیوہ ہونے کے بعد یعنی ۳ھ میں، زینبؓ بنت خزیمہ جنگ اُحد میں بیوہ ہونے کے بعد ۳ھ میں، ام سلمہؓ ۴ھ میں بیوہ ہونے کے بعد، حضرت زینبؓ ۵ھ میں مطلقہ ہونے کے بعد۔ جویریہؓ ۵ھ میں غزوہ بنی مصطلق میں بیوہ ہوکر۔ ام حبیبہؓ حبش میں غالباً ۵ یا ۶ھ میں بیوہ ہوکر (ان کا نکاح حبش میں ہوا اور ۷ھ کے شروع میں وہ مدینہ پہنچ گئیں) صفیہؓ ۷ھ میں غزوۂ خیبر میں بیوہ ہونے کے بعد، ماریہؓ قبطیہ ۷ھ میں۔ میمونہؓ بنت الحارث ۷ھ میں۔ اب سورۂ احزاب کا نزول غزوہ احزاب کے بعد کا ہے یعنی ۵ھ کے بعد کا۔ سورۂ نساء کی آیت تعدد ازواج جس کا یہاں حوالہ ہے اس کے متعلق یقیناً کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن یہاں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کا نزول ۵ھ کے بعد کا ہے اب اگر اس آیت زیر بحث کا نزول ۵ھ سے پہلے کا مانا جائے تو غالباً بعض نکاح نبی کریم صلعم کے اس آیت کے نزول کے بعد ہوئے اور وہ یا مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْكَ میں آتے ہیں۔ جیسے جویریہؓ، صفیہؓ اور ماریہؓ قبطیہ اور یا امْرَاَةً وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ میں جیسے میمونہؓ تو گویا نبی صلعم کے نکاحوں پر جو حدبندی اس آیت کی رو سے کی گئی وہ یہ تھی کہ خاص خاص عورتوں سے آپ کو نکاح کی اجازت تھی جن میں کوئی نہ کوئی غرض دینی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے لِكَیْلَا یَكُوْنَ عَلَیْكَ حَرَجٌ میں یعنی امور دینی میں تنگی نہ ہو یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ مومنوں پر ازدواج کے بارہ میں تنگی ہو اور نبی پر نہ ہو بلکہ نبی کے لیے ایک ضرورت تھی جو مومنوں کے لیے نہ تھی اس لیے فرمایا کہ تا تجھ پر اس ضرورت دینی میں تنگی نہ ہو۔ اور قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا میں اشارہ تعدد ازواج کی چار تک حدبندی کی طرف ہی ہے اور اگر اس آیت کا نزول ۵ھ کے بعد کا ہو تو مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ وغیرہ میں عطف خاص علی العام ہوگا کیونکہ خواہ کوئی دشمن قوم سے تھیں یا قریشیوں میں سے یا غیر قریشی عرب میں سے یا کسی بیرونی قوم سے سب اُمہات المومنین ہونے میں اور ازواج مطہرات ہونے میں یکساں شامل تھیں۔

آنحضرت صلعم کی بیبیوں کی کثرت پر عیسائیوں کو بڑا اعتراض ہے گو ان کے اپنے پیغمبروں میں بعض کی بیبیوں کی تعداد سو تک یا اس سے بھی زیادہ پہنچ گئی اور گو حضرت ابراہیم سے لیکر جس قدر بڑے بڑے نبیوں کا ذکر توریت میں ہے وہ سب ہی تعدد ازواج پر عامل تھے۔ رہے حضرت عیسٰی سو اُن کا نمونہ بھی ایک بی بی کا نہیں بلکہ ان کے اس نمونہ پر عمل کیا جائے جو انجیل میں مذکور ہے تو دنیا کا ہی خاتمہ ہوجائے، قرآن کریم نے کھول کر بتا دیا کہ نبی صلعم کی غرض ان بیبیوں کو زوجیت میں لانے کی حظِّ نفس نہیں کیونکہ اگر حظِّ نفس غرض ہوتی تو ان بیبیوں کے لیے خوب سامان آرائش بھی مہیا کرتے مگر وہاں معمولی مسلمانوں کے گھروں میں جو

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَاۤ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِىْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ﴿۵۱﴾

سے تو نے علیحدگی اختیار کی تھی تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں یہ بہت قریب ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور غمگین نہ ہوں اور سب کی سب اس پر راضی رہیں جو تو انھیں دے اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے اور اللہ جاننے والا بردبار ہے ۲۶۶۴

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ رَّقِيْبًا ﴿۵۲﴾ ع ۶

(اس کے) بعد تیرے لیے (اور) عورتیں (نکاح میں لانا) جائز نہیں اور نہ یہ کہ تو ان کی جگہ دوسری بیویاں بدل لے خواہ ان کا حسن تجھے اچھا لگے مگر جس کا تیرا دایاں ہاتھ مالک ہو چکا، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگہبان ہے ۲۶۶۵

آسودگی تھی وہ بھی میسر نہ آئی۔ علاوہ ازیں غور کیا جائے تو آنحضرت ؐ کے کل کے کل نکاح سوائے عائشہ صدیقہ رضؓ اور سودہ رضؓ کے صرف چار یا پانچ سال کے اندر محدود ہیں یعنی ۳ھ سے لیکر ۷ھ تک اور یہ وہ زمانہ ہے جب اسلام کے خلاف چاروں طرف جنگ وجدال کا سلسلہ جاری ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنگوں کی مشکلات کی وجہ سے مردوں کی تعداد کم ہو جانے سے اور عورتوں کی تعداد بڑھ جانے سے بھی یہ ضرورت پیش آئی تھی کہ ایک ایک مرد کئی کئی بیبیوں کا متکفل ہو۔ اسلامی سوسائٹی بغیر اس کے پاک نہ رہ سکتی تھی وہ لوگ جو سیہ دلی سے شہوانی اغراض کو ان شادیوں کا اصل محرک بتاتے ہیں وہ تاریخ کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے ہیں جو شخص ۲۵ سال کی عمر تک تجرد میں رہ کر اور ۵۳ سال کی عمر تک ایک بی بی پر اکتفا کر کے اپنی زندگی کی پاکیزگی اور اپنی عصمت کا بیّن ثبوت دے دیتا ہے اور بتا دیتا ہے کہ اسے کس قدر حکومت اپنے قوائے شہوانی پر حاصل ہے وہ بڑھاپے کی حالت میں قوائے شہوانی کا غلام نہیں ہو سکتا۔ قوائے شہوانی کی غلامی کا وقت تو جوانی تک ہے بڑھاپے میں تو خود وہ قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں۔ ہاں بڑھاپے میں دس بیبیوں کے حقوق ادا کر کے محمد رسول اللہ صلعم نے یہ بیّن ثبوت بھی دیدیا کہ وہ قوائے شہوانی جن پر آپ نے جوانی میں حکمرانی کی کس قدر زبردست تھے۔ ہاں آپ کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ حالت تجرد میں پاکیزگی اور قوائے شہوانی پر حکمرانی کا، پھر ایک لمبے زمانہ تک ایک بی بی سے اعلیٰ درجہ کے تعلق محبت کا، پھر بوقت ضرورت تعدد ازواج کا بھی نمونہ دکھائیں اگر یہ سب نمونے آپ کی زندگی میں نہ ہوتے تو آپ بھی لوگوں کے لیے اُسوۂ حسنہ نہ ہو سکتے تھے۔

۲۶۶۴ واقعہ ایلاء اور نبی صلعم کو طلاق کا اختیار دیا جانا: اس آیت کے متعلق کئی اقوال ہیں۔ بخاری میں خود حضرت عائشہ رضؓ سے دو مختلف باتیں مروی ہیں اول یہ کہ اس میں ان عورتوں کا ذکر ہے جو اپنے آپ کو نبی صلعم کے نکاح کے لیے پیش کرتی تھیں گویا اس سے مراد ہے کہ ایسی عورتوں میں سے جس کو چاہو نکاح میں لیلو اور جسے چاہو انکار کر دو اور دوسرا یہ کہ اس کے نزول کے بعد آنحضرت صلعم اگر ایک بی بی کی باری میں دوسری بی بی کے پاس جانا چاہتے تو اس سے دریافت کر لیا کرتے گویا اس آیت میں آپ کو بتا دیا گیا کہ باری مقرر کرنے میں آپ مجبور نہیں۔ قول اوّل اس لیے قابل قبول نہیں کہ جہاں وھبت نفسھا فرمایا وہیں ساتھ شرط لگا دی تھی ان اراد النبی ان یستنکحھا یعنی اگر نبی اس سے نکاح کرنا چاہے تو کرے اس لیے دوبارہ ان الفاظ کی ضرورت نہ تھی۔ اور ابن عباس اور حسن کا ایک قول ہے کہ اس سے مراد ہے جسے چاہے طلاق دے اور جسے چاہے اپنے پاس رکھے (د) اور ابن زید کا قول ہے کہ یہ واقعہ ایلاء کے متعلق ہے یعنی جب نبی صلعم نے ایک ماہ کے لیے اپنی بیبیوں سے علیحدگی اختیار کی (ج) گویا ایک طرف بیبیوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ چاہیں تو مال لیکر رخصت ہو جائیں اور چاہیں تنگی کی حالت میں نبی صلعم کے گھر میں رہیں اور دوسری طرف آپ کو بھی اختیار دیا گیا کہ جسے چاہیں رکھیں اور جسے چاہیں طلاق دیں اور ممن عزلت میں بھی اس علیحدگی کی طرف اشارہ ہے اور ابتغاء سے مراد اس بی بی کو اپنے پاس جگہ دینا ہے اور اس کا دوبارہ ذکر اس لیے کیا کہ اسی کی سفارش خاص طور پر کی ہے جیسا کہ ذٰلک ادنیٰ ان تقرا عینھن سے ظاہر ہے یعنی تمہارا انہیں اپنے پاس رکھنا ہی ان کی راحت کا موجب ہے پس مطلب یہ ہے کہ جب انہیں اختیار دیا گیا کہ چاہیں تو نبی کے گھر میں رہیں اور چاہیں طلاق لے لیں۔ اور ایسا ہی اختیار نبی کو دیا گیا کہ جسے چاہیں رکھیں اور جسے چاہیں طلاق دیں۔ تو جب بیبیوں نے نبی کے گھر کو سب دنیا کی آسائشوں پر ترجیح دی تو آنحضرت صلعم کو بھی یہی حکم دیا گیا کہ سب کو اپنے پاس رکھیں اور آپ نے ایسا ہی کیا یعنی کسی کو طلاق نہ دی۔

۲۶۶۵ آنحضرت صلعم کا اور نکاحوں سے روکا جانا: ابن عباس کہتے ہیں کہ اس سے مراد ہے کہ نبی صلعم کو ان بیبیوں کے بعد اور بیبیوں سے روک دیا گیا (ج) یعنی جب آپ کی بیبیوں نے مال دنیا کے خیال کو ترک کر کے نبی صلعم کی رفاقت کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو آئندہ اور نکاح کرنے سے روک دیا اور یہی عکرمہ اور انس کا قول ہے (د) اور یہی صحیح ہے۔ لکھا ہے کہ اس وقت نو بیبیاں آپ کے نکاح میں تھیں لیکن ماریہ رضؓ کو شامل کر کے کل تعداد دس بنتی ہے اور آپ کو نہ صرف اس تعداد کے بڑھانے سے روکا گیا بلکہ اسبات سے بھی کہ ان بیبیوں میں سے کسی کو طلاق دیکر اس کی جگہ اور نکاح کریں اور الّا ما ملکت یمینک سے مراد وہی بیبیاں ہیں جو بذریعہ عہد آپ اپنے نکاح میں لے چکے ہیں کیونکہ اوپر لفظ تھے لا یحل لک النساء من بعد اس کے بعد تیرے لیے عورتیں حلال نہیں اس لیے بتایا کہ جو تیرے نکاح

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ
النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ
غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ
فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا
مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ
يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۫ وَاللّٰهُ
لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ
مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ
ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ وَمَا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو نبیؐ کے گھروں میں داخل
نہ ہو سوائے اس کے کہ تمھیں کھانے کے لیے اجازت دی
جائے (مگر) اس کے بھی پکنے کا انتظار کرنیوالے نہ ہو بلکہ جب تمھیں
بلایا جائے تو داخل ہو پھر جب تم کھانا کھا لو تو متفرق ہو جاؤ اور
باتوں میں نہ لگ جاؤ - یہ بات نبیؐ کو تکلیف دیتی
ہے مگر وہ تم سے حیا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ حق
بات سے شرم نہیں کرتا ۲۶۶۶ اور جب تم ان سے کوئی
چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے ان سے مانگو۔ یہ
تمھارے دلوں کے لیے اور ان کے دلوں کے لیے بہت پاک ہے ۲۶۶۷

ہیں وہ حلال ہیں اور جن لوگوں نے اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے انہوں نے غلطی کی ہے کیونکہ یہ سب کو مسلم ہے کہ اس کے بعد آپ نے کوئی نکاح نہیں کیا بلکہ ـــہ کے بعد آپ نے کوئی نکاح نہیں کیا اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کو منسوخ اس سے پہلی سے کہا گیا ہے۔ اور آیندہ نکاحوں سے اس لیے بھی روک دیا کہ بڑی ضرورت جو جنگوں کی وجہ سے پیش آئی تھی وہ اس نویں سال میں جب یہ واقعہ ایلاء اور تخییر پیش آیا ختم ہو چکی تھی اور ملک عرب میں امن قائم ہو چکا تھا۔

۲۶۶۶ یہ ہدایت آنحضرت صلعم کے وقت کی قدر سکھانے کے لیے ہے اور عموماً ہر انسان کے وقت کی قدر سکھانے کے لیے۔ عرب میں یہ دستور تھا کہ دعوتوں میں کھانے سے پہلے اور پیچھے بہت وقت باتوں میں ضائع کرتے جن سے حاصل کچھ نہیں ہوتا تھا۔ یہی دستور آج بھی مہذب سوسائٹی میں ہے اور یورپ کی نقل میں مسلمانوں کی دعوتوں پر کئی کئی گھنٹے لغو باتوں میں ضائع ہوتے ہیں اور انہی لوگوں کو اگر کہا جائے کہ کبھی خدا کے آگے بھی سجدہ کر لو تو جواب دیتے ہیں کہ فرصت نہیں ملتی تو اس ہدایت میں صرف نبی کریم صلعم کے وقت کی قدر ہی نہیں سکھائی بلکہ مسلمانوں کو اپنے وقت کی قدر بھی سکھائی ہے۔ ایک اعتراض یہ ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی ہدایات کی قرآن شریف میں کیا ضرورت تھی؟ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہی ہیں جن سے انسان کی زندگی مفید یا غیر مفید ہو جاتی ہے، پھر کہتے ہیں کہ نبی صلعم نے اپنے آرام کے لیے یہ ہدایات قرآن میں داخل کر دیں حالانکہ اگر آپؐ کے اشغال پر ایک سرسری نظر بھی ان لوگوں کی ہوئی ہوتی تو انہیں معلوم ہوتا کہ آپ کے کندھوں پر جس قدر بوجھ تھا آج تک کسی ایک انسان کے کندھوں پر اتنا بوجھ نہیں ہوا۔ ایک طرف بادشاہت ہے اور ملک کا نظم ونسق، دوسری طرف جنگیں ہیں ان کا انتظام، دشمن جہاں جہاں ہیں ان کی خبر رکھنا اور ان کے انسداد کے لیے تجاویز کو عمل میں لانا، انتظام ملکی قائم کرنا، تنازعات کا فیصلہ کرنا، قانون بنانا، پھر قوم کی ساری مذہبی اور روحانی ضروریات کا انتظام، اخلاق سکھانا۔ تمدن اور معاشرت کے اصول بتانا، ہر قسم کی بدیوں کو اور بد رسوم کو جڑ سے اکھیڑنا۔ نمازیں پڑھانا، بیماروں کی خبر گیری۔ بیکسوں کی فکر۔ اگر اس کثرت کار میں جس کی نظیر دنیا میں کسی اور انسان کی زندگی میں نہیں ملتی آپ کے اشغال کی خاطر ہی یہ ہدایت دی جاتی تو بھی اس کی سخت ضرورت تھی مگر اصل یہ ہے کہ اس ہدایت کو دیکر ہر مسلمان کو اپنے وقت کی قدر کرنا سکھایا ہے اور بتایا ہے کہ اپنے اوقات کو فضول باتوں میں ضائع نہ کیا کریں اور یہ بھی سچ ہے کہ نبی صلعم اپنی حیائے جبلی کی وجہ سے بڑی بڑی تکالیف اٹھا لیتے تھے لیکن دوسروں کو کچھ کہنا پسند نہ کرتے تھے کہ انہیں ناگوار خاطر نہ ہو۔ مگر وحی الٰہی ایک خارجی شے تھی اس آیت کا نزول اس دعوت پر ہوا جو زینب بنت جحش کے ساتھ نکاح کے بعد نبی کریم نے دی تھی۔"

۲۶۶۷ گو یہاں ازواج مطہرات کا ذکر نہیں مگر اوپر بیوت النبی کے ذکر کی وجہ سے یہاں انہی کا ذکر سمجھا گیا ہے۔ روایات میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے نبی کریم صلعم سے عرض کیا کہ آپ کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے ہیں نیک بھی اور بدکار بھی اس لیے آپ اُمہات المومنین کو مردوں سے پردہ کرنے کا حکم دیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ خاص ضرورت بھی نبی کریم صلعم کے لیے تھی۔ لیکن جس بات کا حکم اُمہات المومنین کو دیا گیا اور جس طرح انہوں نے اس کی تعمیل کی وہی حکم سب مسلمان عورتوں کے لیے ہے اور اُمہات المومنین کے نمونہ پر ہی ان کو بھی چل کر دکھانا چاہیئے۔ واقعی یہ حکم حجاب نہایت درجہ قلوب کی پاکیزگی کا موجب ہے۔ مردوں اور عورتوں کا وہ کھلا میل جول جو یورپ میں مروج ہے اس نے اس قدر تمام قلوب کو ناپاک کر دیا ہے جس کا نتیجہ زنا کی کثرت میں کھلا کھلا نظر آ رہا ہے۔ اسلام کے احکام اعلیٰ درجہ کی حکمت پر مبنی ہیں۔ جہاں عورتوں کے مردوں کے سامنے آئے بغیر کام ہو سکتا ہے وہاں ان کو سامنے آنے سے روک دیا ہے اور یوں عورتوں کو ناپاک مردوں کے جذبات کا شکار ہونے سے بچایا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ضرورت کے وقت بھی عورتوں کو باہر نکلنے سے منع کیا گیا ہے باوجود اس حکم حجاب کے نبی کریم صلعم کی بیبیاں جنگوں میں شریک ہوتی تھیں صحابہ کی بیبیاں اپنے ضروری کاروبار کرتی تھیں۔ عورتیں مسجدوں میں جاتی تھیں۔ وعظ ونصیحت کی مجالس میں جاتی تھیں اور بخاری کی حدیث میں آنحضرت صلعم کا ارشاد اسی آیت کی تفسیر میں صاف طور پر مذکور ہے قَدْ اُذِنَ لَكُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَاجَتِكُنَّ تمہیں یہ اجازت ہے کہ اپنی ضرورت کے لیے باہر نکلو۔ یہ حکم حجاب ۵ سنہ ہجری کا ہے اور پردہ کے احکام میں سب سے پہلے نازل ہوا۔

كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ
اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ
اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ﴿٥٣﴾

اور تمھیں مناسب نہیں کہ اللہ کے رسول کو ایذا دو ۔ اور نہ یہ کہ اس کی بیویوں سے اس کے بعد کبھی نکاح کرو ۔ یہ بات اللہ کے نزدیک بہت بڑی ہے ٢٦٦٨

اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ
كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿٥٤﴾

اگر تم کچھ ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ تو اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَاۗىِٕهِنَّ وَلَآ اَبْنَاۗىِٕهِنَّ
وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَاۗءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ
اَبْنَاۗءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَاۗىِٕهِنَّ وَلَا
مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿٥٥﴾

ان پر اپنے باپوں (کے سامنے ہونے) میں کوئی گناہ نہیں اور نہ اپنے بیٹوں کے اور نہ اپنے بھائیوں کے اور نہ اپنے بھتیجوں کے اور نہ اپنے بھانجوں کے اور نہ اپنی عورتوں کے اور نہ اس کے جن کے ان کے داہنے ہاتھ مالک ہیں اور (اے بی بیو) اللہ کا تقویٰ کرو اللہ ہر چیز پر گواہ ہے ٢٦٦٩

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰۗىِٕكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَي النَّبِيِّ ۭ
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ
وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٥٦﴾

اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں اے لوگو جو ایمان لائے ہو اس پر درود بھیجو اور سلام بھیجو ٢٦٧٠

٢٦٦٨ اس حصّہ میں اوّل رسول اللہ کو ایذا دینے سے منع فرمایا اور یہ ایذا دینا آپ کے متعلق غلط باتوں کے پھیلانے سے تھا اور یہ کام اصل میں منافق کرتے تھے اور بعض مسلمان اپنی سادگی سے ان باتوں کو پھیلا دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اس قسم کے جھوٹے قصے منافقین کے مشتہر کردہ روایات میں بھی راہ پا گئے۔ مثلاً زینب کو دیکھنے کا قصہ جو صریحاً ایک باطل قصہ ہے ایسا ہی اور بعض باتیں منافقین نے مشتہر کر کے مسلمانوں میں پھیلا دیں۔ افسوس ہے کہ آج تک مسلمان اپنے بھولے پن سے بعض ایسی روایات کو مانتے چلے جاتے ہیں اور قرآن کریم پر تدبّر نہیں کرتے کہ کس طرح انہیں ایسی ایذا دینے والی باتوں کی تشہیر سے روکا گیا تھا۔

دوسرے حصّہ میں آپ کی ازواج سے نکاح سے روکا اس میں عیسائی معترضین کی نکتہ چینی محض عداوتِ حق کا نتیجہ ہے۔ سوائے حضرت عائشہ صدیقہ رض کے نبی کریم صلعم کی بیبیاں سب بیوہ تھیں اور ایک بی بی مطلقہ تھیں۔ پس اس حکم میں ذاتی غرض نبی کریم صلعم کی کیا ہو سکتی تھی۔ جب ازواج مطہرات کو اُمہات المومنین قرار دیا تو اس بات سے بھی روکا کہ آپ کے بعد انہیں کوئی شخص اپنے نکاح میں لائے کیونکہ بی بی بننے سے اس مرتبہ بلند سے گر کر ایک ادنیٰ حیثیت قبول کرنی پڑتی اور یہ ظاہر ہے کہ جو بی بی کسی دوسرے کے نکاح میں آجائیں ان کی وہ حیثیت ام المومنین ہونے کی باقی نہ رہتی اور اس کے ساتھ ہی وہ غرض بھی مفقود ہو جاتی جس کے لیے وہ نبی کریم صلعم کی زوجیت میں آئی تھیں۔ پھر وہ نمونہ کہاں دکھا سکتی تھیں جو نبی کی بی بی ہونے کی حیثیت میں دکھایا اور علاوہ اس کے زوجہ کی حیثیت میں خاوند کے بعض خیالات کا اثر ان پر ضرور پڑتا اور یہ بات خود موجب فتنہ ہوتی جب تمام دنیوی آسائشوں کو نبی کریم صلعم کی زوجیت کی خاطر ترک کیا تو یہ بھی ایک آسائش تھی جسے ترک کر دیا گیا جس طرح ان کا باقی آسائشوں کو ترک کرنا دین کے لیے ضروری تھا اسی طرح اس آسائش کو ترک کرنا بھی دین کی خاطر ضروری تھا۔

حضرت ماریہ قبطیہ رض کا یہاں سے ازواج مطہرات میں ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ یہ حکم ازواج کے لیے ہے اور نبی کریم صلعم کی وفات کے بعد آپ کو بھی ازواج میں شمار کر کے اس حکم کے ماتحت سمجھا گیا۔ حالانکہ اگر ان کی حیثیت لونڈی کی ہوتی تو وہ ازواج میں داخل نہ ہوتیں بلکہ ما ملکت ایمانہم میں داخل کر کے انھیں اس حکم سے مستثنےٰ قرار دیا جاتا۔ صحابہ کے اس عمل نے ان کے ازواج میں سے ہونے کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے۔

اس آیت کے شان نزول میں جو بعض باتیں لکھی ہیں کہ فلاں صحابی نے یوں کہا تھا تو وہ منافقین کی انہی ایذا دہ باتوں میں سے ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا۔ اور جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ منافق ایسی باتیں کہتے تھے یہی صحیح ہے۔

٢٦٦٩ یہ استثنا اظہار زینت میں ہے عام عورتوں کے لیے اسی کی مثل حکم سورۂ نور میں گزر چکا ہے دیکھو ع ٢٣٢٤ ابن سعد نے زہری سے روایت کی ہے کہ اس حکم میں ہر ایک ذی رحم محرم شامل ہے نسب سے ہو یا رضاع سے۔

ع ٢٦٧٠ آنحضرت صلعم پر درود: اللہ اور فرشتوں کی صلوٰۃ کے متعلق دیکھو ع ٢٦٦٠ یہاں مومنوں کو حکم ہے کہ تم بھی صلوٰۃ بھیجو۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ
لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ وَ اَعَدَّ
لَہُمۡ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ﴿۵۷﴾

وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں ان پر اللہ نے دنیا اور آخرت میں لعنت کی ہے اور ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کیا ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ
بِغَیۡرِ مَا اکۡتَسَبُوۡا فَقَدِ احۡتَمَلُوۡا
ع بُہۡتَانًا وَّ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۵۸﴾

اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا دیتے ہیں بغیر اس کے کہ انھوں نے (قصور) کیا ہو تو وہ بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اُٹھاتے ہیں ۲۶۷۱ء

یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ قُلۡ لِّاَزۡوَاجِکَ وَ بَنٰتِکَ
وَ نِسَآءِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ یُدۡنِیۡنَ عَلَیۡہِنَّ
مِنۡ جَلَابِیۡبِہِنَّ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَنۡ
یُّعۡرَفۡنَ فَلَا یُؤۡذَیۡنَ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ
غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۵۹﴾

اے نبی اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچان لی جائیں تو انھیں ایذا نہ دی جائے۔ اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۲۶۷۲ء

صلعم سے دریافت کیا گیا کہ کس طرح آپ پر صلوٰۃ بھیجیں تو آپ نے فرمایا یوں کہو اللّٰھمّ صلّ علی محمّد وعلیٰ اٰل محمد کما صلّیت علی ابراھیم وعلیٰ اٰل ابراھیم انّك حمید مجید۔ اللّٰھم بارك علی محمّد وعلیٰ اٰل محمّد کما بارکت علی ابراھیم وعلیٰ اٰل ابراھیم انك حمید مجید۔ ایک حدیث کا منکر استہزا کے طور پر کہتا ہے کہ خدا نے تو مومنوں کو حکم دیا تھا کہ نبی پر صلوٰۃ بھیجیں۔ یہ خدا کو کہتے ہیں تو نبی پر صلوٰۃ بھیج۔ اس استہزا کی وجہ جہالت ہے اللہ کی صلوٰۃ اور بندوں کی صلوٰۃ دو مختلف چیزیں ہیں۔ بندے خود تو کوئی طاقت نہیں رکھتے کہ وہ نبی پر صلوٰۃ بمعنی مغفرت یا برکت بھیجیں مغفرت اور برکات کا سرچشمہ تو اللہ تعالیٰ ہے اس لیے مومنوں کا صلوٰۃ بھیجنا سوائے اس کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں دیکھو ۲۶۶۰ء اور یہ کہنا کہ انہیں الفاظ کو دوہرایا جائے جو قرآن شریف میں ہیں اس سے بھی بڑھ کر جہالت ہے۔ قرآن شریف ایک کام کے لیے ایک حکم دیتا ہے اس کی تعمیل یہ نہیں کہ ہم حکم کو رٹتے جائیں۔ کیا اقیموا الصلوٰۃ کے حکم کی تعمیل یوں ہو جائے گی کہ ہم بھی وظیفہ کرتے رہیں اقیموا الصلوٰۃ، اقیموا الصلوٰۃ۔ یا حکم ہو کہ استغفار کرو تو ہم بھی کہتے رہیں استغفار کرو یا حکم ہو کہ اللہ کو بہت یاد کرو تو ہم بھی کہتے رہیں اللہ کو بہت یاد کرو۔ اور نبی صلعم پر صلوٰۃ بھیجنے سے نہ صرف آنحضرت صلعم سے محبت پیدا ہوتی ہے بلکہ ان فیوض و برکات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا ہے جو آپ کی وساطت سے دنیا کو پہنچ رہے ہیں اور احادیث درود شریف کی فضیلت سے بھری پڑی ہیں۔
یہ ذکر ایذا کی باتوں کے بالمقابل کیا ہے یعنی ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو ایذا کی باتیں کرتے ہیں تو مومنوں کو حکم ہوتا ہے کہ تم آپؐ کے لیے رحمت و برکت کی دعا کرو جس میں اشارہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی عزت و مرتبہ دنیا میں ترقی کرتا رہے گا۔ کیونکہ جو دعا اللہ تعالیٰ خود سکھاتا ہے وہ ضائع نہیں ہو سکتی۔

۲۶۷۱ء آنحضرت صلعم کے ذکر کے بعد عام مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ذکر کر کے بتایا کہ نیک اور پاک لوگوں پر تہمت لگانے والے خواہ وہ پاک لوگ خود نبی ہوں یا ان کے ساتھی سب ایک حکم میں ہیں۔ جو لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم پر اور ائمہ اور مجدّدین پر ناپاک تہمتیں لگاتے ہیں وہ غور کریں۔

۲۶۷۲ء یدنین۔ دَنیٰ کے معنی ہیں قریب ہوا اور اَدنیٰ کے معنی ہیں دوسری چیز کو قریب کیا اور یہاں چادروں کے قریب کرنے سے مراد انکا اوڑھنا ہے۔
جلابیب۔ جِلباب کی جمع ہے۔ جَلَب سے جس کے معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ چلانا ہیں۔ اور جِلباب قمیص کو کہتے ہیں اور جِلباب ایک کپڑے کو کہتے ہیں جو خِمار یعنی اوڑھنی سے بڑا ہوتا ہے جس کے ساتھ عورت اپنے سر اور سینہ کو ڈھانک لیتی ہے اور یہاں جلباب سے مراد خمار یعنی اوڑھنی ہے (ل) اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہر ایک وہ لباس ہے جو ستر کا کام دے یا کپڑوں کے اوپر پہنا جائے (جیسے اوور کوٹ) اور انصار کی عورتیں سیاہ لباس اوپر سے پہنتی تھیں (د)
پردہ یا زینت کو ڈھانکنے کا ایک حکم سورۂ نور میں گزر چکا ہے ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن (النور ۲۴۔ ۳۱) یعنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈال لیں اور ایک حکم یہاں ہے کہ جلباب اوڑھ لیں۔ سورۂ نور کا نزول بھی پانچویں سال ہجرت کا ہے اور اس سورت کا نزول بھی پانچویں سال ہجرت میں ہی شروع ہوا۔ اس لیے غور طلب یہ ہے کہ ان دونوں حکموں میں سے پہلے کونسا حکم نازل ہوا، ظاہر ہے کہ اگر سورۂ نور کا حکم پہلے نازل ہو چکا ہوتا تو پھر اس حکم کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہاں یہ ذکر ہے کہ مسلمان بیبیاں چادریں اوڑھ لیا کریں تاکہ پہچان لی جائیں اور اگر وہ پہلے ہی چادریں اوڑھتی ہوتیں تو انہیں سے پہچان لی جاتیں۔ پس یہ الفاظ صاف بتاتے

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي
الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا
يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۝٦٠

اگر منافق اور وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور مدینہ میں بُری خبریں اڑانے والے باز نہ آئیں تو ہم تجھے ان کے خلاف اٹھائیں گے پھر وہ اس (شہر) میں تیرے ساتھ نہ رہنے پائیں گے مگر تھوڑا ۲۶۷۳

مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا
تَقْتِيْلًا ۝٦١

پھٹکارے ہوئے جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور قتل کیے جائیں گے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝٦٢

(ایسا ہی) اللہ کا قانون ان میں (رہا ہے) جو پہلے گزر چکے اور تو اللہ کے قانون میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا۔

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۭ قُلْ اِنَّمَا
عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ
السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ۝٦٣

لوگ تجھ سے (موعود) گھڑی کے متعلق پوچھتے ہیں کہہ دے اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور تجھے کیا معلوم ہے کہ شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝٦٤

اللہ تعالیٰ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے جلتی ہوئی آگ تیار کی ہے

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا
وَّلَا نَصِيْرًا ۝٦٥

ہمیشہ اس میں رہیں گے نہ کوئی دوست پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ
يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ۝٦٦

جس دن اُن کے مُنہ آگ میں اُلٹائے جائیں گے کہیں گے اے کاش! ہم نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاۗءَنَا

اور کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں

ہیں کہ پہلے یہ حکم نازل ہوا ہے اور اس کی غرض صرف اسی قدر تھی کہ مسلمان بیبیوں کو شہر کے بدمعاش تکلیف نہ دیں۔ کیونکہ روایات سے ثابت ہے کہ لونڈیاں اور آزاد عورتیں رات کو جب قضائے حاجت کے لیے باہر نکلتیں تو بعض بدمعاش رستوں پر بیٹھے رہتے اور عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے اور پھر عذر کر دیتے کہ ہم نے اس بی بی کو لونڈی خیال کیا تھا۔ تو پس یہ ایک امتیازی نشان قرار دیا گیا جس سے شریف عورتیں پہچانی جا سکیں اور کوئی ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ پس اصل یہ ہے کہ سب سے پہلے حکم حجاب نازل ہوا دیکھو ع۲۶۶۷ اس کے بعد یہ حکم نازل ہوا جیسا کہ بخاری میں حضرت سودہؓ کے باہر نکلنے کے واقعہ میں ہے بعد ما ضرب الحجاب اور چونکہ چھیڑ چھاڑ ایک عارضی بات تھی اس لیے مستقل حکم سورۂ نور میں دیا کہ عورتیں زینت کو چھپا کر باہر نکلا کریں اور چادریں اوپر ڈال لیا کریں پس جلباب اور خمار سے ایک ہی مراد ہے جیسا کہ لسان العرب میں بھی ہے۔ اور اس جلباب کی غرض انہی مقامات کو ڈھانکنا ہے جن کی تشریح سورۂ نور میں ہے دیکھو ع۲۳۲۲ اور اس موقعہ پر ابن جریر میں دونوں قسم کے قول منقول ہیں ایک یہ کہ جلباب سے منہ بھی ڈھانکا جاتا تھا اور صرف ایک آنکھ کھلی چھوڑی جاتی تھی۔ اور دوسرا یہ کہ جلباب صرف پیشانی پر باندھی جاتی تھی۔ اور اس دوسرے قول کی تائید چونکہ سورۂ نور سے ہوتی ہے اس لیے یہی معنی مراد ہیں۔

۲۶۷۳ مرجفون۔ دیکھو ع۱۱۱۳ اور مرجفون سے مراد وہ لوگ ہیں جو جھوٹی خبریں پھیلا کر لوگوں میں اضطراب پیدا کرتے تھے اور جب لوگ بری خبروں اور فساد کی باتوں کے ذکر میں لگ جائیں تو کہا جاتا ہے اَرْجَفَ الْقَوْمُ (ل)

نغرینک۔ غِراء وہ ہے جس سے کسی چیز کو دوسری سے چپکایا جاتا ہے اور اِغْراء کے معنی برانگیختہ کرنا ہیں فاغرینا بینہم العداوۃ (المائدۃ۔ ۱۴) (غ)

اس آیت میں انہی لوگوں کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلعم اور مومنوں کے متعلق ایذا دہ باتیں کرتے تھے۔ ان کے متعلق یہاں صریح پیشگوئی ہے کہ آخر کار یہ یا تو ان باتوں سے رک جائیں گے ورنہ مدینہ سے نکال دیئے جائیں گے۔

فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا ﴿۶۷﴾	کی اطاعت کی سو انھوں نے ہمیں رستہ سے گمراہ کر دیا۔
رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَابِ	اے ہمارے رب انھیں دوچند عذاب دے اور ان
وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِیْرًا ﴿۶۸﴾ ع ۸	پر بہت بڑی لعنت کر۔
یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں
اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ	نے موسیٰ کو ایذا دی سو اللہ نے اُسے اس سے بری کیا جو وہ
وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِیْهًا ؕ﴿۶۹﴾	کہتے تھے اور وہ اللہ کے نزدیک مرتبے والا تھا ۲۶۷۴
یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ تعالیٰ کا تقوٰے کرو اور سیدھی
قَوْلًا سَدِیْدًا ﴿۷۰﴾	بات کہو۔
یُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ	وہ تمھارے لیے تمھارے عملوں کی اصلاح کریگا اور تمھارے
ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ	گناہ تمھیں بخش دے گا اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی
فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا ﴿۷۱﴾	اطاعت کی اس نے بڑی بھاری کامیابی حاصل کی ۲۶۷۵
اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ	ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا
وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ	تو انھوں نے انکار کیا کہ اس کا بوجھ اٹھائیں اور اس سے
یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا	ڈرے اور انسان نے اس کا بوجھ اُٹھا لیا۔
الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾	وہ بڑا ظلم کرنے والا بڑا جاہل ہے ۲۶۷۶

۲۶۷۴ حضرت موسیٰ کی بریت کا ذکر: بخاری میں حضرت موسیٰ کو بنی اسرائیل کے ایذا دینے کا قصہ یوں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ لوگوں سے شرم کی وجہ سے اپنے جسم کو بہت چھپایا کرتے تھے تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ موسیٰ کو برص کی بیماری ہے یا کوئی اور بیماری ہے جس کی وجہ سے وہ لوگوں کے سامنے ننگے نہیں ہوتے تو اللہ تعالیٰ نے جب ان کی بریت کا ارادہ کیا تو یوں ہوا کہ ایک دن حضرت موسیٰ تنہائی میں ننگے نہا رہے تھے اور کپڑے ایک پتھر پر رکھے ہوئے تھے تو پتھر کپڑے لیکر بھاگا تب حضرت موسیٰ اس کے پیچھے پیچھے بھاگے یہاں تک کہ بنی اسرائیل کے لوگوں کے سامنے آگئے اور انہوں نے دیکھ لیا کہ آپ کو ایسی کوئی بیماری نہیں اور حضرت موسیٰ نے اپنے کپڑے لے لیے اور پتھر کو مارنا شروع کیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بخاری کی حدیث ہے مگر بخاری کتاب اللہ نہیں اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ایک ایک حرف واقعی رسول اللہ صلعم کے منہ سے نکلا ہوا ہے اور اس لیے اس کے ہر ایک لفظ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ممکن ہے یہ روایت ہی غلط ہو یا رسول اللہ صلعم کے الفاظ پورے طور پر محفوظ نہ رہے ہوں۔ اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ موسیٰ کا یہ ایذا دینا آپ پر ہارون کے قتل کا الزام دینا تھا (ث) اور بعض روایات میں ہے کہ آپ پر نعوذ باللہ زنا کا الزام لگایا گیا تھا (د) اور اس آخری روایت کے مطابق۔ بائبل (گنتی ۱۲: ۱) میں ہے کہ حضرت موسیٰ کی بہن نے ان پر ان کی کوشی بی بی کے متعلق کچھ الزام لگایا تھا اور اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ یہ زینب سے نکاح کے قصہ میں نازل ہوئی (د) تو یہ بات بھی بائبل کے بیان کی موید ہے اور حق بھی یہی ہے کہ حضرت موسیٰ کا ذکر یہاں قطعاً اصل مقصود نہیں بلکہ بتانا یہ ہے کہ نبی صلعم پر اسی طرح کا الزام لگایا گیا اور اس میں کچھ شک معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت زینب کے متعلق جو بعض قصے روایات میں آگئے ہیں یہ منافقوں نے بنا کر مشہور کیے اور یہی وہ روایت ہے جس کی طرف یہاں اشارہ ہے اور یوں قرآن کریم نے ان ناپاک قصوں کی تردید کی ہے

۲۶۷۵ کاش مسلمان ان آیات پر غور کریں۔ مسلمانوں کی کامیابی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں ہے دوسری قوموں کی نقل سے کچھ نہیں بنے گا۔

۲۶۷۶ یحملنھا۔ حملھا الانسان۔ زجاج کا قول ہے کہ یہاں یحملنھا کے معنی ہیں اس میں خیانت کریں اور امانت یہاں وہ فرائض ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مقرر کیے ہیں اور طاعت اور معصیت اور اسی طرح تفسیر میں آیا ہے اور انسان اس جگہ کافر اور منافق ہے اور ابو اسحاق اس آیت کے متعلق کہتے ہیں کہ حقیقت اس کی یہ ہے واللہ اعلم کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو وہ امانت دی ہے جو ان پر اپنی طاعت سے فرض کیا ہے اور آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو بھی امانت دی ہے جیسا کہ فرمایا ائتیا طوعا او کرھا قالتا اتینا طائعین (حٰم السجدۃ ۴۱-۱۱) سو اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ آسمان اور زمین نے امانت کو نہیں اٹھایا یعنی اسے

لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۳﴾ ع

تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے اور (تاکہ) اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں پر رجوع برحمت کرے۔ اور اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۲۶۷۷

ادا کیا اور ہر شخص جو امانت میں خیانت کرتا ہے وہ امانت کو اُٹھاتا ہے جس طرح گناہ کرے تو کہتے ہیں حَمَلَ الاثم ...... اور آسمانوں اور زمین نے انکار کیا کہ امانت کا بوجھ اٹھائیں اور اس امانت کو ادا کیا اور اس کا ادا کرنا اللہ کی طاعت ہے اس میں جو انہیں حکم دیا اور اس پر عمل کرنا اور معصیت کا ترک کرنا اور وحملها الانسان میں حسن کہتے ہیں کافر اور منافق مراد ہے انہوں نے امانت کا بوجھ اپنے اوپر لیا یعنی اس میں خیانت کی اور اطاعت نہ کی اور یہ معنی واللہ اعلم صحیح ہیں اور جو کوئی انبیاء اور صدیقوں اور مومنوں میں سے اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو اسے ظلوم جہول نہیں کہا جاتا اور اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے جو آگے آتا ہے لیعذب اللہ المنافقین۔ ابو منصور کہتے ہیں اور کسی نے آیت کی یہ تفسیر نہیں کی جو ابو اسحاق نے کی ہے اور شاعر کے قول سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ حمل امانت سے مراد اس کی خیانت اور ادا نہ کرنا ہے اذ اَنْتَ لَمْ تَبْرَحْ تُؤَدِّی امانۃ۔ وتَحْمِلُ اُخرٰی افْرَحَتْكَ الودائعُ جہاں تحمل اخری سے مراد ہے اس میں خیانت کرتا ہے اور اسے ادا نہیں کرتا (ل) اور بعض نے حمل امانت سے مراد فرائض انسانی کا اختیار کرنا لیکر ظلوم سے مراد لی ہے کہ باوجود ضعف کے اس امانت کو لے لیا اور یہ اپنے نفس پر ظلم تھا اور جہول سے مراد لی ہے کہ عاقبت کو نہ سوچا مگر اس میں بُعد ہے اور سیاق مضمون پہلے معنے کو ہی چاہتا ہے۔

۲۶۷۷ اس میں بتایا کہ عذاب درحقیقت اسی خیانت کا نتیجہ ہے جو انسان کرتا ہے یعنی جب وہ ان قوٰی کو جو اللہ تعالیٰ نے اسے دیئے ہیں ٹھیک طور پر استعمال نہیں کرتا تو اس کا نتیجہ دکھ ہوتا ہے۔

اٰیاتھا ۵۴ (۳۴) سُوْرَةُ سَبَاٍ مَّكِّيَّةٌ رکوعاتھا ۶

نام: اس سورت کا نام السبا ہے اور اس میں چھ رکوع اور ۵۴ آتیں ہیں۔ سبا کی قوم ملک یمن میں رہتی تھی اور ان کی تباہی کا واقعہ آنحضرت صلعم کے زمانہ سے قریب ترین تھا۔ یعنی یہ پہلی یا دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے اور یوں بھی ان کا مسکن حجاز کے بالکل قریب تھا۔ اور قریش کی یمن میں اغراض تجارت کے لیے آمد و رفت بھی بہت تھی پس مکان اور زمانہ ہر دو کے لحاظ سے یہ واقعہ بہت قریب کا تھا اور اس کی طرف خصوصیت سے قریش کو پھر مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ نعمتوں کے بعد ناشکری پر اللہ تعالیٰ اظہار ناپسندیدگی بھی فرمایا کرتا ہے۔

خلاصہ مضمون: سب سے پہلے رکوع میں بتایا کہ نتائج اعمال حق ہیں۔ اچھے کاموں کا نتیجہ عزت اور راحت ہے بُرے کاموں کا نتیجہ ذلت اور دکھ ہے یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے۔ اور قوموں کی عزت و ذلت میں ان کے عروج اور بربادی میں یہی کام کرتا ہے۔ دوسرے رکوع میں بتایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر اس کے اعمال حسنہ کی وجہ سے انعام کرتا ہے پھر وہ قوم ناشکری کرتی ہے تو وہ بھی اس ناشکری کی سزا پاتی ہے اور مثال کے طور پر پہلے داؤدؑ و سلیمانؑ کے ماتحت بنی اسرائیل کے غلبہ کا اور پھر سلیمان کے بعد ان کے زوال کا ذکر کیا اور ایسا ہی قوم سبا پر انعامات اور سلب انعام کا ذکر کیا۔ تیسرے رکوع میں بتایا کہ مومنوں کا کفار سے مقابلہ ہوگا اور مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی نصرت ملیگی اور وہ غالب ہونگے۔ چوتھے رکوع میں مخالفت کرنے والوں کا ذکر کیا کہ ایک سرگروہ ہیں جو حق کی مخالفت کے لیے لوگوں کو اکساتے ہیں اور دوسرے بغیر سوچے سمجھے ان کی پیروی کرتے ہیں۔ پانچویں رکوع میں بتایا کہ کثرت مال جس پر انسان بھول جاتا ہے کوئی فخر کا مقام نہیں اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں سے پہلی قوموں کو اس قدر حصہ دیا کہ کفار قریش ان کے مقابل پر مال دنیا کی کثرت کے لحاظ سے کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ اور آخری رکوع میں سورت کو یہ بتا کر ختم کیا کہ حق کا آنا بیفائدہ نہیں وہ غالب آکر رہے گا۔

تعلق: جب پچھلی سورتوں میں اسلام کے غلبہ کی پیشگوئیاں کیں اور آخر سورۂ احزاب میں دکھا بھی دیا کہ اسلام کو کفر کی کوئی طاقت تباہ نہیں کر سکی تو اب ایک ایسی سورت اسکے بعد رکھی ہے جس میں یہ بتایا ہے کہ یہ انعام جو مسلمانوں پر ہوا محض ان کے اعمال کے لحاظ سے ہوا اگر نعمت کے ملنے پر انہوں نے ناشکری کی تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان سے پہلے قوموں کا ہوا۔

زمانہ نزول: یہ سورت بالاجماع مکّی ہے۔ اس کے زمانہ نزول کی تعیین مشکل ہے لیکن نفس مضمون کے لحاظ سے گو بہت ابتدائی سورتوں میں سے نہیں۔ مگر بہت پچھلے زمانہ کی بھی نہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ وَ لَہُ الۡحَمۡدُ فِی الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ ہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱﴾

سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس کا وہ (سب کچھ) ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور آخرت میں (بھی) اسی کی تعریف ہے اور وہ حکمت والا خبردار ہے۔

یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَ مَا یَخۡرُجُ مِنۡہَا وَ مَا یَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعۡرُجُ فِیۡہَا ؕ وَ ہُوَ الرَّحِیۡمُ الۡغَفُوۡرُ ﴿۲﴾

وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اُترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے اور وہ رحم کرنے والا بخشنے والا ہے ۲۶۷۸

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَا تَاۡتِیۡنَا السَّاعَۃُ ؕ قُلۡ بَلٰی وَ رَبِّیۡ لَتَاۡتِیَنَّکُمۡ ۙ عٰلِمِ الۡغَیۡبِ ۚ لَا یَعۡزُبُ عَنۡہُ مِثۡقَالُ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الۡاَرۡضِ وَ لَاۤ اَصۡغَرُ مِنۡ ذٰلِکَ وَ لَاۤ اَکۡبَرُ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۳﴾

اور کافر کہتے ہیں وہ گھڑی ہم پر نہیں آئے گی۔ کہہ، ہاں میرے رب کی قسم (جو) غیب کا جاننے والا ہے وہ تم پر آکر رہے گی اس سے ایک ذرّہ بھر بھی غائب نہیں رہتا (نہ آسمان) میں اور نہ زمین میں اور نہ اس سے چھوٹا اور نہ بڑا مگر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں ہے۔

لِّیَجۡزِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ رِزۡقٌ کَرِیۡمٌ ﴿۴﴾

تا کہ ان لوگوں کو بدلہ دے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں ان کے لیے مغفرت اور عزّت والا رزق ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ سَعَوۡ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیۡنَ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ مِّنۡ رِّجۡزٍ اَلِیۡمٌ ﴿۵﴾

اور جو لوگ ہماری آیتوں کے ہرانے میں کوشش کرتے ہیں۔ ان کے لیے سخت قسم کا دردناک عذاب ہے۔

وَ یَرَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ہُوَ الۡحَقَّ ۙ وَ یَہۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ ﴿۶﴾

اور وہ جنھیں علم دیا گیا ہے جانتے ہیں کہ وہ جو تیری طرف تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا وہی سچ ہے اور اس کا رستہ دکھاتا ہے جو غالب تعریف کیا گیا ہے۔

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ہَلۡ نَدُلُّکُمۡ عَلٰی رَجُلٍ یُّنَبِّئُکُمۡ اِذَا مُزِّقۡتُمۡ کُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّکُمۡ لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴿۷﴾

اور کافر کہتے ہیں کیا ہم تمھیں ایک آدمی بتائیں جو تمھیں خبر دیتا ہے کہ جب تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو پھر تم ایک نئی پیدائش میں آؤ گے ۲۶۷۹

۲۶۷۸ اس میں اپنے جسمانی اور روحانی قوانین کی طرف توجہ دلائی ہے زمین میں داخل ہونے والی چیز پانی ہے اور اس سے نکلنے والی سبزی اور روئیدگی ہے۔ یہ تو جسمانی قانون ہے اور اس کے مقابل پر روحانی قانون یہ ہے کہ آسمان سے وحی اُترتی ہے جو پانی کے مشابہ ہے اور اس میں چڑھنے والی چیز عمل ہے اور انہی نتائج اعمال کے حق ہونے کی طرف ہی اس رکوع میں توجہ دلائی ہے۔

۲۶۷۹ مزقتم۔ مَزْق کپڑے وغیرہ کے پھاڑنے کو کہا جاتا ہے اور کسریٰ کو خط لکھنے کی حدیث میں آتا ہے لمّا مَزَّقَہٗ دعا علیہم ان یُمَزَّقوا کل مُمَزَّق اور تمزیق کے معنی پھاڑنا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہیں۔ اور ان کی تمزیق سے مراد ان کی پراگندگی اور زوال ملک ہے (ل)

اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَمْ بِہٖ جِنَّۃٌ ؕ
بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ
فِی الْعَذَابِ وَ الضَّلٰلِ الْبَعِیْدِ ﴿۸﴾

اس نے اللہ پر جھوٹ بنایا ہے یا اسے جنون ہے بلکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ عذاب میں اور دور کی گمراہی میں ہیں۔

اَفَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا بَیْنَ اَیْدِیْہِمْ وَمَا
خَلْفَہُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنْ
نَّشَاْ نَخْسِفْ بِہِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ
عَلَیْہِمْ کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ
لَاٰیَۃً لِّکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ﴿۹﴾ ع

کیا وہ اس پر غور نہیں کرتے جو اِن کے سامنے اور جو اِن کے پیچھے آسمان اور زمین سے ہے۔ اگر ہم چاہیں تو انھیں زمین میں نابود کردیں۔ یا اُن پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دیں۔ اس میں ہر ایک رجوع کرنے والے بندے کے لیے نشان ہے ۲۶۸۰

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ؕ یٰجِبَالُ
اَوِّبِیْ مَعَہٗ وَ الطَّیْرَ ۚ وَ اَلَنَّا لَہُ
الْحَدِیْدَ ﴿۱۰﴾ لا

اور داؤدؑ کو ہم نے اپنی طرف سے بزرگی دی۔ اے پہاڑو! اس کے ساتھ تسبیح کرو اور پرندوں کو (ان کے کام میں لگایا) اور ہم نے ان کے لیے لوہے کو نرم کردیا ۲۶۸۱

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِی السَّرْدِ
وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۱﴾

کہ فراخ زرہیں بنا اور (ان کے) بنانے میں اندازہ نگاہ رکھ اور اچھے عمل کرو جو تم کرتے ہو مَیں اُسے دیکھتا ہوں ۲۶۸۲

وَ لِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّہَا شَہْرٌ وَّ
رَوَاحُہَا شَہْرٌ ۚ وَ اَسَلْنَا لَہٗ عَیْنَ
الْقِطْرِ ؕ وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ

اور سلیمان کے لیے ہوا کو (کام میں لگا دیا) اس کی صبح کی منزل ایک مہینے کی راہ تھی اور شام کی منزل بھی ایک مہینے کی راہ اور ہم نے اس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہادیا اور جنّوں میں سے کچھ وہ تھے جو اسکے

۲۶۸۰ع مراد یہ ہے کہ زمینی یا آسمانی عذاب سے ہلاک کردیں دیکھو ع۱۸۴۴۔

۲۶۸۱ع اَوِّبِی۔ اَوْب کے لیے دیکھو ع۳۸۵ اور اَوَّبَ اور اٰبَ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی رَجَعَ یا لوٹا۔ اور یہاں اَوِّبِی کے معنی ہیں سَبِّحِی یعنی تسبیح کرو یا تسبیح کو لوٹاؤ اور اِیَاب کے معنی بھی رجوع ہیں اِنَّا اِلَیْنَا اِیَابَہُمْ (الغاشیۃ ۸۸-۲۵) اور اَوْبَۃ بمعنی رجوع تَوْبَۃ کی طرح ہے اور اَوَّاب اللہ تعالیٰ کی طرف بکثرت رجوع کرنے والا ہے یا تسبیح کرنے والا یا فرمانبردار یا وہ جو توبہ اور طاعت کی طرف لوٹ کر آتا ہے داؤد ذا الاید انہٗ اوّاب (صٓ ۳۸-۱۷) (ل)

اَلَنَّا لِین سے ہے لَانَ کے معنی ہیں نرم ہوا اور اَلَانَ کے معنی وہی ہیں جو لَیَّنَ کے ہیں یعنی اسے نرم کیا۔

بنی اسرائیل پر جو انعام ظاہری ہوا یعنی حکومت اور بادشاہت وہ اپنے کمال کو داؤد اور سلیمان میں پہنچا اس لیے یہاں انہیں دو کا ذکر کیا ہے۔ اصل غرض تو قوم سبا کا ذکر ہے لیکن چونکہ سبا کی بڑائی اور عظمت کا زمانہ حضرت سلیمان سے تعلق رکھتا ہے اس لیے تمہیداً پہلے داؤد اور سلیمان کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انعام دیتا ہے اور اس کے بعد قومیں ظلم اور زیادتی کرتی ہیں تو پھر ان کی پاداش بھی ملتی ہے۔ پہاڑوں کی تسبیح اور پرندوں کی تسخیر اور زرہوں کے بنانے کے لیے دیکھو ع۲۱۷۳ اور لوہے کے نرم کرنے سے کیا غرض ہے یہ آگے خود بتایا یعنی یہ کہ زرہیں بناؤ اور لوہے کے نرم ہونے سے ہی چیزیں بن سکتی ہیں۔

۲۶۸۲ع سابغات۔ سابغ کی جمع ہے اور دِرْعٌ سابغٌ کامل فراخ زرہ کو کہتے ہیں (غ) دیکھو ع۲۶۰۸۔

سرد۔ سَرْد ایک چیز کو دوسری کے پیچھے لانا ہے اسی سے کہا جاتا ہے سَرَدَ الحدیث اور آنحضرت صلعم کے کلام کی صفت میں ہے لم یکن یَسْرُد الحدیث سردا یعنی ایک بات کو دوسری کے پیچھے جلد جلد نہ لاتے تھے اور سرد کے معنی سوراخ کرنا بھی آتے ہیں اور حلقوں کا ایک دوسرے میں داخل کرنا جیسے زرہ کے بنانے میں (ل)

حضرت داؤد کے ذکر میں دوسری جگہ ہے وعلّمنٰہ صنعۃ لبوس لکم لتحصنکم من باسکم (الانبیاء ۲۱-۸۰) اور یہاں بھی سابغات سے مراد فراخ زرہیں ہیں اور قدر فی السرد سے مراد عموماً یہ لی گئی ہے کہ زرہ کے حلقوں کو مناسب اندازہ سے بنا مگر ایک قول یہ ہے کہ زرہ کے بنانے میں اندازہ سے وقت صرف کرو۔

يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿١٢﴾ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَاۗءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ۭ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿١٣﴾ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰي مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَاۗبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿١٤﴾

سامنے اس کے رب کے حکم سے کام کرتے اور جو کوئی ان میں سے ہمارے حکم سے پھرتا ہم اسے جلتی ہوئی آگ کا عذاب چکھاتے ٢٦٨٣ وہ اس کے لیے جو وہ چاہتا تھا بناتے تھے (یعنی) مسجدیں اور مجسّمے اور (بڑے بڑے) لگن جیسے تالاب اور ایک جگہ دھری رہنے والی دیگیں۔ اے آل داؤد شکر کرتے ہوئے عمل کرو۔ اور میرے بندوں میں سے تھوڑے شکرگزار ہیں ٢٦٨٤ سو جب ہم نے اس پر موت کا حکم صادر کیا تو انھیں اس کی موت کا پتہ کسی چیز نے نہ دیا مگر ایک زمین کے کیڑے نے جو اس کے عصا کو کھا گیا۔ سو جب وہ گر گیا جنوں پر واضح ہوگیا کہ اگر وہ غیب جانتے تو رُسوا کرنے والے دُکھ میں نہ رہتے ٢٦٨٥

اور سارا وقت اس میں صرف نہ کردو (د) اور یہی معنی سیاق کے مطابق ہیں۔ کیونکہ آگے آتا ہے واعملوا صالحا۔ مطلب یہ ہے کہ نبی کا کام نہیں کہ سارا زور جنگ پر صرف کردے وہ ایک ضرورت وقتی ہے اور اصل غرض اعمال صالحہ ہیں۔

ع٢٦٨٣ اسلنا۔ سَیْل۔ پانی کے سیلاب کو کہتے ہیں سیل العرم (١٦) اور سال الشئ کے معنی ہیں ایک چیز بہ گئی اور اَسَلْتُہ کے معنی ہیں میں نے اسے بہادیا اور اِسالۃ فی الحقیقت قِطر کی وہ حالت ہے جو پگھلنے کے بعد حاصل ہوتی ہے (غ) اور عین القطر سے مراد اصل میں تانبے کی کان ہے (د) اور بہانا اس لیے کہا کہ تانبا پگھلا کر کام میں لایا جاتا تھا۔

حضرت سلیمان کے لیے تسخیر ہوا پر دیکھو ع٢١٧٥ صبح اور شام کے آنے جانے کو شہر کہا ہے یعنی ایک ماہ کا سفر اور مطلب یہ لیا گیا ہے کہ صبح کے وقت اتنی دور پہنچا دیتی تھی کہ ایک مہینہ میں آدمی سفر کرسکے۔ اگر اس سے جہازوں کا چلنا مراد لیا جائے جو ہوا سے چلتے تھے تو مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ صبح کے وقت روانہ ہوئے شام تک اتنا سفر کرلیتے تھے جس قدر ایک ماہ میں کیا جاتا اور ایسا ہی شام کے وقت چلے ہوئے صبح تک اتنا ہی کام کرلیتے اور یا مطلب غدوھا سے ان کی کسی ملک کی طرف روانگی ہے اور رواح سے مراد ان کی واپسی جس طرح چارپایوں کے شام کو گھر آنے کو اراحۃ کہا جاتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایک ایک مہینہ تک کے سفر پر آپ کے جہاز جاتے تھے اور جنّوں سے مراد وہی لوگ ہیں جنہیں دوسری جگہ شیاطین کہا ہے دیکھو ع٢١٧٦ اور نذقہ من عذاب السعیر میں مراد بعض نے عذاب اُخروی لیا ہے اور بعض نے دنیا میں سزا دینا (د) اور جنّ معاملات میں تیز اور زود رس انسان کو بھی کہا جاتا ہے ع١٠١٥۔

ع٢٦٨٤ محاریب۔ محراب کی جمع ہے جس کے لیے دیکھو ع٤١٢ اور بنی اسرائیل کے محاریب ان کی مسجدیں تھیں جن میں وہ بیٹھتے تھے یا نماز کے لیے جمع ہوتے تھے اور فخرج علی قومہ من المحراب (مریم ١٩ - ١١) میں مسجد بھی مراد لی گئی ہے اور محراب بمعنی قصر یا محل بھی آتا ہے اور کہا گیا ہے کہ محراب وہ جگہ ہے جہاں بادشاہ لوگوں سے دور ہوکر الگ ہوتا ہے اور مسجد کے محراب کو بھی محراب اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں امام لوگوں سے الگ ہوتا ہے (ل)

جفان۔ جفنۃ کی جمع ہے کھانے کے برتن سے مخصوص ہے اور جَفْن (جمع اَجْفان) پلک کو کہتے ہیں (غ)

قدور۔ قِدْر کی جمع ہے جس میں گوشت پکایا جاتا ہے (غ) یعنی ہانڈی۔

تمثال یا مجسمے جو سلیمان کے لیے بنائے گئے بعض کے نزدیک حیوانات کے تھے بعض کے نزدیک فرشتوں اور انسانوں کے اور بائبل میں ہے "اس نے پاک ترین مکان میں دو کروبیوں کو تراش کر بنایا" (٢ تواریخ ٣ : ١٠) "اور گرداگرد اس کے نیچے بیلوں کی صورتیں تھیں"۔ "اور حورام نے برتن اور پھاوڑے اور کٹورے بنائے" (٢ تواریخ ٤ : ٣ و ١١) کہا گیا ہے کہ اس شریعت میں تصاویر وغیرہ کا بنانا جائز تھا مگر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایسی باتوں کے جواز یا عدم جواز کا انحصار نیات پر ہے۔

اعملوا آل داؤد شکرا میں شکرا کو بعض نے مفعول قرار دیا ہے یعنی شکر کے لیے عمل کرو نہ امید و بیم کے لیے اور بعض نے مفعول مطلق کیونکہ شکر بھی ایک نوع عمل ہے اور شکرا حال ہے اور مراد ہے شاکرین۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان باوجود بادشاہت کے جو کی روٹی کھاتے تھے اور موٹا پہنتے تھے۔

ع٢٦٨٥ منسأۃ۔ نَسْءٌ سے ہے جس کے معنی ہیں پیچھے ڈال دینا دیکھو ع١١٢٩ اور منسأۃ عصا کو کہتے ہیں اس لیے کہ اس سے چیز کو پیچھے کردیا جاتا ہے (غ)

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ﴿١٥﴾

سبا کے لیے ان کی سکونت کی جگہ میں ایک نشان تھا، دو باغ دائیں اور بائیں تھے۔ اپنے رب کے رزق سے کھاؤ اور اس کا شکر کرو اچھا شہر اور بخشنے والا رب ہے ۲۶۸۶

فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ ﴿١٦﴾

تو انھوں نے منہ پھیر لیا سو ہم نے ان پر زور کا سیلاب بھیجا اور ان کے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ بدل دیئے جن میں تلخ میوے اور جھاؤ اور کچھ تھوڑی سی بیریاں تھیں ۲۶۸۷

حضرت سلیمان کے عصا کو دیمک کے کھانے کا قصّہ: مفسرین نے یہاں ایک قصّہ لکھا ہے کہ حضرت سلیمان کی جب وفات قریب آئی تو انہوں نے دعا کی کہ میری موت کا علم جنوں کو نہ ہو، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جنّ علم غیب نہیں جانتے جیسا کہ انہیں دعوی تھا۔ چنانچہ آپ ایک عصا کا سہارا لیے کھڑے ہوئے حالت عبادت میں فوت ہو گئے اور اسی طرح ایک سال کھڑے رہے یہاں تک کہ دیمک نے عصا کو کھا لیا تب آپ گر پڑے اس قصّہ کی کوئی اصلیت توریت میں نہیں ہے اور گو ابن جریر نے اسے حدیث مرفوع کے طور پر بیان کیا ہے مگر ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس کی صحت میں نظر ہے اور اسے غریب اور منکر کہا ہے اور جنوں کو تو علم غیب کا دعوی تھا مگر کیا اس زمانہ میں انسانوں کو بھی سمجھ نہ آتا تھا کہ حضرت سلیمانؑ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ پیشاب پاخانہ کے محتاج ہیں۔ پھر اس عرصہ میں امور مملکت کس طرح طے پاتے تھے حضرت سلیمان بادشاہ تھے اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت ان پر فرض تھی امور سلطنت کو سرانجام دینا بھی ان کے ذمہ تھا پھر عصا کے سہارے سے لاش کا کھڑا رہنا بھی قیاس میں نہیں آسکتا سوائے اس کے کہ اسے بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی نعش مبارک کا ایک معجزہ بنا لیا جائے اور ایک نبی کی لاش کی یہ بے حرمتی ہے کہ ایک سال تک وہ دفن بھی نہ ہو۔ اور بظاہر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس مضمون کا یہاں کیا تعلق ہے اگر ایسا ہوا بھی تو اس کو اس موقعہ پر بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ حضرت سلیمان پر اپنی نعمتوں کے ذکر کے بعد بتانا تو یہ چاہیئے تھا جیسا آگے سبا کے ذکر میں بتایا ہے کہ جب پچھلے لوگوں نے ناشکری کی تو اللہ تعالیٰ نے وہ نعمتیں چھین لیں جنّ غیب جانتے تھے یا نہ جانتے تھے۔ اس کا یہاں کیا تعلق ہے اور جنوں کے سلیمان کے ماتحت ہوتے ہوئے کون خیال کر سکتا تھا کہ جن علم غیب جانتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت سلیمان کی وفات کے جلد ہی بعد اس سلطنت کی حالت خراب ہو گئی۔ حضرت سلیمان کے بیٹے رحبعام کے تخت نشین ہونے کے تھوڑی دیر بعد یربعام کی انگیخت پر بنی اسرائیل نے کچھ مطالبات پیش کیے اس وقت حضرت سلیمان کے پرانے مشیروں نے رحبعام کو یہ مشورہ دیا کہ وہ قوم کو تنگ نہ کرے اور ان کے مطالبات کو قبول کر لے مگر اس نے بجائے ان مشیروں کی بات سننے کے اپنے نوجوان ساتھیوں کے کہنے پر بنی اسرائیل کے مطالبات کا سخت جواب دیا اور ان پر سختی کرنے کی ٹھانی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس قومیں باغی ہو گئیں اور حضرت سلیمان کی سلطنت برباد ہو گئی اور رحبعام کی حکومت صرف ایک چھوٹی سی شاخ پر رہ گئی (اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ غیر اسرائیلی قومیں بھی آزاد ہو گئیں) دیکھو اسلاطین باب ۱۲۔ پس دابۃ الارض یہی رحبعام حضرت سلیمان کا بیٹا ہے جس کی نظر صرف زمین تک محدود تھی اور سلیمان کے عصا کا کھایا جانا اس کی سلطنت کی بربادی ہے۔ اور جنّ سے مراد غیر قومیں ہیں۔ جنہوں نے اب تک بنی اسرائیل کی ماتحتی کا جُوا اُٹھایا ہُوا تھا۔

۲۶۸۶ سبا کے لیے دیکھو ۲۴۶۳ اور یہاں مراد اس سے وہ قبائل ہیں جو سبا کی نسل سے تھے اور دائیں اور بائیں باغوں سے مراد یہ ہے کہ دائیں طرف بھی باغ ہی باغ تھے اور بائیں طرف بھی جیسا کہ قتادہ سے مروی ہے (ر) اور شہر کو طیب بلحاظ اس کی اعلیٰ درجہ کی آب و ہوا کے کہا ہے چونکہ سبا کا تعلق سلیمان سے بھی تھا اس لیے اس ذکر کے بعد اس ذکر کو شروع کیا ہے۔

۲۶۸۷ عرم۔ عُرام شدت اور کثرت کو کہتے ہیں اور رجلٌ عارمٌ خبیث اور شریر آدمی کو اور عَرِم بند کو کہا جاتا ہے اور ان روکوں کو جو وادی کے درمیان میں بنائی جاتی ہیں تاکہ پانی روکا جائے اور عَرِم اس سیلاب کو کہتے ہیں جس کے سامنے کچھ ٹھہر نہ سکے اور سخت بارش کو بھی کہتے ہیں (ل)

خمط ایک درخت ہے جس کا کانٹا نہیں یا اراک یعنی پیلو اور خَمْطَۃ شراب کو کہا جاتا ہے جب تلخ ہو (غ) اور زجاج کا قول ہے کہ ہر ایک سبزی کو کہا جاتا ہے جس کا مزہ تلخ ہو اور فراء کا قول ہے کہ پیلو کے پھل کو خمط کہتے ہیں (ل)

اثل۔ اَثْلَۃ کسی چیز کا اس کا اصل ہے۔ اور اَثْل ایک درخت ہے جو طَرفاء (جھاؤ) سے ملتا جلتا ہے مگر اس سے بڑا اور اچھا ہوتا ہے اسی سے نبی کریم صلعم کا منبر بنایا گیا تھا (ل)

مارب کے بند کا ٹوٹنا: اس قوم نے ایک بڑا بند لگا کر پہاڑوں کے پانی کا ذخیرہ بنایا ہوا تھا جس پر اُن کی خوشحالی کا دارومدار تھا مگر جب انہوں نے نعمائے الٰہی

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ
نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ⑰

یہ سزا ہم نے انھیں دی اس لیے کہ انھوں نے ناشکری
کی اور ہم ناشکر گزار ہی کو سزا دیتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ
بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا
فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَ
اَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ⑱

اور ہم نے ان میں اور ان بستیوں میں جن میں ہم نے
برکت دی تھی نظر آنے والی بستیاں بنائی تھیں اور ہم نے ان میں
سفر کا اندازہ کر دیا تھا، ان میں راتوں اور دنوں کو امن
سے چلو ۲۶۸۸ع

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا
اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ
كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ
صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ⑲

تو انھوں نے کہا اے ہمارے رب ہمارے سفروں میں
دوری ڈال دے اور اپنی جانوں پر ظلم کیا پس ہم نے انھیں افسانے
بنا دیا اور انھیں ریزہ ریزہ کر دیا۔ اس میں ہر ایک صبر کرنے والے
شکر کرنیوالے کے لیے نشان ہیں ۲۶۸۹ع

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ
فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ⑳

اور شیطان نے ان پر اپنا ظن سچ کر دکھایا، سو مومنوں کی
ایک جماعت کے سوائے انھوں نے اس کی پیروی کی ۲۶۹۰ع

سے اعراض کیا تو یہی بند ٹوٹ کر ان کی تباہی کا موجب ہو گیا اور باغوں کی جگہ جنگل بن گئے۔ اس بند کا ٹوٹنا ایک تاریخی واقعہ ہے جو پہلی یا دوسری صدی عیسوی کا ہے۔ ان لوگوں کی طرف کسی نبی کے آنے کا ذکر یہاں نہیں ہے اور یہ زمانہ بھی فترت کا تھا پس ان کا اعراض ان نعمتوں سے اعراض تھا جو ان کو دی گئیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نعمتوں کی قدر نہ کرنے پر بغیر انبیاء کے آنے کے بھی عذاب آ جاتا ہے اور اگلی آیت میں ان کے کفر سے مراد بھی ناشکرگزاری ہے جس پر لفظ کفور بھی شاہد ہے اور اس قوم کی تباہی کا واقعہ چونکہ قریب ترین واقعہ آنحضرت صلعم کے زمانہ سے تھا اس لیے اس کی طرف جہاں کفار کو توجہ دلائی ہے، مسلمانوں کو بھی توجہ دلائی ہے کہ اگر نعمتیں ملنے کے بعد ناشکرگذاری کریںگے تو مواخذہ کے نیچے بھی آئیں گے اور اس کے لیے کسی نئے رسول کے بھیجنے کی ضرورت نہ ہو گی اس لیے کہ آنحضرت صلعم کو کافۃ للناس بھیجا گیا ہے دیکھو آیت ۲۸۔

ع۲۶۸۸ ظاھرۃ۔ ظَھَرَ کے معنی ہیں ایک چیز زمین کی پیٹھ پر نظر آ گئی پس وہ مخفی نہ رہی، پھر اس کا استعمال ہر ایک چیز پر ہے جو آنکھ سے یا بصیرت سے نظر آ جائے۔ ما ظھر منہا و ما بطن (الانعام[6]۔ ۱۵۱) الا مراء ظاھرا (الکھف[18]۔ ۲۲) یعلمون ظاھرا من الحیٰوۃ الدنیا (الروم[30]۔ ۷) اور ظھر الفساد فی البر و البحر (الروم[30]۔ ۴۱) میں ظھر سے مراد ہے بہت ہو گیا اور پھیل گیا اور نعمۃ ظاھرۃ و باطنۃ (لقمٰن[31]۔ ۲۰) سے مراد ہے وہ نعمتیں جن سے ہم واقف ہیں اور وہ جن سے ہم واقف نہیں (اور اس سے مراد دنیوی اور دینی نعمتیں لینا زیادہ مناسب ہے) اور قریٰ ظاھرۃ میں ظاہر پر بھی حمل کیا گیا ہے کہ یہ بعض حالتوں کے لیے ایک مثال ہے (غ) اور مفسرین نے یہاں کئی معنی کیے ہیں۔ ایک دوسرے سے اتنی قریب کہ ایک سے دوسری نظر آتی تھی یا بلند مقامات پر۔ یا مشہور بستیاں کیونکہ ھذا امر ظاھر کہتے ہیں جب مراد ہو کہ یہ بات مشہور ہے یا شہروں سے باہر چھوٹی بستیاں کیونکہ ظاھر البلد سے مراد ہوتی ہے شہر سے باہر (ر) اور قریٰ التی بارکنا فیہا سے مراد شام کی بستیاں ہیں بوجہ اپنے درختوں اور پھلوں کی کثرت کے اور اپنے اہل کی فراخی کے (ر)

یہ بھی اہل سبا کا ذکر ہی ہے۔ یمن اور شام میں بڑی بھاری تجارت تھی۔ اصل میں یہ لوگ سمندر کے رستے ہندوستان اور دیگر ممالک سے تجارت کرتے تھے اور پھر ان تمام ممالک کی اشیاء کو لا کر شام میں پہنچاتے تھے گویا تجارت کے لیے درمیانی بنکر دونوں طرف سے فائدہ اُٹھاتے تھے اور تجارت سے دولت اور اس کے ساتھ آسایش میں ترقی ہوتی ہے تب لوگ دنیا میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں۔ میور کہتا ہے کہ یہ تجارت بہت رونق پر تھی اور اس سے یہ قوم بہت دولتمند ہو گئی تھی اور لکھتا ہے کہ حضر موت سے ایلہ تک اس وقت ستّر منزلیں تھیں اور وہی آج بھی موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان سب باتوں کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے سامانوں سے انسان جو کچھ بناتا یا حاصل کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی اسے دیتا ہے اور رات اور دن کو امن سے سفر کرنے کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر رستہ چلتا تھا کہ رات چلنے والوں کو بھی اس پر خطر نہ تھا۔

ع۲۶۸۹ ربنا باعد بین اسفارنا ہو سکتا ہے کہ زبان قال سے کہا اور ہو سکتا ہے کہ زبان حال سے کہا (ر) اور دوسرے معنی زیادہ موزون ہیں یعنی ان کی ناشکرگزاری زبان حال سے اپنی تجارت کی تباہی مانگتا تھی فجعلنٰھم احادیث یعنی ان کے قصّے باقی رہ گئے اور اس قوم کا نام و نشان مٹ گیا۔

ع۲۶۹۰ صدق سے یہاں مراد ہے حقق یا وجد ظنہ صادقا یعنی ثابت کر دیا یا سچا پایا (ر) اور ابلیس کا ظن یہی تھا کہ انسان میرے پیچھے لگ کر اور شہوات دنیوی

ع وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ۭ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿٢١﴾

اور اسے ان پر کوئی غلبہ حاصل نہ تھا مگر یہ اس لیے ہوا کہ ہم اسے جو آخرت پر ایمان لاتا ہے اس سے الگ کر دیں جو اس کے بارے میں شک میں ہے اور تیرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿٢٢﴾

کہہ ان کو بلاؤ جنھیں تم اللہ کے سوائے (معبود) سمجھتے ہو وہ ایک ذرہ کے برابر بھی اختیار نہیں رکھتے (نہ) آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ ان دونوں میں ان کی کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے اس کا کوئی مددگار ہے۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٢٣﴾

اور اس کے ہاں شفاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی مگر اس کے لیے جس کے بارے میں وہ اجازت دے یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جائے گی کہیں گے کیا ہے جو تمہارے رب نے کہا ہے کہیں گے حق (فرمایا ہے) اور وہ بلند (اور) بڑا ہے ٢٦٩١

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٤﴾

کہہ کون تمھیں آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے کہہ اللہ اور ہم یا تم سیدھے رستے پر ہیں یا کھلی گمراہی میں ہیں ٢٦٩٢

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٥﴾

کہہ تم سے اس کے متعلق باز پرس نہ ہو گی جو ہم نے جرم کیا ہو اور ہم سے اس کے متعلق پرسش نہ ہو گی جو تم کرتے ہو۔

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۭ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿٢٦﴾

کہہ ہمارا رب ہمیں جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کریگا اور وہ خوب فیصلہ کرنے والا جاننے والا ہے ٢٦٩٣

میں منہمک ہو کر تباہ ہو جائیں گے۔ اور اگلی آیت میں صاف بتا دیا کہ ان لوگوں پر بھی ابلیس کو سلطان یعنی تسلّط حاصل نہ تھا یعنی وہ خود اس کے پیچھے لگے ورنہ شیطان کو کوئی ایسی طاقت نہیں دی گئی کہ وہ زبردستی لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لے۔

٢٦٩١ اس آیت کے معنی میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں ان میں سے دو معنی سیاق کے لحاظ سے ہو سکتے ہیں یعنی ایک یہ کہ جس گھبراہٹ کے واقع ہونے اور دور ہونے کا ذکر ہے وہ قیامت کی گھبراہٹ ہے اور ماذا قال ربکم کہنے والے مشفوع ہیں اور الحق کہنے والے شافع اور الحق سے مراد اذن شفاعت ہے اور دوسرے یہ کہ یہ فترت کے بعد نزول وحی کے متعلق ہے اور اس کی توجیہ یوں کی گئی ہے کہ جب وحی کے نزول پر ایک لمبا زمانہ گزر گیا اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کا نزول آنحضرت صلعم پر ہوا تو ملائکہ سما نے خیال کیا کہ قیامت آگئی ہے پھر جب ان کا خوف دور ہوا تو بعض نے کہا کہ کیا حکم ہوا ہے تو دوسروں نے کہا الحق یعنی وحی الٰہی کا نزول ہوا ہے اور ایک معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ فزع عن قلوبھم میں اس گھبراہٹ کا دور ہونا مراد ہے جو قوم کی تباہی پر پیدا ہوتی ہے یعنی قیامت وسطیٰ کے بعد اور مطلب یہ ہے کہ ان کی تباہی صرف مخالفت کی تباہی ہو گی اور آخر کار یہ لوگ حق کو پہچان لیں گے۔

٢٦٩٢ یہ لف و نشر مرتب ہے۔ اور معنی ظاہر ہیں کہ ایک گروہ اہل توحید کا ہے اور ایک اہل شرک کا اب ظاہر ہے کہ ان میں سے ہدایت پر کون ہے اور گمراہی میں کون۔

٢٦٩٣ اللہ تعالیٰ کا سب کو جمع کرنا ایک تو قیامت کے دن ہے اور اسی دن سب فیصلے کھلے کھلے ہونگے لیکن جب من العذاب الادنیٰ (السجدۃ ٣٢-٢١) کے

قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾

کہ مجھے وہ دکھاؤ جنھیں تم نے شریک بناکر اس کے ساتھ ملا رکھا ہے ہرگز نہیں بلکہ وہی اللہ غالب حکمت والا ہے ۲۶۹۴

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور ہم نے تجھے تمام ہی لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۲۶۹۵

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾

اور کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو۔

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع

کہ تمھارے لیے ایک دن کی میعاد ہے اس سے تم ایک گھڑی پیچھے نہیں رہ سکتے اور نہ بڑھ سکتے ہو ۲۶۹۶

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚۖ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ِۨالْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾

اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا کہتے ہیں ہم اس قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اس پر جو اس سے پہلے ہے اور اگر تو دیکھے جب ظالم اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے ایک دوسرے کی طرف بات لوٹائیں گے جو کمزور تھے وہ انھیں جو بڑے تھے کہیں گے اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾

جو بڑے تھے وہ اُنھیں جو کمزور تھے کہیں گے کیا ہم نے تمھیں ہدایت سے روکا تھا اس کے بعد کہ وہ تمھارے پاس آگئی بلکہ تم خود مجرم تھے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا

اور جو کمزور تھے وہ انھیں جو بڑے تھے کہیں گے بلکہ (یہ

وعدے کھلے کھلے قرآن شریف میں موجود ہیں جب کفار کی مسلمانوں پر چڑھائی اور ان کی شکست کا ذکر موجود ہے سیھزم الجمع ویولّون الدبر (القمر ۵۴-۴۵) اور یہاں آگے آیت ۲۹ میں سوال بھی موجود ہے متی ھذا الوعد جو وہ ہمیشہ اپنی ہلاکت کی پیشگوئیوں پر کرتے تھے تو اس جمع کرنے سے مراد بھی اسی دنیا میں جمع کرنا ہے یعنی کسی میدان میں حریفوں کے طور پر ہر دو فریق کا لے آنا اور یہ مسلمانوں اور کفار کی جنگوں کی طرف اشارہ ہے۔

۲۶۹۴ ارونی سے مراد یہاں دلائل سے دکھانا ہے اور عزیز کے لفظ میں اشارہ ہے کہ اس کا نام پھیلانے والے غالب ہونگے اور بُت تمہاری کچھ بھی امداد نہ کر سکیں گے۔

۲۶۹۵ آنحضرت کی رسالت عامہ اور ختم نبوت: کافۃ کے لیے دیکھو ۲۶۷ اور یہاں اس لفظ کو اختیار کر کے یہ بتایا ہے کہ آپ کی رسالت عامہ سے اب کوئی شخص باہر نہیں نکل سکتا گویا اس سے خروج سے روکا گیا ہے کیونکہ کفّ کے معنی روکنا ہیں۔ یہ آیت بھی ختم نبوت پر دلیل ہے کیونکہ جب کوئی شخص اس رسالت سے باہر نہیں نکل سکتا تو اور رسول کی بھی ضرورت نہیں۔

۲۶۹۶ ہوسکتا ہے کہ میعاد یوم میں اشارہ یہ ہو کہ میرے چلے جانے کے بعد ایک دن کی میعاد ہو گی جیسا کہ دوسری جگہ ہے عسٰی ان یکون ردف لکم بعض الذی تستعجلون (النمل ۲۷-۷۲) اور دن سے مراد پیشگوئی میں ایک سال لیا جائے گا اور پہلا اجتماع مسلمانوں اور کفار کا ہجرت سے ایک سال گزر جانے کے بعد ہوا۔

بَلۡ مَكۡرُ الَّيۡلِ وَ النَّهَارِ اِذۡ تَاۡمُرُوۡنَنَاۤ اَنۡ نَّكۡفُرَ بِاللّٰهِ وَ نَجۡعَلَ لَهٗۤ اَنۡدَادًا ؕ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الۡعَذَابَ ؕ وَ جَعَلۡنَا الۡاَغۡلٰلَ فِیۡۤ اَعۡنَاقِ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا ؕ هَلۡ یُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۳۳﴾

تمھاری) رات اور دن کی تدبیریں تھیں (جب تم ہمیں کہتے تھے کہ ہم اللہ کا انکار کریں اور اس کے شریک ٹھیرائیں اور جب عذاب دیکھیں گے تو ندامت کو چھپائیں گے — اور جو کفر کرتے ہیں ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں ان کو بدلہ نہیں ملے گا مگر اسی کا جو وہ کرتے تھے ع۲۶۹۷

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَةٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ﴿۳۴﴾

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانیوالا نہیں بھیجا، مگر اس کے آسودہ حال لوگوں نے کہا جو تمھیں دے کر بھیجا گیا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔

وَ قَالُوۡا نَحۡنُ اَكۡثَرُ اَمۡوَالًا وَّ اَوۡلَادًا ۙ وَّ مَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِیۡنَ ﴿۳۵﴾

اور کہتے ہیں ہم مال اور اولاد میں بڑھ کر ہیں اور ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔

قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۶﴾ ع ۴/۱۲

کہہ میرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

وَ مَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ بِالَّتِیۡ تُقَرِّبُكُمۡ عِنۡدَنَا زُلۡفٰۤی اِلَّا مَنۡ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ۫ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمۡ جَزَآءُ الضِّعۡفِ بِمَا عَمِلُوۡا وَ هُمۡ فِی الۡغُرُفٰتِ اٰمِنُوۡنَ ﴿۳۷﴾

اور نہ تمھارے مال اور نہ تمھاری اولاد وہ چیز ہے جو مرتبہ میں تمھیں ہمارے قریب کرے مگر جو ایمان لاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو ان کے لیے ان کے عمل کا دوچند اجر ہے اور وہ بلند مقامات میں امن میں ہوں گے۔

وَ الَّذِیۡنَ یَسۡعَوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیۡنَ اُولٰٓئِكَ فِی الۡعَذَابِ مُحۡضَرُوۡنَ ﴿۳۸﴾

اور جو لوگ ہماری آیتوں کو ہرانے کی کوشش کرتے ہیں وہ عذاب میں حاضر کیے جائیں گے۔

قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ وَ یَقۡدِرُ لَهٗ ؕ وَ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَهُوَ یُخۡلِفُهٗ ۚ وَ هُوَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ ﴿۳۹﴾

کہہ میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے رزق کی کشایش دیتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) اس کے لیے تنگ کرتا ہے اور جو چیز تم خرچ کرو وہ اس کا بدلہ دیتا ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے ع۲۶۹۸

ع۲۶۹۷ اسرار ندامت سے مراد اس کا اظہار بھی لیا گیا ہے دیکھو ع۱۴۰۸ اور زنجیروں کے گردنوں میں ہونے پر دیکھو ع۱۵۹۹ ۔

ع۲۶۹۸ یُخلف ۔ اَخلَفَ کے معنی وعدہ کا خلاف کیا بھی آتے ہیں بما اخلفوا اللہ ما وعدوہ (التوبۃ ۹ ۔۔) ان اللہ لا یخلف المیعاد (آل عمران ۳ ۔ ۹) اور اِخلاف کے معنی یہ بھی ہیں کہ ایک دوسرے کے بعد پانی پلائے اور درخت کے پتے جھڑ جانے کے بعد پھر سبز ہو جائے، تو کہا جاتا ہے اخلف الشجر اور اخلف

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ أَهَٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿٤٠﴾

اور جس دن ان سب کو اکٹھا کرے گا پھر فرشتوں کو کہے گا کیا یہ لوگ تمھاری عبادت کرتے تھے ۲۶۹۹ع

قَالُوا سُبْحَٰنَكَ أَنتَ وَلِيُّنَا مِن دُونِهِمْ ۖ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ ۖ أَكْثَرُهُم بِهِم مُّؤْمِنُونَ ﴿٤١﴾

کہیں گے، تو پاک ہے تو ہمارا کارساز ہے نہ یہ بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے تھے - ان میں سے اکثر ان پر ایمان لانے والے تھے۔

فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَلَا ضَرًّا ۖ وَنَقُولُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿٤٢﴾

سو آج تم میں سے کوئی دوسرے کے لیے نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ نقصان کا اور جو ظلم کرتے تھے ہم انھیں کہیں گے آگ کا عذاب چکھو جسے تم جھٹلاتے تھے۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتُنَا بَيِّنَٰتٍ قَالُوا مَا هَٰذَآ إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَن يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ ءَابَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوا مَا هَٰذَآ إِلَّآ إِفْكٌ مُّفْتَرًى ۚ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ إِنْ هَٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٤٣﴾

اور جب اُن پر ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں، کہتے ہیں یہ صرف ایک (ایسا) شخص ہے جو چاہتا ہے کہ تمھیں ان سے روک دے جس کی عبادت تمھارے باپ دادا کرتے تھے اور کہتے ہیں یہ صرف بنایا ہُوا جھوٹ ہے اور کافر حق کے بارے میں جب وہ ان کے پاس آگیا کہتے ہیں، یہ تو کھلا جادو ہے۔

وَمَآ ءَاتَيْنَٰهُم مِّن كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا ۖ وَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِن نَّذِيرٍ ﴿٤٤﴾

اور ہم نے انھیں کوئی کتابیں نہیں دیں جنھیں وہ پڑھتے ہوں اور ہم نے تجھ سے پہلے ان کی طرف کوئی ڈرانیوالا نہیں بھیجا۔

وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَآ ءَاتَيْنَٰهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٥﴾

اور انھوں نے (بھی) جھٹلایا جو اُن سے پہلے تھے اور یہ اس کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے جو ہم نے انھیں دیا تھا سو انھوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا پس میری ناپسندیدگی کیسی تھی ۲۷۰۰ع

اللہ علیك اس کے متعلق کہا جاتا ہے جس کا مال جاتا رہے اور اس سے مراد ہوتی ہے کہ تجھے بدلہ دے (رغ)

ع۲۶۹۹ اس لیے کہ مشرک ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے اور انہیں دیویاں سمجھ کر ان کی عبادت کرتے تھے اگلی آیت میں جواب مذکور ہے کہ یہ ہماری نہیں بلکہ جنّوں یعنی شیاطین کی عبادت کرتے تھے کیونکہ انہی راہوں پر چلتے تھے جن پر شیطان چلاتا تھا اسی ذیل میں وہ سب لوگ آتے ہیں جو نیک بندوں کو خدا بناتے ہیں جیسے پرستاران مسیح۔ یہ لوگ فی الحقیقت انہیں معبود نہیں بناتے کیونکہ ان کی بتائی ہوئی راہوں پر نہیں چلتے بلکہ جنّوں یا شیاطین یا اپنی خواہشات کو اپنا معبود بناتے ہیں، کیونکہ انہی کے پیچھے لگتے ہیں۔

ع۲۷۰۰ معشار کسی چیز کے عُشر یعنی دسویں حصّہ کو کہتے ہیں (رغ) اور مراد تقلیل میں مبالغہ ہے (ر)
واقعی عرب کے لوگ سامان دنیا کے لحاظ سے بعض پہلی قوموں کے مقابل پر کچھ بھی حقیقت نہ رکھتے تھے لیکن انہوں نے بھی جب جھٹلایا تو اُن کی طاقت دنیوی انہیں اللہ تعالیٰ کی سزا سے نہ بچا سکی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے مال اور اولاد پر کیا فخر کرتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہلاک کرنا چاہتا ہے تو بڑے بڑے جبار بھی اس کے سامنے ہل

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿۴۶﴾

کہہ میں تمھیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے لیے دو دو اور ایک ایک کر کے کھڑے ہو جاؤ پھر غور کرو، کہ تمھارے ساتھی کو کچھ جنون نہیں — وہ صرف تمھیں سخت عذاب سے پہلے ڈرانے والا ہے ۲۷۰۱

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۴۷﴾

کہہ جو میں تم سے اجر مانگتا ہوں وہ تمھارے لیے ہی ہے۔ میرا اجر صرف اللہ پر ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے ۲۷۰۲

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۴۸﴾

کہہ میرا رب حق فرماتا ہے، وہ غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے ۲۷۰۳

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ مَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيْدُ ﴿۴۹﴾

کہہ حق آ گیا اور باطل نہ (کسی امر کی) ابتدا کر سکتا ہے، اور نہ لوٹا سکتا ہے ۲۷۰۴

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ ۚ وَ اِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ﴿۵۰﴾

کہہ اگر میں گمراہ ہوں تو میری گمراہی اپنی ہی جان پر ہے اور اگر میں سیدھے راہ پر ہوں تو اس کی وجہ سے ہے جو میرا رب میری طرف وحی کرتا ہے وہ سننے والا قریب ہے۔

وَ لَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۵۱﴾

اور کاش تو دیکھتا جب گھبرا اٹھیں گے تو (اس وقت) بچ نہ سکیں گے اور نزدیک مکان سے پکڑے جائیں گے ۲۷۰۵

وَّ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَ اَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ

اور کہیں گے ہم اس پر ایمان لائے اور ان کے لیے دور جگہ

گر جاتے ہیں کہ ان کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔

ع۲۷۰۱ تنہائی میں انسان کو غور کا موقعہ ملتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ایک ایک دو دو ہو کر اس معاملہ پر غور کرو۔ مجنون انسان کو دنیا کی بہتری کی فکر نہیں ہو سکتی وہ تو اپنی بہتری بھی نہیں سوچ سکتا۔ دوسروں کی کیا سوچے گا۔

ع۲۷۰۲ اجر تو آپ کوئی مانگتے ہی نہ تھے۔ ان اجری الا علی اللہ۔ پس یہاں اجر سے مراد صرف یہ ہے کہ جو کچھ تمھیں کرنے کو کہتا ہوں وہ صرف تمھاری بھلائی کے لیے ہے۔

ع۲۷۰۳ قذف کے لیے دیکھو ع۲۰۶۲ اور یہاں مراد قذف بالحق سے صرف رمی یعنی پھینکنا ہے اور اگر دور پھینکنا مراد لیا جائے تو اشارہ اس کے اطراف و اکناف عالم میں اشاعت کی طرف ہے (ر) یا اس لفظ کے اختیار کرنے میں اشارہ ایک دور افتادہ مخلوق کی طرف ہے جو حق سے بہت دور پڑی ہوئی تھی۔ اور حق سے مراد یہاں وحی یا قرآن کریم ہے اور ابن عباس سے یہ معنی بھی مروی ہیں کہ حق کو باطل پر پھینکتا ہے (ر) اس صورت میں علام الغیوب میں اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے کہ باطل حق کے سامنے نابود ہو جائے گا جیسا دوسری جگہ فرمایا فید مغہ فاذا ھو زاھق (الانبیاء ۲۱-۱۸) اور اگلی آیت میں بھی اسی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

ع۲۷۰۴ دوسری جگہ فرمایا قل جاء الحق وزھق الباطل ...... (بنی اسرائیل ۱۷-۸۱) اور یہاں اس باطل کے نابود ہونے کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہے ما یبدئ الباطل وما یعید یعنی اس کا کوئی اثر باقی نہ رہا اور یہ محاورہ قبیلہ کی ہلاکت سے ماخوذ ہے کیونکہ جب وہ ہلاک ہو جائے تو اس کے لیے نہ کسی امر میں ابتدا کرنا باقی رہتا ہے نہ اس کا اعادہ کرنا (ر) اور باطل سے مراد یہاں کفر و شرک ہے۔

ع۲۷۰۵ فوت دیکھو ع۵۴۴ یہاں مراد ہے لا یفوتون اس سے یعنی اللہ تعالٰے کی گرفت سے دور نہ ہو سکیں گے یا بچ نہ سکیں گے۔ اور مکان قریب سے پکڑا جانے سے مراد یہاں عذاب دنیا کا آنا ہے اور ابن زید نے اس میں بدر کی طرف اشارہ لیا ہے (ج)

مِنۡ مَّكَانٍۭ بَعِيۡدٍ ﴿٥٢﴾	سے (ایمان کا) پا لینا کہاں (ممکن) ہے ۲۷۰۶
وَّقَدۡ كَفَرُوۡا بِهٖ مِنۡ قَبۡلُ ۚ وَيَقۡذِفُوۡنَ	اور اس کا پہلے انکار کر دیا اور دور جگہ سے بن دیکھے (اٹکل
بِالۡغَيۡبِ مِنۡ مَّكَانٍۭ بَعِيۡدٍ ﴿٥٣﴾	پچو) باتیں کرتے ہیں ۲۷۰۷
وَحِيۡلَ بَيۡنَهُمۡ وَبَيۡنَ مَا يَشۡتَهُوۡنَ	اور ان کے اور ان کی خواہشوں کے درمیان ایک روک ڈال
كَمَا فُعِلَ بِاَشۡيَاعِهِمۡ مِّنۡ قَبۡلُ ؕ	دی جائے جس طرح پہلے ان جیسے لوگوں سے کیا گیا۔ وہ بے چین
اِنَّهُمۡ كَانُوۡا فِىۡ شَكٍّ مُّرِيۡبٍ ﴿٥٤﴾ ع ۶	کر دینے والے شک میں تھے ۲۷۰۸

۲۷۰۶ تناوش۔ نَوش اور تناوُش کے معنی تناول ہیں یعنی ایک چیز کا پالینا اور مطلب یہ ہے کہ ایک اور جگہ سے (یعنی موت کے بعد) ایمان کا پالینا کس طرح ممکن ہے اور جب قریب مکان (یعنی اس دنیا میں) تھے تو اس وقت ایمان نہ لاتے تھے۔ یعنی جب ان کے اختیار میں تھا (غ) اور ابن عباس سے اس کی تفسیر رجوع الی الدنیا مراد ہے (د) مراد وہی لوگ ہیں جو عذاب میں گرفتار ہو کر مارے گئے کہ مرنے کے بعد وہ چاہیں گے کہ ایمان لائیں اور اگلی آیت میں وقد کفروا بہ من قبل میں اس دنیا میں کفر کرنے کا ذکر ہے۔

۲۷۰۷ یہاں ان کے اس دنیا میں کفر اور تک بازیوں کا ذکر ہے اور مکان بعید سے مراد یہاں معقولی رنگ میں بعید ہونا مراد ہے۔

۲۷۰۸ مایشتھون سے مراد آیات بالا کے لحاظ سے رجوع الی الدنیا یا ایمان یا طاعت وغیرہ مفسرین نے لیا ہے (د) مگر وہ چیز جسے کفار چاہتے ہیں وہ اغراض دنیوی ہیں زین للناس حب الشھوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ (آل عمران ۳-۱۴) پس مراد یہ ہے کہ وہ عذاب جو ان کی موت کا موجب ہوگا ان کی محبوب چیزوں کو ان سے دور کر دیگا یا مایشتھون سے مراد حق کو نابود کرنے کی خواہش ہے کہ وہ پوری نہ ہوگی اور وہ ناکام رہیں گے اور مجاہد نے مایشتھون سے مراد مال اور دنیا کی آسائشیں ہی لی ہیں (ج) ۔

آیاتھا ۴۵ (۳۵) سُوۡرَةُ فَاطِرٍ مَّكِّيَّةٌ رکوعاتھا ۵

نام: اس سورت کا نام فاطر ہے اور ملائکہ بھی اس کا نام ہے اور اس میں پانچ رکوع اور پینتالیس آیتیں ہیں اور اس کے نام فاطر میں جو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے یہ اشارہ ہے کہ وہ خدا جس نے فطرت انسانی کو بنا کر خدا سے ملنے کی تڑپ اس میں رکھی ہے اس تڑپ کے پورا کرنے کا سامان بھی دیا ہے اس لیے اس کا مضمون بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت روحانی ہی ہے۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ کی دونوں قسم کی نعمتوں یعنی نعمائے جسمانی و روحانی کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ شیطان نعمائے روحانی سے انسان کو محروم کر کے اسے دُکھ کی طرف لیجاتا ہے۔ دوسرے رکوع میں بتایا ہے کہ انسان کو عزت صرف تعلق باللہ سے ملتی ہے تیسرے میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت روحانی کا ذکر ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام قوموں کے اندر رسول بھیجکر ان کی ربوبیت روحانی کی چوتھے میں بتایا کہ اختلاف تمام عالم میں ہے اس لیے انسانوں میں ان نعمائے روحانی کے لینے میں اور ان سے فائدہ اُٹھانے میں بھی اختلاف مراتب ہے یہاں تک کہ وہ برگزیدہ لوگ جنہیں اب وارث کتاب اللہ بنایا جاتا ہے وہ بھی سب یکساں نہیں۔ پانچویں میں بتایا کہ نعمائے روحانی کے انکار سے انسان خود ہی دکھ میں مبتلا ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ بڑا بردبار ہے ہر ظلم پر فوراً گرفت نہیں کرتا بلکہ ایک وقت تک مہلت بھی دیتا ہے۔

تعلق: پچھلی سورت میں مسلمانوں پر اپنے انعامات کا ذکر دوسرے لوگوں کے ذکر میں کیا تھا۔ یہاں بتایا ہے کہ وہ خدا جو جسمانی طور پر لوگوں کی ربوبیت فرماتا ہے روحانی طور پر بھی فرماتا ہے اور تمام امتوں میں رسول بھیجنے کے بعد اب اس نے اپنی روحانی نعمت کتاب اللہ کا وارث اُمت محمدیہ کو بنایا ہے۔

زمانہ نزول: سورت مکی ہے اور زمانہ نزول وہی معلوم ہوتا ہے جو پچھلی سورت کا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ
جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِىۡۤ اَجۡنِحَةٍ
مَّثۡنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ يَزِيۡدُ فِى
الۡخَلۡقِ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ①
مَا يَفۡتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنۡ رَّحۡمَةٍ فَلَا
مُمۡسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمۡسِكۡ ۙ فَلَا مُرۡسِلَ
لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ②
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ ؕ
هَلۡ مِنۡ خَالِقٍ غَيۡرُ اللّٰهِ يَرۡزُقُكُمۡ مِّنَ
السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ
فَاَنّٰى تُؤۡفَكُوۡنَ ③
وَاِنۡ يُّكَذِّبُوۡكَ فَقَدۡ كُذِّبَتۡ رُسُلٌ
مِّنۡ قَبۡلِكَ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ④

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنیوالے کے نام سے
سب تعریف اللہ کے لیے ہے (جو) آسمانوں اور زمین کا پیدا
کرنیوالا ہے (اور) فرشتوں کو رسول بنانیوالا (جو) دو دو تین
تین چار چار بازوؤں والے (ہیں) وہ پیدائش میں جو
چاہتا ہے بڑھاتا ہے اللہ ہر چیز پر قادر ہے ع۲۷۰۹
اللہ جو رحمت لوگوں کے لیے کھولے تو اس کو بند کرنے
والا کوئی نہیں اور جسے وہ بند کر دے تو اس کے بعد اسے کوئی
کھولنے والا نہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے ع۲۷۱
اے لوگو! اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو کیا اللہ کے
سوائے کوئی اور پیدا کرنے والا ہے جو تمھیں آسمان اور زمین سے رزق
دیتا ہے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، سو تم کہاں
الٹے پھر جاتے ہو۔
اور اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو تجھ سے پہلے رسول (بھی) جھٹلائے
گئے اور اللہ کی طرف ہی (سب) کام لوٹائے جاتے ہیں۔

ع۲۷۰۹ اجنحۃ ۔ جناح کی جمع ہے پرند کے بازوؤں کو اور کسی چیز کے دو جانبوں کو اس کے دو جناح کہا جاتا ہے (غ) اور انسان کے بازو کو بھی جناح کہا جاتا ہے اور سارے ہاتھ کو بھی۔ اور حدیث میں ہے ان الملئکۃ تَضَعُ اجنحتھا لطالب العلم جس کے معنی کیے گئے ہیں کہ فرشتے اپنے پر طالب علم کے لیے بچھا دیتے ہیں جب وہ چلتا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان کا اس کی تعظیم کے لیے تواضع کرنا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد علمی مجالس میں اُن کا نزول ہے اور بعض کے نزدیک اس سے مراد ان کے اظلال ہیں اور جناح بمعنی عربی میں بہت سی مثالیں ہیں (ل)
فرشتوں کی رسالت دو طرح پر ہے ایک امور جسمانی میں ایک امور روحانی میں۔ وہ مدبرات امور جسمانی بھی ہیں یعنی وہ وسائط جن کے ذریعہ سے نظم عالم جسمانی قائم ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی وحی اور اس کا کلام اس کے خاص بندوں یعنی اس کے انبیاء اور اولیاء کو پہنچانے والے بھی ہیں اور یہاں فاطر کا لفظ اختیار کرنے میں خصوصیت سے اشارہ اسی کی طرف ہے کہ وہ خدا جس نے فطرت انسانی کے اندر ایک پیاس رکھی ہے کہ کسی ہستئ بالا سے تعلق پیدا کرے اس نے لازماً اس فطرت کی پیاس کے بجھانے کا سامان بھی دیا ہے اس لیے فاطر کے ساتھ ہی ملائکہ کی رسالت کا ذکر کیا۔ فرشتوں کے بازو: اور فرشتوں کو اولی اجنحۃ کہا ہے اور جناح پرند میں پر ہیں جس سے وہ پرواز کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ سکتا ہے اور انسان میں اس کا ہاتھ یا بازو ہے جس کی مدد سے وہ کام کرتا ہے پر نہیں پس فرشتہ کا جناح اپنے رنگ کا ہوگا اس کی کیفیت کو ہم نہیں جان سکتے کیونکہ وہ جسم نہیں جسے ہم دیکھ سکیں انا لا نعرف حقیقتہ وکیفیتہ (د) اور جو لوگ فرشتوں کے پرندوں جیسے پر سمجھتے ہیں وہ غلطی کھاتے ہیں اور مثنیٰ و ثلٰث و ربٰع کو بعض نے یرسلون محذوف قرار دیکر اس کے متعلق مانا ہے (د) یعنی فرشتے دو دو تین تین چار چار بھیجے جاتے ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ یہ اجنحۃ کی صفت ہے یعنی فرشتوں میں بھی تفاوت ہے سب فرشتے یکساں نہیں بعض دو جناح والے ہیں بعض تین جناح والے بعض چار والے اور یزید فی الخلق میں یہ اشارہ ہے کہ بعض کے جناح اس سے بھی زیادہ ہیں چنانچہ حدیث متفق علیہ میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے جبرئیل کو دیکھا اور اس کے چھ سو جناح تھے اور ظاہر ہے کہ جس طرح انسان کی طاقت اس کے بازو سے ہے اسی طرح جن ملائکہ کے جناح زیادہ ہیں وہ زیادہ قوت اور طاقت والے ہیں اور یہاں اس ذکر کی غرض اللہ تعالیٰ کی نعمائے جسمانی اور روحانی کی طرف توجہ دلانا ہے۔
ع۲۷۱ یعنی جن نعمتوں کو اللہ تعالیٰ نے پہنچانے کا سامان کیا ہے ان کو کوئی روک نہیں سکتا اور اشارہ اللہ تعالیٰ کی نعمائے روحانی کی طرف ہے جس خیر کو اللہ تعالیٰ پہنچانا چاہتا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا جیسا کہ آیت ۴ میں تکذیب کا ذکر کر کے اس کا انجام بتا دیا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا
تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۖ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ
بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۵

اے لوگو! اللہ کا وعدہ سچا ہے سو تمھیں دنیا کی زندگی دھوکا نہ دے اور نہ بڑا دھوکا دینے والا تمھیں اللہ کے بارے میں دھوکا دے۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ
عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا
مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۶

شیطان تمھارا دشمن ہے سو اُسے دشمن سمجھو وہ صرف اپنے گروہ کو بلاتا ہے تاکہ وہ جلتی ہوئی آگ کے رہنے والوں میں سے ہوں۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۥ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷ ع

جو کافر ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ اور جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْۗءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ
حَسَنًا ۭ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَ
يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ڮ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ
عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا
يَصْنَعُوْنَ ۝۸

تو کیا وہ شخص جسے اس کا بُرا عمل بھلا معلوم ہوتا ہے اور وہ اسے اچھا سمجھتا ہے (ہدایت پا سکتا ہے) سو اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ پس تیری جان ان پر افسوس کرتے ہوئے ہلاک نہ ہو جائے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں ع۲۷۱۱

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ
سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا
بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝۹

اور اللہ تعالیٰ وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے سو وہ بادل کو اٹھاتی ہیں پس ہم اسے ایک مُردہ شہر کی طرف چلاتے ہیں پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتے ہیں اسی طرح جی اٹھنا ہے ع۲۷۱۲

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ
جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ
وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۭ وَالَّذِيْنَ

جو کوئی عزت چاہتا ہے تو سب عزت اللہ کے لیے ہی ہے، اسی کی طرف پاک کلمے چڑھتے ہیں اور نیک عمل اس کو بلند کرتا ہے — اور جو لوگ بُری مخفی تدبیریں کرتے

ع۲۷۱۱ تذہب نفسك - ذہب کے لیے دیکھو ع۲۰۸۰ اور یہاں جان کے جانے سے مراد موت ہے (غ)
جب انسان گمراہی میں یہاں تک دور نکل جائے کہ بدی کو اچھا سمجھے تو اس کا ہدایت پانا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ یہی حالت عرب کی بحیثیت قوم ہو چکی تھی کہ وہ بدیوں پر علانیہ فخر کرتے تھے اور انہیں اچھا سمجھ کر کرتے تھے۔ یہ حالت اخلاقی موت کی ہے اور اس وقت یہ حالت عرب کی ہی نہیں بلکہ کل عالم کی ہو چکی تھی ایسے لوگوں کے لیے نبی کریم صلعم کا دل رنج سے پگھلتا تھا جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا لعلك باخع نفسك الا یکونوا مومنین (الشعرا ۲۶ ع ۱ - ۳) آپ کے قلب کا یہ درد ہی تھا جس نے آخرکار ایسے سخت دلوں کو بھی موم کر دیا۔

ع۲۷۱۲ اس نشور سے اس قیامت روحانی کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو نبی کریم صلعم کے درد دل سے برپا ہونے والی تھی کیونکہ آسمانی پانی وحی کی جگہ ہے اور مردہ زمین سے مردہ دلوں کا ذکر مقصود ہے اور مردہ زمین کا آسمانی پانی سے زندہ ہونا بتاتا ہے کہ مردہ دل وحی الٰہی کی تاثیر سے زندہ ہو جائیں گے اور کذٰلك النشور میں اگر نشور سے مراد قیامت کبریٰ ہی لی جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ جس طرح نبی کریم صلعم کی وحی کی طفیل ایک قیامت روحانی برپا ہو گی اور اسی کا ذکر بادل کے آنے اور مردہ زمین کے زندہ ہونے میں ہے اسی طرح قیامت کبریٰ بھی ہو کر رہے گی ٭

يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ
وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝۱۰

ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کی مخفی
تدبیر ملیا میٹ ہوجائے گی ۲۷۱۳

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ
ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۭ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ
اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَمَا يُعَمَّرُ
مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ
اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۱۱

اور اللہ نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے پھر تمھیں
جوڑے بنایا۔ اور کوئی عورت حمل میں نہیں لیتی اور
نہ جنتی ہے مگر اسے علم ہوتا ہے، اور کسی عمر والے کو
عمر نہیں دی جاتی اور نہ کسی کی عمر کم ہوتی ہے، مگر یہ
(سب کچھ) ایک کتاب میں ہے یہ اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ڰ هٰذَا عَذْبٌ
فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ
اُجَاجٌ ۭ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا
طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ
وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا
مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۲

اور دو دریا برابر نہیں، یہ میٹھا ہے خوش ذائقہ ۲۷۱۳ و
اس کا پینا خوش گوار ہے اور یہ کھاری ہے کڑوا۔
اور ہر ایک سے تم تازہ گوشت کھاتے ہو اور
زیور نکالتے ہو، جسے تم پہنتے ہو۔
اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ اسے پھاڑتی چلی جاتی ہیں۔
تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو ۲۷۱۴

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ
فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ڮ
كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ ذٰلِكُمُ
اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۭ ۝۱۳
اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ

وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل
کرتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے۔
ہر ایک ایک وقت مقرر کے لیے چلتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ
تمھارا رب ہے، اسی کی بادشاہت ہے اور وہ جنھیں تم اس
کے سوائے پکارتے ہو وہ ایک ذرہ بھر اختیار نہیں رکھتے ۲۷۱۵
اگر تم انھیں بلاؤ تو وہ تمھاری پکار کو نہیں سنتے اور اگر سنیں

ع ۲۷۱۳ عزت وہ حالت ہے جو انسان کو مغلوب ہونے سے بچانے والی ہو ع ۲۶۵ پس بتایا کہ ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ اسے عزت حاصل ہو اور وہ ذلت کی حالت سے بچے تو عزت کا اصل سرچشمہ العزیز خدا ہی ہے جو سب غالبوں پر غالب ہے پس اس سے تعلق پیدا کرے اور اس کیلئے دو طریق بتائے ایک کلمہ طیب یا پاکیزہ کلمات جس سے مراد لا الٰہ الا اللہ لیا گیا ہے یعنی توحید الٰہی کا قائل ہو اور یہ تمام پاکیزہ کلمات کی جڑ ہے اور دوسرے اعمال صالحہ بالفاظ دیگر انسان اچھی باتوں کا قائل ہو اور پھر اپنے قول کو عمل میں لانے والا ہو تو اسے رفع ملتا ہے یعنی وہ قرب الٰہی حاصل کرتا ہے (رفع کے لیے دیکھو ع ۴۴۵) اور کلمات کے متعلق فرمایا کہ وہ چڑھتے ہیں اور عمل صالح کے متعلق فرمایا کہ وہ انسان کا مرتبہ بلند کرتا ہے اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ اقرار توحید کو بھی اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے لیکن مراتب بلند اور اللہ تعالیٰ کا قرب صرف اقرار توحید سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ اعمال صالحہ سے اور یرفعہ میں بعض نے مراد لیا ہے کہ اچھے عمل پاک کلمات کو بلند کرتے ہیں اور بعض نے یہ کہ پاک کلمات عمل صالح کو بلند کرتے ہیں اور ضمیر عمل صالح کے کرنے والے کی طرف بھی جا سکتی ہے اور آیت کے دوسرے حصہ میں بتایا کہ جو لوگ اللہ سے تعلق پیدا کرنے والوں کے خلاف تدبیریں کرتے ہیں ان کی تدابیر ناکام ہونگی۔

ع ۲۷۱۳ الف مِلْحٌ۔ اس پانی کو کہتے ہیں جس کا مزہ بدل کر کھاری ہو گیا ہو (غ) اور نمک کو بھی کہتے ہیں۔

ع ۲۷۱۴ آیت ۱۱ کے مضمون کے لیے دیکھو ع ۱۶۰۲ اور اس آیت کے مضمون کے لیے دیکھو ع ۲۳۸۶ و ع ۱۴۲۴۔

ع ۲۷۱۵ قطمیر۔ کھجور کی گٹھلی میں ننھے گڑھے کو کہتے ہیں اور وہ نہایت قلیل شے کے لیے بطور مثال بولا جاتا ہے (غ)، اور بعض کے نزدیک کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کو کہا جاتا ہے۔

سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۭ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴿۱۴﴾ ع ۲ ۱۴

تو تمھاری بات کو قبول نہ کر سکیں اور قیامت کے دن تمھارے شرک کا انکار کریں گے اور (خدائے) باخبر کی طرح کوئی تجھے خبر نہ دے گا ۲۷۱۶

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾

اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو، اور اللہ تعالیٰ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ۚ

اگر چاہے تمھیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۱۷﴾

اور یہ اللہ تعالیٰ پر مشکل نہیں۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۭ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور اگر کوئی بوجھ میں دبا ہُوا اپنے بوجھ (کے ہٹانے) کے لیے بلائے اس (کے بوجھ) میں سے کچھ نہ اُٹھایا جائیگا اگرچہ قریبی ہو، تو صرف انھیں ڈراتا ہے جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کوئی اپنے آپ کو پاک کرتا ہے تو اپنی ہی جان (کی بھلائی) کے لیے پاک کرتا ہے اور اللہ کی طرف ہی پھر کر جانا ہے ۲۷۱۷

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ﴿۱۹﴾ۙ

اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں۔

وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴿۲۰﴾ۙ

اور نہ اندھیرا اور روشنی۔

وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ﴿۲۱﴾ۚ

اور نہ سایہ اور دھوپ ۲۷۱۸

وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَاۗءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾

اور نہ ہی زندے اور مُردے برابر ہیں۔ اللہ (تعالیٰ) جسے چاہتا ہے سناتا ہے اور تو انھیں سنانے والا نہیں، جو قبروں میں ہیں ۲۷۱۹

۲۷۱۶ یہاں پہلے حصہ میں کہ تمہاری پکار کو نہیں سنتے بت بھی مراد ہو سکتے ہیں اور انسان بھی جو گزر چکے جیسے حضرت عیسیٰ اور دوسرے معنی موقعہ کے لحاظ سے انسب ہیں اس لیے کہ دوسرے حصہ آیت میں ہے کہ اگر وہ تمہاری پکار کو سنیں بھی تو قبول نہیں کر سکتے اور آخر پر قیامت کے دن انکار کا ذکر صاف بتاتا ہے کہ یہ انسان یا ملائکہ ہیں جن کی لوگ عبادت کرتے ہیں۔

۲۷۱۷ مثقلة۔ اَثْقَلَهٗ کے معنی ہیں اسے بوجھ کے نیچے دبا دیا فهم من مغرم مثقلون (الطور ۵۲۔ ۴۰) اور مثقلة وہ ہے جو اس طرح دبا ہوا ہو (ل) اور مراد گناہوں کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ کیونکہ ثِقل ذنب کو بھی کہتے ہیں۔

۲۷۱۸ حرور۔ حَرّ اور حرارۃ گرمی ہے لا تنفروا فی الحر قل نار جهنم اشد حرا (التوبۃ ۹۔ ۸۱) اور حرور گرم ہوا (غ)

۲۷۱۹ آیت ۱۹ سے لیکر ۲۲ تک میں نیکی اور بدی یا ان کے کرنے والوں کا مقابلہ کیا ہے۔ جو پہلی اور آخری آیت میں نیکی اور بدی کرنے والے ہیں جنہیں پہلے اندھے کہا ہے انہیں کو یہاں مردے کہا ہے اور جنہیں پہلے دیکھنے والے قرار دیا ہے انہیں یہاں زندہ کہا ہے اور درمیانی دو آیتوں میں نیکی اور بدی کا مقابلہ ہے بدی کو پہلے اندھیرا اور پھر دھوپ کہا ہے اور نیکی کو پہلے نور اور پھر سایہ کہا ہے۔ گویا بدی باوجود اندھیرے کے گرمی کی شدت لیے ہوئی ہے اور نیکی باوجود نور اور روشنی ہونے کے سایہ کی ٹھنڈک اپنے اندر رکھتی ہے اور ترتیب پہلی دو آیتوں میں ایک ہے اور پچھلی دو میں بدل دی ہے۔ اور ہر ایک کے پہلے لا لانا عربی زبان کی خاص ترکیب ہے اور نفی کی تاکید

إِنْ أَنْتَ إِلَّا نَذِيرٌ ﴿۲۳﴾

تو صرف ڈرانے والا ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ
وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ﴿۲۴﴾

ہم نے تجھے حق کے ساتھ خوش خبری دینے والا اور ڈرانیوالا
بنا کر بھیجا ہے اور کوئی قوم نہیں مگر اس میں ڈرانے والا گذر چکا ۲۷۲۰

وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ۚ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ
وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ﴿۲۵﴾

اور اگر تجھے جھٹلائیں تو انھوں نے بھی (اپنے رسولوں کو) جھٹلایا جو
ان سے پہلے تھے۔ ان کے رسول ان کے پاس کھلی دلیلوں
اور صحیفوں اور روشن کرنے والی کتاب کے ساتھ آئے۔

ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَكَيْفَ
كَانَ نَكِيرِ ﴿۲۶﴾ ع

پھر میں نے انھیں پکڑا جنھوں نے کفر کیا، سو میری
ناپسندیدگی کیسی تھی۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۚ
فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا ۚ
وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ
مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ﴿۲۷﴾

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ بادل سے پانی اتارتا ہے،
پھر ہم اس کے ساتھ پھل نکالتے ہیں جو مختلف قسموں کے ہیں۔
اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ خطے ہیں، جن کے
رنگ مختلف ہیں اور (بعض) نہایت سیاہ ہیں ۲۷۲۱

کے لیے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ تکرار کے قائم مقام ہے گویا اصل ترکیب یوں ہے ولا الظلمت ولا النور ولا النور والظلمت اور مقابل کے لفظ کو چھوڑ دیا ہے۔
یہاں پر مفسرین نے بھی قبول کیا ہے کہ من فی القبور سے مراد کفر پر اصرار کرنیوالے ہیں ترشیح لتمثیل المصرین علی الکفر بالاموات لیکن ان اللہ یسمع من یشآء
میں یہ خوشخبری دیدی ہے کہ جو کام بشر کی طاقت سے نہیں ہو سکتا وہ الٰہی طاقت کر دکھائے گی۔

۲۷۲۰ جب آنحضرت صلعم کے کام کا ذکر کیا کہ بدی کے بد انجام سے آپ ڈراتے ہیں اور لوگوں کو راہ راست پر لاتے ہیں اور مُردوں کو زندگی اور اندھوں کو بصارت دیتے ہیں تو ساتھ ہی بتایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون یعنی ایسے لوگوں کا آنا کوئی نیا قانون نہیں بلکہ دنیا کی تمام قوموں میں رسول آتے رہے یہاں تک کہ کوئی قوم رسول سے خالی نہیں گزری۔ یہ سورت مکی ہے اور مکہ میں سب سے پہلے زمانہ کی جس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تعلیم کی یہ وسعت کہ تمام قوموں میں نبی آتے رہے کوئی بعد کا خیال نہیں اور نہ یہاں کوئی تدریجی ترقی ہے بلکہ ابتدا سے اسلام کی بنیاد ہی اس اصول پر رکھی گئی جس کا ذکر الحمد للہ رب العالمین میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ تمام قوموں کی ربوبیت روحانی پہلے الگ الگ رسولوں کے ذریعے سے فرماتا رہا اب تمام قوموں کو ایک رسول کے ہاتھ پر جمع کرنا چاہتا ہے جس کی طرف آیت ۳۱ میں اشارہ ہے تاکہ قومی نفاق اور بغض دور ہوں۔ پس مذہبی عداوتوں کو دور کرنے کے لیے یہ اصول قائم کیا کہ تمام مذاہب کی اصل بنیاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے بعد میں ان میں غلطیوں کا پیدا ہو جانا اور بات ہے نظام مذہب جو اسلام نے شروع سے بتایا ہے وہ اپنے اندر ایک علمی رنگ رکھتا ہے۔ اگر مذہب انسانوں کی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس ضرورت کو پورا کرنا ضروری سمجھا تو اس کا نظام شروع سے ایک ہونا چاہیئے۔ یہی اصول ان من امۃ الا خلا فیہا نذیر میں قائم کیا ہے اور خود اس اصول کو قائم کر کے ان مذاہب باطلہ کا رد کیا ہے جو خدا کا قانون ساری دنیا میں یکساں جاری نہیں سمجھتے جس کی بدترین مثال عیسائی مذہب ہے جو پہلے تو خدا کی وحی کو ایک خاص گھرانہ یعنی بنی اسرائیل سے مخصوص کرتا ہے پھر وہاں بھی ایک عرصہ دراز تک پیغمبر اور شرائع بھیجکر آخر خدا کو پتہ لگتا ہے کہ شرائع کا بھیجنا فضول تھا انسان ان پر عمل نہیں کر سکتا خدا کا بیٹا کفارہ ہو تو کام بن سکتا ہے۔

۲۷۲۱ جدد۔ جَدّ ہموار زمین کا قطع کرنا ہے اور اسی سے ہے جَدَّ فی سیرہ یا جَدَّ فی امرہ۔ اور ثوبٌ جَدِیدٌ کا اصل بھی اسی سے ہے یعنی مراد اس سے مقطوع یا قطع کیا ہوا لباس ہے (کیونکہ قطع کر کے نیا لباس بنتا ہے) پھر ہر چیز جو نئی پیدا ہو اسے جدید کہا جاتا ہے بل ھم فی لبس من خلق جدید (قٓ ۵۔ ۱۵) اور جدد جُدَّۃ کی جمع ہے جس سے مراد کھلا رستہ ہے کیونکہ طریقٌ مجدُودٌ اس رستہ کو کہا جاتا ہے جس پر چلا جائے اور اسے قطع کیا جائے اور اسی سے جَادَّۃ ہے اور فیض الٰہی کو جَدّ کہا جاتا ہے انہ تعالیٰ جد ربنا (الجن ۲۔ ۳) اور بعض کے نزدیک اس کے معنی عظمت ہیں اور جو اللہ تعالیٰ انسان کو حظوظ دنیوی سے (اپنے فیض سے) عطا فرماتا ہے اسے بھی جدّ کہا جاتا ہے حدیث میں ہے لاینفع ذا الجدّ منک الجدّ حظوظ دنیوی اس کے صاحب کو نفع نہیں پہنچاتے یعنی ثواب آخرت حظوظ دنیا سے نہیں ملتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طاعت سے ملتا ہے اور جَدّ باپ کے باپ اور ماں کے باپ کو بھی کہا جاتا ہے پس جَدّ کے معنی نسب بھی ہو سکتے ہیں (غ)

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ
مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى
اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ
عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾

اور اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چارپایوں کے رنگ کئی طرح کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے صرف اس کے علم والے بندے ڈرتے ہیں۔ اللہ غالب بخشنے والا ہے ۲۷۲۲

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا
الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ
عَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾

جو لوگ کتاب اللہ کو پڑھتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور اس سے جو ہم نے انھیں دیا چھپ کر اور ظاہر خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو تباہ نہیں ہوگی۔

لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ
فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۰﴾

تاکہ وہ انھیں ان کے اجر پورے دے اور اپنے فضل سے انھیں بڑھ کر دے وہ بخشنے والا قدردان ہے۔

وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ
هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۳۱﴾

اور کتاب جو ہم نے تیری طرف وحی کی ہے وہ حق ہے اس کی تصدیق کرنے والی جو اس سے پہلے ہے۔ یقیناً اللہ اپنے بندوں سے خبردار (انھیں) دیکھنے والا ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا
مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ
وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ
بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۳۲﴾

پھر ہم نے کتاب کا وارث ان کو بنایا جنھیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چنا سو کوئی ان میں سے اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہے اور کوئی ان میں سے میانہ رو ہے، اور کوئی ان میں سے اللہ کے حکم سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے یہی بڑا فضل ہے ۲۷۲۳

غرابیب۔ غِربیب کی جمع ہے اور وہ سیاہی میں غراب یعنی کوّے سے مشابہ ہے (رغ)
مناظر قدرت کے اختلافات میں مراتب انسانی کے اختلافات کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ اگلی آیت میں واضح کر دیا ہے۔

۲۷۲۲ اختلافات قدرت میں تردید تناسخ اور ہستی باری پر دلیل: پہلی آیت میں نباتات اور جمادات کے اختلافات کی طرف توجہ دلائی ہے یہاں انسانوں اور جانوروں کے اختلافات کی طرف۔ ان اختلافات کی طرف توجہ دلانے میں ایک طرف عقیدۂ تناسخ کی کھلی تردید ہے اس لیے کہ اختلافات صرف انسانوں میں اور جانداروں میں نہیں بلکہ جمادات اور نباتات میں بھی ہیں پس یہ کسی پہلی پیدائش کے اعمال کا نتیجہ نہیں ہو سکتے کیونکہ جمادات کے لیے اہل تناسخ بھی پہلی پیدائش کوئی نہیں مانتے اور دوسری طرف ان تمام اختلافات قدرت کے اندر اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایک دلیل ملتی ہے کہ ایک ہی قسم کی ایک چیز دوسری سے نہیں ملتی اسی لیے ساتھ ہی فرمایا کہ علماء اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں یعنی جس قدر زیادہ کوئی شخص ان تغیرات عالم پر غور کرتا ہے اسی قدر زیادہ خشیۃ اللہ اس پر غالب ہوتی ہے آگے انہی کا ذکر ہے۔

۲۷۲۳ نظام مذہب کو قائم کرکے اور یہ بتا کر کہ سب نبیوں کے آخر پر ہم نے ایسا نبی بھیجا جو تمام پہلے انبیا کی تصدیق کرتا ہے اب بتایا ہے کہ آئندہ دنیا کی ہدایت کے لیے ہم نے جو مکمل کتاب نازل کی ہے یعنی قرآن کریم تو آنحضرت صلعم یا اُمم سالفہ کے بعد اس کا وارث امت محمدیہ کو بنایا ہے جو تمام اُمتوں میں سے برگزیدہ امت ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا وکذٰلک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (البقرۃ ۲ - ۱۴۳) اور اصطفینا من عبادنا اس امت کے متعلق فرما کر اس کے بہترین امت ہونے کی طرف اشارہ کیا لیکن یہ بتا دیا کہ یہ ساری امت بھی ایک رنگ میں رنگین نہیں اختلاف مراتب جو دنیا میں ہر جگہ موجود ہے ان میں بھی رہیگا ظالم لنفسہ وہ ہے جو ان ہدایات کی تعمیل میں قاصر رہتا ہے جو دی گئی ہیں مقتصد یا میانہ رو وہ ہے جو نیک اور بد کے بین بین ہے یعنی نیکی بھی کرتا ہے کبھی اس سے بدی بھی سرزد ہو جاتی ہے دیکھو ۸۵۴ اور سابق وہ ہے جو نیکیوں میں اور خدمات کے بجالانے میں کمال کو حاصل کرتا ہے اور ترتیب ان لوگوں کی کثرت و قلت کے لحاظ سے ہے یعنی تعداد میں زیادہ قاصر ہیں پھر میانہ رو پھر سابق اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ یہ سب اس اُمت میں سے ہیں اور سب جنت میں جائیں گے

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ۚ وَ لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۳۳﴾

ہمیشگی کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے ان میں انھیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے۔ اور ان کا لباس ان میں ریشم ہوگا۔

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۙ﴿۳۴﴾

اور کہیں گے سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے ہم سے غم دُور کر دیا، یقیناً ہمارا رب مغفرت کرنے والا قدر دان ہے۔

الَّذِيْۤ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾

وہ جس نے ہمیں اپنے فضل سے ٹھیرنے کے گھر میں اتارا نہ ہمیں اس میں مشقت ہوگی اور نہ ہمیں اس میں تکان ہوگی ۲۷۲۴

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۚ﴿۳۶﴾

اور جو کافر ہیں ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے، نہ اُن کا کام تمام کیا جائے گا کہ مرجائیں اور نہ کچھ اس کا عذاب ان سے ہلکا کیا جائے گا۔ اسی طرح ہم ہر ناشکرے کو سزا دیتے ہیں۔

وَ هُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۠﴿۳۷﴾

اور وہ اس میں چلائیں گے ہمارا رب ہمیں نکال دے۔ ہم اچھے عمل کریں گے نہ وہ جو (پہلے) کرتے تھے۔ کیا ہم نے تمھیں اتنی عمر نہ دی تھی کہ اس میں نصیحت حاصل کر لیتا جو نصیحت حاصل کرنا چاہتا تھا اور تمھارے پاس ڈرانے والا آیا سو چکھو کیوں کہ ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ۲۷۲۵

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۳۸﴾

اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے غیب کو جاننے والا ہے۔ وہ سینوں کی باتوں کو (بھی) جاننے والا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَ لَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَ لَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾

وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں حاکم بنایا، سو جو کوئی کفر کرے تو اس کا کفر اسی پر ہے اور کافروں کو ان کا کفر اُنکے رب کے نزدیک صرف بغض میں بڑھاتا ہے۔ اور کافروں کو ان کا کفر صرف نقصان میں بڑھاتا ہے۔

ہاں جو ظالم ہیں انہیں اللہ چاہے تو بخش دے اور چاہے تو سزا دیکر جنت دیدے۔

۲۷۲۴ لغوب: تکان اور مشقت کو کہا جاتا ہے وما مسنا من لغوب (قٓ - ۳۸) (غ) اور لغوب یعنی تکان نصب یعنی تکلیف یا مشقت کا نتیجہ ہے (ر) دار المقامۃ سے مراد دار الاقامۃ ہے۔

۲۷۲۵ یصطرخون - اصطراخ - صرخ سے باب افتعال ہے جس کی ت طا سے بدل گئی ہے معنی استغاثۃ یا مدد طلب کرنا ہیں دیکھو ۲۱۰۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰي بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ۝۴۰

کہہ کیا تم اپنے شریکوں کو دیکھتے ہو جنھیں تم اللہ کے سوائے پکارتے ہو مجھے دکھاؤ انھوں نے زمین سے کیا پیدا کیا ہے یا اُن کے لیے آسمانوں میں شرکت ہے، یا ہم نے انھیں کتاب دی ہے تو وہ اس کی کھلی دلیل پر قائم ہیں بلکہ ظالم جو ایک دوسرے کو وعدہ دیتے ہیں، صرف دھوکا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ڬ وَلَىِٕنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝۴۱

اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ اپنے رستہ سے ہٹ نہ جائیں۔ اور اگر وہ ہٹ جائیں تو اس کے بعد کوئی نہیں جو انھیں تھام سکے، وہ بُردبار بخشنے والا ہے ۲۴۲۶

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَاۗءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَۨا ۝۴۲

اور اللہ کی پکّی قسمیں کھاتے تھے کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آئے تو وہ قوموں میں سے ہر ایک سے بڑھ کر ہدایت والے ہوں گے پھر جب ان کے پاس ڈرانے والا آیا تو اس نے انھیں نفرت میں ہی بڑھایا ۲۴۲۷

اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۭ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ڬ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝۴۳

زمین میں تکبّر اور بُری تدبیریں کرنے لگے۔ اور بُری تدبیر کا وبال صرف اس کے کرنے والے پر ہی پڑتا ہے، سو یہ پہلوں کے ہی برتاؤ کا انتظار کرتے ہیں سو تُو اللہ تعالیٰ کے طریق میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا۔ اور نہ تُو اللہ کے طریق کو ٹلتا ہوا پائے گا۔

۲۴۲۶ تزولا۔ زال کے معنی ہیں ایک چیز اپنے رستہ سے ہٹ گئی ایک طرف کو مائل ہوتی ہوئی وان کان مکرھم لتزول منه الجبال (ابراھیم ۱۴-۴۶) اور اسی سے زوال ہے جو اس چیز کے متعلق کہا جاتا ہے جو پہلے ثابت ہوا ور زوال الشمس بلحاظ ظاہر کے کہا جاتا ہے اور مازال اور لایزال خاص محاورہ ہے جس کے معنی ہیں ہمیشہ رہا اور اس کی اصل یا سے ہے ولا یزالون مختلفین (ھود ۱۱-۱۱۸) لایزال بنیانھم (التوبة ۹-۱۱۰) فما زلتم فی شك (المؤمن ۴۰-۳۴) اور یہ گویا دو نفیوں کا اجتماع ہے اس لیے اس کے معنی اثبات کے ہیں (غ)

زمین کا رستہ سے ہٹنے کو روکنا صاف بتاتا ہے کہ زمین بھی حرکت کرتی ہے اور اس کا ایک رستہ ہے اور آسمانوں کا ہٹنے سے روکنا بتاتا ہے کہ آسمانوں سے مراد یہاں اجرام سماوی ہیں جو اپنے اپنے رستوں پر چلتے ہیں مطلب یہ کہ وہ قوانین جن سے یہ چیزیں اپنے اپنے رستوں پر چلتی ہیں اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں اگر ان چیزوں کے مقرر رستے نہ ہوں تو عالم تباہ ہو جائے لئن زالتا میں اشارہ قیامت کی طرف ہے۔

۲۴۲۷ احدی الامم سے مراد کل واحدۃ من الامم قریش جب سنتے کہ یہودیوں نے کس طرح اپنے پیغمبروں کو رد کیا اور جھٹلایا تو کہتے کہ اگر ہمارے پاس رسول آئے تو ہم اس کی تابعداری کر کے دکھائیں۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ
وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۚ وَمَا كَانَ
اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ
وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ﴿٤٤﴾
وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا
مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ وَلَٰكِن
يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ
ع ۸ ۱۷ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِعِبَادِهِ بَصِيرًا ﴿٤٥﴾

اور کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں، پس دیکھتے کہ ان کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے، اور وہ قوت میں ان سے بڑھ کر تھے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ اسے کوئی چیز عاجز کر دے (نہ) آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ جاننے والا قدرت والا ہے۔

اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس پر پکڑتا جو وہ کرتے ہیں تو اس کی پیٹھ پر کوئی حیوان نہ چھوڑتا۔ لیکن وہ انھیں ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا ہے، سو جب ان کا وقت آجائے گا۔ تو اللہ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے[۲۷۲۸]

۲۷۲۸ دابۃ سے مراد زمینی لوگ: یہی مضمون النحل ۱۶: ۶۱ میں ہے ولو یواخذ اللہ الناس بظلمھم ما ترك علیھا من دابۃ ولکن یوخرھم الی اجل مسمی فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔ دابۃ ہر زمین پر چلنے والا ہے مگر مجازاً اس سے مراد وہ لوگ لیے گئے ہیں جو حیوانات کی طرح زمین پر جھکے رہتے ہیں اور اسی زندگی کو اصل غرض اور مقصد سمجھ لیتے ہیں جیسے فرمایا ان ھم الا کالانعام (الفرقان ۲۵: ۴۴) ظلم یا برے اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی گرفت انسانوں پر ہی ہوتی ہے اور انہی انسانوں کا یہاں ذکر ہو سکتا ہے نہ دوسروں کا یؤخرھم میں ضمیر ھم جو عقلا کے لیے ہے صاف بتاتی ہے کہ یہاں اسی قسم کے لوگوں کا ذکر ہے مراد حیوانات نہیں اور سارے لوگ بھی اس میں شامل نہیں اور دابۃ سے مراد انسان ہونا مفسرین نے بھی مانا ہے (د)

اٰیاتھا ۸۳ — سُوْرَةُ يٰسٓ مَكِّيَّةٌ (۳۶) — رکوعاتھا ۵

نام: اس سورت کا نام یٰس ہے اور اس میں پانچ رکوع اور ۸۳ آیتیں ہیں۔ اس کا نام یٰس پہلی آیت سے لیا گیا ہے اور یہ خطاب اے انسان آنحضرت صلعم کو ہے جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ انسانیت کو آپ نے کمال تک پہنچایا اور اس لیے آپ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے ہی انسان کمال کو حاصل کر سکتا ہے یہی اس سورت کا اصل مضمون ہے اس سورت کو خود زبان مبارک نبوی سے قلب قرآن کا خطاب ملا ہے اور اس کے فضائل احادیث میں بہت سے آئے ہیں اور اس کا قلب قرآن ہونا اسی لحاظ سے ہے کہ قرآن کی اصل غرض انسان کو کمال پر پہنچانا ہے اور اسی کا بالخصوص ذکر اسی سورت میں ہے اور بلحاظ ترتیب ظاہری بھی اس کا مقام قلب کا ہی ہے۔

خلاصہ مضمون: سب سے پہلے قرآن کو آنحضرت صلعم کی صداقت پر بطور شہادت پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ آنحضرت صلعم کا معجزہ قرآن کریم ہے کیونکہ آپ نے جس بات کا دعویٰ کیا ہے اسے قرآن کریم ثابت کر دے گا اور وہ ثابت کر دینا عملی طور پر انسانوں کو اس مقام پر پہنچانا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ جن انسانوں کو اس مقام پر پہنچانا ہے ان کی حالت کیسی ہے اور ان میں احساس گویا مر چکا ہے دوسرے رکوع میں ایک مثال کے رنگ میں سمجھایا ہے کہ وہ قوم جس کی اصلاح کا کام آنحضرت صلعم کے سپرد براہ راست کیا گیا ہے اس قابل نہ رہی تھی کہ کوئی موجودہ مذہب ان کی اصلاح کر سکتا۔ اور عملی طور پر پہلے مذاہب اس کی اصلاح کی کوشش میں ناکام ہو چکے ہیں۔ تیسرے رکوع میں حق کی صداقت کے کچھ نشانات بیان کر کے یہ سمجھایا ہے کہ آنحضرت صلعم کے وجود باجود سے اللہ تعالیٰ ایک مردہ زمین کو زندہ کر دیگا چوتھے رکوع میں آپ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے والوں کی جزا اور آپ کی مخالفت کرنے والوں کی سزا کا ذکر ہے اور پانچویں میں بتایا ہے کہ جو قومیں اپنے برسر عروج ہونے کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتی ہیں انہیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کے بھی آخر زوال کا وقت آئے گا اور اللہ تعالیٰ جس کی قدرت اور حکومت تمام اشیاء پر ہے حق کو غالب کرے گا اور معبودان باطل اپنے پرستاروں کی کوئی نصرت نہ کر سکیں گے۔

تعلق اور زمانہ نزول: پچھلی سورت میں انسانوں کی ربوبیت روحانی کا ذکر تھا اور بتایا تھا کہ اس نے تمام قوموں کی ربوبیت روحانی بذریعہ رسل کے کی تو اب یہاں یہ بتایا ہے کہ اب انسان کامل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے تمام انسانوں کی ربوبیت روحانی ہوگی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھ سورتوں کا ایک مجموعہ ہے یعنی السبا۔ فاطر۔ یٰس۔ الصّٰفّٰت۔ ص۔ الزمر۔ چنانچہ سورۃ السبا الحمد للہ رب العالمین سے شروع ہوتی ہے اور سورۃ الزمر الحمد للہ رب العالمین پر ختم ہوتی ہے۔ ان کا مضمون بھی قریباً ایک ہی چلتا ہے اور زمانہ نزول بھی ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ سورت بھی درمیانی مکی زمانہ کی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنیوالے کے نام سے

یٰسٓ ① — اے انسان (کامل) ۲۷۲۸

وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ ② — حکمت والا قرآن گواہ ہے ۲۷۲۹

۲۷۲۸ یٰس حضرت ابن عباس سے اس کے معنی اے انسان مروی ہیں (ج) اور بعض روایات میں ہے کہ اس کے یہ معنی لغت حبش یا لغت طے میں ہیں (د) اور بعض نے اسے اسمائے اللہ یا اسمائے قرآن یا اسمائے رسول اللہ صلعم میں سے کہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ س مقطعات کے طور پر انسان میں سے لیا گیا ہے اور انسان کا لفظ نکرہ لانے سے آپؐ کے کمال انسانیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

۲۷۲۹ و دیکھو ۶۸۴ یہ واؤ قسم کی کہلاتی ہے۔ قسم اصل میں کیا چیز ہے۔ انسان کے قسم کھانے کا یہ منشا ہوتا ہے کہ وہ اپنے بیان کو کسی زبردست شہادت سے مؤید کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کی قسم کھانا: اب یہ پہلے دکھایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے وہی لفظ استعمال ہوتے ہیں جو انسان کے لیے مگر دونوں کے استعمال میں یہ کھلا فرق ہے کہ جب ایک فعل اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کا منشا صرف اس فعل کی آخری غرض ہوتی ہے اور وہ آلہ یا ذریعہ کالعدم ہوتا ہے جس کے واسطہ سے انسان اس غرض کو حاصل کرتا ہے جس طرح بنانا ایک فعل ہے۔ جب انسان کسی چیز کو بنائے گا تو وہ آلوں اور ذریعوں کے واسطے سے ایک چیز کو جو پہلے نہیں تھی وجود میں لائے گا۔ لیکن یہی فعل بنانا جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو گا تو مطلب صرف اس کا وجود میں لانا ہو گا اور آلے اور ذریعے درمیان میں نہیں رہیں گے۔ پس قسم کی اصل غرض چونکہ ایک شہادت پیش کرنا ہے اس لیے جب قسم اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو گی تو مطلب صرف یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ اور شہادتوں سے ایک بیان کو مؤید کرنا چونکہ معیوب نہیں بلکہ ضروری ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کی قسم کھانا بھی معیوب نہیں بلکہ ضروری ہے۔ پس قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کی قسموں پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ صرف کم فہمی سے پیدا ہوا ہے یعنی یہ خیال کر کے کہ قسم کی غرض کوئی نہیں یہ محض کوئی ڈھکوسلا ہے۔

اقسام قرآن: غور کیا جائے گا تو معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ربوبیت کی بھی قسم کھائی ہے یعنی اپنی صفت ربوبیت کو بطور گواہ پیش کیا ہے دیکھو ۶۸۴ نبی کریم صلعم کی زندگی کی قسم کھائی ہے گویا آپ کی پاکیزہ زندگی کو بطور گواہ پیش کیا ہے۔ دیکھو ۱۴۰۲ یہاں قرآن حکیم کی قسم کھائی ہے گویا قرآن حکیم کو نبی کریم صلعم کی صداقت کی شہادت میں پیش کیا ہے۔ ملائکہ اور ہواؤں کی قسمیں کھائی ہیں۔ آسمان اور نجم کی قسم کھائی ہے مومنوں کی قسم کھائی ہے جس کا ذکر آگے اپنے اپنے موقعہ پر آئے گا اور سب سے زیادہ ضروری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ بعض وقت آئندہ ہونے والے واقعات کی قسم کھائی ہے گویا انہیں بطور شہادت پیش کیا ہے اور ان کی شہادت یہ ہوتی ہے کہ ان واقعات کا ہو جانا جن کے لیے بتانے کے وقت کوئی قرائن موجود نہ تھے ایک کھلا ثبوت اس کلام کی صداقت کا ہو جاتا ہے۔

یہاں قرآن حکیم کی قسم کا جواب ہے کہ آنحضرت صلعم رسولوں میں سے ہیں۔ اور سیدھے رستہ پر ہیں (علی صراط مستقیم خبر ثانی ہے) پس معلوم ہوا کہ قرآن حکیم کو آپ کی رسالت پر بطور گواہ پیش کیا ہے۔ گویا یہ آپ کا معجزہ ہے جس سے آپ کی رسالت ثابت ہوتی ہے اور یہ آنحضرت صلعم کی کل انبیائے عالم پر فضیلت ہے کسی نبی کی کتاب اس کا معجزہ نہیں اور نہ اس کی صداقت پر بطور گواہ پیش کی گئی ہے سوائے قرآن کریم کے، انجیل حضرت مسیح کا معجزہ نہیں نہ توریت حضرت موسیٰ کا مگر قرآن کریم آنحضرت صلعم کا معجزہ ہے دوسرے انبیاء کے معجزات چند خارق عادت امور ہیں جو انکے سامنے کے لوگوں نے بھی سب نے نہیں دیکھے۔ مگر قرآن حکیم وہ معجزہ ہے جو نہ صرف آپ کی زندگی میں کل عرب نے دیکھا بلکہ آج تیرہ سو سال سے عرب و عجم ایشیا و یورپ سب دیکھتے چلے جاتے ہیں۔ اور ہمیشہ تک ساری دنیا دیکھتی چلی جائے گی پس یہی ایک زندہ معجزہ ہے اور ضروری تھا کہ جس شخص پر نبوت و رسالت کو ختم کیا جاتا اسے ایسا ہی زندہ اور دائمی معجزہ دیا جاتا پھر یہ صرف معجزہ نہیں بلکہ دلیل بھی ہے ہر ایک معجزہ صرف اس قدر دکھاتا ہے کہ اس کے دکھانے والے کو اللہ تعالیٰ نے معمولی انسانوں سے بڑھکر کوئی طاقت دی ہے مگر یہ ایسا معجزہ ہے کہ اس کا اعجاز ہی اس کی صداقت کی دلیل ہے اور ایسی سیدھی زبردست اور دلوں کو کھا جانے والی دلیل ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے آنحضرت صلعم کیلئے کسی اور معجزہ کی ضرورت نہ تھی گو اللہ تعالیٰ نے دوسری قسم کے بھی بہتیرے معجزات آپ کو عطا فرمائے۔

ایک اور بات قابل غور یہ ہے کہ یہاں قرآن کے حکیم ہونے کو بطور شہادت پیش کیا ہے یعنی یہ ایک پُر حکمت کتاب ہے بلاشبہ ایک اُمّی قوم کے اُمّی انسان کے منجانب اللہ ہونے پر اس سے بڑھکر کیا شہادت ہو سکتی تھی کہ ان پُر حکمت باتوں کو پیش کیا جائے جو اس کے منہ سے نکلتی ہیں مگر اس نے کہیں سے نہیں سیکھیں۔ یہاں قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت کو اور اسکی کامیابی کو بطور اعجاز پیش نہیں کیا بلکہ اس کی حکمت کو پیش کیا ہے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قرآن کریم نے مذہب کو ایک سائنس اور علم بنا دیا یہ کام دنیا کی اور کسی کتاب نے نہیں کیا۔ ہاں حکمت کی بات پہلے لفظ پرست لوگوں کو سمجھ نہیں آتی لیکن جوں جوں علم ترقی کرتا ہے حکمت کی باتیں خود دلوں میں گھر کرتی چلی جاتی ہیں ان تیرہ سو سال میں لوگوں نے کیا کیا حکمت کی باتیں اس پاک کتاب سے سیکھی ہیں انہیں چھوڑ کر صرف اسی بات کو دیکھا جائے کہ آج یورپ کس طرح باوجود مسلمانوں کے ساتھ سخت ترین عداوت کے قرآن حکیم کے اصولوں کو تسلیم کرتا چلا جاتا اور ان کے سامنے سر جھکاتا چلا جاتا ہے۔ تو یہ نتیجہ یقینی ہو جاتا ہے کہ جوں جوں علم ترقی کریگا قرآن کریم کی صداقت خود بخود روشن ہوتی چلی جائے گی۔

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿٣﴾
کہ تو پیغمبروں میں سے ہے۔

عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿٤﴾
سیدھے رستہ پر ہے۔

تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ﴿٥﴾
غالب رحم والے نے اتارا ؏٢٧٣٠

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿٦﴾
تاکہ تو ان لوگوں کو ڈرائے، جن کے باپ دادا نہیں ڈرائے گئے سو وہ غافل ہیں ؏٢٧٣١

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓی اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿٧﴾
اُن میں سے بہتوں پر بات پوری ہوئی سو وہ ایمان نہیں لاتے ؏٢٧٣٢

اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴿٨﴾
ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈالے ہیں اور وہ ٹھوڑیوں تک ہیں سو ان کے سر اونچے کے اونچے رہ گئے ہیں ؏٢٧٣٣

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا
اور ہم نے ان کے سامنے ایک دیوار بنا دی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے بھی، یوں ان پر پردہ ڈال دیا ہے

؏٢٧٣٠ تنزیل کی نصب مدح پر ہے اور عزیز رحیم کی طرف سے اس کا اترنا بیان کیا تا معلوم ہو کہ یہ منکروں پر غالب آئے گا اور ماننے والوں کیلئے بڑے بلند مراتب کا موجب ہوگا۔ کیونکہ صفت رحیمیت مومنوں سے خاص ہے۔

؏٢٧٣١ اس میں شبہ نہیں کہ آنحضرت صلعم سے پہلے حجاز میں کوئی رسول نہیں آیا لیکن یہاں ما انذر اٰباؤھم سے مراد یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ انہوں نے انذار قبول نہیں کیا کیونکہ یہاں اُن کی سخت دلی کا ذکر ہے اور ایک رنگ میں یہود و نصاریٰ کے ذریعہ سے ملک عرب کے لوگوں کو انذار ہوا مگر انہوں نے اسکی پروا نہیں کی اسلیئے ان کی حالت غافلون کی تھی یعنی ایسے لوگ جن میں نیکی کا احساس بھی نہ رہا تھا ایسی قوم کے انذار کو آپکے سپرد کرنے میں یہ بتایا ہے کہ کس قدر مشکل وہ کام تھا۔ جو آنحضرتؐ کے سپرد کیا گیا جس قوم کی اصلاح کرنے میں پہلے مذاہب ناکام ہوئے اسکی اصلاح آپ کے ذمے ڈالی گئی۔

؏٢٧٣٢ کیا قول پورا ہوا۔ عموماً قول ابلیس مراد لیا گیا ہے لاغوینھم اجمعین اور ابو حیان نے ایک قول اس کے معنی میں نقل کیا ہے کہ مراد رسولوں کا قول توحید ہے اور حق سے مراد ہے کہ اس کی دلیل روشن ہو گئی (د) اور میرے نزدیک قول فھم غافلون ہی ہے۔ کیونکہ غافل اسے کہتے ہیں جسے اس چیز کا احساس نہ ہو جس کا احساس ہونا چاہیے دیکھو ؏١٥١٦ ب گویا ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں نیکی اور روحانیت اور اخلاق فاضلہ کا احساس ہی باقی نہیں رہا۔

؏٢٧٣٣ مقمحون قَمَحَ اونٹ کے متعلق کہا جاتا ہے جب وہ حوض پر سر اونچا کرے اور پانی نہ پیئے اور مُقْمَح وہ شخص ہے جو اپنا سر اونچا کئے ہوئے ہے گویا اسے نیچا کر ہی نہیں سکتا اور اِقْمَاح سر کے اونچا اور آنکھ کے نیچا کرنے کو بھی کہا جاتا ہے اور اَقْمَحَهُ الْغُلُّ کے معنی ہیں کہ طوق کی تنگی کی وجہ سے اس کا سر اونچا رہ گیا (ل) اور اَقْمَحْتُ الْبَعِیْرَ کے معنی ہیں اونٹ کے سر کو پیچھے کی طرف کو باندھ دیا اور مقمحون یہاں اس کے ساتھ بطور تشبیہ کے ہے اور مثال کے طور پر اور غرض ان کے اس وصف کو بیان کرنا ہے کہ وہ حق کی فرمانبرداری سے اور رشد کے قبول کرنے سے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے کس طرح انکار کر رہے ہیں اور کہا گیا ہے کہ یہ قیامت میں ان کی حالت کی طرف اشارہ ہے (غ)۔

گردنوں میں طوقوں کے ہونے سے مراد ان کا رسم و رواج وغیرہ میں جکڑا ہوا ہونا ہے دیکھو ؏١٥٩٩ اور طوقوں کا ٹھوڑیوں تک ہونا اسی تشبیہ کے لحاظ سے ہے جو مقمحون میں ہے کیونکہ جب طوق ٹھوڑی تک ہوگا تو سر بالکل نیچے نہیں ہو سکے گا اور مراد یہی ہے کہ رسم و رواج کے طوقوں نے انہیں ایسے طور پر جکڑا ہوا ہے کہ وہ اپنے سروں کو بالکل نہیں جھکا سکتے اور تیسیر میں ہے کہ اس سے مراد ہے کہ انہیں قبول حق کی توفیق نہیں ملتی یہاں تک کہ وہ حق کے مقابلہ میں تکبر اختیار کرتے ہیں کیونکہ متکبر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی گردن اونچی ہے اور بعض نے اسے ان کے کفر پر پختہ ہونے سے تمثیل لیا ہے گویا کفر پر اس شخص کی طرح پختہ ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہوں کہ وہ اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے اور ضحاک اور فراء کا قول ہے کہ گردنوں میں طوق ہونے سے مراد ان کا فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے رکنا ہے جیسا کہ فرمایا لا تجعل یدك مغلولة الی عنقك (بنی اسرائیل - ٢٩) اور قیامت میں ایسا ہونا تو ظاہر ہے کیونکہ جو حالت انسان اپنی اس دنیا میں رکھتا ہے وہی قیامت میں کھلے طور پر ظاہر ہو جائے گی اور اخلاقی اور غیر مرئی امور ظاہر طور نظر آنے لگیں گے۔ آج یہی رسم و رواج کے طوق مسلمانوں کے گلے میں پڑے ہوئے ہیں۔

يُبْصِرُوْنَ ۝۹

سو وہ نہیں دیکھتے [۲۷۳۴]

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰

اور ان کے لیے برابر ہے کہ تو انھیں ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان نہیں لاتے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ۝۱۱

تو صرف اسے ڈرا سکتا ہے جو نصیحت کی پیروی کرتا ہے اور رحمٰن سے غیب میں ڈرتا ہے، سو اُسے مغفرت اور عزّت والے رزق کی خوش خبری دے دے۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۲ ع

ہم ہی مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ہم لکھ لیتے ہیں جو وہ آگے بھیجتے ہیں اور ان کے نشان پیچھے رہ جاتے ہیں اور ہر ایک چیز کو ہم ایک کُھلی کتاب میں محفوظ کر لیتے ہیں [۲۷۳۵]

وقف غفران — ع ۱ – ۱۸ منزل

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝۱۳ ج

اور ان کے لیے گاؤں کے رہنے والوں کی مثال بیان کر، جب ان کے پاس رسول آئے [۲۷۳۶]

۲۷۳۴ اعنیںھم۔ غشاوۃ کیلئے دیکھو ۱۸ع اور اَغشٰی کے معنی ہیں پردہ ڈال دیا کانما اغشیت وجوھم (یونس ۲۷-۱۰) سامنے اور پیچھے روک ہونا اور پردہ ڈالنا سب اسی معنی میں ہے جیسا طوقوں وغیرہ کا ہونا اور خلفھم کی روک یہ ہے کہ وہ عواقب امور پر غور نہیں کرتے گویا ان کی نظر رک گئی ہے اور آگے نہیں جاتی اور بین ایدیھم سے مراد یہ ہے کہ پچھلی تاریخ پر اور قوموں کی حالت پر غور نہیں کرتے گویا اس طرف سے بھی نظر رکی ہوئی ہے اور یہی دو باتیں ہیں یعنی عواقب امور میں فکر کرنا اور پہلی قوموں کی حالت پر غور یا پہلے لوگوں کو جو ایسے ہی افعال پر نتائج ملے ان پر غور کرنا جن سے راہ راست پر چلنے کی توفیق ملتی ہے پس جب یہ دو باتیں نہیں تو گویا ان پر پردہ پڑ گیا اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف ان باتوں کو منسوب کیا اسلیئے کہ یہ سب باتیں ان کے افعال کا نتیجہ ہیں ؎

۲۷۳۵ قرآن کریم کا احیائے موتے کا عظیم الشان معجزہ: نحی الموتٰی میں اشارہ انہی کفر پر اصرار کرنیوالوں کیطرف بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ ابھی پچھلی سورت میں وما یستوی الاحیاء ولا الاموات (فاطر ۳۵-۲۲) میں کفار کو مردے کہا ہے اور قیامت کے دن مردوں کو زندہ کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے مگر یہاں پہلے معنی انسب ہیں۔ یعنی اول ان کے کفر پر اصرار اور مردہ ہونے کا ذکر کیا اور پھر فرمایا کہ اس قرآن حکیم کے ذریعہ سے ہم ان مردوں کو بھی زندہ کرینگے اور یہ ایسے زندہ ہونگے کہ نہ صرف اپنے لیے اعمال صالحہ آگے بھیجیں گے جس کا ذکر ما قدموا میں ہے بلکہ وہ اپنے پیچھے علم اور نیکی کے آثار چھوڑیں گے اس لیے واثارھم بھی ساتھ بڑھایا۔ اور فی الحقیقت قرآن کریم نے اپنی صداقت کا ثبوت مردہ عرب کو زندہ کر کے دیدیا اور ایسا ثبوت کسی اور نبی کی زندگی میں ہمیں نظر نہیں آتا۔ ہاں اسی طرح بے شمار مردے اس نے زندہ کیئے اور آئندہ بھی کرے گا۔ یوں جو دعوی شروع رکوع میں کیا تھا کہ قرآن کریم آنحضرت کا معجزہ ہے اس کا ثبوت یہاں دیدیا۔ امام بمعنی کتاب کے لیے دیکھو ۱۵۵ع ؎

۲۷۳۶ انطاکیہ اور حواریین عیسیٰ: اس قریہ سے مفسرین نے مراد انطاکیہ لیا ہے اور یہی حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے اور مرسلون سے مراد قتادہ اور اجلہ مفسرین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری لیے ہیں (ر) اور بعض کے نزدیک یہ اللہ کے رسول تھے جو حضرت عیسیٰ کی تائید کیلئے بھیجے گئے اور کہتے ہیں وہ عیسیٰ کی شریعت کی پیروی کرنے والے تھے مگر اول تو حضرت عیسیٰ خود حضرت موسیٰ کی شریعت کے پیرو تھے اور دوسرے حدیث سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ اور آنحضرت صلعم کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا اور یہ زمانہ فترت ہے۔ پس اگر ان الفاظ میں کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ سمجھا جائے تو مرسلون سے مراد حضرت عیسیٰ کے بھیجے ہوئے ہونگے اور ان پر لفظ رسول بطور مجاز بولا گیا ہے لیکن اول تو ایسا کوئی خاص تاریخی واقعہ عیسائیت کی تاریخ میں نظر نہیں آتا دوسرے اللہ تعالےٰ نے یہاں صاف الفاظ میں اسے مثال کہا ہے اس لیے تاریخی واقعہ مراد لینا درست بھی نہیں۔ بلکہ یہ صرف مثال کے طور پر ایک بات سمجھائی ہے اور اس میں عرب کی سخت دلی کا بیان ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان لوگوں کے احساس مذہبی کی یہ حالت تھی کہ دو رسولوں کا پیغام یکے بعد دیگرے انہیں پہنچایا گیا مگر اس قوم پر کوئی اثر نہ ہوا اور یہ دو رسول حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام تھے۔ اور یہ امر واقع ہے کہ عرب کی اصلاح کیلئے پہلے یہودیوں نے بڑی زبردست کوشش کی اور ناکام رہے اور پھر

إِذْ أَرْسَلْنَآ إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا
فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوٓا إِنَّآ إِلَيْكُم مُّرْسَلُونَ ۝١٤

جب ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو انھوں نے دونوں کو جھٹلایا تب ہم نے تیسرے سے قوت دی سو انھوں نے کہا کہ ہم تمھاری طرف رسول ہیں۔ ۲۷۳۷

قَالُوا مَآ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَآ
أَنزَلَ الرَّحْمَٰنُ مِن شَيْءٍ إِنْ أَنتُمْ
إِلَّا تَكْذِبُونَ ۝١٥

انھوں نے کہا، تم تو ہماری طرح انسان ہی ہو، اور رحمٰن نے کچھ نہیں اتارا۔ تم جھوٹ ہی کہتے ہو۔

قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّآ إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ ۝١٦

انھوں نے کہا ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم تمھاری طرف ضرور بھیجے گئے ہیں۔

وَمَا عَلَيْنَآ إِلَّا الْبَلَٰغُ الْمُبِينُ ۝١٧

اور ہمارے ذمے سوائے کھول کر پہنچا دینے کے اور کچھ نہیں۔

قَالُوٓا إِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ لَئِن لَّمْ
تَنتَهُوا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُم مِّنَّا
عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝١٨

انھوں نے کہا ہم نے تمھیں منحوس پایا ہے اگر تم باز نہ آؤ، تو ہم تمھیں پتھرا دیں گے اور ہماری طرف سے ضرور تمھیں دردناک دُکھ پہنچے گا۔

قَالُوا طَٰٓئِرُكُم مَّعَكُمْ أَئِن ذُكِّرْتُم
بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ۝١٩

انھوں نے کہا تمھاری نحوست تمھارے ساتھ ہی ہے کیا اس لیے کہ تمھیں نصیحت کی گئی ہے بلکہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو۔ ۲۷۳۸

وَجَآءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَىٰ
قَالَ يَٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ ۝٢٠

اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا اے میری قوم رسولوں کی پیروی کرو۔ ۲۷۳۹

اتَّبِعُوا مَن لَّا يَسْـَٔلُكُمْ أَجْرًا وَهُم مُّهْتَدُونَ ۝٢١

ان کی پیروی کرو جو تم سے اجر نہیں مانگتے اور وہ ہدایت پر ہیں۔

عیسائیوں نے ہمارے نبی کریم صلعم کی تشریف آوری سے پہلے بڑی بھاری کوشش کی مگر ملک عرب پر بحیثیت مجموعی کوئی اثر نہ ہوا اور اس کا ذکر اسی مناسبت سے کیا کہ عرب کے لوگوں کی سخت دلی کا اوپر ذکر تھا کہ ان میں نیکی کا احساس بھی باقی نہ رہا تھا۔ اسلیئے انہوں نے نہ یہود کے پیغام کی پرواہ کی نہ نصاریٰ کی اور اسکو بطور مثال یوں بیان کیا کہ ایک بستی ایسی سخت دل ہے جو دو رسولوں کو جھٹلا چکی ہے تب تیسرا رسول انکے پاس بھیجا جاتا ہے اگر اس واقعہ کیطرف اشارہ نہ ہو تو پھر دو رسول پہلے بھیجنے میں اور تیسرا بعد میں بھیجنے میں کوئی خاص غرض نظر نہیں آتی ۞

۲۷۳۷ عزّزنا۔ عزّ سے ہے دیکھو ۱۳۶۷ اور عزۃ بمعنی شدت و قوت بھی ہے اور عَزَّزْتُ کے معنی ہیں قوی کیا مضبوط کیا (ل) ۞

۲۷۳۸ طائرکم معکم یعنی تمہاری شومئ قسمت کی وجہ تمہارے اپنے اعمال ہیں اَئِن ذکرتم کا جواب محذوف ہے یعنی کیا نیک نصیحت کو تم اپنی شومی قسمت کی وجہ ٹھہراتے ہو یا نیک نصیحت کرنے پر تم ہمیں بُرا کہتے ہو اور دکھ دیتے ہو ۞

۲۷۳۹ مفسرین نے اس کا نام حبیب دیا ہے مگر یہ محض خیال ہی خیال ہے۔ یہ واقعہ بھی اسی تمثیل کا حصّہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ رسولوں کی تائید کے لیے کوئی نہ کوئی با اثر شخص اس قوم میں سے کھڑا ہو جاتا ہے جو لوگوں کو سمجھاتا ہے قرآن کریم میں رجل مومن من اٰل فرعون کا ذکر ہے اور حضرت عیسیٰ کی تائید کیلئے یوسف آرمتیا کھڑا ہو گیا تھا آنحضرت صلعم کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کے ذریعہ سے نصرت پہنچائی اور بہت سے لوگ آپکی نصیحت سے داخل اسلام ہوئے مطلب یہ ہے کہ رسولوں کو اللہ تعالےٰ بغیر نصرت کے نہیں چھوڑتا ۞

وَمَالِيَ لَآ اَعۡبُدُ الَّذِيۡ فَطَرَنِيۡ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۲﴾

اور مجھے کیا ہوا کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

ءَاَتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنۡ يُّرِدۡنِ الرَّحۡمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغۡنِ عَنِّيۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَا يُنۡقِذُوۡنِ ﴿۲۳﴾

کیا میں اُسے چھوڑ کر (اور) معبود بناؤں کہ اگر رحمٰن مجھے کوئی دُکھ پہنچانے کا ارادہ کرے تو ان کی سفارش میرے کسی کام نہ آئے گی اور نہ وہ مجھے بچا سکیں گے۔

اِنِّيۡۤ اِذًا لَّفِيۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۲۴﴾

میں اس صورت میں یقیناً کھلی گمراہی میں ہوں گا۔

اِنِّيۡۤ اٰمَنۡتُ بِرَبِّكُمۡ فَاسۡمَعُوۡنِ ﴿۲۵﴾

میں تمھارے رب پر ایمان لایا سو میری (بات) سنو

قِيۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيۡتَ قَوۡمِيۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾

کہا گیا، جنت میں داخل ہو جا، اس نے کہا اے کاش میری قوم جانتی [۲۷۴۰]

بِمَا غَفَرَ لِيۡ رَبِّيۡ وَجَعَلَنِيۡ مِنَ الۡمُكۡرَمِيۡنَ ﴿۲۷﴾

وہ جو میرے رب نے میری مغفرت کی اور مجھے عزّت والوں میں سے بنایا۔

وَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلٰى قَوۡمِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ مِنۡ جُنۡدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنۡزِلِيۡنَ ﴿۲۸﴾

اور ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارا اور نہ ہم کبھی اتارتے ہیں [۲۷۴۱]

اِنۡ كَانَتۡ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمۡ خٰمِدُوۡنَ ﴿۲۹﴾

وہ صرف ایک آواز ہوتی ہے۔ پس وہ ناگہاں بجھ کر رہ گئے۔

يٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ ۚ مَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۳۰﴾

ہائے افسوس بندوں پر کوئی رسول اُن کے پاس نہیں آتا مگر وہ اس سے ہنسی کرتے ہیں۔

اَلَمۡ يَرَوۡا كَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنَ

کیا وہ غور نہیں کرتے کتنی نسلیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک

۲۷۴۰ قیل ادخل الجنۃ میں ایک قول تو یہ ہے کہ وہ زندہ جنت میں داخل ہوگا اور دوسرا یہ ہے کہ شہید ہو کر داخل جنت ہوا اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ جنت اس کے لیے واجب ہوگئی (ج) اور بعض نے مراد اس سے صرف بشارت لی ہے یعنی اسے جنت کی خوش خبری دی گئی (د) اور یہ معنی لیے جائیں تو پھر موت کے وقت سے اس کی خصوصیت نہیں بہتیرے لوگ ہیں جنہیں اس دنیا کی زندگی میں جنت کی بشارت دی جاتی ہے اور ہمارے نبی کریم صلعم کے دس صحابی جو عشرہ مبشرہ کہلاتے ہیں مشہور ہیں اور اس کا اپنی قوم پر افسوس کرنا بظاہر اسی دنیا کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

۲۷۴۱ اعدائے حق کی ہلاکت کیلئے آسمان سے فرشتے نہیں اترتے: من بعدہ سے مراد اس کی موت لی گئی ہے مگر اس کے ایمان لانے کے بعد بھی مراد ہو سکتی ہے کیونکہ ایمان لا کر وہ اپنی قوم سے نکل جاتا ہے اور قوم مخالفت پر اڑی رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دشمن حق قوم پر ہم آسمان سے لشکر نہیں اتارا کرتے بلکہ زمین سے ہی وہ اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو اس قوم کی تباہی کا موجب ہو جاتے ہیں خواہ وہ زلزلہ ہو۔ یا آتش فشاں ہو یا آندھی ہو یا غرق ہو یا جنگ ہو۔ پہلے نبیوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا اور ہمارے نبی کریم صلعم کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا اور نزول ملائکہ جس کا ذکر جنگوں کے متعلق آتا ہے وہ صرف مومنوں کو قوت دینے اور دشمنوں کے دل میں رُعب ڈالنے کیلئے تھا۔ دشمن کے مارنے کے لیے اوپر سے فرشتوں کے آنے کو یہ آیت غلط ٹھہراتی ہے اس لیے لڑائیوں میں فرشتوں کا مقابلہ کرنا صحیح نہیں۔ اور اگلی آیت میں جو آتا ہے صیحۃ واحدۃ تو یہ بھی سب کے لیے ہے۔ خود نبی کریم صلعم کے اعدا کے متعلق آگے آتا ہے ما ینظرون الا صیحۃ واحدۃ (۴۹) تو مراد اس سے عذاب کے متعلق حکم الٰہی ہے۔ خواہ کسی رنگ میں ہو اور بعض نے جند من السماء سے مراد ملائکہ وحی لے کر یہ مطلب لیا ہے کہ اس کے بعد اس کی قوم پر نبوت کا دروازہ بند ہو گیا مگر ایک مومن کے قتل ہونے پر اللہ تعالیٰ کا کسی قوم کو نبوت سے محروم کر دینا سمجھ نہیں آتا۔

الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٣١﴾ | کیں کہ وہ ان کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے ٢٧٤٢

ع وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿٣٢﴾ | اور کُل ہاں سب کے سب ہی ہمارے حضور حاضر کیے جائیں گے

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا | اور ایک نشان ان کے لیے مردہ زمین ہے ہم نے اسے زندہ کیا

وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿٣٣﴾ | اور اس میں سے اناج نکالا تو وہ اس سے کھاتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ | اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے

وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿٣٤﴾ | اور اس میں چشمے جاری کیے۔

لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ | تاکہ وہ اس کے پھل سے کھائیں اور اُن کے ہاتھوں نے

اَيْدِيْهِمْ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٣٥﴾ | اسے نہیں بنایا، تو کیا وہ شکر نہیں کرتے ٢٧٤٣

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا | بے عیب (ذات) ہے جس نے سب جوڑے پیدا کیے اس

مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ | سے جو زمین اگاتی ہے اور ان کی اپنی جانوں سے اور

وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٦﴾ | اس سے جو وہ نہیں جانتے ٢٧٤٤

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ | اور ایک نشان ان کے لیے رات ہے اس سے ہم دن کو

فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿٣٧﴾ | کھینچ لیتے ہیں تو ناگہاں وہ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں ٢٧٤٥

٢٧٤٢ انہم الیہم لایرجعون سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جنہیں ہلاک کر دیا گیا وہ ان کی طرف جو اسی دنیا میں رہ جاتے ہیں لوٹ کر نہیں آتے حضرت ابن عباس سے کہا گیا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت علی قیامت سے پہلے پھر زندہ ہو کر آئینگے تو آپ نے فرمایا پھر ہم بہت ہی بُرے لوگ ہیں کہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا اور ان کی میراث تقسیم کرلی تب آپ نے پڑھا انہم الیہم لایرجعون (ر) اور بعض نے کہا اہل مکّہ کی طرف لوٹکر نہیں آتے اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ ہم نے ان سے پہلے نسلوں کو اس لیے ہلاک کیا کہ وہ رسولوں کی طرف رجوع نہ کرتے تھے دوسرے معنی کو ترجیح ہے۔

٢٧٤٣ عرب کی مردہ زمین کے زندہ ہونے میں نشان: ان آیات سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کس طرح ہم آسمانی پانی کے ذریعہ سے مردہ زمین کو زندہ کرتے رہتے ہیں اور اس میں اناج اور پھل نکالتے رہتے ہیں اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ کس طرح اللہ تعالٰے نے اس زمین کو جو پہلے محض مردہ تھی نہ اس پر روئیدگی تھی نہ کوئی جاندار تھا زندہ کیا اور اس میں سارے سامان انسانوں کی روزی کے پیدا کئے اور اس کے اندر پانی کے چشمے بہائے۔ اسے بر رنگ نشان اس لیے بیان کیا کہ انسان کے لیے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت رحمانیت سے پیدا کیا انسان کے ہاتھوں نے یہ چیزیں نہیں بنائیں اسی طرح وہ سامان جو انسان کی روحانی زندگی کا موجب ہیں۔ انسان کے ہاتھ انہیں نہیں بنا سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی صفت رحمانیت سے پیدا کرتا ہے اور یہی ارسال رسل ہے۔ اور پھر یہ یوں بھی نشان ہے کہ جس طرح اللہ تعالٰے مردہ زمین کو زندہ کرکے اس میں چشمے بہاتا اور پھل وغیرہ اگاتا ہے۔ ایسا ہی اب اس کی روحانی بارش سے عرب کی مردہ زمین زندہ ہو جائے گی اور علوم کے چشمے بہ نکلیں گے اور بڑے بڑے عظیم الشان انسان اس مردہ قوم میں سے پیدا ہونگے۔ انسان کے ہاتھوں میں یہ طاقت نہ تھی کہ یہ کام کرتے اللہ تعالٰے اپنی قدرت کاملہ سے یہ کر دکھائیگا۔

٢٧٤٤ یہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب چیزوں کے جوڑے پیدا کیے یہاں تک کہ سبزیوں کے بھی اور انسانوں کے جس میں سب جاندار شامل ہیں اور مالایعلمون بڑھا کر بتایا کہ ایسے بھی جوڑے ہیں جنہیں وہ نہیں جانتے اس میں وہ سب چیزیں آجاتی ہیں جن کا علم انسان آہستہ آہستہ حاصل کرتا چلا جاتا ہے جوڑوں کا ذکر اس لیے کیا کہ دنیا میں سب نشو و نما جوڑوں سے ہی ہے پس قوائے روحانی کے نشو و نما کیلئے بھی کسی رنگ کی زوجیت چاہئے یعنی روحانی طور پر انسان ترقی نہیں کر سکتا جب تک اس کا تعلق کسی اور ہستی سے نہ ہو اور وہ اللہ تعالیٰ ہے جیسے دوسری جگہ ہے ومن کل شئ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون ففروا الی اللہ۔ (الذٰریٰت ۵۱: ۴۹، ۵۰) اور سبحان سے شروع اس لیے کیا کہ یہ تعلق اس قسم کا نہیں جیسے جسمانی ازواج میں ہوتے ہیں بلکہ یہ روح کا تعلق ہے اور تمام عیبوں اور نقصوں سے پاک ہے اور بتایا یہ ہے کہ تعلق باللہ سے تم میں روحانی نشو و نما پیدا ہوگا۔

٢٧٤٥ آنحضرت کے ظہور سے پہلے دنیا پر ظلمت کا چھا جانا: رات میں سے دن کو کھینچ کر نکال لینا (اور سلخ کسی چیز کا چمڑا اتارنا ہے ع ١١٧٦) اس لیے فرمایا کہ پہلے

وَ الشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا ؕ — اور سورج اپنے مقرر رستے پر چلتا رہتا ہے۔

ذٰلِكَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۳۸﴾ — یہ غالب علم والے کا اندازہ ہے[۲۷۴۶]

وَ الۡقَمَرَ قَدَّرۡنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالۡعُرۡجُوۡنِ الۡقَدِیۡمِ ﴿۳۹﴾ — اور چاند کے لیے ہم نے کئی منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ وہ پھر کھجور کی پرانی سوکھی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے[۲۷۴۷]

لَا الشَّمۡسُ یَنۡۢبَغِیۡ لَهَاۤ اَنۡ تُدۡرِكَ الۡقَمَرَ وَ لَا الَّیۡلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَ كُلٌّ فِیۡ فَلَكٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۴۰﴾ — نہ سورج کو حاصل ہے کہ چاند کی غایت کو پہنچے، اور نہ رات دن سے آگے نکلنے والی ہے اور سب (اپنے اپنے) دائرے میں چل رہے ہیں[۲۷۴۸]

وَ اٰیَةٌ لَّهُمۡ اَنَّا حَمَلۡنَا ذُرِّیَّتَهُمۡ فِی الۡفُلۡكِ الۡمَشۡحُوۡنِ ﴿۴۱﴾ — اور ایک نشان ان کے لیے یہ ہے کہ ہم ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں اٹھاتے ہیں۔

وَ خَلَقۡنَا لَهُمۡ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ مَا یَرۡكَبُوۡنَ ﴿۴۲﴾ — اور ان کے لیے اس جیسا کچھ اور پیدا کیا ہے جس پر وہ سوار ہوتے ہیں[۲۷۴۹]

ظلمت ہے اور نور گویا ایک لباس ہے جو اس تاریکی کو پہنایا جاتا ہے جب وہ نور کا لباس اتار لیا جاتا ہے تو پھر اندھیرا ہی اندھیرا رہ جاتا ہے۔ اور انسان کچھ کام نہیں کر سکتا اور اس میں اشارہ یہ ہے کہ جب روحانی روشنی دنیا میں مفقود ہو جاتی ہے یعنی نور نبوت گم ہو جاتا ہے تو روحانی طور پر لوگ ظلمت میں رہ جاتے ہیں جب تک وہ نور پھر نہ آئے اس وقت تک تاریکی دور نہیں ہو سکتی اور نہ روحانی ترقی کیلئے انسان سعی کرنے کے قابل ہوتا ہے اور بتایا ہے کہ دنیا میں اس وقت سب لوگ اندھیرے میں ہیں کیونکہ پہلی نبوتوں کا نور گم ہو چکا اس لیے اب طلوع آفتاب کی ضرورت ہے اور اس آفتاب کے طلوع کا یہ نشان ہوگا کہ دنیا میں روحانی بیداری پیدا ہو جائے گی چنانچہ یہ امر واقع ہے کہ دنیا میں جو تاریکی پھیل گئی تھی وہ آفتاب اسلام کی روشنی سے ہی دور ہوئی اور تمام مذاہب کے اندر اصلاحات اسلام کے اصول سے ہی پیدا ہوئیں ؞

۲۷۴۶ مستقر کیلئے دیکھو ۹۶۰ سورج کے مستقر سے مراد اس کا انتہائے سیر بھی لیا گیا ہے اور سائنس سے آج یہ ثابت ہے کہ یہ کل نظام شمسی جس کا مرکز سورج ہے ایک اور عظیم الشان ستارے کے گرد حرکت کر رہا ہے اور بعض نے مراد مشرق اور مغرب میں اس کے انتہائی طلوع اور غروب کی جگہ کو لیا ہے اور بعض نے ظرف زمان لے کر مطلب یہ لیا ہے کہ ایک وقت تک چلتا ہے یعنی قیامت کے قایم ہونے تک اور یہ جو حدیث میں ہے کہ آفتاب کا مستقر عرش کے نیچے ہے تو خدا کا عرش ایک خاص جگہ کا نام نہیں بلکہ اس کے نفاذ قدرت کیطرف اس میں اشارہ ہے پس آفتاب کا مستقر عرش کے نیچے ہونا یا اس کا سجدہ کرنا صرف یہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر نہیں بلکہ اس کے سامنے سر جھکاتا ہے ؞

۲۷۴۷ عرجون کھجور کی شاخ کو یا خصوصیت سے اس شاخ کو کہا جاتا ہے جو خشک ہو کر ٹیڑھی ہو جائے (ل) ؞
قدیم۔ قِدَم۔ حدوث کے خلاف ہے (ل) اور قِدَم گزشتہ زمانہ میں موجود ہونا ہے اور بقاء آیندہ میں موجود ہونا۔ اور قدیم کا لفظ اللہ تعالیٰ کی صفات میں قرآن شریف یا آثار صحیحہ میں نہیں آیا (غ) ؞

۲۷۴۸ ینبغی۔ بغی کے اصل معنی تو تجاوز ہیں اور اس کا اکثر استعمال مذموم ہے یعنی بری بات کی طرف تجاوز مگر بعض وقت اچھے موقعہ پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے عدل سے احسان کی طرف تجاوز یا فرض سے نفل کی طرف تجاوز پر ینبغی بھی دو طرح پر ہے ایک جب وہ چیز ایک فعل کیلئے مسخر ہو جیسے النار ینبغی ان تحرق الثوب اور دوسرے جب ایک چیز میں اہلیت ہو جیسے فلان ینبغی ان یعطی لکرمه (اور یہاں) اور وما علمنٰه الشعر وما ینبغی له (۶۹) میں پہلے معنی میں ہے۔
سیاروں کا اپنے دوائر میں گردش کرنا، سورج چاند کی غایت کو نہیں پہنچ سکتا یعنی جو کام چاند کا ہے وہ سورج نہیں دے سکتا۔ ہر ایک کے سپرد اللہ تعالیٰ نے الگ الگ کام کیا ہے رات دن سے آگے نہیں نکل سکتی یعنی جب دن آ جاتا ہے تو رات باقی نہیں رہ سکتی اپنا کام کر کے وہ دور ہو جاتی ہے اور سورج اور چاند دو پر کیا منحصر ہے سب سیارے اپنے اپنے دائروں میں چل رہے ہیں۔ سبح کا لفظ چونکہ سیال چیز میں تیرنے پر بولا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ سب اجرام سماوی کسی ٹھوس چیز پر نہیں بلکہ پانی یا ہوا کی طرح کسی رقیق چیز میں گردش کر رہی ہیں اور یہاں یہ بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اب جب آفتاب نبوت طلوع ہو گیا تو رات باقی نہیں رہ سکتی۔ اور قرآن سے ظلمت کا دور ہونا ہی اس کی حقانیت کا کافی نشان ہے ؞

۲۷۴۹ کشتیوں والی قوم: فلك المشحون سے مراد بعض نے حضرت نوح کی کشتی لی ہے اور من مثله ما یرکبون سے اور کشتیاں جن پر لوگ سوار ہوتے ہیں جو گویا حضرت نوح کی کشتی کے نمونہ پر بنی ہیں لیکن حملنا ذریتهم میں ذکر ان لوگوں کا ہے جو مخاطب قرآن ہیں اس لیے دوسرے معنی یعنی یہ کہ فلك اسم جنس ہے صحیح ہیں اور دوسرے معنی بھی

وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾
اور اگر ہم چاہیں تو انھیں غرق کردیں تو ان کے لیے نہ کوئی فریاد رس ہوگا اور نہ وہ بچائے جائیں گے۔

اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾
مگر ہماری طرف سے رحمت اور ایک وقت تک سامان ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾
اور جب انھیں کہا جاتا ہے اس سے بچاؤ کرو جو تمھارے سامنے ہے اور جو تمھارے پیچھے ہے تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۲۷۵۰

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۶﴾
اور ان کے پاس کوئی پیغام اپنے رب کے پیغاموں میں سے نہیں آتا مگر وہ اس سے منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾
اور جب انھیں کہا جاتا ہے اس میں سے خرچ کرو جو اللہ نے تمھیں دیا ہے۔ تو جو کافر ہیں وہ انھیں جو ایمان لائے کہتے ہیں کیا ہم اسے کھانا دیں جسے اگر اللہ چاہتا تو کھانا دیتا۔ تم کھلی غلطی میں ہو ۲۷۵۱

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾
اور کہتے ہیں، یہ وعدہ کب ہے؟ اگر تم سچے ہو۔

مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾
وہ کسی چیز کا انتظار نہیں کرتے مگر ایک آواز کا جو انھیں پکڑ لے گی اور وہ ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے ۲۷۵۲

حضرت ابن عباس مجاہد وغیرہ ہما سے مروی ہیں اور من مثلہ سے مراد کشتی کی مانند کوئی اور چیز ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ اونٹ ہیں (ج) کیونکہ وہ گویا سفائن البر ہیں یعنی خشکی کی کشتیاں لیکن یوں تو انسان گھوڑوں ہاتھیوں پر بھی سوار ہوتے ہیں اونٹ کی خصوصیت نہیں بلکہ فرمایا والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا (النحل ۱۶-۸) اور کشتی سے مماثلت صرف اس بات میں ہو ناکہ اس پر سواری کی جاتی ہے درست نہیں۔ میرے نزدیک اس میں اشارہ ہوائی کشتیوں یا ہوائی جہازوں کی طرف ہے اور وہی آبی کشتیوں کی مثل کہلا سکتے ہیں اور خلقنا اس لیے فرمایا کہ جو چیز انسان اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے سامانوں سے بناتا ہے اس کا بنانا اللہ تعالیٰ کی طرف بھی منسوب ہوسکتا ہے اور کشتی اللہ تعالےٰ کے تصرفات عظیمہ میں سے ہونے کے لحاظ سے اور انسانوں کے لیے موجب منفعت ہونے کے لحاظ سے نشان ہے والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس (البقرۃ ۲-۱۶۴) اور اگلی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ذکر ایک خاص قوم کا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کشتیوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے بہت کچھ عطا فرمائے گا لیکن وہ ایک وقت کیلئے ہوگا اور اگر وہ قبول حق سے انکار کریں گے تو انہیں غرق کردیا جائے گا رحمۃ منا ومتاعا الی حین اور یہ کہ یہاں ذکر عرب کا نہیں دو باتوں سے ظاہر ہے ایک تو فلک مشحون سے ان کا بہت ہی کم تعلق تھا اور دوسرے من مثلہ کوئی اور چیز ان کیلئے پیدا نہیں کی گئی اور قرآن کریم میں یہ بسا اوقات ہوتا ہے کہ آئندہ زمانہ کے واقعات کی طرف بطور پیشگوئی اشارہ کیا جاتا ہے ؛

ع ۲۷۵۰ مفسرین کے اتقوا مابین ایدیکم وماخلفکم میں کئی اقوال ہیں مثلاً مابین ایدیکم سے مراد اُمم سابقہ کا عذاب لیا ہے اور ماخلفکم سے عذاب آخرت یا مابین ایدیکم جو پہلے گناہ کر چکے اور ماخلفکم جو آیندہ کرینگے مابین ایدیکم وہ مکروہات جن کا انہیں فکر ہے اور ماخلفکم وہ مکروہات جن کا انہیں گمان بھی نہیں (ر) لیکن اتقوا کے معنی نگہداشت حقوق لے کر جیسے واتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام (النساء ۴-۱) میں مابین ایدیکم سے مراد وہ باتیں ہیں جو آنکھوں کے سامنے ہیں اور ماخلفکم وہ جو پس پردہ ہیں۔ یا وہ حقوق جو امور ظاہری سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ جو امور باطنی سے تعلق رکھتے ہیں ان انتم الا فی ضلال مبین مومنوں کیطرف سے جواب بھی ہوسکتا ہے ؛

ع ۲۷۵۱ جہلائے مکہ اگر یہ جواب دیتے تھے کہ جسے خدا نے نہیں دیا ہم اسے کیوں دیں تو اس سے بدتر حالت آج بڑی بڑی مہذب قوموں کی ہے جو قومیں سامان دنیا سے محروم ہیں وہ جو کچھ ان کے پاس ہے اسے بھی لینا چاہتے ہیں بجائے اس کے کہ انکا ہاتھ پکڑ کر انہیں مشکلات سے باہر نکالیں ؛

ع ۲۷۵۲ یخصمون اصل میں یختصمون ہے اور اختصام اور تخاصم باہم جھگڑنا ہے ؛

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى
اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٥٠﴾

پس نہ وہ وصیت کر سکیں گے اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر جائیں گے ۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ
اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿٥١﴾

اور صور پھونکا جائے گا پس وہ ناگہاں قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف دوڑ پڑیں گے ۲۷۵۳

قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ
هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ
الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٥٢﴾

کہیں گے ہم پر افسوس کس نے ہمیں ہماری خوابگاہ سے اٹھایا یہ وہ ہے جس کا وعدہ رحمٰن نے کیا تھا اور رسولوں نے سچ کہا تھا ۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا
هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿٥٣﴾

وہ صرف ایک ہی آواز ہو گی تو وہ سب کے سب ہمارے حضور حاضر ہو جائیں گے ۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّلَا
تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٥٤﴾

سو آج کسی جان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا اور تمھیں کچھ بدلہ نہ ملے گا ، مگر اسی کا جو تم کرتے تھے ۔

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ
فٰكِهُوْنَ ﴿٥٥﴾

جنّت والے اُس دن ایک کام میں لگے ہوئے خوش ہوں گے ۲۷۵۴

هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ
مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿٥٦﴾

وہ اور ان کے جوڑے سایوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے ۔

لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿٥٧﴾

ان کے لیے اس میں پھل ہو گا اور ان کے لیے ہو گا جو وہ مانگیں ۲۷۵۵

یہاں سے معلوم ہوا کہ متیٰ ھذا الوعد کا سوال عذاب دنیا کیلئے آتا ہے کیونکہ یہاں عذاب دنیا کا ذکر ہے جو انہیں جھگڑتے ہوئے آئیگا اور وہ وصیت بھی نہ کر سکیں گے اور جھگڑنے سے مراد یہ ہے کہ امور دنیا اور تجارت میں ان کا اس قدر انہماک ہو گا کہ باہم جھگڑ رہے ہوں گے اور آنے والے عذاب کی طرف خیال بھی نہ ہو گا یتخاصمون ویتنازعون فی معاملاتھم ومتاجرھم (د) آج یورپ کے باہم جھگڑے بعید نہیں کہ کسی ایسے ہی عذاب کا پیش خیمہ ہوں جس کا ذکر اس آیت میں ہے ۔

۲۷۵۳ اجداث ۔ جَدَث کی جمع ہے جس کے معنی قبر ہیں یوم یخرجون من الاجداث سراعا (المعارج ۔ ۴۳) (غ) قبروں سے نکل پڑنے سے مراد اس حالت سے نکلنا ہے جس میں وہ بعد موت ہیں ۔

۲۷۵۴ شغل ۔ شَغْل اور شُغُل اور شُغْل کوئی پیش آنیوالی بات ہے جو انسان کی توجہ کو دوسری طرف سے ہٹا دے (غ) گویا وہ اس وقت دوسری سب باتوں سے اہم ہے اور یہ کمال مسرت سے بھی ہو سکتا ہے اور کمال تکلیف سے بھی اور یہاں کمال مسرت مراد ہے (د)
فٰکھون ۔ فاکھۃ سب پھلوں کو کہتے ہیں وفاکھۃ مما یتخیرون (الواقعۃ ۵۶ ۔ ۲۰) اور فواکہ جمع ہے وفواکہ مما یشتھون (المرسلٰت ۔ ۴۲) اور فواکھۃ اُنس والوں کیساتھ باتیں کرنا ہے (غ) اور فَکِہ وہ ہے جو پھل کھاتا ہے اور فاکِہ وہ جس کے پاس پھل ہوں اور مزاح کرنے والے کو بھی کہتے ہیں جیسا کہ نبی صلعم کی صفت میں ہے مِن اَفکَہِ الناس مع صَبِیٍّ یعنی بچوں کیساتھ بہت مزاح کرنے والے تھے ۔ اور زید بن ثابت کی حدیث میں ہے من افکہ الناس اذا خلا مع اھلہ یعنی جب اپنی بیبی کے ساتھ تنہائی میں ہوتے تھے تو بہت مزاح کرنیوالے ہوتے تھے اور تَفَکُّہ کے معنی ہیں اس نے تعجب کیا فظلتم تفکھون (الواقعۃ ۵۶ ۔ ۶۵) اور یہاں معنی نادم ہونا بھی کئے گئے ہیں اور فاکھین بما اٰتاھم ربھم (الطور ۵۲ ۔ ۱۸) میں معنی ہیں نعمت والے خوش ہونے والے اور یہی معنی یہاں ہیں ۔ اور فَکِہٌ فخر کرنیوالے اکڑباز کو کہا جاتا ہے (ل) واذا انقلبوا الی اھلھم انقلبوا فکھین (التطفیف ۸۳ ۔ ۳۱)

۲۷۵۵ یدعون ۔ اِدّعاء یہ ہے کہ ایک چیز کو طلب کرے کہ وہ اس کے لیے ہے ولکم فیھا ما تدعون (حٰمٓ السجدۃ ۴۱ ۔ ۳۱) یعنی جو تم مانگو اور دَعْوٰی ادعاء کو بھی کہتے ہیں

سَلٰمٌ ۟ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ ﴿۵۸﴾
سلامتی رحم کرنے والے رب کی طرف سے قول ہوگا۔

وَ امْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾
اور اے مجرمو! آج جدا ہو جاؤ ۲۷۵۶

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا
تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ
مُّبِیْنٌ ۙ﴿۶۰﴾
اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تمھیں حکم نہیں دیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرو وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔

وَّ اَنِ اعْبُدُوْنِیْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۶۱﴾
اور کہ میری عبادت کرو، یہ سیدھا رستہ ہے۔

وَ لَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِیْرًا ؕ
اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾
اور یقیناً اس نے تم میں سے بہت سی مخلوق کو گمراہ کیا، تو کیا تم عقل سے کام نہ لیتے تھے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾
یہ وہ دوزخ ہے جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا تھا۔

اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾
آج اس میں داخل ہو جاؤ اس کے بدلے جو تم کفر کرتے تھے۔

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤی اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ
اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا
كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾
آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں اس کی گواہی دیں گے جو وہ کماتے تھے ۲۷۵۷

وَ لَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰۤی اَعْیُنِهِمْ
فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰی یُبْصِرُوْنَ ﴿۶۶﴾
اور اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھوں کو مٹا دیں پھر وہ رستے کے آگے بڑھیں تو کس طرح دیکھیں گے۔

وَ لَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰی مَكَانَتِهِمْ
فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِیًّا وَّ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾
اور اگر ہم چاہیں تو انھیں ان کی جگہ پر مسخ کر دیں، پھر وہ نہ آگے چل سکیں اور نہ لوٹ سکیں ۲۷۵۸

فما كان دعوٰهم اذ جاءهم باسنا (الاعراف-۵) اور دعاء یا پکار کو بھی واٰخر دعوٰهم ان الحمد للہ رب العالمین (یونس-۱۰) (غ)

۲۷۵۶ امتازوا۔ مَازَ کے معنی دو چیزوں کو الگ الگ کیا اور اِمْتَازَ اور تَمَیَّزَ اس کے لیے بطور مطاوع کے ہیں یعنی ایک چیز الگ ہوگئی یا کٹ گئی۔ تکاد تمیّز من الغیظ (الملک-۸) (غ)

۲۷۵۷ منہوں پر مہر لگانے سے مراد یہ ہے کہ کلام نہ کرینگے (د) اس قسم کی آیات میں بتایا ہے کہ دوسرے عالم کی کیفیات الگ رنگ کی ہیں انسان کلام تو منہ سے کرتا ہے مگر وہاں منہ سے کلام نہیں ہوگا کیونکہ وہاں عمل کے نتائج ظاہر ہونگے اور وہ اظہار بذریعہ کلام نہیں بلکہ انسان کی حالت سے ہوگا یہاں ہاتھوں کے کلام کرنے اور پاؤں کے گواہی دینے کا ذکر ہے دوسری جگہ ہے شهد علیهم سمعهم وابصارهم وجلودهم بما كانوا یعملون (حٰم السجدہ-۲۰) کان اور آنکھیں اور چمڑے گواہی دینگے۔ چنانچہ تفاسیر میں بھی یہ قول منقول ہے شهادتها دلالتها علی افعالها وظهور آثار المعاصی علیها بان یبدل اللہ تم هیئاتها باخری یفهم منها اهل الحشر ویستدلون بها علی ما صدر منهم فجعلت الدلالة الحالیة بمنزلة المقالیة مجازاً (ر)

۲۷۵۸ مسخنا مسخ خَلْق اور خُلُق کا بگاڑنا ہے اور ان کا ایک صورت سے دوسری صورت میں بدل دینا اور بعض حکماء کا قول ہے کہ مسخ دو طرح پر ہے ایک مسخ خَلْق جو صورت میں ہو اور دوسرا مسخ خُلُق جو ہر زمانہ میں ہوتا رہتا ہے یعنی انسان بعض اخلاق ذمیمہ کو جو بعض حیوانات سے تعلق رکھتے ہیں حاصل کر لیتا ہے مثلاً شدت حرص میں کتے کی طرح ہو جانا وغیرہ اور وجعل منهم القردة والخنازیر میں جو دو وجوہ ہو سکتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے اور یہاں لمسخنٰهم علی مكانتهم دونوں وجوہ کو اپنے اندر رکھتا ہے گو اول زیادہ صاف ہے (غ) اور ابن عباس سے لمسخناهم علی مكانتهم کے معنی مروی ہیں لاهلكناهم فی مساكنهم (ج) ہم انہیں اپنے گھروں میں ہلاک کر دیں اور حسن کہتے ہیں ہم انہیں گھروں میں بٹھا دیتے (ج)۔

مضیا۔ مُضِیّ اور مَضَاء کے معنی نفاذ ہیں اور اس کا استعمال اجسام اور معانی دونوں میں ہوتا ہے مضی مثل الاولین (الزخرف-۸) فقد

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ۞ ۶۸

اور جسے ہم لمبی عمر دیتے ہیں اسے بناوٹ میں اوندھا کر دیتے ہیں تو کیا یہ عقل سے کام نہیں لیتے ۲۷۵۹

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۞ ۶۹

اور ہم نے اسے شعر نہیں سکھایا اور نہ اسے یہ شایاں ہے یہ صرف نصیحت اور کھول کر بیان کرنے والا قرآن ہے ۲۷۶۰

مضت سنۃ الاولین (الانفال ۸-۳۸) (غ)

یہ تو ظاہر ہے کہ دونوں آیتیں اس دنیا کی حالت کے متعلق ہیں یعنی اگر اللہ چاہتا تو دنیا میں ایسا کر دیتا فانظاھر ان ھذا وکذا ما قبلہ لوکان لکان فی الدنیا (د) آیا مراد اس سے ظاہر طور پر ایسا کر دینا ہے یعنی واقعی آنکھوں کا نور لے جانا اور صورتوں کا مسخ کر دینا تو یہ ہوا نہیں پھر اس کے ذکر کا کیا فائدہ تھا لیکن اگر دونوں باتوں کو روحانی رنگ میں لیا جائے تو بعض لوگوں کی ان میں سے یہ حالت ہو بھی گئی اور مسخ کے جو معنی روایات میں ہیں ان کے لحاظ سے یہ دونوں باتیں روحانی رنگ میں ہی ہیں۔

۲۷۵۹ بظاہر اس آیت کا یہاں تعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا جزا و سزا کا ذکر تھا اور یہاں ایک قانون بتایا کہ جسے ہم لمبی عمر دیتے ہیں آخر اس کی قوت کو ضعف سے بدل دیتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے۔ بات یہ ہے کہ اصل ذکر قرآن حکیم میں قوموں کے عروج و زوال کا چلتا ہے گو اکثر لوگ اس نظر سے قرآن شریف کو نہیں پڑھتے۔ اس سورت میں بھی بعض قوموں کی تکذیب قرآن کا ذکر ہے تو اس کیلئے اپنا ایک قانون بتاتا ہے کہ جو قوم دنیا میں لمبی عمر پاتی اور ترقی کرتی ہے آخر اس پر قانون قدرت کے مطابق وہ زمانہ آتا ہے کہ قوت کی بجائے ضعف پیدا ہو کر زوال کی حالت نمودار ہوتی ہے۔ اور یہ توجہ دلائی ہے کہ قوم کی حالت کو انسان کی حالت پر قیاس کر لو یا گزشتہ قوموں کے حالات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ بڑا بڑا اقبال حاصل کر کے اور لمبے زمانہ تک عروج پا کر آخر وہ مٹ گئیں۔ پس قرآن کریم کی مخالفت کرنے والے کہاں باقی رہ سکتے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس قانون کے ماتحت مسلمانوں کی بھی آخر وہی حالت ہونی چاہیے تو یہ صحیح ہے فرق یہ ہے کہ جب ایک مسلمان قوم زوال کی طرف پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایک دوسری قوم کو اس کی جگہ کھڑا کر دیتا ہے اس لیے عربوں پر زوال آ سکتا ہے ایرانیوں پر آ سکتا ہے ہندیوں پر آ سکتا ہے ترکوں پر آ سکتا مگر اسلام پر نہیں آ سکتا۔ اسلام بعض اصولوں کا نام ہے اگر اصول صحیح ہیں تو وہ آخر دنیا تک رہیں گے ہاں ان سے فائدہ اٹھانے میں کبھی ایک قوم کو سبقت لے جائے گی کبھی دوسری۔ آج بھی اسلام کے مخالف اپنے لمبے عروج پر فخر نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کے قانون لاتبدیل ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ ان الفاظ میں یہ بھی اشارہ ہو کہ انسان کا جسم ترقی کے بعد انحطاط کی طرف جاتا ہے مگر اس کی روح اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کر کے ہمیشہ ترقی کرتی ہے اور اس کی غیر متناہی ترقیات ہی اسے دوسری زندگی کے لیے باقی رکھتی ہے۔

۲۷۶۰ شعر اور نصیحت: یہ مضمون بھی بے تعلق نہیں۔ بظاہر یہ قانون کہ جسے لمبی عمر ملتی ہے وہ بناوٹ میں اوندھا بھی ہوتا ہے یعنی ضعف کے بعد قوت اور قوت کے بعد ضعف ہے ایک شاعرانہ تخیل رکھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ تو فرمایا کہ یہ شاعرانہ تخیل نہیں یہ نصیحت ہے تاکہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں اور اصول صحیحہ کو قبول کر لیں اور چونکہ سورت کی ابتدا اس سے کی تھی کہ قرآن حکمت والی کتاب ہے اور اس کے اصول علمی ہیں اس لیے بھی بتایا کہ شاعرانہ بلند پروازیاں نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے اصول کو اعلیٰ درجہ کے کلام میں بیان کیا ہے۔

آنحضرت صلعم اور شاعری: آنحضرت صلعم کا شعر نہ جاننا ایک تاریخی امر ہے۔ آپ جس زمانہ میں پیدا ہوئے وہ عرب میں شاعری کے عروج کا زمانہ تھا، لیکن آپ کی طبیعت کو شعر سے ادنیٰ مناسبت بھی نہ تھی یہاں تک کہ روایات میں ہے کہ اگر کبھی آپ بطور مثال کوئی شعر پڑھتے تو اس کے اول کو آخر اور آخر کو اول کر دیتے (ج) کفی بالشیب والاسلام للمرء ناھیا کو آپ نے پڑھا کفی بالاسلام والشیب للمرء ناھیا تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو شعر نہیں سکھایا (د) یعنی شاعر نے کہا تھا کہ بڑھاپا اور اسلام انسان کو بدی سے روکنے کے لیے کافی ہیں اور آپ نے اسلام کو مقدم کر کے یوں ادا کیا کہ اسلام اور بڑھاپا انسان کو بدی سے روکنے کے لیے کافی ہیں۔ گو وزن قائم نہ رہا اگر آپ کا کلام اشعار میں ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ اس زمانہ میں وہ ملک بڑے بڑے شاعر پیدا کر رہا تھا ایک شاعر کا خیال اس طرف چلا گیا کہ اخلاقی اور روحانی مضامین پر شعر کہے، مگر آنحضرت صلعم کی آمد نے بالکل کایا پلٹ دی اتنے اعلیٰ درجہ کے مضامین بیان فرمائے جو شاعروں کے وہم و گمان میں بھی نہ آئے تھے گو شعر کا نام تک نہیں جانتے۔ اور سارا کلام نثر میں ہے جس سے عرب اب تک قریباً ناآشنا تھے یہ بجائے خود ایک اعجاز تھا۔ یہ سوال ہوا ہے کہ آیا شعر کا نہ جاننا آنحضرت صلعم کی خصوصیت تھی یا دیگر انبیاء بھی ایسے ہی تھے تفاسیر میں دونو قول ہیں اسمیں کوئی شک نہیں کہ کوئی نبی بھی شاعر نہیں ہوا ہاں شعر کہہ لینا دوسری بات ہے لیکن شعر کا اثر چونکہ عارضی ہوتا ہے اور آپ کا پیغام دائمی تھا جس نے ہمیشہ کیلئے دنیا کو اٹھانا تھا اس لیے پیرایہ شعری سے آپ کے کلام کو بالکل پاک رکھا گیا۔

مگر تعجب یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کو اس پیرایہ میں یہ سمجھایا گیا تھا کہ وہ بھی شعر و شاعری کی طرف کم مائل ہوں یہ بیماری مسلمانوں میں خاص زور پکڑ گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ عملی حالت روز بروز کمزور ہوتی چلی گئی بہت سے مسلمان بادشاہوں نے بجائے اس کے کہ علوم کو ترقی دیتے شاعروں کو بڑے بڑے انعامات دیکر شاعری کو ترقی دی اور آج بھی مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ کہیں مشاعرہ ہو کسی جلسہ میں نظم پڑھی جاتی ہو پیر و جوان سب کام چھوڑ کر بھاگے چلے جاتے ہیں لیکن اگر کوئی وعظ و نصیحت کی مجلس ہو قرآن حکیم کی درس و تدریس کا سلسلہ ہو تو الا ماشاء اللہ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝٧٠

تاکہ اسے ڈرائے جو زندہ ہے اور کافروں پر حجت قائم ہو ۲۷۶۱

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَاۤ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۝٧١

کیا وہ غور نہیں کرتے کہ ہم نے ان کے لیے اس سے جو ہمارے ہاتھوں نے بنایا چارپائے پیدا کیے ہیں سو وہ ان کے مالک ہیں۔

وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ۝٧٢

اور ہم نے انھیں ان کا مطیع کر دیا، پس ان میں سے ان کی سواری ہے اور ان میں سے وہ کھاتے ہیں ۲۷۶۲

وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۝٧٣

اور ان کے لیے ان میں فائدے اور پینے کی چیزیں ہیں، تو کیا یہ شکر نہیں کرتے ۲۷۶۳

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝٧٤

اور اللہ کے سوائے معبود بناتے ہیں۔ تاکہ انھیں مدد ملے۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ۝٧٥

وہ ان کی مدد کی طاقت نہیں رکھتے اور وہ ان کے لیے ایک لشکر ہے حاضر کیے گئے ۲۷۶۴

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝٧٦

سو ان کی بات تجھے غمگین نہ کرے ہم جانتے ہیں جو یہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝٧٧

کیا انسان غور نہیں کرتا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا پھر دیکھو وہ کھلا جھگڑا کرنے والا ہے۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ

اور ہمارے لیے ایک نادر بات بیان کی اور اپنی پیدائش کو

۲۷۶۱ حیا۔ حیّ اور حیوٰۃ کے لیے دیکھو ۹۷ میں موت کی تشریح اور یہاں معنی حی القلب ہیں (یعنی جس کا دل زندہ ہے) جو عقل سے کام لیتا ہے اور سمجھتا ہے مردہ دل نہیں اور کند ذہن نہیں (ج)۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص کچھ بھی عقل سے کام لیتا ہے وہ تو قرآن کی نصیحت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور جو کفر میں اڑے ہوئے ہیں اُن کو احساس ہی کوئی نہیں۔

۲۷۶۲ ذللنا۔ ذُلّ سے ہے دیکھو ۹۷ اور تذلیل کے معنی منقاد یا مطیع کرنا اور وذلّلت قطوفہا تذ لیلا (الدھر ۷۶ - ۱۴) میں مراد ہے سُہّلت یعنی ان کے لیے سہولت سے میسر آنے والے بنائے گئے۔ فاسلکی سبل ربك ذللا (النحل ۱۶ - ۶۹) میں ذُلل کے معنی ہیں فرمانبردار۔

۲۷۶۳ مشارب۔ مَشرَب کی جمع ہے اور یہ مصدر بھی ہے (جیسے یہاں اور پینے سے مراد یہاں دودھ وغیرہ ہے اور اسم مکان بھی جیسے قد علم کل اناس مشربهم (البقرۃ ۲ - ۶۰) اور اسم زمان بھی (غ)۔

منافع سے مراد سوائے سواری اور کھانے اور دودھ کے دیگر فوائد ہیں جیسے ان سے دوسرے کام لینا یا ان کے چمڑے ہڈیاں وغیرہ۔

۲۷۶۴ ھم لہم جند محضرون۔ یعنی مشرک اپنے معبودوں کیلئے حاضر کیا گیا لشکر ہے اور حاضر کیے گئے سے مراد ان کی حفاظت کیلئے حاضر ہونا یا تیار رہنا ہے اور یہ معنی قتادہ سے مروی ہیں (د) پس یہاں کھلی پیشگوئی ہے کہ باوجود ساری طاقت ان بتوں کی حمایت میں صرف کرنیکے یہ مغلوب ہونگے اور بت ان کی کچھ بھی مدد نہ کرسکیں گے اور بعض نے محضرون سے مراد قیامت کے دن عذاب میں حاضر ہونا لیا ہے۔

قَالَ مَنۡ یُّحۡیِ الۡعِظَامَ وَ ہِیَ رَمِیۡمٌ ﴿۷۸﴾
قُلۡ یُحۡیِیۡہَا الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَہَاۤ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ؕ
وَ ہُوَ بِکُلِّ خَلۡقٍ عَلِیۡمُۨ ﴿۷۹﴾
الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنَ الشَّجَرِ الۡاَخۡضَرِ
نَارًا فَاِذَاۤ اَنۡتُمۡ مِّنۡہُ تُوۡقِدُوۡنَ ﴿۸۰﴾
اَوَ لَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ
بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَہُمۡ ؕ بَلٰی ٭
وَ ہُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۸۱﴾
اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ
لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۸۲﴾
فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ
شَیۡءٍ وَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾

بھول گیا، کہتا ہے کون ہڈیوں کو زندہ کریگا جب وہ گل چکی ہوں گی ۲۷۶۵
کہہ انھیں وہی زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار بنایا ۔
اور وہ ہر پیدایش کو خوب جاننے والا ہے ۲۷۶۶
وہ جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ بنائی،
تو دیکھو تم اس سے جلاتے ہو ۲۷۶۷
کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر
نہیں کہ ان (انسانوں) کی مثل بنا سکے، ہاں اور
وہ بڑا پیدا کرنے والا جاننے والا ہے ۲۷۶۸
اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے صرف یہی ہوتا ہے
کہ اسے کہتا ہے ہو جا، سو وہ ہو جاتی ہے۔
سو پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت
ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ۲۷۶۹

۲۷۶۵ ضرب لنا مثلا یعنی ہماری شان میں ایک عجیب بات بیان کرتا ہے جو اپنی ندرت میں مثل کی طرح ہے اور وہ احیائے موتی ہے (د)۔

رمیم۔ رَمّ پرانی چیز کی اصلاح کرنا ہے اور رِمَّۃ بوسیدہ ہڈیوں سے مخصوص ہے اور یہی معنی رمیم کے ہیں ماتذر من شئ اتت علیہ الاجعلتہ کالرمیم (الذٰریٰت ۵۱-۴۲) (غ) اور حدیث میں ہے کہ آپ نے گوبر اور رِمّۃ یعنی بوسیدہ ہڈی کیساتھ استنجا کرنے سے منع کیا۔

احیائے موتٰی کے انکار کو یوں ظاہر کیا کہ بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا مطلب یہ نہیں کہ گوشت تو زندہ ہو سکتا ہے اور بوسیدہ ہڈیاں زندہ نہیں ہو سکتیں بلکہ احیا کے استبعاد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے مطلب یہ ہے کہ گوشت تو ایک طرف رہا جب ہماری ہڈیاں تک بھی گل جائیں گی اور ہمارا کچھ باقی نہ رہ جائیگا تو پھر احیا یا زندہ کرنا کس طرح ہوگا۔ اور گو یہ انکار احیائے موتی پر ہے لیکن اس میں اشارہ اس بات کی طرف بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کام جو اس وقت تک ایک مردہ حالت میں نظر آتا ہے وہ زندہ کس طرح ہوگا آج بھی لوگ اسلام کو ایک مردہ حالت میں سمجھتے اور تعجب کرتے ہیں کہ یہ کس طرح زندہ ہوگا کیا عجیب جواب ہے جس نے پہلے زندہ کیا وہی دوبارہ زندہ کریگا۔

۲۷۶۶ یحییھا اور انشاھا میں ضمیر نفس کی طرف ہوگی جو پچھلی آیت سے مفہوم ہے اور بکل خلق بتاتا ہے کہ یہ پیدایش اس پیدایش سے بالکل الگ ہے وہ جس نے پہلی پیدائش کی اور اس سے واقف ہے وہ اس بات سے بھی واقف ہے کہ دوسری خلق کس طرح ہوگی۔

۲۷۶۷ سبز درخت سے آگ کا ہونا اس لحاظ سے تو ظاہر ہی ہے کہ لکڑی آگ کے لیے ایندھن کا کام دیتی ہے مگر یہاں اس مضمون کا کیا تعلق ہے۔ محض اتنی بات کہ سبز درخت جس میں اجزائے مائیت ہیں اس سے آگ پیدا کرنا قدرت پر دال ہے اور ایک قدرت سے دوسری قدرت پر استدلال ہے اس لیے صحیح نہیں کہ ان دونوں باتوں میں کوئی مناسبت بھی چاہیئے اور لفظ اخضر کو ساتھ رکھنا بتاتا ہے کہ یہ ایندھن کی طرف اشارہ نہیں جو خشک لکڑی سے ہوتا ہے مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو سبز درخت بھی آپس میں رگڑ کھا کر آگ کو پیدا کرتے ہیں جو ایک تیسری چیز ہے جس کا وجود ان درختوں میں کوئی نظر نہیں آتا اسی طرح ایک انسان کے انسان کامل کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے اور دو روحوں کے باہم رگڑ کھانے سے ایک نئی زندگی پیدا ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم کے متعدد مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی جس کی طرف قرآن کریم نے بار بار اشارہ کیا ہے وہ ایک بالکل نئی زندگی ہے جس کا تعلق اعمال انسانی سے ہے جو تعلق باللہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لیے دوزخیوں کے لیے باوجود لعنت کے یہ زندگی نہیں لا یموت فیھا ولا یحییٰ (طٰہٰ ۲۰-۷۴) ہاں وہ بھی اس دوسری زندگی کو ان الایشوں سے پاک صاف ہونے کے بعد پالیں گے جن میں تعلق باللہ کے توڑنے سے وہ ملوث ہو گئے ہیں۔

۲۷۶۸ مثلھم میں ضمیر انسانوں کی طرف جاتی ہے جو ذوی العقول ہیں یعنی وہ خدا جس نے آسمانوں اور زمین کی اتنی بڑی مخلوق کو پیدا کیا، کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ انسانوں جیسی ہستیوں کو جو اس وسیع مخلوق کے سامنے کچھ بھی نہیں پیدا کر سکے اور مثلھم کہہ کر یہ بھی صاف بتا دیا کہ وہ یہی انسان نہیں ہوں گے ان کی مثل ہوں گے۔

۲۷۶۹ ملکوت کے لفظ میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ جس حق کی تکذیب ہو رہی ہے آخر اس کی حکومت دنیا میں ہوگی۔

سُوْرَةُ الصّٰفّٰتِ مَكِّيَّةٌ (۳۷)

اٰيَاتُهَا ۱۸۲ — رُكُوْعَاتُهَا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

وَ الصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾ — گواہ ہیں صف باندھنے والی (جماعتیں) قطاروں میں۔

فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ﴿۲﴾ — پھر روکنے والی (جماعتیں) روکتی ہوئی۔

فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ﴿۳﴾ — پھر نصیحت کی پیروی کرنے والی (جماعتیں)

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾ — تمہارا معبود یقیناً ایک ہی ہے ع۲۷۷۰

نام: اس سورت کا نام الصّٰفّٰت ہے اور اس میں پانچ رکوع اور ۱۸۲ آیتیں ہیں اور اس کا نام اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے جہاں خدا کے حضور صف باندھ کر کھڑے ہونے والوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید پر بطور نشان یا دلیل پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ لوگ جو اللہ کے حضور صفیں باندھ کر کھڑے ہوتے اور ذکر الٰہی کرتے ہیں یہ آخر کار غالب ہونگے اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں برباد نہ کر سکے گی۔

خلاصہ مضمون: سب سے پہلے رکوع میں توحید کے آخری غلبہ کا بیان ہے اور اس کے رستہ میں جس قدر رکاوٹیں ہیں ان کے دُور کیا جانے کا ذکر ہے۔ دوسرے رکوع میں موحدین اور مشرکین کے انجام کا ذکر اور مقابلہ کیا ہے تیسرے اور چوتھے رکوع اور پانچویں رکوع کے شروع میں بتایا ہے کہ پہلے رسولوں کا بھی اسی طرح مقابلہ کیا گیا مگر جتنے اللہ کو مصیبت کے وقت پکارنے والے راستباز بندے ہوئے ہیں سبھی کو اللہ تعالیٰ نے مصائب سے نجات دی اور کامیاب کر کے پیچھے آنیوالے لوگوں کے لیے انہیں ہادی راہ بنایا اور ان کا ذکر جمیل آنے والی نسلوں میں باقی رکھا۔ چنانچہ تیسرے رکوع میں حضرت نوحؑ اور ابراہیمؑ کا ذکر ہے اور حضرت ابراہیم کے ذکر میں حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا ذکر بھی ہے۔ چوتھے رکوع میں حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ اور حضرت الیاسؑ اور لوطؑ کا ذکر ہے۔ اور پانچویں رکوع کے شروع میں حضرت یونسؑ کا۔ اور اسی پانچویں رکوع میں نہایت صفائی سے یہ پیشگوئی بھی کی ہے کہ رسول اللہ صلعم آخر کار مظفر و منصور ہونگے اور مومنوں کو ان کے مخالفوں پر غالب کیا جائے گا۔

تعلق و زمانہ نزول: جب پچھلی سورت میں انسان کامل محمد رسول اللہ صلعم کے پیغام کا ذکر کیا تو اس میں آپ کے اور آپ کے ساتھیوں اور ان کے ذریعہ سے توحید کے آخری غلبہ کا ذکر کیا۔ یہ سورت بالاتفاق مکّی ہے اور اس مجموعہ کی باقی سورتوں سے بلحاظ نزول کسی قدر پہلے کی معلوم ہوتی ہے۔

ع۲۷۷۰ صٰفّٰت۔ صافّۃ کی جمع ہے جس سے مراد صف باندھنے والی جماعت ہے اور صَفّ قرآن میں مُصَلّی ہے یعنی جائے نماز۔ کیونکہ لوگ وہاں صف باندھتے ہیں ثم ائتوا صفا (طٰہٰ ۲۰-۶۴) ازہری کہتے ہیں اس مقام پر آؤ جہاں تم اپنی عید اور نماز کے لیے جمع ہوتے ہو کیونکہ ائتِ الصفّ کے معنی ہیں نماز کی جگہ آؤ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے معنی ہوں صف باندھ کر آؤ۔ وعرضوا علیٰ ربك صفا (الکہف ۱۸-۴۸) میں یہ بھی جائز ہے کہ سب ایک ہی صف میں ہوں اور ایسے موقع پر جمع بھی مراد ہوتی ہے (ل)

زاجرات۔ زَجْر۔ آواز کے ساتھ دور کرنا ہے پھر کبھی اس کا استعمال آواز پر ہوتا ہے اور کبھی دور کرنے پر فانما ھی زجرۃ واحدۃ (النزعٰت ۷۹-۱۳) مجنون و ازدجر (القمر ۵۴-۹) یا دھتکارا گیا۔ اور ما فیہ مزدجر (القمر ۵۴-۴) میں مُزدجر سے مراد ہے گناہوں کے ارتکاب سے روکنا اور دور کرنا (غ) اور زَجر کے معنی منع کرنا اور روکنا ہیں اور حدیث میں جہاں زجر ہے اس کے معنی نھی یعنی روکنا ہیں اور حدیث عزل میں ہے کانہ زَجَرَ یعنی گویا آپ نے اس سے روک دیا (ل)

تٰلیٰت۔ تالی کے معنی تلاوت کرنے والا یا پیروی کرنے والا ع۶۷ اور تالیات ایسی جماعتیں۔

توحید الٰہی پر راستبازوں اور مومنین کی شہادت: یہاں جن چیزوں کی قسم کھائی ہے بالفاظ دیگر جنہیں بطور گواہ پیش کیا ہے دیکھو ع۲۷۲۹ وہ صف باندھنے والی روکنے والی تلاوت قرآن کرنے والی جماعتیں ہیں اور جواب قسم یا وہ امر جس کی وہ شہادت ادا کرتے ہیں یہ ہے کہ معبود ایک ہی ہے عموماً مفسرین نے مراد اس سے ملائکہ لیے ہیں اور ایسے ہی بعض اور موقعوں پر بھی فرشتے مراد لیے ہیں اور یہ معنی حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہیں مگر ظاہر ہے کہ ملائکہ خود غیر مرئی ہستیاں ہیں اور انہیں بطور شہادت پیش کرنا درست نہیں ہو سکتا اور دوسرے تلاوت ذکر کا لفظ فرشتوں پر صادق نہیں آسکتا مومنین پر ہی آسکتا ہے۔ چنانچہ قتادہ سے التّٰلیٰت ذکرا کے معنی میں یہی روایت ہے ما یتلیٰ علیکم فی القراٰن (ج) بنو آدم یتلون کتابہ تعالیٰ (د) اور اگر تیسری آیت میں مومنین مراد لیے جائیں تو پہلی دو آیتوں میں بھی وہی مراد ہونے چاہئیں۔ اور صٰفّٰت صفا میں مراد نماز میں صف باندھنے والے لوگ ہیں اور زاجرات زجرا میں لوگوں کو معاصی سے روکنے والے اور تالیات ذکرا میں خود اتباع ذکر کرنے والے اور پھر ان کی شہادت دو طرح پر ہے ایک تو یہ کہ جتنی اس قسم کی جماعتیں دنیا میں ہوئی ہیں یعنی انبیاء اور مصلحین اور

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ رَبُّ الْمَشَارِقِ ﴿۵﴾	آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اور مشرقی زمینوں کا رب ۲۷۷۱
اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ ﴿۶﴾	ہم نے ورلے آسمان کو (عجیب) زینت (یعنی) ستاروں سے آراستہ کیا ہے ۲۷۷۲
وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ﴿۷﴾	اور ہر سرکش شیطان سے (ان کی) حفاظت کی ہے ۲۷۷۳
لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ﴿۸﴾	وہ اعلیٰ درجے کے گروہ کی باتیں نہیں سُن سکتے اور ہر طرف سے ملامت کیے جاتے ہیں۔
دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ﴿۹﴾	دھتکارے ہوئے اور (یہ) دکھ ان کو لگا ہوا ہے ۲۷۷۴

ان کے اتباع وہ دنیا میں کہیں بھی ہوئے ہوں اور کسی زمانہ میں ہوئے ہوں سب کے سب توحید الٰہی پر شہادت دیتے ہیں یعنی تمام راستبازوں کی جماعتوں کی شہادت یہی ہے کہ خدا ایک ہے اور دوسرے رنگ میں یہ شہادت بطور پیشگوئی ہے کیونکہ یہ سورت تو اس وقت کی ہے جب مکہ میں آنحضرت صلعم کی مخالفت کمال پر ہے تو گویا بتایا ہے کہ آنحضرت صلعم کی قوت قدسی سے اس ملک میں جماعتوں کی جماعتیں ایسی پیدا ہو جائیں گی جو خدا کے حضور نمازوں میں صفیں باندھ کر کھڑی ہوں گی اور ان کا کام دوسرے لوگوں کو معاصی سے روکنا اور خود اتباع قرآن کرنا ہوگا۔ اور ایک ملک عرب سے کیا خاص ہے یہی شہادت آیندہ کل دنیا بھی ادا کرے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صٰفّٰت سے مراد جنگ میں صفیں باندھنے والے اور زاجرات سے مراد دشمن کو روکنے والے ہوں یا گھوڑوں کو چلانے والے اور اس صورت میں بھی یہ پیشگوئی ہے کہ حق اور باطل کا مقابلہ ہو کر آخر حق غالب آئیگا۔ معبودان باطل نیست و نابود ہو جائیں گے اور ایک خدا کا نام لیا جائے گا اور ان دونوں معنوں کو صحیح تسلیم کیا گیا ہے دیکھو روح المعانی۔

۲۷۷۱ مشرقی ممالک اور روحانیت: ربّ المشارق میں مشارق سے مراد عموماً طلوع آفتاب کے مختلف نقطے لیے گئے ہیں مگر اس سے مراد مشرقی سرزمینیں بھی ہو سکتی ہیں اور گو ایسے موقعہ پر ایک کا نام لینے سے دونوں مراد ہوتے ہیں اور رب المشارق سے مراد رب المشارق و المغارب ہی ہے لیکن لفظ مشارق خاص طور پر اختیار کرنے میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ روحانی تربیت میں مشرق فائق رہا ہے۔ چنانچہ انبیاء اور راستباز اکثر مشرقی ممالک میں ہی پیدا ہوئے ہیں آفتاب روحانیت کا طلوع جب ہوا مشرق سے ہی ہوا اور توحید الٰہی کا غلغلہ ہمیشہ مشرق میں ہی بلند رہا اور مغرب ہمیشہ مادیات اور جسمانیات کا دلدادہ ہی رہا ہے اور روحانیت میں مشرق کا دست نگر رہا ہے یہاں تک کہ وہ جسے خدا خدا کر کے پکارا جاتا ہے وہ بھی صرف ایک مشرقی انسان ہی تھا۔ اور شاید اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اب جو دنیا کی ربوبیت روحانی آنحضرت صلعم کے ذریعہ سے کی جاتی ہے تو اوّل اس کا عروج مشرقی ممالک میں ہی ہوگا اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا کہ صداقت روحانی کو پہلے وہی لوگ قبول کرتے جن کو روحانیت سے تعلق زیادہ رہا ہے اور مغربی لوگ ایک وقت تک بوجہ اپنی مادہ پرستی کے اس سے محروم رہتے۔ اور اس زمانہ میں اس لفظ میں بالخصوص مسلمانوں کے لیے بڑی بھاری تسلی ہے کیونکہ اہل مغرب مسلمانوں اور اہل مشرق کو ایسا سمجھتے ہیں کہ گویا وہ اس خدا کے پیدا کئے ہوئے انسان ہی نہیں جس نے اہل مغرب کو پیدا کیا اور وہ محض اہل مغرب کی خدمت کیلئے پیدا ہوئے ہیں۔

۲۷۷۲ اس ظاہری زینت میں اشارہ ہے کہ عالم روحانیت میں بھی بعض وجود اس عالم کی زینت کا موجب ہو جاتے ہیں اور دوسرے نفوس کے لیے روشنی کا موجب ہو جاتے ہیں جیسا کہ ہمارے نبی کریم صلعم نے فرمایا اصحابی کالنجوم میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں۔ اور سماء الدنیا سے مراد وہ بلندی ہے جو ہماری حد نگاہ ہے۔

۲۷۷۳ حفظاً فعل محذوف کا مفعول ہے حفظنا حفظاً۔ آسمان کے شیاطین سے محفوظ ہونے سے کیا مراد ہے دیکھو ۱۶۷۹ اور شیطان مارد سے مراد یہاں کاہن وغیرہ ہی ہیں جو ستاروں سے علم غیب حاصل کرنے کا دعویٰ کرتے تھے اور ان کا ذکر ان راستبازوں کے مقابل پر کیا ہے جن کا اوپر ذکر تھا۔

۲۷۷۴ دیکھو ۱۶۷۹ یہ کاہن وغیرہ ملاء اعلیٰ کی باتیں نہیں سنتے اور الملا الاعلیٰ سے مراد ملائکہ ہیں یا اشراف ملائکہ (ر) مطلب یہ کہ وہ جو ظاہر کرتے ہیں کہ ہم غیب کی باتیں معلوم کرتے ہیں تو یہ بالکل جھوٹ ہے وہاں تک ان کی رسائی نہیں نہ وہ سُن سکتے ہیں اور یقذفون من کل جانب دحورا میں جو یہ مراد لی گئی ہے کہ ان پر آسمان کی چاروں جہات سے انگارے پھینکے جاتے ہیں تو یہ صحیح نہیں اس لیے کہ اگر ظاہری شہاب مراد لیے جائیں تو ان کا چاروں طرف سے پھینکا جانا شاذ و نادر ہی وقوع میں آتا ہے اور یہاں یہ مراد اس لیے بھی نہیں کہ اگلی آیت میں ہے الا من خطف الخطفة فاتبعه شهاب ثاقب پس یہاں شہاب مراد نہیں۔ قذف کے معنی ملامت بھی ہیں دیکھو ۳۰۶۲ اور یہ ملامت ان پر اس لیے ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ جھوٹ ثابت ہوتا اس لیے سب لوگ حتیٰ کہ ان کے معتقد بھی ان پر ملامت کرتے ہیں اور عذاب لازم یا تو یہی ہے اور یا مراد عذاب آخرت ہے یعنی دنیا میں یوں ذلیل ہوتے ہیں کہ ان کی باتیں جھوٹی نکلتی ہیں تو ملامت ہوتی ہے اور آخرت

اِلَّا مَنۡ خَطِفَ الۡخَطۡفَةَ فَاَتۡبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ⑩

سوائے اس کے جو ایک (آدھ) دفعہ اُچک لیجائے تو اس کے پیچھے روشن انگارا آتا ہے ٢٧٧٥

فَاسۡتَفۡتِهِمۡ اَهُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمۡ مَّنۡ خَلَقۡنَا ؕ اِنَّا خَلَقۡنٰهُمۡ مِّنۡ طِيۡنٍ لَّازِبٍ ⑪

تو ان سے پوچھ کیا اُن کا بنانا زیادہ مشکل ہے یا وہ خلقت جو ہم نے بنائی ہم نے انھیں مضبوط مٹی سے پیدا کیا ہے ٢٧٧٦

بَلۡ عَجِبۡتَ وَيَسۡخَرُوۡنَ ⑫

بلکہ تو تعجب کرتا ہے اور وہ ہنسی کرتے ہیں ٢٧٧٧

وَاِذَا ذُكِّرُوۡا لَا يَذۡكُرُوۡنَ ⑬

اور جب انھیں نصیحت کی جاتی ہے نصیحت قبول نہیں کرتے۔

وَاِذَا رَاَوۡا اٰيَةً يَّسۡتَسۡخِرُوۡنَ ⑭

اور جب کوئی نشان دیکھتے ہیں ہنسی اڑاتے ہیں ٢٧٧٨

وَقَالُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۚۖ ⑮

اور کہتے ہیں یہ کچھ نہیں مگر کھلا جادو ہے۔

ءَاِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ⑯

کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجائیں گے تو کیا ہم ضرور دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔

اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ ⑰

اور کیا ہمارے باپ دادا بھی۔

قُلۡ نَعَمۡ وَاَنۡتُمۡ دَاخِرُوۡنَ ⑱

کہہ ہاں اور تم ذلیل (بھی) ہوگے ٢٧٧٩

فَاِنَّمَا هِىَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ ⑲

وہ صرف ایک ہی للکار ہے سو وہ ناگہاں دیکھنے لگیں گے۔

کا عذاب الگ ہے ؛

٢٧٧٥ ثاقب۔ ثَقَبَ سوراخ کرنا ہے اور ثاقب وہ ہے جو اپنی روشنی کے ساتھ اس چیز میں کھب جائے جس پر وہ واقع ہو النجم الثاقب (الطارق ٨٦-٣) (غ)

شیطان سے مراد: چونکہ اوپر ذکر تھا کہ انکی باتیں جھوٹ ہونے کی وجہ سے ہر جانب سے ان پر ملامت ہوتی ہے اسلئے یہاں بتایا کہ کبھی کبھار کوئی بات انکی سچ بھی نکل آتی ہے اور اسکو جلدی سے اُچک لیجانے سے تشبیہ دی ہے یعنی یہ بھی ایسی بات نہیں ہوتی جس سے معلوم ہو کہ اس سرچشمۂ غیب تک اسے کوئی دسترس ہے بلکہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی جلدی سے کوئی چیز اُچک لیجائے شہاب ثاقب کے اس کے پیچھے آنے سے کیا مراد ہے دیکھو ع ١٦٧٩ جہاں مفصل بحث گزر چکی ہے من خطف الخطفۃ سے یہ مراد نہیں کہ ملاء اعلیٰ سے کچھ باتیں سن بھی آتے ہیں اس کی تردید لایسمعون میں صاف موجود ہے اور دوسری جگہ بھی ہے انہم عن السمع لمعزولون (الشعراء ٢٦-٢١٢) ام لہم سلم یستمعون فیہ (الطور ٥٢-٣٨)

٢٧٧٦ لازب۔ لَزَبَ الشئ اس کا بعض بعض میں داخل ہوگیا اور لزب الطین مٹی چمٹ گئی اور سخت ہوگئی اور طین لازب چمٹ جانے والی مٹی ہے اور لازب اور لازم ایک ہی معنی میں ہے اور لازب بمعنی ثابت بھی ہے (ل)؛

اھم اشد خلقا ام من خلقنا یہ تو ظاہر ہے کہ من ذوی العقول کیلئے ہے اور اس لیے دوسری جگہ جو آتا ہے ءانتم اشد خلقا ام السماء (النزعت ٧٩-٢٧) تو یہاں من خلقنا سے مراد سماء نہیں اور ظاہر ہے کہ من خلقنا میں ایسا ذکر ہونا چاہیے جو ظاہر ہوا اور یہ فی الحقیقت وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا یعنی نمازوں کو قائم کرنے والے بدیوں سے روکنے والے قرآن کریم کی پیروی کرنیوالے ان کے مقابل پر کاہنوں کا ذکر کیا تھا جو اس وقت ملک عرب کے روحانی پیشوا تھے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں قایم یہ جماعت رہ سکتی ہے جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے یعنی راستبازوں کی جماعت یا یہ لوگ یعنی کاہن وغیرہ۔ مطلب یہ ظاہر کرنا ہے کہ نیکی کے مقابل پر یہ کہانت وغیرہ اب ملک عرب میں نہیں رہ سکتی اور باطل کی ساری فوجیں توحید کے مقابل پر نیست و نابود کر دی جائے گی اور چمٹ جانیوالی مٹی سے ان راستبازوں کو پیدا کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ ثابت و قائم رہینگے ؛

٢٧٧٧ یعنی تو بوجہ اپنی شدت معرفت کے ان کے انکار پر تعجب کرتا ہے اور وہ بسبب اپنی جہالت کے ہنسی کرتے ہیں (غ) عجب کے لیے دیکھو ٢٦٣

٢٧٧٨ یستسخرون۔ باب استفعال کا استعمال یہاں یا تو مبالغہ کے لیے ہے اور یا مراد یہ ہے کہ ایک دوسرے کو تمسخر کی طرف بلاتے ہیں (د) ؛

٢٧٧٩ یعنی تم صرف اپنے اعمال کی جزا و سزا کے لیے مبعوث ہی نہیں ہوگے بلکہ اس دنیا میں بھی مغلوب اور ذلیل ہوگے یہ بھی ابتدائی سورتوں میں کفار کی آخری

وَ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿٢٠﴾

اور کہیں گے ہم پر افسوس یہ جزا کا دن ہے۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٢١﴾ ع

یہ فیصلہ کا دن ہے، جسے تم جھٹلاتے تھے۔

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ وَ مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿٢٢﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿٢٣﴾

اکٹھا کرو انھیں جو ظلم کرتے تھے اور ان کے ساتھیوں کو اور انھیں جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوائے عبادت کرتے تھے ـــ پھر انھیں دوزخ کے رستہ کی طرف لے جاؤ ١٢٧٧٩

وَ قِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿٢٤﴾

اور انھیں ٹھیراؤ کہ ان سے پوچھا جائے گا۔

مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿٢٥﴾

تمھیں کیا ہوا تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔

بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿٢٦﴾

بلکہ وہ اس دن فرمانبردار ہوں گے۔

وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿٢٧﴾

اور ایک دوسرے کی طرف منہ کرکے پوچھنے لگیں گے۔

قَالُوْۤا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿٢٨﴾

کہیں گے تم بڑے زور سے ہمارے پاس آتے تھے۔

قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٩﴾

(دوسرے) کہیں گے بلکہ تم (خود ہی) مومن نہ تھے۔

وَ مَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿٣٠﴾

اور ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا، بلکہ تم خود سرکش لوگ تھے۔

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَاۤ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴿٣١﴾

سو ہمارے رب کی بات ہم پر پوری ہوئی ہمیں ضرور مزا چکھنا ہوگا۔

فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿٣٢﴾

پس ہم نے تمھیں گمراہی کی طرف بلایا کیونکہ ہم خود گمراہ تھے۔

فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿٣٣﴾

سو وہ اس دن عذاب میں شریک ہونگے۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿٣٤﴾

ایسا ہی ہم مجرموں سے (معاملہ) کرتے ہیں۔

اِنَّهُمْ كَانُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٣٥﴾

یہ ایسے تھے کہ جب انھیں کہا جاتا کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں، اکڑتے تھے۔

مغلوبیت کی ایک کھلی پیشگوئی ہے ۞

١٢٧٧٩ ازواجہم۔ ازواج یا زوج کیلئے دیکھو ١٣٩ ابن عباس کہتے ہیں یعنی اتباعھم و من اشبھم من الظلمۃ (ج) یعنی اس سے مراد ان کے پیرو ہیں اور جو ظالموں میں سے انکے مشابہ ہیں اور حضرت عمرؓ سے اس کے معنی امثالھم مروی ہیں (د) یعنی ان کی مثل۔ اور ما کانوا یعبدون سے مراد سب معبودانِ باطل لیے گئے ہیں لیکن آگے جو سوال و جواب آیا ہے کہ بعض بعض سے کہینگے کہ تم نے ہمیں گمراہ کیا اور وہ کہینگے ہم نے زبردستی تمہیں کسی راہ پر نہیں ڈالا تم خود کفر کرتے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ما کانوا یعبدون سے مراد یہاں انکے وہ سردار ہیں جن کے پیچھے وہ آنکھیں بند کرکے چلتے تھے اور دوزخ کی طرف لیجایا جانا بھی انہی کے حق میں درست ہو سکتا ہے نہ ملائکہ اور مسیح وغیرہ کے حق میں ۞

وَ يَقُولُونَ اَئِنَّا لَتَارِكُوٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ۭ ۳۶
اور کہتے ، کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک مجنون شاعر کی خاطر چھوڑ دیں۔

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ ۳۷
بلکہ وہ حق لے کر آیا اور رسولوں کی تصدیق کی۔

اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيمِ ۚ ۳۸
تم یقیناً دردناک عذاب چکھو گے۔

وَ مَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۙ ۳۹
اور تمھیں بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر وہی جو تم کرتے تھے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِينَ ۴۰
مگر اللہ کے مخلص بندے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ۙ ۴۱
ان کے لیے رزق ہے جس کی خبر دی گئی ہے ۲۷۸۰

فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُونَ ۙ ۴۲
(یعنی) پھل اور وہ باعزّت۔

فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيمِ ۙ ۴۳
نعمتوں والے باغوں میں۔

عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِينَ ۴۴
تختوں پر آمنے سامنے ہونگے ۲۷۸۱

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ۙ ۴۵
ان میں ایک پیالہ پھرایا جائے گا ۲۷۸۲ صاف سفید (شراب)

بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِينَ ۚ ۴۶
سے پینے والوں کے لیے لذّت والا ۲۷۸۳

لَا فِيهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ ۴۷
نہ اس میں ہلاکت ہوگی اور نہ وہ اس سے متوالے ہونگے ۲۷۸۴

۲۷۸۰ رزق معلوم کیا ہے خود اگلی آیت میں بتا دیا فواکہ یعنی پھل ہیں۔ اور فاکہین نعمتوں کے حاصل کرنے والے ہیں دیکھو ۲۷۵۴ پس یہ پھل درحقیقت نعماء کے قایم مقام ہیں اور انکو پھل اس لحاظ سے کہا ہے کہ وہ اعمال کے ثمرات ہیں اور وہ معلوم اسی لحاظ سے ہے کہ اسکی خبر دی گئی ہے ورنہ اس کی کیفیات کا کوئی علم انسانوں کو نہیں دیا گیا دیکھو ۲۶۲۲ ؂

۲۷۸۱ متقابلین۔ مُقابلۃ اور تقابل یہ ہے کہ ایک دوسرے کیطرف آگے بڑھیں خواہ ذات سے یا توجہ سے یا محبت سے متکئین علیہا متقابلین (الواقعۃ ۵۶-۱۶) (غ) اور یہاں انکے تقابل سے ان کے ایک دوسرے کیساتھ مانوس ہونے کی طرف اشارہ ہے (د) ؂

۲۷۸۲ کأس برتن کو کہتے ہیں مع اس کے جو اس میں پینے کی چیز ہو اور ان دونوں میں سے ہر ایک کو علیٰحدہ بھی کہا جاتا ہے من کاس کان مزاجہا کافورا (الدھر ۷۶-۵) (غ) معین کیلئے دیکھو ۲۲۷۱ ؂

۲۷۸۳ لذۃ۔ لَذّۃ نقیض الم (ورد) ہے اور لَذّبہ یَلَذّ وتلذ الاعین (الزخرف ۴۳-۷۱) اور یہاں لَذّۃ سے مراد ہے لذیذۃ یا ذات لذۃ (ل)

۲۷۸۴ غول کسی چیز کا ہلاک کر دینا ایسے طریق پر کہ محسوس نہ ہو (غ) ؂
ینزفون۔ نزف الماءَ کے معنی ہیں کنوئیں سے تھوڑا تھوڑا کر کے سارا پانی کھینچ لیا اور اسی سے متوالے کو نزیف کہتے ہیں گویا اس کا فہم بدمستی سے جاتا رہا یا اسکی عقل جاتی رہی اور اُنْزِفْتُ (جس سے ینزفون ہے) نزفت سے زیادہ بلیغ ہے (غ)
ان تین آیتوں میں بہشتی نعمتوں میں سے پینے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ پہلے اسے معین کہا ہے اور معین اسے کہتے ہیں جو ظاہر ہو یعنی سطح زمین پر جاری ہو یہ اشارہ اس طرف ہے کہ وہ ختم نہیں ہوتا۔ اور وہ سفید ہے یعنی ہر قسم کے عیب سے پاک ہے دیکھو ۴۹۴ پھر اس میں پینے والوں کے لیے لذّت ہے یہ اس لیے کہا کہ اس دنیا میں جس چیز کو پی کر لوگ سرور حاصل کرتے ہیں وہ لذت سے خالی ہوتی ہے پھر یہاں کی شراب آہستہ آہستہ انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے مگر اس میں یہ بھی نقص نہیں پھر اس سے عقل جاتی رہتی ہے اس میں یہ بھی نقص نہیں مطلب یہ ہے کہ اس میں سرور ہے اور لذت ہے مگر وہ ہر قسم کے عیوب سے خالی ہے اور یہ کیا چیز ہے دوسری جگہ فرمایا مثل الجنۃ التی وعد المتقون فیہا انہار من ماء غیر اسن وانہار من لبن لم یتغیر طعمہ وانہار من خمر لذۃ للشاربین وانہار من عسل مصفی (محمد ۴۷-۱۵) یعنی پانی کی نہریں ہوں گی اور دودھ کی شراب کی اور شہد کی۔ اور یہی پینے کی معمولی اور اعلےٰ درجہ کی چیزیں ہیں۔ اور مثل الجنۃ کہہ کر بتا دیا کہ سچ مچ اس دنیا کا سا پانی اور اس دنیا کا سا دودھ اور اس دنیا کی سی شراب اور اس دنیا کا سا شہد نہیں بلکہ یہ مثال کے طور پر بتا دیا ہے کیونکہ پانی پیاس بجھاتا ہے اور دودھ قوت دیتا ہے اور شراب سے سرور حاصل ہوتا ہے اور شہد میں شفاء ہے تو مطلب یہ ہوا کہ وہ چیزیں جن سے یہ اغراض یہاں حاصل ہوتی ہیں وہاں

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿۴۸﴾ اور ان کے پاس نیچی نگاہوں والی بڑی آنکھوں والی ہونگی۔

كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾ گویا کہ وہ محفوظ کیے ہوئے انڈے ہیں ۲۷۸۵

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾ سو وہ ایک دوسرے کی طرف منہ کرکے پوچھیں گے۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّىْ كَانَ لِىْ قَرِيْنٌ ﴿۵۱﴾ ان میں سے ایک کہنے والا کہیگا کہ میرا ایک ساتھی تھا۔

يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿۵۲﴾ (جو) کہا کرتا تھا کہ کیا تو ماننے والوں میں سے ہے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ﴿۵۳﴾ کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہمیں بدلہ دیا جائے گا۔

قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ کہے گا کیا تم جھانکنا چاہتے ہو۔

بھی ملیں گی گو ان کی کیفیت یہ نہیں ؀

۲۷۸۵ قٰصِرٰت۔ قَصْر یا قِصَر خلاف طول ہے اور قَصَرْتُ کے معنی ایک چیز کو چھوٹا کیا بھی آتے ہیں اور یہ بھی کہ اس کے بعض کو بعض سے ملایا اور اسی دوسرے معنی سے قَصْر بمعنی محل ہے جس کی جمع قصور ہے ویجعل لك قصورا (الفرقان ۲۵-۱۰) اور قَصَرْتُہٗ بمعنی جعلتہ فی القصر بھی ہے یعنی اسے محل میں رکھا حور مقصورات فی الخیام (الرحمٰن ۵۵-۷۲) اور قصرت الصلوٰۃ کے معنی ہیں نماز کے بعض ارکان چھوڑ کر اسے چھوٹا کر دیا اور عورت کو قاصرۃ الطرف کہتے ہیں جب وہ اپنی آنکھ اس چیز کی طرف نہ اُٹھائے جس کی طرف آنکھ اُٹھانا ناجائز ہے۔ اور قَصَّرَ شَعَرَہٗ اپنے بالوں کا کچھ حصہ کاٹ دیا محلقین رءوسکم ومقصرین (الفتح ۴۸-۲۷)

طرف۔ طرف کسی چیز کی جانب ہے اور طَرْفُ العین آنکھ کی پلک کو کہا جاتا ہے اور طرف کے معنی پلک کی حرکت ہیں اور پھر اس سے دیکھنا مراد لیا جاتا ہے کیونکہ پلک کی حرکت دیکھنے کو چاہتی ہے قبل ان یرتد الیك طرفك اور قاصرات الطرف سے مراد ہے عفت کی وجہ سے آنکھ کو بند کر لینے والیں (غ)

عین۔ اَعْیَنُ اور عَیْنَاء کی جمع ہے اور یہ لفظ آنکھ کی خوبصورتی کی وجہ سے بقر وحش پر بولے جاتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ عورتوں کو تشبیہ دی گئی ہے حور عین (الواقعۃ ۵۶-۲۲) (غ) بیل کو اعین اور گائے کو عیناء کہا جاتا ہے اور بڑی آنکھ والے مرد کو بھی اعین کہا جاتا ہے جس کی جمع عین ہے (ل)؀

بیض۔ بَیْضَۃٌ واحد ہے جس کے معنی انڈا اس کی سفیدی کی وجہ سے ہیں اور بیضۃ عورت کو بھی کنایۃً کہا جاتا ہے ایک رنگ میں مشابہت کے لحاظ سے اور دوسرا اس کے محفوظ ہونے کے لحاظ سے اور بیضۃُ البلد ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اہل شہر میں سے محفوظ اور ان میں رئیس ہوں جیسا شاعر کے قول میں ہے، کانت قریشٌ بیضۃً (غ) اور بیضۃ الدار اسکے وسط اور بڑے حصہ کو کہا جاتا ہے اور بیضۃ الاسلام اسلام کی جماعت اور انکے اصل کو کہا جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے ولا تُسَلِّطْ علیہم عَدُوًّا من غیرھم فیستبیح بیضتہم یعنی اے خدا مسلمانوں پر ایسا دشمن انکے غیر سے مسلط نہ کیجیو جو ان کی جماعت اور انکے اصل کو ہلاک کردے یعنی ان کا بکلی استیصال کردے (ل)؀

بہشت میں عورتیں بھی ہونگی۔ یہ تو ظاہر ہے کیونکہ جو انعام مومن مردوں کیلئے ایمان اور عمل صالح پر ہے وہی مومن عورتوں کے لیے ہے اور مومن عورتیں اسی طرح بہشت میں جائیں گی جس طرح مومن مرد اس لیے عندھم قٰصرٰت الطرف میں ان پاک دامن بیبیوں کا ذکر بھی ہو سکتا ہے جنہوں نے یہاں اپنی نگاہوں کو کسی ناجائز موقعہ پر نہیں اٹھایا اور ان کا بیض ہونا بلحاظ ان کی سیادت وشرافت کے ہو سکتا ہے اور ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے ایک بوڑھی عورت کے سوال پر کہا کہ جنت میں کوئی بوڑھی عورت نہ ہو گی اور وہ غمناک ہوئی تو آپ نے یہ آیت پڑھی انا انشانٰھن انشاء فجعلنٰھن ابکارا عربا اترابا لاصحاب الیمین (الواقعۃ ۵۶-۳۵ تا ۳۸) یعنی یہی بوڑھی عورتیں جنت میں ایک نئی پیدائش حاصل کر لیں گی اس لیے ان پر بوڑھی کا لفظ صادق نہ آئیگا۔ لیکن چونکہ یہاں نعمائے بہشتی میں یہ ذکر ہے اور انہیں کو دوسری جگہ حور عین بھی کہا ہے اس لیے یہ بہشت کی ان نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے ما لا عین رات ولا اذن سمعت جس طرح بہشت کے فواکہ کو یہاں کے پھلوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور بہشت کے پانی اور دودھ کو یہاں کے پانی اور دودھ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اسی طرح بہشت کی قاصرات الطرف کو بھی اس دنیا کی عورتوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا علاوہ ازیں جس طرح بہشت کے فواکہ اور بہشت کا پانی اور دودھ مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں ہیں اسی طرح بہشت کی قاصرات الطرف بھی مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں ہیں۔ قرآن نے بہشت کی کسی نعمت کے لحاظ سے مردوں اور عورتوں میں فرق نہیں کیا پس بلاشبہ حور ایک بہشت کی نعمت ہے مگر وہ نعمت مردوں اور عورتوں کیلئے یکساں ہے اور اصل بات جیسا کہ بارہا لکھا جا چکا ہے یہی ہے کہ جن نعمتوں کا ذکر آتا ہے وہ بطور مثال ہے پس حور کا ذکر بھی بطور مثال ہے اور خوبصورتی میں اگر کسی چیز کی مثال دینی ہو تو وہ عورت سے ہی دی جا سکتی ہے۔ انسان جس طرح کھانے سے لذت حاصل کرتا ہے پینے سے لذت حاصل کرتا ہے اسی طرح حسن سے بھی لذت حاصل

فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ﴿۵۵﴾
سو اس نے جھانکا تو اس کو دوزخ کے درمیان دیکھا۔

قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ ﴿۵۶﴾
کہا اللہ کی قسم قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک کر دیتا۔

وَ لَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ ﴿۵۷﴾
اور اگر میرے رب کی نعمت نہ ہوتی تو میں بھی ان میں سے ہوتا جو (عذاب میں) حاضر کیے گئے ہیں۔

اَفَمَا نَحْنُ بِمَیِّتِیْنَ ﴿۵۸﴾
تو کیا (یہ سچ نہیں کہ) ہم مرنے والے نہیں۔

اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿۵۹﴾
مگر ہماری پہلی موت اور ہمیں عذاب نہیں دیا جائیگا۔[٢٧٨٦]

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۶۰﴾
یقیناً یہ بڑی کامیابی ہے۔

لِمِثْلِ هٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿۶۱﴾
ایسی ہی چیزوں کے لیے چاہیئے کہ عمل کرنیوالے عمل کریں۔

اَذٰلِكَ خَیْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿۶۲﴾
کیا یہ بہتر مہمانی ہے یا تھوہر کا درخت[٢٧٨٧]

اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِیْنَ ﴿۶۳﴾
ہم نے اسے ظالموں کے لیے سزا بنایا ہے۔

اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْۤ اَصْلِ الْجَحِیْمِ ﴿۶۴﴾
وہ ایک درخت ہے جو دوزخ کی جڑ میں اُگتا ہے۔

طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ ﴿۶۵﴾
اس کا خوشہ ایسا ہے جیسے شیطانوں کے سر۔

فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾
سو وہ اس سے کھائیں گے پھر اس کے ساتھ پیٹوں کو بھریں گے۔

کرتا ہے اور یہ اس کیلئے سرور کا موجب ہوتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت۔ پس نعمائے بہشتی کا نقشہ نامکمل ہوتا۔ اگر اس میں کھانے پینے کی چیزوں کا ذکر ہوتا مگر ان چیزوں کا ذکر نہ ہوتا جو حسن سے تعلق رکھتی ہیں۔ کیا انسان کی فطرت حسن وجمال سے لذّت حاصل نہیں کرتی کیا اور انسان کے کمال سرور کا نقشہ اس میں حسن وجمال کی تصویروں کے بغیر مکمل ہو سکتا ہے ؛ مگر ان باتوں کو شہوانی خیالات سے منسوب کرنا اپنے شہوانی خیالات کا نتیجہ ہے۔ کیفیات جنت کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ نہ جنت میں بقائے نوع کی ضرورت ہے اور نہ ان امور کی جو بقائے نوع سے تعلق رکھتے ہیں مزید بحث کیلئے دیکھو زوجنٰھم بحور عین (الطور ۵۲-٢٠) اور یہاں عورت کی پاک دامنی کو اس کا سب سے بڑا جوہر قرار دیا ہے اور یہی اس کی حقیقی خوبصورتی ہے ؛

٢٧٨٦ یہ اس جنتی کا قول ہے اور یہ اس کے مطابق ہے جو دوسری جگہ فرمایا لا یذوقون فیہا الموت الا الموتۃ الاولیٰ ووقٰھم عذاب الجحیم (الدخان ۴۴-۵۶) یعنی اب ہم پر دوسری موت نہ آئے گی کیونکہ جنت سے پھر نہ نکالے جائیں گے اور نہ کوئی تکلیف آئے گی ؛

٢٧٨٧ زقوم۔ شجرۃ الزقوم سے مراد دوزخ کے ناپسندیدہ کھانے ہیں اور اسی سے زَقَمَ اور تَزَقَّمَ اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو کوئی چیز نگل جائے۔ (غ) اور زقوم طعام اہل نار ہے اور ابن سیدہ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو قریش کو معلوم نہ تھا کہ زقوم کیا چیز ہے ابوجہل نے کہا کہ یہ درخت ہمارے ملک میں تو ہوتا نہیں کیا کوئی جانتا ہے کہ یہ کیا ہے تو ایک شخص نے جو بلاد افریقہ سے واپس آیا تھا کہا کہ افریقی لغت میں زقوم مکھن اور کھجور ملایا ہوا ہوتا ہے تو ابوجہل نے اپنی لونڈی سے کہا کہ مکھن اور کھجوریں لے آؤ تب وہ اسے کھاتے تھے اور کہتے تھے کہ یہی ہے جس سے محمدؐ (صلعم) ہمیں ڈراتے ہیں تب یہ آیت نازل ہوئی انہا شجرۃ تخرج فی اصل الجحیم طلعہا کانہ رءوس الشیٰطین اور شیاطین میں یہاں تین وجوہ بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ اس کا خوشہ بدنمائی میں گویا شیطانوں کے سر کی طرح ہے اور وہ گو دیکھے نہ جاتے ہوں لیکن قبیح چیز کے متعلق کہا جاتا ہے کانہ راس شیطان دوسری توجیہ یہ ہے کہ شیطان ایک قسم کے سانپ کا نام ہے جس کا منہ بہت بدنما ہوتا ہے تیسری یہ کہ ایک بدشکل روئیدگی ہوتی ہے جس کا نام رءوس الشیاطین ہے ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ایک اعرابی نے مجھے خبر دی کہ زقوم ایک سیاہ سا درخت ہے جس کے چھوٹے چھوٹے پتے ہوتے ہیں اور اس کے پتوں کے سرے بہت بدنما ہوتے ہیں اور ثعلب سے ہے کہ زقوم ہر ایک کھانا ہے جو قتل کر دے (ل) ؛

معلوم ہوا کہ یہاں شجرۃ الزقوم سے مراد وہ تھوہر کا درخت نہیں جو اس دنیا میں ہوتا ہے بلکہ یہ کوئی اور درخت ہے جو دوزخ کی جڑ بنیاد میں اگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دوزخ کی جڑ میں اُگنے والا درخت اعمال بدنتائج کا ہی درخت ہے اور رُءوس الشیاطین کا لفظ اختیار کرنے میں بھی اس طرف

ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿٦٧﴾
پھر اس کے اوپر اُن کے لیے کھولتے ہوئے پانی کی ملونی ہوگی۔ ۲۷۸۸

ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿٦٨﴾
پھر ان کا لوٹ کر آنا دوزخ کی طرف ہے۔

اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴿٦٩﴾
انھوں نے اپنے باپ دادوں کو گمراہ پایا۔

فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿٧٠﴾
اور وہ اُسی (قدموں کے) نقشوں پر دوڑے چلے جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٧١﴾
اور ان سے پہلے بھی بہت سے پہلے لوگوں میں سے گمراہ ہوئے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿٧٢﴾
اور ہم نے ان کے اندر ڈرانے والے بھیجے۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٧٣﴾
سو دیکھ کہ ان لوگوں کا انجام کیسا ہُوا جو ڈرائے گئے۔

ع اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٧٤﴾
مگر خدا کے مخلص بندے (بچ گئے)

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿٧٥﴾
اور نوحؑ نے ہمیں پکارا، سو ہم کیسے اچھے (دعا) قبول کرنیوالے ہیں۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿٧٦﴾
اور ہم نے اسے اور اس کے پیروؤں کو بڑی سختی سے نجات دی۔

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿٧٧﴾
اور ہم نے اس کی نسل کو (وہاں) انہی کو باقی رکھا۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ ﴿٧٨﴾
اور ہم نے پچھلے لوگوں میں اس کا (ذکر خیر) باقی رکھا۔ ۲۷۸۹

سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٩﴾
قوموں میں نوحؑ پر سلام ہے۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٨٠﴾
اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨١﴾
وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿٨٢﴾
پھر دوسروں کو ہم نے غرق کر دیا۔

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿٨٣﴾
اور ابراہیمؑ بھی اسی کے گروہ میں سے تھا۔ ۲۷۹۰

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٤﴾
جب وہ بے عیب دل کے ساتھ اپنے رب کے پاس آیا۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿٨٥﴾
جب اس نے اپنے بزرگ اور اپنی قوم سے کہا یہ کیا ہے جس کی تم پوجا کرتے ہو۔

اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿٨٦﴾
کیا تم اللہ کے سوائے جھوٹے بنائے ہوئے معبودوں کو چاہتے ہو۔

فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٧﴾
تو تمہارا خیال جہانوں کے رب کے متعلق کیا ہے؟

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِى النُّجُوْمِ ﴿٨٨﴾
تب اس نے ستاروں کو ایک نظر دیکھا۔

اشارہ کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیطان کے پیچھے لگنے سے پیدا ہوتا ہے اور رءُوس رَاس کی جمع ہے جس کے معنی سر ہیں اور کبھی اس سے مراد رئیس بھی لے لیا جاتا ہے (غ)۔

ع۲۷۸۸ شوب کے معنی خَلط یعنی ملاوٹ ہیں (غ) الفوا۔ اَلْفَيْتُ وجدت میں نے اسے پایا الفينا عليه (البقرۃ ۲۔ ۱۷۰) الفيا سيدها (يوسف ۱۲۔ ۲۵) (غ)

ع۲۷۸۹ ترکنا کا مفعول محذوف ہے یعنی ثنائے حسن اور یہ ابن عباس سے مروی ہے اور یوں بھی معنی کر لیے گئے ہیں کہ اگلا قول سلام والا باقی چھوڑا۔

ع۲۷۹۰ تمام نبی ایک گروہ ہیں کیونکہ اصل اصول سب کا ایک ہی ہے توحید الٰہی کو دنیا میں پھیلانا ان هٰذه امتكم امة واحدة وانا ربكم

فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ ﴿۸۹﴾ اور کہا میں تو بیمار ہوں ۲۷۹۱؎

فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِیْنَ ﴿۹۰﴾ پھر وہ پیٹھ پھیرتے ہوئے اس سے پھر گئے۔

فَرَاغَ اِلٰۤی اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ سو وہ ان کے معبودوں کی طرف متوجہ ہُوا اور کہا کیا تم کھاتے نہیں ۲۷۹۲؎

مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ تمھیں کیا ہُوا تم بولتے نہیں۔

فَرَاغَ عَلَیْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْیَمِیْنِ ﴿۹۳﴾ پھر انھیں زور سے مارنے کی طرف متوجہ ہُوا۔

فَاَقْبَلُوْۤا اِلَیْهِ یَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾ تب وہ دوڑتے ہوئے اس کی طرف آئے ۲۷۹۳؎

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ اس نے کہا کیا تم اس کی عبادت کرتے ہو جسے (خود) تراشتے ہو۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں پیدا کیا اور جو تم بناتے ہو ۲۷۹۴؎

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْیَانًا فَاَلْقُوْهُ فِی الْجَحِیْمِ ﴿۹۷﴾ انھوں نے کہا اس کے لیے ایک عمارت بناؤ پھر اسے شعلے مارتی ہوئی آگ میں ڈال دو۔

فاعبدون (الانبیاء ۲۱ - ۹۲)

۲۷۹۱؎ سقیم ۔ سَقَم اور سُقْم اس بیماری کو کہتے ہیں جو بدن سے مخصوص ہو اور مَرَض بدن میں بھی ہوتا ہے اور دل میں بھی فی قلوبهم مرض (البقرة ۲ - ۱۰) اور یہاں سقیم میں یا تو تعریض ہے اور یا گذشتہ کی طرف اشارہ ہے اور یا آیندہ کی طرف اور یا اس تھوڑے سے اختلال طبیعت کی طرف اشارہ ہے جو انسان کے جسم میں بہر حال ہوتا ہے خواہ وہ اسے محسوس نہ کرے اور مکان سقیم کہا جاتا ہے جب اس مکان میں خوف ہو (غ) اور لسان العرب میں ہے کہ سقم مرض ہی ہے (تو اس لحاظ سے دل کی بیماری پر بھی یہ لفظ صادق آسکتا ہے) چنانچہ ان اقوال میں سے جو انی سقیم کی تفسیر میں دیئے گئے ہیں ایک یہ ہے سقیم بما اری من عبادتکم غیر اللہ (ن) یعنی تمہاری غیر اللہ کی عبادت کو دیکھ کر بیمار ہو گیا ہوں یعنی اس سے سخت بیزار ہوں اور ایک قول ہے سقیم القلب لکفرکم (د) تمہارے کفر کی وجہ سے میرا دل بیمار ہے اور تاج العروس میں ہے کہ قلب سقیم ۔ فہم سقیم ۔ کلام سقیم سب محاورات بولے جاتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ امام راغب کا سقم کو بدن سے مخصوص کرنا صحیح نہیں۔ اور کہا جاتا ہے ھو سقیم الصدر علیه جس کے معنی ہیں حاقد یعنی اسکے خلاف کینہ رکھتا ہے (ت)۔

حضرت ابراہیم کی طرف جھوٹ منسوب کرنا غلط ہے: اسے مفسرین نے حضرت ابراہیم کے تین جھوٹوں میں سے ایک ٹھہرایا ہے حالانکہ صدیقا نبیا ان تینوں جھوٹوں کو خود جھوٹ ٹھہراتا ہے اور یہ کہنا کہ یہ جھوٹ اللہ کی راہ میں تھے بے معنی ہے۔ اللہ کی راہ اور بدی۔ یہ دو باتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ بدی نہ اللہ کی طرف منسوب ہو سکتی ہے نہ اللہ کی راہ کی طرف اگر جھوٹ بولنا برا فعل ہے تو کسی وقت بھی جائز نہیں جس طرح چوری کرنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں مثلاً اگر ایک بت کو پہنائے ہوئے زیور چرانے جائز نہیں خواہ نیت ان کو اچھی جگہ صرف کرنے کی ہی ہو تو جھوٹ بول کر بت کا توڑنا بھی جائز نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ سقیم سے مراد سقیم القلب لیکر جس کی لغت اجازت دیتی ہے کوئی دِقت باقی نہیں رہتی اور نہ خواہ مخواہ ایک نبی کی طرف جھوٹ منسوب کرنا پڑتا ہے اور نجوم کی طرف دیکھ کر یہ فقرہ بمعنی سقیم القلب اور بھی زیادہ موزوں ہے اس لیے کہ وہ لوگ نجوم کی عبادت کرتے تھے جیساکہ قرآن شریف میں دوسری جگہ حضرت ابراہیم کے ساتھ ان کی بحث کا ذکر ہے فلما (راکوکبا قال ھذا ربی (الانعام ۶ - ۷۷) اور اگر بیمار ہی معنی لیے جائیں تو اس کے جھوٹ ہونے پر کیا دلیل ہے ستاروں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات بہت چلی گئی ہے تب انہوں نے کہا کہ میں بیمار بھی ہوں اور زیادہ نہیں جاگ سکتا زبردستی اسے جھوٹ بنانے سے کیا حاصل ہے

۲۷۹۲؎ راغ ۔ رَوْغ مضبوط تدبیر کیلئے مائل ہونا ہے اور راغ فلانٌ الی فلانٍ کے معنی ہیں اس کی طرف مائل ہوا کسی ایسے امر کے لیے جس کا اس سے باریک مضبوط تدبیر سے ارادہ کرتا ہے فراغ الی اھله (الذٰریٰت ۵۱ - ۲۶) یعنی مائل ہوا اور اسکی حقیقت یہ ہے کہ کسی قسم کے میلان کیساتھ ایک چیز طلب کیجائے اور آیت ۹۳ میں راغ علیهم میں علی غلبہ کے اظہار کیلئے ہے (غ)۔

۲۷۹۳؎ یزفون ۔ زفیف ہوا کا چلنا اور شتر مرغ کی تیزی ہے جس کے چلنے کے ساتھ پرواز ملا ہوا ہوتا ہے پس یزفون بمعنی یُسْرِعُوْن ہے۔ یعنی تیزی سے دوڑتے ہوئے (غ)۔

۲۷۹۴؎ ماتعملون کے ظاہر معنی یہی ہیں کہ اس سے مراد بت وغیرہ ہیں جنہیں وہ تراش کر بناتے تھے (ر) مطلب یہ ہے کہ تم پتھر لکڑیوں وغیرہ سے بت بناتے ہو حالانکہ ان سب چیزوں کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور بعض نے ماتعملون سے مراد اعمال انسانی بھی لیے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ ان اعمال کا خالق اس لیے ہے کہ اسی نے وہ اسباب پیدا کئے ہیں جن سے یہ اعمال بنتے ہیں۔ اور بعض نے ما کو استفہامیہ انکار و تحقیر کے لیے لیا ہے ای شئ تعملون یہ تم کیا کام کرتے ہو (ر)۔

فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۹۸﴾
سو انھوں نے اس کے ساتھ ایک چال چلنی چاہی پر ہم نے انہی کو نیچا دکھایا۔ ۲۷۹۵

وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۹۹﴾
اور اس نے کہا میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں وہ مجھے رستہ دکھائیگا۔ ۲۷۹۶

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۰﴾
میرے رب مجھے (اولاد) عطا فرما جو نیکوکاروں میں سے (ہو)

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾
سو ہم نے اسے ایک بردبار لڑکے کی خوش خبری دی۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ز سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾
سو جب وہ اس کے ساتھ کام کاج (کی عمر) کو پہنچا اس نے کہا اے میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کرتا ہوں تو دیکھ تیری کیا رائے ہے، اس نے کہا اے میرے باپ جو کچھ تجھے حکم دیا جاتا ہے کر، تو مجھے اگر اللہ چاہے صبر کرنے والوں میں سے پائے گا۔ ۲۷۹۷

۲۷۹۵ء اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو جو آگ میں ڈالنے کی تجویز تھی وہ کید کے رنگ کی تھی یعنی کوئی باریک خفیہ تدبیر تھی اور ان کا اسفل یا ذلیل ہونا اس چال میں ناکامی ہے ؛

۲۷۹۶ء رب کی طرف جانے سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہجرت کر کے اس مکان کی طرف چلا جاؤں جس کا رب نے حکم دیا ہے اور اسے بعض نے شام اور بعض نے مصر کہا ہے (ر) اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ تمہاری چالوں سے اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں اور سیھدین میں ہدایت سے مراد کامیابی کا رستہ دکھانا ہے

۲۷۹۷ء سعی دیکھو ۱۸۱۷ء اور یہاں مراد اس سے مل کر اس کے شغلوں اور حاجتوں میں کوشش کرنا ہے (ر) اور حضرت ابن عباس سے اس کے معنی عمل مروی ہیں (ج) ؛

حضرت ابراہیم کو بیٹا قربان کرنے کا حکم: حضرت ابراہیم نے خواب میں دیکھا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو ذبح کیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ واقعی یہی دیکھا یا جو کچھ دیکھا تھا اسکا نتیجہ یہ تھا کہ آپ اپنے بیٹے کو ذبح کر دیں اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کو رویا میں حکم دیا گیا تھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دیں (ر) اور الفاظ ما تؤمر صاف بتاتے ہیں کہ یہی بات حق ہے اور اسی کے مطابق توریت میں ہے یعنی خدا نے ابراہیم کو حکم دیا تھا کہ آپ اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کریں (پیدائش ۲۲: ۱و۲) اور ایک راویت میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے نذر مانی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کریں گے تو اس نذر کے پورا کرنے کا حکم ہوا تھا (ج) بہرحال الفاظ قرآنی اور توریت کے بیان دونوں سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹا قربان کرنے کا حکم ہوا تھا ؛

ذبیح اسمٰعیل تھے نہ اسحاق: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کونسا بیٹا تھا جس کے قربان کرنے کا حکم ہوا تھا۔ توریت میں صاف طور پر اسحاق کا نام دیا ہے اور مسلمانوں میں سے بھی بعض نے اسی بنا پر اسحاق کا نام لے دیا ہے مگر قرآن کریم کی صراحت اس کے خلاف ہے اس لیے کہ یہاں صفائی سے پہلے ایک بیٹے کیلئے دعا کا اس پر بشارت کا۔ اسی بیٹے کے قربان کرنے کا ذکر ہے اور اس ذکر کے خاتمہ پر فرمایا و بشرنٰہ باسحٰق نبیا من الصالحین (۱۱۲) جس سے معلوم ہوا کہ یہ سب حضرت اسمٰعیل کا ذکر ہے (ر) اسحاق کی بشارت بھی اس واقعہ کے بعد ہے اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ کتاب پیدائش سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کی عمر چھیاسی سال کی تھی جب حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے اور ان کی عمر ننانوے سال کی تھی جب حضرت اسحاق کی بشارت ملی گویا اس وقت حضرت اسمٰعیل کی عمر چودہ سال کی تھی۔ اور یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب حضرت اسمٰعیل بلغ معہ السعی کا مصداق ہیں اور یہ عمر دس بارہ سال کی ہونی چاہیے۔ اور معاویہ کی حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی آنحضرت صلعم کے پاس آیا اور آپ کو خطاب کیا یا ابن الذبیحین اے دو ذبیحوں کے بیٹے۔ جس میں ایک حضرت اسمٰعیل کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا آنحضرت صلعم کے والد عبداللہ کی طرف کیونکہ عبدالمطلب نے جب زمزم کھودا تو نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ اس امر کو آسان کر دے تو وہ اپنا ایک بیٹا قربان کرے گا پھر جب قرعہ نکالا گیا تو عبداللہ کے نام کا قرعہ نکلا اور آخر سو اونٹ فدیہ میں دیا گیا اور حدیث جو بیان کی جاتی ہے جس میں یہ لفظ آتے ہیں کہ جب اللہ تعالےٰ نے اسحاق سے ذبح کی سختی کو دور کیا تو ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب منکر ہے (ر) اور بعض صحابہ اور سلف کی طرف جو یہ قول منسوب ہے تو قرآن کریم کی صراحت کے مقابل قابل قبول نہیں (ث) اور توریت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ میں حضرت اسمٰعیل کی دشمنی کی وجہ سے یہودیوں نے تحریف کر کے اسمٰعیل کی جگہ اسحاق کا نام رکھدیا۔ کیونکہ جہاں قربانی کا حکم ہے وہاں ایک طرف اسحاق کا نام ہے دوسری طرف اس کے ساتھ ہی ہے "اپنے اکلوتے بیٹے کو" (پیدائش ۲۲: ۲) اب اکلوتے کا لفظ حضرت اسحاق پر کسی صورت میں صادق نہیں آسکتا۔ کیونکہ اس سے پہلے حضرت اسمٰعیل موجود ہیں۔ بلکہ یہ لفظ اسحاق کی پیدائش سے پیشتر صرف حضرت اسمٰعیل پر صادق آسکتا ہے علاوہ ازیں مینڈھے کے بطور فدیہ دیا جانے کا ذکر توریت میں بھی ہے لیکن اس قربانی کی یادگار حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں عرب میں رہی اور یہ یادگار آج تک اُمت محمدیہ میں چلتی ہے اور کوئی اسکی یادگار حضرت اسحاق کے نام سے وابستہ نہیں ؛

فَلَمَّآ اَسۡلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلۡجَبِيۡنِ ۝۱۰۳	سو جب دونوں نے حکم مانا اور اسے ماتھے کے بل لٹایا[۲۷۹۸]
وَ نَادَيۡنٰهُ اَنۡ يّٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ ۝۱۰۴	اور ہم نے اُسے پکارا کہ اے ابراہیمؑ!
قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝۱۰۵	تونے خواب سچ کردکھایا، اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔
اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِيۡنُ ۝۱۰۶	بیشک یہ ایک کھلا امتحان تھا۔
وَ فَدَيۡنٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِيۡمٍ ۝۱۰۷	اور ہم نے ایک بھاری قربانی اس کا فدیہ دیا[۲۷۹۹]
وَ تَرَكۡنَا عَلَيۡهِ فِى الۡاٰخِرِيۡنَ ۝۱۰۸	اور ہم نے پچھلے لوگوں میں اس کا ذکر(خیر) باقی رکھا۔
سَلٰمٌ عَلٰۤى اِبۡرٰهِيۡمَ ۝۱۰۹	ابراہیمؑ پر سلام ہو۔
كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝۱۱۰	اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔
اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝۱۱۱	وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔
وَبَشَّرۡنٰهُ بِاِسۡحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝۱۱۲	اور ہم نے اسے اسحاقؑ کی خوشخبری دی ایک نبی کی جو نیکو کاروں میں سے تھا
وَ بٰرَكۡنَا عَلَيۡهِ وَعَلٰٓى اِسۡحٰقَ ؕ وَ مِنۡ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحۡسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ مُبِيۡنٌ ۝۱۱۳ ع	اور ہم نے اُسے اور اسحاقؑ کو برکت دی اور ان دونوں کی نسل سے نیکی کرنے والے بھی ہیں اور اپنے نفس پر کھلا ظلم کرنیوالے (بھی)
وَلَقَدۡ مَنَنَّا عَلٰى مُوۡسٰى وَ هٰرُوۡنَ ۝۱۱۴	اور ہمیں نے موسیٰؑ اور ہارونؑ پر احسان کیا۔
وَ نَجَّيۡنٰهُمَا وَ قَوۡمَهُمَا مِنَ الۡكَرۡبِ الۡعَظِيۡمِ ۝۱۱۵	اور ہم نے ان دونوں کو اور ان کی قوم کو بڑی سختی سے نجات دی۔
وَ نَصَرۡنٰهُمۡ فَكَانُوۡا هُمُ الۡغٰلِبِيۡنَ ۝۱۱۶	اور ہم نے انھیں مدد دی سو وہ غالب ہوئے۔

حضرت اسمٰعیل کے ذبح کرنے کا خواب یا حکم بے معنی نہ تھا۔ اور اس سے مراد صرف اس قدر نہ تھی کہ حضرت ابراہیم کو آزمایا جائے بلکہ اس کے نیچے ایک اور مفہوم تھا اور وہ یوں پورا ہوا کہ حضرت اسمٰعیل کو آخر حضرت ابراہیم نے حکم الٰہی کے ماتحت اپنے سے جدا کر کے ایک ایسے بیابان میں رکھا ہے جو بظاہر ذبح کرنے کے برابر تھا اور اس کو یوں چھوڑا جانے میں ایک پرحکمت اشارہ تھا جس کو بعد میں نبیوں نے کھولا۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا "کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے" (متی ۲۱: ۴۲) پس حضرت اسمٰعیل کے ذبح کرنے کے حکم میں اسکے مکہ معظمہ میں تنہا چھوڑا جانے کی طرف اشارہ تھا اور یہ خود ایک پیشگوئی تھی کہ یہ وہی پتھر ہے جو عمارت نبوت کے کونے کا سرا بنے گا جیسا کہ آنحضرت صلعم نے خود بھی فرمایا انا ھذہ اللبنۃ و انا خاتم النبیین۔

ع۲۷۹۸ تَلَّ۔ تَلّ بلند جگہ کو کہتے ہیں یعنی ٹیلہ اور تَلَّہٗ کے معنی ہیں اسے ٹیلے پر لٹایا (غ)۔

جبین۔ جُبن ضعف قلب ہے اور جبین پیشانی یا ماتھے کی دونوں طرفیں ہیں (غ)۔

انسان کی قربانی کا منسوخ ہونا: حضرت ابراہیم کا اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کیلئے تیار ہو جانا قابل اعتراض نہیں اس لیے کہ اس سے پہلے انسان کی قربانی کا رواج تھا اور حضرت ابراہیم نے جو رویا دیکھا اس کا منشا یہی سمجھا کہ حضرت اسمٰعیل کی قربانی دی جائے اور اس واقعہ سے درحقیقت انسان کی قربانی کی رسم منسوخ ہوئی اور جانوروں کی قربانی اسکی جگہ قرار پائی۔

ع۲۷۹۹ اس کا فدیہ تو مینڈھا تھا اور عظیم اسے اس لحاظ سے کہا کہ اس کی یادگار میں ہمیشہ کیلئے دنیا میں ایک قربانی قرار پائی۔

وَاٰتَیْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ ﴿۱۱۷﴾ اور ہم نے دونوں کو واضح کتاب دی ع۲۸۰۰

وَهَدَیْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴿۱۱۸﴾ اور ہم نے دونوں کو سیدھے رستے پر چلایا۔

وَتَرَكْنَا عَلَیْهِمَا فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ اور ہم نے دونوں کا پچھلے لوگوں میں (ذکرِ خیر) باقی رکھا۔

سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ موسیٰؑ اور ہارونؑ پر سلام ہو۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۲۱﴾ اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۲۲﴾ وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

وَاِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۲۳﴾ اور الیاسؑ بھی رسولوں میں سے تھا

اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم تقوےٰ اختیار نہیں کرتے۔

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخٰلِقِیْنَ ﴿۱۲۵﴾ کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور سب سے بہتر پیدا کرنے والے کو چھوڑتے ہو؟ ع۲۸۰۱

اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۲۶﴾ (یعنی) اللہ کو جو تمھارا رب اور تمھارے پہلے باپ دادوں کا رب ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ تو انھوں نے اسے جھٹلایا پس وہ (عذاب میں) حاضر کیے گئے ہیں۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۱۲۸﴾ مگر اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے (بچ گئے)

وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۲۹﴾ اور ہم نے پچھلے لوگوں میں اس کا (ذکرِ خیر) باقی رکھا۔

سَلٰمٌ عَلٰۤی اِلْ یَاسِیْنَ ﴿۱۳۰﴾ الیاسینؑ پر سلام ہو ع۲۸۰۲

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳۲﴾ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۳۳﴾ اور لوطؑ بھی رسولوں میں سے تھا۔

اِذْ نَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۳۴﴾ جب ہم نے اسے اور اس کے اہل کو سب کو نجات دی۔

ع۲۸۰۰ مستبین - بان - اِستبان - تبیّن کے ایک ہی معنی ہیں یعنی واضح ہوا و لتستبین سبیل المجرمین (الانعام۶-۵۵) (غ)
کتاب یا توریت صرف حضرت موسیٰ کو نہیں دی گئی بلکہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ دونوں کو پس اصل کتاب دونوں کی وحی پر مشتمل ہے۔ چونکہ بعض قسم کے کام جیسے عبادت وغیرہ کا کرانا حضرت ہارون کے سپرد تھے اس لیے اس کے متعلق حضرت ہارون کو وحی ہوئی ہوگی اور مستبین بلحاظ تفصیلات شریعت اسے کہا ؛

ع۲۸۰۱ بعل دیکھو ع۲۹۳ اور عرب کے لوگ اپنے معبود کو جس کیساتھ اللہ تعالیٰ کا تقرب چاہتے بعل کہتے تھے (غ) اور قوم الیاس کا بت بھی بعل تھا (ر) اور لغت یمن میں بعل رب کو کہتے ہیں (ج) اور بعل سورج یا سورج دیوتا کا قائم مقام بھی ہے ؛

ع۲۸۰۲ الیاسین۔ الیاس کی دوسری صورت ہے جیسے سینا اور سینین یا ادریس اور ادریسین۔
حضرت الیاس نویں صدی قبل مسیح کے پہلے نصف میں ظاہر ہوئے اور ان کا وعظ بعل کے خلاف تھا دیکھو یہودی انسکلوپیڈیا حضرت الیاس کا ذکر صرف ایک اور موقعہ پر قرآن شریف میں آتا ہے یعنی الانعام۶-۸۶ میں ؛
ذکرِ انبیاء میں ترتیب: اس سورت میں انبیاء کا ذکر جس ترتیب سے کیا ہے اس میں بظاہر کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔ پہلے حضرت نوحؑ اور ابراہیمؑ کا ذکر ہے۔ پھر

اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ﴿۱۳۵﴾	سوائے ایک بڑھیا کے (جو پیچھے رہنے والوں میں سے رہی)
ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۱۳۶﴾	پھر دوسروں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔
وَ اِنَّکُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَیْہِمْ مُّصْبِحِیْنَ ﴿۱۳۷﴾	اور تم ان پر صبح کے وقت گزرتے ہو۔
ع ۸ وَ بِالَّیْلِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾	اور رات کو، تو پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔
وَ اِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۳۹﴾	اور یونسؑ بھی رسولوں میں سے تھا۔
اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْکِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾	جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگا ۲۸۰۳
فَسَاہَمَ فَکَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ ﴿۱۴۱﴾	سو اس نے قرعہ ڈالا، پھر وہ مغلوب ہوا ۲۸۰۴
فَالْتَقَمَہُ الْحُوْتُ وَ ہُوَ مُلِیْمٌ ﴿۱۴۲﴾	سو مچھلی نے اُسے لقمہ بنایا اور وہ اپنے آپ کو ملامت کرنیوالا تھا ۲۸۰۵

حضرت موسیٰ و ہارون کا پھر الیاس کا جو نویں صدی قبل مسیح کے ہیں پھر لوط کا جو حضرت ابراہیم کے ہمعصر ہیں پھر یونس کا جو آٹھویں صدی قبل مسیح کے ہیں اب اگر حضرت لوط کا ذکر درمیان میں نہ ہوتا تو یہ ترتیب تاریخی تھی گویا حضرت ابراہیمؑ کے بعد آپ کے خاندان کی شاخ اسرائیل کا ذکر ہے اور اسمٰعیلی شاخ میں چونکہ صرف آنحضرت صلعم ہی ایک نبی ہیں اسلیئے آخر پر آپ کا ذکر ہے حضرت لوطؑ کا ذکر یہاں اس مناسبت سے لایا گیا ہے جسے قرآن کریم نے صراحت سے بیان فرمادیا وانکم لتمرون علیھم مصبحین وباللیل افلا تعقلون ۔ یعنی انکی تباہ شدہ بستیاں شب و روز تمہاری آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور باقی کا تو صرف انہوں نے ذکر ہی سنا ہوا تھا اور یونس سے پہلے لوط کا ذکر لانے میں ایک اور مناسبت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت لوط کی قوم نے یہانتک شوخی کی کہ جب عذاب کی خبر انہیں پہنچ گئی اس وقت بھی خود حضرت لوط کے مہمانوں سے بدسلوکی کرنے کی کوشش کی اور گستاخی میں حد سے بڑھ گئے اسلیئے سب کے سب تباہ ہوئے لیکن حضرت یونس نے جب اہل نینوہ کو عذاب کی خبر دی تو انہوں نے گریہ و زاری اختیار کی اور رجوع الی اللہ کیا اسلیئے سب کے سب بچ گئے ؛

۲۸۰۳ ابق ۔ اِباق غلاموں کا بھاگنا اور چلا جانا ہے جب نہ انہیں کوئی خوف ہوا اور نہ ان سے زیادہ مشقت لیجاتی ہو اور حضرت یونس کے متعلق یہی لفظ بولا گیا ہے جب وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے (ل)؛

یوں تو ہجرت سنت انبیاء ہے مگر حضرت یونس کی ہجرت پر لفظ اباق بولا ہے گویا ابھی خوف کی وہ حالت نہ تھی جس کیلیے ہجرت ضروری ہو جاتی ہے جیسا کہ اس لفظ کی لغوی تشریح سے ظاہر ہے جب خوف کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ اس کیلیئے ہجرت ضروری ہو تو انبیاء کو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمادیتا ہے اسی لیے دوسری جگہ فرمایا فاصبر لحکم ربك ولاتکن کصاحب الحوت (القلم ۔ ۴۸) یعنی مصائب کو برداشت کرو اور خوف کی حالت میں رہ کر بھی دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ حکم دے کہ ہجرت کر جاؤ اسی لیے نبی کریم صلعم نے ہجرت نہیں کی جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں آیا ۔ پس حضرت یونس کی ہجرت قبل از وقت اور حکم الٰہی کے پہنچنے سے پیشتر ہونے کی وجہ سے اس پر ابق بولا گیا ہے ؛

۲۸۰۴ ساھم ۔ سَہْم تیر کو کہتے ہیں اور خط کو بھی اور ساھم دوسرے کے ساتھ قرعہ اندازی کی اور سُہام دُبلاپن اور رنگ کا متغیر ہونا ہے (ل)؛
مدحضین ۔ دحض اصل میں پھسلنا ہے پھر دلیل کا باطل ہونا ۱۹۳۴ اور سورج کے ڈھلنے پر بھی بولا جاتا ہے (غ) اور مدحض سے مراد مغلوب ہے ؛

حضرت یونس کا قصہ بائبل میں کتاب یونہ میں مذکور ہے اس میں اور قرآن کریم کے بیان میں یہ اختلاف ہے کہ بائبل میں مذکور ہے ۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس کو اہل نینوہ کی طرف جانے کا حکم دیا تو وہ ترلیس کو بھاگ گیے اور اس وقت یہ کشتی میں سوار ہونے کا قصہ پیش آیا اور اس کے بعد آپ اہل نینوہ کی طرف گیے ۔ اور پھر جب اہل نینوہ کی گریہ و زاری کی وجہ سے ان سے عذاب ٹل گیا تو یونس ناراض ہو گئے یہ دونوں باتیں یعنی نبی کا انکار کرنا اور خدا تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے دوسری طرف چلے جانا اور خدا سے ناراض ہونا شان نبوت کے منافی ہیں اور قرآن کریم میں مذکور نہیں ۔ اور نہ ہی یہ بات قابل قبول ہے ۔ البتہ کشتی کا واقعہ اور قرعہ اندازی سے حضرت یونس کا دریا میں ڈالا جانا بائبل میں بھی مذکور ہے اور قرآن شریف سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے ؛

۲۸۰۵ التقم ۔ لَقِمَ جلدی سے کھا جانا ہے اور لَقِمَ اور اِلْتَقَم منہ میں لینا ہے اذا اَخذ بھا بفیك اور اِلْتِقام مہلت سے نگل جانے پر بھی بولا جاتا ہے ۔ اور حدیث میں ہے ان رجلاً اَلْقَمَ عینہ خصاصۃَ الباب جس کے معنی کیے گیے ہیں کہ دروازے میں جو مشق تھا اسے اپنی آنکھ کے مقابل رکھا گویا اسے آنکھ کیلیئے ایسا بنایا جیسا منہ کے لیے لقمہ ہوتا ہے (ل)؛

حوت بڑی مچھلی کو کہتے ہیں اور مثال کے طور پر انسان پر اشعار عرب میں بولا گیا ہے حوتاً اذا ما زادنا جئنا بہ جس کی تشریح کی ہے کہ وہ حوت

فَلَوۡلَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الۡمُسَبِّحِيۡنَ ۝۱۴۳ لیکن اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا۔
لَلَبِثَ فِیۡ بَطۡنِهٖۤ اِلٰی يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ ۝۱۴۴ تو اس کے پیٹ میں رہتا اس دن تک کہ (لوگ) اٹھائے جائیں ۲۸۰۶

بمعنی بڑی مچھلی کی طرح ہے کہ جو کچھ نگل جائے اسے کفایت نہیں کرتا۔ اور حوت آسمان میں ایک برج ہے اور پرندکے پانی کے گرد گھومنے کو حوت کہتے ہیں اور بنوحوت ایک قبیلہ کا نام ہے (ل) ؛

ملیم کے معنی کے لیے دیکھو ۱۸۲۶ مگر (لام میں ہمزہ تعدیہ کے لیے لے کر (جیسے اقذ منه میں) یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ ملامت کرنے والے تھے۔ یعنی اپنے آپ کو (د) ؛

کیا حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں رہے: قرآن کریم میں حضرت یونس کے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے متعلق صریح لفظ نہیں ہیں۔ ہاں یہ الفاظ ہیں فالتقمہ الحوت جن کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ مچھلی نے انہیں نگل لیا اور یہ بھی کہ مچھلی نے انہیں منہ میں لیا۔ یعنی مچھلی کے منہ میں چلے گئے اور اس صورت میں ممکن ہے کہ یہی ان کے باہر نکال پھینکنے کا بھی موجب ہوا ہو۔ دوسرے لفظ جن سے آپ کے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کا استدلال کیا گیا ہے یہ ہیں للبث فی بطنه الی یوم یبعثون (۱۴۴) لیکن اول تو اس سے مراد مچھلی کا پیٹ لینا اس لیے درست نہیں کہ مچھلی ایسی کوئی نہیں ہو سکتی جو اس وقت سے لے کر قیامت تک زندہ رہے۔ جب سب چیزوں پر فنا ہے اور اس زمانہ کے سب جاندار مر چکے ہیں تو مچھلی کا قیامت تک زندہ رہنا ناممکن ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مچھلی مر کر حضرت یونس اسی طرح صحیح سالم اس کے پیٹ میں رہتے تو مری ہوئی چیز کے اجزا قائم نہیں رہ سکتے دوسرے اگر مچھلی کا پیٹ بھی مراد لیا جائے تو یہاں سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ تسبیح کرنیوالوں میں سے نہ ہوتے تو مچھلی کے پیٹ میں رہتے۔ مچھلی کے پیٹ میں جانے یا نہ جانے کا کوئی قطعی ثبوت ان الفاظ میں نہیں۔ تیسرے الفاظ قرآنی فنادٰی فی الظلمٰت (الانبیاء ۲۱-۸۷) ہیں جس سے یہ سمجھا گیا ہے کہ مچھلی کے پیٹ میں آپ نے یہ دعا کی لیکن دیکھو ۹۵۷ و ۲۱۸۰ ظلمت سے مراد شدائد بھی لیے جاتے ہیں اور وہیں کذٰلك ننجی المؤمنین بتاتا ہے کہ مراد مشکلات ہی ہیں۔ البتہ یونہ کی کتاب میں حضرت یونس کے تین دن اور تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہنے کا ذکر ہے اور حدیث مرفوع اس بارہ میں صرف ایک ہے اور وہ ایک ہی طریق سے۔ یعنی محمد بن اسحاق کے طریق سے مروی ہے اور ابن جریر نے اسے لیا ہے اور بزاز نے اپنی مسند میں اسی طریق سے اسے بیان کر کے لکھا ہے کہ سوائے اس طریق کے اور کسی طرح پر اس کے نبی کریم صلعم سے ہونے کا علم ہم کو نہیں۔ اور یہ حدیث جو ابو ہریرہ سے مروی ہے۔ یوں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یونس کو مچھلی کے پیٹ میں قید کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے مچھلی کی طرف وحی کی کہ اسے پکڑ لے اور نہ اس کے گوشت کو نقصان پہنچا اور نہ اس کی ہڈی کو توڑ پھر جب اسے لے کر سمندر کی تہ میں پہنچ گئی تو یونس نے کچھ حرکت سنی اور اپنے دل میں کہا یہ کیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی کی اور وہ مچھلی کے پیٹ میں تھا کہ یہ سمندر کے جانوروں کی تسبیح ہے تب اس نے بھی تسبیح کی جب وہ مچھلی کے پیٹ میں تھا اور فرشتوں نے اس کی تسبیح سنی اور کہا اے ہمارے رب ہم ایک کمزور سی آواز ایک غیر معمولی زمین سے سنتے ہیں کہا یہ میرا بندہ یونس ہے اس نے میری نافرمانی کی اسلیئے میں نے اسے دریا میں مچھلی کے پیٹ میں قید کر دیا انہوں نے کہا کیا یہ وہ صالح بندہ ہے جس کا عمل صالح ہر رات اور دن میں تیری طرف چڑھتا تھا۔ کہا ہاں۔ پس انہوں نے اسکی شفاعت کی تو اس نے مچھلی کو حکم دیا اور اس نے اسے ساحل پر پھینک دیا (ث) اور اقوال سلف میں مختلف باتیں ہیں۔ مثلاً ایک قول ہے کہ مچھلی نے چاشت کے وقت آپ کو نگلا اور ظہر کے وقت پھینک دیا۔ اور ایک قول میں تین دن حضرت یونس مچھلی کے پیٹ میں رہے اور ایک قول میں سات دن اور ایک قول میں چالیس دن۔ اور ظاہر ہے کہ چونکہ حضرت یونس اہل نینوہ کی طرف مبعوث ہوئے تھے اس لیے یہ دریائے دجلہ تھا اور وہیں کی مچھلی ہونی چاہیئے۔ مگر ایک قول ہے کہ یہ مصر میں دریائے نیل سے اللہ تعالیٰ کی وحی پر حاضر ہو گئی تھی اور ایک قول ہے کہ بحر اخضر کی مچھلی تھی اور اسے حکم ہوا تھا کہ دریاؤں کو پھاڑتی ہوئی چلی جائے حالانکہ بحر اخضر سے دریائے دجلہ تک کوئی دریا یا سمندر نہیں۔ اور کسی میں ہے کہ یونس کودنے کے لیے کشتی کے کنارے پر کھڑے تھے جب مچھلی کو وحی ہوئی اور وہ اتنی جلدی پہنچی کہ حضرت یونس جب کودے تو سیدھے مچھلی کے پیٹ میں پہنچے اور ایک قول ہے کہ مچھلی کشتی کے ساتھ ساتھ چلی اور اس کا سر دریا سے اُٹھا ہوا تھا اور وہ سانس لے رہی تھی۔ اور یونس تسبیح کر رہے تھے یہاں تک کہ خشکی پر پہنچ گئی اس کے مقابل پر یہ امر واقع ہے کہ اتنی بڑی مچھلی کوئی نہیں دیکھی گئی جس کے گلے میں سے سالم انسان گزر جائے البتہ اتنے بڑے منہ کی مچھلیاں سمندروں میں ملتی ہیں جن کے منہ میں سالم انسان آ سکتا ہے اور معجزہ کہنا اسے اس لیے درست نہیں کہ یہ کوئی امر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دشمنوں پر اتمام حجت کے لیے نہیں بلکہ صرف ایک نبی پر احسان و انعام کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت تو اتنی بڑی ہے کہ اس سے بھی عجیب تر کاموں کا اظہار ہوتا رہتا ہے لیکن اکیلی حدیث وہ بھی قصہ کے رنگ کی۔ اور پھر ایسی حدیث جسے کسی اعلیٰ پایہ کے محدث نے قبول نہیں کیا اور چند اقوال جن میں خود بہت سا اختلاف ہے۔ ان کی شہادت اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچانے کیلئے کافی نہیں لیکن اگر کوئی قطعی شہادت اسبات کی ہو تو ہمیں اسکے ماننے سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قرآن کریم کے الفاظ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے ؛

۲۸۰۶ بطن کے معنی پیٹ ہیں اور قبیلہ کو بھی بطن کہتے ہیں اور وادی کا بھی بطن کہلاتا ہے (غ) ؛

اگر یونس تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو اس کے پیٹ میں قیامت کے دن تک رہتے مگر یوم بعث تک کسی مچھلی کا زندہ رہنا تمام مسلمات اسلامی کے خلاف ہے۔ اور اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ وہ مچھلی غیر فانی ہے اور خدا کی صفات میں شریک ہے اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ حضرت یونس قیامت تک اس کے پیٹ میں زندہ محبوس رہتے یہ بھی خلاف مسلمات ہے۔ مراد صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے نام کو دنیا میں پھیلانے

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ سَقِيْمٌ ﴿١٤٥﴾ پھر ہم نے اسے کھلے میدان میں ڈالا اور وہ بیمار تھا۔

وَ اَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿١٤٦﴾ اور ہم نے اس پر ایک کدّو کا درخت اگایا ۲۸۰۷

وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿١٤٧﴾ اور ہم نے اسے ایک لاکھ کی طرف بھیجا بلکہ (اس سے) زیادہ ہی تھے۔

فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿١٤٨﴾ سو وہ ایمان لائے تو ہم نے انھیں ایک وقت تک سامان دیا۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَ لَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿١٤٩﴾ پس ان سے پوچھ کیا تیرے رب کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے ہیں۔

اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّ هُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿١٥٠﴾ یا ہم نے فرشتوں کو عورتیں بنایا اور وہ موجود تھے۔

اَلَاۤ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿١٥١﴾ دیکھو وہ اپنی طرف سے جھوٹ (بنا کر) کہتے ہیں۔

وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿١٥٢﴾ کہ اللہ کی اولاد ہے اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔

اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿١٥٣﴾ کیا اس نے بیٹیوں کو بیٹوں پر ترجیح دی ۲۸۰۸

مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿١٥٤﴾ تمہیں کیا ہوا کیسا فیصلہ کرتے ہو۔

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿١٥٥﴾ تو کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے۔

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٥٦﴾ یا تمھارے پاس کوئی کھلی سند ہے۔

فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٥٧﴾ سو اپنی کتاب لاؤ اگر تم سچے ہو۔

وَ جَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ اور اس کے اور جنّوں کے درمیان ناطہ تجویز کرتے ہیں۔

والے نہ ہوتے تو مچھلی ان کو نگل جاتی یا دریا میں ہی ڈوب کر مر جاتے اور یہی ان کا قیامت کے دن تک وہاں رہنا ہے کیونکہ وہیں دریا میں ہی وہ مدفون ہو جاتے اللہ تعالےٰ نے انہیں اسلیے بچایا کہ وہ تسبیح کرنے والے یا اللہ تعالیٰ کا نام دنیا میں پھیلانے والے تھے اور بطنہ میں ضمیر دریا کی طرف جانا کوئی مستبعد امر نہیں اسلیے کہ دریا کا مفہوم کشتی میں موجود ہے اور دریا اس وقت تک رہیں گے جب تک یہ صف لپیٹی جائے ؛

۲۸۰۷ یقطین۔ قطن بالمکان کے معنی اقام ہیں یعنی وہاں رہا اور یقطین ہر وہ درخت ہے جو اپنی ساق پر کھڑا نہیں ہوتا یعنی جس کی بیل ہو۔ اور مجاہد کا قول ہے کہ ہر چیز جو زمین میں پھیلتی جائے وہ یقطین ہے اور اسی میں سے کدو ککڑی خربوزہ وغیرہ ہیں اور ابن جبیر کا قول ہے کہ ہر چیز جو اُگے اور اسی سال میں خشک ہو جائے وہ یقطین ہے (ل) ؛

حضرت یونس اور کدو کا درخت: بائبل میں ارنڈی کا درخت اُگانے کا ذکر ہے گو وہاں دریا سے باہر پھینکا جانے پر یہ ذکر نہیں بلکہ بعد میں اہل نینوہ سے ناراض ہو کر شہر سے باہر چلا جانے اور وہاں مکان بنا لینے پر یہ ذکر ہے مفسرین نے عموماً کدو مراد لیا ہے۔ لغوی تشریح دونوں پر صادق آسکتی ہے۔ غرض اس کی کیا تھی۔ بائبل میں یہ ذکر ہے کہ ایک دن یہ درخت اُگا اور دوسرے دن ایک کیڑے نے اسے کھانا شروع کر دیا اور وہ خشک ہو گیا جس پر یونس کو افسوس ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "تجھے اس رینڈی کے درخت پر رحم آیا جس کیلئے تو نے کچھ محنت نہ کی اور نہ تو نے اسے اگایا جو ایک ہی رات میں اُگا اور ایک ہی رات میں سوکھ گیا اور کیا مجھے لازم نہ تھا کہ میں اتنے بڑے شہر نینوہ پر جس میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں سے زیادہ ہیں جو اپنے دہنے بائیں ہاتھ کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتے اور مواشی بھی بہت ہیں شفقت نہ کروں" (یونہ ۴: ۱۰و۱۱) اور مفسرین میں سے وہب کا قول بھی اسی کے قریب قریب ہے اور یہ بات ویسے بھی قرین قیاس ہے کیونکہ سمجھانا یہ مقصود ہے کہ گو اللہ تعالیٰ نیکوں کو بچاتا ہے مگر وہ ان کے دشمنوں کو تباہ کرنے میں جلدی نہیں کرتا۔ وہ اس کی مخلوق ہیں اور ان پر بھی وہ شفقت کرتا ہے ؛

۲۸۰۸ اصطفی ہمزہ مفتوح ہمزہ استفہام انکاری ہے اِصطفیٰ ہمزہ وصل حذف ہو گیا۔ دوسری جگہ ہے وجعلوا الملائکۃ الذین ہم عباد الرحمٰن اناثا (الزخرف ۴۳: ۱۹)

وَ لَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾
اور جنّ خوب جانتے ہیں کہ وہ (عذاب میں) حاضر کیے جاتے ہیں ۲۸۰۹

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾
اللہ تعہ اس سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾
ہاں اللہ تعہ کے مخلص بندے (بچ جاتے ہیں)

فَاِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾
سو تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو۔

مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾
تم اس کے خلاف (کسی کو) فتنہ میں نہیں ڈال سکتے۔

اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾
سوائے اس کے جو (خود) دوزخ میں جانے والا ہے ۲۸۱۰

وَ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾
اور ہم میں سے کوئی نہیں مگر اس کے لیے ایک معلوم مقام ہے۔

وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾
اور ہم صفیں باندھنے والے ہیں۔

وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾
اور ہم تسبیح کرنے والے ہیں ۲۸۱۱

وَ اِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾
اور یہ کہا کرتے تھے۔

لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾
اگر ہمارے پاس کوئی پہلوں کی نصیحت ہوتی ۲۸۱۲

لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾
تو ہم ضرور اللہ تعہ کے مخلص بندے ہوتے۔

۲۸۰۹ مطلب یہ ہے کہ اصل میں تو یہ ملائکہ کو نہیں پوجتے بلکہ جنوں یعنی شیاطین کو پوجتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ویوم یحشرھم جمیعًا ثم یقول للملئکة اھٰؤلاء ایاکم کانوا یعبدون ۝ قالوا سبحٰنک انت ولینا من دونھم بل کانوا یعبدون الجن اکثرھم بھم مومنون (السّبا ۳۴ - ۴۰ و ۴۱) پس اسی لحاظ سے فرمایا کہ یہ بت پرست فرشتوں اور خدا میں نہیں بلکہ شیاطین اور خدا میں نسب ٹھہراتے ہیں یہی حال نصاریٰ کا ہے دیکھو ۲۶۹۹ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ملائکہ اور خدا میں نسب ہو سکتا ہے بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر حقیقت پر غور کیا جائے تو ان کی غلطی ایسی کھلی ہے کہ ان کی فطرت بھی اس کو دھکے دیتی ہے یعنی شیاطین اور خدا میں نسب قایم کرنا مگر اس ناپاک عقیدہ کو ایک اچھا لباس پہنانے کی کوشش کرتے ہیں اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں اور خدا کے درمیان نسب قائم کر رہے ہیں ؛

۲۸۱۰ فاتنین - فتن کیلئے دیکھو ۲۴۳ آگ یا دُکھ میں ڈالنا اور اس کے معنی ابتلاء وامتحان بھی ہیں یعنی آزمائش میں ڈالنا اور فاتن اس سے اسم فاعل ہے اور صالٍ صلی یصلی سے اسم فاعل ہے یعنی آگ میں داخل ہونے والا ؛

علیہ میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے - اور مطلب ہے اس کے خلاف یا اس کی راہ سے ہٹا کر - اس آیت اور اگلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ مشرکوں یا ان کے معبودوں یعنی شیاطین کا کسی پر کوئی تسلط نہیں کہ کسی کو زبردستی فتنہ یعنی امتحان یا دکھ میں ڈال سکیں ہاں جو خود جہنم کا رستہ لیتا ہے وہی جہنم میں جاتا ہے لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم (ر) اور پیچھے آچکا ہے وما کان لنا علیکم من سلطٰن ج بل کنتم قوما طٰغین (۳۰) یہ اسی کے مطابق ہے۔

۲۸۱۱ آیت ۱۶۴ سے ۱۶۶ تک حکایت کے طور پر قول ہے اور مفسرین نے عمومًا اسے قول ملائکہ سے حکایت لیا ہے۔ لیکن دوسرا قول اس بارہ میں یہ ہے کہ یہ مومنوں کے قول سے حکایت ہے قیل ھو من قول الرسول علیہ الصلوٰة والسلام ای وما من المسلمین الا لہ مقام معلوم علی قدر اعمالہ یوم القیامة (ر) اور دوسرے قول کو اس لیے ترجیح ہے کہ جن دو گروہوں کا ذکر چلتا ہے وہ کافر اور مومن ہیں جب کفار اور مشرکین کی حالت کو بیان کیا تو اس کے بالمقابل ضروری تھا کہ مومنوں کا بھی ذکر ہوتا چنانچہ آیت ۱۶۰ میں ہے الا عباد اللہ المخلصین اور ابتدائے سورت میں والصّٰفّٰت صفا میں بھی دکھایا جا چکا ہے - کہ مومن ہی مراد ہیں اور یہاں بھی وہی لفظ ہیں اور مقام معلوم کی تشریح دوسری جگہ آچکی ہے اولٰئک لھم رزق معلوم فواکہ وھم مکرمون (۴۱ و ۴۲) اور یہ امر کہ ملائکہ کی بھی صفوف ہیں بالکل صحیح ہے جیسا کہ حدیث میں ہے لیکن یہاں ذکر مومنوں کا ہی معلوم ہوتا ہے اور ابن ابی حاتم نے ولید بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے کہ مسلمان صفیں باندھ کر کھڑے نہ ہوتے جب تک کہ یہ آیت نازل نہیں ہوئی وانا لنحن الصافون (ر) اس سے بھی اسی قول کی تائید ہوتی ہے ؛

۲۸۱۲ ذکر سے مراد یہاں نصیحت کی کتاب ہے جو منجانب اللہ نازل ہوئی ہو جیسا کہ دوسری جگہ ہے واقسموا باللہ جھد ایمانھم لئن جاءھم نذیر لیکونن اھدی من احدی الامم (فاطر ۳۵ - ۴۲)

فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ سو اس کا انکار کیا پس جان لیں گے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اور ہمارا حکم ہمارے بندوں (یعنی) رسولوں کی نسبت پہلے سے ہو چکا ہے

اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ کہ وہ ضرور نصرت دیئے جائیں گے

وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ اور کہ ہمارا لشکر ضرور غالب رہے گا ۲۸۱۳

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۴﴾ سو ان سے ایک وقت تک منہ پھیر لے ۲۸۱۴

وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾ اور انھیں دیکھتا رہ یہ دیکھ لیں گے ۲۸۱۵

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ تو کیا ہمارے عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں۔

فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ سوجب وہ ان کی انگنائی میں آ اُترے گا تو ان لوگوں کی صبح

صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۷﴾ بُری ہو گی جو ڈرائے گئے ۲۸۱۶

وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ اور اُن سے ایک وقت تک منہ پھیر لے

وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ اور دیکھتا رہ وہ بھی دیکھ لیں گے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ تیرا رب رہاں، عزّت والا رب اس سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں

وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ اور رسولوں پر سلام ہے۔

ع ۴۴/۹ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾ ع اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے ۲۸۱۷

۲۸۱۳ رسولوں کی نصرت اور مومنوں کا غلبہ: سورت کے خاتمہ پر ان پُرزور الفاظ میں تحدّی کر کے سورت کے اصل مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ سورت جیسا کہ اس کے مضمون اور طرزِ عبارت سے ظاہر ہے پہلے زمانہ کی سورتوں میں سے ہے جب کوئی صورت آنحضرت صلعم کی کامیابی کی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی اور مخالفت اپنے پورے زور پر تھی۔ رسولوں کو یقیناً مدد ملے گی۔ خدا کا لشکر یعنی مومن ضرور غالب آئیں گے کس قدر صاف پیشگوئی اسلام کے غلبہ کی ہے اور جن حالات میں یہ بیان ہوئی اس وقت کسی کو ایسے غلبہ کا وہم بھی نہ ہو سکتا تھا۔ یہی بیکسی کے وقت کی کہی ہوئی باتیں آخر عرب کے دلوں کو کھا گئیں کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ جن حالات میں یہ کہا گیا کوئی انسان نہ کہہ سکتا تھا۔ آج اللہ تعالیٰ کی یہی آواز انہم لہم المنصورون وان جندنا لہم الغالبون فضائے آسمانی میں گونج رہی ہیں مگر کاش کوئی اللہ کا جذبہ اور اللہ کی راہ میں اسی طرح جان و مال کو بیدریغ قربان کرے جس طرح ایک لشکر کو کرنا پڑتا ہے۔ تو وہ نظارہ بھی دیکھ لے جو اللہ تعالیٰ نے عرب کو دکھایا اذا جاء نصر اللہ والفتح ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا۔

۲۸۱۴ حین کسی چیز کے بلوغ اور اس کے حصول کا وقت ہے اور اس کی خصوصیت مضاف الیہ سے ہوتی ہے جیسے لات حین مناص (ص ۳۸ - ۳) اور جب اکیلا ہو تو کوئی وجہ پر آتا ہے مثلاً اجل کیلئے جیسے متعناھم الی حین (یونس ۱۰ - ۹۸) اور سال کے لیے جیسے توتی اکلھا کل حین (ابراھیم ۱۴ - ۲۵) اور گھڑی کے لیے جیسے حین تمسون وحین تصبحون (الروم ۳۰ - ۱۷) اور مطلق زمانہ کے لیے جیسے ھل اتی علی الانسان حین من الدھر (الدھر ۷۶ - ۱) ولتعلمن نباہ بعد حین (ص ۳۸ - ۸۸) اور حان کے معنی قریب ہوا (غ)۔

ایک وقت تک منہ پھیر لے۔ یہ مطلب نہیں کہ وعظ و نصیحت چھوڑ دو بلکہ یہ منشا ہے کہ ان کے غلبہ کی پروا نہ کرو اور ان کی ایذادہی پر صبر کرو۔ حتّٰی حین میں اسی مسلمانوں کے غلبہ کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر صراحت سے ان جندنا لہم الغالبون میں ہے اسی لیے مفسرین نے اسے یوم بدر یا یوم فتح مکہ پر لگایا ہے۔

۲۸۱۵ یعنی ان کے موجودہ برے حال اور بُرے اعمال کو دیکھتے رہو وہ بھی ان کے نتیجہ کو دیکھ لیں گے۔

۲۸۱۶ یعنی وہی عذاب موعود جس کے لیے جلدی کر رہے ہیں وہ ان کے گھروں میں آ کر رہے گا اور ساحۃ یا انگنائی کے لفظ میں یہ اشارہ بھی صاف ہے کہ خود مکہ میں ان کی آخری مغلوبیت ہو گی۔

۲۸۱۷ رسولوں کی سلامتی پر رب العالمین کی تعریف اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کی ربوبیت روحانی کرتے ہیں اور گو خاص طور پر آنحضرت صلعم کے غلبہ اور نصرت کی یہ پیشگوئیاں ہیں مگر جمع کا صیغہ اس لیے آیا ہے کہ یہی قانون سب رسولوں کیلئے تھا اور پہلے رسولوں کا جو ذکر کیا ہے تو وہ بھی درحقیقت اسی غرض کیلئے تھا۔

آیاتھا ۸۸ سُوْرَةُ صٓ مَكِّيَّةٌ (۳۸) رکوعاتھا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

صٓ وَ الْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ① ط
اللہ صادق ہے بزرگی دینے والا قرآن گواہ ہے ۲۸۱۸

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ ②
بلکہ جو کافر ہیں وہ جھوٹی شیخی اور مخالفت میں ہیں۔

كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ
ان سے پہلے ہم نے کتنی نسلیں ہلاک کیں، تب انھوں نے

فَنَادَوْا وَّ لَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ③
پکارا اور خلاصی کا وقت نہ رہا تھا ۲۸۱۹

وَ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَ
اور وہ تعجب کرتے ہیں کہ ان میں سے ایک ڈرانے والا اُن کے

نام: اس سورت کا نام ص ہے اور اس میں پانچ رکوع اور ۸۸ آیتیں ہیں۔ اور ص بجائے صدق اللہ کے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچ ہے اور وہ وعدہ حق کی کامیابی کا ہے اور اس میں اشارہ ان تکلیفوں اور مصیبتوں کی طرف ہے جو راستبازوں کو پہنچتی ہیں اور بتانا یہ مقصود ہے کہ کتنے بھی دُکھ انہیں پہنچیں مگر وہ مایوس نہیں ہو سکتے اس لیے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے وعدوں کی سچائی پر یقین کامل ہوتا ہے ؂

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں کفار کی ضد اور عداوت کا ذکر ہے اور ان کے اس عزم کا کہ وہ کبھی اپنے بتوں کو چھوڑ کر ایک خدا کو نہیں مانیں گے دوسرے رکوع میں حضرت داؤد اور آپ کے مخالفین کا ذکر ہے گویا بتایا ہے کہ باوجود بادشاہ ہونے اور سب سامان حفاظت موجود ہونے کے بھی آپ کے مخالف آپ کی جان لینے کے درپے تھے تیسرے رکوع میں حضرت سلیمان کا ذکر ہے اور اس میں بتایا ہے کہ جس طرح حضرت سلیمان کو محض اعلائے کلمۃ اللہ کیلئے حکومت کے ظاہری سامانوں کی ضرورت تھی اسی طرح آنحضرت صلعم کو بھی ہو گی مگر انبیاء علیہم السلام کا دلی تعلق ان ظاہری سامانوں سے نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار ہی چاہتے ہیں چوتھے رکوع میں حضرت ایوب کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ راستبازوں کو صبر کا اجر کس طرح ملتا ہے۔ اور پھر اسی مضمون کو عام کیا ہے پانچویں رکوع میں بتایا ہے کہ شیطان اور شیطان صفت لوگ ہمیشہ سے راستبازوں کی مخالفت کرتے چلے آئے ہیں اور ابلیس کی آدم سے مخالفت کا ذکر کیا ہے ؂

تعلق اور زمانہ نزول: پچھلی سورت میں توحید کے آخری غلبہ کا ذکر تھا تو یہاں بتایا کہ بڑے بڑے مصائب کے بعد اور بڑا صدق دکھانے کے بعد یہ غلبہ ملیگا اس کے نزول کا زمانہ وہی معلوم ہوتا ہے جو پچھلی سورت کے نزول کا ہے ؂

۲۸۱۸ ص اس کی تفسیر ضحاک سے صدق اللہ مروی ہے (ج) اور بعض نے مراد صدور الکفار عن القرآن لیا ہے یعنی کفار کا قرآن سے روکنا (د) سیاق پہلے معنی کو چاہتا ہے۔

قرآن سے شرف انسانیت کا حاصل ہونا: یہاں قرآن ذی الذکر کی قسم کھائی ہے بالفاظ دیگر قرآن کی اس حیثیت کو شہادت میں پیش کیا ہے کہ اس سے ذکر یعنی شرف ملتا ہے دیکھو ع ۱۹۱ اور جواب قسم درحقیقت پہلے ص میں مذکور ہے صدق اللہ یعنی اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے خود یہ بات گواہ ہے کہ قرآن سے شرف ملتا ہے اور وہ بات جو اللہ تعالے نے فرمائی اور جس کے سچ ہونے کا یہاں ذکر ہے وہی ہے جو پچھلی سورت کے آخر میں ہے یعنی انا جندنا لھم الغالبون بعض وقت سورتوں کا تعلق ایسا شدید ہوتا ہے کہ گویا دونوں سورتیں ایک ہی مضمون پر چلتی ہیں یہاں یہی صورت ہے اور یہ بات بطور گواہی اس لیے پیش کی کہ وہ چیز جس سے انسان کو شرف ملتا ہے ضرور ہے کہ وہ دنیا میں غالب ہو اس لیے کہ اگر اس دنیا کو بنانے والی کوئی مدبر بالارادہ ہستی ہے تو ضرور ہے کہ وہ چیز جس سے انسان کو بزرگی ملتی ہے وہ ضائع اور برباد نہ ہو بلکہ آخر کار غالب آئے گویا ان لوگوں کی حالت کی طرف توجہ دلائی ہے جنہوں نے قرآن کو قبول کیا اور اس پر عامل ہوئے کہ کس طرح ایک ذلیل حالت سے نکل کر انھوں نے شرف انسانی کا بلند سے بلند مقام حاصل کیا تو ایسے لوگ تباہ اور مغلوب نہیں ہو سکتے بلکہ غالب ہو کر رہینگے اس لیے اس کے مقابل پر اگلی آیت میں فرمایا کہ کافروں کو حقیقی شرف انسانیت تو حاصل نہیں صرف کچھ مال و ریاست کی وجہ سے جھوٹی شیخی دکھا رہے ہیں اور حق کی مخالفت اختیار کر رہے ہیں ؂

۲۸۱۹ لات۔ لاتہٗ حقہٗ۔ یلیتہٗ اور الاتہٗ کے معنی ہیں نقصہٗ اسے کم کر دیا۔ لایلتکم من اعمالکم شیئا (الحجرات ۴۹: ۱۴) اور لیت آرزو اور تمنی کیلئے آتا ہے۔ یلیتنی کنت ترابا (النبا ۷۸: ۴۰) یلیتہا کانت القاضیۃ (الحاقۃ ۶۹: ۲۷) اور لات یہاں لیس کے ساتھ مشبہ ہے اور عموماً حین کے ساتھ آتا ہے۔ اور یہ اصل میں لا ہے اور ت حین کے لیے بڑھائی گئی ہے (ل) یا ت تاکید کے معنی یا مبالغہ کیلئے بڑھائی گئی ہے (د) اور لات اور عزیٰ دو بتوں کے نام ہیں (غ) ؂

مناص۔ ناص الی کذا کے معنی ہیں اس کی پناہ لی اور ناص عنہ اس سے الٹا پھر گیا اور مناص کے معنی ملجا یا پناہ ہیں (غ) ؂

قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿٤﴾

پاس آیا اور کافر کہتے ہیں یہ جادوگر (اور) جھوٹا ہے۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ﴿٥﴾

کیا سب معبودوں کو ایک ہی معبود بنا دیا! یہ تو بہت ہی عجیب بات ہے ۲۸۲۰ء

وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۚۖ ﴿٦﴾

اور ان میں سے بڑے بڑے لوگ کہنے لگے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر ثابت قدم رہو، اس بات میں کچھ غرض رکھی گئی ہے ۲۸۲۱ء

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚۖ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۚۖ ﴿٧﴾

ہم نے پچھلے دین میں یہ نہیں سنا، یہ صرف بناوٹ ہے ۲۸۲۲ء

ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا ؕ بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِیْ ۚ بَلْ لَّمَّا یَذُوْقُوْا عَذَابِ ؕ ﴿٨﴾

کیا ہم میں سے اسی پر نصیحت اتاری گئی، بلکہ وہ میرے ذکر کے بارے میں شک میں ہیں۔ بلکہ انھوں نے میرا عذاب نہیں چکھا ۲۸۲۳ء

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِیْزِ الْوَهَّابِ ۚ ﴿٩﴾

کیا ان کے پاس تیرے رب کی رحمت کے خزانے ہیں، (جو) غالب بہت دینے والا (ہے)

۲۸۲۰ء عجاب فعال بنائے مبالغہ ہے مراد ہے بہت عجیب ۞

آنحضرت کا عزم اور کفار کی مایوسی: ترمذی اور مسند احمد میں حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ جب ابوطالب بیمار ہوا تو قریش کی ایک جماعت اس کے پاس آئی اور کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتا ہے ایسا ایسا کہتا ہے تم اسے روک دو ابوطالب نے آپ کو بلا بھیجا اور جب آپؐ آئے تو کہا کہ آپ کی قوم شکایت کرتی ہے اور خیال کرتی ہے کہ آپ انکے معبودوں کو گالیاں دیتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ میں تو انکو ایک بات پر جمع کرنا چاہتا ہوں اگر وہ اسے مان لیں تو عرب انکا مطیع ہو جائے۔ اور عجم جزیہ ادا کرے تو سب نے گھبرا کر کہا کہ ایک کیا ایسی دس باتیں کہیں تو آپ نے فرمایا کہ وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے تب وہ سب اُٹھکر چلے گیے اور یہ لفظ اجعل الاٰلہۃ الٰہا واحدا اور یہ اگلی آیتیں نازل ہوئیں ۞

۲۸۲۱ء انطلق الملا کے معنی دو طرح ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ وہ چلے گئے۔ دوسرے یہ کہ وہ بول اُٹھے۔ جیسے دوسری جگہ ہے ولا ینطلق لسانی اور چونکہ یہاں سرداروں کا ذکر ہے اس لیے دوسرے معنی ہی زیادہ موزون ہیں اور یہ معنی گو مجازی ہوں مگر ایسے مشہور ہیں کہ حقیقی معنی کی طرح ہی ہیں اصبروا علیٰ اٰلھتکم اس لیے کہا کہ انہیں خوف ہوا کہ آنحضرت صلعم کی باتوں سے لوگوں کے قدموں میں بت پرستی کے معاملہ میں لغزش نہ آ جائے۔ ان ھٰذا لشیء یراد سے مراد ہے کہ توحید کا قائم کرنا اور بت پرستی کا دور کرنا ایک ایسا امر ہے جس کا ارادہ آنحضرت صلعم نے کر لیا ہے یعنی یہ ارادہ کر لیا ہے کہ ایسا کر کے رہیں گے اور یہ اب اس پر پورا زور لگائیں گے یا یہ کہ مصائب زمانہ میں سے ایک مصیبت ہے جس کا ہمارے متعلق ارادہ ہو چکا ہے۔ یا یہ کہ یہ عرب و عجم کی سرداری ایک ایسی چیز ہے جس کا ارادہ ہر ایک کرتا ہے مگر حاصل نہیں ہو سکتی اور نقال کی توجیہ یہ ہے کہ آپ کی غرض صرف ہم پر سرداری حاصل کرنا ہے۔

۲۸۲۲ء توحید کا سب مذاہب سے گم ہو جانا: الملۃ الاخرۃ سے مراد عیسائی مذہب بھی ہو سکتا ہے جیسے مقاتل کا قول ہے کیونکہ اس میں بھی توحید نہیں بلکہ تثلیث کی تعلیم ہے اور عرب کا مذہب بھی ہو سکتا ہے جیسے قتادہ کا قول ہے اور درحقیقت کسی مذہب میں بھی توحید خالص کی تعلیم باقی نہ رہی تھی اور بعض لوگوں نے یوں بھی اس کے معنی کیے ہیں کہ جو پیچھے آنے والا مذہب یا نبی آخر الزمان کا مذہب ہے اس کے متعلق ہم نے یہ نہیں سنا کہ پیشگوئیوں میں کہیں یہ بھی ذکر ہو کہ وہ سب معبودوں کا صفایا کر دیگا اور میرے نزدیک اس بات کو ترجیح ہے کہ اس سے مراد عیسائی مذہب ہے اس لیے کہ اسلام سے پہلے یہی سب سے آخری مذہب تھا اور عیسائی لوگ بھی تین خداؤں کے قائل تھے اور جس طرح عرب کے بُت پرست خدا کی بیٹیوں کے قائل تھے یہ خدا کے بیٹے کے قائل تھے۔

۲۸۲۳ء یعنی ان کا اعتراض یہ ہے کہ محمد رسول اللہؐ پر وحی کیوں نازل ہوئی لولا نُزِّلَ ھٰذا القراٰن علیٰ رجل من القریتین عظیم (الزخرف ۴۳ - ۳۱) اس کا جواب دیا ہے کہ اصل میں اعتراض رسول اللہ صلعم کی ذات پر نہیں اس لیے کہ آپ کو تو امین اور صادق جانتے تھے۔ بلکہ وحی الٰہی کے متعلق شک ہے جیسا کہ دوسری جگہ ہے فانھم لا یکذبونک ولٰکن الظّٰلمین باٰیٰت اللہ یجحدون (الانعام ۶ - ۳۳) دوسرا جواب دیا ہے کہ اس میں بھی حقیقت میں کوئی شک نہیں مگر

اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۟ فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ ۝۱۰

یا ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور (اسکی) جو اُن کے درمیان ہے تو چاہیئے کہ وہ ذریعے بنا کر اوپر چڑھ جائیں ۲۸۲۴

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ۝۱۱

یہ بھی ایک شکست خوردہ لشکر (اگلے) لشکروں سے ہے ۲۸۲۵

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ۝۱۲

ان سے پہلے نوحؑ کی قوم اور عادؔ اور لشکروں والے فرعون نے جھٹلایا ۲۸۲۶

وَ ثَمُوْدُ وَ قَوْمُ لُوْطٍ وَّ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ ؕ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ۝۱۳

اور ثمودؔ اور لوطؑ کی قوم اور بَن کے رہنے والوں نے، یہ (شکست خوردہ) گروہ ہیں۔

اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ۝۱۴ ع

سب کے سب نے ہی رسولوں کو جھٹلایا، سو میرا عذاب ثابت ہُوا۔

وَ مَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً

اور یہ کسی چیز کے منتظر نہیں مگر ایک آواز کے جس سے

جب تک عذاب نازل نہ ہو ماننے کے لیے تیار نہیں۔

۲۸۲۴ ان دونوں آیتوں میں بتایا ہے کہ غالب آنے کے اسباب ان کے قبضہ میں نہیں ہیں۔ ارتقاء کے معنی اوپر چڑھنا ہیں دیکھو ۱۸۷۸ لیکن اس کا استعمال معانی میں بھی ہے جیسے ترقی فی العلم اور حدیث میں اہل جنت کے ایک گروہ کی صفت میں آتا ہے الذین لایسترقون یعنی وہ جو اسباب دنیا کی طرف التفات نہیں کرتے (ل) پس یہاں ارتقاء سے مراد اسباب یا ذرائع میں ترقی کرنا یا آگے بڑھنا ہے مطلب یہ ہے کہ جتنا زور چاہیں لگالیں وہ حق کو مغلوب نہیں کرسکتے۔

۲۸۲۵ مھزوم۔ ھَزْم کی اصل یہ ہے کہ کسی چیز کو دبایا جائے یہاں تک کہ وہ ٹوٹ جائے اور اسی سے ھزیمۃ بمعنی شکست ہے فھزموھم باذن اللہ (البقرۃ ۲-۲۵۱)

عظیم الشان لشکروں کی شکست کی پیشگوئی: جب اوپر ان کی تکذیب پر زور لگانے کا ذکر کیا اور ان کو بتایا کہ جتنا زور تکذیب پر چاہیں لگالیں غالب نہیں آسکتے۔ بلکہ حق ہی غالب آئیگا تو اب صفائی سے یہ بتایا کہ یہ تکذیب کے لیے ایک لشکر تیار کریں گے جند کے بعد ما تنکیر کیلئے بڑھا کر اس کی عظمت کی طرف توجہ دلائی ہے یعنی ما یہاں تعظیم اور تکثیر کے لیے ہے اور ھنالك میں اشارہ آنحضرت صلعم کی مخالفت کی طرف ہے اور مھزوم صیغہ اسم مفعول اس لیے لایا گیا ہے کہ تا تحقق وقوع کی طرف اشارہ کرے یعنی باوجود رسول اللہ صلعم کی مخالفت میں ایک عظیم الشان لشکر جمع کرنے کے یہ شکست کھائیں گے اور من الاحزاب میں اشارہ پہلی قوموں کی طرف ہے جیسا کہ اگلی دو آیتوں میں اس کی تصریح موجود ہے یعنی جس طرح پہلے گروہوں اور جتھوں نے جو رسولوں کی تکذیب اور مخالفت کے لیے جمع ہوئے شکستیں کھائیں اور مغلوب ہوئے ایسا ہی نبی کریم صلعم کی مخالفت میں جو عظیم الشان لشکر جمع ہوگا وہ شکست کھائے گا اور اس پیشگوئی میں بعض نے بدر کی طرف اور بعض نے فتح مکّہ کی طرف اشارہ مانا ہے مگر یہ ان کی ساری جنگوں پر بحیثیت مجموعی صادق آتا ہے اور بالخصوص اگر جند ما کا لفظ صادق آتا ہے تو وہ غزوۂ احزاب پر صادق آتا ہے اور شاید اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے اس کا نام غزوۂ احزاب اور ان لشکروں کا نام احزاب رکھا گیا۔ ان ابتدائی سورتوں میں ایسی کھلی اور واضح پیشگوئیاں کہ مسلمانوں اور کفار میں جنگ ہوگی اور کفار کے عظیم الشان لشکر ہونگے مگر با ایں وہ شکست کھائیں گے رسول اللہ صلعم کی صداقت پر آفتاب نصف النہار کی طرح روشن دلیلیں ہیں۔

۲۸۲۶ اوتاد۔ وَتد یا وَتِد کی جمع ہے جس کے معنی میخ ہیں والجبال اوتادا (النبا ۷۸-۷) اور اوتاد الارض پہاڑوں کو کہا جاتا ہے اور اوتاد البلاد بڑے بڑے سرداروں کو۔ اور ابن جریر نے یہ معنی بھی قبول کیے ہیں کہ اوتاد سے مراد بنیان یعنی عمارت ہے کیونکہ خیمہ میخوں سے لگایا جاتا ہے اور بیضاوی نے ذوالاوتاد کے معنی ذوالجموع الکثیرۃ کیے ہیں یعنی بہت جماعتوں یا لشکروں والا اور کشاف نے ذوالملك الثابت معنے کیے ہیں کیونکہ میخوں سے ایک چیز مضبوط ہوتی ہے اور ذوالجنود یا لشکروں والا ہی زیادہ موزوں معنی ہیں اس لیے کہ لشکروں کا لازمہ خیمے اور میخیں ہیں۔

یہاں بھی جو ترتیب مکذبین انبیاء کی دی ہے وہ تاریخی نہیں بلکہ مکانی ترتیب ہے۔ یعنی اول وہ ممالک ہیں جو حجاز سے دور پڑے ہوئے ہیں یعنی موصل اور احقاف اور مصر۔ اور پھر وہ مقامات لیے ہیں جو بالکل قریب ہیں اور جن پر اہل حجاز کا گزر اپنے سفروں میں بہت رہتا تھا یعنی علاقہ حجر و سدوم و مدین اور اصحاب الایکہ یا بن والوں کو پیچھے اس لیے رکھا کہ پہلے دونوں مقامات پر نشانات ہلاکت موجود تھے۔

مَا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ۝۱۵	کوئی افاقہ نہیں ع۲۸۲۷
وَ قَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا	اور کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمارا حصّہ حساب کے دن
قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ۝۱۶	سے پہلے ہی ہمیں جلد دیدے ع۲۸۲۸
اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ اذْكُرْ عَبْدَنَا	اس پر صبر کر جو یہ کہتے ہیں اور ہمارے قوت والے بندے
دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝۱۷	داؤد کو یاد کرو (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا تھا ع۲۸۲۹
اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ	ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ کام میں لگایا تھا وہ شام اور
بِالْعَشِيِّ وَ الْاِشْرَاقِ ۝۱۸	دن چڑھنے تسبیح کرتے تھے۔
وَ الطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝۱۹	اور پرندوں کو جو اکٹھے کیے گئے تھے سب اسکی طرف رجوع کرنیوالے تھے ع۲۸۳۰
وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ	اور ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کیا اور اسے حکمت عطا کی
وَ فَصْلَ الْخِطَابِ ۝۲۰	اور بات کا فیصلہ کرنا (سکھایا) ع۲۸۳۱
وَ هَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا	اور کیا تجھے دشمن کی خبر پہنچی ہے، جب وہ دیوار پھاند کر

ع۲۸۲۷ فواق مادہ فوق ہے اور افاقۃ یہ ہے کہ متوالاپن کے بعد فہم انسان کی طرف رجوع کرے یا بیماری کے بعد قوت رجوع کرے اور دودھ دوہنے میں افاقۃ دودھ کا لوٹ کر آنا ہے اور فُواق یا فَواق وہ وقفہ ہے جو دو دفعہ دودھ دوہنے کے درمیان ہو اور یہاں فواق کے معنی راحت ہیں جو اس کی طرف لوٹ کر آئے اور بعض نے اس کے معنی کیے ہیں کہ اس کے لیے دنیا کی طرف لوٹ کر آنا نہیں (رغ) اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا عیادۃ المریض قدر فواق ناقۃ بیمار کی بیمار پرسی اونٹنی کے دو دفعہ دودھ دوہنے کے درمیانی وقفہ کے برابر ہے اور عرب میں محاورہ ہے ما اقام عندی فواق ناقۃ جس سے مراد بہت تھوڑی دیر ٹھہرنا ہے اور بعض کے نزدیک فواق اور افاقۃ کے ایک ہی معنی ہیں۔ اور افاقۃ غشی یا متوالے پن سے ہوتا ہے ابو عبیدہ کا قول ہے کہ فواق فتح کے ساتھ بمعنی افاقہ یا راحت ہے جیسے مریض کا افاقہ اور فُواق پیش کے ساتھ وقفہ ہے اور مراد اس سے انتظار ہے (ل)

ع۲۸۲۸ قطّ۔ قِطّ اصل میں وہ شئے ہے جو عرض میں کاٹی جائے جیسا قِدّ وہ ہے جو طول میں کاٹی جائے اور قِطّ حصّہ کو کہتے ہیں جو کسی کے لیے الگ کر دیا جائے گویا کہ وہ قطع کر دیا گیا ہے اور ابن عباسؓ نے یہی معنی کیے ہیں اور قِطّ صحیفہ کو کہتے ہیں اور تحریر اور اس کاغذ پر جس میں تحریر ہو دونوں پر بولا جاتا ہے (رغ) یعنی عذاب کو جلدی مانگتے ہیں۔

ع۲۸۲۹ ذاالاید۔ اَید اور اٰد دونوں کے معنی قوت ہیں اور ذاالاید کے معنی ذاالقوۃ ہیں یعنی قوت والا اور حضرت داؤد کی قوت عبادت پر اتم تھی اور دوسری جگہ ہے والسماء بنینٰھا باید (الذٰریٰت۵۱ - ۴۷) اور اسی سے اَیَّدَ ہے (ن) وایدناہ بروح القدس (البقرۃ۲ - ۸۷) یعنی تائید کی یا قوت دی ذاالاید سے مراد صاحب قوت ہی ہے اور اولی الایدی والابصار (۴۵) میں اشارہ قوت کی طرف ہے جو ان کے لیے وجود میں لائی گئی (رغ)

ع۲۸۳۰ اوّاب۔ اَوب کے لیے دیکھو ع۳۸۵ اور اوّاب۔ توّاب کی طرح ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف ترک معاصی سے اور اچھے کام کرنے سے رجوع کرتا ہے اور یہ صرف اس جاندار سے مخصوص ہے جو ارادہ رکھتا ہے (رغ) یعنی سوائے انسان کے دوسرے جانداروں پر نہیں بولا جا سکتا۔

چونکہ اوّاب صرف انسانوں کو کہا جا سکتا ہے جو اختیار اور ارادہ رکھتے ہیں اور ترک معاصی اور فعل خیرات انہی کا کام ہو سکتا ہے اور یہی اوّاب کے معنی ہیں، اس لیے جبال اور طیر سے مراد بھی انسان ہی ہونے چاہئیں اور یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ پہاڑ اور پرندے اوّاب تھے پس کل لہ اوّاب بتاتا ہے کہ جبال اور طیر سے مراد یہاں انسان ہی ہیں جبال سے انسان مراد ہونے پر دیکھو ع۱۶۲۳ اور طیر سے بھی مجازاً مراد انسان ہو سکتے ہیں دیکھو ع۴۳۲ اور ممکن ہے کہ ایک طرف لفظ جبال میں بڑے بڑے طاقتور انسانوں کی طرف اشارہ ہو اور دوسری طرف طیر میں اعلیٰ درجہ کے روحانی انسانوں کی طرف۔ اور اصل میں تو مقصود ذکر آنحضرت صلعم ہے اور داؤد کے ذکر میں بتایا ہے کہ دونوں قسم کے انسان آپ کو دیئے جائیں گے دوسری توجیہ کے لیے دیکھو ع۲۱۷۳۔

ع۲۸۳۱ فصل الخطاب۔ فَصل ایک چیز کا دوسری سے الگ کرنا ہے اور اقوال و افعال میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اور خطاب اور مخاطبۃ کے معنی ایک دوسرے کی طرف کلام کا لوٹانا ہیں فصل الخطاب وہ ہے جو مراجعت کلام کے معاملہ کا فیصلہ کر دے (رغ) یعنی جس بات میں جھگڑا ہو اس کا فیصلہ کرنا اور بعض مفسرین کا قول ہے کہ فصل الخطاب یہ ہے کہ دلیل کے ساتھ فیصلہ کرے اور بعض کا قول ہے کہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنا مراد ہے اور بعض کے نزدیک فیصلے میں فقاہت کا

الْمِحْرَابَ ﴿٢١﴾
إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُودَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ
قَالُوا لَا تَخَفْ ۖ خَصْمَانِ بَغَىٰ بَعْضُنَا
عَلَىٰ بَعْضٍ فَاحْكُم بَيْنَنَا بِالْحَقِّ
وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ ﴿٢٢﴾
إِنَّ هَٰذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ
نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ فَقَالَ
أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ ﴿٢٣﴾
قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ
إِلَىٰ نِعَاجِهِ ۖ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ
لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ
مَّا هُمْ ۗ وَظَنَّ دَاوُودُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ
فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ ۩ ﴿٢٤﴾
السجدة

حجرے میں داخل ہوئے ۲۸۳۲
جب وہ داؤدؑ کے پاس آئے تو وہ ان سے گھبرا گیا۔
انھوں نے کہا ڈر نہیں (ہم) دو فریق ہیں جن میں سے ایک نے
دوسرے پر زیادتی کی ہے سو ہمارے درمیان حق کے ساتھ
فیصلہ کر اور نا انصافی نہ کرنا اور ہمیں سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کر۔ ۲۸۳۲ا
یہ میرا بھائی ہے، اس کی ننانوے دُنبیاں ہیں۔ اور
میری ایک ہی دُنبی ہے۔ تو اس نے کہا، اسے میرے
سپرد کر دے اور جھگڑے میں مجھ پر غالب آ گیا۔
(داؤدؑ نے) کہا یقیناً اس نے تجھ پر ظلم کیا ہے کہ تیری دُنبی
کو اپنی دنبیوں (میں ملانے) کے لیے مانگا اور بہت سے شریک
ایک دوسرے پر زیادتی ہی کرتے رہتے ہیں، سوائے ان کے
جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں اور وہ بہت ہی تھوڑے
ہیں اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے اسے مصائب میں ڈالا ہے سو
اس نے اپنے رب کی حفاظت مانگی اور رکوع کرتا ہوا گر گیا اور (اللہ کی طرف) متوجہ ہوا۔ ۲۸۳۳

نام ہے (ل)

۲۸۳۲ خصم۔ خُصومَۃ جھگڑا کرنا ہے اور خِصْم جھگڑا کرنیوالا۔ اور یہ واحد جمع مذکر مونث پر یکساں بولا جاتا ہے اور اس کی تثنیہ بھی آئی ہے ھذان خصمان اختصموا فی ربھم (الحج ۲۲۔ ۱۹) جہاں دو فریق یعنی مومن اور کافر مراد ہیں اور خصیم وہ ہے جو بہت جھگڑا کرے فاذا ھو خصیم مبین (النحل ۱۶۔ ۴) اور خَصِم وہ ہے جو خصومت سے مختص ہو بل ھم قوم خصمون (الزخرف ۴۳۔ ۵۸) (غ) اور یہاں خصم سے مراد حضرت داؤد کے ساتھ جھگڑا کرنے والے معلوم ہوتے ہیں۔
تَسَوَّرَ۔ سُوْر (دیوار) سے ہے اس نے دیوار پھاندی (ل)

۲۸۳۲ا صراط۔ طریق مستقیم یعنی سیدھے رستے کو کہا جاتا ہے اور اسے سراط بھی کہا جاتا ہے یعنی آسان (غ)

۲۸۳۳ حضرت داؤد اور اوریاہ کی جورو کا باطل قصّہ: یہاں مفسرین نے اوریاہ کی جورو کا قصّہ لکھا ہے جو اصل میں بائبل سے لیا گیا ہے اور ابن جریر نے اسے حضرت ابن عباس کی طرف منسوب کیا ہے ابن کثیر کہتے ہیں قد ذکر المفسرون ھھنا قصۃ اکثرھا ماخوذ من الاسرائیلیات ولم یثبت فیھا عن المعصوم حدیث یجب اتباعہ یعنی یہ قصہ اسرائیلیات سے لیا گیا ہے اور آنحضرت صلعم سے اس میں کوئی حدیث ثابت نہیں۔ اور پھر لکھا ہے کہ ابن ابی حاتم نے جو ایک حدیث یزید الرقاشی کی روایت سے بیان کی ہے اس کی سند صحیح نہیں کیونکہ یزید ضعیف الحدیث ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس قصّہ کو ان آیات کی تفسیر ٹھہرانے کے لیے قرآن کریم کے الفاظ کو بھی توڑنا مروڑنا پڑتا ہے مثلاً یہ کہ جو لوگ دیوار پھاند کر آئے وہ دو فرشتے تھے۔ فرشتوں کو دیوار پھاندنے کی کیا ضرورت تھی اور قرآن شریف میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ وہ فرشتے تھے۔ پھر اگر فرشتے تھے تو انہوں نے جھوٹ کیوں بولا اور از سرتا پا ایک جھوٹا قصہ کیوں بنایا۔ اور قرآن کریم کے صریح الفاظ اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ یہاں حضرت داؤد کی کسی کمزوری کا ذکر ہو بلکہ پہلی اور پچھلی آیات سب اُن کے مقام بلند کے اظہار کے لیے ہیں۔ پہلے انہیں اواب کہا ہے اور اواب وہ ہے جو ترک معاصی اور فعل خیرات کرتا ہے تو اس لفظ کے ساتھ معصیت کا ذکر بالکل ناموزوں ہے پھر انہیں حکمت دینے کا اور فصل الخطاب کا ذکر ہے۔ پھر فیصلہ کے وقت حضرت داؤد خود فرماتے ہیں کہ سوائے مومنوں کے اکثر شرکاء ایک دوسرے پر ظلم ہی کرتے ہیں اور ایسے لوگ جو ظلم سے بچیں بہت کم ہیں۔ یہ استثنا اگر خود ان کو شامل نہیں کرتا تو اور کسے کرتا ہے پھر آیت کا خاتمہ اس پر کیا ان لہ عندنا لزلفی وحسن مآب یعنی وہ ہمارے مقربین میں سے تھے۔ پھر اسی واقعہ کے ساتھ انہیں خلیفہ بنانے کا ذکر بطور انعام ہے۔

ابو حیان نے ان آیات کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ہم ظاہر آیات کو نہیں چھوڑ سکتے کہ دیوار پھاندنے والے انسان تھے اور کہ حضرت داؤد کا ان سے خوف اس وجہ سے

فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾

سو ہم نے اس سے اس کی حفاظت کر دی اور اس کے لیے ہمارے ہاں قرب اور اچھی منزلت ہے۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ

ع ۱۱ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾

اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں حاکم بنایا ہے، سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور خواہشات کی پیروی نہ کر ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بہکا دیں گی۔ وہ لوگ جو اللہ کی راہ سے بہک جاتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اس لیے کہ وہ حساب کے دن کو بھول گئے ۲۸۳۴

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ؕ ﴿۲۷﴾

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بیفائدہ پیدا نہیں کیا یہ ان کا خیال ہے جو کافر ہیں سو اُن پر جو کافر ہیں آگ کی وجہ سے افسوس ہے ۲۸۳۵

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿۲۸﴾

کیا ہم ان کو جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح ٹھیرائیں گے، یا کیا ہم متقیوں کو بدکاروں کی طرح کر دیں گے ۲۸۳۶

تھا کہ آپ نے خیال کیا کہ یوں بے وقت وہ آپ پر حملہ کرنے کے لیے آئے ہیں کیونکہ آپ اس وقت اکیلے حالت عبادت میں تھے اور جب ان پر واضح ہوگیا کہ وہ ایک مقدمے کر آئے ہیں تو آپ نے اس غلط ظن کی وجہ سے استغفار کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف کیا۔ اسی کے قریب قریب یہ ہے کہ اصل میں یہ دیوار پھاندنے والے ارادۂ قتل سے آئے تھے لیکن حضرت داؤد کو بیدار پا کر انہوں نے ایک غلط قصّہ بنا لیا کہ ہم مقدمہ کے فیصلہ کے لیے آئے ہیں تب حضرت داؤد نے ارادہ کیا کہ ان سے بدلہ لیں لیکن پھر خیال ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان تھا کہ کیا اپنے نفس کے لیے وہ غضب میں آتے ہیں یا نہیں سو آپ نے استغفار کیا اور استغفار کے متعلق ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ استغفار اُن پر حملہ آوروں کے لیے تھا اور فغفرنا لہ ذٰلك میں لام اجل کا ہے یعنی آپ کے استغفار کی وجہ سے ہم نے ان لوگوں کو معاف کر دیا (د)

ادنیٰ تدبر سے معلوم ہوگا کہ یہ قصّہ آنحضرت صلعم کی تسلّی کے لیے بیان کیا گیا ہے اور آپ کو بتایا گیا ہے کہ اگر آپ کی مخالفت کی جاتی ہے اور آپکی جان لینے کے منصوبے کیے جاتے ہیں تو ایسا ہی پہلے نبیوں کے ساتھ بھی ہوا یہاں تک کہ داؤد جیسے طاقتور بادشاہ کے خلاف بھی ایسے منصوبے ہوتے رہے چنانچہ یہ ذکر یہاں سے شروع ہوتا ہے اصبر علی ما یقولون واذکر عبدنا داؤد ذا الاید یعنی اگر تمہیں تکلیفیں دیجاتی ہیں تو صبر کرو اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے نبیوں سے ایسا ہی ہے کہ ان کے دشمن پہلے پہلے انہیں خوب دکھ دیتے ہیں یہاں تک کہ ہمارے طاقتور بندے داؤد کو یاد کرو کہ اسے بھی ایسا معاملہ پیش آیا اور آگے ذکر ہے کہ کس طرح منصوبہ کرنے والوں نے دیوار پھاند کر آپ کا کام تمام کرنا چاہا لیکن آپکو بیدار پا کر ٹال گئے اور ایک مقدمے کا فیصلہ چاہا معلوم ہوتا ہے ان لوگوں کا منشا آپ کو مار کر ملک لینے کا تھا اس لیے آپ نے اُنہیں نرمی سے یوں بھی سمجھایا کہ شریک ایک دوسرے پر ظلم اور ایک دوسرے کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اور یبغی کے لفظ میں یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے اور فتنۃ سے مراد تکالیف و محن ہیں جو اس کے اصل معنی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف اسے اس لیے منسوب کیا کہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہوتی ہیں اور استغفار درحقیقت طلب حفاظت کے لیے ہے اور غفرنالہ میں یہ اشارہ ہے کہ ہم نے دشمنوں سے اس کی حفاظت کی اور ذٰلك میں اشارہ آپ کے دشمنوں کے منصوبوں کی طرف ہے اور اس کی وجہ یہ فرمائی ہے کہ وہ ہمارے مقرب تھے۔ اور یہ سب گویا رسول اللہ صلعم کو تسلّی ہے کہ آپ کے خلاف بھی ایسے منصوبے ہونگے اور اللہ تعالیٰ آپ کی بھی حفاظت کرے گا۔ ورنہ اس قصّہ کا کوئی تعلق اس سورت سے نہیں۔

۲۸۳۴ یہ خلیفہ بنانا پہلے سے ہے مگر یہاں اس کے لانے میں آنحضرت صلعم کی بادشاہت کی طرف اشارہ ہے اور خواہشات کی پیروی بادشاہ کے لیے یہ ہے کہ اپنی قوم کے بالمقابل دوسری قوم سے انصاف نہ کرے۔ بادشاہ قوموں کی یہ خواہش آخر کار اُن کی تباہی کا موجب ہوجاتی ہے۔

۲۸۳۵ من تعلیلیہ ہے جیسے فویل لہم مما کتبت ایدیہم میں یعنی اس آگ کی وجہ سے اُن پر افسوس ہے جو اُن کے فاسد ظن کی وجہ سے ان کے اعمال بد کے نتیجہ میں ملے گی اور من تبیین کے لیے بھی آتا ہے مِنْ برد (النور ۲۴-۴۳) اور نفی اور استفہام میں استغراق کے لیے ہوتا ہے فما منکم من احد (غ)

۲۸۳۶ یہ گویا پچھلی آیت کا نتیجہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے اقتضائے حکمت سے پیدا کیا ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ متقی اور فاجر یکساں ٹھہریں یعنی

كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوۡۤا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝۲۹

یہ کتاب جو ہم نے تیری طرف اتاری ہے برکت دی گئی ہے تاکہ وہ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے نصیحت حاصل کریں۔

وَوَهَبۡنَا لِدَاوٗدَ سُلَيۡمٰنَ ؕ نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ؕ ۝۳۰

اور ہم نے داؤدؑ کو سلیمانؑ دیا، کیا اچھا بندہ تھا وہ بار بار (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا تھا۔

اِذۡ عُرِضَ عَلَيۡهِ بِالۡعَشِىِّ الصّٰفِنٰتُ الۡجِيَادُ ۝۳۱ فَقَالَ اِنِّىۡۤ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَيۡرِ عَنۡ ذِكۡرِ رَبِّىۡ ۚ حَتّٰى تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ ۝۳۲ رُدُّوۡهَا عَلَىَّ ؕ فَطَفِقَ مَسۡحًۢا بِالسُّوۡقِ وَالۡاَعۡنَاقِ ۝۳۳

جب اس پر پچھلے پہر اصیل تیز رو گھوڑے پیش کیے گئے ۲۸۳۷ تو اس نے کہا میں اچھے مال کی محبت کو اپنے رب کے ذکر کی وجہ سے اختیار کرتا ہوں یہاں تک کہ وہ پردے میں چھپ گئے ۲۸۳۸ انھیں میرے پاس لوٹا کر لاؤ، تب وہ اُن کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا ۲۸۳۹

اللہ تعالیٰ کا معاملہ ان سے یکساں ہو اس لیے ضروری ہے کہ متقیوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں کامیاب کرے اور حق کو قائم کرے اور وہ لوگ جو بدیوں میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں (فجار فاجر کی جمع ہے دیانت کے پردے کو پھاڑ دینے والا ۸۸ گویا وہ بدی میں یہاں تک ترقی کر جاتا ہے کہ کوئی حجاب باقی نہیں رہ جاتا) انہیں نیست و نابود کردے۔ ذکر تو حضرت داؤد کا تھا اور اسی کے تسلسل میں آگے حضرت سلیمان کا ذکر آتا ہے درمیان میں یہ آیات یہی توجہ دلانے کے لیے ہیں کہ یہ قصّے نہیں آئندہ کے واقعات ہیں کہانیاں نہیں سبق ہیں اس لیے متقی بنو فاجر نہ بنو۔

۲۸۳۷ صافنات۔ صَفْن دو چیزوں کو جمع کرنا ہے ایک کو دوسری سے ملاتے ہوئے صَفَنَ الفرس قوائمہٗ (غ) اور اس کے معنی ہیں تین ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور چوتھی کے سم کو موڑ لیا اور حدیث میں آتا ہے قُمنا خلفہٗ صُفُونا یعنی جب رسول اللہ صلعم رکوع سے سر اٹھاتے ہم آپ کے پیچھے صافن ہونے کی حالت میں کھڑے ہوتے تھے جس کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ ہر شخص جو پیروں کو برابر کیے کھڑا ہو۔ اور صافن کے معنی مطلق کھڑا ہونے والا بھی کیے گئے ہیں اور فراء کا قول ہے کہ عرب لوگ مطلق کھڑا ہونے والے کو صافن کہتے ہیں خواہ تین ٹانگوں پر کھڑا ہو یا سب پر اور حدیث میں آتا ہے مَنْ سَرَّہٗ ان یقوم لہ الناس صفونا یعنی جو شخص اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ لوگ اس کے لیے مؤدبانہ کھڑے رہیں جہاں صفونا کے معنی واقفین کیے گئے ہیں (ل)

جیاد۔ جَواد کی جمع ہے۔ اور جُود سخاوت یعنی مال اور علم کے خرچ کرنے کا نام ہے اور جواد اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بہت سخاوت کرنے والا ہو۔ اور اس گھوڑے کو جو اپنی جمع شدہ دوڑ کی طاقت کو خرچ کرتا ہے (غ) یعنی تیز دوڑنے والا گھوڑا اور اسی مادہ سے جیّد ہے جو ردی کا نقیض ہے۔

۲۸۳۸ خیر۔ بہت اور اچھے مال کو کہتے ہیں دیکھو ع ۲۲۰ اور مفسرین نے لکھا ہے کہ عرب کے لوگ خیل یعنی گھوڑوں کو بھی خیر کہتے ہیں (ر)

عن۔ عَنْ بہت سے معنی کے لیے آتا ہے اور ایک چیز سے تجاوز جو اس کے عام معنی ہیں اور بدل کے معنی میں بھی آتا ہے لا تجزی نفس عن نفس شیئا (البقرۃ ۲۔ ۴۸) تعلیل کے لیے جیسے وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الا عن موعدۃ (التوبۃ ۹۔ ۱۱۴) وما نحن بتارکی الھتنا عن قولک (ھود ۱۱۔ ۵۳) بعد کے معنی میں جیسے عما قلیل لیصبحن نادمین (المؤمنون ۲۳۔ ۴۰) لترکبن طبقا عن طبق (الانشقاق ۸۴۔ ۱۹) مراد ہے ایک حالت کے بعد دوسری حالت۔ مِن کے معنی میں جیسے یقبل التوبۃ عن عبادہ (التوبۃ ۹۔ ۱۰۴) نتقبل عنہم احسن ما عملوا۔ (الاحقاف ۴۶۔ ۱۶) ب کے معنی میں جیسے وما ینطق عن الھوٰی (النجم ۵۳۔ ۳) (مغنی) یہاں عن تعلیل کے لیے ہے یعنی اپنے رب کے ذکر کی وجہ سے۔

۲۸۳۹ طفق۔ طَفِقَ یفعل کذا۔ اخذ یفعل کذا کی طرح ہے یعنی وہ کام کرنے لگ گیا وطفقا یخصفن (الاعراف ۷۔ ۲۲)

حضرت سلیمان اور گھوڑوں کا واقعہ: اس واقعہ کو بھی عجوبہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے یہاں تک کہ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ پروں والے گھوڑے تھے۔ اور لفظ عن کے صحیح معنی یہاں نہ لینے کی وجہ سے یہ خیال کر لیا گیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ گھوڑوں کی دوڑ کو دیکھتے رہے اور نماز ترک کردی اور تب اپنے اس قصور سے توبہ یوں کی کہ سب گھوڑوں کو اپنے ہاتھ سے کاٹ ڈالا جو ایک ہزار یا بیس ہزار تھے۔ اگر عصر کی نماز گھوڑ دوڑ کے دیکھنے میں قضا ہوئی تو مغرب اور عشا گھوڑوں کے مارنے میں قضا ہو گئی ہو گی۔ قرآن کریم نے ایک سیدھا سادہ واقعہ لکھا ہے حضرت سلیمان بادشاہ تھے وسیع سلطنت تھی انہیں گھوڑے بھی رکھنے پڑتے تھے اچھے اچھے خوبصورت گھوڑے منگواتے اور رکھتے لیکن بتایا یہ ہے کہ یہ گھوڑوں کی محبت کی وجہ سے نہ تھا جیسا اہل دنیا کا خیال ہوتا ہے بلکہ یہ محبت عن ذکر ربی تھی یعنی اس لیے کہ یہ گھوڑے بھی خدا کی راہ میں جہاد میں کام آتے تھے اور حتی توارت بالحجاب میں انہی گھوڑوں کا دور نکل جانا اور نظر سے غائب ہو جانا مراد ہے۔ ان کی دوڑ کو دیکھ کر آپ خوش ہوئے اور ان گھوڑوں کو اپنے ہاتھ سے تھپکی دینی شروع کی کاٹنے کا یہاں کوئی ذکر نہیں بخاری میں موجود ہے یَمْسَحُ اَعْرَافَ الْخَیْلِ وَعَرَاقِیْبَھَا

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾

اور ہم نے سلیمانؑ کو امتحان میں ڈالا اور اس کے تخت پر ایک جسم کو ڈالا، پھر اس نے رجوع کیا ۲۸۴۰ کہا میرے رب! میری حفاظت فرما اور مجھے وہ بادشاہت عطا فرما جو میرے بعد کسی کو شایاں نہیں (کہ چھین لے) تو بہت عطا فرمانے والا ہے ۲۸۴۱

یعنی گھوڑوں کے ایال اور پاؤں پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا اور نہ سورج کے غروب ہونے کا ذکر ہے اور ان باتوں کا ذکر کرنے سے بتانا یہ مقصود ہے کہ خود نبی کریم صلعم کو خدا کی راہ میں گھوڑوں سے کام لینا ہوگا مگر یہ دنیا کے مال کی محبت کی وجہ سے نہ ہوگا بلکہ صرف اس لیے کہ وہ خدا کی راہ میں کام آئیں گے۔ انبیاء کو ظاہری شان و شوکت سے کوئی وابستگی نہیں ہوتی اور مسلمانوں کو بھی سمجھایا ہے کہ سلطنت ملے تو اسے صرف دین کا خادم سمجھیں اصل مقصود نہ بنا لیں مال دنیا صلحا کے پاس بھی آتا ہے مگر اس کی عظمت ان کی نگاہ میں نہیں ہوتی۔

۲۸۴۰ جسد جَسَد اور جسم کے ایک ہی معنی ہیں لیکن جَسَد خاص ہے کیونکہ جسد وہ ہے جس کا کوئی رنگ ہو اور جسم میں یہ ضروری نہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جسد صرف انسان کے جسم سے خاص ہے (غ) اور جسم کی جمع اجسام ہے تعجبك اجسامهم (المنفقون ۶۳-۴)

حضرت سلیمانؑ کا بیٹا: حدیث میں ہے کہ حضرت سلیمان نے کہا تھا میں ستر یا چالیس بیبیوں کے پاس جاؤں گا اور ہر ایک سے ان میں سے ایک مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہوگا۔ اور انشاء اللہ نہیں کہا تھا تو صرف ایک بی بی حاملہ ہوئی اور اس سے بھی ایک ادھورا بچہ پیدا ہوا۔ جاءت بشق رجل۔ آیا اس سے مراد جسمانی طور پر ادھورا ہے یا اخلاقی طور پر مفسرین نے جسمانی طور پر ادھورا لیا ہے۔ اور اس کے تخت پر ڈالنے کے یہ معنی صحیح نہیں کہ دائی نے بچہ کو لا کر تخت پر رکھ دیا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ حضرت سلیمان کا جانشین بلحاظ اخلاق و قوت ادھورا تھا اور تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے دیکھو ۲۶۸۵ جہاں سلیمان کے جانشین کا ذکر ہے اور ثم اناب فرمایا کیونکہ گو حضرت سلیمان پہلے ہی اواب تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کا جانشین کسی قابل نظر نہیں آتا تو اور بھی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور جو یہاں بعض مفسرین نے قصہ بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان کی شان و شوکت اور شیاطین اور جنوں کا ان کے ماتحت ہونا ایک انگشتری کی وجہ سے تھا جس پر اسم اعظم تھا اور وہ انگشتری ایک شیطان نے چرالی اور وہ سلیمان بن گیا اور پھر اس قصہ کو طول دیا ہے تو یہ سب لچر حکایات ہیں جن سے قرآن کریم جیسی پرحکمت کتاب پاک ہے۔

۲۸۴۱ حضرت سلیمان کی اس دعا کا کیا منشا ہے؟ کیا یہ مطلب ہے کہ وہ سچ مچ دنیا کی بڑی بھاری بادشاہت کے طالب تھے اور یہ چاہتے تھے کہ اتنی بڑی حکومت آپ کے بعد کسی کو نہ ملے۔ یہ دونوں باتیں شان نبوت کے خلاف ہیں۔ دنیا کی حکومت اور دنیا کے مال و دولت کی طلب یا محبت انبیاء کے دلوں میں قطعاً نہیں ہوتی پھر اتنی بڑی ہوس کا کیا ذکر کہ یہ بھی خواہش ہو کہ میرے بعد ایسی حکومت دنیا میں کسی کو نہ ملے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ کے زمانے میں سحر کا زور تھا تو آپ کو معجزہ ایسا دیا گیا جو تمام سحروں سے بڑھ کر تھا۔ اور حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں شفائے امراض پر زور تھا اس لیے آپ کو معجزہ شفائے امراض کا دیا گیا۔ اور آنحضرت صلعم کے زمانہ میں فصاحت پر فخر تھا تو آپ کو بلحاظ فصاحت ایسا معجزہ دیا گیا جس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اسی طرح حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں لوگوں کو حکومت اور بادشاہت پر فخر تھا اس لیے آپ کو ایسی حکومت دی گئی۔ لیکن یہ دلیل نہایت بودی ہے اس لیے کہ معجزات انبیاء اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے نہیں لیا کرتے نہ حضرت موسیٰ نے عصا کے سانپ بننے کی دعا کی نہ حضرت عیسیٰ نے بیماروں کو اچھا کرنے کی نہ آنحضرت صلعم نے فصاحت کے لیے دعا کی پھر دوسری دقت یہ ہے کہ اس کو تخت پر جسد کے ڈالنے سے کیا تعلق ہے جن مفسرین نے جسد کے ڈالنے سے شیطان کا خاتم سلیمان پہن کر سلیمان ہو جانا مراد لیا ہے انہوں نے اس کی توجیہیں کی ہے ھب لی ملکا لا ینبغی لاحد غیری من ھو فی عصری ان یسلبہ منی کھذہ السلبۃ اور یہ معنی عطا اور قتادہ سے مروی ہیں۔ یعنی مجھے ایسا ملک دے جو کسی میرے اہل زمانہ کے لیے شایاں نہ ہو کہ وہ مجھ سے چھین لے جس طرح اس دفعہ چھین لیا گیا ہے اور روح المعانی میں خاتم سلیمان کے قصہ کو چونکہ رد کیا گیا ہے۔ اس لیے اس قدر تغیر کے ساتھ اس توجیہ کو قبول کیا گیا ہے کہ یہ دعائے عدم سلب ملک ہو سکتی ہے گو پہلے سلب نہ ہوا ہو اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا دوام چاہنا اچھی دعا ہے پس حضرت سلیمان کی دعا یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسی بادشاہت عطا فرمائے جو کسی دوسرے کے لیے شایاں نہیں کہ ان سے چھین سکے اور یہی صحیح ہے اور یہ دعا آپ نے اسیلئے کی کہ آپ کو اپنے بعد اس بادشاہت کی جو آپ نے اس قدر محنت سے بنائی تھی بری حالت دکھائی گئی۔ اور بعد یہاں بمعنی غیر ہے جیسے فمن یھدیہ من بعد اللہ (الجاثیۃ ۲۳) میں مراد عن غیر اللہ ہے لیکن چونکہ ملک ظاہری بادشاہت پر بھی بولا جاتا ہے اور نبوت یا دینی بادشاہت پر بھی دیکھو ۱۲۵ و ۳۹۷ اس لیے میرے نزدیک ترجیح اس بات کو ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے دعا باطنی ملک کے لیے کی ہے نہ ظاہری ملک کے لیے یعنی وہ دیکھتے ہیں کہ یہ حکومت اور یہ جاہ و جلال تو چلا جائے گا لیکن اللہ تعالیٰ کا نام دنیا میں بلند کرنے سے جو ملک حاصل ہوتا ہے اسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ پس وہ اعلائے کلمۃ اللہ یا اللہ کے نام کی حکومت چاہتے ہیں۔ کیونکہ جو حکومت ظاہر طور پر حاصل ہوتی ہے وہ دوسرا چھین سکتا یا برباد کر سکتا ہے لیکن جو حکومت روحانی طور پر حاصل ہوتی ہے یعنی جس کا تعلق اخلاق سے ہے اسے دوسرا انہیں چھین سکتا۔ جسموں پر حکومت زائل ہو جاتی ہے لیکن دلوں پر جو حکومت ملتی ہے وہ کبھی زائل نہیں ہوتی اور اس کی تائید خود اس سے ہوتی ہے کہ دو دعائیں اکٹھی ہیں یعنی اغفر لی اور ھب لی ملکا اور دعائے غفران انسان کے باطن یا اخلاق سے تعلق رکھتی ہے نہ حکومت ظاہری سے اور دوسری جگہ جہاں قرآن کریم میں ملک سلیمان کا ذکر ہے (البقرۃ ۲-۱۰۲) تو وہاں

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ﴿٣٦﴾
سو ہم نے اس کے لیے ہوا کو کام میں لگایا وہ اس (اللہ) کے حکم سے نرمی سے چلتی تھی جدھر وہ قصد کرے ع۲۸۴۲

وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَغَوَّاصٍ ﴿٣٧﴾
اور شیطانوں کو ہر ایک معمار اور غوطہ زن کو (ان کے کام میں لگایا) ع۲۸۴۳

وَآخَرِينَ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ﴿٣٨﴾
اور اوروں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ع۲۸۴۴

مراد اُن کا دین یا اُن کی نبوت ہی ہے۔ دیکھو ع۱۲۷ اور ظاہری حکومت کو وارث کے ذریعہ سے جاتے دیکھ کر یہ تڑپ آپ کے دل میں پیدا ہوئی کہ آپ کی حکومت دلوں پر ہو اور اسی کے قریب قریب سید مرتضیٰ کا قول ہے انما سأل ملك الاخرة وثواب الجنة (ر) حدیث عفریت: اور حدیث میں جو آتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ایک عفریت نے رات کے وقت میری نماز کو خراب کرنا چاہا تو اللہ تعالےٰ نے مجھے اس پر قدرت دے دی اور میں نے ارادہ کیا کہ اسے مسجد کے ستون سے باندھ دوں پھر مجھے سلیمان کا قول یاد آ گیا ربّ ھب لی ملکا لاینبغی لاحد من بعدی تو اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے جو میں نے لکھی ہے اور جنوں پر حکومت اس سے مراد نہیں کیونکہ حدیث میں صاف لفظ ہیں فامکننی اللہ منه اللہ تعالیٰ نے اس جنّ پر مجھے قدرت دے دی اور اسے میرے قابو میں کر دیا اور یہ صریح الفاظ اس خیال کو غلط ٹھہراتے ہیں کہ جنوں پر حضرت سلیمان کے بعد کسی کو قدرت نہیں مل سکتی اور اصل تو یہ ہے کہ حضرت سلیمان کے جنّ انسان ہی تھے اور یہ عفریت جس نے نبی کریم صلعم کو تکلیف دی یہ بھی کوئی سرکش انسان ہی تھا اور آنحضرت صلعم کا اسے چھوڑ دینا اور ھب لی ملکا کو یاد کر کے سزا نہ دینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سزا تو حکومت جسمانی سے دی جاتی ہے اور آپ کی حکومت روحانی یا دلوں پر ہونی ضروری تھی اور یہ فعل چونکہ آپ کی ذات سے تعلق رکھتا تھا اس لیے ایسے آدمی کو معاف کر دینا گویا اس کے دل پر قبضہ کر لینا تھا۔ ہاں جہاں اسلام کو تباہ کرنے کی کوشش کی گئیں تو آپ نے سزا بھی دی اور اس سارے قصہ کو یہاں بیان کرنے کی غرض بھی مسلمانوں کو سمجھانا ہے کہ حکومت ظاہری جا بھی سکتی ہے اور چلی جائیگی۔ لیکن باطنی حکومت یا دلوں پر حکومت کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ آج وہ بادشاہت بہت کچھ مسلمانوں سے چھن چکی ہے جو کبھی انہیں دنیا میں حاصل تھی لیکن محمد رسول اللہ صلعم کو جو حکومت قلوب پر حاصل ہے اس کے سامنے آج بھی بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں جھکتی چلی جاتی ہیں۔ یہی وہ ملک آپ کو بھی ملا جو لاینبغی لاحد من بعدی کا مصداق ہوا جسے کوئی عیسائی طاقت نہیں چھین سکتی بلکہ جس کے سامنے خود عیسائی طاقتیں جاتی رہیں گی اور ظاہری سلطنت جو آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہ کو دی گئی وہ حضرت سلیمان کی سلطنت سے بہت بڑھ کر تھی۔ اور یہ سارا ذکر اصل میں مسلمانوں کی حالت کا نقشہ ہے جس طرح سلیمان کی سلطنت ظاہری پر ایک وقت ایسا آیا کہ ان کے تخت پر ایک جسد تھا اسی طرح مسلمانوں کی حالت ہوئی کہ وہ حکومت جو دنیا میں ان کو ملی ایسے لوگوں کے سپرد ہوئی جو اس کے اہل نہ تھے آیت ۲۸ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور ان آیات میں یہی توجہ دلا کر مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے۔ کہ حکومت ظاہری چھن جائے تو اس حکومت باطنی کی طرف توجہ کریں جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔

ع۲۸۴۲ رخاء۔ رُخاء لینت یعنی نرمی کو کہتے ہیں اور اسی سے استعارۃً ارخاء الستر لیا گیا ہے یعنی پردہ کا چھوڑ دینا (غ)

اصاب۔ صواب دو طرح پر ہے ایک کسی چیز کی اپنی ذات کے اعتبار سے یعنی جب کوئی چیز اپنی ذات میں محمود ہو اور مقتضائے عقل و شریعت سے پسندیدہ ہو تو اسے صواب کہا جاتا ہے اور دوسرا قصد کرنے والے کے اعتبار سے جب وہ مقصود کو پالے جب اصاب کذا کے معنی ہوتے ہیں جو طلب کیا تھا پالیا جیسے اصاب السّھم یعنی تیر نشانہ پر لگا۔ اور مصیبة اصل میں تیر پھینکنے میں ہے پھر دکھ پہنچنے کے لیے مخصوص ہو گئی ہے اولما اصابتکم مصیبة قد اصبتم مثلیها (آل عمران ۳-۱۶۵) وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم (الشوریٰ ۴۲-۳۰) اور اصاب خیر اور شر دونوں میں آتا ہے۔ ان تصبك حسنة تسؤهم وان تصبك مصیبة (التوبة ۹-۵۰) ولئن اصابکم فضل من اللہ (النساء ۴-۷۳) (غ) اور یہاں اصاب بمعنی قَصَدَ و اراد ہے جیسا کہ ابن عباس سے مروی ہے (ر)

حضرت سلیمان کے لیے ہوا کے مسخر ہونے پر دیکھو ع۲۱۷۵ اور اسی ہوا کو عاصفة بھی کہا ہے (الانبیاء ۲۱-۸۱) جس کے لیے دیکھو نوٹ مذکورہ بالا اور ہوا کی تسخیر سے مراد یہی ہے کہ ہوا سے اُن کے کام نکلتے تھے جیسے جہازوں کا چلنا جیسے فرمایا وسخّر لکم الشمس والقمر (ابراھیم ۱۴-۳۳) اور ایسا ہی اور چیزوں کی انسان کے لیے تسخیر کا ذکر ہے حتیٰ کہ ایک جگہ فرمایا وسخر لکم ما فی السمٰوات وما فی الارض جمیعا منه (الجاثیة ۴۵-۱۳) اور یہاں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کا حضرت سلیمان کے کام میں لگانا اسی دعا کا نتیجہ تھا جو اوپر مذکور ہے۔ رب اغفر لی وھب لی ملکا مگر مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمان اس ظاہری حکومت کے دلدادہ نہ تھے اور ان کے دل میں کوئی تڑپ تھی تو اعلائے کلمة اللہ کے لیے تھی اور اسی بات کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں ظاہری حکومت میں سب قسم کے سامان عطا فرمائے یہاں تک کہ بڑے بڑے سرکش آپ کے مطیع ہو گئے تاکہ وہ اس کے نام کو بلند کریں اور یہی اگلی دو آیات کا مضمون ہے۔

ع۲۸۴۳ بناء۔ بناء عمارت اور بنانا ہے اور بَنّاء بنانے والا یعنی معمار۔

ع۲۸۴۴ اصفاد۔ صَفَد اور صفاد کے معنی غُلّ یعنی طوق ہیں اور جمع اصفاد ہے اور صَفَد کے معنی عطیہ بھی ہیں (غ)

ان شیاطین کے متعلق ع۲۱۷۶ میں بحث گذر چکی ہے معماری کا کام کرنے والے اور غوطہ زن انسان ہی ہو سکتے ہیں) اور اگر معمار سچ مچ کے شیاطین تھے تو مزدور کون تھے اور ان کا زنجیروں میں جکڑا ہوا ہونا صاف بتاتا ہے کہ وہ غیر مرئی ہستیاں نہیں۔ جو ناری مخلوق ہے بلکہ ایسے اجسام ہیں جو زنجیروں میں جکڑے جا سکتے ہیں اور یہ کہنا کہ وہ

هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾

یہ ہماری عطا بے حساب ہے سو احسان کر، یا روک رکھ ۲۸۴۵

وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾ ع ۱۲

اور اس کے لیے ہمارے ہاں قرب اور اچھی منزلت ہے۔

وَ اذْكُرْ عَبْدَنَاۤ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ﴿۴۱﴾

اور ہمارے بندے ایوبؑ کو یاد کر جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے شیطان نے تکان اور تکلیف پہنچائی ہے ۲۸۴۶

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ﴿۴۲﴾

اپنی ایڑی لگائے چل، یہ ٹھنڈا (پانی) نہانے اور پینے کو ہے ۲۸۴۷

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَ ذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾

اور ہم نے اسے اس کے اہل اور ان کی مثل ان کے ساتھ دیئے (یہ) ہماری طرف سے رحمت تھی اور خالص عقل والوں کے لیے نصیحت ۲۸۴۸

مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں بے سند بات ہے اور علاوہ ازیں یہ تو ان کا اختیار ہوا کہ کوئی شکل اختیار کر لیں۔ اگر ایسی شکل اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ زنجیروں میں جکڑے جاتے تو وہ فوراً کیوں اپنی شکل اختیار کر کے آزاد نہ ہو جاتے۔

ع۲۸۴۵ امنن۔ مَنَّ کے لیے دیکھو ع۳۳۷ کسی پر احسان کرنا اور مَنّ بلا عوض چھوڑ دینے پر بھی بولا جاتا ہے فاما منا بعد واما فداء (محمد[۴۷]۔۴) اور یہاں مطلب خرچ کرنا ہے (غ) اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں انہیں آزاد کر دو یا قید رکھو (ر) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسری قوموں کے قیدی تھے۔

ع۲۸۴۶ حضرت ایوب کا ذکر الانبیاء[۲۱]۔ ۸۳ و ۸۴ میں گذر چکا ہے ابن جریر حضرت ایوب کو حضرت اسحاق کے پوتے کا پوتا قرار دیتے ہیں۔ اور ابن عساکر کہتے ہیں کہ ان کی ماں لوط کی بیٹی تھی اور ایک قول ہے کہ وہ سلیمان کے بعد ہوئے (م) ایوب کی کتاب مجموعہ بائبل میں زبور سے پہلے رکھی گئی ہے لیکن بعض لوگوں کے نزدیک یہ صرف ایک قصہ ہے اور حضرت ایوب کوئی تاریخی انسان نہ تھے مگر حزقیل ۱۴: ۱۴ میں حضرت ایوب کا نام حضرت نوح اور دانیال کے ساتھ لیا گیا ہے اور یہودیوں نے انہیں ہمیشہ ایک تاریخی انسان سمجھا ہے اور تازہ ترین تحقیقات یہ ہے کہ وہ ایک تاریخی انسان تھے لیکن بائبل میں جو کتاب ایوب کے نام سے ایک کتاب ہے وہ بعد کی تصنیف ہے بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلسطین کے مشرق کے رہنے والے تھے اور ایک بڑے سردار کی حیثیت رکھتے تھے اور بہت سے مال و دولت کے مالک تھے۔

ع۲۸۴۷ مغتسل۔ غَسَل (مصدر غُسْل) کے معنی ہیں ایک چیز پر پانی بہایا اور اس کی میل کو دور کر دیا فاغسلوا وجوهکم وایدیکم (المائدة[۵]۔۶) اور اِغْتِسال بدن کا دھونا ہے حتی تغتسلوا (النساء[۴]۔۴۳) اور مُغْتَسَل نہانے کی جگہ ہے اور وہ پانی جس سے نہایا جائے اور غِسْلین کفار کے بدنوں کا دھوون ہے۔ ولا طعام الا من غسلین (الحاقة[۶۹]۔۳۶) (غ)

شراب۔ شُرب ہر ایک سیال چیز کا نوش کرنا ہے پانی ہو یا کچھ اور (غ) اور شراب وہ چیز ہے جو پی جائے خواہ وہ کسی نوع سے ہو اور کسی حال پر ہو (ل) اور شارب پینے والا لذة للشاربین (محمد[۴۷]۔۱۵) اور مونچھوں کے بالوں کو شارب کہا جاتا ہے جس کی جمع شوارب ہے گویا وہ پینے والوں کی صورت پر ہیں (غ)

حضرت ایوب کی تکالیف: پچھلی آیت میں لفظ نُصب آیا تھا جس کے معنی تکان ہیں دیکھو ع۱۳۶ اور یہاں فرمایا ارکض برجلك اور رکض سواری کے دوڑانے اور چلنے کو کہا جاتا ہے دیکھو ع۲۱۳۵ اور یہاں برجلك سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد سواری کا دوڑانا ہے یہ دونوں لفظ اس بات پر صریح دلالت کرتے ہیں کہ حضرت ایوب کی تکالیف جن کا ذکر یہاں اور قرآن کریم میں دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے انی مسنی الضر (الانبیاء[۲۱]۔ ۸۳) کسی سفر سے تعلق رکھتی ہیں جن میں وہ اپنے اہل و عیال اور اپنے ساتھیوں سے جدا ہو گئے ہیں اور یہاں فرمایا مسنی الشیطان بنصب و عذاب اور دوسری جگہ صرف یہ الفاظ ہیں انی مسنی الضر۔ جس سے معلوم ہوا کہ تکلیف اور دکھ کو شیطان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یہ مراد نہیں کہ شیطان کو تکلیف پہنچانے کی کوئی خاص قدرت حاصل ہے اور قرآن کریم میں صراحت سے فرمایا کہ شیطان کا کام صرف وسوسہ اندازی ہے یوسوس فی صدور الناس (الناس[۱۱۴]۔۵) فوسوس لهما الشیطان (الاعراف[۷]۔ ۲۰) مگر انبیاء وسوسہ شیطانی سے بھی محفوظ ہیں اور دکھ تکلیف یا غلطی کو شیطان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جیسے فرمایا وما انسٰنیه الا الشیطٰن ان اذکره (الکهف[۱۸]۔۶۳) اور غلبہ کسی قسم کا بھی شیطان کو انسان پر حاصل نہیں، وما کان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی (ابراهیم[۱۴]۔۲۲) اور یا شیطان سے مراد یہاں کوئی شیطان صفت دشمن ہے جس نے شرارت سے آپ کو تکلیف پہنچائی ہے اور ان تکالیف کی وجہ سے آپ کو ہجرت کرنی پڑی ہے اور یہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں بشارت دی ہے کہ آگے چلے چلو ان تکلیفوں کا ازالہ ہو جائے گا۔ اگر انہیں کوئی جسمانی بیماری بھی تھی جیسا کہ بائبل میں ذکر ہے تو کسی ایسے چشمہ پر پہنچا دیا۔ جس میں نہانے سے اور جس کا پانی پینے سے وہ بیماری دور ہو گئی اور یا نہانے کی غرض محض تکان کا دور کرنا ہے۔

ع۲۸۴۸ اس پر ع۲۱۶۸ میں بحث گذر چکی ہے اور چونکہ اهل کا لفظ دینی اتحاد رکھنے والوں پر بھی بولا جاتا ہے دیکھو ع۱۳۷۰ اس لیے ممکن ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے پیرو

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ
وَلَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ
نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾
وَاذْكُرْ عِبٰدَنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ
وَيَعْقُوْبَ اُولِى الْاَيْدِىْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾
اِنَّاۤ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾

اور اپنے ہاتھ میں جھاڑو لے اور اس سے مار اور قسم نہ توڑ۔ ہم نے
اسے صابر پایا۔ کیا اچھا بندہ تھا وہ بار بار (اللہ کی طرف)
رجوع کرنے والا تھا ۲۸۴۹
اور ہمارے بندوں ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کر
(جو) قوت والے اور بصیرت والے (تھے)
ہم نے انھیں ایک خالص بات سے خالص کرلیا (یعنی آخرت کے) گھر کی یاد سے۔ ۲۸۵۰

جو اُن سے جدا ہو گئے تھے وہ بھی انہیں مل گئے اور جہاں ہجرت کر گئے تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے اور پیرو بھی دے دیئے۔ دوسرے انبیاء کے ذکر میں آنحضرت صلعم کا ذکر برابر موجود ہے اور حضرت ایوب کے ان واقعات کو ذکر کرکے یہی بتایا ہے کہ جس طرح انہیں ایک لمبے زمانے تک تکلیفیں اٹھا کر آخر ہجرت کرنی پڑی ایسا ہی معاملہ آپ کے ساتھ ہوگا۔ اور جس طرح انہیں ان کے اہل اور اس کی مثل مل گئے اسی طرح آنحضرت صلعم کے ساتھ ہوگا۔ اگر بی بی معنی لیے جائیں تو آنحضرت صلعم کے مکی مصائب میں آپ پر یہ کم مصیبت نہ تھی کہ آپ کی غمگسار بی بی کا انتقال ہو گیا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں جا کر آپ کو اور ازواج مطہرات عطا فرمائیں اور اگر پیرو معنی لیے جائیں تو ہجرت میں صحابہ سے جدا ہو کر پھر مدینہ پہنچ کر نہ صرف وہ صحابہ ہی مل جاتے ہیں بلکہ اتنی یا اس سے بڑھ کر تعداد انصار کی بھی مل گئی۔

۲۸۴۹ ضغث کے ایک معنی ۱۵۴۵ میں بیان ہو چکے ہیں اور ضِغث مختلف شاخوں کی مُٹھی کو بھی کہتے ہیں جن کی جڑ ایک ہو اور اس لیے جھاڑو کو بھی کہا جاتا ہے۔ یا نبات سے وہ چیز جو کف کو بھر دے اور ایک قول ہے کہ کوئی چیز جو مٹھی میں لی جائے وہ ضغث ہے اور حدیث میں آتا ہے فمنهم لاخذ الضِّغثِ جس سے مراد ہے منهم من مال من الدنیا شیئا ان میں سے وہ ہے جسے دنیا کا کچھ مال مل جائے (ل)

اضرب۔ ضرب کے معنی (مارنا) مشہور ہیں (مگر یہ متعدی ہے اور یہاں مفعول مذکور نہیں) اور ضَرَب کے معنی اِسراع فی السَّیر ہیں یعنی چلنے میں جلدی کرنا اور اس معنی میں حدیث میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ ضرب یعسوب الدین بذ نبہ یعنی فتنوں کے خوف سے زمین پر تیز چلا اور بعض نے ذنبہ کے معنی اَتباعہ کیے ہیں یعنی اپنے پیروؤں کے ساتھ چلا اور جاء فَلَانٌ یضرب کے معنی ہیں تیزی سے چلتا ہوا آیا۔ اور ضربَ المَجْدَ کے معنی ہیں کَسَبَ یعنی بزرگی حاصل کی (ل)

تحنث۔ حِنث قسم کی خلاف ورزی ہے اور حِنث یہ بھی ہے کہ انسان حق کو چھوڑ کر کوئی بات کہے اور حِنث بڑے گناہ یا شرک کو کہتے ہیں وکانوا یصرون علی الحنث العظیم (الواقعۃ ۵۶ - ۴۶) اور تَحَنَّثَ کے معنی ہیں عبادت کی گویا حِنث یعنی گناہ کا ازالہ کیا جیسے حدیث میں ہے کان یَخْلُو بِغارِ حِراءٍ فَیَتَحَنَّثُ فیه (ل)

حضرت ایوبؑ کے جھاڑو سے مارنے کا قصّہ: ان الفاظ کے معنی یوں کیے گئے ہیں کہ جھاڑو ہاتھ میں لے اور اس سے (اپنی بی بی کو) مار اور قسم نہ توڑ۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ایوبؑ نے اپنی بیماری کے ایام میں قسم کھائی تھی کہ وہ سو کوڑا اپنی بی بی کو لگائیں گے۔ لیکن چونکہ اس بی بی نے ان کی بڑی خدمت کی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی شفایابی پر انہیں یہ حکم دیا کہ سو تنکوں کا ایک جھاڑو لیکر اپنی بی بی کو مار لو اور یوں قسم پوری کر لو اور پھر اس کی بنا پر جواز حیلہ کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ اور دو تین حدیثیں بھی بیان کی جاتی ہیں جو اعلیٰ پایہ کی نہیں کہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں ایک دفعہ ایک ایسے شخص نے ارتکاب زنا کیا جو چل پھر نہ سکتا تھا تو آپ نے اسے سو تنکے کا ایک جھاڑو مروانے پر اکتفا کیا۔ اور ایسا ہی ذکر ایک بیمار اور ایک بوڑھے کے متعلق ہے۔ لیکن حضرت ایوب کے متعلق جو قصّہ بیان کیا جاتا ہے وہ بائبل میں مذکور نہیں۔ اور نہ حدیث میں ہے اور پھر قرآن کریم کے الفاظ میں اتنا کچھ بڑھانا پڑتا ہے اور قسموں کا اس طرح پورا کرنا حیلوں کا دروازہ کھولنا ہے جس سے قسم کی کچھ وقعت باقی نہیں رہ سکتی اور آنحضرت صلعم کا فعل اگر یہ حدیثیں صحیح ہوں تو صرف یہ بتاتا ہے کہ حالات کے ماتحت سزا میں نرمی کر دینی چاہیئے اور یہاں اگر جھاڑو ہی معنی لیے جائیں تو ہو سکتا ہے کہ مراد صرف یہ ہو کہ اپنے دشمنوں پر جب قابو ملے تو اُن سے ایسا معاملہ کر و جیسا کوڑوں کی جگہ ایک جھاڑو سے مار لیا جائے کیونکہ اعداء کا ذکر مفہوم میں داخل ہے اور کامیابی پر ان کو سزا دینا ایک قدرتی امر ہے اور شاید اس میں اشارہ اس طرف ہو کہ نبی کریم صلعم کا معاملہ نرمی اور تخفیف میں اپنے اعدا سے کیسا ہوگا اور حق تو یہ ہے کہ آپ نے ایک جھاڑو لے کر بھی کسی کو نہیں مارا بلکہ اپنے سارے کے سارے دشمنوں کو فتح مکّہ پر معاف کر دیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ مراد صرف اس قدر ہو کہ مال دنیا سے جو حصّہ دیا جاتا ہے وہ لے لو اور اس کے ساتھ مجد یا بزرگی کو کماؤ اور اللہ تعالیٰ کی معصیت نہ کر یعنی ایسا نہ ہو کہ مال دنیا کو اصل چیز سمجھ کر اس سے محبت کرنے لگو اور اسی قسم کا ذکر حضرت سلیمان کے متعلق بھی تھا اس لیے یہ معنی زیادہ موزون ہیں۔ اور اس طرح قرآن کریم میں کچھ بڑھانے کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔

۲۸۵۰ خالصۃ۔ خالص اور خالصۃ کے ایک ہی معنی ہیں (ت) اس میں اسی طرح ہے جیسے داھیۃ۔ راویۃ میں (غ) اور کہا جاتا ہے ھٰذا الشئ خالصۃٌ لك یعنی یہ چیز خاص کر تیرے لیے ہے ما فی بطون ھٰذہ الانعام خالصۃ لذکورنا (الانعام ۶ - ۱۳۹) ایسا ہی ھی للذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا خالصۃ یوم القیامۃ (الاعراف ۷ - ۳۲) یعنی قیامت کے دن کافر ان کے ساتھ ان نعمتوں میں شریک نہ ہونگے اور یہاں معنی ہیں کہ ہم نے انہیں دار یعنی دار آخرت کے ذکر سے خالص کیا ہے اور اخلصناھم کے معنی ہیں کہ ہم نے انہیں اس کے لیے خالص بنایا ہے کیونکہ وہ دار آخرت کو یاد دلاتے ہیں۔ اور یہ انبیاء

وَإِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ ﴿٤٧﴾
اور وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ لوگوں (اور) نیکوں میں سے تھے ٢٨٥١

وَاذْكُرْ إِسْمٰعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۖ وَكُلٌّ مِّنَ الْأَخْيَارِ ﴿٤٨﴾
اور اسماعیلؑ اور الیسعؑ اور ذوالکفلؑ کو یاد کر اور وہ سب نیکوں میں سے تھے۔

هٰذَا ذِكْرٌ ۚ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٤٩﴾
یہ نصیحت ہے اور متقیوں کے لیے اچھا ٹھکانا ہے ٢٨٥٢

جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْأَبْوَابُ ﴿٥٠﴾
ہمیشگی کے باغ (جن کے) دروازے ان کے لیے کھولے گئے ہیں۔

مُتَّكِئِينَ فِيهَا يَدْعُونَ فِيهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ وَّشَرَابٍ ﴿٥١﴾
ان میں تکیے لگائے ہوئے ہونگے ان میں بہت سے پھل اور پینے کی چیزیں بھی منگوائیں گے۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ أَتْرَابٌ ﴿٥٢﴾
اور ان کے پاس نیچی نگاہوں والی ہم عمریں ہوں گی ٢٨٥٣

هٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿٥٣﴾
یہ وہ ہے جن کا تمھیں حساب کے دن کے لیے وعدہ دیا جاتا تھا۔

إِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهُ مِنْ نَّفَادٍ ﴿٥٤﴾
یہ ہمارا (دیا ہوا) رزق ہے جو ختم نہ ہو گا۔

هٰذَا ۚ وَإِنَّ لِلطّٰغِينَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿٥٥﴾
یہ (متقیوں کے لیے ہے) اور سرکشوں کے لیے بہت بُرا ٹھکانا ہے

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٥٦﴾
(یعنی) جہنم اس میں داخل ہوں گے سو وہ بُری جگہ ہے۔

هٰذَا ۙ فَلْيَذُوقُوهُ حَمِيمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿٥٧﴾
یہ پس چاہیئے کہ اسے چکھیں اُبلتا ہُوا اور حد سے زیادہ ٹھنڈا پانی ہے ٢٨٥٤

کی شان ہے اور یا یہ مطلب ہے کہ وہ آخرت اور رجوع الی اللہ کا ذکر بہت کرتے ہیں (ل) اور یا ب سبب کے لیے ہے یعنی ایک خالص خصلت کی وجہ سے جو ذکری الدار ہے انہیں خالص بنایا ہے۔

ع٢٨٥١ اخیار۔ خَیرًا ور شَرّ کا استعمال دو طرح پر ہے ایک اسم کے طور پر جیسے ما انفقتم من خیر (البقرۃ٢۔ ٢١٥) ان علمتم فیھم خیرا (النور٢٤۔ ٣٣) یدعون الی الخیر (آل عمران٣۔ ١٠٤) اور دوسرا وصف کے طور پر اور اس وقت ان کی تقدیر افعل منہ پر ہوتی ہے جیسے ھٰذا خیرٌ من ذاك اسی کے مطابق ہی نأت بخیر منھا (البقرۃ٢۔ ١٠٦) ان تصوموا خیر لکم (البقرۃ٢۔ ١٨٤) جہاں اسم یا وصف مراد ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہی فان خیر الزاد التقوی (البقرۃ٢۔ ١٩٧) اور خیرات حسان (الرحمٰن٥٥۔ ٧) میں اصل خَیّرَاتٌ ہے اور خَیّرٌ فضیلت والا ہے جو خیر سے مختص ہو اور تخفیف کر کے کہا جاتا ہے رجل خَیْرٌ وامراۃ خیرۃ اور خیرات سے مراد ہیں مختارات یعنی چُنی ہوئی یا برگزیدہ جن میں کوئی عیب نہیں (غ) اخیار یہاں اسی معنی میں خیر کی جمع ہے۔ اور مصطفین مصطفٰی کی جمع ہے دیکھو ع١٦٥

ع٢٨٥٢ ھٰذا ذکر میں اشارہ اس کی طرف ہے جو گذر چکا یعنی یہ ان کی بزرگی اور عظمت کا اظہار ہے جو اس دنیا میں ہوتا ہے اور ذکر بمعنی شرف آتا ہے اور یا مطلب یہ ہے کہ یہ گذشتہ انبیاء کا ذکر ہے اور آگے فرمایا جو اب تقوٰی اختیار کریں، اُن کے لیے بھی اچھا مآب ہے۔

ع٢٨٥٣ اتراب۔ تُراب مٹی۔ خلقکم من تراب (الروم٣٠۔ ٢٠) یلیتنی کنت ترابا (النبأ٧٨۔ ٤٠) اور تَرِب کے معنی ہیں مٹی سے مل گیا یا فقیر ہو گیا او مسکینا ذا متربۃ (البلد٩٠۔ ١٦) یعنی فقر کی وجہ سے مٹی سے ملا ہوا۔ اور تَرِیْبَۃ پسلی کو کہتے ہیں اور اس کی جمع ترائب ہے من بین الصلب والترائب (الطارق٨٦۔ ٧) اور تِرْب، جس کی جمع اَتْراب ہے ہمزاد کو کہتے ہیں یعنی ساتھ پیدا ہوا ہوا اور یہ اکثر مونث پر بولا جاتا ہے اور اتراب کی تفسیر ثعلب نے امثال سے کی ہے یعنی ان کی مثل اور یہ پسندیدہ ہے اس لیے کہ وہاں ولادت کوئی نہیں (ل)۔

بہشت میں عورتوں کے ہونے پر دیکھو ع٢٧٨٥ اور قاصرات الطرف کی تشریح بھی وہیں گذر چکی ہے اور اتراب بھی انہیں کہا ہے یعنی وہ ساتھ پیدا ہوئی ہوئی ہیں ظاہر ہے کہ مراد اس سے اہل جنت کے ساتھ پیدا ہوئی ہیں اور اہل جنت کی ولادت سے اُن کا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا مراد نہیں، بلکہ ان کی وہ روحانی پیدائش مراد ہے جو اُنہیں اہل جنت بناتی ہے گویا ان نعمائے جنت کی پیدائش اعمال صالحہ کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔

ع٢٨٥٤ غساق۔ غسق دیکھو ع١٨٦٥ غَسَقَتْ عَیْنُہٗ کے معنی ہیں اس کی آنکھ سے آنسو بہے اور غَسَقَ الجرحُ زخم سے زرد پانی بہا اور غاسِق رات کو کہتے ہیں اور زجاج کا قول ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ رات دن کی نسبت ٹھنڈی ہوتی ہے اور غاسق کے معنی بارد یعنی ٹھنڈ ہیں اور غسّاق کے معنی تین طرح پر کیے

وَّاٰخَرُ مِنۡ شَكۡلِهٖۤ اَزۡوَاجٌ ؕ ۝۵۸

اور اسی صورت کی اور (سزا) رنگا رنگ کی (موجود ہے)

هٰذَا فَوۡجٌ مُّقۡتَحِمٌ مَّعَكُمۡ ۚ لَا مَرۡحَبًۢا بِهِمۡ ؕ اِنَّهُمۡ صَالُوا النَّارِ ۝۵۹

یہ ایک فوج ہے جو تمہارے ساتھ اندھا دھند داخل ہونے والی ہے ان کے لیے فراخی نہیں کیونکہ وہ آگ میں داخل ہونے والے ہیں ۲۸۵۵ع

قَالُوۡا بَلۡ اَنۡتُمۡ ۟ لَا مَرۡحَبًۢا بِكُمۡ ؕ اَنۡتُمۡ قَدَّمۡتُمُوۡهُ لَنَا ۚ فَبِئۡسَ الۡقَرَارُ ۝۶۰

کہیں گے بلکہ تم (ایسے ہو) تمہارے لیے کوئی فراخی نہیں، تم نے اسے ہمارے لیے پہلے بھیجا، سو کیا ہی بُری ٹھیرنے کی جگہ ہے۔

قَالُوۡا رَبَّنَا مَنۡ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدۡهُ عَذَابًا ضِعۡفًا فِى النَّارِ ۝۶۱

کہیں گے اے ہمارے رب جس نے اسے ہمارے لیے آگے بھیجا تو اس کے لیے آگ میں عذاب کو دوچند بڑھا۔

وَقَالُوۡا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمۡ مِّنَ الۡاَشۡرَارِ ؕ ۝۶۲

اور کہیں گے ہمیں کیا ہوا ہم ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جنھیں ہم شریروں میں سے گنتے تھے۔

اَتَّخَذۡنٰهُمۡ سِخۡرِيًّا اَمۡ زَاغَتۡ عَنۡهُمُ الۡاَبۡصَارُ ۝۶۳

کیا ہم ان کی ہنسی اڑاتے تھے یا (ہماری) آنکھیں اُن سے پھر گئی ہیں ۲۸۵۶ع

اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهۡلِ النَّارِ ۝۶۴ ع

یہ دوزخ والوں کا ایک دوسرے سے جھگڑنا یقیناً سچ ہے۔

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا مُنۡذِرٌ ۖ وَّمَا مِنۡ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ۚ ۝۶۵

کہہ میں صرف ڈرانے والا ہوں اور سوائے اللہ اکیلے فوقیت والے کے کوئی معبود نہیں۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا الۡعَزِيۡزُ الۡغَفَّارُ ۝۶۶

آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، غالب بخشنے والا۔

قُلۡ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيۡمٌ ۙ ۝۶۷

کہہ یہ ایک عظیم الشان خبر ہے ۲۸۵۷ع

گئے ہیں ابن عباس اور ابن مسعود سے اس کے معنی زمہریر مروی ہیں یعنی سخت ٹھنڈا اور ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ پانی ہے جو دوزخیوں کے زخموں سے بہے گا اور ایک قول ہے کہ اس سے مراد ان کے آنسو ہیں جو آنکھوں سے بہیں گے اور پہلے قول کے مطابق ایک قول ہے کہ غسّاق بدبودار سخت ٹھنڈا ہے جسکی ٹھنڈک اُبلتے ہوئے پانی کی حرارت کی طرح جلا دیتی ہے (ل) اور حمیم یا اُبلتے ہوئے پانی کے مقابل پر سخت ٹھنڈا زیادہ موزوں معنی بھی ہیں۔ جیسے دوسری جگہ ہے لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا (الدھر ۷۶ - ۱۳) اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے اپنے قوٰی کو اعتدال پر نہیں رکھا یا افراط کی طرف نکل گئے یا تفریط کی طرف اسی طرح ان کی غذا بھی یا حد سے زیادہ گرم ہوگی یا حد سے زیادہ سرد جزاء وفاقا۔

۲۸۵۵ع مقتحم ۔ قَحُمَ بہت بوڑھا اور قَحَمَ فی الامر اور اِقۡتَحَمَ کے معنی ہیں اپنے آپ کو بغیر فکر و اندیشہ کے ڈال دیا۔ یا بلا سوچے سمجھے (ل)، یا اِقۡتِحَام کے معنی ہیں کسی ڈرانے والی سختی میں گھس جانا فلا اقتحم العقبۃ (البلد ۹۰۔ ۱۱) (غ)

مرحبا دیکھو ۱۳۵۸ع اور آنے والے کو بطور دعا کہا جاتا ہے اھلاً و مرحبًا یعنی تو اہل میں آگیا اور فراخی میں آگیا اور مرحبًا سے مراد ہے اَنۡزِلۡ فِی الرَّحۡبِ والسَّعَۃِ فراخی اور وسعت میں ٹھیر اور نصب بوجہ فعل محذوف ہے (ل)

فوج مقتحم ۔ اندھا دُھند داخل ہونے والی۔ فوج سے مراد وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے پیچھے چل کر اور اپنی عقل سے کام نہ لیکر گمراہ ہوئے یعنی اتباع۔ اور لا مرحبا بھم متبوع سرداروں کی ان مقلدوں کے لیے دعا ہے۔

۲۸۵۶ع پہلی آیت میں اور یہاں اشارہ مومنوں کی طرف ہے یعنی ہم تمسخر کر کے ان کی تحقیر کرتے اور انہیں بُرا کہتے تھے یا وہ کہیں آگ میں ہی ہیں اور ہم انہیں دیکھتے نہیں۔

۲۸۵۷ع ھو میں اشارہ قرآن کریم کی طرف ہے اور یا وہ چیز جس سے ڈرایا جاتا ہے۔

اَنۡتُمۡ عَنۡهُ مُعۡرِضُوۡنَ ﴿٦٨﴾
تم اس سے منہ پھیر رہے ہو۔

مَا كَانَ لِيَ مِنۡ عِلۡمٍۢ بِالۡمَلَاِ الۡاَعۡلٰٓى اِذۡ يَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿٦٩﴾
مجھے اعلیٰ درجہ کے سرداروں کا کوئی علم نہیں، جب وہ جھگڑتے ہیں ۲۸۵۸

اِنۡ يُّوۡحٰٓى اِلَىَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ﴿٧٠﴾
میری طرف سوائے اس کے کچھ وحی نہیں کیا جاتا کہ میں صرف ڈرانے والا ہوں

اِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِيۡنٍ ﴿٧١﴾
جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں ۲۸۵۹

فَاِذَا سَوَّيۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِيۡنَ ﴿٧٢﴾
سو جب میں اس کی تکمیل کردوں اور اپنی روح اس میں پھونکوں تو اس کے لیے فرمانبرداری کرتے ہوئے گر جاؤ۔

فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ ﴿٧٣﴾
تو سب فرشتوں کُل کے کُل نے فرمانبرداری کی۔

اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَ ؕ اِسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿٧٤﴾
مگر ابلیس (نے نہ کی) اس نے تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

۲۸۵۸ حدیث میں ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلعم نماز فجر میں بہت دیر سے آئے پھر آپ نے نماز پڑھا کر فرمایا کہ میں آج رات اُٹھا اور نماز پڑھی اور پھر نماز میں اونگھ آگئی یہاں تک کہ میں جاگ اُٹھا پھر میں نے اپنے رب کو احسن صورت پر دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد کیا تو جانتا ہے کہ ملأ اعلیٰ کس بارے میں جھگڑتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے اپنی ہتھیلی میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھی تو میرے لیے ہر چیز روشن ہو گئی اور میں نے پہچان لیا۔ تب فرمایا اے محمد کیا تو جانتا ہے ملأ اعلیٰ کس بارے میں جھگڑتے ہیں۔ میں نے کہا کفّاروں کے بارے میں۔ کہا کفارے کیا ہیں۔ میں نے کہا جماعت کی طرف قدم اُٹھا کر جانا اور نماز کے بعد مسجدوں میں بیٹھنا اور مشکلات کے وقت وضو کو پورا کرنا۔ کہا اور درجات کیا ہیں۔ میں نے کہا کھانا کھلانا اور کلام میں نرمی کرنا اور نماز پڑھنا جب لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ فرمایا مانگ۔ میں نے کہا میں تجھ سے نیکیوں کا کرنا اور منکرات کا ترک اور مسکینوں کی محبت مانگتا ہوں اور یہ کہ تو میری حفاظت فرمائے اور مجھ پر رحم کرے اور جب تو کسی قوم کو فتنہ میں ڈالنا چاہے تو مجھے بغیر فتنہ کے ڈالنے کے وفات دیجیو اور میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں اور اس کی محبت جو تجھ سے محبت کرے اور اس عمل کی محبت جو مجھے تیری محبت سے قریب کرے اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ یہ حق ہے اسے پڑھو اور سیکھو اور یہ مشہور خواب کی حدیث ہے اور جو اسے جاگتے میں سمجھتا ہے وہ غلطی کرتا ہے (ت)

خواب میں رویت باری تعالیٰ۔ لیکن مفسرین کے نزدیک اس حدیث میں جس اختصام کا ذکر ہے وہ اس آیت قرآنی میں مذکور نہیں (اور خواب میں جو تمثلات انسان کو دکھائے جاتے ہیں ان سے بعض وقت سطحی نظر کے لوگ ٹھوکر کھا کر اعتراض کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی صفت تو ہے لیس کمثلہ شئی لیکن خواب میں جو کچھ اللہ تعالیٰ دکھاتا ہے وہ دوسرے عالم کی بات ہوتی ہے اور علیحدہ حواس ہوتے ہیں۔ ورنہ سچ مچ اللہ تعالیٰ انسان کی صورت پر متمثل نہیں ہوتا) مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں ملأ اعلیٰ کا وہ اختصام مراد ہے جو آدم کے خلیفہ بناتے وقت انہوں نے کیا گویا فرشتے کہتے تھے کہ آدم کو خلیفہ نہ بنایئے۔ مگر جیسا تفصیل سے دوسری جگہ بیان ہو چکا یہ بات درست نہیں کہ فرشتوں نے آدم کے خلیفہ بنانے پر کوئی جھگڑا اللہ تعالیٰ سے کیا ہو اور یہاں یختصمون میں ضمیر کفار کی طرف جاتی ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ جس بات سے ڈرایا جاتا ہے وہ تو آکر رہے گی لیکن کب آئے گی اس کا مجھے علم نہیں اس کا علم ملأ اعلیٰ کو ہے یعنی ان فرشتوں کو جن پر اللہ تعالیٰ اپنے رازوں کا اظہار فرماتا ہے۔ پیغمبر پر سارا علم غیب ظاہر نہیں کیا جاتا اور نذیر مبین سے جو آگے آتا ہے اور منذر سے جو شروع رکوع میں ہے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے اور حدیث میں جو ملاء اعلیٰ میں اختصام کا ذکر ہے تو اس کی کیفیت کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ ملأ اعلیٰ خدا سے جھگڑتے ہیں کیونکہ وہ لا یعصون اللہ ما امرھم کے مصداق ہیں اور نہ یہ مراد ہو سکتی ہے کہ وہ باہم جھگڑتے ہیں یعنی بعض کہتے ہیں کہ یہ ثواب کا کام ہے اور بعض یہ کہ یہ نہیں بلکہ مراد اس سے صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس سے تعلق ہے اور دوسری طرف خدمت مخلوق تو اختصام سے مجازی رنگ میں مراد یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس بات کو دوسری پر فضیلت ہے گویا یہ دونوں باتیں ایسی اعلیٰ درجے کی ہیں کہ ملاء اعلیٰ بھی نہیں جانتے کہ کس کو ان میں سے دوسری پر فضیلت دیں۔

۲۸۵۹ یہ مضمون پہلے بیان ہو چکا ہے مگر یہاں اسے لانے کی غرض یہ ہے کہ شیطان کا راستبازوں کی مخالفت کرنا قدیم قانون ہے۔ مگر شیطان اور اس کے نمائندے آخر کار مغلوب ہوتے ہیں۔

قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿۷۵﴾
کہا، اے ابلیس کس چیز نے تجھے روکا کہ تو اس کی فرمانبرداری کرتا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے، کیا تو نے تکبّر کیا یا تو عالی مرتبہ (لوگوں) میں سے ہے ع۲۸۶۰

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۷۶﴾
اس نے کہا، مَیں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۷۷﴾
کہا تو اس (حالت) سے نکل جا، کیونکہ تو دُور کیا گیا ہے۔

وَّ اِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْۤ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۷۸﴾
اور تجھ پر میری لعنت قیامت کے دن تک ہے۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۷۹﴾
کہا میرے رب تو مجھے اس دن تک مہلت دے جب وہ اٹھائے جائیں۔

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۸۰﴾
کہا تو ان میں سے ہے جنھیں مہلت دی گئی۔

اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۸۱﴾
اس دن تک جس کا وقت معلوم ہے۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾
کہا تو تیری عزّت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۸۳﴾
سوائے ان میں سے تیرے خالص بندوں کے۔

قَالَ فَالْحَقُّ ؗ وَ الْحَقَّ اَقُوْلُ ﴿۸۴﴾
کہا تو حق یہ ہے اور میں حق ہی کہتا ہوں۔

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَ مِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۵﴾
مَیں ضرور جہنم کو تجھ سے اور ان سب سے جو تیری پیروی کریں بھر دوں گا۔

قُلْ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴿۸۶﴾
کہہ میں تم سے اس پر اجر نہیں مانگتا، اور میں بناوٹ کرنے والوں میں سے نہیں ہوں ع۲۸۶۱

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾
یہ صرف جہانوں کے لیے بزرگی (کا موجب) ہے۔

وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿۸۸﴾ ع
اور تم ضرور اس کی خبر کو ایک وقت کے بعد جان لوگے۔

ع۲۸۶۰ انسان کو دو ہاتھوں سے پیدا کرنے میں اشارہ: یدیّ یا دونوں ہاتھوں سے کیا مراد ہے؟ اس کی ایک توجیہ یہ کی گئی ہے کہ جس کام کی طرف خاص توجہ ہو اسے دونوں ہاتھوں سے انجام کو پہنچایا جاتا ہے تو گویا مطلب یہ ہے کہ جسے میں نے ایک خصوصیت دے کر پیدا کیا ہے اور دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہ بطور تاکید ہے جیسے ارجع البصر کرتین اور بعض نے کہا کہ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اِسمیں قوائے ملکوتی اور قوائے حیوانی جمع کیے گئے ہیں اور یہ آخری توجیہ لطیف ہے اور ام کنت من العالین سے یہ مراد ہے کہ فی الواقع تو بلند مرتبہ والوں میں سے ہے اور یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ شیطان کا تعلق سفلی یا حیوانی خواہشات سے ہے نہ اعلیٰ یا ملکوتی صفات سے۔

ع۲۸۶۱ متکلّف۔ کَلَف۔ اصل میں وہ چیز ہے جو چہرہ پر ظاہر ہو جاتی ہے جیسے تِل اور کَلَف اور کُلْفَۃ سُرخی اور سیاہی ملی ہوئی یا سیاہی ہے جو چہرہ پر ظاہر ہو جائے اور جلد کے رنگ کو بدل دے (ل) اور تکلّف وہ ہے جسے انسان کرے درآنحالیکہ اس کے چہرہ پر کَلَف کا اظہار ہو اور اس کے ساتھ اس کے کرنے میں اسے مشقت بھی کرنی پڑے پھر کُلفۃ عرف میں مشقت کا نام ہو گیا ہے اور تکلف اس کا نام ہے جو مشقت سے یا بناوٹ سے کیا جائے اس لیے تکلّف دو طرح پر ہے ایک قابل تعریف اور وہ یہ ہے کہ انسان اس کا قصد کرے اور اس کی غرض یہ ہو کہ وہ امر اس پر آسان ہو جائے اور اس سے اس کو محبت پیدا ہو جائے اسی لحاظ سے تکلیف کا استعمال عبادات میں ہے اور دوسرا یہ ہے کہ انسان دوسروں کو دکھانے کے لیے اس کا قصد کرے اور اسی معنی میں یہاں متکلف ہے اور حدیث میں بھی ہے انا و اتقیاء امتی بُرَاءٌ من التکلف مَیں اور میری امت کے متقی تکلّف سے بیزار ہیں۔

اٰیاتھا ۷۵ (۳۹) سُوْرَۃُ الزُّمَرِ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتھا ۸

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○
تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ①
اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ
فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ②
اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِیْنَ
اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُہُمْ
اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی ؕ اِنَّ اللّٰہَ
یَحْکُمُ بَیْنَہُمْ فِیْ مَا ہُمْ فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ ۬ؕ
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہْدِیْ مَنْ ہُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ ③
لَوْ اَرَادَ اللّٰہُ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰی
مِمَّا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَہٗ ؕ ہُوَ اللّٰہُ
الْوَاحِدُ الْقَہَّارُ ④

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
یہ کتاب اللہ تعالیٰ غالب حکمت والے کی طرف سے اتاری گئی ہے۔
ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے سو اللہ
کی ایسی عبادت کر کہ فرمانبرداری صرف اسی کی ہو۔
سنو خالص فرمانبرداری اللہ کے لیے ہی ہے اور جو لوگ اس
کے سوائے ولی بناتے ہیں (کہتے ہیں کہ) ہم ان کی عبادت صرف
اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے نزدیک کر دیں۔ اللہ تعالیٰ
ان کے درمیان ان باتوں میں فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں
اللہ تعالیٰ اسے منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا جو جھوٹا ناشکر گزار ہے ۲۸۶۲
اگر اللہ چاہتا کہ بیٹا بنائے تو وہ اپنی مخلوق سے جسے چاہتا،
چن لیتا، بے عیب ذات ہے وہ اللہ تعالیٰ اکیلا
سب کے اوپر ہے ۲۸۶۳

نام: اس سورت کا نام الزمر ہے اور اس میں آٹھ رکوع اور ۷۵ آیات ہیں سورت کا نام دو گروہوں یعنی مومنوں اور کافروں کے گروہوں سے لیا گیا ہے جن کا ذکر اس سورت میں ہے۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی ضرورت بیان کی ہے دوسرے میں فرمانبرداری کرنے والوں کے اجر اور نافرمانوں کی سزا کا مقابلہ کیا ہے تیسرے میں فرمانبرداری اور نافرمانی کے نتائج بتائے ہیں چوتھے میں نافرمانوں کی سزا کا ذکر ہے۔ پانچویں میں یہ کہ وہ سزا ٹل نہیں سکتی۔ چھٹے میں رحمت الٰہی کی وسعت کو بیان کر کے کہ وہ سب گناہ بخشنے کو تیار ہے ساتویں میں حساب کتاب اور آٹھویں میں ہر دو فریق کے آخری ٹھکانے کا ذکر ہے۔

تعلق اور زمانہ نزول: پچھلی سورت میں مومنوں کو بتایا تھا کہ کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ مصائب کو برداشت کریں اور ان میں صدق دکھائیں اب یہاں ان دونوں گروہوں کا مفصل ذکر کیا ہے یعنی ایک وہ گروہ جو حق کو پھیلانے کے لیے کھڑا کیا گیا ہے۔ اور دوسرا وہ جو حق کو قبول نہیں کرتا بلکہ اس کی مخالفت پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ زمانہ نزول وہی ہے جو اس مجموعہ کی باقی سورتوں کا۔

۲۸۶۲ للہ الدین الخالص حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم اپنے مال لوگوں کو دیتے ہیں تاکہ ہماری شہرت ہو اور تاکہ ہمیں اجر ملے فرمایا اللہ تعالیٰ کسی چیز کو قبول نہیں کرتا سوائے اس کے جو خالص اس کے لیے ہو۔ پس یہاں سکھایا ہے کہ نیکی کرنا محض اللہ تعالیٰ کے لیے ہو نہ اس لیے کہ اس پر کچھ اجر ملے گا اور اللہ کے لیے ہونے سے یہ مراد ہے کہ اسے اپنا فرض سمجھ کر کیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذمے رکھا ہے۔ نیکی کرنا درحقیقت فرائض انسانی میں سے ایک فرض ہے اور یہ دین اسلام کی سب سے پہلی تعلیم ہے۔ یہی توحید کامل ہے اور کسی اور غرض کو مدنظر رکھ کر کام کرنا شرک کا ایک باریک پہلو ہے اسی لیے اس کیساتھ ہی غیر اللہ کی عبادت کا ذکر کیا جو موٹی قسم شرک کی ہے اور بتایا کہ بت پرست بھی یہی عذر کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے بت پرستی کرتے ہیں۔ یہ عذر بہت سے پیر پرستوں کا بھی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان پیروں کی وساطت سے ہمیں خدا کے دربار میں رسائی حاصل ہوتی ہے۔ اور بعض بت پرست یہ کہتے ہیں کہ ہم صرف تصور جمانے کی خاطر بتوں کو سامنے رکھتے ہیں درحقیقت ان سب باتوں کا ماحصل وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان کیا باطل پرستی کبھی حق پرستی تک نہیں پہنچا سکتی۔

۲۸۶۳ عقیدہ ابنیت: یہاں عیسائی عقیدہ کی تردید کی ہے کیونکہ سب سے بڑا شرک یہی ہے عیسائی باپ بیٹے اور روح القدس کی ایک ذات کے تین اقنوم قرار

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۵

اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے ہر ایک ایک وقتِ مقرر کے لیے چلتا ہے سنو وہ غالب بخشنے والا ہے ۲۸۶۴

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۶

تمھیں ایک ہی اصل سے پیدا کیا، پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور تمھارے لیے چارپایوں کے آٹھ جوڑے اتارے۔ وہ تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے۔ پیدایش کے بعد پیدایش ہے تین اندھیروں میں، یہ اللہ تمھارا رب ہے اسی کی بادشاہت ہے، اس کے سوائے کوئی معبود نہیں پھر تم کس طرح پھر جاتے ہو ۲۸۶۵

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۟ وَ لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَ اِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۷

اگر تم ناشکری کرو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمھارے لیے پسند کرتا ہے اور کوئی بوجھ اٹھانیوالا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا پھر تمھارے رب کی طرف تمھارا لوٹ کر جانا ہے پس وہ تمھیں اس کی خبر دیگا جو تم کرتے تھے۔ وہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ

اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے وہ اپنے رب کو اس کی طرف رجوع کرتا ہوا پکارتا ہے پھر جب وہ اسے اپنی طرف

دیتے ہیں سبحانہ۔ الواحد۔ القہار کہہ کر بتایا کہ یہ تو ہو سکتا ہی نہیں اور لو اراد اللہ اس لیے فرمایا کہ ارادہ الٰہی تو کسی ضرورت پر ظہور پذیر ہوتا ہے اگر جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں فی الواقع یہ ضرورت بھی ہوتی کہ خدا کا کوئی بیٹا ہو۔ تو پھر بھی اس کی ذات میں شرک نہ ہو سکتا تھا بلکہ وہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو بیٹا بنانے کے لیے چن لیتا اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں جو پہلے انبیا سے ہوا اگر کہیں بیٹے کا لفظ آیا ہے تو محض اس معنی سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ بندہ ہے کیونکہ جو لوگ اللہ تعالےٰ کی صفات کو اپنے اندر لے لیتے ہیں۔ وہ ایک گونہ مشابہت (اللہ کی ذات اس لفظ کے عام معنی میں مشابہت اور مماثلت سے پاک ہے) اللہ تعالیٰ سے پیدا کر لیتے ہیں اور یوں مجاز کے طور پر نہ حقیقت کے رنگ میں ان پر بیٹے کا لفظ بولا جا سکتا ہے۔

۲۸۶۴ یکوّر۔ کَوْر ایک چیز کا لپیٹنا اور اس کے بعض کا بعض سے ملانا ہے جیسے پگڑی کا سر پر لپیٹنا اور رات اور دن کی تکویر میں ان کی کمی بیشی کی طرف اشارہ ہے (غ)۔

۲۸۶۵ انزل لکم من الانعام صاف بتاتا ہے کہ انزال کے معنی لازماً اوپر سے اتارنا نہیں بلکہ ایک شے کے اسباب مہیا کرنا ہیں۔ دیکھو ع۱۴ اور یہ حدیث کہ اللہ تعالےٰ نے چارپایوں کو جنت میں پیدا کیا پھر وہاں سے اتارا۔ صحیح نہیں (د)

اور تین اندھیروں سے مراد پیٹ۔ رحم اور مشیمہ کے پردے لیے گیے ہیں اور بعض نے پیٹھ اور پیٹ اور رحم کی ظلمت مراد لی ہے (د) مطلب یہ ہے کہ اگر تمھاری پہلی پیدایش بھی تمھاری نظروں سے مخفی تیار ہوتی ہے تو دوسری پیدایش اگر تمھاری نظروں سے مخفی ہے تو تعجب کیوں کرتے ہو۔

نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوٓا إِلَيْهِ مِن قَبْلُ وَجَعَلَ لِلَّهِ أَندَادًا لِّيُضِلَّ عَن سَبِيلِهِۦ ۚ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا ۖ إِنَّكَ مِنْ أَصْحَٰبِ النَّارِ ﴿٨﴾

سے نعمت عطا کرتا ہے اسے بھول جاتا ہے جس کے لیے (اسے) پہلے پکارتا تھا اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہمسر بناتا ہے تاکہ اس کے رستے سے (لوگوں کو) گمراہ کرے۔ کہہ اپنی ناشکری سے تھوڑا فائدہ اُٹھالے تُو آگ والوں میں سے ہے۔

أَمَّنْ هُوَ قَٰنِتٌ ءَانَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَقَآئِمًا يَحْذَرُ الْءَاخِرَةَ وَيَرْجُوا رَحْمَةَ رَبِّهِۦ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَٰبِ ﴿٩﴾ ع ۱۵

کیا وہ جو رات کے وقتوں میں سجدہ کرکے اور کھڑا ہوکر فرماں برداری کرنے والا ہے آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہے (نافرمان کے برابر ہے) کہہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں؟ صرف خالص عقل والے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

قُلْ يَٰعِبَادِ الَّذِينَ ءَامَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَأَرْضُ اللَّهِ وَٰسِعَةٌ ۗ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّٰبِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿١٠﴾

کہہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو اپنے رب کا تقویٰ کرو، جو لوگ بھلائی کرتے ہیں ان کے لیے اس دنیا میں بھلائی ہے اور اللہ کی زمین فراخ ہے۔ صابروں کو اُن کا اجر ضرور بے حساب ملے گا۔ ۲۸۶۶

قُلْ إِنِّيٓ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ ﴿١١﴾

کہہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مَیں اللہ کی عبادت اس کے لیے فرمانبرداری کو خالص کرتا ہوا کروں۔

وَأُمِرْتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٢﴾

اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے بڑھ کر فرمانبردار بنوں۔

قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٣﴾

کہہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ ۲۸۶۷

قُلِ اللَّهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُۥ دِينِي ﴿١٤﴾

کہہ میں اللہ کی ہی اس کے لیے اپنی فرمانبرداری کو خالص کرتا ہوا عبادت کرتا ہوں۔

فَاعْبُدُوا مَا شِئْتُم مِّن دُونِهِۦ ۗ قُلْ إِنَّ الْخَٰسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوٓا أَنفُسَهُمْ وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ الْقِيَٰمَةِ ۗ أَلَا ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ﴿١٥﴾

تو تم اس کے سوائے جس کی چاہو عبادت کرو۔ کہہ گھاٹے میں رہنے والے وہ ہیں جنھوں نے قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو گھاٹے میں رکھا۔ دیکھو یہی کھلا گھاٹا ہے۔

۲۸۶۶ یا عبادی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایتاً قول ہے کہ یہاں نیکی کرنے والوں کو اس دنیا میں بھلائی کا وعدہ دیا ہے اور ارض اللہ واسعۃ میں یہ اشارہ ہے کہ ایک جگہ حق کے قبول کرنے سے روکا جاتا ہے تو دوسری جگہ چلے جاؤ اور یہ ہجرت کی طرف اشارہ ہے اور صابر کے لفظ میں بھی صاف بتا دیا کہ اللہ کی راہ میں بڑے بڑے دکھ بھی اٹھانے پڑیں گے۔ مگر آخر کار کامیابی ہے ؛

۲۸۶۷ اس میں بتایا کہ سکھ صرف فرمانبرداری سے ملتا ہے اگر سید البشر کے منہ سے بھی یہ لفظ کہلوائے گیے ہیں تو آج مسلمان اللہ تعالےٰ کے قوانین کی نافرمانی کرکے کس طرح سکھ کے امیدوار ہو سکتے ہیں اول المسلمین میں اور یہاں اصل الاصول یہ ہے کہ قانون الٰہی کی کامل فرمانبرداری ہو ؛

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ؕ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ؕ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ۝۱۶

ان کے لیے ان کے اوپر آگ کے سائبان ہوں گے اور ان کے نیچے (ایسے ہی) سائبان - اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے اے میرے بندو تم میرا تقوےٰ اختیار کرو ۲۸۶۸

وَ الَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝۱۷

اور وہ جو طاغوت کی عبادت سے بچتے ہیں اور اللہ کی طرف جھکتے ہیں ان کے لیے خوشخبری ہے سو میرے بندوں کو خوشخبری دو۔

الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۱۸

وہ جو بات کو سنتے ہیں پھر اس کی اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے اور یہی خالص عقل والے ہیں ۲۸۶۹

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ؕ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِى النَّارِ ۝۱۹

تو کیا وہ جس پر عذاب کا فتوےٰ سچ ثابت ہوا، سو کیا تو اسے بچا سکتا ہے جو آگ میں جا رہا ہے ۲۸۷۰

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ۝۲۰

لیکن وہ لوگ جو اپنے رب کا تقوےٰ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے بلند مقامات ہیں ان کے اوپر (اور) بلند مقامات بنے ہوئے ہیں ۲۸۷۱ ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں - اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا ہوا ہے - اللہ تعالیٰ وعدے کا خلاف نہیں کرتا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِى الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ۝۲۱ ع ۱۶

کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی اتارتا ہے۔ پھر اسے چشمے بنا کر زمین میں چلاتا ہے پھر اس کے ساتھ کھیتی اگاتا ہے جس کے مختلف رنگ ہیں پھر وہ خشک ہو جاتی ہے۔ تب تو اسے زرد دیکھتا ہے پھر وہ اسے چورا چورا کر دیتا ہے۔ اس میں عقل والوں کے لیے نصیحت ہے ۲۸۷۲

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ

بھلا جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ

ع ۲۸۶۸ گویا آگ ہی اوپر ہوگی اور آگ ہی نیچے یعنی چاروں طرف سے احاطے کیے ہوئے اس سے بھی معلوم ہوا کہ دوزخ میں مکان کی کیفیت وہ نہیں جو یہاں ہے ؛

ع ۲۸۶۹ یا تو قول عام ہے اور مطلب یہ ہے کہ بری باتوں کے پیچھے نہیں لگتے اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں اور یا قول سے مراد قرآن کریم ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس میں اگر بدلہ لینے کی اجازت ہے تو اس سے بہتر یہ بھی ہے کہ عفو کیا جائے پس وہ اعلیٰ درجہ کی باتوں کی پیروی کرتے ہیں ؛

ع ۲۸۷۰ یعنی جو آگ کی طرف چلا جا رہا ہے پیغمبر اسے جبراً نہیں بچا سکتا ؛

ع ۲۸۷۱ اس میں اشارہ جنت کی ترقیات غیر متناہی کی طرف ہے کتنے بھی بلند مقام پر پہنچ جائیں اس سے آگے اور بلند مقامات ہوں گے ؛

ع ۲۸۷۲ یھیج - ھاج (مصدر ھیجان) ایک چیز ضرر یا مشقت کی وجہ سے اٹھی اور ھَیَّجَ اسے اٹھایا یا اکسایا اور سبزی کے متعلق ھاج کہا جاتا ہے جب وہ خشک ہو جائے اور زرد پڑ جائے اور زمین کو بھی ھائج کہا جاتا ہے جس کی سبزی زرد پڑ جائے (ل) ؛

حطام - حَطْم - ھَشْم کی طرح کسی چیز کا توڑنا ہے لا یحطمنکم سلیمان وجنودہ (النمل ۲۷ - ۱۸) اور حُطَمَة دوزخ کا نام ہے لینبذن فی الحطمة (الھمزة ۱۰۴ - ۴) اور حُطام وہ ہے جو خشک ہو کر چورا چورا ہو جائے (غ) ؛

عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ فَوَیۡلٌ لِّلۡقٰسِیَۃِ
قُلُوۡبُہُمۡ مِّنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ
فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۲﴾
اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ کِتٰبًا
مُّتَشَابِہًا مَّثَانِیَ ٭ۖ تَقۡشَعِرُّ مِنۡہُ جُلُوۡدُ
الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ ۚ ثُمَّ تَلِیۡنُ
جُلُوۡدُہُمۡ وَ قُلُوۡبُہُمۡ اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ ؕ
ذٰلِکَ ہُدَی اللّٰہِ یَہۡدِیۡ بِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ
وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ ﴿۲۳﴾
اَفَمَنۡ یَّتَّقِیۡ بِوَجۡہِہٖ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ
یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ وَ قِیۡلَ لِلظّٰلِمِیۡنَ
ذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَکۡسِبُوۡنَ ﴿۲۴﴾

اپنے رب کی طرف سے ایک نور پر ہے (کیا وہ تاریکی میں رہنے
والے کی طرح ہے) سو اُن پر افسوس جن کے دل اللہ کے ذکر کے
مقابلہ میں سخت ہیں، وہ کھلی گمراہی میں ہیں ۲۸۷۳
اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام اتارا ہے (یعنی) کتاب جس کی باتیں ملتی
جلتی دوہرائی گئی ہیں اس سے ان لوگوں کے دل کانپ اٹھتے ہیں
جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور ان کے دل
اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے نرم ہو جاتے ہیں — یہ اللہ تعالیٰ
کی ہدایت ہے وہ اس کے ساتھ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے
اور جسے اللہ گمراہ ٹھیرائے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ۲۸۷۴
بھلا وہ جو اپنے منہ کے ساتھ بڑے عذاب سے قیامت کے
دن بچاؤ کرنا چاہے (اہل جنت کی طرح ہے) اور ظالموں سے کہا جائے
گا چکھو، جو تم کماتے تھے ۲۸۷۵

۲۸۷۳ قاسیۃ ۔ قسوۃ ہر چیز میں صلابت یا سختی کو کہتے ہیں اور زمین کو قاسیۃ کہا جاتا ہے جب اس میں کوئی سبزی نہ اگتی ہو اور رات کو قاسیۃ کہا جاتا ہے جب سخت تاریک ہو اور دل کی قَسْوَۃ یہ ہے کہ رحمت اور نرمی اور خشوع اس سے جاتے رہیں (ل)۔

من ذکر اللہ۔ من یہاں یا بمعنی عن ہے اور یا تعلیل کے لیے یعنی اللہ کے ذکر کی وجہ سے گویا جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو انکے دل سخت ہو جاتے ہیں (مغنی)

۲۸۷۴ تقشعر قُشَعْرِیْرَۃ کانپنے کو کہتے ہیں اور اِقْشَعَرَّ جِلْدُ الرَّجُلِ یعنی اس کا چمڑا یا بدن کانپ اٹھا اور حدیث عمر میں ہے کہ ہند نے انہیں کہا جب ابو سفیان کو درّہ سے مارا لَرُبَّ یومٍ لوضَرَبْتَہٗ لَاقْشَعَرَّ بَطْنُ مکۃ بہت وقت ایسے گذرے ہیں کہ اگر تو اسے مارتا تو وادیٔ مکّہ کانپ اٹھتی (ل) پس اقشعرار سے مراد لازماً یہ نہیں کہ انسان سچ مچ کانپنے لگے بلکہ ایک خوف اور رعب کی حالت کا طاری ہو جانا بھی اقشعرار ہے۔

قرآن کے متشابہ اور مثانی ہونے سے مراد: یہاں قرآن کو احسن الحدیث فرمایا گویا دنیا میں کوئی کلام اس سے بہتر نہیں اور پھر اسے متشابہ کہا ہے جس کے لیے دیکھو ع۳۷۵ اور یہاں کل کتاب کو متشابہ کہا ہے اس لحاظ سے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے کی مثل ہے یعنی ایک دوسرے کے موید ہیں یا مراد صحت معنی اور احکام اور مبنی علی الحق ہونے میں تشابہ ہے اور اسے مثانی کہا ہے جس کے لیے دیکھو ع۱۷۱ یعنی اس کے فوائد بار بار اور از سر نو تازہ ہوتے رہتے ہیں۔ یا اس لیے کہ اسے تلاوت میں دہرایا جاتا ہے۔ یا اس لیے کہ اس میں اصول دین کی ضروری باتوں کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔

قرآن یا کسی اور کلام کو سن کر اپنے آپ کو بے ہوش بنانا یا تواجد کرنے لگنا ناجائز ہے: اس سے خشیۃ اللہ رکھنے والوں کے چمڑے کانپ اٹھتے ہیں پھر ان کے چمڑے نرم ہو جاتے ہیں۔ کانپنا اور نرمی دونوں بلحاظ معنی ہیں یعنی ایسی کیفیت ان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے جیسا کانپنے والے کے اندر اور جیسے اس کے اندر جس کا چمڑا نرم ہو یعنی وہ مرعوب ہو اور بات اس کے اندر اثر کر جائے وقیل ھو تصویر للخوف بذکر اثارہ وتشبیہ حالۃ بحالۃ (ر) اور بعض نے کہا ہے کہ عذاب کے ذکر پر کانپ اٹھتے ہیں اور رحمت کے ذکر پر نرم ہو جاتے ہیں مگر اصل غرض صرف یہ ہے کہ کلام اللہ کی عظمت کا ان کے دلوں پر رعب ہوتا ہے اور وہ ان کے اندر اثر کرتی ہے اور اگر ظاہر الفاظ کو بھی لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عظمت کلام اللہ کے سامنے واقعی انسان کانپ اٹھے لیکن بیہوش ہو جانا یا تواجد کرنے لگنا یہ بناوٹ کی بدعات ہیں عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے اپنی دادی اسماء سے کہا کہ بعض لوگ قرآن کریم کو سن کر بے ہوش ہو جاتے ہیں تو انہوں نے فرمایا اعوذ باللہ تعالیٰ من الشیطان اور حضرت ابن زبیر سے ایسی ہی روایت ہے کہ میں نے اپنی والدہ سے ایسے لوگوں کا ذکر کیا کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تو کانپنے لگتے اور بے ہوش ہو جاتے تو آپ نے فرمایا ان کے ساتھ مت بیٹھ میں نے رسول اللہ صلعم کو قرآن پڑھتے دیکھا ہے اور ابو بکر و عمر کو بھی اور ان پر بھی یہ حالت طاری نہ ہوتی تھی تو یہ لوگ اُن سے زیادہ خشیۃ اللہ نہیں رکھتے اور ابن عمر سے ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو دیکھا جو قرآن سن کر گر پڑا تو آپ نے فرمایا ہم تو نہیں گرتے ان لوگوں کے اندر شیطان گھس گیا ہے مگر تعجب ان لوگوں پر ہے جو معمولی انسان کے کلام کو سن کر وجد کرنے لگتے اور بیہوش ہو جاتے ہیں۔ صحابہ نے جس بات کو قرآن کریم کے لیے بھی جائز نہیں سمجھا وہ غیر اللہ کے کلام کے سامنے وہ حالت بناتے ہیں۔

۲۸۷۵ یتقی بوجھہ ۔ اِتَّقٰی فلانٌ بکذا سے مراد ہوتی ہے کہ اسے اپنے نفس کے لیے حفاظت یا سپر بنایا اور یہاں اس عذاب کی شدت پر تنبیہ ہے جو انہیں

كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَاَتٰىهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۵﴾

انھوں نے جو ان سے پہلے تھے جھٹلایا، سو ان پر ایسی جگہ سے عذاب آیا جس کی انھیں کوئی خبر نہ تھی۔

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الۡخِزۡىَ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَكۡبَرُ ۘ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾

سو اللہ (تعالیٰ) نے انھیں دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا، اور آخرت کا عذاب بڑا ہے کاش وہ جانتے۔

وَلَقَدۡ ضَرَبۡنَا لِلنَّاسِ فِىۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ۚ ﴿۲۷﴾

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا غَيۡرَ ذِىۡ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۲۸﴾

قرآنِ عربی جس میں ٹیڑھا پن نہیں تاکہ وہ بچیں۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيۡهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوۡنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلۡ يَسۡتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ ۚ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۹﴾

اللہ تعالیٰ مثال بیان کرتا ہے، ایک آدمی ہے جس میں کئی (مالک) ایک دوسرے سے جھگڑنے والے شریک ہیں اور ایک آدمی جو پورے طور پر ایک آدمی کا (نوکر) ہے کیا ان دونوں کی حالت برابر ہے سب تعریف اللہ کے لیے ہے بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے ؏۲۸۷۶

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمۡ مَّيِّتُوۡنَ ﴿۳۰﴾

تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔

ثُمَّ اِنَّكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ عِنۡدَ رَبِّكُمۡ تَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۳۱﴾ ع

پھر تم قیامت کے دن اپنے رب کے پاس جھگڑا کرو گے۔

فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدۡقِ اِذۡ جَآءَهٗ ؕ اَلَيۡسَ فِىۡ جَهَنَّمَ مَثۡوًى لِّلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۳۲﴾

سو اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ بولتا ہے اور سچائی کو جھٹلاتا ہے، جب وہ اس کے پاس آتی ہے کیا جہنم میں کافروں کا ٹھکانا نہیں؟

وَالَّذِىۡ جَآءَ بِالصِّدۡقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴿۳۳﴾

اور وہ جو سچائی کو لایا اور اس کی تصدیق کرتا ہے، یہی متقی ہیں ؏۲۸۷۷

پہنچے گا۔ گویا قیامت کے دن کے عذاب سے جس چیز کو وہ اپنے لیے بطور ڈھال بنائیں گے وہ ان کے مونہہ ہوں گے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا فرمایا وتغشیٰ وجوھھم النار (ابراھیم ۱۴ - ۵۰) یا یوم یسحبون فی النار علی وجوھھم (القمر ۵۴ - ۴۸) (غ) وجہ چونکہ اشرف اعضا ہے اس لیے مطلب یہ ہے کہ اشرف ترین مقام پر بدترین عذاب ہوگا۔

۲۸۷۶ متشاکسون۔ شَکِس (اور شَرِس) بدخلقی کو کہتے ہیں اور یہاں مراد ہے اپنی بدخلقی کی وجہ سے باہم جھگڑنے والے (غ) اور کہا گیا ہے کہ جو لین دین وغیرہ میں بدخلق ہو اسے شکس کہا جاتا ہے۔ اور تشاکس کے معنی ہیں ایک دوسرے کے مخالف ہوئے اور یہاں مراد ایک دوسرے کے مقابل کھڑا ہونے والے ہیں۔ اور تفسیر اس مثال کی یہ ہے کہ ایک شخص موحد ہے جو ایک ہی خدا کا پرستار ہے اور ایک کئی معبودوں کا پرستار ہے (ل)۔

سلما۔ سَلِمَ فُلَانٌ لِفُلَانٍ وہ اس کے لیے خالص ہوا (ل)۔

موحد یا ایک خدا کے پرستار کے سامنے صرف ایک ہی بات ہوتی ہے یعنی اپنے ہر کام میں خدا کی خوشنودی کو مدنظر رکھنا لیکن بہت معبودوں کا پرستار یا بہت لوگوں کی رضا کا طالب یا اپنی حرص و ہوا کا تبع کبھی ایک طرف جاتا ہے کبھی دوسری طرف۔

۲۸۷۷ پہلی آیت میں اللہ پر جھوٹ بولنے والے اور سچائی کو جھٹلانے والے گروہ کا ذکر ہے اس میں سچائی کے لانے والے اور سچائی کی تصدیق کرنے والے گروہ

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ۚۖ ۳۴

ان کے لیے اپنے رب کے پاس ہے جو کچھ وہ چاہیں یہ نیکی کرنے والوں کا بدلہ ہے۔

لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَ يَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۳۵

تاکہ اللہ ان سے وہ بہت بُرے عمل دُور کردے، جو انھوں نے کیے اور اُن کو ان کے بہترین اعمال کا جو وہ کرتے تھے بدلہ دے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ وَ يُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۚ ۳۶

کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں اور تجھے ان سے ڈراتے ہیں جو اس کے سوائے ہیں اور جسے اللہ گمراہ ٹھیرائے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں[۲۸۷۸]

وَ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ۳۷

اور جسے اللہ ہدایت دے تو اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ کیا اللہ غالب سزا دینے والا نہیں؟

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۳۸

اور اگر تو ان سے پوچھے کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تو کہیں گے اللہ نے۔ کہہ تو کیا تم نے غور نہیں کیا کہ وہ جنھیں تم اللہ کے سوائے پکارتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو کیا وہ اس کی (بھیجی ہوئی) تکلیف کو دور کر سکتے ہیں یا اگر وہ مجھ پر رحم کرنا چاہے تو کیا وہ اس کے رحم کو روک سکتے ہیں، کہہ اللہ میرے لیے بس ہے بھروسا رکھنے والے اسی پر بھروسا رکھتے ہیں۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ ۳۹

کہہ، اے میری قوم اپنی جگہ پر عمل کرتے رہو میں بھی عمل کرنے والا ہوں، سو تم جان لو گے۔

مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۴۰

کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اُسے رُسوا کردے اور اس پر باقی رہنے والا عذاب نازل ہوگا[۲۸۷۹]

کا اللہ پر جھوٹ بولنا مشرکانہ عقاید کی ترویج ہے جیسے یہ کہ اللہ تعالےٰ کا بیٹا ہے اور یا بت ہمارے شفیع اور کارساز ہیں اور پھر اس غلطی پر دوسری غلطی یہ کہ حق کی مخالفت کرتے ہیں اور سچائی لانے والے اور تمام پہلی سچائیوں کی تصدیق کرنے والے تو نبی کریم صلعم ہیں اور پھر آپ کا ہر متبع اس ذیل میں آجاتا ہے۔

۲۸۷۸ مشرکین عرب خود توہم پرست اور بزدل تھے ان کا اعتقاد یہ تھا کہ بت نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نبی کریم صلعم کو بھی ڈراتے ہوں گے جیسا مفسرین نے لکھا ہے مگر یہاں بالذین من دونہ ہے جس سے مراد اُن کے بڑے بڑے سردار ہیں جو آپ کے خلاف منصوبے کرتے تھے اس کے جواب میں فرمایا کہ ان کے تمام منصوبوں اور کوششوں سے اللہ تعالےٰ اپنے بندے کو بچانے کے لیے کافی ہے۔

۲۸۷۹ پہلے عذاب (یعنی رسوا کرنے والے عذاب) میں اشارہ عذاب دنیوی کی طرف ہے اور عذاب مقیم دوزخ کا عذاب ہے (ر) اس سے معلوم ہوگا کہ قرآن کریم نے شروع سے ہی آنحضرت صلعم کے مخالفین کو صفائی سے بتا دیا تھا کہ ان پر اسی دنیا میں عذاب ذلت آئے گا۔

إِنَّآ أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ
بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ
مَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ
أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ ﴿٤١﴾ ع
اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا
وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ
الَّتِي قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ
الْأُخْرٰٓى إِلٰٓى أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ فِي
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٤٢﴾
أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ۚ
قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ

ہم نے تجھ پر لوگوں (کی بھلائی) کے لیے حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے سو جو کوئی سیدھی راہ پر چلتا ہے تو وہ اپنے (بھلے کے) لیے ہے اور جو کوئی گمراہ ہوتا ہے تو اس کے گمراہ ہونے کا وبال اسی پر ہے اور تو اُن کا ذمہ دار نہیں۔

اللہ روحوں کو قبض کرتا ہے ان کی موت کے وقت اور جو مرے نہیں ان کی نیند میں پھر انھیں روک رکھتا ہے جن پر موت کا حکم ہو چکا ہے اور دوسروں کو ایک مقررہ وقت تک بھیج دیتا ہے اس میں اُن کے لیے نشان ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں ع۲۸۸۰

کیا انھوں نے اللہ کے سوائے سفارشی بنا رکھے ہیں، کہہ کیا اگر وہ نہ کچھ اختیار رکھتے ہوں اور نہ عقل

ع۲۸۸۰ منام۔ نَوْم کی تفسیر کئی طرح پر کی گئی ہے اور وہ سب مختلف نظروں سے صحیح ہیں کہا گیا ہے کہ وہ دماغ کے اعصاب کا ڈھیلا پڑجانا ہے بخارات کی رطوبتوں سے جو اس کی طرف چڑھتے ہیں اور کہا گیا ہے کہ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر موت نفس کو قبض کرے۔ اور کہا گیا ہے کہ نوم موت خفیف ہے اور موت نوم ثقیل ہے اور منام اور نوم کے ایک ہی معنی ہیں۔ اور نَامَتِ السُّوْقُ یا بازار سو گیا کے معنی ہیں تجارت ٹھنڈی پڑ گئی۔ نام الثوب کے معنے ہیں کپڑا پرانا ہو گیا اور یہ معنی بلحاظ تشبیہ ہیں (غ)۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنا توفی نفس یا قبض روح کا قانون بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ توفی نفس دو وقتوں میں ہوتا ہے ایک موت کے وقت اور ایک نیند میں۔ یہ آیت اس بات کے لیے فیصلہ کُن ہے کہ توفی میں وہ چیز جو اللہ تعالیٰ لیتا ہے کیا ہے یہاں توفی کا مفعول الفس ہے جو نفس کی جمع ہے اور نفس کے معنی حسب ذیل ہیں: روح حیوانی، نفس ناطقہ۔ سارا انسان دیکھو ع۵۹۸ توفی میں ان میں سے کونسی چیز لی جاتی ہے ظاہر ہے کہ سارا انسان نہیں لیا جاتا کیونکہ نیند اور موت دونوں میں جسم یہیں رہ جاتا ہے اور کبھی بھی اللہ تعالیٰ اسے اُٹھا کر کہیں اور نہیں لے جاتا۔ پس سارا انسان اگر ایک جگہ سے دوسری جگہ جائے تو اس پر لفظ توفی نہیں بولا جائیگا جب کسی کے متعلق لفظ توفی بولا جائیگا تو یہ اسکا لازم نتیجہ ہوگا کہ اسکا جسم نہیں لیا گیا۔ آیا روح حیوانی لی جاتی ہے یہ بھی ظاہر ہے کہ نیند روح حیوانی انسان کے اندر موجود ہوتی ہے اور موت میں نہیں اس لیے توفی نفس سے مراد روح حیوانی کا لیا جانا بھی نہیں باقی صرف ایک صورت رہ جاتی ہے یعنی یہ کہ نفس ناطقہ یا وہ چیز جس سے عقل و تمیز ہے لی جائے اور یہی صحیح ہے اور اس پر کئی دلائل ہیں اول یہ کہ توفی کا لفظ صرف انسان پر بولا جاتا ہے دوسرے جانداروں پر نہیں اگر روح حیوانی کا لیا جانا مراد ہوتا تو یہی لفظ دوسرے جانداروں پر بھی بولا جاتا۔ دوسرے یہ کہ نیند اور موت دونوں میں جو چیز لی جاتی ہے وہ تمیز یا عقل انسانی ہی ہے اور کوئی چیز نہیں جو دونوں میں مشترک طور پر لی جاتی ہو۔ تیسرے جس غرض کے لیے توفی نفس ہوتی ہے وہ جزا و سزائے اعمال ہے اور اعمال کے کرنے میں گو جسم اور روح حیوانی شریک ہوتے ہیں مگر اعمال کی ذمہ داری اور ان کا احساس تمیز یا عقل انسانی سے ہی پیدا ہوتا ہے اس لیے وہی چیز لی جانی چاہیئے جس پر اصل ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ ابن آدم میں ایک نفس ہے اور ایک روح اور ان دونوں کے درمیان سورج کی شعاع کا سا تعلق ہے اور نفس تو وہ ہے جس سے عقل اور تمیز ہے اور روح وہ ہے جس سے سانس لیتا اور حرکت کرتا ہے سو موت کے وقت یہ دونوں لیے جاتے ہیں اور نیند میں صرف نفس لیا جاتا ہے اور یہ نفس و روح میں فرق کے متعلق ایک قول ہے اور بعض نے اسے اکثر کی طرف منسوب کیا ہے (ر)

ایک اور امر جو اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ جب ایک شخص پر موت وارد ہو جائے تو اسے زندہ کر کے مردہ زندہ کر کے اس دنیا میں واپس نہیں بھیجا جاتا: اس دنیا میں نہیں بھیجا جاتا گو یہاں نفس ناطقہ کا ذکر ہے لیکن چونکہ روح کے واپس آنے کا لازمی نتیجہ نفس ناطقہ کا واپس آنا ہے اس لیے اگر نفس ناطقہ کو اللہ تعالیٰ روک رکھتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ روح حیوانی بھی واپس نہیں آتی۔ اور منام کے لفظ میں غشی وغیرہ بھی آجاتے ہیں۔ یعنی وہ تمام حالات جن میں عقل و تمیز واپس آجاتی ہے۔ لیکن موت کے بعد نفس ناطقہ کا اس جسم کی طرف واپس آنا قرآن کریم کی صراحت کی رو سے محال ہے۔

اس آیت کا یہاں کیا تعلق ہے کہ موت اور نیند میں نفس انسانی کو لے لیا جاتا ہے اس کی غرض جزا و سزائے اعمال کی طرف توجہ دلانا ہے جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو جو اعمال انسانی کی اصل محرک ہے لے لیتا ہے اور ان اعمال کی جزا و سزا لازمی طور پر اسے ملے گی۔

شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۳﴾

رکھتے ہوں۔

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۴۴﴾

کہہ سفارش سب اللہ کے اختیار میں ہے اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤگے۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾

اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل نفرت کرتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جب ان کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس کے سوائے ہیں، تو وہ خوش ہوتے ہیں ۲۸۸۱

قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

کہہ اے اللہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، غائب اور حاضر کے جاننے والے، تُو اپنے بندوں میں اس بارے میں فیصلہ کریگا جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْۗءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۷﴾

اور اگر ان لوگوں کے لیے جو ظلم کرتے ہیں وہ سب کچھ بھی ہو جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اتنا اور ہو) تو اس کے ساتھ بُرے عذاب سے (بچنے کے لیے) قیامت کے دن فدیہ دے دیں اور اللہ کی طرف سے ان کے لیے وہ ظاہر ہوگا جس کا انھیں گمان بھی نہ تھا۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور ان کے لیے اس کی برائیاں ظاہر ہو جائیں گی جو وہ کماتے ہیں اور وہی انھیں آلے گا جس پر وہ ہنسی کرتے تھے ۲۸۸۲

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۡ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ ۭ بَلْ هِىَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۹﴾

سو جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے ہمیں پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اسے اپنی طرف سے نعمت عطا کرتے ہیں کہتا ہے، یہ مجھے (اپنے) علم سے ملی ہے بلکہ وہ آزمایش ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے ۲۸۸۳

۲۸۸۱ اشمأزت۔ شَمْز۔ تقبّض یعنی سکڑنا یا تنگ ہونا ہے اور نفس کا کسی چیز سے دور ہونا جسے وہ ناپسند کرتا ہے اور یہاں زجاج نے معنے نَفَرَتْ کیے ہیں (ل) اور دوسری جگہ ہے واذا ذکرت ربك فی القراٰن وحدہ ولوا علی ادبارھم نفورا (بنی اسرائیل ۱۷-۴۶)
یہ تو کفار کا ذکر ہے مگر آج مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہے اپنے اپنے حلقہ میں جس شخص کو بڑا مانتے ہیں اس کا ذکر نہ آئے تو ان کے دل خوش نہیں ہوتے۔

۲۸۸۲ یہاں اشارہ عذاب دنیا کی طرف بھی ہوسکتا ہے اور استہزا تو اسی پر زیادہ کرتے تھے اور عذاب اخروی کی طرف بھی۔

۲۸۸۳ علیٰ علم یعنی وجوہ کسب کے علم سے یہ چیز مجھے حاصل ہوئی ہے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی بڑائی ظاہر کرتا ہے اور اوتیتہ اور ھی فتنۃ میں ضمیر نعمت کی طرف ہی ہے پہلی جگہ بلحاظ معنی اور دوسری جگہ بلحاظ لفظ اور فتنۃ اسے اس لیے کہا کہ کھرے اور کھوٹے کے پرکھنے کا یہ ذریعہ ہے۔

قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ
اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۵۰﴾

یہی (بات) انھوں نے کہی جو ان سے پہلے تھے تو وہ ان کے کچھ کام نہ آیا جو وہ کماتے تھے۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ
مَا كَسَبُوْا ۙ وَ مَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۱﴾

سو انھیں اس کے بدنتائج پہنچ گئے جو وہ کماتے تھے۔ اور جو ان میں سے ظلم کرتے ہیں انھیں اس کے بدنتائج پہنچ کر رہیں گے جو یہ کماتے ہیں اور وہ (خدا کو) عاجز کرنے والے نہیں۔

اَوَ لَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ ع

کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى
اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ
هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾

کہہ، اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سبھی گناہ بخش دیتا ہے۔ ہاں وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۲۸۸۴

وَ اَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ
مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ
لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کی فرمانبرداری کرو، اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے پھر تمھیں مدد نہ ملے۔

وَ اتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ
مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ
الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

اور اس بہتر بات پر چلو جو تمھارے رب کی طرف سے تمھاری طرف اتاری گئی قبل اس کے کہ تم پر ناگہاں عذاب آجائے اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا
فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَ اِنْ كُنْتُ
لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

(ایسا نہ ہو) کہ کوئی شخص کہے ہائے افسوس اس پر جو میں نے اللہ تعالیٰ کی جانب نگاہ رکھنے میں کوتاہی کی اور میں تو ہنسی کرنے والوں میں سے تھا ۲۸۸۵

۲۸۸۴ رحمت الٰہی کی وہ وسعت بے پایاں جسکو یہ آیت ظاہر کر رہی ہے دوسری کتابیں اس سے خالی ہیں اگر کوئی تھکے ماندوں کو آرام کی خوشخبری دیتا ہے تو قرآن تمام قسم کی خطاکاریوں اور زیادتیوں پر رحمت کی خوش خبری سناتا ہے۔ کس قدر کمال تعلیم اسلامی کا ہے کہ رحمت الٰہی کا دروازہ تو اتنا وسیع کھولا مگر یہ نہیں کہ کفارہ کی طرح ساتھ ہی گناہ پر جرأت کا باب بھی وا کر دیا ہو بلکہ رجوع الی اللہ شرط رکھی ہے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں صراحت سے بتا بھی دیا و انیبوا الی ربکم اس بارے میں افراط و تفریط کے دو پہلو ہیں۔ ایک عیسائی مذہب نے اختیار کیا ہے کہ جو شخص کفارہ پر ایمان لے آئے جو گناہ چاہے کرتا جائے اس پر کوئی مواخذہ نہیں اور دوسرا ہندو مذہب نے کہ جتنی مدت چاہے توبہ کرے اور گناہوں کی معافی کے لیے روئے مگر خدا معاف ہی نہیں کر سکتا۔ اسلام کی تعلیم افراط و تفریط کے درمیان ہے۔

۲۸۸۵ حسرتی اصل میں حسرتی ہے علیٰ تعلیلیہ ہے یعنی علت کے لیے اور ما مصدریہ۔ یعنی میری تفریط یا کوتاہی کی وجہ سے، جنب کے اصل معنی پہلو ہیں اور یہاں مطلب اس کا امر اور اس کی حد ہے جو اس نے مقرر کر دی ہے (رغ)، ساخر سخر سے ہنسی کرنے والا۔

أَوْ تَقُوْلَ لَوْ أَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٥٧﴾

یا کہے کہ اگر اللہ مجھے ہدایت کرتا تو میں بھی متقیوں میں سے ہوتا۔

أَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ أَنَّ لِيْ كَرَّةً فَأَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾

یا جب عذاب دیکھے تو کہے، اگر میرے لیے لَوٹ کر جانا ہوتا تو میں نیکی کرنے والوں میں سے ہوتا۔

بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٥٩﴾

ہاں میری آیتیں تیرے پاس آئی تھیں پر تو نے انھیں جھٹلایا اور تکبر کیا اور تو منکروں میں سے تھا۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ۭ أَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٦٠﴾

اور قیامت کے دن تُو ان لوگوں کو دیکھے گا جنھوں نے اللہ پر جھوٹ بولا (کہ) ان کے منہ کالے ہیں، کیا متکبروں کا ٹھکانا دوزخ میں نہیں۔

وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۡ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦١﴾

اور جو تقویٰ کرتے تھے اللہ انھیں ان کی کامیابی کے ساتھ[۲۸۸۶] نجات دیگا انھیں کوئی تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۡ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿٦٢﴾

اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٣﴾ ع ٦/١١

آسمانوں اور زمین کے خزانے اسی کے ہیں اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں وہی نقصان اٹھانے والے ہیں[۲۸۸۷]

قُلْ أَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَأْمُرُوْٓنِّيْٓ أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿٦٤﴾

کہہ، اے جاہلو! کیا تم مجھے کہتے ہو کہ میں اللہ کے غیر کی عبادت کروں۔

وَلَقَدْ أُوْحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٥﴾

اور تیری طرف وحی کی گئی ہے اور اُن کی طرف جو تجھ سے پہلے تھے اگر تو شرک کرے تو تیرا عمل ضرور برباد ہو جائیگا اور تو نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا[۲۸۸۸]

[۲۸۸۶] بمفازتہم۔ با ملابست کے لیے ہے یعنی عذاب یا جہنم سے نجات کے ساتھ انہیں کامیابی کی اعلیٰ منزل پر بھی پہنچائے گا مفازۃ کے لیے دیکھو [۵۸۳]۔

[۲۸۸۷] مقالید۔ قَلْد سے ہے اور قلادۃ ہر وہ چیز ہے جو طوق بنائی جائے اور جو کسی چیز کا احاطہ کرلے اور مقالید کے معنی ہیں وہ چیز جس کے ساتھ وہ آسمانوں اور زمین کا احاطہ کرتا ہے اور اسکے معنی خزائن یعنی خزانے اور مفاتیح یا کنجیاں بھی کیے گئے ہیں اور ان سب سے اشارہ ایک ہی معنی کی طرف ہے اور وہ اللہ تعالےٰ کی قدرت اور اس کا ان چیزوں کی حفاظت کرنا ہے (غ) اور بعض کے نزدیک مقالید جمع ہے جس کا واحد کوئی نہیں اور بعض نے اسے تقلید بمعنی الزام (یعنی دوسری چیز کے ساتھ لگا دینا) سے مقلید یا مقلاد کی جمع کہا ہے (ر)

[۲۸۸۸] یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ بذریعہ وحی لوگوں کو اطلاع دیتا رہا ہے کہ شرک سے عمل حبط ہو جاتا ہے یعنی جس عمل میں جس قدر حصہ شرک کا ہوگا وہ انسان کے کسی کام نہیں آسکتا اور ہو سکتا ہے کہ خطاب پہلے حصہ آیت میں خاص ہو اور دوسرے میں عام یا دونوں حصوں میں عام ہو۔

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۶﴾
وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَ
الْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ
وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۷﴾
وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِى
السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ
شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى
فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴿۶۸﴾
وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا
وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِایْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ
وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ
وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۹﴾
وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ
وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۰﴾ ع
وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ
حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ
قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ
مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ

بلکہ اللہ کی ہی عبادت کر اور شکر کرنے والوں میں سے ہو۔
اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر نہیں کی جو اس کی قدر کا حق ہے
اور زمین سب قیامت کے دن اس کی مُٹھی میں ہو گی اور
آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے وہ
پاک ہے اور اس سے بلند ہے جو وہ شرک کرتے ہیں ۲۸۸۹ع
اور صور پھونکا جائے گا ، پس جو کوئی آسمانوں
اور زمین میں ہیں بیہوش ہو جائیں گے سوائے اس
کے جو اللہ تعالیٰ چاہے پھر وہ دوسری بار پھونکا جائے گا۔
تب وہ دیکھتے ہوئے کھڑے ہوں گے ۲۸۹۰ع
اور زمین اپنے رب کے نور کے ساتھ چمک اٹھے گی ،
اور کتاب رکھ دی جائے گی اور نبی اور شہید بلائے جائیں
گے اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کیا جائے
گا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا ۲۸۹۱ع
اور ہر نفس کو جو اس نے کیا ہے پورا دیا جائے گا اور وہ
خوب جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔
اور جو کافر ہیں وہ دوزخ کی طرف گروہ گروہ بنا کر لے جائے
جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچ جائیں گے
اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اس کے چوکیدار ان
سے کہیں گے کیا تم میں سے تمہارے پاس رسول نہ آئے تھے جو تم پر تمہارے

ع۲۸۸۹ قبضۃ کے لیے دیکھو ع۲۰۹۶ محض حاصل کر لے کو بھی قبض کہا جاتا ہے اور راغب نے یہاں معنی کیے ہیں فی حَوْزِہٖ یعنی اسی کی ملک ہو گی دوسرے کسی کا اس میں کوئی دخل نہ ہو گا۔ اور بعض نے قبض کو ملک اور تصرف سے مجاز قرار دیا ہے اور یمین کو قدرت تامہ سے (د) اور مطویّ کے لیے دیکھو ع۲۱۹۲ عظمت الٰہی کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ع۲۸۹۰ یہاں دو نفخوں کا ذکر ہے پہلا نفخہ وہ ہے جس سے صفحۂ زمین لپیٹ لیا جائے گا۔ دوسرا نفخہ وہ ہے جس سے حساب کتاب کے لیے سب انسانوں کو اٹھا کر کھڑا کیا جائے گا۔

ع۲۸۹۱ مخفی نتائج کا ظہور: ارض سے مراد زمین محشر ہے (د) یوم تبدل الارض غیر الارض (ابراھیم ۱۴-۴۸) اور اس زمین کا تباہ ہو جانا اوپر سے ظاہر ہے اور نور رب سے اس کے چمک اُٹھنے میں ایک یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نتائج جو آنکھوں سے مخفی تھے ظہور پذیر ہو جائیں گے اور الکتب سے مراد یہاں حساب ہے، جیسا کہ سدی سے مروی ہے اور بعض نے صحائف اعمال مراد لیے ہیں اور نبیوں اور شہیدوں کا بلایا جانا اس لحاظ سے بھی ہے کہ وہ سابق ہیں اور اس لحاظ سے بھی کہ وہ اپنی امتوں پر گواہ ہیں اور شہداء سے مراد یہاں امت محمدیہ کو بھی لیا گیا ہے اور یہ بہت موزوں ہے اس لیے کہ نبی بھی شہداء میں داخل ہیں۔ مگر اس امت کا ذکر کرتے ہوئے خصوصیت سے فرمایا لتکونوا شھداء علی الناس (البقرۃ ۲-۱۴۳) اور دوسری امتوں کے صلحا بھی اس میں داخل ہیں۔

وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ط
قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ
الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝٧١

رب کی آیتیں پڑھتے تھے اور تمھیں تمھاری اس دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے
کہیں گے ہاں، لیکن کافروں پر عذاب کا
وعدہ ثابت ہوا ۲۸۹۲

قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝٧٢

کہا جائے گا دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اسی
میں رہو، سو متکبروں کا ٹھکانا کیا بُرا ہے۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ
زُمَرًا ط حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ
اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ
عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝٧٣

اور جنھوں نے اپنے رب کا تقویٰ کیا وہ بہشت کی طرف گروہ گروہ کر کے
چلائے جائیں گے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آئینگے اور اس کے دروازے
کھول دیئے جائیں گے اور اس کے چوکیدار انھیں کہیں گے تم پر سلام ہو،
تم پاک ہو سو اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہو جاؤ۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا
وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ
الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝٧٤

اور وہ کہیں گے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنا
وعدہ ہم سے سچا کیا اور ہمیں زمین کا وارث بنایا ہم جنت میں جہاں
چاہیں ہیں سو عمل کرنے والوں کا اجر کیا ہی اچھا ہے ۲۸۹۳

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ
الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ
وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ
لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٧٥ ع ۸

اور تو فرشتوں کو دیکھے گا عرش کے اردگرد حلقہ باندھے ہوئے
اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہونگے اور ان کے
درمیان انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا
سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے۔

۲۸۹۲ سیق۔ سُوق کے معنی ہانکنا یا لے جانا ہیں۔ الی ربک یومئذ المساق (القیمۃ ۳۰) ایسا ہی ہے جیسا الی ربک المنتھی (النجم ۵۳۔ ۴۲) اور
سُوق بازار کو کہتے ہیں جہاں مال تجارت لے جایا جاتا ہے جمع اسواق ہے مال ھذا الرسول یاکل الطعام و یمشی فی الاسواق (الفرقان ۲۵ - ۷) (غ) اور حدیث
میں ہے یسوق الناس بعصاہ جو کنایہ ہے اس بات سے کہ وہ اس کے مطیع اور اس پر متفق ہونگے (ل)
زمرا۔ زمَرا۔ زُمْرَۃ کی جمع ہے قلیل جماعت کو کہتے ہیں (غ)
خزنۃ۔ خازن کی جمع ہے اور خازِن حفاظت کرنے والا ہے کسی بھید کی حفاظت ہو یا کسی اور چیز کی۔
جماعت جماعت کر کے لے جانے میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ الگ الگ مراتب کے لوگ علیحدہ علیحدہ گروہ ہوں گے جیسا اہل جنت کی صفت میں حدیث
میں ہے کہ پہلا گروہ جو میری امت میں سے جنت میں جائیگا بدر کی صورت پر ہوگا۔ یعنی کاملین کا گروہ ہوگا۔ اسی طرح دوسرے گروہوں کا ذکر ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا
ہے کہ عذاب اتمام حجت کے بعد ہے۔
۲۸۹۳ زمین کا وارث بنانے میں صاف اشارہ فتوحات ملکی کی طرف ہے اور اس طرف کہ جس زمین پر کفار اس وقت متصرف تھے وہ مومنوں کو دی جائے گی۔

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنِ مَكِّيَّةٌ (۴۰)

اٰیَاتُھَا ۸۵ رُکُوْعَاتُھَا ۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

حٰمٓ ۝۱ (اللہ تعالیٰ) بے انتہا رحم والا ہے ۲۸۹۴ء

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝۲ یہ کتاب اللہ تعالیٰ غالب علم والے کی طرف سے اُتری ہے۔

غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۳ گناہ بخشنے والے اور توبہ قبول کرنے والے سخت سزا دینے والے بڑے فضل والے (کی طرف سے) اس کے سوائے کوئی معبود نہیں اسی کی طرف انجام کار جانا ہے ۲۸۹۵ء

نام: اس سورت کا نام المؤمن ہے اور اس میں نو رکوع اور پچاسی آیتیں ہیں سورت کا نام اس رجل مومن کے ذکر سے لیا گیا ہے جو فرعون کے سامنے حمایت حق کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اور اس سورت کا اصل مضمون بھی یہی ہے کہ رسول تو رسول مومنوں کو بھی جب وہ حمایت حق میں کھڑے ہو جائیں اللہ تعالیٰ اس دنیا میں نصرت دیتا ہے اور مخالفت حق کتنی بھی زبردست ہو یہ اللہ کا قانون مستمرہ ہے کہ اس کا انجام ناکامی ہوتی ہے۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں کا ذکر کر کے بتایا کہ مومنین کی حفاظت کی جاتی ہے اور دوسرے رکوع میں اسی مضمون کو جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ مومنین کی حفاظت بھی بوجہ ان کے اعمال کے ہے اور اعمال کے نتائج کو ظاہر ہونے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ تیسرے، چوتھے اور پانچویں رکوع میں فرعون کے ذکر میں مخالفین حق کو تنبیہ کی ہے فرعون دنیوی طاقت کا نمائندہ ہے اور وہ اپنا پورا زور مخالفت میں صرف کرتا ہے مگر حق کو نابود نہیں کر سکتا، بلکہ آخر کار خود نابود ہو جاتا ہے اسی اثنا میں یہ بھی بتایا کہ اسی کی قوم میں سے اس کا ناصح بھی پیدا ہوا۔ مگر دنیوی طاقت کے نشہ میں اس نے کسی چیز کی پروا نہ کی۔ چھٹے رکوع میں کھلے الفاظ میں یہ وعدہ دیا کہ رسول اور مومن جو کوئی بھی حق کو لیکر نکلے اس کے ساتھ نصرت الٰہی کا وعدہ اس دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی اور ساتویں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر کر کے آٹھویں میں نشان کے آنے کو یقینی بتایا اور نویں میں یہ بیان کر کے کہ بدی کی سزا کا قانون ہمیشہ سے دنیا میں کام کرتا آیا ہے۔ سورت کو ختم کیا۔

تعلق و زمانہ نزول: اس سورت سے لیکر چھیالیسویں سورت تک یعنی سات سورتوں کا یہ ایک مجموعہ ہے جو حٰم سے شروع ہوتا ہے اور اس لیے یہ آل حٰم کہلاتی ہیں ان ساتوں سورتوں کا مضمون باہم ملتا جلتا ہے اور جس طرح پچھلے مجموعہ سور کا مضمون حق کی کامیابی ہے اس مجموعہ کا مضمون بھی یہی ہے ہاں یہاں زیادہ زور اعدا کی ناکامی پر دیا ہے۔ ان میں انبیاء کی تاریخ کا بہت کم ذکر ہے اور جیسا کہ حٰم میں اشارہ ہے ان سب سورتوں میں یہ بتایا ہے کہ دشمن باوجود اپنی طاقت و دولت اور دنیوی سامانوں کے غالب نہیں آ سکتے اور اہل حق کی نصرت یقینی ہے زمانہ نزول ان کا دو باتوں سے مکی زمانہ کا درمیانی حصہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک جیسا کہ ع۲۹۲۱ میں دکھایا گیا ہے اس سے کہ ان سورتوں کے نزول سے پہلے انبیاء کے تذکرے نازل ہو چکے ہیں اور یہ تذکرے سورۂ بنی اسرائیل و کہف و مریم و طٰہٰ میں موجود ہیں۔ اور دوسرا اس بات سے کہ ان سورتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم اور مسلمانوں کی مخالفت اپنے پورے زور پر تھی۔

ع۲۸۹۴ حٰم بعض کے نزدیک اس کے معنی ہیں قُضِیَ ما ھو کائنٌ یعنی جو کچھ ہونے والا تھا اس کا فیصلہ ہو چکا اور ابن عباس سے تفسیر میں تین قول آئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اللہ کا اسم اعظم ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ قسم ہے تیسرا یہ کہ یہ الرحمٰن کے حروف ہیں اور حدیث میں آتا ہے اذا بُیِّتُّم فقولوا حٰم لا یُنصرون۔ ابن اثیر کہتے ہیں اس کے معنی ہیں اللّٰھم لا یُنصرون اور مراد اس سے خبر ہے نہ دعا کیونکہ اگر دعا ہوتی تو لا یُنصرون نہ ہوتا بلکہ لا ینصروا ہوتا گویا مطلب ہے واللہ لا ینصرون اور یوں بھی معنی کیے گئے ہیں کہ وہ سورتیں جو حٰم سے شروع ہوتی ہیں ان کی بڑی شان ہے۔ پس تنبیہ کی ہے کہ ان کی شرف منزلت کی وجہ سے ان کا ذکر الیسا ہے کہ اللہ سے نصرت کا نزول طلب کرنے کے وقت اسے ظاہر کیا جائے اور لا ینصرون نیا جملہ ہے یعنی قولوا حٰم کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کی مدد نہیں ہو گی۔ اور یہ سات سورتیں جن کی ابتدا میں حٰم آتا ہے آل حٰم یا ذوات حٰم کہلاتی ہیں اور ابن مسعود کا قول ہے کہ آل حٰم قرآن کا دیباچہ ہیں (ل)

ع۲۸۹۵ یہاں چار صفات بیان فرمائی ہیں جن میں سے تین فضل و رحم کی صفات ہیں اور صرف ایک ہی سزا کا ذکر ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی صفات میں رحم کو کس قدر غالب کیا ہے۔ پھر ان تین صفات رحم میں سے دو گناہوں کی معافی سے تعلق رکھتی ہیں اور غافر الذنب کے ساتھ قابل التوب لا کر صاف بتایا ہے کہ پہلے سے مراد بغیر توبہ کے گناہوں کا بخشنے والا ہے اور دوسرے سے مراد توبہ پر بخشنے والا اور شدید العقاب کو قابل التوب کے بعد اس لیے لایا گیا ہے کہ جو بدی پر اصرار کرتا ہے اس کے لیے اس کی سزا بھی سخت ہے۔

مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ۴

اللہ کی آیتوں کے بارے میں جھگڑا نہیں کرتے مگر وہی جو کافر ہیں سو ان کا شہروں میں تصرف تجھے دھوکا نہ دے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ
مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۠ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ
بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ
لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۣ
فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۵

ان سے پہلے نوحؑ کی قوم نے جھٹلایا اور ان کے بعد (اور) گروہوں نے اور ہر قوم نے اپنے رسول کے متعلق ارادہ کیا کہ اسے پکڑلیں اور جھوٹ کو لیکر جھگڑتے رہے تاکہ اس کے ساتھ سچائی کو زائل کردیں، تو میں نے انھیں پکڑا، سو میری سزا کیسی تھی۔

وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۶ (وقف النبی علیہ السلام) (وقف لازم)

اور اسی طرح تیرے رب کی بات ان لوگوں پر جو کافر ہیں پوری ہوئی کہ وہ دوزخی ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ
يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ
بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا
وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ
لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ
عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۷

وہ جو عرش کو اٹھاتے ہیں اور جو کوئی اس کے اردگرد ہیں ۲۸۹۶ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں — اور ان کے لیے جو ایمان لائے حفاظت مانگتے ہیں ہمارے رب تیری رحمت اور علم ہر چیز پر پھیلا ہوا ہے سو انھیں بخش جو توبہ کرتے ہیں اور تیرے رستے پر چلتے ہیں اور انھیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ ۲۸۹۷

رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِ الَّتِيْ
وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ

اے ہمارے رب اور انھیں ہمیشگی کے باغوں میں داخل کر جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے باپ دادوں اور اُن

ع۲۸۹۶ حاملین عرش سے مراد: الذین یحملون العرش اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ اسے یا اس کے عرش کو کوئی اور اُٹھائے ہوئے ہو۔ وہ قیوم ہے اور ساری مخلوقات اس سے قائم ہیں وہ کسی سے قائم نہیں اور حمل عرش کا وہ مفہوم نہیں ہوسکتا۔ جو کسی چیز کے اٹھانے کا مفہوم ہوتا ہے نہ فرشتوں کا اٹھانا اس طرح پر ہے جیسے انسان اپنے کندھوں پر ایک بوجھ اُٹھا لیتا ہے دیکھو ع۱۰۹۵ جہاں دکھایا گیا ہے کہ جس طرح کرسی علم کے لیے ہے عرش قدرت کے لیے ہے اور اس کے حامل وہ ملائکہ ہیں جو قدرت کا نفاذ کرتے ہیں اور قرآن کریم میں آتا ہے کہ قیامت کے دن یہ آٹھ ہونگے ویحمل عرش ربك فوقھم یومئذٍ ثمٰنیة اور آثار میں ہے کہ اس وقت یہ چار ہیں اور قیامت کے دن آٹھ ہونگے عن وھب حملة العرش اربعة فاذا کان یوم القیامة ایدوا باربعة اٰخرین (ر) اور ظاہر ہے کہ تمام عالم کا ظہور اور اس کا قیام صفات الٰہی سے ہے اور انہی صفات کے حامل ملائکہ ہیں اب اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی صفات جن کی قدرت نفاذ پاتی ہے چار ہیں یعنی ربوبیت۔ رحمانیت۔ رحیمیت۔ مالکیت۔ پس وہ چار حامل انہیں چار صفات کے ظہور میں لانے والے ہیں اور قیامت کے دن اُن کے آٹھ ہونے کی وجہ ظاہر ہے اس لیے کہ قیامت میں ایک اور تجلی انہی چار صفات کی ظاہر ہوگی اور من حوله سے مراد دیگر صفات الٰہی کے مظہر ملائکہ ہیں اور ان سب کا استغفار مومنوں کے لیے یہ ہے کہ وہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت چاہتے ہیں اور درحقیقت یہ خود صفات الٰہی کا تقاضا ہے کہ مومنوں کی حفاظت ہو اور اس میں بھی توجہ اللہ تعالیٰ کے رحم بے پایاں کی طرف دلائی ہے۔

ع۲۸۹۷ رحمت اور علم کو جمع کرکے بتایا کہ جس طرح ہر چیز پر علم حاوی ہے ہر چیز کا احاطہ رحمت نے بھی کیا ہوا ہے اللہ تعالیٰ کے اس وسیع رحم کی طرف سوائے قرآن کے اور کسی کتاب نے توجہ نہیں دلائی۔

وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۙ ۸

کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو نیک ہوں۔ تُو غالب حکمت والا ہے۔

وَ قِهِمُ السَّيِّاٰتِ ؕ وَ مَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۹ ع

اور اُنھیں بُرائیوں سے بچا اور جسے تو آج بُرائیوں سے بچالے تو تُو نے اس پر رحم کیا اور یہ عظیم الشان کامیابی ہے ع۲۸۹۸

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ۱۰

جو کافر ہیں انھیں پکارا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی بیزاری تمھاری اپنی جانوں کی بیزاری سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جب تمھیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے ع۲۸۹۹

قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۱۱

کہیں گے ہائے ہمارے رب تو نے ہم پر دو موتیں وارد کیں اور دو دفعہ ہمیں زندہ کیا، سو ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں تو کیا نکلنے کے لیے کوئی رستہ ہے ع۲۹۰۰

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَ اِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ؕ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ۱۲

یہ اس لیے کہ جب اکیلے اللہ کو پکارا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ شرک کیا جاتا تو تم مان لیتے تھے پس اللہ تعالیٰ کے لیے ہے (جو) بلند (اور) بڑا ہے)

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ؕ وَ مَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ۱۳

وہی ہے جو تمھیں اپنے نشان دکھاتا ہے اور تمھارے لیے آسمان سے رزق اتارتا ہے اور فائدہ وہی اٹھاتا ہے جو (اللہ تعالیٰ کی طرف) رجوع کرتا ہے۔

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۱۴

تو اللہ تعالیٰ کو اسی کی خالص فرمانبرداری کرتے ہوئے پکارو، اگرچہ کافر ناپسند کریں۔

ع۲۸۹۸ برائیوں سے بچانے کے لیے دعا غفر کے بعد ہے پس یہاں غفر سے مراد اُن گناہوں کی بخشش ہے جو توبہ سے یا ایمان لانے سے پیشتر وہ کر چکے ہیں اور برائیوں سے بچانے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے آیندہ بدیاں سرزد نہ ہوں مفسرین نے سیئات سے مراد عقوبات لی ہیں مگر عقوبات سے بچانا خود غفر کا نتیجہ ہے۔

ع۲۸۹۹ یعنی اب جو بدی کے نتائج ظاہر ہونے پر تم کو اپنی جانوں سے بیزاری ہے اس سے کہیں بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی تم سے بیزاری تھی جب دنیا میں تمہیں ایمان کی طرف یعنی نیک باتوں کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے۔

ع۲۹۰۰ دوسری جگہ فرمایا کنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم پس پہلی موت وہ نیستی کی حالت ہے جس سے انسان کو پیدا کیا گیا اور دوسری موت وہ ہے جو اس دنیوی زندگی کے بعد آتی ہے اور دوسری جگہ اسی دوسری موت کو موت اولی کہا ہے ان ھی الا موتتنا الاولی (الدخان ۴۴-۳۵) اس لیے کہ اس سے پہلی یا دنیوی زندگی کا انقطاع ہوتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو موتوں کے وارد کرنے سے مراد ایک موت جہالت و کفر ہو اور ایک موت جس سے انقطاع حیات ہوتا ہے اور دو زندگیوں سے مراد ایک حیات دنیوی اور دوسری حیات اخروی ہے۔

رَفِيعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾

درجوں کا بلند کرنے والا صاحبِ عرش ہے۔ وہ روح کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے ڈالتا ہے تاکہ ملاقات کے دن سے ڈرائے ع۲۹۰۱

يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۶﴾

جس دن وہ نکل کھڑے ہوں گے، اُن کی کوئی چیز اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں، آج بادشاہت کس کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ اکیلے سب پر غالب کے لیے ع۲۹۰۲

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۷﴾

آج ہر جان کو وہی بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا۔ آج کوئی ظلم نہیں، اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ؕ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴿۱۸﴾

اور انھیں قریب آنے والے دن سے ڈرا، جب دل غم سے بھرے ہوئے گلوں تک آ رہے ہوں گے۔ ظالموں کا کوئی دلی دوست نہیں اور نہ کوئی سفارشی ہے جس کی بات مانی جائے ع۲۹۰۳

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي

وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور اُسے جو سینے

ع۲۹۰۱ رفیع الدرجات سے مراد لوگوں کے درجات بلند کرنے والا ہی ہے جیسے فرمایا رفعنا بعضھم فوق بعض درجات یا نرفع درجات من نشاء۔
یوم التلاق سے مراد قیامت کا دن ہے اور اسے اس نام سے اس لیے خاص کیا گیا ہے کہ وہ پہلوں اور پچھلوں کے اکٹھا ہو جانے یعنی ایک دوسرے کو ملنے اور اہل سماء اور اہل ارض کی ملاقات کا اور ہر شخص کی اپنے عمل سے ملاقات کا دن ہے اور لقاء اللہ یا ملاقاۃ اللہ سے مراد بھی قیامت ہے (غ)
آنحضرت کے بعد مجدد دین کا مامور کیا جانا: روح سے مراد یہاں وحی ہے جیسا کہ قتادہ سے مروی ہے (ر) اور یہ ظاہر بھی ہے کیونکہ یہ روح سب بندوں پر نہیں خاص بندوں پر نازل ہوتی ہے اور القائے روح کی غرض یہاں امر الٰہی کی تبلیغ بیان فرمائی ہے یعنی تاکہ ایسا انسان لوگوں کو ڈرائے کہ آخر انہیں اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے پڑیں گے اور اس آیت کے نیچے روح المعانی میں حدیث مجدد کا ذکر کیا ہے فان الالقاء لم یزل من لدن آدم علیه السلام الی انتهاء زمان نبینا صلعم وھو فی حکم المتصل الی قیام الساعۃ باقامۃ من یقوم بالدعوۃ علی ما روی ابوداؤد عن ابی ھریرۃ عن النبی علیه الصلوٰۃ والسلام انه قال ان اللّٰہ تعالیٰ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ علٰی رَأْسِ کلّ مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا ای باحیاء ما اندرس من العمل بالکتاب والسنۃ (ر) یعنی یہ القائے وحی آدم علیه السلام سے لیکر ہمارے نبی صلعم کے زمانہ تک رہا اور وہ قیامت تک کے لیے حکم اتصال رکھتا ہے اس شخص کے کھڑا ہونے سے جو دعوت اسلام کے کام کو لے کر کھڑا ہو جیسا کہ ابوداؤد نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر سو سال کے سر پر ایک ایسے شخص کو اٹھاتا رہے گا جو اس کے دین کی تجدید کرتا رہے یعنی عمل بالکتاب والسنۃ سے جو کچھ مٹتا رہا ہے اسے زندہ کرتا رہے اور حدیث مجدد گو صرف ابوداؤد نے بیان کی ہے لیکن حفاظ کا اس کی صحت پر اتفاق ہے اور امت کے تعامل نے اس کی صداقت پر مہر لگا دی ہے کیونکہ بڑے بڑے راستبازوں کے مجددیت کے دعوے موجود ہیں اور ان بزرگوں کو جھوٹا وہی شخص کہہ سکتا ہے جسے قرآن و حدیث کی پروا نہ ہو۔

ع۲۹۰۲ بارزون دیکھو ع۳۲ مطلب یہ ہے کہ ان کی چھپی ہوئی حالت ظاہر ہو جائے گی یعنی نتائج اعمال جو مخفی تھے وہ ظاہر ہو جائیں گے اور لا یخفی علی اللہ منھم شئ میں بتایا کہ اللہ پر وہ نتائج اس وقت بھی مخفی نہ تھے۔ یہ ظاہر ہونا صرف انسان کے اپنے لیے ہے اور للہ الواحد القہار گویا ان لوگوں کا جواب ہے جو یہاں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے فوق ہونے کا اقرار نہ کرتے تھے یعنی اس دن وہ بھی تسلیم کر لیں گے۔ یوں تو ہمیشہ ہی بادشاہت اللہ کی ہے۔

ع۲۹۰۳ ازفۃ - ازِف کے معنی ہیں قریب آگیا اور ازفۃ قریب آنے والی چیز ہے اور مراد اس سے قیامت ہے ازفت الازفۃ (النجم ۵۳ - ۵۷) (غ) اور ابومسلم کا قول ہے کہ اس سے مراد موت کا دن اور اجل کا آنا ہے (ر) القلوب لدی الحناجر پر دیکھو ع۲۶۳۴ ٭

الصُّدُوۡرُ ﴿۱۹﴾

چھپاتے ہیں۔

وَ اللّٰہُ یَقۡضِیۡ بِالۡحَقِّ ؕ وَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ
مِنۡ دُوۡنِہٖ لَا یَقۡضُوۡنَ بِشَیۡءٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ
ع هُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۲۰﴾

اور اللہ تعالیٰ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور وہ جنھیں یہ اس کے سوائے پکارتے ہیں، کسی چیز کا فیصلہ نہیں کرتے اللہ ہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔

اَوَ لَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا
کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا
مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَانُوۡا ہُمۡ اَشَدَّ مِنۡہُمۡ
قُوَّۃً وَّ اٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ فَاَخَذَہُمُ
اللّٰہُ بِذُنُوۡبِہِمۡ ؕ وَ مَا کَانَ لَہُمۡ
مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾

اور کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں، پس دیکھیے ان کا انجام کیا ہوا جو اُن سے پہلے تھے، وہ قوت میں اور زمین میں نشانات (بنانے) میں ان سے بڑھ کر تھے، سو اللہ نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑا اور کوئی انھیں اللہ تعالیٰ (کی سزا) سے بچانے والا نہ تھا۔[۲۹۰۳]

ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَانَتۡ تَّاۡتِیۡہِمۡ رُسُلُہُمۡ
بِالۡبَیِّنٰتِ فَکَفَرُوۡا فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ ؕ
اِنَّہٗ قَوِیٌّ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۲﴾

یہ اس لیے ہُوا کہ اُن کے رسول اُن کے پاس کھلے دلائل لے کر آتے تھے، پر انھوں نے انکار کیا سو اللہ تعالیٰ نے انھیں پکڑا وہ طاقتور سزا دینے میں سخت ہے۔

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا
وَ سُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿ۙ۲۳﴾

اور ہم نے موسیٰؑ کو اپنی آیتوں اور کھلی سند کے ساتھ بھیجا۔

اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ ہَامٰنَ وَ قَارُوۡنَ
فَقَالُوۡا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ﴿۲۴﴾

فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف، تو انھوں نے کہا جادوگر جھوٹا ہے[۲۹۰۴]

فَلَمَّا جَآءَہُمۡ بِالۡحَقِّ مِنۡ عِنۡدِنَا
قَالُوا اقۡتُلُوۡۤا اَبۡنَآءَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا
مَعَہٗ وَ اسۡتَحۡیُوۡا نِسَآءَہُمۡ ؕ وَ مَا
کَیۡدُ الۡکٰفِرِیۡنَ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾

سو جب وہ ہماری طرف سے حق لے کر ان کے پاس آیا انھوں نے کہا ان لوگوں کے بیٹوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں قتل کر دو اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دو، اور کافروں کی تدبیر رائیگاں ہی جاتی ہے۔

وَ قَالَ فِرۡعَوۡنُ ذَرُوۡنِیۡۤ اَقۡتُلۡ مُوۡسٰی

اور فرعون نے کہا مجھے چھوڑ دو، میں موسیٰؑ کو قتل کردوں

ع۲۹۰۳ واق۔ وقی یقی سے اسم فاعل ہے یعنی بچانے والا مالك من الله من ولی ولا واق (الرعد ۱۳-۳۷) اور قِ اور قوا اس سے امر ہیں۔ وقنا عذاب النار (البقرۃ ۲-۲۰۱) قوا انفسکم واھلیکم نارا (التحریم ۶۶-۶) آثار یا نشانات سے مراد ایسی عمارات ہیں جو بطور نشان یا یادگار بنائی جائیں جیسے مضبوط قلعے یا محفوظ شہر۔

ع۲۹۰۴ مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے متکبروں کے لیے حضرت موسیٰ کا پیغام تھا فرعون و ہامان کو اپنی بادشاہت اور طاقت پر بھروسہ تھا۔ قارون کو دولت پر فخر تھا۔ طاقت یا دولت کا نشہ جہاں ہو وہاں حق کی کون پروا کرتا ہے اور یہ رسول اللہ صلعم کے لیے تسلی ہے۔

وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾

اور چاہیئے کہ وہ اپنے رب کو بلائے مَیں ڈرتا ہوں کہ وہ تمھارے دین کو بدل دے یا یہ کہ وہ زمین میں فساد ظاہر کرے۔

وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾ ع ۸

اور موسیٰؑ نے کہا میں اپنے رب اور تمھارے رب کی پناہ چاہتا ہوں، ہر اس متکبر سے جو حساب کے دن پر ایمان نہیں لاتا۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖۗ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۗ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ يَعِدُكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾

اور فرعون کے لوگوں میں سے ایک مومن مرد نے جو اپنا ایمان چھپاتا تھا کہا، کیا تم ایسے شخص کو قتل کرتے ہو، جو کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور وہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے کھلے نشان لایا ہے اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اسی پر ہے اور اگر وہ سچّا ہے تو بعض وہ باتیں تمھیں پہنچ رہیں گی جن کا وہ وعدہ دیتا ہے اللہ اسے ہدایت نہیں کرتا جو حد سے گزرنے والا جھوٹا ہے ع۲۹۰۵

يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرْعَوْنُ مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَمَاۤ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾

اے میری قوم آج تمھاری بادشاہی ہے زمین میں تم غالب ہو مگر اللہ کی سزا سے بچانے کے لیے کون ہماری مدد کرے گا اگر وہ ہم پر آجائے۔ فرعون نے کہا میں تمھیں وہی دکھاتا ہوں جو مَیں صحیح سمجھتا ہوں اور مَیں تمھیں بھلائی کی راہ پر ہی چلاتا ہوں ع۲۹۰۶

ع۲۹۰۵ رجل مومن کا ذکر: ظاہر یہی ہے کہ یہ مرد مومن فرعون کے لوگوں میں سے تھا بعض نے بوجہ مومن پر وقف کے اسے اسرائیلی کہا ہے ایمان چھپانے سے مراد فرعون سے اس بات کو مخفی رکھنا ہے۔ فعلیہ کذبہ سے مراد ہے کہ وہ بوجہ اپنے افترا کے خود ہلاک ہو جائے گا۔ یا اس کا جھوٹ خود ظاہر ہو جائے گا۔ اور سچا ہونے کی صورت میں بعض ان تکالیف کے پہنچنے سے جن کا وہ وعدہ کرتا ہے بعض نے مراد عذاب دنیا لیا ہے اور بعض نے مراد کل بھی لیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس میں اشارہ ہو کہ بعض وقت عذاب رجوع سے ٹل بھی جاتا ہے رجل مومن کا قصہ بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی صداقت کی بہت سی دلائل فرعون کے سامنے آتی رہی ہیں اور صرف عصا کا سانپ بننا ہی سب بینات نہ تھیں جو حضرت موسیٰ لے کر گئے تھے۔

موسیٰ اور فرعون کا قصہ فی الحقیقت حق اور اس کی مخالفت کا قصہ ہے۔ ایک طرف حق اپنی غایت درجہ کی بےکسی میں ہے کہ اس کی پیٹھ پر کوئی طاقت نہیں کوئی دولت نہیں۔ دوسری طرف طاقت ظاہری اور حکومت اور دولت ہے اور اس مقابلہ میں آخر کار حق کا غالب آنا اور طاقت کا مغلوب ہونا اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کے کلام کی صداقت کا سب سے بڑا گواہ ہے آنحضرت صلعم کے وقت بھی یہی مقابلہ تھا اور آج پھر دنیا میں یہی مقابلہ ہے باطل اپنی تمام تر طاقت اور دولت اور حکومت کے ساتھ صف آرا ہے اور اس کے مقابلہ میں حق بےکسی اور بے سروسامانی کی حالت میں نظر آتا ہے آج بھی وہی باتیں کہنے والے موجود ہیں جو فرعون نے کہی تھیں۔ اسلام کو ہم کیوں کچلنا چاہتے ہیں اس لیے کہ اس سے زمین میں فساد پھیلتا ہے اور صلح اور آشتی صرف عیسائیت سے پھیل سکتی ہے۔ اس مقابلہ میں خود مخالفت حق کرنے والی قوم میں بھی کچھ دل بول اٹھتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں زیادتی ہے۔ یہی رجل مومن کے ذکر میں بتانا مقصود ہے اور اسی کی طرف یہ رجل مومن توجہ دلاتا ہے کہ اگر وہ باطل ہے جو حضرت موسیٰ لائے ہیں تو باطل سرسبز نہیں ہو سکتا۔ اور اگر حق ہے تو کوئی طاقت اسے مغلوب نہیں کر سکتی۔

ع۲۹۰۶ ظاہرین یہاں ظاہر بمعنی غالب ہے دیکھو ع۱۲۸۶۔

وَقَالَ الَّذِيٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ﴿۳۰﴾

اور جو ایمان لایا تھا اس نے کہا اے میری قوم میں تم پر (اور گروہوں کی طرح مصیبت کا) دن آنے سے ڈرتا ہوں۔

مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾

قوم نوح کے حال کی طرح اور عاد اور ثمود کے اور ان کے جو اُن کے بعد آئے اور اللہ تعالیٰ بندوں کے لیے ظلم نہیں چاہتا۔

وَيٰقَوْمِ اِنِّيٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾

اور اے میری قوم میں تم پر ایک دوسرے کو پکارنے کا دن آنے سے ڈرتا ہوں ۲۹۰۷ جس دن تم پیٹھ پھیرتے ہوئے بھاگ جاؤ گے، تمھیں اللہ تعالیٰ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ ٹھیرائے تو کوئی اسے ہدایت دینے والا نہیں ہو سکتا۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ﴿۳۴﴾

اور پہلے تمھارے پاس یوسفؑ کھلی دلیلیں لے کر آیا، مگر تم اس کے بارے میں جو وہ تمھارے پاس لایا شک ہی میں رہے، یہاں تک کہ جب وہ فوت ہو گیا، تو تم نے کہا اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی رسول نہیں بھیجے گا اسی طرح اللہ تعالیٰ اسے گمراہی میں چھوڑتا ہے جو حد سے گزرنے والا شک کرنے والا ہے ۲۹۰۸

الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ

جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر کسی دلیل کے جو اُن کے پاس آئی ہو (یہ) اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اس کے نزدیک جو ایمان لائے بڑی بیزاری (کی بات) ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ

اریکم - اری - رَاٰی سے ہے اور رائی دو مخالف باتوں میں سے ایک کا بوجہ غلبہ ظن صحیح مان لینا ہے (غ)، اس لیے یہاں اُریکم کے معنی اشیر علیکم کیے گئے ہیں یعنی تمہیں مشورہ دیتا ہوں یا انہیں تعلیم دیتا ہوں بھی معنے ہو سکتے ہیں دیکھو ۱۲۸۶ ہر فاتح غالب قوم کے لیے اس میں سبق ہے وہ اپنی طاقت کے نشہ میں بہت کچھ کر گذرتے ہیں اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا مگر خدا کی سزا جب آتی ہے تو انہیں کوئی بچا بھی نہیں سکتا۔

۲۹۰۷ یوم التناد - یوم التنادی سے زجاج کے نزدیک مراد یہ ہے کہ دوزخ والے اہل جنت کو پکاریں گے کہ ہم پر پانی بہاؤ۔ اور تنادَوْا کے معنی یہ بھی ہیں کہ ایک دوسرے کو پکارا اور یہ بھی کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مجلس میں بیٹھے تجالسوا فی النادی (ل)، فتنادوا مصبحین (القلم ۶۸-۲۱) اور ایکدوسرے کو پکارنا مدد کے لیے ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ مجلس میں بیٹھنا مشورہ کے لیے پس یوم التناد سے مراد بھی وہی عذاب یا مصیبت کا دن ہے جب مدد کے لیے ایک دوسرے کو پکارنے کی ضرورت ہو اور آگے صاف آتا ہے یوم تولون مدبرین پیٹھ پھیر کر بھاگنے کا دن بھی وہی ہے۔

۲۹۰۸ یوسف پر اہل مصر ایمان نہیں لائے: اشارہ حضرت یوسفؑ کی نبوت کی طرف ہے اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مصر حضرت یوسف پر ایمان نہیں لائے بلکہ آپ کے متعلق شک میں ہی رہے یہاں تک کہ جب حضرت یوسفؑ فوت ہو گئے تو وہ تکذیب پر پختہ ہو گئے اور لن یبعث اللہ من بعدہ رسولا میں حضرت یوسفؑ کی رسالت کی بھی تکذیب ہے اور دوسرے کسی رسول کی رسالت کی بھی یعنی رسول کوئی ہو ہی نہیں سکتا جسے اللہ تعالیٰ بھیجے وارادوا بقولہم لن یبعث اللہ من بعدہ رسولا تکذیب رسالتہ ورسالۃ غیرہ ای لا رسول فیبعث فہم بعد الشک بتوا بھذا التکذیب (ر) اور بعض اقوال میں ہے کہ یہ یوسف جنوں میں سے تھا جسے اللہ تعالیٰ نے اہل مصر کی طرف مبعوث کیا تھا اور اس سے مراد صرف یہی ہو سکتی ہے کہ یہ کوئی غیر اسرائیلی نبی تھا۔

اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿٣٥﴾

ہر متکبر سرکش کے دل پر مہر لگاتا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ
صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴿٣٦﴾

اور فرعون نے کہا اے ہامان میرے لیے ایک بلند محل بنا، تاکہ میں رستوں پر پہنچوں۔

اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ
مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۭ وَكَذٰلِكَ
زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ
عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ
ع اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴿٣٧﴾

(یعنی) آسمانوں (پر پہنچنے) کے رستے پھر موسیٰؑ کے خدا کو دیکھوں اور میں اسے جھوٹا ہی سمجھتا ہوں اور اسی طرح فرعون کو اس کا برا کام اچھا معلوم ہوا اور وہ رستے سے رک گیا۔ اور فرعون کی تدبیر ہی ہلاک ہونے والی تھی ع۲۹۰۹

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ
اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿٣٨﴾

اور جو ایمان لایا تھا اس نے کہا اے میری قوم میری پیروی کرو تاکہ میں تمھیں بھلائی کا رستہ دکھاؤں۔

يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۡ
وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿٣٩﴾

اے میری قوم یہ دنیا کی زندگی صرف (چند روزہ) سامان ہے اور آخرت ہی ٹھیرنے کا گھر ہے۔

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا
مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ
ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا
بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٤٠﴾

جو برائی کرتا ہے اسے اس کی مثل ہی بدلہ دیا جاتا ہے اور جو نیکی کرتا ہے مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو، تو وہی بہشت میں داخل ہوں گے اس میں بے حساب رزق دیئے جائیں گے۔

وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَ
منزل تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ﴿٤١﴾

اور اے میری قوم مجھے کیا ہوا ہے کہ میں تمھیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف بلاتے ہو۔

تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ
بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۡ وَّاَنَا

تم مجھے بلاتے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور اس کے ساتھ اسے شریک کروں جس کا مجھے علم نہیں اور میں تمھیں غالب

فرعون اور مسئلہ ختم نبوت: بعض لوگوں نے ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ فرعون اس بات کا قائل تھا کہ حضرت یوسف پر نبوت ختم ہو گئی ہے یہ قرآن کریم کے ساتھ ہنسی کرنا ہے نعوذ باللہ من ذٰلک وہ فرعون جو اللہ تعالیٰ کا بھی قایل نہیں و ما رب العالمین (الشعرآء ۲۶-۲۳) اور جو اپنی خدائی منواتا ہے، ما علمت لکم من الٰه غیری (القصص ۲۸-۳۸) اسے توحید کا قائل اور وحی الٰہی کا معتقد مگر ختم نبوت کا قائل قرار دینا بگڑے ہوئے دماغ کا کام ہے آنحضرت صلعم پر ختم نبوت کے انکار نے کہاں تک اس قوم کو پہنچا دیا ہے۔

ع۲۹۰۹ ایسا ہی بیان القصص ۲۸-۳۸ میں گذر چکا ہے یہاں اسباب السمٰوات کے لفظ بڑھائے ہیں اور مراد وہ ذرائع ہیں جن سے آسمان تک پہنچا جائے یا رستے مراد ہو سکتے ہیں۔

اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾

بخشنے والے کی طرف بلاتا ہوں۔

لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾

سچ تو یہ ہے کہ جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو اس کے لیے کوئی دعوت نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں اور کہ ہمارا لوٹ کر جانا اللہ کی طرف ہے اور کہ حد سے گزرنے والے ہی آگ کے رہنے والے ہیں ع۲۹۱۰

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾

سو تم یاد کرو گے جو میں تمھیں کہتا ہوں، اور میں اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں اللہ تعالیٰ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ ع۲۹۱۱

فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾

سو اللہ تعالیٰ نے اسے ان کی تدبیروں کی شر سے بچا لیا اور فرعون کے لوگوں کو بُرے عذاب نے آلیا۔

اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾

آگ ہے جس پر وہ صبح اور شام پیش کیے جاتے ہیں، اور جس دن (آخری) گھڑی آجائے گی (کہا جائے گا) فرعون کے لوگوں کو سخت تر عذاب میں داخل کرو ع۲۹۱۲

وَاِذْ يَتَحَاۗجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰۗؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾

اور جب آگ کے اندر جھگڑتے ہوں گے کمزور تکبّر کرنے والوں سے، کہیں گے ہم تمھارے تابع تھے تو کیا تم ہم سے آگ کا کچھ حصّہ ہٹا سکتے ہو۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ ۙ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۸﴾

جو بڑے بنے ہوئے تھے کہیں گے ہم سب اس کے اندر ہیں اللہ نے بندوں کے درمیان فیصلہ کر دیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا

اور وہ جو آگ میں ہوں گے دوزخ کے نگہبانوں سے کہیں گے اپنے رب کو پکارو (کہ) وہ ایک دن ہم پر سے کچھ

ع۲۹۱۰ لیس لہ دعوۃ کیونکہ وہ نہ بولتے ہیں نہ سمجھتے ہیں نہ نفع دیتے ہیں نہ نقصان دیتے ہیں۔(ج) اور یا یہ مطلب ہے کہ سچے معبود کو تو چاہیئے کہ وہ اپنے معزز بندوں یعنی نبیوں کو اپنی طرف بلائے اور انہیں اپنی عبادت کا حکم دے پھر اُن کے ذریعے سے دوسرے لوگوں کو بلائے مگر معبودانِ باطل ایسا نہیں کرتے۔

ع۲۹۱۱ افوض۔ فَوَّضَ الیہ الامر کے معنی ہیں اس امر کو اس کی طرف پھیرا۔ اور اسے اس میں حاکم بنایا (ل) یعنی تم مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ خود نقصان اٹھاؤ گے اور وقت آئے گا کہ میری ان باتوں کو یاد کرو گے۔

ع۲۹۱۲ عالم برزخ میں ثواب و عذاب: اس سے معلوم ہوا کہ عالم برزخ میں بھی کسی نہ کسی رنگ میں عذاب کا (اور اس لیے ثواب کا بھی) احساس کرایا جاتا ہے گو اس کا پورا ظہور قیامت کے دن ہی ہوگا۔ اس لیے ساتھ ہی فرمایا کہ قیامت کے دن سخت تر عذاب میں داخل کیے جائیں گے اور صحیحین میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ایک شخص مر جاتا ہے تو اس کی جگہ دوزخ میں ہو یا بہشت میں صبح اور شام اس کے سامنے لائی جاتی ہے (م) اور شرحبیل اور ابن مسعود سے ایک روایت میں ہے کہ ان کی روحیں صبح اور شام سیاہ پرندوں کے پیٹوں میں آگ پر لائی جاتی ہیں (ج۔م) اور یہ پرندے صورتیں ہیں جو ان کے اعمال کی صورتوں سے تیار ہوتی ہیں۔

مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۴۹﴾

عذاب ہلکا کر دے۔

قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰۗؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾ ع

کہیں گے اور کیا تمھارے پاس تمھارے رسول دلائل کے ساتھ نہیں آئے تھے؟ کہیں گے ہاں، کہیں گے پھر تم پکارو اور کافروں کی دعا بھی رائیگاں جائے گی ۲۹۱۳ع

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾

یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ان کی جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں مدد کرتے ہیں اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے ۲۹۱۴ع

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾

جس دن ظالموں کو ان کا عذر کچھ فائدہ نہ دے گا اور ان کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے بُرا گھر ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿۵۳﴾

اور ہم نے موسیٰؑ کو ہدایت دی اور بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا۔

هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۵۴﴾

(جو) ہدایت اور نصیحت عقل والوں کے لیے ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۵۵﴾

سو صبر کر، کیونکہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اور اپنے قصور کے لیے حفاظت مانگ اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ شام اور صبح تسبیح کر ۲۹۱۵ع

اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ

وہ لوگ جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر کسی سند کے

ع۲۹۱۳ کفار کی دعا: اس آیت کا مطلب تو صرف اس قدر ہے کہ جب عذاب آجائے پھر کافروں کی دعا بیکار رہے۔ روح المعانی میں ہے کہ آیت میں جس دعائے کفار کا ذکر ہے وہ قیامت کے دن کے متعلق ہے رہا یہ امر کہ کفار کی دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ علیحدہ بحث ہے مگر ظاہر ہے کہ امن یجیب المضطر کے الفاظ عام ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کریم میں صاف ذکر ہے کہ مشرک جب مصیبت میں ہوتے ہیں جیسے سمندر میں کشتی میں اور طوفان آتا ہے تو وہ خدا کو پکارتے ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ انہیں نجات دیتا ہے اور وہ پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔

ع۲۹۱۴ اشہاد۔ شاہد کی جمع ہے یعنی گواہ اور گواہوں میں فرشتے اور انبیاء اور مومن داخل ہیں۔

یہاں نہ صرف رسولوں کے لیے بلکہ مومنوں کے لیے بھی نصرت کا وعدہ ہے اور بالتصریح یہ وعدہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں بھی نصرت دی جائے گی۔ اور آخرت میں بھی۔ آخرت کی نصرت کا سوال تو پردۂ غیب میں ہے لیکن دنیا کی زندگی میں نصرت کے ملنے پر لوگوں نے اعتراض کیے ہیں مثلاً یہ کہ بعض رسول قتل کیے گئے یا مومن قتل ہو جاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ان کے دشمنوں سے بعد میں انتقام لے لیا جاتا ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ نصرت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ جس حق کو رسول لائے ہیں یا جسے مومن پھیلانا چاہتے ہیں اس مقصد میں اُنہیں کامیابی ہو۔ سو گو اہل حق اپنا کام کر کے شہید ہو جائیں مگر حق مغلوب نہیں ہوتا اور ضرور ہے کہ آخر کار حق کا غلبہ ہو۔ یہ وہ نصرت ہے جو رسولوں اور مومنوں کو ملتی ہے۔ اور مومنوں سے مراد یہاں وہی مومن ہیں جو رسولوں کے جانشین ان کے کام میں ہوتے ہیں۔

ع۲۹۱۵ آنحضرتؐ کے استغفار سے مراد: استغفار کے لیے دیکھو ع۲۵۸ اور ذنب کے لیے ع۳۸۱ اور یہاں مراد اُن قصوروں یا گناہوں سے حفاظت مانگنا ہے جو انسان سے سرزد ہو سکتے ہیں اس لیے کہ نبی کریم صلعم جو دوسروں کو گناہوں سے پاک کرتے تھے جیسا کہ قرآن کریم کی صراحت سے ثابت ہے خود گناہ کا ارتکاب نہ کر سکتے تھے ھو الذی بعث فی الامّیین رسولاً منھم یتلوا علیھم اٰیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ (الجمعۃ ۶۲-۲) اور ایسے لفظ قرآن کریم میں کئی بار آتے ہیں دیکھو البقرۃ ۲-۱۲۹ و ۱۵۱، آل عمران ۳-۱۶۴، التوبۃ ۹-۱۰۳۔ ایسا ہی متعدد مقامات قرآنی سے عصمت انبیاء ثابت ہے اس لیے آپ کی صورت میں استغفار کے معنی سوائے گناہ سے طلب حفاظت کے اور کوئی نہیں ہو سکتے۔

بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ
اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ
بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۵۶﴾

جو اُن کے پاس آئی ہو، ان کے سینوں میں کچھ نہیں، مگر بڑائی (کی خواہش) ہے جسے وہ پہنچنے والے نہیں سو اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہ - وہی سننے والا دیکھنے والا ہے ۲۹۱۶ع

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ
خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے بڑا کام ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۲۹۱۷ع

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۥ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ
لَا الْمُسِيْٓءُ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں -
اور نہ وہ جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں اور بدی کرنے والے، بہت کم تم نصیحت حاصل کرتے ہو -

اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۹﴾

یقیناً (موعود) گھڑی آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے -

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ
اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ
سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ ع

اور تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو میں تمہاری (دعا) قبول کروں گا وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبّر کرتے ہیں، ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے -

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا
فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ
فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۱﴾

اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام پاؤ اور دن کو روشن (بنایا) - اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے -

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۡ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۲﴾
كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۶۳﴾

یہ اللہ تمہارا رب ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، اس کے سوائے کوئی معبود نہیں تو تم کس طرح اُلٹے پھر جاتے ہو -
اسی طرح وہ لوگ اُلٹے پھر جاتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے -

---

ع۲۹۱۶ یہاں استعاذہ سے مراد مخالفین کی شرارتوں سے خدا کی پناہ میں آنا ہے جیساکہ پہلے یجادلون لاکر اور لعد میں سمیع اور لبصیر لاکر بتا دیا -

ع۲۹۱۷ ظاہر مطلب یہ ہے کہ لوگ جو مخالفت حق کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں وہ خدا کے سامنے لاشئے ہیں - انسان کیا چیز ہے اس نے آسمان اور زمین پیدا کیے ہیں جن کے سامنے انسان کی کچھ حقیقت ہی نہیں - اولیس الّذی خلق السمٰوات والارض بقادر علیٰ ان یخلق مثلھم (یٰسٓ ۳۶-۸۱) مگر ابوالعالیہ سے یہاں مروی ہے کہ الناس سے مراد دجال ہے اور چونکہ پیچھے الذین یجادلون کا ذکر ہے اور دجال سب سے بڑا حق سے جدال کرنے والا ہے اس لیے یہ معنی موزوں ہیں اور اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ دجال ایک آدمی کا نام نہیں بلکہ ایک گروہ کا نام ہے -

اَللّٰہُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَکُمۡ فَاَحۡسَنَ صُوَرَکُمۡ وَ رَزَقَکُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ ۚۖ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۶۴﴾

اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو ٹھیرنے کی جگہ بنایا اور آسمان کو ایک عمارت بنایا اور تمھاری صورتیں بنائیں تو خوب ہی تمھاری صورتیں بنائیں اور تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا یہ اللہ تعالیٰ تمھارا رب ہے سو اللہ جہانوں کا رب بابرکت ہے۔

ہُوَ الۡحَیُّ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ فَادۡعُوۡہُ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ؕ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۶۵﴾

وہ زندہ ہے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں سو خالص اسی کی فرماں برداری کرتے ہوئے اُسے پکارو، سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے۔

قُلۡ اِنِّیۡ نُہِیۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَمَّا جَآءَنِیَ الۡبَیِّنٰتُ مِنۡ رَّبِّیۡ ۫ وَ اُمِرۡتُ اَنۡ اُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۶۶﴾

کہہ، مجھے روکا گیا ہے کہ میں اُن کی عبادت کروں، جنھیں تم اللہ تعالیٰ کے سوائے پکارتے ہو، جب میرے پاس میرے رب کی طرف سے کھلی دلائل آگئی ہیں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں جہانوں کے رب کی فرمانبرداری کروں۔

ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَۃٍ ثُمَّ یُخۡرِجُکُمۡ طِفۡلًا ثُمَّ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَشُدَّکُمۡ ثُمَّ لِتَکُوۡنُوۡا شُیُوۡخًا ۚ وَ مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّتَوَفّٰی مِنۡ قَبۡلُ وَ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَجَلًا مُّسَمًّی وَّ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۷﴾

وہی ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر لوتھڑے سے۔ پھر وہ تمھیں بچّہ بنا کر نکالتا ہے، پھر تم اپنی جوانی کو پہنچتے ہو، پھر تم بوڑھے ہو جاتے ہو اور تم میں سے کوئی وہ ہے، جسے پہلے وفات دے دی جاتی ہے اور تم ایک مقرر میعاد کو پہنچتے ہو اور تاکہ تم عقل سے کام لو ۲۹۱۸

ہُوَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ۚ فَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۶۸﴾ ع ۷ / ۱۲

وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے پھر جب وہ ایک بات کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اسے صرف یہی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰہِ ؕ اَنّٰی یُصۡرَفُوۡنَ ﴿ۚۛ۶۹﴾ منزل ۶

کیا تو نے ان کی حالت پر غور نہیں کیا جو اللہ کی آیتوں کے بارے میں جھگڑتے ہیں وہ کس طرح اُلٹے پھر جاتے ہیں۔

اَلَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِالۡکِتٰبِ وَ بِمَاۤ اَرۡسَلۡنَا

جو کتاب کو اور اسے جس کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا،

۲۹۱۸ لتبلغوا اشدکم اور لتکونوا شیوخا میں لام عاقبت کا بھی ہو سکتا ہے اور بعض نے یبقیکم محذوف مانا ہے یعنی تمہیں باقی رکھتا ہے تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔

شیوخ ۔ شیخ کی جمع ہے جس شخص کی عمر زیادہ ہوگئی ہو اُسے شیخ کہا جاتا ہے۔ ھذا بعلی شیخا (ھود ۷۲) وابونا شیخ کبیر (القصص ۲۳) اور چونکہ بڑی عمر والے کے تجربے زیادہ ہوتے ہیں اس لیے زیادہ علم والے کو بھی شیخ کہہ دیتے ہیں (غ)

بِهٖ رُسُلَنَا ۛ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝٧٠
اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ
يُسْحَبُوْنَ ۝٧١
فِي الْحَمِيْمِ ۥ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ۝٧٢
ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ
تُشْرِكُوْنَ ۝٧٣
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ
لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ۭ
كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ۝٧٤
ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ۝٧٥
اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ
فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝٧٦
فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا
نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ
نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ۝٧٧
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ
مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ
مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۭ وَمَا كَانَ
لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ

جھٹلاتے ہیں سو وہ جان لیں گے ع۲۹۱۹
جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں
گھسیٹ کر،
ع۲۹۲۰ اُبلتے ہوئے پانی میں ڈالے جائیں گے پھر آگ میں جھونکے جائیں گے۔
پھر انھیں کہا جائے گا کہ وہ کہاں ہیں، جو تم اللہ تعالیٰ
کے سوائے،
شریک بناتے تھے، کہیں گے وہ ہم سے کھوئے گئے،
بلکہ ہم پہلے کسی چیز کو بھی نہ پکارتے تھے، اسی طرح
اللہ تعالیٰ کافروں کو ہلاک کرتا ہے۔
یہ اس لیے ہے کہ تم زمین میں ناحق خوش ہوتے
تھے اور اس لیے کہ تم اتراتے تھے ع۲۹۲۱
دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اسی میں رہو گے
سو متکبروں کا ٹھکانا کیا ہی بُرا ہے۔
سو صبر کر کیونکہ اللہ کا وعدہ سچّا ہے، سو اگر ہم
تجھے بعض وہ باتیں دکھائیں جن کا ہم ان سے وعدہ کرتے
ہیں یا تجھے وفات دیدیں تو ہماری طرف ہی وہ لوٹائے جائیں گے ع۲۹۲۲
اور یقیناً ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے ان میں سے وہ ہیں جن کا
ذکر ہم نے تجھ سے کر دیا اور ان میں سے وہ ہیں جن کا
تجھ سے ذکر نہیں کیا۔ اور کسی رسول کے لیے (اختیار)
نہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے سوائے نشان لائے

ع۲۹۱۹ الکتب سے مراد قرآن ہے اور ما ارسلنا بہ رسلنا سب رسولوں کی وحی ہے۔

ع۲۹۲۰ سلاسل۔ سِلْسِلَة کی جمع ہے فی سلسلة ذرعها سبعون ذراعا (الحاقة ۶۹-۳۲) اور یہ سَلّ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کا دوسری سے کھینچ کر نکالنا ہیں۔ سلسلة میں گویا یہ فعل بار بار پایا جاتا ہے (رغ)

یسجرون۔ سَجْر آگ کا بھڑکانا ہے اور فی النار یسجرون ایسا ہی ہے جیسا وقودها الناس والحجارة اور دوسری جگہ آتا ہے والبحر المسجور (الطور ۵۲-۶) اذا البحار سجرت (التکویر ۸۱-۶) تو مراد ہے کہ ان میں آگ لگا دی جائے گی اور بعض کے نزدیک ان کے معنی ہیں کہ ان کا پانی خشک ہو جائے گا۔ (غ)

ع۲۹۲۱ تفرحون۔ تمرحون۔ مرح۔ شدت فرح کو کہتے ہیں دیکھو ع۱۸۳۲ اور یہاں بعض نے یوں فرق کیا ہے کہ انبیاء اور اولیاء کے مصائب کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور اپنے مال و دولت پر اتراتے تھے۔

ع۲۹۲۲ بعض الذی نعدهم سے مراد قتل ہونا اور گرفتاری ہے (س) وعدہ تو ان کے ساتھ عذاب دنیا اور عذاب آخرت دونوں کا تھا۔ اس لیے بعض الذی نعدهم فرمایا اور اس سے پہلے فاصبر ان وعد اللہ حق کہہ کر بتا دیا کہ عذاب دنیا کا جو وعدہ ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ اور او نتوفینك اس لیے بھی فرمایا کہ آپ کے اعداء تو پیچھے بھی پیدا ہونے والے تھے۔

اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِیَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۷۸﴾ ع

سو جب اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا اور ابطالِ حق کرنے والے گھاٹے میں رہے ۲۹۲۳

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾

اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمھارے لیے چار پائے بنائے تاکہ تم ان میں سے بعض پر سوار ہو اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔

وَلَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَیْهَا وَعَلَی الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾

اور تمھارے لیے اُن میں فائدے ہیں اور تاکہ ان پر چڑھ کر تم اس حاجت کو پہنچو جو تمھارے سینوں میں ہے اور ان پر اور کشتیوں پر تم اُٹھائے جاتے ہو ۲۹۲۴

وَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ ۖ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾

اور وہ تمھیں اپنے نشان دکھاتا ہے سو تم کن کن اللہ تعالیٰ کے نشانوں کا انکار کروگے۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ فَمَاۤ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾

تو کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں، پھر دیکھتے ان کا انجام کیسا ہُوا جو اُن سے پہلے تھے، وہ (تعداد میں) ان سے زیادہ تھے اور طاقت میں اور زمین میں نشانات کے لحاظ سے مضبوط تر تھے سو اُن کی کمائی ان کے کام نہ آئی۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَ

پھر جب ان کے پاس ان کے رسول کھلے دلائل لے کر آئے وہ اسی پر نازاں رہے جو ان کے پاس کچھ علم تھا، اور ان

۲۹۲۳ یعنی رسولوں کا آنا تو عام ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا وان من اُمة الا خلا فیہا نذیر (فاطر ۳۵ - ۲۴) اور ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ قانون بھی عام ہے کہ سزا کا لانا رسول کے اختیار میں نہیں ہوتا لیکن وہ سزا آتی ضرور ہے اور آخر حق و باطل میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور حق غالب آجاتا ہے اور باطل مغلوب ہو جاتا ہے۔

یہاں سے دو باتیں اور معلوم ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ اس سورت کا نزول اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جب کچھ رسولوں کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو چکا ہے اس لیے یہ سب سورتیں جو حٰمٓ سے شروع ہوتی ہیں، مکّی زمانہ کے درمیانی حصّہ کی معلوم ہوتی ہیں دوسری بات جو یہاں سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ سوائے ان انبیاء کے جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے اور بھی نبی ہوئے ہیں اور طبرانی نے حضرت علی سے روایت بیان کی ہے کہ ان رسولوں میں سے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم پر نہیں کیا حبش کا ایک نبی تھا اور ایسے ہی لفظ حضرت ابن عباس سے مروی ہیں۔ کہ حبش میں اللہ تعالیٰ نے ایک سیاہ رنگ کا نبی مبعوث کیا (م) اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب ایران کو فتح کیا تو ایرانیوں کو اہل کتاب میں داخل کر کے گویا زرتشت کا نبی ہونا تسلیم کر لیا۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندوستان کو نبیوں سے خالی مانیں۔ اور رامچندر اور کرشن جی کی جو عزت اور محبت کروڑہا انسانوں کے دلوں میں ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ بھی اپنے زمانہ میں اس ملک میں نبی ہی گزرے ہیں ہاں یہ محض اجتہاد ہے۔

۲۹۲۴ منافع۔ نفع وہ چیز ہے جس سے بھلائیوں کی طرف پہنچنے میں مدد حاصل کی جاتی ہے۔ اور جس سے بھلائی کی طرف پہنچا جاتا ہے۔ پس وہ خیر ہے اور ضُرّ کی ضد ہے لا املك لنفسی نفعا ولا ضرا (الاعراف ۷ - ۱۸۸) لن تنفعكم ارحامكم ولا اولادكم (الممتحنة ۶۰ - ۳) (غ) اور مَنْفَعَة وہ فائدہ ہے جو حاصل کیا جاتا ہے۔

حاجة کسی چیز کی حاجة اس کی ضرورت ہے جس کے ساتھ اس کی محبت ہو حاجة مما اُوتوا (الحشر ۵۹ - ۹)

حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸۳﴾	کو اس (سزا) نے آلیا جس پر وہ ہنسی کرتے تھے ۲۹۲۵
فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ	پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا کہا ہم اللہ واحد پر ایمان
وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿۸۴﴾	لائے اور اس کا انکار کیا جو اس کے ساتھ شریک ٹھیراتے تھے۔
فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا	پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو ان کا ایمان انھیں سود مند
بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ	نہ ہوا، یہی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو اس کے بندوں میں چلی آئی ہے
ع ۹ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾	اور وہاں کافر گھاٹے میں رہے ۲۹۲۶

۲۹۲۵ انبیاء کا علم اور دنیا داروں کا علم: ایک وہ علم اخلاق و روحانیت اور آخرت کا علم ہے جو رسول لاتے ہیں۔ دوسرا وہ علم انسانی اور خشک فلسفہ اور منطق ہے جو انسان اپنی کوشش سے حاصل کرتا ہے لوگ اس دوسرے علم پر خوش ہو جاتے ہیں۔ اور اوّل الذکر علم کے حاصل کرنے کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے حالانکہ یہی وہ علم ہے جس نے دنیا میں تبدیلی پیدا کی ہے اور انسانوں کو بدی کے پنجے سے چھڑا کر نیکی اور اخلاق کے اعلےٰ سے اعلےٰ مقاموں پر پہنچایا ہے۔ مگر علم خشک انسان کو بدی سے نہیں روک سکتا۔ بلکہ اس سے بدی پر اور جرأت بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ اس بات پر ہنسی کی جاتی ہے کہ ایک قوم جو زبردست قوت کی مالک ہے وہ بھی کبھی نیچا دیکھ سکتی ہے۔ لیکن آخر وہ سزا واقع ہو کر رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون بدی کی سزا کے متعلق یہی ہے کہ جب تک وہ کچھ نیکیوں کے ساتھ ملی رہتی ہے اس وقت تک کھلے طور پر ظاہر نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ نتائج اس قدر باریک ہوتے ہیں کہ انسان کی آنکھ انہیں دیکھ نہیں سکتی لیکن جب ایک قوم کی کثرت بدکاریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے تو وہ نتائج کھلے رنگ میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور یہی قوم کی تباہی ہوتی ہے۔ بدی کے نتیجہ کے اسی قانون مستمرہ کا ذکر یہاں ہے اور یہ ذکر کثرت سے قرآن شریف میں پایا جاتا ہے۔

۲۹۲۶ مطلب یہ ہے کہ ایک وقت تک انسان کو رجوع فائدہ دیتا ہے۔ لیکن جب بدی اس انتہا کو پہنچ جائے جس پر سزا لازماً مترتب ہو جاتی ہے تو پھر رجوع یا ایمان بھی کوئی فائدہ نہیں دیتا اسی لیے لما راوا باسنا کی شرط ہے یعنی جب ہماری سزا آ پہنچے تو پھر ایمان سے بھی نفع نہیں ہوتا۔

ایاتھا ۵۴ — (۴۱) سُوْرَةُ حٰمٓ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ — رکوعاتھا ۶

نام: اس سورت کا فصّلت ہے اور حٰمٓ یا حٰمٓ السجدۃ بھی اسے کہا جاتا ہے اور اس میں چھ رکوع اور ۵۴ آیتیں ہیں۔ اس کی ابتدا میں ہی آتا ہے کتاب فصلت ایاتہ جہاں سے اس کا نام لیا گیا ہے یعنی اس کی آیات کو بار بار واضح کر کے بیان کیا گیا ہے اور اسکے آخری سے پہلے رکوع میں ہے کہ اگر اس کی آیات میں کچھ بھی ابہام رہتا تو کہتے لولا فصلت ایاتہ اصل غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یوں ہی انسان پر گرفت نہیں کرتا جب تک کہ اس کی بھلائی اور اس کی برائی کی راہیں کھول کھول کر اسے نہیں بتا دیتا۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں دعوت حق پر کفار کے اعراض کا ذکر ہے، دوسرے میں انذار ہے، تیسرے میں بتایا ہے کہ وہ بدیاں جن سے بچنے کے لیے یہ پاک کتاب ہدایت فرماتی ہے خود انسان کے جوارح پر اپنا اثر چھوڑتی ہیں جو بالآخر قیامت کے دن ایک کھلی شہادت کے رنگ میں ظاہر ہوگا، چوتھے میں بتایا کہ قرآن کریم کے اثر سے بچنے کے لیے کفار نے کیا راہ اختیار کی ہے اور مومنین کے تعلیم قرآن پر چلنے کا یہ نتیجہ بتایا ہے کہ ملائکۃ اللہ ان پر نازل ہونگے، پانچویں میں بتایا کہ دعوت الی القرآن بہترین کام ہے اور قرآن کریم باطل کے اثرات سے محفوظ ہے چھٹے میں نتائج اعمال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام کا غلبہ نہ صرف ملک عرب میں ہوگا بلکہ اطراف واکناف عالم میں بھی اس کو غالب کیا جائے گا۔

تعلّق: پچھلی سورت میں مومنوں کی نصرت کا ذکر تھا اس میں بھی مخالفت حق کی ناکامی کو کھول کر بیان کیا اور آخر پر بتایا کہ اسلام کا غلبہ نہ صرف ملک عرب میں بلکہ اطراف واکناف عالم میں بھی یقینی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

حٰمٓ ۝۱
(اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والا رہے)

تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲
(کتاب کا) نازل کرنا اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنیوالے کی طرف سے ہی۔

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا
لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۳
یہ کتاب ہے جس کی آیتیں کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ قرآنِ عربی
ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔

بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ
فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝۴
خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا، پر ان میں سے بہتوں
نے منہ پھیر لیا، سو وہ نہیں سنتے۔

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ
اِلَيْهِ وَ فِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَيْنِنَا
الثلثة وَ بَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝۵
اور کہتے ہیں ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں جس کی طرف
تو ہمیں بلاتا ہے اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے اور ہمارے
اور تمہارے درمیان پردہ ہے سو عمل کر ہم بھی عمل کرنے والے ہیں ۲۹۲۷ع

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ
اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا
اِلَيْهِ وَ اسْتَغْفِرُوْهُ ۗ وَ وَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝۶
کہہ، میں صرف تمہاری طرح ایک انسان ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے
کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے سو اسی کی طرف سیدھی راہ پر لگے رہو
اور اس کی حفاظت مانگو اور مشرکوں کے لیے افسوس ہے۔

الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ
بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۷
جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے بھی
منکر ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
ع ۸/۱۵ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۸
جو لوگ ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں، ان کے
لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے ۲۹۲۸ع

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ
کہہ کیا تم اس کا انکار کرتے ہو، جس نے زمین کو دو

۲۹۲۷ع یہ ان کے اعراض کا نقشہ ہے مطلب یہ ہے کہ تمہاری بات ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی جیسا دوسری جگہ ہے یا شعیب ما نفقہ کثیرا مما تقول (ھود ۱۱-۹۱) یہی نہیں بلکہ ہمکو وہ بات سنائی بھی نہیں دیتی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان ایک حجاب ہے یہ سب ان کے اعراض کی تصویر ہے کہ کس حد تک وہ دعوت حق کی طرف سے منہ پھیرے ہوئے تھے۔

۲۹۲۸ع ممنون۔ مَنّ کے لیے دیکھو ۳۳۷ع اور غیر ممنون کے معنی غَيْرُ مَعْدُوْد لکھے ہیں یعنی جو گنا نہیں جا سکتا جیسے بغیر حساب اور بعض نے اس کے معنی غَيْرُ مَقْطُوْع وَلَا مَنْقُوْصٍ لکھے ہیں یعنی نہ قطع ہونے والا نہ کم کیا گیا اور اسی سے منون موت کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ عدد کو گھٹاتی اور مدد کو قطع کرتی ہے (غ)

عارضی نجات: اسلام نے اعمال صالحہ کا اجر غیر منقطع فرمایا ہے۔ برخلاف بعض مذاہب کے جو کہتے ہیں کہ اعمال صالحہ کا اجر محدود ہے اہل تناسخ کا یہی خیال ہے جو نجات کو عارضی قرار دے کر پھر روحوں کو واپس لاتے ہیں یہ عقیدہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں نقص لازم کرتا ہے کیونکہ نیک انسان کے اعمال صالحہ کا منقطع ہو جانا اس کی موت کی وجہ سے ہے اور وہ اس کے اپنے اختیار کی بات نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اسے لاکھوں سال تک زندہ رکھتا تو وہ اسی طرح نیکیوں پر قائم رہتا۔ بلکہ یوماً فیوماً ترقی کرتا اس لیے اللہ تعالیٰ اسے اجر غیر محدود عطا فرماتا ہے اور یہی حق ہے عارضی نجات کا مسئلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سخت بخل منسوب کرتا ہے۔

الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهٗٓ
أَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِينَ ⑨
وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا
وَبٰرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَآ أَقْوَاتَهَا
فِيٓ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ ۭ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِينَ ⑩
ثُمَّ اسْتَوٰٓى إِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ
فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ
كَرْهًا ۭ قَالَتَآ أَتَيْنَا طَآئِعِينَ ⑪
فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِي يَوْمَيْنِ
وَأَوْحٰى فِي كُلِّ سَمَآءٍ أَمْرَهَا ۭ وَزَيَّنَّا
السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ۖ وَحِفْظًا ۭ
ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ⑫

وقتوں میں پیدا کیا اور اس کے لیے ہمسر ٹھیراتے ہو
وہ جہانوں کا رب ہے۔
اور اس میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں برکت دی۔
اور اس کی خوراکوں کا اس میں اندازہ کیا (دیہ) چار دن میں (کیا)،
مانگنے والوں کے لیے سب کچھ ٹھیک کر دیا گیا ۲۹۲۹
پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا، سو اسے اور
زمین کو کہا، آجاؤ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ انھوں نے
کہا ہم دونوں خوشی سے حاضر ہیں ۲۹۳۰
سو انھیں سات آسمان دو دن میں بنایا اور ہر آسمان میں
اس کا امر وحی کیا اور ہم نے ورلے آسمان کو ستاروں
سے زینت دی اور ہر طرح سے اس کی حفاظت کی۔ یہ
غالب علم والے کا اندازہ ہے ۲۹۳۱

۲۹۲۹ زمین کا تدریجی طور پر بننا اور چھ مراتب: زمین اور آسمان اور ہر چیز چھ وقتوں میں یا چھ مراتب طے کر کے پیدا ہوئی۔ دیکھو ۱۰۹۴ مفسرین نے عموماً یہاں یہ غلطی کھائی ہے کہ اربعۃ ایام یا چار دن میں پہلے دو دن کو شامل سمجھا ہے اور پھر آیت ۱۲ کے دو دن ملا کر کُل چھ دن بنائے ہیں گویا چار دن میں زمین بنی اور دو دن میں آسمان حالانکہ اگر اربعۃ ایام پہلے دو دنوں کو شامل کر کے ہوتا تو آیت ۱۲ میں یومین کی جگہ ستۃ ایام ہونا چاہیئے تھا اور اس تقسیم کی کہ چار دن میں زمین بنی اور دو دن میں آسمان کوئی سند نہیں بلکہ یہاں وہ بات بیان کی ہے جو آج سے تیرہ سو سال پیشتر کسی کے وہم میں بھی نہ آئی تھی۔ اول زمین کا دو وقتوں میں بنانا ہے۔ یعنی خود اس زمین پر دو حالتیں آئیں، جہاں تک آج ہمارا علم پہنچا ہے وہ بھی یہی ہے کہ پہلے یہ محض ایک ناری ٹکڑا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو کر اس کے اوپر کی سطح بنی ان دو حالتوں کے بعد تیسری حالت جس کا بیان کیا پہاڑوں کا بننا ہے اور یہ بھی تازہ علمی تحقیقات کے عین مطابق ہے۔ یعنی جب اوپر کی سطح موٹی ہونی شروع ہوئی تو پھر زلازل وغیرہ سے اصل سطح کے اوپر پہاڑ بنے اور یہ پہاڑ دریاؤں اور بارشوں کا موجب بنے اسی کی طرف بارك فیھا میں اشارہ معلوم ہوتا ہے اور قدر فیھا اقواتھا میں نباتات حیوانات اور خود انسان کی پیدائش کی طرف اشارہ ہے کیونکہ قوت وہ ہے جس سے بدنِ انسان قائم رہتا ہے۔ اور یہ کل چار حالتیں بنتی ہیں۔ اور سواء اللسائلین میں یا تو سوال زمین وغیرہ کے پیدا کرنے کے متعلق ہے یعنی یہ جواب سب کے لیے برابر ہے اور یا سوال سے مراد رزق کا طلب کرنا ہے جس کی کسی کو حاجت ہو یعنی وہ اقوات جو اللہ تعالےٰ نے زمین میں رکھے ہیں انہیں کوئی طلب کرنے والا ہو سب کو برابر ملتا ہے ابن جریر نے دونوں معنی قبول کیے ہیں۔

ع ۲۹۳۰ دخان دھوئیں کو کہتے ہیں اور یہاں مراد ہے کہ وہ دخان کی مثل ہے یعنی اس میں کوئی پکڑ رکھنے کی طاقت نہیں (مطلب یہ کہ وہ کوئی ٹھوس چیز نہیں) اور حدیث میں ہے ھُدنَۃٌ علٰی دَخَنٍ یعنی ایسی صلح جس کے نیچے فساد ہو (غ) اور یہ آخری زمانہ میں ایک جنگ عظیم کے متعلق پیشگوئی ہے کہ اس کے بعد ایسی صلح ہو گی جس کے نیچے فساد ہوگا اور اقوام کے دل باہم محبّت کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ یہ نقشہ آج ہماری آنکھوں کے سامنے کھینچا ہوا موجود ہے۔

طوعا او کرھا دیکھو ۱۶۰۹ ان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی تاثیر کے لیے اور ان کے اس سے رکنے کے محال ہونے کے لیے یہ ایک مثال ہے اثبات طوع اور کرہ مراد نہیں اور ان کا یہ کہنا کہ ایتنا طائعین بھی ایک مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ان میں کامل طور پر موثر ہے (م) مزید دیکھو نوٹ ع ۳۰۲۷

ع ۲۹۳۱ آسمان کی طرف وحی: اوحی فی کل سماء امرھا۔ یا تو جن کی طرف وحی کی گئی اس کا ذکر نہیں اور یا وحی خود آسمانوں کی طرف ہوئی۔ اور یہ اس کے نزدیک تسخیر ہے جو آسمان کو زندہ نہیں مانتا اور اس کے نزدیک نطق ہے جو اسے زندہ مانتا ہے (غ) مگر اصل یہ ہے کہ ہر ایک چیز کی وحی اس کی حالت کے مطابق ہے جانداروں میں بھی شہد کی مکھی کی وحی نطق نہیں اور یہاں الفاظ عام ہیں۔ ہر ایک سماء کے متعلق جو کوئی امر تھا وہ اس میں وحی کیا یعنی اس امر کا اس میں نفاذ کیا۔

آسمانوں کے دو دن میں بننے سے مراد: یہاں سات آسمانوں کے اسی طرح دو دن میں بنانے کا ذکر ہے جس طرح زمین کے دو دن میں بنانے کا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سات آسمانوں سے مراد نظام شمسی کے سات بڑے سیارے ہیں۔ جو اوپر نظر آنے کے لحاظ سے آسمان کہلاتے ہیں۔ مگر جس طرح وہاں پہاڑ بنانے اور سامان خوراک وغیرہ زمین میں پیدا کرنے کا ذکر تھا یہاں وہ ذکر نہیں بلکہ صرف اس قدر فرمایا کہ ہر آسمان میں اس کا امر وحی کیا یعنی ہر ایک میں وہ کچھ پیدا کیا جس کے لیے اس میں استعداد تھی اور جس کا تقاضا

فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَقُلۡ اَنۡذَرۡتُكُمۡ صٰعِقَةً مِّثۡلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ ؕ ﴿۱۳﴾

سو اگر وہ منہ پھیر لیں تو کہہ دے، میں تمھیں عاد اور ثمود کے عذاب جیسے عذاب سے ڈراتا ہوں ۲۹۳۲

اِذۡ جَآءَتۡهُمُ الرُّسُلُ مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوۡا لَوۡ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنۡزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾

جب رسول ان کے پاس ان کے آگے اور ان کے پیچھے سے آئے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کی عبادت نہ کرو، انھوں نے کہا اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتوں کو اُتارتا، سو جو تم کو دے کر بھیجا گیا ہے ہم اس سے انکاری ہیں ۲۹۳۳

فَاَمَّا عَادٌ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ وَقَالُوۡا مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىۡ خَلَقَهُمۡ هُوَ اَشَدُّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً ؕ وَكَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَجۡحَدُوۡنَ ﴿۱۵﴾

سو عاد نے تو زمین میں ناحق تکبّر کیا، اور کہنے لگے کہ کون طاقت میں ہم سے زیادہ مضبوط ہے۔ کیا انھوں نے غور نہ کیا کہ اللہ جس نے انھیں پیدا کیا طاقت میں ان سے زیادہ مضبوط ہے۔ اور وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔

فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا صَرۡصَرًا فِىۡۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيۡقَهُمۡ عَذَابَ

سو ہم نے اُن پر منحوس دنوں میں تند ہوا چلائی، تاکہ اُنھیں دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب

حکمت الٰہی نے کیا اور با سبع سمٰوات سے مراد باقی کل مخلوق ہے اور بتایا یہ ہے کہ زمین کی طرح ہی دو حالتوں میں سے گذر کر ہر ایک جرم سماوی بنا ہے اور حِفظا فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے حفظنہا حفظا۔ اور یہ صریح شہادت ہے کہ آسمان شیاطین سے محفوظ ہیں۔ اور کسی شیطان کا وہاں تک دخل نہیں اور یہ جو مفسرین نے لکھا ہے کہ پہلے شیاطین کا دخل سارے آسمانوں پر تھا اور حضرت عیسٰے کے وقت میں چوتھے آسمان تک رہ گیا اور آنحضرت صلعم کے وقت میں وہ بھی رُک گیا۔ تو یہ صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب آسمانوں کو بنایا تو اسے محفوظ بھی کیا۔ ہاں اگر اس کے یہ معنی کیے جائیں کہ آنحضرت صلعم کی قوت قدسی نے جس قدر شیاطین کا تصرف انسانوں سے دور کیا اور کسی نبی کو وہ میسر نہیں آیا تو یہ صحیح ہے۔ یہاں زمین اور آسمان کے بنانے کی کسی ترتیب کا ذکر نہیں بلکہ صرف دونوں کے بنانے کا ذکر ہے۔ ترتیب کے متعلق دوسری جگہ صاف ہے والارض بعد ذلك دحٰها (النزعٰت ۷۹: ۳۰) مفسرین نے ان الفاظ کی توجیہ یوں کرنی چاہی ہے کہ زمین کو پیدا تو پہلے کیا مگر دحٰها سے مراد اس میں پہاڑوں وغیرہ کا بنانا ہے مگر پہاڑوں کا بنانا بھی آسمان کے بننے سے پہلے مذکور ہے اس لیے صحیح یہی ہے کہ یہ الفاظ بطور اصل محکم کے ہیں اور یہی بات قطعی ہے کہ زمین بعد میں بنی۔

۲۹۳۲ عتبہ کا پیغام اور آنحضرتؐ کا جواب: ابن ہشام کی ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت حمزہ ایمان لائے اور مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی اور وہ بہت ہوگئے تو ایک دن عتبہ بن ربیعہ نے جو سرداران قوم سے تھا قریش سے کہا کہ تم کہو تو میں محمد رسول اللہ صلعم کے پاس جاؤں اور کچھ باتیں ان کے پیش کروں کہ وہ اس کام سے رک جائیں۔ چنانچہ عتبہ جب آپ اکیلے خانہ کعبہ میں بیٹھے تھے آپ کے پاس گیا اور کہا کہ اگر آپ کا ارادہ اس کام سے مال جمع کرنے کا ہو تو ہم اس قدر مال جمع کرکے آپ کو دے سکتے ہیں کہ آپ ہم سب سے زیادہ مالدار ہوں اور اگر بزرگی چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں۔ کوئی امر بغیر آپ کے مشورے کے طے نہ کریں گے۔ اور اگر بادشاہت چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں اور اگر آپ کو کوئی بیماری ہے تو ہم آپ کے علاج پر خواہ کتنا روپیہ ضرورت ہو صرف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ جب عتبہ بات کر چکا تو آپ نے یہی سورت حٰم تنزیل من الرحمٰن الرحیم پڑھنی شروع کی یہاں تک کہ آپ سجدہ پر پہنچے تو آپ نے سجدہ کیا اور ایک روایت میں ہے کہ اس آیت تک انذرتکم صٰعقۃ مثل صٰعقۃ عاد و ثمود پہنچے اب عتبہ اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور اس کا چہرہ متغیر ہوا ہوا تھا اور اس نے کہا میں نے وہ بات سنی ہے جو نہ شعر ہے نہ سحر ہے نہ کہانت ہے پس اے معشر قریش تم ان کو اپنے کام سے نہ روکو۔ اور مخالفت نہ کرو اگر وہ عزت پائیں تو اس میں تمہاری عزت ہوگی۔ تب سب لوگ بولے اے ابا الولید تم پر بھی آپ کا سحر چل گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتنے کتنے سخت دل لوگوں پر بھی قرآن اثر کیے بغیر نہ رہتا تھا لیکن قومی تعصب غالب آجاتا اور پھر مخالفت شروع کر دیتے۔

۲۹۳۳ من بین ایدیہم و من خلفہم آگے اور پیچھے سے مراد ہر طرف سے آنا ہے اور آنا یہاں بطور تمثیل وسعت دعوت پر ہے یعنی ہر طرح سے سمجھایا۔

الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۶﴾

چکھائیں اور آخرت کا عذاب زیادہ رسوا کرنے والا ہے اور انھیں مدد نہیں دی جائے گی ۲۹۳۴

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۷﴾

اور رہے ثمود، تو ہم نے انھیں رستہ دکھایا، پر انھوں نے اندھا رہنے کو ہدایت پر ترجیح دی سو ذلّت کے عذاب کی ہولناک آواز نے انھیں آلیا اس کی وجہ سے جو وہ کماتے تھے۔

ع ۲ / ۱۶ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸﴾

اور ہم نے انھیں بچالیا جو ایمان لاتے اور تقویٰ کرتے تھے۔

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور جس دن اللہ کے دشمن آگ کی طرف چلائے جائیں گے تو وہ جدا جدا جماعتوں میں تقسیم کیے جائیں گے۔

حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۰﴾

یہاں تک کہ جب اس پر آپہنچیں گے، اُن کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم ان کے خلاف ان کے عملوں کی گواہی دیں گے ۲۹۳۵

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور وہ اپنے جسموں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی کہیں گے اللہ نے ہمیں بولنے کی قوت دی جس نے ہر چیز کو بولنے کی قوت دی اور اس نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا، اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاتے ہو۔

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور تم پردہ داری اس خیال سے نہ کرتے تھے کہ تمھارے کان اور تمھاری آنکھیں اور تمھارے جسم تمھارے خلاف گواہی دینگے لیکن تم نے خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ بہت سی باتیں جو تم کرتے ہو نہیں جانتا ۲۹۳۶

۲۹۳۴ نحسات۔ نَحِسَة کی جمع ہے (ر) اور نَحْس ضد سَعْد ہے فی یوم نحس مستمر (القمر ۵۴ - ۱۹) اور نُحَاس اس شعلے کو کہتے ہیں جس میں دھواں نہ ہو۔ یرسل علیکما شواظ من نار و نحاس (الرحمٰن ۵۵ - ۳۵) اور یہ تانبے سے مشابہت کی وجہ سے کہا جاتا ہے کیونکہ نحاس تانبے کو کہتے ہیں (غ) اور فراء کا قول ہے کہ نحاس یہاں دخان یعنی دھواں ہے اور ازہری کہتے ہیں یہی سب مفسرین کا قول ہے (ل) اور اصل نَحْس یہ ہے کہ افق سُرخ ہو کر شعلے کی طرح ہو جائے اس لیے شُوم یا بدبختی کے لیے بطور مثال ہو گیا ہے اور بعض نے ایام نحسات کے معنی سخت سردی والے دن کیے ہیں (غ) اور منحوس دنوں سے مراد اُن کی بدقسمتی کے دن ہیں۔ اور ایک ہی دن کو الگ الگ شخصوں کی طرف منسوب کر کے نحس بھی کہا جاتا ہے اور سعد بھی (ر)

۲۹۳۵ جلود کے ظاہر معنی چمڑے ہی ہیں مگر بعض نے یہاں مراد جوارح یعنی اعضا لیے ہیں اور بعض نے فروج سے کنایہ لیا ہے (ر) مگر دیکھو ۶۷۵ اس سے مراد بعض وقت بدن بھی لیا جاتا ہے اور یہاں یہی وسیع معنی ہیں کان اور آنکھ کا ذکر علیحدہ اس لیے کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت تھی، وجعل لکم السمع والابصار والافئدة (النحل ۱۶ - ۷۸) اور اگلی آیت میں ان کو لفظ جلود میں شامل کر لیا ہے اور وہاں انطق سے مراد دلالت ہے دیکھو ۲۴۵۷ یعنی ان اعضا کی حالت خود بتادے گی کہ انسان نے کیا کچھ کیا تھا اور گویہ شہادت کھلے طور پر قیامت میں ادا ہوگی۔ لیکن بدی کا اثر انسان کے جوارح پر یہاں بھی پڑتا ہے۔ ہاں وہ یہاں اکثر حالات میں عام نظروں سے مخفی رہتا ہے اور جب بدی حد سے زیادہ ترقی کر جاتی ہے تو وہ اثر یہاں بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔

۲۹۳۶ تستترون۔ سِتْر ڈھانکنا اور اِسْتِتَار کے معنی ہیں چھپنا اور مَسْتُور چھپایا گیا۔ حجابًا مستورا (بنی اسرائیل ۱۷ - ۴۵) (غ) اور جس چیز سے چھپتے

وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِیْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ
اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۲۳﴾
فَاِنْ یَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ
وَ اِنْ یَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِیْنَ ﴿۲۴﴾
وَ قَیَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَیَّنُوْا لَهُمْ مَّا
بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ حَقَّ
عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ فِیْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ
مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۚ
ع ۴ ۱۷ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۲۵﴾
وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا
الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴿۲۶﴾
فَلَنُذِیْقَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِیْدًا ۙ
وَّ لَنَجْزِیَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِیْ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾
ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ
فِیْهَا دَارُ الْخُلْدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا

اور اسی تمھارے ظن (فاسد) نے جو تم نے اپنے رب کے متعلق کیا تمھیں ہلاک کیا، سو تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گئے۔
سو اگر وہ صبر کریں تو آگ ان کا ٹھکانا ہے، اور اگر وہ معافی چاہیں تو انھیں معافی نہ دی جائے گی۔
اور ہم نے ان کے لیے ساتھی مقرر کر رکھے ہیں، سو وہ انھیں جو کچھ ان کے آگے اور ان کے پیچھے ہے اچھا کر کے دکھاتے ہیں اور (خدا کی) بات ان پر صادق آئی ان قوموں میں (داخل ہوتے ہوئے) جو جنوں اور انسانوں سے ان سے پہلے گزر چکیں، وہ نقصان اٹھانے والے ہوئے[2937]
اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو مت سنو، اور اس میں شور ڈالو شاید تم غالب آجاؤ[2938]
سو ہم انھیں جو کافر ہیں ضرور سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے، اور ہم انھیں بہت بری باتوں کا بدلہ دیں گے جو وہ کرتے تھے۔
یہ اللہ کے دشمنوں کی سزا ہے (یعنی) آگ، ان کے لیے اس میں رہنے کا گھر ہے (یہ) اس کی سزا ہے) جو وہ

تھے وہ ان کے جوارح ہیں یعنی اپنے جوارح سے تم اس لیے نہ چھپتے تھے کہ اس وقت تمہیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہی چیزیں تم پر گواہی دیں گی۔ اور یا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے جوارح سے چھپ نہ سکتے تھے۔

ع۲۹۳۷ قیضنا۔ دوسری جگہ ہے ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض لہ شیطانا (الزخرف ۴۳-۳۶) اور قَیض انڈے کے اوپر کا چھلکا ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ قرین یا شیطان اس پر ایسا غالب ہو جاتا ہے جیسے انڈے پر چھلکا (غ) اور قَیّض اللہ لہ قرینا کے معنی ہیں اس کے لیے تیار کر دیا، یا ذریعہ بنا دیا ایسے طور سے کہ اسے گمان بھی نہ تھا اور زجاج نے قرآن کریم میں دونوں جگہ معنے کیے ہیں کہ ہم اس کے لیے شیطان یا قرین کو ایک سبب بنا دیتے ہیں اور یہ بطور جزا ہے (ل) قرناء قرین کی جمع ہے دیکھو ع۶۵۸

اللہ تعالےٰ کا شیطانوں کو مقرر کرنا یا مسلط کرنا محض ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے اللہ تعالےٰ نے کسی انسان پر شیطان کو بطور ابتدا مسلط نہیں کیا وما کان لی علیکم من سلطان (ابراھیم ۱۴-۲۲) لیکن جب انسان شیطان کے ساتھ تعلق پیدا کرتا کرتا اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ پھر بدی اسے اچھی لگتی ہے تو اس وقت درحقیقت شیطان کا پورا تسلط انسان پر ہو جاتا ہے فھو ولیھم الیوم (النحل ۱۶-۶۳) اسی حالت کا یہاں ذکر ہے جب اعراض میں حد سے گذر گئے کسی نیک بات کی طرف کان نہ دھرا بدی سے محبت اور پیار ہو گیا تو گویا شیطان کے قبضہ میں آ گئے اور پھر ان سے شیطانی خیالات کا ہی اظہار رہتا ہے۔

ع۲۹۳۸ الغوا۔ لَغَا آواز کو کہتے ہیں اور الغوا فیہ کے معنی یہاں کیے ہیں الغطوا فیہ یعنی اس میں شور ڈالو اور باتیں کرنے لگ جاؤ اور حدیث میں ہے من قال یوم الجمعۃ والامام یخطب لِصاحبہ صَہ فقد لَغَا۔ یعنی جس نے جمعہ کے دن جب امام خطبہ پڑھ رہا ہو اپنے ساتھی کو کہا چُپ اس نے بھی بات کی اور اس کے معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ وہ صحیح راہ سے ہٹ گیا۔ (ل)

قرآن کریم کے اثر کو باطل کرنے کی تدابیر: قرآن کریم کا اثر چونکہ قلوب پر بہت ہوتا تھا۔ ابھی عتبہ جیسے دشمن کا ذکر ہو چکا حضرت ابوبکر کا واقعہ بھی اسی طرح کا ہے کہ آپ اپنے گھر کے صحن میں بلند آواز سے قرآن شریف پڑھتے تھے تو کفار نے یہ کہہ کر روک دیا کہ ہماری عورتوں اور بچوں پر اس کا اثر ہوتا ہے اس لیے ان لوگوں نے یہ علاج سوچا کہ جب بلند آواز سے قرآن مجید پڑھا جائے تو دوسرے لوگ شور ڈالنے لگیں یا سیٹیاں اور تالیاں بجانے لگیں۔ یا اور بیہودہ باتوں میں لگ جائیں جن سب

بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۲۸

ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ
اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا
تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ۝۲۹

اور جو کافر ہیں وہ کہیں گے اے ہمارے رب جنھوں نے جنّوں اور انسانوں میں سے ہمیں گمراہ کیا تھا ہمیں دکھا، کہ ہم انھیں اپنے پاؤں کے نیچے ڈالیں تاکہ وہ سب سے نیچے رہنے والوں میں سے ہوں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا
تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا
وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ
كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۳۰

وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ تو ہمارا رب ہے پھر سیدھے راہ پر جمے رہتے ہیں ان پر فرشتے اُترتے ہیں کہ تم نہ ڈرو اور نہ غمگین ہو، اور اس جنّت کی خوشی مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ۲۹۳۹

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ
فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ
وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝۳۱ ۭ

ہم دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں تمھارے مددگار ہیں اور تمھارے لیے اس میں وہ سب کچھ ہے جو تمھارے دل چاہیں اور تمھارے لیے اس میں (وہ سب کچھ) ہے جو تم مانگو۔

ع ۱۸ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝۳۲

(یہ) مہمانی بخشنے والے رحم کرنے والے (اللہ) کی طرف سے (رہے)

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى
اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ
الْمُسْلِمِيْنَ ۝۳۳

اور اس سے بہتر کس کی بات ہے جو اللہ کی طرف بلاتا ہے اور اچھے کام کرتا ہے اور کہتا ہے میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ ۲۹۴۰

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ
اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ

اور نیکی اور بدی برابر نہیں (بدی کو) بہت اچھے طریق سے دُور کر، پھر تو دیکھے گا

کی غرض شور پیدا کرنا تھا تاکہ کوئی شخص قرآن کو سن نہ سکے اسے وہ اپنے غلبہ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

۲۹۳۹ استقامت سے مراد: اس آیت کے معنی میں اقوال مختلف ہیں۔ اول استقامۃ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ ان کی موت توحید پر ہو دوسرا یہ کہ وہ پھر شرک کی طرف نہ لوٹیں۔ تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت پر استقامت اختیار کریں یہی معنی حضرت عمرؓ نے منبر پر کیے (ج) اور استقامۃ کے اصل معنی یہی ہیں کہ ایک انسان سیدھی راہ پر لگا رہے دیکھو ع۱۵۰۹ گویا قالو ربنا اللہ میں توحید قولی ہے اور استقاموا میں عملی توحید ہے کیونکہ استقامت فعل کو چاہتی ہے۔ دوسرا اختلاف نزول ملائکہ کے متعلق ہے بعض نے کہا موت کے وقت نزول ملائکہ مراد ہے اور بعض نے آخرت میں نزول ملائکہ لیا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں ملائکہ کا آنا مراد ہے۔ گویا ان کا نزول بطور الہام ہے (ر) اور قرآن کریم اسی آخری قول کی تائید کرتا ہے اول اس لیے کہ خوف و حزن کا وقت یہ دنیا ہی ہے دوسرا اس لیے کہ اگلی آیت میں ہے نحن اولیاؤکم فی الحیٰوۃ الدنیا اس کا فائدہ یہی ہے کہ اس زندگی میں انہیں یہ تسکین دی جائے اگر وقت پر کوئی تسکین نہیں دی گئی اور موت کے وقت یا آخرت میں یہ کہا تو اس کا فائدہ کچھ نہیں۔ علاوہ ازیں اوپر آچکا ہے انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا (المومن ۴۰-۵۱) اور یہ نزول ملائکہ بھی درحقیقت انہی نصرت کے سامانوں میں سے ایک سامان ہے اور امت مسلمہ کی اس پر شہادت فعلی رنگ میں موجود ہے کہ اولیاء اللہ پر نزول ملائکہ ہوتا ہے وقد قد هنالك ان جميعا من الناس يقولون يتنزل الملائكة على المتقين في كثير من الاحايين (ر) اور پہلے حصہ رکوع میں کفار کے اثر قرآن کو باطل کرنے کا ذکر تھا۔ یہاں بتایا کہ وہ اثر ایسا ہے کہ باطل نہیں ہو سکتا۔

۲۹۴۰ دعوت الی اللہ (اور یہی دعوت الی الاسلام ہے) بہترین کام ہے بشرطیکہ انسان خود بھی عمل صالح کرے مسلمانوں کو دعوت الی اللہ کی طرف توجہ دلائی گئی تھی مگر آج سب کاموں سے پیچھے یہی کام رکھا گیا ہے۔ اور اگر کوئی ایک کام ہے جس کی طرف تمام دنیائے اسلام کی آج بے توجہی ہے تو وہ دعوت الی الاسلام کا کام ہے

بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾
وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْاۚ وَمَا
یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۳۵﴾
وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ
فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۶﴾
وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ وَ
الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا
لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ
الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۳۷﴾
فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ
یُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ
لَا یَسْــٴَـمُوْنَ ﴿۳۸﴾ السجدۃ
وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً
فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ
رَبَتْ ؕ اِنَّ الَّذِیْۤ اَحْیَاهَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ
اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۳۹﴾
اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا لَا

کہ وہ شخص کہ تجھ میں اور اس میں دشمنی ہے گویا وہ دل سوز دوست ہے۔
اور یہ (خصلت) انہی کو دی جاتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ انہی کو دی جاتی ہے جو بڑے نصیب والے ہیں ۲۹۴۱
اور اگر شیطان کی طرف سے تجھے بُری بات پہنچے، تو اللہ کی پناہ مانگ، وہ سننے والا جاننے والا ہے ۲۹۴۲
اور اس کی نشانیوں میں سے رات اور دن اور سورج اور چاند ہیں۔ سورج کو سجدہ نہ کرو اور نہ چاند کو، اور اللہ کو سجدہ کرو، جس نے انھیں پیدا کیا اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔
پس اگر وہ تکبّر کریں تو وہ جو تیرے رب کے پاس ہیں رات کو اور دن کو اس کی تسبیح کرتے ہیں، اور وہ تھکتے نہیں ۲۹۴۳
اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تو زمین کو مُردہ دیکھتا ہے پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ ہلتی ہے اور پھولتی ہے، وہی جس نے اسے زندہ کیا یقیناً مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۲۹۴۴
وہ لوگ جو ہماری آیتوں کے بارے میں کجروی اختیار کرتے

اور اگلی آیت میں تبایا کہ جو شخص دعوت الی اللہ کا کام کرتے ہیں انہیں دوسروں کے ہاتھ سے دکھ بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔ مگر ان کا کام نہیں کہ بدی کا بدلہ بدی پہنچائیں۔ بلکہ بدی کو نیکی سے دور کرنے کی کوشش کریں نتیجہ یہ ہوگا کہ بدترین دشمن بہترین دوست بن جائے گا۔ دعوت الی اللہ کے کام میں اس سے بڑھ کر کوئی روک نہیں ہو سکتی کہ ایک انسان ہر ایک دکھ اور تکلیف کو جو دوسروں کی طرف سے اسے پہنچے بدلہ لینے کے لیے دل میں جمع کرتا جائے۔

ع۲۹۴۱ یلقّی کے معنی یُعَلَّمُ وَ یُوَفَّقُ لھا یعنی سکھایا جاتا اور اس کی توفیق دیا جاتا (ل)، اور یلقٰھا میں ضمیر اس خصلت کی طرف جاتی ہے یعنی بدی کو نیکی سے دور کرنا۔ حظ نصیب مقدر کو کہا جاتا ہے فنسوا حظاً ممّا ذکّروا بہ (المائدۃ ۵۔ ۱۴) للذکر مثل حظ الانثیین (النساء ۴۔ ۱۱) (غ)

ع۲۹۴۲ یہ الفاظ بعینہ وہی ہیں جو الاعراف ۷۔ ۲۰۰ میں آئے ہیں اور وہاں دکھایا گیا ہے کہ مراد نزغ سے وسوسہ نہیں بلکہ تکلیف دہ باتیں ہیں جو دشمنوں کی طرف سے پہنچتی ہیں۔ یہاں بھی سیاق عبارت اسی معنی کو چاہتا ہے اس لیے کہ پیچھے بھی دشمن کی طرف سے تکلیف پہنچنے کا ذکر ہے۔

ع۲۹۴۳ یسئمون۔ سَآمة ملالت ہے اس سے جو دیر تک رہے فعل سے ہو یا اثر فعل سے لا یسأم الانسان من دعاء الخیر (۴۹) عند ربک سے مراد عموماً ملائکہ لیے گئے ہیں مگر جو انسان اللہ تعالیٰ کے حضور میں قرب رکھتے ہیں وہ بھی اسی کا مصداق ہیں۔ وہ رات اور دن اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی راحت قلب اس سے بڑھتی ہے ملال کبھی پیدا نہیں ہوتا۔

ع۲۹۴۴ خاشعة جب زمین خشک ہو جائے اور اس پر مینہ نہ برسے تو کہا جاتا ہے خَشَعَتْ پس خاشعة اس زمین کو کہا جاتا ہے جو مُردہ ہو اور جس میں سبزی نہ ہو۔ اور ارض خاشعة اسے بھی کہا جاتا ہے جسے بوجہ نرمی کے ہوائیں اڑا لے جاتی ہوں (ل) اس میں صاف اس انقلاب عظیم کی پیشگوئی ہے جو قرآن کریم کے ذریعہ سے دنیا میں پیدا ہونے والا تھا۔

يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ؕ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِى النَّارِ
خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِىْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ
اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
بَصِيْرٌ ﴿۴۰﴾

ہیں ہم پر مخفی نہیں ، تو کیا وہ جو آگ میں ڈالا جاتا ہے بہتر ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن کی حالت میں آئے ۔ جو چاہو سو کرو ، جو کچھ تم کرتے ہو دیکھنے والا ہے ۲۹۴۵

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ
وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۙ﴿۴۱﴾

جنھوں نے نصیحت کا انکار کیا جب وہ ان کے پاس آگئی (وہ اپنا انجام دیکھ لیں گے) اور وہ یقیناً عزت والی کتاب ہے ۲۹۴۶

لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ
وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۲﴾

جھوٹ نہ اس پر اس کے سامنے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے وہ حکمت والے تعریف کیے گئے (اللہ) کی طرف سے اتاری گئی ہے ۲۹۴۷

مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ
مِنْ قَبْلِكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ
وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۴۳﴾

تجھے کچھ نہیں کہا جاتا مگر وہی جو تجھ سے پہلے رسولوں کو کہا گیا ۔ تیرا رب بخشش والا اور دردناک سزا دینے والا ہے ۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا
لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ
قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ
وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِىْٓ اٰذَانِهِمْ
وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ
ع ۱۲ ۱۹ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۴۴﴾ ع

قرء حفص بتسهيل الهمزة الثانية ۱۲

اور اگر ہم اسے عجمی قرآن بناتے ، تو کہتے اس کی آیتیں کھول کر کیوں نہ بیان کی گئیں کیا عجمی اور عربی (برابر ہیں؟) کہہ وہ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہدایت اور شفا ہے ۔ اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ ان کے حق میں نابینائی ہے وہ دُور کی جگہ سے پکارے جاتے ہیں ۲۹۴۸

ع ۲۹۴۵ الحاد کے لیے دیکھو ع ۱۷۸۶ یہاں مراد آیات الہٰی کے بارے میں باطل کی طرف مائل ہونا یعنی ان کی تکذیب ہے ظلم یا شک یا اعتراض بھی معنی ہو سکتے ہیں اور ظلم ان آیات کے مٹانے پر زور لگانے میں ہے۔

ع ۲۹۴۶ کافروں کا کیا حشر ہوگا یوں بتایا کہ یہ کتاب جس کا انکار کرتے ہیں عزیز ہے یعنی غالب آنے والی چیز ہے نہ مغلوب ہونے والی دیکھو ع ۸۴۱ پس اس کے منکر ضرور ہے کہ آخر کار مغلوب ہوں۔

ع ۲۹۴۷ باطل آگے اور پیچھے سے اس پر نہیں آسکتا ۔ مراد سب جہات ہیں یعنی کسی طرف سے نہیں آسکتا اور یا بین یدیہ یا سامنے سے مراد واقعات ہیں جو موجود ہیں یا گذر چکے ۔ اور خلفہ علوم ہیں جو بعد میں ظاہر ہوں اور اسی لحاظ سے حکیم اور حمید کی صفات ہیں ۔ یعنی اس کے علوم سب حکمت پر مبنی ہیں ۔ اور جو کچھ اس میں بیان ہوا اس پر اس کی تعریف ہوتی ہے۔

ع ۲۹۴۸ اعجمی ۔ عُجمۃ ۔ اِبَانۃ یا کھول کر بیان کرنے کے خلاف ہے اور اِعجام کے معنی ابہام ہیں اور عَجم خلاف عرب ہے جس کے لیے دیکھو ع ۱۵۱۶ الف اور اَعْجَمْ وہ ہے جس کی زبان میں ابہام ہو، خواہ وہ عربی ہو یا غیر عربی اور اَعْجَمی اس کی طرف منسوب ہے اور چارپائے کو عَجماء کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ ناطق کی طرح اپنے مطلب کو بیان نہیں کر سکتا (غ)

یہاں قرآن اعجمی سے مراد ایسی کتاب ہے جس میں کافی وضاحت نہ ہوتی دیکھو ع ۱۵۱۶ الف اسی لیے اس کے مقابل پر لولا فصلت اٰیٰتہ فرمایا اور یہ اس لیے کہا کہ ان سورتوں میں بہت کھول کھول کر انذار کیا گیا ہے مگر باوجود اس قدر وضاحت کے کافروں کو اب بھی کچھ نظر نہیں آتا ۔ ھو علیھم عمی کے یہی معنی ہیں اور ینادون من مکان بعید میں بھی یہی اشارہ ہے کہ وہ ان کو دور کی آواز معلوم ہوتی ہے یعنی ٹھیک سمجھ نہیں آتی تمثیل لھم فی عدم فھمھم واغفاءھم بما دعوا الیہ (ر)

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِیْهِ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ﴿۴۵﴾

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی سو اس کے بارے میں اختلاف کیا گیا اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ ہو گیا ہوتا اور وہ یقیناً اس کے متعلق سخت شک میں ہیں

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴿۴۶﴾

جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اپنی جان (کی بھلائی) کے لیے اور جو کوئی بُرا کرتا ہے تو اس کا وبال اس پر ہے اور تیرا رب بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں

اِلَیْهِ یُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ؕ وَ مَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَ یَوْمَ یُنَادِیْهِمْ اَیْنَ شُرَكَآءِیْ ۙ قَالُوْۤا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِیْدٍ ﴿۴۷﴾

اسی کی طرف (موعودہ) گھڑی کا علم حوالہ کیا جاتا ہے۔ اور نہ کوئی پھل اپنے گابھوں سے نکلتے ہیں اور نہ کسی مادہ کو حمل ہوتا ہے اور نہ وہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے ہوتا ہے اور جس دن انھیں پکارے گا میرے شریک کہاں ہیں، کہیں گے ہم تیرے سامنے اعلان کرتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی اس کا اقرار کرنے والا نہیں ن ۲۹۴۹

وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَ ظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِیْصٍ ﴿۴۸﴾

اور وہ جنھیں وہ پہلے پکارا کرتے تھے وہ ان سے کھوئے جائیں گے اور وہ یقین کریں گے کہ ان کے لیے کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں

لَا یَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَیْرِ ۫ وَ اِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَیَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ﴿۴۹﴾

انسان بھلائی مانگنے سے نہیں اکتاتا، اور اگر اسے تکلیف پہنچے تو مایوس ناامید ہو جاتا ہے۔

وَ لَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَیَقُوْلَنَّ هٰذَا لِیْ ۙ وَ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً ۙ وَّ لَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّیْۤ اِنَّ لِیْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۫ وَ لَنُذِیْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ ﴿۵۰﴾

اور اگر ہم اسے اپنی طرف سے رحمت کا مزہ چکھائیں کسی تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی ہو تو وہ ضرور کہیگا، یہ میرا حق ہے۔ اور میں (موعودہ) گھڑی کو آنے والا یقین نہیں کرتا۔ اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا جاؤں تو میرے لیے اس کے پاس یقینی بھلائی ہے سو ہم ضرور انھیں جو کافر تھے جو وہ کرتے تھے بتا دیں گے اور ہم انھیں سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

وَ اِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ

اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے اور کنارہ کش ہو جاتا ہے اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو (لمبی)

ع ۲۹۴۹ اکمام۔ کَمْ عدد کو ظاہر کرتا ہے اور سوال کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور خبر کے لیے بھی اور اس کے بعد اسم پر مِنْ بھی داخل ہوتا ہے کم من قریۃ اھلکنٰھا (الاعراف۔ ۴) اور کُمّ قمیص کا وہ حصہ ہے جو ہاتھ کو ڈھانکتا ہے یعنی آستین اور کِمّ وہ ہے جو پھل کو ڈھانکتا ہے یعنی گابھ اور اس کی جمع اکمام ہے والنخل ذات الاکمام (الرحمٰن ۵۵۔ ۱۱) (غ) اَیْن سے مکان کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے یعنی کہاں جس طرح متی سے زمانہ کے متعلق یعنی کب (غ) مطلب نتائج اعمال کے ظہور سے ہے جنہیں عورت کے حمل سے اور پھل کے نکلنے سے تشبیہ دی گئی ہے دیکھو ع ۱۶۰۲

دُعَآءٍ عَرِيضٍ ﴿٥١﴾

چوڑی دعا میں لگ جاتا ہے ۲۹۵۰

قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِن كَانَ مِنْ عِندِ اللَّهِ ثُمَّ كَفَرْتُم بِهِۦ مَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِى شِقَاقٍۭ بَعِيدٍ ﴿٥٢﴾

کہہ، کیا تم نے غور کیا اگر (یہ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو، پھر تم اس کا انکار کرو اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جو دور کی مخالفت میں ہے۔

سَنُرِيهِمْ ءَايَٰتِنَا فِى ٱلْءَافَاقِ وَفِىٓ أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ ٱلْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُۥ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ شَهِيدٌ ﴿٥٣﴾

ہم انھیں اپنی نشانیاں اطراف میں اور ان کی اپنی جانوں میں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان کے لیے کھل جائے کہ وہ حق ہے ــ کیا یہ کافی نہیں کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد حال ہے ۲۹۵۱

أَلَآ إِنَّهُمْ فِى مِرْيَةٍ مِّن لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ۗ أَلَآ إِنَّهُۥ بِكُلِّ شَىْءٍ مُّحِيطٌۢ ﴿٥٤﴾ ع

سنو! وہ اپنے رب کی ملاقات سے شک میں ہیں، سنو! وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

ع۲۹۵۰ نای بجانبہ ۔ پہلو پھیر لیا یعنی اعراض کیا۔ دیکھو ع۹۲۷ اور نای بجانبہ اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو تکبر کر کے اپنا منہ پھیر لے اور یہاں مراد ہے کہ اپنے خالق سے اپنے پہلو کو پھیر لیا۔ گویا اس کی عبادت اور دعا سے اعراض کیا اور یا اس کے معنی ہیں قبول سے دور ہو گیا (ل)

عریض اصل میں اجسام میں بولا جاتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال غیر اجسام میں بھی ہے۔ اور عریض کے معنی وسیع ہیں اور مراد بہت دعا ہے جسے برابر جاری رکھا جائے مطلب یہ ہے کہ خوشحالی میں انسان خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور تکلیف میں اس کی طرف جھکتا ہے۔

ع۲۹۵۱ اسلام کا غلبہ عرب میں اور اطراف عالم میں: آفاق۔ واحد۔ اُفُق یا اُفْق ہے اور آفاق کے معنی نواحی یا اطراف ہیں (غ) یعنی چاروں طرف یہاں دو باتوں کا ذکر ہے ایک آفاق میں نشانیوں کا دکھانا دوسرے اہل عرب کو ان کے اپنے نفسوں میں یعنی ملک عرب کے اندر اور مطلب یہ ہے کہ اسلام کی کامیابی مشرق و مغرب میں بھی دکھائیں گے اور خود ملک عرب میں بھی۔ سخت ترین مصائب کے وقت یہ عظیم الشان بشارت اور تسکین سوائے خدائے عالم الغیب کے کون دے سکتا تھا۔

سُورَةُ الشُّورَىٰ (۴۲) مَكِّيَّةٌ

آیاتھا ۵۳ — رکوعاتھا ۵

نام: اس سورت کا نام الشوریٰ ہے اور اس میں پانچ رکوع اور ۵۳ آیتیں ہیں۔ سورت کا نام اس عظیم الشان حکم سے لیا گیا ہے جسے مسلمانوں کی حکومت اور کل قومی کاموں کی بنیاد قرار دیا گیا ہے یعنی باہمی مشورہ سے امور کو طے کرنا۔

زمانہ نزول: یہ سورت بالاتفاق مکّی ہے اور اس زمانہ کی ہے جب مسلمانوں کی نہ کوئی قوم بنی تھی نہ کوئی قومی کام طے ہونے والے تھے اور حکومت کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اس وقت مسلمانوں کو مشورہ کا حکم دینا اور نماز اور انفاق فی سبیل اللہ کے ساتھ اسے مسلمانوں کی عظیم الشان ضرورت قرار دینا بتاتا ہے کہ کس قدر اہمیت اس اصول کو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔

خلاصہ مضمون: سورت کے پہلے رکوع میں بتایا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے بھیجنے کی غرض یہ ہے۔ کہ ام القریٰ سے شروع کر کے کل عالم کو انذار کریں یعنی بدی کے بد نتائج سے متنبہ کریں دوسرے رکوع میں بتایا کہ اسلام کا حق کل دنیا کو انذار کرنے کا ہے اس لیے کہ اسلام ہی تمام اختلافات مذہبی کا فیصلہ کرتا ہے تیسرے اور چوتھے رکوع میں مومنوں کو کامیابی کی بشارت دی ہے۔ کیونکہ اتنی عظیم الشان پیغام کی متحمل کوئی قوم نہ ہو سکتی تھی جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تائیدات اور نصرتوں کے وعدے اور آخری کامیابی کی بشارتیں نہ ہوں جو ان میں ہر قسم کی مصائب کے برداشت کرنے کی ہمت پیدا کریں۔ اس موقعہ پر مسلمانوں کو مشورے کا حکم دیا۔ یعنی جب کامیاب ہو جائیں تو پھر حکومت کے صحیح اصول کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اور آخری رکوع میں بتایا کہ بدی کے نمایندوں کے لیے آخر کار ہلاکت ہے اور زندگی کی بنیاد صرف قرآن کریم ہے جس سے دنیا کی قوموں کو آیندہ کے لیے زندگی مل سکتی ہے۔

تعلق: پچھلی سورت میں اسلام کے اطراف و اکناف میں غلبہ کی پیشگوئی کی تو یہاں بتایا کہ اسلام کا پیغام کل عالم کیلئے ہے۔ اور اسلام سب اختلافات مذہبی کا فیصلہ کرتا اور اصول اتحاد اقوام کی صحیح بنیاد رکھتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

حٰمٓ ﴿۱﴾

(اللہ تعالیٰ) بے انتہا رحم والا۔

عٓسٓقٓ ﴿۲﴾

جاننے والا سننے والا قادر ہے ۲۹۵۲

کَذٰلِکَ یُوۡحِیۡۤ اِلَیۡکَ وَ اِلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۙ اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۳﴾

اسی طرح اللہ غالب حکمت والا تیری طرف وحی کرتا ہے، اور ان کی طرف جو تجھ سے پہلے ہوئے ۲۹۵۳

لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ ہُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ﴿۴﴾

اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ بلند عظمت والا ہے۔

تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرۡنَ مِنۡ فَوۡقِہِنَّ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۵﴾

قریب ہے کہ آسمان ان کے اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ان کے لیے بخشش مانگتے ہیں جو زمین میں ہیں۔ سنو! اللہ تعالیٰ ہی بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۲۹۵۴

وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہُ حَفِیۡظٌ عَلَیۡہِمۡ ۫ۖ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۶﴾

اور جو لوگ اس کے سوائے مددگار بناتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر نگہبان ہے اور ان کا معاملہ تیرے سپرد نہیں کیا گیا۔

وَ کَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی وَ مَنۡ حَوۡلَہَا وَ تُنۡذِرَ یَوۡمَ الۡجَمۡعِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ ؕ فَرِیۡقٌ فِی الۡجَنَّۃِ

اور اسی طرح ہم نے تیری طرف قرآن عربی وحی کیا ہے، تاکہ تو بستیوں کے مرکز کو ڈرائے اور ان (سب) کو جو اس کے اردگرد ہیں اور اس اکٹھا ہونے کے دن سے ڈرائے جس میں کوئی شک نہیں،

۲۹۵۲ عسق مفسرین ان حروف پر خاموش ہیں۔ ابن جریر نے حذیفہ سے ایک روایت بیان کی ہے جو ان حروف کو آنے والے فتنوں پر لگاتے ہیں اور ابن عباسؓ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ س ہر ایک فرقہ کی عمر ہے جو ہونے والا ہے اور ق ہر ایک جماعت ہے جو ہونے والی ہے مگر اس سے بھی کچھ مطلب نہیں کھلتا اصل بات یہی ہے کہ یہ حروف اسماء الٰہی کے قائم مقام ہیں۔ یعنی ع علیم۔ س سمیع اور ق قادر کی جگہ اور پہلی آیت میں حم رحمان کی جگہ ہے اور وحی کا نازل فرمانا صفت رحمانیت کا تقاضا ہے اور علیم۔ سمیع۔ قادر کا تعلق انذار۔ وحی کی مخالفت اور ابطال حق کرنے والوں کی سزا سے ہے۔

۲۹۵۳ کذلک یعنی اس کی مثل جو اس سورت میں ہے یا اسی طرح بواسطہ ملک وحی کرتا ہے (ر) مگر ہو سکتا ہے کہ مراد یہ ہو کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کا جس کا ذکر حم میں ہے یہ تقاضا رہا ہے کہ وہ وحی کرے۔

۲۹۵۴ اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت: فوقھن میں ضمیر بعض نے سماوات کی طرف ہی لی ہے۔ اور مراد ان کی جہت فوقانیت یا اوپر کی سمت ہے اور بعض نے ضمیر کو جماعات کفار کی طرف لیا ہے اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ یعنی کفار کا ظلم تو اس قدر ہے کہ آسمان اُن کے اوپر سے پھٹ پڑتے مگر اس کی صفات میں رحم اس قدر غالب ہے کہ اس کے فرشتے لوگوں کے لیے بخشش مانگتے ہیں اور اس روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے جو حذیفہ نے بیان کی ہے اور دوسری طرف ان الفاظ قرآنی کو مدنظر رکھتے ہوئے جو دوسری جگہ عیسائیت کے متعلق فرمائے ہیں تکاد السموات یتفطرن منه وتنشق الارض وتخر الجبال ھدا ان دعوا للرحمن ولدا (مریم ۱۹: ۹۰ و ۹۱) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اشارہ عیسائی اقوام کی طرف ہے یعنی ان کے عقاید باطلہ تو ایسے ہیں کہ ان پر آسمان پھٹ پڑیں مگر انکے بعض افعال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو تباہ نہیں کرے گا۔ اگلی آیت میں بھی اسی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

وَ فَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۞٧

ایک گروہ بہشت میں ہوگا اور ایک گروہ دوزخ میں ع۲۹۵۵

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ۞٨

اور اگر اللہ تعہ چاہتا تو انھیں ایک ہی گروہ بناتا، لیکن وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کے لیے کوئی کارساز نہیں اور نہ کوئی مددگار ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَ هُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى ۫ وَ هُوَ

ع عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞٩

کیا انھوں نے اللہ تعہ کے سوائے مددگار بنائے ہیں، سو اللہ تعہ ہی مددگار ہے اور وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَ مَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖۚ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ۞١٠

اور جو تم کسی بات میں اختلاف کرو تو اس کا فیصلہ اللہ تعہ کی طرف ہے، یہ اللہ میرا رب ہے اس پر میں بھروسا رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں ع۲۹۵۶

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۞١١

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا، اس نے تمھارے لیے تمھاری جنس سے جوڑے پیدا کیے اور چارپایوں کے بھی جوڑے (پیدا کیے) وہ اس (طرح) سے تمھیں پھیلاتا رہتا ہے اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے ع۲۹۵۷

ع۲۹۵۵ یوم الجمع سے مراد قیامت کا دن لیا گیا ہے کیونکہ اس میں مخلوقات جمع ہوگی اور یا ارواح اور جسم جمع ہونگے یا اعمال اور عمل کرنے والے جمع ہوں گے اور دوسری جگہ ہے یوم یجمعکم لیوم الجمع (التغابن ۶۴-۹) (د) لیکن حق و باطل کے فیصلہ کے لیے ایک جمع ہونے کے دن کا اس دنیا میں بھی آنا ضروری قرار دیا گیا تھا قل یجمع بیننا ربنا ثم یفتح بیننا (السبأ ۳۴-۲۶) اور اس لیے یہاں دونوں کی طرف اشارہ ہے۔

ام القریٰ ومن حولھا کے انذار پر دیکھو ع۹۸۲ اس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کا انذار پہلے اس قوم کے لیے ہے جو اس سے فائدہ اٹھا کر دنیا کے لیے ماں کا کام دے یعنی دنیا کی روحانی تربیت کرے گویا بتایا ہے کہ خاتم النبیین کی بعثت کا مرکز وہی مقام ہوسکتا تھا جو دنیا کا مرکز ہے جب تک پہلے اس میں انذار نہ ہو دوسری قوموں میں انذار نہ ہوسکتا تھا کیونکہ اس قوم نے دوسری قوموں کے لیے منذر بننا تھا۔

ع۲۹۵۶ آیت ۸ میں اختلافات امم کا ذکر تھا تو فرمایا کہ اس اختلاف مذہبی کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔ کیونکہ جب ساری قومیں اپنے اپنے اندر رسولوں کا آنا مانتی تھیں اور تمام قوموں میں سخت اختلافات پیدا ہو چکے تھے تو ان کا فیصلہ کس طرح ہوسکتا تھا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نئی وحی نہ آتی یہی فحکمہ الی اللہ سے مراد ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیشہ ایک ہی دین کی تلقین کی ہے یعنی اسلام یا اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری کا دین اور تمام انبیاء کا ایک ہی مذہب تھا اسی کے اصل اصول کو اسلام کا اصل الاصول قرار دے کر اختلافات مذہبی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جب پہلے رکوع میں آپ کی بعثت کو ام القریٰ سے شروع کر کے کل عالم کے لیے قرار دیا تو اب بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ہی تمام اختلافات مذہبی کا فیصلہ کرتا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کل عالم کا مذہب ہو۔

ع۲۹۵۷ من الانعام ازواجا سے مراد ہے کہ چارپایوں کے جوڑے ان کی جنس سے پیدا کئے جس طرح انسان کے جوڑے انسان کی جنس سے پیدا کئے اور یا مراد ہے کہ تمہارے فائدہ کیلئے حیوانات کے جوڑے پیدا کیے یا قسم قسم کے حیوان پیدا کیے اور یذرؤکم فیہ سے مراد ہے کہ اس تدبیر سے وہ تمہیں پھیلاتا ہے یعنی تعلق زوجیت کی غرض یہ ہے کہ ان کے درمیان توالد ہو اور انسان اور حیوان کی نسل پھیلے۔

لیس کمثلہ شی ۔ مثل کے معنی بیان ہو چکے ہیں۔ اور یہاں کاف کو جو تشبیہ کے لیے ہے اور مثل کو تاکید نفی کے لیے جمع کیا ہے۔ اور اس میں تنبیہ ہے کہ نہ مثل کا استعمال صحیح ہے نہ کاف کا اس لیے دونوں امور کو جمع کیا اور بعض کے نزدیک مثل یہاں بمعنی صفت ہے یعنی اس کی صفت جیسی کوئی صفت نہیں اور اس میں تنبیہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ کی صفات میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کے ساتھ انسان کی صفات کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ صفات اس طرح پر نہیں جس طرح بشر میں

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾

آسمانوں اور زمین کے خزانے اسی کے ہیں، وہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾

اس نے تمھارے لیے دین کا وہی رستہ مقرر کیا ہے جس کا نوحؑ کو حکم دیا تھا اور جو ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا کہ دین کو قائم رکھو، اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ مشرکوں کو وہ بھاری معلوم ہوتا ہے جس کی طرف تو انھیں بلاتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے لیے جسے چاہتا ہے چُن لیتا ہے اور اسے اپنی طرف ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف) رجوع کرتا ہے ۲۹۵۸

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾

اور انھوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس کے بعد جو اُن کے پاس علم آگیا آپس کے حسد کی وجہ سے اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے پہلے سے ایک وقت مقرر کے لیے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور جن لوگوں کو ان کے بعد کتاب ورثہ میں ملی، وہ اس کے متعلق سخت شک میں ہیں ۲۹۵۹

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ

سو تو اسی کی طرف بلا —— اور سیدھی راہ پر چلتا رہ جیسا تجھے حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر اور کہہ میں اس پر ایمان لایا جو اللہ تعالیٰ نے کتاب اتاری ہے اور مجھے حکم دیا

ہیں یعنی اس کی صفات بشر پر قیاس نہیں کی جا سکتیں۔ (غ) مثلاً اس کا دیکھنا سننا ایسا نہیں جیسا بشر کا ہے۔ اور اس کا بنانا ایسا نہیں جیسا بشر کا ہے کیونکہ بشر آلات اور مادے کا محتاج ہے خدا نہیں اور بعض نے مثل سے مراد یہاں ذات لی ہے یعنی مراد یہ ہے کہ اس کی ذات جیسی کوئی شے نہیں۔ جیسے عرب کہتے ہیں مثلك لایبخل اور مراد یہ ہوتی ہے کہ تو بخیل نہیں (ر) اور یہاں یہ ذکر اس مناسبت سے کیا ہے کہ اوپر انسانوں اور حیوانات میں توالد وتناسل کا ذکر تھا۔

۲۹۵۸ اصل اصول ادیان: یہاں بتایا کہ دین کا اصل اصول تو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے چنانچہ جو حکم اب دیا جاتا ہے یہی نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا گیا تھا اور نوح اور ابراہیم کے درمیان والذی اوحینا الیك لاکر اس وحی کی عظمت کی طرف توجہ دلائی ہے اور اقیموا الدین میں دین سے مراد اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی کامل فرمانبرداری ہے یعنی اصل اصول سب دینوں کا یہی رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک جانیں اور اسی کی فرمانبرداری کریں اور آگے فرمایا کہ مشرکوں کو شرک چھوڑ کر ایک اللہ کو ماننا بڑا دشوار معلوم ہوتا ہے اور یہ حالت ہر قوم کی ہے جس نے جو شرک بنایا ہے اس شرک کے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔

۲۹۵۹ ماتفرقوا میں ضمیر ان انبیاء کی امتوں کی طرف ہے۔ یعنی سب انبیاء کو تو ایک ہی دین توحید الٰہی کا دیکر بھیجا گیا تھا۔ مگر اس علم کے آنے کے بعد پھر لوگوں نے باہم تفرقہ کیا۔ کلمۃ سبقت من ربك یہ ہے کہ اختلافات عقاید پر یہاں سزا نہیں دی جاتی اور اورثوا الکتاب من بعدھم سے مراد آنحضرت صلعم کے زمانہ یا اس کے بعد کے لوگ ہیں کہ وہ اس حق میں جو نہایت واضح تھا شک کر رہے ہیں۔

لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اَللّٰہُ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمۡ ؕ
لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَ لَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ؕ لَا حُجَّۃَ
بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اَللّٰہُ یَجۡمَعُ بَیۡنَنَا ۚ
وَ اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ؕ﴿۱۵﴾

گیا ہے کہ تمھارے درمیان انصاف کروں اللہ ہمارا رب اور تمھارا رب ہے ہمارے لیے ہمارے عمل ہیں اور تمھارے لیے تمھارے عمل ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں اللہ ہمیں جمع کرے گا اور اسی کی طرف انجام کار پھر کر آنا ہے ۲۹۶۰

وَ الَّذِیۡنَ یُحَآجُّوۡنَ فِی اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ
مَا اسۡتُجِیۡبَ لَہٗ حُجَّتُہُمۡ دَاحِضَۃٌ
عِنۡدَ رَبِّہِمۡ وَ عَلَیۡہِمۡ غَضَبٌ وَّ لَہُمۡ
عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ﴿۱۶﴾

اور جو لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اس کے بعد کہ اس کی بات مان لی گئی ان کا جھگڑا ان کے رب کے نزدیک باطل ہے اور ان پر ناراضگی ہے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے ۲۹۶۱

اَللّٰہُ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ
وَ الۡمِیۡزَانَ ؕ وَ مَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّ
السَّاعَۃَ قَرِیۡبٌ ﴿۱۷﴾

اللہ وہ ہے جس نے کتاب اور میزان کو حق کے ساتھ اتارا اور تجھے کیا خبر ہے شاید (موعودہ) گھڑی نزدیک ہی ہو ۲۹۶۲

یَسۡتَعۡجِلُ بِہَا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِہَا ۚ
وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مُشۡفِقُوۡنَ مِنۡہَا ۙ وَ
یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہَا الۡحَقُّ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الَّذِیۡنَ
یُمَارُوۡنَ فِی السَّاعَۃِ لَفِیۡ ضَلٰلٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۱۸﴾

اس کے لیے وہی جلدی کرتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے اور جو ایمان لائے وہ اس سے ڈرنے والے ہیں، اور وہ جانتے ہیں کہ وہ سچ ہے سنو! جو لوگ (موعودہ) گھڑی کے بارے میں جھگڑتے ہیں وہ پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں ۲۹۶۳

اَللّٰہُ لَطِیۡفٌۢ بِعِبَادِہٖ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ
ع ۲ وَ ہُوَ الۡقَوِیُّ الۡعَزِیۡزُ ﴿۱۹﴾

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر لطف کرنے والا ہے وہ جسے چاہتا ہے رزق دیتا ہے اور وہ طاقتور غالب ہے۔

مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ حَرۡثَ الۡاٰخِرَۃِ نَزِدۡ لَہٗ فِیۡ

جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اسے اس کی کھیتی میں

۲۹۶۰ فلذلك سے مراد لی گئی ہے کہ اس تفرقہ کے سبب سے لوگوں کو راہ حق کی طرف بلاتے رہو مگر اصل مراد اسی اصل الاصول کی طرف بلانا ہے۔ جو سب دینوں کی تعلیم مشترک ہے۔ اور اسی لیے آگے فرمایا اٰمنت بما انزل اللہ من کتاب اور اسی اصول مشترک کی طرف اشارہ ہے اللہ ربنا و ربکم میں اور حجۃ اصل میں مصدر بمعنی احتجاج یعنی جھگڑا ہے۔

۲۹۶۱ اسلام کا قیام اس کی صداقت کی دلیل ہے: من بعد ما استجیب لہ یعنی بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی بات کو بہتیرے لوگوں نے قبول بھی کر لیا یعنی دین اسلام قائم ہو گیا کیونکہ ایک یہ بھی صریح شہادت صداقت اسلامی کی تھی کہ سخت ترین مخالفت کے باوجود لوگ اسے قبول کرتے جاتے تھے اور اس زمانہ کے لیے یہ دلیل بالخصوص قابل غور ہے کہ عیسائیت نے ساری دنیا پر تسلط حاصل کر کے اسلام کو مٹانا چاہا مگر ان کی سب کوشش حجتھم داحضۃ کی مصداق ہے اور وہ خود بھی اسے محسوس کر رہے ہیں۔

۲۹۶۲ میزان کے معنی یہاں عدل مروی ہیں (ج) یا شریعت جس سے حقوق کا موازنہ کیا جاتا ہے (ر) یعنی کتاب تو انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ نے عدل یا ایک اندازہ بھی نازل کیا ہے جس میں اشارہ انسانوں کے محاسبہ کی طرف معلوم ہوتا ہے اسی لیے آگے ساعۃ کا ذکر آتا ہے یعنی وہ محاسبہ کا وقت قریب ہی آ پہنچا ہے

۲۹۶۳ یمارون۔ ممارات کے وہی معنی ہیں جو امتراء کے ہیں یعنی اس بات میں جھگڑنا جس میں شک ہو فلا تمار فیھم الا مراء ظاہرا (الکہف ۱۸-۲۲) افتمارونہ علی ما یری (النجم ۵۳-۱۲) (غ)

حَرْثِهٖ ۚ وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿۲۰﴾

برکت دیتے ہیں اور جو کوئی دنیا کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس میں سے کچھ اسے دیدیں گے اور اس کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں ۲۹۶۴

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

کیا ان کے کوئی شریک ہیں جنھوں نے دین کا کوئی ایسا رستہ ان کے لیے مقرر کردیا ہے جس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے نہیں دی۔ اور اگر فیصلے کی بات (پہلے سے) نہ ہوچکی ہوتی تو ان کے درمیان (ابھی) فیصلہ کردیا جاتا اور ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَ هُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾

تُو ظالموں کو دیکھے گا (کہ) اس سے ڈر رہے ہیں جو انھوں نے کمایا ہے اور وہ ان پر واقع ہونے والا ہے اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں وہ بہشت کے باغوں میں ہوں گے، اُن کے لیے ان کے رب کے پاس ہے جو وہ چاہیں۔ یہی بڑا فضل ہے۔

ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ وَ مَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾

یہ وہ ہے جس کی خوشخبری اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں کہہ میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا، مگر قریبیوں میں باہم محبّت (چاہتا ہوں) اور جو کوئی نیکی کرتا ہے ہم اس کے لیے اس میں خوبی بڑھاتے ہیں اللہ بخشنے والا قدر دان ہے ۲۹۶۵

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ؕ وَ

کیا کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بنالیا ہے، سو اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تیرے دل پر مُہر کر دیتا، اور اللہ تعالیٰ جھوٹ کو

۲۹۶۴ حرث دیکھو ۲۶۴ اور یہاں مراد اس سے وہ آبادی یا فائدہ ہے جو اس سے حاصل ہوتا ہے اور ایک روایت میں ہے اُحرُثْ فی دنیاك لاٰخرتك۔ یعنی دنیا میں آخرت کے لیے کھیتی تیار کرلے یعنی فائدہ حاصل کرلے (غ)۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں بعض باتوں میں ناکامی بھی ہوسکتی ہے مگر آخرت کی کوئی کوشش ضائع نہیں ہوتی۔

۲۹۶۵ الا المودة فی القربیٰ یہاں بعض نے الّا کو استثنائے متصل قرار دے کر یوں معنی کیے ہیں کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ تم مجھ سے بوجہ قرابت کے (فی گویا سببیت کے لیے ہے) محبت کرو اور حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ قریش کا کوئی بطن نہ تھا جس میں آپ کا تعلق قرابت نہ ہو گویا اسی تعلق قرابت کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ جس طرح تم اپنے قریبیوں کی حمایت کرتے ہو اور خواہ مخواہ ایذا نہیں دیتے یہی معاملہ مجھ سے کرو اور ایک معنی یوں کیے گیے ہیں کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ تم میرے قریبیوں سے محبت کرو گویا یہ اہل بیت کی محبت کی تلقین ہے اور اہل بیت کی محبت کے متعلق بعض احادیث بھی ہیں۔ لیکن اگر یہ احادیث صحیح بھی مانی جائیں تو بھی اس بات کی کہ اس آیت کا یہی منشا ہے کوئی سند نہیں۔ ان احادیث کا منشا صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو دکھایا گیا تھا کہ آپ کی امت کے بعض لوگ اہل بیت سے بغض کریں گے اس لیے آپ نے اس سے بچنے کی اور اہل بیت سے محبت کی ہدایت فرمائی اور ان سب معنوں پر یہ اعتراض ہے کہ وعظ پر کسی اجر کا نہ مانگنا سب انبیاء کی عام تعلیم ہے جیسا کہ ہر نبی کے ذکر میں یہ لفظ آتے ہیں اور آنحضرت صلعم کے ذکر میں بھی یہی لفظ آتے ہیں کہ میں تم میں سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ تو سب انبیاء کے لیے اور ہمارے نبی کریم صلعم کے لیے بھی ہر جگہ یہ فرما کر کہ نبی وعظ کے لیے کوئی اجر نہیں مانگتا یہاں کوئی اور اصول قائم نہیں کیا جاسکتا پس الا المودة فی القربیٰ میں الا استثنا منقطع ہے اور اس سے مراد یا تو یہ ہے جیسا کہ عبداللہ ابن القاسم سے مروی ہے کہ

يَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ	مٹاتا ہے اور اپنی باتوں سے حق کو ثابت کرتا ہے وہ
اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۲۴	سینوں کی باتوں سے واقف ہے ؏۲۹۶۶
وَهُوَ الَّذِىْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ	اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول
وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ	کرتا ہے اور بدیوں کو مٹاتا ہے اور وہ
مَا تَفْعَلُوْنَ ۲۵	جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔
وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	اور اُن کی (دعا) قبول کرتا ہے جو ایمان لاتے اور
الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ	اچھے عمل کرتے ہیں اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ دیتا
وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۲۶	ہے اور کافروں کے لیے سخت عذاب ہے ؏۲۹۶۷
وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا	اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے رزق فراخ کردے
فِى الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا	تو وہ زمین میں سرکش ہوجائیں لیکن وہ اس اندازہ سے اتارتا ہے جو
يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۲۷	چاہتا ہے ہاں وہ اپنے بندوں سے خبردار دیکھنے والا ہے۔
وَهُوَ الَّذِىْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ	اور وہی ہے جو بارش اتارتا ہے، اس کے بعد کہ وہ
مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَهُوَ	مایوس ہوگئے ہوں اور وہ اپنی رحمت کو پھیلاتا ہے
الْوَلِىُّ الْحَمِيْدُ ۲۷	اور وہ کارساز تعریف کیا گیا ہے ؏۲۹۶۸
وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کا پیدا

میں تم سے کوئی اجر یا اپنی ذات کے لیے کوئی منفعت نہیں چاہتا اگر چاہتا ہوں تو صرف یہی چاہتا ہوں کہ تم باہم محبت سے رہو۔ یعنی اس میں اتفاق و یگانگت کی تعلیم ہے اور یا جیسا کہ حسن سے مروی ہے قربیٰ بجائے قربۃ ہے اور مراد قرب الٰہی کا حاصل کرنا ہے یعنی تم سے یہ چاہتا ہوں کہ اعمال صالحہ سے اللہ تعالیٰ کے قرب کو حاصل کرنے کی تڑپ اپنے دلوں میں پیدا کرو (ر) اور ان آخری معنوں پر خود قرآن کریم کی شہادت ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا قل ما اسئلکم علیہ من اجر الا من شاء ان یتخذ الی ربہ سبیلا (الفرقان ۲۵-۵۷) یعنی میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ جو کوئی چاہے اپنے رب کی طرف رستہ اختیار کرے اب دونوں جگہ ایک ہی لفظ ہیں کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور دونوں جگہ بعد میں الا آتا ہے جو منقطع ہی ہو سکتا ہے نہ متصل پھر ایک جگہ الا کے بعد یہ لفظ ہیں کہ جو کوئی چاہے اپنے رب کی طرف رستہ اختیار کرے اور دوسری جگہ مودت فی القربیٰ ہے پس یا تو مودت فی القربیٰ سے مراد حصول قرب الٰہی کی تڑپ اور محبت ہی ہے اور دونوں آیتیں ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں اور یا ایک جگہ الی ربہ سبیلا کہہ کر حقوق اللہ کی طرف اور دوسری جگہ مودۃ فی القربیٰ کہہ کر حقوق العباد کی طرف توجہ دلائی ہے ؏

؏۲۹۶۶ اس بات کا جواب کہ یہ کہتے ہیں جھوٹ افترا کر لیا ہے یہ دیا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو تیرے دل پر مہر کر دیتا مطلب یہ ہے کہ جھوٹ افترا کرنے والے کے دل پر تو اللہ تعالیٰ مہر لگا دیتا ہے اگر تم بھی ایسا کرتے تو تمہارے دل پر بھی مہر لگ جاتی اور تمہیں کسی نیکی کی توفیق نہ ملتی بالفاظ دیگر بتایا ہے کہ افترا کرنے والے تو یہ ہیں جن کے دلوں پر ایسی مہر لگی ہوئی ہے کہ انہیں کسی نیکی کی توفیق ملتی ہی نہیں اور آنحضرت صلعم جو خود نیکی کرتے اور دوسروں کو نیکی کی تعلیم دیتے ہیں وہ ان باتوں سے بہت بلند ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خطاب عام ہو یعنی یختم علی قلبک سے مراد کافر کے دل پر مہر کر دینا ہے جو ایسی باتیں کہتا ہے اور مجاہد اور مقاتل سے یہ معنی مروی ہیں کہ تیرے دل پر ایسی صبر کی مہر لگا دے کہ ان کی اذیت والی باتیں تجھے ناگوار نہ گزریں (ر)

؏۲۹۶۷ استجابۃ کے لیے دیکھو ؏۲۳۱ اور ترجمہ میں وہ معنی اختیار کیے گئے ہیں جب استجابت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو گویا پہلی آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرتا ہے پھر بدیوں کو معاف کرتا ہے۔ پھر اعمال صالحہ کرنے والوں کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے بلکہ اپنے عظیم الشان فضل سے اس سے بھی بڑھ کر دیتا ہے جس قدر وہ مانگتے ہیں۔ اور یستجیب کا فاعل الذین اٰمنوا بھی ہو سکتا ہے یعنی مومن اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اختیار کرتے ہیں ؏

؏۲۹۶۸ اس میں اشارہ اس رحمت کی طرف معلوم ہوتا ہے جو زمین کے مردہ ہو جانے کے بعد رحمۃ للعالمین کے وجود میں عطا کی گئی ؏

وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۚ وَهُوَ عَلٰى — کرتا ہے اور جو ان کے اندر اس نے جاندار پھیلائے ہیں اور
ع جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ — وہ ان کے جمع کرنے پر جب چاہے قادر ہے ۲۹۶۹

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ — اور جو تم پر مصیبت پڑتی ہے، تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی
اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾ — ہے اور وہ بہت کچھ معاف بھی کر دیتا ہے ۲۹۷۰

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ ۚ وَمَا — اور تم زمین میں (اللہ کو) عاجز کرنے والے نہیں، اور
لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۳۱﴾ — تمھارے لیے اللہ کے سوائے کوئی کارساز نہیں اور نہ کوئی مددگار ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِى الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾ — اور اس کی نشانیوں میں سے سمندر میں پہاڑوں جیسی کشتیاں ہیں ۲۹۷۱

اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ — اگر وہ چاہے تو ہوا کو ٹھیرا دے سو وہ اس کی پیٹھ
عَلٰى ظَهْرِهٖ ۚ اِنَّ فِى ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ — پر کھڑی رہ جائیں یقیناً اس میں ہر ایک صبر کرنے والے
صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۳﴾ — شکر کرنے والے کے لیے نشان ہیں ۲۹۷۲

اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ — یا انھیں اس کی وجہ سے جو انھوں نے کمایا تباہ کر دے
عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۴﴾ — اور وہ بہت کچھ معاف کرتا ہے۔

وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِىْٓ اٰيٰتِنَا ۗ — اور (تاکہ) وہ جان لیں، جو ہماری آیتوں کے بارے میں

۲۹۶۹ سماوات میں جانداروں کا ہونا: دابۃ کے آسمان اور زمین دونوں میں ہوئے پر مفسرین کو دقت پیش آتی ہے اور اور کبھی اسے ملائکہ پر لگایا گیا ہے اور کبھی مراد مطلق حیّ لیے گیے ہیں حالانکہ دابۃ بالخصوص چلنے والے پر بولا جاتا ہے اور ملائکہ جو غیر مرئی لطیف ہستیاں ہیں ان پر یہ لفظ صادق نہیں آسکتا۔ لیکن اس میں کیا بُعد ہے کہ آسمانوں میں جو اجرام سیارے وغیرہ ہیں ان میں ویسے جاندار موجود ہوں جیسے اس زمین پر چلتے ہیں بلکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دیگر کرہ ہائے سماوی جانداروں سے خالی نہیں ۔

۲۹۷۰ ترقی درجات کے لیے مصائب: مفسرین نے بعض احادیث اس آیت کی تفسیر میں بیان کی ہیں کہ جو کوئی تکلیف یا بیماری وغیرہ آتی ہے تو وہ کسی گناہ کی وجہ سے آتی ہے مگر ان احادیث کے صریحاً خلاف یہ آیت قرآنی ہے۔ ولنبلونکم بشئ من الخوف والجوع (البقرۃ ۲-۱۵۵) جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو محض ان کی ترقی درجات کے لیے بھی تکالیف میں ڈالتا ہے۔ اور حدیث میں ہے اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل سخت تر مصائب کے اٹھانے میں نبی ہیں پھر جیسے جیسے اعلیٰ درجے کے لوگ ہوں گے ویسی ہی ان کی تکالیف بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ اور بچوں پر جو تکالیف آتی ہیں وہ ان کے لیے ترقی درجات کا موجب ہونے کے علاوہ ان کے والدین کے لیے بھی ترقی درجات کا موجب ہوتی ہیں۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ جس کے چھوٹے بچے مر جائیں وہ والدین کے لیے بہشت میں لے جانے کا موجب ہوتے ہیں۔ اور یہاں جو ذکر ہے وہ کفار کا ذکر ہے جو ابطال حق کرنا چاہتے تھے اور اپنا سارا زور حق کے نیست و نابود کرنے کے لیے صرف کر رہے تھے انہیں بتایا کہ جو کچھ تمہیں مصیبت پہنچے گی وہ تمہاری انہی کرتوتوں کی وجہ سے پہنچے گی اور پھر بھی تمہارے سارے اعمال کی سزا تمہیں نہیں ملیگی اللہ تعالیٰ بہت کچھ تمہاری زیادتیوں کو معاف بھی کر دے گا۔ اور یہ اس عفو کی طرف اشارہ ہے جو نبی کریم صلعم نے دکھایا۔ اور ان کی ساری زیادتیوں پر عفو کی قلم پھیر دی اور یہ بات کہ یہاں مخالفین کی سزا کا ذکر ہے اگلی آیت سے ظاہر ہے کہ تم خدا کی سزا سے بھاگ نہیں سکتے۔ اور تمہارا کوئی مددگار بھی نہیں ہوگا۔ دونوں آیتوں میں ایک ہی خطاب ہے ۔

۲۹۷۱ الجوار۔ واحد الجاریۃ ہے جس کے معنی کشتی ہیں جو سمندر میں چلتی ہے (جری سے) حملنٰکم فی الجاریۃ (الحاقۃ ۶۹-۱۱) (غ)
اعلام۔ عَلَم کی جمع ہے جو اصل میں نشان ہے۔ جس سے کوئی چیز جانی جائے جیسے لشکر کا علم یا رستے کا عَلَم اور اسی لیے پہاڑ کو بھی عَلَم کہا جاتا ہے (غ)۔

۲۹۷۲ رواکد۔ رکد پانی اور ہوا کے ٹھہر جانے پر بولا جاتا ہے۔ اور ایسا ہی کشتی کے ٹھہر جانے پر بھی (غ) ۔
کشتیوں کا سمندر میں چلنا اللہ تعالیٰ کے فضل کے نشانات میں سے ہے مگر یہاں اس بیان میں خاص اشارہ کفار کی حالت کی طرف ہے کہ وہ کتنے ہی طاقتور ہوں لیکن اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کی طاقت کا خاتمہ کر دے اور وہ دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔ اسی لیے آیت کے اخیر پر صبّار شکور کے لفظ آئے ہیں ۔

مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ۝۳۵

جھگڑتے ہیں ان کے لیے کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں ۲۹۷۳

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۳۶ۚ

تو جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے ، اور جو کچھ اللہ (تعالیٰ) کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں ۲۹۷۴

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝۳۷ۚ

اور جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور بےحیائی کی باتوں سے بچتے ہیں اور جب غصے میں آئیں ، تو معاف کر دیتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳۸ۚ

اور جو لوگ اپنے رب کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور ان کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے اور اس سے جو ہم نے انھیں دیا خرچ کرتے ہیں ۲۹۷۵

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝۳۹

اور وہ کہ جب ان پر زیادتی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ

اور بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے پھر جو کوئی معاف کرے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ پر ہے، وہ

۲۹۷۳ بعلم پر نصب ہے گویا پہلے کوئی ایسے الفاظ مقدر ہیں جیسے لینتقم منہم یعنی تاکہ انہیں سزا دے اور تاکہ وہ جان لیں اور پچھلی آیات میں چونکہ اس کا ذکر صاف ہے اس لیے ایسا مقدر ماننے میں ہرج کوئی نہیں ؛

۲۹۷۴ یہاں بھی خطاب کفار کو ہی خاص معلوم ہوتا ہے۔ جو اپنی ظاہری طاقت کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہیں بتایا ہے کہ یہ طاقت باقی رہنے والی چیز نہیں۔ چند روزہ سامان ہے ؛

۲۹۷۵ اسلام کی جو کچھ تعلیم ہے شروع سے ایک ہی ہے۔ یہ مکی سورت ہے اور یہاں بھی شوریٰ یعنی مشورہ کا حکم موجود ہے یہ ظاہر ہے کہ اس سورت یا آیت کے نزول کے وقت مسلمانوں کے کوئی اہم کام ایسے نہ تھے جن میں شورے کے حکم کی حاجت ہو کیونکہ مشورہ قومی کاموں میں ہوتا ہے۔ اور قومی کام زیادہ تر حکومت کے متعلق ہی ہوتے ہیں پس یہاں امرھم شوریٰ بینہم میں گویا بتا بھی دیا ہے کہ مسلمانوں کو حکومت بھی ملے گی اور ان کی حکومت کی بنیاد مشورہ پر ہونی چاہیے۔ اور نماز اور انفاق کے درمیان اس حکم کو لا کر اس کی اہمیت بتا دی ہے۔ اور احادیث بھی مشورہ کے متعلق صریح ہیں۔ ایک حدیث میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کے بعد کوئی اہم امر پیش آئے جس میں قرآن کریم کی کوئی نص صریح نہیں نہ آپ کا کوئی فیصلہ ہے تو فرمایا کہ میری امت کے نیک لوگوں کو جمع کرو اور مشورہ سے اس کا فیصلہ کرو اور اکیلے کی رائے سے فیصلہ نہ کرو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جس سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ عاقل ہو (ر) اس آیت کے صریح حکم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی حکومت کی بنیاد صرف مشورے پر ہے اور پارلیمنٹ اصل اسلامی قانون ہے جس کا حکم سوائے اسلام کے اور کسی مذہب کی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔ مسلمان قوم کی تربیت جن اصول پر ہوئی ان میں سے تین عظیم الشان اصول یہاں بیان ہوئے ہیں۔ یعنی نماز یا اللہ تعالیٰ کے حضور جھکے رہنا اور اصلاح نفس اور انفاق فی سبیل اللہ یا اپنی قوتوں اور اپنے مال و دولت کو مخلوق خدا کی بھلائی کے لیے خرچ کرنا اور شوریٰ یعنی امور قومی کو باہمی مشورہ سے طے کرنا اس سے بہتر قوم کی رہنمائی کے لیے کوئی اصول نہیں ہو سکتے ؛

لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٠﴾

ظالموں سے محبت نہیں کرتا۲۹۷۶

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿٤١﴾

اور جو کوئی اپنے (اوپر) ظلم کے بعد بدلہ لیتا ہے تو ان لوگوں پر (الزام کا) رستہ نہیں۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٤٢﴾

(الزام کا) رستہ صرف ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتی کرتے ہیں، انہی کے لیے دردناک دکھ ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿٤٣﴾ ع

اور جو کوئی صبر کرے اور معاف کرے تو یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿٤٤﴾

اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ قرار دے تو اس کے لیے اس کے بعد کوئی کارساز نہیں اور تُو ظالموں کو دیکھے گا، جب وہ عذاب کو دیکھیں گے کہیں گے کیا کوئی رستہ لوٹنے کا بھی ہے۔

وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِىْ

اور تُو انھیں دیکھے گا اس پر لائے جائیں گے تو ذلّت کی وجہ سے عاجزی اختیار کر رہے ہوں گے (اور) چھپی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے اور جو ایمان لائے وہ کہتے ہیں نقصان اٹھانے والے وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے گھروالوں کو قیامت کے دن نقصان میں رکھا سنو ظالم

۲۹۷۶ تمام تعزیرات کا خلاصہ اس ایک آیت میں آجاتا ہے۔ بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھ کر تعزیرات کا اصل منشا لوگوں کو دوسروں پر ظلم اور زیادتی سے روکنا ہے اور اس کے لیے کچھ سزائیں تجویز کی ہیں۔ ان سب سزاؤں کا خلاصہ یہاں چار لفظوں میں ہے بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔ یہی تمام سزاؤں کی اصل بنیاد ہے سوائے قتل زنا اور ڈاکہ چوری کے مگر ان میں بھی ایک حد تک امام کی رائے پر معاملہ کو چھوڑا ہے۔ باقی تمام سزاؤں کے لیے ایک اصول بتا دیا ہے۔ مگر اس سے بڑھکر یہ کہ اگر بغیر سزا دینے کے اصلاح ہو جائے جو تعزیرات کی اصل غرض ہے تو معاف کر دو یہی وجہ ہے کہ عفا کے ساتھ اصلح کا لفظ بڑھایا یعنی معافی اس صورت میں ہو جب اس کا نتیجہ اصلاح ہو۔

طاقت کے وقت عفو: یہ آیت بھی ایک پیشگوئی کے رنگ میں ہے۔ اور اس میں بتایا ہے کہ مسلمانوں کو اس قدر طاقت ملے گی کہ اپنے مخالفوں کو سزا دینے کا اختیار رکھتے ہوں گے اس وقت بھی عفو کو مدنظر رکھنے کی ضرورت بتائی ہے۔ غربت اور مسکینی کی حالت میں جیسے حضرت مسیح اور آپ کے حواریوں کو پیش آئی، صبر اور عفو آسان باتیں ہیں لیکن جب ظالموں پر تسلط حاصل ہو اور ظلم کرنے والے حاکم محکوم بن جائیں اس وقت عفو دکھانا بڑا کام ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کا نمونہ ہمارے نبی کریم صلعم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسا پیش کیا جس کی کوئی نظیر دنیا میں نہیں ملتی اسی لیے رکوع کی آخری آیت میں فرمایا صبر و غفر عزم الامور میں سے یہ ہے کہ مصیبت کے وقت صبر کرے طاقت کے وقت معاف کرے۔

اور یہ جو بدی کے بدلہ کو سیئۃ کہا ہے تو یہ اسی کے مطابق ہے۔ جو ع۲۷ میں بیان ہوا اور اس میں فلسفۂ سزا کی طرف اشارہ ہے کہ سزا بھی کسی کو تکلیف پہنچانا ہے مگر یہ ظلم کو روکنے کے لیے ضروری ہو جاتی ہے۔

عَذَابٍ مُّقِيمٍ ﴿٤٥﴾	قائم رہنے والے عذاب میں رہیں گے ۲۹۷۷
وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ أَوْلِيَاءَ يَنصُرُونَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ ۗ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن سَبِيلٍ ﴿٤٦﴾	اور اللہ کے سوائے ان کے کوئی حمایتی نہ ہوں گے جو اُن کی مدد کریں اور جسے اللہ گمراہ قرار دے تو اس کے لیے کوئی بھی رستہ نہیں۔
اسْتَجِيبُوا لِرَبِّكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ ۚ مَا لَكُم مِّن مَّلْجَإٍ يَوْمَئِذٍ وَمَا لَكُم مِّن نَّكِيرٍ ﴿٤٧﴾	اپنے رب کی فرماں برداری کرو اس سے پہلے کہ اللہ کی طرف سے وہ دن آجائے جس کے لیے ٹلنا نہیں۔ تمھارے لیے اس دن کوئی پناہ نہیں اور نہ تمھارے لیے انکار کرنا ہے۔
فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ ۗ وَإِنَّا إِذَا أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَإِنَّ الْإِنسَانَ كَفُورٌ ﴿٤٨﴾	سو اگر وہ منہ پھیرلیں تو ہم نے تجھے ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔ تجھ پر صرف بات کا پہنچا دینا ہے، اور ہم جب انسان کو اپنی طرف سے رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو وہ اس پر خوش ہوجاتا ہے اور اگر انھیں کوئی بُرائی پہنچے اس کی وجہ سے جو اُن کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے تو انسان ناشکر گزار ہو جاتا ہے
لِّلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَن يَشَاءُ الذُّكُورَ ﴿٤٩﴾	اللہ کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے ۲۹۷۸

۲۹۷۷ خفی کے معنی مخفی ہیں اور یہاں مراد ضعیف یعنی کمزور ہے اور ابن عباس نے اس کے معنی ذلیل کیے ہیں (ر) ٭
یہاں جو نقشہ عذاب کا کھینچا ہے وہ قیامت پر بھی صادق آتا ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر صفائی سے ان کی اس حالت پر صادق آتا ہے جو اس دنیا میں انہیں پیش آئی ذلت کی وجہ سے عاجزی اختیار کرنا اور کمزور نگاہ سے دیکھنا ان کی وہ حالت ہے جو فتح مکہ میں ظہور میں آئی ٭

۲۹۷۸ اناث۔ ذکور۔ اناث۔ انثیٰ کی جمع ہے اور ذکورا ور ذُکران ذکر کی اور ذَکَرَ اور اُنثیٰ ایک دوسرے کی ضد ہیں یعنی نر اور مادہ ومن یعمل من الصالحات من ذکر او انثی (النساء-۱۲۴) اور چونکہ ہر نوع حیوانی میں مادہ بہ نسبت نر کے کمزور ہوتی ہے اس لیے اُنثیٰ اس کو بھی کہتے ہیں جس کا عمل کمزور ہو (غ) ٭
اوپر کفار کی سزا کا ذکر تھا اور آگے اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں سے کلام کا ذکر ہے۔ اور درمیان میں ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے کسی کو لڑکیاں اور کسی کو لڑکے دینے کا ذکر ہے۔ ان آیات کا باہم تعلق کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ منکرین کی سزا میں ایک قوم کو مٹانے کا اور وحی الٰہی سے دوسری قوم کو زندہ کرنے کا اشارہ ہے گویا اللہ تعالیٰ ایک قوم کو مٹاتا اور ایک کو خلق کرتا ہے اس پر فرمایا یخلق مایشاء یعنی وہ اختیار رکھتا ہے جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ لفظ اناث میں اشارہ کمزور عملوں والوں کی طرف ہو اور عقیم میں یہ اشارہ ہو کہ ایک نسل کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس کی آگے ترقی کا سامان بند کر دیا جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اناث اور ذکور کے دینے میں اشارہ ایک قوم کی تکثیر کی طرف ہو۔ اور عقیم میں دوسری قوم کی ہلاکت کیطرف اور آگے علیم اور قدیر کی صفات میں بھی اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے اور قرآن کریم میں یہ بسا اوقات ہوتا ہے کہ ایک ظاہری نظارہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے اور اس کے پیچھے ایک اور غرض بھی ہوتی ہے اور روح المعانی میں ہے کہ اناث کو پہلے اس لیے رکھا کہ وہ تکثیر نسل کا موجب ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عورتوں کی جو تحقیر ملک عرب میں

اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾	یا وہ انھیں ملا دیتا ہے (کچھ) لڑکے اور (کچھ) لڑکیاں اور جسے چاہتا ہے بانجھ بناتا ہے، وہ جاننے والا قدرت والا ہے۔
وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾	اور کسی بشر کے لیے یہ میسّر نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے مگر وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے یا رسول بھیجے، پس اپنے حکم سے جو چاہے وحی کرے۔ وہ بڑا بلند حکمت والا ہے ۲۹۷۹
وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ	اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے روح بھیجی،

اور عام طور پر دنیا میں کی گئی تھی اس کو دور کرنے کے لیے اناث کا ذکر پہلے کیا اور یوں گویا عورت کے مقام بلند کی طرف توجہ دلائی اور اگر غور کیا جائے تو اولاد کی پرورش اگر ایک بڑا بھاری فریضۂ انسانی ہے جس سے انسان نسل انسانی کی خدمت کا سبق سیکھتا ہے۔ اور اس کے اندر اپنے آرام کو دوسروں کے آرام پر قربان کرنے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ تو یہ غرض لڑکیوں کی پرورش سے بہ نسبت لڑکوں کے زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ لڑکوں کی پرورش میں انسان کو کچھ اپنے نام کا اور کچھ اپنے آرام کا بھی خیال ہوتا ہے لیکن لڑکیوں کی پرورش بے غرض ربوبیت کا ایک نمونہ ہے۔ کہ ایک انسان ان کی پرورش کر کے جب وہ کام کاج کے قابل ہوتی ہیں تو انہیں دوسرے کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ پالنے والے کے لیے نام کے بقا یا آرام کا موجب نہیں ہوتیں؂

۲۹۷۹ وحی کی اقسام: وحیا دیکھو ۷۶۸ امام راغب نے ایک عام وحی بیان کی ہے جس کا ذکر ان کے نزدیک اس آیت میں ہے۔ وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیه تو وہ کہتے ہیں یہ وحی اپنے سب انواع میں عام ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی معرفت اور اس کی عبادت کے وجوب کی معرفت اس وحی تک محدود نہیں جو اولوالعزم رسولوں سے خاص ہے بلکہ یہ چیزیں عقل اور الہام سے بھی پہچانی جاتی ہیں جس طرح سماعت سے پہچانی جاتی ہیں۔ (غ) اور آیت زیر بحث میں جن وحیوں کا ذکر ہے وہ ایک تو رسول کے ذریعہ سے ہے جسے دیکھا جاتا ہے اور جس کی بات سنی جاتی ہے جیسا جبرئیل علیہ السلام کا نبی صلعم کو صورت معین میں کلام پہنچانا اور دوسری کلام کا سننا در آنحالیکہ کلام کرنے والا نہ دیکھا جائے جیسے حضرت موسیٰ نے اللہ تعالےٰ کا کلام سنا اور تیسری قسم میں ایک القاء فی الروع ہے یعنی دل کے اندر ایک بات کا ڈالنا جیسے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی اور ایک الہام ہے جیسے اوحینا الی ام موسی ان ارضعیه یا تسخیر جیسے اوحی ربك الی النحل اور ایک خواب کے ذریعے سے جیسے آنحضرت صلعم نے فرمایا انقطع الوحی و بقیت المبشرات جس میں مومن کا رویا شامل ہے پس الہام اور تسخیر اور رویا پر لفظ وحیا دلیل ہے اور سماع کلام بغیر معائنہ پر من وراء حجاب اور جبرئیل کے صورت معینہ میں پہنچانے پر یرسل رسولا (غ)

میرے نزدیک مفسرین نے جو استثنا حضرت موسیٰ کے لیے کیا ہے وہ صراحت قرآنی کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے انا اوحینا الیك کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعده (النسآء ۴-۱۶۳) اور انہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور یہ بات قابل قبول نہیں کہ تمام انبیاء کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کسی علیحدہ پیرایہ میں کلام کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون عام ہے انبیاء کے مکالمہ میں بھی ایک حصّہ تو وہ ہے جو ان کی وحی متلو کہلاتی ہے۔ اور یہ جبرئیل صورت معینہ میں پہنچاتے ہیں۔ اور دوسرا وہ جو بذریعہ رویا یا کشف ان پر وارد ہوتا ہے۔ یا جو کلام بغیر کلام کرنے والے کے دیکھنے کے سنا جاتا ہے جو اولیاء اللہ میں الہام کہلاتا ہے اور تیسرا وہ جو بذریعہ وحی خفی ان کے دل میں ڈالا جاتا ہے جس پر بعض وقت الہام کا لفظ بھی بول دیا جاتا ہے اور یہ وحی غیر متلو ہے صورت اول یرسل رسولا والی ہے اور یہ انبیاء سے مخصوص ہے اسی لیے اب بعد خاتم النبیین صلعم جبرئیل کا وحی نبوّت لیکر آنا موقوف ہے گو وہ مومنوں کی تائیدات کے لیے آتا ہے اور دوسری صورت من وراء حجاب ہے اور تیسری صورت وحیا اور ان پچھلی دونوں صورتوں میں اولیاء اور انبیاء دونوں شامل ہیں اور اسی میں حضرت موسیٰ کی والدہ یا حضرت مریم یا حواری آتے ہیں جن سے اللہ تعالےٰ نے کلام کیا۔ باقی رہی نحل کی طرف وحی یا زمین یا آسمان کی طرف وحی تو یہ انسانوں کے ساتھ

أَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ
وَلَا الْإِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا
نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَ
اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝٥٢
صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ
تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝٥٣ ع

تُو نہ جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ اس پر
ایمان (کیا ہے) لیکن ہم نے اسے نور بنایا، اس کے
ساتھ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت
دیتے ہیں اور تُو یقیناً سیدھے رستے کی طرف ہدایت کرتا ہے ۲۹۸
اس اللہ کا رستہ جس کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے
اور جو کچھ زمین میں ہے۔ سنو! اللہ تعالیٰ کی طرف ہی
سب باتیں انجام کار لوٹتی ہیں۔

کلام سے بالکل علیحدہ چیز ہے ؛

۲۹۸۰ وحی الٰہی سے زندگی: یہاں قرآن کو روح یا زندگی کہہ کر بتا دیا کہ اسی سے آیندہ قوموں کو زندگی ملے گی اور اس لیے وہی قوم زندہ ہوگی جو اس کی حامل ہے اور یوں جہاں مخالفت کرنے والوں کی ہلاکت کا ذکر کیا۔ مومنوں کو زندگی کی بشارت دی ؛

آنحضرتؐ کا قبل از بعثت کتاب اور اس پر ایمان کو نہ جاننا: یہاں یہ الفاظ آتے ہیں کہ تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا مگر آنحضرت صلعم اللہ تعالیٰ پر ایمان تو پہلے بھی رکھتے تھے بلکہ عبادت کے لیے غار حرا میں جایا کرتے تھے اور بتوں سے متنفر تھے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل تھے اور یہ کہنا کہ آپ ایمان سے خالی تھے کفر ہے۔ پس ان الفاظ کا کیا مطلب ہے اگر سیاق پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں دوسروں کو زندگی دینے کا ذکر ہے۔ اور یہ زندگی بذریعہ قرآن اور اس پر ایمان کے آپ نے پیدا کی تو یہ بات صحیح ہے کہ جب قبل از بعثت آپ پر وحی ہی نہ ہوئی تھی تو اس وحی پر ایمان کے ذریعے سے جو انقلاب دنیا میں پیدا ہونے والا تھا اور جو زندگی قوموں کو ملنے والی تھی اس کا آپ کو کیا علم ہو سکتا تھا ؛

پس معنی صاف ہیں ہم نے روح یعنی قرآن کو جو قوموں کے لیے زندگی ہے تیری طرف وحی کیا۔ اس پر ایمان لاکر قوموں میں زندگی پیدا ہوگی۔ قبل از بعثت نہ رسول اللہ صلعم کو اس قرآن کی خبر تھی اور نہ ہی یہ خبر تھی کہ اس پر ایمان سے کیا انقلاب ظہور میں آئے گا۔ اسی لیے آگے فرمایا ولکن جعلناہ نوراً نھدی بہ من نشاء من عبادنا وانک لتھدی الی صراط مستقیم بلاشبہ پہلے آپ نہ جانتے تھے کہ یہ لوگ کس طرح ان ظلمتوں سے باہر نکلیں گے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک نور دیدیا اس نور کے ذریعہ سے آپ نے لوگوں کو صراط مستقیم پر چلایا ؛

اٰیاتُھا ۸۹ (۴۳) سُوْرَۃُ الزُّخْرُفِ مَکِّیَّۃٌ رُکُوعَاتُھا ۷

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

حٰمٓ ۚ ① (اللہ تعالیٰ) بے انتہا رحم والا (ہے)

وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۙ ② کھول کر بیان کرنے والی کتاب گواہ ہے ،

اِنَّا جَعَلْنٰہُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ۚ ③ کہ ہم نے اسے عربی قرآن بنایا ، تاکہ تم سمجھو۔

وَاِنَّہٗ فِیْۤ اُمِّ الْکِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَکِیْمٌ ۗ ④ اور وہ ہمارے پاس ام الکتاب میں بلند مرتبہ حکمت والا ہے ۲۹۸۱

نام: اس سورت کا نام الزخرف ہے اور اس میں سات رکوع اور ۸۹ آیتیں ہیں۔ زخرف کے معنی سونا ہیں اور اس سورت میں بتایا ہے کہ لوگ عموماً دنیوی آرائش کے ظاہری سامانوں پر فریفتہ رہتے ہیں حالانکہ یہ چیزیں یعنی چاندی سونا وغیرہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کچھ حقیقت نہیں رکھتیں اور وہ محض اپنے رحم بے پایاں سے رسول کو بھیجتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو بدی کے بد انجام سے ڈرائے۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باوجود ایک قوم کے حد اسراف کو پہنچ جانے کے انہیں بھلایا نہیں بلکہ ان میں ایک علم و حکمت کی کتاب دے کر ایک رسول کو بھیجا کہ شرک کی بیخ کنی کرے دوسرے رکوع میں شرک کی تردید کی ہے اور بتایا کہ شرک پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی۔ تیسرے رکوع میں بتایا کہ لوگ چاہتے ہیں کہ کوئی مالدار آدمی رسول ہو کیوں کہ ان کی نظروں میں مال کی وقعت بہت ہوتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مال دنیا کچھ حقیقت نہیں رکھتا اور رسول کا انتخاب اور درجات کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ چوتھے میں مخالفت رسول پر سزا کا ذکر کیا۔ پانچویں میں حضرت موسیٰ اور قوم فرعون کی مثال سے اسے واضح کیا، چھٹے میں فرمایا کہ حضرت عیسیٰ کا آنا بنی اسرائیل کے لیے قیامت وسطیٰ کا قائم ہونا تھا اور سمجھایا کہ ایک برگزیدہ قوم بھی جب خدا کے رسول کی مخالفت کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں گر جاتی ہے۔ ساتویں میں آنحضرت صلعم کی مخالفت کرنے والوں کو توجہ دلائی کہ ان کے لیے دنیا میں بھی ناکامی ہے اور آخرت میں بھی عذاب ہے۔

تعلق: جب پچھلی سورت میں یہ بتایا کہ پیغام اسلام کل عالم کے لیے ہے تو یہاں بتایا کہ مذہب لوگوں کے اخلاق کی درستگی کے لیے آتا ہے دنیوی سامانوں سے متمتع کرنا اس کی کوئی غرض نہیں۔ عیسائی اقوام کو اپنی دنیوی زیب و زینت پر بہت فخر ہے حالانکہ مذہب کی غرض اخلاقی زیب و زینت کا جامہ پہنانا ہے انہی کی طرف زخرف کے ذکر میں خاص اشارہ ہے اور آخری دو رکوعوں میں حضرت عیسیٰ کا ذکر اور عقیدۂ ابنیت کی تردید ہے۔

۲۹۸۱ ام الکتاب دیکھو ۳۷۵ محکمات یا اصول کو کہا ہے اور فاتحہ کو ام الکتاب کہا ہے اس لیے کہ وہ کتاب کا مبدا یعنی آغاز ہے (غ) یا اس لیے کہ ہر نماز میں پہلے اسی کو پڑھا جاتا ہے (ل) اور زجاج کہتے ہیں اُمُّ الکتاب اَصْلُ الکتاب یعنی کتاب کا اصل ہے اور کہا گیا ہے لوح محفوظ۔ اور تہذیب میں ہے کہ شرائع اور احکام اور فرائض کی آیات میں سے ہر ایک محکم آیت اُمّ الکتاب ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ امّ الکتاب فاتحہ ہی ہے کیونکہ وہ تمام نمازوں میں ہر سورت سے پہلے پڑھی جاتی ہے اور اس کے ساتھ مصحف کی ابتدا ہوتی ہے اور یہاں ام الکتاب لوح محفوظ کو کہا ہے اور قتادہ کہتے ہیں اصل کتاب ہے اور ابن عباس سے ہے کہ ام الکتاب قرآن ہے اوّل سے لیکر آخر تک (ل) اور یہی دو قول اس کے معنی میں ابن جریر نے نقل کیے ہیں یعنی لوح محفوظ اور اصل الکتاب وجملتہ (ج) اور لوح محفوظ سب کتب سماوی کے لیے بطور اُمّ ہے یعنی ان کا اصل اور امّ الکتاب سے مراد علم ازلی اور آیات محکمات بھی لی گئی ہیں (م)

لدی۔ لَدَی اور لَدُن قریب قریب ہیں اور لَدُن عِندَ سے خاص ہے کیونکہ وہ نہایت فعل پر دلالت کرتا ہے اور بعض وقت عند کی جگہ ہی استعمال ہوتا ہے۔ قد بلغت من لّدنی عذرا (الکہف ۱۸-۷۶) وھب لنا من لدنک رحمۃ (آل عمران ۳- ۸) والفیا سیدھا لدا الباب (یوسف ۱۲-

۲۵) (غ)

قرآن کا علو و حکمت: ان آیات میں کتاب مبین کی قسم کھا کر اس کتاب کو بطور شہادت اس بات پر پیش کیا ہے کہ ہم نے اسے عربی قرآن بنایا ہے یعنی وضاحت سے بیان کرنے والا دیکھو ۱۵۱۶ اور کہ وہ علیّ اور حکیم ہے عَلِیّ کے لیے دیکھو ۱۶۰۳ اور مراد اس کا سب کتب پر بلند ہونا اور وجوہ فساد سے بلند ہونا ہے اور حکیم سے مراد سب کتب پر حاکم ہونا یا محکم ہونا ہے (ح) یا حکیم سے مراد ہے کہ اس میں حکمت اور علم کی باتیں ہیں تو مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی بلند مرتبگی اور اس کے پُرحکمت

اَفَنَضۡرِبُ عَنۡكُمُ الذِّكۡرَ صَفۡحًا اَنۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِيۡنَ ﴿۵﴾	تو کیا ہم تم سے اعراض کرتے ہوئے نصیحت کو پھیر دینگے اس لیے کہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو ۲۹۸۲
وَكَمۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ نَّبِىٍّ فِى الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۶﴾	اور کتنے ہی نبی ہم نے پہلوں میں بھیجے۔
وَمَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ نَّبِىٍّ اِلَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۷﴾	اور کوئی نبی ان کے پاس نہیں آتا تھا مگر وہ اس سے ہنسی کرتے تھے۔
فَاَهۡلَكۡنَاۤ اَشَدَّ مِنۡهُمۡ بَطۡشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۸﴾	سو ہم نے انھیں ہلاک کر دیا جو قوت میں ان سے زیادہ سخت تھے اور پہلوں کی مثال گزر چکی ۲۹۸۳
وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ خَلَقَهُنَّ الۡعَزِيۡزُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۹﴾	اور اگر تو ان سے سوال کرے کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تو ضرور کہیں گے کہ انھیں غالب علم والے نے پیدا کیا۔
الَّذِىۡ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَرۡضَ مَهۡدًا وَّجَعَلَ لَكُمۡ فِيۡهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۰﴾	جس نے تمھارے لیے زمین کو جائے آرام بنایا اور تمھارے لیے اس میں رستے بنائے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔
وَالَّذِىۡ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَنۡشَرۡنَا بِهٖ بَلۡدَةً مَّيۡتًا كَذٰلِكَ تُخۡرَجُوۡنَ ﴿۱۱﴾	اور وہ جس نے بادل سے پانی ایک اندازے سے اتارا پھر ہم اس کے ساتھ ایک مردہ شہر کو زندہ کرتے ہیں اسی طرح تم زندہ کرکے نکالے جاؤ گے

ہونے پر خود قرآن ہی گواہ ہے اور اس کی شہادت یہ ہے کہ وہ اپنے پیروؤں کو بلند مرتبہ اور حکیم بنا کر دکھا دے کیونکہ اس کا دعویٰ یہی ہے کہ اس کی تعلیم علو اور حکمت کے مقام پر پہنچاتی ہے اور ام الکتاب کے جو بھی معنے کیے جائیں مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور علم الٰہی ضائع نہیں ہو سکتا، بلکہ دشمن جو اسے تباہ کرنا چاہتے ہیں تو ان کے مقابل میں اس کے علو اور اس کے پُر حکمت ہونے کا ذکر کیا۔

۲۹۸۲ نضرب عنکم۔ الضرب یقع علی جمیع الاعمال الّا قلیلا۔ ضرب کا لفظ سب کاموں پر استعمال ہو جاتا ہے سوائے تھوڑوں کے اور اضربت عن الشئ کے معنی ہے اس سے رک گیا اور اعراض کیا۔ اور ضَرَبَ عنہ الذکر اور اَضۡرَبَ عنہ دونوں کے معنی ہیں صَرَفَہٗ اسے پھیر دیا اور یہاں معنی ہیں کہ کیا ہم تم کو یوں ہی چھوڑ دیں۔ اور تمہیں اس بات کا علم نہ دیں جو تم پر واجب ہے اس لیے کہ تم زیادتی کرتے ہو۔ اور ضربت عنہ الذکر کا محاورہ سوار سے لیا گیا ہے جب وہ جانور پر سوار ہو۔ پھر اسے ایک طرف سے پھیرنا چاہے۔ تو اسے مارتا ہے تاکہ اسے دوسری طرف پھیر دے اور یوں ضرب بمعنی صرف ہو گیا ہے۔ اور ضربت فلاناً عن فلانٍ کے معنی ہیں اسے اس سے روک دیا (ل)

صفحا۔ صَفۡح کے معنی جنب یا پہلو ہیں اور ہر چیز کا صَفۡح اس کی جانب ہے۔ اسی سے مصافحۃ یعنی ایک شخص کا اپنی ہتھیلی کی جانب کو دوسرے کی ہتھیلی کی جانب میں رکھ دینا اور صَفَحَ عنہ کے معنی ہیں اس کے گناہ سے اعراض کیا۔ واَصۡلُہٗ من الاعراض بصفحۃ وجھہ گویا اس کے گناہ سے اپنا منہ پھیر لیا اور یہاں صفح سے مراد صرف اعراض ہے کیونکہ صَفَحَ عَنِّیۡ فُلَانٌ کے معنی ہیں اس سے پیٹھ پھیرتے ہوئے اعراض کیا (ل) اور صفحا یہاں صافحین کی جگہ ہے۔ یا ضرب کے لیے غیر لفظ سے مصدر ہے۔

انسان کی خطاکاری پر اللہ کا رحم: آیت کا مطلب یہی ہے کہ ایک قوم اگر خطا کاری میں حد سے گذر گئی ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ بھی اسے اسی اسراف کی حالت میں چھوڑ دے اور ان کو نصیحت نہ کرے بالفاظ دیگر کوئی قوم کتنی بھی خطا کاری میں بڑھ جائے اللہ تعالیٰ کا رحم اس کی دستگیری کے لیے بھی تیار ہے یعبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ (الزمر ۳۹ - ۵۳) مگر مفسرین نے یوں بھی معنی کیے ہیں کہ کیا ہم تمہارے گناہوں سے درگذر کرتے ہوئے عذاب کو تم سے پھیر دیں گے گویا ذکر سے مراد ذکر عذاب ہے۔ اور پہلے معنی بلحاظ سیاق بھی زیادہ موزوں ہیں۔ اس لیے کہ آگے یہی ذکر چلتا ہے۔ کہ پہلے لوگوں میں بھی ہم نبی بھیجتے رہے۔ اور وحی کا نزول صفت رحمانیت کا تقاضا ہے جیسا کہ سب سے پہلی آیت میں اشارہ ہے۔

۲۹۸۳ مثل الاولین سے مراد ان کا ذکر ہے جو ایک مثل کے حکم میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ قرآن میں یہ ذکر ہو چکا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورتیں درمیانی زمانہ کی ہیں اور ان سے پہلے ایسی سورتیں نازل ہو چکی تھیں جن میں انبیاء اور ان کے مکذبین کا ذکر ہے۔

وَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَ جَعَلَ لَكُمْ — اور وہ جس نے سب کے سب جوڑے پیدا کیے اور تمھارے لیے کشتیاں

مِّنَ الْفُلْكِ وَ الْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ﴿۱۲﴾ — اور چارپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔

لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ — تاکہ تم ان کی پیٹھوں پر سوار ہو، پھر اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو

رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَ تَقُوْلُوْا — جب اس پر قرار پکڑو اور کہو، وہ پاک

سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا — ذات ہے جس نے ہمارے لیے اسے کام میں لگایا

كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ — اور ہم اسے قابو میں رکھنے والے نہ تھے ۲۹۸۴

وَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ — اور ضرور ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں

وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ — اور وہ اس کے بندوں میں سے اس کی اولاد مقرر کرتے ہیں ۲۹۸۵

ع الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ ؏ — انسان کھلا ناشکر گزار ہے

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصْفٰىكُمْ — کیا اس نے اپنی مخلوق سے (اپنے لیے) بیٹیاں بنالیں اور تمھیں

بِالْبَنِيْنَ ﴿۱۶﴾ — بیٹوں کے لیے چن لیا؟

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ — اور جب ان میں سے کسی کو اس کی خوش خبری دی جاتی ہے

لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا — جو وہ رحمٰن کے لیے مثال بیان کرتا ہے تو اس کا منہ سیاہ

وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿۱۷﴾ — ہو جاتا ہے اور وہ غم سے بھرا ہوا ہوتا ہے ۲۹۸۶

اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَ هُوَ فِي — کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے اور وہ جھگڑے میں

۲۹۸۴ علیٰ ظھورہٖ ضمیر مذکر کو بعض نے ما ترکبون کی طرف لیا ہے اور لفظ انعام مذکر بھی آتا ہے۔ اور مونث بھی۔ ایک جگہ ہے مما فی بطونہ (النحل ۱۶۔ ۶۶) اور دوسری جگہ مما فی بطونہا (المومنون ۲۳۔ ۲۱) اور یہاں ضمیر واحد رکھی گئی ہے کیونکہ یہ بمنزلہ جمع ہے (ج)۔

مقرنین۔ قرن کے لیے دیکھو ۶۵۸ وغیرہ اور اَقْرَنْتُ للشیءِ کے معنی ہیں مجھے اس پر طاقت یا قوت حاصل ہے پس مُقْرِن طاقت رکھنے والا ہے۔ اور اِقْران ایک شخص کا دوسرے پر قوت رکھنا ہے (ل)۔

اس اور اگلی آیت کی مذکورہ دعا سبحان الذی سخر لنا ھٰذا وما کنا لہ مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون جانور پر سواری کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ اور دونوں آیتوں میں تعلق یہ ہے کہ جانور پر سواری جسمانی طور پر سیر ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا روحانی سیر ہے۔

۲۹۸۵ جزء کے معنی بعض یا حصہ ہیں اور یہاں بعض مفسرین نے ولد یا بیٹا اور بعض نے عدل یا اس کا ہمسر مراد لیا ہے۔ (ج) اور یہ جو کہا گیا ہے کہ جزء لغت عرب میں بمعنی اناث ہے تو زمخشری اسے غلط قرار دیتا ہے۔

یہاں انتقال مضمون اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹا منسوب کرنے کی طرف کیا ہے اور اگلے رکوع میں عرب کے اس عقیدہ کا ذکر ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں چونکہ عیسائیوں کا عقیدہ ابنیت اور عرب کا یہ عقیدہ باہم ملتے جلتے ہیں اس لیے دونوں کا ذکر ایک جگہ کیا ہے اس رکوع میں اصل ذکر بعثت انبیاء کا تھا اس کے آخر پر اس عقیدہ کا ذکر یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ تمام انبیاء کی اصولی تعلیم اللہ تعالیٰ کی توحید رہی ہے۔ یہ مشرکانہ عقیدہ کہ اس کا بیٹا یا بیٹیاں بھی ہیں لوگوں کا اپنا افترا ہے کسی نبی نے یہ تعلیم نہیں دی۔

۲۹۸۶ یہی مضمون النحل ۱۶۔ ۵۷ و ۵۸ اور الصافات ۳۷۔ ۱۴۹ تا ۱۵۳ میں بیان ہو چکا ہے یعنی ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دینا بما ضرب للرحمٰن مثلا میں اسی طرف اشارہ ہے اور مثل سے مراد یہاں شبہ ہے یعنی اس کو اللہ تعالیٰ کی مثل یا اس کی جنس سے قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اولاد والد کی جنس سے ہوگی۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرنا گویا دوسروں کو اس کی جنس سے یا اس جیسا قرار دینا ہے اور پہلی آیت میں مما یخلق اس لیے بڑھایا کہ مخلوق تو تغیر اور فنا کے نیچے ہے اسے اللہ تعالیٰ جیسا قرار دینا کیسی بعید از عقل بات ہے۔

الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴿۱۸﴾
وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ
الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ
سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۹﴾
وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ
مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ
اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۲۰﴾ ؕ
اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ
بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾
بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى
اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾
وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ
قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ
اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا

کھول کر بات نہ کر سکے ۲۹۸۷
اور انھوں نے فرشتوں کو جو خدا کے بندے ہیں دیویاں بنایا، کیا وہ ان کی پیدائش پر موجود تھے۔ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور ان سے پوچھا جائے گا ۲۹۸۸
اور کہتے ہیں کہ اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے، انھیں اس کا کچھ علم نہیں۔ وہ محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔
کیا ہم نے انھیں اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے، جس سے وہ دلیل پکڑتے ہیں ۲۹۸۹
بلکہ کہتے ہیں ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک طریق پر پایا اور ہم ان کے قدموں کے نقشوں پر چلنے والے ہیں۔
اور اسی طرح ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے آسودہ حال لوگوں نے کہا ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک طریق پر پایا اور ہم ان کے قدموں کے

۲۹۸۷ ینشؤ۔ نشٔ اور نشأۃ کسی چیز کا حادث کرنا اور اس کی تربیت کرنا ہے ولقد علمتم النشأۃ الاولی (الواقعۃ ۵۶۔ ۶۲) اور ناشئۃ اللیل (مزمّل ۷۳۔ ۶) میں مراد قیام اور نماز کے لیے کھڑا ہونا ہے۔ اور نشأ السحاب کے معنی ہیں بادل ہوا میں پیدا ہوا۔ اور بڑھتا گیا اسی معنی میں ہے وینشئ السحاب الثقال (الرعد ۱۳۔ ۱۲) اور انشاء ایک چیز کا وجود میں لانا اور اس کی تربیت کرنا ہے۔ اور اس کا اکثر استعمال جانداروں میں ہے۔ ھوالذی انشأکم (الانعام ۶۔ ۹۸) وانشأنا من بعدھم قرنا اٰخرین (الانعام ۶) ثم انشانٰہ خلقا اٰخر (المومنون ۲۳۔ ۱۴) وننشئکم فی مالا تعلمون (الواقعۃ ۵۶۔ ۶۱) ینشئ النشأۃ الاٰخرۃ (العنکبوت ۲۹۔ ۲۰) یہ سب وہ وجود میں لاتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے خاص ہے اور یہاں معنی تربیت کرنا ہیں (غ)؏

زیورات میں پرورش پانے والے کے متعلق دو قول ہیں بعض کے نزدیک اس سے مراد لڑکیاں اور عورتیں ہیں۔ اس معنے کے لحاظ سے عورتوں کے لیے زیورات وغیرہ کے پہننے کا جواز اور مردوں کے لیے اس کے عدم جواز کا استدلال کیا گیا ہے۔ اور ابن زید کا قول ہے کہ اس سے مراد ان کے بت ہیں جو وہ چاندی اور سونے سے بناتے تھے اور ینشؤ فی الحلیۃ سے مراد زیورات سے ان کا بنانا ہے (ج) اور فی الخصام غیر مبین بھی بتوں پر صادق آسکتا ہے اور اس صورت میں نفی ابانۃ سے مراد نفی خصام ہوگی (ح) یعنی وہ دلیل دینے یا کچھ بیان کرنے یا جھگڑا کرنے کے قابل ہی نہیں اور چونکہ اگلی آیت میں اناث سے مراد ان کی دیویاں یا ان کے بت ہی ہیں۔ جس کے لیے دیکھو ۷۳۴ اس لیے یہاں بھی بتوں کا ذکر ہی اصل منشا معلوم ہوتا ہے۔ اور بتوں کو زیورات یعنی سونے چاندی اور جواہرات سے مرصع کرنا بت پرستوں میں عام رواج ہے۔ اور بتوں کے دلیل نہ دینے یا نہ بولنے کو دوسری جگہ بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ فسئلوھم ان کانوا ینطقون (الانبیاء ۲۱۔ ۶۳) افلا یرون الا یرجع الیھم قولا (طٰہٰ ۲۰۔ ۸۹)

۲۹۸۸ بتوں کو ملائکہ کا مظہر قرار دینا: فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیکر ان کی عبادت بھی کرتے تھے جیسے کہ اگلی آیت سے ظاہر ہے پس اناث سے مراد انہیں دیویاں قرار دینا ہی ہے اور چونکہ ان کے بتوں کے نام جن کی وہ عبادت کرتے تھے عورتوں پر تھے اور فرشتوں کی اور کسی رنگ میں انکا عبادت کرنا معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان بتوں یا اپنی دیویوں کو ملائکہ کا مظہر قرار دیتے تھے جس پر دوسری جگہ قرآن کریم میں شہادت موجود ہے۔ کہ جب فرشتوں سے کہا جائے گا کہ کیا یہ تمہاری عبادت کرتے تھے تو وہ جواب میں کہیں گے بل کانوا یعبدون الجنّ (السبا ۳۴۔ ۴۱)

۲۹۸۹ پہلی آیت میں فرمایا کہ ان کے پاس اس عقیدہ کے متعلق کوئی علم نہیں یعنی عقلی دلیل نہیں یہاں فرمایا کہ کوئی کتاب بھی ان کے پاس نہیں کسی نبی یا راستباز کی یہ تعلیم نہیں بالفاظ دیگر نقلی دلیل بھی کوئی نہیں اگلی آیت میں امۃ کے معنی دین کے لیے دیکھو ۲۱۸۳ یہی معنی یہاں مجاہد نے کیے ہیں۔ (ج)؏

عَلٰٓى اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ ۝۲۳

نقشوں کے پیچھے چلتے ہیں۔

قٰلَ اَوَلَوۡ جِئۡتُكُمۡ بِاَهۡدٰى مِمَّا وَجَدۡتُّمۡ عَلَيۡهِ اٰبَآءَكُمۡ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ۝۲۴

(ڈرانیوالے نے) کہا کیا اگر میں تمھارے پاس اس سے زیادہ ہدایت والی بات لایا ہوں جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا۔ انھوں نے کہا ہم اس کا جو تمھیں دیکر بھیجا گیا ہے انکار کرنے والے ہیں۔ ۲۹۹۰

فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝۲۵ ع

تو ہم نے انھیں سزادی، سو دیکھ کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِيۡمُ لِاَبِيۡهِ وَقَوۡمِهٖۤ اِنَّنِىۡ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعۡبُدُوۡنَ ۝۲۶

اور جب ابراہیمؑ نے اپنے بزرگ اور اپنی قوم سے کہا، میں اس سے بیزار ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو۔

اِلَّا الَّذِىۡ فَطَرَنِىۡ فَاِنَّهٗ سَيَهۡدِيۡنِ ۝۲۷

مگر وہ جس نے مجھے پیدا کیا سو وہی مجھے سیدھی راہ دکھائیگا ۲۹۹۱

وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِىۡ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ۝۲۸

اور اس نے اپنی اولاد میں یہ کلمہ پیچھے چھوڑا تاکہ وہ رجوع کریں ۲۹۹۲

بَلۡ مَتَّعۡتُ هٰٓؤُلَاۤءِ وَاٰبَآءَهُمۡ حَتّٰى جَآءَهُمُ الۡحَقُّ وَرَسُوۡلٌ مُّبِيۡنٌ ۝۲۹

بلکہ میں نے انھیں اور ان کے باپ داداؤں کو سامان دیا، یہاں تک کہ اُن کے پاس حق اور کھول کر بیان کرنیوالا رسول آیا ۲۹۹۳

وَلَمَّا جَآءَهُمُ الۡحَقُّ قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ۝۳۰

اور جب حق ان کے پاس آیا کہنے لگے یہ جادو ہے اور ہم اس کا انکار کرنے والے ہیں ۲۹۹۴

وَقَالُوۡا لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيۡمٍ ۝۳۱

اور کہنے لگے کیوں یہ قرآن دو بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر نہ اتارا گیا ۲۹۹۵

اَهُمۡ يَقۡسِمُوۡنَ رَحۡمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحۡنُ

کیا وہ تیرے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں، ہم نے ان کے

۲۹۹۰ قال میں ضمیر نذیر کی طرف جاتی ہے جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہے اور نذیر کو اپنی تعلیم یا اپنے دین کو اھدیٰ کہنا اس لحاظ سے ہے کہ باوجود تعلیم کے بگڑ جانے کے کچھ نہ کچھ ہدایت ہر قوم کے پاس ہوتی ہے ؛

۲۹۹۱ یعنی میں سوائے ایک پیدا کرنے والے کے اور کسی کی عبادت نہیں کرتا الا یہاں استثنائے منقطع ہے۔ اور ہدایت دینے سے مراد صحیح تعلیم پر قائم کرنا نہیں کیونکہ وہ تو قائم ہیں۔ اور سوائے خدا کے کسی کی عبادت نہیں کرتے بلکہ منزل مقصود پر پہنچانا ہے دیکھو ع۵ ؛

۲۹۹۲ عقب۔ عَقِب پاؤں کے پچھلے حصہ کو کہا جاتا ہے اور استعارۃً بیٹے اور بیٹے کے بیٹے پر اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے یہاں اور جاء فی عَقِبِہٖ اس سے کچھ بقیہ باقی رہ گیا۔ اور اَعْقَبَہٗ کذا کے معنی ہیں اس چیز کا اسے وارث کر دیا فاعقبھم نفاقا (التوبۃ ۹) (غ) اور بعض نے فی عقبہ کے معنی من خلفہ کیے ہیں یعنی اپنے پیچھے اور بعض نے عقب ابراہیم سے مراد آل محمد صلعم کو لیا ہے (ج) اوپر ذکر تھا کہ حضرت ابراہیم نے تمام معبودان باطل سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اور توحید الٰہی پر قائم ہوئے۔ الا الذی فطرنی جعل میں فاعل اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتا ہے۔ اور ابراہیم بھی اور ھا کی ضمیر اسی کلمہ توحید کی طرف ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ووصّٰی بھا ابراھیم بنیہ ویعقوب (البقرۃ ۲-۱۳۲) اور حضرت یعقوب کا قول اذ قال لبنیہ ما تعبدون من بعدی قالوا نعبد الٰھک والٰہ اٰبائک (البقرۃ ۲-۱۳۳) مطلب یہ ہے کہ توحید الٰہی کے مذہب کو ہی ابراہیم نے اپنی اولاد میں باقی چھوڑا۔ اور یرجعون میں رجوع سے مراد اسی صحیح تعلیم کی طرف رجوع ہے یعنی ملک عرب میں یہ تعلیم باقی چلی آتی ہے۔ پس اگر یہ لوگ غور کریں تو بت پرستی چھوڑ کر خدائے واحد کی طرف رجوع کریں ؛

۲۹۹۳ یعنی ان کے مشرکانہ عقاید اور ان کی بدکرداریوں پر گرفت نہیں کی۔ اور حق قرآن کریم ہے ؛

قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ
دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ
وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۳۲﴾
وَ لَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً
لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ
سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا
يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ۙ
وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ۙ
وَ زُخْرُفًا ؕ وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ
لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾ ع ۳ / ۱۰ / ۹

درمیان ان کی دنیا کی زندگی میں ان کی روزی تقسیم کی ہے،
اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کیے ہیں۔ تاکہ
ایک دوسرے سے کام لیتا رہے اور تیرے
رب کی رحمت اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں ۲۹۹۶
اور اگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی گروہ ہو جائیں گے
تو ہم ان کے لیے جو رحمٰن کا انکار کرتے ہیں ان کے گھروں
کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں (بھی) جن پر
وہ چڑھتے ہیں ۲۹۹۷
اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں۔
اور سونے کے (بھی) اور یہ سب صرف دنیا کی زندگی کا
سامان ہے اور آخرت تیرے رب کے نزدیک متقیوں
کے لیے ہے ۲۹۹۸

۲۹۹۴ یہاں قرآن کریم کو سحر کہا ہے اس لیے کہ اس کی تعلیم دلوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ دیکھو ۱۲۹ انبیاء کو ساحر کہنے کی اصل وجہ یہی ہے ؂

۲۹۹۵ قریتین یعنی دو بستیوں میں اشارہ مکہ اور طائف کی طرف ہے۔ اور رجل عظیم سے مراد جاہ و مال والا آدمی ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کیونکہ کفار کی نظر میں عظمت کا انحصار مال دنیا پر تھا اور مال دنیا کے لحاظ سے رسول اللہ صلعم بڑے نہ تھے ہاں نیکی اور راستبازی میں آپ کا مرتبہ اس قدر بلند تھا کہ اس کا اعتراف سب عرب کو تھا۔ بعض لوگوں نے خاص نام لیے ہیں مثلاً مکہ میں ولید بن مغیرہ یا عتبہ بن ربیعہ کا نام اور طائف میں حبیب بن عمرو یا ابن عبدیالیل یا ابن مسعود ثقفی کا نام مگر اس تعین کی کوئی ضرورت نہیں ؂

۲۹۹۶ رحمۃ ربك سے مراد نبوت یا اللہ تعالیٰ سے قرب کا تعلق ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی باطنی نعمتوں کی تقسیم اُن کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ظاہری نعمتوں کی تقسیم بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کا ظاہری قانون قدرت یہ ہے کہ سامان روزی کے لحاظ سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت کے کام لے سکیں اور نظام قائم رہے۔ تو جس طرح بعض مصالح کی بنا پر یہ اختلافات ظاہری ہیں یہی حالت اختلافات روحانی کی ہے اور کون شخص فی الحقیقت دوسروں پر فضیلت رکھتا ہے۔ اور کس کی قوت قدسی دوسروں کو نیکی کی راہ پر لا سکتی ہے۔ یہ علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے ؂

۲۹۹۷ فضۃ۔ فضّ کے لیے دیکھو ۵۵۱ کسی چیز کا توڑنا ہے اور فِضّۃ چاندی کو کہتے ہیں اس لیے کہ جواہر میں یہ سب سے ادنیٰ درجہ پر ہے جس سے معاملہ کیا جاتا ہے (غ) ؂

معارج۔ معراج کی جمع ہے دیکھو ۲۳۴۸ ؂

لوگوں کے امۃ واحدۃ یا ایک ہی گروہ ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ سب کفر پر جمع ہو جائیں مطلب یہ ہے کہ مال دنیا تو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایک حقیر شے ہے اور وہ کفار کو اتنا مال بھی دیدے کہ ان کے گھروں کی چھتیں اور سیڑھیاں اور دروازے اور ان کے بیٹھنے کے تخت سب سونے چاندی کے ہوں لیکن اس صورت میں لوگ سب کے سب کفر کی طرف ہی جھک جائیں اور مال دنیا کو ہی اپنا مطلوب اور مقصود بنا لیں آج اس آیت کی سچائی کس قدر عیاں ہو رہی ہے کہ یورپ کی کافر قوموں کو اللہ نے کچھ وافر حصہ مال دنیا سے دیا۔ تو کس طرح پر سب لوگ ان کی پیروی کر کے مال دنیا کے حصول پر ہی گر گئے ہیں۔ اور شب و روز ہر ایک کو یہ فکر ہے کہ اس کا گھر نہایت خوبصورت بن جائے اور اس میں بیش قیمت سامان ہو اس ہوس نے آج دنیا کو اخلاق فاضلہ کے لیے قدم اٹھانے سے محروم کر رکھا ہے ہاں یہ چیزیں اپنی ذات میں بری بھی نہیں لیکن ان کو مطلوب اور مقصود بنا لینا انسان کو اپنے کمال حقیقی سے محروم کر دیتا ہے ؂

۲۹۹۸ زخرف کے لیے دیکھو ۱۳۸۸ زینت اور کمال حسن کو بھی زخرف کہا جاتا ہے یا ملمع کو اور سونے کو بھی اور ابن زید کا قول ہے کہ زخرف سے مراد اثاث البیت اور اس کا تجمل ہیں (ر) اور سونا معنی لے کر زخرفا من زخرف کے قائم مقام ہوگا یعنی یہ چیزیں چاندی اور سونے کی بنا دیں اور آخری الفاظ میں فرمایا کہ یہ محض دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور آخرت ان لوگوں کے لیے ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے لیے ہر قسم کی قربانی کرتے ہیں اور سونے چاندی کی پرستش نہیں کرتے ؂

وَ مَنۡ یَّعۡشُ عَنۡ ذِکۡرِ الرَّحۡمٰنِ نُقَیِّضۡ
لَہٗ شَیۡطٰنًا فَہُوَ لَہٗ قَرِیۡنٌ ﴿۳۶﴾

اور جو کوئی رحمٰن کی یاد سے منہ پھیر لے، ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں سو وہ اس کا ساتھی ہو جاتا ہے ع۲۹۹۹

وَ اِنَّہُمۡ لَیَصُدُّوۡنَہُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ وَ
یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ ﴿۳۷﴾

اور وہ انھیں رستے سے روکتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت پانے والے ہیں ع۳۰۰۰

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَنَا قَالَ یٰلَیۡتَ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکَ
بُعۡدَ الۡمَشۡرِقَیۡنِ فَبِئۡسَ الۡقَرِیۡنُ ﴿۳۸﴾

یہاں تک کہ جب ہمارے پاس آتا ہے کہتا ہے اے کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کی دوری ہوتی سو کیا بُرا ساتھی ہے ع۳۰۰۱

وَ لَنۡ یَّنۡفَعَکُمُ الۡیَوۡمَ اِذۡ ظَّلَمۡتُمۡ اَنَّکُمۡ
فِی الۡعَذَابِ مُشۡتَرِکُوۡنَ ﴿۳۹﴾

اور آج تمھیں یہ بات فائدہ نہ دے گی، جبکہ تم ظالم ہو کہ تم عذاب میں شریک ہو۔

اَفَاَنۡتَ تُسۡمِعُ الصُّمَّ اَوۡ تَہۡدِی الۡعُمۡیَ
وَ مَنۡ کَانَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۴۰﴾

تو کیا بہروں کو سنا سکتا ہے یا اندھوں کو رستہ دکھا سکتا ہے اور اسے جو کھلی گمراہی میں ہے ع۳۰۰۲

فَاِمَّا نَذۡہَبَنَّ بِکَ فَاِنَّا مِنۡہُمۡ مُّنۡتَقِمُوۡنَ ﴿۴۱﴾

سو اگر ہم تجھے لے جائیں تو بھی انھیں ہم سزا ہی دینے والے ہیں۔

اَوۡ نُرِیَنَّکَ الَّذِیۡ وَعَدۡنٰہُمۡ فَاِنَّا
عَلَیۡہِمۡ مُّقۡتَدِرُوۡنَ ﴿۴۲﴾

یا تجھے دکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے تو ہم ان پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں ع۳۰۰۳

فَاسۡتَمۡسِکۡ بِالَّذِیۡۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ ۚ اِنَّکَ
عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۴۳﴾

سو اسے مضبوط پکڑ لے جو تیری طرف وحی کی گئی ہے، بیشک تو سیدھے رستے پر ہے۔

ع۲۹۹۹ یعش۔ عَشا نظر کی کمی ہے دن کو ہو یا رات کو اور بعض کے نزدیک وہ رات کے وقت نظر کا نقص ہے اور وہ اندھاپن نہیں اور عَشا یَعۡشُوۡ کے معنی ہیں اس کی نظر کمزور ہو گئی۔ اور عَشَوۡت الی النار کے معنی ہیں آگ کا قصد کیا اس کے ساتھ ہدایت پاتے ہوئے اور عَشَوۡت عنہا کے معنی ہیں اس سے اعراض کیا۔ (ل)؛ شیطان کس انسان کا قرین بنتا ہے: قیض کے معنی اور شیطان کے انسان پر مقرر یا مسلط ہونے کے لیے دیکھو ع۲۹۳۷ اس آیت سے اور حٰمٓ ۔ ۲۵ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شیطان ہر انسان کا قرین نہیں۔ بلکہ وہ صرف انہی کے لیے قرین بنتا ہے جو خود حق اور صداقت سے منہ پھیرتے ہیں شیطان کی وسوسہ اندازی عام ہے مگر اس کے وسوسوں کو قبول سب نہیں کرتے قرین کے لیے دیکھو ع۶۵۸ جب انسان شیطان کے وسوسے کو رد کرتا ہے تو اس کی وسوسہ اندازی بھی کم ہو جاتی ہے۔ اور جس قدر زیادہ وہ اس کے وساوس کو قبول کرتا جاتا ہے اسی قدر زیادہ اس کا تعلق اس سے ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کا دائمی رفیق ہو جاتا ہے شیطان تو وہی ہے مگر وہ قرین صرف بدکاروں کا ہوتا ہے ؛

ع۳۰۰۰ بدی کب اچھی معلوم ہوتی ہے؟ روکنے والے وہی شیاطین ہیں مگر وہ بدی کو ایسا خوبصورت کر کے بناتے ہیں کہ بدکار سمجھتے ہیں کہ ہم راہ راست پر ہیں۔ اور اچھا کام کر رہے ہیں۔ جب انسان بدی میں بہت زیادہ مبتلا ہو جاتا ہے تو اسی بدی کو وہ اچھا سمجھنے لگتا ہے اس لیے کہ نور فطرت بالکل دب جاتا ہے ورنہ اصل حالت فطرت انسان کی یہ نہیں ؛

ع۳۰۰۱ مشرقین سے مراد مشرق و مغرب ہیں (ج) بعض نے گرمی اور سردی کے مشرق مراد لیے ہیں ؛

ع۳۰۰۲ قرآن شریف نہ صرف اندھوں کو رستہ دکھاتا اور بہروں کو سناتا ہے بلکہ مُردوں تک کو زندہ کرتا ہے اومن کان میتا فاحییناہ (الانعام ۶ - ۱۲۲) یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو دیکھنا چاہتے ہی نہیں اور نہ سننا چاہتے ہیں اور مراد روحانی اندھے اور روحانی بہرے ہیں جیسا کہ آیت کے آخری الفاظ صاف بتاتے ہیں ؛

ع۳۰۰۳ ان دونوں آیات میں یہ بتایا ہے کہ بدی کی سزا تو بدکاروں کو مل کر رہے گی کسی کو رسول اللہ کی زندگی میں مل جائے تو کیا اور بعد میں مل جائے تو کیا۔ چونکہ اسلام کے مخالف تو آپ کے بعد بھی پیدا ہوتے رہنے تھے اس لیے فرمایا کہ بعد میں بھی سزا ملتی رہے گی ؛

وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ ۚ وَ سَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۴۴﴾

اور یقیناً وہ تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے مشرف ہے اور تم سے پوچھا جائے گا۔

وَ سْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾ ع

اور ان سے پوچھ جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا کیا ہم نے رحمٰن کے سوائے (اور بھی) معبود بنائے تھے جن کی عبادت کی جائے ۳۰۰۴

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۶﴾

اور ہم نے موسیٰؑ کو اپنی آیتوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا، تو اس نے کہا میں جہانوں کے ربّ کا رسول ہوں

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰیٰتِنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَضْحَكُوْنَ ﴿۴۷﴾

سو جب وہ ہمارے نشان لے کر ان کے پاس آیا تو وہ ان پر ہنسی کرنے لگے۔

وَ مَا نُرِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ اِلَّا هِیَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۫ وَ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور ہم انھیں کوئی نشان نہ دکھاتے تھے مگر وہ اپنی نوع کے (پہلے نشان) سے بڑا ہوتا تھا اور ہم نے انھیں عذاب میں پکڑا، تاکہ وہ رجوع کریں ۳۰۰۵

وَ قَالُوْا یٰۤاَیُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور انھوں نے کہا اے جادوگر! ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر جیسا اس نے تجھ سے عہد کیا ہے ہم ضرور ہدایت پانیوالے ہیں ۳۰۰۶

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ یَنْكُثُوْنَ ﴿۵۰﴾

سو جب ہم نے ان سے عذاب دور کر دیا تو وہ عہد شکنی کرنے لگے۔

وَ نَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ

اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کی کہا اے میری قوم کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں اور یہ نہریں ہیں جو میرے نیچے بہتی ہیں ۳۰۰۷

۳۰۰۴ یہاں سوال رسولوں سے تو ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ فوت ہو چکے اس لیے مراد ان رسولوں کی امتیں لی گئی ہیں یا رسولوں سے سوال سے مراد ان کی تعلیم کو دیکھنا ہے کہ کوئی رسول اللہ تعالیٰ کی طرف شرک کی تعلیم کو منسوب نہیں کرتا اور اصل غرض مشرکین پر اتمام حجت ہے کہ جن انبیاء کو وہ مانتے ہیں وہ تو شرک کی تعلیم نہیں دیتے تھے ؛

۳۰۰۵ اخت ہارون: اخت دیکھو ۶۳۴ و ۱۰۷۹ اور یہاں اختھا سے مراد ہے وہ نشان جو اس سے پہلے گذر چکا اور اسے اس کی اخت اس لحاظ سے کہا کہ صحت اور بیان کرنے اور صدق میں وہ دونوں شریک ہیں (غ) اور یا اخت ہارون (مریم ۱۹-۲۸) میں ایک توجیہ یہ ہے کہ اس سے مراد اختهٗ فی الصلاح ہے یعنی صلاحیت میں اس کی بہن اور بلحاظ نسب بہن ہونا مراد نہیں۔ (غ) ؛

نشانوں سے مراد حضرت موسیٰ کی سچائی کے نشانات ہیں اور ان میں وہ معجزات بھی ہیں جن کا ذکر دوسری جگہ ہے دیکھو ۱۱۴۳ اور سورۃ الاعراف ۷-۱۳۳ وغیرہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عصا کے سانپ بننے اور ید بیضا سے بڑھکر معجزات وہ تھے جو ان سے پیچھے دکھائے گئے اور کسی نشان کا بڑا ہونا بلحاظ اس کی وضاحت کے اور اس اثر کے ہے جو وہ ایک چیز کی صداقت پر پیدا کرتا ہے اور سچائی کا یہی نشان ہے کہ وہ روز بروز زیادہ واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور اس پر نئی سے نئی دلائل پیدا ہوتی جاتی ہیں اور ہر ایک قسم کا دھندلاپن اس کی دلایل سے دور ہوتا جاتا ہے ؛

۳۰۰۶ ساحر۔ ساحر کے معنی ان کے نزدیک عالم تھے اور سحر ان کے نزدیک مذموم نہیں تھا اور مراد اس سے عالم ہے (ج) یہی مضمون ۱۱۴۴ میں ہے ؛

۳۰۰۷ من تحتی۔ من بین یدی فی الجنان (ج) یعنی میرے سامنے باغوں میں یا مراد یہ ہے کہ میرے زیر حکومت جن سے میں جس طرح چاہوں فائدہ اٹھاؤں بہشتیوں کے متعلق بھی ایسے ہی الفاظ آتے ہیں۔ تجری من تحتہم الانھٰر جس سے مراد یہی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں فائدہ اٹھائیں۔ اور تحت۔ فوق کے مقابل پر ہے اور تحت کا استعمال اس چیز میں ہوتا ہے جو الگ ہو اور اسفل کا اس میں جو ساتھ ملی ہوئی ہو (غ) اور جس طرح فوق بلحاظ مرتبہ ہو سکتا ہے تحت بھی بلحاظ مرتبہ ہو سکتا ہے ؛

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ — تو کیا تم دیکھتے نہیں۔

اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ۬ وَّ لَا یَكَادُ یُبِیْنُ ﴿۵۲﴾ — بلکہ میں اس سے بہتر ہوں جو ذلیل ہے اور کھول کر بیان نہیں کر سکتا ع۳۰۰۸

فَلَوْلَاۤ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ ﴿۵۳﴾ — تو اس پر سونے کے کڑے کیوں نہ اتارے گئے، یا اس کے ساتھ فرشتے اکٹھے ہو کر کیوں نہ آئے ع۳۰۰۹

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۵۴﴾ — سو اس نے اپنی قوم کو خفیف کیا تو انھوں نے اس کی بات مان لی وہ نافرمان لوگ تھے۔

فَلَمَّاۤ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۵۵﴾ — سو جب انھوں نے ہمیں ناراض کیا تو ہم نے انھیں سزا دی، پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا ع۳۰۱۰

ع۱۱ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ ﴿۵۶﴾ — سو انھیں گئے گزرے کر دیا اور پچھلوں کے لیے کہاوت بنا دیا ع۳۰۱۱

وَ لَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْیَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ یَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾ — اور جب مریم کے بیٹے کی مثال بیان کی جاتی ہے تو تیری قوم اس پر چلّا اٹھتی ہے ع۳۰۱۲

ع۳۰۰۸ مہین مَھْنَۃ کے معنی خدمت کرنا ہیں اور مَھِین مردوں میں سے ضعیف یعنی کمزور کو کہا جاتا ہے اور حدیث میں نبی کریم صلعم کی صفت میں ہے کہ آپ مَھِین نہ تھے اور دوسری جگہ ہے ولا تطع کل حلاف مَھِین (القلم ۶۸-۱۰) جہاں مراد فاجر ہے یا مَھانۃ (بمعنی قلت) سے ہے۔ اور رائے اور تمیز کی کمی سے مراد ہے اور ماء مھین (السجدۃ ۳۲-۸) سے مراد بھی تھوڑا پانی ہے یا کمزور (ل)۔

ایک طرف اپنی حکومت اور بادشاہت کا ذکر کیا ہے اور دوسری طرف حضرت موسیٰ کی کمزوری کا کہ ایک وہ محکوم قوم سے تھے اور لا یکاد یبین میں یہ کہا ہے کہ نہ صرف قومی طور پر محکوم ہے بلکہ ذاتی وصف بھی اس میں نہیں کہ کوئی زبردست تقریر کر سکے۔

ع۳۰۰۹ مقترنین۔ اِقْتِران دیکھو ع۹۰۶ کسی معنی میں دو یا زیادہ چیزوں کا اکٹھا ہونا ہے (غ) اور یہاں مراد اکٹھے چلتے ہوئے لیے گئے ہیں۔ یا ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے یا ایک دوسرے سے ملے ہوئے (ج) اور یہ کنایہ اعانت سے ہے اس لیے ابن عباس نے معنی کیے ہیں جو اس کی مدد کریں ان کے مقابل پر جو اس کے مخالف ہیں۔ (ر)۔

سونے کے کڑے پہننے سے مراد: مجاہد کہتے ہیں کہ جب کسی شخص کو سردار بنایا جاتا تھا تو اُسے سونے کے کڑے اور سونے کا طوق پہنایا جاتا تھا۔ (ر) گویا سونے کے کڑوں کا پہنا نا نشان ریاست تھا اور فرعون کا مطلب یہ تھا کہ خدا نے ایک ایسے شخص کو رسول کیوں بنایا جو ریاست سے حصّہ نہیں رکھتا جیسا کفار مکہ کا قول دوسری جگہ ہے لولا نزل ھٰذا القراٰن علی رجل من القریتین عظیم (۳۱)

ع۳۰۱۰ اٰسفونا۔ اَسَف دیکھو ع۱۱۵۷ اور اٰسَف کے معنی ہیں اَغْضَبَ ناراض کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا اور غضب ہماری طرح نہیں بلکہ اپنے اولیاء میں ان کی رضا کو اپنی رضا اور ان کے غضب کو اپنا غضب ٹھیرایا اسی لیے کہا من اھان لی ولیًّا فقد بارزنی بالمُحَارَبۃ جو شخص میرے ولی کی اہانت کرتا ہے وہ میرے ساتھ جنگ کرتا ہے (غ) اور اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غضب یا اسف میں جو انسان سے تعلق رکھنے والا حصّہ یعنی ثوران دم القلب ہے وہ باقی نہیں رہتا صرف نتیجہ باقی رہتا ہے جو سزا دینا ہے دیکھو ع۲۷۔

ع۳۰۱۱ سلف (ع۳۵۲) متقدم ہے یعنی جو پہلے گذر چکا اور مراد ان کی ہلاکت ہے اور ان کا آگ میں پہلے جانا بھی مراد لیا گیا ہے اور مَثَل سے مراد ان کا عبرت ہونا ہے۔

ع۳۰۱۲ یصدون۔ صَدّ کی مضارع جب یَصُدّ ہو تو اس کے معنی اعراض کرنے کے ہوتے ہیں اور یَصِدّ ہو تو اس کے معنی ضَجّ یعنی فریاد کرنا یا چلا اٹھنا ہیں۔ (ل)۔

حضرت عیسیٰ اور معبودان عرب: مجاہد کا قول اس آیت کی تفسیر میں یہ ہے کہ قریش کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت کریں جس طرح عیسیٰ کی عبادت عیسیٰ کی قوم کرتی ہے۔ (ج) اور ایک روایت میں ہے کہ عبد اللہ بن الزبعری نے آنحضرت صلعم کو پڑھتے ہوئے سنا انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم تو کہا کہ حضرت عیسیٰ کی نصاریٰ عبادت کرتے ہیں۔ اور آپ اسے نبی اور عبد صالح بتاتے ہیں تو اگر وہ آگ میں جائیں گے تو ہم اور ہمارے معبود

وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ۝۵۸

اور کہتے ہیں کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ۔ یہ اسے تیرے لیے بیان نہیں کرتے مگر جھگڑنے کو بلکہ یہ لوگ جھگڑالو ہی ہیں ع۳۰۱۳

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ ۝۵۹

وہ (اور) کچھ نہیں مگر ایک بندہ ہے جس پر ہم نے انعام کیا اور اسے بنی اسرائیل کے لیے نمونہ بنایا ع۳۰۱۴

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ۝۶۰

اور اگر ہم چاہتے تو تم میں فرشتے مقرر کر دیتے جو زمین میں خلیفہ ہوتے ع۳۰۱۵

وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۶۱

اور یقیناً یہ (موعودہ) گھڑی کے لیے علم ہے سو تم اس کے متعلق شک نہ کرو اور میری پیروی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے ع۳۰۱۶

بھی آگ میں جانے پر راضی ہیں۔ (ر) اصل مطلب صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ بت پرست دیکھتے تھے کہ حضرت عیسیٰ کی تو آنحضرت صلعم عزت کرتے ہیں اور ان کے بتوں کی نہیں کرتے اس لیے وہ کہتے تھے کہ ہمارے معبود بہتر ہیں یا عیسیٰ یہ عرب کے معبود تھے اور حضرت عیسیٰ ایک دوسری قوم کے معبود تھے تو وہ اس بات پر چلا اٹھتے کہ کیا وجہ ہے کہ ایک غیر قوم کے معبود کی عزت کی جاتی ہے اور اپنے معبودوں کی عزت نہیں کی جاتی اس کا جواب آیت ۵۹ میں دیا ہے کہ اس کی عزت اس وجہ سے ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کا ایک برگزیدہ بندہ تھا نہ اس وجہ سے کہ وہ ایک قوم کا معبود ہے۔ اور آیت ۶۴ میں بتایا کہ وہ اپنے آپ کو معبود بنا کر پیش نہ کرتا تھا بلکہ وہ تو اللہ کی عبادت کی طرف ہی بلاتا تھا ان کی امت نے ایک غلط راہ پر قدم مار کر انہیں خدا بنا لیا ہے ؂

ع۳۰۱۳ ضربوہ۔ ضرب کا لفظ جب مثل کے ساتھ آئے تو اس کے معنی بیان کرنے کے ہوتے ہیں جیسے واضرب لہم مثلا اصحب القریۃ (یٰسٓ ۳۶-۱۳) و اضرب لہم مثل الحیوۃ الدنیا (الکہف ۱۸-۴۵) یا جیسے اوپر کی آیت میں ولما ضرب ابن مریم مثلا اور بعض وقت صرف لفظ ضرب مثال بیان کرنے پر بولا جاتا ہے جیسے کذٰلک یضرب اللہ الحق والباطل (الرعد ۱۳-۱۷) اور یہاں ضربوا اسی معنی میں ہے اور یہاں ان کا بیان بمقابلہ اس بیان کے ہے جو قرآن شریف نے حضرت عیسیٰ کا ذکر کیا کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ وہ بھی تو ایک قوم کا معبود ہے یہ ان کا کہنا محض جھگڑے اور مقابلہ کے لیے ہے بلکہ فرمایا کہ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو ہر بات میں جھگڑا کرنا ہی انکا کام ہے کیونکہ خصم اسے کہتے ہیں جو جھگڑے سے مختص ہو دیکھو ع۲۸۳۲ ؂

ع۳۰۱۴ حضرت عیسیٰ کا مثل ہونا: مثلا لبنی اسرائیل میں مثل کے معنی اٰیۃ یا نشان کیے گئے ہیں۔ جس کی تشریح ابن جریر یوں کرتے ہیں اٰیۃ لبنی اسرائیل وحجۃ لنا علیہم بارسالنا الیہم بالدعاء الینا یعنی بنی اسرائیل کے لیے نشان اور ہماری ان پر حجت اس لیے کہ ہم نے انہیں اپنی طرف بلانے کے لیے اسے بھیجا اور یا چونکہ مثل تشبیہ کے طور پر بیان کی جاتی ہے۔ اس لیے مراد اس سے ان کے لیے نمونہ بنانا ہے جس کی زندگی کے مطابق وہ اپنی زندگیاں بنائیں۔ اور یا حسنات میں مثل مراد ہے اور اس صورت میں بھی معنی نمونہ ہی ہوں گے ؂

ع۳۰۱۵ خلیفۃ اللہ انسان ہی ہو سکتا ہے: منکم کے ایک معنی بدلا منکم کیے گئے ہیں اور مطلب یہ لیا گیا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو تم سب کو ہلاک کر دیں اور تمہاری جگہ فرشتوں کو لے آئیں (ج) اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ تمہاری جگہ خلافت روحانی یعنی نبوت کے لیے فرشتے بھیج دیتے اور اس میں نصاریٰ کے عقیدے کی تردید ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی گنہ گاری کی وجہ سے ضروری ہوا کہ خود خدا انسان بنے تو بتایا کہ خدا کو انسان بناتے ہو اگر ایسا بھی تھا کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ ناقابل خلافت پاتا اور خلافت کے لیے کسی اور کی ضرورت ہوتی تو وہ انسانوں کے لیے فرشتے بنا دیتا جو خلیفۃ اللہ کا کام کرتے کیونکہ فرشتے تو معصوم عن الخطا بھی ہیں۔ لیکن وہ تمہارے لیے نمونے کا کام نہ دے سکتے جس طرح بشر رسول نمونے کا کام دیتے ہیں اور نہ انسان ان کے نقش قدم پر چل سکتے تو پھر خدا کے انسان بننے سے کیا غرض حاصل ہو سکتی ہے۔

ع۳۰۱۶ انہ لعلم للساعۃ سے مراد: انہ میں ضمیر حضرت ابن عباس اور بعض اور مفسرین کے نزدیک ابن مریم کی طرف جاتی ہے۔ اور حسن اور قتادہ سے مروی ہے کہ یہ قرآن کی طرف ہے۔ (ج) اس دوسرے قول پر جو اعتراض بعض نے کیا ہے کہ یہاں قرآن کا ذکر پہلے نہیں وہ صحیح نہیں اس لیے کہ بہت موقعوں پر اسی طرح ضمیر قرآن بغیر اس کے پہلے ذکر کے آئی ہے جیسے لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ (القیمۃ ۷۵-۱۶) یا جیسے انا انزلنہ فی لیلۃ القدر (القدر ۹۷-۱) اور حق یہی ہے کہ قرآن ہی ساعت کا علم دیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کو ساعت کے لیے نشان تو کہا جا سکتا ہے خواہ نزول عیسیٰ ہی مراد ہو مگر ساعت کا علم وہ نہیں اس لیے حضرت ابن عباس کی قرات بھی ع کی زبر کے ساتھ ہے۔ اور بلحاظ سیاق بھی اس معنی پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس لیے کہ جب عیسائیوں کے عقیدہ باطل کا ذکر کیا کہ وہ ایک انسان کو خدا بناتے ہیں۔ تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ آخر ان کی طاقت پر بھی خاتمہ کی گھڑی آئے گی جس کا علم قرآن شریف نے دیدیا ہے سو وہ اس میں شک نہ کریں اور رسول اللہ صلعم کی اطاعت اختیار کریں کہ یہی صراط مستقیم ہے اور اگر ضمیر حضرت عیسیٰ کی طرف ہی لی جائے تو ساعت سے مراد بنی اسرائیل کی ساعت

وَ لَا یَصُدَّنَّکُمُ الشَّیۡطٰنُ ۚ اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۶۲﴾

اور تمھیں شیطان نہ روک دے، وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔

وَ لَمَّا جَآءَ عِیۡسٰی بِالۡبَیِّنٰتِ قَالَ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ لِاُبَیِّنَ لَکُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ تَخۡتَلِفُوۡنَ فِیۡہِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۶۳﴾

اور جب عیسےؑ کھلی دلیلیں لے کر آیا، کہا میں تمھارے پاس حکمت لایا ہوں اور تاکہ میں تمھارے لیے بعض وہ باتیں کھول کر بیان کروں جن میں تم اختلاف کرتے ہو، سو اللہ تعالیٰ کا تقویٰ کرو اور میری فرماں برداری کرو۔

اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ رَبِّیۡ وَ رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡہُ ؕ ہٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ﴿۶۴﴾

اللہ ہی میرا رب اور تمھارا رب ہے سو اس کی عبادت کرو، یہ سیدھا رستہ ہے۔

فَاخۡتَلَفَ الۡاَحۡزَابُ مِنۡۢ بَیۡنِہِمۡ ۚ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡ عَذَابِ یَوۡمٍ اَلِیۡمٍ ﴿۶۵﴾

سو ان میں سے (کئی) جماعتوں نے اختلاف کیا، سو ان کے لیے جو ظالم ہیں دردناک دن کے عذاب کی وجہ سے افسوس ہے۔۳۰۱۷

ہَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا السَّاعَۃَ اَنۡ تَاۡتِیَہُمۡ بَغۡتَۃً وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۶۶﴾

یہ صرف (موعودہ) گھڑی کے منتظر ہیں کہ ان پر اچانک آجائے اور انھیں خبر بھی نہ ہو۔

اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍۭ بَعۡضُہُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۶۷﴾ ؑ ۱۱/۱۲

متقیوں کے سوائے اس دن دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہو نگے۔۳۰۱۸

یٰعِبَادِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۸﴾

اے میرے بندو! تم پر آج کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہو گے۔

یا قیامت وسطیٰ ہوگی یعنی حضرت عیسیٰ کا (جسے عیسائیوں نے خدا بنالیا) ظہور بنی اسرائیل کے لیے ایک نشان تھا۔ کہ ان کی ساعت وسطیٰ آگئی۔ جب نبوت ان سے لے لی جائے گی جیسا کہ حضرت مسیح کے اقوال میں بھی صاف اس بات کا ذکر ہے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائیگی "(متی ۲۱: ۴۳) اور اس کے آگے آتا ہے کہ کاہن اور فریسی "سمجھ گیے کہ ہمارے حق میں کہتا ہے" گویا حضرت عیسیٰ کا آنا ایک نشان تھا کہ اب نبوت ان میں سے نکل کر دوسری طرف جاتی ہے اسی لیے فرمایا واتبعون ھذا صراط مستقیم گویا جس بات کی خبر حضرت عیسیٰ نے دی تھی وہ خدا کی بادشاہت آگئی۔ اس لیے تم میری پیروی کرو یہی سیدھا رستہ ہے اور قیامت کے نشانوں میں اگر ہے تو نزول عیسیٰ ہے نہ خود عیسیٰ مگر یہاں ذکر نزول عیسیٰ کا نہیں بلکہ عیسیٰ کا ہے ہم قرآن شریف میں اپنی طرف سے یہ نہیں بڑھا سکتے کہ عیسیٰ سے مراد نزول عیسیٰ لے لیں۔ اور کوئی حدیث بھی آنحضرت صلعم سے اس آیت کی تفسیر میں مروی نہیں۔ جس کی وجہ سے اس قدر تصرف جائز ہو اور پھر اس معنی کے لیے قرات بھی دوسری اختیار کرنی پڑتی ہے جو قرآن شریف میں نہیں۔ پس پہلے معنی ہی قابل قبول ہیں۔ اور چونکہ ذکر قرآن شریف کا شروع ہو گیا تھا اس لیے دوبارہ جب حضرت عیسیٰ کا ذکر کیا تو لفظ عیسیٰ بالتصریح لایا گیا۔ ولما جاء عیسی آیت ۶۳ اگر ضمیر عیسیٰ کی طرف ہی لی جائے تو پھر بھی نزول عیسیٰ مراد نہیں ہو سکتا اور ساعت سے مراد یہودیوں کی تباہی ہے نہ قیامت کبریٰ۔

قیامت کبریٰ کا نشان ہمارے نبی کریم صلعم ہیں جو فرماتے ہیں انا والساعۃ کھاتین۔

۳۰۱۷ء احزاب سے مراد نصاریٰ کے مختلف فرقے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ بعض نے یہود و نصاریٰ کا اختلاف مراد لیا ہے۔

۳۰۱۸ء اخلاء خلیل کی جمع ہے دیکھو ۲۴۰ء مراد یہ ہے کہ سب محبتیں قیامت کے دن منقطع ہو جائیں گی سوائے اس محبت کے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ یا مراد بدکار اور ان کے ہم صحبت ہیں۔ کہ وہ قیامت میں ایک دوسرے کے دشمن ہو نگے ۞

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝٦٩

وہ جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے اور فرمانبردار ہیں۔

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ۝٧٠

تم اور تمھارے ساتھی جنت میں داخل ہو جاؤ، عزت کے ساتھ رکھے جاؤ گے۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّ اَكْوَابٍ ۚ وَ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَ اَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٧١

ان پر سونے کی رکابیاں اور پیالے لیے پھرینگے اور اس میں ہے جو دل چاہے اور (جس سے) آنکھیں لذت پائیں، اور تم اسی میں رہو گے ۳۰۱۹ء

وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْۤ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٧٢

اور یہ وہ جنت ہے جس کے تم وارث کیے گئے ہو اس کا بدلہ جو تم کرتے تھے۔

لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝٧٣

اس میں تمھارے لیے بہت پھل ہیں، جن سے تم کھاتے ہو۔

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝٧٤

مجرم دوزخ کے عذاب میں رہیں گے۔

لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَ هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝٧٥

اور وہ ان سے ہلکا نہ کیا جائیگا اور وہ اس میں ناامید ہونگے۔

وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ۝٧٦

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ظالم تھے۔

وَ نَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ؕ

اور پکاریں گے اے مالک! تیرا رب ہمارا کام تمام

۳۰۱۹ء صحاف۔ صحیفۃ کسی چیز کا وہ ہے جو پھیلا ہوا ہو۔ اور اسے بھی کہتے ہیں جس میں لکھا جاتا ہے اور اس کی جمع صحائف اور صُحُف ہے صحف ابراہیم و موسیٰ (الاعلیٰ۔ ۱۹) یتلوا صحفا مطھرۃ فیھا کتب قیمۃ (البینۃ۹۸۔ ۲و۳) جہاں مراد قرآن ہے اور فیہا کتب اس لیے کہا کہ اس میں پہلی کتب سے بڑھکر کچھ ہے۔ اور مصحف وہ ہے جس میں لکھے ہوئے صحیفے ہیں اور اس کی جمع مصاحف ہے اور صَحْفۃ جس کی جمع صحاف ہے اس کے معنی فراخ پیالہ ہیں (غ) یعنی کھانے کے بڑے برتن (ث)۔

اکواب۔ کوب کی جمع ہے وہ پیالہ جس کا دستہ نہ ہو (غ) یعنی پینے کے برتن۔

جنت کی نعمتیں اور آرزوئیں: انسان کو جن چیزوں سے اس دنیا میں خوشی حاصل ہوتی ہے اور جو کھانے پینے کے سامان سے تعلق رکھتی ہیں ان کا ذکر کر کے آگے بڑھایا کہ جنت میں ہر ایک سامان ہوگا۔ جس کی دل آرزو کرے مگر چونکہ بسا اوقات غلط آرزوں سے انسان اپنی حقیقی راحت کو خراب کرلیتا ہے۔ اس لیے اس کیساتھ ہی بڑھایا کہ وہ چیزیں راحت دینے والی ہوں گی اور یہ تو ظاہر ہے کہ دلوں کی آرزؤں سے مراد کفار کے دلوں کی آرزوئیں نہیں کہ اس دنیا کی آرائش اور آسایش کے سامان مراد لیے جائیں۔ وہ تو دوزخ میں ہوں گے اور ان کے لیے حیل بینھم وبین مایشتھون کا حکم ہے بلکہ راستبازوں کی آرزوئیں مراد ہیں اور وہ آرزوئیں جسمانی آسایش کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ اخلاقی اور روحانی ترقیات کے لیے ہوتی ہیں۔ اور ان کی آنکھوں کو لذت بھی دنیا کی چیزوں سے نہیں ملتی بلکہ روحانی نعماء سے ملتی ہے کسی راستباز کی زندگی میں ہمیں یہ نظر نہیں آتا کہ اس کے دل میں یہ آرزو ہو کہ رہنے کو آراستہ محل اور کھانے کو اعلیٰ درجہ کی چیزیں اور پہننے کو فاخرہ لباس ہوں۔ اور روح المعانی میں ہے کہ تلذ الاعین سے اشارہ اللہ تعالیٰ کی رویت کی طرف ہے اور نبی کریم صلعم فرماتے ہیں وقرۃ عینی فی الصلوٰۃ میری آنکھ کی راحت نماز میں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہاں کا کھانا پینا بھی کوئی اور رنگ رکھتا ہے۔ اس کا قیاس اس دنیا کے کھانے پینے پر کرنا صحیح نہیں۔

۳۰۲۰ء مالک دوزخ کے داروغہ کا نام ہے۔ عذاب سے چھوٹنے کے لیے موت مانگتے ہیں جواب میں ماکثون کا لفظ لاکر بتایا کہ ابھی انکو اور انتظار کرنا ہے دیکھو ۱۸۸۷ء۔

قَالَ اِنَّكُمۡ مّٰكِثُوۡنَ ﴿۷۷﴾ — کر دے، کہیگا تمھیں رہیں (رہنا ہے) ۳۰۲۰

لَقَدۡ جِئۡنٰكُمۡ بِالۡحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَكُمۡ لِلۡحَقِّ كٰرِهُوۡنَ ﴿۷۸﴾ — یقیناً ہم تمھارے پاس حق لائے لیکن تم میں سے اکثر حق کو ناپسند کرنے والے ہیں۔

اَمۡ اَبۡرَمُوۡۤا اَمۡرًا فَاِنَّا مُبۡرِمُوۡنَ ﴿۷۹﴾ — کیا انھوں نے کوئی بات ٹھان رکھی ہے سو ہم نے بھی ٹھان رکھی ہے ۳۰۲۱

اَمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّا لَا نَسۡمَعُ سِرَّهُمۡ وَنَجۡوٰٮهُمۡ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيۡهِمۡ يَكۡتُبُوۡنَ ﴿۸۰﴾ — آیا سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی چھپی باتوں اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سنتے ہاں اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس لکھتے جاتے ہیں ـ

قُلۡ اِنۡ كَانَ لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الۡعٰبِدِيۡنَ ﴿۸۱﴾ — کہہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہو، تو میں پہلا عبادت کرنے والا ہوں ۳۰۲۲

سُبۡحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ ﴿۸۲﴾ — آسمانوں اور زمین کا رب، رب عرش ـ اس سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں ۳۰۲۲ا

فَذَرۡهُمۡ يَخُوۡضُوۡا وَيَلۡعَبُوۡا حَتّٰى يُلٰقُوۡا يَوۡمَهُمُ الَّذِىۡ يُوۡعَدُوۡنَ ﴿۸۳﴾ — سو انھیں چھوڑ دے باتوں میں لگے رہیں اور کھیلتے رہیں یہاں تک کہ اپنے اس دن کو پائیں جس کا انھیں وعدہ دیا جاتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِىۡ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِى الۡاَرۡضِ — اور وہی ہے جو آسمان میں معبود ہے اور زمین میں معبود ہے،

۳۰۲۱ ابرموا ـ اِبرام کسی معاملہ کا مضبوط کرلینا ہے ـ اور اس کا اصل رسے کے مضبوط بٹنے سے ہے (غ) ابرموا امرا سے مراد ہے کہ انہوں نے اپنی مخالفت رسول کی تدبیر کو مضبوط کر لیا ہے اور فانا مبرمون میں بتایا کہ ہم اس امر کا استحکام کر رہے ہیں جس کے لیے رسول کو بھیجا گیا ہے۔ اگلی آیت میں بتا دیا کہ ان کی شرارتوں اور تدابیر کا سدباب کر دیا جائے گا ؎

۳۰۲۲ اِنۡ نافیہ بھی ہوتا ہے بمعنی ما اور اکثر اس کے بعد اِلّا آتا ہے ـ جیسے ان الکافرون الّا فی غرور (الملک ۶۷ ـ ۲۰) إن امھاتھم الا الّٰئی ولدنھم (المجادلۃ ۵۸ ـ ۲) ان من اھل الکتاب الا لیومنن بہ (النساء ۴ ـ ۱۵۹) اور بعض کا خیال ہے کہ اِن نافیہ سوائے اس کے آتا ہی نہیں ـ کہ اس کے بعد اِلّا ہو اور یہ غلط ہے ان عندکم من سلطان بھٰذا (یونس ۱۰ ـ ۶۸) قل ان ادری اقریب ما توعدون (الجن ۷۲ ـ ۲۵) وان ادری لعلہ فتنۃ لکم (الانبیاء ۲۱ ـ ۱۱۱) اور یہاں بھی بعض کے نزدیک اِن نافیہ ہے (مغنی)

عیسائیوں کا عقیدہ ابنیت: بہت سے مفسرین نے یہاں اِنۡ کو نافیہ لیا ہے اور اول العابدین کے معنی اول الشاہدین لیے ہیں یا یہ کہ میں پہلا وہ شخص ہوں جو اللہ کی عبادت کرتا ہوں ـ اس ایمان اور تصدیق کے ساتھ کہ رحمان کا کوئی بیٹا نہیں ـ اور بعض نے عبد فلان من ھذا الامر کے محاورہ پر جس کے معنی ہیں ـ انف منہ وغضب واباہ یعنی اس کام سے عار کی اور ناراض ہوا اور اس کا انکار کیا ـ اول العابدین سے مراد اس کام کی عار کرنے والا یا اول انکار کرنے والا لیے ہیں ـ اور اِنۡ کو اس صورت میں بمعنی لَوۡ مانا ہے اور بعض نے تقدیر یوں مانی ہے ـ کہ اگر تمہارے زعم میں کوئی اللہ کا بیٹا ہے تو میں تمہاری تکذیب اور تمہاری بات کا انکار کرنے میں اول المومنین باللہ ہوں ـ (ج) اور یوں بھی معنی کیے گئے ہیں کہ اگر رحمان کا کوئی بیٹا ہوتا اور کسی دلیل سے یہ ثابت ہو جاتا تو میں اس بیٹے کی سب سے پہلا عبادت کرنے والا ہوتا کیونکہ جب میں اللہ تعالےٰ کی عظمت وجبروت کو ظاہر کرتا ہوں تو اس کا بیٹا کوئی ہوتا تو اسکی میں کیوں عبادت نہ کرتا (ر) ؎

ولد حقیقت پر محمول نہیں: اور میرے نزدیک یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اگر رحمان کا کوئی بیٹا ہو سکتا ہے تو وہ حقیقت میں خدا یا ابن اللہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا کوئی بندہ اس کے اخلاق میں رنگین ہونے کی وجہ سے مجازاً اس کا بیٹا کہلا سکتا ہے ـ خود انجیل میں بھی بیٹے کا لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے ـ "اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لیے دعا مانگو تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو" (متی ۵: ۴۴ ـ ۴۵) اور اس طرح بیٹا کہلانے میں ایک کی کوئی خصوصیت نہیں ساری مخلوق شریک ہو سکتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا لو اراد اللہ ان یتخذ ولدا لاصطفی مما یخلق ما یشاء سبحٰنہ (الزمر ۳۹ ـ ۴) اس لیے فرمایا فانا اول العابدین میں خدا کی عبادت میں سب سے آگے ہوں ـ لیکن بیٹا کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ جو بیٹا بناتے ہیں وہ اس لیے بناتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بلا بدل رحم نہیں کر سکتا اور رحمان ہی ہے وہ جو بلا بدل رحم کرتا ہے پس جس خدا کی صفت رحمانیت ہے اس کا بیٹا کوئی نہیں ہو سکتا ؎

۳۰۲۲ا یصفون ـ وصف کسی چیز کا بیان اس کے حلیہ اور اس کی نعت کے ساتھ کرنا ہے اور صفۃ اس کی وہ حالت ہے اور وصف حق بھی ہوتا ہے اور باطل بھی (غ) ؎

إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ﴿٨٤﴾
اور وہ حکمت والا علم والا ہے۔

وَتَبَارَكَ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٥﴾
اور وہ بابرکت ہے کہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان اسی کی بادشاہت ہے اور اسی کو (موعودہ) گھڑی کا علم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾
اور وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے جنھیں یہ اس کے سوائے پکارتے ہیں مگر وہ جس نے حق کی گواہی دی، اور وہ (اسے) جانتے ہیں ۳۰۲۳

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٨٧﴾
اور اگر تو ان سے پوچھے کس نے انھیں پیدا کیا، تو کہیں گے اللہ تعالیٰ نے، پھر کس طرح اُلٹے پھر جاتے ہیں۔

وَقِيلِهِ يَا رَبِّ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾
اور اس کی پکار (کا علم بھی اللہ تعالیٰ کو ہے) کہ اے میرے رب یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے ۳۰۲۴

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٨٩﴾ ع ۷ ۲۲ ۱۳
سو اُن سے درگزر کر اور کہہ دے سلام۔ آخر جان لیں گے۔

۳۰۲۳ شفاعت آنحضرت صلعم : الامن شھد بالحق۔ حق یا توحید کی شہادت دینے والے خود حضرت محمد مصطفےٰ صلعم ہیں۔ اسی لیے آگے بڑھایا وھم یعلمون یعنی وہ آپ کو جانتے ہیں۔ یعنی اب جو لوگ ہیں ان کی شفاعت صرف رسول اللہ صلعم ہی کر سکتے ہیں۔ اور کوئی نہیں خواہ بت ہوں یا حضرت عیسیٰ کیونکہ حضرت عیسیٰ کی پیروی کا زمانہ گذر چکا تھا اور یہ زمانہ اتباع رسول اللہ صلعم کا تھا۔ اور آپ ہی اب شفاعت کر سکتے ہیں۔ یہاں آنحضرت صلعم کی شفاعت کا بالتصریح ذکر کیا ہے ؛

۳۰۲۴ وقیلہ میں ضمیر آنحضرت صلعم کی طرف ہی ہے اور قیلہ کا عطف ساعۃ پر ہے یعنی مراد ہے عندہ علم الساعۃ وعلم قیلہ یعنی جس طرح ساعت کا علم اللہ کو ہے اسی طرح رسول کی اس پکار کا بھی علم اللہ کو ہے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اور اس پکار کا علم ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کو سنتا ہے اور وہ ضرور اس کا فیصلہ کرے گا۔ اور رسول کے اس دردِ دل کی آواز پر توجہ فرمائے گا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ساعت سے مراد قوم کی ساعت وسطیٰ ہے اور قیامت کبریٰ مراد نہیں۔ اور واؤ قسم کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ اور جواب قسم بعض کے نزدیک ان ھؤلاء قوم لایؤمنون ہے اور بعض کے نزدیک یہ سارا قول آنحضرت صلعم کا ہے اور جواب قسم محذوف ہے یعنی لننصرنہ اور قیل اور قول کے ایک ہی معنی ہیں اور یہاں آنحضرت صلعم کی اس پکار کی قسم کھائی ہے یعنی اسے بطور شہادت پیش کیا ہے کہ ایسا شخص جس کو اس قدر غم لوگوں کے ایمان نہ لانے کا ہے۔ ضرور ہے کہ اسے نصرت دی جائے ؛

سُوْرَةُ الدُّخَانِ مَكِّيَّةٌ (۴۴)

اٰيَاتُهَا ۵۹ — رُكُوْعَاتُهَا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○	اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
حٰمٓ ۚ ﴿۱﴾	(اللہ تعالیٰ) بے انتہا رحم والا۔
وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۙ ﴿۲﴾	کھول کر بیان کرنے والی کتاب گواہ ہے۔
اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِىْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ	ہم نے اسے ایک بابرکت رات میں اتارا ہے۔ ہم ہمیشہ
اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴿۳﴾	ڈراتے رہے ہیں ۳۰۲۵
فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۙ ﴿۴﴾	پھر حکمت کی بات کا اس میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے ۳۰۲۶
اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۚ ﴿۵﴾	ہماری طرف سے حکم ہوتا ہے ہم ہمیشہ رسول بھیجتے رہے ہیں۔

نام: اس سورت کا نام الدخان ہے اور اس میں تین رکوع اور انسٹھ آیتیں ہیں۔ دخان کے عام معنی دھواں ہیں۔ مگر اس کے معنی قحط اور خشک سالی بھی آئے ہیں۔ اور اس لفظ میں اس سورت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس میں ذکر نبی کریم صلعم کے مخالفین کی سزا کا ہے۔ اور انہیں بتایا ہے کہ پہلے ان پر خشک سالی کے رنگ میں چھوٹا عذاب بھیجا جائے گا۔ اور آخر ان کی طاقت بالکل توڑ دی جائے اور چونکہ دخان کے معنی شرؔ بھی ہیں اور ایک دخان کا ذکر اشراط الساعۃ میں بھی ہے اس لیے ممکن ہے کہ اس زمانہ کے شر عظیم کی طرف بھی اشارہ ہو جس کا بڑا حصہ گذر چکا اور اس عذاب کو دور کر دیا گیا مگر انکم عائدون بھی موجود ہے اور یہی آخری گرفت کے لانے کا موجب ہوگا۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں دخان کی پیشگوئی اور اس کے بعد ایک عظیم الشان گرفت کا ذکر ہے۔ دوسرے رکوع میں بنی اسرائیل کی نجات کی خبر میں جو فرعون کے ہاتھ سے انہیں ملی مسلمانوں کو خوش خبری دی ہے اور تیسرے میں بدوں اور نیکوں کی آخری جزا سزا کا ذکر کیا ہے۔

تعلق: پچھلی سورت میں یہ ذکر تھا کہ دنیا کی زیب و زینت ظاہری کو لوگ زندگی کی اصل غرض سمجھ کر مقصد زندگی سے دور جا پڑتے ہیں اس لیے اب بتایا کہ یہ ظاہری آسائش کے سامان بھی بعض وقت تھوڑی دیر کیلئے بطور تنبیہ لے لیے جاتے ہیں مگر جو لوگ پھر بھی سبق نہ لیں ان پر آخر سخت گرفت ہوتی ہے۔

۳۰۲۵ء **ابتدائے نزول قرآن:** لیلۃ مبارکۃ سے مراد لیلۃ القدر ہی ہے جیساکہ دوسری جگہ صراحت سے موجود ہے انا انزلنٰہ فی لیلۃ القدر اور لیلۃ القدر رمضان میں ہے شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن (البقرۃ ۲-۱۸۵) گویا قرآن شریف کے نزول کی ابتدا رمضان میں لیلۃ القدر میں ہوئی اور لیلۃ القدر ۲۵ یا ۲۷ یا ۲۹ رمضان میں ہے اور ابن جریر کہتے ہیں کہ قرآن کریم رمضان کے چوبیس دن گذرنے کے بعد نازل ہوا گویا پچیسویں رات میں اور انا کنا منذرین میں سنۃ اللہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہی قانون چلا آیا ہے۔ کہ وہ اپنی طرف سے منذر بھیجتا رہا ہے ؎

۳۰۲۶ء **لیلۃ القدر اور اس میں قضائے امور:** یہاں مفسرین نے امر حکیم سے مراد کسی کی زندگی اور کسی کی موت اور معائش اور مصائب اور رزق وغیرہ لیاہے کہ ایک سال کیلئے اس رات میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے قطع نظر اس سے کہ ایسی کوئی رات ہے یا نہیں جس میں ایک سال کی قضا و قدر کا فیصلہ کر دیا جاتا ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ امر حکیم سے مراد کسی کا مرنا کسی کا جینا کسی کا رزق حاصل کرنا کسی کا بھوکا رہنا نہیں بلکہ یہ وہ حکمت والے امور ہیں جو قرآن کریم میں ہدایت خلق کیلئے نازل ہوئے ہیں اور اس بیان کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں کہ ہم نے قرآن کو ایسی رات میں اتارا جس میں لوگوں کی موت اور زندگی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے کیونکہ یہ وہ امور نہیں جن کی وجہ سے کوئی رات مبارک کہلا سکے جیساکہ یہاں اسے کہا گیا ہے۔ بلکہ اس کی برکت یہی ہے کہ اس میں وہ پُر حکمت باتیں نازل ہوئیں جو ہدایت و اصلاح عالم کا موجب ہوئیں۔ اور یہ بات کہ وہ تمام امور ایک ہی رات میں نازل نہیں ہوئے محل اعتراض نہیں اس لیے کہ اس پاک کتاب کا نزول جس معنی سے اس لیلۃ مبارک میں صحیح ہے اسی معنی سے تمام حکمت والے امور کا کھول کر بیان کرنا بھی اس میں صحیح ہے اور اس کی عام توجیہ یہ ہے کہ اس رات میں قرآن کریم کا نزول سمائے اول پر ہوگیا۔ اور دوسری یہ کہ ابتدا اس رات میں ہوئی اور تیسری توجیہ یوں بھی ہو سکتی ہے کہ لیلۃ مبارکۃ میں اشارہ اس سارے زمانے کی طرف ہے جس میں نبی کریم صلعم پر قرآن نازل ہوتا رہا۔ اور اسے لیلۃ اس لحاظ سے کہا کہ اصل میں وہ تاریکی کا زمانہ تھا۔ انوار نبوت نے اسے روشن کیا۔ اگلی آیت میں امراً من عندنا سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے یعنی اس کتاب کا نزول اور ان امور کی تفصیل یہ ہماری جناب سے ایک حکم ہے ؎

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝٦ تیرے رب کی طرف سے رحمت ہے وہ سننے والا جاننے والا ہے

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے

اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝٧ اور اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ رَبُّكُمْ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے تمھارا

وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝٨ رب اور تمھارے پہلے باپ دادوں کا رب ہے۔

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۝٩ بلکہ وہ شک میں (پڑے ہوئے) کھیلتے ہیں۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَاۗءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۝١٠ سو اس دن کا انتظار کر جب آسمان کھلا دھواں لائے۔

يَّغْشَى النَّاسَ ۭ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝١١ وہ لوگوں کو ڈھانک لے گا یہ دردناک عذاب ہے ٣٠٢٧

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ۝١٢ ہمارے رب ہم سے عذاب دور کر ہم ایمان لانے والے ہیں۔

اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝١٣ یہ نصیحت کہاں حاصل کریں گے اور ان کے پاس کھول کر بیان کرنے والا رسول آیا۔

٣٠٢٧ دخان۔ جذب یعنی خشک سالی مراد ہے کہا گیا ہے کہ بھوکا اپنے اور آسمان کے درمیان بھوک کی شدت کی وجہ سے دھواں دیکھتا تھا بلکہ بھوک کو دھواں کہا گیا ہے۔ کیونکہ خشک سالی میں زمین خشک ہو کر غبار اٹھتا ہے تو اس غبار کو دھوئیں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اس لیے بھوک کے سال کو، غَبراء اور جُوع اَغبر کہا گیا ہے اور عرب کے لوگ دخان کو شَرّ کے موقع پر بولتے تھے جب کہ وہ بہت ہو۔ (ل) ؎

آنحضرت کی دعا پر اہل مکہ پر قحط کا آنا: بخاری میں حضرت ابن مسعود سے ہے کہ جب قریش نے آنحضرت صلعم کی باتوں کو ماننے سے انکار کیا۔ تو آپ نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ یوسف کے سالوں کی طرح ان پر قحط کے سال لائے پس اُن پر قحط آیا اور یہ سخت مصیبت تھی یہاں تک کہ انہوں نے ہڈیاں اور چمڑے اور مردار کھائے پس ایک شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا تو بھوک کے مارے اسے اپنے اور آسمان کے درمیان ایک دھواں سا دکھائی دیتا تھا اور بعض روایات میں ہے کہ زمین سے ایک دھواں سا اٹھتا نظر آتا تھا۔ پس کوئی شخص رسول اللہ صلعم کے پاس آیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ابوسفیان آیا۔ اور کہا۔ یا رسول اللہ مضر کے لیے اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کیجئے کیونکہ وہ ہلاک ہو گئے تب آپ نے بارش کی دعا کی اور بارش ہوئی اور بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے یہ آیت پڑھی فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین یہاں تک کہ آپ انا کاشفوا العذاب قلیلا انکم عائدون پر پہنچے اور حضرت عبداللہ بن مسعود نے اس شخص کو جو اس آیت کو عذاب قیامت کے متعلق سمجھتا تھا کہا کہ کیا قیامت کے دن یہ عذاب دور کیا جائے گا؟ اور آپ نے فرمایا البطشۃ الکبریٰ یوم بدر ہے۔ اور اس کے متعلق مختلف روایتیں بخاری میں ہیں اور دیگر کتب حدیث میں بھی ہیں۔ اور بعض نے اس دخان کو نشانات قیامت میں سے قرار دیا ہے اور حذیفہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ دخان قیامت کے نشانات میں سے ہے تو حذیفہ نے پوچھا کہ دخان کیا ہے تو آپ نے یہ آیت پڑھی یوم تاتی السماء بدخان مبین لیکن اس حدیث پر جرح ہوئی ہے اور حضرت ابن مسعود کی روایت صحیح ثابت ہے ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں دوہری پیشگوئی ہے اور ایک دفعہ پوری صراحت سے وہ پوری ہو چکی ہے۔ اور دوسری دفعہ کا تعلق قرب قیامت سے ہے۔ یعنی موجودہ زمانہ سے اور یہاں واقعی دخان کا نظارہ اپنے دوسرے معنی کی رو سے دیکھا گیا ہے یعنی شر عظیم کے دنیا پر ظاہر ہونے سے جو گذشتہ جنگ یورپ کی صورت میں نمودار ہوئی اور اس کی صداقت حدیث سے ظاہر ہے جس میں ایک شر عظیم کا ذکر ہے۔ یہ حدیث حضرت حذیفہ کی ہے اور ابوداؤد میں ہے قلت یا رسول اللہ ھل بعد ھذا الشر خیرٌ قال ھُدنۃٌ علی دَخَن یعنی میں نے دریافت کیا یا رسول اللہ اس شر کے بعد خیر ہو گی تو آپ نے فرمایا صلح ہو گی جس کے نیچے فساد ہو گا۔ جس سے صاف معلوم ہوا کہ اس شر سے مراد جنگ ہے اور یہ ھدنۃ علی دخن وہی ہے جس کا نظارہ آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور یہاں لفظ دخن اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد اس حدیث میں ہے کہ آپ نے فتنۃ عُمیاء صَمّاءُ ایک ایسا فتنہ ہو گا جو سخت خطرناک ہو گا۔ اور یہ بھی یہاں سے ظاہر ہے کہ یہ قحط مکہ میں ہی شروع ہوا۔ اور روح المعانی میں ہے کہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اس کا آنحضرت صلعم کے مکی زمانہ میں ہونا ہی بیان کیا ہے مگر بعض روایات میں ہے کہ ابوسفیان کا قصہ مدنیہ سے تعلق رکھتا ہے جس سے یہ خیال کیا گیا ہے کہ شاید یہ دو دفعہ ہوا ہو۔ مگر اصل بات صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ یہ قحط اس وقت شروع ہوا جب ابھی آپ مکہ میں ہی تھے اور ختم اس وقت ہوا جب آپ مدنیہ تشریف لے گئے اور یہاں یہ آیات بطور پیشگوئی ہیں جیسا کہ فارتقب کے لفظ سے ظاہر ہے کہ ان کا نزول قحط کے ظہور سے پہلے ہوا ؎

ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ﴿١٤﴾	پھر وہ اس سے پھر گئے اور کہنے لگے سکھایا ہوا ہے، دیوانہ ہے ۳۰۲۸
إِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيلًا إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ﴿١٥﴾	ہم عذاب کو تھوڑی دیر کے لیے دور کر دینگے تو پھر (انہی کی طرف) لوٹ جاؤ گے۔
يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ ﴿١٦﴾	جس دن ہم سخت گرفت سے پکڑیں گے ہم ضرور سزا دینے والے ہیں ۳۰۲۹
وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ ﴿١٧﴾	اور ہم نے ان سے پہلے فرعون کی قوم کو آزمایا اور ان کے پاس معزز رسول آیا۔
أَنْ أَدُّوا إِلَيَّ عِبَادَ اللَّهِ ۖ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٨﴾	کہ اللہ کے بندوں کو میرے سپرد کر دو، میں تمہارے لیے امانت والا رسول ہوں ۳۰۳۰
وَأَن لَّا تَعْلُوا عَلَى اللَّهِ ۖ إِنِّي آتِيكُم بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ﴿١٩﴾	اور کہ اللہ کے مقابل سرکشی اختیار نہ کرو میں تمہارے پاس کھلی دلیل لایا ہوں۔
وَإِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَن تَرْجُمُونِ ﴿٢٠﴾	اور میں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ مانگتا ہوں کہ تم مجھے سنگسار کرو۔
وَإِن لَّمْ تُؤْمِنُوا لِي فَاعْتَزِلُونِ ﴿٢١﴾	اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے الگ ہو جاؤ۔
فَدَعَا رَبَّهُ أَنَّ هَٰؤُلَاءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُونَ ﴿٢٢﴾	سو اس نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ مجرم لوگ ہیں۔
فَأَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُم مُّتَّبَعُونَ ﴿٢٣﴾	تو میرے بندوں کو رات کے وقت لے جا تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔
وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۖ إِنَّهُمْ جُندٌ مُّغْرَقُونَ ﴿٢٤﴾	اور دریا کو ساکن چھوڑ دے۔ یہ ایک لشکر ہے جو غرق کیے جائیں گے ۳۰۳۱

۳۰۲۸ معلّم تعلیم دیا گیا یعنی وہ جسے کوئی دوسرا سکھاتا ہے انما یعلّمہ بشر (النحل ۱۶: ۱۰۳) یہ بعض عجمی غلام تھے جو نبی کریم صلعم پر ایمان لائے اور کفار کہتے تھے کہ یہی لوگ آپ کو سکھاتے ہیں۔ ان کی اس درخواست پر یعنی ربنا اکشف عنا العذاب انا مومنون پر فرمایا انّٰی لہم الذکری عذاب کے ٹل جانے سے یہ نصیحت کہاں حاصل کرنے والے ہیں۔ کیونکہ مخالفت میں اس قدر دور نکل چکے ہیں کہ کبھی جھوٹے الزامات لگاتے ہیں کہ آپ کو دوسرے سکھاتے ہیں اور کبھی مجنون کہتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ دونوں باتیں غلط ہیں اور عذاب کے دور ہونے کی درخواست انہوں نے رسول کریم صلعم کے ذریعہ سے ہی کی تھی جیسے کہ پچھلی سورت میں حضرت موسیٰ کے ذکر میں گذر چکا۔ (الزخرف ۴۳: ۴۹)

۳۰۲۹ بطشۃ الکبری سے مراد بھی عذاب دنیا ہی ہے جیسا کہ حضرت ابن مسعود نے اسے یوم بدر قرار دیا ہے اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہو بطشۃ الکبری کا لفظ اس پر زیادہ صادق آتا ہے کیونکہ ایک تو اس میں حملے کا رنگ ہے اور دوسرے اس سے ان کی قوت کا کلی استیصال ہو گیا۔ اور پھر وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ اور کاشفوا العذاب قلیلا صاف بتاتا ہے کہ بطشۃ الکبری قحط کے ختم ہونے کے کچھ مدت بعد ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ابتدا اس کی جنگ بدر سے ہے ؇

۳۰۳۰ ادوا۔ اداء کسی حق کا ایک ہی دفعہ اور پورا پورا دے دینا اور امانت کا واپس کرنا ہے فلیؤد الذی اؤتمن امانتہ (البقرۃ ۲: ۲۸۳) ان تؤدوا الامانات الی اھلھا (النساء ۴: ۵۸) واداء الیہ باحسان (البقرۃ ۲: ۱۷۸) (غ) اور یہاں مراد ہے کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کر کے میرے سپرد کر دو اور اس کے لیے ادائے امانت کا لفظ استعمال کیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ کسی قوم کا کسی وقت دوسری قوم کے ماتحت ہونا محض ایک امانت ہے اور دوسری قوم کو غلام بنانا کسی کا حق نہیں۔ اور دوسری جگہ ہے فارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبھم (طٰہٰ ۲۰: ۴۷) اور بعض نے عباد اللہ کو منادی قرار دیکر یوں معنی کیے ہیں کہ اے بندگان خدا حق اللہ کو جو ایمان اور قبول دعوت ہے میری طرف ادا کرو ؇

۳۰۳۱ رھا الشئ رھوًا کے معنی ہیں سَکَنَ یعنی وہ چیز حالت سکون میں ہوئی۔ اور ہر ایک ساکن جو حرکت نہ کرے، سے رَھْو کہا جاتا ہے اور جب کہیں اِفْعَلْ کذا رَھْوًا تو مراد ہوتی ہے ساکنا علی ھیئتك یعنی ٹھہر ٹھہر کر آہستگی سے اور رَھَا البحرُ کے معنی ہیں سَکَنَ یعنی ساکن ہو گیا۔ اور زجاج کہتے ہیں یہاں معنی یبس

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ کتنے باغ اور چشمے چھوڑ گئے۔

وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾ اور کھیتیاں اور عزت والے مقام۔

وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾ اور نعمتیں جن میں مزے سے رہتے تھے ۳۰۳۲

كَذٰلِكَ ۖ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۲۸﴾ ایسا ہی (اب) ہوگا اور ہم نے ان (چیزوں) کا وارث دوسرے لوگوں کو بنا دیا ۳۰۳۳

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿۲۹﴾ سو ان پر آسمان اور زمین نہ روئے اور نہ انھیں مہلت دی گئی ۳۰۳۴

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۳۰﴾ اور ہم نے بنی اسرائیل کو رسوا کرنے والے عذاب سے نجات دی۔

مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ (یعنی) فرعون (کے ہاتھ) سے، وہ سرکش حد سے نکل جانے والوں میں سے تھا۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۲﴾ اور ہم نے انھیں (اپنے) علم کی بنا پر قوموں پر برگزیدہ کیا۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ﴿۳۳﴾ اور ہم نے انھیں نشانیوں میں سے وہ کچھ دیا جس میں کھلا انعام تھا ۳۰۳۵

یا خشک ہیں۔ ایک قول ہے کہ رھوا یہاں حضرت موسیٰ کی صفت ہے یعنی آہستگی سے (ل)
سمندر کو ساکن چھوڑ دے۔ الفاظ کے معنی تو یہی درست ہیں۔ مگر سمندر کے ساکن ہونے سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ اس کا پانی پتھر بن جائے بلکہ پانی میں تموج کا نہ ہونا اس کا ساکن ہونا ہے گویا حضرت موسیٰ کے گذرنے کے وقت سمندر سکون کی حالت میں تھا اور یوں اپنی جگہ سے پیچھے ہٹا ہوا تھا اس لیے خشک رستہ نکل آیا تھا۔ اسی سمندر میں جب تموج پیدا ہوا تو اس نے خشک جگہ کو ڈھانک لیا۔ اور یوں لشکر فرعون غرق ہو گیا یہی اصل حقیقت فلق بحر کی ہے ؎

۳۰۳۲ نَعْمَة۔ نِعْمَة حالت حسنہ کا نام ہے اور نعمة۔ تَنَعُّم یعنی فراخی یا آسودگی ہے (غ) اور فاکھین کے لیے دیکھو ۲۷۵۴ ؎

۳۰۳۳ بنی اسرائیل کو نعمتوں کا عطا کیا جانا: قومًا اٰخرین سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان ہلاک ہونے والوں کے بعد دوسرے لوگ (جو بنی اسرائیل نہ تھے) ان چیزوں کے وارث ہوئے اور اس سے مراد بنی اسرائیل لیکر یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کو نعمت اور دولت سے محروم کر کے ہم نے بنی اسرائیل کو جنہیں وہ ذلیل کرنا چاہتا تھا اس قسم کی نعمتیں جو فاتح اور زندہ قوموں کو ملتی ہیں دیں۔ اس صورت میں اورثنٰھا سے مراد یہ ہو گی کہ ایسی نعمتوں کا انہیں اپنی جگہ پر وارث بنایا۔ کیونکہ بنی اسرائیل مصر میں واپس نہیں گئے۔

۳۰۳۴ بکت۔ بُکاء کا استعمال اس حالت پر ہے جب غم کی وجہ سے آنسوؤں کے جاری ہونے کیساتھ آواز غالب ہو اور بُکیً کا اس حالت پر جب حزن غالب ہو اور بُکیً کا استعمال غم اور آنسوؤں کے بہنے دونوں کے اجتماع پر بھی ہوتا ہے۔ اور ہر ایک پر الگ الگ بھی جیسا کہ فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیرًا (التوبة ۹-۸۲) میں اشارہ خوشی اور غم کی طرف ہے۔ اور باکی (رونے والا) کی جمع باکون بھی ہے۔ اور بُکیّ بھی خروا سجدا وبکیا (مریم ۱۹-۵۸) اور بُکیّ کا اصل فُعُول ہے جیسے ساجد کی جمع سجود ہے اور یہاں آسمان کے رونے سے مراد بعض نے جو آسمان کی زندگی اور علم کے قائل ہیں حقیقت لی ہے اور بعض کے نزدیک یہ مجاز ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے کہ اہل سماء ان پر نہیں روئے (غ) ؎
آسمان اور زمین کا رونا: حضرت ابن عباس نے اس کے معنی یوں کیے ہیں کہ قوم فرعون نے نہ تو زمین میں کوئی اچھے آثار چھوڑے اور نہ انکا کوئی نیک عمل آسمان پر چڑھا۔ پس نہ زمین ان پر روئی اور نہ آسمان (ج) گویا ان کا رونا ایک اچھی چیز کے نہ پایا جانے پر اظہار غم ہے۔ مومن جب فوت ہوتا ہے۔ تو اس کے اعمال صالحہ کے رک جانے کیوجہ سے آسمان اور زمین اظہار غم کرتے ہیں اور کافر کے لیے ایسا نہیں ہوتا۔ اور ایک حدیث کا مضمون بھی اس کے قریب قریب ہے ؎

۳۰۳۵ چونکہ یہاں بنی اسرائیل کو فضیلت اور انعام دینے کا ذکر ہے اس لیے بلاء سے مراد بھی انعام ہی ہے دیکھو ۷۲ اور آیات سے مراد ایسی نشانیاں ہیں جیسے سمندر سے پار کرنا اور اُن کے دشمنوں کو تباہ کرنا۔ بادل کا سایہ۔ من و سلویٰ۔ اور توریت بھی مراد ہو سکتی ہے ؎

اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَیَقُوۡلُوۡنَ ﴿۳۴﴾
یہ کہتے ہیں،

اِنۡ هِیَ اِلَّا مَوۡتَتُنَا الۡاُوۡلٰی وَ مَا نَحۡنُ بِمُنۡشَرِیۡنَ ﴿۳۵﴾
کچھ نہیں، مگر ہماری پہلی موت ہی ہے اور ہم پھر اٹھائے نہیں جائیں گے ۳۰۳۶

فَاۡتُوۡا بِاٰبَآئِنَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۶﴾
سو ہمارے باپ داداؤں کو لے آؤ، اگر تم سچے ہو۔

اَهُمۡ خَیۡرٌ اَمۡ قَوۡمُ تُبَّعٍ ۙ وَّ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ اَهۡلَکۡنٰهُمۡ ۫ اِنَّهُمۡ کَانُوۡا مُجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۷﴾
کیا یہ اچھے ہیں یا تبّع کی قوم! اور وہ جو ان سے پہلے تھے۔ ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، کیونکہ وہ مجرم تھے ۳۰۳۷

وَ مَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَهُمَا لٰعِبِیۡنَ ﴿۳۸﴾
اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔

مَا خَلَقۡنٰهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۹﴾
ہم نے انھیں حق کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ مِیۡقَاتُهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۴۰﴾
فیصلے کا دن ان سب کا وقت مقرر ہے۔

یَوۡمَ لَا یُغۡنِیۡ مَوۡلًی عَنۡ مَّوۡلًی شَیۡئًا وَّ لَا هُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۱﴾
جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہ آئے گا، اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۴۲﴾ ع ۱۵
سوائے اس کے جس پر اللہ تعالیٰ رحم کرے بیشک وہ غالب رحم کرنے والا ہے۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ ﴿۴۳﴾
بے شک زقوم کا درخت

طَعَامُ الۡاَثِیۡمِ ﴿۴۴﴾ معانقة
گنہگار کا کھانا ہے۔

کَالۡمُهۡلِ ۚ یَغۡلِیۡ فِی الۡبُطُوۡنِ ﴿۴۵﴾
پگھلے ہوئے تانبے کی طرح پیٹوں میں کھولے گا۔

۳۰۳۶ موت اولیٰ سے مراد: جیساکہ خود ان کے اس قول سے ظاہر ہے وہ دوسری زندگی کے قائل نہ تھے پس موتتنا الاولی کے الفاظ ان کی طرف کیوں منسوب کیے اور فی الحقیقت بھی دوسری موت تو کوئی ہے ہی نہیں۔ ہاں قرآن شریف نے پہلی نیستی پر موت کا لفظ استعمال کیا ہے کنتم امواتا فاحیاکم اصل یہ ہے کہ موت اولیٰ یا پہلی موت سے مراد وہ موت ہے جو حیات اولیٰ یعنی پہلی زندگی کا خاتمہ کرتی ہے۔ گویا وہ جب دوسری زندگی کا انکار کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو مر جائیں گے اور اس موت کے بعد جو اس پہلی زندگی کا خاتمہ کر دے گی کوئی دوسری زندگی نہیں۔

۳۰۳۷ تُبّع تفسیر میں ہے کہ تُبّع۔ بادشاہ تھا اور مومن تھا۔ اور اس کی قوم کافر تھی اور اور بھی تبع ہوئے ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ یمن کا بادشاہ تھا اور شاہ یمن کو تبع نہیں کہتے تھے سوائے اس کے کہ وہ حضر موت اور سبا اور حمیر کا مالک ہو (ل) اور حضرت عائشہ اور بعض اور صحابہ نے اسے مومن قرار دیا ہے۔ (ج) اور بعض احادیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ تبع کو بُرا مت کہو اور بعض روایات میں ہے کہ وہ سمرقند سے فتح کر کے واپس آیا تو لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ وہ خانہ کعبہ کو برباد کرنا چاہتا ہے مگر اس نے ایسا نہ کیا بلکہ خانہ کعبہ کا حج کیا اور بعض تواریخ میں ہے کہ وہ آنحضرت صلعم سے سات سو یا ہزار سال پہلے ہوا۔ اور ابن مردویہ نے جو ابن عباس کی روایت بیان کی ہے اس میں ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ پر ایمان لاتا تھا۔ (ر) تبع کا ذکر صرف ایک جگہ اور آتا ہے واصحاب الایکۃ وقوم تبع (ق۔ ۱۴) جہاں اس قوم کا ذکر مکذبین رسل میں کیا پس ممکن ہے کہ وہ بھی رسولوں میں سے ہو۔ اور روح المعانی میں ہے کہ ایک اور روایت میں حضرت ابن عباس سے اس کا نبی ہونا بیان کیا گیا ہے گو اس کی صحت ثابت نہیں۔

كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ﴿٤٦﴾ — اُبلتے ہوئے پانی کے کھولنے کی مانند۔

خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ﴿٤٧﴾ — اسے پکڑ لو، پھر اسے دوزخ کے درمیان کھینچ لے جاؤ ٣٠٣٨

ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ ﴿٤٨﴾ — پھر اس کے سر کے اوپر اُبلتے ہوئے پانی کا عذاب ڈالو۔

ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ﴿٤٩﴾ — چکھ، تُو زبردست معزز تھا ٣٠٣٩

إِنَّ هَٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ ﴿٥٠﴾ — یہ وہ ہے جس پر تم جھگڑتے تھے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ ﴿٥١﴾ — متقی امن کی جگہ میں ہوں گے۔

فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿٥٢﴾ — (یعنی) باغوں اور چشموں میں۔

يَلْبَسُونَ مِنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَقَابِلِينَ ﴿٥٣﴾ — باریک اور موٹا ریشم پہنیں گے، ایک دوسرے کے سامنے (بیٹھیں گے)

كَذَٰلِكَ وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ﴿٥٤﴾ — ایسا ہی ہوگا، اور ہم انھیں خوبصورت حوروں کے ساتھی بنا دینگے ٣٠٤٠

يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ آمِنِينَ ﴿٥٥﴾ — اس میں حالت امن میں ہر قسم کے پھل منگوائیں گے۔

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۖ وَوَقَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿٥٦﴾ — اس میں کوئی موت نہیں چکھیں گے سوائے پہلی موت کے (جو چکھ چکے) اور اس نے انھیں دوزخ کے عذاب سے بچا دیا۔

فَضْلًا مِنْ رَبِّكَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٥٧﴾ — تیرے رب کی طرف سے فضل ہے، یہی بڑی کامیابی ہے۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٨﴾ — سو ہم نے اسے تیری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

ع ٣ ١٧ ١٢ فَارْتَقِبْ إِنَّهُمْ مُرْتَقِبُونَ ﴿٥٩﴾ — پس انتظار کر کہ وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں۔

ع ٣٠٣٨ اِعْتِلوا۔ عَتْل کے معنی ہیں سختی سے کھینچنا یا سختی سے لے جانا جیسے عَتَلْتُهُ الی السجن اور عُتُلّ کے معنی ہیں۔ سخت۔ بدخلق بہت کھانے والا سخت جھگڑالو عتل بعد ذٰلک زنیم (القلم ٦٨-١٣) (ل)

ع ٣٠٣٩ انت العزیز الکریم یا تو یہ مراد ہے کہ تو اپنے آپ کو عزیز کریم کہتا تھا یا سمجھتا تھا حالانکہ فی الواقع ایسا نہ تھا۔ اور یا یہ کہ تو اپنی قوم میں عزیز کریم تھا مگر وہ تیری دنیوی عزت و وجاہت اب کسی کام نہیں آسکتی۔ اور نہ عذاب سے بچا سکتی ہے اور یہاں دوزخ کے عذاب کے ذکر میں بتایا ہے کہ یہ عذاب انسان کے اندر بھی ہوگا اور باہر سے بھی ہوگا ؃

ع ٣٠٤٠ زوجنٰہم۔ زوج بمعنی قرین بھی آتا ہے یعنی ساتھی اور شبیہ بھی الی ما متعنا بہ ازواجاً منہم (طٰہٰ ٢٠-١٣١) جس سے مراد اشباہ و اقران ہیں ایسا ہی احشروا الذین ظلموا وازواجہم (الصّٰفّٰت ٣٧-٢٢) میں مراد اقران ہیں وقولہ و زوجنٰہم بحور عین اے قرنّاھم بِھِنَّ وَلَمْ یجیئی فی القراٰن زَوَّجنٰہم حُورًا کما یقال زَوَّجْتُہٗ امْرَأَةً تنبیھًا علٰی اَنَّ ذٰلک لایکونُ علی حسب المتعارف فیما بیننا من المناکحۃ ..... یعنی یہاں زَوَّجنا سے مراد حور کو ان کا قرین بنا دینا ہے اور قرآن شریف میں کہیں زَوَّجناھم حورا نہیں آیا۔ جس طرح پر زَوَّجْتُہٗ امرأۃ کہہ دیا جاتا ہے یعنی میں نے عورت کو اسکے نکاح میں دے دیا۔

بہشت میں زوج کا تعلق: اور یہ تنبیہ ہے اس بات پر کہ بہشت میں یہ تعلق اس قسم کا نہیں ہوگا جیسا ہمارے درمیان عورت اور مرد کے نکاح میں متعارف ہے (غ) ؃

حور۔ حَوَر اور حوراء کے لیے دیکھو ع ٤٤١ اور حُوْر۔ اَحْوَر اور حَوْرا دونوں کی جمع ہے۔ (غ) اور عِیْن اَعْیَن اور عَیْناء دونوں کی جمع ہے دیکھو ع ٢٧٨٥ اور وہیں یہ بحث بھی مفصل گذر چکی ہے کہ حور نعمائے جنت میں سے ایک نعمت ہے۔ جو مردوں کے لیے بھی ہے اور عورتوں کے لیے بھی اور زوج کی بحث میں امام

سُوْرَةُ الْجَاثِيَةِ مَكِّيَّةٌ (۴۵)

آیاتہا ۳۷ — رکوعاتہا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

حٰمٓ ۝۱

(اللہ تعالیٰ) بے انتہا رحم والا۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۲

کتاب کا اتارنا اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے ہے۔

اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۳

یقیناً آسمانوں اور زمین میں مومنوں کے لیے نشان ہیں۔

وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝۴

اور تمھاری پیدائش میں اور اس میں جو وہ جانوروں سے پھیلاتا رہتا ہے ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو یقین رکھتے ہیں۔

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۵

اور رات اور دن کے اختلاف میں اور اس میں جو اللہ تعالیٰ بادل سے رزق اتارتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے اور ہواؤں کے ہیر پھیر میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں ۳۰۴۱۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶

یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو ہم تجھ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ اور اس کی آیتوں کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے ۳۰۴۲۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝۷

افسوس ہر جھوٹے گنہگار پر۔

يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ

وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو سنتا ہے (جو) اس پر پڑھی جاتی ہیں، پھر تکبر کرتا ہوا اڑ جاتا ہے، گویا کہ انھیں سنا ہی نہیں۔ سو اسے

راغب نے اس بات کو صاف کر دیا ہے کہ حور کیساتھ تزویج مناکحت کے رنگ میں نہیں بلکہ قرین کے رنگ میں ہے اور مزید براں یہ کہ حور اور عین دونوں لفظ مذکر کی جمع بھی ہیں اور مونث کی بھی۔ اور اگرچہ یہ الفاظ ایسے ہیں جو عورتوں کے لیے عام طور پر استعمال ہوتے ہیں مگر مراد اس سے فی الواقع عورتیں نہیں ہو سکتیں جیسا کہ ۲۷۸۵ میں دکھایا جا چکا ہے۔ کیونکہ نعمائے بہشتی میں نام بیشک اس دنیا کے ہیں گو ان چیزوں کی اصل حقیقت وہ نہیں اور اصل غرض صرف کمال حسن کو ظاہر کرنا ہے جو انسان کے حسن اعمال کا نتیجہ ہے مگر اس عالم میں ایک نیا رنگ اختیار کر لیتا ہے جس کی حقیقت کو ہم اس عالم میں نہیں سمجھ سکتے۔

نام: اس سورت کا نام الجاثیۃ ہے اور اس میں چار رکوع اور ۳۷ آیتیں ہیں۔ اس میں وحی الٰہی کی حقانیت اور جزاو سزا کے حق ہونے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور ان کی صداقت کے انکار پر سزا کا ذکر ہے۔ اور اسی لحاظ سے اس کا یہ نام بھی ہے جس کے معنی ہیں گھٹنوں کے بل بیٹھنے والی (جماعت) یعنی جزاو سزا کے خوف یا اہوال قیامت کی وجہ سے بڑی بڑی جماعتیں خدا کے حضور عاجز ہونگی۔

۳۰۴۱ رزق سے مراد یہاں پانی ہے جو بادل سے برستا ہے۔ اس میں اور اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کی طرف توجہ دلائی ہے ان تمام امور میں یہ نشان ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے اپنی صفت رحمانیت سے یہ سارے سامان پیدا کئے اسی طرح کتاب کا اتارنا بھی صفت رحمانیت کا تقاضا تھا۔

۳۰۴۲ بعد اللہ وایاتہ سے مراد ہے بعد حدیث اللہ وآیاتہ یعنی اللہ کی بات یا قرآن کریم کے بعد اور اس کے نشانات کے بعد جن کی طرف اوپر توجہ دلائی گئی ہے۔

بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۸﴾

دردناک عذاب کی خبر دے ۳۰۴۲ا

وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئَاۨ اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ؕ﴿۹﴾

اور جب ہماری آیتوں سے کسی کا علم اسے ہوتا ہے۔ تو اس پر ہنسی کرتا ہے، یہی ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ؕ﴿۱۰﴾

ان کے آگے دوزخ ہے اور جو کچھ انھوں نے کمایا ان کے کسی بھی کام نہ آئے گا اور نہ وہ جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سوائے حمایتی بنائے ہیں، ان کے لیے بھاری عذاب ہے۔

هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾ ع

یہ ہدایت ہے اور جو لوگ اپنے رب کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں، ان کے لیے شدید قسم کا دردناک عذاب ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۚ﴿۱۲﴾

اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے سمندر تمھارے کام میں لگایا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے (فضل سے) تمھارے کام پر لگایا، اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں ۳۰۴۳

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

انھیں کہہ دے جو ایمان لائے ہیں کہ ان سے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے) دنوں کی امید نہیں رکھتے درگزر کریں تاکہ وہ ایک قوم کو اس کے مطابق بدلہ دے جو وہ کماتے ہیں ۳۰۴۴

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾

جو کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اپنی جان (کی بھلائی) کے لیے ہے اور جو بُرا کرتا ہے تو اسی پر (اس کا نقصان) ہے پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۚ﴿۱۶﴾

اور یقیناً ہمیں نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی اور انھیں ستھری چیزوں سے رزق دیا اور انھیں قوموں پر فضیلت دی۔

۳۰۴۲ا الیم۔ اَلَم وجع شدید یا سخت درد کو کہا جاتا ہے اَلِمَ یَالَمُ۔ فانہم یالمون کما تالمون (النساء ۴-۱۰۴) اور الیم بمعنی مُولِم ہے یعنی درد دینے والا (غ)

۳۰۴۳ منہ میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے۔ یعنی ان سب چیزوں کا مسخر کر کے انسان کے کام میں لگا دینا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

۳۰۴۴ مومنوں کا کفار کو معاف کرنا حکم قتال سے منسوخ نہیں: ایام اللہ کے لیے دیکھو ۵۲۴ یہاں یرجون ساتھ لا کر جس کا اقتضا خوش کرنے والی بات ہے بتا دیا کہ ان الفاظ سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے دن ہیں اور مطلب یہ ہے کہ کافر یہ توقع نہیں رکھتے کہ نیکی کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی انعام ملتا ہے اس لیے نیکی کرنے والوں کو دکھ بھی دیتے ہیں۔ پس مومنوں کو حکم دیا کہ ان تکالیف پر ان کو معاف کرتے رہیں۔ اس قسم کی تکلیف اذن قتال سے منسوخ نہیں کیونکہ اذن قتال کفار کے پہلے جنگ کرنے پر ہے اور جنگ کو چھوڑ کر بہتیری تکلیفیں پہنچائی جاتی تھیں۔ مکہ میں جنگ نہ تھی مگر یہ تکالیف بے انتہا تھیں۔ ان سب پر معافی کا حکم ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان سورتوں کا نزول تکالیف کے زمانہ کا ہے۔

وَ اٰتَیْنٰهُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۷﴾

اور ہم نے انھیں اس معاملہ کے متعلق کھلی دلیلیں دیں سو انھوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آگیا۔ آپس کے حسد کی وجہ سے۔ تیرا رب ان کے درمیان قیامت کے دن ان باتوں میں فیصلہ کریگا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں ۳۰۴۵

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾

پھر ہم نے تجھے اس معاملہ میں ایک کھلے رستہ پر لگا دیا سو اس کی پیروی کر اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر جو علم نہیں رکھتے ۳۰۴۶

اِنَّهُمْ لَنْ یُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ۚ وَ اللّٰهُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۹﴾

وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تیرے کچھ بھی کام نہ آئیں گے اور ظالم ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور اللہ تعالیٰ متقیوں کا مددگار ہے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًی وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

یہ لوگوں کے لیے روشن دلیلیں ہیں اور ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو یقین کرتے ہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ؕ
ع ۲ / ۱۸ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾

آیا وہ لوگ جو بدیاں کماتے ہیں گمان کرتے ہیں کہ ہم انھیں ان کی طرح کر دیں گے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں (یعنی) ان کا جینا اور ان کا مرنا برابر ہے۔ برا ہے جو یہ فیصلہ کرتے ہیں ۳۰۴۷

وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور تاکہ ہر جان کو اس کے مطابق بدلہ دیا جائے جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ

تو کیا تو نے دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنایا اور اللہ تعالیٰ نے اسے (اپنے) علم کی بنا پر گمراہ ٹھیرایا اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا۔ پس

۳۰۴۵ الامر سے مراد یہاں بعض نے دین لیکر بینات من الامر سے مراد حضرت موسیٰ کے معجزات لیے ہیں مگر اس کا یہاں کوئی موقعہ نہیں اور ابن عباس نے مراد امر النبی صلعم لیا ہے یعنی آنحضرت کے دنیا میں ظاہر ہونے کا معاملہ (ر) تو اس صورت میں بینات من الامر سے مراد آنحضرت صلعم کے ظہور کے متعلق کھلی دلیلیں ہونگی۔ یعنی وہ پیشگوئیاں اور نشانات جو بنی اسرائیل کی کتاب میں موجود تھے اور یہاں اختلاف سے مراد بھی آنحضرت صلعم سے اختلاف مراد ہے اور اگلی آیت میں الامر کا لفظ آنحضرت صلعم کے متعلق لاکر صاف بتا دیا کہ یہی مراد ہے۔

۳۰۴۶ شریعۃ کے لیے دیکھو ۸۳۴ اور الامر یا اس معاملہ سے مراد دین ہی ہے۔

۳۰۴۷ یعنی نیکوں اور بدوں کی زندگی اور موت کا یکساں ہونا گمان باطل ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس زندگی میں بھی نیکی کرنے والے بدوں پر ممتاز ہو جاتے ہیں۔

فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾

اللہ کے بعد کون اسے ہدایت دے سکتا ہے، تو کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے ۳۰۴۸

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾

اور کہتے ہیں یہ کچھ نہیں مگر ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ ہم مرتے ہیں اور ہم جیتے ہیں اور سوائے زمانہ کے ہمیں کوئی ہلاک نہیں کرتا اور انھیں اس کا کچھ علم نہیں، وہ صرف ظن سے کام لیتے ہیں ۳۰۴۹

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾

اور جب ان پر ہماری کھلی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کی دلیل اور کچھ نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں ہمارے باپ داداؤں کو لے آؤ اگر تم سچے ہو۔

قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ
ع ۳ ۱۹ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

کہہ اللہ ہی تمھیں زندہ کرتا ہے پھر وہی تمھیں مارے گا، پھر وہ تمھیں قیامت کے دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۳۰۵۰

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور اللہ کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور جس وقت (موعودہ) گھڑی قائم ہوگی اس وقت (حق کو) باطل قرار دینے والے گھاٹے میں ہوں گے

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور تو ہر ایک امت کو گھٹنوں کے بل دیکھے گا ہر ایک امت اپنی کتاب کی طرف بلائی جائے گی۔ آج تمھیں وہی بدلہ دیا جائے گا جو تم عمل کرتے تھے ۳۰۵۱

ع ۳۰۴۸ یہاں اصل ذکر تو کفار کا ہی ہے۔ اور انہیں کے متعلق فرمایا کہ انہوں نے اپنے حرص و ہوا کو معبود بنا رکھا ہے مگر اصل غرض مسلمانوں کو سمجھانا ہے کہ اپنی خواہشات کے پیچھے لگے رہنا یہ بھی شرک ہے۔ گو بہت سے لوگ اس شرک خفی کو دیکھ نہ سکتے ہوں۔ بلکہ یہ شرک ایسا خطرناک ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے متعلق فرماتا ہے اضله الله علے علم ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہ شدہ قرار دیتا ہے۔ جو بجائے احکام خدا کی پیروی کے اپنی خواہشات کی پیروی میں لگ جاتا ہے اور اس کے دل وغیرہ پر مہر لگا دیتا ہے۔ آج گو مسلمان بت پرستی سے بچے ہوئے ہوں مگر یہ شرک خفی یا اپنے حرص و ہوا کا اتباع ان میں بھی پایا جاتا ہے ۞

ع ۳۰۴۹ الدھر۔ دَھْر اصل میں عالم کی کل مدت ہے اس کے ابتدائے وجود سے لے کر اس کے خاتمہ تک هل اتى على الانسان حين من الدهر (الدھر ۷۶-۱) پھر ہر لمبی مدت پر بولا جاتا ہے اور زمان تھوڑی اور لمبی مدت دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اور کسی شخص کا دہر اس کی مدت حیات ہے اور جو بات زندگی بھر باقی رہے اسے بھی دھر کہہ دیتے ہیں۔ اور آنحضرت صلعم کی حدیث میں ہے لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ تو اللہ کے دہر ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ خیر و شر جو لوگ زمانہ کی طرف منسوب کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور یہاں مراد زمانہ ہی ہے (غ) ۞

تناسخ: نموت و نحیا میں مفسرین نے بہت سی توجیہات کی ہیں بعض مرجاتے ہیں بعض جیتے ہیں۔ یا ایک نسل مرجاتی ہے تو اسکی جگہ دوسری نسل لے لیتی ہے۔ یا نموت میں حالت عدم کی طرف اشارہ ہے۔ اور ایک مراد یہ بھی لی گئی ہے کہ اس سے اشارہ تناسخ کی طرف ہے۔ یعنی ایک جسم پر موت آتی ہے تو کسی دوسرے جسم میں زندہ ہو جاتے ہیں۔ (ر) اور دہر کے ہلاک کرنے سے یہ مراد ہے کہ جس طرح ہر چیز ایک مدت کے بعد ہلاک ہو جاتی ہے اور اس کا کچھ نشان نہیں رہتا یہی ہماری حالت ہے ۞

ع ۳۰۵۰ الی بمعنی فی بھی ہو سکتا ہے یعنی قیامت کے دن جمع کرے گا۔ اور اصل معنی لے کر انتہا بھی مراد ہو سکتی ہے۔

ع ۳۰۵۱ گھٹنوں کے بل بیٹھا ہونے میں اشارہ اس دن کے شدائد کی طرف ہے۔ اور یہ حالت اس شخص کی ہے جو حساب کتاب کے انتظار میں خائف ہے اور

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

یہ ہماری کتاب تمھارے بارے میں حق کے ساتھ بولتی ہے ہم لکھ لیتے تھے، جو کچھ تم عمل کرتے تھے ۳۰۵۲ع

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۰﴾

سو وہ لوگ جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں، تو انھیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یہ کھلی کامیابی ہے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۟ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

اور جو کافر ہیں (انھیں کہا جائے گا) کیا میری آیتیں تم پر پڑھی نہ جاتی تھیں۔ پھر تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے۔

وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿۳۲﴾

اور جب کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ سچ ہے اور (موعودہ) گھڑی میں کچھ شک نہیں، تم کہتے ہم نہیں جانتے وہ گھڑی کیا ہے ہم کو ایک خیال سا آتا ہے اور ہمیں یقین نہیں ۳۰۵۳ع

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور ان کے لیے ان کی بُرائیاں ظاہر ہوگئیں جو وہ عمل کرتے تھے۔ اور انھیں اس چیز نے آلیا جس پر وہ ہنسی کرتے تھے۔

وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور کہا جائے گا آج ہم تمھاری پروا نہیں کرتے جس طرح تم نے ہمارے اس دن کی ملاقات کی پروا نہ کی اور تمھارا ٹھکانا آگ ہے اور تمھارے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۳۵﴾

یہ اس لیے کہ تم نے اللہ کی آیتوں کو ہنسی بنایا اور تمھیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا، سو آج وہ اس سے باہر نہیں نکالے جائیں گے اور نہ انھیں گناہ بخشوانے کا موقع دیا جائے گا۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۶﴾

پس اللہ ہی کے لیے سب تعریف ہے (جو) آسمانوں کا رب اور زمین کا رب، سب جہانوں کا رب ہے۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۪ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾ ع ۱۱

اور اسی کے لیے آسمانوں اور زمین میں بڑائی ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

امت کا لفظ لانے میں شاید یہ اشارہ ہے کہ ہر نبی کی امت کا حساب اسی تعلیم کے لحاظ سے ہوگا جو اس نبی کی وساطت سے دی گئی پھر ہر امت میں سے نیک بد الگ ہو جائیں گے۔

۳۰۵۲ع نامۂ اعمال کی گویائی: یہاں سے معلوم ہوا کہ نامۂ اعمال کو گویائی دی جائیگی (اور کہیں ہے کہ اس کا وزن کیا جائیگا اور کہیں ہے اقرء کتبك) تو گویا بغیر پڑھنے کے ہی وہ بتا دے گا۔ کہ کیا عمل ہیں اس قسم کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ یہ سب کچھ وہاں حال سے ہوگا نہ قال سے نیز دیکھو ۲۴۵۷ع ؛

۳۰۵۳ع مستیقنین۔ اَیْقَنَ اور اِسْتَیْقَنَ کے ایک ہی معنی ہیں دیکھو ۱۵۰ع و فی الارض اٰیات للموقنین (الذّٰریٰت ۵۱-۲۰) اور مَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا (النساء ۴-۱۵۷) میں معنی ہیں مَا قَتَلُوْهُ قَتْلًا تَیَقَّنُوْهُ بل انما حکموا تخمینًا و وهمًا (غ) اسے ایسا قتل نہیں کیا جس پر انہیں یقین ہو گیا ہو کہ قتل ہو گیا بلکہ اٹکل سے اور خیال سے حکم لگا دیا (کہ قتل ہو گیا ہوگا)؛

اٰیَاتُهَا ٣٥ (٤٦) سُوْرَةُ الْاَحْقَافِ مَکِّیَّةٌ رُکُوْعَاتُهَا ٤

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○
حٰمٓ ۚ ①

اللہ تعہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
(اللہ تعالیٰ) بے انتہا رحم والا۔

تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ②

کتاب کا اُتارنا اللہ تعہ غالب حکمت والے کی طرف سے ہے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا
بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَ
الَّذِیْنَ کَفَرُوْا عَمَّاۤ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ③

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے حق کے ساتھ اور ایک وقتِ مقرر کے لیے ہی پیدا کیا ہے اور جو کافر ہیں جس سے انھیں ڈرایا جاتا ہے اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ
اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ ؕ اِیْتُوْنِیْ
بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ
عِلْمٍ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ④

کہہ، کیا تم نے دیکھا وہ جنھیں تم اللہ تعہ کے سوائے پکارتے ہو، مجھے بتاؤ کون سی چیز انھوں نے زمین سے پیدا کی ہے یا اُن کی آسمانوں میں شراکت ہے۔ میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ یا علم کا کوئی نشان (لاؤ) اگر تم سچے ہو ٣٠٥٤

وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰى یَوْمِ
الْقِیٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ⑤

اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ تعہ کے سوائے اسے پکارتا ہے، جو قیامت کے دن تک اُسے جواب نہیں دے سکتا اور وہ اُن کے پکارنے سے بے خبر ہیں۔

وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً
وَّ کَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ کٰفِرِیْنَ ⑥

اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت کا انکار کرنے والے ہوں گے ٣٠٥٥

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ
الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا
سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ؕ ⑦

اور جب اُن پر ہماری کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو جو کافر ہیں حق کے متعلق کہتے ہیں جب وہ ان کے پاس آچکا، یہ کھلا جادو ہے۔

نام: اس سورت کا نام الاحقاف ہے اور اس میں چار رکوع اور ٣٥ آیتیں ہیں۔ الاحقاف کے معنی ریت کے ٹیلے یا تودے ہیں اور غرض اس سورت کی انجام مخالفت کی طرف توجہ دلانا ہے جس کے لیے تیسرے رکوع میں قوم عاد کی مثال بیان کی ہے۔ جو بڑی زبردست قوم تھی۔ اور یوں بتایا ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اپنی طاقت پر بھروسہ کر کے حق سے روگردانی نہ کرے اللہ تعالیٰ کی زبردست طاقت کے سامنے سب طاقتیں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ پہلے دو رکوعوں میں صداقت وحی کا ذکر ہے اور پچھلے دو میں وحی کی مخالفت کے انجام کا۔

ع ٣٠٥٤ اَثارة۔ اَثر کسی چیز کا بقیہ ہے اور اس کی جمع آثار ہے اور یہاں اَثَارة ہے جس کے معنی زجاج نے علامت کیے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس کے معنی بقیہ علم ہوں یا علم کی بات جو لکھی جائے۔ (ل) دیکھو ع ١٥٨٣ ؎

ع ٣٠٥٥ ظاہر ہے کہ یہاں انہیں معبودوں کا ذکر ہے جو انسانوں میں سے بنا لیے گئے ہیں:

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ ۖ كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝٨

بلکہ کہتے ہیں اس نے جھوٹ بنا لیا ہے۔ کہہ اگر مَیں نے یہ جھوٹ بنایا ہے تو تم میرے لیے اللہ تعالیٰ کے مقابل پر کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے جن باتوں میں تم لگے رہتے ہو، وہ انھیں خوب جانتا ہے، وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہ بس ہے اور وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝٩

کہہ، مَیں کوئی نیا رسول نہیں ہوں اور مَیں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائیگا اور نہ (یہ کہ) تمھارے ساتھ (کیا کیا جائے گا)[۳۰۵۶] مَیں اسی پر چلتا ہوں جو میری طرف وحی ہوتی ہے اور مَیں صرف کھلا ڈرانے والا ہوں۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ فَآمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝١٠ ع

کہہ، کیا تم دیکھتے ہو اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو، اور تم اس کا انکار کرتے ہو اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے اپنے مثیل (کے آنے) کی گواہی دی تھی، سو اُس نے تو مانا اور تم تکبّر کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا[۳۰۵۷]

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَا سَبَقُونَا إِلَيْهِ ۚ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا

اور جو کافر ہیں وہ ان کے بارے میں جو مومن ہیں کہتے ہیں اگر یہ بہتر ہوتا تو وہ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ لیجاتے اور چونکہ وہ اس سے ہدایت یاب نہ ہوئے تو کہیں گے

۳۰۵۶ بدعا۔ بَدِیع اور بِدْع کسی چیز کا اس کے پہلے کو کہتے ہیں۔ اور ماکنت بدعًا من الرسل سے مراد ہے کہ میں پہلا رسول نہیں ہوں جو بھیجا گیا ہوں مجھ سے پہلے بھی رسول آچکے ہیں۔ (ل) اور بِدْع کے معنی مُبْدَع بھی ہو سکتے ہیں یعنی جس سے پہلے کوئی نہ آیا ہو اور مبدِع بھی یعنی بدعت کے طور پر کچھ کہنے والا (غ)۔

ما ادری مایفعل بی ولا بکم حسن سے روایت ہے کہ اس سے مراد آخرت نہیں یعنی یہ مطلب نہیں کہ مجھے علم نہیں۔ کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا مجھ سے یا تم سے کیا معاملہ ہوگا بلکہ دنیا کا معاملہ مراد ہے یعنی آیا میں بھی نکالا جاؤں گا جس طرح مجھ سے پہلے نبی نکالے گئے۔ یا قتل کیا جاؤں گا جس طرح مجھ سے پہلے نبی قتل کیے گئے (ج) اور سیاق عبارت اسی کو صحیح ٹھہراتا ہے۔ یعنی جس طرح پہلے رسول عالم الغیب نہ تھے میں بھی نہیں نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ تم میرے ساتھ کیا معاملہ کروگے۔ اور نہ یہ کہ اللہ تمہارے ساتھ کیا معاملہ کریگا یعنی معاف کر دیگا یا سزا دے گا یا کتنی سزا دیگا مگر یہاں علم نہ ہونے سے مراد تفصیلات کا علم نہ ہونا ہے اور نذیر مبین کہکر بتادیا کہ تم بدی کے بدنتائج کو ضرور بھگتو گے۔

۳۰۵۷ حضرت موسیٰ کی شہادت آنحضرت صلعم کے لیے: یہ شاہد کون ہے؟ جمہور مفسرین نے اسے عبداللہ بن سلام کہا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں مسروق سے روایت ہے کہ یہ عبداللہ بن سلام کے بارے میں نہیں کیونکہ یہ سورت مکّہ میں نازل ہوئی اور عبداللہ بن سلام مدینہ میں اسلام لائے..... آپ نے فرمایا کہ توریت قرآن کی مثل ہے اور موسیٰ مثیل آنحضرت صلعم ہیں اور یہ شاہد موسیٰ ہیں (ج) اور یہاں فی الحقیقت اشارہ اس موسیٰ کی مثل نبی والی پیشگوئی کی طرف ہے جو استثنا ۱۸: ۱۵-۱۸ میں پائی جاتی ہے" میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا" تو اس پیشگوئی کی طرف توجہ دلا کر کفار پر اتمام حجت کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ افترا نہیں ہو سکتا۔ جیسا تم کہتے ہو کیونکہ یہ حضرت موسیٰ کی پیشگوئی کے مطابق ہے اگلے رکوع میں اس مضمون کو کھول کر بیان کیا ہے۔

اِفۡكٌ قَدِيۡمٌ ⑪

یہ پُرانا جھوٹ ہے ع۳۰۵۸

وَمِنۡ قَبۡلِهٖ كِتٰبُ مُوۡسٰٓى اِمَامًا وَّ رَحۡمَةً ‌ؕ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنۡذِرَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ‌ۖ وَبُشۡرٰى لِلۡمُحۡسِنِيۡنَ ‌ۚ⑫

اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب راہ نما اور رحمت (تھی) اور یہ کتاب (اسے) سچ کر دکھانے والی ہے عربی زبان (میں) تاکہ وہ انھیں ڈرائے جو ظالم ہیں اور نیکی کرنے والوں کے لیے خوشخبری ہے ع۳۰۵۹

اِنَّ الَّذِيۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ‌ۚ⑬

وہ لوگ جو کہتے ہیں اللہ ہمارا رب ہے پھر سیدھی راہ پر جمے رہتے ہیں تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ع۳۰۶۰

اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَـنَّةِ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ‌ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ⑭

یہی جنّت والے ہیں، اسی میں رہیں گے۔ یہ اس کا بدلہ ہے جو وہ عمل کرتے ہیں۔

وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسٰنَ بِوَالِدَيۡهِ اِحۡسٰنًا ‌ؕ حَمَلَـتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّوَضَعَتۡهُ كُرۡهًا ‌ؕ وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ‌ؕ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوۡزِعۡنِىۡۤ اَنۡ اَشۡكُرَ نِعۡمَتَكَ الَّتِىۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَىَّ وَعَلٰى وَالِدَىَّ وَاَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰٮهُ وَاَصۡلِحۡ لِىۡ فِىۡ ذُرِّيَّتِىۡ ‌ۚ اِنِّىۡ تُبۡتُ اِلَيۡكَ وَاِنِّىۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ⑮

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں نے اسے تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور اسے تکلیف سے جنا اور اس کا حمل میں رکھنا اور اس کا دودھ چھڑانا تیس مہینے (تک) ہے یہاں تک کہ جب اپنی قوت کو پہنچتا ہے اور چالیس سال کو پہنچتا ہے کہتا ہے میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیری نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھے اور میرے ماں باپ کو دی اور کہ میں نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو اور میرے لیے میری اولاد کی اصلاح کر، میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں ع۳۰۶۱

ع۳۰۵۸ لو کان خیرا یعنی قرآن کوئی اچھی چیز ہوتی تو یہ غرباء اور ضعفاء جیسے بعض غلام اور لونڈیاں تھیں ہم سے جو بڑے بڑے لوگ ہیں سبقت نہ لے جاتے۔ افک قدیم کہنے سے یہ منشا ہے کہ پہلے بھی لوگ اسی طرح جھوٹ بناتے رہے ہیں ؂

ع۳۰۵۹ قبلہ میں ضمیر قرآن کی طرف ہے۔ اور اماماً ورحمۃ اسی سے حال ہے اور بعض کے نزدیک یہ کتاب سے حال ہے۔ صورت اول میں امام اور رحمۃ قرآن کریم کو کہا ہے۔ اور صورت ثانی میں توریت کو بنی اسرائیل کے لیے امام اور رحمت بیان فرمایا ہے۔ اور وہ اس لحاظ سے بھی امام اور رحمت ہے کہ آنحضرت صلعم کی پیشگوئی اس میں بالتصریح موجود ہے۔ اور یہاں بالخصوص اسی کی طرف اشارہ بھی ہے۔ کیونکہ آگے قرآن کریم کو مصدق کہا ہے اور لسانا عربیا میں اشارہ وضاحت بیان کی طرف بھی ہے۔ اور پیشگوئی کی طرف بھی جس کی رو سے بنی اسمٰعیل یا عرب میں سے نبی کا آنا ضروری تھا دیکھو ع۱۵۱۶ا ؂

ع۳۰۶۰ ایمان کی رو سے توحید پر قائم ہیں۔ اور منتہائے عمل استقامت ہے استقامۃ کے لیے دیکھو ع۱۵۰۹ ؂

ع۳۰۶۱ حمل اور فصال یعنی دودھ چھڑانے کی کل مدت تیس ماہ ہے اور دودھ پلانے کا زمانہ دو سال ہے والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین (البقرۃ ۲۔۲۳۳) باقی چھ ماہ حمل کے رہ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ بھی دی گئی ہے کہ اقل مدت حمل چھ ماہ ہے لیکن اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ یہاں حمل میں مشقت کا ذکر ہے اور مشقت کا رنگ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب بچّے کا بوجھ پیٹ میں محسوس ہو اور یہ چوتھے مہینے میں ہی ہوتا ہے۔

انبیاء کی عمر بوقت بعثت: بلغ اشدہ و بلغ اربعین سنۃ۔ اَشُد اور اربعین سنۃ کو بعض نے الگ الگ لیا ہے یعنی ایک سے مراد بلوغ جسمانی یا وہ بلوغ

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَن سَيِّـَٔاتِهِمْ فِىٓ أَصْحَٰبِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِى كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿۱۶﴾	یہی وہ ہیں جن سے ہم ان کے بہترین عمل قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کرتے ہیں، جنت والوں میں (شامل کرکے) سچا وعدہ ہے، جو انھیں دیا جاتا ہے ۳۰۶۱ء
وَالَّذِى قَالَ لِوَٰلِدَيْهِ أُفٍّ لَّكُمَآ أَتَعِدَانِنِىٓ أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُونُ مِن قَبْلِى ۚ وَهُمَا يَسْتَغِيثَانِ اللَّهَ وَيْلَكَ ءَامِنْ ۚ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۚ فَيَقُولُ مَا هَٰذَآ إِلَّآ أَسَٰطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۷﴾	اور وہ جو اپنے ماں باپ کو کہتا ہے تف ہے تم پر کیا تم مجھے ڈراتے ہو کہ میں نکال کھڑا کیا جاؤنگا اور مجھ سے پہلے (بہتیری) نسلیں گزر چکی ہیں اور وہ دونوں اللہ سے فریاد کرتے (ہوئے کہتے) ہیں، تجھ پر افسوس ایمان لا، اللہ کا وعدہ سچّا ہے تو وہ کہتا ہے یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں
أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِىٓ أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا خَٰسِرِينَ ﴿۱۸﴾	یہی وہ ہیں جن پر بات صادق آئی، ان گروہوں میں سے جو جنّوں اور انسانوں سے ان سے پہلے گزر چکے۔ وہ نقصان اٹھانے والے تھے۔
وَلِكُلٍّ دَرَجَٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوا ۖ وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَٰلَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۹﴾	اور ہر ایک کے لیے اس کے مطابق درجے ہیں جو انھوں نے عمل کیے اور تاکہ ان کے اعمال (کے اجر) وہ انھیں پورے پورے دے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائیگا۔
وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَٰتِكُمْ فِى حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُم بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِى الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنتُمْ تَفْسُقُونَ ﴿۲۰﴾ ع	اور جس دن کافر آگ پر پیش کیے جائیں گے، تم اپنی اچھی چیزوں کو دنیا کی زندگی میں لے چکے اور ان سے چندروزہ فائدہ اٹھالیا ـــــ سو آج تمھیں ذلّت کا عذاب بدلے میں دیا جائے گا، اس لیے کہ تم زمین میں ناحق تکبّر کرتے تھے، اور اس لیے کہ تم نافرمانی کرتے تھے ۳۰۶۲ء

جو قوائے جسمانی کے کمال نشو و نما سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرے سے بلوغ روحانی یعنی وہ بلوغ جو اخلاق کے کمال نشو و نما سے تعلق رکھتا ہے اور بعض نے ایک ہی۔ اَشُدّ کے لیے دیکھو ۱۵۲۹ اور بلوغ روحانی چالیس سال پر ہی ہے۔ اور اسی عمر میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوتی ہے اور یہ سب انبیاء کے متعلق مسلم ہے۔ سوائے اس کے کہ بعض لوگوں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے اور کہا ہے۔ کہ ان دونوں کو بچپن میں نبوت عطا ہوئی۔ مگر بچپن میں نبوت کا ملنا بے معنی ہے اس لیے حضرت عیسیٰ کے متعلق اٰتانی الکتاب اور حضرت یحییٰ کے متعلق اٰتینٰہ الحکم صبیًّا کی توجیہ یوں کی گئی ہے کہ یہ اس بات کی خبر ہے جو ابھی واقع ہونے والی تھی (ر) اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ۳۰ سال کی عمر میں مانی ہے مگر یہ لوگ تاریخ کے بہت کچے ہیں۔ خود اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ جو پیدائش مسیح کا سال (اناجیل میں دیا گیا ہے اس سے پانچ چھ سال پہلے آپکی پیدائش ہوئی بعثت انبیاء چالیس سال پر ہی صحیح ہے اور آیت کا مضمون عام ہے۔

۳۰۶۱ء نتجاوز۔ جوز الطریق رستے کا وسط ہے اور جاوَزَ اس کے جوز سے آگے نکل گیا فلما جاوزہ (البقرۃ ۲ - ۲۴۹) (غ)

۳۰۶۲ء طیبٰت اذہاب یا لے جانے سے مراد عموماً یہ لی گئی ہے کہ اچھے اچھے سامانوں یا لذات کو تم نے دنیا کی زندگی میں پورا پورا لے لیا۔ اور آخرت کے لیے کوئی

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖۤ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۲۱﴾

عاد کے بھائی (ہود) کا ذکر کر، جب اس نے اپنی قوم کو احقاف میں ڈرایا، اور ڈرانے والے اس سے پہلے بھی آئے اور اس کے پیچھے بھی، کہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کرو، مَیں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب (کے آنے) سے ڈرتا ہوں ۳۰۶۳

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۲﴾

انھوں نے کہا، کیا تو ہمارے پاس آیا ہے کہ ہمیں اپنے معبودوں سے پھیر دے، سو لے آ جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر تو سچا ہے۔

قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ٘ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

اس نے کہا، (اس کا) علم تو صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اور مَیں تمھیں وہی پہنچاتا ہوں جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے لیکن میں ایسے لوگ دیکھتا ہوں جو جہالت کرتے ہیں۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۴﴾

پھر جب اسے ایک بادل (کے رنگ میں) دیکھا جو اُن کی وادیوں کی طرف بڑھ رہا تھا، کہنے لگے یہ بادل ہم پر مینہ برسانے والا ہے، بلکہ یہ وہ ہے جس کے لیے تم جلدی کرتے تھے ہوا ہے جس میں دردناک عذاب ہے ۳۰۶۴

تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ

اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کرتی ہے، سو وہ ایسے ہو گئے کہ سوائے ان کے مکانوں کے کچھ نظر نہیں

حصہ ان کا باقی نہ چھوڑا۔ اور گویہ سچ ہے کہ لذات دنیوی میں انہماک انسان کے لیے حصہ آخرت کو باقی نہیں رہنے دیتا اور یہ بھی سچ ہے کہ صلحاء کی زندگی میں نمونہ یہی پایا جاتا ہے کہ وہ دنیوی لذات کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور سادہ غذا سادہ لباس سادہ مکان پر ہی گذارہ کرتے ہیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ بالخصوص اس زمانہ میں جب چاروں طرف لذات دنیوی کے لیے ایک جنون سا لوگوں کی طبائع پر غالب آ گیا ہے صلحاء کی سادہ زندگی کی طرف رجوع کرنا اصلاح کی سب سے پہلی ضرورت ہے اور تعجب تو اس قوم پر ہے جو حضرت عیسیٰؑ کو خدا بناتی ہوئی اور ان کی زندگی میں ایک کراس اور مصیبت کی برداشت کا ہی سب سے بڑا سبق بتاتی ہوئی خود ہر طرح کی لذات اور عیش و آرام کے سامانوں کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہے۔ لیکن یہاں طیبات کے اذہاب یا ضائع کرنے سے مراد ان قویٰ کا ضائع کر دینا جو انسان کے لیے طیبات کو بطور نتیجہ پیدا کرتے ہیں زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں اذہاب اور استمتاع دو الگ الگ فعل ہیں اور لذات دنیوی میں پڑ جانا استمتاع کا مفہوم ہے کیونکہ اس طرح انسان چند روز فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو طیبات سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیتا ہے۔ اور اس محرومی کی طرف ہی اذہاب طیبات میں اشارہ ہے استمتاع کے لیے دیکھو ۲۴۳۷ دنیا کی زندگی کتنی بھی لمبی ہو بمقابلہ آخرت کے چند روزہ ہے۔

۳۰۶۳ احقاف۔ حِقف کی جمع ہے تو وہ ریگ یا ریت جو مستطیل شکل میں اونچی ہو گئی ہو (ل) جس میں ٹیڑھا پن پیدا ہو جائے اور یہ علاقہ یمن میں عمان اور حضرموت کے درمیان ہے جہاں قوم عاد کے لوگ رہتے تھے۔ اور پہلے پیچھے ڈرانے والوں کے آنے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عام قانون ارسال رسل کی طرف توجہ دلائی ہے یا یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ خاص اس قوم میں ہود سے پہلے بھی رسول آئے اور پیچھے بھی جس سے معلوم ہوا کہ اس قوم کا کچھ بقایا رہ بھی گیا تھا۔

۳۰۶۴ عارض وہ چیز جو اپنے عرض یعنی فراخی کو ظاہر کرے۔ بعض وقت بادل پر بولا جاتا ہے جیسے یہاں اور بعض وقت اس پر جو بیماری سے سامنے آ جائے اور بعض وقت رخسار پر (غ)۔

مستقبل۔ اقبال اور استقبال کے ایک ہی معنی ہیں سامنے کی طرف متوجہ ہونا (غ)۔

نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۲۵﴾ وَلَقَدْ مَکَّنّٰھُمْ فِیْمَآ اِنْ مَّکَّنّٰکُمْ فِیْہِ وَجَعَلْنَا لَھُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَۃً ۫ۖ فَمَآ اَغْنٰی عَنْھُمْ سَمْعُھُمْ وَلَآ اَبْصَارُھُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُھُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ کَانُوْا یَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَحَاقَ بِھِمْ مَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ ﴿۲۶﴾ ع

آتا تھا، اسی طرح ہم مجرم قوم کو بدلہ دیتے ہیں۔
اور یقیناً ہم نے انھیں ایسی باتوں میں قدرت دی تھی جن میں تم کو بھی قدرت نہیں دی اور انھیں کان اور آنکھیں اور دل دیئے تھے سو نہ ان کے کان اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل کسی کام آئے، جب کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور انھیں اس نے آلیا جس پر وہ ہنسی کرتے تھے۔

وَلَقَدْ اَھْلَکْنَا مَا حَوْلَکُمْ مِّنَ الْقُرٰی وَصَرَّفْنَا الْاٰیٰتِ لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْلَا نَصَرَھُمُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ قُرْبَانًا اٰلِھَۃً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْھُمْ ۚ وَذٰلِکَ اِفْکُھُمْ وَمَا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور ہم نے تمھارے آس پاس کی کئی بستیاں ہلاک کردیں اور ہم آیتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں تاکہ وہ رجوع کریں ع۳۰۶۵
تو انھوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی جنھیں انھوں نے قرب حاصل کرنے لیے اللہ کے سوائے معبود بنایا تھا، بلکہ وہ ان سے غائب ہوگئے اور یہ ان کا جھوٹ اور افترا کی ہوئی باتیں تھیں۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْکَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْہُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِھِمْ مُّنْذِرِیْنَ ﴿۲۹﴾

اور جب ہم جنّوں کا ایک گروہ تیری طرف لے آئے کہ وہ قرآن کو سنیں سو جب اس پر حاضر ہوئے کہنے لگے چپ رہو۔ سو جب تمام ہُوا، اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر واپس ہوئے ع۳۰۶۶

قَالُوْا یٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا کِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ

کہا اے ہماری قوم! ہم نے ایک کتاب سنی ہے، جو موسیٰؑ کے بعد اتاری گئی، اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس

ع۳۰۶۵ ماحولکم من القریٰ میں عرب کے کنارے کی سب بستیاں آجاتی ہیں جن کی ہلاکت کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے بلکہ اس سے بھی بڑھکر وسعت اس کے معنی میں ہے اور تمام دنیا کی بستیاں جہاں ہلاکت آئی ہو شامل ہوسکتی ہیں۔ اور جو بعض مضامین کو قرآن شریف میں بار بار بیان فرمایا ہے تو اس کی غرض بھی یہاں خود ہی بتادی تاکہ لوگ رجوع کریں انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے اور دنیوی اشغال میں اس کا انہماک اس قدر ہے کہ جس طرح گہری نیند سوئے ہوئے کو جگانے کے لیے ایک دفعہ ہلانا کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ بار بار ہلانے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح غافل لوگوں کی تنبیہ کے لیے بار بار ایک بات کا بیان کرنا ضروری ہوتا ہے اور نیکوں کے لیے بھی یہ بار بار کا دہرانا رجوع الی اللہ میں ترقی کا موجب ہوتا ہے۔

ع۳۰۶۶ جنوں کے وفد کے متعلق روایات مختلف: انصتوا۔ نَصَتَ اور اَنْصَتَ کے معنی ہیں چپ رہا اور بات کو سنا (ل) جنوں کے اس گروہ کے متعلق ذیل کی باتیں روایات میں ملتی ہیں جو تفسیر ابن کثیر سے لی گئی ہیں۔ ۱۔ مسند احمد کی روایت میں زبیر سے مروی ہے کہ یہ نخلہ میں تھا اور رسول اللہ صلعم عشا کی نماز پڑھ رہے تھے اور وہ (بوجہ کثرت تعداد) ٹوٹے پڑتے تھے۔ ۲۔ ابن عباس سے ابن جریر میں روایت ہے کہ وہ سات تھے اور نصیبین کے رہنے والے تھے اور بیہقی میں ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے جنوں پر قرآن نہیں پڑھا نہ انہیں دیکھا آپ اپنے صحابہ کی ایک جماعت کیساتھ سوق عکاظہ کا قصد کرتے ہوئے گئے تھے ادھر شیطانوں کو آسمان کی خبر ملنی رک گئی تھی اور ان پر شہاب پھینکے جانے لگے۔ تو شیاطین لوٹ کر اپنی قوم کی طرف آئے اور کہا کہ آسمان کی خبر ملنی رک گئی ہے

يَدَيۡهِ يَهۡدِيۡۤ اِلَى الۡحَقِّ وَ اِلٰى طَرِيۡقٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۳۰﴾

سے پہلے ہے، وہ حق کی طرف اور سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتی ہے ۳۰۶۷

پس وہ چاروں طرف پھیل گئے کہ سماوی خبروں کے رک جانے کی وجہ معلوم کریں اور جو گروہ تہامہ کی طرف آیا تھا انہوں نے رسول اللہ صلعم کو اپنے صحابہ کے ساتھ نخلہ میں نماز فجر پڑھتے پایا اور جب قرآن کو سنا تو کہا کہ یہی ہے جس کی وجہ سے آسمانی خبر ہم تک پہنچنی رک گئی ہے۔ پھر اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے اور کہا یٰقومنا انا سمعنا قرانا عجبا یھدی الی الرشد اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر اتارا۔ قل اوحی الی انہ استمع نفر من الجن۔ اور یہ بخاری اور مسلم نے بھی روایت کی ہے اور امام احمد نے ابن عباس سے ایک روایت کی ہے۔ کہ جنّ وحی کو سن لیا کرتے تھے اور ایک بات کے ساتھ دس جھوٹ ملا کر آگے مشتہر کیا کرتے تھے۔ جب رسول اللہ صلعم مبعوث ہوئے تو ان پر انگارے پڑنے لگے۔ تو اس کی شکایت انہوں نے ابلیس سے کی تب وہ مختلف اطراف میں اس بات کی تلاش میں نکلے۔ اور حسن بصری نے بھی یہی کہا ہے کہ رسول اللہ صلعم کو ان کے متعلق کوئی علم نہیں ہوا جب تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وحی آپ پر نہیں اتاری۔ ۳۔ محمد بن اسحاق نے محمد بن کعب سے روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلعم طائف تشریف لے گئے تو وہاں سے واپسی پر نخلہ میں رات رہے اور وہاں جنوں نے آپ سے قرآن سنا اور یہ نصیبین کے رہنے والے تھے۔ ۴۔ ابن مسعود سے امام احمد نے روایت کی ہے کہ ہم نے مکہ میں ایک رات رسول اللہ صلعم کو نہ پایا اور ہمیں سخت فکر دامنگیر رہا یہاں تک کہ صبح ہوئی تو آپ حرا کی طرف سے واپس آئے اور فرمایا کہ مجھے جنوں کا بلانے والا بلا کر لے گیا تھا۔ سو میں ان کے پاس گیا اور انہیں قرآن پڑھ کر سنایا پھر آپ ہمارے ساتھ گئے یہاں تک کہ ہمیں ان کے نشان اور ان کی آگ جلانے کے نشان دکھائے اور کسی روایت میں ابن مسعود سے یوں ہے کہ اس رات رسول اللہ صلعم نے صحابہؓ سے فرمایا۔ کہ تم میں سے کون میرے ساتھ جنوں کے پاس جائیگا۔ تو میرے سوائے اور کوئی آپ کے ساتھ نہ گیا۔ پھر جب ہم مکہ کی اوپر کی زمین میں پہنچ گئے تو آپؐ نے میرے لیے ایک نشان لگا دیا اور میں وہاں ٹھہرا رہا۔ اور آپؐ آگے چلے گئے اور قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔ اور ایک سواد کثیر میرے اور آپ کے درمیان حائل ہو گیا یہاں تک کہ میں آپ کی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ اور بیہقی کی ایک روایت میں ابن مسعود سے ہے کہ رسول اللہ صلعم مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور فرمایا کہ جنوں کی ایک جماعت پندرہ کس کی بنی اخوہ اور بنی عمہ سے میرے پاس آج آنے والی ہے۔ اور عکرمہ کی ایک روایت میں ہے کہ وہ جزیرہ موصل کے بارہ ہزار جن تھے اور قتادہ کی ایک روایت میں ہے کہ وہ نینوہ سے آئے تھے! ور عبدالعزیز بن عمر سے ایک روایت میں ہے کہ جو جنّ آپ کو نخلہ میں ملے وہ نینوہ سے تھے اور جو مکہ میں ملے وہ نصیبین سے تھے اور ابن عباس سے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ سات کس اہل نصیبین میں سے تھے پس رسول اللہ صلعم نے انہیں اپنی قوم کی طرف رسول بنایا اور مجاہد کی روایت میں ہے کہ یہ سات تھے جن میں سے تین اہل حران میں سے تھے اور چار نصیبین سے اور ابن مسعود کی ایک روایت میں یہ لفظ بھی ہیں کہ جب رسول اللہ صلعم وہاں سے واپس آئے اور نماز پڑھنے لگے تو ان میں سے بھی دو شخص آئے اور انہوں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی تو ابن مسعود کہتے ہیں میں نے دریافت کیا۔ یا رسول اللہ یہ کون تھے تو آپ نے فرمایا نصیبین کے جنّ۔

جنّ غیر مرئی ہستیاں نہ تھیں: اس اختلاف روایات میں حضرت ابن عباس ان کو ایسی غیر مرئی ہستیاں قرار دیتے ہیں جو شیاطین کہلاتی ہیں۔ اور اس واقعہ کو ابتدائے نبوت کا واقعہ بتاتے ہیں۔ حالانکہ یہ سورتیں بہت بعد کی ہیں۔ پس یہ خیال قابل قبول نہیں اور جہاں تک شیاطین کے استماع وحی کا سوال ہے اس پر میں مفصل بحث ۱۶۷۹ء میں کر چکا ہوں۔ اور حضرت ابن عباس کے مقابل پر زیادہ قابل اعتماد حضرت ابن مسعود کی روایات ہیں کیونکہ وہ اس واقعہ میں آنحضرت صلعم کیساتھ ہونا بیان کرتے ہیں اور ان سب روایات میں جو قدر مشترک کے طور پر بات ہے وہی لی جا سکتی ہے اور وہ صرف اسی قدر ہے کہ یہ ایک نفر یا چند آدمیوں کی جماعت تھی اور رسول اللہ صلعم کو انکے آنے کا علم تھا مگر آپ تنہائی میں اور رات کے وقت ان سے ملے ہیں۔ اور قرآن شریف انہیں پڑھ کر سنایا ہے اور جہاں وہ رات رہے ہیں وہاں اُنکے نشان اور ان کے آگ جلانے کے نشان بھی ان کے چلے جانے کے بعد باقی تھے اور یہ باہر سے آئے تھے اور یہ واقعہ مکہ کا ہے۔ لفظ جنّ پر مفصل بحث ۱۰۱۵ء میں گذر چکی ہے جہاں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ انسانوں پر بھی بولا جاتا تھا اور غیر مرئی ہستیوں پر بھی اور حضرت ابن مسعود نے جو باتیں ان کے متعلق بیان کی ہیں۔ وہ صاف بتاتی ہیں کہ یہ غیر مرئی ہستیاں نہ تھیں وہ کہیں باہر سے آئے تھے یعنی اجنبی لوگ تھے شاید اسی وجہ سے انہیں جنّ کہا ہے اور رسول اللہ صلعم کا اُن سے مکہ سے باہر جا کر تنہائی میں ملاقات کرنا اسی کا مؤید ہے اگر غیر مرئی ہستیاں ہوتیں تو مکہ میں کون امر مانع تھا علیحدگی اور تنہائی کی ضرورت اسی لیے پیش آئی کہ کفار تکلیف نہ دیں پھر ان کے اپنے نشان اور اُن کے آگ جلانے کے نشان بھی انکے چلے جانے کے بعد موجود تھے آگ جلانے کی ضرورت کھانا وغیرہ پکانے کیلئے انسانوں کو ہوتی ہے اور نشان بھی انسانوں کے باقی رہ سکتے ہیں نہ غیر مرئی ہستیوں کے پھر بعض ان میں سے آنحضرت صلعم کے پیچھے نماز بھی پڑھتے ہیں شاید یہ ایسے ہوں جو فوراً ایمان لے آئے ہوں اور باقی ابھی تردد میں ہوں۔ اور انہیں اہل نصیبین یا اہل موصل یا اہل نینوہ قرار دینا بھی صاف بتاتا ہے کہ وہ انسان ہی تھے ورنہ جنوں کی کوئی خاص بستیاں نصیبین یا موصل میں نہیں ہیں۔ وہ تو غیر مرئی ہستیاں ہیں انہیں بستیاں بنا کر رہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اور غالباً یہ نصیبین کے یہودی تھے۔ جیسا کہ انا سمعنا کتابا انزل من بعد موسیٰ سے ظاہر ہے علاوہ ازیں جنّ ان احکام کے مکلف بھی نہیں ہو سکتے جو انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان کیے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ علیحدہ ہستیاں ہیں اور قرآن شریف میں جس قدر احکام ہیں وہ انسانوں کیلئے ہیں جنوں کیلئے ضروری نہیں اگر ان پر بھی اسی طرح قرآن شریف پر ایمان لانا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہوتا جس طرح انسانوں کے لیے ضروری ہے تو کچھ نہ کچھ تفصیلی احکام ضرور ان کے متعلق ہوتے۔ رہا انسانوں کے جنوں کو دیکھنے کا سوال سو وہ اسی رنگ میں دیکھے جا سکتے ہیں جس طرح ملائکہ اور وہ اس قسم کی ہستیاں ہیں کیونکہ وہ نار سے پیدا ہوئے ہیں تو ملائکہ نور سے۔ پس جہاں تک ان کے شکل و صورت کے اختیار کرنے۔ مکلف باحکام ہونے کھانے پینے وغیرہ کا معاملہ ہے انہیں مشابہت ملائکہ سے ہے نہ انسانوں سے۔

۳۰۶۷ء کتابا انزل من بعد موسیٰ۔ حالانکہ بنی اسرائیل میں موسیٰ کے بعد بہت سے نبی آ چکے تھے لیکن چونکہ تفصیلی شریعت حضرت موسیٰ کے بعد کسی نبی پر نازل نہ

يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۱﴾

اے ہماری قوم اللہ کی طرف بلانے والے کو قبول کرو اور اس پر ایمان لاؤ کہ وہ تمھارے قصور تمھیں معاف کر دے اور تمھیں دردناک عذاب سے پناہ دے۔

وَ مَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۲﴾

اور جو کوئی اللہ کی طرف بلانے والے کو قبول نہ کرے گا، تو وہ زمین میں (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والا نہیں اور اس کے لیے اس کے سوائے کوئی مددگار نہ ہونگے یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۳﴾

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے نھکا نہیں وہ اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کرے۔ ہاں وہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۰۶۸

وَ يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور جس دن وہ جو کافر ہیں آگ پر پیش ہوں گے کیا یہ سچ نہیں؟ کہیں گے ہاں ہمارے رب کی قسم، کہے گا، پس عذاب چکھو، اس لیے کہ تم کفر کرتے تھے۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

سو صبر کر، جس طرح اولوالعزم رسول صبر کرتے رہے، اور ان کے لیے جلدی نہ کر۔ جس دن وہ اسے دیکھیں گے جس کا انھیں وعدہ دیا جاتا ہے، گویا دن کی ایک گھڑی ہی ٹھہرے تھے (یہ) پہنچا دینا ہے تو کیا سوائے نافرمان لوگوں کے کوئی اور بھی ہلاک کیا جائے گا ۳۰۶۹

ہوئی تھی اور وہ مثیل کی پیشگوئی بھی جس کی طرف قرآن شریف نے باربار توجہ دلائی تھی کتاب موسیٰ میں ہی تھی اس لیے اسی کا ذکر کیا؛

۳۰۶۸ یعی۔ اِعْیاء وہ عاجزی ہے جو بدن کو چلنے سے پہنچتی ہے اور عیّ وہ عاجزی ہے جو کسی امر کا متولی ہونے اور کلام سے پہنچتی ہے افعیینا بالخلق الاول (ق ۵۰ - ۱۵) (غ)؛ اس بیان میں کہ اللہ تعالیٰ زمین اور آسمان کو پیدا کر کے تھکا نہیں بائیبل کے اس بیان کی غلطی کو ظاہر کیا ہے کہ اس نے چھ دن میں زمین و آسمان بنا کر ساتویں دن آرام کیا؛

۳۰۶۹ اولوالعزم۔ عَزْم دل کا کسی کام کے کر لینے پر مضبوط ہو جانا ہے۔ اور اولوالعزم سے مراد وہ ہیں جنہوں نے اللہ کے امر پر عزم کر لیا اس میں جو اس نے انہیں حکم دیا اور تفسیر میں ہے کہ نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اولوالعزم رسول ہیں اور آنحضرت صلعم بھی ان میں سے ہیں۔ (ل) اور بعض نے اور نام بھی لیے ہیں۔ مگر ابن زید کا قول جو ابن جریر میں منقول ہے صحیح ہے کل الرسل کانوا اولی عزم سب رسول ہی اولوالعزم تھے۔

بلاغ کے معنی دو طرح پر کیے گئے ہیں ذٰلک بلاغ لھم فی الدنیا الی اجلھم یعنی یہی ان کا ٹھہرنا دنیا میں ان کی اجل تک ان کا پہنچا دینا تھا اور دوسرے یہ کہ یہ قرآن ان کے لیے بلاغ ہے یعنی بات کو کمال کو پہنچا دیتا ہے اگر وہ غور و فکر سے کام لیں (ج)

اٰیَاتُهَا ۳۸ (۴۷) سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ مَّدَنِيَّةٌ رُكُوْعَاتُهَا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۱

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
جنھوں نے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ کے رستے سے روکا، ان کے عمل برباد کر دیئے ۳۰۷۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ
الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ
سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝۲

اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے اور اس پر ایمان لائے، جو محمد پر اتارا گیا، اور وہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے ان کی برائیوں کو ان سے دور کر دیا اور ان کی حالت سنوار دی۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا
الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا
الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ

یہ اس لیے کہ جو کافر ہیں وہ غلط رستے پر چلے اور جو ایمان لائے انھوں نے اپنے رب کی طرف سے حق کی پیروی کی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ لوگوں کے

نام: اس سورت کا نام محمد ہے اور دوسرا نام قتال بھی ہے۔ اور اس میں چار رکوع اور اڑتیس آیتیں ہیں آنحضرت صلعم کا اسم مبارک محمد اس سورت کی دوسری آیت میں آتا ہے جہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو محمد صلعم پر ایمان لاتے ہیں۔ اور اس نام میں ہی یہ اشارہ ہے کہ آپ کے نام لیوا دنیا میں ذلیل و خوار نہیں رہ سکتے (اور اسی مضمون کو صراحت سے اس سورت میں بیان کیا ہے) اس لیے کہ محمد کے معنی ہیں تعریف کیا گیا۔ گویا اس سورت کا نام یہ رکھکر اور دوسری طرف دونوں فریق کا جو آپ پر ایمان لاتے تھے اور جو آپ کی مخالفت کرتے تھے ذکر کر کے یہ سمجھایا ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھی کس مپرسی کی حالت میں نہیں رہ سکتے بلکہ ضرور ہے کہ آپ کا جلال دنیا میں ظاہر ہو۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں یہ بتایا ہے کہ آنحضرت صلعم پر ایمان لانے والے گو اس وقت گھروں سے نکالے جا چکے ہیں اور دشمن اپنی مخالفت میں کامیاب نظر آتا ہے۔ مگر یہ حالت نہ رہے گی مسلمانوں کی تکلیفیں دور کی جائیں گی اور مخالفین کی مخالفت آخر ناکام ہوگی۔ اور یہیں یہ بھی بتایا ہے کہ یہ جنگوں کے ذریعے سے ہوگا جن کیلئے مخالف تیار ہو کر نکل چکے ہیں لیکن مسلمان ان پر غالب آئیں گے اور ان میں سے قیدی بھی بنائیں گے جنہیں فدیہ لے کر یا احسان کے طور پر چھوڑ دینے کا حکم یہاں دیا گیا ہے۔ دوسرے رکوع میں اسی مضمون کو جاری رکھتے ہوئے بتایا ہے کہ ان اہل مکہ سے جنہوں نے آنحضرت صلعم کو نکالا ہے۔ زیادہ زبردست قوموں کو بھی ہم حق کی مخالفت کی وجہ سے ہلاک کر چکے ہیں۔ اور ان کی تباہی کی گھڑی بھی قریب آرہی ہے۔ پچھلے دونوں رکوعوں میں منافقین کا ذکر کیا ہے جو جنگ سے ڈرتے تھے اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل کرتے تھے۔

تعلق: حٰمٓ کی ساری سورتیں عام طور پر حق اور باطل کے مقابلہ کا ذکر کرتی ہیں اس لیے ان کے بعد ایسی سورت کو لایا گیا ہے جس میں یہ وضاحت سے بیان کر دیا گیا کہ اس وحی پر ایمان لانے والے کس طرح کامیاب ہونگے۔ اور ان کے مخالفین جو اہل باطل ہیں کس ذریعہ سے ہلاک ہوں گے اور وہ وحی جو اللہ تعالیٰ نے بھیجی ہے اس کے حامل کا جلال آخر دنیا میں کس طرح ظاہر ہوگا۔

زمانہ نزول: یہ سورت مدنی ہے اور جیسا کہ اس کے مضمون سے ظاہر ہے ابتدائی مدنی زمانہ کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ بقرہ کا کچھ حصہ اسکے نزول سے پیشتر نازل ہو چکا تھا بالخصوص وہ حصہ جس میں جنگ کی اجازت دی گئی ہے لیکن جنگ بدر سے پہلے کی یہ سورت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں کوئی ذکر اس جنگ کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے غلبہ کا ذکر محض بطور پیشگوئی ہی ہے۔

ف۳۰۷ یہ انہی اعمال کے برباد کرنے کا ذکر ہے جو ان کے کفر اور اللہ کے رستے سے روکنے کے اعمال ہیں کیونکہ یہ سورت دونوں فریق کے مقابلہ کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک طرف کافر ہیں جو اس وقت مسلمانوں پر غالب آکر انہیں ان کے گھروں سے نکال چکے ہیں اور لوگوں کو دین اسلام کیطرف سے روکنے میں گویا کامیاب ہو چکے ہیں دوسری طرف مسلمان ہیں جو اس وقت نہایت کس مپرسی کی حالت میں گھر بار چھوڑ کر مدینہ میں آبیٹھے ہیں تو اس حالت میں یہ سورت نازل ہوتی ہے اور بتاتی ہے کہ کفار کا غلبہ اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکنا باقی نہ رہے گا اور مسلمانوں کی بیکسی کی حالت بھی باقی نہ رہے گی نہ ان کی تکالیف باقی رہیں گی۔ جیسا اگلی آیت میں صفائی سے فرمایا اور وہاں سیئات سے مراد وہی تکالیف جسمانی ہیں جو اس وقت مسلمانوں کے لاحق حال ہو رہی تھیں۔

اللّٰہُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَھُمْ ③	لیے ان کی حالتیں بیان کرتا ہے ۳۰۷۱
فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ	سو جب تمھاری کافروں سے مڈبھیڑ ہو جائے ، تو
الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْھُمْ فَشُدُّوا	گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ جب تم ان پر غالب
الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً	آجاؤ تو قید میں مضبوط باندھ لو پھر بعد میں یا تو احسان کے
مع ۱۳ حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا ۛ ۚ ذٰلِکَ ؕۛ	طریق پر یا فدیہ لیکر چھوڑ دو ، یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار
وَلَوْ یَشَآءُ اللّٰہُ لَانْتَصَرَ مِنْھُمْ وَ لٰکِنْ	رکھ دے ۔ یہ (یاد رکھو) اور اگر اللہ چاہے تو انھیں (اور طرح)
لِّیَبْلُوَا بَعْضَکُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا	سزا دیدے لیکن (جنگ اس لیے ہوئی) تاکہ تمھیں ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَلَنْ یُّضِلَّ اَعْمَالَھُمْ ④	اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہو گئے تو وہ ان کے عمل برباد نہیں کرے گا۔ ۳۰۷۲

۳۰۷۱ یعنی کفار کے ان اعمال کفر و مخالفت اسلام کی بربادی اور مومنوں کی حالت کو اچھا بنانا اس لیے ہے کہ کفار باطل کی پیروی کرتے ہیں - اور مسلمان حق کی - اور حق کی پیروی سے ضرور ہے کہ انسان کی حالت سنور جائے اور امثالھم سے مراد کفار اور مسلمانوں کی حالت یا ان کی صفات ہیں -

۳۰۷۲ وثاق - وثق کے لیے دیکھو ۹۴۷ اور وَثاق اور وِثاق وہ ہے جس کے ساتھ کسی چیز کو باندھا جائے ولا یوثق وثاقہ احد (الفجر ۸۹ - ۲۶) (غ)

اوزار - وِزر کی جمع ہے دیکھو ۱۰۴۴ اور اوزار الحرب سے مراد اس کے آلات از قسم سلاح ہیں (غ)

انتصر - اِنتصر دیکھو ۱۹۲۳ اور ظالم سے اِنتصار اس سے بدلہ لینا اور اس کو سزا دینا ہیں فدعا ربہ انی مغلوب فانتصر (القمر ۵۴ - ۱۰) والذین اذا اصابھم البغی ھم ینتصرون (الشوریٰ ۴۲ - ۳۹) اور استنصرہٗ علی عدوّہ کے معنی ہیں اس سے سوال کہ اسکے دشمن کے خلاف اسے مدد دے اور تناصر ایک دوسرے کو مدد دینا ہے (ل)

قیدی یا غلام بنانے کی ضروری شرط : اول بتایا کہ کفار کو کس صورت میں قید کیا جاسکتا ہے اور یاد رکھنا چاہیے کہ کسی آزاد انسان پر اگر غلامی کا نام اسلام کی رو سے آسکتا ہے تو انہیں لوگوں پر آسکتا ہے جنہیں غلبہ پاکر قید کرایا گیا ہو یہی مراد ماملکت ایمانھم سے ہے اس کی پہلی شرط ہے جنگ کا ہونا جس کا ذکر لقیتم میں ہے اور جنگ میں تو قتل ہی ہے پھر جب دشمن مغلوب ہو جائے (اثخان کے لیے دیکھو ۱۲۵۴) تو جو پکڑے جائیں انہیں قید کر لینا ہے اثخان کے معنی قتل کرنا نہ ہونا یہاں سے خود ظاہر ہے اس لیے کہ یہ معنی ان الفاظ کے ہو سکتے ہی نہیں - کہ جب انہیں قتل کر دو تو پھر قید کر لو پس دشمن کا قید میں لینا صرف بعد جنگ اور غلبہ ہی جائز ہے - اور غلبہ کے بعد پھر قتل نہیں بلکہ قید کرنا ہے - پھر قید کر کے بھی ہمیشہ کے لیے انہیں غلام نہیں بنایا جاسکتا بلکہ ان کا آزاد کر دینا ضروری ہے خواہ دشمن قوم سے فدیہ لے کر آزاد کیا جائے اور خواہ بغیر فدیہ لینے کے محض بطور احسان وہ ہمیشہ کیلئے قید یا غلامی میں نہیں رکھے جا سکتے اور یہ اسلام کا کھلا کھلا قانون ہے - اور اسی کے مطابق رسول اللہ صلعم کا عمل ہے آپ نے جنگ بدر میں قیدیوں سے فدیہ لے کر آزاد کیا اور بہت سی جنگوں میں بطور احسان آزاد کیا - ایک حنین کی جنگ میں چھ ہزار قیدی بغیر ایک حبہ فدیہ لینے کے آزاد کیے بنی مصطلق کی جنگ میں بغیر فدیہ کے قیدی آزاد کیے اور بنو نضیر کی مثال اس کے خلاف نہیں - اس لیے کہ وہ جنگ میں مغلوب ہو کر قید نہ ہوئے تھے بلکہ اس شرط پر صلح کی تھی کہ جو فیصلہ سعد دیں اسے ہر دو فریق مانیں گے - اور سعد نے ان کا فیصلہ توریت کے حکم کے مطابق کر کے انہیں ان کی غداریوں کی وجہ سے مروا دینے کا فیصلہ دیا -

قیدی کا قتل جائز نہیں : اور اگر کبھی کسی ایک آدھ آدمی کو آپ نے مارنے کا حکم دیا تو وہ اس کے کسی اور جرم کی بنا پر نہ کہ جنگ کرنے کی وجہ سے پس یہی صحیح اسلامی قانون ہے جیسا کہ روح المعانی میں بھی ہے - وظاھر الاٰیۃ علی ما ذکرہ السیوطی فی احکام القراٰن العظیم امتناع القتل بعد الاسر اور لکھا ہے کہ حجاج نے ابن عمر کے پاس ایک قیدی قتل کرنے کو بھیجا تو آپ نے فرمایا یہ حکم ہمیں نہیں اور یہی آیت پڑھی اور جن لوگوں نے قیدیوں کے قتل کو جائز کیا ہے تو وہ ان کی اجتہادی غلطی ہے، نص صریح اس کے خلاف ہے -

کفار پر عذاب بصورت جنگ آنے میں حکمت : اور یہ جو فرمایا حتی تضع الحرب اوزارھا تو مطلب یہ ہے کہ یہ قید میں لینا بھی اسوقت تک ہے جبتک جنگ کا سلسلہ جاری رہے اور جب جنگ نہ ہو تو کسی کو قید میں لینا یا عارضی طور پر غلام بنانا بھی جائز نہیں - اور بعض نے جنگ کے رکنے کو نزول عیسیٰ سے خاص کیا ہے اور جنگ کے ذریعہ سے سزائے دشمن اس مصلحت پر مبنی تھی جیسا کہ یہاں صفائی سے فرمایا تاکہ ایک دوسرے کے ذریعہ سے لوگوں کی جودت اور رواٗت ظاہر ہو جائے کوئی اور بلائے آسمانی وارد ہوتی تو مسلمانوں کو کمالات کے حصول کا موقعہ نہ ملتا - اور اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ آپ کے صحابہ کو بھی حصول کمالات کا موقع دے اس لیے جنگ ضروری ٹھہری اور یا اشارہ قیدیوں کے بطور احسان یا فدیہ لے کر چھوڑ دینے کی طرف ہے کہ وہ تھے تو مستحق سزا کیونکہ مسلمانوں کو بڑے بڑے دکھ دیئے تھے - اور اللہ چاہتا تو یہی حکم دیتا کہ ایسے لوگوں کو قتل کر دیا جائے مگر یہ احسان ان پر کیا تاکہ اس احسان عظیم سے مسلمان اپنے کمالات کو حاصل کریں - اور جنگ میں تو مسلمان بھی قتل ہوئے تھے اس لیے فرمایا کہ جو اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اگر وہ قتل بھی ہو جائیں تو ان کے اعمال برباد نہیں ہونگے اور دین حق کو پھیلانے کی جو کوشش انہوں نے کی وہ ناکام نہیں ہوگی -

سَیَهْدِیْهِمْ وَ یُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝۵

انھیں منزلِ مقصود پر پہنچائیگا اور ان کی حالت سنوار دے گا۔

وَ یُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝۶

اور انھیں جنت میں داخل کرے گا جس کی پہچان انھیں کرادی ہے۳۰۷۳

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝۷

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تم اللہ تعالیٰ (کے دین) کی مدد کرو تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم مضبوط کردیگا۔

وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۸

اور جو کافر ہیں اُن کے لیے ٹھوکریں کھانا ہے اور ان کے عمل برباد کر دے گا ۳۰۷۴

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝۹

یہ اس لیے کہ انھوں نے اُسے ناپسند کیا جو اللہ تعالیٰ نے اتارا، سو اس نے اُن کے عمل بیکار کردیئے۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ؗ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ اَمْثَالُهَا ۝۱۰

تو کیا وہ زمین میں پھرے نہیں، پس وہ دیکھ لیتے کہ ان کا انجام کیسا ہوا جو اُن سے پہلے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن پر تباہی بھیجی اور کافروں کے لیے اس جیسی (سزائیں) ہی ہیں ۳۰۷۵

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝۱۱ ع

یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اُن کا کارساز ہے جو ایمان لائے اور کافروں کے لیے کوئی کارساز نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝۱۲

اللہ (تعالیٰ) ان لوگوں کو جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اور جو کافر ہیں وہ چند روزہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے ہیں جس طرح چارپائے کھاتے ہیں، اور آگ اُن کا ٹھکانا ہے ۳۰۷۶

وَ كَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ هِیَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ

اور کتنی بستیاں تھیں جو تیری اس بستی سے جس نے

۳۰۷۳ عرف۔ عَرَّفَ کے معنی ہیں ایک چیز کی معرفت یا اس کا علم دے دیا۔ عرف بعضه و اعرض عن بعض (التحریم ۶۶-۳) اور عَرَّفَ کے معنی یہ بھی ہیں جَعَلَ لَهٗ عَرْفًا اے ریحًا طَیِّبًا یعنی اس کے لیے عرف یا خوشگوار ہوا پیدا کردی اور یہاں عَرَّفَهَا کے معنی ہیں طَیَّبَهَا وَ زَیَّنَهَا یعنی اسے طیب اور خوبصورت بنایا۔ اور یا یہ معنی ہیں کہ ان کیلئے اس کا وصف بیان کیا۔ اور اس کی طرف انہیں شوق دلایا اور انہیں اس کا رتبہ دکھایا (غ) اور یہ معنی مفسرین نے بھی قبول کیے ہیں (ر) اور پہلے معنی کے کر مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جنت کی کچھ معرفت مومنوں کو یہاں بھی کرادی ہے ایک تو ان کی کامیابیوں کے وعدوں کو پورا کرکے اور دوسرا اس دنیا کی جنت روحانی عطا فرما کر ۞

۳۰۷۴ تعس۔ تَعَسَ۔ ٹھوکر کھانا ہے جس سے پھر انسان اٹھ نہ سکے اور نگونسار ہو جانا (غ) اور اس سے مراد ہلاکت بھی ہے (ل) ۞

۳۰۷۵ امثالها مراد ہے امثال عاقبتهم یعنی ان کی عاقبت کی مثالیں جس سے معلوم ہوا کہ متعدد عذاب یا سزائیں ان پر آئیں گی ۞

۳۰۷۶ اس لیے کہ انہوں نے غرض زندگی چارپایوں کی طرح صرف کھانے پینے کو ٹھہرا رکھا ہے اور چونکہ اپنے قویٰ کو ان کاموں میں نہیں لگاتے ہیں..... جن سے راحت پیدا ہوتی ہے اس لیے ان کا ٹھکانا آگ ہے ۞

قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ
فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿۱۳﴾

تجھے نکالا ہے طاقت میں بڑھ کر تھیں، ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، پس ان کا کوئی مددگار نہ ہوا۔ ۳۰۷۷

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ
زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ اتَّبَعُوْٓا
اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۴﴾

تو کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی دلیل پر (قائم) ہے اس کی طرح ہو سکتا ہے جسے اس کا بُرا عمل اچھا معلوم ہوتا ہے اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَآ
اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنْهٰرٌ
مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَ اَنْهٰرٌ
مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ ۵
وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَ لَهُمْ
فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغْفِرَةٌ
مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي
النَّارِ وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ
اَمْعَآءَهُمْ ﴿۱۵﴾

اس جنت کی (ایک) مثال ہے جس کا وعدہ متقیوں کو دیا جاتا ہے اس میں پانی کی نہریں ہیں جو بگڑتا نہیں، اور دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزا نہیں بدلتا۔ اور شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذّت ہے۔ اور صاف کیے ہوئے شہد کی نہریں ہیں۔ اور ان کے لیے اس میں سب قسم کے پھل، اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے (کیا اس کے رہنے والے) ان کی مثل ہیں جو آگ میں رہنے والے ہیں اور انھیں اُبلتا ہوا پانی پلایا جائیگا تو ان کی انتڑیوں کو کاٹ ڈالے گا۔ ۳۰۷۸

۳۰۷۷ اس آیت میں کفار کے نبی کریم صلعم کو مکہ سے نکالنے کا ذکر ہے گو وہ تو آپ کو قتل ہی کرنا چاہتے تھے لیکن نکالنے کی نسبت اُن کی طرف اس لیے کی ہے کہ اُن کے اس فعل کی وجہ سے ہی آپ کو نکلنا پڑا حضرت ابن عباس سے ایک روایت میں ہے کہ جب آنحضرت صلعم گھر سے نکل کر غار کی طرف چلے تو پھر کر فرمایا انت احب بلاد اللہ تعالی الی اللہ وانت احب بلاد اللہ تعالی الیّ ولولا ان اهلك اخرجونی منك لما خرج منك (ر) یعنی اے مکہ تو اللہ تعالیٰ کے تمام شہروں سے اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے اور تو مجھے بھی تمام شہروں سے بڑھکر محبوب ہے اور اگر تیرے لوگوں نے مجھے نہ نکالا ہوتا تو میں تجھ سے نہ نکلتا۔ تب یہ آیت نازل ہوئی مگر چونکہ یہ ساری سورت بعد ہجرت کی ہے جب جنگ کی تیاری کفار کی طرف سے ہو چکی ہے اور مسلمانوں کو بھی دفاع کے لیے جنگ کرنے کی اجازت مل چکی ہے اس لیے یہ قرین قیاس نہیں کہ اکیلی آیت پہلے کی نازل شدہ ہو اور یہاں بھی صاف پیشگوئی ہے کہ ان کفار کو ہم ہلاک کر دیں گے اور کوئی ان کا مددگار نہ ہوگا ؂

۳۰۷۸ غیر۔ غیّر کا استعمال کئی طرح پر ہے اول صرف نفی کے لیے اتبع ھواہ بغیر ھدی من اللہ (القصص ۲۸-۵۰) فی الخصام غیر مبین (الزخرف ۴۳-۱۸) دوم استثنا کے لیے ما علمت لکم من الٰہ غیری (القصص ۲۸-۳۸) ھل من خالق غیر اللہ (فاطر ۳۵-۳) سوم نفی صورت کے لیے بغیر اس کے مادہ کے جیسے پانی جب گرم ہو تو اس کا غیر ہوتا ہے جب وہ ٹھنڈا ہو کلما نضجت جلودھم بدلنٰھم جلودا غیرھا (النساء ۴-۵۶) چہارم یہ کہ وہ کسی ذات کو شامل رکھنے والا ہو جیسے تقولون علی اللہ غیر الحق (الانعام ۶-۹۳) جہاں غیر الحق سے مراد باطل ہے اغیر اللہ ابغی ربا (الانعام ۶-۱۶۴) واستکبر ھو وجنودہ فی الارض بغیر الحق (القصص ۲۸-۳۹) ویستبدل قوما غیرکم (التوبۃ ۹-۳۹) ائت بقراٰن غیر ھذا (یونس ۱۰-۱۵) اور تَغْیِیْر دو طرح پر ہے ایک صورت کا تبدیل کرنا بغیر اس کی ذات کے جیسے کہیں گے غَیَّرْتُ داری یعنی اس کی عمارت کو بدل دیا اور دوسرے ایک چیز کی جگہ دوسری چیز لے آنا ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم (الرعد ۱۳-۱۱) (غ)

اٰسن۔ اَسَنَ الماءُ کے معنی ہیں پانی کی بو بگڑ کر بُری ہوگئی اور ایسا پانی اٰسِن ہے (غ) ؂

لبن۔ لَبَن دودھ عَسَل شہد۔ امعاء مِعَی کی جمع ہے انتڑیاں۔

جنت میں چار قسم کی نہریں: یہاں چند چیزوں کا ذکر ہے اور ایک طرف اگر مثل الجنۃ کہہ کر بتا دیا ہے کہ یہ اس دنیا کی چیزیں نہیں تو دوسری طرف خود ان چیزوں کے اوصاف بھی ایسے بیان کر دیئے ہیں۔ وہ ایسا پانی ہے کہ اس کی بو بگڑتی نہیں۔ ایسا دودھ ہے کہ اس کا مزہ تبدیل نہیں ہوتا۔ ایسی شراب ہے جو لذت ہی لذت ہے۔ یعنی نہ اس کے مزہ میں نقص یا بگاڑ ہے نہ اس کا نتیجہ سکر ہے ---------- ایسا شہد ہے جس میں کسی قسم ملاوٹ نہیں۔ پھر فرمایا کہ سب قسم کے پھل بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰۤى
اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۟ قف اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ
وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۶﴾

اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں یہاں تک کہ جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں انھیں جنھیں علم دیا گیا ہے، کہتے ہیں اس نے ابھی کیا کہا تھا۔ یہی وہ ہیں جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی اور وہ اپنی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں ع۳۰۷۹

وَ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى
وَّ اٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾

اور جو ہدایت اختیار کرتے ہیں وہ انھیں ہدایت میں بڑھاتا ہے اور انھیں ان کا تقویٰ دیا ۳۰۸۰

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ
بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ
اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿۱۸﴾

تو یہ اور کچھ انتظار نہیں کرتے مگر (موعودہ) گھڑی کا کہ اُن پر اچانک آجائے۔ سو اس کی نشانیاں تو آچکیں، پھر جب وہ آجائے گی ان کی نصیحت انھیں کہاں (مفید) ہو گی ۳۰۸۱

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اسْتَغْفِرْ
لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ
ع ۲ ۸ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾ ع

سو جان لے کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے کوئی معبود نہیں اور اپنے قصور کے لیے حفاظت مانگ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے اور اللہ تعالیٰ تمھارے آنے جانے اور تمھارے ٹھیرنے کو جانتا ہے ۳۰۸۲

مغفرت کو ان سب کے ساتھ اکٹھا کر کے بتا دیا کہ ان نعمتوں کا رنگ کیا ہے خمر کے لفظ سے یہ خیال کر لینا کہ اسی دنیا کی شراب وہاں ہوگی صحیح نہیں۔ یہ خمر وہی ہے جس کو دوسری جگہ شرابا طھورا (الدھر ۷۶ - ۲۱) کہا ہے گویا انسان کو پاک کر دینے والی۔ اور یہاں خمر یا ڈھانک لینے والی چیز اس کو اس لیے کہا ہے کہ وہ کمزوریوں کو ڈھانک کر انسان کو اعلیٰ مراتب پر پہنچانے والی ہے اور یہاں چار قسم کی نہروں کا ذکر کیا ہے جو ہر ایک مومن کے لیے ہونگی۔ ایک پانی کی جس سے زندگی ہے دوسری دودھ کی جس سے قوت ملتی ہے۔ تیسری شراب کی جس سے لذت اور سرور ملتا ہے چوتھی شہد کی جس سے شفا ملتی ہے اور یہی چار چیزیں انسان کی راحت کے نقشہ کو مکمل کرتی ہیں اور بہشت میں مغفرت سے مراد گناہوں کی بخشش نہیں کیونکہ گناہوں کی بخشش کے بعد تو انسان بہشت میں داخل ہوگا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور اس کا خاص تعلق ہے۔ جو اہل جنت کو میسر ہوگا۔

ع۳۰۷۹ اٰنفا۔ اٰنف ناک کو کہتے ہیں اور کسی چیز کی اٰنف اس کی ابتدا کو بھی کہتے ہیں اسی سے اٰنف بمعنی مُبْتَدَاٗ ہے (غ) یعنی شروع کرتے وقت۔

ع۳۰۸۰ تقوٰھم ان کا تقویٰ انہیں دیا یعنی انہیں متقی بنایا اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ انہیں ان کے تقویٰ کی راہیں بتا دیں اور بعض نے تقویٰ سے مراد جزائے تقویٰ لی ہے۔

ع۳۰۸۱ اشراط۔ شرط ہر حکم معلوم ہے جو کسی ایسے امر کے متعلق ہو جو اس کے واقع ہونے پر واقع ہو اور یہ امر اس کے لیے بطور علامت ہو اور اسی سے شرط علامت کو کہا جاتا ہے اور اشراط الساعۃ ساعت کی علامات ہیں (غ)۔

الساعۃ کی اشراط سے مراد عموماً علامات قیامت لی گئی ہیں جن کے لیے دیکھو ع۱۰۴۰ مگر یہاں لفظ ہیں فقد جاء اشراطھا اس کی علامتیں ظاہر ہو چکی ہیں اور یہ کہنا کہ چونکہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے انا والساعۃ کھاتین اس لیے آپ کا ظہور ہی علامات قیامت کا ظاہر ہونا ہے۔ صحیح نہیں اس لیے کہ وہ تو محض ابتدا ہے اور جو علامات قیامت حدیث میں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں آنحضرت صلعم کا ظہور نہیں۔ پس اس ساعت سے مراد ساعت وسطیٰ یا ان مخالفین کی تباہی ہے اور درحقیقت اسی کا ذکر اس سورت میں ہے اور اس کی علامات ظاہر ہو چکی تھیں۔ کیونکہ اس کی سب سے بڑی علامت یہی تھی کہ آنحضرت صلعم مکّہ سے نکل جائیں وما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم (الانفال ۸ - ۳۳) اور انی لھم اذا جاءتھم ذکرٰھم کی ترکیب اس طرح ہے کہ اذا جاءتھم جملہ معترضہ کے طور پر ہے۔ یعنی جب وہ ساعت آجائیگی انی لھم ذکرھم یعنی پھر انہیں نصیحت کیا فائدہ دے گی جیسے فرمایا یومئذٍ یتذکر الانسان وانی لہ الذکرٰی (الفجر ۸۹ - ۲۳)

ع۳۰۸۲ ہر مسلم اپنے اور دوسروں کے لیے استغفار کرے: اس سورت میں شروع سے ذکر دو گروہوں یعنی مومنوں اور کافروں کا چلتا ہے اور سوائے اس کے کہ قرائن قویہ ہوں خطاب قرآن شریف میں عام ہی ہوتا ہے اور یہاں بھی یہی صورت ہے یعنی خطاب ہر مسلم کو ہے۔ کہ اپنے قصور کی بھی حفاظت چاہے اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی۔ اور یہ خطاب خصوصیت سے رسول اللہ صلعم کو نہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلعم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ میں آپ کیلئے استغفا

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۚ﴿۲۰﴾

اور جو ایمان لائے وہ کہتے ہیں کوئی سورت نازل کیوں نہیں ہوتی پس جب ایک واضح معنی والی سورت نازل کی گئی اور اس میں جنگ کا ذکر کیا گیا تو تو انھیں دیکھتا ہے جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ وہ تیری طرف دیکھتے ہیں اس شخص کی طرح جس پر موت (کے خوف) سے بیہوشی طاری ہو، سو ان کے لیے ہلاکت ہے ۳۰۸۳

طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۫ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۫ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ﴿۲۱﴾

فرمانبرداری اور پسندیدہ بات کا کہنا (مناسب تھا) پھر جب معاملہ پختہ ہو گیا تو اگر یہ اللہ تعالیٰ کے لیے (عہد کو) سچ کر دکھاتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا ۳۰۸۴

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْۤا اَرْحَامَكُمْ ﴿۲۲﴾

پس اگر تم حاکم بن جاؤ تو قریب ہے کہ زمین میں فساد پھیلاؤ اور اپنے رحموں کو قطع کرو ۳۰۸۵

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰۤى اَبْصَارَهُمْ ﴿۲۳﴾

یہی وہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی، سو انھیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ۳۰۸۶

کیا کروں تو آپؐ نے فرمایا ہاں اور یہ آیت پڑھی (ج) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس آیت کے یہی معنی سمجھے کہ ہر شخص کو دوسرے کے لیے استغفار کرنا چاہیے۔ اور اگر آپ کے لیے بھی مانا جائے تو ذنبك سے وہ ذنوب مراد ہیں جو ابھی سرزد نہیں ہوئے کیونکہ انبیاء سے کسی ذنب کا سرزد ہونا قرآن کی نص صریح کے خلاف ہے لایسبقونه بالقول وھم بامرہ یعملون (الانبیاء ۲۱-۲۷) دیکھو ۲۱۵۶ ہاں وہ بھی انسان کا ذنب کہلا سکتا ہے جو امکانی طور پر انسان سے سرزد ہو سکتا ہے اور اس کیلئے حفاظت چاہنا یہ ہے کہ وہ سرزد نہ ہو۔ اور یہی استغفار انبیاء ہے دیکھو ۲۵۸

متقلبکم و مثوٰکم یعنی تمہارا بیداری میں اپنے امور میں منصرف ہونا اور نیند میں اپنے خوابگاہوں میں آرام کرنا (ج) اور یا متقلب دنیا کے متعلق ہے۔ اور مثوٰی آخرت کے (ر)

۳۰۸۳ مغشی۔ غَشِیَ کے معنی ہیں ڈھانکا اور غُشِیَ عَلٰی فلانٍ اسے اس چیز نے آلیا جس نے اس کے فہم پر پردہ ڈال دیا کالذی یغشی علیه من الموت (الاحزاب ۳۳-۱۹) اسی سے مُغْشِیّ ہے (غ)

اولی۔ اَولٰی کلمہ تہدید اور تخویف ہے جس سے اس شخص کو ڈرایا جاتا ہے جو ہلاکت پر پہنچ گیا ہو اس سے اسے بچنے کی ترغیب دی جاتی ہے یا اس سے اسے خطاب کیا جاتا ہے جو ذلیل ہو کر ہلاکت سے بچ گیا ہو۔ پس دوبارہ اس کی مثل سے اسے روکا جاتا ہے اور اکثر استعمال اس کا مکرر ہے اولٰی لك فاولٰی (القیمۃ ۷۵-۳۵) (غ)

اس میں مومنوں اور منافقوں کا مقابلہ ہے یعنی مومن تو اس حالت کو دیکھ کر کہ کافر کس طرح تلوار لے کر اسلام کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں یہ خواہش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں دفاع کی اجازت دے لیکن جب یہ حکم نازل ہوتا ہے تو منافق جن کے دلوں میں بیماری ہے اسے اپنے لیے ایک موت کی طرح سمجھتے ہیں اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر جنگ ہوئی تو مسلمانوں کے ساتھ ہم بھی مارے جائیں گے اور سورت محکمہ سے مراد واضح المعنی ہے کیونکہ جنگ کا پیش آنا تو پیشگوئی سے بھی معلوم ہوتا تھا مگر مسلمانوں کو وضاحت سے یہ حکم ابھی نہ دیا گیا تھا۔

۳۰۸۴ یعنی چاہیے یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے طاعت اور قول معروف اختیار کرتے اور امر کے پختہ ہونے سے مراد جنگ کا واقع ہونا ہے یعنی نزول حکم پر منہ سے اطاعت اختیار کرتے اور موقعہ پر اپنے عہد کو سچا کر دکھاتے تو یہ ان کے لیے بہتر تھا۔

۳۰۸۵ تولیتم کے معنی یہاں دونوں طرح پر کیے گئے ہیں اگر تم اس حکم سے پھر جاؤ یا اگر تم حاکم بن جاؤ (ج) پہلی صورت میں ان کا کفار کے ساتھ ملنا فساد فی الارض اور قطع رحمی تھی اس لیے کہ انہی منافقین کے رشتہ دار ہی مسلمان تھے تو ان کو مروانا قطع رحمی تھی اور زمین میں فساد اس طرح پر کہ کافر فساد کر رہے تھے اور مسلمانوں کو محض ظلم سے تکلیفیں پہنچا رہے تھے۔

۳۰۸۶ اصم۔ صَمَم شنوائی کے حاسہ کا جاتے رہنا ہے اور اس شخص کے متعلق بھی کہا جاتا ہے جو حق کی طرف مائل نہیں ہوتا اور اسے قبول نہیں کرتا فعموا وصمّوا

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾

تو کیا قرآن پر غور نہیں کرتے ، یا دلوں پر ان کے تالے لگے ہوئے ہیں ع‌۳۰۸۷

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَاَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾

وہ لوگ جو اپنی پیٹھوں پر پھر گئے ، اس کے بعد کہ ان کے لیے ہدایت واضح ہو گئی شیطان نے (اسے) ان کے لیے اچھا کر دکھایا اور انھیں لمبے وعدے دیئے ع‌۳۰۸۸

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِىْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾

یہ اس لیے ہُوا کہ وہ انھیں کہتے ہیں جو اللہ کے اتارے ہوئے حکم کو ناپسند کرتے ہیں کہ ہم بعض باتوں میں تمھاری فرمانبرداری کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے بھید کو جانتا ہے ع‌۳۰۸۹

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾

تو کیا حالت ہو گی جب فرشتے انھیں وفات دیں گے اُن کے مونہوں اور ان کی پیٹھوں کو مارتے ہوں گے ۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾ ع

یہ اس لیے کہ وہ اس بات کی پیروی کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو غضب دلاتی ہے اور اس کی رضا کو ناپسند کرتے ہیں سو اس نے ان کے عمل بیکار کر دیئے

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾

آیا وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے ، خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے کینوں کو باہر نہیں نکالے گا ع‌۳۰۹۰

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِىْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾

اور اگر ہم چاہیں تو ہم تجھے وہ (لوگ) دکھا دیں پس تو انھیں ان کی نشانیوں سے پہچان لے اور یقیناً تو انھیں (ان کے) طرزِ کلام سے ہی پہچان لے گا اور اللہ تعالیٰ تمھارے عملوں کو جانتا ہے ع‌۳۰۹۱

(المائدۃ ۵ - ۷۱) (غ) اور اگلی آیت میں بتا دیا کہ یہ بہرا اور اندھا کرنا ان کے عدم تدبّر کی وجہ سے ہے۔

ع‌۳۰۸۷ اقفال قُفْل کی جمع ہے ۔ تالا ۔ اور یہ ہر اس چیز کے لیے مثال ہو گیا ہے جو کسی فعل کے کرنے میں انسان کے لیے مانع ہو (غ)۔

ع‌۳۰۸۸ اصلی لہم ۔ اصلی کے لیے دیکھو ع‌۵۷۳ اور یہاں مراد آرزوؤں کا لمبا کرنا یا اپنے جھوٹے وعدوں کو آگے آگے کرتے جانا ہے یا لمبی زندگی کا وعدہ دینا مراد ہے۔ اور بعض نے ضمیر یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف مانی ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کو مہلت دیتا ہے اور ان پر عقوبت جلد نہیں لاتا۔

ع‌۳۰۸۹ الذین کرھوا ما نزل اللہ کفار ہیں ما یود الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم (البقرۃ ۲ - ۱۰۵) منافق انہیں کہتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ۔ اور تمہاری اطاعت کریں گے ۔ یعنی رسول اللہ صلعم کے خلاف تمہیں مدد دیں گے ۔ یا اشارہ اس کی طرف ہے ۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا الم تر الی الذین نافقوا یقولون لاخوانھم الذین کفروا من اھل الکتاب لئن اخرجتم لنخرجن معکم ولا نطیع فیکم احدا ابدا (الحشر ۵۹ - ۱۱)

ع‌۳۰۹۰ اضغان ضِغْن کی جمع ہے جس کے معنی سخت کینہ ہیں ۔ اور کینوں کو باہر نکالنے سے مراد یہ ہے کہ انہیں ظاہر کر دے کیونکہ منافق اپنے کینہ کو چھپانے کی کوشش کرتے تھے اور یوں پتہ لگ جائے کہ کون منافق ہے اور یا مراد یہ ہے کہ کینہ کو دور کر دے اور دونوں طرح پر ہی ہوا۔

ع‌۳۰۹۱ لحن کلام کا اس طریق سے پھیرنا ہے جس پر وہ جاری ہے یا اعراب کے دور کرنے سے یا مٹا کر اور یہ مذموم ہے اور اس کا اکثر استعمال اس طرح ہے اور بالتصریح سے دور کر کے اور تعریض کی طرف اس کے معنی کو پھیر کر (غ) اور خوش آوازی پر بھی بولا جاتا ہے اسلئے اَلحَنَ اسے کہتے ہیں جو بہت خوش آواز ہو ۔ اور ابن اثیر کہتے ہیں لحن استقامت کی جہت سے مائل ہونا ہے ۔

کفر یا نفاق کا نشان جسم پر نہیں ہو سکتا: اور حدیث میں الحن بحجتہ اسی معنی میں ہے مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو منافقوں کے ماتھے پر کوئی ایسا کلنک کا ٹیکا

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا۟ اَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾

اور ہم تمھیں ضرور آزمائیں گے یہاں تک کہ ہم تم میں سے جہاد کرنیوالوں اور صبر کرنے والوں کو ظاہر کردیں اور تمھارے حالات کو جانچ لیں [۳۰۹۲ع]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾

جو کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے رستے سے روکتے ہیں اور رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں، اس کے بعد کہ ان کے لیے ہدایت واضح ہوگئی، وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور وہ ان کے عملوں کو بے کار کردے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے عملوں کو ضائع نہ کرو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾

جو کافر ہیں اور اللہ کے رستے سے روکتے ہیں پھر وہ مرجاتے ہیں حالانکہ وہ کافر ہی ہیں، تو اللہ تعالیٰ انھیں ہرگز نہیں بخشے گا۔

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ ڰ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ڰ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾

سو تم سست نہ ہو اور صلح کی طرف (دشمن کو) بلاؤ اور تم ہی غالب رہو گے۔ اور اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ ہے، وہ تمھارے لیے تمھارے عملوں کو کم نہ کرے گا [۳۰۹۳ع]

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾

دنیا کی زندگی صرف کھیل اور بے حقیقت چیز ہے اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقوٰے اختیار کرو، تو وہ تمھارے اجر تمھیں دے گا اور تمھارے مال تم سے نہیں مانگے گا۔

لگا دیتا کہ ہر شخص انہیں ان کی ظاہر علامات سے ہی پہچان لیتا۔ لیکن ایسا اس نے نہیں چاہا۔ ہاں جس طرز سے وہ کلام کرتے ہیں اس سے بھی پہچاننے والا انہیں پہچان سکتا ہے اور رسول اللہ صلعم تو پہچانتے ہی تھے لیکن ان کا کھلے طور پر ظاہر کردینا ایک وقت تک مقدر نہ تھا اس کی وجہ اگلی آیت میں دی ہے۔ ہاں آخر کار ان کے نام بھی آنحضرت صلعم کو بتا دیئے گئے۔ ایسی روایتیں قابل قبول نہیں کہ بعض منافق رات کو سوئے تو صبح ان کے ماتھے پر لکھا ہوا تھا ھذا منافق اللہ تعالیٰ کا ماتھے پر لکھنا یہی ہوتا ہے کہ اس کے افعال سے ظاہر کردے اسی طرح دجال کے متعلق جو آتا ہے کہ اس کے ماتھے پر کفر کا لفظ لکھا ہوا ہوگا تو اس سے بھی مراد سیاہی سے لکھا ہوا ہونا نہیں۔ بلکہ افعال کی شہادت مراد ہے۔

۳۰۹۲ع منافقوں اور مسلمانوں کا امتیاز اس لیے ابتدا میں نہیں کیا گیا کہ تا جہاد کرنے والوں اور صابروں کی کمال کوشش اور صبر کے نمونے ظاہر ہوں اخبارکم سے مراد ان کی خبریں یا حالات ہیں یعنی اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ مومنوں کے صبر اور کوشش کے نتائج دنیا میں ظاہر ہوں۔ اور منافقوں کا نفاق ظاہر ہو جائے۔

۳۰۹۳ع یتر۔ وَتر اعداد میں شفع کے خلاف ہے یعنی طاق اور وَتَرْتُہ کے معنی ہیں میں نے اسے کوئی امر مکروہ پہنچایا (غ) اور وَتَرَہٗ حقّہٗ وماله کے معنی ہیں اس کا حق اور اس کا مال اسے گھٹا کر دیا۔ اور کمی بالنقصان کے معنی اس کے اس لیے آتے ہیں کہ وہ پہلے گویا کثیر تھا پھر اکیلا رہ گیا (ل)۔

مطلب یہ ہے کہ جب جنگ شروع ہوچکی ہے تو دب کر اور مغلوب فریق کی حیثیت اختیار کرکے صلح کی طرف نہ بلاؤ اس لیے کہ اس صورت میں مسلمانوں کو دبا کر بالکل نابود کردیا جاتا۔ ایسی صلح سے روکا ہے جس کے ساتھ وہن ہو۔ یعنی کوئی شخص دشمن کے مقابلہ پر زور نہیں لگانا چاہتا۔ اور اس سے ڈر کر ہمت ہار بیٹھا ہے اس کا صلح کیلئے دشمن کو بلانا اپنی بربادی ہے اور یہ بھی بتایا کہ غلبہ تمھارے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کوشش اللہ کی راہ میں کروگے اللہ اس کے اجر کو کم نہیں کرے گا۔

إِن يَسْأَلْكُمُوهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوا وَ
يُخْرِجْ أَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾

اگر وہ اُن (اموال) کو تم سے مانگے اور تم سے الحاح کرے تو تم بخل کرو اور وہ (بخل تمہارے کینوں کو باہر نکال دے ۳۰۹۴ء

هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنفِقُوا
فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنكُم مَّن يَبْخَلُ
وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن
نَّفْسِهِ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ
وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ
ع ۸ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم ﴿۳۸﴾

دیکھو تم وہ لوگ ہو جو بُلائے جاتے ہو کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو، پس تم میں سے وہ ہے جو بخل کرتا ہے، اور جو کوئی بخل کرتا ہے تو وہ صرف اپنی جان سے بخل کرتا ہے اور اللہ (تعالیٰ) بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو ـــــ اور اگر تم پھر جاؤ تو وہ تمہارے سوائے کسی اور قوم کو بدل کر لے آئیگا، پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے ۳۰۹۵ء

۳۰۹۴ء پہلی آیت میں ہے کہ اگر تم ایمان لاؤ تو وہ تمہیں اجر دیگا اور تمہارے مال تم سے نہیں مانگے گا۔ اور دوسری میں ہے کہ اگر وہ تم سے مانگے تو تم بخل کرو۔ پس پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں کچھ ایمان ہو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے مال نہیں مانگتا بلکہ وہ تمہیں کچھ اجر دینا چاہتا ہے۔ لیکن اجر بغیر انسان کی محنت اور قربانی اور عمل کے نہیں ملتا۔ اس لیے تمہیں مال خرچ کرنا پڑے گا تب ہی اجر ملیگا۔ منافقوں میں سب سے بڑا نقص یہی تھا کہ وہ اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کو بڑی بھاری مصیبت سمجھتے تھے تو انہیں بتایا ہے کہ جس ایمان کا تمہیں دعویٰ ہے کہ اگر تم میں واقعی وہ ایمان ہو تو تمہیں کبھی یہ مصیبت معلوم نہ ہو اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ اپنے لیے نہیں مانگتا بلکہ تمہیں اجر دینے کیلئے اور تمہارے مراتب بلند کرنے کے لیے تمہیں خرچ کرنے کو کہتا ہے جیسا کہ آگے چل کر فرمایا تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ اور دوسری آیت میں ان کی اصل حالت کا نقشہ کھینچا ہے کہ تم پر بڑا بڑا زور بھی دیا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو تم بخل کرتے ہو۔ اور فی الحقیقت تمہیں اسلام سے بغض آخر ظاہر ہو کر رہے گا خواہ تم اسے کتنا بھی چھپانا چاہو۔

۳۰۹۵ء خدا کی راہ میں مال خرچ نہ کرنے والی قوم زندہ نہیں رہ سکتی: پچھلی دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں مومنوں کا ذکر تھا اور دوسری میں منافقوں کا تو اب دونوں کا اکٹھا ذکر کر کے یا کل امت کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ تم کو جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلایا جاتا ہے وہ تمہاری اپنی بھلائی کے لیے ہے لیکن بعض لوگ تم میں سے بخل کرتے ہیں۔ اور جو بخل کرتا ہے اس کا نقصان بھی خود اس کی اپنی ذات کو ہی پہنچتا ہے اور اگر تم سب کے سب احکام الٰہی سے پھر جاؤ تو پھر اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ اور لوگوں کو کھڑا کر دے گا۔ روح المعانی میں ایک روایت نقل کی ہے کہ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ یہ کون لوگ ہیں جن کے لانے کا یہاں ذکر ہے تو آپ نے سلمان فارسی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔ یہ اور اس کی قوم اور پھر فرمایا کہ اگر ایمان ثریا پر ہو تو فارس کے کچھ لوگ اسے واپس لائیں گے۔

سُوْرَةُ الْفَتْحِ مَدَنِيَّةٌ (۴۸)

اٰیَاتُهَا ۲۹ — رُکُوْعَاتُهَا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ (تعالیٰ) بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ① ہم نے تیرے لیے ایک کھلی فتح (کی راہ) کھول دی ہے ۳۰۹۶

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ تاکہ اللہ تعالیٰ اُن قصوروں سے تیری حفاظت کرے جو تیرے ذمّے پہلے

نام وخلاصہ مضمون: اس سورت کا نام الفتح ہے اور اس میں چار رکوع اور انتیس آیتیں ہیں اس سورت کا نام اس عظیم الشان فتح پر ہے جو اسلام کو صلح حدیبیہ میں حاصل ہوئی۔ ظاہری نظروں میں تو یہ کوئی فتح نہ تھی۔ بلکہ خود صحابہ رضی اللہ عنہم کے بڑے حصہ پر یہ امر شروع میں مخفی رہا کہ صلح حدیبیہ بھی کوئی فتح ہے بلکہ وہ سب کے سب صلح حدیبیہ کی شرائط کو اسلام کے لیے ذلت کا موجب سمجھ کر مغموم تھے یہاں تک کہ اس سورت کے نزول سے غم کی جگہ خوشی سے دل بھر گئے اور اس کا فتح مبین ہونا بعد میں واقعات نے ثابت کر دیا یعنی اس صلح کے ساتھ آمد و رفت کے رستے کھل گئے اور مسلمانوں اور کفار کا باہم میل ملاپ ہو گیا اور اسلام کی خوبیاں دلوں میں گھر کرنے لگیں اور کثرت کیساتھ لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے بلکہ اسلام کی کشش ایسی زبردست ثابت ہوئی کہ جو لوگ مسلمان ہوتے تھے وہ اپنے گھر بار کو چھوڑ کر مقام عیص پر ساحل پر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ کیونکہ بروئے شرائط معاہدہ وہ مدینہ میں نبی کریم صلعم کے پاس نہ رہ سکتے تھے اور یوں یہ ثابت ہو گیا کہ اسلام کی فتح دلوں پر تھی اور جب تلوار کی حکومت اٹھی تو کافر ہی مسلمان ہوئے مسلمانوں میں سے کوئی کفر میں واپس نہ گیا مگر اس سورت میں صرف صلح حدیبیہ کی فتح کا ہی ذکر نہیں بلکہ پہلے رکوع میں یہ بتا کر کہ صلح حدیبیہ ایک فتح مبین ہے جو اسلام کے لیے بڑی بڑی برکات کا موجب ہو گی اور دوسرے میں ان لوگوں کا ذکر کر کے جو ان مشکلات کے وقت ساتھ نہیں ہوتے تھے تیسرے میں فرمایا کہ یہ صلح عظیم الشان فتوحات اسلامی کا پیش خیمہ ہے جن میں سب سے پہلے یہود کو پر فتح تھی جو خیبر کے مقام پر حاصل ہوئی اور بعد میں دیگر فتوحات اور تیسرے درجہ پر بیرونی ملکوں کی فتوحات اور ان سب کی خوش خبری سنا کر چوتھے رکوع میں بتایا کہ اسلام آخر کار کل دنیا کے مذاہب پر غالب آئیگا اور یوں ہر طرح سے اس سورت کا نام الفتح موزون ہے ۞

تعلق و تاریخ نزول: پچھلی سورت کا نام محمد تھا اور اس سورت کا نام جو اس کے بعد آتی ہے الفتح ہے گویا بتایا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کا ظہور دنیا میں چاہتا تھا کہ فتح بھی اس کے ساتھ ہو۔ وہ دشمنوں سے مغلوب نہیں ہو سکتا بلکہ سب دشمنوں پر غالب آئیگا پہلوں پر بھی اور پچھلوں پر بھی۔ محمدؐ کا نام جہاں جائیگا وہاں فتح بھی اس کے ہمرکاب ہو گی۔

اس سورت کے نزول کی تاریخ یقین کامل سے متعین کی جاسکتی ہے اور ساری سورت کا نزول ایک ہی وقت میں ہوا یہ ثابت ہے کہ آپ اس سفر میں پہلی ذیقعد ۶ھ ہجری کو نکلے اور دس دن سے کچھ زیادہ آپ کا قیام حدیبیہ میں رہا اور آپ کی واپسی میں حالت سفر میں اس سورت کا نزول ہوا۔ گویا یہ ذیقعد ۶ھ کے آخری دن تھے اور بظاہر جس وقت اس سورت کا نزول ہوا تو آپ مکہ سے ہی قریب تھے مگر چونکہ ہجرت کے بعد جو کچھ نازل ہوا وہ مدنی کہلائے گا۔ اس لحاظ سے یہ سورت مدنی ہے ۞

۳۰۹۶ بخاری میں حضرت انس کا قول ہے کہ جس فتح مبین کا ذکر اس آیت میں ہے وہ صلح حدیبیہ ہے۔ اور ابن کثیر میں حضرت ابن مسعود اور جابر اور براء کے اقوال نقل کیے گئے ہیں جن کے الفاظ قریباً ایک ہی ہیں انکم تعدون الفتح فتح مکة ونحن نعد الفتح صلح الحديبية تم فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو اور ہم صلح حدیبیہ کو فتح سمجھتے ہیں۔ اور روح المعانی میں زہری سے اس کی وجہ نقل کی ہے لم يكن فتح اعظم من صلح الحديبية اختلط المشركون بالمسلمين وسمعوا كلامهم وتمكن الاسلام من قلوبهم واسلم في ثلاث سنين خلق كثير وكثر بهم سواد الاسلام کوئی فتح صلح حدیبیہ سے بڑھکر نہیں ہوئی۔ مشرکوں کا مسلمانوں کے ساتھ میل جول ہوا۔ اور انہوں نے ان کی باتوں کو سنا اور اسلام نے ان کے دلوں میں جگہ پکڑی۔ اور تین سال میں بہت سی مخلوق اسلام لائی۔ اور ان کے ساتھ سواد اسلام بہت بڑھا۔ اور جمہور کے نزدیک یہ ذکر صلح حدیبیہ کا ہی ہے اور یہی ابن عباس اور انس اور شعبی اور زہری سے روایت ہے اور ابن عطیہ نے کہا یہی صحیح ہے (ر) اور ابن جریر میں حضرت عمر کی اس مشہور روایت میں کہ انہوں نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا السنا على الحق۔ آخری الفاظ یوں ہیں فقال يا رسول الله افتح هو قال نعم یعنی حضرت عمر نے عرض کیا یا رسول اللہ یہی فتح ہے آپ نے فرمایا ہاں۔ اور بعض لوگوں نے اس سے فتح مکہ مراد لی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں فتح مکہ کا ذکر آگے اسی سورت میں آتا ہے پس یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کی سب سے بڑی فتح وہی ہے جو صلح سے حاصل ہوئی گو اس صلح میں مغلوب فریق کا پہلو ہی اختیار کیا گیا ہو کیونکہ اسلام کی فتح دلوں پر ہے اور ظاہری فتح صرف جسموں پر ہوتی ہے اور حقیقی فتح وہی ہے جو دلوں پر ہو اور امام راغب نے یہاں فتح سے مراد ان علوم و ہدایات کا دیا جانا لیا ہے جو ثواب اور مقام محمود تک پہنچانے کا ذریعہ ہوئے دیکھو ۱۱۲۴ اور واقعات نے یوں اسے فتح مبین ثابت کیا کہ اس کے ساتھ ہی کفار میں اشاعت اسلام کا دروازہ کھل گیا اور کثرت سے لوگ اسلام کے اندر داخل ہوئے یہاں تک کہ اگر حدیبیہ کو جاتے وقت آپ کے ساتھ صرف چودہ سو آدمی تھے تو ڈیڑھ سال بعد مکہ پر چڑھائی کے وقت دس ہزار جاں نثار آپ کے ہمرکاب تھے اور یوں توریت کی وہ پیشگوئی پوری ہوئی جو حضرت موسیٰ کی زبان سے کی گئی تھی "خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے دہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔ (استثنا ۳۳:۲) ۞

وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ
وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝۲
وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝۳
هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ
الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ
اِيْمَانِهِمْ ۭ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۴

لگائے گئے اور جو پیچھے لگائے جائیں گے اور اپنی نعمت کو تجھ
پر تمام کرے اور تجھے سیدھے رستے پر چلائے ۳۰۹۷
اور اللہ تعا تجھے زبردست نصرت سے مدد دے۔
وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں تسکین نازل کی، تاکہ
وہ اپنے ایمان کے ساتھ ایمان میں ترقی کریں، اور اللہ تعا
کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں اور اللہ تعالیٰ
علم والا حکمت والا ہے ۳۰۹۸

۳۰۹۷ آنحضرت کے غفر ذنب سے مراد: لیغفر لك اللّٰہ ما تقدم من ذنبك وما تاخر یہ نتیجہ ہے فتح مبین یعنی صلح حدیبیہ کا اس لیے اس کے یہ معنی کرنا کہ اللہ تعالیٰ تیرے گناہ بخش دے جو پہلے ہوئے یا جو بعد میں ہونگے کسی طرح صحیح نہیں کیونکہ گناہوں کا بخشنا کسی صلح یا کسی فتح کا نتیجہ بھی نہیں ہو سکتا اللہ تعالےٰ نے فتح مبین کو غفر ذنب کا ذریعہ بنایا ہے اور وہ باتیں جو اس کا نتیجہ بتائی ہیں چار ہیں غفر ذنب۔ اتمام نعمت۔ ہدایت۔ نصرت۔ اگر غفر ذنب سے مراد گناہوں کا بخشنا لیا جائے تو اس کا باقی تینوں باتوں سے کوئی تعلق نہیں رہتا اور نہ ہی صلح حدیبیہ سے کچھ تعلق رہتا ہے علاوہ ازیں قرآن کریم میں کہیں آنحضرت صلعم کے کسی ذنب کا ذکر نہیں بلکہ آپ کے مقامات عالیہ کا ہی ذکر ہے اور تاریخ تو بتاتی ہے کہ اس وقت بھی جب ابھی آپ منصب نبوت پر فائز نہ ہوئے تھے آپ الامین کے پاک نام سے مشہور تھے پس ذنبك کے معنی آنحضرت کے گناہ نہ تو سیاق سباق سے درست ٹھہرتے ہیں اور نہ ہی قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے اور یہ ہم جانتے ہیں کہ اضافت بعض وقت حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی۔ مثلاً باثمی واثمك (المائدۃ ۵-۲۹) اثمی سے مراد ہے وہ گناہ جو تو میرے خلاف کرنے لگا ہے۔ دیکھو ۸۱۴ اور این شرکاؤکم الذین کنتم تزعمون (الانعام ٦ - ۲۲) میں معنی تمہارے شریک نہیں بلکہ مراد ہیں وہ شریک جو تم بناتے تھے اور این شرکائی (النحل ۱٦ - ۲۷) میں معنی میرے شریک نہیں بلکہ مراد ہے وہ جنہیں میرے شریک سمجھا جاتا تھا اسی طرح یہاں ذنبك کے معنی ہیں جو دوسروں کے زعم میں آنحضرت صلعم کے ذنوب تھے۔ یا وہ ذنوب جو دوسرے آپ کی طرف منسوب کرتے تھے اور انہی کا تعلق صلح حدیبیہ سے بھی تھا کیونکہ بہت سی باتیں غلط طور پر دشمنان اسلام نے مشہور کر رکھی تھیں اب جو صلح ہوئی اور مسلمانوں اور مشرکوں کا باہم میل جول ہوا اور اصل حقیقت پر انہیں آگہی ہوئی تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ باتیں نادرست ہیں اور آنحضرت صلعم کے اخلاق کے وہ گرویدہ ہو گئے۔ اور اسلام میں داخل ہونے لگے یہی آنحضرت صلعم پر اتمام نعمت تھا کہ لوگ راہ حق کو قبول کر کے آپ کے حلقہ بگوش ہوں اور یہی وہ ہدایت ہے یعنی منزل مقصود پر پہنچانا جس کا یہاں ذکر ہے کیونکہ آپ کی منزل مقصود یہی تھی کہ ملک عرب نور اسلام سے منور ہو جائے ورنہ یھدیك صراطا مستقیما کے معنی اس شخص کے حق میں کیا ہو سکتے ہیں جو خود وانك لتھدی الی صراط مستقیم (الشوریٰ ۴۲ - ۵۲) کا مصداق ہوا اور یہی وہ نصر عزیز یا زبردست نصرت تھی جو آپ کو عطا فرمائی گئی جس کی وجہ سے لوگوں کی گردنیں دین اسلام کے سامنے جھک گئیں اور یہ جو ان ذنوب کے متعلق فرمایا ما تقدم اور ما تاخر تو ما تقدم تو وہی ذنوب ہیں جو آپ کے متعلق مشتہر ہو چکے تھے اور ما تاخر وہ ہیں جو ابھی ذنوب آپ کی طرف منسوب کیے جانے والے تھے ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذی کثیرا (آل عمران ۳ - ۱۸٦) دیکھو ۵۸۳ اور ان کو اس لیے ساتھ ملایا ہے کہ آخر اللہ تعالےٰ اسی طریق پر ان الزامات سے بھی آپ کو پاک کر دے گا جو آپ پر لگائے جانے والے تھے اور جس طرح صلح اور میل جول باہمی سے ما تقدم کا فیصلہ ہوا اسی طرح جب ٹھنڈے دل سے عیسائی لوگ آنحضرت صلعم کی زندگی کے واقعات پر غور کریں گے تو انہیں بھی معلوم ہو جائیگا کہ انہوں نے محض پادریوں کی سنی سنائی باتوں پر ایسے معائب آنحضرت صلعم کی طرف منسوب کیے تھے جن سے فی الحقیقت آپ پاک ہیں اور یہ آپ کا غفر ویسا ہی ہے جیسے حضرت عیسیٰ کی تطہیر و مطھرك من الذین کفروا جہاں مراد ہے کافروں کے لگائے ہوئے الزامات سے تجھے پاک کروں گا حضرت عیسیٰ کو پاک کیا ہے نہ اس لیے کہ آپ نعوذ باللہ بذات خود ناپاک تھے بلکہ اس لیے کہ کافروں نے آپکو ناپاک قرار دیا۔ آنحضرت صلعم کا غفر ذنوب کیا نہ اسلیئے کہ آپ کے کوئی ذنوب تھے بلکہ اس لیے کہ کافروں نے آپ کی طرف ذنوب منسوب کیے تھے اور لیغفر لك اللّٰہ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ باتیں جو ذنوب کا رنگ اختیار کر سکتی ہیں اللہ تعالیٰ تمہیں ان سے محفوظ کر دے یعنی ان مواقع پر ذنوب کو سرزد نہ ہونے دے انبیاء کا ذنوب سے غفر یہی ہے کہ ان سے ذنب سرزد نہ ہو دیکھو ۲۵۸ و ۳٦٦۔

۳۰۹۸ سکینت یا اطمینان کے نازل کرنے سے دشمن کا رعب دور کیا جاتا ہے۔ دیکھو ۳۱۷ا اور یہاں اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے کہ باوجود مسلمانوں کے سامان جنگ نہ رکھنے کے اور ان کی قلت کے اور کفار کی کثرت اور ان کے اپنے گھر سے قریب ہونے کے مسلمانوں کے دلوں میں اللہ تعالےٰ نے ایسی سکینت نازل فرمائی کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے اگر کفار ان میں یہ آمادگی نہ دیکھتے تو وہ مسلمانوں کو کچل ڈالنے کی ہی تجویز کرتے اور صلح پر کبھی راضی نہ ہوتے اسی لیے فرمایا للّٰہ جنود السموٰت والارض اور اس کی تائید آیت ۱۸ سے ہوتی ہے لقد رضی اللّٰہ عن المؤمنین اذ یبایعونك تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم فانزل السکینۃ علیھم واثابھم فتحا قریبا۔ اور اس سے اگلی آیت میں فرمایا لیدخل المومنین والمومنات جنٰت۔ یعنی سکینت کے دلوں میں ہونے سے

لِّيُدۡخِلَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ جَنّٰتٍ
تَجۡرِيۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا
وَيُكَفِّرَ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ
عِنۡدَ اللّٰهِ فَوۡزًا عَظِيۡمًا ۙ﴿۵﴾

تاکہ مومن مَردوں اور مومن عورتوں کو باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، انھیں میں رہیں گے اور ان سے ان کی بُرائیاں دُور کرے اور یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی بھاری کامیابی ہے۔

وَّيُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتِ وَ
الۡمُشۡرِكِيۡنَ وَالۡمُشۡرِكٰتِ الظَّآنِّيۡنَ
بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوۡءِ ؕ عَلَيۡهِمۡ دَآئِرَةُ السَّوۡءِ ۚ
وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ وَلَعَنَهُمۡ وَاَعَدَّ
لَهُمۡ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا ﴿۶﴾

اور منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو اللہ تعالیٰ کے حق میں بُرے خیال رکھنے والوں کو سزا دے، اِنہی پر بُری گردش ہے اور اللہ تعالیٰ کا غضب اُن پر آیا، اور ان پر لعنت کی اور ان کے لیے دوزخ تیار کیا اور وہ بُری جگہ ہے۔

وَلِلّٰهِ جُنُوۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿۷﴾

اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا
وَّنَذِيۡرًا ۙ﴿۸﴾

ہم نے تجھے گواہ اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے [۳۰۹۸]

لِّتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُعَزِّرُوۡهُ
وَتُوَقِّرُوۡهُ ؕ وَتُسَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً
وَّاَصِيۡلًا ﴿۹﴾

تاکہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو، اور اس کا ادب کرو اور صبح اور شام اس کی تسبیح کرو [۳۰۹۹]

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُبَايِعُوۡنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوۡنَ
اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ اَيۡدِيۡهِمۡ ۚ فَمَنۡ
نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنۡكُثُ عَلٰى نَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ
اَوۡفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيۡهُ اللّٰهَ فَسَيُؤۡتِيۡهِ

وہ لوگ جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ سے ہی بیعت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں کے اوپر ہے پس جو کوئی (یہ بیعت) توڑتا ہے وہ اپنی جان کے نقصان کے لیے ہی توڑتا ہے اور جو اسے پورا کرتا ہے جس پر اس نے اللہ سے عہد

ان کا ایمان بڑھا جس کا نتیجہ ان کا جنت کو حاصل کرنا ہے اور اسی ازدیاد ایمان کا نتیجہ ہی یہ ہوا کہ کفار اور منافقین کو ان کے ہاتھ سے سزا ملی جس کا ذکر آیت ۶ میں ہے۔

۳۰۹۸ آنحضرتؐ کا شاہد ہونا: یہاں آپ کی تین صفات بیان کی ہیں شاهد۔ مبشر۔ نذیر۔ مبشر نیکوں کو اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والوں کو خوش خبری دینے والا اور نذیر بدی کے بد انجام سے ڈرانے والا۔ پس شاہد یا گواہ وہ ہے جو اپنے نفس میں اللہ تعالیٰ کی ہستی اور نیکی کے نیک انجام کی گواہی دینے والا ہے۔ لیکون الرسول علیکم شهیدا دیکھو ۱۷۸

۳۰۹۹ توقروا۔ وقر کے لیے دیکھو ۹۲۶ اور توقیر کے معنی تعظیم ہیں یعنی عظمت کرنا اور ما لکم لا ترجون لله وقارا (نوح ۱۳:۷۱) میں وقار کے معنی عظمت ہیں (ل)

نبی کو بھیجنے کی غرض بتائی اور تعزیر (دیکھو ۱۱۶۵) اور توقیر اللہ تعالیٰ کی بھی ہو سکتی ہے اور نبی کی بھی اور آگے تسبحوہ میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے

ع ۹ أَجْرًا عَظِيمًا ⑩

کیا ہے تو وہ اسے بڑا اجر دے گا ۳۱۰۰

سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلْ فَمَن يَمْلِكُ لَكُم مِّنَ اللَّهِ شَيْـًٔا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۚ بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ⑪

دیہاتیوں میں سے پیچھے رہے ہوئے لوگ تجھ سے کہیں گے ہمیں ہمارے مالوں اور ہمارے گھر والوں نے مشغول رکھا سو ہمارے لیے بخشش مانگ۔ اپنی زبانوں سے وہ بات کہتے ہیں جو اُن کے دلوں میں نہیں ہے۔ کہہ، تو کون تمہارے لیے اللہ تعا کے مقابل میں کسی چیز کا اختیار رکھتا ہے اگر وہ تمھیں نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے یا تمھیں نفع پہنچانے کا ارادہ کرے بلکہ اللہ تعا اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے ۳۱۰۱

۳۱۰۰ یبایعون بیع کے لیے دیکھو ۳۵۲ اور مبایعۃ اور مشاراۃ خرید و فروخت دونوں پر بولے جاتے ہیں اور بایع السلطان کے معنی ہیں سلطان کیلئے طاعت کو لگانے کا عہد کیا اس کے عوض میں جو وہ اسے عطا کرتا ہے اور اسے بیعۃ اور مُبایَعۃ کہا جاتا ہے فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم بہ (التوبۃ ۹۔ ۱۱۱)

علیہُ میں ضمہ کی وجہ یہ دی گئی ہے کہ یہ ہائے ھُوَ کی ہائے ہے جو مفہوم ہے جیسے لَہٗ اور ضربہٗ میں اور اس میں اس عہد کی عظمت کی طرف اشارہ ہے، یہاں جس مبایعۃ یا بیعت کا ذکر ہے وہ بیعت الرضوان ہے جو حدیبیہ میں درخت کے نیچے ہوئی (۱۸) اور یہ بیعت اس پر تھی کہ آنحضرت صلعم کی نصرت کو نہ چھوڑیں گے گو موت بھی قبول کرنی پڑے یا یہ کہ قریش سے بھاگیں گے نہیں۔ اور آیت کے نزول سے پہلے یہ بیعت ہو چکی تھی اور یہاں فرمایا کہ وہ بذل طاعت کا عہد تجھ سے نہیں اللہ سے ہے گویا اصل طاعت تو اللہ تعالیٰ کی ہی ہے اور رسول درمیان میں واسطہ ہے جیسا کہ فرمایا من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (النساء ۴۔ ۸۰) اور ید اللہ فوق ایدیھم کے معنی ابن جریر نے دو طرح پر کیے ہیں ایک یہ کہ بیعت میں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر تھا یعنی وہ نبی کریم سے بیعت کر کے گویا اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ ید سے مراد قوت ہے اور معنی یہ ہیں کہ نصرت رسول میں اللہ کی طاقت ان کی طاقتوں سے بڑھکر ہے کیونکہ بیعت اسی بات پر کی تھی کہ وہ دشمن کے خلاف رسول اللہ صلعم کی نصرت کریں گے اور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کے ذکر سے جسم لازم نہیں آتا۔ بلکہ یہ صرف کنایہ کے طور پر ہے جیسے کہہ دیتے ہیں فلان بین انیاب المنیۃ وہ موت کے دانتوں کے درمیان ہے اور زجاج نے معنی کیے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ وفا یا ثواب میں ان کے اقرار طاعت والے ہاتھوں کے اوپر ہے اور مفردات راغب میں ہے کہ اولیاء اللہ کو ایدی اللہ کہا جاتا ہے اور اسی معنی میں یہاں ید اللہ ہے یعنی آنحضرت صلعم کے ہاتھ کو ید اللہ کہا ہے اور آپ کا ہاتھ چونکہ ان کے ہاتھوں کے اوپر تھا اس لیے فرمایا ید اللہ فوق ایدیھم اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے جو حدیث میں ہے لایزال العبد یتقرب الیّ بالنوافل حتی اُحِبَّہٗ فاذا اَحْبَبْتُہٗ کنتُ سمعہ الذی یسمع بہ وبَصَرہ الذی یُبْصِرُ بہ ویَدَہ التی یَبْطِشُ بھا یعنی بندہ نوافل کے ذریعہ سے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ پس جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان ہوتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہوتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہوتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور پھر دوسرے معنی بھی دیئے ہیں۔ یعنی یہ کہ ید اللہ سے مراد اس کی نصرت اور اس کی نعمت اور اس کی قوت ہے (غ)۔

۳۱۰۱ اعراب کی کمزوری: صلح حدیبیہ کے واقعہ سے کچھ ہی پہلے کفار قریش ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہو چکے تھے اور ابھی ان کی قوت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی اتنے میں رسول اللہ صلعم ایک رویا کی بنا پر عمرہ کے لیے نکلتے ہیں اور چودہ پندرہ سو کی تعداد میں مسلمان بھی ساتھ نکلتے ہیں جنگ پیش آ جانے کا خطرہ تو لگا ہوا ہی تھا۔ مدینہ کے اردگرد کے بعض دیہاتی لوگوں نے خیال کیا کہ اس حالت میں آپ کے ساتھ نکلنا خطرہ سے خالی نہیں گو آپ قربانیاں بھی ساتھ لے کر گئے تھے۔ ان قبائل کے نام جھینہ۔ مزینہ۔ غفار اشجع لکھے ہیں انہوں نے خیال کیا کہ یہاں گھر میں بیٹھے تو مسلمانوں کو کفار چھوڑتے نہیں پھر گھر سے باہر نکل کر خود ان کے گھر میں چلے جانا اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنا ہے اس کا ذکر اگلی آیت میں ہے اس لیے وہ ساتھ نہ گئے یہی مخلفین ہیں یہاں ان کی قلبی حالت کا نقشہ کھینچا ہے کہ واپسی پر عذر کریں گے کہ مالوں کا اور بال بچے کا محافظ کوئی نہ تھا۔ فرمایا کہ یہ جھوٹ ہے اور یہ جو فرمایا کہ فمن یملك تو مطلب یہ ہے کہ اس وقت تو تم مال اور اہل کی خاطر رک گئے لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے اعمال بد کی سزا آئے گی تو اس وقت اس سے کون چھڑائے گا۔ کان اللہ بما تعلمون خبیرا بتاتا ہے کہ نہیں ان کے اعمال کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دکھ اور سکھ کے لیے ارادہ آلٰہی تو تمہارے اعمال پر ہوتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی سزا آ جائے تو پھر اسے کوئی شخص دور نہیں کر سکتا۔

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚۖ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا ﴿١٢﴾

بلکہ تم نے خیال کیا تھا کہ رسولؐ اور مومن اپنے گھروالوں کی طرف کبھی بھی لوٹ کر نہیں آئیں گے اور یہ تمہارے دلوں کو اچھا معلوم ہُوا اور تم بُرا خیال دل میں لائے۔ اور تم ہلاک شدہ قوم تھے۔

وَ مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿١٣﴾

اور جو کوئی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ پر ایمان نہیں لاتا، تو ہم نے کافروں کے لیے بھڑکائی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٤﴾

اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے وہ جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ٣١٠٢ع

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٥﴾

جب تم غنیمت کے حاصل کرنے کے لیے جاؤ گے تو پیچھے رہے ہوئے لوگ کہیں گے ہمیں اپنے ساتھ جانے دو۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل دیں ۔۔ کہہ، تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پہلے سے فرما دیا ہے، تو کہیں گے بلکہ تم ہم پر حسد کرتے ہو بلکہ یہ خود بہت ہی کم سمجھتے ہیں ٣١٠٣ع

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ

پیچھے رہے ہوئے دیہاتیوں سے کہہ دے کہ تم ایک

٣١٠٢ع عذاب میں رحمت: باوجود اس کے کہ جسے چاہے بخشے جسے چاہے عذاب دے آخر پر صفات غفور رحیم کا ہی ذکر کیا جس سے نہ صرف یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا رحم اس کے غضب پر سبقت لے گیا ہے بلکہ یہ بھی کہ اس کا عذاب دنیا بھی انسان کی بہتری کیلئے ہے یعنی وہ ایسی چیز ہے کہ انجام کار انسان کی بھلائی کا موجب ہے پس اسکا عذاب بھی بتقاضائے رحم ہی ہے جو انجام کار اس پر ہوگا:

٣١٠٣ع تبدیل کلام اللہ سے مراد: یہ سورت آنحضرت صلعم پر حدیبیہ سے واپسی کے وقت نازل ہوئی اور وہ باتیں جن کا یہاں ذکر ہے بطور پیشگوئی ہیں جو بعد میں واقع ہونے والی تھیں اور وہ مغانم جن کی طرف یہاں مسلمانوں کے جانے کا ذکر ہے جنگ خیبر سے تعلق رکھتے ہیں جیسا کہ آیت ١٨، ١٩ میں فرمایا کہ بیعت رضوان والوں کو ہم نے بعض خاص مغانم کا وعدہ دیا ہے اور یہ خیبر کے مغانم تھے مجاہد اور قتادہ سے یہی روایت ہے اور ابن جریر نے اور دیگر مفسرین نے اس کو صحیح مانا ہے اور صحیح احادیث میں یہ موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب حدیبیہ سے مغانم خیبر کا وعدہ کیا تھا (ر) اور مخلفین کا یہ کہنا کہ ہم بھی ساتھ چلیں اس وعدہ الٰہی کے خلاف تھا کیونکہ وہ وعدہ صرف بیعت رضوان والوں سے مخصوص تھا اس لیے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو بدلنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے وہی وعدہ مراد ہے جس کا ذکر آگے آیت ١٨ میں ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تبدیل کلام اللہ سے مراد اس میں تحریف نہیں بلکہ ان وعدوں کا پورا نہ ہونا ہے جو اس میں ہیں۔ اور یہ جو فرمایا کذلکم قال اللہ من قبل تو اس سے مراد ہے کہ تمہاری طرف واپس آنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا تھا کیونکہ سورت رستے میں ہی نازل ہوئی تھی اور مخلفین کے ساتھ یہ معاملہ بعد میں پیش آیا اور جن لوگوں نے اس سے اشارہ اس آیت کی طرف لیا ہے قل لن تخرجوا معی ابدا ولن تقاتلوا معی عدوا (التوبۃ ٩ - ٨٣) تو انہوں نے غلطی کی ہے اس لیے کہ یہ قول غزوۂ تبوک سے تعلق رکھتا ہے جو حدیبیہ کے تین سال بعد پیش آیا اور اسی وقت ہی سورۂ توبہ کا بھی نزول ہوا تھا پس مطلب ان الفاظ کا یہ ہے کہ جب مخلفین جنگ خیبر میں نکلنے کے وقت یہ کہیں کہ ہمیں بھی ساتھ لے چلو تو اس وقت ان کو کہہ دینا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں پہلے سے ہی اطلاع دے چکا ہے کہ تم اس میں ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے:

سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶﴾

سخت جنگ کرنے والی قوم کی طرف بلائے جاؤ گے، ان کے ساتھ جنگ کرو گے یہاں تک کہ وہ فرمانبردار ہو جائیں پس اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمھیں اچھا بدلہ دے گا، اور اگر تم پھر جاؤ گے، جس طرح تم پہلے پھر گئے، تو تمھیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا ۳۱۰۴ع

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾ ع ۲

اندھے پر کوئی تنگی نہیں اور نہ لنگڑے پر تنگی ہے اور نہ بیمار پر تنگی ہے۔ اور جو شخص اللہ (تعالیٰ) اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے، اُسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اور جو کوئی پھر جائے اسے دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔

لَقَدْ رَضِىَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِىْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾

یقیناً اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہُوا، جب وہ درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے، سو اس نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا، پس ان پر تسکین نازل کی — اور انھیں بدلے میں ایک قریب فتح دی ۳۱۰۵ع

ع۳۱۰۴ یہ قوم کون ہے؟ فارس وروم۔ ہوازن وغطفان۔ بنو حنیفہ مختلف نام لیے گئے ہیں اور گو جیسا کہ ابن جریر نے لکھا ہے صحیح یہی ہے کہ جب قرآن شریف میں نام نہیں اور نہ کسی حدیث صحیح میں تو ہم بھی تعین نہیں کر سکتے لیکن اس قوم کا ذکر ان الفاظ میں کہ وہ اولی باس شدید ہے یعنی سخت جنگ کرنیوالی قوم صاف بتاتا ہے کہ یہ عرب سے باہر کی اقوام ہیں یعنی فارس وروم کیونکہ ان دونوں طاقتوں سے عرب کے لوگ خائف تھے اور گو وہ برائے نام آزاد تھے۔ مگر فارس وروم کی سلطنتیں جو کچھ چاہتیں ان کے ملک کے اندر کر سکتی تھیں اور عرب کے بعض حصوں پر بھی قابض تھیں یہ بڑی عظیم الشان اور پرانی بادشاہتیں تھیں اور زبردست مسلح اور قواعد دان فوجیں رکھتی تھیں او یسلمون میں یہ خوش خبری دی ہے کہ ان کے ساتھ جنگوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ فرمانبردار ہو جائیں گے اور اَوْ بمعنی حتی ہے اس سے یہ مراد لینا کہ یا وہ مسلمان ہو جائیں گے یا ان سے لڑائی کرو گے بے معنی سی بات ہے اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکلنا کہ تلوار اور اسلام ان کے سامنے پیش کیے جائیں گے ساری تعلیم قرآنی اور اصول دین کو باطل کرنا ہے جو کتاب لا اکراہ فی الدین کی تعلیم کھلے الفاظ میں پیش کرتی ہے جو جنگ کو جائز نہیں ٹھہراتی جب تک کہ دشمن ابتدا نہ کرے وہ یہ تعلیم نہیں دے سکتی کہ لوگوں کے سامنے تلوار اور اسلام کو پیش کرو؛

ع۳۱۰۵ اسی آیت کی وجہ سے اس بیعت کا نام بیعت الرضوان مشہور ہے اور یہ حدیبیہ کے مقام پر ایک سمرہ یعنی کیکر کے درخت کے نیچے ہوئی۔ اصحاب بیعت رضوان کی تعداد تیرہ سو۔ چودہ سو اور پندرہ سو بیان کی گئی ہے اور صحیح چودہ سو ہی ہے واقعات اس بیعت کے یہ ہیں کہ جب آنحضرت صلعم ذیقعد ۶ھ کی پہلی تاریخ مدینہ سے ایک رؤیا کی بنا پر نکل کر عمرہ کے ارادہ سے حدیبیہ کے مقام پر پہنچے جو مکہ سے ۹ میل ہے تو آپ نے ایک شخص خراش نام کو قریش کے پاس اس غرض کے لیے بھیجا کہ انہیں اطلاع دے کہ آپ صرف عمرہ کے لیے آئے ہیں اور کوئی غرض نہیں تاکہ ان کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ مگر انہوں نے اس کے اونٹ کو مار ڈالا اور خود اسے مار دینا چاہتے تھے مگر بعض لوگوں نے روک دیا۔ تب آپ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا مگر قریش نے ان کی بات کو بھی نہ سنا اور کہا کہ خود طواف کرنا چاہتے ہو تو کر لو۔ انہوں نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلعم کے بغیر نہیں کر سکتا۔ تب انہوں نے حضرت عثمان کو قید کر دیا۔ ادھر رسول اللہ صلعم اور مسلمانوں کو یہ خبر پہنچی کہ حضرت عثمانؓ قتل ہو گئے ہیں اور آپ نے فرمایا کہ ہم نہیں جائیں گے جب تک ان سے بدلہ نہ لے لیں اور ایک منادی نے آواز دی کہ روح القدس آنحضرت صلعم پر نازل ہوئی ہے۔ اور آپ کو بیعت لینے کا حکم دیا ہے چنانچہ لوگوں نے آپ سے بیعت کی (ر) اور بخاری میں ہے کہ یہ بیعت موت پر تھی اور مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ اس بات پر تھی کہ ہم بھاگیں گے نہیں اور بخاری میں سعید بن المسیب کا قول ہے کہ جب اگلے سال ہم نکلے تو اس درخت کا ہمیں پتہ نہ ملا؛

وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۱۹

اور بہت سے مالِ غنیمت جنھیں وہ لیں گے، اور اللہ تعا غالب حکمت والا ہے۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝۲۰

تمھارے ساتھ اللہ تعا نے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جنھیں تم لو گے پھر یہ تم کو جلدی دلوا دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے اور تاکہ مومنوں کے لیے نشان ہو اور تمھیں سیدھے رستے پر چلائے ۳۱۰٦ع

وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝۲۱

اور اور (فتوحات) بھی ہیں جن پر تمھیں قدرت نہیں تھی اللہ تعا نے ان کا بھی احاطہ کر لیا ہے اور اللہ تعا ہر چیز پر قادر ہے ۳۱۰۷ع

بیعت سے قوت کا پیدا ہونا: اس بیعت کا نتیجہ بیان فرمایا ہے فانزل السکینۃ علیہم یعنی انہیں اطمینان خاطر حاصل ہوا اور ان کے قلوب پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے سکینت نازل ہوئی۔ اور ان کے دل مضبوط ہو گئے اور ہر قسم کا خوف ان کے دلوں سے جاتا رہا اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود ایک طاقتور دشمن کے عین گھر میں ہونے کے اس قدر دشمن کے بے رعبی ان کے دلوں میں تھی کہ وہ ان شرائط صلح پر بھی راضی نہ تھے اور مرنے مارنے کو تیار تھے اور علم ما فی قلوبہم میں اشارہ ان کے صدق و اخلاص کی طرف ہے اور اثابہم فتحا قریبا میں جس قریبی فتح کا ذکر ہے وہ فتح خیبر ہے جو کہ حدیبیہ سے واپسی کے جلد بعد ہی ظہور میں آگئی جیساکہ ابن عباس قتادہ وغیرہما سے مروی ہے اور حسن نے فتح ہجر کہا ہے اور صحیح بخاری میں ہے کہ اہل بحرین سے آپ نے صلح کی اور مجوس ہجر سے جزیہ لیا (ر) مگر پہلا قول صحیح ہے کیونکہ آگے آیت ۲۷ میں صاف فرمایا فجعل من دون ذلک فتحا قریبا یعنی یہ فتح قریب خانہ کعبہ کی زیارت اور طواف سے پہلے پہلے ہوگی دیکھو نوٹ ۳۱۱۳ع جہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ عمرہ کے لیے نکلنے سے پیشتر آپ خیبر کو فتح کر چکے تھے اور اگلی آیت میں مغانم کثیرہ سے مراد مغانم خیبر ہیں جیساکہ احمد کی حدیث میں ہے (ر) یا فتح قریب سے مراد فتح خیبر ہے اور مغانم کثیرہ میں اشارہ اور فتوحات کی طرف ہے جیسے فتح مکہ حنین وغیرہ میرے نزدیک دوسری بات کو ترجیح ہے دیکھو اگلا نوٹ۔ آنحضرت صلعم کا اس موقعہ پر صحابہؓ سے بیعت لینا حالانکہ وہ نہ صرف سچے دل سے مسلمان تھے بلکہ اسلام کیلئے اپنا سب کچھ فدا کر چکے تھے اور بارہا اپنی جانیں اور سر بھی خدا کی راہ میں پیش کر چکے تھے بتاتا ہے کہ بعض وقت خاص ضروریات کے لیے بھی بیعت کی ضرورت واقع ہو جاتی ہے یہ وہ بیعت نہیں جو عام طور پر صوفیا لیتے ہیں بلکہ ایک خاص غرض کیلئے بیعت لی گئی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت لی گئی جیساکہ ان الفاظ سے ظاہر ہے جو اوپر نقل ہوئے کہ روح القدس نے آپ پر نازل ہو کر آپ کو حکم دیا ہے کہ بیعت لیں اسی طرح اگر اس امت میں کوئی مجدد اللہ تعالیٰ کیطرف سے مامور ہو کر اسی کے حکم کے ماتحت بیعت لے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ لبیک کہیں یہ بیعت ایک قوت پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہے جیسے یہاں بھی اس بیعت پر اللہ تعالیٰ نے سکینت نازل فرمائی اسی قبیل سے وہ بیعت ہے جو اس صدی کے مجدد اور اس امت کے مسیح نے لی جسکی غرض صرف ایک قوی جماعت کا تیار کرنا ہے جو عیسائیت کا مقابلہ کرے اور کسر صلیب کے کام کو اتمام کو پہنچائے ؁

صحابہ کے اخلاص کی سند: قرآن کریم کے ایسے ایسے صریح الفاظ کے ہوتے ہوئے کہ اللہ تعالےٰ ان مومنوں پر راضی ہے جنھوں نے شجرہ کے نیچے بیعت کی اہل تشیع کا صحابہ کے متعلق نفاق وغیرہ کے الفاظ منہ پر لانا کلام الٰہی کا صریح مقابلہ ہے کیا ان میں ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ نہ تھے بلکہ عثمانؓ کی طرف سے آنحضرت صلعم نے اپنا ہاتھ ہاتھ پر رکھا اس لیے کہ وہ اُس وقت اہل مکہ کی قید میں تھے اور انہی کے متعلق خبر کی وجہ سے اس بیعت کی ضرورت پیش آئی تھی ؁

۳۱۰٦ع یہاں پھر دوہرایا ہے کہ ایک مغانم کثیرہ ہیں اور دوسری وہ فتح ہے جو جلد عطا فرمائی اور مغانم کثیرہ سے مراد وہی فتوحات مکہ حنین وغیرہ ہیں جن کا ذکر اوپر بھی ہو چکا ہے اور عجل لکم ھذہ والی فتح فتح قریب ہے یعنی خیبر اور یہ دوہرانا تاکید کے لیے ہے اور کف ایدی الناس عنکم میں بتایا کہ اب قریش تم کو تکلیف نہ پہنچا سکیں گے کیونکہ اس سے پہلے وہ تین حملے مدینہ پر کر چکے تھے گویا بتا دیا کہ ان کے حملوں کا اب خاتمہ ہے اور یا کف ایدی الناس عنکم میں اشارہ صلح حدیبیہ کی طرف ہے جیساکہ آیت ۲۴ میں ذکر ہے بلکہ صلح حدیبیہ نے ویسے بھی دشمنی کا خاتمہ کر دیا کیونکہ پہلے کفار مسلمانوں کو ایذا پہنچاتے تھے اب صلح کی وجہ سے ان ایذاؤں کا خاتمہ ہوا اسی لیے اس کو آیت کہا ہے اور ہدایت صراط مستقیم قرار دیا ہے کیونکہ اس سے اسلام پھیلا اور یوں آیت ۲ کے مضمون کی تائید اس سے ہوتی ہے ؁

۳۱۰۷ع یہ اور فتوحات جن کو یہاں لم تقدروا علیہا فرمایا ہے فتوحات فارس و روم و دیگر ممالک ہیں لم تقدروا علیہا اس لیے کہا کہ عرب کی کیا مجال تھی کہ ان ممالک کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے وہ خود بھی ان سلطنتوں سے اس قدر مرعوب تھے کہ ان کے چند سپاہی ملک کے اندر آکر جسے چاہتے پکڑ لیتے تو وہ عذر نہ کرتے تھے یوں اس سورت میں اگر ایک طرف یہ خوش خبری سنائی کہ صلح قایم ہو کر اسلام کی ترقی کی راہ نکل آئی تو دوسری طرف یہ بھی بتا دیا کہ فتوحات ملکی کا بھی مسلمانوں کو وعدہ دیا جاتا ہے جو صرف ملک عرب تک محدود نہ ہونگی بلکہ ان مقامات پر بھی ہونگی جن کا وہم و گمان بھی عرب کے لوگوں کو نہ ہو سکتا تھا ؁

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۲۲﴾

اور اگر وہ جو کافر ہیں تمھارے ساتھ جنگ کرتے تو پیٹھیں پھیر دیتے، پھر وہ نہ کوئی دوست پاتے اور نہ کوئی مددگار ۳۱۰۸ع

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

اللہ تعالیٰ کا قانون ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے، اور تو اللہ تعالیٰ کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔

وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿۲۴﴾

اور وہی ہے جس نے ان کے ہاتھوں کو تم سے اور تمھارے ہاتھوں کو ان سے وادی مکّہ میں روک رکھا بعد اس کے کہ تمھیں ان پر فتح دی اور اللہ (تعالیٰ) جو تم کرتے ہو، اسے دیکھنے والا ہے ۳۱۰۹ع

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ وَلَوْلَا رِجَالٌ

وہی ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تمھیں مسجد حرام سے روک دیا اور قربانی کو بھی جو روکی گئی کہ اپنے ٹھکانے پر پہنچے ۳۱۱۰ع اور اگر مومن مرد اور مومن

ع۳۱۰۸ یہاں بتایا کہ گو مصلحت الٰہی سے صلح ہو گئی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان خائف تھے یا جنگ پیش آتی تو وہ بھاگ اٹھتے۔ اگر کافر ان کے ساتھ جنگ کرتے تو وہی پیٹھ دکھاتے جیسا کہ پہلے بھی کافر ہی بھاگتے رہے بلکہ اگلی آیت میں فرمایا کہ ہمیشہ سے یہی اللہ کا قانون ہے کہ انبیاء اللہ کے ساتھ جنگ کرنے والے ہی شکست کھاتے ہیں۔

ع۳۱۰۹ اس آیت میں دونوں فریقوں کے جنگ سے رکے رہنے کا ذکر ہے حالانکہ کفار نے تو مسلمانوں کے قاصدوں تک کو گرفتار کر کے جنگ کے لیے تیاری ظاہر کی اور مسلمان بھی ان سخت شرائط کو ناپسند کرتے تھے مگر مصلحت الٰہی کا یہی تقاضا ہوا کہ جنگ نہ ہو اور صلح کی بنیاد پڑ کر ایک طرف خونریزی کا خاتمہ ہو اور دوسری طرف اسلام ترقی کرے اور من بعد ان اظفرکم علیھم میں یا تو اشارہ سابقہ فتوحات اسلامی کی طرف ہے اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے اور یا اس چھوٹے سے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو خود حدیبیہ میں پیش آیا۔ کہ قریش کے اَسّی آدمیوں نے چھپ کر آنحضرت صلعم پر حملہ کرنا چاہا تھا مگر خود قید ہو گئے اور آنحضرت صلعم نے بالآخر انہیں معاف کر دیا۔

ع۳۱۱۰ معکوف۔ عکوف دیکھو ع۱۵۹ گویا اپنے آپ کو کسی امر پر روک لینا ہے اس لیے معکوف کے معنی مَحْبُوس۔ مَمْنُوع ہیں یعنی روکی گئی (غ)۔

آنحضرت کا روکا جانا اور شرائط صلح حدیبیہ: یہاں بتایا ہے کہ کفار نے کس حالت میں آنحضرت صلعم کو روکا حالانکہ خانہ کعبہ سے کبھی کسی کو روکا نہ گیا تھا اور سخت ترین دشمن بھی حج کے ایام میں حرم میں آ سکتے تھے مگر آنحضرت صلعم کی عداوت اس قدر ان کے دلوں میں ترقی کر گئی تھی کہ باوجود قربانیاں ساتھ ہونے کے اور باوجود یہ علم ہو جانے کے کہ سوائے زیارت و طواف بیت اللہ کے اور آپ کا کچھ منشا نہیں حرم کی حد پر پہنچے ہوئے چودہ سو آدمیوں کو حج سے روک دیا گیا آخر جب قریش کو علم ہوا کہ مسلمان مرنے مارنے پر تیار ہیں تو سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا مگر ساتھ یہ شرط لگا دی کہ اس سال حج کی اجازت ہرگز نہ دی جائیگی۔ سہیل کیساتھ جو شرائط طے ہوئیں وہ حسب ذیل تھیں اور یہ معاہدہ دس سال کے لیے تھا۔ (۱) مسلمان اس سال بغیر حج کیے واپس چلے جائیں (۲) اگلے سال آئیں مگر تین دن سے زیادہ مکّہ میں قیام نہ کریں (۳) مکہ میں جو مسلمان ہیں ان کو ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہنا چاہے تو اسے نہ روکیں (۴) مکہ والوں میں سے اگر کوئی شخص مدینہ جائے تو مسلمان پابند ہونگے کہ اس کو واپس کر دیں لیکن اگر مسلمانوں میں سے کوئی مکہ چلا جائے تو قریش اسے واپس نہ کریں گے (۵) قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ جس فریق کے ساتھ چاہیں شریک معاہدہ ہو جائیں۔

ابھی معاہدہ لکھا نہ گیا تھا کہ ابوجندل جو سہیل کے فرزند تھے اور مکہ میں اسلام لا چکے تھے پہنچے اور اپنی حالت زار رسول اللہ صلعم کو دکھائی۔ آنحضرت نے بہتیرا چاہا کہ وہ معاہدہ سے مستثنےٰ ہوں مگر سہیل نہ مانا۔ معاہدہ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کا لکھنا بھی سہیل نے نہ مانا۔ محمد رسول اللہ کے لفظ کٹوا کر محمد بن عبداللہ لکھوایا گیا حج کرنا نہ ملا۔ حکم ہوا کہ اسی جگہ قربانیاں کر کے واپس چلو۔ ان سب باتوں کی وجہ سے مسلمان سخت مغموم تھے حضرت عمرؓ نے جرات کر کے آنحضرت صلعم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ رسول برحق نہیں فرمایا یقیناً ہوں پھر کہا کیا ہم حق پر نہیں فرمایا ہیں کہا پھر دین میں ہم پر ایسی ذلت کیوں ڈالی جاتی ہے آپ نے فرمایا میں خدا کے حکم کے مطابق کرتا ہوں۔ اس واقعہ کے بعد سورۂ فتح نازل ہوئی جس سے مسلمانوں کے سارے غم اور پریشانیاں دور ہو گئیں۔

مُؤْمِنُونَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَنْ تَطَـُٔوهُمْ فَتُصِيبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِي رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۲۵﴾

عورتیں نہ ہوتیں جنھیں تم نہیں جانتے ، کہ تم انھیں پامال کردو گے پھر تمھیں ان کی وجہ سے لاعلمی میں کوئی نقصان پہنچ جائے ، تاکہ اللہ (تعالیٰ) جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے ۔ اگر وہ الگ ہو جاتے تو جو ان میں سے کافر تھے ہم انھیں دردناک عذاب میں مبتلا کرتے ۳۱۱۱

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهٗ عَلٰى رَسُولِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوٓا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿۲۶﴾ ع ۳

جب کافروں نے اپنے دلوں میں ضد ٹھان لی (اور) ضد بھی جاہلیت کی ، تو اللہ (تعالیٰ) نے اپنے رسولؐ پر اور مومنوں پر تسکین اتاری اور انھیں تقوٰے کی بات پر جمائے رکھا اور وہ اسی کے زیادہ حق دار اور اسی کے اہل تھے اور اللہ (تعالیٰ) ہر چیز کو جاننے والا ہے ۳۱۱۲

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِينَ ۙ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ ۙ لَا تَخَافُونَ ۚ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِنْ دُونِ

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو خواب سچ کر دکھایا ۔ اگر اللہ (تعالیٰ) نے چاہا تو تم ضرور مسجد حرام میں امن کے ساتھ داخل ہو گے اپنے سر منڈوانے اور بال کٹواتے ، کچھ خوف نہ کرو گے ۔ سو وہ جانتا ہے جو تم نہیں جانتے ، پس اس سے پہلے ایک

۳۱۱۱ یہاں بتایا ہے کہ مکہ میں کچھ مومن بھی تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ جنگ نہ ہو کیونکہ جنگ میں وہ بھی پامال ہو جاتے اور ان کا مارا جانا قومی نقصان یا مسلمانوں کا اپنا ہی نقصان تھا اس لیے فرمایا فتصیبکم منہم معرۃ اور یہ فی الواقعہ ایک اور رنگ کا بھی نقصان تھا کیونکہ انہی لوگوں کی تحریک سے پھر دوسرے لوگ بھی کثرت سے اسلام میں داخل ہوئے اگر لڑائی ہو جاتی تو اسلام کی ترقی میں بڑی بھاری رکاوٹ پیدا ہو جاتی اس کی طرف اشارہ لیدخل اللہ فی رحمتہ میں ہے۔ مفسرین نے یہاں افسوس اور رنج جو مسلمانوں کو اس وجہ سے پہنچے گا یا ان کے قتل کا گناہ یا دیت کا دینا۔ یا کفار کی طعنہ زنی کہ مسلمانوں نے اپنے بھائیوں کو مار ڈالا مراد لیے ہیں۔ مگر صرف پہلی وجہ درست ہو سکتی ہے باقی باتیں قابل قبول نہیں اور لیدخل اللہ فی رحمتہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جنگ کو روک دینا صرف اس لیے تھا کہ تا بہت سے لوگوں کو اپنی رحمت میں داخل کرے یعنی اسلام کی توفیق دے اور آخری الفاظ میں بتایا ہے کہ مومنوں اور کافروں کا ملا ہوا ہونا کافروں کے بھی بچاؤ کا موجب ہو گیا اگر مومن ان میں ملے ہوئے نہ ہوتے تو جنگ ہو کر ہلاک ہو جاتے ؛

۳۱۱۲ حمیۃ قوت غضبیہ کا جوش ہے ۱۲۸۸ اور انفۃ یعنی عار اور غیرت کے معنی میں بھی آتا ہے (ل) اور یہاں مراد ان کا اصرار ہے کہ اس سال آنحضرت صلعم اور مسلمان حج نہ کریں حالانکہ صلح بھی ہو گئی پھر بھی شرط یہی ٹھہرائی کہ حج کئے بغیر واپس جائیں کیونکہ انہوں نے صاف کہا تھا کہ اگر ہم حج کرنے دیں گے تو اہل عرب ہم پر طعن کریں گے کہ مسلمان اپنی طاقت کے بل بوتے پر حج کر کے چلے گئے اس لیے اس کو حمیۃ الجاہلیۃ کہا ہے یعنی کوئی سچی غیرت نہ تھی بلکہ جھوٹی شیخی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کلمۂ تقویٰ پر لگا دیا یعنی انہوں نے خونریزی سے بچنے کیلئے اس ذلت کو برداشت کر لیا یہی کلمۂ تقویٰ تھا اور اللہ تعالیٰ نے یہاں مسلمانوں کی تعریف کی ہے کہ وہ واقعی اس بات کے حقدار اور اہل تھے مفسرین نے کلمۂ تقویٰ سے مراد لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو لیا ہے مگر سیاق اس معنی کو نہیں چاہتا ؛

ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿٢٧﴾
هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى
وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ
كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿٢٨﴾
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ
اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ
تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا
مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ

قریب فتح عطا کی ٣١١٣ء
وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین
کے ساتھ بھیجا، تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے
اور اللہ تعالیٰ گواہ بس ہے ٣١١٤ء
محمد (صلعم) اللہ تعالیٰ کا رسول ہے اور جو اس کے ساتھ ہیں
کافروں کے مقابلہ میں قوی آپس میں رحم کرنے والے،
تو انھیں رکوع کرتے ہوئے سجدہ کرتے ہوئے دیکھتا ہے وہ
اپنے رب کا فضل اور اس کی رضا چاہتے ہیں ان کا نشان اُن

٣١١٣ء صدق۔ یہاں صدق بالفعل سے مراد ہے یعنی ایک امر کا تحقق مطلب یہ ہے کہ آپ کے رویا کو سچا کر دیا (غ) محلقین۔ حلق عضو معروف ہے اور حلقہ کے معنی ہیں اس کا حلق کاٹ دیا۔ پھر بالوں کے کاٹنے (یعنی منڈوانے پر اس کا استعمال ہوتا ہے ولا تحلقوا رؤسکم (غ) اور حلقوم کے معنی بھی حلق ہی ہیں۔ فلولا اذا بلغت الحلقوم (الواقعۃ ٥٦-٨٣) (ل)

آنحضرت صلعم کی رویائے طواف بیت اللہ: آنحضرت صلعم مدینہ میں تھے کہ آپؐ نے خواب دیکھا کہ آپ مکہ میں داخل ہوئے ہیں اور خانہ کعبہ کا طواف کیا ہے۔ پس آپؐ نے اپنے صحابہؓ کو اس کی خبر دی پھر جب آپ حدیبیہ کے سال نکلے تو ان میں سے کسی جماعت کو شک نہیں تھا کہ یہ رویا اسی سال پوری ہو گی لیکن جب صلح ہو گئی اور آپ لوٹ آئے تو صحابہ کے دلوں میں کچھ خیال گذرا کہ ایسا کیوں ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے اس کے بارے میں سوال کیا اور کہا کیا آپ نے نہ فرمایا تھا کہ ہم خانہ کعبہ میں جائیں گے اور اس کا طواف کریں گے آپؐ نے فرمایا ہاں لیکن کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسی سال حج کریں گے۔ عرض کیا نہیں تب فرمایا کہ یقیناً تم خانہ کعبہ پہنچو گے اور اس کا طواف کرو گے (ث) اور ایک روایت میں ہے کہ ایک فرشتہ آنحضرت صلعم پر آیا اور اس نے کہا لتدخلن الخ (د) اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم نے رویا میں صرف اس قدر دیکھا تھا کہ آپ خانہ کعبہ کا طواف کریں گے اور یہ محض اجتہاد تھا کہ اسی سال طواف ہوگا لیکن آپ چودہ سو آدمی کے ساتھ اسی رویا کی بنا پر نکلے اور آخر واقعات نے بتایا کہ اس رویا کا پورا ہونا آئندہ سال پر مقدر تھا اس سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں اول یہ کہ جو خواب یا الہامات بطور پیشگوئی ہوں ان میں سب تفصیلات پر آنحضرت صلعم کو بھی مطلع نہ کیا جاتا تھا۔ دوم یہ کہ خواب یا الہام کی تعبیر میں اجتہادی غلطی نبی سے بھی ہو سکتی ہے۔ (لیکن شریعت میں نبی سے اجتہادی غلطی نہیں ہو سکتی) جس کی اصلاح بعد میں اللہ تعالیٰ کے فعل سے ہو جاتی ہے سوم یہ کہ ملہم کا اپنے اجتہاد کو صحیح یقین کر کے کسی فعل کا کر لینا جائز ہے جیسا کہ آنحضرت صلعم نے یہ یقین کر کے کہ حج اسی سال ہوگا چودہ سو آدمیوں کے ساتھ سفر اختیار کیا ؏

یہ سورت تو اس وقت نازل ہوئی جب آپ حدیبیہ سے واپس آ رہے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ساتھ یقین دلایا کہ رسول اللہ صلعم کا وہ رویا سچا اور منجانب اللہ تھا اور پورا ہو کر رہے گا۔ اور مسلمان امن کی حالت میں خانہ کعبہ میں جائیں گے یہاں تک کہ حج کر کے سر منڈوا کر یا بال چھوٹے کرا کر حالت احرام سے باہر نکلیں گے اور کسی کا خوف نہیں ہوگا اور اس سے پہلے پہلے ایک فتح قریب آپ کو حاصل ہو گی۔ یہ فتح قریب جیسا کہ نوٹ ٣١٠٦ء میں دکھایا جا چکا ہے فتح خیبر تھی۔ آنحضرت صلعم حدیبیہ سے ذیقعد ٦ھ میں واپس ہوئے اور ذوالحج اور محرم مدینہ میں ٹھہرے اور صفر ٧ھ میں خیبر کی طرف نکلے اور اللہ تعالیٰ نے اسے آپ کے ہاتھ پر ایک حصہ کو بزور شمشیر اور ایک حصہ کو صلح سے فتح کرایا اور اس میں صرف وہی لوگ گئے اور انہی پر مال غنیمت بھی تقسیم ہوا جو بیعت الرضوان میں شامل تھے اور نبی کریم صلعم جب دوبارہ عمرہ کو نکلے تو مکہ کے قریب پہنچ کر آپ نے ہتھیار ایک جگہ چھوڑ دیئے اور سرداران کفار غیظ و حسد کی وجہ سے مکہ سے باہر نکل گئے تاکہ اس نظارہ کو نہ دیکھیں کہ رسول اللہ صلعم کس شان و شوکت سے اس پاک گھر کا طواف کر رہے ہیں جہاں سے کفار نے آپ کو نکال دیا تھا لیکن لکھا ہے کہ عورتیں اور بچے بازاروں میں اور کوٹھوں پر جمع تھے اور رسول صلعم کو دیکھ رہے تھے۔ اور عبداللہ بن رواحہ انصاری آپ کی اونٹنی کی باگ پکڑے ہوئے شعر پڑھ رہے تھے جن میں آتا ہے۔ خلوا بنی الکفار عن سبیلہ اور حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی صلعم طواف کعبہ میں اور صفا اور مروہ کے درمیان دوڑے تاکہ مشرکوں کو معلوم ہو جائے کہ آپ قوت رکھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کافر کہا کرتے تھے کہ یثرب کے بخار نے آنحضرت صلعم کے ساتھیوں کو کمزور کر دیا ہے اسی لیے آپ نے حکم دیا تھا کہ پہلے تین طوافوں میں لوگ دوڑ کر چلیں (ث) ؏

٣١١٤ء اس آیت میں یہ توجہ دلائی ہے کہ ایک کفار عرب پر ہی اسلام کا غلبہ مقدر نہیں بلکہ دنیا کے سب مذاہب پر یہ مذہب غالب آ کر رہیگا اور اللہ کی گواہی کا ذکر اس لیے کیا کہ ظاہر حالات بسا اوقات اس کے مخالف نظر آئیں گے ؏

وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ
مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۛۖ وَ مَثَلُهُمْ فِی
الْاِنْجِيْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ
فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی
سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ
الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً
ع ۳ / ۱۲ وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ ع

کے مونہوں پر سجدوں کے اثر سے ظاہر ہے ۳۱۱۵ یہ ان کی
مثال تورت میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں، کھیتی کی
طرح، جس نے اپنی سوئی نکالی پھر اُسے مضبوط
کیا، سو وہ موٹی ہوئی، پھر اپنی نالوں پر سیدھی
کھڑی ہوگئی کسانوں کو خوش کرتی ہے تا کہ
ان کی وجہ سے کافروں کو غضب میں لائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں
سے ان لوگوں سے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے
ہیں حفاظت اور بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے ۳۱۱۶

۳۱۱۵ اشداء۔ شدید کی جمع ہے اور شِدّۃ قوت اور بہادری کو بھی کہتے ہیں اور شدید قوی آدمی کو کہتے ہیں (ل) شِدّۃ کا استعمال عقد میں بھی ہے اور بدن میں بھی اور قوائے نفس میں بھی اور عذاب میں بھی کانوا اشد منھم قوۃ (الروم ۳۰ - ۹) علمہ شدید القوٰی (النجم ۵۳ - ۵) غلاظ شداد (التحریم ۶۶ - ۶) باسھم بینھم شدید (الحشر ۵۹ - ۱۴) فی العذاب الشدید (ق ۵۰ - ۲۶) اور شدید بخیل کو بھی کہتے ہیں گویا کہ وہ باندھ دیا گیا ہے وانہ لحب الخیر لشدید (العادیات ۱۰۰ - ۸) (غ) رحماء۔ رحیم کی جمع ہے۔

صحابہ کے اوصاف جلیلہ: محمد رسول اللہ یا تو یہ پورا جملہ علیحدہ ہے جب غلبہ دینی کا ذکر کیا تو یہ بھی بتا دیا کہ وہ غلبہ دینی محمد صلعم کی رسالت سے ہی وابستہ تھا۔ اور یا جب ہدایت اور دین حق دیکر رسول بھیجنے کا ذکر کیا تو بتا دیا کہ اس رسول کا نام محمدؐ ہے پھر آپ کے ساتھیوں کا ذکر کیا اور ان کے بعض اوصاف بیان کیے پہلا اشداء علی الکفار ہے اس کے معنی کافروں پر سختی کرنے والے نہیں بلکہ کفار کے مقابل پر قوی اور مضبوط ہیں جیسے اعزۃ علی الکافرین یعنی اُن سے مرعوب نہیں ہو جاتے اُنکے اثر کو قبول نہیں کرتے مقابلہ ہو جائے تو مضبوطی اور قوت سے مقابلہ کرتے ہیں دوسرا وصف رحماء بینھم ہے یعنی آپس میں ایسے نہیں کہ دوسرے کے اثر کو قبول نہ کریں۔ بلکہ ایک دوسرے پر رحم کرنے والے ہیں یہ دونوں اوصاف ایسے ہیں جن سے قومی ترقی وابستہ ہے قدرت میں ہر ایک شے کی ترقی اسی سے وابستہ ہے کہ جو امور اسے نقصان پہنچانے والے ہیں ان کے اثر کو قبول نہ کرے اور اندرونی ترکیب میں اس کے اجزا ایک دوسرے کے معاون ہوں اسی کے مطابق حدیث صحیح میں ہے مثل المومنین فی توادھم وتراحمھم کمثل الجسد الواحد مومنوں کی مثال آپس کی محبت اور رحم میں ایک جسم کی مثال ہے المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضا مومن۔ مومن کے لیے دیوار کی طرح ہے جس کا بعض بعض کو قوت دیتا ہے اس کے بعد بتایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جھکے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فضل بھی مانگتے ہیں جس سے مراد حسنات دنیا بھی ہو سکتی ہیں اور اس کی رضا بھی یعنی حسنات آخرت اور ان کے مونہوں پر نشانیوں کے ہونے سے مراد ماتھے پر سیاہ نشان نہیں بلکہ وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنے والوں کے چہروں پر ہوتا ہے۔ تعرف فی وجوھھم نضرۃ النعیم (التطفیف ۸۳ - ۲۴) اور گو بعض نے اس سے مراد قیامت کے دن نور کا ظاہر ہونا لیا ہے مگر صحیح یہی ہے کہ وہ اس دنیا میں بھی نظر آجاتا ہے چنانچہ مجاہد نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ وہ نشان نہیں جو تم دیکھتے ہو بلکہ وہ اسلام کا نشان اور اچھی صفت اور خشوع ہے اور خود مجاہد سے بھی مروی ہے کہ اس سے مراد خشوع ہے (ج) اور ایک شخص نے جب انہیں کہا کہ میں تو اسے وہ نشان سمجھتا ہوں جو ماتھے پر پڑ جاتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ یہ تو اس شخص کے ماتھے پر بھی ہو سکتا ہے جو فرعون سے زیادہ سخت دل ہو (ث) اور جابر سے ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا من کثرت صلوٰتہ باللیل حسن وجھہ بالنھار جو رات کو بہت نماز پڑھتا ہے اس کا منہ دن کو بہت خوبصورت نظر آتا ہے اسی قسم کے اور بھی صحابہ کے اقوال ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی کا اثر انسان کے ظاہر پر بھی ہوتا ہے اور لکھا ہے کہ صحابہؓ کی خالص نیابت اور حسن اعمال کی وجہ سے جو شخص ان کی طرف دیکھتا تھا ان کے ظاہر و باطن کو دیکھکر خوش ہوتا تھا (ث) اور حضرت ابن عمر نے ایک شخص کی ناک پر سجدے کا نشان دیکھا تو فرمایا تیری ناک تیرے منہ کی صورت ہے سو اسے خراب نہ کر (ر)

۳۱۱۶ زرع۔ زرع۔ اِنبات۔ یعنی اگانا ہے اور فی الحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے نہ انسان کا ءانتم تزرعونہ ام نحن الزارعون (الواقعہ ۵۶ - ۶۴) اور زرع اصل میں مصدر ہے اور اس سے مراد مزروع یعنی اگائی ہوئی چیز یا کھیتی لی جاتی ہے فنخرج بہ زرعا (غ) زُرّاع۔ زارع کی جمع ہے۔

ذٰلک مثلھم یعنی جو اوپر ان کے اوصاف بیان ہوئے یہی تورت اور انجیل میں بھی ہیں یا تو اس لحاظ سے کہ پیشگوئیوں میں ایسا ذکر ہے مثلاً تورت انہیں قدوسی قرار دیتی ہے اور انجیل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل سے باغ کو لیکر ان لوگوں کو دیگا جو اس کے پھل عین وقت پر دیتے ہیں اور یا مراد یہ ہے کہ مومنوں کی یہی صفات تورت اور انجیل میں بھی ہیں اور کزرع سے ان کی ایک اور مثال دی ہے جس میں یہ سمجھانا مقصود ہے کہ گو ابھی مسلمان تھوڑے نظر آتے ہیں مگر چونکہ حق ایک بیج کی طرح ہے اس لیے یہ بڑھے گا اور پھیلے گا اور دنیا کی کوئی طاقت اس کے قدرتی نشوونما کو نہیں روک سکتی اور لیغیظ بھم الکفار میں تمثیل سے اصل

سُوْرَةُ الْحُجُرٰتِ مَدَنِيَّةٌ (۴۹)

اٰیَاتُهَا ۱۸ — رُکُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۱

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو (کسی معاملہ میں) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے آگے نہ بڑھو اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ کرو اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے ۳۱۱۷

(بقیہ صفحہ سابقہ)

کی طرف رجوع کیا ہے اور لیغیظ بھم الکفار میں یا تو مسلمانوں کی موجودہ کمزوری کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں کمزور دیکھ کر کافر غضب میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں تباہ کر دیں اور یا آئندہ قوت کی طرف اشارہ ہے کہ جب وہ اس مضبوطی کی حالت کو پہنچ جائیں گے تو پھر کافر انہیں دیکھ دیکھ کر غیظ میں آئیں گے۔ مگر اُن کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ اس مثال میں بھی یہی سمجھایا ہے کہ اسلام آخرکار دنیا میں پھیل جائے گا۔ اور کہ اس کی ترقی تدریجی ہوگی۔ جس طرح کھیتی آہستہ آہستہ بڑھتی اور پھیلتی ہے ؏

نام و خلاصہ مضمون: اس سورت کا نام الحجرات ہے اور اس میں دو رکوع اور اٹھارہ آیتیں ہیں۔ اس سورت کا اصل مضمون جماعت اسلامی کے نظام کو قائم کرنا اور باہمی محبت و وداد کا پیدا کرنا ہے اور سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے سامنے ہر ایک فرد جماعت کو کس طرح مؤدب رہنا چاہیے اور چونکہ جماعت میں اسی قدر محبت اور الفت بڑھے گی جس قدر زیادہ محبت الفت اس پاک وجود سے ہے جو اس کی روح کے قائم مقام ہے یعنی رسول خدا صلعم کی محبت جن کی نسبت فرمایا لا یؤمن احدکم حتٰی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین اس لیے سورت کی ابتدا اس سے کی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے تقدم اختیار نہ کرو اور اپنی آوازوں کو بھی رسول کے سامنے پست رکھو اور یہ نہ صرف بتقاضائے محبت و ادب تھا بلکہ نظام جماعت کیلئے بھی ضروری تھا اور ان لوگوں کو روکا جو باہر سے آتے تو فوراً رسول اللہ صلعم کے حجروں پر آوازیں دینا شروع کرتے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اہم قومی کام جو رسول اللہ صلعم کی توجہ کو چاہتے تھے اُن کے لیے بھی آپ کو تنہائی میسر نہ آتی تھی اسی مناسبت کے لحاظ سے اس سورت کا نام الحجرات ہوا۔ اس تمہید کے بعد مسلمانوں کو ساری وہ راہیں سکھائی ہیں جن سے قوم میں باہم محبت پیدا ہو سکتی ہے۔ بغیر تحقیق کے ایک دوسرے کے خلاف کچھ کاروائی نہ کر بیٹھیں۔ اگر باہم دو گروہوں میں لڑائی بھی ہو جائے تو من حیث الجماعت مسلمان ان میں اصلاح کی کوشش کریں اور زیادتی کرنے والے کے خلاف جنگ تک کرنے کے لیے تیار رہیں تاکہ جماعت کا امن قائم رہ سکے پھر جن باتوں سے عداوت پیدا ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کی تحقیر۔ ایک دوسرے پر عیب لگانا۔ ایک دوسرے کے نام رکھنا۔ دوسروں کے اقوال و افعال کی نسبت بدظنی کرنا۔ دوسروں کی چھپی ہوئی باتوں کی ٹوہ میں لگے رہنا۔ پیٹھ پیچھے ان کی کمزوریوں کا ذکر ان تمام باتوں سے روک کر بتایا کہ تم سب انسان یکساں ہو۔ کسی قوم کو دوسری قوم پر فخر نہ کرنا چاہیے۔ کہیں کا رہنے والا ہو۔ کسی قوم اور قبیلہ سے ہو۔ کسی رنگ کا ہو معزز ہونے کا معیار صرف ایک ہی ہے یعنی تقویٰ اللہ۔ یا اللہ تعالیٰ کے قایم کردہ حقوق کی رعایت۔ جو شخص جس قدر زیادہ دوسروں کے حقوق کی پرواکرتا ہے اسی قدر زیادہ اس کی عزت اور مرتبہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے پھر مسلمانوں میں سے اس سخت کمزور گروہ کا ذکر کیا جو ابھی برائے نام ہی اسلام میں شامل ہے اور دوسری طرف کامل مومنوں کا ذکر کیا۔ اور بتایا کہ اس مرتبہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرو ؏

تعلق و تاریخ نزول: اس سورت کا تعلق پچھلی سورت سے ظاہر ہے یہ گویا اس کے آخری حصہ رحماء بینھم کی تفسیر ہے اور یوں بھی جب فتح کا ذکر کیا اور اس میں یہ اشارہ کیا کہ لوگ اسلام میں داخل ہونگے۔ تو ان نئے داخل ہونے والے کے لیے ادب کا ذکر بھی ضروری تھا اور وہ یہاں کیا۔ سورت کا نزول ۹ سنہ ہجری کا ہے اور یہ مدنی ہے ؏

۳۱۱۷ تقدموا۔ تَقْدِیم سے ہے اور تَقَدُّم چار طرح پر ہے جیسا کہ قَبْل کے معنی میں بیان ہوا (یعنی مکان کے لحاظ سے زمانہ کے لحاظ سے مرتبہ کے لحاظ سے ترتیب صناعی کے لحاظ سے) اور قَدَّم کسی چیز کو آگے کیا یا آگے بھیجا۔ اشفقتم ان تقدموا بین یدی نجوٰکم صدقات (المجادلۃ ۵۸-۱۳) لبئس ماقدمت لھم انفسھم (المائدہ ۵-۸۰) اور قَدَمْتُ فُلَانًا اَقْدُمُہ کے معنی ہیں اس کے آگے آگے چلا یقدم قومہ یوم القیامۃ (ھود ۱۱-۹۸) (غ) اور یہاں لاتقدموا کے معنی زجاج نے کیے ہیں۔ کہ جب تمہیں کسی کام کا حکم دیا جائے تو اسے اس کے اس وقت سے پہلے نہ کرو جس وقت تمہیں کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور قَدَّمَ بین یدیہ کے معنی ہیں تَقَدَّم یعنی آگے بڑھا۔ اور زجاج کے نزدیک تُقَدِّموا اور تَقَدَّموا کے ایک ہی معنی ہیں (ل) روح المعانی میں ہے کہ یہ قَدَّم متعدی سے ہے یعنی ایک چیز کو دوسری سے آگے کرنا اور پھر دو احتمال بیان کیے ہیں یعنی یا یہ کہ مفعول کو چھوڑ دیا گیا ہے اور نفس فعل کی تقدیم ہی مراد ہے یعنی لاتفعلوا التقدیم تقدیم مت اختیار کرو اور یا یہ کہ مفعول کو عام رکھنے کی خاطر حذف کر دیا ہے اور ابن جریر کئی معنی دیتے ہیں جن میں ابن عباس سے مروی ہے کہ کتاب اور سنت کے خلاف مت کہو۔ یا یہ اس کی کلام سے پہلے کلام نہ کرو ؏

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ
فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ
بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ
تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ②
اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ
رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ
اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی آوازوں کو نبیؐ کی
آواز سے اونچا نہ کرو ، اور نہ اس سے پکار پکار کر
بات کرو جیسا ایک دوسرے کو پکارتے ہو ، ایسا نہ
ہو کہ تمھارے عمل بے کار ہو جائیں اور تمھیں خبر بھی نہ ہو ۳۱۱۸ع
وہ لوگ جو اپنی آوازوں کو رسول اللہؐ کے سامنے پست
رکھتے ہیں وہی ہیں جن کے دل اللہ تعالیٰ نے تقوے
کے لیے خالص کر دیئے ہیں ، ان کے لیے

لن نؤمن بھذا القراٰن ولا بالذی بین یدیہ (السبا ۳۴-۳۱) میں بین یدیہ سے مراد اس سے پہلی کتابیں ہیں ان ھو الا نذیر لکم بین یدی عذاب شدید (السبا ۳۴-۴۶) میں مراد لقائے عذاب ہے یعنی اس بات سے ڈرانے والا کہ اگر تم نافرمانی کرو تو تمھیں عذاب شدید ملے گا۔ اور نکالا لما بین یدیھا (البقرۃ ۲-۶۶) میں مراد یا تو وہ امتیں ہیں۔ جو پیدا ہو چکیں اور اس وقت سامنے موجود تھیں اور یا مراد وہ گناہ ہیں جو پہلے گذر چکے ثم لاٰتینھم من بین ایدیھم (الاعراف ۷-۱۷) میں مراد ما تقدم ہے یعنی ان کو گمراہ کروں گا یہاں تک کہ وہ اسے جھٹلائیں جو پہلے گذر چکا اور امر بعث کو بھی جو بعد میں آنے والا ہے اور بین یدیک ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو تمہارے سامنے ہو (ل) اور یہاں مراد بین یدی اللہ ورسولہ سے اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنا یا ان کے فیصلہ یا اذن سے پہلے کسی معاملہ کا فیصلہ کر دینا ہے یعنی جب تک اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ایک معاملہ میں نہ ملے تم خود اس میں پیش دستی نہ کرو اور جب حکم مل جائے تو پھر اس سے ادھر ادھر نہ ہو اور متابعت یعنی پیروی کی صفت سے خروج نہ کرو۔

شان نزول کے مختلف قصے بیان کیے گئے ہیں کہیں یہ کہ کسی شخص نے نماز عید سے پہلے قربانی کر دی تھی کہیں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے باہم ایک جھگڑے کا قصہ ہے جو بخاری میں بھی ہے اور یہ باتیں صحیح بھی ہوں تو عموم حکم میں شامل ہونگی اور مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام سے کسی قسم کی پیشقدمی نہ کی جائے چونکہ اس سورت کا مضمون مسلمانوں کی باہم اخوت قایم کرنا ہے اس لیے اس کی ابتدا اس سے کی ہے کہ سب کے سب اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت کو سب باتوں پر مقدم کریں کیونکہ یہی اخوت اسلامی کی بنیاد ہے اور باہمی محبت جو اس سورت کا اصل مضمون ہے قایم نہیں ہو سکتی جب تک کہ رسول اللہ صلعم کی محبت سب محبتوں پر فایق نہ ہو لایؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔

ع۳۱۱۸ ہر بات میں افراط و تفریط کے پہلو ہو جاتے ہیں اور اصلاح اسی کا نام ہے کہ کسی معاملہ میں افراط و تفریط ہر دو پہلوؤں سے روک کر میانہ روی پر قائم کیا جائے۔ مساوات بلاشبہ بہت اچھی چیز ہے اور ملک عرب میں مساوات موجود تھی مگر اس کے ساتھ اگر آداب مجلس قایم نہ رہیں تو اخلاق کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا ہے یوں تو سب انسان برابر ہیں۔ لیکن اگر ایک سپاہی جرنیل کے سامنے ادب ملحوظ نہ رکھے اور اگر ایک شاگرد استاد کے سامنے سر جھکا کر نہ رکھے تو نہ وہ سپاہی وقت پر کام کر سکتا ہے نہ وہ طالب علم علم حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے آنحضرت صلعم بشر مثلکم بھی ہیں گو آپ سب انسانوں کے معلم بھی ہیں پھر آپ ایک جرنیل کی حیثیت بھی رکھتے ہیں اس لیے جن آداب کی ضرورت نظام کے قیام اور ترقی کے حصول کے لیے ہے وہ ضرور تھا کہ اس کامل تعلیم کا بھی حصہ ہوتے جو محمد رسول اللہ صلعم لائے تھے آپ کو اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ کوئی شخص آپ کے سامنے نیچی آواز سے گفتگو کرے اور نہ کسی کے اونچی آواز سے گفتگو کرنے سے آپ کا کچھ بگڑتا تھا مگر نظام قومی اور ان لوگوں کی اپنی ترقی میں یہ امر ہارج تھا جیسا کہ اگلی آیت میں اور اس آیت کے آخری حصہ میں صراحت بھی کر دی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نصائح بھی اپنے پاک کلام میں اتاریں۔ اور یہ خاص موقع بھی تھا اس لیے کہ پہلے لوگ تھوڑے تھوڑے دین اسلام میں داخل ہوتے اور ہجرت کر کے نبی کریم صلعم کے پاس آجاتے اور آپ کی صحبت میں رہ کر خود ہر قسم کے اداب سے واقف ہو جاتے تھے لیکن جب ہر قسم کے لوگ کثرت سے اسلام کے اندر داخل ہونے لگے اور سب کو موقعہ بھی نہ ملتا تھا کہ زیادہ دیر آنحضرت صلعم کے پاس ٹھہریں تو ضروری ہوا کہ انہیں آداب مجلس سے بھی آگاہ کیا جائے اور پہلے عام حکم کے بعد کہ کسی معاملہ میں بھی اللہ اور رسول سے تقدم اختیار نہ کیا جائے اور ان کے احکام سے آگے قدم نہ رکھا جائے چند خاص باتوں کا ذکر کیا یعنی ایک یہ کہ نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کرو گویا آپ کے سامنے گفتگو میں طریق ادب اختیار کیا جائے اور دوسرے یہ کہ آپ کو اس طرح پکار کر آواز نہ دی جائے جس طرح ایک دوسرے کو نام سے پکار کر آواز دی جاتی ہے۔ باہر کے لوگ جب آتے تھے تو آپ سے یا محمد کہہ کر ہی خطاب کیا کرتے تھے اور بعض نے اول سے مراد لیا ہے کہ نبی سے بات کرتے وقت آواز کو آپ کی آواز سے اونچا نہ کرو اور دوسرے یہ کہ آپ جب خاموش ہوں اور گفتگو کرنے والا دوسرا ہو تو بہت بلند آواز سے گفتگو نہ کرے اور یہ جو فرمایا ان تحبط اعمالکم وانتم لاتشعرون۔ تو مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تمہارے ادب کے طریقوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بعض تمہارے اعمال بیکار ہو جائیں کیونکہ جب آپؐ کی صحبت میں بیٹھ کر فیض حاصل نہ کیا تو یہ عمل ضائع ہو گیا۔ لیکن جو لوگ قدرتاً بلند آواز ہوں وہ اس میں شامل نہیں جیسا کہ ثابت بن قیس کا ذکر ہے۔ کہ وہ رفیع الصوت تھے تو جب یہ آیت نازل ہوئی تو وہ گھر میں بیٹھ گئے اور روتے تھے کہ یہ میرے ہی بارے میں نازل ہوئی تب رسول اللہ صلعم نے انہیں بلوا بھیجا اور فرمایا کہ تو تو اہل جنت میں سے ہے ؛

وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٣﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ
الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٤﴾
وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ
لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٥﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ
فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا
قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا

مغفرت اور بڑا اجر ہے ٣١١٩
جو لوگ تجھے حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں،
ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے ٣١٢٠
اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ تو ان کی طرف نکل آتا
تو ان کے لیے بہتر ہوتا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ٣١٢٠ا
اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے
پاس خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو، ایسا
نہ ہو کہ کسی قوم کو نادانی سے دکھ پہنچاؤ،

ع٣١١٩ امتحن۔ محن اور امتحان ابتلاء کی طرح ہے (غ) (جس کے لیے دیکھو ع١٥٥) اور حدیث میں اس شخص کے ذکر میں ہے جو اپنی جان اور مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے یہاں تک کہ دشمنوں سے مقابلہ ہوتا ہے تو اُن سے جنگ کرتا ہے یہاں تک کہ قتل کیا جاتا ہے فذٰلك الشھیدُ المُمْتَحَنُ فی جنۃ اللہ تحت عرشه لا یَفضلُه النبیون الابدرجۃ النبوۃ جہاں ممتحن کے معنی ہیں صاف کیا گیا پاکیزہ کیا گیا خالص کیا گیا کیونکہ مَحَنْتُ الفضّۃ کے معنی ہیں چاندی کو آگ سے پاک اور خالص کیا۔ اور مجاہد امتحن اللہ قلوبھم کے معنی مروی ہیں اُن کے دلوں کو خالص کر دیا۔ اور ابو عبیدہ نے اس کے معنی کیے ہیں انہیں مصفّٰی اور پاکیزہ (مہذب) بنایا۔ اور بعض نے اِمْتَحَنَ کے معنی شرح کیے ہیں یعنی ان کے دلوں کو کھول دیا اور مَحَن کے اصل معنی کوڑے سے مارنا ہیں اور اسم مِحنۃ ہے (ل)۔

اس سے معلوم ہوا کہ آواز کے پست کرنے سے دل میں اتقاء پیدا ہوتا ہے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو لوگ اپنی آوازوں کو بلا ضرورت بلند رکھتے ہیں وہ اخلاق فاضلہ سے محروم رہ جاتے ہیں کیونکہ ان کو کسی موقعہ پر ادب ملحوظ نہیں رہتا اور علاوہ ازیں ایسے لوگ علم کے حاصل کرنے میں بھی اکثر محروم رہ جاتے ہیں کیونکہ گفتگو میں بلند آواز عموماً طبیعت میں ایک قسم کے انکار سے یا تکبر سے ہوتی ہے اس آیت سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم کی حدیث کے وقت آواز کا بلند کرنا بھی موجب محرومی ہو جاتا ہے یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں کو اللہ تعالےٰ نے تقویٰ کے لیے ہر قسم کی آلائش سے پاک کر دیا تھا۔

ع٣١٢٠ حجرات۔ حُجْرَۃ کی جمع ہے اور حُجْرَۃ وہ ہے جس میں لوگ اترتے ہیں اور اس کے گرد احاطہ کر لیتے ہیں اور گھروں کے حجروں کو ان کے روکنے کی وجہ سے حجرے کہا جاتا ہے (ل) یعنی اُن کے گرد دیوار ہونے کی وجہ سے کوئی ان میں داخل نہیں ہو سکتا اور یہاں مراد نبی کریم صلعم کی بیبیوں کے حجرے ہیں اور یہ کھجور کی ٹہنیوں کے بنے ہوئے تھے جن کے دروازوں پر پردے پڑے ہوئے تھے اور چھوٹے چھوٹے تھے اور ولید بن عبدالملک کے عہد میں مسجد میں شامل کر دیئے گئے۔

جب دور دور سے لوگ آنے لگے تو انہیں آنحضرت صلعم کی مصروفیتوں کی خبر نہ تھی اس لیے بعض لوگ آتے ہی آنحضرت صلعم کو یا محمدؐ یا محمدؐ کہہ کر پکارنے لگتے۔ ادھر اگر آنحضرت صلعم کی مصروفیتوں کو دیکھا جائے تو سمجھ نہیں آتا کہ آپ اکیلے اتنے کام کیوں کر لیتے ایک طرف اگر آپ معلم قرآن ہیں تو دوسری طرف نمازوں کے امام ہیں پھر اگر آپ بادشاہ وقت ہیں تو دوسری طرف ادنیٰ ادنیٰ کاموں میں حصہ لیتے ہیں کہیں کسی کا سودا لا دیتے ہیں کہیں کسی بی بی کو گھر کے کام میں مدد دیتے ہیں کہیں بکری کا دودھ دوہ لیتے ہیں کہیں اپنے کپڑے اور جوتے کی مرمت کر لیتے ہیں پھر اگر آپ کو ہی چاروں طرف مہمات ملکی کا فکر ہے تو آپ کو خود ہی اتنی بڑی قوم کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور ہر ایک وفد آتا ہے کہ دین سیکھے ادھر ایک فوجی مہم تیار کرنے کی ضرورت ہے یہ سب کام آپ خود ہی سرانجام دیتے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر ہر شخص اپنی ضرورت کو مقدم کرے تو کام نہیں چل سکتا۔ اس لیے یہ طریق ادب سکھایا کہ جب دوسرے کاروبار اور حوائج ضروریہ سے فراغت ہوگی تو آپ خود باہر نکل آئیں گے۔ ہر شخص اگر آکر آوازیں دینے لگے تو اس سے بڑے بڑے اہم کام رک جائیں گے اس سب تعلیم کے آج بھی زندہ کیا جانے کی ضرورت ہے اگر ایک طرف مسلمانوں میں بڑے آدمی اور علما اور سجادہ نشین اپنے آپ کو عوام الناس سے چھپ کر الگ رکھ کر افراط کے مرتکب ہیں تو دوسری طرف اس تفریط کا سلسلہ بھی جاری ہے کہ ہر شخص اپنی بات کو اہم ترین قومی کاموں سے ضروری سمجھ کر یہی چاہتا ہے کہ پہلے اس کا کام ہو جائے۔

ع٣١٢٠ا حتیٰ۔ جارہ ہے اور انتہا اور غایت میں اِلیٰ کا کام دیتا ہے لیکن اس کا مجرور اس کا آخر ہوتا ہے یا آخری خبر سے ملنے والا جیسے ھی حتی مطلع الفجر اور حتیٰ جب مضارع منصوب پر داخل ہوتا ہے تو تین معنوں میں ہوتا ہے کبھی اِلیٰ کے معنی میں جیسے حتی یرجع الینا موسی (طٰہٰ ٢٠-٩١) کبھی کَی تعلیلیہ کے معنی میں ولا یزالون یقاتلونکم حتّٰی یردوکم (البقرۃ ٢-٢١٧) کبھی الّا کے معنی استثنا میں اور مضارع حتی کے بعد اسی وقت منصوب ہوتا ہے جب مستقبل کے معنی میں ہو اور کبھی حتی واو کی طرح عاطفہ ہوتا ہے۔

فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۞ ۶
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ
يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ
وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ
الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۞ ۷

پھر اس پر جو تم نے کیا پشیمان ہو ۳۱۲۱
اور جان لو کہ تمھارے اندر اللہ تعالیٰ کا رسولؐ ہے اگر
وہ بہت سے معاملات میں تمھاری بات مان لیا کرے تو تم مشکل
میں پڑ جاؤ، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمھارے نزدیک ایمان کو محبوب کر دیا
ہے اور اسے تمھارے دلوں میں زینت دی ہے اور کفر
اور فسق اور نافرمانی کو تمھارے نزدیک مکروہ کر دیا ہے،
یہی بھلائی کی راہ پر چلنے والے ہیں ۳۱۲۲

ع۳۱۲۱ تبینوا۔ اَبان۔ اِستَبان۔ تَبَیَّنَ لازمی اور متعدی دونوں طرح پر آتے ہیں اِسْتَبان الشئ تبیّن الشئ کے معنی ہیں ظہر وہ چیز ظاہر ہوگئی دیکھو ع۲۸۰ اور اِسْتَبَنْتُہٗ اور تَبَیَّنْتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اسے تحقیق کیا یا ظاہر کیا (ل)

اَنْ کا استعمال چار طرح پر ہے ایک یہ کہ حرف مصدری ہو جو مضارع پر نصب دیتا ہے جیسے واَن تصوموا خیر لکم (البقرۃ ۲-۱۸۴) دوم اَنَّ سے مخفف اور یہ فعل یقین کے بعد آتا ہے جیسے علم ان سیکون منکم مرضٰی (المزمل ۷۳-۲۰) وحسبوا الا تکون فتنۃ (المائدۃ ۵-۷۱) سوم مفسرہ دیکھو ع۵۹۰ چہارم لمّا کے بعد تاکید کیلئے فلما اَنْ جاء البشیر (یوسف ۱۲-۹۶) ولما ان جاءت رسلنا لوطا سئ بہم (العنکبوت ۲۹-۳۳) اور اِنْ بھی چار طرح پر آتا ہے شرط کے لیے اور دونوں فعلوں کو جزم دیتا ہے۔ ان ینتھوا یغفر لہم (الانفال ۸-۳۸) اِنّ سے مخفف اور اس کے ساتھ لام ضروری ہوتا ہے ان کاد لیضلنا عن الھتنا (الفرقان ۲۵-۴۲) اور نافیہ جس کے لیے دیکھو ع۳۰۲۲ اور حرف نفی کی تاکید کے لیے۔

خبروں کی تحقیقات: حرث بن ابی ضرار خزاعی کا واقعہ احادیث میں لکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے اسلام قبول کیا اور رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ میں اپنی قوم کو اسلام کی طرف بلاؤں گا اور ان سے زکوٰۃ بھی وصول کروں گا۔ آپ اپنا عامل بھیج دیں جو مال زکوٰۃ لے آئے جس شخص کو آپ نے بھیجا وہ رستہ سے واپس آگیا اور کہا کہ زکوٰۃ دینے کی بجائے وہ مجھے قتل کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ تب رسول اللہ صلعم نے خالد یا کسی اور شخص کو ایک دستہ کے ساتھ اس کی طرف بھیجا اور بعد میں اصل واقعات کا اظہار ہوا۔ (ش) ایسے ایسے واقعات چونکہ پیش آتے رہتے تھے اس لیے اس کے متعلق بھی نصیحت فرمائی اور نبا چونکہ اہم خبر کو کہتے ہیں اس لیے فرمایا کہ اہم خبروں میں ایسے آدمیوں کا اعتبار نہ کرو جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی پروا نہ کرتے ہوں خواہ وہ مسلمان ہی کہلاتے ہوں بلکہ اگر غیر معتبر ذریعے سے خبر ملے تو پہلے تحقیق کر لو کہ صحیح بات کیا ہے۔ اور یوں گویا مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے کہ ہر خبر پر بغیر کافی وجہ اور بغیر تحقیقات کے اس قدر وثوق نہیں کر لینا چاہیئے۔ کہ اس کی بنا پر کسی قوم کو نقصان پہنچ جائے ضروریات قومی کے ساتھ اصول انصاف اور تحقیق کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اکیلے آدمی کی شہادت بھی قابل قبول ہے بشرطیکہ وہ فاسق نہ ہو اس قسم کی ہدایات مسلمانوں کو باہمی فتنوں سے بچانے کے لیے تھیں۔

ع۳۱۲۲ اَنّ۔ اِنّ دونوں تاکید کے لیے آتے ہیں اور اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتے ہیں اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ اِنّ کے بعد جملہ مستقل ہوتا ہے اور اَنّ کے بعد جو آتا ہے وہ مفرد کے حکم میں ہوتا ہے جو کبھی مرفوع اور کبھی منصوب اور کبھی مجرور کے موقع پر ہوتا ہے اور اِنّ جب ما سے مل جائے تو اس کے عمل کو باطل کرتا ہے اور اس چیز کے لیے جس کا ذکر ہے اثبات حکم کرتا ہے اور اس کے ماسوا سے اس کی نفی کرتا ہے یعنی حصر کے لیے ہوتا ہے جیسے انما المشرکون نجس (التوبۃ ۹-۲۸) اور یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ نجاست تامہ شرک سے مختص ہے انما حرم علیکم المیتۃ والدم (البقرۃ ۲-۱۷۳) گویا اسی کو حرام کیا ہے اور یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ سب سے بڑی حرام کی ہوئی چیزیں یہی ہیں (غ)

فی۔ فِیْ ظرفیت کے لیے آتا ہے حقیقتاً ہو جیسے غلبت الروم فی ادنی الارض یا مجازاً جیسے یدخلون فی دین اللہ افواجا اور کبھی مصاحبت کے لیے آتا ہے کبھی تعلیل کے لیے جیسے ان امراۃ دخلت النار فی ھرۃ یعنی بلی کی وجہ سے اور کبھی علی کے معنی میں جیسے لاصلبنکم فی جذوع النخل اور کبھی الیٰ کے معنی میں جیسے ردوا ایدیھم فی افواھھم اور کبھی مقایسہ کے لیے جیسے ما متاع الدنیا فی الاخرۃ الا قلیل یعنی آخرت پر قیاس کر کے اور فی اسم بمعنی فم ہوتا ہے لیبلغ فاہ یعنی مونہہ لَوْ ایک چیز کے امتناع کے لیے ہوتا ہے بوجہ کسی دوسری کے امتناع کے جیسے لوکان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا (الانبیاء ۲۱-۲۲) اسی معنی میں ہے لو عاش ابراہیم لکان نبیاً یعنی چونکہ اس کا نبی ہونا ممتنع تھا اس لیے وہ زندہ بھی نہ رہا اور شرط کے معنی میں بھی آتا ہے دیکھو ع۳۲ اور لَوْلَا بھی دو طرح پر آتا ہے کسی چیز کے امتناع کیلئے اور اس کے غیر کے واقع ہو جانے کی وجہ سے لولا انتم لکنا مومنین (السبا ۳۴-۳۱) اور ھَلَّا کے معنی میں لولا ارسلت الینا رسولا (القصص ۲۸-۴۷) (غ)

حَبَّبَ۔ مَحَبَّۃ اس چیز کا ارادہ ہے جسے تم اچھا سمجھو پس ہر محبت ارادہ ہے۔ لیکن ہر ارادہ محبت نہیں اور یہ تین طرح پر ہے لذت کے لیے نفع کے لیے بزرگی کے لیے اور اللہ تعالیٰ کی محبت انسان کے لیے اس کا اس پر انعام ہے اور انسان کی محبت اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے قرب کا طلب کرنا ہے اور حَبَّبَ ایک چیز کو دوسرے کی طرف محبوب کر دیا جیسے یہاں (غ)

فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعْمَةً ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۸﴾

اللہ کی طرف سے فضل اور (اس کی) نعمت ہے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔

وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۹﴾

اور اگر مومنوں میں سے دو گروہ جنگ کریں تو اُن میں صلح کرا دو، پس اگر ایک دُوسرے پر زیادتی کرتا ہے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف رجوع کرے، پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل سے صلح کرا دو اور انصاف کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبّت کرتا ہے ۳۱۲۳

عصیان عصا کے لیے دیکھو ۸۸۔ اور یہ عصوت سے ہے یعنی وادی ہے اور عصی عصیانا جس کے معنی نافرمانی ہیں پائی ہے اور کبھی مجازاً ذلت یعنی معمولی لغزش پر بھی بولا جاتا ہے (اقرب الموارد) اسی لحاظ سے فرمایا وعصیٰ آدم ربہ (طٰہٰ ۲۰-۱۲۱) کیونکہ دوسری جگہ خود فرمایا فنسی ولم نجد له عزما اور عاصی اور عصی اس سے اسم فاعل ہیں۔ ولم یکن جبارا عصیا (مریم ۱۹-۱۴)

صحابہ کا مقام محفوظیت: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کی عصمت کو بیان فرمایا ہے یعنی وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے کہ گناہ ان سے سرزد نہ ہوتا تھا ان لوگوں پر تعجب ہے جو انبیا کی عصمت کو معرض بحث میں لاتے ہیں یہاں نبی کے پیروؤں کے لیے مقام عصمت کا حاصل ہونا بیان کیا گیا ہے پہلے یہ فرمایا کہ رسول دوسرے لوگوں کی اطاعت نہیں کرتا کیونکہ وہ رضائے الٰہی کے رستوں پر چلتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے روشنی پاتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے اس کی اطاعت کریں اسی لیے اس کے مقابل پر رسول کے پیروؤں کے رسول کی اطاعت کرنے کا ذکر کیا اور اطاعت کی بجائے لفظ ایمان اختیار کیا۔ کیونکہ اس میں فعل قلب اور اقرار لسان اور فعل جوارح تینوں شامل ہیں اور پھر ایمان یا اطاعت رسول کا ان کے نزدیک محبوب ہونا بیان کیا اور جو چیز محبوب ہوتی ہے انسان اسے دوسرے پر ترجیح دیتا ہے اور اسی کا ارادہ کرتا ہے گویا بتا دیا کہ صحابہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو دل سے بھی اچھا سمجھتے ہیں اور اسی کا ارادہ بھی کرتے ہیں اور زینه فی قلوبکم میں بتایا کہ وہ اطاعت رسول اُن کے قلوب میں گھر کر گئی ہے اور وہی ان کو خوبصورت اور پیاری معلوم ہوتی ہے گویا ان کے دل اس کی طرف کھچے چلے جاتے ہیں اور پھر اس سے تین قسم کی ظلمتوں کی نفی کی۔ یعنی اگر وہ طاعات بجالاتے ہیں تو یہ نہیں کہ ان طاعات میں کسی قسم کی ظلمت کی ملونی ہو۔ سب سے بڑی ظلمت کفر ہے اس سے اتر کر اور زبان سے اقرار کر کے پھر انسان حدود سے تجاوز کرنے لگتا ہے جو فسق ہے۔ اس سے اتر کر معمولی نافرمانیاں ہیں ان تمام ظلمتوں سے ان کا پاک ہونا ان الفاظ میں بیان کیا کہ ان کی طبیعت ان چیزوں سے کراہت کرتی ہے اور جس چیز سے انسان کی طبیعت کراہت کرے اس کی طرف وہ کبھی عمداً قدم نہیں اٹھا سکتا اور یہ حکم ان کی اکثریت پر ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو تاریخ ایسا کوئی دوسرا پاک گروہ پیش کرنے سے عاجز ہے اور یہ رسول اللہ صلعم کی زبردست قوت قدسی کا ثبوت ہے اہل تشیع اور عیسائیوں کے اعتراضات کا اس آیت میں جواب ہے اور صحابہ میں جو باہم اختلاف ہوئے تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی وجہ بھی ان کی زبردست قوت ایمانی تھی جس بات کو سچا سمجھا اس کے مقابل کسی کی پروا نہیں کی؛

۳۱۲۳ دو مسلمان گروہوں کی جنگ میں جماعت اسلامی کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے: بخاری اور مسلم وغیرہما میں ہے کہ عبداللہ بن ابی نے کچھ کلمات آنحضرتؐ کی تحقیر کے لیے بولے جس پر بعض صحابہ اور اس کے ساتھیوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ابن جریر نے ایک انصاری اور اس کی بی بی کے متعلقین کے جھگڑے کے قصے میں اس کا نزول بیان کیا ہے لیکن آیت مسلمانوں کی عام ہدایت کے لیے ہے جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے اور کسی خاص واقعہ سے اسے کچھ تعلق معلوم نہیں ہوتا دوسرے منافقوں کے گروہ کے لیے مومن کا لفظ نہیں آسکتا تھا اور فی الحقیقت یہی اس سورت کی اصل غرض ہے کہ مسلمانوں کو بتایا جائے کہ وہ سب باہم بھائی بھائی ہیں پس اگر مقاتلہ تک بھی ان میں نوبت پہنچ جائے تو پھر بھی ان میں مصالحت کی کوشش ہی کرنی چاہیے جیسا کہ اگلی آیت میں فرمایا انما المومنون اخوة البتہ باہم جنگ وجدال میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ غلطی پر کون فریق ہے اور زیادتی کس کی ہے پس اگر زیادتی کرنے والا فریق اپنی زیادتی سے باز نہ آئے تو جماعت اہل اسلام کا فرض ہے کہ وہ اس کی اعانت کرے جس پر زیادتی ہو رہی ہے مسلمانوں نے اس طریق عمل کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور آج کل جو صلح کل لوگ ہیں وہ مصالحت اسے قرار نہیں دیتے جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے بلکہ مصالحت ان کے نزدیک یہ ہے کہ منہ سے اتنا کہہ چھوڑیں کہ ہم دونوں کو برا نہیں کہتے جب زیادتی کرنے والے کے ساتھ اللہ تعالیٰ مقاتلہ تک کو ضروری ٹھہراتا ہے اور مصالحت کیلئے صحیح طریق عمل اسی کو قرار دیتا ہے تو آج ہمارا کوئی اور طریق تجویز کرنا قرآن کے اس صریح حکم سے سرتابی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا باہمی تفرقہ روز بروز ترقی کر رہا ہے۔

باغی کافر نہیں: یہاں پر یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم دونوں گروہوں کو مومن قرار دیتا ہے گو جنگ تک بھی ان کی نوبت پہنچ چکی ہو پس وہ لوگ جو ادنی ادنی باتوں

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۱۰﴾ ع ۱۳

مومن بھائی بھائی ہی ہیں، سو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو اور اللہ کا تقویٰ کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ۖ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ۚ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۱۱﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو (ایک) قوم (دوسری) قوم پر ہنسی نہ کرے شاید وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں (دوسری) عورتوں پر (ہنسیں) شاید وہ اُن سے بہتر ہوں۔ اور اپنے لوگوں کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو نام دھرو، ایمان کے بعد بُرا نام کیا ہی بُرا ہے اور جو توبہ نہ کرے تو وہی ظالم ہیں ۳۱۲۴

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو بہت گمان (بد) کرنے

پر اپنے مسلمان بھائیوں کو کافر قرار دیتے ہیں اس حکیمانہ تعلیم سے کتنی دور بٹے ہوئے ہیں خوارج کا باغی علی الامام کو یا اہل تشیع کا حضرت علیؓ سے جنگ کرنے والوں کو کافر قرار دینا اس تعلیم قرآنی کی صریح خلاف ورزی ہے۔

صحابہ کی باہمی جنگ: صحابہ میں جو لڑائیاں ہوئیں وہ اس آیت کے ماتحت آتی ہیں اللہ تعالیٰ نے دونوں جنگ کرنے والوں گروہوں کو مومن قرار دیا ہے خواہ حضرت علیؓ کا گروہ ہو خواہ حضرت معاویہ کا اور حضرت عائشہ صدیقہ کا اس جنگ میں حصہ لینا محض مصالحت کی غرض سے تھا۔ ان کی غرض حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو سزا دینا تھا اور یہ آپ کے اپنے بیانات سے ظاہر ہے۔ جو تاریخ نویسوں نے نقل کیے ہیں مثلاً ایک موقعہ پر انہوں نے والئ بصرہ کے دو ایلچیوں کو حضرت عثمانؓ کے قاتلین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ اور انہی سے اصل بنائے فساد پیدا ہوئی تھی۔ "واقعہ یہ ہے کہ آوارہ گردان قبائل نے مدینہ پر جو حرم محترم تھا حملہ کیا اور وہاں فتنے برپا کیے۔ انہوں نے بے گناہ خلیفہ اسلام کو قتل کیا معصوم خون کو حلال جان کر بہایا جس مال کا لینا ان کو جائز نہ تھا وہ لوٹا۔ حرم محترم نبوی کی بے عزتی کی ماہ مقدس کی توہین کی لوگوں کی آبروریزی کی مسلمانوں کو بے گناہ مار پیٹ کی" اور آخر کار فرمایا کہ میں انہی امور کی اصلاح کیلئے نکلی ہوں یعنی جب ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرتا ہے تو زیادتی کرنے والے گروہ کو سزا دینا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ جب جنگ میں حضرت عائشہ کو ناکامی ہوئی تو حضرت علیؓ نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ انہیں مدینہ بھیجا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت عائشہ بھی بغرض اصلاح ہی نکلی ہیں اور اسی طرح حضرت زبیر اور طلحہ کے قاتلوں پر حضرت علیؓ نے اظہار ناراضگی فرمایا۔

ع ۳۱۲۴ نساء۔ اور نسوان اور نِسْوَة تینوں مَرْأَة کی جمع ہیں یعنی عورتیں اور یہ جمع غیر لفظ سے ہے جیسے مَرْء کی جمع قَوْم ہے یا نساء النبی (الاحزاب ۳۳۔ ۳۲) قال نسوة فی المدینة (یوسف ۱۲۔ ۳۰) (غ)

تلمزوا۔ لَمْز کے معنی ع ۱۳۰۸ میں مفردات راغب سے بیان کیے گئے ہیں لیکن لسان العرب میں ہے کہ اَلْغَمْز کی طرح منہ پر یعنی سامنے ہوتا ہے مگر خفی کلام کے ساتھ اور من یلمزک فی الصدقات (التوبہ ۹۔ ۵۸) میں معنی کیے گئے ہیں یحرک شفتیہ یعنی اپنے ہونٹ ہلاتا ہے اور لُمَزَة اور ھُمَزَة میں یہ فرق کیا ہے کہ لُمَزَة منہ پر عیب لگانے والا ہے اور ھُمَزَة پیٹھ کے پیچھے اور لکھا ہے کہ اس کا اصل یہ ہے کہ آنکھ اور سر اور ہونٹ کے ساتھ اشارہ کیا جائے یعنی کلام خفی سے ملا ہوا۔ اور وہ معنی بھی آئے ہیں جو مفردات سے نقل کیے گئے ہیں یعنی پیٹھ کے پیچھے عیب لگانا اور ابن کثیر نے یہ تفریق کی ہے کہ ھَمْز فعل سے ہے اور لَمْز قول سے۔

تنابزوا۔ نَبَز کے معنی لقب یا نام ہیں اور نبز مصدر ہے یعنی نام رکھنا اور تنابُز ایک دوسرے کے نام رکھنا اور اکثر استعمال اس کا ذم کے موقع پر ہے ثعلب کا قول ہے۔ یہودی یا نصرانی کو یا یہودی یا نصرانی کہہ کر پکارتے تھے اس سے روکا ہے یہودی یا نصرانی مسلمان ہو جائے تو اسے یہودی یا نصرانی کہنے سے روکا ہے اور الفاظ بعد الایمان دوسرے معنی کی تائید کرتے ہیں (ل)

القاب۔ لَقَب کی جمع ہے اور وہ انسان کا ایسا نام ہے جو پہلے نام کے سوا ہو اور اس میں معنی کا لحاظ ہوتا ہے برخلاف اعلام یعنی انسان کے اسم معرفہ کے اور لقب عزت کے طور پر بھی ہوتا ہے جیسے بادشاہوں کے القاب اور نبز یا ذم کے طور پر بھی (غ)

دوسروں کی تحقیر سے بچنے کی نصیحت: آیت کے پہلے حصہ کے متعلق مختلف روایتیں ہیں بنی تمیم کے کچھ لوگوں نے بلالؓ پر ہنسی کی تھی یا حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ نے

مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ وَّ لَا
تَجَسَّسُوۡا وَ لَا يَغۡتَبۡ بَّعۡضُكُمۡ بَعۡضًا ؕ
اَيُحِبُّ اَحَدُكُمۡ اَنۡ يَّاۡكُلَ لَحۡمَ اَخِيۡهِ
مَيۡتًا فَكَرِهۡتُمُوۡهُ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲﴾
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ
وَّ اُنۡثٰى وَجَعَلۡنٰكُمۡ شُعُوۡبًا وَّ قَبَآئِلَ
لِتَعَارَفُوۡا ؕ اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰكُمۡ ؕ

سے بچو، کیونکہ بعض بدگمانی گناہ ہے اور نہ ایک دوسرے
کے بھید ٹٹولو اور نہ ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے بُرا کہو۔ کیا
تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا
گوشت کھائے تو تم اس سے کراہت کرتے ہو اور اللہ کا تقویٰ
کرو اللہ تعالیٰ رجوع برحمت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۳۱۲۵
اے لوگو! ہم نے تمھیں مرد اور عورت سے پیدا کیا
اور تمھاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو
پہچانو، تم میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے شریف وہ ہے جو سب سے

ام سلمہ کے متعلق کچھ کہا تھا یا عکرمہ بن ابی جہل کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ یہ اس امت کے فرعون کا بیٹا ہے اور دوسرے حصہ کے متعلق ثابت بن قیس کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی کو مسجد میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ فلاں عورت کا بیٹا ہے جس سے عیب لگانا مقصود تھا تو آیت نازل ہوئی تو انہوں نے توبہ کی ایک روایت کی رو سے بنی سلمہ کے ایک شخص نے کہا کہ یہ آیت ہمارے متعلق نازل ہوئی کہ ہم میں ایک ایک شخص کے دو دو تین تین نام پڑے ہوئے تھے اصل غرض تو جماعت اسلام میں محبت و مودت کے تعلقات پیدا کرنا ہے اس لیے جب یہ ذکر کیا کہ مسلمانوں میں باہمی مصالحت کی کوشش کرنی چاہیئے تو ساتھ ہی ان موجبات کو بھی دور کرنے کی تعلیم دی جن سے باہم تنافر تحاسد پیدا ہوتا اور بعض وقت لڑائیوں تک نوبت پہنچا دیتا ہے اور یہاں تین باتوں سے روکا ہے اول دوسروں پر تمسخر کرنا دوسرا ان پر مونہہ پر عیب لگانا تیسرا ان کے نام رکھنا اور ان تینوں میں دوسرے کی تحقیر اس کے مونہہ پر ہے لایسخر میں تو اس بات سے روکا ہے کہ اس کی تحقیر کے لیے اس پر ہنسی کرے اور لا تلمزوا میں اس سے کہ سر یا آنکھ یا ہونٹوں کے اشارہ اور کلام خفی سے اس کی تحقیر کرے اور لا تنابزوا میں اس سے کہ اس کے نام رکھے اور یہ تینوں باتیں عموماً دوسروں کے سامنے ہی ہوتی ہیں۔ اور اگلی آیت میں ان باتوں کا ذکر ہے جو عموماً پیٹھ پیچھے ہوتی ہیں اور تنابزوا بالالقاب میں ہر قسم کے نام رکھنا منع کیا ہے۔ مثلاً کسی کا ایسا نام رکھنا جسے وہ ناپسند کرے یا کسی کو یہودی یا نصرانی کہنا یا کسی کو فاسق یا منافق کہنا اور بالخصوص یہ دوسری باتیں مراد ہیں جیسا کہ بئس الاسم الفسوق سے ظاہر ہے یعنی ایک شخص جو ایمان لا چکا ہے اس کا نام یہودی یا نصرانی یا فاسق یا منافق رکھنا بہت بُرا کام ہے اور عورتوں کو یہاں بالخصوص خطاب کیا ہے کیونکہ یہ بیماری عورتوں میں بالخصوص پائی جاتی ہے۔

۳۱۲۵ تجسسوا جَسَّ سے ہے اور وہ اصل میں رگ کا چھونا ہے تاکہ صحت یا بیماری کا حکم لگانے کے لیے نبض کا حال دیکھا جائے اور وہ حسّ سے زیادہ خاص ہے، کیونکہ حسّ اس چیز کا جاننا ہے جس کا ادراک حِس سے ہو اور جَسّ ہر قسم کے حال کا جاننا ہے اور لفظ جاسوس اسی سے ہے (غ) اور تجسس دوسرے کے بھید کی تلاش کرنا ہے اور اسکا اطلاق غالباً شر میں ہوتا ہے اور تحسّس کا خیر میں (ث) اور جاسوس صاحب سِرِّ شر ہے اور ناموس صاحب سِرِّ خیر اور حدیث میں جساسۃ سمندر کے جزائر کا ایک دابّہ ہے جو خبریں تلاش کر کے دجال کو پہنچائیگا (ل) اور دابہ سے مراد یہاں زمین پر جھکا ہوا انسان ہے۔

یغتب۔ غِیْبَۃ یہ ہے کہ انسان دوسرے کے عیبوں کا ذکر کرے بغیر اس کے کہ اس ذکر کی ضرورت ہو (غ) اسی سے اغتیاب ہے اور حدیث میں ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ غیبت یہ ہے کہ تم اس بات کا ذکر اپنے بھائی کے متعلق کرو جسے وہ ناپسند کرتا ہے ذکرك اخاك بما یکرہ اور جب دریافت کیا گیا کہ اگر وہ بات جو کہی جاتی ہے میرے بھائی میں پائی جاتی ہو فرمایا یہی غیبت ہے اور اگر نہ پائی جاتی ہو تو یہ بہتان ہے۔ (ث)

لحم۔ گوشت کو کہتے ہیں جمع لحوم ہے لن ینال اللہ لحومھا (الحج ۲۲-۳۷)

یہاں تین اور باتوں کا ذکر ہے جن سے جماعت میں نقصان پیدا ہوتا ہے پہلی بات ظن ہے حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ اگر تمہارے بھائی کے منہ سے کوئی بات نکلے تو جب تک اسے اچھے معنی پر حمل کر سکتے ہو کرو اور ایک حدیث میں ہے ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ظن سے بچو ظن سب سے جھوٹی بات ہے (ث) اور اصول یہی ہے کہ جب تک ایک بات یا فعل نیکی پر محمول ہو سکتا ہے اسے بدی پر محمول نہ کیا جائے بعض الظن اثم میں بتایا کہ گو بعض وقت بدگمانی صحیح بھی ہو مگر ہمیں ضرورت نہیں کہ بدگمانی میں پڑیں اسلیئے کہ شاید وہ غلط ہی ہو اور گناہ ہو جائے اور دوسری بات جس سے روکا ہے لوگوں کے احوال کا تجسس کرنا ہے ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ مسلمان کی عورات (یعنی پردے کی باتوں) کی ٹوہ میں نہ لگے رہو جو ایسا کرتا ہے اللہ اسے رسوا کرتا ہے۔ (ر)

تیسری بات جس سے منع کیا ہے غیبت ہے یعنی پیٹھ پیچھے کسی کے عیبوں کا ذکر کرنا اور اسے مردہ بھائی کے گوشت کے کھانے سے تشبیہ دی ہے کیونکہ عیب یا کمزوری ایک مردہ گوشت کے حکم میں ہے لیکن حصول علم کیلئے لوگوں کے احوال کا تلاش کرنا یا کسی کے اس عیب کا بیان کرنا جس کا اثر اس علم پر پڑتا ہے جیسے راویوں کا کذب وغیرہ یہ ایک ضرورت کے لیے ہے غیبت وہ ہے جو بلا ضرورت ہو جیسا کہ راغب نے لکھا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ ﴿۱۳﴾

پرہیزگار ہے۔ اللہ تعالیٰ جاننے والا خبردار ہے ۳۱۲۶

قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ لٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَ لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَ اِنۡ تُطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَا یَلِتۡکُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِکُمۡ شَیۡـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۴﴾

دیہاتی کہتے ہیں ہم ایمان لائے، کہہ تم ایمان نہیں لائے، لیکن کہو ہم مسلمان ہوئے اور ایمان ابھی تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا، اور اگر تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تو تمھارے عملوں میں سے تمھیں کچھ کم کر کے نہیں دے گا اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۳۱۲۷

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا وَ جٰہَدُوۡا

مومن صرف وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، پھر کچھ شک نہیں کرتے اور اپنے مالوں اور اپنی

۳۱۲۶ شعوب شعب اکٹھا کرنا اور الگ الگ کرنا اور اصلاح کرنا اور بگاڑ کرنا ہے یعنی اضداد میں سے ہے اور شُعب بڑے قبیلہ کو کہتے ہیں جس کی جمع شُعُوب ہے یعنی سب سے بڑا شعب ہے پھر قبیلۃ پھر عمارہ پھر بطن پھر فخذ پھر فصیلہ اور یہ گویا انسان کے سر کی طرف سے نیچے کی طرف اعضا کے ناموں پر ہیں (ر ل)

تقویٰ عزت کا معیار ہے: ان ہدایات کے بعد ایک اصل بتایا کہ ایک دوسرے کی تحقیر یا عیب شماری وغیرہ جو کی جاتی ہے اس لیے کہ ایک شخص اپنے آپ کو بڑا معزز خیال کرتا ہے تو فرمایا کہ بڑا اور معزز اللہ کے نزدیک وہی ہے جو متقی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو نگاہ رکھنے والا اور کوئی بڑائی چھوٹائی اللہ کے ہاں کوئی قدر نہیں رکھتی بلکہ یہ جو مختلف قومیں اور قبیلے ہیں تو ان کی اصل غرض یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گویا یہ تقسیم انسانوں کی محض شناخت کے لیے ہے نہ بڑائی چھوٹائی پیدا کرنے والی۔ اسلام کی تعلیم کا یہ اصول ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقکم ایک ایسی بنیاد اخوت کی رکھتا ہے جس کا مقابلہ دنیا کا کوئی اصول نہیں کر سکتا یعنی تمام قومی تفریقات و امتیازات کو یکسر مٹا دیا ہے جن کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر فخر ہی نہیں بلکہ ظلم اور زیادتی بھی کر لیتے ہیں۔ اور کالے اور گورے کے سب جھگڑوں کو یکسر مٹا دیا آج دنیا جن مصائب میں سفید اور سیاہ کی تفریق سے پڑ رہی انکا کوئی علاج سوائے اسلام کے نہیں اور بیہقی کی ایک روایت میں حجۃ الوداع کے خطبے میں یہ لفظ آتے ہیں۔
یٰایہا الناس الا ان ربکم واحد لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاسود علی احمر ولا لاحمر علی اسود الا بالتقوٰی ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقکم (م)
یعنی اے لوگو تمہارا رب ایک ہی ہے پس عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی فضیلت ہے سوائے تقویٰ کے تم میں سے اللہ کے نزدیک وہی سب سے بڑھ کر عزت والا ہے جو سب سے بڑھ کر متقی ہے اور اس آیت کے شان نزول میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے بنی بیاضہ کو حکم دیا تھا کہ ابو ہند سے اپنی ایک عورت کی شادی کر دیں تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ کیا ہم اپنے موالی سے شادی کر دیں۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی اور آنحضرت نے خود زینب جیسی اعلیٰ خاندان کی عورت کی شادی زید ایک آزاد شدہ غلام سے کی اور آنحضرت صلعم کا نسب قطع نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ سیّد اگر کوئی بُرا کام کرے یا مرتد ہو جائے تو وہ بھی قابل عزت ہے۔ عزت بہرحال تقویٰ سے ہی ہے۔

۳۱۲۷ ظاہر ہے کہ یہ خاص لوگوں کا ذکر ہے مجاہد کہتے ہیں بنی اسد بن خزیمہ کا ذکر ہے جنہوں نے اسلام ظاہر کیا تھا مگر ان کے دلوں میں کھوٹ تھا وہ صرف مغانم اور دنیا کے مال کے خواہشمند تھے اور بعض کے نزدیک مزینہ جھینہ۔ اسلم۔ شجاع وغیرہ قبیلوں کا ذکر ہے بہرحال عام طور پر اعراب کا ذکر نہیں۔ دوسری جگہ ہے ومن الاعراب من یومن باللّٰہ والیوم الاٰخر ویتخذ ما ینفق قربٰت عند اللّٰہ وصلوٰت الرسول (التوبۃ ۹: ۹۹) اسلمنا سے یہاں مراد صرف ظاہری طور پر فرمانبرداری کر لینا ہے لیکن یہ الفاظ لا کر بتا دیا کہ دائرہ اسلام میں وہ بھی داخل ہیں اور جماعت اسلامی کا حصہ ہیں انہیں اسلام سے خارج قرار نہیں دیا بلکہ آخر پر ان اللّٰہ غفور رحیم لا کر مسلمانوں کو یہی ہدایت کی ہے کہ ان سے نرمی کا معاملہ کریں اور برائے نام مسلمانوں کو بھی مسلمان اور اپنے بھائی ہی سمجھیں۔ ہاں ان کی کمزوریوں کا ذکر کر کے اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔ اور اگلی آیت میں بتایا کہ مومن کے نام کے مستحق ہونا چاہتے ہو تو اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کر کے دکھاؤ یوں مومن اور مسلم میں ایک فرق رکھا ہے یعنی مسلم تو ہر وہ شخص ہے جو دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا خواہ ابھی اسلام کے احکام پر پورے طور پر عامل ہے یا نہیں اور خواہ دل میں وساوس بھی پیدا ہوتے ہوں اور مومن وہ ہے جس کا نہ صرف دل ہر قسم کے وساوس سے پاک ہے بلکہ جو بلحاظ عمل بھی اس بلند مرتبہ پر پہنچ چکا ہے کہ اس کی ساری طاقت اور اس کا مال و دولت اعلائے کلمۃ اللہ میں صرف ہوتے ہیں۔ اور یہاں ایمان کامل یعنی اس کے تینوں پہلوؤں کا ذکر ہے۔ اول اقرار لسانی اٰمنوا باللّٰہ ورسولہ دوم تصدیق قلبی ثم لم یرتابوا سوم عمل بالجوارح جاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللّٰہ جو لوگ اپنے بھائیوں پر ذرا ذرا کمزوریاں دیکھ کر کفر کے فتوے صادر کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ مقام محل غور ہے کہ قرآن کریم کس صراحت سے ان لوگوں کو مسلم قرار دیتا ہے جن کے متعلق خود ہی فرماتا ہے۔ کہ ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ آج اس معیار پر کتنے مسلمان پورے اترتے ہیں اور کتنے ان اعراب کے ذیل میں آتے ہیں جو صرف نام کے مسلمان کہلوا کر اسلام پر احسان جتاتے ہیں۔

بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ⑮

جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں - یہی
سچّے ہیں -

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِیْنِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ
یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ
وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ⑯

کہہ کیا تم اللہ تعہ کو اپنا دین جتاتے ہو اور اللہ (تعالیٰ)
جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ،
اور اللہ تعہ ہر چیز کا جاننے والا ہے -

یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا
تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ
عَلَیْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ⑰

تجھ پر احسان جتاتے ہیں کہ وہ اسلام لائے ، کہہ مجھ پر اپنے
اسلام کا احسان مت رکھو ، بلکہ اللہ تعہ نے تم پر احسان
کیا کہ تمھیں ایمان کی راہ دکھائی —— اگر
تم سچّے ہو ۳۱۲۸ء

اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ
ع ۲ ۱۴ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ع ⑱

اللہ تعہ آسمانوں اور زمین کا غیب جانتا ہے اور اللہ تعہ
اسے دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو -

۳۱۲۸ء بنی اسد بن خزیمہ کے متعلق لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلعم کے پاس آئے تو کہنے لگے کہ ہم بوجھوں اور عیال کے ساتھ آپ کے پاس آئے ہیں اور ہم نے آپ کے ساتھ جنگ نہیں کی جیسا کہ فلاں قبیلہ نے کی ہے تو گویا یہ احسان جتانا تھا تو فرمایا کہ احسان تو اللہ کا تم پر ہے کہ تمہیں ایمان کا رستہ دکھا دیا آج جو لوگ خدا اور اس کے رسول کے لیے تنکا بھی نہیں اٹھاتے وہ بھی عملی طور پر گویا اسلام پر احسان جتاتے ہیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کو اللہ کے رستے میں کچھ کام کر کے یہ کہنا مناسب نہیں کہ میں نے فلاں بڑا کام کیا ہے بہت ایسے لوگ ہیں جن کو کسی خدمت دینی کی توفیق ملتی ہے تو وہ اسے بہت بڑی چیز سمجھ کر خدا کے دین یا اس کے رسول پر احسان سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ان کا فرض تھا جو انہوں نے ادا کیا ؛

آیاتھا ۴۵ (۵۰) سُوْرَۃُ قٓ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتھا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ①

(اللہ سب باتوں پر) قادر ہے، بزرگی والا قرآن گواہ ہے ۳۱۲۹

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ②

بلکہ یہ تعجب کرتے ہیں کہ ان کے پاس ان میں سے ایک ڈرانے والا آیا، سو کافر کہتے ہیں یہ عجیب بات ہے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ③

کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو اٹھائے جائیں گے)، یہ لوٹ کر آنا دُور (از قیاس) ہے ۳۱۳۰

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ④

ہم جانتے ہیں جو زمین ان سے کم کر دیتی ہے اور ہمارے پاس حفاظت کرنے والی کتاب ہے ۳۱۳۱

نام: اس سورت کا نام قٓ ہے اور اس میں تین رکوع اور پینتالیس آیتیں ہیں۔ قٓ مقطعات قرآنی میں سے ہے اور مراد اس سے اللہ تعالیٰ کا اسم قادر یا قدیر ہے۔ اور اس سورت میں یہی دکھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعہ سے ایک انقلاب عظیم پیدا کر دے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی قیامت کا ذکر بھی ہے اور دونوں باتوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی طرف ہی توجہ دلائی ہے اور ترتیب کے لحاظ سے پچھلی سورتوں سے تعلق ظاہر ہے اس لیے کہ سورۃ الفتح میں دین اسلام کے کل دینوں پر غلبہ کا ذکر تھا۔ اور سورۃ الحجرات اسی کے ایک حصہ کی تفسیر تھی۔ پس اس سورت کو ساتھ رکھ کر یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس غلبہ کے لانے پر قادر ہے اور کہ یہ غلبہ بذریعہ قرآن کریم ہوگا۔ اسی لیے قرآن کی صفت مجید کا سب سے پہلے یہاں ذکر کیا ہے اور یہ سورت مکی ہے اور اس کا نزول غالباً ابتدائی مکی زمانہ سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

۳۱۲۹ ق۔ ابن جریر میں تین قول لکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ قرآن کے اسماء میں سے ہے۔ زمین کے ارد گرد ایک پہاڑ ہے۔ مگر اس تیسری بات کو توسیاق سے کوئی تعلق نہیں اور روح المعانی میں ایک قول نقل کیا ہے کہ جبل قاف کا جس کے بہت طول طویل قصے بنائے گئے ہیں، کوئی وجود نہیں اور پہلا قول ابن عباس کا ہے اور وہی صحیح ہے۔

مجید۔ مجد کرم اور جلال کی وسعت ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت میں بھی مجید ہے یعنی وہ عطائے فضل میں جو اس سے خاص ہے وسعت والا ہے اور قرآن کا وصف بھی ہے۔ بہ سبب کثرت اس کے جو مکارم دنیوی اور اخروی سے اس میں ہیں (غ)۔

ق والقرآن المجید کی ترکیب ایسی ہی ہے جیسے ص والقرآن ذی الذکر کی۔ اور جواب قسم گو ق میں آگیا جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے جس کا کافر انکار کرتے ہیں۔ یعنی قیامت کا آنا یا آنحضرت صلعم کا روحانی قیامت قائم کرنا اور اس پر گواہ خود قرآن مجید کو بنایا ہے اس لیے کہ اس کے ذریعہ سے دنیا میں مجد پیدا ہوگی اور اس کے متبعین کو مکارم دنیوی اور اخروی سے حصہ کثیر دیا جائیگا۔ اور قرآن شریف میں قیامت کے ذکر کیساتھ ساتھ اس روحانی قیامت کا ذکر بھی چلتا ہے۔ جس کی طرف یحشر الناس علی قدمی میں اشارہ ہے۔

۳۱۳۰ بعید۔ بعد کے لیے دیکھو ۱۴۷۷ فی العذاب والضلل البعید (السبا ۸:۳۴) میں بعید سے مراد گمراہی میں ایسی دوری ہے جس سے لوٹ کر ہدایت کی طرف آنا سخت دشوار ہے اور ما قوم لوط منکم ببعید (ھود ۸۹) میں گمراہی میں مقاربت ہے (غ) اور یہاں بعید سے مراد بعید از مکان یا بعید از عادت ہے (ر)۔

۳۱۳۱ تنقص۔ نقص حظ میں کمی کرنا ہے اور منقوص کم کیا گیا نقص من الاموال (البقرۃ ۱۵۵) غیر منقوص (ھود ۱۰۹) (غ)

کتاب حفیظ سے مراد حفاظت کرنے والی کتاب ہے کتاب حافظ تفصیل الاشیاء (ر) مگر جس چیز کی حفاظت کی طرف یہاں اشارہ ہے وہ اعمال انسانی ہیں۔ کیونکہ انہی کی حفاظت کا ذکر بار بار قرآن شریف میں آتا ہے جیسے کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون (الانفطار ۱۱، ۱۲) ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید (ق ۱۸) لہ معقبات من بین یدیہ و من خلفہ یحفظونہ من امر اللہ (الرعد ۱۱)۔

دوسری پیدائش اعمال سے ہے؛ پس ان کے اس اعتراض کے مقابل پر کہ ہم مٹی ہو جائیں گے فرمایا ہے کہ جس چیز کو زمین کم کر دے گی اسے بھی ہم جانتے ہیں یعنی وہ جسم انسانی ہے لیکن ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو ان چیزوں کو محفوظ کر لیتی ہے جو محفوظ کرنے کے قابل ہیں یعنی اعمال انسانی کو اس لیے کہ جسم میں تو یہاں بھی ہر آن ایک تغیر رہتا ہے۔ لیکن اعمال کے نتائج ساتھ ساتھ پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اور کوئی عمل بے فائدہ نہیں ہوتا۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ﴿۵﴾

بلکہ انھوں نے حق کو جھٹلا دیا، جب وہ ان کے پاس آیا۔ سو وہ الجھن کی حالت میں ہیں ۳۱۳۲

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ﴿۶﴾

تو کیا وہ اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھتے ہم نے اُسے کس طرح بنایا اور اسے زینت دی اور اس میں کوئی خلل نہیں ۳۱۳۳

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ﴿۷﴾

اور زمین کو ہمیں نے پھیلایا اور اس میں پہاڑ ڈالے اور اس میں ہر قسم کی خوش نما چیزیں اگائیں۔

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴿۸﴾

ہر ایک رجوع کرنے والے بندے کو سمجھانے اور یاد دلانے کو۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ﴿۹﴾

اور ہم نے بادل سے برکت والا پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ باغ اگائے اور دانہ جو کاٹا جاتا ہے۔

وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ﴿۱۰﴾

اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھا تہ بتہ ہے ۳۱۳۴

رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿۱۱﴾

بندوں کے لیے رزق (ہے) اور اس کے ساتھ ہم مُردہ بستی کو زندہ کرتے ہیں اسی طرح نکلنا ہوگا ۳۱۳۵

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ﴿۱۲﴾

ان سے پہلے بھی جھٹلایا نوحؑ کی قوم نے اور کنوئیں والوں نے اور ثمود نے۔

وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ﴿۱۳﴾

اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے۔

وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۭ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾

اور بن کے رہنے والوں اور تُبّع کی قوم نے، سب نے رسولوں کو جھٹلایا سو میرا (عذاب کا) وعدہ سچا ہُوا۔

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۭ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۵﴾ ع ۱۵/۱۵

تو کیا ہم پہلی پیدائش میں تھک گئے؟ بلکہ وہ نئی پیدائش کے متعلق شبہ میں ہیں ۳۱۳۶

ع ۳۱۳۲ مریج کے لیے دیکھو ع ۲۳۸۶ مراد یہ ہے کہ ایک رائے قایم نہیں کر سکتے کبھی سحر کہتے ہیں کبھی کہانت وغیرہ۔

ع ۳۱۳۳ آسمان میں فروج نہ ہونے سے مراد: فروج دیکھو ع ۲۲۵۲ والمراد سلامتھا من کل عیب وخلل (ر) مراد اس سے ہر عیب اور خلل سے سلامت ہونا ہے اور دوسری جگہ فرمایا الذی خلق سبع سمٰوات طباقا ما تری فی خلق الرحمان من تفوت فارجع البصر ھل تری من فطور (الملک ۶۷ - ۳) جہاں آسمانوں کے ذکر میں ہی فرمایا ہے کہ نہ ان میں تفاوت ہے نہ اختلال یعنی ایک ہی قانون کے ماتحت سب نظام چل رہا ہے یہی منشا یہاں فروج کے نہ ہونے سے ہے یعنی قانون الٰہی میں کوئی فرق اور اختلال نہیں۔

ع ۳۱۳۴ بٰسقٰت۔ بسق فلانٌ علی اصحابہ یعنی ان پر علو حاصل کیا اور باسق وہ ہے جو اونچائی میں لمبا ہو جائے (غ)

ع ۳۱۳۵ دیکھو ع ۲۵۸۵ اس کے اندر دونوں مفہوم شامل ہیں۔ قیامت میں مردوں کا زندہ کرنا۔ روحانی زندگی کا عطا کرنا۔ جس طرح آسمانی بارش سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے اسی طرح وحی کی بارش سے روحانی مردے زندہ ہو جاتے ہیں اور یہ قیامت کا ثبوت ہے۔

ع ۳۱۳۶ مطلب یہ ہے کہ پہلی پیدائش جو نیستی سے ہستی کرنا تھا اگر اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ عاجز نہیں آئی تو نئی پیدائش کے متعلق یہ شبہات

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾

اور ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں جو اس کا نفس وسوسہ ڈالتا ہے اور ہم اس سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں ۳۱۳۷

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴿۱۷﴾

جب دو لینے والے لیتے جاتے ہیں (وہ) دائیں اور بائیں بیٹھے ہوتے ہیں ۳۱۳۸

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿۱۸﴾

وہ کوئی بات نہیں بولتا، مگر اس کے پاس ایک نگہبان تیار ہوتا ہے ۳۱۳۹

کہ یہ کس طرح ہوگا۔ صحیح نہیں یہاں اس دوسری پیدائش کو خلق جدید کہہ کر صاف بتا دیا کہ یہی جسم پھر نہیں بنے گا۔ بلکہ وہ ایک نئی پیدائش ہوگی اور وہ جسم جیساکہ اوپر ذکر ہوا اعمال انسانی سے تیار ہوگا ؎

۳۱۳۷ حبل الورید۔ حَبْل ہر ذریعہ کو کہتے ہیں ۴۹۰ اور یہاں مراد رگ ہے اور ورید وہ رگ ہے جو جگر اور دل سے ملتی ہے اور اس میں خون اور روح (حیوانی) کے مجاری ہیں (غ) پہلے رکوع میں آسمان زمین وغیرہ کی پیدائش کا ذکر کیا تو اس میں انسان کی پیدائش اور اس کے ساتھ ہی اس کے اعمال کی حفاظت کا ذکر کیا ہے جس کی طرف کتاب حفیظ (۴) میں اشارہ کیا تھا پہلے اپنے علم کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نہ صرف انسان کے اعمال کا ہی علم ہے بلکہ ان بُرے خیالات کا بھی علم ہوتا ہے۔ جو اسکے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور برے خیالات کا ذکر بالخصوص اس لیے کیا کہ شریروں کی سزا کا ذکر خصوصیت سے آگے کیا ہے اور یہ بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو خالق فطرت انسانی ہے وہی اس کی اندرونی بیماریوں اور اس کے وساوس سے بھی خبردار ہے۔ اور بذریعہ اپنی وحی کے ان کا علاج کرتا ہے اور یہاں وسوسہ کو نفس کی طرف منسوب کیا ہے اور دوسری جگہ شیطان کی طرف من شر الوسواس الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس اور یہ دونوں باتیں صحیح ہیں وسوسہ کے پیدا کرنے میں شیطان کی تحریک بھی ہے اور وہ وسوسہ انسان کے اندر ہی پیدا ہوتا ہے اور انسان سے اپنے قریب ہونے کا ذکر اس لیے کیا کہ انسان گناہ پر جرات اس لیے کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دور سمجھتا ہے۔

۳۱۳۸ شمال۔ یمین کے مقابل پر ہے اور اس کی جمع شمائل ہے عن الیمین والشمائل (النحل ۱۶-۴۸) عن ایمانھم وعن شمائلھم (الاعراف ۷-۱۷) اس کے معنی زجاج نے کیے ہیں کہ میں انہیں اس بارہ میں گمراہ کروں گا جس سے وہ روکے گئے ہیں اور بعض نے اس کے معنی کیے ہیں کہ میں اس میں انکو گمراہ کرونگا جو وہ عمل کرتے ہیں کیونکہ جو کچھ انسان کمائے کسبت یداک کا مصداق ہی ہوتا ہے گو دونوں ہاتھوں نے فی الواقع کچھ نہ کیا ہو اور حدیث میں قرآن کے ذکر میں ہے یُعطی صاحبُہ یوم القیامۃ المُلْکَ بیمینہ والخُلْدَ بشمالہ تو آپ کا اس سے یہ مطلب نہیں تھا کہ واقعی کوئی چیز اس کے دائیں یا بائیں ہاتھ میں پکڑا دی جائے گی بلکہ یہ منشا ہے کہ ملک اور خلد دونوں اسے دیئے جائیں گے اور طَیْرٌ شِمال اس پرند کو کہا جاتا ہے جس سے بدفال لی جائے اور جری لہ غراب شمالٍ میں مراد ہے ما یکرہ یعنی ایسی بات پیش آئی جسے وہ ناپسند کرتا تھا اور اہل عرب کہتے ہیں فلان عندی بالیمین جس سے مراد ہوتی ہے کہ وہ منزلہ حسنہ یا اچھے مرتبہ پر ہے گویا یمین کے معنے منزلہ حسنہ ہیں اور جب ایک شخص کا مقام ذلیل ہو تو کہا جاتا ہے انت عندی بالشمال اور شمال کے معنی شؤم یا نحوست بھی ہیں۔ اور اِشْتَمَلَ علیہ الامر کے معنی ہیں احاطہ اس کا احاطہ کیا یا اسے شامل کیا اما اشتملت علیہ ارحام الانثیین (الانعام ۶-۱۴۴)

قعید۔ قعود کے معنی تَرَصُّد بھی آتے ہیں یعنی کسی چیز کے انتظار میں ہونا یا اسے نگاہ میں رکھنا لاقعدن لھم صراطک المستقیم (الاعراف ۷-۱۶) اور انا ھھنا قاعدون (المائدۃ ۵-۲۴) میں معنی متوقعون ہیں یعنی امید میں ہیں اور یہاں قعید سے مراد ہے کہ وہ فرشتہ اسے نگاہ میں رکھتا ہے اور اس کے لیے اس کے خلاف لکھتا ہے۔ اور (قعید) واحد اور جمع پر یکساں بولا جاتا ہے (غ) اور مجاہد سے بھی قعید کے معنی رصد مروی ہیں (ج)

اب اس حفاظت اعمال کا ذکر صراحت سے فرماتا ہے دو لینے والے ہیں جو ہر فعل اور قول کو لے لیتے ہیں یعنی وہ فرشتے جو ہر انسان کے ساتھ ہیں اور نیک و بد اعمال کو محفوظ کر لیتے ہیں اور عن الیمین و عن الشمال میں اشارہ منزلہ حسنہ اور گری ہوئی حالت کی طرف ہے جو علی الترتیب نیکی اور بدی سے پیدا ہوتی ہیں اور دوسری جگہ انہی لینے والوں کو کاتبین یا لکھنے والے کہا ہے کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون (الانفطار ۸۲-۱۱ و ۱۲) مگر ان کا لکھنا اس طرح قلم و دوات سے نہیں نہ اس طرح کے کاغذوں پر ہے جیسا ہم انسان لکھتے ہیں جیساکہ روح المعانی میں بھی ہے وکذا لم یصح خبر قلمھما ومدادھما۔ پس ان کا لکھنا ان کا کسی طرح پر محفوظ کر لینا ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے ہاں اس لکھنے یا حفاظت کے نتائج ہم بھی دیکھ لیتے ہیں اور پوری صفائی سے وہ قیامت میں نظر آئیں گے جیساکہ آگے آتا ہے اور یہ بھی بعض آثار میں ہے کہ بھلائی لکھنے والا فرشتہ دوسرے پر امین یا امیر ہے ؎

۳۱۳۹ یلفظ۔ لَفْظ کسی چیز کا پھینکنا ہے جو تمہارے منہ میں ہو اسی سے لَفَظْتُ بالکلام کے معنی ہیں کلام کیا (ل) عتید۔ عتاد کسی چیز کا ذخیرہ کر رکھنا ہے قبل اس کے کہ اس کی حاجت ہو جیسے اعداد یا تیار رکھنا اور عتید تیار کرنے والا بھی ہے اور وہ چیز بھی جو تیار کی گئی ہو اور یہاں عتید کے معنی

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ⑲
اور موت کی بے ہوشی سچ مچ آکر رہے گی، یہ وہ ہے جس سے تو کنارہ کرتا تھا ۳۱۴۰

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ⑳
اور صور میں پھونکا جائے گا یہ (عذاب کے) وعدے کا دن ہے۔

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ㉑
اور ہر شخص آئے گا اس کے ساتھ (ایک) چلانے والا اور (ایک) گواہ ہوگا ۳۱۴۱

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ㉒
یقیناً تو اس سے غفلت میں تھا تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے ہٹا دیا، پس تیری نگاہ آج تیز ہے ۳۱۴۲

وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ؕ ㉓
اور اس کا ساتھی کہیگا یہ وہ ہے جو میرے پاس تھا جہنم کے لیے تیار ۳۱۴۳

اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ۙ ㉔
ہر ناشکرے دشمن (حق) کو دوزخ میں ڈال دو ۳۱۴۴

اعمال عباد کو ذخیرہ رکھنے والا ہیں اور آگے آتا ہے ھذا ما لدی عتید اور اعتدنا لھم عذابا الیما (النسآء ۴-۱۸) میں اعتدنا کو بعض نے اسی مادہ سے قرار دیا ہے اور بعض کے نزدیک اعدنا سے ہے (غ)

۳۱۴۰ تحید حاد ایک چیز سے پھر گیا اس سے ہٹ کر دوسری طرف مائل ہوا یا بھاگ گیا (ل)

۳۱۴۱ سائق۔ سوق چلانا سائق چلانے والا اور مراد وہ فرشتہ ہے جو اسے چلائے (غ) یا محشر کی طرف لے جائے (ل) اور حضرت عثمان سے مروی ہے۔ سائق اللہ کی طرف چلانے والا اور شہید اس کے عملوں کی گواہی دینے والا اور ابن عباس سے ہے کہ سائق فرشتوں میں سے ہے اور شہید اپنے نفس سے اس پر گواہی دینے والا یعنی جوارح اور مجاہد سے ہے کہ سائق امر اللہ کی طرف لے جانے والا اور شہید اعمال کی گواہی دینے والا اور قتادہ سے ہے کہ سائق حساب کی طرف چلانے والا ہے (ج) اور جابر سے مرفوع ہے کہ ملک حسنات اور ملک سئیات میں سے ایک سائق ہے اور ایک شہید اور ابو ہریرہ سے ہے کہ سائق ملک الموت ہے اور شہید آنحضرت صلعم اور ابو مسلم کا قول ہے کہ سائق شیطان ہے جو دنیا میں انسان کے ساتھ تھا (ر) اور چونکہ یہاں ذکر دو فرشتوں کا ہے جو حسنات اور سیئات کو لکھتے ہیں اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ مراد سایق اور شہید سے وہی ہیں اور بدیوں کے لکھنے والے کو سایق اس لیے کہا کہ بدیوں کے نتائج سامنے آنے پر انسان ان کی طرف خود قدم نہیں اٹھاتا گویا مجبور کر کے اس کی طرف لے جاتا ہے جس طرح ایک چارپائے کو لے جایا جاتا ہے۔ اور نیکیوں کے لکھنے والا چونکہ انسان کے اعمال حسنہ کی گواہی دیتا ہے اس لیے اسے شہید کہا ؂

۳۱۴۲ غطاء وہ چیز ہے جو کسی چیز کے اوپر ڈالی جائے از قسم طبق وغیرہ جیسا کہ غشاء وہ ہے جو از قسم لباس دوسری کے اوپر ڈالی جائے اور جہالت کے لیے استعارۃً استعمال ہوا ہے (غ)

بدی کے بدنتائج کو انسان یہاں کیوں نہیں دیکھتا: من ھذا میں اشارہ بدی کے بدنتائج کی طرف ہے جن پر لفظ سائق دلالت کرتا ہے یعنی جب وہ نتائج سامنے آئینگے تو اس وقت وہ شخص گویا اس قول کا مصداق ہوگا اور غطاء کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ وہ نتائج بد تو یہاں بھی دیکھے جا سکتے ہیں مگر انسان کی آنکھوں پر ایک پردہ پڑا رہتا ہے۔ اور لذات دنیا میں انہماک کی وجہ سے وہ انہیں نہیں دیکھتا۔ تو قیامت میں صرف وہ غطاء دور کر دیا جاتا ہے جو یہاں پڑا ہوا تھا جس سے معلوم ہوا کہ بدنتائج تو پہلے بھی اسی طرح موجود تھے مگر انسان انہیں دیکھتا نہ تھا اور قیامت کے دن ان چیزوں کو اس لیے دیکھ لے گا کہ اس کی نظر تیز ہو جائے گی یا اس کو نئے حواس مل جائیں گے۔ جن سے وہ اس قابل ہو جائے گا کہ ان لطیف امور کو بھی دیکھ لے جو ان حواس سے مخفی ہیں اور بعض نے من ھذا سے مراد امور معاد وغیرہ کو لے کر یہ معنے کیے ہیں کہ وحی الٰہی سے ہم نے وہ غفلت کا پردہ دور کر دیا۔ جس کی وجہ سے لوگوں کو یہ امور نظر نہ آتے تھے (ر) اور اس میں شک نہیں کہ قیامت کبریٰ کے ساتھ ساتھ اس قیامت روحانی کا ذکر بھی چلتا ہے جو نبی کریم صلعم کے وجود سے دنیا میں قایم ہوئی ؂

۳۱۴۳ قرین سے مراد شیطان قرین ہے وقیضنا لھم قرناء (حٰمٓ ۴۱-۲۵) یعنی جب بدی کے بدنتائج سامنے آئیں گے تو شیطان جو اس بدی کا محرک تھا وہ بھی آئے گا کہ یہ میری تحریک سے تیار ہوا ہے جو جہنم میں ڈالا جانے کے لائق ہے۔

۳۱۴۴ القیا میں ہو سکتا ہے کہ خطاب سائق اور شہید کی طرف ہو اور دونوں کو خطاب اس لیے کیا کہ بدی کی وجہ سے اسے جہنم میں ڈالا جاتا ہے اور نیکی اس کی اس قدر کم تھی کہ وہ بدی کے بدنتائج کو دور نہ کر سکی مگر مفسرین نے اور توجیہات بھی کی ہیں ایک یہ کہ القیا کا الف نون تاکید کی جگہ ہے اور حسن کی قرات القین نون خفیفہ سے اس معنی کی موید ہے (ر) اور دوسری یہ کہ اہل عرب اکیلے اور جماعت کو حکم دینے میں تاکید کے لیے تثنیہ کو استعمال کرتے ہیں اس پر ابن جریر نے کئی شعر

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِۣ ﴿۲۵﴾
نیکی سے روکنے والے حد سے بڑھنے والے شک کرنے والے کو۔

الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿۲۶﴾
جو اللہ کے ساتھ دوسرا معبود ٹھیراتا تھا، سو اُسے سخت عذاب میں ڈال دو۔

قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۲۷﴾
اس کا ساتھی کہے گا اے ہمارے رب مَیں نے اسے سرکش نہیں بنایا بلکہ وہ خود ہی گمراہی میں دُور نکل گیا تھا۔ ۳۱۴۵

قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾
کہے گا میرے سامنے مت جھگڑو اور مَیں نے (عذاب کا) وعدہ تمھاری طرف پہلے بھیج دیا تھا۔

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۲۹﴾ ع ۱۶
میرے حضور بات بدلی نہیں جاتی اور نہ میں بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا ہوں۔

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿۳۰﴾
جس دن ہم دوزخ کو کہیں گے کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے۔ ۳۱۴۶

نقل کیے ہیں۔ مثلاً فقلت لصاحبی لاتحبسانا .... یافان تزجرانی یا بن عفان انزجر۔ اور بعض نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ تثنیہ فعل کے دوہرانے کے قائم مقام ہوتا ہے یعنی الق الق کی جگہ القیا کہہ دیا اور فعل کا دوہرانا تاکید کے لیے ہے اور الملک ۶۷-۴ میں کرتین سے مراد کثرت ہے۔

۳۱۴۵۔ گویا شیطان اپنی بریت ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اسے گمراہ نہیں کیا یہ خود ہی گمراہی میں مبتلا تھا اس کا جواب دیا ہے لا تختصموا لدی۔ یعنی میرے حضور جھگڑا نہ کرو۔ دونوں کو بدی پر عذاب کا وعدہ دیا گیا تھا۔ کفار اور ان کے شیاطین کا یہ جھگڑا قرآن شریف میں کئی جگہ مذکور ہے ما کان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی فلا تلومونی ولوموا انفسکم (ابراھیم ۱۴-۲۲)

۳۱۴۶۔ امتلأت مَلَأَ الشَّیءَ ایک چیز کو بھر دیا اور اِمْتَلَاءَ وہ بھر گئی۔

مزید۔ زیادہ پر دیکھو ۱۳۹۰ اور ھل من مزید میں زیادہ کے لیے استدعا بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ وہ بھر چکی ہے جیسا فرمایا لاملأن جھنم من الجنۃ والناس اجمعین (ھود ۱۱-۱۱۹) (غ)

اللہ کے دوزخ میں وضع قدم سے مراد: قول کے لیے دیکھو ۴۵ کسی چیز کی حالت کسی بات پر دلالت کرے تو اس پر بھی قول کا لفظ بول دیا جاتا ہے اِمْتَلأَ الحوض وَقال قطنی بخاری میں حضرت انس سے ہے قال یُلقٰی فی النار وتقول ھل من مزید حتی یضع قَدَمَهٗ فتقول قَطْ قَطْ۔ یعنی لوگ آگ میں ڈالے جائیں گے اور دوزخ کہے گی کچھ اور بھی ہے یہاں تک کہ وہ اپنا قدم اس میں رکھے گا پس وہ کہے گی بس بس۔ اسی کی مثل اور روایات بھی ہیں۔ وہ امور جو عالم آخرت سے تعلق رکھتے ہیں ان کے متعلق ظاہر الفاظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے قدم سے مراد سچ مچ کا قدم ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ ان تشبیہات سے پاک ہے لیس کمثلہ شیئ نہایہ اور لسان العرب میں الفاظ حتی یضع اللہ فیھا قَدَمَهٗ کی تشریح میں ہے کہ حسن اور ان کے اصحاب سے روایت ہے کہ اس سے مراد ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں ان لوگوں کو ڈالے جنھیں اپنی بدترین مخلوقات میں سے اس نے آگ کے لیے پہلے سے بھیج رکھا ہے الذین قدمھم لھا من شرار خلقہ تو وہ اللہ کا قدم آگ کے لیے ہیں فھم قدم اللہ للنار جیسا کہ مسلم اس کا قدم جنت کے لیے ہیں اور قَدَم ہر ایک وہ چیز ہے جسے تم خیر یا شر سے آگے بھیجو اور کہا گیا ہے کہ کسی چیز پر قدم کا رکھنا مثال ہے ردع اور قمع کے لیے یعنی باز رکھنے اور ذلیل کرنے کیلئے گویا یوں فرمایا گیا کہ اللہ کا امر اس کے لیے آئے گا تو اسے اور زیادہ کے طلب سے روک دے گا اور اس کے یہ معنی بھی کیے گئے ہیں کہ اس سے مراد اس کے جوش کا ٹھنڈا کرنا ہے جیسا کہ کسی امر کے لیے جس کے تم ابطال کا ارادہ کرو کہا جاتا ہے وضعتہ تحت قدمی (ن-ل) اور بعض نے قدم سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ لیا ہے جو وہ پہلے سے کر چکا ہے سبقت رحمتی غضبی (غق) اور یہ ظاہر ہے کہ یہ کلام اسی طرح صورت حال کا اظہار ہے جس طرح فقال لھا وللارض ائتیا طوعا او کرھا قالتا اتینا طائعین۔ جس سے مراد صرف زمین اور آسمان کی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا اظہار ہے نہ یہ کہ وہ لفظ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان سے کہے تھے اور انہوں نے وہ جواب دیا تھا۔ اسی طرح یہاں بھی یہ ظاہر کرنا مراد ہے کہ دوزخ تو ھل من مزید کا ہی نعرہ لگاتی ہے اگر کوئی چیز اسکی آگ کو ٹھنڈا کر سکتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے جس طرح انسان کی حرص ہر وقت ھل من

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ﴿۳۱﴾

اور بہشت متقیوں کے لیے قریب کردی گئی ہے کچھ دور نہیں ۳۱۴۷

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ﴿۳۲﴾

یہ وہ ہے جس کا تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے ہر اللہ کی طرف رجوع کرنیوالے حفاظت کرنیوالے کے لیے ۳۱۴۸

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ﴿۳۳﴾

جو غیب میں رحمٰن سے ڈرتا ہے اور رجوع کرنے والے دل کے ساتھ آتا ہے۔

ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿۳۴﴾

سلامتی سے اس میں داخل ہو جاؤ، یہ رہنے کا دن ہے۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿۳۵﴾

ان کے لیے اس میں ہوگا جو وہ چاہیں اور ہمارے پاس (اس سے) بڑھ کر ہے ۳۱۴۹

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِى الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۶﴾

اور کتنی نسلیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیں جو قوت میں ان سے سخت تر تھیں، سو انھوں نے شہروں کو چھان مارا کیا کوئی بھاگنے کی جگہ ہے ۳۱۵۰

اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴿۳۷﴾

اس میں اس کے لیے نصیحت ہے جس کا دل ہے، یا وہ کان لگاتا ہے درانحالیکہ (اس کا دل) حاضر ہے ۳۱۵۱

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ وقتوں میں پیدا کیا۔ اور تکان نے ہمیں نہیں چھوا ۳۱۵۲

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾

سو اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں، اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر سورج نکلنے سے پہلے اور ڈوبنے سے پہلے۔

مزید کا نعرہ لگاتی ہے وہی مثال دوزخ کی ہے جزاء وفاقا یہ دونوں نعرے زبان حال سے ہی ہیں ؏

۳۱۴۷ یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ بہشت قیامت کے دن متقیوں کے لیے قریب کردی جائے گی لیکن قریب کرنے کا ذکر اس دنیا کے لیے زیادہ موزون ہے۔ یعنی متقی کے لیے اسی جگہ جنت قریب کردی جاتی ہے گویا جس قدر وہ تقویٰ میں قدم بڑھاتا ہے اسی قدر جنت اس سے قریب ہوتی چلی جاتی ہے اس لیے غیر بعید ساتھ بڑھایا کہ دور نہیں جیساکہ خیال ہے کہ قیامت میں ہی جاکر ملے گی۔ اور دوسری جگہ ہے ان رحمت الله قریب من المحسنین۔

۳۱۴۸ حفیظ دیکھو ۸۰۷ یہاں مراد ہے احکام الٰہی یا حدود اللہ کی حفاظت کرنے والا یا ان کی نگہداشت کرنے والا۔

۳۱۴۹ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے کہ انسان جو چاہے اسے مل جائے لہم ما یشاءون فیہا مگر لدینا مزید میں بتایا کہ ہم اسے وہ کچھ بھی دیں گے جو اس کے اپنے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ اور اسے اللہ تعالیٰ کی رویت سے بھی تعبیر کیا گیا ہے جیسے زیادۃ کو دیکھو ۱۳۹۰

۳۱۵۰ نقبوا۔ نقب دیوار اور چمڑے میں سوراخ کرنا ہے اور نقّب القومُ کے معنی ہیں سار وا وہ چلے گئے اور نقیب وہ ہے جو قوم کے حالات کا پتہ لگاتا ہے اس کی جمع نُقَبَاء ہے وبعثنا منہم اثنی عشر نقیبا (المائدۃ ۵-۱۲) (رغ) ھل من محیص۔ علیحدہ کلام ہے یعنی ہم نے پہلوں کو ہلاک کردیا تو کیا ان کے لیے کوئی بھاگ کر چلا جانے کی جگہ ہے۔

۳۱۵۱ لمن کان لہ قلب دیکھو ۱۴۰۹ ظاہر ہے کہ یہاں مراد عقل و علم ہی ہے ورنہ دل تو ہر ایک کا موجود ہی ہے اور وھو شہید میں بھی حضور قلب ہی مراد ہے جس کا دل حاضر نہیں وہ گویا وہاں موجود ہی نہیں ؏

۳۱۵۲ چھ دن میں بنانے سے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ تھک گیا تھا بلکہ تدریج سے بنانے میں حکمت تھی۔ اسی لیے فرمایا کہ حق اور صداقت کی ترقی بھی بتدریج ہوگی فاصبر علی ما یقولون۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾	اور رات کے حصے میں بھی اس کی تسبیح کر اور نماز کے پیچھے بھی۔ ۳۱۵۳
وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۴۱﴾	اور سن! جس دن پکارنے والا نزدیک جگہ سے پکارے۔
يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿۴۲﴾	جس دن وہ چیخ کو حق کے ساتھ سن لیں گے یہ نکل پڑنے کا دن ہے ۳۱۵۴
اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿۴۳﴾	ہم ہی زندہ کرتے اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری طرف ہی انجام کار آنا ہے۔
يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۭ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿۴۴﴾	جس دن زمین ان پر سے پھٹ جائے گی (وہ) تیزی سے نکل پڑیں گے) یہ جمع کرنا ہم پر آسان ہے ۳۱۵۵
نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۣ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿۴۵﴾ ع ۱۶ / ۱۷	ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور تُو ان پر جبر کرنے والا نہیں، سو قرآن کے ساتھ اسے نصیحت کر جو میرے وعدہ (عذاب سے) ڈرتا ہے ۳۱۵۶

۳۱۵۳ ادبار السجود میں سجود سے مراد نماز ہے اور نماز کے بعد تسبیح سے مراد نوافل بھی ہو سکتے ہیں اور ذکر بھی (ج)

۳۱۵۴ منادی کے پکارنے سے مراد عموماً قیامت کے دن اسرافیل یا جبرائیل کا پکارنا لیا گیا ہے اور مکان قریب سے مراد بیت المقدس مگر قرآن کریم میں دوسری جگہ صاف منادی آنحضرت صلعم کو کہا ہے ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان (آل عمران ع-۱۹۲) اور یہی یسمعون الصیحۃ بالحق ہے گویا مضمون کا انتقال قیامت کبریٰ سے قیامت روحانی کی طرف کیا ہے اور من مکان قریب میں اشارہ ان کے قبول کر لینے کی طرف ہے۔ جس طرح واخذ وا من مکان قریب (السبا ۳۴ ۵۱) میں اسی دنیا کے عذاب کی طرف اشارہ ہے دیکھو ۲۷۰۵ اور یوم الخروج سے مراد روحانی طور پر اٹھ کھڑا ہونا بھی ہو سکتا ہے دیکھو ۲۵۸۵۔

۳۱۵۵ اگر یہاں اشارہ قیامت کبریٰ کی طرف لیا جائے تو زمین کے پھٹنے کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہاں مجازاً مراد ان کا روحانی قبروں سے نکلنا ہی ہو۔ سراعاً مصدر ہے جو عنہم میں ضمیر سے حال ہے۔

۳۱۵۶ ق والقراٰن المجید سے سورت کو شروع کیا تھا اور فذکر بالقراٰن پر ختم لیا۔ پس اصل مضمون اس کا قرآن مجید کے ذریعہ سے انقلاب عظیم کا پیدا ہونا ہے جبار کے لیے دیکھو ۸۰۷۔

اٰیاتھا ۶۰ (۵۱) سُوْرَةُ الذّٰرِيٰتِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتھا ۳

نام: اس سورت کا نام الذّٰریٰت ہے اور اس میں تین رکوع اور ساٹھ آیتیں ہیں۔ ذاریات وہ ہوائیں ہیں جو اڑا کر پھیلانے کا کام کرتی ہیں یعنی بیج کو ایک جگہ سے اڑا کر دوسری جگہ پہنچاتی ہیں اور یہاں حق کے پھیلانے والی جماعت کیساتھ انہیں مشابہت دی ہے اور بتایا ہے کہ پہلی حالت حق کی بھی ایسی ہی ہوتی ہے مگر آخر وہ بڑھتا اور پھیلتا ہے اور کوئی مخالفت اسے روک نہیں سکتی بلکہ اس کی مخالفت کرنے والے خود تباہ ہو جاتے ہیں پچھلی سورت میں ذکر تھا کہ اللہ تعالےٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ حق کو غالب کرے تو یہاں بتایا کہ وہ غلبہ تدریجی ہوتا ہے اور یہ بیج پھیلتا جائے گا یہاں تک کہ آخر بار آور ہو کر تمام دنیا میں پہنچے گا سورت مکّی ہے اور اس کا نزول ابتدائی مکی زمانہ کا ہی معلوم ہوتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

وَ الذّٰرِیٰتِ ذَرۡوًا ۙ﴿۱﴾ — گواہ ہیں اُڑا کر پھیلا دینے والیاں۔

فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا ۙ﴿۲﴾ — پھر بوجھ اٹھانے والیاں۔

فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا ۙ﴿۳﴾ — پھر نرمی سے چلنے والیاں۔

فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا ۙ﴿۴﴾ — پھر کام کو تقسیم کرنے والیاں ۳۱۵۷

اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾ — جو تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے وہ یقیناً سچا ہے۔

وَّ اِنَّ الدِّیۡنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۶﴾ — اور جزا و سزا ضرور آ کر رہے گی۔

وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الۡحُبُکِ ۙ﴿۷﴾ — رستوں والا آسمان گواہ ہے ۳۱۵۸

۳۱۵۷ حق کی کامیابی پر مناظر قدرت سے دلیل: حضرت علیؓ سے روایت ہے اور حضرت عمرؓ سے ایسے ہی الفاظ مرفوع ہیں کہ ذاریات سے مراد ہوائیں ہیں اور حاملات سے مراد بادل اور جاریات سے مراد کشتیاں ہیں اور مقسمات سے مراد ملائکہ ہیں۔ اور ہوائیں جو کام کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ بیج کو ایک جگہ سے اڑا کر دوسری جگہ پہنچاتی ہیں یا نباتات اور درختوں میں نر اور مادہ کو ملاتی ہیں جیساکہ آج تحقیقات علمی سے پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے اور یہ قرآن کریم کی صداقت اور رسول اللہ صلعم کی سچائی کا ایک بین ثبوت ہے کہ ایسی علمی باریکیاں جن کا دنیا کو صدہا سال بعد علم ہوا عرب کے ایک اُمی کی زبان سے ظاہر ہوئیں اور ذاریات ذروا کے بعد دوسرا مرتبہ حملت وقرا کا بیان فرمایا ہے گویا اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ہواؤں کا اس چیز کو پھیلانا جسے سائنس والے پالن کہتے ہیں ایک حمل کے قائم مقام ہوتا ہے اور حملت کی تفسیر میں جو اوپر بادل بیان ہوا ہے تو وہ بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ بادلوں کا کام یہ ہے کہ وہ بوجھ کو اٹھاتے ہیں یعنی پانی کو سمندروں سے اٹھا کر لاتے ہیں اور پھر جگہ جگہ پانی برس کر وہ بیج جن کو ہواؤں نے پھیلایا تھا اگتے اور پھولتے اور پھلتے ہیں تب اس پیداوار کو اور اس سے جو اور سامان پیدا ہوتے ہیں کشتیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی ہیں۔ پھر فرشتے حکم الٰہی کے مطابق اس کی مخلوق میں تقسیم امر کا کام کرتے ہیں تو گویا ان چاروں باتوں میں مناظر قدرت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کس طرح ایک چیز ادنیٰ منازل سے ترقی کر کے اعلیٰ مقامات تک پہنچتی ہے اور یوں ان ظاہری نظارہ ہائے قدرت کو حق کی ترقی اور کامیابی کے قانون پر بطور گواہ پیش کیا ہے اور انما توعدون لصادق میں انہی وعدوں کی طرف اشارہ ہے جو حق کی آخری کامیابی اور اس کی مخالفت کی آخری ناکامی کے متعلق دیئے گئے تھے گویا بتایا ہے کہ جس طرح ظاہری منظر قدرت میں کچھ اسباب کام کر رہے ہیں اسی طرح حق کی ترقی میں بھی کچھ اسباب کام کر رہے ہیں جس طرح وہاں ہوائیں بیج کو اڑا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی ہیں اسی طرح حق کے قائم ہونے میں پہلی منزل یہی تھی کہ کچھ لوگ اس حق کے بیج کو تمام ملک میں پہنچا دیں چنانچہ عرب کے کناروں سے لوگ آتے تھے اور اس حق کو جو رسول اللہ صلعم لائے بغیر قبول کیے عرب کے کناروں تک لے جاتے تھے دوسرا مرتبہ ان ہواؤں کا ہے جو اس بیج میں زندگی پیدا کرتی اور درختوں اور نباتات کو بارآور کرتی ہیں اور یہ بارش کی ہوائیں ہیں چنانچہ اسی طرح اس بیج پر جو جگہ جگہ پھیل گیا تھا جب رحمت الٰہی کی بارش ہوئی تو وہ لا معلوم بیج جگہ جگہ پرورش پا کر کزرع اخرج شطأہ کا مصداق ہوا اور لوگوں نے حق کو قبول کیا۔ پھر جماعتوں کی جماعتیں اس حق کو لے کر باہر پہنچیں اور یہ جاریات کے قائم مقام ہوگئیں گویا جو وحی اللہ تعالیٰ نے ملک عرب میں نازل کی تھی اس کی پیداوار کو لے کر ملک عرب کے لوگ باہر چلے گئے تا اس بارش کے پھلوں کو بھی متمتع کریں اور یوں اسے دنیا میں تقسیم کر کے مقسمت امرا کا مصداق ہوئے اور ہر ملک کے لوگوں میں اسے پہنچایا اور جو اس کا اہل تھا اس نے اس سے فائدہ اٹھایا اور چاروں لفظ ہواؤں پر بھی صادق آ سکتے ہیں۔ یعنی ذاریات وہ ہوائیں جو سمندروں سے بخارات کو اڑاتی ہیں اور حاملات وہ جو اس پانی کے بوجھ کو اٹھاتی ہیں۔ اور جاریات وہ جو اسے لے کر چلتی ہیں اور مقسمت وہ جو اسے جگہ جگہ برساتی ہیں اور اس سورت میں بھی وحی الٰہی کی اس بارش کی طرف ہی اشارہ ہے جو رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے دنیا پر برسائی گئی۔ گویا ایک پیاسی اور تڑپتی ہوئی دنیا سے بخارات بن کر اوپر کو اُٹھے اور وحی الٰہی کے رنگ میں پھر دنیا پر بارش ہو کر دنیا کی زندگی کا موجب ہوئے اور بادلوں کو حاملات اور فرشتوں کو مقسمت بلحاظ جماعتوں کے فرمایا ہے اور اسی لحاظ سے مومنوں کی جماعتیں بھی ان الفاظ سے مراد ہو سکتی ہیں یعنی ایک جماعتیں وہ ہونگی جو حق کے بیج کو دور دور پہنچائیں گی پھر ایسی جماعتیں ہونگی جو اس بیج کو بطور حمل اپنے اندر لے لینگی پھر ایسی جماعتیں ہونگی جو اسے لیکر آسانی سے چلنے والی ہونگی یعنی وہ اسے کوئی بوجھ محسوس نہ کریں گی۔ بلکہ اس کا نتیجہ ان کے حق میں یسر ہو کر پھر وہی لوگ اس حق کو لے کر دوسرے انسانوں تک پہنچائیں گے اور یہ مقسمات ہیں۔

۳۱۵۸ حبك واحد اس کا حبیکۃ ہے اور حُبُک کے معنی باندھنا ہیں اور حُبُک کے معنی رستے ہیں حبك السماء طرائقها اور مراد اس سے نجوم کے رستے ہیں (ل) اور بعض لوگوں نے اس سے مراد مخصوص رستے لیے ہیں جو ستاروں اور کہکشاں کے ہیں اور بعض نے معقول رستے مراد لیے ہیں جو بصیرت سے معلوم ہوتے

إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝٨ تم صرف مختلف باتیں کہہ رہے ہو۔

يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ أُفِكَ ۝٩ اس سے وہی پھیرا جاتا ہے جو حق سے باطل کی طرف پھرتا ہے۔ ۳۱۵۹

قُتِلَ الْخَرَّاصُونَ ۝١٠ اٹکلیں دوڑانے والے مارے گئے۔

الَّذِينَ هُمْ فِي غَمْرَةٍ سَاهُونَ ۝١١ جو جہالت میں بھولے ہوئے ہیں ۳۱۶۰

يَسْأَلُونَ أَيَّانَ يَوْمُ الدِّينِ ۝١٢ پوچھتے ہیں جزا وسزا کا دن کب آئیگا ۳۱۶۱

يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ ۝١٣ جس دن وہ آگ میں جلائے جائیں گے۔

ذُوقُوا فِتْنَتَكُمْ هَٰذَا الَّذِي كُنتُم اپنے دکھ دینے کا مزہ چکھو، یہ وہ ہے جس کے
بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ۝١٤ لیے تم جلدی کرتے تھے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝١٥ متقی باغوں اور چشموں میں ہونگے۔

آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ إِنَّهُمْ لے رہے ہوں گے جو ان کو اُن کے رب نے دیا،
كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُحْسِنِينَ ۝١٦ وہ اس سے پہلے نیکی کرنے والے تھے۔

كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ۝١٧ تھوڑا سا جو وہ رات کو سوتے تھے ۳۱۶۲

وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۝١٨ اور صبح کے وقتوں میں وہ استغفار کرتے تھے۔

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝١٩ اوران کے مالوں میں سوالی اور نہ مانگنے والے محتاج کا حق تھا ۳۱۶۳

ہیں جس کی طرف یذکرون اللہ قیاما الایۃ میں اشارہ ہے (غ)

آسمان میں راستے اور صداقت وحی کی ایک دلیل: اللہ تعالیٰ کا آسمان کو ذات الحبک فرمانا اسی کے مطابق ہے جو فرمایا وکل فی فلک یسبحون (یٰس ۳۶-۴۰) یعنی ان رستوں سے مراد اجرام سماوی کے رستے ہیں اور یہ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایک زبردست دلیل ہے اس لیے کہ یہ اس وقت کے لفظ ہیں جب دنیا میں کسی سائنس دان کو اس بات کا وہم بھی نہ تھا کہ اجرام سماوی ستاروں کے گرد گھومتے ہیں یا خود ستارے جیسے ہمارا سورج بھی کسی رستے پر چل رہے ہیں اور یہاں رستوں والے آسمان کو بطور گواہ پیش کرنا اس لحاظ سے ہے کہ یہ اجرام سماوی ایک قانون کے ماتحت ہونے اور ایک نظام میں منسلک ہونے سے یہ شہادت دے رہے ہیں کہ وہ حق ہے جو پیغمبر کہتا ہے یعنی اس کارخانے کا چلانے والا ایک ہی ہے اور اس کے مقابل جو کچھ تم لوگ اس کی وحی کے متعلق رائیں لگاتے ہو وہ خود اپنے اختلاف سے ہی اپنے باطل ہونے پر دلیل ہیں حق ایک ہی ہے اور ایک ہی سرچشمہ سے نکلتا ہے اور باطل باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لیے جواب قسم انکم لفی قول مختلف ہے۔

۳۱۵۹ افک کے لیے دیکھو ۹۸۶ جو شخص حق سے باطل کی طرف پھرتا ہے وہی اس قرآن سے منہ موڑتا ہے۔

۳۱۶۰ ساھون۔ سَہو خطا ہے جو غفلت سے ہو (غ) اور نہایہ میں ہے کہ السہو فی الشئ علم نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ترک کرنا ہے اور السہو عن الشئ باوجود علم کے اس کا ترک کرنا ہے اسی معنی میں ہے ھم عن صلاتھم ساھون (الماعون ۱۰۷-۵) (ل) یعنی باوجود نماز پڑھنے کے نماز سے بے خبر ہیں یعنی اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

۳۱۶۱ ایان کے معنی مَتی کے قریب قریب ہیں یعنی کب ایان مرسٰھا (النازعات ۷۹-۴۲) اور یہ ایّ اوان سے ہے اور اِیّا ضمیر منصوب سے ملایا جاتا ہے جیسے ایاك نعبد اور اِیْ تحقیق کلام کے لیے آتا ہے قل ای وربی (یونس ۱۰-۵۳) (غ)

۳۱۶۲ یھجعون۔ ھُجُوع رات کے سونے کو کہتے ہیں (غ)۔

۳۱۶۳ محروم وہ ہے جو خیر سے روکا گیا ہے اور یہاں محروم کے معنی ایسا شخص بھی کیے گئے ہیں جس کا مال بڑھتا نہیں لاینمی لہ مال۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ بے روزگار شخص ہے جو کچھ کما نہیں سکتا (ل) اور بل نحن محرومون (القلم ۶۸-۲۷) میں مراد ہے کوشش کی جانب سے خالی ہاتھ رہے ہوئے اور یہاں محروم سے مراد ہے جس کا رزق وسیع نہیں جس طرح اوروں کا ہے اور جس نے یہ کہا کہ اس سے مراد کتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کتے کا

وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿۲۰﴾	اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشان ہیں۔
وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾	اور تمھاری اپنی جانوں میں بھی تو کیا تم دیکھتے نہیں۔
وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾	اور تمھارا رزق آسمان میں ہے اور وہ بھی جس کا تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے۔ ٣١٦٤
فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ	سو آسمان اور زمین کا رب گواہ ہے کہ یہ یقیناً سچ ہے ٹھیک
مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿۲۳﴾ ع	اسی طرح جو تم باتیں کرتے ہو۔
هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ	کیا تیرے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں
الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۴﴾	کی خبر آئی ؟
اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ	جب اس پر داخل ہوئے ، کہا سلام۔ اُس نے
سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۲۵﴾	(جواب میں) کہا سلام، (یہ) اجنبی لوگ ہیں۔
فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿۲۶﴾	پس وہ اپنے گھر والوں کی طرف چپکے سے گیا اور ایک موٹا بچھڑا لایا۔ ٣١٦٥
فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾	سو اُسے ان کے نزدیک کیا، کہا کیا تم کھاتے نہیں !
فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ	پس دل میں اُن سے ڈرا ، انھوں نے کہا ڈر نہیں اور
وَ بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾	اسے ایک صاحبِ علم لڑکے کی خوش خبری دی۔
فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ	تو اس کی عورت چیخ مار کر آگے آئی اور اپنے مُنہ پر ہاتھ
وَجْهَهَا وَ قَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿۲۹﴾	مارا اور کہا بُڑھیا بانجھ (رہوں)، ٣١٦٦
قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ	انھوں نے کہا اسی طرح تیرے رب نے کہا ہے وہ
هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۰﴾	حکمت والا علم والا ہے۔

نام ہے جیساکہ بعض لوگوں نے خیال کیا ہے اور یہ اس کی طرف سے مثال کے طور پر ہے کیونکہ کتے کو لوگ بہت محروم کرتے یا رد کرتے ہیں (غ) اور رسول اللہ صلعم سے مروی ہے کہ محروم وہ ہے جس کے پاس کچھ نہیں اور جس کی حاجت کا علم نہیں ہوتا کہ اسے کوئی خیرات دے یعنی جو وہ مانگتا نہیں اور تعفف اختیار کرتا ہے (ج) ؏

٣١٦٤ فی السماء رزقکم مجاہد سے ہے کہ رزق سے مراد یہاں مطر یعنی بارش ہے (ج) تو مطلب یہ ہوا کہ پانی جو تمھارے لیے مایۂ حیات ہے وہ آسمان سے ہی اترتا ہے اور سماء کے معنی سحاب یعنی بادل بھی یہاں لیے گئے ہیں (ر) تو مطلب یہ ہوا کہ بارش سے تمہیں رزق ملتا ہے اگر آسمانی بارش بند ہو جائے تو تمہارے کھانے پینے کے سامان بھی نہ رہیں اور اس صورت میں ماتوعدون کا منشا یہ ہوگا کہ وہ جو تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے بارش کی طرح اوپر سے ہی آنا اور تمہارے لیے مایۂ حیات بنتا ہے یا یہ کہ وہ بھی روحانی بارش سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اور یا فی السماء سے مراد یہ ہے کہ یہ اٹل ہے اور ایسا ہی ماتوعدون بھی اٹل ہے۔

٣١٦٥ دوسری جگہ ہے بعجل حنیذ (ھود۔ ٦٩) یعنی بھنا ہوا۔ ان مہمانوں کے لیے دیکھو ١٤٨٠ آیت ٣١ میں انہیں مرسل کہا ہے۔

٣١٦٦ صرۃ۔ صَرَّ دیکھو ٥٠٤ اور صَرَّۃ جماعت کو بھی کہتے ہیں جس کے بعض بعض سے منضم ہوں کا نہم صُرُّوا گویا کہ وہ ایک برتن میں جمع کیے گئے ہیں اور صَرَّۃ صیحۃ یعنی چیخ کو بھی کہتے ہیں (غ) اور کرب اور جنگ کی شدت کو بھی کہتے ہیں (ل م) صکت۔ صكّ کے معنی مارنا ہیں خواہ کسی چیز سے ہو (ل) بخاری میں اس کی تفسیر میں ہے فجمعت اصابعها فضربت جبهتها۔ یعنی اپنی انگلیاں اکٹھی کیں اور اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا دوسری جگہ بیان کیا ہے کہ یہ صرف تعجب سے تھا۔ یٰویلتیٰ ءالد وانا عجوز وھذا بعلی شیخا ان ھذا لشیٔ عجیب (ھود۔ ٧٢)

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝۳۱
(ابراہیمؑ نے) کہا ، اے رسولو! تمھارا اصل کام کیا ہے؟

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۲
انھوں نے کہا ، ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝۳۳
تاکہ اُن پر مٹی کے پتھّر برسائیں۔

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝۳۴
(جن پر) تیرے رب کے ہاں حد سے بڑھ جانے والوں کے لیے نشان کیے گئے ہیں[۳۱۶۷]

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۳۵
سو ہم نے ان کو جو اس میں مومن تھے نکال دیا۔

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۳۶
پر ہم نے اس میں سوائے مسلموں کے ایک گھر کے اور کسی کو نہ پایا۔

وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ
الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝۳۷
اور ہم نے اس میں ان لوگوں کے لیے نشان چھوڑا ، جو
دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔

وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ
بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۸
اور موسیٰؑ میں (نشان ہے) جب ہم نے اسے فرعون کی
طرف کھلی سند کے ساتھ بھیجا۔

فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝۳۹
سو اس نے اپنی قوت پر سرتابی کی اور کہا (یہ) جادوگر ہے یا دیوانہ۔

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ
وَهُوَ مُلِيْمٌ ۝۴۰
سو ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا پھر انھیں سمندر میں
ڈالا اور وہ قابلِ ملامت تھا۔

وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ۝۴۱
اور عاد میں (نشان ہے) جب ہم نے ان پر تباہ کرنے والی ہوا بھیجی۔

مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا
جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ۝۴۲
وہ کسی چیز کو نہ چھوڑتی تھی جس پر آتی تھی ، مگر اُسے چُورا
کر دیتی تھی۔

وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا
حَتّٰى حِيْنٍ ۝۴۳
اور ثمود میں (نشان ہے) جب انھیں کہا گیا ، ایک وقت
تک فائدہ اٹھالو۔

فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ
الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۴۴
سو انھوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی ، تو انھیں
ہولناک آواز نے آلیا اور وہ دیکھ رہے تھے۔

فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا
كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ۝۴۵
پس نہ وہ اُٹھنے کے قابل رہے اور نہ
وہ بدلہ لے سکے۔

وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا
قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝۴۶ ع
اور (اس سے) پہلے نوحؑ کی قوم (میں نشان تھا) بیشک وہ
نافرمان لوگ تھے۔

۳۱۶۷ یعنی ان کا خطاکاروں پر بھیجا جانا مقدر تھا اور مسومۃ کے معنی مرسلۃ بھی کیے گئے ہیں اور اسی سے ہے فیہ تسیمون (النحل ۱۶-۱۰) (۳) لنرسل علیہم حجارۃ میں فاعل اللہ تعالیٰ ہے جیسا کہ آیت وترکنا فیہا اٰیۃ سے صاف ظاہر ہے۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾
اور آسمان کو ہم نے قوت کے ساتھ بنایا اور ہم وسیع قدرت والے ہیں ۔

وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾
اور زمین کو ہم نے ہی بچھایا ، سو ہم کیا خوب تیار کرنے والے ہیں ۔

وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾
اور ہر چیز سے ہم نے جوڑے پیدا کیے ، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ع۳۱۶۸

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۚ﴿۵۰﴾
سو اللہ تعالیٰ کی طرف دوڑو ، میں اس کی طرف سے تمھارے لیے کھلا ڈرانے والا ہوں ع۳۱۶۹

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۚ﴿۵۱﴾
اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا معبود نہ بناؤ ، میں اس کی طرف سے تمھارے لیے کھلا ڈرانے والا ہوں ۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۚ﴿۵۲﴾
اسی طرح ان لوگوں کے پاس جو ان سے پہلے تھے ، کوئی رسول نہیں آیا ، مگر انھوں نے کہا جادوگر ہے یا دیوانہ ۔

اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۚ﴿۵۳﴾
کیا ایک دوسرے کو وصیت کر رکھی ہے بلکہ یہ سرکش لوگ ہیں ۔ ع۳۱۷۰

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ۫﴿۵۴﴾
سو ان سے منہ پھیر لے کیونکہ تجھ پر کوئی الزام نہیں ع۳۱۷۱

ع۳۱۶۸ موسع ۔ وُسع بمعنی قدرت سے ہے دیکھو ع۳۶۴ اور اید کے لیے دیکھو ع۲۸۲۹ یہ ید کی جمع نہیں اور پہلے آسمان اور زمین کا ذکر کرکے پھر فرمایا کہ ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے ہیں گویا اول آسمان اور زمین کی زوجیت کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ آسمان سے بارش نازل ہوتی ہے تو زمین میں روئیدگی پیدا ہوتی ہے اور پھر عام کیا کہ دنیا میں ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں ۔ جیساکہ دوسری جگہ کھول کر فرمایا سبحان الذی خلق الازواج کلھا مما تنبت الارض و من انفسھم ومما لایعلمون (یٰسٓ ۳۶ ۔ ۳۶) یعنی نہ صرف نباتات میں جوڑے ہیں بلکہ اور مخلوق میں بھی جس کا ابھی انہیں علم بھی نہیں ۔ یہ مخلوق وہی ہے جس کا علم آج خوردبین سے حاصل ہوا ہے بلکہ شاید اور بھی کوئی ہو جس کا علم ابھی حاصل نہیں ہوا اور اس سب کا نتیجہ یہ بتایا کہ لعلکم تذکرون تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرو ۔ جیساکہ اگلی آیت میں وضاحت سے بیان کیا ہے ۔

ع۳۱۶۹ فروا ۔ فَرَّ اور فِرار کے معنی بھاگنا ہیں اور این المفر (القیامۃ ۷۵ ۔ ۱۰) میں مَفَرّ کے معنی بھی فرار ہیں (ل) اور مَفَرّ کے معنی فرار کی جگہ یا فرار کا وقت بھی ہو سکتے ہیں ۔

جس طرح ہر چیز کی ترقی اور اس کا نشوونما بغیر زوج کے نہیں ہوتا اسی طرح انسان کی ترقی اور اسکی روح کا حقیقی نشوونما اللہ تعالےٰ سے تعلق کے بغیر نہیں ہوتا اور فروا الی اللہ کا مطلب یہی ہے ھو تمثیل للاعتصام بہ (ر) یعنی اللہ تعالیٰ کو ہی تم اپنا محبوب و مقصود حقیقی بناؤ اور سب چیزوں کو چھوڑ کر اس کی طرف بھاگو اس لیے اگلی آیت میں فرمایا کہ اس کے ساتھ کسی کو الٰہ مت بناؤ یعنی کوئی تمہارا محبوب و مقصود سوائے باری تعالیٰ کے نہ ہو یعنی اللہ تعالیٰ کو محبوب بھی بناؤ مگر ایسا محبوب کہ اس کے سوائے اور کوئی محبوب نہ ہو ۔

ع۳۱۷۰ تواصوا ۔ وصیۃ کے لیے دیکھو ع۱۶۷ اور اوصٰی اور وَصّٰی اس سے فعل ہیں وصی بھا ابراھیم بنیہ (البقرۃ ۲ ۔ ۱۳۲) ووصینا الانسان بوالدیہ (العنکبوت ۲۹ ۔ ۸) اور تواصی القوم ایک دوسرے کو وصیت کی ۔ تواصوا بالحق وتواصوا بالصبر (العصر ۱۰۳ ۔ ۳) (غ)

ع۳۱۷۱ منہ پھیر لینے سے مراد : اوپر چونکہ ذکر تھا کہ ساحر و مجنون کہتے ہیں اور یہ ان کی ایذاؤں کی طرف اشارہ ہے جو وہ نبی کریم صلعم کو استہزا کرکے پہنچاتے تھے ۔ اس لیے فرمایا کہ ان سے منہ پھیر لو یعنی ان کے اس استہزا وغیرہ کی کچھ پروا نہ کرو یہ ہجرت کا حکم نہیں ۔ البتہ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول پر بعض صحابہ کو یہ خیال گذرا کہ اب قریش پر عذاب نازل ہوگا فما انت بملوم گو یہاں صرف اس غرض کے لیے لایا گیا ہے کہ معاملہ تبلیغ میں آپ نے کوئی کمی نہیں کی مگر الفاظ عام ہیں اور صاف بتاتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کسی قسم کی ملامت کے نیچے نہ تھے یہ بھی آپ کی عصمت پر دلیل ہے ۔

وَّ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾
اور نصیحت کرتا رہ نصیحت مومنوں کو فائدہ دیتی ہے ۔

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾
اور میں نے جنّوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں ع۳۱۷۲

مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّ مَاۤ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾
مَیں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ مَیں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا دیں ۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾
اللہ ہی رزق دینے والا قوت والا زبردست ہے ۔

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾
سو اُن کے لیے جو ظلم کرتے ہیں مقرر پیمانہ ہے ، جیسے ان کے ساتھیوں کا مقرر پیمانہ تھا سو وہ مجھ سے جلدی نہ کریں ع۳۱۷۳

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع ۳ ۱۴ ۲
پس افسوس اُن پر جو کافر ہیں اس دن سے جس کا انھیں وعدہ دیا جاتا ہے ۔ ع۳۱۷۳

ع۳۱۷۲ انسان کی پیدائش کی غرض: جنّ اور انسان کی پیدائش کی اصل غرض بتائی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود بنائیں بالفاظ دیگر بتایا کہ انسان اپنے کمال کو صرف عبادت الٰہی سے حاصل کر سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں کہا کہ میں ان سے رزق یا کھانا طلب نہیں کرتا ۔ یعنی اُن کی عبادت سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ۔ کیونکہ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں اور یوں سمجھایا کہ عبادت کی غرض صرف اپنی تکمیل ہے اور وہ کمال صرف عبادت الٰہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور جنّوں اور انسانوں کا ذکر اس لیے کیا کہ یہی نافرمانی کرتے ہیں ملائکہ نافرمانی نہیں کرتے یا اس لیے کہ وہ عبادت کیلئے مسخر ہیں اور یہاں اس عبادت کا ذکر ہے جو اختیار سے ہے اس لیے صرف جنّوں اور انسانوں کا ذکر کیا ٭

ع۳۱۷۳ ذنوب ۔ ذَنَب جانور کی دم کو کہتے ہیں اور ذَنُوب لمبی دم والے گھوڑے کو کہتے ہیں اور استعارۃً نصیب یعنی حصہ یا بہرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے سَجْل کا لفظ اس کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ذَنْب کی جمع ذُنُوب ہے (غ) اور یَوْم ذَنُوبٌ اس دن کو کہتے ہیں جس کی شر لمبی ہو اور ذَنوب اس ڈول کو کہتے ہیں جس میں پانی ہو حدیث میں ہے فامر بذنوب من ماء فاھریق علیہ (ل) یعنی آپ نے پانی کا ایک ڈول لانے کے لیے حکم دیا اور وہ اس پر بہا دیا گیا ۔

ع۳۱۷۳ للذین ۔ ل کئی طرح پر آتا ہے فعل کو دوسرے پر وارد کرنے کے لیے جیسے تلّہ للجبین (الصّٰفّٰت ۳۷-۱۰۳) کے لیے جیسے مِلک کے لیے جیسے للہ ملک السموات والارض استحقاق کے لیے جیسے لھم اللعنۃ اور یہاں بعض کے نزدیک بمعنی علیٰ ہے اور بان ربک اوحی لھا (الزلزال ۹۹ - ۵) میں بعض نے لام کو بمعنی الیٰ لیا ہے مگر یہ اس بات پر تنبیہ کے لیے ہے کہ یہ وحی تسخیر سے ہے اور انبیاء کی وحی کی طرح نہیں اور اجل کے معنی ہیں جیسے لاتکن للخائنین خصیما (النساء ۴ - ۱۰۵) اور لام ابتدا کے لیے بھی آتا ہے جیسے لمسجد اسس علی التقوی (التوبۃ ۹ - ۱۰۸) لیوسف واخوہ احب الی ابینا (یوسف ۱۲ - ۸) لانتم اشد رھبۃ (الحشر ۵۹ - ۱۳) اور اِنّ کے ساتھ کبھی اس کے اسم میں اور کبھی اس کی خبر میں جیسے ان فی ذلک لعبرۃ یا ان ربک لبالمرصاد ۔ ان ابراھیم لحلیم اور لام قسم جیسے لعمرک (الحجر ۱۵ - ۷۲) اور لو کی خبر میں آتا ہے جیسے لو انھم اٰمنوا واتقوا لمثوبۃ ۔ لو تزیلوا لعذبنا الذین کفروا اور کبھی لام مکسورہ ابتدا کے لیے آتا ہے ۔ لیتا ذنکم الذین ملکت ایمانکم ۔ لیقض علینا ربّک نیز دیکھو ع۵۴۹ تعلیل کے لیے ع۵۶۲ بمعنی اِلیٰ ع۴۹۷ انتفاع کے لیے ع۵۷۳ عاقبت کے لیے ۔ الذین ۔ الذی اسم موصول ہے تثنیہ اللذان جمع الذین مونث التی اور جمع مونث کے لیے الّتی اور اللائی ٭

سُوْرَةُ الطُّوْرِ مَكِّيَّةٌ (۵۲)

اٰیاتُھا ۴۹ — رُکُوعاتُھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
وَالطُّوْرِ ①	طور گواہ ہے۔
وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ②	اور لکھی ہوئی کتاب۔
فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ③	پھیلے ہُوئے ورقوں میں۔
وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ④	اور آباد گھر۔
وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ⑤	اور اونچی چھت۔
وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ⑥	اور بھرا ہُوا دریا ۳۱۷۴

نام: اس سورت کا نام الطور ہے اور اس میں دو رکوع اور انچاس آیتیں ہیں۔ لفظ طور میں اشارہ حضرت موسیٰؑ کی وحی کیطرف ہے جس کا نزول طور پر ہوا اور مقصود اس نام میں یہ ہے جیسا کہ سورت کی ابتدائی آیات میں وضاحت کر دی ہے کہ جس طرح اس وحی کی مخالفت کرنے والوں کا انجام ہلاکت ہوا اسی طرح آنحضرت صلعم کی وحی کی مخالفت کرنے والوں کا انجام ہلاکت ہوگا اور یہی مضمون اس سورت کا ہے بلکہ آخری آیات میں جنگ بدر کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے جو آنحضرت صلعم کے مخالفین کی قوت کو توڑنے کا موجب ہُوئی پچھلی سورت میں حق کی تدریجی ترقی کا ذکر تھا تو یہاں مخالفت کرنے والوں کی سزا کا ذکر کیا اس کا نزول بھی ابتدائے مکی زمانہ سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

۳۱۷۴ رقّ۔ رِقّۃ وہ باریکی ہے جو بلحاظ عمق ہو اور کبھی اجسام میں ہوتی ہے اور کبھی نفس میں قساوت کے مقابل پر جیسے رقیق القلب اور رَقّ کاغذ کی طرح ہے جس پر لکھا جاتا ہے (غ) یعنی کھال جس پر لکھا جاتا ہے۔

مسجور۔ دیکھو ۲۹۲۰ اور سَجَرْتُ النھرَ کے معنی ہیں میں نے دریا کو بھر دیا اور اذا البحار سُجّرت (التکویر۔ ۶) میں ثعلب نے معنی کیے ہیں بھر دیئے جائیں گے اور البحر المسجور کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ سمندر کو آگ لگا دی جائے گی پس وہ نار جہنم ہو جائیگا اور حضرت علیؓ سے منقول ہے آگ سے بھرا ہوا اور مسجور کے معنی کلام عرب میں مَمْلُوّ ہیں یعنی بھرا ہوا اور سَکَرت الاِناءَ اور سَجَرتُہ کے معنی ہیں میں نے اسے بھر دیا اور اذا البحار سجرت میں یہ معنی بھی کیے گئے ہیں یعنی بعض بعض میں ملا کر سب ایک کر دیئے جائیں اور مسجور کے معنی ساکن اور خالی بھی آئے ہیں (ل)۔

طور سے مراد اس نام کا پہاڑ بھی لیا گیا ہے اور مطلق پہاڑ بھی۔ اور کتاب مسطور سے مراد توریت بھی لی گئی ہے اور توریت زبور انجیل بھی اور قرآن بھی۔ اور لوح محفوظ بھی۔ اور بیت المعمور سے مراد وہ گھر لیا گیا ہے جو خانہ کعبہ کے مقابل پر آسمان میں ہے اور حسن نے کہا کہ یہ کعبہ ہے اور سقف مرفوع سے مراد آسمان لیا گیا ہے اور بحر مسجور سے مراد بھرا ہوا یا خشک یا آگ لگا ہوا دریا لیا گیا ہے اور ان سب چیزوں کو اس بات پر گواہ ٹھہرایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب مکذبین پر یقیناً آکر رہے گا گویا گذشتہ واقعہ کو بطور شہادت پیش کیا ہے اور اس صورت میں طور سے مراد وہ پہاڑ ہونا جہاں حضرت موسیٰ پر وحی نازل ہوئی اور آپ کو شریعت دی گئی اور کتاب سے مراد توریت ہونا اور بحر سے مراد وہ دریا ہونا جو بنی اسرائیل کے لیے خشک ہو گیا اور فرعون کے لیے بھر کر غرق کرنے کا موجب ہو گیا۔ لیکن اس صورت میں البیت المعمور کا تعلق بظاہر نظر نہیں آتا جب تک کہ اس سے بیت المقدس یا وہ گھر مراد نہ لیا جائے جو حضرت موسیٰ نے عبادت کے لیے قایم کیا۔ لیکن قرآن کریم نے لفظ ایسے اختیار کیے ہیں جو ایک طرف اگر حضرت موسیٰ کے متعلق صادق آتے ہیں تو دوسری طرف آنحضرت صلعم کے متعلق بھی صادق آتے ہیں یعنی آپ پر بھی ایک پہاڑ پر نزول وحی ہوا اور آپ کو بھی ایک کتاب دی گئی جو کھالوں وغیرہ پر لکھی جاتی تھی اور آپ کو بھی ایک بیت معمور یعنی خانہ کعبہ دیا گیا اور آپ کے دشمن بھی آپ کے مقابلہ میں تباہ ہوئے جس طرح حضرت موسیٰ کے دشمن تباہ ہوئے۔ وہ اگر دریا میں غرق ہوئے تو یہ خشکی پر غرق ہوئے اور بحر کا لفظ دونوں پر صادق آتا ہے دیکھو ۲۵۹۷ اور سقف مرفوع میں مراد آسمان بھی ہو سکتا ہے اور بیت معمور کی بلند چھت بھی ہو سکتی ہے اور البیت المعمور کا خانہ کعبہ کے مقابل آسمان پر یا ایک بیت معمور کا ہر آسمان پر ہونا خود اس بات کو چاہتا ہے کہ خانہ کعبہ بھی البیت المعمور ہی ہے جیسا کہ حسن سے روایت ہے (ر) اور گو یہ لفظ دوسرے قبلوں پر بھی بولا گیا ہو مگر حقیقتاً خانہ کعبہ پر ہی صادق آتا ہے جس کی زیارت تا قیامت ہوتی رہے گی۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝۷	تیرے رب کا عذاب آکر رہے گا۔
مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝۸	اسے کوئی روکنے والا نہ ہوگا۔
يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝۹	جس دن آسمان جنبش میں ہوگا ۳۱۷۴
وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝۱۰	اور پہاڑ اُڑ جائیں گے۔
فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۱	تو اس دن جھٹلانے والوں کے لیے افسوس ہے۔
الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۝۱۲	جو (عبث) باتوں میں لگے ہوئے کھیل رہے ہیں۔
يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۝۱۳	جس دن دھکے دیکر دوزخ کی آگ کی طرف دھکیلے جائیں گے۔ ۳۱۷۵
هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝۱۴	یہ وہ آگ ہے جسے تم جھٹلاتے تھے۔
اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۝۱۵	تو کیا یہ جادو ہے یا کیا تم دیکھتے نہیں۔
اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۶	اس میں داخل ہو جاؤ، پھر صبر کرو یا نہ صبر کرو تمھارے لیے برابر ہے تمھیں صرف اسی کا بدلہ دیا جاتا ہے جو تم کرتے تھے۔
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ۝۱۷	متقی باغوں اور نعمتوں میں ہیں۔
فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝۱۸	اپنے رب کے دیئے پر خوش ہوں گے اور ان کے رب نے انھیں جلتی ہوئی آگ کے عذاب سے بچایا۔
كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۹	خوشگواری سے کھاؤ اور پیو، بدلہ اس کا جو تم کرتے تھے۔
مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝۲۰	برابر بچھے ہوئے تختوں پر تکیئے لگائے ہوئے اور ہم انھیں خوبصورت حوروں کا ساتھی بنا دیں گے۔
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ	اور جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان میں اُن کی پیروی کی، ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے عمل سے ہم کچھ کم نہیں کریں گے۔ ہر شخص اپنی

۳۱۷۴ تمور۔ مار یمور مورا) ایک چیز حرکت میں آئی یا آئی اور گئی اور صحاح میں تمور السماء مورا کے معنی کیے ہیں تَمُوْجُ مَوْجًا اور مار الشئ ایک چیز مضطرب اور متحرک ہوئی اور مَارَ پانی یا خون یا آنسوؤں کے بہنے پر بھی بولا جاتا ہے (ل) اور ابن عباس سے یوم تمور السماء کی تفسیر میں مروی ہے یوم تشقق السماء (ج) تو اس صورت میں مراد وہی ہوگی جو یوم تشقق السماء بالغمام میں مراد ہے دیکھو ۲۳۶۷ اور یوں بھی جس عذاب کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے وہ اولاً عذاب دنیا ہی ہے اور بعدہ عذاب آخرت کیونکہ حضرت موسیٰ کے مقابل پر جس عذاب کا ذکر ہے وہ بحر مسجور کا عذاب ہے یعنی فرعون کا سمندر میں غرق ہونا جسے حضرت موسیٰ کے لیے فرقان قرار دیا گیا ہے اور اس کے بالمقابل ہمارے نبی صلعم کا فرقان بدر ہے جیسا کہ سورت کی آخری آیات سے ظاہر ہے وان یروا کسفا من السماء ساقطا (۴۴:۵۲) اور یہ عذاب دنیا ہے نہ عذاب آخرت اور تسیر الجبال پر دیکھو ۱۶۲۳ و ۲۱۰۱۔

۳۱۷۵ یدعون۔ دَعٌّ سختی کے ساتھ دور کرنا ہے الذی یدع الیتیم (الماعون ۱۰۷ - ۲) (غ) یہاں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس عذاب کا پہلی آیات میں ذکر ہے وہ عذاب دنیا ہے اور اس کے بعد پھر وہ عذاب جہنم کی طرف دھکیلے جائیں گے۔

امْرِیٍٔۢ بِمَا کَسَبَ رَهِیْنٌ ﴿۲۱﴾
کمائی میں گرو ہے ۳۱۷۶

وَ اَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاکِهَةٍ وَّ لَحْمٍ مِّمَّا یَشْتَهُوْنَ ﴿۲۲﴾
اور ہم انھیں پھل اور گوشت جس سے وہ چاہیں، پے بہ پے دیں گے۔

یَتَنَازَعُوْنَ فِیْهَا کَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِیْهَا وَ لَا تَاْثِیْمٌ ﴿۲۳﴾
وہ اس میں ایک دوسرے سے وہ پیالہ لیں گے جس میں نہ لغو ہے اور نہ گناہ ۳۱۷۷

وَ یَطُوْفُ عَلَیْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ کَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّکْنُوْنٌ ﴿۲۴﴾
اور ان کے آس پاس ان کے غلام پھرتے ہوں گے گویا کہ وہ پردے میں رکھے ہوئے موتی ہیں ۳۱۷۸

وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾
اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔

قَالُوْۤا اِنَّا کُنَّا قَبْلُ فِیْۤ اَهْلِنَا مُشْفِقِیْنَ ﴿۲۶﴾
کہیں گے ہم پہلے اپنے اہل میں ڈرنے والے تھے۔

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾
سو اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں لُو کے عذاب سے بچا لیا۔

اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ ﴿۲۸﴾ ع ۲۸/۳
ہم پہلے سے اُسے پکارتے تھے، وہ بڑا احسان کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

۳۱۷۶ الحقنا۔ لَحِقْتُهٗ اور لَحِقْتُ بِهٖ کے معنی ہیں میں نے اسے پالیا لم یلحقوا بھم من خلفھم (آل عمران ۳-۱۷۰) و اٰخرین منھم لما یلحقوا بھم (الجمعۃ ۶۲-۲) اور اَلْحَقْتُ بِهٖ کذا اسے دوسرے کے ساتھ ملا دیا (غ) اَلَتْنَا۔ اَلْت کے معنی نقص ہیں اور حضرت عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ ایک شخص نے آپ کو کہا اتق اللّٰہ یا امیر المومنین تو دوسرے آدمی نے جو سن رہا تھا کہا اَتَالِتُ علی امیر المومنین تو حضرت عمرؓ نے کہا اسے چھوڑ دے قوم کا بھلا اسی وقت تک ہے جب تک یہ ایسی باتیں ہمیں کہتے رہیں اور تالت کے معنی یہاں کیے گئے ہیں امیر المومنین کی ہتک کرتا ہے یا ان کے مقام کو گراتا ہے اور اَلَتَهٗ مالہ وحقّہٗ کے معنی ہیں اس کا مال اور حق کم کر کے دیا گویا لات (دیکھو ۲۸۱۹) اور اَلَت کے ایک ہی معنی ہیں (ل)

امرء۔ مَرْءُ انسان کو کہتے ہیں اور اِمْرُءٌ بھی اور اِمْرَأَۃٌ عورت کو ان امرؤا ھلک (النساء ۴-۱۷۶) اور مُرُوَّۃُ مرء یعنی انسان کا کمال یہ ہے (غ)

رھین۔ رَھْن وہ ہے جو قرضہ کے لیے اعتماد کے طور پر رکھا جائے اور رھین اور رھینۃ۔ کل نفس بما کسبت رھینۃ (المدثر ۷۴-۳۸) میں دو قول ہیں یعنی فعیل بمعنی فاعل یا ثابت اور کھڑا ہونے والا اور یا فعیل بمعنی مفعول یعنی ہر ایک نفس اس کی جزا میں کھڑا کیا جائے گا جو اس نے عمل کر کے آگے بھیجا ہے اور چونکہ رہن سے ایک چیز کا حبس یعنی روک رکھنا مقصود ہے اس لیے استعارۃً یہ لفظ روک رکھنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے (غ) مراد اس سے یہ لی گئی ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ مومن کی ذریت کو گو اس نے اعمال کے لحاظ سے وہ کمال حاصل نہ کیا ہو جنت میں وہی درجہ مل جائے گا جو اعلیٰ درجہ کے مومنوں کو ملے گا اور بعض نے دوسری ذریت سے مراد چھوٹے بچے لیے ہیں مگر آیت کے آخری الفاظ کل امری بما کسب رھین سے اشارہ کچھ اور معلوم ہوتا ہے اور دوسری جگہ یہی مضمون یوں ادا ہوا ہے کل نفس بما کسبت رھینۃ الا اصحاب الیمین (المدثر ۷۴-۳۸، ۳۹) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنی کرتوتوں کی وجہ سے گرفتار بلا ہوں گے تو پس یہاں اصل بات جس کا ظاہر کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ محض نسب سے کچھ فائدہ حاصل نہیں نیک لوگوں کی اولاد ان نیکوں کے ساتھ اگر ملے گی تو اس شرط پر کہ اتبعتھم بایمان کی مصداق ہو یعنی ایمان میں ان کا اتباع کرے اور جو ایمان میں نیکوں کا اتباع نہیں کرتے وہ نیکوں کی ذریت ہونے کی وجہ سے چھٹکارا نہیں پا سکتے کیونکہ یہاں ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہے ہاں ساتھ ہی یہ اشارہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر ایمان میں اتباع ہو اور اعمال اس کمال کو نہ پہنچ سکیں جس کمال کو اس پہلی نسل کے اعمال پہنچے ہیں جنہوں نے خطرناک تکالیف اُٹھا کر حق کو قبول کیا ہے تو اس کمی کی وجہ سے وہ پیچھے نہیں رہیں گے۔ بلکہ اپنے باپ دادوں کے ساتھ ہی ہوں گے اور ما التنٰھم میں شاید اسی طرف اشارہ ہے اور یا یہ عام ہے کہ کسی کا عمل بھی ہم کبھی کم نہیں کرتے۔

۳۱۷۷ یتنازعون۔ تنازع کے لیے دیکھو ۵۳۹ اور نَازَعَنِیْ فُلَانٌ بنا لہ کے معنی ہیں مصافحہ کیا اور منازعۃ مصافحہ ہے۔ اور مُنَازَعَۃُ الکأس سے مراد پیالہ کا ایک دوسرے کو دینا یا ایک دوسرے سے لینا ہے (ل)۔

۳۱۷۸ غلمان۔ غلام کی جمع ہے ۲۱۶ و ۱۹۴۷ لُؤلُؤ موتی۔ غلمان سے مراد یہاں خادم ہیں (ج) اور بعض نے مراد ان کو اولاد لی ہے جو ان سے پہلے

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ — سو نصیحت کرتا رہ کہ تو اپنے رب کی نعمت سے کاہن نہیں
بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾ — اور نہ ہی دیوانہ ہے ع۳۱۷۹
اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ — بلکہ کہتے ہیں کہ شاعر ہے ہم اس کے لیے زمانہ کی گردش
رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿۳۰﴾ — کا انتظار کرتے ہیں ع۳۱۸۰
قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ — کہہ، انتظار کرو کہ میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے
الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴿۳۱﴾ — والوں میں سے ہوں۔
اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ — کیا اُن کی عقلیں انھیں یہ حکم دیتی ہیں، بلکہ وہ
هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۳۲﴾ — سرکش لوگ ہیں۔
اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ — کیا کہتے ہیں یہ جھوٹ بنا لیا ہے بلکہ وہ ایمان نہیں لاتے ع۳۱۸۱
فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا — تو اِس جیسی کوئی بات لائیں، اگر

گذر چکی (ر) صورت اول میں یہ نعمائے بہشتی میں سے ایک نعمت ہے اور جیسے یہاں ان خدام کو موتی کہا ہے دوسری جگہ ان ساتھیوں کو جنہیں حور کہا ہے یاقوت اور مرجان سے تشبیہ دی ہے دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ یہ اس دنیا کی چیزیں نہیں ؀

ع۳۱۷۹ کاھن۔ کاھن وہ ہے جو ایک قسم کے ظن سے گذری ہوئی مخفی خبریں بتاتا ہے اور عرّاف وہ ہے جو آیندہ کی خبریں دیتا ہے اور آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جو شخص کاہن یا عراف کے پاس جاتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس پر اس کی تصدیق کرتا ہے تو اس سے کفر کرتا ہے جو ابی القاسم پر نازل ہوا (غ) اور حدیث میں جو کاھن کا ذکر آتا ہے تو ابن اثیر نے لکھا ہے کہ وہ وہ ہے جو آیندہ زمانہ میں ہونے والی چیزوں کی خبر دیتا ہے اور چھپی ہوئی باتوں کے جاننے کا دعویٰ کرتا ہے اور عرب میں کاہن لوگ تھے جیسے شِقّ اور سَطِیح وغیرہ بعض ان میں گمان کرتے تھے کہ ان کا کوئی جن تابع ہے جو انہیں خبریں پہنچاتا ہے۔ اور بعض کاان میں سے خیال تھا کہ وہ سائل کے کلام اور فعل اور حال وغیرہ پر غور کر کے ایسی باتوں کا استدلال کر لیتا ہے جن سے وہ امور غیبی کو معلوم کر سکتا ہے اور ایسے لوگوں کو عرّاف کے نام سے مخصوص کرتے تھے اور ازہری کا قول ہے کہ کہانت ملک عرب میں ہمارے نبی صلعم کی بعثت سے پیشتر موجود تھی۔ لیکن آپ کی تشریف آوری سے کہانت کا علم باطل ہو گیا اور کاہنوں کے اباطیل فرقان کے سامنے اُٹھ گئے اور اب کہانت باقی نہیں رہی۔ اور کاہن لوگ اپنے باطل قولوں کو مسجع کر کے پیش کرتے تھے جس سے لوگوں کے دلوں پر خاص اثر پڑتا تھا اور ان کے دل اور کان ان کی طرف مائل ہوتے تھے۔ (ل)

کہانت اور قرآن: اعدائے حق نے جو پیرائے آنحضرت صلعم کو بدنام کرنے کے لیے اختیار کیے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ لوگوں کو کہتے رہتے تھے کہ آپ کاہن ہیں اس کی اللہ تعالیٰ نے یہاں نفی کی ہے اور جس شخص کو عربی زبان سے ادنیٰ واقفیت بھی ہے اور اس نے کاہنوں کے کلام کو دیکھا ہے وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ کاہنوں کے کلام اور فرقان حمید میں زمین و آسمان کا فرق ہے کاہنوں کا کلام صرف ایک ظنی بات کو ذومعنی پیرایہ میں بیان کرنے کے لیے مسجع کیا جاتا تھا اس میں کوئی صداقت کوئی اخلاق کوئی اصول نہیں ہوتے تھے۔ بالمقابل قرآن کریم ایک نہایت پاکیزہ کلام ہے جس میں اعلیٰ درجہ کے اخلاق اور روحانیت کے اصول اور اللہ تعالیٰ کی ہستی اور قدرت کاملہ پر اعلیٰ درجہ کی دلائل بیان ہوئی ہیں اور قرآن کریم نے تو کہانت کو دنیا سے نابود کیا آج کل کی اس تحریک میں جو سپریچوئلزم کے نام سے موسوم ہے کہانت کا بیشتر رنگ پایا جاتا ہے اور اس کو بھی صرف قرآن شریف ہی دور کر سکتا ہے عیسائیت نے اس بیماری کو یورپ میں پیدا کیا ہے اور اس کا علاج اسلام میں ہے ؀

ع۳۱۸۰ ریب۔ ریب المنون میں (حوادث کو) ریب کہا ہے نہ اس لیے کہ اس کے وقوع میں شک ہے بلکہ اس لیے کہ ان کے وقت حصول میں شک ہے (غ) اور رَیْب زمانہ کی گردش کو بھی کہتے ہیں۔ اور حدیث فاطمہ میں ہے یُرِیْبُنِی مَا یُرِیْبُھَا یعنی جس بات سے اسے تکلیف پہنچتی ہے مجھے بھی تکلیف پہنچتی ہے۔ اور رابنی ھذا الامر کہا جاتا ہے جب کوئی ایسا امر ہو جسے تم ناپسند کرتے ہو اور رَیْبُ الدَّھْر زمانہ کی گردشیں اور اس کے حوادث ہیں اور ریب المنون حوادث دہر ہیں (ل)

منون۔ مَنّ کے معنی قطع کرنا ہیں۔ اور مَنُوْن موت ہے کیونکہ وہ ہر چیز کو قطع کر دیتی ہے اور بعض کے نزدیک مَنُوْن دہر یعنی زمانہ ہے (ل)۔

ع۳۱۸۱ تقول۔ تَقَوَّلَ تقولاً کے معنی ہیں خود جھوٹ بنا لیا اور تَقَوَّلَ عَلَیَّ مجھ پر جھوٹ بولا اور وہ بات میری طرف منسوب کی جو میں نے نہیں کہی لو تقول علینا بعض الاقاویل (الحاقۃ ۶۹ - ۴۴) (ل)

صٰدِقِيْنَ ۝۳۴
سچے ہیں ۳۱۸۲

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝۳۵
کیا یہ بغیر کسی کے (پیدا کرنے کے) پیدا ہو گئے ہیں یا یہی پیدا کرنے والے ہیں ۳۱۸۳

اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝۳۶
یا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، بلکہ یقین نہیں کرتے۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَّيْطِرُوْنَ ۝۳۷
کیا ان کے پاس تیرے رب کے خزانے ہیں یا یہ مسلّط ہیں ۳۱۸۴

اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۸
کیا ان کے پاس کوئی ذریعہ ہے جس سے سُن لیتے ہیں تو چاہیئے کہ ان کا سننے والا کوئی کھلی دلیل لائے ۳۱۸۵

اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ۝۳۹
کیا اس کے لیے بیٹیاں ہیں اور تمھارے لیے بیٹے ہیں۔

اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝۴۰
کیا تو ان سے اجر مانگتا ہے تو یہ چٹّی کے بوجھ میں دبے ہوئے ہیں۔

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۝۴۱
کیا ان کے پاس غیب ہے تو وہ لکھ لیتے ہیں ۳۱۸۶

اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ۝۴۲
کیا یہ کوئی داؤ کرنا چاہتے ہیں، تو جو کافر ہیں وہی داؤ کے نیچے آتے ہیں ۳۱۸۷

۳۱۸۲ اس ابتدائی زمانہ میں بھی قرآن کے کلام بے مثل ہونے کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔

۳۱۸۳ خلقوا من غیر شیٔ۔ من غیر مقدّر و خالق (ر) یعنی بغیر کسی اندازہ کرنے والے اور خالق کے خود بخود ہو گئے ہیں ام ھم الخالقون یعنی اپنے خالق آپ ہیں اور اگر یہ اپنے خالق ہیں تو کیا آسمانوں اور زمین کو بھی انہوں نے ہی پیدا کیا ہے جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے اور ام خلقوا من غیر شیٔ کے یہ معنی بھی کیے گئے ہیں کہ کیا بغیر کسی علت و غایت کے پیدا کیے گئے ہیں؟

۳۱۸۴ مصیطر۔ سَطر ایک صف ہے لکھی ہوئی چیز کی ہو یا درختوں یا کھڑے ہوئے ہوئے لوگوں کی۔ اور تَسَیْطَرَ فلانٌ علٰی کذا اور سَیْطَرَ عَلَیہ کے معنی ہیں کہ اس پر ایک سطر کی طرح قایم ہو گیا اور مصیطر سے مراد وہی ہے جو افمن ھو قائم علی کل نفس (الرعد ۱۳ - ۳۳) میں قائم ہے اور ما انا علیکم بحفیظ (الانعام ۶ - ۱۰۴) سے مراد ہے (غ) اور مُسَیْطِر اور مُصَیطِر وہ ہے جسے کسی چیز پر مسلط کر دیا جائے تاکہ وہ اس پر بلند ہو اور اس کے احوال کا تعہد کرے اور اس کے عمل کو لکھے اور اس کا اصل سَطر سے ہے اور یہاں مصیطر کے معنی مسلّط ہی ہیں اور طا کی وجہ سے سین صاد سے بدل گیا ہے (ل) مطلب یہ ہے کہ نہ ان کے پاس الٰہی خزانے ہیں نہ انہیں چیزوں پر تسلط دیا گیا ہے۔

۳۱۸۵ شیاطین کے آسمان سے اخبارِ غیبی لانے کی قطعی تردید: مُسلّم کے لیے دیکھو ۹۳۵ مراد کوئی ذریعہ یا سبب ہے یہ آیت اس خیال کی کلی نفی کرتی ہے کہ شیاطین آسمان پر چڑھ کر کچھ غیب کی باتیں سن لیتے ہیں جنہیں کاہنوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ کیونکہ یہاں اسی بات کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ اگر یہ کچھ سنتے ہیں تو پیش کریں۔

۳۱۸۶ یعنی ان کے پاس کوئی ایسا علم غیب نہیں جس پر انہیں اس قدر وثوق ہو کہ وہ اسے لکھ لیں۔ زبانی بعض باتیں کہہ دیتے تھے اگر جھوٹ نکلا تو کوئی پوچھنے والا نہیں اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ نبی کریم صلعم کو اس غیب پر جس کا آپ نے اظہار کیا کسقدر وثوق تھا کہ ہر ایک آیت نزول کے ساتھ لکھ بھی لی جاتی تھی اور علاوہ ازیں حفظ بھی کر لی جاتی تھی۔

۳۱۸۷ مکیدون۔ الذین یحیق بھم کید ھم و یعود علیھم وبالہ (ر) اور کید ہر تدبیر کو کہتے ہیں التدبیر بباطل او حق (ل) یعنی خواہ باطل تدبیر ہو اور خواہ حق نیز دیکھو ۵۰۷۔

اَمۡ لَهُمۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ‌ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۴۳﴾
کیا ان کے لیے سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی معبود ہے، اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے جو وہ شرک کرتے ہیں۔

وَاِنۡ يَّرَوۡا كِسۡفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوۡلُوۡا سَحَابٌ مَّرۡكُوۡمٌ ﴿۴۴﴾
اور اگر یہ آسمان سے (عذاب کا) کوئی ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں، کہیں گے تہ بتہ بادل ہیں [٣١٨٨]

فَذَرۡهُمۡ حَتّٰى يُلٰقُوۡا يَوۡمَهُمُ الَّذِىۡ فِيۡهِ يُصۡعَقُوۡنَ ﴿۴۵﴾
سو انھیں چھوڑ دے یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن کو ملیں، جس میں ہلاک کیے جائیں گے [٣١٨٩]

يَوۡمَ لَا يُغۡنِىۡ عَنۡهُمۡ كَيۡدُهُمۡ شَيۡـــًٔا وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ؕ‏ ﴿۴۶﴾
جس دن ان کا داؤ اُن کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ انھیں مدد دی جائے گی۔

وَاِنَّ لِلَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا عَذَابًا دُوۡنَ ذٰلِكَ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۷﴾
اور ان کے لیے جو ظالم ہیں اس کے سوائے ایک اور عذاب ہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے [٣١٩٠]

وَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعۡيُنِنَا‌ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ حِيۡنَ تَقُوۡمُۙ‏ ﴿۴۸﴾
اور اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کر، کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر جب تو اُٹھے [٣١٩١]

ع ۲ / ۴ وَمِنَ الَّيۡلِ فَسَبِّحۡهُ وَاِدۡبَارَ النُّجُوۡمِ ﴿۴۹﴾
اور رات کے کسی حصّہ میں بھی اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے ڈوبنے کے بعد بھی۔

٣١٨٨ ساقطا۔ سُقُوط ایک بلند مکان سے پست مکان کی طرف گرنا ہے اور اسی معنی میں ہے الا فی الفتنۃ سقطوا (التوبۃ ۹۔ ۴۹) اور ایک سقوط یہ ہے کہ جو چیز سیدھی کھڑی ہے وہ گر جائے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب اس پر بڑھاپا آجائے اور وہ بڑی ہو جائے (غ) اور سقط الی القوم کے معنی ہیں نزلوا علی (یعنی سقوط بمعنی نزول ہے اور حدیث میں ہے علی الخبیر سَقَطْتَ جس سے مراد یہ ہے کہ تو ایک باخبر آدمی کے پاس آگیا ہے (ل) آسمان سے کسی ٹکڑے کے گرنے سے کیا مراد ہے دیکھو ۱۵۷۷ کفار بار بار اس رنگ میں عذاب کا مطالبہ کرتے تھے فاسقط علینا کسفا من السماء (الشعراء ۲۶۔ ۱۸۷) او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا (بنی اسرائیل ۱۷۔ ۹۲) اور کسف اس لحاظ سے کہا کہ وہ عذاب کا ایک ٹکڑا یا حصّہ ہے اور سحاب مرکوم کہنے سے یہ منشا ہے کہ عذاب کے آنے سے پہلے وہ ان حالات کو جن سے عذاب پیدا ہوتا ہے اپنی بہتری کا موجب سمجھتے ہیں۔ قومیں جب حق کی مخالفت میں مست ہوتی ہیں تو وہ انہی چیزوں کو جو ان کے لیے انجام کار دکھوں کا موجب بنتی ہیں سکھ کا موجب سمجھتی ہیں۔

٣١٨٩ یصعقون۔ صعق الانسان کے معنی ہیں وہ بے ہوش ہو گیا اور اس کی عقل جاتی رہی یا وہ مر گیا۔ اور صُعِق کے معنی ہیں اسے صاعقہ نے آلیا۔ اور صاعقہ وہ آگ بھی ہے جو رعد کے ساتھ آسمان سے اترتی ہے اور صیحۃ العذاب کو بھی صاعقہ کہا جاتا ہے۔

جنگ بدر کی پیشگوئی: اس سے مراد عموماً نفخہ اولیٰ یعنی قیامت کو لیا گیا ہے مگر دیکھو اگلی آیت جہاں صاف فرمایا کہ یہ اس دن کا ذکر ہے جس دن ان کی تدبیر انہیں کچھ کام نہ دے گی۔ اور یہ وہی تدبیر ہے جس کا ذکر آیت ۴۲ میں ہو چکا ہے ام یریدون کیدا فالذین کفروا هم المکیدون علاوہ ازیں جیسا کہ روح المعانی میں لکھا ہے نفخہ اولیٰ پر تو وہی لوگ مریں گے جو اس وقت زندہ موجود ہونگے ان کفار پر تو وہ نفخہ اولیٰ آنے والا نہ تھا اور یہاں صاف لکھا ہے کہ ان کفار کو جو آپ کو کاہن شاعر مفتری وغیرہ کہتے ہیں اور آپ کے خلاف تدبیریں کرتے ہیں آپ چھوڑ دیں یہاں تک کہ ان پر وہ دن آجائے جس میں وہ ہلاک ہو جائیں یا ان پر عذاب آجائے اور یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ یہاں اس عذاب دنیا کا وعدہ ہے جو ان کفار پر آنے والا تھا اور جو فی الحقیقت ان کی تدابیر کا جو وہ اسلام کے خلاف کر رہے تھے بد نتیجہ تھا اور انہی کی تدابیر کا وبال ان پر آنے والا تھا۔ جیسا کہ هم المکیدون سے ظاہر ہے پس صحیح وہی قول ہے جو روح المعانی میں ہے کہ اس سے مراد یوم بدر ہے اور یہی وہ دن تھا جو لا یغنی عنهم کیدهم شیئا کا مصداق ہوا اس لیے کہ وہ اسلام کے تباہ کرنے کے لیے ایک زبردست تدبیر کر کے آئے تھے اور آخر خود ہلاک ہو کر واپس ہوئے۔

٣١٩٠ دون ذلک سے مراد جنگ بدر سے پہلے ہے اور وہ جیسا کہ مجاہد نے کہا ہے قحط ہے جو سات سال کے لیے ان پر پڑا (ر) یا دون یہاں صرف سوائے کے معنی میں ہے اور اشارہ عذاب قیامت کی طرف ہے۔

٣١٩١ باعیننا سے مراد ہے ہماری حفاظت میں یعنی یہ جتنی تدبیریں چاہیں کریں۔ رسول اللہ صلعم کو نقصان نہیں پہنچا سکتے اور حین تقوم میں مراد بعض نے نیند سے اٹھنا اور بعض نے نماز کے لیے اٹھنا لیا ہے (ج) اور یا کسی مجلس سے اٹھنا مگر اگلی آیت میں رات کی تسبیح کا ذکر ہے اس لیے حین

تقوم دن میں تسبیح کی طرف اشارہ ہے اور ادبار النجوم یا صبح کے وقت کا خصوصیت سے ذکر کیا کیونکہ وہ وقت خاص طور پر قبولیت دعا کا ہے۔
لکن۔ استدراک کے لیے آتا ہے۔ اور واؤ کے ساتھ بھی اور واؤ کے بغیر بھی استعمال ہوتا ہے۔

اٰیاتُہا ۶۲ (۵۳) سُوْرَةُ النَّجْمِ مَكِّيَّةٌ رُکُوعَاتُہا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝١ ستارہ گواہ ہے جب وہ ڈوبتا ہے ۳۱۹۲ء

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝٢ تمہارا ساتھی گمراہ نہیں ہوا اور نہ وہ بہکا ہے ۳۱۹۳ء

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝٣ اور نہ خواہش نفس سے بولتا ہے۔

تمہید سورت: اس سورت کا نام النجم ہے اور اسی میں تین رکوع اور باسٹھ آیتیں ہیں اور النجم سے مراد یا ستارہ ہے اور اس لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ مخالفین کے اقبال کا ستارہ غروب ہونے کو ہے اور یا اس سے مراد قرآن کریم کا ہر حصہ ہے جو نازل ہوتا ہے اور اس میں آنحضرت صلعم کے مقامات عالیہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ دونوں باتیں اس سورت کے مضمون میں داخل ہیں اور پچھلی سورت میں اگر حضرت موسٰی کی وحی کی طرف جو طور پر ہوئی بالخصوص توجہ دلائی تھی تو اس میں قرآن کریم اور اس وحی کے حامل حضرت محمد مصطفٰے صلعم کے کمالات کی طرف توجہ دلائی اور وہ سورت ادبار النجوم پر ختم ہوتی ہے تو اس کی ابتدا والنجم اذا ھوی سے ہوتی ہے یہ سورت مکّی ہے اور اس کا نزول پانچویں سال بعثت کا ہے یعنی ابتدائی مکّی زمانہ کا کیونکہ یہ ثابت ہے کہ حبش کی ہجرت اول ہو چکی تھی جب یہ سورت نازل ہوئی اور ابن مردویہ نے ابن مسعود سے روایت بیان کی ہے کہ یہ پہلی سورت ہے جو آنحضرت صلعم نے کفار کے سامنے علی الاعلان پڑھی۔

۳۱۹۲ء نجم اصل میں چڑھتے ہوئے ستارے کو کہا جاتا ہے اور جمع نجوم ہے اور نجم کے معنی طَلَعَ یعنی چڑھا یا ظاہر ہوا۔ اور نجُوم اس کا مصدر بھی ہے اور نجم سبزی کے نکلنے پر بھی بولا جاتا ہے اور یہاں بعض کے نزدیک کوکب مراد ہے اور بعض کے نزدیک ثریا مراد ہے اور بعض کے نزدیک قرآن مراد ہے جو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا تھا اور ھَوٰی سے مراد اس کا نزول ہے اور فلا اقسم بمواقع النجوم میں دونوں معنی لیے گئے ہیں اور نجم سبزیوں میں سے وہ چیز ہے جس کی ساق نہ ہو (غ) اور اہل لغت کہتے ہیں کہ نجم بمعنی نجوم ہے یعنی کل ستارے۔ اور نجم اصل میں ہر ایک ستارے پر بولا جاتا ہے اور ثریا پر بالخصوص اور نجوم سے مراد اشیا کے وظائف بھی لیے جاتے ہیں یعنی رزق یا ذکر وغیرہ کے وہ حصے جو روز کیلئے مقرر کیے جاتے ہیں۔ اور نجم وقت مضروب ہے یعنی جو کسی بات کے لیے مقرر کر لیا جائے (ل)

النجم کے معنی میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ ۱۔ ستاروں کا قیامت میں بکھر جانا۔ ۲۔ ثریا۔ ۳۔ شعری اور کاہن اس کے طلوع کے وقت امور غیبی کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔ ۴۔ زہرہ جس کی عبادت کی جاتی تھی۔ ۵۔ اور ابن عباس مجاہد وغیرہما کا قول ہے قرآن کی مقدار جو نبی صلعم پر نازل ہوتی تھی۔ ۶۔ اور جعفر صادق کا قول ہے کہ اس سے مراد نبی صلعم ہیں اور ھوی سے مراد معراج کی رات آپ کا نزول ہے (ر) یہ تو ظاہر ہے کہ یہاں نجم کو بطور گواہ پیش کیا ہے اس بات پر کہ محمد رسول اللہ صلعم گمراہ نہیں ہیں۔ پس اگر نجم سے مراد قرآن شریف کے نازل شدہ ٹکڑے لیے جائیں یا خود رسول اللہ صلعم کو لیا جائے تو مطلب صاف ہے یعنی قرآن کا ہر ٹکڑہ جو نازل ہوتا ہے اس بات پر گواہ ہے کہ رسول اللہ صلعم ضلالت میں نہیں۔ کیونکہ ہر ٹکڑہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کی شہادت رکھتا ہے اور اگر نجم سے مراد ایک خاص ستارہ لیا جائے یا ستارے لیے جائیں تو ان کے غروب ہونے سے صبح کا طلوع مراد ہے اور اشارہ ہے کہ جس طرح ستارے غائب ہو جاتے ہیں تو رات کی جگہ دن لے لیتا ہے۔ اور آفتاب کی روشنی نمودار ہوتی ہے اسی طرح دنیا پر ایک لمبی رات کے بعد محمد رسول اللہ صلعم کی رسالت کے آفتاب نے طلوع کیا ہے اور یا نجم کے غروب ہونے میں اشارہ کفار کے ستارے کے غروب ہونے کی طرف ہے۔

۳۱۹۳ء آنحضرت کی عصمت عمل اور اعتقاد: غَیّ وہ جہالت ہے جو اعتقاد فاسد سے پیدا ہو دیکھو ۳۳۰ء پس ماضلّ میں نفی ضلالت کی ہے یعنی آپ طریق حق سے نہیں پھرے اور ماغوی میں نفی اعتقاد فاسد کی ہے یعنی آپ کا اعتقاد بھی صحیح ہے یعنی عملی طور پر بھی اور علمی طور پر بھی آپ کا قدم صواب پر ہے اس سے زیادہ جامع اور مانع الفاظ میں کسی کی عصمت کا ذکر نہ ہو سکتا تھا عموماً صرف گناہ سے بچنے کا نام عصمت رکھا جاتا ہے یعنی کسی فعل کا خلاف حکم الٰہی صادر نہ ہونا مگر قرآن کریم نے آنحضرت صلعم کو نہ صرف گناہ سے محفوظ قرار دیا ہے بلکہ عقیدہ کو بھی غلطی سے پاک بنایا ہے یہ آیت آپ کی عصمت پر نص صریح ہے اور غوی بمعنی خاب

اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ۙ﴿۴﴾ یہ صرف وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے ۳۱۹۴

عَلَّمَهٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی ۙ﴿۵﴾ اسے مضبوط قوتوں والے نے سکھایا ہے ۳۱۹۵

ذُوۡ مِرَّةٍ ؕ فَاسۡتَوٰی ۙ﴿۶﴾ حکمت والے نے — سو وہ اعتدال پر قائم ہوا ۳۱۹۶

ے کرما غوی میں پیشگوئی بھی ہو سکتی ہے یعنی آپ کے غلطی پر نہ ہونے کو یہ بات ثابت کردیگی کہ آپ ناکام نہیں ہوتے ؛

۳۱۹۴ آپ کا حرص و ہوا سے خالی ہونا: وما ینطق عن الھوی عام ہے یعنی رسول اللہ صلعم خواہش نفسانی سے کوئی بات نہیں کرتے اور ان ھو میں ضمیر قرآن شریف کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر والنجم میں موجود ہے اور اگر نجم سے مراد ستارہ لیا جائے تو پھر بھی ان ھو میں ضمیر قرآن کی طرف ہی ہوگی کیونکہ قرآن شریف کا ذکر اس طرح پر بار ہا آیا ہے اور بعض نے یوں توجیہ کی ہے کہ یہ سوال مقدر کا جواب ہے یعنی جب یہ کہا گیا کہ آپ حرص و ہوا سے کوئی بات بھی نہیں کرتے تو اس پر سوال ہوتا تھا کہ پھر یہ قرآن کیا ہے تو اس کا جواب دیا ہے کہ یہ وحی ہے بہر حال ضمیر قرآن شریف کی طرف ہے خواہ اس کا ذکر پہلے مانا جائے یا نہ۔ اور ضمیر کو نطق کی طرف لینا اس لیے درست نہیں کہ یہ کسی کے نزدیک بھی مسلم نہیں کہ آپ کا سارا کلام یا کم از کم نبوت کے بعد کا ہی سارا کلام وحی سے تھا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آپ کا اجتہاد بھی وحی خفی کی روشنی سے تھا۔ مگر پھر بھی اس نطق کو مسائل دینی پر محدود کرنا پڑے گا۔ حالانکہ ینطق عام ہے اور حرص و ہوا سے آپ کا کوئی کلام قبل از نبوت بھی نہ تھا چہ جائیکہ بعد از نبوت کسی کلام کو ایسا مانا جائے اور یہ الفاظ بھی آپ کی عصمت پر صریح دلیل ہیں کیونکہ گناہ بغیر ہوائے نفس کے پیدا نہیں ہوتا۔

۳۱۹۵ قوی۔ قُوّۃ کا استعمال کبھی قدرت کے معنی میں ہوتا ہے جیسے خذوا ما اٰتینٰکم بقوۃ (البقرۃ ۲-۶۳) اور کبھی اس استعداد کے لیے جو کسی شے میں موجود ہو جیسے گٹھلی کو کہا جائے کہ یہ بالقوہ درخت ہے اور کبھی اس کا استعمال بدن میں ہوتا ہے اور کبھی قلب میں اور کبھی کسی خارجی معاون کے متعلق اور کبھی قدرت الٰہیہ کے متعلق قوت بدن میں جیسے من اشد منا قوۃ (حٰم السجدۃ ۴۱-۱۵) فاعینونی بقوۃ (الکھف ۱۸-۹۵)۔ اور قلب میں قوت کی مثال یٰیحیٰی خذ الکتٰب بقوۃ (مریم ۱۹-۱۲) اور خارجی معاون کی مثال جیسے لو ان لی بکم قوۃ (ھود ۱۱-۸۰) یعنی کوئی لشکر ہوتا یا مال الیاہی نحن اولوا قوۃ (النمل ۲۷-۳۳) اور قدرت الٰہیہ کی مثال ان اللہ قوی عزیز (الحدید ۵۷-۲۵) ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین (الذٰریٰت ۵۱-۵۸) جس میں وہ قوت بھی شامل ہے جو مخلوق کے لیے ہے۔ اور ذی قوۃ عند ذی العرش (التکویر ۸۱-۲۰) سے مراد جبرئیل ہے اور علمہ شدید القوی (النجم ۵۳-۵) میں لفظ جمع استعمال کیا گیا ہے (یعنی قوی قوۃ کی جمع ہے) تو مطلب یہ ہے کہ اس عالم کے لحاظ سے اور ان لوگوں کے لحاظ سے جنہیں سکھاتا اور فائدہ پہنچاتا ہے وہ بہت قوتوں والا ہے اور عظیم قدرت والا ہے اور بیابان کو قِواء کہا جاتا ہے اور اقوی الرجل کے معنی ہیں وہ بیابان میں گیا ومتاعا للمقوین (الواقعۃ ۵۶-۷۳) (غ)

۳۱۹۶ ذو مرۃ۔ مُرُور کے معنی ایک چیز سے گذر جانا اور آگے نکل جانا ہیں واذا مروا بھم یتغامزون (التطفیف ۸۳-۳۰) اذا مروا باللغو مروا کراما (الفرقان ۲۵-۷۲) میں یہ تنبیہ ہے کہ جب انہیں لغویات کی طرف دھکیلا جاتا ہے تو اس سے الگ ہو جاتے ہیں اور جب اسے سنتے ہیں تو کان بند کر لیتے ہیں۔ اور جب اسے دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور فلما کشفنا عنہ ضرہ مر کان لم یدعنا (یونس ۱۰-۱۲) میں مراد ہے اعراض کرنا ہے اور اَمْرَرْتُ الحبلَ کے معنی ہیں میں نے رسہ کو بٹا اور اسی سے ذو مِرّۃ ہے گویا کہ وہ مضبوط بٹا ہوا ہے (غ) اور ذو مِرّۃ کے معنی ہیں صاحب عقل اور اصالت اور احکام اور مِرّہ قوت ہے (ل) گویا شدید القوی میں قوت فعل کا ذکر ہے اور ذو مِرّۃ میں قوت نظری اور عقلی کا (ر) اور مَرّۃ جزو زمان ہے۔ یعنی ایک بار اور مَرّتین دوبارہ ثلاث مرات تین بار (غ)۔

آنحضرت کے جملہ قویٰ کا حالت اعتدال پر ہونا: شدید القوی اور ذو مرۃ سے مراد جبرئیل لیے گئے ہیں اور جبرئیل کا آنحضرت صلعم کو تعلیم دینا اس لحاظ سے ہے کہ وہی حامل وحی ہیں۔ جو آنحضرت صلعم تک وحی الٰہی کو پہنچاتے ہیں اور حسن رضؓ سے منقول ہے کہ شدید القوی اور ذو مرۃ اللہ تعالیٰ ہے اور جمع (یعنی قوی) تعظیم کے لیے ہے (ر) تو اس صورت میں مراد صرف اسی قدر ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو سکھایا۔ اور فاستوی کے معنی ہیں اپنی ذات میں حالت اعتدال پر ہوا دیکھو ۱۰۹۵ اور اس کو عموماً جبرئیل کے متعلق ہی سمجھا گیا ہے اور استوی سے مراد یہ لی گئی ہے کہ جبرئیل اپنی صورت حقیقی پر ظاہر ہوئے اور حسن نے فاستوی میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لی ہے اور استواء اور افق اعلیٰ پر ہونے سے مراد اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت اور سلطان کا اظہار لیا ہے (ر) لیکن فاستوی وھو بالافق الاعلی۔ ثم دنا فتدلی فکان قاب قوسین او ادنی میں تمام ضمیریں ایک ہی طرف جاتی ہیں اور ثم دنی میں حسن نے ضمیر آنحضرت صلعم کی طرف مانی ہے اور جیسا کہ آگے ظاہر ہوگا۔ ان الفاظ میں ذکر نبی کریم صلعم کا ہی ہے اور آپ کا ذکر ہی فاستوی میں ہے اور مراد یہ ہے کہ آپ اپنی تمام قوتوں کے لحاظ سے حالت اعتدال پر ہیں۔ گویا کوئی قوت ایسی نہیں کہ حد سے تجاوز کر گئی ہو نہ کوئی قوت ایسی ہے کہ دوسری قوتوں سے دب کر ناقص رہ گئی ہو اور قوتوں کا حالت اعتدال پر ہونا آپ کے عملی کمال کو ظاہر کرتا ہے اور یہ گویا ما ضلّ کے مقابلہ پر ہے یعنی آپ کی عصمت عملی پہلو میں ما ضلّ سے ثابت ہے لیکن چونکہ صرف نفی ضلالت سے کوئی کمال ثابت نہیں ہوتا اس لیے یہاں فرمایا کہ آپ کی عملی قوتیں تمام حالت اعتدال پر قایم ہونے کی وجہ سے کمال کو پہنچ گئی ہیں۔

وَ هُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ؕ﴿۷﴾ اور وہ بلند انتہائی مقامات پر ہے ۳۱۹۷

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۙ﴿۸﴾ پھر قریب ہُوا اور بہت قریب ہوا ۳۱۹۸

فَکَانَ قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی ۚ﴿۹﴾ سو وہ دو کمانوں کا وتر ہُوا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قریب ۳۱۹۹

۳۱۹۷ افق۔ اُفق وہ ہے جو انتہائے فلک اور اطراف زمین سے ظاہر ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ہے وَاَنْتَ لَمَّا وُلِدْتَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ وَضَاءَتْ بِنُوْرِكَ الْاُفُق یعنی جب آپ پیدا ہوئے تو زمین چمک اُٹھی اور افق آپ کے نور سے روشن ہو گیا (یعنی زمین کے انتہائی مقامات) اور آفِق (یعنی افق میں جانے والا) وہ ہے جو علم اور کرم میں غایت کو پہنچ جائے اور جائز ہے کہ اُفق فُلك کی طرح واحد اور جمع دونوں پر استعمال ہو (ل)

آنحضرت صلعم کے جملہ قویٰ کا کمال کو پہنچنا: وھو بالافق الاعلے میں بھی رسول کریم صلعم کا ہی ذکر ہے جیسا کہ اوپر دکھایا گیا اور آپ کے افق اعلیٰ میں ہونے سے یہ مراد ہے کہ آپ علو اور بلند مرتبگی کے انتہائی مقامات کو پہنچ گئے اور یہ فاستوی کے لیے گویا بطور ایک تتمہ کے ہے یعنی وہ قویٰ ایسی حالت میں اعتدال پر قایم ہیں کہ کمال کو بھی پہنچ چکی ہیں۔ بالفاظ دیگر باوجود اس کے کہ آپ کی ہر ایک قوت کمال کو پہنچی ہوئی ہے اعتدال پر بھی قائم ہے۔ اور یہ آپ کے اخلاق کا پہلو ایسا ہے کہ دنیا کا کوئی انسان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آپ کی ہر ایک نیکی کا اظہار اس وقت ہوا ہے کہ جب حالات کلیتہً اس کے مخالف تھے مثلاً بادشاہ رہ کر آپ نے فقیرانہ زندگی بسر کی اگر بادشاہت کو چھوڑ کر فقیرانہ زندگی اختیار کرتے تو یہ کمال قوت پر دال نہ تھا اسی طرح آپ کی قوت عفو اپنے کمال میں دشمنوں کے ساتھ جنگ میں فتح کے وقت ظاہر ہوئی اور دوستوں کے ساتھ جنگ میں نافرمانی کے وقت جب نافرمانی سے قومی نقصان ہوا جیسے اُحد کی جنگ میں اسی طرح آپ کے تمام اخلاق کی حالت ہے مگر ان تفصیلات کا یہ موقعہ نہیں۔ اور یہاں یہ بتایا ہے کہ نہ صرف آپ کے کمال کو پہنچے بلکہ کمال کے انتہائی مقامات تک پہنچ گئے جہاں تک انسان کے لیے پہنچنا ممکن تھا۔ اور آپ کے کمالات تمام پر فوقیت لے گئے؛

۳۱۹۸ تدلی دیکھو ۱۰۶۴ اور مفردات میں ہے اَلتَّدَلِّی الدُّنُوُّ وَالْاِسْتِرْسَالُ یعنی تدلّی کے معنی قریب ہونا اور موانست چاہنا ہے اور لسان العرب میں تَدَلّٰی علینا کے معنی دیئے ہیں وہ ہمارے پاس آیا اور زجاج کا قول نقل کیا ہے کہ دنی اور تدلّی کے ایک ہی معنی ہیں یعنی قرب فتدلی اے زاد فی القرب یعنی تدلّی کے معنی ہیں قرب میں بڑھا؛

آنحضرت کا قرب اللہ تعالےٰ سے: اکثر مفسرین نے تو یہاں ضمیر جبرئیل کی طرف ہی لی ہے اور مراد یہ لیا ہے کہ حضرت جبرئیل آنحضرت صلعم سے قریب ہوئے اور پھر اور زیادہ قریب ہوئے اور یہی لفظ حدیث اسراء میں بھی آتے ہیں۔ فتدلی فکان قاب قوسین اور ابن اثیر کہتے ہیں کہ وہاں بھی جبرئیل کا قرب آنحضرت صلعم سے ہی مراد ہے مگر جبرئیل کے آنحضرت صلعم سے قرب کو خاص طور پر بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی بلکہ یہ ذکر بھی آنحضرت صلعم کے اللہ تعالیٰ سے قرب کا ہے اور ابن جریر کی روایت جو انس بن مالک سے ہے صاف بتاتی ہے کہ وہاں ذکر آنحضرت صلعم کا ہی ہے ثم علا به بما لا یعلمه الا اللہ حتی جاء سدرة المنتهی ودنا الجبار رب العزة فتدلی حتّٰی کان منه قاب قوسین او ادنی یہ ذکر جبرئیل کے آنحضرت سے قرب کا نہیں بلکہ آنحضرت کے اللہ تعالیٰ سے قرب کا ہے اور اسی کے مطابق بخاری میں شریک کی روایت میں جو انس سے ہے معراج کا ذکر ہے جس میں بعینہٖ یہی لفظ آتے ہیں۔ یہ دونوں روایتیں اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ یہاں ذکر آنحضرت کے اللہ تعالیٰ سے قرب کا ہے نہ جبرئیل کے آنحضرت سے قرب کا جو فی الحقیقت اس قدر اہمیت سے بیان کرنے کی بات بھی نہ تھی۔

۳۱۹۹ قاب۔ قاب وہ ہے جو قبضہ اور گوشۂ کمان کے درمیان ہے۔

قوسین۔ قَوْس کمان ہے جس سے تیر چلایا جاتا ہے۔

قاب قوسین کے معنی دو طرح پر کیے گئے ہیں یعنی قدر قوسین یا دو کمانوں کا اندازہ اور دوسرے معنی یہ کیے گئے ہیں۔ کان منه حیث الوتر من القوس یعنی اس مرتبہ پر جیسے وتر قوس سے ہوتا ہے پہلے معنی لے کر بھی یہ مطلب نہیں کہ جبرئیل اور آنحضرت صلعم میں یا آنحضرت صلعم میں اور اللہ تعالیٰ میں دو کمانوں کا فاصلہ رہا۔ یہ بے معنی بات ہے کیونکہ ایسا فاصلہ اجسام میں ہو سکتا ہے اصل حقیقت اس کی یہ ہے جیسا کہ خفاجی نے کہا ہے کہ ایام جاہلیت میں عرب جب ایک دوسرے سے مضبوط عہد کرتے تھے تو وہ دو کمانیں نکالتے تھے اور ایک کو دوسری کے ساتھ ملا دیتے تھے اور دونوں کے قاب مل جاتے تھے یہاں تک کہ وہ گویا ایک ہی قاب والی ہو جاتی تھیں پھر ان دونوں کو اکٹھا کھینچتے اور ان سے ایک ہی تیر چلاتے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا کہ ان میں سے ایک کی رضامندی دوسرے کی رضامندی ہے اور ایک کی ناراضگی دوسرے کی ناراضگی اور اس کے خلاف ممکن نہیں (ر) پس مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کا اللہ تعالیٰ سے ایسا قرب شدید کا تعلق ہوا جس سے بڑھ کر قرب ممکن نہیں اسی لیے قاب قوسین کے بعد او ادنی کے لفظ بڑھائے ہیں یعنی گو دو کمانوں کے ملانے والوں کا تعلق بھی بہت شدید ہوتا ہے مگر آنحضرت صلعم کا تعلق اللہ تعالیٰ سے اس سے بھی قریب تر تھا یعنی انسانی تعلقات جس قدر قرب کو ظاہر کر سکتے ہیں اس سے بڑھ کر آپ کا تعلق ہے پس فاستوی میں اخلاق کے کمال کا ذکر کیا ہے اور دنا فتدلی میں قرب الٰہی کے کمال کا ذکر کیا ہے۔

فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی ﴿۱۰﴾ سو اس نے اپنے بندے کی طرف وحی کی، جو وحی کی ۳۲۰۰
مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ﴿۱۱﴾ جو اس نے دیکھا وہ دل نے جھوٹ نہیں کہا۔
اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی ﴿۱۲﴾ تو کیا تم اس سے اس پر جھگڑتے ہو جو وہ دیکھتا ہے۔
وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ﴿۱۳﴾ اور اس نے اسے ایک اور نزول کے وقت بھی دیکھا ۳۲۰۱
عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ﴿۱۴﴾ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ۳۲۰۲

۳۲۰۰ یہاں بھی مفسرین نے ضمیر جبرئیل کی طرف مانی ہے مگر عبدہ میں اللہ کی طرف ضمیر لی ہے حالانکہ اگر ان سب ضمیروں کو اللہ تعالیٰ کی طرف لیا جائے تو سیاق اور معنی دونوں کے لحاظ سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور ما اوحی کا ابہام اس کی تفہیم کے لیے ہے یعنی بڑی عظیم الشان وحی اور وہ وحی قرآنی ہے جس سے بڑھکر طاقتور وحی کوئی نہیں ہوئی۔ اور اگلی ایت میں ماکذب الفؤاد کہہ کر بتا دیا کہ اس وحی کا تعلق قلب رسول سے ہے جیسا کہ دوسری جگہ بھی فرمایا فانہ نزلہ علی قلبك اور اگر اسے معراج کے متعلق مانا جائے جیسا اکثر مفسرین کا خیال ہے تو اس سے ثابت ہے کہ معراج بھی اس جسد عنصری کے ساتھ نہ تھا۔ کیونکہ جو کچھ دیکھا وہ دل نے دیکھا اور دل کا دیکھنا ان آنکھوں سے نہیں ہوتا حالانکہ اگر یہ جسد جاتا تو چاہیے تھا کہ ان آنکھوں سے دیکھنے کا ذکر ہوتا پہلی آیات میں یہ بتا کر کہ آنحضرت صلعم نے کمالات انسانی کے انتہائی مراتب کو طے کیا اور پھر قرب الٰہی کے غایت مدارج پر پہنچے۔ آخر پر فرمایا کہ تب اللہ تعالےٰ نے آپ کی طرف اس قرآن کو وحی کیا اور یوں بتا دیا کہ اب اگر کوئی شخص کمالات انسانی اور قرب الٰہی کے انتہائی مدارج پر پہنچنا چاہتا ہے تو اس کے لیے یہی راستہ ہے اور آیت ۱۲ افتمارونہ علی مایری میں اسی وحی کی طرف ہی اشارہ ہے اسی لیے مضارع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے اور کفار کا جھگڑا بھی قرآن کریم پر ہی تھا اور یہ جو بعض روایات میں ہے کہ ما اوحی سے مراد وہ ہے جس کو نبی کریم صلعم نے ظاہر نہیں فرمایا تو یہ بالبداہت غلط ہے اسلئے کہ انحضرت صلعم کل وحی کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہی مبعوث ہوئے تھے ؛

۳۲۰۱ نزلۃ - المرۃ الواحدۃ من النزول (ل) یعنی ایک مرتبہ کا نزول۔

آنحضرت کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا کس طرح تھا: راٰہ کسے دیکھا؟ حضرت عائشہ کا قول ہے کہ یہ حضرت جبرئیل تھے اور کہ آنحضرت صلعم نے انہیں دو مرتبہ اپنی اصلی صورت پر دیکھا اور ان کے چھ سو پر تھے اور بہت سے مفسرین اسی طرف گئے ہیں اور حضرت ابن عباس سے ایک قول میں اس کی تفسیر میں منقول ہے رای ربہ بقلبہ اپنے رب کو اپنے قلب سے دیکھا (ج) اور حسن سے بھی روایت ہے کہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور چونکہ میں دکھا چکا ہوں کہ اوپر کی آیات میں جبرئیل کا نہیں بلکہ آنحضرت صلعم کا ہی ذکر ہے اس لیے اسی ذکر کو جاری رکھا ہے اور یا تو یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور یا مراد یہ ہے کہ اپنے آپ کو سدرۃ المنتھی کے پاس دیکھا اور گو اس دوسرے معنی کے متعلق کوئی قول مروی نہیں مگر میرے نزدیک اسے ترجیح ہے اور یہ معراج نبوی کی طرف اشارہ ہے گو اصل مقصود اس میں یہی ہے کہ آپ کے مقامات عالیہ بتائے جائیں اور جیسا کہ اگلے نوٹ سے ظاہر ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ سدرۃ المنتھی آسمان پر ایک درخت ہے جیسے یہاں ہوتے ہیں اور نبی کریم صلعم وہاں گئے بلکہ اس مقام علو تک پہنچنا مراد ہے جس طرح ھو بالافق الاعلی سے یہ مراد نہیں کہ آپ افق میں کہیں چلے گئے تھے اور خواہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا یا اپنے آپ کو دیکھا دونوں صورتوں میں سدرۃ المنتھی میں کوئی جسمانی بلندی مراد نہیں جہاں اللہ تعالیٰ بیٹھا ہوا ہو۔ اور ان الفاظ سے معراج کے جسد عنصری کے ساتھ ہونے پر دلیل پکڑنا غلط ہے ؛

رہا یہ سوال کہ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا سو اس پر دونوں قسم کی روایات ہیں حضرت عائشہ کے لفظ تو صحیح بخاری میں یہ ہیں کہ جو شخص یہ تین باتیں کہتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے اول یہ کہ آنحضرت صلعم نے اللہ تعالےٰ کو دیکھا اور آپ نے آیت لاتدرکہ الابصار پڑھی اور دوم یہ کہ آپ کل کی باتوں کو جانتے تھے اور آپ نے آیت ماتدری نفس ماذا تکسب غدا ..... پڑھی اور سوم یہ کہ آپ نے وحی سے کچھ مخفی رکھا تھا۔ اور آپ نے آیت بلغ ما انزل الیك پڑھی اور حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ آپ نے دو دفعہ اللہ تعالیٰ کو اپنے قلب سے دیکھا اور جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ آنحضرت صلعم نے اللہ تعالیٰ کو ان آنکھوں سے دیکھا تو ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس بارے میں صحابہؓ سے کوئی شہادت نہیں ملتی۔ بہر حال لاتدرکہ الابصار صاف اس کے خلاف ہے۔ اور حضرت عائشہ کے قول کے معنی بھی اسی قدر ہو سکتے ہیں کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھا قلب سے دیکھنا یا کشف یا رویا میں دیکھنا اس کے خلاف نہیں پس حق یہی ہے کہ آنحضرت صلعم نے اللہ تعالےٰ کو اپنے قلب سے دیکھا اور بعض حدیثوں میں رویا میں دیکھنے کا بھی ذکر ہے اور یہ آیت لاتدرکہ الابصار کے خلاف نہیں ؛

۳۲۰۲ سدرۃ - سِدْر ایک درخت ہے جو کھانے میں تھوڑا کام دیتا ہے وشیئ من سدر قلیل (السبا ۳۴ - ۱۶) اور بعض وقت اسے بے کانٹا کیا جاتا ہے۔ اور اس کے سایہ سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اس لیے ظل جنت اور اس کی نعمتوں کے لیے یہ مثال کے طور پر بھی بیان کیا گیا ہے فی سدر مخضود (الواقعۃ ۵۶ - ۲۸) کیونکہ سایہ دینے میں وہ بہت کام آتا ہے اور اذ یغشی السدرۃ ما یغشی (۱۶) میں اشارہ اس مرتبہ کی طرف ہے جس کے لیے نبی صلعم کو خاص کیا گیا۔ افاضۂ الٰہیہ اور نعمائے جسمانیہ میں کہا گیا ہے کہ یہ وہ درخت ہے جس کے نیچے نبی صلعم سے بیعت کی گئی تو اللہ تعالیٰ نے اس میں مسلمانوں

عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى ⑮	اسی کے پاس جنت ہے جو اصل ٹھکانا ہے۔
اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ⑯	جب سدرہ پر چھا رہا تھا، جو چھا رہا تھا ۳۲۰۳
مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ⑰	آنکھ پھری نہیں اور نہ حد سے بڑھی ۳۲۰۴
لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ⑱	اس نے اپنے رب کے بڑے بڑے نشانات دیکھے ۳۲۰۵
اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ⑲	تو کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔
وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ⑳	اور منات تیسرے اور کو ۳۲۰۶
اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ㉑	کیا تمہارے لیے لڑکے ہیں اور اس کے لیے لڑکیاں۔
تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ㉒	یہ تقسیم تو بہت بے انصافی کی ہے ۳۲۰۷

پر سکینت نازل کی (غ) اور ابن اثیر کہتے ہیں کہ سدرۃ المنتھی جنت کی انتہائی حد پر ہے جس پر اولین اور آخرین کا علم منتہی ہو جاتا ہے۔ (ن) اور مفسرین کے مختلف اقوال ہیں بعض اہل علم کا قول ہے کہ اسے سدرۃ المنتھی اس لیے کہا گیا ہے کہ اس پر تمام عالموں کا علم ختم ہو جاتا ہے اور کعب کا قول ہے کہ ملک مقرب ہو یا نبی مرسل ہو سب کا علم اس پر ختم ہو جاتا ہے اور جو اس کے آگے ہے وہ غیب ہے جسے اللہ کے سوائے کوئی نہیں جانتا اور ایک قول ہے کہ جو کچھ زمین کے اوپر کو چڑھتا ہے وہ وہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ اس سے آگے نہیں اور ایک قول ہے کہ وہ ہر شخص کی انتہا ہے۔ جو سنت رسول اللہ پر چلتا ہے۔ (ج) اور بعض حدیثوں میں اس کے پتوں کا ذکر ہے کہ وہ ہاتھی کے کانوں کی طرح ہیں اور ایک روایت میں ہے کہ اس کا ایک ایک پتہ کل اُمت کو ڈھانک سکتا ہے۔ (ج) اور بعض روایات میں ہے کہ یہ وسط جنت میں ایک درخت ہے اور بعض میں ہے کہ اس سے چار نہریں نکلتی ہیں دو باطنی اور دو ظاہری اور ظاہری نہریں دجلہ اور فرات کو کہا گیا ہے اور بعض میں ہے کہ اس سے پانی اور دودھ اور خمر اور شہد کی نہریں نکلتی ہیں جن کا ذکر نعمائے جنت میں ہے۔ ان تمام روایات سے ظاہر ہے کہ محض لفظ سدرۃ کی وجہ سے اسے ایک ایسا درخت سمجھنا جیسے ہم یہاں بیری کے درخت دیکھتے ہیں گو وسیع پیمانہ پر ہی ہو صحیح نہیں۔ بلکہ اس سے مراد ایک خاص مقام ہے جس سے آگے کسی انسان کا علم ترقی نہیں کر سکتا تو بتانا یہ مقصود ہے کہ آپؐ کا علم بھی اس کمال کو پہنچا۔ جس سے آگے ترقی ممکن نہیں۔ جیسا کہ فاستوٰی میں بتایا تھا کہ آپ کے کمالات عملی انتہائے علو کو پہنچے اور آپ کا علم ایسا کامل ہوا کہ تا قیامت اب کوئی ترقی علمی اس کو باطل نہیں کر سکتی۔ بلکہ جس قدر علم دنیا میں ترقی کرے گا اسی قدر علوم قرآنی کی صداقت ظاہر ہو گی۔ بالفاظ دیگر تمام انسانوں سے بڑھکر آپ کو علم دیا گیا اور یوں علم و عمل دونوں کے لحاظ سے آپ کی وہ تکمیل کی گئی جس سے آگے انسان کی تکمیل نہیں ہو سکتی اسی وجہ سے آپ خاتم النبیین بھی ہوئے کیونکہ جب آپ کا نور نبوت علم اور عمل دونوں پہلوؤں سے کمال کو پہنچ گیا تو اب دنیا کو اور کسی نور کی حاجت نہ رہی اور اگر راہ میں ضمیر مفعول اللہ تعالیٰ کیلئے مانی جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ معرفت الٰہی میں آپ کو وہ کمال حاصل ہوا جو دوسرے کسی انسان کو حاصل نہیں ہوا اور اگلی آیت میں عندھا جنۃ الماوٰی میں بتایا کہ ایسے علم یا ایسی معرفت کے حصول سے انسان جنت کو بھی پورے طور پر پا لیتا ہے ؛

۳۲۰۳ حسن سے مروی کہ وہ ڈھانکنے والی چیز نور رب العزت ہے۔ اسی کے مطابق ابوہریرہ سے روایت ہے (ر)

۳۲۰۴ بَصَر نظر کو کہتے ہیں اور بصیرت کو بھی دیکھو ۱۲۱ اور چونکہ اوپر کی آیات سے ظاہر ہے کہ جن باتوں کا یہاں ذکر ہے وہ بصیرت سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے یہاں مراد بصیرت ہی ہے اور ما زاغ میں بتایا کہ آپ اصل مقصد سے اِدھر اُدھر نہیں ہوئے اور ما طغیٰ میں یہ کہ حد سے متجاوز نہیں ہوئے ؛

۳۲۰۵ ان آیات سے مراد وہ عجائبات ہیں جو معراج میں آپ کو دکھائے گئے جن میں نہ صرف آپ کے کمالات ہی ظاہر کیے گئے۔ بلکہ آپؐ کی اور آپؐ کے دین کی کامیابیوں کی بھی بشارت دی گئی اور یہاں ربہ کا لفظ لاکر خود بتا دیا کہ مراد وہ آیات ہیں جن میں آپکی ربوبیت روحانی یا آپ کے ذریعہ سے جو ربوبیت روحانی ہونے والی تھی اس کی طرف اشارہ تھا۔ اور ان آیات کبریٰ کے دیکھنے کیلئے مع جسم آسمان پر جانے کی ضرورت نہ تھی اللہ تعالیٰ نے یہ عجائبات آپ کو اسی آنکھ سے دکھائے جو انبیاء کو دی جاتی ہے۔ رہا معراج کا جسد عنصری کے ساتھ ہونا یا نہ ہونا اس کے لیے دیکھو ۱۸۰۱ جہاں مفصل بحث گذر چکی ہے۔

۳۲۰۶ لات ثقیف کا بت طائف میں تھا اور عزیٰ غطفان کا بت نخلہ میں تھا (ج) اور منات خزاعہ کا بت تھا اور لات کو اللہ کی عزیٰ کو العزیز کی تانیث سمجھتے تھے (ج) اور لات انسان کی شکل پر تھا اور عزیٰ درخت کی صورت پر اور منات پتھر تھا اسی لیے اسے الگ بیان کیا ہے اور الاخریٰ یہاں ذم کے لیے ہے (ر) یہ سب نام مؤنث پر ہیں گویا یہ ان کی دیویاں تھیں جنہیں وہ خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اس لیے اگلی آیت میں فرمایا کہ اپنے لیے بیٹے تجویز کرتے ہو۔ اور خدا کے لیے بیٹیاں ؛

۳۲۰۷ ضیزی۔ ضَازَ کے معنی ہیں جار ظلم کیا اور ضیزی نا انصافی یا ظلم ہے۔

اِنۡ هِیَ اِلَّاۤ اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُكُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهۡوَی الۡاَنۡفُسُ ۚ وَ لَقَدۡ جَآءَهُمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمُ الۡهُدٰی ﴿۲۳﴾

یہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ داداؤں نے رکھ لیے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری ، یہ لوگ صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور اس کی جو ان کے نفس چاہتے ہیں اور ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ہے ۔

اَمۡ لِلۡاِنۡسَانِ مَا تَمَنّٰی ﴿۲۴﴾ ۫ۖ

کیا انسان کو وہ مل جاتا ہے جس کی وہ آرزو کرتا ہے ۔

ع ۵ فَلِلّٰهِ الۡاٰخِرَةُ وَ الۡاُوۡلٰی ﴿۲۵﴾ ع

تو آخرت اور پہلی زندگی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے ۔

وَ كَمۡ مِّنۡ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِیۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَیۡـًٔا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ یَّاۡذَنَ اللّٰهُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَرۡضٰی ﴿۲۶﴾

اور کتنے فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ کام نہیں دیتی ، مگر اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے اور پسند کرے اجازت دے ۳۲۰۸ء

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ

وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ، وہ

غرانیق کا جھوٹا قصہ: اس موقعہ پر واقدی کی روایت پر جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ ایسی لچر ہے کہ قرآن کریم کے کھلے الفاظ کے سامنے وہ قابل غور بھی نہیں۔ مگر چونکہ عیسائیوں نے اس پر بہت زور دیا ہے اور اسے بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے اس لیے مختصراً اس کا ذکر کر دینا ضروری ہے کہا یہ جاتا ہے کہ جب نبی صلعم اس سورت کو پڑھتے ہوئے اس آیت پر پہنچے تو آپ نے بجائے الکم الذکر ولہ الانثی تلك اذا قسمة ضیزی کے یہ الفاظ پڑھ دیئے۔ تلك الغرانیق العلیٰ وان شفاعتهن لترتجی یعنی یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی امید رکھی جاتی ہے ایسی خرافات اور قرآن جیسا پُرحکمت کلام! اس سورت کے متعلق یہ مسلم امر ہے کہ علی الاعلان کفار میں پڑھی گئی اور ابن مسعود کی ایک روایت میں ہے کہ یہی سورت ہے جو نبی کریم صلعم نے علی الاعلان کفار کو سنائی اور یہ پہلی سورت تھی جس میں سجدہ نازل ہوا اور سجدہ کے موقعہ پر نبی صلعم نے سجدہ کیا۔ اور آپ کے ساتھ ہی سب سامعین نے بھی جن میں مشرک بھی تھے لیکن سوال یہ ہے کہ اس خیال کو تو سورت کا لفظ لفظ دھکے دے رہا ہے اگر بالفرض دو آیتیں چھوڑ کر ان کی بجائے یہ لفظ رکھے بھی جائیں تو اگلی تمام آیات پھر اس خیال کی کھلی کھلی تردید کر رہی ہیں۔ کیونکہ آیت ۲۳ میں صاف طور پر ان بتوں کو نام قرار دیا ہے جنکے نیچے کچھ حقیقت نہیں اور اس سے بھی آگے چل کر آیت ۲۶ میں فرشتوں کی شفاعت کو بھی اذن الٰہی سے مشروط کیا ہے بتوں کی شفاعت کا اقرار یہاں کس طرح موزون ہو سکتا تھا اور آیت ۲۷، ۲۸ میں پھر وہی مضمون ہے جس کی طرف اشارہ الکم الذکر ولہ الانثی میں ہے پھر اس سے آگے ساری سورت کو پڑھ جاؤ جن کفار کو یہ کہدیا کہ تمہارے بت بھی واقعی خدا کے ہاں سفارشی ہیں۔ کیا انہیں ایسے الفاظ میں مخاطب کیا جا سکتا تھا۔ ذلك مبلغهم من العلم (۳۰) لیجزی الذین اساؤا بما عملوا ویجزی الذین احسنوا بالحسنی (۳۱) افرءیت الذی تولی (۳۳) الا تزر وازرة وزر اخری (۳۸) وان لیس للانسان الا ما سعی (۳۹) پھر اس سے آگے مختلف قوموں کی ہلاکت کا ذکر ہے اگر بتوں کی شفاعت تسلیم کر لی تھی تو پھر باقی اختلاف کس بات پر تھا جس پر اس قدر تہدید کفار سے کی جاتی جو اس سورت میں موجود ہے یہاں تک کہ آخر میں انکو سنا دیا کہ ان کی ہلاکت کی گھڑی سر پر آپہنچی ہے۔ واقدی نے بہتیری موضوع حدیثوں کو لکھ مارا ہے اور محدثین اس کی سند کو کچھ بھی وقعت نہیں دیتے کسی زندیق نے ایک روایت بنا کر مشہور کر دی اور واقدی یا زہری نے اسے قبول کر لیا تو یہ اتنے اہم معاملہ پر کوئی دلیل نہیں۔ رسول اللہ صلعم کی زندگی نبوت سے پہلے بھی تاریخی طور پر شرک اور بت پرستی کی آمیزش سے پاک ثابت ہے۔ چہ جائیکہ نبوت کے اندر ایسے واقعات کا وہم دل میں لایا جائے پھر ایسے وقت میں جب کفار کی طرف سے سخت ترین تکلیفیں پہنچ کر مسلمان ہجرت کر کے حبش جا چکے تھے۔ کسی محقق نے اس روایت کو قبول نہیں کیا اور حدیث کی کسی کتاب میں اس کو جگہ نہیں ملی۔ پھر یہ مسلمہ تاریخ کے خلاف ہے اسلیے سوائے سخت تعصب یا حد درجہ کی سادگی کے کوئی شخص ایسی روایات کا نام تک بھی نہ لے گا۔ نیز دیکھو ۲۲۳۷ء و ۳۲۲۰ء۔

۳۲۰۸ء شفاعت کس کے لیے ہے: یرضی کا لفظ لا کر بتا دیا کہ جب تک ایک شخص نے حصول رضائے الٰہی کی راہوں پر چلنے کی کوشش نہیں کی تو اسے شفاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھاتا اللہ تعالیٰ کی رضا بھی اس کیلئے نہیں ہو سکتی ؟

لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ۲۷
وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ
اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ
الْحَقِّ شَيْـًٔا ۚ ۲۸

فرشتوں کے نام عورتوں کے رکھتے ہیں ۳۲۰۹ء اور انھیں اس کا کچھ علم نہیں ، وہ صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور ظن حق کے مقابل کچھ کام نہیں دیتا ۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا
وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ ۲۹

سو اس سے منہ پھیر لے جو ہمارے ذکر سے پھر جاتا ہے اور سوائے دنیا کی زندگی کے اور کچھ نہیں چاہتا ۔

ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ
وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ۳۰

ان کے علم کا منتہا یہی ہے ، تیرا رب اسے خوب جانتا ہے جو اس کے رستے سے گمراہ ہے اور وہ اسے خوب جانتا ہے جو ہدایت پر ہے ۔

وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ۙ
لِيَجْزِىَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا
وَيَجْزِىَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۚ ۳۱

اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تاکہ وہ اُن لوگوں کو جو بُرا کرتے ہیں ان کے عمل کا بدلہ دے اور انھیں جو نیکی کرتے ہیں اچھا بدلہ دے ۔

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ
وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ
اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ
فِىْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ
هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۳۲ ع

وہ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں سوائے اس کے کہ خیال دل میں گزرے ، تیرا رب وسیع مغفرت والا ہے وہ تمھیں خوب جانتا ہے جب تمھیں زمین سے پیدا کرتا ہے اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں بچے ہوتے ہو ، سو اپنے نفسوں کو پاک نہ ٹھیراؤ وہ اسے خوب جانتا ہے جو تقوٰے اختیار کرتا ہے ۳۲۱۰ء

۳۲۰۹ء یہ لوگ ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے یہ سب بت پرستی کی تردید چلتی ہے۔ کہاں یہ تعلیم اور کہاں بتوں کی شفاعت !

۳۲۱۰ء لَمَم - لَمَمْتُ کے معنی ہیں جمع کیا تاکلون التراث اکلا لما (الفجر ۸۹ - ۱۹) معصیت کے قریب ہونا ہے اَلْمَمْتُ بکذا کے معنی ہیں میں اس پر آیا اور اس کے قریب ہوا بغیر اس کے کہ اس میں داخل ہوا اور لَمْ نفی ہے جو ماضی کے لیے آتی ہے گو فعل مستقبل پر داخل ہوتی ہے (غ) اور اِلْمام لغت میں یہ ہے کہ ایک چیز کے وقت پر تو آئے مگر اس کو کرے نہیں اور بعض نے اس کے معنی مغائر لیے ہیں۔ اور کلبی نے کہا کہ وہ نظر ہے جو بغیر ارادہ کے پڑجائے تو یہ لمم ہے لیکن اس کا دہرانا لمم نہیں بلکہ ذنب ہے (ل)

تزکوا - تزکیۃ دو طرح پر ہے ایک فعل کے ساتھ اور وہ اچھا ہے قد افلح من زکّٰھا (الشمس ۹۱ - ۹) اور دوسرا قول کے ساتھ اور یہ مذموم ہے کہ انسان آپ اپنا تزکیہ قول سے کرے یعنی اپنے آپ کو مزکّی قرار دے ۔ اسی سے یہاں منع کیا ہے کیونکہ عقلاً اور شرعاً انسان کا اپنی مدح آپ کرنا ایک فعل قبیح ہے (غ)

اجنۃ - جَنِین کی جمع ہے اور یہ بچے کا نام ہے جب تک کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں ہے اور یہ فعیل بمعنی مفعول ہے (غ) یعنی نظر سے مخفی۔ جَنّ سے جس کے معنی چھپانا ہیں اور جُنَّۃ ڈھال کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے صاحب کو بچا لیتی ہے اتخذوا ایمانھم جنۃ (المجادلۃ ۵۸ - ۱۶) مطلب یہ ہے کہ انسان کو تزکیہ نفس کے لیے سخت جدوجہد کی ضرورت ہے ہر ایک گناہ سے اور فاحشہ سے بچنے کی ضرورت ہے ۔ ہاں اگر کوئی خیال دل میں گذر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی وسیع مغفرت سے کام لیتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان بُرے خیالات کو دل میں لا سکتا ہے بلکہ اس کے مدنظر تو

اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ تَوَلّٰى ۝۳۳ — کیا تو نے اُسے دیکھا جو پھر گیا۔

وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ۝۳۴ — اور تھوڑا سا دیا پھر رُک گیا ۳۲۱۱

اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ۝۳۵ — کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ دیکھتا ہے۔

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِىْ صُحُفِ مُوْسٰى ۝۳۶ — کیا اسے اس کی خبر نہیں ملی، جو موسیٰؑ کے صحیفوں میں ہے۔

وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰٓى ۝۳۷ — اور ابراہیمؑ کے جس نے وفا دکھلائی ۳۲۱۲

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝۳۸ — کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝۳۹ — اور کہ انسان کے لیے کچھ نہیں، مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے ۳۲۱۳

یہی بات ہونی چاہیئے کہ ہر ایک گناہ سے اور ہر ایک بدخیال سے بچے۔ لیکن اگر کمزوری سے کبھی کوئی خیال دل میں گذر جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر گرفت نہیں فرماتا اور لمم سے مراد یہاں خیال بد کا دل میں آنا ہی ہے کیونکہ اہل لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد ایسی مقاربت گناہ ہے جس میں فعل انسان سے کوئی سرزد نہیں ہوا۔ پھر اس کے ساتھ ہی تزکیہ کے لیے ایک اور اصول بتایا اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنے قصور اور عاجزی کا معترف رہے جو لوگ اپنے آپ کو پاک سمجھ لیتے ہیں وہ گناہ سے بچنے کی کوشش ترک کر دیتے ہیں۔ اور بدی کے مقابلہ کی کوشش کا چھوڑ دینا آخر انسان کو بدی کے سامنے عاجز اور کمزور کر دیتا ہے یوں کمزوری کا اعتراف اصل میں قوت کا موجب ہے اگلے رکوع میں اس سعی کے مضمون کو ہی جاری رکھتا ہے

انشأکم من الارض سے بھی یہ ظاہر ہے کہ سارے انسان زمین سے ہی پیدا کیے جاتے ہیں ؛

۳۲۱۱ اعطی۔ اِعطاء کسی چیز کا دینا ہے حتی یعطوا الجزیۃ (التوبۃ ۹۔۲۹) اور عَطیّہ اور عطاء صلہ یعنی بدلہ سے مختص ہیں ھٰذا عطاؤنا (صٓ ۳۸۔۳۹) فان اعطوا منہا رضوا (التوبۃ ۹۔۵۸) اور اَعْطَی البعیرُ کے معنی ہیں انقاد یعنی فرمانبردار رہا گویا اس نے اپنا سر دے دیا اور انکار نہیں کرتا (غ)

اکدی۔ کُدْیۃ زمین کی سختی ہے کہا جاتا ہے حَفَرَ فاکدی جب کھودتا ہوا ایسی زمین پر پہنچ جائے جو سخت ہے اور بطور استعارہ ایسے طالب کیلئے بولا جاتا ہے جو بے مراد واپس آجائے اور ایسے دینے والے پر جو تھوڑا دے کر رک جائے (غ)

تھوڑا دینے سے مراد یہاں تھوڑی فرمانبرداری کرنا ہی ہے اور مفسرین نے جن لوگوں کا ذکر اس کے شان نزول میں کیا ہے وہ ولید بن مغیرہ ہو یا نضر بن الحرث یا عاص بن وائل وہ سب اسی قسم کے لوگ تھے کہ اسلام کی طرف کچھ جھک کر رہ گئے۔ اور یہ مرض آج بھی دنیا میں بہت ہے اکثر لوگ چند باتوں میں ہاں میں ہاں ملانے کو تیار ہوتے ہیں۔ لیکن کسی کام پر پورا زور لگانے والے بہت ہی کم ملتے ہیں۔ اور اگلی آیت میں فھو یری سے مراد ہے کہ کیا وہ نتائج کو دیکھتا ہے ؟

۳۲۱۲ واذ ابتلی ابراھیم ربہ بکلمت فاتمھن (البقرۃ ۲۔۱۲۴) اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین (البقرۃ ۲۔۱۳۱)

۳۲۱۳ اصول سعی اور اس کا صحیح مفہوم : یہ وہ زرین اصول ہے جس پر نہ صرف مذہب کا بلکہ کل دنیا کے کاروبار کا دارومدار ہے جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے لیے آخرت میں کوئی نتیجہ پیدا ہو وہ یہاں کوشش کرے جو شخص چاہتا ہے کہ اسے دنیا میں کچھ نتائج ملیں وہ یہاں کوشش کرے ہاں جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے فضل ورحم سے مل جاتی ہیں وہ بھی اس کی بعض صفات کا تقاضا ہے مثلاً انسان کے لیے ہوا پیدا کر دی گئی پانی پیدا کر دیا گیا اور اس میں اس کی کوشش کا کچھ دخل نہیں۔ مگر ان ہواؤں اور پانیوں سے اب جس قدر انسان اپنی سعی اور جدوجہد سے کام لیتا ہے اسی قدر فائدہ اٹھاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اور اپنی رحمانیت سے ہمارے لیے قرآن بھیج دیا۔ لیکن یہ ہماری ترقی کا سامان ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا ہے اس سامان سے جس قدر ہم اپنی سعی اور جدوجہد سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اسی قدر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی موہبت بھی اسی انسان کو فائدہ دیتی ہے جو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے افسوس ہے کہ آج مسلمان اس اصول سے بالکل غافل ہیں۔ اور سعی اور جدوجہد کا اصول نہ دنیا میں برتتے ہیں نہ دین میں۔ اقوام یورپ اسی اصول کو اپنی کتاب کی تعلیم کے خلاف دنیا میں کام میں لا کر فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

میت کو ثواب : یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جب انسان کے اعمال اس کی موت کے ساتھ منقطع ہو جاتے ہیں تو پھر دوسرے کے اعمال کا بھی اس کو کوئی فائدہ ملتا ہے ؟ ہم میت کے لیے نماز جنازہ پڑھتے ہیں۔ حدیث صحیح میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلعم سے دریافت کیا کہ میری ماں یکایک فوت ہو گئی اور میرا خیال ہے کہ اگر وہ بات کرتی تو صدقہ کرتی تو کیا اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اسے اجر ملے گا آپؐ نے فرمایا ہاں۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا میری بہن نے حج کی نذر مانی تھی اور وہ مرگئی۔ تو آپؐ نے فرمایا اگر اس پر قرضہ ہوتا تو کیا تو ادا کرتا۔ کہا ہاں فرمایا پھر اللہ کا حق اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ ادا کیا جائے اور مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین باتوں کے ایک ولد صالح جو اس کے لیے دعا کرتا ہے ایک صدقہ جاریہ جو اس کے بعد چلتا ہے۔ ایک علم جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ

وَ اَنَّ سَعۡیَہٗ سَوۡفَ یُرٰی ﴿۴۰﴾	اور کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی ۳۲۱۴
ثُمَّ یُجۡزٰىہُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰی ﴿۴۱﴾	پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔
وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الۡمُنۡتَہٰی ﴿۴۲﴾	اور کہ انجام تیرے رب کی طرف ہی ہے ۳۲۱۵
وَ اَنَّہٗ ہُوَ اَضۡحَکَ وَ اَبۡکٰی ﴿۴۳﴾	اور کہ وہی ہنساتا اور رُلاتا ہے۔
وَ اَنَّہٗ ہُوَ اَمَاتَ وَ اَحۡیَا ﴿۴۴﴾	اور کہ وہی مارتا اور زندہ کرتا ہے۔
وَ اَنَّہٗ خَلَقَ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّکَرَ وَ الۡاُنۡثٰی ﴿۴۵﴾	اور کہ وہی دو جوڑے پیدا کرتا ہے، نر اور مادہ۔
مِنۡ نُّطۡفَۃٍ اِذَا تُمۡنٰی ﴿۴۶﴾	نطفہ سے جب وہ ڈالا جاتا ہے۔
وَ اَنَّ عَلَیۡہِ النَّشۡاَۃَ الۡاُخۡرٰی ﴿۴۷﴾	اور کہ اسی پر دوسرا اٹھانا ہے۔
وَ اَنَّہٗ ہُوَ اَغۡنٰی وَ اَقۡنٰی ﴿۴۸﴾	اور کہ وہی دولت دیتا اور وہی پونجی دیتا ہے ۳۲۱۶
وَ اَنَّہٗ ہُوَ رَبُّ الشِّعۡرٰی ﴿۴۹﴾	اور کہ وہی شعریٰ کا رب ہے ۳۲۱۷

باتیں فی الحقیقت اس کے اعمال میں ہی داخل ہیں۔ تو ان احادیث سے معلوم ہوا کہ دوسرے کے عمل سے بھی انسان کچھ نفع اٹھا لیتا ہے مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جیسا کہ یہ حدیثیں صاف بتاتی ہیں یہ ایسے تعلق شدید کی صورت ہے کہ گویا عمل کرنے والا انسان اس دوسرے کا قایم مقام ہو جاتا ہے۔ اور ایسے امور میں ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ جو امر شریعت سے معلوم ہوتا ہے اسے اس قدر وسیع کریں کہ قیاس کرتے کرتے ایک نیا اصول قایم کر لیں اسی لیے وہ لوگ جو اجرت دیکر قبروں پر کسی میت کی خاطر قرآن پڑھواتے ہیں ایسا طریق اختیار کرتے ہیں جو خلاف شریعت ہے رسول اللہ صلعم سے یہ بات ثابت نہیں اور روح المعانی میں ہے کہ وہ قرآن پڑھنے والے تو صرف اجرت کی خاطر قرآن پڑھتے ہیں اس کا ثواب کسی کو کیا پہنچے گا۔ اور اسی طرح پر دعا کا فائدہ ایک مسلم امر ہے یعنی ہم کسی کی مغفرت کے لیے دعا کرتے ہیں جیسے جنازہ میں تو اس کا فائدہ اسے پہنچتا ہے مگر یہ اللہ تعالیٰ کی موہبت کے سامانوں میں سے ہے کیونکہ وہ چاہے تو دعا کو قبول کرے اور چاہے نہ کرے اور علاوہ ازیں دعا بھی خود سعی کے سامانوں میں سے ایک سامان ہے جس کا اثر اللہ تعالیٰ دوسرے پر بھی ڈال دیتا ہے اور یہی اصول مسئلہ شفاعت میں کام کرتا ہے ؎

۳۲۱۴ سوف فعل مضارع کو استقبال کے لیے خاص کر دیتا ہے اور حال کے معنی سے الگ کر دیتا ہے سوف استغفر لکم ربی (یوسف ۱۲-۹۸) اور فسوف تعلمون (الانعام ۶-۱۳۵) میں یہ تنبیہ ہے۔ اگرچہ جو وہ طلب کرتے ہیں اس وقت موجود نہیں مگر وہ لامحالہ ہو کر رہے گا (غ)

یُرٰی۔ اریتہ الشئ سے ہو سکتا ہے یعنی میں نے اسے وہ چیز دکھائی گویا وہ کوشش اسے دکھائی جائیگی پس وہ اس پر ظاہر ہو جائیگی اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اگر وہ کوشش ٹھیک حد تک پہنچی ہے تو مطلوبہ نتیجہ پیدا ہو گا اسی کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے۔

۳۲۱۵ الی ربک المنتھی کے معنی دو طرح پر کیے گئے ہیں۔ اول یہ کہ انجام کار اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور وہی اعمال کے نتائج دینے والا ہے اسی لیے آگے فرمایا کہ وہی خوشی اور غم دیتا ہے جو جس کا اہل ہے وہ اسے پہنچا دیتا ہے وہی کسی کو مارتا ہے اور کسی کو زندہ کرتا ہے وغیرہ دوسرے یہ کہ منتہائے افکار اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یعنی مخلوق کے بارہ میں غور و فکر کام دیتا ہے نہ خالق میں کیونکہ محدود محدود میں غور و فکر کر سکتا ہے غیر محدود میں نہیں اور ایک معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں ایک سلسلہ علت و معلول کا ہے ایک سبب ہے ایک نتیجہ تو علت العلل ذات باری ہے اور یہ معنی بھی سیاق کے لحاظ سے موزون ہیں گویا بتایا یہ ہے کہ تمہارا پیدا کرنے والا وہی ہے جو علت العلل ہے ؎

۳۲۱۶ اقنی۔ قِنۡوَۃ اور قِنۡیَہ کِسۡبَہ یعنی کمانے کو کہتے ہیں اور قَنَی المال کے معنی ہیں اس کو اپنے نفس کے لیے لیا۔ اور حدیث میں ہے فاقنوھم جس سے مراد ہے کہ انہیں علم سے قِنۡیَۃ دو جس سے وہ اپنا کام نکال لیں جب اس کی ضرورت ہو اور اقناہ اللہ کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ نے اسے اتنا دیا جو اس کے لیے سکون اور اطمینان کا موجب ہوا اور یہاں اقنی کے معنی ارضی بھی کیے گئے ہیں یعنی راضی کیا اور یہ بھی کہ اسے وہ دیا جسے بعد کفایت وہ ذخیرہ کرے (ل) اور اس کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں جعل لہٗ قِنۡیَۃً مِنَ الرِّضَا وَ الطَّاعَۃِ (غ) یعنی اسے اپنی رضا اور طاعت کا مال دیا۔

۳۲۱۷ شعریٰ ایک ستارہ کا نام ہے اور اس کی تخصیص اس لیے کی ہے کہ ان کی ایک قوم اس کی عبادت کرتی تھی (غ) اور یہ سخت گرمی کے موسم میں

وَ اَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا ۨ الْاُوْلٰى ﴿٥٠﴾
اور کہ اسی نے عاد اوّل کو ہلاک کیا۔

وَ ثَمُوْدَاۡ فَمَآ اَبْقٰى ﴿٥١﴾
اور ثمود کو، سو (انھیں) باقی نہ چھوڑا۔

وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰى ﴿٥٢﴾
اور نوحؑ کی قوم کو اس سے پہلے (ہلاک کیا) کیونکہ وہ بڑے ظالم اور بڑے سرکش تھے۔

وَ الْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿٥٣﴾
اور تباہ شدہ بستیوں کو دے مارا۔

فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿٥٤﴾
سو انھیں وہ ڈھانک لیا جس چیز نے ڈھانک لیا۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿٥٥﴾
سو تُو اپنے رب کی کن نعمتوں پر جھگڑتا ہے۔

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿٥٦﴾
یہ اگلے ڈرانے والوں میں سے ڈرانے والا ہے۔

اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿٥٧﴾
آنے والی گھڑی آ پہنچی ۳۲۱۸

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿٥٨﴾
اللہ تعالیٰ کے سوائے اسے کوئی دُور کرنے والا نہیں۔

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿٥٩﴾
تو کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو۔

وَ تَضْحَكُوْنَ وَ لَا تَبْكُوْنَ ﴿٦٠﴾
اور ہنستے ہو اور روتے نہیں۔

وَ اَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿٦١﴾
اور تم غافل ہو ۳۲۱۹

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَ اعْبُدُوْا ﴿٦٢﴾ ع السجدة
سو اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرو اور (اس کی) عبادت کرو ۳۲۲۰ (السجدة ۱۳)

طلوع کرتا ہے اور جاہلیت میں بعض عرب اس کی عبادت کرتے تھے (ل)

۳۲۱۸ ازفة کے لیے دیکھو ۲۹۰۳ اور یہاں مراد مخالفین کی تباہی اور ہلاکت ہے نہ قیامت کبریٰ اس لیے کہ اول تو اوپر تمام قوموں کی ہلاکت کا ہی ذکر کیا ہے۔ اور ھذا نذیر من النذر الاولی کہہ کر صاف بتا دیا کہ جس طرح وہ ہلاک ہوئے تم بھی ہلاک ہو گے دوسرے اگلی آیت میں ہے لیس لھا من دون اللہ کاشفة یعنی اللہ اسے دور کر سکتا ہے اور کوئی نہیں حالانکہ قیامت کو اللہ تعالےٰ دور نہیں کریگا۔ اس مشکل کی وجہ سے کاشفة کے معنی تاخیر ڈالنے والا بھی کیے ہیں مگر صحیح یہی ہے کہ یہاں ساعت وسطیٰ کا ذکر ہے یعنی قوم کی تباہی کا۔

۳۲۱۹ سامدون۔ سامد لاھی یعنی غافل کو کہتے ہیں جو اپنا سر اٹھائے ہوئے ہو۔ (غ)

۳۲۲۰ کفار کا سجدہ کرنا: بخاری میں ہے کہ سورۂ النجم پہلی سورت ہے جس میں سجدہ نازل ہوا تو جب رسول اللہ صلعم اسے پڑھ چکے تو آپ نے سجدہ کیا اور جو لوگ سننے والے تھے ان سب نے بھی سجدہ کیا یعنی کفار بھی سجدے میں شامل ہوئے سوائے امیۃ بن خلف کے جس نے بجائے سجدہ کرنے کے مٹی کی ایک مٹھی لی اور اس پر سجدہ کیا۔ سو یہ بعد میں کافر ہونے کی حالت میں قتل ہوا۔

اس سجدہ کو اس جعلی روایت کا موید سمجھا گیا ہے جس کا ذکر ۳۲۰۷ میں ہو چکا ہے حالانکہ بات بالکل صاف ہے یہ پہلی سورت ہے جس میں سجدہ نازل ہوا۔ کفار باوجود بت پرستی کے اللہ تعالیٰ کی ہستی کے قائل تھے اور بتوں کو صرف اس کی جناب میں سفارشی مانتے تھے اس لیے جب آنحضرت صلعم نے فاسجدوا للہ واعبدوا کہہ کر سجدہ کیا تو وہ بھی ساتھ ہی سجدہ میں گر گئے یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں کہ اس پر یہ خیال کر لیا جائے کہ آنحضرت صلعم نے چونکہ بتوں کی تعریف اس سورت میں کر دی تھی اس لیے کفار نے سجدہ کیا اور یہ ممکن ہے کہ اسی سجدہ کرنے سے مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا ہو کہ اب یہ مخالفت ترک کر دیں گے۔ اور اسی کی شہرت حبش میں مہاجرین کو پہنچ گئی ہو جس کی وجہ سے بعض لوگ واپس بھی آ گئے ہوں۔

سُوْرَۃُ الْقَمَرِ مَکِّیَّۃٌ (۵۴) — اٰیَاتُھَا ۵۵ — رُکُوْعَاتُھَا ۳

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ① (وعدے کی) گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا ۳۲۲۱

نام: اس سورت کا نام القمر ہے اور اس میں تین رکوع اور پچپن آیتیں ہیں اس کا نام القمر معجزہ شق القمر کے ذکر سے لیا گیا ہے جس سے اس سورت کی ابتدا ہوتی ہے اور چونکہ اس سورت میں صراحت کے ساتھ مخالفین مکّہ کی طاقت کے خاتمہ کا ذکر ہے جس کا جنگ میں شکست کی صورت میں نمودار ہونا یہاں بطور پیشگوئی بیان کیا گیا ہے اور چونکہ چاند اہل عرب کے لیے بطور نشان تھا اس لیے شق القمر کا معجزہ اور اس سورت کا نام القمر دونوں اس ایک ہی حقیقت کے اظہار کے لیے اختیار کیے گئے ہیں اور اس سورت میں مختلف قوموں کی تکذیب انبیاء کی وجہ سے ان پر ہلاکت کے آنے کا ذکر کر کے آخر صاف بتایا کہ اسی طرح تم کافر اور مکذب لوگ بھی ہلاک ہوگے اور یہ بھی بتایا کہ قریش کی ہلاکت بذریعہ جنگ ہوگی۔ اور یہ گویا سورت النجم کا تتمہ ہے کیونکہ وہاں بھی کمالات نبوی کا ذکر کر کے آخر پر فرمایا تھا کہ آپ کی مخالفت کرنیوالے ہلاک ہونگے اور ان دونوں کا تعلق الیسا شدید ہے کہ اس کا خاتمہ جن الفاظ پر کیا تھا ازفت الازفۃ انہی سے اس کی ابتد کی ہے اقتربت الساعۃ اور نام کا تعلق بھی ظاہر ہے اور نزول بھی ایک ہی زمانہ کا ہے جیساکہ حضرت عائشہ کی بخاری کی روایت سے ظاہر ہے کہ میں چھوٹی سی تھی جب یہ آیت نازل ہوئی بل الساعۃ موعدھم و الساعۃ ادھی وامر۔

۳۲۲۱ شق القمر پر روایات متواترہ: ابن اثیر واقعہ انشقاق قمر کے متعلق کہتے ہیں ورد فی الاحادیث المتواترۃ بالاسانید الصحیحۃ یعنی اس کا ذکر متواتر حدیثوں میں اسناد صحیح کے ساتھ ہے۔ بخاری میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے ہے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں چاند دو ٹکڑے ہو گیا ایک ٹکڑا پہاڑ کے اوپر تھا اور ایک نیچے تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا گواہ رہو ابن عباس کی روایت میں صرف پھٹنے کا ذکر ہے اُنس کی روایت میں ہے کہ اہل مکہ نے نشان مانگا تھا تو آپ نے شق قمر کا معجزہ دکھایا۔ اور ایک روایت میں ہے یہاں تک کہ انہوں نے حرا کو ان دونوں کے درمیان دیکھا اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ ایک ٹکڑا اس پہاڑ پر تھا اور ایک اس پہاڑ پر یعنی صفا اور مروہ پر طبرانی میں ابن عباس کی ایک روایت میں ہے کہ چاند کو رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں کسوف لگا تو کفار نے کہا چاند پر جادو کر دیا ہے تب یہ آیت نازل ہوئی اور کسی روایت میں ہے۔ کہ ایک ٹکڑا پہاڑ کے پیچھے تھا۔ اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ جب کفار نے شق قمر کو دیکھا تو کہا یہ ہم پر جادو کر دیا ہے باہر سے آنے والوں سے دریافت کرو دریافت کیا تو باہر سے آنے والوں نے بھی اس کی شہادت دی ؛

ان تمام روایات سے جس نتیجہ پر ہم پہنچتے ہیں وہ اس حد تک یقینی ہے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں انشقاق قمر دیکھا گیا یعنی چاند کا پھٹنا دیکھا گیا۔ لیکن باقی امور میں کہ دو ٹکڑے کہاں کہاں تھے روایات میں اتفاق نہیں اور قصہ گویوں نے یہاں تک ترقی کی ہے کہ یہ قصہ بھی بنا لیا ہے جو کسی روایت میں نہیں کہ ایک ٹکڑا نبی صلعم کی جیب میں داخل ہو کر آپ کی آستین سے نکل گیا تھا لیکن جہاں تک اصل واقعہ کا تعلق ہے ایک طرف احادیث اس بارہ میں تواتر کو پہنچ گئی ہیں اور دوسری طرف قرآن کریم کے صریح الفاظ بھی اسی پر دال ہیں۔ کہ انشقاق قمر وقوع میں آیا اور یہ بات کہ ابن عباس اس وقت پیدا نہ ہوئے تھے اور انس چار سال کے تھے اور وہ ان حدیثوں کے راویوں میں سے ہیں اصل واقعہ کو پایۂ اعتبار سے نہیں گرا سکتی اس لیے کہ ان کے سوائے بھی ایک جماعت صحابہ کی ان روایات کو بیان کرتی ہے اور معجزات کی تمام تاریخ میں کوئی معجزہ ایسی زبردست شہادت سے ثابت نہیں جیسے شق القمر کا معجزہ اور یہ جو بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ انشقاق قرب قیامت میں وقوع میں آئے گا۔ اور اس بنا پر انہوں نے اسے پیشگوئی قرار دیا ہے تو قیامت کے متعلق تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ چاند باقی بھی رہے گا یا نہیں اور یہ الفاظ اقتربت الساعۃ سے غلطی لگی ہے ساعت سے مراد یہاں قیامت کبریٰ نہیں بلکہ قریش کی یا مخالفین اہل عرب کی ہلاکت کی ساعت ہے جیساکہ پچھلی سورت کے آخر پر ازفت الازفۃ سے مراد بھی وہی ساعت وسطیٰ تھی بلکہ ساعت سے یہ مراد قرآن کریم کی صراحت اور صحیح حدیث سے ثابت ہے دیکھو ۳۲۳۵ بل الساعۃ موعدھم میں اسی ساعت کا ذکر ہے اور رسول اللہ صلعم کا اسے بدر کے دن پڑھنا بخاری سے ثابت ہے صاف بتاتا ہے کہ اسی ساعت کا ذکر یہاں ہے ؛

انشق القمر کے معنی اور معجزہ کے نیچے حقیقت: اور انشق القمر کے معنی جو وضح الامر کیے گئے ہیں (غ) تو وہ بھی اسی لحاظ سے ہیں یعنی رسول اللہ علیہ وسلم کا امر واضح ہو گیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قمر یعنی چاند عرب کا نشان تھا جیسے سورج ایران کا نشان تھا اور اس کا انشقاق ان کی قوت کے ٹوٹنے کا نشان تھا پس یہ معجزہ صرف بجائے خود ہی ایک نشان صداقت نبوت نہ تھا بلکہ اس کے نیچے ایک حقیقت بھی مخفی تھی۔ یعنی کہ ان لوگوں کی قوت رسول اللہ صلعم کے مقابل میں توڑ دی جائے گی ؛

انشقاق قمر کا وقوع خلاف قانون قدرت نہیں: رہا یہ کہ انشقاق قمر خلاف قانون قدرت ہے تو یہ اعتراض اس قدر زبردست شہادت کے ہوتے ہوئے قابل توجہ نہیں کسی قانون قدرت نے کوئی فیصلہ قطعی نہیں دیدیا کہ ان اجرام سماوی میں کوئی تغیرات یا بڑے بڑے انقلاب نمودار نہیں ہوتے رہتے بلکہ قانون

وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَ يَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ﴿۲﴾

اور اگر کوئی نشان دیکھیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں زبردست جادو ہے ۳۲۲۲

وَ كَذَّبُوْا وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ وَ كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳﴾

اور انھوں نے جھٹلایا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی، اور ہر کام (اپنے وقت پر) قرار پکڑنے والا ہے ۳۲۲۳

وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ﴿۴﴾

اور یقیناً انھیں وہ باتیں پہنچ چکی ہیں، جن میں تنبیہ ہے۔

حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ﴿۵﴾

کامل دانائی (کی باتیں) مگر ڈرانا کسی کام نہ آیا۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ﴿۶﴾

سو اُن کی پروا نہ کر، جس دن بلانے والا ایک سخت چیز کی طرف بلائے گا۔

خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ﴿۷﴾

ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہونگی قبروں سے نکل پڑیں گے، گویا کہ وہ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں۔

مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ﴿۸﴾

پکارنے والے کی طرف دوڑے جاتے ہونگے، کافر کہیں گے یہ تنگی کا دن ہے ۳۲۲۴

قدرت کی شہادت تو اس کے خلاف ہے۔ آخر زمین پر جو یہ اتنے بڑے بڑے پہاڑ بنے تو کیا یہ بغیر کسی انقلاب عظیم کے ہی بن گئے تھے اور خود سورج میں بڑے بڑے انقلاب آتے رہتے ہیں اور بعض وقت بڑے بڑے داغ نمودار ہوتے ہیں جنھیں ظاہر آنکھ بھی دیکھ سکتی ہے تو یہ کونسی بعید بات ہے کہ کوئی عظیم الشان انقلاب چاند کے اندر نمودار ہوا جس نے انشقاق کی کیفیت اس کے اندر پیدا کر دی اور اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کی قوت اعجازی کے اظہار کے لیے یہ تغیر عظیم ان لوگوں کو بھی دکھا دیا جو آپ سے نشان مانگتے تھے انبیاء علیہم السلام کی قوت کشفی بعض وقت اس قدر زبردست ہوتی ہے کہ دور کی چیزیں انہیں پاس نظر آتی ہیں اور اسی قوت کشفی کا اثر بعض وقت دوسرے لوگوں پر بھی اعجازاً ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ بھی اس نظارہ میں شریک ہو جائیں صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دو ٹکڑے الگ الگ دیکھنے بیان کیے گئے ہیں سو یہ سب روایات میں نہیں بعض روایات میں ہے اور ان میں باہم اختلاف ہے اور یہ بھی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس انشقاق کے وقت چاند کو گرہن بھی لگا تھا جیسا کہ ایک روایت میں صاف الفاظ بھی ہیں (اور شاید یہی وجہ ہو کہ بعض بزرگوں نے انشقاق کو خاص قسم کا خسوف ہی قرار دیا ہے غالباً وہ گرہن نصف چاند کا تھا یعنی نصف تاریک ہو گیا اور نصف روشن رہا اور شاید یہی وجہ ہو کہ ٹکڑوں کا ذکر الگ الگ بعض روایات میں آتا ہے۔

۳۲۲۲ مستمر۔ اِسْتَمَرَّ الشَّیْئُ کے معنی ہیں ایک چیز ایک طریقہ پر ہوتی چلی گئی اور استمر بالشئی کے معنی ہیں اس کے اٹھانے پر مضبوط ہو گیا۔ اور استمر مریرہ کے معنی ہیں اس کا عزم مستحکم ہو گیا اور حملت حملا خفیفا فمرت بہ (الاعراف ۱۸۹) میں مراد استمرت ہے یعنی اپنی عادت کے مطابق بیٹھتی اٹھتی رہی اور اس کے بوجھ کو محسوس نہیں کیا اور کسی شخص کا کام جب فساد کے بعد مضبوط ہو جائے تو کہا جاتا ہے اِسْتَمَرَّ اور ہر چیز کو مستمر کہا جاتا ہے جس کی روش منقاد ہو گئی ہو (ل) اور یہاں مستمر کے معنی ذاہب بھی کیے گئے ہیں۔ یعنی ایسا جادو جو گذر جائے گا۔ اور سحر شدید بھی یعنی سخت جادو (ج)

۳۲۲۳ مستقر یعنی قرار پکڑنے والا اِسْتَقَرَّ سے جس کے معنی ہیں ایک چیز نے قرار پکڑا یا مضبوط ہو گئی۔ اور کل امر سے مراد ہر امر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو کیونکہ پہلے ایک امر اللہ کی تکذیب کا ذکر ہے تو قانون کو عام کر کے بتایا ہے کہ ہر امر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو ضرور ہے کہ وہ قایم اور ثابت ہو کر رہے۔

۳۲۲۴ یوم عسر اور یوم عسیر وہ ہے جس میں امر مشکل ہو جائے یوم عسیر (المدثر ۹) وکان یوما علی الکافرین عسیرا (الفرقان ۲۶) (غ) بلاشبہ یہ لفظ قیامت پر بھی صادق آسکتے ہیں لیکن جس چیز کی طرف یہاں توجہ دلائی گئی ہے وہ وہی ساعت وسطیٰ ہے یعنی مکذبین کی ہلاکت کا وقت نہ قیامت کبریٰ اسی سے اعدائے حق کو بار بار ڈرایا جاتا تھا اور اسی لیے جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ پہلی قوموں کی ہلاکت کی ہیں جیسے آگے نوح کی قوم کا اور اس

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا	ان سے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا، سو انھوں نے
عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ ﴿٩﴾	ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا دیوانہ ہے اور (اسے) ڈانٹا گیا۔
فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴿١٠﴾	سو اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہوں تو میری مدد فرما۔
فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿١١﴾	پس ہم نے بادل کے دروازے زور سے برستے ہوئے پانی سے کھول دیئے ٣٢٢٥
وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ	اور زمین میں چشمے بہا دیئے تو پانی ایک کام کے لیے جمع ہوگیا
عَلٰٓي اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿١٢﴾	جس کا اندازہ ہو چکا تھا ٣٢٢٦
وَحَمَلْنٰهُ عَلٰي ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ﴿١٣﴾	اور ہم نے اسے تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر سوار کر دیا۔ ٣٢٢٧
تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ	اور وہ ہمارے سامنے چلتی تھی، یہ اس شخص کو بدلہ دیا گیا
كَانَ كُفِرَ ﴿١٤﴾	جس کا انکار کیا گیا۔
وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿١٥﴾	اور ہم نے اسے نشان (کے طور پر) چھوڑا تو کیا کوئی نصیحت قبول کرنیوالا ہے
فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿١٦﴾	سو میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا تھا ٣٢٢٨
وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ	اور یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا ہے،
فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿١٧﴾	تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔
كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ	عاد نے جھٹلایا، تو میرا عذاب اور میرا ڈرانا
وَنُذُرِ ﴿١٨﴾	کیسا تھا۔
اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا	ہم نے ان پر ایک آندھی ایک سخت نحوست والے

کے بعد عاد ثمود وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ اور داعی پیغمبر صلعم ہی ہیں اور شیٔ نکر کی طرف آپ کا بلانا ہی تھا۔ کہ ان لوگوں کو جو آپ کو دنیا سے نابود کرنے کے درپے تھے آخر آپ کی اطاعت اختیار کرنی پڑی اور احداث سے مراد مجازاً اُن کے گھر ہیں جو بوجہ فقدان روحانی زندگی قبروں سے مشابہ ہیں ؛

٣٢٢٥ منھمر۔ ھمر آنسوؤں اور پانی کا بہنا ہے اور انھمر کے معنی ہیں بہا (غ) اور مینہ کے برسنے پر بھی بولا جاتا ہے (ل)

٣٢٢٦ طوفان نوح میں التقاء ماء سے مراد : فالتقی الماء یہاں مفسرین نے ماء کی جگہ ماءین یعنی دو پانی لیے ہیں یعنی ایک اوپر سے بادل سے پانی برستا تھا اور دوسرا نیچے سے زمین سے پھوٹتا تھا اور یہ دونوں پانی جمع ہو گئے بالفاظ دیگر پانی اوپر یہاں تک چڑھ گیا کہ بادلوں کو جا ملا ایسا ہو جانا قدرت خداوندی سے تو کچھ بعید نہیں مگر یہاں صرف ماء ہے اور دو پانیوں کا ذکر نہیں اور پانی کے التقاء سے مراد پانیوں کا اکٹھا ہونا ہے اور امر قدر میں اشارہ ہے قوم نوح کی ہلاکت کی طرف اور ایک قوم کی ہلاکت کے لیے بادلوں تک پانی پہنچانے کی ضرورت بھی نہیں ؛

٣٢٢٧ الواح۔ لوح کشتی کے تختہ کو کہا جاتا ہے اور اسے بھی جس پر لکھا جاتا ہے یعنی تختی کو وکتبنا لہ فی الالواح (الاعراف ٧-١٤٥) اور لوح محفوظ کی کیفیت ہم پر مخفی ہے سوائے اس قدر کے جو احادیث میں ذکر آ گیا ہے (غ)

دسر۔ دِسار کی جمع ہے میخ کو کہتے ہیں اور دسر کے اصل معنی ہیں زور سے کسی چیز کا دھکیلنا (غ) تختیوں اور میخوں سے بنی ہوئی چیز یعنی کشتی پر سوار کیا۔

٣٢٢٨ نذر۔ نُذُر کی جمع بھی ہے اور اِنذار سے اسم بھی ہے اور اسی طرح نذیر بھی اسم ہے کیف نذیر (الملک ٦٧-١٧) اور عذراً او نذراً (المرسلٰت ٧٧-٦) بھی بمعنی مصدر ہی ہے (ل)

فِیۡ یَوۡمِ نَحۡسٍ مُّسۡتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾	دن میں چلائی ۔
تَنۡزِعُ النَّاسَ ۙ کَاَنَّہُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ مُّنۡقَعِرٍ ﴿۲۰﴾	وہ لوگوں کو یوں اُکھاڑ پھینکتی تھی، گویا کہ وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں ۳۲۲۹
فَکَیۡفَ کَانَ عَذَابِیۡ وَ نُذُرِ ﴿۲۱﴾	سو میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا تھا ۔
وَ لَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ ﴿۲۲﴾ ع	اور یقیناً ہم نے نصیحت کے لیے قرآن کو آسان کر دیا، تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے ۔
کَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾	ثمود نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا ۔
فَقَالُوۡۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُہٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِیۡ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ﴿۲۴﴾	سو انھوں نے کہا کیا ہم اپنے میں سے ہی ایک انسان کی پیروی کریں تو اس صورت میں ہم گمراہی اور دُکھ میں ہونگے ۳۲۳۰
ءَاُلۡقِیَ الذِّکۡرُ عَلَیۡہِ مِنۡۢ بَیۡنِنَا بَلۡ ہُوَ کَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾	کیا ہمارے درمیان میں سے اسی پر نصیحت اُتری ہے بلکہ وہ جھوٹا خود پسند ہے ۔
سَیَعۡلَمُوۡنَ غَدًا مَّنِ الۡکَذَّابُ الۡاَشِرُ ﴿۲۶﴾	کل کو جان لیں گے کہ کون جھوٹا خود پسند ہے ۳۲۳۱
اِنَّا مُرۡسِلُوا النَّاقَۃِ فِتۡنَۃً لَّہُمۡ فَارۡتَقِبۡہُمۡ وَ اصۡطَبِرۡ ﴿۲۷﴾	ہم اونٹنی کو اُن کی آزمائش کے طور پر بھیجنے والے ہیں سو اُنھیں دیکھتا رہ اور صبر کر ۔
وَ نَبِّئۡہُمۡ اَنَّ الۡمَآءَ قِسۡمَۃٌۢ بَیۡنَہُمۡ ۚ کُلُّ شِرۡبٍ مُّحۡتَضَرٌ ﴿۲۸﴾	اور انھیں خبر دے کہ پانی اُن کے درمیان تقسیم ہوا ہوا ہے ہر پینے کی باری پر حاضری ہو گی ۳۲۳۲

۳۲۲۹ اعجاز عجز یا عَجُز کی جمع ہے ۔ ہر چیز کے موخر یا اس کی اصل کو کہتے ہیں ۔
منقعر ۔ قعر کسی چیز کی نہایت اسفل یعنی گہرائی کو کہتے ہیں ۔ اور منقعر کے معنی دو طرح کیے گئے ہیں زمین کی گہرائی میں جانے والا اور اپنے قعر یعنی جڑ سے اکھاڑ کر پھینکا ہوا (غ)

۳۲۳۰ سعر ۔ سُعُر اور سُعُر کے معنی جنون ہیں اور یہ ان کی دنیوی حالت کا ذکر ہے اور سُعُر یہاں سعیر (دوزخ) کی جمع نہیں ۔ اور فراء کے نزدیک اس کے معنی عذاب اور مصیبت ہیں یا مراد یہ ہے کہ ایسے امر میں ہیں جو ہمیں جلاتا ہے یا یہ کہ اس کا نتیجہ آگ یا جلن ہے (ل)

۳۲۳۱ اشر ۔ اشر شدت بطر ہے یعنی بہت خود پسندی یا اترانا ۔ اور یہ وہ خوشی ہے جو ہوائے نفس سے پیدا ہوتی ہے (غ) اور اشرا انے والا

۳۲۳۲ محتضر ۔ احتضر حضر سے ہے اور عرب کے لوگ کہتے ہیں اللّبن مُحۡتَضَرٌ و مَحۡضُوۡرٌ نَغَطِّہٖ دودھ محتضر ہے پس اسے ڈھانک کر رکھو ۔ تو محتضر سے مراد ہے کہ اس پر جنّ چار پائے وغیرہ آجاتے ہیں گویا وہ کثیر الآفات ہے اور اُحۡتُضِرَ فلانٌ کے معنی ہیں اس کی موت آموجود ہوئی اور جنون والے کو بھی مُحۡتَضَر کہا جاتا ہے (ل) اور یہاں مراد ہے یَحۡضُرُہٗ اصحابُہٗ (غ) یعنی اس کے اصحاب اس پر موجود ہوتے ہیں ؏

حضرت صالح کی اونٹنی اور پانی کا قصہ: ان الماء قسمۃ بینہم کے معنی یوں کیے گئے ہیں کہ پانی ان کے اور اونٹنی کے درمیان تقسیم کر دیا گیا ہے اور پھر اس سے یہ قصہ بنایا گیا ہے کہ ایک دن اونٹنی سارا پانی پی جاتی تھی اور لوگوں کو اس دن پانی نہ ملتا تھا ۔ حالانکہ یہ ذکر قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں اور پھر یہاں پانی کی تقسیم ان میں آپس کے اندر ہے مطلب تو صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح کی اونٹنی کو چراگاہ اور پانی سے نہ روکا جائے چراگاہ کے متعلق دوسری جگہ ذکر ہے فذروھا تاکل فی ارض اللّٰہ (ھود ۱۱ ۔ ۶۴) اور یہاں پانی کے متعلق فرمایا کہ پانی تم میں تقسیم شدہ ہے اس لیے کہ یہ علاقہ پہاڑی تھا ۔ اور جب کافی بارشیں نہ ہوں تو ایسے علاقوں میں پانی کی تکلیف ہو جاتی ہے تو مطلب یہ تھا کہ تم نے تو آپس میں پانی کے حصے کیے ہوئے ہیں لیکن اس

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَرَ ﴿٢٩﴾
پس انھوں نے اپنے ساتھی کو پکارا سو اس نے ہاتھ بڑھایا اور (اسے) مار دیا۔ ۳۲۳۳

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٠﴾
تو میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا تھا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿٣١﴾
ہم نے ان پر ایک ہی آواز بھیجی، سو وہ باڑ لگانے والے کی روندی ہوئی باڑ کی طرح چورا ہو گئے ۳۲۳۴

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ﴿٣٢﴾
اور یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ ﴿٣٣﴾
لوطؑ کی قوم نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّا آلَ لُوطٍ ۖ نَجَّيْنَاهُمْ بِسَحَرٍ ﴿٣٤﴾
ہم نے ان پر پتّھر برسائے، سوائے لوطؑ کے لوگوں کے۔ انھیں ہم نے صبح کے وقت بچا لیا۔

نِعْمَةً مِنْ عِنْدِنَا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ ﴿٣٥﴾
(یہ) ہماری طرف سے نعمت (تھی) اسی طرح ہم اسے بدلہ دیتے ہیں جو شکر کرتا ہے۔

وَلَقَدْ أَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿٣٦﴾
اور اس نے انھیں ہماری گرفت سے ڈرایا تھا، پر انھوں نے ڈرانے میں جھگڑا کیا۔

وَلَقَدْ رَاوَدُوهُ عَنْ ضَيْفِهِ فَطَمَسْنَا أَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٧﴾
اور انھوں نے اس کے مہمانوں کو لے جانا چاہا، پس ہم نے ان کی آنکھیں بند کر دیں سو میرا عذاب اور میرا ڈرانا چکھو۔

وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُسْتَقِرٌّ ﴿٣٨﴾
اور ایک قائم رہنے والے عذاب نے انھیں صبح کے وقت آ لیا۔

فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٩﴾
سو میرا عذاب اور میرا ڈرانا چکھو۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ﴿٤٠﴾ ع ۲ ۹
اور یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿٤١﴾
اور فرعون کے لوگوں کے پاس بھی ڈرانے والے آئے۔

كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا فَأَخَذْنَاهُمْ
انھوں نے ہمارے سب نشانوں کو جھٹلایا، سو ہم نے انھیں

وجہ پر صالح کی اونٹنی کو پانی سے نہ روکا جائیگا۔ خواہ باری ایک فریق کی ہو یا دوسرے کی۔

۳۲۳۳ تعاطی۔ عطا سے ہے تعاطی الشئ کے معنی ہیں تناوله اسے لیا اور تعاطی اس چیز کا لینا ہے جس کا لینا درست نہیں اور کسی چیز پر جرأت کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہاں معنی کیے گئے ہیں تعاطی عقر الناقۃ یعنی ناقہ کے مارنے کو لیا اور یا اس کے معنی ہیں جرأت کی اور رسول اللہ صلعم کی صفت میں ہے اذا تعوطی الحق لم یعرفہ احد یعنی آنحضرت صلعم اپنے اصحاب کے ساتھ نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے اخلاق سے پیش آتے تھے جب تک کوئی حق ضائع نہ کیا گیا ہو لیکن اگر دیکھتے کہ کسی کا حق باطل کیا گیا ہے تو آپ بالکل متغیر ہو جاتے گویا وہ لوگ بھی آپ کو نہ پہچانتے جو آپ کو جانتے تھے (ل)۔

۳۲۳۴ محتظر حظیرۃ باڑ کو کہتے ہیں اور محتظر باڑ کا لگانے والا (غ) اور ھشیم دیکھو ۱۹۲۵ پتوں وغیرہ کو کہتے ہیں جو بالکل چورا ہو گئے ہوں۔ اس

أَخْذَ عَزِيزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾
(ایسا ہی) پکڑا (جیسا) غالب قدرت والے کا پکڑنا ہوتا ہے)

أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَٰئِكُمْ أَمْ لَكُم بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾
کیا تمہارے کافر ان سے بہتر ہیں یا تمہارے لیے صحیفوں میں بریت (لکھی ہوئی) ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرٌ ﴿۴۴﴾
کیا کہتے ہیں کہ ہم ایک جمعیت ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہیں۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾
(یہ) جمعیت شکست کھائے گی اور پیٹھ پھیر دیں گے۔

بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ﴿۴۶﴾
بلکہ (موعودہ) گھڑی ان کا وقت مقرر ہے اور وہ گھڑی بہت مصیبت والی اور بہت تلخ ہے ۳۲۳۵

إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ﴿۴۷﴾
بیشک مجرم گمراہی اور دکھ میں ہیں۔

يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾
جس دن آگ کے اندر اپنے مونہوں کے بل گھسیٹے جائیں گے دوزخ کا چھوجانا چکھو۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾
ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے پر پیدا کیا ہے ۳۲۳۶

یے ھشیم المحتظر سے مراد یہی ہو سکتی ہے کہ باڑ لگانے والا جب خشک ٹہنیوں وغیرہ کو اکٹھا کر کے باڑ لگاتا ہے تو پتے وغیرہ گر کر چورا ہو جاتے ہیں اور ان سے مثال دینے میں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اُن کی کچھ قدر و قیمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہ تھی۔

۳۲۳۵ ادھی۔ دھو اور دھاء عقل ہے اور داھیۃ بڑے امر منکر کو کہتے ہیں (ل) امر۔ مرارۃ ضد حلاوت ہے اور مُرٌّ حُلوٌ کی۔ یعنی تلخ۔

آنحضرت کا جنگ بدر کو الساعۃ قرار دینا: بخاری میں حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم بدر کے دن ایک خیمہ میں تھے اور آپ دعا کر رہے تھے اَللّٰھُمَّ اَسْئَلُکَ عَھْدَکَ وَعْدَکَ اللھم ان شئت لن تُعبَدُ بعد الیوم ابدا اے اللہ میں تجھ سے چاہتا ہوں کہ اپنا عہد اور اپنا وعدہ پورا فرما اے اللہ اگر تو چاہے تو آج کے دن کے بعد تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو گا (یعنی اگر یہ مٹھی بھر مسلمان کفار کے ہاتھ سے مارے گئے) تو حضرت ابوبکر نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ بس کیجئے اپنے رب سے دعا کرنے میں آپ نے حد درجہ کا زور لگایا ہے اور آپ اس وقت زرہ پہنے ہوئے تھے پس آپ نکلے اور آپ پڑھ رہے تھے سیھزم الجمع ویولون الدبر بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر یعنی یہی آیات اور عکرمہ کی ایک روایت میں ہے کہ جب سیھزم الجمع نازل ہوئی تو حضرت عمر نے کہا کونسی جمعیت شکست کھائے گی کونسی جمعیت مغلوب ہو گی تو عمر کہتے ہیں جب بدر کا دن آیا تو میں نے رسول اللہ صلعم کو زرہ پہنے ہوئے دیکھا اور آپ پڑھ رہے تھے سیھزم الجمع ویولون الدبر تو اس دن اس کے معنے مجھے سمجھ آئے اور بخاری میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی اور میں اس وقت چھوٹی سی لڑکی تھی جو کھیلا کرتی تھی حضرت عمر کے علاوہ قتادہ۔ عکرمہ اور ابن عباس سے یہی روایت ہے کہ سیھزم الجمع یوم بدر کے متعلق ہے۔

جنگ بدر کی پیشگوئی کی عظمت: ان روایات سے بصراحت ثابت ہے کہ خود حضرت نبی کریم صلعم نے ان آیات کو بدر کی جنگ پر چسپاں کیا اور اس لیے الساعۃ سے مراد بھی یقیناً قریش کی ساعت وسطی یعنی ان کی ہلاکت کی گھڑی ہے نہ قیامت کبریٰ اور یہ بھی ثابت ہے کہ یہ آیت مکہ میں پانچویں چھٹے سال بعثت میں نازل ہوئی جو رسول اللہ صلعم کی دعوت کا ابھی بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ اور جب کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ رسول اللہ صلعم کے ساتھ کبھی اتنے آدمی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ کفار کے بالمقابل جنگ میں نکلیں اور پھر کفار کی جمعیت کو جو سب ایک دوسرے کی مدد پر تلے ہوئے تھے (نحن جمیع منتصر) شکست دے سکتے ہیں ایسے حالات میں جب کوئی بات بھی نہیں سنتا یہ کھلی پیشگوئی کہ مسلمانوں اور کفار میں جنگ ہو گی اور اس جنگ میں کافر شکست کھائیں گے اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے اللہ تعالیٰ کی اس قدرت اور علم غیب کا پتہ دیتی ہے اور خدا کی ہستی پر وہ ایمان پیدا کرتی ہے جس کے سامنے تمام دنیا کے علوم عاجز ہیں اور معجزات میں بھی کوئی معجزہ اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ یہ وہ حقیقت تھی جو شق القمر کے معجزہ کے نیچے تھی اور اس لیے سورت کی ابتدا اقتربت الساعۃ وانشق القمر سے کر کے یہاں صاف کر دیا کہ وہ ساعت جس کے قریب آنے کا نشان ظاہری شق القمر تھا سیھزم الجمع ویولون الدبر کی ساعت ہے اور یوں آخر اس پیشگوئی نے پورا ہو کر شق القمر کی صداقت بھی ظاہر کر دی۔

۳۲۳۶ ہر چیز کو ایک اندازہ پر پیدا کیا ہے۔ عام قانون ہے جو بارہا بیان ہو چکا ہے یہاں مخالفین حق کی ہلاکت کے ذکر میں اس کا ذکر کیا ہے اور اسی کا ذکر

وَ مَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ۝۵۰	اور ہمارا حکم تو ایک ہی ہے (یوں آجائے گا) جیسے آنکھ کا جھپکنا۔
وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۵۱	اور ہم تم جیسوں کو ہلاک کر چکے ہیں، تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔
وَ كُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ۝۵۲	اور ہر ایک بات جو انھوں نے کی ہے صحیفوں کے اندر ہے۔ ۳۲۲۳
وَ كُلُّ صَغِيْرٍ وَّ كَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝۵۳	اور ہر ایک چھوٹی اور بڑی (بات) لکھی ہوئی ہے۔
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ ۝۵۴	متقی باغوں اور فراخی میں ہوں گے۔
فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۵۵ ع	راستی کے مقام میں، قدرت والے بادشاہ کے پاس۔

اس میں مقصود ہے جیسا کہ پہلے بھی اس کا ذکر چلتا ہے۔ اور آگے بھی یہی ذکر چلتا ہے ولقد اھلکنا اشیاعکم مطلب یہ ہے کہ یہ بھی اپنے اندازہ سے نہیں بڑھ سکتے اور جب ان کا وقت آجائے گا تو ان کی صف بھی لپیٹ دی جائے گی۔ اور اسی کی طرف اشارہ ما امرنا الا واحدۃ میں ہے اور حکم کے ایک ہونے کا منشا یہ ہے کہ اسے کوئی ٹال نہیں سکتا اور نہ وہ اپنی قوت و طاقت میں کوئی نظیر رکھتا ہے دیکھو ع ۲۱ اور اسے آنے دیر نہیں لگتی ؛

ع ۳۲۲۳ الزبر یا صحیفوں سے مراد یہاں نامہ ہائے اعمال ہیں جہاں ہر کام چھوٹا ہو یا بڑا لکھا جاتا ہے ؛

سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ مَدَنِيَّةٌ (۵۵)

اٰیاتھا ۷۸ — رکوعاتھا ۳

نام : اس سورت کا نام الرحمٰن ہے اور اس میں تین رکوع اور ۷۸ آیتیں ہیں۔ اس کا نام الرحمٰن پہلی آیت میں ہی مذکور ہے جہاں بتایا کہ قرآن کریم کا بھیجا جانا بتقاضائے صفت رحمانیت ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی ظاہری نعمتوں کے لیے ہر قسم کے سامان دنیا میں پیدا کر رکھے ہیں مگر پھر ایک وہ انسان ہیں جو ان سامانوں سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دکھ اٹھاتے ہیں اور دوسرے جو ان سامانوں سے کام لیتے ہیں اور راحت حاصل کرتے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی باطنی نعمت کا سامان قرآن کریم میں دنیا کو دیدیا ہے پھر ایک وہ لوگ ہیں جو قرآن سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو اس کا نتیجہ بھی یہ ہے کہ دنیا میں روحانی طور پر اور آخرت میں کھلے طور پر دکھ اٹھاتے ہیں اور مومن جو ان سامانوں کو کام میں لاتے ہیں وہ دنیا میں روحانی طور پر اور آخرت میں کھلے طور پر جنت حاصل کرتے ہیں۔ یہی مضمون اس سورت کا ہے اور پچھلی سورت سے تعلق ظاہر ہے اور یہ سورت بھی مکی ابتدائی زمانہ کی ہے ؛

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اَلرَّحۡمٰنُ ۞ ① — رحمٰن نے،

عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ② — قرآن سکھایا۔

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ③ — انسان کو پیدا کیا،

عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ ④ — اُسے بولنا سکھایا ۳۲۳۸ء

اَلشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ ⑤ — سورج اور چاند حساب کے نیچے ہیں،

وَّ النَّجۡمُ وَ الشَّجَرُ یَسۡجُدٰنِ ⑥ — اور بُوٹیاں اور درخت سجدے کرتے ہیں ۳۲۳۹ء

وَ السَّمَآءَ رَفَعَہَا وَ وَضَعَ الۡمِیۡزَانَ ⑦ — اور آسمان کو بلند کیا اور میزان کو قائم کیا ۳۲۴۰ء

اَلَّا تَطۡغَوۡا فِی الۡمِیۡزَانِ ⑧ — تاکہ تم میزان میں سرکشی نہ کرو۔

وَ اَقِیۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَ لَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ ⑨ — اور وزن کو انصاف سے قائم کرو اور تول میں کمی نہ کرو۔

۳۲۳۸ء بیان دیکھو ۵۲۲ء کسی چیز کی حالت کا ظاہر کرنا بیان ہے بعض لوگوں کا قول ہے کہ بیان دو طرح پر ہے ایک حالت سے یعنی یہ کہ بعض اشیاء اپنی بناوٹ کے آثار سے کسی حالت پر دلالت کریں۔ اور دوسرا خبر کے ذریعہ سے اور یہ کبھی نطق یعنی بات کرنے سے اور کبھی کتابت یعنی لکھنے سے اور کبھی اشارہ سے ہوتا ہے۔ حالت سے بیان کی مثال ہے انہ لکم عدو مبین جو شیطان کے متعلق ہے یعنی اس کا دشمن ہونا حالت سے ظاہر ہے اور کلام کو بیان کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس سے معنی مقصود کا اظہار ہوتا ہے اور جس چیز کیساتھ اجمال وابہام کلام کی تشریح کی جائے اسے بھی بیان کہا جاتا ہے جیسے ان علینا بیانہ (القیامۃ ۷۵ - ۱۹)

پہلی دو آیتوں میں قرآن کے سکھانے کا ذکر ہے اور دوسری دو میں بیان کے سکھانے کا۔ اور یہ دونوں باتیں رحمان نے سکھائی ہیں یعنی اسکی صفت رحمانیت کا تقاضا ہیں اور انسان کے کسی عمل کا نتیجہ نہیں اور ابتدا قرآن سے کی گویا اسی کو سب سے بڑی نعمت قرار دیا اور اس سورت میں ذکر نعمتوں کا ہی ہے اور حق بھی یہی ہے اس لیے کہ اسی نے انسان کو بنایا کہ اللہ تعالیٰ کی کیا کیا نعمتیں اس کے لیے ہیں اور بیان سکھانے سے جیسا کہ اس سے پہلے خلق الانسان سے ظاہر ہے مراد یہ ہے کہ اسے اظہار خیالات کرنے کا طریق سکھایا اور نطق کی بجائے بیان کا لفظ اس لیے اختیار کیا کہ نطق صرف گویائی ہے مگر بیان میں نطق تحریر اور اشارات سب آجاتے ہیں اور انسان یہاں عام ہے ؛

۳۲۳۹ء بڑے بڑے اجرام سماوی ایک طرف۔ چھوٹی چھوٹی بُوٹیاں اور درخت دوسری طرف سب کے سب ایک قانون میں جکڑے ہوئے ہیں اور جکڑنے والے کے وجود پر دلالت کرتے ہیں اور باایں یہ چیزیں ایک دوسرے پر اثر ڈالنے والی ہیں جس سے معلوم ہوا کہ ان سب کا بنانے والا ایک ہی ہے سورج اور چاند کے اثر سے چھوٹی چھوٹی بُوٹیاں اور درخت نشوونما پاتے ہیں اس مخلوق میں ایک عظیم الشان ربط موجود ہے اسکی طرف توجہ دلائی ہے پھر وہ خدا جو ان تمام چیزوں کو ایک قانون میں رکھکر کمال تک پہنچاتا کیا اس نے انسان کے کمال کو پہنچنے کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا اسی کا ذکر اگلی آیات میں لفظ میزان میں ہے ؛

۳۲۴۰ء میزان اجرام سماوی: میزان کے معنی عدل ہیں (ل) نیز دیکھو ۱۰۵۰ء اور یہاں بھی مجاہد سے عدل ہی معنی مروی ہیں (ج) اور وہ میزان یا عدل ہے جو تمام اجرام سماوی میں قایم کیا گیا ہے کیونکہ اس کا ذکر رفع سماء کے ساتھ کیا ہے یعنی وہ قانون جس کی وجہ سے یہ تمام سلسلہ ایک نظم میں منسلک ہے چھوٹے سے چھوٹے ذرہ سے لے کر بڑے سے بڑے اجرام سماوی تک جن کے سامنے یہ ساری زمین بھی ایک چھوٹے سے گیند سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی سب ایک قانون کے ماتحت چلتے ہیں۔ تو جس طرح یہ ایک میزان ظاہری ہے اسی طرح انسان کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایک میزان دی ہے۔ جس سے اس کا نظام صحیح طور پر قایم رہ سکتا ہے یہ میزان اخلاق کیلئے ہے وانزلنا معھم الکتاب والمیزان (الحدید ۵۷-۲۵) اور اسی کا ذکر اگلی آیت میں ہے گویا ظاہری میزان سے جو مخلوقات کے اندر کام کر رہی ہے اسی باطنی میزان کی طرف توجہ دلائی ہے جس پر انسان کے اخلاقی اور روحانی نظام کا مدار ہے ؛

وَ الْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ⑩	اور زمین کو مخلوق کے لیے رکھا ۳۲۴۱
فِيهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّ النَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ⑪	اس میں پھل ہے اور گابھوں والی کھجوریں۔
وَ الْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَ الرَّيْحَانُ ⑫	اور بُھس والا دانہ اور خوشبودار پھول ۳۲۴۲
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ⑬	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ۳۲۴۳
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ⑭	اس نے انسان کو ٹھیکری جیسی سُوکھی ہُوئی مٹی سے پیدا کیا۔ ۳۲۴۴
وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ⑮	اور جنّوں کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ⑯	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَ رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ⑰	وہ دونوں مشرقوں کا رب ہے اور دونوں مغربوں کا رب ہے ۳۲۴۵
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ⑱	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ⑲	اسی نے دو دریا چلائے ہیں جو باہم ملتے ہیں۔

۳۲۴۱ انام وہ ساری مخلوقات ہے جو زمین پر ظاہر ہے اور مفسرین کہتے ہیں کہ انام سے مراد جنّ اور انسان ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد جان اور انسان کا ذکر کیا ہے اور جنّ کا ذکر اس سے پہلے کوئی نہیں (ل) اور حضرت ابن عباس سے اس کے معنی کل شیٔ فیہ الروح مروی ہیں یعنی تمام چیزیں جن میں روح ہے اور حسن سے جنّ و انس اور مجاہد اور قتادہ اور ابن زید سے کل مخلوق (ج) اور ابن عباس کی ایک اور روایت میں ہے کہ اس سے بنی آدم مراد ہیں (ر) اور انتفاع تام انسان کے لیے ہی ہے ؛

۳۲۴۲ ریحان وہ ہے جس کے لیے رائحۃ یعنی خوشبو ہو اور کہا گیا ہے کہ اس کے معنی رزق ہیں۔ پھر اس دانہ کو جو کھایا جاتا ہے ریحان کہا جاتا ہے ایک اعرابی کو کہا گیا تو کہاں جاتا ہے جواب دیا اَطْلُبُ مِن ریحانِ اللہ یعنی میں اللہ کے رزق سے طلب کرتا ہوں اور اولاد کو بھی ریحان کہا جاتا ہے (غ) اور ابن عباس کا قول ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں ریحان آیا ہے اس سے مراد رزق ہے اور یہی معنی مجاہد سے مروی ہیں اور ابن زید کا قول ہے کہ نبات سے ہر خوشبو والی شے مراد ہے (ج) اور میرے نزدیک ریحان سے مراد یہاں خوشبودار نبات ہی ہیں اور بتانا یہ مقصود ہے کہ کیسی کیسی عجیب چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے زمین سے پیدا کی ہیں ایک طرف اگر پھل ہیں تو دوسری طرف دانہ ہے جس کے ساتھ جانوروں کے لیے بھوسہ بھی ہوتا ہے پھر ان سب سے بڑھ کر لطیف چیز خوشبودار پھول جو گو انسان کے کھانے کے کام میں نہ آئے مگر اس کی راحت کے عجیب ترین سامانوں میں سے ہے اور اس کے دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے ؛

۳۲۴۳ تثنیہ کا استعمال جنّ و انس کے خطاب کی وجہ سے سمجھا گیا ہے اور گو اس میں شک نہیں کہ جنّ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے اور انسان کی طرح وہ بھی ناشکر گذاری کرنے والے ہیں اس لحاظ سے دونوں کو خطاب صحیح ہو سکتا ہے۔ لیکن اول تو اوپر جنّوں کا ذکر نہیں کہ انہیں خطاب میں شامل سمجھا جائے اور دوسرے جن نعمتوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان سب سے انسان ہی فائدہ اٹھانے والے ہیں مثلاً پھل اور دانہ اور موتی اور کشتیاں وغیرہ اس لیے یا تو انسانوں کے دو گروہ مراد ہو سکتے ہیں جن کا ذکر قرآن شریف میں اکثر آتا رہتا ہے یعنی مومن اور کافر یا بڑے اور چھوٹے یا اہل مشرق اور اہل مغرب کہ یہ بھی بڑی بھاری تقسیم دنیا میں ہوئی ہے یا سپید اور غیر سپید اور یا تثنیہ کا استعمال محض تاکید کے لیے دیکھو ۳۱۴۴ اور اس فقرہ کا بار بار دہرانا اس کی عظمت کے لیے ہے اور یہ اسلوب کلام ہے کہ جس بات کی بہت تاکید منظور ہو اسے بار بار دوہرایا جاتا ہے اور اس کی مثالیں عرب کے شعراء میں بکثرت موجود ہیں ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے اس سورت کے پڑھتے وقت صحابہ کو فرمایا کہ اس آیت کے پڑھا جانے پر بارگاہ الٰہی میں یوں عرض کریں۔ لابشیٔ من نعمك ربنا نكذب فلك الحمد (ر)

۳۲۴۴ فخّار گھڑے کو کہا جاتا ہے بوجہ اس کی آواز کے جو گویا کثرت فخر کرنے والے سے مشابہ ہے (غ) دیکھو ۱۶۸۵

۳۲۴۵ سردی اور گرمی میں سورج کے طلوع اور غروب کے انتہائی نقطوں کو دو مشرق اور دو مغرب کہا ہے یا سورج اور چاند کے دو جائے طلوع اور انہی کے دو جائے غروب مراد ہیں اور بعض کے نزدیک مطلع فجر اور مطلع سورج دو مشرق ہیں اور مغرب شمس اور مغرب شفق دو مغرب ہیں (ر) اور یا آج کل کی اصطلاح کے مشرق قریب اور مشرق بعید مراد لیے جائیں اور دوسری طرف پرانی دنیا ایک مغرب اور نئی دنیا دوسرا مغرب سمجھ لیا جائے۔ تو کل روئے زمین اس تقسیم میں آجاتی ہے ؛

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝۲۰
ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے جس سے آگے نہیں گزر سکتے۔ ۳۲۴۶

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۲۱
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۝۲۲
ان دونوں میں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۲۳
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۝۲۴
اور اسی کی کشتیاں ہیں جو دریا میں پہاڑوں کی طرح اٹھی ہوئی ہیں ۳۲۴۷

ع فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۲۵
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝۲۶
سب جو اس کے اوپر ہیں فنا ہونے والے ہیں۔

وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝۲۷
اور تیرے رب کی ذات باقی رہتی ہے (جو) جلال اور عزت والا ہے ۳۲۴۸

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۲۸
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

يَسْئَلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۝۲۹
اسی سے مانگتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں ہر آن وہ ایک شان میں ہے ۳۲۴۹

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۳۰
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

۳۲۴۶ دو سمندر: دیکھو ۲۳۸۶ بعض نے مراد یہاں بحرارض و بحر سماء لیے ہیں۔ اور بعض نے بحر احمر اور بحر روم (ج) اور ظاہر کے لحاظ سے یہ دوسرے معنی بھی درست ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ہی وہ قطعہ زمین ہے جو اقوام عالم کا اس وقت جولانگاہ بنا ہوا ہے اور ان دونوں سمندروں کو اب ملا بھی دیا گیا ہے اور سمندروں کا ملانا یہی ہے کہ ان دونوں میں جہازوں کا رستہ کھل جائے اور انہی دو میں جہازوں کی تگ و دو بھی سب سے زیادہ ہے جن کی طرف آیت ۲۳ اشارہ کرتی ہے۔

۳۲۴۷ منشئٰت نشاء سے ہے اور یہاں مراد مَرْفُوْعَةُ الشُّرُع ہے یعنی جن کے بادبان بلند ہوں (ل) اور ہو سکتا ہے کہ مراد صرف سمندر کے اوپر اٹھی ہوئی ہوں اور پہاڑوں کی طرح اٹھی ہوئی کشتیاں وہی ہیں جو اس زمانہ میں نظر آتی ہیں اور انہی کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ بھی اللہ تعالےٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ نہ جیسا کہ ان کے مالک تصور کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو ہی خدا سمجھنے لگ گئے ہیں اور شاید اس طرف بھی اشارہ ہو کہ آخر کار یہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے آگے جھکیں گے۔

۳۲۴۸ فان۔ فنا نقیض بقا ہے اور فانٍ اس سے اسم فاعل ہے اور فنی اس پر بھی بولا جاتا ہے جو موت کے قریب ہو اس لیے شیخٌ فان بہت بوڑھے آدمی کو کہا جاتا ہے اور گھر کا فناء اس کے سامنے کے صحن کو کہا جاتا ہے اس لیے کہ گھر وہاں ختم ہو جاتا ہے (ل) اور چونکہ بقا کسی چیز کا اپنی پہلی حالت پر ثابت رہنا ہے ۱۴۹۴ اس لیے فان سے مراد ہے کہ اپنی پہلی حالت پر قائم نہیں رہتی گویا ہر چیز پر تغیر آتا رہتا ہے۔

جَلَل۔ جلالة عِظَمُ القدر یعنی مرتبہ کی بڑائی ہے اور جلال (بغیر ہائے کے) اس میں انتہا کو پہنچ جانا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے وصف سے مخصوص ہے اور اس کے غیر میں استعمال نہیں ہوا اور جَلَلٌ سے حقیر شے مراد لی جاتی ہے کل مصیبةٍ بعدك جَلَلٌ (غ)۔

سب مخلوق قانون فنا کے ماتحت ہے: قریباً ایسے ہی الفاظ سورۂ القصص ۲۸ کی آخری آیت میں ہیں کل شی ھالك الا وجھه جس پر بحث ۲۵۴۴ میں گذر چکی ہے یہاں بھی اگر وہی معنی لیے جائیں تو سیاق کے مطابق ہیں اوپر ذکر ظاہری نعمتوں کا ہے تو یہاں بتایا ہے کہ یہ چیزیں باقی رہنے والی نہیں باقی رہنے والے صرف وہی اعمال ہیں جن میں رضائے الٰہی مقصود ہو پس تم اس نعمت کا انکار کیوں کرتے ہو۔ اور دوسرے معنی وہ ہیں جو ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں یعنی ہر چیز ہر آن ایک تغیر کے ماتحت ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات تغیر سے پاک ہے گویا خالق اور مخلوق میں یہ فرق ہے کہ خالق کی ذات میں کوئی تغیر نہیں اور مخلوق کوئی بھی اور کسی وقت بھی تغیر سے پاک نہیں پس تم مخلوق کی رضامت چاہو اور اتنی بڑی نعمت کو جو رضائے الٰہی ہے نہ چھوڑو۔

۳۲۴۹ اللہ کے شان میں ہونے سے مراد: ان کے سوال سے مراد اُن کا محتاج ہونا اور اس احتیاج کا اکثر اظہار حالت سے ہی ہوتا ہے اور کل یوم ھو فی

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾
ہم تمہاری طرف جلد متوجہ ہوئے اے دونوں گروہو ٣٢٥٠

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾
اے جنوں اور انسانوں کے گروہ اگر تمہیں طاقت ہے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ، تو نکل جاؤ۔ تم نہیں نکل سکتے، مگر غلبہ کے ساتھ ٣٢٥١

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾
تم دونوں پر آگ کے شعلے اور دھواں چھوڑا جائے گا تو تم اپنے آپ کو بچا نہ سکو گے ٣٢٥٢

شان کے متعلق ابن ماجہ میں ہے من شأنہ ان یغفر ذنباً و یفرج کرباً و یرفع قوماً و یضع اٰخرین (ر) اس کی شان سے یہ ہے کہ گناہ کو معاف کرے مصیبت کو دور کرے اور کسی قوم کو بلند کرے اور کسی کو ذلیل کرے اور ایک روایت میں یہ لفظ ساتھ فرمائے ہیں ویجیب داعیاً دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرے اور فی الحقیقت ہر ایک کی احتیاج کو پورا کرنے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے اور یہی اس کی شان ہے۔

٣٢٥٠ نفرغ کے معنی ابن الاعرابی نے نَعْمِدُ کیے ہیں اور جریر کا شعر نقل کیا ہے جس میں فَرَغْتُ بمعنی عَمَدْتُ آیا ہے یعنی عمد یا قصد کیا اور حضرت ابوبکرؓ کی حدیث میں ہے اَفْرُغ اِلٰی اضیاف حبس میں معنی اِعْمِدْ و اقصِدْ ہیں (ل) اور یہاں متوجہ ہونے سے مراد سزا دینے کے لیے متوجہ ہونا ہے۔ اور معمولی معنی لے کر بھی مراد وہی ہوگی یعنی سخت سزا دینا کیونکہ کسی چیز کے لیے فارغ ہونا اکثر تہدید کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ گویا اس کی خاطر اور سب کاموں کو چھوڑ دیا اور ابن عطیہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے عذاب دنیا کا وعدہ قرار دیتے ہیں (ر)

ثقلن عرب ہر ایک نفیس قیمتی شے کو جو محفوظ کی جاتی ہو ثَقَل کہتے ہیں اور اسی سے بڑے عزت والے سردار کو بھی ثَقَل کہا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو ثقلان کہا ہے اس لیے کہ انہیں باقی سب جانداروں پر جو زمین میں ہیں یہ فضیلت دی گئی کہ عقل اور تمیز سے مخصوص ہیں اور ابن الانباری کا قول ہے کہ اس لیے انہیں ثقلان کہا گیا ہے کہ وہ زمین پر ثقل کی طرح ہیں یعنی بوجھ کی طرح اور حدیث میں سوال قبر میں آتا ہے۔ یَسْمَعُھَا مَنْ بَیْنَ المشرق والمغرب اِلَّا الثقلین یعنی انسانوں اور جنوں کے سوائے اسے سب سنتے ہیں اور حدیث میں ہے انی تارکٌ فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں کتاب اللہ اور اپنی عترت اور انہیں ثقلان ان کے قدر اور شان کی عظمت کے لحاظ سے کہا ہے۔ (ل) اور حسن کا قول ہے کہ جنّ و انس کو ثقلان ان کے گناہ کے بوجھ کی وجہ سے کہا گیا ہے (ر) اور یہاں مراد حق کی مخالفت کرنے والے ہیں۔ جن کی سزا کا آگے ذکر بھی ہے اور جنّ سے مراد وہ غیر مرئی ہستیاں بھی ہو سکتی ہیں جو انسان کے اندر بدی کی تحریک کرتی ہیں اور ایسے انسان بھی ہو سکتے ہیں جو ابھی موجود نہ ہونے اور آنکھوں سے مستور ہونے کی وجہ سے جنّ کہلا سکتے ہیں۔

٣٢٥١ تنفذوا۔ نَفَذَ کسی چیز کے متعلق کہا جاتا ہے جب وہ کسی چیز کو پھاڑ کر اس کی ایک طرف سے دوسری طرف نکل جائے اور اسی سے نفاذ فی الامر ہے (غ)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سزا سے بچنے کی کوئی راہ نہیں بغیر غلبہ کے اس سے بچ نہیں سکتے اور غلبہ انہیں مل نہیں سکتا۔

٣٢٥٢ شواظ وہ شعلہ ہے جس میں دھواں نہ ہو (غ) اور بعض کے نزدیک دھوئیں سے ملا ہوا شعلہ ہے اور ضحاک کا قول ہے کہ وہ دھواں ہے جو شعلہ سے نکلتا ہے (ر) اور نحاس کے لیے دیکھو ٢٩٣٤ اور بخاری نے پگھلا ہوا تانبا معنے لیے ہیں۔

شعلوں اور دھوئیں کی سزا: یہ سزا ضحاک کے قول میں دنیا میں ہے اور ابن ابی شیبہ نے ان سے اسی آیت کی تفسیر میں یہ روایت کی ہے۔ کہ مغرب کی طرف سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو اکٹھا کر دے گی۔ اور بحر میں ہے کہ مراد اس سے جنوں اور انسانوں کا عاجز آ جانا ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ تمہاری حالت اس شخص کی ہوگی جس پر شعلے اور دھواں بھیجا جائے پس اسے اس سے بچنے کی طاقت نہ ہو (ر) اور ضحاک کی روایت اس جنگ عظیم پر خوب چسپاں ہوتی ہے جس کا مزہ ابھی یورپ چکھ چکا ہے۔ جس میں واقعی آگ کے شعلے اور گیس یا دھواں اس طرح برسائے گئے کہ لوگوں کی حالت دیوانوں کی طرح ہو گئی ٭

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۳۶
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝۳۷
سو جب آسمان پھٹ جائے گا اور سُرخ ہو جائے گا جیسے سُرخ چمڑا ۳۲۵۳

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۳۸
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْــَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۝۳۹
سو آج کے دن نہ انسان سے اس کے گناہ کے بارے میں سوال کیا جائے گا اور نہ جنّ سے ۳۲۵۴

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۴۰
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۝۴۱
مجرم اپنے نشانوں سے پہچانے جائیں گے۔ پھر پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے ۳۲۵۵

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۴۲
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝۴۳
یہ وہ دوزخ ہے جسے مجرم جھٹلاتے تھے۔

۳۲۵۳ وردۃ۔ وَرد گلاب کا پھول وارد سے ہے جو پانی کی طرف پہلے جاتا ہے اور گلاب کے پھول کو اس لیے ورد کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلے نکلتا ہے اور سب درختوں کے شگوفہ کو ورد کہا جاتا ہے اور آسمان کو ورد کہا جاتا ہے جب وہ بہت سرخ ہو جائے اور یہ قیامت کی نشانی کے طور پر ہے فکانت وردۃ کالدھان (غ)

دھان۔ دُھن تیل کو کہتے ہیں اور دَھَنَ تیل لگایا اور اسی سے مُداھنۃ اور اِدھان ہیں جن کے معنی ایک دوسرے سے ملائمت اور نرمی کرنا ہیں اور مداھنۃ یہ ہے کہ اس کے خلاف ظاہر کیا جائے جو دل میں ہے اور ودوا لوتدھن فیدھنون (القلم ۶۸-۱۹) میں معنی ہیں تو اپنے دین میں نرم ہو جائے تو وہ بھی نرم ہو جائیں یا خلاف ضمیر ظاہر کرے اور افبھٰذا الحدیث انتم مدھنون (الواقعۃ ۵۶-۸۱) میں معنی ہیں مکذبون یعنی جھٹلانے والے اور دِھان سرخ چمڑے کو کہتے ہیں جو نہایت صاف ہو اور ابواسحاق کا قول ہے کہ مراد یہاں یہ ہے کہ آسمان مختلف رنگ بدلے گا۔ جیسے مختلف چمڑوں کے رنگ ہوتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسری جگہ ہے یوم تکون السماء کالمھل (المعارج ۷۰-۸) (ل) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد دُرْدِیّ الزَّیت یعنی تلچھٹ ہے (غ)

یہ قیامت کا ذکر ہے اور آسمان کے انشقاق سے مراد اجرام سماوی کا انشقاق بھی ہو سکتا ہے مگر اس کی اصل حقیقت پر کوئی آگاہ نہیں ہو سکتا

۳۲۵۴ قیامت میں نتائج اعمال کا ظہور: دوسری جگہ ہے فوربك لنسئلنھم اجمعین (الحجر ۱۵-۹۲) تو وہاں سوال سے مراد باز پرس ہے یعنی سزا دینا اور یہاں مطلب یہ ہے کہ یہ سوال نہیں کیا جائے گا کہ تم نے فلاں گناہ کیا یا نہیں کیونکہ جیسا کہ اگلی آیت میں آتا ہے مجرم اپنے نشانوں سے پہچانے جائیں گے بالفاظ دیگر گناہ خود بخود اپنے نتائج سے ظاہر ہونگے پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن نتائج کا ظہور ہوگا اور ہر چیز کا خود بخود اپنے نتیجہ سے پتہ لگ جائیگا۔ یہی اعضاء وغیرہ کی شہادت ہے ؛

۳۲۵۵ نواصی ناصیۃ کی جمع ہے ۱۴۷۴ دونوں اطراف کا نام لیا ہے اور مراد کل ہے اور انکا پکڑا جانا بھی انہی نتائج کا ظہور ہے جن کا ذکر یعرف المجرمون بسیماھم میں ہے اور عذاب کے ذکر کے ساتھ فبای اٰلاء ربکما تکذبان کہہ کر بتایا کہ نعمتوں کو جھٹلانے کا نتیجہ ہی عذاب ہے پہلے رکوع میں یہ لفظ اپنی نعمائے ظاہری کے ساتھ بڑھائے ہیں اور یوں نعمائے باطنی کی طرف توجہ دلائی ہے دوسرے رکوع میں مجرموں کی سزا کے ذکر کیساتھ یہ لفظ بڑھائے ہیں۔ اور یوں ان کے جھٹلانے کا نتیجہ بتایا ہے اور تیسرے میں مومنوں کے انعامات کا ذکر کرتے ہوئے یہی لفظ فرمائے ہیں۔ اور یوں بتایا ہے کہ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کو کام میں لانے کا انجام خوشی ہے اور جس طرح پر وہ راحت جو مومنوں کو اپنے قوٰی کے استعمال صحیح سے حاصل ہوتی ہے۔ اس دنیا میں بھی مل جاتی ہے جیسا کہ اگلے رکوع میں دو جنتوں کے ذکر میں صاف بتا دیا اسی طرح وہ سزا جو مجرموں کو ملتی ہے اس کا ایک رنگ یہاں بھی مل جاتا ہے۔ ہاں یہاں وہ آگ اور وہ گرفت سب کچھ ظاہر نظروں سے مخفی مگر دلوں کو محسوس ہوتی ہے قیامت میں یہ سب کچھ ظاہر طور پر دیکھنے میں آجائیگا ؛

يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ اٰنٍ ۝٤٤ وہ اس کے اور کھولتے پانی کے درمیان پھریں گے۔

ع ۲/۱۷ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝٤٥ تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝٤٦ اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف رکھتا ہے اس کے لیے دو جنت ہیں ۳۲۵۶

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝٤٧ تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۝٤٨ دونوں (بہشت) شاخوں والے ہیں ۳۲۵۷

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝٤٩ تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ۝٥٠ ان دونوں میں دو چشمے بہتے ہیں۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝٥١ تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ۝٥٢ ان دونوں میں ہر پھل کی دو قسمیں ہیں۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝٥٣ تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۢ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ ایسے بچھونوں پر تکیے لگائے ہوئے ہونگے، جن کے استر

۳۲۵۶ اللہ کے خوف سے مراد: خوف کے لیے دیکھو ۵۹ اور اللہ تعالیٰ کے خوف سے وہ خطرہ مراد نہیں ہوتا جو رعب کی وجہ سے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ جیسے شیر سے خوف کا احساس بلکہ اس سے مراد گناہوں سے رکنا اور طاعات کا اختیار کرنا ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس شخص کو ڈرنے والا نہیں کہا جا سکتا جو گناہوں کو نہ چھوڑتا ہو (غ) مقام مصدر میمی بمعنی قیام ہے تو خاف مقام ربہ سے مراد یہ ہوئی کہ اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے اور اس بات کی فکر لگی رہتی ہے کہ میں نے اپنے رب کے سامنے جا کر کھڑا ہونا ہے۔ اور جس کو یہ فکر ہوگی وہی معاصی سے بچے گا۔ اور طاعات میں قدم بڑھانے کی کوشش کرے گا۔

مومن کے لیے دو بہشتوں کا وعدہ: ایسے شخص کے لیے دو بہشت ہیں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ایک جنت فعل طاعات کا اور ایک ترک معاصی کا۔ اور ایک یہ کہ ایک جنت روحانی اور ایک جسمانی۔ میرے نزدیک دو جنتوں سے مراد ایک اس دنیا کی جنت ہے اور ایک آخرت کی جنت کیونکہ متقی کو اس دنیا میں بھی جنت ملتی ہے۔ جس طرح مخالفین حق کے لیے قرآن شریف میں جگہ جگہ دو عذابوں کا وعدہ ہے۔ یہاں متقی کے لیے دو انعاموں کا وعدہ ہے جو بر رنگ جنت ہیں اور دوسری جگہ نفس مطمئنہ کو یعنی ایسے نفس کو جو اللہ تعالیٰ سے کامل تعلق پیدا کر چکا ہے مخاطب کر کے فرمایا فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی (الفجر ۸۹- ۲۹، ۳۰) گویا اسے دنیا میں بھی جنت مل جاتی ہے اور پھر اس دنیا کی جنت سے مراد فتوحات ظاہری بھی ہو سکتی ہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں۔ حدیث میں جو دجلہ و فرات یا نیل و فرات کو انہار جنت میں سے قرار دیا تو وہ شاید اسی طرف اشارہ ہو۔ لیکن یہاں من خاف میں الفاظ میں عمومیت ہے اور اس لیے مراد اس دنیا کی روحانی جنت ہے اور ہر ایک شخص جو رضائے الٰہی کے رستوں پر قدم مارتا ہے اور ہر ایک قسم کی بدی سے بچتا ہے۔ یقیناً اس دنیا میں بھی ایک جنت پا لیتا ہے اور یہ جنت بطور ایک نشان کے ہوتی ہے کہ اس کے لیے آخرت میں بھی جنت ہے جس طرح اس دنیا کی سزا آخرت کی سزا کا پیش خیمہ ہے۔

۳۲۵۷ ذواتا۔ ذو عام استعمال میں وہ ہے جس کے ذریعہ سے اسمائے اجناس اور انواع کے وصف کی طرف پہنچا جاتا ہے اور یہ ہمیشہ مضاف ہی استعمال ہوتا ہے اور مونث میں ذات کہا جاتا ہے اور تثنیہ میں ذواتا اور جمع میں ذوات، ـــــ ذو مرۃ (النجم ۵۳- ۶) ذوی القربی (البقرۃ ۲- ۱۷۷) ذات الیمین وذات الشمال (الکھف ۱۸- ۱۸) اور اسی سے لفظ ذات لیا گیا ہے جس سے مراد کسی شے کا عین لیا جاتا ہے جو ہر ہو یا عرض اور یہ کلام عرب سے نہیں اور ذا ھذا میں اشارہ ہے معقول کی طرف یا محسوس کی طرف اور اس کے مقابل میں اس کے لیے جو ظاہر طور پر دور ہو یا مرتبہ کے لحاظ سے بڑا ہو ذلک کہا جاتا ہے (غ)

افنان۔ فَنَن کی جمع ہے اس شاخ کو کہتے ہیں جو تازہ پتوں والی ہو اور کسی چیز کی نوع کو بھی کہتے ہیں اور اس صورت میں جمع فنون آتی ہے۔ اور ذواتا افنان سے مراد ہے شاخوں والے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہے مختلف رنگوں والے (غ) اور ابن عباس نے یہاں معنی کیے ہیں ذواتا انواع من الاشجار والثمار درختوں اور پھلوں سے مختلف نوعوں والے (ر)

اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَ جَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾
موٹے ریشم کے ہیں اور دونوں باغوں کے پھل قریب ہیں ۳۲۵۸

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

فِیۡہِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ ۙ لَمۡ یَطۡمِثۡہُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَہُمۡ وَ لَا جَآنٌّ ﴿ۚ۵۶﴾
ان میں نگاہوں کو نیچی رکھنے والی ہوں گی جنھیں ان سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ جن نے ۳۲۵۹

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿ۚ۵۷﴾
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

کَاَنَّہُنَّ الۡیَاقُوۡتُ وَ الۡمَرۡجَانُ ﴿ۚ۵۸﴾
گویا کہ وہ یاقوت اور مونگا ہیں۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

۳۲۵۸ بطائن بِطَانَۃ کی جمع ہے استر یا کسی چیز کا اندر خلاف اس کے ظاہر کے دیکھو ۵۰۵
استبرق کے معنی دیباج یا موٹا ریشم ہیں مگر اسے فارسی یا سریانی سے معرب خیال کیا گیا ہے حالانکہ اس کی تصغیر عربی زبان میں اُبَیْرِق موجود ہے۔ اور اس کا مادہ برق موجود ہے جس سے بہت سے مشتقات آئے ہیں اور تاج العروس میں اِستبرق کے معنی لکھے ہیں۔ بجلی سے روشن ہوگیا یا چمک اٹھا اور بطائن کو استبرق کہہ کر یہ اشارہ کیا ہے کہ وہ اندر سے بھی چمک رہے ہونگے اور ان تمام نعمتوں کے ذکر میں ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کا رنگ ہے ؞

۳۲۵۹ یطمث طمث خون حیض ہے اور اس کے معنی چھونا ہیں خواہ کسی قسم کی چیز ہو کہا جاتا ہے مَا طَمَثَ ذٰلِكَ الْمَرْتَعَ قَبْلَنَا اَحَدٌ یعنی اس چراگاہ کو ہم سے پہلے کسی نے نہیں چھوا۔ (یا اس میں کوئی داخل نہیں ہوا) اور ایسا ہی اونٹ کے متعلق کہا جاتا ہے ماطمث البعیرَ حبل یعنی رسہ نے اسے نہیں چھوا اور یہاں معنی لم یمسسن ہیں یعنی نہیں چھوا (ل)

قاصرات الطرف میں دو قول ہیں ایک یہ کہ وہ حوران بہشتی ہیں یعنی نعمائے جنت میں سے ایک نعمت اور دوسرا یہ کہ وہ اس دنیا کی عورتیں ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اس دوسری پیدائش میں انہیں جنّ یا انسان نے نہ چھوا ہوگا اور یہ دوسرا قول شعبی اور کلبی کا ہے (ر) اور اُم سلمہ کی حدیث میں ہے نساء الدنیا افضل من الحور العین دنیا کی عورتیں حوروں سے بڑھکر ہیں (ر) مفسرین نے اس موقعہ پر یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ جنوّں کی نفی طمث سے کیا مطلب ہے۔ کیا جنّ اس بات پر قادر ہیں کہ انسانوں کے ساتھ ان کے اس قسم کے تعلقات ہوسکیں۔ ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ اہل یمن کی ایک قوم نے امام مالک کو لکھا تھا کہ یہاں ایک جنّ مرد ہے جو ایک انسان عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو امام مالک نے کہا کہ اس میں کوئی بُرائی تو نہیں لیکن مجھے یہ ناپسند ہے کہ ایک عورت حاملہ پائی جائے تو وہ کہدے کہ یہ جنّ کی طرف سے ہے اور اسلام میں فتنہ بڑھے (ر) یہ روایت بھی عجیب ہے کہ جنّ اس زمانہ میں ایسی مرئی ہستیاں تھیں جیسے انسان کہ اہل یمن لکھتے ہیں۔ کہ ایک جنّ نکاح کرنا چاہتا ہے۔ بہرحال امام مالک کا جواب بتاتا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں کہ جنوں کے انسانوں سے اس قسم کے تعلقات ہوسکتے ہیں۔ ورنہ زنا کار عورتوں کا یہ عذر بنا بنایا تھا اور یہاں یہ بحث اس غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ طمث کو خاص معنی میں لیا جاتا ہے حالانکہ لغت میں اس کے عام معنی چھونا ہی ہیں اور یہاں مراد صرف اسی قدر ہے کہ وہ نعمتیں ایسی محفوظ رکھی گئی ہیں کہ نہ انسان ان کے پاس پھٹکا ہے نہ جنّ۔

کیا جنّ جنت میں جائیں گے: ایک اور سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ کیا جنوّں کو ثواب ملے گا۔ امام ابو یوسف محمد وغیرہما کا قول ہے کہ جنوں کو طاعت پر ثواب ملے گا اور وہ جنت میں داخل ہونگے اور امام ابو حنیفہ سے تین روایتیں ہیں اول یہ کہ ان کے لیے کوئی ثواب نہیں سوائے اس کے کہ وہ آگ سے نجات پاجائینگے اور پھر انہیں حکم ہوگا کہ دوسرے حیوانات کی طرح مٹی ہوجائیں دوسرا قول یہ ہے کہ وہ اہل جنت میں سے ہونگے مگر دخول جنت سے بڑھکر انہیں کوئی ثواب نہ ملے گا تیسرا قول توقف کا ہے اور حق یہی ہے کہ گو جنوّں کے عذاب اور آگ میں جانے کا ذکر قرآن شریف میں ہے مگر ان کے بہشت میں جانے کا کوئی ذکر نہیں نہ ان نعما کے حاصل کرنے میں ان کا ذکر ہے جو اہل جنت کے لیے ہیں۔ اور ہونا بھی یوں ہی چاہیے تھا اس لیے کہ وہ ادنی درجہ کی ہستیاں ہیں اور جنت کے اعلیٰ مقام کو حاصل نہیں کرسکتیں وہ انسان کی صفات بہیمی سے تعلق رکھتی ہیں اور بہشت میں چونکہ یہ صفات بہیمی نہ ہونگی اس لیے جنات کا بھی وہاں کوئی کام نہیں اور دوزخ میں وہ اس لیے ہیں کہ صفات بہیمی کی وہاں اصلاح ہوگی اور جب تک وہ اصلاح نہ ہو جائے ایک نہ ایک رنگ میں ان ہستیوں کا باقی رہنا بھی ضروری ہے جو ان صفات سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن بہشت میں وہی جائیگا جس کی صفات بہیمی کی اصلاح ہوچکی ہے ؞

هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ ۚ﴿۶۰﴾
نیکی کا بدلہ سوائے نیکی کے کچھ نہیں ۳۲۶۰

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

وَ مِنۡ دُوۡنِہِمَا جَنَّتٰنِ ۚ﴿۶۲﴾
اور ان سے ادھر دو اور باغ ہیں ۳۲۶۱

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿ۙ۶۳﴾
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

مُدۡہَآمَّتٰنِ ۚ﴿۶۴﴾
دونوں بہت سرسبز ہیں۔ ۳۲۶۲

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۚ﴿۶۵﴾
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

فِیۡہِمَا عَیۡنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ۚ﴿۶۶﴾
ان دونوں میں دو چشمے جوش مار رہے ہیں ۳۲۶۳

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

فِیۡہِمَا فَاکِہَۃٌ وَّ نَخۡلٌ وَّ رُمَّانٌ ﴿ۚ۶۸﴾
ان دونوں میں پھل ہے اور کھجور اور انار ۳۲۶۴

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۚ﴿۶۹﴾
تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

فِیۡہِنَّ خَیۡرٰتٌ حِسَانٌ ۚ﴿۷۰﴾
ان میں اچھی خوب صورت ہوں گی ۳۲۶۵

۳۲۶۰ یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ یہ نعمتیں جن کا اوپر ذکر ہے جن میں باغ اور پھل اور قاصرات الطرف ہیں یہ سب کچھ ان نیکیوں کا اجر ہے جو کسی انسان نے کی ہیں۔ پس ان نعمتوں میں ضروری ہے کہ مرد اور عورتیں دونوں شریک ہوں اس کے ساتھ ہی اس آیت نے عمل کے لیے ایک نہایت خوبصورت راہ بتائی ہے کہ جو شخص کسی کے ساتھ کچھ احسان کرتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ بھی اس کے ساتھ احسان کرے بہت لوگ ہیں جو یہ تو چاہتے ہیں کہ دوسرے ان کے ساتھ نیکی کریں۔ مگر خود دوسرے کے ساتھ نیکی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اور یاقوت جواہر میں سے ہے جس کی جمع یواقیت ہے۔

۳۲۶۱ مقربین اور اصحاب الیمین کے لیے جنت: یہ دو جنت ہر رنگ میں پہلے دو جنتوں کی طرح ہی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ایک سابقین مقربین کے لیے ہیں اور دوسرے معمولی مومنین کے لیے اور اگلی سورت میں ان دونوں گروہوں کا بالتفصیل ذکر ہے یعنی سابقین یا مقربین کا اصحاب الیمین کا اور من دونھما میں اشارہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان سے کمتر ہیں۔ اس لیے پہلے سابقین کے لیے ہیں اور یہ اصحاب الیمین کے لیے اور ابن جریر میں اس کے مطابق ایک مرفوع روایت بھی ہے اور بعض نے پچھلے دو کو افضل کہا ہے مگر پہلا قول ترجیح کے قابل ہے دیکھو ۳۲۸۰ اور اگلی سورت میں جہاں دونوں گروہوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ سابقین کے ذکر کو ہی مقدم کیا ہے اس لیے یہاں بھی وہی مقدم ہونا چاہیے اور یہ بھی دو ہی جنت ہیں یعنی ایک اس دنیا کا اور ایک آخرت کا اور ان جنتوں میں چار چشموں یا دریاؤں کا ذکر ہے اور اس میں ایک طرف اشارہ فتوحات ملکی کی طرف بھی ہے۔ چنانچہ حدیث مسلم میں ما فی الدنیا من انھار الجنۃ کے باب میں ہے عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم سیحان وجیحان والفرات والنیل کل من انھار الجنۃ یعنی سیحون اور جیحون اور فرات اور دجلہ (نیل کا لفظ یہاں دجلہ کے لیے ہی معلوم ہوتا ہے) جنت کی نہروں میں سے ہیں تو یہ بھی چار ہی دریا ہیں اور یوں ان چار دریاؤں کے ذکر میں جو ان آیات میں مذکور ہیں ان چار کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے اور مسلمانوں نے پہلے اس علاقہ کو فتح کیا جس میں دجلہ و فرات ہیں اور بعد میں اسکو جس میں سیحون اور جیحون ہیں۔

۳۲۶۲ مدھامتان۔ دُھمۃ رات کی سیاہی کو کہتے ہیں اور اس سے گھوڑے کی سیاہی بھی مراد لی جاتی ہے۔ اور ایسی سبزی بھی جس کا رنگ کمال سرسبزی کو پہنچا ہوا ہو۔ (غ)

۳۲۶۳ نضاختان نَضۡخ کے معنی پانی کے جوش مارنے کی شدت اور اس کا چشمہ سے پھوٹ کر نکلنا ہیں اور عین نضاخۃ وہ چشمہ ہے جو پانی کے ساتھ جوش مار رہا ہو (ل) گویا یہ ابتدا ہے اور پہلی حالت میں وہ چشمے بہ رہے ہیں اسی طرح یہاں صرف باغوں کی سرسبزی کی طرف توجہ دلائی ہے اور پہلی صورت میں انہیں بہت شاخوں والے قرار دیا ہے۔

۳۲۶۴ رُمّان انار ہے اور فاکھۃ کے بعد نخل و رمان کے ذکر میں عطف خاص علی العام ہے اور پہلے جنتوں میں ہر پھل کے دو نوع قرار دیئے ہیں اور یہاں اس کا ذکر نہیں۔

۳۲۶۵ خیرات خَیۡرۃ کی جمع ہے وھی الفاضلۃ من کل شئی یعنی ہر قسم کی فضیلت والی چیز کو خَیۡرۃ کہا جاتا ہے (ل) اور اچھی عورت کو بھی امراۃ خیرۃ

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿۷۲﴾	حوریں جو خیموں میں ٹھیرائی ہوئی ہیں ۳۲۶۶
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۳﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۷۴﴾	انھیں ان سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا اور نہ جنّ نے۔
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۵﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿۷۶﴾	سبز قالینوں اور خوبصورت فرشوں پر تکیے لگائے ہوئے ہونگے ۳۲۶۷
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۷﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾ ع ۳ ۱۳	تیرے رب کا نام بابرکت ہے، جو جلال اور عزّت والا ہے۔

کہا جاتا ہے اور یہاں خیرات سے مراد خَیّرات ہیں اور خَیِّر اسے کہتے ہیں جو فاضل ہو اور خیر سے مختص ہو (غ) اور قرآن کریم میں ہے فاستبقوا الخیرات جہاں خیرات سے مراد خوبیاں اور بھلائیاں ہی ہیں ؎

حسان حَسَنٌ اور حَسَنَۃٌ کی جمع بھی حِسان آتی ہے اور حَسْنَاء کی بھی اور امراۃ حسناء خوبصورت عورت کو کہا جاتا ہے (ل)

۳۲۶۶ خیام۔ خَیْمَۃ دیہاتیوں کا گھر ہے جسے وہ درختوں کی ٹہنیوں سے بناتے ہیں۔ اور عرب کے نزدیک وہ بیت اور منزل کی طرح ہے اور بعض کا قول ہے کہ اگر درختوں سے نہ بنا ہو تو اسے خیمہ نہیں کہا جائے گا اور حدیث میں ہے الشھید فی خیمۃ اللّٰہ اور یہ استعارہ ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ظل کے لیے کیونکہ دوسری حدیث میں ہے الشھید فی ظل اللّٰہ (ل) اور یہاں جن خیموں کا ذکر ہے وہ بھی استعارہ کا رنگ ہی ہو سکتا ہے اور یا شاید یہ مطلب ہو کہ ابھی وہ ظاہر نہیں ہوئیں۔

۳۲۶۷ رفرف۔ رفیف الشجر درخت کی شاخوں کا انتشار ہے اور رف الطیر پرندنے اپنے بازو پھیلا لیے اور رفرف پھیلے ہوئے پتے ہیں اور یہاں مراد ایک قسم کا کپڑا ہے جو مرغزار سے مشابہ ہوتا ہے (غ) اور رفرف ایک حدیث میں خیمہ کی چھت کے معنی ہیں اور آنحضرت صلعم کی وفات کی حدیث میں خیمہ کے پردہ کے معنی میں آیا ہے اور بعض کے نزدیک یہ جمع ہے جس کا واحد رفرفۃ ہے اور بعض نے یہاں رفرف سے مراد ریاض الجنۃ یعنی باغ کے قطعات لیے ہیں اور بعض نے فرش اور بچھانے کی چیزیں۔ (ل)

عبقری۔ عَبْقَر ایک موضع کا نام ہے جس کے متعلق اہل عرب کا خیال تھا کہ وہ جنوں کی سرزمین میں ہے پھر اس کی طرف ہر چیز کو نسبت کیا جاتا ہے اس کی دانائی کی وجہ سے یا اس کے بنانے کی کمال خوبی اور اس کی قوت کی وجہ سے (ل) اور حدیث میں (حضرت عمر کے متعلق) ہے فلم اَرَ عبقریا یفری فریہ اور عبقری القوم قوم کے سردار اور ان کے بڑے کو کہا جاتا ہے۔ چونکہ عرب عبقر کو جنوں کا مکان سمجھتے تھے اس لیے جس چیز کو دیکھتے تھے کہ دوسروں پر فوقیت لے گئی ہے اور نادر ہے جس کا کرنا مشکل ہے یا اپنے نفس میں عظمت رکھتی ہے اسے عبقری کہہ دیتے تھے اور حدیث میں عبقری بمعنی دیباج یا ایسے فرش کے آیا ہے جو نشانوں والا ہو (ن) اور وہ ایک قسم کا فرش ہے اور یہاں جنت کے فرشوں کے لیے بطور مثال بیان کیا گیا ہے (غ) اس سے معلوم ہوا کہ عظمت یا ندرت کے لحاظ سے جنّ کی طرف نسبت دینے کا عرب میں عام محاورہ تھا ؎

آیاتہا ۹۶ (۵۶) سُورَةُ الْوَاقِعَةِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝۱	جب ہو جانے والی (بات) ہو جائے گی۔
ربع لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝۲	اس کے ہو جانے میں کوئی جھوٹ نہیں ۳۲۶۸
خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝۳	(وہ کسی کو) نیچا کرنے والی (کسی کو) بلند کرنے والی (ہے)
اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝۴	جب زمین سخت حرکت سے ہلے گی ۳۲۶۹
وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝۵	اور پہاڑ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے ۳۲۷۰
فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۝۶	پس وہ اڑتا ہُوا غبار ہو جائیں گے۔
وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝۷	اور تم تین قسم ہو گے ۳۲۷۱
فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ۬ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝۸	سو برکت والے، برکت والوں کی کیا (اچھی) حالت ہے ۳۲۷۲
وَاَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۙ۬ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۝۹	اور بدبختی والے، بدبختی والوں کی کیا (بری) حالت ہے ۳۲۷۳
وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝۱۰	اور آگے بڑھنے والے سب سے آگے ہی ہیں۔

نام: اس سورت کا نام الواقعة ہے اور اس میں تین رکوع اور چھیانوے آیتیں ہیں اس کا نام الواقعة پہلی ہی آیت میں مذکور ہے اور یہ وقوع میں آنے والی چیز جزا و سزا کی گھڑی ہے اس دنیا کی جزا و سزا اور قیامت کی جزا و سزا دونوں اس کے اندر آجاتی ہیں۔ اور اس میں انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر ہے۔ گروہ اول جو مقربین بارگاہ الٰہی ہیں۔ گروہ دوم عامہ مومنین۔ گروہ سوم مکذبین اور اعدائے حق، یہ سورت مکّی ہے اسی زمانہ کی ہے جس زمانہ کی اس سے پہلی سورت اور اس میں اسی کے مضمون کو جاری رکھا ہے۔ وہاں بھی دراصل تین گروہوں کا ہی ذکر تھا۔ یہاں واضح کر کے بیان کر دیا ہے۔

۳۲۶۸ کاذبة اس موقعہ پر مصدر ہے جیسے عافية۔ عاقبة (ج) یا کذب یہاں نفس فعل کی طرف منسوب ہے جیسے فعلة صادقة۔ فعلة کاذبة۔ اور ناصية كاذبة (العلق ۹۶-۱۶) میں مبالغہ ہے جیسے کذّاب میں (غ) یا محذوف۔ موصوف نفس کی صفت اور اسم فاعل ہے (م)

الواقعة سے مراد قیامت لی گئی ہے لیکن اس کا اطلاق عام بھی ہے اور سختی اور ناپسندیدگی کے موقعہ پر بولا جاتا ہے ۲۲۴۲ پس اس میں اشارہ قیامت کی طرف بھی ہے اور اس سزا کی طرف بھی جس کا مخالفین کو وعدہ دیا جاتا تھا۔

۳۲۶۹ رجت۔ رَجّ کے معنی ہیں کسی چیز کو ہلانا اور اسے اضطراب میں کر دینا۔ اور اذا رجت الارض رجا کے وہی معنی ہیں جو اذا زلزلت الارض زلزالها کے معنی ہیں (غ)۔

۳۲۷۰ بست۔ بَسّ کے معنی ہیں ایک چیز کو ریزہ ریزہ کر دینا یا پیس ڈالنا اور بعض کے نزدیک اس کے معنی تیز چلانا بھی ہیں (غ)

۳۲۷۱ ازواجا ثلثة، زوج کا استعمال وہاں بھی ہوتا ہے جہاں ایک چیز کا دوسری کے ساتھ ذکر کیا جائے خواہ بلحاظ مماثلت اور خواہ بلحاظ مقابلہ ان تین گروہوں کو جن میں سے دو جنتی ہیں اور ایک اہل نار اس لحاظ سے ازداج کہا ہے کہ ایک ہی اصول پر عمل پیرا ہونے یا ان کو چھوڑنے سے وہ تین قسمیں بنتی ہیں ؎

۳۲۷۲ میمنة۔ اور یُمن کے ایک ہی معنی ہیں یعنی برکت۔ اور اصحاب المیمنة وہ ہیں جو اپنے نفسوں پر برکت کا موجب ہیں (ل)

۳۲۷۳ مشئمة اور شؤم کے ایک ہی معنی ہیں اور یہ ضد یُمن ہے یعنی نحوست (ل)

أُولَٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ⑪ — وہی مقرب ہیں

فِي جَنّٰتِ النَّعِيمِ ⑫ — نعمتوں والے باغوں ہیں۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ ⑬ — ایک بڑی جماعت پہلوں میں سے۔

وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ⑭ — اور تھوڑے پچھلوں میں سے ۳۲۷۴

عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ ⑮ — جڑاؤ تختوں پر ۳۲۷۵

مُّتَّكِـِٔينَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِينَ ⑯ — ان پر تکیے لگائے ہوئے آمنے سامنے (ہوں گے)

يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ⑰ — ان پر ہمیشہ ایک حالت میں رہنے والے لڑکے پھر رہے ہونگے۔ ۳۲۷۶

بِأَكْوَابٍ وَّأَبَارِيقَ ۙ وَكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ⑱ — آب خورے اور لوٹے اور خالص پینے کا پیالہ لیے ہوئے ۳۲۷۷

لَّا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنزِفُونَ ⑲ — اس سے انھیں درد سر نہ ہوگا اور نہ وہ متوالے ہونگے۔

وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ ⑳ — اور میوہ جیسا وہ پسند کریں۔

وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ㉑ — اور پرند کا گوشت جس کی انھیں خواہش ہو۔

وَحُورٌ عِينٌ ㉒ — اور خوبصورت حوریں،

۳۲۷۴ ثلة۔ ثُلَّۃ بھیڑ بکری کی جماعت پر بولا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک بڑی جماعت سے مخصوص ہے اور ثُلَّۃ الناس انسانوں کی جماعت پر (ل)۔
سابقین میں جو مقربان بارگاہ الٰہی ہیں فرمایا کہ کثیر حصہ پہلوں میں سے ہوگا۔ اور تھوڑے پچھلوں میں سے یہ اولین کون ہیں قرآن کریم نے خود دوسری جگہ بتا دیا والسابقون الاولون من المهاجرین والانصار (التوبۃ ۹ ۔۱۰۰) اور اس کی وجہ یہ ہے جیسا کہ ۲۳۴۱ میں دکھایا گیا ہے کہ جس قدر قربانیاں اس وقت لوگوں نے کیں پچھلے زمانہ میں اس قدر قربانیاں نہیں کیں ورنہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آئندہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے دروازۂ تکمیل بند کر دیا ہے یا تنگ کر دیا ہے اور بہت یا تھوڑے بلحاظ نسبت ہیں یعنی جو لوگ پہلے پہلے اسلام لائے انہیں چونکہ بڑے بڑے دکھ اللہ تعالیٰ کے رستے میں اٹھانے پڑے اس لیے ان کا بڑا حصہ مقربین بارگاہ الٰہی میں داخل ہوا۔ اور پچھلے لوگوں میں سے کثیر حصہ کو چونکہ ایسا مقابلہ پیش نہیں آیا اس لیے ان میں سے تھوڑے سابقیت کے مرتبہ کو حاصل کرتے ہیں اور یہ آیت جو اولین میں سے کثیر حصہ کو مقربین بارگاہِ الٰہی ٹھہراتی ہے نہ صرف عیسائیوں پر ہی اتمام حجت کرتی ہے جو حضرت عیسیٰ کے متعلق من المقربین قرآن میں پاکر سمجھتے ہیں کہ ایک حضرت عیسیٰ ہی خدا کے پاس پہنچے ہیں یہ آیت امت محمدیہ کے اولین گروہ یعنی اولین من المهاجرین والانصار سے کثیر حصہ کو مقربین میں داخل کر کے صاف بتاتی ہے کہ بلحاظ درجات یہ لوگ بھی حضرت عیسیٰ کے پیچھے نہیں رہے اور گروہ انبیاء میں ہی داخل ہیں بلکہ اہل تشیع پر بھی یہ حجت قاطع ہے۔ جو اولین من المهاجرین والانصار کے کثیر گروہ کو نعوذ باللہ منافق قرار دیتے ہیں اور مومنین کی کثرت کو مہدی غائب کے ظہور سے وابستہ قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم نہایت ہی کھلے الفاظ میں ان کی تردید کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ اولین میں سے مقربین کا حصہ کثیر ہے اور آخرین سے قلیل اسی طرح وہ لوگ جنہوں نے آج ایک نئی نبوت قائم کرنے کی کوشش میں یہاں تک صحابہ کی شان میں گستاخی کی ہے کہ یہ لکھ دیا ہے کہ انہوں نے کامل فرمانبرداری رسول اللہ صلعم کی نہیں کی اسی لیے ان میں سے کوئی نبی نہ بنا ان پر بھی یہ آیت اتمام حجت کرتی ہے۔ اور صحابہ کے کثیر حصہ کو مقربین بارگاہ الٰہی میں داخل کر کے یہ بتاتی ہے کہ انہوں نے جس حد تک آنحضرت صلعم کی فرمانبرداری کی اس حد تک پچھلوں کو میسر نہیں آسکتا۔

۳۲۷۵ موضونۃ۔ وَضن زرہ کا بننا ہے اور ہر ایک مضبوط بننے پر استعمال ہوا ہے (غ) اور وَضن کے اصل معنی ایک چیز کے بعض کا بعض پر دوہراتے چلے جانا ہے جیسے اینٹوں یا پتھروں کا اور سریر یا اور اسی قسم کی چیزوں کے جواہرات یا کپڑوں سے بننے پر بولا جاتا ہے۔ (ل) اور اس کے معنی مَصفوفۃ بھی کیے گئے ہیں (ج) یعنی قطاروں میں بچھائے ہوئے۔

۳۲۷۶ مخلدون اپنی حالت پر باقی رہنے والے ان میں استحالہ نہیں ہوگا۔ (یعنی حالت تبدیل نہیں ہو گی) یا زیوروں سے آراستہ کیونکہ خَلَدَۃ ایک قسم کی بالی ہے (غ)

۳۲۷۷ اباریق۔ اِبریق کی جمع ہے کوزہ یا کوزہ کی مثل۔ اور اکواب اور اباریق میں فرق یہ کیا گیا ہے کہ اکواب میں دستے اور ٹوٹی نہیں ہوتی اور اباریق میں ہوتی ہے۔ (ج)

كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ ۝٢٣
محفوظ رکھے ہُوئے موتیوں کی طرح۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝٢٤
اس کا بدلہ، جو وہ عمل کرتے تھے۔

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيمًا ۝٢٥
وہ اس میں کوئی لغو بات نہ سنیں گے اور نہ کوئی گناہ کی بات۔

إِلَّا قِيلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۝٢٦
مگر ایک ہی بات سلامتی سلامتی۔

وَأَصْحٰبُ الْيَمِينِ ۙ مَآ أَصْحٰبُ الْيَمِينِ ۝٢٧
اور برکت والے، برکت والوں کی کیا (اچھی) حالت ہے۔

فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ۝٢٨
بیریوں میں (رہیں) جن کے کانٹے نہیں ۳۲۷۸

وَّطَلْحٍ مَّنْضُودٍ ۝٢٩
اور کیلے تہ بتہ (پھل والے)

وَّظِلٍّ مَّمْدُودٍ ۝٣٠
اور وسیع سایہ۔

وَّمَآءٍ مَّسْكُوبٍ ۝٣١
اور بلندی سے گرتا ہوا پانی ۳۲۷۹

وَّفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ۝٣٢
اور بہت پھل۔

لَّا مَقْطُوعَةٍ وَّلَا مَمْنُوعَةٍ ۝٣٣
نہ ختم ہو اور نہ (اس سے) روکے۔

وَّفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ ۝٣٤
اور بلند فرش۔

إِنَّآ أَنْشَأْنٰهُنَّ إِنْشَآءً ۝٣٥
ہم نے انھیں ایک نئی پیدائش میں اٹھا کھڑا کیا ہے۔

فَجَعَلْنٰهُنَّ أَبْكَارًا ۝٣٦
پس انھیں نوجوان بنایا ہے۔

عُرُبًا أَتْرَابًا ۝٣٧
محبت والیاں ہم عمر ۳۲۸۰

۳۲۷۸ مخضود۔ خَضَد گیلی چیز کا یا خشک کا توڑنا ہے بشرطیکہ الگ الگ ٹکڑے نہ ہو جائیں اور درخت کے کانٹے توڑنے یا دور کرنے پر بھی بولا جاتا ہے اور ایسے درخت کو مخضود کہا جاتا ہے (ل) اور یہ معنی ایک مرفوع حدیث میں بھی ہیں مگر مجاہد اور ضحاک سے اس کے معنی مروی ہیں جو پھل کے بوجھ سے شاخیں ٹوٹی پڑتی ہوں۔ یا دوہری ہوگئی ہوں (ج) اور پہلے معنی ہی قابل ترجیح ہیں اس لیے کہ ظاہر یہ کرنا ہے کہ اس دنیا کی بیریاں نہیں جن میں کانٹے ہوتے ہیں کیونکہ جنت میں کوئی ایذا دینے والی چیز نہیں اور وہاں کی بیریاں بھی کچھ اور حقیقت رکھتی ہیں۔

۳۲۷۹ طلح کیلے کے درخت کو کہتے ہیں۔

مسکوب۔ سَکَبَ الماء کے معنی ہیں پانی بہایا۔ اور ماء مسکوب بہایا ہوا یا گرایا ہوا پانی۔

۳۲۸۰ عربا۔ عُرُب۔ عَرُوْبَۃ کی جمع ہے گویا وہ اپنے حال کو اپنی عفت سے اور خاوند کی محبت سے کھول کر بیان کر دینے والی ہے کیونکہ اعراب کے معنی بیان کرنا ہیں (غ)

جنت میں اس دنیا کی عورتیں: یہ عورتیں کون ہیں؟ ترمذی کی حدیث میں ہے کہ ایک بڑھیا نبی کریم صلعم کے پاس آئی اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے لیے دعا کریں کہ میں جنت میں جاؤں آپ نے فرمایا جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہیں ہوگی وہ روتی ہوئی لوٹ گئی تو آپؐ نے فرمایا کہ اسے کہدو کہ مطلب یہ ہے کہ بڑھیا ہونے کی حالت میں کوئی عورت جنت میں داخل نہیں ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے انا انشاْنٰھن انشاء فجعلنٰھن ابکارا لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس طرح پہلے مقربین کے لیے کچھ نعماء کا ذکر ہے اور ان میں حور عین کا ذکر ہے اس کے مقابل پر یہاں اصحاب الیمین کے لیے عربا اترابا کا ذکر ہے اور یہ ترتیب ضروری ٹھہراتی ہے کہ یا تو دونوں جگہ مراد اس دنیا کی عورتیں لی جائیں تو اس صورت میں حور عین بھی انہی مقربین بارگاہ الٰہی کی صفت ہوگی جو عورتوں میں سے قرب الٰہی کا بلند مرتبہ حاصل کرتی ہیں اور یا انا انشاْنٰھن انشاء میں بھی حور عین کا ہی ذکر ہے گو لفظ دوسرے ہوں اور میرے نزدیک ترجیح اسی دوسری بات کو ہی ہے۔ کہ قرآن کریم میں جہاں اس قسم کا ذکر آیا ہے وہ نعمائے جنت میں سے ایک نعمت ہے جو مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں ہے۔ اور اعمال حسنہ کے نیک نتائج کو جس طرح ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے جو کھانے پینے سے تعلق رکھتے ہیں اور انسان کے لیے بقا کا موجب ہیں اسی طرح ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے جو حسن منظر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور راحت اور لذت اور سرور کا موجب ہوتے ہیں جس

ع ۱۴ لِّاَصۡحٰبِ الۡیَمِیۡنِ ﴿۳۸﴾ برکت والوں کے لیے۔

ثُلَّۃٌ مِّنَ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۳۹﴾ ایک بڑی جماعت پہلوں میں سے۔

وَ ثُلَّۃٌ مِّنَ الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۴۰﴾ اور ایک بڑی جماعت پچھلوں میں سے۔

وَ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۬ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ اور بائیں ہاتھ والے، بائیں ہاتھ والوں کی کیا (بری) حالت ہے۔

فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّ حَمِیۡمٍ ﴿۴۲﴾ لُو میں، اور اُبلتے ہوئے پانی میں۔

وَّ ظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ ﴿۴۳﴾ اور سیاہ دھوئیں کے سایہ میں ۳۲۸۱

لَّا بَارِدٍ وَّ لَا کَرِیۡمٍ ﴿۴۴﴾ نہ ٹھنڈا اور نہ عزّت والا۔

اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُتۡرَفِیۡنَ ﴿۴۵﴾ وہ اس سے پہلے آسودہ حال تھے۔

وَ کَانُوۡا یُصِرُّوۡنَ عَلَی الۡحِنۡثِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۴۶﴾ اور بڑے گناہ پر اصرار کرتے تھے۔

وَ کَانُوۡا یَقُوۡلُوۡنَ ۬ۙ اَئِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۴۷﴾ اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹّی اور ہڈیاں ہوجائیں گے تو کیا ہم اُٹھائے جائیں گے؟

اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۴۸﴾ اور کیا ہمارے پہلے باپ دادا بھی۔

طرح اس دنیا کی زندگی میں ایک وہ چیزیں ہیں جو انسان کی بقا کا موجب ہیں اور دوسری وہ جو اس کی راحت اور سرور کا موجب ہیں اسی طرح نعمائے بہشتی میں دونوں چیزوں کا ذکر ہے اور غرض صرف یہ بتانا ہے کہ بہشت میں وہ اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں بھی ملیں گی جو انسان کی روح کے بقا کا موجب ہیں اور وہ بھی جو اس کی روح کے لیے لذت اور سرور کا موجب ہیں پس ایک طرف اگر پھلوں کا اور گوشت کا اور پانیوں اور دودھ کا اور ایسی چیزوں کا ذکر ہے تو دوسری طرف مناظر حسن کا ذکر ہے کیونکہ حسن انسان کی طبیعت میں سرور اور راحت پیدا کرنے میں سب سے بڑا سامان ہے۔ پھر اس حسن کا رنگ کہیں تو زیب و زینت کے سامانوں میں نظر آتا ہے۔ جیسے تخت اور فرش یا مناظر قدرت کے رنگ میں جیسے چشمے اور درخت وغیرہ لیکن ان دونوں سے بڑھکر اللہ تعالیٰ نے انسان کی شکل میں حسن کو انسان کے لیے مرغوب خاطر کیا ہے اس لیے منظر حسن و جمال کو کمال کو پہنچانے کے لیے اس رنگ کا بھی ذکر فرمایا ہے اور اسی میں حور و غلمان کا یا قاصرات الطرف کا ذکر ہے لیکن بہشت کی سب سے بڑی نعمت دیدار الٰہی کو قرار دیا ہے اور یوں بتایا ہے کہ اصل غرض کیا ہے ؂

مقربین اور اصحاب الیمین کی جنت میں فرق کا رنگ: مقربین اور اصحاب الیمین کے لیے جن نعمتوں کا ذکر ہے ان میں ایک باریک فرق بھی نظر آتا ہے مثلاً جن نعماء کا ذکر مقربین کے لیے ہے۔ عموماً اس رنگ کی ہیں جو تہذیب اور تمدن کی ترقی کے ساتھ انسان کو مرغوب خاطر ہوتی ہیں مثلاً تخت اور لباس ہائے فاخرہ اور مجالس جن میں ہر قسم کا سامان سرور ہے۔ اور جن نعماء کا ذکر اصحاب الیمین کے لیے ہے وہ ایسی ہیں جو عموماً ابتدائی مراحل پر انسان کی خوشی کا موجب ہوتی ہیں اور اس لیے اہل بادیہ یا دیہات کے رہنے والوں کے لیے ان میں لطف کا سامان ہوتا ہے جیسے بیریاں اور کیلے اور گرتا ہوا پانی اور یہاں بیری اور کیلے کے ذکر میں بھی ایک پُرحکمت بات ہے بیری ایسا درخت ہے جو خشک ترین مقامات میں ہو جاتا ہے اور کیلا کثرت پانی کو چاہتا ہے اور اصل غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ سب ہی قسم کے پھلوں والے درخت ہیں اور سورۃ الرحمٰن کے آخری رکوع میں بھی اسی قسم کا فرق دونوں قسموں کے باغوں میں رکھا ہے مثلاً پچھلے باغوں کی سرسبزی کی طرف زیادہ توجہ دلائی ہے اور پہلوں کی کثرت اشجار اور شاخوں کی طرف۔ پچھلے باغوں میں چشمے جوش مار رہے ہیں جو نظارہ جنگلوں اور پہاڑوں کا ہے اور پہلوں میں وہ بہ رہے ہیں۔ پچھلے باغوں میں جو حور ہیں وہ خیموں میں ہیں اور پہلوں میں خیموں کا ذکر نہیں اور یوں مقربین کی ترقی روحانی کی وجہ سے ان کے لیے ترقی یافتہ قوموں کی راحت کے سامان کا ذکر ہے اور اصحاب الیمین کی ابتدائی حالت کی وجہ سے ان کے لیے انہیں راحت کے سامانوں کا ذکر ہے جن سے ترقی کے ابتدائی مراحل کی قومیں زیادہ مانوس ہوتی ہیں ؂

۳۲۸۱ یحموم اسی مادہ سے ہے جس سے حمیم ہے دھواں جو سخت سیاہ ہو فرط حرارت کی وجہ سے یہ نام ہے (غ) اور اس ظل کو اگلی آیت میں لا بارد ولا کریم کہا کیونکہ سایہ میں بیٹھنے سے ٹھنڈک بھی حاصل ہوتی ہے اور یہ عزت کا مقام بھی ہے مگر اس سایہ میں ان دونوں باتوں کی نفی کی ہے اور بعض نے کریم سے مراد نافع لیا ہے کیونکہ یہی اس کا کرم ہے ؂

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۹﴾
کہہ پہلے اور پچھلے (سب)

لَمَجْمُوْعُوْنَ ۵ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾
یقیناً ایک مقرر دن کے مقرر وقت پر اکٹھے کیے جائیں گے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾
پھر تم اے گمراہو! جھٹلانے والو!

لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾
ضرور تھوہر کے درخت سے کھاؤ گے۔

فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾
پھر (اپنے) پیٹوں کو اس سے بھرو گے۔

فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿۵۴﴾
پھر اس کے اوپر اُبلتا ہُوا پانی پیو گے۔

فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿۵۵﴾
پھر پیو گے جیسے پیاسے اونٹ پیتے ہیں۔

هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۵٦﴾
یہ جزا کے دن اُن کی مہمانی ہے۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾
ہم نے تم کو پیدا کیا پھر کیوں تم (دوسری پیدائش کو) سچ نہیں مانتے۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾
تو کیا تم نے دیکھا جو تم نطفہ ڈالتے ہو۔

ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾
کیا تم اسے پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿٦۰﴾
ہم نے تمہارے درمیان موت مقرر کردی ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں۔

عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَ نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦۱﴾
کہ تمہاری مثل بدل کر لائیں اور تمہیں اس صورت میں پیدا کریں جو تم نہیں جانتے ۳۲۸۲

وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٦۲﴾
اور تم پہلی پیدائش کو جانتے ہو تو پھر نصیحت کیوں نہیں پکڑتے۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿٦۳﴾
کیا تم نے دیکھا جو تم بوتے ہو

ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿٦۴﴾
کیا تم اُسے اُگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔

لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿٦۵﴾
اگر ہم چاہیں تو اسے چورا چورا کردیں، تو تم تعجب کرنے لگو۔

اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿٦٦﴾
(کہ) ہم پر چٹی پڑ گئی۔

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿٦۷﴾
بلکہ ہم محروم ہو گئے۔

۳۲۸۲ بعث بعد الموت میں یہ جسم نہیں: یہاں بعث بعد الموت پر ہی بحث ہے اسی سے کفار انکار کرتے تھے اسی پر اللہ تعالیٰ نے زور دیا پس ننشئکم فی ما لا تعلمون میں بھی بعث بعد الموت کا ذکر ہے اور یہاں صاف فرمایا کہ بعث میں تمہاری صورتیں ایسی ہونگی جنہیں تم نہیں جانتے یعنی یہ صورتیں نہ ہونگی پس یہ جسم بھی نہ ہونگے رہا یہ کہ پھر ایک دوسرے کو کس طرح پہچانیں گے تو اگر اس دنیا میں بھی ایک انسان اپنی آواز نک سے پہچانا جاسکتا ہے تو وہاں جہاں سب حالات شکل وصورت میں عیاں اور آشکارا ہو جائیں گے ایک دوسرے کو پہچاننا کون سا مشکل کام ہے ؞

اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿٦٨﴾	کیا تم نے وہ پانی دیکھا، جو تم پیتے ہو۔
ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿٦٩﴾	کیا تم اُسے بادل سے اُتارتے ہو یا ہم اُتارنے والے ہیں ۳۲۸۳
لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾	اگر ہم چاہتے تو اُسے کھاری بنا دیتے، تو کیوں تم شکر نہیں کرتے۔
اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿٧١﴾	کیا تم نے آگ کو دیکھا، جو تم روشن کرتے ہو۔
ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿٧٢﴾	کیا تم اس کا درخت پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں۔
نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿٧٣﴾	ہم نے اسے نصیحت اور مسافروں کے لیے سامان بنایا ۳۲۸۴
ع ۳ / ۱۵ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٧٤﴾ الثلثة	سو اپنے رب عظمت والے کے نام کی تسبیح کر۔
فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿٧٥﴾	(ایسا نہیں) میں قرآن کے حصّوں کے نزول کی قسم کھاتا ہوں ۳۲۸۵
وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿٧٦﴾	اور وہ بھاری قسم ہے اگر تم جانو۔
اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿٧٧﴾	یقیناً یہ قرآن نفع پہنچانے والا ہے۔
فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿٧٨﴾	محفوظ کتاب میں۔
لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿٧٩﴾	سوائے پاک لوگوں کے اسے کوئی نہ چھوتا ۳۲۸۶

۳۲۸۳ مُزْن بادل کو کہتے ہیں اور اس کا ایک ٹکڑا مُزْنَة ہے (غ)

۳۲۸۴ تذکرة آگ کو قیامت کی آگ یعنی دوزخ کے لحاظ سے کہا اور مقوین سے مراد (دیکھو ۳۱۹۵) مسافر ہیں اور ابن زید کا قول ہے کہ مقوی زبان عرب میں بھوکے کو کہتے ہیں (ج) اور مسافر کا ذکر خصوصیت سے اس لیے کیا کہ وہ زیادہ محتاج ہوتا ہے حضرت علیؓ کے متعلق روایت ہے کہ ان چاروں موقعوں پر جہاں جہاں سوال کا رنگ ہے آپ پڑھتے تھے بل انت یارب۔

۳۲۸۵ لا عدم محض کے لیے استعمال ہوتا ہے اور تینوں زمانوں میں اور اسم اور فاعل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور بعض وقت لا ایک کلام مثبت پر داخل ہوتا ہے اور وہ کلام محذوف کی نفی کرتا ہے جیسے مایعزب عن ربك من مثقال ذرة فی الارض ولا فی السماء (یونس ۱۰ - ٦١) اور اسی پر محمول ہے لا اقسم بیوم القیمة (القیمة ۷۵ - ١) فلا اقسم برب المشارق (المعارج ۷۰ - ۴۰) فلا وربك لایومنون (النساء ۴ - ٦٥) اور جیسے یہاں اور بعض وقت دو متضاد باتوں پر مکرر لایا جاتا ہے اور دونوں میں اثبات امر مراد ہوتا ہے اور کبھی ان کے درمیان کسی حالت کا اثبات ہوتا ہے مثلاً لاشرقیة ولا غربیة (النور ۲۴ - ۳۵) جس سے مراد ہے کہ وہ شرقی بھی ہے اور غربی بھی (غ) اور لولا دو طرح پر آتا ہے کسی چیز کا امتناع اس کے غیر کے وقوع کی وجہ سے لولا انتم لکنا مؤمنین (السبا ۳۴ - ۳۱) اور دوسرا بمعنی ھلّا اور اس کے پیچھے فعل آتا ہے جیسے لولا ارسلت الینا رسولا (غ)

مواقع النجوم سے مراد: ابن عباس ۔ مجاہد عکرمہ کے نزدیک مواقع النجوم سے مراد یہاں قرآن کریم کے نجوم یا ٹکڑوں کا نزول یا وقت نزول ہی ہے (ج) دیکھو ۳۱۹۲ اور روح المعانی میں ہے کہ اس کے بعد انه لقراٰن کریم لاکر اسے گویا صراحت سے بیان کر دیا ہے کہ مواقع النجوم سے مراد نزول قرآن ہی ہے۔ اور اگر نجوم سے مراد ستارے لیے جائیں تو مواقع سے مراد ان کا غائب ہونا لیا جائیگا۔ اس کے لیے بھی ۳۱۹۲ دیکھو اور بخاری میں ہے کہ مواقع النجوم سے مراد محکم القراٰن ہے یعنی قرآن شریف کی محکم آیات۔

۳۲۸۶ قرآن کی عزت اور حفاظت: قرآن کے ہر حصّہ کے نزول کو بطور شہادت یا قسم پیش کر کے جواب قسم میں تین باتیں بیان فرمائی ہیں (۱) یہ قرآن کریم ہے (۲) یہ محفوظ کتاب میں ہے (۳) سوائے پاکوں کے اسے کوئی نہیں چھوتا۔ اب ظاہر ہے کہ جواب قسم وہ ہے جسے ثابت کرنا مقصود ہے اور قسم بجائے شہادت ہے۔ پس

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے۔

اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ تو کیا تم اس کلام کو جھوٹا قرار دیتے ہو۔

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾ اور (اسے) اپنا حصّہ ٹھیراتے ہو کہ تم جھٹلاتے ہو ۳۲۸۷

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ تو کیوں نہیں ہوتا کہ جب (روح) گلے میں آ پہنچتی ہے۔

وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ اور ہم تمھاری نسبت اس سے قریب تر ہیں، لیکن تم نہیں دیکھتے۔

فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تو کیوں اگر تم کسی کے ماتحت نہیں، ۳۲۸۸

تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾ اسے لوٹا نہیں دیتے اگر تم سچے ہو

قرآن کے ہر حصّہ کے نزول کو بطور شہادت پیش کیا ہے کہ یہ قرآن کیا ہے۔ یعنی اندرونی شہادت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ پہلی بات قرآن کا کریم ہونا ہے کریم کے لیے دیکھو ۶۴۷ قرآن کو کریم بلحاظ اس کے معزز اور ممتاز ہونے کے بھی کہا جا سکتا ہے مگر یہ پھر صرف ایک دعویٰ ہوگا کریم جب اللہ تعالیٰ کا وصف ہو تو مراد اس کا احسان وانعام ہوتا ہے پس کلام الٰہی کے کریم ہونے میں بھی اس کے ذریعہ سے احسان وانعام ہی مراد ہے۔ یعنی دنیا کو اس سے نفع پہنچیگا اور قرآن کا نزول اس پر یوں گواہ تھا کہ جو کچھ نازل ہو رہا تھا وہ انسانوں میں ایک روحانی انقلاب پاکیزگی کی طرف پیدا کرتا چلا جاتا تھا وقیل الکرم اعم من کثرۃ البذل و الاحسان والاتصاف بما یحمد من الاوصاف ککثرۃ النفع (ر) فی کتاب مکنون میں یہ معنی لیے گئے ہیں کہ وہ آسمان پر ہونے کی وجہ سے گرد وغبار سے محفوظ ہے اور شیاطین اسے لے کر نہیں اترے بلکہ ملائکہ لے کر آئے ہیں (ج) یہ دونوں باتیں قرآن شریف کی اس خاص عظمت پر کچھ روشنی نہیں ڈالتیں جس کے ثابت کرنے کے لیے اتنی بڑی قسم کھائی گئی ہے جس طرح قرآن کا کریم ہونا ایک عظیم الشان امر ہے جو پایہ ثبوت کو پہنچ گیا یعنی دنیا بھی اس کی قائل ہو گئی اسی طرح فی الحقیقت باقی دو امور بھی ایسے ہی عظیم الشان امور ہیں جو قرآن کریم کی خصوصیت کو دیگر کتب پر ثابت کرتے ہیں اور مکنون سے مراد یہ ہے کہ وہ دشمنوں کے حملوں اور منصوبوں سے محفوظ ہے یعنی وہ اسے برباد نہیں کر سکتے اور تغیر وتبدل سے بھی محفوظ ہے وقیل ای فی کتاب مصون عن التبدیل والتغییر وھو المصحف الذی بایدی المسلمین ویتضمن ذٰلک الاخبار بالغیب لانہ لم یکن اذ ذاک مصاحف (ر) اب تیسری بات یہ ہے کہ اسے پاکوں کے سوائے کوئی چھو نہیں سکتا تو اس میں ابن جریر میں ایک قول کے مطابق ملائکہ کے ساتھ رسول اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جو انہی کی طرح گناہوں سے پاک کیے گئے ہیں اور روح المعانی میں ایک قول ہے کہ مطھرون سے مراد کفر سے پاک یعنی مومن ہیں۔ اور یمسہ سے مراد یطلبہ ہے حقیقت یہ ہے کہ اوپر جو دو باتیں بیان ہوئیں کہ قرآن پاک کے منافع بہت ہیں جو لوگوں کو اس سے پہنچیں گے اور کہ یہ دشمنوں سے محفوظ ہے انہی کے ذیل میں یہ تیسری بات ہے کہ اس تک رسائی سوائے پاک لوگوں کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی پس دشمن جو نقصان دینے کی نیت سے اس تک پہنچنا چاہتا ہے وہ اس تک نہیں پہنچ سکتا اسے صرف وہی لوگ چھو سکیں گے جو پاک ہیں اور اس سے دونوں باتیں اخذ ہوتی ہیں ایک یہ کہ مسلمان کو بھی چاہیے کہ قرآن کریم کو طہارت کی حالت میں چھوئے اور دوسرے یہ کہ اس کے مضامین عالیہ تک رسائی انہی لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے آپ کو گناہوں سے پاک کر کے اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کریں یہ مطھرین کے قرآن شریف تک پہنچنے کے دو رنگ ہیں ایک ظاہری ایک باطنی قرآن شریف کے ظاہری آداب کا جو شخص پاس کرتا ہے وہی اس کے باطن تک بھی پہنچ سکتا ہے اور یہ حکم مسلمانوں کے لیے ہے اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ کفار کو قرآن شریف پڑھنے کے لیے نہ دیا جائے کیونکہ اس طرح تبلیغ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور قرآن کے آنے کی اصل غرض ہی مفقود ہو جاتی ہے البتہ ایک حدیث سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ دشمنوں کے ہتک آمیز سلوک سے بچانے کے لیے آنحضرت صلعم نے صحابہ کو حکم دیا تھا کہ قرآن شریف کو لیکر دشمن کی سرزمین کی طرف سفر نہ کریں۔ بخاری میں ہے نھینا ان نسافر بالقراٰن الی ارض العدو۔

۳۲۸۷ رزق دیکھو ۱۳ نصیب یا حصہ کو بھی کہتے ہیں اور یہاں یہی مراد ہے (غ) اور اس کے معنی شکر بھی مروی ہیں (ج) اور رازق رزق کے خالق اور اس کے عطا کرنے والے اور اس کے مسبب کو کہا جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے اور اس انسان کو بھی کہا جاتا ہے جو وصول رزق میں سبب بن جاتا ہے ومن لستم لہ برازقین (الحجر ۱۵-۲۰) اور رزاق صرف اللہ تعالیٰ کو کہا جاتا ہے ان اللہ ھو الرزاق (الذاریٰت ۵۱-۵۸) (غ)

۳۲۸۸ مدینین۔ دان الناس کے معنی ہیں انہیں مغلوب کیا یا ماتحت کیا اور حدیث ابی طالب میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا اُرِیدُ من قریشٍ کلمۃً تَدِیْنُ لھم بھا العرب یعنی میں ان سے ایک بات چاہتا ہوں جس سے عرب ان کے ماتحت ہو جائے اور آنحضرت کو ایک شاعر نے یا سید الناس ودیّان

فَاَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ ﴿۸۸﴾
پھر اگر وہ مقربوں میں سے ہے۔

فَرَوۡحٌ وَّ رَيۡحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيۡمٍ ﴿۸۹﴾
تو راحت اور رزق اور نعمت کا باغ ہیں۔

وَ اَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ ﴿۹۰﴾
اور اگر وہ برکت والوں میں سے ہے ۳۲۸۹ء

فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ ﴿۹۱﴾
تو تیرے لیے سلامتی ہے (تو) برکت والوں میں سے (رہے)

وَ اَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنَ الۡمُكَذِّبِيۡنَ الضَّآلِّيۡنَ ﴿۹۲﴾
اور اگر وہ جھٹلانے والوں گمراہوں میں سے ہے۔

فَنُزُلٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ ﴿۹۳﴾
تو کھولتے پانی کی مہمانی ہے۔

وَّ تَصۡلِيَةُ جَحِيۡمٍ ﴿۹۴﴾
اور دوزخ میں جلنا۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الۡيَقِيۡنِ ﴿۹۵﴾
یہ یقینی سچ ہے۔

ع ۳ ۱۶ فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ ﴿۹۶﴾
سو اپنے رب عظمت والے کے نام کی تسبیح کر۔

الحرب کہہ کر مخاطب کیا ہے اور یہاں غیر مدینین کے معنی غیر مملوکین ہیں (ل) اور مَدِیْنٌ غلام کو اور مَدِیْنَۃٌ لونڈی کو کہا جاتا ہے (غ)
ان آیات میں بتایا ہے کہ انسان کسی دوسرے کے حکم کے ماتحت ہے اگر وہ خود قادر ہے تو اپنی موت پر کیوں قدرت حاصل نہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا فادرءوا عن انفسکم الموت ان کنتم صادقین (آل عمران ۳ - ۱۶۸)

۳۲۸۹ء فسلٰم لك من اصحاب الیمین میں سلٰم کے معنی بخاری میں مُسَلَّم کیے گئے ہیں یعنی یہ بات مسلم ہے کہ تو اصحاب الیمین میں سے ہے اور ابن جریر نے یوں بھی معنی کیے ہیں فسلٰم لك انت من اصحاب الیمین یعنی اسے یوں کہا جائیگا کہ تیرے لیے سلامتی ہے تو اصحاب الیمین میں سے ہے ؛

آیاتھا ۲۹ | سُوۡرَةُ الۡحَدِيۡدِ مَدَنِيَّةٌ (۵۷) | رکوعاتھا ۴

نام : اس سورت کا نام الحدید ہے اور اس میں چار رکوع اور انیتس آیتیں ہیں اس کا نام الحدید اس ذکر سے لیا گیا ہے کہ جب لوگ حق کو نیست و نابود کرنے پر تل جاتے ہیں تو پھر انبیاء کو بھی تلوار اٹھانی پڑتی ہے۔ ورنہ یہ ان کے آنے کی اصل غرض نہیں ہوتی اسی لحاظ سے اس سورت میں اول اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت کی وسعت کا ذکر ہے۔ پھر مسلمانوں کو انفاق کی طرف توجہ دلائی ہے۔ پھر منافقوں کا ذکر کیا ہے جو نصرت دین میں شامل نہیں ہوتے۔ اور مسلمانوں کو بھی توجہ دلائی ہے کہ لمبا زمانہ گذر جانے پر ان کے دل پہلے اہل کتاب کی طرح سخت نہ ہو جائیں۔ پھر بتایا کہ دنیوی زندگی کو غرض بنانے کا نتیجہ دکھایا اور آخر پر رسولوں کے ارسال کے قانون کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ حق کے قایم رکھنے کے لیے تلوار کی ضرورت بھی پڑتی ہے اور سب سے آخر حضرت عیسیٰ کے متبعین کا ذکر کیا ؛

یہ سورت مدنی ہے اور اس کا نزول صلح حدیبیہ کے بعد کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں ان لوگوں کی فضیلت کا ذکر ہے۔ جو من قبل الفتح اپنے اموال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہے بعض لوگوں نے اس کے صدر کو مکی کہا ہے مگر یہ درست معلوم نہیں ہوتا اور تعلق اس کا پہلی سورت کے ساتھ اس لحاظ سے ہے کہ وہاں جن اچھے لوگوں کا ذکر تھا وہ دین الٰہی کی نصرت کرنے والا گروہ ہے اور جو لوگ نصرت دین الٰہی نہیں کرتے ان کا حشر گویا کفار کے ساتھ ہے۔ اور یہاں سے سورۂ تحریم تک دس سورتیں مدنی ہیں۔ سورۂ احزاب کے بعد جو مکی سورتوں کا سلسلہ چلا تھا اور اس میں صرف تین سورتیں مدنی درمیان میں ایک خاص تعلق کے لیے لائی گئی تھیں یعنی محمد۔ الفتح۔ الحجرات۔ اسے یہاں بند کر کے مدنی سورتوں کا مجموعہ کی اس سب سے پہلی سورت میں کچھ ذکر منافقین کا اور بطور اشارہ ذکر مخالفین کا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱﴾

اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ۚ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲﴾

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے، وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ہُوَ الۡاَوَّلُ وَ الۡاٰخِرُ وَ الظَّاہِرُ وَ الۡبَاطِنُ ۚ وَ ہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۳﴾

وہ (سب سے) پہلے اور (سب سے) پیچھے اور (سب سے) ظاہر اور (سب سے) مخفی ہے اور ہر چیز کو جاننے والا ہے [۳۲۹۰]

ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ؕ یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَ مَا یَخۡرُجُ مِنۡہَا وَ مَا یَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعۡرُجُ فِیۡہَا ؕ وَ ہُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۴﴾

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ وقتوں میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر قائم ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اُترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے وہ تمھارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو اور اللہ تعالیٰ اسے جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔

لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۵﴾

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سب کام لوٹائے جاتے ہیں۔

یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ وَ یُوۡلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیۡلِ ؕ وَ ہُوَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۶﴾

وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور وہ دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡہِ ؕ فَالَّذِیۡنَ

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس سے خرچ کرو جس میں اس نے تمھیں (اپنا) نائب بنایا ہے سو جو

۳۲۹۰ الاول والآخر والظاہر والباطن حدیث میں ایک دعا کی ذیل میں زبان نبوی سے ان صفات باری کی حسب ذیل تفسیر موجود ہے۔ انت الاول فلیس قبلک شئ وانت الاخر فلیس بعدک شئ وانت الظاہر فلیس فوقک شئ وانت الباطن فلیس دونک شئ اور یہ مسلم اور ترمذی کی حدیث ہے یعنی تو اول ہے تجھ سے پہلے کوئی نہیں اور تو آخر ہے تجھ سے پیچھے کوئی نہیں (یعنی سب مخلوق کے فنا کے بعد باقی رہنے والا) اور تو ظاہر ہے تجھ سے اوپر کوئی نہیں اور تو باطن ہے تجھ سے دون کوئی نہیں اور ان آخری دو فقروں کی تشریح پھر دو طرح پر کی گئی ہے۔ یعنی ظاہر کے ایک یہ معنی کہ تو غالب ہے تجھ پر کوئی غالب نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ تو سب چیزوں سے زیادہ ظاہر ہے ظہور میں تجھ سے اوپر کوئی نہیں کیونکہ ہر چیز کا ظہور تجھ سے ہے اور باطن کے ایک یہ معنی کہ تیرے سوائے کوئی ملجا اور کوئی منجا نہیں جس کی طرف التجا لیجائی جائے اور دوسرے یہ کہ تو سب چیزوں سے زیادہ باطن ہے اور ہر چیز کی حقیقت کو اس کا غیر جانتا ہے۔ یعنی خود اللہ تعالیٰ اور تیری حقیقت کو تیرا غیر نہیں جانتا یا ہر چیز کی حقیقت کی معرفت ممکن ہے۔ لیکن تیری ذات کی حقیقت کی معرفت ممکن نہیں۔ اور تیسرے معنی باطن کے یوں بھی کیے گئے ہیں کہ تجھ سے قریب تر کوئی نہیں والباطن اقرب من کل شئ (ر) اور مفردات میں ہے کہ ظاہر سے اشارہ ہماری بدیہی معرفت کی طرف ہے کیونکہ فطرت جس چیز کی طرف دیکھتی ہے یہی فیصلہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے اور باطن سے اشارہ ہماری حقیقی معرفت کی طرف ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر کا قول ہے یا من غایۃُ مَعرِفَتِہِ القصور عن مَعرِفَتِہِ یا اپنی آیات سے ظاہر اور اپنی ذات میں باطن یا ظاہر اس لحاظ سے کہ وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور باطن اس لحاظ سے کہ اس کا احاطہ نہیں کیا جاتا لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار (غ)

اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿٧﴾ وَ مَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَ قَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٨﴾

لوگ تم میں سے ایمان لاتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے ۳۲۹۱۔ اور تمھیں کیا ہوا کہ تم اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے اور رسول تمھیں بلاتا ہے کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ اور وہ تمھارا عہد لے چکا ہے، اگر تم مومن ہو ۳۲۹۲۔

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩﴾

وہی ہے جو اپنے بندے پر کھلی آیتیں اتارتا ہے تاکہ وہ تمھیں اندھیرے سے روشنی کی طرف نکالے اور اللہ تعالیٰ تم پر مہربان رحم کرنے والا ہے۔

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۭ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ۭ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ۭ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿١٠﴾ ع

اور تمھارا کیا عذر ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو، اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کا ورثہ ہے۔ تم میں سے وہ برابر نہیں جس نے فتح سے پہلے خرچ کیا، اور لڑائی کی (اور جس نے پیچھے کیا) یہ مرتبہ میں ان سے بڑھ کر ہیں جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور لڑائی کی اور ہر ایک کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اچھا وعدہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے ۳۲۹۳۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَ لَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿١١﴾

کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے اچھا مال الگ کرے، تو وہ اسے اس کے لیے بڑھاتا ہے اور اس کے لیے عزت والا بدلہ ہے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١٢﴾

جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا ان کا نور ان کے آگے دوڑ رہا ہوگا اور ان کے دائیں، آج تمھارے لیے خوش خبری ہے، باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ انھیں میں رہو گے۔ یہی بھاری کامیابی ہے ۳۲۹۴۔

۳۲۹۱۔ گویا حقیقی مالک ان اموال کا اللہ تعالیٰ ہے اور انسان صرف بطور نائب یا امین ہے پس اللہ کے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

۳۲۹۲۔ یہاں کفار کو خطاب بے کر میثاق سے مراد دلائل عقلی یا عہد الست بر مکہ لیا گیا ہے مگر اصل مخاطب یہاں ایمان لانے والے ہیں۔ جیسا کہ آیت ۱۰ سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ اور ایمان سے مراد یہاں بات کا مان لینا یا ایمان کامل ہے اور میثاق سے مراد اقرار زبانی جو اسلام لا کر کیا۔ ان کنتم مومنین میں بھی اسے صاف کر دیا ہے اور یہ تنبیہ منافقوں کو ہے ؛

۳۲۹۳۔ الفتح سے مراد مجاہد اور قتادہ کے نزدیک فتح مکّہ ہے اور عامر نے اسے فتح حدیبیہ کہا ہے اور حضرت ابو سعید خدری کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے بھی اس آیت کو فتح حدیبیہ کے متعلق ہی بیان فرمایا اور قرآن کریم نے بھی اپنے کھلے الفاظ میں حدیبیہ کو ہی فتح مبین کہا ہے اس لیے اسی قول کو ترجیح ہے ؛

۳۲۹۴۔ مومنوں کو نور کس طرح مل سکتا ہے: ابن جریر میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ نور آگے اور دائیں ہوگا۔ دوسرا یہ کہ ان کا ایمان ان کے آگے ہوگا۔ اور انکی کتاب

يَوْمَ يَقُولُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾

جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں مومنوں سے کہیں گے ہمارا انتظار کرو، ہم بھی تمہارے نور سے (روشنی) لیں کہا جائے گا اپنے پیچھے کو لوٹ جاؤ، اور نور تلاش کرو۔ پس ان کے درمیان ایک دیوار حائل کردی جائے گی اس کا ایک دروازہ ہوگا اس کے اندر کی طرف رحمت ہے اور اس کے باہر کی جہت سے عذاب ہے ۳۲۹۵

يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾

انھیں پکاریں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے کہیں گے ہاں لیکن تم نے اپنی جانوں کو فتنے میں ڈالا اور انتظار کرتے رہے اور شک میں پڑے رہے اور تمھیں آرزوؤں نے دھوکے میں رکھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا اور بڑے دھوکے باز نے تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکے میں رکھا۔

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

سو آج تم سے فدیہ نہیں لیا جائے گا اور نہ ان سے جنھوں نے کفر کیا، تمہارا ٹھکانا آگ ہے وہی تمہاری رفیق ہے اور وہ بُری جگہ ہے ۳۲۹۶

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا

کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے نرم ہوجائیں اور اس کے (لیے) جو حق سے اترا ہے اور ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں

ان کے دائیں ہاتھ میں اور ضحاک کا قول ہے اور ابن جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے اور اصل بات یہ ہے کہ اعمال کی جزا تو اعمال کے مطابق ہے جس شخص کی یہاں یہ حالت ہے کہ اس کا نور ایمان اس کے آگے آگے ہے اور کتاب دائیں ہاتھ میں یعنی اس پر مضبوط ہو کر عمل کرتا ہے وہی ایمان اور کتاب اس کے لیے قیامت کے دن نور بن جاتے ہیں اور فی الحقیقت نور یہیں سے ساتھ لے کر جاتے ہیں یخرجھم من الظلمٰت الی النور (البقرۃ ۲ - ۲۵۷) اور دائیں ہاتھ ہونے سے یہ مراد نہیں کہ باقی طرفوں میں ظلمت ہوگی۔ بلکہ آگے بڑھنے اور یمن کے لحاظ سے ان دو طرفوں کا نام لیا ہے اور جس کے دو جانب نور ہوگا۔ اس کے چاروں طرف روشنی ہوگی ظلمت اس کے کسی طرف بھی نہیں ہوسکتی ؛

ع ۳۲۹۵ اعمال اور جزا کا تعلق: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافق ظلمت میں ہونگے روایات میں ہے کہ پہلے انہیں نور دیا جائیگا لیکن جب صراط پر جائیں گے تو بجھا دیا جائیگا یہ بھی جزاء وفاقا کا رنگ ہے۔ وہ پہلے ایمان لائے مگر صراط مستقیم پر نہ چلے ویسا ہی معاملہ ان سے قیامت میں ہوگا اور ان کا مومنوں سے نور مانگنا اور مومنوں کا جواب سب ان کے انہیں اعمال کی طرف اشارہ ہے۔ ارجعوا وراءکم یعنی یہ نور تو بذریعہ اعمال دنیا میں ہی مل سکتا تھا۔ اور درمیان میں دیوار کا حائل ہوجانا یا روک کا یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ ان کا تعلق باہم منقطع ہوجائیگا۔ جس طرح دنیا میں انہوں نے منقطع کر دیا تھا اور اس دیوار میں دروازہ بتاتا ہے کہ اس دروازہ سے وہ آخر کار داخل ہوجائیں گے مگر جب تک کہ اپنے اعمال کی پاداش نہ حاصل کرلیں اس وقت تک نہیں یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت اور نار میں فرق بھی صرف ایک دیوار کا ہے حالانکہ ایک اعلیٰ علیین پر ہے اور دوسرا اسفل السافلین میں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور دوزخ کے بیان میں ظاہری بلندی اور پستی مراد نہیں۔ ایک ہی دیوار درمیان میں ہے ادھر عذاب ہے ادھر رحمت اور یہ وہی دیوار ہے جسے انسان اپنے اعمال سے کھڑا کر لیتا ہے پھر ایک دفعہ اسے نور کہا تو دوسری دفعہ اسے رحمت اور جنت قرار دیا۔ اور جسے پہلے ظلمت قرار دیا اسی کو بعد میں عذاب جہنم سے تعبیر کیا ؛

ع ۳۲۹۶ آگ یا دوزخ کو یہاں کفار اور منافقین کا مولیٰ یا مددگار کہا ہے۔ اور اس طرح صاف بتا دیا ہے کہ دوزخ اُن کے لیے بطور علاج ہے گویا ایک ایسا علاج ہے جو ان کے لیے دکھ کا موجب ہے مگر وہ اس قابل نہیں رہے کہ جب تک آگ کے ذریعہ سے ان کی آلایشوں کو صاف نہ کیا جائے وہ جنت میں یا خدائے قدوس کے حضور میں حاضر ہوسکیں ؛

الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۱۶﴾

جنھیں پہلے کتاب دی گئی پھر ان پر لمبا زمانہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں ۳۲۹۷

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷﴾

جان لو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرے گا، ہم نے تمہارے لیے آیتیں کھول کر بیان کر دی ہیں تاکہ تم عقل سے کام لو۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۸﴾

صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور (جو) اللہ تعالیٰ کے لیے اچھا مال الگ کرتے ہیں، ان کے لیے بڑھایا جائے گا اور ان کے لیے عزت والا اجر ہے ۳۲۹۸

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖۗ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۹﴾ ع ۱۹ ۱۸

اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے یہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں ان کے لیے ان کا اجر اور ان کا نور ہے، اور جو لوگ انکار کرتے ہیں اور ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں، وہ دوزخ والے ہیں ۳۲۹۹

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ

جان لو کہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشا اور زینت اور

۳۲۹۷ مسلمانوں کی آیندہ حالت کا نقشہ: مقاتل اور کلبی نے اس آیت کو منافقین کے متعلق سمجھا ہے مگر یہ صحیح نہیں (ر) اور ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ مکہ کی تکلیفات کے بعد مدینہ میں صحابہ کو کچھ آسودگی میسر آگئی تھی اس لیے اس آیت کا نزول ہوا (ر) اور یہ بالبداہت غلط ہے مدینہ میں آکر مکہ سے زیادہ تکلیفات کا شکار انہیں ہونا پڑا اس کے بالمقابل ابن جریر نے قتادہ کی روایت بیان کی ہے جس میں شداد بن اوس کا قول ہے اول مایرفع من الناس الخشوع سب سے پہلے لوگوں سے خشوع اٹھایا جائے گا جس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس آیت کو آیندہ زمانہ پر لگایا جب لوگوں کے درمیان میں سے خشوع اٹھ جائے اور قرآن کریم کے کھلے الفاظ اسی نتیجہ کے موید ہیں۔ اس لیے کہ یہاں طال علیہم کا ذکر اہل کتاب کے متعلق ہے یعنی ان کے دل ایک لمبا زمانہ گذرنے کے بعد سخت ہوئے تھے تو اسی حالت سے مسلمانوں کو ڈرایا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی لمبا زمانہ گذر جائے تو تمہارے دل سخت ہو جائیں۔ اور الم یان میں کچھ مصائب کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے یعنی اس قدر مصائب اور تکالیف کو اٹھا کر بھی تمہیں سمجھ آئیگا یا نہیں۔ کہ پہلی ضرورت ذکر اللہ اور قرآن کے آگے اپنے آپ کو جھکانا ہے۔ اور یہی وہ بات ہے جس کی طرف آج مسلمانوں کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے :

۳۲۹۸ مُصَّدِّق اصل میں مُتَصَدِّق ہے یعنی صدقہ دینے والا۔ خدا کی راہ میں دینے کو مشکلات کا علاج بنایا ہے۔

۳۲۹۹ دین کے لیے بھاگنے والوں کا حضرت عیسیٰ کے ساتھ ہونا: اٰمنوا باللہ ورسلہ سے مراد یہاں کامل الایمان لوگ ہیں جو دین کے مقابل پر کسی چیز کی پروا نہیں کرتے چنانچہ ابو درداء سے ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا من فر بدینہ من ارض الی ارض مخافۃ الفتنۃ علی نفسہ ودینہ کتب عند اللہ صدیقا فاذا مات قبضہ اللہ شہیدا ثم تلا ھذہ الایۃ ..... ثم قال ھذہ فیھم ثم قال والفارون بدینھم من ارض الی ارض یوم القیمۃ مع عیسی بن مریم فی درجتہ فی الجنۃ یعنی جو شخص اپنے نفس اور دین پر فتنہ کے خوف سے اپنے دین کو لے کر ایک ملک سے دوسرے ملک کو بھاگتا ہے۔ وہ اللہ کے نزدیک صدیق لکھا جاتا ہے اور جب مرتا ہے تو اللہ اسے شہید کے طور پر قبض کرتا ہے پھر آپ نے یہ آیت پڑھی والذین اٰمنوا باللہ ورسلہ اور فرمایا یہ انہی کے بارہ میں ہے پھر فرمایا اور اپنے دین کو لے کر ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف بھاگنے والے قیامت کے دن عیسیٰ بن مریم کے ساتھ ان کے جنت کے درجہ میں ہونگے معلوم ہوا حضرت عیسیٰ بھی اپنے دین کو لے کر ملک شام سے بھاگ گئے تھے :

لَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًاؕ وَفِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾

آپس میں فخر کرنا اور مال اور اولاد میں ایک دوسرے پر کثرت چاہتا ہے ، بارش کی مثال کی طرح جس کا سبزہ کسانوں کو خوش لگتا ہے ۔ پھر وہ خشک ہو جاتا ہے تو اسے زرد دیکھتا ہے پھر وہ چورا چورا ہو جاتا ہے اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رضا ، اور دنیا کی زندگی صرف دھوکے کا سامان ہے ۲۳۰۰

سَابِقُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۱﴾

اپنے رب کی مغفرت کی طرف سبقت کرو اور اس جنت کی طرف جس کی فراخی آسمان اور زمین کی فراخی کی طرح ہے وہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ۔

مَاۤ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَاؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۲۲﴾ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ﴿۲۳﴾

کوئی مصیبت زمین میں نہیں پہنچتی ہے اور نہ تمھاری اپنی جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں ہوتی ہے ، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں یہ اللہ تعالیٰ پر آسان ہے ۲۳۰۱ تاکہ تم اس پر غم نہ کھاؤ جو تم سے جاتا رہا اور نہ اس پر اِتراؤ جو تمھیں دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی متکبر فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا ۔

۲۳۰۰ تکاثر ۔ کثرۃ اور قِلّۃ کا استعمال کمیت منفصلہ مثلاً اعداد وغیرہ میں ہوتا ہے اور فاکھۃ کثیرۃ (الزخرف ۔ ۷۳) میں صرف کثرت عدد کی طرف اشارہ نہیں بلکہ فضیلت کی طرف بھی اور مکاثرۃ اور تکاثر کثرت مال اور عزت میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش ہے الھٰکم التکاثر (التکاثر ۔ ۱) اور انا اعطینٰک الکوثر میں کہا گیا ہے کہ وہ جنت میں ایک نہر ہے جس سے نہریں نکلتی ہیں اور کہا گیا ہے بلکہ وہ خیر کثیر ہے جو نبی صلعم کو دی گئی ۔ اور سخی آدمی کو بھی کوثر کہا جاتا ہے (رغ) اور استکثار اپنے لیے کسی چیز کی کثرت چاہنا ہے ولا تمنن تستکثر (المدثر ۔ ۶)

یہ دنیا کی زندگی کو غرض بنا لینے کے نتائج ہیں اس لیے آخر پر فرمایا کہ آخرت میں سخت عذاب ہے کیونکہ یہاں آخرت کے لیے کوئی تیاری نہیں کی اور اس کے مقابل پر مغفرت اور رضا کا ذکر کیا کہ یہ اس کے لیے ہے جو آخرت کو غرض بناتا ہے آج ان الفاظ کو بالخصوص سامنے رکھنے کی ضرورت ہے ۔ جب چاروں طرف یہی لہو ولعب اور تفاخر اور تکاثر کا نظارہ نظر آتا ہے ؁

۲۳۰۱ آخری زمانہ میں مصائب اہل اسلام : کتاب سے مراد علم الٰہی ہے اور نبراھا کی ضمیر مصیبت کی طرف جاتی ہے اور ہر مصیبت کے کتاب میں ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ بعض اسباب کا نتیجہ ہے ۔ ان اسباب کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور فی الارض سے مراد قحط زلزلے وغیرہ لیے گئے ہیں اور فی انفسکم سے مراد بیماریاں وغیرہ مگر ہو سکتا ہے کہ یہاں خطاب مسلمانوں کو ہے اور مراد فی الارض سے دنیا کی اور قوموں کی مصائب ہیں اور فی انفسکم سے مسلمانوں کی مصائب اور دیلمی میں ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا سیفتح علی اُمتی باب من القدر فی اٰخر الزمان لا یسدہ شئ ۔ یکفیکم منہ ان تلقوہ بھٰذہ الاٰیۃ (م) یعنی میری اُمت پر ایک مصائب کا دروازہ آخری زمانہ میں کھولا جائے گا ۔ اسے کوئی چیز نہیں روک سکے گی تمہارے لیے

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾

جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں اور جو پھر جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، تعریف کیا گیا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾ ع ١٩

ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری، تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اتارا، اس میں شدّت کی سختی ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں اور تاکہ اللہ تعالیٰ جان لے کون اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب میں مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ قوت والا غالب ہے ٣٣٠٢ء

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور ہم نے ہی نوحؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب (کے سلسلہ) کو رکھا، سو ان میں سے کچھ ہدایت پر ہیں اور بہت سے ان میں سے نافرمان ہیں۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ۬ وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ رَهْبَانِيَّةَ ا۟بْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا

پھر ہم نے ان کے قدموں پر ان کے پیچھے (اور) رسول بھیجے اور (سب سے) پیچھے عیسیٰؑ بن مریم کو بھیجا اور اُسے انجیل دی ــــ اور ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے اس کی پیروی کی مہربانی اور رحم ڈالا۔ اور رہبانیت انھوں نے خود نکالی ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا، مگر اللہ کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے (نکالی) پر اس کی وہ

کافی ہوگا کہ اس آیت ما اصاب من مصیبۃ سے اس کا مقابلہ کرو جس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے۔ کہ یہ آیت آخری زمانہ کے متعلق ایک پیشگوئی اپنے اندر رکھتی ہے اور فی الحقیقت آج کے مسلمانوں کے مصائب مفصل احادیث نبوی میں موجود ہیں اور اس آیت میں تسلی ہے ؛

شگون لینا جائز نہیں: اور امام احمد کی حدیث میں ہے کہ دو شخص حضرت عائشہ پر داخل ہوئے اور عرض کیا کہ ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کہا کرتے تھے کہ عورت اور چارپائے اور گھر میں شگون ہے تو انہوں نے کہا یہ نہیں بلکہ آپ یوں فرمایا کرتے تھے کہ اہل جاہلیت کہا کرتے تھے کہ ان چیزوں میں شگون ہے اور آپ نے یہ آیت پڑھی ؛

٣٣٠٢ء میزان سے مراد یہاں عدل ہے (ج) رسولوں کے ساتھ کتاب بھیجی جس میں احکام اور شرایع ہیں اور ان کے ساتھ عدل کو نازل کیا۔ یعنی اس کتاب کو ٹھیک طور پر استعمال کرنے کا طریق دونوں کی غرض بتائی کہ لوگ انصاف پر قایم ہوں اگر صرف احکام ہوتے یعنی کتاب اور اس کے ساتھ میزان نہ ہوتی تو بھی لوگ اس پر عمل نہ کر سکتے اس لیے کہ انہیں علم نہ ہوتا کہ کس حکم پر کس حد تک اور کن حالات میں عملدرآمد کرنا ہے، رسول کا اس پر عمل کر کے دکھانا گویا ایک میزان قائم کر دینا ہے۔ پس میزان اصل میں رسول کا نمونہ ہے اور اس کے ساتھ لوہے کا ذکر کیا یعنی لوگ اس کی مخالفت کرتے اور تلوار سے اسے نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔ یہی منشا ہے لیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب کا اور اس نصرت کو جو مومن ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کے دین کی کرتے ہیں بالغیب اس لیے کہا کہ اس وقت تو غلبہ کفر کا ہی ہوتا ہے اور حق کی کامیابی محض ایک ایمانی بات ہوتی ہے اور لوہے کے اتارنے کا یہ منشا نہیں کہ حضرت آدم کے ساتھ کچھ اوزار نازل ہوئے تھے۔ بلکہ زمین میں لوہے کا پیدا کرنا مراد ہے ؛

دَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾

نگہداشت نہ کر سکے جو اس کی نگہداشت کا حق تھا۔ سو ہم نے ان میں سے ان لوگوں کو جو ایمان لائے ان کا اجر دیا۔ اور بہت سے ان میں سے نافرمان ہیں ۳۳۰۳

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ کرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ تا کہ وہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصّے دے اور تمہارے لیے نور پیدا کر دے جس سے تم چلو اور تمہاری مغفرت کرے اور اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۳۳۰۴

لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا

تاکہ اہل کتاب یہ نہ سمجھیں کہ وہ (مسلمان) اللہ تعالیٰ کے فضل میں سے

۳۳۰۳ بدعت رہبانیت: علیٰ اٰثارھم میں ضمیر نوح اور ابراہیم کی طرف ہی ہے اور تثنیہ کی بجائے جمع ضمیر لانے میں اشارہ دیگران کے ہمعصر رسولوں کی طرف ہے جیسے کہ حضرت ابراہیم کے ساتھ لوط تھے۔ اور قفینا بعیسی ابن مریم لاکر بتا دیا کہ ان تمام رسولوں کا عیسیٰ بن مریم پر خاتمہ کر دیا گویا یوں فرمایا کہ رسول کے بعد رسول بھیجتے رہے یہاں تک کہ عیسیٰ پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور اس کے پیروؤں کے دلوں میں مہربانی اور رحم کا خصوصیت سے ذکر کیا۔ (اور یوں صحابہ کی صفت میں بھی ہے رحماء بینھم) اس لیے کہ ان کی تعلیم میں صرف اس ایک پہلو پر ہی زور تھا۔ گویا ان کی تعلیم صرف ایک شاخ قوائے انسانی کی پرورش کیلئے تھی اور یوں بتا دیا کہ یہ سب مقامی اور وقتی تعلیمات تھیں اور پھر ان کی رہبانیت کا ذکر کیا جو انہوں نے بطور بدعت اختیار کر لی یعنی نرمی اور محبت کی تعلیم تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے مگر یہ کبھی اس نے کسی قوم کو تعلیم نہیں دی کہ علایق دنیوی سے بکلی منقطع ہو کر عبادت میں مصروف ہو جائیں اور لا ابتغاء رضوان اللہ میں الّا استثنائے منقطع ہے یعنی یہ بدعت حصول رضائے الٰہی کے لیے تھی۔ مسلمانوں نے بھی اس قسم کی بہت سی بدعات نکالی ہیں جیسے مختلف قسم کے اذکار اور چلے جن کا کتاب و سنت میں کوئی نام و نشان نہیں۔ اور نہ رسول اللہ صلعم کے عمل میں ان کا پتہ ملتا ہے۔ مگر ان کی غرض بھی تزکیہ نفس ہی تھی اور فما رعوھا حق رعایتھا میں بتایا کہ ایسی باتیں جو لوگ ایجاد کر لیتے ہیں تو پھر ان پر قایم نہیں رہ سکتے۔ اور انجام کار ان کا نقصان بہ نسبت ان کے نفع کے بڑھ جاتا ہے۔ اگر کچھ لوگ ان سے فائدہ اٹھا کر منھم مھتد کا مصداق ہوتے ہیں۔ تو کثیر حصہ فسق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رہبانیت کا انجام بھی یہی ہوا کہ ایک طرف تو خود رہبانیت اختیار کرنے والے گو چند آدمی زہد و عبادت میں ترقی کر گئے مگر کثیر حصہ اسی رہبانیت کی وجہ سے خطرناک فسق و فجور میں مبتلا ہوا جس کا اعتراف خود عیسائیوں کو ہے اور دوسری طرف کثیر حصہ جو دنیوی مشاغل کو ترک نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی زندگیوں میں مذہب برائے نام باقی رہ گیا۔ اور وہ بھی فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے:

اسلام میں بدعت کیا ہے: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بدعت گو حصول رضائے الٰہی کے لیے ہی ہو مگر نتیجہ اس کا اچھا نہیں ہو سکتا۔ اور بدعت محض ہر ایک ایسے کام کا نام نہیں جو رسول اللہ صلعم نے نہ کیا ہو۔ بلکہ کسی ایسی بات یا کسی ایسی رسم کو دین کا جزو قرار دینا ہے جو کتاب یا سنت نبوی سے ثابت نہ ہو۔ مثلاً بعض بزرگوں نے بدعت کی تعریف کو وسعت دیتے ہوئے رد ملاحدہ وغیرہ کو اور تصنیف کتب علم اور بنائے مدارس کو بھی بدعت میں داخل کیا ہے اور پھر اسے بدعت کی واجب اور مندوب قسم قرار دیا ہے اور بعض نے مختلف اقسام کے کھانوں یا لباس کو بدعت قرار دے کر پھر اسے بدعت کی قسم مباح قرار دیا ہے ایسا ہی بعض لوگ خطبہ جمعہ میں سامعین کی زبان میں وعظ کرنے کو بدعت سمجھتے ہیں۔ اب باطل کا رد کرنا خواہ کسی جائز طریق پر ہو نہ صرف بدعت نہیں بلکہ اولین فرض ہر مسلم کا ہے۔ رسول اللہ صلعم خود ساری عمر رد باطل کرتے رہے اور اس رد کرنے میں کوئی تقریر کرے یا کتاب لکھے اس سے فرق نہیں پڑتا ایسا ہی خطبہ جمعہ میں وعظ رسول اللہ صلعم کرتے تھے اور اس کی غرض سامعین کو فائدہ پہنچانا تھا اب اگر کوئی خطیب عربی زبان میں خطبہ پڑھ چھوڑتا ہے تو وہ خطبہ کی اصل غرض سے بے خبر ہے اور خطبہ کا حق وہی ادا کرتا ہے جو سامعین کو وعظ سناتا ہے اور اس کے لیے ان کی زبان میں تقریر کرنا ضروری ہے رہا یہ سوال کہ کوئی شخص کونسا کھاتا ہے یا کس طرح کھاتا ہے یا کونسا لباس پہنتا ہے یا کس مکان میں رہتا ہے ان پر بدعات کا نام نہیں آ سکتا۔ اور کل بدعۃ ضلالۃ کا ارشاد صحیح ہے اور حضرت عمر کا یہ قول نماز تراویح کے متعلق نعمت البدعۃ ھٰذہ بطور فرض معلوم ہوتا ہے۔ یعنی تم اگر اسے بدعت کہو تو یہ اچھی بدعت ہے کیونکہ صلوٰۃ تراویح کا اصل برنگ تہجد شریعت میں موجود ہے۔ اور یہ بھی حدیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم رمضان میں نماز تہجد کا خاص اہتمام فرماتے تھے اس لیے حضرت عمرؓ نے اس کی اہمیت کی خاطر اسے اول شب میں کر دیا تاکہ جو لوگ پچھلے وقت نماز کے لیے اٹھ نہیں سکتے وہ بالکل محروم نہ رہ جائیں اور اس کی ایک نظیر خود وتروں میں موجود ہے جو حالانکہ اصل میں نماز تہجد کا ہی حصہ ہے۔ مگر عام لوگوں کی خاطر اسے اول شب میں رکھ دیا گیا۔ اور اس کا اول شب میں رکھنا خود رسول اللہ صلعم کا فعل ہے۔ پس نماز تراویح بدعت نہیں البتہ افضل یہی ہے کہ رمضان میں نماز تہجد کا خاص تعاہد کیا جائے:

۳۳۰۴ کفلین سے مراد کفل دنیا اور کفل آخرت ہیں۔ چونکہ اوپر عیسائیوں کا ذکر تھا جنہوں نے رہبانیت اختیار کی۔ تو یہاں بتایا کہ مسلمان اگر تعلیم قرآن پر

يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ کسی چیز پر دسترس نہیں رکھتے ۔ اور فضل اللہ تعالیٰ
وَ اَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے ،
مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾ ع ۴ ۲۰ اور اللہ (تعالیٰ) بڑے فضل والا ہے ۳۲۰۵

چاہیں تو وہ دین ودنیا دونوں کو اپنے اندر جمع کریں گے ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ ۔

۳۲۰۵ لئلا یہاں لِکَیْ کے معنی میں ہے کیونکہ عرب ہر کلام میں لا کو بطور صلہ داخل کرتے ہیں جس کے اول اور آخر میں انکار ہو اور غرض اس کی تصریح ہوتی ہے جیسے ما منعک الا تسجد اذ امرتک (الاعراف ۔ ۱۲) وحرام علی قریۃ اھلکنھا انھم لا یرجعون (الانبیاء ۔ ۹۵) (ج)

سُوْرَةُ الْمُجَادَلَةِ مَدَنِيَّةٌ (۵۸)

اٰیاتھا ۲۲ — رکوعاتھا ۳

نام: اس سورت کا نام المجادلۃ ہے اور اس میں تین رکوع اور بائیس آیتیں ہیں یہ نام اس سورت کا ایک مسلمان عورت کے آنحضرت صلعم کے ساتھ مجادلہ سے لیا گیا ہے مگر صدر سورت میں اس کا ذکر کر کے باقی ساری سورت میں مخالفین کی منصوبہ بازیوں اور شرارتوں کا ذکر ہے ۔ اور یہ دو گروہ ہیں ایک یہودی اور ایک منافق اور یہ دونوں اندرونی دشمن اسلام تھے کیونکہ یہود نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کیا ہوا تھا ۔ اور منافق برائے نام مسلمان کہلاتے تھے اور یہ ذکر مقابلہ کے رنگ میں ہے ایک عورت بھی رسول اللہ صلعم سے جھگڑتی ہے ۔ مگر اس کے جھگڑے کی اللہ تعالیٰ اس قدر عزت کرتا ہے کہ فرماتا ہے کہ اس کی بات کو ہم نے سن لیا ۔ اس لیے کہ وہ حق پر جھگڑتی ہے مگر منافق اور یہودی ناحق پر جھگڑا کرتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ ذلیل ہونگے اور اللہ کا رسول غالب آئیگا ۔ اور پچھلی سورت میں جو ذکر کیا تھا یہاں اس کو زیادہ واضح کر دیا ہے ۔ اس سورت کے نزول کے زمانہ کے متعلق اس قدر وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ مدنی ہے اور سورۂ احزاب سے پہلے کی ہے ۔ کیونکہ سورۂ احزاب کے صدر میں بھی ظہار کا ذکر ہے اور اس میں بھی اور یہاں جو ذکر ہے ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ احزاب والا حکم ابھی نازل نہ ہوا تھا ۔ اور چونکہ سورۂ احزاب کا نزول چوتھے سال ہجرت سے شروع ہوتا ہے ۔ اس لیے یہ سورت اس سے پیشتر کی ہے ؎

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

قَدۡ سَمِعَ اللّٰہُ قَوۡلَ الَّتِیۡ تُجَادِلُکَ فِیۡ زَوۡجِہَا وَ تَشۡتَکِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ٭ۖ وَ اللّٰہُ یَسۡمَعُ تَحَاوُرَکُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ ﴿۱﴾

اَلَّذِیۡنَ یُظٰہِرُوۡنَ مِنۡکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِہِمۡ مَّا ہُنَّ اُمَّہٰتِہِمۡ ؕ اِنۡ اُمَّہٰتُہُمۡ اِلَّا الّٰٓیِٴۡ وَلَدۡنَہُمۡ ؕ وَ اِنَّہُمۡ لَیَقُوۡلُوۡنَ مُنۡکَرًا مِّنَ الۡقَوۡلِ وَ زُوۡرًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوۡرٌ ﴿۲﴾

وَ الَّذِیۡنَ یُظٰہِرُوۡنَ مِنۡ نِّسَآئِہِمۡ ثُمَّ یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا قَالُوۡا فَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَۃٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِکُمۡ تُوۡعَظُوۡنَ بِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۳﴾

فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ فَصِیَامُ شَہۡرَیۡنِ

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اللہ تعالیٰ نے اس (عورت) کی بات سُن لی، جو تجھ سے اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑتی تھی، اور اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتی تھی، اور اللہ تعالیٰ تم دونوں کی گفتگو سُن رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے ۲۴۰۵

تم میں جو لوگ اپنی عورتوں کو مائیں کہہ دیتے ہیں، وہ اُن کی مائیں نہیں، ان کی مائیں صرف وہی ہیں جنھوں نے انھیں جنا، اور وہ بیہودہ بات اور جھوٹ کہتے ہیں۔ اور اللہ (تعالیٰ) یقیناً معاف کرنے والا اور مغفرت کرنے والا ہے

اور جو لوگ اپنی عورتوں کو مائیں کہہ دیتے ہیں پھر اس کی طرف واپس لوٹتے ہیں جو کہا تھا، تو ایک غلام کا آزاد کرنا ہے، اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو چھوئیں، اس کے ساتھ تمھیں وعظ کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے ۲۴۰۶

پھر جو کوئی (غلام) نہ پائے تو دو مہینے کے پے بہ پے روزے

۲۴۰۵ خولہ بنت ثعلبہ کا واقعہ: ان چار آیات کا نزول خولہ (یا خویلہ جو اس کی تصغیر ہے) بنت ثعلبہ کے متعلق ہے۔ اور یہ کسی قدر اختلاف کے ساتھ متعدد روایات میں ہے ان کا خاوند اوس بن صامت بوڑھا آدمی تھا۔ اور طبیعت میں کچھ بد خلقی آگئی تھی۔ کسی بات پر ناراض ہو کر بی بی سے ظہار کیا اور جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جب بی بی کو ماں کہہ دیا جاتا تو وہ اس پر قطعاً حرام ہو جاتی {اور سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ ایلاء اور ظہار دونوں جاہلیت میں طلاقیں تھیں (رف)} اور ان کا بال بچہ بہت تھا۔ تب وہ بی بی رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنا ماجرا بیان کیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں یہی سمجھتا ہوں کہ تو اس پر حرام ہو گئی (یہ بعض روایات کے الفاظ ہیں بعض میں لفظ کچھ اور ہیں) اس پر وہ بار بار عرض کرتی رہی کہ میرے بچے چھوٹے چھوٹے ہیں اسی حالت میں رسول اللہ صلعم پر حالت وحی طاری ہوئی جب وہ حالت جاتی رہی تو آپ نے اسے بلا کر یہ آیات سنائیں اس مسئلہ کا ذکر اگلی آیت میں ہے ؛

انسان اور خدا میں عرض و معروض کے لیے کوئی واسطہ بکار نہیں: یہ آیات بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کی بات کو سنتا ہے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تک بات پہنچانے کے لیے درمیان میں کوئی واسطہ ہونا چاہیے وہ سخت غلطی پر ہیں۔ یہاں خود رسول اللہ صلعم سے ایک معمولی عورت بحث کر رہی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا کہ ہم نے اس کی بات کو سُن لیا۔ تو اس میں عاجز سے عاجز اور گنہگار سے گنہگار بندے کے لیے خوشخبری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو بھی سننے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ خولہ جیسا دل رضائے مولیٰ کا طالب اس کے سینہ میں ہو حضرت عمر کے عہد میں یہی بی بی ایک دفعہ رستے میں انہیں مل گئیں۔ جب بہت سے معزز آدمی آپ کے ساتھ تھے اس کے خطاب کرنے پر آپ ایک طرف اس کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھکر باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ بہت دیر ہو گئی آخر جب وہ گئی تو ایک شخص نے کہا اے امیر المومنین ایک بڑھیا کی خاطر آپ نے اتنے بڑے بڑے آدمیوں کو روک رکھا آپ نے اسے ملامت کی اور فرمایا یہ وہی خولہ ہے جس کی بات کو اللہ تعالیٰ نے سنا ؛

۲۴۰۶ ممانعت ظہار: ثم یعودون لما قالوا۔ یعنی اول تو اسے ماں کہا پھر لوٹ کر اس سے بی بی کا تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں۔ گویا جس چیز کو اپنے اوپر حرام کر دیا تھا اب اس کی طرف لوٹتے ہیں تو اس کا کفارہ ایک غلام کا آزاد کرنا ہے وہ نہ کر سکے تو ساٹھ روزے، وہ نہ ہو سکے تو ساٹھ مسکینوں کا کھانا جیسا کہ اگلی آیت میں ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ظہار سے روکتا ہے اور جو شخص ظہار کرتا ہے اس کے لیے یہ خاص سزا مقرر کی ہے اور سزا انہی افعال پر دی جاتی ہے جن کا روکنا مد نظر ہو۔ اور پھر اسے منکر اور زور بھی کہا پس کسی مسلمان کا اپنی بی بی کو ماں کہنا تعلیم اسلامی کی رو سے ناجائز ہے آیت ۵ سے بھی یہی ظاہر ہے۔ اس لیے کہ وہاں اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کا ذکر ہے تو گویا اسے بھی مخالفت حکم الٰہی قرار دیا ہے ؛

مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٤﴾

ہیں، اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو چھوئیں۔ پھر جسے (یہ) طاقت نہ ہو، تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ اس لیے کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور یہ اللہ تعالیٰ کی (قائم کردہ) حدّیں ہیں۔ اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ قَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۚ﴿٥﴾

جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں ذلیل کیے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے (مخالفتِ حق کرنے والے) ذلیل کیے گئے اور ہم نے تو کھلے حکم اتار دیئے ہیں اور کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔۳۳۰۷

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿٦﴾ ع

جس دن اللہ تعالیٰ ان سب کو اُٹھائے گا، پھر انھیں اس کی خبر دے گا جو انھوں نے کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا ہے اور وہ اسے بھول گئے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَ لَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَ لَاۤ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٧﴾

کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے کوئی تین خفیہ مشورہ کرنے والے نہیں ہوتے مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ مگر وہ ان کا چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم ہوتے ہیں اور نہ زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں وہ ہوں پھر انھیں قیامت کے دن اس کی خبر دے گا جو انھوں نے کیا۔ اللہ (تعالیٰ) ہر چیز کو جاننے والا ہے۔۳۳۰۸

۳۳۰۷۔ یہ قرآن کریم کی نہایت ہی لطیف طرز انتقال مضمون کی ہے۔ شروع سورت کو یہاں سے کیا تھا کہ ایک عورت اپنے خاوند کے بارہ میں تجھ سے جھگڑتی ہے اسی اثنا میں ان لوگوں کا ذکر کیا جو عورتوں پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں گویا یہ بھی ایک گونہ مخالفت حق ہے تو اس سے اب اس عظیم الشان مخالفت حق کی طرف انتقال مضمون کیا جو اعدائے اسلام کر رہے تھے۔

۳۳۰۸۔ ان آیات میں ان خفیہ مشوروں کا ذکر ہے۔ جو یہود اور منافقین اسلام کی بربادی کے لیے کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں صاف کر دیا اور جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا لاخیر فی کثیر من نجوٰھم (النساء۴: ۱۱۴) یعنی اُن کے خفیہ مشورے کسی بھلے کام کے لیے نہیں دیکھو ۱۷۳۱ تو یہاں ان مخالفین حق کو جو خفیہ منصوبوں سے اسلام کو تباہ کرنا چاہتے تھے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مشوروں کے حالات سے واقف ہے۔ اور ثلاثۃ اور خمسۃ چونکہ مطلق ہیں اس لیے تین افراد بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اور تین قومیں بھی اور لا ادنی من ذٰلک دوسری بات کا موید ہے کیونکہ قوموں کی حالت میں ایک یا دو قومیں بھی منصوبہ بازی اور خفیہ مشورہ کر سکتی ہیں اور آج تین قوموں نے بھی اسلام کے خلاف خفیہ مشورے کئے اور پانچ نے بھی اور اس سے کم نے بھی اور زیادہ نے بھی گو زیادہ تر تین اور پانچ کے ہی رہے مگر اسلام کا کچھ بگاڑ سکے اور جسے اپنی طرف سے مار چکے تھے اسے اعجازی زندگی اللہ تعالیٰ نے دوبارہ عطا فرمائی اور اسلام کا نام پہلے سے بڑھ کر روشن ہوا تین اور پانچ کے خاص عدد اختیار کرنے میں اسی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۫ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ؕ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۸﴾

کیا تو نے انھیں نہیں دیکھا، جنھیں خفیہ مشورے سے روکا گیا پھر وہ لوٹ کر اس کی طرف جاتے ہیں، جس سے روکے گئے اور گناہ اور زیادتی اور رسولؐ کی نافرمانی کا خفیہ مشورہ کرتے ہیں اور جب تیرے پاس آتے ہیں۔ تو تجھے اس (کلمہ) سے دعا دیتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے تجھے دعا نہیں دی اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کیوں ہمیں اس پر عذاب نہیں دیتا جو ہم کہتے ہیں ان کے لیے دوزخ کافی ہے وہ اس میں داخل ہونگے سو وہ بُری جگہ ہے ۳۳۰۹

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تم الگ ہو کر بات چیت کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی بات چیت نہ کرو، اور نیکی اور تقویٰ کی بات چیت کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کا تقوےٰ کرو جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے۔

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰﴾

(یہ) خفیہ مشورہ شیطان کی طرف سے ہے تاکہ انھیں غم میں ڈالے جو ایمان لائے اور وہ (مشورہ) سوائے اللہ کے اذن کے انھیں کوئی نقصان پہنچانے والا نہیں اور اللہ تعالیٰ پر ہی چاہیئے کہ مومن بھروسا کریں ۳۳۱۰

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تمھیں کہا جائے کہ مجلسوں میں کھُل کر بیٹھو، تو کھل جایا کرو، تاکہ اللہ تعالیٰ تمھیں فراخی دے۔ اور جب کہا جائے اُٹھ جاؤ، تو اُٹھ جایا کرو۔ تا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے درجات بلند کرے جو تم میں سے ایمان لائے اور وہ جنھیں علم دیا گیا، اور اللہ (تعالیٰ) اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے ۳۳۱۱

ع ۳۳۰۹ حضرت عائشہ کی روایت بخاری مسلم وغیرہما میں ہے کہ کچھ یہودی رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بجائے السلام علیک کے کہا السام علیک۔ جس کے معنی ہیں تجھ پر موت آئے تو حضرت عائشہ نے کہا علیکم السام ولعنکم اللہ وغضب علیکم۔ تم پر موت آئے اور اللہ کی لعنت ہو اور اس کا غضب ہو۔ تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اے عائشہ اللہ تعالیٰ اس قسم کی لعنت گوئی کو پسند نہیں کرتا اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ یہودی رسول اللہ صلعم کے پاس آتے تو السام علیك ہی کہا کرتے تھے (ر) اس سے صاف معلوم ہوا کہ ان آیات میں یہودیوں کا ذکر ہے اور یہ لوگ منافقوں کے ساتھ مل کر اسلام کی تباہی کے لیے خفیہ مشورے کیا کرتے تھے۔ اور بما لم یحیك به اللّٰه میں اس دعا کی طرف اشارہ ہے جو تشہد میں ہے السلام علیك ایها النبی و رحمة اللّٰه وبركاته جو تحیۃ من جانب اللہ ہے۔

ع ۳۳۱۰ یہاں صاف بتا دیا کہ یہ خفیہ مشورے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے تھے اور اسی لیے انہیں شیطان کی طرف منسوب کیا ہے۔

ع ۳۳۱۱ تفسحوا۔ فَسِیۡح وسیع مکان کو کہتے ہیں اور تَفَسُّح کے معنی توسع یا کشادہ ہو جانا ہیں؛

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ
الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ
صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ
فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾
ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ
نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا
وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ
وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ ع
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ
وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾
اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ اِنَّهُمْ
سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم رسولؐ سے علیحدہ بات چیت کرو، تو اپنے مشورے سے پہلے صدقہ دے لیا کرو۔ یہ تمھارے لیے بہتر اور زیادہ پاکیزگی کا موجب ہے۔ پھر اگر تم نہ پاؤ تو اللہ تعالیٰ مغفرت والا رحم کرنیوالا ہے۔

کیا تم ڈر گئے کہ اپنے مشورہ سے پہلے صدقہ دیا کرو، تو جب تم نے (ایسا) نہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے تم پر رجوع برحمت کیا ہے، تو نماز کو قائم کرو، اور زکوٰۃ دو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور اللہ تعالیٰ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو ۳۳۱۲

کیا تو نے انھیں نہیں دیکھا جو اُن لوگوں سے دوستی گانٹھتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ ناراض ہے، نہ وہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے اور وہ جھوٹ پر قسمیں اُٹھاتے ہیں اور وہ جانتے ہیں ۳۳۱۳

ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے سخت عذاب تیار کیا ہے۔ بُرا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

مجالس۔ جَلَسَ کے معنی بیٹھا اور مَجْلِس اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں انسان بیٹھتا ہے۔

آداب مجلس: اوپر اعدائے اسلام کے خفیہ منصوبوں کا ذکر تھا اور یہاں آداب مجلس میں ایک بات کا ذکر کر دیا ہے۔ یعنی مجلس میں اپنے بھائیوں کے آرام کا خیال رکھنا۔ اور دوسروں کی خاطر خود تکلیف اٹھالینا۔ تو وجہ تعلق یہ ہے کہ جب ان مجالس خفیہ کا ذکر کیا جہاں گناہ اور زیادتی اور معصیت الرسول کے مشورے ہوتے تھے۔ اور اس کے بالمقابل مومنوں کو تعلیم دی کہ جو مجالس قایم کریں نیکی اور تقوی کے قایم کرنے کے لیے کریں۔ تو اب ان مجالس میں کچھ آداب کا بھی ذکر کیا۔ اور گو یہ حکم عام ہے مگر خصوصیت سے رسول اللہ صلعم کی مجلس کا ذکر ہے جہاں کثرت سامعین کی وجہ سے اور اس شوق کی وجہ سے کہ رسول اللہ صلعم کے قریب بیٹھا جائے بھیڑ زیادہ ہو جاتی تھی۔ اور بعض نے مجالسِ قتال مراد لی ہیں جہاں شوق شہادت کی وجہ سے ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور انشزوا سے مراد بھی یا رسول اللہ صلعم کی مجلس سے اٹھ جانا ہے تاکہ آپ تنہا بھی ہو سکیں اور حسن اور قتادہ اور ضحاک کے نزدیک مراد جنگ یا نماز یا طاعت رسول کے لیے اٹھنا ہے۔ (ر) اور والذین اوتوا العلم سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلعم کی مجالس علمی کا ذکر ہے جہاں علم اور معرفت اور روحانیت کا سبق ملتا تھا۔ اور ترمذی وغیرہ نے آنحضرت صلعم سے حدیث بیان کی ہے فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلۃ البدر علی سائر الکواکب (د) عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چودھویں کے چاند کی سب ستاروں پر ؎

۳۳۱۲ اس سے پہلی آیت میں تھا کہ رسول اللہ صلعم سے مشورہ کرو تو کچھ صدقہ دے لو اور یہاں ہے کہ اگر تم نہ دو تو بھی ہرج نہیں تو کہا گیا ہے کہ پہلی آیت دوسری سے منسوخ ہے اور بعض کے نزدیک وہ آیت حکم زکوٰۃ سے منسوخ ہے پھر کوئی کہتا ہے پہلی آیت کا حکم دس دن قایم رہا تھا کوئی کہتا ہے صرف ایک گھڑی کوئی کہتا ہے عمل کرنے سے پہلے ہی اس پر خط نسخ کھینچا گیا۔ اگر غور کیا جائے تو دونوں آیتوں میں اختلاف کوئی نہیں بلکہ دوسری آیت پہلی کے مطلب کو ہی واضح کرتی ہے پہلی آیت میں صدقہ دینے کے حکم کے ساتھ ہی فرمایا فان لم تجدوا یعنی اگر نہ پاؤ تو اللہ غفور رحیم ہے اور دوسری آیت میں بھی یہی بتایا ہے کہ اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ تعالیٰ اس پر گرفت نہیں کرتا چنانچہ فاذ لم تفعلوا کے بعد ہے وتاب اللہ علیکم تو دونوں کا ماحصل ایک ہے۔ جو دینا چاہے دے دینا افضل ہے، لیکن اگر کوئی شخص نہ دے تو مواخذہ اس پر نہیں ؎

۳۳۱۳ قوماً غضب اللہ علیہم یہودی ہیں۔ اور ان سے دوستی کرنے والے منافق انہی کا ذکر پچھلے رکوع میں تھا؎

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۱۶

انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہے، پس اللہ کے رستہ سے روکتے ہیں سو ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۷

نہ ان کے مال اور نہ ہی ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے مقابل پر ان کے کسی کام آئیں گے۔ یہ آگ والے ہیں، وہ اسی میں رہیں گے۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝۱۸

جس دن اللہ تعالیٰ ان سب کو اٹھائے گا، تو اس کے سامنے بھی قسمیں کھائیں گے جس طرح تمھارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ کسی بات پر ہیں دیکھو یہ یقیناً جھوٹے ہیں۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۱۹

شیطان نے ان پر قابو پالیا ہے، سو انھیں اللہ کا ذکر بھلا دیا۔ یہ شیطان کا گروہ ہیں۔ دیکھو شیطان کا گروہ ہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ ۝۲۰

جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں، وہ سخت ذلیل لوگوں میں سے ہیں۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۲۱

اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ یقیناً میں غالب رہوں گا میں اور میرے رسول۔ اللہ تعالیٰ طاقتور غالب ہے [۳۳۱۴]

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ

تو ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہیں (ایسا) نہ پائے گا کہ وہ اس سے دوستی رکھیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے اور گو وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا اُن کے بھائی یا ان کے کنبے کے لوگ [۳۳۱۵]۔ انہی کے

۳۳۱۴۔ حق اور باطل کے مقابلہ میں آخر حق غالب آتا ہے گو یہ جد و جہد کتنے عرصہ تک جاری رہے اور یہی رسولوں کا غالب آنا ہے کیونکہ وہ حق کو قائم کرنے کے لیے ہی آتے ہیں۔ عرب میں حق محمد رسول اللہ صلعم کی زندگی میں ہی غالب آگیا۔ اور باطل نابود ہوگیا۔ خود دنیا بھی اسی حق کے آگے آہستہ آہستہ سر جھکاتی چلی جا رہی ہے۔

۳۳۱۵۔ کفار سے موالات: یؤمنون باللہ والیوم الاخر یہاں صاف بتا دیا کہ اس سے مراد صرف مسلمان ہیں اور ان الفاظ کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی مسلمان کسی کافر سے کسی قسم کا تعلق محبت کا رکھ نہیں سکتا۔ اگر یہ منشا ہوتا تو اہل کتاب کی بیبیوں سے نکاح کی اجازت کیوں دی جاتی جو جعل بینکم مودۃ ورحمۃ (الروم ۳۰ - ۲۱) کا مصداق ہوں گی۔ بلکہ کفار میں سے یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو حاد اللہ ورسولہ کا مصداق ہیں یعنی دشمنی میں دوسری حد پر چلے گئے ہیں۔ حالت جنگ میں ایک قوم کل کی کل اس کا مصداق ہو جائیگی خواہ اس کے بعض افراد اس حد پر نہ بھی ہوں مگر اس کے علاوہ ہر فرد سے علیحدہ معاملہ اس کی حالت کے مطابق ہوگا۔ اور دوسری طرف لفظ یوادون کا استعمال فرمایا ہے اور ود میں محبت کے علاوہ اس چیز کے ہونے کی خواہش کا پایا جانا ہے ع ۱۳۷ ا پس دشمنان اسلام کے ساتھ مودت نہیں ہو سکتی۔ لیکن جو لوگ اسلام کے دشمن نہیں اور اسلام کا استیصال کرنے کے درپے نہیں

فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡاِیۡمَانَ وَ اَیَّدَہُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡہُ ؕ وَ یُدۡخِلُہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ؕ اُولٰٓئِکَ حِزۡبُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۲۲﴾ ع

دلوں کے اندر (اللہ تعالیٰ نے) ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی روح سے ان کی تائید کی ہے اور وہ انھیں باغوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اُنھیں میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا گروہ ہیں سنو! اللہ (تعالیٰ) کا گروہ ہی کامیاب ہوگا ۳۳۱۶ء

ان سے تعلقات محبت یا موالات بھی ہو سکتے ہیں ؛

۳۳۱۶ء ایدھم بروح منه - روح کلام الٰہی کو بھی کہا جاتا ہے اور جبرئیل کو بھی ۱۱۱ع اور یہاں مراد جبرئیل ہی ہیں جیسا کہ آنحضرت صلعم نے حضرت حسان کو کہا تھا وروح القدس معك روح القدس تیرے ساتھ ہے اور ایک روایت میں ہے۔ وجبرئیل معك جبرئیل تیرے ساتھ ہے پس اللہ تعالیٰ حضرت جبرئیل کے ساتھ مومنوں کی تائید فرماتا ہے اور یہاں بالخصوص صحابہ کا ذکر ہے اور رضی اللہ عنہم و رضوا عنه کی سند نے اس بات کا فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ پاک جماعت انتہائی مراتب قرب الٰہی کو طے کر چکی تھی انکو برا کہنے والے اہل تشیع اور انکو ناقص قرار دینے والے ختم نبوت کے بعد اجرائے نبوت کرنے والے غور کریں ؛

سُوۡرَۃُ الۡحَشۡرِ مَدَنِیَّۃٌ (۵۹)

آیاتھا ۲۴ — رکوعاتھا ۳

تمہید سورت : اس سورت کا نام الحشر ہے اور اسے سورت بنی نضیر بھی کہا گیا ہے۔ اور اس میں تین رکوع اور چوبیس آیتیں ہیں حشر سے مراد یہاں جلا وطنی ہے اور اس سورت میں بنی نضیر کی جلا وطنی کا ذکر ہے۔ اور یہ گویا ان کی ان منصوبہ بازیوں اور شرارتوں کی سزا تھی جن کا ذکر پچھلی سورت میں ہے اور یہی وجہ تعلق ہے۔ یہ سورت مدنی ہے اور اس کا نزول چوتھے سال ہجری کا ہے۔ ربیع الاول ۴ھ میں بنی نضیر کے محاصرہ کا واقعہ پیش آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس سورت کا نزول ہوا ؛

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ①

اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

ہُوَ الَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ مِنۡ دِیَارِہِمۡ لِاَوَّلِ الۡحَشۡرِ ؕؔ مَا ظَنَنۡتُمۡ اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا وَ ظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ مَّانِعَتُہُمۡ حُصُوۡنُہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ فَاَتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ حَیۡثُ لَمۡ یَحۡتَسِبُوۡا ٭ وَ قَذَفَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الرُّعۡبَ یُخۡرِبُوۡنَ بُیُوۡتَہُمۡ بِاَیۡدِیۡہِمۡ وَ اَیۡدِی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ٭ فَاعۡتَبِرُوۡا یٰۤاُولِی الۡاَبۡصَارِ ②

وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جو کافر ہیں اپنے گھروں میں سے پہلی جلاوطنی کے لیے نکالا۔ تم خیال نہ کرتے تھے کہ وہ نکل جائیں اور وہ سمجھتے تھے کہ ان کے قلعے انھیں اللہ تعالیٰ (کی سزا) سے بچالیں گے، سو اللہ تعالیٰ ان پر وہاں سے آیا جہاں سے انھیں گمان بھی نہ تھا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے ویران کرتے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں سے بھی۔ سو اے بصیرت والو عبرت حاصل کرو[۳۳۱۷]

۳۳۱۷ بنی نضیر کی جلاوطنی کی وجہ: آنحضرت صلعم کی ہجرت کے بعد قریش مدینہ کے مختلف لوگوں سے ساز باز رکھتے اور اس ذریعہ سے اسلام کو تباہ کرنے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ ابوداؤد میں ہے کہ جنگ بدر سے پیشتر انہوں نے عبداللہ بن ابی کو خط لکھا جس میں دھمکی بھی دی کہ اگر وہ نبی کریم کے ساتھ جنگ نہ کریگا تو قریش اس پر چڑھائی کریں گے اور عبداللہ تیار بھی ہوگیا مگر نبی کریم کو وقت پر خبر پہنچ جانے کی وجہ سے اس جنگ کا سدباب ہوگیا پھر قریش نے جنگ بدر کے بعد ایسا ہی ایک خط بنو نضیر کو لکھا انہوں نے آنحضرت صلعم سے بدعہدی کرنی چاہی رسول اللہ صلعم نے ان کا محاصرہ کیا اور کہا کہ تم میرے ساتھ عہد کرو۔ (ایک عہد مدینہ آنے پر اُن سے پہلے بھی ہوا تھا مگر اس کے خلاف ان سے افعال سرزد ہونے پر آپ نے تجدید معاہدہ چاہی) مگر انہوں نے انکار کیا۔ پھر آپ بنو قریظہ کے پاس گئے اور یہی مطالبہ ان سے کیا تو انہوں نے عہد کرلیا تب آپ نے بنو نضیر کے ساتھ جنگ کی۔ یہاں تک کہ وہ مدینہ کو چھوڑ دینے پر راضی ہوگئے۔ اس شرط پر کہ جو کچھ مال و اسباب اپنے اونٹوں پر لاد کرلے جاسکیں لے جائیں لیکن دوسری روایات میں اس واقعہ کے جنگ اُحد کے بعد پیش آنے کا ذکر ہے۔ چنانچہ اصحاب مغازی کہتے ہیں کہ اصحاب بئر معونہ کے قتل کے بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ اور بئر معونہ کا واقعہ جنگ اُحد کے بعد کا ہے اور صحیح یہی معلوم ہوتا ہے اور بنی نضیر کی عداوت کا ذکر یہاں بھی صاف الفاظ میں آیت ۱۴ میں موجود ہے اور تاریخی طور پر یہ بھی ثابت ہے کہ جنگ اُحد کے بعد کعب بن اشرف چالیس سواروں کے ساتھ مکہ گیا اور اسلام کی تباہی کے لیے قریش کے ساتھ خانہ کعبہ کے پاس معاہدہ کیا یہی وجہ کعب کے قتل کیا جانے کی تھی۔

یہودیوں کی دوسری جلاوطنی کی طرف اشارہ: اول الحشر۔ حشر کے لیے دیکھو ۳۸۲ اصل لوگوں کو اپنے گھروں سے نکالنا ہے اور یہاں جلاوطنی پر بولا گیا ہے اور یہ جلاوطنی ملک شام کی طرف تھی کیونکہ یہ لوگ گو کچھ خیبر میں بھی گئے مگر اکثر حصہ ملک شام میں چلا گیا تھا۔ اور اس پر اول الحشر کا لفظ آنا بطور پیشگوئی کے ہے جس میں یہ اشارہ ہے کہ یہودیوں کی ایک اور جلاوطنی بھی ملک عرب سے وقوع آنے والی تھی اور یہ حضرت عمر کے عہد میں وقوع میں آئی جب خیبر سے انہیں جلاوطن کرکے ملک شام میں آباد ہونے کی اجازت دی گئی اور بعض روایات میں ارض شام کا نام ارض محشر بھی آتا ہے تو شاید اسی لحاظ سے ہو یا اس لحاظ سے کہ آخری زمانہ میں ملک شام کے اندر بعض واقعات مسلمانوں کو پیش آنے والے تھے اور اگلی آیت میں بتایا کہ یہ جلاوطنی بھی ان کی نرم سزا تھی ورنہ وہ اس سے بھی زیادہ سزا کے مستحق تھے۔

یہ لوگ مضبوط قلعوں میں رہتے تھے اور اس لیے ان کا خیال یہ تھا کہ مسلمان ہمیں نکال نہیں سکتے اور دوسری طرف عبداللہ بن اُبیّ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تمہاری مدد کریں گے اور تمہارے ساتھ مل کر جنگ کریں گے جیسا کہ آیت ۱۱ میں ذکر ہے اور اتٰہم اللہ سے مراد ان پر اللہ کی سزا کا آنا ہے۔ اور ان کا اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو خراب کرنا اس طرح تھا کہ ایک تو وہ نہ چاہتے تھے کہ یہ جگہ مسلمانوں کے کام آئے۔ اور دوسرے انہیں اجازت تھی کہ جو کچھ ساتھ لے جاسکتے ہیں لے جائیں اس لیے انہوں نے گھروں کو برباد کرنا شروع کیا تاکہ لکڑی وغیرہ ان میں سے نکال کر ساتھ لے جائیں ایدی المومنین اس لیے فرمایا کہ محاصرہ کرنے میں مسلمانوں کو بھی یہ ضرورت پیش آئی کہ ان کے گھروں کو ویران کریں۔

وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ③

اور اگر اللہ تعالیٰ نے ان پر جلا وطنی نہ لکھ دی ہوتی تو انھیں دنیا میں عذاب دیتا اور آخرت میں ان کے لیے آگ کا عذاب ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ④

یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سزا دینے میں سخت ہے۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَاۗىِٕمَةً عَلٰٓي اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ⑤

تم نے جو کھجور کا درخت کاٹا، یا اُسے اپنی جڑوں پر کھڑا چھوڑا۔ سو اللہ (تعالیٰ) کے اذن سے تھا اور تاکہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے ۳۳۱۸

وَمَآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑥

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ان سے جو مالِ غنیمت دلوایا تو تم نے اس پر گھوڑے نہیں دوڑائے اور نہ اونٹ، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلّط دے دیتا ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ) ہر چیز پر قادر ہے ۳۳۱۹

مَآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ

جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بستیوں والوں سے مالِ غنیمت دلایا تو وہ اللہ تعالیٰ کے لیے اور رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے تاکہ تم میں سے دولتمندوں کے اندر نہ پھرتا رہے ۳۳۲۰ اور جو تمھیں رسول دیتا ہے وہ لے لو، اور جس سے وہ تمھیں

۳۳۱۸ لینہ۔ لین نرمی کو کہتے ہیں اور لینۃ تر و تازہ کھجور کے درخت کو کہتے ہیں اور کسی ایک نوع سے خاص نہیں (غ)۔ محاصرہ کی ضرورت کے لیے مسلمانوں کے بعض درخت کھجور کے کاٹ دیئے تھے۔ ان کی نیت برباد کرنا نہ تھا بلکہ کسی آڑ کو دور کرنا تھا اگر محض بربادی کی نیت ہوتی تو کوئی بھی درخت باقی نہ چھوڑتے۔

۳۳۱۹ افاء دیکھو ۲۶۶۳ ایسے مال کا ملنا جس میں مشقت نہ ہو اور بعض کے نزدیک فیٔ کے لفظ میں جس کے معنی سایہ ہیں اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا کا بیش قیمت مال بھی ایک سایہ کی طرح ہے جو زائل ہو جاتا ہے (غ)

اوجفتم۔ وجیف تیز چلنا ہے اَوْجَفْتُ البعیر کے معنی ہیں اونٹ کو تیز چلایا اور قلوب یومئذ واجفۃ (النزعٰت ۷۹-۸) میں واجفۃ کے معنی پریشان ہیں (غ)

رکاب۔ رَاکِبٌ تعارف میں اونٹ کے سوار سے مختص ہے اور رکاب مرکوب ہے (غ) یعنی سواری کا اونٹ۔

۳۳۲۰ اموال بنی نضیر اور حضرت عباس اور علی کا جھگڑا: جو حکم مالِ غنیمت کے پانچویں حصّہ کے بارے میں ہے وہی یہاں کل مال فیٔ کے متعلق ہے دیکھو ۱۲۳۱ اور بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے یہ مال اپنے اہل نفقہ کے لیے خاص کر لیا تھا آپ اس میں سے ایک سال کا خرچ اپنے اہل کیلئے لے لیتے باقی ہتھیاروں گھوڑوں وغیرہ کی تیاری پر جہاد کے لیے صرف کرتے۔ اور ابوداؤد میں ہے کہ حضرت علی اور حضرت عباس حضرت عمر کے پاس ایک جھگڑا لائے جو اس مال کے متعلق تھا۔ اور اور صحابی بھی وہاں تھے تو حضرت عمر نے سب سے قسم دے کر پوچھا کہ کیا یہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا یا نہیں لانورث ما ترکنا

وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۷
لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا
مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ
فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ
اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ ۸

روکتا ہے رُک جاؤ ــــ اور اللہ کا تقویٰ کرو۔
اللہ (تعالیٰ) سزا دینے میں سخت ہے ۳۳۲۱
(وہ) مہاجر ناداروں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور
اپنے مالوں سے نکالے گئے ہیں، اللہ کا فضل اور
رضا چاہتے ہیں اور اللہ (تعالیٰ) اور اس کے رسولؐ
کی مدد کرتے ہیں، یہی سچے ہیں ۳۳۲۲

وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ
قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ
وَ لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً
مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ
وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَ مَنْ يُّوْقَ
شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ ۹
وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ

اور وہ جو ان سے پہلے (ہجرت کے) گھر میں رہتے اور
ایمان رکھتے تھے وہ اس سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کرکے
ان کی طرف آتا ہے اور اپنے سینوں میں اس کی کوئی حاجت
نہیں پاتے جو انھیں دیا جاتا ہے اور وہ اپنے آپ پر (انھیں)
مقدم رکھتے ہیں گو انھیں تنگی ہی ہو اور جو شخص اپنے نفس کے بخل
سے بچ جائے تو وہی کامیاب ہوں گے ۳۳۲۳
اور وہ جو ان کے بعد آئے کہتے ہیں ہمارے رب ہماری

صدقۃ ہم (انبیاء) ورثہ نہیں چھوڑتے جو ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔ پھر فرمایا اموال بنی نضیر سے رسول اللہ صلعم اپنے عیال کیلئے ایک سال کا خرچ رکھ لیا کرتے تھے اور باقی فی سبیل اللہ صرف کر دیتے آپ نے پھر سب کو قسم دیکر پوچھا تو انہوں نے اقرار کیا کہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ پھر آپ نے حضرت ابوبکر کا ذکر کیا کہ اُن کے خلیفہ ہونے پر حضرت عباس اپنا اور حضرت علی اور حضرت فاطمہ کا ورثہ .... طلب کرنے آئے تو حضرت ابوبکر نے یہی فیصلہ کیا اور آپ نے فرمایا واللہ یعلم انہ لصادق بارّ راشد پھر فرمایا کہ میرے خلیفہ ہونے پر تم پھر آئے تو میں نے تم کو وہ مال اس شرط پر دے دیا کہ اسے اسی طرح پر خرچ کرو جس طرح رسول اللہ صلعم خرچ کرتے تھے سو اگر تم اس شرط پر قایم ہو تو اس مال کو رکھو ورنہ واپس کر دو۔ اور اس کے خلاف میں ہرگز فیصلہ نہیں کر سکتا ٭

ع۳۳۲۱ ما اٰتکم الرسول فخذوہ پر عمل ایک خاص موقعہ پر ہی دیا جاتا ہے مگر اس کے الفاظ کی عمومیت صاف بتلاتی ہے کہ اس میں رسول اللہ صلعم کے کل احکام و نواہی آجاتے ہیں۔ پس عمل بر حدیث کے لیے یہ آیت بھی حجت ہے۔ بشرطیکہ اس حدیث کی صحت ثابت ہو ٭

ع۳۳۲۲ للفقراء بدل ہے لذی القربیٰ سے یعنی ذی القربیٰ اور یتامیٰ وغیرہ جن کا ذکر پہلی آیت میں گذر چکا ان سے مراد غرباء ہیں دیکھو ۱۲۳۱ ٭

ع۳۳۲۳ خصاصۃ۔ اِختصاص۔ خُصوصِیّۃ عموم کے خلاف ہے یعنی کسی چیز کا کسی بات میں الگ ہونا جس میں دوسرے شریک نہیں اور خاصّۃ ضد عامّۃ ہے لاتصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ (الانفال ۲۵) واللہ ... یختص برحمتہ من یشاء (اٰل عمرٰن ۷۴) اور فقر کو جسکی کوئی روک نہیں خصاصۃ کہا جاتا ہے (غ) ٭

والذین تبوؤ الدار والایمان سے مراد انصار ہیں اور الدار سے مراد دار ہجرت یعنی مدینہ ہے اور ایمان میں جگہ بنانے سے مراد ایمان میں مضبوط ہونا ہے۔ دیکھو ۵۰۸ اور یا مراد اخلصوا الایمان یا لزموا الایمان ہے (ر) اور یہاں انصار کی یہ خصوصیت سے تعریف کی ہے کہ وہ باوجود اپنی تنگی کے مہاجرین کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی کو شحّ سے بچنا قرار دیا ہے کیونکہ شح بخل اور حرص کے اکٹھا ہونے کا نام ہے۔ اموال بنی نضیر میں سے انصار کو کوئی حصہ نہیں دیا گیا سوائے تین کے اس لیے کہ مہاجرین کے پاس کچھ بھی نہ تھا اور جب آنحضرت صلعم نے انصار سے دریافت کیا کہ چاہو تو تم مہاجرین کو اپنے مکانوں میں سے حصہ دیدو اور بنی نضیر کی جگہ سب میں تقسیم کر دی جائے اور چاہو تو یہ جگہ صرف مہاجرین کو دے دی جائے تو انہوں نے عرض کیا ہم اپنے اموال میں سے بھی مہاجرین کو حصہ دیتے ہیں اور اموال بنی نضیر بھی آپ انہی کو دے دیں۔ یہ وہ پاک گروہ تھا جن کے دلوں میں مال دنیا کی محبت ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی نہ تھی۔ اس آیت کی تفسیر میں بخاری میں اس شخص کا قصہ لکھا ہے جس کے سپرد رسول اللہ صلعم نے ایک مہمان کو کیا تو اس کے گھر میں سوائے بچوں کے کھانے کے کچھ نہ تھا تو میاں بیوی نے بچوں کو بھوکا سلا دیا اور آپ چراغ بجھا کر جو کچھ تھا وہ مہمان کو کھلا دیا اور آپ بھی بھوکے رہے اور کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝١٠ ع

مغفرت کر اور ہمارے بھائیوں کی جو ایمان میں ہم سے سبقت لے گئے اور ہمارے دلوں میں ان کے لیے جو ایمان لائے حسد نہ پیدا ہونے دے اے ہمارے رب تو مہربان رحم کرنے والا ہے ۳۳۲۴

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِن قُوتِلْتُمْ لَنَنصُرَنَّكُمْ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝١١

کیا تو نے انھیں نہیں دیکھا جو منافق ہیں وہ اپنے بھائیوں کو جو اہل کتاب میں سے کافر ہیں کہتے ہیں اگر تمھیں نکالا گیا تو ہم تمھارے ساتھ نکلیں گے اور ہم تمھارے معاملہ میں کبھی کسی کی اطاعت نہ کریں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور تمھاری مدد کریں گے۔ اور اللہ (تعالیٰ) گواہی دیتا ہے کہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔

لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ وَلَئِن قُوتِلُوا لَا يَنصُرُونَهُمْ وَلَئِن نَّصَرُوهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنصَرُونَ ۝١٢

اگر انھیں نکالا گیا تو یہ ان کے ساتھ نہ نکلیں گے اور اگر ان سے جنگ ہوئی تو یہ ان کی مدد نہ کریں گے اور اگر یہ ان کی مدد کریں تو پیٹھیں پھیر دیں گے۔ پھر ان کی کوئی مدد نہ ہوگی ۳۳۲۵

لَأَنتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً فِي صُدُورِهِم مِّنَ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ۝١٣

اللہ کی نسبت تمھارا ڈر ان کے دلوں میں بہت زیادہ ہے یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں۔

لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُّحَصَّنَةٍ أَوْ مِن وَرَاءِ جُدُرٍ بَأْسُهُم بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ ۝١٤

یہ اکٹھے (بھی) تم سے نہیں لڑیں گے، سوائے اس کے کہ قلعوں سے محفوظ کی ہوئی بستیوں میں ہوں یا دیواروں کی آڑ میں، ان کی لڑائی آپس میں سخت ہے تو انھیں اکٹھا سمجھتا ہے اور ان کے دل علیحدہ علیحدہ ہیں یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے ۳۳۲۶

كَمَثَلِ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَرِيبًا

(ان کی حالت) ان لوگوں کی حالت کی طرح ہے جو ان سے پہلے

۳۳۲۴ مہاجرین اور انصار کی تعریف کے بعد فرمایا بعد میں آنے والے اُن کے لیے دعائے ترقی درجات کرتے ہیں اور اپنے دلوں میں ان کے لیے کسی قسم کا حسد یا کپٹ نہیں رکھتے اہل تشیع اور خوارج اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے ؛

۳۳۲۵ ان آیات میں مواعید کا ذکر ہے جو خفیہ طور پر منافقوں نے یہودیوں سے کیے تھے اور انہیں کہا تھا کہ تم مقابلہ پر اڑے رہو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اور اس آیت میں فرمایا کہ جو نصرت کی غرض ہے وہ تو بہر حال پوری نہیں ہو سکتی ؛

۳۳۲۶ کافر قومیں اب بھی قلعہ گزین ہو کر یا خندقوں میں گھس کر ہی لڑائی کرتی ہیں کھلے میدان میں نکلنے کی جرأت نہیں اس لیے کہ اصل جوہر شجاعت مفقود ہے۔ اور تحسبهم جمیعا وقلوبهم شتی کا مصداق آج بھی عیسائی اقوام نظر آرہی ہیں ؛

ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۵﴾

قریب ہی اپنے کام کی سزا چکھ چکے ہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ۳۳۲۷

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾

شیطان کی حالت کی طرح، جب وہ انسان کو کہتا ہے کفر کر پھر جب وہ کفر کرتا ہے تو کہتا ہے میں تجھ سے بے تعلق ہوں۔ میں اللہ جہانوں کے رب سے ڈرتا ہوں ۳۳۲۸

فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۷﴾ ع

سو ان دونوں کا انجام یہ ہے کہ وہ دونوں آگ میں ہیں، اسی میں رہیں گے اور یہی ظالموں کی سزا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ کرو اور ہر نفس غور کرے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے اور اللہ کا تقویٰ کرو، اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا، سو اس نے انھیں اپنا آپ بھلوا دیا، یہی نافرمان ہیں۔

لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴿۲۰﴾

آگ والے اور جنّت والے برابر نہیں۔ جنت والے ہی بامراد ہیں۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو تُو اسے اللہ کے خوف سے گرا ہوا پھٹا ہوا دیکھتا — اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ فکر کریں ۳۳۲۹

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۲۲﴾

وہی اللہ ہے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا وہ بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنے والا ہے۔

۳۳۲۷ مجاہد کہتے ہیں کہ مراد اس سے اہل بدر ہیں۔ مگر ابن عباس کا قول کہ مراد بنی قینقاع ہیں ترجیح کے قابل ہے۔ یہ بھی مدینہ میں یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا۔ اور سب سے پہلے اسی نے اہل اسلام کے ساتھ معاہدہ توڑا اور لڑائی کا فیصلہ کر کے قلعہ گزیں ہو گئے آخر پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد جلا وطنی اختیار کی اور شام میں جا آباد ہوئے یہ بدر سے ایک ماہ بعد کا واقعہ ہے دونوں بھی مراد ہو سکتے ہیں ؛

۳۳۲۸ پہلی آیت میں مشابہت بنی نضیر کی ہے اور یہاں منافقین کی جو انہیں شیطان کی طرح جھوٹے وعدے دیتے رہے۔

۳۳۲۹ قرآن کریم کی پہاڑوں کو گرا دینے کی طاقت : یہ بیان تو بطور مثال ہے جیسا کہ خود فرما دیا۔ مگر قرآن کریم کی مثالیں بھی ایک گہری حقیقت اپنے اندر رکھتی ہیں جبل دیکھو ۱۶۲۳ بلحاظ ثبات ایک انسان پر بھی بولا جاتا ہے اور عرب کے اندر ایک کیا ہزار ہا جبال تھے جو اپنے عقاید و اعمال پر ایسے پکے تھے کہ انہیں نہ یہودیوں کی تعلیم توحید اپنی جگہ سے ہلا سکی نہ عیسائیت کا عروج اور اس کی پرزور تبلیغ پانچ سو سال تک ان کی اصلاح پر دو قوموں نے زور لگایا مگر یہود و نصاریٰ کی تبلیغ اگر زبردست آندھی بھی تھی تو عرب کے لوگ پہاڑ تھے جن پر اس کا کچھ اثر نہ تھا لیکن قرآن نے بیس سال کے اندر ان پہاڑوں کو گرا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور علوم اور اخلاق کے دریا ان سے بہا نکالے وان من الحجارۃ لما یتفجر منہ الانہار۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٢٣﴾

وہی اللہ ہے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں ، بادشاہ پاک سلامتی والا امن دینے والا نگہبان غالب بگڑے کو بنانے والا سب بڑائیوں کا مالک ـ اللہ اس سے پاک ہے جو وہ شرک کرتے ہیں ٣٣٣٠

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٤﴾ ع٣

وہی اللہ ہے (مادہ کا) پیدا کرنے والا ، روح کا پیدا کرنے والا ـ (مختلف) شکلیں بنانیوالا اس کے لیے سب اچھے نام ہیں ـ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کی تسبیح کرتا ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے ٣٣٣١

٣٣٣٠ القدوس ـ تقدیس کے لیے دیکھو ع٤٧ اور القدوس کے معنی طاہر اور عیوب سے منزہ ہیں اور برکت والا بھی معنی کیے گئے ہیں (ل) یہاں اللہ تعالیٰ کے چند اسمائے حسنیٰ کا ذکر کیا ہے کیونکہ غلطنی غلطیاں مذاہب میں لگتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الحاد سے ہی لگتی ہیں ـ بلحاظ اپنی حکومت اور تصرف کے وہ بادشاہ ہے مگر وہ دنیا کے بادشاہوں کی طرح دوسروں کا محتاج نہیں کیونکہ وہ ہر نقص سے پاک یا قدوس اور ہر عیب اور آفت سے سلامت یا سلام ہے بلکہ وہ دوسروں کو امن دینے والا اور ان پر نگہبان ہے پھر وہ غالب بھی ہے مگر ایسا غالب کہ فی الحقیقت سب سے اوپر ہے اور بڑی سے بڑی عظمت اور کبریائی کا مالک ہے ؛

٣٣٣١ المصور ـ تصویر کے لیے دیکھو ع٤٧ اور المصور اسمائے باری میں سے ہے جس نے تمام موجودات کی تصویر بنائی اور انہیں ایک ترتیب دی پس ہر چیز کو خاص صورت اور علیحدہ حقیقت عطا کی جس سے باوجود اس کے اختلاف اور کثرت کے اس کی تمیز کی جاتی ہے (ل)

آریہ سماج کا شرک : پہلی آیت میں ان اسماء کا ذکر کیا تھا جو قدرت و عظمت سے تعلق رکھتے ہیں ـ اور یہاں ان اسماء کا ذکر کیا ہے جو ایجاد سے تعلق رکھتے ہیں ـ یعنی اشیاء کو وجود میں لانے سے اور یہاں تین صفات بیان کی ہیں الخالق ـ البارئ ـ المصور ـ الخالق اور الباری کے فرق کے لیے دیکھو ع٤٧ یہی فرق ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے اور المصور سے مراد ہے مادہ یا مادہ اور روح کی مختلف ترکیبوں سے مختلف صورتیں بنانے والا ـ آریہ سماج والے اللہ تعالیٰ کو صرف المصور مانتے ہیں اور اسکے مادہ اور روح کا خالق ہونے سے انکار کرتے ہیں ـ گویا ان دو صفات کے منکر ہیں ـ اور چونکہ کسی اسم الٰہی کا انکار صریح شرک ہے اس لیے آریہ سماج بھی ایک مشرک فرقہ ہی ہے کامل توحید سوائے اسلام کے کسی کو نصیب نہیں ان اسمائے الٰہی کے انکار کا نتیجہ یہ ہے کہ مادہ اور روح کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خود بخود اور ازلی ہونے میں کامل شریک مانتے ہیں چھوٹے چھوٹے اگر تینتیس کروڑ دیوتا چھوڑ دیئے تو کیا ـ دو بڑے خدا بنا لیے ـ صفات الٰہی کا جو کامل اور مکمل نقشہ قرآن کریم نے کھینچا ہے کسی آسمانی کتاب میں تلاش کرنا عبث ہے ؛

آیاتہا ١٣ — سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةِ مَدَنِيَّةٌ (٦٠) — رکوعاتہا ٢

تمہید سورت : اس سورت کا نام الممتحنۃ ہے اور اس میں دو رکوع اور تیرہ آیتیں ہیں اور اس میں مسلمانوں کے کفار کے ساتھ تعلقات پر بحث ہے اور ایک طرف اگر ان کفار سے جو جنگ کرتے ہیں ہر طرح پر ترک موالات کا حکم ہے تو دوسری طرف غیر مسلم جنگ نہیں کرتے ان سے احسان کرنے اور انصاف کرنے کا حکم ہے انہی تعلقات باہمی میں یہ بھی ذکر ہے کہ جب ایسی عورتیں خاوندوں سے الگ ہو کر آجائیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں ـ تو ان کے متعلق ان کا امتحان لے کر پورا اطمینان کر لینا چاہیے اگر وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہوں تو پھر ان کے تعلقات نکاح پہلے خاوندوں سے قایم نہیں رہ سکتے ـ اسی امتحان سے اس سورت کا نام لیا گیا ہے یہ سورت مدنی ہے اس کا زمانہ نزول صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان ہے ؛

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ
وَ عَدُوَّکُمۡ اَوۡلِیَآءَ تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡہِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ
وَ قَدۡ کَفَرُوۡا بِمَا جَآءَکُمۡ مِّنَ الۡحَقِّ ۚ
یُخۡرِجُوۡنَ الرَّسُوۡلَ وَ اِیَّاکُمۡ اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا
بِاللّٰہِ رَبِّکُمۡ ؕ اِنۡ کُنۡتُمۡ خَرَجۡتُمۡ
جِہَادًا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِیۡ ٭ۖ
تُسِرُّوۡنَ اِلَیۡہِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ ٭ۖ وَ اَنَا اَعۡلَمُ
بِمَاۤ اَخۡفَیۡتُمۡ وَ مَاۤ اَعۡلَنۡتُمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡہُ
مِنۡکُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ①

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو میرے مخالفوں اور اپنے مخالفوں کو دوست نہ بناؤ کہ ان کی طرف دوستی کے پیغام دو، حالانکہ وہ اس حق کا انکار کرتے ہیں جو تمھارے پاس آیا وہ رسول کو اور تمھیں نکالتے ہیں اس لیے کہ تم اللہ تعالیٰ اپنے رب پر ایمان لاتے ہو، ۳۳۳۲ اگر تم میرے رستہ میں جہاد کے لیے اور میری رضا کو ڈھونڈنے کے لیے نکلے ہو تم چھپ کر انھیں دوستی کے پیغام دیتے ہو۔ اور میں خوب جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو، اور جو کوئی تم میں سے ایسا کرے گا وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

اِنۡ یَّثۡقَفُوۡکُمۡ یَکُوۡنُوۡا لَکُمۡ اَعۡدَآءً
وَّ یَبۡسُطُوۡۤا اِلَیۡکُمۡ اَیۡدِیَہُمۡ وَ اَلۡسِنَتَہُمۡ
بِالسُّوۡٓءِ وَ وَدُّوۡا لَوۡ تَکۡفُرُوۡنَ ؕ ②

اگر وہ تمھیں پالیں تو تمھارے دشمن ہوں اور اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں تم پر بدی کے ساتھ چلائیں اور وہ چاہتے ہیں کہ تم کافر بن جاؤ۔

معانقة ١٢ الساعة الوقف عن النبي ﷺ

لَنۡ تَنۡفَعَکُمۡ اَرۡحَامُکُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُکُمۡ ۚۛ
یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ۚۛ یَفۡصِلُ بَیۡنَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ
بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ③

تمھارے رشتے اور تمھاری اولاد قیامت کے دن تمھیں نفع نہ دیں گے، وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ تعالیٰ اسے جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔

قَدۡ کَانَتۡ لَکُمۡ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ
وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗ ۚ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِہِمۡ
اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡکُمۡ وَ مِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ

تمھارے لیے ابراہیمؑ اور ان لوگوں میں جو اس کے ساتھ تھے اچھا نمونہ ہے۔ جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا، ہم تم سے بے تعلق ہیں اور اس سے جس کی تم اللہ تعالیٰ کے

۳۳۳۲ حاطب بن ابی بلتعہ کا واقعہ: بخاری میں حضرت علی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے مجھے اور زبیر اور مقداد کو بھیجا اور فرمایا کہ روضہ خاخ پر تمہیں ایک عورت اونٹ پر سوار ملے گی اس کے پاس ایک خط ہوگا اسے لے لینا چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ خط حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف سے مشرکین مکّہ کے نام تھا۔ جس میں نبی کریم صلعم کی بعض باتوں کی خبر انہیں پہنچائی گئی تھی دریافت پر حاطب نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مہاجرین کے تو سب کے اہل مکّہ میں رشتے ہیں اور میں قریش میں سے نہیں میں نے خیال کیا کہ میں ان سے کوئی احسان کر چھوڑوں تاکہ وہ میرے رشتہ داروں کو نہ ستائیں اور میں نے یہ کفر و ارتداد سے نہیں کیا رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ حاطب نے سچ کہا ہے اور عمرو بن دینار نے جو اس حدیث کا پہلا راوی ہے۔ کہا یہ آیت اسی کے بارہ میں نازل ہوئی ::

اسلام کے دشمنوں سے دوستی کی ممانعت: یہ واقعہ فتح مکّہ سے پیشتر کا ہے۔ اور حاطب نے قریش کو آنحضرت صلعم کے مکّہ پر چڑھائی کرنے کے ارادہ کی خبر دی تھی۔ یہ واقعہ بھی اسی آیت کے ماتحت آتا ہے مگر اس قسم کی ہدایات ہر زمانہ میں مسلمانوں کے لیے بکار ہیں کیونکہ اسلام کی دشمنی کا سلسلہ ختم نہیں ہو گیا اور جو لوگ مسلمانوں کو اپنے گھروں سے نکالتے ہوں اس لیے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں تو ایسے لوگوں سے تعلقات محبت قائم کرنا مسلمان کا کام نہیں۔ کھول کر اس مضمون کو دوسرے رکوع میں بیان کیا ہے یہاں اور پھر اگلی آیت میں کفار کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے کہ وہ جلا وطنی قتل قید بدزبانی ہر طرح سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے تیار ہیں اور وہ راضی نہیں ہو سکتے جب تک کہ اسلام کا نام مٹا کر ان چند نفوس کو بھی کافر نہ بنالیں جو مسلمان ہو چکے تھے ::

دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ
بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى
تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ
لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَ مَآ اَمْلِكُ لَكَ
مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا
وَ اِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿٤﴾
رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا
وَ اغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ﴿٥﴾
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ
لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ
ع وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٦﴾
عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ
الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَ اللّٰهُ
قَدِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٧﴾
لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ
فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ
اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿٨﴾

سوائے عبادت کرتے ہو، ہم تم سے بیزار ہیں اور ہمارے اور تمھارے درمیان دشمنی اور بیر ہمیشہ کے لیے ظاہر ہو گیا یہاں تک کہ تم اکیلے اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ، مگر ابراہیمؑ کا اپنے بزرگ کو یہ کہنا کہ میں تیرے لیے بخشش مانگوں گا اور میں اللہ تعالیٰ کے سامنے تیرے لیے کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا، اے ہمارے رب ہم نے تجھ پر بھروسا کیا اور تیری طرف رجوع کیا اور تیری طرف انجام کار پھر کر آنا ہے ۳۳۳۳

اے ہمارے رب ہمیں ان لوگوں (کے ہاتھ) سے جو کافر ہیں دکھ نہ پہنچا اور اے ہمارے رب ہماری حفاظت فرما۔ تو غالب حکمت والا ہے ۳۳۳۴

یقیناً تمھارے لیے ان میں اچھا نمونہ ہے، اس کے لیے جو اللہ تعالیٰ (کے سامنے جانے) اور پچھلے دن کی امید رکھتا ہے۔ اور جو کوئی منہ پھیر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہی بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔

قریب ہے کہ اللہ تمھارے اور ان لوگوں کے درمیان جن کے ساتھ ان میں سے تمھاری دشمنی ہے محبت پیدا کر دے اور اللہ تعالیٰ قادر ہے اور اللہ (تعالیٰ) بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۳۳۳۵

اللہ تعالیٰ تمھیں ان سے نہیں روکتا جنھوں نے تمھارے ساتھ دین کے بارے میں لڑائی نہیں کی اور تمھیں اپنے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان سے احسان کرو اور ان سے انصاف کرو۔ اللہ (تعالیٰ) انصاف کرنے والوں سے محبّت رکھتا ہے ۳۳۳۶

۳۳۳۳ کفرنا بکم کفر بعض وقت بمعنی براءۃ بھی آتا ہے یعنی کسی چیز سے بے تعلقی یا بیزاری انی کفرت بما اشرکتمون من قبل (ابراھیم ۱۴-۲۲) (ل) اور کوافر (آیت ۱۰) کافرۃ کی جمع ہے۔

حضرت ابراہیم کا نمونہ پیش کیا ہے کہ جب ان کی قوم کی دشمنی اور نفرت ان کے ساتھ علی الاعلان ظاہر ہو گئی تو وہ بھی قوم سے الگ ہو گئے اور اب کو مستثنیٰ رکھنا شاید اس وجہ سے ہو کہ وہ اسے ایسا دشمن نہ سمجھتے تھے کیونکہ دوسری جگہ ہے فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرأ منہ (التوبۃ ۹-۱۱۴) اور حضرت ابراہیم کو یہاں صرف اس امر میں بطور نمونہ پیش کیا ہے کہ باوجود حد درجہ کے حلم کے انہیں بھی آخر اعدائے دین سے قطع تعلق کرنا پڑا۔ کیونکہ خدا کی محبت کے سامنے آخر سب محبتوں کو قربان کرنا پڑتا ہے ؛

۳۳۳۴ بخاری میں مجاہد سے ہے لا تجعلنا فتنۃ لا تعذبنا بایدیھم یعنی ہمیں ان کے ہاتھوں سے عذاب نہ دے۔

۳۳۳۵ قریش کے اسلام لانے کی پیشگوئی: یہ پیشگوئی صاف بتاتی ہے کہ ان کفار کی تباہی ہونے والی نہیں تھی بلکہ اصلاح ہو کر آخر وہی مسلمانوں کے دوست بننے والے تھے

۳۳۳۶ کفار سے احسان اور انصاف کی تعلیم: یہ آیت اور اس سے اگلی آیت کفار سے تعلقات کے متعلق بطور اصول محکم ہیں اور جہاں جہاں کفار سے موالات یا عدم موالات کا ذکر آتا ہے اس کے حل کرنے کی یہی کنجی ہے۔ کفار کے ساتھ بڑے بڑے احسان بھی ہو سکتے ہیں انصاف کا معاملہ بھی ہو سکتا ہے جیسا

إِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ
وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى
اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ⑨

اللہ تمھیں صرف ان لوگوں سے دوستی کرنے سے روکتا ہے جنھوں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا اور تمھارے نکالنے میں (دوسروں کی) مدد کی اور جو اُن سے دوستی کرتے ہیں تو وہی ظالم ہیں ۳۳۳۷

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ
مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ
بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ
فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ
حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَ
اٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ
اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ
وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْئَلُوْا مَآ
اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ
اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ⑩

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب مومن عورتیں تمھارے پاس ہجرت کرتی ہوئی آئیں تو اُن کا امتحان لے لیا کرو، اللہ ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ پھر اگر تم انھیں مومنہ جانو، تو انھیں کافروں کی طرف نہ لوٹاؤ، نہ وہ عورتیں ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ ان عورتوں کے لیے حلال ہیں، اور جو انھوں نے خرچ کیا ہے انھیں دے دو اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان سے نکاح کرو، جب تم اُنھیں اُن کے مہر دے دو۔ اور کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روک رکھو اور تم طلب کرو جو تم نے خرچ کیا ہے اور وہ طلب کریں جو انھوں نے خرچ کیا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ علم والا حکمت والا ہے ۳۳۳۸

کہ اس آیت میں بتایا بشرطیکہ وہ مسلمانوں سے دین کی وجہ سے جنگ نہ کرتے ہوں نہ مسلمانوں کو دین کی وجہ سے گھروں سے نکالتے ہوں جو احسان کا مستحق ہے اس سے احسان کرنا چاہیئے جو انصاف کا مستحق ہے اس سے انصاف کرنا چاہیئے۔ اہل عرب کے کتنے قبیلے کافر تھے جیسے خزاعہ۔ بنی الحرث۔ کنانہ مزینہ وغیرہ جن سے نبی کریم صلعم کے معاہدات تھے اور عبداللہ بن زبیر نے اس میں کفار کی عورتوں اور بچوں کو شامل کیا ہے۔ وہ لوگ ظالم ہیں جو اسلام کی تعلیم کو تنگدلی کی تعلیم قرار دیتے ہیں۔ کفار کے ساتھ انصاف ہی نہیں حسن سلوک کی تعلیم عملی رنگ میں اگر دی ہے تو اسلام نے دی ہے یہ اگر آزاد کافر قوموں کے لیے ہے تو ذمیوں کے حقوق تو اس سے بھی بڑھ کر ہیں۔

۳۳۳۷ ترک موالات: اگر یہ ہدایت نہ دی جاتی تو مسلمان زندہ کیونکر رہ سکتے تھے جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کرتے ہیں ان سے دوستی اپنی قوم سے کھلی دشمنی ہے آج جب دو قوموں میں جنگ ہوتی ہے تو کیا کوئی مہذب قوم اپنی قوم کے افراد کو ایسی قوم کے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھنے یا کاروبار کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ اسلام کی تعلیم اصول صحیحہ پر مبنی ہے اس آیت نے صاف بتا دیا کہ ترک موالات کلی طور پر صرف جنگ کرنے والی قوم کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

۳۳۳۸ عصم۔ عِصمۃ کی جمع ہے یعنی ان کا عقد نکاح کیونکہ عِصمۃ النکاح کے معنی عقدۃ النکاح ہیں (ل)

عورتوں کی مکہ سے ہجرت: یہ سورت صلح حدیبیہ کے بعد کے زمانہ کی ہے اور جو عورتیں اسلام لا کر مکہ میں تکلیف اٹھاتی تھیں وہ ہجرت کر آتی تھیں کیونکہ شرائط صلح صرف مردوں پر حاوی تھیں اور کفار کی اصل غرض یہی تھی کہ مسلمانوں کی جنگی طاقت نہ بڑھ جائے۔ تو ان عورتوں کے بارے میں پہلے یہ حکم دیا ہے کہ ان کا امتحان لے لیا کرو۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ یہ امتحان یوں تھا کہ عورت کا حلفی بیان لیا جاتا تھا کہ نہ وہ خاوند کے بغض کی وجہ سے نکلی ہے اور نہ صرف ایک زمین کو چھوڑ کر دوسری زمین میں جانے کے لیے اور نہ دنیا کی کسی غرض کے لیے بلکہ صرف اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے لیے (ج) اور حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ آپ ان عورتوں کا امتحان بیعت سے لیتے تھے جس کا ذکر آگے آتا ہے لا یشرکن باللہ شیئا (ج) اور درست یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں باتیں ہوتی تھیں۔

مہاجر عورتوں سے نکاح کی شرط: چونکہ مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد سے ناجائز تھا اس لیے ایسی عورتوں سے جو کافر خاوندوں کو چھوڑ کر ہجرت کر آئیں مسلمانوں کو نکاح کرنے کی اجازت دی۔ مگر دو شرطیں ساتھ لگائیں اول یہ کہ کافر خاوندوں نے جو مہر اُن کو دیئے تھے وہ انہیں واپس کیے جائیں اور دوسری یہ کہ اس

وَاِنۡ فَاتَكُمۡ شَىۡءٌ مِّنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ اِلَى الۡـكُفَّارِ فَعَاقَبۡتُمۡ فَاٰتُوا الَّذِيۡنَ ذَهَبَتۡ اَزۡوَاجُهُمۡ مِّثۡلَ مَاۤ اَنۡفَقُوۡا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡۤ اَنۡتُمۡ بِهٖ مُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۱﴾

اور اگر تمھاری عورتوں (کے مہروں) سے کچھ تم سے نکل کر کافروں کی طرف چلا گیا ہے، پھر تمھاری باری آئے تو ان لوگوں کو جن کی عورتیں چلی گئی ہیں اس کی مثل دے دو جو انھوں نے خرچ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ کرو جس پر تم ایمان لائے ہو ۳۳۳۹

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اِذَا جَآءَكَ الۡمُؤۡمِنٰتُ يُبَايِعۡنَكَ عَلٰٓى اَنۡ لَّا يُشۡرِكۡنَ بِاللّٰهِ شَيۡـئًا وَّلَا يَسۡرِقۡنَ وَلَا يَزۡنِيۡنَ وَلَا يَقۡتُلۡنَ اَوۡلَادَهُنَّ وَلَا يَاۡتِيۡنَ بِبُهۡتَانٍ يَّفۡتَرِيۡنَهٗ بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِنَّ وَاَرۡجُلِهِنَّ وَلَا يَعۡصِيۡنَكَ فِىۡ مَعۡرُوۡفٍ فَبَايِعۡهُنَّ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲﴾

اے نبی! جب تیرے پاس مومن عورتیں آئیں، تجھ سے بیعت کریں اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی، اور نہ چوری کریں گی، اور نہ زنا کریں گی، اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی، اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے سامنے کوئی بہتان باندھ لائیں گی، اور نہ کسی اچھی بات میں تیری نافرمانی کریں گی، تو ان سے بیعت لے لے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگ، اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۳۳۴۰

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَوَلَّوۡا قَوۡمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ قَدۡ يَئِسُوۡا مِنَ الۡاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الۡكُفَّارُ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡقُبُوۡرِ ﴿۱۳﴾ ع ۲ ۸

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ان سے دوستی مت کرو، جن پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوا ہے۔ وہ آخرت سے ایسے ہی ناامید ہیں، جیسا کہ کافر قبروں والوں (کے جی اٹھنے) سے ناامید ہیں ۳۳۴۱ النصف

بی بی کو بھی مہر دیا جائے۔ کفار کے ساتھ یہ معاملہ کہ مہر انہیں واپس کرد و اسلام کی تعلیم میں کمال انصاف کو ظاہر کرتا ہے۔ اور پھر جس طرح یہ کہا کہ مسلمان عورتیں اگر کفار کے گھروں سے نکل آئیں تو نکاح باقی نہیں رہتا اسی طرح مسلمانوں کو حکم دیا کہ جو عورتیں اپنے کفر و شرک پر قائم ہیں انہیں تم قید نکاح میں روک کر نہ رکھو اور یہاں کوافر سے مراد بھی کافر مشرک عورتیں ہیں ورنہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔

۳۳۳۹ عاقبتم۔ عُقبۃ کے معنی نوبت یا باری ہیں اور عاقبت الرجل کے معنی ہیں کسی کام میں اسے آرام دیا اور دوسرے نے اپنی باری لی اور اَعۡقَبَ اور عَاقِبۡ دونوں کے معنی ہیں تو اونٹ سے اتر جاتا کہ میں اپنی باری لوں (ل) اور یہی معنی یہاں ہیں مگر بعض مفسرین نے یہاں عاقبتم کے معنی غنمتم لیے ہیں یعنی تم کوئی مال غنیمت حاصل کرو (ل) اور صورت اول میں مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح کسی مسلمان کی بی بی کافر تھی اور وہ علیحدہ ہو گئی اسی طرح تمہاری باری آجائے اور کسی کافر کی بی بی مسلمان ہو کر آجائے تو جو مہر کفار کی طرف لوٹانا تھا اسے اس مسلمان کو دے دو۔

۳۳۴۰ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلعم نے انہی الفاظ میں عورتوں سے بیعت لی تھی انہی میں ہند بنت عتبہ ابوسفیان کی بی بی بھی تھی جو درمیان میں بعض باتیں بھی کہتی جاتی تھی اور عورتوں کی بیعت کے متعلق حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلعم ہاتھ میں ہاتھ نہ لیتے تھے (ج) اور احمد ترمذی وغیرہ کی روایات میں بھی ہے کہ نبی کریم صلعم عورتوں سے مصافحہ نہ کرتے تھے جس طرح مردوں سے کرتے تھے اور شعبی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم جب عورتوں سے بیعت لیتے تھے تو اپنے ہاتھ پر کپڑا رکھ لیتے تھے (ر) ممکن ہے کہ دونوں طرح آپ نے بیعت لی ہو۔ اور لا یاتین ببھتان یفترینہ بین ایدیھن وارجلھن سے یہ مراد لی گئی ہے کہ عورتیں جاہلیت میں فرضی حمل قرار دیکر خاوندوں کو دھوکہ دے لیا کرتی تھیں مگر اس کے معنی محض بہتان باندھنے کے بھی ہو سکتے ہیں اور ید اور رجل ذات سے کنایہ ہیں کیونکہ زیادہ تر افعال انہیں سے کیے جاتے ہیں۔ یا یہ مراد ہے کہ اپنے دلوں میں بہتان نہ بنائیں کیونکہ دل کا مقر بھی ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان ہے (ر)

۳۳۴۱ عملاً تو یہود و نصاریٰ دونوں کی یہ حالت ہے کہ آخرت پر ان کا ایمان کچھ نہیں صرف دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں مگر یہودیوں میں بالخصوص ایک فرقہ بھی ایسا ہے یعنی صدوقی جو آخرت کے عقیدتاً بھی منکر ہیں۔

آیاتها ۱۴ (۶۱) سُوْرَةُ الصَّفِّ مَدَنِيَّةٌ رکوعاتها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ①

اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ②

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ③

اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ سخت بیزاری کی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم کرتے نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ④

اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبّت رکھتا ہے جو اس کے رستے میں صف باندھ کر جنگ کرتے ہیں گویا کہ وہ مضبوط دیوار ہیں ۳۳۴۲

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۭ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ⑤

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم تم مجھے کیوں ستاتے ہو اور تم جانتے ہو کہ میں تمھاری طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، سو جب وہ ٹیڑھے چلے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل ٹیڑھے ہی رہنے دیئے۔ اور اللہ (تعالیٰ) نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

تمہید سورت: اِس سورت کا نام الصف ہے اور اس میں دو رکوع اور چودہ آیتیں ہیں اس سورت کا اصل مضمون غلبۂ دین اسلام ہے جو اسے تمام مذاہب پر حاصل ہوگا۔ مگر اس کے لیے بتایا کہ مسلمانوں کو بڑی بڑی قربانیاں کرنی چاہئیں۔ یہاں تک کہ ضرورت ہو تو خدا کے رستے میں مستحکم دیوار کی طرح کھڑے ہو کر جنگ بھی کریں اور دوسری طرف عیسیٰ کے حواریوں کی طرح دین اسلام کو لے کر دنیا میں نکل جائیں کیونکہ یہی غلبہ کی اصل راہ ہے یہ سورت مدنی ہے اس کی تاریخ نزول کے تعیین کے لیے کوئی یقینی واقعات نہیں مگر غالباً ابتدائی مدنی زمانہ کی ہی ہے۔

۳۳۴۲ مرصوص۔ رَصَّ الْبُنْیَانَ دیوار کو پختہ کیا۔ اور مضبوط کیا اور اس کے بعض کو بعض سے ملایا۔ اور ایسی دیوار مرصوص ہے اور حدیث میں آتا ہے تراصوا فی الصُّفوف یعنی نماز کی صفوں میں ایک دوسرے سے مل کر رہو۔ اور رَصاص سیسہ کو کہتے ہیں (ل)

پہلی آیتوں میں ان لوگوں سے اللہ تعالیٰ نے اظہار ناراضگی فرمایا ہے۔ جو منہ سے کہہ دیتے ہیں مگر کرتے نہیں۔ اور یہاں بتایا کہ اللہ تعالیٰ محبت تو اس سے کرتا ہے کہ جب اس نے ایک بات منہ سے نکالی تو پھر اپنے دوسرے بھائیوں سے مل کر حفاظت دین میں ایک مضبوط دیوار کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان پر تیر اور تلواریں اس طرح پڑتی ہیں جیسے دیوار پر قول جو عمل میں نہیں آتا وہ کہنے والے کو اللہ تعالیٰ کے غضب کا محل بنا دیتا ہے۔ اور جب کہنے والا اس کے عمل میں لانے کے لیے اپنی جان بھی حاضر کر دیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے نبی کریم صلعم کے صحابہ نے بارہا بنیان مرصوص کا نقشہ جنگ میں دکھایا اور بالخصوص جنگ اُحد میں جب نبی کریم صلعم کے گرد صحابہ کی ایک دیوار قائم ہوگئی۔ اور بعض صحابہ دشمن کی طرف پیٹھ پھیر کر کھڑے ہو گئے کہ تیر سامنے آتا ہوا دیکھ کر جگہ سے نہ ہل جائیں اس گروہ کے اللہ تعالیٰ کا محبوب ہونے پر یہ آیت نص قطعی ہے اگلی آیت میں حضرت موسیٰ جس ایذا کا اپنی قوم کے ہاتھوں سے ذکر کرتے ہیں۔ وہ ان کا انکار جنگ ہی تھا۔ اور وہاں بھی انہیں قوم فاسق ہی قرار دیا ہے فلا تاس علی القوم الفاسقین (المائدۃ ۵-۲۶)

وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ
مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ
وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي
اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۞ ۶

اور جب عیسیٰؑ ابن مریم نے کہا ، اے بنی اسرائیل
میں تمھاری طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس کی تصدیق
کرتا ہُوا جو میرے سامنے توریت سے ہے ۔ اور ایک
رسول کی خوش خبری دیتا ہُوا جو میرے بعد آئے گا ۔
اس کا نام احمدؐ ہے سو جب وہ ان کے پاس کھلی دلیلیں
لے کر آیا تو انھوں نے کہا یہ صریح جادو ہے ۳۳۴۳

۳۳۴۳ احمد یہاں احمد میں اشارہ ہے نبی صلعم کی طرف آپ کے نام اور آپ کے کاموں کے ساتھ اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ جیسے آپ کا نام احمد ہے اسی طرح آپ اپنے اخلاق اور احوال میں محمود ہونگے اور لفظ احمد کو عیسیٰ کی بشارت سے خاص کیا۔ اس بات کے جتانے کے لیے کہ آپ عیسیٰ سے بڑھ کر قابل حمد ہیں (غ) اور آنحضرت صلعم سے پہلے کوئی شخص نہیں گذرا جس کا نام احمد رکھا گیا ہو سوائے اس کے جو بیان کیا جاتا ہے۔ کہ خضر کا یہ نام تھا (ت) اور مُحمّد تحمید سے ہے گویا کہ اس کی بار بار تعریف کی جاتی ہے۔ (ل) اور لفظ احمد یا تو مضارع متکلم سے منقول ہے اور یا حامدیت سے افعل التفضیل ہے یعنی بہت حمد کرنے والا اور یہ بھی جائز ہے کہ محمودیت سے ہو یعنی بہت زیادہ قابل حمد (ر) اور یہ اسم جلیل ہمارے نبی محمد صلعم کے لیے علم ہے جیسا کہ حسان کے شعر میں ہے۔ صلی الالہ ومن یحف بعرشہ۔ والطیّبون علی المبارک احمد۔

حضرت عیسیٰ کی بشارت آنحضرت صلعم کے متعلق: حضرت عیسیٰ کی جس بشارت کا یہاں ذکر ہے وہ انجیل کے محرف مبدل ہونے کے باوجود اب تک اس میں پائی جاتی ہے چنانچہ ذیل کے مقامات پر یہ پیشگوئی ہے (۱) "اور میں باپ سے درخواست کرونگا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے" (یوحنا ۱۴-۱۶) (۲) "لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری گواہی دیگا" (یوحنا ۱۵-۲۶) (۳) "اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا" (یوحنا ۱۶-۷) (۴) "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہیگا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔ اور تمہیں آیندہ کی خبریں دے گا" (یوحنا ۱۶-۱۳)

روح القدس اس پیشگوئی کا مصداق نہیں: جس لفظ کا ترجمہ یہاں مددگار کیا گیا ہے وہ یونانی میں پیراکلیٹ ہے اور بائبل کے پہلے اردو ترجموں میں اس کا ترجمہ تسلی دینے والا کیا گیا ہے۔ اور ترمیم شدہ ترجموں میں مددگار کا لفظ اختیار کر کے حاشیہ میں وکیل یا شفیع کا لفظ دیا گیا ہے یعنی اس کا ترجمہ وکیل یا شفیع بھی ہو سکتا ہے۔ عیسائیوں کو اس پیشگوئی کے بارے میں بہت مشکلات پیش آئی ہیں۔ اس لیے کہ جب اس کا مصداق آیا تو انہوں نے اسے قبول نہ کیا اور کہا یہ جاتا ہے کہ اس دوسرے تسلی دینے والے سے مراد روح القدس ہے جو عیسائیوں کے نزدیک خدائی کا تیسرا اقنوم ہے اس میں شک نہیں کہ اس دوسرے شفیع کو روح القدس اور سچائی کی روح بھی کہا گیا ہے مگر اس ساری پیشگوئی میں کھلے قرائن موجود ہیں کہ اس سے مراد وہ روح القدس نہیں جو عیسائیوں کی خدائی کا تیسرا اقنوم ہے اول۔ اسے دوسرا مددگار یا شفیع کہا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کی طرح کا ہی شفیع یا مددگار ہے یعنی بصورت انسان۔ دوم۔ پیشگوئیوں میں انتظار ایک نبی کا تو پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ استثنا ۱۸-۱۸ کی پیشگوئی کا انتظار حضرت مسیح کے وقت تک پایا جاتا ہے یعنی مثیل موسیٰ نبی کے آنے کی پیشگوئی۔ لیکن روح القدس کے آنے کی کوئی پیشگوئی بائبل میں کہیں نہیں۔ سوم۔ اس کے متعلق لکھا ہے کہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ تمہارے پاس نہ آئے گا۔ اب روح القدس کے متعلق یہ کسی صورت میں نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت عیسیٰ کے جانے سے اس کا آنا وابستہ تھا کیونکہ روح القدس کا نزول پہلے بھی انبیاء پر ہوتا رہا۔ خود حضرت عیسیٰ پر بھی حضرت یحییٰ سے بپتسمہ لینے کے وقت روح القدس کا نزول ہوا اور حضرت عیسیٰ کے جانے سے جس شفیع کا آنا وابستہ ہے وہی موعود نبی ہے جس کا ذکر استثنا ۱۸-۱۸ میں ہے یہ قطعی دلیل ہے اس بات پر کہ یہاں روح القدس کے نزول کی پیشگوئی نہیں۔ چہارم۔ اس کے متعلق صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہیگا۔ لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔ اب روح القدس کہاں سے سنے گا اگر نبی کی پیشگوئی اسے مانیں تو بات صاف ہے کہ نبی جو کچھ اللہ تعالیٰ سے سنتا ہے وہی کہتا ہے مگر روح القدس کہیں سے نہیں سنتا وہ خود خدائی کا اقنوم ثالث ہے۔ پنجم۔ وہ باتیں جو حضرت عیسیٰ نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ اس قوم میں ان باتوں کی برداشت نہیں وہ دوسرا شفیع آکر کہیگا۔ روح القدس نے نہ کوئی ایسی باتیں کہیں نہ کہہ سکتا تھا نہ حضرت عیسیٰ کے رخصت ہوتے ہی ان کی قوم میں کوئی نئی طاقت پیدا ہو گئی تھی۔ ششم۔ اس کے متعلق صاف لکھا ہے کہ وہ آیندہ کی خبریں دیگا اور آیندہ کی خبریں دینے والے کو لغت میں نبی کہتے ہیں۔ پس صاف معلوم ہوا کہ یہ نبی کی پیشگوئی ہے۔ روح القدس نے کوئی آیندہ کی خبریں عیسائیوں کو نہیں دیں اور نہ آج عیسائیوں میں کوئی ایسا شخص پایا جاتا ہے جو روح القدس کے اثر

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُوَ يُدْعٰۤى اِلَى الْاِسْلَامِؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ⑦	اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ افترا کرتا ہے اور اسے اسلام کی طرف بلایا جائے اور اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۳۳۴۴
يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ⑧	چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نُور کو اپنے مونہوں (کی پھونکوں) سے بجھادیں ۳۳۴۴ ؎ اور اللہ تعالیٰ اپنے نور کو پورا کرکے رہیگا گو کافر بُرا منائیں۔
هُوَ الَّذِىْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ⑨ ع	وہی ہے جس نے اپنا رسولؐ ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا، تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے اگرچہ مشرک بُرا منائیں۔
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ⑩	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو میں تمھیں ایسی تجارت بتاتا ہوں جو تمھیں دردناک عذاب سے بچائے ۳۳۴۵

سے آیندہ کی خبریں دے سکے لیکن مسلمانوں میں بطفیل متابعت آنحضرت صلعم ایسی خبریں دینے والے آج بھی ہیں۔

حضرت عیسیٰ کی پیشگوئی کے مصداق آنحضرت صلعم ہیں: اگر یہ پیشگوئی رُوح القدس پر صادق نہیں آتی تو ہمارے نبی کریم صلعم پر نہایت صفائی سے صادق آتی ہے آپ ابد تک ہمارے ساتھ ہیں اس لیے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں اور آپکی نبوت کا دامن قیامت تک پھیلا ہوا ہے آپ نے حضرت عیسیٰ کی صداقت کی گواہی اس وقت دی جب دنیا انہیں رد کر رہی تھی۔ آپ کا آنا حضرت عیسیٰ کے جانے سے وابستہ تھا۔ آپ نے سچائی کی تمام راہیں دکھائیں الیوم اکملت لکم دینکم۔ آپ جو کچھ سنتے تھے وہی کہتے تھے۔ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ آپ نے آیندہ کی خبریں دیں اور آج تک آپ کی آیندہ کی خبریں پوری ہوکر آپ کی صداقت کی شہادت دے رہی ہیں۔ رہا یہ کہ اس آنے والے کو روح القدس یا روح حق کہا گیا ہے تو یہ بلحاظ اس کے تقدس اور اس کے حق ہونے کے ہے اور قرآن کریم نے بھی رسول اللہ صلعم کو الحق ہی کہا ہے قل جاء الحق پھر روح القدس نے کبھی نہ کہا کہ وہ مسیح کی اس پیشگوئی کی مصداق ہے مگر قرآن نے صاف طور پر اس پیشگوئی کو آنحضرت صلعم پر لگایا جیسا کہ اس آیت میں یا جیسا کہ یجد ونکم مکتوبًا عندھم فی التوراۃ والانجیل میں۔ یا جیسا کہ اس حدیث میں انا دعوۃ ابی ابراھیم وبشارۃ عیسیٰ میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں اور عیسیٰ کی بشارت۔

احمد کا لفظ اختیار کرنے کی وجہ: اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے۔ کہ قرآن شریف میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے احمد کے آنے کی خوشخبری دی تھی اور اناجیل میں کچھ اور الفاظ ہیں تو اصل بات یہ ہے کہ ترجمہ میں ایک لفظ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے جیسا کہ موجودہ تراجم سے بھی ظاہر ہے پس جب حضرت عیسیٰ کی اصل انجیل جو رومی یا عبرانی میں ہوگی کہیں دنیا میں موجود نہیں تو ہم وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ حضرت عیسیٰ نے کیا لفظ بولا تھا۔ سوائے اس کے کہ قرآن کی شہادت کو قبول کریں۔ اور وہ شہادت احمد پر ہے اور احمد آنحضرت صلعم کا اسم علم تھا اور حدیث صحیح میں آپ نے خود فرمایا ہے کہ انا محمد وانا احمد اور احمد کا لفظ یہاں اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ آنحضرت صلعم کا جمالی نام ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی چونکہ جمالی صفت کے مظہر ہی تھے اس لیے وہی نام ان کی بشارت میں ہونا لازم تھا۔

۳۳۴۴ اتمام نور سے مراد: یہ عیسائیوں کا ذکر ہے جو اللہ پر جھوٹ افترا کرتے ہیں کہ اس نے یہ تعلیم بھیجی تھی کہ خدا تین ہیں اور کہ عیسیٰ مسیح بھی خدا ہے۔ حالانکہ انہیں اسلام کی طرف بلایا جاتا ہے اور آگے بھی انہیں کی کوششوں کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اللہ کے نور کو بجھانے کی کوششیں کریں گے مگر اللہ اس اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر چھوڑے گا اور وہ کمال تک پہنچانا صرف تکمیل دین نہیں بلکہ دین اسلام کو کل دینوں پر غالب کرنا ہے۔

۳۳۴۴ ؎ یطفئوا - طَفِئَتِ النارُ آگ بجھ گئی - اَطْفَأْتُھَا میں نے اسے بجھا دیا۔ لیطفؤا میں اشارہ ہے کہ ایسے وسائل کا قصد کرتے ہیں جن سے اس آگ کو بجھا دیں (رغ)

۳۳۴۵ تجارۃ - راس المال میں تصرف ہے تاکہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے (رغ) اور یہاں تجارت اللہ اور رسول پر ایمان لانے کو کہا گیا ہے کیونکہ انسان کے قوائے روحانی بھی ایک راس المال کا حکم رکھتے ہیں۔ سو جو شخص انہیں ایسے طریق پر کام میں لاتا ہے کہ ان سے فائدہ اٹھائے تو وہ بھی گویا ایک قسم کی تجارت ہی کرتا ہے۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۱۱﴾

تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور اللہ تعالیٰ
کے رستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ
جہاد کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔

يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۙ﴿۱۲﴾

وہ تمھارے گناہوں سے تمھاری حفاظت کرے گا اور
تمھیں باغوں میں داخل کریگا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور
پاکیزہ مکانوں میں جو ہمیشگی کے باغوں میں ہیں۔ یہ
بڑی کامیابی ہے۔

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ
فَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

اور ایک اور چیز جسے تم پسند کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد
اور نزدیک فتح اور مومنوں کو خوش خبری دے ع۳۳۴۶

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ
كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ
مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ
نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ
بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ
فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ
فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ ع

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ تعالیٰ (کے دین) کے مددگار
بن جاؤ، جس طرح عیسیٰؑ بن مریم نے حواریوں سے کہا تھا،
اللہ تعالیٰ (کے رستے) میں کون میرے مددگار ہیں، حواریوں نے کہا
ہم اللہ تعالیٰ (کے دین) کے مددگار ہیں سو بنی اسرائیل سے ایک گروہ
ایمان لایا، اور ایک گروہ نے انکار کیا۔ سو ہم نے
مومنوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی
سو وہ غالب ہوگئے ع۳۳۴۷

ع۳۳۴۶ اوپر چونکہ نعمائے جنت کا تذکرہ کیا تھا اس لیے یہاں نصر من اللہ و فتح قریب میں اس دنیا کی کامیابیوں کا ذکر ہے۔
ع۳۳۴۷ نصرت دین بذریعہ اشاعت: حضرت عیسٰی نے جنگ نہیں کیا اس لیے یہاں انصار اللہ ہونے سے مراد اللہ تعالےٰ کے دین کی نصرت بذریعہ اشاعت ہے اور مسلمانوں کو یہ بتایا ہے کہ ان کی کامیابی بھی اسی میں ہے کہ جس طرح حضرت عیسٰی کے حواری اپنے دین کو لیکر مختلف ملکوں میں نکل گئے تھے اسی طرح مسلمان بھی دین اسلام کو دنیا کے اطراف و اکناف میں پہنچا دیں۔ گویا ابتدائے سورت میں اگر یہ بتایا تھا کہ مسلمان کو ملا کر اگر ضرورت ہو تو دین اسلام کی خاطر سر کٹوانے کے لیے بھی تیار رہو۔ اور آخر پر بتایا کہ دین کا غلبہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ اسے اطراف و اکناف عالم میں پہنچاؤ۔ شاید اس پچھلے زمانہ کی زیادہ تر ضرورت بھی یہی ہے صحابہ نے دونوں حکموں کی تعمیل کی اور توحید کو لیکر تمام دنیا میں پھیل گئے۔ مگر آج اسلام ساری دنیا میں بدنام ہو رہا ہے اور ان کے نام لیوا ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے بھی گھروں سے نکلنے کا نام نہیں لیتے۔

آیاتہا ۱۱ (۶۲) سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ مَدَنِيَّةٌ رکوعاتہا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ
الْحَكِيْمِ ۝۱

اللہ کی تسبیح کرتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (جو) بادشاہ پاک غالب حکمت والا (ہے)

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا
مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۲

وہی ہے جس نے اُمّیوں کے اندر انہی میں سے ایک رسولؐ بھیجا، جو اُن پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں پڑے تھے۔

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳

اور ان میں سے اوروں کو بھی ۔ جو ابھی ان کو نہیں ملے اور وہ غالب حکمت والا ہے ۳۳۴۸

تمہید سورت: اس سورت کا نام الجمعۃ ہے اور اس میں دو رکوع اور گیارہ آیتیں ہیں اصل مضمون اس سورت کا یہ ہے کہ نبی کریم صلعم ہی اب تا قیامت دنیا کے معلم اور مزکی رہیں گے اور جس قدر علم دنیا میں پھیلے گا اور جس قدر لوگوں کا تزکیہ ہوگا آپ کی شاگردی سے ہی پھیلے گا اور ہوگا اور چونکہ مسلمانوں میں تعلیم اسلامی کو زندہ رکھنے کے لیے جمعہ کے دن اجتماع نہایت ضروری ہے اس لحاظ سے اس سورت میں نماز جمعہ کی اہمیت کو بیان فرمایا ہے اور اسی پر اس سورت کا نام ہے گویا اصل غرض تو یہ ہے کہ تعلیم اسلامی ہی دنیا میں زندہ رہے گی۔ اور اس کی زندگی کے سامانوں میں سے جو ایک عظیم الشان سامان تھا اس کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے اور اسی پر سورت کا نام ہے۔ پچھلی سورت میں مسلمانوں کو بتایا تھا کہ دین کو دنیا کے کناروں تک پہنچائیں کیونکہ یہی دین سب دینوں پر غالب آئیگا۔ یہاں بتایا کہ آنحضرت صلعم کی شاگردی سے ہی اب دنیا کی پیاس بجھ سکے گی۔ یہ سورت مدنی ہے اور اس کا نزول بھی ابتدائی مدنی زمانہ سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

۳۳۴۸ و اخرین منھم۔ عطف امیین پر ہے یا یعلمھم میں ضمیر منصوب پر یعنی یعلمھم الکتاب والحکمۃ و یعلم اخرین منھم۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو صحابہ کے بعد آئے اور تعلیم کا سلسلہ جو یوں آخر زمانہ تک چلے گا تو وہ سب کا سب اوّل کی طرف ہی منسوب ہوگا (ر) اور ابن جریر نے دو قول نقل کیے ہیں ایک یہ کہ یہ اعاجم ہیں اور دوسرا یہ کہ اس میں وہ سب لوگ داخل ہیں جو بعد نبی صلعم قیامت تک اسلام میں داخل ہوتے رہیں گے خواہ کوئی ہوں اور بخاری میں پہلے قول کی تائید میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ہم نبی صلعم کے پاس بیٹھے تھے تو آپ پر سورت جمعہ نازل ہوئی تو میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ و اخرین منھم میں کن کا ذکر ہے تو آپ نے تین دفعہ سوال دہرانے پر اپنا ہاتھ سلمان فارسی کے کندھے پر رکھا اور فرمایا اگر ایمان ثریا پر ہوتا تو ان میں سے آدمی اس تک پہنچ جاتے یا ایک آدمی پہنچ جاتا۔ اور حدیث کا منشا یہ نہیں کہ اخرین منھم صرف فارسیوں میں سے ایک یا چند آدمی ہیں۔ بلکہ یہ آخرین کی مدح کے طور پر فرمایا ہے کہ وہ دوسرے لوگ جنھوں نے براہِ راست مجھ سے تعلیم نہیں پائی بلکہ وہ بعد میں آئیں گے اور میری تعلیم سے فائدہ اٹھائیں گے تو ان میں ایسے ایسے کامل الایمان لوگ بھی ہونگے اور یوں اخرین منھم میں کل امت صحابہ کے بعد اول سے لے کر آخر تک شامل ہے گویا ایک تو نبی کریم صلعم کے صحابہ ہیں جن کی تعریف قرآن شریف میں بار بار آچکی اور ایک آخرین ہیں ان کی تعریف میں آنحضرت صلعم نے یہ لفظ فرمائے کہ ان میں بھی بڑے بڑے کامل الایمان لوگ ہونگے اور یہ آیت نص صریح اس بات پر ہے کہ آنحضرت صلعم کے بعد دوسرا نبی نہیں آسکتا اور نہ ہی حضرت عیسیٰ آسکتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر ایسا ہو تو پھر اخرین کے معلم نبی کریم صلعم نہ ہونگے بلکہ وہ نبی ہوگا یا حضرت عیسیٰ ہونگے کیونکہ نبی براہ راست اللہ تعالیٰ سے بوساطت جبرئیل تعلیم حاصل کرتا ہے وہ کسی نبی کا شاگرد نہیں ہوتا اور حضرت عیسےٰ کے متعلق تو خود قرآن شریف کی شہادت موجود ہے۔ کہ انہوں نے تعلیم براہ راست اللہ تعالیٰ سے حاصل کی۔ آنحضرت صلعم سے نہیں کی ویعلمہ الکتاب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل (آل عمران ۳ - ۴۷)

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٤﴾

یہ اللہ تع کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور
اللہ (تعالیٰ) بڑے فضل والا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ
يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ
اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥﴾

ان لوگوں کی مثال جن پر توریت کا بوجھ ڈالا گیا، پھر انھوں
نے اسے نہ اٹھایا گدھے کی مثال کی طرح ہے (جو) کتابیں
اٹھاتا ہے۔ کیا ہی بُری مثال اُن لوگوں کی ہے جو اللہ تع
کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور اللہ (تعالیٰ) ظالم
لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ع۳۳۴۹

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ
اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٦﴾

کہہ اے لوگو! جو یہودی ہو اگر تم سمجھتے ہو کہ اور
لوگوں کو چھوڑ کر تم ہی اللہ تع کے دوست ہو تو موت کی
آرزو کرو اگر تم سچے ہو ع۳۳۵۰

وَ لَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ
اَيْدِيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٧﴾

اور کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے اس کی وجہ سے جو اُن کے
ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اور اللہ تع ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِىْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ
فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ
الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا
ع كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٨﴾

کہہ، موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ تمھیں مل کر رہے گی،
پھر تم پوشیدہ اور ظاہر کے جاننے والے کی طرف
لوٹائے جاؤ گے، سو وہ تمھیں اس کی خبر دے گا جو
تم کرتے تھے ع۳۳۵۱

ع۳۳۴۹ توریت کا بوجھ ڈالنے سے مراد اس پر عمل کے مکلف کیا جانا ہے۔ اور نہ اُٹھانے سے مراد ان کا اس پر عمل نہ کرنا ہے اور ان کو گدھے سے مثال دی۔ اس لیے کہ انسان جو نفع کتاب سے اُٹھا سکتا ہے وہ نہ اُٹھایا نرا بوجھ اس پر رہ گیا وہ مسلمان غور کریں جو قرآن کریم پر عمل نہیں کرتے۔

ع۳۳۵۰ یہ آرزوئے موت بزنگ مباہلہ ہے۔ دیکھو ع۱۲۰۔

ع۳۳۵۱ طاعون کے مقام سے نکلنا: آیت کا مطلب تو صاف ہے کہ یہ یہودی جو مباہلہ سے گریز کرتے ہیں تو کریں آخر اپنے کیے کی سزا پا کر ہی رہیں گے لیکن اس آیت سے یہ غلط استدلال کیا گیا ہے۔ کہ جہاں طاعون پڑ جائے وہاں سے بھاگنا نہیں چاہیئے حالانکہ صحابہ سے طاعون کی جگہ سے خروج کا جواز مروی ہے مثلاً عمرو بن العاص سے کہ انہوں نے کہا کہ طاعون رجس ہے اس سے وادیوں وغیرہ میں یعنی کھلے میدان میں پھیل جاؤ اور ابو موسیٰ اشعری سے کہ انہوں نے طاعون کے پڑنے پر کہا کہ کھلے میدان میں پھیل جاؤ یہاں تک کہ یہ دور ہو جائے البتہ یہ خیال کرنا کہ طاعون کی جگہ سے نکل جانا انسان کو موت سے بچانا ہے اچھا نہیں اور نہ ہی دوسری آبادی میں جانا مناسب ہے کیونکہ اس طرح وہاں بھی طاعون پھیل جائے گی۔

زندگی کی قدر اور موت کا خوف: موت کا خوف سو اس میں شک نہیں کہ دنیا پرست کفار موت کے نام سے گھبراتے ہیں اور دوسری طرف ادنیٰ ادنیٰ ناکامیوں پر خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ اس زندگی کی قدر و قیمت جانتے ہیں نہ دوسرے عالم کی۔ اسلام نے دونوں کی قدر و منزلت سکھاتی ہے اس زندگی کی قدر و منزلت تو یہاں تک ہے کہ خودکشی کرنے والا گویا مسلمان ہی نہیں رہتا اور اس کی موت کفر کی موت ہے اور دوسرے عالم کی قدر و منزلت یہاں تک ہے کہ جب انسان کے لیے پیغام اجل آ جائے تو خوشی سے اس زندگی کو الوداع کہہ کر دوسرے عالم کی طرف قدم رکھے۔ ہاں اس زندگی سے بھی بڑھ کر جس چیز کی قدر سکھائی ہے وہ انسان کا فرض ہے اگر کسی شخص کے سامنے یہ سوال ہو کہ اپنے فرض کو سرانجام دے اور موت قبول کرے یا فرض کو چھوڑ دے اور زندگی کو بچا لے تو بردئے تعلیم اسلام یہ دوسری بات ایک مومن کے شایانِ شان نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۹

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب جمعہ کے دن نماز کے لیے بلایا جائے تو اللہ (تعالیٰ) کے ذکر کی طرف جلدی آجاؤ اور کاروبار کو چھوڑ دو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو ۳۳۵۲

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۱۰

پس جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو اور اللہ (تعالیٰ) کو بہت یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو ۳۳۵۳

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۱۱ ع

اور جب تجارت یا کھیل کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف بھاگ جاتے ہیں اور تجھے کھڑا چھوڑ جاتے ہیں، کہہ جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ کھیل سے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ (تعالیٰ) بہترین رزق دینے والا ہے ۳۳۵۴

۳۳۵۲ علامہ ابن حجر کہتے ہیں کہ نماز جمعہ مکہ میں فرض ہوئی مگر رسول اللہ صلعم نے وہاں جمعہ نہیں پڑھایا تو اس لیے کہ کافی تعداد نہ تھی اور یا اس لیے کہ جمعہ کے لیے اظہار ضروری تھا اور مکہ میں آپ کو چھپ کر نماز پڑھنی پڑتی تھی اور مدینہ میں اول اول اسعد بن زرارہ نے جمعہ پڑھا مگر یہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ بغیر رسول اللہ صلعم کی ہدایت کے ایسا کیا اور بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے جب مصعب بن عمیر کو انصار کی تعلیم کے لیے بھیجا تو اسے جمعہ پڑھانے کا حکم دیا تھا اور مدینہ میں سب سے پہلے جمعہ انہوں نے قائم کیا اور اسعد ایک گاؤں میں جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ جو مدینہ سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور آنحضرت صلعم ہجرت کر کے جب تشریف لائے تو دوشنبہ کے دن قبا میں اُترے اور پھر جمعہ مدینہ میں جا کر پڑھا اور یہ پہلا جمعہ تھا جو آپ نے پڑھا اور کتنے آدمی ہوں تو جمعہ فرض ہوتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے ایک قول میں دو ایک میں تین ایک میں چار پھر اسی طرح بڑھاتے بڑھاتے چالیس اور اسی تک تعداد پہنچائی ہے اور ایک قول میں ہے کہ جماعت کثیر ہو بغیر تعداد کی قید کے اور صحیح یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ دوسے جب جماعت ہو جاتی ہے تو جمعہ کے لیے بھی دو آدمی کافی ہیں اور جمعہ کے ترک کرنے پر احادیث میں سخت مواعید ہیں اور جمعہ کا خطبہ وعظ و نصیحت کے لیے ہے اس لیے اگر سامعین نے اسے سمجھا نہیں تو اصل مقصد جمعہ کا فوت ہو گیا۔ عربی میں خطبہ پڑھ دینا جب سامعین عربی کا حرف بھی نہ جانتے ہوں جمعہ کی غرض کو ہی کالعدم کر دینا ہے۔ ایسا ہی اسعد کا ایک گاؤں میں جمعہ پڑھنا صاف بتاتا ہے کہ جمعہ شہر میں بھی ہو سکتا ہے اور گاؤں میں بھی اور جنگل میں بھی اور جمعہ کے بعد جو لوگ نماز ظہر کو دوہراتے ہیں اور اس کا نام احتیاطی رکھتے ہیں تو یہ طریق بالکل آنحضرتؐ اور صحابہ کے عمل کے خلاف ہے۔ یہ سورت مدنی ہے اور جمعہ کی فرضیت نماز کی فرضیت کے اندر آ جاتی ہے اس آیت میں مسلمانوں کو یہی ہدایت دی ہے کہ جمعہ کے دن نماز کے وقت کاروبار کو چھوڑ کر خطبہ وعظ اور نماز جمعہ میں ضرور شامل ہوں کیونکہ یہ ایک ضروری اجتماع ہے اور اگر اسے ترک کر دیا جائے تو قوم کے اندر پند و نصیحت کا سلسلہ باقی نہ رہ کر قوم مردہ ہو جاتی ہے گویا جمعہ ایک نہایت ضروری رکن دین تعلیم اسلام کو زندہ رکھنے کے لیے ہے اذا نودی سے یہ مراد نہیں کہ اگر اذان نہیں سنی تو اٹھے ہی نہیں بلکہ اس کا وقت مراد ہے اور بیع میں یہاں ہر قسم کے معاملات یا کاروبار شامل ہیں۔

۳۳۵۳ جمعہ کے دن کاروبار کی ممانعت نہیں: جمعہ پڑھ کر کاروبار میں لگ جانا جائز ہے اور کاروبار صرف نماز جمعہ کے لیے چھوڑے جاتے ہیں۔ آگے پیچھے نہیں یہودیوں یا عیسائیوں کے سبت کے خلاف کہ وہ سبت کا سارا دن دنیوی کاروبار کو ممنوع سمجھتے ہیں۔

۳۳۵۴ بخاری میں جابر بن عبد اللہ کی روایت ہے کہ ایک قافلہ جمعہ کے دن آ گیا۔ اور ہم آنحضرت صلعم کے پاس تھے تو لوگ اس کی طرف دوڑ گئے اور آپ کے ساتھ صرف بارہ آدمی رہ گئے اور بعض روایات میں ہے کہ اس وقت آنحضرت صلعم خطبہ پڑھ رہے تھے تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ بات کہ قافلہ کی خبر سُن کر صحابہ اُدھر بھاگ گئے ہوں اور خطبہ چھوڑ گئے ہوں کسی طرح قابل قبول نہیں۔ اور کوئی موقعہ ہو تو علیحدہ بات ہے اور قرآن شریف کے الفاظ میں تجارت اور لہو دو باتیں ہیں اور لہو کی طرف جانے والا کوئی مسلمان نہ تھا۔ اصل میں یہ ذکر منافقوں کا ہے کہ ان کی یہ حالت ہے کہ وہ تجارت اور کھیل کو ذکر اللہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور اگلی سورت انہی منافقوں کے ذکر پر ہے۔ اور عموماً ایک سورۃ کا خاتمہ اس ذکر پر ہوتا ہے جو اگلی سورت کا مضمون ہو۔

آیاتھا ۱۱ (۶۳) سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ مَدَنِيَّةٌ رکوعاتھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ
اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ
لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ
لَكٰذِبُوْنَ ۚ ①

جب منافق تیرے پاس آتے ہیں، کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو یقیناً اللہ تعالیٰ کا رسول ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے۔ اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں ۳۳۵۵ع

اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ②

انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے، سو وہ اللہ تعالیٰ کے رستے سے روکتے ہیں۔ بُرا کام ہے جو یہ کرتے ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ③

یہ اس لیے کہ وہ ایمان لائے پھر کافر ہوئے تو ان کے دلوں پر مُہر لگ گئی، سو وہ سمجھتے نہیں ۳۳۵۶ع

وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ
وَ اِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ
خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ
صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ

اور جب تو انھیں دیکھتا ہے تو ان کے جسم تجھے اچھے معلوم ہوتے ہیں اور اگر وہ بات کریں تو تُو ان کی بات کو سُنے، گویا کہ وہ لکڑیاں ہیں جنھیں (لباس پہنایا گیا ہے۔ وہ ہر زور کی آواز کو اپنے اوپر (تباہی) خیال کرتے ہیں۔ وہ دشمن ہیں، سو اُن سے بچتا

تمہید سورت: اس سورت کا نام المنافقون ہے اور اس میں دو رکوع اور گیارہ آیتیں ہیں اور اس میں منافقوں کا ذکر ہے جو منہ سے کچھ کہتے تھے اور دل میں کچھ رکھتے تھے اور یہ پچھلی سورت کے مضمون کا ہی تتمہ ہے تاکہ مومن کسی قسم کی مشابہت ایسے لوگوں سے پیدا نہ کریں اسی لیے دوسرے رکوع میں مومنوں کو ان کا اصل مقصد زندگی کا ذکر اللہ یاد دلا کر متنبہ کیا ہے کہ اموال و اولاد میں اس قدر مشغول نہ ہوں کہ اصل غرض زندگی کو بھول جائیں یہ سورت بھی مدنی ہے اور اسی زمانہ کی ہے جس زمانہ کی پچھلی سورت ہے۔

ع۳۳۵۵ منافقوں کا جھوٹ بولنا: رسول کی گواہی دینے سے مراد اس پر ایمان لانا ہے یعنی نشھد انك لرسول اللہ سے مراد ہے کہ ہم ایمان لاتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ مگر منافق ایمان نہ لاتے تھے ومن الناس من يقول اٰمنا باللہ وباليوم الاخر وماھم بمؤمنين (البقرۃ ۲-۸) اس لیے انہیں جھوٹے کہا ہے۔ اور یا ان کے جھوٹا ہونے سے مراد عام طور پر ان کی جھوٹ بولنے کی عادت ہے جیسا کہ بخاری میں اس آیت کی تفسیر میں زید بن ارقم کی حدیث ہے جو کہتے ہیں کہ میں نے کسی سفر میں عبداللہ بن ابی کو یہ کہتے سنا کہ ان لوگوں پر روپیہ خرچ نہ کرو جو رسول اللہ صلعم کے پاس ہیں تاکہ یہ لوگ نکل جائیں اور یہ بھی کہ مدینہ جب ہم واپس جائیں گے تو عزت والے لوگ ذلیل لوگوں کو نکال دیں گے۔ زید کہتے ہیں میں نے یہ واقعہ اپنے چچا سے بیان کیا انہوں نے رسول اللہ صلعم سے ذکر کیا۔ آپ نے عبداللہ بن ابی کو بلایا تو اس نے انکار کر دیا اور قسم اٹھائی کہ میں نے یہ نہیں کہا۔ زید کہتے ہیں مجھ پر یہ بہت ہی دشوار گذرا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں۔ اور آنحضرت صلعم نے مجھے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری تصدیق کرتا ہے۔

ع۳۳۵۶ منافقوں کا ایمان اور کفر: اٰمنوا ثم كفروا۔ بعض نے اسے ان لوگوں کے متعلق لیا ہے جو مرتد ہو گئے۔ اور یا مراد ہے کہ قول سے ایمان لاتے ہیں اور دل سے کفر کرتے ہیں۔ یا مومنوں کے سامنے ایمان لاتے ہیں اور اپنے شیاطین سے مل کر کفر کرتے ہیں۔

قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۡ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٤﴾

رہ ۔ اللہ انھیں ہلاک کرے کس طرح اُلٹے پھر جاتے ہیں ع۳۳۵۷

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٥﴾

اور جب انھیں کہا جاتا ہے آؤ اللہ کا رسولؐ تمھارے لیے بخشش مانگے ، وہ اپنے سر پھیر لیتے ہیں اور تو انھیں دیکھیگا کہ وہ (دوسروں کو بھی) روکتے ہیں اور وہ تکبّر کرنے والے ہیں ع۳۳۵۸

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٦﴾

ان پر برابر ہے کہ تو ان کے لیے بخشش مانگے یا ان کے لیے بخشش نہ مانگے ، اللہ انھیں نہیں بخشے گا ۔ اللہ (تعالیٰ) نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿٧﴾

وہی ہیں جو کہتے ہیں کہ ان پر خرچ نہ کرو جو اللہ کے رسولؐ کے پاس ہیں ، یہاں تک کہ وہ چلے جائیں اور اللہ کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کے خزانے ہیں ، لیکن منافق نہیں سمجھتے ۔

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٨﴾ ع ۱۳

کہتے ہیں اگر ہم مدینہ کی طرف لوٹ کر گئے تو عزّت والے ذلیل لوگوں کو اس سے نکال دیں گے اور اللہ کے لیے ہی عزّت ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے لیکن منافق نہیں جانتے ع۳۳۵۹

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٩﴾

اے لوگو ! جو ایمان لائے ہو نہ تمھارے مال اور نہ ہی تمھاری اولاد تمھیں اللہ کے ذکر سے غافل کریں اور جو کوئی ایسا کرے تو وہ نقصان اٹھانے والے ہیں ع۳۳۶۰

ع۳۳۵۷ خشب ۔ خَشَبٌ کی جمع ہے جس کے معنی لکڑی ہیں اور اس سے مراد ایسا شخص لیا جاتا ہے جسے حیا نہ ہو (غ)
مسندۃ ۔ سَنَدَ اصل میں وہ بلند زمین ہے جو پہاڑوں وغیرہ کے سامنے ہو ۔ اور سَنَدَ اَسْنَدَ کسی چیز کو کسی پر تکیہ دینے کے معنی میں آتا ہے اور حدیث کا اسناد اس کا نبی کریم صلعم تک پہنچانا ہے اور سَنَدَ ایک قسم کی چادر ہے اور سَنَّدَ الرجل کے معنی ہیں اس نے وہ لباس پہن لیا ہے ، جسے سَنَدَ کہا جاتا ہے (ل) اور یہاں گو عام طور پر ٹیک لگانے کے معنی لیے گئے ہیں مگر دوسرے معنی زیادہ موزوں ہیں یعنی ظاہر ڈیل ڈول اچھی ہے باتیں بھی خوب بنا بنا کرتے ہیں ۔ مگر جو کچھ ہے باہر ہی باہر ہے ۔ گویا وہ انسان نہیں بلکہ لکڑیاں ہیں جو اچھے لباس میں ملبوس کی گئی ہیں ۔ اور یحسبون کل صیحۃ علیھم سے یہ مراد ہے کہ دشمن کی چڑھائی وغیرہ کی جو آواز آتی ہے اس سے انہیں خیال گذرتا ہے کہ اب مارے گئے ۔

ع۳۳۵۸ لَوَّوا ۔ لَوَی رأسَہ کے معنی ہیں اماله ایک طرف کر لیا یہی معنی یہاں ہیں (غ) لوَی رأسه کے معنی ہیں صرفه اسے پھیر لیا اور تشدید مبالغہ کے لیے ہے اور یہ مثال ہے ترک مکارم کے لیے اور معروف سے الگ ہونے کے لیے اور اچھی بات میں کوتاہی کرنے سے (ل) ، اگلی آیت کا مضمون اس کے مطابق ہے جو سورۂ توبہ میں گذر چکا دیکھو ع۱۳۲۸ ۔

ع۳۳۵۹ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ عبداللہ بن ابی نے یہ باتیں کہی تھیں ۔ زید بن ارقم کی حدیث ع۳۳۵۵ میں گذر چکی ہے ۔

ع۳۳۶۰ تلھکم ۔ لَهَوْتُ بالشئ ۔ اس چیز میں مشغول ہو کر دوسری سے غافل ہو گیا ۔ اور لَهِيْتُ عن الشئ اس کے ذکر کو چھوڑ دیا اور اس سے

وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰﴾	اور اس سے خرچ کرو جو ہم نے تمہیں دیا ہے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت آجائے تو وہ کہے اے میرے رب تو نے مجھے ایک قریب وقت تک کیوں مہلت نہ دی تو میں صدقہ کرتا اور نیکوں میں سے ہوتا۔
وَ لَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱﴾ ع ۱۴	اور اللہ ہرگز کسی شخص کو مہلت نہیں دیتا۔ جب اس کا وقت مقرر آجائے اور اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

غافل ہوگیا۔ اور اَلْھَاہ ذٰلِکَ اس چیز نے اسے غافل کر دیا۔ (ل) اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ (التکاثر ۱۰۲-۱)

گو الفاظ عام ہیں مگر یہاں صاف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ مومنوں کو بھی کثرت سے اموال اور جتھے ملیں گے اور نصیحت کی ہے کہ اس وقت اللہ کے ذکر کو نہ چھوڑیں اور اصل مقصد زندگی سے غافل نہ ہو جائیں۔

سُوْرَةُ التَّغَابُنِ مَدَنِيَّةٌ (۶۴)

اٰیاتُھا ۱۸ — رکوعاتُھا ۲

تمہید سورت: اس سورت کا نام التغابن ہے۔ اور اس میں دو رکوع اور ۱۸ آیتیں ہیں۔ تغابن کے معنی ہیں اس کمی کا ظاہر ہو جانا جو انسان اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں دکھاتا ہے اور اس سورت کا مضمون یہی ہے کہ جو کچھ انسان خدا کے حق میں کمی دکھائے گا اس کا نتیجہ دیکھ لے گا۔ چونکہ پچھلی سورت میں منافقوں کا ذکر تھا اور مومنوں کو متنبہ کیا تھا کہ وہ مال و اولاد میں اسی طرح مبتلا ہو کر ذکر اللہ سے غافل نہ ہو جائیں اس لیے اب اس مضمون کو اور کھولا ہے اور انفاق فی سبیل اللہ کی طرف توجہ دلائی ہے اکثر کے قول میں یہ سورت مدنی ہے اور بلحاظ مضمون بھی مدنی ہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ انفاق پر زیادہ زور مدنی سورتوں میں ہی پایا جاتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ لَهُ الۡمُلۡكُ وَ لَهُ الۡحَمۡدُ ۫ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ①

اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ فَمِنۡكُمۡ كَافِرٌ وَّ مِنۡكُمۡ مُّؤۡمِنٌ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ②

وہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، سو تم میں سے (کوئی) کافر ہے اور (کوئی) تم میں سے مومن ہے اور اللہ تعالیٰ اسے جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے ٣٣٦١

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ وَ صَوَّرَكُمۡ فَاَحۡسَنَ صُوَرَكُمۡ ۚ وَ اِلَیۡهِ الۡمَصِیۡرُ ③

اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، اور تمھاری تصویریں بنائیں سو تمھاری تصویروں کو خوبصورت بنایا اور اسی کی طرف انجام کار جانا ہے۔

یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ یَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَ مَا تُعۡلِنُوۡنَ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ④

وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور اللہ سینوں کی باتوں کو جانتا ہے۔

اَلَمۡ یَاۡتِكُمۡ نَبَؤُا الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ۫ فَذَاقُوۡا وَبَالَ اَمۡرِهِمۡ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ⑤

کیا تمھارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی، جنھوں نے پہلے کفر کیا، سو انھوں نے اپنے کام کی سزا چکھی اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتۡ تَّاۡتِیۡهِمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَقَالُوۡۤا اَبَشَرٌ یَّهۡدُوۡنَنَا ۫ فَكَفَرُوۡا وَ تَوَلَّوۡا وَّ اسۡتَغۡنَی اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ⑥

یہ اس لیے کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی دلیلیں لے کر آتے تھے تو وہ کہتے، کیا انسان ہمیں راہ دکھائیں گے سو انھوں نے کفر کیا اور پھر گئے اور اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہ تھا اور اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے ٣٣٦٢

ع ٣٣٦١ خلق سب کی فطرت صحیحہ پر ہے کفر پر کوئی پیدا نہیں ہوتا: یعنی اللہ تعالیٰ تمھارا خالق ہے چاہیئے تو یہ تھا کہ سب ایمان لاتے مگر بعض لوگ کفر کو اختیار کر لیتے ہیں اور شکر نعمت نہیں کرتے چنانچہ آیت کے آخری الفاظ واللہ بما تعملون بصیر اس معنی کی وضاحت کرتے ہیں۔ اور اس کے یہ معنی کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے میں ہی بعض کو کافر اور بعض کو مومن بنا دیا ہے صحیح نہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پیدائش کے وقت کیا اس سے بھی پہلے علم ہوتا ہے کہ ایک شخص کیسا ہوگا مگر اللہ تعالیٰ پیدا سب کو صحیح فطرت پر کرتا ہے۔ فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا۔ (الروم ٣٠-٣٠) شقی وسعید کا ماں کے پیٹ میں لکھا جاتا: اور حدیث میں ہے کل مولود یولد علی الفطرۃ۔ اور کفر اور ایمان بذریعہ اکتساب ہیں اور حدیث میں آتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں جب بچہ ہوتا ہے تو ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس کا رزق اور اس کی اجل اور اس کا عمل اور اس کا شقی اور سعید ہونا لکھ لیتا ہے تو یہ سب کچھ علم الٰہی سے تعلق رکھتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی پیدائش میں کوئی ایسا فرق کر دیا جاتا ہے کہ وہ خاص قسم کے اعمال کے لیے مجبور ہوتا ہے یہ قرآن شریف کی تعلیم کے اصول کے خلاف ہے۔

ع ٣٣٦٢ بشر یہاں بطور جنس استعمال ہوا ہے۔ اس لیے یھدون جمع لایا گیا ہے۔

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ
قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ
بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ⑦

جو کافر ہیں وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اٹھائے نہیں جائیں گے کہہ ہاں میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے پھر تمھیں ضرور اس کی خبر دی جائیگی جو تم نے عمل کیے اور یہ اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ النُّوْرِ الَّذِيْٓ
اَنْزَلْنَا ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ⑧

سو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ؐ پر ایمان لاؤ اور اس نور (پر) جو ہم نے اتارا اور اللہ تعالیٰ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ
التَّغَابُنِ ؕ وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ
صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَ يُدْخِلْهُ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ⑨

جس دن کہ وہ تمھیں جمع ہونے کے دن کے لیے اکٹھا کریگا یہ کمی کے ظاہر ہو جانے کا دن ہے اور جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے اس کی بُرائیاں اس سے دور کر دیتا ہے اور اسے باغوں میں داخل کرتا ہے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ انہی میں رہیں گے یہ بڑی کامیابی ہے ۳۳۶۳

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑩ ع ۱۵

اور جو انکار کرتے ہیں اور ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں وہی آگ والے ہیں اسی میں رہیں گے اور وہ بری جگہ ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ
وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑪

اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی مصیبت نہیں پہنچتی اور جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۳۳۶۴

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ
تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا
الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ⑫

اور اللہ (تعالیٰ) کی اطاعت کرو اور رسول ؐ کی اطاعت کرو، پھر اگر تم پھر جاؤ تو ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُوْنَ ⑬

اللہ تعالیٰ وہ ہے کہ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں اور اللہ پر ہی مومنوں کو چاہیئے کہ بھروسا کریں۔

ع۳۳۶۳ تغابن۔ غَبن یہ ہے کہ تم اپنے ساتھی کا کسی معاملہ میں جو تمہارے اور اس کے درمیان ہو اخفا کے طریق پر حق کم کر دو۔ اور یہ مال میں بھی ہوتا ہے اور رائے میں بھی غَبِنْتُ کذا کے معنی ہیں اس سے غافل ہوا پس اسے غبن سمجھا اور یوم التغابن قیامت کا دن ہے بوجہ اس مبایعت میں ظہور غبن کے جس کی طرف آیات میں اشارہ ہے ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ۔ ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ۔ الذین یشترون بعھد اللہ وایمانھم ثمنا قلیلا اور بعض کے نزدیک یوم التغابن اسے اس لیے کہا گیا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ان کا اندازہ تھا اس کے خلاف وہاں ظاہر ہوگا (غ)، پس کافر کی وہ کمی ظاہر ہو جائے گی جو ترک ایمان کی وجہ سے ہے اور مومن کی وہ جو نیکی کی کمی کی وجہ سے ہے۔

ع۳۳۶۴ ایمان کا تعلق اول قلب سے ہی ہے۔ اور قلب مرکز ہے۔ پس ایمان سے دل ہدایت پاتا ہے۔ اور دل کے ہدایت پانے سے سب اعمال درست ہو جاتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ وَاَوۡلَادِكُمۡ عَدُوًّا لَّكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُمۡ ۚ وَاِنۡ تَعۡفُوۡا وَتَصۡفَحُوۡا وَتَغۡفِرُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۴﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمھاری بیویوں میں سے اور تمھاری اولاد میں سے بعض تمھارے دشمن بھی ہیں، سو ان سے بچتے رہو۔ اور اگر تم معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو، تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ع۳۳۶۵

اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۵﴾

تمھارے مال اور تمھاری اولاد صرف ایک آزمائش ہیں اور اللہ تعالیٰ وہ ہے کہ اس کے پاس بڑا اجر ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِيۡعُوۡا وَاَنۡفِقُوۡا خَيۡرًا لِّاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۶﴾

سو اللہ تعالیٰ کا تقویٰ کرو جہاں تک ہو سکے اور سنو اور اطاعت کرو اور خرچ کرو، تمھارے اپنے لیے بہتر ہے اور جو اپنے نفس کے بخل سے بچ جائے، تو وہی کامیاب ہیں۔

اِنۡ تُقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا يُّضٰعِفۡهُ لَكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ﴿۱۷﴾

ع ۸/۱۶ عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۸﴾

اگر تم اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی اچھا مال الگ کرو تو وہ اسے تمھارے لیے بڑھاتا ہے اور تمھاری حفاظت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ قدر کرنیوالا بردبار ہے پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا غالب حکمت والا ہے۔

ع۳۳۶۵ بیبیاں اور اولاد کس معنی میں انسان کے دشمن ہیں: اس سے یہ مطلب نہیں کہ بعض بیبیاں خاوندوں کی دشمن ہو جاتی ہیں اور ان کے قتل کے منصوبے کرتی ہیں اور بعض اولاد ماں باپ کی دشمن بن جاتی ہے۔ بلکہ ان کا دشمن ہونا اس لحاظ سے ہے جس کی تصریح آگے خود کر دی ہے۔ کہ وہ فتنہ یعنی آزمایش ہیں بی بی اور اولاد کی محبت انسان سے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی معصیت کے بڑے بڑے کام کرا دیتی ہے بلکہ جب خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو بڑی رکاوٹ یہی ہو جاتی ہے یعنی یا بی بی اور اولاد کا خیال یا وہ چاہتے نہیں کہ تمہارا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ ہو اور یوں انفاق فی سبیل اللہ میں وہ روک ہو جاتے ہیں اور یہی ان کا دشمن ہونا ہے یعنی وہ انسان کے آخرکار نقصان کا موجب ہو جاتے ہیں اور ایک حدیث میں ہے کہ میری امت پر ایک ایسا زمانہ آئیگا کہ ایک شخص کی ہلاکت اس کی بی بی اور اس کی اولاد کے ہاتھ پر ہو گی۔ یعنی وہ ان کے لیے مال کمانے کی خاطر ارتکاب معاصی کرے گا اور ہلاک ہو جائے گا۔ اور آخر پر جو فرمایا وان تعفوا وتصفحوا وتغفروا تو یہ مراد ہے کہ بیبیوں اور اولاد سے اگر تمہیں کچھ تکلیف پیش آئے۔ اس لیے کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم انہیں ناجائز مال لا کر دو یا تمہارے انفاق فی سبیل اللہ پر تم سے ناراض ہو جاتے ہیں یا تکلیف پہنچاتے ہیں۔ تو تم ان سے عفو درگزر وغیرہ ہی کرو اور اگلی آیت میں صاف کر دیا کہ مال اور اولاد انسان کے لیے فتنہ ہے۔ یعنی اس ذریعہ سے اس کا کھرا پن اور کھوٹا پن پرکھا جاتا ہے کہ کون اولاد اور بی بی کی محبت پر اللہ تعالیٰ کی محبت کو قربان کر کے انفاق سے رک جاتا ہے۔ اور کون اللہ کی محبت کو سب پر مقدم کر لیتا ہے اور اس مضمون کو آیت ۱۶ میں سب کا نتیجہ انفقوا لا کر صاف کر دیا ہے۔ اور ساتھ ہی من یوق شح نفسہ بھی بڑھا دیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ اصل غرض یہی ہے۔

سُوْرَةُ الطَّلَاقِ مَدَنِيَّةٌ (۶۵) اٰيَاتُهَا ۱۲ رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَ اتَّقُوا

اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کی حفاظت کرو ۳۳۶۶ اور اللہ تعا

تمہید سورت: اس سورت کا نام الطلاق ہے اور اس میں دو رکوع اور ۱۲ آیتیں ہیں۔ اس کے پہلے رکوع میں طلاق کے کچھ مسائل کا ذکر ہے جو سورۂ بقرہ کے مضمون کی تکمیل کرتے ہیں اور دوسرے رکوع میں رسول کے احکام سے سرکشی اختیار کرنے کا نتیجہ بتایا ہے ان دونوں باتوں میں باہم تعلق کے لیے دیکھو ۳۳۶۲ سورت مدنی ہے اور سورۂ بقرہ کے بعد کی نازل شدہ ہے غالباً اس کا زمانہ چھٹے سال ہجری کے قریب کا ہے بظاہر اس سورت میں ایک ایسے مضمون کا ذکر ہے جس کا پہلی سورتوں سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اگر قرآن کی ترتیب پر بحیثیت مجموعی ایک غور کی نظر ڈالی جائے تو یہی ظاہر بے تعلقی ایک لطیف حکمت کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے قرآن کریم کی ابتدا مدنی سورتوں سے ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ مکّی سورتوں پر ہوتا ہے یعنی سورۂ تحریم کے بعد انتیسویں پارہ سے لے کر آخر تک مکّی سورتیں ہیں سوائے سورۂ النصر کے کہ اس کا نزول بھی گو مدنی زمانہ میں ہے مگر مکّہ میں ہی ہوا اور ظاہر ہے کہ مکّی سورتوں میں تفصیلات شریعت نہیں۔ اور یوں یہ دونوں سورتیں الطلاق اور التحریم مدنی سورتوں کے خاتمہ پر ہیں۔ تو جس طرح پر سب سے پہلی مدنی سورت یعنی سورۂ بقرہ میں ایلاء اور طلاق کا ذکر تھا۔ یہاں مدنی سورتوں کے خاتمہ پر ان سورتوں کو رکھا ہے جن میں وہی ذکر ہے اور یوں گویا اس پہلی سورت کے مضمون کی تکمیل یہاں کر کے ایک پُر حکمت ترتیب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس بات کی طرف بھی کہ قرآن کریم نے ایک معمولی مسئلہ طلاق کو کمال کو پہنچا کر یہ دکھا دیا کہ اس میں ہر ایک ضروری مسئلہ تکمیل کو پہنچا دیا گیا ہے۔ گویا تفصیلات شریعت میں مسئلہ طلاق سے ہی آغاز کیا۔ اور مسئلہ طلاق پر ہی خاتمہ کیا۔ اور فی الحقیقت یہ دس مدنی سورتیں یعنی۔ الحدید۔ المجادلۃ۔ الحشر۔ الممتحنۃ۔ الصف۔ الجمعۃ۔ المنافقون۔ التغابن۔ الطلاق۔ التحریم۔ جن کو یہاں مکّی سورتوں کے اندر رکھا گیا ہے سب کی سب ہی سورۂ بقرہ کے مضمون کی تکمیل کرتی ہیں اور جس طرح سورۂ بقرہ میں مومنوں کی فلاح کی راہیں بیان کی گئی ہیں ان میں بھی فلاح کی راہیں بیان کی گئی ہیں چنانچہ سورۂ بقرہ کی طرح ان سب میں کچھ ذکر منافقین کا اور کچھ یہود کا ہے جس طرح سورۂ بقرہ میں یہ ذکر تھا۔ اور تھوڑا سا ذکر عیسائیت کا ہے جو سورۂ آل عمران کے مضمون کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے اور کچھ تفصیلات شریعت یہاں ہیں جیسے سورۂ بقرہ میں تھیں اور خصوصیت سے زور انفاق فی سبیل اللہ پر ہے جیسے کہ سورۂ بقرہ میں بھی خصوصیت سے اس پر زور دیا گیا تھا۔ یقیناً یہ ترتیب سو رکسی انسان کے خیالات کا نتیجہ نہیں اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ طلاق کے مضمون میں عورتوں کے ساتھ رعایت اور حسن معاشرت اور ان پر تنگی نہ کرنے کی خاص طور پر تعلیم ہے۔ یہاں بھی اور سورۂ بقرہ میں بھی اور قرآن کریم کے اس حصّہ کا خاتمہ جس میں تفصیلات شریعت ہیں اس مضمون سے کر کے یہ بتا دیا کہ اسلام عورتوں سے حسن سلوک اور معاشرت اور خانہ داری کے صحیح اصول کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ نبی کریم صلعم کے حجۃ الوداع کے خطبہ میں بھی عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی خاص تعلیم ہے۔ یہ بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے اور فی الحقیقت سچ یہی ہے کہ اگر اس نصف حصّہ نسل انسانی کی جس کے سپرد ساری نسل انسانی کی بچپن کی تربیت ہے قدر نہ کی جائے تو نتیجہ یہی ہوگا کہ ساری نسل کی ترقی پر بُرا اثر پڑیگا اور آج مسلمان اس معاملہ میں کوتاہی کے نتائج کو ہی بھگت رہے ہیں۔

۳۳۶۶ خطاب آنحضرتؐ سے خاص ہے اور حکم عام ہے۔ گویا نبی کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم اپنی امت کو یوں کہو اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے احکام جو ایسے مسائل میں ہوں وہ سب واجب العمل ہیں۔

طریق طلاق: طلقوھن لعدتھن کے معنی ہیں مستقبلات لعدتھن یعنی ایسے طور پر طلاق دو کہ وہاں سے وہ اپنی عدت کا استقبال کرنے والی ہوں اور کشاف نے اس کی وضاحت یوں کی ہے۔ والمراد ان یطلقن فی طھر لم یجامعن فیہ ثم یخلین حتی تنقضی عدتھن۔ یعنی مراد یہ ہے کہ انہیں ایسے طہر میں طلاق دی جائے جس میں خاوند ان کے قریب نہیں گیا۔ اور پھر انہیں چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ ان کی عدت پوری ہو جائے۔

اور یہ طلاق احسن کہلاتی ہے۔ اور ابراہیم نخعی سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم کے اصحاب صرف ایک ہی طلاق دیتے تھے پھر اس کے بعد کوئی طلاق نہیں دیتے تھے یہاں تک کہ عدت گذر جائے اور بخاری میں ہے کہ عبداللہ بن عمر نے اپنی بی بی کو حالت حیض میں طلاق دی تو آنحضرت صلعم ناراض ہوئے اور مراجعت کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ جب وہ غسل کرلے اور پھر ایک طہر گذرنے کے بعد حیض آئے پھر غسل کرے تو اگر چاہے تو طلاق دے قبل اس کے کہ اسے چھوئے یہ وہ عدت ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے طلاق کا طریق بتایا ہے اور وہ یہ ہے کہ طلاق صرف طہر میں دی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس طہر میں مقاربت نہ ہوئی ہو۔ اور جب طلاق دی جائے

اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۗ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۗ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۗ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ①

اپنے رب کا تقوےٰ کرو، انھیں اپنے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں سوائے اس کے کہ کھلی بے حیائی کریں۔ اور یہ اللہ (تعالےٰ) کی حدیں ہیں۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی حدوں سے آگے بڑھتا ہے تو وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے تُو نہیں جانتا شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی بات پیدا کردے ۳۳۶۷

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۗ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ②

پس جب وہ اپنے مقرر وقت کو پہنچنے لگیں تو انھیں پسندیدہ طریق سے روک رکھو یا پسندیدہ طریق سے انھیں جدا کردو اور اپنے میں سے دو صاحبِ عدل گواہ رکھ لو اور گواہی کو اللہ تعالیٰ کے لیے درست ادا کرو، ان باتوں کا اسے وعظ کیا جاتا ہے جو اللہ (تعالےٰ) اور پچھلے دن پر ایمان لاتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کا تقوےٰ کرتا ہے وہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا رستہ بنا دیتا ہے ۳۳۶۸

تو اس سے عدت شروع ہو جائے گی اور پھر اس عدت کا شمار رکھا جائے یعنی تین طہر گذریں پس ان طہروں کے اندر کوئی دوسری طلاق نہیں دی جاسکتی۔ صحابہ کا بھی یہی عمل تھا۔ مگر جہاں قرآن کریم کے الفاظ صاف موجود ہیں۔ وہاں کسی عمل کا بھی کوئی سوال نہیں۔

تین طلاق: البتہ یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اس حکم قرآنی کے خلاف کیا جائے تو کیا ہوگا سو اگر کوئی شخص حالت حیض میں طلاق دے تو مراجعت نبی کریم صلعم سے ثابت ہے جیسا کہ ابن عمر کی حدیث میں اوپر گذر چکا ہے۔ اور اگر طہر میں طلاق دے لیکن تین طلاق ایک ہی وقت دے جسے طلاق بدعی کہا جاتا ہے۔ یا تین طہروں میں تین طلاقیں دے تو اس کا اثر صرف اس قدر ہوگا۔ کہ پہلی طلاق پر عدت شروع ہو جائے گی اور باقی طلاقیں خواہ اسی وقت کہی گئی ہوں خواہ بعد کے طہروں میں بے اثر ہونگی۔ کیونکہ وہ حکم قرآنی کے خلاف ہیں۔ گویا یہ طلاق ایک ہی طلاق کے حکم میں ہوگی اور صحیحین میں ہے کہ ابو الصہباء نے حضرت ابن عباس سے کہا تھا کہ کیا آپ نہیں جانتے کہ تین طلاقیں نبی کریم صلعم کے زمانہ میں ایک ہی قرار دی جاتی تھیں تو آپ نے جواب میں فرمایا ہاں۔ اور باقی جو لوگوں نے شان نزول میں باتیں بیان کی ہیں تو قرطبی علمائے حدیث کا قول نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صحیح بات یہی ہے کہ یہ ابتداً ایک حکم شرعی کے بیان کے لیے نازل ہوئی اور اسباب نزول میں جو باتیں بیان کی جاتی ہیں وہ صحیح ثابت نہیں ہوتیں (م)

۳۳۶۷ء یعنی عدت میں عورتوں کا اسی طرح گھر میں رکھنا ضروری ہے جس طرح وہ نکاح کی حالت میں تھیں اور انہیں بھی یہی حکم ہے کہ انہی گھروں میں رہیں اس سے مقصود یہ ہے کہ شاید کوئی اصلاح کی صورت پیدا ہو جائے لیکن ایک صورت میں ان کا گھر سے رخصت کردینا جائز ہے۔ یعنی جب ان کو کسی امر فاحش کے ارتکاب کی وجہ سے طلاق دی گئی ہو، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ طلاق کسی وجہ پر دی جاسکتی ہے اور بلاوجہ طلاق دینا جائز نہیں۔ اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ طلاق کو نبی کریم صلعم نے ابغض المباحات کہا ہے اور اسے مباح کہنا صاف بتاتا ہے کہ اس کی اجازت محض کسی ضرورت کی وجہ سے ہے اور اگر حاجت نہ ہو تو وہ مکروہ ہے۔ اور صحابہ کے طلاق سے جس قدر واقعات نقل ہوئے ہیں تو وہ سب بوجہ کسی ضرورت کے طلاق ہوئی ہے نہ بلا ضرورت اور آخری الفاظ یحدث بعد ذٰلک امرا میں اسی طرف اشارہ ہے کہ ان کا گھر میں رہنا اس لیے ضروری ہے کہ تا شاید پھر موافقت کا سامان ہو جائے۔

۳۳۶۸ء طلاق اور مراجعت پر شہادت: یہاں جس شہادت کا ذکر ہے وہ بظاہر طلاق اور مراجعت دونوں پر حاوی ہے کیونکہ دونوں باتوں کا یہاں ذکر ہے مگر بعض نے اسے صرف مراجعت کے متعلق سمجھا ہے۔ اور طبری کا قول ہے کہ یہ طلاق کے وقت شہادت ہے۔

وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ﴿۳﴾

اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرتا ہے تو وہ اس کے لیے بس ہے بیشک اللہ تعالیٰ اپنے کام کو پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔ ۳۳۶۹

وَالّٰٓـِٔیْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔیْ لَمْ يَحِضْنَ ؕ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ﴿۴﴾

اور جو تمھاری عورتوں میں سے حیض سے ناامید ہو چکی ہیں اگر تمھیں شک ہو تو ان کی عدّت تین مہینے ہے اور (ان کی بھی) جنھیں حیض نہیں آتا، اور حمل والی عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ بچّہ جنیں۔ اور جو اللہ (تعالےٰ) کا تقوےٰ کرتا ہے وہ اس کے کام میں آسانی پیدا کر دیتا ہے ۳۳۷۰

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَ يُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ﴿۵﴾

یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جو اس نے تمھاری طرف اتارا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا تقویٰ کرتا ہے وہ اس کی برائیوں کو اس سے دور کر دیتا ہے اور اس کو بہت بڑا اجر دیتا ہے۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَ لَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ

انھیں اپنے مقدور کے مطابق وہیں رکھو جہاں تم رہتے ہو، اور انھیں تنگ کرنے کے لیے انھیں تکلیف نہ دو۔ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرتے رہو،

ع۳۳۶۹ متقی کے لیے مخرج اور رزق کا وعدہ: متقی کے لیے دو باتوں کا وعدہ کیا ہے۔ ایک مخرج اور ایک رزق من حیث لا یحتسب۔ طلاق کے مسئلہ میں اس بات کے ذکر میں یہ سمجھایا ہے کہ مشکلات سے اگر انسان نکل سکتا ہے تو صرف تقویٰ سے اور عورتوں کے معاملہ میں تقویٰ ان کے حقوق کی نگہداشت ہے پس ایک طرف مردوں کو سمجھایا ہے کہ وہ عورتوں پر تشدد کر کے اور ان کے حقوق کی طرف سے لاپروائی برت کر مشکلات سے نجات نہیں پا سکتے اور دوسری طرف عورتوں کو تسلی دی ہے کہ اگر وہ تقویٰ پر قائم رہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو مشکلات سے بھی نجات دیگا اور اپنی جناب سے رزق کا سامان بھی کر دیگا اور یوں اپنے عام قانون کا ذکر فرمایا ہے کہ جو شخص تقویٰ کرے مرد ہو یا عورت اللہ تعالیٰ اسے مشکلات سے بھی نکال دیتا ہے اور رزق بھی ایسے ذریعوں سے بہم پہنچاتا ہے کہ اسے ان ذرائع کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ اللہ کے بالغ امرہ ہونے سے یہ مطلب ہے کہ جس بات کا وہ ارادہ کر لے یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ پوری نہ ہو بلغ کے لیے دیکھو ع۳۰۰

ع۳۳۷۰ حیض نہ آنے کی صورت میں عدت: طلاق کی اصل عدت تین قرء ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گذر چکا ہے لیکن یہاں تین قسم کی عورتوں کا ذکر کیا جو قرء سے عدت شمار نہیں کر سکتیں ایک وہ جو اس قدر بوڑھی ہو گئی ہیں کہ انہیں حیض آنا موقوف ہو گیا ہے اور یہاں ان ارتبتم اس لیے بڑھایا کہ بعض وقت بیماری کی صورت ہو جاتی ہے جسے استحاضہ کہا جاتا ہے اور ماہوار ایام نہیں ہوتے۔ دوسری وہ جنہیں ابھی حیض آیا ہی نہیں۔

حاملہ کی عدت: اور تیسری حاملہ عورتیں۔ اور حاملہ کی صورت میں حکم عام ہے یعنی خواہ مطلقہ ہو خواہ بیوہ اس کی عدت وضع حمل ہے اور جس طرح حمل کی صورت میں اگر بیوہ کی معمولی عدت چار ماہ دس یوم گذر جائیں اور وضع حمل نہ ہوا ہو تو نکاح جائز نہیں۔ بلکہ وضع حمل کا انتظار کرنا ہوگا۔ اسی طرح اگر چار ماہ دس یوم سے پہلے وضع حمل ہو جائے تو عدت وضع حمل کے ساتھ ختم سمجھی جائے گی اور اس بارہ میں صحیح بخاری میں حدیث بھی ہے کہ حضرت ام سلمہ نے فرمایا کہ سُبَیْعَہ اسلمیہ کا خاوند مر گیا اور وہ حاملہ تھیں اور چالیس دن کے بعد ان کے ہاں بچہ ہوا تب انہیں نکاح کا پیغام آیا۔ اور رسول اللہ صلعم نے ان کا نکاح پڑھا دیا۔

فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ
فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ
وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ
تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ﴿٦﴾
لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ
قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ
اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا
ع مَآ اٰتٰىهَا ۭ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ﴿٧﴾

جہاں تک کہ بچہ جنیں - پھر اگر وہ تمھارے لیے دودھ پلائیں تو انھیں ان کی اجرت دو۔ اور آپس میں پسندیدہ طور پر مشورہ کرلو - اور اگر تم ایک دوسرے سے تنگی محسوس کرو تو اس کے لیے دوسری عورت دودھ پلا دے گی۔ ع۳۳۷۱
چاہیئے کہ وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس پر اس کی روزی تنگ ہے تو چاہیئے کہ وہ اس سے خرچ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اسے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص پر کچھ لازم نہیں کرتا مگر اسی کے مطابق جو اسے دیا ہے اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد آسانی کردے گا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ
رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا
شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ﴿٨﴾
فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ
اَمْرِهَا خُسْرًا ﴿٩﴾

اور کتنی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب کے حکم اور اس کے رسولوں سے سرکشی کی تو ہم نے اس کا حساب سختی سے لیا، اور اسے سخت سزا سے عذاب دیا۔
تو انھوں نے اپنے کام کی سزا چکھی، اور ان کے کام کا انجام گھاٹا ہی ہوا ع۳۳۷۲

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا
ع اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۖ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ
قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ﴿١٠﴾

اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کیا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ کا تقوےٰ کرو اے عقل والو جو ایمان لائے ہو، اللہ تعالیٰ نے تمھاری طرف ذکر اتارا ہے۔

رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ
لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ

(وہ) رسول وہی جو تم پر اللہ تعالیٰ کی کھلی آیتیں پڑھتا ہے۔ تاکہ انھیں جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں اندھیرے سے روشنی کی طرف نکالے اور جو اللہ (تعالیٰ) پر ایمان

ع۳۳۷۱ وَجَد۔ وجود یا پانا کئی طرح پر ہے مثلاً حواس خمسہ میں سے کسی سے یا قوت شہویہ یا غضبیہ سے یا عقل سے اور کسی چیز پر قدرت پا لینے کو بھی وجود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسے فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم (التوبۃ ۹-۵) اور فلم تجدوا ماء - (النساء ۴-۴۳) میں مراد ہے کہ پانی پر قدرت نہ پاؤ اور وُجد کے معنی بھی تمکّن ہیں اور غنا کو بھی وُجد کہا جاتا ہے اور یہاں مراد ہے اپنے غنا کے اندازہ پر (غ)
تضیقوا۔ دیکھو ع۱۳۵۸ اور یہاں نفقہ کی تنگی اور سینہ کی تنگی دونوں شامل ہیں (غ)
ائتمروا۔ دیکھو ع۱۱۳۳ اور ائتمار مشورہ کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک دوسرے کے امر کو قبول کرتا ہے (غ)
تعاسرتم۔ تعاسر القوم کے معنی ہیں طلبوا تعسیر الامر ایک امر کو مشکل کرنا چاہا (غ)

ع۳۳۷۲ پہلے رکوع میں طلاق کا ذکر ہے اور دوسرے میں رسولوں کے حکم سے انحراف کا وجہ تعلق یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح خاوند میں اثر ڈالنے کا اور زوجہ میں اثر قبول کرنے کا مادہ ہوتا ہے اسی طرح روحانی طور پر رسول میں اثر ڈالنے کا مادہ ہوتا ہے اور امت میں قبولیت اثر کا اور یوں ایک لطیف تعلق عورت کی خاوند سے علیحدگی اور امت کے تعلیم رسول سے انحراف میں ہے اور اس مضمون کو سورۂ تحریم کے آخر پر قرآن شریف نے خود واضح کر دیا ہے جہاں کفار کی مثال دو عورتوں سے دی ہے اور مومنوں کی مثال بھی دو عورتوں سے دی ہے دیکھو ع۳۳۸۳

بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ⑪

لاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے اس کو باغوں میں داخل کرتا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ہمیشہ انہی میں رہیگا اللہ تعالیٰ نے اسے اچھا رزق دیا ہے ۳۳۷۳

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ⑫

اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمین سے انھیں کی مانند ان کے درمیان حکم نازل ہوتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ۔ اور کہ اللہ (تعالیٰ) نے ہر چیز کا (اپنے) علم سے احاطہ کر رکھا ہے ۳۳۷۴

۳۳۷۳ رسول کا نزول: رسولا یہاں پہلی آیت میں ذکرا سے بدل ہے اور آنحضرت صلعم کے بھیجنے کو یہاں انزل سے تعبیر کیا ہے (م)

۳۳۷۴ چونکہ ہر چیز اپنے نیچے والی چیز کے لحاظ سے سماء کہلاتی ہے اور اوپر والی چیز کے لحاظ سے ارض دیکھو ۴۴ اس لیے سات آسمانوں اور ان کی مثل زمینوں سے مراد ایک ہی ہے یعنی نظام شمسی کے سات بڑے سیارے جو زمین کے علاوہ ہیں اور یا وہ سیارے اتنی زمینیں ہیں اور ان کے رستے جن میں وہ چلتے ہیں سبع سمٰوات ہیں جیسا کہ انہیں دوسری جگہ سبع طرائق (المومنون ۲۳-۱۷) کہا ہے اور یتنزل الامر بینھن سے مراد اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کا نفوذ بھی ہوسکتا ہے اور قتادہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کا حکم اور اس کی قضا ہر زمین میں ہے اور بعض کے نزدیک مراد موت اور حیات اور غنا اور فقر وغیرہ ہیں اور مقاتل کا قول ہے کہ نزول وحی مراد ہے اور بینھن اس لیے کہا کہ ان تمام میں ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک ان امور کا نفوذ ہے (م)

سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ مَدَنِيَّةٌ (۶۶)

اٰيَاتُهَا ۱۲ — رُكُوْعَاتُهَا ۲

تمہید سورت: اس سورت کا نام التحریم ہے اور اس میں دو رکوع اور بارہ آیتیں ہیں اور اس کا نام التحریم اس واقعہ سے لیا گیا ہے جو آنحضرت صلعم کو مدینہ میں پیش آیا یعنی واقعہ ایلاء اور وہ یہ تھا کہ آنحضرت صلعم کی بیبیوں نے جب مسلمانوں میں نسبتاً آسودہ حالی دیکھی تو انہیں خیال ہوا کہ انہیں بھی اس سے حصہ ملنا چاہیئے کہ آنحضرت صلعم کے گذارہ کی یہ حالت تھی کہ گھروں میں کوئی سامان نہ تھا۔ روشنی کے لیے چراغ تک نہ ہوتا تھا مہینوں صرف کھجور کھا کر پانی پی لیتے اور کھانا نہ پکتا تھا پس آپ کی بیبیوں کے دل میں اس خیال کا آنا کہ کسی قدر آسودہ حالی انہیں ملے ایک قدرتی امر تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے جس غرض کے لیے اپنے نبی کو اجازت دی تھی کہ ان بیبیوں کو اپنے نکاح میں لائیں وہ اس کے منافی تھی آنحضرت صلعم نے ان کے اس مطالبہ کو ناپسند کیا بعض بیبیوں نے اصرار اور مطالبہ میں شدّت کا پہلو اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنحضرت صلعم نے ایک ماہ کے لیے اپنی بیبیوں کو اپنے اوپر حرام کر دیا اور ایک بالاخانے میں علیحدگی اختیار کی اور لوگوں میں غلط مشہور ہوگیا کہ آپ نے طلاق دے دی ہے بالآخر وحی الٰہی نازل ہوئی اور ازواج مطہرات کو سمجھا دیا کہ اگر وہ نبی کے گھر میں رہنا چاہتی ہیں تو مال دنیا سے محروم ہوکر رہنا پڑے گا اور انہیں اختیار دیا گیا کہ چاہیں تو طلاق لے لیں اور مال دنیا کا حصہ۔ اور چاہیں نبی کے گھر میں رہیں۔ انہوں نے دوسری شق کو اختیار کیا لیکن آنحضرت صلعم ایک ماہ کے لیے علیحدگی کی قسم کھا چکے تھے اس پر یہ آیات نازل ہوئیں کہ آپ کے ایک حلال چیز کو حرام کر لینے سے امت میں فتنہ پڑتا ہے اس لحاظ سے تو سورت کا یہ نام ہے لیکن مومنوں کی تطہیر اور تزکیہ اس کا اصل مضمون ہے اس لیے دوسرے رکوع میں اس اصل غرض کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ امت فی الحقیقت عورت کے حکم میں ہے اور شاید نبی کریم صلعم کے ازواج مطہرات کو طلاق نہ دینے مگر ان سے عارضی علیحدگی اختیار کر لینے میں یہ باریک اشارہ ہو کہ اس امت کی حالت اپنے نبی کی تعلیم کے خلاف چلنے سے اس حد تک نہ پہنچے گی جس حد تک پہلی امتوں کی حالت پہنچی یعنی وہ امتیں اپنے نبیوں کے فرمان سے بالکل نکل گئیں جو گویا بی بی کی طلاق کے حکم میں ہے لیکن اس کے دنیا پر گر جانے اور دنیا کی طرف مائل ہو جانے سے اسے کچھ حصہ مصائب کا جو عارضی علیحدگی سے مشابہ ہے ضرور برداشت کرنا پڑے گا۔ سورت کا تعلق پچھلی سورت سے ظاہر ہے اور زمانہ نزول نواں سال ہجری ہے اور سورت مدنی ہے ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ ۚ تَبۡتَغِیۡ مَرۡضَاتَ اَزۡوَاجِکَ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ①

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
اے نبیؐ کیوں اسے حرام کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے حلال کیا، تُو اپنی بیویوں کی رضا چاہتا ہے اور اللہ (تعالیٰ) بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۳۳۷۵

۳۳۷۵ ان الفاظ میں کس چیز کی تحریم کا ذکر ہے؟ ایک لچر قصہ ماریہ قبطیہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے جس کے متعلق اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ وہ قصہ کسی صحیح طریق پر مروی نہیں دیکھو روح المعانی دوسرا قصہ شہد پینے کا ہے۔ یعنی نبی صلعم زینب بنت جحش کے گھر شہد پیا کرتے تھے تو حضرت عائشہ اور حفصہ نے یہ مشورہ کیا کہ آپ کو کہا جائے کہ آپ کے منہ سے عفافیر کی بو آتی ہے (یہ ایک بدبودار گوند ہے جو درخت سے جھڑتا ہے) چنانچہ ایسا کہا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں آیندہ شہد نہیں پیوں گا۔ یہ روایت گو بخاری میں ہے مگر محفوظ معلوم نہیں ہوتی اس لیے کہ اس بنا پر نبی کریم صلعم اس خاص شہد کا پینا چھوڑ سکتے تھے مگر یہ بات کہ مطلق شہد ہی چھوڑ دیتے جس کے متعلق قرآن شریف میں ہے فیہ شفاء للناس قابل قبول نہیں۔ اور نہ ہی حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کے متعلق یہ بات قابل قبول ہے کہ انہوں نے ایک جھوٹ بنایا ہو۔ ممکن ہے کہ اس قصہ کی کچھ اصلیت ہو اور وہ صرف اس قدر ہو کہ کوئی خاص قسم کا شہد ہو جس میں بُو ہو اور حضرت عائشہ یا حفصہ نے ایسا محسوس کر کے ہی یہ بات کہی ہو اور نبی کریم صلعم نے آیندہ اس کے پینے سے انکار کر دیا ہو اور بلاشبہ آپ کی طبیعت نفاست پسند تھی اور بُو یا میل سے آپ کو سخت نفرت تھی لیکن یہاں پر اس واقعہ کا ذکر نہیں ہو سکتا اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ تیسری بات جس کی طرف یہاں اشارہ ہے وہ بھی بخاری میں اور دیگر صحاح میں مذکور ہے۔ بخاری نے باب تبتغی مرضات ازواجك قد فرض الله لكم تحلة ايمانكم کے ماتحت ایک حدیث نقل کی ہے حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ وہ دو عورتیں کون ہیں جن کا ذکر ان آیات میں ہے وان تظاهرا عليه آپ نے فرمایا حفصہؓ اور عائشہؓ، پھر فرمایا کہ ہم جاہلیت میں عورتوں کی کچھ منزلت نہ سمجھتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارہ میں قرآن کریم میں احکام اتارے اور ان کے حصے مقرر کیے تو ایک دن میں ایک معاملہ میں کچھ فکر کر رہا تھا تو میری بی بی نے کہا کہ آپ یوں کریں تو میں نے کہا تمہیں اس معاملہ میں کیا دخل ہے۔ تم کیوں خواہ مخواہ بولتی ہو تو اس نے کہا تم عجیب آدمی ہو تم میری بات کو برداشت نہیں کرتے اور تمہاری بیٹی رسول اللہ صلعم سے سوال جواب کرتی ہے یہاں تک کہ آپ بعض وقت ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے بیان کیا ہے کہ وہ کس طرح حفصہؓ کے پاس اور پھر ام سلمہؓ کے پاس گئے کیونکہ اُن سے بھی کچھ تعلق قرابت تھا تو انہوں نے فرمایا کہ تم ہر بات میں دخل دیتے ہو یہاں تک کہ رسولؐ اور ان کی بیبیوں میں جو کوئی معاملہ ہو تم اس میں بھی دخل دینے لگے اس جواب پر آپ خاموش ہو کر واپس آگئے۔ پھر اس کے جلد ہی بعد ان کا ہمسایہ ایک دن آیا اور خبر دی کہ رسول اللہ صلعم اپنی بیبیوں سے الگ ہو گئے تو کہتے ہیں میں نے کہا کہ اب حفصہ اور عائشہ کو خفت اٹھانی پڑی تب میں مدینہ آیا اور رسول اللہ صلعم سے اذن لیکر اس بالاخانے میں گیا جس میں آپ نے علیحدگی اختیار کی تھی اور وہاں آپ سے وہ پہلا ذکر بھی کیا۔ اور احمد کی روایت میں یہ لفظ آتے ہیں کہ یہ خبر مشہور ہو گئی کہ رسول اللہ صلعم نے اپنی بیبیوں کو طلاق دیدی ہے۔ تو میں نے جا کر پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ نے اپنی بیبیوں کو طلاق دے دی ہے۔ تو آپ نے فرمایا نہیں اور اس کے آخر پر یہ لفظ آتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے قسم کھالی تھی کہ آپؐ ایک ماہ تک اپنی بیبیوں کے پاس نہیں جائیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اظہار ناراضی فرمایا (ت) اور بخاری نے آگے اذا اسر النبی اور ان تتوبا الی الله کے باب باندھ کر اسی حدیث کا ایک حصہ بیان کیا ہے۔

واقعہ ایلاء: جب ہم سیاق کو دیکھتے ہیں تو اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ اگر یہ شہد کا قصہ ہوتا تو اظہار ناراضی صرف دو بیبیوں پر ہوتا۔ یعنی حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ پر حالانکہ یہاں آگے چل کر عسى ربه ان طلقكن میں سب بیبیوں کو شامل کیا ہے اور یہ قطعی شہادت اس بات پر ہے کہ یہاں ذکر اسی ایلاء کے واقعہ کا ہے۔ جس میں سب بیبیاں شامل تھیں اور مطالبہ مال بھی سبھی کا تھا اور اس کا مفصل ذکر سورۂ احزاب میں گزر چکا ہے۔ یعنی آنحضرت صلعم کی ازواج نے زیادہ نفقہ طلب کیا تھا جس پر یہ آیات اتری تھیں یا یہا النبی قل لازواجك ان كنتن تردن الحيوة الدنيا وزينتها فتعالين امتعكن واسرحكن سراحا جميلا دیکھو ع ۲۶۴۷ پھر دوسرا قرینہ یہ ہے کہ پچھلی سورت کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔ یا یہا النبی اذا طلقتم النساء۔ اور اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔ یا یہا النبی لم تحرم ما احل الله لك جس میں صاف اس واقعۂ ایلاء کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے اور روایات سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کیونکہ احمد کی روایت کے آخر میں یہ لفظ ہیں حتی عاتبه الله اور وہ عتاب سوائے اس آیت کے اور کہیں نہیں پس یہ آیت اسی واقعہ کے متعلق ہے تیسرے ابن جریر میں حضرت عائشہ کی روایت صاف ہے۔ عن عائشة قالت الی رسول الله صلعم وحرم فامر فی الایلاء بکفارة وقيل له فی التحریم لم تحرم ما احل الله لك یعنی آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے ایلاء کیا۔ اور حرام ٹھیرایا تو ایلاء کے متعلق کفارہ کا حکم دیا گیا۔ اور تحریم کے متعلق فرمایا گیا لم تحرم ما احل الله لك حضرت عائشہ سے بہتر سند اس بارہ میں نہیں مل سکتی۔ اور نسائی میں حضرت ابن عباس کے متعلق ہے کہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا میں نے اپنی عورت کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے تو آپ نے فرمایا تو جھوٹ کہتا ہے وہ تجھ پر حرام نہیں پھر یہ آیت پڑھی لم تحرم ما احل الله لك (ر) جس سے معلوم ہوا کہ یہ بی بی کے اپنے اوپر حرام کر لینے کے متعلق ہی ہے۔ اور اہل لغت کے نزدیک حرام اور تحریم کا لفظ بالخصوص

قَدْ فَرَضَ اللّٰہُ لَکُمْ تَحِلَّۃَ اَیْمَانِکُمْ ۚ وَ اللّٰہُ مَوْلٰىکُمْ ۚ وَ ہُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ﴿۲﴾

اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے تمھاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ تمھارا کارساز ہے اور وہ علم والا حکمت والا ہے ۳۳۷۶

وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِہٖ وَ اَظْہَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ عَرَّفَ بَعْضَہٗ وَ اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَہَا بِہٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَکَ ہٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ﴿۳﴾

اور جب نبیؐ نے اپنی ایک بیوی سے ایک بھید کی بات کہی، سو جب اس نے وہ بات بتا دی اور اللہ تعالیٰ نے (نبی کو) اس پر آگاہ کر دیا تو اس کا کچھ حصّہ جتا دیا اور کچھ حصّہ سے اعراض کیا۔ پس جب اس کو اس کی خبر دی تو اس نے کہا آپ کو کس نے یہ بتایا۔ کہا مجھے علم والے خبردار نے بتایا ۳۳۷۷

ایسے موقعہ پر بولا جاتا ہے چنانچہ لسان العرب میں ہے کہ حضرت عمر کی حدیث میں ہے فی الحرام کفارۃ یعنی حرام میں کفارہ ہے جس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ زوجہ کی تحریم مراد ہے جس میں نیت طلاق نہ ہو اور آگے لکھا ہے کہ اسی سے ہے یا یھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لك اور اسی سے حدیث عائشہ ہے آلی رسول اللہ صلعم وحرم فجعل الحرام حلالاً۔ جس سے مراد ہے کہ جو اپنے نفس پر ایلاء کرکے اپنی بیبیوں کو حرام کر لیا تھا اس کو لوٹا یا یعنی حلال کیا (ل)

آپ کے ازواج سے حسن سلوک پر شہادت: "تبتغی مرضات ازواجك اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ بیبیوں کی رضامندی چاہنے سے کیا مراد ہے۔ شہد پینے کا واقعہ جس رنگ میں بیان کیا جاتا ہے اس میں اگر آنحضرت صلعم کا شہد پینا چھوڑ دینا ایک بی بی کو خوش کرنے کے لیے مانا جائے تو دوسری بی بی کو ناخوش کرنے والا تھا۔ اس لیے اس پر یہ لفظ صادق نہیں آسکتے کہ تو اپنی بیبیوں کی رضامندی کو چاہتا ہے۔ بظاہر یہ رضامندی کل کی ہے یا کم سے کم بہت بڑے حصّہ کی۔ اب ہم ایلاء کے واقعہ کو لیتے ہیں تو تبتغی مرضات ازواجك کے یہ معنی ہوئے کیا تو اپنی بیبیوں کی رضامندی چاہتا ہے؟ یعنی اگر تم ایسا چاہتے ہو تو پھر ان کو الگ کرنا ٹھیک نہیں کیونکہ ان کی رضامندی اسی میں ہے کہ وہ تمہاری زوجیت میں رہیں اور تھوڑے مال پر بھی خوش رہیں۔ ذٰلك ادنی ان تقر اعینھن ولا یحزن ویرضین بما اٰتیتھن کلھن (الاحزاب ۳۳-۵۱) یا یوں معنی ہو سکتے ہیں کہ تم تو اپنی بیبیوں کی رضامندی کو چاہتے ہو پھر علیحدگی کیوں اختیار کرتے ہو۔ اور یہ گویا آپ کے حسن سلوک کا نقشہ کھینچا ہے جو آپ اپنی بیبیوں سے کرتے تھے جیسا کہ آپ کے اپنے کلام سے اس کا ثبوت ملتا ہے خیرکم خیرکم لاھلہ وانا خیرکم لاھلہ اور یا مرضات ازواجك سے مراد بیبیوں کے لیے رضامندی ہے یعنی بیبیوں کے لیے رضائے الٰہی چاہتے ہو۔ تو گویا اس صورت میں یہ بتایا کہ آپ نے جو اپنی بیبیوں سے تعلق کو منقطع کیا جس پر لم تحرم نازل ہوا تو یہ اپنی خوشی کے لیے نہ تھا نہ محض غضب کی وجہ سے بلکہ اصل بات یہ تھی کہ آپ چاہتے تھے کہ یہ بیبیاں رضائے الٰہی کو حاصل کریں۔ کیونکہ ان کا مطالبہ زیادتی نفقہ کا رضائے الٰہی کے حصول کے خلاف تھا۔ تو پس یہ صاف کر دیا کہ آپ کا اپنے آپ کو ایک حلال چیز سے روکنا محض دوسروں کی خیرخواہی کے لیے ہے اور آپ نہ چاہتے تھے کہ جن لوگوں کا آپ سے تعلق ہے ان کا کوئی قدم رضائے الٰہی کے خلاف پڑے اس لیے آپ نے اپنے نفس پر تکلیف برداشت کرکے ایسی راہ اختیار کی پس آپ کا یہ فعل کوئی بھی معنی لیے جائیں محض حصول رضائے الٰہی کے لیے تھا۔ مگر اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے روک دیا اور گو ایلاء کو بھی اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا ہے دیکھو ع ۲۸۹ مگر چونکہ یہ ایلاء کی ایک خاص صورت تھی جس میں بیبیوں کو صرف ایک مدت معینہ کے لیے اپنے نفس پر حرام کر لیا گیا تھا جیسا کہ حضرت عائشہ کی روایت میں دونوں لفظ آتے ہیں۔ آلی وحرم اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا لم تحرم ما احل اللہ اور اپنے نبی کے لیے پسند نہ فرمایا کہ ایک حلال چیز کو اپنے لیے حرام کر لیں کیونکہ نبی صلعم میں اگر ایسا نمونہ جائز رکھا جاتا تو امت میں اس قسم کی افراط و تفریط کے لیے گنجائش نکل آتی۔ جس طرح پہلی امتوں نے افراط و تفریط کی راہیں اختیار کیں۔

ع ۳۳۷۶ تحلۃ۔ حلّ سے مصدر ہے وہ چیز جس سے قسم کی قید دور ہو جائے یہاں وہ کفارہ ہے (غ)

ع ۳۳۷۷ آنحضرتؐ اور آپ کی بی بی میں راز کی بات: یہ بات کیا تھی؟ شہد کے واقعہ کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے حضرت حفصہ سے کہہ دیا تھا کہ میں شہد کو آیندہ ترک کر دونگا، مگر یہ بات کسی سے نہ کہنا اور حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ کو یہ بات بتا دی اور ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم نے بعض روایات بیان کی ہیں کہ یہ بات حضرت ابوبکر اور عمر کی خلافت کے متعلق تھی۔ اور شیعہ کہتے ہیں کہ یہ بات حضرت علی کی خلافت کے متعلق تھی اور جس بات کو اللہ تعالیٰ نے مخفی رکھا ہے اس کے پیچھے پڑنا بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسی بات ہی ہو جس کا دوسروں پر ظاہر کرنا مصلحت نہ ہو میاں بی بی میں بعض ایسی راز کی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کا دوسروں پر ظاہر کرنا ٹھیک نہیں ہوتا اور ایسی بات کا اسی واقعہ ایلاء میں ہونا قرین قیاس بھی ہے۔ نیز دیکھو اگلا نوٹ۔ اور اس بات کے یہاں بیان کرنے سے ایک طرف نبی کریم صلعم کے اخلاق فاضلہ کا دکھانا مطلوب ہے کہ آپ اپنی بیبیوں کی قدر

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ④

اگر تم دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف جھک جاؤ تو تمھارے دل مائل ہی ہو چکے ہیں اور اگر تم اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو تو اللہ تعالیٰ ہی اس کا دوست ہے اور جبرئیلؑ اور صالح مومن بھی۔ اور (سب) فرشتے اس کے بعد مددگار ہیں ۔۳۳۷۸

عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ⑤

اگر وہ تمھیں طلاق دیدے تو اس کا رب ابھی اسے تم سے بہتر بیویاں تمھارے بدلے دیدے۔ مسلم، مومن، فرماں بردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت کرنے والیاں، روزے رکھنے والیاں، بیوہ اور کنواریاں ۔۳۳۷۹

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اس کے اوپر فرشتے (مقرر) ہیں سخت (اور) طاقتور،

ومنزلت کرتے تھے اور اپنے راز کی باتیں ان سے کہتے تھے اور پھر ساتھ ہی یہ کہ جب اس راز کو ظاہر کیا گیا تو آپ نے ساری بات جتائی بھی نہیں ایک تنگ دل آدمی ایسے موقعہ پر بی بی سے بڑی درشتی سے پیش آتا۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ بھی اپنی بیبیوں سے حسن سلوک میں آپ کے نقش قدم پر چلیں۔

۳۳۷۸ یہاں دو صورتوں کا ذکر ہے اول یہ صورت کہ وہ دو بیبیاں توبہ کریں اور دوسری یہ کہ نبی کریم صلعم کے خلاف ایک دوسری کی پیٹھ بھریں اب یہ ایک دوسری کی پیٹھ بھرنا اس واقعہ ایلاء کے متعلق ہے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نفقہ کی زیادتی کے مطالبہ میں ابتداءً دو بیبیاں یعنی حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ شامل تھیں۔ حضرت عمر کی حدیث جو اوپر نقل ہو چکی ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہاں حضرت عمر اپنی بیٹی حفصہ کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ عائشہ کے پیچھے تم نہ لگو اور یہ امر واقعہ ایلاء کے بالکل قریب کا ہے پس توبہ بھی اسی معاملہ کے متعلق ہے اور غالباً وہ مخفی بات بھی اسی معاملہ سے تعلق رکھتی ہے اور توبہ کی صورت میں جو فرمایا فقد صغت قلوبکما تو اس کے یہ معنی لینا کہ تمہارے دل رسول اللہ صلعم کی مخالفت کی طرف مائل ہو چکے ہیں زیادتی ہے صغی کے معنی صرف مائل ہوا ہیں خواہ اچھی بات کی طرف ہو یا بری بات کی طرف اور چونکہ برے پہلو کا ذکر دوسری صورت میں ہے یعنی وان تظاہرا علیہ میں اس لیے فقد صغت قلوبکما میں اچھے پہلو کا ذکر ہے یعنی تمہارے دل پہلے ہی رسول اللہ صلعم کی محبت اور فرمانبرداری کی طرف مائل ہیں اور دوسری صورت میں فرمایا کہ اللہ اس کا مولی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کا حقیقی تعلق تو اللہ سے ہے اور جبریل سے جو آپ پر وحی لاتا ہے اور پھر صالح مومنوں سے جو آپ کے پیغام کو قبول کرتے ہیں اور بیبیوں سے جو تعلق ہے وہ بھی بوجہ ان کے صالح ہونے کے ہے کہ وہ پیغام حق کے پہنچانے میں معاون بنتی ہیں پس جب اس کا حقیقی تعلق اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ سے ہے تو اگر بیبیاں پیغام حق کے پہنچانے میں روک پیدا کرنے لگیں تو اسے ان کی کیا پرواہ ہے تو گویا ایک طرف آپ کے بیبیوں سے تعلق اور محبت وغیرہ کا ذکر کیا تو دوسری طرف یہ بھی بتا دیا کہ محبت اور تعلق اسی صورت میں ہے کہ وہ بیبیاں پیغام حق کے پہنچانے میں معاون ہیں۔ اگر وہ روک بننے لگیں تو پھر وہ تعلق بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ اور یہی سبق مسلمانوں کو دیا کہ وہ اپنی بیبیوں سے اعلیٰ درجہ کے تعلقات محبت اور حسن سلوک رکھیں لیکن اگر وہ حق کے رستہ میں روک بنیں تو انکی کوئی پروانہ کریں ؞

۳۳۷۹ ثیبات۔ ثَیِّب کی جمع ہے اور وہ ایسی عورت کو کہا جاتا ہے جس نے نکاح کیا ہو پھر بعد مساس کسی وجہ سے الگ ہو گئی ہو یعنی خواہ خاوند کی وفات سے یا اس کے طلاق دینے سے (ل) اور اس کا مادہ ثیب بھی قرار دیا گیا ہے اور ثوب بمعنی رجوع بھی۔

آنحضرت کی ازواج کے اوصاف : ان طلقکن میں اب تمام بیبیوں کا ذکر ہے کیونکہ مطالبہ بالآخر تمام کی طرف سے تھا۔ اور یہاں بتایا یہ ہے کہ اگر آنحضرت صلعم سے علیحدگی تم چاہو اور اس کی صورت دوسری جگہ یوں بیان کی ہے ان کنتن تردن الحیوۃ الدنیا و زینتھا فتعالین امتعکن و اسرحکن سراحاً جمیلاً (الاحزاب ۳۳ - ۲۸) تو اللہ تعالیٰ اسے اور بیبیاں ان اوصاف کی دے دیگا۔ کیونکہ اصل غرض جس کے لیے آنحضرت صلعم کو بیبیوں کی ضرورت ہے۔ وہ دین حق کا دوسروں کو پہنچانا ہے۔ لیکن چونکہ ازواج مطہرات نے اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کیا اس لیے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ سب اوصاف ان ازواج میں ہی موجود تھے انہوں نے مال دنیا پر لات ماری اور رسول اللہ صلعم کے گھر میں رہنے کو ترجیح دی ؞

شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۝۶

اللہ تعالیٰ جو حکم انھیں دے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اور جو کچھ حکم ملتا ہے وہی کرتے ہیں ع۳۳۸۰

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۷ ع ۱۹

اے منکرو! آج عذر مت کرو، تمھیں وہی بدلہ ملے گا جو تم عمل کرتے تھے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَ یُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ۙ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ ۚ نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَ بِاَیْمَانِھِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۸

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ تعالیٰ کے آگے خالص توبہ کرو۔ امید ہے کہ تمھارا رب تم سے تمھاری برائیوں کو دور کردے اور تمھیں باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جس دن اللہ تعالیٰ نبی ؐ کو اور اُن کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے رسوا نہیں کرے گا، ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے دائیں چلتا ہوگا کہیں گے اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لیے کامل کر اور ہماری مغفرت فرما۔ تو ہر چیز پر قادر ہے ع۳۳۸۱

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْھِمْ ؕ وَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝۹

اے نبی ؐ کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان کے مقابل میں سخت رہ۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے ع۳۳۸۲

ع۳۳۸۰ اصل غرض اس سورت میں اور پچھلی سورت میں مومنوں کی تطہیر اور تزکیہ ہے اور ازواج کے ذکر سے شروع کرنے میں جو اشارہ ہے اس کے لیے دیکھو ع۳۳۷۲ اور قوا انفسکم واھلیکم نارا میں بتایا ہے کہ تم اپنی بھی اصلاح کرو اور اپنے اہل و عیال کی بھی اصلاح کی فکر رکھو۔ نہ تم ان پر زیادتی کرو یا حقوق اللہ میں کسی قسم کی افراط و تفریط کرو نہ انہیں احکام آلٰہی کی حد سے آگے بڑھنے دو۔ وقودھا الناس والحجارۃ میں بتایا کہ تم چھوٹے ہو یا بڑے کوئی چیز سوائے تقویٰ اللہ کے تمہیں اس سے نہیں بچا سکتی علیھا ملائکۃ غلاظ شداد میں بتایا کہ سزا کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسی ہستیاں مقرر کی ہیں۔ جو اپنے کام کو کر کے رہتی ہیں۔ اور کسی کے چیخنے چلانے سے وہ کام کو چھوڑ نہیں دیتیں علیظ اور غلظۃ کے لیے دیکھو ع۱۳۲۱

ع۳۳۸۱ بہشت میں غیر متناہی ترقیات اور قرآن کا امتیاز: یہاں وضاحت کر دی کہ اصل غرض مومنوں کی تطہیر ہے اور اسی تطہیر کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ بہشت میں داخل ہونگے اور ان کا یہ دعا کرنا کہ اے ہمارے رب ہمارے نور کو کامل کر اور ہماری مغفرت فرما صاف بتاتا ہے کہ مغفرت سے مراد ترقی درجات ہے اور بہشت میں اتمام نور اور ترقی درجات کی دعا صاف بتاتی ہے کہ قرآن کریم بہشت کی ترقیات کو غیر متناہی قرار دیتا ہے۔ جہاں ہمیشہ پاک انسانوں کے دلوں کے اندر اور زیادہ ترقی کی خواہش پیدا ہوتی رہے گی۔ اور یہ وہ بات ہے جو بہشت کے متعلق دنیا کے کسی مذہب نے نہیں بتائی وہ بہشت کو محض ایک خوشی کی حالت سمجھتے ہیں جس میں انسان ہمیشہ کے لیے پڑا رہے گا اور بعض مذاہب تو اسے وہاں سے نکال کر پھر دنیا میں لاتے ہیں جیسے ہندو مذہب مگر یہ تعلیم کہ بہشت اعلیٰ سے اعلیٰ ترقیات کا مقام ہے اور کہ وہ ترقیات غیر متناہی ہیں۔ صرف اسلام نے سکھائی ہے اور کسی مذہب میں اس کا نشان نہیں پایا جاتا حتیٰ کہ عیسائیوں کی کتاب میں جہاں ایک روحانی بہشت کا نقشہ کھینچا جانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ بہشت کے مقام ترقی ہونے کی طرف اشارہ تک بھی نہیں بلاشبہ قرآن نے تمام روحانی صداقتوں کو کمال تک پہنچایا اور ان پر ترقی کی کوئی گنجایش باقی نہیں چھوڑی اور اسی لیے کوئی نیا مذہب بھی اب نہیں آسکتا ؎

ع۳۳۸۲ تطہیر اور تزکیہ بغیر اس کے کمال کو نہیں پہنچتا کہ کفر اور نفاق کا سختی سے مقابلہ کیا جائے واغلظ علیھم پر دیکھو ع۱۳۲۱

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ﴿۱۰﴾

اللہ (تعالےٰ) ان کے لیے جو کافر ہیں، نوحؑ کی عورت اور لوط کی عورت کی مثال بیان کرتا ہے۔ وہ ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے ماتحت تھیں، پھر انھوں نے ان کی خیانت کی پس وہ اللہ تعالےٰ کے مقابل میں ان دونوں کے کچھ بھی کام نہ آئے اور کہا گیا کہ تم دونوں آگ میں داخل ہونیوالوں کے ساتھ داخل ہو جاؤ ۳۳۸۳

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۱﴾

اور اللہ تعالےٰ ان کے لیے جو ایمان لائے، فرعون کی عورت کی مثال بیان کرتا ہے۔ جب اس نے کہا اے میرے رب میرے لیے اپنے پاس جنت میں گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے ظالم لوگوں سے نجات دے ۳۳۸۴

وَ مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴿۱۲﴾ ع ۲

اور مریم عمران کی بیٹی کی، جس نے اپنی عصمت کو محفوظ کیا تو ہم نے اپنی روح اس میں پھونکی اور اس نے اپنے رب کی باتوں کی اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرماں برداروں میں سے تھی ۳۳۸۵

۳۳۸۳ عورت اور امت کی مماثلت: اس آیت میں کفار کی مثال عورت سے دی ہے اور اگلی دو میں مومنوں کی مثال عورت سے دی ہے۔ اور یوں بتادیا کہ عورتوں کے ذکر میں بھی امت کا ذکر مقصود ہو سکتا ہے۔ کفار کی مثال حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیبیوں سے دی ہے اب لوط کی بی بی کا ذکر تو قرآن شریف میں ہے۔ اور اس کی تباہی کا ذکر بھی ہے۔ لیکن نوح کی بی بی کا ذکر نہ قرآن شریف میں ہے اور نہ حدیث میں اور توریت میں بھی ایسا ذکر نہیں ملتا البتہ نوح کے ایک بیٹے کا ذکر قرآن شریف میں بھی ہے۔ اور توریت میں بھی جو تباہ ہوگیا اور قرین قیاس ہے کہ اس نے اپنی والدہ کی تربیت کے نیچے عقاید کفر میں تربیت پائی ہو۔ اور ان عورتوں کی خیانت سے مراد ان کا کفر یا نفاق ہی ہے اور راغب نے خیانت اور نفاق کو ایک ہی کہا ہے ع ۴۲۶ اور یہاں نفاق ہی معنی لیے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ یہ کفار گو رسولوں کے پیرو ہی ہوں لیکن اگر ان رسولوں کی تعلیم پر عامل نہ ہوں۔ تو محض برائے نام پیرو ہونا انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا اور اس میں سمجھایا مسلمانوں کو ہے کہ اگر وہ رسول کی پیروی نہ کریں تو دعوئے ایمان سے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچیگا ؛

۳۳۸۴ مومن کی روحانی ترقی کے دو مرتبے: اس آیت میں مومن کی مثال فرعون کی بی بی سے دی ہے اور اگلی میں مریم بنت عمران سے اور فرعون کی بی بی حضرت موسیٰ کی تربیت کرنے والی تھی اور مریم حضرت عیسیٰ کی اور شاید ان دو مثالوں میں یہ اشارہ بھی ہو کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ جیسے انسان آنحضرت صلعم کی امت میں سے پیدا ہونگے اور حدیث میں ہے لو کان موسی و عیسٰی حیین لما وسعهما الا اتباعی لیکن اصل میں مومن کے دو مرتبوں کی طرف ان دو مثالوں میں توجہ دلائی ہے۔ یعنی اس پہلی مثال میں اس مومن کے مرتبہ کی طرف جو فرعون کے نیچے ہے یعنی اس کا شیطان ابھی مسلم نہیں ہوا اور اسے بدی کی طرف تحریک کرتا ہے۔ مگر مومن اس کے بالمقابل جدوجہد میں لگا رہتا ہے من فرعون و عملہ میں اسی جدوجہد کی طرف اشارہ ہے اور اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو یعنی جہاں شیطان کا مقابلہ ختم ہو جاتا ہے اور اسی حالت کے لیے اگلی مثال بیان کی ہے۔ اور اس دوسرے مرتبہ کا ذکر اگلے نوٹ میں ہے ؛

۳۳۸۵ یہ دوسری مثال مومن کی اس اعلیٰ مرتبہ کے لیے ہے جب وہ احصنت فرجها کا مصداق ہوتا ہے یعنی شیطان کسی جگہ سے اس پر حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ گویا اس کا شیطان فرمانبردار ہو جاتا ہے تب اس میں اللہ تعالیٰ کی روح یا اس کا پاک کلام پھونکا جاتا ہے اور وہ نفس مطمئنہ بن جاتا ہے چونکہ اصل ذکر مقصود مومن کا تھا نہ مریم کا اس لیے بجائے نفخنا فیها کے نفخنا فیه فرمایا حالانکہ دوسری جگہ ایسے ہی موقعہ پر جہاں مریم کا ذکر مقصود تھا فیها فرمایا ہے دیکھو الانبیاء ۲۱ - ۹۱ جس سے معلوم ہوا کہ یہاں ذکر مومن کا مقصود ہے اور اسی میں نفخ روح کا ذکر ہے اور بعض نے ضمیر کو حضرت عیسیٰ کی طرف لیا ہے ؛

امت محمدیہ اور امم سابقہ: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلی مثال میں مراد یہ ہو کہ جس طرح نوح اور لوط کی بیویاں تباہ ہو گئیں اسی طرح پہلے نبیوں کی امتیں آخر کار ہلاکت تک پہنچ جائیں گی اور دوسری مثال میں یہ کہ امت محمدیہ ایک وقت فرعون کے نیچے آکر مبتلائے مصیبت ہو جائیگی لیکن آخر کار وہ اس مصیبت سے نکل جائیگی ؛

سُوْرَةُ الْمُلْكِ مَكِّيَّةٌ (۶۷)

اٰیاتُھا ۳۰ ۔۔۔ رکوعاتُھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۨ ۝١
الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝٢
الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝٣
ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝٤

اللہ تعالےٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
وہ ذات، بابرکت ہے جس کے ہاتھ میں بادشاہت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔
جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے اور وہ غالب بخشنے والا ہے ۳۳۸۶
جس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا، تو رحمان کی پیدائش میں کوئی اختلاف نہ دیکھے گا۔ پھر نظر کو لوٹا۔ کیا تو کوئی بگاڑ دیکھتا ہے ۳۳۸۷
پھر نظر کو بار بار لوٹا، نظر تیری طرف حیرت سے تھک کر واپس آئے گی ۳۳۸۸

تمہید سورت: اس سورت کا نام الملک ہے اور اس میں دو رکوع اور تیس آیتیں ہیں اور اس کے نام الملک میں یہ اشارہ ہے کہ ایک خدا کا قانون ہی ساری دنیا میں چلتا ہے اور اس لیے شروع میں توجہ دلائی ہے کہ وہ عظیم الشان مخلوقات سماوی جس کو دیکھکر نظر بھی متحیر رہ جاتی ہے۔ وہ بھی سب ایک قانون کے ماتحت ہے اور اسی سے انسان کو توجہ دلائی ہے کہ وہ بھی جب تک اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے قانون کے ماتحت نہیں چلاتا نہ صرف اس کی زندگی کی غرض پوری نہیں ہوتی بلکہ اس کا نتیجہ دکھ ہوتا ہے۔ یہاں سے لے کر آخر تک سب سورتیں مکی ہیں۔ سوائے سورۃ النصر کے اور ہر ایک سورت میں ایک خاص امر کی طرف توجہ دلائی ہے ؎

۳۳۸۶ موت وحیات پر اللہ تعالیٰ کا تصرف تام: موت اور زندگی کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کا ایک عظیم الشان نشان ہے۔ جن قوانین کے ماتحت زندگی پیدا ہوتی ہے اور جن قوانین کے تحت موت ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے تصرف تام میں ہیں۔ کوئی ان قوانین کو ایک ذرہ بھر ادھر ادھر نہیں کر سکتا اور موت اور زندگی انسان کے لیے انعام کا موجب ہیں زندگی اسے اچھے کام کا موقعہ دیتی ہے اور موت اچھے کام کے نتائج کو ظاہر کرتی ہے ؎

۳۳۸۷ طباقا۔ مطابقۃ اسمائے نسبتی میں سے ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری کے اوپر اس کے اندازہ سے رکھو پھر طباق کا استعمال کبھی اس چیز میں ہوتا ہے جو دوسری کے اوپر ہو اور کبھی اس میں جو دوسری کے موافق ہو۔ اور لترکبن طبقا عن طبق (الانشقاق ۸۴-۱۹) میں مطلب یہ ہے کہ انسان درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہے (غ)
تفٰوت - فوت - دیکھو ۵۴۴ اور تفاوت اوصاف میں اختلاف ہے۔ گویا کہ ایک دوسرے کے وصف کو دور کر دیتی ہے (غ)
فطور - افطر سے مصدر ہے اور فطر کے لیے دیکھو ۹۱۳ اور فطور کے معنی اختلال ہیں (غ)
تمام مخلوق پر ایک ہی قانون حاوی ہے:۔ جب اپنا موت وحیات کا قانون بیان فرمایا کہ اس میں کسی کو کوئی تصرف حاصل نہیں تو اب اپنی عظیم الشان سماوی مخلوق کی طرف توجہ دلائی۔ سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے موافق پیدا کیا خواہ یہ سات نظام شمسی کے سیارے ہوں اور خواہ ستاروں کے سات درجے۔ ایک دوسرے کے اوپر بھی ہیں مگر یہاں ان کے ایک ہی قانون کے ماتحت ہونے کا ذکر ہے اسی لیے فرمایا کہ تم اس مخلوق میں تفاوت نہیں پاؤ گے۔ یعنی اوصاف میں اختلاف نہیں یہ نہیں کہ ایک جگہ ایک قانون کام کر رہا ہے تو دوسری جگہ اس کے مخالف قانون کام کر رہا ہے جو اس پہلے قانون کو باطل کر دیتا ہو اور دوسری بات اس کی قدرت عظیم پر دلالت کرنے والی یہ بتائی کہ اس قانون میں خلل کوئی واقعہ نہیں ہوتا۔ یعنی یہ کبھی نہیں ہوتا کہ قانون کسی حالت میں اپنا کام کرنا چھوڑ دے یہ دو باتیں اللہ تعالیٰ کی عظمت قدرت پر دلالت کرتی ہوئی اس کی توحید پر بھی شہادت ہیں اتنی عظیم الشان مخلوق میں کہ جہاں انسان کی نظر متحیر رہ جاتی اور تھک جاتی ہے جیسا کہ اگلی آیت میں بیان فرمایا ایک ہی قانون کام کر رہا ہے سائنس بھی آج یہی بتاتا ہے کہ ایک ذرہ سے لے کر ان عظیم الشان کروں جن کی عظمت کا انسان کے وہم میں آنا بھی مشکل ہے ایک ہی قانون کام کر رہا ہے ؎

۳۳۸۸ کرتین تثنیہ سے مراد تکریر اور تکثیر ہے یعنی بار بار ایک فعل کا کرنا جیسے لبیک اور سعدیک میں اور مراد ہے رجعۃ بعد رجعۃ یعنی لوٹاتے چلے جاؤ آخر

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُومًا لِّلشَّيٰطِينِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ﴿۵﴾

اور ہم نے ورلے آسمان کو ستاروں سے زینت دی اور انھیں شیطانوں کے لیے اٹکل بازی کا ذریعہ بنا دیا ہے اور اُن کے لیے جلنے کا عذاب تیار کر رکھا ہے ع۳۳۸۹

وَلِلَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۶﴾

اور ان کے لیے جو اپنے رب کا انکار کرتے ہیں، دوزخ کا عذاب ہے اور وہ بُری جگہ ہے۔

اِذَآ اُلْقُوا فِيهَا سَمِعُوا لَهَا شَهِيقًا وَّهِيَ تَفُورُ ﴿۷﴾

جب اس میں ڈالے جائیں گے اس کا چیخنا سُنیں گے اور وہ جوش مار رہی ہوگی۔

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيرٌ ﴿۸﴾

قریب ہے کہ جوش سے پھٹ پڑے، جب کبھی اس میں ایک گروہ ڈالا جائے گا اس کے چوکیدار اُن سے پوچھیں گے کیا تمھارے پاس ڈرانے والا نہ آیا تھا۔

قَالُوا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِن شَيْءٍ ۚ اِنْ اَنتُمْ اِلَّا فِي ضَلٰلٍ كَبِيرٍ ﴿۹﴾

کہیں گے، ہاں! ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تھا۔ مگر ہم نے جھٹلایا اور کہا اللہ (تعالےٰ) نے کچھ نہیں اتارا۔ تم بڑی غلطی میں ہو۔

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيٓ اَصْحٰبِ السَّعِيرِ ﴿۱۰﴾

اور کہیں گے اگر ہم سنتے یا عقل سے کام لیتے تو ہم دوزخ والوں میں نہ ہوتے ع۳۳۹۰

فَاعْتَرَفُوا بِذَنۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيرِ ﴿۱۱﴾

سو اپنے گناہ کا اقرار کریں گے۔ پس دوزخ والوں کے لیے دُوری ہے۔

اِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿۱۲﴾

وہ لوگ جو غائبانہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

وَاَسِرُّوا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوا بِهٖ ۖ اِنَّهٗ عَلِيمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿۱۳﴾

اور اپنی بات کو چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو وہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ

کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا اور وہ باریک باتوں کا

نظر تھک جائیگی مگر قانون ایک ہی کام کرتا نظر آئے گا۔

ع۳۳۸۹ اس پر ع۱۶۷۹ میں مفصل بحث گذر چکی ہے۔ اور مصباح ستارے کو بھی کہتے ہیں دیکھو ع۲۲۳۱

ع۳۳۹۰ عقل سے کام نہ لینے پر گرفت: پچھلی آیت میں سوال صرف نذیر کے متعلق تھا۔ مگر یہاں سمع اور عقل دونوں کا ذکر کیا ہے اور اس میں اشارہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر پیغمبر کی آواز کسی جگہ نہ پہنچی ہو جسے انسان سُن سکتا ہے تو عقل تو اللہ تعالےٰ نے ہر ایک انسان کو دی ہے اس لیے فرمایا لو کنا نسمع او نعقل یعنی اگر ہم ڈرانے والے کی آواز کو سُن لیتے یا وہ آواز پہنچی تھی تو عقل سے ہی کام لیتے۔

ع الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾

جاننے والا خبردار ہے ۳۳۹۱

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾

وہی ہے جس نے زمین کو تمھارے ماتحت کر دیا، سو اس کی اطراف میں چلو اور اس کے دیے سے کھاؤ اور اس کی طرف (موت کے بعد) اُٹھ کر جانا ہے ۳۳۹۲

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ﴿۱۶﴾

کیا تم اس سے نڈر ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمھیں زمین میں نابود کر دے سو وہ ناگہاں کانپنے لگے گی ۳۳۹۳

اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ﴿۱۷﴾

یا تم اس سے نڈر ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھر برسائے سو تم جان لوگے کہ میرا ڈرانا کیسا تھا۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۱۸﴾

اور انھوں نے بھی جھٹلایا جو اُن سے پہلے تھے۔ سو میری ناپسندیدگی کا (انجام) کیسا ہُوا۔

وقف غفران — وقف منزل

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ؕۘ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيْرٌ ﴿۱۹﴾

کیا وہ اپنے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھتے (جو) پر پھیلائے ہوئے (رہیں) اور سکیڑ (بھی) لیتے ہیں۔ سوائے رحمٰن کے انھیں کون روک رکھتا ہے وہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے ۳۳۹۴

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ﴿۲۰﴾

بھلا وہ کون ہے؟ جو تمھارے لیے لشکر ہو کر رحمٰن کے مقابلہ میں تمھیں مدد دے۔ کافر صرف دھوکے میں ہیں۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ﴿۲۱﴾

بھلا وہ کون ہے جو تمھیں رزق دے۔ اگر وہ اپنا رزق روک دے، بلکہ سرکشی اور نفرت پر اڑے ہوئے ہیں۔

۳۳۹۱ یہاں خلق کو دلیل علم قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ ایک چیز کا پیدا کرنا۔ اس کے تمام حالات پر پیدا کرنے والے کو حاوی کر دیتا ہے ؛

۳۳۹۲ مناکب۔ مَنْکِب بازو اور کندھے کے ملنے کی جگہ ہے اور زمین کے مناکب سے مراد اس کے رستے یا اس کی جوانب یا پہاڑ ہیں (ل)
اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمانیت سے انسان کے لیے سب سامان پیدا کیے ہیں مگر ایک رزق حاصل کرنے کے لیے اسے کس قدر جدوجہد اختیار کرنے کی ضرورت ہے جب اس رزق ظاہری کے لیے یہ ضرورت ہے کہ زمین کی اطراف و جوانب کو چھان مارے تو اللہ تعالیٰ کا رزق روحانی بغیر جدوجہد کے کس طرح حاصل ہو سکتا ہے توکّل کے متعلق جو غلط خیال پھیلا ہوا ہے اسے یہ آیت جڑ سے کاٹتی ہے ؛

۳۳۹۳ اللہ کے آسمان پر ہونے سے مراد: من فی السماء مفسرین نے عموماً مراد اللہ تعالیٰ لیا ہے، لیکن یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک خاص مکان میں آسمان میں ہے۔ بلکہ محض بلندی اور علو کی نسبت کی ہے۔ اور دوسری جگہ ہے وھو اللہ فی السمٰوٰت وفی الارض (الانعام ۶ - ۳) بعض نے یہ توجیہ کی ہے کہ اس کا امر آسمان میں نافذ ہے بعض نے یہ کہ وہ خالق من فی السماء ہے۔ بعض نے مراد ملائکہ لیے ہیں کیونکہ سزا کا ذکر ہے اور خود عذاب کی نسبت بھی آسمان کی طرف ہی کی جاتی ہے اور جن عذابوں کا یہاں ذکر ہے وہ مخالفین نبی کریم صلعم پر آئے ان کا خسف ان کی ذلت تھی اور زمین کا کانپنا ان جنگوں کی وجہ سے تھا جو اس پر ہوئیں اور اگلی آیت میں حاصب کا ذکر ہے جس کے معنی عذاب بھی ہو سکتے ہیں۔ اور سخت آندھی بھی جنگ احزاب میں ان پر آندھی کا عذاب ہی آیا تھا ؛

۳۳۹۴ دیکھو ۲۳۳۶ پرندے پر پھیلائے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے ایک قانون کے ماتحت ہیں۔ اسی کی طرف انسان کو توجہ دلائی ہے کہ وہ بھی قانون کی فرمانبرداری اختیار کرے اور عذاب کے متعلق پرندوں کے ذکر پر مفصل بحث ۱۷۶۹ میں گذر چکی ہے اور یہاں آگے

اَفَمَنۡ یَّمۡشِیۡ مُکِبًّا عَلٰی وَجۡہِہٖۤ اَہۡدٰۤی اَمَّنۡ یَّمۡشِیۡ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۲۲﴾

تو کیا وہ جو اپنے منہ کے بل اوندھا چلتا ہے زیادہ ہدایت پر ہے یا وہ جو سیدھا راہِ راست پر چلتا ہے ٣٣٩٥ؔ

قُلۡ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَکُمۡ وَ جَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَۃَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۲۳﴾

کہہ وہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا اور تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، بہت ہی کم تم شکر کرتے ہو۔

قُلۡ ہُوَ الَّذِیۡ ذَرَاَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

کہہ وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا، اور اسی کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے۔

وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۵﴾

اور کہتے ہیں یہ وعدہ کب ہے، اگر تم سچے ہو۔

قُلۡ اِنَّمَا الۡعِلۡمُ عِنۡدَ اللّٰہِ ۪ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۲۶﴾

کہہ علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور میں صرف کھلا ڈرانے والا ہوں۔

فَلَمَّا رَاَوۡہُ زُلۡفَۃً سِیۡٓـَٔتۡ وُجُوۡہُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ قِیۡلَ ہٰذَا الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِہٖ تَدَّعُوۡنَ ﴿۲۷﴾

سو جب اُسے قریب دیکھیں گے تو کافروں کے منہ بُرے ہو جائیں گے اور کہا جائے گا یہ وہی ہے جو تم مانگا کرتے تھے۔

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ اَہۡلَکَنِیَ اللّٰہُ وَ مَنۡ مَّعِیَ اَوۡ رَحِمَنَا ۙ فَمَنۡ یُّجِیۡرُ الۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۸﴾

کہہ بھلا دیکھو تو اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہلاک کر دے اور انھیں جو میرے ساتھ ہیں یا ہم پر رحم کرے تو کافروں کو دردناک عذاب سے کون پناہ دے گا ٣٣٩٦ؔ

قُلۡ ہُوَ الرَّحۡمٰنُ اٰمَنَّا بِہٖ وَ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡنَا ۚ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ ہُوَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۹﴾

کہہ وہ رحمٰن ہے جس پر ہم ایمان لائے اور اسی پر ہم بھروسا کرتے ہیں۔ سو تم جان لو گے، کون کھلی گمراہی میں ہے۔

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ اَصۡبَحَ مَآؤُکُمۡ غَوۡرًا فَمَنۡ یَّاۡتِیۡکُمۡ بِمَآءٍ مَّعِیۡنٍ ﴿۳۰﴾ ع

کہہ دیکھو تو ۔ اگر تمھارا پانی زمین کے اندر چلا جائے تو کون تمھارے پاس جاری پانی لائے گا ؟ ع ٣٣٩٧

پیچھے عذاب کا ہی ذکر ہے ؛

٣٣٩٥ مکب کے لیے دیکھو ٢٤٢٢ اور سوی کے لیے ١٩٧٩ وہ جو اخلاق میں اور خلقت میں افراط و تفریط سے محفوظ ہو اور مُکِبّ اور سَوِیّ دونوں کا تعلق عمل سے ہے جو شخص قانون پر چلتا ہے وہ افراط و تفریط سے بچا ہوا سیدھے رستے پر چلتا ہے۔ اور جو شخص قانون کی فرمانبرداری نہیں کرتا وہ گویا اوندھا اپنے منہ پر چلتا ہے یعنی قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔ تو ان دونوں میں سے منزل مقصود پر پہلا ہی پہنچے گا۔ قانون سے نکلنے والے کا نتیجہ لازماً دکھ ہے۔ یہی مثال مومن اور کافر کی ہے ؛

٣٣٩٦ یعنی تمہاری آرزو تو یہ ہے کہ پیغمبر اور اس کے ساتھی ہلاک ہو جائیں اور ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ ہم پر رحم کرے گا اور ہماری نصرت کرے گا۔ تو دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی صورت ہو، لیکن بہرحال کفار کو جو ان کی نافرمانی کی سزا ملنے والی ہے اس سے وہ کس طرح بچ سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ مومنوں پر اللہ تعالیٰ کا رحم ہی ہوگا اگلی آیت میں واضح کر دی ہے ؛

٣٣٩٧ وحی اور اخلاق کا تعلق : ظاہر طور پر بھی یہ بات صحیح ہے کہ جب بارش بند ہوتی ہے تو زمین کا پانی یعنی وہ چشمے جو زمین کے اندر جاری ہیں وہ بھی نیچے چلے جاتے ہیں۔ اور خشک ہو جاتے ہیں۔ اور یہی قانون اس کا عالم روحانی میں ہے اگر اللہ تعالیٰ کی وحی نازل نہ ہو تو اخلاق خود بخود مردہ ہو جاتے ہیں اسی لیے اگلی سورت کے شروع

(۶۸) سُوْرَةُ الْقَلَمِ مَكِّيَّةٌ

اٰیاتُھا ۵۲ — رکوعاتُھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا يَسْطُرُوْنَ ۝۱	دوات (گواہ ہے) اور قلم اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔
مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝۲	تُو اپنے رب کے فضل سے دیوانہ نہیں۔
وَ اِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝۳	اور یقیناً تیرے لیے اجر ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا۔
وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝۴	اور تو یقیناً بلند اخلاق رکھتا ہے ۳۳۹۸

(بقیہ صفحہ سابقہ)
میں آنحضرت صلعم کے اخلاق فاضلہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آنحضرت صلعم سے پیشتر جو ایک لمبا زمانہ فترت گذرا ہے اس میں تمام دنیا کے اخلاق مردہ ہوگئے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس امت میں اپنے کلام کو بند نہیں کیا۔ ورنہ اخلاق مردہ ہوکر پھر نبوت کی ضرورت پڑے اور جس قدر اللہ تعالیٰ سے کسی کا تعلق ہوتا ہے اسی قدر اس کے اخلاق بھی ہر قسم کی آلایش سے پاک ہوتے ہیں:

تمہید سورت: اس سورت کا نام القلم ہے اور ن بھی اسے کہتے ہیں اور اس میں دو رکوع اور باون آیتیں ہیں۔ یہ دونوں نام پہلی ہی آیت میں آتے ہیں۔ اور ان دونوں لفظوں میں یہ توجہ دلائی ہے کہ قلم اور دوات کی مدد سے جس قدر علوم دنیا میں پھیلیں وہ سب آخر دنیا کو اس نتیجہ تک پہنچائیں گے کہ جیسا کہ سطحی نظروں نے خیال کر لیا ہے محمد رسول اللہ صلعم مجنون نہیں بلکہ آپ کو ایسا اجر ملیگا جو کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ تمام علوم یہ بھی شہادت دیں گے کہ آپ اخلاق کے بلند ترین مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ اور اس سورت کی غرض یہی بتانا ہے کہ ایک طرف اگر محمد رسول اللہ صلعم کے اخلاق تعلق باللہ سے کمال کو پہنچ گئے ہیں۔ تو دوسری طرف دنیاداروں اور طالبان مال کے اخلاق گرتے گرتے آخر کار کہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ اخلاق فاضلہ صرف تعلق باللہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور وحی آلٰہی کا نزول اخلاق کے نشوونما میں وہی کام دیتا ہے جو بارش زمین کی روئیدگی کے نشوونما میں دیتی ہے۔ اور یہی تعلق اس سورت کا پچھلی سورت سے ہے۔ دیکھو ۳۳۹۷ گویا جو انسان اپنے آپ کو ایک خدا کی رضا کے ماتحت کر دیتا ہے اس کا نتیجہ بھی قانون آلٰہی کے ماتحت یہی ہے کہ وہ ہر قسم کی خوبیوں کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے اور جو اس قانون کے خلاف چلتا ہے وہ ہر قسم کی بدیوں کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے اس سورت کا نزول بہت ہی ابتدائی زمانہ کا ہے حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ پہلے سورۂ اقرء نازل ہوئی پھر یہ سورت پھر مزمل پھر مدثر۔

۳۳۹۸ ن۔ نون کے معنی مچھلی ہیں اور یہاں ن کے معنی حسن اور قتادہ سے دوات اور ابن عباس سے حوت مروی ہیں اور ازہری کا قول ہے کہ اگر اس سے مراد دوات یا حوت ہوتی تو نون لکھا جاتا نہ ن (ل) مگر صرف یہ وجہ اس معنی کو رد کرنے کے لیے کافی نہیں۔ کیونکہ قرآن شریف کا رسم الخط کئی باتوں میں معمولی رسم الخط سے اختلاف رکھتا ہے اور مفسرین سے عموماً یہی معنی مروی ہیں اور سیاق ایک ہی معنی دوات کو چاہتا ہے پس یہی معنی یہاں ہیں اور ابن جریر میں ایک قول ہے کہ اس سے مراد لوح نور ہے۔ یعنی نورانی تختی۔

آنحضرتؐ کی صداقت پر شہادت علوم: دوات اور قلم اور تمام تحریروں کی قسم کھائی ہے یعنی انہیں بطور گواہ پیش کیا ہے اور جواب قسم میں فرمایا کہ پیغمبر مجنون نہیں تو گویا تمام دنیا کے علوم اس بات پر گواہی دیں گے کہ محمد رسول اللہ مجنون نہیں۔ جب انہیں بدی کے بد نتائج سے ڈرایا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ یہ مجنون شخص ہے علوم کی شہادت پیش کر کے بتایا کہ مجنون کی باتیں تو بے جوڑ ہوتی ہیں اور علم کی بات اس کے منہ سے نہیں نکل سکتی مگر محمد رسول اللہ صلعم کا اس قدر احسان علوم پر ہوگا کہ وہ علوم ہی آخر شہادت دے اٹھیں گے کہ یہ انسان مجنون نہ تھا اور اس کے ساتھ دو باتیں اور بیان فرمائیں ایک یہ کہ آپ کا اجر غیر منقطع ہے اور دوسری یہ کہ آپ خلق عظیم پر ہیں اور یہ دونوں باتیں بھی بطور جواب قسم ہیں اور ان میں ایک پیشگوئی بھی ہے یہ سورت بہت ہی ابتدائی زمانہ کی ہے یہاں تک کہ اکثر نے اسے نزول میں دوسرے مرتبہ پر رکھا ہے یعنی اقراء کے بعد اس کا نزول مانا ہے۔ اس وقت اجر بھی غیر ممنون کی خبر کیسی عظیم الشان پیشگوئی تھی اور اصل مضمون کے ساتھ اس کا یوں رابطہ ہے۔ کہ مجنون کا فعل کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔ مگر محمد رسول اللہ صلعم نے وہ انقلاب دنیا میں پیدا کیا کہ جس کی نظیر کسی دوسرے انسان میں نہیں ملتی۔ ایک عظیم الشان سلطنت کے ساتھ ایک ایسا مذہب قائم کیا کہ جب تک دنیا باقی ہے یہ بھی باقی ہیں اس لیے آپ کا اجر بھی منقطع نہیں ہو سکتا:

مگر اس سے بھی بڑھکر تیسری بات ہے کہ آپ خلق عظیم کے مالک ہیں یہ خلق عظیم کیا تھا مسلم ابوداؤد وغیرہ میں ہشام سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائیشہ سے عرض کیا کہ مجھے آنحضرت صلعم کے اخلاق کی کچھ خبر دو تو آپ نے فرمایا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے۔ میں نے کہا پڑھتا ہوں تو فرمایا کہ آپ کا خلق قرآن ہی تھا۔ یعنی جس قدر اعلیٰ درجہ کی صفات انبیاؑ اور مومنوں کے اندر بیان کی گئی ہیں یا جن صفات عالیہ کی طرف قرآن شریف میں توجہ دلائی گئی ہے۔ وہ سب آپؐ میں موجود تھیں اور حدیث

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝٥
سو تُو دیکھ لے گا اور یہ بھی دیکھ لیں گے۔

بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝٦
کہ تم میں سے کس کو جنون ہے ۳۳۹۹

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۪ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝٧
تیرا رب اُسے خوب جانتا ہے جو اس کے رستہ سے بھٹک گیا اور وہ سیدھے رستے پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝٨
سو تو جھٹلانے والوں کی بات نہ مان۔

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝٩
وہ چاہتے ہیں کہ تو مداہنت اختیار کرے تو وہ بھی مداہنت اختیار کریں ۳۴۰۰

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝١٠
اور تُو کسی قسمیں کھانے والے ذلیل آدمی کی بات نہ مان۔

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۝١١
(جو) عیب لگانے والا، چغلیاں لگانے والا۔

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝١٢
بھلائی سے روکنے والا، حد سے بڑھنے والا گنہگار۔

عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝١٣
سخت جھگڑالو، اس کے علاوہ شرارت میں مشہور (ہے)

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝١٤
اس لیے کہ وہ مال اور بیٹوں والا ہے ۳۴۰۱

میں ہے کہ آپ نے فرمایا انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق میں اس لیے معبوث ہوا ہوں کہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق کو کمال کو پہنچاؤں اور آپؐ کے اخلاق فاضلہ کے سامنے اگر عرب نے سر جھکایا اور پھر ایک عالم نے تو وہ دن بھی دور نہیں کہ کل عالم ہی سر جھکا دے حالانکہ مجنون میں تو اخلاق کا نام بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اجر غیر ممنون کے ساتھ خلق عظیم کو بیان کر کے بتایا کہ غربت میں ہر شخص اچھے اخلاق دکھانے کا دعویٰ کر سکتا ہے مگر طاقت اور غلبہ کے وقت وہ حلم اور فروتنی اور بردباری کے اخلاق بھول جاتے ہیں لیکن محمد رسول اللہ صلعم کے اخلاق ایسے کمال کو پہنچے ہوئے ہیں اور ایسے حالت اعتدال پر ہیں کہ بلند سے بلند مقام پر کھڑے ہو کر بھی ان اخلاق میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور اگر اہل عرب پہلے آپؐ کے اخلاق فاضلہ کی وجہ سے آپ کے الامین ہونے کے قائل تھے تو آخر میں صرف اخلاق نبوی نے ہی دنیا کی متکبر ترین قوم کو ایسا رام کیا کہ سر جان مال عزت سب کچھ آپ پر قربان کر دیا۔

۳۳۹۹ مفتون کے معنی ہیں فُتِن بالجنون جنون میں مبتلا کیا گیا۔ یا مراد فُتُون بمعنی جنون ہے (ل)

فستبصر میں صاف بتا دیا کہ اجر غیر ممنون اسی دنیا میں پا کر پیغمبر اور اس کے مکذب دونوں دیکھ لیں گے کہ جنون کسے تھا مفسرین نے بھی اسے مانا ہے۔

فستبصر ویبصرون فی الدنیا لظہور عاقبۃ الامر بغلبۃ الاسلام اور مقاتل نے وعید یوم بدر مراد لیا ہے (ر)

۳۴۰۰ مداھنۃ یہ ہے کہ اس کے خلاف ظاہر کیا جائے جو دل میں ہے ۳۲۵۳ جب نبی کریم صلعم کے مقام عظیم اور خلق عظیم کا ذکر کیا تو ساتھ ہی بتایا کہ آپ کے اخلاق مداہنہ سے پاک ہیں۔ دنیا دار خواہ کتنے بھی اعلیٰ درجے کے اخلاق دکھائیں مگر یہ سب کچھ مداہنہ کے رنگ میں ہوتا ہے باہر سے ہنس ہنس کر ملتے ہیں اندر سے جڑیں کاٹتے چلے جاتے ہیں اللہ سے تعلق رکھنے والے کے اخلاق اس آلائش سے پاک ہوتے ہیں وہ اندر باہر سے ایک ہوتا ہے اخلاص اور سچائی اس کے اندر ہوتی ہے۔ دنیا داروں کے اخلاق ظاہری گو بعض وقت خدا پرستوں کے اخلاق کی طرح نظر آئیں مگر یہ سب کچھ دکھاوے کے لیے ہوتا ہے یہ ایک قسم کے مکذبین ہیں دوسرے وہ ہیں جن کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔

۳۴۰۱ حلاف۔ حَلِف اصل میں وہ قسم ہے جس کے ذریعہ سے کسی سے عہد کیا جائے پھر ہر قسم پر بولا گیا ہے اور حَلّاف بہت قسمیں کھانے والا ہے (غ)

مشاء۔ مَشْی ارادہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہے اور کنایتاً چغلخوری مراد لی جاتی ہے جیسے یہاں (غ)

نمیم۔ نمیمۃ اصل میں خفیف حرکت ہے اور چغلی یا بات کو جھوٹ کے ساتھ آراستہ کر کے ظاہر کرنے کو کہتے ہیں (غ)

زنیم جو ایک قوم میں سے نہیں مگر ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے (غ) اور زنیم موسوم بالشر کو بھی کہتے ہیں اور زانیہ کی اولاد کو بھی (ل) اور سعید بن جبیر سے اس کے معنی شرارت میں مشہور مروی ہیں (ج) چونکہ یہ سب باتیں اخلاق کے رنگ کی ہیں اس لیے یہی معنی چسپاں ہیں۔

بندگان سیم وزر کے اخلاق: یہ اخلاق انسانی کا ذلیل ترین پہلو ہے۔ جو خلق عظیم کی ضد کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور اعدائے حق کی نوبت آخر یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور اس سب کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ صاحب مال اور اولاد ہے یعنی مال دنیا اور جتھے پر فخر کرنا آخر انسان کو بندۂ سیم وزر بنا دیتا ہے۔ تب اس کے اخلاق کی یہ حالت ہو جاتی ہے اور مداہنت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے جو اندر بھرا ہوا تھا وہ آخر باہر نکل آتا ہے اور زیادہ قسمیں کھانے کو بھی یہاں بدترین اخلاق میں رکھا گیا ہے گو وہ جھوٹ ہوں یا سچ۔

اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۵﴾

جب اس پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں کہتا ہے پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

سَنَسِمُهٗ عَلَی الۡخُرۡطُوۡمِ ﴿۱۶﴾

ہم اس کی ناک پر داغ لگائیں گے ع۳۴۰۲

اِنَّا بَلَوۡنٰهُمۡ کَمَا بَلَوۡنَاۤ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ ۚ اِذۡ اَقۡسَمُوۡا لَیَصۡرِمُنَّهَا مُصۡبِحِیۡنَ ﴿۱۷﴾

ہم انھیں آزمائیں گے جس طرح ہم نے باغ والوں کو آزمایا۔ جب انھوں نے قسمیں کھائیں کہ وہ صبح ہوتے ہی اس کا پھل کاٹیں گے۔

وَ لَا یَسۡتَثۡنُوۡنَ ﴿۱۸﴾

اور (حق مساکین کا) استثنا نہ کرتے تھے ع۳۴۰۳

فَطَافَ عَلَیۡهَا طَآئِفٌ مِّنۡ رَّبِّکَ وَ هُمۡ نَآئِمُوۡنَ ﴿۱۹﴾

سو اس پر تیرے رب کی طرف سے پھر جانے والی (آفت) پھر گئی اور وہ سو رہے تھے۔

فَاَصۡبَحَتۡ کَالصَّرِیۡمِ ﴿۲۰﴾

اور وہ ایسی زمین کی طرح ہوگیا جس کی کھیتی کاٹی گئی ہو۔

فَتَنَادَوۡا مُصۡبِحِیۡنَ ﴿۲۱﴾

ادھر صبح ہوتے ہی انھوں نے ایک دُوسرے کو پکارا۔

اَنِ اغۡدُوۡا عَلٰی حَرۡثِکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰرِمِیۡنَ ﴿۲۲﴾

کہ سویرے ہی اپنی کھیتی پر چلو، اگر تم (اُسے) کاٹنے والے ہو۔

فَانۡطَلَقُوۡا وَ هُمۡ یَتَخَافَتُوۡنَ ﴿۲۳﴾

سو وہ چلے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے۔

اَنۡ لَّا یَدۡخُلَنَّهَا الۡیَوۡمَ عَلَیۡکُمۡ مِّسۡکِیۡنٌ ﴿۲۴﴾

کہ آج تمھارے پاس اس میں کوئی مسکین داخل نہ ہونے پائے۔

وَّ غَدَوۡا عَلٰی حَرۡدٍ قٰدِرِیۡنَ ﴿۲۵﴾

اور وہ سویرے ہی جا پہنچے (اور وہ) روکنے پر قادر تھے ع۳۴۰۳ ا

فَلَمَّا رَاَوۡهَا قَالُوۡۤا اِنَّا لَضَآلُّوۡنَ ﴿۲۶﴾

سو جب اُسے دیکھا کہنے لگے بلاشبہ ہم راہ بھول گئے ہیں۔

بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۲۷﴾

بلکہ ہم بے نصیب ہیں۔

قَالَ اَوۡسَطُهُمۡ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ لَوۡ لَا تُسَبِّحُوۡنَ ﴿۲۸﴾

ان میں سے بہترین (شخص) بولا کیا میں نے تمھیں نہیں کہا تھا کہ تم کیوں تسبیح نہیں کرتے۔

ع۳۴۰۲ ناک پر داغ لگانے سے مراد: خرطوم اصل میں ہاتھی (اور سُور) کے متعلق بولا جاتا ہے اور یہاں اظہار قباحت کے لیے ناک کو خرطوم کہا ہے اور یہاں وسم علی الخرطوم سے مراد ہے۔ ایسی عار اس کو لگا دیں گے جو اس سے محو نہ ہو جیسے ناک کاٹ دینا کہہ دیتے ہیں (غ) یہ مراد نہیں کہ ہر ایک ایسے انسان کی ناک پر سچ مچ کوئی نشان لگ جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ جن باتوں کے ذریعہ سے وہ اپنی عزت قایم کرنا چاہتا ہے وہی آخر اس کی ذلت کا موجب ہو جاتی ہیں ؛

ع۳۴۰۳ یصرمن۔ صرم قطع کرنا ہے۔ اور الصرام انقطاع ہے اور حدیث میں ہے لا یحل لمسلم ان یصارم مسلما فوق ثلاث یعنی اس سے مکالمہ قطع نہ کرے اور صریمۃ کسی امر کے قطع کرنے پر عزیمت ہے اس لیے صارمین سے مراد ہے عازمین علی صرم النخل یعنی کاٹنے پر عزم کرنے والے۔ اور صریم اور صریمۃ وہ قطعہ زمین ہے جو بڑے حصہ ریت سے الگ ہو اور وہ زمین بھی جس کی کھیتی کاٹی گئی ہو اور رات کو بھی اس لیے کہ وہ دن سے منقطع ہوتی ہے (ل) ؛

یستثنون۔ استثناء کے معنی ان شاء اللہ کہنا اور الگ کرنا آتے ہیں۔ یہاں دوسرے معنی ہی مراد ہیں۔ اور قتادہ سے یہی معنی مروی ہیں یعنی حق مسکین کو الگ نہ کرتے تھے ؛

ع۳۴۰۳ ا حرد تیزی اور غضب سے روکنا (غ) یعنی اس قدر جوش تھا کہ مسکین کو پاس نہ پھٹکنے دیں ؛

قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾
کہنے لگے، ہمارا رب پاک ہے ہم ہی ظالم تھے۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿٣٠﴾
پھر ایک دُوسرے کی طرف متوجہ ہوکر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿٣١﴾
کہنے لگے ہم پر افسوس! ہم سرکش تھے۔

عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿٣٢﴾
امید ہے کہ ہمارا رب ہمیں اس سے بہتر بدلے میں دے۔ ہاں ہم اپنے رب کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٣﴾ ع
اسی طرح عذاب آئے گا اور آخرت کا عذاب یقیناً اس سے بڑا ہے کاش یہ جانتے۔ ٣٤٠٤

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٣٤﴾
متقیوں کے لیے ان کے رب کے پاس نعمتوں کے باغ ہیں۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿٣٥﴾
تو کیا ہم فرماں برداروں کو مجرموں کی طرح کردیں۔

مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٦﴾
تمھیں کیا ہوا، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو۔

اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿٣٧﴾
کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو۔

اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿٣٨﴾
کہ تمھارے لیے اس میں وہ ہے جو تم پسند کرو۔ ٣٤٠٥

اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٩﴾
یا تم نے ہم سے کوئی قسمیں لے رکھی ہیں جو قیامت کے دن تک پہنچنے والی ہیں کہ تمھارے لیے وہی ہے جو تم خود فیصلہ کرو۔

سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿٤٠﴾
ان سے پوچھ، کون اُن میں سے اس کا ذمہ دار ہے۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكَاۗءُ ښ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَاۗىِٕهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿٤١﴾
یا ان کے کوئی شریک ہیں تو اپنے شریکوں کو لائیں، اگر وہ سچے ہیں۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ
جس دن شدت ظاہر ہوگی اور وہ سجدے کی طرف

٣٤٠٤ اس مثال میں مخالفین کے دونوں عذابوں کا کھلا کھلا ذکر کردیا ہے یعنی ایک عذاب دنیا اور ایک عذاب آخرت اور عذاب دنیا کی نوعیت بھی صراحت سے بتا دی۔ جس طرح باغ والوں کی کی کرائی پر اللہ تعالیٰ نے پانی پھیر دیا۔ اس لیے کہ وہ مساکین کا حق نہ دیتے تھے اسی طرح ان کفار پر عذاب آئیگا یعنی ان کی تمام کوششیں جو وہ کریں گے برباد کردی جائیں گی۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ آخر یہ لوگ مسلمان ہونگے۔ انا الی ربنا راغبون اور اس باغ سے بہتر انہیں ملے گا۔ فی الواقع عرب ان کی طاقت نابود ہوئی تو دنیا پر حکومت دے دی اس قدر صراحت اس سے نہایت ہی ابتدائی زمانہ کی پیشگوئی میں کس قدر زبردست دلیل صداقت اسلام پر ہے اس مثال سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کے دل کو جو بڑا غم کھا رہا تھا وہ مساکین کی حالت تھی اور یہی اسلام کا سب سے بڑا مقصد تھا کہ غربا اور مساکین کی خبرگیری ہو ضعیفوں اور کمزوروں کے حق ملیں۔

٣٤٠٥ اوپر کی آیات میں بتایا ہے کہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مجرموں اور مسلموں سے اللہ تعالیٰ کا ایک ہی معاملہ ہوگا۔ وہ صحیح نہیں مسلم وہ ہے جو ایک قانون الٰہی کی فرمانبرداری کرتا ہے مجرم وہ ہے جو ذات باری سے قطع تعلق کرلیتا ہے۔ قانون پر چلنے والا اور قانون کو توڑنے والا یکساں نہیں ہوسکتے تو پہلے ان کے اس فیصلہ کو غلط قرار دیا پھر فرمایا کہ کوئی کتاب اللہ تعالیٰ نے ایسی نہیں اتاری جس میں یہ لکھا ہو نہ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم سے کوئی ایسا عہد کیا ہے کہ جو راہ وہ چاہیں اختیار کرلیں۔ مگر نتیجہ سکھ ہی ملتا رہے گا۔ جو کچھ ملتا ہے آرزوؤں سے نہیں ملتا اور یہ جو ایمان کے متعلق بالغۃ الی یوم القیامۃ فرمایا تو مطلب یہ ہے کہ ہمارا عہد اگر ہوتا تو پھر قیامت کے دن تک یہی عہد ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنتیں بدلتیں نہیں لیکن یہ فیصلہ کرنے والے خود دوسروں کے لیے ان کی آرزوؤں کے وہ نتائج تسلیم نہیں کرتے

اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۴۲﴾
بلائے جائیں گے تو کر نہ سکیں گے ۳۴۰۶

خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ وَ قَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَ هُمْ سٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾
ان کی نظریں جھکی ہوئی ہوں گی، ذلت اُن پر چھائی ہوئی ہو گی اور کبھی ان کو سجدے کی طرف بلایا جاتا تھا اور وہ صحیح و سالم تھے۔

فَذَرْنِيْ وَ مَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾
سو مجھے چھوڑ دے اور اسے جو اس بات کو جھٹلاتا ہے ہم انھیں آہستہ آہستہ اس طریق سے پکڑیں گے جس کا انھیں علم نہ ہو۔

وَ اُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾
اور میں انھیں مہلت دیتا ہوں، میری تدبیر مضبوط ہے۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾
کیا تو ان سے اجر مانگتا ہے تو وہ چٹی کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾
یا اُن کے پاس غیب ہے تو وہ لکھ لیتے ہیں۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَ هُوَ مَكْظُوْمٌ ؕ ﴿۴۸﴾
سو اپنے رب کے حکم کا صبر سے انتظار کر اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جا جب اس نے پکارا اور وہ رنج سے بھرا ہوا تھا ۳۴۰۷

لَوْ لَاۤ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾
اگر اسے اپنے رب کی نعمت نہ پا لیتی، تو وہ بُرے حال میں کھلے میدان میں ڈال دیا جاتا۔

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾
سو اس کے رب نے اُسے چن لیا اور اُسے نیکوکاروں سے بنایا۔

وَ اِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَ يَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾
اور قریب ہے کہ کافر تجھے اپنی نظروں سے (گھور کر) پھسلا دیں۔ جب وہ نصیحت سنتے ہیں اور کہتے ہیں یقیناً یہ دیوانہ ہے۔

وَ مَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۲﴾ ع
اور وہ جہانوں کے لیے شرف ہے ۳۴۰۸

جو اپنے لیے تجویز کرتے ہیں ؁

۳۴۰۶ کشف عن الساق کے لیے دیکھو ۲۴۷۶ اور ایک جماعت صحابہ اور تابعین نے یکشف عن ساق کے معنی کئے ہیں امر شدید ظاہر ہو گا (ج) اور ابن عباس سے یہ بھی معنی مروی ہیں کہ سخت امر کھل جائیگا اور اعمال ظاہر ہو جائیں گے۔ اور مجاہد سعید بن جبیر قتادہ سے معنی شدت الامر مروی ہیں۔ اور حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ جاہلیت میں اسی معنی میں یہ محاورہ استعمال ہوتا تھا۔ اور عرب کے لوگ جب کسی امر کی شدت کو ظاہر کرنا ہوتا تھا کہتے تھے کشفت ھذا الامر عن ساق (ج)

عمل کے مطابق جزا: فلا یستطیعون حدیث میں بھی آتا ہے کہ ان کی پیٹھیں ایسی ہو جائیں گی کہ وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ گویا ان کی وہ حالت ہو جائے گی جو اپنے اندر اپنے عمل سے یہاں پیدا کر لی تھی۔ اس دنیا میں جب انہیں سجدہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو باوجود اس پر قدرت رکھنے کے وہ اس طرف متوجہ نہ ہوتے تھے جیسا اگلی آیت میں بتایا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہ جھکنا ان کی طبیعت کا جزو بن گیا۔ اور وہ اس قابل نہ رہے کہ جھکنا چاہیں تو جھک جائیں اللہ تعالیٰ کے آگے یہاں جھکنے سے اخلاق فاضلہ پیدا ہوتے ہیں انہیں انہوں نے حاصل نہ کیا۔ اور چونکہ یہاں اکڑتے تھے وہاں بھی اکڑے رہیں گے۔ اسی اصول کی طرف توجہ دلائی ہے کہ راحت اخلاق فاضلہ سے اور اخلاق فاضلہ تعلق باللہ سے پیدا ہوتے ہیں ؁

۳۴۰۷ حضرت یونس کی ہجرت بلا اذن: صاحب الحوت حضرت یونس ہیں اور یہاں صبر سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں سے بوجہ ان کی بداخلاقی کے یا ان کے دکھ دینے کے علیحدگی کا خیال دل میں نہ لاؤ جیسے حضرت یونس نے جلدی کی دیکھو ۲۱۸۰ یعنی انہوں نے بلا اذن الٰہی ہجرت کی اور اگلی آیت میں بتایا کہ پھر بھی اللہ تعالیٰ کے فضل نے ان کی دستگیری کی ورنہ اس طرح ہجرت کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کامیابی سے محروم رہ جاتے مذموم میں اشارہ ناکامی کی طرف ہی ہے۔ اور کھلے میدان میں ڈالے جانے سے مطلب ایسی جگہ ہے۔ جہاں انہیں پناہ نہ ملتی۔ اور آیت ۵۱ کا بھی یہی مطلب ہے کہ کافر اس قدر بری نگاہوں سے آپ کی طرف دیکھتے ہیں کہ ان کے بُرے تیوروں کو دیکھ کر ہی ایک شخص اپنی جگہ چھوڑ جائے۔ مگر جسے اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر کھڑا کیا ہے وہ ان چیزوں کی پروا نہیں کرتا ؁

۳۴۰۸ قرآن سب قوموں کے لیے عزت کا موجب ہے: گویا وحی الٰہی نے صرف محمد رسول اللہ صلعم کے اخلاق فاضلہ کو ہی کمال کو نہیں پہنچایا نہ وہ صرف ایک قوم عرب کو ہی مقام عزت تک پہنچائیگا بلکہ اس کے اندر اس قدر وسعت ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کو مقام عظمت تک پہنچا دے گا ؁

(۶۹) سُوْرَۃُ الْحَاقَّۃِ مَکِّیَّۃٌ

اٰیَاتُہَا ۵۲ — رُکُوْعَاتُہَا ۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

اَلْحَآقَّۃُ (۱) — حق ہو کر رہنے والی۔

مَا الْحَآقَّۃُ (۲) — حق ہو کر رہنے والی کیا (بات) ہے ۳۴۰۹

وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّۃُ (۳) — اور تجھے کیا معلوم ہے حق ہو کر رہنے والی کیسی (بات) ہے۔

کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌۢ بِالْقَارِعَۃِ (۴) — ثمود اور عاد نے بڑی مصیبت کو جھٹلایا۔

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِیَۃِ (۵) — سو ثمود زور کی کڑک سے ہلاک کیے گئے ۳۴۱۰

وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَۃٍ (۶) — اور عاد سخت آندھی سے ہلاک کر دیئے گئے۔

سَخَّرَهَا عَلَیْهِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّ ثَمٰنِیَۃَ اَیَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِیْهَا — اس نے اسے اُن پر سات راتیں اور آٹھ دن چلائے رکھا جڑ سے کاٹتی ہوئی، سو تُو لوگوں کو اس میں گرے

تمہید سورت: اس سورت کا نام الحاقۃ ہے اور اس میں دو رکوع اور باون آیتیں ہیں۔ اور اس کے نام میں اشارہ اس طرف ہے کہ جو کچھ بدی کا اور اللہ تعالیٰ سے قطع تعلق کا نتیجہ ہے۔ وہ کسی صورت میں ٹل نہیں سکتا۔ ہاں یہ نتیجہ پہلے اس دنیا میں بر رنگ عذاب ظاہر ہوتا ہے جیسے عاد و ثمود و فرعون کی حالت میں اور آخر کھلا انکشاف اس کا قیامت میں ہوگا۔ جب تمام مخفی قوتیں اور نتائج ظاہر ہو جائیں گے اور آخر پر پھر تسبیح یا تعلق باللہ کی طرف توجہ دلائی۔ یہ بھی ابتدائی زمانہ کی سورت ہے اور اس کا تعلق پچھلی سورت سے یوں ہے کہ اس میں ایک قانون کی خلاف ورزی کا جو نتیجہ بتایا تھا تو یہاں اس کے متعلق فرمایا کہ وہ نتیجہ ایک حد تک اس دنیا میں اور آخر کامل طور پر قیامت میں ظاہر ہو جائیگا۔

۳۴۰۹ الحاقۃ سے مراد: الحاقۃ۔ حاققتہ۔ فحققتہ۔ میں نے حق میں اس کے ساتھ جھگڑا کیا۔ اور اس پر غالب آیا اور الحاقۃ قیامت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ یوم یقوم الناس سے اس کی تفسیر کی ہے کیونکہ اس میں جزا ثابت ہوگی (غ) و الحاقۃ النازلۃ وھی الداھیۃ ایضا (ل) یعنی حاقۃ مصیبت یا بھاری مصیبت کو بھی کہا جاتا ہے۔ اور قیامت کو الحاقۃ اس لیے کہا کہ وہ ہر انسان کو خیر یا شر سے کچھ واجب کرے گی یا اس لیے کہ اس میں امور کی حقیقت کھلے گی۔ یا اس لیے کہ اللہ کے دین میں ہر باطل کے ساتھ جھگڑا کرنے والے پر وہ غالب آئے گی (ل) اور ہر ایک معنی کے لحاظ سے جس طرح یہ لفظ قیامت کبریٰ پر صادق آتا ہے اسی طرح مکذبین کی ہلاکت یا قیامت وسطیٰ پر بھی صادق آتا ہے اور دونوں اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ جیسا کہ ایک طرف ثمود اور عاد کی ہلاکت سے مکذبین رسول کی ہلاکت کی طرف اشارہ کیا اور دوسری طرف قیامت کبریٰ کا بھی ذکر کیا اور قیامت وسطیٰ اور قیامت کبریٰ کے لیے ایک نشان کے طور پر قرار دی گئی ہے جیسا کہ ابھی پچھلی سورت میں گذر چکا کذلک العذاب ولعذاب الاٰخرۃ اکبر اور راغب نے ما ادرٰک اور ما یدریک میں یہ فرق کیا ہے کہ ما ادرٰک جہاں آیا ہے وہاں ساتھ ہی بتا بھی دیا ہے کہ وہ کیا چیز ہے وکل موضع ذکر فی القراٰن وما ادرٰک فقد عقب ببیانہ اور اس کی مثالیں دی ہیں۔ وما ادرٰک ماھیہ نار حامیۃ (القارعۃ ۱۰-۱۱) وما ادرٰک ما لیلۃ القدر لیلۃ القدر خیر۔ وما ادرٰک ما الحاقۃ ثم ما ادرٰک ما یوم الدین اور یہاں جس بات کا معاً پیچھے بیان آتا ہے وہ ثمود اور عاد کا جھٹلانا اور ان کا ہلاک کیا جانا ہے اور اگر غور کیا جائے تو مکذب قوم کی ہلاکت بھی فی الحقیقت جزا و سزا کے قانون کو ظاہر کر دیتی ہے۔ ہاں قیامت میں انکشاف تام ہے اور یہاں کا انکشاف صرف اہل بصیرت کے لیے ہے۔

۳۴۱۰ طاغیۃ۔ طغی سے ہے اور انا لما طغی الماء (۱۱) میں مراد پانی کا حد سے تجاوز کر جانا ہے۔ اور طاغیۃ طوفان کی طرف اشارہ ہے اور طغوی اسم ہے کذبت ثمود بطغوٰھا (الشمس ۹۱-۱۱) جس میں یہ تنبیہ ہے کہ جب انہیں ان کی سرکشی کی سزا سے ڈرایا گیا انہوں نے اس کو جھٹلایا (غ) اور طغوی کے معنی طغیان بھی کیے گئے ہیں (ل) مگر یہاں ثمود کے طاغیۃ سے ہلاک ہونے کا ذکر ہے۔ اور ثمود کا عذاب پانی کا طوفان نہ تھا۔ اور زجاج کے نزدیک طاغیۃ عاقبۃ کی طرح اسم ہے اور مراد طغیان ہے اور قتادہ کے نزدیک اس سے مراد صیحۃ العذاب ہے (ل) اور بخاری میں طغیان اور سخت آندھی دونوں معنی لیے ہیں۔ مگر در حقیقت یہ سخت زلزلہ تھا۔ دیکھو الاعراف۔ ۷۸ فاخذتھم الرجفۃ۔

صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝۷
پڑے دیکھتا گویا کہ وہ کھوکھلی کھجوروں کے تنے ہیں ۳۴۱۱ء

فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝۸
تو کیا تو ان میں سے کسی کو باقی دیکھتا ہے۔

وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۝۹
اور فرعون نے اور انھوں نے جو اس سے پہلے تھے اور الٹی ہوئی بستیوں نے خطا کاریاں کیں ۳۴۱۲ء

فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝۱۰
سو اُنھوں نے اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی، پس اس نے انھیں بڑا سخت پکڑا۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝۱۱
جب پانی حد سے بڑھنے لگا ہم نے تمھیں کشتی پر سوار کیا۔

لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝۱۲
تاکہ اسے تمھارے لیے نصیحت بنائیں اور یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝۱۳
پس جب صور میں ایک پھونک سے پھونکا جائے گا۔

وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝۱۴
اور زمین اور پہاڑ اُٹھائے جائیں گے پھر ایک ہی مرتبہ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔

فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝۱۵
سو اس دن ہو جانے والی بات ہو جائے گی۔

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۝۱۶
اور آسمان پھٹ جائے گا، سو وہ اس دن بودا ہوگا ۳۴۱۳ء

وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ؕ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝۱۷
اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تیرے رب کا عرش اُس دن آٹھ اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے ۳۴۱۴ء

۳۴۱۱ء حسوم ۔ حَسْم کسی چیز کا اثر دور کرنا ہے قطعہٗ فحسمہٗ یعنی اسے کاٹا پھر اس کا مادہ بھی دور کر دیا اور یہاں حسوم سے مراد ہے ان کے اثر کو مٹانے والی یا ان کی خبر کو مٹانے والی یا ان کی عمروں کو قطع کرنے والی اور یہ سب باتیں اس کے عموم میں داخل ہیں (غ) اور حسوما کے معنی الدائمۃ فی الشر بھی کیے گئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے بھی جن کا اول ان کے آخر سے منقطع نہیں (ل)

صرعی ۔ صریع کی جمع ہے صَرْع کے معنی زمین پر گرا دینا ہیں اور مصارعۃ کشتی ہے (ل)

۳۴۱۲ء خاطئۃ ۔ خاطیٔ وہ ہے جو گناہ کا قصد کرے الا الخاطئون (۳۷) اور کبھی بڑے گناہ کو بھی خاطئۃ کہا جاتا ہے (غ)

۳۴۱۳ء واھیۃ ۔ وھی چمڑے یا کپڑے میں شق ہو جانا ہے اور ہر ایک چیز کو جس کی مضبوطی ڈھیلی پڑ جائے کہا جاتا ہے وَھِیَ (غ) اور وَھَی السِّقاء کے معنی ہیں مشکیزہ پھٹ گیا۔ اور وَھَی الحائطُ کے معنی ہیں دیوار کمزور ہو گئی۔ یا گرنے والی ہو گئی (ل)

یہ ذکر احوال قیامت کا ہے اور بظاہر زمین اور پہاڑوں کا یک مرتبہ توڑا جانا اور آسمان کا کمزور پڑ جانا یہ سب موجودہ نظام کے قایم نہ رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ کس طرح یہ ہوگا اس کیفیت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے ؂

۳۴۱۴ء ارجا ۔ رَجَا کی جمع ہے اور کوئیں یا آسمان وغیرہ کا رَجَا اس کا کنارہ ہے۔ (غ)

فرشتوں کے کناروں پر ہونے سے کیا مراد ہے بعض نے کہا وہاں پناہ لیں گے بعض نے کہا نزول کے لیے وہاں اجتماع ہوگا اور ممکن ہے کہ یہ اشارہ ہو کہ وہ ملائکہ جو مدبرات امر ہیں وہ کناروں پر ہونگے کیونکہ کسی چیز کے کنارہ پر ہونا گویا اس سے الگ ہو جانا ہے ؂

حمل عرش سے کیا مراد ہے۔ عرش کے لیے دیکھو ۱۰۹۵ء پس حمل عرش سے یہ مراد لینا کہ واقعی کوئی عظیم الشان تخت بنا ہوا ہے جس کو کسی اور نے سہارا دیا ہوا ہے صحیح نہیں وہ القیوم ہے یعنی ہر چیز کے قیام کا موجب اور کوئی چیز اس کے قیام کا موجب نہیں۔ پس یہاں مراد نفاذ امر کا حمل ہے رہا یہ کہ اس کے حمل کو آٹھ سے کیا تعلق ہے سو اس کا حقیقی علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے لیکن چونکہ ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ اس عرش کے اٹھانے والے اب چار ہیں اور سورۂ فاتحہ میں چار صفات

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾ — اس دن تم پیش کئے جاؤ گے تمہاری کوئی چھپی بات چھپی نہ رہے گی ۳۴۱۵

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ — سو جس کی کتاب اس کے (دائیں ہاتھ) میں ملے گی، تو وہ

هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿۱۹﴾ — کہے گا لو میری کتاب پڑھو ۳۴۱۶

اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿۲۰﴾ — میں جانتا تھا میرا حساب مجھے ملے گا۔

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿۲۱﴾ — سو وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا۔

فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۲۲﴾ — بلند باغ میں۔

قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ﴿۲۳﴾ — جس کے میوے قریب ہیں ۳۴۱۷

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ — خوش گواری سے کھاؤ اور پیو، اس کا بدلہ جو تم نے گزرے

فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿۲۴﴾ — ہوئے دنوں میں کیا۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ — اور جس کی کتاب اس کے بائیں (ہاتھ) میں دی جائے گی تو وہ کہیگا

يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ﴿۲۵﴾ — اے کاش میری کتاب مجھے نہ دی جاتی۔

وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ﴿۲۶﴾ — اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔

يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ﴿۲۷﴾ — اے کاش! وہ (موت) کام تمام کرنے والی ہوتی ۳۴۱۸

مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ﴿۲۸﴾ — میرے مال نے مجھے کام نہ دیا۔

هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ﴿۲۹﴾ — میرا غلبہ مجھ سے جاتا رہا۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾ — اسے پکڑو، پھر اسے طوق پہناؤ۔

ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾ — پھر اسے دوزخ میں داخل کرو ۳۴۱۹

ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ — پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی ناپ ستّر ہاتھ ہے

ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾ — اسے جکڑو۔

الٰہی کو سب صفات کے لیے بطور اُمّ قرار دیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ چار کے لفظ میں انہی چار صفات کی طرف اشارہ ہے جن پر موجودہ نظام عالم کا انحصار ہے یعنی ربوبیت رحمانیت۔ رحیمیت۔ مالکیت اور قیامت کے دن آٹھ کے لفظ میں یہ اشارہ ہو کہ ان چار صفات کا اس دن ایک نیا ظہور ہوگا۔ ان چار صفات پر ہمارے اعمال اور نتائج اعمال کا انحصار ہے اور چونکہ ان اعمال کے نتائج وہاں ایک نئی زندگی کی صورت میں رونما ہونگے۔ اور وہ نئی زندگی چونکہ موجودہ کیفیت کو اپنے اندر نہیں رکھتی ہو گی اس لیے وہاں ربوبیت۔ رحمانیت۔ رحیمیت مالکیت کا بھی ایک نیا رنگ ظاہر ہوگا اور یہ توجیہ حضرت مجدد صد چہاردہم نے کی ہے اور بعض نے ثمانیۃ سے مراد آٹھ اصناف یا آٹھ صفوف بھی لی ہیں۔

۳۴۱۵ گویا حقائق کا انکشاف کامل ہو جائیگا۔ اور تمام مخفی نتائج اور مخفی قوتیں ظہور پذیر ہو جائیں گی۔

۳۴۱۶ ھاؤم۔ ھا بمعنی اخذ ہے ھات کا نقیض اور ھاؤُمَ اور ھاؤُما اور ھاؤُمُوا آتے ہیں (غ) اور کتابیہ۔ حسابیہ۔ مالیہ وغیرہ میں اور السیاہی ماھیہ (القارعۃ۔ ۱۰) میں ھا سکت کے لیے ہے یعنی وقفہ کے لیے۔

۳۴۱۷ قطوف۔ قَطْف پھل کا لینا ہے اور قِطْف وہ پھل ہے جو چنا گیا اس کی جمع قطوف ہے (غ)

۳۴۱۸ یلیتھا کانت القاضیۃ اشارہ موت کی طرف ہے اور قاضیۃ قاطعۃ ہے یا مراد ہے کہ دنیا کی زندگی نہ ہوئی ہوتی۔

۳۴۱۹ ستر ہاتھ کی زنجیر: سبعون کا استعمال عدد کامل کے طور پر ہوتا ہے یعنی ایک لمبی زنجیر میں جس طرح اس نے دنیا کی زندگی میں اپنے آپ کو ایک لمبی زنجیر کے

اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ﴿۳۳﴾	وہ اللہ تعالیٰ عظمت والے پر ایمان نہ لاتا تھا۔
وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۳۴﴾	اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دیتا تھا۔ ۳۴۲۰
فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾	سو آج اس کے لیے یہاں کوئی دلی دوست نہیں۔
وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴿۳۶﴾	اور نہ دھوؤں کے سوائے کوئی کھانا ہے۔
ع لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ﴿۳۷﴾	سوائے خطاکاروں کے اسے کوئی نہیں کھاتا۔
فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾	سو نہیں میں اس کی قسم کھاتا ہوں جو تم دیکھتے ہو۔
وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾	اور جو تم نہیں دیکھتے ۳۴۲۱
اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾	وہ یقیناً معزز رسول کا کلام ہے۔
وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾	اور وہ شاعر کی بات نہیں، تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔
وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾	اور نہ کاہن کی بات ہے تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو۔
تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾	جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے۔
وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾	اور اگر وہ ہم پر بعض باتیں افترا کے طور پر بنا لیتا۔
لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾	تو ہم ضرور اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے۔
ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾	پھر اس کی رگِ جان کاٹ دیتے۔
فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾	پھر تم میں سے کوئی (بھی) اس سے روکنے والا نہ ہوتا ۳۴۲۲
وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾	اور وہ یقیناً متقیوں کے لیے نصیحت ہے۔
وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾	اور بیشک ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے جھٹلانے والے ہیں۔
وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾	اور یقیناً وہ کافروں کے لیے حسرت ہے۔
وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾	اور وہ یقینی حق ہے۔

اندر ڈالا ہوا تھا۔ حضرت مجدد نے ایک لطیف بات بیان کی ہے کہ جس طرح انسان کی اوسط عمر ستر سال ہے اُسی کے مقابل پر ستر ہاتھ کی زنجیر ہے گویا اس کی ہر کڑی انسان نے اپنے ہاتھ سے تیار کی ہے۔

۳۴۲۰ یحض۔ حضّ۔ حثّ کی طرح ہے یعنی ایک چیز کی ترغیب دلانا (غ)

۳۴۲۱ شاہد و غائب کو بطور شہادت پیش کیا ہے یعنی ایسے نشانات صداقت جو تمہیں نظر آ رہے ہیں اور ایسے جو آئندہ دیکھو گے اور اس کے جواب میں جو اگلی آیت میں فرمایا کہ وہ رسول کریم کا قول ہے تو اس سے مراد اکثر کے نزدیک آنحضرت صلعم ہی ہیں (ر)

۳۴۲۲ وتین وہ رگ ہے کہ جب اسے کاٹ دیا جائے تو انسان مر جائے۔
حاجزین۔ حجز۔ دو چیزوں کے درمیان کسی فاصل سے روک ڈالنا ہے جعل بین البحرین حاجزا (النمل ۲۷-۶۱) اور حجاز شام اور بادیہ کے درمیان روک ہے (غ) اور اقاویل۔ قول یا اقوال کی جمع ہے۔

مفتری پر گرفت: ان چار آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون بیان فرمایا ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالےٰ پر افترا کرے اور کہے کہ اسے یہ وحی ہوئی ہے حالانکہ اسے وحی نہیں ہوئی تو ایسے شخص کو وہ زیادہ مہلت نہیں دیتا بلکہ جلد اس کا کام تمام کر دیتا ہے اور اس قانون کو آنحضرت صلعم کی صداقت پر یہاں بطور دلیل پیش کیا ہے۔ یہ گویا

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾ ع | سو اپنے عظمت والے رب کے نام کی تسبیح کر ۳۴۲۳

اللہ تعالیٰ نے صادق کے لیے پرکھ رکھی ہے۔ اگر وہ مفتری پر گرفت نہ کرتا تو نبوت کے معاملہ میں امن اٹھ جاتا ۞

۳۴۲۳ ان پانچ آیات میں اصل مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے اوّل قرآن کا ذکر ہونا پھر اس کے جھٹلانے والوں کا ذکر پھر یہ کہ جھٹلانا ان کے لیے موجب حسرت ہو گا۔ انہ لحسرۃ میں ضمیر ان کے فعل تکذیب کی طرف جاتی ہے۔ پھر فرمایا کہ اس کا وقوع حق الیقین ہے اسی لیے اسے شروع میں الحاقۃ کہا تھا اور ان سب کا نتیجہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرو گویا اصل غرض تو تسبیح ہی تھی مگر جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتے ان کے لیے دکھ اور حسرت کا آنا یقینی ہے ۞

علم کے تین مراتب: حق الیقین یقین کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے اس سے اتر کر عین الیقین اس سے اتر کر علم الیقین علم الیقین ایسا ہے جیسا دھوئیں سے آگ کے وجود کا یقین۔ عین الیقین گویا اس آگ کا خود دیکھ لینا ہے۔ اور حق الیقین اس کے اندر داخل ہو جانا۔ بدی کے بد نتائج انسان دلیل سے بھی مان سکتا ہے۔ دیکھ بھی سکتا ہے۔ لیکن اگر اس طرح فائدہ نہ اٹھائے تو پھر ان کا بھگتنا ضروری ہے ۞

(۷۰) سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ

اٰیاتھا ۴۴ | رکوعاتھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ | اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے باربار رحم کرنے والے کے نام سے

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴿۱﴾ | ایک مانگنے والا وہ عذاب مانگتا ہے ، جو کافروں پر

لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ﴿۲﴾ | آ کر رہے گا کوئی اسے ہٹانے والا نہیں۔

مِّنَ اللّٰهِ ذِى الْمَعَارِجِ ﴿۳﴾ | اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بلند مرتبوں والا ہے ۳۴۲۴

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِىْ | فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں ایک دن میں جس کا

يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴿۴﴾ | اندازہ پچاس ہزار سال ہے ۳۴۲۵

تمہید سورت: اس سورت کا نام المعارج ہے اور اس میں دو رکوع اور چوالیس آیتیں ہیں اور اس کا مضمون اس کے نام کے مطابق یہ ہے کہ مومنوں کے لیے جو بعض اعلیٰ درجہ کی صفات کو جن کا ذکر اس سورت میں ہے اپنے اندر لے کر تزکیہ نفس کرتے ہیں بڑے بڑے بلند مراتب اللہ تعالیٰ کی جناب میں ہیں اور مخالفین کو بھی یہی سمجھایا ہے۔ کہ وہ بجائے عذاب مانگنے کے ان نیک صفات کو اپنے اندر لیں اور ترقیات روحانی کا مشاہدہ کریں۔ اور آخر پر یہ بھی بتایا ہے کہ آخر کار یہ لوگ اس طرف رجوع کریں گے۔ پچھلی سورت میں اللہ تعالیٰ سے قطع تعلق کا نتیجہ عذاب بتایا تھا تو یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والوں کے مراتب عالیہ کا ذکر ہے

۳۴۲۴ معارج۔ عَرَجَ کے معنی آتے ہیں ترقی کی یا بلند ہوا۔ اور مَعَارِج۔ مِعْرَج کی جمع ہے اور اس سے مراد قتادہ کے نزدیک فواضل اور نعم ہیں (ل) اور مصاعد جو اس کے معنے کیے ہیں ۲۳۴۸ اس سے مراد بھی مراتب عالیہ ہی ہیں۔ اور ابن جریر نے ذی المعارج کے معنی ذی العلو والدرجات والفواضل والنعم کیے ہیں اور اس پر ابن عباس اور قتادہ کی سند پیش کی ہے اور مراد ذی المعارج سے یہ ہے کہ اس کے پاس انسان کے لیے بڑے بڑے بلند مراتب ہیں یعنی جو انسان ترقی کرنا چاہتا ہے اس کے لیے اس کے پاس بڑے بڑے درجات ہیں ۞

یہاں سوال کرنے والے کافر ہیں۔ سورہ قلم میں جو نزول میں دوسری سورت ہے کفار کو صاف وعدہ دیا تھا کذلک العذاب والعذاب الاخرۃ اکبر تو اب وہ سوال کرتے ہیں کہ وہ عذاب آتا کیوں نہیں جو اللہ کی طرف سے آنے والا ہے اس کا جواب دیا ہے۔ لیس لہ دافع وہ آ کر رہے گا اور جب آئے گا تو کوئی اسے ہٹا بھی نہ سکے گا۔ لیکن یہ اپنے لیے تکلیف کیوں مانگتے ہیں اللہ تو ذی المعارج ہے جس کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے انسان بڑے بڑے بلند درجات کو حاصل کر سکتا ہے ۞

۳۴۲۵ روح سے مراد: روح کے معنی کئی جگہ بیان ہو چکے ہیں یہاں مفسرین نے روح کے معنی میں ذیل کے اقوال دیئے ہیں۔ اول جبرئیل دوم مجاہد کا قول کہ روح سے مراد ایسے ملائکہ ہیں جو ان ملائکہ کے حق میں جو بنی آدم پر نگہبان کے طور پر مقرر ہیں حفظہ کا حکم رکھتے ہیں گویا جس طرح ہم ان ملائکہ کو نہیں دیکھتے ملائکہ ان ملائکہ کو نہیں دیکھتے۔ سوم ایک ملک عظیم الخلقت ہے چہارم ابو صالح کا قول کہ وہ ایک مخلوق ہے انسان کی طرح مگر انسان نہیں۔ پنجم میت کی روح جب قبض کی جائے اور مراد غالباً مومن میت کی روح ہے۔ (ر) یہاں سیاق جس معنی کو چاہتا ہے وہ آخری ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذی المعارج ہونے میں توجہ یہ دلائی تھی کہ کافر عذاب مانگتے ہیں حالانکہ اگر وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کریں تو بڑے بڑے درجات حاصل کر سکتے ہیں پس یہاں روح سے مراد بھی مومنوں کا عروج ہی ہے یعنی ان کی روحانی ترقی اور ملائکہ کا ذکر ساتھ اس لیے کیا کہ ملائکہ انسان کے دل میں نیکیوں کے محرک ہیں جس طرح اہل نار کے متعلق ان کے

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۵	سو صبر کر خوبیوں سے بھرا ہوا صبر ۳۴۲۶
اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۶	وہ اسے دور سمجھتے ہیں۔
وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۷	اور ہم اسے قریب دیکھتے ہیں ۳۴۲۷
يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۸	جس دن آسمان تلچھٹ کی طرح ہو جائے گا۔
وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۹	اور پہاڑ اُون کی طرح ہو جائیں گے ۳۴۲۸
وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۱۰	اور دوست دوست کو نہ پوچھے گا۔
يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ	(گو) وہ انھیں دکھائے جائیں گے مجرم چاہیگا کہ کاش وہ اس دن کے
مِنْ عَذَابِ يَوْمِىِٕذٍۢ بِبَنِيْهِ ۱۱	عذاب کا (کوئی سا) فدیہ دے سکتا اپنے بیٹے۔
وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۱۲	اور اپنی جورو اور اپنا بھائی۔
وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۱۳	اور اپنا کنبہ جو اُسے پناہ دیتا ہے ۳۴۲۹
وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۱۴	اور سب کوئی جو زمین میں ہیں پھر یہ اسے چھڑا دے۔
كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۱۵	ہرگز نہیں وہ شعلہ مارتی ہوئی آگ ہے۔
نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۱۶	ہاتھ پاؤں کو کھا جانے والی ۳۴۳۰

قرین یعنی شیطان کا ذکر کیا اسی طرح مومنوں کے عروج کے ذکر میں ملائکہ کا ذکر ساتھ کیا جو اس عروج میں ان کے معاون ہیں۔ اور دوسری جگہ آتا ہے۔ یوم یقوم الروح والملائکۃ صفا لا یتکلمون الا من اذن لہ الرحمٰن وقال صوابا (النباء ۷۸-۳۸) اور یہاں بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ مراد مومن ہی ہیں اور مومنوں کو روح اس لحاظ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی روح یعنی کلام الٰہی سے وہ نئی زندگی حاصل کرتے ہیں۔ جسمانی زندگی میں تو کفار بھی ان کے ساتھ اشتراک رکھتے ہیں۔ بلکہ دیگر حیوانات بھی لیکن وہ زندگی جو مومنوں کو ملتی ہے صرف کلام الٰہی سے ملتی ہے اس لیے ان پر روح کا لفظ بولا ہے۔

پچاس ہزار سال کا دن: رہا یہ کہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ سے کیا مراد ہے تو یہ انسان کی ترقیات روحانی کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ اتنی مدت تک بھی وہ ترقی کرتے چلے جائیں تو وہ ترقیات ختم نہیں ہوتیں اور اس سے مراد بھی محدود کرنا نہیں کہ اس کے بعد کوئی ترقی نہ ہوگی بلکہ یا تو یہ صرف ایک منزل ترقی ہے اور یا یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان کی ترقیات کا وہ زمانہ ایسا وسیع ہے کہ اس کا ایک ایک دن گویا پچاس پچاس ہزار سال کا ہے۔

ع۳۴۲۶ صبرا جمیلا۔ جمیل کے لیے دیکھو ع۱۷۰۹ چونکہ یہاں کفار کی ایذا رسانیوں پر صبر کا ذکر ہے اس لیے ارشاد فرمایا کہ صرف مصائب کو برداشت کر لینا کافی نہیں بلکہ صبر جمیل ہو جس میں سب قسم کی بھلائیاں ہوں اور دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ اور یہاں مراد یہ نہیں کہ صبر کرو آخر قیامت آئیگی بلکہ کفار کی ایذا رسانیوں پر صبر مراد ہے۔

ع۳۴۲۷ یرونہ بعیدا یعنی اس سزا یا عذاب کو بعید سمجھتے ہیں۔ اور بعید سے مراد امکان سے بعید ہے یعنی سمجھتے ہیں کہ عذاب نہیں آ سکتا۔

ع۳۴۲۸ عھن رنگی ہوئی اون کو کہتے ہیں اور رنگ کی خصوصیت ایسی ہی ہے جیسے فکانت وردۃ کالدھان میں (غ) اور بعض کے نزدیک ہر اون کو عھن کہا جاتا ہے (ل) عذاب کے ذکر میں عذاب قیامت کا بالخصوص ذکر کیا ہے اس لیے کہ عذاب دنیا صرف اسی کے لیے بطور پیش خیمہ ہے اور یہی لفظ مجازاً عذاب دنیا پر بھی صادق آتے ہیں۔

ع۳۴۲۹ فصیلۃ۔ فصل کے معنی جدا کرنا ہیں اور فصیلۃ انسان کا کنبہ جو اس سے الگ ہوا ہوا ہے (غ) مطلب یہ کہ جن کی خاطر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تھی وہ وہاں کام نہ آسکیں گے یہ باتیں اس دنیا کے عذاب اور آخرت کے عذاب دونوں پر صادق آتی ہیں۔

ع۳۴۳۰ لظی خالص شعلہ کو کہتے ہیں اور آگ کے شعلہ مارنے پر تلظی کہا جاتا ہے نارا تلظی (الیل ۹۲-۱۴) اور لظی جہنم کا نام ہے (غ)
دوزخ کا طاقت کو سلب کر دینا: دوزخ کو نزاعۃ للشوی کہا ہے شوی کے لیے دیکھو ع۱۹۱۴ اطراف یعنی ہاتھ پاؤں کو سلب کر دینے والی گویا کام کرنے

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰى ﴿۱۷﴾	اسے بلاتی ہے جو پیٹھ پھیر لیتا ہے اور پھر جاتا ہے۔
وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾	اور جمع کرتا ہے اور بند رکھتا ہے۔
اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾	انسان بے صبر پیدا ہوا ہے ۳۴۳۱
اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾	جب اُسے تکلیف پہنچتی ہے واویلا کرتا ہے۔
وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾	اور جب اسے بھلائی پہنچتی ہے (ہاتھ) روک لیتا ہے۔
اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾	مگر نماز پڑھنے والے (ایسے نہیں)
الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾	جو اپنی نماز پر ہمیشہ قائم ہیں ۳۴۳۲
وَ الَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾	اور وہ جن کے مالوں میں ایک مقرر حق ہے۔
لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾	سوال کرنے والے اور محروم کے لیے۔
وَ الَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۲۶﴾	اور وہ جو جزا و سزا کے دن کی سچائی کو مانتے ہیں۔
وَ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۲۷﴾	اور وہ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں۔
اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾	بیشک ان کے رب کا عذاب ایسا ہے کہ اس سے نڈر نہ ہونا چاہیئے۔
وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۲۹﴾	اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔
اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۳۰﴾	سوائے اپنی بیویوں کے یا اُن کے جن کے اُن کے دائیں ہاتھ مالک ہیں تو ان پر ملامت نہیں۔
فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾	پھر جو کوئی اس (حد) سے آگے نکلنا چاہتا ہے تو یہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔
وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾	اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔
وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾	اور جو اپنی شہادتوں پر قائم ہیں۔
وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾	اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔
ع اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾	یہی باغوں میں عزت والے ہیں ۳۴۳۳

کی طاقت اور چلنے کی طاقت کو سلب کر دیتی ہے۔

۳۴۳۱ ھلوع۔ ھَلَع حرص کو کہتے ہیں یا جزع اور قلت صبر (ل) اور اگلی آیتیں خود تفسیر کرتی ہیں اور انسان سے مراد یہاں وہی کافر انسان ہے جو جمع فاوعی کا مصداق ہے کیونکہ مومنوں کو آگے الا المصلین میں خود مستثنیٰ کیا ہے اور خُلِقَ میں یہ اشارہ ہے کہ اس پر یہ حالت اس قدر غالب ہے کہ گویا پیدا ہی ایسا ہوا ہے۔

۳۴۳۲ دائمون۔ دَوام کے اصل معنی سکون ہیں الماء الدائم ساکن پانی کو کہتے ہیں۔ اور دام الشیئُ ایک چیز ایک لمبے زمانہ تک رہی وکنت علیھم شھیدا مادمت فیھم (المائدۃ ۵-۱۱۷) الا ما دمت علیہ قائما (آل عمران ۳-۷۴) (غ)

۳۴۳۳ کن صفات کو اندر لے کر مومن ترقی کر سکتا ہے: یہاں جو صفات مومنوں کی بیان کی ہیں ان میں سے بہت سی وہی ہیں جو سورۂ مومنون کی ابتدا میں گذر چکی ہیں۔ دیکھو ۲۲۴۹ تا ۲۲۵۳ اور یہ مومنوں کی وہ صفات ہیں جو ان کے تزکیہ و تطہیر کا موجب ہیں اور یہی اصل غرض نزول کتاب اللہ کی ہے اور انہی صفات

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾
مگر انھیں کیا ہوا جو کافر ہیں تیری طرف دوڑے آرہے ہیں۔

عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾
دائیں (جانب) سے اور بائیں سے گروہ گروہ ہو کر ع۳۴۳۴

اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾
کیا ان میں سے ہر شخص آرزو رکھتا ہے کہ نعمتوں والی جنت میں داخل ہو۔

كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾
ہرگز نہیں ہم نے انھیں اس غرض کے لیے پیدا کیا ہے جو وہ جانتے ہیں۔

فَلَاۤ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾
سو نہیں میں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی قسم کھاتا ہوں کہ ہم (اس بات) پر قدرت رکھتے ہیں۔

عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾
کہ بدل کر اُن سے بہتر کر دیں، اور ہم اس سے عاجز نہیں۔

فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾
سو انھیں چھوڑ دے، بیہودہ باتوں میں لگے رہیں اور کھیلیں، یہاں تک کہ اپنے اس دن کو پالیں جس کا انھیں وعدہ دیا جاتا ہے۔

يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾
جس دن وہ قبروں سے نکل پڑیں گے دوڑتے ہوئے۔ گویا کہ وہ کسی نشان کی طرف دوڑے جا رہے ہیں ع۳۴۳۵

خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ ع
ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی ذلت ان پر چھائی ہوئی ہو گی، یہ وہ دن ہے جس کا انھیں وعدہ دیا جاتا تھا۔

کو اپنے اندر لے کر انسان وہ ترقی کرتا اور وہ فضائل حاصل کرتا ہے جن کی طرف ذی المعارج میں اشارہ ہے۔

ع۳۴۳۴ عزین۔ عزۃ کی جمع ہے اور اس کے معنی ہیں جماعات متفرقہ اور اس کی اصل عَزَدُتُہٗ سے ہے جس کے معنی ہیں اسے کسی کی طرف منسوب کیا گویا وہ جماعتیں ایسی ہیں جو ایک دوسرے کی طرف منسوب ہیں خواہ عادت میں یا ایک دوسرے کی مدد کرنے میں اور اس سے اعتزاء فی الحرب ہے (غ)

کفار کے آخر کار آنحضرتؐ کی طرف آنے کی پیشگوئی: کہا گیا ہے کہ اس سے مراد کفار کا آنحضرت صلعم کے گرد استہزاء کے لیے جمع ہونا ہے جب آپ کعبہ میں نماز یا قرآن پڑھتے مگر مھطعین میں ذلت یا خوف کا پایا جانا ضروری ہے دیکھو ع۱۶۶۲ اور عزین کا لفظ بھی اس قسم کے اجتماع کا پتہ نہیں دیتا جو استہزاء کے لیے ہوتا ہو کیونکہ اس میں متفرق گروہ یا ٹولیاں بننے کی ضرورت نہیں۔ اور دوسری جگہ ہے مھطعین الی الداع (القمر ۵۴-۸) دیکھو ع۳۲۲۴ یہاں بھی بطور پیشگوئی اُس حالت کا نقشہ کھینچا ہے جب وہی لوگ جو حق کو نیست و نابود کرنے کے درپے تھے آخر کار گروہ گروہ بن کر دوڑے دوڑے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور یہ جماعات متفرقہ عرب کے تمام کونوں سے مدینہ میں پہنچیں جس کے لیے عن الیمین و عن الشمال کے لفظ زیادہ موزون ہیں اسی پیشگوئی کے پورا ہونے پر فرمایا و رایت الناس ید خلون فی دین اللّٰہ افواجا اور آگے جو فرمایا ایطمع کل امرئ منھم ان یدخل جنۃ نعیم تو اس کا مطلب یہ ہے کہ محض اُن کے منہ سے یہ کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے جنت نہیں مل جاتی اس لیے کہ اصل غرض تو تزکیہ اور تکمیل نفس ہے جب تک اللہ تعالیٰ کی راہ میں مجاہدات شاقہ اختیار نہ کریں اور اپنے آپ کو بلیٰ من اسلم وجھہ للّٰہ کا مصداق نہ بنائیں اسی کی طرف توجہ دلانے کے لیے فرمایا انا خلقنٰھم مما یعلمون جہاں من اجل کے لیے ہے اور معنی یوں ہیں انا خلقنٰھم من اجل ما یعلمون وھو تکمیل النفس بالایمان والطاعۃ (ر) گویا انہیں صفات مومنین کی طرف توجہ دلائی جن کا ذکر اوپر کیا اور آگے نبدل خیرا منھم میں بھی اسی طرف اشارہ ہے اور تبدیلی حالت کی بھی ہو سکتی ہے اور آخری آیت میں خاشعۃ ابصارھم ترھقھم ذلۃ کے بعد ذٰلک الیوم الذی کانوا یوعدون لا کر صاف بتا دیا کہ اس عذاب کے دن کا نقشہ ہے جس کا اُن سے وعدہ کیا جاتا ہے جس کا کچھ ذکر ابھی سورۃ قلم میں گذر چکا ہے اور وہاں بھی ان کی عاجزی اور ذلت کا ذکر تھا اور یہ وہی عاجزی اور ذلت تھی جو رسول اللہ صلعم کی کامیابی سے آخر انہیں حاصل ہوئی اور جس کے بعد وہ گروہ در گروہ رسول اللہ صلعم کی طرف چلے آئے۔

ع۳۴۳۵ نصب۔ نَصْب کے معنی کسی چیز کا قائم کرنا اور بلند کرنا ہیں اور نصیبۃ اور نُصُب ہر چیز ہے جو گاڑی جائے پھر نشان بنا دی جائے اور بعض نے نُصُب کو نصیبۃ کی جمع کہا ہے اور وہ علامت ہے جو قوم کے لیے نصب کی جائے (ل) یوفضون۔ وفض سے ہے اور ایفاض کے معنی اسراع یعنی جلدی کرنا ہیں (غ)

سورة نوح مكية (٧١)

اٰیاتها ٢٨ — ركوعاتها ٢

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَكَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ①

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ اپنی قوم کو ڈرا، اِس سے پہلے کہ اُن پر دردناک عذاب آجائے۔

قَالَ يٰقَوۡمِ اِنِّىۡ لَـكُمۡ نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ②

اس نے کہا اے میری قوم میں تمھارے لیے کھلا ڈرانے والا ہوں۔

اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوۡهُ وَاَطِيۡعُوۡنِ ③

کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کا تقویٰ کرو اور میری اطاعت کرو۔

يَغۡفِرۡ لَـكُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِكُمۡ وَيُؤَخِّرۡكُمۡ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ④

وہ تمھارے گناہ بخش دے گا اور تمھیں ایک وقت مقرر تک مہلت دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا وقت مقرر جب آجائے تو پیچھے نہیں ڈالا جا سکتا۔ کاش! تم جانتے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّىۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِىۡ لَيۡلًا وَّنَهَارًا ۙ⑤

اُس نے کہا، اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو رات اور دن بلایا۔

فَلَمۡ يَزِدۡهُمۡ دُعَآءِىۡۤ اِلَّا فِرَارًا ⑥

مگر میرے بلانے نے ان کا بھاگنا ہی بڑھایا۔

وَاِنِّىۡ كُلَّمَا دَعَوۡتُهُمۡ لِتَغۡفِرَ لَهُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَهُمۡ فِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَاسۡتَغۡشَوۡا ثِيَابَهُمۡ وَاَصَرُّوۡا وَاسۡتَكۡبَرُوا اسۡتِكۡبَارًا ۚ⑦

اور جب کبھی میں نے انھیں بلایا کہ تو انھیں بخش دے انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں اور اپنے کپڑے اوڑھ لیے اور (کفر پر) اَڑ گئے اور بڑا تکبّر کیا۔

ثُمَّ اِنِّىۡ دَعَوۡتُهُمۡ جِهَارًا ۙ⑧

پھر میں نے انھیں کھلے طور پر بلایا۔

ثُمَّ اِنِّىۡۤ اَعۡلَنۡتُ لَهُمۡ وَاَسۡرَرۡتُ لَهُمۡ اِسۡرَارًا ۙ⑨

پھر میں نے اُن سے ظاہر باتیں کیں اور چھپ کر بھی اُن سے کہا ۳۴۳۶

فَقُلۡتُ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ⑩

میں نے کہا، اپنے ربّ سے بخشش مانگو، وہ بڑا بخشنے والا ہے۔

تمہید سورت: اس سورت کا نام نوح ہے اور اس میں دو رکوع اور اٹھائیس آیتیں ہیں اور سورت کا نام حضرت نوح کے ذکر سے لیا گیا ہے جو اس کا واحد مضمون ہے حضرت نوح کے ایک عرصہ دراز تک لوگوں کو نصیحت کرنے اور حق کی طرف بلانے میں سمجھانا یہ مقصود ہے کہ دنیا کی اصلاح ایک زمانہ چاہتی ہے لوگ ان باتوں کو فوراً قبول نہیں کر لیتے اور آخر کار اس قوم کی ہلاکت میں یہ نشان ہے کہ جو لوگ اس حق کو جو رسول اللہ صلعم لائے ہیں قبول نہ کریں گے اور کفر اور بدی پر اصرار کریں گے تو وہ آخر کار ہلاک کر دیئے جائیں گے پچھلی سورت میں ان بلند مراتب کا ذکر تھا جو انسان حاصل کر سکتا ہے مگر ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ یہاں سب سے پہلے تاریخی نبی کے حالات میں ایک مثال دی ہے کہ اپنی ترقی کی راہوں سے لوگ کس طرح منہ موڑ رکھتے ہیں؛

۳۴۳۶ اصابع۔ اِصْبَع کی جمع ہے انگلی اَعْلَنْتُ۔ اِعلان۔ اسرار کی ضد ہے یعنی ظاہر کرنا اور اس کا اکثر استعمال معانی میں ہے نہ اشیاء میں (غ)

يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿۱۱﴾

وہ تم پر زور کا مینہ برساتا ہُوا بادل بھیجے گا۔

وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴿۱۲﴾

اور تمھیں مال اور بیٹوں سے مدد دیگا اور تمھارے لیے باغ بنائے گا اور تمھارے لیے نہریں بہائے گا۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾

تمھیں کیا ہُوا کہ تم اللہ تعالیٰ سے عزّت کی امّید نہیں رکھتے۔

وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾

اور اس نے تمھیں مختلف حالات میں سے (گزار کر) پیدا کیا ہے۔ ۳۴۳۶

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾

کیا تم نہیں دیکھتے کس طرح اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا ہے

وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾

اور چاند کو اُن میں نُور بنایا اور سُورج کو چراغ بنایا۔

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾

اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں زمین سے سبزہ کے طور پر اُگایا۔

ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾

پھر وہ تمھیں اس میں لَوٹا دیگا اور تمھیں ایک نئی پیدائش میں نکال کھڑا کرے گا۔ ۳۴۳۷

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ﴿۱۹﴾

اور اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے زمین کو وسیع قطعہ بنایا ۳۴۳۸

لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾ ع ۲/۹

تاکہ تم اس کے کھُلے رستوں میں چلو۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾

نوحؑ نے کہا اے میرے رب انھوں نے میری نافرمانی کی اور اس کی پیروی کی جس کے مال اور اولاد نے اس کا نقصان ہی بڑھایا۔

۳۴۳۶ اطوار۔ طَور کی جمع ہے اور طور کے معنی تارۃً بھی آتے ہیں اور حال بھی اور یہاں معنی کیے گئے ہیں احوال مختلفۃ اور فراء کا قول ہے کہ اس سے مراد ہے پہلے نطفہ پھر علقہ وغیرہ اور بعض کے نزدیک صورتوں اور اخلاق کا اختلاف مراد ہے۔ (ل)

انسان کا مختلف مراتب سے گذرنا اور مسئلہ ارتقاء: انسان کی خلق اطوار اسے مراد اس کا مختلف حالات سے گذرنا ہے جیساکہ ابن عباس مجاہد قتادہ حسن سے مروی ہے (ج) اور یہ حالات مختلفہ وہی ہیں جنھیں قرآن کریم نے مختلف جگہ پر بیان کیا ہے مثلاً پہلے مٹی کی حالت پھر اس سے کئی حالتوں میں تبدیل ہو کر یعنی نبات کی حالت میں سے گذر کر جس کا ذکر آگے آیت ۱۷ میں ہے۔ نطفہ کی شکل پھر اس کے بعد حالات مختلف اور ہو سکتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے جو حالات مختلف انسان پر گذرے ہوں ان کی طرف اشارہ ہو اور اس حد تک مسئلہ ارتقا کا مان لینا قرآن کریم کی کسی تصریح کے خلاف نہیں لیکن خود مسئلہ ارتقاء جس صورت میں پیش کیا جاتا ہے اس میں بہت سی فرضی باتیں ہیں ہاں یہ ممکن ہے کہ انسان کو ابتدائی حالت سے موجودہ شکل وصورت تک پہنچنے میں ایک لمبا زمانہ لگا ہو۔ تو ان حالات مختلفہ کی طرف توجہ دلا کر کہ تم کیا تھے اور کن کن حالتوں سے گذار کر تمھیں اس موجودہ حالت تک پہنچایا۔ یہ توجہ دلائی ہے کہ تم اللہ سے وقار کی امید کیوں نہیں رکھتے یعنی اس بات کی امید کہ اللہ تعالیٰ تمھیں اس سے بھی بلند تر مقامات عطا فرما سکتا ہے اور چونکہ پچھلی سورت کا یہی مضمون تھا اس لیے یہی معنی زیادہ موزوں ہیں اور یہاں یہی توجہ دلائی ہے کہ انسان باوجود اس علم کے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کس حالت سے اٹھا کر کس حالت تک پہنچایا ہے آئندہ کے متعلق پھر کیوں یہ امید نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی بلند مقامات عطا فرما سکتا ہے ؛

۳۴۳۷ پہلی زندگی اور دوسری زندگی میں فرق: یعنی پہلی زندگی کی ابتدا تو زمین سے نبات کے رنگ میں ہوتی ہے کیونکہ نبات حیات جسمانی کی ادنیٰ ترین صورت ہے پھر اسی زمین میں انسان لوٹایا جاتا ہے۔ مگر دوبارہ نکالنے کو نبات سے تعبیر نہیں کیا۔ بلکہ یخرجکم اخراجا کہہ کر بتا دیا کہ وہ ایک خاص رنگ کا نکال کھڑا کرنا ہے اس رنگ کی حیوانی زندگی نہیں اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے اس زمین میں ہی انسان کی ترقی کا اتنا سامان رکھا ہے کہ مٹی کی حالت سے ترقی کر کے وہ اس مرتبہ کو پہنچتا ہے تو دوسری زندگی میں ترقی کے اس سے بھی بلند تر مراتب ہونا بالکل قرین قیاس ہے ؛

۳۴۳۸ بِساط۔ بَسط پھیلانا اور بِساط ہر پھیلائی ہوئی چیز ہے اور بساط کے معنی وسیع زمین بھی ہیں (غ)

وَمَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿٢٢﴾

اور انھوں نے بڑے بھاری حیلے کیے ۳۴۳۹ء

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا ۙ وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ﴿٢٣﴾

اور کہا ، اپنے معبودوں کو نہ چھوڑو۔ اور ودّ کو نہ چھوڑو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو ۳۴۳۹اء

وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا ۖ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا ﴿٢٤﴾

اور انھوں نے بہتوں کو گمراہ کیا اور تُوظالموں کی ہلاکت ہی بڑھائیو۔

مِمَّا خَطِيئَاتِهِمْ أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوا لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا ﴿٢٥﴾

اپنی خطا کاریوں سے وہ غرق کیے گئے ، پھر آگ میں داخل کیے گئے ، سو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سوائے کسی کو مددگار نہ پایا۔

وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾

اور نوحؑ نے کہا اے میرے رب زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑیو ۳۴۴۰ء

إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾

اگر تو انھیں چھوڑ دے گا تو تیرے بندوں کو گمراہ کردیں گے اور ان کی اولاد بھی سوائے بدکار ناشکروں کے نہ ہوگی۔

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۖ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا ﴿٢٨﴾ ع ۲

اے میرے رب میری حفاظت فرما اور میرے ماں باپ کی اور اس کی جو ایمان لاکر میرے گھر میں داخل ہو اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کی اور ظالموں کی ہلاکت ہی بڑھائیو۔

۳۴۳۹ء کبار۔ کبیر سے بڑھکر کُبار اور کُبار سے بڑھ کر کُبّار ہے یعنی بہت ہی بڑا (غ)

۳۴۳۹اء بخاری میں حضرت ابن عباس کی روایت سے ہے کہ وہی بت جو قوم نوح میں تھے بعد میں ملک عرب میں آ گئے اور ودّ دومۃ الجندل میں کلب کا بت تھا اور سُواع ہذیل کا تھا اور یغوث مراد کا تھا پھر بنی غُطَیف کا ہوگیا۔ جو جوف میں سبا کے پاس ہے اور یعوق ہمدان کا تھا اور نسر حِمیر کا تھا اور یہ اصل میں قوم نوح میں صالح لوگ تھے جب وہ مرگئے تو اس قوم نے ان کے نام کے بت بنا لیے اور پہلے یہ صرف بطور یادگار بنائے گئے تھے بعد میں ان کی پرستش شروع ہوگئی اور ملک عرب میں آجانے کی روایت سے یہ مراد نہیں کہ وہی بت اٹھاکر وہاں لائے گئے بلکہ یہ مطلب ہے کہ ایسے ہی بت اہل عرب نے بھی بنالیے اور ان کے وہی نام رکھ لیے۔ اور بعض نے کہا کہ ودّ مرد کی شکل پر سواع عورت کی شکل پر یغوث شیر کی شکل پر یعوق گھوڑے کی صورت پر اور نسر عقاب کی شکل پر تھا۔ مگر پہلی روایت قابل ترجیح ہے۔

۳۴۴۰ء دیارا۔ دیّار۔ دار سے وزن فیعال ہے یعنی ساکن یا بسنے والا (غ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کفر میں اور فسق و فجور میں اس حد تک ترقی کر گئے تھے کہ اگر انہیں تباہ نہ کیا جاتا تو حق کا نام و نشان دنیا سے مٹ جاتا۔

سُوْرَةُ الْجِنِّ مَكِّيَّةٌ (۷۲)

اٰیاتھا ۲۸ — رکوعاتھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝١

کہہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنّوں کی ایک جماعت نے سنا تو کہنے لگے کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سُنا ہے ۳۴۴۱ء

يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝٢

وہ بھلائی کی طرف ہدایت کرتا ہے سو ہم اس پر ایمان لائے اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔

وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝٣

اور کہ ہمارے رب کی عظمت بہت بلند ہے اس کی نہ جورو ہے اور نہ بیٹا ۳۴۴۲ء

وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝٤

اور کہ ہم میں سے (بعض) بے وقوف اللہ تعالیٰ پر حق سے دُور بات کہتے تھے۔

وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝٥

اور کہ ہم نے خیال کیا کہ انسان اور جنّ اللہ تعالےٰ پر جھوٹ نہیں بولتے۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝٦

اور کہ انسانوں میں سے کچھ مرد جنّوں میں سے کچھ مردوں کی پناہ پکڑتے تھے، سو انھوں نے ان کی سرکشی بڑھائی ۳۴۴۳ء

تمہید سورت: اس سورت کا نام الجن ہے اور اس میں دو رکوع اور اٹھائیس آیتیں ہیں اور جنّ سے مراد جیساکہ ۳۰۶۶ء میں دکھایا جاچکا ہے انسان ہی ہیں۔ چونکہ یہ باہر کے لوگ تھے جو اہل عرب کی نظر سے مخفی تھے اس لیے انہیں جنّ کہا گیا ہے اور یہ جن عیسائی تھے اور اس سورت میں یہ ذکر ہے کہ یہ لوگ بھی آنحضرت صلعم پر ایمان لائے۔ چونکہ پچھلی سورت میں حضرت نوح کا ذکر تھا جن کی مخالفت پر قوم اس قدر کمربستہ ہوئی کہ آخر ان کی ہلاکت کے سوائے اور کوئی رستہ نہ رہا اور اس میں بھی نبی صلعم کو تسلی دینا تھا کہ حق کن سخت مشکلات کے ساتھ دنیا میں قایم ہوتا ہے تو اب اس سورت میں یہ بتایا ہے کہ اگر اہل عرب مخالفت کرتے ہیں تو اور لوگ ہیں جو اس پیغام حق کو سُن کر قبول کرتے چلے جاتے ہیں اور اس میں اسلام کی آیندہ کامیابیوں کی بشارت تھی ۞

اس سورت کا نزول آنحضرت صلعم کی طائف سے واپسی کے وقت کا مانا گیا ہے اگر سورۂ احقاف میں اسی واقعہ کا ذکر سمجھا جائے تو یہی تاریخ نزول ہو گی۔ اور اسی سفر میں ایک عیسائی غلام بھی مسلمان ہوا تھا۔ اور اگر اس میں کسی اور واقعہ کا ذکر ہے دیکھو ۳۴۴۲ء تو اس کا زمانہ نزول ابتدائی مکّی زمانہ ہو گا۔ جس زمانہ کی یہ سورتیں بظاہر معلوم ہوتی ہیں ۞

۳۴۴۱ء مومن جنوں کا نوع انسانی سے ہونا: اس پر مفصل بحث ۳۰۶۶ء میں گزرچکی ہے اور اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں اور آیت ۱۷ میں جو وسعت رزق یا مال کثیر کا ذکر ہے وہ بھی بتاتا ہے کہ مراد انسان ہی ہیں اور وہاں ذکر بھی مال کثیر سے آزمانے کا ہے اور مال سے آزمایا جانا انسانوں کے لیے ہے اور ایسا ہی مساجد کا ذکر آیت ۱۸ میں اسی کا موئد ہے اور دوسرا رکوع تو صراحت سے بتا رہا ہے کہ انسانوں کا ہی ذکر ہے جن میں سے کچھ ایمان لاتے اور کچھ مخالفت کرتے ہیں اور انہی مخالفت کرنے والوں کا ذکر پہلے رکوع میں بھی ہے اور دوسرے میں بھی اور یہ امر کہ آنحضرت صلعم کی طرف وحی ہوئی اس بات کے منافی نہیں کہ وہ انسانوں کی طرح ہوں اس لیے کہ یہ وہ واقعات ہیں جو ان لوگوں کو اپنی قوم سے پیش آئے جب وہ واپس گئے جیساکہ سورہ الاحقاف میں ذکر ہے فلما قضی ولّوا الی قومھم (۲۹:۴۶) اور ان کے نوع انسان سے ہونے پر آیت ۶ میں لفظ رجل کا استعمال بھی شاہد ہے دیکھو ۳۴۴۳ء ۞

۳۴۴۲ء عیسائی جن: یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عیسائی ہیں اور ممکن ہے کہ یہ سب ذکر بطور پیشگوئی کے ہو اور مطلب یہ ہو کہ عیسائی اقوام جو بوجہ اپنی عظمت کے کبھی جن کی حیثیت حاصل کریںگے آخر ان کا ایک حصّہ بھی قرآن کریم کی صداقت پر ایمان لائے گا اور یہ کوئی بعید بات نہیں کہ سورۂ احقاف میں جنّوں کا ذکر

وَّ اَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۟ۙ ۷

اور کہ انھوں نے خیال کیا جیسے تم خیال کرتے ہو کہ اللہ (تعالیٰ) کسی کو نہیں اُٹھائے گا ۳۴۴۴

وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ شُهُبًا ۟ۙ ۸

اور کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اسے سخت پہروں اور شعلوں سے بھرا ہُوا پایا ۳۴۴۵

وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۟ۙ ۹

اور کہ ہم اس کے بیٹھنے کی جگہوں میں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے مگر جو کوئی اب سننے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنے لیے شعلہ تیار پاتا ہے ۳۴۴۶

وَّ اَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۟ۙ ۱۰

اور کہ ہم نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ جو زمین میں ہیں بُرائی کا ارادہ ہُوا ہے یا ان کے رب نے ان کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔

وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ۟ۙ ۱۱

اور (بعض) ہم میں سے صالح ہیں اور (بعض) ہم میں سے اس کے سوا ہیں ہم متفرق رستے اختیار کیے ہوئے ہیں ۳۴۴۷

اور یہ ذکر الگ الگ واقعات ہوں اور اگر ایک ہی واقعہ سمجھا جائے تو ان الفاظ میں اشارہ یہودیوں کے عقیدہ کی طرف ہو سکتا ہے جو عزیر کو ابن اللہ کہتے تھے ؎

۳۴۴۳ رُجل نوع انسان میں سے مرد کو (برخلاف عورت کے) کہا جاتا ہے (ل) اور اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ رجل جنوں کے ذکور پر بھی بولا جا سکتا ہے اور کہا گیا ہے کہ ذکور جنّ پر اس کا استعمال درست نہیں (ر) ؎

رھقا دیکھو ۱۳۹۰ اور آیت ۱۳ میں غشیان ذلت مراد ہے اور رھق کے معنی کذب۔ حمق۔ سفاہت۔ جہالت بھی آتے ہیں (ل) ؎

یہاں رجال کا لفظ جنوں پر لا کر صاف بتا دیا ہے کہ یہ جنّ نوع انسان سے ہی ہیں جیسا کہ لفظ رجل کی لغت سے ظاہر ہے اور اس مشکل سے بچنے کے لیے بعض لوگوں نے یوں تاویل کی ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں سے پناہ مانگ کر رجال یعنی انسانوں کی پناہ میں آتے ہیں جو بہت بعید تاویل ہے اور سیدھی بات یہی ہے جیسا کہ ۳۰۶۶ میں دکھایا جا چکا ہے کہ یہ انسانوں کی قسم سے ہی تھے۔ اور چھوٹے آدمیوں کا بڑے آدمیوں کی پناہ تلاش کرنا معمولی بات ہے ؎

۳۴۴۴ اس کے معنی دونوں طرح پر کیے گئے ہیں یعنی کوئی رسول مبعوث نہیں کریگا یا مُردوں کو موت کے بعد نہیں اٹھائے گا ؎

۳۴۴۵ لمسنا دیکھو ۶۶۴ لمَس کے معنی طلب بھی آتے ہیں (غ) اور لمَس کبھی چیز کا چھونا اور کبھی اس کی معرفت ہوتی ہے اسی سے التماس طلب کے معنی میں ہے (ل) اور یہاں طلب خبر مراد ہے (د) ؎

حرسا۔ حَرَس اور حُرّاس۔ حارس کی جمع ہے اور وہ محافظ مکان ہے اور اس کا اکثر استعمال مکان کی محافظت پر ہے (غ)

یہاں اشارہ انہی باتوں کی طرف ہے جو کاہن یا اس قسم کے دوسرے لوگ کرتے ہیں اس زمانہ میں عیسائی ممالک میں سپرچوئلسٹ اسی ذیل میں آتے ہیں۔ مفصل بحث ۱۶۷۹ گزر چکی ہے اور حرس سے مراد ہے کہ اخبار غیبی تک ہماری رسائی نہیں ؎

۳۴۴۶ شہابوں کا گرنا: اس آیت پر ۱۶۷۹ کے آخری حصہ میں بحث گزر چکی ہے شہاب آنحضرت صلعم سے پہلے بھی گرتے تھے حالانکہ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہاب جن کا یہاں ذکر ہے ان کا تعلق رسول اللہ صلعم کی بعثت سے ہے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شہاب آپ کے سامنے گرا تو آپؐ نے دریافت فرمایا جاہلیت میں شہاب کے گرنے پر تم خیال کیا کرتے تھے تو صحابہ نے عرض کیا کہ ہم کہتے تھے کوئی بڑا آدمی مر جائیگا یا پیدا ہوگا۔ اور خود واقعات بھی یہی بتاتے ہیں اور آج تک شہاب گرتے ہیں حالانکہ اس وقت تو وحی کا نزول نہیں ہو رہا پس ان شہابوں سے مراد وہی ہے جو ۱۶۷۹ میں بیان ہو چکا اور یہ تاویل کہ پہلے حوادث کونی سے ان شہابوں کا تعلق تھا اور آنحضرت صلعم کی بعثت پر رمی شیاطین کا کام ان سے لیا گیا بہت دور کی تاویل ہے ؎

شیاطین کے آسمانوں سے روکا جانے سے مراد: اور ایک روایت میں جو آیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے وقت تین آسمانوں سے شیاطین کو روکا گیا پھر آنحضرت صلعم کے وقت سارے آسمانوں سے تو اس کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ قرآن کریم کی قوت قدسی نے بدی کے دور دورہ میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ؎

۳۴۴۷ قددا۔ قَدّ کے معنی ہیں کسی چیز کا طول میں قطع کرنا ان کان قمیصه قد من قبل (یوسف ۱۲-۲۶) اور اسی لحاظ سے قامت انسان کو قدّ کہا جاتا ہے اور قِدَد قِدّة کی جمع ہے اس کے معنی طرائق ہیں اور لوگوں کے ایک گروہ کو قِدّة کہا جاتا ہے اور یہ قِطْعَة کی طرح ہے اور قد حرف ہے جو توقع

وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾

اور کہ ہمیں یقین ہے کہ ہم زمین میں اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے، اور نہ بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں ۳۴۴۸

وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤی اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾

اور کہ جب ہم نے ہدایت کو سنا، تو اس پر ایمان لائے، سو جو کوئی اپنے رب پر ایمان لاتا ہے اسے نقصان کا خوف نہیں نہ ظلم کا۔

وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾

اور کہ ہم میں سے (بعض) فرمانبردار ہیں اور (بعض) ہم میں سے حق سے پھرنے والے ہیں اور جو کوئی فرمانبردار ہوتا ہے تو یہی بھلائی کا قصد کرتے ہیں۔

وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾

اور حق سے پھرنے والے سو وہ دوزخ کا ایندھن ہیں ۳۴۴۹

وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَی الطَّرِیْقَةِ لَاَسْقَیْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾

اور کہ اگر وہ سیدھے رستے پر قائم رہتے تو ہم انھیں بہت سا پانی پلاتے ۳۴۵۰

لِّنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ ؕ وَ مَنْ یُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ یَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾

تاکہ ہم انھیں اس میں آزمائیں اور جو کوئی اپنے رب کے ذکر سے منہ پھیرتا ہے وہ اسے سخت عذاب میں داخل کرتا ہے ۳۴۵۱

وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾

اور کہ مسجدیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، سو اللہ (تعالیٰ) کے ساتھ اور کسی کو نہ پکارو۔

وَّ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾ ع

اور کہ جب اللہ تعالیٰ کا بندہ اسے پکارتا ہوا اٹھا تو قریب تھا کہ اس پر ہجوم کر کے اسے مار) دیں ۳۴۵۲

کے لیے ہے اور وہ جب فعل ماضی پر داخل ہو تو ہر ایسے فعل پر داخل ہوتا ہے جس میں تجدد پایا جائے (غ) اور یہاں مراد طرائق سے ذوی طرائق اور قدد سے متفرقہ مختلفہ ہیں۔ (ر)

۳۴۴۸ ھَرَبًا ھَرَب کے معنی قرار یا بھاگنا ہیں مطلب یہ ہے کہ بھاگ کر ہم اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ اور لن نعجز اللّٰہ فی الارض سے مراد ہوگی کہ مقابلہ کر کے خدا کو نہیں ہرا سکتے۔

۳۴۴۹ تحرّ و احری سے ہے اور تَحَرّی کے معنی ہیں بہتر اور حق چیز کا قصد یا قصد اور طلب میں کوشش اور اس کے خاص کر لینے پر عزم (ل)

۳۴۵۰ غدقا۔ غَدَق کے معنی کثیر ہیں یعنی بہت پانی اور مراد اس سے وسعت رزق اور مجاہد کے نزدیک مال کثیر ہے (ج)

۳۴۵۱ صعد۔ صعود اور صَعَد سے مراد گھاٹی ہوتی ہے (جس پر چڑھا جاتا ہے)۔ اور ہر ایک شاق یعنی دشوار امر پر اس کا استعمال ہوتا ہے سارھقه صعودا (المدثر-۱۷) اور صَعَد سے مراد بھی شاق ہے (غ) یا اس سے مراد ایسا عذاب ہے جو اس پر غالب آجائے (ر)

۳۴۵۲ لبدا۔ لَبَدَ بالمکان یعنی مکان میں ٹھہر گیا یا اس سے لگ گیا اور لِبدَة یا لُبدَة بال یا اون ہیں ایک دوسرے سے چسپاں کیے ہوئے اور لُبادَة ایسے بالوں کی قبا ہے اور مال لُبَد کثیر مال کو کہتے ہیں جس کے ختم ہو جانے کا خوف نہ ہو گویا اس کا بعض بعض پر چڑھا ہوا ہے اهلکت مالا لبدا (البلد-۶) اور لِبدَة یا لُبدَة لوگوں کی جماعت ہے گویا وہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور لِبَد لِبدَة کی جمع ہے اور لِبَدا کے یہاں معنی ہیں بعض بعض پر جمع ہوئے ہوئے (ل)

حسن اور قتادہ کے نزدیک یہاں کادوا کی ضمیر کفار قریش کی طرف ہے یعنی آپ کے امر کے ابطال کے لیے اکٹھے ہو کر آپ پر گرے پڑتے ہیں اور بعض نے مراد وہی جنّ لیے ہیں مگر ان کی تعداد تھوڑی تھی اور بعض نے مومنوں کا نماز میں آپ کا اتباع کرنا مراد لیا ہے مگر یہ بھی بعید تاویل ہے اور ابن جریر نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے اور یہی بلحاظ سیاق بھی درست ہے اور اس صورت میں قام عبد اللّٰہ سے مراد قیام بالرسالۃ ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۰﴾
کہہ میں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔

قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾
کہہ میں تمہارے لیے کسی نقصان کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ بھلائی کا۔

قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ
کہہ مجھے اللہ تعالیٰ کے مقابل پر کوئی پناہ نہیں دے سکتا، اور نہ میں اسے

وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾
چھوڑ کر کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں ۳۴۵۳

اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ۭ وَمَنْ
ہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے (احکام کا) پہنچا دینا اور اس کے پیغام ہیں اور

يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ
جو کوئی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے اس کے لیے دوزخ

جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴿۲۳﴾
کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا ۳۴۵۴

حَتّٰٓي اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ
یہاں تک کہ جب اسے دیکھیں گے جس کا انھیں وعدہ دیا جاتا ہے تو جان لیں گے

مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾
کہ مددگار کس کا کمزور ہے اور گنتی میں (کون) تھوڑے ہیں ۳۴۵۵

قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ
کہہ میں نہیں جانتا کہ وہ جس کا تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے، قریب ہے یا

۳۴۵۳ ملتحد۔ لحد اور الحاد دیکھو ۱۴۸۶ اِلتَحَدَ کے معنی ہیں مائل ہوا پس مُلتَحَد پناہ یا جائے پناہ ہے۔ (غ)؁

۳۴۵۴ اِلَّا کس سے استثناء ہے۔ ایک قول میں لا املک لکم ضرا ولا رشدا سے اور ایک قول میں ملتحدا سے اور دونوں صورتوں میں اسے استثنائے منقطع قرار دینا ہی بہتر ہے اور اس میں کچھ ہرج نہیں۔ صورت اول میں یوں معنی ہوں گے کہ میں نقصان و نفع کا مالک تو نہیں۔ میرا کام احکام الٰہی کا پہنچا دینا ہے۔ دوسری صورت میں یوں کہ میں اللہ کو چھوڑ کر کوئی جائے پناہ نہیں پا سکتا میرا کام اس کے احکام کو پہنچا دینا ہے؁

۳۴۵۵ اذا راوا ما یوعدون اسی دنیا کے عذاب کے وعدے کے متعلق ہے کیونکہ مددگار کی کمزوری اور قلت عدد کا سوال یہیں پیدا ہوتا ہے ابوسفیان نے آخر مکّہ کی فتح کے وقت اقرار کیا کہ ان کے بت ان کی کچھ مدد نہ کر سکے؁

۳۴۵۶ یظہر دیکھو ۱۲۸۶ اظہر علی الشیٔ کے معنی ہیں غلبہ و علاہ یعنی اس پر غالب آیا اور اس پر علو حاصل کیا فاصبحوا ظاہرین (الصف ۶۱۔۱۴) کے معنی ہیں غالب ہو گئے۔ اظہر اللہ المسلمین علی الکافرین یعنی اللہ نے مسلمانوں کو کافروں پر غالب کیا اور اَظْهَرَنی اللّٰہ علی ما سُرِقَ منّی یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے اطلاع دیدی (ل) اور یہاں مراد اظہار سے کامل طور پر اطلاع دیدینا ہے جس سے سارا حال اتم وجہ پر ظاہر ہو جائے (ر)؁

رسولوں پر کامل انکشاف غیب نہیں ہوتا۔ اوپر ذکر تھا کہ کفار آخر کار اپنے آپ کو ان کے مقابلہ میں مغلوب پائیں گے جنہیں تھوڑے اور کمزور سمجھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی دوسری آیت میں فرمایا کہ یہ مجھے علم نہیں دیا گیا کہ وہ کفار کی مغلوبیت کا وقت جلد آنے والا ہے یا کچھ وقت کے بعد اور اس کی وجہ یوں دی عالم الغیب غیب کا جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے فلا یظہر علٰی غیبہ احدا۔ غیب پر وہ کامل غلبہ جو اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں دیتا۔ اور اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کی یہی حالت ہے وہ قدرت کاملہ رکھتا ہے اور اپنی قدرت سے کچھ حصہ انسان کو عطا کرتا ہے قدرت کامل نہیں دیتا وہ علم تام رکھتا ہے اور اپنے علم میں سے تھوڑا سا انسان کو دیتا ہے سارا علم نہیں دیتا۔ اسی طرح وہ علم غیب پر کامل طور پر حاوی ہے اور اس علم غیب میں سے کچھ حصہ انسان پر ظاہر کرتا ہے کامل طور پر اسے غیب پر اطلاع نہیں دیتا اسی لیے جب رسولوں پر کچھ پیشگوئیوں کا اظہار فرماتا ہے تو ایک حصہ منکشف کرتا ہے ایک مخفی رکھتا ہے یہ عین اس کی صفات کے تقاضا کے مطابق ہے اور آگے الا من ارتضٰی من رسول میں اِلَّا استثنائے منقطع ہے یعنی رسولوں کو جس قدر علم چاہتا ہے دیتا ہے سارا انہیں بھی نہیں دیتا لکن الرسول المرتضی یظہرہ جل و علا علٰی بعض الغیوب المتعلقۃ برسالتہ (ر)۔ بلحاظ سیاق سوائے اس معنی کے اور کوئی معنی درست نہیں؁

غیر رسول کو غیب پر اطلاع ملنا: یہ سوال کہ سوائے رسولوں کے بھی کوئی غیب کی بات کسی پر ظاہر کرتا ہے یا نہیں سو یہ قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے ظاہر ہے جیسے لہم البشرٰی فی الحیٰوۃ الدنیا یا حدیث سے جہاں فرمایا رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء۔ یا لم یبق من النبوۃ الا المبشرات اور اگر اظہار علی الغیب سے کثرت انکشاف مراد لے لیا جائے تو لفظ رسول میں رسول کے کامل متبعین بھی داخل ہو سکتے ہیں جن کو باتباع رسول اس نعمت سے کچھ حصہ ملتا ہے مگر نہ اس قدر جیسا کہ متبوع کو اس صورت میں بھی یہ آیت تو صرف رسولوں کے متعلق ہو گی لیکن ضمنی طور پر اس میں رسولوں کے کامل متبعین بھی داخل ہو جائیں گے؁

اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ﴿۲۵﴾

میرا رب اس کی مدّت لمبی کر دے گا۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

غیب کا جاننے والا ہے سو وہ اپنے غیب پر کسی کو غالب نہیں کرتا۔

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾

ہاں جسے رسول بنانا پسند کرے ع۳۴۵۶ سو وہ اس کے آگے اور اس کے پیچھے پہرہ لگا دیتا ہے۔

لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾ ع ۲/۱۲

تاکہ (انھیں) علم ہو جائے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغاموں کو پہنچا دیا ہے اور وہ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے، جو اُن کے پاس ہے اور ہر چیز اُس نے گن کر محفوظ کر رکھی ہے ع۳۴۵۷

ع۳۴۵۷ رصد ا۔ دیکھو ع۱۲۶۶ اور رَصَد اکیلے پہرہ دینے والے کو بھی کہا جاتا ہے (اور جماعت کو راصدین) اور اکیلے مرصد اور جماعت کو بھی (غ)
یہاں یعلم میں ضمیر کس کی طرف ہے اور مراد کیا ہے ایک قول ہے کہ تا رسول جان لے کہ پہلے رسولوں نے اپنے رب کی رسالتوں کو پہنچا دیا دوسرا ہے کہ تا مشرک جان لیں (لیعلم المشرکون) کہ رسولوں نے اپنے رب کے پیغام کو پہنچا دیا اور تیسرا ہے کہ تا آنحضرتؐ جان لیں کہ ملائکہ نے اپنے رب کی رسالتوں کو پہنچا دیا (ج) اور ابن جریر اول کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن دوسرا قول میرے نزدیک قابل ترجیح ہے اس لیے کہ اصل غرض تو مخالفین پر اتمام حجت تھی اور اس سورت میں مخالفین کا ذکر اسی طرح آیا ہے اور احاط بما لدیہم بھی مخالفین کے متعلق ہی ہو سکتا ہے اور رسول کے آگے پیچھے پہرہ لگانے سے مراد صرف یہ ہے کہ رسول کی اللہ تعالیٰ حفاظت کرتا ہے اور کوئی اسے ہلاک نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ آخر کار مخالفوں کو بھی یہ پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کی حفاظت کرنے والا خدا ہے اور کہ اس نے اپنے پیغام کو پہنچا دیا۔

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ مَكِّيَّةٌ (۷۳)

اٰیاتھا ۲۰ — رکوعاتھا ۲

تمہید سورت: اس سورت کا نام المزّمّل ہے اور اس میں دو رکوع اور بیس آیتیں ہیں۔ اور مزّمّل کے معنی ہیں لباس اوڑھنے والا اور اشارہ نماز کی تیاری کی طرف ہے اور اس سورت میں یہ بتایا ہے کہ بلحاظ قیام و بلحاظ حضور قلب رات کی نماز یعنی نماز تہجد بہترین نماز ہے اور اس سے انسان میں قوت عملی پیدا ہوتی ہے اور اس کے قول میں تاثیر پیدا ہوتی ہے گویا نماز انسان میں اعلیٰ درجہ کا حسن روحانی پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں نماز کو مومن کا معراج کہا گیا ہے اور اس میں اشارہ یہ ہے کہ تعلق باللہ سے ہی جس کے لیے نماز ایک ذریعہ ہے انسان کا قدم ترقی کی طرف اُٹھتا ہے اس سورت کے زمانہ نزول کے متعلق کہا گیا ہے کہ اقرء کے بعد سورۂ مدثر نازل ہوئی اور اس کے بعد مزمل گو یہ ترتیب صحیح نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ سورۂ مزمل ابتدائی مکی زمانہ کی نازل شدہ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

يٰۤاَيُّهَا الۡمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ — اے کپڑا اوڑھنے والے ۳۴۵۸

قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا ۙ﴿۲﴾ — رات کو قیام کر سوائے تھوڑے (حصّے) کے۔

نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِيۡلًا ۙ﴿۳﴾ — (یعنی) اس کا آدھا یا اس سے کچھ کم کر۔

اَوۡ زِدۡ عَلَيۡهِ وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا ؕ﴿۴﴾ — یا اس پر بڑھالے، اور قرآن کو ٹھیر ٹھیر کر پڑھ ۳۴۵۹

اِنَّا سَنُلۡقِىۡ عَلَيۡكَ قَوۡلًا ثَقِيۡلًا ○﴿۵﴾ — ہم تجھ پر ایک بھاری بوجھ ڈالیں گے ۳۴۶۰

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيۡلِ هِىَ اَشَدُّ وَطۡـاً وَّاَقۡوَمُ قِيۡلًا ؕ﴿۶﴾ — بیشک رات کا اُٹھنا (نفس کو) زیادہ روندنے والا اور بات کو زیادہ درست رکھنے والا ہے ۳۴۶۱

اِنَّ لَكَ فِى النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِيۡلًا ؕ﴿۷﴾ — دن کو تیرے لیے لمبا شغل ہے۔

وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلۡ اِلَيۡهِ — اور اپنے رب کے نام کی بڑائی کر اور (سب سے) الگ ہوکر اس کی

۳۴۵۸ مزمّل۔ زَمَلَ کے معنی ہیں دوڑا اور جلدی کی اور زَمَّلَ الشیٔ کے معنی ہیں اسے چھپایا اور تَزَمَّل کپڑوں کا لپیٹ لینا ہے اور مُزَّمِّل اصل میں مُتَزَمِّل ہے یعنی اپنے آپ کو کپڑوں میں لپیٹ لینے والا (ل) اور قتادہ کے نزدیک نیاری نماز کے لیے اپنے آپ کو کپڑوں میں لپیٹ لینے والا مراد ہے۔ اور عکرمہ کے نزدیک امر نبوت ورسالت کا تزمّل مراد ہے (ج)۔

۳۴۵۹ نصف کسی چیز کا آدھا ہے اور اسی سے اِنصاف ہے گویا وہ جتنا فائدہ دوسرے سے اُٹھاتا ہے اسی قدر دوسرے کو پہنچاتا ہے (غ) اور قُم میں حکم قیام سے مراد نماز یا عبادت ہے اور نصفہ پہلے قلیلا سے بدل ہے۔

۳۴۶۰ ثقیل۔ قول ثقیل سے مراد یہاں وحی ہے جو رسول اللہ پر اتاری گئی اور اسے ثقیل اس کے عظیم الشان مرتبہ کی وجہ سے اور اس کی عظیم الشان جلالت کی وجہ سے کہا ہے اور وہ سفسفہ کی قسم کا کلام نہیں جس کا استخفاف کیا جاسکتا ہے ہر ایک نفیس اور بیش بہا چیز کو ثقیل کہا جاتا ہے (ل) اور وحی جب آتی تھی تو رسول اللہ صلعم کی حالت متغیر ہوجاتی تھی یہاں تک کہ ایک حدیث میں زید بن ثابت کے متعلق ہے کہ انہوں نے کہا قریب تھا کہ میری ران کچلی جائے جس کے اوپر نشست میں رسول اللہ صلعم کی ران تھی اور اس حالت میں نزول وحی شروع ہوا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اونٹنی پر آپ سوار ہوتے تو اونٹنی بوجھ سے بٹھر جاتی اور ایک میں ہے کہ سخت ترین سردی کے دن میں آپ کی پیشانی پر پسینہ چل پڑتا۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ نزول وحی کی خاص کیفیت تھی اور یہ کوئی فرضی بات نہ تھی۔

۳۴۶۱ وطأ۔ وَطْأ کے اصل معنی پامال کرنا ہیں اور یہاں بعض نے وِطَأ پڑھا ہے اور اس صورت میں اس کے معنی مواطأۃ یا موافقت ہیں یعنی زبان اور دل کی موافقت اور وَطْأ کے معنی قیام ہونگے یعنی قیام میں زیادہ مضبوطی پیدا کرنے والا۔ اثبت قیاماً (ل)

ناشئۃ اللیل دیکھو ۲۹۸۷ اور بعض نے اس کے معنی کیے ہیں وہ نفس جو رات کو اپنی خواب گاہ سے عبادت کے لیے اٹھتا ہے اور مجاہد نے اور صدیقہ نے اس قیام کو سو کر اٹھنے کے بعد جو قیام ہو اس سے مخصوص کیا ہے گویا یہی منشا لیل کی طرف اضافت کا ہے (ر) مطلب یہ ہے کہ رات کو عبادت کے لیے اٹھنا قیام کی غرض کو زیادہ عمدگی سے پورا کرنے والا ہے اور قول میں درست تر ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس میں حضور قلب بھی ہوتا ہے۔

تہجد کی برکات: یا مراد یہ ہے کہ شب بیداری سے انسان میں قوت عمل بھی مضبوط ہوتی ہے اور اس کی بات بھی زیادہ موثر ہوتی ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جنکی ضرورت اصلاح خلق کے لیے ہے یعنی انسان کے اندر خود قوت عمل کا ہونا اور اس کی بات کا مؤثر ہونا اور یہ دونوں صفات نماز تہجد سے پیدا ہوتی ہیں اس لیے جب پہلی آیت میں فرمایا کہ ہم تیری طرف عظیم الشان وحی بھیج رہے ہیں جس کی غرض اصلاح عالم ہے تو اب اس غرض کو پورا کرنے کے لیے یہ طریق بتایا اور اس سے اگلی آیت میں بتایا کہ دن کے وقت وعظ ونصیحت اور لوگوں کی تعلیم کا شغل بھی ہے اس لیے اپنی قوت عمل اور تاثیر کو بڑھانے کے لیے رات کا وقت ہے جو شخص تہجد کو اپنی عادت کر لیتا ہے اس میں یہ خوبیاں بھی پیدا ہوجاتی ہیں۔

تَبۡتِيۡلًا ؕ﴿۸﴾	طرف متوجہ ہو جا ۳۴۶۲
رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ لَاۤ اِلٰهَ	مشرق اور مغرب کا رب ہے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں
اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذۡهُ وَكِيۡلًا ﴿۹﴾	سو اُسے کارساز بنا۔
وَ اصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ وَ اهۡجُرۡهُمۡ	اور اس پر صبر کر جو یہ کہتے ہیں اور خوبی سے کنارہ کشی کرتا ہوا
هَجۡرًا جَمِيۡلًا ﴿۱۰﴾	انھیں چھوڑ دے۔
وَ ذَرۡنِىۡ وَ الۡمُكَذِّبِيۡنَ اُولِى النَّعۡمَةِ	اور مجھے چھوڑ دے اور صاحبِ دولت جھٹلانے والوں کو اور
وَ مَهِّلۡهُمۡ قَلِيۡلًا ﴿۱۱﴾	انھیں تھوڑی سی مہلت دے ۳۴۶۳
اِنَّ لَدَيۡنَاۤ اَنۡكَالًا وَّ جَحِيۡمًا ۙ﴿۱۲﴾	ہمارے پاس بیڑیاں اور جلتی ہوئی آگ ہے۔
وَّ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۳﴾	اور گلا گھونٹ دینے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے ۳۴۶۴
يَوۡمَ تَرۡجُفُ الۡاَرۡضُ وَ الۡجِبَالُ وَ	جس دن زمین اور پہاڑ کانپ اٹھیں گے اور پہاڑ پراگندہ
كَانَتِ الۡجِبَالُ كَثِيۡبًا مَّهِيۡلًا ﴿۱۴﴾	ریت کا تودہ ہو جائیں گے ۳۴۶۵
اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ رَسُوۡلًا ۙ شَاهِدًا	ہم نے تمھاری طرف رسول بھیجا ہے (جو) تم پر گواہ ہے،
عَلَيۡكُمۡ كَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ؕ﴿۱۵﴾	جس طرح ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا ۳۴۶۶
فَعَصٰى فِرۡعَوۡنُ الرَّسُوۡلَ فَاَخَذۡنٰهُ	تو فرعون نے رسول کی نافرمانی کی، سو ہم نے اُسے
اَخۡذًا وَّبِيۡلًا ﴿۱۶﴾	سخت وبال میں پکڑا ۳۴۶۷
فَكَيۡفَ تَتَّقُوۡنَ اِنۡ كَفَرۡتُمۡ يَوۡمًا	سو اگر تم انکار کرو تو اس دن سے کس طرح بچو گے، جو بچوں

۳۴۶۲ تبتل۔ بَتْل کے معنی قطع ہیں اور تَبَتُّل دنیا سے انقطاع کرکے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جانا ہے اور یہی معنی تَبْتِیْل کے ہیں اور تَبَتُّل کے معنی عورتوں سے قطع تعلق اور ترک نکاح بھی ہے اور اس معنی میں اسلام میں کوئی تبتّل نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے لا رھبانیۃ ولا تبتل فی الاسلام۔ اور بتول کے معنی ایسی عورت بھی ہیں جو تزویج سے منقطع ہو اور ایسی بھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف منقطع ہو (ل) اور یہاں معنی عبادت میں انقطاع اور اخلاص نیت ہیں اور یہی اشارہ ثم ذرھم میں ہے (غ) اور مراد یہ ہے کہ تمام دوسرے اشغال کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کا جلال ظاہر کرنے میں لگ جاؤ۔

۳۴۶۳ ان کو چھوڑنے سے مراد وہی ان کی ایذاؤں پر صبر کرنا ہے اور ذرنی والمکذبین یعنی میں ان کی سزادہی کے لیے کافی ہوں۔

۳۴۶۴ انکال۔ نِکْل کی جمع ہے اور یہ چارپائے کی قید (یعنی جسے منہ میں ڈال کر اسے قابو کیا جاتا ہے) یا لگام کا لوہا ہے کیونکہ وہ روک لیتی ہیں اور نَکَلَ عن الشئ کے معنی ہیں کمزور ہو گیا اور عاجز آ گیا (غ)

غصۃ وہ ہڈی ہے جس سے حلق بند ہو جاتا ہے (غ)۔

۳۴۶۵ کثیب۔ کَثْب کے معنی قرب ہیں اور پھر اجتماع کے معنی میں آتا ہے اور کثیب ریت کے تودہ کو کہتے ہیں۔ جمع کُثُب ہے (ل)۔

مہیلا۔ ھَالَ علیہ التراب اس پر مٹی ڈالی۔ اور ھَیْل وہ ریت ہے جو اپنی جگہ پر نہ رہے اور یہی مَہِیل ہے (ل)۔

۳۴۶۶ سورۂ مزمل کا نزول نہایت ابتدائی زمانہ کا ہے اس وقت بھی کس صراحت سے آنحضرت صلعم کو مثیل موسیٰ کی پیشگوئی کا مصداق ٹھہرایا ہے دیکھو استثناء ۱۸: ۱۸ "میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا دنیا کی تاریخ میں محمد رسول اللہ صلعم کے سوائے کسی نبی نے موسیٰ جیسا نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا"۔

۳۴۶۷ فرعون بوجہ انکار موسیٰ اسی دنیا میں پکڑا گیا اس لیے مثیل موسیٰ کا ذکر کرکے فرعون کے مثیلوں کو خطاب کیا کہ تم ایسے ہی گرفت کے دن سے کس طرح بچ سکتے ہو اور بچوں کو بوڑھا کرنے والا دن بوجہ اپنے اہوال کے ہے کیونکہ وہ کفار کی ذلت کا دن ہے۔ قیامت کے دن میں بچے بوڑھے نہ

يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ﴿١٧﴾

کو بوڑھا کر دے گا۔

السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿١٨﴾

آسمان اس سے پھٹ پڑنے والا ہے اس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿١٩﴾ ع ۱۳

یہ ایک نصیحت ہے، سو جو کوئی چاہے اپنے رب کی طرف رستہ اختیار کرے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَىِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٠﴾ ع ۱۴

تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات کے قریب قیام کرتا ہے اور (کبھی) اس کا نصف اور (کبھی) اس کی تہائی اور ان میں سے بھی ایک گروہ جو تیرے ساتھ ہیں ۔ اور اللہ تعالیٰ رات اور دن کا اندازہ کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ تم اس کی حفاظت نہ کر سکو گے، سو وہ تم پر رجوع (برحمت) کرتا ہے سو قرآن سے جو بآسانی پڑھ سکتے ہو پڑھو، وہ جانتا ہے کہ تم میں سے بیمار ہوں گے اور اور جو زمین میں سفر کریں گے اللہ (تعالیٰ) کے فضل کو تلاش کرتے ہوں گے اور اور جو اللہ (تعالیٰ) کی راہ میں جنگ کریں گے۔ سو پڑھو جو اس سے بآسانی پڑھ سکو اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ اور اللہ (تعالیٰ) کے لیے اچھے عمل کرو۔ اور جو کچھ تم اپنی جانوں کے لیے نیکی سے آگے بھیجو گے، اسے اللہ تعالیٰ کے پاس پاؤ گے بہتر اور اجر میں بڑھ کر اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت چاہو، اللہ تعالیٰ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ۳۴۶۸

ہونگے وہ ایک ہی حالت پر رہیں گے اور فرعون کی گرفت دنیا کا ذکر صاف قرینہ ہے کہ یہاں بھی اس دنیا میں گرفت ہی مراد ہے اور السماء منفطر بہ آسمان کے اس سے پھٹ پڑنے سے مراد اس کا ظاہر ہونا ہے ٭

۳۴۶۸ حضرت عائشہ سے ایک روایت میں ہے کہ اس سورت کے پہلے اور آخری حصہ کے نزول میں بارہ مہینے کا وقفہ تھا اور اس آخری حصہ میں بتایا کہ قیام لیل کا حکم وجوب کے طور پر ہے اور حسب استطاعت ہے۔ بیماری سفر جہاد کو بطور عذر بیان کیا اور فاقرءوا ما تیسر منہ میں بتایا کہ جس قدر انسان سہولت سے رات کو اُٹھ سکے اُٹھے۔ اور تجدوہ عند اللہ ھو خیراً و اعظم اجرا میں خیرا و اعظم اجرا مفعول ثانی ہے اور ھو کی ضمیر فصل کے لیے ہے ٭

سُوۡرَۃُ الۡمُدَّثِّرِ مَکِّیَّۃٌ (۷۴)
اٰیاتھا ۵۶ رکوعاتھا ۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○	اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾	اے چادر اوڑھنے والے ۳۴۶۹
قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۪ۙ﴿۲﴾	اُٹھ اور ڈرا۔
وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ ۪ۙ﴿۳﴾	اور اپنے رب کی بڑائی کر۔
وَ ثِیَابَکَ فَطَہِّرۡ ۪ۙ﴿۴﴾	اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ ۳۴۷۰
وَ الرُّجۡزَ فَاہۡجُرۡ ۪ۙ﴿۵﴾	اور ناپاکی سے دُور رہ ۳۴۷۱

تمہید سورت: اس سورت کا نام المدثر ہے اور اس میں دو رکوع اور چھپن آیتیں ہیں اور کپڑا اوڑھنے والے نبی کریم صلعم ہیں جیسے پچھلی سورت میں اور اس میں آپ کو انذار کے لیے مامور کیا ہے اور اعدائے حق کو حق کی مخالفت سے ڈرایا ہے پچھلی سورت میں نماز کے ذریعہ سے تکمیل نفس کا ذکر ہے اور تکمیل نفس کے بعد گویا اب بتایا ہے کہ اوروں کی تکمیل کرو۔ حالانکہ نزول میں ان سورتوں کی ترتیب اور ہے یعنی سورۂ مدثر پہلے کی ہے اور مزمل بعد کی مگر یہاں بلحاظ مضمون ان کی ترتیب رکھی ہے گویا پہلے اپنے نفس کی تکمیل کی فکر کرو پھر دوسروں کی تکمیل کی طرف متوجہ ہو۔

زمانہ نزول اس سورت کا یقینی طور پر ابتدائی ہے بلکہ بعد فترت یہ پہلی سورت ہے۔ فترت کے زمانہ سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں پہلی وحی اقرا نازل ہوکر پھر وحی کا آنا کچھ عرصہ کے لیے رک گیا۔ غالباً یہ عرصہ کوئی چھ ماہ کے قریب تھا۔ اور اس فترت میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ وحی کی عظمت اور جلال کی برداشت کی قوت نبی کریم صلعم میں پیدا ہو اور بتدریج اس پر عظمت اور پُرجلال نظارے سے آپ کی طبیعت مانوس ہو پھر نبی کریم صلعم کی تشریف آوری سے پہلے ایک نہایت لمبا زمانہ فترت وحی کا دنیا پر گذرا یعنی کامل چھ صدیاں جس کی نظیر پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملتی اور یہ زمانہ فترت ایسا ہی تھا جیسے ایک لمبا عرصہ امساک باران اور گرمی کا عظیم الشان بارش کیلئے پیش خیمہ ہوتا ہے

۳۴۶۹ مدثر۔ دُثور کے اصل معنی دُروس یا مٹنا ہیں جیسا کہ حدیث عائشہ میں ہے دَثَرَ مکانُ البیت فلم یَحُجّہ ھود یعنی خانہ کعبہ کا نشان مٹ گیا۔ اس لیے حضرت ہود نے اس کا حج نہیں کیا اور تَدَثَّر بالثوب کے معنی ہیں کپڑے میں داخل ہوکر اپنے آپ کو اس میں لپیٹ لیا اور دِثار وہ کپڑا ہے جو اندر کے کپڑوں کے اوپر سے پہنا جائے الضار کے متعلق حدیث میں ہے انتم الشعارُ والناسُ الدِّثارُ یعنی تم اندر کے لباس کی مانند یا خواص ہو اور لوگ اوپر کے لباس کی مانند یا عوام ہیں اور مُدَّثِّر اصل میں مُتَدَثِّر ہے یعنی سونے کے وقت کپڑا اوپر لے لینے والا (ل) اور اس کے معنی بعض نے کیے ہیں سونے کے لیے کپڑا اوڑھنے والا اور بعض نے نبوت اور اس کی ذمہ داریوں کے لباس کو اوڑھنے والا (ج)۔

صحیح حدیث سے بلکہ احادیث کے اتفاق سے ثابت ہے کہ یاایھا المدثر سب سے پہلی وحی ہے جو فترت الوحی کے بعد نازل ہوئی۔ یعنی پہلی وحی اقرا تھی اس کے بعد وحی کچھ عرصہ کے لیے رکی رہی پھر ایک دن رسول اللہ صلعم کہیں جارہے تھے کہ آپ نے آسمان سے ایک آواز سنی اور وہی فرشتہ دیکھا جسے آپ نے غار حرا میں دیکھا تھا تو آپ اس کے رعب سے سخت خائف ہوئے اور گھر میں آئے اور حضرت خدیجہ سے کہا کہ مجھے کپڑا اڑھادو تب نازل ہوا یاایھا المدثر یہ جابر بن عبداللہ کی روایت صحیح بخاری میں ہے اور بعض نے جو اسے اقرا کے مقابل میں سب سے پہلی وحی کہا ہے تو ان کو غلطی لگی ہے یہ فترت کے بعد پہلی وحی تھی اور مدثر کا خطاب بلحاظ حالات ظاہری بھی صحیح ہے جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے اور مطلب اس سے یہ ہے کہ آپ مرعوب ہوکر کپڑا کیوں اوڑھتے ہیں اُٹھو اور مخلوق خدا کو بدی کے بدنتائج سے ڈراؤ اور دوسرے معنی بھی صحیح ہیں یعنی آپ کو جو لباس نبوت اور کمالات نفسی کا لباس اُڑھایا گیا ہے تو اب اٹھو اور اپنے کام میں لگ جاؤ اور دوسروں میں بھی یہ کمالات پیدا کرو۔

۳۴۷۰ ثیاب۔ ثوب کی جمع ہے جس کے معنی کپڑا ہیں اور یہاں ثیاب سے مراد لباس بھی ہوسکتا ہے اور نفس سے کنایہ بھی ہوسکتا ہے (غ)

تطہیر ثیاب کے معنی ابن عباس اور عکرمہ سے مروی ہیں کہ اللہ کی معصیت پر لباس مت اوڑھ اور ابن عباس وغیرہ سے یہ معنی بھی مروی ہیں کہ مراد ذنوب سے تطہیر ہے اور لکھا ہے کہ عرب مطہر الثیاب اس شخص کو کہتے تھے جو عہد کو وفا کرے اور لوگوں میں اصلاح کرے اور اچھے عمل کرنے والے کو بھی طاہر الثیاب کہتے تھے (ج) اور مراد دونوں معنی ہیں ظاہر کو پاک وصاف رکھنا بھی اسی طرح ضروری ہے جیسے باطن کو پاک وصاف رکھنا۔ اور ہر مسلمان کے لیے یہ دونوں حکم ہیں کہ اپنے لباس ظاہری کو بھی پاک وصاف رکھے اور اپنے اعمال یعنی باطن کو بھی پاک وصاف رکھے اور حکم کا منشا اس عمل پر مداومت اختیار کرنے کا ہے۔

۳۴۷۱ رجز۔ رجز کے اصل معنی اضطراب ہیں اور رِجز اور رُجز کے ایک ہی معنی ہیں یعنی ناپاکی یا عذاب۔ اور بتوں کی پرستش یا شرک کو بھی کہا

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۞ ۶
اور اس لیے احسان نہ کر کہ زیادہ ملے ۳۴۷۲

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۞ ۷
اور اپنے رب کے لیے صبر کر۔

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ۞ ۸
پس جب بگل بجایا جائے گا ۳۴۷۳

فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۞ ۹
تو اس دن وہ ایک مصیبت کا وقت ہوگا۔

عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ۞ ۱۰
(یعنی) کافروں پر سہل نہیں ہوگا۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۞ ۱۱
مجھے چھوڑ دے اور اسے جسے میں نے اکیلا پیدا کیا ۳۴۷۴

وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ۞ ۱۲
اور اُسے مال فراواں دیا۔

وَبَنِينَ شُهُودًا ۞ ۱۳
اور بیٹے حاضر رہنے والے۔

وَمَهَّدْتُ لَهُ تَمْهِيدًا ۞ ۱۴
اور اس کے لیے خوب سامان تیار کیا۔

ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ۞ ۱۵
پھر وہ آرزو رکھتا ہے کہ میں بڑھاؤں۔

كَلَّا ۖ إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ۞ ۱۶
ہرگز نہیں وہ ہماری آیتوں کا مخالف ہے۔

سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا ۞ ۱۷
میں اسے سخت مشقّت میں مبتلا کردوں گا۔

إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۞ ۱۸
اس نے فکر کیا اور اندازہ کیا۔

فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۞ ۱۹
پس ہلاک ہو کیسا اندازہ کیا۔

ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۞ ۲۰
پھر ہلاک ہو کیسا اندازہ (کیا)

ثُمَّ نَظَرَ ۞ ۲۱
پھر دیکھا۔

ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۞ ۲۲
پھر تیوری چڑھائی اور مُنہ بنایا ۳۴۷۵

جاتا ہے یا ایسے عمل کو جس کا نتیجہ عذاب ہو (ل) گویا پچھلی آیت میں اپنے ظاہر و باطن کو پاک رکھنے کا حکم ہے تو یہاں اس کا طریق بھی بتایا کہ ہر قسم کی ناپاکی سے دور رہے ظاہری ہو یا عملی ؛

۳۴۷۲ نیکی کرکے اجر نہ چاہنا: اس کے معنی اور کئی طرح پر بھی کیے گئے ہیں مثلاً یہ کہ جو احسان کرو اسے بڑا نہ سمجھو یا یہ کہ اپنی حسنات سے اللہ تعالیٰ پر احسان نہ رکھو مگر ظاہر معنی جو ترجمہ میں ہیں اس موقعہ پر موزون ہیں اور احسان کرنے میں ایسے احسانات بھی داخل ہیں جو انسان مالی امداد کے طور پر یا حسن سلوک دوسرے سے کرتا ہے اور وہ احسان بھی جو آنحضرت صلعم دوسروں کو ہدایت پہنچا کر لوگوں پر کرتے تھے۔ اور مطلب یہ ہے کہ تم جو اس نعمت قرآن کو دوسروں تک پہنچاؤ تو اس لیے نہیں کہ تمہیں بڑا اجر ملے بلکہ اسے اپنا فرض منصبی سمجھ کر اور یہ معنی ابن زید نے اختیار کیے ہیں ؛

۳۴۷۳ ناقور۔ نقر (ع ۶۷۲) زبان کی آواز کو بھی کہتے ہیں کیونکہ زبان کی طرف کو مخرج نون کے ساتھ لگاتا ہے اور ناقور صور یعنی بگل ہے (ل)

۳۴۷۴ کہا گیا ہے کہ یہ آیات ولید بن مغیرہ کے متعلق نازل ہوئیں اور اشارہ اس واقعہ کی طرف سمجھا گیا ہے جو کئی سال بعد کا ہے اور گو یہ ممکن ہے کہ یہ آیات بہت دیر بعد نازل ہوئی ہوں مگر یہاں سے سارا مضمون آخر رکوع تک مسلسل ہے اس لیے یہ قرین قیاس نہیں اور الفاظ بھی عام ہیں ان میں ہر ایک منکبر سرکش کا ذکر ہے جو حق کی پروا نہیں کرتا اور اپنے مال و دولت پر مغرور رہتا ہے۔ اور وحیدا اس کے متعلق بھی ہوسکتا ہے جو پیدا کیا گیا یعنی اسے اکیلا پیدا کیا مال و دولت ساتھ نہ تھا سب کچھ میں نے دیا۔ اور پیدا کرنے والے کے متعلق بھی ہوسکتا ہے یعنی میں نے اکیلے ہی اسے پیدا کیا تو مطلب یہ ہوگا کہ میں اکیلا ہی اسے ہلاک کرنے کے لیے بھی کافی ہوں اور یا ذرنی کے متعلق ہوسکتا ہے یعنی مجھے تنہا اس کی سزا کے لیے چھوڑ دو ؛

۳۴۷۵ عبس۔ عبوس سینہ کی تنگی سے چہرے پر تنگی یا ترشی کے نشان پیدا ہوتا ہے اسی سے عبوس ہے یوما عبوسا (الدھر ۷۶-۱۰) (غ)

ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾

پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا۔

فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾

پھر کہا، یہ کچھ نہیں مگر جادو ہے جو چلا آتا ہے ۳۴۷۶

اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾

یہ کچھ نہیں مگر انسان کی بنائی ہوئی بات ہے۔

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾

میں اسے دوزخ میں داخل کروں گا ۳۴۷۷

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾

اور تجھے کیا خبر ہے دوزخ کیا ہے۔

لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾

وہ باقی نہیں رکھتی اور نہ چھوڑتی ہے۔

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾

چمڑے کو جھلس دینے والی ہے ۳۴۷۸

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾

اس پر انیس ۱۹ (داروغے) ہیں۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾ ع ۱۵

اور ہم نے آگ کے داروغے فرشتوں کو ہی بنایا۔ اور ہم نے اُن کی گنتی صرف اُن کی آزمائش کے لیے ٹھیرائی ہے جو کافر ہیں۔ تاکہ وہ لوگ یقین کریں، جنھیں کتاب دی گئی۔ اور جو ایمان لائے وہ ایمان میں بڑھیں اور وہ جنھیں کتاب دی گئی اور مومن شک میں نہ پڑیں اور تاکہ وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے۔ اور کافر کہیں، اللہ (تعالیٰ) نے اس مثال کے ساتھ کیا ارادہ کیا۔ اسی طرح اللہ تم جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو کوئی نہیں جانتا، مگر وہی اور یہ صرف انسان کیلئے نصیحت ہے ۳۴۷۹

بسر کسی چیز کے وقت سے پہلے اس کے لیے جلدی کرنا بسر ہے اور یہاں مراد ہے کہ عبوس کو اس کے وقت سے پہلے ظاہر کیا۔ وجوہ یومئذ باسرۃ (القیٰمۃ ۷۵-۲۴) میں بھی یہی مراد ہے (غ) اور بسر کے معنی ابو اسحاق نے کیے ہیں سخت کراہت سے دیکھا۔ اور باسرہ سے مراد ہے ترش روئی ظاہر کرنے والے اس لیے کہ انہیں یقین ہو جائے گا کہ عذاب ان پر نازل ہونے والا ہے (ل)۔

۳۴۷۶ آنحضرتؐ کے متعلق اعتراف کفار: ولید بن مغیرہ کے متعلق روایت ہے کہ آنحضرت صلعم سورۃ حم پڑھ رہے تھے اور وہ سن رہا تھا جب اپنی قوم میں واپس گیا تو قرآن کریم کی صداقت کا اس پر اثر تھا ابو جہل کو یہ بات پہنچی تو اس نے دریافت کیا۔ ولید نے کہا کہ شعر کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا مگر یہ شعر نہیں۔ اور ہم کاہنوں کو بھی خوب جانتے ہیں یہ کہانت نہیں اور یہ کذب بھی نہیں کیونکہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لیکن ابو جہل کے اصرار پر کہ کوئی ایسی بات کہے جس کی وجہ سے قریش آپ سے متنفر رہیں آخر کہا کہ یہ سحر ہے جو ایک شخص کو اس کے اہل و عیال سے الگ کر دیتا ہے (د)

۳۴۷۷ سقر۔ سَقَرَتہ الشمسُ سورج نے اسے متغیر کر دیا اور پگھلا دیا اور سَقَر دوزخ کا نام ہے (غ)۔

۳۴۷۸ لواحۃ۔ لوح ۳۲۲۷ اور لَوَّحَہُ الحَرُّ کے معنی ہیں گرمی نے اسے متغیر کر دیا یعنی سیاہ کر دیا یا جھلس دیا (غ)۔

بشر۔ بَشَرَۃ چمڑے کے باہر کے حصے کو کہتے ہیں اور بَشَر اس کی جمع ہے (غ)۔

۳۴۷۹ اصحاب النار سے مراد یہاں دوزخ کے داروغے ہیں اور ان کی گنتی اُنیس اوپر کی آیت میں بیان ہوئی ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ اُنیس فرشتے ہوں یا نہیں

كَلَّا وَ الْقَمَرِ ﴿۳۲﴾
ہرگز نہیں چاند گواہ ہے۔

وَ الَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾
اور رات جب جانے لگے۔

وَ الصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾
اور صبح جب روشن ہو۔

اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾
وہ بھاری مصیبتوں میں سے ایک ہے ع۳۴۸۰

نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾
انسان کے لیے ڈرانے والی۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾
اس کے لیے جو تم میں سے چاہتا ہے کہ آگے بڑھے یا پیچھے رہے۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾
ہر شخص اس کے بدلے جو اس نے کمایا گرفتار (بلا) ہوگا۔

اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿۳۹﴾
سوائے دائیں ہاتھ والوں کے۔

فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾
وہ بہشتوں میں ہوں گے، پوچھیں گے

عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۱﴾
مجرموں سے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾
تمھیں کیا چیز دوزخ میں لائی۔

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾
کہیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے۔

وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾
اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے۔

وَ كُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾
اور ہم بیہودہ باتیں کرنے والوں کے ساتھ مل کر بیہودہ باتیں بنایا کرتے تھے۔

وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴۶﴾
اور ہم جزا و سزا کے دن کو جھٹلاتے تھے۔

حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿۴۷﴾
یہاں تک کہ ہمیں موت نے آلیا۔

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾
سو انھیں سفارش کرنے والوں کی سفارش فائدہ نہ دے گی۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۹﴾
تو انھیں کیا ہوا کہ وہ نصیحت سے منہ پھیرنے والے ہیں۔

كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿۵۰﴾
گویا کہ وہ بدکے ہوئے گدھے ہیں۔

جماعتیں اور خاص اس گنتی کے متعلق فرمایا کہ یہ کافروں کے لیے آزمائش ہے اور آیت کے آخر میں ماذا اراد اللہ بھذا مثلا کہہ کر اسے ایک مثال قرار دیا جس کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور ممکن ہے کبھی اس کے متعلق کوئی ایسا انکشاف ہو جو مومنوں کے لیے ازدیاد ایمان کا موجب ہو جب ہم اس میں سینکڑوں باتیں علم غیب کی ایسی پاتے ہیں جن کا جاننا انسان کی طاقت میں نہیں اور ان کی صداقت آج اظہر من الشمس ہے تو دوزخ پر انیس فرشتوں کا ہونا کوئی اتنی بڑی بات نہیں جو کسی عقلمند کے لیے ٹھوکر کا موجب ہو سکے۔ وما یعلم جنود ربک الا ھو بتاتا ہے کہ فرشتوں کی تو کوئی انتہا نہیں یہ انیس کسی خاص کام کے لحاظ سے ہیں ممکن ہے کہ انسان میں کوئی انیس قویٰ ایسے ہوں جن کے بے محل استعمال سے آگ پیدا ہوتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وما جعلنا عدتھم الا فتنۃ للذین کفروا صرف جملہ معترضہ کے طور پر ہو اور باقی مضمون صرف دوزخ کے ذکر سے تعلق رکھتا ہو۔

ع۳۴۸۰ احدی الکبر۔ کبر۔ کُبریٰ کی جمع ہے۔ انھا میں ضمیر سقر کی طرف ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ اور بھی بڑی بڑی مصیبتیں ان کے لیے ہیں دوزخ بھی ان میں سے ایک ہے البتہ احدی کے لفظ میں یہ اشارہ ہوگا کہ اس کی نظیر اور کوئی نہیں دیکھو ع۲۰۱ اور ضمیر کو نذارت کی طرف بھی مانا گیا ہے اور حال۔ قصہ یا ساعت کی طرف بھی اور اگلی آیت میں نذیرا بمعنی انذارا مانا گیا ہے یعنی وہ انذار میں بے مثل ہے یا بمعنی منذرۃ یا ذات انذار ہے اور یہاں

فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿۵۱﴾
شیر سے بھاگ رہے ہیں ۳۴۸۱۔

بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾
بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے، کہ اُسے کھلے ہوئے صحیفے دیئے جائیں ۳۴۸۲۔

كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۵۳﴾
ایسا نہیں ہوسکتا بلکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔

كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾
ایسا نہیں یہ ایک نصیحت ہے۔

فَمَنْ شَاۗءَ ذَكَرَهٗ ﴿۵۵﴾
سو جو کوئی چاہے اسے یاد رکھے۔

وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾ ع ۲
اور وہ یاد نہیں رکھتے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔ اس کی شان ہے کہ اس کے احکام کی نگہداشت کی جائے اور اس کی شان ہے کہ وہ بخشے ۳۴۸۳۔

قمر کو بطور شہادت پیش کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ جس طرح چاند پہلے چھوٹا سا ہوتا ہے اور بڑھتا چلا جاتا ہے یہی مثال حق کی ہے کہ وہ تدریجاً ترقی کریگا اور رات کے دور ہونے اور صبح کے روشن ہونے میں بھی باطل کی تاریکی کے دور ہونے اور حق کی روشنی پھیلنے کی طرف اشارہ ہے اس لیے جواب قسم میں فرمایا کہ حق کی مخالفت کا نتیجہ احدی الکبر ہے ؂

۳۴۸۱ء مستنفرۃ۔ نفر ۶۸۴ استنفار کے معنی ہیں طلب النفار اور لڑائی سے بھاگنے کے لیے اُکسانا اور یہاں مستنفرۃ بمعنی نافرۃ ہے (غ)
قسورۃ۔ قسر کے معنی غلبہ یا قہر ہیں اسی سے قسورۃ ہے جس کے معنی شیر ہیں اور تیر انداز اور شکاری بھی کیے گئے ہیں (غ) حق سے ان کے بھاگنے کی وجہ سے انہیں جنگلی گدھوں سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ یہ حد درجہ کی حماقت تھی کہ سیدھی سیدھی باتوں سے اس طرح بھاگتے تھے۔

۳۴۸۲ء یعنی ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ خود اسے کھلے ہوئے صحیفے ملیں یعنی رسول کی معرفت کتاب ملنے کی بجائے ہر ایک کو ایک لکھی لکھائی کتاب بھیجی جائے اور بعض وقت کفار آپ کو کہا کرتے تھے کہ ہم تو آپ کی پیروی کریں گے کہ لکھی لکھائی کتاب ہمارے پاس آئے جس کا سرنامہ یوں ہو کہ رب العالمین سے فلاں شخص کے نام۔ دوسری جگہ ہے حتی تنزل علینا کتابا نقرؤہ (بنی اسرائیل ۱۷۔ ۹۳)

۳۴۸۳ء اللہ تعالیٰ کی مشیت سب مشیتوں پر غالب ہے اور اللہ کی مشیت ان کے لیے تب ہی ہو جب یہ اپنے آپ کو اس کا اہل بنائیں اور اس میں خوشخبری بھی ہے کہ آخر کار یہ اسے قبول کرینگے اھل التقوی یعنی اس بات کا حق دار کہ اس کے احکام کی نگہداشت کی جائے اور اھل المغفرۃ یعنی اس بات کا اہل کہ مغفرت کرے اس میں اشارہ ہے کہ گو انسان مغفرت پانے کا حق دار نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے کا حقدار ہے ؂

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ مَكِّيَّةٌ (۷۵)

اٰیاتھا ۴۰ — رکوعاتھا ۲

تمہید سورت: اس سورت کا نام القیامۃ ہے اور اس میں دو رکوع اور چالیس آیتیں ہیں اس میں قیامت کا ذکر ہے اور قیامت پر قیامت کو بطور شہادت پیش کیا ہے یعنی اس قیامت روحانی کو جو بذریعہ نبی کریم صلعم پیدا ہونے والی تھی اور اس روحانی قیامت سے مراد انسان کے اندر ایک نئی زندگی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور نبی کریم صلعم کے ذریعہ سے نہ صرف وہ احساس پیدا ہوا بلکہ اس قدر قوت کو پہنچا کہ اس کے سامنے بڑے بڑے پہاڑ اُڑ گئے اور یہی تعلق اس سورت کا پچھلی سورت سے ہے جس کے آخر پر فرمایا تھا کہ قرآن ایک تذکرہ ہے جس میں یہی اشارہ تھا کہ اس سے ایک روحانی قیامت برپا ہو گی اور اس سورت میں اسی روحانی قیامت کو بطور شہادت قیامت کبریٰ پیش کیا ہے یہ بھی ابتدائی مکی وحی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۙ﴿۱﴾ — نہیں، مَیں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں۔

وَ لَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ؕ﴿۲﴾ — اور نہیں، مَیں ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں ۳۴۸۴

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ﴿۳﴾ — کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے۔

بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ﴿۴﴾ — ہاں ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کے (سارے) اعضا کو ٹھیک کریں ۳۴۸۵

بَلۡ یُرِیۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِیَفۡجُرَ اَمَامَہٗ ۚ﴿۵﴾ — بلکہ انسان چاہتا ہے کہ آگے بدکاری کرتا چلا جائے ۳۴۸۶

۳۴۸۴ لوامۃ بہت ملامت کرنے والا۔ النفس اللوامۃ وہ ہے کہ اس نے کچھ فضائل کو اپنے اندر لے لیا ہے پھر جب اس کے صاحب سے کوئی امرِ مکروہ سرزد ہو تو اسے اس پر ملامت کرتا ہے اور یہ نفس مطمئنہ سے کمتر ہے اور بعض کے نزدیک یہ وہ نفس ہے جو اپنی ذات میں مطمئن ہے پھر دوسروں کی تادیب کے لیے انہیں ملامت کرتا ہے گویا نفس مطمئنہ سے بالاتر ہے (غ) تین قسم کے نفس کے لیے دیکھو ۱۵۵۳۔

قسم سے پہلے لفظ لا پر دیکھو ۶۸۴ اور یہاں قیامت کے دن اور نفس لوامہ کو بطور شہادت پیش کیا ہے اور جواب قسم کا ذکر ایحسب الانسان ان لن نجمع عظامہ میں ہے یعنی بعث بعد الموت ضرور ہوگا بالفاظ دیگر قیامت کے وجود پر ایک تو خود قیامت کو ہی بطور شہادت پیش کیا ہے اور دوسرا نفس لوامہ کو۔ قیامت کے لیے قیامت کس طرح دلیل ہے ؟ قیامت کے معنی ہیں ایک ہی مرتبہ کھڑا ہو جانا اور ساعت اور قیامت میں فرق یہ ہے کہ ساعت تباہی کا وقت ہے اور قیامت زندگی کا۔ دیکھو ۱۰۸ یعنی ساعت میں اس تباہی کی طرف اشارہ ہے جو پہلے عالم پر آئے گی اور قیامت میں اس زندگی کی طرف جو بعد میں قائم ہوگی۔ اب یہ زندگی جو بعد الموت ملے گی فی الحقیقت اعمال کا نتیجہ ہے اچھے عملوں والوں کی زندگی بہشتی ہوگی یعنی خوشی کی اور برے عملوں والوں کی زندگی جہنمی ہوگی یعنی دکھ کی۔ اس زندگی کا کھلے طور پر نمودار ہونا ہی قیامت ہے۔ لیکن ایک باریک رنگ میں یہ زندگی یہیں پیدا ہو جاتی ہے۔ نیک اعمال کے نیک نتائج بداعمال کے بدنتائج مخفی طور پر یہاں بھی ظاہر ہو جاتے ہیں بہشتی زندگی اسی دنیا میں شروع ہو جاتی ہے اور جہنمی زندگی بھی یہیں اپنا اثر دکھانے لگتی ہے گویا ایک چھوٹی قیامت یہاں بھی برپا ہو جاتی ہے۔ وہ زندگی جو کامل طور پر بعد موت ظہور پذیر ہوگی اس کا احساس یہیں سے شروع ہو جاتا ہے اور یہ دونوں قیامتیں برپا کرنے والے نبی ہی ہوتے ہیں یعنی کھلی قیامت کی خبر بھی انبیاء اللہ کے ذریعہ سے ملتی ہے اور روحانی قیامت کا احساس بھی وہی پیدا کرتے ہیں اور اسی احساس کا پیدا کر دینا درحقیقت اس کھلی قیامت کے وجود پر ایک بیّن شہادت ہے اور اسی کی طرف آگے بل الانسان علٰی نفسہ بصیرۃ میں توجہ دلائی ہے یوں قیامت کو قیامت پر بطور شہادت پیش کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے نفس لوامہ سے مقرون کیا ہے۔ کیونکہ نفس لوامہ ہی اس روحانی زندگی یا روحانی قیامت کے احساس کی ابتدائی حالت ہے نفس امّارہ کی حالت میں یہ احساس بالکل مفقود ہوتا ہے اور نفس مطمئنہ کی حالت میں وہ احساس بہت قوی ہو جاتا ہے مگر ابتدا اس کی اس وقت سے ہوتی ہے جب انسان بدی کے بدنتائج کو محسوس کرنے لگے اور اس کا نفس اسے ہر ایسے امر پر ملامت کرنے لگے جو اس روحانی زندگی کے پیدا ہونے میں روک ہے اور اگر نفس لوامہ کے دوسرے معنی لیے جائیں تو مراد خود آنحضرت صلعم ہونگے گویا قیامت کے وجود پر قیامت بھی شاہد ہے اور نبی بھی شاہد ہے جو اس کی خبر دیتا ہے۔

۳۴۸۵ بنان۔ دیکھو ۱۲۱۲ واضربوا منہم کل بنان (الانفال-۱۲) کی تفسیر کرتے ہوئے ابواسحاق نے لکھا ہے کہ بنان سے مراد سارے اعضائے بدن ہیں جن میں انگلیاں بھی شامل ہیں کیونکہ یہ اَبَنّ بالمکان سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں مکان میں اقامت اختیار کی اور اقامت اور حیات کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ بنان سے تیار ہوتی ہیں یعنی کل اعضا سے اور یہاں بنان کے معنی بعض نے انگلیاں یا انگلیوں کے پورے اور بعض نے اطراف بھی کئے ہیں (ل)

ہڈیاں جمع کرنے سے مراد: ان دو آیتوں میں بعث بعد الموت کا ذکر کیا ہے پہلی میں فرمایا کہ کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کریں گے اور دوسری میں فرمایا کہ ہم اس کے سارے اعضا کے پورا کرنے پر قادر ہیں۔ تو ہڈیوں کے جمع کرنے سے یہ منشا تو ہو نہیں سکتا کہ ہڈیاں سب کہیں موجود ہونگی ان کا جمع کرنا کوئی دشوار کام ہے ہڈی اصل میں وہ ہے جو انسان میں سب سے دیرپا شے ہے اور ہڈیوں کے جمع کرنے میں اشارہ انہیں چیزوں کے جمع کرنے کا ہے جو دیرپا ہیں یعنی نتائج اعمال۔ قرآن کریم میں عموماً ہڈیوں کے اُٹھانے کو ہی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسے وانظر الی العظام کیف ننشزھا ثم نکسوھا لحما (البقرۃ ۲-۲۵۹) یا من یحی العظام وھی رمیم (یٰس ۳۶-۷۸) اور نسوی بنانہ میں پہلی ساخت جسم انسانی کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ دوسری پیدائش کے اعضا کو مکمل کرنے پر قادر ہیں۔

۳۴۸۶ لیفجر امامہ۔ فجور دیکھو ۸۸ اور امام کے معنی ہیں آگے لیفجر امامہ کے معنی ہیں زندگی کا ارادہ کرتا ہے تاکہ اس میں فجور کرتا چلا جائے

يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝۶
پوچھتا ہے قیامت کا دن کب ہے۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝۷
سو جب نظر خیرہ ہو جائے گی ۳۴۸۷

وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸
اور چاند تاریک ہو جائے گا۔

وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝۹
اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیئے جائیں گے ۳۴۸۸

يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝۱۰
اس دن انسان کہیگا کہاں بھاگ کر جانا ہے۔

كَلَّا لَا وَزَرَ ۝۱۱
ہرگز نہیں کوئی جائے پناہ نہیں۔

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨالْمُسْتَقَرُّ ۝۱۲
تیرے رب کی طرف اس دن ٹھکانا ہے۔

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝۱۳
اس دن انسان کو اس کی خبر دی جائے گی جو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴
بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ دلیل ہے۔

وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝۱۵
اور گو وہ اپنے عذر پیش کرے ۳۴۸۹

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝۱۶
اس کے ساتھ اپنی زبان کو مت ہلانا تاکہ اسے جلدی لے لے ۳۴۹۰

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝۱۷
ہمارے ذمے اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہے۔

اور بعض نے معنی کیے ہیں تا اس میں گناہ کرے یا معنی ہیں گناہ کرے پھر کہے کل کو توبہ کر لوں گا پھر نہ کرے (غ) مطلب یہی ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ آگے آگے معاصی میں مبتلا ہوتا چلا جائے اس سے کوئی چیز اسے روکنے والی نہ ہو (ج)

ع۳۴۸۷ برق۔ برق بادل کی چمک کو کہتے ہیں اور برق جب آنکھ کے متعلق کہا جاتا ہے تو مطلب ہوتا ہے کہ وہ مضطرب ہو گئی (غ)

ع۳۴۸۸ سورج اور چاند کا جمع ہونا: خسف قمر سے مراد اگر گرہن لیا جائے تو جمع شمس و قمر سے سورج گرہن اور چاند گرہن کا اکٹھا واقع ہونا لیا جائیگا۔ اور چونکہ چاند گرہن مہینہ کے وسط میں ہوتا ہے اور سورج گرہن آخر میں اس لیے مراد اس سے کسی خاص مہینہ میں دونوں کا اکٹھا ہونا ہوگا جیسا کہ ایک روایت میں مہدی کے ظہور کی علامت رمضان میں کسوف و خسوف کا اجتماع ہے اور ایسا ایک اجتماع ۱۸۹۳ء میں ہو چکا ہے اور حضرت ابن مسعود نے مراد دونوں کا طلوع مغرب سے لیا ہے اور اگر مراد اس سے محض چاند کا تاریک ہونا لیا جائے تو سورج اور چاند کے اجتماع سے مراد دونوں کا تاریک ہو جانا لیا جائے گا اور چاند تب ہی تاریک ہوگا جب سورج تاریک ہو جائے کیونکہ چاند کی روشنی سورج کی روشنی سے ہے اور دونوں کا تاریک ہو جانا گویا موجودہ نظام عالم کا درہم برہم ہو جانا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین مع چاند کے سورج میں جا ملے۔

ع۳۴۸۹ انسان کی اپنے نفس پر شہادت: انسان کے اپنے نفس پر دلیل ہونے کے یہی معنی ہیں کہ اس دوسری زندگی کی شہادت تو خود اس کے اندر سے ملتی ہے جیسا کہ نفس لوامہ میں اشارہ تھا۔ مگر انسان طرح طرح کے عذر پیش کر کے اس احساس زندگی سے دور ہوتا چلا جاتا ہے معاذیر معذرۃ بمعنی عذر کی جمع ہے۔

ع۳۴۹۰ تحرك۔ حَرَكَة سکون کی ضد ہے۔ اور یہ صرف جسم کے لیے ہے اور وہ ایک جسم کا انتقال ایک جگہ سے دوسری جگہ ہے (غ)

بخاری میں ہے کہ ابتدا میں جب آنحضرت صلعم پر وحی آتی تھی تو آپ اسے جلدی جلدی لینے کی کوشش کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس سے روکا اور تسلی دی کہ اس کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے کوئی چیز ضائع نہیں ہو سکتی لیکن چونکہ قیامت کے ذکر میں مخالفین کی ہلاکت کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے اس لیے زبان کو ہلانے سے یہ مراد ہو سکتی ہے کہ ان کے عذاب کے بارہ میں زبان کو مت ہلا کہ جلدی انہیں عذاب آ لے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ پچھلی سورت میں اسی عذاب سے ڈرایا تھا قم فانذر اور آگے جو قرآن کی جمع کا ذکر ہے تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ مخالف تو اس کوشش میں تھے کہ قرآن کو نابود کر دیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے عذاب کے لیے جلدی نہ کرو۔ قرآن شریف کو یہ مٹا نہیں سکتے اس کا پڑھنا اور جمع کرنا ہمارے ذمے ہے۔

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ — پس جب ہم اس کو پڑھیں تو تُو اس کے پڑھنے کی پیروی کر۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾ — پھر ہمارے ذمے اس کا کھول کر بتانا ہے ۳۴۹۱

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ — ہرگز نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت کرتے ہو ۳۴۹۲

وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾ — اور آخرت کو چھوڑتے ہو۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ — (کچھ) مُنہ اس دن تروتازہ ہوں گے ۳۴۹۳

اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ — اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾ — اور (کچھ) مُنہ اس دن بُرے بنے ہوئے ہوں گے۔

تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾ — جان لیں گے کہ ان پر پیٹھ توڑنے والی مصیبت آنے والی ہے ۳۴۹۴

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾ — ہرگز نہیں جب (جان) گلے تک پہنچ جائے گی ۳۴۹۵

ع۳۴۹۱ ان آیات میں قرآن کریم کے متعلق تین باتوں کا بیان ہے۔ اول قرآن کا جمع کرنا۔ دوم اس کا پڑھنا۔ سوم اس کا واضح کرنا اور یہ تینوں الگ الگ باتیں ہیں اس کا پڑھنا تو بذریعہ وحی اس کا آنحضرت صلعم کو پہنچانا ہے۔ لیکن چونکہ جو حصّہ نازل ہوتا تھا وہ بلحاظ ضروریات وقتی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نازل ہوتا تھا اس لیے اس کو ایک ترتیب میں لانا بھی ایک عظیم الشان کام تھا اس کے متعلق فرمایا کہ اس کا جمع کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ ترتیب قرآن کریم نہ آنحضرت صلعم نے اپنی رائے سے کی اور نہ کوئی اسے تبدیل کرنے کا مجاز تھا بلکہ یہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی۔ اسی لیے آنحضرت ہر ایک آیت اور سورۃ کے متعلق خود حکم دیتے تھے کہ اسے فلاں موقعہ پر رکھو اور آیت میں جمع کو پڑھنے پر اس لیے مقدم کیا کہ اصل قرآن جو ہمیشہ کے لیے دنیا میں رہنا تھا وہ جمع شدہ قرآن تھا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قرآن میں سے کوئی چیز ضائع نہیں ہوئی کیونکہ جس کی جمع کا کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے رکھا یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ اس میں کوئی انسان کچھ کمی بیشی کردے اور محقق اہل شیعہ بھی قرآن کریم کو کامل مانتے ہیں اس میں سے کوئی حصّہ ضائع شدہ نہیں مانتے۔ جیسے سید مرتضیٰ۔ محمد بن حسن طوسی۔ ابو علی طبرسی صاحب مجمع البیان۔ محمد بن علی بن بابویہ جن میں سے آخر الذکر کا یہ قول ہے اعتقادنا ان القراٰن الذی انزله الله علی نبیه هو ما بین الدفتین و ما فی ایدی الناس لیس باکثر من ذٰلك و من نسب الینا انا نقول انه اکثر من ذٰلك فهو کاذب۔ یعنی "ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر اُتارا وہ وہی ہے جو بین الدفتین موجود ہے اور جو لوگوں کے ہاتھ میں ہے اس سے بڑھ کر نہیں اور جو شخص ہماری طرف یہ بات منسوب کرے کہ ہم کہتے ہیں وہ اس سے بڑھ کر ہے وہ جھوٹا ہے۔" اور سید مرتضیٰ نے ایسی روایات کو ضعیف قرار دیا ہے جن میں قرآن میں کسی کمی بیشی کا ذکر ہو اور خود اہل سنت کی کتب احادیث میں بھی ایسی بعض ضعیف روایات ہیں۔

بیان قرآن: تیسری بات جس کا یہاں دعویٰ کیا ہے یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر بھی اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے یعنی بعض مسائل میں جو عمل سے تعلق رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے خود ہی ان مقامات کی وضاحت فرما دی ہے۔ اور جس طرح جمع قرآن محض قرآن کے پڑھنے سے الگ امر تھا اسی طرح بیان قرآن قرآن شریف سے الگ ہے جس طرح جمع قرآن نبی کریم کرتے تھے اسی طرح بیان قرآن بھی آنحضرتؐ کرتے تھے جس طرح جمع قرآن اللہ تعالیٰ کی وحی خفی سے آپؐ نے کیا اسی طرح بیان قرآن بھی اللہ تعالیٰ کی وحی خفی سے آپ نے کیا۔ پس نماز یا بعض دیگر امور کے متعلق جو کچھ آنحضرت صلعم نے فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم پا کر ہی بیان فرمایا اور یہ سب کچھ بیان قرآن ہے یہی حدیث ہے اور ان لوگوں پر افسوس ہے جو خود تو تفسیر قرآن کرنے بیٹھ جاتے ہیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ نبی صلعم نے یوں اس حکم قرآنی کی وضاحت فرمائی تو اسے قبول نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے تین باتوں کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ قرآن کا اتارنا۔ قرآن کا جمع کرنا۔ قرآن کا بیان کرنا۔ اور یہ تینوں الگ الگ امور ہیں۔ جو شخص ان تینوں میں سے کسی ایک چیز کو چھوڑتا ہے وہ قرآن کی نص صریح کو رد کرتا ہے۔

ع۳۴۹۲ کلا میں تہدید کفار کے لیے ہے جو انکار قیامت کرتے ہیں۔ اصل مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ تم نفع عاجل کے پیچھے پڑتے ہو اور جس بات میں انجام کار نفع ہے اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

ع۳۴۹۳ ناضرۃ۔ نَضْرۃ کے معنی حسن ہیں۔ نضرۃ النعیم (التطفیف ۸۳-۲۴) لقّاهم نضرۃ وسرورا (الدهر-۱۱) (غ) گو یا رب رحیم کی طرف نظر ہی ان کے چہروں کی تروتازگی کا موجب ہے اور جو باسرۃ ہیں تو اللہ تعالیٰ کی جناب سے دوری ہی ان کے چہروں پر سیاہی کا موجب ہے۔

ع۳۴۹۴ فاقرۃ۔ فقارۃ۔ پیٹھ کی ہڈی کو کہتے ہیں اور فاقرۃ وہ مصیبت ہے جو فقار کو توڑ دے (غ)

ع۳۴۹۵ تراقی۔ تَرْقُوۃ کی جمع ہے وہ ہڈی جو گلے کی گہرائی اور کندھے کو ملاتی ہے (غ) یا ترقوۃ اسے اس لحاظ سے کہا ہے کہ سانس وہاں تک چڑھتا

وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿۲۷﴾ — اور کہا جائے گا، کون طبیب ہے۔

وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ — اور یقین کرلے گا کہ یہ جدائی ہے۔

وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ — اور ایک پنڈلی (دوسری) پنڈلی سے لپٹ جائے گی۔

ع اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ٍالْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾ — تیرے رب کی طرف اس دن چلا جانا ہے ۳۴۹۶

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ — تو نہ وہ تصدیق کرتا ہے اور نہ نماز پڑھتا ہے۔

وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ — لیکن جھٹلاتا ہے اور پھر جاتا ہے۔

ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾ — پھر اپنے ساتھیوں کی طرف اتراتا ہوا چلا جاتا ہے ۳۴۹۷

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾ — افسوس ہے تجھ پر اور افسوس!

ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾ — پھر افسوس ہے تجھ پر اور افسوس!

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾ — کیا انسان خیال کرتا ہے کہ مہمل ہی چھوڑ دیا جائے گا ۳۴۹۸

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾ — کیا وہ منی کا ایک نطفہ نہ تھا جو ڈالی جاتی ہے۔

ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾ — پھر وہ ایک لوتھڑا تھا سو (اسے) پیدا کیا پھر ٹھیک بنایا۔

فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾ — تب اس سے دو زوج بنائے مرد اور عورت۔

اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْیِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾ ع — کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کرے؟ ۳۴۹۹

ہے (مادہ رقی سے) اور راق بھی رقی سے ہے جس کے معنی ہیں من یرقیہ یعنی کون اس پر افسون کرے گا اور ابن عباس نے من راق کے معنی کیے ہیں کون اس کی روح کو لیکر چڑھے گا رحمت کے فرشتے یا عذاب کے فرشتے (غ) اور رُقیۃ پڑھ کر پھونکنے کو کہتے ہیں اور راق ایسا کرنے والا اور حدیث میں رقیۃ یا پڑھ کر پھونکنے کا جواز بھی پایا جاتا ہے اور اس سے نہی بھی اور ان دونوں میں تطبیق اس طرح ہوسکتی ہے کہ قرآن یا اسمائے الٰہی کو پڑھ کر پھونکنا تو جائز ہے مگر اس کے سوائے نہیں (ل) اور ضحاک وغیرہ سے اس کے معنی مطلق طبیب مروی ہیں (ج) اور یہی مراد معلوم ہوتی ہے یعنی جب نزع کا وقت آجاتا ہے تو پھر کوئی طبیب نہیں ملتا جو بچا سکے۔

ع۳۴۹۶ التفت الساق بالساق۔ کے معنی حضرت ابن عباس سے شدت پر شدت کا بڑھنا منقول ہیں اور عطاء سے ہے کہ مالوف چیزوں کی مفارقت کی شدت کے ساتھ دوسرے عالم کی طرف انتقال کی شدت مل جائے گی۔ اور رب کی طرف مساق ہونے سے مراد ہے کہ منتہٰی رب کی طرف ہے دیکھو ۲۸۹۲ع یہاں موت کا نقشہ کھینچا ہے کیونکہ یہ بھی ایک قیامت من مات فقد قامت قیامتہ۔

ع۳۴۹۷ یتمطی۔ مَطْو چلنے میں کوشش اور جلدی ہے اور تَمَطّی کے معنی تبختر ہیں (ل) یا اکڑ کر چلنا یا اپنی مَطا یعنی پیٹھ کو اکڑتے ہوئے چلنا (غ) جس قیامت کی طرف اوپر توجہ دلائی تھی اسی سے اعراض کرنے والے کا یہاں ذکر ہے کہ وہ اکڑتا ہوا اپنے اہل یعنی اپنے ساتھیوں کی طرف چلا جاتا ہے اور حق کی پروا نہیں کرتا اور اس کے اکڑنے سے مراد اس کی متکبرانہ روش ہے گویا وہ اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ کسی خوبی کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

ع۳۴۹۸ یترک۔ تَرْک کسی چیز کا چھوڑنا ہے ارادہ اور اختیار سے یا قہر و اضطرار سے، وترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض (الکھف ۱۸۔ ۹۹) واترک البحر رھوا (الدخان ۴۴۔ ۲۴) دوسرے سے ہے کم ترکوا من جنّٰت (الدخان ۴۴۔ ۲۵) اور ہر ایک فعل کے متعلق کہا جاتا ہے جس سے وہ اپنے حال کی طرف منتہی ہوتا ہے ماترکتہ کذا (غ) اور تَرْک بمعنی البقاء بھی آتا ہے وترکنا علیہ فی الاٰخرین (الصّٰفّٰت ۳۷۔ ۷۸) اور ترکتُ الشئ کے معنی ہیں خلّیتُہ یعنی اس سے الگ رہا (ل)

سدی۔ سُدی کے معنی مہمل ہیں یعنی ایسی حالت میں کہ نہ اسے کچھ کرنے کا حکم دیا جائے اور نہ کسی چیز سے روکا جائے (ل) کیوں بلا کچھ لازم کیے اور بلا کسی چیز سے روکے نہیں چھوڑا جاتا اور اس کی وجہ اگلی سورت میں بیان کی ہے۔

ع۳۴۹۹ یعنی جس نے عجیب در عجیب طریق سے یہ زندگی بنائی کیا وہ دوسری زندگی نہیں بنا سکتا۔ احادیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم جب یہ پڑھتے تو کہتے سبحانک اللّٰھم وبلٰی۔ اور احمد ابوداؤد وغیرہما نے ابوھریرہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا جو شخص سورۃ والتّین پڑھے تو الیس اللّٰہ باحکم

(بقیہ صفحہ سابقہ)
الحٰکمین کے بعد کہے بلیٰ و انا علیٰ ذٰلکم من الشٰھدین اور جو شخص یہ سورت پڑھے تو ان یحیی الموتیٰ پر کہے بلیٰ۔ اور جو والمرسلٰت پڑھے تو فبای حدیث بعدہ یومنون پر کہے۔ اٰمنا باللہ۔

سُوْرَۃُ الدَّھْرِ مَکِّیَّۃٌ (۷۶)

اٰیَاتُھَا ۳۱ رُکُوْعَاتُھَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْـًٔا مَّذْكُوْرًا ① — یقیناً انسان پر زمانے کا ایک وقت آچکا ہے کہ وہ کوئی چیز قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖۗ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا ② — ہم نے انسان کو ملے ہوئے نطفہ سے پیدا کیا ہے اسے ہم آزماتے ہیں، سو اسے ہم نے سُننے والا دیکھنے والا بنایا ع ۳۵۰

اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ③ — ہم نے اسے رستہ دکھایا ہے چاہے وہ شکرگزار ہے اور چاہے ناشکرا۔

اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَاۡ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِیْرًا ④ — ہم نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور جلتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ — نیک اس پیالے سے پیتے ہیں جس کی ملونی

تمہید سورت: اس سورت کا نام الانسان ہے اور الدھر بھی آیا ہے اور اس میں دو رکوع اور اکتیس آیتیں ہیں اور بلحاظ مضمون یہ نام الانسان نہایت ہی موزوں ہے اس لیے کہ یہاں انسان کی روحانی ترقیات کا ذکر ہے اور بتایا ہے کہ پہلا مرتبہ انسان کی روحانی ترقی کا یہ ہے کہ بدی کی طاقت کو دبائے اور دوسرا یہ کہ نیکی کی قوت اپنے اندر پیدا کرے۔ اور تعلق بھی پچھلی سورت سے صاف ہے کیونکہ وہاں فرمایا تھا کہ رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے دنیا میں ایک روحانی قیامت قائم ہو گی یہاں بتایا کہ اس روحانی زندگی کے دو مدارج ہیں۔ یہ سورت جمہور کے نزدیک مکّی ہے اور قتادہ اور مجاہد اسے مدنی کہتے ہیں اور بعض نے اسے کچھ مکّی اور کچھ مدنی قرار دیا ہے مگر ان دونوں باتوں کے لیے کوئی دلیل نہیں اور صحیح یہی ہے کہ یہ سورت اس حصہ کی باقی سورتوں کی طرح ابتدائی مکّی زمانہ کی ہے۔

ع ۳۵۰ امشاج۔ مَشج دو رنگوں کا باہم ملنا ہے یا دو چیزوں کا ملنا اور مَشِیج مرد اور عورت کے ماء کا ملنا ہے اور امشاج کے معنی میں فراء نے کہا ہے وہ ماء الرجل اور ماء المرأۃ اور خون اور علقہ کا باہم ملنا ہے اور ابواسحاق کا قول ہے کہ امشاج منی اور خون کا اخلاط ہے پھر ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے اور نطفۃ امشاج مرد کا پانی ہے جو عورت کے پانی اور اس کے خون سے ملتا ہے (ل) اور عکرمہ ابن عباس وغیرہما سے امشاج کے معنی اختلاط ماء الرجل وماء المرأۃ مروی ہیں (ج) اور امشاج مَشَج کی جمع ہے۔

انسان کیوں مکلف احکام ونواہی ہے: ابتلاء یا آزمائش سے یہاں مراد اس کا ابتلاء تکلیف سے ہے یعنی بعض احکام کے اس پر لازم کرنے سے اور چونکہ انسان کو اس غرض کے لیے بنایا تھا اس لیے فرمایا کہ ہم نے اسے سمیع وبصیر بنایا اور گو سننے اور دیکھنے کی صفات دوسرے جانداروں میں بھی پائی جاتی ہیں مگر انسان اس سننے دیکھنے سے جن نتائج پر پہنچتا ہے وہ نہیں پہنچتے پس اس کا سننا اور دیکھنا ایک نیا رنگ اپنے اندر رکھتا ہے جس کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے کہ وہ چاہے تو شکرگزاری کی راہ اختیار کرے اور چاہے کفران کی۔ گویا اسے اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے قویٰ کو جس موقع پر چاہے استعمال کرے اور جس موقعہ پر چاہے روکے بالفاظ دیگر وہ جذبات پر حکومت کرنے کا اہل ہے۔

كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝٥
کافور ہے ع۳۵۰۱

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۝٦
(وہ) چشمہ (ہے) جس سے اللہ تعالیٰ کے بندے پیتے ہیں، وہ اسے چیر کر بہا نکالتے ہیں۔

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝٧
نذر کو پورا کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی مصیبت پھیل جانے والی ہے ع۳۵۰۲

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝٨
اور اس کی محبّت کی وجہ سے مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں ع۳۵۰۳

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝٩
ہم تمھیں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں، ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔

اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝١٠
ہم اپنے رب سے تنگی اور سختی کے دن کا خوف رکھتے ہیں ع۳۵۰۴

فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝١١
سو اللہ تعالیٰ نے انھیں اس دن کی مصیبت سے بچا لیا اور انھیں تازگی اور خوشی سے ملا دیا۔

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝١٢
اور انھیں ان کے صبر کرنے کی وجہ سے باغ اور ریشم بدلہ میں دیا۔

مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۝١٣
اس میں تختوں پر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے نہ اس میں دھوپ کی (حدّت) دیکھیں گے اور نہ سخت سردی ع۳۵۰۵

ع۳۵۰۱ مزاج۔ مَزْج کے معنی اختلاط یعنی ملانا ہیں اور مزاج وہ ہے جس سے کوئی چیز ملا دی جائے (غ)
کافور۔ کفر سے ہے جس کے معنی ڈھانکنا ہیں اور کافور ایک خوشبو ہے (غ)
ابرار کے لیے یہاں جن باتوں کا ذکر آگے آتا ہے یوفون بالنذر۔ یطعمون الطعام۔ وہ سب اس دنیا میں ان کے کام ہیں۔ پس بظاہر قیاس اس بات کو چاہتا ہے کہ یشربون من کاس بھی اسی دنیا کے متعلق ہو۔ اور آگے الفاظ یفجرونہا تفجیرا کہ اس چشمے کو وہ خود ہی بہا نکالتے ہیں اسی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن اگر اسے بہشت کا وعدہ بھی سمجھا جائے تو چونکہ ان تمام سورتوں میں اصل غرض یہی بتانا ہے کہ بہشت کی زندگی اس دنیا سے شروع ہوتی ہے گو ان نعمتوں کا یہاں اور رنگ ہے اور بہشت میں اور رنگ ہوگا اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کافوری پیالہ مومن کو یہاں بھی ملتا ہے۔ اور کافور کے چونکہ اصل معنی ڈھانکنے والا ہیں اور کافور کی خاصیت بھی زہروں کو دبانا ہے اس لیے اس کافوری پیالے میں اشارہ روحانیت کی پہلی منزل کی طرف ہے جس میں بدی کی قوت کمزور ہو جاتی اور دب جاتی ہے اور پہلے اسے کاس کہہ کر پھر فرمایا عینا یشرب بہا عباد اللہ جہاں عینا کافور سے بدل ہے جس سے معلوم ہوا کہ کافوری پیالہ انسان کی جدوجہد سے آخر ایک چشمہ بہا نکالتا ہے اور اسی جدوجہد کی طرف یفجرونہا میں اشارہ ہے۔
ع۳۵۰۲ مستطیر۔ طَارَ کا اصل پرندے کے اڑنے کے متعلق ہے مگر تفرق پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اور استطارۃ اور تطایر کے معنی تفرق یعنی پھیل جانا اور ذہاب ہیں۔ استطار الغبارُ غبار ہوا میں پھیل گیا۔ اور مستطیر پھیل جانے والی جیسے صبح مستطیر (ل)
ع۳۵۰۳ مسکین یتیم۔ اسیر کوئی ہو مسلم کی شرط نہیں۔ آنحضرت صلعم خود بھی مشرکین پر خرچ کر دیتے تھے صحابہ بھی۔ یہ وسعت اسلامی ہے ہاں مسلم بھائی اول حقدار ہے۔ اسلام کی تعلیم کا اصل الاصول ہی غربا اور مساکین کی خبر گیری کر کے انہیں اُٹھانا ہے۔
ع۳۵۰۴ قمطریر۔ اِقْمَطَرَّ سخت ہو گیا۔ اور قمطریر شدید یا شدید اور غلیظ کو کہتے ہیں جو اپنی شدت سے ماتھے پر تیوریاں ڈال لے (ل) دن کو عبوس اور قمطریر کہنا جن کا تعلق اخلاق میں ماتھے پر تیوریاں ڈالنے سے ہے ان اخلاق کی طرف بھی اشارہ ہے۔
ع۳۵۰۵ شمس۔ سورج اور روشنی جو اس سے نکلتی ہے (غ) اور زمہریر شدت سردی (ل) حریر باریک کپڑا (غ)

وَ دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَ ذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿۱۴﴾

اور اس کے سائے اُن پر جُھکے ہوئے ہوں گے اور اس کے پھل اُن کے لیے سہولت سے میسّر آنے والے بنائے گئے ہیں۔

وَ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۠ ﴿۱۵﴾

اور ان پر چاندی کے برتنوں کا دور چلایا جائے گا اور آبخوروں کا جو شیشہ کے ہیں۔

قَوَارِيْرَا۠ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ﴿۱۶﴾

شیشے بھی چاندی کے انھوں نے اسے اندازہ سے بنایا ہے ۳۵۰۶

قرأ حفص بغير الألف في الوصل فيهما ووقف على الأول بالألف وعلى الثاني بغير الألف

وَ يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ﴿۱۷﴾

اور اس میں انھیں ایک پیالہ پلایا جائے گا جس کی ملونی سونٹھ کی ہوگی۔

عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ﴿۱۸﴾

اس میں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل ہے ۳۵۰۷

وَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴿۱۹﴾

اور ان پر ہمیشہ ایک حالت پر رہنے والے لڑکے گھومیں گے۔ جب تو انھیں دیکھے گا تو انھیں بکھرے ہوئے موتی سمجھے گا۔

وَ اِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا ﴿۲۰﴾

جب تو ادھر دیکھے گا تو نعمتیں اور ایک بڑی بادشاہت دیکھے گا۔

عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ وَّ حُلُّوْۤا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَ سَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾

ان کے اوپر سبز باریک ریشم اور موٹے ریشم کے کپڑے ہوں گے اور وہ چاندی کے کنگن پہنے ہوئے ہونگے اور ان کا رب انھیں پاک کرنے والی پینے کی چیز پلائے گا ۳۵۰۸

ع۳۵۰۶ فضۃ ۔فضّ توڑنا اور پراگندہ کرنا ع۵۵۱ اور فضۃ چاندی یعنی جواہر میں سے ادنیٰ ترین چیز جس سے معاملہ کیا جاتا ہے (غ)

نعمائے بہشتی میں اعمال حسنہ کا نقشہ: یہاں ان برتنوں کو قواریر یعنی شیشے کے بھی کہا ہے اور ان کا چاندی سے ہونا بھی بیان کیا ہے گویا بلحاظ اپنی صفائی کے وہ شیشے کے ہیں اور بلحاظ بے داغ اور سفید ہونے کے چاندی کے یا شیشے کا نقص جو ٹوٹ جانا ہے وہ ان میں موجود نہیں گویا وہ چاندی کے ہیں اور چاندی کا نقص جو شفاف نہ ہونا ہے وہ ان میں نہیں گویا شیشے کے ہیں اور اصل میں نعمائے بہشت کی کمال خوبی اور بے عیب اور خالی از نقص ہونے کا ذکر ان آیات میں ہے دھوپ اور سردی دونوں کا وہاں نہ ہونا بھی اسی کمال کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس دنیا کی زندگی میں بلحاظ اخلاق انسان کامل کا یہی نقشہ ہوتا ہے اس میں نہ حدت ہوتی ہے نہ سردمہری وہ آئینہ کی طرح صاف بھی ہوتا ہے اور چاندی کی طرح بے عیب بھی اور قدروھا تقدیرا میں بتایا کہ انھوں نے خود ہی اس کا اندازہ کیا ہے جس میں ان کے اخلاق اور اعمال حسنہ کی طرف اشارہ ہے قدروھا باعمالھم الصالحۃ (ر)

ع۳۵۰۷ زنجبیل ۔سونٹھ کو کہتے ہیں اور عرب کے نزدیک وہ نہایت اعلیٰ درجہ کی چیز ہے (ل)

سلسبیل ۔سہل ۔لذیذ ۔تیزی سے چلنے والا اور بعض نے اسے سل اور سبیل سے مرکب کہا ہے اور بعض کے نزدیک ہر تیز جاری چشمے کو کہتے ہیں (غ)

بہشت میں کیا نعمتیں ہونگی ان سب کا ذکر بالتفصیل تو کہیں نہیں آیا جن چند چیزوں کا ذکر کیا ہے وہ کسی خاص غرض کے لیے ہے پہلے ایک کاس کا ذکر کیا تھا جس کی ملونی کافور ہے یہاں ایک کاس کا ذکر ہے جس کی ملونی سونٹھ ہے وہاں اس قوت کی طرف اشارہ تھا جو بدیوں کو دباتی ہے یہاں اس قوت کی طرف اشارہ ہے جو عمل کی طاقت پیدا کرتی ہے کیونکہ زنجبیل کا خاصہ یہی ہے کہ وہ قوت دیتی ہے گویا دوسرے روحانی مرتبہ کی طرف لطیف اشارہ کیا ہے کہ جب بدی کی قوت دب جاتی ہے تب نیکی کی قوت میں زبردست تحریک پیدا ہوتی ہے اور درحقیقت روحانی ترقی کے یہ دو ہی مدارج ہیں اول بدی کا دبانا۔ دوسرا نیکیوں اور طاعات میں ترقی کرنا ان دونوں کاسوں میں ان ہی دو حالتوں کی طرف اشارہ ہے۔

ع۳۵۰۸ عالی ۔عَلَیٰ یَعْلُوْ سے عالٍ ہے اور عَلِیَ یَعْلَیٰ سے عَلَیٰ ادر مکانوں اور اجسام میں زیادہ استعمال علا کا ہے (غ) اور یہاں عَلیٰ کی جگہ عالی استعمال ہوا ہے۔

طہور ۔اصحاب شافعی کہتے ہیں کہ طہور کے معنی مُطَھِّر ہیں یعنی پاک کرنے والا ۔گو یہ معنی بہ حیثیت لفظ درست نہ ہوں مگر معنی کے لحاظ سے

إِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾ ع	یہ تمھارے لیے بدلہ ہے اور تمھاری کوشش کی قدر ہوئی۔
إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾	ہم نے تجھ پر قرآن کو تھوڑا تھوڑا کرکے اتارا ہے۔
فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾	سو اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کر اور ان میں سے کسی گنہگار یا ناشکرے کی اطاعت نہ کر۔
وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾	اور اپنے رب کا نام صبح اور شام یاد کر۔
وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾	اور رات کے کچھ حصّے میں اس کے آگے سجدہ کر اور لمبی رات اس کی تسبیح کر۔
إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾	یہ لوگ جلد ملنے والے نفع سے محبّت رکھتے ہیں اور اپنے آگے ایک بھاری دن کو چھوڑتے ہیں۔
نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾	ہم نے انھیں پیدا کیا اور ان کی بناوٹ کو مضبوط بنایا اور جب ہم چاہیں گے تو ان کی مثل بدل کر اور لے آئیں گے ۳۵۰۹ء
إِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾	یہ نصیحت ہے، سو جو کوئی چاہے — اپنے رب کی طرف رستہ اختیار کرے۔
وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾	اور تم نہیں چاہتے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔ اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے ۳۵۱۰ء
يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾ ع	وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کیا ہے۔

اس میں تطہیر ہے کیونکہ طاہر دو قسم ہے ایک وہ کہ اس کی طہارت دوسرے کو نہیں پہنچتی اور دوسرا وہ جس کی طہارت دوسرے پر اثر کرتی ہے اس معنی سے طہور پاک کرنے والا ہو گا (غ)

۳۵۰۹ء اسر۔ اَسَر کے معنی باندھنا ہیں اور بمعنی خَلق بھی آتا ہے اَسَرَہُ اللّٰہُ خَلَقَہ میں یہی معنی یہاں ہیں اور بِاَسْرِھَا میں اسر کے معنی جمیع ہیں (م)

اس رکوع میں بتایا ہے کہ حق بتدریج پھیلے گا اور ان کا بدلنا دونوں طرح ہو سکتا ہے یا ان کی جگہ دوسری قوم آجائے یا وہ خود ایک تبدیل شدہ قوم بن جائیں۔

۳۵۱۰ء انسان کا ارادہ مشیت الٰہی کے ماتحت: سورۂ مدثر کے آخر پر تھا فمن شاء ذکرہ وما یذکرون الّا ان یشاء اللہ اور یہاں پر ہے فمن شاء اتخذ الیٰ ربہ سبیلا وما تشاؤن الّا ان یشآء اللہ دونوں جگہ پر پہلے تو یہ فرمایا کہ جو چاہے وہ اللہ کا رستہ اختیار کرے اور پھر فرمایا کہ انسان نہیں چاہتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔ اور اسی سورت کی ابتدا میں فرمایا تھا کہ رستہ ہم نے دکھا دیا ہے اب جو چاہے رستہ اختیار کرے جو چاہے انکار کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے خدا کی طرف آئے چاہے اس کی طرف سے پھر رہے لیکن انسان کا یہ اختیار پھر کسی حد بندی کے ماتحت ہے اور وہ حد بندی اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے اور یہ واقعات کے بالکل مطابق ہے۔ مثلاً انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین سے فائدہ اُٹھا کر اپنے لیے معاش کی صورت پیدا کرے اور چاہے نہ کرے۔ اس عام قاعدہ سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر بھی یہ انسان کا اختیار کئی

(بقیہ صفحہ سابقہ)

طرح پر محدود ہے اور سچ یہی ہے کہ انسان کا علم۔ اس کا ارادہ۔ اس کی طاقت سب ایک حدبندی کے ماتحت ہیں۔ نہ اس کا علم غیر محدود طریق پر کام کرتا ہے نہ اس کی طاقت اور نہ اس کا ارادہ دیکھو ۳۲ دوسرے انسان کی مشیت جہاں تک وحی الٰہی کا سوال ہے یوں بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ وحی الٰہی نہ بھیجتا تو پھر انسان وہ رستہ ہی اختیار نہ کرسکتا تھا۔ پہلے مشیت الٰہی ہوئی کہ وحی الٰہی بھیجے تو پھر انسان کے اختیار کا سوال آیا کہ اس وحی پر چلے یا نہ چلے ما تشاءون الآ ان یشاء اللہ یوں بھی سچ ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت فی الحقیقت بعض افعال پر بعض نتائج مترتب کرتی ہے وہ حق ہے اس کی ہر بات حکمت اور مصلحت کے ماتحت ہے گو انسان کو معلوم نہ ہو لیغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء ہیں مشیت اسی قانون کے رنگ میں کام کرتی ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں بکثرت ہے کہ اعمال صالحہ کا نتیجہ مغفرت ہے اور اعمال بد کا نتیجہ عذاب۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جو ہماری نظر میں ایک وقت عمل صالح ہے وہ کسی باریک ہماری نظروں سے مخفی وجہ کے سبب سے خدا کی نظر میں عمل بد ہو جیسے ریاکاری کے اعمال یا جیسے وہ اعمال جن میں کبر مل جائے اسی طرح ایک شخص جب ذکر کی طرف کان نہیں دھرتا تو مشیت الٰہی کا یہ تقاضا ہے کہ اس کو ذکر و ہدایت سے محروم کردے۔

سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ مَكِّيَّةٌ (۷۷)

اٰیَاتُھَا ۵۰ — رُکُوْعَاتُھَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

وَ الْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۝۱ — گواہ ہیں نیکی پھیلانے کے لیے بھیجی ہوئی۔

فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۝۲ — پھر خس و خاشاک کو اُڑا دینے والی (جماعتیں)

وَّ النّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۝۳ — اور دُور دُور پھیلا دینے والی۔

فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۝۴ — پھر الگ کر دینے والی۔

فَالْمُلْقِیٰتِ ذِکْرًا ۝۵ — پھر نصیحت کو پیش کرنے والی (جماعتیں)، ۳۵۱۱ء

تمہید سورت: اس سورت کا نام المرسلٰت ہے اور اس میں دو رکوع اور پچاس آیتیں ہیں۔ مرسلات سے مراد رسولوں کی جماعتیں ہیں! اور اس سورت میں بتایا ہے کہ رسولوں کی تکذیب کا ثمرہ کیا ملتا ہے۔ پچھلی سورت میں انسان کی ان ترقیات روحانی کا ذکر تھا جو رسول کے نفخ روح سے پیدا ہوتی ہیں اور اس میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس نئی زندگی کو قبول نہیں کرتے بلکہ تکذیب رسل سے حق کا نام بھی مٹانا چاہتے ہیں ؂

بخاری مسلم وغیرہ ہما میں حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ ہم غار منیٰ میں تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۂ مرسلات نازل ہوئی اور آپ پڑھتے تھے اور میں آپ کے منہ سے اُسے لے رہا تھا۔ پس یہ سورت مکّی ہے اور ابتدائی زمانہ کی ہے ؂

۳۵۱۱ء عرف۔ عُرف کے معنی وہی ہیں جو معروف کے معنی ہیں وامر بالعرف (الاعراف ۷-۱۹۹)

پہلے رسولوں اور مومنین کے حالات سے شہادت: مرسلات کے بارے میں تین قول ہیں یعنی ہوائیں یا فرشتے یا رسول۔ عاصفات کے بارے میں ایک ہی قول ہے یعنی ہوائیں۔ ناشرات کے بارے میں تین قول ہیں۔ ہوائیں۔ بارش۔ فرشتے۔ فارقات کے بارے میں دو قول ہیں۔ فرشتے قرآن کریم ملقیات سے مراد فرشتے لیے گئے ہیں (ج) اور بعض کے نزدیک پہلی دو ملائکہ کی جماعتیں ہیں۔ اور پچھلی تین قرآن کریم کی صفات ہیں (د) فرشتے یا رسول یا قرآن اگر مطلب ہو تو مراد ایسی جماعتیں ہونگی اور جواب قسم ہے کہ جو وعدہ دیا جاتا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ پس مراد ایسی جماعتیں ہو سکتی ہیں جو وعدۂ الٰہی کے وقوع پر بطور گواہ ہوں۔ ہوائیں یا بارش بھی ایک باریک رنگ میں یہ دلالت کرتی ہیں لیکن جیسا کہ آگے بالتصریح مذکور ہے الم نھلك الاولین یعنی پہلوں کی ہلاکت کا ذکر ہے اور پھر یوم الفصل کا ذکر ہے اور ویل یومئذ للمکذبین کو دوہرایا ہے تو یہ تمام باتیں ایک قطعی شہادت ہیں کہ والمرسلٰت میں مراد رسولوں کی جماعتیں ہیں یعنی جس قدر رسول گزر چکے ان سب کی زندگیاں اس بات پر شاہد ہیں کہ مکذب ہلاک کئے جاتے ہیں انما توعدون لواقع اور رسول ہی مرسلات عرفاً ہوتے ہیں جو معروف کو لے کر آتے اور معروف کو دنیا میں پھیلاتے ہیں اور دوسری صفت ان کی یہ بیان کی ہے کہ وہ عصف کو یعنی وہ چھلکا یا پتے وغیرہ جو چورا ہو جاتے ہیں جنہیں بالفاظ دیگر خس و خاشاک کہنا چاہیے اس کو اڑا دیتے ہیں کیونکہ جب حق آتا ہے تو باطل چلا جاتا ہے اور اس میں ارشارہ ان لوگوں کی ہلاکت کی طرف بھی ہے جو زندگی سے محروم یعنی مردہ اور اخلاق کے لحاظ سے خس و خاشاک کے حکم میں ہوتے ہیں اور باطل کو بھی

عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۙ﴿۶﴾ — عذر کے لیے یا ڈرانے کو ۳۵۱۲ ؎

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۷﴾ — جو تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے وہ ضرور ہو کر رہے گا۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ﴿۸﴾ — پس جب تاروں کی روشنی جاتی رہے۔

وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۙ﴿۹﴾ — اور جب آسمان پھٹ جائے۔

وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۙ﴿۱۰﴾ — اور جب پہاڑ اُڑا دیے جائیں

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ؕ﴿۱۱﴾ — اور جب رسولوں کا وقت مقرر آجائے ۳۵۱۳ ؎

لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ ؕ﴿۱۲﴾ — کس دن کے لیے دیر کی جاتی ہے۔

لِیَوْمِ الْفَصْلِ ۚ﴿۱۳﴾ — فیصلے کے دن کے لیے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ ؕ﴿۱۴﴾ — اور تجھے کیا معلوم ہے فیصلے کا دن کیسا ہے۔

وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۱۵﴾ — اس دن جھٹلانے والوں کے لیے افسوس ہے۔

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِیْنَ ؕ﴿۱۶﴾ — کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا۔

ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۷﴾ — پھر ہم پچھلوں کو اُن کے پیچھے بھیجیں گے ۳۵۱۴ ؎

خس و خاشاک سے مثال دی جاتی ہے۔ پس یہ دونوں رسولوں کی صفات ہیں اور اس کے بعد بجائے فا کے واؤ سے شروع کیا یعنی والناشرات نشرا۔ تو یہ گویا اور قسم کی جماعتیں ہیں جو رسولوں کے ساتھ مل کر حق کو دور دور پہنچا دیتی ہیں اور ان ناشرات یعنی حق کو پھیلانے والی جماعتوں کی دو صفات بیان کیں۔ ایک یہ کہ وہ فارقات ہیں یعنی اپنے اعمال کے لحاظ سے حق و باطل میں فرق کرنے والی ہوتی ہیں اور ان کی زندگیاں حق و باطل میں فرق کا ایک نمونہ بن جاتی ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ ذکر کو لوگوں کے سامنے پیش کرتی ہیں یعنی ان کا کام بھی یہی ہوتا ہے کہ جو بات رسولوں پر نازل ہوئی اسے دوسرے لوگوں تک پہنچا دیں گویا ان پانچ آیتوں میں رسولوں اور ان کے ساتھیوں کی زندگیوں کو بطور شہادت پیش کیا ہے اور ساتھ ہی گویا رسول کریم صلعم اور آپ کے صحابہ کی زندگیوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ وہی کام کر رہے ہیں جو رسول اور ان کے ساتھی دنیا میں کیا کرتے تھے ؛

۳۵۱۲ ؎ عذراً اَو نذراً یہ دونوں مصدر ہیں۔ عذرا عَذَرَ سے گناہ کی نجاست کو دور کیا دیکھو ۱۳۱۶ ؎ اور نذرا یعنی ڈرانے کے لیے۔ گویا ان کا وہ ذکر پہنچانا دو غرضوں کے لیے ہوتا ہے بعض سے گناہ کی نجاست کو دور کر دیتے ہیں اور بعض کو ڈراتے ہیں کہ اگر وہ بدی اور حق کی مخالفت پر اصرار کرینگے تو ہلاک ہو جائینگے ؛

۳۵۱۳ ؎ فرجت ۔ فرج دو چیزوں کے درمیان شق ہے۔ اور فرجت کے معنی ہیں انشقت (غ)

اقتت ۔ وَقت غایت زمانہ ہے جو کسی عمل کے لیے مقرر کیا گیا ہو وَقَّتُّ کذا اس کے لیے میں نے وقت مقرر کیا کتاباً موقوتا (النساء۔۱۰۳) (غ) اور وَقَّتَ الشیٔ کے معنی ہیں اس کی حد بیان کر دی اور توقیت تحدید اوقات ہے (ل) اور یہاں یوں بھی معنی کیے گئے ہیں بلغت میقاتھا الذی کانت تنتظرہ (ر) یعنی اس وقت مقرر کو پہنچ گئے جس کا انتظار کرتے تھے ؛

طمس نجوم وغیرہ سے مراد: یہ چاروں باتیں اس وعدہ عذاب پر بھی صادق آتی ہیں جو مخالفین حق کو اس دنیا کے متعلق دیا گیا تھا۔ اور آخرت پر بھی اور ستاروں کی روشنی جاتے رہنے سے اور آسمان کے پھٹنے سے اور پہاڑوں کے اُڑنے سے بلحاظ قیامت تو معنی ظاہر ہیں اور اس دنیا کے وعدے کے لحاظ سے مرادرات کی تاریکی کا دور ہونا اور آسمان کا روشنی سے پھٹ پڑنا اور مخالفت کا اُڑ جانا ہوگا اور رسولوں کے وقت مقرر کا آ جانا ایک صورت میں قیامت اور دوسری صورت میں باطل کی شکست ہے اور یا اشارہ آخری رسول کے آنے کی طرف ہے جس کی پیشگوئی سب نبیوں نے کی تھی ؛

۳۵۱۴ ؎ اٰخرین سے مراد یہاں آخری رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہیں۔ خواہ وہ سامنے موجود ہوں یا پیچھے آنے والے مطلب یہ ہے کہ سب کے ساتھ ایک ہی معاملہ ہوتا رہے گا اور مفسرین نے اہل مکہ مراد لیے ہیں۔ مگر دیکھو ۳۵۱۷ ؎ یہاں مراد آخرین سے بالخصوص پچھلے زمانہ کے لوگ ہیں۔ یعنی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پچھلے زمانہ میں آنے والے ہیں ؛

كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ اسی طرح ہم مجرموں سے سلوک کرتے ہیں۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۹﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے افسوس ہے۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾ کیا ہم نے تمھیں حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا۔

فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾ پھر اسے ایک محفوظ جگہ میں رکھا۔

اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾ ایک مقرر اندازے تک۔

فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾ سو ہم اندازہ کرتے ہیں تو کیا ہی اچھا ہم اندازہ کرنے والے ہیں۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے افسوس ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ کیا ہم نے زمین کو سمیٹ لینے والی نہیں بنایا ۳۵۱۵

اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾ (کیا) زندوں کو اور (کیا) مُردوں کو

وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّ اور اس میں بڑے بڑے اونچے پہاڑ بنائے اور تمھیں

اَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾ میٹھا پانی پلایا ۳۵۱۶

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے افسوس ہے۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾ اس کی طرف چلو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ تین شاخوں والے سائے کی طرف چلو

لَّا ظَلِيْلٍ وَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ نہ سایہ دینے والا اور نہ شعلے سے بچاتا ہے۔

اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ وہ چنگاریاں پھینکتا ہے جیسے محل۔

كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ گویا وہ زرد اُونٹ ہیں ۳۵۱۷

۳۵۱۵ کفاتا۔ کَفت کے معنی قبض یعنی لینا اور جمع یعنی اکٹھا کر لینا ہیں اور زمین کو کفات کہنے سے مراد ہے کہ سب لوگوں کو جمع کیے ہوئے ہے خواہ مُردے ہوں خواہ زندے اور کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ وہ زندوں کو اپنے ساتھ لگائے ہوئے ہے (یعنی اپنی طرف کھینچے ہوئے) جیسے انسان حیوان وغیرہ اور مردوں کو جیسے جمادات اور کفات ' نہایت تیز چلنے کو بھی کہتے ہیں اور کَفت سخت چلانے کو بھی کہتے ہیں (غ) تو یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ زمین کو ایسا بنایا کہ تمام چیزیں اس کی طرف کھچی رہتی اور اس کے ساتھ لگی رہتی ہیں اور یہ اس کی کشش ثقل کی طرف اشارہ ہے اور یوں بھی کہ احیاء و اموات کو ساتھ لیے تیز چلتی رہتی ہے دونوں صورتوں میں یہ بھی قرآن کریم کے ان انکشافات علمی کی ایک مثال ہے جن کا اس کے نزول کے وقت دنیا کو علم نہ تھا ۞

۳۵۱۶ شٰمخٰت۔ شمخَ الجبلُ پہاڑ بہت بلند ہوا اور شامخ بہت اونچے پہاڑ کو کہتے ہیں اور متکبر کو بھی شامخ کہتے ہیں (ل) ۞

۳۵۱۷ ظِلّ ہر ایک ڈھانک لینے والی چیز کو بھی کہا جاتا ہے خواہ وہ محمود ہو یا مذموم جیسے یہاں اور ظل من یحموم (الواقعۃ ۵۶-۴۳) یہ مذموم ہے (غ)

شُعَب۔ شُعبہ کی جمع ہے (اور شعب کی جمع شُعُوب ہے دیکھو ۳۱۲۶) اور تنہ کا شعبۃ شاخ ہے اور شاخ کا شعبۃ اس کی اطراف ہیں اور اس میں اختراق کے معنی کی طرف رجوع ہے اور شُعبۃ ہر شے سے ایک ٹکڑا یا طائفہ ہے جیسے الحیاء شعبۃ من الایمان (ل)

لَهَب آگ کا جل اُٹھنا یا شعلہ مارنا ہے اور لہیب شعلہ ہے اور دھوئیں اور غبار کو بھی لہب کہا جاتا ہے (غ)

شَرَر واحد شررۃ ہے اور شرار النار وہ چیز ہے جو آگ میں سے اڑتی ہے یعنی چنگاریاں کیونکہ ان سے شر پہنچتی ہے (غ)

قصر بخاری میں ہے کہ ابن عباس نے اس لفظ کی تفسیر میں فرمایا کہ ہم تین تین ہاتھ کی یا اس سے کم جلانے کی لکڑیاں جاڑوں میں جلانے کے لیے

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾ — اس دن جھٹلانے والوں کے لیے افسوس ہے۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ — یہ وہ دن ہے کہ وہ بات نہ کریں گے۔

وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ — اور نہ انھیں اجازت دی جائے گی کہ عذر پیش کریں۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۷﴾ — اس دن جھٹلانے والوں کے لیے افسوس ہے۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ — یہ فیصلے کا دن ہے ہم نے تمھیں اور پہلوں کو اکٹھا کیا ۳۵۱۸

فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ — سو اگر تمھارے پاس کوئی حیلہ ہے تو میرے خلاف حیلہ کرو۔

ع ۱ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾ — اس دن جھٹلانے والوں کے لیے افسوس ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ — متقی سایوں اور چشموں میں ہیں۔

وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ — اور پھلوں میں جن کو وہ چاہیں۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ — خوشگواری سے کھاؤ اور پیو، اس کا بدلہ جو تم کرتے تھے۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ — اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ — اس دن جھٹلانے والوں کے لیے افسوس ہے۔

كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ — کھاؤ اور تھوڑا فائدہ اٹھالو، کیونکہ تم مجرم ہو۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾ — اس دن جھٹلانے والوں کے لیے افسوس ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾ — اور جب انھیں کہا جاتا ہے جھک جاؤ جھکتے نہیں۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ — اس دن جھٹلانے والوں کے لیے افسوس ہے۔

ع ۲ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ — سو اس کے بعد کس کلام پر ایمان لائیں گے۔

کھجوڑتے تھے انہیں قصر کہتے تھے اور قصر محل کو بھی کہتے ہیں اور ابن جریر کہتے ہیں کہ زبان عربی میں اونٹوں کو محلوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔
پرستاران صلیب کو خطاب: حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ صلیب کے پرستاروں کو کہا جائے گا (ر) اور تین شاخوں والے سائے کا ذکر تثلیث کا عقیدہ رکھنے والی قوم کے لیے موزون بھی ہے۔ اور یہاں ظلّ کو تین شاخوں والا کہا ہے اور فی الحقیقت تو وہ سایہ نہیں بلکہ کوئی عذاب ہے جو مکذبین حق کو ڈھانک لیتا ہے پس اس کی تین شاخوں سے مراد اس کے اندر تین قسم کی تکلیف ہے اور ان تین شاخوں کا ذکر بھی خود قرآن کریم نے کر دیا ہے ظل کے لیے دیکھو ع ۶۷۶ اس کے تین معنی ہیں۔ سایہ۔ حفاظت آسایش تو تین شاخوں کے ذکر میں انہی تین باتوں کی نفی کی ہے۔ چنانچہ اول فرمایا کہ وہ ظلیل نہیں یعنی سایہ کا کام نہیں دیتا نہ اس میں کوئی ٹھنڈک ہے اور حفاظت کے معنی کے مقابل پر فرمایا کہ وہ آگ سے بھی نہیں بچاتا یعنی حفاظت کا کام نہیں دیتا اور آسایش کے معنی کے مقابل پر فرمایا کہ اس سے شرارے نکلتے ہیں اور ان کو محلوں سے اور زرد اونٹوں سے تشبیہ دی ہے یہ تشبیہ بھی بلحاظ ان شراروں کی جسامت اور ان کے رنگ کے صحیح ہے اور ان لفظوں کے اختیار کرنے میں یہ اشارہ بھی ہے کہ وہ آسایش جو وہ محلات میں چاہتے تھے۔ اب شراروں کے رنگ میں وہی محلات ان کے دکھ کا موجب ہیں۔ اور وہ دولت جو وہ اونٹوں میں خیال کرتے تھے اسی سے انہیں عذاب ملے گا ؛

ع ۳۵۱۸ قیامت کے دن تو سب اکٹھے ہونگے۔ مگر اس دنیا میں بھی ایک یوم الفصل آتا ہے جب حق و باطل الگ الگ ہو جاتے ہیں اس دن پہلوں اور پچھلوں کا اکٹھا کرنا بلحاظ سزا کے ہے یعنی ذات و عذاب میں وہ اکٹھے ہو جاتے ہیں ؛

(۷۸) سُوْرَةُ النَّبَاِ مَكِّيَّةٌ

اٰیَاتُهَا ۴۰ — رُکُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ①
کس (بات) کا ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں۔

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ②
بڑی بھاری خبر کے متعلق۔

الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ③
جس کے بارے میں وہ اختلاف کر رہے ہیں ع۳۵۱۹

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ④
یُوں نہیں، یہ جان لیں گے۔

ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ⑤
ہاں یُوں نہیں، یہ جان لیں گے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ⑥
کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا؟

وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ⑦
اور پہاڑوں کو میخیں ع۳۵۲۰

وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ⑧
اور ہم نے تمھیں جوڑے جوڑے پیدا کیا۔

وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ⑨
اور ہم نے تمھاری نیند کو آرام (کا موجب) بنایا۔

وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ⑩
اور ہم نے رات کو پردہ بنایا۔

وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ⑪
اور دن کو ہم نے معاش کے لیے بنایا۔

وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ⑫
اور ہم نے تمھارے اوپر سات مضبوط (آسمان) بنائے۔

وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ⑬
اور ہم نے سورج کو روشنی اور گرمی دینے والا بنایا ع۳۵۲۱

تمہید سورت: اس سورت کا نام النباء ہے اور اس میں دو رکوع اور چالیس آیتیں ہیں۔ النباء اس خبر کو کہتے ہیں جس سے عظیم الشان فائدہ حاصل ہو۔ اور یہاں اس لفظ میں اشارہ اسی یوم الفصل کی طرف ہے جس کا ذکر پچھلی سورت میں تھا اور یہ یہاں صراحت سے بیان بھی کر دیا ہے۔ یوں پچھلی سورت کے مضمون کو جاری رکھا ہے۔ یہ سورت بھی ابتدائی مکّی زمانہ کی ہے ٭

ع۳۵۱۹ النباء العظیم سے مراد قرآن یا امر نبوت بھی لیا گیا ہے اور بعث بعد الموت بھی اور کفار کا باہم اختلاف قرآن کے متعلق ہی تھا کہ یہ کیسا کلام ہے کوئی اسے سحر کہتا تھا کوئی شعر۔ کوئی افترا۔ کوئی پریشان خوابیں۔ کوئی کاہن کا قول۔ مگر اختلاف سے مراد آنحضرت صلعم سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے یعنی آپ کی مخالفت نباء عظیم وہی یوم الفصل ہے جس کا ذکر پچھلی سورت میں بھی تھا اور آگے بھی آنا ہے اور آگے کلّا اسی مخالفت پر زجر کے طور پر ہے ٭

ع۳۵۲۰ زمین کو مہاد کہا ہے یعنی تیار کی ہوئی جگہ یا وہ جگہ جس پر پھرا جاتا ہے (غ) اور پہاڑوں کو میخوں سے تشبیہ دی ہے (اوتاد کے لیے دیکھو ع۲۸۲۶) اس لیے کہ وہ ظاہر صورت میں سطح زمین پر میخوں کی طرح ہیں اور پہاڑوں کے ساتھ ہی اس کی ابتدائی حالت تزلزل کا خاتمہ ہوا۔ اللہ تعالےٰ کی مخلوق میں مختلف چیزوں کے وجود میں اپنی حکمت کا بیان کیا ہے حتّٰی کہ دن اور رات بھی اپنی اپنی جگہ کام دیتے ہیں اور نیند کو سبات کہا ہے۔ اسی کے قریب لفظ الفرقان ۲۵ - ۴۷ میں ہیں مگر وہاں دن کو نشورا کہا ہے اور یہاں معاشا اور نشور کے لفظ میں جی اٹھنے کی طرف اشارہ کر کے بتایا ہے کہ موت نیند کی طرح ہے اور اس نیند کے بعد ضرور ہے کہ پھر دن آئے اور وہی قیامت یا جی اُٹھنا ہے ٭

ع۳۵۲۱ دھاج - دھج آگ سے روشنی اور گرمی کا حاصل ہونا ہے۔ اسی سے دھّاج روشنی دینے والا ہے (غ) یا روشنی اور گرمی پہنچانے والا ٭

وَّ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾	اور ہم بادلوں سے زور سے برستا ہوا پانی اتارتے ہیں ۳۵۲۲
لِّنُخۡرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا ﴿۱۵﴾	تاکہ ہم اس کے ساتھ غلّہ اور سبزی نکالیں۔
وَّ جَنّٰتٍ اَلۡفَافًا ﴿۱۶﴾	اور گھنے باغ۔
اِنَّ يَوۡمَ الۡفَصۡلِ كَانَ مِيۡقَاتًا ﴿۱۷﴾	بیشک فیصلے کے دن کا وقت مقرر ہے۔
يَّوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا ﴿۱۸﴾	جس دن صُور پھونکا جائے گا تو تم فوج فوج ہو کر آؤ گے۔
وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتۡ اَبۡوَابًا ﴿۱۹﴾	اور آسمان کھول دیا جائیگا سو دروازے ہو جائیں گے۔
وَّ سُيِّرَتِ الۡجِبَالُ فَكَانَتۡ سَرَابًا ﴿۲۰﴾	اور پہاڑ اُڑائے جائیں گے سو وہ ریت ہو جائیں گے ۳۵۲۳
اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتۡ مِرۡصَادًا ﴿۲۱﴾	دوزخ گھات میں ہے۔
لِّلطّٰغِيۡنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾	وہی سرکشوں کا ٹھکانا ہے۔
لّٰبِثِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَحۡقَابًا ﴿۲۳﴾	اس میں برسوں رہیں گے
لَا يَذُوۡقُوۡنَ فِيۡهَا بَرۡدًا وَّ لَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾	نہ اس میں ٹھنڈک پائیں گے اور نہ پینے کی چیز۔
اِلَّا حَمِيۡمًا وَّ غَسَّاقًا ﴿۲۵﴾	سوائے اُبلتے ہوئے اور سخت ٹھنڈے پانی کے۔
جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾	بدلہ موافق (اعمال ہے) ۳۵۲۴
اِنَّهُمۡ كَانُوۡا لَا يَرۡجُوۡنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾	کیونکہ وہ حساب کی اُمید نہ رکھتے تھے۔
وَّ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾	اور ہماری آیتوں کو جھوٹ قرار دیتے ہوئے جھٹلاتے تھے ۳۵۲۵
وَكُلَّ شَىۡءٍ اَحۡصَيۡنٰهُ كِتٰبًا ﴿۲۹﴾	اور ہر چیز کو ہم نے کتاب میں محفوظ کر لیا۔

۳۵۲۲ معصرات۔ مُعۡصِر وہ بادل ہے جو مینہ برسانے کے قریب ہے اور ابن عباس نے معصرات ہواؤں کو کہا ہے اور بعض نے خود بارشوں کو (ل)۔
ثجاج۔ ثَجّ بہت بہانا یا بہت پانی کا بہانا ہے اور مَطَرٌ ثجاج زور سے برسنے والی بارش ہے۔
سبعًا شدادا نظام شمسی کے سات سیارے ہیں علاوہ زمین کے۔ اور اس کا ذکر کر کے پھر سورج کا ذکر کیا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی طرف توجہ دلائی کہ کس طرح ایک چیز دوسری سے وابستہ ہے سورج کی گرمی مینہ برسانے کا موجب ہے اس لیے کہ سورج کی گرمی سے سمندروں کا پانی بخارات کی صورت میں منتقل ہوتا ہے اور تب پانی برستا ہے پھر پانی سے سبزیاں نکلتی ہیں اور باغوں کے باغ بن جاتے ہیں اس لیے سب باتوں کا نتیجہ فرمایا کہ یوم الفصل بھی ایک وقت مقرر ہے چھ سو سال کی گرمی نے زمین کے بخارات کو اٹھا کر ابر رحمت محمد رسول صلعم کی صورت میں برسایا اور اس سے مردہ دلوں میں باغات بنا دیئے۔

۳۵۲۳ عذاب دنیا کا نقشہ عذاب آخرت کے رنگ میں: یہ دوسری حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ یعنی یوم الفصل کا۔ سورت کے آخر پر انا انذرنکم عذابا قریبا صاف بتایا ہے کہ ان آیات میں عذاب دنیوی کا بھی ذکر ہے جو عذاب قیامت کا پیش خیمہ ہے۔ تو اس صورت میں فوج فوج ہو کر آنا یدخلون فی دین اللہ افواجا کا مصداق ہے اور آسمان کا کھولا جانا یوم تشقق السماء بالغمام (الفرقان۔۲۵) کا مصداق ہے اور پہاڑوں کے اڑائے جانے پر دیکھو ۱۶۲۳۔

۳۵۲۴ جزا کا مطابق اعمال ہونا: غساق دیکھو ۲۸۵۴ وفاق دیکھو ۶۵۴ جزاء وفاقا ایک اصول عذاب کے معاملہ میں قایم کرتا ہے عذاب میں ایک طرف حمیم یعنی اُبلتا ہوا پانی ہے دوسری طرف غساق یا شدت کا ٹھنڈا یہ حقوق میں افراط و تفریط کا نتیجہ ہے یا نفرت و محبت میں حد سے نکل جانے کا نتیجہ اور پہلی آیت میں برد کے لیے دیکھو ۲۳۳۷ کہ مراد اس سے راحت کی زندگی ہے۔

۳۵۲۵ کذابا۔ کذّاب اور تکذیب کے ایک ہی معنی ہیں اور آیت ۳۵ میں لایسمعون فیھا لغوا ولا کذابا۔ میں یہی معنی ہیں یعنی وہ ایک دوسرے کو نہیں جھٹلائیں گے اور نفی تکذیب سے نفی کذب خود لازم آتی ہے (غ)۔

ع فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ع ﴿۳۰﴾	سو چکھو، ہم تم پر عذاب ہی بڑھاتے جائیں گے ۳۵۲۶
اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾	متقیوں کے لیے کامیابی ہے۔
حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا ﴿۳۲﴾	باغ اور انگور۔
وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۳﴾	اور نوجوان ہم عمر۔
وَّ كَاْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾	اور پاک پیالہ ۳۵۲۷
لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا ع ﴿۳۵﴾	وہ اس میں لغو نہیں سُنیں گے۔ اور نہ جھٹلانا۔
جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾	تیرے رب کی طرف سے بدلہ عطائے کافی ۳۵۲۸
رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا	آسمانوں اور زمین کا رب اور جو اُن کے درمیان ہے۔
الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ع ﴿۳۷﴾	بے انتہا رحم والا، وہ اس سے کوئی بات نہیں کرسکیں گے ۳۵۲۹
يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا	جس دن رُوح اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے،
لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ	وہ کوئی بات نہ کرسکیں گے، سوائے اس کے جسے رحمان
الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾	اجازت دے اور وہ درست بات کہے ۳۵۳۰
ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ج فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ	یہ دن حق ہے، سو جو کوئی چاہے اپنے رب کی طرف
اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾	ٹھکانا بنائے۔
اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۵ يَّوْمَ	ہم تمھیں ایک قریب عذاب سے ڈراتے ہیں، جس دن
يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَ يَقُوْلُ	انسان دیکھ لے گا، جو اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے
ع الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ع ﴿۴۰﴾	بھیجا اور کافر کہے گا، کاش میں مٹی ہوتا ۳۵۳۱

۳۵۲۶ یہ بھی جزائے وفاق کے طور پر ہی ہے جس طرح مجرم ایک گناہ کرکے اس پر بڑھتا چلا گیا اسی طرح عذاب اس پر بڑھتا چلا جائے گا جب تک اللہ تعالیٰ چاہے اوپر احقاب کا لفظ لاکر صاف بتا دیا ہے کہ یہ ایک مدت معینہ ہے دیکھو ۱۹۳۷ و ۱۵۰۶ ۔

۳۵۲۷ کواعب۔ کاعب کی جمع ہے اور جاریۃ کاعب اس لڑکی کو کہا جاتا ہے جس پر جوانی کا اُبھار آگیا ہو (ل) ۔

دہاق ۔ اِدہاق پیالے کا اوپر تک بھرنا ہے اور دہاق کے معنی بھرا ہوا بھی ہیں اور صافی بھی (ل) ۔

۳۵۲۸ حساب یہاں بمعنی کافی ہے کیونکہ حَسْبِیْ کذا کے معنی ہیں وہ شے مجھے کافی ہے اور عمل بھی مراد لیا گیا ہے کیونکہ منتہائے عمل حساب ہے (غ)

۳۵۲۹ لایملکون منہ خطابا۔ منہ خطاب کیلئے بیان مقدم ہے یعنی کسی قسم کا خطاب کرنے کا اختیار نہیں رکھتے ۔

۳۵۳۰ صواب ایک شے کے اپنے نفس کے اعتبار کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے جب کوئی شے بروئے عقل و شریعت پسندیدہ اور محمود ہو تو اسے صواب کہا جاتا ہے ۔ اور صواب یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنے مقصود کو پالے خواہ مذموم ہو یا محمود (غ) اس کے لیے دیکھو ۲۸۴۲ یہاں پہلے معنی مراد ہیں ۔
فرشتوں اور روح کا قیام: فرشتوں اور روح کے کھڑا ہونے پر دیکھو ۳۴۲۵ اور بیہقی کی روایت ہیں الاسماء والصفات میں ابن عباس سے ہے کہ الروح سے مراد ارواح الناس ہیں (ر) اور جیسا کہ نوٹ مذکور میں دکھایا گیا ہے اصل مراد مومنین کے ارواح ہیں اور فرشتوں کا ان کے ساتھ کھڑا ہونا اسی طرح ہے جس طرح جنّ و شیاطین بدکاروں کے ساتھ حاضر کیے جائیں گے ۔

۳۵۳۱ عذابا قریبًا سے مراد عذاب آخرت بھی لیا گیا ہے اور اس کا قرب اس کے تحقق کے لحاظ سے ہے اور قتادہ کے نزدیک یہ گناہ کی پاداش ہے جو قریب تر ہے اور مقاتل نے یوم بدر مراد لیا ہے (ر) اور ظاہر الفاظ اسی آخری معنی کو چاہتے ہیں یعنی عذاب دنیا کی طرف اشارہ ہے اور یوم ینظر المرء اس پر بھی صادق آتا ہے اس لیے کہ یہ بھی ایک رنگ نتیجہ اعمال کا ظاہر کر دینا ہے اور کافر اس وقت بوجہ ذلت کے چاہتے ہیں کہ مر کر مٹی ہو چکے ہوتے اگلی سورت کا مضمون بھی اسی معنی کو چاہتا ہے ۔

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ مَكِّيَّةٌ (۷۹)

آیاتھا ۴۶ — رکوعاتھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔
وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا ①	گواہ ہیں ڈوب کر نکال لینے والی۔
وَّ النّٰشِطٰتِ نَشْطًا ②	اور خوشی سے آگے چلنے والی۔
وَّ السّٰبِحٰتِ سَبْحًا ③	اور تیزی سے شغل میں لگ جانے والی۔
فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ④	پھر سبقت کرتی ہوئی آگے بڑھ جانے والی۔
فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ⑤	پھر معاملہ کی تدبیر کرنے والی (جماعتیں)۔ ۳۵۳۲

تمہید سورت: اس سورت کا نام النّٰزعٰت ہے اور اس میں دو رکوع اور چھیالیس آیتیں ہیں نازعات کے معنی اپنے آپ کو کھینچ کر نکال لینے والی جماعتیں ہیں اور اشارہ اس نام کے اختیار کرنے میں یہ ہے کہ مدارج روحانی کا یہ پہلا مرتبہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو خواہشات نفسانی سے کھینچ کر باہر نکال لے پھر اس کے آگے دوسرے مراتب ہیں جو انسان کو اس کے کمال روحانی تک پہنچاتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی اشارہ ہے کہ اعدائے اسلام کے لیے سزا جو آنے والی ہے تو وہ جنگوں کے رنگ میں آنے والی ہے۔ سورت ابتدائی مکی زمانہ کی ہے۔ مضمون کا تعلق ظاہر ہے ؂

۳۵۳۲ نزعٰت۔ نَزْع کے اصل معنی جذب یعنی کھینچنا اور قلع یعنی جگہ سے نکال دینا ہیں نَزَعَ القَوْسَ کمان کو کھینچا۔ اور انسان کے متعلق جب وہ کسی چیز سے محبت کرے اور اس کا نفس اسے اس کی طرف کھینچتا ہوا لے جائے کہا جاتا ہے یَنْزِعُ اِلَیہ نزاعًا اور نَزَعَ الانسان الی اھلہ کے معنی ہیں حَنَّ و اشْتاقَ یعنی اپنے اہل کی طرف آرزو کی اور مشتاق ہوا اور نُزَّاعُ القبائل ان کے غرباء کو کہا جاتا ہے یعنی ان لوگوں کو جو ان قبائل کی پناہ میں ہیں مگر ان میں سے نہیں اور اس کا واحد نازِع ہے اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا طوبی للغرباء اور فرمایا کہ غرباء نُزَّاع ہیں یعنی جو شخص اپنے اہل اور کنبہ سے دور ہو گیا اور غائب ہو گیا گویا نُزَّاع سے مراد مہاجرین ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے وطنوں کو ترک کر دیا۔ اور نَزَعَ فی القَوْس ونزع قوس کو کھینچا اور نازع رامی یعنی تیر چلانے والے کو کہتے ہیں (ل)

غرقًا۔ غرق پانی میں ڈوبنا ہے اور قرضہ یا اور مصائب میں مبتلا ہو جانے پر بھی بولا جاتا ہے اور اَغْرَقَ النَّبل کے معنی ہیں بلغ به غایة المدّ فی القوس یعنی کمان میں جس قدر تیر کو کھینچا جا سکتا تھا کھینچا اور کہا جاتا ہے نزع فی قوسه فاغرق۔ اور اغرق کے معنی طرح طرح بھی کیے گئے ہیں یعنی تیر کو شدت نزع سے بہت دور پھینکا اور یہاں غرق بمعنی اِغراق ہے اور حضرت علی کی حدیث میں ہے لقد اَغْرق فی النَّزع جس کے معنی ہیں بالغ فی الامر وانتھی فیه یعنی ایک امر کو کمال کو پہنچایا اور اس کے انجام کو پہنچا (ل)

نشطٰت۔ نشاط ضد کسل ہے نَشِطَ الانسانُ عمل کے لیے اپنے نفس کو طیب بنایا (یعنی خوشی سے ایک کام کو کیا) اور نَشَطْتُ الحبلَ رسّے کو کھول دیا اور نَشَطَ الدَّلوَ من البئر یعنی بغیر وقفہ کے ایک ہی دفعہ ڈول کو کنوئیں سے کھینچ لیا۔ (ل) اور نشط کی تخصیص اس بات پر تنبیہ ہے کہ ان پر وہ امر سہل ہے اس لیے کہ نَشْط وہ گانٹھ ہے جس کا کھولنا آسان ہے (غ) ؂

مفسرین کے اقوال حسب ذیل ہیں نازعات سے مراد فرشتے ہیں جو کافر کی جان نکالتے ہیں یا موت یا ستارے جو افق سے افق کی طرف جاتے ہیں۔ یا کمانیں۔ اور ناشطات سے مراد فرشتے ہیں جو مومن کی روح قبض کرتے ہیں یا موت یا ستارے یا رسے اور سابحات سے مراد ستارے یا فرشتے ہیں اور سابقات سے مراد فرشتے یا موت یا گھوڑے یا ستارے ہیں۔ اور مدبرات سے مراد فرشتے ہیں یا ستارے (ج) اور نازعات کی تفسیر سدی سے مروی ہے جو کہتے ہیں کہ یہ نفوس انسانی کی جماعت ہے جو موت کے ساتھ اپنے رب کی طرف نکلتی ہے۔ اور ناشطات کی تفسیر ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ وہ نفوس مومنہ ہیں جو موت کے وقت خوشی سے دوسرے عالم کی طرف انتقال کرتے ہیں اور سابقات کی تفسیر ابن مسعود سے مروی ہے جو کہتے ہیں کہ یہ وہ نفوس انسانی ہیں جو قبض کے وقت ملائکہ کی طرف سبقت کرتے ہیں (ر) تو یوں یہ سب بزرگ نازعات۔ ناشطات۔ سابقات کی تفسیر نفوس انسانی سے کرتے ہیں اس لیے ان سے مراد نفوس انسانی کی ترقیات روحانی بھی لی گئی ہیں جو سلوک اور تطہیر ظاہر و باطن میں انہیں پیش آتی ہیں۔ یعنی وہ شہوات سے اپنے آپ کو باہر نکالتے ہیں اور عالم قدس کی طرف نشاط سے چلتے ہیں اور مراتب ارتقاء میں تیرتے ہیں اور کمالات کی طرف سبقت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ دوسروں کی تکمیل کرنے کے اہل ہو جاتے ہیں (ر) اور نازعات سے مراد لڑنے والے ہونا بھی عطاء سے مروی ہے جو کہتے ہیں کہ یہ کمانوں کو کھینچنے والے ہیں (ر) اور باقی صفات بھی انہی کی ہو سکتی ہیں اور جواب قسم یہاں محذوف ہے مگر اس کی طرف اشارہ یوم ترجف الراجفة میں ہے اور اگر جواب

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ﴿٦﴾	جس دن کانپنے والی کانپ اُٹھے گی۔
تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ؕ﴿٧﴾	پیچھے آنے والی اس کے پیچھے آئے گی ۳۵۳۳
قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ﴿٨﴾	(کچھ) دل اس دن دھڑکتے ہوں گے۔
اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۘ﴿٩﴾	اُن کی نظریں نیچی ہوں گی۔
يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ؕ﴿١٠﴾	کہتے ہیں کیا ہم اُلٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے ۳۵۳۴
ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ؕ﴿١١﴾	کیا جب ہم کھوکھلی ہڈیاں ہو جائیں گے ۳۵۳۵
قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۘ﴿١٢﴾	کہتے ہیں یہ لوٹنا نقصان والا ہے۔
فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ﴿١٣﴾	وہ تو صرف ایک ہی ڈانٹ ہوگی۔
فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ؕ﴿١٤﴾	اور وہ ایک میدان میں ہوں گے ۳۵۳۶
هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۘ﴿١٥﴾	تجھے موسیٰؑ کی خبر تو پہنچ چکی ہے۔

قسم حقانیت بعثت کو بھی مانا جائے تو اس میں قیامت روحانی اور قیامت کبریٰ دونوں آجائیں گی اس لیے شہادت میں مومنین کی جماعتوں کو پیش کیا ہے اور لفظ ایسے اختیار فرمائے ہیں جو ان کے ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے کمالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں یعنی ظاہری رنگ میں جنگ کی طرف اشارہ ہے۔ اور نازعات سے مراد زبردست تیر چلانے والے ہیں اور ناشطات سے مراد خوشی سے دشمن کے مقابلہ کے لیے نکلنے والے اور سابحات سے مراد تیزی سے کام میں لگ جانے والے۔ اور سابقات سے مراد دشمن کی طرف سبقت کرنے والے اور مدبرات سے مراد امور جنگ و امور ملکی کی تدبیر کرنے والے اور کمالات روحانی کی رو سے وہ مطلب ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اور ایک اور رنگ میں ہر انسان کو توجہ دلائی ہے کہ اس کی کامیابی کا رستہ کیا ہے اس کی سب سے پہلی سیڑھی نازعات کی ہے یعنی ایک امر کے اشتیاق میں ترقی کر کے اس شوق کو کمال تک پہنچانا جو غرق کا مصداق ہے اور دوسرا مرتبہ اس کا ناشطات ہے یعنی وہ بوجھ کے رنگ میں انسان نہ اٹھا رہا ہو بلکہ نشاط خاطر سے اس کی طرف متوجہ ہو اور تیسرا مرتبہ سابحات کا ہے یعنی جس طرح پر پانی یا ہوا میں ایک جسم تیرتا ہے کہ رکاوٹ بہت کم ہوتی ہے اسی طرح وہ عمل میں لگ جائے کیونکہ سبح کے معنی عمل میں تیزی سے گذرنا ہیں اور یہ گویا تین ضروریات ہر امر کی ہیں امر دین ہو یا امر دنیا۔ پہلا کمال اشتیاق اور محویت دوسرا انشاط خاطر کا حاصل ہونا تیسرا عمل میں تیزی سے لگ جانا اور باقی دو نتائج ہیں یعنی ایسے نفوس سبقت لے جاتے ہیں اور تدبیر امر کرنے کے بھی قابل ہو جاتے ہیں اور اصل غرض تو مومنوں کو توجہ دلانا ہے کہ دنیا میں خدا کا نام پھیلانے کے لیے کیا ضروریات ہیں امور دنیا ضمناً اس کے اندر آجاتے ہیں ؁

۳۵۳۳ مفسرین نے ترجف الراجفۃ سے مراد نفخہ اولیٰ اور تتبعہا الرادفۃ سے مراد نفخہ ثانیہ لیا ہے مگر آگے آتا ہے قلوب یومئذ واجفۃ ابصارہا خاشعۃ حالانکہ نفخہ ثانیہ کے ساتھ تو نتا ہی ہے اس وقت قلوب واجفۃ اور ابصار خاشعۃ کہاں۔ پس مراد رجف سے جنگ کے ساتھ زمین کا کانپ اُٹھنا ہے کیونکہ رجف کے اصل معنی اضطراب شدید ہیں دیکھو ۱۱۱۳ اور تتبعہا الرادفۃ میں بتایا کہ ان جنگوں کے بعد وہ عظیم الشان مصیبت ان پر آئے گی جس سے ان کے دل پریشان اور آنکھیں نیچی ہو جائیں گی یعنی ان کی ذلت اور مغلوبیت ؁

۳۵۳۴ حافرۃ حفر کے معنی کھودنا اور حُفرۃ مکان کے محفور کو یعنی کھودی ہوئی جگہ کو کہتے ہیں شفا حفرۃ من النار (آل عمران۳ - ۱۰۲) اور گھوڑے کے سم کو حافر اسی لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی دوڑ میں جگہ کو کھودتا جاتا ہے اور لمردودون فی الحافرۃ مثال کے طور پر ہے کہ جہاں سے آیا تھا وہیں لوٹایا گیا یا حافرۃ وہ زمین ہے جہاں ان کی قبریں تھیں اور مطلب یہ ہے کہ کیا ہم لوٹائے جائیں گے حالانکہ ہم قبروں میں ہیں۔ (غ) اور عرب کہتے ہیں اتیتُ فلاناً ثم رجعتُ علی حافرتی یعنی میں فلاں کے پاس گیا پھر اسی رستہ پر واپس لوٹ گیا اور حافرۃ خلقت اُولیٰ یعنی پہلی پیدائش ہے۔ اور حافرۃ کسی چیز میں عود کرنا ہے یہاں تک کہ اس کا آخر اس کے اول پر لوٹایا جائے اور یہاں مراد زندگی کی طرف لوٹایا جاتا ہے (ل) اور ءانا لمردودون سے نیا کلام شروع ہوتا ہے یعنی کافر اس وقت یوں کہہ رہے ہیں ؁

۳۵۳۵ نخرۃ نَخِیر ناک کی آواز کو کہتے ہیں اور نخر العَظْمُ سے مراد ہے ہڈی پرانی ہو گئی اور بوسیدہ ہو گئی یا اندر سے خالی ہو گئی اور ہوا کے ساتھ اس میں سے آواز آنے لگی اور ناخرۃ اور نخرۃ کے ایک ہی معنی ہیں (ل) ؁

۳۵۳۶ ساھرۃ۔ سَھَر جاگنا ہے اور ساھرۃ وجہ الارض ہے۔ کیونکہ وہ جانداروں کے سونے اور بیداری کی جگہ ہے یا بیابان ہے (غ)

إِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾ — جب اس کے رب نے اُسے وادیٔ مقدس طویٰ میں پکارا۔

اِذْهَبْ إِلٰى فِرْعَوْنَ إِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ — (کہ) فرعون کی طرف جا کہ وہ حد سے نکل گیا ہے۔

فَقُلْ هَلْ لَّكَ إِلٰٓى أَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ — اور کہہ کہ کیا تو چاہتا ہے کہ تو پاک ہو؟

وَأَهْدِيَكَ إِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ — اور میں تجھے تیرے رب کی طرف رستہ دکھاؤں سو تو ڈرے۔

فَأَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾ — سو اس نے اسے بڑا نشان دکھایا۔

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾ — مگر اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی۔

ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾ — پھر وہ کوشش کرتا ہُوا پھر گیا۔

فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾ — پھر (لوگوں کو) جمع کیا اور پکارا۔

فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلٰى ﴿۲۴﴾ — اور کہا میں تمہارا بڑا رب ہوں۔

فَأَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْأُوْلٰى ﴿۲۵﴾ — سو اللہ نے اُسے آخرت اور دنیا کی عبرتناک سزا میں پکڑا۔

ع إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾ — اس میں اس شخص کے لیے عبرت ہے جو ڈرتا ہے۔

ءَأَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَآءُ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ — کیا پیدائش میں تم زیادہ سخت ہو یا آسمان! اس نے اسے بنایا۔

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ — اس کی بلندی کو اونچا کیا، پھر اسے ٹھیک بنایا ۳۵۳۷

وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ — اور اس کی رات کو اندھیری بنایا اور اس کی روشنی نکالی ۳۵۳۸

وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ — اور زمین کو اس کے بعد بچھایا ۳۵۳۹

أَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ — اس سے اس کا پانی اور اس کا چارہ نکالا۔

۳۵۳۷ سمك۔ سَمَك مچھلی ہے اور سَمَكَة آسمان میں ایک برج کا نام ہے اور سَمْك بلندی ہے (ل)
یعنی تم کیا چیز ہو۔ وہ بلند آسمان جن کی بلندی کی انتہا کو بھی تم نہیں پا سکتے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے زیر فرمان اور اس کے قانون کے ماتحت ہیں۔ انسان اس کی فرمانبرداری اور اس کے قانون سے کس طرح نکل سکتا ہے۔

۳۵۳۸ اغطش۔ اَغْطَشَ کے معنی ہیں تاریک بنایا۔ اَغْطَش سے ہے جس کے معنی ہیں وہ شخص جس کی آنکھ میں ایک قسم کا اندھاپن ہے (غ)۔

۳۵۳۹ دحٰی کے معنی ہیں اَزَالَھَا عن مَقَرِّھا اس کی جائے قرار سے اسے ہٹایا جیسے کہتے ہیں دَحَی الْمَطَرُ الحَصٰی من وجہ الارض بارش نے کنکریوں کو زمین کی سطح سے ہٹا دیا (غ) اور دَحْو کے معنی بسط یعنی پھیلانا بھی ہیں اور پتھر وغیرہ کے پھینکنے پر بھی دَحْو کا لفظ بولا جاتا ہے ھو یَدْحُو بالحجر کے معنی ہیں اس نے پتھر پھینکا (ل) اس لفظ کے اختیار کرنے میں ایک عظیم الشان علمی بات کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا علم آج دنیا کو ہوتا ہے یعنی یہ کہ زمین اصل میں کسی بڑے جرم سماوی کا ایک حصہ ہے جو اس سے الگ ہو گیا اور پھر آہستہ آہستہ اس کے گرد حرکت کرتا کرتا ٹھنڈا ہو گیا۔ دحی کے لفظ میں یوں علیحدہ کرنے کی طرف اور پتھر کی طرح پھینک دینے کی طرف اشارہ ہے۔ اور پھر بعد ذٰلك کہہ کر یہ بھی بتا دیا کہ زمین کا بننا بعد میں وقوع میں آیا اور پھر اگلی آیت میں ایک اور علمی انکشاف کی طرف توجہ دلائی ہے یعنی یہ کہ پانی اور چارہ یعنی سبزیاں وغیرہ جو اس زمین پر ہیں وہ اسی زمین سے نکالے اور یہی آج علمی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ اول زمین پر پانی الگ ہوئے اور پھر ان پانیوں سے سبزیاں وغیرہ پیدا ہوئیں اور پھر پہاڑوں کو قائم کر کے اس پانی کے برسنے کا انتظام فرمایا جس پر انسان کی زندگی اور معاش کا مدار ہے۔

وَ الْجِبَالَ اَرْسٰهَا ﴿۳۲﴾ — اور پہاڑوں کو مضبوط بنایا۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾ — تمھارے لیے اور تمھارے چارپایوں کے لیے سامان۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿۳۴﴾ — سوجب غالب آنے والی مصیبت آجائے گی ۳۵۳۹

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾ — جس دن انسان یاد کرے گا جو اس نے کوشش کی۔

وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿۳۶﴾ — اور دوزخ اس کے لیے ظاہر ہوجائے گا جو دیکھتا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ — سو جس نے سرکشی کی۔

وَ اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ — اور دنیا کی زندگی کو مقدم کیا۔

فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾ — تو دوزخ ہی ٹھکانا ہے۔

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ — اور جو اپنے رب کے آگے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے اور نفس کو خواہش سے روکتا ہے ۳۵۴۰

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾ — تو بہشت ہی ٹھکانا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ﴿۴۲﴾ — وہ تجھ سے اس گھڑی کے متعلق سوال کرتے ہیں کب اس کا قائم ہونا ہے۔

فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا ﴿۴۳﴾ — اس بارے میں کہ تو اس کا یاد دلانے والا ہے ۳۵۴۱

اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا ﴿۴۴﴾ — تیرے رب کی طرف اس کا انجام ہے۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا ﴿۴۵﴾ — تو صرف اسے ڈرانے والا ہے جو اس سے ڈرتا ہے۔

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا ﴿۴۶﴾ ع ۲ — جس دن وہ اسے دیکھ لیں گے، گویا کہ صرف ایک شام یا صبح ہی ٹھیرے تھے۔

۳۵۳۹ طامّة۔ طَمَّ الماءُ پانی چڑھ گیا اور بہت ہوگیا۔ اور ہر ایک چیز جو بہت ہوجائے اور غالب آجائے تو اس کے متعلق طَمَّ کہا جاتا ہے اور طامّة وہ داهیة یا عظیم الشان مصیبت ہے جو ہر چیز پر غالب آجائے۔ اور الطامّة قیامت کا نام بھی ہے (ل) اس نام کے اختیار کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ کامل انکشاف حقایق کا وقت ہوگا اور جو حالت انسان نے اس دنیا میں اپنے اندر پیدا کی ہے وہی حالت تمام باتوں پر غالب آکر کامل ظہور پکڑے گی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں اشارہ مصائب دنیوی کی طرف بھی ہو۔ الفاظ برزت الجحیم لمن یری اس دنیا کے مصائب کی طرف ہی اشارہ کرتے ہیں اس صورت میں فاما من طغیٰ سے نیا کلام شروع ہوتا ہے ؛

۳۵۴۰ اس سے معلوم ہوا کہ اس سورت کی اصل غرض یہی نفس کو خواہشات سے روک کر اس کو ترقی دینا ہے اور والنازعات غرقا میں انہی ترقیات روحانی کی طرف اشارہ ہے ؛

۳۵۴۱ آنحضرت اور قرب ساعت: اس کے ایک معنی یوں ہوسکتے ہیں کہ فیم علیحدہ بطور سوال ہو یعنی پچھلی آیت کے سوال کی طرف اشارہ کر کے فرمایا فی ماھذا السوال یہ سوال کس لیے ہے انت من ذکرٰھا تو یعنی تیرا بھیجنا اس ساعت یعنی قیامت کے یاد دلانے والی چیزوں میں سے ہے یعنی قرب ساعت کی آپ علامت ہیں اور دوسرے معنی وہ ہیں جو میں نے ترجمہ میں اختیار کیے ہیں اور اس صورت میں فیم گویا عمّا کے قائم مقام ہے اور عمّا میں ما الساعة سے بدل ہے یعنی اس چیز کے بارے میں کہ کب آئے گی تجھ سے سوال کرتے ہیں جس کے لیے تو یا تیرا ارسال ذکری یعنی علامت ہے۔ اور اگلی آیت میں الی ربک منتھٰھا میں بتایا کہ اس کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف ہی منتہی ہوتا ہے ؛

ایاتها ۴۲ (۸۰) سُوْرَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓى ۙ ①	تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔
اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ؕ ②	اس لیے کہ اس کے پاس اندھا آیا ۳۵۴۲
وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۙ ③	اور تجھے کیا خبر ہے کہ شاید وہی پاکیزگی اختیار کرے۔
اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ؕ ④	یا نصیحت قبول کرے پس نصیحت اسے فائدہ دے۔
اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ ⑤	جو پروا نہیں کرتا۔
فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ؕ ⑥	تو اس کی طرف تو متوجہ ہوتا ہے ۳۵۴۳
وَ مَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ ⑦	اور تجھ پر کیا (الزام) ہے اگر وہ پاکیزگی اختیار نہ کرے۔
وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ ⑧	اور جو تیرے پاس دوڑتا آیا۔
وَ هُوَ يَخْشٰى ۙ ⑨	اور وہ ڈرتا ہے۔
فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ ⑩	تُو اس سے تو بے رُخی کرتا ہے۔
كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ ⑪	یوں نہیں چاہیئے، یہ ایک نصیحت ہے۔
وقف لازم فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۘ ⑫	سو جو کوئی چاہے اسے یاد رکھے۔

تمہید سورت: اس سورت کا نام عبس ہے اور الصاخۃ اور سفرۃ بھی اسے کہا جاتا ہے اور اس میں بیالیس آیتیں ہیں سورت کا نام اس واقعہ سے لیا گیا ہے جو ابن ام مکتوم کے ساتھ پیش آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب روسائے قریش سے بات کر رہے تھے۔ تو ابن ام مکتوم آگئے اور انہوں نے آنحضرت صلعم کی توجہ کو اپنی طرف پھیرنا چاہا جسے آنحضرت صلعم نے ناپسند کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ سورت اتاری اور بتایا کہ بڑے آدمیوں کی اتنی پروا نہ کرو کہ ان کی طرف توجہ کرنے سے اس کی طرف سے بے توجہی ہو جائے جو خود کچھ سیکھنا چاہتا ہے اور بتایا کہ غریب اور چھوٹے چھوٹے لوگ اس قرآن کریم کی بدولت عظیم الشان مرتبہ پر پہنچائے جائیں گے اور یہی اس سورت کا اصل مطلب ہے۔ یہ سورت ابتدائی مکی زمانہ کی ہے۔

۳۵۴۲ ابن ام مکتوم کا واقعہ: ابن جریر نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ عبس و تولی ابن ام مکتوم کے بارے میں نازل ہوا وہ آیا اور کہنے لگا مجھے ہدایت دیجئے اور رسول اللہ صلعم اس وقت چند مشرک رؤساء سے باتیں کر رہے تھے پس آپ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور دوسروں کی طرف متوجہ رہے تب یہ آیات نازل ہوئیں۔ یہ واقعہ تو بالکل ایک معمولی واقعہ ہے ابن ام مکتوم نابینا تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ رسول اللہ صلعم کس سے باتیں کر رہے ہیں آنحضرت صلعم نے بھی اس کے دخل دینے کو بُرا منایا مگر اللہ تعالیٰ نے سمجھایا کہ آپ بڑوں کی پروا کر کے چھوٹوں کی طرف سے بے توجہی نہ کریں اس لیے کہ قرآن کریم انہی چھوٹے چھوٹے لوگوں کو بلند مقام پر پہنچا دیگا۔ اور آپ کی غرض چونکہ اصلاح ہے اس لیے آپ کو اس بات کا خیال نہ ہونا چاہیئے کہ سوال کرنے والا بڑا ہے یا چھوٹا۔ جو کوئی قرآن کریم کو اپنا ہادی بنائے گا جو کوئی نفس کو ہوا و حرص سے روک کر اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے سر جھکا دے گا۔ وہی دنیا میں بھی بڑا ہو جائے گا۔ یوں ان الفاظ میں یہ خوشخبری دی کہ قرآن شریف انہی چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو بلند مقامات تک پہنچا دے گا اور انہیں دنیا کے ہادی اور رہنما بنا دے گا۔ اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وحی کا سرچشمہ آنحضرتؐ کا اپنا قلب مبارک نہ تھا۔ ورنہ اپنے متعلق ایسے الفاظ کو کون پسند کرتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے دنیا میں پڑھے جائیں۔

۳۵۴۳ تصدی دیکھو ۱۳۲۹ اور تصدّی کے معنی ہیں اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کیا یا اس کی طرف متوجہ ہوا (ل)۔

فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾	عزّت والے صحیفوں میں،
مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ﴿۱۴﴾	(جو بلند (اور) پاک (ہیں)
بِاَيْدِیْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾	لکھنے والوں کے ہاتھوں میں،
كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾	(جو) معزز نیک (ہیں) ۳۵۴۴
قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَاۤ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾	انسان ہلاک ہو، کیسا ناشکرا ہے۔
مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾	اسے کس چیز سے پیدا کیا۔
مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾	نطفہ سے اُسے پیدا کرتا ہے پھر اسے طاقت دیتا ہے۔
ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾	پھر رستہ (اس کے لیے) آسان کر دیتا ہے۔
ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾	پھر اُسے مارتا ہے پھر قبر میں ڈالتا ہے ۳۵۴۵
ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾	پھر جب چاہے گا اُسے اٹھا کھڑا کرے گا۔
كَلَّا لَمَّا یَقْضِ مَاۤ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾	یوں نہیں وہ پورا ہی نہیں کرتا جو اسے حکم دیتا ہے۔
فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ ﴿۲۴﴾	پس انسان کو چاہیئے کہ اپنے کھانے کی طرف دیکھے۔
اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾	(پہلے) ہم خوب پانی برساتے ہیں۔
ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾	پھر ہم زمین کو شق کرتے ہوئے پھاڑتے ہیں۔
فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾	پھر ہم اس میں غلّہ اگاتے ہیں۔
وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ﴿۲۸﴾	اور انگور اور ترکاری۔
وَّ زَیْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ﴿۲۹﴾	اور زیتون اور کھجور۔
وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾	اور گھنے باغ۔
وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ﴿۳۱﴾	اور پھل اور چارہ ۳۵۴۶

۳۵۴۴ خادمانِ قرآن کے لیے عظیم الشان خوش خبری: ان چھ آیات میں یہ عظیم الشان خوشخبری ہے کہ قرآن چونکہ خود ایک مکرم و مطہر چیز ہے اس لیے کے لکھنے والے بھی نہ صرف کرام یعنی معزز ہونگے بلکہ اعلیٰ درجہ کے راست باز بھی ہونگے۔ دنیوی مرتبہ کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی راستبازی کو اگر کسی قوم نے جمع کیا تو وہ صرف مسلمان قوم ہے حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و علی سب قرآن کریم کے کاتب تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے ساتھ والوں کو کرام بررہ بنا کر دکھا دیا کہ وہ قرآن کے خدمت گزاروں کو کہاں تک پہنچا دیتا ہے۔ ابن عباس نے سفرۃ سے مراد کاتب قرآن ہی لیے ہیں اور قتادہ نے قاری اور بعض نے ملائکہ بھی مراد لیے ہیں اور وہب بن منبہ نے سفرۃ سے صحابہ کو مراد لیا ہے کیونکہ وہ سفیر ہیں آنحضرت صلعم اور امت کے درمیان (ر) ؎

۳۵۴۵ اقبر۔ قبر وہ جگہ ہے جہاں میت کو رکھا جاتا ہے۔ اور اَقْبَرْتُہٗ کے معنی ہیں اس کے لیے جگہ بنائی جس میں وہ دفن کیا جائے اور کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ اسے الہام کیا کس طرح دفن کرے۔ اور مَقْبَرۃ قبروں کی جگہ ہے جمع مقابر۔ زرتم المقابر (التکاثر ۱۰۲-۲) اور یہ موت سے کنایہ ہے اور ما انت بمسمع من فی القبور (فاطر ۳۵-۲۲) میں مراد وہ لوگ ہیں جو مردوں کے حکم میں ہیں الذین فی حکم الاموات یعنی جاہل (غ) اور اقبرہ سے مراد حالت قبر میں رکھنا بھی ہو سکتا ہے جسے برزخ سے تعبیر کرنا چاہیے یعنی وہ حالت جو موت اور قیامت کے درمیان ہے۔

ثم السبیل یسرہ میں مجاہد کا قول ہے کہ یہ انا ھدینٰہ السبیل کی طرح ہے یعنی سبیل خیر کا آسان کرنا مراد ہے (ج) ؎

۳۵۴۶ قضب ترکاری کو کہتے ہیں اور قضیب کا استعمال درخت کی شاخوں میں ہے اور قضب کا ترکاریوں میں (غ) ؎

مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾	تمھارے لیے اور تمھارے چارپایوں کے لیے سامان۔
فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ ﴿۳۳﴾	سوجب بہرا کر دینے والی مصیبت آئے گی ۳۵۴۷
يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ﴿۳۴﴾	جس دن انسان اپنے بھائی سے بھاگے گا۔
وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ﴿۳۵﴾	اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے۔
وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ﴿۳۶﴾	اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے۔
لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ﴿۳۷﴾	ہرانسان کے لیے اس دن ایک کام ہوگا جو اسے کافی ہوگا۔
وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾	(کچھ) منہ اس دن چمک رہے ہوں گے۔
ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾	خوش خوش خبری کو پالینے والے۔
وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾	اور (کچھ) منہ اس دن ایسے ہوں گے کہ اُن پر غبار ہوگا۔
تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾	سیاہی اُن پر چھائی ہوگی۔
أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾ ع ۵	یہی کافر بدکار ہیں ۳۵۴۸

غلبا۔ غَلَبَ غالب آیا۔ اور غُلْب اَغْلَب کی جمع ہے جس کے معنی گھنا ہیں (ل) ابّ چارہ کو کہتے ہیں (غ)۔

۳۵۴۷ صاخّۃ۔ صَخّ لوہے کا لوہے پر مارنا ہے اور ہر ایک ایسی آواز کو صَخّ کہا جاتا ہے اور صاخّۃ وہ آواز ہے جو قیامت لانے والی ہوگی۔ کیونکہ وہ کانوں کو بہرا کر دے گی۔ اور صاخّۃ ہر ایک بڑی مصیبت کو بھی کہا جاتا ہے (ل)۔

۳۵۴۸ مسفرۃ۔ سَفْر (ع ۲۲۵) پردہ کا دور کرنا ہے اور اسفار رنگ سے مخصوص ہے والصبح اذا اسفر (المدثر ۷۴ - ۳۴) یعنی اس کا رنگ روشن ہو جائے (غ) علیھا غبرۃ دیکھو ع ۱۱۱۷ مراد ان کا غم کی وجہ سے متغیر ہونا ہے۔

موت کے ساتھ بھی انسان اپنے تعلق والوں سے بھاگتا ہے بڑی مصیبت پر بھی اور قیامت کو بھی بھاگے گا اور جن دو گروہوں کا نقشہ کھینچا ہے وہ ایک طرف وہ ہیں جن کے چہروں پر بوجہ کامیابی کے اور پہلی خوشخبریوں کو پالینے کے خوشی ہے اور دوسرا وہ گروہ ہے جن کے چہروں پر غم اور ذلت کے آثار ہیں اور یہ قیامت میں تو ہوگا ہی۔ یہاں بھی ناکامی پر دشمن سیاہ رو ہوئے اور قیامت میں بھاگنے سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک نفس کو اپنی ذمہ داری کا اس قدر فکر ہوگا کہ دوسرے کی طرف متوجہ نہ ہو سکے گا۔

آیاتھا ۲۹ — سُورَةُ التَّكْوِيرِ مَكِّيَّةٌ (۸۱) — رکوعھا ۱

تمہید سورت: اس سورت کا نام التکویر ہے اور اس میں اُنتیس آیتیں ہیں اور اس میں پہلے مذاہب کی صف لپیٹنے کا ذکر ہے جس کے لحاظ سے اس کا نام التکویر ہے اور اسلام کے ساتھ جو علمی ترقیات دنیا میں پیدا ہونے والی تھیں انہیں یہاں بطور پیشگوئی بیان کیا ہے اور خلاصہ مضمون اس سورت کا یہی ہے کہ قرآن کریم کے ذریعہ سے دنیا میں علم اور شرف پھیلینگے گویا پہلی سورت کے مضمون کو ہی جاری رکھا ہے۔ یہ سورت بھی ابتدائی مکی زمانہ کی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ۪ۙ ① — جب سورج لپیٹ لیا جائے گا۔

وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ ۪ۙ ② — اور جب تارے جھڑ جائیں گے۔

وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ ۪ۙ ③ — اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔

وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ۪ۙ ④ — اور جب اونٹنیاں بیکار کر دی جائیں گی۔

وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ۪ۙ ⑤ — اور جب وحشی اکٹھے کیے جائیں گے۔

وَ اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ۪ۙ ⑥ — اور جب دریا خشک کر دیئے جائیں گے۔

وَ اِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ ۪ۙ ⑦ — اور جب لوگ باہم ملا دیے جائیں گے۔

وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ ۪ۙ ⑧ — اور جب زندہ درگور کی ہوئی سے پوچھا جائے گا۔

بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۚ ⑨ — کس گناہ پر وہ قتل کی گئی۔

وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ ۪ۙ ⑩ — اور جب صحیفے پھیلا دیئے جائیں گے۔

وَ اِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتۡ ۪ۙ ⑪ — اور جب آسمان کی کھال اتاری جائے گی

وَ اِذَا الۡجَحِیۡمُ سُعِّرَتۡ ۪ۙ ⑫ — اور جب دوزخ بھڑکائی جائے گی۔

وَ اِذَا الۡجَنَّۃُ اُزۡلِفَتۡ ۪ۙ ⑬ — اور جب بہشت قریب لائی جائے گی ۳۵۴۹

ع ۳۵۴۹ انکدرت۔ کَدَر صفاء کی ضد ہے اور کُدُرۃ بالخصوص رنگ میں ہوتی ہے اور کُدُورۃ پانی میں اور زندگی میں اور انکدار وہ تغیر ہے جو ایک چیز کے بکھر جانے سے ہو (غ)۔

عشار۔ عُشَرَاء کی جمع ہے دس ماہ کی حاملہ اونٹنی (غ) اور اسے اعلیٰ درجہ کا مال سمجھا جاتا ہے۔

وحوش۔ وَحۡش کی جمع ہے ان حیوانات کو کہا جاتا ہے جو انسان سے اُنس نہیں رکھتے (غ)

موءدۃ۔ وَأد بلند سخت آواز کو کہتے ہیں اور زندہ درگور کرنے کو اور مَوۡءُوۡدَۃ وہ ہے جو زندہ درگور کی گئی ہو (ل)

کشطت۔ کَشۡط کے معنی ہیں ایک چیز کو اکھیڑ دیا یا کھینچ لیا یا اس کا پردہ اتار دیا (ل)

قیامت کبریٰ اور اس دنیا کے واقعات کی خبروں کو ملانے میں حکمت: جہاں جہاں قیامت کے متعلق یا موجودہ نظام عالم کے درہم برہم ہونے کے متعلق ذکر قرآن کریم میں آتا ہے تو وہ الفاظ ایک رنگ میں اس دنیا کے بعض واقعات پر بھی صادق آتے ہیں جیسا کہ کئی جگہ دکھایا جا چکا ہے۔ یہاں قرآن کریم نے اس حقیقت کو آشکارا کرنے کے لیے دونوں قسم کے نشانوں کو ملا دیا ہے یعنی ایک وہ نشان ہے جو قیامت کبریٰ سے تعلق رکھتے ہیں اور صرف مجازاً اس دنیا کے بعض واقعات پر چسپاں ہو سکتے ہیں اور ایک وہ نشان جو صراحت سے اس دنیا کے بعض واقعات کے متعلق ہیں اور اس دنیا میں ظاہر ہونے والے امور غیبی کے متعلق ان نشانات کا ہونا آیت ۲۴ سے صفائی سے ثابت ہے جہاں یہ بتا دیا ہے کہ ان آیات میں بہت سے امور غیبی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے سورج کی تکویر اور ستاروں کا جھڑ جانا اس نظام عالم کا درہم برہم ہونا ہے مگر مجازاً اس سے مراد ہو سکتی ہے نظام روحانی میں ایک خلل عظیم کا واقعہ ہونا جیسا کہ بعض احادیث میں ہے کہ آخری زمانہ میں علم اُٹھا لیا جائے گا اور تاروں کا جھڑ جانا اصحابی کالنجوم کی طرف اشارہ ہے یعنی علمائے دین کی حالت کا خراب ہو جانا یا سورج کے لپیٹ لینے اور تاروں کے جھڑ جانے میں پہلے نظام روحانی کی صف کا لپیٹ لیا جانا اور اس کی جگہ ایک نیا نظام قائم کیا جانا ہے جس کے نشانات وہ ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔ پہاڑوں کے دور کیا جانے پر دیکھو ع ۱۶۲۳ و ع ۲۱۰۱ اونٹنیوں کا بیکار ہو جانا قیامت کی تباہی سے کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ جب نظام عالم ہی تباہ ہو جائے تو اونٹنیوں کے بیکار ہونے کے کیا معنی بلکہ یہ صرف اس دنیا کے متعلق ایک پیشگوئی ہے اور اس کا وہی مطلب ہے جو حدیث میں آتا ہے لیترکن القلاص فلا یسعی علیہا اونٹنیوں کو چھوڑ دیا جائے گا اور ان پر سواری نہیں کی جائے گی اور یہ ایک پیشگوئی ہے کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ نئی سواری نکل آئے گی اور اونٹنیوں سے وہ کام نہ لیا جائیگا

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾	ہر شخص جان لے گا کہ کیا لایا ہے۔
فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾	نہیں میں پیچھے ہٹنے والوں کی قسم کھاتا ہوں۔
الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾	چلنے والوں چھپنے والوں کی۔
وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾	اور رات کی جب وہ جانے لگے۔
وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾	اور صبح کی جب وہ طلوع کرے ۳۵۵۰

جو وہ پیشگوئی کے وقت دے رہی ہیں۔ چنانچہ خود ملک عرب میں ریل کے بن جانے سے یہ پیشگوئی پوری ہو رہی ہے اور قریب زمانہ میں بالکل واضح ہو جائے گی۔ وحشیوں کے اکٹھا کرنے سے مفسرین نے مراد اُن کی موت لی ہے مگر ظاہر ہے کہ اس ذکر کی ضرورت کچھ نہ تھی وحشیوں کی موت کا ذکر کیوں ضروری ہوا؟ یہاں حشر سے مراد ان کا اجتماع معلوم ہوتا ہے اور دنیا کی اس حالت کی طرف اشارہ ہے جب انسان وحشی جانوروں کو بھی اکٹھا کر لے گا جیسے آج جگہ جگہ چڑیا گھروں میں وہ اکٹھے کئے گئے ہیں اور یا مراد استعارۃً وحشی قومیں ہیں اور اشارہ یہ ہے کہ ان میں بھی تعلیم پھیل کر وہ مہذب ہو جائینگی اذا البحار سجرت کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ دریا بھر جائینگے یا خشک ہو جائینگے۔ اور یوں بھی کہ شہر بھر جائینگے اور ان کے بھرنے سے مراد مدنی زندگی کا ترقی کر جانا ہے۔ اور اسی کی طرف وحشیوں کے حشر میں بھی اشارہ ہے۔ اور دنیا کا میلان اسی طرف بڑھتا جا رہا ہے کہ شہروں میں کثرت سے لوگوں کا اجتماع ہوتا چلا جائے۔ اور اس کو اذا النفوس زوجت نے اور بھی صاف کر دیا ہے اس کے معنی مفردات میں دو طرح پر کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ روحیں جسموں کے ساتھ ملائی جائیں اور دوسرے یہ کہ ہر گروہ اپنی مثل کے ساتھ ملایا جائے گا۔ اور دوسرے معنی ہی زیادہ موزون ہیں۔ اور یہ الفاظ بھی حالت زمانہ پر بھی صادق آتے ہیں کہ ہر قسم کے لوگ ایک ایک گروہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ یا دنیا کے لوگوں کا باہم میل جول مراد ہے اور اس کے بعد زندہ درگور کا ذکر آتا ہے۔ عرب میں یہ رواج تھا کہ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اس بے رحمی کی رسم کو اسلام نے دور کیا اور سوال کرنے سے مطلب اس کا روکنا ہی ہے ورنہ اگر جزا و سزا کا ذکر ہو تو سوال گاڑنے والے سے ہونا چاہیئے اور اس کی ابتدا گو رسول اللہ صلعم کے زمانہ سے ہی ہو گئی لیکن اس کو آخری زمانہ کے نشانات میں رکھا ہے اس لیے کہ اسی قسم کی بعض اور رسوم کا مٹانا جن میں انسان کو بے گناہ مارا جاتا ہے اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے بالخصوص ستی کی رسم یعنی بیوہ عورت کا خاوند کے ساتھ جلایا جانا جو ہندوؤں میں چلی آتی تھی کہ وہ زندہ درگور کرنے کی سی ہی رسم تھی اور یوں بھی ان نشانات کا ذکر کرنا جن کی ابتدا آنحضرت صلعم کے زمانہ سے ہو گئی انا والساعۃ کہاتین کی طرف اشارہ ہے اس کے بعد صحیفوں کا پھیلنا ہے۔ سو جس قدر کتابیں اور رسالے اور اخبارات آج چھپتے ہیں وہ اذا الصحف نشرت کی حقیقت کو اس قدر واضح کر رہے ہیں کہ مزید تشریح کی ضرورت نہیں اور پھر آسمان کے پردہ کے دور کرنے کا ذکر ہے۔ اور مراد اس سے یہ ہے کہ آسمان کی حقیقت منکشف ہوتی چلی جائے گی۔ اور یہ علوم کی ترقی کی طرف اشارہ ہے اور اس کے بعد پھر قیامت کے ذکر کی طرف منتقل کر دیا یعنی دوزخ کی آگ کا بھڑکایا جانا اور جنت کا قریب لایا جانا جس طرح سب سے پہلی دو آیتوں میں قیامت کا ذکر ہی اصل مقصود تھا اسی طرح یہاں آخری دو آیات میں اسی ذکر کو دوہرا دیا ہے اور مجازاً یہ بھی اس دنیا کے واقعات پر لگ سکتے ہیں۔ دوزخ کی آگ کا بھڑکانا یہی ہے کہ حرص و ہوا تیز ہو جائے اور مال دنیا کی محبت ایک دوزخ کی طرح انسانوں پر حاوی ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی جنت کا قریب لایا جانا ہے کیونکہ دنیا کی محبت کا دوزخ خود بخود انسانوں کی طبائع کو روحانیات کی طرف پھیرے گا اور پھر اصل حقیقت ان پر منکشف ہو جائیگی۔ اور ذکر قیامت کے ساتھ ان نشانات کا بطور پیشگوئی بیان کرنا جو اسی دنیا میں واقع ہونے والے تھے۔ قرآن کریم کے اس اسلوب کے مطابق ہے کہ آخرت کے وعد وعید کے اثبات کے لیے اس دنیا میں کچھ وعد و وعید کر کے انہیں پورا کر دیتا ہے اسی طرح وہ نشانات جو اس آخری زمانہ میں ظہور پذیر ہونے والے تھے ان کے متعلق علم غیب کا اظہار کر کے یہ بتا دیا ہے کہ قیامت کے متعلق جو کچھ فرمایا وہ بھی واقع ہو کر رہے گا اور خصوصیت سے جن باتوں کا ذکر اس آخری زمانہ کے متعلق کیا ہے وہ نئی سواریوں کا نکلنا۔ وحشی اقوام کا اجتماع برنگ تمدن و تہذیب (یورپ کے لوگ اس وقت جب یہ پیشگوئی کی گئی وحشیوں سے کم نہ تھے) شہروں کا بھر جانا لوگوں کا باہمی میل جول وحشیانہ مظالم کا جو عورتوں پر کیے جاتے تھے دور ہونا۔ اخباروں کتابوں کا دنیا میں پھیل جانا۔ علوم کی ترقی ہیں۔ اور ان تمام باتوں کے لحاظ سے جیسا صاف نقشہ اس زمانہ کا قرآن شریف نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر کھینچا وہ اس کی حقانیت پر تا قیامت گواہ رہے گا نیز دیکھو اگلا نوٹ ان عجیب ترقیات علمی کا یہاں کیوں ذکر کیا؟ اس لیے کہ فی الحقیقت قرآن کریم کا ان ترقیات کے ساتھ ایک عظیم الشان تعلق ہے اور ان کی بنیاد قرآن کریم نے ہی رکھی ہے کیونکہ جس قدر علوم کو قرآن کریم نے دنیا میں پھیلایا اور کسی آسمانی کتاب نے اس کا لاکھواں حصہ بھی کر کے نہیں دکھایا۔ علوم کا دنیا میں پھیلانا یہ قرآن کریم کے عظیم الشان کارناموں میں سے ہے اسی لیے سورت کے آخر پر فرمایا کہ یہ قرآن تمام قوموں کے لیے ذکر یعنی موجب شرف ہے ❊

۳۵۵۰۔ خنّس۔ خَنَسَ ہٹ گیا اور پیچھے رہ گیا اور حدیث میں الشیطان یُوَسْوِسُ الی العبدِ فاذا ذکر اللہ خَنَسَ شیطان بندے کی طرف

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿١٩﴾
یہ یقیناً معزز رسول پر (اُترا ہُوا) کلام ہے۔

ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ﴿٢٠﴾
طاقت والے صاحب عرش کے نزدیک مرتبے والے پر۔

مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ﴿٢١﴾
جس کی اطاعت کی جاتی ہے اور امین –

وَمَا صَاحِبُكُم بِمَجْنُونٍ ﴿٢٢﴾
اور تمھارا ساتھی دیوانہ نہیں۔

وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ﴿٢٣﴾
اور یقیناً اس نے اپنے آپ کو کھُلے انتہائی مقام پر دیکھا۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ﴿٢٤﴾
اور وہ غیب پر بخیل نہیں ۳۵۵۱

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ﴿٢٥﴾
اور یہ مردود شیطان کا کلام نہیں۔

فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ ﴿٢٦﴾
سو تم کدھر جاتے ہو ۳۵۵۲

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ﴿٢٧﴾
وہ سب قوموں کے لیے شرف ہے۔

لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ ﴿٢٨﴾
اس کے لیے جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہے۔

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٢٩﴾ ع
اور تم نہیں چاہتے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ جہانوں کا رب چاہے۔

وسوسہ ڈالتا رہتا ہے پھر جب وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اور شیطان کو خناس اسی لحاظ سے کہا ہے من شر الوسواس الخناس (الناس ۱۱۴-۴) اور خُنَّس خانس کی جمع ہے یعنی پیچھے ہٹنے والے (ل)۔

کنّس۔ کَنَسَ الظَّبْیُ ہرن غائب ہوگیا اور اپنے کناس میں چھپ گیا۔ اسی سے کانِس ہے جس کی جمع کُنَّس ہے یعنی غائب ہوجانے والے (ل)۔

عسعس کے معنی اَقْبَلَ بھی ہیں یعنی آئے اور اَدْبَرَ بھی یعنی چلی جائے۔ کیونکہ عِساس اندھیرے کے ہلکا ہونے کا نام ہے (غ)

تنفس۔ نَفَس کشادگی کو کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے لاتسُبُّوا الریح فانہا من نفس الرحمٰن یعنی ایسی چیز جس سے کرب دور ہوتا ہے اور دن کا تَنَفُّس اس کا توسّع ہے یعنی فراخ ہونا اسی سے یہاں ہے اور مُنافَسَۃ نفس کا مجاہدہ ہے جو اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے ساتھ تشبہ کے لیے کیا جائے اور ان کے ساتھ ملنے کے لیے بغیر کسی کو ضرر پہنچانے کے وفی ذٰلک فلیتنافس المتنافسون (التطفیف ۸۳-۲۶)

آفتاب صداقت کا طلوع: خنّس۔ جوار۔ کنس تینوں سیاروں کے لیے ہیں۔ خنس میں اشارہ ان کی عجیب حرکت فلکی کی طرف ہے کہ آگے بڑھتے بڑھتے پیچھے ہٹنے لگتے ہیں۔ جوار میں ان کے تیز گزرنے کا ذکر ہے کنس میں اشارہ ان کے غائب ہونے کی طرف ہے مراد اس سے زحل۔ مشتری۔ مریخ۔ زہرہ اور عطارد لیے گئے ہیں۔ یا نظام شمسی کے سب سیارے مراد ہو سکتے ہیں۔ اور اصل منشا سیاروں کا غائب ہونا ہے جو طلوع فجر سے تعلق رکھتا ہے جیسا کہ رات کے پیچھے ہٹنے اور صبح کے نمودار ہونے کا ذکر کر کے خود ہی بتا دیا۔ گویا بتایا کہ آفتاب صداقت طلوع ہوگیا ہے اور سب تاریکیاں اس کے سامنے کافور ہوجائیں گی پیچھے ہٹنے والے خناس شیاطین بھی اسی تاریکی کے فرزند تھے اور کاہن وغیرہ بھی اور الجوار الکنس سے مراد مذاہب ہو سکتے ہیں جن کے اب غروب ہونے کا وقت آگیا تھا اور ایک قول میں مراد اس سے بقر وحشی یا ہرن ہیں اور ہو سکتا ہے کہ مراد وہ چیزیں ہوں جن کا تاریکی سے تعلق ہے اور جواب قسم ہے کہ یہ قرآن رسول کریم کا قول ہے یعنی آنحضرت صلعم کا دیکھو ۳۴۲۱ اور

رسول کریم صلعم کی صفات۔ کریم۔ ذی قوت۔ مکین۔ مطاع۔ امین کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ یہی صفات یہ دوسروں میں پیدا کرے گا۔ اور دنیا میں اس قرآن کی بدولت علم اور قوت کی ترقی ہوگی چنانچہ ایسے ہی نشانات کی طرف پہلی آیات میں توجہ بھی دلائی ہے۔

۳۵۵۱ء ضنین۔ ضَنَّۃ نفیس شے کے متعلق بخل ہے اور ضنین بخیل ہے (غ) یہ اشارہ ان امور غیبی کی طرف ہے جو اوپر بیان ہوئے اور راٰہ میں دونوں ضمیریں آنحضرت صلعم کی طرف ہی جاتی ہیں اور مراد آپ کا اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر ہونا ہے دیکھو ۳۱۹۷ء۔

۳۵۵۲ء یعنی اپنی عزت اور شرف کی باتوں کو چھوڑ کر کدھر جا رہے ہو؟ ذکر للعالمین میں اس کو اور بھی کھول دیا۔

اٰيَاتُهَا ۱۹ (۸۲) سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ مَكِّيَّةٌ رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝۱
جب آسمان پھٹ جائے گا۔

وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝۲
اور جب ستارے پھیل جائیں گے۔

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝۳
اور جب دریا بہا دیئے جائیں گے۔

وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝۴
اور جب قبریں کھول دی جائیں گی ۳۵۵۳

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝۵
ہر شخص جان لیگا جو اس نے آگے بھیجا اور (جو) پیچھے رکھا۔

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝۶
اے انسان! تجھے اپنے ربّ کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکا دیا۔

الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝۷
جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تجھے حکمت سے بنایا پھر تجھے اعتدال پر بنایا۔ ۳۵۵۴

فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝۸
جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دیا ۳۵۵۵

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝۹
یوں نہیں بلکہ تم جزا کو جھٹلاتے ہو۔

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝۱۰
اور یقیناً تم پر حفاظت کرنے والے ہیں۔

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝۱۱
معزز لکھنے والے۔

تمہید سورت: اس سورت کا نام الانفطار ہے اور اس میں اُنیس آیتیں ہیں۔ ابتدائی مکی زمانہ کی سورت ہے اور لفظ انفطار میں سورت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے کہ کس طرح روحانی بارش سے قوائے انسانی نشو و نما پا کر کمالات انسانی کا ظہور ہوتا ہے ۞

۳۵۵۳ قبروں سے نکالا جانے سے مراد: بُعْثِرَتْ یہاں فراء نے اس کے معنی کیے ہیں سونا اور چاندی جو اس کے پیٹ میں ہے وہ نکالا جائیگا اور مردوں کا نکلنا اس کے بعد ہے اور یہ اشراط الساعۃ میں سے ہے کہ زمین اپنے اندر جو معدنیات ہیں انہیں نکال دے اور زجاج نے بعثرت کے معنی کیے ہیں ان کی مٹی الٹا دی جائے گی اور بَعْثَرْتُ الشَّیْءَ کے معنی ہیں میں نے اسے نکالا اور اسے ظاہر کر دیا اذا بعثر ما فی القبور (العٰدیٰت - ۹) کے معنی ہیں جو ان میں ہے نکالا جائے گا (ل) اور یہ موخر الذکر بعث کی طرف اشارہ ہے اور کہا گیا ہے کہ رازوں کے ظاہر ہونے کی طرف کیونکہ انسان کی حالت جب تک وہ دنیا میں ہے مستور ہے گو یا کہ وہ قبر میں ہے پس قبور استعارہ کے طور پر ہے اور یہ بھی معنی کیے گئے ہیں کہ جہالت موت کے ساتھ دور ہو جائے گی (غ) اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جہالت علم کے ساتھ دور ہو جائے گی۔ قبر پر دیکھو ۲۵۴۵ ۞

ہو سکتا ہے کہ ان تمام امور میں استعارہ ہے آسمان کے پھٹنے سے مراد بارش کا نزول ہے اور مراد بارش روحانی ہے ستاروں کے پھیلنے سے مراد علم دین کی روشنی والوں کا دنیا میں پھیل جانا ہے۔ دریاؤں کے بہانے سے علوم کے دریاوں کا بہانا مراد ہے اور قبروں کے کھول دینے سے ان لوگوں کا روحانیت کی زندگی پا لینا جو گویا قبروں میں دبے ہوئے تھے اور ہو سکتا ہے کہ یہ سب قیامت کے متعلق ہو ۞

۳۵۵۴ عَدَلَ کسی چیز کے برابر کیا یا پھیرا۔ اور عَدَلْتُ الشَّیْءَ فَاعْتَدَلَ کے معنی ہیں سَوَّیْتُہٗ فاستوی یعنی حالت اعتدال پر بنایا۔ (ل) تسویۃ میں اشارہ کمال کی طرف ہے اور عدل میں اعتدال کی طرف غَرَّكَ میں توجہ دلائی ہے کہ ایسے کمال کی حالت پر پیدا کیا۔ مگر تم اپنی زندگی کی غرض محض کھانے پینے تک محدود سمجھتے ہو۔ ربك الكريم میں اشارہ اسی مکرمت کی طرف ہے ۞

۳۵۵۵ رَكَّبَ۔ رَكَّبَ الشَّیْءَ ایک چیز کے بعض کو بعض پر رکھا۔ اور یہی معنی تَرَاكَبَ کے ہیں حبا متراکبا (الانعام ۶ - ۱۰۰) (ل)

يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ — وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو ۳۵۵۶

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۱۳﴾ — یقیناً نیک نعمتوں میں ہوں گے۔

وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴿۱۴﴾ — اور بدکار یقیناً دوزخ میں ہوں گے۔

يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾ — جزا کے دن اس میں داخل ہوں گے۔

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ — اور وہ اس سے غائب نہیں ہوں گے ۳۵۵۷

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۷﴾ — اور تجھے کیا معلوم ہے جزا کا دن کیا ہے۔

ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۸﴾ — پھر تجھے کیا معلوم ہے جزا کا دن کیا ہے۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾ ع — جس دن کوئی شخص کسی شخص کے لیے کوئی اختیار نہ رکھے گا اور حکم اس دن اللہ تعالیٰ ہی کا ہوگا ۳۵۵۸

۳۵۵۶ کِرامًا کاتبین: یہ حافظ وہی اعمال کی حفاظت کرنے والے ہیں جن کا ذکر ۱۶۰۵ میں گزر چکا۔ اعمال کی ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ منشا نہیں کہ ہماری طرح قلم و دوات سے لکھتے ہیں۔ اصل غرض حفاظت اعمال ہے ؀

۳۵۵۷ اس دنیا میں بھی دوزخ ہے: دونوں طرح معنی کیے گئے ہیں وہ اس سے غائب نہیں ہوں گے یعنی ہر وقت دوزخ میں رہیں گے یا دخول جہنم تو اسی وقت ہوگا مگر پہلے بھی اس سے غائب نہ تھے۔ اور اشارہ عذاب قبر کی طرف سمجھا گیا ہے۔ مگر دوزخ کی ابتدا اسی دنیا سے ہوتی ہے ؀

۳۵۵۸ قیامت کے دن الامر للہ سے مراد: حکم تو ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ہے مگر توجہ اس طرف دلائی ہے کہ یہاں تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ اختیار دیا ہے کہ ایک کام کو کرے یا نہ کرے لیکن وہ نتائج کا وقت ہوگا اس وقت یہ اختیار کسی کو نہیں ہوگا کہ اپنے کیے کا نتیجہ بھگتے یا نہ بھگتے ؀

اٰیاتھا ۳۶ (۸۳) سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ مَكِّيَّةٌ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ﴿۱﴾ — کمی کرنے والوں کے لیے تباہی ہے ۳۵۵۹

الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ﴿۲﴾ — جو جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں، تو پورا کر لیتے ہیں۔

تمہید سورت: اس سورت کا نام التطفیف ہے اور اس میں چھتیس آیتیں ہیں تطفیف معاملہ یا ادائیگی حقوق میں کمی کرنا ہے۔ اور اس سورت میں بتایا ہے کہ وہ قویٰ جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دیئے ہیں انہیں مناسب محل پر استعمال نہ کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایسے آدمیوں کے اعمال ایک قید خانہ میں رہ جاتے ہیں یعنی ترقی کے قابل نہیں ہوتے اور جو ان قویٰ کو استعمال کرتے ہیں وہ بلند سے بلند ترقی کے مقامات پر پہنچ جاتے ہیں یہ سورت بھی ابتدائی مکی زمانہ کی ہے۔ اسے سُورۃ المطففین بھی کہا جاتا ہے۔

۳۵۵۹ مطففین۔ طَفَّ الشَّیُٔ اور اَطَفَّ چیز قریب ہوگئی۔ اور اَطَفَّ فلان لفلان اسے دھوکہ دینے کا ارادہ کیا اور طَفَّفَ علی الرحل اسے اس سے کم دیا جتنا اس سے لیا تھا اور ماپ اور تول میں کمی تطفیف ہے اور ایک شخص نے نماز سے غفلت کا عذر کیا تو حضرت عمرؓ نے اسے کہا طَفَّفْتَ جس کے معنی ہیں نَقَصْتَ یعنی تو نے ادائیگی حق میں کمی کی (ل) اور گو آگے ماپ اور تول کا ذکر ہے مگر اس کا استعمال بھی تمام معاملات پر ہے ع۱۱۲۰ اور یہاں ہر قسم کی کمی کرنے والے مراد ہیں حقوق اللہ میں ہو یا حقوق العباد میں ویل سے مراد ہے کہ انجام ان کا اچھا نہیں ؀

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝۳
اور جب انھیں ماپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔

اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴
کیا وہ خیال نہیں کرتے کہ وہ اٹھائے جائیں گے۔

لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵
ایک بڑے دن کے لیے۔

يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶
جس دن لوگ جہانوں کے رب کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝۷
ہرگز نہیں، بدکاروں کے اعمال قید خانے میں ہیں ۳۵۶۰ؑ

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝۸
اور تو کیا جانتا ہے قید خانہ کیا ہے۔

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝۹
وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۰
اس دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی ہے۔

الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝۱۱
جو جزا کے دن کو جھٹلاتے ہیں۔

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝۱۲
اور اسے کوئی نہیں جھٹلاتا مگر ہر حد سے بڑھنے والا گنہگار۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۳
جب اس پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں، کہتا ہے پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۱۴
ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے عملوں کا زنگ بیٹھ گیا ہے ۳۵۶۱ؑ

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝۱۵
ہرگز نہیں وہ اپنے رب سے اس دن اوجھل میں ہوں گے

ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝۱۶
پھر وہ ضرور دوزخ میں داخل ہوں گے۔

ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ
پھر کہا جائے گا یہ ہے جسے تم جھٹلاتے

۳۵۶۰ؑ سجّین۔ سَجَنَ قید کیا۔ سِجْن قید خانہ رب السجن احب الیّ (یوسف ۱۲ ۔ ۳۳) اور سِجّین اسی سے فِعّیل ہے اور اس کے معنی سجن یا قید خانہ ہیں اور جہنم میں ایک وادی ہے اور ہر چیز سے سخت کو سجین کہا جاتا ہے اور یہاں معنی کیے گئے ہیں کہ ان کی کتاب قید خانہ میں ہوگی بوجہ ان کی خساست مرتبہ کے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے اور کہا گیا ہے کہ ایک پتھر میں ہوگی جو ساتویں زمین کے نیچے ہے اور حساب بھی معنی کیے گئے ہیں۔ ابن عرفہ کہتے ہیں وہ ان پر روک رکھی گئی ہے تاکہ اس کے مطابق بدلہ دیا جائے۔ اور حدیث ابوسعید میں ہے وتُوئی کتابه مختوما فیوضع فی السجین (ل)

کتاب فجار کے سجین میں ہونے سے مراد: فجار وہی لوگ ہیں جو حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کمی کرتے ہیں اور دنیا پر جھکے رہتے ہیں ان کی کتاب سے مراد ان کے اعمال ہیں جیسا کہ پچھلی سورت میں ذکر تھا کہ کراماً کاتبین جو کچھ انسان کرتا رہتا ہے اسے لکھتے جاتے ہیں۔ تو جن لوگوں کے اعمال صرف اسی دنیوی زندگی تک محدود ہوتے ہیں وہ گویا ایک قید خانہ میں رہ جاتے ہیں یعنی کسی ترقی کے قابل نہیں رہتے گویا ان کا ترقی سے رکنا ہی سجین ہے

۳۵۶۱ؑ دل پر زنگ کس طرح بیٹھتا ہے: ران۔ رَیْن طبع اور میل ہے اور وہ زنگ جو تلوار اور شیشہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور رَین دل کی سیاہی ہے حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم سے اس آیت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ بندہ ایک گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے دل پر پیدا ہو جاتا ہے پھر اگر اس سے توبہ کرے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر پھر گناہ کرے تو ایک اور نقطہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ آخر کار دل سیاہ ہو جاتا ہے (ل)۔

یہاں بتایا کہ گناہ سے انسان کا دل سیاہ ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کی صفائی اور جلا باقی نہیں رہتی۔ اس لیے اگلی آیت میں اس کا نتیجہ بتایا ہے کہ وہ اپنے رب سے محجوب ہیں کیونکہ ان کے دل سیاہ ہو چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے لیے اعلیٰ درجہ کا صاف دل درکار ہے اور پھر ان کا جہنم میں داخل ہونا ضروری ہے تاکہ وہ زنگ جو انہوں نے خود اپنے اعمال سے لگا لیا ہے دور ہو جائے۔

تُكَذِّبُوْنَ ۚ (۱۷) — تھے۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۚ (۱۸) — ہرگز نہیں، نیکوں کے اعمال بلند مقامات پر ہیں ۳۵۶۲ع

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۚ (۱۹) — اور تجھے کیا معلوم ہے بلند مقامات کیا ہیں۔

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۙ (۲۰) — وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے۔

يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ (۲۱) — جسے مقرب موجود پائیں گے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۙ (۲۲) — یقیناً نیک بندے نعمتوں میں ہوں گے۔

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۙ (۲۳) — تختوں پر دیکھ رہے ہوں گے۔

تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۚ (۲۴) — تو اُن کے چہروں پر نعمتوں کی تازگی معلوم کرے گا۔

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۙ (۲۵) — انھیں ایک خالص پینے کی چیز پلائی جائے گی جس پر مہر لگی ہوئی ہے ۳۵۶۳ع

خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۚ (۲۶) — اس کی مُہر مشک کی ہے اور اس میں چاہیئے کہ رغبت کرنے والے رغبت کریں۔

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۙ (۲۷) — اور اس کی ملاوٹ اس پانی سے ہے جو بلندیوں سے بہتا ہے ۳۵۶۴ع

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ (۲۸) — وہ ایک چشمہ ہے جس سے مقرب پیتے ہیں۔

ع۳۵۶۲ علیین کہا گیا ہے کہ یہ سب سے اعلیٰ درجہ کا بہشت ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ فی الحقیقت اس کے رہنے والوں کا نام ہے اور یہ عربیت میں قریب تر ہے اس لیے کہ یہ جمع (یعنی ون یا ین) ناطقوں سے مخصوص ہے اور اس کا واحد عِلّیٌّ ہے تو مطلب یہ ہے کہ نیک لوگ ان اعلیٰ درجہ کے لوگوں میں ہونگے جیسے اولئك مع الذين انعم الله عليهم رغ) اور علیین سے مراد اعلی الامکنۃ ہیں یعنی اعلیٰ درجہ کے مکان اور اس کی جمع نون کے ساتھ اس لیے آئی ہے کہ جب کسی چیز میں واحد اور تثنیہ کی بنا نہ ہو تو اسے نون سے جمع کیا جاتا ہے اور مطلب علّیّون سے شیٔ فوق شیٔ ہے اور شاعر کے قول میں وابلین وابل کی جمع آئی ہے جہاں مراد بارش کے بعد بارش غیر محدود طور پر ہے اسی طرح علیون ہے کہ مراد اس سے ارتفاعٌ بعد ارتفاع بلندیوں پر بلندیاں ہیں اور ابو اسحاق نے بھی علیین کے معنی اعلی الامکنۃ ہی کیے ہیں (ل)۔

ابرار کی کتاب کے علّیّون میں ہونے سے مراد: یہ گویا سجین کے مقابل پر ہے فجار جو دنیا کی زندگی پر گرے رہتے ہیں اُن کے مقابل پر ابرار ہیں جو نیکی میں وسعت اختیار کرتے ہیں ان کے اعمال علیون میں ہونا بیان کر کے یہ سمجھایا ہے کہ وہ ایک بلندی کے بعد دوسری بلندی کی طرف غیر محدود طور پر ترقی کر کے چلے جاتے ہیں جیساکہ لسان العرب میں اس کے معنی کیے گئے ہیں۔ جس طرح دنیا داروں کے اعمال قید خانہ میں رہ جاتے ہیں نیکوں کے اعمال ترقی پر ترقی کرتے چلے جاتے ہیں اور یہ گویا مقربین بارگاہ الٰہی ہیں کیونکہ اصل ذکر مقصود اعلیٰ شے اعلیٰ کمال کا ہے۔

ع۳۵۶۳ رحیق زجاج کہتے ہیں یہ وہ شراب ہے جس میں کوئی غِشّ نہیں یعنی اعلیٰ درجہ کی صاف اور اسے مَخْتُوم کہا ہے یعنی وہ محفوظ رکھی گئی ہے (ل) جیسے ان کے اعمال خالص اور محفوظ ہیں ویسے ہی جزا ہے۔ اور یہ شراب محبت الٰہی وہ اس دنیا میں بھی پیتے ہیں اور اگلی آیت میں اس کی مہر کو مِسْكٌ یعنی مشک کہا ہے اس لیے کہ باوجود ان کے عمل نتائج اعمال کے بند ہونے کے وہ اپنی خوشبو دوسروں کو پہنچاتے ہیں۔

ع۳۵۶۴ تسنیم۔ سَنام اونٹ کی کوہان کو کہا جاتا ہے اور ہر چیز کا سنام اس کا سب سے اونچا حصّہ ہے اور یہاں تسنیم کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ جنت میں پانی ہے جس کا یہ نام رکھا گیا ہے اس لیے کہ وہ چوباروں اور محلات کے اوپر سے بہے گا اور بعض نے اسے جنت میں ایک چشمہ کا نام سمجھا ہے لیکن اگر یہ معرفہ ہوتا تو غیر منصرف ہوتا۔ پس اس کے معنی ہیں ایسا پانی جو بلندیوں سے ان کے اوپر بہتا ہے (ل) اور پانی چونکہ حیات کا موجب ہے اس لیے اونچائی سے بہنے والے پانی میں بھی اشارہ ان کے مراتب عالیہ کی طرف ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾	جو مجرم ہیں وہ ان پر جو ایمان لائے ہنسا کرتے تھے۔
وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾	اور جب ان پر گزرتے تو آنکھوں سے اشارے کرتے تھے۔۳۵۶۵
وَاِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾	اور جب اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ کر جاتے (تو) اتراتے ہوئے لوٹتے۔
وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾	اور جب انھیں دیکھتے کہتے، یہ یقیناً گمراہ ہیں۔
وَمَاۤ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۳۳﴾	اور وہ ان پر محافظ بنا کر نہیں بھیجے گئے۔
فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾	سو آج جو ایمان لائے، وہ کافروں پر ہنستے ہیں۔۳۵۶۶
عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾	تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔
ع هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾	کافروں کو وہی بدلہ ملا جو وہ کرتے تھے۔

۳۵۶۵ تیغامز (دن آنکھ اور ابرو اور پلک کے ساتھ اشارہ کرنا ہے (ل) یہ وہ اشارہ ہے جو استہزا اور عیب جوئی کے لیے ہو۔

۳۵۶۶ مومنوں کے کفار پر ہنسنے سے مراد: یہ کلام بطور مجاز ہے۔ فی الحقیقت ہنسنا مراد نہیں کیونکہ مومن تو اس دنیا میں بھی کافر کی مصیبت پر ہنستا نہیں۔ بلکہ اس سے ہمدردی کرتا ہے یا اس پر افسوس کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ اپنے آپ کو دنیا میں بڑے عالی مرتبہ اور مومنوں کو حقیر سمجھ کر ان پر ہنستے تھے۔ قیامت کے دن یہ حالت تبدیل ہو جائیگی مومن تو مراتب عالیہ پر ہونگے اور کافر ذلت کی حالت میں ہونگے گویا وہ ہنسی کا مقام بن گئے۔

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ (۸۴)

اٰيَاتُهَا ۲۵ — رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴿۱﴾	جب آسمان پھٹ جائے گا۔
وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۲﴾	اور اپنے رب کی بات سنے گا اور وہ اسی لائق ہے۔
وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴿۳﴾	اور جب زمین پھیل جائے گی۔
وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ﴿۴﴾	اور جو اس کے اندر ہے وہ نکال دے گی اور خالی ہو جائے گی۔

تمہید سورت: اس سورت کا نام الانشقاق ہے اور اس میں پچیس آیتیں ہیں۔ انشقاق کے لفظ میں اشارہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام ترقیات کسی انشقاق سے وابستہ ہیں جس طرح آسمان کے انشقاق سے جو بارش سے وقوع میں آتا ہے زمین کی مخفی طاقتیں ترقی پذیر ہوتی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انشقاق روحانی وحی کے رنگ میں واقع ہوتا ہے تو انسان کی مخفی طاقتیں ظہور پذیر ہو کر اور ایک قیامت روحانی قائم ہو کر قیامت کبریٰ کے وجود پر نشان ٹھہرتی ہے یعنی اسی طرح آخر کار کل انسانوں کے قوائے مخفی ظہور پذیر ہونگے۔ یہ سورت بھی ابتدائی زمانہ کی ہے اور اس میں انسان کی ان ترقیات کے ساتھ ساتھ اسلام کی ترقیات کی بشارت عظمیٰ ہے۔

وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتۡ ۝۵
اور اپنے رب کی بات سنے گی اور وہ اسی لائق ہے ۳۵۶۷ع

یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ كَدۡحًا فَمُلٰقِیۡهِ ۝۶
اے انسان تو سخت کوشش کر کے اپنے رب کی طرف پہنچنے والا پھر اُسے ملنے والا ہے ۳۵۶۸ع

فَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیۡنِهٖ ۝۷
سو جس کی کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں دی گئی،

فَسَوۡفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیۡرًا ۝۸
تو اس کا حساب بھی آسان لیا جائے گا۔

وَّ یَنۡقَلِبُ اِلٰۤی اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا ۝۹
اور وہ اپنے ساتھیوں کی طرف خوش خوش لوٹ جائے گا۔

وَ اَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهۡرِهٖ ۝۱۰
اور جس کی کتاب اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دی گئی

فَسَوۡفَ یَدۡعُوۡا ثُبُوۡرًا ۝۱۱
تو وہ موت مانگے گا،

وَّ یَصۡلٰی سَعِیۡرًا ۝۱۲
اور دوزخ میں داخل ہوگا۔

اِنَّهٗ كَانَ فِیۡۤ اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا ۝۱۳
وہ (پہلے) اپنے ساتھیوں میں خوش تھا۔

اِنَّهٗ ظَنَّ اَنۡ لَّنۡ یَّحُوۡرَ ۝۱۴
اس کا خیال تھا کہ وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ ۳۵۶۹

بَلٰۤی ۚۛ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِیۡرًا ۝۱۵
ہاں اس کا رب اسے دیکھنے والا ہے۔

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ۝۱۶
سو نہیں میں شام کی سُرخی کی قسم کھاتا ہوں۔

وَ الَّیۡلِ وَ مَا وَسَقَ ۝۱۷
اور رات کی اور اس کی جسے وہ جمع کرتی ہے۔

وَ الۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝۱۸
اور چاند کی جب وہ کامل ہوتا ہے۔

لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ۝۱۹
تم ضرور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف چڑھو گے ۳۵۷۰ع

فَمَا لَهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝۲۰
سو انھیں کیا ہُوا کہ ایمان نہیں لاتے۔

۳۵۶۷ع قیامت انسان کی مخفی طاقتوں کے ترقی پذیر ہونے کا نتیجہ ہے:۔ یہ سب نشانات قیامت کبریٰ کے ہو سکتے ہیں اور اس صورت میں زمین کے پھیل جانے سے مراد یہ لی گئی ہے کہ اس کی وسعت بڑھا دی جائے گی اور القت ما فیھا سے یہ کہ مُردے نکال دے گی۔ مگر ہو سکتا ہے کہ یہ قیامت روحانی کے قیام پر بطور شہادت ایک امر پیش کیا گیا ہے اور آسمان کے انشقاق سے مراد بارش کا اترنا۔ اور زمین کے پھیلنے سے مراد اس کا سبزیوں وغیرہ سے بڑھنا اور پھولنا ہو جیسے دوسری جگہ ہے فاذا انزلنا علیھا الماء اھتزت وربت (الحج ۲۲ – ۵) اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح آسمان کے پانی برسانے سے زمین کی مخفی طاقتیں باہر نکل آتی ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی روحانی بارش سے انسان کی مخفی طاقتیں باہر نکل آتی ہیں اور وہ جیسا کہ اگلی آیت میں ہے خدا کے رستہ میں کوشش کرتا کرتا اللہ تعالیٰ کو پالیتا ہے۔ اور اس معنی کی تائید لترکبن طبقا عن طبق کے پہلے معنی سے ہوتی ہے اور فی الحقیقت ان مخفی طاقتوں کا ترقی پذیر ہونا قیامت روحانی کو ہی نہیں بلکہ قیامت کبریٰ کو بھی چاہتا ہے اس لیے کہ سب لوگوں میں یہ طاقتیں اس عالم میں ترقی پذیر نہیں ہوئیں اس لیے ضروری تھا کہ دوسرے عالم میں ان کی کامل ترقی ہوتی۔ اور ما فیھا سے مراد زمین کی اندرونی طاقتوں کا باہر نکل آنا ہوگا اور بعض نے القا سے خزانوں کا دجال کے وقت میں باہر نکالنا مراد لیا ہے (ر) اور اخبار غیبی کے نشانات قیامت کے ساتھ ملانے پر دیکھو ۳۵۴۹ع اور اس معنی کی لترکبن طبقا عن طبق کے دوسرے معنی سے تائید ہوتی ہے ؛

۳۵۶۸ع کادح۔ کدح کے معنی کوشش اور مشقت ہیں (غ) یعنی اللہ تعالیٰ کا صرف نام لے لینے سے اللہ نہیں ملتا بلکہ یہاں بھی مجاہدہ کی ضرورت ہے ؛

۳۵۶۹ع یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر آنے پر یقین نہ رکھتا تھا اس لیے اس کے لیے عمل بھی کوئی نہ کیا۔ کتاب کے دائیں یا پیٹھ پیچھے دیا جانے پر دیکھو ۱۸۵۸ع

۳۵۷۰ع وسق۔ وَسق متفرق چیزوں کا جمع کرنا ہے اور اس لیے ایک اندازہ معین کو بھی کہتے ہیں جو ساٹھ صاع کے برابر ہوتا ہے اور یہاں ما

وَ اِذَا قُرِئَ عَلَيۡهِمُ الۡقُرۡاٰنُ لَا يَسۡجُدُوۡنَ ﴿۲۱﴾ السجدۃ — اور جب اُن پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے۔

بَلِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يُكَذِّبُوۡنَ ﴿۲۲﴾ — بلکہ کافر جھٹلاتے ہیں۔

وَ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يُوۡعُوۡنَ ﴿۲۳﴾ — اور اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے جو وہ دلوں میں رکھتے ہیں ۳۵۷۱

فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۲۴﴾ — سو انھیں دردناک عذاب کی خبر دے۔

اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ — ہاں جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں، اُن کے

ع ۲۵ ۹ لَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ﴿۲۵﴾ ع — لیے اجر ہے جو ختم نہ ہوگا۔

وسق سے مراد ہے ماجمع من الظّلام یعنی تاریکیاں جو وہ جمع کرتی ہے یا رات کے حادثات مراد ہیں اور اِتّساق اجتماع ہے (غ) اور اِتّسق القمر کے معنی ہیں استوی یعنی کامل ہوگیا اور اتساق قمر اس کا بھر جانا اور اس کا اجتماع اور اس کا کامل ہونا ہے جو تیرھویں اور چودھویں رات کو ہوتا ہے (ل) دیکھو ۳۳۸۷ لترکبن طبقاً عن طبق سے مراد ہے انسان کا درجہ بدرجہ ترقی کرنا اور شفق۔ اور پھر رات کا تاریکیوں کو جمع کرنا پھر چاند کا کمال کو پہنچنا ظاہر مناظر قدرت ہیں کہ اسی طرح انسان بھی روحانی طور پر ترقی کرتا ہے شفق کی حالت گویا اسی دنیا کے آخری اوقات سے مشابہ ہے اور موت کے بعد کی حالت رات کی تاریکی سے مشابہ ہے اور پھر چاند کی طرح کمال کو پہنچنا ہے جو جنت کی حالت سے مشابہ ہے اور مجاہد سے شفق کے معنی کل النہار مروی ہیں (ج) اور بخاری میں ابن عباس سے ہے کہ لترکبن طبقا عن طبق نبی کریم صلعم کی ترقیات کا ذکر ہے۔ اور معنی حالاً بعد حالٍ ہی کیے ہیں اور مطلب یہ لیا گیا ہے کہ آپ کا امر بتدریج ترقی کرے گا یعنی پہلے مغلوبیت کی حالت ہوگی پھر برابری کی پھر غلبہ کی اور اصل میں مراد امر اسلام ہے جو سب کو شامل کرتا ہے یعنی امر اسلام ترقی کرتے کرتے آخر سب ظلمتوں کو دور کر دے گا اور بدر کامل کی طرح ہو جائیگا۔ گو درمیان میں رات کی تاریکیوں کی طرح اس پر مشکلات کا زمانہ بھی آجائے ؎

۳۵۷۱ بما یوعون۔ ایعاء دیکھو ۱۵۷۰ یہاں مراد دلوں میں کچھ باتوں کا بند رکھنا ہے خواہ وہ منصوبے ہوں جو اسلام کے خلاف اسلام کے دشمن رکھتے ہیں یا ان کے کینے۔ اور یہ معنی لترکبن کے دوسرے معنی کے مطابق ہیں اور یا مراد ان قویٰ کا بند رکھنا ہیں جنہیں وہ ترقی سے روکتے ہیں اور یہ لترکبن کے پہلے معنی کے مطابق ہے اور ابن زید نے اعمال سوء کا جمع رکھنا مراد لیا ہے (ر) اور عذاب الیم کی بشارت میں یہ اشارہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ عذاب الیم روحانی ترقیات کا راستہ کھولنے کے لیے ایک ضروری چیز ہے یعنی جو لوگ یہاں ان ترقیات کے لیے مجاہدہ نہیں کرتے جیسا کدح کے لفظ میں اشارہ ہے انہیں دوسرے عالم میں ان مجاہدات کی جگہ عذاب میں سے گزرنا پڑے گا ؎

سُوۡرَةُ الۡبُرُوۡجِ مَكِّيَّةٌ (۸۵)

اٰيَاتُهَا ۲۲ — رُكُوۡعُهَا ۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ ﴿۱﴾ — ستاروں والا آسمان گواہ ہے۔

وَ الۡيَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ ﴿۲﴾ — اور وعدے کا دن

وَ شَاهِدٍ وَّ مَشۡهُوۡدٍ ﴿۳﴾ — اور گواہ اور جس کی گواہی دی گئی۔

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ﴿۴﴾ — خندق والے ہلاک ہوگئے ۳۵۷۲

تمہید سورت: اس سورت کا نام البروج ہے اور اس میں بائیس آیتیں ہیں لفظ بروج میں اشارہ ایک قوم کے ملک عرب میں پیدا ہونے کی طرف ہے جو اس ملک کو اسی طرح بھر دے گی جس طرح ستاروں نے آسمان کو بھرا ہوا ہے کیونکہ ستارے رات کے وقت روشنی کا موجب ہوتے ہیں اور صحابہ نے بھی روشنی کو دنیا میں پھیلایا اور مخالفین کا ذکر بھی کیا کیونکہ وہ اس قوم کو مٹانے کی کوششیں کرنے والے تھے۔ یہ سورت بالاتفاق مکّی ہے اور ابتدائی زمانہ کی ہے ؎

۳۵۷۲ یہاں تین چیزوں کو گواہ کے طور پر پیش کیا۔ اول برجوں والا آسمان اور بروج سے مراد ستارے ہیں دیکھو ۶۹۶ اور یہاں مجاہد سے یہی معنی مروی ہیں (ج) دوم یوم موعود ہے جس سے فصل قضاء کا دن مراد لیا گیا ہے مگر فصل قضاء سے مراد اس دنیا میں حق و باطل کے فیصلہ کا وقت ہی

النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝۵
آگ والے جس میں ایندھن ڈالا جاتا ہے۔ ع۳۵۷۳

اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝۶
جب وہ اس پر بیٹھے ہوئے تھے

وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝۷
اور وہ اس پر گواہ تھے، جو وہ مومنوں کے ساتھ کرتے تھے۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۸
اور وہ ان سے صرف اس بات کو بُرا مناتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ غالب تعریف کیے گئے پر ایمان لائے ہیں۔

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۹
وہ جس کی بادشاہت آسمانوں اور زمین کی ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝۱۰
وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دکھ دیتے ہیں، پھر توبہ نہیں کرتے، تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے ع۳۵۷۴

ہوسکتا ہے یا وہ دن جب حق ظاہر ہو جائے اور اس کے رستے سے رکاوٹیں دور ہو جائیں اگر قیامت کا دن مراد لیا جائے تو اسے گواہ کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ سوم شاہد اور مشہود ہیں اول سے مراد جمعہ کا دن۔ یا آنحضرت صلعم یا خود انسان یا اللہ تعالیٰ لیا گیا ہے اور دوم سے مراد یوم عرفہ یا قیامت کا دن اور ان تین کی شہادت کو اس بات کے متعلق پیش کیا گیا ہے کہ خندق والے ہلاک ہوگئے خندق والوں کے متعلق بھی مختلف اقوال ہیں بعض کے نزدیک جن مومنوں کے ان کے ہاتھ سے قتل کا ذکر ہے وہ بقایائے مجوس میں سے اہل کتاب تھے اور بعض کے نزدیک بنی اسرائیل کے کچھ لوگ تھے اور خیال کیا جاتا ہے کہ دانیال بھی ان میں سے تھے (ج) اور صہیب کی روایت مسلم وغیرہ میں ہے کہ ایک لڑکا ایک کاہن کے پاس جایا کرتا تھا پھر اسے ایک راہب مل گیا اور اس کے پاس جانے لگا بالآخر بادشاہ نے ان سب کو مروا دیا اور جب لوگوں کا رجوع ان کی باتوں کی طرف دیکھا تو ایک خندق کھدوا کر اور اس میں آگ جلوا کر ایسے لوگوں کو اس میں ڈال دیا۔ اور بعض کے نزدیک ذونواس ایک یہودی بادشاہ تھا جس نے عیسائیوں کو آگ میں جلوا دیا (ر) اور بائبل میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ بخت النصر شاہ بابل نے تین یہودیوں سدرک۔ میسک اور عبید نجو کو اس قصور پر کہ وہ بادشاہ کے بنائے ہوئے بت کو سجدہ نہ کرتے تھے۔ آگ کی جلتی ہوئی بھٹی میں ڈلوا دیا مگر ان کا کچھ نقصان نہ ہوا۔ دیکھو دانیال تیسرا باب۔ اور یہاں توجیہ یوں بھی کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلعم کے اعدا بھی اسی طرح ہلاک کیے جائیں گے جس طرح خندق والے ہلاک ہوئے جنہوں نے پہلے خدا پرستوں کو تکلیف پہنچائی پس ہوسکتا ہے کہ اصحاب الاخدود میں انہی واقعات کی طرف اشارہ ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ یہ آیندہ کے متعلق پیشگوئی ہو ورنہ شہادت کا پیش کرنا بے معنی ہے ایک اصحاب الاخدود تو وہ تھے جن کے مقابل پر نبی کریم صلعم کو مدینہ کے گرد خندق کھود کر اپنے آپ کو محفوظ کرنا پڑا اور ایک اصحاب الاخدود وہ ہیں جن کی تمام جنگیں آج خندق میں ہوتی ہیں۔ اور دونوں جگہ مومنوں کو تکلیف محض اس لیے پہنچائی جاتی ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لانے والی قوم ہے۔ اور یا اصحاب الاخدود سے مراد اصحاب النار ہی ہیں اور مطلب یہ ہے کہ مومنوں کو دکھ دینے کی وجہ سے آخر انہیں دوزخ کے عذاب کا مزا چکھنا پڑے گا اور اس صورت میں آیت ۷ میں ان کے شہود ہونے سے مراد ہوگی کہ جو دکھ وہ مومنوں کو دیتے رہے تھے اس کا مزہ برنگ عذاب چکھ رہے ہونگے اور ستاروں والے آسمان کی طرف توجہ دلا کر یوم موعود کے ذکر میں یہ اشارہ ہے کہ جس طرح یہ ظاہری آسمان ستاروں سے بھرا ہوا ہے اسی طرح ملک عرب پاک اور نیک لوگوں سے بھر جائیگا جو لوگوں کے لیے نور اور ہدایت کا موجب ہونگے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے صحابہ کو نجوم سے مشابہت بھی دی ہے اصحابی کالنجوم پس اصل مراد یہ ہے کہ وہ وعدے کا دن آرہا ہے جب ملک عرب اسی طرح نیک لوگوں سے بھر جائے جس طرح آسمان ستاروں سے بھرا ہوا ہے۔ اور شاھد حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور مشہود وہ امر جس کی گواہی آپ نے دی یعنی حق کا غالب آنا یا مشہود وہ لوگ ہیں جو آپ کی تعلیم کو اپنے اندر لے لینگے کیونکہ یہی وہ امر بھی تھا جس کی گواہی دی گئی ؞

ع۳۵۷۳ ربیع سے روایت ہے کہ عذاب جہنم آخرت میں اور جلنے کا عذاب دنیا میں ہے (ر) آگے بطش میں بھی عذاب دنیا کیطرف اشارہ ہے

ع۳۵۷۴ وقود۔ وَقَدَتِ النَّارُ (مصدر وُقُود) آگ جل اُٹھی اور اَوْقَدْتُھا میں نے اسے جلایا اور یہی معنی اِسْتَوْقَدَ کے ہیں کَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نارًا (البقرۃ ۲-۱۷) اَوْقِدْ لِی یٰھَامَانُ (القصص ۲۸-۳۸) نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ (الھمزۃ ۱۰۴-۶) اور وَقَدَ کا استعمال استعارۃً جنگ کے لیے ہوتا ہے جیسے

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ⑪
وہ لوگ جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں ، ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ، یہ بڑی کامیابی ہے۔

إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ⑫
یقیناً تیرے رب کی گرفت سخت ہے۔

إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ ⑬
وہی پہلی بار بناتا اور بار بار بناتا ہے۔

وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ⑭
اور وہ بخشنے والا محبّت کرنے والا ہے۔

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ⑮
عرش کا مالک بڑی شان والا۔

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ⑯
کرگزرنے والا جو وہ چاہتا ہے۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ⑰
کیا تجھے لشکروں کی خبر پہنچی ہے۔

فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ ⑱
فرعون اور ثمود کی۔

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ⑲
بلکہ وہ جو کافر ہیں جھٹلانے میں (لگے ہوئے) ہیں۔

وَاللَّهُ مِن وَرَائِهِم مُّحِيطٌ ⑳
اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے۔

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ㉑
بلکہ وہ ایک قرآن بڑی شان والا ہے۔

فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ㉒ ع ۱۰/۳۲
محفوظ تختی میں ۳۵۷۵ء

نار کا استعمال ہوتا ہے کلما اوقدوا نارا للحرب (المائدۃ ۵-۶۴) اور وَقُود ایندھن کو بھی کہا جاتا ہے جس سے آگ جلتی ہے اور شعلہ کو بھی جو اس سے نکلتا ہے وقودھا الناس والحجارۃ (البقرۃ ۲-۲۴) (غ) اور یہاں شعلوں والی آگ مراد ہو سکتی ہے یا ایسی آگ جس میں ایندھن ڈال کر اسے جلتا رکھا جاتا ہے۔

۳۵۷۵ء قرآن کے لوح محفوظ میں ہونے سے مراد : لوح محفوظ مشہور ہے اور حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ اس کا طول مابین السماء والارض ہے اور اس کا عرض مابین المشرق والمغرب ہے (ر) اور یہاں قرآن مجید کے لوح محفوظ میں ہونے سے ایک مراد یہ لی گئی ہے کہ وہاں تک شیاطین نہیں پہنچ سکتے اور ایک یہ کہ قرآن شریف بعد اتار اجانے کے تغیر و تبدل اور کمی زیادتی سے محفوظ ہے جیسا کہ انّا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون کا منشاء ہے (م) اور چونکہ یہاں اوپر ذکر ان لوگوں کا تھا جو تکذیب اور مخالفت کے درپے ہیں اور قرآن مجید کو گویا نابود کرنا چاہتے ہیں تو اس لیے لوح محفوظ میں ہونے سے خاص اشارہ اسی طرف معلوم ہوتا ہے کہ دشمن اسے نیست و نابود نہیں کر سکتے۔ اور لوح محفوظ کا تعلق علم الٰہی سے ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں

آیاتها ۱۷ — سُورَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ (۸۶) — رکوعها ۱

تمہید سورت : اس سورت کا نام الطارق ہے اور اس میں سترہ آیتیں ہیں اور طارق رات کے وقت آنے والے کو کہتے ہیں اور مراد اس سے نبی کریم صلعم کا ظلمت کے وقت دنیا میں ظاہر ہونا اور اس ظلمت کو دور کرنا ہے اور پچھلی سورت کے مضمون کو جاری رکھا ہے کہ کس طرح آپ کے آنے سے تاریکی دور ہو کر نور اور ہدایت پھیل جائے گی یہ سورت بھی بالاتفاق مکّی ہے اور ابتدائی زمانہ کی ہے ؛

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

وَ السَّمَآءِ وَ الطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾ آسمان گواہ ہے اور رات کو آنے والا۔

وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ اور تجھے کیا خبر ہے کہ رات کو آنے والا کون ہے۔

النَّجۡمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾ چمکتا ہُوا ستارہ ہے ۳۵۷۶

اِنۡ کُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَیۡہَا حَافِظٌ ؕ﴿۴﴾ کوئی جان نہیں مگر اس پر حفاظت کرنے والا ہے۔

فَلۡیَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ مِمَّ خُلِقَ ؕ﴿۵﴾ پس انسان دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔

خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ﴿۶﴾ وہ گرائے ہوئے پانی سے پیدا ہُوا ہے۔

یَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَیۡنِ الصُّلۡبِ وَ التَّرَآئِبِ ؕ﴿۷﴾ وہ پیٹھ اور پسلیوں کے بیچ میں سے نکلتا ہے ۳۵۷۷

اِنَّہٗ عَلٰی رَجۡعِہٖ لَقَادِرٌ ؕ﴿۸﴾ یقیناً وہ اس کے لوٹانے پر بھی قادر ہے۔

ع۳۵۷۶ طارق۔ طریقۃ رستہ ہے ع۲۰۸۰ اور طارق رستہ پر چلنے والا لیکن تعارف میں رات کے وقت آنے والے سے مخصوص ہوگیا ہے اور نجم کو بھی اس کے رات کے وقت ظہور کرنے کی وجہ سے طارق کہا جاتا ہے (غ) اور رات کے آنے والے کو طارق اس لیے کہا جاتا ہے کہ اسے دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے کیونکہ طَرْق کے معنی مارنا ہیں اور یہاں طارق سے مراد وہ نجم بھی لیا گیا ہے جسے صبح کا سیارہ کہا جاتا ہے اور ہند کا قول ہے نحن بنات الطارق ہم طارق کی بیٹیاں ہیں یعنی ہمارا باپ شرف اور علو میں ستارہ کی طرح ہے اور کہا گیا ہے کہ مراد ہے ہم لوگوں میں سے صاحب مرتبہ کی بیٹیاں ہیں گویا کہ وہ علو قدر کے لحاظ سے نجم ہے اور طارق ہر نجم کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ رات کو نکلتا ہے۔ اور یذھبا بطریقتکم المثلٰی (طٰہٰ۔۶۳) میں طریقۃ کے معنی رجال اشراف بھی کیے گئے ہیں کیونکہ عرب لوگ بڑے صاحب فضل کو کہتے ہیں کہ یہ اپنی قوم کا طریقہ ہے (ل)۔

آنحضرتؐ کی مشابہت صبح کے سیارہ سے: یہاں آسمان اور طارق کو شہادت میں پیش کرکے خود ہی بتا دیا ہے کہ طارق چمکتا ہوا ستارہ ہے۔ اور لفظ ثاقب میں اشارہ ہے کہ اس کی روشنی ایسی تیز ہے کہ تاریکی کو پاش پاش کر دے گی۔ اور چونکہ طارق کا لفظ عربی زبان میں عظیم الشان لوگوں پر بولا جاتا تھا اس لیے یہاں اس میں خاص اشارہ حضرت نبی کریم صلعم کی طرف ہے اور آپ کو طارق اس لحاظ سے کہا کہ آپ ایک سخت تاریک رات میں آئے جیسا کہ دوسری جگہ بھی آپ کی آمد کے زمانے کو لیل سے ہی تعبیر کیا ہے ع۳۰۲۶ کیونکہ ساری دنیا پر تاریکی اور جہالت چھائی ہوئی تھی اور نجم ثاقب اس لحاظ سے کہ آپ کی قوت قدسی کی تیز روشنی اس جہالت کی تاریکی کو دور کرنے والی تھی اور انجیل میں اس لطیف استعارہ کو ایک بدنما رنگ میں پیش کیا ہے جہاں مسیح کے آنے کو ایک چور سے مشابہت دی ہے جو رات کے وقت آتا ہے متی ۲۴: ۴۳ و ۴۴ اور قرآن کریم نے آنحضرت صلعم کو طارق کہکر صبح کے سیارہ سے مشابہت دی ہے اس لیے کہ گو وہ رات کو آتا ہے مگر اس کے بعد جلد ہی دن چڑھ جاتا ہے اور جواب قسم ان کل نفس لما علیھا حافظ ہے اور بعض نے انہ علی رجعہ لقادر کو جواب قسم کہا ہے اور حقیقت میں دونوں کا مطلب ایک ہے کیونکہ گو بعض نے حافظ سے مراد یہاں اللہ تعالیٰ کی حفاظت کو لیا ہے مگر اصل مطلب حفاظت اعمال سے ہے جیسا کہ ابن سیرین اور ابن عباس سے مروی ہے یحفظ عملھا ویحصی علیھا ماتکسب من خیر او شر (ج) اور یہ حافظ وہی ہے جس کا ذکر لحافظین کراماً کاتبین میں ہے۔ اور اعمال کے محفوظ کرلینے کا نتیجہ ہی دوسری زندگی ہے پس انہ علی رجعہ لقادر اسی کا نتیجہ ہے اور رسول اللہ صلعم کے وجود کو اللہ تعالیٰ نے قیامت یا بعثت کی شہادت ٹھہرایا ہے اس لیے کہ آپ کے وجود سے اس دنیا میں قیامت روحانی قایم ہوکر قیامت کبریٰ کی صداقت پر کھلی گواہی ہوگئی۔

ع۳۵۷۷ دافق۔ دَفق پانی کا گرانا ہے اور وہ متعدی ہے اور ماء دافق سے مراد ہے ذو دَفق ایک ہی مرتبہ گرایا ہوا (ل)۔

صلب صُلب سخت کو کہتے ہیں اور بلحاظ سختی کے پیٹھ کو صلب کہا جاتا ہے جمع اَصْلاب ہے من اصلابکم (النسآء۔۲۳) (غ)

یہاں صلب اور ترائب کے درمیان کہکر ایک لطیف پیرایہ میں بتایا ہے کہ انسان کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے ایک حدیث میں ہے من یضمن لی ما بین لحییہ وما بین رجلیہ فاضمن لہ الجنۃ جہاں ما بین رجلیہ یعنی اس کے دونوں پاؤں کے درمیان سے مراد اس کی شرمگاہ ہے اور امام راغب نے فرج کے معنی ایسے ہی لفظ لکھے ہیں۔ ما بین الرجلین۔ بعث بعد الموت کو بعید خیال کرنے والوں کو توجہ دلائی ہے کہ انسان کی پہلی پیدائش میں کیا کم قدرت کا نظارہ ہے کہ دوسری کو بعید سمجھتے ہو۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ⑨	جس دن چھپی باتیں ظاہر ہو جائیں گی ۳۵۷۸
فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ⑩	تو اس کے لیے نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ کوئی مددگار۔
وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ⑪	آسمان گواہ ہے جو (مینہ کو) لوٹاتا ہے۔
وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ⑫	اور زمین جو (پودوں سے) پھٹ پڑتی ہے ۳۵۷۹
اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ⑬	یہ یقیناً فیصلہ کی بات ہے۔
وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ⑭	اور یہ بیہودگی نہیں ۳۵۸۰
اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ⑮	یہ بھی ایک تدبیر میں لگے ہوئے ہیں۔
وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ⑯	اور میں بھی ایک تدبیر کر رہا ہوں۔
ع فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ⑰	پس تو کافروں کو مہلت دے انھیں تھوڑی ہی مہلت دے ۳۵۸۱

۳۵۷۸ یہاں بتایا کہ جس طرح انسان نطفہ کی حالت میں ایک سرّ کی حالت میں ہے اسی طرح اس کی دوسری زندگی اس عالم میں ایک سرّ کی حالت میں رہتی ہے اور نتائج اعمال محفوظ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہی اسرار قیامت کے دن ظہور پذیر ہو جاتے ہیں ۞

۳۵۷۹ بخاری میں مجاہد کا قول ہے کہ ذات الرجع بادل ہے جو مینہ کو لوٹاتا ہے اور ذات الصدع زمین یعنی نبات کی ساتھ پھٹنے والی اور آسمان کو ذات الرجع اس لیے کہا کہ زمین سے بخارات آبی اُٹھتے ہیں تو آسمان انہیں بارش کے رنگ میں لوٹا دیتا ہے اور ان دونوں آیتوں میں آسمان اور زمین کی زوجیت کیطرف توجہ دلائی ہے کہ آسمان کے بارش برسانے سے زمین میں سے کیا کیا نکل کھڑا ہوتا ہے اسی طرح قرآن ایک بارش روحانی ہے جو انسانوں کے اندر ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیگا اور انکی مخفی طاقتوں کو زندہ کر دیگا اسی لیے جواب قسم ہے انه لقول فصل یعنی حق کو باطل سے الگ کر دیگا۔ حق زندہ ہوگا اور باطل مر جائے گا۔

۳۵۸۰ هزل ہر کلام جس سے فائدہ کچھ نہ ہو کیونکہ ھزال دبلاپن کو کہتے ہیں (غ) اور ھَزْل نقیض جِدّ ہے (ل) یعنی بیہودگی ۞

۳۵۸۱ رویدا۔ رُوْد مہلت کو کہتے ہیں اور رویداً کے معنی ہیں مھلاً اور سیبویہ کے نزدیک یہ اسم فعل ہے اور روید ا کے معنی ہیں امھله یعنی اسے مہلت دے اور بعض نے رُوید کو رود کی تصغیر قرار دیا ہے (ل) اور مطلب یہ ہے کہ فیصلے کے دن کا انتظار کریں ۞

آیاتہا ۱۹ (۸۷) سُوْرَةُ الْاَعْلٰى مَكِّيَّةٌ رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ①	اپنے رب بہت بلند کے نام کی تسبیح کر۔
الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ②	جس نے پیدا کیا، پھر ٹھیک بنایا۔
وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ③	جس نے (حد کا) اندازہ لگایا پھر راہ دکھائی ۳۵۸۲

تمہید سورت: اس سورت کا نام الاعلیٰ ہے اور اس میں اُنیس آیتیں ہیں الاعلےٰ اللہ تعالیٰ کا اسم ہے اور یہاں بتایا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے سے ہی انسان علو کے مقام پر پہنچ سکتا ہے۔ یہ سورت بھی ابتدائی مکی زمانہ کی ہے ۞

۳۵۸۲ الاعلیٰ بمعنی عالی ہے اور العَلِیّ اور العالی اور المتعالی اور الاعلیٰ ان سب کے معنی ملتے جلتے ہیں۔ العلیّ صاحب شرف ہے اور وہ العالی کے معنی میں ہے اور وہ وہ ہے جس کے اوپر کوئی نہیں یا وہ اپنی مخلوق پر غالب ہے اور اپنی قدرت سے ان کو مغلوب رکھتا ہے اور الاعلیٰ وہ ہے جو ہر ایک عالی سے بلند تر ہے اور اس کا اسم الاعلیٰ ہے یعنی اس کی صفت سب صفات سے بلند تر ہے ۞

وَ الَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی ۪ۙ ﴿۴﴾ — اور جس نے چارہ نکالا۔

فَجَعَلَہٗ غُثَآءً اَحۡوٰی ؕ﴿۵﴾ — پھر اسے سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا ۳۵۸۳

سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی ۙ﴿۶﴾ — ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہ بھولے گا۔

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ؕ اِنَّہٗ یَعۡلَمُ الۡجَہۡرَ وَ مَا یَخۡفٰی ؕ﴿۷﴾ — مگر جو اللہ تعالیٰ چاہے ۳۵۸۴ وہ کھلی بات کو جانتا ہے، اور (اسے بھی) جو چھپا ہے۔

وَ نُیَسِّرُکَ لِلۡیُسۡرٰی ۚ﴿۸﴾ — اور ہم آسان (طریق) کی طرف تجھے چلائیں گے ۳۵۸۵

فَذَکِّرۡ اِنۡ نَّفَعَتِ الذِّکۡرٰی ؕ﴿۹﴾ — سو نصیحت کرتا رہ، نصیحت یقیناً نفع دیتی ہے۔

نماز سے علو کا ملنا: یہاں اوّل اللہ تعالیٰ کے اسم الاعلےٰ کی تسبیح کے لیے فرمایا اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم اس آیت کو پڑھکر کہا کرتے تھے سبحان ربی الاعلےٰ اور اس نام کی تنزیہ میں یہ اشارہ ہے کہ اس کا علو تمام عیوب سے منزہ ہے اور جسمانی بلندی کے خیال سے بالاتر اور یہ بھی کہ انسان کو علو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے ہی مل سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جس صفت کو انسان اپنے سامنے رکھتا ہے اسی صفت کا وہ مظہر بن جاتا ہے اور نماز میں انتہائی ذلت کی حالت سبحان ربی الاعلےٰ کا ذکر سکھانا بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ اسی ذریعہ سے انسان علو پر پہنچ سکتا ہے اور اسی لیے نماز کو معراج مومن کہا ہے گویا سبح اسم ربک الاعلےٰ میں نماز کی طرف ہی توجہ دلائی ہے اور اس کو آگے چل کر واضح بھی فرمایا ہے دیکھو آیت [15] وذکر اسم ربہ فصلّٰی

خلق و ہدایت کا تعلق: اس کے بعد چار امور کا ذکر کیا۔ خلق۔ تسویۃ۔ تقدیر۔ ہدایت اور چونکہ یہاں مفعول مذکور نہیں اس لیے ساری مخلوق ہی مراد ہے یعنی ہر چیز کو پیدا کیا۔ ہر چیز کو ایک کمال دیا۔ ہر چیز کے لیے ایک اندازہ اور حد بست مقرر کی کہ اس سے باہر وہ نہیں نکل سکتی اور ہر چیز کو ہدایت دی یعنی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں ایک قانون بتایا کہ اس پر چل کر وہ اپنے کمال کو حاصل کرے۔ پیدائش کے مقابلہ میں اندازہ مقرر کرنا اور تسویہ کے مقابلہ میں ہدایت ہیں اور یہ چاروں باتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اگر اللہ تعالیٰ خلق نہیں کرتا تو وہ ان چیزوں کی حد بست بھی مقرر نہیں کر سکتا اور نہ کمال تک پہنچانے کے قوانین بنا سکتا ہے دوسری جگہ یوں فرمایا اعطی کل شیءٍ خلقہ ثم ھدٰی گویا خلق سے ہی ہدایت وابستہ ہے۔ ایسا ہی انسان کے کمال روحانی کو حاصل کرنے کی راہ بھی اللہ تعالیٰ ہی بتا سکتا ہے آریہ جو خلق کے منکر ہیں انہیں ہدایت کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔

۳۵۸۳ احوی۔ حُوَّۃ سیاہی ہے جو سبزی کی طرف مائل ہو اور اسی سے حَوّاء ہے۔ اور ہر ایک سیاہ کو اَحْوٰی کہا جاتا ہے اور اَحْوٰی وہ ہے جو پرانا ہو کر سیاہ ہو جائے (ل) سبزی کا کمال یہی ہے۔

۳۵۸۴ آنحضرت کا معجزہ کہ قرآن کو نہ بھولتے تھے: جب ہر چیز کا کمال الگ ہے تو اس کی ہدایت بھی الگ ہے انسان دیگر مخلوق سے ایک فوقیت رکھتا ہے اس لیے اس کا کمال بھی بلند تر ہے۔ اور وہ کمال حاصل کرنے کے لیے اتباع وحی ضروری ہے اللہ تعالیٰ کی وحی کا یہاں ایک نشان بیان کیا کہ ہم تجھے پڑھاتے ہیں تو تو اسے بھول نہیں سکتا۔ آنحضرت صلعم بھی ایک انسان تھے اور ہر انسان بھولتا بھی رہتا ہے آنحضرت بھی دیگر باتوں میں بعض وقت بھول جاتے تھے جس کے متعلق فرمایا الّا ما شاء اللہ جہاں اِلَّا استثنائے منقطع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح دوسرے انسان بھولتے ہیں تم بھی بہتیری باتیں بھول جاتے ہو مگر اللہ تعالیٰ کے پڑھانے کا یہ نشان ہے کہ آپ اسے بھولتے نہیں۔ آپ پر بیس بیس رکوع کی سورت اکٹھی نازل ہوئی اور ان سورتوں کے مضامین جو توحید و نبوت کی دلائل سے پُر ہیں نہایت دقیق ہیں پھر ایک ایک سورت کا نزول کئی کئی سال تک ممتد رہا جب ایک آیت اترتی تو اسے آپ ایک خاص جگہ لکھوا دیتے لیکن آپ خود نہ پڑھنا جانتے ہیں نہ لکھنا نہ آپ کے گھر میں کوئی لکھا ہوا نسخہ قرآن شریف کا موجود ہے۔ بایں آپ نمازوں میں متفرق مقامات سے قرآن پڑھتے ہیں اور نہ کسی سورت میں ایک حرف کی کمی بیشی وقوع میں آتی ہے نہ ترتیب میں ایک آیت آگے پیچھے ہوتی ہے یہ کس قدر بڑا معجزہ ہے کہ بجائے خود یہی صداقت وحی پر ایک قاطع دلیل ہے۔ الا ما شاء اللہ سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ آپ قرآن کا کوئی حصہ بھی بھول جاتے تھے کیونکہ اس طرح عبارت بے معنی ہو جاتی ہے یعنی عبارت یوں ہوگی کہ ہمارے پڑھائے ہوئے کو تم نہیں بھولتے مگر اس میں سے جو خدا چاہے بھول بھی جاتے ہو۔ اصل مطلب وہی ہے جو اوپر بیان ہوا کہ ہمارے پڑھائے ہوئے کا یہ نشان ہے کہ تم اسے نہیں بھولتے حالانکہ دوسری باتوں کو بھول بھی جاتے ہو اور قرآن تو ساتھ ساتھ لکھا بھی جاتا تھا۔ پس اس کا کوئی حصہ بھلایا نہیں گیا۔

۳۵۸۵ نیسّر۔ یسری۔ یُسْرٰی سہل کو کہتے ہیں اور یَسَّرَہٗ کے معنی ہیں اسے سہل کر دیا اور تیسیر خیر میں بھی ہوتی ہے اور شر میں بھی فسنیسرہ للعسرٰی (اللیل ۹۲-۱۰) (ل) اور یسریٰ عمل خیر ہے (ج) کیونکہ اس کا نتیجہ سہولت ہے تو مطلب یہ ہے کہ ہم ایسے اسباب پیدا کر دیں گے کہ آپ کے رستے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہو جائیں اور ہر قسم کی بھلائی کے لیے سہولتیں پیدا کر دینگے۔

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝۱۰
وہی نصیحت حاصل کرتا ہے جو ڈرتا ہے۔

وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝۱۱
اور بدبخت اس سے دُور ہوتا ہے۔

الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝۱۲
جو بڑی آگ میں داخل ہوگا۔

ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝۱۳
پھر وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ زندہ ہوگا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝۱۴
وہی کامیاب ہوتا ہے جو اپنے آپ کو پاک کرتا ہے۔

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝۱۵
اور اپنے رب کے نام کو یاد کرتا ہے پس نماز پڑھتا ہے۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۱۶
بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝۱۷
حالانکہ آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝۱۸
یقیناً یہ پہلے صحیفوں میں ہے۔

صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝۱۹ ع
ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں (میں)۔ ۳۵۸۶

۳۵۸۶ انبیاء کی تعلیم ہمیشہ ایک ہی رہی ہے: ان ھذا لفی الصحف الاولی میں اشارہ اس تعلیم کی طرف ہے یعنی یہی تعلیم قد افلح من تزکی یعنی (تزکیہ سے ہی انسان فلاح کو حاصل کر سکتا ہے) پہلے صحیفوں میں بھی موجود ہے بالفاظ دیگر تمام انبیاء کی تعلیم ہمیشہ ایک ہی رہی ہے کہ انسان دنیا کی زندگی تک اپنی نظر کو محدود نہ رکھے بلکہ ایک نئی زندگی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے اور بعض نے اشارہ ھذا میں ذکری یعنی قرآن کی طرف لیا ہے کہ یہ قرآن پہلے صحیفوں میں بھی موجود ہے جیسا کہ دوسری جگہ ہے لفی زبر الاولین (الشعراء ۲۶-۱۹۶)

سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ (۸۸)

اٰیاتها ۲۶ — رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱
کیا تیرے پاس ڈھانک لینے والی کی خبر آئی ہے؟ ۳۵۸۷

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝۲
(کچھ) مُنہ اس دن ذلیل ہوں گے۔

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝۳
محنت کرنے والے تھکے ماندے

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝۴
جلتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝۵
اُبلتے ہوئے چشمے سے انھیں پانی پلایا جائے گا۔

تمہید سورت: اس سورت کا نام الغاشیۃ ہے اور اس میں چھبیس آیتیں ہیں۔ غاشیۃ ڈھانک لینے والی چیز کو کہتے ہیں اور اس نام میں یہ اشارہ ہے کہ جو لوگ اپنے نفس کا تزکیہ نہیں کرتے اور دنیا پر ہی گرے رہتے ہیں ان کے لیے آخر ایک وقت آتا ہے کہ جس مصیبت سے وہ بچنا چاہتے تھے وہی ان کو ڈھانک لیتی ہے ابتدائی مکی زمانہ کی سورت ہے۔

۳۵۸۷ الغاشیۃ دیکھو ۱۰۸۱ اور اصل استعمال اس کا ہر ڈھانک لینے والی چیز پر ہے مثلاً ایک شخص کا غاشیۃ وہ ہیں جو اس کے دوستوں وغیرہ میں سے اس کی ملاقات کو پے در پے آتے ہیں اور قیامت کو غاشیۃ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے خوف سے مخلوق کو ڈھانک لے گی (ل) اور چونکہ یہاں ذلت اور مشقت اور تکان وغیرہ کا ذکر ہے ہو سکتا ہے کہ قیامت کو غاشیۃ اسی لحاظ سے کہا ہو کہ جس محنت و مشقت سے انسان یہاں بچنا تھا آخر وہی اس کو ڈھانک لے گی۔

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ ﴿٦﴾	سوائے کانٹوں کے ان کے لیے کوئی کھانا نہ ہوگا۔
لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ ﴿٧﴾	وہ نہ موٹا کرتا ہے اور نہ بھوک میں کام آتا ہے ۳۵۸۸
وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاعِمَةٌ ﴿٨﴾	کچھ منہ اس دن تروتازہ ہوں گے۔
لِسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿٩﴾	اپنی کوشش کی وجہ سے راضی ہوں گے۔
فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿١٠﴾	بلند بہشت میں۔
لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً ﴿١١﴾	تُو اُس میں کوئی لغویات نہ سُنے گا۔
فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿١٢﴾	اس میں بہتا ہُوا چشمہ ہے۔
فِيهَا سُرُرٌ مَرْفُوعَةٌ ﴿١٣﴾	اُس میں اونچے تخت ہوں گے۔
وَأَكْوَابٌ مَوْضُوعَةٌ ﴿١٤﴾	اور آب خورے رکھے ہوئے۔
وَنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ﴿١٥﴾	اور گاؤ تکیے قطار میں لگے ہُوئے۔
وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ﴿١٦﴾	اور فرش بچھائے ہوئے ۳۵۸۹
أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ وقفة	توکیا بادلوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیے گئے ہیں۔
وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿١٨﴾ وقفة	اور آسمان کی طرف کہ وہ کیسا بلند بنایا گیا ہے۔
وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وقفة	اور پہاڑوں کی طرف کہ وہ کس طرح کھڑے کیے گئے ہیں۔
وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿٢٠﴾ وقفة	اور زمین کی طرف کہ وہ کس طرح بچھائی گئی ہے ۳۵۹۰

۳۵۸۸ عاملة۔ ناصبة مجاہد کا قول بخاری میں ہے کہ اس سے مراد نصاریٰ ہیں تو اس صورت میں مراد یہ ہوگی کہ وہ دنیا میں کام کرتے رہے جن کا نتیجہ سوائے تکان اور درماندگی کے کچھ نہ ملا اور یہ معنی زید سے مروی ہیں (ل) اور قیامت کے دن اُن کے عاملة ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہاں خدا کی راہ میں مشقت برداشت نہ کرتے تھے وہاں مشقت اٹھانی پڑے گی۔

ضریع خشک شدہ شبرق یا ایک خاردار جھاڑی ہے یا بدبودار نبات جسے سمندر پھینکتا ہے جو کچھ ہو مراد منکر شئے ہے (غ) دنیا اور اسکی آرزوئیں فی الحقیقت خاردار جھاڑیاں ہیں جو نہ انسان کو موٹا کرتی ہیں یعنی نہ روحانی طور پر اس کے کسی فائدہ کا موجب ہیں نہ بھوک رُکتی ہے بلکہ دنیا کی حرص کی آگ اور زیادہ مشتعل ہوتی ہے۔

۳۵۸۹ نمارق واحد نُمرُقة یا نِمرِقة ہے وسادة یعنی تکیئے کو کہتے ہیں اور اس گدی کو بھی جو زین کے اوپر بیٹھنے کے لیے رکھی جاتی ہے (غ)

زرابی زِربِ کی جمع ہے اور وہ ایک قسم کا خوبصورت کپڑا ہے جو ایک خاص مقام کی طرف منسوب ہے (غ)

۳۵۹۰ ابل اونٹوں کو کہتے ہیں اس لفظ سے واحد نہیں آیا۔ اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد بادل ہیں اور یہ اگر ہو تو تشبیہ کی وجہ پر صحیح ہو سکتا ہے (غ) اور بعض نے کہا ہے کہ ابل کے معنی بادل ہیں جو بارش کے لیے پانی اٹھاتے ہیں (ل) ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اونٹ کی پیدائش کی طرف توجہ دلائی ہو کہ وہ ریگستانوں میں سخت برداشت کی طاقت رکھتا ہے اور سماء جبال ارض کے ساتھ زیادہ موزون بادل کا ذکر ہے۔

سطحت۔ سَطح گھر کا سب سے اونچا مقام ہے اور سَطَحتُ البَیتَ کے معنی ہیں گھر کی سطح بنائی (غ) اس لفظ کے اختیار کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ زمین کا اوپر کا چھلکا قابل رہائش بنایا ہے۔

یوں تو سب ظاہری مناظر قدرت کی طرف توجہ دلائی ہے مگر ساتھ ہی اس میں انسان کو یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ بادلوں کی سخاوت۔ آسمان کی رفعت۔ پہاڑوں کے استقلال۔ زمین کی فراخی کو اپنے اخلاق میں جمع کرے۔

فَذَكِّرْ ۟ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ؕ﴿۲۱﴾ — سو نصیحت کر تُو صرف یاد دلانے والا ہے۔

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۙ﴿۲۲﴾ — اُن پر تُو داروغہ نہیں۔

اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ۙ﴿۲۳﴾ — ہاں جو منہ پھیرتا اور انکار کرتا ہے۔

فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ؕ﴿۲۴﴾ — تو اللہ تعالیٰ اُسے بڑا عذاب دے گا۔

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۙ﴿۲۵﴾ — ہماری طرف ہی اُن کا لَوٹ کر آنا ہے۔

ع ۱۳ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾ ع — پھر ہمارے ذمے ہی اُن کا حساب ہے۔

(ایاتہا ۳۰) سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ (۸۹) (رکوعہا ۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

وَالْفَجْرِ ۙ﴿۱﴾ — فجر گواہ ہے،

وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۙ﴿۲﴾ — اور دس راتیں،

وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۙ﴿۳﴾ — اور جفت اور طاق،

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۚ﴿۴﴾ — اور رات جب جانے لگے ع۳۵۹۱

تمہید سورت: اس سورت کا نام الفجر ہے اور اس میں تیس آیتیں ہیں فجر صبح کی روشنی کے پھوٹنے کا نام ہے اور اس سورت میں بتایا ہے کہ انسان کی اعلےٰ سے اعلیٰ روحانی حالت جسے نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے عبادت الٰہی سے پیدا ہوتی ہے اور اس عبادت کے خاص ایام وہ دس راتیں ہیں جن میں نزول قرآن شروع ہوا۔ اسی فجر کی طرف سورت کے نام میں اشارہ ہے۔ اور ابتدائی مکّی سورتوں میں سے یہ ایک ہے۔

ع۳۵۹۱ عبادت الٰہی پر روحانی ترقی کا مدار ہے: یہاں جن چار چیزوں کو بطور شہادت پیش کیا ہے ان میں سے دس راتوں کے متعلق حضرت ابن عباس کی دو روایتیں ہیں اول یہ کہ یہ ذوالحج کی پہلی دس راتیں ہیں اور دوسری یہ کہ یہ رمضان کی آخری دس راتیں ہیں۔ بلکہ تبریزی کا خیال ہے کہ ان دس راتوں کے رمضان کی آخری راتیں ہونے پر اتفاق ہے اور صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم جب آخری عشرہ میں داخل ہوتے تھے تو بہت شب بیداری کرتے تھے اور وہاں لفظ ہیں اذا دخل العشر۔ اور انہی دس راتوں میں لیلۃ القدر بھی ہے اور لیال عشر کے لفظ ذی الحج کی پہلی اور رمضان کی آخری دونوں راتوں پر صادق آتے ہیں اور والشفع والوتر کے متعلق امام احمد اور ترمذی کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا الصلوٰۃ بعضہا شفع و بعضہا وتر یعنی یہ نماز ہے کہ اس کی رکعات جفت بھی ہیں اور طاق بھی اور بعض نے شفع سے مراد مخلوق کو لیا ہے اور وتر سے خالق کو۔ اور اور بھی کئی قول ہیں (ر) اور پچھلی سے پچھلی سورت میں بلکہ کئی سورتوں میں اصل مضمون یہی رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت کا تعلق پیدا کرنے سے انسان کو فلاح ملتی ہے۔ تو اس سورت میں عبادت کے بہترین ایام کا ذکر کیا ہے اور بجائے ایام کے لیال کا لفظ بھی اسی لیے اختیار کیا کیونکہ رات کی عبادت ہی بہترین عبادت ہے۔ اور جواب قسم کوئی بیان نہیں فرمایا گویا یوں فرمایا کہ اگر اس طرح سے تعلق باللہ پیدا کرو تو تم خود دیکھ لو کہ تم کس مقام پر پہنچ جاتے ہو۔ چنانچہ سورت کے آخر پر اسی ابتدا کی طرف توجہ دلانے کے لیے بغیر کسی اور تمہید کے فرمایا یایتہا النفس المطمئنۃ اور یہاں بھی فرمایا ھل فی ذٰلک قسم الذی حجر۔ کیونکہ حجر وہ چیز ہے جو انسان کو حرص و ہوا کے اتباع سے روکتی ہے دیکھو ع۱۰۲۲ اور شفع اور وتر کے لفظ میں یہ اشارہ بھی ہوسکتا ہے کہ مخلوق تو سب زوجین کے رنگ میں پیدا کی گئی ہے من کل خلقنا زوجین لعلکم تذکرون (الذٰریٰت ۵۱۔ ۴۹) اور اللہ تعالیٰ کی ذات واحد ہے۔ پس اگر تمہاری جسمانی ترقیات بغیر زوجین کے نہیں ہوسکتیں تو روحانی ترقی بغیر خدائے واحد سے تعلق پیدا کرنے کے نہیں ہوسکتی جو سب مخلوق کے مقابل پر وتر ہے جیسا کہ دوسری جگہ ہر چیز سے زوجین ہونیکے ذکر کے بعد فرمایا ففروا الی اللہ (الذٰریٰت ۵۱۔ ۵۰) اور خدا سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ عبادت ہے اور فجر کے لفظ میں اشارہ دس راتوں کی ابتدا کی فجر کی طرف بھی ہوسکتا ہے اور لیلۃ القدر کی فجر کی طرف ھی حتی مطلع الفجر۔ اور والیل اذا یسر میں آخری رات کے نکلنے یا تاریکی کے دور ہونے اور روشنی کے نمودار ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

هَلْ فِي ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ ۝٥	اس میں عقل والوں کے نزدیک قسم ہے ۔
أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝٦	کیا تو نے غور نہیں کیا کہ تیرے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا ۔
إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝٧	(عاد) ارم بلند عمارتوں والے (کے ساتھ) ع۳۵۹۲
الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝٨	جن کی مثل شہروں میں پیدا نہ ہوئے تھے ع۳۵۹۳
وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝٩	اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے وادی میں چٹان تراشے ۔
وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۝١٠	اور لشکروں والے فرعون کے ساتھ ،
الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝١١	جنھوں نے شہروں میں سرکشی کی ۔
فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۝١٢	سو اُن میں بہت فساد کیا ۔
فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝١٣	سو تیرے رب نے اُن پر عذاب کا کوڑا چلایا ع۳۵۹۴
إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝١٤	بیشک تیرا رب گھات میں ہے ۔
فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ	تو انسان کی حالت یہ ہے کہ جب اسے اس کا رب آزماتا ہے پھر اسے
فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝١٥	عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے معزز کیا ہے ۔
وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ	اور جب اسے آزماتا ہے پھر اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ
رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۝١٦	کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا ع۳۵۹۵
كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝١٧	ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم کی خاطر داری نہیں کرتے ۔
وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝١٨	اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے ع۳۵۹۶
وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَمًّا ۝١٩	اور میراث سب کچھ سمیٹ کر کھا جاتے ہو ۔

ع۳۵۹۲ ارم ۔ ایک نشان تھا جو پتھروں کو جمع کر کے بیابان میں بنا دیتے تھے جمع ارام ہے اور بعض نے اسے عاد کے نشانوں سے خاص کیا ہے اور عاد اولی کے والد کا نام بھی اِرَم تھا اور ان کے شہر کو جس میں وہ رہتے تھے اِرَم کہا گیا ہے ۔
عماد ۔ عَمُود کے لیے دیکھو ع۱۵۹۶ اور عَمَدَ الشیٔ کے معنی ہیں ایک چیز کو کھڑا کیا یا سہارا دیا اور عِماد (واحد عِمَادَۃ) بلند عمارتوں کو کہتے ہیں اور یہاں معنی لمبے قد والے بھی کیے گئے ہیں اور بلند عمارتوں والے بھی (ل)
ع۳۵۹۳ تاریخی طور پر بھی یہ ثابت ہے کہ عاد اپنے زمانہ میں قوی ترین قوم تھی اور اس کا تصرف دور دور پھیل گیا تھا ۔
ع۳۵۹۴ سوط کوڑے کو کہتے ہیں اور اس کا اصل ایک چیز کے بعض کو بعض سے مخلوط کرنا ہے انواع عذاب بھی مراد لیا گیا ہے (غ) مجاہد سے ہے کہ سَوطَ عذاب سے مراد ہے جس سے عذاب دیا گیا ۔ اور عرب کے لوگ سوطَ عذاب ہر نوع کے عذاب کو کہتے ہیں (بخاری)
ع۳۵۹۵ اللہ تعالیٰ انسان کو دونوں طرح آزماتا یا اس کی جودت و رداءت کو ظاہر کرتا ہے کبھی انعام دیکر کبھی مصائب سے ۔ لیکن ناشکرا انسان دونوں صورتوں میں اپنے نفس کی ہی پرواہ کرتا ہے انعام ملے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے معزز بنایا ہے یا بڑا بنایا ہے ۔ پھر غربا کے ساتھ مل کر بیٹھنا یا ان کے ساتھ شامل ہونا اسے دشوار معلوم ہوتا ہے اسی لیے آگے فرمایا بل لا تکرمون الیتیم ۔ اور جب رزق کم ملتا ہے تو اسے ذلت سمجھتا ہے حالانکہ نہ حقیقی عزت محض رزق کی فراوانی میں ہے اور نہ تنگئ رزق ذلت کے قائم مقام ہے بلکہ یہ دونوں انسان کی جودت و رداءت کے ظاہر کرنے کے سامان ہیں ۔
ع۳۵۹۶ تحاضون ۔ حضّ ۔ حثّ کی طرح ہے یعنی اس کے معنی کسی امر کی ترغیب دلانا ہیں (غ) ولا یحضّ (الماعون ۱۰۷ ۔ ۳)

وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ؕ﴿۲۰﴾ — اور مال سے بیحد پیار کرتے ہو۔ ۳۵۹۷

كَلَّاۤ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾ — ہرگز نہیں جب زمین ٹکڑے ٹکڑے کر کے توڑ دی جائے گی۔

وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۚ﴿۲۲﴾ — اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے قطاروں کی قطاریں ۳۵۹۸

وَ جِایْٓءَ یَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۬ۙ یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَ اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ؕ﴿۲۳﴾ — اور اس دن دوزخ لائی جائے گی۔ اس دن انسان یاد کرے گا اور اس یاد سے اُسے کیا فائدہ ہوگا ۳۵۹۹

یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ ۚ﴿۲۴﴾ — کہے گا اے کاش میں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ آگے بھیجا ہوتا۔

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ ۙ﴿۲۵﴾ — سو اس دن ایسی سزا دے گا جو کسی نے نہ دی ہوگی۔

وَّ لَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ ؕ﴿۲۶﴾ — اور ایسا جکڑے گا کہ کسی نے نہ جکڑا ہو۔

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ — اے اطمینان پانے والی جان!

ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۚ﴿۲۸﴾ — اپنے رب کی طرف لوٹ آ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۙ﴿۲۹﴾ — سو میرے بندوں میں داخل ہو جا۔

ع ۱ ۱۴ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾ — اور میری جنت میں داخل ہو جا ۳۶۰۰

۳۵۹۷ تراث کا اصل وُراث ہے جس کی واؤ تا سے بدل گئی ہے اور اس کے معنی میراث ہیں (غ)
جمّا۔ جَمّ کے معنی کثیر ہیں اور اس کی اصل جَمام سے ہے جس کے معنی مشقت کے اٹھانے کا ترک کرنا ہیں جم غفیر بڑے مجمع کو کہتے ہیں (غ)

۳۵۹۸ اللہ اور فرشتوں کا آنا ایک رنگ میں اس دنیا میں بھی ہوتا ہے دیکھو ۳۶۹

۳۵۹۹ جہنم۔ جِهِنّام بڑی گہرائی کو کہا جاتا ہے اور بئرٌ جَهَنَّمٌ بہت گہرائی والے کنوئیں کو کہا جاتا ہے اور بعض لوگوں نے اسے فارسی سے معرب کہا ہے اور بعض کے نزدیک یہ عربی ہے اور اس کی بہت گہرائی کی وجہ سے اسے جہنم کہا گیا ہے اور ابن خالویہ نے کہا ہے کہ چونکہ اس کا مادہ عربی زبان میں موجود ہے اس لیے یہ عربی لفظ ہے (ل)
یہاں جہنم کے لانے کا ذکر ہے اور ایک حدیث میں بھی یہی ذکر ہے اور یہی صحیح ہے اس لیے کہ جہنم ہر انسان اپنے ہاتھ سے پیدا کرتا ہے اور وہی جہنم قیامت میں اس کے سامنے لائی جائے گی۔

۳۶۰۰ یہ گویا ابتدائی آیات سورت کی تکمیل ہے۔ نفس مطمئنۃ کے لیے دیکھو ۱۵۵۳ اور الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد ۱۳-۲۸) سے ظاہر ہے کہ نفس مطمئنۃ کا مرتبہ ذکر اللہ سے ہی حاصل ہوتا ہے جس کی طرف والفجر ولیال عشر میں توجہ دلائی گئی ہے۔ اور ادخلی فی عبادی اور ادخلی جنتی دونوں اس دنیا کے لیے ہیں اور فی الحقیقت اگر اس دنیا میں جنت نہ ملے تو وہ نفس مطمئنۃ نہیں کہلا سکتا اور راضیۃ مرضیۃ سے مراد ہے راضیۃ عن ربك مرضیۃ عندہ۔ اللہ سے راضی ہے اور اللہ کی رضا کا محل بھی ہے۔ یہ کمالِ روحانی جو انبیاء کو ملتا ہے اس امت کے اولیاء کو بھی ملتا ہے۔

آیاتها ۲۰ — سُوْرَةُ الْبَلَدِ مَكِّيَّةٌ (۹۰) — رکوعها ۱

تمہید سورت: اس سورت کا نام البلد ہے اور اس میں بیس آیتیں ہیں بلد شہر کو کہتے ہیں اور البلد سے مراد مکہ معظمہ ہے اور اس نام میں اشارہ یہ ہے کہ آپ ان تمام برکات کے وارث کیے جائیں گے جو اس شہر سے مخصوص ہیں اور اس میں بتایا یہ ہے کہ ان درجات عالیہ کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کو تکالیف شاقہ کا مقابلہ کرنا پڑے کیونکہ انسان کی تمام ترقیات کا انحصار ہی اسباب پر ہے کہ وہ مشقت اٹھائے۔ ابتدائی مکی زمانہ کی وحی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○	اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
لَاۤ اُقۡسِمُ بِہٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۱﴾	نہیں میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں۔
وَ اَنۡتَ حِلٌّۢ بِہٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۲﴾	اور تُو اس شہر میں حرمت سے آزاد کیا گیا ہے۔
وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾	اور باپ کی اور جو اس سے پیدا ہُوا۔
لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ؕ﴿۴﴾	یقیناً ہم نے انسان کو مشقت کے لیے پیدا کیا ہے ۳۶۰۱
اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ اَحَدٌ ۘ﴿۵﴾	کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کو قدرت حاصل نہیں ہو گی۔
یَقُوۡلُ اَہۡلَکۡتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ﴿۶﴾	کہے گا، مَیں نے بہت سا مال برباد کر دیا ۳۶۰۲
اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ یَرَہٗۤ اَحَدٌ ؕ﴿۷﴾	کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔
اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ عَیۡنَیۡنِ ۙ﴿۸﴾	کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائیں؟
وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَیۡنِ ۙ﴿۹﴾	اور زبان اور دو ہونٹ۔
وَ ہَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ ۚ﴿۱۰﴾	اور ہم نے اسے دونوں اونچے رستے دکھا دیئے ۳۶۰۳

۳۶۰۱ حِلّ کے معنی حلال ہیں (غ) حَلَّ یَحُلُّ مصدر حُلول یا حَلّ کے معنی مکان میں اُترنا ہیں اور حَلّ یَحِلُّ مصدر حلّ یا حلال کے معنی حالت حرمت سے نکلنا ہیں (ل) یا حِلّ سے مراد مُستَحَلّ ہے یعنی تجھے تکلیف پہنچائی جاتی ہے اور اس کی حرمت تیرے لیے نہیں رہی (ر)

کَبَد۔ کَبِد جگر کو کہتے ہیں اور کَبَد مشقت کو اور خلقنا الانسان فی کبد میں تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی حالت پر پیدا کیا ہے کہ مشقت سے وہ الگ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ضرور ہے کہ مشقت کے ساتھ ایک مرتبہ سے دوسرے مرتبہ کی طرف ترقی کرے (غ)
ترقی درجات کے لیے مشقت اٹھانا ضروری ہے: یہاں جن چیزوں کو بطور شہادت پیش کیا ہے وہ ایک تو البلد ہے یعنی مکہ معظمہ (ح) یہی بخاری میں مجاہد سے روایت ہے اور دوسرے والد اور ما ولد اور اس سے مراد عام انسان اور اس کی اولاد۔ آدم اور اس کی اولاد۔ ابراہیم اور اس کی اولاد لیے گئے ہیں (ج) اور جواب قسم ہے کہ انسان کو مشقت اٹھانے کے لیے پیدا کیا ہے یعنی انسان کی ترقی درجات بغیر مشقت اٹھانے کے نہیں ہوتی جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ کے درجات تو بہت بلند ہونگے مگر جد و جہد کرنا اور مشقت اٹھانا اس کے لیے ضروری ہے اور البلد کے ذکر کے ساتھ فرمایا وانت حل بھٰذا البلد اور اس کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں یعنی تم بحیثیت فاتح اس شہر میں داخل ہو گے اور اس وقت تم اس شہر کی حرمت سے آزاد ہو گے اور جنگ کرنے کی اجازت ہو گی اور یہ بھی کہ اس وقت اس شہر میں تمہارے لیے حرمت باقی نہیں رہی اور حالانکہ یہاں کے درخت بھی نہیں کاٹے جاتے۔ مگر خدا کے رسول کو ہر تکلیف پہنچائی جاتی ہے اور اس کی جان تک لینے میں ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے تو گویا شہر مکّہ کی گواہی جہاں اب رسول خدا صلعم کو تکلیفیں دی جاتی ہیں اور جہاں بالآخر آپ بحیثیت فاتح داخل ہونگے اور ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ کی گواہی اور ان کے فرزند اسمٰعیلؑ کی گواہی جس نے اپنی گردن چھری کے سامنے رکھ دی یہی ہے کہ انسان مشقت اٹھانے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اور بغیر تکالیف شاقہ میں سے گذرنے کے وہ اپنے کمال کو حاصل نہیں کر سکتا جو انسان تکلیف سے بھاگتا ہے وہ اپنے کمال کو کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور شہر مکّہ کی شہادت گویا خود رسول کریم صلعم کے ان حالات کی شہادت ہے جو مکّہ میں آپ کو پیش آ رہے تھے اور آیندہ پیش آنے والے تھے اور اس شہادت کے پیش کرنے میں قرآن کریم نے کیسا پر حکمت کلام استعمال کیا ہے کہ ایک ہی لفظ استعمال کر کے دو مختلف باتوں کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ یعنی ان تکالیف کی طرف جو رسول اللہ صلعم اٹھا رہے تھے اور ان کامیابیوں کی طرف جو ان تکالیف کے بعد آپ کو ملنے والی تھیں اور یوں بتا دیا کہ ہر انسان کے لیے کامیابی کا رستہ یہی ہے۔ آج جو مسلمان دین کے لیے ایک کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتے اور ایک پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتے وہ کس طرح توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ بھی دنیا میں کامیاب ہونگے۔

۳۶۰۲ یہ وہ بات ہے جو وہ آیندہ کہے گا۔ یعنی وہ لوگ جو رسول اللہ کی مخالفت میں روپیہ صرف کر رہے ہیں اس وقت تو وہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان پر کسی کو قدرت حاصل نہیں مگر ایک وقت آئے گا کہ کہیں گے کہ ہم نے اتنا مال یوں ہی برباد کیا۔ یعنی جب مخالفت ناکام ہو گی تو اس وقت یہ سمجھ آئے گا۔

۳۶۰۳ نجدین۔ نجد اونچے سخت مکان کو کہتے ہیں اور یہاں نجدین بطور مثال ہے حق و باطل کے دو رستوں کے لیے اور قول میں صدق

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾
سو وہ اونچی گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾
اور تجھے کیا خبر کہ اونچی گھاٹی کیا ہے ۳۶۰۴ء

فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾
کسی گردن کا آزاد کرنا،

اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾
یا بھوک کے دن میں کھانا کھلانا۔

يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾
قریبی یتیم کو۔

اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾
یا مٹی سے ملے ہوئے مسکین کو ۳۶۰۵ء

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾
پھر ان لوگوں میں سے ہو جو ایمان لاتے ہیں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو رحم کی نصیحت کرتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿۱۸﴾
یہ خوش نصیب ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿۱۹﴾
اور جو ہماری آیتوں کا انکار کرتے ہیں، وہ بدنصیب ہیں۔

ع ۲ ۱۵ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۲۰﴾
آگ میں (ڈال کر) ان پر دروازے بند کردیئے جائیں گے ۳۶۰۶ء

وکذب اور فعل میں جمیل وقبیح کے لیے۔ اور وہ دونوں رستے اللہ تعالےٰ نے واضح کر دیئے ہیں۔ جیسے اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ میں (غ)

حق و باطل کے رستوں کو دو اونچے رستے کہا ہے گویا وہ آسانی سے معلوم ہو سکتے ہیں اور کسی انسان کی نظر سے مخفی نہیں وہ خود بھی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے اور زبان اور ہونٹوں کو کام میں لا کر دریافت بھی کر سکتا ہے۔

۳۶۰۴ء عقبة۔ عَقَبَة بہت اونچا پہاڑ ہے جو رستہ میں آپڑے اور اس میں لنبا اور سخت دشوار گزار رستہ چلے (ل)

ان مشکلات کو جن میں سے گزر کر مراتب عالیہ حاصل ہوتے ہیں اونچے پہاڑ سے تشبیہ دی ہے جس میں سے رستہ گزرتا ہو اور یوں بتایا ہے کہ انسان کو کس قدر استقلال اور ثبات قدم بکار ہے کہ خدا کے رستہ میں ترقی کرے۔ یہی مشکلات حق کے پھیلانے میں تھیں۔

۳۶۰۵ء فك۔ فَكّ کشادگی کردینا ہے اور گردن کے فَكّ سے مراد اس کا آزاد کردینا ہے اور گردن کا آزاد کرنا غلام کا آزاد کرنا بھی ہے اور انسان کا اپنے نفس کو اللہ کے عذاب سے آزاد کرنا بھی جو اچھی باتوں اور عمل صالح سے ہوتا ہے اور ایسا ہی دوسرے کو اس طرح آزاد کرنا اور یہ دوسری بات انسان کو پہلی کے بعد حاصل ہوتی ہے کیونکہ جو خود ہدایت پر نہیں اس میں دوسروں کو ہدایت دینے کی قوت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اور لم یکن الذین کفروا من اهل الکتاب والمشرکین منفکین (البینة ۹۸-۱) میں منفکین سے مراد ہے متفرّقین یعنی الگ الگ ہونے والے گویا سب کے سب گمراہی پر رہتے (غ)

مسغبة۔ سَغَب بھوک کو کہتے ہیں جس کے ساتھ درماندگی ہو اور پیاس کو بھی جس کے ساتھ درماندگی ہو (غ)

ہمدردی مخلوق کی تعلیم کی اہمیت: عقبة یا اونچی گھاٹی جس کا طے کرنا ترقی درجات کے لیے ضروری ہے اس کی تفسیر خود کلام اللہ نے یوں فرمائی ہے کہ گردن کو آزاد کرے۔ یتیم مسکین کو کھانا کھلائے۔ ایمان لائے۔ دوسروں کو صبر اور رحم کی نصیحت کرے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام کو آزاد کرنا۔ یتامیٰ اور مساکین کی خبرگیری حاجتمندوں پر رحم کو اسلام کی تعلیم میں کس قدر اہمیت دی گئی ہے۔

غلام کی آزادی کو ترقی کی جدوجہد میں پہلا قدم قرار دینا اسلام کی تعلیم سے خاص ہے اور کسی مذہب میں یہ تعلیم نہیں پائی جاتی جو بات عیسائی دنیا کو آج سمجھ آئی ہے وہ آج سے تیرہ سو سال پیشتر ایک اُمی کی زبان سے ظاہر کی گئی یہ انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ ہاں جہاں غلام کے آزاد کرنے کی ضرورت بتائی ساتھ ہی اس آزادی کی طرف بھی توجہ دلائی جو نیکی سے انسان کو حاصل ہوتی ہے جو لوگ بدی کی غلامی میں مبتلا ہیں ان کا آزاد کرنا بھی فك رقبة میں شامل ہے اور اسی کی طرف تواصوا بالصبر میں اشارہ ہے اور کیسا پر حکمت کلام ہے کہ یہاں چونکہ اصل غرض یہ تھی کہ غلاموں کی آزادی مساکین و یتامیٰ کی خبرگیری کی تعلیم دی جائے اس لیے تواصوا بالصبر کے ساتھ تواصوا بالمرحمة بڑھایا۔ کہ نہ صرف خود یہ کام کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی یہی نصیحت کرتے ہیں کہ مخلوق خدا پر رحم کرنا سیکھیں اور سورۂ عصر میں جہاں اصل غرض تبلیغ دین حق ہے تواصوا بالصبر کے پہلے تواصوا بالحق رکھا ہے۔

۳۶۰۶ء مؤصدة۔ اَصَدَ البابَ دروازہ کو بند کر دیا اَوْصَدَهٗ اَغْلَقَهٗ اور اَصَدَ القِدْرَ ہانڈی کو ڈھانک دیا (ل) اور مطلب یہ ہے کہ آگ میں ڈال کر ان پر نکلنے کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔

آیاتھا ۱۵ (۹۱) سُوْرَةُ الشَّمْسِ مَكِّيَّةٌ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ① سورج اور اس کی روشنی گواہ ہیں۔

وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ② اور چاند جب وہ اس کے پیچھے آتا ہے۔

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ③ اور دن جب وہ اسے روشن کرتا ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ④ اور رات جب وہ اسے ڈھانک لیتی ہے۔

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ⑤ اور آسمان اور اس کا بنانا۔

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ⑥ اور زمین اور اس کا بچھانا۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ⑦ اور نفس اور اس کی تکمیل ۳۶۰۷

تمہید سورت: اس سورت کا نام الشمس ہے اور اس میں پندرہ آیتیں ہیں اور اس میں یہ بتایا ہے کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے وہ صفات جمع کی ہیں جو اس کی مخلوق میں سے اضداد کے اندر ہیں مثلاً سورج اور چاند۔ اور رات اور دن اور آسمان اور زمین کی صفات کو اس کے اندر جمع کیا ہے اور یوں بتایا ہے کہ نفس انسانی کو بڑے کمال کے مرتبہ پر پیدا کیا گیا ہے اور پھر اس کو خارجی روشنی بھی برنگ وحی عطا کی ہے پس جو انسان ان کمالات کو ترقی دیتا ہے وہ فلاح پاتا ہے اور جو ان کو نشو و نما نہیں دیتا وہ انجام کار ناکام ہوتا ہے۔ اور الشمس نام میں اشارہ کمال نبوی کی طرف بھی ہے جو عالم روحانیت میں سورج کا حکم رکھتے ہیں کہ آیندہ تمام انوار آپ کی ذات بابرکات سے ہی پھیلیں گے اور جس طرح آفتاب عالم جسمانی کا مرکز ہے آنحضرت صلعم عالم روحانی کے مرکز ہیں۔ یہ سورت ابتدائی مکی زمانہ کی ہے۔

۳۶۰۷ تلی سے مراد یہاں اتباع ہے۔ پیروی کے طور پر اور مرتبہ کے لحاظ سے اس لیے کہ چاند سورج کے نور سے روشنی لیتا ہے اور وہ اس کے لیے بمنزلہ خلیفہ ہے اور کہا گیا ہے کہ جعل الشمس ضیاء والقمر نورا (یونس ۱۔ ۵) میں اسی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ ضیاء کا مرتبہ نور سے اعلیٰ ہے کیونکہ ہر ضیاء نور ہے لیکن ہر نور ضیاء نہیں (غ)

طحی۔ طحو اور دحو کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی چیز کا پھیلانا (غ)

نفس انسانی کا کمال اور انسان کامل: ان آخری الفاظ نے خود بتا دیا کہ پہلی چھ آیتوں میں جن امور کی طرف توجہ دلاتی ہے وہ کسی نہ کسی رنگ میں تکمیل نفس انسانی پر شاہد ہیں۔ سورج روشنی دینے والا ہے اور چاند سورج کی روشنی کا اثر قبول کرنے والا۔ انسان کامل ان دونوں صفات کا مظہر ہے یعنی رسول اللہ صلعم سورج کی طرح روشنی کا سرچشمہ بھی ہیں اور چاند کی طرح اللہ تعالیٰ کے نور سے منور بھی ہوتے ہیں۔ دن اور رات کے بھی دو علیحدہ علیحدہ کام ہیں۔ دن روشنی کرتا ہے اور جد و جہد کا موقعہ دیتا ہے رات تاریکی کا پردہ ڈال کر سکون کا موجب ہوتی ہے انسان کامل ان دونوں خوبیوں کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے وہ جد و جہد بھی کمال درجہ کی کرتا ہے اور اس کے نفس کو سکون بھی کامل طور پر ملتا ہے۔ اس کے بعد آسمان ہے جو علو کا مظہر ہے اور زمین جو پستی اور خاکساری کا مظہر ہے اور انسان کامل بھی ان دونوں باتوں سے حصّہ لیتا ہے یعنی اس میں صفت علوّ کا اظہار بھی ہوتا ہے اور پستی کی صفت کا بھی گویا یہ جو بظاہر متضاد صفات نظر آتی ہیں یعنی اثر ڈالنے اور اثر قبول کرنے کی صفات۔ جد و جہد اور سکون کی صفات۔ علو اور پستی کی صفات جن میں سے کوئی سورج رکھتا ہے کوئی چاند۔ کوئی دن رکھتا ہے اور کوئی رات۔ کوئی آسمان رکھتا ہے اور کوئی زمین۔ انسان کامل کے اندر یہ سب صفات جمع ہوتی ہیں اور یہی اشارہ ماسوّٰیھا میں ہے اور یہ تمام باتیں اپنے پورے کمال کے ساتھ تو آنحضرت صلعم میں ہی پائی جاتی ہیں لیکن ہر انسان اپنے اپنے کمال یا اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان سے حصّہ لیتا ہے تو یہ تو اس کے ذاتی جوہر ہیں لیکن ان ذاتی جوہروں کو جلا دینے کے لیے اور نمایاں کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی سے بھی اسے کچھ حصّہ دیا ہے جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے اور سورج کی روشنی اور چاند کے اتباع میں یہ اشارہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلعم جو انسان کامل ہیں وہ اپنی امت کے لیے ایک سورج کا حکم رکھتے ہیں اور اب آپ کے بعد جو آپ کی پیروی کرنے والے ہونگے وہ صرف آپ کے انوار سے نور مستعار لینے والے ہونگے اور نور کا مرکز صرف آپ کی ذات ہی ہوگی۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰىهَا ﴿۸﴾
پھر الہام سے اسے اس کی بدکاری اور اس کے تقویٰ (کے رستے بتادیئے)۳۶۰۸

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴿۹﴾
وہ کامیاب ہوا جس نے اسے پاک کیا۔

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴿۱۰﴾
اور وہ نامراد رہا جس نے اسے دفن کیا۔ع۳۶۰۹

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوٰىهَآ ﴿۱۱﴾
ثمود نے اپنی سرکشی سے (حق کو) جھٹلایا۔

إِذِ انْبَعَثَ أَشْقٰىهَا ﴿۱۲﴾
جب ان کا ایک بڑا بدبخت اٹھا۔

فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ﴿۱۳﴾
تو اللہ کے رسول نے انھیں کہا ، اللہ کی اونٹنی اور اس کے پانی (سے اسے نہ روکو)

فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا ۙ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿۱۴﴾
مگر انھوں نے اسے جھٹلایا پھر اس (اونٹنی) کو مار ڈالا تو اللہ نے ان کے گناہ کی وجہ سے ان پر عذاب بھیجا پھر اسے برابر کر دیا۔

ع ۱۵/۱۶ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿۱۵﴾
اور وہ اس کے انجام سے نہیں ڈرتا ع۳۶۱۰

ع۳۶۰۸ الھم ۔ اِلھام القاءُ الشئِ فی الرّوع یعنی کسی چیز کا دل میں ڈالنا ہے اور یہ اس سے مختص ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملأ اعلیٰ کی طرف سے ہو (غ) اور لَہَم کے اصل معنی ابتلاع ہیں یعنی کسی چیز کا نگل لینا۔ اور اِلہام مایلقی فی الرّوع کا نام ہے یعنی جو دل میں ڈالا جائے اور حدیث میں ہے اسئلك رحمةً من عندك تُلْھِمُنی بھا رشدی. جہاں الہام سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دل میں کوئی بات ڈالے جو اس سے فعل یا ترک کرا دے اور یہ ایک قسم کی وحی ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے مخصوص کر لیتا ہے (ل)

یہاں الھمھا کے معنی ابن عباس مجاہد وغیرہ ہما سے بَیَّنَ ۔ عَلَّمَ ۔ عَرَّف مروی ہیں (ج) اور ظاہر ہے کہ یہاں یہ مراد نہیں ہو سکتا کہ ہر شخص کے دل میں فجور اور تقویٰ کی باتیں ڈال دی جاتی ہیں اس لیے کہ لفظ الہام مطلقاً اس پر بولا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اور اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں یہ نہیں ڈالتا کہ وہ فجور کرے۔ ہاں یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ انسان کا نور قلب اس کو بتا دیتا ہے کہ یہ بات فجور کی ہے یا تقویٰ کی اور یا اس سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے ذریعہ سے بتا دیتا ہے کہ فجور کی راہیں کونسی ہیں اور تقویٰ کی کونسی۔ گویا ایک تو انسان کے اندر صفات رکھی ہیں اور دوسرے ایک روشنی باہر سے مل جاتی ہے جس طرح ایک بینائی کی طاقت انسان کے اندر ہے اور ایک روشنی باہر موجود ہے اور دونوں کی مدد سے انسان دیکھتا ہے۔

ع۳۶۰۹ بظاہر یہی جواب قسم ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس کے اندر یہ کمالات تو رکھے ہیں اور وحی کی خارجی روشنی بھی عطا فرمائی ہے۔ لیکن ایک تو وہ انسان ہے جو اس نفس کا تزکیہ کرتا ہے یعنی خیرات و برکات سے اسے بڑھاتا ہے ع۱۶۴۴ اور ایک وہ جو اسے دفن کرتا اور چھپاتا ہے گویا ان قویٰ کو نشو و نما نہ دینا ایسا ہے جیسے ایک بیج کو ضائع ہونے کے لیے دفن کر دینا تدسیة کے لیے دیکھو ع۱۷۵۲ یہی لفظ لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے پر بولا ہے مطلب یہ ہے کہ سوائے تزکیہ کے تم فلاح حاصل نہیں کر سکتے اور نافرمانی کار ستہ آخر ناکامی لائے گا۔

ع۳۶۱۰ دمدم ۔ دَمَّ ۔ اور دَمْدَمَ کے معنی ہیں ہلاک کیا اور اَرْجَفَ یعنی زلزلہ بھیجا اور غَضِبَ بھی اس کے معنے کیے گئے ہیں (ل)

اپنے عام قانون کو بیان کر کے ایک مثال بیان کی ہے اور وہ قوم ثمود کی ہے کہ جو بوجہ اپنے رسول کی حد درجہ کی مخالفت کے اسی دنیا میں ہلاک کر دیئے گئے اور اس قوم کو جن کا مسکن مدینہ کے شمال میں تھا آنحضرت صلعم کے مخالفین سے خاص مناسبت ہے دیکھو ع۲۴۷۸ اور لا یخاف عقبٰھا میں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب ایک قوم کو ہلاک کرتا ہے تو یہ اس کی مصلحت و حکمت کے تقاضا سے ہوتا ہے کہ وہ اس کی جگہ اس سے بہتر کو لاتا ہے اس لیے کسی قوم کی تباہی یا ہلاکت میں وہ انجام کا خوف نہیں کرتا۔ انجام بہرحال اچھا ہی ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو حق کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں تباہ کر دیئے جاتے ہیں اور حق دنیا میں قائم ہو جاتا ہے۔

آیاتہا ۲۱ (۹۲) سُوْرَۃُ الَّیْلِ مَکِّیَّۃٌ رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ — اللہ تعالٰی بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

وَ الَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی ① — رات گواہ ہے جب وہ پردہ ڈالتی ہے۔

وَ النَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی ② — اور دن جب وہ روشن ہوتا ہے۔

وَ مَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰٓی ③ — اور نر اور مادہ کا پیدا کرنا۔

اِنَّ سَعْیَكُمْ لَشَتّٰی ④ — بیشک تمھاری کوشش الگ الگ ہے ع۳٦١١

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی ⑤ — سو جو دیتا ہے اور تقوےٰ کرتا ہے۔

وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ⑥ — اور اچھی بات کی تصدیق کرتا ہے۔

فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی ⑦ — تو ہم اسے آسانی کی طرف چلائیں گے۔

وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰی ⑧ — اور جو بخل کرتا ہے اور پروا نہیں کرتا۔

وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ⑨ — اور اچھی بات کو جھٹلاتا ہے۔

فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی ⑩ — تو ہم اُسے تنگی کی طرف چلائیں گے۔

وَ مَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی ⑪ — اور اس کا مال اس کے کام نہ آئیگا جب وہ ہلاک ہوگا۔

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی ⑫ — یقیناً رستہ دکھا دینا ہمارا کام ہے۔

وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَ الْاُوْلٰی ⑬ — اور بلا شبہ آخرت اور پہلی زندگی ہمارے لیے ہی ہے ع۳٦١٢

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰی ⑭ — سو میں تمھیں اس آگ سے ڈراتا ہوں جو شعلے مارتی ہے۔

لَا یَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَی ⑮ — اس میں کوئی داخل نہیں ہوتا مگر بڑا بدبخت۔

الَّذِیْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ⑯ — جو جھٹلاتا ہے اور پیٹھ پھیر لیتا ہے۔

تمہید سورت: اس سورت کا نام الیل ہے اور اس میں اکیس آیتیں ہیں۔ الیل نام میں یہ اشارہ ہے کہ رات اور دن یکساں نہیں اسی طرح اللہ تعالےٰ کی راہ میں نیکی میں قدم اُٹھانیوالا اور اس کے لیے جد وجہد کرنے والا اور وہ جو حق کی تکذیب کرتا ہے یکساں نہیں۔ اور یہاں نیک اور بد کا مقابلہ دکھایا ہے گویا ایک کو دن کی روشنی سے تشبیہ دی ہے اور دوسرے کو رات کی تاریکی سے۔ چونکہ پچھلی سورت میں آنحضرت صلعم کو عالم رُحانی کا مرکز اور آفتاب قرار دیا تھا اس لیے اب بتایا کہ اس آفتاب کی روشنی سے فائدہ اٹھانے والے اور اس کی پروا نہ کرنے والے یکساں نہیں ہو سکتے بلکہ تاریکی کے فرزندوں کا انجام بھی تنگی اور تاریکی ہی ہے تو یہاں بتایا کہ اس کمال کا انحصار اپنی اپنی جد وجہد پر ہے۔ جمہور کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔

ع۳٦١١ رات کا تمام چیزوں پر تاریکی کا پردہ ڈال دینا۔ دن کا اپنی روشنی کے ساتھ عالم کو منور کر دینا۔ دونوں یکساں نہیں پس اگر ایک انسان تصدیق حق میں کوشش کرتا ہے اور دوسرا تکذیب حق کی کوشش کرتا ہے تو دونوں کی کوشش کے نتائج بھی یکساں نہیں ہو سکتے اور خلق نر و مادہ میں یہ توجہ دلائی ہے کہ زوجیت کے عالمگیر اصول پر تمام ترقیات کا مدار ہے پس جو انسان اللہ تعالیٰ سے تعلق توڑتا ہے وہ روحانیت میں کس طرح ترقی کر سکتا ہے۔

ع۳٦١٢ یعنی اس دنیا میں بھی تصرف تمام ہمارا ہے آخرت میں بھی۔ بدکار یہ نہ سمجھے کہ اس دنیا میں وہ خوش رہے گا۔

وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿۱۷﴾ اور بڑا تقویٰ کرنے والا اس سے بچایا جاتا ہے۔

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ﴿۱۸﴾ جو تزکیہ کے لیے اپنا مال دیتا ہے ع۳۶۱۳

وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤی ﴿۱۹﴾ اور اس کے ذمے کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے۔

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی ﴿۲۰﴾ مگر اسے صرف اپنے رب بلند تر کی رضا منظور ہے ع۳۶۱۴

ع ۲۱ ۱۷ وَ لَسَوْفَ یَرْضٰی ﴿۲۱﴾ اور وہ جلد خوش ہو جائے گا۔

ع۳۶۱۳ اشقی اس میں داخل ہوتا ہے اور اتقی بچایا جاتا ہے بالفاظ دیگر جو کامل طور پر معاصی میں منہمک ہے وہی آگ میں بھی پورا پورا داخل ہوتا ہے اور جو کامل طور پر تقویٰ اختیار کرتا ہے وہی کامل طور پر بچایا جاتا ہے ان کے درمیان جو لوگ ہیں وہ اپنے اپنے اعمال کے مطابق جزا پاتے ہیں۔

ع۳۶۱۴ رضائے الٰہی کی جنت: پہلی آیت میں بتایا کہ کسی شخص کے پاس کوئی ایسی نعمت نہیں کہ جس کے دینے پر وہ بدلہ لینے کا حقدار ہو۔ کیونکہ سب کچھ تو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہی ہے۔ اور اِلَّا ابتغاء وجه ربّه الاعلیٰ میں بتایا کہ.... جو بدلہ ملتا ہے وہ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو چاہتا ہے۔ اور محض خرچ کرنا رضا چاہنے کا عملی ثبوت نہیں۔ یہی روپیہ بعض وقت انسان بظاہر اچھے موقعہ پر خرچ کرتا ہے مگر اس کی غرض دکھاوا ہوتی ہے اس لیے اس کا اجر بھی کچھ نہیں پس رضائے الٰہی کا چاہنا ہی اصل چیز ہے اور ہر ایک عمل اسی سے پرکھا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک قدر رضائے الٰہی کی طلب کی ہوتی ہے اور جنت کی نعمت عظمٰی بھی رضائے الٰہی ہی ہے رضوان من اللہ اکبر گویا رضائے الٰہی چاہنے کا بدلہ رضائے الٰہی کا مل جانا ہے اور یہی جنت ہے۔ تفاسیر میں ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت ابوبکرؓ کے بلال کو خرید کر آزاد کرنے پر ہوا تب آپ نے اور غلاموں کو جنہیں دین اسلام کی وجہ سے دکھ دیا جاتا تھا خرید کر آزاد کیا۔ اور ایسے سات آدمی تھے جنہیں آپ نے خرید کر آزاد کیا اور کفار کی اذیت سے نجات دلائی۔

سُوْرَةُ الضُّحٰی مَکِّیَّۃٌ (۹۳)

اٰیاتُھا ۱۱ رکوعُھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

وَ الضُّحٰی ﴿۱﴾ دن کی روشنی گواہ ہے۔

وَ الَّیْلِ اِذَا سَجٰی ﴿۲﴾ اور رات جب ساکن ہو۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰی ﴿۳﴾ تیرے رب نے تجھے چھوڑا نہیں اور نہ وہ ناراض ہوا ع۳۶۱۵

تمہید سورت: اس سورت کا نام الضحی ہے اور اس میں گیارہ آیتیں ہیں۔ پچھلی سے پچھلی سورت میں آنحضرت صلعم کے کمالات کا نقشہ کھینچکر آپ کو عالم روحانی کا آفتاب قرار دیا تھا۔ اور اس کے بعد آپ سے روشنی لینے والوں اور اس روشنی کے رد کرنے والوں کا ذکر تھا۔ اب یہاں بتایا ہے کہ ظاہری نظارۂ قدرت کے مطابق اسلام کی اس پہلی جد و جہد کے بعد ایک سکون کا زمانہ بھی آئے گا جسے لیل سے مشابہت دی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو چھوڑے گا نہیں اور امر اسلام ترقی کرتا جائے گا۔ سورت ابتدائی مکی زمانہ کی ہے۔

ع۳۶۱۵ سجی۔ سَجَیٰ کے معنی ہیں سَکَنَ حالت سکون میں ہوا سَجَی الْبَحْرُ سمندر ساکن ہو گیا (غ)

ودّع۔ وَدْع کے معنی ترک یا چھوڑ دینا ہیں اور وَدّع کے معنی یہاں ہیں چھوڑ دیا (غ)

اسلام پر غربت کا زمانہ اور خوشخبری: صحیح حدیث میں صرف اس قدر ہے کہ نبی صلعم دو تین رات بیمار ہو گئے تو رات کو تہجد کے لیے نہیں اٹھتے تھے تو ایک خبیث عورت نے کہا یا محمد انی لَاَرْجُوان یکون شیطانك قد ترکك لم اَرَہٗ قَرِبَكَ مُنْذُ لَیْلَتَیْنِ اوثلث۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ یہ بخاری کے لفظ ہیں۔ مگر اول تو تہجد کے لیے نہ اُٹھنے کو وحی کے آنے سے کوئی تعلق نہیں۔ اور دوسرے دو رات یا تین رات وحی کے نہ آنے پر ودع اور قلی کے لفظ بھی نہیں بولے جا سکتے کیونکہ وحی کا روزانہ نازل ہونا کوئی لازمی امر نہ تھا۔ بلکہ یہاں اشارہ آیندہ زمانہ کی طرف معلوم ہوتا ہے جیسا کہ قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہے کہ اسلام پر زمانہ نبوی کے بعد ایک زمانہ غربت کا پھر آنے والا تھا بدء الاسلام غریبًا وسیعود کما بدأ اور دن کی روشنی اور رات کے سکون کی گواہی کو جو پیش کیا ہے تو وہ بھی اسی لحاظ سے ہے یعنی ایک زمانہ تو اسلام پر ضحی کا ہے۔ جب سورج کی شعاعیں تیز پڑ رہی ہیں اور کمال درجہ کی جد و جہد کی وجہ سے اسلام اور مسلمان نصرت الٰہی سے مالا مال ہو رہے ہیں اور ایک زمانہ اس کے بعد سکون کا ہے جب یہ

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ④ — اور پچھلی حالت یقیناً تیرے لیے پہلی حالت سے بہتر ہے۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ⑤ — اور تیرا رب تجھے جلد دے گا سو تو خوش ہو جائے گا ۳۶۱۶

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ⑥ — کیا اس نے تجھے یتیم نہیں پایا سو پناہ دی۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ⑦ — اور تجھے طالب پایا تو راستہ بتایا

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ⑧ — اور تجھے تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ⑨ — سو یتیم پر سختی نہ کر۔

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ⑩ — اور سوالی کو نہ ڈانٹ۔

ع ۱۱/۱۸ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ⑪ ع — اور اپنے رب کی نعمت کا ذکر کرتا رہ ۳۶۱۷

جد وجہد نہ رہے گی اور بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نصرت چھوڑ دی ہے اسے یہاں لیل کی سکون سے تعبیر کیا ہے اسی موقعہ کے لیے یہ تسلی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی چھوڑے گا نہیں اور نہ آپ سے کبھی ناراض ہوگا یعنی اس سکون کی حالت کو جو اُمت پر آئے آنحضرت صلعم کے امر کی ترک نصرت یا اس سے ناراضگی کا نتیجہ نہ سمجھا جائے کیونکہ جس طرح دن کے بعد رات آتی ہے اسی طرح جد وجہد کے زمانے کے بعد سکون کے زمانہ کا آنا لازمی امر ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ترک نصرت نہ ہونے کا یہ ثبوت ہے کہ اس کے بعد پھر آپ کا امر ایک ایسی حالت کی طرف عود کرے گا جو پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے یعنی دنیا میں اسلام کا ہی دور دورہ ہوگا اور لیظھرہ علی الدین کلہ ہو کر آفتاب رسالت کی روشنی تمام عالم پر محیط ہو جائے گی جیسا کہ اگلی آیت کا مفہوم ہے۔

۳۶۱۶ـ اسلام کی ترقی رک نہیں سکتی: ان دو آیات میں ما ودعک کی مزید تشریح فرمائی ہے اور دو باتیں بیان کی ہیں ایک یہ کہ آخرت تیرے لیے اولیٰ سے بہتر ہے اور دوسرا یہ کہ تیرا رب تجھے اس قدر برکات دیگا کہ تو راضی ہو جائے گا۔ اب ان کو اگر آخرت کے متعلق وعدہ لیا جائے تو ان سے ما ودعک ربک کے مضمون کو کوئی تقویت نہیں ملتی۔ اور یہاں اس کی غرض سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہوسکتی اور یہ کوئی تسلّی نہیں کہ خدا نے آپ کو چھوڑا نہیں اس لیے کہ آخرت میں بڑے بڑے انعامات ملیں گے۔ نصرت الٰہی تو پہلے اس دنیا میں ظاہر ہونی چاہیئے اگر یہاں نصرت نہیں تو آخرت کے انعامات محض دعویٰ ہی دعویٰ رہ جائینگے اس لیے ابن عطیہ اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہاں آخرت سے مراد نہایت امر آنحضرت صلعم ہے اور اولیٰ سے مراد ابتدائے امر (ر) میرے نزدیک مراد ہر پیچھے آنے والا وقت ہے اور مطلب یہ ہے کہ آپ کا امر ترقی ہی ترقی کرتا جائے گا اور ہر پچھلی گھڑی پہلی گھڑی سے بہتر ہے اور قیامت بھی اس میں شامل ہے یعنی جب دنیا میں یہ امر کمال کو پہنچ جائے تو پھر قیامت میں ایک نئے رنگ میں اس کا ظہور ہوگا۔ یہاں تک کہ کل لوگ اس حالت پر آجائیں، جس پر آنحضرت صلعم دنیا کو لانا چاہتے ہیں پس یہاں یہ سمجھایا ہے کہ گو اسلام پر ترقی کے بعد سکون کے زمانے بھی آئیں گے مگر اسلام کا قدم پیچھے کسی صورت میں نہیں ہٹے گا آج بھی چشم غور بین اس عجیب نظارہ کو دیکھ سکتی ہے کہ ایک طرف عیسائی طاقتیں اسلام کی دنیوی طاقت کو مٹانے میں ایڑی چوٹی تک زور لگا رہی ہیں اور دوسری طرف اصول اسلامی دلوں پر فتح حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔

۳۶۱۷ـ ضالاً۔ ضالّ سے مراد یہاں ہے غَیْرُ مُهْتَدٍ لِمَا سِیْقَ اِلَیْكَ مِنَ النُّبُوَّةِ یعنی خود اس نبوت کی طرف رستہ نہ پانے والا جو تجھے دیگئی اور حضرت یعقوب کے متعلق جو ضلال کا لفظ آتا ہے لفی ضلالك القدیم اور ان ابانا لفی ضلال مبین تو اس سے مراد ان کی حضرت یوسف سے بہت محبت ہے اور یہی مراد انا لنراھا فی ضلال مبین میں ہے (غ) اور ضَلَّ الشیٔ کے معنی خَفِیَ وَغَابَ ہیں یعنی وہ چیز مخفی ہوگئی اور غائب ہوگئی ضَلَّ الماءُ فی اللبنِ یعنی پانی دودھ میں غائب ہوگیا (ل)

تنھر۔ نَھْر۔ اِنتھار کے معنی ہیں سختی سے روکنا و لا تنھرھما (بنی اسرائیل ۱۷-۲۳) (غ)

آنحضرت صلعم کا طالب ہدایت ہونا اور ضال سے مراد: یہ چھ آیتیں ایک ترتیب میں ہیں۔ پہلی تین میں آنحضرت صلعم پر تین انعامات کا ذکر ہے یتیم پایا اور پناہ دی۔ ضال پایا اور ہدایت دی مفلس پایا اور غنی کیا اور پچھلی تین میں تین ارشاد اسی کے مطابق آنحضرت صلعم کو ہیں یتیم پر سختی نہ کرنا سائل کو نہ ڈانٹنا انہیں اپنے رب کی نعمت کا چرچا کرنا۔ اب ظاہر ہے کہ جو نعمت اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم پر کی اسی کے مطابق ایک حکم بھی آپ کو دیا چونکہ آپ کو یتیم پاکر پناہ دی تو اس کے مقابل پر فرمایا کہ تم بھی یتیموں کے ملجا و ماویٰ بن جاؤ اور کبھی یتیم پر سختی نہ کرو۔ اور جب آپ کو خالی ہاتھ پاکر غنی کیا تو اس کے مقابل پر اس نعمت کے چرچا کرنے کا ارشاد فرمایا اس لیے یہ ہدایت کہ تم سائل کو ڈانٹو نہیں وجدك ضالا فھدیٰ کے مقابل پر ہے یعنی تم بھی کسی وقت سائل تھے اس لیے سائل کو مت ڈانٹو اور یہ معنی لفظ ضالّ کے درست بھی ہیں۔ اس لیے کہ ضال ایک معنی میں محب بھی ہے اور یاوہ ایسا

سُورَةُ اَلَمْ نَشْرَحْ مَكِّيَّةٌ (۹۴)

اٰیَاتُھَا ۸ — رُکُوْعُھَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝۱ — کیا ہم نے تیرے لیے تیرا سینہ نہیں کھولا۔

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝۲ — اور تجھ سے تیرا بوجھ اتار دیا۔

الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَھْرَكَ ۝۳ — جس نے تیری پیٹھ توڑ رکھی تھی ع۳۶۱۸

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝۴ — اور ہم نے تیرے ذکر کو تیرے لیے بلند کیا۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝۵ — تو تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔

(بقیہ صفحہ سابقہ)

طالب ہے کہ اپنے وجود کو طلب میں ہی محو کر دیتا ہے اور یہی حالت رسول اللہ صلعم کی قبل از بعثت تھی اور یا ضال کے معنی یہاں بے خبر ہیں یعنی اس ہدایت کی آپ کو خبر نہ تھی جو آپ کو ملی۔ اور یہ معنی امام راغب نے کیے ہیں اور قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی فرمایا ہے ماکنت تدری ما الکتب والایمان (الشوریٰ ۴۲-۵۲) دیکھو ع۲۹۸۰ اور یہ معنی ان الفاظ کے کرنا کہ آپ نعوذ باللہ من ذٰلک گمراہ تھے قرآن کریم کے بھی خلاف ہے اور تاریخی طور پر جو واقعات آنحضرت صلعم کے متعلق ثابت ہیں ان کے بھی خلاف ہے۔ قبل از نبوت آپ کی دیانت امانت زبان زد عام و خاص تھی یہاں تک کہ آپ کا نام ہی الامین ہو گیا تھا۔ عمل کے لحاظ سے تو یہ تاریخی شہادت موجود ہے اور اس کے علاوہ قرآن کریم نے بھی آپ کی پہلی زندگی کو بطور نمونہ پیش کیا ہے فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ افلا تعقلون (یونس ۱۰-۱۶) اور عقاید کے پہلو سے بھی آنحضرت صلعم کا توحید پر قائم ہونا ثابت ہے۔ چھوٹی عمر میں جب آپ سفر شام میں اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ گئے تو اس وقت بھی آپ نے بتوں کے ذکر پر فرمایا کہ مجھے کسی چیز سے ایسی نفرت نہیں جیسی ان بتوں سے اور قرآن کریم کی نص صریح ہے کہ آپ نے کبھی اور کسی وقت بھی بتوں کی عبادت نہیں کی ولا انا عابد ما عبدتم دیکھو ع۳۶۶۰ غرض کیا بلحاظ عقاید اور کیا بلحاظ اعمال آپ شروع سے ہی جادۂ صواب پر قدم زن تھے ہاں وحی الٰہی نے مزید راہیں کمالات اور ہدایت خلق کی آپ کے سامنے کھول دیں اور وہ چیز جس کی تڑپ آپ کے دل کو کھا رہی تھی لعلك باخع نفسك الا یکونوا مؤمنین اس کے لیے سامان پیدا کر دیئے۔ آپ کی ضلالت مخلوق خدا کے لیے آپ کی بیحد محبت تھی اور سائل سے مراد بھی سائل دینی ہے جیسا کہ نعمۃ سے مراد نبوت ہے اور یہ معنی نعمۃ کے مجاہد سے مروی ہیں (ج) پس اس کے مقابل پر جو فرمایا کہ وجدك عائلا فاغنی تو غنا بھی بلحاظ علم کے ہے۔

تمہید سورت: اس سورت کا نام الانشراح یا الشرح ہے اور اس میں آٹھ آیتیں ہیں۔ اور اس میں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی صداقت کے دلائل قائم کر دیئے ہیں اس لیے اب اسلام ناکام نہیں ہو سکتا۔ یہ سورت بھی ابتدائی مکی زمانہ کی ہے۔ اسے سورہ الم نشرح بھی کہا جاتا ہے۔

ع۳۶۱۸ بعض لوگوں نے یہاں اس واقعہ شرح صدر کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو بچپن میں اور پھر بعد بلوغت آپ کو پیش آیا اور وہ ایک کشفی نظارہ تھا جس میں یہ دکھایا گیا کہ آپ کے دل کو ہر قسم کی آلایش سے پاک کیا گیا ہے اور معراج کے وقت بھی ایسے ہی واقعہ کے پیش آنے کا ذکر صحیح روایات میں پایا جاتا ہے۔ لیکن شرح صدر سے مراد یہاں وہی ہے جو راغب نے بیان کیا ہے دیکھو ع۱۰۱۴ یعنی انوار الٰہی اور سکینت سے آپ کے سینہ مبارک کا بھر جانا اور یہ بذریعہ وحی وقوع میں آیا بعینہ ایسے ہی الفاظ حضرت موسیٰ کی طرف منسوب ہیں رب اشرح لی صدری۔ جہاں مراد دلائل کا میسر آنا ہے دیکھو ع۲۰۵۷ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصلاح عالم کے لیے بہت متفکر تھے اور آپ کو کوئی رستہ نظر نہ آتا تھا وہ دلائل نہ ملتے تھے جن سے توحید باری کو دنیا میں قائم کر سکیں کہ وحی الٰہی نے نزول فرما کر آپ کا سینہ کھول دیا اور دلائل سے بھر دیا۔ اور آپ کا وہ بوجھ جس نے آپ کی پیٹھ توڑ رکھی تھی اُتار دیا۔ اس لیے کہ وحی نے آپ کے قلب مبارک کو اطمینان سے بھر دیا اور ہر طرح کے علمی دلائل آپ پر کھل گئے اور آپ کا بوجھ جو اُتار دیا گیا وہ بھی یہی تفکرات کا بوجھ تھا۔ اس غم نے کہ دنیا کس طرح اپنے مولیٰ سے دور پڑی ہوئی اور ناپاکیوں میں ملوث ہے آپ کی پیٹھ کو توڑ رکھا تھا لعلك باخع نفسك الا یکونوا مومنین اللہ تعالیٰ نے جب آپ کے سینے کو روشن کر دیا اور رستے کھول دیئے تو وہ بوجھ بھی ہلکا ہو گیا اور رفع ذکر بھی عطائے نبوت سے ہوا۔

إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٦ — ہاں تنگی کے ساتھ آسانی ہے ۳۶۱۹

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝٧ — سو جب تو فارغ ہو تو کام میں لگ جا۔

وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝٨ — اور اپنے رب کی طرف دل لگا ۳۶۲۰

ع ۸ ۱۹

۳۶۱۹ اس میں یہ بتایا کہ گو دلائل مل گئے وہ غم کا بوجھ ہلکا ہو گیا مگر تنگی اور تکلیف اٹھانے کے بغیر مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ مضبوط وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل گیا کہ کچھ تکلیف اٹھانے کے بعد یُسر کی حالت پیدا ہو جائیگی اور ان الفاظ کے دوہرانے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ دو دفعہ اسلام پر مصیبت اور تنگی آئے گی ایک اس کی ابتدا میں اور ایک آخر میں اور دونوں دفعہ عسر کے بعد یُسر یقینی ہے۔ اسلام کے موجودہ مصائب میں یہ آیت مسلمانوں کے زخمی دلوں کے لیے مرہم کا کام دیتی ہے اور اسلام پر دوسری دفعہ مصیبت کا آنا احادیث سے بھی ظاہر ہے۔ دیکھو ۳۶۱۵

۳۶۲۰ یہاں فراغ اور نصب کے متعلق مختلف خیالات ہیں۔ ایک عبادت سے فارغ ہو تو دوسری عبادت میں لگ جاؤ عبادت سے فارغ ہو تو دعا میں لگ جاؤ جنگ سے فارغ ہو تو دعا اور عبادت میں لگ جاؤ امر دنیا سے فارغ ہو..... تو عبادت رب میں لگ جاؤ (ج) لیکن چونکہ اوپر ذکر تھا کہ ہم نے آپ کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اور آپ کو غم و فکر سے خالی کر دیا تو وہی فارغ ہونا یہاں مراد ہے۔ یعنی اب جبکہ وہ تفکرات دور ہو گئے تو جو کام تمہارے سپرد ہوا ہے اس میں ساری توجہ لگا دو۔ اور جس رب نے یہ ہدایت دی ہے اسی کی طرف جھکے رہو یا اسی کے کام میں لگے رہو اور اس کا نام پھیلانے کی کوشش کرو۔

سُورَةُ التِّينِ مَكِّيَّةٌ (۹۵)

آیاتها ۸ — رکوعها ۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ ۝١ — انجیر اور زیتون گواہ ہیں۔

وَطُورِ سِينِينَ ۝٢ — اور سینا پہاڑ۔

وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۝٣ — اور یہ امن والا شہر ۳۶۲۱

تمہید سورت: اس سورت کا نام التین ہے اور اس میں آٹھ آیتیں ہیں۔ اس کے نام میں سلسلہ موسویہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بتایا ہے کہ انسان کا بلند مرتبہ اخلاق فاضلہ پر قایم رہنے سے رہتا ہے اور ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ سلسلہ محمدیہ جو بلد امین میں قایم کیا جاتا ہے وہ تاقیامت باقی رہے گا۔ جمہور کے نزدیک یہ سورت مکی ہے اور بعض لوگوں نے اسے مدنی بھی کہا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔

۳۶۲۱ تین۔ تین اور زیتون کہا گیا ہے کہ دو پہاڑ ہیں اور کہا گیا ہے کہ یہ دو درخت ہیں (غ) اور بعض نے کہا یہ شام میں دو پہاڑ ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ شام میں دو مسجدیں ہیں (ل) اور تینۃ انجیر کا درخت ہے۔

انجیر اور زیتون کی شہادت سے مراد: یہاں چار چیزوں کو بطور شہادت پیش کیا ہے انجیر اور زیتون اور سینا پہاڑ اور بلد امین یعنی شہر مکہ۔ انجیر کا ذکر تو قرآن شریف میں دوسری جگہ نہیں مگر زیتون کا ذکر خصوصیت سے سورۂ نور میں آیا ہے جہاں نور محمدی کو درخت زیتون سے روشن قرار دیکر اس سے مشابہت دی ہے۔ اور دوسری طرف ہم بائبل کو دیکھتے ہیں تو وہاں انجیر کے درخت کو سلسلہ اسرائیلی سے مشابہت دی ہے چنانچہ یرمیاہ کا کشف باب ۲۴ میں اس طرح مذکور ہے کہ "دو ٹوکریاں انجیروں کی خداوند کے ہیکل کے سامنے دھری تھیں۔ ایک ٹوکری میں اچھے سے اچھے انجیر تھے ...... اور دوسری ٹوکری میں بُرے سے بُرے انجیر" اور پھر آگے چل کر اچھے انجیروں کو بنی اسرائیل کے اچھے لوگ قرار دیا ہے اور بُرے انجیروں کو بُرے لوگ۔ اور حضرت عیسیٰ کے مشہور انجیر کے درخت پر لعنت کرنے کے واقعہ میں بھی درحقیقت اسی طرف اشارہ ہے دیکھو متی باب ۲۱۔ "اور جب صبح کو شہر میں جانے لگا اسے بھوک لگی تب انجیر کا ایک درخت راہ کے کنارے دیکھکر اس پاس گیا اور جب پتوں کے سوائے اس میں کچھ نہ پایا تو کہا اب سے تجھ میں کبھی پھل نہ لگے وہیں انجیر کا درخت سوکھ گیا"۔ اب ظاہر ہے کہ حضرت مسیح کو انجیر کے درخت پر کیا خفگی آسکتی تھی کہ اس پر پھل نہیں کیونکہ وہ پھل کا موسم بھی نہ تھا اصل میں یہ ایک تمثیل تھی جسے لفظ پرست انجیل نویسوں نے واقعہ کا رنگ دیدیا۔ انجیر کا درخت سلسلہ بنی اسرائیل کے قایم مقام تھا اس پر پتے تھے پھل نہ تھا۔ یعنی ظاہر طور پر کچھ افعال اچھے نظر آتے تھے مگر حقیقت سے وہ بھی خالی تھے اور حضرت مسیح نے بتا دیا کہ آیندہ کے لیے یہ درخت سوکھ گیا اور اس میں کوئی نبی نہیں آئے کا

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ﴿٤﴾	یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے۔
ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ﴿٥﴾	پھر ہم اسے ذلیل سے ذلیل حالت کی طرف بھی لوٹا دیتے ہیں ع٣٦٢٢
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿٦﴾	مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کرتے ہیں تو اُن کے لیے ایسا اجر ہے جو ختم نہیں ہوتا۔
فَمَا یُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ﴿٧﴾	تو کیا چیز تجھے اس کے بعد جزا کے معاملہ میں جھٹلا سکتی ہے ع٣٦٢٣
ع اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ ﴿٨﴾	کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر نہیں ؟

پس انجیر سلسلہ اسرائیل کے قایم مقام ہے اور زیتون سلسلہ محمدی کے اور اسی کی وضاحت کے لیے لف و نشر مرتب کے طور پر طور سینا کا ذکر کیا جہاں سے سلسلہ موسوی کی ابتدا ہوئی اور پھر بلد امین کا یعنی مکہ معظمہ کا جہاں سلسلہ محمدیہ کی بنیاد رکھی گئی اور یہاں البلد کے ساتھ الامین کا لفظ بڑھایا جس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ شہر امانت حق کو ہمیشہ کے لیے ادا کرتا رہے گا گویا اس سلسلہ کا قیام جو بلد امین میں قائم ہوتا ہے طور سینا کے سلسلہ کی طرح ایک وقت جا کر ختم نہیں ہو جائے گا اور شاید سینا پہاڑ کے تجلی الٰہی کے وقت دکا ہو جانے میں یہی اشارہ ہو اور ان چاروں چیزوں کی شہادت اس بات پر ہے کہ انسان کو اللہ تعالےٰ نے بہترین صورت پر پیدا کیا ہے اور اس میں ایسی استعداد رکھی ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچ سکتا ہے لیکن وہ اپنے عملوں کی وجہ سے گر کر ذلیل سے ذلیل حالت کی طرف بھی چلا جاتا ہے سلسلہ موسویہ کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے۔ اور سلسلہ محمدیہ کی تاریخ بھی یہی سبق ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

ع٣٦٢٢ تقویم۔ کسی شے کی تقویم اس کا راست کرنا ہے اور یہاں اشارہ اس بات کی طرف ہے جس کے ساتھ حیوانوں میں سے انسان کو خاص کیا گیا ہے یعنی عقل اور فہم اور قامت کی راستی دے کر کہ جس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ اس کو ہر شے پر جو اس عالم میں ہے غلبہ حاصل ہے (غ)

احسن تقویم سے مراد جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے صرف جسمانی ساخت کی عمدگی نہیں جسکے لحاظ سے وہ تمام جانداروں سے افضل ہے بلکہ اس میں عقل اور فہم کے علاوہ اخلاق فاضلہ اور تعلق باللہ بھی شامل ہیں اور فی الحقیقت اخلاق کی طرف ہی یہاں خاص اشارہ ہے کیونکہ اخلاق بلند سے ہی انسان بلند مقام پر پہنچتا ہے اور جب اس کے اخلاق گر جائیں تو دوسرے حیوانات سے بھی زیادہ ذلیل ہو جاتا ہے اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں وہ خود اشرف ہو کر اپنے سے ادنیٰ یا اپنے جیسی چیزوں کے سامنے اپنے آپ کو جھکا کر ذلیل کرتے ہیں۔ احسن تقویم پر وہی انسان قائم رہ سکتا ہے جو سوائے اللہ تعالےٰ کے اور کسی کے آگے اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے اور رددناہ میں فاعل اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے اس لیے کہ ان کے اعمال بد کی جزا وہی اُنہیں دنیا اور ذلیل کرتا ہے۔

ع٣٦٢٣ جمہور نے خطاب عام لیکر اس کے یوں معنی کیے ہیں کہ اے انسان اس دلیل کے بعد کیا چیز ہے کہ تجھے جزا اور اس کے انکار کی وجہ سے کاذب بنائے کیونکہ تکذیب حق سے انسان خود کاذب ہو جاتا ہے اور قتادہ اور فراء وغیرہ کا قول ہے کہ خطاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور اس معنی میں خطاب ہر حامل قرآن سے بھی ہو سکتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ کیا چیز تجھے جزا کے اس بیان کے بعد جھٹلا سکتی ہے یعنی استفہام نفی تکذیب کے لیے ہے اور آخری آیت کے بعد حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے مطابق جواباً کہا جاتا ہے بلیٰ وانا علیٰ ذٰلك من الشاھدین۔

سُوْرَةُ الْعَلَقِ مَكِّيَّةٌ (٩٦)

اٰیاتُھا ١٩ — رکوعھا ١

تمہید سورت: اِس سورت کا نام العلق ہے اور اسمیں اُنیس آیتیں ہیں علق انسان کی وہ حالت ہے جب وہ ماں کے رحم سے تعلق پکڑتا ہے اور تب اس میں ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے اور چونکہ اس سورت کی ابتدائی آیات میں سب سے پہلی وحی ہے جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوئی تو اس تمام میں یہ اشارہ ہے کہ اب اس نئے تعلق سے جو ذات باری کے ساتھ پیدا ہوتا ہے آپ کو ایک نئی زندگی دی جاتی ہے اور اس میں اشارہ اس انقلاب عظیم کی طرف ہے جو ایک گمنام آدمی کے ذریعہ سے دنیا میں ہونے والا تھا۔ اس سورت کا پہلا حصّہ سب سے پہلی وحی ہے جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوئی اور باقی حصّہ بھی ابتدائی مکّی زمانہ کا ہی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾
اپنے رب کے نام سے پڑھ، جس نے پیدا کیا۔

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾
انسان کو ایک لوتھڑے سے پیدا کیا۔

اِقۡرَاۡ وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۙ﴿۳﴾
پڑھ اور تیرا رب سب سے بڑھ کر بزرگی والا ہے۔

الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ﴿۴﴾
جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔

عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ؕ﴿۵﴾
انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا ۲۶۲۴

کَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ۙ﴿۶﴾
نہیں انسان سرکشی اختیار کرتا ہے۔

اَنۡ رَّاٰہُ اسۡتَغۡنٰی ؕ﴿۷﴾
اس لیے کہ وہ اپنے تئیں بے نیاز سمجھتا ہے ۲۶۲۵

اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجۡعٰی ؕ﴿۸﴾
تیرے رب کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡہٰی ۙ﴿۹﴾
کیا تو نے اسے دیکھا جو بندے کو روکتا ہے۔

عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی ؕ﴿۱۰﴾
جب وہ نماز پڑھتا ہے ۲۶۲۶

اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَانَ عَلَی الۡہُدٰۤی ۙ﴿۱۱﴾
کیا تو نے دیکھا اگر وہ ہدایت پر ہوتا۔

ع۲۶۲۴ یہ پانچ آیتیں بالاتفاق سب سے پہلی وحی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی باقی آیات اس سورت کی بعد میں نازل ہوئیں۔ حضرت عائشہ رضؓ کی روایت سے بخاری میں ہے کہ جب فرشتے نے کہا اِقْرَءْ تو آپ نے کہا مَا اَنَا بِقَارِئٍ میں پڑھنا نہیں جانتا تب اس نے آپ کو خوب زور سے دبایا اور تین دفعہ اسی طرح ہوا تب فرشتے نے یہ پانچ آیتیں پڑھیں اور آپ ان کے ساتھ گھر واپس ہوئے اور وحی کا رعب آپ کے اوپر اس قدر طاری تھا کہ آپ کے مونڈھے اور گردن کا گوشت پھڑک رہا تھا۔ بعض لوگوں نے سخت غلطی کھائی ہے جو یہ خیال کیا ہے کہ یہ خوف آپ کو اس وجہ سے تھا کہ آپ کو شک تھا کہ نعوذ باللہ یہ جنون یا شیطان ہے اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کے لیے انسان کو ایک دوسرے عالم میں منتقل ہونا پڑتا ہے اور چونکہ یہ انتقال حالت بیداری میں ہوتا ہے اس لیے انسان پر ایک حالت موت کی طرح طاری ہوتی ہے یہ تو آپ کا پہلا تجربہ تھا بعد میں بھی یہ حالت تھی کہ جب وحی آتی تو سخت سردی کے دن میں آپ کی پیشانی مبارک پر پسینہ آجاتا۔

اس سب سے پہلے پیغام کا کیا منشا ہے جو خاتم النّبیین پر نازل ہوا۔ سب سے پہلے پڑھنے کو کہا اور پڑھنا بھی رب کے نام کی استعانت سے اور اس کے ساتھ ہی انسان کو علق سے پیدا کرنے کا ذکر کیا۔ پھر پڑھنے کو کہا اور اس کے ساتھ رب اکرم کا ذکر کیا جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ سے علم دیا ہے۔ یہ امر غور طلب ہے کہ یہاں علق سے پیدا کرنے کا کیوں خصوصیت سے ذکر کیا۔ نطفہ سے پیدا کرنے کا ذکر کیوں نہ کیا جو بیشتر قرآن شریف میں آتا ہے۔ علق کے لیے دیکھو ع۷۴۳ یہ اصل میں کسی چیز سے لٹک جانے یا تعلق پیدا کرنے کا نام ہے اور علقہ نطفہ کی وہ حالت ہے جب وہ رحم مادر سے تعلق پیدا کرلیتا ہے۔ بغیر اس تعلق کے نطفہ کچھ چیز نہیں۔ انسان کی زندگی کی ابتدا نہیں ہوتی جب تک کہ نطفہ رحم مادر سے تعلق نہیں پکڑتا۔ اور اقرء باسم ربک میں اسی طرف توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرکے انسان کی اس اعلیٰ زندگی کی ابتدا ہوتی ہے جس سے اکثر لوگ بیخبر ہیں اور پھر جو دوہرایا اقرء وربک الاکرم تو گویا بتایا کہ اس کے ساتھ تعلق پیدا کرکے انسان حقیقی عزت حاصل کرتا ہے اور اگر بار بار پڑھنے کی طرف توجہ دلائی تو ساتھ ہی لکھنے کی طرف بھی توجہ دلائی کہ علم کی ترقی قلم سے ہی ہوتی ہے علم انسانی کی اصل ترقی اسی وقت سے شروع ہوئی جب سے انسان نے قلم کا استعمال شروع کیا تو یوں گویا انسان کی ساری ترقیوں کی جڑ پڑھنے اور لکھنے کو قرار دیا۔ ہاں ساتھ باسم ربک میں یہ توجہ دلائی کہ اعلیٰ زندگی کی ابتدا اللہ تعالیٰ سے تعلق سے ہوتی ہے اور اسی سے انسان کو عزت ملتی ہے۔ رسول اللہ صلعم ایک گمنام آدمی تھے۔ گو آپ کے جاننے والے آپ کی فطری پاکیزگی کی وجہ سے آپ کی عزت کرتے تھے مگر اللہ تعالیٰ کے کلام کے نزول نے آپ کی زندگی کو اتنا بڑا پلٹا دیا کہ آپ دنیا کی سب سے زبردست طاقت بن گئے اور انسانوں میں اور قوموں کی زندگیوں میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردیا اور یہ انقلاب جو ایک اقرء سے وقوع میں آیا اسبات کی شہادت ٹھہری کہ اس کلام میں کس قدر طاقت بھری ہوئی ہے۔ آج بھی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے اسی اقرء کے حکم کی تعمیل لازم ہے۔

ع۲۶۲۵ یعنی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا محتاج نہیں سمجھتا اور اپنے مال و دولت کو کافی سمجھتا ہے۔

ع۲۶۲۶ بخاری میں ہے کہ ابوجہل نے کہا تھا کہ اگر میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کعبہ کے پاس نماز پڑھتا دیکھوں گا تو آپ کی گردن لتاڑ دوں گا۔ تو

أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوٰى ﴿١٢﴾	یا تقوٰے کا حکم دیتا۔
أَرَءَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿١٣﴾	کیا تو نے دیکھا اگر اس نے جھٹلایا اور پیٹھ پھیر لی۔
أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿١٤﴾	کیا وہ جانتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے۔
كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ﴿١٥﴾	نہیں اگر وہ نہ رُکے گا تو ہم اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹیں گے ع۳۶۲۷
نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٦﴾	جھوٹی خطا کار پیشانی (سے)
فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ﴿١٧﴾	سو وہ اپنے اہل مجلس کو بلالے۔
سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿١٨﴾	ہم بھی بہادروں کو بلالیں گے ع۳۶۲۸
۱۹ ع ۲۱ كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿١٩﴾ السجدة	نہیں اس کی بات نہ مان اور سجدہ کر اور قرب حاصل کر۔

آنحضرت صلعم نے فرمایا اگر وہ ایسا کرے تو فرشتے اسے پکڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ اور اصل یہ ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ سے سرکشی اختیار کرتا ہے تو پھر اپنا تعلق ہی نہیں توڑتا بلکہ آہستہ آہستہ دوسروں کو بھی راہِ حق سے روکتا ہے اور اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے۔

ع۳۶۲۷ نسفعاً۔ سَفَع اصل میں سیاہی کو کہتے ہیں اور سَفَعَتْهُ السّموم گرم ہوا نے اسے سیاہ کر دیا۔ اور ناصیة کے ساتھ اس کے معنی جذب اور اخذ ہوتے ہیں اور پیشانی کے بالوں سے پکڑنے سے مراد اس کا ذلیل کرنا ہے اور بعض نے پیشانی کو منہ کی جگہ لیکر سیاہ کرنا بھی معنی لیے ہیں (ل) دیکھو اٰخذ بناصیتھا ع۱۲۷۴۔

ع۳۶۲۸ زبانیة۔ زَبْن کے معنی دفع ہیں اور زبانیة وہ جو لوگوں کو روکتے ہیں اور عرب کے لوگ شُرَط یعنی اعوان وانصار کو زبانیة کہتے ہیں اور زجاج کے نزدیک اس کے معنی غلاظ وشداد ہیں (ل)

یہاں مطلب سزا دینے والوں سے ہے جن کا یہ اعدائے حق مقابلہ نہ کرسکیں گے اور اس دنیا میں بھی ان کو سزا ملی اور ان کے اہل مجلس اسلام کے بہادروں کے مقابلہ میں ذلیل ہوئے۔

سُوْرَةُ الْقَدْرِ مَكِّيَّةٌ (۹۷)

اٰیاتھا ۵ — رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔
إِنَّآ أَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴿١﴾	ہم نے اسے لیلۃ القدر میں اتارا۔
وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ﴿٢﴾	اور تجھے کیا خبر ہے کہ لیلۃ القدر کیا ہے ع۳۶۲۹

تمہید سورت: اس سورت کا نام القدر ہے اور اس میں پانچ آیتیں ہیں اس کے نام میں یہ اشارہ ہے کہ اس میں امور خیر وبرکت نازل ہوتے ہیں اس سورت میں اصل ذکر قرآن کریم کے نزول کا ہے جو لیلۃ القدر میں اتارا گیا اسی موزونیت کے لحاظ سے اس کا نام القدر ہے یہ سورت ابتدائی مکی زمانہ کی ہے اور اسی پر جمہور کا اتفاق ہے اور جن لوگوں نے اسے مدنی کہا ہے وہ ایک ضعیف روایت کی بنا پر ہے۔

ع۳۶۲۹ لیلۃ القدر۔ قَدْر کے معنی قضاء اور حکم ہیں اور لیلۃ القدر حکم کی رات ہے فیھا یفرق کل امر حکیم (الدخان ۲۴-۴) (ل) اور ما قدروا اللہ حق قدرہ میں قدر کے معنی تعظیم بھی لیے گئے ہیں دیکھو ع۹۸۱ انزلنٰہ میں ضمیر قرآن کریم کی طرف ہی جاتی ہے اور اقرء باسم ربک کے بعد جو سب سے پہلی وحی ہے انا انزلناہ کو لاکر صاف بتادیا کہ مراد لیلۃ القدر میں اتارنے سے یہی ہے کہ اس میں قرآن کریم کا نزول شروع ہوا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مختلف زمانوں کی نازل شدہ سورتوں کو شدید تعلق کی وجہ سے موجودہ ترتیب پر رکھا گیا ہے لیلۃ القدر کیا ہے اور اس میں قرآن کے اتارنے سے کیا مراد ہے دیکھو ۳۰۲۵ و ۳۰۲۶۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۥ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝٣
لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے ۳۶۳۰ء

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم ۚ مِّن كُلِّ أَمْرٍ ۝٤
اس میں فرشتے اور رُوح اپنے رب کے اذن سے ہر امر (خیر) کو لیے ہوئے اترتے ہیں ۳۶۳۱ء

سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝٥
سلامتی یہ فجر کے طلوع تک ہے ۳۶۳۲ء

۳۶۳۰ء لیلۃ القدر کی عظمت کی طرف توجہ دلائی کہ وہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے اور یہاں ہزار کا لفظ تکثیر کے لیے ہے مگر اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ جس طرح آنحضرت صلعم کا زمانہ تمام زمانوں پر فوقیت رکھتا ہے اسی طرح ہر صدی کے سر پر جو آپ کے خلفاء آئیں گے ان کا زمانہ صدی کے باقی زمانہ پر فوقیت رکھنے والا ہے کیونکہ ہزار مہینے تراسی سال کے قریب بنتے ہیں اور بیس سال کے قریب گویا ہر صدی میں مجدد کا زمانہ ہے اسی قسم کا ایک اشارہ روح المعانی میں بھی بیان ہوا ہے کہ اس میں بنو اُمیہ کی سلطنت کی طرف اشارہ ہے جو اسّی سال کے قریب رہی۔

۳۶۳۱ء روح کے متعلق یہاں بھی وہی مختلف اقوال ہیں جو ۳۴۲۵ء میں بیان ہوئے اور گو رحمت یا وحی بھی یہاں معنی ہو سکتے ہیں مگر اصل مطلب روح کے اُترنے کا روحانی زندگی کا نزول ہے گویا لیلۃ القدر سے ایک نئی روحانی زندگی مومنین کو ملتی ہے اور من کل امر سے مراد ہر امر خیر و برکت ہے اور مِن ب کے معنی میں ہے (ر) اور یہ بالکل اس کے مطابق ہے جو دوسری جگہ فرمایا فیھا یفرق کل امر حکیم دیکھو ۳۰۲۶ء۔

۳۶۳۲ء سلام کے معنی ہر خوف کے امر سے سلامتی ہے اور اسے ھِیَ کی خبر مقدم کہا گیا ہے مگر سلام پر وقف ہے اس لیے سلام میں اشارہ من کل امر کی طرف معلوم ہوتا ہے یعنی جو امور نازل ہوتے ہیں وہ سلامتی کا موجب ہیں اور ھی حتی مطلع الفجر میں یہ اشارہ ہے کہ جس طرح فجر کے ساتھ نور آفتاب کی روشنی نظر آنے لگتی ہے اسی طرح یہ لیلۃ القدر انوار و برکات کو لانے کا موجب ہے۔

سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ مَدَنِيَّةٌ (۹۸)

آیاتُھا ۸ — رکوعُھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝
اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝١
وہ لوگ جو اہل کتاب میں سے کافر ہوئے اور مشرک (گناہ سے) باز آنے والے نہ تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل آئے ۳۶۳۳ء

تمہید سورت: اس سورت کا نام البیّنۃ ہے اور اس میں آٹھ آیتیں ہیں۔ یہاں رسول کریم صلعم کو کھلی دلیل قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ دنیا گناہ اور ناپاکی میں اس قدر ملوث ہوگئی تھی کہ بغیر آسمانی بارش اور اللہ تعالیٰ کے رسول کے اس کا گناہ کی غلامی سے نکلنا محال تھا۔ اگر محمد رسول اللہ صلعم کی قوت قدسی دنیا میں نہ آتی تو دنیا شرک و ضلالت سے باہر نہ نکل سکتی۔ یہ سورت جمہور کے قول میں مکّی ہے لیکن بعض لوگوں نے اسے اس بنا پر مدنی کہا ہے کہ بعض روایات میں یہ ذکر ہے کہ جب یہ نازل ہوئی تو آنحضرت صلعم نے اُبیؓ کو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے میں تمہیں یہ پڑھاؤں مگر بخاری میں یہ لفظ نہیں کہ جب یہ نازل ہوئی تو اس وقت فرمایا بلکہ عام لفظ ہیں اور صحیح یہی ہے کہ یہ مکّی ہے اور غالباً ابتدائی زمانہ کی ہی ہے اور اُبیؓ کو پڑھانے کا حکم شاید اس لیے ہوا ہو کہ وہ اہل کتاب میں سے ایمان لائے تھے اور یہاں اہل کتاب کو ان کی اپنی کوششوں کی ناکامی کی طرف توجہ دلائی ہے۔

۳۶۳۳ء منفکین۔ فَکَکْتُ الشئَ کے معنی ہیں خَلَّصْتُهٗ اسے نجات دی یا آزاد کر دیا۔ اسی سے فک الرھن ہے اور فک رقبۃ غلام کا آزاد کرنا ہے، دیکھو ۳۶۰۵ء اور فَکَّهٗ سے لازمی ہے اِنْفَکَّ یعنی وہ آزاد ہو گیا یا نجات پا گیا (ل)۔ بخاری میں ہے منفکین زائلین یعنی کفر و شرک کو چھوڑنے والے۔

دنیا کے لیے ایک نجات دہندہ کی ضرورت تھی: پچھلی سورت میں نزول قرآن کا ذکر تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس زمانہ نزول قرآن میں دنیا خیر و برکت سے بھر جائے گی یہاں دوسرے پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اہل کتاب اور مشرک ان ناپاکیوں سے جن میں وہ ملوث ہو گئے تھے اور گناہ کی غلامی سے آزاد ہونے والے نہ تھے یہاں تک کہ ان کے پاس خدا کا رسول آتا جو ان پر پاک صحیفے پڑھتا اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا کی حالت کفر و شرک کی تاریکیوں میں پڑ کر یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اب کوئی معمولی واعظ انہیں اس سے آزاد نہ کر سکتا تھا جب تک کہ ایک فرستادۂ خدا ان کو پاک نہ کرتا اور یہ امر تاریخی طور پر ثابت

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝۲

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول جو پاک صحیفے پڑھتا ہے۔

فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝۳

جس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں ۳۶۳۴

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۴

اور جنہیں کتاب دی گئی تھی انھوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی دلیل آ گئی ۳۶۳۵

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ۬ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝۵

اور انھیں یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ (تعالیٰ) کی عبادت کریں اس کے لیے فرمانبرداری کو خالص کرتے ہوئے راست رو ہوں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی ٹھیک دین ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝۶

وہ لوگ جنھوں نے اہل کتاب میں سے انکار کیا اور مشرک بھی دوزخ کی آگ میں ہوں گے، اسی میں رہیں گے۔ وہ بدترین مخلوق ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝۷

جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں، وہ بہترین مخلوق ہیں ۳۶۳۶

جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝۸ ع

ان کا بدلہ ان کے رب کے ہاں ہمیشگی کے باغ ہیں۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ انہی میں رہیں گے۔ اللہ (تعالیٰ) ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے یہ اس کیلئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔

شدہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے جزیرہ نمائے عرب کو شرک سے پاک کرنے کے لیے صدیوں تک زور لگایا مگر ان کی ساری کوششوں کا نتیجہ ملک عرب کی اخلاقی حالت پر اتنا بھی نہ ہوا جتنا سمندر کی سطح پر ایک ہلکی لہر کا اثر ہوتا ہے یہ وہ بات ہے جو خود میور نے لکھی ہے۔ اور فی الحقیقت جو لوگ خود ناپاکیوں کے اندر مبتلا تھے وہ دوسروں کو کیونکر ناپاکیوں سے نکال سکتے تھے۔ اسی مناسبت سے آگے صحفا مطہرۃ کا ذکر آتا ہے گویا بتایا ہے کہ رسول کے آنے کی ضرورت اس لیے تھی کہ پہلے اہل کتاب اس قابل نہ رہے تھے کہ وہ دوسروں کو گناہ کی غلامی سے نجات دلا سکتے۔ بلکہ وہ خود ایک نجات دہندہ کے محتاج تھے اور منفکین کے معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ بُرے اچھوں سے الگ ہونے والے نہ تھے۔

۳۶۳۴ یہاں بتایا کہ وہ کھلی دلیل جو دنیا کو گناہ کی غلامی سے آزاد کر سکتی ہے اللہ کا رسول ہے اور وہ پاک صحیفے پڑھتا ہے اور انہی سے اب دنیا پاک ہو سکتی ہے اور فیہا کتب قیمۃ کے بڑھانے میں یہ اشارہ ہے کہ اس قرآن میں پہلی کتابوں کی تمام وہ تعلیم موجود ہے جو قائم رکھنے کے قابل تھی اور قرآن کو صحیفے کہہ کر بتا دیا کہ اسوقت بھی قرآن کریم برابر لکھا جاتا تھا۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ رسول اللہ ان صحیفوں پر سے پڑھتے ہوں۔

۳۶۳۵ تفرّق سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مومن اور کافر الگ الگ ہوئے اور یہ بھی کہ اہل کتاب نے حق سے تفرقہ کیا اور اگلی آیت میں بتایا کہ انکا یہ تفرقہ کرنا کیسا بے معنی ہے اس لیے کہ انہیں نیکی اور عبادت کی طرف ہی بلایا جاتا تھا اور یہی انبیاء پہلے بھی کرتے رہے۔

۳۶۳۶ بریۃ کے معنی خلق ہیں اور یہ یا تو برأ سے مشتق ہے اور ہمزہ متروک ہو گیا ہے اور یا بَرَیْتُ العُوْدَ سے ہے میں نے لکڑی کو تراشا گویا وہ بری یعنی مٹی سے بنائی گئی ہے (غ) شر البریۃ اور خیر البریۃ کے تقابل میں سمجھایا کہ انسان جب اپنے قوائے خداداد کو بے محل استعمال کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہیں کرتا تو اس جیسا برا بھی کوئی نہیں وہ سب مخلوق سے بدتر ہے کیونکہ سب مخلوق قانون کی فرمانبرداری کرتی ہے اور جب وہ اپنے قویٰ کا درست استعمال کرتا ہے تو وہ تمام مخلوقات پر فوقیت لے جاتا ہے اس میں صاف بتا دیا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔

(۹۹) سُوْرَۃُ الزِّلْزَالِ مَکِّیَّۃٌ

اٰیاتھا ۸ — رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے باربار رحم کرنے والے کے نام سے

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝١ — جب زمین اپنے بھونچال سے ہلائی جائے گی۔

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝٢ — اور زمین اپنے بوجھ نکال دے گی۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝٣ — اور انسان کہے گا اسے کیا ہوا۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝٤ — اس دن وہ اپنی سب خبریں بیان کردے گی۔

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝٥ — کیونکہ تیرے رب نے اس کے لیے وحی کی تھی ۳۶۳۷

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ۬ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝٦ — اس دن لوگ الگ الگ ہو کر نکل پڑیں گے کہ انھیں ان کے عمل دکھائے جائیں ۳۶۳۸

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝٧ — تو جو کوئی ایک ذرہ کے وزن کے برابر بھلائی کرتا ہے اسے دیکھ لے گا۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝٨ ع — اور جو کوئی ایک ذرہ کے وزن کے برابر بدی کرے گا اسے دیکھ لے گا ۳۶۳۹

تمہید سورت: اس سورت کا نام الزلزال ہے اور اس میں آٹھ آیتیں ہیں اور اس کے نام میں یہ اشارہ ہے کہ اس روحانی بیداری کے پیدا کرنے کے لیے جس کا پیام رسول اللہ صلعم لائے ہیں ایک انقلاب عظیم دنیا میں رونما ہوگا۔ یہ سورت ابتدائی مکی زمانہ کی ہے۔

۳۶۳۷ روحانی بیداری کے لیے انقلاب عظیم کا واقع ہونا: یہ عظیم الشان انقلاب کا ذکر ہے۔ قیامت کا ذکر ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ ہر بات کا نمونہ آنحضرت صلعم کی مختصر زندگی میں دیدیا ہے۔ اس لیے وہ عظیم الشان انقلاب اس دنیا میں بھی آیا اور اسی کی طرف یہاں خصوصیت سے اشارہ ہے جیسا کہ اگلی سورت میں اس کی وضاحت بھی کردی ہے چنانچہ اخرجت الارض اثقالھا میں اگر مُردوں کا قبروں سے نکلنا مراد لیا گیا ہے تو خزانوں کا زمین سے نکلنا بھی مراد لیا گیا ہے (ر) خواہ وہ دجال کے زمانہ میں نکلیں یا آگے پیچھے۔ اور فی الحقیقت جو روحانی بیداری انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے وہ بھی ایک انقلاب عظیم سے ہی پیدا ہوتی ہے انسان جو دنیا میں مستغرق ہو رہا ہے جب تک شدت سے نہ ہلایا جائے اس وقت تک اس میں روحانیت کا احساس پیدا نہیں ہوتا تب وہ اپنی مخفی طاقتوں کو باہر نکال دیتا ہے اور راز ہائے عظیمہ جو اس کے اندر مخفی تھے باہر نکل آتے ہیں اور معلوم ہو جاتا ہے کہ وحی اسی کے فائدہ کے لیے ہوئی تھی۔ ایسا ہی پیغمبروں کے ذریعہ سے جو ایک انقلاب عظیم روحانیت کے لیے پیدا ہوتا ہے اس کے لیے بھی ایک نہ ایک رنگ میں ان تمام چیزوں کا واقع ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جب تک زمین ہل نہیں جاتی جب تک اس کے خزانے اور بوجھ باہر نہیں نکل آتے تب تک قوم میں روحانی بیداری پیدا نہیں ہوتی آنحضرت صلعم کے وقت میں بھی جب تک یہ عظیم الشان زلزلہ جنگوں کی صورت میں نمودار نہیں ہوا اور باطل نے حق کو کچلنے کے لیے اپنا پورا زور نہیں لگایا اس وقت تک وہ روحانی بیداری ملک عرب میں پیدا نہیں ہوئی جسکے ساتھ قیامت وسطیٰ قائم ہوئی اور جس دن وہ انقلاب آگیا اس دن گویا یوں معلوم ہوتا تھا کہ زمین خود اپنی سب خبریں بیان کر رہی ہے جو کچھ سالہا سال پیشتر ایسے وقت میں سنا تھا کہ جب اسکے پورا ہونے کا وہم و گمان بھی نہ تھا وہ پورا ہوتا دیکھ لیا اور اوحی لھا میں بتایا کہ اس وقت معلوم ہو جائیگا کہ وحی الٰہی اہل زمین کے فائدے کے لیے ہی تھی۔

۳۶۳۸ قیامت میں تو لوگ اعمال کے نتائج کو دیکھ ہی لیں گے مگر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلعم کی زندگی میں بھی یہ نظارہ دکھا کر قیامت پر دلیل قائم کردی جنہوں نے حق کی خاطر سب کچھ قربان کردیا تھا انہوں نے اپنی قربانیوں کا پھل پایا اور اہل باطل نے باطل کو نیست و نابود ہوتے بھی دیکھ لیا۔

۳۶۳۹ نیکی اور بدی کے ثمرات کا اصول غیر متبدل: آنحضرت صلعم نے ان آیات کو الجامِعَۃُ الفَاذَّۃ کا نام دیا ہے (بخاری) یعنی یہ اصول جو ان میں بیان ہوا وہ جامع اور منفرد ہے اور یہ کسی دوسری آیت کے منافی نہیں۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ اگر کافر نیکی کرے تو وہ ضائع نہیں جاتی اور اگر مسلمان بدی کرے تو اسے معافی حاصل نہیں۔ البتہ جس طرح ظاہری قوانین میں ہے نیکی کا اجر بھی اپنی چھوٹائی بڑائی کے لحاظ سے ہوتا ہے اور بدیوں کی سزا بھی ان کی چھوٹائی بڑائی کے لحاظ سے

(بقیہ صفحہ سابقہ)

ہوتی ہے۔ ایک انسان اعلےٰ درجہ کی مقوی غذائیں کھاتا اور اچھے اصول صحت پر قائم ہے وہ یقیناً اپنی زندگی میں اس کے اچھے نتائج کو دیکھتا ہے لیکن اگر وہ ان اصول صحت پر عمل کرنے کے بعد زہر کھالے تو وہ بھی اپنا اثر دکھا کر رہے گی۔ نیکی اور بدی سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کا ہم کوئی اندازہ نہیں کر سکتے۔ مگر قانون صحیح یہی ہے کہ ہر نیکی اپنی جزا رکھتی ہے اور ہر بدی بھی اپنا اثر پیدا کرتی ہے پھر بعض نیکیوں سے بعض بدیوں کے اثر محو ہو جاتے ہیں اور بعض بدیوں سے بعض نیکیوں کے اثر محو ہو جاتے ہیں۔ پس سچی توبہ سے انسان کے گناہ معاف ہونا یا ارتداد سے اس کی بعض نیکیاں ضائع ہو جانا اس اصول کے خلاف نہیں اور اصل کام کرنے والا اصول ہر جگہ یہی ایک ہے۔

سُوْرَۃُ الْعٰدِیٰتِ مَکِّیَّۃٌ (۱۰۰)

اٰیاتُھا ۱۱ — رُکُوْعُھا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ﴿۱﴾ — گواہ ہیں دوڑنے والے ہانپتے ہوئے۔

فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ﴿۲﴾ — پھر مار کر آگ نکالنے والے۔

فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا ﴿۳﴾ — پھر صبح کے وقت حملہ کرنے والے۔

فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا ﴿۴﴾ — پھر اس کے ساتھ وہ گرد اُٹھاتے ہیں۔

فَوَسَطْنَ بِہٖ جَمْعًا ﴿۵﴾ — پھر وہ اس کے ساتھ (دشمن کی) جماعت میں جا گھستے ہیں۔ ۳۶۴۰

تمہید سورت: اس سورت کا نام العادیات ہے اور اس میں گیارہ آیتیں ہیں اور اس نام میں خیل یعنی رسالہ کے گھوڑوں کی طرف اشارہ ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہ انقلاب عظیم جس کا ذکر پچھلی سورت میں تھا اس پر گھوڑے بھی گواہ ہونگے یعنی اس کا پیش خیمہ لڑائیاں ہونگی اور یا اگر مراد نفوس عادیات لیے جائیں تو مومنوں کی ترقیات روحانی کی طرف اشارہ ہے یہ بھی ابتدائی زمانہ کی مکی سورت ہے اور بعض نے اسے بھی مدنی کہا ہے مگر مضمون کی نوعیت بتاتی ہے کہ یہ مکی ہے

ع ۳۶۴۰ عٰدیٰت ضبحا۔ عَدْو دوڑنا اور عادیات دوڑنے والے۔ مراد خیل الغزاۃ یعنی غازیوں کے گھوڑے ہیں اور ضَبح گھوڑے کے انفاس کی آواز ہے اور حفیف العَدْو یعنی دوڑنے کی آواز کو بھی کہا گیا ہے (غ)

موریٰت قدحا۔ وَرَی آگ نکالی موریٰت آگ نکالنے والے اور قَدَحٌ پیالے کو کہتے ہیں اور قَدَح بالزَّنْدِ کے معنی ہیں زند کے ساتھ مار کر آگ نکالی (ل)

مغیرات۔ غور کے لیے دیکھو ع ۱۲۹۳ اور غار اور اَغَارَ کے اصل معنی ہیں گہرائی کی طرف گیا پھر یہ معنی ہو گئے کہ کسی امر میں جلدی کی اور اَغَارَ علی القوم کے معنی ہیں ان پر رسالے سے حملہ کیا اور اَغَار کے معنی ہیں سخت تیز دوڑا اور مُغیرۃ جس کی جمع مغیرات ہے وہ گھوڑے ہیں جو اس طرح دشمن پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

نقع۔ نَقَعَ الماءُ پانی جمع ہوا اور نَقْع غبار کو کہا جاتا ہے جو اوپر چڑھ جاتا ہے (ل)

وسطن۔ وَسَطَ الشئ و تَوَسَّطَہٗ کے معنی ہیں صار فی وسطہٖ یعنی اس کے درمیان میں ہو گیا (ل)

جنگ کا ذکر بطور پیشگوئی: یہاں جن چیزوں کو بطور گواہ پیش کیا ہے ان سے مراد جمہور کے نزدیک خدا کی راہ میں جنگ کرنے والوں کے گھوڑے ہیں (ر) اور یہ سورت تو ابتدائی زمانہ کی ہے اور یہ سب ذکر بطور پیشگوئی کے ہے اور پچھلی سورت میں جو توجہ دلائی گئی تھی کہ ایک انقلاب عظیم برپا ہوگا قبل اس کے کہ وہ قیامت روحانی مبعوث ہو جس کے لیے رسول اللہ صلعم ظاہر ہوئے ہیں تو یہاں اس انقلاب کے اس حصہ کی طرف توجہ دلائی ہے جس کے ذریعہ سے باطل کا نابود ہونا تھا۔ یعنی لڑائیاں اور اس لیے غازیوں کے گھوڑوں کو جن سے باطل کا قلع قمع ہونا تھا بطور شہادت پیش کیا اور فی الحقیقت یہ ایک پیشگوئی ہے اور رسالوں کا ذکر اس لیے کیا کہ جنگ کی کامیابی کا انحصار رسالے پر ہے آج اس قدر علم جنگ میں ترقی کے باوجود بھی عمدہ زبردست رسالہ ہی کامیاب جنگ کا پیش خیمہ ہے امور ملکی میں مسلمانوں کو ان باتوں سے خاص فائدہ اُٹھانا چاہیئے اور انسانوں کی جماعتیں بھی عادیات وغیرہ سے مراد ہو سکتی ہیں۔ یعنی جو اپنے کمالات کے حاصل کرنے کے لیے سرپٹ دوڑتے ہیں اور پھر اپنے افکار کے ساتھ انوار معارف کی آگ نکالتے ہیں اور صبح کے وقت حرص و ہوا کی فوجوں پر حملہ کرتے ہیں پھر اس کے ساتھ وہ غبار اُٹھاتے ہیں جو اوپر چڑھ جاتا ہے جو ان کے اعمال کے صعود کی طرف اشارہ ہے اور پھر مقربین کی جماعت میں جا داخل ہوتے ہیں اور یہ سب مومنوں کی ترقیات روحانی کی طرف اشارہ ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ ⑥ یقیناً انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ ⑦ اور وہ یقیناً اس بات پر خود گواہ ہے۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۗ ⑧ اور وہ یقیناً مال کی محبت میں بڑا سخت ہے ۳۶۴۱

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِى الْقُبُوْرِ ۙ ⑨ تو کیا وہ جانتا نہیں جب وہ جو قبروں میں ہیں باہر نکالے جائیں گے۔

وَحُصِّلَ مَا فِى الصُّدُوْرِ ۙ ⑩ اور جو سینوں میں ہے وہ ظاہر کیا جائے گا ۳۶۴۲

ع ۱۱ ۲۵ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ع ⑪ یقیناً ان کا رب اس دن ان سے باخبر ہوگا۔

۳۶۴۱ کنود۔ ناشکرا انسان کو کہتے ہیں اور اَرضُ کَنُوْدٌ وہ زمین ہے جس میں کچھ نہیں اُگتا۔ (غ)
جواب قسم یہ ہے کہ انسان ناشکر گزار ہے یعنی جو قوٰی اللہ تعالیٰ نے اس میں رکھے ہیں ان کی تربیت نہیں کرتا چونکہ اصل غرض اس مقابلہ کی یہی تھی کہ حق قائم ہو جائے اور باطل نابود ہو جائے اس لیے بتایا کہ یہ جو لوگ مخالفت حق کرنے والے ہیں آخر کار ان پر ثابت ہو جائے گا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی اور وانه على ذٰلك لشهيد میں بتایا کہ انسان کی اپنی فطرت بھی اس بات پر گواہی دیتی ہے مگر وہ مال دنیا کی محبت میں اس قدر بخیل ہے کہ اپنے اعلیٰ قوٰی کی پروا نہیں کرتا۔

۳۶۴۲ حُصِّلَ۔ تَحْصِیل چھلکے سے مغز کا نکالنا جیسے سونے کی کان سے سونے کا نکالنا۔ یعنی جو دلوں میں ہے وہ ظاہر کیا جائے گا۔ (غ)
بعثر ما فی القبور پر دیکھو ۳۵۵۳ اور یہاں حصل ما فی الصدور لاکر اسی معنی کی تائید کی ہے کہ مراد اس سے رازوں کا ظاہر ہونا ہے اور وہ قیامت میں بھی ہوگا اور رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے جو قیامت روحانی قائم ہوئی اس میں بھی اسی کا اظہار ہوا جو سینوں کے اندر مخفی تھا یعنی جو کچھ سینوں کے اندر مضمر تھا وہ ظہور میں آگیا۔

اٰیاتُها ۱۱ سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ (۱۰۱) رُکُوعُها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اَلْقَارِعَةُ ۙ ① سخت مصیبت،

مَا الْقَارِعَةُ ۚ ② کیا ہی بڑی مصیبت ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۗ ③ اور تجھے کیا خبر ہے کیسی بڑی سخت مصیبت ہے ۳۶۴۳

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ ④ جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوں گے۔

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۗ ⑤ اور پہاڑ دھنی ہوئی اُون کی طرح ہوں گے ۳۶۴۴

تمہید سورت: اس سورت کا نام القارعۃ ہے اور اس میں گیارہ آیتیں ہیں۔ پچھلی سورت کا مضمون یہاں بھی جاری رکھا ہے اور یہ ابتدائی مکی زمانہ کی سورت ہے۔

۳۶۴۳ قارعۃ کے لیے دیکھو ۱۶۲۵ مصیبت۔ نبی کریم صلعم کا سریّہ۔ قیامت تینوں پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔ اور یہاں تینوں مفہوموں پر حاوی ہے۔ پچھلی سورت میں جنگوں کے متعلق صراحت سے پیشگوئی تھی اس لیے یہاں سریّہ مراد ہونا کوئی بعید امر نہیں اور سخت مصیبت اور قیامت کے معنی ظاہر ہیں۔

۳۶۴۴ فراش۔ فراشۃ واحد ہے اور پروانے کو کہتے ہیں۔ اور لوگوں کو فراش مبثوث سے مثال دینے میں اشارہ اس دن کے ہول و اضطراب کی طرف ہے یا ان کی کثرت اور پراگندگی اور ان کے ضعف اور ذلت اور ان کے آنے اور جانے کی وجہ سے انہیں پروانوں سے تشبیہ دی ہے بہرحال یہ تشبیہ اس دنیا میں بھی صحیح ثابت ہوئی اور قیامت کا نظارہ تو اس سے فوق الفوق ہوگا اور پہاڑوں کا دھنی ہوئی اون کی طرح ہونا ان کے اڑائے جانے کی طرح ہے دیکھو ۱۶۲۳

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۶﴾	سو جس کی نیکیاں بھاری ہوں گی۔
فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ﴿۷﴾	وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا۔
وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۸﴾	اور جس کی نیکیاں ہلکی ہوں گی،
فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ﴿۹﴾	تو اس کا ٹھکانا ہاویہ ہے ۳۶۴۵
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ؕ﴿۱۰﴾	اور تجھے کیا خبر ہے وہ کیا ہے؟
ع نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾	وہ جلتی ہوئی آگ ہے۔

۳۶۴۵ھاویۃ۔مادہ ھوی ہے دیکھو ع۱۹۶۴ اور ھواء معروف ہے اور افئدتھم ھواء۔ (ابراھیم ۱۴-۴۳) میں مراد ہے کہ عقل سمجھ کچھ باقی نہ رہے گی اور ھاویۃ کو دوزخ کا نام قرار دیا گیا ہے مگر ابن بری کا قول ہے کہ یہ اسم علم نہیں بلکہ ہر ایک گڑھا ہے جس کی گہرائی کی کوئی انتہا نہ ہو اور اُمّہ ھاویۃ کے معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ اس کا ٹھکانا ہاویہ ہوگا اور بعض نے اسے دعا کے طور پر قرار دیا ہے جیسے ھوت اُمّہ جس کے معنے ہیں اس کی ماں ہلاک ہو اور بعض نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ دوزخ اسے اس طرح اپنی طرف پناہ دیگی جس طرح ماں بیٹے کو پناہ دیتی ہے (ل)

دوزخ علاج کے طور پر ہے: موازین کے بھاری اور ہلکا ہونے پر دیکھو ع۱۰۵۰ اور یہ لفظ قیامت کبری پر بھی صادق آتے ہیں اور روحانی قیامت پر بھی کیونکہ نیکی کرنے والا انسان یہیں خوشی کی زندگی پا لیتا ہے اور جس کی نیکی کی قوت مردہ رہتی ہے وہ یہیں ہاویہ میں ہوتا ہے اور یہاں دوزخ کو گنہگار کی اُمّ یا ماں قرار دیا ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ جس طرح ماں بچے کی تربیت کرتی ہے اسی طرح گنہگار کی تربیت کے لیے ہاویہ کی ضرورت ہے پس یہ محض سزا نہیں بلکہ بطور علاج ہے۔ گویا دوزخ کا اصل منشا ان امراض روحانی کا علاج ہے جو انسان اپنے ہاتھ سے آپ پیدا کر لیتا ہے انسان آپ اپنے لیے آگ بناتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا فضل بے پایاں ایسا ہے کہ اس آگ کو بھی بطور ایک علاج کے بنا دیتا ہے۔

سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ (۱۰۲)

اٰیَاتُهَا ۸ — رُکُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾	کثرت مال کی خواہش نے تمہیں غافل کر رکھا ہے۔
حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾	یہاں تک کہ تم قبروں کو دیکھنے ہو ع۳۶۴۶
كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳﴾	نہیں، تم جان لو گے۔
ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ﴿۴﴾	نہیں نہیں تم جان لو گے۔
كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ؕ﴿۵﴾	نہیں اگر تم علم یقین کے ساتھ جانتے،

تمہید سُورت: اس سورت کا نام التکاثر ہے اور اس میں آٹھ آیتیں ہیں یہاں بتایا ہے کہ کثرت مال و دولت کی خواہش اور تڑپ انسان کو اصل مقصد زندگی سے غافل رکھتی ہے ورنہ وہ انہماک حرص و ہوا کو دوزخ کے رنگ میں یہاں بھی دیکھ سکتا ہے۔ گویا وہ انقلاب روحانی جس کو رسول اللہ صلعم پیدا کرنے آئے تھے اس کی طرف اگر لوگ متوجہ نہیں ہوتے تو محض اس لیے کہ کثرت مال کی محبت نے انہیں غافل کر رکھا ہے۔ یہ بھی ابتدائی مکی سورتوں میں سے ایک ہے

۳۶۴۶ تکاثر دیکھو ع۳۳۰ کثرت مال و عزت میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش۔ یعنی کثرت مال و اولاد و جاہ وغیرہ کی خواہش جو انسان کی حیوانی زندگی سے تعلق رکھنے والی باتیں ہیں اسے حقیقی مقصد زندگی سے جو اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا ہے غافل کر رکھتی ہیں۔ جب پچھلی سورتوں میں اس انقلاب روحانی پر زور دیا جسے رسول اللہ صلعم دنیا میں پیدا کرنے آئے تھے تو اب یہ بتایا کہ وہ کونسی چیز ہے جو لوگوں کی توجہ کو اخلاقی اور روحانی پہلو سے جو فی الحقیقت ان کی اصل خوشی کا موجب ہے ہٹائے رکھتی ہے اور زرتم المقابر سے دیکھو ع۳۵۴۵ موت مراد ہے یعنی اسی طرح اشغال دنیا میں منہمک تم مر جاتے ہو۔ اسی لیے آگے فرمایا کلا یعنی تکاثر مال دنیا سے تمہاری فلاح نہیں سوف تعلمون اور اس بات کا تم کو علم ہو جائے گا۔ اور ایک علم اس دنیا میں ہو جانا ہے اور ایک موت کے بعد اس لیے دو دفعہ سوف تعلمون فرمایا۔

لَتَرَوُنَّ الۡجَحِيۡمَ ۙ﴿۶﴾ تو تم ضرور دوزخ کو دیکھ لیتے ۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيۡنَ الۡيَقِيۡنِ ۙ﴿۷﴾ پھر تم اُسے ضرور یقین کی آنکھ کے ساتھ دیکھ لوگے ۔

ع ۸/۲۷ ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِيۡمِ ﴿۸﴾ پھر تم سے ضرور اس دن نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا ۔ ۳۶۴۷

۳۶۴۷ ان آیات میں یقین کے دو مراتب کا ذکر علم الیقین اور عین الیقین کے الفاظ میں کیا ہے اور تیسرے مرتبہ کا ذکر لتسئلن میں کیا ہے اور دوسری جگہ حق الیقین کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے (الحاقۃ ۶۹ - ۵۱) اور یہ تین مراتب یقین اس طرح پر ہیں کہ پہلا مرتبہ یقین کا دلائل علمی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اس لیے اسے علم الیقین کہا ہے اور دوسرا مرتبہ مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جسے عین الیقین کہا ہے اور تیسرا مرتبہ اس چیز کے اندر داخل ہونے یا ان حالات کے اپنے اوپر وارد ہونے سے حاصل ہوتا ہے اسے حق الیقین کہا ہے اور یہاں اس کا ذکر لتسئلن یومئذ عن النعیم میں کیا ہے۔ کیونکہ نعمتوں کے متعلق سوال گویا ان نعمتوں کی ناشکری کا عملی طور پر یا برنگ نتیجہ انسان پر وارد ہونا ہے ان تین مراتب یقین کی مثال یہ ہے کہ مثلاً دھوئیں کو دیکھ کر بذریعہ علم انسان کو یقین ہوجاتا ہے کہ وہاں آگ جل رہی ہے پھر اگر وہ آگے چلا جائے تو آگ کو خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیگا یہ عین الیقین ہے۔ پھر خود اس کے اندر داخل ہوجائے تو وہ حالت اس پر وارد ہوکر بتا دیتی ہے کہ یہ آگ ہے یہ حق الیقین ہے۔ تو یہاں کفار کو بتایا ہے کہ اگر تم علم الیقین سے کام لیتے یعنی دلائل پر غور کرتے تو تمہیں معلوم ہوجاتا کہ کثرت مال و دولت کے پیچھے لگنا اور اصل مقصد زندگی کو بھلا دینا ایک دوزخ ہے اور یہ جو فرمایا کہ تم اسے عین الیقین سے دیکھ لوگے تو مطلب یہ ہے کہ ایسے واقعات تمہارے سامنے پیش آجائیں گے کہ جس طرح انسان آنکھ سے ایک چیز کو دیکھ لیتا ہے اسی طرح تم دوزخ کو دیکھ لوگے اور پھر بعد موت اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کے نتائج کھلے طور پر تم پر وارد ہونگے اور تم حق الیقین سے دوزخ دیکھ لوگے۔

سُوۡرَةُ الۡعَصۡرِ مَكِّيَّةٌ (۱۰۳)

آیاتھا ۳ — رکوعھا ۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○ اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

وَالۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ زمانہ گواہ ہے ،

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِىۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ کہ انسان نقصان میں ہے ۔

اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں

ع ۲۸ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾ اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں ۳۶۴۸

تمہید سورت: اس سورت کا نام العصر ہے اور اس میں تین آیتیں ہیں۔ اور اس کے نام میں مرور ایام کی طرف اشارہ ہے کہ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اور ہر انسان جو اس وقت کو اچھے مصرف میں نہیں لاتا وہ نقصان میں ہے اور اچھا مصرف یا عقاید کے رنگ میں کسی بات پر قائم ہونا ہے یعنی ایمان اور یا اعمال کے رنگ میں یعنی اعمال صالحہ کا بجا لانا مگر ہر انسان جو انہی دونوں پہلوؤں سے دوسروں کی بھلائی نہیں کرتا وہ بھی نقصان میں ہے۔
یہ سورت مکی ہے۔ اور ابتدائی زمانہ کی سورتوں میں سے ہے اور پچھلی سورت سے تعلق یہ ہے کہ وہاں بتایا تھا کہ مال دنیا کی کثرت کوئی نفع کی چیز نہیں بلکہ انسان کو اصل مقصد زندگی سے غافل رکھنے والی شئے ہے اور یہاں وہ اصل مقصد زندگی بتایا۔

۳۶۴۸ عصر کے معنی دہر یعنی زمانہ ہیں اور رات کو اور دن کو بھی عصر کہا جاتا ہے اور صبح اور پچھلے پہر کی نمازوں کو حدیث میں عصرین کہا ہے اور یہاں بعض کے نزدیک مراد مطلق وقت ہے اور بعض کے نزدیک نماز عصر کا وقت اور بعض کے نزدیک کوئی ساعت (ل) اور دھر زمانہ کو بحیثیت مجموعی کہا جاتا ہے اور عصر اس کے مرور اور گزرنے کے لحاظ سے۔

وقت کی قیمت: جب پچھلی سورت میں انسان کی طلب کثرت مال دنیا کا ذکر کیا اور اسے ہی انسان اپنے نفع کی چیز سمجھتا ہے تو یہاں بتایا کہ فی الحقیقت ایسا انسان گھاٹے میں ہے اور وہ اپنے قوائے خداداد کو ضائع کر رہا ہے اور اس پر عصر یا گزرتے ہوئے وقت کی شہادت کو پیش کیا ہے۔ گویا ہر لمحہ جو گزر رہا ہے اگر وہ صحیح مصرف میں نہیں آیا تو وہ برباد ہوگیا اور انسان کے ہاتھ سے ایک قیمتی چیز یونہی چلی گئی۔ وقت کی قیمت کو لوگ بہت کم پہچانتے ہیں حالانکہ یہی چیز سب سے زیادہ قیمتی ہے اللہ تعالیٰ نے یہاں اسے شہادت میں پیش کر کے اس کی عظمت اور قیمت کی طرف توجہ دلائی ہے اور زمانہ کی شہادت بحیثیت مجموعی یہ بتاتی ہے کہ اس زندگی سے فائدہ اٹھانے والے وہی لوگ ہوئے ہیں جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں۔ مال دنیا کا

(بقیہ صفحہ سابقہ)

جمع کرلینا بالآخر انسان کو کچھ نفع نہیں پہنچاتا۔ اور عصر سے وہ وقت مراد لیکر جو غروب آفتاب سے پہلے ہے مطلب وہی ہے جو پہلے بیان ہوا اس لیے کہ وہ وقت اس بات پر گواہ ہوتا ہے کہ آفتاب غروب ہورہا ہے اور انسان کے لیے مہلت اور موقعہ بہت کم ہے وہ اپنے وقت کو ضائع نہ کرے اور یا مراد اس سے رسول اللہ صلعم کا زمانہ ہے کہ اس چھوٹے سے زمانہ میں تمام زمانوں کا خلاصہ آگیا۔ اور واقعات کے رنگ میں اللہ تعالیٰ نے اس بیس سال کے عرصہ میں وہ سب کچھ دکھا دیا جو تمام زمانوں میں دکھاتا رہا یعنی حق کی کامیابی اور ابطال حق کی تمام کوششوں کا ضائع جانا اور دنیا میں ایک نمونہ قیامت کا قائم ہوجانا کہ جس میں اچھے اور بُرے الگ الگ ہو گئے اور یقینی طور پر معلوم ہوگیا کہ نیکی اپنا اجر رکھتی ہے اور بدی دنیا میں قائم نہیں رہ سکتی۔

ہر مسلمان کے اولین چار فرض: یہاں جن لوگوں کو حالت نقصان سے مستثنےٰ کیا ہے ان میں چار صفات کا پایا جانا ضروری قرار دیا ہے۔ اول ایمان جس میں تمام عقاید صحیحہ آجاتے ہیں۔ دوسرے اعمال صالحہ جس سے مراد ہر قسم کی صلاحیت والے اعمال ہیں۔ تیسرے ایک دوسرے کو حق کا پہنچانا۔ جس میں یہ بتایا کہ انسان کا صرف خود حق پر قائم ہوجانا بھی کافی نہیں جب تک کہ وہ حق دوسروں کو نہ پہنچائے اور چوتھے صبر کی ایک دوسرے کو وصیت کرنا اور صبر یہ ہے کہ تمام مشکلات کا سامنا کرکے اللہ تعالیٰ کی طاعت پر انسان قائم ہوجائے۔ گویا ایک حق ہے اور ایک حق پر قائم ہونا ہے۔ حق ایمان کے مقابل پر ہے اور صبر اعمال صالحہ کے مقابل پر۔ انسان خود صحیح عقیدہ پر قائم ہو۔ دوسروں کو صحیح عقیدہ پر قائم کرنے کی کوشش کرے۔ خود اعمال صالحہ پر قائم ہو دوسروں کو اعمال صالحہ پر قائم کرنے کی کوشش کرے اور یہ ہر مسلمان کا فرض قرار دیکر بتا دیا کہ ہر مسلمان جب تک حق کو دوسروں تک نہیں پہنچاتا بلکہ اس حق پر دوسروں کو قائم کرنے کے لیے پورا زور نہیں لگاتا اس وقت تک وہ بھی نقصان میں ہے۔ اس چھوٹی سی سورت میں کس قدر جامع تعلیم ہے اور یہی شہادت ہے اس بات پر کہ قرآن کریم کی ہر سورت بجائے خود ایک مکمل کتاب ہے خواہ کتنی بھی چھوٹی سورت کیوں نہ ہو اور امام شافعی سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا اگر اور کوئی سورت نازل نہ ہوتی تو یہ سورت ہی لوگوں کے لیے کافی ہوتی۔

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ مَكِّيَّةٌ (۱۰۴)

اٰیاتُھا ۹ — رکوعُھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۣ ۝۱ — تباہی ہے ہر عیب لگانے والے طعن کرنے والے کے لیے

الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝۲ — جو مال کو جمع کرتا ہے اور اُسے شمار میں لاتا ہے۔

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝۳ — وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ رکھے گا۔ ۳۶۴۹

كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝۴ — ہرگز نہیں وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝۵ — اور تجھے کیا خبر ہے حطمہ کیا ہے؟

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝۶ — اللہ تعالیٰ کی جلائی ہوئی آگ،

الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝۷ — جو دلوں پر چڑھتی ہے۔

اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝۸ — وہ اُن پر لمبے لمبے،

تمہید سورت: اس سورت کا نام ھمزۃ ہے اور اس میں نو آیتیں ہیں پچھلی سورت کے مقابل پر ان لوگوں کی حالت دکھائی ہے جو مال دنیا سے محبت کرتے ہیں اور بجائے اپنی اصلاح کرنے کے دوسروں کی عیب شماری میں لگے رہتے ہیں۔ یہ سورت بھی مکی ہے اور ابتدائی مکی زمانہ کی ہے۔

۳۶۴۹ ھمزۃ اور لمزۃ پر دیکھو ۳۱۲۴ اور عَدَّدَ کے لیے دیکھو ۱۲۹۷ اور ۲۲۴ اور یہاں فراء نے معنی یہ لیے ہیں کہ مال کو عُدَّۃ بنانا ہے یعنی مصائب اور حوادث دہر سے بچنے کا سامان (دل) اور جو معنی ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں ان میں گننا اور عُدَّۃ بنانا دونوں مفہوم آجاتے ہیں اور اصل مطلب یہاں عُدَّۃ بنانا ہی معلوم ہوتا ہے یعنی جن مصائب عظمیٰ کی خبر دی جاتی ہے اور جس انقلاب عظیم کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے ایک مال سے محبت کرنے والا سمجھتا ہے کہ وہ مال اس کو ان مصائب سے بچادے گا۔ اور اخلدہ میں یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ مال اسے ہمیشہ کے لیے باقی رکھے گا اور یہ بھی کہ مال کے جمع کرلینے سے ہی وہ خلد کو بھی حاصل کرلے گا۔

فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ⑨ ع ۲۹ — ستونوں میں بند کر دی جائے گی ۳۶۵ؔ

آیاتها ۵ (۱۰۵) سُوْرَةُ الْفِيْلِ مَكِّيَّةٌ رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ① — کیا تو نے غور نہیں کیا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ ۳۶۵اؔ

اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِیْ تَضْلِيْلٍ ② — کیا ان کی تدبیر کو برباد نہیں کیا؟

وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ③ — اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرند بھیجے۔

تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ④ — جو ان پر سخت پتھر مارتے تھے۔

غ۳۶۵ حطمه جو حَطم سے ماخوذ ہے یعنی توڑنا۔ دوزخ کا نام ہے کیونکہ وہ چیز کو توڑ دے گی اور بعض کے نزدیک ابواب جہنم سے ایک باب ہے (دل)

دوزخ کی آگ انسان کے دل سے پہلے اٹھتی ہے: یہاں حطمہ اس آگ کو کہا ہے جو اللہ تعالیٰ کی جلائی ہوئی ہے اور دلوں پر اطلاع پا لیتی ہے اور دلوں پر اطلاع پا لینے سے مراد یہی ہے کہ اس کا اصل منبع دل ہے۔ کیونکہ دل سے ہی اعمال کا تعلق بلحاظ نیت وغیرہ ہے اور دل انسان کے لیے مرکز کے طور پر ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر وہ حالت اصلاح میں ہو تو سارا جسم حالت اصلاح میں ہوتا ہے اور اس میں فساد ہو تو سارے جسم میں فساد پیدا ہو جاتا ہے پس دل سے ہی یہ آگ پہلے بھڑکتی ہے اور پھر لمبے ستونوں میں چاروں طرف سے انسان کو گھیر لیتی ہے اور مال سے جو شخص محبت کو بڑھاتا ہے اس کا دل یہاں بھی اس آگ کا مشاہدہ کر لیتا ہے اور مطلب یہی بتانا ہے کہ مال دنیا کی محبت آخرکار انسان کو کہاں پہنچاتی ہے اور دوسروں کی عیب شماری بھی لازماً دل کے اندر ایک آگ بھڑکاتی ہے۔

تمہید سورت: اس سورت کا نام الفیل ہے اور اس میں پانچ آیتیں ہیں اور اس نام میں اشارہ اصحاب الفیل کے واقعہ کی طرف ہے جنہوں نے خانہ کعبہ کو تباہ کرنا چاہا مگر خود تباہ ہو گئے اور اس سورت میں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حق کو جو محمد رسول اللہ صلعم لائے ہیں دنیا کی تمام طاقتوں کے مقابلہ میں بچائیگا۔ اور صلیب اور توحید کی جنگ میں توحید ہی غالب آئے گی یہ سورت بھی بالاتفاق مکی ہے۔

ع۳۶۵ا واقعہ اصحاب فیل آنحضرت کے لیے بطور ارہاص تھا: فیل - ہاتھی - اصحاب فیل کا واقعہ ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے۔ ابرہہ جو یمن کا عیسائی وائسرائے شاہ حبش کی طرف سے تھا اس نے صنعاء میں ایک عظیم الشان گرجا بنوایا جس کی غرض یہ تھی کہ اہل عرب بجائے خانہ کعبہ میں جمع ہونے کے اس گرجا میں جمع ہوا کریں اور اس طرح انہیں آہستہ آہستہ عیسائی بنا لیا جائے۔ مگر چونکہ اہل عرب نے ابرہہ کے اس گرجا کی کوئی پروا نہ کی۔ تو آخر اس نے خانہ کعبہ کو گرا دینے کے لیے مکہ معظمہ پر چڑھائی کی اور یہ واقعہ بالاتفاق مورخین اسی سال کا ہے جس سال حضرت نبی کریم صلعم پیدا ہوئے اور بعض کے نزدیک آپ کی پیدائش کا دن وہی تھا جس دن ابرہہ کے لشکر پر تباہی آئی اس سال کا نام تاریخ عرب میں عام الفیل ہو گیا اور اس لشکر کا نام اصحاب الفیل اور یہ اس ہاتھی کی وجہ سے ہوا جو لشکر کے ساتھ تھا اور جس کا نام محمود تھا اور بعض کے نزدیک کئی ہاتھی تھے اور ابرہہ کا ہاتھی محمود نامی تھا۔ جب یہ لوگ مکہ کے قریب پہنچے تو عبد المطلب نے مکہ کو اہالیِ مکہ سے خالی کرا دیا اور سب لوگ قریب کی پہاڑیوں پر چلے گئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابرہہ نے عبد المطلب کے کچھ اونٹ پکڑ لیے تھے تو جب عبد المطلب نے ابرہہ سے واپس طلب کیے اور ابرہہ نے تعجب کیا کہ تم خانہ کعبہ کے متعلق کوئی درخواست نہیں کرتے جسے میں تباہ کرنا چاہتا ہوں تو عبد المطلب نے جواب دیا انی انا رب الابل وان للبیت ربا لیمنعہ' میں اونٹوں کا مالک ہوں اور خانہ کعبہ کا رب بھی ہے جو اس کی حفاظت کر لے گا اور جب مکہ کو خالی کیا تو اس وقت کعبہ کے دروازہ کی کنڈی کو پکڑ کر کہا لاھم ان المرء یمنع رحلہ فامنع رحالک۔ لا یغلبن صلیبھم ومحالھم ابدا محالک کوئی فکر کی بات نہیں انسان اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے سو تو اپنے گھر کی حفاظت کر ان کی صلیب اور ان کی طاقت تیری طاقت پر کبھی غالب نہیں آ سکتی۔ چنانچہ قبل اس کے ابرہہ خانہ کعبہ تک پہنچ سکے اس کے لشکر میں تباہی پھیل گئی اور وہ خود بھی بیمار ہو گیا اور سخت ناکامی کی حالت میں یمن واپس پہنچا جہاں جا کر وہ مر گیا۔

اس واقعہ کا آنحضرت صلعم کی پیدائش کے سال پیش آنا آپ کی نبوت کے لیے بطور ارہاص تھا اور اللہ تعالیٰ یہ دکھانا چاہتا تھا کہ خانہ کعبہ کو دنیا کی کوئی طاقت برباد نہیں کر سکتی بلکہ جو اسے برباد کرنے کی ٹھانے گا وہ خود برباد ہو جائے گا۔

ع فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ﴿٥﴾ سو انھیں کھائے ہوئے بھُس کی طرح کر دیا۔ ۳۶۵۲

(ایاتھا ۴) سُوْرَةُ قُرَيْشٍ مَكِّيَّةٌ (۱۰۶) (رکوعھا ۱)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ ﴿١﴾ قریش کی حفاظت کی وجہ سے۔

إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ﴿٢﴾ ان کے جاڑے اور گرمی کے سفروں میں حفاظت کی وجہ سے ۳۶۵۳

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ ﴿٣﴾ پس چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں۔

الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ ۵ وَّ جس نے انھیں بھوک میں کھانا دیا۔

۳۶۵۲ ابابیل۔ اِبّیل کی جمع ہے اور ابابیل کے معنی ہیں مُتَفَرِّقَۃ متفرق اونٹوں کی قطاروں کی طرح (غ) ابن سیدہ کا قول ہے کہ اِبّیل اور اِبّوْل اور اِبّالۃ پرندوں یا گھوڑوں یا اونٹوں کے ایک جھنڈ کو کہا جاتا ہے اور ابابیل کا استعمال کثرت کے معنی میں آیا ہے (ل)

اصحاب فیل کس طرح تباہ ہوئے: مفسرین کے اقوال اس لشکر کی تباہی کے بارے میں عموماً یہی ہیں کہ پرند اس لشکر پر آئے اور ہر ایک کی چونچ میں ایک سنگریزہ اور دو دو سنگریزے دونوں پنجوں میں تھے اور وہ سنگریزہ جس شخص پر گرتا تھا اسے ہلاک کر دیتا تھا۔ لیکن عکرمہ کا قول ہے کہ جس پر سنگریزہ گرتا تھا اسے چیچک نکل آتی تھی وعن عکرمہ ان من اصابہ الحجر جدرتہ وھو اول جدری ظھر (ر) ایسی ہی روایت ابن کثیر نے یعقوب سے بیان کی ہے اور چونکہ صحیح حدیث اس بارہ میں کوئی نہیں کہ اصحاب فیل کی تباہی کا اصل موجب کیا ہوا تھا اس لیے قرین قیاس ہے کہ چیچک کی وبا لشکر میں پھوٹ پڑی اور آخر ابرہہ خود بھی اسی مرض کا شکار ہوا جس کی وجہ سے لشکر بھاگ گیا اور یہ مسلّم ہے کہ ابرہہ تمام پھنسیوں سے بھرا ہوا یمن میں جا مرا۔ اور پرندوں کے بھیجنے میں اشارہ یہ ہے کہ جب لاشیں چھوڑ کر لشکر بھاگ گیا تو پرندوں نے انہیں نوچ نوچ کر پتھروں پر مارا اور کھائے ہوئے بھُس کی طرح کر دیا۔

تمہید سورت: اِس سورت کا نام قریش ہے اور اس میں چار آیتیں ہیں۔ اور اس نام میں یہ اشارہ ہے کہ قریش جن پر ہم نے اس قدر احسان کیا انہیں چاہیئے تھا کہ خدائے واحد کی جو اس گھر کا رب ہے عبادت کرتے کیونکہ خدا نے ہی ان کو تجارت کا سامان دے کر بھوک سے بچایا اور کعبہ کو حرم بنا کر دشمنوں کے خوف سے محفوظ کر دیا۔ یہ سورت ابتدائی مکی زمانہ کی ہے۔

۳۶۵۳ ایلاف۔ الف کے معنی ہزار ہیں۔ اِلْف اجتماع۔ اَلَفَ کے معنی ہیں ایک ہزار کامل کر دیا۔ اَلِفَ الشَّیْءَ کے معنی ہیں لزمہ یعنی اس سے پیوستہ ہوا۔ اور اَلَفَہٗ ایاہ اسے اس کے ساتھ لازم کر دیا اسی سے ایلاف مصدر ہے الفت فلانا الشیٔ اذا الزمتہ ایاہ اور یہاں معنی ہیں لتؤلف قریشُ الرحلتین فیتصلا ولا ینقطعا یعنی تاکہ قریش دو سفروں کو اکٹھا رکھیں پس وہ دونوں ملے رہیں اور الگ الگ نہ ہوں۔ گویا مطلب ہے دونوں سفروں کا جمع رکھنا ایک سے فارغ ہوں تو دوسرے میں لگ جائیں اور ایک قول ہے کہ ایلاف یُؤْلِفُوْن سے ہے جس کے معنی ہیں تیار کرتے ہیں اور سامان بناتے ہیں اور ابن عباس سے ہے کہ ایلاف سے مراد عہد ہے اور اول شخص جس نے باہر کے بادشاہوں سے عہد کیا ہاشم تھا اور یہ عہد قریش سے لیا گیا تھا۔ اور اَلَّفَ کے معنی ہیں دو چیزوں کو تفرقہ کے بعد جمع کیا (ل)، فَاَلَّفَ بَیْنَ قلوبکم (آل عمران ۳ ۔ ۱۰۳)

قریش۔ قَرْش کے معنی جمع کرنا ہیں اور قریش ایک دریائی جانور ہے جو سب جانوروں کو کھا جاتا ہے اور ہمارے رسول اللہ صلعم کے قبیلہ کا نام قریش ہے جن کا باپ نضر بن کنانہ ہے اور بعض کے نزدیک بوجہ ان کے خوف اور عظمت کے یہ نام دابۃ البحر سے مشتق ہے اور بعض کے نزدیک ان کے ارد گرد سے مکہ میں جمع ہو جانے کے لحاظ سے۔

رحلۃ۔ رَحْل اونٹ کا پالان ہے پھر کبھی اس سے اونٹ مراد لیا جاتا ہے اور کبھی وہ چیز جس پر گھر میں بیٹھا جاتا ہے اور جمع رِحال ہے اور رُحلۃ کے معنی اِرْتحال یا کوچ کرنا ہیں (غ)

شتاء سردی اور صَیف گرمی۔

قریش پر احسان: عام طور پر اس سورت کا تعلق پچھلی سورت سے مان کر یہ مطلب لیا گیا ہے کہ ہم نے اصحاب فیل کو تباہ کر دیا تاکہ قریش اپنی تجارتوں میں لگے رہیں اور انہیں نقصان نہ پہنچے۔ اور دو سفروں کا ذکر کیا اس لیے کہ گرمیوں کے موسم میں ملک شام کی طرف قافلہ جاتا تھا اور سردیوں میں ملک یمن کی طرف کیونکہ شام کا ملک ٹھنڈا تھا اور یمن گرم اور یہ تجارت قریش کی عزت اور شرف کا موجب تھی۔ اس لیے اگلی آیات میں فرمایا کہ قریش کو چاہیئے

ع ۴ ۲۱ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝۴ | اور خوف سے امن دیا ۳۶۵۴

کہ جب خدا نے ان کی اس قدر حفاظت کی اور انہیں اس قدر سامانوں سے متمتع فرمایا تو وہ بھی خدائے واحد کی پرستش کریں جس کی طرف محمد رسول اللہ صلعم انہیں بلا رہے ہیں۔ مگر بجائے اس کے یہ مخالفت کر رہے ہیں۔ اور ابن جریر کہتے ہیں کہ چونکہ ہر سورت بجائے خود کامل ہے اس لیے لایلاف میں ل تعجب کے لیے ہے۔ یعنی کیا قریش کے لیے ان تجارت کے سامانوں کو اکٹھا رکھنے پر تعجب کرتے ہیں لیکن دونوں سورتوں کا باہم اس قدر تعلق ماننے میں کسی ایک کا ناقص ہونا لازم نہیں ہوتا دونوں بجائے خود بلحاظ مضمون مکمل ہیں لیکن ان کا باہم تعلق شدید ہے اور یہ تعلق رکھ کر بتا دیا ہے کہ سورتوں میں باہم کس قدر ربط ہے۔

۳۶۵۴ بھوک میں کھانا بذریعہ تجارت کے ملتا تھا جو وہ با امن کرتے تھے اس لیے کہ بوجہ کعبہ کی خدمت کے کوئی انہیں چھیڑتا نہ تھا اور یوں بھی بوجہ حج کے مکہ عرب کی تجارت کا مرکز ہوگیا تھا اور امنہم من خوف میں بتایا کہ سارا عرب دن رات جنگ میں مصروف ہے مگر یہ حرم کے اندر ہر قسم کے خوف سے محفوظ ہیں کوئی انہیں چھیڑ نہیں سکتا اور جو خانہ کعبہ پر چڑھائی کرے خدائے تعالیٰ اسے ہلاک کر دے گا۔

اٰیاتها ۷ (۱۰۷) سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اللہ (تعالیٰ) بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝۱ | کیا تو نے اس شخص کی حالت پر غور کیا جو دین کو جھٹلاتا ہے۔

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝۲ | یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳ | اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا ۳۶۵۵

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝۴ | پس ان نمازیوں کے لیے تباہی ہے۔

الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝۵ | جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔

الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝۶ | جو دکھاوا کرتے ہیں۔

ع ۷ ۳۲ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝۷ | اور خیرات کو روکتے ہیں ۳۶۵۶

تمہید سورت: اس سورت کا نام الماعون ہے اور اس میں سات آیتیں ہیں۔ ماعون کے معنی زکوٰۃ اور خیرات ہیں اور یہاں بتایا ہے کہ وہ دین جس کی طرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاتے ہیں وہ اصل میں بیکسوں اور غریبوں کی ہمدردی ہے جب تک یہ دل میں پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک نماز بھی ایک دکھاوا ہے۔ اس سورت کو بھی بعض نے مدنی کہہ دیا ہے مگر جمہور کے قول میں مکی ہے اور یہی صحیح ہے۔

۳۶۵۵ دین کا سب سے بڑا رکن: دین کے معنی یہاں ابن عباس نے حکم اللہ کیے ہیں (ج) اور عموماً جزا اس کے معنی کیے گئے ہیں اور مجاہد نے اسلام مراد لیا ہے اور اصل یہ ہے کہ دین یہاں اپنے مشہور معنی میں ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ دین یا مذہب صرف چند باتوں کے منہ سے کہہ دینے کا نام نہیں پس جو شخص یتیم سے سختی سے پیش آتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا (خود کھلانا اس کے ضمن میں آگیا) وہ گویا دین کو جھٹلاتا ہے بالفاظ دیگر دین کا سب سے بڑا رکن یہی ہے کہ یتیم اور مسکین کی خبرگیری کرنے والا ہو۔ رسول اللہ صلعم سے بڑھ کر کوئی یتیموں مسکینوں کا ہمدرد دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ اغنیا کے مال کا حصہ یتامیٰ مساکین کو آپ نے دلایا ورثہ کا حصہ آپ نے دلایا ان کی حفاظت کے قانون آپ نے بتائے اور نبوت سے پہلے اور نبوت سے بعد جو ایک ولولہ آپ کے قلب مبارک میں موجزن نظر آتا ہے وہ بیکسوں کی خبرگیری ہے۔

۳۶۵۶ ماعون۔ معن تھوڑی سہل چیز کو کہا جاتا ہے اور حضرت علی سے ماعون کے معنی زکوٰۃ مروی ہیں اور ماعون زکوٰۃ کو اس لیے کہا گیا ہے کہ زکوٰۃ چالیسواں حصہ مال کا ہونے کی وجہ سے ایک قلیل شے ہے اور ماعون گھر کے اسباب کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی کہا جاتا ہے جیسے ڈول کلہاڑی ہانڈی پیالہ اور فراء کا قول ہے کہ عرب ماعون پانی کے لیے بھی کہہ دیتے ہیں (ل) اور بخاری میں ہے کہ ماعون کا اعلیٰ درجہ زکوٰۃ ہے اور ادنیٰ درجہ سامان کا عاریتاً دینا ہے۔

نماز کی حقیقت سے بے خبر رہ کر نماز پڑھنا دکھاوا ہے: فویل للمصلین۔ ظاہر ہے کہ مصلی نماز پڑھنے والا ہے اس پر ذیل کی وجہ خود بتا دی کہ وہ اپنی نماز سے غافل ہیں بعض نے اس کے معنی نماز میں تاخیر لی ہے یعنی وقت پر نماز نہیں پڑھتے اور بعض نے مطلق ترک صلوٰۃ مراد لیا ہے مگر ان دونوں باتوں کی

(بقیہ صفحہ سابقہ)

الفاظ قرآنی سے تائید نہیں ہوتی۔ دیکھو ع۳۱۶۰ جہاں سہو عن الشئ کی تشریح کی گئی ہے مراد یہ ہے کہ باوجود نماز پڑھنے کے نماز کی حقیقت سے بے خبر ہیں اسی لیے یراؤن بھی کہا ہے یعنی ان کی ظاہر حرکات کو لوگ دیکھتے ہیں مگر دل ان کے نماز سے غافل ہیں اور یہی معنی ابن زید سے مروی ہیں۔ یصلون ولیست الصلوٰۃ من شانہم (رج) اور اس کے ساتھ یمنعون الماعون بڑھا کر بتایا کہ جن لوگوں کے دلوں میں مخلوق خدا کی ہمدردی پیدا نہیں ہوتی ان کی نماز نے انہیں کچھ فائدہ نہیں دیا نماز انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکانے کے لیے اور اللہ تعالیٰ سے قلبی تعلق پیدا کرنے کے لیے ہے جس شخص کے دل میں مخلوق خدا کی خدمت کا جوش نہیں اس کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی نماز بھی اصل حقیقت سے دور ہے۔

آیاتہا ۳ (۱۰۸) سُوْرَۃُ الْکَوْثَرِ مَکِّیَّۃٌ رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝۱ — ہم نے تجھے کوثر دی ہے ع۳۶۵۷

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲ — سو تُو اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر ع۳۶۵۸

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳ ع — جو تیرا دشمن ہے اس کا نام لیوا کوئی نہ رہے گا ع۳۶۵۹

تمہید سورت: اس سورت کا نام الکوثر ہے اور اس میں تین آیتیں ہیں اور اس کے نام میں یہ اشارہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیر کثیر دی گئی ہے، یعنی ہر قسم کی بھلائیوں سے اتنا بڑا حصہ دیا گیا ہے جو پہلے انبیاء کو نہیں دیا گیا اور آپ سے دشمنی کرنے والے ہمیشہ ناکام رہا کریں گے۔ اس سورت کے نزول کے متعلق اختلاف ہے بعض اسے مکی کہتے ہیں اور بعض مدنی اور بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ اس کا نزول دو دفعہ ہوا ایک مکہ میں اور ایک مدینہ میں مگر صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔

ع۳۶۵۷ کوثر۔ دیکھو ع۳۳۰۰ اور کوثر ہر شے کی کثرت کو کہا جاتا ہے اور کوثر جنت کی وہ نہر ہے جس سے تمام نہریں نکلتی ہیں اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہے اور کوثر کے معنی خیر کثیر ہیں اور تفسیر میں ہے کہ کوثر قرآن اور نبوت ہے اور کہا گیا ہے کہ کوثر سے مراد یہاں خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آپ کی امت کو دیگا اور یہ سب کثرت کے معنی کی طرف راجع ہے اور جو کچھ تفسیر میں کوثر کے متعلق آیا ہے وہ سبھی کچھ نبی صلعم کو دیا گیا۔ یعنی آپ کو خیر کثیر دی گئی اور تمام دینوں پر دین اسلام کا غلبہ دیا گیا اور دشمنوں پر نصرت دی گئی اور اپنی امت کے لیے شفاعت دی گئی اور خیر سے وہ کچھ دیا گیا جو شمار میں نہیں آسکتا (ل) اور عکرمہ سے ہے کہ کوثر سے مراد خیر کثیر اور قرآن اور حکمت ہیں اور سعید بن جبیر سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے ہر قسم کی خیر سے کثرت عطا فرمائی پوچھنے والے نے کہا وہ جنت میں نہر ہے آپ نے کہا نہر بھی اور اس کے سوائے بھی (رج) ذیل کے اور اقوال ہیں۔ آپ کی اولاد، آپ کے پیرو، آپ کی امت کے علماء۔ آپ کا نور قلب۔ آپ کے فضائل کثیرہ۔ آپ کا ایثار۔ اور بخاری میں حضرت ابن عباس کے متعلق ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کوثر وہ خیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی اور سعید نے کہا کہ نہر بھی اس خیر کثیر میں سے ہے۔

ع۳۶۵۸ انحر۔ نَحْر۔ سینہ کا وہ حصہ ہے جہاں ہار ہوتا ہے اور نَحَرَہٗ اس کے سینہ پر مارا یا ذبح کر دیا اور یہاں مراد نحر الھدی یعنی قربانیوں کا ذبح کرنا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ سینہ پر ہاتھ رکھنے کا حکم ہے اور کہا گیا ہے کہ شہوت کے دور کرنے سے نفس کشی مراد ہے (غ) اور بعض نے اس کے معنی کئے ہیں کہ اپنے سینہ سے قبلہ کی طرف متوجہ ہو (م) اور نماز کے ساتھ انحر کے حکم میں وسعت ہی لینی چاہیئے اور مراد اس سے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دینا ہے۔

ع۳۶۵۹ ابتر۔ بَتْر کے اصل معنی قطع کرنا ہیں اور اس شخص کو ابتر کہا جاتا ہے جس کے پیچھے اس کی نسل نہ ہو اور اس شخص کو بھی ابتر کہا جاتا ہے جس کا ذکر خیر منقطع ہو جائے اور حدیث میں ہر اس امر کو ابتر کہا ہے جو اللہ کے ذکر سے شروع نہ کیا جائے۔ اور یہاں ابتر کے معنی مقطوع الذکر ہیں اس لیے کہ کفار سمجھتے تھے کہ آنحضرت صلعم کا ذکر آپ کی زندگی کے ساتھ منقطع ہو جائے گا اس لیے کہ آپ کی اولاد نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص آپ سے دشمنی کرتا ہے اسی کا ذکر منقطع ہوگا اور آپ کے متعلق ارشاد فرمایا ورفعنالك ذكرك کیونکہ آپ مومنوں کے باپ ہیں (غ)

اس چھوٹی سی سورت میں ایک عظیم الشان پیشگوئی ہمیشہ کے لیے رکھ دی کہ جو شخص آپ کے ساتھ دشمنی کر کے اس حق کو مٹانا چاہے گا جو آپ لائے ہیں اس کا ذکر خیر ہمیشہ کے لیے دنیا سے منقطع ہو جائے گا اور آپ کو خیر کثیر سے حصہ ملتا چلا جائے گا اور یہ پیشگوئی تمام زمانوں کے لیے ہے آج بھی جس شخص نے آپ سے بغض رکھا اس کا ذکر خیر اللہ تعالیٰ نے منقطع کر دیا۔

سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ مَكِّيَّةٌ (۱۰۹)
اٰيَاتُهَا ۶ — رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	اللہ تعہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝۱	کہہ دے اے کافرو!
لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲	میں اس کی عبادت نہیں کرونگا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔
وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝۳	اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔
وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴	اور نہ میں کبھی اس کی عبادت کرنے والا ہوا جس کی تم عبادت کرتے تھے۔
وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝۵	اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔
ع لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝۶	تمھارے لیے تمھارا بدلہ ہے اور میرے لیے میرا بدلہ ہے ۳۶۶۰

تمہید سورت: اس سورت کا نام الکافرون ہے اور اس میں چھ آیتیں ہیں اور اس نام میں یہ اشارہ ہے کہ رسول خدا صلعم اور آپ کے دین میں کفر کی کوئی تاریکی باقی نہیں رہ گئی ہے اور اس سورت میں توحید کا عملی رنگ پیش کیا ہے یعنی عملی طور پر رسول اللہ صلعم اور آپکے پیرو اُن چیزوں کی عبادت سے بیزار ہیں جن کی عبادت کفار کرتے ہیں خواہ وہ مال و دولت ہو اور خواہ شجر و حجر یا انسان وغیرہ۔ اس کے دوسرے ناموں مقشقشۃ وغیرہ میں اسی طرف اشارہ ہے اور یہ سورت اور سورۂ اخلاص ایک ہی ہیں یہ عملی رنگ میں توحید کو کامل کرتی ہے اور اخلاص علمی رنگ میں۔ اور یہ ابتدائی مکی زمانہ کی سورت ہے۔

ع ۳۶۶۰ عمل میں توحید اور شرک سے بیزاری: یہاں اپنے متعلق دو باتیں فرمائیں اول لا اعبد ما تعبدون اور دوسری لا انا عابد ما عبدتم۔ تو پہلے یعنی لا اعبد میں استقبال مراد ہے یعنی میں کبھی بھی تمہارے معبودان باطل کی عبادت نہیں کروں گا کیونکہ جیسا کہ زمخشری نے لکھا ہے لا جب مضارع پر داخل ہوتا ہے تو اس کو استقبال کے معنی میں کر دیتا ہے جس طرح ما مضارع پر داخل ہو کر اسے حال کے معنی کر دیتا ہے۔ اور دوسرے یعنی ولا انا عابد ما عبدتم میں عبدتم ماضی لا کر صاف بتا دیا کہ میں نے پہلے بھی کبھی اس کی عبادت نہیں کی جس کی تم عبادت کرتے رہے ہو۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ کی نفی پہلے اور استقبال کی پیچھے چاہیئے تھی لیکن چونکہ استقبال کے متعلق کفار اپنا پورا زور لگا رہے تھے اور آپ کو اور آپ کے صحابہ کو ہر قسم کی ایذا پہنچا رہے تھے اور قتل کے منصوبے کر رہے تھے تو اس کی وقعت کے لحاظ سے اسے مقدم کیا یعنی جتنا تم چاہو زور لگا لو میں کبھی اس چیز کی عبادت نہیں کرونگا جس کی تم عبادت کرتے ہو اور اس کے بعد فرمایا کہ میں نے پہلے بھی کبھی اس چیز کی عبادت نہیں کی جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اس لیے جب قبل از نبوت میں نے تمہارے ان بتوں کی عبادت نہیں کی تو اب کس طرح کر سکتا ہوں اور کفار کے متعلق دونوں دفعہ ایک ہی لفظ ہیں ولا انتم عابدون ما اعبد۔ یعنی تم خدا کی عبادت ہرگز نہیں کر رہے اور اس کا دو دفعہ لانا تاکید کے لیے ہے اور یہ ظاہر کرنے کو کہ تمہیں اپنی بات پر اصرار ہے۔ اور آخری آیت میں دین کے معنی جزا ہیں یعنی تم اپنی عبادت کا نتیجہ دیکھ لوگے میں اپنی عبادت کا نتیجہ پا لوں گا۔ اور یہاں معبود بنانے میں ہر وہ چیز شامل ہے جسکو دنیا میں محبوب یا مطلوب یا مقصود بنایا جاتا ہے۔

سُوْرَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ (۱۱۰)
اٰيَاتُهَا ۳ — رُكُوْعُهَا ۱

تمہید سورت: اس سورت کا نام النصر ہے۔ اور اس میں تین آیتیں ہیں۔ اور اس نام میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد آنحضرت صلعم کو مطابق ان وعدوں کے جو پیشتر سے کیے تھے ملی۔ پچھلی سورت میں چونکہ آخر پہ فرمایا تھا لکم دینکم ولی دین اس لیے یہاں اس سورت میں اس نتیجہ کا ذکر کیا جو محمد رسول اللہ صلعم کو ملا اور اگلی سورت میں اس نتیجہ کا ذکر ہے جو اعدائے دین کو ملا یہ سورت بلحاظ نزول مقام مکی ہے اور بلحاظ زمانہ مدنی یعنی ہجرت کے بعد نازل ہوئی اور اس کا نزول حجۃ الوداع میں ہوا اسی لحاظ سے اسے مکی سورتوں کے مجموعہ میں شامل کیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ ۙ﴿۱﴾ — جب اللہ (تعالیٰ) کی مدد اور فتح آگئی۔

وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾ — اور تو نے لوگوں کو اللہ (تعالیٰ) کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے دیکھ لیا۔

فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ اسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾ ع ۳/۲۵ — تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور اس کی حفاظت مانگ ـــــ وہ رجوع برحمت کرنے والا ہے ۳۶۶۱ء

۳۶۶۱ء اللہ تعالیٰ کی نصرت کا نظارہ: ترمذی اور بیہقی نے ابن عمر سے یہ روایت بیان کی ہے کہ یہ سورت رسول اللہ صلعم پر حجۃ الوداع میں ایام تشریق کے وسط میں نازل ہوئی اور بخاری میں ابن عباس کی روایت ہے قال اَجَلُ اَوْ مثلُ ضُرِبَ محمد صلعم نُعِیَتْ لہ نَفْسُہٗ یعنی اس میں آنحضرت صلعم کی وفات کی خبر دی گئی ہے یا یہ مثال ہے گویا آپ کو اپنی موت کی خبر دی گئی اور ایسی ہی ایک اور روایت ابن عباسؓ سے ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اس میں رسول اکرم صلعم کی وفات کی خبر دی گئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ وفات کی خبر وفات کے قریب ہی دی گئی اور روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نزول مکّہ میں ہوا اور مکّہ میں نزول حجۃ الوداع میں ہی ہوسکتا تھا۔ اس لیے جس نصر اور فتح کی یہاں خوش خبری دی گئی ہے وہ کوئی ظاہری فتح نہیں۔ گو فتح مکّہ پر یہ لفظ بالخصوص بولا گیا ہے بلکہ یہ وہی فتح مبین ہے جس کا ذکر سورۃ فتح میں ہے یعنی لوگوں کا اسلام کو قبول کرنا جیسا کہ خود ہی یہاں وضاحت بھی کر دی ہے اور نصر اللہ تعالیٰ کی مدد ہے اور فتح اس کا نتیجہ۔ پس یہاں آنحضرت صلعم کو حکم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کا کھلا نظارہ دیکھ لیا اور لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہوگئے یہاں تک کہ ملک عرب میں کوئی مشرک باقی نہ رہا تو اب اللہ کی تسبیح کر جس نے اپنے ان وعدوں کو پورا کیا۔ اور حضرت عائشہ کی روایت سے صحیح بخاری میں ہے کہ اس سورت کے نزول کے بعد آپ اپنی ہر نماز میں سبحانک اللّٰھم ربنا وبحمدک اللّٰھم اغفرلی پڑھا کرتے تھے۔

استغفار سے مراد یہاں ان لوگوں کے لیے بھی استغفار ہوسکتا ہے جو آپ کی مخالفت کے بعد آپ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور یہ فوج در فوج لوگوں کا اسلام میں داخل ہونا دسویں سال ہجرت کا واقعہ ہے۔

ایاتھا ۵ — سُوۡرَۃُ اللَّھَبِ مَکِّیَّۃٌ (۱۱۱) — رکوعھا ۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ ؕ﴿۱﴾ — ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہوئے اور وہ بھی ہلاک ہُوا ۳۶۶۲ء

تمہید سورت: اس سورت کا نام اللھب ہے اور تبت بھی کہہ لیتے ہیں اور اس میں پانچ آیتیں ہیں اس میں ان لوگوں کا انجام ہلاکت ہونا بنایا ہے جو عداوت حق میں غضب سے بھر جاتے ہیں۔ اسی کی طرف ابولہب کے ذکر میں اشارہ ہے اور یہ ابتدائی مکّی زمانہ کی سورت ہے۔

۳۶۶۲ء ابی لھب۔ عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب کی کنیت ابولہب ہے یہ آنحضرت صلعم کا چچا تھا اور مقاتل سے مروی ہے کہ یہ اس کی کنیت اس وجہ سے تھی کہ اس کے رخسارے سُرخ تھے اور یا یہ کنایہ جہنمی ہونے سے ہے گویا وہ خود لہب کا باپ ہے جیسے ابوالخیر نیک کو ابوالشر بد کو اخوالحرب جنگ کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ اور یوں شخص معلوم کا ذکر کرکے کنایتاً اسے عام کر دیا ہے (ر)

صفا کا واقعہ: بخاری میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلعم پر یہ آیت نازل ہوئی وانذر عشیرتک الاقربین (الشعراء ۲۶: ۲۱۴) تو رسول اللہ صلعم نکلے یہاں تک کہ صفا پر چڑھ گئے اور تب آپ نے (مختلف قبیلوں کو) پکارنا شروع کیا جب سب جمع ہوگئے تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ ایک رسالہ اس پہاڑ کے نیچے سے نکل کر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو تم میری بات کو سچ مانو گے۔ سب نے کہا ہم نے کبھی تجھ سے جھوٹ نہیں دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ تمہیں عذاب شدید سے ڈراتا ہوں۔ ابولہب نے کہا تبًّا لک ما جمعتنا الا لھذا تو ہلاک ہو تو نے ہمیں صرف اس لیے جمع کیا تھا: تب یہ سورت اُتری۔

اور اصل غرض صرف یہ بتانا ہے کہ جو شخص مخالفت میں ابولہب بنتا ہے اس کا انجام اچھا نہیں اور وہ ہلاک ہو کر رہے گا اور یدا میں اشارہ ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ جن سے وہ حق کی دشمنی کا کام کرتا تھا ہلاک ہو جائیں گے اور اس شخص کا یہ قاعدہ تھا کہ جب رسول اللہ صلعم حاجیوں

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝۲ | اس کا مال اور جو اس نے کمایا تھا اس کے کسی کام نہ آیا۔
سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝۳ | وہ جلد شعلوں والی آگ میں داخل ہوگا۔
وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝۴ | اور اس کی عورت چغل خور۔
فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵ | اس کے گلے میں کھجور کی چھال کا رسّہ ہے ۳۶۶۳

ہیں وعظ کے لیے نکلتے اور توحید کی تبلیغ کرتے تو یہ بھی پیچھے نکلتا اور کہتا کہ یہ کذاب ہے اور ساتھ ہی پتھر اُٹھا اُٹھا کر آپ کے پاؤں اور پنڈلیاں زخمی کر دیتا کہ تا آپ چلنے سے رک جائیں اور ابولہب کا ذکر خاص کرنے میں یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ باوجود اس قدر رشتہ داری کے تعلق کے بھی جب حق کی مخالفت اختیار کی تو تباہی سے نہ بچا۔ پس اور کوئی کس طرح بچ سکتا ہے اور ابولہب جنگ بدر کے سات دن بعد وبائی بیماری سے مر گیا اور اس کے گھر کے لوگ بھی اس کے پاس نہ گئے اور آخر حبشیوں سے اٹھوا کر اسے دفن کرا دیا گیا۔

۳۶۶۳ حطب ۔ حَطَب وہ چیز ہے جو جلانے کے لیے تیار کی جائے اور فلانٌ حَطَبَ بِفلان کے معنی ہیں اس کی چغلخوری کی۔ اور حمّالة الحطب میں چغلی سے کنایہ ہے (غ) اور بخاری میں مجاہد سے ہے کہ حمالۃ الحطب سے مراد چغل خور ہے۔

جید ۔ گردن یا وہ گردن جس میں ہار پہنا ہوا ہو اور عورت کی گردن پر زیادہ بولا جاتا ہے (ل) مَسَد ۔ کھجور کی چھال (غ)

ام جمیل اور اس کا انجام : ابولہب کی عورت ام جمیل تھی ۔ اور اس کے حمالۃ الحطب ہونے سے مراد اس کی چغل خوری ہے بعض نے ظاہری معنی مراد لیے ہیں یعنی وہ کانٹے وغیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رستے میں پھینک دیا کرتی تھی تاکہ آپ اندھیرے میں چلیں تو زخمی ہوں اور قتادہ سے ہے کہ بوجہ سخت بخیل ہونے کے وہ خود ایندھن باہر سے اُٹھا کر لایا کرتی تھی اور پہلی دونوں صورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا مراد ہے اور رسے کے گردن میں ہونے سے مراد یہاں دوزخ میں زنجیروں کا ہونا لیا گیا ہے ۔ اور چونکہ جید زیور والی گردن کو کہتے ہیں اس لیے اشارہ اس کے مال و دولت یا زیورات کی طرف ہے اور لکھا ہے کہ اس کا ہار جواہرات کا تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ میں اسے محمد صلعم کی عداوت پر خرچ کروں گی اور پیشگوئی کے رنگ میں بھی یہی اس کا انجام ہوا یعنی لکڑی کے گٹھے کا رسّہ اس کے گلے میں پڑ گیا اور وہ گلا گھٹ کر مر گئی۔ اور مطلب یہ ہے کہ مرد ہو یا عورت ، عداوت حق اسے تباہی کو پہنچا کر چھوڑے گی۔

سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ (۱۱۲)

اٰیاتھا ۴ — رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ | اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ | کہہ اللہ (تعالیٰ) ایک ہے۔
اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ | اللہ (تعالیٰ) بے نیاز ہے۔
لَمْ يَلِدْ ڏ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ | نہ اس کا کوئی بیٹا ہے۔ اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے۔
وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴ | اور اس کا کوئی ہمسر نہیں ۳۶۶۴

تمہید سورت : اس سورت کا نام الاخلاص ہے اور اس میں چار آیتیں ہیں اور اس نام میں یہ اشارہ ہے کہ اس میں توحید باری کو ہر قسم کے شرک سے خالص کر کے بیان کیا گیا ہے اور یہ توحید باری پر جامع تعلیم ہے اور ہر قسم کے شرک کی اس میں تردید کی ہے اور اسی لیے اس کا نام اساس بھی ہے کیونکہ توحید اصول دین کی بنیاد ہے اور یہ فی الحقیقت قرآن کریم کی آخری سورت ہے کیونکہ باقی دونوں سورتیں پناہ مانگنے کے لیے ہیں اور اس توحید کی جامع تعلیم پر قرآن کریم کو ختم کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ یہی اس کی تعلیم کا لب لباب ہے اور یہ ابتدائی مکی سورتوں میں سے ایک ہے۔

۳۶۶۴ صمد ۔ صَمَدَ اِلیہ کے معنی ہیں قَصَدَہٗ اس کا قصد کیا اور الصمد وہ ہے کہ حاجات کے وقت اس کا قصد کیا جائے یا وہ سید مطاع جس کے سوائے کسی امر کا فیصلہ نہ ہو یا وہ کہ اس نے سب کو پیدا کیا ہے اور کوئی چیز اس سے مستغنی نہیں (ل)

کفوا ۔ کُفْءٌ مرتبہ اور قدر میں کسی چیز کا ہم پلہ ۔ اسی سے مکافاۃ ہے جس کے معنی مساوات یا فعل میں مقابلہ ہیں (غ) اور کفءٌ کسی چیز کی نظیر یا اس کے

(بقیہ صفحہ سابقہ)
مساوی کو کہتے ہیں اور کُفْءٌ اور کُفُوءٌ کے ایک ہی معنی ہیں اور اسی سے نکاح میں مکافاۃ ہے یعنی زوج کا حسب و نسب وغیرہ میں عورت کا ہم پلہ ہونا (ل)۔

توحید کی جامع تعلیم اور شرک کی کامل تردید: اس چھوٹی سی سورت میں وحدانیت باری تعالیٰ کے سارے پہلوؤں کو شامل کیا ہے اور ہر قسم کے شرک کا ابطال کیا ہے۔ پہلی آیت میں اس کا احد ہونا بیان کیا ہے یعنی وہ اپنی ذات میں اکیلا ہے اور یوں ہر قسم کے شرک فی الذات اور تثلیث وغیرہ کی تردید کی ہے دوسری آیت میں اس کا صمد ہونا بیان کیا ہے یعنی وہ جس نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اور اس لیے سب چیزیں اس کی محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اس میں اس غلط خیال کی بھی تردید ہے کہ مادہ اور روح کو اللہ تعالیٰ نے پیدا نہیں کیا بلکہ وہ خود بخود ہیں اگر ایسا ہو تو پھر اللہ تعالیٰ صمد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ مادہ اور روح کا محتاج ہوا اور مادہ اور روح اس کے محتاج نہ ہوئے ایسا ہی بت پرست قوموں کے اس عقیدہ کی بھی تردید ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لیے بتوں کی ضرورت ہے مانعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفٰی (الزمر ۳۹-۳) تیسری آیت میں خدا کے باپ یا بیٹا ہونے کی تردید ہے اور یہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے۔ چوتھی میں اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر ہونے کی تردید ہے جیسے اوتار ماننے والوں کا عقیدہ ہے یا جیسے آتش پرستوں کا عقیدہ ہے کہ خالق خیر خدا کے مقابلہ پر ایک خالق شر ہے۔
پھر ایک اور پہلو سے ہر قسم کے شرک کی یہاں نفی کی ہے کیونکہ شرک یا ذات میں ہوگا جس کی تردید احد میں ہے یا صفات میں ہوگا جس کی تردید صمد میں ہے یا بلحاظ ولد یا والد ہونے کے ہوگا جس کی تردید لم یلد ولم یولد میں کی ہے اور یا افعال میں ہوگا یعنی اس جیسا فعل کوئی دوسرا بھی کر سکتا ہے۔ جس کی تردید لم یکن لہ کفوا احد میں کی ہے یوں تمام پہلوؤں سے اس آخری سورت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کو کمال کے رنگ میں بیان کیا ہے اور ہر قسم کے شرک کی جڑ کاٹی ہے۔

(۱۱۳) سُوْرَةُ الْفَلَقِ مَكِّيَّةٌ

آیاتھا ۵ — رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱	کہہ میں صبح کے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔
مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲	ہر چیز کے شر سے، جو اس نے پیدا کی۔
وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝۳	اور تاریک رات کے شر سے۔ جب تاریکی چھا جائے۔
وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝۴	اور عزیمتوں میں پھونکنے والی کی شر سے۔
وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝۵ ع ۳۸	اور حسد کرنے والے کی شر سے جب وہ حسد کرے ۳۶۶۵

تمہید سورت: اس سورت کا نام الفلق ہے اور اس میں پانچ آیتیں ہیں اور اس کے نام میں اشارہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ تاریکیوں کو پھاڑ کر روشنی نمودار کرتا اور بیج کو پھاڑ کر درخت بناتا ہے اسی طرح اس شخص کے لیے ظلمتوں میں سے روشنی نکالتا اور اس کے کام کو کامیاب کرتا ہے جو اس کی پناہ میں آتا ہے وہ آیت جس کی تعمیل میں یہ دونوں سورتیں بطور دعا سکھائی گئی ہیں یعنی فاذا قرات القران فاستعذ باللہ من الشیطان الرجیم (النحل ۱۶-۹۸) مکّی ہے اس لحاظ سے یہ سورتیں مکّی ہونی چاہئیں تھیں مگر مفسرین نے ان ہر دو سورتوں کو مدنی قرار دیا ہے اور روایات اسی بات کو صحیح ٹھہراتی ہیں ان دونوں سورتوں کا قرآن کریم کے خاتمہ پر رکھا جانا اسی آیت کریمہ کے منشاء کے مطابق ہے

۳۶۶۵ وقب۔ وَقَبَتِ الشَّمْسُ کے معنی ہیں سورج ڈوب گیا اور یہاں وَقَبَ سے مراد اس کا غائب ہونا ہے (رغ)
نفّٰثٰت۔ نفث۔ نفل سے کم ہے یعنی تَفْل میں کچھ تھوک بھی ساتھ ہوتا ہے اور نفث۔ نفخ کی طرح ہے۔ منتر پڑھنے والے کے متعلق کہا جاتا ہے نفث الراقی۔ اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ان رُوح القُدُس نفث فی رُوعی جس سے مراد ہے کہ روح القدس نے مجھے وحی کی یا میرے دل میں ڈالا اور افتتاح صلوۃ میں جو دعا میں آتا ہے۔ اللھم انی اعوذ بک من الشیطان الرجیم من ھَمْزِہٖ ونفثِہٖ ونفخِہٖ۔ تو نفث سے مراد یہاں شعر ہے اور شعر کو نفث اس لیے کہا گیا ہے کہ انسان اسے اپنے منہ سے پھونکتا ہے جس طرح منتر کو پڑھ کر پھونکتا ہے اور نفاثات سے مراد ساحر ہیں اور ھو ینفث عَلَیَّ غَضَبًا گویا وہ شدت غضب سے پھنکارتا ہے (ل)
عُقَد۔ عُقْدَۃ کی جمع ہے اور یہ اس کا نام ہے جو مضبوط باندھ لیا جائے نکاح ہو یا قسم یا اور کچھ۔ لا تعزموا عقدۃ النکاح (البقرہ ۲-۲۳۵)

(بقیہ صفحہ سابقہ)
اور عُقدَة روک کو بھی کہتے ہیں واحلل عقدة من لسانی اور ساحرہ جو گانٹھ دیتی ہے اسے بھی عقدة کہا جاتا ہے اور اس کی اصل عزیمت سے ہے اس لیے اسے عزیمت بھی کہا جاتا ہے (رغ) اور حدیث دعا میں ہے لك من قلوبنا عقدة الندم جس سے مراد ندامت پر عزم کا پختہ کر لینا ہے اور ایک اور حدیث میں ہے لا اُحلُّ عقدة جہاں عقدة کے معنی عزم ہیں اور ہر شے کا عُقدَة اس کا ابرام یعنی پختہ یا محکم کر لینا ہے (ل)

اس سورت میں چار چیزوں سے پناہ مانگنے کی دعا سکھائی ہے اول ہر چیز کی شر سے جو اللہ نے پیدا کی ہے کیونکہ ہر چیز انسان کے نقصان کا موجب بھی ہو سکتی ہے اور نفع کا بھی گو بذات خود اس میں کوئی برائی نہ ہو مثلاً آگ یا پانی انسان کے نفع کا موجب بھی ہیں اور ان سے نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ دوسرے اندھیرے سے پناہ مانگنے کو فرمایا کیونکہ تاریکی میں ہر قسم کے مصائب ہوتے ہیں اور یہاں بالخصوص ان تاریکیوں کی طرف اشارہ ہے جو کسی کام کی ابتدا میں انسان کے سامنے ہوتی ہیں ہر کام کی ابتدا میں اور اسی طرح تبلیغ حق کی ابتدا میں چاروں طرف تاریکی اور ظلمت کا سامنا تھا یہ گویا پہلا مرحلہ ہے اور تاریکی سے پناہ چاہی ہے گویا روشنی مانگنا ہے جب انسان کے سامنے رستے کھل جاتے ہیں اور انسان ایک کام کے لیے اپنا عزم پختہ کر لیتا ہے تو پھر ایک اور قسم کی مشکلات کا مقابلہ ہوتا ہے یعنی اس کام میں رکاوٹ ڈالنے والے پیدا ہو جاتے ہیں جن کو یہاں نفاثات فی العقد سے تعبیر کیا ہے اس کے اگر مشہور معنی بھی لیے جائیں تو اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جادو سچ مچ کوئی ایسی چیز ہے جس سے کام میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے بلکہ یہ دھوکہ باز لوگوں کی کارروائیوں کی طرف اشارہ ہے اور اصل یہ ہے کہ نفاثات سے مراد نفث کرنے والی جماعتیں ہیں فالنفاثات صفة للنفوس (ر) اور نفث کے معنی میں وسعت ہے دل میں خیالات ڈالنا یا غضب وغیرہ سے پھونکیں مارنا اس کے اندر شامل ہے اور عقدة کے معنی عزم یا استحکام امر ہیں گویا یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو انسان کے عزم کو اپنی پھونکوں سے برباد کرنا چاہتے ہیں یہ رکاوٹ دوسرے مرحلہ پر پیش آتی ہے اور جب انسان اس مرحلہ سے بھی گزر جاتا ہے۔ اور کامیابی ظاہر ہوتی ہے تو پھر حاسد پیدا ہوتے ہیں اس لیے تیسرے مرحلہ پر جو آخری مرحلہ ہے حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کا ارشاد فرمایا اور رب الفلق کی پناہ مانگنے کو اس لیے کہا کہ فلق صبح کو کہتے ہیں جب تاریکی پھٹ کر روشنی نمودار ہوتی ہے اور اسی لفظ سے فالق الحب والنوی بھی ہے جو دانہ اور گٹھلی کو پھاڑ کر ایک درخت بناتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی اس ربوبیت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس طرح وہ تاریکی کو پھاڑ کر روشنی عطا کرتا ہے اور گٹھلی کو پھاڑ کر درخت بناتا ہے، اسی طرح پناہ مانگنے والے کے کام سے ہر قسم کی رکاوٹوں کو دور کرے۔ ظلمت کو پاش پاش کر کے روشنی نکالے اور اس کے امر مخفی کو جو ایک بیج سے مشابہت رکھتا ہے ترقی دے کر ایک درخت بنائے اور سب سے بڑھکر اس دعا کی ضرورت تبلیغ حق میں ہے۔

اٰیَاتُهَا ۶ سُوْرَةُ النَّاسِ مَکِّیَّةٌ (۱۱۴) رُکُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ — اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱ — کہہ میں لوگوں کے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔

مَلِكِ النَّاسِ ۝۲ — لوگوں کے بادشاہ کی۔

اِلٰهِ النَّاسِ ۝۳ — لوگوں کے معبود کی۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۵ الْخَنَّاسِ ۝۴ — پیچھے ہٹ جانے والے کے وسوسہ کی شر سے۔

الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝۵ — جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔

ع مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ۝۶ — جنّوں اور انسانوں میں سے ۳۶۶۶

۳۹

تمہید سورت: اس سورت کا نام النّاس ہے اور اس میں چھ آیتیں ہیں اور اس کے نام میں یہ اشارہ ہے کہ سب لوگوں کا حقیقی تربیت کرنے والا حقیقی بادشاہ۔ اصل محبوب صرف ایک خدا ہے اور اسی رب بادشاہ محبوب کی پناہ میں رہنا چاہیئے۔ اس سورت پر قرآن شریف کا خاتمہ ہوتا ہے نزول اس کا اور اس سے پہلی سورت کا ایک ہی وقت میں ہوا اور یہ ایک دوسرے کے مضمون کی تکمیل کرتی ہیں۔

۳۶۶۶ع اس سورت میں پہلی سورت کے مضمون کی تکمیل ہے مگر یہاں صرف ایک چیز سے پناہ مانگنے کی دعا ہے یعنی خناس کے وسوسہ کی شرارت سے اس کو پچھلی سورت سے الگ کر کے بتایا ہے کہ شیطان کا وسوسہ سب سے زبردست چیز ہے جو انسان کو خیرات سے محروم کر دیتی ہے اور یہاں شیطان کو خناس کہا ہے یعنی پیچھے ہٹ جانے والا جس کے لیے دیکھو ع۳۵۵ اور شیطان جو وسوسہ اندازی کرتا ہے تو پیچھے ہٹ کر ہی کرتا ہے علی الاعلان

مقابلہ پر آ کر نہیں کرتا اور یہاں پناہ مانگنے کے لیے لفظ بھی زبردست رکھے ہیں ربّ ۔ مَلِكٌ ۔ اِلٰہ ۔ ربّ پرورش کرنے والا ۔ مَلِكٌ حکومت کرنے والا ۔ اِلٰہ مطلوب اور محبوب حقیقی ۔ اور شیطان کا وسوسہ تین رنگوں میں ہی ہوتا ہے ۔ کبھی ربوبیت کے رنگ میں کہ انسان خدا کے سوائے دوسرے کو اپنا پرورش کرنے والا سمجھ لیتا ہے ۔ کبھی حکومت کے رنگ میں کہ انسان اپنے اوپر دوسرے کی حکومت کو سمجھ کر اس قدر اس کے آگے جھک جاتا ہے کہ خدا کو بھول جاتا ہے اور کبھی محبوبیت کے رنگ میں کہ انسان دوسری چیزوں کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے مال کو عورت کو بیٹوں کو عزت کو شہرت کو ۔ پس یاد دلایا ہے کہ سب کا تربیت کرنے والا ایک ہے سب پر بادشاہ بھی ایک ہے ۔ سب کا محبوب حقیقی بھی ایک ہے ۔ پس ان تینوں راہوں سے وسوسہ شیطانی سے اپنا بچاؤ کرو ۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وسوسہ اندازی کا کام جنّ بھی کرتے ہیں اور انسان بھی ؛

آنحضرت ؐ کے مسحور ہونے کی غلط روایت : یہ دونوں سورتیں مُعَوِّذَتَین کے نام سے موسوم ہیں ۔ اس لیے کہ ان میں ہر قسم کی برائیوں سے پناہ مانگنے کا طریق بتایا ہے اور یہ ایک دوسرے کے مضمون کی تکمیل کرتی ہیں اور یہودی کے سحر کے قصّہ کے متعلق ان کا نازل ہونا صحیح نہیں اور گو یہ روایت بخاری اور مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلعم پر ایک یہودی کے سحر کا اثر ہو گیا تھا ۔ مگر یہ قرآن کریم کی نص صریح کے خلاف ہے اس لیے کہ مسحور آپ کو کفار کہتے تھے اور یہ بات کہ آپ خیال کرتے تھے کہ آپ نے ایک فعل کیا ہے اور وہ نہ کیا ہوتا کسی طرح قابل قبول نہیں ۔ اتنا بڑا واقعہ گروہ کثیر کے علم میں آتا اور اس کی روایت کرنے والے بھی بہت ہوتے حالانکہ یہ روایت صرف ایک ہی راوی کی ہے اور ایسے واقعہ کے متعلق جسے نہ قرآن شریف قبول کرتا ہے نہ عقل صحیح اس کو تسلیم کر سکتی ہے ایک آدمی کی روایت کچھ وقعت نہیں رکھتی ؛

دُعَاءُ خَتْمِ الْقُرْاٰن

اَللّٰھُمَّ اٰنِسْ وَحْشَتِیْ فِیْ قَبْرِیْ ۔

اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ وَاجْعَلْهُ لِیْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً ۔ اَللّٰھُمَّ ذَکِّرْنِیْ مِنْهُ مَا نَسِیْتُ وَعَلِّمْنِیْ مِنْهُ مَا جَھِلْتُ وَارْزُقْنِیْ تِلَاوَتَهٗ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَاٰنَآءَ النَّھَارِ وَاجْعَلْهُ لِیْ حُجَّۃً یَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

سنہ ۱۳۸۴ھ ★ سنہ ۱۹۶۴ء

اس فہرست میں حوالجات نمبروں کے ہیں۔

ضمیمہ (۱) لغات قرآن

ا - اداء

باب الالف

ا- الٓم- ۸- المص- ۱۰۴۶-
الر- ۱۳۶۹- المر- ۱۵۹۵-
اَبّ- ۳۵۴۶
ابد- ۴۰۳- ۱۵۰۶-
ابق- ۲۸۰۳-
ابل- ۱۰۲۷- ۳۵۹۰-
ابابیل- ۳۶۵۲-
الو- اَبُ- ۱۶۸- ۹۶۷- ۱۳۵۵-
اَبیٰ- ۵۳
اَتی- ۶۲۴- ۱۹۹۰- ۲۰۱۶-
اِتیاد ۳۰۲- و ۲۲۷۶- ماتیّ ۲۰۱۶-
اثّ- اثاث ۱۷۷۰
اثر- ایثار- ۱۵۸۳- اثارۃ ۱۵۸۳-
۳۰۵۴
اثل- اثلۃ- ۲۶۸۷-
اثم- ۱۰۸- ۳۸۱- ۷۲۹-
اثام ۱۰۸- ۲۳۹۶- اثیم- ۳۵۳-
اج- یاجوج- ماجوج- ۱۹۶۰
اجاج ۱۹۶۰- ۲۳۸۶-
اجر- ۶۳۷- ۲۵۱۱-
اِستئجار- ۲۵۱۱-
اَجل- ۳۰۰- ۵۲۹- ۱۳۷۸-
موجل- ۵۲۹- اَجُل ۸۱۷
اخذ- ۳۲۹- و ۴۷۲- ۱۲۵۵- ۱۳۴۵
اتخاذ- ۷۵- مؤاخذۃ- ۳۶۵
اخر- اٰخِر- اٰخَر- اٰخِرۃ- ۱۵
اخری ۳۷۵- ۱۰۷۹
اَخّر- ۱۶۶۱- مستاخر ۱۶۸۴-
الاٰخر- ۳۲۹۰-
اخو- اخ- ۲۸۳- ۱۰۷۹- ۱۸۲۴-
اخوان الشیاطین- ۱۸۲۴-
اخت ۶۳۴- ۱۰۷۹- ۱۹۹۵- ۳۰۰۵-
اِدّ- ۲۰۳۶
اٰدم- ۴۹
اِداء- ۳۰۳

اُذن - الذی

اُذُن- ۱۲۳- ۳۵۶- ۱۳۱۱-
اِذن- ۱۲۳- ۳۵۶- ۵۲۹- ۱۴۳۴-
اَذِن- ۳۵۶- ۲۱۹۵-
تاَذّن- ۱۱۷۱- اٰذَنَ- ۲۱۹۵-
اذی- ۲۸۵- ۴۹۹۔
ارب- مارِبۃ- ۲۰۵۳
اِربۃ ۲۰۵۳- ۲۳۲۴-
مآرب- ۲۳۲۴-
ارض- ۲۴- ۱۱۴۵-
ارك- اریکۃ- ۱۹۱۵
ارم- ۳۵۹۲
اَزّ- ۲۰۳۲
ازر- اٰزر- ۲۰۵۹-
ازف- اٰزفۃ- ۲۹۰۳
اُسّ- اُسّس- ۱۳۴۹
اسر- ۶۱- ۳۵۰۹- اَسیر ۱۰۸- ۱۲۵۴
اَسَف- ۱۱۵۷- اٰسف ۳۰۱۰
اسن- اٰسن- ۳۰۷۸
اَسیٰ- اٰسی- اُسوۃ- ۸۱۱- ۲۶۴۰
اشر- ۳۲۳۱
اصد- مؤصدۃ- ۳۶۰۶-
اصر- ۳۶۵- ۴۷۲- ۱۱۶۵-
اَصل- ۱۲۰۰- ۱۶۵۱- اصیل- ۱۲۰۰
افّ- ۱۸۲۱
افق- ۲۹۵۱- ۳۱۹۷
افك- ۹۸۶- ۱۱۳۶- ۲۳۰۸- ۲۱۵۹-
مؤتفکۃ- ۱۳۱۹- افاك ۹۸۶-
افل- افول- ۹۶۹-
اُکل- ۳۴۱- ۱۰۲۴- ۱۵۹۸-
اَکل- ۳۵۱
اَلّ- ۲- ۳۳۰- ۴۸۲- اِلّ- ۱۲۶۹
الٰ- ۷۲- ۳۱۷-
اِلّا- ۱۵۲- و ۲۴۵۶-
الت- ۳۱۷۶
التی- اللّٰتی- اللّائی- ۳۱۷۳- و-
الذی- الذان- الذین ۳۱۷۳ و

الف - اِنَّ - اَنَّ

الف- الُوف- ۳۱۲-
اَلّف ۲۲۳۷- ۳۶۵۳-
ایلاف ۳۶۵۳-
الك- ملائکۃ- ۴۵
الم- الیم- ۳۰۴۲ و
الٰہ- ۲۱-
اللّٰہ- ۱- اللّٰھم- ۳۹۷
الو- اَلَوْتُ- اَلِیْتُ- یَاتَل ۲۳۱۵
اِلٰی- ۲۸۹- ۶۰۱- ایلاء- ۲۸۹
اِلّ (الاء) ۱۱۱
اَمْر- ۲۲۸۳
اُمّ- ۱۰۲- ۱۶۳- ۳۷۵- ۶۳۴
ام القریٰ- ۹۸۲- امّی- ۱۰۲- ۱۱۶۵
ام الکتاب- ۳۷۵- ۲۹۸۱-
اَمّ- ۱۵۵- اُمّۃ- ۱۶۳- ۱۴۴۵-
۱۶۹۶- ۲۱۸۳- امام- ۱۵۵- ۱۷۰۷
۳۴۸۶- اَمّ- ۷۸۱
امت- ۲۱۰۲-
امد- ۴۰۳
امر- ۳۵۲- ۶۷۸- ۱۱۳۳- ۱۱۵۸-
۱۸۱۵- ۲۱۶۰- اَمّر- ۱۸۱۵-
ائتمار- ۱۱۳۳- ۳۳۷۱- اِمر-
۱۹۴۶- اولوا الامر- ۶۷۸-
امر اللّٰہ- ۱۷۱۶
امس- ۲۵۰۷
اَمَلَ- اَمل- ۱۹۲۶-
امن- ۳۰۹- ایمان- ۱۱- ۱۸۰-
اَمَانۃ- ۳۶۱- ۴۶۶- ۶۷۷-
اَمَنَۃ- ۵۴۵- امین ۱۱۰۶
المؤمن- ۱۱-
امو- اَمۃ- ۲۸۴
اَمّا- ۲۴۷۹- اِمّا- ۵۹-
اِن- ۲۰۹- ۵۲۳- ۸۰۲- ۲۲۶۳-
۳۰۲۲- ۳۱۲۱-
اَنْ- ۵۹۰- ۳۱۲۱-
اِنَّ- اَنَّ- اَنَّمَا- اِنَّمَا- ۳۱۲۲-

اِنّما - اٰیان

اِنَّمَا- ۲۱۰
انث- اُنثیٰ- ۴۳۴- ۲۹۷۸-
انس- اناس- ۸۸- اٰنس ۶۰۹-
انسان- انسی- اناسی- ۲۳۸۲-
انس- استیناس- ۲۳۱۹-
انف- اٰنف- ۳۰۷۹-
انم- انام- ۳۲۴۱
انّی- ۲۸۶
اِنیٰ- اَنیٰ- اٰنٍ- اِناء- اٰنیۃ- ۵۰۱-
اَوْ- ۹۹- ۳۰۵- ۱۶۶۷- ۲۱۰۷- ۳۱۰۴-
اَوب- مآب- ۳۸۵- ۲۸۳۰-
اوّاب- ۲۶۸۱- ۲۸۳۰-
ایاب- ۲۶۸۱
اَود- ۳۲۹ ج
اول- تاویل- ۳۷۶- ۱۰۹۳-
اوّل- ۴۸۴- ۱۳۴۱- اُولیٰ ۱۰۷۹-
الاوّل- ۳۲۹۰-
اوہ- اوّاہ- ۱۳۵۵-
اوی- ۱۲۲۷- ۱۹۴۰- اٰوی- ۱۲۲۷-
مَاْوی- ۵۳۷- ۱۲۲۷-
اھل- ۷۲- ۱۳۷- و ۵۰۸- ۶۳۹- ۱۱۱۷
۲۱۲۳-
اھل الکتٰب ۱۳۷ و ۴۹۸-
اھل البیت- ۲۶۵۲
اھل التقویٰ۔ اھل المغفرۃ ۳۴۸۳
اِی- ۱۴۰۷- ۳۱۶۱-
اَیّ- اٰیۃ- ۶۰- ۱۳۸- ۴۵۱- ۱۹۸۸-
۲۰۶۸- ایھا- ایّ- ایتھا- ۱۵۹۰-
۱۸۴۶- کاَیّن- ۵۳۱- ۱۵۹۰-
اِیّا- ۳۱۶۱
اید- ایّد- ۲۸۲۹
ایکۃ- ۱۷۰۶
ایم- ایّم- ۷۴۱- ۲۳۲۵
این- ۲۹۴۹-
ایّان- ۳۱۶۱-

اس فہرست میں حوالجات نوٹوں کے ہیں۔

ب ۔ برق

باب الباء

ب۔ بأ۔ ۱۔ ۵۴۴۔ ۲۰۱۶۔ ۲۲۶۰۔ ۲۸۸۱
بال۔ ۱۳۰
بئر۔ ۱۵۲۰۔ ۲۲۳۳۔
بئس۔ باس۔ بأساء۔ ۱۱۵۔ ۲۱۵۔
ابتأس ۱۴۶۲۔
بؤس۔ باش۔ ۲۳۱۸۔
بتّ۔ ۷۳۵
بتر۔ ابتر۔ ۳۶۵۹
بتك۔ ۷۳۵
بتل۔ تبتّل۔ تبتیل۔ ۳۴۶۲
بثّ۔ منبثّ۔ ۲۰۲
بجس۔ انبجاس۔ ۸۸۔
بحث۔ ۸۱۶۔
بحر۔ ۷۳۔ ۸۸۲۔ ۲۵۹۷۔
بحار۔ ۷۳۔ ۲۵۹۷۔ بحیرۃ ۷۳۔ ۸۸۲
بخس۔ ۳۶۰۔ ۱۱۲۰۔
بخع۔ باخع۔ ۱۸۹۵۔
بخل۔ ۵۷۶۔
بدا۔ بادی الرای۔ ۱۴۵۶۔
بدر۔ ۵۱۰۔ بدر۔ بدار۔ ۶۰۹
بدع۔ بدیع۔ ۱۴۹۔ بدع ۳۰۵۶
بدل۔
بدن۔ بدنۃ۔ ۲۲۲۶۔
بدو۔ باد۔ ۱۵۸۷
بذر۔ تبذیر۔ ۱۸۲۳
برّ۔ ۶۷۔ ۲۸۷۔ ۵۹۰۔ ۲۵۹۷۔
برّ۔ ۶۷۔ ۲۱۵۔ بارّ۔ بررۃ۔ ۵۹۰
برء۔ البارئ۔ ۷۷ براءۃ۔ بریٔ ۲۴۳
براء۔ تبرّأ۔ ۲۰۴۔ ۱۲۶۲۔
بریّۃ ۳۶۳۶
برج۔ ۶۹۶۔ ۱۶۷۹۔ ۱۳۷۲۔
تبرّج ۶۹۶۔ ۲۳۴۷۔ ۲۶۵۱۔
برح۔ ۱۵۷۳۔ ۱۹۳۷۔
برد۔ بَرد۔ ۲۳۳۷۔ ۳۵۲۴۔
برز۔ بارز۔ ۳۲۰۔ ۱۹۲۷
برزخ۔ ۲۲۹۷
برص۔ ابرص۔ ۴۳۳
برق۔ ۱۶۰۶۔ ۳۴۸۷۔

استبرق۔ بعید

استبرق۔ ۱۹۱۵۔ ۳۲۵۸
برك۔ مبارك۔ ۴۸۴۔ ۹۸۲۔
برکۃ۔ ۴۸۴۔ ۹۸۲۔ ۱۰۹۶۔ ۱۸۰۱۔
بارك۔ ۹۸۲۔ ۱۸۰۱۔ تبارك ۱۰۹۶
برم۔ ابرام۔ ۳۰۲۱
برہ۔ برہان۔ ۱۴۳۔
بزغ۔ بازغ
بسّ۔ ۳۲۷۰
بسر۔ باسرۃ ۳۴۷۵۰۔
بسط۔ ۳۱۴۔ ۷۹۷۔ ۱۱۰۷۔
بسطۃ۔ ۳۱۶۔ ۱۱۰۷
بساط۔ ۳۴۳۸۔
بسق۔ باسق۔ ۳۱۳۴
بسل۔ ۹۶۳۔
بسم۔ تبسّم۔ ۲۴۶۰۔
بشر۔ ۱۲۳۔ ۳۴۷۸۔
بشری۔ ۱۲۳۔ ۱۴۱۴۔
بشیر۔ ۱۵۱۔ ۱۴۱۴۔
تبشیر۔ ۳۹۲۔ مباشرۃ۔ ۲۳۶۔
استبشر ۵۶۶۔ مبشّر ۱۴۱۴۔
بصر۔ ۲۰۹۶۔ ۳۲۰۴۔
ابصر۔ ۱۸۱۱۔ ۲۰۹۶۔
بصیر۔ ۱۲۱۔ ۱۵۸۵۔
البصیر ۱۲۱۔ بصیرۃ۔ ۱۲۱۔
۹۹۵۔ مبصرۃ۔ ۱۸۱۱۔
استبصار۔ ۲۵۵۹۔
بضع۔ بضاعۃ۔ بضع۔ ۱۵۲۶۔
بطوء۔ بطّأ۔ ۶۸۸۔
بطر۔ ۱۲۳۸۔
بطش۔ بطشۃ۔ ۲۴۲۸۔
بطل۔ باطل۔ ۶۵۔ ۳۳۹۔ ۱۱۷۵
ابطال۔ ۳۳۹۔ ۱۱۷۵۔
مبطل۔ ۱۱۷۵۔ ۲۶۰۲۔
بطن۔ ۵۰۵۔ ۱۹۰۸۔ ۲۸۰۶۔
بطانۃ۔ ۵۰۵۔ ۳۲۵۸۔
بعث۔ ۷۹۔ ۳۱۵۔ ۸۱۶۔ ۱۹۰۰۔
بعثر۔ ۳۵۵۳۔
بعد۔ بعِد۔ ۱۴۷۷۔ بُعد ۲۸۴۱
بعید۔ ۳۱۳۰۔

بعض ۔ بہل

بعض۔ بعوضۃ۔ ۴۰۔
بعل۔ ۲۹۳۔ ۲۸۰۱۔
بغت۔ بغتۃ۔ ۹۳۱۔ ۹۴۶۔
بغض۔ بغضاء۔ ۵۰۵۔
بغل۔ بغال۔ ۱۷۲۱۔
بغی۔ ۱۱۵۔ ۲۱۱۔ ۳۷۶۔ ۳۹۰۔ ۴۷۳۔
۲۷۴۸۔ ابتغاء۔ ۲۵۵۔ ۳۷۶۔
انبغاء ۲۷۴۸۔ غیرباغ۔ ۳۱۱
بغاء۔ ۱۹۸۷۔ ۲۳۲۸ بغی۔ ۱۹۸۷۔
بقر۔ بقرۃ۔ ۹۶۔ ۱۰۲۷
بقع۔ بقعۃ۔ ۲۵۱۴۔
بقل۔ ۸۹
بقی۔ بقیّۃ۔ ۳۱۷۔ ۱۴۹۴۔
باقیات۔ ۳۱۷۔
بكّ۔ بكّۃ۔ ۴۸۴۔
بكر۔ بكرۃ۔ ۱۹۶ و۔ ۴۱۷۔
ابکار۔ ۴۱۷۔ بکم۔ ابکم۔ ۳۰ و
بکاء۔ بکی۔ بکیّ۔ ۳۰۳۴۔
بل۔ ۷۶۴۔ ۲۱۶۷۔
بلد۔ البلد۔ ۱۶۰۰
بلس۔ ابلاس۔ ابلیس۔ ۵۲ و
بلع۔ ۱۴۶۸
بلوغ۔ بلاغ۔ ۳۰۰۔ ۳۹۱۔ ۳۰۶۹۔
بلیغ۔ ۶۸۱۔ بالغۃ ۱۰۳۱۔
تبلیغ۔ ۳۹۱۔
بلی۔ بلاء۔ ۷۲۔ ۱۹۴۔ ۱۳۹۲۔
ابلاء۔ ابتلاء۔ ۱۵۵۔
بنّ۔ بنانۃ۔ بنان۔ ۱۲۱۲۔ ۳۴۸۵۔
بنو۔ ابن۔ ۶۱۔ ۲۱۵۔ بنت۔ ۶۳۴
بنی۔ بنیان۔ ۶۱۔ ۱۳۵۰۔ بناء ۳۴۔
بنّاء۔ ۲۸۴۳۔
باء۔ ۹۱۔ بوّأ۔ ۵۰۸۔ ۲۲۱۶۔
بواء۔ مبوّأ۔ ۱۴۲۹۔ تبوّا۔ ۹۱۔
باب۔ ۲۴۰۔ ۱۶۹۲۔
بار۔ بوار۔ بور۔ ۱۶۵۴۔ ۲۳۶۱۔
بال۔ ۱۵۵۰۔
بہت۔ بہتان۔ ۳۳۳۔
بہج بہیج۔ بہجۃ۔ ۲۲۰۲۔
بہل۔ ابتہال۔ ۴۵۳

بہم ۔ تم ۔

بہم۔ بہیمۃ۔ ۷۸۰
بیت۔ البیت۔ ۱۵۷۔ ۲۴۰۔
بات۔ ۲۴۰۔ ۷۰۱۔ بیّت۔ ۱۵۷۔
۷۰۱۔ بیات۔ ۷۰۱۔ ۱۰۴۸۔
باد۔ ۱۹۱۸۔
بیض ابیضّ۔ ۴۹۴۔ ۱۵۷۶۔
بیضاء۔ ۱۱۳۱۔
بیضۃ۔ ۲۷۸۵
بیع۔ ۲۹۔ ۳۵۲۔ بیعۃ۔ ۲۲۳۰۔
مبایعۃ۔ ۳۱۰۰۔
بین۔ ۱۹۳۲۔ بین یدیہ۔ ۳۱۱۷
بیان۔ ۵۲۲۔ ۳۲۳۸۔
تبیّن۔ ۳۱۲۱۔ مبین۔ ۳۲۳۸
المبین۔ ۲۳۱۷۔
ابان۔ استبان۔ مستبین۔ ۲۸۰۰۔
۳۱۲۱۔ بیّنۃ۔ ۱۱۱۔ ۹۵۳۔ ۱۴۵۱۔

باب التاء

ت۔ تا۔ ۱۵۶۸۔ ۱۷۵۰۔
تبّ۔ تباب۔ تتبیب۔ ۱۵۰۲۔
تبر۔ تتبیر۔ متبّر۔ تبار۔ ۱۱۴۷۔
تبع۔ ۵۹۔ ۴۳۷۔ ۱۱۷۶۔ ۱۶۴۹۔
اتبع۔ ۱۱۷۶۔ اتّبع۔ ۴۳۷۔
تبیع ۱۸۵۶۔ تابع۔ ۲۳۲۴۔
تبّع۔ ۳۰۳۷۔
تجر۔ تجارۃ۔ ۳۳۴۵۔
تحت۔ ۳۰۰۷
ترب۔ تراب۔ اتراب۔ متربۃ۔ تربیۃ
ترب۔ ۲۸۵۳۔
ترف۔ مترف۔ اتراف۔ ۱۵۱۲۔
ترك۔ ۳۴۹۸۔
تعس۔ ۳۰۷۴
تفث۔ ۲۲۱۹۔
تقن۔ اتقان۔ ۲۴۹۴۔
تلّ۔ ۲۷۹۸۔
تلك۔ ۳۲۴
تلی۔ ۶۷۔ ۱۲۷۔ ۱۴۵۱۔ ۳۶۰۷۔
تلاوۃ۔ ۶۷۔ ۱۵۳۔ تالی۔ ۲۷۷۰۔
تمّ۔ اتمّ۔ ۱۵۵۔ تمام ۷۸۷۔ ۱۱۴۵

تنر - ثبة

تنر۔ تنور۔ ۱۳۶۵۔
توب۔ تاب۔ ۵۷۔ ۱۳۵۷
تواب۔ ۵۷۔ توبة۔ ۵۷۔ ۱۲۲۶
متاب۔ ۱۶۲۲۔ تابوت۔ ۳۱۷
تور۔ تارة۔ ۲۰۷۴
تین۔ ۳۶۲۱
تاہ۔ ۸۱۱

باب الثاء

ثبت۔ تثبیت۔ اثبات۔ ثبات
۳۲۰۔ ۱۲۲۹ب
ثابت۔ ۱۲۲۹ب
ثبر۔ ثبور۔ مثبور۔ ۱۸۸۵۔
ثبط۔ تثبیط۔ ۱۲۹۷
ثج۔ ثجاج۔ ۳۵۲۲
ثخن۔ اثخن۔ ۱۲۵۴
ثرب۔ تثریب۔ یثرب۔ ۱۵۸۴۔
ثری۔ ۲۰۴۵۔
ثعب۔ ثعبان۔ ۲۲۱۱ ل
ثقب۔ ثاقب۔ ۲۷۷۵۔
ثقف۔ ۲۴۲
ثقل۔ ۱۱۸۶۔ ۱۲۹۱۔ اثقل۔ مثقلة
۲۶۱۷۔ اثاقل۔ ۱۲۹۱۔
ثقلان۔ ۳۲۵۰۔ ثقیل۔ ۱۲۹۱
۳۴۶۰۔ ثقال۔ ۱۲۹۴۔ ۱۶۰۶۔
مثقال۔ ۶۶۰
ثل۔ ثلة۔ ۳۲۷۴
ثلث۔ ۶۰۳
ثمر۔ ۴۴۔ ۱۲۷۔ ۱۰۳۶۔ ۲۰۲۳۔ ۲۲۴
ثمر۔ اثمر۔ ۱۹۱۷۔ ثمرات۔ ۳۴۲
ثمن
ثنی۔ ۱۴۴۲۔ ۲۲۰۴۔ ثنی۔ مثانی۔ ۱۸۱۰
استثناء۔ ۳۴۰۳۔
مثنی۔ ۶۰۳
ثوب۔ ثاب۔ ۱۵۷۔ ۵۳۰۔
ثاب۔ ۵۴۴۔ مثابة۔ ۱۵۷۔
مثوبة۔ ۱۳۶۔ ۱۵۷۔
ثواب۔ ۱۳۶۔ ۱۵۷۔ ۵۳۰۔ ۵۴۴۔
ثبة۔ ۶۸۷

ثور - جارية

ثور۔ ثار۔ اثارة۔ ۹۷۔
ثوی۔ مثوی۔ ۵۳۷۔ ۳۰۸۲
ثیب۔ ثیب۔ ۳۳۷۹۔

باب الجيم

جأر۔ ۱۷۴۹
جب۔ ۱۵۲۰
جبت۔ ۶۷۱
جبر۔ جبار۔ الجبار۔ ۸۰۷۔
جبل۔ ۱۶۲۳۔ ۲۳۳۷۔ ۳۳۲۹۔
جبل۔ جبلة۔ ۲۴۳۸۔
جبن۔ جبین۔ ۲۷۹۸۔
جبة۔ جبهة۔ ۱۲۸۸
جبی۔ جابیة۔ ۵۷۵۔ ۱۱۹۸
اجتباء ۵۷۵۔ ۱۱۹۸۔
جث۔ اجتثاث۔ ۱۶۵۲
جثم۔ ۱۱۱۳
جثی۔ جاثیة۔ جثی۔ ۲۰۲۱
جحد۔ جحود۔ ۹۳۳
جحم۔ جحیم۔ ۱۵۱۔
جد۔ جدید۔ جدة۔ ۲۷۲۱
جدث۔ ۲۷۵۳۔
جدر۔ جدار۔ ۱۳۳۸۔ ۱۹۵۰
جدل۔ جدال۔ ۱۲۹۱
جذ۔ مجذوذ۔ ۱۵۰۶۔
جذاذ۔ ۲۱۶۶
جذع۔ ۱۹۹۰
جذو۔ جذوة۔ ۲۵۱۳۔
جرح۔ جارحة۔ ۶۸۹۔
جرح۔ اجتراح۔ جوارح۔ ۹۵۵
جرد۔ جراد۔ ۱۱۴۳۔
جوز۔ جرز۔ ۱۸۹۶
جرع۔ تجرع۔ ۱۶۳۶
جرف۔ ۱۳۵۰
جرم۔ ۳۸۱۔ ۷۸۲۔ ۱۳۶۱
اجرام۔ مجرم۔ ۷۸۲۔ ۱۳۶۱
لاجرم۔ ۱۳۳۰۔
جری۔ مجری۔ ۱۳۶۶۔
جارية۔ ۱۳۶۶۔ ۲۹۷۱

جزء - جو

جزء۔ ۳۳۵۔ ۲۹۸۵۔
جزع۔ ۱۶۴۹۔ ۲۱۹۱
جزی ۷۱۔ جزية۔ ۱۲۸۱
جس۔ تجسس۔ ۳۱۲۵۔
جسد۔ ۲۸۴۰
جسم۔ ۲۸۴۰۔
جعل
جفا۔ ۱۶۱۱۔
جفن۔ جفنة۔ ۲۶۸۴
جفا۔ تجافی۔ ۲۶۲۱
جل۔ جلال۔ ۳۲۴۸
جلب۔ اجلب۔ ۱۸۵۲۔
جلباب۔ ۲۶۷۲
جلد۔ ۶۷۵۔ ۲۳۰۳۔ ۲۹۳۵۔
جلدة۔ ۲۳۰۳
جلس۔ مجلس۔ ۳۳۱۱
جلو۔ جلاء۔ جلوة۔ ۱۱۵۱
تجلی۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۸۶۔
جثم۔ ۳۵۹۷
جمح۔ ۱۳۰۷۔
جمد۔ جامدة۔ ۲۴۹۴۔
جمع۔ ۱۴۱۹۔ ۲۰۷۸۔ اجمع۔ ۱۴۱۹۔
۲۰۷۸۔ جامع۔ ۱۴۱۹۔ ۲۳۴۹۔
مجموع۔ ۲۳۴۹۔ جمیع۔ ۲۴۱۴
جمل۔ جمال۔ جملة۔ جمالة۔ ۱۰۸۰۔
۱۷۰۹۔ جمیل۔ ۳۴۲۶۔
جن۔ ۳۹۔ ۹۹۱۔ ۱۰۱۵۔
جن۔ ۹۹۱۔ ۱۰۱۵۔ ۱۶۸۶۔
جنة۔ ۳۹۔ ۱۱۸۵۔ جنة۔
جنین۔ ۳۲۱۰۔ جان۔ ۱۶۸۶
جنب۔ ۵۸۸۔ ۱۲۸۸۔ ۲۸۸۵۔
جنب۔ ۶۵۵۔ ۶۶۳۔
اجتناب۔ ۶۴۶۔ جانب۔ ۲۹۵۰۔
جنح۔ ۱۹۸۔ ۲۵۱۵۔ جناح۔ ۱۹۸
۱۸۲۲۔ ۳۷۰۹۔ جناح۔ ۱۹۸۰۔
جند۔ ۳۱۸۔
جنف۔ ۱۷۰۰۔ ۲۲۱
جنی۔ جنی۔ ۱۹۹۲
جو۔ ۱۷۶۹۔

جوب - حجة

جوب۔ اجابة۔ ۲۳۱۔ ۸۸۷۔
استجابة۔ ۲۳۱۔ ۲۹۶۷۔
جواب۔ ۲۳۱۔
جود۔ جواد۔ ۲۸۳۷
جودی۔ ۱۳۶۸
جار۔ ۶۵۵۔ ۱۲۳۹۔
جاور۔ ۱۵۹۸۔ تجاور۔ متجاور
۱۵۹۸۔ استجار۔ ۱۲۶۷
جائر۔ ۱۷۲۲۔
جاز۔ تجاوز۔ ۳۰۶۱
جوس۔ ۱۸۰۵۔
جوع۔ ۲۱۱۱۔
جوف۔ ۲۶۲۸
جال۔ جالوت۔ ۳۱۹۔
جهد۔ ۲۸۰۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۷۔
جهد۔ مجاهدة۔ ۲۸۰۰۔
جهاد۔ ۲۸۰۔ ۱۳۲۱۔
جهر۔ جهرة۔ ۶۵۷۔ ۹۴۶۔
جهز۔ جهاز۔ ۱۵۵۷۔
جهل۔ جاهل۔ ۹۶۔ جهالة۔ ۶۲۶
جاهلية۔ ۲۶۵۱
جهنم۔ ۳۵۹۹۔
جاء۔ ۱۹۹۰۔ ۲۰۳۶۔ اجاء۔ ۱۹۹۰۔
جیب۔ ۳۳۲۳۔
جید۔ ۳۶۶۳۔

باب الحاء

حب۔ حب۔ ۲۰۳۔ ۹۸۶۔ ۱۶۳۶
حبة۔ ۲۰۳۔ استحباب۔ ۱۶۳۶۔
حبب۔ محبة۔ ۳۱۲۲۔ ۳۲۱۰
حبر۔ احبار۔ ۸۲۷
حبط۔ ۲۷۹۔ ۳۹۳۔
حبك۔ حبیكة۔ ۳۱۵۸۔
حبل۔ ۴۹۰۔ ۵۰۰۔ ۳۱۳۷۔
حتم۔ ۳۰۲۳۔
حتی۔ ۳۱۲۰ ل
حث۔ حثیث۔ ۱۰۹۶
حج۔ ۱۰۱۔ ۱۹۸۔ ۴۸۵۔
محجة۔ ۱۰۱۔ ۷۷۰۔ ۲۹۶۰

حجة - حق۔	تحسس - حمت۔	حفد - حمل۔	حمل
رجة (ججر) - ۲۵۱۲ -	تحسّس - ۱۵۷۹ -	حفد - حفدة - ۱۷۶۳ -	حمل - احتمل - ۱۶۰۲ -
محاجة - ۱۰۱	حسب - ۵۶۹ - ۶۱۱ - حبيب - ۲۶۱	حفر - حفرة - حافرة - ۳۵۳۴	تحميل - ۲۳۴۲ - حمولة - ۱۰۲۵
حجب - حجاب - ۱۸۳۸	۶۱۱ - حساب - ۲۶۱ - ۳۵۲۸	حفظ - ۷۰۰ - محافظة - ۳۰۷ -	حمی - حام - ۸۸۲ - ۱۲۸۸ -
حجر - حجر - ۶۳۴ - ۱۰۲۲ - ۲۳۶۴	حسبان - ۱۹۲۱ -	حفظة - حافظ - ۹۵۶ - ۳۱۵۰	حميّة - ۱۲۸۸ - ۳۱۱۲
حجارة - ۳۸ - محجرة - ۳۱۴۰	حسد - ۱۴۱	حفيظ - ۲۱۵ - ۳۱۴۸ -	حنّ - حنين - ۱۲۷۷ -
الحجر - ۱۷۰۸ - محجور - ۲۳۶۴	حسر - استحسار - ۲۱۴۱	محفوظ - ۲۱۵۰ - استحفظ - ۸۲۷	حنان - ۱۹۸۱ -
حجز - حاجز - ۳۴۲۲ -	حسرة - حسير - محسور - ۲۰۵	حفی - احفاء - ۱۱۸۶ - ۲۰۰۶ -	حنث - ۲۸۴۹ -
حدّ - ۲۳۷ - ۱۳۱۳ - حادّ - محادّة	حسم - حسوم - ۳۴۱۱ -	حفّ - ۲۰۰۶ -	حنجر - حنجرة - ۲۶۳۴ -
۲۳۷ - ۱۳۱۳ - حديد - ۲۳۷ -	حسن - ۱۰۶ - ۵۰۷ - حسن - ۱۳۹۰ -	حق - ۶۵ - ۳۶۹ - الحق - ۶۵ - ۱۵۱	حند - حنيد - ۱۴۸۰ -
۲۶۳۹ - حدب - ۲۱۸۶ -	احسان - ۱۰۶ - ۱۷۷۷ -	۸۶۸ - ۲۱۰۸ - احقاق - ۱۲۰۷ -	حنف - حنيف - ۱۷۰ -
حدث - احداث ۲۱۰۷	حسنة - ۱۰۵ - ۵۰۷ - ۵۹۳ -	استحق - ۸۸۵ - حقيق - ۱۱۳۰ -	حنك - احتناك - ۱۸۵۰ -
محدث - ۲۱۲۷ -	۶۹۷ - حسنی - ۱۳۹۰	حاقة - ۳۴۰۹ -	حوب - ۶۰۱ -
حديث ۱۵۱۶ د - ۲۲۶۹ -	حسان - ۳۲۶۵ -	حقب - ۱۹۳۷ -	حوت - ۱۱۶۹ - ۲۸۰۵ -
حدق - حديقة - ۲۳۸۰	حشر - ۳۸۲ - ۹۳۹ - ۳۳۱۷ -	حقف - احقاف - ۳۰۶۳	حوج - حاجة - ۲۹۲۴ -
حذر - تحذير - ۳۰۱ - حذر ۶۸۷ -	حاشر - محشورة - ۳۸۲	حكم - ۵۰ ل - ۳۷۵ - ۶۵۴ -	حوذ - استحوذ - ۷۵۰
حُرّ - تحرير - محرّر - ۳۰۸ - ۸۷۰	حصّ - حصحص - ۱۵۵۱ -	حُكم - ۲۷۲ - ۱۵۲۹ - ۱۹۸۰	حور - تحاور - حواری - ۴۴۱
حرّ - حرور - ۲۷۱۸ -	حصب - حاصب - ۱۸۵۵	حاكم - ۶۵۴ - احكم - محكم -	حور - ۳۰۴۰ -
حرب - محراب - ۴۱۲ - ۲۶۸۴ -	حصب - ۲۱۸۸ -	۳۷۵ - ۱۴۴۰ - حكيم - ۵۰ ل - ۱۶۴	حاش - ۱۵۳۴ -
محاربة - ۸۱۸ -	حصد - حصاد - ۱۳۸۸ -	حكمة - ۵۰ ل - ۱۶۴ - ۳۲۱ - ۲۶۵۳ -	حوط - احاطة - ۳۲۹ ل - ۱۳۸۷ -
حرث - ۲۶۲ - ۲۹۶۴ -	حصيد - ۱۳۸۸ - ۲۱۳۷ -	الحكيم - ۴۵۱ - ۱۳۷۰ -	۱۳۹۹ - ۱۵۶۴ - ۱۸۴۹ -
حرج - ۶۸۴ - ۱۰۱۴ -	حصر - ۴۱۵ - ۷۱۲ - ۱۲۶۶ - ۱۸۰۸ -	حلّ - ۲۰۶ - ۷۸۰ - ۳۶۰۱ -	حول - حال - حيلة - ۷۲۰ - ۱۲۲۵ -
حرد - ۳۳۰۳ و	احصار - ۲۵۰ - ۱۲۶۶ -	احلّ - ۲۰۶ - ۷۸۰ - حلال - ۲۰۶	۱۸۰۱ - تحويل - حول - ۱۸۴۵ -
حرس - ۳۴۴۵ -	حصور - ۴۱۵ - حصير - ۱۸۰۸ -	۷۸۰ - محلّ - ۲۵۰ - ۲۲۲۳ -	حوی - حوية - ۱۰۲۹ -
حرص - حريص - ۱۲۱	حصل - تحصيل - ۳۶۴۲ -	حليلة - ۶۳۴ - تحلّة - ۳۳۷۶ -	احوی - ۳۵۸۳ -
حرض - تحريض - ۷۰۵ - ۱۲۵۱ -	حصن - محصنة - تحصّن - ۲۳۵ -	حلف - ۶۸۰ - ۸۷۰ - ۳۴۰۱	حیّ - ۳۶۹ - ۲۷۶۱ - احياء - ۷۹ -
حرف - تحريف - ۱۰۰ - ۷۹۹ -	حصان - ۴۲۷ -	حلاف - ۳۴۰۱ -	استحياء - ۴۰ - الحیّ - ۳۲۹ -
۲۳۰۵ - تحرّف - ۱۲۱۶ -	حصی - احصاء - ۱۶۵۶ - ۱۹۰۰ -	حلق - محلّق - حلقوم - ۳۱۱۳ -	حيوة - ۴۳۴ - ۱۰۵۱ -
حرق - تحريق - احتراق - ۲۰۹۸ -	حضّ - ۳۴۲۰ - ۳۵۹۶ -	حلم - حليم - ۲۸۸ - حلم - ۱۵۴۵ -	حيّة - ۲۰۵۴ - تحيّة - ۷۰۷ -
۲۱۷۰ - حريق - ۵۷۷ -	حضر - محضر - ۲۲۹۵ - ۲۵۳۰	حلی - حلية - حلّی - ۱۱۵۵ - ۱۶۱۱ -	حيوان - ۲۵۷۳ - يحيٰى - ۱۴۱۴
حرك - حركة - ۳۴۹۰	حاضرة - ۳۶۰ -	۱۷۲۴ -	حاد - ۳۱۴۰ -
حرم - حرام - ۱۸۱ - ۷۸۰ -	محتضر - ۳۲۳۲	حمّ - ۲۸۹۴	حير - حيران - ۹۶۴ -
۲۱۸۵ - ۳۳۷۵ - محروم	حطّ - حطّة - ۸۵ -	حمّ - حميم - ۹۶۳ -	حوز - متحيّز - ۱۲۱۶
۱۸۱ - ۳۱۶۳ - حرمة - ۲۲۲۰	حطب - ۳۶۶۳ -	يحموم - ۳۲۸۱	حيص - محيص - ۱۶۴۹ -
تحريم - ۳۳۷۵	حطم - حطام - حطمة - ۲۸۷۲ -	حمأ - ۱۶۸۵ - حمئة - ۱۶۸۵ -	حيض - محيض - ۲۸۵
حری - تحرّی - ۳۴۴۹	۳۶۵۰ -	۱۹۵۵ -	حيف - ۲۳۴۰
حزب - ۸۴۳ - ۱۴۵۱	حظّ - ۲۹۴۱ -	حمد ۲ - محمد - ۵۲۸ - ۳۳۴۳	حاق - ۹۱۰
حُزن - حَزن - ۵۹	حظر - محظور - ۱۸۱۸ -	احمد - ۳۳۴۳ -	حين - ۲۸۰۷ -
حسّ - ۵۳۸ - ۲۱۹۰ - ۳۱۲۵	محتظر - ۳۲۳۴	حمر - حمار - حمير - ۱۷۲۱ -	
احساس - ۳۴۰ - حيس - ۲۱۹۰	حفّ - حافّ - ۱۹۱۶	حمل - ۱۳۳۵ - ۱۶۰۲ - ۱۹۹۴ - ۲۳۴۲ -	

اس فہرست میں حوالجات نوٹوں کے ہیں۔

خب - خصام

باب الخاء

خَبث - ۲۴۶۵-
خبت - إخبات - مُخبت - ۱۴۵۴-
خبث - خبیث - ۳۴۳ - ۵۷۴ - ۹۰۱ - ۱۲۲۹ ح - ۲۳۱۸-
خَبْر - خُبر - ۱۹۴۴-
خبز
خبط - تخبط - ۳۵۱-
خبل - خبال - ۵۰۵-
خبو - خِباء - ۱۸۸۱-
ختر - ختّار - ۲۶۱۲-
ختم - ۱۸ - ۱۱۲۷ - خاتم - ختام - ۲۶۵۹ - مختوم - ۳۵۶۳-
خدّ - اُخدُود - ۲۶۰۶-
خدع - خادع - مخادعة ۲۱ - ۷۵۱-
خِدن - ۶۳۹-
خذل - خذلان - ۵۵۳-
خرّ - خریر - ۱۵۸۷ - ۱۸۸۸-
خرب - خراب - ۱۴۶-
خرج - اخرج - ۴۹۷ - ۲۵۸۵
خراج - ۱۹۶۱-
خردل - ۲۱۶۱-
خرص - خرّاص - ۱۰۳۰
خرطم - خرطوم - ۳۴۰۲
خَرق - ۹۹۱ - ۱۹۴۶-
خزن - خازن - ۱۶۸۲ - ۲۸۹۴-
خزی - ۱۴۶
خسأ - خاسئ - ۹۴-
خُسر - خُسران - خاسر ۴۲ - ۴۷۵
خسف - ۱۷۴۲ - ۱۸۵۵ - ۲۵۳۹-
خشب - ۳۳۵۷-
خشع - خاشعة - خشوع - ۴۸ - ۲۷۴۹ - ۲۹۴۴-
خشی - خشیة - ۷۸۶ - ۱۹۵۱-
خَصّ - اختصاص - خاصّة
خصاصة - ۳۳۲۳-
خَصف - ۱۰۶۴
خَصم - خصیم - ۷۲۶ - ۲۸۳۲-
خصام ۲۶۳۴-

اختصام - استخلف

اختصام - تخاصم - ۲۷۵۲-
خَصِم - ۲۸۳۲-
خضد - مخضود - ۳۲۷۸-
خضر - مخضرة - اُخضَر - ۹۹۰ - ۱۵۴۴-
خضع - خضوع - ۲۴۰۳-
خطّ - ۲۵۶۵-
خطأ - ۱۰۵ - خطیئة - ۱۰۵ - ۷۲۹ - ۲۴۱۹ - خاطئ خاطئة ۳۴۱۲
خطب - مخاطبة - ۱۳۶۳ - ۱۵۵۱
خطبة - ۳۰۴-
خطف - اختطاف - تخطّف ۱۲۲۷
خطو - خطوة - ۲۰۶-
خفّ - خَفّف - استخفاف - خفیف - ۱۷۷۰ - خفاف ۱۲۹۴
خفت - تخافت - ۱۸۸۹-
خفض - خافضة - ۱۷۱۱ - اخفاء ۱۶۰۴ - ۲۴۵۱ - استخفاء مستخفی - ۱۶۰۴
خفیّ - ۱۹۷۴ - ۲۹۷۷-
اخفیٰ - ۲۰۴۶-
خلّ - خُلّة - خلیل - خِلٰل - حلل - ۳۲۸ - ۷۴۰ - ۱۲۹۸-
خلیل - ۳۰۱۸-
خلد - ۲۶ - خالد - ۳۹ - ل - ۲۱۳۱-
خلود - ۷۱۵ - ۱۵۰۶ - ۲۱۳۱-
خلد - اخلاد - ۱۱۷۷ - ۲۱۵۲
مُخَلَّد - ۳۲۷۶-
خلص - استخلص - ۱۵۵۴-
اَخلص - ۲۰۰۹ - ۲۸۵۰۰-
مُخلِص - مُخلَص - ۱۷۴ - ۲۰۰۹-
خالصة - ۲۸۵۰۰-
خالص - ۱۷۴ - ۲۸۵۰۰-
خلط - اختلاط - ۲۸۳ - ۱۳۸۸-
مخالطة - ۲۸۳-
خلیط - ۲۸۳ - ۱۳۸۸-
خلع - ۲۰۴۹-
خلف - ۱۱۵۰ - ۱۱۷۲ - ۲۳۴۳-
خلّف - ۱۳۲۹ - ۱۳۵۸-
استخلف - ۲۳۴۳-

خلیفة - تخییل

خلیفة - ۴۵ - ۲۳۴۳-
اختلاف - ۲۰۲ - ۲۱۴ - ۱۵۱۸-
مُخلّف - ۱۳۲۹ - خالف - ۱۳۳۱-
خِلف - ۱۳۲۹ - اخلاف - ۲۶۹۸
خلفة - ۲۳۹۲-
خَلق - ۳۳ - ۷۷ - ۱۳۵ - ۴۳۱ - ۱۱۰۷ - ۲۴۲۹ - خلاق - ۱۳۵-
خُلق - ۱۳۵ - ۲۴۲۹-
اختلاق - ۲۴۲۹-
مخلقة - ۲۲۰۰-
خلا - ۲۶ - ۱۶۹ - ۵۲۸-
خمد - خامد - ۲۱۳۷-
خمر - خمار - ۲۸۱ - ۲۳۲۳-
خمص - مخمصة - ۷۸۸ - ۱۳۶۰-
خمط - ۲۶۸۷-
خنزر - خنزیر -
خنس - خانس - خنّاس - ۳۵۵۰
خنق - مُنخنقة - ۷۸۴-
خور - خوار - ۱۱۵۵-
خوض - ۷۴۹ - ۹۶۱ - ۱۳۱۵ - ۱۴۱۲-
خوف - ۵۹ - ۶۵۲ - ۱۲۴۵ - ۱۷۴۳ - ۱۹۵۱ - تخولیف - تخوّف -
خیفة - ۱۷۴۳ - ۱۲۰۰-
خول - خالة - ۶۳۴-
خَول - تخویل - ۹۸۵-
خان - اختیان - ۲۳۴-
خیانة - ۲۳۴ - ۷۲۶-
خائن - خوّان - ۷۲۶-
خائنة - ۷۹۹-
خوی - خاویة - ۳۳۴-
خاب - خائب - ۵۱۳-
خیر - ۱۳۷ ل - ۲۴۰ - ۷۴۴ - ۱۴۹۳ - ۲۱۵۳ - ۲۳۲۷ - ۲۸۳۸ - ۲۸۵۱
اختیار - مختار - ۲۰۵۰ - ۲۵۲۳-
خیرات - ۲۸۵۱ - ۳۲۶۵-
خیرة - ۲۵۳۳-
خیط - خیاط - ۲۳۵-
خیل - ۳۸۵ - ۱۷۲۱ - ۱۸۵۲-
تخییل - ۲۰۸۲-

مختال - دفق

مختال - ۶۵۶-
خام - خیمة - ۳۲۶۶-

باب الدال

دأب - دائب - ۳۸۱ - ۱۵۴۷-
دبّ - دابّة - ۲۰۲ - ۱۴۴۳ - ۱۷۴۵ - ۱۷۵۴ - ۲۷۲۸-
دبر - تَدَبُّر - تَدبیر - إدبار - ۷۰۲ - ۲۶۱۶ - دابر - ۹۴۴ - دُبُر - ۶۶۷ - ۷۰۲ - ۹۴۴-
دثر - تَدَثّر - مدّثر - ۳۴۶۹-
دحر - دحور - مدحور - ۱۰۶۰-
دحض - ادحاض - داحضة ۱۹۳۴ - مدحض - ۲۸۰۴-
دَحو - ۳۵۳۹
دخر - داخر - ۱۷۴۴-
دخل - دخول - ۱۷۷۹ - مُدخل - ۶۴۷ - مُدّخل - ۱۳۰۷
دخن - دخان - ۳۰ - ۲۹ - ۳۰۲۷
دَرّ - مِدرار - دُرّی - ۹۰۶ - ۲۲۳۱
دَرء - تدارء - ۹۸ - ۵۶۴-
درج - استدراج - ۱۱۸۳-
درجة - ۲۹۴ - ۵۵۶ - ۱۱۸۳-
دَرْج - ۷۵۵ - ۹۹۴-
دَرس - ۴۷۰ - ۹۹۶-
درك - ادراك - تَدارك - ۷۵۵ - ۹۹۴ - اِدّرك - ۹۹۴ - ۲۴۸۵-
دری - اَدْریٰ - ۱۳۸۱-
دسّ - ۱۷۵۲-
دسیٰ - ۱۷۵۲-
دسر - دِسار - ۳۲۲۷-
دعّ - ۳۱۷۵-
دعا - إدّعاء - ۲۷۵۵-
دعیّ - دعوة - ۲۶۲۸-
دعاء - ۲۰۸ - ۲۱۰۳-
داعی - ۲۱۰۳ - دعویٰ - ۲۷۵۵-
دفء - ۱۷۱۹-
دفع - مدافعة - ۳۲۲ - ۵۶۰-
دفق - دافق - ۳۵۷۷-

دك - ذخر

دكّ - دَكّاء - ١٩٦٥
دلّ - دليل - ٢٣٧٨ -
دلك - دُلوك - ١٨٦٥
دلو - دلّی - ١٠٦٤ - ادلاء - ٢٣٨
تدلّی - ١٠٦٤ - ٣١٩٨
دمر - تدمير - ١٨١٥
دمغ - ٢١٤٠ -
دم - دمدم - ٣٦١٠
دمو - دم - ٤٦
دنا - ادناء - ٢٦٧٢ - ادنی - ٩٠ -
دنيا - ١٠٨ - ١٢٣٣ -
دانية - ٩٩٠ -
دار - ديار - ٣١٢ - ٨٤٠ - ١٨٠٥ -
دَور - دائرة - ٨٤٠ - ١٨٠٥ -
دیّار - ٣٤٤٠ -
دولة - تداول - داول - ٥٣٤
دام - دائم - دوام - ٣٤٣٢ -
دون - ٣٩٩ - ١٢٠٠ -
دهر - ٣٠٤٩ - ٣٦٤٨ -
دهق - دهاق - ٣٥٢٧
دهم - مُدهامّ - ٣٢٦٢ -
دُهن - ٢٢٥٨ - ادهان - مدهن
دهان - ٣٢٥٣
مداهنة - ٣٤٠٠
دهی - ادهی - ٣٢٣٥ -
دين - ٣ - ١٥٢ - ٣٣٠ - ١٥٧٠ -
١٧٤٨ - ٣٦٥٥
تداين - مداينة - ٣٥٩
دان - مدين - مدينة - ٣٤٨٨

باب الذال

ذا - هذا - ٣٢٥٧ -
هٰذه - ٥٥ -
ذالك - ٩ - ٢٢٢٠ - ٣٢٥٧ -
ذاب - ذئب
ذأم - مذؤم - ١٠٦٠
ذب - مذبذب - ذُباب - ٣ - ٧٥ -
ذبح - ٧٢ - ٧٨٤ -
ذخر - اذخار - ٤٣٥ -

ذرّ - رُبّ

ذرّ - ذرّية - ١٥٦ - ١٤٢٣ -
ذرّة - ٦٦٠ -
ذرأ - ٢٢٩٠ -
ذرع - ذراع - ١٤٨٦ -
ذرو - ذاريٰت - ١٩٢٥
ذعن - اذعان - ٢٣٣٩
ذقن - ١٨٨٨
ذكر - ١٩١ - ٣٠٤ - ٣٠٩ - ١٠٤٧
١٧٤١ - ٢١٣٣ - ٢١٦٢ - ٢٩٧٨
اذّكر - ٤٦ ١٥ - تذكر - ٣٦٠ -
ذكری - ١٠٤٧ - الذكر - ١٩١ -
١٦٧٤ - اهل الذكر - ١٧٤١ -
ذكا - تذكية - ٧٨٤
ذُلّ - ٩١ - ٥١٠ - ٨٤١ - ١٨٢٢ -
ذلول - ٩٧ - ذلّة - ٩١ - ٥٠٠
ذليل - اذلة - ٥١٠ - ٨٤١ -
ذلل - تذليل - ٢٧٦٢ -
ذمّ - ذِمّة - مذموم - ١٧٦٩ -
ذنب - ذنوب - ٣٨١ - ٣١٧٣ -
ذو - ذات - ذواتا - ٣٢٥٧ -
ذَوُد - ٢٥٠٩
ذوق - ٥٧٧
ذهب - اذهب - ذاهب - ٢٠٨٠
٢٧١١ -
ذهل - ٢١٩٨ -

باب الراء

رأس - ٢٧٨٧
رأف - رافة - رؤف - ١٨٠ -
١٣٦٧
رأى - روية - ٢٠٣ - ٧٢٦ - ٩٤٠ - ٢٩٠٦
ری - ارايتُ - ارايتك - ٩٤٠ -
٢٩٠٦ - ٣٢١٤ -
رويا - ١٦ ١٥ اج ١٥٤٥ - ١٨٠١ -
١٨٤٩ - مرأة - ٧٥٢ -
رئاء - ٣٤٠ - ٧٥٢ -
رئی - ٢٠٢٥ -
رَبّ - ٢ - ٤٥٥ - ١٢٨٤ -
رُبّ - رُبما - ١٦٧٢

ربانی - ردف

ربانی - ٤٧٠ - ربّی - ٥٣١ -
ربيبة - ٦٣٤ -
ربح - ٢٩ -
ربص - تربّص - ٧٥٠ -
ربط - رباط - مرابطة - ٥٩٧
١٢١١ - ١٢٤٧ -
ربع - ربٰع - ٦٠٣ -
ربا - ٣٥١ - ٢٥٩٦ -
رابی رابية - ١٦١١ -
ربوة - ٣٤١ - ٢٢٧١ -
أرْبیٰ - ١٧٧٩ -
رتع - ١٥٢١ -
رتق - ٢١٤٨ -
رتل - ترتيل - ٢٣٧١ -
رجّ - ٣٢٦٩ -
رجْز - ٨٧ - رُجز - ٣٤٧١ -
رجس - ٨٧١ - ١٣٦٤ -
رجع - رجوع - راجع - ٦٩ -
رجف - رجفة - ١١١٣ - ١١٦٣ -
ارجاف - مرجف - ١١١٣ -
٢٦٧٣ -
رجل - ٣٤٤٣ - زاجل - رَجل - ٣٠٨
١٨٥٢ -
رجم - رجوم - رجيم - ٤١٠ -
١٦٧٩ - ٢٠٠٥ -
رجاء - إرْجاء - مرجوّ - ١١٣٤ - ١٣٤٧ -
١٧٤٨ - ٣٤١٤ -
رحب - مرحبًا - ١٣٥٨ - ٢٨٥٥ -
رحق - رحيق - ٣٥٦٣ -
رحل - رحلة - ١٥٥٨ - ٣٦٥٣ -
رحم - ٢٩٢ - ٦٠٠ - الرحيم - الرحمٰن
١ - رحمة - ١٣٧ و - ١٣٦٧ -
رُحم - مرحمة - ١٩٥١ -
رخا - رخاء - ٢٨٤٢ -
ردّ - ٢٧٧ - ٦٦٧ - ١٦٤٠ -
ارتداد - ٢٧٨ -
مَرَدّ - ٢٠٢٧ -
رد - رداء - ٢٥١٦ -
ردف - مردف - ١٢٠٨ - ٢٤٨٧

ردم - رقّ

رَدم - ١٩٦٢ -
ردی - تَرَدّی - ٧٨٤ - ١٠٢١ -
مترّدية - ٧٨٤ - ردی - ٢٥١٦ -
رذل - أرْذل - ١٤٥٦ -
رزق - ١٣ - ٤١٢ - ١٤١١ - ٣٢٨٧ -
رزاق - رازق - ٣٢٨٧ -
رسّ - ٢٣٧٣ -
رسخ - راسخ - ٣٧٧ -
رسل - رسول - ١١٠ - ٢٠٠٩ -
إرسال - مُرْسَل - ١١٠ - ٢٠٣٢ -
رسا - ارسٰی - رواسی - مرسی - ١١٨٦ -
رَشد - رُشد - ٢٣١ - ٣٣٠ - ٦٠٩
١٩٠٩ - ٣١٦٣ و -
رَصّ - مرصوص - ٣٣٤٢ -
رَصَد - ارصاد - مرصد - ١٢٦٦ -
٣٤٥٧ -
رضع - أرْضع - استرضع - ٣٠٢ -
٢١٩٨ - مرضعة - ٢١٩٨ -
رضا - ٣٨٦ - ٧٨٧ - ١٩٧٦ -
رضی - مرضیّ - راضية - ١٩٧٦
رضوان - ٣٨٦ -
رطب - ١٩٩٢ -
رعب - ٥٣٧ -
رعد - ١٦٠٦ -
رعی - راع - مَرْعی - رعاء - ١٣٧ -
٢٥٠٩ -
رغب - راغب - ١٦٥ - ١٧٤١ - ٣٦٠٠
رغم - مراغم - ٧٢١ -
رفت - رفات - ١٨٤١ -
رفث - ٢٣٢ -
رِفد - ١٥٠١ -
رَفرف - ٣٢٦٧ -
رفع - ٩٣ - ٣٢٥ - ٤٤٥ - ٧٦٤ -
١١٧٧ - رافعة - مرفوعة
٤٤٥ - الرافع - ٣٢٥ - ٤٤٥ -
رفق - رفيق - ٦٨٦ -
مِرْفق - ٧٩٣ - ١٩٠٣ -
مرتفق - ١٩١٤ -
رقّ - ٣١٧٣

رقب - ارهق

رقب - ۲۱۵ - ۶۰۰ - ۱۲۶۹ -
رقیب - ۲۱۵ - ۶۰۰ -
رقیبة - ۲۱۵ - ۶۰۰ - ۸۴۰ -
رقد - رقود - ۱۹۰۵ -
رقم - رقیم - ۱۸۹۷
رقی - ارتقاء - ۱۸۷۸ - ۲۸۲۳ -
راق - تراقی - ۳۴۹۵ -
رکب - ۱۲۳۳ - رکب - تراکب ۳۵۵۵
رکوب - متراکب - ۳۰۸ - ۹۹۰ -
رکاب - ۳۲۱۹ - راکب - ۳۰۸ -
رکد - ۲۹۷۲ -
رکز - ۲۰۳۲ -
رکس - ارکس - ۶۰۸ -
رکض - ۲۱۳۵
رکع - رکوع - راکع - ۶۶ - ۱۵۹ -
رکم - رکام - ۱۲۲۹ ح
رکن - رکن - ۱۴۸۹ -
رمّ - رمیم - ۲۷۶۵
رمز - ۳۱۷ -
رمض - رمضان - ۲۲۸ -
رمّان - ۳۲۶۳ -
رمی - ۲۳۰۵ -
روح - ۱۱۱ - ۷۷۳ - ۱۵۷۹ - ۱۶۸۷ -
۱۶۱۴ - ۱۶۲۰ - ۱۸۴۲ - ۱۹۸۳ -
۲۱۸۲ - ۲۹۰۱ - ۳۳۱۶ - ۳۴۲۵
۳۶۳۱ - اراحة - ۱۶۷۰ -
ریح - ۲۰۲ - ۷۷۳ - ۱۲۳۷ - ۱۵۸۶
ریحان - ۳۲۴۲ -
رود - ارادة - مراودة - ۱۵۳۰ -
روید - ۳۵۸۱ -
روض - روضة - ۲۵۸۲ -
روع - ۱۴۸۴ -
روغ - راغ - ۲۷۹۲ -
روم - ۲۵۷۷ -
رهب - رهبة - رهبانیة - راهب
۶۲ - ۸۶۷
رهط - ۱۴۹۸
رهق - ۱۳۹ - ۱۹۵۱ - ۳۴۴۳ -
ارهق - ۱۹۵ -

رهن - زلفی

رهن - رهان - ۳۶۱ -
رهین - رهینة - ۳۱۷۶ -
رهو - ۳۰۳۱ -
ریب - ۹ - ۱۳۵۱ - ۱۴۷۸ - ۳۱۸۰ -
اراب - مریب - ۱۴۷۸
ریش - ۱۰۶۶ -
ریع - ریعة - ۲۴۲۶ -
ران - ۳۵۶۱ -

باب الزاء

زبد - ۱۶۱۱ -
زبر - زبر - زبور - ۵۸۰ -
زبن - زبانیة - ۳۶۲۸ -
زج - زجاجة - ۲۳۳۱ -
زجر - ازدجار - مزدجر - زجرة
۲۷۷۰ -
زجی - مزجاة - ازجاء - ۱۴۸۰ -
زح - زحزح - ۱۲۱ - ۵۸۲ -
زحف - ۱۲۱۵ -
زخرف - ۱۰۰۲ - ۱۳۸۸ - ۲۹۹۸ -
زرب - زرابی - ۳۵۸۹ -
زرع - زارع - زرّاع - ۳۱۱۶ -
زرق - ۲۰۹۹
زری - ازدراء - ۱۴۵۹ -
زعم - ۹۷۹ - ۱۵۶۷ -
زعیم - ۱۵۶۷ -
زف - ۲۷۹۳ -
زفر - زفیر - ۱۵۰۵
زقم - زقوم - ۲۷۸۷ -
زکی - ۱۶۳ - ۳۰۱ - ۱۹۴۷ -
تزکیة - ۱۶۳ - ۹۶۹ - ۳۲۱۰ -
زکوٰة - ۶۶ - ۱۹۴۷ - ۱۹۸۱ - ۲۲۵۱ -
زکیّ - ۱۹۸۱ - زکیّة - ۱۹۴۷ -
ازکی - ۳۰۱ -
زلّ - ازلّ - ۵۶ - استزلّ - ۵۳۸ -
زلزل - زلزال - ۲۷۳ -
زلزلة - ۲۷۳ - ۲۱۹۷ -
زلف - ازلف - زلفة - زلف
زلفی - ۱۵۱۱ -

زلق - سبغ

زلق - ازلاق - ۱۹۲۱
زلم - ازلام - ۵۸۷ -
زمر - زمرة - ۲۸۹۲ -
زمل - مزمّل - ۳۳۵۸ -
زمهریر - ۳۵۰۵ -
زنجبیل - ۳۵۰۷ -
زنم - زنیم - ۳۴۰۱
زنی - زانی - زانیة - ۲۳۰۳
زهد - زاهد - ۱۵۲۷ -
زهر - زهرة - ۲۱۳۲ -
زهق - زاهق - زهوق - ۱۸۶۸ -
زوج - ۱۳۹ - ۱۰۲۶ - ۲۷۷۹ - ۳۰۳۰
۳۲۷۱ - تزویج - ۳۰۳۰ -
زود - تزوّد - زاد - زیادة - ۲۵۷ -
مزید - ۳۱۴۶ - ۳۱۴۹
زیادة - ۱۳۹۰ -
زور - زار - تزاور - زور - ۱۹۰۳ -
زال - ۱۳۹۱ - ۱۶۶۳ - ۲۷۲۶ -
لایزال - ۲۷۲۶ -
زوال - ۱۶۶۳ - تزیّل - ۱۳۹۱
زیت - زیتون - ۲۳۳۱ -
زیغ - ازاغ - ۳۷۶ - ۲۶۳۳ -
زین - زان - ۲۷۱ - زینة - ۲۳۲۲

باب السین

س - ۱۹۰۸
سال - سوال - سائل - ۲۱۵ -
تساءل - ۶۰۰ -
سئول - ۱۵۲۵ - ۲۰۶۱ -
مسئول - ۳۲۶۰ -
سئم - سامة - ۲۹۴۳ -
سبأ - ۲۲۶۳ - ۲۶۸۶ -
سب - سبب - ۲۰۳ - ۱۹۵۳ - ۲۲۰۷ -
سبت - ۹۳ - ۱۶۹۸ -
سبات - ۲۳۸۰ -
سبح - ۳۷ - ۲۱۵۱ - تسبیح - ۳۷ -
سبط - اسباط - ۱۷۱ -
سبع - ۳۳ - سبع - ۸۳ -
سبغ - اسبغ - سابغ - ۲۶۰۸ - ۲۹۸۳ -

سبق - سربل

سبق - ۱۸۵ - ۱۳۳۱ - ۲۱۸۹ -
استباق - ۱۸۵ - ۱۳۳۱ -
مسبوق - سابق - ۱۳۳۱ -
سبل - سبیل - ۱۹۳ - ۲۱۵ - ۳۶۶ -
سبیل الله - ۱۹۳ - ۳۳۶ -
سنبلة - ۳۳۶ -
ستّ -
ستر - ۱۹۵۷ - استتار - مستور -
۲۹۳۶ -
سجد - ۵۲ - ۵۰۱ - ۲۲۰۹ -
سجّد - ۸۷ - ساجد - ۱۵۹
مسجد - ۱۳۶ - ۱۰۷۰ -
سجر - مسجور - تسجیر - ۲۹۲۰ -
۳۱۷۴ -
سجل - سجلّ - سجیل - ۱۳۹۱ - ۲۱۹۲
سجن - سجّین - ۱۳۹۱ - ۳۵۶۰
سجی - ۳۶۱۵ -
سحب - سحاب - ۲۰۲ -
سحت - ۸۲۴ -
سحر - ۳۸۸ - ۱۸۳۹ -
سحر - ۱۲۹ - ۸۸۸ - ۱۱۳۲ - ۱۳۷۱
۱۸۳۹ - مسحور - ۱۶۷۸ - ۱۸۳۹
۱۸۸۴ - ساحر - ۸۸۸ - ۱۳۲۱ -
۳۰۰۶ - مسحّر - ۲۴۳۲ -
سحق - سحق - سحیق - ۲۲۲۱ -
سخر - ۲۷۱ - ۱۳۲۷ - تسخیر - مسخّر
۲۰۲ - ۱۰۹۶ - استسخر - ۲۷۷۸ -
ساخر - ۲۸۸۵ -
سخری - ۱۰۹۶ - ۲۳۰۰ -
سخط - ۵۵۵ - ۱۳۰۸ -
سد - ۶۱۴ - ۱۹۵۹ -
سدید - سداد - ۶۱۴ -
سدر - سدرة - ۳۲۰۲ -
سدی - ۳۴۹۸
سرّ - سرّ - سرور - سریر - ۱۶۹۳
سرّاء - ۵۱۸ - اسرار - ۱۴۰۸
سرب - سارب - ۱۶۰۴ - ۱۹۳۸
سراب - ۲۳۴۴ -
سربل - سربال - ۱۲۶۹ - ۱۷۷۱ -

اس فہرست میں حوالجات نوٹوں کے ہیں۔

سرج - سُکُر

سرج - سراج - ۲۳۹۱-

سرح - تَشْریح - ۲۹۵ - ۱۷۲۰

سرد - ۲۶۸۲

سردق - سرادق - ۱۹۱۴

سرع - سارع - سریع - ۲۶۱

سرف - اسراف - ۵۳۳ - ۱۰۲۴ - ۲۱۱۸ - ۲۳۹۵-

سرق - استراق - ۱۶۷۹-

سرمد - ۲۵۳۴-

سری - اَسْریٰ - ۱۴۹۰-

سرّی - ۱۹۹۱-

سطو - ۳۵۹۰-

سطر - مسطور - اساطیر - ۹۲۶-

مصیطر - ۳۱۸۴-

سطا - سطوۃ - ۲۲۳۵-

سعد - سعید - ۱۵۰۴-

سَعَر - سعیر - ۶۱۵-

سُعُر - ۳۲۳۰-

سَعٰی - ۱۸۱۷ - ۲۷۹۷-

سغب - مسغبۃ - ۳۶۰۵-

سفح - مسافحۃ - ۶۳۶-

سفر - اسفار - سَفَرۃ - ۲۲۵ - ۳۵۴۸ - مُسفرۃ - ۳۵۴۸-

سفع - ۳۶۲۷-

سفک - ۴۶-

سفل - اسفل - سافل - سفلیٰ - ۱۲۳۳ - ۱۴۹۱-

سفن - سفینۃ - ۱۹۴۶-

سفہ - سفیہ - ۲۵ - ۳۶۰۰ - ۱۶۵۰-

سقر - ۳۳۴۷-

سقط - ساقط - ۱۱۵۶ - ۳۱۸۸ - مٰلک - ۳۵۳۷-

سقف - ۲۱۵۰-

سقم - سقیم - ۲۷۹۱-

سقی - اسقی - سقایۃ - ۱۵۶۵-

سکب - مسکوب - ۳۲۷۹-

سکت-

سکر - تسکیر - ۱۶۷۸-

سُکُر - سکران - ۶۶۳-

سَکَر - سَنّ

سَکَر - ۱۷۵۹ - سُکُریٰ ۲۱۹۸

سکن - مسکنۃ - ۹۱ - سکون - ۵۴

سکینۃ - ۳۰۷ - سِکّین - ۱۵۳۴

استکانۃ - ۵۳۲ - ۲۲۸۹-

سلّ - سُلالۃ - ۲۲۵۴-

تَسلّل - ۲۳۵۰ - سلسل-

سلسلۃ - ۲۹۲۰-

سَلب - ۲۲۴۶-

سلخ - انسلاخ - ۱۱۷۶-

سلسبیل - ۳۵۰۷-

سلط - سلطان - ۵۲۷ - ۱۶۴۱-

سلف - ۳۵۲ - ۶۳۳ - ۳۰۱۱-

سلق - ۲۶۳۹-

سلک - سلوک - ۱۶۷۵۔

سلم - ۳۰۲ و ۱۷۳۴ - ۲۸۷۶-

سِلْم - ۲۶۷-

اسلام - مسلم - ۱۴۴ - ۱۶۳ - ۴۷۳-

تسلیم - ۳۰۲ و ۶۸۴-

سلام - ۷۱۷ - ۲۰۱۷ - ۲۳۹۳ - ۳۲۸۹

۳۶۳۲ - سُلَّم - ۹۳۵ - ۳۱۸۵-

سلیم - ۲۱ - ۲۴ - سَلَم - دارالسلام

السلام - ۱۳۸۹-

سلو - سلوٰی - ۸۱-

سمّ - سموم - ۱۰۸۰ - ۱۶۸۶-

سمد - سامد - ۳۲۱۹-

سمر - سامر - سامری - ۲۰۹۰ - ۲۲۸۲-

سمع - ۱۱۸ - ۱۶۲ - ۸۲۳-

سمیع - ۱۶۲ - استماع - ۹۲۶-

سماع - ۱۲۹۸-

غیرمسمع - ۶۶۶

سمن - اسمن - سمین - ۱۵۴۴-

سمو - اسم - ۱ - ۴۲۴ - ۱۶۲۷-

اسماء - ۴۹ - ۱۱۸۱ - ۱۵۴۲-

سمّی - ۱۶۲۷ - ۱۹۷۷ - ۲۰۱۹-

تسمیۃ - ۱۶۲۷ - سماء - ۳۱ - ۴۲ - ۲۲۰۴ - ۲۲۴۲-

سَنّ - سِنّ - مسنون - ۱۶۸۵-

سَنۃ - سیرۃ

سَنۃ - ۱۱۴۰ - ۱۵۳۹-

سُنّۃ - ۵۲۱ - ۱۲۲۹ط

سند - تسنید - مُسَنَّد - ۳۳۵۷

سندس - ۱۹۱۵-

سنم - تسنیم - ۳۵۶۴-

سنہ - تسنّہ - ۳۳۴-

سنا - ۲۳۳۷-

سہر - ساہرۃ - ۳۵۳۶-

سَہْل - ۱۱۱۱-

سہم - ساہم - ۲۸۰۴-

سہو - ۳۱۶۰-

سوء - ۱۰۵ - ۲۰۶ و ۱۴۸۶-

سیئۃ - ۱۰۵ - ۵۰۷ - ۵۹۳ - ۶۹۷ - سوأۃ - ۸۱۶ - ۱۰۶۱-

سوأی - ۲۵۸۰-

ساب - سائبۃ - ۸۸۲-

ساح - ساحۃ - ۱۳۵۳ - ۲۸۱۶-

سود - سید - اسوداد - ۴۱۵ - ۴۹۴

سور - سورۃ - ۳۷-

سوار - ۳۷ - ۱۹۱۵-

تسوّر - ۳۷ - ۲۸۳۲-

سوط - ۳۵۹۴-

ساع - ساعۃ - ۹۳۱ - ۱۱۸۶-

سوغ - سائغ - ۱۶۴۶-

سوف - ۱۹۰۸ - ۳۲۱۴-

سوق - ۲۸۹۲ - ساق - ۲۴۷۶ - ۳۴۹۶ - مساق - ۲۸۹۲-

سائق - ۳۱۴۱-

سَول - تَسْویل - ۱۵۲۵-

سام - مسوِّم - ۴۷ - ۵۱۱-

مسَوَّمۃ - ۳۸۵ - ۳۱۶۷-

سیما - ۳۴۹ - ۱۰۸۶-

سوی - استوی - تسویۃ - ۴۴ - ۱۰۹۵ - ۱۶۸۷ - سِوٰی - ۱۹۷۹ - ۳۳۹۵-

سواء - ۴۵۵ - ۲۱۹۵-

ساح - سائح - ۱۳۵۳-

سیر - ۸۷۶ - سیّارۃ - ۸۷۶ - ۱۵۰۷۰-

تسییر - ۱۹۲۷-

سیرۃ - ۲۰۵۵-

سبل - شعر

سیل - اِسالۃ - ۲۶۸۳-

سیناء - سینین - ۳۲۵۸-

باب الشین

شأم - مشئمۃ - ۳۲۷۳-

شأن - ۱۴۱۲-

شبہ - متشابہ - ۱۳۹ و ۳۷۵-

شتت - شتّٰی - ۲۳۴۸-

شتا - شتاء - ۳۶۵۳-

شجر - شَجَرۃ - ۵۵-

شحّ - ۷۴۲ - شُحّ - شحیح - ۲۶۳۹-

شحم

شَحْن - مشحون - ۲۴۲۵-

شخص - شاخصۃ - ۱۶۶۱ - ۲۱۸۷-

شدّ - ۱۴۲۶ - اَشدّ - ۱۰۳۴ - ۱۵۲۹ - ۳۰۶۱ - ۳۱۱۵-

شدۃ - ۱۰۳۴ - ۳۱۱۵

شدید - ۳۱۱۵-

شرّ - ۲۱۵۲ - شرر - ۳۵۱۷-

شرب - ۱۱۹ - شِرب - ۲۴۳۳-

مشرب - ۲۷۶۳-

شارب - شراب - ۲۸۴۷-

شرح - ۱۰۱۴-

شرد - تشرید - ۱۲۴۴-

شرذم - شرذمۃ - ۲۴۱۳-

شرط - ۳۰۸۱-

شرع - شِرعۃ - شریعۃ - ۸۳۴-

شارع - ۱۱۶۹-

شرق - اشراق - مشرق - شرقی - ۱۷۰۳

شرک - ۱۲۱ - ۴۵۵-

شری - اشتراء - ۲۹ - ۲۶۰۳-

شطط - ۱۹۰۲

شطا - شاطئ - ۲۵۱۴-

شطر - ۱۸۱-

شطن - شیطان - ۲۶ - ۲۱۷۶ - ۲۷۸۷-

شعب - ۳۱۲۶ - شعبۃ - ۳۵۱۷-

شعر - ۲۱ - ۱۷۷۰-

شعيرة - مشهود

شعيرة - ٨١٧ -
مشعر الحرام - ٢٥٦ -
شعرى - ٣٢١٧
شعل - اشتعال - ١٩٧٥ -
شغف - ١٥٣٣ -
شغل - ٢٧٥٤ -
شفع - شفاعة - ١٧ - ٣٢٩ و ٧٠٦ -
شفق - اشفاق - مشفق - ٢٢٧٥ -
شفه - شفة - ٤٩١ -
شفى - شفاء - شفا - ١٣٥٠ -
شق - شقاق - ١٧٢ - ١٢١٣ -
انشقاق - تشقق - ٢٣٦٧
شِق - شُقة - ١٢١٣ - ١٢٩٥
شقى - ١٥٠٤ - ٢٠٤٤ - ٢١١٠ -
اشقى - ٣٦١٣ -
شك - ١٣٣٠
شكر - ٢ - ٧٥ و - ١٦٣٨ -
شاكر - شكور - ٧٥ و
مشكور - ١٨١٧ -
شكس - متشاكس - ٢٨٧٦ -
شكل - شاكلة - ١٨٧١ -
شكى - اشتكاء - مشكوٰة - ٢٣٣١
شمت - ١١٥٩ -
شمخ - شامخ - ٣٥١٦ -
شمز - اشمأز - ٢٨٨١ -
شمس - ٣٥٠٥
شمل - اشتمال - شمال - شمائل - ٢١٣٨
شنأ - شنٰان - ٧٨٢
شوب - ٢٧٨٨ -
شور - تشاور - شورى - ٣٠٢ -
اشار - ١٩٩٦ -
شوظ - شواظ - ٣٢٥٢
شوك - شوكة - ١٢٠٧ -
شوى - ١٩١٤ - ٣٤٣٠
شهب - شهاب - ١٦٧٩
شهد - شهادة - شهود - ٣٧
شاهد - ٤٣٢ - ١٤٥١ - ٢٩١٤ -
شهيد - ٣٧ - ١٧٨ - ٦٨٦ - ١٤٥١ -
٣١٤١ - مشهود - ١٥٠٣ - ١٨٦٥ -

شهر - صدقة

شهر - ٢٢٨
شهق - شهيق - ١٥٠٥ -
شهى - اشتهى - ٢١٩٠ -
شهوة - ٣٨٥ -
شئ - شاء - ٣٢ - ٩٩٧ -
شيب - ١٩٧٥ -
شيخ - ٢٩١٨ -
شيد - مشيّدة - ٦٩٦
شيع - شيعة - ١٠٤١ -

باب الصّاد

ص - ٢٨١٨
صبّ - ٢٢١٠
صباء - صابى - ٩٢ - ١٥٣٦ -
صبح - اصباح - مصباح - ٢٣٣١
٢٥٤٠ - ٣٣٨٩ -
صبر - ٦٨ - ١٩٢ - ٢١٣ - ٣٢٠ - ٣٨٨ -
مصابرة - ٥٩٧ - اصطبار - ٢٠١٩
صابر - ٣٨٨ -
صبع - اصبع - ٣٤٣٦ -
صبغ - صبغة - ١٧٣ - ٢٢٥٨ -
صبو - صبى - ١٥٣٦ -
صحب - اصحب - ٢١٥٧ -
صاحب - ٦٠
صحف - صحاف - صحفة - صحيفة
٣٠١٩ -
صخّ - صاخّة - ٣٥٤٧ -
صخر - صخرة - ١٩٤٠
صدّ - ٢٧٦ - ٣٠١٢ -
صديد - صدود - ١٩٤٥ -
صدر - ١٠١٤ - ٤٠٩ - اصدر - ٢٥٠٩ -
صدع - تصدّع - ١٧١٤
صدف - ١٩٦٣ -
صدق - ٦٣ - ٢١٥ - ١٤٢٩ - ٣١١٣ -
تصديق - ٢٦٩٠ - تصدّق - ٣٥٧
صادق - ٣٨٨ - صديق - ٦٨٦ -
٢٠٠٢ - ٢٣٤٨ - مصدّق - ٦٣ -
مصّدّق - ٣٢٩٨ -
صدقة - ٦٠٧ - ١٣١٠ -

لسان صدق - صلّى

لسان صدق - قدم صدق
١٣٧١ -
صدى - تصدية - ١٢٢٩ و
تصدّى - ٣٥٤٣
صرّ - اصرار - ٥٠٤ - ٥١٩ -
صرصر - ٥٠٤ - صرّة - ٣١٦٦
صرح - ٢٤٧٦
صرخ - صارخ - صريخ - مصرخ
٤١٠ - ١٦٥٠ - استصراخ - ٢٥٠٧
اصطراخ - ٢٧٢٥ -
صرط - صراط - ٢٨٣٢ و
صرع - صريع - ٣٤١١ -
صرف - تصريف - ٢٠٧ - ٩٤٥ -
صرم - صارم - صريم - ٣٤٠٣ -
صعد - اصعاد - ٥٤٣ -
صعود - ٥٤٣ - ١٠١٤ - ٣٤٥١
صعيد - ٦٦٤ -
صعر - تصعير - ٢٦٠٦ -
صعق - ١٠٥١ - صاعقة - ٣١ - ١١٦٣ -
٣١٨٩ -
صغر - صغار - ١٠١٣ - صاغر - ١٥٥
١٢٨١ - صغيرة - اصغر - ١٩٢٩ -
صغو - ١٠٠٣ - ٣٣٧٨ -
صفّ - ١٩٢٨ - صافّة - ٢٢٢٦ -
٢٣٣٦ - ٢٧٧٠ -
صفح - ١٤١ - ٢٩٨٢ -
صفد - ١٦٦٨ - ٢٨٤٤ -
صفر - صفراء - ٩٦ ب
صفصف - ٢١٠٢
صفن - صافن - ٢٨٣٧
صفو - اصطفاء - ١٦٥ -
صفا - ١٩٧ - صفوان - ٣٤٠ -
صكّ - ٣١٦٦
صلب - ٧٦٢ - ٣٥٧٧ -
صلح - صالح - ٤٢٦ - ٦٨٦ - ١١٨٨ -
صلد - ٣٤٠ -
صلصل - صلصال - ١٦٨٥ -
صلى - اصطلاء - ١٢ - ٢٢٥٤ -
صلّى - صلوٰة - ١٢ - ١٩٦ - ٦٦٣ -

مصلّى - اضطرار

٨٨٤ - ١٣٤٠ - ١٣٤٤ - ٢٢٣٠ -
٢٦٦٠ - مصلّى - ١٥٨ -
صال صلّى - ٢٠٢٢ - ٢٨١٠ -
صمم - اصم - ١٣٠ و - ٣٠٨٦ -
صمت
صمد - ٣٦٦٤
صمع - صومعة - ٢٢٣٠ -
صنع - صنعة - ١٩٦٨ -
اصطناع - ٢٠٦٢ -
مصنعة - ٢٤٢٧ -
صنم - ١١٤٦ - ٢٢ م ٣ -
صنو - ١٥٩٨ -
صوب - اصاب - مصيبة - ٢٨٤٢
صواب - ٣١ - ٢٨٤٢ - ٣٥٣٠ -
صيّب - ٣١
صوت - انصات - ١٨٥٢ -
صور - صار (يصور) - ٣٣٥ -
صورة - تصوير - ٣٧٤ -
المصور - ٣٣٣١ - صُور - ٩٦٦ -
صوع - صواع - ١٥٦٥ -
صوف - ١٧٧٠ -
صوم - ٢٢٢ -
صهر - ٢٢١١ - ٢٣٨٧ -
صيح - صيحة - ١٤٧٩ -
صيد - اصطياد - ٧٨٠ - ٨٧٦ -
صير - صار - (يصير) صير - ١٦١ -
صيص - صيصة - ٢٦٤٥ -
صيف - ٣٦٥٣ -

باب الضاد

ضأن - ضائن - ١٠٢٦ -
ضبح - ٣٦٤٠
ضجع - مضجع - ٥٤٧ -
ضحك - ١٣٣٠ - ضاحك - ١٤٨٢
٢٤٦٨ -
ضحى - ٢٠٧٧ - ٢١١١
ضد - ٢٠٣١
ضرّ - ٢١٥ - ٣٦٠ - ٧١٨ -
اضطرار - ١٦١ - ٢١١ -

مضارّة - طرف

مضارّة - ۳۰۲ - ۳۶۰ -
ضرّاء - ۲۱۵ - ۵۱۸
ضرب - ۸۸ - ۹۱ - ۵۴۹ - ۷۲۲ -
۲۰۸۵ - ۲۸۴۹ - ۲۹۸۲ - ۳۰۱۳ -
ضرع - تضرّع ۶۰۲، ۹۴۱، ۹۵۷، ۱۱۲۵
۲۲۸۹ - ضریع - ۳۵۸۸ -
ضعف - ۳۱۴ - ۵۱۵ - ۵۳۲ - ۲۶۰۱ -
مضاعفة - ۵۱۵ -
ضعیف - ۳۶۰ -
مستضعف - ۶۹۱ -
ضغث - ۱۵۴۵ - ۲۸۴۹ -
ضغن - ۳۰۹ -
ضفدع - ۱۱۴۳ -
ضلّ - اضلال - ۷ و - ۴۱ - ۳۶۰ -
۷۳۰ - ضالّ - ۷ و - ۹ - ۲۴ - ۳۶۱۷
ضلال - ۷ و - ۳۶۰ - ۷۳۰ - ۱۵۱۸ .
۳۶۱۷
ضمّ - ۲۵۱۵
ضمر - ضامر - ۲۲۱۷ -
ضنّ - ضنین - ۳۵۵۱ -
ضنک - ۲۱۱۶ -
ضوء - ۴ - ۱۳۷ - ۲۲۳۳۰ -
ضیاء - ۲۱۶۲ - ۲۲۳۳۰ -
ضهی - ضاهی - ۱۲۸۳ -
ضیر - ۲۴۱۲ -
ضیز - ضیزی - ۳۲۰۷ -
ضیع - اضاع
ضیف - ۱۴۸۷ -
ضیق - ضاق - ضائق - ۱۳۵۸ -
۱۴۴۷ - تضییق - ۳۳۷۱ -

باب الطاء

طٰہٰ - ۲۴۰۱ - طٰسٓمٓ - ۲۴۰۱ -
طبع - ۱۸ - ۱۱۷۷ -
طبق - طباق - ۳۳۸۷ -
طحو - ۳۶۰۷ -
طرح - ۱۵۱۹ -
طرد - طارد - ۱۳۹ و - ۲۴۲۴
طرف - ۵۱۳ - ۱۵۱۱ - ۱۶۳۲ - ۲۷۸۵ .

طرق - طهر

طرق - طریق - ۲۰۸۰ -
طریقة - ۲۰۸۰ - ۲۲۵۶ - ۳۵۷۶
طارق - ۳۵۷۶ -
طری - طرّی - ۱۷۲۴ -
طعم - طعام - ۳۱۸ - ۴۸۲ - ۸۷۶ -
طعن - ۶۶۶ -
طغی - طغیان - طاغوت - ۲۸ -
۳۳۱ - ۶۷۱ - ۱۹۵۱ -
طغوی - طاغیة - ۳۴۱۰۰
طف - مطفّف - ۳۵۵۹ -
طفئ - اطفاء - ۳۳۴۴ -
طفق - ۲۸۳۹ -
طفل - ۲۲۰۱ -
طلّ - ۳۴۱ -
طلب - طالب - مطلوب - ۲۲۴۶ -
طلح - ۳۲۷۹ -
طلع - ۹۹ - ۱۹۰۵ - اطّلع - ۱۹۰۵ -
مطلع الشمس - ۱۹۵۷ -
طلق - طلاق - ۲۹۰ - انطلاق - ۲۴۰۶
طمّ - طامّة - ۳۵۳۹ و
طمث - ۳۲۵۹ -
طمس - ۶۶۷ -
طمع - ۱۰۰ -
طمن - اطمینان - ۱۸۷۹ -
طود - ۲۴۱۶ -
طُور - ۹۳ - طَور - ۳۴۳۶ و -
طوع - ۱۹۸ - ۱۶۰۹ - اطاع - ۴۸۷ - ۵۳۵ -
استطاع - ۲۷۷ - ۴۸۵ - ۸۹۰ - تطوّع - ۱۹۸ -
۲۷۷ - مطوّع - ۱۳۲۷ - طوّع - ۸۱۵
طاعة - ۴۸۷ -
طوف - طواف - ۱۹۸ -
طائف - ۱۵۹ - ۱۱۹۶
طائفة - ۴۶۰ - طوفان ۱۱۴۳
طوق - اطاق - طاقة - ۲۲۶ -
طوّق - ۵۷۶ -
طول - ۶۳۹ - طالوت - ۳۱۶ -
طوی - طیّ - مطویّ - ۲۱۹۲ -
طُویً - ۲۰۴۹ -
طهر - طهارة - ۱۳۹ و - ۴۱۸ - ۴۲۶ -
طهر - تطهّر - ۲۸۵ - ۴۱۸ -

تطهیر - عبد

تطهیر - ۱۵۹ - ۱۳۴۴ -
مطهّرة - ۱۳۹ و - طهور - ۲۳۸۱ -
۳۵۰۸ -
طیب - طاب - ۶۰۲ - طیّب - ۸۲ -
۵۷۴ - ۶۰۱ - ۱۲۲۹ ح - ۲۳۱۸ -
طوبی - ۱۶۲۱ -
طیر - طار - مستطیر - ۳۵۰۲ -
طیر - طائر - ۴۳۱ - ۱۱۴۱ - ۱۸۱۲ -
۲۸۳۰ - تطیّر - اطّیّر - ۱۱۴۱ -
طین - ۴۳۱ -

باب الظاء

ظعن
ظفر - ۱۰۲۹
ظلّ - ظَلّ - ۱۷۵۱ - ظِلّ - ۸۰ - ۹۷۶ -
۱۶۰۹ - ۲۳۷۸ - ۳۵۱۷ -
ظلیل - ۹۷۶ -
ظُلّة - ۲۶۹ - ۱۱۷۳ -
ظُلم - ۵۵ - ۴۵۰ - ۹۷۳ - ۱۸۵۸ -
ظلمة - ۳۰۰ - ۹۵۷ - ۱۶۳۵ -
ظالم - ۳۴۶ - ظلّام - ۵۷۸ -
ظلوم - ۱۶۵۶ -
ظماء - ظمآن - ۱۳۶۰ - ۲۱۱۱ -
ظنّ - ۹
ظَهَر - ۱۲۸۶ - ۱۹۱۸ - ۳۴۵۶ -
ظاهر - ۲۳۸۸ - اظهار - ۲۵۸۴ -
۳۴۵۶ - تظاهر - ۱۰۸ -
ظَهْر - ۱۲۸۶ - ۱۴۹۹ -
ظاهر - ۱۹۰۸ - ۲۶۸۸ - ۲۹۰۶ -
۳۴۵۶ - ظهیرة - ۲۳۴۵ -
ظهری - ۱۴۹۹ -
ظهیر - ۲۳۸۸ - ظهار - ۲۶۲۸ -

باب العین

عسق - ۲۹۵۲ -
عباء - ۲۴۰۰ -
عبث - ۲۳۰۱ -
عبد - عبادة - ۴ - عبودیّة - ۴ - ۲۸۴ -
تعبید - ۲۲۷ - ۲۴۱۰ -

عبد - عذر

عَبْد - ۲۸۴ - ۵۷۸ - ۱۶۹۱ - ۳۰۲۲ -
عبید - ۵۷۸ - عابد - ۲۲۷۰ -
عَبْر - عِبرة - ۳۸۴ - ۱۵۴۴ -
اعتبار - ۳۸۴ - عابر - ۶۶۳ -
عبس - عبوس - ۳۴۷۵
عبقر - عبقری - ۳۲۶۷
عتب - اعتاب - استعتاب
۱۷۷۳ -
عتد - عتاد - اعتاد معتید
۳۱۳۹
عتق - عتیق - ۲۲۱۹ -
عَتُل - عتُلّ - ۳۰۳۸
عتی - عُتوّ - عِتیّ - ۱۹۷۸ -
عثر - ۸۸۵
عثو - عثی - ۸۸
عجب - اعجاب - ۲۶۳ - ۱۹۴۰ -
عُجاب - ۲۸۲۰ -
عجز - ۱۰۱۸ - ۲۲۳۶ - ۳۲۲۹ -
معجز - ۱۰۱۸ - معاجز ۲۲۳۶
عجف - اعجف - ۱۵۴۴ -
عجل - عاجلة - عجول - ۱۸۱۰ -
عجم - اعجم - ۱۵۱۶ -
اعجمی - ۲۹۴۸ -
عدّ - ۲۲۴ - اعداد - ۱۲۹۷ -
عدد - ۳۶۴۹ - عدد - ۱۲۹۷
۱۸۹۹ - معدودة - ۲۲۴ ۱۸۹۹
عِدّة - ۲۲۴ - عُدّة - ۱۲۹۷ -
عدل - ۳۶۰ - ۷۹۶ - ۹۰۱ - ۳۵۵۴
عدن - ۱۳۲۰ -
عَدو - اعتداء - ۹۴ - ۲۴۸ -
۱۴۱۳ - عدوان - ۱۰۸ - ۱۲۴
۲۴۶ - عدوّ - ۱۲۴ -
عدوة - ۱۲۳۳ - عداوة ۱۰۸ .
۱۲۴ - عاد - ۲۱۱ -
عادیات - ۳۶۴۰ -
عذب - عذاب - تعذیب
۱۹ -
عذر - اعتذار ۱۳۱۶ - ۱۳۳۳ -
عذّر - معذّر - ۱۳۳۳ -

عذر۔ عسل

عُذر۔ ۳۵۱۲۔ معاذیر۔ ۳۳۸۹۔
عزّ۔ معزّۃ۔ معتزّ۔ ۲۲۲۶۔
عَرَب۔ اعراب۔ عربیّ۔ ۱۵۱۶ و۔
۱۶۳۰۔ اَعراب۔ ۱۳۳۳۔
عُرُب۔ ۳۲۸۰۔
عرج۔ عُروج۔ اعرج۔ ۲۳۴۸۔
معارج۔ ۲۳۴۸۔ ۲۹۹۷۔ ۳۲۲۴۔
عرجن۔ عرجون۔ ۲۴۷۰
عرش۔ ۳۳۴۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۱۴۵۔
۱۳۶۸۔ ۱۴۴۴۔ ۱۵۸۷۔ ۳۳۱۴۔
معروش۔ ۱۰۲۴۔
عرض۔ ۲۸۷۔ ۵۱۷۔ ۱۱۶۲۔ ۱۲۹۵۔
۱۹۲۸۔ اعراض۔ ۱۰۶۔
تعریض۔ ۳۰۴۔ عارض۔ ۳۰۶۴۔
عریض۔ ۱۰۶۔ ۵۱۷۔ ۲۹۵۰۔
عُرضۃ۔ ۲۸۷۔
عرف۔ اعترف۔ ۱۳۴۳۔
عَرَف۔ ۲۴۷۳۔ ۳۰۷۳۔
عُرف۔ ۲۹۴۔ ۱۰۸۶۔ ۳۵۱۱۔
معروف۔ ۲۹۴۔ عرفات۔ ۲۵۶۔
عرم۔ ۲۶۸۷۔
عری۔ اعتری۔ عروۃ۔ عراء۔ ۳۳۱
۱۴۷۳۔ ۲۱۱۱۔
عزّ۔ ۱۳۶۷۔ عزز۔ ۲۹۸۔ ۱۱۶۵۔
۲۴۷۳۔ عزیز۔ ۸۳۱۔
العزیز۔ ۱۶۴۔ ۱۵۳۳۔
عزّۃ۔ ۱۶۴۔ ۲۶۵۔ ۸۳۱۔
عزّی۔ ۲۸۱۹۔ ۳۲۰۶۔
عزب۔ ۱۳۱۲۔
عزر۔ تعزیر۔ ۱۱۶۵
عزل۔ اعتزال۔ ۲۸۵۔ ۱۴۶۷۔
عزم۔ ۲۹۰۰۔ ۵۸۳۔ ۲۱۰۹۔
اولوالعزم۔ ۳۰۶۹
عزو۔ عزین۔ ۳۲۳۴۔
عسر۔ عسیر۔ ۲۴۔ ۳۲۔
عُسر۔ ۱۳۵۷۔ ۱۵۶۱۔
تعاسر۔ ۳۳۷۱۔
عسعس۔ ۳۵۵۰۔
عسل۔ ۳۰۷۸۔

عسی۔ معقب

عسی۔ ۳۱۵
عشر۔ معاشرۃ۔ ۶۳۰۔
عشیرۃ۔ ۶۳۰۔ ۱۰۱۵۔ ۲۴۴۷۔
مَعشر۔ ۱۰۱۵۔ عشیر۔ ۶۳۰۔
معشار۔ ۲۷۰۰۔ عشراء۔ ۳۵۴۹۔
عشی۔ ۲۹۹۹۔ عشیّ۔ عشاء۔ ۳۱۷
۲۵۸۴۔
عصب۔ عصیب۔ ۱۴۸۶۔
عصبۃ۔ ۱۵۱۸۔
عصر۔ اعصار۔ ۳۴۲۔ ۳۶۴۸۔
مُعصر۔ ۳۵۲۲۔
عصف۔ عاصف۔ ۱۲۸۷۔ ۱۶۴۷۔
عصم۔ ۸۵۵۔ اعتصام۔ ۴۸۸۔
استعصام۔ ۴۸۸۔ ۱۵۳۵۔
عصمۃ۔ ۳۳۳۸۔
عاصم۔ ۴۸۸۔
عصو۔ عصاء۔ ۸۸۔ ۱۱۳۱
عصی۔ عصیان۔ عصیّ۔ ۳۱۲۲۔
معصیۃ۔ ۳۸۱
عضّ۔ ۵۰۶۔ ۲۳۶۹۔
عضد۔ ۱۹۳۱۔
عضل۔ ۳۰۱۔
عضی۔ عضین۔ ۱۴۱۳۔
عطف۔ ۲۲۰۴۔
عطل۔ معطّلۃ۔ ۲۲۳۳۔
عطی۔ اعطاء۔ عطاء۔ ۳۲۱۱۔
تعاطی۔ ۳۲۳۳۔
عظم۔ عظیم۔ ۱۹۷۵۔
عف۔ تعفف۔ ۳۴۹۔
استعفاف۔ ۶۱۰۔
عفر۔ عفریت۔ ۲۴۷۱۔
عفی۔ ۷۵ و۔ ۲۸۲۔ ۳۶۴۔ ۱۱۹۴۔
عَقِب۔ ۵۲۸۔ ۲۹۹۲۔
اعقب۔ ۲۹۹۲۔
عاقب۔ ۱۶۱۴۔ ۲۲۴۰۔ ۳۳۳۹
عاقبۃ۔ ۱۶۱۴۔ عُقب۔ عُقبی
۱۶۱۴۔ ۱۹۲۴
عقاب۔ ۱۶۱۴۔ ۱۸۰۰۔
معقب۔ ۱۶۰۵۔ عقبۃ۔ ۳۶۰۴

عقد۔ عنت

عقد۔ ۶۴۹۔ ۷۷۹۔ ۸۷۰۔
عَقّد۔ عاقد۔ ۸۷۰۔
عقدۃ۔ ۳۰۶۔ ۳۶۶۵۔
عقر۔ عاقر۔ ۴۱۶۔ ۱۱۱۲۔
عقل۔ ۶۷۔
عقم۔ عقیم۔ ۲۲۳۸۔
عکف۔ عاکف۔ ۱۵۹۔ ۲۳۶۔
معکوف۔ ۳۱۱۰۔
علق۔ علقۃ۔ ۲۲۰۰۔ ۳۶۲۴۔
معلّقۃ۔ ۷۴۳
علم۔ ۴۴۔ ۱۲۳۔ ۱۵۲۔ ۱۷۹۔ ۲۸۳۔
۳۲۹ و۔ ۵۲۴۔ ۱۹۰۰۔
علّم۔ ۱۶۴۔ ۴۲۸۔ اعلم۔ ۱۶۴۔
عالِم۔ علیم۔ علّام۔ ۴۴۔
عالَم۔ ۲۔ عَلَم۔ ۲۹۷۱۔
مُعلّم۔ ۳۰۲۸۔
علن۔ اعلان۔ ۳۴۳۶۔
علوّ۔ علا۔ تعالی۔ متعالی۔ عَلیّ
۱۶۰۳۔ استعلاء۔ ۲۰۸۱۔
تعال۔ ۵۴۳۔ عالی۔ ۱۴۹۱۔ ۳۵۰۸۔
العلی۔ العالی۔ المتعالی۔ الاعلی
۳۵۸۲۔ عُلی۔ ۲۰۴۴ و۔
علّیون۔ ۳۵۶۲۔ عُلی۔ ۱۶۹۰۔
۲۴۶۷۔ ۲۸۸۵۔ علی۔ عینی۔ ۲۶۴۲
عمّ۔ عمۃ۔ ۶۳۴۔
عمد۔ تعمّد۔ عمود۔ ۱۵۹۶۔
عماد۔ ۳۵۹۲
عمر۔ ۱۲۱۔ ۱۹۸۔ ۱۴۰۲۔ تعمیر۔ ۱۲۱
عُمرۃ۔ اعتمار۔ ۱۹۸۔ عمارۃ۔ ۱۲۱۔
۱۹۸۔ ۱۲۷۳۔ عمران۔ ۳۰۵۔
عمق۔ عمیق۔ ۲۲۱۷۔
عمل۔ عامل۔ ۲۰۵۔ ۵۲۰۔
عمہ۔ ۲۸۔
عمی۔ ۲۸۔ ۳۰ و۔ ۱۴۵۷۔ ۲۵۳۲۔
اعمی۔ ۱۴۵۷۔ ۱۸۵۹۔
عن۔ ۲۸۳۸
عنب۔ ۳۴۲۔
عنت۔ ۲۸۳۔ ۱۳۶۷۔ ۲۱۰۵۔
معانتۃ۔ ۲۸۳۔

عند۔

عند۔ ۴۱۲۔ ۶۹۸۔ عندن۔ ۱۴۷۶۔
عنز۔ ۱۰۲۶۔
عنق۔ ۲۳۰۳
عنکبوت۔ ۲۵۶۱۔
عنو۔ عنا۔ ۲۱۰۵۔
عوج۔ ۲۸۶۔ ۱۰۸۴۔ ۲۱۰۲۔
عود۔ عید۔ ۸۹۲۔ ۱۱۲۲۔
معاد۔ ۲۵۴۲
عوذ۔ اعاذۃ۔ ۴۱۰۔
عور۔ عورۃ۔ ۲۳۲۴۔ ۲۶۳۵۔
عوق۔ معوّق۔ یعوق۔ ۲۶۳۸۔
عول۔ ۶۰۶۔
عوم۔ عام۔ ۱۵۴۹۔
عون۔ عوان۔ ۹۶ و۔
استعانۃ۔ ۲۔
عہد۔ ۴۲۔ ۱۵۹۔
عہن۔ ۳۴۲۸۔
عیّ۔ اعیاء۔ ۳۰۶۸۔
عیب
عیر۔ ۱۵۶۵۔
عیسی۔ ۱۱۱۔
عیش۔ معیشۃ۔ عیشۃ۔ ۱۰۵۱۔
عیل۔ عیلۃ۔ عائل۔ ۱۲۸۸۔
عین۔ ۸۸۔ ۱۴۶۳۔ ۱۹۵۵۔
عِین۔ ۲۷۸۵۔ ۳۰۴۰۔
معین۔ ۲۲۷۱۔

باب الغین

غبر۔ غابر۔ غبرۃ۔ ۱۱۱۷۔
غبط۔ ۱۴۱۰۔
غبن۔ تغابن۔ ۳۳۶۳۔
غثو۔ غثاء۔ ۲۲۶۸۔
غدر۔ غادر۔ ۱۹۲۷۔
غدق۔ ۳۴۵۰۔
غدو۔ غدوۃ۔ غد۔ ۵۰۸۔ ۱۳۰۰۔ ۱۹۰۹
غداء۔ ۵۰۸۔
غرّ۔ غرور۔ ۳۹۵۔ ۵۸۲۔ ۲۶۱۳۔
غرب۔ غریب۔ غراب۔ ۸۱۶۔
مغرب ۱۹۵۵
غربیب۔ ۲۷۲۱۔

غرف - غمر

غرف - غرفة -۳۱۸-
غرق - اغراق - ۳۵۳۲-
غرم - عارم - غرام - ۱۳۳۹
غرو - اغراء -۸۰۰-۲۶۷۳-
غزل -۱۷۷۹-
غزو - غاز - ۵۴۹-
غسق - غاسق - ۱۸۶۵-۲۸۵۴-
غساق -۲۸۵۴-۳۵۲۴-
غسل - اغتسال - مغتسل غسلین
-۲۸۴۷
غشی -۱۸-۱۱۸۸-۳۰۸۳-
اغشاء -۳۷۳۴- استغشاء ۱۴۴۲
غاشیة - ۱۰۸۱-۳۵۸۷-
غشاوة - ۱۸- مغشی -۳۰۸۳-
غص - غصة - ۳۴۶۴-
غصب - ۱۹۵۰-
غضن - ۲۳۲۱-
غضب - ۷
غطش - اغطش -۳۵۳۸-
غطو - غطاء - ۳۱۴۲-
غفر -۲۵۸-۲۸۴-۳۶۶۶-
استغفار -۲۵۸- ۳۸۸- ۳۶۶۱
غافر - غفار - غفور -۲۵۸-
مغفرة -۲۸۴-۳۳۸-
غفل - غفلة - ۱۵۱۶ب
غافل - ۲۳۱۶-
غل -۵۵۴- ۸۵۰-۱۰۸۲-۱۱۶۵
-۱۵۹۹
غلب - اغلب -۳۵۴۶-
غلظ - ۱۳۲۱- غلیظ -۵۵۱-
۶۳۲- ۳۳۸۰
غلف - اغلف - ۱۱۳
غلق - غلق -۱۵۳۰-
غلم - غلام - ۴۱۶- ۱۹۴۷-
غلمان - ۳۱۷۸-
غلو - غلو - غلی -۳۷۷-
غم - ۸۰- ۵۴۴- غمة -۱۴۱۹-
غمام - ۸۰-
غمر - غمرات -۹۸۴-

غمز - فج

غمز - تغامز - ۳۵۶۵
غمض - اغماض - ۳۴۳-
غنم - مغنم - ۷۱۷-۱۲۳۱-
غنی - اغنی - غنی -۳۸۰-۱۳۸۸-
غوث - غیث - استغاثة - ۱۲۰۸
اغاث -۱۵۴۹-
غور - غار - مغار -۱۲۹۳-
اغار - مغیرة -۳۶۴۰-
غوص - غواص - ۷۶- ۲۱-
غوط - غائط - ۶۶۴-
غول - ۷۷۸۴-
غوی - ۱۶۸۹- ۲۱۱۳-
اغواء -۱۰۵۸-۱۴۶۰-۱۶۸۹-
۲۰۱۵- غی -۳۳۰-۱۰۵۸-۲۰۱۵
-۳۱۹۳
غیب - ۱۱- ۴۲۱- اغتیاب - غیبة
۳۱۲۵- غیابة -۱۵۲۰-
غائبة -۲۴۸۸-
غیر - تغییر -۳۰۷۸-
غیض - غاض - ۱۴۶۸-
غیظ - ۵۰۶- ۵۱۸-

باب الفاء

فأ - فؤاد - ۱۰۰۰-
فتئ - ۱۵۷۷-
فتح -۱۰۱- ۱۱۲۴- استفتاح -۱۱۴
۱۶۴۴- مفتح -۹۵۴-
فتر - فترة -۸۰۴- فتور -۸۰۴-۳۴۱
فتق - ۲۱۴۸-
فتل - فتیل -۶۶۹-
فتن - ۲۴۳- ۸۳۷- ۹۵۰- ۱۸۶۰-
۲۵۴۵- فتنة ۲۴۳-۲۴۶-۲۷۶
۳۷۶- ۸۵۹- ۹۲۴- ۱۴۲۴-
۲۱۵۳- فتون -۳۰۶۳-
فاتن -۲۸۱۰- مفتون -۳۳۹۹
فتی - افتاء - استفتاء -۷۴۱
فتی - فتاة -۶۳۹-
فتیة -۱۸۹۸-
فج - فجاج -۲۱۴۹

فجر - فشل

فجر - انفجار - تفجیر - ۸۸-
فاجر - ۸۸- ۲۸۳۶ -
فجور - ۸۸- ۳۴۸۹-
فجو - فجوة - ۱۹۰۴-
فحش - فاحشة - ۲۰۶ و ۵۱۹-
۶۲۴- ۶۲۹- فحشاء ۲۰۶ و ۳۴۴-
فخر - فخور -۶۵۶- ۱۴۴۶-
فخار -۱۶۸۵- ۳۲۴۴-
فدی - فدیة - فداء - ۱۰۸- ۲۲۶-
فر - فرار - مفر - ۳۱۶۹-
فرت - فرات - ۲۳۸۶-
فرج - ۲۲۵۲- ۳۱۲۳- ۳۵۱۳-
فرح - ۱۴۴۶-
فرد - فرید - ۹۸۵-
فردس - فردوس - ۱۹۷۰-
فرش - فراش - ۳۴- ۱۰۲۵-۳۶۴۴
فرض - ۹۶ و ۲۵۳- ۳۰۵-
فارض - ۹۶ و - فریضة - ۳۰۵ -
فرط - افراط - ۹۳۱- ۱۹۱۳- ۱۷۵۵-
۲۰۶۷- تفریط - ۹۳۱-
فرع - ۱۶۵۱-
فرعون - ۷۲ -
فرغ - افراغ -۳۲۰-۳۲۵۰-
فارغ - ۲۵۰۲-
فرق - ۷۳- ۸۱۰- ۱۳۰۶- ۱۸۸۷-
تفریق - ۱۷۱- تفرق - ۴۹۰-
فریق - فرقة -۲۴۱۶-
فرقان - ۷۶ - ۳۷۱- ۲۱۶۲-
فره - فاره - ۲۴۳۱-
فری - افتراء - ۳۹۵-
فری - ۱۹۹۴-
فز - استفز - ۱۸۵۲-
فزع - تفزیع - ۲۱۹۱-
فسح - تفسح - ۳۳۱۱-
فسد - فساد - ۲۴-
فسر - تفسیر - ۲۳۷۲-
فسق - فاسق - ۴۱- ۱۲۵-
فسوق - ۲۵۳-
فشل - ۵۰۹-

فصح - فوہ

فصح - فصیح - ۲۵۱۶-
فصل - ۹۵۳- ۱۰۰۴- ۲۸۳۱-
تفصیل - ۴۰۰۱- فصال -۳۰۲-
فصیلة - ۳۴۲۹
فصم - انفصام - ۳۳۱-
فض - انفض - ۵۵۱-
فضة - ۲۹۹۷- ۳۵۰۶
فضح - ۱۷۰۰-
فضل - ۱۳۷ و - ۲۵۵- ۳۰۶-
تفضیل -۳۲۴- تفضل - ۲۲۵۹-
فضی - افضی - ۶۳۲-
فطر - ۹۱۳- ۲۵۹۱- تفطر - ۲۰۳۷-
فاطر - فطرة - ۹۱۳- ۲۵۹۱-
فطور - ۹۱۳- ۳۳۸۷-
فظ - ۵۵۱-
فعل - ۶۶۷- مفعول - ۶۶۷- ۱۲۳۳-
فقد - تفقد - ۲۴۶۱-
فقر - فقیر - ۶۱- فاقرة - ۳۴۹۴-
فقع - فاقع - ۹۶ب
فقه - تفقه - ۹۲۶- ۱۳۶۲-
فك - انفك - ۳۶۰۵- ۳۶۲۳-
فكر - تفكر - ۵۸۸-
فكه - تفكه - فاكهة - فاكه - فكه
-۲۷۵۴
فلح - افلح - ۱۶- ۲۲۴۸ و -
فلق - ۷۳ - ۹۱۶ - انفلق - ۲۴۱۶-
فلك - ۲۰۲- فلك - ۲۱۵۰-
فلن - فلان
فن - افنان - ۳۲۵۷-
فند - تفنید - ۱۵۸۶-
فنی - فان - ۳۲۴۸-
فوت - ۵۴۴- تفاوت - ۳۳۸۷-
فوج - ۲۴۹۳-
فور - فار - ۵۱۱- ۱۴۶۵-
فوز - مفازة - ۵۸۲ -
فوض - تفویض - ۲۹۱۱-
فوق - ۴۴۷- افاق - فواق - ۲۸۲۷-
فوم - ۸۹-
فوہ - فم - ۵۰۵-

فہم ۔ قدم

فہم۔
فی ۔ ۲۹۶۵ - ۳۱۲۲ -
فیٔ ۔ ۸۰ - ۶۷۶ - ۱۲۰۲ - ۱۷۴۴ - ۲۶۶۳ -
فاء ۲۸۹ - ۱۷۴۴ -
افاء ۔ ۲۶۶۳ - ۳۳۱۹ -
تفیؤ ۔ ۱۷۴۴ ۔ فئة ۔ ۳۱۹ ۔
فیض ۔ فاض ۔ افاض ۔ ۲۵۶ - ۱۳۳۵ -
۱۴۱۲ -
فیل ۔ ۳۶۵۱ -

باب القاف

ق ۔ ۳۱۲۹ -
قبح ۔ مقبوح ۔ ۲۵۱۹ ۔
قبر ۔ اقبر ۔ مقبرة ۔ ۳۵۴۵ ۔
قبس ۔ اقتباس ۔ ۲۰۴۸ ۔
قبض ۔ ۳۱۴ ۔ ۱۳۱۷ - ۲۳۷۹ -
قبضة ۔ ۳۰۹۶ - ۲۸۸۹ -
قبل ۔ ۱۹۲ ۔ ۱۰۰۱ - ۲۴۶۹ -
اقبال ۔ ۱۵۶۶ ۔ استقبال ۔ ۳۰۶۴ ۔
تقبّل ۔ ۱۶۲ ۔ ۳۱۱ ۔ تقابل ۔ ۸۱ - ۲۷ ۔
قبلة ۔ ۱۷۷ ۔ ۱۴۲۵ -
قبیلة ۔ ۱۰۶۷ ۔ ۳۱۲۶ -
قبیل ۔ ۱۸۷۷ ۔ قبول ۔ ۴۱۱ ۔
قتر ۔ مقتر ۔ قتور ۔ ۳۰۵ ۔ ۱۳۹۰ ۔
قتل ۔ ۷۷ ۔ ۹۱ ۔ ۹۸ - ۶۶۲ -
مقاتلة ۔ ۲۴۱ ۔ ۳۲۷ - ۱۲۸۳ -
اقتتال ۔ ۳۲۷ -
قثاء ۔
قحم ۔ اقتحم ۔ ۲۸۵۵ -
قدّ ۔ قدّ ۔ قدّة ۔ ۳۳۳۷ -
قدح ۔ ۳۶۴۰
قدر ۔ ۱۴۹ و ۹۸۱ - ۹۸۷ - ۲۰۶۳ -
۲۱۸۰ - ۲۶۵۷ -
لیلة القدر ۔ ۳۶۲۹ ۔ تقدیر ۔ ۹۸۷ ۔
۲۳۵۲ ۔ مقتدر ۱۹۲۵ ۔ قادر ۔ قدیر ۳۲
مقدور ۔ ۲۶۵۷ ۔ قدر ۔ ۲۶۸۴ ۔
قدس ۔ تقدیس ۔ ۷۷ ۔ ۸۰۶ ۔
القدوس ۔ ۳۳۳۰ -
قدم ۔ ۱۳۷۱ ۔ ۳۱۱۷ ۔ ۳۱۴۶ -
تقدّم ۔ تقدیم ۔ ۳۱۱۷ ۔

مستقدم ۔ قصر

مستقدم ۔ ۱۶۸۴ ۔ قدیم ۔ ۲۷۴۷ ۔
قدو ۔ اقتداء ۔ ۹۸۰ ۔
قذف ۔ ۲۰۶۲ ۔ ۲۷۰۳ ۔ ۲۷۷۴ ۔
قرّ ۔ ۹۶۰ ۔ ۱۹۹۳ ۔ قرار ۔ ۹۶۰ ۔ ۲۷۷۱
مستقر ۔ ۹۶۰ ۔ ۹۸۹ ۔ ۱۴۳۳ ۔
قُرّة ۔ ۹۶۰ ۔ ۱۹۹۳ ۔ ۳۲۲۳
قارورة ۔ ۲۴۷۶ ۔
قرأ ۔ قرآن ۔ ۲۲۸ ۔ قروء ۔ ۲۹۱ ۔
قرب ۔ ذوی القربی ۔ ۱۰۶ ۔
قریب ۔ مقرب ۔ ۲۳۱ ۔
قربة ۔ ۱۳۴۰ ۔ قربان ۔ ۵۷۹ ۔ ۸۱۲ ۔
قرح ۔ ۵۲۴ ۔
قردة ۔ ۹۴ ۔ ۸۴۷ ۔
قرش ۔ قریش ۔ ۳۶۵۳ ۔
قرض ۔ ۳۱۴ ۔ ۱۹۰۴ ۔
قرطس ۔ قرطاس ۔ ۹۱۸ ۔
قرع ۔ قارعة ۔ ۱۶۲۵ ۔ ۳۶۴۳ ۔
قرف ۔ اقتراف ۔ ۱۰۰۳ ۔
قرن ۔ ۹۰۶ ۔ ۱۶۶۸ ۔ قرّن ۔ مقرّن
۱۶۶۸ ۔ ۲۳۵۸ ۔
اقترن ۔ ۹۰۶ ۔ ۱۶۶۸ ۔ ۳۰۰۹ ۔
اُقرن ۔ ۲۹۸۴ ۔ قرین ۔ ۶۵۸ ۔ ۱۶۶۸
۲۹۸۹ ۔ ذوالقرنین ۔ ۱۹۵۳ ۔
قری قریة ۔ ۸۳ ۔
قسّ ۔ قسّیس ۔ ۸۶۷ ۔
قسر ۔ قسورة ۔ ۳۴۸۱ ۔
قِسط ۔ ۱۰۷۰ ۔ اقسط ۔ مُقسط ۔
قاسط ۔ ۳۸۹ ۔ قسطاس ۔ ۱۸۳۰ ۔
قسم ۔ استقسام ۔ ۷۸۵ ۔
قاسم ۔ ۱۰۶۳ ۔ اقسم ۔ تقاسم ۔ مقتسم
قِسمة ۔ ۱۷۱۲ ۔
قسی ۔ قسوة ۔ ۹۹ ۔ ۷۹۹ ۔
قاسیة ۔ ۷۹۹ ۔ ۲۸۷۳ ۔
قشعر ۔ اقشعرار ۔ ۲۸۷۴ ۔
قصّ ۔ قصص ۔ ۲۱۹ ۔ ۲۵۴ ۔ ۱۵۱۶ ۔ ب
قصاص ۔ ۲۱۶ ۔
قصد ۔ اقتصاد ۔ قاصد ۔ ۸۵۴ ۔
۱۷۲۲ ۔
قصر ۔ ۷۲۲ ۔ ۱۱۹۷ ۔ ۲۷۸۵ ۔ ۳۵۱۷ ۔

تقصیر ۔ قمع

تقصیر ۔ مقصور ۔ قاصرات
الطرف ۔ ۲۷۸۵ ۔ اقصر ۔ ۱۱۹۷ ۔
قصف ۔ قاصف ۔ ۱۸۵۶ ۔
قصم ۔ ۲۱۳۴ ۔
قصو ۔ اقصی ۔ قصّی ۔ ۱۲۳۳ ۔ ۱۸۰۱
قض ۔ انقض ۔
قضب ۔ ۳۵۴۶ ۔
قضی ۔ ۱۴۹ و ۱۴۱۹ ۔ ۱۶۹۹ ۔ ۱۸۰۴
۲۲۱۹ ۔ قاضیة ۔ ۲۵۰۴ ۔ ۳۱۸
قطّ ۔ ۲۸۲۸ ۔
قطر ۔ قطران ۔ اقطار ۔ ۱۶۶۹ ۔ ۱۹۶۳
قطع ۔ ۵۱۳ ۔ ۱۳۵۱ ۔ ۱۳۶۱ ۔ ۱۵۹۸ ۔
۲۲۰۷ ۔ قطعة ۔ ۱۵۹۸ ۔
قطف ۔ ۳۴۱۷ ۔
قطمیر ۔ ۲۷۱۵ ۔
قطن ۔ یقطین ۔ ۲۸۰۷ ۔
قعد ۔ قاعد ۔ ۵۶۴ ۔ ۲۳۴۷ ۔
قاعدة ۔ ۱۶۲ ۔ قعود ۔ ۱۰۵۸ ۔
۳۱۳۸ ۔ مقعد ۔ ۵۰۸ ۔
تعید ۔ ۳۱۳۸ ۔
قعر ۔ منقعر ۔ ۳۲۲۹ ۔
قفل ۔ ۳۰۸۷ ۔
قفو ۔ قفا ۔ اقتفاء ۔ ۱۱۰ ۔ ۱۸۳۱ ۔
قلّ ۔ قِلّة ۔ اقلّ ۔ ۱۰۹۹ ۔
قلب ۔ ۱۲۳ ۔ ۱۰۰۰ ۔ ۱۴۰۹ ۔ ۳۱۵۱ ۔
تقلب ۔ ۱۸۱ ۔ ۵۹۴ ۔ ۲۴۴۹ ۔
تقلیب ۔ ۱۰۰۰ ۔
انقلاب ۔ ۵۲۸ ۔
متقلّب ۔ ۳۰۸۲ ۔
تقلیب الامور ۔ ۱۲۹۹ ۔
قلد ۔ قلادة ۔ ۷۸۱ ۔ مقالید ۲۸۸۷
قلع ۔ اقلع ۔ ۱۴۶۸ ۔
قلم ۔ ۴۲۲ ۔
قلی ۔ ۲۴۳۵ ۔
قمح ۔ مقمح ۔ ۲۷۳۳ ۔
قمر ۔ ۲۳۹۱ ۔
قمص ۔ قمیص ۔
قمطر ۔ قمطریر ۔ ۳۵۰۴ ۔
قمع ۔ مقمع ۔ ۲۲۱۲ ۔

قمل ۔ کبر

قُمّل ۔ ۱۱۴۳ ۔
قنت ۔ قانت ۔ ۱۴۸ ۔ ۳۸۸ ۔ ۶۵۱ ۔
قنط ۔ قانط ۔ قنوط ۔ ۱۶۹۵ ۔
قنطر ۔ قنطار ۔ ۳۸۵ ۔
قنع ۔ قانع ۔ مُقنع ۔ ۱۶۶۲ ۔ ۲۲۲۶
قنو ۔ ۹۹۰ ۔
قنی ۔ اقنی ۔ ۳۴۱۶
قوب ۔ قاب ۔ ۳۱۹۹ ۔
قوت ۔ مقیت ۔ ۷۰۶ ۔ ۱۲۴۷ ۔
قوس ۔ ۳۱۹۹ ۔
قوع ۔ قاع ۔ ۲۱۰۲ ۔
قول ۔ قال ۔ ۳۵ ۔ ۲۰۶ و ۷۷۳ ۔ ۱۱۷۲
۲۰۹۷ ۔ ۳۱۴۶ ۔ تقوّل ۔ ۳۱۸۱ ۔
قیل ۔ ۳۰۲۴ ۔ قال (قیل) ۱۰۴۸ ۔
مقیل ۔ ۲۳۶۶ ۔
قَوم ۔ ۷۷ ۔ قیام ۔ ۵۰۱ ۔ ۷۴۶ ۔ ۷۹۳ ۔
۸۷۷ ۔ قیامة ۔ ۱۰۸ ۔ اقامة ۔ ۱۲ ۔
۱۷۰۵ ۔ قوام ۔ ۶۰۸
استقامة ۔ ۱۵۰۹ ۔
قائم ۔ ۳۸۹ ۔ ۵۰۱ ۔ ۱۶۲۷ ۔
قویم ۔ ۶۵۰ ۔ ۷۴۹ ۔ ۷۹۵ ۔
اقوم ۔ ۶۶۶ ۔ قیوم ۔ ۳۲۹ ۔
قیّم ۔ ۱۸۹۲ ۔ مستقیم ۔ ۵
مقام ۔ ۱۴۱۹ ۔ ۱۶۴۳ ۔ ۳۲۵۶ ۔
مقیم ۔ ۱۷۰۵ ۔ تقویم ۔ ۳۶۲۲ ۔
قوی ۔ قوّة ۔ مقوی ۔ ۳۱۹۵ ۔
قہر ۔ القاهر ۔ القهار ۔ ۹۱۷ ۔
قیض ۔ قیّض ۔ ۲۹۳۷ ۔ ۲۹۹۹ ۔

باب الکاف

ک ۔ ۳۳۷ ۔ کما ۔ ۳۶۰ ۔
کهیعص ۔ ۱۹۷۳ ۔
کأس ۔ ۲۷۸۲ ۔
کبّ ۔ مُکبّ ۔ کبکبة ۔ ۳۴۲۲ ۔
۳۳۹۵ ۔
کبت ۔ ۵۱۳
کبد ۔ ۳۶۰۱ ۔
کبر ۔ ۵۳ ۔ ۹۸ ۔ ۲۷۶ ۔ ۴۱۴ ۔ ۱۶۰۳ ۔
۳۴۸۰ ۔ تکبر ۔ استکبار ۔ ۵۲ ۔
اکبر ۔ ۱۵۳۴ ۔ کبیر ۔ کبیرة ۔ ۸۰ ۔

کتب - کمث

۲۷۶-۶۲۶-۱۰۱۱-۱۹۲۹-
الکبیر-المتکبر-اکبر-کبریاء-۵۳-
۱۶۰۳-کبار-۳۴۳۹-
کتب-کتاب-۹-۱۵۳-۲۱۶-۳۰۴-۳۴۸
۵۲۹-۹۵۴-۱۱۵۳-۱۴۱۲-۱۶۳۱-
مکاتبۃ-۲۳۲۷-اکتتاب-۲۳۵۴
کتم-۵۱-کتمان-۱۹۹-
کثب-کثیب-۳۴۶۵-
کثر-استکثار-کثرۃ-۳۳۰۰-
تکاثر-۳۲۰۰-۳۶۴۶-
کوثر-۳۳۰۰-۳۶۵۷-
کدح-۳۵۶۸-
کدر-انکدر-۳۵۴۹-
کدی-اکدی-۳۲۱۱-
کذب-۲۳-تکذیب-۶۰-۵۲۱-
کاذبۃ-۳۳۶۸-
کذّاب-۳۵۲۵-
کرّ-کرّۃ-۱۸۰۶-
کرب-۹۵۸-
کرس-کرسیّ-۳۲۹ب
کرم-۶۴۷-کریم-۶۴۷-۲۴۰۴-
۳۲۸۱-۳۲۸۶-
اکرام-تکریم-مکرم-۱۸۵۰-
کرہ-۲۷۵-۴۷۳-۱۶۰۹-۲۹۳۰۰-
اکراہ-۳۳۰-
کسب-۳۴۳-اکتسب-۳۶۴-
کسد
کسف-کسفۃ-۱۸۷۷-
کسل-کسلان-۷۵۲-
کسوۃ-۳۳۴-
کشط-۳۵۴۹-
کشف-کاشف-۹۱۶-
کشف عن الساق-۲۴۷۶-۳۴۰۶
کظم-۵۱۸-
کعب-کعبۃ-۸۷۷-
کاعب-۳۵۲۷-
کفّ-۷۹۷-۸۸۸-کافۃ-۲۶۷-
۲۶۹۵-
کمث-۳۶۶۴-

کفت - کیف

کفت-کفات-۳۵۱۵-
کفر-۱۷-۳۳۱-۳۴۷-۵۰۲-۲۱۸۴
تکفیر-۳۴۷-کافر-۱۷-۲۴۰۹-
کوافر-۳۳۳۳-کفّار-۳۵۳-۱۹۵۶
کفور-۳۵۳-۲۱۸۴-کافور-۳۵۰۱
کفران-۲۱۸۴-کفارۃ-۳۴۷-۸۷۰
کفل-کفیل-۷۰۶-کفّل-۳۱۱-
ذوالکفل-۲۱۷۹-
کفی-۱۷۲-
کلّ-۶۲۱-۱۷۶۶-کلالۃ-۶۲۱-۷۷۸
کُلّ-۱۷۶۶-کلّما-۴۱۲-کلّا-۲۲۹۷
کلاء-۲۱۵۶-
کلب-مکلّب-۷۸۹-۱۹۰۸-
کلح-کالح-۲۹۹۹-
کلف-کلّف-۳۶۴-تکلّف-۲۸۶۱
کلم-تکلیم-۲۴۹۲-تکلّم-۲۵۹۴
کلمۃ-۵۷-۱۵۵-۴۱۵-۴۲۳-
۱۹۷۱-کلام-۱۰۰-۳۲۵-
کمّ-اکمام-۲۹۴۹-
کمل-اکمال-کامل-۷۸۷-
کمہ-اکمہ-۴۳۳-
کنّ-اکنان-اکنّۃ-مکنون-۳۰۴-
کند-کنود-۳۶۴۱-
کنز-۱۴۴۷-
کنس-کانس-۳۵۵۰-
کوب-۳۰۱۹
کود-کاد-۹۷-۱۵۷۰-
کور-تکویر-۲۸۶۴-
کوکب-۱۵۱۶ج
کون-کان-۲۷۲-۴۹۷-
مکانۃ-۱۰۱۹
کوی-۱۲۸۸-
کہف-۱۸۹۷-
کہل-۴۲۶-
کہن-کاہن-۳۱۷۹-
کیٔ-
کید-۵۰۷-۲۱۶۵-۳۱۸۷-
مکید-۳۱۸۷-
کیف-۳۹۶-

کیل - لفت

کیل-اکتیال-۱۱۲-۱۵۵۷-۱۵۵۹

باب اللام

ل-۴۳۱-۵۴۹-۵۷۳-۲۰۶۴-
۳۱۷۳ لِ-لئلا-۳۳۰۵-
لاء لاء-لؤلؤ-۳۱۷۸-
لُبّ-۳۴۵-
لبث-تلبّث-۲۶۳۶-
لبد-۳۴۵۲-
لبس-۶۵-۹۰۹-۹۵۹-۱۰۲۱-
۲۱۷۴-لباس-۲۳-۱۰۶۶-
۱۷۹۲-لبوس-۲۱۷۴-
لبن-۳۰۷۸-
لجّ-لجّہ-لجّیّ-۲۲۸۸-۲۴۷۶-
لجاء-التجاء-۱۳۰۷-
لحد-الحاد-۱۱۸۱-۱۷۸۶-۱۹۱۲-
۲۲۱۵-۲۹۴۵-
ملتحد-۱۹۱۲-۳۴۵۳-
لحف-الحاف-۳۴۹-
لحق-الحق-۳۱۷۶
لحم-۳۱۲۵
لحن-۳۰۹۱-
لُدّ-الدّ-۲۶۳
لدن-۲۹۸۱
لدی-۲۹۸۱-
لذّ-لذّۃ-۲۷۸۳-
لزب-لازب-۲۷۷۶
لزم-۱۴۵۷-
لسن-لسان-۲۰۰۸-
لطف-تلطّف-لطیف-۹۹۴-
۱۹۰۶-
لظی-تلظّی-۳۴۳۰-
لعب-۸۴۵-۹۳۲-۲۱۳۸-
لعلّ-۱۴۲۷-
لعن-لعنۃ-۱۱۳
لغب-لغوب-۲۴۲۷-
لغو-لاغیۃ-۲۸۸-۲۲۵۰-۲۹۳۸
لف-لفیف-الفاف-۱۸۸۶-
لفت-التفات-۱۲۲۱-۱۴۹۰

لفح -

لفح-۲۲۹۹
لفظ-۳۱۳۹-
لغو-۲۷۸۸-
لقب-۳۱۲۴-
لقح-لاقح-۱۶۸۲-
لقط-التقاط-۱۵۲۰-
لقف-۱۱۳۶-
لقم-التقم-۲۸۰۵
لقمان-۲۶۰۴
لقی-لقاء-۵۷-۶۹-القاء-۲۰۹۴-
تلقّی-۴۱۰-۲۹-یوم التلاق-۲۹۰۱-
تلقّی-۵۷-
لکنّ-۳۱۹۱-
لَمّ-۱۵۰۸-لمم-۳۲۱۰-
لَما-۴۷۲-لمّا-۵۲۶-۱۵۰۸-
لمح-۱۴۶۷-
لمز-لمزۃ-۱۳۰۸-۲۲۹۵-
۳۱۲۴-۳۶۴۹-
لمس-۳۴۴۵-لامس-۲۳۶-۶۶۴
لَن-
لو-۳۲-۳۱۲۲-لولا-۳۱۲۲-
۳۲۸۵-
لا-۶۸۴-۳۱۲۴-۳۲۸۵-۳۴۸۴
۳۶۶۰-لات-لیت-۲۸۱۹-
لوح-۳۲۲۷-لوّاحۃ-۳۴۷۸-
لوح محفوظ-۳۵۷۵-
لوذ-لواذ-۲۳۵۰-
لوط-
لوم-لائم-ملوم-ملیم-۱۸۲۶
۲۸۰۵-لوّامۃ-۳۴۸۴-
لون-۱۴۲۳-
لوی-لوّی-۴۶۹-۵۴۳-۷۴۶-
۳۳۵۸-
لہب-۳۵۱۷-ابولہب-۳۶۶۲-
لہث-۱۱۷۸-
لہم-الہام-۳۶۰۸
لہو-۹۳۳-۲۱۳۹-۲۶۰۳-
الہا-۳۳۶۰-
لیت-لات-الات-۲۸۱۹-۳۲۰۶

اس فہرست میں حوالجات نوٹوں کے ہیں۔

لیس ۔ مــرد

لیس۔
لیل ۔۷۴۔
لین۔۵۵۱۔ الان۔۲۶۸۱۔
لیّن۔۲۰۶۶۔ لینۃ۔۳۳۱۸۔

باب المیم

مأتہ
متع ۔ متاع ۔ ۱۶۱ ۔ ۳۰۵ ۔ ۶۳۷۔
استمتاع ۔ ۶۳۷ ۔ تمتّع ۔ ۲۵۲۔
متن ۔ متین ۔ ۱۱۸۴۔
متیٰ ۔ ۲۹۴۹۔
مثل ۔ ۳۰ ۔ ۲۷۴ ۔ ۳۵۲ ۔ ۱۶۲۸۔
۱۷۵۴ ۔ ۱۷۶۴ ۔ ۱۸۷۵ ۔ ۲۳۷۴۔
۲۹۵۷ ۔ ۲۹۸۳ ۔ ۲۹۸۶ ۔ ۳۰۱۱۔
۳۰۱۴ ۔ تمثّل ۔ ۱۹۸۴۔
مُثلیٰ ۔ ۲۰۸۰ ۔ مُثلۃ ۔ ۱۶۰۰۔
تمثال ۔ ۲۱۶۴۔
مجد ۔ مجید ۔ ۳۱۲۹۔
مجس ۔ مجوس ۔ ۲۲۰۸۔
محص ۔ ۵۲۵۔
محق ۔ ۳۵۳ ۔ ۵۲۵۔
محل ۔ محال ۔ ۱۶۰۷۔
محن ۔ امتحان ۔ ۳۱۱۹۔
محو ۔ ۱۸۱۱۔
مخر ۔ ماخرۃ ۔ ۱۷۲۴۔
مخض ۔ مخاض ۔ ۱۹۹۰
مدّ ۔ ۲۸ ۔ ۱۷۱۱ ۔ امداد ۔ ۱۱۹۷۔
مُدۃ ۔ ۱۷۱۱ ۔ ۱۹۷۱۔
مِداد ۔ ۱۹۷۱۔
مدن ۔ مدینۃ ۔ ۱۵۳۳۔
مرّ ۔ مُرّۃ ۔ مِرّۃ ۔ ۳۱۹۶۔
مستمر ۔ ۳۲۲۲ ۔ مُرّ ۔ ۳۲۳۵
مرأ ۔ مِرئ ۔ ۶۰۷ ۔ امرء ۔ امرأۃ
۳۱۷۶۔
مرت ۔ ماروت ۔ ۱۳۰۔
مرج ۔ مارج ۔ مرجان ۔ ۲۳۸۶۔
مریج ۔ ۳۱۳۲
مرح ۔ ۱۸۳۲ ۔ ۲۹۲۱۔
مرد ۔ مارد ۔ مرید ۔ ۷۳۴ ۔ ۱۳۳۴۔

ممرّد ۔ مــلاء

ممرّد ۔ ۲۴۷۶۔
مرض ۔ مریض ۔ ۲۲ ۔ ۲۲۵
مرو ۔ مَروۃ ۔ ۱۹۷
مری ۔ مریۃ ۔ امتراء ۔ ۱۸۴۱۔
مراء ۔ ممارۃ ۔ ۸۰ ۔ ۱۹ ۔ ۲۹۶۳
مریم ۔ ۱۱۱۔
مزج ۔ مزاج ۔ ۳۵۰۱۔
مزق ۔ مزّق ۔ ۲۶۷۹۔
مزن ۔ ۳۲۸۳۔
مسّ ۔ ۳۰۵ ۔ ۳۵۱ ۔ ۳۲۸۶۔
مساس ۔ ۲۰۹۷
مسح ۔ ۶۶۴ ۔ مسیح ۔ ۴۲۴۔
مسخ ۔ ۲۷۵۸۔
مسد ۔ ۳۶۶۳۔
مسک امساک ۔ ۲۹۵ ۔ ۲۲۴۲۔
استمساک ۔ ۳۳۱ ۔ مِسک ۳۵۶۳
مسو ۔ إمساء ۔ ۲۵۸۳۔
مشج ۔ امشاج ۔ ۳۵۰۰۔
مشی ۔ ۳۴۰۱۔
مصر ۔ ۹۰۔
مضغ ۔ مضغۃ ۔ ۲۲۰۰۔
مضی ۔ مضیّ ۔ ۵۸ ۔ ۲۷
مطر ۔ امطر ۔ ۱۱۱۸۔
معی ۔ تمعّی ۔ ۳۴۹۷۔
مع۔
معز ۔ ۱۰۲۶۔
معن ۔ ماعون ۔ ۳۶۵۶۔
معی ۔ أمعاء ۔ ۳۰۷۸
مقت ۔ ۶۳۳۔
مک ۔ مکّۃ ۔ ۴۸۴
مکث ۔ ۱۸۸۷
مکر ۔ ۴۴۳ ۔ ۱۲۲۹ب ۔ ۱۳۸۶۔
۱۵۳۴۔
مکن ۔ مکّن ۔ ۹۰۶ ۔ ۱۵۲۸ ۔ ۱۹۵۴
مکین ۔ ۱۵۵۴۔
مکا ۔ مُکاء ۔ ۱۲۲۹د
ملّ ۔ مِلۃ ۔ املال ۔ ۱۵۲ ۔ ۳۶۰۔
ملاء ۔ ۳۱۵ ۔ ۳۱۳۶ ۔ امتلاء ۔ ۳۱۳۶۔
ملأ ۔ ۴۸۰۔

ملح ۔ ن

ملح ۔ ۱۳ ۔ ۱۲۷۶۔
ملق ۔ املاق ۔ ۱۰۳۳۔
مُلک ۔ ۱۳۷ ۔ ۱۳۹ ۔ ۳۹۷۔
مَلِک ۔ ۳ ۔ ۳۱۵ ۔ ۲۰۹۲۔
مالک ۔ ۳ ۔ ۳۰۲۰ ۔ ملکوت ۔ ۳۹۷۔
ملی ۔ املاء ۔ ۳۶۰ ۔ ۵۷۳ ۔ ۳۰۸۸۔
ملیّ ۔ ۵۷۳۔
مِن ۔ ۳۱۸ ۔ ۳۴۱ ۔ ۳۴۷ ۔ ۳۸۰۔
۳۸۱ ۔ ۲۸۳۵ ۔ ۳۴۳۴۔
منّ ۔ ۸۱ ۔ ۳۳۷ ۔ ۲۸۴۵۔
مِنّۃ ۔ ۳۳۷ ۔ ممنون ۔ ۲۹۲۸
منون ۔ ۲۹۲۸ ۔ ۳۱۸۰۔
منات ۔ ۳۲۰۶۔
منع ۔ منّاع ۔ ۷۵۰۔
منی ۔ امنیۃ ۔ ۱۰۲ ۔ تمنّی ۔ ۱۰۲۔
۶۴۸ ۔ ۲۲۳۷۔
ما ۔ ۱۱۳ ۔ ۴۳۵ ۔ ۵۵۱ ۔ ۲۷۹۴ ۔ ۲۸۸۵
موت ۔ ۷۹ ۔ ۴۳۴ ۔ ۵۲۷ ۔ ۱۰۱۰۔
۱۶۳۶ ۔ امات ۔ ۳۳۴۔
میّت ۔ ۷۹ ۔ ۴۳۴ ۔ ۱۰۱۰۔
میتۃ ۔ ۲۱۰۰۔
موج ۔ ۱۹۶۶
مُور ۔ ۳۱۷۴ و۔
موسیٰ ۔ ۷۴۔
ماء ۔ ماء ۔ ۱۳۴۴۔
مہد ۔ ۲۶۵ ۔ ۴۲۶۔
مہاد ۔ ۲۶۵ ۔ ۳۵۲۰۔
مہل ۔ امہال ۔ ۱۹۱۴۔
مہما ۔ ۱۱۴۲۔
مہن ۔ مہین ۔ ۳۰۰۸۔
مید ۔ مائدۃ ۔ ۸۹ ۔ ماد ۔ ۱۷۲۵۔
میر ۔ مار ۔ ۱۵۶۱۔
میز ۔ تمییز ۔ ۵۷۴ ۔ امتاز ۔
تمیّز ۔ ۲۷۵۶۔
میکال ۔ ۱۲۲
میل ۔ مال ۔ ۷۴۳۔

باب النون

ن ۔ ۳۳۹۸۔

نأی ۔ نــزع ۔

نأی ۔ ۹۲۷ ۔ ۲۹۵۰۔
نبأ ۔ ۴۲۱ ۔ ۲۵۳۲ ۔ إنباء ۔ ۵۰۔
نبیّ ۔ نُبوّۃ ۔ ۹۱ ۔ ۲۰۰۹۔
نبت ۔ نبات ۔ انبات ۔ ۴۱۱۔
نبذ ۔ ۱۲۶ ۔ انتبذ ۔ ۸۳ ۔ ۱۹۔
نبز ۔ تنابز ۔ ۳۱۲۴۔
نبط ۔ استنباط ۔ ۷۰۳۔
نبع ۔ ینبوع ۔ ۱۸۷۶۔
نتق ۔ ۱۱۷۳۔
نشر ۔ منشور ۔ ۲۳۶۵
نجد ۔ ۳۶۰۳۔
نجس ۔ ۱۲۷۹۔
نجل ۔ انجیل ۔ ۳۷۰۰۔
نجم ۔ ۳۱۹۲۔
نجی ۔ نجاۃ ۔ ۷۲ ۔ ۲۰۱۰۔
مناجاۃ ۔ تناجی ۔ ۷۳۱۔
نجیّ ۔ ۱۵۷۳ ۔ ۲۰۱۰۔
نجوی ۔ ۷۳۱ ۔ ۱۵۷۴ ۔ ۱۸۳۹۔
نحب ۔ ۲۶۴۲۔
نحت ۔ ۱۱۱۱۔
نحر ۔ ۳۶۵۸۔
نحس ۔ نحاس ۔ ۲۹۳۴ ۔ ۳۲۵۳۔
نحل ۔ نحلۃ ۔ ۶۰۷۔
نحن۔
نخر ۔ نخرۃ ۔ ۳۵۳۵۔
نخل ۔ ۳۴۲۔
نِدّ ۔ ۳۶۔
ندم ۔ ندامۃ ۔ ۸۱۶۔
ندی ۔ نداء ۔ ۲۰۸ ۔ ۵۹۰۔
نادی ۔ ۵۹۰ ۔ ۲۰۳۴۔
ندّی ۔ ۲۰۲۴ ۔ یوم التناد ۔ ۲۹۰۷
نذر ۔ ۳۴۶ ۔ ۳۵۴۲ ۔ انذار ۔ ۱۷۔
۱۵۱ ۔ منذر ۔ ۱۷۔
نذیر ۔ ۱۵۱ ۔ ۳۲۲۸۔
نُذُر ۔ ۳۲۲۸ ۔ ۳۵۱۲۔
نزع ۔ تنازع ۔ منازعۃ ۔ ۳۹۷۔
۵۳۹ ۔ ۱۱۹۵ ۔ ۱۸۴۳ ۔ ۳۱۷۷۔
۳۵۳۴۔
نازعات ۳۵۳۲۔

نزغ - نظر

نزغ - ۱۱۹۵ - ۱۸۴۳ -
نزف - انزف - ۲۷۸۴
نزل - انزل - تنزیل - ۱۴ - ۵۶ - ۱۲۳ -
۱۰۶۶ - ۱۵۵۷ - ۱۶۸۱ - ۱۸۸۷ -
مُنزَل - ۲۲۶۲ - مَنزِل - ۱۳۷۴ -
نزلة - ۳۲۰۱ - نُزُل - ۵۹۵ -
نشئ - ۱۲۹۰ - منشأة - ۲۶۸۵ -
نساء - نِسوان - نِسوۃ - ۳۱۲۴
نسب - انساب - ۲۲۹۸ - ۲۳۸۷ -
نسخ - نسخة - استنساخ - ۱۳۸ -
نسر - ۳۴۳۹ ل -
نسف - ۲۰۹۸ -
نسك - منسك - ۱۶۳ - ۲۲۲۴ -
۲۲۴۳ - نسك - ۲۵۱ -
نسل - ۲۶۴ -
نسی - ۶۷ - ۷۹۹ - ۱۳۱۷ -
نشأة - انشاء - ناشئة - ۲۹۸۷ -
۳۴۶۱ - منشآت - ۳۲۴۷ -
نشر - نشور - انشار - انتشار - ۱۹۰۳
۲۱۴۲ - ۲۳۶۵ - ۲۳۸۰
نشز - نشوز - انشاز - ۳۳۴ - ۶۵۲
نشط - ناشطات - ۳۵۳۲ -
نَصب - نصیب - ۳۹۴ - ۷۸۵ - ۱۳۶۰ -
نُصب - ۳۴۳۵ -
نصت - انصات - ۳۰۶۶ -
نصح - نصوح - ۱۱۰۳ - ۱۳۳۴ -
نصر - انصار - نصیر - ۴۴۰ - ۱۳۴۱
انتصار - استنصار - تناصر
۱۹۲۳ - ۳۰۷۲ -
نصران - ۹۲ -
نصف - ۳۴۵۹ -
نصی - ناصیة - ۱۳۷۴ - ۳۲۵۵ -
نضج - ۶۷۵ -
نضخ - نضاخة - ۳۲۶۳ -
نضد - منضود - نضید - ۱۴۹۱
نضر - نضرة - ناضرة - ۳۴۹۳ -
نطح - نطیحة - ۴۸۷ -
نطف - نطفة - ۱۷۱۸ -
نطق - انطق - ناطق - منطق - ۲۵۰۷
نظر - ۱۳۷ - ۳۵۷ -

نعج - نکث

نعج - نعجة - ۱۰۲۶ -
نعس - نعاس - ۵۴۵ - ۱۲۱۰ -
نعق - ۲۰۸ -
نعل - ۲۰۴۹ -
نعم - ۱۱۵ - إنعام - ۶ -
أنعام - ۳۸۵ - ۷۸۰ -
نعمة - ۷۸۰ - ۲۶۱۱ - ۳۰۳۲ -
نَعَم - ۱۴۰۷ - نعمّا - ۳۴۷ -
نغص - انغاص - ۱۸۴۲ -
نفث - ۳۶۶۵ -
نفح - ۲۱۶۰ -
نفخ - ۴۳۲ -
نفد - نفاد - ۱۷۸۱ -
نفذ - ۳۲۵۱ -
نفر - ۶۸۷ - ۱۲۹۱ - استنفار
۳۴۸۱ - نفیر - ۱۲۹۱ - ۱۸۰۶ -
نفور - ۱۲۹۱
نفس - ۷۷ - ۴۰۱ - ۵۹۸ - ۱۶۸۷ -
۱۷۶۳ - ۳۴۸۴ -
تنفّس - تنافس - ۳۵۵۰ -
نفش - منفوش - ۲۱۷۲ -
نفع - منفعة - ۲۹۲۴ -
نفق - ۱۳ - ۵۵۹ - انفاق - منافق
۱ - ۵۵۹ - إنفاق - ۱۳ - ۳۴۶
۳۸۸ - ۱۸۸۳ -
نفل - نافلة - ۱۲۰۲ - ۱۸۶۶ -
نفی - ۸۱۸
نقب - نقیب - ۷۹۸ -
نقیب - ۳۱۵۰ -
نقذ - إنقاذ - ۴۹۱ -
نقر - نقیر - ۶۷۲ - ناقور - ۳۴۷۳ -
نقص - منقوص - ۳۱۱۳ -
نقض - انقاض - ۱۷۷۸ -
نقع - ۳۶۴۰ -
نقم - انتقام - ۸۴۶ -
منتقم - ۳۷۲ -
نکب - ناکب - ۲۲۸۷ -
منکب - ۳۳۹۲ -
نکث - انکاث - ۱۱۴۴ - ۱۷۷۹ -

نکح - وبل

نکح - نکاح - ۲۸۴ - ۶۰۹ -
نکد - ۱۱۰۰ -
نکر - ۱۴۸۱ - انکار - ۱۴۸۱ - ۱۷۲۹ -
۲۲۳۲ - تنکیر - ۲۲۳۲ - ۲۲۷۳ - نکیر - منکر
۲۲۳۲ - منکرة - ۱۷۲۹ -
نکر - ۱۹۴۷ -
نکس - ناکس - تنکیس - ۲۱۹۶ -
نکص - ۲۲۸۱ -
نکف - استنکاف - ۷۷۶ -
نکل - نکال - تنکیل - ۹۵ - ۷۰۵ -
انکال - ۳۴۶۴ -
نمّ - نمیم - ۳۴۰۱ -
نمرق - نمرقة - ۳۵۸۹ -
نمل - انملة - ۵۰۶ - نملة - ۲۴۵۹ -
نوء - ناء - ۳۵۳۶ -
نوب - اناب - منیب - ۱۴۸۵ -
نوح - ۴۰۵ - ۱۱۰۱ -
نور - نار - ۴۹۱ - نور - منیر - ۵۸۰
۱۶۳۵ - ۲۳۳۰ -
نوش - تناوش - ۲۷۰۶ -
نوص - مناص - ۲۸۱۹ -
نوق - ناقة - ۱۰۲۷ -
نول - نیل - تناول - ۱۳۶۰ - ۲۲۷۷ -
نوم - منام - ۲۸۸۰ -
نون - ذوالنون - ۲۱۸۰ -
نوی - نواۃ - ۹۸۶ -
نهج - منهاج - ۸۳۴ -
نهر - ۳۹ - ۳۱۸ - ۱۸۳۱ - ۳۶۱۷ -
نهار - ۲۰۲ - ۳۱۸ - ۱۵۱۱ -
نهی - انتهی - ۲۲۵ - ۹۵۲ -
نُهیٰ - ۲۰۷۳ -

باب الواو

و - ۵۰۰ - ۶۸۴ - ۲۷۲۹ -
وأد - موءدة - ۳۵۴۹ -
وأل - موئل - ۱۹۳۶ -
وبر - ۱۷۷۰
وبق - موبق - ۱۹۳۲ -
وبل - وبال - وابل - وبیل - ۳۴۰۰

وتد

وتد - ۲۸۲۶ - ۳۵۲۰ -
وتر - ۳۰۹۳ - تتری - ۲۲۶۹ -
وتن - وتین - ۳۴۲۲ -
وثق - اوثق - واثق - میثاق - ۷۹۴
وثاق - ۳۰۷۲ -
وثن - ۲۲۲۰ -
وجب - ۲۲۲۶ -
وجد - ۳۳۷۱ -
وجس - اوجس - ۱۴۸۱ -
وجف - اوجف - واجفة - ۳۳۱۹
وجل - ۱۲۰۳ -
وجه - ۱۴۴ - ۶۶۷ - ۱۸۰۷ - ۱۹۱۳ -
۲۱۰۵ - ۲۵۴۴ - وجهة - ۱۸۵ -
وجیه - ۴۲۵ - وجه النهار - ۴۶۳
وحد - احد - واحد - ۱۴۱ - ۲۰۱ -
وحش - ۳۵۴۹ -
وحی - ۷۶۸ - ۸۸۹ - ۱۰۰۲ -
وُدّ - ۱۳۷ ل - ۱۴۹۷ - ودود - ۱۴۹۷
وَدّ - ۳۴۳۹ ل
ودع - مستودع - ۹۸۹ - ۱۴۴۲ -
ودّع - ۳۶۱۵ -
ودق - ۲۳۳۷ -
ودی - دیة - وادی - ۷۱۴ -
وذر - ۳۰۳ - ۱۰۰۰ -
ورث - وارث - میراث - ۵۷۶ -
۱۰۸۳ - تراث - ۳۵۹۷ -
ورد - اورد - وارد - مورود - ۱۵۰۰ -
۲۰۲۳ - ۲۰۳۴ - وردة - ۲۲۵۴ -
ورید - ۳۱۳۷ -
ورق - ۱۰۶۴ - ۱۹۰۶ -
وری - ۳۷۰ - ۳۶۴۰ - واری - ۳۷۰ -
۸۱۹ - تواری - ۸۱۶ - ۱۷۵۲ -
وراء - ۸۱۶ - ۱۴۸۲ -
تورية - ۳۷۰ - موریت - ۳۶۴۰ -
وزر - وازرة - ۹۳۱ - ۱۰۴۴ -
اوزار - ۱۰۴۴ - ۳۰۷۲ -
وزیر - ۲۰۵۸ -
وزع - اَوْزَع - ۲۴۵۸
وزن - موزون - ۱۰۵۰ -

میزان - وقت

میزان-۱۱۲۰-۲۱۶۱-۲۹۶۲-۳۲۴۰-
وسط-۱۷۸-۳۶۴۰-
وسطی-اوسط-۳۰۷-۸۷۰-
وسع-۳۶۴-سعۃ-واسع-۱۴۷۰-
مُوسع-۳۱۶۸-
وسق-اتّساق-۳۵۷۰-
وسل-وسیلۃ-۸۴۰-۱۸۴۶-
وسم-متوسّم-سیما-۱۷۰۴-
وسن-سِنۃ-۱۳۲۹ ل
وسوس-۱۰۶۱-
وشی-شِیۃ-۹۷-
وصب-واصب-۱۷۴۸-
وصد-وصید-۱۹۰۵
وصف-۱۰۲۲-۳۰۲۲ ل-
وصل-وصیلۃ-۸۸۲-
وصّل-۲۵۲۳-
وصی-وصیۃ-۱۶۷-وصّی-تواصی
-۳۱۷۰
وضع-۳۸۴-۱۹۲۹-اَوضع-۱۲۹۸-
موضع-۶۶۶-
وضن-موضونۃ-۳۲۷۵-
وطئ-موطئ-مواطاۃ-۱۳۶۰-۳۴۶۱
وطر-۲۶۵۶-
وطن-موطن-۱۲۷۷-
وعد-وعید-۳۴۴-واعد-۷۴
موعد-۱۹۲۸-
وعظ-موعظۃ-۹۵-۵۲۲-
وعی-ایلاء-وعاء-۱۵۷۰-۳۵۷۱-
وفد-۲۰۳۳-
وفر-موفور-۱۸۵۱-
وفض-ایفاض-وفق-۲۴۳۵-توفیق
۶۵۴-۳۵۲۴
وفی-توفّی-۳۰۳-۴۴۴-۸۹۷-
۹۵۵-۲۸۸۰-
استیفاء-توفیۃ-۳۰۳-
وقب-۳۶۶۵-
وقت-میقات-۲۳۹-
وقّت-۳۵۱۳-وقد-ایقاد-
استیقاد-وقود-۳۵۷۳-

وقذ - ھدی

وقذ-موقوذۃ-۷۸۴-
وقر-وقار-توقیر-۹۲۶-۳۰۹۹-
وقع-واقعۃ-۲۲۴۲-
وقف-مُوقف-۹۲۸-
وقی-اِتّقی-۱۰-۲۶۵۰-۲۸۷۵-
تقوی-تقاۃ-۱۰-۴۰۰-واق-
۲۹۰۳ ل-
وکا-توکّأ-اِتّکاء-مُتّکأ-۱۵۳۴-
وکد-توکید-۱۷۷۸-
وکز-۲۵۰۴-
وکل-توکّل-۵۰۹-وکیل-۵۰۹-
۱۵۶۲-۱۸۰۲-
ولج-اولج-۳۹۸-ولیجۃ-۱۲۷۲-
ولد-۱۴۸-۶۱۹-ولید-۶۹۱-
ولی-تولّی-۱۰۶-۲۶۴-
ولّی-۱۸۱-۴۳۲-وَلِیّ-۳۳۳-۸۳۹
۱۴۱۳-مولٰی-۳۳۲-۶۴۹-اولی-۴۵۹
۷۴۶-۲۶۳۰-۳۰۸۳-
ولایۃ-۳۳۲-۳۹۹-۱۹۲۴-
ونی-۲۰۶۵-
وھب-الوھاب-۳۷۹-
وھج-وھّاج-۳۵۲۱-
وھن-۵۲۳-۵۳۲-
وھی-واھیۃ-۳۴۱۳-
وَیْ-وَیْکَاَنّ-۲۵۴۰-
ویل-۸۱۶-ویلتی-۱۴۸۳-

باب الھاء

ھبط-۵۶-۲۱۱۵-
ھبا-ھباء-۲۳۶۵-
ھتا-ھاتین-ھاتوا-
ھجد-تھجّد-۱۸۶۶-
ھجر-۲۸۰-۶۵۳-۲۲۸۲-
ھاجر-مھاجر-۲۸۰-۱۳۴۱-
ھجع-۳۱۶۲-
ھدّ-۲۰۳۷-
ھدھد-۲۴۶۱-
ھدم-ھدّم-۲۲۳۰-
ھدی-ھدایۃ-۱۰۰۵-۱۶-۵۹-۲۵۰-

ھرب - ھی

۳۳۳-۳۸۴-۵۲۲-۷۸۱-۱۱۲۷-
۱۱۸۰-۱۳۹۶-۲۱۱۹-
اھتدی-۵-۱۳۹۶-۲۰۸۸-
ھدیّۃ-۲۸۰۰-۷۸۱-
ھرب-۳۴۴۸-
ھرت-ھاروت-۱۳۰-
ھرع-اُھرع-۱۴۸۷-
ھزّ-اھتزاز-۱۹۹۲-
ھزئ-استھزاء-ھزو-۷۲-۹۶-
ھزل-۳۵۸۰-
ھزم-مھزوم-۲۸۲۵-
ھشّ-۲۰۵۳-
ھشم-ھشیم-۱۹۲۵-۳۲۳۴-
ھضم-ھضیم-۲۱۰۶-۲۴۳۰-
ھطع-مھطع-۱۶۶۲-۳۴۳۴-
ھَلْ-۲۶۹-۱۵۶۰-
ھلّ-اھلّ-۲۱۰-ھلال-۲۳۹-
ھلع-ھلوع-۳۴۳۱-
ھلک-تھلکہ-۲۲۹-اھلک-ھالک
-۱۸۱۵
ھلُمّ-۱۰۳۲-
ھمّ-اھمّ-۵۰۹-۵۴۶-
ھمد-ھامدۃ-۲۱۳۷-۲۲۰۲-
ھمر-منھمر-۳۲۲۵-
ھمز-ھمزۃ-۲۲۹۵-۳۱۲۴-۳۶۴۹
ھمّاز-۲۲۹۵-
ھمس-۲۱۰۳-
ھامان-۲۴۹۹-
ھنا-ھنئ-۶۰۷-
ھنالک-۴۱۳-
ھو-
ھود-ھاد-۹۲-۱۴۳-ھود-۱۱۰۵-
ھار-انھار-۱۳۵۰-
ھون-اھان-۱۱۵-
ھوی-۱۵۲-۱۶۵۹-۲۰۸۷-۳۱۹۲
استھوی-۹۶۴-
ھواء-۱۶۵۹-۳۶۴۵-
ھاویۃ-۳۶۴۵-
ھی-ھا-۲۵۷-۳۴۱۶-ھاؤم-۳۴۱۶

ھا

ھاء-ھَیَّاء-ھیئۃ-۴۳۱-۱۹۰۳-
ھیت-۱۵۳۰-
ھاج-۲۸۷۲-
ھال-مھیل-۳۴۶۵
ھام-ھیم-۲۴۵۲-
ھیمن-مھیمن-۸۳۲-
ھیھات-۲۲۶۵-

باب الیاء

ی-یٰس-۲۷۲۸ ل-
یأس-۷۸۶-۱۶۲۴-استیئس-۱۵۷۳
یبس-یابس-۱۵۴۴-۲۰۸۵-
یتم-یتیم-۱۰۶-۶۰۱-
یتامی النساء-۴۲۱
ید-۸۵۱-۱۲۸۱-تائید-۸۵۱-
یسر-۱۸۲۵-یُسْر-یُسرٰی-۳۵۸۵
یسیر-۱۵۶۱-۲۳۷۹-
میسور-۱۸۲۵-میسرۃ-۳۵۷-
میسر-۲۸۱-
یسع-
یعق-یعوق-۳۴۳۹ ل-
یعقوب-۱۶۷
یغث-یغوث-۳۴۳۹ ل-
یقت-یاقوت-۳۲۶۰
یقط-یقطین-۲۸۰۷-
یقظ-ایقاظ-۱۹۰۵-
یقن-یقین-۱۵-۱۵۰-۱۴۱۵-
ایقان-۱۵۰-موقن-مستقین
-۳۰۵۳
یمّ-۲۰۶۲
یمن-ایمن-۲۰۱۰-۲۰۸۶-یمین-۲۸۷
۶۰۵-۶۴۹-۱۸۵۸-میمنۃ-۳۷۷۲
ینع
یوم-۳-۵۲۴-۸۹۹-۱۰۹۴-۱۴۳۵
یوم الزینۃ-۲۰۷۷-
یوم التلاق-۲۹۰۱-
ایام اللہ-۵۲۴-۳۰۴۴-

تمّت بالخیر
نعم المولی ونعم النصیر

فہرستِ مضامینِ تفسیر بہ ترتیبِ حروفِ تہجی

یعنی

انڈکس

نوٹ: حوالجات فہرست ہذا اکثر صورتوں میں اُس صفحہ کے حاشیہ پر مل جائیں گے جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جہاں صفحہ پر حاشیہ کم ہو تو اس کے لیے بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ہوگا۔ لیکن ہر حوالہ کا نمبر اسی صفحہ پر ہوگا۔ جہاں قرآنی آیات پر نمبر لگایا گیا ہے۔

الف

احمر: ۵۲۳، ۱۳۳۰
آخرت۔ پر ایمان کا مفہوم۔ ۱۲
" کا انکار۔ ۷۵۲
پر یقین کا فائدہ ۳۶۱
" کا یقینی علم بذریعہ وحی ملتا ہے۔ ۷۸۴
" کی کیفیات۔ ۱۸۳، ۵۱۳، ۷۹۲
" میں نئے حواس ۱۲۹۵
" میں مدارج۔ ۸۲۸
" اور دنیا کی زندگی میں فرق۔ ۱۴۱۰
" کو مقدم کرنا۔ ۷۱۹
" اور نسب ۹۵۲
" کا اندھاپن۔ ۸۹۲
وعدہ آخرت آنحضرت کا ظہور ہے ۸۰۹
نیز دیکھو بعث قیامت
آدم۔ ۲۷
" کی خلق علی صورتہ کا مفہوم۔ ۱۸۲
" کی عصمت ۸۹۰
" کی طرف نسبت شرک۔ ۵۴۷
" کا عصیان ۱۲۸۷
" کی جنت ۳۰
" کا درخت ممنوع ۳۱
" کا ہبوط ۳۲
" وحوا کا سوأت کو دیکھنا۔ ۵۰۶
" وحوا کا پتوں سے اپنے آپکو ڈھانکنا۔ ۵۰۷
" کا لباس جنت ۵۰۷
" کے دو بیٹے۔ ۴۱۸
" کے ذکر میں ابن آدم کا ذکر۔ ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۸
" سے پہلے نسل انسانی کا وجود۔ ۳۰۶
لاکھوں آدم ہوئے ہیں۔ ۳۰۶
آریہ سماج کا شرک۔ ۱۳۹۴، ۱۴۹۴
آزر۔ ۴۷۴، ۶۱۱، ۷۲۸

آسائش کی نسبت اللہ کی طرف ۶۲۳
" سے غفلت کا پیدا ہونا۔ ۲۲۴
آسمان۔ ۲۵، ۲۴
" دخان ہے ۱۲۰۹
" وزمین کی پہلی غیر ممیز حالت ۹۰۱
" وزمین کا چھ دن میں پیدا کرنا۔ ۵۱۵
" کا دو دن میں بننا۔ ۱۲۰۹
" کی عمارت سے تشبیہ۔ ۲۰، ۹۰۱
اجرام سماوی میں باہمی تعلقات ۷۰۴
سات آسمان ۲۵، ۱۳۸۶، ۱۴۳۸
نظام شمسی کے سات سیارے اور انکے ساتھ ۹۴۰
اجرام سماوی کے رستے ۱۱۳۳، ۱۳۰۰
اجرام سماوی کا اپنے اپنے فلک میں چلنا۔ ۱۱۴۱، ۹۰۲
" میں جانداروں کا ہونا۔ ۱۲۲۴، ۱۳۸۹
" کے غیر مرئی ستون ۷۰۴
" میں فروج کا نہ ہونا ۱۲۹۳
نظام عالم کا خاتمہ ۱۰۹۷
" سے عذاب کا آنا۔ ۴۳
" سے جانوروں کا اترنا ۵۰
" میں چڑھنا۔ ۷۳۳
" پر جسد عنصری سے جانا۔ ۸۰۶
" کی طرف وحی۔ ۱۲۰۹
" اور زمین کا رونا۔ ۱۲۴۷
" اور مینہ کا تعلق ۱۴۶۰
" کی شیطانوں سے حفاظت ۷۳۴، ۱۲۱۰، ۱۴۱۳
" کے دروازے کھلنا۔ ۵۱۲
" کا پیٹا جانا۔ ۹۱۵
" کا زمین پر گرنا۔ ۹۳۴
" کے ٹکڑے کا گرنا۔ ۱۳۱۰

آسمان کا کھولا جانا۔ ۱۴۳۸
" کا پھٹنا۔ ۱۴۱۹، ۱۴۳۴
" کی کھال اتارا جانا۔ ۱۴۴۸
آسیہ ۲۰۷
آگ۔ اعلان جنگ کا نشان۔ ۴۳۵
" سے مجازاً مراد جنگ ۹۰۳
اہل شرک کی آگ ۶۱۹
" چار قسم ۸۷۲
" کا سبز درخت سے نکلنا۔ ۱۱۴۷
" کا مغرب کی طرف سے نکلنا۔ ۱۳۳۱
آواز کی پستی کا اثر اخلاق پر ۱۲۸۵
آیۃ الکرسی۔ ۱۵۵
ابراہیم ۷۴، ۸۶۱
" کی تکمیل نفس۔ ۷۴
وعدہ ابراہیمی اور اس میں اسمٰعیل کی شمولیت ۷۵، ۴۱۷
" کا اسمٰعیل اور ہاجرہ کو حکم الٰہی سے مکہ میں چھوڑنا ۷۶، ۷۲۷
" اور اسمٰعیل کا خانہ کعبہ کی تعمیر کرنا۔ ۷۸
ملت ابراہیمی۔ ۸۰، ۸۱، ۲۳۲، ۴۲۹، ۷۰۴
" اور کافر بادشاہ کا جھگڑا ۱۵۸
" اور پرندوں کا قصہ "
" اور احیائے موتیٰ "
" اور یہودیت اور عیسائیت ۲۳۲
" کے متبعین۔ ۲۳۳
" کا مکہ میں آنا۔ ۲۴۷
" کا استغفار آزر کے لیے ۴۷۴، ۶۱۱
" کی اپنی قوم سے بحث ۴۷۴، ۱۱۵۶
" کی قوم کے دیوتا۔ ۴۷۴
بشارت اسحاق اور قوم لوط کا عذاب ۶۵۸

" ابراہیم کی بی بی کا ہنسنا ۶۵۹
رسول جو ان کی طرف آئے کون تھے ۶۵۸، ۷۴۱
" کی دعائیں ۷۷-۷۲۰
" دنیا کے پیشرو ۷۷۴
" کی عصمت ۸۶۱
" کے جھوٹ بولنے کی غلط روایت ۸۶۱، ۹۰۶-۱۱۵۶
" کی دشمن سے محبت۔ ۸۶۲
" کا آگ سے بچایا جانا۔ ۹۰۷-۱۱۵۷
" کا بتوں کو توڑنا۔ ۹۰۵
" کی ہجرت۔ ۹۰۸-۱۰۵۶-۱۱۵۷
" کا ارکان حج کو قائم کرنا۔ ۹۲۴
" کا بحث میں عذر بیماری۔ ۱۱۵۶
" کو بیٹا قربان کرنیکا حکم اور اسکا مفہوم ۱۱۵۷
" کی نسل میں توحید ۱۳۳۴
" کا اعدائے دین سے قطع تعلق ۱۳۶۶
" (ابن النبی صلعم) ۶۹۵-۱۰۰۳-۱۲۸۷
ابرہہ ۹۲۵، ۱۴۸۷-۱۴۸۸
ابن اللہ۔ عیسائی عقیدہ کی تردید۔ ۷۰-۴۱۵
۴۸۱-۱۱۸۰-۱۲۴۲
پہلی کافر قوموں کی نقل ۵۸۵
" نظام عالم کو باطل کرتا ہے ۸۶۹
" لفظ کا استعمال پہلی کتابوں میں
۴۱۵-۱۸۵-۷۱-۱۱۸۱
ولد اللہ و ابن اللہ۔ ۷۰
مسیح مجازاً ابن اللہ کہلایا ۷۰
یہود اور عیسائیوں کا اپنے آپ کو ابن اللہ کہنا ۴۱۵
ابن ام مکتوم ۱۴۴۴
ابن حضرمی ۱۲۵، ۵۶۴
ابن عباس۔ ۱۸۴، ۱۸۵، ۸۰۲

ابن عمر ۲۸۲، ۳۱۴
ابن قمئہ ۲۷۱
ابوایوب انصاری۔ ۱۱۳
ابوالبختری ۵۷۲
ابوبکرؓ ۴۳۲، ۵۷۱، ۵۷۶، ۵۸۹، ۵۹۸
۱۱۳۸، ۱۳۲۶، ۱۴۴۵، ۱۴۷۲
" کا خطبہ آنحضرتؐ کی وفات پر ۲۷۲
" کا منکرین زکوٰۃ سے جنگ کرنا ۵۸۰
" کی وسعت قلبی ۹۶۱
" کی فضیلت ۹۶۱
ابی بن خلف سے شرط ۱۰۶۶
" اور حضرت فاطمہ کا دعویٰ۔ ۱۳۶۰
ابوجہل ۴۶۲، ۷۹۶، ۱۱۵۴، ۱۴۷۷
ابودجانہ ۲۷۸
ابوذر غفاری ۳۶۲، ۵۸۶
ابوسفیان ۲۳۴، ۲۷۵، ۲۹۱، ۴۲۱
ابوطالب ۶۱۰، ۱۰۴۵، ۱۱۶۶
ابوعامر ۶۰۸
ابوعبیدہ ۵۸۴
ابولہب ۱۴۹۲
ابوموسیٰ اشعری ۱۳۷۴
ابوہریرہ ۴۳۶
ابی ابن خلف ۱۰۶۶
ابلیس۔ ۲۹
قوت وہمیہ کا نام نہیں۔ ۲۹
دیکھو شیطان۔
اتمام نعمت ۴۰۸
اتھیوپیا۔ ۸۳۴
اجتہاد ۴۴۶، ۷۲۴
اجماع ۳۸۱، ۹۵۶
اُحد کی جنگ۔ ۲۵۸
" میں فرشتوں کی مدد۔ ۲۶۱
" میں کفار کی ناکامی۔ ۲۶۳
" میں آنحضرتؐ کے قتل کی خبر ۲۷۱
" میں نصرت الٰہی۔ ۲۷۶
" میں کفار کی شکست ۲۷۶
" میں تیراندازوں کی غلطی ۲۷۷
جنگ احد میں آنحضرتؐ کا انا النبی پکارنا [illegible]
" میں آنحضرتؐ کا تنہا رہ جانا۔ ۲۸۰
" میں نیند کا آنا۔ ۲۸۰

احد میں بھاگنے والے۔ ۲۸۱
احمد ۴، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱
احرام ۱۱۴، ۴۴۴
احزاب کی جنگ۔ ۱۰۹۱
" کی پیشگوئی ۱۱۶۷
" میں فرشتوں کا نزول۔ ۲۶۱، ۵۵۵
احسان ۲۹۷، ۷۹۹، ۱۳۳۴
احقاف ۱۲۵۹
احیائے موتیٰ ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۰
" کی کیفیت ۱۶۰
" سے مراد ۲۱۹
دیکھو مردوں کا زندہ ہونا۔
اختیار ۱۴۲۹
اور مشیت الٰہی ۱۴۳۲
ادب ۱۲۸۴
ادریس ۸۶۳
اذان ۴۳۳
ارتداد۔ حصول طلاق کے لیے۔ ۱۲۶
آنحضرتؐ پر ایمان لانے والے مرتد نہ ہوتے تھے۔ ۲۳۴، ۵۲۴
" کے واقعات ابتدائی تاریخ اسلام میں ۴۳۲
" کا موجودہ فتنہ "
مُرتد کا حکم قتل نہیں۔ ۱۲۵
" مرتد اور فسخ نکاح۔ ۱۲۶
مرتد کب قتل ہوسکتا ہے۔ ۳۷۱
ارتقاء۔ ۳، ۱۴۱۰
ارض مقدس ۴۱۶
ارقم۔ کا گھر۔ ۲
ازالہ حیثیت عرفی کا قانون۔ ۳۹۱
استخارہ۔ ۴۰۶
استعاذہ۔ ۷۶۹
استعداد۔ کے اختلافات۔ ۵۱۸
استغفار ۱۱۶، ۲۸۵
" ترقی روحانی کا کمال ہے۔ ۱۹۱
" مشکلات میں۔ ۳۷۹
" اور شفاعت۔ ۹۰۰
انبیا کا استغفار۔ ۱۲۹۷
استقامت ۱۲۱۳
استمداد (غیر اللہ سے) ۹۱
استنباط مسائل۔ ۳۶۹

استہزاء۔ مجلس استہزا میں شمولیت ۳۸۸، ۴۷۱
مومن کی کافر پر ہنسی ۶۵۲
اسراء۔ ۷۷۷
" میں اشارہ۔ ۷۷۹
اسرافیل ۶۱
اسعد بن زرارہ ۱۳۷۵
اسکندریہ کا کتب خانہ ۸۶۰
اسماعیل ۷۷، ۴۷۶
" کعبہ کے پاس چھوڑ لجانیکی غرض۔ ۷۲۷
" کی رسالت۔ ۸۶۳
" کا صبر ۹۱۱
ذبیح اسمٰعیل تھا نہ اسحٰق۔ ۱۱۵۷
نیز دیکھو ابراہیم۔
اسلام۔ کس مقام پر پہنچاتا ہے۔ ۵
" کا یہودیوں اور عیسائیوں پر اتمام حجت ۳۵
وسعت دائرہ اسلام۔ ۴۷
" کا مفہوم۔ ۹۸
" عالمگیر مذہب ہے۔ ۲۴۱
" اور رہبانیت۔ ۴۴۲
" تفرقیات مرتبہ کو مٹاتا ہے۔ ۴۶۷
اصول اسلام کی سادگی۔ ۵۴۷
" اور صلح۔ ۵۶۹
" مذہب فطرت ہے۔ ۱۰۷۰
" میں نظام مذہب۔ ۱۱۳۰
" رنگ و قوم کی تفرقیات کو مٹاتا ہے ۱۲۹۰
قومیت اسلامی کی بنیاد ایک دوسرے کی نیک کام میں اعانت ۴۰۵
حکومت اسلام کی بنیاد مشورہ پر ہے ۱۲۲۵
اخوت اسلامی کے حقوق۔ ۱۹۵
اخوت اسلامی کی بنیاد۔ ۱۹۵
" پر تلوار کا اعتراض۔ ۵۲۴، ۵۷۷
۵۷۵، ۵۸۰، ۱۲۷۷
اشاعت اسلام۔ ۲۹۷
اشاعت تعلیم اسلام پر زکوٰۃ کا صرف ۵۹۴
اسلام کی تعلیم۔ میں میانہ روی۔ ۲۰۶
" میں دشمن سے ہمدردی۔ ۸۳
" میں دشمن سے پیار کا عملی رنگ ۱۰۲
" میں دشمن سے انصاف کرنا۔ ۴۰۵
دوسرے مذاہب کے معبودوں کو گالی نہ دو۔ ۴۸۳
" میں دشمنوں میں محبت پیدا کرنیکی طاقت ۵۷

اسلام کی تعلیم میں کفار سے احسان۔ ۱۳۶۶
اسلام کی تعلیم کی وسعت ۱۶۷، ۱۴۳۰
غیر مسلم کو صدقہ دینا ۳۴۳
" میں کل مخلوق سے حُسن سلوک۔ ۳۴۳
" میں ایفائے عہد ۱۰، ۲۳۶، ۲۳۷
" اور ضبط و قواعد ۱۰۴
" میں اصول محنت و مساوات دولت میں توازن ۱۷۱
" میں خواہشات پر حکومت ۱۰۴
اخوت دینی اور تعلقات رشتہ داری ۵۷۴
" میں دینی دنیوی ترقی کا کمال ۱۲۹۲
اسلام اور دیگر مذاہب۔ ہر مذہب میں کچھ صداقت ہے۔ کامل صداقت صرف اسلام میں ہے۔ ۴۷۔ ۶۹۔ ۷۳
اصل الاصول سب کا ایک ہے ۸۱، ۱۲۲۰
اسلام سب مذاہب کے بزرگوں کو قبول کرتا ہے ۸۲
مذہبی آزادی ۱۱۱-۱۱۲
دیگر مذاہب کے معبدوں کا قیام۔ ۱۱۱
اسلام اختلافات کا فیصلہ کرتا ہے ۱۲۳، ۷۶۰
اصول مقابلہ مذاہب ۲۳۱
پہلے مذاہب کا تفرقہ ۲۵۱
دوسرے مذاہب میں اچھے لوگوں کا اعتراف ۲۳۶
اسلام میں تکمیل مذہب ۴۰۷
باہم محبت کی بنیاد ۴۸۳
اختلاف عقائد مٹ نہیں سکتا۔ ۹۲۲
مذاہب کا باہم عناد اور ایک رسول کی ضرورت ۹۴۶
مختلف دینوں کا تعلق
اسلام میں دوسرے لوگوں کا داخل ہونا ۱۰۴۴
سب مذاہب کا توحید کے ساتھ شرک کو ملا دینا۔ ۱۰۷۱
اختلاف مذاہب کا فیصلہ وحی سے ہونا ضروری تھا۔ ۱۲۱۹
مذاہب سابقہ کی صف کا لپیٹا جانا ۱۴۴۷
ابتدائی مذاہب میں دعائیں ۴۴
مفہوم نجات ۴۷، ۴۴۳، ۲۴۲
شراب خوری ۱۲۸
طلاق ۱۳۳

شراب اور سود خوری۔ ۱۷۰
تعلیم توحید ۱۹۱
بدی کا کفارہ ۳۳۸
گناہ اور توبہ ۱۱۹۰
بہشت کی ترقیات ۱۳۹۰
اسلام اور عیسائیت ۸۴۸
مقابلہ دعا۔ ۲
ترقی کا مقابلہ ۸۲۳
اسلام کے دشمن۔ اعدائے اسلام کی تدابیر اور منصوبے۔ ۱۹۷، ۷۲۹، ۷۵۲، ۱۳۵۴
" میں باہم جنگ۔ ۴۷۱
" کے گروہ ہائے مختلف۔ ۴۷۸
" کی انتظار۔ ۶۰۴
" کا مقابلہ عبادت ہے۔ ۶۱۴
" کی سزائیں۔ ۶۲۹، ۱۰۳۱، ۱۲۶۵، ۱۳۹۴
" کو چیلنج ۶۳۵
" کے ظلم سے نجات ۶۴۱
" کی قوت واقتدار۔ ۷۲۹
" کے اسلام لانے کی بشارت۔ ۱۰۱۲
" کا تتبیہ۔ ۱۳۶۶
" سے دوستی کی ممانعت۔ ۱۳۶۵
" کی ہلاکت۔ ۱۴۳۳
اسلام کی مغلوبیت اور خوشخبری ۶۹۶
اسلام کی ترقی کا ایک ہزار سال رکنا ۹۳۱
اسلام کی بیکسی اور عیسائیت کی طاقت ۱۱۹۸
اسلام پر غربت کا زمانہ ۱۴۷۲
اسلام پر دو دفعہ مصیبت کا زمانہ اور کامیابی ۱۴۷۵
اسلام کا غلبہ۔ غلبہ کی پیشگوئی۔ ۱۲۱
اسلام کی ترقی انفاق فی سبیل اللہ سے ہوگی۔ ۱۶۲
حکومت اسلامی کے زوال کے اسباب ۱۹۵
اسلام کا غلبہ دو رنگ میں۔ ۴۳۱
اسلام کفر پر غالب آئے گا۔ ۵۶۸
اصول اسلام کی کامیابی۔ ۵۸۵
اسلام کے غلبہ کے نشانات۔ ۷۱۷، ۹۰۴، ۱۰۳۴
" کی تبلیغ میں آسانی کا وعدہ ۸۲۳
" کا مشرق ومغرب میں پھیلنا۔ ۹۱۶
" کے غلبہ میں رحم کی خوشخبری۔ ۹۹۷

اسلام پر زوال نہیں۔ ۱۱۴۵
اسلام کا اول مشرق میں پھیلنا۔ ۱۱۴۹
اس کا قیام اس کی صداقت کی دلیل ہے ۱۲۲۱
اسلام کی فتح دلوں پر۔ ۱۲۷۲
اسلام کا کل مذاہب پر غالب آنا۔ ۱۲۸۱
اسلام کا آخری غلبہ۔ ۱۳۷۱
اسلام کی فتح لوگوں کا دین اسلام قبول کرنا تھا ۱۴۹۲
اسلام کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ ۱۴۷۶
اسلام کی ترقی اور آخری غلبہ ۱۴۷۳
اسلام کی نصرت بذریعہ اشاعت۔ ۱۴۷۲
اصحاب الایکہ ۷۴۳
اصحاب الرس ۹۸۸
اصحاب الفیل ۱۴۸۷، ۱۴۸۸
اصحاب کہف ۸۱۱، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۲۱، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۲
" کے ذکر میں غرض۔ ۸۱۵
" میں آنحضرت صلعم کی طرف اشارہ ۸۱۷
کہف کا محل وقوع۔ ۸۱۸
" کے ذکر میں تاریخ عیسائیت۔ ۸۲۰
اصلاح بین الناس۔ ۳۸۱
اصول اور خصوصیات ۲۱۰
اطاعت۔ اللہ کی معصیت میں مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں۔ ۲۵۵، ۱۰۵۳
رسول کی اطاعت ۲۶۵، ۲۹۱، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۷
اولی الامر کی اطاعت۔ ۳۵۴
کفار کی اطاعت۔ ۲۷۵، ۱۰۸۸
اعتکاف۔ ۱۰۹
أعراب۔ ۶۰۲، ۶۰۴، ۱۲۷۵
اعراف۔ ۵۱۳، ۵۱۴
افراط۔ ۶
افغان۔ بنی اسرائیل ہیں۔ ۹۴۵
الہام ۸۳۶، ۱۲۲۸، ۱۲۸۱، ۱۴۶۹
اللہ۔ اسم اعظم۔ ۳، ۱۵۵
" اسم ذات ہے ۳
اسم اللہ میں غیر شریک نہیں۔ ۴۵۶
اسماء اللہ اور حصول کمال۔ ۵۴۵
" کے اسماء حسنیٰ اور ان کا ذکر۔ ۸۱۰
" کے ننانوے نام۔ ۸۱۶

سب سے بڑی چار صفات ۱
ام صفات ۱
صفات پر نظام جسمانی و روحانی کا مدار ۲
صفات باری اور صفات انسان میں فرق۔ ۱۹
صفات برنگ مبالغہ ۲۹۴
اللہ کا بے مثل ہونا ۱۲۱۹
صفات باری اور عیسائیت کے عقائد کی تردید۔ ۱۸۰
ربوبیت میں تردید شرک۔ ۱
ربوبیت کی وسعت۔ ۸۲
رحمانیت میں عقاید باطلہ کی تردید۔ ۸۱۰، ۸۹۷
رحیمیت میں عقاید باطلہ کی تردید۔ ۱
مالکیت میں عقاید باطلہ کی تردید۔ ۱
" کی مشیت۔ ۱۹، ۴۸۳، ۴۹۴، ۷۵۴، ۱۴۲۴
" قادر مطلق۔ ۱۹
" نیستی سے ہستی کرتا ہے۔ ۱۹، ۲۴
خلق سے توحید پر دلیل۔ ۱۹
علم پر دلیل۔ ۱۳۹۴
عبادت پر دلیل۔ ۷۱۰
خلق اور ہدایت کا تعلق ۱۴۶۱
خلق اشیا صرف خاصہ باری ہے ۲۱۶، ۲۱۷، ۸۳۱
" بغیر آلہ اور مادہ اور مکان اور زمانہ کے وجود میں لانے والا۔ ۷۱
خلق کی غرض رحم ہے۔ ۶۷۱
علم الٰہی دو طرح پر۔ ۸۵
علم وقوع فعل۔ ۲۶۹
علم غیب کا وقوع کی طرف انتقال۔ ۸۱۷
" سریع الحساب۔ ۱۱۸
" کا ارادہ۔ ۶۷۹
" کا اختیار۔ ۱۰۴۷
" کا کلام بندے سے تین طرح پر۔ ۱۵۲، ۱۲۲۸
" کے کلام میں الفاظ۔ ۵۲
مکالمہ الٰہیہ منقطع نہیں ہوسکتا ۵۳۶، ۱۱۰۴، ۱۳۹۶
ہر ایک سے کلام نہ کرنا۔ ۷۲
دوزخیوں سے کلام نہ کرنا۔ ۹۹
صفت مغفرت ۱۴۲۴
صفات میں غلبہ رحم ۱۱۹۳
رحمت کی غضب پر سبقت۔ ۴۵۸، ۲۶۴

وسعت رحمت ۴۶۸، ۵۳۸، ۱۸۹، ۱۱۹۴
اللہ بغیر توبہ گناہ بخشتا ہے ۱۲۱۸، ۱۱۹۳
رحم خطاکاری پر روکا نہیں جاتا۔ ۱۲۳۱
" کا ہدایت دینا۔ ۵
" کا مہر لگانا ۱۴
" کی طرف بیماری بڑھانے کی نسبت ۱۵
" کا اضلال ۲۳
" کی طرف خدع کی نسبت ۳۸۹
" کی طرف کسی لفظ کی نسبت ۱۷
" کی عداوت ۶۲
" کی محبت ۳۸۳
" کی گواہی ۳۹۸، ۴۵۹، ۸۰۷
" کا دلوں پر پردہ ڈالنا۔ ۷۹۲
" کا دلوں کو پھیرنا۔ ۴۸۴
" کی طرف نسبت افعال ۸۲۷
" کا غضب ۶
" سے استعانت ۳۷
" کا قرب ۱۰۷، ۴۲۲، ۶۰۴، ۷۹۴
" کا آنا۔ ۱۲۱، ۱۸۵
امر اللہ کا آنا۔ ۲۶۱
" کی نصرت ۱۲۳
" کا نزول ۱۹۱
" کا انسان کو علم دینا۔ ۱۷۴
" کی اذن۔ ۲۱۶
" کی رویت ۴۸۲، ۵۳۴، ۷۷۸، ۱۱۷۸
" کا خوف ۴۰۷، ۱۳۳۳
" کی تقدیر انتہاء۔ ۴۸۰، ۹۸۲، ۱۴۶۱
" کی تجلیات ۵۳۴، ۵۳۵
" کا انسان اور اسکے قلب میں حائل ہونا۔ ۵۶۰
" کی رضا ۵۹۷-۶۰۶
" کا عماء میں ہونا۔ ۶۳۹
" کا تجیل ہونا۔ ۷۴۴
" کا ہاتھ ۷۹۹
" کے حکم میں شریک کا نہ ہونا۔ ۸۲۴
" کے حکم کے ماتحت دوسرا حکم۔ ۴۶۸
" کے سامنے پیش ہونا۔ ۸۳۰
" کے کلمات۔ ۸۴۸
" کی صلوٰۃ مسلمانوں پر۔ ۱۱۰۴
" سے تعلق سے عزت کا ملنا۔ ۱۱۲۸
" کا دہر ہونا۔ ۱۲۵۳

اللہ کا نشان میں ہونا۔ ۱۳۳۰
" کا آسمان پر ہونا ۱۲۹۴
" کے لیے حکومت یا امر کا ہونا۔ ۱۴۵۱
" کا وتر ہونا۔ ۱۴۹۴
" کی حفاظت۔ ۱۴۹۵
" اَب یا باپ کرکے کیوں نہیں پکارا گیا۔ ۴
اللہ کی توحید۔ ۹۴، ۷۷۹، ۸۱۱
" کی جامع تعلیم۔ ۱۴۹۴
" مذاہب کا اصل الاصول ہے ۹۴، ۱۲۲۰
" فطرت کا مذہب ہے ۷۰۱
" اخلاق فاضلہ کی جڑ ہے ۷۸۷
" عملی رنگ ۴۹۵، ۱۴۹۱
" پر دلائل۔ ۹۵، ۱۹۱، ۴۲۶، ۸۹۹
۹۳۵، ۹۵۰، ۱۰۲۷، ۱۱۴۸
۱۳۰۰، ۱۳۲۸، ۱۳۹۲
الیاس۔ ۱۱۵۹، ۴۷۶
" کا آسمان پر جانا۔ ۲۰۴
" کی دوبارہ آمد۔ ۳۰۴
الیسع۔ ۴۷۶
ام جمیل۔ ۱۴۹۳
ام سلمہ۔ ۱۳۸۷
ام سلیم۔ ۲۵۸
ام سلیط۔ ۲۵۸
ام عمارہ۔ ۲۵۸
ام القریٰ۔ ۵۳
ام الکتاب۔ ۲۵۲
ام کحت۔ ۳۰۹، ۳۸۴
امانت۔ ۲۳۷
ادائے امانت ۳۵۴
حمل امانت۔ ۱۱۱۳
امر یا نہی۔ سے اس کے خلاف استدلال۔ ۲۰۸
امر بالمعروف۔ ۲۵۱
" کا ترک۔ ۴۴۰
امت محمدیہ میں مقربین اور کاملین کا گروہ۔ ۲۱۱
" کا کام دوسروں کی تکمیل۔ ۲۵۳
" میں اور نبی نہیں آسکتا۔ ۲۵۳
" کی فضیلت امم پر ۲۵۳
" کا حق کے ساتھ ہدایت کرنا۔ ۵۴۵
" کی ہلاکت باہمی فساد ہے۔ ۵۹۹
" کے مدارج عالیہ۔ ۶۲۳

امت محمدیہ کی برگزیدگی اور تین گروہ۔ ۱۱۳۱
" کے درجات انبیا کے ساتھ ہونا۔ ۱۳۴۸
" میں سے آخرین۔ ۱۳۷۳
" میں موسیٰ اور عیسیٰ کے مثیل۔ ۱۳۹۱
" اور امم سابقہ۔ ۱۳۹۱
" میں مکالمہ الہیہ۔ ۱۳۹۶
" کا آنحضرتؐ کے نور سے مستعار لینا۔ ۱۴۱۹
امہات المومنین کے اوصاف۔ ۱۳۸۹
امی۔ ۲۳۶
امیہ ۵۴۴
انجیر۔ سلسلہ موسویہ کا نشان۔ ۱۴۷۵
انجیل۔ کی زبان۔ ۵۲
" کے متعلق پہلے عیسائی بزرگوں کا خیال۔ ۵۲
اناجیل کے مختلف نسخے۔ ۵۳
" میں تحریف کی مثالیں۔ ۵۳
" اور ضرورت عمل۔ ۵۴
وجہ تسمیہ ۱۸۱، ۱۸۲
چار اناجیل۔ ۱۸۱
" کے مصنف۔ ۱۸۱
زمانہ تصنیف ۱۸۱
" میں ہدایت۔ ۱۸۲
" میں تعلیم توحید ۲۲۲
" میں واقعات صلیب مسیح۔ ۳۹۳
" میں ہدایت و نور۔ ۴۲۷
" میں آنحضرتؐ کے متعلق پیشگوئی۔ ۵۳۹
اندھا بہرہ ہونے سے مراد۔ ۴۳۸
اُنس۔ ۴۲۲
انسان۔ نسل انسانی کی وحدت۔ ۴، ۵۳۹
حصول کمال کیلئے خدمت مخلوق۔ ۴
" خلیفہ کن معنوں میں ہے ۲۶
" میں متضاد قوتوں کا اجتماع۔ ۲۶
" کا حصول علم۔ ۲۷
" کا اشیاء پر تصرف۔ ۲۸
" کا کمال علمی ۲۷
" کا کمال عملی ۲۸
" کی کمال راحت ۳۰
" کا ہبوط ۳۳
" کے کمال کے مختلف مدارج ۱۵۲
" فطرتاً معصوم ہے ۲۰۱، ۱۳۷۹
" کا قانون پیدائش۔ ۲۱۳

انسان کا مٹی سے پیدا ہونا۔ ۲۲۹، ۵۰۴
۸۲۴، ۹۴۰، ۱۰۶۹
تفاوت درجات ۲۸۷، ۱۱۷۶، ۱۲۳۵
نسل انسانی کا متحد الاصل ہونا۔ ۳۰۶
انسان اول کی پیدائش ۳۰۷
بہیمی اور ملکوتی صفات کا جامع ۴۱۰
انسان کی پیدائش ۴۵۶
" کی ذمہ داری ۴۷۹
" کی ذمہ داری کا قانون ۴۹۹
پیدائش کے چھ مرتبے ۵۱۵
چارپایوں سے مشابہت ۵۴۵
" کا تعلق خالق سے ۷۰۴
" کو دوسرے حیوانات سے ممیز کرنے والی باتیں ۷۳۷
" انسان کی ابتدائے پیدائش۔ ۷۳۷
" میں روح اللہ کا نفخ۔ ۷۳۸
" کا فطرت صحیح پر پیدا ہونا۔ ۷۸۴
" کی فضیلت دیگر مخلوق پر۔ ۷۹۹
" کی پہلی اور دوسری پیدائش اس زمین سے ہونا۔ ۸۷۹
" کا عجلت سے پیدا ہونا۔ ۹۰۲
" کی پیدائش کے مختلف مراتب ۹۱۹
" کی ترقی کے چھ مراتب ۹۳۸، ۹۳۹
" کے نفس سے زوج کا پیدا کیا جانا۔ ۱۰۶۹
" میں دو دل نہ ہونا۔ ۱۰۸۸
" کو اللہ کا دو ہاتھوں سے پیدا کرنا۔ ۱۱۷۹
" کی پیدائش کی غرض۔ ۱۳۰۴
" کا کمال سوائے تعلق باللہ کے نہیں ۱۳۱۳
" کا زمین سے پیدا ہونا۔ ۱۳۱۸
" کو بیان کا سکھانا۔ ۱۳۲۸
" موت پر قدرت نہیں رکھتا۔ ۱۳۴۴
" کی پیدائش میں شقاوت یا سعادت کا لکھا جانا ۱۳۸۱
" اور خواہش معاصی۔ ۱۴۲۵
" قوت کے استعمال میں صاحب اختیار ہے ۱۴۲۹
انسان کامل۔ ۱۴۳۱، ۱۴۶۹
" کا بہترین صورت پر پیدا ہونا۔ ۱۴۷۶
" کا اشرف المخلوقات ہونا۔ ۱۴۸۰
انصار۔ ۶۰۵، ۱۳۶۱
انطاکیہ ۱۱۳۷
انفاق۔ بے محل۔ ۹۹۴

انفاق غیر مسلم پر ۱۴۳۰
انفاق فی سبیل اللہ ۱۱ - ۱۲۴ - ۱۴۶
۱۶۱ - ۲۶۷ - ۶۱۴
" سے رکنا ہلاکت ہے ۱۱۳ - ۱۲۷۱
" کے پہلے حقدار اہل وعیال ہیں ۱۲۹
" کی غرض ترقی دین ہو۔ ۱۶۲
" کے لیے سوال کیا ہو۔ ۱۶۴
" اپنی بھلائی کے لئے ہے ۱۲۷۱
انہار الجنۃ ۳۰۱
اوریاہ ۱۱۶۹
اوس ۵۶-۲۴۸
اوس بن صامت ۱۳۵۳
اولوالامر ۳۵۵
اولاد کی خواہش ۲۰۴
" کا قتل ۴۹۱
" کو جاہل رکھنا اسے قتل کرنا ہے ۴۹۱، ۴۹۲
" کی تربیت ۳۱۴-۴۹۱-۴۹۶
چھوٹی اولاد کی موت ۱۲۲۴
" میں لڑکیاں ۱۲۲۷
" کی دشمنی ۱۳۸۱
اونٹ کا گوشت ۲۴۴
اہرمن ۴۸۱
اہل بیت ۱۰۹۸
" کی تطہیر ۱۰۹۹
" کی محبت ۱۲۲۲
اہل ذمہ کے حقوق ۲۳۶
اہل قرآن ۱۴۳- ۲۶۵، ۳۵۵
۲۵۸، ۴۶۶، ۴۶۸، ۹۷۴
اہل کتاب ۶۵
" " سے نکاح ۱۳۰ - ۴۰۹
" " کا انکار پر اصرار ۲۴۳
" کے مومن۔ ۲۵۵
" کا کھانا۔ ۴۰۹
" کا ذبیحہ ۴۰۹، ۴۸۷
" سے آنحضرتؐ کا عفو۔ ۴۱۴
" سے موالات۔ ۴۳۰
" کا مسلمانوں سے سلوک۔ ۴۳۳
" سے جنگ۔ ۵۸۴
ایتاء ذی القربیٰ ۷۶۶
ایثار۔ ۱۰۱

ایران کا روم پر غلبہ ۱۰۶۵
ایلاء ۱۳۲، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷
ایمان کا مفہوم۔ ۹، ۱۰۱، ۳۸۷
〃 بالغیب کی حقیقت ۱۰
اللہ اور آخرت پر ایمان۔ ۱۴
〃 بلا عمل۔ ۳۸۳، ۱۳۶۶
〃 کا انکار۔ ۴۱۰
〃 کا بڑھنا گھٹنا۔ ۵۵۳
〃 کی شاخیں۔ ۵۵۳
〃 خوف و رجا کے درمیان ہے۔ ۷۴۰
〃 اور عمل کا تعلق۔ ۱۱۲۸
〃 کے تین پہلو۔ ۱۲۹۰
ایوب۔ ۴۷۶، ۱۱۷۴
〃 کی تکلیف ۹۱۱، ۱۱۷۴
〃 کو اہل کا دیا جانا۔ ۹۱۱
〃 کے جھاڑو سے مارنے کا قصہ۔ ۱۱۷۵

ب

بابل۔ ۶۳
بادشاہ۔ ظل اللہ ہے۔ ۱۷۷
〃 اور رعایا کے تعلقات۔ ۳۵۴
بادشاہت۔ کی غرض ۱۱۹، ۱۴۷
〃 انتخاب سے ہے وراثت سے نہیں ۱۴۷
〃 کی ضرورت۔ ۱۴۷
〃 عزت کا موجب ہے۔ ۱۹۴
〃 قوم کی ہوتی ہے نہ افراد کی۔ ۴۱۶
〃 کس طرح ملتی ہے۔ ۵۳۱
〃 نصب العین نہیں۔ ۶۳۷
〃 کے فرائض۔ ۹۰۸
〃 کی بنیاد مشورہ پر ہے۔ ۱۲۲۵
بادل۔ بادلوں کے سایے ۱۲۰
بارہ مہینے ۵۸۷
باطل۔ کی بے بنیادی۔ ۷۲۵، ۱۳۳۲
〃 کی تردید بدعت نہیں۔ ۱۳۵۱
باغ سے مراد۔ ۸۲۷
باغی علی الامام۔ ۱۲۸۷
بائیبل۔ ۱۸۱
〃 میں تحریف۔ ۵۲، ۵۳، ۱۹۳
〃 ۲۳۸، ۵۲۲، ۶۹۲
〃 میں فحش قصے۔ ۱۳۱، ۵۲۲، ۶۶۱
〃 میں افعال قبیحہ کی نسبت انبیا کی طرف، ۶۹۲

بائیبل کے مضامین قرآن میں۔ ۹۸۳
توریت و انجیل کا باہم اختلاف۔ ۱۴۸
سموئیل کی کتاب کی تاریخی حیثیت۔ ۱۴۸
قاضیون کی کتاب کی تاریخی حیثیت ۱۴۹
طالوت کے متعلق متضاد بیان۔ ۱۵۱
〃 میں بدر اور ہجرت کی پیشگوئی۔ ۱۸۸
〃 کی اصلاح قرآن سے۔ دیکھو قرآن نیز دیکھو توریت اور انجیل۔
بت۔ بتوں کی شفاعت۔ ۶۲۲
〃 کا زیورات سے آراستہ کیا جانا۔ ۱۲۳۳
〃 کو مظہر ملائکہ قرار دینا۔ ۱۲۳۳
بت پرستی۔ کا آخر نابود ہو جانا۔ ۵۳۳
〃 کے لیے حصول قرب الٰہی کا غلط عذر۔ ۶۲۳
〃 کا شرک۔ ۱۴۹۴
بحرین۔ کا خراج۔ ۱۷۵، ۱۴۷۷
بخت النصر۔ ۱۵۹، ۴۴۰، ۷۸۰، ۱۴۵۷
بدر۔ ۲۶۰
بدر کی جنگ ۵۵۳ تا ۵۵۷
〃 میں آنحضرتؐ کی دعا۔ ۱۸۸
〃 کی پیشگوئی۔ ۱۸۸، ۱۳۲۶
〃 کی پیشگوئی بائبل میں۔ ۱۸۸
〃 کا نشان ہونا۔ ۱۸۸
〃 میں مسلمانوں اور کفار کی نسبت۔ ۱۸۹
〃 فرشتوں کا آنا۔ ۵۵۵
〃 میں آنحضرتؐ کی رمی ۵۵۸
〃 کا فرقان ہونا۔ ۵۶۵
〃 میں قیدیوں کے بارہ میں مشورہ۔ ۵۷۱
〃 میں قیدیوں سے فدیہ۔ ۵۷۱، ۵۷۲
〃 کا الساعۃ قرار دیا جانا۔ ۱۳۲۶
بدر صغریٰ ۲۹۱
بدعت۔ ۱۳۵۱
بدگمانی۔ ۱۲۸۹
بدگوئی۔ ۷۹۰
بدی۔ کیا ہے۔ ۴۵۵
〃 کا خالق۔ ۴۵۵
〃 کا اثر۔ ۱۳، ۱۲۱۱
〃 کی قوت کمزور ہے۔ ۵۴
〃 پر حسرت۔ ۹۶
〃 کے مقابلہ کی تیاری۔ ۳۰۲
〃 سے پاک ہونے کا طریق۔ ۳۳۷

بدی کو نیکی سے دور کرنے کی تعلیم ۷۱۲
〃 پر مجبور کوئی نہیں۔ ۸۰۴، ۸۲۵
〃 کا مقابلہ نیکی ہے ۹۵۰
〃 کا نیکی سے بدلنا ۹۹۴
〃 کی کھلی سزا کب آتی ہے ۱۲۰۷
〃 کے بد نتائج کا نہ دیکھنا ۱۲۹۵
〃 کا اچھا معلوم ہونا ۱۲۳۶
برزخ ۷۶۸، ۹۵۱
〃 میں ثواب و عذاب ۱۲۰۱
برطانیہ ۸۱۸
بسم اللہ ہر سورت کی آیت ہے۔ ۲
〃 سورتوں کی ابتدا میں۔ ۲
〃 ہر کام کی ابتدا میں۔ ۳
〃 میں عملی توحید۔ ۳
〃 کا نزول۔ ۳
〃 ہر سورت کا خلاصہ ہے۔ ۲
بشر۔ ۳۵۶
بعث کا دن۔ ۵۰۴
بعث روحانی ۴۶۳ دیکھو قیامت۔
بعث بعد الموت۔ کی غرض۔ ۶۱۹
〃 پر تعجب۔ ۷۹۳، ۱۱۴۷
〃 میں یہ جسم نہیں۔ ۸۰۸، ۱۱۴۷، ۱۳۴۱
〃 اعمال سے ہے۔ ۱۲۹۲
〃 نئی پیدائش ہے ۱۲۹۳
〃 ہڈیاں جمع کرنے سے مراد۔ ۱۴۲۵
بعل۔ ۱۱۵۹
بغی۔ ۷۶۶
بکہ۔ ۲۴۶
بلال۔ ۱۴۷۲
بلعم۔ ۵۴۴
بلقیس۔ ۱۰۱۹ تا ۱۰۲۵
بلوغت۔ کی عمر۔ ۳۰۸، ۳۱۴
〃 جسمانی و روحانی۔ ۶۷۸، ۱۲۵۷
بنک کا سود۔ ۱۶۹، ۱۷۰
بنی اسد بن خذیمہ ۱۲۹۰
بنی اسرائیل۔ ۳۴
〃 کا خدا سے عہد۔ ۳۴
〃 کی فضیلت ۳۷
〃 کا عبور دریا۔ ۳۹، ۸۸۲، ۱۰۰۲، ۱۲۴۷
〃 اور گائے کی پرستش۔ ۴۰

بنی اسرائیل کا اللہ کو دیکھنے کا سوال ۴۱
〃 بادل کا سایہ ۴۲
〃 پر من و سلویٰ کا اترنا۔ ۴۳
〃 کی نافرمانیاں ۴۳
〃 کی ذلت و مسکنت ۴۶
〃 پر پہاڑ کا اٹھانا ۴۷، ۴۲، ۵
〃 بندر اور سور بننا ۴۸، ۴۳۴، ۳۴۹
〃 اور گائے کے ذبح کرنیکا واقعہ ۴۹
〃 کی مسیح کے قتل کی کوشش ۵۰، ۳۹۳
〃 کی قساوت قلبی ۵۱
〃 اور نبی موعود ۵۸
〃 کی موت اور زندگی ۱۴۵
〃 کا خروج از مصر ۱۴۵
〃 کی تاریخ میں اہل اسلام کیلئے سبق ۱۴۵، ۱۴۷
〃 اور حرمت طعام ۲۴۴
〃 کے بارہ سردار ۴۱۳
〃 کی نبوت اور بادشاہت ۴۱۶
〃 کا بیابان میں رہنا ۴۱۸
〃 پر دو بار تباہی ۴۴۰۔ ۷۷۹
〃 کے ذکر میں مسلمانوں کی مشکلات کا علاج ۵۴۲
〃 پر مصریوں کا اثر ۵۲۳
〃 کی نجات کا سامان ۶۳۷
〃 کے بڑے لوگ ۶۳۷
〃 ارض مقدس میں ۶۳۹
〃 کی تاریخ کا مسلمانوں میں دہرایا جانا ۷۸۰
〃 کے سلسلہ کا محدود ہونا ۸۳۴
〃 کا باغ اور خزانوں کا ورثہ ۱۰۰۱
〃 کی ساعت وسطیٰ ۱۲۳۹
〃 ابتدا و انتہائے سلسلہ میں دو نبی ۸۷۶
بنی اسماعیل ۳۴
〃 میں نذیر کا نہ آنا ۱۰۸۲
بنی حارثہ ۲۵۹
بنی سلمہ ۲۵۹
بنی قریظہ ۵۶، ۴۳۰، ۱۰۹۶
بنی قینقاع ۱۰۹۶، ۱۳۶۲
بنی کنانہ ۵۶۶
بنی مدلج ۳۷۱
بنی نضیر ۵۶، ۴۳۰، ۱۰۹۶، ۳۵۹
بن یامین ۶۷۵، ۶۹۱، ۶۹۳، ۶۹۷
بولشوزم ۱۷۱، ۳۱۷، ۴۷۱

یونس۔ ۱۶۲
بہشت۔ کی ابتدا اس دنیا سے ہے۔ ۱۹۰
۵۹۷، ۶۲۰، ۱۳۳۲، ۱۳۴۴
سکون روحانی کی بہشت۔ ۳۰
اس عالم کی جنت اور اسباب آسائش۔ ۳۰، ۸۹۱
" کی خوشخبری اس دنیا میں۔ ۱۱۳۹
" کا مخفی ہونا۔ ۲۱، ۸۶۴
" میں ازواج۔ ۲۲
" کے دروازے۔ ۱۱۰، ۷۳۹
" متشابہات میں سے ہے۔ ۱۸۳
" میں کیفیت مکان۔ ۲۶۶
" کی وسعت۔ ۲۶۶
وعدۂ جنت میں دو وعدے۔ ۳۰۱
بہشتوں کا مُرد ہونا۔ ۳۸۲، ۶۰۶
" فضل سے ملتی ہے۔ ۵۱۳
" کا خلود۔ ۶۶۶
" میں عزیزوں کا ساتھ ہونا۔ ۷۱۲
" کی کمال راحت کا نقشہ۔ ۷۴۰
" اور دوزخ کے درمیان پردہ۔ ۷۹۲
" اور دوزخ کے درمیان دیوار۔ ۱۳۴۷
" کی صبح و شام۔ ۸۶۴
" میں سلامتی۔ ۸۶۴
" کی روضات میں علم و اخلاق کی طرف اشارہ ۱۰۶۷
" میں تقاضائے نزع نہیں۔ ۱۱۵۴
" میں غیر متناہی ترقی۔ ۱۱۸۳، ۱۳۹۰
" کی آرزوئیں۔ ۱۲۴۱
" میں زوج کا تعلق۔ ۱۲۴۹
" میں مغفرت۔ ۱۲۶۷
" دو بہشت۔ ۱۳۳۳
دو بہشتوں کے وعدے میں فتوحات کی طرف اشارہ۔ ۱۳۳۳
مقربین اور اصحاب الیمین کی بہشت میں فرق ۱۳۳۵، ۱۳۴۰
" کی نہریں دنیا میں۔ ۱۳۳۵
" میں اس دنیا کی عورتیں۔ ۱۳۳۹
" رضائے الٰہی سے بنتی ہے۔ ۱۴۷۲
بہشت کی نعمتیں۔ ذکر بطور مثال ہے۔ ۷۱۵
" ان کی حقیقت۔ ۱۰۸۵، ۱۲۶۶
" غل و غش سے خالی ہیں۔ ۵۱۳
سب سے بڑی نعمت رضائے الٰہی ہے۔ ۵۹۷
درخت اور نہریں۔ ۲۲، ۷۴۴
پھل۔ ۲۲
رزق۔ ۵۱۵
سلامتی۔ ۶۲۰، ۸۶۴
دکھ کا نہ ہونا۔ ۶۲۴
سبز لباس۔ ۸۲۶
سونے کے کڑے۔ ۸۲۶
ریشم۔ تخت۔ ۸۲۶
پینے کی چیزیں۔ ۱۱۵۲
عورتیں۔ ۱۱۵۳
حور۔ ۱۱۶۷، ۱۳۰۸، ۱۳۳۴، ۱۳۳۹
چار قسم کی نہریں۔ اور ان کی غرض ۱۲۶۶
شراب۔ ۱۲۶۶
اللہ کی رویت۔ ۱۲۹۷
غلمان ۱۳۰۷
بقاء و سردار کا سامان۔ ۱۳۳۹
ان میں اعمال حسنہ کا نقشہ۔ ۱۴۳۱
بئر معونہ ۲۹۳، ۱۲۵۹
بی بی۔ دیکھو عورت۔
بیت ایل ۷۶
بیت اللہ۔ دیکھو کعبہ۔
بیت المال۔ ۳۱۷، ۵۹۴
بیت المعمور ۱۳۰۵
بیت المقدس۔ ۴۳، ۷۵، ۱۵۹، ۷۸۰
بیعت۔ سے قوت کا پیدا ہونا۔ ۱۲۷۸
" مجدد۔ ۱۲۷۸
" خاص مقصد کے لیے۔ ۱۲۷۸
" عورتوں سے۔ ۱۳۶۸
بیعت رضوان۔ ۱۲۷۵، ۱۴۷۷
بیوہ۔ کی عدت اور نکاح۔ ۱۴۰
عدت میں پیغام نکاح۔ ۱۴۱
" کے لیے ایک سال اتباع کا حکم۔ ۱۴۳

پ

پانچ باتوں کا علم ۱۰۸۱
پانی۔ میں پھونکنے کی ممانعت۔ ۲۱۶
" سے زندگی۔ ۹۰۱
" کا زمین سے نکالا جانا۔ ۱۳۴۲
پتھر جن کی عبادت ہوتی تھی۔ ۴۴۳
پردہ۔ ۹۶۴ تا ۹۶۶
پردہ میں افراط و تفریط ۹۶۷
عمر رسیدہ عورتیں مستثنیٰ ہیں ۹۷۸
عورت کا اجنبی مرد سے کلام ۱۰۹۸
عورت کا ضروریات کیلئے باہر نکلنا ۱۰۹۸
حکم حجاب ۱۱۰۹
" کے ذریعہ بدمعاشوں سے بچانا ۱۱۱۲
پرند۔ کا عذاب سے تعلق ۷۶۴، ۱۴۸۸
" کا جنگ سے تعلق ۹۰۹
" کی تسخیر ۹۰۹
" کی تسبیح۔ ۹۷۲، ۱۳۹۴
پولیٹیکل قیدی۔ ۲۸۵
پولوس۔ ۲۱۵، ۴۳۹
پہاڑ۔ کا اُڑنا۔ ۸۸۸، ۱۰۳۲، ۱۴۳۴
" سے کھانے کا سامان۔ ۷۵۰
" سے اضطراب زمین کا رکنا۔ ۷۵۰
" کی تسبیح۔ ۹۰۹
" کی تسخیر۔ ۹۰۹، ۱۱۶۸
پھول۔ ۱۳۲۹
پھونکنا (پڑھ کر) ۱۴۲۸
پیر پرستی۔ اور جھوٹے پیشوا۔ ۹۶، ۱۷۵
۲۳۱، ۲۵۰، ۲۵۱، ۷۲۴
پیراکلیٹ ۱۳۷۰
پیشگوئی متشابہات سے ہے۔ ۱۸۵
" میں استعارہ۔ ۱۸۶
انذاری پیشگوئیوں کا ٹل جانا۔ ۴۴۱
" میں اجتہادی غلطی۔ ۱۲۸۱
تمام تفصیلات پر اطلاع نہیں ملتی۔ ۱۲۸۱
" کا لکھنا۔ ۱۳۰۹
" کی برکت مسلمانوں میں ہے۔ ۱۳۷۱
قرآن میں پیشگوئیاں۔ دیکھو قرآن۔
پین اسلامزم۔ ۲۷۶

ت

تابوت۔ ۱۴۷، ۱۴۸
تبع۔ ۹۲۵، ۱۲۴۸
تبوک کی جنگ۔ ۱۴۲، ۵۸۸
تثلیث۔ ۱۹۱، ۳۹۹، ۴۳۸
تثنیہ کا استعمال۔ واحد میں ۱۲۹۵
" کثرت کے لیے۔ ۱۳۹۲
تجارت۔ ۱۱۵، ۱۷۰، ۳۳۶
" مال حرام کی۔ ۱۷۰
تجارت میں معاملات کی تحریر ۱۷۳
تجسس ۱۲۸۹
تحریف۔ ۳۴۸، ۴۱۳، ۶۹۳ نیز دیکھو انجیل
" بائیبل و توریت
تحقیر ۱۲۸۸
تخییر ۱۰۹۷
تراویح۔ بدعت نہیں ۱۳۵۱
ترک ۸۴۵
ترکہ کی تقسیم ۳۱۷
تسبیح۔ کل مخلوق کی۔ ۷۹۱
" پہاڑوں کی ۹۰۹
" پرندوں کی۔ ۹۷۲
تسخیر عالم ۷۲۲، ۷۵۰
تشریق کے ایام ۱۱۸
تصویر کا بنانا ۱۱۱۷
" کے ذریعہ تعلیم ۱۰۲۵
" والے گھر میں فرشتے کا نہ آنا ۱۱۰
تعدد ازدواج ۳۰۹، ۳۸۴
" اور الہامی کتابیں ۳۰۹
" پر حد بندی ۳۰۹
تعریف کی خواہش ۲۹۸
تعلیم۔ کا نہ دینا قتل کرنے کے برابر ہے ۴۹۱
۴۹۲، ۴۹۶
اسلام کا سب سے پہلا پیغام۔ ۱۴۷۷
دیکھو علم۔ عورت
تفرقہ ۷۶۷
تفریط ۶
تفسیر۔ کا اصول ۱۸۳ تا ۱۸۵
" میں اتباع صحیح حدیث کا واجب ہے۔ ۱۱۶۹
تفاسیر میں اسرائیلیات ۱۱۶۹
تقدیر۔ ۹۸۲، ۱۴۳۲
تقلید۔ ۹۷، ۵۴۳، ۱۰۷۹
تقویٰ۔ ۸
" حصول کمال کی پہلی سیڑھی ہے۔ ۹
" کے تین مرتبے۔ ۴۴۴
" کا کامل مرتبہ۔ ۹۹۵
" معیار قرب ہے ۱۲۹۰ دیکھو متقی۔
تقیہ۔ ۱۹۶
تکبر۔ ۳۴۳، ۷۹۰، ۱۰۵۰
تکفیر۔ ۵۶، ۳۷۳

تکفیر کرنے والے فرقے۔ ۴۹۸
تکلف۔ ۱۱۷۹
تمثیل۔ میں بیان واقعہ نہیں ہوتا۔ ۸۲۶
قرآن میں تمثیلات۔ دیکھو قرآن۔
تمسخر۔ ۸۰۶
تمنی۔ ۳۳۸
تمیم داری۔ ۴۴۸
تناسخ۔ ۲، ۴، ۷۰۵، ۹۴۳، ۱۱۳۱، ۱۲۵۳
تواضع ۵۰۴
توبالسک ۸۴۴
توبہ۔ ۲۴۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۴۲۲، ۱۲۰۷
توریت۔ وجہ تسمیہ اور مجموعہ کتب۔ ۱۸۱
〃 میں تحریف۔ ۵۲، ۴۲۶
〃 کے احکام۔ ۵۵
〃 میں ہدایت و نور۔ ۱۸۱، ۴۲۵
〃 کے بعض احکام کی منسوخی۔ ۲۲۲
〃 اور انبیاء بنی اسرائیل۔ ۲۲۲
〃 کی تکمیل ترمیم تنسیخ۔ ۲۲۲
〃 کی حفاظت ۴۲۶
〃 اور دیگر انبیائے بنی اسرائیل کی کتب۔ ۴۲۶
〃 وانجیل کی اقامت سے مراد۔ ۴۳۷
〃 کا اتمام نعمت ہونا۔ ۴۹۶
〃 وانجیل کے ترجمے۔ ۴۹۷
〃 کا مفصل ہونا۔ ۵۳۵
〃 کو اللہ تعالیٰ کا لکھنا۔ ۵۳۵
〃 میں آنحضرت صلعم کی پیشگوئی۔ ۵۳۹
〃 کا رحمت ہونا۔ ۶۴۷، ۱۲۵۷
〃 اور قرآن کی تعلیم۔ ۷۸۱
〃 کی تعلیم قرآن میں۔ ۷۸۷
〃 کی فضیلت دیگر کتب سابقہ پر۔ ۱۰۴۳
توکل۔ ۲۶۰، ۵۷۰، ۶۴۴، ۶۹۱، ۱۳۹۳
تہجد۔ ۸۰۲، ۱۲۸۲، ۱۴۱۷، ۱۴۱۹
تہمت۔ ۶۸۶، ۹۶۲، ۱۱۱۱
تیمم۔ ۳۳۶، ۳۴۷

ث

ثابت بن قیس۔ ۱۳۷، ۳۴۴، ۱۲۸۴
ثعلبہ بن حاطب۔ ۵۹۹
ثمود۔ ۵۱۹، ۵۲۰، ۷۹۵، ۱۴۷۰
ثنویہ۔ ۴۵۵
ثور (غار) ۵۸۹

ج

جالوت۔ ۱۴۹
جانور۔ سے سبق۔ ۴۲۰، ۷۴۱
〃 اور علم غیب۔ ۱۰۱۷
جبر۔ ۹۸۲
جبرائیل۔ ۴۱، ۴۲، ۱۱۷۴
جبل رحمت۔ ۱۱۶
جدعون۔ ۱۴۹
جرم میں اعانت۔ ۱۰۳۷
جزا اور سزا کا قانون۔ ۴، ۱۲، ۱۹۴، ۷۸۳، ۸۹۵
〃 کا انکار۔ ۸۹۸
جزیہ۔ ۵۸۳
جسمانی امور سے روحانی امور پر استدلال۔ ۴۸۰، ۵۰۷، ۷۴۹، ۱۰۲۸، ۱۱۱۵
جعفر۔ ۴۴۱، ۶۷۱
جمعہ۔ ۱۳۷۳، ۱۳۷۵
〃 کا خطبہ۔ ۱۳۵۱، ۱۳۷۵
جمہوریت۔ ۳۴۰، ۳۵۶
جمیلہ۔ ۱۳۷
جن۔ ۴۸۵، ۴۸۹، ۸۰۵، ۱۳۳۴
〃 کا اطلاق انسان پر۔ ۴۸۵، ۴۸۹، ۱۰۱۸، ۱۱۱۷، ۱۳۳۶، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳
〃 کی آگ سے پیدائش۔ ۵۰۴
〃 دیکھے نہیں جاتے۔ ۵۰۸
جنوں میں رسول۔ ۴۸۹
انسان جنوں کی طرف رسول نہیں ہو سکتا۔ ۸۰۷
جنوں کا وفد آنحضرت صلعم کی خدمت میں ۱۲۶۰
〃 کے انسان سے تعلقات مناکحت ۱۳۳۴
〃 جن بہشت میں جائینگے یا نہ۔ ۱۳۳۴
جنازہ۔ غیر مسلم کا جنازہ۔ ۶۱۱
جنگ۔ میں صبر۔ ۱۵۰
〃 فضل بھی ہوتا ہے۔ ۱۵۱
〃 میں معذور لوگ۔ ۳۷۴، ۶۰۲
الحرب خدعۃ سے مراد۔ ۳۸۹
〃 میں پیٹھ دکھانے کی ممانعت۔ ۵۵۸
〃 میں درخت کاٹنا۔ ۱۳۵۹
جنگ خندق میں ۱۳۶۲
〃 اور خمر و میسر ۱۲۷
〃 اور حرمت سود ۲۶۴
اسلامی جنگ۔ مسلمانوں کو جنگ کی ضرورت کیوں پیش آئی ۱۱۱، ۳۶۳
مسلمان جنگ کرنا نہ چاہتے تھے ۱۲۴
〃 کی غرض ۹۲۹، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۲۵، ۵۷۰، ۵۶۴
〃 لوٹ کے لئے نہ تھے ۱۲۴، ۲۶۳، ۳۶۳
فی سبیل اللہ جنگ سے مراد۔ ۱۱۱
〃 کی شرائط۔ ۱۱۱
〃 کی حد۔ ۱۱۱، ۱۱۲
〃 کی حرمت کے مہینوں میں ممانعت۔ ۱۱۳، ۱۲۵
مسلمان جنگ کرنیوالے کیسے ہوں۔ ۹۲۹، ۳۶۳
مسلمانوں کو اصلاح نفس کے ذریعہ جنگ کیلئے تیار کیا گیا۔ ۳۶۴، ۵۵۳
〃 کا خاتمہ۔ ۶۱۵
〃 کا خاتمہ اسلام کی ترقی کا موجب ہوا۔ ۱۲۷۹
قریش اور مسلمانوں کی تین بڑی لڑائیاں۔ ۲۶۱
نزول ملائکہ کی حکمت۔ ۲۶۱
مسلمانوں اور کفار کی اغراض جنگ کا مقابلہ۔ ۳۶۴
مکلف صرف آنحضرت صلعم تھے۔ ۳۶۹
قریب کے کفار سے جنگ۔ ۶۱۶
پیشگوئیوں میں ذکر اور حکم جنگ میں فرق۔ ۱۲۶۸
جنگ کے قیدی۔ بنانے کی ضروری شرائط۔ ۱۲۶۴
〃 فدیہ لیکر یا بطور احسان آزاد کیے جائیں۔ ۵۷۱، ۱۲۶۴
〃 کا قتل جائز نہیں ہے۔ ۱۲۶۴
جنگ عظیم۔ اور اسکے بعد صلح۔ ۱۲۰۹، ۱۲۴۵
〃 کے بعد فتنہ عظیم۔ ۱۲۴۵
جوا۔ ۱۲۸، ۴۴۱
جودی۔ ۶۵۳
جہاد۔ کی تین قسم۔ ۱۲۷، ۵۹۸
〃 اصغر اکبر۔ ۱۲۷
〃 منافق سے۔ ۱۲۷
〃 جو ہر حال میں ضروری ہے۔ ۱۲۷
جہاد اصلاح نفس و جہاد اعداء۔ ۳۶۵
〃 کی فضیلت۔ ۳۷۴
〃 نہ کرنے والے۔ ۳۷۴
قلمی جہاد میں مسلمانوں کی غفلت ۵۶۹
قلمی و سیفی جہاد ۴۷۰۔ ۵۹۳
مجاہدہ دینی و مجاہدہ علمی ۶۱۳
اعلائے کلمۃ اللہ کا جہاد ۷۷۱
جہاد کبیر ۹۹۱
جہاد نفس ۱۰۵۳
جدوجہد ۱۳۹۴
جھوٹ ۱۵
جیحون ۱۳۳۵
جیش السویق ۲۹۱

چ

چاند کے نور کا محو کیا جانا ۷۸۱
〃 کا سورج سے روشنی لینا ۱۴۶۹ دیکھو سورج
چڑھاوے ۴۰۶
چودہویں سال اور چودہویں صدی ۸۷۱
چوری کی سزا ۴۲۳
چھوٹے۔ بڑوں کی گمراہی کا موجب ہیں ۷۲۳

ح

حاطب بن ابی بلتعہ ۱۳۶۵
حبش۔ میں نبی ۱۴۰۶
حبط اعمال ۶۴۷ دیکھو عمل
حجاب ۹۶۶
حجاج ۹۲۵
حج ۹۲
اعمال حج حضرت ابراہیمؑ کے قائم کردہ ہیں ۷۹، ۹۲۴
〃 اور جنگ کا اکٹھا ذکر ۱۱۱
〃 سے روکا جانے کی صورت میں ۱۱۳
〃 تین طرح پر ۱۱۴
〃 کے مہینے ۱۱۰، ۱۱۵
〃 کی غرض ۱۱۵، ۹۲۴، ۹۲۵
〃 روحانیت کا آخری مقام ہے ۱۱۵
〃 میں زاد راہ کی ضرورت۔ ۱۱۵
〃 اور تجارت۔ ۱۱۵
کنکریوں کا پھینکنا۔ ۱۱۷
ارکان حج میں عاشقانہ افعال کا رنگ۔ ۱۱۷
〃 میں استطاعت کی شرط۔ ۲۴۶
〃 کا ہمیشہ قائم رہنا۔ ۲۴۷

حج مشرک کس طرح کرتے تھے۔ ۵۶۲
" سے مشرکوں کو روکنے کی وجہ۔ ۵۸۱
" کی فرضیت۔ ۹۲۵
" کے منافع۔ ۹۲۵
" عبادت کا منتہی ہے۔ ۹۲۶
ارکان حج میں دوڑنا۔ ۱۲۸۱
حج اکبر ۵۷۶
حجۃ الوداع۔ کا خطبہ۔ ۳۴۴، ۱۶۲، ۳۲۷، ۱۲۹۰
الحجر۔ ۵۲۰
حجر اسود۔ ۸۸
" یمین اللہ ہے۔ ۳۱۱
حدیبیہ۔ کی صلح فتح تھی۔ ۱۲۷۲
" کے مقام پر بیعت ۱۲۷۵
شرائط صلح۔ ۱۲۷۹
حدیث۔ قرآن کے بعد حدیث سے فیصلہ۔ ۳۵۵
احادیث فتن۔ ۴۳۶
احادیث قصص۔ ۸۳۳
" پر عمل بر نص قرآنی۔ ۱۳۶۱
" تفسیر نبوی ہے۔ ۱۴۲۷
" کا وحی خفی سے ہونا۔ ۱۳۲۷
حرث بن ابی ضرار۔ ۱۲۸۶
حرمت۔ کے مہینے۔ ۱۱۰، ۵۸۷
حزقیل۔ ۱۵۹، ۹۱۱
حسان۔ ۹۵۹
حسد۔ ۶۷، ۹۹۱
حسن ظن۔ ۹۶۰
حفظ فروج۔ ۹۳۹
حق۔ قیام حق میں مشکلات۔ ۱۲۳
بیج سے مشابہت۔ ۴۸۰، ۴۸۱، ۱۲۸۲
" کی مضبوطی۔ ۷۲۴
" کے قبول کرنے میں فوائد دنیوی مدنظر نہ ہوں۔ ۹۲۰
" کی نصرت رک نہیں سکتی۔ ۹۲۱
" کے پھیلانے کیلئے کوشش کی ضرورت ۹۳۷
" سے باطل کا نابود ہونا۔ ۱۱۲۴
اہل حق کے مقابل پر باطل نہیں رک سکتا۔ ۱۱۵۰
" کی کامیابی پر مناظر قدرت سے دلیل۔ ۱۱۳۵
" کی تدریجی ترقی۔ ۱۴۲۴
" کے پہنچانے کی غرض۔ ۱۴۳۴
" و باطل کے رستے ممیز ہیں۔ ۱۴۶۸

حق کا دوسروں کو پہنچانا ضروری ہے۔ ۱۴۸۶
حقوق العباد۔ ۴۱۲
حکمت۔ ۱۶۵
حلالہ۔ ۱۳۸
حمراء الاسد۔ ۲۹۰
حمص۔ ۵۸۳
حمنہ۔ ۹۵۹
حنین۔ ۵۸۲
حوّا۔ ۳۰۶ دیکھو آدم۔
حواری۔ ۲۲۳، ۱۳۷۲
آنحضرتؐ کے لیے شہادت۔
حواریوں کی روحانی حالت بروئے انجیل۔ ۴۵۱، ۲۲۳
" سے وعدے ۲۲۳
" اور مطالبہ مائدہ۔ ۴۰۲
" رسول کس معنی میں تھے۔ ۴۱۶
حور۔ ۱۱۵۳، ۱۲۳۹
حیات طیبہ۔ ۷۶۸
حیض۔ اور مقاربت۔ ۱۳۱
حیوانات۔ کا حشر۔ ۴۶۴
" کا آتارا جانا۔ ۱۱۸۱
حیی بن اخطب۔ ۳۵۲

خ

خالد بن سنان۔ ۴۱۶، ۱۰۸۲
خبر۔ کی تحقیقات۔ ۱۲۸۶
خبر عظیم ۱۴۳۷
ختم نبوت۔ ۶، ۸۵، ۱۷۷، ۳۵۷، ۵۱۰، ۷۰۶، ۸۰۵، ۱۱۲۱، ۱۳۷۳
" کی تفسیر احادیث سے۔ ۱۱۰۳
" کے خلاف احادیث اور اقوال۔ ۱۱۰۴
آخری نبی کے آنے میں حکمت۔ ۲۴۰
آخری نبی کی علامت تصدیق انبیاء ہے۔ ۲۴۱
خدا۔ لفظ کا استعمال مجازاً۔ ۱۸۵
" کی بادشاہت۔ ۱۹۴ دیکھو اللہ۔
خدیجہ۔ ۲۰۷
خراش ۱۲۰۷
خرطوم۔ ۸۴۲، ۸۳۴
خروج۔ ۱۴۵
خزرج۔ ۵۶، ۲۴۸

خضر۔ ۸۱۱، ۸۳۳، ۸۳۶، ۸۴۱، ۹۰۲، ۱۳۷۰
" و موسیٰ کے واقعات میں صداقت آنحضرت صلعم ۸۴۱
خطا ۱۷۸
خطوط میں القاب ۱۰۲۱
خلافت ۹۷۶
" ہر انسان کیلئے ۲۶
" کا دوام۔ ۹۷۵
" کا وعدہ۔ ۹۷۵
روحانی خلافت۔ ۹۷۵، ۹۷۶
خلیفۃ اللہ انسان ہی ہو سکتا ہے۔ ۱۲۳۹
" مال میں۔ ۱۳۴۶
خلع ۳۲۸
خُلق۔ اخلاق اور غذا کا تعلق۔ ۹۷
" سے فوقیت۔ ۱۲۲
" اور مال۔ ۱۷۰، ۹۳۱
پچھلی کمزوریوں کا ذکر۔ ۱۷۰
" ترقی کی اصل بنیاد ہے۔ ۹۳۷
" کی تکمیل بعثت نبوی سے۔ ۱۳۹۷
" کا کمال کیا ہے۔ ۱۳۹۷
دنیا داروں کے اخلاق کی آخری حالت۔ ۱۳۹۷
اخلاق فاضلہ نماز سے پیدا ہوتے ہیں ۹۳۸
" بدون وحی پیدا نہیں ہوتے۔ ۱۳۹۵
تعلق باللہ سے۔ ۱۳۹۶
خلوت ۹۶۳، ۹۷۷
خندق۔ ۱۰۹۱
" والے۔ ۱۴۵۷
خوارج ۹۵۶
خواہشات کی پیروی۔ ۴۷۲، ۹۸۹، ۱۲۵۳
" حیوانی اور ملکی۔ ۹۲۷
خودکشی۔ ۳۳۶
خورس۔ ۷۸۰
خوف و حزن مومن کے لیے نہیں۔ ۶۹، ۱۶۲، ۲۹۰
خولہ بنت ثعلبہ۔ ۱۳۵۳
خون بہا۔ ۱۰۲
خیانت۔ ۵۶۰، ۱۱۱۴
خیبر۔ کی فتح کی پیشگوئی۔ ۱۲۷۸

خیبر۔ پر حملہ اور فتح۔ ۱۲۸۱
" کے غنائم ۱۲۷۶

د

دابۃ۔ کا اطلاق انسان پر ۷۵۹، ۱۱۳۴
دابۃ الارض ۴۹۸، ۱۰۳۰
دابر قوم ۴۶۵
دارائے اوّل ۸۴۲، ۸۴۵
دار الندوہ ۵۶۱
داؤد ۱۵۰، ۱۵۲، ۴۷۶، ۷۹۴، ۱۱۱۶
" کا اسرائیل پر لعنت کرنا ۷۸۰
" و سلیمان اور بکریوں کا کھیتی چرنے کا واقعہ ۹۰۸
پہاڑوں اور پرندوں کی تسخیر ۹۰۹
" کا زرہ بنانا ۹۱۰، ۱۱۱۶
" اور اوریا کی جورو کا قصہ ۱۱۶۹
دجال ۴۹۸، ۱۴۸۱
" کی دائیں آنکھ نہ ہونے سے مراد ۲۱۱
" کا فتنہ ۸۱۱، ۸۱۲
احادیث میں لفظ دجال اختیار کرنے کی وجہ ۸۱۳
" کی تعلیم ۸۱۷
" کی ایک آنکھ ۸۱۹
" سفید رنگ ہوگا ۹۹۲
" گروہ کا نام ہے ۱۲۰۳
" کے ماتھے پر کفر لکھا ہوا ہوگا ۱۲۶۹
" کے وقت میں خزانوں کا نکلنا ۱۴۵۵
دجلہ ۱۳۳۵
دخان ۱۲۴۵
درجات کی ترقی مشقت سے ہے۔ ۱۴۶۷
درخت۔ سے مراد بدی۔ ۳۱
دشمن۔ کے مقابلہ کی تیاری۔ ۳۰۲، ۳۶۲
" کے حقوق۔ ۴۰۵
" سے نرمی کی تعلیم۔ ۷۹۳
" سے محبت۔ ۸۶۲
" کے لیے غم۔ ۹۹۷
دعا۔ بہترین۔ ۲
" خداوندی۔ ۲
" میں لفظ رب کا استعمال۔ ۴
" علمی اور عملی غلطیوں سے بچنے کی۔ ۶
" قرب الٰہی کے حصول کی۔ ۱۰۸

دعا کی قبولیت۔ ۱۰۸، ۱۲۲۲
عدم قبولیت کا اعتراض۔ ۱۰۸
جامع دین و دنیا دعا۔ ۱۱۷
کفار پر نصرت کی دعا۔ ۱۷۸
زیغ سے بچنے کی دعا۔ ۱۸۶
قبولیت کا وقت۔ ۱۹۱
کامیابی کی دعا۔ ۳۰۰
" کے ساتھ ضرورت عمل۔ ۳۰۰، ۱۳۱۹
" کرانا شرک نہیں۔ ۴۲۲
" آنحضرتؐ کے روضہ مبارک پر۔ ۴۲۲
" حالت اضطرار میں۔ ۴۶۵
" میں تضرع۔ ۴۷۰، ۵۱۷
" مشرک کی۔ ۴۷۰
" مصائب میں۔ ۵۱۷
" سجدۂ تلاوت کی۔ ۵۵۱
" قبر پر۔ ۶۰۲
کونسی دعا نہ کرنی چاہیئے ۶۵۴
" کافر کی۔ ۷۰۹، ۱۲۰۲
" میں اعتدال۔ ۸۱۰
" بلند آواز سے۔ ۸۱۰
" میں اخفا اور تضرع۔ ۸۴۹
یونس کی دعا۔ ۹۱۲
جانور پر سوار ہونے کی دعا۔ ۱۲۳۲
" کے لیے کوئی واسطہ بکار نہیں۔ ۱۳۵۴
تشہد کی دعا۔ ۱۳۵۵
بد دعا۔ ۲۶۳، ۷۸۲
دعوت۔ الی الاسلام۔ ۲۴۹، ۲۵۰، ۴۴۷، ۷۰۱
" میں صبر کی ضرورت۔ ۷۷۵
" کا صحیح طریق۔ ۸۷۸
" کی مشکلات اور فوائد۔ ۱۲۱۳
دل۔ پر پردہ۔ ۴۶۰، ۸۳۲
" کا اندھاپن۔ ۹۳۰
" پر زنگ کا لگنا۔ ۱۴۵۳
" مرکز ہے۔ ۱۴۸۷
دنیا۔ حسنات دنیا کی طلب۔ ۱۱۷
" کی زینت۔ ۱۹۰، ۱۲۲، ۵۰۹، ۸۲۹
" کو زندگی کا مقصد بنانا۔ ۱۲۲
۱۹۰، ۷۳۹، ۷۸۶، ۱۳۴۹
مرغوبات دنیا میں انہماک۔ ۱۹۰
" کی پرستش کا انجام۔ ۲۳۷

دنیا۔ اور آخرت۔ ۲۴۴، ۴۶۲
" کی زندگی کیوں دھوکا ہے۔ ۲۹۶
" کی زندگی میں تنگی۔ ۸۹۲
" کی آرزوؤں کی مثال۔ ۱۴۶۲
دنیاداروں کے مطالبات۔ ۶۴۶
" کے دلائل حقہ سے اعراض کی وجہ۔ ۶۴۹
" کا معیار عظمت۔ ۱۲۳۵
دوا۔ حرام چیز کا استعمال۔ ۱۲۸
دودھ۔ پلانے کی مدت۔ ۱۳۹
" دینے والے جانوروں کے ذبح کی ممانعت۔ ۹۷۰
دوزخ۔ پر فنا۔ ۲۱
" دنیا میں۔ ۳۳، ۱۴۵۱، ۱۴۸۵
" کے دروازے۔ ۱۱۰، ۷۳۹
" متشابہات میں سے ہے۔ ۱۸۳
" سے بریت کا دعوے۔ ۱۹۳
" سے نکلنا۔ ۴۲۳
" بطور علاج ہے۔ ۵۲۵، ۸۶۶، ۱۳۴۷، ۱۴۸۴
" کا خلود۔ ۴۸۹، ۶۶۶
دوزخیوں کی رزق سے محرومی۔ ۵۱۵
انسان کے دوزخ کے لیے پیدا کیے
جانے سے مراد۔ ۵۴۵
" کے سات طبقے۔ ۷۳۹
" ہر شخص کی علیحدہ ہے۔ ۷۳۹
" میں مومن داخل نہ ہونگے۔ ۸۶۵
" میں موت اور زندگی نہیں۔ ۸۸۲
عذاب کی کیفیت۔ ۹۲۳
" کا بھرنا۔ ۱۰۸۴
" میں اللہ کا وضع قدم۔ ۱۲۹۶
" نعرۂ ہل من مزید۔ ۱۲۹۶
" کا طاقت کا سلب کر دینا۔ ۱۴۰۶
" کے داروغے۔ ۱۴۲۲
" انسان اپنے ہاتھ سے تیار کرتا ہے ۱۴۶۶
" کی آگ دل سے اٹھتی ہے۔ ۱۴۸۷
نیز دیکھو بہشت۔ ۱۴۸۷
دولت۔ کی تقسیم کا صحیح اصول۔ ۳۱۷، ۵۹۴
دلویاں۔ (عرب میں) ۳۸۱
دیت۔ دیکھو خونبہا۔

ڈ

ڈاکہ۔ کی سزا۔ ۴۲۰، ۴۲۱

ذ

ذات الرقاع ۳۷۷
ذبح۔ کی غرض ۴۰۵
" غیر اللہ کے نام پر ۴۰۶
اہل کتاب کا ذبیحہ ۴۰۹۔ ۴۸۷
ذکر و فکر ۲۹۸
ذکر قلب ۵۵۱
ذکر اللہ سے اطمینان قلب ۴۴۵، ۱۳۱۷
" سے شرف کا ملنا۔ ۱۰۶۰
ذکریا۔ ۲۰۲
ذمہ داری کا احساس۔ ۲۴۹
ذوالقرنین۔ ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۴۱، ۸۴۳
" کی دیوار۔ ۸۴۶
ذوالکفل۔ ۹۱۱

ر

راست باز۔ کی اولاد۔ ۸۴۱، ۱۳۰۷
" کی محبت دنیا میں بڑھتی ہے۔ ۸۷۰
" وارث زمین ہونگے۔ ۹۱۶
راستبازی۔ کا معیار۔ ۲۳۶
رامچندر۔ ۱۲۰۶
رائے میں مساوات۔ ۳۵۶
رجعت۔ ۱۰۳۱
رجم ۹۵۵، ۹۵۶
رحبعام۔ ۱۱۱۸
رحم۔ صلہ رحمی۔ ۳۰۷
رسم و رواج۔ پرخرچ۔ ۱۴۳، ۳۴۴
" مسئلہ وراثت میں۔ ۳۲۲
مشرکانہ رسوم۔ ۴۴۷، ۴۵۴، ۴۸۶
" کی زنجیریں۔ ۷۰۶، ۱۱۳۶
رسول۔ استعمال بطور مجاز۔ ۱۱۳۷
دیکھو نبی۔
رضا۔ اللہ کی۔ ۸۸۳، ۱۴۷۳
رضا بالقضاء۔ ۴، ۳۳۹
رضاعت۔ ۳۲۹
رفتار۔ میں میانہ روی۔ ۱۰۷۹
رمضان۔ ۱۰۶
" اور نزول قرآن۔ ۱۰۷
" اور قرب الٰہی ۱۰۷
" کی آخری دس راتیں۔ ۱۴۶۴
رمی جمار۔ ۱۱۷

رنگ۔ رنگوں کا اختلاف ۱۰۶۹
" کا امتیاز ۱۲۹۰
روح۔ تین طرح پر ۸۰۴
" جسم کے ساتھ پیدا ہوتی ہے ۵۴۳۔ ۸۰۴
قبض روح ۴۶۹
" کا بعد موت اس عالم میں آنا ۹۵۲
" کی ترقیات غیر متناہی ۱۱۴۵
ارواح (مومنین) کا قیام ۱۴۳۹
روح اللہ ۱۸۳۔ ۱۰۸۴
" کا ہر انسان میں نفخ ۷۳۸، ۱۰۸۴
روح القدس ۵۷ ـ ۷۵۱
" کی تائید ۱۳۵۸
" اور مسیح کی پیشگوئی ۱۳۷۰
روحانیت۔ پیدائش روحانی ۲۰۱
" کی حکمت ۶۴۹
" قوائے روحانی کا نشوونما ۷۰۶
روحانی نشوونما تعلق باللہ سے ہے
۹۹۷، ۱۴۶۴ ـ ۱۴۷۶
روحانی بیداری کے لئے انقلاب عظیم کی
ضرورت ۱۴۸۱
روحانی ترقی ۱۳۸۹، ۱۳۹۱، ۱۴۰۵
۱۴۱۰، ۱۴۴۰، ۱۴۴۳، ۱۴۸۲، ۱۴۹۵
" اس دنیا سے قیامت تک ۱۴۵۶
" کا غیر محدود ہونا ۱۴۵۳
" کا فجور سے رک جانا ۱۴۵۲
روحانی قیامت دیکھو قیامت
روزہ۔ شرعی اصطلاح میں ۱۰۴
" کا حکم عالمگیر رہا ہے ۱۰۴، ۱۰۶
" کی غرض۔ ۱۰۴، ۱۰۶
" اور بیمار۔ ۱۰۶
" اور سفر۔ ۱۰۵، ۱۰۶
" کا فدیہ کون دے سکتا ہے۔
" اور شیخ فانی۔ حاملہ۔ دودھ پلانیوالی۔
" جہاں دن لمبے ہوں۔ ۱۰۷، ۱۰۹
" سے قرب الٰہی کا حصول۔ ۱۰۷
" کی حدود۔ ۱۰۹
" اور حرام خوری سے اجتناب۔ ۱۱۰
عاشورہ کا روزہ۔ ۱۰۵
خاموشی کا روزہ۔ ۸۵۶

روس۔ ۸۴۴
روم۔ ایران سے جنگ۔ ۱۰۶۵
روم (بحر) ۱۳۳۰
رومن امپائر۔ ۵۸۴
رؤیا۔ ۱۲۲۸
" میں ایک جسم کا ملنا۔ ۷۷۸
" میں بڑے کام کا ارتکاب ۸۹۵
" پر عمل۔ ۱۲۷۵
رہبانیت۔ ۴۴۲، ۱۳۵۱
اسلام کی رہبانیت جہاد ہے۔ ۴۴۲
رہن۔ ۱۷۵
ریحانہ ۳۳۳

ز

زبان۔ زبانوں کا اختلاف۔ ۱۰۶۹
زبور۔ ۲۹۵، ۷۹۴
زبیر۔ ۳۵۹، ۱۲۸۸
زراعت اور فتوحات ۳۵
زرتشت ۱۲۰۶
زقوم ۷۹۶، ۱۱۵۴
زکریا۔ ۲۰۲، ۲۰۶، ۳۷۹، ۸۵۰
" کی نبوت۔ ۲۰۲
زکوٰۃ۔ کی غرض۔ ۳۹
انکار زکوٰۃ پر فوج کشی۔ ۵۷۹
" کی مدات۔ ۵۹۳
" سے مسلمانوں کی غفلت۔ ۵۹۴
" کا صرف اشاعت و تعلیم اسلام پر۔ ۵۹۴
" اور یتامیٰ۔ ۵۹۵
" سے تطہیر۔ ۶۰۷
زمین۔
" کی گردش ۱۵
" کی ابتدا۔ ۷۳۷
" کی سب سے پہلی حالت۔ ۷۳۷
" کی حالت تزلزل۔ ۷۵۰، ۱۴۳۷
" کی حرکت اور رستہ۔ ۱۱۳۳
" کا تدریجی بننا اور چھ مراتب۔ ۱۲۰۹
سات زمینیں اور ان میں زندگی۔ ۱۳۸۶
" کی کشش ثقل۔ ۱۴۳۵
" کس طرح بنی۔ ۱۴۴۲
" کا چھلکا ۱۴۶۳ دیکھو آسمان۔
زمیندارہ بنک۔ ۱۶۹

زنا۔ مبادی کا علاج۔ ۳۲۳
" سے بچنے کے سامان۔ ۳۲۳، ۹۶۳
مبادی زنا میں سزا۔ ۳۲۳
" کی سزا توریت میں۔ ۳۲۴
" کے مبادی سے بچنا۔ ۶۸۹
" کی سزا۔ ۷۹۷
زانی یا زانیہ سے نکاح۔ ۹۵۷
" پر طلاق۔ ۹۵۷
زانیہ یا زانی کا اخراج برادری سے۔ ۹۵۷
" کی تہمت۔ ۹۵۸
" کی تعریف میں وسعت۔ ۹۶۴
زانی کو جھاڑو سے سزا۔ ۱۱۷۵
زنجبیلی پیالہ۔ ۱۴۳۱
زندگی۔ کے اسباب۔ ۱۶۱
" کی قدر ۱۳۷۴
زوجیت۔ کا تعلق کل مخلوق میں۔ ۴۰۳، ۱۱۴۰، ۱۳۰۳
زہرہ ۹۴۰
زیتون۔ ۹۴۱
" سلسلہ محمدیہ کا نشان۔ ۱۴۷۵
زید۔ ۱۱۰۰
" اور زینب کی طلاق کا واقعہ ۱۱۰۱
زید بن ارقم۔ ۱۳۷۶
زید بن عمرو۔ ۱۰۸۲
زینب بنت جحش۔ ۱۱۰۰، ۱۳۸۷
" کے متعلق غلط قصے۔ ۱۱۱۳
زینت۔ ۸۹۳، ۵۰۹، ۹۱۵
زیورات۔ ۱۲۳۳

س

سات قابل قدر آدمی۔ ۱۶۶
سادگی۔ ۱۲۵۸
سامری۔ ۸۸۴، ۸۸۶
سبا۔ ۱۰۲۰، ۱۱۱۸
سبت ۵۴۰، ۷۷۴، ۱۳۷۵
سبیل اللہ ۹۱
سپریچوئلزم ۱۳۰۸
ستارہ۔ ستاروں کی شیطان سے حفاظت۔ ۷۳۴
" کا پھینکا جانا۔ ۷۳۴
" کی روشنی جاتے رہنا۔ ۱۴۲۴
ستی۔ ۱۴۴۸

سیتارتھ پرکاش میں مرد و عورت کے تعلقات ۱۳۱
سٹینلے (لارڈ) ۴۴۲
سجدہ تسخیری اور اختیاری۔ ۹۲۲
" کا نشان ماتھے پر ۱۲۸۲
" تلاوت ۵۵۱
سجدۂ شکر ۷۰۰
سحر۔ ۴۳، ۴۳۵
سدرۃ المنتہیٰ۔ ۱۳۱۴
سدوم۔ ۴۵۸
سراقہ بن مالک۔ ۵۶۶، ۸۲۶، ۹۸۴
سزا۔ کا ذکر الفاظ فعل میں۔ ۱۷
" کا فلسفہ۔ ۱۷، ۱۲۲۶
" بلحاظ حالات ہے۔ ۴۲۴
" میں اسراف ۶۸۹
" کا مطابق اعمال ہونا۔ ۸۰۷، ۸۲۵، ۱۴۳۸
" کا اصول۔ ۱۲۲۶
سعد بن ابی وقاص۔ ۱۰۳
سعی۔ ۱۳۱۸
سفر۔ کی حد۔ ۱۰۵
سکینت۔ ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۲۷۳
سلام۔ السلام علیکم نشان اسلام ہے۔ ۳۷۴
عیسیٰ کا سلام۔ ۳۷۰
اسلام کا سلام۔ ۳۷۰
صلحا کا سلام۔ ۴۵۹
سلمان فارسی۔ ۱۲۷۳
سلیمان۔ ۴۲، ۴۷۶
" پر یہود کا افترا۔ ۴۳
" اور ہوا کی تسخیر ۹۱۰، ۱۱۱۶، ۱۱۷۳
" کے شیاطین۔ ۹۱۰، ۱۱۷۳
" اور منطق الطیر ۱۰۱۶
" کا داؤد کا وارث ہونا۔ ۱۰۱۶
" کا افواج کو زیادتی سے روکنا۔ ۱۰۱۸
" کے لشکر میں پرند۔ ۱۰۱۸
" کے لشکر میں جن۔ ۱۰۱۸
" کا رعب۔ ۱۰۱۹
" کا سفر یمن۔ ۱۰۱۹
" اور چیونٹی کا قصہ۔ ۱۰۱۸
" اور ہدہد۔ ۱۰۱۹
" اور سبا پر چڑھائی۔ ۱۰۲۰

سلیمان اور ملکہ سبا کا ہدیہ ۱۰۲۲
" اور ملکہ سبا کا تخت ۱۰۲۲
" اور بلقیس کی پنڈلیوں پر بالوں کا قصہ ۱۰۲۴
" اور شیش محل اور اس کی غرض ۱۰۲۵
" اور مجسمے ۱۱۱۷
" کے عصا کا قصہ ۱۱۱۸
" کا بیٹا ۱۱۱۸، ۱۱۷۲
" اور گھوڑوں کا واقعہ ۱۱۷۱
" کی انگوٹھی کا قصہ ۱۱۷۲
" کی دعا ھب لی ملکاً ۱۱۷۲
سموئیل ۱۴۷
سمندر کھاری اور میٹھے سمندر ۹۹۱، ۱۳۳۰
سنت۔ ناسخ قرآن نہیں ۹۵۶
سورج (دیوتا) ۴۷۴
" کا مغرب سے طلوع ۴۹۸
" کی حرکت ۱۱۴۱
نظام شمسی ۱۴۳۸
" اور چاند کا سجدہ ۶۷۴
" اور چاند کا جمع ہونا ۱۴۲۶
سورج گرہن اور چاند گرہن رمضان میں ۱۴۲۶
سؤر۔ شریعت موسوی میں ۹۸
مسیح کا سؤر سے اظہار نفرت ۹۸
" کی حرمت کی وجہ ۹۹
قتل خنزیر سے مراد ۴۳۴
سواع ۱۴۱۱
سوال۔ قرآن کریم میں سوالات کی غرض ۱۱۰
بھیک مانگنا مذموم ہے ۱۶۸
چھوٹے چھوٹے سوالات۔ ۴۴۶
رسولوں سے سوال۔ ۴۴۹
صادقوں سے سوال۔ ۴۵۳
سود۔ ۱۰۶۲، ۲۶۴، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۲
" کی حرمت اور یہود و نصاریٰ۔ ۲۶۵
سود خوار قتل نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۶۲
سود خواری کے بدنتائج۔ ۱۷۰
سورت۔ سورتوں کے نام ۱
مکی اور مدنی کی تقسیم۔ ۸، ۳۰۵
ہر سورت علیحدہ کتاب ہے۔ ۲۱
سوشلزم۔ ۱۷۱
سونے کے کڑے۔ ۱۲۳۸

سیاہی۔ ۶۲۵
سیتھین۔ ۸۴۴
سیحون۔ ۱۳۳۵
سینا۔ ۹۴۱

ش

شاعر۔ ۱۰۱۲
شافعی (امام) ۳۵۱
شام۔ کی یمن سے تجارت۔ ۱۱۱۹
" کا ارض محشر ہونا۔ ۱۳۵۹
شراب۔ ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۷۰، ۳۴۹، ۴۴۳
شراکت۔ ۱۷۰
شرک۔ ۲
" کی اقسام۔ ۲۰، ۲۳۱، ۳۴۹، ۴۸۱، ۶۳۴، ۷۵۷، ۹۸۹، ۱۲۵۳، ۱۴۹۴، ۴۵۵
" بدیوں کی جڑ ہے۔ ۲۱
" سے عملی انقطاع۔ ۱۳۰
" سے بزدلی کا پیدا ہونا۔ ۲۷۶
" سے توبہ۔ ۳۵۰
" کی سزا۔ ۳۵۰
" کا نہ بخشا جانا۔ ۳۵۰
" افترا علی اللہ ہے۔ ۴۵۹
" کے لیے تقرب کا جھوٹا عذر۔ ۴۶۰
" سے جبراً نہیں روکا۔ ۴۸۳
" مشیت الٰہی کا عذر۔ ۴۹۴
" کے خلاف دلیل۔ ۵۳۳، ۷۱۵، ۹۵۰
" میں ذلت۔ ۹۲۶
" پر دلیل نہیں۔ ۹۳۵، ۱۲۳۳
" میں شیطان کی پرستش۔ ۱۱۲۳
" سے حبط اعمال۔ ۱۱۹۰
شرک کرنیوالے سے علیحدگی کا اعلان۔ ۵۷۶، ۵۷۷
" " مقرب نہیں ہو سکتے۔ ۷۹۱
شرکاء اللہ سے مراد گمراہ کرنیوالے۔ ۱۰۴۶
شریعت۔ کی تفصیلات اور مغز ۱۰۱
شرعی رخصت پر عمل۔ ۱۰۵
نزول شریعت کی غرض۔ ۳۳۴
" کی ضرورت۔ ۳۳۵
" پر چلنے کی قابلیت۔ ۳۳۵
شریعت اور عیسائیت۔ ۳۳۵
" کی ظاہری پابندی۔ ۳۵۹
شرائع مختلفہ۔ ۴۲۹
تفصیلات میں غلو۔ ۴۴۶
شعب ابی طالب۔ ۶۴۴
شعر۔ اور نصیحت۔ ۱۱۴۵
مسلمانوں میں شعرگوئی کا مرض۔ ۱۱۴۵
شعری۔ ۱۳۱۹
شعیب۔ ۵۲۳، ۱۰۳۸
" نابینائی کی روایت۔ ۶۶۴
شفاعت ۳۸، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵
" برنگ دعا ہے۔ ۱۵۴
آنحضرتؐ کی شفاعت۔ ۱۵۴، ۱۲۴۳
" کی حدیث۔ ۶۶۸
" کے لیے تعلق کی ضرورت ۸۶۹
مومن شفاعت کرینگے۔ ۸۶۹
" میں اذن۔ ۸۸۹
مومن کا دوسرے کے لیے استغفار شفاعت ہے۔ ۹۰۰
" کس کے لیے ہے۔ ۱۳۱۶
شفیع۔ دوسرا شفیع۔ ۱۹۷
شق القمر ۱۳۲۱
شقی اور سعید۔ کا لکھا جانا۔ ۱۳۷۹
شکار۔ ۴۰۹
" احرام میں۔ ۴۴۵
شکر۔ ۷۲۰
شگون۔ ۱۳۵۰
شہاب ۷۳۴، ۷۳۵، ۱۴۱۳
شہادت۔ کامیابی ہے۔ ۵۹۲
شہد کی مکھی۔ سے سبق۔ ۷۶۱
شہید۔ ۲۰، ۱۲۹۴
شہداء سے استمداد جائز نہیں ۹۱
" مرتے نہیں۔ ۹۱
" کی ارواح۔ ۲۱۸، ۸۲۶
" کی زندگی۔ ۲۸۹
" کی قبر پر سلام۔ ۷۱۲
شہوت پر حکومت۔ ۹۳۹
شیخی۔ جھوٹی شیخی حصول کمال میں مانع ہے۔ ۱۱۹
شیطان۔ ۲۹
شیطان کا اطلاق انسان پر ۱۷، ۲۹۱، ۱۱۷۳، ۵۴۹، ۵۶۶، ۸۶۸، ۹۱۰، ۹۵۱
" کا اطلاق برے اخلاق پر ۱۶
" کا انسان میں خون کی طرح پھرنا ۱۶
" بدی کا محرک ہے ۱۶، ۲۹، ۸۶۸
" کی غرض پیدائش ۲۹
" فرمانبرداری کیلئے بنایا گیا ہے ۲۹
" کا انکار سجدہ ۳۰
" کا کام وسوسہ اندازی ہے۔ ۳۱
" اور نفس انسانی۔ ۳۲
لمۂ شیطانی۔ ۱۶۵
حدیث مس شیطان ۲۰۰
" کا نفخ۔ ۲۱۶
" کو معبود بنانا۔ ۳۸۲، ۸۶۱
" کو حکم سجدہ۔ ۵۰۴
" کا ہبوط۔ ۵۰۴
" کا مہلت مانگنا۔ ۵۰۴
" کو مہلت کا دیا جانا۔ ۵۰۵
" کا مردود ہونا۔ ۵۰۵
" کا آدم کو پھسلانا۔ ۵۰۶
" کا ہر طرف سے آنا۔ ۵۰۵
" کا بدی کو سجانا۔ ۴۶۵، ۵۰۶
" کا ذکر بطور اسم جنس۔ ۵۰۸
" کا کام۔ ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸
" دکھیا نہیں جاتا۔ ۵۰۸
" کے بھائی۔ ۵۵۰
" کا انکار شرک۔ ۷۲۳
" کا وعدہ۔ ۷۲۳
" کا انسان پر تسلط نہیں۔ ۷۲۴
۷۳۹، ۷۲۴، ۷۹۷، ۱۱۲۰
" اور فرشتوں کا کلام۔ ۷۳۴، ۱۰۱۱
" کا استراق سمع۔ ۷۳۵
القائے سمع۔ ۱۰۱۲
" اور شہاب۔ ۷۳۵
" کا آخر دنیا تک رہنا۔ ۷۳۹
" کا تسلط کس پر ہے۔ ۷۶۹
" کی تعلی۔ ۸۰۴
" کی مال و اولاد میں شرکت۔ ۷۹۷
" کے سوار اور پیادے۔ ۷۹۷
" ملائکہ میں سے نہیں۔ ۸۳۱
ہر انسان کا شیطان الگ ہے ۸۳۱
شیطان کی ولایت ۸۶۱
" کا القا ۹۳۲
" کے لشکر ۱۰۰۳
" کے تعلق سے ناپاکی پیدا ہوتی ہے ۱۰۱۲
" کا خطف ۱۱۵۰
" کا سر ۱۱۵۴
" تکلیف دینے پر قادر نہیں ۱۱۷۴
" کب انسان پر تصرف حاصل کر لیتا ہے۔ ۱۲۱۲
" کس کا قرین ہوتا ہے ۱۲۳۶
" کی وسوسہ اندازی ۱۲۹۴
" کا غیبی خبریں لانا ۱۳۰۹
" کا آسمان سے روکا جانا ۱۴۱۳
" کا وسوسہ تین رنگ میں ۱۴۹۶
شیعہ اور تقیہ ۱۹۶
" اور امام معصوم ۳۵۶
" اور تبلیغ خلافت علیؓ ۴۳۶
" پر اتمام حجت، ۹۷۶، ۵۷۶، ۱۲۷۹، ۱۳۳۸، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱
" اور حفاظت قرآن ۷۳۲
" اور وراثت انبیاء ۸۵۰

ص

صادق کی معیت ۶۱۳
صالح ۵۲۰، ۷۹۶
" کی اونٹنی ۵۲۰، ۱۰۰۷، ۱۳۴۴
صبح کے وقت کی خصوصیت ۱۹۱
صبر ۹۰-۱۰۱-۷۷۰
صحابہ کی سچائی سے محبت ۱۵-۶۱۳
" کی تائید روح القدس سے ۵۷
" کا عمل قرآن پر۔ ۷۳
" کا کمال صبر۔ ۹۲
" کا مقام۔ ۱۱۹، ۴۵۱، ۱۳۵۸، ۱۴۴۵
" کے سینے اناجیل ہیں۔ ۱۸۱
" کی جان نثاری۔ ۲۷۸، ۲۸۱، ۳۱۵، ۶۱۲، ۶۱۳
" کی محبت آنحضرتؐ سے۔ ۲۷۹، ۶۶۹، ۹۰۳
" کی دشمن سے بیخوفی۔ ۲۹۱
" میں تعلقات اخوت۔ ۳۳۹، ۵۷۴
" کا ایمان و اخلاص۔ ۳۵۹، ۷۷۱، ۱۲۷۸

صحابہ کی کمال اطاعت - ۳۶۲، ۴۰۸، ۴۰۵
" اور اصحاب موسیٰ - ۳۱۷
" اور انفاق - ۴۰۳
" میں سابق اول - ۴۰۵
" نے رضائے الٰہی کا مقام حاصل کیا - ۴۰۶
" کی وفاداری - ۴۰۹، ۱۰۹۵
" کی استقامت - ۴۶۹
" کا ستاروں کی مانند ہونا - ۴۳۹
" کے اوصاف - ۹۳۸، ۹۷۱، ۹۹۳، ۱۲۸۲
" کا اصطفاء - ۱۰۷۶
" کا خونریزی سے اجتناب - ۱۲۸۰
" کا معاصی اور ظلمتوں سے پاکیزہ ہونا - ۱۲۸۵
" کی باہم لڑائیاں - ۱۲۸۸
" میں مقربین الٰہی کی کثرت - ۱۳۳۸
" کی مال دنیا سے بے رغبتی - ۱۳۶۱
" کی مہمان نوازی - ۱۳۶۱
" کا ذکر بطور پیشگوئی - ۱۴۴۱
" کا جنگ میں ثبات - ۱۳۶۹
" کا محبوب الٰہی ہونا - ۱۳۶۹
" اور خطبۂ جمعہ - ۱۳۷۵
صحبت - صحبت بد - ۴۷۲
ہم صحبت کو نصیحت - ۴۷۲
صدقات بھلی بات بتانا صدقہ ہے - ۱۶۳
" کا ابطال - ۱۶۳
" سے مفلس نہیں ہوتا - ۱۶۵
" میں صحابہ کا نمونہ - ۱۶۵
قومی چندے - ۱۶۶
مخفی صدقات - ۱۶۶
" غیر مسلم کو دینا - ۱۶۷
" غیر حقدار کو مل جانا - ۱۶۷
" کا فائدہ ذاتی اور قومی - ۱۶۷
" کس پر خرچ ہوں - ۱۶۷
کن محتاجوں کو مقدم کیا جائے - ۱۶۷
" کی تعلیم کی تکمیل - ۱۶۸
" اور سود - ۱۶۸
" سے برکت - ۱۶۱
" سے مال کم نہیں ہوتا - ۲۶۷
صدقۂ فطر - ۱۰۶
صدوقی - ۱۳۶۸

صدیقیت - کمال اکتساب ہے - ۳۶۱
صفا - ۹۲
" کو سونا بنانے کی درخواست - ۷۹۵
" پر آنحضرتؐ کا لوگوں کو بلانا - ۱۴۹۲
صفوان بن معطل - ۹۵۹
صفیہ - ۱۹۹، ۳۳۳، ۵۶۴
صلح - ۵۶۹
ہمت ہار کر صلح کرنے کی ممانعت - ۱۲۷۰
صلوٰۃ - اللہ کی بندے پر - ۹۲
صلیب - یہودیوں میں طرز - ۳۹۳
اسلام میں سزائے صلیب - ۴۲۱

ط

طائف - ۱۲۳۵
طاعون - کے مقام سے نکلنا - ۴، ۱۳۷
طالوت - (ساؤل) ۱۴۷، ۱۴۹
طعمہ بن ابیرق - ۳۷۸
طلاق - حصول کے لیے ارتداد - ۱۲۶
" اسلام اور دیگر مذاہب میں - ۱۳۳
وجوہ کو معین نہ کرنے کی وجہ - ۱۳۳
" کا وقت - ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۳۸۲
" پر سات حد بندیاں - ۱۳۳ تا ۱۳۷
" رجعی - ۱۳۵
" بائن - ۱۳۵، ۱۳۷
" بدعی - ۱۳۵
" کے تین اقسام - ۱۳۵
تین طلاق - ۱۳۵، ۱۳۹، ۱۳۸۳
" اور حسن سلوک - ۱۳۶، ۱۱۰۵
" عورت حاصل کر سکتی ہے / وجوہات طلاق - ۱۳۷
" بربنائے ناموافقت - ۱۳۷، ۳۲۶
مطلقہ عورت سے پہلے خاوند کے نکاح کا جواز - ۱۳۹
" قبل از تقرر مہر - ۱۴۱
آنحضرتؐ کا طلاق سے روکنا - ۱۴۲
" قبل از خلوت - ۱۴۲، ۱۱۰۶
" میں عورت سے مال لینا - ۳۲۵، ۳۲۷
" سے پیشتر اصلاح کی تاکید - ۳۴۲
" کے مقدمات عدالت میں جانے کا نقصان - ۳۴۲

طلاق کا طریق - ۱۳۸۲
" بلاوجہ مکروہ ہے - ۱۳۸۳
" اور مراجعت پر شہادت - ۱۳۸۳
طلحہ - ۲۷۸، ۱۲۸۰، ۱۲۸۸
طواف - ۹۲۵
طور - ۴۴، ۱۳۰۵
طہارت ظاہری اور باطنی کا تعلق - ۹۰، ۱۴۲۰
" کی دو قسمیں - ۲۰۷
" جسمانی - ۴۱۰، ۹۲۵
طیطوس - ۴۴۰، ۸۰۷

ظ

ظل - کا سجدہ - ۷۱۰
" کافر کا - ۷۱۰
ظل اللہ - ۷۱۰
ظلی نبوت - ۷۱۰، ۱۱۰۵
ظلم - ۴۶۹
ظلمت سے نکلنا - ۷۱۸
ظہار - ۱۰۸۹، ۱۳۵۳

ع

عاد - ۵۱۹
" کے دیوتا - ۵۱۹
عاد اولیٰ - ۵۱۹
عاد ثانیہ - ۵۱۹
عالمین - ۵۹۴
عایش - ۹۸۲
عایشہ - ۱۰۳، ۱۰۷۷، ۱۰۹۷، ۱۳۵۵
" جنگ احد میں - ۲۵۸
" اور واقعہ افک - ۹۵۹
" جنگ جمل میں - ۱۰۹۸، ۱۲۸۸
" کی خیرات - ۱۰۹۹
" کی فراست - ۱۳۵۰
عبادت - ۶۱۴، ۱۰۵۹
" مقصد زندگی ہے - ۵
" کی استقامت پر تقدیم - ۵
" واطاعت میں فرق - ۱۹
" حصول کمال کا ذریعہ ہے - ۱۹
" کی چالیس راتیں - ۵۳۴
" سے یقین کا حاصل ہونا - ۷۴۶
عباد الرحمٰن - ۹۹۳

عبادہ بن صامت - ۴۳۰
عباس - ۵۷۲، ۴۲۳، ۵۸۲
عبداللہ بن ابی - ۱۴، ۲۸۱، ۳۰۲، ۴۳۰، ۶۰۰، ۹۶۰، ۹۶۸، ۱۲۸۷، ۱۳۵۹، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷
عبداللہ بن جحش - ۱۲۵، ۵۶۳
عبداللہ بن رواحہ - ۱۲۸۱
عبداللہ بن سعد بن ابی سرح - ۴۷۸
عبداللہ بن سلام - ۶۴۰، ۱۰۱۰
عبدالحارث - ۵۴۸
عبدالرحمان - ۱۶۲
عبدالمطلب - ۱۴۸۷
عبودیت کمال مخلوق ہے - ۷۰۰، ۸۷۰
عبقر - ۱۳۳۶
عتبہ - ۱۲۱۰
عثمان - ۱۶۲، ۲۸۲، ۲۸۴، ۵۸۶، ۶۹۸، ۱۲۷۷، ۱۲۸۰، ۱۲۸۸، ۱۴۴۵
عثمان بن ابی طلحہ - ۳۵۴
عداس - ۹۸۳
عدت - ۱۳۴
" اس کی غرض - ۱۳۴
" بیوہ کی - ۱۴۰
" حیض نہ آنے کی صورت میں - ۱۳۸۴
" حاملہ کی - ۱۳۸۴
عدل - ۲۹۰، ۳۸۴، ۴۱۱، ۴۴۸، ۶۶۷
تعدد ازدواج میں شرط عدل - ۳۱۱
عورتوں میں عدل - ۳۸۶
عذاب - ۱۴
عذاب دنیا - عذاب آخرت کے لیے دلیل ہے - ۷۰، ۵۵۷
وعدۂ عذاب دنیا کیلئے بھی ہے - ۴۲۹
دو عذابوں کی خبر - ۱۰۸۶
عذاب دنیا کا نقشہ عذاب آخرت کے رنگ میں - ۱۴۳۸
عذاب آخرت کا ذکر بطور مثال ہے - ۲۸۶
" کے ذکر میں استعارہ - ۳۵۳، ۸۰۶
" کی غرض - ۳۹۱، ۴۶۵، ۷۹۵، ۹۴۳، ۹۴۹
" بطور علاج - ۵۲۵
" میں رحم - ۷۶۱، ۱۲۷۶
" ترقیات روحانی کے لیے ہے - ۱۴۵۶

اس فہرست میں حوالہ جات صفحات کے ہیں۔

عذاب تعیش و غفلت کا نتیجہ۔ ۶۳۰
" فساد پر آتا ہے۔ ۶۶۰
" اور بعثت رسل۔ ۷۸۵
" عذاب ہلاکت سے مراد اور اس کی غرض۔ ۷۸۵
" دنیا کی کل بستیوں پر۔ ۷۹۵
آگ کا بار بار بھڑکایا جانا۔ ۸۰۸
" اور رسول کا تعلق۔ ۸۹۴
" بغیر نبی کی بعثت کے بھی آتا ہے۔ ۱۱۱۹
" کے لیے فرشتے نہیں اترتے۔ ۱۱۳۹
" بصورت جنگ میں حکمت۔ ۱۲۶۴
ستر ہاتھ کی زنجیر۔ ۱۴۰۳
عذاب مخالفین آنحضرت صلعم کا مطالبہ ۵۶۲، ۱۱۴۳
تاخیر کی وجہ۔ ۵۶۲
" کا وقت۔ ۴۲۳
" کی نوعیت ۴۷۱، ۷۲۸، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۹۷، ۸۹۴، ۱۲۲۷، ۱۳۹۴، ۱۳۹۹
" ہلاکت کا عذاب ۷۲، ۱۲۱، ۴۶۴، ۷۰۶، ۸۳۳، ۸۹۲، ۸۹۴، ۹۰۳، ۱۰۴۳، ۱۰۶۲
عرب کا اسماعیل کی اولاد سے ہونا۔ ۷۷
" کے متعلق توریت میں پیشگوئی۔ ۸۷
" کی اصلاح میں یہود و نصاری کی کوشش۔ ۴۹۷، ۱۱۳۷
" بادیہ نشین۔ ۶۰۲
" کا قبول اسلام۔ ۶۱۵، ۶۱۷
" کا محل وقوع۔ ۹۷۰، ۱۲۱۹
" میں آنحضرت صلعم کا انقلاب پیدا کرنا۔ ۹۸۹
" میں نبی کا نہ آنا۔ ۱۰۴۳
" اور عذاب ہلاکت۔ ۱۰۴۶
" کی اخلاقی موت۔ ۱۱۲۷
" میں زندگی کا پیدا ہونا۔ ۱۱۴۰
عرب جاہلیت ۷۵۹، ۹۸۹، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵
" کی توہم پرستی۔ ۱۱۰
" میں طلاق۔ ۱۳۳
" میں یتامیٰ کی محرومیت ۳۱۵
" میں عورت۔ ۳۲۵

عرب میں باپ کی بی بی سے نکاح۔ ۳۲۸
" کی بت پرستی۔ ۳۸۱، ۹۸۹
جانوروں کے کان چیرنا۔ ۳۸۲
فال نکالنے کا رواج۔ ۴۰۶
" میں قوی کا حق کمزور پر فائق ہونا۔ ۴۳۰
" میں قتل اولاد۔ ۴۹۱
" کا بروقت عبادت ننگا ہونا۔ ۵۰۹
لڑکی کا زندہ درگور کرنا۔ ۷۵۸، ۱۴۴۸
" کے اعتقاد۔ ۷۵۹
" میں معاہدہ۔ ۷۶۸
عورتوں کا بیحیائی سے باہر نکلنا۔ ۹۲۶، ۱۰۹۸
لونڈیوں سے زنا کروانا۔ ۹۶۸
" میں شرک۔ قتل۔ زنا۔ ۹۹۴
قوم نوح کے بتوں کا عرب میں لایا جانا۔ ۱۴۱۱
عربی۔ ام الالسنہ ہے۔ ۶۷۲
عرش۔ ۵۱۶
" کا پانی پر ہونا۔ ۶۴۴
حاملین عرش۔ ۱۱۹۴، ۱۴۰۲
عرفات۔ ۱۱۶
عرفہ۔ ۱۱۶
عزیز۔ ۳۷۱، ۴۲۱
عزیٰ۔ ۲۷۵، ۱۳۱۵
عزیر۔ ۵۸۴
عصمت۔ سے بلند تر مقام۔ ۵
" اور تبلیغ کا تعلق۔ ۴۳۶
" حقیقی اور عصمت ظاہری۔ ۴۳۶
" اور خطا۔ ۱۰۰۳
عصمت انبیا۔ ۲۵۶، ۲۸۶، ۴۳۶، ۴۸۸، ۵۱۸، ۵۱۹، ۸۵۲، ۸۷۷
۹۰۰، ۹۰۵ کا راز۔ ۷۲۷
آدم۔ ۳۲، ۸۹۰
زکریا۔ ۸۵۰ یحییٰ۔ ۸۵۱
ابراہیم ۸۶۱ موسیٰ۔ ۸۶۲
اسماعیل۔ ۸۶۳ ہارون۔ ۸۸۵
عفریت۔ ۱۱۷۳
عفو۔ ۶۷، ۲۶۷، ۵۴۹
عقبہ ۹۸۷
عقل۔ اور مذہب۔ ۳۶، ۹۵
۹۸، ۴۸۴، ۵۵۹، ۷۰۱

عقل سے کام نہ لینے پر گرفت ۶۲۹، ۱۲۶۸، ۱۳۹۳
" کی رسالت ۷۸۴
عقیدہ۔ عقائد باطلہ پر اس دنیا میں گرفت نہیں ۶۹
عقاید باطلہ کی کمزوری ۱۰۵۸
عکل ۱۳۶
علم۔ علم دین مخفی نہیں رکھا گیا ۴۳۶
تمام اقوام میں توسیع علم ۶۱۵
حصول علم کے لیے سفر و صعوبت ۸۳۵
" اور قوت جسمانی۔ ۱۰۲۳
" کی فضیلت۔ ۱۱۲۵
" انبیا اور دنیا داروں کا۔ ۱۲۰۷
" اور قرآن۔ ۱۳۹۶
" کے تین مراتب۔ ۱۴۰۵، ۱۴۸۵
علماء کا کام ۷۹
" کا وارث انبیاء ہونا۔ ۲۳۹
" و مشائخ۔ ۵۸۶
" کی فضیلت۔ ۱۳۵۶
علی۔ ۱۰۳، ۲۳۰، ۲۸۴، ۴۳۲، ۵۷۶، ۵۸۹، ۷۳۹، ۱۳۶۵، ۱۴۴۵
" اور معاویہ کی جنگ۔ ۳۷۲
" اور آیت رجم ۹۵۶
قیامت سے پہلے زندہ ہونے کا خیال۔ ۱۱۴۰
" اور عائشہ طلحہ زبیر۔ ۱۲۸۸
" اور عباس کا جھگڑا۔ ۱۳۶۰
عمار ۳۴۷
عمر۔ ۲۷۲، ۲۷۵، ۳۲۷، ۴۲۲، ۴۲۳، ۵۷۱، ۵۹۸، ۸۶۰، ۹۹۲، ۱۰۷۹، ۱۲۴۵، ۱۲۷۹، ۱۲۸۱، ۱۳۲۶، ۱۳۸۷
تین طلاق پر فیصلہ۔ ۱۳۵
" کی محدثیت ۳۶۱، ۳۶۲، ۸۹۶
" اور آیت رجم ۹۵۵
" اور بڑے آدمیوں پر نکتہ چینی۔ ۱۳۰۷
" اور خولہ ۱۳۵۳
" اور اموال بن نضیر ۱۳۶۰
عمرہ۔ ۹۲
عمران ۱۷۹، ۱۹۸
عمر بن عبدالعزیز ۷۶۲
عمرو بن عاص۔ ۱۳۷۴
عمل۔ تزئین اعمال۔ ۱۲۲، ۴۶۵، ۴۸۳

حبط عمل ۱۲۶، ۱۹۳
فلسفۂ عمل ۲۷۳
عمل۔ کامیابی پیدا کرنیوالے ۳۰۰
" سے زندگی کا پیدا ہونا ۴۵۶
" کی حفاظت ۴۷۰، ۶۳۲، ۷۰۸، ۱۲۹۲
" کی ضرورت ۶۷۱
اچھے عمل کا بقا ۸۲۹
" کی ذمہ داری کا احساس ۷۰۸
" کا تعلق ایمان سے ۱۱۲۸
" کی تحریر سے مراد ۱۲۹۴
اعمال حسنہ کا نقشہ نمائے بہشت میں ۱۴۳۱
اعمال کا وزن ۵۰۳
عمل اور جزا کا تعلق ۱۹۳، ۱۳۴۷، ۱۴۰۰
محاسبۂ اعمال ۱۷۶، ۱۲۲۱
اس دنیا میں ۱۱۸
انسان خود کرتا ہے ۷۸۳
نتائج اعمال ۱۲، ۴۶۱، ۷۲۲
" کی تشبیہ حمل سے ۷۰۷
" کا فلسفہ ۷۸۳
" اور بچہ ۷۸۳
" اور فاتر العقل ۷۸۴
اعمالنامہ۔ کا کھلا ہونا ۷۸۳
" کا پڑھنا ۸۹۸
" کا پیٹھ پیچھے یا ہاتھ میں دیا جانا ۷۹۹
" کا رکھا جانا ۸۳۰
" کی گویائی ۱۲۵۴
عمیرۃ الاسدی ۳۱۱
عورت۔ کو حرث کہنے کی وجہ ۱۱۹
" کی کھیتی سے تشبیہ۔ ۱۳۱
" پر مرد کی فوقیت کی وجہ۔ ۱۳۴
" کی گواہی۔ ۱۷۵
حدیث النساء لا یحشرن ۱۸۷
" اور خدمت دین۔ ۱۹۹
" کی جنگ میں شمولیت۔ ۲۵۸
" کا اعوجاج۔ ۳۰۷
" کا پسلی سے پیدا ہونا۔ ۳۰۶
" حالت سفر میں۔ ۳۱۷
" اور وراثت۔ ۳۱۵
جاہلیت میں مال متروکہ کا حصہ۔ ۳۲۵
" کی عصمت کی عزت۔ ۳۲۳، ۳۴۰

لڑکیوں کی تعلیم۔ ۳۳۴
عورت کی حکومت۔ ۳۴۰
" اور بہشت۔ ۳۸۴، ۱۳۳۴، ۱۱۵۴
" کی نبوت۔ ۷۵۵
" اور مرد کے اعمال کی جزا یکساں ہے۔ ۷۶۸
جنگ اور نماز میں شمولیت۔ ۹۶۵
" اور منہ کا کھلا رکھنا۔ ۹۶۴ تا ۹۶۶
اخفائے زینت۔ ۹۶۴
" کا غیر مرد کو دیکھنا۔ ۹۶۵
" کا اظہار محاسن ۹۶۶، ۹۶۷
" کا باہر نکلنا۔ ۹۵۸، ۹۶۴
" کی چال میں حیا۔ ۱۰۳۸
" کا نفس انسان سے پیدا ہونا۔ ۱۰۶۹
" مقامات عالیہ کے حصول میں مرد
کی ہم پایہ ہے۔ ۱۱۰۰
" کی عزت۔ ۱۲۲۷
" کی حور پر فضیلت ۱۳۳۴
امت کے لیے مثال۔ ۱۳۸۵، ۱۳۹۱
" سے بیعت۔ ۱۳۶۸
عورت (بی بی) مرد کے ساتھ مساوات حقوق
۱۳۴
" کا حق طلاق۔ ۱۳۷، ۱۳۹
" کی ہندوستان میں حق طلاق سے محرومی ۱۳۷
" سے حسن سلوک۔ ۳۲۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۹
مرد کا عورت پر قوام ہونا۔ ۳۳۹
" اور خاوند کے باہم حقوق اور ذمہ داریاں ۳۴۰
" پر خاوند کے حقوق۔ ۳۴۰
" کو مارنا۔ ۳۴۱
" اور خاوند میں فساد کی اصلاح۔ ۳۴۱
خاوند پر مطالبات ۱۰۹۷
" کی دشمنی۔ ۱۳۸۱
" کی تحریم پر کفارہ۔ ۱۳۸۷
عول۔ ۳۲۱
عہد۔ جس میں حق تلفی ہو۔ ۱۳۲
" کفار سے۔ ۳۷۱
" کی وفا۔ ۴۰۳، ۹۳۹
" اور عیسائیت۔ ۴۰۳
عہد شکنی کی سزا۔ ۵۷۷

عہد کی عزت۔ ۵۷۸
عہد اسلام۔ ۶۰۹
عہد انبیاء۔ ۶۱۰
عہد فطرت اور عہد شریعت۔ ۶۲۶
عہد نامہ۔ پرانا اور نیا۔ ۱۸۱
عیب شماری۔ ۱۴۸۶
عیسیٰ۔ ۵۷، ۱۵۲، ۱۵۳، ۴۷۶
" کی زبان۔ ۵۲
ابن مریم اور مسیح نام کی وجہ۔ ۵۷
عیسیٰ اور روح القدس کا تعلق۔ ۵۷
" کا مخصوص ہونا۔ ۱۸۶
" کی پیشگوئی آنحضرتؐ کے لیے ۱۹۸، ۱۳۷۰
" اور یحییٰ۔ ۲۰۵، ۸۵۲
استدلال فضیلت۔ ۲۰۷
" اور ان کی والدہ۔ ۲۰۸، ۸۵۶
" کی والدہ اور بھائیوں کا آپ پر ایمان۔ ۸۵۹، ۸۵۷
" کا وجیہ ہونا۔ ۲۱۱
" کا مقرب ہونا۔ ۲۱۱
" کا صالح ہونا۔ ۲۱۱
" لکھنا جانتے تھے۔ ۲۱۲
" کا بنی اسرائیل کے لیے مبعوث ہونا۔ ۲۱۵
" اور دوسری اقوام۔ ۲۱۵
" کے کلام میں مجاز۔ ۲۱۸
" کا نفخ روحانی۔ ۲۱۸
" اور لڑکوں کا قصہ ۲۲۱
" کے مصدق توریت ہونے سے مراد۔ ۲۲۱
" اور جمع مال۔ ۲۲۱
" کا اپنی اطاعت کے لیے بلانا۔ ۲۲۲
" کے حواری۔ ۲۲۳، ۴۵۱، ۶۶۹، ۱۱۳۷
" کی تطہیر ۲۲۷، ۱۲۷۳
" کے متبعین عیسائی ہیں نہ مسلمان۔ ۲۲۷
" سے چار وعدے۔ ۲۲۷
" اور آدم سے مشابہت۔ ۲۲۹
" کے منکرین کا قیامت تک وجود۔ ۲۹۵
" کے ملعون ہونے کا عیسائی عقیدہ۔ ۲۹۹
" کا پہلے انبیا کے نقش قدم پر چلنا۔ ۴۲۷
" اور یہود ۴۳۵
" کی دعائے مائدہ۔ ۴۵۱
" کا اصل کام ۴۵۰
" کی دعائے مغفرت امت۔ ۴۵۳

جان و مال دینے کی تعلیم۔ ۶۱۰
عیسیٰ کی شفاعت۔ ۶۲۲
" کا سلام۔ ۶۵۹
" اور شیاطین۔ ۷۳۵
" کی پیشگوئی بیت المقدس کی تباہی پر ۷۸۰
" کی بے گناہی۔ ۸۵۳
" کی محدود تعلیم۔ ۸۵۴، ۸۵۳
" آیت ہونے سے مراد۔ ۸۵۴، ۹۴۵
" کے متعلق عجیب قصے۔ ۸۵۶
" کے زمانہ نبوت کے حالات ۸۵۷
" اور گدھے کی سواری۔ ۸۵۷
" اور وسوسہ شیطانی۔ ۹۵۱
" کا عفو۔ ۱۲۲۶
" کا مثل ہونا۔ ۱۲۳۹
" اور معبودان عرب۔ ۱۲۳۸
" اور علم ساعت۔ ۱۲۴۰
" کی عمر لوقت بعثت۔ ۱۲۵۸
" پر رسولوں کا خاتمہ۔ ۱۳۵۱
" کی تعلیم میں صرف رحم کا پہلو۔ ۱۳۵۱
" کی انجیر کے درخت پر لعنت۔ ۱۴۷۵
عیسیٰ کی پیدائش ۱۸۰، ۱۸۳، ۲۱۳
۲۱۴، ۸۵۲، ۸۵۵، ۸۶۳
" کے بھائی اور بہن۔ ۲۱۴، ۸۵۹
عیسیٰ کے معجزات۔ ۴۵۱
جھولے میں باتیں کرنا۔ ۲۱۱، ۲۱۲
۲۱۳، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹
" کا پرند بنانا۔ ۲۱۶، ۲۱۷
" کا علاج امراض۔ ۲۱۹،
" مردوں کو زندہ کرنا۔ ۴۵۱، ۵۵۹
عیسیٰ اور شریعت۔ روزے رکھتے تھے اور ۲۲۱
روزے کا حکم دیا۔ ۱۰۴
حکم نماز و زکوٰۃ۔ ۲۱۲
خود عبادت اور دعا کرنا۔ ۷۹۴
عیسیٰ کی خدائی۔ دیکھو ابن اللہ کا ابطال۔
۲۱۲، ۲۲۸، ۲۳۹، ۴۱۴
۴۳۸، ۸۵۴، ۸۵۵، ۱۸۰
" بروئے انجیل مجازاً ابن اللہ تھے۔ ۱۸۵، ۷۱
" بشر سے بڑھ کر نہیں۔ ۱۸۰
" کا اعتراف لاعلمی۔ ۱۸۲
کلمۃ اللہ ہونا۔ ۲۱۰، ۸۴۸

" روح منہ سے مراد ۳۹۹
اقرار عبودیت ۴۰۰
وفات سے ابطال ۴۱۴
کا عقیدہ بت پرستوں کی نقل ہے۔ ۴۳۹
سوال تعلیم الوہیت ۴۵۲
اقرار توحید ۴۵۲
کھانا کھانا ۴۳۹
عیسیٰ کی ہجرت دیگر اقوام اسرائیل میں جانا ۲۱۱
کا اشارہ ۸۵۹
ملک شام سے دین کے ساتھ بھاگنا ۱۳۴۸
کشمیر میں آنا ۲۱۰، ۹۴۵
عیسیٰ کی صلیب قتل کی کوشش ۵۰
" کے واقعات ۵۱
" کی تدبیر ۲۲۴
" مقتول و مصلب نہیں ہوئے ۳۹۳
انجیل کی شہادت ۳۹۳
ہم شکل کا قصہ ۲۹۴
قتل میں شک ۳۹۴
عیسیٰ کی وفات ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۷،
۴۵۳، ۷۵۱، ۸۳۶، ۸۹۷، ۹۰۲
عیسیٰ پر فنا آنے کی شہادت ۱۸۰
زندگی کا عقیدہ عیسائیت کا موید ہے ۲۲۵
رفع ۲۲۶
رفع اور عدم مصلوبیت کا تعلق ۳۹۵
دشمنوں کا روکنا۔ ۴۵۰
" زندہ آسمان پر نہیں گئے۔ ۲۲۴، ۳۹۴
۴۳۹، ۴۵۰، ۵۰۶، ۸۵۹
" ایک سو بیس برس کی عمر ۹۴۵
" قبر ۹۴۵
عیسیٰ کا نزول۔ ۲۱۵، ۲۵۳، ۳۵۷،
۳۹۵، ۴۹۸، ۱۳۷۴
عیسائی۔ ضال ہیں۔ ۶
" دو گروہ۔ ۲۲۸
مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش ۲۳۳
عیسائیوں کی تحریف۔ ۲۳۸
" کا دعویٰ ابنیت۔ ۴۱۵
" اور یہودیوں کی باہم عداوت۔ ۴۳۵
" کا حرام کو حلال بنانا۔ ۴۴۳
" کا اسلام سے قریب تر ہونا۔ ۴۴۱
عیسائی اور قتال۔ ۸۱۹

اس فہرست میں حوالجات صفحات کے ہیں۔

عیسائی اور تین شاخون الاسایہ۔ ۱۴۳۶
عیسائی اقوام۔ کی مخالفت اسلام۔ ۲۳۴
۴۴۰، ۵۸۶، ۸۱۴، ۱۳۷۱
" کا دعویٰ برتری۔ ۲۳۶
" اور معاہدات۔ ۲۳۷
" کے اسلام لانے کی پیشگوئی۔ ۴۰۲، ۸۱۴، ۱۳۱۲
" میں باہم بغض۔ ۴۱۳
" کا اسلام پر تمسخر۔ ۴۳۴
" آنحضرتؐ کا ان کیلئے غم کھانا ۸۱۴
" کی زمینی ترقی۔ ۸۱۵، ۱۴۶۳
" کی تجارت کی وسعت۔ ۸۱۵
" کا مال اور طاقت پر فخر۔ ۸۲۷
" کی روحانیت سے محرومی۔ ۸۲۷
" کا انکار خدا اور انکار قیامت ۸۲۷
" کی صنعت۔ ۸۴۷
" کی حکومت۔ ۸۶۰
" کا دابۃ الارض ہونا۔ ۱۰۳۰
" اور عذاب ہلاکت۔ ۱۲۱۸
عیسائیت۔ کی مخالفت اسلام کا زمانہ۔ ۶۱
" کا عقیدہ ابنیت مسیح۔ ۷۰
" کا بپتسمہ۔ ۸۲
" اور شراب۔ ۱۲۸
" کے خاص امراض۔ ۱۲۸
" کی شریعت اور اس کا حشر ۱۳۳
" میں طلاق۔ ۱۳۳
" کے عقاید کی تردید صحف الٰہی میں۔ ۱۸۰
" کی بنیاد متشابہات پر ہے۔ ۱۸۵، ۱۸۶
" اور محبوبات دنیا۔ ۱۸۹
" کا افترا۔ ۱۹۳، ۱۳۷۱
" اور شریعت۔ ۲۰۱، ۳۳۵
۴۰۲، ۴۱۳
" پر قرآن کا احسان ۲۲۳
" کے عروج کی پیشگوئی۔ ۳۰۱
" پر اسکی کتابوں سے اتمام حجت۔ ۳۹۳، ۴۳۷
" اور صلیب مسیح۔ ۳۹۶
" اور عقل۔ ۳۹۹
" اور حرمت غذا کا قانون۔ ۴۰۴
" غیر اقوام سے نکاح۔ ۴۰۹
" کا قیامت تک رہنا۔ ۴۱۳
" اور سزائے گناہ۔ ۴۱۵

عیسائیت اور آسایش دنیوی۔ ۴۵۱
" میں بت پرست قوموں کی نقل۔ ۵۸۵
" کا ملکی غلبہ۔ ۵۸۵
" کی تاریخ قرآن میں۔ ۸۱۲، ۸۱۵
" کے اصول پر علمی دلیل کوئی نہیں۔ ۸۱۴
" کا نیک لوگوں کے حق میں غلو۔ ۸۲۱
" کی ترقی۔ ۸۲۳
" کی تاریخ میں چھ سال کی غلطی ۸۲۴
" کی تین سو سال کی حالت غربت۔ ۸۲۴
" کے فرقوں کا اختلاف باہم۔ ۸۶۰
" کی حالت آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت۔ ۱۰۷۴
" کی تعلیم اور ایک حبشی نبی۔ ۱۰۷۹
" کی اصلاح عرب کی کوشش۔ ۱۱۳۷
" کی عرب کو عیسائی کرنے کی تجویز۔ ۱۴۰۷
" کا شرک۔ ۱۴۹۴
عیسائیت اور اسلام بمنزل مقصود۔ ۵
مفہوم شفاعت۔ ۳۸
" کی کشمکش۔ ۵۸۶
" کا اصولی مقابلہ۔ ۸۴۸
عیون موسیٰ۔ ۴۴

غ

غذا۔ کا اثر اخلاق پر۔ ۹۹، ۹۷، ۹۸
ممنوع غذائیں۔ ۹۸، ۴۰۵
حرمت کی علت۔ ۹۸
" کی حرمت بنی اسرائیل میں۔ ۴۹۴، ۲۴۴
" میں اعتدال۔ ۵۰۹
غرانیق۔ کا جھوٹا قصہ۔ ۹۳۱، ۱۳۱۶
غرباء کی تقسیم ترکہ میں امداد۔ ۳۱۶
" کے لیے خوشخبری۔ ۴۶۷، ۱۴۴۶
" نبی کے پہلے پیرو۔ ۶۴۹
" سے ملاپ۔ ۱۴۶۵
غربا کی خبرگیری کی اہمیت۔ ۱۴۶۵، ۱۴۶۸
" کی خبرگیری تعلیم اسلام کا اصل الاصول ہے۔ ۱۴۳۰، ۱۴۸۹
غسان۔ کا بادشاہ۔ ۶۱۳
غض بصر۔ ۹۶۳
غضب۔ ۲۶۷، ۵۰۴، ۵۵۰
غفر۔ ۱۱۶، ۱۷۷
مغفرت اور جنت۔ ۲۶۸، ۱۴۶۷
غلام۔ سے حسن سلوک۔ ۳۴۳، ۷۹۲

غلام کا آزاد کرنا ۵۹۴، ۹۶۸، ۱۲۶۴، ۱۴۶۸
غلام بنانا حق نہیں ۱۲۴۶
غنا ۱۰۷۶، ۱۰۷۷
غنیمت ۵۵۲
مال غنیمت کی نیت سے جنگ کرنے کی ممانعت ۳۷۳، ۲۷۷، ۳۶۳
" کی تقسیم ۵۶۴
مال غنیمت یہود میں ۱۴۹
غیب۔ ۱۰، ۲۰۸، ۱۴۱۵
غیبت۔ ۱۲۸۹
غیلان بن مسلمہ۔ ۳۱۱

ف

فاران۔ ۷۷
فارس۔ دیکھو ایران۔
فاطمہ۔ ۲۰۸، ۵۶۴
فال۔ ۴۰۶
" کے تیر۔ ۴۴۳
فترت۔ ۴۱۶، ۱۳۹۶، ۱۴۲۰
فحش۔ ۷۶۶
فدک ۱۰۷۲
فرات۔ ۱۳۳۵
فرشتہ۔ ۲۵، ۷۵۷
" کا کام۔ ۲۶
" کا علم۔ ۲۵
" کا انسان کو سجدہ۔ ۲۸
" اور کتے اور تصویر والا گھر۔ ۱۱۰
" کا آنا۔ ۱۷۱، ۷۳۲
" کا جنگ میں نزول اور اس کی غرض۔ ۱۲۱، ۲۶۱، ۲۶۲، ۵۵۵، ۵۵۶
" لمہ ملکی۔ ۱۹۵
" کا کلام۔ ۲۰۴
" رسول بن کر نہیں آتا۔ ۴۵۷، ۸۰۷، ۱۲۳۹
" کی آواز ۵۲۷
" ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ ۵۸۳، ۴۵۹، ۸۰۷
" کی صلوٰۃ۔ ۱۱۰۴
دو طرح کی رسالت۔ ۱۱۲۶
" کے بازو۔ ۱۱۲۶
" کا نزول مومنوں پر ۱۲۱۳
مشرکین کا فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینا ۱۲۳۲

فرشتہ نیکیوں اور بدیوں کے لکھنے والا ۱۲۹۵
" آسمان کے کناروں پر ہونے سے مراد ۱۴۰۲
" کا قیامت میں قیام ۱۴۳۹
فرض ۲۸۹، ۳۶۶، ۱۳۷۵
فرعون رعمسیس ۸۷۹، ۹۹۸، ۱۰۰۱
۱۰۳۴، ۳۹
" کا رجوع ۶۳۸
" کی لاش ۶۳۹
" اور مسئلہ ختم نبوت ۱۲۰۰
آل فرعون کا مومن ۱۱۳۸، ۱۱۹۸
فرقان ۴۰، ۵۶۱، ۹۹۵
فریمسنری ۶۴
فطرت کا حکم ۳
" کی کمزوری کا علاج ۳۲
" بے گناہی پر ہے ۳۳
" کی شہادت توحید باری پر
۹۵، ۱۹۱، ۶۲۶
" کا مذہب اسلام ہے ۲۴۲
۳۸۲، ۱۰۷۰
" کا عہد۔ ۴۱۱، ۵۲۶، ۵۴۲
" کا نور۔ ۴۵۹، ۵۲۶، ۵۴۳
" کا نور انبیاء میں۔ ۴۷۴
" پر پیدائش۔ ۵۴۳
" کا خدا کی طرف جھکنا۔ ۶۲۳
" میں تبدیلی نہیں ۱۰۷۰
فقیر اور مسکین ۵۹۴
فنا ۱۰۵۱، ۱۳۳۰

ق

قاب قوسین۔ ۱۳۱۳
قابیل۔ ۴۱۸
قادیانی احمدی۔ اور مسئلہ نبوت۔
۶۰۵، ۳۵۶، ۳۶۲
۵۱۰، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۲۰۰
اور وراثت انبیاء۔ ۸۵۷
" کی صحابہ کی شان میں گستاخی۔ ۱۳۳۸
قارون۔ ۶۳۸، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹
قانون۔ کی فرمانبرداری کی ضرورت۔
۲۴۲، ۹۴۸، ۱۱۸۲، ۱۳۹۴
سب مخلوق میں ایک قانون جاری ہے ۱۳۹۲، ۱۲۹۳

اس فہرست میں حوالہ جات صفحات کے ہیں۔

قبر۔ استعمال بطور مجاز۔ ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۳۲۳
" پر مسجد بنانا۔ ۸۲۱
" پر قرآن پڑھوانا۔ ۱۳۱۹
قبروں سے نکلنا۔ ۱۴۵۰
قبلہ۔ تحویل قبلہ۔ ۸۴، ۸۵
" پرستش کی چیز نہیں۔ ۸۵، ۸۶
" دوسری قوموں کے قبلے۔ ۸۷
ایک قبلہ کے تقرر کی وجوہات: ۸۸
ایک قبلہ میں اتحاد قومی۔ ۸۹
قتل۔ خطا۔ ۳۷۲
" عمد ۳۷۳
ارادۂ قتل کی سزا قتل نہیں۔ ۴۱۹
قرآن۔ نام کی وجہ۔ ۱۰۷
الکتاب۔ ۸
" ہدایت ہے۔ ۹، ۲۱، ۴۳۱
" فرقان ہے۔ ۱۸۲
" حکیم ہے۔ ۹۸۲، ۲۲۸، ۴۱۷، ۱۱۳۵، ۱۲۳۰
" ذکر ہے۔ ۲۲۸، ۵۰۱
" شفا ہے۔ ۴۳۱، ۸۰۳
" وعظ ہے۔ ۴۳۰
" قیم ہے۔ ۸۱۳
" سے شرف کا ملنا۔ ۸۹۷، ۱۱۶۵، ۱۲۹۲
" ۱۴۰۰، ۱۴۴۴
" قوموں کیلئے زندگی ہے۔ ۱۲۲۹
" کریم ہے۔ ۱۳۴۳
" پہلی کتابوں کا مصدق ہے۔ ۳۵، ۵۲، ۱۸۱
" سب اختلافات مذہبی کا فیصلہ کرتا ہے۔ ۱۹۳، ۴۷۸، ۷۶۰
" یہود و نصاریٰ میں فیصلہ کرتا ہے۔ ۱۰۲۹
" پہلی کتابوں کا محافظ ہے۔ ۴۲۸
" کی دیگر کتب سماوی پر فضیلت۔ ۴۷۸
" پہلی کتابوں کے اجمال کو کھولتا ہے۔ ۷۳۱، ۹۲۷
" سے شرائع سابقہ کی منسوخی۔ ۷۷۰
" میں پہلی کتابوں کی تعلیم۔ ۱۴۸۰
" کا پہلے صحیفوں میں ہونا۔ ۱۴۶۲
" ہر دعویٰ کی دلیل دیتا ہے۔ ۶۸، ۹۴۷
" دعاوی اور دلائل کا جامع ہے۔ ۴۸۶
" کل صداقتوں کا جامع ہے۔ ۱۰۶۱
" خلاصۂ تعلیم۔

قرآن میں ذکر اضداد۔ ۱۳، ۲۰۶
" کی فصاحت و بلاغت۔ ۲۱
" کا بے مثل ہونا۔ ۲۰، ۸۰۵، ۱۳۰۹
" بغیر معنی جاننے کے پڑھنا۔ ۵۳
" کا کوئی حصہ منسوخ نہیں۔ ۶۶، ۶۷
" سنت یا اجماع سے منسوخ نہیں ہو سکتا ۹۵۶
" کے تین امتیازات۔ ۱۰۷
" سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب۔ ۱۰۷
" ابتدائے نزول۔ ۱۰۷، ۱۲۴۴
" نزول میں سب سے پہلی آیت۔ ۱۴۷۷
سب سے پہلی سورت۔ ۲
نزول میں آخری آیت۔ ۱۷۳
" کا پیرایہ بیان۔ ۱۳۲
" اور تفصیلات نماز۔ ۱۴۳
" بجبر کسی سے کچھ نہیں منواتا۔ ۱۵۶
" کی جمع و ترتیب۔ ۱۷۳، ۷۳۲، ۱۴۲۷
" میں اصول قوانین۔ ۱۷۴
" کے نزول کی ضرورت۔ ۱۸۰
" میں استعارہ اور مجاز۔ ۱۸۳، ۷۳۱
" ۸۰۶، ۸۰۸، ۸۹۰، ۱۱۸۴
" بنیاد اتحاد مسلمین ہے۔ ۲۴۹
" میں اتحاد پیدا کرنے کی طاقت۔ ۲۵۰
" ساری دنیا میں ایک ہے۔ ۲۴۹
" عبادت اور اصول علم کو جمع کرتا ہے۔ ۲۹۹
" مسلمانوں کا قرآن کو چھپانا۔ ۲۹۷
" تمام معاملات میں اول حکم ہے۔ ۳۵۵
" میں کوئی اختلاف نہیں۔ ۳۶۷
" کا اعجاز۔ ۳۶۸
" میں بلند اخلاق کی تعلیم۔ ۳۸۰
" معجزات کا انکار نہیں کرتا۔ ۴۶۲
" ۴۸۳، ۷۹۵
" میں مضامین کا تکرار ۴۸۲، ۷۹۱، ۱۲۶۰
" مفصل ہے۔ ۴۸۵، ۶۳۴، ۷۰۲۸
" دنیا کی آخری مذہبی کتاب۔ ۴۸۶
" کی اصلاح۔ ۶۰۴
" تعلیم کے متعلق مطالبہ کفار۔ ۶۲۱
" حقائق کی طرف بلاتا ہے۔ ۶۲۷
" افترا نہیں۔ ۶۲۷، ۶۴۶
" کی پیروی اولیاء اللہ بناتی ہے۔ ۶۳۲

قرآن کا معجزہ ۶۳۹
" سے انقلاب ۷۱۴
" اور مال دنیا ۷۴۵
" غرض نزول ۷۱۸
" کی حفاظت ۷۳۲، ۱۳۴۱
" اور کہانت ۷۳۶، ۱۳۰۸
" اور امراض جسمانی ۸۰۳
" کی تعلیم کا کمال ۸۰۵
" کا ہمیشہ کے لیے دنیا میں رہنا۔ ۸۰۵
" کا تدریجی نزول۔ ۸۰۹، ۹۸۷
" کے کامل ہونے کے نتائج۔ ۸۱۳
" کے متعلق مختلف رائیں۔ ۸۹۶
" سحر نہیں۔ ۸۹۶
" کلام کہانت نہیں۔ ۱۰۱۱
" کا عربی میں نزول۔ ۱۰۱۰
" پر لفظ خلق کا اطلاق۔ ۱۰۰۶
" میں اعتراضوں کا جواب۔ ۹۸۸
حقانیت پر دلیل۔ ۱۰۶۱
" اپنی صداقت کا آپ گواہ ہے۔ ۱۰۶۱
" سے روحانی قیامت کا برپا ہونا۔ ۱۱۲۷
" کا قلب۔ ۱۱۳۴
" میں اقسام ۱۱۳۵
" دائمی معجزہ۔ ۱۱۳۵
" سے اقشعرار کا پیدا ہونا۔ ۱۱۸۵
" سنکر گر پڑنا یا رقص کرنا۔ ۱۱۸۴
" کا اثر سخت مخالفین پر ۱۲۱۰
" کے اثر کو باطل کرنے کی تدبیر ۱۲۱۲
" پر باطل حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ ۱۲۱۵
" عجمی قرآن سے مراد۔ ۱۲۱۵
" سب سے بڑی نعمت ہے۔ ۱۳۲۸
" کو ناپاکی کی حالت میں نہ چھوا جائے۔ ۱۳۴۴
" کے فہم تک رسائی پاکوں کو ملتی ہے۔ ۱۳۴۴
" کا غیر مسلموں کے ہاتھ میں دینا۔ ۱۳۴۳
" کا دشمن کی ہتک سے بچانا۔ ۱۳۴۳
" کا پہاڑوں کو اڑا دینا۔ ۱۳۶۳
" کی خدمت پر خوشخبری۔ ۱۴۴۵
" کا لکھا جانا۔ ۱۴۸۰
" کا خاتمہ تعلیم۔ ۱۴۹۳
" کا بیان یا تفسیر۔ ۱۴۲۷
" نبأ عظیم ہے۔ ۱۴۳۷

قرآن اور علم ۶۲۸، ۶۴۶، ۷۲۵، ۱۳۹۶، ۱۴۴۸، ۱۱۳۵
قرآن کے انکشافات علمی کشش ثقل و دیگر
تعلقات نظام سماوی ۷۰۴
چاند کا نور محو ہو جانا ۷۸۲
موجودہ نظام کا ابتری کی حالت سے نکلنا ۹۰۰
پانی سے زندگی کا ہونا ۹۰۱
اجرام سماوی کا اپنے افلاک میں تیز چلنا ۹۰۲
سورج کا مستقر ۱۱۴۱
زمین کا تدریجی طور پر بننا ۱۲۰۹
آسمان کا دخان ہونا ۱۲۰۹
آسمان میں رستے ۱۳۰۰
تمام مخلوق میں زوجیت ۱۱۴۰، ۱۳۰۳
نظام شمسی کے سات سیارے اور ان میں زندگی ۱۳۸۶
زمین کی کشش ثقل ۱۴۳۵
زمین کا تیز چلنا ۱۴۳۵
زمین کیونکر بنی ۱۴۴۲
چاند کا سورج سے نور مستعار لینا ۱۴۶۹
قرآن کا مخفی واقعات کو ظاہر کرنا۔ بائیبل میں
تحریف ۵۲
فرعون کی لاش کا محفوظ رکھا جانا ۶۳۹
عیسائیت کا تین سو سال غربت کی حالت میں رہنا ۸۲۳
قرآن میں پیشگوئیاں، خانہ کعبہ دشمن کے
قبضہ میں کبھی نہ جائیگا ۲۴۷
حج بیت اللہ کا ہمیشہ قائم رہنا
۲۴۷، ۴۴۶
خانہ کعبہ کا بتوں سے پاک کیا جانا۔ ۸۰۳
کعبہ میں پھر بت پرستی کا نہ آنا۔ ۸۰۳
مکہ کی فقر سے بے خوفی۔ ۵۸۳
آئندہ زمانہ کا عذاب۔ ۷۴۵
ہجرت کرنیوالوں کی کامیابی۔ ۷۵۵
ہجرت کامیابی کا پیش خیمہ ہے۔ ۸۰۲
ہجرت کے بعد قریش کی قوت کا توڑا جانا ۸۰۱
مخالفت کا استیصال آپ کی زندگی میں
ہو جائے گا۔ ۹۵۰
صحابہ کی شہرت۔ ۹۷۰
آنحضرت کا مکہ میں لوٹ کر آنا۔ ۱۰۵۰

روم کا غلبہ۔ ۱۰۶۶
مکہ پر عذاب قحط۔ ۱۲۴۵
آنحضرت کی عظیم الشان طاقت۔ ۱۳۹۶
اونٹوں کا ترک کیا جانا۔ ۱۴۴۷
وحشی جانوروں کا اجتماع۔ ۱۴۴۸
ترقی علم و تہذیب۔ ۱۴۴۸
حقیقت آسمان کا منکشف ہونا۔ ۱۴۴۸
صحف علمی کی اشاعت۔ ۱۴۴۸
لوگوں کا میل جول۔ ۱۴۴۸
علم کا پھیل جانا۔ ۱۴۴۸
سونے چاندی کی کانیں۔ ۱۴۵۰
خندق والوں کی جنگ۔ ۱۴۵۷
آنحضرتؐ کے دشمنوں کا ذکر منقطع ہونا۔ ۱۴۹۰
ابولہب کا انجام۔ ۱۴۹۲ ابولہب کی بیوی کا انجام ۱۴۹۳
کفار کی مغلوبیت ۷، ۱۸۷، ۲۵۶، ۳۶۴، ۵۴۹، ۱۱۵۰، ۱۲۶۳، ۱۲۶۶
فتوحات اسلامی کی بشارت۔ ۷۰
یہود کی شکست ۲۵۴
جنگ بدر ۱۸۸، ۹۸۶، ۱۳۱۰، ۱۳۲۶
کفار کی جنگ کا کمزور ہو جانا۔ ۵۵۸
کفار کی جنگ میں ناکامی۔ ۵۵۸
بدر کے بعد لڑائیاں اور کفار کی مغلوبیت ۵۶۳
جنگ اور فتح۔ ۱۱۲۱
ہجرت سے ایک سال بعد قریش کو سزا کا ملنا۔ ۱۱۲۱
کفار کی جنگ اور شکست۔ ۱۱۶۷
فتح خیبر ۱۲۷۸
مخالفین کا صرف کردہ مال پر افسوس کرنا۔ ۱۴۶۷
جنگ کے ذریعہ سے باطل نابود ہوگا۔ ۱۴۸۲
امت مسلمہ کا قیام اور تزکیہ۔ ۷۹
مسلمان بڑی متمدن قوم بنیں گے۔ ۱۷۳
مسلمانوں کی حکومت ۱۹۴
مسلمانوں کی تولیت کعبہ۔ ۵۶۲
مسلمانوں کو عرب اور باہر کی بادشاہت کی خوشخبری۔ ۷۰۰
امت مسلمہ کا ممالک عالم کو فتح کرنا ۹۱۶، ۱۰۹۶
دوسرے مذاہب کا مسلمانوں کے ماتحت آنا ۹۲۹
مسلمانوں کو دوامی بادشاہت کا ملنا۔ ۹۷۵

مسلمانوں کا باغوں اور محلات کا مالک بنایا جانا۔ ۹۸۴
مسلمانوں کا کفار پر غلبہ ۹ سال میں۔ ۱۰۶۶
مسلمان دشمن کے ہاتھ سے ہلاک نہ ہونگے ۱۱۵۲
کفار سے سلطنت لیکر مسلمانوں کو دیا جانا۔ ۱۱۹۲
فارس و روم کی جنگ اور آخری فتح۔ ۱۲۷۷، ۱۲۷۸
فتوحات اسلامی۔ ۱۲۷۸
خادمان قرآن کا بلند مقام۔ ۱۴۴۵
عرب سے کفر کا مٹ جانا۔ ۷۷
غلبہ اسلام۔ ۱۲۱، ۳۰۷، ۴۳۱
عرب سے شرک کا مٹ جانا۔ ۵۳۳، ۹۷۶
مغلوبیت کفر۔ ۵۶۳
کفر اسلام پر غالب نہیں آ سکتا۔ ۵۶۸
دین اسلام کا جملہ مذاہب پر غلبہ ۵۸۵، ۱۲۸۱
آنحضرت صلعم کی کامیابی۔ ۸۷۱
دین اسلام کی تمکین۔ ۹۷۶
عرب کی بنجر زمین میں روحانی نشوونما ۱۰۸۶
قرآن کا غالب آنا۔ ۱۲۱۵
اسلام کا غلبہ عرب اور اطراف عالم میں ۱۲۱۷
اسلام کی ترقی تین سو سال تک۔ ۱۰۸۳
اسلام میں سب مذاہب کے لوگ داخل ہونگے ۱۰۴۴
قریش اسلام لائیں گے۔ ۱۳۶۶
دین اسلام کا آخری غلبہ ۱۳۷۱
مخالفین کا مسلمان ہونا۔ ۱۳۹۹
کفار کا گروہ در گروہ اسلام لانا۔ ۱۴۰۸
اسلام کی ترقی۔ ۱۴۵۶
عیسائیوں کا زمین میں تصرف۔ ۳۰۱
عیسائی اقوام کا اسلام لانا۔ ۳۰۲، ۸۱۴، ۱۴۱۲
عیسائی اقوام کی ترقی۔ ۸۱۴
مسلمانوں میں اختلاف کا ہونا۔ ۱۸۴
مسلمانوں کا مالی و جانی نقصان اور ایذا۔ ۲۹۷
آخری زمانہ میں فتنے۔ ۵۶۰
فتنوں کے بعد کامیابی۔ ۵۶۰
اسلام کی ترقی میں ایک ہزار سال کی روک ۱۰۸۳
صلح جس کے نیچے فساد ہو اور پھر فتنہ عظیم۔ ۱۲۴۵

مسلمانوں پر مصائب کا دروازہ کھل جانا ۱۳۴۹
عسر کے بعد یسر کی حالت کا پیدا ہونا ۱۴۷۵
قرآن میں تمثیلات ۱۷، ۱۸، ۲۲، ۹۸، ۱۶۰، ۱۶۱، ۳۱۱، ۴۱۶، ۵۴۴، ۶۴۸، ۷۱۱، ۷۲۲، ۷۶۳، ۷۷۶، ۹۳۶، ۹۷۴، ۱۰۵۸، ۱۱۳۷، ۱۱۷۳، ۱۱۸۵، ۱۲۸۲
قرآن میں قصص۔ کی غرض ۳۴، ۱۵۱، ۵۱۸، ۹۸۲، ۱۱۷۱
قرآن کا اصلاح بائبل کرنا۔ ۳۱، ۶۰، ۶۳، ۷۴، ۱۵۰، ۵۲۲، ۵۲۷، ۵۲۹، ۵۳۶، ۵۳۷، ۶۶۱، ۶۷۲، ۶۷۴، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۸۰، ۶۸۳، ۶۸۶، ۱۱۶۰، ۶۹۲، ۶۹۷، ۸۸۵، ۸۹۰، ۱۲۶۲، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۹
قرامطہ۔ ۹۲۵
قربانی۔ یہودیوں میں۔ ۲۹۵
سوختنی قربانی۔ ۲۹۵
" کو ہار پہنانا۔ ۳۰۴
" کا گوشت۔ ۹۲۵
" کی غرض۔ ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸
" اور جنگ کا تعلق۔ ۹۲۸
انسانی قربانی کی منسوخی۔ ۱۱۵۸
قرضہ۔ کی معافی۔ ۱۷۲
" میں تحریر۔ ۱۷۳
حق مدیون۔ ۱۷۴
" کی ادائیگی۔ ۳۱۹
" جس میں ضرر ہو۔ ۳۲۲
قرضداروں کی امداد۔ ۵۹۴
قرعہ اندازی۔ ۲۰۹، ۳۰۶، ۹۵۹
قریش۔ ۱۴۸۸
اسلام لانے کی پیشگوئی۔ ۱۳۶۶
" کی تجارت۔ ۱۴۸۸
قس بن ساعدہ۔ ۱۰۸۲
قسطنطین۔ ۸۲۴ قسطنطنیہ۔ ۱۱۳
قسم۔ لغو قسم۔ ۱۳۲
" نیکی سے رکنے کی۔ ۱۳۲
رب کی قسم۔ ۳۵۸
" کی حفاظت ۴۴۳
" کا کفارہ۔ ۴۴۳
" کم کھانے کی تعلیم۔ ۴۴۳، ۱۳۹۷

اللہ کا قسم کھانا ۸۱۸، ۱۱۳۵
قرآن کی قسمیں ۱۱۳۵
قصاص ۱۰۲، ۱۰۳
" زخموں میں نہیں۔ ۱۰۲، ۴۵۵
قضا و قدر میں فرق ۷۱
" کے مصائب۔ ۱۷۸
" کا ٹلنا۔ ۷۱۶
قطع ید۔ ۴۲۳
قوالی۔ ۱۰۷۷
قوم۔ کی زندگی اور موت۔ ۴۲، ۶۳۰
قومی مال۔ ۱۷۱
قومی اتحاد۔ ۲۴۹
بعض افراد کا اثر کل قوم پر۔ ۲۷۷
قوم کی ناموس کی حفاظت۔ ۲۸۸
اسلام میں قومیت کی بنیاد۔ ۴۰۵
" کی ہلاکت۔ ۴۶۵
قوموں کے عروج و زوال کا قانون ۴۶۹
قومی مفاد کو مقدم کرنے کی ضرورت ۵۶۱
" سے نعمت کب چھنتی ہے۔ ۵۶۷
" کی حالت کیونکر بدل سکتی ہے۔ ۷۰۸
" کی اجل ۷۱۶
" کی ہلاکت کا اٹل قانون ۸۷۰
قوموں کی تباہی ۸۹۸
قومی ترقی کا راز ۹۳۸
معاملات قومی اور ذاتی کام ۹۸۰
قوموں کا عروج و زوال۔ ۱۱۴۵
" کا انفاق سے رکنا موت ہے ۱۲۷۱
قومی تفریقات۔ ۱۲۹۰
" کی تبدیلی (دو طرح پر) ۱۴۳۲
" کی ہلاکت مصلحت الٰہی سے ہے۔ ۱۴۷۰
قیامت۔ دیکھو۔ آخرت بعث کبریٰ وسطیٰ صغریٰ۔ ۵۶، ۱۴۰۱، ۱۴۸۱
" میں بیع و شفاعت نہیں۔ ۱۵۳
امور متعلق قیامت متشابہات سے ہیں۔ ۱۸۳
" کے نشان۔ ۴۹۸
" میں اماموں کے ساتھ بلایا جانا۔ ۷۹۹
" میں تین گروہ۔ ۸۰۷
" کا اخفا۔ ۸۷۴
" کا زلزلہ ۹۱۸

قیامت کا علم۔ ۱۰۸۲
" کی گھبراہٹ۔ ۱۱۲۰
" مخفی نتائج اعمال کا ظہور ہے۔ ۱۱۳۶
۱۱۹۱، ۱۳۳۲، ۱۴۵۵، ۱۴۶۰
" کا نفخہ۔ ۱۱۹۱
" اور آنحضرت صلعم کا ظہور۔ ۱۲۶۷
" میں اعضا کی شہادت۔ ۱۳۳۲
" اور موجودہ نظام۔ ۱۴۰۳
بچوں کو بوڑھا کرنے والا دن۔ ۱۴۱۸
" کا اس دنیا میں ظہور۔ ۱۴۲۵
" پر قیامت کی شہادت۔ ۱۴۲۵
" کا قرب۔ ۱۴۳۹
" میں جی اٹھنا۔ ۱۴۳۷
" اور دنیا کے واقعات کا اکٹھا ذکر۔ ۱۴۴۷
قیامت کے مختلف نام۔ اور ان سے مراد
الساعۃ۔ ۱۸۸، ۴۶۴، ۴۹۸، ۵۴۷
۷۶۳، ۹۱۸، ۱۲۶۷، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۶
یوم الجمع۔ ۱۲۱۹
آزفۃ۔ ۱۳۲۰
یوم التغابن ۱۳۸۰
یوم الفصل۔ ۱۴۳۶، ۱۴۳۸
روحانی قیامت۔ ۱۲۹۵، ۱۴۲۵
۱۴۴۱، ۱۴۵۵، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳

ک

کاتب۔ ۱۷۴
کافر۔ صرف کفر کی وجہ سے قتل جائز نہیں ۱۱۱، ۳۷۴
کفار کا مومنوں پر ہنسنا۔ ۱۲۲
کفار کی مسلمانوں پر زیادتی۔ ۱۲۵
کفار سے معاہدات۔ ۱۹۵
کفار سے موالات۔ دیکھو موالات۔
کفار کی اطاعت۔ ۲۷۵
کفار کی جنگ کی غرض۔ ۳۶۴
" سے شدت۔ ۴۳۲
کافر بادشاہ کی اطاعت۔ ۴۳۲
" کی شہادت۔ ۴۴۸
کفار کی عہد شکنیاں۔ ۵۶۶، ۵۶۷
۵۶۸
کافر بادشاہ کے قانون پر عمل۔ ۶۹۳
کافر کے نیچے۔ ۷۸۴
" کے آگے پیچھے سد۔ ۱۱۳۷
" کے اعمال کی بربادی۔ ۱۲۶۳
" پر سختی۔ ۱۲۸۲
" سے احسان وانصاف کی تعلیم۔ ۱۳۶۴
کفار کے مطالبات۔ ۸۰۶، ۹۸۶، ۱۴۲۴
" کافر کی نیکی۔ ۱۴۸۱ دیکھو کفر۔
کافوری پیالہ۔ ۱۴۳۰
کالب بن یفنہ ۴۱۷
کاہن۔ ۷۳۴
" اور علم غیب۔ ۷۳۴
" کا تعلق شیاطین سے۔ ۷۳۵
" کا دعوائے علم غیب۔ ۱۱۴۹
" کی خبروں پر ایمان۔ ۱۳۰۸
کتا۔ کتے والے گھر میں فرشتہ کا نہ آنا۔ ۱۱۰
کتا (بطور مثال) ۸۲۰
کتاب۔ کتمان کتاب۔ ۲۹۷
" لکھی ہوئی کیوں نہ اتری۔ ۴۵۷
کثرت۔ قلیل کا کثیر پر غالب آنا۔ ۱۵۰
کثرت رائے پر آنحضرتؐ کا عمل۔ ۲۸۵
کثرت رائے اور مجدد صد چہاردہم ۲۸۵
کراماً کاتبین۔ ۴۷۰، ۷۰۸
کرسی۔ ۱۵۵
" اور عرش کے متعلق غلط فہمی۔ ۵۱۶
کرشن۔ ۱۲۰۶
کشتی۔ میں نشان۔ ۱۱۴۲
کشف۔ ۷۷۸، ۸۷۲، ۱۲۲۸
کشمیری۔ بنی اسرائیل ہیں۔ ۹۴۵
کعب بن اشرف۔ ۳۵۲، ۱۳۵۹
کعب بن مالک۔ ۶۱۲
کعبہ۔ سے مسلمانوں کا روکا جانا۔ ۷۰
" دنیا کا سب سے پہلا معبد ۷۵، ۸۹
۲۴۶
" اجتماع مذاہب کا نشان ہے۔ ۷۵
" کی قدامت۔ ۷۵
" کے متعلق دو پیشگوئیاں۔ ۷۶
" پر دشمن قابض نہ ہوگا۔ ۷۶
" کو قبلہ بنانے کا حکم۔ ۷۶
" کا بتوں سے پاک کیا جانا۔ ۷۷، ۹۲۴
" کی تعمیر ۷۸
" کی تولیت ۸۶، ۵۸۱
" جائے عبادت ہے معبود نہیں۔ ۸۸
" کو قبلہ بنانے پر اعتراض۔ ۸۹
" آخری قبلہ ہے۔ ۸۹، ۲۳۶
" کی طرف منہ کرنا شرک نہیں۔ ۱۰۱
" آدم نے بنایا۔ ۲۴۶
" اور بیت المقدس میں چالیس سال کا فرق۔ ۲۴۶
کعبہ کے نام۔ ۲۴۶
" مقام امن ہے۔ ۲۴۷
" دشمن کے قبضہ میں نہ جائیگا ۲۴۷
" کی حرمت۔ ۴۰۴، ۴۴۴
" میں شکار۔ ۴۴۵
" موجب قیام دنیا ہے ۴۴۵
" تباہی سے بچا رہے گا۔ ۴۴۶
" کے متولی مسلمان رہیں گے۔ ۵۶۲
" میں غیر مسلم کے داخل ہونیکی ممانعت۔ ۵۸۳
" میں جذب۔ ۷۲۸
" عتیق ہونے سے مراد۔ ۹۲۵
" کے مقابل پر گرجا۔ ۱۴۸۷
" کوئی طاقت برباد نہیں کرسکتی۔ ۱۴۸۷
کفارہ۔ ۲، ۴، ۸۳، ۱۰۴، ۱۹۸
۳۳۵، ۴۱۵، ۴۹۹
بدی کا کفارہ نیکی ہے۔ ۶۷۰
کفر۔ ہر فعل مذموم کفر ہے۔ ۱۲
اصل اور فرع کا کفر۔ ۱۲
" کا کمال۔ ۱۳
دون کفر ۴۲۸
" کے غلبہ سے مرعوب نہ ہو۔ ۴۳۱
" سے سینہ کا تنگ ہونا۔ ۴۸۸
" کی آخری مغلوبیت۔ ۷۳۲
" کا کلمہ مجبوری میں۔ ۷۷۱
" کی ظلمت۔ ۹۷۲
" یا نفاق کا جسم پر نشان نہیں ہوسکتا۔ ۱۲۴۹
" کے فتوے۔ ۱۲۹۰
" پر کوئی پیدا نہیں ہوتا۔ ۳۷۹
کلالہ۔ ۴۰۱
کلمۃ اللہ۔ ۲۰۵، ۲۱۰
" لاتعداد ہیں ۲۱۰، ۱۰۸۰
" میں تبدیل نہ ہونے کا مفہوم۔ ۴۶۳، ۱۲۷۹
کنعان ۴۱۳
کن فیکون ۷۱
کوا۔ ۴۲۰
کوثر۔ ۱۴۹۰
کوڑے۔ کی سزا۔ ۹۵۵
کھانا۔ کھانے میں اعتدال۔ ۵۰۹
قریبیوں اور دوستوں کے گھروں سے کھانا کھانا ۹۷۹
مل کر کھانا کھانا۔ ۹۷۹، ۹۸۰
کہانت کا قرآن سے دور ہونا۔ ۷۳۶
۱۱۵۰، ۱۳۰۸
" اور نبوت میں مابہ الامتیاز۔ ۱۰۱۱
کیمیا۔ ۱۰۴۹
کینہ وحسد۔ ۹۶۱

گ

گائے کا ذبح کرنا اور توحید۔ ۷
" کی پرستش ۴۰
" کی مشرکانہ عظمت ۴۵۴
گدیاں ۲۵۰، ۵۸۵
پیراوران کی نذریں ۶۰۵
گناہ۔ کی معافی ۴، ۱۱۹۸
" سے بچنے کا علاج ۱۲
" سے پاک کرنیوالی چیزیں ۳۰۱
" صغیرہ وکبیرہ کی تقسیم ۳۳۷، ۳۳۶
" ظاہری اور باطنی ۴۸۶
" پر پشیمانی کا فطری احساس ۵۰۷
" سے نجات وحی الٰہی سے ملتی ہے ۵۰۸
" کے مدارج ۵۱۰
" پر اصرار۔ ۵۴۲
" کا اقرار۔ ۶۰۶، ۱۳۱۸
" کا بغیر توبہ بخشا جانا۔ ۱۱۹۳
" سے حفاظت کی دعا۔ ۱۱۹۴
" سے دل کا سیاہ ہونا۔ ۱۴۵۲
" اللہ سے محجوب کرتا ہے۔ ۱۴۵۲
گواہ۔ ۱۷۴
دو گواہوں کی ضرورت۔ ۱۷۴
لعان میں مرد عورت کی شہادت کی مساوات ۱۷۵
جھوٹی شہادت یا اخفائے شہادت۔ ۱۷۶
" کافر بھی ہوسکتا ہے۔ ۴۴۸
گواہی قرائن توبہ سے رد ہوسکتی ہے۔ ۴۴۹
قرائن کی گواہی۔ ۶۸۰
ایک آدمی کی گواہی۔ ۱۲۸۶

اس فہرست میں حوالجات صفحات کے ہیں۔

ل

لات۔ ۱۳۱۵
لباس۔ اور اس کا اتارا جانا۔ ۵۰۸
〃 اعلیٰ درجہ کا منع نہیں۔ ۵۱۰
〃 کی پاکیزگی۔ ۱۴۲۰
لعنت۔ ۵۸ کرنا خدا کو پسند نہیں۔ ۱۳۵۵
لغو۔ لغو قسم۔ ۱۴۲
〃 سے اجتناب۔ ۹۳۸
لقاء اللہ۔ ۴۶۲، ۷۰۴
لقمان۔ ۱۰۷۷
لندن میں یاجوج ماجوج کے مجسمے۔ ۸۴۵
لوح محفوظ۔ ۱۲۴۳، ۴۵۸
لوح و قلم۔ ۲۰۹
لوط۔ ۴۷۶، ۵۲۲، ۵۲۳
〃 کی قوم کا عذاب۔ ۵۲۳
〃 کی بیٹیاں۔ ۶۶۱
〃 کی بستیوں کی تباہی۔ ۶۶۲
〃 کے مہمان۔ ۷۴۱
〃 غیر قوم میں نبی تھے۔ ۷۴۴
〃 کی ہجرت۔ ۹۰۸
〃 کی قوم کے خلاف وضع فطرت افعال ۱۰۰۸
〃 کی بی بی۔ ۱۰۰۸، ۱۳۹۱
〃 کی قوم کی ڈاکہ زنی۔ ۱۰۵۷
لونڈی۔ سے نکاح۔ ۳۱۲
〃 سے نکاح پر قید کی وجہ۔ ۳۳۳
〃 کو آزاد کر کے نکاح کرنے کی ترغیب ۳۳۴
〃 سے نکاح کی شرائط۔ ۳۳۴
اپنی مملوکہ سے نکاح۔ ۳۳۴
لوہا۔ ۱۳۵۰
لیلۃ القدر۔ ۱۲۴۴، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹
〃 اور زمانہ مجدد۔ ۱۴۷۹

م

مارب۔ کا بند۔ ۱۱۱۸
ماریہ قبطیہ۔ ۳۳۳، ۱۱۱۰، ۱۳۸۷
ماسکو۔ ۸۴۴
مال۔ کی محبت۔ ۱۷۰، ۳۳۶، ۵۸۷، ۷۸۸، ۱۰۹۹
〃 کی حفاظت۔ ۱۷۳، ۳۱۳، ۷۸۸
ناجائز طریق سے حاصل کردہ۔ ۱۷۲
مال میں تصرف کا اختیار کب دیا جائے۔ ۳۱۴
〃 کو ترقی نہ دینا سفاہت ہے۔ ۳۱۳
〃 کے حصول کے ذرائع۔ ۳۲۹
〃 کا جمع کرنا۔ ۵۸۶، ۷۸۸
〃 کا بیجا خرچ۔ ۷۸۸
〃 کے خرچ میں میانہ روی۔ ۷۸۸
〃 کا حاصل کر لینا کامیابی نہیں۔ ۹۴۶
〃 سے آخرت میں فائدہ۔ ۱۰۴۹
〃 میں دوسروں کا حق ۱۰۶۲، ۱۳۰۰
〃 کی کثرت۔ ۴۸۶، ۱۲۳۵، ۱۴۸۴
مالک (امام) ۲۲۵
مائدہ۔ ۴۴۷، ۴۵۰، ۴۵۱
مایوسی ۶۹۶، ۸۰۳
مباہلہ۔ یہود سے۔ ۶۰، ۱۳۷۴
〃 عیسائیوں سے۔ ۲۳۰
〃 اور فضیلت علیؓ کا سوال۔ ۲۳۰
〃 کب جائز ہے۔ ۲۳۰
〃 قریش کا بدر میں۔ ۵۵۸
مبشرات۔ ۳۶۱، ۶۳۳
مُبلّغ۔ کی پہلی ضرورت۔ ۵۵۰
متبنّیٰ بنانا۔ ۱۰۸۹
متشابہات۔ کی تاویل۔ ۱۸۴، ۱۸۶
متعہ۔ ۳۳۱، ۳۳۲
متقی کون ہے۔ ۸
〃 اور ضرورت ہدایت۔ ۹
〃 کی غیر متناہی ترقیات۔ ۹
〃 کے چار اوصاف۔ ۲۶۷
〃 کے لیے مخرج کا وعدہ۔ ۱۳۸۴
مجادلہ۔ کا طریق۔ ۱۰۶۰
مجدد۔ اور امام سے اختلاف ۳۵۶
〃 کا ساتھ دینا۔ ۶۱۳
بعثت مجددین۔ ۹۷۶، ۱۱۹۶
〃 کی بیعت۔ ۱۲۷۸
مجدد صد چہاردہم۔ دیکھو مرزا غلام احمد صاحب قادیانی۔
مجلس۔ کے آداب۔ ۱۳۵۶
مومنوں کی مجالس کی غرض۔ ۱۳۵۶
مجمع البحرین۔ ۸۳۳
مجوس۔ کا عقیدہ۔ ۱۴
〃 کا شرک۔ ۴۵۵، ۷۸۱، ۱۴۹۴ اور دیکھو
آتش پرست
محبت۔ عمل کے لئے جذبہ محبت کی ضرورت ۹۵
محبت الٰہی کا کمال ۱۱۵
محبت الٰہی کس طرح بڑھتی ہے ۱۶۴
محدثیت ۳۶۲، ۶۷۶، ۸۹۶
محکم اور متشابہ ۱۸۳، ۱۸۵
(حضرت) محمد (مصطفیٰ) احمد (مجتبیٰ) صلعم
اسم مبارک محمد ۴، ۲۷۱
اسم مبارک احمد ۴، ۲۷۱، ۱۳۷۰
محمدؐ کی آل۔ ۳۸
〃 آخری نبی ہیں۔ اور اول النبیین دیکھو ختم نبوت
〃 کا دعائے ابراہیم ہونا۔ ۷۹، ۱۹۹، ۲۱۰
〃 کی بعثت اختلافات کے فیصلہ کے لیے تھی۔ ۱۲۳
〃 سب قوموں کی طرف ایک رسول۔ ۱۵۳
〃 کی شفاعت۔ ۱۵۴، ۱۲۴۳
〃 کی بعثت عامہ۔ ۱۹۲، ۵۳۹، ۷۱۹، ۹۸۱، ۹۹۱، ۱۱۲۱
〃 آدم آخر ہیں۔ ۱۹۸
〃 جنگ میں لوگوں کے لیے پناہ کا موجب تھے ۱۰۰
〃 کا گذارہ۔ ۱۷۵، ۵۶۴
〃 کا یہودی کے پاس زرہ رہن رکھنا ۱۷۵
〃 کے کفار سے معاہدات۔ ۱۹۵
〃 کی پیروی سے محبوب الٰہی بنتا ہے ۱۹۸
〃 کا مسیح کی اصل تعلیم پر روشنی ڈالنا۔ ۲۰۸
〃 کا خط۔ ۲۳۲
〃 موعود انبیاء۔ ۲۴۰
〃 قومی انبیا اور دنیا کا نبی۔ ۲۴۴
〃 کے لیے حواریان مسیح کی شہادت۔ ۲۴۱
〃 کے رویا۔ ۲۵۸، ۲۸۱
〃 کی اطاعت۔ ۲۶۵
〃 کے قتل کی خبر اُحد میں۔ ۲۷۱
〃 کی آرزو خدا کی راہ میں جان دینے کی۔ ۲۷۰
〃 کی حفاظت من جانب اللہ۔ ۲۷۳، ۴۱۲، ۴۳۷، ۴۳۶
〃 کے زخم احد میں۔ ۲۷۱
〃 کی وفات اور ابوبکر۔ ۲۷۲
〃 کی توحید پر غیرت۔ ۲۷۵
محمدؐ کا رعب ۲۷۶، ۱۰۱۹
〃 کا مشورہ پر عمل ۲۸۵
〃 کی امت پر گواہی ۳۴۵
〃 کی وحی خفی ۳۴۷، ۳۵۹، ۳۷۷
〃 کی معیت ۳۶۱
〃 کی وحی کا دیگر انبیا کی طرح ہونا ۳۹۷
〃 کا یہود کے فیصلے تورات پر کرنا ۴۲۵
محمدؐ اور رہبانیت امت ۴۵۱
〃 امت کا بگڑنا ۴۵۳
〃 کے دو خزانے ۴۷۱
〃 صرف کمال انسانی کیلئے آئے ہیں ۴۶۶
ابنیا کی ہدایت کے اقتدا سے مراد ۴۷۴
〃 کا مشرکانہ رسوم کا استیصال کرنا۔ ۴۹۱
〃 توحید کے عملی معلم ہیں۔ ۴۹۷
وحی کے وقت حالت ۵۲۷، ۱۴۱۷، ۱۴۲۶
〃 کے لیے کامل تجلی۔ ۵۳۵
حفاظت الٰہی پر کامل یقین۔ ۵۴۸
〃 کے خلاف قریش کا آخری مشورہ ۵۶۱
〃 کے ذوی القربیٰ۔ ۵۶۴
〃 اور عہد کی واپسی ۵۷۶، ۵۷۷
〃 کی والدہ۔ ۶۱۰
〃 کا اتباع وحی۔ ۶۲۱
〃 کو وحی یا قرآن پر شک کبھی نہیں ہوا ۶۳۹، ۱۴۷۷
〃 کو سچے خواب آنا۔ ۶۷۳
〃 کا بیٹے کی وفات پر رونا۔ ۶۹۵
〃 اور یوسف۔ ۶۸۶
〃 کی پیروی سے بصیرت ملتی ہے ۷۰۱
〃 اور موسیٰ۔ مماثلت اور فرق۔ ۷۱۸
〃 کے وقت شہب کا گرنا۔ ۷۳۵
〃 کا سب سے آخر ہجرت کرنا۔ ۷۴۲
〃 کی عمر کی قسم۔ ۷۴۲
〃 پر اعتراض کہ کوئی اور تعلیم دیتا ہے۔ ۷۷۰
〃 کا بہشت و دوزخ کو دیکھنا۔ ۷۷۸
〃 کا ارض مقدس کا وارث کیا جانا۔ ۷۷۹
〃 کے متعلق مختلف رائیں۔ ۷۹۲
〃 کا حفاظت الٰہی پر بھروسہ۔ ۸۰۱
〃 کا مقام محمود۔ ۸۰۲
〃 اور یہود کا مطالبہ شام میں جانے کا ۸۰۱
〃 کا شعب ابی طالب میں محصور ہونا ۸۰۱
〃 کا ضروریات انسانی کا کامل علم۔ ۸۲۶

محمد کا بشیر ہونا اور مسلمانوں کو بشارت۔ ۸۰۸
" کا نذیر عریاں ہونا۔ ۸۹۱
" کا رنگ۔ ۸۹۳
" مفتری شاعر نہیں۔ ۸۹۷
" کے سرخ اور سفید خزانے۔ ۹۱۶
" کا لڑائیوں میں بی بی کو ساتھ رکھنا ۹۵۹
" اور واقعہ افک عائشہ۔ ۹۵۹
" کا نور فطری۔ ۹۷۰
" کا دوسروں کے گھر جانا۔ ۹۶۳
" کی دعوت اور مسلمانوں کی غفلت۔ ۹۸۰، ۹۸۱
" کا پیدا کردہ انقلاب۔ ۹۷۵
" کے ظہور سے تاریکی کا دور ہونا۔ ۹۹۰
" کے انقلاب روحانی کا ذکر مختلف پیرایوں میں ۹۹۰
" لکھ پڑھ نہ سکتے تھے۔ ۹۸۳
" بعد نبوت لکھنے پڑھنے کا سوال۔ ۱۰۶۱
" کے والدین۔ ۱۰۱۲
" کا اقربا کو ڈرانا۔ ۱۰۱۱
" پر دو بڑے اعتراض۔ ۱۰۱۱
" صفا پر۔ ۱۰۱۱، ۱۴۹۲
" کے نو بڑے دشمن۔ ۱۰۲۶
" کی اقامت مدینہ کی پیشگوئی موسیٰ کے ذکر میں ہے۔ ۱۰۳۹
" کی موسیٰ سے مماثلت اور ایک دوسرے کی تائید و تصدیق۔ ۱۰۴۲، ۱۴۱۸
" کے مکہ میں واپس آنے کی پیشگوئی۔ ۱۰۵۰
بعثت سے قبل دنیا میں فساد۔ ۱۰۷۳، ۱۱۴۰، ۱۴۷۹
" کا چلنا۔ ۱۰۷۹
" کا اسوۂ حسنہ ہونا۔ ۱۰۹۴
" کا عہد یہود و دیگر اقوام سے۔ ۱۰۹۲
" سے تعلق ابنیت روحانی ہو سکتا ہے ۱۰۸۹
" اور مومنوں کا تعلق ۱۰۸۹
" سے مومنوں کی محبت۔ ۱۰۹۰
" مومنوں کے باپ ہیں۔ ۱۰۹۰
" سے جسمانی رشتوں کی نفی۔ ۱۰۸۹
" کا نبوت کو ختم کرنا۔ ۱۱۰۳
" کے متعلق غلط روایات کی تشہیر۔ ۱۱۱۰
" کی کچھ خصوصیات۔ ۱۱۰۶
" کی نبوت کا انعکاس۔ ۱۱۰۵

محمد کی ابوت تا قیامت ہے۔ ۱۱۰۴
" پر درود۔ ۱۱۱۰
" مجنون نہیں۔ ۱۱۲۴
" اور شاعری ۱۱۴۵
" کے پیرو کیسے ہونگے۔ ۱۱۶۸
" کی بعثت سے پہلے توحید کا اٹھ جانا۔ ۱۱۶۶
" کی بادشاہت۔ ۱۱۷۲
" کا عفریت پر قدرت پانا۔ ۱۱۷۳
" کا عقبہ کو جواب۔ ۱۲۱۰
" کا مودۃ فی القربیٰ کا چاہنا۔ ۱۲۲۲
" کا قبل از بعثت کتاب کو نہ جاننا۔ ۱۲۲۹
" پر دوسرے سے سیکھنے کا الزام۔ ۱۲۴۹
" کا مکہ سے نکالا جانا۔ ۱۲۶۶
" اسیران جنگ ہمیشہ رہا کرتے رہے ہیں ۱۲۶۴
" کا منافقوں کو پہچاننا۔ ۱۲۷۰
" پر اتمام نعمت۔ ۱۲۷۳
" کا حدیبیہ کو نکلنا۔ ۱۲۷۵
" کا مجوس ہجر سے جزیہ لینا۔ ۱۲۷۸
" کی اہل بحرین سے صلح۔ ۱۲۷۸
" پر روح القدس کا نزول۔ ۱۲۷۸
" کو بیعت کا حکم۔ ۱۲۷۸
" کا عمرہ کے لیے نکلنا۔ ۱۲۷۸، ۱۲۷۷
" کا عمرہ۔ ۱۲۸۱
" کا خونریزی سے اجتناب۔ ۱۲۸۰
" کا مکان رہائش۔ ۱۲۸۵
" کا ادب کیوں سکھایا گیا۔ ۱۲۸۴
" کا نسب قطع نہ ہوگا۔ ۱۲۹۰
" کا پیشگوئی پر وثوق۔ ۱۳۰۹
" کا قرب اللہ سے۔ ۱۳۱۳
" کا کلام سب وحی نہیں۔ ۱۳۱۲
" کا اللہ کو دیکھنا۔ ۱۳۱۴
" اور قصۂ غرانیق۔ ۱۳۱۶
" کی حق کے لیے غیرت۔ ۱۳۲۵
" کی مجلس علمی تھی۔ ۱۳۵۱
" کے اہل کا نفقہ۔ ۱۳۶۰
" ساری امت کے معلم ہیں۔ ۱۳۷۳
" کا اپنے لیے حلال کو حرام کرنا۔ ۱۳۸۸
" کا اصل تعلق صرف اللہ تعالیٰ سے تھا ۱۳۸۹
" کے شہد پینے کا قصہ۔ ۱۳۸۷
" کا پیدا کردہ انقلاب ۱۳۹۶
" اور مساکین ۱۳۹۹

محمد اور فترت وحی ۱۴۲۰
" کے متعلق کفار کا اقرار کہ آپ کاہن کاذب نہیں ۱۴۲۲
" کی صفات ۱۴۳۹
" اور قرب ساعت ۱۴۴۳
" کے وجود سے قیامت پر شہادت ۱۴۵۹
" کی مشابہت ستارہ سے ۱۴۵۹
" کا طالب ہدایت ہونا ۱۴۷۳
" کی شرح صدر۔ ۱۴۷۴
سب سے پہلی وحی۔ ۱۴۷۷
" کا زمانہ خلاصہ ازمنہ ہے۔ ۱۴۸۶
" کی ضرورت باوجود پہلی کتب کے۔ ۱۴۸۰
" کی پیدائش کا سال۔ ۱۴۸۷
" کے اعدا کا ذکر خیر باقی نہ رہیگا۔ ۱۴۹۰
" کے لیے نصرت کا نظارہ۔ ۱۴۹۲
" کی وفات کے قریب آجانے کی خبر ۱۴۹۲
" کے مسحور ہونے کی غلط روایت۔ ۱۴۹۷
آنحضرت صلعم کا ذکر انبیا کے ذکر میں:
خضر و موسیٰ۔ ۸۴۱
صالح۔ ۱۰۲۹
داؤد اور سلیمان۔ ۱۰۲۷، ۱۱۰۷
موسیٰ۔ ۱۰۳۳، ۱۱۱۳
ایوب۔ ۱۱۷۵
آنحضرت کے مخالفین۔ سے معاملہ۔ ۴۱۷، ۱۴۳۴
روکنے والے۔ ۷۷۵
مخالفت اور اس کا انجام۔ ۷۰۰
آپ کے دشمن۔ ۷۲۷
آپ کے خلاف منصوبہ۔ ۷۹۶، ۱۰۲۶
لالچ دیکر دعوت سے روکنے کی کوشش ۸۰۰
کا استیصال۔ ۹۵۰
کے لیے آپ کا غم۔ ۹۹۷
یہود کو سزا دینا۔ ۱۰۹۶
آنحضرت کے ازواج مطہرات۔
مومنوں کی مائیں ہیں۔ ۱۰۹۰، ۱۰۹۹
امت کے لیے نمونہ ہیں۔ ۱۰۹۷
کو طلاق کا اختیار دینا۔ ۱۰۹۷
کو گھر میں ٹھیرنے کا حکم۔ ۱۰۹۸
کا رجس سے پاک کیا جانا۔ ۱۰۹۹، ۱۰۹۸

کا کام اقوال و افعال نبی کو محفوظ رکھنا ۱۱۰۰
اغراض نکاح ۱۱۰۰
زینب سے نکاح کے متعلق جھوٹے قصے ۱۱۰۲
زینب سے نکاح کی وجوہات ۱۱۰۲
دشمن و غیر اقوام کی بیبیوں سے نکاح ۱۱۰۶
چار کی حد بندی سے مستثنیٰ کرنا ۱۱۰۶
نکاحوں کی تاریخیں ۱۱۰۷
کثرت پر اعتراض اور جواب ۱۱۰۷
نکاح کے متعلق مختلف نمونے ۱۱۰۸
ایلا ۱۱۰۸
ایلا میں لطیف اشارہ ۱۳۸۶
سے ممانعت نکاح ۱۱۱۰
عارضی علیحدگی ۱۳۸۷
بی بی سے راز کی باتیں کہنا ۱۳۸۸
ازواج کے اوصاف ۱۳۸۹
آنحضرت کا کام مختلف کام ۲۵۹
تعلیم و تزکیہ ۱۱۰۹، ۲۸۷
حالات مختلف میں سے گذرنا ۳۲۸
آپ کی مشکلات ۴۳۰
آپ کے سامنے قوم ۱۱۳۶
آنحضرت کے خاص اسما
النبی۔ الرسول۔ ۲۵، ۴۲۵
منادی۔ ۲۹۹
اول المسلمین۔ ۲۹۹
بینۃ۔ ۸۹۴
شاہد۔ ۱۱۰۵، ۱۲۷۴
مبشر۔ نذیر۔ داعی۔ سراج منیر۔ ۱۱۰۵
المزمل۔ ۱۴۱۷۔ المدثر۔ ۱۴۲۰
رسول کریم۔ ذو قوۃ مکین مطاع۔
امین۔ ۱۴۴۹
الشمس۔ القمر۔ ۱۱۰۵، ۱۴۶۹
آنحضرت کی دعائیں۔ ۱۸۸، ۲۶۹، ۶۰۵، ۸۵۰، ۱۲۲۶
اور بد دعا۔ ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۸۲
آنحضرت کی عصمت۔ شیطان آپ کا فرمانبردار تھا۔ ۱۶، ۳۰
صدور ذنب سے محفوظ ہونا۔ ۴۳۶
کبھی نافرمانی نہیں کی۔ ۴۵۸

بت پرستی سے محفوظ ہونا۔ ۱۴۹۱، ۴۶۸
خواہش نفس کی پیروی نہ کرتے تھے ۴۶۶
کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ۶۲۱، ۱۴۹۲
شہوات پر حکومت۔ ۶۷۹
آپ کی ہوی۔ ۷۲۷، ۱۱۱۱، ۱۳۱۳
آپ کی نیکی کا اعتراف ۹۴۸
وساوس شیطانی سے محفوظ ہونا ۹۵۱
آپ کی ہدایت ۱۲۷۳
حرص و ہوا سے خالی ہونا۔ ۱۳۱۱
علمی اور اعتقادی پہلوؤں سے کامل عصمت ۱۳۱۱، ۱۳۱۲
بت پرستی سے نفرت۔ ۱۴۷۴
کبھی گمراہ نہ ہوئے۔ ۴۷۳، ۱۴۷۴
کبھی غیر اللہ کی عبادت نہیں کی ۱۴۹۱
غفر ذنوب اور تطہیر عیسیٰ ۱۲۷۳، ۲۲
استغفار۔ ۲۵۸، ۱۲۰۲
غفر ذنب۔ ۱۲۷۳
پچھلے ذنوب ۱۲۷۳
ہر فعل رضائے الٰہی کے لیے تھا۔ ۱۳۸۸
آنحضرتؐ کے اخلاق کا کمال۔ ۲۸۴
۱۳۱۳، ۱۳۹۶
تعلیم قرآن کا عملی نمونہ ہیں ۴۶۶، ۱۳۹۶
آپ کی بعثت سے تکمیل اخلاق ۱۳۹۷
وسعت قلب۔ ۴، ۲۳۰، ۹۶۴
بیٹی کی عزت کرنا۔ ۲۰۸
شجاعت۔ ۲۷۸، ۳۶۹، ۵۰۲
کسی کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا۔ ۲۸۰
لینت۔ ۲۸۴
رحمت۔ ۲۸۴
یتیموں اور بیواؤں کی حمایت۔ ۳۱۵
بیبیوں سے حسن معاشرت ۳۲۶
۳۴۲، ۱۳۸۸
کی امانت و دیانت۔ ۳۷۹، ۶۲۱
صداقت۔ ۴۶۲، ۶۲۱
بنظیر یقین۔ ۴۹۰
حیا۔ ۵۹۰، ۵۹۵
عفو ۱۲۲۶، ۵۹۰، ۶۹۸
حسن ظن ۵۹۵
سختی۔ ۵۹۸
ہمدردی انسانی۔ ۱۲۷، ۶۱۶، ۶۵۷، ۸۱۴

محنت۔ ۶۴۹
استقلال۔ ۸۰۰
غیر مسلموں کے لیے رحمت۔ ۹۱۶
مخالفین کی غمخواری۔ ۹۹۷
شفقت۔ ۱۰۹۰
قوائے شہوانی پر حکمرانی۔ ۱۱۰۸
عزم۔ ۱۱۶۶
قویٰ کا اعتدال اور کمال پر ہونا۔ ۱۳۱۲
ہر فعل رضائے الٰہی کے لیے تھا۔ ۱۳۸۸
مداہنہ سے پاک ہونا۔ ۱۳۹۷
آنحضرتؐ کی فضیلت۔ رسل پر۔ ۱۵۲
جامع کمالات انبیاء ہیں۔ ۱۵۲، ۳۹۷، ۴۷۷
اور حضرت موسیٰ۔ ۱۵۳
اور حضرت یونس۔ ۴۴۱
وارث برکات اسرائیل کیا جانا ۶۹، ۷۷۲
آپ کے نور کا کمال۔ ۸۷۱
آپ کا نور دائمی اور محیط عالم ہے ۹۷۰
جامع شرق و غرب ہونا۔ ۹۷۰
سب مخلوق پر فضیلت ۱۰۴۷
تکمیل علمی و عملی۔ ۱۳۱۵
علم کا کمال۔ ۱۳۱۵
جامع اخلاق انبیاء و صلحا۔ ۱۳۹۶
انسان کامل ہیں۔ ۱۴۶۹
آنحضرتؐ کی قوت قدسی۔ ۱۲۸، ۱۴۰
۱۲۰، ۳۱۵، ۵۳۹، ۶۰۵، ۷۵۸، ۹۶۱
آنحضرتؐ کے معجزات۔ قرآن کو نہ بھولنا۔
۶۶، ۱۴۶۱
لکڑی کا کلام کرنا۔ ۲۱۲
حفظ قرآن۔ ۴۵۵
مٹھی پھینکنے کا اثر۔ ۵۵۸
قحط کا دور ہونا۔ ۶۸۶
مردوں کو زندہ کرنا۔ ۴۸۶، ۵۵۹، ۹۹۰، ۱۱۳۲
مُردوں کو سنانا۔ ۱۰۳۰
ہوا سے نصرت۔ ۱۰۹۱
احزاب کی شکست۔ ۱۰۹۴
دعائے بارش ۱۲۴۵
شق القمر۔ ۱۳۲۱
آنحضرتؐ کے لیے پیشگوئیاں بائبل میں
۳۵، ۱۸۵، ۱۸۸، ۵۳۹
انجیل میں ۱۳۷، ۱۸۲، ۵۳۹، ۱۳۷۰

پہلے صحیفوں میں ۱۰۱۰
ذکر خضر میں ۸۴۱
ان کی شہرت عام تھی ۵۳
یہود سے عہد ۶۲
خدا کی آمد ۱۵۲، ۱۸۵
اہل کتاب پر روشن ہونا ۸۷
آنحضرتؐ کی صداقت کے نشانات ۱۲۱
۶۱۵، ۱۱۳۵، ۱۳۹۶
صداقت کا ناقابل تردید ثبوت۔ ۲۳۵
اقربا کا ایمان۔ ۱۰۱۱
محمود۔ ۱۴۸۷
محنت ۱۷۱، ۶۴۹
محنت کی اجرت۔ ۱۰۳۸
مداہنہ ۱۳۹۷
مدح۔ ۳۵۱
مذہب۔ کے پانچ اصول۔ ۷
〃 میں عقل۔ ۳۶، ۹۸، ۵۵۹
〃 کے دو ستون۔ ۶۸
〃 علم ہے۔ ۷۳
〃 میں جبر نہیں ہونا چاہیئے۔ ۱۵۶
〃 اصول اور فروع۔ ۱۸۶
اختلاف مذاہب تا قیامت رہیگا۔ ۲۲۸
اصول مقابلہ مذاہب۔ ۲۳۱
مذاہب کا اصل الاصول۔ ۳۸۴، ۱۲۲۰
کی اسلام نے کس طرح تکمیل کی۔ ۴۰۷
اختلافات مذہبی کا فیصلہ ۴۲۸، ۴۸۵
اختلافات مذہبی میں حکمت۔ ۴۲۹
کی صداقت پر ایک دلیل۔ ۱۰۴۴
قومی اتحاد کی غرض۔ ۱۰۵۶
کا سب سے بڑا رکن۔ ۱۴۸۹
مذہبی آزادی۔ کا قیام۔ ۵۶۴
مرارہ۔ ۶۱۲
مرتد۔ دیکھو ارتداد
مردہ۔ مردے اس دنیا میں واپس نہیں آتے ۲۱۹، ۹۱۳، ۱۱۴۰، ۱۱۸۷
مردوں سے کلام۔ ۴۸۴
مردوں کا زندہ ہونا۔ ۵۱۷
سے زندہ کا نکالنا۔ ۱۰۶۸
سماع موتی۔ ۱۰۷۴
میت کو ثواب ۱۳۱۸
مروہ۔ ۹۲

مریم ۵۷
〃 خاندان کہانت سے تھی ۱۹۹
〃 اخت ہارون اور بنت عمران ۱۹۹
۸۵۷، ۱۲۳۷
〃 کی تزویج اور صاحب اولاد ہونا ۲۰۰
۲۰۹، ۲۱۵
〃 مریم صفت مومن ۲۰۱
〃 کے متعلق مفسرین کے خیالات ۲۰۲
〃 کو رزق من عند اللہ ملنا ۲۰۳
〃 کی نبوت۔ ۲۰۷
〃 اناجیل میں۔ ۲۰۸
〃 کی فضیلت ۲۰۷
〃 کی عصمت۔ ۲۰۹، ۸۵۳
〃 کی کفالت ۲۰۹
〃 کا اصطفائے روحانی۔ ۲۰۹
〃 کی بریت۔ ۲۰۹
〃 کا حاملہ ہونا۔ ۲۱۳، ۸۵۴
〃 پر یہود کا بہتان ۳۹۲
〃 کی خدائی کا عقیدہ ۳۹۹، ۴۵۲
〃 پر بہتان۔ ۳۹۹
〃 کا روزۂ خاموشی ۸۵۶
〃 کا درد زہ ۸۵۵
〃 کا سفر بیت لحم ۸۵۵
〃 کو حیض آنا۔ ۸۵۳
〃 کی منگنی۔ ۸۵۴
〃 کا کشف۔ ۸۵۳
〃 کا حجاب۔ ۸۵۳
〃 کا بلوغ اور انتقال مکانی ۸۵۳
〃 کا شرقی مکان میں جانا۔ ۸۵۳
〃 کو صدیقہ کہنے کی ضرورت۔ ۸۵۹
〃 میں نفخ روح سے مراد۔ ۹۱۲
مرزا غلام احمد قادیانی۔ کی طرف دعوے نبوت کی نسبت۔ ۱۸۵
〃 اور دعوت الی الاسلام۔ ۲۵۱
اور ارتداد۔ ۴۳۲
اور مصائب اسلام۔ ۵۳۱
اور غلبہ اسلام۔ ۵۶۸
اور دین کو دنیا پر مقدم کرنے کا عہد ۵۸۲

اور مخالفت علما۔ ۵۸۶
اور الہام و شریعت۔ ۸۳۶
مزدلفہ۔ ۱۱۶
مسلمان۔ مسلم کون ہے۔ ۵۶
" کا عہد۔ ۳۴، ۶۰۹
" اور انتظار مہدی۔ ۴۵
" اور علم۔ ۵۳
" ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہ کریں۔ ۵۶، ۴۱۹
" کو بشارات فتوحات۔ ۷۰
" اور قرآن ۷۳
" امت مسلمہ کا کام۔ ۸۵
" کا مقام۔ ۸۰
کامیابی کی راہ۔ ۹۰، ۲۴۹، ۲۷۱، ۵۳۳، ۵۵۹
اسلام میں کامل طور پر داخل ہونے کی ضرورت ۱۲۰
اندرونی اختلافات کا حل۔ ۱۸۶
قرآن پر اتحاد۔ ۲۴۹
اور اتحاد قومی۔ ۲۴۹
اور کافر کی اطاعت ۲۴۸
مقابلہ دشمن میں کیسا ہو۔ ۲۷۴
کا کافر پر رعب۔ ۲۷۶
موت سے خائف نہ ہو۔ ۲۸۳
مسلمانوں کی اصلاح۔ ۲۹۷
پر ہندؤں کا اثر۔ ۳۵۱، ۵۲۳
کا مسلمان کو غلطی سے مار دینا۔ ۳۷۲
کو حالت سکون پر راضی نہ ہونا چاہیئے۔ ۳۷۵
بھائی کی مدد۔ ۴۱۳
میں شدت۔ ۴۳۲
اور سیاسی مغلوبیت۔ ۴۳۴
کی دوسری قوموں سے مخالفت ۴۷۱
حالت موت میں۔ ۴۷۹
کا نصب العین۔ ۴۹۹
مسلمانوں کی حکومت اور کمال روحانی ۵۰۰
مسلمانوں میں افراط و تفریط۔ ۵۱۰، ۱۲۸۵
اور ارتداد۔ ۵۲۴
موجودہ مشکلات اور ان کا علاج ۵۳۳
مشکلات اور مجدد۔ ۵۳۱
وہ چند دشمنوں پر غالب آنا۔ ۵۷۰
باہمی محبت کی ضرورت۔ ۵۶۹
ملکی اور مذہبی مقابلہ ۵۶۹
ایک دوسرے کی دینی امداد۔ ۵۷۳
قربانیوں کی ضرورت۔ ۵۸۰
زندگی کا اصل الاصول۔ ۵۸۲
اور غیر مسلم طاقتیں۔ ۵۸۳
دشمن کے مقابلہ پر ایک ہوں۔ ۵۸۷
اور انفاق مال۔ ۶۰۳، ۹۹۴
کے لیے بد دعا۔ ۶۲۰
مسلمانوں میں شرک۔ ۷۰۱
ایثار کی کمی۔ ۷۱۹
بیماریوں کی جڑ۔ ۹۷۶
مسلمانوں کے لیے استغفار۔ ۱۲۶۷
ایک دوسرے کی تائید اور ایک دوسرے پر رحم کریں۔ ۱۲۸۲
دو مسلمان گروہوں کی نزاع میں مسلمانوں کا طریق عمل۔ ۱۲۸۷
آخری زمانہ کے مصائب۔ ۱۳۴۹
آئندہ حالت کا نقشہ ۱۳۴۸
کے چار فرائض۔ ۱۴۸۶
مسافر کی امداد۔ ۵۹۴
مساوات۔ ۱۱۵، ۱۲۸۴
مسجد سے روکنا۔ ۶۹
" کا غیر کی عبادت کیلئے استعمال۔ ۲۳۰
" میں جوتی سے جانا۔ ۸۷۳
مسجد اقصیٰ ۷۷۷
مسجد حرام۔ دیکھو کعبہ
میں جنگ کی ممانعت ۱۱۲
مسجد ضرار۔ ۶۰۸
مسجد قبا۔ ۶۰۸
مسح۔ موزوں پر۔ ۴۱۰
مسلح۔ ۹۵۹، ۹۶۱
مسکین۔ کھانے کا اندازہ۔ ۳۴۴
" کی خبر گیری۔ ۱۳۹۹، ۱۴۶۸
مسیح۔ وجہ تسمیہ۔ ۲۱۰
بائیں آنکھ نہ ہونے سے مراد۔ ۲۱۱
دیکھو عیسیٰ۔
مسیح موعود۔ اور قتل خنزیر۔ ۴۳۴
" اور غلبہ اسلام۔ ۵۸۶
" دیکھو میرزا غلام احمد
مسیلمہ۔ ۵۸۰
مشرق۔ اور روحانیت۔ ۱۱۴۹
دو مشرق اور دو مغرب۔ ۱۳۲۹
مشرکین۔ کے لیے ممانعت استغفار ۶۱۱
دیکھو شرک۔
مشقت۔ ۱۷۷، ۱۴۶۷
مشورہ۔ ۲۵۸، ۳۸۰، ۱۲۲۵
مصر۔ اہل مصر کی قرابت۔ ۳۰۷
مصعب بن عمیر۔ ۲۷۱، ۲۷۸، ۱۲۷۵
مصیبت۔ میں رجوع الی اللہ۔ ۳۷
" میں حکمت۔ ۹۱، ۴۴۵، ۶۹۷
قیام حق کے لیے برداشت مصائب ضروری ہے۔ ۱۲۳
" کی غرض ۲۷۰، ۲۸۸، ۲۹۲
" کا اللہ کی طرف سے ہونا۔ ۳۶۶
" مانگنے کی ممانعت۔ ۶۲۰، ۷۸۲
" میں صبر۔ ۶۷۷
" چھپانے کا حکم۔ ۶۹۶
" میں خوشخبری۔ ۷۸۲
" میں دوزخ کا رنگ ۸۶۶
دوسرے کی مصیبت پر خوش نہ ہو۔ ۹۴۲
" کا علاج۔ ۹۷۷
مضارع۔ کا استعمال گذشتہ پر۔ ۴۱۵
معاشرت۔ ۱۳۴
معاویہ۔ ۳۷۲
معبود باطل۔ ۷۱۵
" تین قسم۔ ۶۲۵
" کا عجز۔ ۶۲۷، ۹۳۶
" کا دوزخ میں جانا۔ ۹۱۴
" سے مراد سردار۔ ۱۱۵۱، ۱۲۵۵
معجزات۔ ۴۸۴
" تائیدی امور ہیں۔ ۴۸۴
" اور عقل۔ ۴۸۴
" کا قرآن انکار نہیں کرتا۔ ۷۹۵
" اقتراحی۔ ۲۱۷
معراج۔ احادیث معراج۔ ۷۷۷
" کے جسد عنصری سے نہ ہونے کے دلائل۔ ۷۷۸، ۸۰۶، ۱۳۱۴
" کی غرض۔ ۷۷۹
" کب ہوا۔ ۷۷۹
معراج کے رویا۔ ۷۹۶
" کی رات ۹۷۹
" میں کیا دیکھا ۱۳۱۵
معقل بن یسار ۱۳۹
مغرب کی اسلام سے محرومی ۱۱۴۹
مغیرہ بن شعبہ ۵۰۶، ۱۰۳۷
مفتری فلاح نہیں پاتا ۶۲۲
" پر گرفت۔ ۱۴۰۴
مقام ابراہیم۔ ۲۴۷
مقداد ۴۱۷
مقطعات ۶۱۷۸
مقوقس۔ ۳۳۲
مکہ۔ ۳۵، ۱۲، ۱۴۶۶
" کے لیے دعائے ابراہیم ۷۷
" کے نام۔ ۲۴۶
" ام القریٰ ہے۔ ۴۷۸
" کے لیے فقر سے بے خوفی کی بشارت
مکہ میں قحط ۱۲۴۵، ۹۴۷، ۶۸۶
اہل مکہ پر عذاب۔ ۷۷۲
" میں نہر ۸۰۵
مکانات کے بیع اور کرایہ ۹۲۴
" کی حرمت من جانب اللہ ہے ۱۰۳۲
" میں ہر قسم کے پھلوں کا پہنچنا۔ ۱۰۴۵
" میں امن۔ ۱۰۶۴
" کا محبوب ترین شہر ہونا۔ ۱۲۶۶
ملاء اعلیٰ۔ ۱۱۷۸
ملاقات۔ کے آداب۔ ۹۶۳
ملک یمین۔ ۳۱۱، ۳۳۰
منات۔ ۱۳۱۵
منافقین۔ زمانہ حال کے۔ ۱۴
" کا دعویٰ اصلاح۔ ۱۵
" کا جنگ احد سے واپس ہو جانا۔ ۲۵۹
" کا طریق عمل۔ ۲۷۳، ۲۷۵
" کی جنگ احد میں چہ میگوئیاں۔ ۲۸۰
" کے ایمان و کفر کا سوال۔ ۲۸۳، ۱۳۷۶
" کا رسول اللہ کے فیصلہ پر راضی نہ ہونا۔ ۳۵۶
" کے مختلف گروہ۔ ۳۷۱
" اندرونی دشمن ہیں۔ ۳۸۰
" کی آخری حالت۔ ۳۸۸

منافقین کی دورخی چال۔ ۳۸۹
" کی نماز میں سستی۔ ۳۹۰، ۵۹۲
" کا درک اسفل میں ہونا۔ ۳۹۰
" کا جنگ تبوک سے پیچھے رہ جانا۔ ۵۸۸
" پر مال و اولاد کا عذاب۔ ۵۹۲
" اور انفاق مال۔ ۵۹۲، ۶۰۴
" کے تبوک میں نہ جانے کے عذر۔ ۵۹۰
" کی آنحضرتؐ کے خلاف سازشیں ۵۹۱
" پر سختی سے مراد۔ ۵۹۸
" سے جہاد۔ ۵۹۸
" کی آخری علیحدگی۔ ۵۹۶
" سے زکوٰۃ کا نہ لیا جانا۔ ۵۹۹
" پر آنحضرتؐ کا احسان۔ ۵۹۸
" کے لیے آنحضرتؐ کا استغفار۔ ۶۰۰
" سے قطع تعلق۔ ۶۰۱
" کو جنگ میں شامل کرنے کی ممانعت۔ ۶۰۱، ۶۰۰
" کی توبہ۔ ۶۰۶
" کی سزا۔ ۶۰۶
" پر دو دفعہ عذاب۔ ۶۰۶
" سے زکوٰۃ۔ ۶۰۷
" سے اجتناب ۶۰۷
جنگ کے لیے نہ نکلنا سب سے بڑی علامت تھی۔ ۶۰۹
" اور افک عائشہ۔ ۹۵۹
" کا آنحضرتؐ کے متعلق غلط روایات کو شہرت دینا۔ ۱۱۱۰، ۱۱۱۲
" کا مشرکوں کی اطاعت کا اقرار ۱۳۴۹
" اور نزول احکام جنگ۔ ۱۲۶۸
" کا وجود کیوں پہلے سے نہ بتایا گیا۔ ۱۲۷۰
" کے نور کا صراط پر جاتے رہنا۔ ۱۳۴۷
" کا جھوٹا اقرار حکم شہادت۔ ۱۳۷۶
" کی ظاہرداری۔ ۱۳۷۶
منحوس دن۔ ۱۲۱۱
منکر۔ ۷۶۶
موالات کفار۔ ۱۹۵، ۲۵۷، ۳۹۰، ۴۳۰، ۴۳۳، ۱۳۵۷، ۱۳۶۴
مسلمانوں کی مسلمانوں سے موالات ۵۷۳

موت۔ کی آرزو۔ ۶۰
" سے خوف۔ ۲۸۳، ۱۳۷۴
موت قتل۔ ۲۸۳
" اور ادائیگی فرض۔ ۲۸۹
" میں کیا لیا جاتا ہے۔ ۱۱۸۷
دو موتیں اور دو زندگیاں۔ ۱۱۹۵
موت اولیٰ ۱۲۴۸
" نعمت کے رنگ میں۔ ۱۳۹۲
" و حیات کامل تصرف الٰہی میں۔ ۱۳۹۲
" کی مثال نیند سے۔ ۱۴۳۷
موسیٰ۔ ۴۷۵، ۴۷۶، ۵۲۷، ۸۶۲
" کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا سوال۔ ۴۱، ۵۳۴
" پر نزول شریعت۔ ۴۰
" انبیائے بنی اسرائیل اور شریعت موسوی۔ ۲۵۸
" سے کلام۔ ۳۹۷
" کی بعثت کی اصل غرض۔ ۵۲۷
" اور ساحر۔ ۵۲۸
" کے نو نشان۔ ۵۳۲
" اور میقات طور۔ ۵۳۷
" کے اصحاب سے طور پر معاملہ ۵۳۸
" اور الواح توریت۔ ۵۳۷
" کی دعا۔ ۶۳۸
" پر پہلے ایمان لانے والے۔ ۶۳۷
" کا فرعون پر غالب آنا۔ ۶۳۸
" کے اصحاب۔ ۶۶۶
" کی آنحضرتؐ کے لیے پیشگوئی۔ ۸۱۰
" مصر میں۔ ۸۳۳
" اور خضر۔ ۸۳۳، ۸۳۶
" کی کوشتی بی بی۔ ۸۳۴
" کا سفر خرطوم۔ ۸۳۴
" اور مچھلی۔ ۸۳۴، ۸۳۵
" کی وحی اور انبیاء کی طرح تھی۔ ۸۶۳
" کو جوتی اتارنے کا حکم۔ ۸۶۳
" کا آگ کو دیکھنا کشف تھا۔ ۸۶۲، ۱۰۱۵
" پر وحی کی ابتدا ۸۶۲
" اور ہارون کی اعانت کی درخواست ۸۶۵
" کا شرح صدر اور عقدہ لسان۔ ۸۶۵
" کا فرعون سے مقابلہ دلائل ۸۷۹
" کی تقریر ساحروں کے سامنے ۸۸۰

ساحروں کی شعبدہ بازی ۸۸۱
موسیٰ کا عبور دریا ۸۸۳، ۱۲۴۶
زیورات اور بچھڑے کا تعلق ۸۸۵
" اور جبرئیل کی گھوڑی کا قصہ ۸۸۶
" اور بچھڑے کی خاکستر ۸۸۷
" کا قبطی کو قتل کرنا ۹۹۸، ۱۰۳۶
" کی ہجرت ۱۱۰۰
" مدین میں ۱۰۳۸
" کا نکاح۔ ۱۰۳۹
" اور فرعون کا محل بنوانا۔ ۱۰۴۱
" پر الزامات۔ ۱۱۱۳
" اور ہارون کی ایک کتاب۔ ۱۱۵۹
" اور فرعون کا قصہ حق و باطل کی تمثیل ہے ۱۱۹۸
" کو قوم کا ایذا دینا۔ ۱۳۶۹
موسیٰ کے معجزات۔ ۴۴، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۸۶۴، ۱۲۳۷
مولفۃ القلوب ۵۹۳
مومن۔ کی صفات۔ ۹۱۰، ۹۳۸، ۱۴۰۶
" کا رفع۔ ۵۱۲
عاصی مومن کا خلود اور عذاب ۶۶۷
" کی دنیوی زندگی۔ ۶۲۵
کامل مومن دوزخ میں داخل نہ ہونگے ۸۹۹
مومنوں کا غلبہ۔ ۱۱۶۴
" کی نصرت۔ ۱۲۰۲
" پر فرشتوں کا نزول۔ ۱۲۱۳
" اور مسلم میں فرق۔ ۱۲۹۰
" کو نور ملنا۔ ۱۳۴۶
" کا ادنیٰ مرتبہ۔ ۱۳۹۱
" کی مریم سے مشابہت۔ ۱۳۹۱، ۱۴۳۳
" مومنوں کا کفار پر پہنچنا۔ ۱۴۵۴
مہدی۔ ۵۲۴
" کے ظہور کی علامات۔ ۱۴۲۶
مہر۔ ۱۳۶، ۳۱۲
" کی مقدار ۳۲۷
" میں تقرر کے بعد کمی بیشی۔ ۳۳۲
" کب واپس لیا جا سکتا ہے۔ ۳۰۸
مہر۔ دلوں پر مہر سے مراد۔ ۱۳، ۴۶۶
۵۲۶، ۵۹۹، ۷۷۱
" کی نسبت اللہ کی طرف۔ ۱۴

مہمان نوازی ۶۵۸
میزان ۱۳۵۰، ۵۰۲، ۵۰۳، ۱۳۲۸
میکائیل ۶۱، ۶۲
میور۔ حفاظت قرآن پر۔ ۷۳۲

ن

ناشکری۔ ۷۵۱
ناصرہ۔ ۸۵۳
نام دھرنا۔ ۱۲۸۸
نبوت و رسالت موہبت ہے اکتساب سے نہیں۔ ۵، ۳۶۱، ۴۸۷
" دعا سے نہیں ملتی۔ ۵
" کی ضرورت۔ ۲۷
" اصطلاح شریعت و لغت میں ۴۲، ۲۰۷، ۳۶۱
" ایک قوم سے مخصوص نہیں۔ ۲۳۶
" بنی اسرائیل سے بنی اسمٰعیل کی طرف انتقال ۴۰۱
" بطور مجاز۔ ۴۱۶
ستر اصحاب موسیٰ کی نبوت۔ ۴۱۶
" کی ضروری شرائط ۴۷۶
" کی غرض ۴۹۰
" اور مکالمہ میں فرق ۵۳۵
" کا انقطاع ۶۳۳
" کے انقطاع سے مقامات عالیہ کا انقطاع نہیں ہوا ۶۳۳
قومی نبوتوں کی ضرورت ۸۳۹
مقامی نبوتیں ۸۳۹
نبوت عامہ ۳۶۲
نبوت خاصہ یا تشریعی۔ ۳۶۲
نبی و رسول۔ صاحب کتاب ہے۔ ۴۶
ہدایت لاتا ہے ۵۷
" کے ساتھ کتاب کا نزول ضروری ہے ۱۲۳
" کو کتاب و حکم ملتا ہے۔ ۲۳۹
" صاحب شریعت ہوتا ہے۔ ۴۲۹
" کے ساتھ پیغام ضروری ہے۔ ۵۱۱
" کی قوت قدسی۔ ۲۲۱
" مطاع ہوتا ہے۔ ۳۵۷
" میں مخزاری مخلوق۔ ۵۲۵
" کی بے نفسی۔ ۶۵۰

اس فہرست میں حوالجات صفحات کے ہیں۔

نبی کی دعوت میں دنیوی لالچ نہیں ہوتا۔ ۶۵۰
" کی فطرت میں مخلوق کی خدمت ہے ۶۵۷
" میں رحمت کا جوش۔ ۷۲۱
" شاہد ہے۔ ۶۴۷، ۷۶۷
" شیطان سے محفوظ ہوتا ہے۔ ۸۵۲
" کے لیے سلامتی۔ ۸۵۲
" پر محبت کا ڈالا جانا۔ ۸۷۷
" کا اغراض نفسانی سے پاک ہونا۔ ۸۷۷
اللہ سے تعلق کا نشان ۸۹۷
" کی عبادت میں نشاط ۸۹۸
" کی وحی میں شیطان القا نہیں کرتا۔ ۹۳۲
" کمزوروں کی حمایت کرتا ہے۔ ۱۰۳۸
" اجر نہیں مانگتا۔ ۱۱۲۴
" کا علم محدود ہے۔ ۱۲۵۶
" کا غلبہ۔ ۱۳۵۷
" کا نزول۔ ۱۳۸۶
" کا قتل ۴۶، ۱۹۳
" کے چار کام۔ ۷۹
" کی وصیت۔ ۸۰
" کی اطاعت کی ضرورت۔ ۲۲۲
۹۷۴، ۱۲۸۷
" کی محبت۔ ۳۶۱
" کا استعمال خواب بین پر ۴۱۶
" کو ساحر کہنے کی وجہ۔ ۴۱۸، ۴۵۰، ۵۲۸
" کی فضیلت کا ذکر الزام دور کرنے کے لیے ۴۷۶
" صرف مرسل الیہم کی نوع سے ہو سکتا ہے۔ ۴۹۰
" کا مذہب قبل از بعثت۔ ۵۲۴
" مجنون نہیں۔ ۵۴۶
" کی بعثت سے پیشتر کے لوگ۔ ۶۱۰
" کا اسوہ۔ ۶۴۷
" کے پیروؤں کی غربت۔ ۶۴۹
" کا بشر ہونا۔ ۶۴۹
" کی مشکلات۔ ۷۰۲
" کا اخراج اور اس کی کامیابی۔ ۷۲۱
" کا پیغام قوم کی زبان میں ۷۱۹
" پر مصائب کا آنا۔ ۷۳۵، ۸۷۷، ۱۱۷۰
" نبی کی وراثت ۸۵۰، ۱۳۲۰
" کا کھانا کھانا اور بازاروں میں پھرنا ۹۸۵

نبی اور کاہن۔ ۱۰۱۱
" اور شاعر۔ ۱۰۱۲
" کو قبل از بعثت علم نہیں دیا جاتا۔ ۱۰۵۱
" اور شعر ۱۱۴۵
" کی نصرت۔ ۱۱۶۴، ۱۲۰۲
" اور مال دنیا۔ ۱۱۷۲
" کی عمر بوقت بعثت۔ ۱۲۵۸
" کا استغفار۔ ۱۲۶۷
" کے ذنوب۔ ۱۲۶۸
" کا نمونہ میزان ہے۔ ۱۳۵۰
" پر کامل انکشاف غیب نہیں ہوتا ۱۴۱۵
" پر پہرہ سے مراد۔ ۱۴۱۶
" دو قیامتیں لاتا ہے۔ ۱۴۲۵
انبیاء و رسل۔ سب ایک گروہ ہیں ۸۱
۹۱۲
" کی بعثت کا قانون۔ ۱۲۲، ۵۱۰
ایک دوسرے پر فضیلت۔ ۱۵۲
سب سے کلام ہوا۔ ۱۵۳
" پر ایمان ۱۷۷
" کی وفات پر دلیل ۲۷۲
انبیا و رسل کے ذکر میں ترتیب۔ ۸۶۳
۱۱۵۹، ۱۱۶۷، ۳۹۷، ۴۷۶، ۷۴۳
" ہر قوم میں آئے ۱۱۳۰، ۳۹۷، ۶۲۹
" کی تعلیم کا وقتی ہونا۔ ۴۵۱، ۱۳۵۱
" سب ایک ایک قوم کی طرف آئے ۶۳۵
سلسلہ نبوت کا نظم۔ ۷۲۶
" کا نزول ضرورت پر۔ ۸۶۵
" کا عہد۔ ۱۰۹۰
" جو قرآن میں مذکور نہیں۔ ۱۲۰۶
اولو العزم رسول۔ ۱۲۶۲
قومی نبیوں کا خاتمہ عیسیٰ پر۔ ۱۳۵۱
انبیا کی تعلیم کا ایک ہونا۔ ۱۳۶۲
غیر نبی۔ کو وحی۔ ۲۰۷، ۴۵۰، ۶۷۶
مقربین۔ ۶۳۳
" پر نبیوں کا رشک۔ ۶۳۳
" کو فہم معاملہ میں نبی پر فضیلت۔ ۹۰۹
نبی کے کامل متبعین کو غیب پر اطلاع ملنا۔ ۱۴۱۵
نپولین۔ عبور قلزم کا واقعہ۔ ۱۰۰۲
نجات۔ ۳۸
عارضی نجات۔ ۱۲۰۸

نجات اور غیر اسلامی مذاہب ۴۷
" عمل سے ہے نہ لفظوں سے ۶۸
" کے لئے ایمان صحیح کی ضرورت ۶۱۹
(دنیا کا) نجات دہندہ ۹ ۱۴۷۹
نجاشی ۴۴۱
نجران۔ وفد نجران۔ ۲۳۹، ۱۸۰، ۲۳۰
نجم ۱۳۱۱
نذر ۱۶۶
نساب ۷۲۰
نسب ۱۳۰۷، ۱۱۷
نسخ۔ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں
۶۵، ۶۶، ۶۷، ۳۶۸، ۷۶۹
" کی روایات۔ ۶۶
" پر صحابہ کا اختلاف۔ ۱۴۴
" کا استعمال صحابہ میں۔ ۱۶۶
مزعومہ منسوخ آیات ۱۰۳، ۱۰۶
۱۴۳، ۱۵۶، ۱۷۶، ۵۷۱، ۹۵۶
۹۵۷، ۱۱۰۹، ۱۲۵۱، ۱۳۵۶
نسر ۱۴۱۱
نسیان ۱۷۸
نشوز ۳۴۱، ۳۸۵
نصرت الٰہی ۱۲۳، ۷۰۲، ۱۴۹۲
نضر بن الحرث ۴۷۸، ۱۰۷۶
نظر کا لگنا۔ ۶۹۱
نعیم بن مسعود اشجعی ۲۹۱
نفاق۔ ۱۴، ۲۸۸، ۵۹۸، ۱۰۵۳
نفخ فی الصور ۴۷۳
نفس۔ ۳۰۵
" کی اصلاح۔ ۳۶۴
اپنے نفس کی فکر۔ ۴۴۷
" پر ظلم۔ ۱۰۳۶
" اور وسوسہ کا تعلق ۱۲۹۴
تزکیہ کے لیے ضرورت سعی۔ ۱۳۱۷
" کی تکمیل دوسروں کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ ۱۴۲۰
" کی ترقی تزکیہ سے ہے۔ ۱۴۷۰
نفس ناطقہ۔ ۱۱۸۷
نفس امارہ۔ ۶۸۸
نفس لوامہ۔ ۶۸۸، ۱۴۲۵
نفس مطمئنہ ۶۸۸، ۱۴۶۶
نکاح۔ کی غرض۔ ۱۰۸، ۳۳۱

نکاح۔ غیر مسلم سے ۱۳۰، ۴۰۹
عارضی نکاح جائز نہیں ۱۳۸
" بغیر تقرر مہر ۱۴۱
" میں پسندیدگی ۳۰۹
" چھوٹی عمر میں ۳۰۹
اصل الاصول ایک بیبی ہے ۳۱۱، ۳۱۲
" بلوغت میں ہونا چاہیئے۔ ۳۱۴
" میں حرمت کی وجہ ۳۲۹
" اور مسافحت ۳۳۱
" بلا خاوند عورتوں کے ۳۸۵
زانیہ یا کسبی سے نکاح ۹۵۷
" مجردوں کے ۹۶۷
" میں لڑکی کا معاوضہ ۱۰۳۹
" میں قومی تفرقات کا مٹانا ۱۱۰۰
کفار کی مہاجر عورتوں سے نکاح کی شرائط ۱۳۶۷
نماز۔ بغیر فاتحہ نہیں ہوتی۔ ۵۵۱
" باجماعت کی ابتدا۔ ۲
" کی اقامت کا مفہوم ۱۰
آنحضرت کونسی نماز پڑھتے تھے ۱۰، ۱۴۳۱
" اور حصول قرب الٰہی ۱۰
نماز اور زکوٰۃ کا اکٹھا ذکر ۱۱، ۱۰۱
" کی غرض ۳۶
" علاج مشکلات ہے ۶۸، ۶۷۰، ۷۲۵، ۸۰۱
" بدی سے روکتی ہے۔ ۱۴۲
نماز عصر ۱۴۲
نمازوں کی تعداد اوقات۔ ۱۴۲
۸۰۲، ۸۹۳، ۱۰۹۸
" حالت خوف میں۔ ۱۴۲
" سفر میں۔ ۳۷۶
" کی تعلیم وحی خفی سے ۱۴۳
" ذکر اللہ ہے۔ ۱۴۳
نماز فجر میں قنوت۔ ۲۶۳
" میں حضور قلب۔ ۳۴۷، ۵۵۱
" حالت سکر اور جنابت میں۔ ۳۴۶
" نرمی کے اخلاق پیدا کرتی ہے۔ ۳۶۵
قصر صلوٰۃ۔ ۳۷۶
" قصر سفر اور قصر خوف ۳۷۶
" میدان جنگ میں۔ ۳۷۷

اس فہرست میں حوالجات صفحات کے ہیں۔

نماز میں کسل۔ ۳۹۰، ۵۹۲
〃 میں زینت کا حکم۔ ۵۰۹
〃 کی فرضیت۔ ۷۷۷
نماز فجر۔ ۸۰۱
جمع بین الصلوتین۔ ۸۰۲
〃 تہجد۔ ۸۰۷
قرات بالجہر اور آہستہ۔ ۸۱۰
〃 سے حصول کامیابی۔ ۸۹۳
〃 رزق روحانی ہے۔ ۸۹۴
〃 اخلاق فاضلہ کی جڑ ہے۔ ۹۳۸
〃 میں خشوع۔ ۹۳۸
〃 کی حفاظت۔ ۹۳۹
〃 کے بدی سے روکنے پر دلیل۔ ۱۰۵۹
بدی سے روکنے پر واقعات کی شہادت ۱۰۵۹
〃 کے بعد نوافل۔ ۱۲۹۸
احتیاطی نماز۔ ۱۳۷۵
〃 سے علو۔ ۱۰۶۰
〃 کی حقیقت۔ ۱۴۶۱، ۱۴۸۹
نوح۔ ۱۹۸، ۵۱۸
〃 کا طوفان ۵۱۹، ۶۶۴، ۶۵۲، ۱۳۲۳
〃 کی کشتی ۶۵۱، ۱۰۵۴
〃 کا بیٹا ۶۵۴، ۱۳۹۱
〃 کا ذکر انباء الغیب ہے۔ ۶۵۵
〃 کی عمر ۱۰۵۴
〃 کی بی بی۔ ۱۳۹۱
نوفل بن معاویہ۔ ۳۱۱
نہی عن المنکر ۲۵۱
نیکی۔ کی خاطر نیکی۔ ۱۲، ۴۶۶، ۱۴۷۱
〃 پر ندامت نہیں ہوتی۔ ۹۶
〃 و بدی کے نتائج۔ ۱۷۶، ۴۹۸، ۱۴۸۱
〃 پر راحت ۷۲۴
〃 بدی کی جامع تعلیم۔ ۷۶۶
〃 اور بدی کا مقابلہ۔ ۱۱۲۹
〃 فرائض انسانی میں سے ہے۔ ۱۱۸۰
〃 کا ظاہر پر نشان۔ ۱۲۸۲
〃 سے روحانی ترقیات۔ ۱۴۵۳
نیل۔ ۸۳۳، ۱۳۳۵
نینوی۔ اہل نینوی کا عذاب۔ ۶۴۰

و

وادی نمل۔ ۱۰۱۸
واشمات۔ ۳۸۲
والدین۔ کی ذمہ داری اولاد کے متعلق۔ ۳۱۴
〃 سے سلوک۔ ۷۸۷
وحی۔ ضرورت وحی۔ ۴، ۳۳، ۷۶۵
وحی الٰہی پر ایمان لانے کی ضرورت۔ ۱۱
پہلی وحی پر ایمان۔ ۱۱
〃 مع عدم عمل۔ ۱۱
〃 سے تکمیل قوائے فطرت۔ یا فطری کمزوری کا علاج۔ ۲۰، ۸۹۰
〃 خارجی شے ہے۔ ۲۵، ۳۲
۸۴، ۵۴۸، ۶۷۶، ۱۴۴۴
نزول وحی کا قانون۔ ۳۳
〃 ہر شخص کو کیوں نہیں ہوتی۔ ۲۹۳
〃 کے اقسام۔ ۳۹۷، ۱۲۲۸
〃 سے مصلح کو شرح صدر ملنا۔ ۵۰۲
〃 کی بارش سے تشبیہ۔ ۷۰۹، ۱۳۰۱
〃 صفت رحمانیت سے ہے۔ ۷۱۳
〃 اور شیاطین کا اسے سننا۔ ۷۳۴
〃 سے آخرت کا علم یقینی پیدا ہوتا ہے۔ ۸۰۴
〃 سے زندگی کا ملنا۔ ۸۷۹، ۱۲۲۹
〃 سے ربوبیت روحانی۔ ۸۱۲
〃 کا نزول الفاظ میں۔ ۱۰۰۹
〃 اور اخلاق کا تعلق ۱۳۹۵
〃 سے انقلاب عظیم۔ ۱۴۷۷
نزول وحی کی کیفیت۔ ۱۴۷۷
〃 کی جلالت۔ ۱۴۱۷
غیر نبی کو وحی ۲۰۸، ۴۵۰، ۶۷۶
غیر نبی کو یقینی وحی ۸۷۶، ۱۰۳۴
نبی کو قبل از نبوت وحی کا ہونا۔ ۶۷۶
وحی خفی۔ ۱۴۳، ۳۵۹، ۴۱۰
ودّ۔ ۱۴۱۱
وراثت میں اصول جمہوریت۔ ۳۱۷
حقوق وراثت کن باتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ۳۱۷
اولاد کا حق۔ ۳۱۸
پوتے کا حق۔ ۳۱۸
ماں باپ کے حصے۔ ۳۱۸
بھائیوں بہنوں کے حصے۔ ۳۱۸، ۳۱۹
مسئلہ کی پانچ صورتیں۔ ۳۲۲
کلالہ۔ ۳۲۱، ۴۰۱
خاوند بیوی کے حصے۔ ۳۲۰
معاہدہ یا مواخاۃ سے نہیں ۳۳۹
وسیلہ۔ ۴۲۲، ۱۳۵۳
وصیت۔ ۱۰۳، ۴۴۸
〃 کا حکم منسوخ نہیں۔ ۱۰۳
〃 خیراتی کاموں کے لیے ۱۰۳
〃 ورثاء کے لیے نہیں۔ ۱۰۴
〃 میں اصلاح۔ ۱۰۴
〃 کا حق۔ ۳۱۹
〃 کی غرض ۳۲۰
وضو۔ ۴۱۰
وعظ۔ واعظ کے لیے ضرورت عمل۔ ۳۶
وقت۔ کی قدر۔ ۱۱۰۹، ۱۴۸۵
وقف زندگی۔ ۱۹۹
ولاء ۳۱۷
ولدیت۔ اللہ کی مومنوں سے۔ ۱۵۷
〃 نبوت عامہ ہے۔ ۳۶۲
خلافت نبوت ہے۔ ۹۷۵
ولد۔ بطور مجاز۔ ۷۰
ولی کا تقرر۔ ۱۷۴
اولیاء اللہ۔ سے استمداد۔ ۹۱
〃 کو مبشرات کا ملنا۔ ۶۳۳
〃 پر نزول ملائکہ۔ ۱۲۱۳
خدا کس طرح ان کا ہاتھ آنکھ بنتا ہے۔ ۱۲۷۵
ولید بن مغیرہ۔ ۱۴۲۱، ۱۴۲۲

ہ

ہابیل۔ ۴۱۸
ہاتھ پاؤں کے کلام سے مراد۔ ۱۱۴۴
ہاجرہ۔ ۷۶، ۳۰۷ دیکھو ابراہیم۔
ہاروت ماروت۔ ۶۳، ۶۴
ہارون۔ ۴۷۶
〃 موسیٰ کی طرح صاحب امت و صاحب کتاب ہے ۱۰۴۸
〃 اور خلافت موسیٰ۔ ۵۳۴
〃 نے شرک نہیں کیا۔ ۵۳۷
〃 کو وحی۔ ۶۳۷
〃 کی عصمت۔ ۸۸۵
ہاشم۔ ۱۴۸۸
ہامان ۱۰۳۴
ہبل ۲۷۵
ہجر ۱۲۷۸
ہجرت۔ کا مفہوم باطنی ۱۲۷
〃 جو ہر وقت ہو سکتی ہے ۱۲۷
〃 کی پیشگوئی بائبل میں ۱۸۸
〃 کی طاقت نہ رکھنے والے ۳۷۵
〃 کی ضرورت۔ ۳۷۶
حالات موجود ہیں۔ ۳۷۶
ہجرت حبش۔ ۴۴۱، ۷۷۱
〃 کے واقعات۔ ۵۸۹
ہجرت مدینہ۔ ۷۷۱
〃 سے کامیابیوں کا دروازہ کھلنا۔ ۸۰۳
〃 کرنے والوں کا مرتبہ عیسیٰ بن مریم کا ہے ۱۳۴۸
〃 عورتوں کی۔ ۱۳۶۷
ہدایت۔ ۵
〃 کا کتمان ۹۳
〃 ظالم کو نہیں ملتی۔ ۱۵۷
〃 کا قانون ۷۱۳
〃 کا تعلق قلب سے ہے ۱۳۸۰
ہدہد۔ ۱۰۲۰
ہرشفیلڈ۔ ۹۸۳
ہرقل۔ ۶۲۱
ہلال۔ ۶۱۲
ہلال بن عویمر اسلمی۔ ۳۷۱
ہمسایہ کے حقوق۔ ۳۴۳
ہند بنت عتبہ۔ ۱۳۶۸
ہندو مذہب میں شراب۔ ۱۲۸
ہندوؤں میں طلاق۔ ۱۳۳
مذہب کی حالت بعثت نبوی کے وقت ۱۰۷۴
ہوا۔ کی تسخیر۔ ۹۰۹

ی

یاجوج۔ ماجوج۔ ۴۳۵، ۴۹۸، ۸۱۲، ۸۴۲
〃 انسان ہیں۔ ۸۴۴
〃 کا فساد اور ترکوں پر حملہ۔ ۸۴۵
〃 کا خروج اور انجام۔ ۸۴۶، ۹۱۳

اس فہرست میں حوالجات صفحات کے ہیں۔

" کے مقابلہ کی طاقت کسی قوم کو نہیں ۸۴۶
" کا اسلام لانا۔ ۸۴۷
" کا دنیا پر تصرف۔ ۸۱۳
یتیم۔ ۳۰۸
یتامیٰ سے میل جول۔ ۱۲۹
یتامیٰ اور انجمنیں۔ ۱۲۹
صاحب جائداد یتامیٰ۔ ۳۰۸
یتامیٰ کی خبر گیری۔ ۳۰۸
۳۸۴، ۱۴۶۸، ۱۴۸۹
جاہلیت میں۔ ۳۱۵
مال یتیم میں حق خدمت۔ ۳۱۴
یتامیٰ کی تربیت۔ ۳۱۳
یثرب۔ ۱۰۹۱
یثرو۔ ۱۰۳۸
یحییٰ۔ ۲۰۴، ۴۷۶
" کی بے گناہی۔ ۲۰۱، ۸۵۱
" کی بے نظیری۔ ۸۵۱
" کی کتاب۔ ۸۵۲
ید اللہ۔ ۱۲۷۵
یسار۔ ۷۷۰، ۹۸۳
یعقوب ۸۰، ۲۴۵، ۶۹۰، ۶۹۵
یعوق۔ ۱۴۱۱
یغوث ۱۴۱۱
یمبرس۔ ۵۲۹
یمن اور شام کی تجارت۔ ۱۱۱۹
ینیس۔ ۵۲۹
یوحنا۔ ۲۰۴
یورپ۔ پر مسلمانوں کا رعب۔ ۷۲۶
" اور تعدد ازدواج۔ ۳۱۰
" میں اسلام کا پھیلنا۔ ۴۲۱
" اور عرب جاہلیت۔ ۴۸۶
" میں تبلیغ۔ ۵۶۹
" کا طریق عمل۔ ۶۸۸
" اور معاہدہ۔ ۷۶۷
" کی دنیوی ہوشیاری اور دینی غفلت ۸۱۹

۸۱۹
یورپ کے ارادے۔ ۸۲۱
" کی تین اور پانچ قومیں۔ ۸۲۲، ۱۳۵۴
اقوام یورپ ہی یاجوج ماجوج ہیں ۸۴۴
" کا جھگڑا اور مسلمان ۸۸۵
اقوام یورپ کا نقشہ۔ ۸۹۷
" کی بیماریوں کا علاج۔ ۹۷۷، ۹۷۹
" کی ننگی تصویریں اور عرب کے فحش شعر ۹۹۴
" کی جنگ عظیم۔ ۱۳۳۱
یوزآسف۔ ۹۴۵
یوسف۔ ۴۷۶
" کا کرم وصبر۔ ۵۹۰
" کے ذکر میں آنحضرتؐ کا ذکر۔ ۶۶۲، ۶۶۳
" کو سورج چاند کا سجدہ۔ ۶۶۴
" کے خواب کی تعبیر۔ ۶۶۴
" کے قصہ میں ذکر قمیص۔ ۶۷۷
" کی عصمت۔ ۶۷۹
" اور عورتوں کا ہاتھ کاٹنا۔ ۶۸۲، ۶۸۶
" پر عورتوں کا دباؤ ڈالنا۔ ۶۸۲
" کا معصیت پر قید کو ترجیح دینا۔ ۶۸۳
" اور بادشاہ کا خواب۔ ۶۸۶
" کا مصر پر مالی تصرف ۶۸۸
" کی مہمان نوازی۔ ۶۸۹
" اور پیالہ کا واقعہ۔ ۶۹۱
" پر چوری کا الزام ۶۹۳
" اور قمیص۔ ۶۹۸
" کا عفو۔ ۶۹۷
" اور بھائیوں کا سجدہ۔ ۶۹۹
" اور اہل مصر کا ایمان لانا۔ ۱۱۹۹
یوسف آرمتیا۔ ۸۱۸، ۱۱۳۸
یوسف نجار۔ ۸۵۵
یوشع بن نون۔ ۴۱۷، ۸۴۴
یونس۔ ۴۷۶، ۶۴۰
" کی دعا۔ ۹۱۲

یونس کی قوم پر ناراضگی ۹۱۲
بلا اذن ہجرت۔ ۹۱۲، ۱۱۶۰
۱۴۰۰
" اور مچھلی۔ ۱۱۶۱
" اور کدو کا درخت ۱۱۶۲
یہود۔ مغضوب علیہم ہیں ۶
" کا عرب میں آنا۔ ۴۴
مسلمانوں کا اتباع یہود ۴۴
" کا انتظار نبی آخر الزمان۔ ۴۴
" کا پیشگوئیوں کو چھپانا۔ ۳۵
" کا بندر بننا۔ ۵۴۱، ۴۸، ۳۴۹
" کا خیال کہ ان کا عذاب محدود ہے ۵۴
" کو اپنی قوم کے خلاف جنگ نہ کرنے کا حکم۔ ۵۵
" کی تکذیب وقتل انبیاء۔ ۵۷
" کا حسد۔ ۵۹
" کا دعویٰ اور حالت عملی۔ ۵۹
" کے سحر کی پیروی۔ ۶۳
" کی خلاف اسلام شرارت ۶۵
" کے گستاخانہ سوالات۔ ۶۷
" کا توحید پر بت پرستی کو ترجیح دینا۔ ۶۷
" کی شریعت اور غذاؤں کی حرمت ۹۸
" کا عذاب استیصال۔ ۱۲۱
" میں شراب۔ ۱۲۸
" اور طلاق۔ ۱۳۳
" کا اثر اہل مدینہ پر۔ ۱۵۶
" کا روزہ میں کلام نہ کرنا۔ ۲۰۶
" کے اسلام کو بدنام کرنے کی تدابیر ۲۳۴
" کا انجام۔ ۲۵۴
" کی منافقت اور بدزبانی۔ ۲۵۷
" کا اسلامی چندوں پر استہزا۔ ۲۹۴
" کا آنحضرت صلعم پر برتاؤ۔ ۳۴۸

یہود۔ پر عرب کی بت پرستی کا اثر ۳۵۱
" کا سوال کتاب اتارنے پر ۳۹۲
" پر طیبات کا حرام ہونا ۳۹۶
" اور غیر اقوام سے نکاح ۴۰۹
" کا دعوئے ابنیت ۴۱۵
" کی عہد شکنی ۴۱۶، ۱۳۵۹، ۱۳۶۳
" کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ۔ ۴۲۱
منافق یہودی ۴۲۴
" میں سزائے زنا ۴۲۴
" کا توریت کے فیصلوں سے انکار ۴۲۵
" کو دعوت ایمان ۴۲۵
" اور نصاریٰ میں عداوت ۴۳۵
" پر دو دفعہ عذاب ۴۴۰
" کی اہل اسلام سے عداوت ۴۴۰
" کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننا ۴۵۹
" کا انکار نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۴۷۸
" پر نعما اور ان کی نافرمانی ۵۴۰
" اور حکم سبت ۵۴۰
" کا نقشہ کئی مدنی سورتوں میں ایک ہے۔ ۵۴۱
" کے قبائل مدینہ میں اور مسلمان ۱۰۹۶
" کی اصلاح عرب کی کوشش ۱۱۳۷
" کے اسلام کے خلاف منصوبے ۱۳۵۴
" کی دو جلاوطنیاں۔ ۱۳۵۹

تمت بالخیر

نِعْمَ الْمَوْلیٰ
وَ
نِعْمَ النَّصِیْر

فہرست سُوَرِ قرآن شریف

نمبر شمار	نام سُورة	زمانہ نزول	تعداد آیات	صفحہ	نمبر شمار	نام سُورة	زمانہ نزول	تعداد آیات	صفحہ
۱	الفاتحة	ابتدائی مکی	۷	۱ تا ۶	۲۸	القصص	آخری مکی	۸۸	۱۰۳۳ تا ۱۰۵۱
۲	البقرة	سنہ ۱و۲ھ	۲۸۶	۷ تا ۱۷۸	۲۹	العنکبوت	درمیانی مکی	۶۹	۱۰۵۲ تا ۱۰۶۴
۳	اٰل عمرٰن	سنہ ۳ھ	۱۹۹	۱۷۹ تا ۳۰۳	۳۰	الرّوم	〃	۶۰	۱۰۶۵ تا ۱۰۷۵
۴	النّسآء	سنہ ۵ھ	۱۷۷	۳۰۴ تا ۴۰۱	۳۱	لقمٰن	〃	۳۴	۱۰۷۶ تا ۱۰۸۱
۵	المآئِدة	سنہ ۷و۸ھ	۱۲۰	۴۰۲ تا ۴۵۳	۳۲	السّجدة	〃	۳۰	۱۰۸۲ تا ۱۰۸۷
۶	الانعام	آخری مکی	۱۶۶	۴۵۴ تا ۵۰۰	۳۳	الاحزاب	سنہ ۵و۶ھ	۷۳	۱۰۸۷ تا ۱۱۱۴
۷	الاعراف	〃	۲۰۶	۵۰۱ تا ۵۵۱	۳۴	سبا	درمیانی مکی	۵۴	۱۱۱۴ تا ۱۱۲۵
۸	الانفال	سنہ ۲ھ	۷۵	۵۵۲ تا ۵۷۴	۳۵	فاطر	〃	۴۵	۱۱۲۵ تا ۱۱۳۴
۹	التّوبة	سنہ ۹و۱۰ھ	۱۲۹	۵۷۵ تا ۶۱۶	۳۶	یٰسٓ	〃	۸۳	۱۱۳۴ تا ۱۱۴۷
۱۰	یونس	آخری مکی	۱۰۹	۶۱۷ تا ۶۴۲	۳۷	الصّٰفّٰت	〃	۱۸۲	۱۱۴۸ تا ۱۱۶۴
۱۱	هود	〃	۱۲۳	۶۴۳ تا ۶۷۱	۳۸	صٓ	〃	۸۸	۱۱۶۵ تا ۱۱۷۹
۱۲	یوسف	〃	۱۱۱	۶۷۲ تا ۷۰۲	۳۹	الزّمر	〃	۷۵	۱۱۸۰ تا ۱۱۹۲
۱۳	الرّعد	〃	۴۳	۷۰۳ تا ۷۱۷	۴۰	المؤمن	〃	۸۵	۱۱۹۳ تا ۱۲۰۷
۱۴	ابرٰهیم	〃	۵۲	۷۱۸ تا ۷۳۰	۴۱	حٰمٓ السّجدة	〃	۵۴	۱۲۰۷ تا ۱۲۱۷
۱۵	الحِجْر	〃	۹۹	۷۳۱ تا ۷۴۶	۴۲	الشّورٰی	〃	۵۳	۱۲۱۸ تا ۱۲۲۹
۱۶	النّحل	〃	۱۲۸	۷۴۷ تا ۷۷۵	۴۳	الزّخرف	〃	۸۹	۱۲۳۰ تا ۱۲۴۳
۱۷	بنیٓ اسرآءیل	ابتدائی مکی	۱۱۱	۷۷۶ تا ۸۱۱	۴۴	الدّخان	〃	۵۹	۱۲۴۴ تا ۱۲۴۹
۱۸	الکهف	〃	۱۱۰	۸۱۲ تا ۸۴۸	۴۵	الجاثیه	〃	۳۷	۱۲۵۰ تا ۱۲۵۴
۱۹	مریم	〃	۹۸	۸۴۹ تا ۹۷۰	۴۶	الاحقاف	〃	۳۵	۱۲۵۵ تا ۱۲۶۲
۲۰	طٰهٰ	〃	۱۳۵	۹۷۱ تا ۸۹۴	۴۷	محمّد	سنہ ۱ھ	۳۸	۱۲۶۳ تا ۱۲۷۱
۲۱	الانبیآء	〃	۱۱۲	۸۹۵ تا ۹۱۷	۴۸	الفتح	سنہ ۶ھ	۲۹	۱۲۷۲ تا ۱۲۸۲
۲۲	الحجّ	آخری مکی	۷۸	۹۱۷ تا ۹۳۷	۴۹	الحُجُرٰت	سنہ ۱۰ھ	۱۸	۱۲۸۳ تا ۱۲۹۱
۲۳	المؤمنون	〃	۱۱۸	۹۳۸ تا ۹۵۳	۵۰	قٓ	اِبتدائی مکی	۴۵	۱۲۹۲ تا ۱۲۹۸
۲۴	النّور	سنہ ۵ھ	۶۴	۹۵۴ تا ۹۸۱	۵۱	الذّٰریٰت	〃	۶۰	۱۲۹۸ تا ۱۳۰۴
۲۵	الفرقان	آخری مکی	۷۷	۹۸۱ تا ۹۹۵	۵۲	الطّور	〃	۴۹	۱۳۰۵ تا ۱۳۱۰
۲۶	الشّعرآء	〃	۲۲۷	۹۹۶ تا ۱۰۱۳	۵۳	النّجم	〃	۶۲	۱۳۱۱ تا ۱۳۲۰
۲۷	النّمل	〃	۹۳	۱۰۱۴ تا ۱۰۳۲	۵۴	القمر	〃	۵۵	۱۳۲۱ تا ۱۳۲۷

نمبر شمار	نام سُورۃ	زمانہ نزول	تعداد آیات	صفحہ
۵۵	الرّحمٰن	ابتدائی مکّی	۷۸	۱۳۲۷ تا ۱۳۳۶
۵۶	الواقعہ	〃	۹۶	۱۳۳۷ تا ۱۳۴۴
۵۷	الحدید	سنہ ۸ھ	۲۹	۱۳۴۴ تا ۱۳۵۲
۵۸	المجادلہ	سنہ ۳-۴ھ	۲۲	۱۳۵۲ تا ۱۳۵۸
۵۹	الحشر	سنہ ۳-۴ھ	۲۴	۱۳۵۸ تا ۱۳۶۴
۶۰	الممتحنۃ	سنہ ۷ھ	۱۳	۱۳۶۴ تا ۱۳۶۸
۶۱	الصّف	سنہ ۱ھ	۱۴	۱۳۶۹ تا ۱۳۷۲
۶۲	الجمعۃ	سنہ ۱ھ	۱۱	۱۳۷۳ تا ۱۳۷۵
۶۳	المنافقون	سنہ ۵ھ	۱۱	۱۳۷۶ تا ۱۳۷۸
۶۴	التّغابن	سنہ ۱ھ	۱۸	۱۳۷۸ تا ۱۳۸۱
۶۵	الطّلاق	سنہ ۵ھ	۱۲	۱۳۸۲ تا ۱۳۸۶
۶۶	التّحریم	سنہ ۹ھ	۱۲	۱۳۸۶ تا ۱۳۹۱
۶۷	الملك	ابتدائی مکّی	۳۰	۱۳۹۲ تا ۱۳۹۵
۶۸	القلم	〃	۵۲	۱۳۹۶ تا ۱۴۰۰
۶۹	الحآقّۃ	〃	۵۲	۱۴۰۱ تا ۱۴۰۴
۷۰	المعارج	〃	۴۴	۱۴۰۵ تا ۱۴۰۸
۷۱	نوح	〃	۲۸	۱۴۰۹ تا ۱۴۱۱
۷۲	الجنّ	〃	۲۸	۱۴۱۲ تا ۱۴۱۶
۷۳	المزّمّل	〃	۲۰	۱۴۱۶ تا ۱۴۱۹
۷۴	المدّثّر	〃	۵۶	۱۴۲۰ تا ۱۴۲۴
۷۵	القیٰمۃ	〃	۴۰	۱۴۲۴ تا ۱۴۲۸
۷۶	الدّھر	〃	۳۱	۱۴۲۹ تا ۱۴۳۲
۷۷	المرسلٰت	〃	۵۰	۱۴۳۳ تا ۱۴۳۶
۷۸	النّبا	〃	۴۰	۱۴۳۷ تا ۱۴۳۹
۷۹	النّٰزعٰت	〃	۴۶	۱۴۴۰ تا ۱۴۴۳
۸۰	عبس	〃	۴۲	۱۴۴۴ تا ۱۴۴۶
۸۱	التّکویر	〃	۲۹	۱۴۴۶ تا ۱۴۴۹
۸۲	الانفطار	〃	۱۹	۱۴۵۰ تا ۱۴۵۱
۸۳	المطفّفین	〃	۳۶	۱۴۵۱ تا ۱۴۵۴
۸۴	الانشقاق	〃	۲۵	۱۴۵۴ تا ۱۴۵۶
۸۵	البروج	ابتدائی مکّی	۲۲	۱۴۵۶ تا ۱۴۵۸
۸۶	الطّارق	〃	۱۷	۱۴۵۸ تا ۱۴۶۰
۸۷	الاعلیٰ	〃	۱۹	۱۴۶۰ تا ۱۴۶۲
۸۸	الغاشیۃ	〃	۲۶	۱۴۶۲ تا ۱۴۶۴
۸۹	الفجر	〃	۳۰	۱۴۶۴ تا ۱۴۶۶
۹۰	البلد	〃	۲۰	۱۴۶۶ تا ۱۴۶۸
۹۱	الشّمس	〃	۱۵	۱۴۶۹ تا ۱۴۷۰
۹۲	الّیل	〃	۲۱	۱۴۷۱ تا ۱۴۷۲
۹۳	الضّحیٰ	〃	۱۱	۱۴۷۲ تا ۱۴۷۳
۹۴	الانشراح	〃	۸	۱۴۷۴ تا ۱۴۷۵
۹۵	التّین	〃	۸	۱۴۷۵ تا ۱۴۷۶
۹۶	العلق	〃	۱۹	۱۴۷۶ تا ۱۴۷۸
۹۷	القدر	〃	۵	۱۴۷۸ تا ۱۴۷۹
۹۸	البیّنۃ	〃	۸	۱۴۸۹ تا ۱۴۸۰
۹۹	الزلزال	〃	۸	۱۴۸۱ تا ۱۴۸۱
۱۰۰	العٰدیٰت	〃	۱۱	۱۴۸۲ تا ۱۴۸۳
۱۰۱	القارعۃ	〃	۱۱	۱۴۸۳ تا ۱۴۸۴
۱۰۲	التّکاثر	〃	۸	۱۴۸۴ تا ۱۴۸۵
۱۰۳	العصر	〃	۳	۱۴۸۵ تا ۱۴۸۵
۱۰۴	الھمزۃ	〃	۹	۱۴۸۶ تا ۱۴۸۶
۱۰۵	الفیل	〃	۵	۱۴۸۷ تا ۱۴۸۷
۱۰۶	قریش	〃	۴	۱۴۸۸ تا ۱۴۸۸
۱۰۷	الماعون	〃	۷	۱۴۸۹ تا ۱۴۸۹
۱۰۸	الکوثر	〃	۳	۱۴۹۰ تا ۱۴۹۰
۱۰۹	الکٰفرون	〃	۶	۱۴۹۱ تا ۱۴۹۱
۱۱۰	النّصر	سنہ ۱۰ھ	۳	۱۴۹۱ تا ۱۴۹۱
۱۱۱	اللّھب	ابتدائی مکّی	۵	۱۴۹۲ تا ۱۴۹۳
۱۱۲	الاخلاص	〃	۴	۱۴۹۳ تا ۱۴۹۳
۱۱۳	الفلق	〃	۵	۱۴۹۳ تا ۱۴۹۴
۱۱۴	النّاس	〃	۶	۱۴۹۵ تا ۱۴۹۶